THE BOOK WAS DRENCHED

ہوں گی۔ تمہاری خدمت اور بچوں کی دیکھ بھال میں نہیں میرے بدلے کوئی اور آکر کر جاتا ہے۔ مگر تم سے جو مسئلہ پوچھا تھا اُس کے جواب سے پہلو خوب بچا گئے۔ مفتی کوئی آسمان سے تھوڑا ہی ٹپکا کرتے ہیں۔ عالم دین ہی مفتی بھی ہوتے ہیں۔ تم نے علم دین آخر اسی لئے پڑھا ہے نا؟ کہ دین کے مسئلے مسائل خود بھی جان لو۔ اور جو نہیں جانتے اُنہیں بھی بتاؤ۔ پھر میرے سوال سے جان بوجھ کر کیوں پہلو تہی کر رہے ہو۔

ہم:- بیوی کے ساتھ اُس کے فرائض بھی تو پوچھنے چاہئے۔

بیوی:- بیوی کے فرائض مجھے سب معلوم ہیں۔ تم شوہر کے فرائض اور بیوی کے حقوق مذہب کی رُو سے بتاؤ۔

ہم:- خاوند پر بیوی کے یہ حقوق ہیں کہ اپنی حیثیت اور بیوی کی خدمت کے مطابق اُس کے نان و نفقے کا انتظام کرے۔ مناسب حد تک اُس سے محبت اور شوہرانہ انداز کا اُس کا احترام بھی کرتا رہے۔ شوہر کے فرائض یہ ہیں کہ بیوی کو صاف اور دشمنداؤں والے گھر کی چار دیواری میں نظر بند رکھے۔ جلسہ بازسہیلیوں سے اُسے ملنے نہ دے۔ نیاز مند شوہروں کی بر خود غلط بیویوں کو گھر میں آنے نہ دے۔ زنانہ رسائل و اخبارات زنانہ لیڈرات اور زنانہ لیڈیات کی زد سے اُسے ایمان کی طرح بچائے رکھے۔ گھر کا کام کاج زیادہ ہو تو ہاتھ بٹانے کے لئے حسب ضرورت و گنجائش آمدنی چار کی شرعی تعداد تک اضافہ بھی کر سکتا ہے۔

بیوی کا فرض یہ ہے کہ شوہر کو اپنی دُنیا بنا کر باقی ساری دُنیا کو بھول جائے۔ اُس کی اطاعت خدمت اور اُس کے بچوں کی پالنگت کو اپنی نجات اور خدا کی خوشنودی کا وسیلہ بنائے۔

بیوی:- اس فرائض نامے کو کبھی تم بھی کرو گے کہ نہیں! ہم نے تو سُنا تھا کہ اسلام میں عورت اور مرد کے حقوق مساوی ہیں۔ تمہارے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیوی اپنے خاوند کی تابعدار ہوتی ہے۔

ہم:- جب عورت مرد ہی برابر نہیں تو اُس کے حقوق کیونکر مساوی ہو سکتے۔ مرد انسان ہے۔ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ ساری کائنات اور عورت خدا نے مرد کے لئے پیدا کی ہے اور مرد کو اپنی بندگی اور بزم دنیا میں اپنی نمائندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔ پھر بھلا مرد اور عورت کے حقوق برابر کیوں ہو سکتے ہیں؟ نہیں ہو سکتے۔ بیوی شوہر کی بندور ہوتی یہ سوال خود بخود حل ہو جائے گا جب تم یہ معلوم کرو گی کہ میاں الفاظ آقا کے لئے بولے جاتے ہیں۔ پھر جب مرد آقا کہلائیگا تو آگے خود تم بتلا لو کہ بیوی اُس کی رشتہ میں کیا لگتی ہے؟

بیوی:- کیا واقعی تمہارا یہی مذہب ہے؟ مذاق تو نہیں کر رہے ہو!

ہم:- میرا کیا تمہارا بھی یہی مذہب ہے۔ مذہب کے معاملے میں مذاق کیسا؟

بیوی:- توبہ میرا یہ مذہب ہو۔ میں تو خدا کے فضل سے مسلمان ہوں۔ میرے مذہب میں تو عورت مرد میں بڑائی چھٹائی نہیں۔

ہم:- مسلمان تو بحمد اللہ ہم بھی ہیں، اور پکا سا مسلمان ہیں۔ کیونکہ تمہارے قول کے مطابق عالم دین بھی ہیں۔ ہم نے تو قرآن شریف میں یہی پڑھا ہے۔

"اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ"

یعنی مرد عورتوں کے حاکم ہوتے ہیں۔

بیوی:- کس قرآن میں یہ لکھا ہے کہ بیوی شوہر کی محکوم ہے اور اُس کی بندور؟

ہم:- اُس قرآن میں جو حضرت رسول اللہ صلعم پر نازل ہوا تھا۔ جو مسجدوں، مکتبوں، دین محمد تاجر کتب کی دکانوں اور ہماری الماری میں رکھا ہے۔ جسے چھٹپن میں تم نے مُلانی سے پھچیاں کھا کر اور ہم نے میاں جی سے جوتیوں کے زور پر پڑھا ہے۔ جس کی ہم کبھی کبھی اور پولیس کے گواہ آئے دن عدالت میں قسمیں کھایا کرتے ہیں۔

بیوی:- توبہ میں نے پھچیاں کھائی ہوں۔ مجھے تو مُلانی بہشتن نے کبھی پھول کی چھڑی بھی نہیں لگائی۔ تم نے جوتیاں کھائی ہوں گی۔

ہم:- مُلانی تمہاری بہشتن تھی یا نہیں، یہ تو تمہیں معلوم ہوگا۔ مگر سُنا ہے کہ اپنی شاگردوں کو روئی کی طرح دُھنکا کرتی تھی۔ تم مکرنے کو مکر جاؤ ہمیں تو اقرار ہے کہ ہم نے قرآن، کفش خوری، گوشمالی اور گوشش گیری کے زور پر پڑھا ہے۔ اللہ جنت نصیب کرے ہمارے میاں جی کو کان اِس انداز سے امیٹھا کرتے تھے کہ کانوں والا کان کے ہر پیچ کے ساتھ گھوم جاتا تھا۔ ۳۵ برس اس حادثے کو بیت گئے۔ مگر ہمارے کان اُس وقت کی زک اُٹھائے ہوئے آج تک اپنے مرکز پر نہیں آ سکے۔ میاں جی نے کانوں کو دو سال تک امیٹھا بھی اور کھینچا بھی۔ کمبخت بڑے سخت جان تھے جو اُکھڑے نہیں پھر مرحوم کی مشق توجہ سے شرقاً غرباً اس قدر پھیل گئے ہیں کہ ہمارے

[illegible] نہیں رہا۔ محلّے کے ہمجولیوں نے ہمارے [illegible] ہمارا نام "کن پھیڑو" رکھ دیا تھا۔ وطن کو خیرباد کہنے تک اسی معزز لقب سے ہم یاد کئے جاتے رہے۔ خیریت یہ ہوئی کہ پردیس میں کوئی بچپن کا واقف نہیں ملا۔ ورنہ یہ لقب تاریخی صورت اختیار کر جاتا۔

بیوی:۔ میں تو جب خوش ہوتی کہ تمہارے میاں جی تمہارے دونوں کان جڑ سے اکھاڑ پھینکتے۔

ہم:۔ وہ ضرور اکھاڑ پھینکتے، مگر بیوی والے تھے۔ جانتے تھے کہ یہ بھی کبھی کسی بیوی کا میاں بنے گا۔ اس کے ناک کان اس کی بیوی کی امانت ہیں۔ میں امانت میں خیانت کرنے والا کون؟ میاں کے کان اُکھڑے پائے گی تو مجھے لعنت ملامت کرے گی کہ میاں جی خواہ مخواہ میرے بیویانہ فرائض میں مداخلت بے جا کر گئے۔ لو اب سنبھالو اپنی امانت کو۔ لاؤ کوئی تیز سا چاقو۔

بیوی:۔ کوئی بیوی کسی میاں کی ناک کان نہیں کاٹا کرتی میاؤں کے کوتک اُن کے ناک کان کٹوایا کرتے ہیں۔ تمہارے یہی رنگ ڈھنگ رہے تو کسی دن کوئی ماں کا لال یہ فرض بھی ادا کر دے گا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟

ہم:۔ وہ ماں کے لال خدا کرے ہمارے سالار جنگ بہادر نہ بن بیٹھیں اور کسی کو ہمارے ناک کان بھلا کیا تکلیف پہنچا رہے ہیں؟ جو ان کے متعلق غیر آئینی زحمت مول لے گا۔

بیوی:۔ سالار جنگ کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے تمہارے ناک کان کاٹنے کی؟ تمہارا کوئی بھائی بند کاٹے یا اکھیڑے۔ جو تمہاری کمائی کے حقدار ہیں وہی ناک کان کے بھی خریدار بنیں گے۔

دیکھو جی میرے بھائی کا نام ہر بات میں مت لیا کرو۔ وہ بیچارہ کسی کے لینے میں نہیں دینے میں نہیں، اچھے میں نہیں بُرے میں نہیں، مگر دُنیا ہے کہ اُسے ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

ہم:۔ "دنیا" تمہارے دونوں آنکھوں سے چار سال تک چھاتی پر مونگ دلتے دیکھتی رہی ہے اور منہ سے اُف تک نہیں کی۔ نیم آستین پہن کر دسترخوان پر پلیٹیں کی پلیٹیں دُنیا تو نہیں صاف کیا کرتی تھی؟

بیوی:۔ پھر تم نے اُس کے کھانے دُکھا! تین تین مہینے تمہارا سارا بیانت اُسی کا مہمان رہا کرتا تھا یا کسی اور کا؟

تمہارے گھر والوں کو تو کبھی اتنا بھی سوذی نصیب نہیں ہوا کہ ایک وقت ہی کے لئے ہاتھ گیلے کر دیتے۔ ہاں ہلنے کھانے کو خوب ہیں۔ منہ اُٹھا اور لاہور کو چل کھڑے ہوئے۔ پھر اتنی توفیق کبھی نہیں ہوتی کہ لاؤ بچوں کے ہاتھ پر دو چار پیسے رکھ دیں۔ یہ کیا جانیں گے کہ تائے چچے کیا ہوتے ہیں؟ بس ننگ دھڑنگ آ کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"مکھن لاؤ، پیسٹری منگواؤ۔ بریانی پکاؤ، لوبانی منگواؤ۔ یہ کھلاؤ وہ کھلاؤ۔"

جب آئیں گے منہ کی لبساند نکال جائیں گے۔ اِدھر وہ تمہارے خاندان کی قلماقلنیاں آٹھ دن خدا کے یہیں کھڑی نظر آئی ہیں۔ ذرا دل پہ چتیا اُٹھا اور "چلو لاہور" پھر مکھیاں مارتی آتی ہیں اور موذی کا سامال سمجھ کر کھاتی بھی ہیں۔ لٹاتی بھی ہیں۔ چار دن میں سیب کا سا رنگ نکال کر چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ گھر جا کر ہر ایک کو یہ سناتی ہیں:۔

"دلھن بڑی اکل کھری ہے۔ سسرال کے کسی آدمی کو دیکھ نہیں سکتی۔ یہاں سے کسی کو آتے دیکھا اور صندوقوں الماریوں میں قفل پڑنے شروع ہو گئے۔ ہاں بھائی بھاوج منہ چھوٹ کھاتے ہیں اور دندناتے ہیں۔ خصم کی کیا مجال جو انہیں تم سے تو بھی کہہ سکے۔ خصم ہے نگوڑا۔ ہیز۔ جرُوا کا غلام۔ ندیدے کو کوئی جرُوا ملتی تو جانے کیا کرتا؟ اِدھر سے آیا بیگم کیا ہو رہا ہے۔ اُدھر سے نکلا بیوی تمہاری طبیعت کیسی ہے، تم نے سیب بھی کھائے — سنگتروں کا عرق بھی پیا، بٹیروں کی یخنی پیتی ہونا؟ دواءالمسک یاد کر کے کھا لیا کرو۔

سُن سُن کر جی کے کباب ہو جاتے ہیں۔ کچھ جرُوا نہ جرُوا کی دُم ٹھکی سی نگوڑی۔"

یہ ہے تمہاری قلماقلنیوں کا وتیرہ۔ میں بُری ہوں، اکل کھری ہوں، سب کچھ ہوں۔ پھر آتی کیوں ہیں یہ بلائیں؟ میں اِن کے گھروں پر خاک ڈالنے کون سے دن جاتی ہوں کہ یہ یہاں بن بلائی مہمان بن کر آٹھویں دن کھڑی نظر آتی ہیں؟ اب کے [illegible] میرے گھر میں قدم رکھ کے دیکھے، کو نیچے نہ کاٹ دوں تو میرا نام خورشید بیگم نہیں۔ بنوڈومنی رکھ دینا۔

میرا بھائی تمہاری زبان پر خوب [illegible] ہے۔ ہائے ہائے تمہارا جگرا! شاباش ہے تمہیں! [illegible] تو بہنوئی کو دیکھ دیکھ

کہ بھولے نہیں سماتا، فرشِ راہ ہوا جاتا ہے۔ اور بہنوئی صاحب کا حال یہ ہے کہ ہریں گے پھریں گے۔ بُہائی پہ اُسی کو یاد کریں گے۔

ہم :- ہاں بیوی تم سچّی، ہمارا گرو سچا۔ جھوٹا کل سنسار۔ ہم بُرے، ہمارا کنبہ بُرا، کنبے کے مرد نِرے کھوٹے ٹکنگھٹے، اور عورتیں قلماقنیاں اُردو بیگنیاں۔ جو کچھ کہو وہ تھوڑا ہے۔ ایک غلطی کر بیٹھے ہیں پہاڑ جیسی غلطی۔ اُس کی سزا جو دوگی جب تک دو گی بھگتیں گے۔ تمہاری قیدِ بے میعاد میں گرفتار ہیں۔ زندانِ عنصری سے آزادی کبھی ملے گی تو تمہاری قید و بند سے بھی رہائی پائیں گے۔

بیوی :- میری قید سے اُس وقت بھی رہائی نہیں پا سکتے۔ مطمئن رہو۔ دنیا کے آگے قیامت ہے۔ میں وہاں بھی تمہیں موجود ملوں گی۔ ذوقؔ شاعر تمہارے لئے یہ شعر کہہ گیا ہے

"اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"

ہم :- کدھر جاتے؟ جہنم میں جائیں گے۔ تمہارے قدموں کی برکت جہنم سے اِدھر تھوڑا ہی رہنے کو چھوڑے گی۔ تمہارا قصور ہی ایسا کیا ہے ہم نے۔

بیوی :- بھلا میں تمہاری کون؟ تین میں نہ تیرہ میں۔ تمہارے قرآن کی رو سے تمہاری بندوری ہوں۔ بھلا بندوری آقا کا کیا بنا بگاڑ سکتی ہے۔ جہنم یا بہشت جہاں بھی تمہیں پہنچائیں گی۔ تمہاری پیاری کھاوجیں تم پر حق جتانے والی بہنیں، تمہاری کمائی کے حقدار رشتہ دار تمہارے گھر کو گھر داماد بنانے والے بھانجے بھتیجے۔ میں بے چاری کون؟ خاندان کی شریک نہ خون کی۔ بندوری ہوں بندوری۔ دن رات اپنی ہڈیاں پیلتی ہوں، تمہارے بچّوں کی ماماگیری کرتی ہوں۔ بچّوں کے آگے کا بچا کھچا جو مل جاتا ہے۔ زہر مار کر لیتی ہوں۔ ہفتوں بیمار پڑی رہتی ہوں کوئی جھوٹے کو بھی یہ نہیں پوچھتا کہ تیرا کیا حال ہے؟ تو کیوں... نڈھال ہے؟ دو دو دن منہ میں کھیل اُڑ کر نہیں جاتی۔ ہاتھ ٹوٹ جائیں جو کوئی دو چمچے دلیا پکا کے منہ میں ڈالنے کی زحمت اُٹھائے۔ زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں، دُنیا کے کندھے کا بوجھ بنی ہوئی ہوں۔ جس دن آنکھیں بند ہوئیں کفن میلا ہونے سے پہلے تمہاری یہ آدم خور بلائیں کوئی ہتنی لاکر بٹھا دیں گی۔

نئے نویلے دولہا کبھی بھولے سے بھی یاد نہ کریں گے۔ یاد نہ کریں گے کہ اٹھارہ سال کی بندوری نے دن کو دن نہیں سمجھا۔ رات کو رات نہیں جانا۔ آٹھ پہر میرے بچّوں، میرے سنتے جیل رشتہ داروں کی خدمت کرتی رہی۔ لاؤ دو بول فاتحہ کے پڑھ کے اُس کی رُوح کو ثواب پہنچا دیں۔

ہم :- بیوی بس اب یہ مرثیہ ختم کرو۔ رونے کو جی چاہ رہا ہے چاہنے لگا۔ اُس کا ایک آدھ بند اور پڑھ دیا تو حسین حسین کرنے لگیں گے۔ آنکھیں گھٹا کی طرح تُلی ہوئی ہیں، کہیں ان سے بوندا باندی شروع ہوگئی تو جھڑی لگتے دیر نہ لگے گی۔ اب تو کوئی تازہ بھجن الاپنے لگو۔ ٹھمری ٹپّے سنتے سنتے کان پک گئے۔

بیوی :- نوج میں ٹھمری ٹپّے سناؤں۔ کوئی ادبی رالی سمجھ لیا ہے مجھے؟ ٹھمری ٹپّے سنو زنگیلی کھاوجوں سے۔ "البیلی آپاؤں" سے خبردار جو اب میرے سامنے ٹھمری ٹپّے کا نام لیا۔ لو جی! اور سنو! ہم سے اب ٹھمری ٹپّوں کی فرمائش ہوتی ہے۔ کل کو کہیں گے ناچو، گاؤ، بھاؤ بتا کر دکھاؤ۔ ٹھمری ٹپّے سننے کا اتنا چسکا تھا تو کسی ڈومنی ڈمری سے رشتہ جوڑا ہوتا۔ شریف گھرانوں کی خاک کیوں چھانتے پھرے؟

ہم :- بس یہ ہی تو غلطی ہوئی، اسی کو تو سر پکڑ کے روتے ہیں کسی غیر شریف گھرانے کی آتی تو نالائق بیوی بن کے تو رہتی۔ خاوند کی آقائے نامدار بننے کی جرأت تو نہ کرتی۔

بیوی :- ارے یہ کہو! قسمت اچھی تھی کہ مجھ نصیبوں جلی کو اندھے امّاں باوا نے تمہاری پچھل پیریوں کے جال میں ڈال دیا۔ "لڑکا عالم دین ہے، خدا رسول کو پہچانتا ہے۔" یہ عالم دین ہیں۔ صورت دیکھنا! عالم دین کی۔ روزے سے واسطہ نہ نماز سے۔ قرآن کو مانے نہ حدیث کو۔ "عورت بندور ہوتی ہے" جی ہاں "بندور ہوتی ہے۔" ان سے کوئی یہ پوچھنے والا نہیں کہ عورتوں نے نبیوں کو جنا۔ اماموں کو گود میں کھلایا۔ ولیوں کو دودھ پلایا۔ تو کیا میرے منہ میں خاک وہ خدانہ کرے۔ ان کی بندوریں تھیں؟

ہم :- توبہ توبہ! ہماری بندوریں کیوں ہونے لگی تھیں، ہم تو انہیں ساری دنیا کے لئے قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ البتہ یہ پھر بھی کہیں گے کہ اپنے خاوندوں کی خادمائیں ضرور تھیں۔ جیسے ہم تمہارے لئے خدا کے خلیفہ ہیں۔ اسی طرح اُن کے نیک صفات شوہر اُن کے آقا تھے۔

بیوی :- آپ ہمارے لئے خدا کے خلیفہ ہیں؟ اے سبحان اللہ! کیا کہنے خلیفہ جی کے۔ پڑوس کے جمّن نائی کو بھی تو لوگ خلیفہ ہی کہہ

کر پکارتے ہیں۔ بس تمہاری خلافت بھی کچھ اسی ٹائپ کی ہوگی۔

ہم:۔ ہاں بیگم! سچ کہتی ہو۔ شوہر اپنی بیوی کے لئے چھدّوانہ طرز کا بھی خلیفہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بیوی کا عورت پن اُس کی ناک چوٹی سے زیادہ وابستگی رکھتا ہے۔ جب کوئی بیوی اپنے بیویانہ حدود سے آگے بڑھ کر شوہر بننے کی جرأت کرنے لگتی ہے تو مرد کو یہ حق بھی حاصل ہوجاتا ہے کہ کورے اُسترے کے ذریعے اِس جعلی شوہر کی ناک چوٹی سے تبادلۂ خیالات کرلیا کرے۔

بیوی:۔ اور اگر کوئی اُجڈ قسم کا شوہر اپنے حدود توڑنے لگے۔ تو اُس کی داڑھی مونچھ کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیئے؟ اُس وقت بیوی کو چھدّو خلیفہ کی قائم مقامی کرنے کی اجازت ہوگی کہ نہیں؟

ہم:۔ بیگم صاحب! مرد کے کوئی حدود نہیں ہوتے، وہ بیکراں ہوتا ہے۔ اُس کی داڑھی مونچھیں قانونِ جزا و سزا سے بالاتر ہیں۔ وہ مرد ہے۔ ظل اللہ ہے۔ ساری کائنات کا آقا ہے۔ وہ مالک اور چمنستانِ ہستی جس کا ایک مرجھایا ہوا سا پھول عورت بھی ہے اُس کی ملکیت ہے۔

بیوی:۔ تو میں تمہاری مملوکہ ہوں۔ جیسا تمہارے گھر کا فرنیچر یہی حیثیت میری ٹھہری نا؟

ہم:۔ بیگم گھر کے فرنیچر میں تو بعض چیزیں بیوی سے زیادہ ضروری ہوتی ہیں۔

بیوی:۔ مثلاً۔

ہم:۔ مثلاً مطالعے کی کتابیں۔ ٹائم پیس، فونٹن پن، بیڈ پیڈ وغیرہ۔

بیوی:۔ پھر اگر بیوی کو فرنیچر ہی سمجھتے ہو تو آئے گئے مہمان کو ڈرائنگ روم کی دوسری چیزیں دکھاتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کرو کہ کچھ فرنیچر گھر میں پڑا ہے اُسے بھی دیکھ لیجئے!

ہم:۔ ہاں اگر کوئی ایسا مہمان آجائے جس سے ہم تمہارا پردہ ضروری نہ سمجھیں تو اُسے ڈرائنگ روم کی سیر کراتے ہوئے اسی قسم کی گفتگو کریں گے۔

جناب یہ قالین جو ہال کمرے میں بچھا ہے۔ ستر روپے کا ہے۔ یونرسٹڈ آکشن روم سے سستا مل گیا، اس کی اصلی قیمت ڈھائی سو ہے۔ یہ فریم والی تصویر مرادی ورما کا شاہکار ہے۔ اس تصویر پر امریکہ کی نمائش میں مصور کو اوّل درجے کا انعام مل چکا ہے۔ یہ چائے کا سیٹ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ فرانس کا شہنشاہ لوئی چہارم اسے استعمال کیا کرتا تھا۔ اور یہ ہماری بیوی ہیں۔ بریانی بُورانی پلاؤ چلاؤ خوب پکانا جانتی ہیں، زیادہ باتونی نہ ہوتیں تو خوب چیز تھیں۔

بیوی:۔ تمہارے دیدے کی زیارت کرنی ہے۔ اچھا پھر یوں ہی سہی۔ میری بھی کوئی سہیلی بشرطیکہ عمر رسیدہ ہوئی، کبھی مہمان بن کر آئی تو میں بھی گھر کی سیر کراتے ہوئے اُس سے اسی طرح کی باتیں کروں گی:۔

بہن یہ میری مرغی ہے، لگاتار انڈے دیتی ہے، کڑک نہیں ہوتی، یہ کتیا بڑی اچھی نسل کی ہے۔ خوب سدھ گئی ہے۔ یہ طوطا بڑا ذہین ہے۔ ہر بات کی نقل اتارتا ہے، یہ گرگابی کرنال شاپ سے ۱۳ روپے میں آرڈر دے کر بنوائی تھی۔ بازار میں ان داموں کو نہیں ملے گی۔ میرا یہ کشمیری نوکر بڑا ایماندار اور خدمت گزار ہے۔ چھ روپے اور کھانے پر نوکر رکھ چھوڑا ہے۔ روٹی تو خیر بُری بھلی پکا لیتا ہے مگر سالن پکانا اسے ابھی نہیں آتا۔ سیکھتے سیکھتے سیکھ جائیگا۔ اور یہ جو چارپائی پہ ڈھیر ہوئے پڑے ہیں۔ میرے شوہر نامدار ہیں مشہور شاعر اور اس سے زیادہ مشہور ادیب ہیں۔ اپنے سوا ساری دنیا کو پاگل خیال کرتے ہیں۔ بہت اچھے مصاحب اور بہت بُرے شوہر ہیں۔ اِن کی تحریر سے کسی دماغی بیماری کا پتہ نہیں چل سکتا۔ ہوش پہ ہوتے ہیں تو دانائی کی باتیں بھی کر لیا کرتے ہیں۔ دن بھر اونگھتے ہیں، رات کو جاگتے ہیں۔ ٹوٹتی رات اُلّو کی آواز بھگانا شروع کر دیتے ہیں۔ میری بکری جتنے پتّے کھاتی ہے۔ اتنے ہی یہ پان چباتے ہیں۔ ان کے پان کی پیک سے پیکداں ترسنا رہتا ہے اور یہ رنگینئ سیّال زیادہ گھر کے در و دیوار اور پوشاک کے لئے ہدیۂ مفت نظر بن جاتی ہے۔ کسی سے سرگوشی کی ضرورت پیش آتی ہے تو مخاطب کا گوشِ شنوا بات سننے سے پہلے پان کے رازِ ارغوانی سے لالہ زار ہو جاتا ہے۔

جہاں یہ سو رہے ہوں قدرت بڑے اصرار کے ساتھ آس پاس کے ہر جاندار کو جاگنے پہ مجبور کر دیتی ہے۔ اِن کے خراٹوں کی حواس پاش موسیقی سے کہاروں کے محلے تک گنگنا اُٹھتے ہیں۔ اِن دل گداز نغموں کو سُن کر طوطیوں تک شب زندہ دار قدرشناس یہ یک آواز وہ شور مرحبا بلند کرتے ہیں کہ آنکھوں سے نیند، دلوں سے قرار اور دماغوں سے عقل، گریز پائی اختیار کر جاتی ہے۔

جیتے رہیں، بڑی خوبیوں کے انسان ہیں۔

"ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی؟"

ہم:- جی خوب کہی۔ آپ کبھی بے خوب بھی کہا کرتی ہیں؟ درست، بجا، مناسب، مگر یہ بھی تو کہو کہ جس خوش قسمت عورت نے ان غیر معمولی صفات کے انسان کو شوہری کے لئے انتخاب کیا وہ بھی زیارت ہی کے قابل ہوگی۔ اس سے زیادہ موزوں شوہر اُسے پراپت نہ ہوسکا ہوگا۔ تبھی تو ایسے عجوبۂ روزگار کو عزیز کرکے قبولا ہوگا۔ وہی کہاوت کہ جیسی رُوح ویسے فرشتے۔

قرآن پاک بھی تو یہی فرماتا ہے کہ

"اَلْخَبِیْثَاتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ"، کیوں غلط کہہ رہا ہوں بیوی! ہماری تمہاری تو وہی مثل ہے۔

"اللہ ملائی جوڑی ایک اندھا ایک کوڑھی"

بیوی:- مجھ سے نشتر پرے دور۔ تمہیں ہوگئے اندھے بھی اور کوڑھی بھی۔ میری آنکھوں سے اپنی کسی قلماقنی کی آنکھیں ملالو! تمہاری بہنڑی کہا کرتی ہیں کہ چشم بد دور ہماری چھوٹی بھاوج کی آنکھیں جہانگیر کی نورجہاں سے ملتی جلتی ہیں۔ "کیوں کہا کرتی ہیں؟ نہیں؟

ہم:- کہا کرتی ہوں گی۔ ہم سے تو ایک دفعہ یہ پوچھتی تھیں کہ کیوں بھیا! تمہاری دلہن کی آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا تھا؟ ہائے ہائے تم نے پہلے ہی سے خیر خبر نہ لی۔ دکھایا کی اچھی بھلی آنکھیں "موگے" لے جاکر ناگوری بیل کی سی کرالیں۔ چاؤ چونچلے تو اتنے بگھارتے رہتے ہو یہ نہ دیکھا گیا کہ آنکھیں خراب ہوئی جارہی ہیں۔ پھر آنکھیں بنوائی تھیں تو غضب کیا آتشیں شیشوں کی عینک تو لے دی ہوتی۔ یوں تو وہ پھر خراب ہوجائیں گی۔ اور خدا نہ کرے پھر بگڑ گئیں تو موگے لے جاؤ یا کالے پانی کسی کے بنائے کچھ نہ بن سکے گا۔

"علامہ ظریف"

نوٹ:- یہ مضمون "بیوی سے پہلی جھڑپ" کے عنوان سے شاید ایک اَور پرچے میں بھی بعض قارئین کی نگاہ سے گزرے۔ بات یہ ہے کہ لاہور ریڈیو اسٹیشن والوں کی درخواست پر علامہ نے یہ مضمون اُنہیں کے تجویز کردہ عنوان کے تحت لکھا تھا مضمون طویل تھا اور براڈکاسٹ کرنے کے لئے کل پندرہ منٹ ملے۔ وہاں تو اس کا نامکمل سا خلاصہ سُنا دیا گیا۔ سوچا یہ تھا کہ مکمل صورت میں شاہکار میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ شاہکار کے کئی نمبروں میں اشاعت کا اعلان بھی کیا گیا۔

زیرِ اشاعت نمبر میں شائع کیا جانے والا تھا کہ اسی اثنا میں ایک مقامی پرچے کے رسالچی اپنے خاص نمبر کے لئے علامہ ظریف سے مضمون کے خواہشگار ہوئے اور بڑے اصرار و التجا سے اس شرط پر یہ مضمون لے گئے کہ اپنے کاتب سے لکھوا کر دو دن میں واپس کر دیں گے تاکہ شاہکار میں بھی وقت موعودہ پر شائع ہوسکے۔ مگر اُنہوں نے غیر دیانتدارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے مضمون کی واپسی سے متعلق پہلے تو کچھ دن ٹال مٹول کی، پھر صاف انکار کرتے ہوئے کہہ دیا کہ "جب تک ہمارا پرچہ شائع نہ ہوجائے یہ مضمون واپس نہیں کیا جاسکتا"۔

مقامی ہمعصر کی اس بے اصولی اور بدمعاملگی سے ہمیں حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ حیرت اس پر کہ اُس نے اپنے اعتماد کی قیمت ایک مضمون کو قرار دینا مناسب خیال کیا۔ اور افسوس اس امر پر کہ شاہکار کے قارئین کے سامنے ہمیں شرمسار ہونا پڑے گا۔

علامہ ظریف کو جب یہ ناگفتنی واقعہ معلوم ہوا تو اُنہوں نے اپنی ضروری مصروفیتوں کو نظر انداز کرکے اس مضمون کو پھر سے لکھنا شروع کیا۔ اور دو دن لگا کر مکمل بھی کر دیا۔ مضمون کی تکمیل کے بعد اس مثل کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّلی" پہلے مضمون کی تمام دلچسپیوں کے ساتھ اس مضمون میں بہت سی ذاتی دلکشیوں کا اضافہ بھی ہوگیا ہے۔ بہت سے نئے اور اچھوتے پہلو اس میں اُجاگر کرکے دکھائے گئے ہیں جو پہلے مسودے میں نظر نہیں آتے۔ اب وہ مضمون اس کے مقابلے میں تیسرے درجے کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ اہلِ نظر دونوں مضمونوں کا اندازہ کریں گے تو اُنہیں بیک نظر محسوس ہوجائیگا کہ مضمون مندرجہ شاہکار اُس مضمون سے ہر پہلو میں نمایاں امتیاز رکھتا ہے۔ جو ایک مقامی رسالے میں غاصبانہ طریقے پر شائع کیا جارہا ہے۔

نقش ثانی، نقش اوّل کی بہ نسبت بسط و تفصیل کے اعتبار سے بھی تگنا ہوگیا ہے۔ اس نمبر میں اُس کی پہلی قسط شائع کی جاتی ہے۔ آئندہ نمبر میں ممکن ہوا تو باقی تمام مضمون ہدیۂ نظر کیا جائے گا۔ اس کی اشاعت کے بعد۔ ۔ ۔ ۔ بیویات سے متعلق پانچ جنگنامے علامہ ظریف کے قلم سے شاہکار کی زینت بنائے جائیں گے۔ دوسرا جنگنامہ "بیوی سے دوسری جھڑپ" کے نام سے ہمیں موصول ہوچکا ہے۔ ان جنگناموں کے مطالعے سے قارئین اندازہ کرسکیں گے کہ علامہ ظریف عورت اور بیوی کی نفسیات مرد اور شوہر کی بابت اُس کے غلط نظریات کے بیان پر کس درجہ حاوی ہیں۔ اسی کے ساتھ گھریلو زبان کی لفظیات اور خانہ داری سے متعلق اردو محاورات پر بھی قارئین کو عبور حاصل ہوسکے گا۔ یہ تمام جنگنامے شاہکار میں شائع کرنے کے بعد کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوسکیں گے۔ (ادارہ)

طوفانی نغمہ

زمانہ ہو گیا گنگا میں اک آئی تھی طغیانی
جلو میں جس کا دامن تھام کر چلتی تھی ویرانی

تھا جل تھل ایک کوسوں تک مسافر تھی نہ راہیں تھیں
یہ عالم تھا ہوائے شام کے لب پر بھی آہیں تھیں

جو ریلا ہڑبڑا کر ناگہاں کروٹ بدلتا تھا
بیابانوں کی پیاسی ریت کا دم سا نکلتا تھا

تھی دہشت آفریں پھنکارتی موجوں کی بیباکی
سرِ ساحل سراسیمہ تھی پیراکوں کی پیراکی

درختوں کے قدم جمتے نہ تھے سیلاب کے آگے
فلک کی گردشیں بیکار تھیں گرداب کے آگے

عجب بپھری ہوئی موجوں کا نقشہ تھا روانی میں
کہ جیسے بُنتی ہوں جل دیویاں قالین پانی میں

ہوائیں تیز کر دیتی تھیں جب تیور دریڑوں کے
کنارا دھم سے گر کر پاؤں چھوتا تھا تھپیڑوں کے

ہر اک ریلے میں خونی موت کے قدموں کی آہٹ تھی
فضائے بحر میں سیلِ بلا کی سنسناہٹ تھی

جدھر پانی کا رُخ ہوتا تھا ساحل گرتا جاتا تھا
کسانوں کی عرق ریزی پہ پانی پھرتا جاتا تھا

بہا کر بستیاں دھارے نے کی تھی رہگذر پیدا
جو ٹکراتی تھیں دو موجیں تو ہوتے تھے شرر پیدا

یقیں ہوتا تھا اکثر جوشِ طوفاں کے قرینے سے
کہ اب مل جائیگا جھک کر فلک گنگا کے سینے سے

نہ بیڑوں کا پتہ تھا اور نہ کوسوں گھاٹ ملتا تھا
جہاں تک تھی نگاہوں کی رسائی پاٹ ملتا تھا

مویشی نیم جاں تھے ہوش پرّاں تھے درندوں کے
بہے جاتے تھے بچّے آشیانوں سے پرندوں کے

کہیں بہتا نظر آتا تھا ساماں خانہ داری کا
کہیں غرقاب ہوتا تھا سفینہ کشتکاری کا

گھُلا تھا ہر طرف رنگِ شفق دریا کے پانی میں کہ موجیں سرد انگارے اُگلتی تھیں روانی میں
نہ کشتی کا نہ کوسوں تک پتا تھا ناخداؤں کا تسلّط تھا فقط طوفاں کے خُونی دیوتاؤں کا
بچارے بے گھرے ہالی موالی روتے جاتے تھے غریبوں کے مکاں موجوں کے لقمے ہوتے جاتے تھے
ہرن دلدل میں دھنسکر رہ گئے تھے خستہ جانی سے نکل آئی تھیں اندھی مچھلیاں گھبرا کے پانی سے
فلک سے ہانپ کر سورج زمیں پر گرنے والا تھا زمیں کی نعش پر کالا کفن فطرت نے ڈالا تھا

اسی نازک سمے میں جب تھے دونوں وقت ملنے کو
زمیں پر غش تھا طاری چرخ پر تھے پھُول کھلنے کو

بہا آتا تھا اک چھپّر پہ اک اندھا بھکاری بھی جسے قسمت سے حاصل تھا کمالِ نغمہ باری بھی
بھجن گاتا ہوا آتا تھا اِکتارے کی تانوں پر ہوائیں جا رہی تھیں لیکے تانیں آسمانوں پر
بدن پر جوگیا بانا، لٹیں شانوں پہ آوارہ ہر اِک موجِ نفس معراجِ روحانی کا ہرکارہ
نوا میں سوز بھی، بشرے پہ نُورِ حق پرستی بھی تشکّر بھی، خوشی بھی، جذبِ خودداری بھی مستی بھی
نہ بے صبری، نہ بے ہوشی، نہ بے چینی، نہ بیتابی وہی مضراب کی ضربت، وہی چہرے کی شادابی
ترانے تیرتے تھے جب بھری گنگا کے دھارے پر تو اک گاتی ہوئی خوشبو پہنچتی تھی کنارے پر
بھجن حل کر کے گردابوں میں گنگا پیتی جاتی تھی جو لے چھڑتی تھی موجوں کے گریباں سیتی جاتی تھی
ہوائیں راگ کی پاکیزہ لہروں میں [redacted]تیں اندھیری رات کے بچپن کی گھڑیاں گنگناتی تھیں

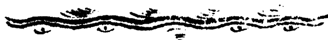
اندھیرا جب ذرا گہرا ہوا یکدم فضا بدلی — ہوا کم ہانپتا طوفان، دیوانی ہوا بدلی

فسونِ کم روی فطرت نے پھونکا تیز دھارے پر
وہ چھپّر رفتہ رفتہ آ لگا آخر کنارے پر

نکالا کھینچ کر دیہاتیوں نے اُس بھکاری کو — کہ وہ پہلا فریضہ جانتے ہیں غمگساری کو
حریمِ دل میں غیرت، شرم ہے آنکھوں کے پردوں میں — ابھی تک بھی یہاں مردانگی باقی ہے مردوں میں
گئے گزرے بھی یہ اچھے ہیں شہری کج کلاہوں سے — برس پڑتی ہیں اب بھی بجلیاں اِن کی نگاہوں سے
کہا میں نے بھکاری سے، یہ آخر ماجرا کیا تھا؟ — کہ یہ کف در دہاں طوفان اور تُو نغمہ پیرا تھا
جواب اُس نے دیا مجھ کو کہ سُن لے شاعرِ دانا! — فنا کو تُو نے کیا سمجھا، بقا کو تُو نے کیا جانا؟
قضا آتی ہے جب، ٹلتی نہیں ساعت بھی جینے کو — ڈبو دیتی ہے ظالم رہگزاروں میں سفینے کو
تو پھر ہم موت کو اک پل بھی کیوں دیں زندگانی کا — کریں کیوں فکر کر کے رنگ پھیکا شادمانی کا

جو موت آتی ہے آئے، مرد کو مرنے کا غم کیسا؟
عمارت میں خوشی کی دفترِ رنج و الم کیسا؟

(حضرت) احسان دانش



اِنتقام

تین بج چکے ہیں - پاٹ شالے سے آنے کا وقت ہو گیا - ماں نے آگ ہوشیار کر دی - چولھے پر توا چڑھایا - اور گول گول پیڑوں کو بیلنے بیٹھ گئی - اوپلے پر بے چھلے آلو اُبل رہے ہیں - ان میں تھوڑا سا ساگ ملا کر وہ ترکاری بنائے گی - بس یہی اُس کی بچّی کا کھانا ہے - اس کا نام ساوتری ہے - اور اگرچہ اس کی عمر بھی کوئی آٹھ نو سال کی ہی ہو گی - پر وہ کوئی بات ایسی نہیں کرتی - جس سے اس کی ماں کو رنج ہو - دوسری لڑکیوں کی طرح وہ اچھّے کھلونوں اور قیمتی کپڑوں کے لئے کبھی ضد نہیں کرتی - بلکہ اس کی ماں جو کچھ اُسے کھانے اور پہننے کو دے دیتی ہے - وہ خوشی خوشی اُسے لے لیتی ہے - بچاری کا باپ اُسے دو سال کا چھوڑ کر مر گیا تھا - اس وقت سے وہ کھلونوں تک سے محروم ہو گئی - اس کی ماں غریب اور نیک ہے - کھیتوں میں دھان کوٹ کر یا گھروں میں چکّی چلا کر کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہے - اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئیں - جو وہ اپنے ارمان نکالے - ہاں جب شب چرن زندہ تھے - تو اس ننھی سی جان کے سب ہی چوچلے پورے ہوتے تھے - وہ اُن کا وقت تھا - اور روپے کی ریل پیل تھی - ساوتری اس طرح رہتی تھی - جس طرح کوئی رانی ہو - کئی کئی جھنجھنے - طرح طرح کے گڈے گڈیاں، قسم قسم کے باجے - رنگ برنگی کپڑے لتے - اچھی اچھی مٹھائیاں غرض اس کے لئے سب کچھ ہی تھا - لیکن وقت بھی یکساں نہیں رہتا شب چرن کے مرتے ہی اُن پر غریبی چھا گئی - وہ تو ساوتری کا دم تھا - جو لچھمی ابھی تک جی رہی ہے - ورنہ چتا کے شعلوں نے اُس کی ہڈیوں کو کبھی کا جلا کر خاک کر دیا ہوتا - اُسے اپنے شوہر سے بڑی محبت تھی - جیسی سب نیک کوک کی بیٹیوں کو ہوتی ہے - اس کے بغیر وہ ایک لمحہ بھی زندہ نہ رہ سکتی تھی - مگر اس بیٹی کے لئے تو اُسے جیسے تیسے جینا ہی پڑیگا - چاہے یہ زندگی کیسی ہی دُکھ بھری کیوں نہ ہو +

ساوتری دبے پاؤں آ کر دروازے میں کھڑی ہو گئی - بغل میں ایک پھٹا پرانا قاعدہ ہے - وہ سوچ رہی ہے - آج میں ماں سے ضرور کہہ دونگی - کہ مہاراج مجھے روز ڈانٹتے ڈپٹتے ہیں سبق بھی دور ہی سے دیتے ہیں - اور جو لڑکیاں اچھے اچھے کپڑے پہن کر آتی ہیں اور جن کے ماں باپ ان کو مٹھائی اور پوڑیاں بھیجتے ہیں - اُن کو وہ گود میں بٹھا کر پیار سے پڑھاتے ہیں —— لیکن نہیں وہ بہت سمجھدار ہے - بعض وقت تو ایسی باتیں کرتی ہے - کہ بڑی عمر کے آدمی بھی دنگ رہ جائیں - وہ اگر یہ بات کہہ دیگی - تو ماں کو رونا آ جائیگا - اس لئے وہ کچھ نہ کہے گی - وہ جتنی لائق ہے - اُتنی ہی خوبصورت بھی - اس کی بڑی بڑی آنکھیں - ہرنی جیسی - لانبے لانبے بال، بنگالن جیسے، پتلے پتلے ہونٹ، پنکھڑیوں جیسے، چھوٹے چھوٹے چمکیلے دانت موتیوں جیسے، اور اُجلا اُجلا رنگ چینی جیسا، آنکھوں میں کھُبا جاتا ہے - اس کی باتیں بھی بھولی بھولی ہوتی ہیں - ایسا معلوم ہوتا ہے - کہ بنگال کی مینا بول رہی ہے - اُس نے پنجوں کے بل آ کر پیچھے سے ماں کی آنکھیں میچ لیں - لچھمی مسکرا دی - گود میں اُٹھا کر خوب پیار کیا - اور بولی - "بھوک لگی ہو گی؟"

"ہاں ماں!" ساوتری نے لچھمی کے گالوں پر ننھّے ننھّے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا - "کھانا ہو گیا کیا؟"

"اب ہُوا چاہتا ہے -" وہ کچھ یاد کر کے کہنے لگی - "ارے تیری ماسی آئی تھی - کہا ساوتری کو میری طرف سے بہت بہت پیار کرنا - اور کہنا - تو میرے پاس بہت دنوں سے نہیں آئی - وہ آج بلا گئی ہے -"

"تو ماں کھانا کھا کر ہو آؤنگی -"

"اچھا - لیکن شام تک آ جائیو -"

آج چاند نہیں نکلا - رات خاموش اور اُداس تھی - ہر طرف اندھیرا پھیل رہا تھا - پکھیرو رات بسر کرنے کے لئے کونے کھدروں میں چھپ گئے تھے - گاؤں کی آمدنی اچھی تھی - لیکن زمیندار بڑا حریص تھا - ہر دم اُسے یہی فکر لگی رہتی تھی - کہ جس طرح بھی ہو - غریبوں کا لہو چوس کر اپنی امیری میں اضافہ کرے - گاؤں کی دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی

کا اُسے خیال نہ تھا۔ سڑکیں خراب ہو رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر گہرے گڑھے ہو گئے تھے۔ راستے کی بہت سی لالٹینیں ٹوٹ گئی تھیں۔ جو ثابت تھیں اُن میں تیل ذرا سا پڑتا تھا۔ لیکن زمیندار کو اُس کی کوئی پروا نہ تھی۔ اور ہوتی بھی کیسے۔ اس کا تو کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا؟ برابر کے شہر سے اُس نے ایک پرانی موٹر خریدی تھی۔ بس اُسی میں اُڑا اُڑا پھرتا تھا۔ موٹر نکل جانے کے بعد بہت سی دھول اُڑتی اور آنے جانے والوں کی آنکھوں میں پڑ کر بڑی تکلیف پہنچاتی۔ لیکن اُس کو اس سے بیحد خوشی ہوتی۔ کیونکہ امیر کا کام ہی غریب کی بےبسی کا مذاق اُڑانا ہے۔

بہت دیر سے کوئی ہولے ہولے چل رہا تھا۔ تھکن اور تاریکی نے اُس کی ہمت توڑ دی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی ٹانگیں اس کے بوجھ کو بڑی مشکل سے گھسیٹ رہی ہیں۔ کبھی کبھی اُسے ڈر بھی لگتا۔ مگر وہ آگے ہی بڑھتا رہتا۔ دھیرے دھیرے۔ ڈگمگ ڈگمگ۔ اتنے میں موٹر کی آواز آئی۔ وہ بڑی تیزی سے آ رہی تھی۔ بیچارہ رہرو سمٹ سمٹا کر ایک طرف ہو گیا۔ پیچھے بہت گہرا کھڈ تھا۔ موٹر کے شور سے اس کے حواس جاتے رہے اور وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ موٹر والے نے بچانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ ایک بہت زور کی چیخ نکلی۔ دھول کا دھواں اُڑا۔ موٹر کے چلنے کی آواز فاصلے میں گم ہو گئی ——— اور پھر وہی خاموشی ——— ہر طرف خاموشی!

لچھمی پوجا کر رہی تھی۔ نہ جانے آرتی کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے تھالی کیوں گر پڑی۔ اُس نے گھبرا کر اُوپر دیکھا۔ پتھر کی مُورتی اُسے جواب نہ دے سکی۔ برابر کے طاق میں دیا جل رہا تھا۔ اس کی جوت دھیمی پڑ گئی۔ اور لچھمی کے دل میں بُرے بُرے خیالات پیدا ہونے لگے۔ "اُسے آ جانا چاہئے تھا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ ساوتری بغیر میرے وہاں سو نہیں سکتی۔ پھر ابھی تک واپس کیوں نہ آئی؟" اُسے معلوم تھا۔ کہ گاؤں کے سب اچھے آدمی اُس سے محبت کرتے تھے۔ اُس کی پیاری پیاری باتیں سب ہی کو بھاتی تھیں۔ پر ایک آدمی تھا ——— نہایت ظالم ——— وہی جس کے پاس موٹر ہے۔ صرف اُس سے لچھمی ڈرتی تھی۔ کیونکہ وہ گاؤں کی عورتوں کو بہو بیٹیاں نہیں سمجھتا تھا۔ لچھمی اب بھی کچھ کم خوبصورت نہیں ہے۔ اور پہلے تو بہت ہی حسین تھی۔ کامنی صورت موہنی مورت۔ گوری چٹی اور چنچل۔ پر سوامی کے بعد اُس نے کبھی آئینہ تک نہ دیکھا۔ زمیندار اس کو بھی حریص نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اس نے طرح طرح کی کوششیں کیں۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس لئے وہ اس سے جلتا تھا۔ زمیندار کا خیال آتے ہی وہ چونک پڑی۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پر ساوتری ابھی تک نہیں لوٹی۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ اور وہ ماسی کے گھر کی طرف چل پڑی۔

سڑک پر پہنچ کر اُس کو بڑی وحشت معلوم ہوئی۔ جھاڑیوں کے پیچھے گیدڑ بول رہے تھے۔ کبھی کبھی رینگنے والے جانوروں کی سرسراہٹ سن کر اُس کا دل اور بھی دہل جاتا تھا۔ مگر وہ دل کی لگن میں چلی جا رہی تھی۔ ایکاایکی کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ ارے یہ کیا؟ کوئی نرم نرم سی چیز! انسان جیسی! اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور وہ بیٹھ کر ٹٹولنے لگی۔ یہ ساوتری تھی۔ جس کی گردن اور کمر پر موٹر کا پہیہ پھر گیا تھا۔ لچھمی کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ سسکتے میں رہ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے خون سے لت پت لاش کو اپنی آغوش میں اُٹھایا۔ اور کچھ سوچتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ گھر پہنچ کر اُس نے اُس کو بستر پر لٹا دیا۔ اور اس کے مکھڑے کو دیوانہ وار چومنے لگی۔ آج اُس کی زندگی کی روشنی گل ہو گئی تھی۔ اور اس کے تمام ارمان ہمیشہ کے لئے مر چکے تھے۔ اُس نے اپنا تیز دھار دار چھُرا نکالا۔ اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

کنور سنگھ آرام سے سو رہا تھا۔ اُسے بڑے دلچسپ خواب دکھائی دے رہے تھے۔ کیونکہ آج اُس نے ایک زبردست فتح پائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب لچھمی کا غرور خاک میں مل جائیگا۔ اور وہ اس کے قدموں پر آ گرے گی۔ کنور سنگھ آخر گاؤں کا راجہ ہے۔ چاہے تو ساوتری کا علاج کرا سکتا ہے۔ پھر لچھمی کیوں نہ اُس کے پاس دوڑی آئیگی؟ کہے گی "مہاراج! میں تمہاری لونڈی ہوں۔ پرجا ہوں۔ میری بچی کی جان بچاؤ۔" بس پھر زمیندار کی جیت ہے۔ لچھمی آخر کار اُس کی ہو ہی جائیگی۔ ... لیکن اُس کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ خواب کے ختم ہونے سے پہلے ہی کسی نے ایک چھُرا پوری طاقت سے اس کے سینے میں بھونک دیا۔ اُس کی چیخیں سن کر نوکر چاکر دوڑ آئے۔ لچھمی بھاگنے لگی۔ لیکن نوکروں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ بیچاری عورت ذات تھی۔ اتنے سارے مردوں کا کہاں تک مقابلہ کرتی؟ اور بھاگ کر وہ کرتی بھی کیا؟ اس کے انتقام کی پیاس بجھ چکی تھی۔ اب اُسے دُنیا میں اور کوئی کام نہیں تھا۔ جب وہ چاروں طرف سے گھر گئی۔ تو اُس نے وہی چھُرا اپنے پیٹ میں بھونک لیا۔ پھر کسی کو آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی وہ تڑپ کر زمین پر گر پڑی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روح ساوتری سے جا ملی۔

صادق الخیری

سوال و جواب

سوالات

(۱) علامہ گرامی!

A.M. اور P.M. انگریزی حروف وقت ظاہر کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ A.P. اختصار ہے۔ (Anti Meridian) کا جس کے لغوی معنی نصف النہار سے پہلے ہوتے ہیں۔ اصطلاح میں یہ رات کے ۱۲ بجے کے بعد سے دوپہر کے ۱۲ بجے تک کا وقت ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح P.M. سے مراد Past-Meridian ہے۔ یعنی نصف النہار کے بعد۔ یہ دوپہر کے ۱۲ بجے کے بعد سے رات کے ۱۲ بجے تک کا وقت ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی 4 P.M. لکھے تو اس کے معنی شام کے چار بجے کے ہوں گے۔ اور 6 A.M. صبح کے چھ بجے ظاہر کرے گا۔ چنانچہ انگریزی کی ہر قسم کی تحریروں میں ان کا عام استعمال ہوتا ہے۔ اور وقت سمجھنے میں کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہیں رہتا۔

اردو میں انگریزی کی تقلید یا ترجمہ کرتے وقت A.M. اور P.M. کی بجائے "صبح اور شام" کے الفاظ استعمال ہوتے ہوئے دیکھے ہیں لیکن اکثر ایسے لفظوں نے غلط فہمی پیدا کی ہے۔ مثلاً 1 A.M. کو اردو میں ایک بجے صبح لکھا جائے تو پڑھنے والا شاید ہی "آدھی رات کے ایک بجے" سمجھے۔ فوراً اس کا دماغ دن کے ایک بجے کی طرف منتقل ہوگا۔ یا اگر کوئی 1 P.M. کو ایک بجے شام کہے تو سننے والا منہ دیکھنے لگے گا کہ عین دوپہر کے وقت شام کیسے ہوگئی۔ اور اگر وہ نئی روشنی کا تعلیم یافتہ منطقی نہ ہوا تو ممکن ہے رات کے ایک بجے سمجھ لے۔ بعض اوقات اس مشکل کو محسوس کرتے ہوئے زیادہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً صبح، شام، دوپہر، رات وغیرہ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ ان مشکلات کا حل نہیں ہے۔ بلکہ بڑھاتا ہے۔ اگر اس انگریزی طرز کو قائم ہی رکھنا ہے تو ہمیں ویسے ہی دو مناسب الفاظ تلاش کرنے چاہئیں۔ تاکہ ان کے اختصار کو ہم خط و کتابت اور مختلف تحریروں میں بلا تکلف استعمال کر سکیں۔

انگریزی میں A (Anti) اور P (Post) قبل اور بعد کے معنی دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ M (Meridian) کا ہونا ہے۔ اس کے معنی نصف النہار کے ہوتے ہیں۔ تو کیا ہمارے لئے (Anti Meridian) کے لئے "قبل نصف النہار" اور (Past-Meridian) کے لئے "بعد نصف النہار" کا استعمال اور A.M. اور P.M. کی بجائے ان کا اختصار "ق-ن" اور "ب-ن" مناسب نہیں؟ مثلاً اگر ہم 2 P.M. کو اردو میں "۲-ق-ن" اور 4 P.M. کو "۴-ب-ن" لکھیں تو کیا قباحت ہے؟

اگر یہ تجویز پسند نہ ہو تو اس کے بجائے اور بہتر صورت پیش کی جائے۔ بہرحال ضرورت ہے کہ اہلِ علم حضرات اس طرف توجہ مبذول فرمائیں۔ اور جلد فیصلہ کریں تاکہ وہ اصلاح پھر ہر قسم کی تحریروں اور تراجم میں استعمال ہو سکے۔

نیاز آگیں
احسان اللہ خاں مضطر۔ صدر بازار ساگر

(۲) قادرِ مطلق صحیح ہے یا قادرِ مطلَق؟ مطلِق یا مطلَق صحیح ہونے کی صورت میں سند سے بھی سرفراز کریں۔ ممنون ہوں گا۔

نیاز مند: دینا ناتھ از کرنال

(۳) خضرِ راہ ادب حضرت علامہ

تسلیم۔

میں کچھ ٹوٹی پھوٹی تک بندی کیا کرتا ہوں۔ اگرچہ میری نظمیں کئی رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ میری شاعری میں خامیاں موجود ہیں۔ آج تک بغیر کسی کی اصلاح کے خود ہی نظر ثانی کر لیا کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے اب تک کوئی ایسا رہنما نصیب نہیں ہوا جو فن کی خامیوں پر آگاہ کر کے مجھے منزل مقصود پر پہنچا دے۔ آج جرأت کر کے آپ کی خدمت میں چند ٹوٹے پھوٹے اشعار بھیج رہا ہوں۔ آپ جیسے ماہرِ فن استاد نے اگر توجہ فرمائی تو یقین ہے کہ آپ کی رہنمائی سے میں اپنی شاعری کی غلطیاں درست کر سکوں گا۔ امید ہے۔ کہ مرسلہ نظم آپ کی اصلاح کے بعد اس قابل ہو جائے گی کہ شاہکار کے صفحات میں جگہ حاصل کر سکے گی۔ آپ نے بہت سے نومشقوں کی اصلاح کر کے انہیں شہرت کے زینے پر پہنچا دیا ہے۔ کیا عجب ہے کہ میں بھی گمنامی کے گوشے سے نکل سکوں۔ اگر آپ نے حوصلہ افزائی فرمائی تو آئندہ ہر مہینے شاہکار کے لئے ایک دو نظمیں بھیجا کروں گا۔

جس نمبر میں میری یہ نظم شائع ہو وہ مجھے ضرور بھجوا دیا جائے۔ اور

میرے لائق جو خدمت ہو اس سے مطلع فرمایا جائے۔

خادم:- سراج الدین روشن از سرگودھا۔

(۴) علامہ شبلی شعر العجم میں زبان پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "زبان تغیر پذیر ہے۔ ساکن نہیں۔" اس فقرے کی تشریح کا طلبگار ہوں۔

پیارے لال شاکر۔ بی۔ اے
(ایم۔ بی ہائی سکول پیٹھانکوٹ)

(۵) آئے دن اخبارات میں نوجوانوں کی خودکشی کے حالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ فاقہ کشی اور تنگدستی ہندوستان کے اُفق پر چھائی ہوئی ہے۔ کانگریسی وزارتیں بھی اس مصیبت عام کے ازالے سے عاجز دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کی رائے میں اس موجودہ بدحالی کے دُور کرنے کی کوئی صورت ہو تو مطلع کیجئے!

غلام حسین انور سہارنپور محلہ کھالے پار

جوابات

(۱) مشرقی ممالک میں غروب آفتاب سے لے کر طلوع سحر تک کے وقت پر رات کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لئے ۸ ش۔ ۱۲ ش۔ ۲ ش۔ ۴ ش میں اشتباہ کی کوئی وجہ نہیں۔ البتہ دن کی تقسیم صبح۔ دوپہر اور شام سے کی جاتی ہے۔ پھر دوپہر خصوصاً موسم گرما میں ۱۱ بجے سے ۲ بجے تک متصور ہوتا ہے۔ دوپہر کو ہم نہ صبح میں شامل کر سکتے ہیں نہ شام میں۔ اس دِقت کو دور کرنے کی حسب ذیل صورتیں نکل سکتی ہیں:-

(۱) دوپہر کو مستقل حیثیت دی جائے۔ اس صورت میں ۱۲ دوپہر، ۱۔ دوپہر۔ ۲۔ دوپہر کی تفصیل اشتباہ کو دور کر سکتی ہے۔ دوپہر کے لفظ کو مخفف کرنے کی ضرورت نہیں۔ طلوع سحر سے لے کر دوپہر سے قبل تک تمام وقت پر صبح اور دوپہر کے بعد سے غروب آفتاب کا تمام وقت پر شام کا اطلاق کیا جائے تو کوئی التباس پیدا نہ ہوگا۔ مثلاً موسم سرما و گرما کے طلوع و غروب کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۵۔ص۔ ۱۱۔ص۔ ۳۔ش۔ ۴۔ش۔ ۵۔ش وغیرہ کی تفصیل مفید مطلب ہو سکتی ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ طلوع سحر سے غروب آفتاب کے وقت کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کر لیا جائے کہ طلوع سحر سے ۱۲ بجے تک صبح اور اس کے بعد سے غروب آفتاب تک شام متصور ہو۔ پھر ۱۲ ص۔ اور ۱۔ ش کے اظہار میں اشتباہ نہ ہوگا۔

(۳) تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دن اور رات کے آٹھ پہر کو صبح صادق۔ چاشت۔ نصف النہار۔ سہ پہر۔ شام اور شب پر تقسیم کیا جائے کہ یہ وقت کے مصطلحہ حصے ہیں۔ اس تقسیم میں قباحت یہ ہے کہ عام لوگ سمجھ نہ سکیں گے۔

مندرجہ بالا صورتیں اسی حالت میں غور طلب ہو سکتی ہیں کہ تہذیب جدید کے اس رواج کی پیروی ضروری سمجھ لی جائے، ورنہ صبح صادق، صبح، دوپہر، سہ پہر، شام، اوّل شب، نصف شب، آخر شب۔ یا بجے کی تفصیل کے ساتھ ۵ بجے صبح۔ بارہ بجے دن۔ ۴ بجے شام۔ ۸ بجے۔ ۱۰ بجے۔ ۲ بجے شب تخفیف الفاظ کے بغیر لکھ دینے میں وضاحت بھی ہو جائیگی اور کاغذ یا وقت کی تضیع بھی نہ ہوگی۔

یہ میری ناچیز رائے ہے۔ اہل نظر کے لئے صلائے عام ہے۔

(۲) "قادر مطلق" میں مطلق کا لفظ بہ فتحۂ لام (لام کے زبر سے) صحیح ہے۔ بہ کسرۂ لام (لام کے زیر سے) غلط ہے۔

مطلق کا مادہ طلق ہے۔ اسی سے "اطلاق" مصدر آتا ہے۔ اطلاق کے معنی چھوڑ دینا۔ مُطلَق بہ فتحۂ لام اسم مفعول ہے بمعنی۔ بے قید۔ آزاد۔ مختار۔ ماضی مطلق۔ جس ماضی میں زمانۂ گزشتہ قریب و بعید کی قید سے آزاد ہو۔ طلاق ملی ہوئی عورت کو مُطلّقہ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ نکاح اور شوہر کی عائد شدہ پابندیوں سے آزاد کر دی جاتی ہے۔

قادر مطلق۔ جس کا اقتدار بے کراں، بے انتہا اور غیر محدود ہو۔

مطلِق بہ کسرۂ لام (لام کے زیر سے) اسم فاعل ہے جس کے معنی ہیں چھوڑ دینے والا۔ اردو میں قادر مطلِق بہ کسرۂ لام غلط ہوگا۔ اردو نظم میں مطلق کا لفظ قافیہ کی صورت میں نظر سے نہیں گزرا۔ اس لئے سند میں کوئی شعر پیش نہیں کیا گیا۔

(۳) آپ کی مرسلہ نظم سے مجھے یہ اندازہ ہوا ہے کہ آپ ایک شاعر بننے کی بہ نسبت ایک قانون پیشہ اور ریاضی دان بننے کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔ لہذا میرا ناچیز مشورہ تو یہ ہے کہ شاعری کے کوچے سے اُلٹے پاؤں واپس ہو جائیے! ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ مرض کا آغاز ہے مبادا یہ درد لا دوا نہ بن جائے۔ خود دماغ سوزی کرنے کی بجائے آپ کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ وقت بہ وقت طبیعت مچلنے لگے تو حدود خلوت میں کسی دوسرے کے اشعار گن گنا لیا کیجئے! اور اگر خدانخواستہ داد لینے کا چسکا پڑ گیا ہے تو بے مغز دوستوں کا ایسا ماحول فراہم کر لیجئے جس تک اردو رسالوں کی پہنچ ناممکن ہو۔ پھر اتنی امداد میں کر دیا کروں گا کہ آپ کے پرائیویٹ پتے پر "شاہکار" بھجوا دیا کروں۔ اس میں جس کی [illegible] نظم آپ کی نگاہ چڑھ جایا کرے بے خطر اُسے اپنے نام سے [illegible] کر

سُنا کر اُن بیداد گروں سے داد حاصل کر لیا کیجئے! ایسا کرنا اگرچہ اخلاقی جُرم میں داخل ہوگا اور مجھے بھی اعانت جرم کا سزاوار بننا پڑے گا۔ لیکن اِس گناہ کبیرہ کے مقابلے میں شاعر بننے کی سعی نارَوا میں جتنے گناہ آپ سے سرزد ہوں گے وہ ایک پوری آبادی کو جہنم تک پہنچانے کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ مگر آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ میری بات مانیں گے نہیں۔ کیونکہ شادی اور شاعری کا جنونِ شوق ناصح کی خشک نصیحت کا متحمل نہیں ہوا کرتا۔ ورنہ مَیں دو بیویوں کا شوہر اور تیس سال سے خارزارِ شاعری کا رہرو ہونے کی حیثیت میں اس قابل ضرور ہو گیا ہوں کہ ان دونوں پیچیدہ مسئلوں کے متعلق جس رائے کا اظہار کروں۔ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ اپنے متواتر تلخ تجربات کے پیشِ نظر میری رائے تو یہ ہے کہ شاعری اور شادی کی راہیں بے منزل اور ان کا آغاز محرومِ انجام ہے۔

شادی خدا جانے آپ نے ابھی تک کی ہے یا نہیں؟ نہ کی ہو تو خدارا نہ کیجئے! اور اگر یہ "لوہے کے لڈو" کھا چکے ہیں تو اب شاعری کی مصیبت نہ خریدیئے۔ کہ زندگی کو سزائے زندگی بنانے کے لئے شادی کرنے کی عقلمندی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اور شاعری شادی شدہ زندگی کے اضطراب کو التہاب میں تبدیل کر دیتی ہے۔

مَیں اِس راہ کا رہنما یا آپ کے بقول خضر و ضر ہرگز نہیں۔ بلکہ ایک اُفتادۂ راہ ہوں۔ نہ مَیں نے نومشقوں کو شہرت کے زینے پر پہنچا کر کوئی ایسا کارنامہ دکھایا ہے جس پر مجھے فخر کرنے کا حق حاصل ہو۔ راہِ ادب و شاعری میں میری رہنمائی اگر وہ اس خطاب کی مستحق ہے تو عرب شاعر کی بیان کردہ سیادتِ غراب کے مطابق ہے:

"وَلَوکَانَ الغُرابُ دَلیلَ قومٍ
سَیَھدِیھم طَرِیقَ الھالکِینَ"

خیال تو کیجئے اردو زبان ہندوستان میں اب چند روز کی مہمان ہے۔ دربار و سرکار سے اسے نکالے مل رہے ہیں۔ اس کے قدر شناس ایک ایک آسودۂ خاک ہو چکے۔ پھر شعر و شاعری کا صحیح ذوق اور فہم رکھنے والے بھی اکسیر کی صورت نایاب ہو گئے۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ شاعر کی قبولیت دماغ کی بجائے اب گلے سے وابستہ ہو رہی ہے۔ یعنی ایک تُنک بندخواہ دماغی افلاس میں کتنا ہی مبتلا ہو اگر خوش گلو ہے تو میرو سَودا کا ہم رتبہ خیال کیا جاتا ہے اور کوئی بلند سے بلند شاعر اگر مطربی اور غنا پیشگی سے بے بہرہ یا اِس پستی کو گوارا کرنے کے ایثار سے قاصر ہے تو خواہ اس کی شاعری میں ستاروں کی موسیقی تحلیل ہو جائے ہر بزم دانجمن سے راندۂ التفات رہے گا۔ اِن ناسازگار حالات میں شاعری کرنا اپنے ساتھ اس مقدس فن کو بھی ذلیل کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

بھائی مَیں نے تو شاعری سے توبہ کر لی ہے۔ اگرچہ پیرکوئین کا نشہ اس کوچے کی سیرا پھیری پر کبھی کبھار اب بھی مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن اس تفریح کو زندگی بنانے کے جرم سے تو قطعی دستبردار ہو چکا ہوں۔

"پس از سی سال این معنی محقق شد بہ خاقانی الخ"

عزیز زندگی کے تیس سال اِس راہِ بے منزل کی رہ نوردی میں برباد کرنے کے بعد دیکھتا ہوں تو ماضی و حال کی طرح مستقبل کی پیشانی پر بھی بخطِ جلی آغاز ہی لکھا ہوا نظر آ رہا ہے۔

اس لئے آپ اور ہر اُس نوجوان کو جس پر اس ہلاکت زائیدہ قدم بڑھانے کی بدبختی سوار ہے اپنے زندگی سوز تجربات کی بلند آہنگ فریاد میں خبردار کر دینا اپنا فرض خیال کرتا ہوں۔ کہ شاعر پیشگی پر خودکشی کو ترجیح دینا۔ کیونکہ خودکشی کی تکلیف آنی ہے۔ مگر شاعری کا عذاب غیرفانی ہے۔

"میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے"

(۴) علامہ شبلی مرحوم کا یہ ارشاد حقیقت کی تصویر ہے۔

انسان کی تغیر پذیری تو ایک بدیہی بات ہے جسمانی طور پر وہ آج بوڑھا ہے کل جوان تھا۔ اور پرسوں بچہ۔ یہ اس کا جسمانی تغیر ہے پھر جب وہ بچہ تھا اُس کے خیالات طفلانہ اور معصوم تھے۔ جوان ہونے پر اُن میں رنگینی اور جذبات میں تڑپ پیدا ہو گئی۔ بوڑھا ہوا تو خیالات سے رنگینی اور جذبات سے بیقراری زائل ہو کر عادات و اطوار اور خیالات میں متانت نے راہ پائی۔ یہ انقلاب انسان کی ذہنیت کا تغیر ہے۔ زبان چونکہ انسان کے شوق تجسس و تحصیل سے متعلق ہے۔ اس لئے اُس میں بھی عمر کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ انسان کی طرح زبان بھی ایک ساکت حالت میں کبھی نہیں رہ سکتی، ادلتی بدلتی اور بڑھتی رہتی ہے۔ ایک زبان جو اپنے ہر بولنے والے کے منہ سے ہمیں یکساں نظر آتی ہے درحقیقت مختلف شکلیں رکھتی ہے بلکہ اُس کی اتنی ہی شکلیں ہیں جتنے بولنے والے۔ اگرچہ زبان کے مفہوم کی یکسانیت ہمیں اس فرق کو محسوس نہیں ہونے دیتی۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کی جسمانی صلاحیت اور نفسانی کیفیت میں چونکہ تفاوت ہوتا ہے اور یہی دو کیفیتیں تخلیقِ زبان کا ذریعہ ہیں۔ ہر انسان کی جسمانی حالت اور نفسیاتی کیفیت عموماً

مختلف اثرات کے ماتحت بدلتی رہتی ہے - اس کا اثر لازمی طور پر زبان کے حصول و صدور پر بھی پڑا کرتا ہے - خلاصہ یہ کہ انسان کی کیفیات جسمانی و نفسیاتی کے تغیر کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے - بنا بریں یہ کہنا کہ زبان ساکن نہیں تغیر پذیر ہے بالکل درست اور راست ہے -

(۵) میرے خیال میں نوجوانوں میں خودکشی کی وبا جو پھیل رہی ہے - اس کی اصلی وجہ عام حالات میں ایسی فاقہ کشی اور تنگدستی نہیں کہ وہ زندگی کو قائم رکھنے سے عاجز ہو چکے ہیں - بلکہ بے کاری اور بے روزگاری اس کا اصلی سبب ہے - وہ اپنی طاقتِ عمل کے اظہار کا موقعہ نہیں پاتے - جسی ذکاوت انہیں بے مشغلہ اور بے کار بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی وہ اپنے جوہر ذاتی کی قدر شناسی سے محروم ہیں - اِس لئے اپنی جامد زندگی سے تنگ آ چکے ہیں - جب تنگی وسائل و کار ان کی فطری جولانیوں کے ظہور و طلوع کے تمام راستے روک دیتی ہے تو ضبط و استقلال کے فقدان کے باعث ان کی قوتِ فیصلہ تباہ ہو کر اُن پر حیرت یاس طاری کر دیتی ہے اور وہ زندگی ہی کو آلامِ زندگی کا سبب گردان کر اسے ختم کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں -

ہمہ گیر فاقہ کشی عالمگیر بیکاری کے سبب ہے - ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں تو اس عام بدحالی بلکہ پامالی کا ذمہ دار زیادہ تر ہمارا نظامِ تعلیم ہے اور غیر تعلیم یافتہ طبقات میں "مشینری سسٹم" اس تباہ کن بے روزگاری کا باعث ہے -

ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم انتہا درجے ناقص اور ضرر رساں ہے کسانوں اور پیشہ وروں کی اولاد موجودہ تعلیم حاصل کر کے اپنے آبائی پیشوں سے متنفر اور اپنے خاندانی پیشوں کو ترقی دینے کی بجائے دفتری بابو بننے کی سعی ناکام میں سرگرداں رہتی ہے موجودہ تعلیم نہیں گھر اور گھاٹ کہیں کا نہیں چھوڑتی، اس تعلیم نے کسانوں اور دستکاروں کی اولاد کو دفتری کلرک بنا کر دفتروں کے دروازوں پر قفل لگا دیا ہے - لاکھوں تعلیم یافتہ نوجوان اپنے آبائی پیشوں سے بیگانہ ہو کر نوکری کے عنقائے بلند آشیاں کی تلاش میں در بدر مارا مارا پھر رہا ہے -

اگر یہ تعلیم نہ پاتے تو والدین کا روپیہ، اپنا وقت اور دماغ بچا کر اپنے گھریلو پیشوں میں لگ جاتے اور اس طرح ملک کی صنعت و حرفت اور زراعت تباہی سے بچ جاتی - نوجوانوں کے لئے کام اور رزق مہیا ہوتا - ملک کے لئے یہ وبال دوش نہ بنتے -

اس مصیبت عام کا ازالہ اس فرسودہ اور از کار رفتہ تعلیمی نظام میں بنیادی انقلاب کے بغیر نہیں ہو سکتا اور افسوس ہے کہ اس سب سے اہم ضرورت کو آج تک قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا -

اَن پڑھ طبقوں میں عام بیکاری مشینری نظام کی کثرت اور وسعت کے سبب پھیل رہی ہے - مشینوں نے ساری دنیا کے مزدوروں کو معاشرت کی بے ضرورت چیز بنا دیا ہے - جس مقدار کار کی انجام دہی کے لئے دو سو مزدوروں کی محنت درکار ہوتی اسے دو چار مشینیں دس پانچ مزدوروں کی مدد سے کم وقت میں سر انجام دے لیتی ہیں باقی ۱۹۰ مزدور بے کار اور بے روزگار ہو جاتا ہے پھر چونکہ عام بے روزگاری کے سبب لوگوں میں طاقت خرید بھی نہیں رہی ہے - اِس لئے مشینری کا تیار کیا ہوا کام بازار بے خریدار کی جنس کس مپرس بن رہا ہے - اس پر اپنی غلامانہ بے بسی کہ ملک کی درآمد برآمد پر غیر ملکی آقاؤں کا اقتدار مسلط ہے - ہندوستان کی خام اجناس غیر ممالک میں کوڑیوں کے مول بھیجی جا رہی ہیں اور پھر انہیں اجناس کو مختلف غیر ملکی صنعتوں کی صورت میں اشرفیوں کی تول ہمیں خریدنا پڑ رہا ہے -

آخر اس سے زیادہ ہماری بے بسی کیا ہو گی کہ ہندوستان کے ساڑھے سات لاکھ دیہات کے کروڑوں دودھ دینے والے مویشیوں کی موجودگی میں ہر سال لاکھوں ٹن بناسپتی گھی ہندوستان کی صحت عامہ کے لئے مصیبت عام بنا ہوا ہے اور ہم اس مصیبت کے روکنے سے قاصر ہیں - ہائے غلامی وائے غلامی ہمارے ملک سے مشینری نظام غارت ہو جائے - غیر ملکی اشیاء کی درآمد پر ہمیں اختیار میسر آئے تو ۳۵ کروڑ... ہندوستانیوں کی ضروریات زندگی کی بہم رسانی ملک کے بے شمار بے کاروں کو روزگار اور روزی مہیا کر سکتی ہے -

یہ خواب شیریں شرمندۂ تعبیر ہو جائے تو فاقہ کشوں کا یہ ملک عظیم پھر "ہندوستان جنت نشان" کہلانے کا مستحق ہو جائے -

تاجور

پریما

سروپ رانی ان اپسراؤں میں سے تھی۔ اعلیٰ تربیت ہیں جن کے ثانی نہیں ہوتے معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کی کوئی کسوٹی اس کے رکھ رکھاؤ اور خود داری کو ٹھیس نہیں لگا سکتی۔ اور اگر اس کے لئے درستگی حواس شرط ہے۔ حواس باختگی اس کے پختہ دماغ کے لئے محال ہے لیکن وہ بے مثل رقاصہ بھی تھی۔ اور یہ شوق حد سے زیادہ تجاوز کر گیا تھا۔

گھاگرا کے کنارے اپنے عالیشان محل کے آراستہ پیش دالان میں رگھبیر سنگھ جی کی خاموش نکتہ چینی سے مرعوب ہو کر اور اُن کے کمالِ فن سے مسحور ہو کر اس کے نازک پیکر کی مکمل جنبشوں، توڑ موڑ اور لچک کے ساتھ اسکے گھنگھروؤں کی جھنکاریں گھاگرا کی موجوں کو تڑپا دیتی تھیں اور اس چھم چھم کے ساتھ ہر چیز رقص کرنے لگتی تھی۔

کون کہہ سکتا تھا۔ وہ رگھبیر کی تکمیل کمال کو نہ پہنچ سکی تھی۔ اگر رگھبیر سے بہتر دشنو کا وجود نہ تھا۔ تو سروپ رانی سے بڑھ کر پارنبی کہاں تھی؟ یہ پیشہ ور نہ تھی۔ وہ بھی پیشہ ور نہ تھا۔

وہ بھی اسی خاندان سے تھا۔ افواہ تھی۔ کہ۔۔۔ کی گدی کا جائز وارث وہی ہے لیکن یہ محض افواہ تھی۔ عوام کی گپ۔ کیونکہ بے چارگی نے اسے وہ پگڑی بھی اُتار دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ جو اس خاندان کا نشان تھی۔ خود داری افلاس اس حد کو پہنچ گئی تھی۔ کہ "رحم دل" اور "کنبہ پرور" مہاراج کی نظروں سے گر کر وہ دوسروں کی نظروں میں سما گیا تھا —— سب سے زیادہ سروپ رانی کی نظروں میں!

مہاراج اُسے کچھ ماہانہ دیتے تھے جس کے متعلق اُسے بتا دیا گیا تھا کہ یہ اس کا آبائی حق ہے۔ لیکن رگھبیر سنگھ کو شرمندۂ انصاف ہونا بھی گوارا نہ تھا۔ اس لئے کماری کے لئے ایک ماہر رقاص کی جستجو پر اُس نے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔

سروپ رانی رحمدل اور قدر دان تھی۔ رگھبیر کے لئے اس کے دل میں بہت جگہ تھی۔ وہ سب سے زیادہ رگھبیر کی عزت کرتی تھی لیکن رگھبیر کسی رحم و کرم کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ وہ کسی کا شرمندہ احسان نہ تھا۔ کسی کا دست نگر نہیں تھا۔ وہ اگر لے رہا تھا۔ تو دے بھی رہا تھا۔ اور اگر سروپ رانی کی بڑھتی چڑھتی عزت اور توجہات کی تلافی کوئی دوسری چیز نہ کرتی ہوتی۔ اسے مجبوراً ترک خدمت کی ناگوار شرمندگی اُٹھانا پڑتی۔

وہ قد آور تھا۔ خوبرو اور جمیل تھا۔ "گھمنڈی" تھا۔ اور "نک چڑھا" تھا۔ کماری کی شادی شدہ سہیلیوں کا خیال تھا۔ کہ وہ مغرور ہے۔ نہ جانے کس بات کا گھمنڈ ہے۔ اُس کی کنواری سہیلیوں میں بھی اس 'حقیقت' کی مخالفت کی ہمت نہ تھی۔ شرم کی بات تھی۔ وہ کہتیں "ہونگے گھمنڈی ہمیں کیا؟"

لیکن پریما کو نہیں معلوم تھا۔ کہ رگھبیر گھمنڈی ہیں یا نہیں۔ نہ وہ جانتی تھی۔ کہ دوسروں کے سامنے انہیں گھمنڈی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اسے بھی رگھبیر کی عجیب و غریب شخصیت کا تجربہ ہوا تھا۔ وہ ان سے خائف تھی۔ ان کی درد بھری خاموشی اور نوکھے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے نہیں۔

کہتے ہیں وہ ناچ سے خائف تھی۔ رقص و سرود کے جلسوں میں جانے جھجکنے لگی تھی۔ ڈرنے لگی تھی کبھی کبھی گنگھروں کی آواز پر کان اور آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ سروپ رانی کو ناچتے دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اور جب کماری اسے چھیڑنے کو ناچتے ناچتے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی۔ وہ دہشت زدہ ہو کر بھاگ جاتی تھی۔

اُسے چھیڑنے میں سبھی کو لطف آتا تھا۔ سروپ رانی کی سہیلیاں دوسروں کے لئے تو آپس میں چھیڑ چھاڑ کرتی تھیں۔ لیکن رگھبیر کے لئے کوئی کسی کو نہ چھیڑتا۔ مگر پریما کو چھیڑنے میں مضائقہ نہ تھا۔ کیونکہ اسے رگھبیر سے کوئی واسطہ ہی کب تھا۔ اس کی نظروں میں سب سروپا ہنسی مذاق جن میں تخیلی پریتم پریم راگ الاپا کرتے تھے۔ اور عجیب "منوہر" "لہری ہر" اور "دریشیدن" وغیرہ اپنی لاعلمی ... چنچل

اور رنگیلی لڑکیوں کے پجاری بن چکے* تھے۔ شرمناک کمزوریاں تھیں۔

کوئی اس کی طرف اشارہ کر کے کہتی۔

"نین رسیلے، بھولی بھالی، سندر مکھ اور سندر کایا

.. ..

کوئی دوسری کہتی:-

" اک منوارے نینوں والا کانوری دیکھ بھرمایا "

تیسری منہ بنا کر کہتی:-

" پاپی ہوئے پر مُوکھ پاپی رام کرے نہ ہوئے "

چوتھی ہاتھ مٹکا کر کہتی:-

" کاندھے گنگا جل ادھرمی نین رسوں پہ اترایا "

وہ جل کر کہتی۔" کون ادھرمی؟ منوہر نا؟! "

" نہ ــــــ رنگو .. .. .. "

" ہائے رام!" اس دل لگی پر وہ روٹھ جاتی۔ چلی جاتی۔ اور سروپ رانی کے بار بار بلانے پر بھی نہ آتی تھی۔ جب کماری کے پاس بیٹھی ہوتی۔ اور وہ گنگھرو بندھوانے لگتیں۔ تو نظریں بچا کر ٹل جاتیں۔ کبھی کوئی بھانپ کر اس کا آنچل کسی دوسری کے آنچل سے باندھ دیتی۔ کوئی اس کے قریب ہی گھنگھرو بجا دیتی۔ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی۔ اور جب تک رگھبیر کماری کو کچھ بتا نہ لیتے۔ نہ چھوڑتی تھی۔

یہ سب پرمیا کو بہت ناگوار تھا۔ اپنی فطرت کی اس کشمکش سے وہ بیزار تھی۔ دوسری کس بے تکلفی سے رگھبیر کے سامنے آتی جاتی تھیں۔ گھنگھرو بجاتی تھیں۔ ناچتی بھی تھیں۔ کاش وہ بھی ویسی ہی بن سکتی۔ اُن میں سے ایک! اس میں کوئی ایسی خصوصیت اچھی یا بُری ایسی نہ رہتی۔ جس سے اُس کی موجودگی کسی طرح نمایاں معلوم ہوتی۔ اسے ڈر تھا۔ کہ کوئی اس کی اس کمزوری سے واقف نہ ہو جائے! کبھی نظریں بچا کر، ہمت کر کے وہ گنگھروؤں کو ایسے چھوتی۔ جیسے انہیں ہر ایک کے ہاتھ نہیں لگنا ہے۔ پھر اس کے ہاتھ جو انہیں ٹھیک طور پر سنبھال بھی نہ سکتے ہوں۔ خدا معلوم اُنہیں کیونکر چھوا جاتا تھا کیسے اُٹھایا جاتا تھا۔ پھر ان کی آواز نکلنے پر اُنہیں چھوڑ دینا مناسب تھا۔ یا مضبوط تھام لینا ــــ یا کچھ اور ــــ؟ وہ انہیں کانپتے ہوئے ہاتھوں میں اُٹھا کر غور سے دیکھتی پھر رکھ دیتی تھی +

سروپ رانی کے رقص کو دُنیا سراہتی تھی۔ بڑے بڑے ماہرینِ فن تعریف کرتے لیکن رگھبیر کی آنکھوں میں اُس نے کبھی تعریف کی جھلک نہ دیکھی۔ رگھبیر انسان ہو کر کس طرح اس قدر بے حس ہو سکتا تھا اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اُس کا چہرہ سنجیدگی اور متانت کی تصویر تھا۔ جس سے اثرات ہی مفقود تھے۔ اس کے خط و خال ایک ذرا سی جنبش پر کیا کچھ نہ کر سکتے تھے ــــ!! اُس کی آنکھوں میں اگر اک ذرا سی چمک پیدا ہو سکتی! لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیل سکتی۔ جب وہ عالم محویت سے ہوش میں آتی۔ تو نوجوان استاد کو کامل خاموشی اور اطمینان سے اپنے پیروں کو تاکتے پاتی۔ اس کا نازک دل ایک ناگوار تکلیف سے دھڑکنے لگتا۔ وہ سوچتی۔" سُنتے تھے پیشہ فن کی دیوانگی کو فنا کر دیتا ہے۔ یہ تو پیشہ ور بھی نہیں"!

سروپ رانی کے دل میں ایک ناقابل برداشت کھٹک پیدا ہو گئی۔ رقابت کیلئے رقیب کا وجود ضروری نہیں۔ کوئی تو ضرور ہو گا۔ جس کے رقص کو رگھبیر سنگھ سراہ سکتے تھے۔ ان کی وہ خاموش اور بے حس آنکھیں چمک سکتی تھیں۔ ان کے افسردہ و سنجیدہ لب متاثر ہو سکتے تھے۔ وہ کیسا رقص ہو گا ــــ؟ کوئی انوکھا رقص ــــ!

وہ مُردہ دل ہو چلی تھی۔ اس کا رقص ناقص ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں کوئی سرور نہ تھا۔ کوئی لذت نہیں تھی!

وہ پریشان ہو گئی۔ گھبرا گئی۔ قدموں کو بے دردی سے بے تال کر دیتی۔ جسم کی جنبشوں کو ادھورا چھوڑ دیتی۔ رگھبیر حیرت سے دیکھ تو سکتے تھے۔ لیکن اس طرح جس طرح ایک بیجان مگر مضبوط اور دیرپا مشین میں بالکل خلاف توقع کوئی خرابی آ جانے پر دیکھ رہے ہوں۔ پھر بھی سب کچھ ناقص کر دینے میں رقص و سرود کی مضبوط دیوار منہدم کر دینے میں ہی اب اسے چین نصیب تھا +

کاش اسے رقص و موسیقی سے کبھی کوئی واسطہ نہ رہا ہوتا۔ وہ شروع ہی سے نہ جانتی۔ کہ رقص میں کوئی کیف بھی ہوتا ہے۔ سخت سے سخت دل بھی اس سے متاثر ہو سکتے ہیں۔

کاش کوئی دوسرا ناچ سیکھتا اور وہ دیکھتی۔ انجان رہ کر۔ بھولے پن سے۔ اسے کوئی انوکھی چیز سمجھ کر ــــ نہیں! ــــ خائف رہ کر ــــ؟

وہ رقص سے خائف رہتی ــــ رگھبیر سے خائف رہتی اور جب رگھبیر گھنگھرو سرکاتے۔ وہ نظریں بچا کر ایک سے دوسری کی آڑ لیتی ہوئی ٹل جانا چاہتی! ــــ کوئی اس کا آنچل تھام لیتی، اُس کا ہاتھ پکڑ لیتی!

مُردے کے ہاتھ

مشہور عالم نجومی چیرو کی زندگی کا ایک خوفناک واقعہ

میں لندن میں رات کے وقت آرام سے اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ مجھے کسی شخص کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ جو نیچے گاڑی میں مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے منتظر تھا۔ اس اطلاع پر میں قدرے حیران اور قدرے جز بز ہوا۔ حیران اس لئے کہ یہ رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ اور جز بز اس لئے کہ دن بھر کام کرنے کے بعد میں سو جانے کے لئے بیچین تھا۔ تاکہ اگلے روز کے کام کے لئے "تازہ دم ہو جاؤں۔"

بہرحال میں نیچے اُترا۔ اور ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو بند گاڑی میں اپنا منتظر پایا۔ "شام بخیر" کے علاوہ کسی اور تمہید کے بغیر اُس نے کہنا شروع کیا۔ "جناب کیا آپ اسی لمحے میرے ساتھ چل کر اُس شخص کا ہاتھ دیکھیں گے۔ جسے میں آپ کو ملاؤں۔ لیکن شرط یہ ہے۔ کہ آپ کو کسی قسم کے سوالات دریافت نہ کرنے ہونگے۔"

میں کسی قسم کے تذبذب کے بغیر اُس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ گو یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ اس کا محرک ہاتھ دیکھنے کا شوق تھا۔ یا کسی عجیب وغریب واقعہ کی جستجو۔

میں گاڑی میں داخل ہو گیا۔ اور چند لمحوں بعد ہم نہایت تیزی سے ہیمپسٹڈ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے اپنے ساتھی کو گفتگو کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ یہ کوشش بے سود ہے۔ بالآخر تنگ آ کر میں گاڑی میں پیچھے کی طرف لیٹ گیا۔ اور اپنے سفر اور منزل مقصود کے متعلق حیرانی سے غور کرنے لگا۔

میں نے دیکھا۔ کہ گاڑی کرائے کی ہے۔ اور شہر کے کسی بھی مصروف حصے سے تعلق رکھ سکتی ہے۔ میرا ساتھی ہر ظاہری اطوار سے ایک شریف آدمی نظر آتا تھا۔ گلی کے لیمپوں کی روشنی میں مجھے گاہے گاہے اس کی شکل نظر آ جاتی تھی۔ اور مجھے اس کو مزید غور سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ اس کے لمبے نرم و نازک ہاتھ اس کے مہذب ہونے پر دلالت کرتے تھے۔ اور اس کی لطیف انگلیاں ہر سد راہ اور معمولی سی معمولی تاخیر پر آپس میں بھنچ جاتی تھیں۔ اس کا چہرہ خوبصورت تھا۔ اور اس کے صاف اور واضح نقوش اسے اُونچے طبقے کا فرد ظاہر کر رہے تھے۔ اس کے بال کسی قدر بھورے تھے۔ اور باریک ترشے ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر وہ کوئی ریٹائرڈ فوجی افسر معلوم ہوتا تھا۔

جُوں جوں ہم ہیمپسٹڈ کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ جب ہم ریشمانڈ کی طرف مُڑے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور خوف محسوس ہوا۔ کہ اُس نے اپنی جیب سے ایک سیاہ ریشمی رومال نکالا۔ اور مجھے مجبور کیا۔ کہ میں اُسے اپنی آنکھوں پر باندھ لوں۔

میرا احتجاج بے سود تھا۔ اُس کا رویہ تحکمانہ اور فیصلہ کُن تھا۔ جس قدر میں نے انکار کیا۔ اس کا اصرار بڑھتا ہی گیا۔ اور آخر کسی عجیب وغریب واقعہ کا مشاہدہ کرنے کی آرزو کے پیش نظر میں مان گیا۔

دس منٹ کے بعد ہم سڑک سے کسی گلی کی طرف مُڑے۔ اور گاڑی کی سست رفتاری سے میں نے اندازہ لگایا۔ کہ منزل مقصود نزدیک ہے۔ چند لمحوں بعد گاڑی بالکل ٹھہر گئی۔ اور میرا ہم سفر نیچے اُترا۔ اُس نے کوچوان کو کرایہ ادا کر کے رخصت کر دیا۔ اور مجھے ہاتھ پکڑ کر اُتارا۔ اور اپنے ساتھ مکان میں لے گیا۔ کچھ دیر

آرام کے لئے دقفہ دے کر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر چپ چاپ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اور آخر ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ جو مجھے بہت سرد محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ اور میری آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ پھر یہ کہہ کر کہ "میں ابھی آیا" وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

پٹی اس قدر مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی۔ کہ اس کے کھل جانے پر بھی چند لمحے مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ جب میری نظر نے کچھ کام کرنا شروع کیا۔ تو میں نے گردن اُوپر اُٹھائی۔ خوف اور حیرت نے مجھ پر پوری طرح قبضہ پا لیا تھا۔ میرا خیال تھا۔ کہ مجھے کسی ایسے مقام پر لے جایا جائیگا۔ جو روشنی سے بقعہ نور بن رہا ہوگا۔ اور کچھ شکی مزاج مہمان میرا کمالِ فن پرکھنے کے لئے منتظر ہونگے۔ لیکن میں موجود تھا۔ ایک ایسی جگہ جہاں چاندنی کے علاوہ کوئی روشنی نہ تھی۔ اور میرے سامنے بستر پر صرف ایک عورت پڑی ہوئی تھی ــــ بلکہ لاش

بستر کے سرہانے کی طرف والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اور وہاں سے ہوا کا ایک مدھم سا جھونکا اُس کی پیشانی کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ بالوں کا اُڑنے اور گرنے کا انداز ایسا تھا۔ جیسے بالوں والی ابھی تک زندہ ہو۔ اُس کے سینے پر آبنوس کا صلیبی نشان آویزاں تھا۔ جو اُس کی سنگِ مرمر کی سی سفید گردن کے مقابلے میں نمایاں تضاد کا مظہر تھا۔ اس کے چہرے سے درد و کرب کے آثار نمایاں نہ تھے۔ لیکن کسی خاص سکون کا بھی پتہ نہ چلتا تھا۔ اس کی آخری ہچکی غالباً یاس کا پہلو لئے ہوئے ہوگی۔ نوجوانی کے عالم میں مرنا بہت مشکل ہے۔ خصوصاً جب مرنے والا خوبصورت بھی ہو۔ اور یہ عورت نوجوان بھی تھی اور خوبصورت بھی۔

میں اس حیرت اور تذبذب کے عالم میں کھڑا تھا۔ کہ دروازہ کھلا اور میرا رفیقِ سفر نمودار ہوا۔ اُس نے آتے ہی دروازوں کے پردے گرا دیئے۔ اور ایک میز پر لیمپ روشن کرکے اُسے بستر کے قریب سرکا دیا۔ پھر مجھے بیٹھ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کفن اُٹھایا۔ اور اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہی وہ ہاتھ ہیں۔ جو میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں۔"

اس سے پیشتر میں نے ہر قسم کے حالات میں لوگوں کے ہاتھ دیکھے تھے۔ مگر مجھے اعتراف ہے۔ کہ اس قدر خوفناک اور لرزہ خیز منظر میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ مجھے اس عورت کے ہاتھوں کو مصروفِ گفتگو کرنے کا کیا حق تھا۔ جب اس کے لب خاموش ہو چکے تھے۔ ماضی کا دفن ہو جانا ہی بہتر ہے۔ میں خاموش رہونگا۔ میں اس فیصلے پر پہنچا ہی تھا۔ کہ ایک سرد ہوا کے جھونکے جیسی کوئی شئے مجھ سے چھو گئی۔ ممکن ہے یہ میرا واہمہ ہو۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہُوا۔ جیسے کوئی آہستہ سے میرے کان میں کہہ رہا ہو۔ "جھجکو نہیں ہاتھ دیکھو۔ اور سب کچھ سچ سچ بتا دو۔" اس وقت میری قوتِ ارادی مجھے جواب دے گئی۔ اور کوئی غیر مرئی طاقت میرے حواس پر قابض ہو گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا۔ کہ میں خود بخود بستر کی طرف کھنچ رہا ہوں۔ دوسرے لمحے میں نے جھک کر مُردہ ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

مزید روشنی کا انتظام کرنے کے لئے میرے ساتھی نے ایک اور لیمپ جلایا۔ مگر دوسرا میز نہ ہونے کی صورت میں اس نے تابوت کو نزدیک کھینچ کر لیمپ اسی پر رکھ دیا۔ میری نظر فوراً ہی اس مختصر عبارت پر پڑی۔ جو تابوت پر کندہ تھی۔

اگنیز مورٹن

عمر ۲۴ سال

صرف ۲۴ سال۔ لیکن اس کے ہاتھ بہت زیادہ تکلیف اور پریشانی کے مظہر تھے۔ البتہ شادی کی لکیریں اُس کی کچھ تلافی کرتی تھیں۔ اور یہ اس بے اندازہ محبت کی وجہ سے تھا۔ جو اسے اپنے خاوند سے تھی۔ جوں جوں میں تفصیلات بتاتا جاتا تھا۔ میرے ساتھی کے دل کا کرب زیادہ سے زیادہ وضاحت اور شدت کے ساتھ اُس کے چہرے پر منتقل ہو رہا تھا۔

بڑھتے بڑھتے میں نے اُس خاموش محبت کا ذکر کیا۔ جو اُسے کسی کے ساتھ تھی۔ جسے اُس نے چپ چاپ اپنے سینے میں چھپائے رکھا۔ اس شخص کے ساتھ اُسے انتہائی محبت تھی۔ اور اُس کی اُس نے اپنے روپے سے مالی امداد بھی کی۔ یہ شخص اُس کا کوئی رشتہ دار تھا۔ اس کا بھی مجھے یقین تھا۔

ایک ایسی چیخ کے ساتھ جیسے کسی نے اُس کے سینے میں چھُری گھونپ دی ہو۔ میرا ساتھی بے ہوش ہو کر کرسی میں پیچھے کی طرف گر پڑا۔

مُردہ ہاتھوں کو چھوڑ کر میں فوراً اس کی طرف متوجہ ہُوا۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت بہتر ہوئی۔ تو اس نے اپنی کنپٹیوں پر

ہاتھ رکھ لئے۔ جیسے میری موجودگی سے حیران ہو کر غور کر رہا ہو۔ کہ میں وہاں کیونکر پہنچ گیا۔ جب اس کے حواس کچھ اور مجتمع ہوئے۔ تو وہ مجھے بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے گیا۔ اور کسی قسم کی وضاحت کے بغیر جذبات سے معمور آواز میں کہا۔ "میں بہت سُن چکا ہوں۔ میں جو کچھ چاہتا تھا۔ سُن چکا ہوں۔ اب براہِ مہربانی چلے جائیے۔ غالباً کسی روز میں آپ کو بلاؤں گا۔ اور سب کچھ بتا دوں گا۔"

آٹھ ماہ گزر گئے۔ اور اس عجیب وغریب واقعے کے متعلق مجھے اور کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ پھر اچانک ہی شام کے وقت ایک گاڑی میرے دروازے کے سامنے آ کر رُکی۔ اور اس کے کوچوان نے مجھے اپنے ساتھ چیرنگ کراس کے نزدیک کسی پرائیویٹ ہوٹل میں چلنے کی فرمائش کی۔

ہوٹل میں پہنچتے ہی مجھے ایک پرائیویٹ ملاقاتی کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں ایک شخص کوچ میں پڑا ہؤا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس امر کے لئے معذرت چاہی۔ کہ وہ اُٹھ نہیں سکتا۔ اس کی آواز جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے حافظے پر زور ڈال کر فوراً پہچان لیا۔ کہ وہ اسی عجیب وغریب واقعے والا ساتھی ہے۔

وہ اس قدر بدل چکا تھا۔ کہ اس کی آواز کے علاوہ اُسے پہچاننا بھی مشکل تھا۔ ایک چُست و چالاک فوجی بشرے والے آدمی کی بجائے جو وہ اس روز محسوس ہوتا تھا۔ آج وہ نہایت ہی نحیف معلوم ہوتا تھا۔ اور اس کے چہرے پر شکستگی برس رہی تھی۔ اس مختصر سے عرصے میں اُس نے اپنی زندگی کے تمام تر سرمایہ کو برباد کر ڈالا ہو۔ اس کے بال سفید اور باریک ہو چکے تھے۔ اور اُس کے چہرے پر تکلیف کی ایسی کیفیت طاری تھی۔ کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔

"اچھا آپ نے مجھے پہچان لیا۔" اُس نے کہا۔ "میں خوش ہوں کہ آپ آ گئے۔ اب میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ پیشتر اس کے کہ اس کی دھڑکن بند ہو۔ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دینا چاہتا ہوں۔ نزدیک ہو جائیے۔ کیا نہیں؟ میری آواز کافی بلند نہیں ہے۔"

جونہی اُسے کھانسی کے دورے سے نجات ملی۔ اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "آپ کو یاد ہے وہ رات گذشتہ اگست جب میں آپ کو لندن سے باہر ایک مکان میں لے گیا تھا۔ اور آپ نے وہاں ہاتھ دیکھے تھے۔ خیر وہ عورت میری بیوی تھی۔ اُس سے چند سال پہلے ہندوستان کی فوجی ملازمت سے ریٹائر ہو کر گھر واپس آتے ہوئے تختہ جہاز پر میری ایک نہایت ہی حسین عورت سے ملاقات ہوئی۔ جو خود بھی ہندوستان سے واپس آ رہی تھی۔ اور ایک ملازمہ کے علاوہ کوئی اس کا ساتھی نہ تھا۔ سفر کے دوران میں ہم ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ اور انگلستان پہنچنے سے پہلے ہی مجھے محسوس ہونے لگا۔ کہ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے محبت ہو رہی ہے۔ اور محبت بھی وہ جو دیوانگی کی حد تک پہنچتی ہے۔ میری عمر چالیس سال کی تھی۔ اور پھر مجھے فوجی زندگی کا تجربہ بھی تھا۔ وہ بیس سال کی بھی مشکل ہی سے تھی۔ خوبصورت ننھی مخلوق۔ لیکن شروع سے ہی مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اس کی زندگی سے کوئی راز وابستہ ہے۔ جسے چھپانے کی وہ انتہائی کوشش کر رہی تھی۔

ایک شام جب ہم جہاز کے بیرونی حصے میں ٹہل رہے تھے۔ میں نے اس امر کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ وہ قدرے گھبرائی۔ پھر سنبھل کر کہا۔ "کرنل راز عورت کا دوسرا نام ہے۔ اگر ہماری دوستی کو برقرار رہنا ہے۔ تو یاد رکھو کہ مجھے اپنے راز محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔"

بعد ازاں جب میں نے اس فقرے پر اپنے دل میں بار بار غور کیا۔ تو اس نتیجے پر پہنچا۔ کہ جو کچھ میں اوّل اوّل سمجھا۔ اس کے الفاظ اس سے کہیں زیادہ پُرمعنی اور سنجیدہ تھے۔ آخرکار یہ سوال محبت اور عزت کی کشمکش پر منتج ہؤا۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لی۔ کہ کسی مرد کو ایک عورت سے اس وقت کے متعلق راز پوچھنے کا کیا حق ہے۔ جب وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اسی رات اس سے مل کر صاف صاف کہہ دوں گا۔ کہ مجھے اس سے والہانہ محبت ہے۔ اور اسے اپنا شریکِ زندگی بن جانے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

مناسب موقع بھی مل گیا۔ وہ جہاز کے پچھلی طرف تنہا کھڑی تھی۔ اور سمندر کی لہروں کا نظارہ کر رہی تھی۔ میں

آہستہ اُس کے نزدیک گیا - اور اُس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا - جب میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا - تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے - وہ رو کر چکی تھی - "اگنیز" میں نے کہا - "میں تم سے محبت کرتا ہوں - مجھ پر بھروسا رکھو - تم رو کیوں رہی تھیں - یہ آخر کیا راز ہے ؟"

اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں بوسہ دیا - اور گرم گرم آنسوؤں کی جھڑی کے درمیان کہا "نہیں - میں نہیں بتاؤں گی - مجھ میں بتانے کی جرأت نہیں - اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے - تو مجھے اپنا راز افشا کرنے کے لئے کبھی نہ کہئے - یہ شرط اپنی محبت کی نشانی تصور کیجئے -"

"اگنیز" میں نے کہا - "میں صرف ایک سوال دریافت کرنا چاہتا ہوں - اور وہ مجھے ضرور دریافت کرنا چاہئے - اگر تم اس سوال کا جواب مجھے دے دو - تو پھر تمہیں ہر راز محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہوگا - کیا تم کسی اور آدمی سے محبت کرتی ہو - اگر نہیں تو کیا تم محبت محسوس کر سکتی ہو - کیا تم مجھ سے محبت کرو گی -" اس نے اپنا سر جھکا کر آہستہ سے کہا - "نہیں جن معنی میں تم کہہ رہے ہو - ان معنی میں میں کسی مرد سے محبت نہیں کرتی - اور نہ کبھی کی ہے - البتہ اب ضرور مجھے محبت ہوئی ہے - میں تم سے محبت کرتی ہوں - جان و دل سے محبت کرتی ہوں -"

انگلستان پہنچ کر ہم نے شادی کر لی - اور تین سال ہم نے مثالی زندگی بسر کی - نہ میں نے اُس کی گزشتہ زندگی کے متعلق کوئی سوال دریافت نہ کیا - اور نہ اُس نے -

ایک روز ڈاک میں ہندوستان سے اس کے نام ایک خط آیا - وہ خط اُسے دیتے ہوئے میں نے کہا - "یہ ہندوستان میں تم کسے جانتی ہو - میرا خیال نہیں تھا - کہ وہاں بھی تمہارے دوست موجود ہیں -" وہ گھبرا گئی - اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں - اُس نے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کہے اور روتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی -

اگر میں اُس کے ساتھ ساتھ جاتا - اور نرمی سے اس کا ہمراز بننے کی کوشش کرتا - تو سب معاملہ ٹھیک ہو جاتا - لیکن افسوس میری طبیعت میں دفعتاً ہی ایک زبردست تغیر رونما ہو چکا تھا - محبت میرے دل سے رخصت ہو چکی تھی - اور اس کی جگہ رشک نے لے لی تھی - جو گرم آگ کی طرح میری رگوں میں دوڑ رہا تھا - اور اس کی زہرناکی میرے دماغ کو ماؤف کر رہی تھی -

میں کئی روز تک اپنی بیوی سے الگ رہا - اور اپنی بدقسمتی اور رشک پر دل ہی دل میں آنسو بہاتا رہا - حتیٰ کہ میں نے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا - اب میں سمجھ گیا تھا - کہ وہ مجھے فوجی ملازمت کو خیرباد کہنے سے کیوں روکتی تھی - وہ چاہتی تھی - کہ میں واپس ہندوستان بھیج دیا جاؤں - اور وہ بھی میرے ساتھ چلی جائے - لیکن نہیں میں یہیں پر اکتفا کرنا نہیں چاہتا چاہتا تھا - میں نے فیصلہ کیا - کہ بغور اپنی بیوی کی حرکات کا معائنہ کروں - اپنے شکوک کی تقویت کے لئے ثبوت فراہم کروں - اور اس ثبوت کو اس کے سامنے رکھ کر اُسے اعترافِ حقیقت پر مجبور کر کے اپنے قلب کی تسکین کا سامان پیدا کروں - چنانچہ میں گھر واپس چلا گیا - اور اپنی بیوی سے مسکرا کر ملا - وہ ایک ہی نظر میں بھانپ گئی - کہ میری مسکراہٹ مصنوعی ہے - اور مُرجھا سی گئی ہے - جس طرح رات آنے پر بعض پھول مُرجھا جاتے ہیں ؂

رشک صحیح معنی میں کیا چیز ہوتا ہے - یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں - بہت کم لوگ اس قسم کی دیوانگی کو ہمدردی کی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں - لیکن آہ یہ کس قدر خوفناک کس قدر قوی اور کس قدر ہمہ گیر ہوتا ہے - وہ عورت جس سے مجھے عشق رہ چکا تھا - اب میری نظروں میں میری بدترین دشمن تھی - میں محسوس کرتا تھا - کہ جب میں اُس کی طرف بڑھتا ہوں - تو وہ جھجک جاتی ہے - جب میں مُسکرانے کی کوشش کرتا - تو میری مُسکراہٹ اسے منجمد کر دیتی - اور میرے بوسے تو اس کے لئے ناقابل برداشت تھے - میں چھُپ چھُپ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا تھا - تاکہ اُس کی کسی حرکت کا مشاہدہ کر سکوں - جب وہ باغ میں ہوتی تھی - تو درختوں کی اوٹ میں ہو کر اسے دیکھنے لگتا تھا - میں نے ڈاکئے تک کو رشوت دے دی - کہ تمام خطوط پہلے مجھ کو ہی ملیں - میں آدھی آدھی رات کو اُٹھ کر اُس کے کمرے میں گیا - اور بعض مرتبہ تو مجھے خطرہ محسوس ہوتا تھا - کہ کہیں میری زہرناک نظریں اس کو ہلاک ہی نہ کر ڈالیں -

آخر ایک رات میری جستجو کا صلہ مل گیا - میں دبے پاؤں اُس کے کمرے میں گیا - اور اُسے ایک خط لکھنے میں مصروف پایا - میرا اس طرح چھُپ کر جانا مردانگی کے خلاف تھا - اور ایک بزدلانہ فعل - لیکن

مجھے اپنے اوپر قابو نہیں رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اور آگے بڑھا۔ اور اُس کی پشت پر کھڑے ہو کر مندرجۂ ذیل الفاظ پڑھے :۔

عزیز ترین لڑکے !

تم جانتے ہو۔ کہ میں ان روایتوں میں ہرگز یقین نہیں کر سکتی۔ جنہوں نے تمہیں انگلستان چھوڑنے پر مجبور کیا۔ تم یہ بھی جانتے ہو۔ کہ میں تمہارے مستقبل کے متعلق بہت بے چین ہوں۔ اور اس وقت کی منتظر ہوں۔ جب تمام باتوں کے باوجود ہماری ملاقات ہوگی۔ میں بیرنگز کالکتہ کے نام تمہیں ایک ہنڈی بھیج رہی ہوں۔ تم اسے ضرور استعمال کر لینا پیارے۔ جن مشکلات کے خلاف تم نے جد و جہد کرنی ہے۔ وہ بہت عظیم ہیں۔ تم وعدہ کرو۔ کہ اس روپے کو ضرور استعمال کر لوگے۔ میرے ——— "

اس سے زیادہ پڑھنے کی مجھ میں ہمت نہ رہی۔ میرے بدترین خدشات کی تائید ہو گئی۔ رشک سے دیوانہ ہو کر میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے اُس کے لئے راستہ صاف کر دوں۔ تاکہ وہ ہندوستان جاکر اُس شخص کے ساتھ رہ سکے۔ جس سے وہ محبت کرتی ہے۔

میرے کمرے میں دوائیوں کا ایک بکس تھا۔ جس میں ہندوستان کی ایک ایسی بُوٹی بھی موجود تھی۔ جو یقینی اور فوری موت کا موجب ہو سکتی تھی۔ میں نے بکس کھول کر اسے دیکھا۔ اور اپنی تسلی کر لی۔

اس کے بعد میں اپنی بیوی کے نام خط لکھنے بیٹھ گیا۔ میں نے لکھا۔ کہ میں نے اُس کی بے وفائی کا سراغ لگا لیا ہے۔ اور یہ کہ اگلی صبح تک وہ بالکل آزاد ہوگی۔ اور ہندوستان جاکر اپنے محبوب سے شادی کر سکیگی۔

میں نے اپنی وصیت نکالی۔ اور اسے بغور پڑھا۔ تاکہ اُس میں کوئی نقص نہ رہ جائے۔ اور اُسے میری تمام جائداد بغیر کسی دقت کے مل سکے۔

" دوسرا شخص غریب ہے۔" میں نے خیال کیا۔ " اس لئے اگر مجھے قربانی کرنا ہے۔ تو مجھے مکمل ایثار کا ثبوت دینا چاہیئے۔ ہاں اسے سب کچھ ملیگا۔ تاکہ ان تین سالوں کی پوری پوری تلافی ہو جائے جن میں وہ میرے ساتھ رہ کر مسرت کا انتظار کرتی رہی ہے۔

جب میں خط لکھ رہا تھا۔ تو مجھے اس کے کمرے میں چلنے پھرنے کی آواز آ رہی تھی۔ " آہ! وہ سو نہیں سکتی۔" میں نے خیال کیا۔ " اس پر بے چینی غلبہ پائے ہوئے ہے۔ اور اس کے اعصاب کمزور ہیں۔ لیکن خیر جب کل میں مر چکا ہوں گا۔ تو اُسے سکون مل سکے گا۔"

پھر میں نے اُس کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اور اپنے کان اس طرف لگا دیئے۔ وہ میرے کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ جب اُس نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تو مجھے لکھنے کا سامان چھپانے کی مشکل ہی سے مہلت مل سکی۔ " آہ! آرتھر۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ میں تمہارے آرام میں خلل ڈال رہی ہوں۔ لیکن میں بہت سخت تکلیف میں ہوں۔ اپنا دوائی کا بکس کھول کر مجھے کوئی خواب آور دوائی دو۔ تاکہ میں آرام سے سو سکوں۔"

میں چونکہ بولا نہیں تھا۔ اس لئے وہ خود ہی دوائیوں والے بکس کی طرف بڑھی۔ لیکن اسے کھلا دیکھ کر وہ اپنی تکلیف بھول گئی۔ اور میرے نزدیک آ کر کہنے لگی۔ " آرتھر۔ آرتھر۔ کیا تم بیمار ہو۔ مجھے معاف کرنا۔ کہ میں تمہارا مناسب خیال نہیں رکھ سکی۔ مجھے تمہارے رویئے سے تکلیف ہو رہی تھی۔ مگر اب میں سمجھی۔ کہ تم بیمار تھے۔ غالباً بہت بیمار۔ آخر کیا بات ہے۔ مجھے معاف کر دو پیارے "

میں اسے اپنے بازوؤں میں اُٹھا لینے کیلئے بے چین تھا۔ مگر مجھے ایسا کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں محسوس کرتا تھا۔ کہ میری طاقت گویائی مجھے جواب دے چکی ہے۔ اور اگر میں بولا۔ تو تمام پردہ فاش ہو جائیگا۔" بہرحال کل میرا خط سب کچھ بتا دیگا۔" میں نے خیال کیا۔ اور جو کچھ اب مجھے معلوم ہے۔ وہ اس کو بھی معلوم ہو جائیگا۔

اس تکلیف دہ گفتگو کو ختم کرنے کی نیت سے میں نے بے پروائی سے اسے اپنے جسم سے الگ کر دیا۔ اور بکس سے ایک شیشی اُٹھا کر اُسے دے دی۔ اور اپنی میز پر خاموشی سے جا بیٹھا۔

آہستہ آہستہ تذبذب کے عالم میں وہ دروازے کی طرف گئی۔ اور ایک لمحے کے لئے دروازے میں ٹھہر گئی۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ اُس نے کہا " شب بخیر" میں نے جواب میں کہا " الوداع"

بے چینی اور تکلیف کے عالم میں میں نے اپنا خط دوبارہ پڑھا۔ خط کا مضمون زیادہ سخت تھا۔ اس لئے میں نے اُسے پھاڑ ڈالا۔ میں نے یہ کئی بار کیا۔ حتیٰ کہ دن نکل آیا۔ اور میرا کام ابھی مکمل نہ ہوا تھا۔ " خیر چند سطریں ہی کافی ہونگی۔" میں نے خیال کیا۔ اور قلم اٹھا کر جلدی سے لکھ دیا۔

" الوداع! مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اب تم آزاد ہو۔

میری بہترین خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔"

میں نے خط لفافے میں بند کر دیا۔ اُوپر اس کا پتہ لکھ دیا۔ اور انجام کے لئے خود کو تیار کرنے لگا۔ اب وہ سو رہی ہو گی۔ میں چپکے سے اس کے کمرے میں جاؤنگا۔ اور اس چہرے کو ایک بار دیکھونگا۔ جس سے مجھے اتنی محبت تھی۔ پھر اپنے کمرے میں آجاؤنگا۔ اور باقی کام آسان ہو گا۔

میں اس کے کمرے میں گیا۔ اور دروازے میں کھڑا ہو کر سورج کی اوّلیں شعاعوں کا مشاہدہ کرنے لگا۔ جو اُس کے تکیئے پر پڑ رہی تھیں۔ اس کے پہلو میں جھک کر اور اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے۔ کہ وہ مبادا وہ جاگ پڑے۔ میں نے اس کا آخری بوسہ لینا چاہا۔ اس کے ہونٹ برف کی مانند سفید تھے۔ "اُف میرے خدا یہ کیا معاملہ ہے" میرے مُنہ سے نکلا۔ میں نے کپڑے ہٹا کر اُسے اپنے سینے سے لگایا۔ اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ مُنہ کو بوسہ دیا۔ سینے کو چُوما۔ حتےٰ کہ میرے دماغ کو اس خیال نے منجمد کر دیا۔ کہ وہ مُردہ ہے۔

اصل بات کیا تھی۔ تم آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہو۔ گھبراہٹ کے عالم میں مَیں نے اسے خواب آور دوائی کی بجائے زہر دے دیا۔ جسے میں خود استعمال کرنا چاہتا تھا۔ صرف ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اور وہ ہے اس خوفناک رات کو تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر اس کا ہاتھ دکھانا۔ خیر یہ اچھا ہی ہُوا۔ تم نے کہا تھا۔ کہ اُسے اپنے کسی عزیز سے محبت تھی۔ جو تمام عمر اُس کے لئے ایک بوجھ بنا رہا۔ اور اسی نے اس کی زندگی کو تباہ کر ڈالا۔ یہ درست تھا۔ جس شخص کو اس نے روپیہ بھیجا۔ وہ اس کا بھائی تھا۔ جو بے عزتی کے عالم میں انگلستان سے بھاگ گیا تھا۔ میں صرف اس لئے زندہ تھا۔ کہ اس لڑکے کے متعلق اپنی بیوی کی خواہشات کو پوری کر دوں۔ میں ہندوستان ہو آیا ہوں۔ اور اُس سے مل کر مرنے کے لئے واپس آگیا ہوں۔"

"تین ہفتے بعد میں تنہا شخص تھا۔ جس نے کرنل مارٹن کی قبر کو آنسوؤں کا ہدیہ پیش کیا ✤

(ترجمہ) گوپال متل

"سازش"

قدرت نے پہلے ہی دن ایک سازش کی۔
اُنہیں ملنے نہ دیا۔
اُنہیں دیکھنے نہیں دیا ایک دوسرے کا حُسن۔
اُنہیں سُننے نہ دی ایک دوسرے کی بات۔
اُسے شاید معلوم تھا۔ دونو مل کر ایک عظیم طوفان
بپا کریں گے۔
اِسی لئے اُس نے نہ جانے کہاں سے ایک حسین چیز کو
لاکر اُن کے درمیان کھڑا کر دیا۔
دِن اِدھر رہا —— اور رات اُدھر
ایک کے دل میں ارمان تھے۔
دُوسرے کی آنکھوں میں حیرت!
ایک کے سینے میں طوفان تھا۔
دُوسرے کے ہونٹوں پہ خاموشی!
اور جب دُنیا کے لوگوں نے اُس چیز کو دیکھا۔ تو بے اختیار
کہہ اُٹھے۔ "شام"
قدرت نے اپنی سازش کی کامیابی دیکھی۔
تو چُپکے سے مُسکرا اُٹھی ——
جس سے شام اور بھی حسین ہو گئی۔

پریم ناتھ سادھو رونق کاشمیری۔ سرینگر

مختار

مغرب کا ایک مشرقی شاعر

طامس مور

اپنے ماحول سے متاثر ہونا تو لازمی ہے۔ لیکن بعض پہلوؤں سے دُور کی باتیں بھی نہایت گہرے اثرات کرتی ہیں۔ شروع سے ذہن انسانی میں ایک دُور کی بات یعنی جنت کا خیالی نقشہ قائم ہے۔ اور یوں دُور کی ہر بات اپنے نامعلوم خصائص کی بنا پر دُھندلی اور دلکش معلوم ہوتی ہے۔ کہنے کو تو کپلنگ نے کہہ دیا۔ کہ مشرق مشرق ہے۔ اور مغرب مغرب۔ اور یہ دو نو کبھی نہیں مل سکتے۔ لیکن اُس نے یہ کہتے ہوئے اس بات کا خیال نہ رکھا۔ کہ دُوری کی دلکشی سے ہی کرّۂ ارض کے ان دونو حصوں کا ایک دُوسرے سے متاثر ہونا لازمی ہے۔ اور یہی اثرات گہرے اور پائیدار ہو کر ان کو ایک دُوسرے کے رنگ میں ڈھال سکتے ہیں۔ مشرق پر مغرب کے اثرات ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں قدم قدم پہ اُن کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت ہمیں مغرب پر مشرق کے اثرات سے سروکار ہے "

جس طرح ہمارے لئے آج لفظ مغرب دورِ جدید کی تمام ارتقائی برکتوں کا تصوّر لئے ہوئے ہے۔ اُسی طرح آج سے ڈیڑھ سو سال پیشتر ایک مغربی کے لئے مشرق کا لفظ ہی چند محدود معانی کی ایک رنگین جمعیت کا مظہر تھا۔ مشرق کا لفظ ہی سُن کر اُس کی نگاہِ تصوّر ایک ایسی خوابگوں سرزمین کا نظارہ کرتی تھی۔ جہاں الف لیلہ کی شہزادیاں ہیں۔ پریاں ہیں۔ حُسینیں ہیں۔ درویش، حرم، مؤذن، مساجد، منادر، فقیر، زر و جواہرات کے بے پناہ انبار، عود و عنبر کی خوشبوئیں، بادشاہوں اور راجوں کے دربار، شاہی شان و شوکت، خلعتیں، زرہ بکتر میں ملبوس سوار اور بیشمار اور ایسی اشیا جن کی درخشانی اور جن کا شکوہ نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ اور یہ سب باتیں انہیں دُوری کے ایک ایسے فسانہ ساز دُھندلکے سے دکھائی دیتی تھیں جس کی زرفشانی اور تنوّع انہیں جنّت کے اُسی ازلی تصوّر کی یاد دلاتا تھا "

دُور دراز کے سفر سے آنے والے سیاحوں کی جہاں دیدہ دروغ گوئی عوام کے لئے اور خصوصاً اُس زمانے کے شعرا کے لئے ایک ایسی عجیب اور دلکش دُنیا کا نقشہ بنانے کا باعث ہوئی جس نے بے اختیار ان کے دلوں کو مشرق کی رومان انگیز فضا کی طرف مائل کر دیا۔ بائرن بذاتِ خود اپنی سفری زندگی میں مشرق کے قریب تک آ پہنچا اور بائرن کے دوست اور ہمعصر ٹامس مور کو بھی ایسے ہی معاملات کا سامنا ہوا "

شاعری پر ان مشرقی اثرات کا ایک نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مغرب کے تاجروں کو مشرق نے اپنی سنہری روایات کے جال سے کھینچنا شروع کر دیا۔ اور دُوسرا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ انگریزی شاعری میں بہت سی مشرقی روایات رائج ہونے کے علاوہ لُغت میں بے شمار مشرقی الفاظ کا اضافہ ہوا۔ عربی سے عنبر، غزال، حرم، مینار، مون سون، زعفران، سلطان، شیخ اور مسجد جیسے لفظ ملے۔ فارسی سے عطر، بازار، کارواں اور کاروانسرائے، درویش، دیوان، یاسمین، مشک اور پری کی درآمد ہوئی۔ اور سنسکرت اور ہندوستان سے اوتار، کافور، جنگل، صندل، راجہ، پالکی اور قُلی کے الفاظ نے انتقال کیا۔ اور انگریزی زبان نے نہ صرف ان لفظوں کو اپنے دامن میں لیا۔ بلکہ ان سے متعلق شاعرانہ روایات، تصوّرات اور تشبیہات بھی اس کا جزو بن

گئے۔ مغربی یا انگریزی شاعری پر پہلے عرب اور ایران کی شاعری نے اثر کیا۔ پھر ہندوستان اور چین جاپان کی باری آئی۔ اس حفظ مراتب کی دو وجوہات ہیں۔ ایک جغرافیائی (جو ملک زیادہ قریب تھا۔ اس کا اثر قدرتاً پہلے ہؤا) اور دوسری نفسیاتی یعنی اُس زمانے کے شعرا کے جذبات و احساسات کو مشرق بعید کی بہ نسبت مشرق قریب یعنی عرب اور ایران کے شعرا کے جذبات اور احساسات سے ایک مناسبت تھی۔ عرب کے بعد کے شعرا اور ایرانی شعرا کے کلام میں شدت اور گہرائی نہ تھی۔ ان کا کلام ایک ہلکی پھلکی اور خوش طبع سی شے تھا۔ اس میں حسن و لطافت کے فانی ہونے پر نوحہ خوانی تھی۔ اس میں محبت کے رومانوی فسانے تھے۔ اور یہ محدود باتیں انگریزی زبان کی شاعرانہ روایات کے مطابق تھیں۔ ان سے انگریزی شاعری میں ایک نیا رنگ یقیناً پیدا ہؤا لیکن وہ رنگ انکی پہلی شاعری میں بھی اپنے طور پر موجود تھا۔ اس زمانے کے انگریزی شعرا میں ایک تکلف تھا۔ ایک جذباتی آفتاد طبع تھی۔ ایک نرمی اور گداز تھا۔ یہ تمام مشرقی اثرات اس وقت ایک پائیدار صورت پکڑ گئے۔ جب ایڈورڈ فٹنز جیرالڈ نے رباعیات عمر خیام کا نفیس ترجمہ اپنے ہمعصروں کے پیش نظر کیا۔ لیکن ہمیں اس سے بہت پہلے کے زمانے سے تعلق ہے۔ اس زمانے سے جب آئرستان میں ٹامس مور کی نغماتی تخلیق کو ایک زبردست قبولیت حاصل ہو رہی تھی ٭

آئرستان اور ہندوستان میں بہت سی باتیں یکساں پائی جاتی ہیں۔ آئرستان کی ابتدا بھی ہندوستان کی طرح ایک افسانوی درجے کو پہنچ چکی ہے۔ جس طرح ایک زمانہ تھا۔ جب ہندوستان کی عظمت اور قوت کی ایک دُنیا قائل تھی۔ اسی طرح ایک زمانہ تھا۔ جب آئرستان کا لوہا بھی تمام یورپ مانتا تھا۔ اور جس طرح آخر قدیم ہندوستان کو زوال آیا۔ اسی طرح قدیم آئرستان کو بھی زوال آیا۔ پھر جیسے راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی مانند ہندوستان میں حیات تازہ کے شعلے بھڑکے اسی طرح آئرستان میں بھی تحریک آزادی نے ایک نئی رُوح پھونک دی۔ لیکن یہ موازنہ تفصیلاً میں تطابق نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ ہندوستان صرف ایک ملک ہی نہیں۔ بلکہ اپنے تنوع اور وسعت کے لحاظ سے ایک ذیلی براعظم بھی ہے۔ اور آئرستان محض ایک محدود ملک ہے۔ اس میں ایک جمعیت ہے۔ ایک ایک رنگی ہے ٭

میر تقی۔ غالب اور اقبال ایسے عظیم شعرا کے مطالعے کے لئے اس بات کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ کہ ہم ان شاعروں کے سوانح سے واقف ہوں۔ اور ان کے حالات زندگی سے اُن کی شخصیت کے بارے میں تصوّر قائم کرسکیں۔ کیونکہ ان کا کلام ہی ان کی شخصیت اور انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لیکن انشا، داغ اور ایسے دوسرے شعرا کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ کہ ہم اُن کے واقعاتِ حیات کو پہلے جان لیں۔ نہ صرف اُن کے ذاتی حالات بلکہ اُن کے زمانے کے حالات جاننا بھی ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا کلام ان کے ماحول اور حالات زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے ٭

طامس مور بھی کوئی بڑا شاعر نہ تھا۔ اس لئے اس کے کلام کے مطالعہ سے پیشتر اس کے حالات جاننا ضروری ہے۔ اس کے سوانح حاصل کرنے میں ہمیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کیونکہ انہیں قعر گمنامی سے بچانے کیلئے اس کا اپنا لکھا ہؤا روزنامچہ موجود ہے۔ اس روزنامچے کے مطالعے سے ہمیں شاعر کا کوئی خاص "شاعرانہ" تصوّر نہیں حاصل ہوتا۔ اس کی شخصیت عام سی رہتی ہے۔ اس کے باوجود بہت کم شاعر ایسے گزرے ہیں۔ جنہیں مور کی سی آسانی کے ساتھ آغاز شاعری میں ہی ایسی قبولیت اور شہرت حاصل ہو گئی ہو۔ خصوصاً اس بات کے مدنظر کہ مور کو ابتدا میں کامیاب زندگی کے راستے میں رکاوٹیں بھی حائل ہوئیں ٭

طامس مور ڈبلن کے ایک معمولی دکاندار کا بیٹا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب جماعت بندی، ذات پات یا فرقہ پرستی یورپ میں اپنی پوری شدت کے ساتھ رائج تھی۔ طامس مور عیسائیت کے کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اس زمانے میں کیتھولک ہونے کے معنے گویا برادری بلکہ ایک طرح سے انسانیت سے خارج ہونے کے تھے۔ کیتھولک ہونے کی وجہ ہی سے مور ڈبلن کے ٹری نٹی کالج میں دوسرے طلبا کے ساتھ علمی امتیاز حاصل کرنے کے لئے مقابلے میں شریک نہ ہوسکا۔ چنانچہ وہاں سے ہٹ کر وہ لنڈن کی دُنیا میں اپنی قابلیت، اپنی حیات انگیز ذہانت اور اپنی خوش طبعی کو لئے ہوئے داخل ہؤا۔ اس وقت تک اُسے ادبی لحاظ سے کوئی درجہ حاصل نہ ہؤا تھا۔ یہاں آکر اُس نے انیکری اون کی نظموں کے ترجمے شائع کئے۔ ان نظموں سے صرف اس بات کا اظہار ہوتا ہے۔ کہ مور نظم نگاری کی خاصی اہلیت رکھتا ہے۔ نیز ایک لذیذ تخیل اور کسی حد تک عالمانہ استعداد کا مالک ہے۔ ان نظموں کے علاوہ اُس نے یونان کے چند شاعروں کی نظموں کے بھی ترجمے کئے۔ ان میں سے دو نظموں کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اب تک نہیں آئی وہ کیوں؟

اب تک نہیں آئی یہاں، اب تک نہیں آئی وہ کیوں؟

کب تک رہوں میں منتظر، کب تک یونہی بیٹھا رہوں؟

دو بار اس گھر کا دیا، میں نے جلایا، بجھ گیا!
آخر چراغِ عمر بھی اک دن یونہی بجھ جائے گا!
جانے کہاں ہے اس گھڑی؟ جانے کہاں ہے کس کے گھر؟
ہوگا نہ اس کے دل پہ بھی کب تک مرے دل کا اثر؟
اب تک نہیں آئی وہ کیوں؟ ابتک کہاں ہے کس جگہ؟
اب تک کہاں ہے، کس جگہ؟

دو بار اس گھر کا دیا میں نے جلایا۔ بجھ گیا!
اس کی محبت کا دیا بھی اس طرح کیا۔ بجھ گیا!
لیکن مجھے چین آئے کیوں؟ لیکن چراغِ دل مرا،
اس میں نہ ہوگی کچھ کمی! یہ یونہی جلتا جائے گا!
یہ یونہی جلتا جائے گا ——

افسوس! اس نے کس قدر کھائی میرے سر کی قسم!
کہتی رہی وہ مجھ سے یہ آؤں گی میں، کرنا نہ غم!
لیکن جو ہو یوں بیوفا اس کی قسم کا اعتبار؟
اس کی بلا سے میرا دل اس کے لئے ہو بیقرار!
کیا فکر اسے؟ بیٹھا رہوں میں شام سے تا بہ سحر!
مغرور اور خودکام کو کیسا خطر؟ کس دل کا ڈر؟
کیسا خطر؟ کس دل کا ڈر؟

(۲)

جس طرح شبنم خموشی میں گرے
گرتے ہیں آنسو مرے تیرے لئے
جس طرح ماضی میں تھی، ہے آج بھی
یاد ہی آرامِ جاں میرے لئے!

مجھ پہ طاری ہے طلسمِ جاوداں
تو ہمیشہ ہے خیالوں میں مرے!
نقش ہے دل پر وہ منظر آج بھی
جیسے پہلی بار دیکھا تھا تجھے!

تلخ شیرینی مرے جذبات کی،
وجۂ دردِ مستقل مجھ کو ہوئی!
جیسے تو آئی اچانک، کیوں نہ یوں،
زندگی سے دور تو بھی ہو گئی؟

ان ترجموں سے بھی ایک بات ظاہر ہے۔ طامس مور کو ان میں محبّت کی شدّت اور ان کا ذاتی لب و لہجہ پسند آیا۔ اور اس کی اپنی طبع زاد نظموں میں بھی یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔

طامس مور جس وقت لنڈن میں پہنچا۔ تو اس کی عمر بیس سال کی تھی۔ مور ہی کی قابلیت کے اور کئی نوجوان بھی شاعری کو ذریعہ شہرت بنا کر بڑے شہروں میں پہنچے لیکن کامیابی کی منزل تک بار نہ پا سکے مگر مور کی قسمت اچھی تھی۔ سب سے بڑی خوش نصیبی تو یہی تھی کہ اُسے لارڈ موئرا سا مربّی مل گیا۔ جو ہر طرح سے اس کی امداد کو تیار رہتا۔ یہ مانا کہ اس قسم کے مربّی کی مدد سے ادبی حلقوں میں کوئی امتیاز حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن سماجی زینے پر بلندی کے سلسلے میں ایک لارڈ کی حمایت انگلستان ایسے امرا پرست ملک میں زبردست معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ مور کی ایسی تعلیم و تربیت کے نوجوان کی حمایت کو کسی کا دل بھی چاہ سکتا تھا۔ اور اس کی خوش طبعی اور مرنجاں مرنج فطرت اس کے لئے ہر جگہ دوست پیدا کر سکتی تھی۔ لنڈن کی سماج کے فیشن پرست طبقے میں مور کو بہت قبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ ایک ایسا نغمہ ساز تھا جو اہم موضوعات کو بھی سلیقے سے ہلکا پھلکا سا بنا دیتا تھا۔ اونچی سوسائٹی کی خواتین کے البموں میں جذباتی، عام فہم اور سیدھے سادے اشعار مشغلے کے طور پر لکھ سکتا تھا۔ اور گاہے ماہے ایک اچھا سا گیت لکھ کر خود ہی اُسے گا بھی سکتا تھا۔ لیکن وقتاً فوقتاً اس قسم کی نظم نگاری سے پیٹ تو بھر نہیں سکتا۔ زندگی کے گزارے کے لئے کسی نہ کسی ذریعے کی ضرورت لازمی تھی۔ چنانچہ روزگار کے حصول میں طامس مور انگلستان کے بحری محکمے میں رجسٹرار کی حیثیت سے امریکہ چلا گیا۔ لنڈن کی سوسائٹی بہت بیوفا ہے۔ اُس کی وہی مثل ہے۔ کہ آنکھیں ہوئی اوٹ اور دل میں آیا کھوٹ۔ انیکرمی اور ان کی نظموں کے مترجم کو آخر کب تک یاد رکھتی۔ دو دن۔ اور اتنا نہیں تو ایک دن اور۔ لیکن مور بھی، لندن کو چھوڑ کر امریکہ کی نئی سرزمین میں پہنچکر اپنی حاصل کی ہوئی قبولیت کو قائم رکھنے سے غافل نہ تھا۔ اس نے امریکہ سے اپنا دوسرا مجموعہ لندن روانہ کر دیا۔ یہ نظمیں

سنجیدہ تھیں۔ ان میں ایک گداز، ایک نرمی اور نزاکت اور لذت وکیف تھا۔ بلکہ ایک طرح سے ان نظموں کے رنگ و بُو سے مور کی آئندہ ظاہر ہونے والی دو لمبی نظموں "لالہ رُخ" اور "فرشتوں کا عشق" کی پیشگوئی ہوتی تھی۔ مور کے قارئین جو اس کی ابتدائی نظموں کی بنا پر ہی اُسے محبوب بنائے ہوئے تھے۔ ان نظموں سے اُس کے اور بھی معتقد ہو گئے +

اس مجموعہ نظم کی اشاعت مور کی زندگی میں ایک اہمیت رکھتی ہے جیفری نے ایک مجلے میں مور کے کلام پر تنقید کی لیکن شاعری کی بجائے شاعر کی اخلاقی حیثیت پر سخت اعتراض کئے۔ مور اس حرکت سے قدرتاً مشتعل ہوا۔ اور اس نے جیفری کو دعوتِ مبارزت دے دی۔ شاعر اور نقاد اس مبارزت کے لئے ایک دوسرے سے ملے بھی لیکن پولیس کے افسروں کی مداخلت نے کسی قسم کا خون خرابہ نہ ہونے دیا۔ بہرصورت اس قصے کی تشہیر ہوتی رہی لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مور نے ایک دشمن کی جان لینے کی بجائے دو آدمیوں کو اپنا دوست بنا لیا۔ جیفری اور مور میں صلح صفائی کرا دی گئی۔ اور آخر ایک گہری دوستی قائم ہو گئی۔ اس واقعے کے کچھ عرصے کے بعد بائرن نے اس دعوتِ مبارزت کے متعلق کوئی مذاق کیا اور مور نے برانگیختہ ہو کر بائرن کو بھی دعوتِ مقابلہ دے دی۔ لیکن بعض لوگوں نے بیچ میں پڑ کر معاملے کو ناگوار صورت اختیار کرنے سے بچا لیا۔ اور بائرن اور مور میں ایک گہری اور پائدار رفاقت کا بندھن پڑ گیا۔ اس واقعے سے مور کی مرنجاں مرنج طبیعت پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ گویا لڑائی جھگڑوں سے بھی اپنے دوستوں میں اضافہ کر لیا کرتا تھا +

امریکہ میں تصنیف کی ہوئی نظمیں گویا شہرت کے پہلے زینے پر لانے والی تھیں۔ بائرن کی دوستی کے ساتھ ہی ساتھ اس کی حقیقی کامیابی کا زمانہ شروع ہو گیا۔

وہ نظمیں جنہوں نے مور کو بامِ شہرت پر پہنچایا۔ (لالہ رُخ اور آئرستانی نغمے) ان کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے۔ کہ وہ دونو ناشر کی فرمائش پر لکھی گئی تھیں۔ آئرستانی نغموں کے الفاظ (یا بول) مور کو قومی دھنوں کے مطابق لکھنے تھے۔ اس کارگذاری کا نتیجہ اچھا نکلا ناشروں کا اندازہ غلط نہ تھا۔ ان گیتوں کو بے حد قبولیت حاصل ہوئی۔ اور یہ ملک کے اطراف و جوانب میں گائے گئے۔ مور کے باقی کلام کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ان گیتوں کے متعلق ایک بات ضرور کہی جا سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ابھی کافی عرصے تک یہ گیت کم سے کم آئرستان میں غیر فانی رہیں گے +

ان میں سے دو گیتوں کے ترجمے ذیل میں درج ہیں۔ ترجمے میں اسمائے معرفہ کی تبدیلی ہندوستانی ذہن کے لئے رومان انگیزی کی بنا پر کی گئی ہے،

کسوٹی

شاما کی آنکھوں کے اندر جیسا ہے اُجیالا،
کوئی نہ جانے کس کے کارن ایسا ہے اُجیالا!
دائیں بائیں جب شاما اپنے نیناں بان چلائے،
کوئی نہ جانے اُس کے دھیان میں کونسا پریمی آئے!

میرا کے نینوں کو پریمی جب دیکھے رس پائے،
ان کی ریشمی پلکیں جن کو لاج جھکاتی جائے!
بھولے سے ہوں اونچی نظریں جیسے بجلی چمکے،
اک پل کے چمکارے ہی سے پریمی کا من دھڑکے!
جگ میں ایسے نیناں لاکھوں جن میں ہے اُجیالا،
لیکن پریم کا میٹھا موہن ان میں ہے اُجیالا!

شاما کا ملبوس سنہرا، جیسے پیلا سونا
تن کے ساتھ لگا، مانو، جل پریوں نے پہنایا!
سندرتا کے سب گُن چھُپ گئے، دھیان سے تو دیکھو نا!
رُوپ کی شوبھا ماند ہوئی، سنگار بھی کام نہ آیا!

میرا کا ملبوس نرالا، ہر اک بات نرالی،
لہرائے، بل کھائے جیسے پون ہو پربت والی!
سندرتا کے سب گُن اپنا رُوپ انوپ دکھائیں،
تن من دونو آزادی میں پریم کے تیر چلائیں!
سیدھی سادی، بھولی بھالی موہن میرا میری،
پیراہن کا رُوپ بڑھے، ایسی سندرتا تیری!

شاما جب دو چار میں بیٹھے، ایسی بات بنائے،
جو سُن لے تکتا رہ جائے، تکتا ہی رہ جائے،
کوئی نہ جانے سوچ سمجھ کر گھاؤ لگاؤ باتیں!
رنگ جمانے کو ہی۔ یا بجلی چمکائیں باتیں!

میرا کا من ہے یا ہے اک پریم و دیا کا مندر
سُکھ آنند کی مُورت اس میں چھپی ہے، من کے اندر
سُکھ کی سیج پہ بھی ہے اتنی بات تو سُوکھی پھیکی!
بوجھ سے دب کر ہوتی ہے جو حالت اک پتی کی!
باتوں سے اتنا تو مانا، سب جگ چنچل جانے،
پریم دیا کے رس کو جو پائے، بس وہی پہچانے!

زُود پشیمانی

وقت جو کھو دیا محبت میں،
دُور سے دیکھنے میں حسرت میں،
نورِ جاں بخش چشمِ میگوں کا،
تھا سبب میرے دل کے شگوں کا!
کیف باقی نہیں اُس افسوں کا،
بس یہی غم ہے تیرے مجنوں کا!
اب ہے ہمدم خیال کا سایا،
عقل نے لاکھ بار سمجھایا،
میں نے اک بار بھی نہیں مانی
اور کھائے فریبِ نسوانی!
اُس کے ملبوس تھے کتابیں تھیں،
سلوٹوں میں کتنی شرابیں تھیں
وقت کھوتا رہا حماقت میں،
دُور سے دیکھنے میں، حسرت میں!
دل تھا میرا ڈرا ہوا آہو،
جس کی آنکھوں سے بہتے تھے آنسو!
بوئے نافہ فضا میں بہتی تھی
ہوش معدوم کر کے رہتی تھی!
مجھ پہ جس وقت وہ نگہ کرتی،
کیسی حالت مری ہوا کرتی!
پھر بھی دُوری میں کہتا تھا اس سے
یہ جنوں اور ــــ اور ــــ اور بڑھے!

کیا ہوئیں وہ حماقتیں معدوم؟
اب ہے خود دار یہ دلِ محروم؟
پھول وہ زرد ہو چکا ہے، کیا؟
جوش وہ سرد ہو چکا ہے، کیا؟
اب برانگیختہ نہیں کرتیں؟
دل میں وحشت کو اب نہیں بھرتیں؟
چشمِ میگوں کا وقت بیت گیا؟
زہرِ افسوں کا وقت بیت گیا؟

آہ! کیسے کہوں کہ ہاں بیتا!
وہ زمانہ ابھی کہاں بیتا!
اب بھی جب مجھ کو یاد آتی ہیں،
جوش و وحشت کو ساتھ لاتی ہیں،
عقل کی ایک بھی نہیں چلتی،
دل سے بہتی ہے خون کی ندی!
فرق اتنا ہے پہلی باتوں میں،
حسن و نکہت کی مست راتوں میں،
وہ مناظر تھے پہلے آنکھوں میں،
اور اب ہیں فقط خیالوں میں!

یہ گیت دلچسپ ہیں، دلکش ہیں۔ ان میں رس ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ صرف محبت کے عام نغمے ہی ہیں۔ ان میں کوئی غیر معمولی ادبی خصوصیات موجود نہیں ہیں۔ اور ان کی قبولیت اور بقا کسی ادبی بنا پر ہے۔ ان کی موسیقی، ان کا نغماتی حسن، ان کی مٹھاس ہی ان کی حیات کی وجہ ہے اور اُن کا موضوعِ عشق و محبت بھی باعثِ بقا ہے۔

مور کے کلام میں خالص آئرستانی رُوح موجود نہیں ہے کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جو اُسے دُوسرے مُلکوں کے مذاق سے علیحدہ کر دے۔ خصوصاً "آئرستانی نغمے" اس رُوحِ ادب سے یکسر عاری ہیں۔ جسے خالص آئرستانی کہا جاتا ہے اور جس میں ابہام، تخیل پرستی اور اُلجھے ہوئے تصورات کو بہت دخل ہوتا ہے۔ ان نغموں میں (اور مور کی شاعری میں عموماً) ہر بات صاف سیدھی سادی، یقینی اور واضح ہوتی ہے۔ اس میں اشارے اور کنائے کو بالکل بار نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود مور کے نغموں میں ہر

آئرستانی کے لئے لذت و موسیقی موجود ہے اور یوں ان گیتوں سے قومی روح کا اظہار ہوتا ہے۔ حقیقتاً مور کا انداز نظر بعد کے آئرستانی شعرائے جدید کا پیچیدہ انداز نظر نہیں ہے۔ ہاں ان میں آئرستانی خوش مذاقی نرم مزاجی، طبیعت کا گداز، حسن ادا اور دلکش تصور موجود ہیں۔

مور کو جو قبولیت اس کے ہموطنوں میں حاصل ہوئی۔ وہ اس کا مستحق تھا۔ کم از کم اس نے قومی روح کیلئے ذریعہ اظہار و ترجمانی مہیا کیا۔ اس کے کلام کی روایتی خصوصیات ہی لوگوں کو اپیل کرتی تھیں۔ اور وہ انہیں پورے طور پر سمجھتے تھے۔ اور بہت عرصے تک اس کلام کی پیروی بھی کسی نہ کسی رنگ میں ہوتی ہی رہی۔ مور کی قبولیت اور شہرت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ تمام انگریزی دان طبقہ اس کے "آئرستانی نغموں" کا مدح خواں تھا۔ انگلستان کے مشہور رومانوی شاعر بائرن نے طامس مور کے کئی آئرستانی نغموں کو آئرستان کی تمام قدیم رزمیہ نظموں سے زیادہ رتبہ دیا ہے۔

مور نے جذبۂ حبِ وطن کو بھی جس رنگ سے اپنے نغموں میں ظاہر کیا ہے۔ اُسے دیکھ کر مخالفین کے دلوں میں بھی کسی طرح کے ناگوار یا ناپسندیدہ تاثرات نہیں ہوتے۔ مور کی پیدائش اس وقت ہوئی۔ جب آئرستان میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ اور حب الوطنی کا جوش رگوں میں طاری تھا۔ لیکن اس سلسلے میں اس نے کبھی عملی حصہ لے کر اپنی زندگی کی عام روش اور بہاؤ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ مور فطری طور پر محض شاعر تھا۔ کوئی پیغامبر یا باغی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ جب بھی انتخاب کا موقع آیا۔ اس نے انقلاب پسندی پر میانہ روی کو ترجیح دی۔ لیکن قومی حیثیت سے آئرستان کیلئے اس کے دل میں تخیل پرستی کا ایک احساس ضرور تھا۔ وہ اپنے ملک میں خوشحالی اور آزادی کا خواہاں تھا۔ اسکے دل میں انگلستان کیلئے بھی ایک ایسی جگہ تھی۔ کہ وہ کھُلم کھلا اس کے خلاف عملی حصہ نہیں لے سکتا تھا۔

۱۸۳۵ء تک "آئرستانی نغموں" کی اشاعت لگاتار جاری رہی۔ لیکن پہلی اشاعت کے چند ہی سال بعد سے طامس مور ایک اور اہم کام میں مشغول ہو گیا۔

آج کل مغرب میں نظر انتقاد پہلے سے کہیں زیادہ گہری اور سخت ہو چکی ہے۔ اور ہم کسی مغربی ناشر سے اس بات کی توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ کسی منظوم مشرقی داستان کیلئے تین ہزار پونڈ کا گرانقدر معاوضہ دینا منظور کر لیگا۔ لیکن گذشتہ صدی کے اوائل کی اور حالت تھی۔ تب لوگ اقتصادی اور جذباتی لحاظ سے کہیں زیادہ امیر تھے۔ ۱۸۱۲ء میں لانگمین کی مشہور ناشر فرم نے مور کے سامنے "لالہ رُخ" کیلئے یہی معاوضہ پیش کیا۔ اور ناشرین بھی گھاٹے میں نہ رہے۔ "لالہ رُخ" کی مثنوی کو اشاعت ہوتے ہی مکمل کامیابی حاصل ہوئی۔ گویا ناشر نے پبلک کے مذاق کا اندازہ بالکل صحیح کیا تھا۔ یورپ کی بہت سی زبانوں میں اس مثنوی کا ترجمہ کیا گیا (اور اردو میں بھی اس کا نثری ترجمہ لطیف الدین احمد کے قلم سے ہو چکا ہے) لیکن آج اور زمانہ ہے۔ آج مغرب کو فرصت نہیں اور نہ ہی مذاق ہے کہ وہ اس قسم کی مشرقی داستانِ منظوم کی موسیقی میں خود کو کھو دے۔ آج کل کے نقادوں کی نظر میں "لالہ رُخ" کا درجہ معمولی ہے اور اس موسیقانہ رومان کی دلکشی اور خوش اسلوبی کے باوجود اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ ۱۸۲۰ء کی جذبات پرست اور رومان نواز پبلک ہی ایسی ادبی تخلیق کی صحیح قدر دان ہو سکتی تھی۔ اس مثنوی کی قبولیت کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ کہ بائرن اور شیلے ایسے شعرا کے کلام میں ایک ایسا باغیانہ عنصر ہوتا ہے جو عوام کو ناگوار گزرتا ہے۔ لیکن مور کے کلام (اور اس مثنوی) میں اس باغیانہ عنصر کا فقدان ہے۔ جو اپنی بے باکی کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں میں غیر مستحسن ہو۔ یہ مثنوی والدین کسی قسم کی جھجک کے بغیر اپنی نوجوان اولاد کے مطالعے کیلئے پیش کر سکتے تھے۔ یہ مانا کہ اس میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جو احساسات کو عشق و محبت کے جذبات سے آشنا کرتے ہیں اور جن میں امنگوں کو بھڑکانے کا مواد موجود ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کے کسی ٹکڑے پر بھی اخلاقی لحاظ سے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ لذیذ تصورات کو اخلاقیات کا آلۂ کار کبھی نہیں بنایا گیا لیکن یہ مثنوی اس لحاظ سے پہلا اقدام تھا۔

مثنوی "لالہ رُخ" کے بعد مور کی اہم تخلیق "فرشتوں کا عشق" ہے اس میں بھی وہی خصوصیات نمایاں ہیں جو اسکی پیشرو مثنوی میں تھیں لیکن بعض اشخاص نے اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا کہ ایک رنگین نظم میں مذہبی موضوع کو کیوں لایا گیا۔ لیکن ایسے بے بنیاد اعتراضات کے باوجود اس نظم کو بھی بہت قبولیت حاصل ہوئی۔

اس کے بعد مور نے ڈرامائی پیشکش کیلئے چند گیت لکھے جنہیں بیانیہ ٹکڑوں کے ذریعے ایک رشتے میں منسلک کر دیا۔ اس کا عنوان اس نے "یونانی شامیں" رکھا۔ یہ ہلکے پھلکے گیتوں کا ایک مختصر مجموعہ تھا۔ جنہیں پہلی شام اور دوسری شام کے تحت درج کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک گیت کا ترجمہ (عبرت) اس مضمون کے آخر میں دیکھئے۔ اور ایک گیت ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

گیت

میں روتا ہوں مری جاں! آہ، میں آنسو بہاتا ہوں،
اور ایسے لمبے، سونے دن کا ہر لمحہ گزرتا ہے !
جب آئے رات، پھر بھی ہے وہی کام آہ ! رونے کا،
نہ تاریکی میں راحت ہے، نہ راحت ہے اُجالے میں !
تسلّی کوئی بھی باقی نہیں ہے، بس تری یادیں،
خرابے میں مرے برباد دل کے شور کرتی ہیں !
اور اپنی وحشیانہ چال سے مجھ کو ڈراتی ہیں !
مرے پژمردہ دل میں کچھ نہیں، بیجان ہے یکسر!
فقط اک بازگشتِ عہدِ رفتہ قید ہستی میں
تڑپتی ہے مری جاں ! اور میں آنسو بہاتا ہوں !

ہر شخص کی زندگی میں جوانی آتی ہے - اور جوانی میں ہر شخص کے جذبات مچلتے ہیں - اور کوئی نہ کوئی موہنی مورت اپنی فرقت کے دکھ کی لذت سے دل کو آشنا کر دیتی ہے - یہ گیت بھی فراق کا گیت ہے اس میں بھی فرقت کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے اور اسلئے یہ ہر شخص کو اپنے تجربے کے مطابق پسند آسکتا ہے - اور مور کی تمام شاعری کا یہی حال ہے - اس کا ہر مصرعہ اکثریت کے احساسات اور جذبات کا ہم آہنگ اور ترجمان ہوتا ہے - یہ کہنا غلط ہوگا کہ مور کی اس جذبات پرستی کی بنیاد خلوص اور حقیقت پر نہیں ہے - جس طرح مور کی احساسات سے لذت گیر ہونے کی خصوصیت اس کے کردار کا لازمہ اور حقیقت پر مبنی تھی - اسی طرح اس کے کلام کی ہر خصوصیت حقیقی ہے - اور اس کی بنیاد خلوص پر ہے -

اس کے بعد کا مجموعہ "گیت، مثنویاں اور متفرق" نظمیں تھا - یہ بھی مور کے عام معیار کے مطابق تھا - اس مجموعے میں سے چند گیت اور نظمیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں -

جوانی لازماً خیالات و جذبات کا ایک مرکز مقرر کر دیتی ہے - لیکن یہ مرکز تخیل پرستی اور محبّت کے دھندلکے میں بعض اوقات عجیب صورتیں اختیار کر جاتا ہے -

ایک دوشیزہ مجھے محبوب ہے
جس کو اوروں نے کبھی دیکھا نہیں
نور میں آتی ہے، سائے میں کبھی
نور میں، سائے میں دونو میں حسیں
اس کو اکثر دیکھتا ہوں خواب میں
کان میں کرتی ہے کچھ سرگوشیاں
لفظ وہ گر میں کسی سے جا کہوں
آہ اُس کے لب پہ ہوتی ہے عیاں!
جان سکتے ہو اگر تو جان لو!
میرے خوابوں کی پری پہچان لو!
چھا رہی ہوں دل پہ جب تاریکیاں
اُس کی آنکھیں دیکھتا ہوں خندہ زن
یاد آ جاتی ہیں وہ سرگوشیاں
گونج میں جن کی میں ہوتا ہوں مگن!
رنج و غم پھر پاس آتے ہی نہیں!
اور مرے دل کو ستاتے ہی نہیں!
اُس کی آنکھوں کا اجالا پھیل کر
آنسوؤں میں نور بھرتا ہے مرے!
جب اذیّت کوش ہو زخمی جگر،
روشن اُن لمحوں کو کرتا ہے مرے!
جان سکتے ہو اگر تو جان لو
میرے خوابوں کی پری پہچان لو

محبت کا ابتدائی زمانہ گذر چکا ہے تجسّس کی پہلی دلکشی مٹ چکی ہے اور ایک لمحے میں جب کمزوری اور تھکن ذرا سی دیر کے لئے بے حال سا کر دیتے ہیں .. .. ..

ابھی بھی تو ہے گریزاں، میں اشتیاق لئے
حسیں خیال ! — یہ بے فائدہ تگ و دو ہے
تصوّرات ہمیشہ ہیں اک تعاقب میں
تری طرف سے وہی سرد دُور کن رَو ہے!
کُشادہ بازوؤں میں میرے آ کے جاتی ہے
مجھے فریبِ تصوّر سے کیوں ستاتی ہے؟
نظر میں آنے سے پہلے ہی، پھر وہی گھری،
ہویدا غم کی ہے بے باک چشم تاریکی!
یہ دیکھتا ہوں کہ جس درجہ نور افشاں ہے
بس اتنی میرے تصوّر سے تو گریزاں ہے!
گھٹا میں برق کا جلوہ ہو جیسے اک لمحہ،
بس ایسے دید بھی تیری ہے مختصر نغمہ!

جویندہ یابندہ، جستجو آخر کسی نہ کسی ذریعے سے کامیاب ہوتی ہے۔ اور فرقت کی جگہ خلوت کی نئی صورتِ حال سے دو چار ہو کر نئی اُلجھنوں کو سلجھانا پڑتا ہے۔

آج کا دن ہے ہمارا پیاری!
آج کا دن ہے ہمارے بس میں،
ہم نہ کھوئینگے اسے یوں بیکار!
رنج و غم اور مسرت ہیں جہاں میں یکساں،
جو بھی ممکن ہو کسی سے اسے حاصل کرلے!
عمر میں غم کے لئے اور بھی ہے وقت بہت،
جب ہوں پژمردہ مسرت کی سہانی کلیاں،
چشمِ نم کر کے بہائیں گے ہم آنسو بھی یہاں!
شاخِ دیروز پہ اُس دم گُلِ راحت یکسر،
خار کی صورتِ قاتل میں نظر آئے گا!
کس لئے یونہی گنوائی ہو یہ شیریں لمحے؟
آج ہے تم پہ جوانی کی بہار!
اور میں بھی ہوں تمہارا طالب!
وقت، ایسا نہ ہو، کل ہم سے یہ باتیں لے لئے
دن جوانی کے، جوانی کی راتیں لے لے!
نغمۂ حسن تمہارا نہ مجھے کل بھائے!
اور یا عشق کا جذبہ ہی نہ دل میں آئے!

لیکن اس چرخِ ناہنجار نے ایسا کون ہے جسے مستقل طور پر آرام سے رہنے دیا ہو۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اخلاص سے لبریز دل میں جذبۂ محبت ایک ہی مرکز پر قائم اور غیر فانی رہے۔ وفا کی قسمیں وعدہ و اقرار کا زمانہ ہے۔

دوام

محبوب ہو؟ ہاں لو سنو، گرچہ نہیں ہو تم مری،
پھر بھی مجھے جانِ جہاں حد سے سوا مرغوب ہو!
اور رشتۂ اُمید جو دُھندلا تھا، اب معدوم ہے،
طالب ہوں لیکن میں تمہارا، تم مری مطلوب ہو!
یہ دل تمہارا جس قدر بھی مجھ سے ہٹتا جائے گا،
میری نگاہوں میں تمہارا حسن بڑھتا جائے گا!
گر اور کی چاہت میں ہی سرشار ہو جاؤ گی تم!
پھر بھی دل ناکام میں شوق اپنا ہی پاؤ گی تم!
بے التفاتی جس گرہ کو کھول سکتی ہی نہیں،
کیا تم سمجھتی ہو کہ موت عقدہ کشا ہو جائیگی؟
ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، آئندہ عمروں میں یہیں،
اس کے دل کے اندر ہی تمہاری یاد پھر لوٹ آئیگی!

ہم تم

نہ پوچھو مجھ سے کہ اب بھی ہے دل میں وہ جذبہ،
مری نگاہوں نے سب راز کہہ دیا ہے تمہیں!
لبِ فسردہ نے چھیڑا تھا جو کبھی نغمہ،
وہ آج تک ہے رواں رُوح کے تسلسل میں!
جو اشک چشمِ ملول و حزیں سے گرتے ہیں،
وہ اک زبانِ خموشی میں بس یہ کہتے ہیں،
"تمہیں ہو، آہ! تمہیں، آج تک مجھے مرغوب!"
شعاعِ ماہ سے کرنیں نگاہ کی اچھی،
مسرتوں سے اذیت اس آہ کی اچھی!
اگر یہی ہے محبت تو سُن لو، اس دل میں،
خیال ایک تمہارے چھائے رہتے ہیں!
مسرتوں میں محبت کی آزمائش کیا؟
غمِ فراق سے اس دل کو آزما لینا!
یہ دل تو تم کو کبھی بھول ہی نہیں سکتا
یہ اختیار تمہیں ہے کہ تم بھلا دینا!

انجامِ محبت کیا ہے۔ غم! لیکن ایسا غم عشق کو
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا،
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

یکتائی

ایک ہی بار ہوئی اُن کی ملاقات مگر
ایک دن وہ کہ جوانی سے تھا شیریں یکسر!
وقت اور فرقتِ قاتل کے غمِ پیہم نے
لاکھ اِس خوابِ جوانی کو مٹانا چاہا
خواب کی آج بھی باقی ہے وہی تابانی،
کسی طاقت سے بھی وہ حسن نہیں مٹ سکتا

نت نئے دیس میں سورج کی شعاعیں دیکھیں،
اجنبی رنگِ مسرت کی بھی کرنیں دیکھیں،
لیکن ان دونو نے پھر خواب نہ ویسا دیکھا!
بے بہا خوابِ جوانی کا جو اک بار آیا!
ایک ہی بار ہوئی اُن کی ملاقات، اُن کے
قلب سرشار جواں سال مسرت بھی بجھے!
آج بھی اُن کے دلوں میں ہے۔ وہی کیف حسیں،
جس نے اِک بار کیا رُوح کو اُن کی شیریں!

اس راستے پر چل کر جس میں " دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔" آخرکار یاس اور قنوطیت یکسر دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔

الوداع! آج سے رخصت دلِ زخمی تجھ کو!
آخرکار ترے عیش کا لمحہ آیا!
جلد آ جائے گا منظر ترے ابدی گھر کا!
الوداع! آج سے رخصت دلِ زخمی تجھ کو!

ایک لمحے کی اذیت اے دل!
مستقل درد سے کم تر ہوگی!
ایک لمحے کو گذر جانے دے،
پھر نہ حالت تری ابتر ہوگی!
الوداع، آج سے، افسردہ، شکستہ دل کو!

درد اب ختم ہوا، بیت گیا، بیت گیا!
چشم ترسے نہ بہے گا کبھی اب خونِ جگر،
لائی ہے موت تری راحتِ ابدی کا پیام!
اب سے ہمدم ہے ترا ایک بہشتی آرام!

بحر کی موج کوئی جس طرح ساحل دیکھے
اور پژمردہ مسافر گلِ منزل دیکھے،

جلد آ جائے گا منظر ترے ابدی گھر کا!
آخرکار ترے عیش کا لمحہ آیا،
الوداع! آج سے رخصت دلِ زخمی تجھ کو!
الوداع آج سے افسردہ شکستہ دل کو!

اور اس سلسلے میں سب سے آخر میں ایک خالص مشرقی گیت ہے۔ جو انگریزی کی بجائے فارسی ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

حسن اور نغمہ

۱۔ گلستاں میں بلبلِ آشفتہ نے
گل سے اک نغمے میں شکوہ کیا،
گیت میں رس ہے بہت مانا مگر
"گیت ہے بیکار سی بیکار شئے،
"گر نہ اس کو ساتھ حاصل ہو ترا!

۲۔ سن کے شکوہ بلبلِ آشفتہ کا
گل نے پتی کی زباں سے یوں کہا
"پھول میں ہے دلکشی، مانا، مگر
"پھول ہے بیکار سی بیکار شئے
"گیت گائیگا تو گر اس حسن کا!"

۳۔ اس طرح بس اسطرح گیتوں سے ہے
حسنِ نسوانی کی افزوں دلکشی!
اور یونہی حسنِ نسوانی سے ہے
نغمۂ شاعر میں نور سرمدی!

۴۔ جس طرح انجم کا بکھرا قافلہ
چرخ پر حرکت میں رہتا ہے سدا
اس طرح جب تک جہاں باقی رہے
حسن و نغمہ میں ہم آہنگی رہے!

کچھ عرصہ بعد مور امریکہ میں اپنے مقرر کردہ نمائندے کی بے ایمانی کی وجہ سے قرض کے لئے گرفتاری کے خطرے سے بچاؤ کی خاطر پیرس کو فرار ہوگیا۔ اس زمانے میں بھی اس کی خوش طبعی اور ادبی کارگذاریاں جاری رہیں۔ ۱۸۲۱ء میں مور پیرس سے چھپتا چھپاتا انگلستان لوٹا۔ یہاں آکر بھی اس نے کچھ طنزیہ کلام لکھا۔ اور اس کی بنا پر "ٹائمز" کا مستقل طنز نگار بن گیا لیکن مور ایک اچھا طنز نگار نہ تھا۔ کیونکہ جذبات پرستی اس کا خاصہ تھا۔ وہ ایک بات کو ناپسند کر سکتا تھا۔ اس پر ہنس سکتا تھا۔ لیکن مستقل طور پر ناراض نہ رہ سکتا تھا۔

(میراجی) (ادبی دنیا)

افکارِ تازہ

معاذ اللہ نازِ حسن اس کا — دماغ آسماں چکرا رہا ہے
فضائے نیم شب اتنی دل آویز — نقاب اُلٹے ہوئے کون آ رہا ہے

(ساقی)

ہر دل پہ خود اک بارِ گراں ہے اے دل — اوروں کے لئے وقت کہاں ہے اے دل
یہ غم میں ترے جو آہ بھرتے ہیں رفیق — یہ آہ تو برف کا دھواں ہے اے دل

(کلیم)

جنوں نہیں کہ کروں جستجوئے منزلِ دوست — ابھی تو اپنی ہی ہستی کو ڈھونڈتا ہوں میں
کلاہِ خسروی رقصاں ہے ٹھوکروں میں مری — جسے نہیں ہوسِ جاہ وہ گدا ہوں میں

(شاعر)

عشق کیا ہے ہمہ تن شوق و تمنا و مراد — عشق کے ہاتھ میں دامن کے سوا کچھ بھی نہیں
یاس و اُمید کا اک حشر بپا ہے دل میں — حال گو سن کے مرا اُس نے کہا کچھ بھی نہیں
تیرے ادنیٰ سے محبت کے اشارے کے سوا — ہم مریضانِ محبت کی دوا کچھ بھی نہیں

(معارف)

تجھے دنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے اے کاش — مجھے دنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا
شوخیٔ حسن ہو یا مصلحتِ عشق کوئی — ورنہ میں اور خرابِ غمِ دوراں ہوتا

(نیچ ویکلی)

کیا تھا عشق نے بھی آج اہتمامِ فریب — پتے کی بات مگر رنگِ رُخ چھپا نہ سکا
ملے تو زہر ہلاہل سمجھ دلِ ناداں — وہی تو آبِ بقا تھا جو ہاتھ آ نہ سکا

کیا موت نے بھی سیکھ لئے دلبری کے رنگ — یہ طرزِ بے رُخی تو اس آرامِ جاں کی ہے

(ادبی دنیا)

دلِ عزیز کی خودداریاں جزاک اللہ — ورنہ لوگ محبت میں کیا نہیں کرتے
زباں پہ لفظِ وفا جن کے ہو مدام وہ لوگ — وفا کا وقت جب آئے وفا نہیں کرتے

کونین ہے عبارت اک عشقِ بے اماں سے — نکلا یہی فسانہ اُلٹا ورق جہاں سے
کس نے اُٹھا دیا ہے پردہ حریمِ جاں سے — آنکھیں بھی مطمئن سی آنسو بھی شادماں سے

(جامعہ)

صفحۂ اطفال

"ہمارا مذہب"

ہمارا مذہب انسانیت ہے۔ ہم اس مذہب پر تمام تفرقے قربان کر دیں گے۔ کہ یہ مذہب تمام مذہبوں سے مقدس تر ہے۔ ہم ہندو ہوں کہ مسلمان، سکھ ہوں کہ عیسائی، چینی ہوں کہ بدھ، انسانیت ہم سب میں مشترک ہے۔ ایسا کون ہے۔ جو انسان ہونے سے انکار کر سکے۔ اگر ایسا ہے۔ تو آؤ ہم صحیح معنوں میں انسان بن جائیں اور انسانیت کے سیدھے سادے اصولوں کو اپنا جزو زندگی بنالیں۔ اس کے بعد ہمیں اور کسی رہنمائی کی ضرورت نہ رہے گی۔

ان اصولوں میں سب سے آسان اور سب سے سادہ تر اصول یہ ہے۔ کہ دوسروں کے لئے وہ بات ہرگز پسند نہ کرو۔ جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے۔ اگر تم اس اصول پر عمل پیرا ہو گئے۔ تو سمجھ لو۔ کہ تم بہت سی برائیوں سے بچے رہو گے۔ فرض کرو۔ کہ تمہارے دل میں کسی شخص کو دھوکا دینے کا خیال پیدا ہو رہا ہے۔ اگر تم اس وقت اپنے آپ کو اس شخص کی جگہ تصور کر لو۔ اور یہ سوچنا شروع کرو۔ کہ اگر کوئی تمہارے ساتھ دھوکا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ تو تمہاری کیا کیفیت ہو گی۔ یاد رکھو۔ کہ تمہاری وقتی لغزش تمہارے دل سے فوراً دور ہو جائیگی۔ اور تم بدی کے راستے میں ہرگز ہرگز گامزن نہ ہو گے +

(گوپال متل)

"ایاز"

ایاز مشہور بادشاہ محمود کا غلام تھا۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ لیکن تھا بہت عقلمند اور سمجھ دار۔ اس لئے محمود اس کی بہت قدر

کرتا تھا۔ یہاں تک کہ سلطنت کے کاموں میں بھی اس سے رائے لیا کرتا تھا۔

ایک غلام کی اتنی عزت اور قدر دیکھ کر محمود کے مصاحبوں اور درباریوں کو بہت رشک ہوتا تھا۔ اس لئے اُنہوں نے ایک روز بادشاہ سے کہا۔ حضور والا! چھوٹوں کو اس قدر بڑھانا اچھا نہیں۔ اس کا رعایا پر بُرا اثر پڑے گا۔ پھر غلام کا کیا اعتبار۔ ایسے لوگوں کی ذات کو حد سے زیادہ اہمیت دینے کا نتیجہ اچھا نہیں ہؤا کرتا۔

محمود نے ساری باتیں سُنیں۔ لیکن کسی قسم کا خیال نہیں کیا۔ وہ ایاز کو جس طرح مانتا تھا۔ اُسی طرح مانتا رہا۔

ایک روز بادشاہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ باغ میں سیر کر رہا تھا۔ اور باغ سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک قافلہ پڑا تھا۔ بادشاہ نے ایک مصاحب سے کہا۔ ذرا پتہ تو لگاؤ۔ قافلہ کہاں سے آیا ہے؟

وہ مصاحب گیا۔ اور واپس آکر بولا۔ جہاں پناہ! مدینے کی طرف سے آیا ہے۔

محمود نے پُوچھا۔ جائیگا کہاں؟

مصاحب نے کہا۔ حضور! میں نے تو دریافت نہیں کیا۔

محمود نے ایاز کو آواز دی۔ وہ بھاگا ہؤا آیا۔ اور بولا۔ جہاں پناہ! غلام حاضر ہے۔ کیا حکم ہے؟

محمود۔ دریافت تو کرو۔ قافلہ کہاں سے آیا ہے؟

ایاز نے دریافت کر کے کہا۔ حضور! یہ قافلہ مدینے کی طرف سے آ رہا ہے۔

محمود۔ جائیگا کہاں؟

ایاز۔ انگورہ کی طرف۔

اس کے علاوہ محمود نے قافلے کے متعلق اور بہت سی باتیں دریافت کیں اور ایاز نے سب کا ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔

ایاز کے جانے کے بعد محمود نے درباریوں سے کہا۔ دیکھا تم لوگوں نے؟ میں غلام کی قدر نہیں کرتا۔ اُس کی عقلمندی کی قدر کرتا ہوں۔

ایک روز محمود کی کوئی قیمتی چیز غائب ہو گئی۔ بہت تلاش کرنے پر بھی اس کا پتہ نہ چلا۔ محمود کے درباریوں کو موقع مل گیا۔ کہ ایاز کو بدنام کریں۔ چنانچہ سب نے اسی کو کہنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کو بھی یقین ہو گیا۔ کہ ایاز ہی نے وہ

چیز چُرائی ہے - چنانچہ بادشاہ نے درباریوں کو حکم دے دیا - کہ وہ ایاز سے اس چیز کے برآمد کرنے کی کوشش کریں - اب بادشاہ کے درباری پتہ لگانے لگے - کہ ایاز سے کن لوگوں کا تعلق ہے - اور وہ کہاں کہاں جاتا آتا ہے -

ایاز جس مکان میں رہتا تھا - اُس کے پاس ہی اُس کی ایک کوٹھری تھی - ایاز اس کوٹھری میں ایک بار روزانہ جاتا - اس میں دس پندرہ منٹ رہ کر نہ جانے کیا کرتا - پھر باہر چلا آتا - ایاز اِس کوٹھری کو ہمیشہ تالا لگائے رکھتا تھا - اور اس میں کبھی کسی کو جانے نہیں دیتا تھا -

محمود کے درباریوں کو اس کوٹھری کا پتہ لگا - اور اُنہوں نے اس طرح اسے کوٹھری میں جاتے آتے دیکھا - تو اُنہیں یقین ہو گیا - کہ ایاز کی خُفیہ کوٹھری ہے - اور وہ ضرور اس میں چوری کی چیزیں رکھا کرتا ہے - چنانچہ اُنہوں نے محمود کے پاس جاکر خبر دی - جہاں پناہ! ایاز کی خُفیہ کوٹھری کا پتہ تو لگ گیا - اور اس میں حضور کی کھوئی ہوئی چیز ضرور موجود ہے - لیکن حضور کے بغیر ہماری ہمت نہیں پڑتی - کہ اس کوٹھری کو کھولیں - اس میں اور نہ جانے حضور کی کیا کیا چیزیں چُرا چُرا کر ایاز نے جمع کی ہیں - تکلیف تو ہو گی - لیکن ہماری درخواست ہے - کہ حضور ہی چل کر وہ کوٹھری کھلوائیں - اور ایاز کی ایمانداری کا تماشہ دیکھیں -

بادشاہ درباریوں کے ساتھ ہو لیا - ایاز اس کوٹھری میں ہی موجود تھا - آہٹ پا کر باہر نکل آیا - دیکھا تو بادشاہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ کھڑا ہے - ایاز کوٹھری کا دروازہ بند کر کے جلدی جلدی تالا بند کرنے لگا - بادشاہ نے کہا - ایاز تالا بند نہ کرو - میں کوٹھری دیکھنا چاہتا ہوں - ایاز نے ہاتھ جوڑ کر کہا - جہاں پناہ! غلام اس کے لئے معافی چاہتا ہے - غلام اس میں کسی دُوسرے کو جانے نہیں دیتا -

یہ کہہ کر ایاز تالا بند کرنا چاہتا تھا - کہ محمود نے بڑھ کر کُنجی لے لی - اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا - دیکھا کوٹھڑی بالکل صاف سُتھری ہے - صرف ایک کونے میں ایک چھوٹی سی مَیلی گٹھری پڑی ہے - محمود اس گٹھڑی کی طرف بڑھا - لیکن اس سے پہلے ایاز نے وہ گٹھری اُٹھا لی - محمود کو تو اُسی وقت شک ہو گیا تھا - جب ایاز نے کوٹھری دکھانے سے انکار کیا تھا - اب تو اسے یقین ہی ہو گیا - کہ چوری شدہ مال اسی کوٹھری میں ہے اور اسی گٹھری میں -

محمود نے کہا۔ لاؤ گٹھری مجھے دو۔

ایاز نے عرض کی ۔حضور والا گٹھری نہ مانگیں۔

محمود۔نہیں گٹھری دینی ہوگی۔ میں دیکھوں گا۔ کہ اس میں کیا ہے؟

ایاز ہاتھ جوڑنے اور گڑگڑانے لگا۔ ایک مصاحب نے ڈانٹ کر کہا۔ نالائق چوری اور سینہ زوری۔ جہاں پناہ کا ادب نہیں کرتا۔ چھوڑ دے گٹھری۔

ایاز نے گٹھری چھوڑ دی۔ مصاحب اسے کھولنے چلا۔ بادشاہ نے اسے روک کر کہا۔ میں خود کھولوں گا۔

بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے گٹھڑی کھولی۔ سب سے پہلے اس میں سے ایک نہایت پھٹی پرانی اور میلی کچیلی ٹوپی نکلی۔ بادشاہ نے اسے جھاڑ کر اور دیکھ بھال کر الگ رکھ دیا۔ اس کے بعد ایک کرتہ نکلا۔ جس کی حالت ٹوپی سے بھی بدتر تھی۔ جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے اسے بھی اچھی طرح دیکھا۔ اور کنارے رکھ دیا۔ پھر ایک پاجامہ نکلا۔ پیوند پر پیوند لگے ہوئے۔ میلا بدبودار۔ ان تین چیزوں کے سوا گٹھری میں اور کچھ بھی نہ تھا۔

محمود نے بڑی حیرانی سے ایاز کی طرف دیکھا۔ اور بولا۔ یہ کون سی ایسی چیزیں تھیں۔ جن کے دکھانے سے تمہیں انکار تھا۔

ایاز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ انہیں چیزوں میں میری اصلیت پوشیدہ تھی۔ جہاں پناہ جو آج بے پردہ ہو گئی۔

بادشاہ نے تعجب سے پوچھا کیسی اصلیت؟

ایاز نے کہا۔ جہاں پناہ! آج آپ کی عنایت و مہربانی سے مجھے تمام دنیا کی نعمتیں حاصل ہیں لیکن میری اصلیت یہی ہے۔ میں انہی کپڑوں میں آپ کے پاس آیا تھا۔ اس لئے میں نے ان کپڑوں کو چھپا کر رکھا تھا۔ اور ایک بار کوٹھری میں آکر تنہائی میں ان کو دیکھ کر اپنی اصلیت یاد کر لیا کرتا تھا۔ تاکہ مجھ میں غرور پیدا نہ ہو جائے۔ اور میں یاد رکھ سکوں کہ میں وہی غلام ہوں۔ یہ کہہ کر ایاز رونے لگا۔ محمود کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے کہا۔ ایاز! تم آج سے غلام نہیں۔ بلکہ وزیر اعظم ہو۔

ایاز یہ سن کر محمود کے قدموں پر گر پڑا۔ محمود نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا +

(عابدہ سلطان عزیز)

(منقول از اخبار پریم)

وصیّت

رائے صاحب شنکرداس کا معائنہ ختم کرکے ڈاکٹر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اور یاس آمیز لہجے میں کہا۔ "رائے صاحب! کاش میں آپ کو کوئی اچھی خبر سنانے کے قابل ہوتا۔ مگر..." وہ رُک گیا۔ اور مریض مطلب سمجھ کر بولا لیکن میں کبھی شفایاب نہیں ہوسکتا۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا؟

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور چلا گیا۔

رائے صاحب شنکرداس آرام کرسی پر بیٹھے عالم تصوّر میں گزشتہ زندگی کے واقعات دہرا رہے تھے۔ ان کے سامنے ان کی حسین بیوی کا متبسم چہرہ تھا۔ جس کے ساتھ اُنہوں نے بیس سال عیش و شادمانی میں گزارے تھے۔ اس کی ناگہانی موت سے رائے صاحب کو دھچکا سا لگا۔ اور دل کا گھاؤ تمام عمر نہ بھر سکا۔ مرحومہ کے خیال نے حزن و ملال کی شکنیں چہرے پر اور بھی نمایاں کردیں۔ پھر انہیں اپنے لڑکے کا خیال آیا۔ تصوّر میں وہ اُسے شیر خوارگی سے بچپن اور بچپن سے شباب کی رعنائیوں میں دیکھنے لگے۔ سترھویں سال اُن کا لڑکا دھرم دیو امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے گیا تھا۔ پہلے چھ ماہ تو اس کے خطوط باقاعدہ آتے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ تعداد کم اور وقفہ زیادہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ بالکل بند ہوگئے۔ آخری خط میں اس نے لکھا تھا۔ "میں ملک کے اندرونی حصّے میں بغرض سیاحت جارہا ہوں۔ اگر آپ کو میری طرف سے خط نہ ملے۔ تو گھبرائیں نہیں۔ اگر زندگی رہی۔ تو کسی دن آپ کی قدمبوسی کرونگا۔

وقت گزرتا گیا اور رائے صاحب بیٹے کی طرف سے خاموشی کے خوگر ہوگئے۔ ساوتری کچھ دنوں سے رائے صاحب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وہ ایک سرو قد۔ خوش جمال جوان سال بیوہ تھی۔ اس کا خیال آتے ہی اُن کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوتی۔ ان خیالات کے جواب میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ اور ساوتری بصد شان دلربائی کمرے میں داخل ہوئی۔ آتے ہی اُس نے رائے صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

"پیارے طبیعت کیسی ہے؟"

"کچھ اچھی نہیں۔ میں اب شفایاب نہیں ہوسکتا۔ آہ کیسے خیال تھا۔ کہ گھوڑے سے گرنے کا یہ انجام ہوگا۔ اتنی خفیف سی چوٹ کا یہ نتیجہ۔ اب میں ہمیشہ صاحب فراش رہونگا۔ ہر اک ضرورت زندگی کے لئے غیر کا محتاج۔ ایشورا! یہ واقعی ناقابل برداشت ہے۔"

"ہیں ہیں! پیارے۔ رنج و غم سے صورت حالات بہتر تو نہیں ہوسکتی۔ ایشور کی مرضی بسر و چشم۔ آپ کے کئی دوست آپ کی خدمت کے لئے تیار ہیں۔"

"میں اب یہاں سے کسی پُرسکون مقام پر جاکر ایک خادمہ رکھ لونگا۔ اور باقی ایام زندگی وہیں گزار دونگا"

"خادمہ؟ ہرگز نہیں۔ سنئے۔ آپ سے مجھے جو محبت ہے۔ وہ آپ سے مخفی نہیں۔ میں ہر وقت آپ کی خدمت کو حاضر ہوں۔ مگر جب تک شادی نہ ہوجائے۔ اکٹھا رہنا سماج کے اصولوں کے خلاف ہے۔ رسوائی کا باعث۔

رائے صاحب نے فرط استعجاب سے ساوتری کی طرف دیکھا۔ اُنہیں یہ الفاظ سُننے کی توقع نہ تھی۔

"شادی؟"

"ہاں ہاں شادی۔ اس صورت میں ہزار خادماؤں سے بہتر میں خدمت کرسکوں گی۔"

بات طے ہوگئی۔ دو ہفتے کے اندر اندر شادی ہوگئی۔ اور وہ ساحل سمندر پر امن چین سے زندگی بسر کرنے لگے۔

دس سال بیت گئے۔ رائے صاحب شادی کرکے پشیمان نہ تھے۔ ساوتری بلاوجہ رائے صاحب کے معاملات میں مداخلت نہ کرتی تھی۔ مگر رائے صاحب کو

اس بات کا احساس ضرور تھا۔ کہ پہلے کی طرح ساوتری اب اُن کا خیال نہ رکھتی تھی۔ گو بظاہر شکایت کا بھی موقع نہ دیتی۔ وہ وکیل تھے۔ اب قانونی کتب میں اُن کا انہماک روز افزوں ہوتا گیا۔ بیٹے کی طرف سے کوئی خبر نہ ملی۔ مگر کبھی کبھار اتنا سُن لیتے۔ کہ وہ بقید حیات ہے۔ ساوتری انہیں دھرم ویر کی طرف سے بدظن کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتی۔

"آج کل کے نوجوان لڑکے والدین کی پروا کب کرتے ہیں خون کتنا سفید ہوگیا ہے۔ باپ دُوسروں کی مدد کا محتاج۔ اور بیٹے سے اتنا بھی نہ ہوسکا۔ کہ خیریت ہی دریافت کرلیتا۔ ناشکرا کہیں کا۔"

مگر رائے صاحب یہ کہہ کر ٹال دیتے "اس بیچارے کو کیا خبر میں کس حال میں ہوں۔ وہ کسی نہ کسی دن آ ہی جائیگا۔ پھر تمہیں معلوم ہوجائیگا۔ کہ وہ کتنا سعادت مند ہے۔"

یہ جواب سُن کر ساوتری ناک بھوں چڑھا کر خاموش ہوجاتی۔

(۲)

دو سال اور گزر گئے۔ رائے صاحب دن بدن نحیف ہوتے گئے۔ ایک دن ساوتری سے کہنے لگے۔

"میری حالت ابتر ہوتی جارہی ہے۔ بہتر ہے میں اپنے معاملات ٹھیک کرلوں۔"

ساوتری کا چہرہ کسی خیال سے چمک اُٹھا۔ مگر بظاہر متانت سے کہنے لگی۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایشور آپ کو میرے سر پر سو سال تک سلامت رکھے۔"

"میں جانتا ہوں ساوتری تو مجھ سے بیحد محبت کرتی ہے مجھ جیسے اپاہج کی بارہ سال تک خدمت کرنا تجھ جیسی دیوی ہی کا کام تھا۔ بہتر یہی ہے۔ کہ میں اپنی وصیت مرتب کر رکھوں۔ نہ جانے کل کیا ہوجائے۔"

ساوتری خاموش رہی۔ مگر رائے صاحب تو یہ پتہ لگانا چاہتے تھے۔ کہ اس گفتگو کا ساوتری پر کیا اثر ہوتا ہے۔ کچھ وقفے کے بعد وہ پھر کہنے لگے۔ "میرا خیال ہے۔ کہ میں اپنی جائداد دھرم ویر اور تمہیں بانٹ دُوں۔" اور کنکھیوں سے بیوی کے چہرے پر غیظ و غضب کی سُرخی کو بھانپ گئے۔ ساوتری کو جوش آگیا۔

"آدھی جائداد اس ناخلف کے لئے؟ خبطی تو نہیں ہوگئے۔ خدمت کروں میں اور جائداد میں شریک ہو وہ۔ جسے آپ کی ذرا بھی پروا نہیں۔"

"خفا ہونے کی بات نہیں۔ میں نے تو یونہی بات کی ہے۔ اگر تم ناراض ہو تو نہ سہی۔"

"بہتر ہے کہ آئندہ اس کا نام بھی میرے سامنے نہ لیا جائے"

"بہت اچھا۔ تو کل میں وصیت تیار کرالونگا۔"

(۳)

رائے صاحب مکان پر تنہا تھے۔ ساوتری کچھ خرید کرنے بازار گئی ہوئی تھی۔ رائے صاحب کے پاس ہی ایک صندوقچی رکھی تھی۔ اُنہوں نے ایک تہ شدہ کاغذ جیب میں رکھ لیا۔ اور ایک پُرفریب تبسم اُن کے لبوں پر نمودار ہُوا۔ ایک اور کاغذ لے کر اس پر لکھنا شروع کیا۔ بمشکل تحریر ختم ہوئی تھی۔ کہ ساوتری واپس آگئی۔ رائے صاحب نے بغیر نگاہ اُٹھائے کہا۔ "تقریباً مکمل ہوچکی ہے۔"

ساوتری نے تمام اشیا میز پر رکھ دیں۔ اور خاوند کے پاس جا بیٹھی۔ تحریر ختم کرکے اُنہوں نے اس کے ہاتھ میں دے دی۔ ساوتری نے اسے حرف بحرف پڑھ کر اپنا اطمینان کرلیا۔ رائے صاحب بولے "گواہوں کی بھی تو ضرورت ہوگی۔ کیا تم نے کسی کو آنے کے لئے کہا ہے۔"

"نہیں تو۔ مجھے تو خیال تک نہیں رہا۔ لیکن میں ابھی اس کا انتظام کئے لیتی ہوں۔"

"ایک گواہ تو تم ہوجاؤگی۔ اور ...."

"اجی میں کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں۔ مجھے بھی قانون سے تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ اگر میں بطور گواہ وصیت پر دستخط کردوں۔ تو کل کو دعویدار نہیں بن سکتی۔"

"تم تو قانون میں ماہر معلوم ہوتی ہو۔"

"اچھا تو گواہ لاؤں۔" یہ کہہ کر وہ جانے ہی کو تھی۔ کہ رائے صاحب نے وہ دستاویز اُٹھا کر علیٰ اسی طرح تہ کر دی۔ جیسی کہ پہلی جیب میں ڈالی تھی۔ اور کہنے لگے۔ "گواہوں کو یہ پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ جتنا کم اُنہیں میرے خانگی امور

کا علم ہو۔ اُتنا ہی بہتر ہے۔"

"بے شک۔ آپ خدانخواستہ اچانک مرجائیں۔ تو میرے لئے مشکل پڑ جائیگی۔"

یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ رائے صاحب اس طوطا چشمی کے خیال سے لرز گئے۔ جب باہر کا دروازہ بند ہوگیا۔

...وہ مسکرائے۔ اُنہوں نے وہ دستاویز آتشدان میں پھینک دی۔ اور چمٹے سے راکھ ادھر اُدھر بکھیر دی۔ مسکراتے ہوئے دُوسری دستاویز جیب سے نکال کر میز پر رکھ دی۔ چند لمحوں میں ساوتری دو اجنبیوں کو لے کر واپس آگئی۔ رائے صاحب کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ اگر ساوتری کی نظر دستاویز پر پڑ گئی تو؟ مگر ساوتری مطمئن تھی۔ گواہوں کے دستخط ثبت ہو گئے۔ اور وہ رُخصت ہو گئے۔ رائے صاحب نے دستاویز تہ کر کے ایک بڑے لفافے میں ڈال کر لفافہ بند کر دیا۔ بیوی کی واپسی پر اُس نے تھوڑی سی لاکھ مانگی۔ اور لفافہ پر اپنی مُہر لگا دی۔

"لو پیاری۔ اب تو خوش ہو۔"

ساوتری نے بغیر جواب دیئے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور اسے میز کے دراز میں رکھ کر چابی اپنے گچھے میں ڈال لی۔ رائے صاحب نے کہا۔ "جب میں مر جاؤں۔ یہ میرے وکیل کو دے دینا۔"

"آپ تسلی رکھیں۔ ایسا ہی کرونگی۔" ساوتری نے مُسکرا کر جواب دیا۔ اور باہر چلی گئی۔

(۴)

باہر آندھی سیٹیاں بجا رہی تھی۔ درخت ٹوٹ رہے تھے۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے کھڑکیوں کے شیشوں پر گر کر شورِ محشر برپا کر رہے تھے۔ بالائی منزل میں رائے صاحب کی لاش پڑی تھی۔ مگر اُس کے لبوں پر ابھی تک وہی عیارانہ مسکراہٹ تھی۔ ساوتری پاس بیٹھی صبح ہونے کی منتظر تھی۔ ان کا داہ کرم سنسکار ہو جائے۔ تو پھر رائے صاحب کی تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ کی وہ بلا شرکت غیرے مالکہ تھی۔ آئندہ زندگی کے مسرت خیز تصور سے اُس کی آنکھوں میں مستی آگئی۔ وہ فطرتاً سیر و سیاحت کی شوقین تھی۔ مگر تنگ دستی کی وجہ سے تکمیل شوق سے قاصر تھی۔ اب خدا نے یہ حسرت نکالنے کا موقع بھی دیا۔

رائے صاحب اتنی دیر زندہ رہیں گے۔ اس کا اسے سان گمان بھی نہ تھا۔ بہار کے دن تو یونہی گزر گئے۔ مگر خیر۔ اب وہ دُنیا کا گوشہ گوشہ دیکھ سکیگی۔ ریل گاڑی۔ موٹر کار۔ جہاز اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہر اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ مزید تسلی کے لئے اُس نے میز کا دراز کھول کر دستاویز نکالی۔ اور سینے سے لگا کر بولی۔ "میری۔ میری۔ سب دولت میری ہے۔"

دروازے پر کسی نے دستک دی۔ کھولا تو ہمسائی تھی۔

"بہن ساوتری! تم نے دن بھر کچھ نہیں کھایا۔ چائے بنا دوں؟"

ساوتری نے چہرہ کو غمگین بنا کر کہا۔ "بہن کھانا پینا جیتے جی چھوٹ سکتا ہے۔ آہ رائے صاحب مجھے کس پر چھوڑ کر سدھارے" اور ٹپ ٹپ آنسو اُس کے رخساروں پر گرنے لگے۔

سچ ہے۔ عورتوں کے آنسو ہمیشہ اُن کی پلکوں پر ہوتے ہیں۔

"صبر بہن صبر۔ اس کے سوائے اب چارہ ہی کیا ہے۔ ایشور سب کا نگہبان ہے۔"

صبح رائے صاحب کی مٹی ٹھکانے لگ گئی۔

جب وکیل اُسے ملنے کے لئے آیا۔ تو ساوتری کا دل دھڑک رہا تھا۔ وکیل نے آتے ہی وصیت کا ذکر چھیڑ دیا۔

"مرحوم کی مصدقہ وصیت تو آپ کے پاس ہو گی؟"

"جی ہاں" کہہ کر ساوتری نے لفافہ وکیل کے ہاتھ میں دے دیا۔

وکیل نے لفافہ کھول کر وصیت پڑھی۔ اور کہنے لگا۔

"ہاں تو یہ لڑکا ہے کہاں؟"

ساوتری اُچھل پڑی۔ "لڑکا [illegible]سا؟"

"دھرم دیو"

"مگر آپ یہ سوال کیوں پوچھتے ہیں؟ اس کا اس وصیت

کے ساتھ کیا تعلق ؟ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اس کی زبان تالو سے چمٹ گئی ہے۔ نامعلوم خوف اس پر طاری ہو گیا۔ اس کی اُمیدوں کی دُنیا اُجڑتی نظر آنے لگی ؛

وکیل نے جواب دیا۔ "کیونکہ آپ کے مرحوم شوہر نے سوائے پانسو روپے کے باقی تمام جائداد اُسی کے نام لکھی ہے"

ساوتری چکرا گئی۔ اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ رائے صاحب کی رُوح سرہانے کھڑی مسکرا رہی تھی ؛

اُلفت وزیر آبادی

تنقید و تبصرہ

طلسمِ حیات ۔ مجلد۔ صفحات ۲۴۴۔ قیمت ۲ روپے۔ سائز ۲۰×۲۶/۱۶۔ کتابت۔ طباعت اور کاغذ عمدہ مصنف ماہر القادری۔ ملنے کا پتہ۔ ملک دین محمد اینڈ سنز۔ بل روڈ لاہور

جناب ماہر القادری ہماری زبان کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ اُن کا شمار ہندوستان کے بہترین غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ گمان ہمیں بھول کر بھی نہ ہوا تھا۔ کہ وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ان کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اور اس کے مطالعہ کے بعد ہم پر یہ انکشاف ہوا ہے۔ کہ ادب کی اس صنف میں بھی ماہر القادری صاحب کا مرتبہ ممتاز ہے۔ تمام کے تمام افسانے دلچسپ ہیں اور اس قدر دلچسپ کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ ان افسانوں کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے۔ کہ یہ رسوائے عالم شبابیات سے پاک ہیں۔ اور ہمارے موجودہ ماحول کی ترجمانی اور عکاسی کرتے ہیں۔ اُمید کی جانی چاہئے۔ کہ انہیں خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہو گی۔ اور مصنف کو اپنی کوشش اور قابلیت کی داد ملیگی۔ پبلشروں نے بھی اس کتاب کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ البتہ ان سے ہمیں ایک شکوہ ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ کتاب کا ٹائیٹل بازاری قسم کا ہے۔ اور ایک ادبی تصنیف کے لئے بالکل ناموزوں ؛

نُورِ مشرق ۔ مجلد۔ صفحات ۱۳۶۔ کتابت اور طباعت قیمت ایک روپیہ۔ مصنف ضیا فتح آبادی ایم۔ اے۔ ملنے کا پتہ:۔ گجندر لال سوتی کٹرہ کرانا پھاٹک حبش خاں۔ دہلی۔

مسٹر ضیا فتح آبادی ہماری زبان کے نوجوان شاعر ہیں۔ اور ان کی اکثر نظمیں جذبات انگیز اور خیال آفرین ہوتی ہیں۔ البتہ پختگی ابھی ان کے کلام میں نہیں آئی۔ اُمید کی جانی چاہیے۔ کہ مشق کے ساتھ یہ چیز بھی پیدا ہو جائیگی۔ اور ضیا صاحب اُردو زبان کے ایک بلند پایہ شاعر ثابت ہونگے۔ کتاب کے آغاز میں حضرات جوش ملیح آبادی آزاد انصاری اور صدیقی کے تعارف بھی شامل ہیں ؛

ہٹلرِ اعظم ۔ صفحات ۳۸۶۔ متعدد تصاویر۔ قیمت مجلد تین روپے۔ غیر مجلد اڑھائی روپے۔ مصنف پروفیسر چندر شیکھر شاستری۔ ملنے کا پتہ:۔ سیاسی لٹریچر کمپنی نمبر ۸۱ مسجد کھجور دہلی۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ ہٹلر کی زندگی کے متعلق ہے اور اس کی حمایت میں لکھی گئی ہے۔ مصنف ہٹلر کے بہت حامی ہیں۔ اور یہ حمایت اس لئے ہے۔ کہ ان کے نزدیک وہ بھی آریہ ہے ۔ جرمنوں کی کامیابی کے خاص وجوہات ان کے نزدیک یہ ہیں۔ کہ ملک جرمنی میں سنسکرت کا پرچار زوروں پر ہے اور لوگ ویدوں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ وید چونکہ سائنس کا مخزن ہیں۔ اس لئے جرمن قوم علوم سائنس میں سب سے زیادہ ماہر ہے ؛

بہر حال اس قسم کی خوش فہمیوں کے علاوہ کتاب دلچسپ بھی ہے۔ اور مفید بھی۔ اور کافی محنت سے لکھی گئی ہے ؛

گوپال متل

بزمِ انتخاب

کمال اتاترک کا ایک دلچسپ واقعہ

کمال اتاترک جب نوجوان تھے اور سالونیکا میں رہتے تھے۔ تو سلطان عبدالحمید کے خلاف اپنے ساتھی دوسرے فوجی افسروں سے سازش کیا کرتے تھے۔ کمال انقلابی تھے۔ اور سلطان کے ظلم و استبداد کا اُسے معزول کر کے خاتمہ کر دینا چاہتے تھے۔

لیکن کمال کی والدہ زبیدہ خانم پُرانے خیال کی خاتون تھیں اور سلطان کو صرف خلیفہ ہی نہیں بلکہ خدا رسیدہ اور بہت بڑا ولی اللہ یقین کرتی تھیں۔ اُن کا وہم اس قدر بڑھا ہوُا تھا۔ کہ سلطان میں سات دلیوں کی طاقت جمع سمجھتی تھیں۔ اُن کا ایمان تھا۔ کہ سلطان کا محافظ خدا ہے۔ اور سلطان کے خلاف کچھ کہنا بلکہ سوچنا بھی عذاب خداوندی میں گرفتار ہو جانے کا موجب ہے!

ایک دن گھر ہی میں کمال کے دوست جمع تھے۔ اور سلطان کے خلاف مشورے کر رہے تھے۔ زبیدہ خانم نے بھنک سُن لی۔ تو دُوسرے کمرے میں جا کر دروازے پر کان رکھ دیا۔ خاتون یہ سُن کر کانپ اُٹھی۔ کہ اس کا اکلوتا بیٹا خلیفہ کے خلاف باتیں کر رہا ہے!

جب لوگ چلے گئے۔ تو اس نے کمال کو الگ بلایا۔ اور رو رو کر منتیں کرنا شروع کیں۔ کہ خلیفہ کے خلاف کبھی کچھ نہ کہے۔ اور جتنی باتیں اب تک کر چکا ہے۔ اُن سے توبہ کرے۔ خاتون کو حق الیقین تھا۔ کہ فرشتے خلیفہ کو سب خبریں پہنچا دیں گے۔ اور خلیفہ اس کے بیٹے کو پھانسی دے دیگا!

مصطفےٰ کمال نے ماں کو لاکھ لاکھ سمجھایا۔ کہ تمہارے خیالات اور اندیشے محض بے بنیاد ہیں۔ اور یہ کہ سلطان عبدالحمید میں نہ کوئی کرامت ہے۔ نہ قوت۔ بلکہ سلطان ظالم اور عیاش ہے۔ اس لئے خدا اس سے ناخوش ہے۔ سادہ لوح زبیدہ نے ایک بات بھی نہ مانی۔ کیونکہ وہ اپنے لڑکے کو بالکل بے سمجھ اور اَلّڑھ یقین کرتی تھی ✦

خاتون کی یہ مخالفت و تکرار برابر جاری رہی۔ یہاں تک کہ سلطان عبدالحمید معزول ہو گیا۔ مگر خاتون مدتوں اس معزولی کی خبر بھی ماننے سے انکار کرتی رہی۔ وہ اب بھی ڈرتی تھی۔ کہ کہیں خلیفہ کا یا خدا کا قہر اس کے اکلوتے بیٹے پر نازل نہ ہو جائے ✦

زبیدہ خانم جب تک زندہ رہی۔ مصطفےٰ کمال کو ننھا سا بچہ ہی سمجھتی رہی۔ گیلی پولی کی ہولناک جنگ میں جب مصطفےٰ کمال کو "پاشا" کا خطاب ملا۔ اور لوگوں نے زبیدہ کو مبارک باد دی۔ تو حیرت زدہ تھی۔ کہ مصطفےٰ جیسے ناسمجھ لڑکے نے اتنی بڑی جنگی فتح اور اتنا بڑا اعزاز کیسے حاصل کر لیا؟ وہ لوگوں سے کہتی تھی۔ کہ میرا مصطفےٰ تو اتنا ناسمجھ ہے کہ اپنے کپڑے بھی ٹھیک نہیں رکھ سکتا۔ لہذا وہ اپنے لڑکے کی ان ترقیوں کا حال سُن کر حیرت میں ڈوب ڈوب جایا کرتی!

مصطفےٰ کمال نے جب انگورہ میں قیام شروع کیا۔ اور جنگ آزادی جاری کی۔ تو زبیدہ خانم بھی انگورہ ہی میں چلی آئی تھی۔ اور اپنے لڑکے کے گھر کا انتظام کیا کرتی تھی۔ اب وہ بہت بوڑھی ہو چکی تھی۔ اور اُس کی توہم پرستیاں پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی تھیں ✦

اب بھی وہ متعجب رہتی تھی۔ کہ آخر لوگ مصطفےٰ کو اس قدر سراہتے کیوں ہیں؟ اُس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ کہ اس کا لڑکا بڑا آدمی ہو گیا ہے۔ وہ اب بھی اپنے مصطفےٰ کو "نصیحت" کیا کرتی تھی۔ اب بھی اُس کی "حرکتوں" پر خفا ہوتی تھی۔ لوگوں سے کہا کرتی تھی۔ مصطفےٰ بڑا ہی شریر اور ضدی لڑکا ہے۔ ذرا اس کا خیال رکھا کرو۔ ایسا نہ ہو کسی سے لڑ پڑے!

جنگ کا ہولناک زمانہ تھا۔ مصطفےٰ کمال روز علی الصباح گھر سے نکل جاتے تھے۔ زبیدہ اُٹھتی تو بیٹے کے کمرے کو خالی پاتی تھی۔ مصطفےٰ کمال اس زمانے میں اس قدر مشغول تھے۔ کہ تن بدن کا بھی ہوش نہ رکھتے تھے۔ کمروں میں ہزاروں جلے ہوئے سگرٹ پڑے ہوتے تھے۔ اُجلے اور میلے کپڑوں کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔ سب چیزیں وہ ادھر

میں اُلٹ پلٹ ڈالتے تھے۔ صبح کو زبیدہ کمرے میں آکر کھڑی ہوتی۔ اُس کے مُنہ سے آہ نکل جاتی۔ اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ہاتھ اُٹھا کر خدا سے دعا کرتی۔ کہ اُس کے بیٹے کو "سمجھ" دے۔ اور تمام آفتوں سے بچائے رکھے!

جب مصطفےٰ کمال نے یونانیوں کا قلع قمع کر ڈالا۔ اور ترکی حکومت کے صدر مقرر ہوئے، تو اس موقع پر بھی زبیدہ کی عجیب حالت تھی۔ وہ حیرت سے ایک ایک سے پوچھتی تھی۔ کہ آخر یہ کیا ہوا ہے؟ آخر میرے مصطفےٰ کے لئے یہ دھوم دھام کیوں ہے؟ وہ برابر اسی وہم میں چلی آتی تھی۔ کہ استنبول میں سلطان وخلیفہ موجود ہے۔ اور اُسی کی طرف سے مصطفےٰ کا یہ تمام اعزاز و اکرام ہو رہا ہے۔ لوگ جب اُس کے اس خیال کی تردید کرتے تھے۔ تو وہ خفا ہو جاتی تھی۔ کیونکہ سمجھتی تھی۔ لوگ اُسے بنا رہے ہیں!

مؤرخوں کا خیال ہے۔ کہ زبیدہ آخر وقت تک اپنے لڑکے کی اصلی پوزیشن سمجھ نہ سکی۔ بلکہ اُسے ہمیشہ شریر اور ضدی لڑکا ہی یقین کرتی رہی ٭

کمال کے تمام مؤرخوں کا بیان ہے۔ کہ صرف ایک ہی موقع پر کمال کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھے گئے۔ یہ موقع زبیدہ کی موت کا حادثہ تھا۔ کمال نے دُنیا بھر میں صرف ایک ہی انسان سے محبت کی تھی۔ اور وہ زبیدہ تھی۔ خود کمال نے اعتراف کیا ہے۔ کہ اُن کی ماں ان سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ اور یہ کہ اپنی ماں کی تربیت سے انہیں بہت فائدہ پہنچا۔ اگرچہ وہ قدامت پرست خاتون تھیں ٭

(ہند۔ کلکتہ)

اقبال اور مزدور

سرمایہ دار اور مزدور کے الفاظ ممکن ہے تخیلات حالیہ کی پیداوار ہوں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے۔ کہ امیر و غریب کا طبقہ تمدن کے ہر دور میں رہا ہے۔ اور رہے گا۔ مرور زمانہ سے ان دونو طبقوں میں ایک کی تن آسانی اور دوسرے کی جانفشانی یا ایک کی بالا دستی اور دوسرے کی زیردستی سے تفریق و امتیاز کی خلیج حائل اور وسیع ہوتی چلی گئی۔ اس خرابی کو دُنیا کے ریفارمرز اور مصلحین کی نظر نے محسوس تو کیا۔ اور دُنیا کی اس طرف توجہ بھی دلائی۔ مگر اس کا ثبوت دستیاب نہیں ہوا۔ کہ اسلام سے پہلے کسی مذہب یا تمدن نے عملی نقطۂ نظر سے اس پر غور کیا ہو ٭

اسلام نے اس ضروری الاصلاح امر کو ابتدا ہی میں محسوس کر لیا۔ اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی سعی جمیل بروئے کار آنے لگی۔ یہ تو ناممکن تھا۔ اور ہے۔ کہ تمام دنیا کی اقتصادی حالت ایک سطح پر کر دی جائے۔ لیکن تفریق و تفاوت باہمی کی اس وسیع خلیج کو بہت کچھ تنگ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مال و اسباب کے متعلق اسلام نے جتنے اصول وضع کئے۔ اُن میں دو پہلو خاص طور پر ملحوظ رکھے۔ (۱) ایک تو یہ کہ تمول یا سرمایہ دار اپنے تمول و سرمایہ سے صرف خود ہی متمتع اور جالب منفعت نہ ہو۔ بلکہ قوم کے ضعیف الحال اور پسماندہ و غریب افراد کو بھی نفع پہنچائے۔ وہ اپنی سرمایہ داری کے نشے میں بے سرمایہ اور زبوں حال بنی نوع انسان کو نہ بھول جائے۔ ان کو ذلت کی نظر سے نہ دیکھے (۲) دوسرے یہ کہ اپنی طاقت سرمایہ سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر کمزوروں کو نہ دبایا جائے۔ اُن سے مُحنت۔ یا زبردستی اور طاقت سے زیادہ کام نہ لے۔ مناسب حق المحنت اور واجبی اُجرت میں کمی نہ کرے۔ ایک مسلم سرمایہ دار کو اسلام ان اصول کی تعلیم دیتا اور ان کی پابندی کو لازمی ٹھہراتا ہے۔

قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں والدین، اعزہ و اقارب، اولاد و افراد خاندان کے ساتھ ساتھ ہمسایوں۔ غلاموں۔ محلہ داروں۔ شہر والوں۔ غریبوں، محتاجوں۔ بیماروں۔ مسافروں۔ قیدیوں۔ یتیموں اور بیواؤں کی پوری امداد و خبرگیری کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ ہم مُشتے نمونہ از خروارے چند مختصر آیات پیش کریں گے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) وآتوھم من مال اللہ الذی اتاکم۔ خدا کے دئے ہوئے مال میں سے ان کو بھی دو ٭

(۲) انفقوا من طیبٰت ماکسبتم۔ اپنی حاصل کی ہوئی عمدہ چیزیں (راہ خدا میں) خرچ کیا کرو۔

(۳) ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتٰمی والمسٰکین وابن السبیل الخ۔ والدین و اقربین۔ یتامی و مساکین اور مسافرین وغیرہ پر اپنا مال خرچ کرو۔ الخ

دُنیوی معیشت کے مدارج کا اختلاف فطری اور نیچرل ہے۔ اسی لئے اسلام نے بھی اس کو برقرار رکھا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیٰوۃ الدنیا ورفعنا

بعضھم فوق بعض درجٰت لیتخذ بعضھم بعضاً سخریا

بنی نوع انسان کی زندگی کی روزی کو ہم نے تقسیم کیا ہے۔ ہم ہی نے بعض کو بعض پر رفعت و فوقیت کے مدارج دے رکھے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔ الخ

یہ آیت بہت لمبی ہے۔ اس میں سب انسانوں کی حالت یکساں نہ رہنے کی حکمت بیان کرنے کے بعد متمول اور سرمایہ داروں کو نصیحت کی گئی ہے۔ کہ دُنیوی ساز و سامان، زندگی کی چند روزہ کامرانی ہے۔ آخرت کی بہبودی و فلاح خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لئے ہے۔ اس لئے اگر تم کو بلند مدارج حاصل ہو جائیں۔ تو مغرور و ظالم نہ ہو جانا۔ اور اپنے سے نیچے درجے کے لوگوں کو حقیر و کمزور یا اپنا دست نگر سمجھ کر اُن پر زیادتی یا حق تلفی نہ کرنا۔

ایک دُوسری جگہ غیر سرمایہ دار کو سرمایہ داری کی ہوس اور متمول پر حسد کرنے سے ممانعت فرما کر آئندہ بتایا گیا ہے۔ کہ یہ تفریق مدارج پیدائشی نہیں ہیں۔ تم بھی اپنی سعی بازو سے تمول حاصل کر سکتے ہو۔ حسرت و افسوس اور حسد کی ضرورت نہیں۔ اس تفاوت مدارج سے اُس کی آزمائش مقصود ہے۔ کہ عطیات قدرت کے ذریعے امور خیر میں کون سابقت کرتا ہے۔

اسلام نے مال و دولت کو اعزاز و اکرام کی بنیاد قرار نہیں دیا۔ معیار فضیلت صرف تقویٰ ہے غرض امداد باہمی اور مساوات کے وہی اصول فطری ثابت ہوتے ہیں۔ جو اسلام نے بتائے ہیں۔ ان اصول کا پابند سرمایہ دار یقیناً ایک رحمت ہے۔ نہ موجب زحمت۔ افسوس ہے کہ اس موقع پر تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس لئے مختصراً مزدور اور اس کی مزدوری کے متعلق چند آیات کے ارشادات سُن لیجئے۔

لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔ تم آپس میں ایک دُوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔

اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم اوزنوھم یخسرون۔ ناپ تول میں (یا مبادلہ و معاوضہ میں) کمی کرنے والوں کے لئے بڑی خرابی ہے۔ تم کو ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیئے۔ کہ خود تو پُورا پورا لو۔ اور دوسروں کو کم دو۔

ان دونو آیتوں میں ضمناً مزدور کا حق محنت و اُجرت بھی شامل ہے۔ اگر مزدور کی اُجرت نہ دی گئی۔ یا کم دی گئی۔ تو گویا اس کا مال ناجائز طریق پر کھایا گیا۔ اسی طرح ناپ تول کے اصول میں معاوضہ بالمثل کی تمام فروعات آجاتی ہیں۔ مزدور سے محنت تو پوری لینا اور معاوضہ کم دینا خُسرو ان مبین کا موجب ہے۔

پیغمبر اسلام علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ کہ مزدور کو اُس کی پُوری پُوری مزدوری اُس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے پہلے دے دو۔

اسی اسلامی تعلیم کی بنا پر اسلام کے قرون اعلیٰ میں شاید ہی کوئی مثال مل سکے گی۔ کہ ایک شخص اپنے جسم و دماغ سے کام لئے بغیر محض دوسروں کی محنت و مزدوری سے فائدہ اُٹھا کر امیر بن گیا ہو۔ آپ اسلام کے اس دور کی تاریخ پڑھ جایئے۔ جو لوگ آپ کو متمول یا سرمایہ دار نظر آئیں گے۔ اُن کی تاریخ ترقی و تمول جسمانی و دماغی محنتوں۔ دست و پا کی عملی حرکتوں اور صحیح و جائز جد و جہد کے کارناموں سے معمور نظر آئے گی۔ البتہ مرور ایام اور مسلمانوں پر غیر اقوام کے اختلاط سے بعد کے لوگوں نے اس چیز کو ایک حد تک نظر انداز کر دیا۔ یہاں تک کہ دُنیا کی سرمایہ داری و مزدوری نے وہ رنگ اختیار کر لیا۔ جو موجودہ دور میں ہر جگہ پر مسلط ہے +

علامہ اقبال نے اس غیر اسلامی سرمایہ داری کی تباہ کاریوں کو پوری طرح محسوس کیا۔ اور اس کی اصلاح و مخالفت کا بیڑا اُٹھایا۔ وہ ایسے سرمایہ داروں سے سخت بیزار ہیں۔ جو مزدوروں کے جائز و واجب حقوق کی نگہداشت اور ان کے مصائب و مشکلات کی پروا نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ اُن کے مخالف اور مزدوروں کے حامی ہو گئے۔ اُنہوں نے اندازہ کیا۔ کہ سرمایہ پرستوں کی سخت گیری و غیر منصفی کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی۔ جب تک افسردہ دل اور خائف و پست خیال مزدوروں میں اپنی ذلّت و مصیبت کا احساس کامل پیدا نہ ہوگا۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک درد بھری آواز بلند کی اور طبقہ مزدوری کی بیداری کے لئے پہلا صُور پھُونکا ؎

ابکہ کچھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل دولت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

ان اشعار میں حیلہ گر اور چالاک سرمایہ دار کے غرور و نخوت کا نقشہ کھینچ کر مزدور کے خوابیدہ احساس کو بیدار کیا ہے - ایک موقع پر آگسٹس کے نظریۂ تقسیم کار کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں -

یکے کار زما یکے کار ساز   نیابد ز محمود کار ایاز

(کلیم)

"مرزا غالب اور ہمہ اوست"

جہانِ رنگ و بُو، کائنات کا شہود و حصار، دوشیزہ صبح کا فردوسی تبسم، سورج کا خندۂ زرنگار، شفقستانِ مغرب کا میکدۂ رنگین، لیلیٰ شب کی بزم حسین، بہار اور بہار کی رعنائیاں، خزاں اور خزاں کی غارت سامانیاں، شامِ کسارِ جنت فریب وادیاں، چشم میگوں، زلف شبگوں —— تعینات اور تعینات کی ساری ہنگامہ آرائیاں محض فریب نظر ہیں - موجود بالذات اگر کوئی شے ہے تو حسن ازل مسبب الاسباب یا خدا ہے —— یہ ہے ہندی "مایا" یا یونانی Pantheism یا صوفیائے اسلام کا وحدت الوجود یا ہمہ اوست -

وحدت الوجود یا ہمہ اوست کو اگرچہ اسلامی معتقدات سے دُور کا بھی سروکار نہیں - لیکن اُپنشدوں اور دیو مانی اشلوکوں کا فلسفہ قلندری نہ صرف دامنِ ہمالہ اور وادیٔ گنگ سے ٹکرایا - بلکہ ایکس ریس جیسے علمائے یونان بھی انہیں سُروں پر Pantheism کے نغمے الاپتے رہے - مایا کے وجدانی نغمے ہندوستان سے باہر یونانی درسگاہوں اور ایرانی مرغزاروں میں بھی گونجے -

جب فاران کی چوٹی پر چمکنے والے سُورج کی چمک نے کاخِ کسریٰ اور قصرِ ہرقل جگمگا دیا - تو عربی اور ایرانی تمدن کے انصال و امتزاج سے اسلامی اخلاقیات و تسلّف میں نئی نئی شاہراہیں نکلیں تصوف اِسی انقلاب و امتزاج کا نتیجہ ہے - تصوف کے وجدانیات نہ صرف خانقاہوں کی ہا و ہُو میں جذب ہو گئے - بلکہ فارسی شاعری کی جان بن گئے - ہندی مایا یا یونانی Pantheism اور نظریوں کے ساتھ ساتھ وحدت الوجود کی شکل میں اسلامی تصوف رُونما ہوا - ریگزارِ عرب کی فطری جذبات والی دُنیا رکنابادی فضاؤں میں کھو گئی - ابن رشیق اور قدامہ کے سیدھے سادے حسن و عشق کے تخیلات فلسفی اور متصوفانہ گتھیاں بن کر رہ گئے -

اُردو شاعری بھی جسے اگر ایک طرف ہندی ماں نے جنا - تو دوسری طرف ایرانی دایہ نے دُودھ پلایا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی - اردو شاعری کے ہر دور میں تصوف کا عنصر ہمہ اوست بہت نمایاں رہا - فارسی شاعری جب اپنی نشاۃ ثانیہ کے لباس اُردو میں جلوہ گر ہوئی - تو جہاں محمد شاہ رنگیلے اور جان عالم کی محفلیں اس کے قہقہوں سے گونج اُٹھیں - وہاں خاک نشینوں کی کٹیوں سے سرمستی و بیخودی کے نغمے بھی پھوٹ نکلے -

آج کی صحبت میں نفس مسئلہ وحدت الوجود پر کسی طرح کی تنقیدی روشنی ڈالنی مقصود نہیں - بلکہ جہاں تک سمع خراشی کی گئی - وہ بطور تمہید ہے - انشاء اللہ آئندہ اس موضوع پر اپنے فرسودہ خیالات پیش کرنے کی کوشش کرونگا -

سرزمین تاج کو جہاں قدرت نے نبوت شاعری کا تاج بخشا - وہاں فلسفہ اور تصوف کے وہ رنگین پھول اُگائے - جو ابد بہار چمن بن کر سارے ہندوستان پر چھا گئے - آج کی صحبت میں اکبر آباد کے دوسرے پیغمبر سخن مرزا غالب کے متصوفانہ اشعار پر جو وحدت الوجود سے متعلق ہیں - روشنی ڈالنے کی جرأت کر رہا ہوں - آیئے مرزا کے اشعار پڑھئے - ہر شعر ایک ملکوتی نغمہ اور ایک فردوسی زمزمہ ہے - جس کے ارتعاشس سے کائنات رُوح نغمہ زار بن جاتی ہے -

اہل تصوف نے سلوک کو تین عوالم میں تقسیم کیا ہے - ابتدائی عالم عالم ناسوت ہے - یہاں طلسم زار تعینات کی گتھیاں سلجھتی ہیں —— یہ عالم رنگ و بو کیا ہے - نگار خانۂ حصار و شہود کی تخلیق کا نتیجہ ہے - یا ذرات اثیریہ و اجزائے ومقناطیسی کی ارتقائی شکل ہے - یا ممکنات کی ساری ہنگامہ آرائیاں محض فریب نظر ہیں -

مرزا غالب عالم ناسوت کی کیفیات اس طرح بیان کرتے ہیں -

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اُٹھایئے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھایئے

حسن بین نگاہیں اور حقیقت نگر آنکھیں طلسم آباد حیات میں سینکڑوں یونستان اور نہ جانے کتنے موسیٰ زار دیکھتے ہیں - لیکن اتنی طاقت کہاں کہ ان تجلی زاروں پر نگاہ ڈالی جائے -

دُنیا کا ہر ذرّہ دیکھنے والی آنکھوں میں سینکڑوں جلوے لئے ہوئے ہے —— یہ وحدت الوجود کا ابتدائی نغمہ ہے -

ناسوت کے بعد مقام جبروت ہے - اور اس کے بعد حیرت کی دشوار گزار اور سنگلاخ وادیاں ہیں - یہ مقام نہایت

سخت و صعب ہے۔ حسن ازل کی بوقلمونیاں طالب حقیقت کو مبہوت کر دیتی ہیں ــــ العلم حجاب الاکبر ــــ یہی وہ منزل ہے۔ جہاں عرفان حقیقت کی مبہم سی لے بیخودی و استغراق کے نغمے برساتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ہستی بھی مطلوب حقیقی کی ذات معلوم ہوتی ہے ؎

ہر کہ آمد در نظر غیر تو نیست
یا توئی یا بوئے تو یا روئے تو

پھر تو انا الحق کے وجدانی ترانے ہر تار روح سے نکلنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد مقام لاہوت ہے۔ جس سے بقا باللہ یا عرفان اتم یا خودی کی سرحد ملی ہوئی ہے۔ مرزا غالب نے انہیں کیفیات کو اچھوتے انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

شاہد و مشہود اصل میں ایک ہی ہیں۔ شاہد خود مشہود ہے۔ اور مشہود خود شاہد ــــ یہاں امتیاز من و تو باقی نہیں رہتا۔ نگاہیں حسن حقیقی کے جلووں میں کھو جاتی ہیں۔ کان جو کچھ سنتے ہیں۔ وہ مطلوب حقیقی کی آواز ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ صحو میں سرمستیاں کم ہو جاتی ہیں ــــ رنگ و بو کی جنت نگاہی پھر دعوت نظارہ دیتی ہے۔ اس وقت کی حیرانیاں نہ پوچھئے۔ نگاہیں بھٹکتی پھرتی ہیں۔ طور نواز جلووں کو ڈھونڈھتی ہیں ــــ ایک طرف حسن حقیقی کی تجلیاں کائنات روح کو ایمن زار بناتی ہیں۔ تو دوسری طرف تعینات کی ہنگامہ آرائیاں اپنی ساری عشوہ گری کے ساتھ پیش نظر ہوتی ہے۔ ان کیفیات کو مرزا بیان کرتے ہیں ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزۂ و عشوۂ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

لیکن یہ کیفیتیں پھر زائل ہو جاتی ہیں۔ مناظر و مرایا کے طلسمی نگار خانے ٹوٹ جاتے ہیں۔ طالب حقیقت پکار اٹھتا ہے ؎

ہرچند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے اے "نہیں ہے"

جب اہل ظرف حیرت کی وادی طے کر جاتے ہیں۔ تو حجاب اکبر کے پردے نظر سے اٹھتے ہیں۔ اور حقیقت اپنی ساری روح پرور کیف آگینیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ سارے ہنگامہ ہائے ہست و بود، تعینات اور تعینات کی طلسم بندیاں، معمورۂ رنگ و بو اور اس کی تمام رعنائیاں مرئیات کی جادو نگاہی، مسموعات کی سامعہ نوازی محض فریب اور دھوکا معلوم ہوتی ہے ــــ غالب فرماتے ہیں ؎

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

من و تو کے امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ ماسوا اور اللہ میں فرق باقی نہیں رہتا۔ غالب فرماتے ہیں ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

مبدا عالم حسن ازل ہے اور حسن کو تقاضائے جلوہ نمائی ہے۔ دنیا ایک آئینہ ہے جس میں حسن ازل خود بیں ہے۔ مرزا پھر ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

یہاں تک کہ مرزا ایک جگہ صاف صاف کہتے ہیں۔ کہ مرایا و مناظر محض اسما ہیں۔ ورنہ ان کا کوئی وجود بالذات نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

غالب مادہ کے منکر ہیں۔ زندگی کے ہنگامے، حرکات، اصوات الوان کا کوئی وجود بالذات نہیں ہے۔ بلکہ اگر ہے۔ تو محض وجود

بالنسبت ہے - جب تک ذہن ادراک نہ کرے - وجود کی بنا محض تصور پر ہے

تمام مادہ جس میں خود میرا جسم اور بنی نوع کے اجسام شامل ہیں - بیجان اور بیکار ہیں - اصل میں کوئی دوسری مستتر طاقت کارفرما ہے اور یہی حقیقت ہے -

غالب کا فلسفہ Spenoza اسپنوزا Heagil ہیگل Berkley برکلے اور Fichle فچلے سے ملتا ہے -

" مادہ سالمات سے مرکب ہے - سالمات اجزا سے مرکب ہیں - جو اب لاتجزی خیال نہیں کئے جاتے - بلکہ جواہر برق سے مرکب ہیں - جو بقول سر آلیور لاج اُڑتی ہوئی مکھیوں کی مثال ہیں - ان کا تجزیہ کیا جائے - تو حلقہ ہائے اثیر یہ رہ جاتے ہیں جن کی تحلیل سے محض خیال باقی رہتا ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

مادہ محض مایا ہے - جب نگاہیں حقیقت سے آشنا ہو جاتی ہیں - تو مادہ کا وجود محض خیالی نظر آتا ہے ؎

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

مشاہدات اور مرئیات محض ہستئ مطلق کا جلوۂ بوقلموں ہے ؎

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

وحدت الوجود کے فلسفہ کا پہلا سبق یہی ہے - کہ ماسوا اور خدا صرف عارضی طور پر جدا ہیں - موت کے بعد یہ جدائی ختم ہو جاتی ہے - ع

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

جب انسان وادئ حیرت طے کر لیتا ہے - اور جبروت سے گزر کر عرفان اتم یا خودی کی سرحد میں قدم رکھتا ہے - تو حسنِ حقیقت بے نقاب نظر آتا ہے - اور وحدت الوجود کے عقدے حل ہو جاتے ہیں - یہاں اب نہ بیخودی رہتی ہے - اور نہ سرمستی بلکہ یہاں تسلیم و ہوش کی ضرورت ہوتی ہے ؎

میں نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے نقاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے

مُشتے نمونہ از خروارے —— غالب کے چند اشعار پیش کئے گئے ہیں - اگر ان کے اشعار کا تجزیہ کیا جائے - تو اکثر اشعار وحدت الوجود کے نظریئے کے حامل نظر آئیں گے -

انشاءاللہ آئندہ صحبت میں فلسفہ ہمہ اوست پر تنقیدی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی - نظریۂ وحدت الوجود کی ابتدا کہاں سے ہوئی - اور کس طرح یہ نظریہ مرور زمانہ کے ساتھ فلسفۂ اسلام کا جزو لاینفک بن گیا - وحدت الوجود کا مفہوم اُپنشدوں میں کیا ہے - یونانی حکما نے اسے کیا سمجھا - مغربی فلاسفہ نے اس کی کیا تاویل کی - صوفیائے کرام اسے کیا سمجھتے رہے - اور دور حاضر کے خود ساختہ فلسفی اور صوفی کیا سمجھتے ہیں - اس قدر عرض کرنے کی ضرور جرأت کرتا ہوں - کہ یہ نظریہ ایک حد تک گمراہ کن ضرور ہے - یہاں تک کہ خود مرزا غالب انتہائے غلو میں مذہب تک سے انکار کرتے رہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

(شاعر- آگرہ)

برقیہ کی ایک نئی شکل

ماہرین طبعیات کی تحقیقات عموماً یا تو سب سے بڑے ذرۂ کائنات یا سب سے چھوٹے ذرۂ برقیہ سے متعلق ہے - کائنات پر سب سے زیادہ عجیب و غریب تحقیق آئنسٹائن کی ہے - جس کا نظریہ مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے - کہ فضا میں روشنی سے زیادہ تیز کوئی اور چیز حرکت نہیں کر سکتی ہے - اندازہ کیا گیا ہے کہ وہ خواہ جہاں سے بھی شروع ہوتی ہو - اور اس کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو - ایک سیکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل جاتی ہے -

برقیہ کے متعلق نظریہ یہ ہے - کہ اس سے قوت کا اخراج مسلسل اور متواتر نہیں - بلکہ وقفہ سے ہوتا ہے - سائنس کے علما کی یہ کوشش ہے - کہ اضافیت اور برقیہ کے نظریوں میں مماثلت پیدا کی جائے - لیکن آئینسٹائن کو بھی اس میں کامیابی نہیں ہوئی - اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے - کہ برقیہ کی ہیئت اور شخص بالکل نامعلوم ہے - گو ماہرین طبعیات نے اس کی شکل قرار دینے کی کوشش کی ہے - ان میں سے ایک گروہ کا خیال ہے - کہ یہ ایک چھوٹا اور محدود جرم ہے - جس میں برقی قوتیں بھری ہیں - لیکن یہ خیال محض اس پر مبنی ہے - کہ مادہ کی تمام کمیت کی اصل برقی مقناطیسیت پر ہے - لیکن نیوٹرون

(Neutron) کے اکتشاف سے اس خیال کی تردید ہو گئی ہے۔ کیونکہ اس ذرہ میں برقی قوت نہیں ہے۔ دوسرا گروہ اس کو ایک نقطہ ریاضی سے تعبیر کرتا ہے۔ جس سے لامحدود قوتیں پھیلتی رہتی ہیں۔ اگر اس سے واقعی لامحدود قوتیں پھیلتی ہیں۔ تو پھر اس کی شکل بغیر اصول کے قرار دے دی گئی ہے۔

کیمبرج کے ایک نوجوان ماہر طبعیات پول ایڈرین مورس ڈیراک نے برقیہ کی ایک نئی شکل قرار دی ہے۔ جو مندرجۂ ذیل ہے۔

یہ ایک برقی نقطہ ہے۔ جس کی شکل محدود ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ اندرونی اور بیرونی، برقیہ خود ساکت رہتا ہے۔ مگر برقی مقناطیسی شعاع مثلاً روشنی کی لہر کی جنبش سے اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور قبل اس کے کہ اس جنبش سے برقیہ میں حرکت پیدا ہو۔ برقیہ اس کو محسوس کر لیتا ہے اور اس میں اسراع پیدا ہو جاتا ہے۔ تاکہ جنبش سے جو حرکت ہو۔ اس کا توازن قائم رہے۔ چنانچہ برقیہ کے اندرونی حصے میں وہ قوت جس سے برقیہ کو جنبش کے پیدا ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ روشنی سے زیادہ تیز رو ہے۔

اس سے اضافیت کا نظریہ غلط ہوتا نظر آتا ہے۔ لیکن ڈیراک کا خیال ہے۔ کہ اضافیت کے نظریہ کو کائنات اصغر (Micro-cosm) سے تعلق نہیں۔ اس لئے اس کے نظریہ کے غلط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے ۞

قدیم انسان

۱۸۵۹ء میں چارلس ڈارون نے جب اپنا نظریۂ ارتقا پیش کیا۔ تو اس کے مقلدین کو یقین ہو گیا۔ کہ شروع میں انسان کے آباؤ اجداد بندر تھے۔ لیکن انسانیت کے موجودہ علما نے اس نظریہ کو بالکل غلط قرار دیا ہے۔ انہوں نے متفقہ طور پر یہ ثابت کیا ہے۔ کہ قدیم انسان اپنے انداز دماغی کیفیت اور دانتوں کی ساخت میں انسان نما بندر سے بالکل مختلف تھے۔ مثلاً انسان کے دماغ کے اندر کی مختلف لکیریں بندر سے زیادہ اُبھری ہوتی ہیں۔ چباتے وقت بندر اپنے جبڑوں کو اوپر نیچے حرکت دیتا ہے۔ لیکن انسان کے جبڑے گھومتے ہیں۞

تاریخی عہد کے قبل کی جتنی انسانی کھوپڑیاں ملی ہیں۔ ان سے اسی قسم کے اختلافات ظاہر ہوتے ہیں۔ ان میں بعض ایسی ضرور ہیں۔ جن میں بندر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ۱۸۹۲ء میں سائنس کے ایک ڈچ عالم کو جاوا میں ایک سر ملا۔ جس کے جبڑے بندر کے ایسے اور دانت انسان کے جیسے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ یہ سر پانچ لاکھ سال سے کم کا نہ ہوگا۔ اس سے زیادہ پرانا دوسرا سر اب تک نہیں ملا ہے۔ اسی طرح ۱۹۲۹ء میں چین کے ایک ماہر انسانیت کو ایک سر ملا۔ جس کی ٹھوڑی بندر اور دماغ اور دانت انسان سے مشابہ تھے۔ ۱۹۱۲ء میں سیسکس (انگلستان) میں ایک سر ملا تھا جس کی پیشانی چوڑی، ہڈی موٹی، دماغ انسان ایسا اور دانت بندر کے جیسے تھے۔ گذشتہ اگست میں انسانیات کے علما کا ایک جلسہ کیمبرج میں منعقد ہوا۔ اس میں ٹرانسوال کے عجائب خانہ کے ناظم نے ایک بندر کی ایسی ہڈیوں کا ذکر کیا۔ جو اس کو جنوبی افریقہ کے ایک خطہ میں ملی ہیں۔ اس خطہ میں درخت نہیں ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ یہاں کے بندر زمین پر چلتے ہونگے مگر یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ ان کی چال انسان کی طرح ہوگی۔ کیونکہ ان کے پاؤں کی ہڈیاں نہیں ملی ہیں۔ مگر جو ہڈیاں ملی ہیں۔ ان میں سر کا حصہ گردن سے ملحق ہے۔ جس طرح عموماً گوریلا اور چمپانزی کا ہوتا ہے۔ جبڑے بندر کے ایسے اور دانت بالکل انسان کے جیسے ہیں ۞

ان شواہد کی موجودگی میں یہ احتمال ہو سکتا ہے۔ کہ شروع میں انسان بندر تھے۔ مگر انسانیات کے جدید علما کا خیال یہ ہے۔ کہ انسان بندر نہ تھے۔ بلکہ بندروں کی ایک مخصوص نسل انسانوں سے مشابہ تھی ۞

——— (معارف)

نگران:- پروفیسر تاجور

شاہکار لاہور

جائینٹ ایڈیٹر خواجہ محمود جاوید ایم-اے

چندہ:-

سالانہ چھ روپے ششماہی تین روپے ۸ر نادار خریداروں سے للعہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی۔ نمونہ پانچ آنے

جلد (۸) | فہرست مضامین بابت ماہ فروری ۱۹۳۹ء | نمبر (۵)

تصاویر:- (۱) سہ رنگی:- عمر خیام عالم خیال میں - یک رنگی:- بچے کی مذہبی تعلیم - سپارٹا کے بچوں کا امتحان تہذیب کی دسترس سے دور فوٹو گرافی کا عجوبہ

[illegible] الیکٹرک پریس برائے شاہکار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار واقع [illegible] علی محمد گلی محمد سٹریٹ (نہ ہسپتال) خواجہ دل محمد روڈ

"شاہکار" کے متعلق

ارکانِ حکومت عمائدِ ملک اور اہلِ علم و قلم حضرات کی راؤں کے چند اقتباسات

ہز ایکسلنسی سر ہربرٹ ولیم ایمرسن کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ آئی سی ایس
سابق گورنر پنجاب

"میں آپ کے اس اقدام سے دلچسپی رکھتا ہوں اور اس کی کامیابی کا متمنی ہوں"

آنریبل سر ملک فیروز خاں نون ایم۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لاء
سابق وزیرِ تعلیم پنجاب۔ حال کمشنر فار انڈیا (انگلینڈ)

"میں شاہکار کے مضامین نہایت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ شاہکار کا اہم ترین مقصد عوام کو غیر ممالک کے متعلق واقفیت بہم پہنچانا ہے۔ ہمارے اکثر اردو رسائل و جرائد سیر و سیاحت، تاریخ جدید اور روزانہ واقعات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔"

آنریبل سر ڈاکٹر میاں سر فضل حسین مرحوم۔ ایم۔ اے۔ ایل ڈی۔ بار ایٹ لا کے۔ سی۔ ایس۔ آئی سابق ممبر تعلیمات حکومت ہند وزیرِ تعلیم پنجاب

"شاہکار اعلیٰ پایہ کا ماہنامہ ہے۔ عمدہ اصولوں پر چلایا جا رہا ہے اور زبان اردو ملک کے لئے مفید ہے۔ مجھے رسالے کا خریدار بنالیں اور اس کا خیر خواہ معاون تصور کریں۔"

آنریبل سر جوالا پرشاد واستو۔ کے۔ ٹی۔ وزیرِ تعلیم صوبجات متحدہ

"میں اسے اوّل درجہ کی چیز سمجھتا ہوں۔ اور آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ میں اس کا خریدار بننا پسند کروں گا۔"

رائٹ آنریبل نواب حیدر نواز جنگ بہادر۔ سر اکبر حیدری صدر اعظم مملکت آصفیہ دکن

"مجھے شاہکار پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ میری رائے ہے کہ اس کا خیر مقدم اردو صحافت کی تاریخ میں ایک ممتاز نشانِ راہ کی حیثیت سے کرنا چاہیئے۔ دلچسپ اور ہادیانہ مضامین کی اشاعت سے آپ کا مجلّہ اردو دنیا کی خدمت بجا لا سکتا ہے۔ اسے اردو کے وہ تمام شیدائی بہت پسند کریں گے۔ جو اس زبان میں مختلف ترین موضوعات پر اظہارِ خیال دیکھنے کے متمنی ہیں۔"

آنریبل جسٹس خواجہ سر محمد نور بی۔ اے۔ ایل۔ وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی۔ جج ہائیکورٹ پٹنہ

"ترتیب مضامین اعلیٰ ہے اور مقالات قیمتی اور ہادیانہ ہیں۔"

ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب۔ ایل ایل۔ ڈی۔ ممبر اسمبلی۔
وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"میں نے رسالہ شاہکار کا مطالعہ کیا۔ اس کی ظاہری شان اور باطنی خوبیاں ناقابلِ انکار ہیں۔ اس کے علمی اور تعلیمی مضامین بہت بلند پایہ ہیں اور تعلیمات پر اس کی رائے قابلِ وقعت ہوتی ہے۔ ایسے بلند اور مفید علمی رسالے کی ادبِ اردو کو ضرورت تھی۔"

مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس (ریٹائرڈ)
سابق نائب معتمد تعلیمات حکومت ہند

"مضامین کا انتخاب و ترتیب۔ مطالب کا مفاد و تنوع، تصاویر کی زیبائش اردو صحافت کے لئے مایۂ ناز خیال کئے جا سکتے ہیں۔ یہ امر واقعی ہے کہ شاہکار سے بہتر رسالہ اب تک شائع نہیں ہوا۔"

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔
پروفیسر لسانیات عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد دکن

"اس قسم کے دیدہ زیب رسالے کی اردو کو بہت سخت ضرورت تھی۔ اگرچہ پنجاب سے اس طرح کے اور بھی رسالے نکلتے رہے ہیں۔ لیکن شاہکار اپنے گوناگوں خصوصیات کی بنا پر سب پر سبقت لے گیا ہے۔ خاص کر تحقیقی اور تنقیدی مقالات و مضامین کی وجہ سے اردو کے سنجیدہ اور علمی رسائل میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس پایہ کے اعلیٰ علمی مقالات کے ساتھ ساتھ ظاہر بینیوں اور عام دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے مذاق کا بھی خیال رکھنا نہایت مشکل امر ہے۔ اور بڑی خوشی ہوتی ہے جب شاہکار میں دونوں خوبیاں ہم پہلو نظر آتی ہیں۔"

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی لٹ۔ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی

شاہکار درحقیقت شاہکار صحافت ہے۔ گزشتہ بیس سال میں پنجاب کی ادبی فضا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ آج اچھا لکھنے والوں اور اچھی سمجھ رکھنے والوں کی تعداد درجنوں سے سینکڑوں ہو چکی ہے۔ اس حیرت افروز انقلاب کے محرکین میں سب سے ممتاز درجہ علامہ تاجور صاحب کا ہے۔ اللہ دے تو عروس ادب کو ایسے ہی جاں نثار و خدمت گزار دے۔ کیا نظم اور کیا نثر۔ دونوں میں اس صاحب کمال نے نہ صرف خود اعجازِ قلم دکھایا بلکہ بیسیوں کو ادب کی سیدھی راہ پر بھی ....

مختصرات

ملکی افواج میں پنجاب کا حصّہ

تاریخ کا ایک ادنیٰ سا طالبعلم بھی اس واقعیت سے روشناس ہے کہ پنجاب ہمیشہ سے ملک کا ایک فوجی صوبہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ ملک کی فوجی خدمات کے لئے تاریخ کے ہر دور میں حکمرانوں کی نگاہیں ہمیشہ پنجاب کی طرف اُٹھتی رہی ہیں۔

برطانوی عہد حکومت سے پہلے بھی مغلیہ دور حکمرانی میں ملک کی افواج میں پنجابیوں کی بھرتی ملک کے دوسرے صوبوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تھی۔

بات یہ ہے کہ پنجاب کی سازگار آب و ہوا اور اس سرزمین کی قدرتی نشوونما کے سبب یہاں کے باشندے تنومندی، طاقت، صحت، اور جذبۂ شجاعت میں امتیازی حیثیت کے مالک رہے ہیں۔

یہ کوئی افسانہ نہیں، پنجاب کے بہادر سکھوں، راجپوتوں اور جاٹوں کے عسکری کارناموں سے عہد بہ عہد کی تاریخ جنگ کے صفحات معمور نظر آتے ہیں۔ مغل شہنشاہوں اور خاندان غلامان کے حکمرانوں کا پایۂ تخت دہلی یا آگرہ تھا۔ لیکن اُن کی عسکری طاقت زیادہ تر پنجابی سپاہیوں کی شہامت و شجاعت سے وابستہ تھی۔ شہنشاہ تغلق گرد و باد کی طرح پنجاب سے اُٹھا اور سارے ہندوستان کو کھوندتا ہوا پنجابی لشکروں ہی کی امداد و اعانت کے بھروسے پر دکن تک چلا گیا۔ دور کیوں جائیں۔ جنگ عظیم میں پنجاب کے سکھوں، راجپوتوں اور جاٹوں کے لشکروں نے جو محیر العقول شجاعت دکھائی اس کا اعتراف برطانوی جنرلوں سے لے کر ہندوستان کے وائسرائیوں اور برطانیہ کے وزیروں تک نے کیا ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ پنجاب ملک کا سب سے بڑا فوجی صوبہ ہے تو اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ ہندوستان کے اور کسی حصے کے باشندے فوجی خدمت کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ نہیں۔ مرہٹے راجپوت گڑھوال اور نیپال کے گورکھے بھی جنگی قابلیت میں کسی سے کم نہیں۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پنجاب شاہی افواج کو سب سے زیادہ سپاہی دیتا رہا ہے۔

نواب سر سکندر حیات خاں صاحب وزیر اعظم پنجاب نے اسی تاریخی واقعیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اعلان میں یہ فرمایا تھا کہ آئندہ بھی فوجی خدمت کے سلسلے میں پنجاب اپنی دیرینہ روایات کو قائم رکھے گا۔ اور جس تناسب سے پنجابی سپاہی ملکی افواج میں پہلے پہلے پیش پیش رہے ہیں۔ اُس تناسب میں کمی نہیں آنے دی جائیگی۔"

لیکن اس اعلان سے غیر فوجی اقوام کے رہنما خواہ مخواہ چراغ پا ہو رہے ہیں۔

سر چمن لال سیتلواد نے خدا جانے سر سکندر کے اعلان کے کس فقرے سے یہ مطلب اخذ کر لیا کہ فوجی خدمت کی اجارہ داری صرف پنجاب کا حق ہے۔ اُن کے اعلان کا نہ یہ مقصد تھا نہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہندوستان بھر میں اہل پنجاب کے سوا فوجی خدمت کی اہل کوئی دوسری قوم نہیں اور صرف پنجاب ہی ملک کی تمام فوجی خدمات کا واحد اجارہ دار ہے۔ البتہ انہوں نے یہ ضرور کہا ہے کہ پنجاب جس تناسب سے ملکی افواج میں حصہ دار چلا آتا ہے اس تناسب کو کم نہ ہونے دیا جائے گا۔ اس میں چڑھنے کی کونسی وجہ ہو سکتی ہے؟ پنجابیوں کے اس حق سے کوئی ناحق پرست ہی انکار کر سکتا ہے۔ صدیوں سے جس صوبے کے افراد ملکی و غیر ملکی میدانوں کو اپنے خون سے لالہ زار بناتے چلے آئے ہیں۔ عہد امن و آزادی میں ان کی جگہ کانگریسی لالوں اور مہاجنوں کو دے دینا نہ انصاف کا اقتضا ہے نہ ملک کی فوجی مصلحت اس غلط بخشی کو جائز ٹھہرا سکتی ہے۔ کہ اس استحقاق کی حمایت کرنے والے کو اجارہ داری کا دعویدار کہنا خوش فہمی کی دلیل بن سکتا ہے۔

ہندوستان کی تمام تجارت پیشہ اقوام اور اکثر پیشہ ور طبقات کے کسی فرد نے عہد تاریخ سے آج تک کبھی میدان جنگ نہیں دیکھا کسی عہد حکومت میں نہیں سنایا گیا کہ بنیوں، مہاجنوں، سوداگروں، حجاموں، نوربافوں، تیلیوں، تنبولیوں سے کبھی کوئی فوج مرتب کی گئی ہے۔

ہندوستانی افواج میں دوسرے صوبوں کے مرہٹے، راجپوت اور گورکھے اور پنجاب کے جاٹ، راجپوت، سکھ اور سرحد کے پٹھان یہی قومیں فوجی خدمات کے لئے مخصوص چلی آتی ہیں۔ اور انہیں کی دیرینہ جنگجوئی و جنگ آرائی کی روایات نے ان اقوام کے افراد میں فوجی کیرکٹر پیدا کر دیا ہے۔ اپنے شجاعانہ جنگی کارناموں کے پیش نظر آئندہ بھی یہی قومیں ملکی افواج کا متاع گراں بہا بنیں گی۔ پنجاب چونکہ جنگی قوموں کا ہمیشہ سے گڑھ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسی لئے ملکی افواج میں پنجابی سپاہی قدرتی طور پر مقابلتہً زیادہ تعداد میں لئے جاتے رہے ہیں اور اپنے دیرینہ استحقاق و اہلیت کی بنا پر آئندہ بھی اہل پنجاب اپنے مقررہ تناسب کو قائم رکھنے کا بجا طور پر مطالبہ کریں گے۔ بس۔

"اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا"

غدر کے ہنگامۂ رست و خیز میں پنجابی سپاہی اپنے خون کی ریتی کھیلے تو غدار وطن کہلائے، جنگ عظیم کے بیرونی میدانوں میں انہوں نے اپنی جاں بازی سے دنیا کی جنگجو اقوام کو محو حیرت بنایا تو سرکار کے کاسہ لیس کا خطاب پایا۔ حالانکہ ہندوستان کی تمام قومیں کسی نہ کسی صورت میں جنگ عظیم میں انگریزوں کی امداد کرتی رہیں۔ جو لوگ توپ کی گرج سے حواس قائم نہ رکھ سکتے تھے انہوں نے جی کھول کر چندے اور قرضے دیکر انگریزوں کی امداد کی۔ مہاتما گاندھی نے رنگروٹوں کی بھرتی کے لئے دور دراز علاقوں کا دورہ کیا۔ مگر ان میں سے کسی پر وطن سے غیر وفاداری کا الزام نہیں آیا۔ مختصر یہ کہ بدنامی اور رسوائی کے حصہ دار پنجاب کے سکھ اور جاٹ بنے۔ اور اب کہ آزاد ہندوستان کے عہد امن میں فوجی اعزاز اور امتیاز کی تقسیم کا وقت آ رہا ہے تو باٹ ترازو چھوڑ کر دھوتی پوش لالہ اور کرگھے کسبت پھینک کر ہر مومن اور خلیفہ دامن دراز نظر آتا ہے۔ کانگریس کا ہر ممبر سُور بیر اور سُورما بن کر ملکی فوج میں بھرتی کا آرزو مند دکھائی دے رہا ہے۔ اگر کہیں واقعتہً فوجی بھرتی میں یہ بے امتیازی برتنے کا کانگریسی رہنماؤں کو موقعہ مل گیا۔ تو ہندوستان کا پھر خدا ہی حافظ ہے انگریز چلا گیا تو سوراج کے خواب پریشاں کی تعبیر بن کر جاپان آ در آمد ہوگا۔ غیر فوجی اقوام کے سپاہیوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ سر ہتھیلی پہ رکھ کر بیرونی حملہ آوروں کو روکیں گے۔ مضحکہ خیز خوش فہمی ہے۔ جو سُورما نکسیر پھوٹنے کی تاب بھی نہیں رکھتے وہ گردن کٹانے پر آمادہ ہوں گے یا چاقو کو دیکھ کر حواس کھو دینے والے لوگ جس دن مشین گنیں چلائیں گے اُس دن کا آفتاب مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا۔

نازپروردِ تنعم نبرد راہ بدوست
عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

انجمن حمایت اسلام کی طلائی جوبلی

انجمن حمایت اسلام لاہور کی پنجاہ سالہ طلائی جوبلی کی تقریب بڑے شان و شکوہ سے منائی گئی۔ اس تقریب کے سلسلے میں جو ... عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی پہلی صدارت کے فرائض والیٔ محمود آباد نے ادا کئے۔ باقی نشستوں کی صدارتیں آنریبل جسٹس دین محمد نواب شاہنواز، خانصاحب (ممدوٹ) اور خان بہادر چودھری خوشی محمد ناظر سابق گورنر کشمیر نے فرمائیں۔

اسی ضمن میں میاں بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بار ایٹ لا کے زیر صدارت ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں چھ سات ہزار تماشائی شریک ہوئے۔ اور پنجاب و بیرون پنجاب کے شعراء نے اپنے کلام سے اہل ذوق کو مستفید فرمایا۔

خان بہادر نواب مظفر خاں صاحب سابق ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات پنجاب، صدر انجمن حمایت اسلام اس تمام تقریب کی روح رواں تھے۔ ان کی مشکور مساعی اور بے پایاں رسوخ و نفوذ کے سبب یہ تقریب بیحد کامیاب ہوئی۔ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سے زائد روپیہ چندے میں فراہم ہوا۔ چندے کی یہ کثیر مقدار انجمن حمایت اسلام کی پنجاہ سالہ زندگی میں سب سے بڑی اور سب سے پہلی کامیابی سمجھنی چاہیئے۔

اعلیحضرت حضور نظام تاجدار دولت آصفیہ دکن نے ۳۰ ہزار روپیہ اس مبارک تقریب پر انجمن کو عنایت فرمایا۔ اسی طرح آنریبل سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم صوبۂ پنجاب نے اپنی جیب خاص سے تین ہزار روپیہ چندہ مرحمت فرمانے کے ساتھ ہی انجمن حمایت اسلام کو حکومت پنجاب کی جانب سے ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ کی اسپیشل گرانٹ دئے جانے کا اعلان فرمایا۔

محترمہ بیگم شاہنواز ایم ایل اے پارلیمنٹری سیکرٹری پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی نے چالیس ہزار روپیہ کی مزروعہ اراضی انجمن کو عطا کی۔ نواب مظفر خاں خانصاحب قبلہ نے جب سے انجمن حمایت اسلام

کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ انجمن کے تمام شعبوں میں روح زندگی نمودار ہوگئی ہے۔ اب اُن حضرات کے لئے دائرہ فتوحات تنگ ہوتے ہوتے حلقۂ زنجیر بن گیا ہے جو انجمن کے فنڈ کو اپنا ترکۂ آبائی سمجھا کرتے تھے۔ اسی لئے اس تقریب کو ناکام بنانے کے لئے ان حضرات کی کوششیں شبانہ روز جاری رہیں۔ مگر اُن کے علی الرغم قدرت نے اس شاندار اجلاس کو کامرانیوں کا ایک جلوہ زار بنا دیا اور فرومایہ معاند طاقتیں پامال زوال ہوکر رہ گئیں۔

یوم اردو

انجمن بہار ادب لکھنؤ کی تجویز پر ۱۸ دسمبر گزشتہ کو تمام ہندوستان میں یوم اردو منایا گیا۔

اس تقریب کے سلسلے میں ملک کے گوشے گوشے میں مسلمانوں اور فراخ دل ہندو حضرات نے جلسے منعقد کئے۔ ان جلسوں میں اردو زبان کی عالمگیری کے پیش نظر اُسے ہندوستان کی مشترکہ ملکی زبان قرار دیا گیا۔ حکومت اور مختلف صوبوں کے تعلیمی ادارات سے پُرزور مطالبہ کیا گیا۔ کہ اردو زبان کو انگریزی زبان کی حیثیت دی جائے، اور اسے ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ لکھنؤ میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے اردو زبان کی خوبیوں پر تقریر فرماتے ہوئے اسے ہندو مسلمانوں کی مشترکہ ملکی زبان تسلیم کیا۔ اور اُن تنگ دل ہندو حضرات کو جو اردو کو مٹا کر ہندی کو زندہ کرنے کی ناکام کوششوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ متنبہ کیا اور ان کی ان تخریبی کوششوں کی مذمت فرمائی۔

لاہور میں بھی اس تقریب پر انجمن اردو پنجاب کے زیر اہتمام مینارڈ ہال میں محترم ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر ڈی ایس سی انچارج کیمسٹری پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔

اس یادگار جلسے میں ہر قوم اور ہر طبقے کے ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی حضرات شریک ہوئے۔ مینارڈ ہال میں حاضرین کی کثرت کے سبب تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔

ڈاکٹر بھٹناگر کا خاندان ہمیشہ سے اردو فارسی ادب شاعری کا خدمت گزار رہا ہے۔ مرزا غالب کے عزیز ترین شاگرد مرزا تفتہ (لالہ ہرگوپال تفتہ رئیس سکندرآباد) ڈاکٹر بھٹناگر کے محترم نانا تھے۔ جنہیں مرزا غالب نے غایت محبت و یگانہ التفات کا اظہار کرتے ہوئے مرزا تفتہ کا لقب عنایت کیا تھا۔ غالب کی "اردوئے معلیٰ" اور "عود ہندی" میں مرزا تفتہ کے نام متعدد خطوط ہیں۔ ان خطوط کی سطر سطر سے استادانہ محبت ٹپکی پڑتی ہے۔ اپنے بے مثل استاد کے ساتھ مرزا تفتہ کی عقیدت بھی عشق کی حد تک بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے استاد کے ایام عسرت میں متعدد بار بلکہ مسلسل ان کی مالی خدمت کر کے حق شاگردی ادا کیا ہے۔ غالب ہر خط میں جو مرزا تفتہ کے نام ہے اس نذرِ عقیدت کا اعتراف کرتے ہیں۔ مرزا تفتہ اردو و فارسی کی تاریخ ادب و شاعری میں لالہ ہرگوپال تفتہ کی بجائے مرزا تفتہ ہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر بھٹناگر کی اردو خدمات انکی دیرینہ خاندانی روایات سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنی گوناگوں علمی مصروفیات میں اردو ادب نظم ونثر کی سرانجام دہی کے لئے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔

اس عظیم الشان تاریخی اجتماع کے لئے اُن سے موزوں تر صدر کوئی دوسرا نہیں مل سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بہ حیثیت صدر جو خطبۂ صدارت پڑھا وہ ان کے علمی رتبے کے شایانِ شان اور اردو ادب و شاعری کی تاریخ سے متعلق گرانقدر معلومات سے لبریز تھا۔

اس خطبۂ صدارت میں انہوں نے بھی اردو زبان کو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت اور ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار دیا۔

اس کے ساتھ انہوں نے اُن ہندو مسلمان ادباء کو جو اردو زبان کو گمراہ کن عربی فارسی اور سنسکرت الفاظ سے ناقابل فہم بنا رہے ہیں۔ آسان اور عام فہم اردو لکھنے کی جانب توجہ دلائی۔

میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے آکسن بار ایٹ لا سیکرٹری انجمن اردو پنجاب نے ایک پُر معلومات مضمون پڑھا جس میں مہاتما گاندھی، آنریبل بابو سمپورنانند وزیر تعلیم یوپی اور دیگر کانگریسی ہندو لیڈروں کی اُن تخریبی کوششوں کی شکایت کی تھی جو یہ حضرات اردو زبان کو مٹا کر ہندی کی ترویج کے سلسلے میں انجام دے رہے ہیں۔

مولانا حامد علیخاں صاحب بی۔ اے جائنٹ ایڈیٹر رسالہ ہمایوں نے ہندوستان کی مجالس قانون ساز سے ایک ریزولیوشن کی صورت میں یہ مطالبہ پیش کیا کہ وہ اردو کو ملک کی مشترکہ زبان قرار دیں

اس ریزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے جو تحریر پڑھی - اس میں اردو کی ہندوستان گیری کو ثابت کرتے ہوئے وضاحت کے ساتھ بتایا کہ اردو ملک کی مشترکہ زبان یا ہندوستان کی لینگوفرینکا کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کا یہ حق ناقابلِ انکار ہے کہ اسے مجالس قانون ساز ملکی زبان کا درجہ دیں۔

راقم الحروف نے حسب مشورہ انجمن اردو پنجاب ذیل کا ریزولیوشن پیش کیا:-

یوم اردو کا یہ اجلاس حکومت پنجاب سے استدعا کرتا ہے کہ پنجاب کے جو تعلیمی ادارے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی خواہش رکھتے ہوں، انہیں ایسا کرنے کی اجازت دی جائے۔ نیز پنجاب یونیورسٹی کے ارباب نظم ونسق سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ یونیورسٹی کے دائرہ عمل میں اردو زبان کی وہی حیثیت تسلیم کریں - جو آجکل انگریزی زبان کو حاصل ہے اور جب تک یونیورسٹی کے منتظمین اس فیصلے پر پہنچیں بلا تاخیر

(ا) ایف - اے اور بی - اے میں اردو زبان کو ڈیڑھ سو نمبر دے کر لازمی مضمون کی حیثیت بخشیں۔

(ب) اردو کو ایم - اے تک ترقی دے کر ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کی پیروی کرتے ہوئے اردو ایم - اے کا نصاب اور امتحان تجویز کریں۔

(ج) ایف - اے اور بی - اے میں اردو کو لازمی مضمون کی صورت میں اختیار کرنے والی طالبات کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اردو پرچے کے جوابات اردو یا انگریزی میں سے کسی ایک میں حسب سہولت لکھ سکیں۔

(د) ایف - اے اور بی - اے میں مشرقی زبانوں کے پرچہ سوالات کے جواب میں بھی امیدواروں کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ انگریزی یا اردو میں جواب دے سکیں۔

(ھ) اس واقعیت کے پیش نظر کہ انٹرنس کے امتحان میں بلکہ ایف - اے اور بی - اے میں اردو لینے والے امیدواروں کی تعداد انگریزی مضمون کے امیدواروں کی تعداد سے دوسرے درجے پر ہوتی ہے ضرورت ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں جب کہ ہر مضمون کا جداگانہ بورڈ ہے - اردو زبان کا بورڈ مستقل اور جداگانہ بنایا جائے تاکہ اس بورڈ کے ممبران یونیورسٹی میں اردو زبان کے حقوق اشاعت وحفاظت کی نگرانی کر سکیں -"

اس ریزولیوشن کے متعلق میں نے تقریر کرتے ہوئے جو دلائل پیش کئے اُن کو سُن کر جلسے نے متفقہ طور پر اس ریزولیوشن کی تائید کی۔

اب اس اجلاس کی کارروائی جن جن اخبارات میں شائع ہو رہی ہے وہ بھی اپنے ادارتی کالموں میں اس ریزولیوشن کی شق کی تائید کر رہے ہیں۔

کسی آئندہ فرصت میں اس پر ایک سلسلۂ مضامین شاہکار کے صفحات میں شائع ہونا شروع ہوگا۔

انسپکٹر مدارس لاہور ڈویژن

عام آسمانی نعمتوں کی طرح علم کی بھی کوئی ذات نہیں، کوئی فرقہ نہیں، کسی خاص قوم کی یہ جاگیر نہیں - بزم انسانیت کے ہر فرد اور ہر ممبر کو اس پر مساوی حق حاصل ہے - علم کی مجلس میں آکر بادشاہ اور فقیر آقا اور غلام بڑا اور چھوٹا سب باہم برابر اور ایک دوسرے کے ہمسر وہمعصر بن جاتے ہیں - خدا کی اس سب سے بڑی نعمت میں عالم انسانیت کا ہر فرد مساوی درجے کا حقدار ہے - سورج کی روشنی کی طرح یہ بھی کسی قوم یا کسی جماعت کی اجارہ داری میں نہیں - اسی بنا پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ علم وتعلیم کے خدمت گذار بھی ایسے ہی افراد ہونے چاہئیں - جو اس خدائی نعمت کی تقسیم - اس کے آداب کی نگہداشت اور اس کے تقسیم کرنے والوں کے حقوق کی حفاظت... بے امتیاز مذہب وملت کرتے ہوں اور اس امر میں تمیز من وتو وتفریق ماوشما کو جائز نہ سمجھتے ہوں - اپنی قوم اپنی جماعت اور اپنی ملت کا سوال علم وتعلیم کی شریعت کا گناہ کبیرہ بن جاتا ہے۔

ایک افسر تعلیم درحقیقت محکمۂ تعلیم کی ذمہ داریوں کے مقابلے میں خدا کی جانب سے تفویض کردہ ذمہ داریاں زیادہ رکھتا ہے - خدا اور اس کی مخلوق کے حقوق اس سے انصاف اور "حق بحقدار رسید" کے فرائض کا مطالبہ کرتے ہیں۔

علم وتعلیم کے ترقی پذیر اور ترقی یاب افراد کی حوصلہ افزائی کے فرض کی ادائگی جس طرح اس کے ذمے ہے - اسی طرح اس راہ کے خاک نشینوں درماندہ اور پست طبقات کی امداد اور دست گیری

کا فریضہ بھی اُسی پر عائد ہوتا ہے - جو افسر تعلیم اپنے ان فرائض کو پیش نظر رکھتا ہے - محکمے کے علاوہ خدا اور مخلوق کے سامنے سرخروئی بھی اُسی کا نوشتۂ تقدیر ہے -

" شاہکار" ایک تعلیمی پرچہ ہے - اساتذہ اور افسرانِ تعلیم کے حقوق کی ابتدا سے حمایت کر رہا ہے - اسی کے ساتھ افسرانِ تعلیم کی کارکردگی، طرزِ عمل اور احساس ذمہ داری کی بابت بے لاگ اور بے جھجک اظہار رائے میں کبھی اپنی ذاتی مصلحتوں کو پیش نگاہ نہیں رکھتا - جہاں نیک دل، اور علم و تعلیم کے مخلص خدمت گزار افسران کی جی کھول کر تحسین کرتا ہے - وہیں قانون شکن، سخت گیر اور فرعون مزاج افسروں کے ناروا سلوک و طریقۂ کار پر صدائے احتجاج بلند کرنے کا فرض بھی کبھی اس نے قضا نہیں کیا - اس لئے ہمیں نہ کوئی خوشامدی کہہ سکتا ہے نہ ذاتی مخالف - کہ بیجا مخالفت بھی خوشامد کی طرح ہمارے مشرب میں کفر ہے -

آج ہم جذبۂ سپاس و امتنان و احساس مسرت کے ساتھ لاہور ڈویژن کے انسپکٹر مدارس کی فرض شناسی اور حسن کارکردگی کا اعتراف کرتے ہیں - اِس سلسلے میں بھی ہماری معلومات و تحقیقات کا واحد ذریعہ اساتذہ کی مسلسل اطلاعات ہیں جو مدت سے ہمیں وقتاً فوقتاً موصول ہوتی رہتی ہیں - لاہور ڈویژن کے مختلف اضلاع کے ہر طبقے اور ہر فرقے کے اساتذہ اس اظہار امتنان و اعتراف میں متفق اللسان و متحد اللہجہ نظر آتے ہیں -

فرقہ داری کے اس عام ہنگامۂ ہاؤ ہو میں جب کہ اکثر ذمہ دار افسر فرقہ نوازی کے جذبات میں سرشار ہو کر اپنے افراد قوم کے ساتھ ناروا جنبہ داری اور دوسری قوموں سے تعلق رکھنے والے ماتحت کارکنوں کے ساتھ تعصب کا برتاؤ کرنے ہی کو اپنے فرض کی ادائگی اور اپنی نجات کا وسیلہ بنائے ہوئے ہوں - ایسے سعید الفطرۃ نصفت پسند و معدلت شعار افسر کا وجود محکمۂ تعلیم اور کارکنانِ تعلیم کے لئے یکساں طور پر باعث افتخار ہو سکتا ہے جو فریقانہ احساسات سے بلند ہو کر اپنے فرائض کو انجام دے رہا ہے -

لاہور ڈویژن کا انسپکٹر مدارس اپنی جامع قابلیت، کاردانی، کارآرائی، کارشعاری میں امتیاز خاص کا مالک ہے - اس کی حق شناسی اور جوہر نوازی مسلمہ اور اساتذہ کے ساتھ اس کا کریمانہ طرز عمل شریفانہ رویہ اور مربیانہ سلوک اعتراف عام حاصل کر رہا ہے -

ہم اپنے محترم رائے بہادر مسٹر منموہن ایم - اے ڈپٹی ڈائرکٹر مسٹر آرمسٹرانگ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اور آنریبل وزیر تعلیم پنجاب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں کہ ان کے متعلقہ محکمے میں ان کی زیر نگرانی ایسا قابل ذہین، کاردان محنتی اور حق شناس انسپکٹر لاہور ڈویژن کے مدارس کی رہنمائی کر رہا ہے -

حسینی گھسیارا

محترم شیخ عباد اللہ صاحب بی - اے اسسٹنٹ ریلوے پبلسٹی افسر این - ڈبلیو - آر - کا افسانہ "حسینی گھسیارا" کے عنوان سے زینت اشاعت ہو رہا ہے - شیخ صاحب ملک کے مشہور اور مقتدر انگریزی روزناموں میں مدتوں داد صحافت دیتے رہے ہیں - انگریزی میں ان کا اندازِ نگارش قبولیتِ عام حاصل کر چکا ہے -

اردو ادب میں ان کی افسانہ نگاری سے جدید اسلوب بیان کا قابلقدر اضافہ متصور ہوتا ہے -

ان کے اور بھی افسانے اردو زبان کے بلند پایہ ماہناموں میں شائع ہوتے رہتے ہیں - موجودہ افسانہ نگاروں میں ان کے افسانے اپنے قارئین کو زندگی سے قریب تر کرنے میں امتیاز خاص رکھتے ہیں ان کا اندازِ تحریر بے تکلفی، برجستگی، شگفتگی اور افسانے کا ہر فقرہ آداب زندگی کے متعلق حقیقی رہنمائی کرتا ہے، بے مثل ہیں - مرزا غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنانے میں جو امتیاز حاصل کیا تھا شیخ عباد اللہ نے افسانے کو اپنی مخصوص شان نگارش سے حیات اجتماعی کا آئینہ دار بنا دیا ہے - پھر ان کے افسانے نہ تو عام افسانہ نگاروں کی طرح امریکہ یا انگلستان کے افسانوں کے بگڑے ہوئے ہندوستانی خاکے ہیں نہ کہیں ان میں حسن و عشق کی ابتذال آرائی ہے - بلکہ شستہ زبان اور روزمرہ میں زندگی کی تصویر کشی ہوتی ہے - ان کے افسانے کو پڑھ کر قارئین کی نگاہوں سے حجابات زندگی اُٹھ جاتے ہیں -

"حسینی گھسیارا" پڑھنے کے بعد قارئین خود اندازہ کر سکینگے کہ فاضل اور بہمہ افسانہ نگار زندگی کے خط و خال کی مصوری میں کس درجے کامیاب ہوا ہے -

امید ہے کہ شاہکار آئندہ نمبروں میں مسلسل طور پر شیخ صاحب کے افادات نگارش کو زینتِ اشاعت بنائے گا -

تاجور

شاعر جنّت میں!

فرطِ گریہ سے مری طبع رواں ہے حسّاس
مجھ کو آئے گی نہ جنّت کی یہ تنہائی راس!

اِس جگہ عشق و مسرّت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور مرے قلب میں نسبت ہی سدا خوف و ہراس!

چھائی رہتی ہیں یہاں مست بہاریں ہر وقت
اور میں رہتا ہوں بہاروں میں حزیں اور اداس!

لپٹے رہتے ہیں یہاں ریشم و سنجاب میں لوگ
میری نظروں میں تو جچتا نہیں رنگین لباس!

سخت دشوار ہے جینے کی مصیبت یارب!
چلتے ہیں موت کے احساس سے میرے انفاس!

کامراں ہوتے ہیں ہر کام میں جنّت والے
اور مرے عشق کی محروم امیدوں پہ اساس!

اونچے ایوانوں سے وحشت ہے ازل سے مجھ کو
مست رہتا ہوں میں ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس!

میرے مولا! مجھے گویائی پہ مجبور نہ کر
گو مرے پاس نہیں کچھ بھی بجز حمد و سپاس!

بس اگر شان میں تیری کوئی اشعار کہوں
دلِ ہر ذرّہ میں لہرائے ضیائے الماس!

لیکن افسوس کہ فردوس کی پہنائی میں
نہ سخن فہم ہے کوئی نہ کوئی قدر شناس!

تیری جنّت میں لگے گا نہ مرا دل اِک پل
تیری جنّت میں گنوا بیٹھوں گا میں ہوش حواس!

اے کہ مستور ہے ادراک کی پرواز سے تو!
مضمحل ہے ترے دربار میں انساں کا قیاس!

پستی و خاک نشینی سے مجھے عار نہیں!
اور جنّت کی بلندی سے سروکار نہیں!

احمد ندیم قاسمی

بیوی سے پہلی جنگ کی داستان

(گذشتہ سے پیوستہ)

بیوی - ڈرتا ہے تمہاری بہن سے، جُرواکی زبان پر زبان نہیں۔کیوں نہ ہو۔آخر تمہاری ہی تو بہن ہے۔اس دن وہاں ثروت کے ہاں بھری مجلس میں میری آنکھوں کو نورجہاں کی آنکھوں سے تشبیہ دی جا رہی تھی بستارا بیگم، ان کی ساس نذیرا ابھی زندہ ہیں اُن سے پوچھ لو کہ کچھ کہہ رہی تھیں یا نہیں؟ بھیّا سے یہ لگا دی کہ اُس بندی کی آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا ہے۔"

اُوئی اُوئی کیا جُروا ہے۔آنکھوں کی برائی پلکوں سے کرتی ہے۔

ہم :- تمہیں غلط فہمی ہوئی۔انہوں نے نورجہاں کا نام لیا تھا۔تم سمجھیں بس نورجہاں جہانگیر بادشاہ کی ملکہ ہی کا نام تھا اور کسی عورت کا نام نورجہاں ہو ہی نہیں سکتا۔بیوی! عیدو نائی کی بیٹی دیکھی نہیں تم نے؟ وہی پھٹے پھٹے دیدوں والی۔جس کے دو دانت ہونٹوں پر پڑے رہتے ہیں۔اُس کا نام بھی نورجہاں ہے۔نورو نورو کہنے لگے ہیں۔اُس کی آنکھیں بھی خراب ہیں۔یوں دیکھنے میں بڑی بڑی معلوم ہوتی ہیں۔مگر شب کوری میں مبتلا ہیں۔شب کوری جانتی ہو۔نا؟ جیسے ہماری بولی میں رتوندا کہتے ہیں۔بے چاری کو چار گھڑی دن سے کچھ نہیں سوجھتا۔یُوں آنکھیں کھولے ضرور رہتی ہے۔ذرا سورج نیچے کو ڈھلا اور اُس کی بینائی نے جواب دیا۔

بس یہی ہوا کہ تمہیں نام کا دھوکا ہو گیا۔انہوں نے عیدو نائی کی بیٹی کا نام لیا تم ملکہ نورجہاں سمجھ بیٹھیں۔اس میں تمہاری خوش فہمی ہے۔اُن بے چاری کا کیا قصور؟

بیوی :- خدا نہ کرے میری آنکھیں نورو نائن کی سی ہوں۔تمہاری بہن کو اس کی آنکھیں پسند ہیں اللہ چاہے ایسی ہی ان کی آنکھیں ہو جائیں گی۔

بڑی بے چاری میری اچھی بھلی آنکھوں میں موتیا بند اُتارتی ہیں۔اللہ! میری آنکھیں نورو نائن کی سی ہیں؟ اپنی کھڑی کو نہیں دیکھتیں؟ رہائے ہوئے چہرے پر پھٹے پھٹے دیدے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے بران کوٹ کے دو کاج۔ایک وہ چھوٹی دھونکل پھرتی ہے۔جلیبا مراتی بھیگا ہوا اُپلا۔سُوجی ہوئی تھوبڑی کے اندر مٹی دھنسی آنکھوں کا کہیں نام نمود نہیں دکھائی دیتا۔مرات گھڑیا دھکیل جیسے گوالے کا چھوکرا۔اِدھر سے آئے گی اماں چھوٹی کھا لوں۔اماں ہائے پی لوں۔آٹھ پہر منہ بھی چلتا ہے اور پیٹ بھی۔ - - - - - - - - اپنی لمبوترے منہ والی کھاجی ہی کو بیچ کہ کہا ہوتا۔نگوڑی کی آنکھیں ہیں۔اللہ توبہ میری آنکھوں سے ستر پہرے دور۔ڈگر ڈگر ہلتی ہیں۔جیسے کسی کی جان کندنی ہو رہی ہو۔پھٹی پھٹی بے نوری آنکھوں ہی کے کارن تو چھٹپن سے اُس کا "دیدوں پھٹی" نام پڑ گیا ہے۔اللہ!! میری آنکھیں اُس دیدوں پھٹی سے بھی گئی گزری ہو گئیں۔

خدا کی شان!! میری صورت میں عیب نکالے جاتے ہیں۔پیارے بھیّا کے سراپا پر جو ٹو کروں نور برس رہا ہے۔اسے کبھی نہ دیکھا۔بھیّا بھیّا، کیا کہنے بھیّا کے۔بھیّا آئے تھے۔یہ جیسی بچوں کی بیچا" کتنے خوبصورت بھیّا ہیں بھنو کے۔وہی کہاوت۔

"اونٹ رے اونٹ تری کونسی کل سیدھی ہے"

خوبصورت بھیّا کے کان دیکھو جیسے سارنگی کے پردے۔ہونٹوں کا دل معلوم ہوتا ہے۔ناند کے دو کنارے توڑ کے منہ کے دہانے پر جوڑ دیئے ہیں۔قد پایا ہے بھیّا نے جس کا لمبان چوڑان برابر سرا یہ ہے۔گردن کندھوں میں ڈوبی ہوئی اور پیٹ اُوئی مرے اللہ!! پیٹ ہے یا کسی پیر کے مزار کا گنبد؟ پھر چھیٹا کا رنگ کالا نہ گورا، کھوسلا ہے۔بلا سے کالے ہی ہوتے۔کالے رنگ میں بھی کچھ نہ کچھ تیکھا پن تو ہوتا ہے۔دانتوں کا دیوالہ ڈاکٹر جلال دین کی عنایت سے نکل چکا ہے۔دانتوں میں "ماس خورہ" لگ گیا تھا۔یا گھاس خورہ۔جو آفت بھی تھی دانتوں کی بتیسی تو نظر آتی

تھی۔ روٹی تو چھین سے کھا لیا کرتے تھے۔ مٹا ماس خورہ گم ہوا تو ڈاکٹر اے حلال دین اور بی حلال دین ایک نہ دو لکھٹے دو دانت خورے لگ گئے۔ سبھی بھرے جیتے جاگتے دانت زنبور کے حوالے کر دیے۔ اور ابھی کیا ہے؟ ال اے۔ بی ڈاکٹر اور سی ڈی ڈاکٹر کا دم سلامت ہے تو گن گن کر رہے سہے دانت بھی اکھیڑ لیں گے۔ پھر میاں پر ملوں کا فالودہ پینے کے لائق رہ جائینگے تو بھلا غضب خدا کا یہ عمر تمہارے پوپلے ہونے کی تھی؟ بہن عمر میں سات برس بڑی، سارے دانت منہ میں بھرے پھرتی ہے بڑے بھائی دس بارہ برس بڑے ان کے کسی دانت نے جنبش نہیں کھائی۔ تم کون ایسے بڑہ چک بوڑھے تھے کہ بچوں کی طرح پوپلے ہو گئے۔ بات کرتے ہو تو سمجھ میں نہیں آتی۔ منہ میں پان ہو تو بات سننے والے کا چہرہ پیک سے رنگین ہو جاتا ہے۔ بڑے بے چارے مجھے بھی وہیں لے چلے تھے۔ "ڈاکٹر حلال دین الیا ڈاکٹر حلال دین ولیا۔ تمہارے دانتوں کا درد ور دسب کھو دیگا۔" سچ ہے ..... درد آپ ہی کھو دیا جائے گا جب مٹھے دانت زنبور کے حوالے ہو جائیں گے۔ میاں اپنا جیسا پوپلا مجھے بھی بنانا چاہتے تھے۔ وہ تو بیچاری سرفراز بیگم کا خدا بھلا کرے اُس نے مجھے روک دیا۔ کہ کیا کر رہی ہو بھابی؟ کیوں دیوان پن اُٹھا ہے۔ بھائی صاحب کی طرح پوپلا بننے کو جی چاہ رہا ہے؟"

وہ نہ روکتی تو میں دیوانی تو جانے پہ تیار ہی ہو گئی تھی۔ ان کا کیا جاتا ڈاکٹر اے حلال دین منہ میں سے سارے دانت اُگلوا لیتا۔ خدا ہی نے بچایا ہے۔ نہیں تم نے تو مجھے پوپلی بنانے میں کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔

ہم:۔ قصور وار تو تمہارے ہم تھے ڈاکٹر اے حلال دین غریب کے کیوں سر ہو گئیں۔ دانتوں کی بیماریوں کا ایسا باکمال ماہر سارے صوبے بھر میں بھی نہیں۔ انگریز تک اسی سے دانتوں کا علاج کراتے ہیں۔ اُس دن یہاں کے دانتوں کے سرکاری ہسپتال کا یورپین ڈاکٹر شکیلہ ڈھائی ہزار روپے تنخواہ اسی کام کی پاتا ہے۔ اپنی کسی رشتہ دار میم کے دانت دکھانے ڈاکٹر اے حلال دین کے پاس آیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر حلال دین اپنے فن کا ماہر نہ ہوتا تو ایسے ایسے ڈاکٹر کیوں اُس کے پاس علاج کرانے آتے؟

بیوی:۔ ہوگا، ہمیں اُس سے کیا؟ تمہیں اس سے ایسی ہی عقیدت ہے تو رہے سہے دانت بھی نکلوا آؤ۔ اپنی بڑی آپا کے دانت نکلوا دو۔ پیلے دانتوں سے منہ بھرے پھرتی ہے۔ میرے دانتوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟

ہم:۔ کیا کہیں؟ دانتوں، آنکھوں کے ڈاکٹر تو سیکڑوں ہو گئے کوئی زبان کی بیماریوں کا ڈاکٹر نہیں ملتا۔

بیوی:۔ زبان کے ڈاکٹر کی کیوں ضرورت پڑ گئی؟ زبان کی کوریں تو میں بھی تراش سکتی ہوں۔

ہم:۔ ہماری ایک مکرمہ کی زبان کے پینچ کچھ ڈھیلے پڑ گئے ہیں بڑھتے بڑھتے ہاتھ بھر کی لمبی ہو گئی ہے۔ آٹھ پہر مشین کی طرح چلتی رہتی ہے۔ کوئی زبان کا مستری مل جائے تو ان کی زبان کی ذرا بریکیں کسوا دوں۔

بیوی:۔ تمہاری زبان کس نے کیل رکھی ہے؟ پہلے اپنی زبان کی خبر لو۔ اس کی کوریں ترشواؤ اور بریکیں بھی کسواؤ! مٹی ۲۴ گھنٹے لتر لتر چلتی ہی رہتی ہے۔ اور کہتی ان کہی جو منہ میں آئے کہنے سے باز نہیں رہتی۔

اور وہ مکرمہ کون ہے؟ میں؟ میری زبان کی بریکیں کسواؤ گے! تم؟ کیا کہنے تمہارے۔

"بُت کریں آرزو خدائی کی"

اپنی بڑی آپا کی زبان پہ رندہ اور آنکھوں میں تیل کی سلائی پھروائی ہوتی۔ مٹی ناگن کی سی زبان اور بندریا کی سی آنکھیں آٹھ پہر چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔

پیاری بھاوج کی جیبیا کی کوریں ترشواؤ۔ جب چلتی ہے تو کسی صورت رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کسی دوسرے کو بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیتی اور تم نے کون سے دن گونگے کا گڑ کھایا تھا اپنی بے کینڈے زبان کی کانٹ چھانٹ بھی تو کراؤ۔ سوتے میں بھی چلتی ہے اور جاگتے میں بھی۔ کیا مجال جو دم بھر کو چین لینے دے۔ پرسوں پڑوسن ہی پوچھ رہی تھی کہ علامہ صاحب رات رات بھر کس سے لڑتے رہتے ہیں۔ یہ سوتے نہیں کسی وقت؟ اب کیا جواب دیتی میں اُسے کہ وہ تو شام سے پڑ کر سوتے ہیں تو نو بجے دن کی خبر لاتے ہیں۔ مگر غارتی زبان چوکیدار کی طرح پہرہ دیتی ہے۔ اس کے بجرے کی نیند اڑ گئی ہے۔ تمہاری لمبی دراز جبیا نے تو پڑوسیوں کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ اُس

کی برکیں بھی کسواؤ! اور چولھیں بھی۔

میری زبان کا ایسا رونا پڑ گیا اُس کے لئے مستری اور سلوتری ڈھونڈھے جانے لگے۔ اللہ کی شان!! ذرا جو خیال ہو اس مردوے کو کہ آخر بیوی بھی آدمی ہے۔ آدمی کا بچہ ہے۔ اس کا دل بھی رکھنا چاہیئے! عورت مٹی کا مان ہی کیا!

ہم:۔ ہیں!! کیا عورت بھی آدمی ہوتی ہے؟ یہ آج ہی سُنا ہے۔

بیوی:۔ تو کیا عورت آدمی نہیں ہوتی۔

ہم:۔ ایں! کیا عورت بھی آدمی ہوتی ہے؟ کل کو کہنے لگو گی کہ عورت بھی اشرف المخلوقات کہلاتی ہے اور تم سے کیا تعجب ہے۔ کبھی اس کا دعوی بھی کر بیٹھو۔ کہ عورت خدا کی خلافت اور خلقِ خدا پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ دیکھو بیوی! خدا کا خلیفہ ہے انسان اور انسان سے مراد ہے آدمی، اور آدمی مذکر ہوتا ہے۔ عورت بیچاری تو عورت ہوتی ہے۔ کائنات کی ہر چیز کی طرح عورت بھی مرد کی اطاعت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ دیکھو کائنات کا سورج آدمی کو روشنی بخشتا ہے۔ چاند اس کی کھیتیاں پکاتا ہے۔ ہوا اور پانی اُسے زندہ رکھتے ہیں۔ تارے اُس کے لئے جگمگاتے ہیں۔ پرندے اُسے رسیلے گیت سناتے ہیں۔ پھول اُس کی خاطر کھلتے ہیں۔ اور فضا کو مہکاتے ہیں۔ کلیاں اُسے دیکھ کر مسکراتی ہیں۔ سبزہ اُس کی نگاہوں کے لئے لہلہاتا ہے۔ گھنگور گھٹائیں اُس کے دل کو لبھاتی ہیں۔ اسی طرح عورت اُس کا دل بہلاتی ہے۔ اُس کے بچے پالتی ہے۔ اُس کے باورچی خانے کا انتظام کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ جہانِ کائنات اور عالمِ عورات کو خلیفۃ اللہ یعنی آدمی یعنی مرد کے لئے خلا نے پیدا کیا ہے۔ مرد نہ ہوتا تو نہ کائنات عالمِ وجود میں آتی نہ عورت نہ بیوی نہ تم۔

بیوی:۔ اور عورت نہ ہوتی تو مرد کس طرح پیدا ہوتا۔ خاک کی انڈے سے؟

ہم:۔ مرد چونکہ خلافتِ الٰہیہ اور کائنات پر حکومت کرنے کے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے اُس کا پیدا ہونا تو ضروری تھا۔ عورت نہ ہوتی تو چاند سورج مرد کو جنتے۔ ستارے اُسے جنتے جنت کی حوروں کو اُسے پیٹ میں رکھنے اور دودھ پلانے کا شرف حاصل ہوتا۔ عورت کا تو یہ بڑا فخر ہے کہ اُسے مرد کی ماں اور اُس کی بیوی بننے کی سرفرازی حاصل ہوئی۔

بیوی:۔ تم نے کسی بڑے آدمی کا قول نہیں سُنا کہ جو ہاتھ پنگوڑا ہلاتا ہے۔ وہ حکومت کی باگ تھامنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہم:۔ یہ قول کسی بڑے آدمی کا نہیں۔ کسی خود فراموش بڑی عورت کا معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر کسی یورپین یا کسی مغرب زدہ انگلستان ریٹرنڈ ہندوستانی کا ہوگا۔ مغربی ملکوں کی زمین برفانی ہے۔ وہاں عورتوں نے مردوں کے حقوق کو دبا لیا ہے۔ یوں بھی وہ برفانی ملک نیاز مند شوہروں اور زن مرید میاؤں کی سرزمین بن گئے ہیں۔ وہاں کے شوہروں میں پانچ فیصدی سے زیادہ شوہریت نہیں ہوتی۔ ہم ٹھہرے سرزمینِ مشرق کے باشندے۔ سو فی صدی مرد اور سو ہی فیصدی شوہر۔ ہمارے ہاں تو جو ہاتھ پنگوڑا ہلاتا ہے ہمیشہ سے ہمیشہ تک پنگوڑا ہی ہلاتا رہے گا۔ سلطنت کی باگ تو درکنار اُسے گھوڑے کی لگام پکڑنے کی بھی اجازت نہ دی جائے گی۔

بیوی:۔ دیکھو! دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہے۔ اب نسوانی بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ عورتوں کو ووٹ کا حق مل چکا ہے۔ وہ زمانہ قریب ہے جب مرد پنگوڑا ہلایا کریں گے۔ بچوں کی پرورش اور باورچی خانے کی ماماگیری اُن کا فرض ہوگا اور عورت دنیا اور مرد پر حکومت کرے گی۔ یہ زمانہ دُور نہیں۔ تمہاری ہماری زندگی ہی میں آجائے گا۔ جب تک یہ مبارک دَور آئے۔ عورتوں کو چاہیئے کہ مردوں کا بائیکاٹ کر دیں۔

ہم:۔ دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کئی گنا زیادہ ہے یہ سچ ہے۔ مگر یہ کوئی اتفاقی امر تو نہیں۔ قدرت جان بوجھ کر عورتوں کی تعداد بڑھاتی ہے۔ اِس کا حُسنِ خلاقی قابلِ داد ہے۔ اِس میں لطیف اشارہ یہ ہے کہ عورت مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ ہر مرد اگر چاہے تو ایک سے لیکر چار تک شادیاں کر سکتا ہے۔ رہا ووٹ کا حق۔ یہ مغرب کے نیاز مند شوہروں کی بیہودگی اور بُزدلی ہے۔ ہم تو شروع ہی سے اِس کے خلاف ہیں۔ خدا نہ کرے۔ اگر عورتوں کا عہد حکومت آگیا تو ہم تو بیوی کچھ کھا کے سو رہیں گے۔ ہم سے تو تم پنگوڑا ہلانے کی امید نہ رکھو۔ باقی رہا مردوں کے بائیکاٹ کا سوال۔ ہم بھی اِس کی بزور تائید کرتے ہیں۔ وہ بڑا مبارک زمانہ ہوگا۔ جب عورتیں مردوں کا پیچھا چھوڑ دیں گی۔ مرد اپنی نیند سوئیں گے۔ اپنی بھوک کھائیں گے جو کچھ کمائیں گے اپنے اوپر اٹھائیں گے۔ کوئی تنخواہ کا دعویدار نہ رہیگا۔

سسرال کے جانداروں کی یالگت سے بچ جائیں گے ۔ زیورات، زرق برق زنانہ پوشاک، تیل پھلیل، گوٹا ٹھپا، مسّی سرمہ، لونڈر اور پوڈر کے جھنجٹ سے چھٹکارا پائیں گے ۔ تم اس بائیکاٹ کی تحریک کی لیڈر بن جاؤ۔ مضامین لکھ لکھ کر ہم دیں گے ۔ اپنے نام سے شائع کراؤ اور سب سے پہلے اس نیک تحریک کا آغاز ہمارے بائیکاٹ سے کرو۔ خدا تحریک میں برکت دے گا۔ ہم خوش ہمارا خدا خوش ۔

بیوی :۔ سسرال والا کون تمہارے ہاں موٹھ بونے آ رہا ہے؟ ایک لے دے کے میرا بھائی ہے ۔ وہی تمہاری آنکھوں میں کھٹکتا ہے مگر وہ تو جب تک میں جیتی ہوں ضرور آئے گا ۔ ہزار بار آئے گا ۔ جم جم آئے گا ۔ تمہارے گھر والے زہرہ پھاڑ کر مر جائیں ۔ اُسے آنے سے کون روک سکتا ہے؟ ۔ مت لیا کرو سسرال کا نام میرے سامنے ۔ بڑے بچارے منہ پہ ہر وقت سسرال کا نام رکھ چھوڑا ہے، اُس اُجڑی سسرال میں اب کون رہ گیا ہے؟ میری تین نوجوان بہنوں کو ٹوک ٹوک کر تو کھا چکے ۔ اماں تمہارے سبز قدم آنے سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں ۔ ایک بوڑھا باپ رہ گیا ہے وہ بھی کے دن اور کے رات کا ۔ باپ کی نشانی ایک بھائی ہے اُس کو میرے پاس آنے سے روکنے والا کون ہے روک کے تو دیکھے ۔

ہم :۔ ہمیں تو معلوم ہے تمہارا بھائی ضرور آئے گا ۔ ہزار بار آئے گا ۔ بلکہ آ گیا تو جانے کا نام نہ لے گا ۔ اُسے بھلا کون روک سکتا ہے ۔ شکر ہے تمہاری بہنیں ہمارے گھر آ کر نہ مریں ۔ ورنہ تم ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتیں ۔ اب تم مرنے لگو تو خدا کے لئے میکے چلی جانا! ہمیں سسرال والے تمہارا خون ہمارے ذمے تھوپ دیں گے ۔

بیوی :۔ مجھ سے کیوں بیزار ہو گئے ہو ۔ میں زیادہ جینے والی نہیں ۔ میری کسی بہن کو جوانی پرانی نہیں ہوئی ۔ جوان ہوتی گئیں مرتی گئیں ۔ میں بھی کوئی دن کی مہمان ہوں ۔ میرے خاندان میں عورتیں کالے چونڈے لیکر سدھار جاتی ہیں ۔

ہم :۔ آہ! بیوی ہم ایسے خوش نصیب کہاں ہیں؟ تم اگر کسی اور گھر جاتیں تو جواں مرگی کے متعلق تمہاری خاندانی روایات ضرور قائم رہتیں ۔ اب تو تم ہمارے گھر آ گئی ہو، بے خطرے رہو ۔ تمہارا یہ کالا لونڈا کالے سے بھورا، بھورے سے چٹا اور چٹے سے خدا جانے کیا کیا رنگ بدلے گا ۔ موت تم سے مایوس ہو چکی ہے ۔ بس ہمیں کو مرنا پڑے گا، تب کام چلے گا ۔ تم جم جم جیتے جاؤ ۔ ہمیں اپنا کچھ انتظام کریں گے ۔

بیوی :۔ میں تو تمہیں مار کے مروں گی ۔ کیا منہ بھر بھر کے مجھے کوس رہے ہیں؟ کوئی سنے تو کیا کہے؟

ہم :۔ تم بے فکر رہو ۔ ہمیں مار کے بھی تم جیتی رہو گی ۔ تم مرنے والی اسامی نہیں ہو ۔

بیوی :۔ خدا کلو لوا کو غارت کرے ۔ مردار نے گھر کے بیوے لے لئے تھے ۔ ماں زادی اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دادی بی کے پیٹ میں اُتر گئی ۔ "اے بیگم لڑکے کی دسوں انگلیاں دس چراغ ہیں میری آنکھوں میں خاک چہرے پہ ایسا نور برستا ہے کہ درود پڑھنے کو جی چاہتا ہے ۔ ایسا داماد چراغ لے کے ڈھونڈھو گی تو نہ پاؤ گی ۔ بیوی کے پاؤں دھو دھو کے پیا کرے گا ۔ ستّارہ نے دادی بی کو ایسا شیشے میں اتارا کہ اُس کا کلمہ بھرنے لگیں اور میری جیتی جان کو اندھیرے کنوئیں میں دھکیل دیا ۔ مجھے کہیں ملے تو مار مار کے بھتنی کا بھس بھر دوں ۔

ہم :۔ ہاں بیوی کہیں ہاتھ لگ جائے تو غیبانی کے پانچ چار ہماری طرف سے بھی لگانا ۔ ہمارے گھر والوں کو بھی اُس نے ایسی ہی بے سر پا باتوں سے اُلو بنایا تھا ۔ اماں مرحومہ کو صبح شام تمہارے متعلق بے معنی قصیدے سنایا کرتی تھی :۔

"بیگم صاحبہ! لڑکی کی بابت کیا بتاؤں، بس دیکھنے کی چیز ہے بے نظیر چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے ۔ بات کرتی ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں ۔ ناگوری بیل کی سی بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں، اونچی ستواں ناک، خندہ پیشانی، سڈول جسم ۔ سنہری رنگ پر لمبے لمبے کالے بال ۔ دھوپ چھاؤں کو شرماتے ہیں ۔ سمجھ دار ایسی کہ بڑے بڑوں کو عقل بتائے ۔ مبارک قدم اتنی کہ اُس کے دم قدم کے ساتھ لکشمی دیوی چھم چھم کرتی آئے گی" ۔ ہماری اماں بے چاری اُس چھپل پیری کے بھرّوں میں آ گئیں ۔ بے پوچھے گچھے جھٹ پیام جڑ دیا ۔ اُدھر سُنتا ہے ۔ تمہارا پیام کہیں سے آ نہیں رہا تھا ۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھ ۔ تمہارے میکے والوں نے فوراً منظور کر لیا ۔ اور اس طرح ہماری ماں کی سادگی اور تمہاری دادی کی پُرکاری سے ہماری تمہاری شادی کا حادثہ ظہور میں آیا ۔ ورنہ کہاں تم کہاں ہم؟ کہاں گنگو تیلن، کہاں راجہ بھوج؟

بیوی :۔ گنگو تیلن تمہاری کوئی آئی لگائی ہو گی ۔ مجھے اُس سے پھر کبھی تشبیہ دی ۔ تو اپنا سر پیٹ لوں گی ۔ لقوہ مارے اس زبان کو مٹی کیسی قینچی کی طرح چلے جا رہی ہے ۔ اچھا اب بھی کیا بگڑا ہے ۔ سوا لاکھ

روپے کا انتظام کر دو۔ آج چلی جاؤں گی۔ خدا رکھے میرے باپ کے یہاں میرے لئے کسی چیز کی کمی نہیں۔

ہم:۔ سوا لاکھ دس نہ بیس۔ اکھٹے سوا لاکھ۔ چل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔

بیوی:۔ کیوں میرے مہر نہیں دو گے۔ کہہ دو نہیں بندھے تھے۔ سوا لاکھ کے مہر؟ میاں یہ آئی بلا سوا لاکھ لئے بغیر نہیں ٹلے گی۔ اسی طرح کلیجہ چاٹتی رہے گی۔

ہم:۔ کلیجہ مرحوم ہے کہاں جو چاٹے گی۔ اُسے تو چاٹ چاٹ کے یہ ختم بھی کر چکی۔ باقی مہر وہر، وہ تم معاف کر چکی ہو۔ اب اگر تم مکر بھی جاؤ۔ تو ہمارے پاس تو سوا لاکھ پیسے بھی نہیں۔

بیوی:۔ میں نے ہرگز معاف نہیں کئے۔ کیوں معاف کروں؟ یتیم ہو۔ فقیر ہو، اپاہج ہو کون ہو۔ مہر تمہیں دینے پڑیں گے میاں! نہیں تو یاد رکھنا عالی جاہ بیگم کی بھتیجی ہوں۔ وہ الٰہ آباد تک مقدمہ لڑی تھیں اور جائداد چڑھوا دی تھی نیلام پر۔

ہم:۔ ہمارے پاس کیا دھرا ہے جسے نیلام پر چڑھوا دو گی۔ دو چار جوڑی کپڑے، تھوڑا سا سامان، کرنال شاپ کا سستا سا جوتا۔ ڈیڑھ ہزار کا قرضہ اور ایک کرایہ کا مکان ہے۔ یہ تمام مقدمے کے بغیر ہی ہم سے لے سکتی ہو۔ رہا لال پھاٹک۔ اس کا بھی ہمیں خوف نہیں۔ مقروض قیدی کو کوئی مشقت نہیں دی جاتی۔ وہاں فرصت میں خوب غزلیں لکھا کرینگے۔

بیوی:۔ دنیا میں تم سے نہ وصول ہوئے۔ تو قیامت میں تمہارا گریبان ہوگا اور میرا ہاتھ کھینچے کھینچے پھروں گی۔

ہم:۔ اجی قیامت جب آئے گی دیکھا جائے گا۔

بیوی:۔ کیوں مرنا نہیں تمہیں؟

ہم:۔ نا۔ مرنا کونسا ایسا ضروری کام ہے۔ کہ کسی کا جی چاہے، نہ چاہے، یہ کام ضرور کرے۔

بیوی:۔ تم یونہی زبان چلائے جاؤ گے، میرا مہر نہیں دو گے!

ہم:۔ کہاں سے دیں تمہارا مہر؟

بیوی:۔ اپنے گردے میں سے دو۔ اور کہاں سے دو۔

ہم:۔ ہمارے گردے میں کیا رکھا ہے۔ تم اپریشن کرا کر دیکھ لو۔ روپیہ تو روپیہ جو تمہاری قسمت کی پتھری بھی نکل آئے۔ تو ہم جھوٹے۔

بیوی:۔ اپنی جان بیچ کر دو۔ کہیں سے دو۔

ہم:۔ ہماری جان کی تو موت بھی گاہک نہیں۔ تمہیں چاہیئے تو مہروں کے بدلے میں لے سکتی ہو۔

بیوی:۔ ظالموں کے جیتے کی موت بھی تو مٹ گئی۔

ہم:۔ ہاں دیکھ لو۔ تم مرتی ہو، نہ تمہاری دادی۔

بیوی:۔ میں تمہیں مار کر مروں گی۔

ہم:۔ تم ہمیں مار کر بھی جیتی رہو گی بیوی۔ ظالموں کی رسی بڑی دراز ہوتی ہے!

(باقی آئندہ) "علامہ ظریف"

بیوہ

سپید پوش۔ لبوں پر سکوت۔ چہرہ فق ہوا میں کاکلِ بے شانہ رازدارِ قلق
جبیں، حکایتِ ناگفتنی کا آئینہ ہو نگاہ، خانۂ افسردگی کی "مکینہ"
جگر پہ ضربتِ تیغِ الم سہاگ کی یاد ہو نگار خانۂ چیں کا "کھنڈر" دلِ ناشاد
اُداسیوں کا وہ عالم کہ مضمحل دنیا تصورات "سکون بخش" میں مخلِ دنیا
نہ ستارے سے تعلق نہ ہار سینے پر سنگار بھینٹ چڑھا بیوگی کے جلنے پر
ضعیف ولولۂ دل۔ اُمنگ پژمردہ ہو حجاب مانعِ شوخی۔ شباب افسردہ
کلائیوں کو نہ لچھوں سے واسطہ باقی حنا سے دُور کفِ دست و پا کی بُراقی
سہاگنوں میں شرارت کی گفتگو سے الگ ہر آرزو سے کنارے۔ ہر آرزو سے الگ
سحر کو محوِ ادائے فریضۂ سحری
نگاہ دیکھ رہی ہے خضوع و بے خبری

شاد عارفی

باورچن شہزادی

کسی کے پاس ملازم تھی ایک باورچن — سلیقہ مند و جفاکش اسیرِ رنج و محن
جفا نصیب غریب الدیار دکھیاری — متاعِ جنسِ الم گنجِ صبر و ناداری
جگر میں ٹیس تھی دنیائے دل تہہ و بالا — بجائے خون رگوں میں تھا درد کا دورا
خزاں نصیب تھی ناواقفِ بہار تھی وہ — یتیم بچے تھے شوہر کی سوگوار تھی وہ
ہر اک ستم تھا اسی کے لئے زمانے کا — ورق تھی ایک وہ تاریخ کے فسانے کا
تغیرات کچھ ایسا فشار دیتے تھے — کہ اور حسنِ خزاں کو نکھار دیتے تھے

پھنسی ہوئی تھی جو نیرنگیوں کے پھندے میں
تو دن تمام گزرتا تھا کام دھندے میں

زمیں پہ چھٹکی تھی جب شب کو چادرِ مہتاب — زمانہ ہوتا تھا جس وقت نیند میں غرقاب
ستارے جبکہ ترنم نواز ہوتے تھے — جب اپنے حسن پہ فطرت کے ساز ہوتے تھے
زمیں پہ ہوتا تھا جب ہر طرف سکوں طاری — گلوں میں ہوتی تھی جس وقت شانِ دلداری
تمام خلق تو پھیلا کے پاؤں سوتی تھی تو — مگر وہ غمزدہ قسمت کو اپنی روتی تھی تو
مصیبتوں کا فسانہ زباں پہ ہوتا تھا — جگر زمین کا شق جس بیاں پہ ہوتا تھا
ہر ایک اشک نظارہ تھا جورِ ہستی کا — ہر اک نفس میں اشارہ تھا اپنی پستی کا
اِدھر تھی شعلہ زنی آہ کے شراروں کی — جھپکتی جاتی تھیں نظریں اُدھر ستاروں کی
نوائے درد سے لبریز تھی فضا ساری — کہ بار بار لرزتا تھا چرخ زنگاری

یہی وظیفہ تھا ہر روز رات کو اس کا
یہی تھا اس کے لئے جام و بادہ و مینا

پسر تھے تین حوادث نواز دُکھیا کے — کہ تین ہی تھے ورق کلّیاتِ بیوا کے
یہ تینوں لختِ جگر ناسمجھ تھے اور معصوم — کہ جن کو دیکھ کے ہوتی تھی اور وہ مغموم
وہ ننھے ننھے سے بچے وہ ماں کی ناداری — نصیب ہوتی تھی روٹی جنہیں بدشواری
کیا تھا فاقہ کشی کی وبا نے یوں بیمار — کہ زرد ہو گئے تھے ان کے پھول سے رخسار

متاعِ زیست کو جورِ فلک نے لوٹا تھا
خزاں رسیدہ چمن کا ہر ایک بوٹا تھا

وہ مبتلائے الم دفعتاً ہوئی بیمار — اجل کا گویا کہ پیغام لے کے آیا بخار
پڑی رہی یونہیں بیچاری چارپائی پر — کسی نے دیکھا نہ اس کی طرف اُٹھا کے نظر
کسے تھی فکر کوئی چارہ گر کو کیوں لاتا — کوئی غریب پہ کس واسطے ترس کھاتا
علاج کیسا تنفر شعار ہوتا تھا — کہ اس کے پاس بھی آنے میں عار ہوتا تھا
یونہیں تڑپتی رہی تین دن وہ دُکھیاری — جڑیں پکڑتی گئی خوب اس کی بیماری

مرض کو بیکس و لاچار سے پڑا پالا
خمارِ زیست کو ٹھنڈا اجل نے کر ڈالا

بوقتِ نزع میں طالب گیا جو بالیں پر — تو دیکھا اشک ہیں آنکھوں میں حال ہے ابتر
میں چاہتا تھا کہوں کچھ بطرزِ اہلِ نیاز — یہ کہہ کے رُوح مگر اس کی کر گئی پرواز

میں اپنا دورِ سلف یاد کر کے روتی ہوں
بگوشِ ہوش سنو! میں ظفر کی پوتی ہوں

طالب فارسی



"ہائے دُنیا"

ہائے دُنیا -
تو میری ایک ہی بات سُنتی -
تو میں اپنی زندگی پر کس قدر اتراتا -
کتنا ناز کرتا — کتنا خوش ہوتا
اتنا تو تم دیکھتی — میرے دل میں تم سے کہنے کے لئے
کتنی باتیں ہیں

(۲)

تم نے مجھے پیدا کیا — بہت اچھا کیا
لیکن مجھے پیدا کرنے سے پیشتر تم نے سوچا تھا
کہ میں جیوں گا نہیں — جینے کی نقل کرونگا -
ہنسونگا نہیں — روؤنگا -
گاؤں گا نہیں — آہیں بھرونگا
یہ سیدھی سادی باتیں تم نے سوچ لی تھیں
کہو — امیروں کی حسین دُنیا ! کہو

(۳)

اور کیا تجھے نہیں معلوم -
میں اس محفل کی طرح ہوں - جس کا چراغ سرِشام ہی بجھ
گیا ہو -
اس ساز کی طرح — جس کے تار ٹوٹ گئے ہوں
اس آبشار کی طرح — جو ہمیشہ روتا ہی رہتا ہے
اس دل کی طرح — جو اندر ہی اندر شمع کی طرح گھُل
جاتا ہے
غریب کی دنیا — کیا تجھے یہ نہیں معلوم ؟
اچھا یہ تو بتاؤ -
میری قسمت لکھتے وقت
تم نے قدرت کا ہاتھ کیوں روک لیا تھا ؟
اُس کی دی ہوئی سیدھی لکیروں کو
تم نے خم دے دے کر ٹیڑھا کیوں بنا دیا تھا ؟
میری قسمت کی شمع
تم نے پہلے ہی دن اپنے دامن سے کیوں بجھا دی تھی

(۴)

اور
جس صبح تو فیاضی سے قہقہے بانٹ رہی تھی
اس صبح مجھے بھی یاد کیا تھا ؟
جس دوپہر کو تو ولولے اور مسرتیں خیرات کر رہی تھی -
اس دوپہر کو مجھے بھی بلایا تھا -
جس شام تو جلتے ہوئے چراغ تقسیم کر رہی تھی -
اس شام تجھے میرا بھی خیال آگیا تھا -
اور جس رات تو محبت اور میٹھی نیند دل کا دان کر
رہی تھی -
اُس رات مجھے بھی کچھ دیا تھا ؟
کہو - کہو - امیروں کی حسین دُنیا

(۵)

میں تمہارا کیا بگاڑ سکونگا
میرا غصہ تو اُس ندی کے زور کا سا ہے - جو اپنے ہی
کنارے گرا دیتی ہے
میرے آنسو کانٹوں پر پڑے ہوئے شبنم کی طرح خاموش
میری آہیں — خزاں زدہ پتّی کی آگ کا دھواں !
میری آواز — صحرا میں بھٹکے ہوئے دیوانے کا قہقہہ
میں تمہارا کیا بگاڑ سکونگا -
کچھ بھی نہیں -

(۶)

لیکن تمہارے اس در پر بیٹھے بیٹھے -
تمہارے آستان کی مٹی پہ لوٹ لوٹ کر

تمہاری طرف بھیگی ہوئی نظریں اٹھا اٹھا کر
اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں کو زبان سے بھگو بھگو کر
اور اپنی آواز کو اپنی ساری طاقت سے آزما آزما کر
ہمیشہ کہتا رہونگا ۔ "ہائے غریبوں کی دنیا"
تو میری ایک ہی بات سُنتی
تو میں اپنی قسمت پر کتنا اترا تا "

پریم ناتھ سادھو رونق کاشمیری

بقیہ سوال وجواب

سرسید کو حسن اتفاق سے ساتھی ایسے ملے کہ جو اپنی اپنی جگہ فخر روز گار تھے اس علمی سوسائٹی نے اپنی بیش بہا تصانیف سے اردو کو اردو بنایا۔ اس دور کی اردو نثر کے خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

سادہ سلیس، عام فہم، عربی الفاظ کی آمیزش، پیرایۂ بیان عالمانہ، تلمیحات کی کثرت اس دور میں زیادہ تر اصلاحی، مذہبی، سیرت نگاری، تاریخی اور علمی کتابیں لکھی گیئں۔

سرسید۔ پروفیسر ذکا اللہ۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی۔ علامہ شبلی۔ مولانا حالی اور ان کے ہم عہد مصنفوں میں مولانا محمد حسین آزاد دہلوی، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی وغیرہم بھی "سرسید اسکول آف اردو لٹریچر" کے قابل قدر ممبر تھے۔ ان کی سحر نگاریوں نے اردو کے اس دور کو کامیاب بنایا۔

تاجور

غزل

نہ مرنے کی خواہش نہ جینے کی آس — میری زندگانی ہے کتنی اُداس
محبت ہے خاموش تاروں کی ضو — محبت ہے خوشرنگ پھولوں کی باس
نہ چھیڑو، مری رُوح کے ساز کو — کہ ہونا پڑے گا تجھی کو اُداس
غموں کو میں کیسے کہوں خیرباد! — ہوائے مسرت نہیں دل کو راس
محبّت کو سمجھے ہوئے ہوں جنوں! — ٹھکانے نہیں میرے شاید حواس
بظاہر ہے مجموعۂ رنگ و بو — حقیقت میں ہے گل جنوں کا لباس
محبّت کی افسردگی، کچھ نہ پوچھ — فلک پر ہیں چاند اور تارے اُداس
یہ دل، یہ غم و درد کی کائنات — کتابِ محبّت کا ہے اقتباس
کسی کی نگاہِ حسیں کے طفیل
اثر بجھ گئی ہے مرے دل کی پیاس

افکارِ تازہ

خود فراموشی و خاموشی و راحت کوشی — یہی رندی ہے تو رندی کو سلام اے ساقی
وہ پلا جس میں ہو مستی کے عوض جوشِ عمل — شورِ قلقل بھی عمل کا ہو پیام اے ساقی

"معارف"

اُس نظر کی چوٹ کھا کر رہ گئے — ہم ہی تھے جو مُسکرا کر رہ گئے
آستاں نزدیک تھا ہم دُور تھے — اپنے اوپر رحم کھا کر رہ گئے
ہم کہاں تکلیفِ خود بینی کہاں — دل کا آئینہ بنا کر رہ گئے

"عالمگیر"

کُلفتِ عشق کا حاصل بھی گیا — درد کے ساتھ مرا دل بھی گیا
ڈوبنے والا تو ڈوبا لیکن — وہ وقارِ لبِ ساحل بھی گیا

مجلہ عثمانیہ

دل وہ شعلہ ہے مرے دل کے جلانے والے — اس کو اُڑنا اگر آجائے تو ختم ہو جائے
سوگوارِ غمِ ہستی باغمِ ہستی کی قسم — دل وہ شیشہ ہے کہ تو چاہے تو پتھر ہو جائے
تجھ کو جینا بھی سکھا دے گا ترا سوزِ طلب — پہلے مرنے کا سلیقہ تو میسّر ہو جائے

"برہان"

تیرے لب پر جو بات ہوتی ہے — مژدۂ صد حیات ہوتی ہے
دن بھی اب اس طرح گزرتا ہے — جیسے فرقت کی رات ہوتی ہے
اب جفا بھی نہیں برائے جفا — از رہِ التفات ہوتی ہے

"ساقی"

بھولی ہوئی وصال کی باتوں کو کر کے یاد — فطرت سے بھیک مانگ رہا ہوں سرُور کی
اُف رے وقارِ خاک نشینانِ کوئے عشق — حالِ خراب میں بھی ادا ہے غرُور کی
اس کے سوا کسی کے تبسّم کو کیا کہوں — ہے اِک پھوار سی مہ و انجم کے نوُر کی

"ادیب لطیف"

سوال و جواب

سوال

علامہ محترم کرم فرما کر اردو نثر کے پہلے دوسرے اور تیسرے دور پر مختصر انداز میں ایک نوٹ درج شاہکار فرمائیے ممنون ہوں گا۔

محمد رشید بی۔اے، ملتان پاک دروازہ

جواب

اردو نثر کا پہلا دور:۔ اس دور کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ دکن میں اردو نثر کی بعض کتابیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن کا عہد تصنیف ۸۰۰ھ کے قریب ثابت ہوتا ہے۔ اس حساب سے اردو کی ابتدا کو آج سے کم و بیش ساڑھے آٹھ سو سال گزر چکے ہیں۔

۸۰۶ھ میں شیخ گنج العلم کے فقہی رسائل خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین اور ہدایت نامہ۔ سید محمد عبداللہ کا اردو ترجمہ نشاط العشق۔ میراں جی شمس العشاق کی کتاب جل ترنگ اس دور کی نثری تصانیف ہیں۔

اس عہد کی اردو کیا ہے؟ درحقیقت ہندی۔ تامل تلنگو اور اسلامی اصلاحات سے مل جل کر ایک مرکب تیار ہوا ہے۔ جسے اردو کی شکل ہیولانی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

اور کی بجائے ہور، سے کی جگہ تے، اپنے کو اپنڑے، مجھے کو منجے، کو کے موقعہ پر، کون، فرماتے ہیں، کی جگہ فرمائے ہیں۔ نہ کی بجائے نا، ہو کو ہوئے لکھتے تھے، زبان کا ڈول اس درجے بے ڈھنگا اور ناتراشیدہ تھا کہ آج اسے قرائن کی مدد کے سوا سمجھنا دشوار ہے، نثر تو خیر لیکن اس عہد کی نظم کو تو بمشکل ہی اردو نظم کا نام دیا جا سکتا ہے۔ نظم میں دکنی الفاظ اکثر استعمال کئے جاتے تھے۔ ذیل کے اقتباسات سے پہلے دور کی نثر کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

حضرت خواجہ بندہ نواز رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب معراج العاشقین میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"نبی کہے تحقیق خدا کے بیان نے ستر ہزار پردے اوجیالے کے ہور اندھیارے کے اگر اس میں تے یک پردہ اٹھ جاوے، تو اس کی آنچ تے میں جلوں ہوا ایک وقت ایسا ہوتا ہے سمجھ اور دیکھ بے پروا اندھارے کے اوجیالے کے عارفاں پر ہے۔ دے واصلاں پر پردے نورانی، و بے واصلاں کا صفا پیدا ہوتا ہے۔ محمدؐ کا نور اے عزیز اول ربوبیت کا پردہ سوائے تن جمالی جسم کے پردے کوں انپڑے یا ج اس جمال الوہیت کے پردے ممکن الوجود کوں انپڑ سکے۔"

(معراج العاشقین مطبوعہ تاج پریس حیدر آباد صفحہ ۲۱)

"اے عزیز مرید صادق اچھے پیر کے سوا کون امر خدا ہو، رسول پیدا کیا ہے۔ اپنے بوج کوں محمدؐ کون یہی ہے، نصیحت کرنے کوں اس بات میں امام جعفر صادق خوب فرمائے ہیں، پیر کوں درکار ہیں، دس جتا سمجھنا، سو اس پر فرض ہوتا ہے۔ اول علم اچھے دانائی کا بوج کا، دوئم سخاوت اچھے دل کا، سوم عمل اچھے دانائی کا، چہارم مرید کے مال سوں طمع نہ کرنا حرص کا پنجم نادانی کا بات نہ کرے مریداں میں، ششم عقل اچھی، ہفتم شجاعت اچھی، ہشتم یاد میں رہنا، نہم حال پہ حال ہوئے، دہم سو بوجھ کا مالک ہوئے۔"

(معراج العاشقین عبارت خاتمہ)

اردو نثر کا دوسرا دور:۔

اردو نثر کے اس دور کی بنیاد اٹھارہویں صدی عیسوی کے اخیر میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کے مبارک ہاتوں سے رکھی گئی۔

کلکتے کے مشہور قلعہ فورٹ ولیم میں حکومت برطانیہ کی جانب سے اُن تازہ ولایت انگریزوں کی تعلیم کے لئے ایک کالج قائم کیا گیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو کر ہندوستان آیا کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی نے ڈاکٹر گلکرائسٹ کو اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا۔ صاحب موصوف کو ہندوستانی زبان میں تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ انہوں نے خود بھی انگریزی زبان میں اردو گرامر۔ اردو ڈکشنری اور چند اور کتابیں تصنیف کیں۔ اور دور دور سے نامور اردو ادیب تلاش کر کے ایک دارالترجمہ والتالیف قائم کیا۔

اس لٹریری سوسائٹی کے ممبروں میں حضرات ذیل قابل ذکر ہیں:۔

میر امن دہلوی۔ حیدر بخش حیدری۔ میر شیر علی افسوس۔ لالہ نہال چند لاہوری مرزا علی لطف۔ مرزا کاظم علی جوان۔ مظہر علی ولا۔ سری للو لال کوی۔

۱؎ اسالیب بیان مصنفہ ڈاکٹر نذر قادری

موخر الذکر نے ہندی نثر میں کہانیاں لکھنے کے ساتھ ہی اردو مصنفین کو ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنے میں مدد دی۔

چونکہ کہانیوں سے انسان کو بدو فطرت سے انس چلا آتا ہے۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے فطرت کی اداشناسی سے کام لے کر حضرات مذکورہ سے فارسی قصوں کو ہندی نثر میں ڈھالنے کا کام لیا۔ تاکہ کہانیوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی ملک میں ہردلعزیزی حاصل کرسکے۔ یہ تدبیر اسقدر کامیاب ثابت ہوئی کہ اردو دنیا آج نصف صدی بعد بھی اُس عہد کے قصے کہانیاں کو فراموش نہ کرسکی۔ چنانچہ شمالی ہند کے عام اردو خوانوں میں اب تک بھی قصے چہار درویش، طوطا کہانی، آرائش محفل وغیرہ رونق بزم و انجمن بنی ہوئی ہیں۔

اس ادبی محفل کی جانب سے جو اردو کتابیں شائع ہوئیں اُن میں ذیل کی تصانیف نے خاص طور پر قبولیت حاصل کی۔

باغ و بہار۔ طوطا کہانی۔ آرائش محفل۔ باغ اردو۔ گلزار دانش نثر بے نظیر گل بکاؤلی۔

اس عہد کی اردو نثر دورِ اول کی رُو سے بہت مختلف ہے۔ پہلے دور کی اردو میں تعقید لفظی و معنوی حروف ربط کا بے سروپا استعمال، تنافر حروف، بے ربط جملے، بے جوڑ فقرے، وکتی الفاظ کی بھرمار کے سبب عبارت عسیر الفہم ہوتی تھی۔ اس دور کی نثر درحقیقت اردو نثر کا صحیح نام پانے کی مستحق سمجھی جاسکتی ہے۔

اس دور کے مصنفین نے اردو کو صیقل کر دیا ہے۔ بے کینڈے اور سامعہ خراش الفاظ کو تراش خراش کے بعد مترنم بنا دیا ہے، تنافر حروف کے عیب سے عبارت پاک ہے۔ فورٹ ولیم لٹریری سوسائٹی نے جس سادہ سلیس عام فہم گنجلک اور تعقید سے پاک اردو کے نمونے پیش کئے وہ آج بھی اردو کے ترقی یافتہ انشا پردازوں کے لئے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔

اسی اردو کو مرزا رجب علی سرور لکھنوی نے فسانہ عجائب میں "اردوئے معلی" سے اردوئے مطلی بناکر زبان کی فطری سادگی کو آرٹ کے سانچے میں ڈھال دیا۔ پیچ در پیچ استعارے، تشبیہات کے شکن در شکن زنجیرے، دور از کار بلکہ بے کار مبالغے۔ مقفیٰ و مسجع فقرے۔ اس قسم کی پابندیوں نے زبان کو چیستان کی طرح عسیر الفہم بنا دیا۔ اس وقت اردو کے پُر تکلف و پُر تصنع تمدن و معاشرت کا زندگی کے ہر شعبے پر اثر پڑ رہا تھا بھلا زبان اور لٹریچر اس بادِ سموم سے کیوں کر محفوظ رہ سکتے تھے۔

فسانہ عجائب کی طرز (سٹائل) اسقدر مقبول ہوئی کہ ہر ادیب فیشن کے طور پر اسی طرز کی تتبع کرنے لگا۔

مرزا غالب جو اردو نثر کے تیسرے دور کا بانی ہے۔ مکاتیب کے علاوہ اپنی دوسری اردو تحریروں کو اس رنگ سے نہ بچا سکا۔ غالب کے معاصرین مولینا غلام امام شہید اور مولینا بے خبر پر تو یہ رنگ صرف کھلا ہی نہیں بلکہ جم گیا ہے۔

اردو نثر کا تیسرا دور: - اس دور کی بنیاد مرزا غالب کے اُن خطوط پر رکھی گئی ہے جو "اردوئے معلی" کے نام سے شائع ہوئے۔ اُن خطوط کی اردو اس عہد میں سب سے جُدا، سب سے ممتاز ہے۔ اور اس وقت سے اب تک حیرت انگیز طور پر غالب نے اس طرز میں اپنے کسی حریف کو اُبھرنے نہیں دیا۔

غالب کی اس اردو پر "سرسید اسکول آف اردو" کی بنیاد رکھی گئی۔

غالب سے پہلے اور اس کے عہد تک بھی مرزا رجب علی سرور لکھنوی کی مقفیٰ و مسجع نثر ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک ہردلعزیزی حاصل کرچکی تھی۔ خطوط کے علاوہ خود غالب کی دوسری تحریریں بھی اسی صنعتی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ غالب کے معاصر مولینا غلام امام شہید اور مولینا بے خبر اسی طرز کا اتباع کرتے رہے۔ یہ اردو کی خوش نصیبی تھی کہ غالب کو ضعف دماغ طاری ہوا اور انہوں نے اس وقت کے دستور کے خلاف فارسی میں خطوط نویسی کی جگہ کاویوں سے تنگ آکر اپنے دوستوں، شاگردوں اور عزیزوں کو اردو میں خطوط لکھنے شروع کر دئیے۔ چنانچہ وہ اپنے شاگرد کے شکایتی خط کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "کیا کروں دماغ اس قابل نہیں رہا کہ فارسی میں خطوط نگاری کرسکوں۔ اس لئے مجبوراً اردو میں تمہیں خط لکھ دیا۔"

ورنہ اگر خدانخواستہ اخیر عمر تک دماغ غالب کا ساتھ دے سکتا تو صرف یہی نہیں کہ اردو ادب "اردوئے معلی" جیسی گراں پایہ کتاب سے محروم ہوجاتا۔ بلکہ اردو نثر کے تیسرے دور کا آغاز ایک مدت دراز کے لئے معرض التوا میں پڑ جاتا۔

سرسید کی دوربین نگاہ تاڑ گئی کہ اردو کو علمی زبان بنانے کے لئے ضروری ہے کہ سرور کی غیر قدرتی صنعتی پابندیوں سے آزاد کرکے اردو کو سلیس، عام فہم اور سادہ بنایا جائے۔ مرزا غالب کی اردوئے معلی کو نمونہ بناکر انہوں نے اور اُن کی پارٹی نے اسی سلیس اور سادہ اردو میں وہ یادگار کتابیں لکھیں جو آج تک اردو ادب کا بہترین سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۹۷ پر دیکھیں)

تصحیح

"کہنے لگ گیا ۔ سننے لگ پڑا"

صوبہ پنجاب کے عام ادیب "کہنے لگ گیا، کہنے لگ پڑا" لکھتے بولتے ہیں۔ پنجاب کے اہلِ قلم کو چاہیئے کہ اس کی تصحیح کریں اور اس غلطی کو دائرۂ تحریر و گفتگو سے خارج کردیں

صحیح روزمرہ یہ ہے:۔

"کہنے لگا، سننے لگا۔ آنے لگے۔ جانے لگے"

گیا اور پڑا کے لفظ زائد اور غلط ہیں۔

تاجورؔ

تصحیح

گزشتہ نمبر کے مضمون " بیوی سے پہلی جنگ کی داستان" میں کتابت کی ایک غلطی رہ گئی:۔

"حواس پاش موسیقی سے کمہاروں کے محلّے جگمگا اُٹھتے ہیں۔"

کمہاروں کی بجائے کہاروں چھپ گیا ہے۔

(ادارہ)

حسینی گھسیارہ

برسات کا موسم، شام کا وقت، کچھ گھمس کی صورت تھی۔ منشی سخاوت علی دوپلی اوڑھے، ململ کے کرتے پر نین سکھ کا انگرکھا، سفید کھڑی کاٹ کا پائجامہ، ہلکی سی چھڑی لئے سیر کو نکلے اور گھاس منڈی جا پہنچے۔

بارش تھی، منڈی میں جو گٹھڑیاں پہنچیں، بکتیں رہیں، خریداروں میں تردد نہ تھا بھاؤ تیز رہا۔ مگر منشی جی تیز مال کے خریدار نہ تھے۔ انہیں تجربہ تھا۔ کہ بارش ہو یا آندھی گھسیاروں اور خریداروں کی تعداد میں فرق نہ آئے گا۔ اور اگر گھوڑے کے لئے گھاس ضروری ہے تو گھسیارے کا بھی پیٹ اور بال بچے ہیں۔ وہ گھاس لائے گا اور بن بیچے نہ جائے گا۔ شام ہو چکی تھی۔ چراغ بتی جل چکے تھے۔ گھاس منڈی میں رونق ہوتی ہے۔ گھسیارے بھی پرکھ کر اپنے مال کے دام لگاتے ہیں۔ بازار دیکھتے ہیں۔ قیمت کے اُتار چڑھاؤ ہوتے ہیں۔ خریدار کی پسند کا اندازہ لگتا ہے۔ یہ بیوپار ہے۔ تجارت ہے۔ گھسیارہ بھی اپنے بازار میں ہوتا ہے۔ وہ بھی سوداگر ہے۔ زعفران نہ سہی۔ گھاس تو بیچتا ہے۔ ہر ایک آدمی گھسیارہ نہیں ہو سکتا۔ منشی جی کو یہ رنگ سب معلوم تھے۔ اس وقت منڈی میں وہ رونق نہ تھی۔ برسات تھی۔ ترشح تھا۔ اُودی اُودی گھٹاؤں کے باعث اندھیرا چھا رہا تھا۔ آسمان کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔

منشی جی اپنے خیال میں محو تھے، آنکھیں کسی گھسیارے کی راہ پر لگی تھیں۔ مگر ذہن میں گزرے زمانوں کے رنگ آآ کر لوٹ رہے تھے۔

اس اندھیرے میں ایک گھسیارہ منڈی میں پہنچا۔ گھاس کا گٹھا لٹھیا کے سہارے سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ منشی جی نے اُسے دیکھا مگر وہیں کھڑے رہے۔

گھسیارے نے گٹھا زمین پر ڈال دیا۔ خود بھی بیدم تھا۔ زمین پر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے لٹھیا زمین پر ٹیکے تھا۔ ان پر اپنا سر رکھ دیا۔ اندھیرے میں اس کے حُلیہ کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ البتہ ایک چارخانہ تہبند تھا جو رانوں تک بندھا تھا۔ تن پر کھدر کی مرزئی جس کی آستینوں سے کہنیاں نکلی ہوئی تھیں۔ سر پر ایک ٹاٹ کا ٹکڑا پانی میں شرابور ہو رہا تھا۔ پاؤں میں جوتی نہ تھی۔ شاید گٹھے میں بندھی ہو۔ اُس نے دم لیا۔ لکڑی کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد لمبا تھا۔ پیٹ پیٹھ سے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ایک قد آور آدمی کے تھے..... مگر ان کی توانائی کا کچھ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس نے سر سے ٹاٹ اُتار کر نچوڑا اور زمین پر رکھ دیا۔ سر کے پٹے (کنوتیاں) لمبی لمبی انگلیوں سے جھٹکے اور دائیں بائیں گاہک کے لئے نظر دوڑائی۔ منشی جی نے دیکھا۔ اُس کی طرف بڑھے۔ اور پوچھا:

منشی جی: - کہو بھیا۔ بڑی دیر میں پہنچے۔ اب کوئی کیا خریدے گا۔ خریدنے والے لے کے چلدیئے۔ یہ گٹھا بیچو گے یا ٹھیکہ کا لائے ہو۔

گھسیارہ: - ہاں پانی تھا۔ دیر ہو گئی۔ میں لاتا بھی دُور سے ہوں۔ یہ بکری کی ہے۔

منشی جی: - (گھاس ٹٹول کر) ہاں۔ کیا پتہ لگ سکتا ہے۔ کچی سی ہے بھیگی بھی بہت ہے۔

گھسیارہ: - سرکار۔ بات کاٹنا نہیں چاہتا۔ دوبڑا ہے۔ کچی نہیں اور آپ جانتے ہیں جنگل میں تو بارش نے دم نہیں لینے دیا۔

منشی جی: - (گھاس سونگھ کر) بھیا بدبودار بھی ہے۔ کس نالی پر سے چھیل لائے۔ میدان کی گھاس جانور خوب رغبت سے کھاتا ہے۔ ایک تنکا نہیں رہنے پاتا۔ خیر اس وقت یہی سہی۔

گھسیارہ: - سرکار معاف کیجیے۔ کہہ نہیں سکتا۔ بدبو والی جگہ سے گھاس نکالنے کو خود اپنی طبیعت نہیں چاہتی۔ مانا آپ خرید کر لے جاتے ہیں۔ مگر ہم تو جانتے ہیں کہ جانوروں کی بھی طبیعت ہوتی ہے۔

منشی جی:۔ ارے بھئی اپنے مال کی ہر ایک تعریف کرتا ہے۔ اچھا کہو کیا دام ہوں گے۔

گھسیارہ:۔ جو مناسب سمجھیں لگا دیجئے گا۔

منشی جی:۔ تمہارا ہی کہنا ہے۔ تو جلدی کرو۔

گھسیارہ:۔ آپ ہی کہہ دیتے تو اچھا تھا۔ بڑی دور سے لایا ہوں سارے رستے پانی برستا رہا۔ بڑی اچھی گھاس ہے۔ ساڑھے چار آنے دید یجئے۔

منشی جی:۔ ارے بھئی ہم تو ایک ہی کہتے ہیں۔ اڑھائی آنے دیں گے۔ اگر منظور ہوں تو اٹھاؤ۔ ورنہ تمہاری مرضی۔ ہم جاتے ہیں۔

غریب گھسیارہ منشی جی کو جاتے دیکھ کر کچھ سہم سا گیا۔ ذرا سوچا۔ گٹھے کو دیکھا۔ آخر پکارہ۔

گھسیارہ:۔ اچھا صاحب لے لیجئے۔

منشی جی:۔ تو اٹھاؤ چلے آؤ۔

گھسیارہ:۔ جناب بوجھ ذرا بھاری ہے (ایک آدمی کو بلا کر) ارے میاں۔ ذرا ہاتھ لگا دینا۔

آدمی:۔ گھاس کے کیا دام پائے؟

گھسیارہ:۔ دس پیسے میں سودا ہو گیا۔

آدمی:۔ ارے میاں اتنی گھاس اور آج۔

گھسیارہ:۔ بھائی مقدر تو یہی ہے۔

منشی جی:۔ ارے چلتے ہو یا مرضی نہیں۔

گھسیارہ:۔ آیا۔ سرکار۔ آرہا ہوں۔ (پاس پہنچ کر) لیجئے آپہنچا۔ کس محلہ میں جائے گا۔

منشی جی:۔ لال کنواں! چلے آؤ! بہت تیز نہیں۔ بس چل رہے ہیں۔ چوک۔ بازار اور سڑکوں سے ہوتے ہوئے لال کنواں آگیا۔ کچھ عمر کا تقاضا۔ کچھ وقت کا۔ منشی جی گھسیارے سے باتیں کرتے کرتے گھر پہنچ گئے۔ راستے میں گھسیارے سے سلسلہ گفتگو جاری رکھنے کی کوشش کی۔ مگر اس نے "جی حضور" اور "بجا فرماتے ہیں"۔ سے زیادہ جواب نہ دیا۔

گھسیارے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ منشی جی کبھی کبھی ٹھٹھک جاتے تھے۔ لیکن پھر دل ہی دل میں کہتے کہ کیا بات ہے۔ شہر میں رہتے رہتے ان گنواروں کا انداز گفتگو شہریوں کا سا ہو جاتا ہے۔

گھسیارے نے طویلہ میں گھاس ڈالی اور لکڑی سے کوٹ۔ پیٹ۔ جھاڑ کر قرینہ سے کونہ میں لگا دی اور کھرپا جالی میں لپیٹ رسی سے باندھ صدر دروازے پر پیسوں کے لئے آکھڑا ہوا۔ منشی جی کا مکان ایک عالی شان حویلی تھی حویلی کیا تھی ایک خوبصورت قصر تھا۔ صدر دروازے کے دائیں بائیں کرسی پختہ چبوترے اور محرابی دیوان خانے تھے۔ جہاں گھسیارہ کھڑا تھا۔ یہ ایک مربعہ میدان تھا۔ یہاں شاید کبھی چمن ہوں گے اور اس میدان کے دائیں بائیں بھی پختہ کمروں کی قطاریں تھیں۔ برسات کی چاندنی میں تمام عمارت نکھر رہی تھی۔ گھسیارے نے عمارت کے در و دیوار کو بغور دیکھا۔ دائیں بائیں نظر ڈالی۔ اور پھر کسی فکر میں غرق ہو کر زمین کو تکنے لگا۔ اتنے میں منشی جی آئے۔ جب پیسے دینے لگے تو گھسیارہ کچھ چونک سا گیا۔ انہوں نے کچھ تعجب محسوس کیا۔ دام دے دئے۔

گھسیارے کے ہاتھ میں پیسے تھے۔ نظر مکان پر جمی تھی اور منہ ہی منہ میں گنگنا رہا تھا "بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے"

منشی جی:۔ کچھ اور تو باقی نہیں۔ ارے میاں تم زمین کا رنگ دیکھو۔ آسمان کے چکر میں نہ پڑو۔

گھسیارہ:۔ نہیں سرکار۔ شکر گزار ہوں۔ یونہی زبان سے بات نکل گئی تھی۔

منشی جی:۔ ارے احمق تمہیں رام سے کیا کام ہے۔

گھسیارہ:۔ نہیں صاحب رام کو ہم سے کیا کام۔ تو کیا اب یہ گھر آپ کا ہے؟

منشی جی:۔ ہاں! کیوں؟ یہ ہمارا ہی ہے۔ تمہیں کیا خیال آیا۔ تم تو بڑے باتونی ہو۔

گھسیارہ:۔ ہرگز نہیں سرکار۔ خیال پڑتا ہے کہ کبھی پہلے بھی یہاں آنا ہوا ہے۔ شاید یہاں کسی اور جگہ گھاس ڈالی ہو۔

منشی جی:۔ ڈالی ہوگی۔ تمہارا کیا نام ہے۔ کہاں رہتے ہو۔

گھسیارہ:۔ صاحب کیا عرض کروں۔ میرا نام حسینی ہے۔ پکی چھاؤنی سے پچھم کو گاؤں ہے۔ اسی میں ٹپرا ڈال رکھی ہے۔

حسینی..... کھرپے رسی کی پنجی اٹھا مکان پر ایک پُر حسرت

نگاہ ڈال۔ خاموش ٹھنڈی آہ بھر اور سلام کر کے چلتا ہوا۔ منشی جی نے اس کے آخری انداز کو تو نہ دیکھا۔ مگر حسینی کی روش اور اندازِ گفتگو پر کھڑے سوچتے رہے۔ حتےٰ کہ وہ نظر سے اوجھل ہو گیا۔ بیشک وہ اس مضمون میں کچھ عرصہ غلطاں و پیچاں تو رہے مگر بات آئی گئی ہوئی۔

بعض واقعات ہوتے ہیں۔ جو زندگی کے معمول پر کوئی اثر نہیں رکھتے۔ البتہ جب ان کے باقی متعلقات وارد ہوتے ہیں تو ان کی یاد بڑی شدت سے تازہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد جب کبھی گھاس منڈی جانے کا اتفاق ہوتا منشی جی حسینی کے متعلق ایک خاص کاوش محسوس کرتے اور ایک دو بار وہاں پتہ لگا لینے کی کوشش بھی کی۔ مگر ایک گھسیارے کی حیثیت ہی کیا کہ کوئی پتہ بتائے۔

بہت دن نہ گزرے تھے کہ ایک دن شام کو منشی جی منڈی میں موجود تھے۔ کچھ گھسیارے منڈی میں پہنچے۔ انہوں نے اپنے گٹھے رکھ دیئے اور حسب معمول دم لیکر ہاتھ پاؤں سے گرد و غبار جھاڑنے لگے۔ مگر اس گروہ سے ایک آدمی کٹ کر علیحدہ ہو گیا اور منڈی کے ایک الگ گوشے کا رُخ کیا۔ وہ گرد میں لت پت تھا۔ سر سے پاؤں تک پسینہ پسینہ تھا۔ بوجھ سے کمر اور گھٹنے جھک رہے تھے۔ پنڈلیوں کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ ہانپتا کانپتا پہنچا۔ مگر سیٹ بچ کر نکلا اور نہ گٹھڑی ڈال منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ بیٹھا رہا۔ کسی کی نگاہ سے بچنا چاہتا تھا۔ دوچار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ یہ وہی حسینی گھسیارہ تھا۔

منشی جی منڈی میں موجود تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کے باعث ایک کنگال گھسیارے کی گھڑیاں کس عذاب میں گزر رہی ہیں۔ افسوس انسان مرجاتا ہے۔ مگر مرکر بھی چین نہیں پاتا۔ حسینی کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ وہ منشی جی کی نگاہ سے بچ رہا تھا۔ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا۔ کہ لیا اوقات ہم نادانستہ کیسے کیسے عذاب اور کن کن گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اکثر ہماری ہمدردیاں کسی دردبھری رُوح کو کیا کیا کٹھن صدمے پہنچاتی ہیں۔ ہمارے مخلصانہ شیریں الفاظ اور درد مندی کی باتیں کس طرح زخم خوردہ لوگوں کے دل میں تیر و نشتر ہو کر اُتر جاتی ہیں۔ ایسے ہی موقعہ پر کہا جاتا ہے کہ ہم کبھی کبھی نیک نیتی کے باوجود اپنی گفتگو سے دوسروں کے لئے دوزخ پیدا کر دیتے ہیں۔ ہم نہیں جان سکتے کہ کوئی کس حال میں ہے۔ یہ کیفیت حسینی کی تھی۔ منشی جی کا منڈی میں ہونا اس کے لئے ایک ناقابل برداشت عذاب تھا۔

اتفاقیہ منشی سخاوت علی ادھر نکل آئے۔ جہاں حسینی تھا۔ مگر انہوں نے پہچانا نہیں۔ گھاس اچھی تھی۔ منشی جی کی نگاہ میں چڑھ گئی۔

منشی جی:۔ سناؤ بھیا۔ کیا دام ہیں۔

حسینی:۔ (بے اعتنائی سے) سات آنے۔

منشی جی:۔ لینے دینے کی کہو۔

حسینی:۔ جو مزاج مبارک میں آئے۔ اور سرکار مناسب خیال کریں۔

منشی جی:۔ (آواز پہچان کر) اس روز تم ہی تھے۔ لال کنواں پر گھاس لے گئے۔ لو ہم نے تو بالکل نہ پہچانا۔ حالانکہ ہم پوچھتے بھی رہے۔

حسینی:۔ ہاں سرکار یاد ہے۔ اس شام بارش ہوئی تھی۔

منشی جی:۔ بس تو پھر۔ آج کیوں اتنے کرارے دام لگا رہے ہو۔

حسینی:۔ نہیں جناب۔ یہ معاملت ہی کیا ہے۔ آپ تو ایسے مہربان ہیں۔ چلیئے میں ڈال آتا ہوں۔

منشی جی:۔ تو آج تین آنے لگا دیتے ہیں (کچھ سوچ کر) اچھا سوا تین آنے دے دیں گے۔ اب تو خوش ہو۔

سودا تو ہو گیا۔ دراصل حسینی سودا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے گھاس کا خیال نہ تھا۔ لال کنواں کے خیال سے اس کی رُوح کانپتی تھی اور وہ منشی جی سے بات کرتے بھی گھبراتا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ گاہکوں کی کمی نہ تھی۔ سودا ہو گیا تھا۔ وہ اس سے جوں توں نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے گٹھا اٹھوایا اور ساتھ ہو لیا۔ مگر منشی جی سے کچھ فاصلہ پر ہی رہا۔ تاکہ بڑے میاں کو بات چیت کا موقعہ نہ دے۔ لیکن ہزار بچیئے۔ ہونی ہو کر رہتی ہے۔ لاکھ تدبیر کیجئے تقدیر نہیں بدل سکتی۔

منشی جی اپنے معمولی انداز میں چل رہے تھے۔ ذرا فاصلے پیچھے حسینی تھا۔ یہ دونو بازاروں میں سے گزر رہے تھے۔

کہ ایک گلی کی ٹکڑ پر ایک سفید پوش آدمی منشی جی کی طرف لپکا اور اُن سے باتیں کرنے لگا۔ اِس مقام پر آمدورفت ذرا کم تھی۔ اُس اجنبی کے انداز سے منشی جی ٹھٹک سے گئے۔ اتنے میں حسینی بھی برابر آ پہنچا۔ اجنبی شکل سے شریف اور گفتگو سے مہذب معلوم ہوتا تھا۔ وجیہہ چہرہ۔ خشخشی داڑھی۔ شرعی مونچھیں۔ چھریرا بدن۔ لمبا قد۔ سر پر ٹوپی۔ سفید انگرکھا۔ اُریبدار پائجامہ۔ بغل میں چھتری، ایک ہاتھ میں پنجرہ لئے دوسرے پر رکھے منشی جی کو پیش کر رہا تھا۔ پنجرہ بڑے سلیقے سے ایک سفید غلاف میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ لہجے میں متانت۔ الفاظ میں تہذیب اور انداز تخاطب میں ولولۂ التجا حد سے سوا تھا۔ حسینی قدرے فاصلے سے یہ منظر دیکھنے لگا۔

اجنبی:۔ قبلہ۔ یہ حقیر سی پیشکش ہے۔ عجیب خوش الحان پرند ہے۔ کچھ ضرورت ہی ایسی ہے کہ جدا کر رہا ہوں۔ مع پنجرے کے پیش کرتا ہوں۔ اپنے شوق کی آخری چیز ہے۔ جب بولتا ہے طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔ صبح شام ذہنی کوفت کو پاس نہیں آنے دیتا۔ بچے بہت خوش ہوتے ہیں۔ گھنٹوں خاموش اس کی دلفریب تانوں کا لطف لیتے رہتے ہیں۔ آپ رکھ سکتے ہیں۔ اپنے لئے نہیں۔ بچوں کے لئے سہی۔ اس کی نگہداشت کچھ مشکل نہیں۔ کسی خادمہ سے فرما دیجئے گا۔ وہ اس کے دانہ پانی کی دیکھ بھال کر لیا کرے۔ بیشک، احتیاط کی ضرورت ہے۔ پرندہ ہے۔ مگر بہت نازک مزاج ہے۔ کیونکہ گانے والا ہے۔ خوب گاتا ہے۔ میں خود ساتھ چل کر پہنچا آتا ہوں کچھ فرمایئے۔

منشی جی حیران تھے۔ کہ یہ کیا پیشکش ہے۔ کیا وقت ہے کیا انداز ہے۔ اسی حیرت میں اس سوداگر کی تقریر سنتے رہے اور بڑے صبر سے سنتے رہے۔ حسینی کھڑا تھا۔ اُس کے بشرے پر کوئی تعجب نہ تھا۔ کوئی حیرت نہ تھی۔ بس گھاس کا گٹھا سر پر رکھے کھڑا تھا اور گنگنا رہا تھا ع

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

منشی جی:۔ جناب میں کیا عرض کروں۔ اپنے ہاں کسی کو پرندوں کا شوق نہیں۔ یہ مفت کا دردِسر کون لے گا۔

اجنبی:۔ کوئی سردردی نہیں۔ بلکہ ایک تفریح ہے۔ اگن ہے۔ جب گاتا ہے محو کر دیتا ہے۔

منشی جی:۔ مگر میں عرض کرتا ہوں مجھے شوق نہیں۔ میرے مطلب کی چیز نہیں۔ آپ بے سود اصرار کرتے ہیں۔

اجنبی:۔ (لمبی آہ بھر کر) میں بڑی امید لیکر گھر سے نکلا ہوں۔ آپ ایک بار ذرا غور کیجئے۔ یہ پیشکش ہے۔ کوئی ایسا معاوضہ نہیں صرف شب بھر کے لئے سہارا ہو جائے۔ کئی دن ہو گئے ہیں۔ بچوں کا عذاب دیکھا نہ گیا۔ اس لئے نکل پڑا اور یہ جرأت کی معاف کیجئے گا۔" یہ کہہ کر چل دیا۔

یہ آخری ترغیب قیامت تھی منشی سخاوت علی بھی تاب نہ لا سکا۔ شل ہو کر جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس اثنا میں حسینی ایک بیدل تماشائی کی طرح کھڑا تھا۔ جب اجنبی چل دیا حسینی نے اُسے آواز دی اور منشی جی سے معذرت کی۔

حسینی:۔ صاحب ذرا عرض سنتے جایئے گا۔

اجنبی:۔ قریب آکر۔ کہئے۔

حسینی:۔ یہ کیا پرندہ ہے؟۔

اجنبی:۔ اگن۔ آپ لیجئے گا۔

حسینی:۔ اگر آپ رضامند ہوں۔

اجنبی:۔ رضامند نہیں، حاجتمند ہوں۔ اپنی اب رضا کہاں۔

حسینی:۔ ذرا تکلیف فرما کر گٹھڑی اُتروا دیجئے (گٹھڑی اتار کر دو کھیسے سے کچھ دام نکال کر) یہ حقیر سی نذر ہے۔ شاید آپ کی ضرورت اس وقت پوری ہو جائے۔ میرے پاس یہی ہے۔

اجنبی:۔ (دام لے کر پنجرہ پیش کرتا ہے) یہ لیجئے۔

حسینی:۔ میں اس قیدی کو کیا کروں گا۔ یہ آپ کے شوق کی چیز ہے اور بچوں کا بہلاوا ہے۔ آپ ہی رکھئے۔

اجنبی:۔ بغیر عوض معاوضہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ دام واپس لے لیجئے۔ شکریہ۔

حسینی:۔ تو یوں کیجئے۔ صبح تین بجے چاندنی کھلی ہوگی۔ اسے میری خاطر رہا کر دیں۔

اجنبی:۔ اور پنجرہ۔

حسینی:۔ صاحب پنجرہ سودے میں شامل نہ تھا۔

اجنبی :- میں پوچھنا نہیں چاہتا کہ آپ کون ہیں - میرا شکریہ قبول کریں - آپ اس قیدی کو رہا کرتے ہیں - آپ دعا کریں کہ ہمیں بھی قیدِ زلیست سے رہائی ملے - آپ کا بوجھ اٹھوا دوں -

حسینی :- ذرا ہاتھ لگا دیجئے -

اجنبی نے گٹھا اٹھوایا اور سلام کر کے اندھیرے میں غائب ہو گیا - منشی جی خاموش کھڑے یہ عبرتناک سودا دیکھ رہے تھے - حسینی راستے سے واقف تھا - قدم اٹھاتا چلا آیا - اس نے یہ بھی غور نہ کیا منشی جی کھڑے تھے - ساتھ ہو گئے یا وہیں رہے - حسینی گھسیارہ منشی جی کے لئے پہلے ہی سے ایک معمہ تھا اب اور بھی زیادہ چیستاں بن گیا - اور یہی وجہ تھی کہ منشی جی چلنے کو تو راستہ پر چل رہے تھے - مگر کھوئے ہوئے سے - آنکھیں راستے پر تھیں اور خیالات کہیں اور - روحانی اضطرار نے دنیا اور اس کے تعلقات پر پردہ ڈال دیا تھا - بس ایک حسینی گھسیارہ اور اس کے متعلق ایک روح فرسا تجسس تھا - اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھاتے چلے - آنکھ سے اوجھل کرنا گوارا نہ تھا - کہ مبادا پنجرے والے کی طرح غائب ہو جائے - تمام راستہ خاموشی میں ختم ہو گیا - حسینی پھر اسی عالیشان مکان پر پہنچا حسب سابق گھاس کوٹ پیٹ کر قرینے سے کونے میں لگا دی اور باہر آکر پیسوں کے لئے میدان میں وہیں آکھڑا ہوا - جہاں پہلے روز ٹھہرا تھا - اس دوران میں منشی جی بھی پہنچ چکے تھے - چبوترے پر ایک چوکی پر بیٹھے تھے - ظاہراً آرام کر رہے تھے - مگر یقیناً کسی گہری فکر میں غرق تھے - جب کچھ وقت گزر گیا اور حسینی بھی انتظار کرتے کرتے تھک گیا - تو اس نے منشی جی کو یاد دلاتے ہوئے کہا - حضور میں نے گھاس ڈال دی ہے - منشی جی کچھ خواب سے بیدار ہوئے اور پھر چپ ہو کر رہ گئے - حسینی کے لئے یہاں ٹھہرنا ایک ایک لمحہ قیامت تھا - وہ اس فضا سے نکلنے کے لئے بیتاب تھا - وہ یہاں سے بغیر دام لئے جا سکتا تھا - لیکن چاہتا تھا کہ اتنی سی بات کو ایک غیر معمولی واقعہ نہ بنا دے - اس نے دوبارہ عرض کی -

حسینی :- سرکار رات ہو رہی ہے - مجھے دور جانا ہے -

منشی جی :- ارے میاں - تم ابتک یہیں ہو -

حسینی :- آپ سے اجازت نہیں لی تھی - ورنہ چلا جاتا - اب اگر ارشاد ہو تو چلا جاؤں -

منشی جی :- نہیں، بھئی - اپنے دام لیتے جاؤ - میں تھک سا گیا تھا - ذرا دم لے رہا ہوں - مگر ہم ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں - ذرا اوپر آؤ تو -

حسینی :- یہیں ٹھیک ہوں - فرمایئے مجھے دیر بہت ہو گئی ہے -

منشی جی :- کیا حرج ہے - چلتا راستہ ہے - رات اپنی ہے - ابھی کیا نوابی پڑ رہی ہے -

حسینی :- سرکار جو ارشاد ہو، میں حاضر ہوں - واقعی نوابی کے اب دن کہاں ہیں -

منشی جی :- آ ہی جاؤ تو سہی - کیا مضائقہ ہے -

حسینی :- جناب فرمایئے - (نیچے ہی قریب آکر)

منشی جی :- ادھر تو آؤ -

حسینی :- (چبوترے پر آکر) ارشاد عالی -

منشی جی :- دیکھئے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں - میرا چھوٹا سا سوال ہے - مجھے بہت پریشانی سی ہے - گھاس کے متعلق نہیں - آپ بہت محنتی آدمی ہیں - اپنی روزی کماتے ہیں اور حلال کر کے کھاتے ہیں - یہ دوسرا معاملہ ہے کہ آپ سے گھاس لی اس سے کوئی تعلق نہیں - آپ کے خیالات بہت اچھے ہیں محنتی لوگوں کا طور طریقہ ایسا ہی ہونا چاہیئے اور آپ کی آج کی ہمدردی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی - بیشک ہمیں اپنے حاجتمند بھائیوں کی مدد کرنی چاہیئے - سنیئے تو سہی اور شاید میں پھر کبھی آپ کو یہ زحمت نہ دوں گا - میں ایک شدید کاوش سی محسوس کر رہا ہوں - آپ اس سے آسودگی حاصل کرا سکتے ہیں - ہاں! وہ صاحب آپ کے کوئی ملاقاتی تھے -

حسینی :- کون صاحب -

منشی جی :- وہی - جو اگن لئے تھے اور بیچنا چاہتے تھے - میں آپ کا ایثار دیکھ کر بہت مسرور ہوا - ہاں! تو وہ آپ کے واقف ہیں؟ -

حسینی :- اچھا وہ صاحب جو پنجرہ میں پرندہ لئے تھے - وہ -

نہیں ہیں سے واقف نہ تھے۔ مجھے ازبس ملال ہے۔ کہ جناب کو وہاں ضرورت سے زیادہ ٹھہرنا پڑا اور ہم حقیر لوگ کسی کی مدد ہی کیا کر سکتے ہیں۔ یوں ہی دو چار پیسے تھے میں نے اُن کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ مجھے ایسا کرنا نہ چاہیئے تھا۔ صاحب غریب آدمی ہوں۔ اِس دفعہ معافی کا خواستگار ہوں۔

منشی جی:- ہنس کر۔ نہیں نہیں۔ میاں اطمینان رکھو۔ بلکہ مجھے تو بہت خوشی ہے کہ آپ لوگوں میں ہمدردی باقی ہے۔ میں داد دیتا ہوں۔ تمہاری ہمت کی۔

حسینی:- (قدرے گھبراہٹ سے) قبلہ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مجھے اجازت ہی دید یجئے۔

منشی جی:- مگر میاں حسینی وہ بات تو بیچ ہی میں رہی جاتی ہے۔ آپ نے فراخدلی سے اتنے دام محض ایک پرندے کے عوض دے ڈالے۔ تمہیں معلوم ہے۔ مجھے تو یہی تامل تھا کہ اس بھلے آدمی کا بیان باور بھی کیا جائے یا نہیں۔ میں واقعی پس و پیش میں تھا۔ مگر آپ نے معاملہ ہی چکا دیا۔ آپ نے واقعی بہت اچھا کیا۔ مگر میاں تم اپنی صورت معاش دیکھو۔ فیاضی، ہمدردی، سخاوت وغیرہ میں اصراف بیجا نہ ہونا چاہیئے اور پھر پرندے ایسی چیزوں کے لئے بہرحال آپ نے خوب کیا۔ میں بہت متاثر ہوا۔ آخر ایسی کونسی چیز محرک ہوئی۔ کہ آپ اپنی بساط سے بڑھ کر فیاض بن گئے۔

حسینی:- جناب عالی۔ معافی چاہتا ہوں۔ پھر کبھی ایسا نہ ہوگا۔ کمبخت یہ طبیعت جذباتی سی ہے۔

منشی جی:- مگر میاں حسینی جذبات بھی کسی بات پر ہی متحرک ہوتے ہیں۔ آخر ایک اگن ہی تھا۔ اور خدا جانے تھا بھی کہ نہیں۔

حسینی:- صاحب نہیں! ایک بھلا آدمی یقین دلا رہا تھا۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں۔ دنیا میں صداقت کا پتہ ابھی بھاری ہے۔ اور اپنا تو ایمان ہے۔ کہ جس روز یہ صورت نہ رہی۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ کیا ہو جائے گا۔ مجھے اجازت دیجئے۔ صاحب ہم غریب لوگ آپ سے بڑھ کر کیا عرض کر سکتے ہیں۔

منشی جی:- میرے بھائی۔ میرا تجسّس میری کاوش برداشت سے گزر رہی ہے۔ پھانس بن کر دل میں کھٹک رہی ہے۔ آخر ہم نے مرغبازیاں۔ بٹیربازیاں [illegible] بازیاں کیں ہیں۔ دنیا بھر کے تیتر مرغ ہضم کر ڈالے۔ پرندہ قفس میں ہو یا آشیانہ میں۔ ہم پر تو کبھی اتنا اثر نہیں ہوتا۔ کہ اپنے بال بچّوں کا حق ایسے شوقینوں کی نذر کر دیں۔

حسینی:- جناب اپنی اپنی طبیعت ہے۔ زندگی کی کچھ واردات ہی ایسی ہے کہ پرندوں سے مناسبت سی ہو گئی ہے۔ ہر انسان کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے۔ جب کبھی ایسا واقعہ پیش آتا ہے۔ بیتاب سا ہو جاتا ہوں۔ بس یہی جی چاہتا ہے۔ مرغ قفس کو آزاد کر دیا جائے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ عرض نہیں کر سکتا۔ وقت بیوقت ہو رہا ہے۔ میری منزل دُور ہے۔

منشی جی:- دیکھئے نا۔ یہی بات تو میں سننا چاہتا ہوں۔ اگر ایک آدمی کا واسطہ ایسے حالات سے پڑ جائے۔ کہ وہ نیک کام کرنے لگے۔ تو اور کیا چاہیئے۔ آپ ذرا کہئے تو سہی۔

حسینی:- اللہ ایسے حالات سے دشمن کا واسطہ نہ ڈالے۔ صاحب نہ اصرار کیجئیگا۔

منشی جی:- میاں آخر بات ہی کیا ہے۔ تم کہو تو سہی۔ بے سود تکلف کر رہے ہو۔

حسینی:- حضور تکلف نہیں۔ بلکہ تکلیف سے بچنا چاہتا ہوں اور آپ کی بے سود سمع خراشی ہوگی۔

منشی جی:- کہئے کہئے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔

حسینی:- اگر آپ کی یہی خوشی ہے۔ مجھے دیر ہو گئی ہے۔ مگر آپ کا ارشاد ہے۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر ان پرندوں پر کیا گذری۔ اور میرا زندہ رہ جانا میری بدترین قسمت ہوئی۔ میں ہمیشہ یہی چاہتا ہوں۔ کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔ وہ دن اور آج کا دن ہے۔ جب کبھی ایسا اتفاق ہو ان واقعات کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ بیتاب ہو جاتا ہوں۔ ایک چوٹ لگتی ہے۔ بلا کی چوٹ لگتی ہے۔

منشی جی:- میاں گھسیارے تم تو بڑی کیفیت کے آدمی ہو۔ یہ بات اور بھی تعجب انگیز ہے۔ بھلا سناؤ تو سہی۔

حسینی:- حضور میں حیران ہوں۔ کہ اِس داستانِ درد کو کہاں سے شروع کروں۔ یہاں تمام اوراق پریشاں پڑے ہیں۔ جرأت نہیں پڑتی۔ میں جسارت نہ کرتا۔ مگر آپ مصر ہیں۔ میں مجبور ہوں۔

منشی جی :- بھلے آدمی - تم نے قصہ کو بھی مات کر دیئے - پرندوں کی بات ہے - افسانہ بنا رہے ہو - تمہید ختم کرو - ہم نے کہہ دیا - کہ تمہاری داستان سننے کے لئے بیتاب ہیں - چلو کہو - زیادہ بیتاب نہ کرو -

حسینی :- حضور میں نے عرض کیا ہے اور آپ سے کوئی بات چھپی نہیں ہو ملک ہاتھوں سے جا چکا تھا - سلطنت ختم ہو چکی تھی - سلطان - بُرا بھلا جو کچھ تھا غنیمت تھا - ہمارا تھا - ہم نے بگاڑا ہمیں بنا سکتے تھے - مگر بگڑی بات بنا نہ سکے - اسے نکال پھینکا - اس کی رسوائی نہ تھی - بلکہ ہم خوار ہوئے - فتنہ پردازوں کا کوئی دین وایمان نہیں ہوتا - یہ ہر دور اور ہر عہد میں ہوتے ہیں سلطنت، ملک، ملت اور خدا سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا - یہ گروہ دنیا تہذیب اور ترقی کے لئے مہلک ہوتا ہے ان کی تخریبی کارروائیاں - ان کی اپنی غرض کے لئے ہوتی ہیں جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا تھا - مگر جو بیج پھولوں کی امید میں بوئے تھے - وہ خار بن کے ہوئے - حضور! پرانے دور کی ڈھیل میں جو مزے تھے وہ نئے عہد کے شکنجے میں کہاں - نئی بساط پر فرزین - اسپ - فیل و رُخ کو پیدل کی چال چلنی پڑی - اب پھر ان نام نہاد محبان وطن کو احساس زیاں ہونے لگا - مگر کور باطنی - کوتہ بینی وہی رہی - نئے نئے فتنے اٹھنے لگے - بےبس اہل سیف سرنگوں تھے - اہل مال کو امن چاہیئے - سلطنت اور سلطان کوئی ہو - اہل حرفہ میں کہاں دم تھا - ایک غیور جانبازوں کا طبقہ تھا - جن کے لڑنے کو بازو تھے اور کٹ جانے کو سر تھا - مگر دماغ و تدبیر سے عاری تھے - کارواں تھا - میر کارواں کوئی نہ تھا - فتنہ پردازوں کا جادو تو چل گیا - مگر لینے کے دینے پڑ گئے - وہ آگ لگی - کہ نشیمن تو کہاں سارا چمن جل اٹھا -

منشی سخاوت علی پر حسینی گھسیارے کی پرمعنی خیز داستان سحر کا سا اثر کر رہی تھی - وہ اُس کی ہیئت کذائی سے بےپروا ٹکٹکی باندھے اس کا منہ تک رہا تھا - چراغ کی مدھم روشنی تھی - مگر منشی جی کے انداز میں گھبراہٹ پیدا تھی -

منشی جی :- مگر ان پرندوں پر کیا بیتی -

حسینی :- سرکار سنتے جایئے - وہ بھی اُڑ جائیں گے - ہاں تو وہ ہنگامہ شروع ہو گیا - جسے غدر کہتے ہیں - یہ غدر تھا کہ غیرت تھی - اس کا فیصلہ تاریخ کے ہاتھ میں ہے - البتہ یہ انقلاب تھا - یہ قہر تھا - یہ قہر الٰہی تھا - یہ ہمارے اعمال کی پاداش تھی - یہ آگ تھی - یہ شعلہ اندر سے اٹھا اور سارا گھر جل گیا -

منشی جی پر سناٹا طاری تھا - آنکھیں حیرت سے حلقوں سے باہر نکلی آتی تھی - چہرے پر وحشت - جسم بے حرکت تھا - حسینی کے بیان میں گویا جادو تھا - معلوم ہوتا تھا منشی سخاوت علی کے دماغ پر ایک ہی خیال غالب ہے - اور جب ذرا موقعہ ملا - اسے دہرایا -

منشی جی :- وہ پرندے کیونکر بچے -

حسینی :- سرکار ذرا صبر کیجئے - ابھی دیکھئے - کیسے پر تولتے ہیں - یہ قہر الٰہی تھا - عذاب تھا - اچھے بُرے - چھوٹے بڑے - گورے کالے سب اس میں مبتلا تھے - دور و نزدیک سے امید و ناامیدی کی خبریں آ رہی تھیں - دونوں طرف جان کی بازی لگی تھی - غرض ادھر تقدیر ہاری - اُدھر تدبیر جیتی - اب کہنے والے کہتے ہیں ظلم اور بیرحمی کا نتیجہ تھی - لڑنے والوں میں کس کا دامن ظلم و ستم سے پاک رہ سکتا ہے - جبکہ لڑائی وطن کے لئے ہو - لڑائی انتقامی جذبات کا جسمانی اظہار ہے - اور جیتنے والے کا انتقام عبرت انگیز ہوتا ہے - حریف بار بار ہزیمت اٹھا چکا تھا - اس کی جمعیت شہر تک پہنچنے نہ پائی تھی - محاصرہ کو کئی ماہ ہو چکے تھے - آخر حریف کی تازہ دم کمک کے مقابلہ میں محصورین نے دم چھوڑ دیا - فصیل ٹوٹی - شہر پناہ کے دروازے کھل گئے - پھر کیا تھا مشق انتقام ہونے لگی -

منشی جی :- (انتہائی وحشت سے) یہ داستان نہ چھیڑیئے - ان پرندوں کی سنایئے - مجھے پیاس لگی ہے - احسان پانی لاؤ - نوکر کچھ فاصلہ پر کھڑا تھا - اپنے آقا اور گھسیارے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا - پانی لایا اور منشی جی کو پلا کر چلا گیا - مگر ان کی وحشت میں فرق نہ آیا - حسینی کی تقریر میں عجب مقناطیسی اثر تھا - کہنے لگے "میاں حسینی! یہ واقعات بیان کرنے کے نہیں - آپ دیوانخانہ میں چلئے - اور خود اُٹھ کر چل پڑے -"

حسینی :- سرکار نہیں - میں اندر نہیں جا سکتا - اگر ناگوار خاطر ہو تو وہاں بہشتی خانہ میں تشریف لے چلیں -

منشی جی بغیر پس و پیش کئے حسینی کے ساتھ ہو لئے -

چبوترے سے نیچے میدان میں اُتر کر ایک پختہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہاں بہشتی یا سقہ کا ظاہرا کوئی نشان نہ تھا۔ شاید اپنے وقت میں آبدار خانہ ہو۔ یہاں ایک تخت پڑا تھا۔ اور اس پر ایک مصلّا تھا اور طاق میں ایک مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ یہاں منشی جی تو بیٹھ گئے۔ مگر حسینی ویسے ہی کھڑا رہا۔ اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

حسینی:۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مشق انتقام ہونے لگی۔ ایک حشر بپا ہو گیا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ گلی کوچوں میں خون بہہ نکلا۔ بہتوں نے مارے جانے سے مرجانا بہتر سمجھا۔ لاشوں سے گھروں میں کوئیں اٹ گئے۔ اس وقت مرنا یا مارا جانا بعد کی زندگی سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ انتقامی جذبات نے انسانوں کو بھیڑیا بنا رکھا تھا۔ جگہ جگہ کربلا کا منظر تھا اور شیروں کے بچے بکریوں کی طرح سر چھپاتے پھرتے تھے۔ یہ بلا کی بزدلی تھی۔

منشی جی:۔ (پھر وحشت سے) وہ پرندے۔ ان کا کیا حشر ہوا۔

حسینی:۔ سنئے سنئے۔ راحت منزل۔ یہ مکان۔ خالی ہو چکا تھا۔ سنسان پڑا تھا۔ واقعی راحت کے سب سامان موجود تھے، مگر ایک سناٹا تھا۔ زمین پر موت تھی۔ آسمان سے موت برس رہی تھی۔ درو دیوار پر موت چھائی ہوئی تھی۔ میں کشت و خون کے بازار سے ادھر آیا۔ اس میدان کو چمن کی صورت چھوڑ کر گیا تھا۔ مگر واپس آیا تو کربلا پایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جاں نثار محافظوں نے حق نمک ادا کیا۔ اور داد شجاعت دی۔

منشی جی:۔ شجاع! ابا جان قبلہ۔ کیا کہا؟

حسینی:۔ نہیں شجاع الدولہ ابھی نہیں۔ راحت منزل کے محافظ۔ جوان گلزاروں میں سینوں اور چہروں پر زخم کھائے۔ سرخرو ہو کر پڑے سو رہے تھے۔ ہاں میں ادھر آیا۔ اسی کمرے میں پہنچا۔ خونیں مناظر دیکھ کر حلق خشک ہو رہا تھا۔ قیامت کی پیاس تھی۔ اس آبدار خانے میں معلوم نہیں کتنا پانی پیا۔ ذرا ہوش آیا۔ یہاں سے ایک مشکیزہ اٹھا اور تلوار لے کر باہر نکلا۔ چمن کشتوں سے پٹا پڑا تھا۔ یہاں کی ابتدا راحت منزل کے اندر کا انجام بتا رہی تھی۔ میں اندر پہنچا۔ جہاں گلدانوں میں پھول ہوتے تھے۔ پھول سے چہرے یوں پڑے تھے۔ جیسے طوفان کے بعد پھول روشوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ ہر کمرے میں کہیں لخت جگر تھا۔ کہیں نور نظر، نور حیات سے محروم پڑا تھا۔ دیکھ دیکھ کر دل پاش پاش ہو رہا تھا۔ میں صدر کمرے میں پہنچا۔ راحت بانو معاذہ رو کے پڑی تھیں۔ آخر وقت نسیم سحر کو سینے سے لگائے تھیں۔ ننھی سی جان ماں سے لپٹ کر سینے پر لیٹے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ایک ہی وار نے معذور ماں بیٹی کا کام تمام کر دیا تھا۔ راحت کی تلوار برابر میں پڑی تھی۔ خون میں تر بتر تھی۔ راحت نے بغیر مقابلہ جان نہیں دی تھی۔ یہیں اسد پڑا سو رہا تھا۔ اپنا اب کچھ باقی نہ تھا۔ غیر محرموں کے لاشوں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ راحت منزل والیوں نے اپنے ناموس کے لئے جانبازی کا حق ادا کر دیا۔

منشی سخاوت علی یہ خونیں داستان بغور سن رہا تھا۔ حسینی اب کوئی چیز معلوم ہونے لگا۔ اس میں کچھ اور بولتا نظر آتا تھا۔ داستان کی ہیبتناکی اور حسینی کے انداز کلام نے منشی جی کو مسحور کر کے بے سکت کر دیا تھا۔ بس اتنا کہا کہ وہ پرندے کیا ہوئے۔ کہاں تھے۔

حسینی:۔ ہاں سرکار عرض کرتا ہوں۔ اب تو تیغ اُٹھ چکی تھی۔ آخری امیدوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ آئندہ کی آرزوئیں ڈھیر ہوئی پڑی تھیں۔ زندگی کا قہقہہ سنسان گھر کی خاموشی میں دفن ہو چکا تھا۔ دل کے ویرانے نے باقی دنیا سے تعلق منقطع کر لیا۔ اب ایک آزادی سی محسوس ہوئی۔ ہر قسم کا خوف جاتا رہا۔ راحت منزل کی راحتیں سمٹ چکی تھیں۔ ہر چیز مٹ چکی تھی۔ میں راحت اسد اور نسیم کے لاشوں پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ صورتیں خاک میں مل کر مجھے سب فکروں سے آزاد کر گئیں۔ اس وقت سناٹا تھا۔ جہاں موت بیدار ہو۔ سب آوازیں خاموش ہو جاتی ہیں۔ اتنے میں ایک پرند کی درد بھری صدا آئی۔ میں چڑیا خانہ میں پہنچا۔ یہاں ہُو کا عالم تھا۔ پرندوں کی حسیات بلا کی ہوتی ہیں۔ یہ بے زبان قبل از وقت حوادث کی آمد معلوم کر لیتے ہیں۔ اور جو جگہ قدرت کو ویران کرنی ہو۔ اسے چھوڑ کر نکل جاتے ہیں۔ یہ صورت یہاں تھی۔ بعض تڑپ تڑپ کر پنجروں میں جان دے چکے تھے اور اکثر پروں میں سر دئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان پرندوں کو انسان کی بربریت سے شرم آ رہی ہے۔ مگر میری مشکل دیکھ کر بیتاب ہو گئے۔ میرا گلشن مٹ چکا تھا۔ ان پرندوں کو قید و بند میں رکھنا بے سود تھا۔ میں نے ہر قفس کا دروازہ کھول

دیا۔ کہ یہ قیدی رہا ہو کر اپنی راہ لیں۔ مگر نہیں۔ دو چار نکلے اور کمرے کے تاودے کاٹ کر پھر پنجروں پر آ بیٹھے۔ باقی کے در کھلے تھے۔ مگر مائل بہ پرواز نہ ہوئے۔ جس چکس پر تھے۔ وہیں تھے۔ قفس کا در کھلا تھا۔ مگر اُڑ جانے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ یہ محشر کی گھڑی تھی۔ آدمی آدمی کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ ماؤں نے اپنے بچے چھوڑ دیئے تھے۔ بھائی بہنوں کو ان کی قسمت کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ مگر یہاں یہ پرندے تھے۔ جو اس کرب و بلا کی حالت میں راحت منزل نہ چھوڑتے تھے۔ اس کے مکینوں کا ساتھ دینے پر تُلے بیٹھے تھے۔ یہ اپنے شوق کی آخری پونجی تھی۔ جن ہاتھوں نے انہیں دانہ پانی دیا تھا۔ وہ جا بجا کٹے پڑے تھے۔ جو کان ان کی راگنیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ بند ہو چکے تھے۔ جو محبت بھری آنکھیں انہیں دیکھتے تھکتی نہ تھیں۔ اب کھلی تھیں۔ مگر بے نور۔ یہ قیامت کا منظر تھا۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ میری عزیز متاع خاک و خون میں ملی پڑی تھی۔ میں پھر دالان میں آیا۔ راحت بانو کا منہ آنچل سے ڈھانپا۔ ننھی نسیم کو اس کی ماں کے سینے سے لگا دیا۔ برابر میں اسد پڑا تھا۔ گھائل ہو کر شیر نے انگڑائی لی۔ اور ٹھنڈا ہو گیا۔ پہلو سے خون بہہ بہہ کر خشک ہو رہا تھا۔ ماں کے لاشے کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا رکھے تھے۔ ان سب کو چھوڑا۔ صدر زینے پر آیا۔ شجاع الدولہ خراج مقابلہ لے چکے تھے۔ زعفرانی قبا ارغوانی ہو چکی تھی۔ جا بجا پھوٹ پھوٹ کر خون بہہ نکلا تھا۔ آخر وقت تک راحت منزل کی نگرانی کی۔ پیرانہ سالی تھی۔ مگر جواں مرد تھا۔

منشی جی:۔ والد مرحوم خانہ زاد تھے۔ اب منشی جی کے چہرہ پر متانت تھی۔ کوئی گھبراہٹ اور بیقراری نہ تھی۔ خاموش ٹھہر گئے تھے۔ آنکھیں نیچی کئے تھے۔ حسینی گھسیارہ کھرپا جالی کی بغچی اپنے معمولی انداز میں بغل میں لئے کھڑا تھا۔ اس کے بشرے اور لہجے سے کسی جذباتی تاثر کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنی عبرتناک واردات سنا رہا تھا۔ اور منشی جی سن رہے تھے۔

حسینی:۔ شجاع جیسا جاں نثار بھی ختم ہوا پڑا تھا۔۔۔۔ پھر کیا ہوا یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔۔۔۔ ہاں! تو سرکار جب وہ آدمی پنجرہ میں پرندہ لئے اسے اپنے شوق کی آخری چیز بتا رہا تھا۔ مجھے ان واقعات کا خیال آگیا اور ان پرندوں کی یاد تازہ ہو گئی۔

منشی سخاوت علی نے دونوں ہاتھ حسینی کی طرف پھیلا کر بڑھائے۔ آنکھیں اس کے چہرے کی طرف اٹھائیں۔ اور دوزانوں ہو کر بولا۔

منشی جی:۔ صاحب عالم بلند اختر! میرے آقا!

حسینی:۔ نہیں صاحب حسینی گھسیارہ۔

عباد اللہ

قطعہ

یہی انساں ہے مالک بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خودی بیں نے خدا بیں
یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

اقبال

نظامِ شمسی

کائنات کی بے پایاں وسعت میں ان گنت ستارے اور اُن کے متعدد نظامات پھیلے پڑے ہیں۔ اور ایک گوشے میں ہمارا نظامِ شمسی بھی واقع ہؤا ہے۔ جس کے نو ارکان دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ہماری زمین ہے۔ جس کے متعلق ہماری معلومات کچھ کم نہیں۔ اگرچہ کئی لحاظ سے محدود ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں نظامِ شمسی کے دوسرے ارکان کے متعلق ہمارا علم کچھ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ کسی سیارے تک تو کجا۔ ہمارے قریب ترین ہمسایہ یعنی زمین کے تابع قمر تک پہنچنا بھی ہمارے لئے کسی صورت میں ممکن نہیں۔ اس کے باوجود فلکی مشاہدوں اور ریاضی دلائل کی بنا پر ہم اپنے ہمسایہ سیاروں کی حالت کا تھوڑا بہت اندازہ کر سکتے ہیں۔ دراصل فلکی اجسام کے متعلق غور کرنا، زمینی اجسام کا مطالعہ کرنے سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ علامہ اقبال نے خوب فرمایا ہے ؎

"چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دل کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن"

لیکن اس سے زیادہ پُرلطف ہے ؎

"ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے
رہ آسمان نوردن بہ ستارہ راز کردن"

نظامِ شمسی کے ارکان میں سورج صدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں تقریباً چھ ہزار درجہ حرارت پر ہائیڈروجن، ہیلیم (Helium) اور آکسیجن گیس کی ایک نوع اور سوڈیم (Sodium) اور کیلشیم (Calcium) دھات کی ایک نوع پائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ نظامِ شمسی کے متعدد سیارے سورج ہی کے زائیدہ ہیں۔ ایک مشہور اور قرین قیاس نظریہ یہ ہے۔ کہ ان سیاروں کی پیدائش کا سبب کوئی زبردست ستارہ ہے۔ جو بیس ارب سال قبل سورج کے قریب ہو کر گزرا تھا۔ جس طرح کہ چاند کے اثر سے سمندر میں مد و جزر پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب دو بڑے ستارے ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔ تو دونو کے مادے میں ایک دوسرے کے اثر سے ہیبت ناک مد و جزر پیدا ہوتا ہے۔ اور جوں جوں دونو قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ مادے کی موجیں بھی زور و قوت سے بلند ہوتی جاتی ہیں۔ چنانچہ بہت ممکن ہے۔ کہ اس ستارے کے دُور ہونے سے قبل سورج کے مادے میں ایسی زبردست موج بلند ہوئی ہو۔ جو انجام کار پاش پاش ہو کر فضا میں بکھر گئی۔ اور اس موج کے ٹکڑے سورج کے اطراف گردش کرنے لگے۔

یہ متعدد ٹکڑے جو ابتدا میں سورج کے گرم سیال مادے پر مشتمل تھے۔ سورج سے دُور ہو جانے کی وجہ سے بتدریج سرد اور سخت ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ان میں سے ایک یعنی زمین پر کسی وقت زندگی کے آثار نمودار ہو گئے۔ بہت ممکن ہے۔ کہ بقول مولانا رومؒ زندگی کی نمود اس نہج پر ہوئی ہو۔ کہ ؎

از جمادی بے خبر سوئے نما
وز نما سوئے حیات و ابتلا
باز سوئے عقل و تمیزاتِ خوش
باز سوئے خارج ایں پنج و شش

بہرحال مختصر یہ ہے۔ کہ ؎

آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہان دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد (اقبال)

اب اگر یہ سوال کیا جائے - کہ زمین کی طرح دوسرے سیاروں پر بھی حیات کا وجود ممکن ہے - تو اس کے جواب مختلف ہو سکتے ہیں۔ دل تو کہتا ہے ؎

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست
کہ ہر ستارہ جہاں بود و یا جہاں بود است (اقبالؒ)

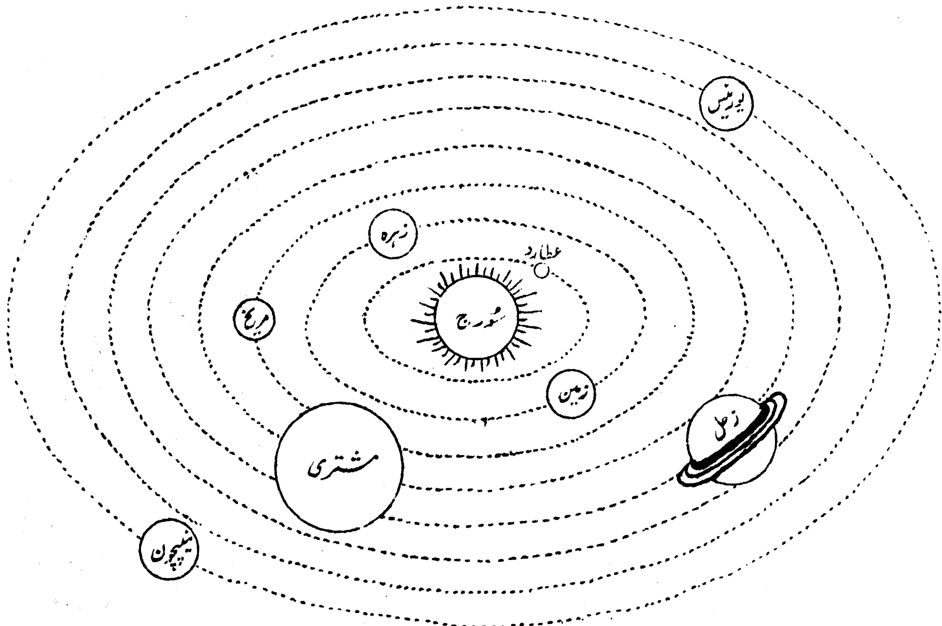
لیکن سائنسدان جو

"کسی زندہ چیز کو سمجھنا اور جاننا چاہتا ہے - تو پہلے اس کی روح کو نکال پھینکتا ہے - اس کے بعد اجزا کو ہاتھ میں لے کر دیکھتا ہے" (گوئٹے)

اس ضمن میں کوئی یقینی رائے دے نہیں سکتا، یہاں شاید اس کو نفی میں ہی جواب دینا پڑے -

سورج اور زمین کے درمیان دو سیارے عطارد (Mercury) اور زہرہ (Venus) واقع ہوئے ہیں - اور زمین کی دوسری جانب بہ ترتیب مریخ (Mars) مشتری (Jupiter) زحل (Saturn) یورینس (Uranus) نیپچون (Neptune) اور پلوٹو (Pluto) موجود ہیں - اگر ان سیاروں کی اندرونی حرارت سے قطع نظر کر کے یہ فرض کر لیا جائے - کہ وہ پوری حرارت سورج سے حاصل کرتے ہیں - تو اندازہ کیا جاتا ہے - کہ عطارد کی تپش دو سو درجے م[1] (200 degrees Centigrade) زہرہ کی ستر درجے م - مریخ کی چالیس درجے نقطۂ انجماد سے کم اور آگے بڑھتے بڑھتے نیپچون کی تپش دو سو درجے نقطۂ انجماد سے کم ہو گی - گویا زمین کی دوسری جانب مریخ وغیرہ کی فضا میں خنکی برف سے بھی بڑھی ہوئی ہے - عطارد ایک چھوٹا سا سیارہ ہے - جو سورج سے قریب رہتا ہے - اس لئے دوربین سے اس کے سطحی حالات کا مشاہدہ کرنا مشکل ہے - آج تک یہ بھی

[1] 'م' سے مراد میٹری نظام ہے



نظامِ شمسی

معلوم نہ ہو سکا۔ کہ اس سیارہ پر کوئی ہوائی کرّہ موجود ہے۔ یا نہیں۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے۔ کہ حد سے بڑھی ہوئی گرمی کی وجہ سے اس سیارے پر کسی قسم کی زندگی کا وجود ناممکن ہے۔ عطارد اور زمین کے درمیان زہرہ واقع ہؤا ہے۔ جو آسمان کے تمام سیاروں میں روشن ترین سیارہ ہے۔ اس کی جسامت قریب قریب زمین کے برابر ہے۔ اور چونکہ اس کی سطح ہمیشہ گہرے بادلوں سے گھری رہتی ہے۔ اس لئے اُس کے سطحی حالات کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے بعض وجوہات کی بنا پر یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اس سیارے کی سطح پر پانی ہی پانی موجود ہے۔ اگر یہ سچ ہے۔ تو بہت ممکن ہے۔ کہ یہاں کوئی آبی مخلوق زندگی بسر کرتی ہو۔ جو کرّہ ہوائی کے گہرے بادلوں کی بدولت سورج کی عریاں شعاعوں کی تیزی سے محفوظ ہے۔ زمین کے دُوسرے بازو مریخ واقع ہؤا ہے۔ جس کے متعلق بہت کچھ خیال آرائیاں کی گئی ہیں۔ یہ زمین سے چھوٹا ہے۔ اور اس کا ہوائی کرّہ لطیف ہے۔ چنانچہ وہ دوربین سے دُوسرے سیاروں کی نسبت صاف اور واضح نظر آتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں اُس کا فاصلہ زمین سے تین کروڑ میل اور سنہ ۱۹۳۱ء میں ایک کروڑ باسٹھ میل تھا۔ ان موقعوں پر اُس کی متعدد تصویریں لی گئیں۔ اور ان سے کئی نتائج اخذ کئے گئے۔ اس کی سطح پر نارنجی رنگت کے دھبّے اور قطبوں پر برف کی کلاہیں نظر آتی ہیں۔ جو سال مریخ کے خاص خاص ایام میں بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہیں۔ جب یہ کلاہیں غائب ہو جاتی ہیں۔ تو سطح پر ایک تغیر نمودار ہو جاتا ہے۔ اور نارنجی رنگت کے دھبّے وسیع اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ یہ تقویم مریخ کا موسم بہار ہو۔ جس میں تمام برف پگھل جاتی ہے۔ اور جنگل گھنے اور سرسبز ہو جاتے ہیں۔ مریخ میں نباتات کا وجود اس لئے بھی ممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کرّۂ ہوائی میں آکسیجن موجود ہے۔ ساٹھ سال قبل ایک اطالوی ہیئت دان نے اس سیارے کی سطح پر بالکل سیدھی اور باریک لکیروں کے ایک جال کا مشاہدہ کیا تھا۔ جن کی توجیہ یہ کی گئی۔ کہ یہ مریخ کی نہریں ہیں۔ اس لحاظ سے شاید نارنجی رنگت کے دھبوں کا سبب پانی ہو۔ جو سیارے کی زمین پر بہتا ہے لیکن ان دھبّوں کو نباتات یا بعض لوگوں کے خیال کے مطابق سمندر قرار دینے سے قبل ہمیں مریخ کی سردی کا خیال کر لینا چاہئے۔ جس میں ان دونو کا وجود ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور رائے یہ ہے۔ کہ یہ دھبّے وسیع صحرا ہیں۔ جو سیارے کے خاص خاص مقامات پر واقع ہوئے ہیں۔ بہرحال تازہ مشاہدات کی بنا پر بھی سائنسی حیثیت سے یہ باور کر لینے کے لئے کوئی ثبوت موجود نہیں۔ کہ مریخ میں حیات کا وجود ہے۔ یہ سچ ہے۔ کہ تمام اجرام فلکی میں ہمیں مریخ کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ بالکل موافق حالات میں بھی دُوربین کے ذریعے اس سیارے کے حالات کا مشاہدہ کرنا، گویا کئی سو گز کے فاصلے سے کسی سکّے کے نقوش کو پڑھنے کی کوشش کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جس طرح ہم مریخ سے آگے مشتری اور زحل کی جانب بڑھتے ہیں۔ ہماری معلومات بھی کم ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ یورینس، نیپچون اور نئے دریافت شدہ ستارے پلوٹو کے متعلق ہمارا علم زیادہ تر ریاضی دلائل پر مبنی ہے ٭

مُشتری تمام سیاروں میں بڑا ہے۔ اور اُس کا حجم زمین سے ہزار گنا ہے۔ اب تک اس کے نو تابع دریافت ہوئے ہیں۔ جو اس کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ دوربین سے اس سیارے پر مختلف رنگ کے حلقے نظر آتے ہیں۔ اور ایک بڑا سُرخ نشان بھی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سب کے سب متغیر ہیں۔ بہت ممکن ہے۔ کہ یہ کثیف بادل ہوں۔ جو سیارے کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ چونکہ اس سیارے کی کثافت نہایت ہی کم واقع ہوئی ہے۔ اس لئے خیال کیا جاتا ہے۔ کہ بادلوں کے تودے عمیق ہونگے۔ ایک اور قیاس جو خالص ریاضی دلائل پر مبنی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس سیارے کا اندرونی حصّہ چٹانوں پر مشتمل ہے۔ جس پر برف کی کئی ہزار میل عمیق تہیں جم گئی ہیں۔ اور اس کے اُوپر ایک بسیط ہوائی کرّہ موجود ہے۔ لیکن اس قیاس میں بہت کچھ گفتگو کی گنجائش موجود ہے۔ اور در اصل ہیئتی حلقوں میں اس پر کافی لے دے ہو چکی ہے۔ مُشتری سے آگے زحل ہے۔ جو ایک دلچسپ سیارہ ہے۔ اس کے خطِ استوا پر تین ہم مرکز چپٹے حلقے

نظر آتے ہیں - جن کی وجہ سے وہ تمام اجرامِ فلکی سے زیادہ خوشنما معلوم ہوتا ہے - خیال کیا جاتا ہے - کہ یہ حلقے چھوٹے چھوٹے تابعوں پر مشتمل ہیں - جو سیارے کے اطراف گردش کر رہے ہیں - زحل سے آگے یورنیس اور نیپچون کے متعلق ہماری معلومات بہت ہی کم ہیں - اتنا کہا جا سکتا ہے - کہ یہ زمین سے کئی گنا بڑے ہیں - اور ان پر ہوائی کُرّے بھی موجود ہیں - اسی طرح پلوٹو کے متعلق کوئی قابلِ ذکر بات نہیں پائی جاتی -

نظامِ شمسی میں مذکورہ بالا بڑے بڑے سیاروں کے علاوہ کئی شہابات (Meteor) اور چھوٹے چھوٹے سیارے بھی موجود ہیں - چھوٹے سیاروں کا ایک جمِ غفیر مریخ اور مُشتری کے درمیان واقع ہُوا ہے - لیکن ان سب سے زیادہ دلچسپ دُمدار ستارے (Comets) ہیں - جو سورج کے گرد ایک چکّر لگا کر دُور فضا کی وسعتوں میں چلے جاتے ہیں - اس قسم کا ایک زبردست ستارہ ۱۹۱۰ء میں نمودار ہُوا تھا - بعض دُمدار ستارے ایسے بھی ہیں - جو بہت دُور نہیں جا سکتے - اور باقاعدہ سورج کا طواف کرتے رہتے ہیں - ایک مثال ہیلی (Halley) کی ہے - جو تقریباً ۷۵ سال میں سورج کے گرد ایک چکّر لگاتا ہے - دمدار تاروں کی ماہیّت کے متعلق بہت کم معلوم ہُوا ہے - ان کی کمیت (Mass) بہت کم ہوتی ہے - اور اجزا میں کاربن مونوکسائڈ گیس اور سوڈیم کا پتہ چلتا ہے -

فلکی مشاہدات اور نظریوں کی مدد سے، جس طرح کہ ہم نظامِ شمسی کے ماضی کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں - اسی طرح مستقبل کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں - بدقسمتی سے مستقبل کے متعلق تمام نظریوں کا ماحصل یہ ہے - کہ کسی نہ کسی دن یہ نظام تباہ و برباد ہونے والا ہے - یا کم از کم اس نظام کے اُن حصّوں پر جہاں حیات کا وجود ہے، کسی نہ کسی دن حرارت کی قلت کی وجہ سے موت چھا جائیگی - کہا جاتا ہے - کہ سورج کی حرارت دن بدن گھٹتی جا رہی ہے - کیونکہ وہ حرارت - جو شعاعوں کی صورت میں سورج سے باہر نکلتی ہے - ہمیشہ کے لئے فضا میں گم ہو جاتی ہے - اور کوئی ایسا ذریعہ موجود نہیں جس سے سورج کھوئی ہوئی حرارت حاصل کر سکے - لہٰذا اگر ہمیں زندگی قائم رکھنا ہے - تو زمین کو چاہیئے - کہ دن بدن سورج کی طرف بڑھتی جائے - لیکن ریاضی قوانین سے معلوم ہوتا ہے - کہ معاملہ اس کے برعکس ہے - چنانچہ ایک ایسے زمانے کی توقع کی جا سکتی ہے - جس میں سورج کی حرارت اس قدر گھٹ جائے گی - کہ زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا - یہ بھی ممکن ہے - کہ اس زمانے سے قبل ہی کوئی ایسا زبردست ستارہ سورج سے قریب ہو کر گزرے - کہ یہ نظام ہی درہم برہم ہو جائے - شاید گوئٹے کا یہ کہنا سچ ہے ؎

" اس کا نام دُنیا ہے ،
یہ چڑھتی ہے اور گرتی ہے ،
ہمیشہ لُڑھکتی رہتی ہے ،
اس میں ہے شیشہ کی جھنکار ،
اور اندر سے ہے کھوکھلی ،
ہاتھ لگایا اور ٹُوٹی ،
دیکھ اس کی تیز چمک ،
جس سے آنکھ جھپکتی ہے ،
واہ رے میری زندگی !
سُن لے میرے پیارے پوت ،
اس دُنیا کے پاس نہ جا ،
اس میں تیری موت ہے ،
یہ ایک مٹی کا گولہ ہے ،
ٹوٹ کے ٹکڑے ہوگا یہ - "

اب ہیئت سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر خالص طبیعیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے - تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن ایسا آئیگا - کہ کائنات کی توانائی (Energy) تمام اجسام میں مساوی طور پر تقسیم ہو جائیگی یعنی کائنات کی تمام اشیا کا درجہ حرارت یکساں ہو جائیگا - اور یہ اس قدر کم ہوگا - کہ اس میں کسی طرح بھی زندگی قائم نہ رہ سکیگی - اگرچہ جدید سائنس کی رُو سے ان خیالات میں گفتگو کی کافی گنجائش موجود ہے - لیکن ابھی تک کوئی تازہ خیالات پیش نہیں کئے گئے - جو ان کی جگہ لے سکیں +

سیّد بشیر الدین - بی - ای - ارکونم

سرائے میں ایک رات

گرمی کے دن تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ اور راتیں لمبی ہونی شروع ہو گئی تھیں ۔ رات کے دس بج چکے تھے ۔ تاریکی نے ہر شے پر اپنا تسلط جما لیا تھا ۔ چرند اور پرند خاموشی سے اپنے اپنے ٹھکانوں سے جا لگے تھے ۔ میں بھی دن بھر کے کام سے فراغت پاکر اوپر کی چھت پر ایک برساتی کے نیچے سونے کی تیاریاں کر رہا تھا ۔ کہ اتنے میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی میں نے اوپر کی کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر پوچھا " کون صاحب ہیں ؟ "

" میں ہوں انور ۔"

" انور کا نام سنتے ہی بھاگا بھاگا نیچے گیا ۔ اور جھٹ سے دروازہ کھولا ۔ دروازہ کا کھلنا تھا ۔ کہ انور نے تار کا ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دیا ۔ اور کہا ۔ لو مبارک ہو ۔ اب انشاء اللہ کام بن جائیگا ۔

بھوں ۔۔ بھوں ۔۔ وں ۔ ں ۔ گلی کا ایک کتا بھونکا ۔ اور میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے انور سے کہا ۔ آیئے اوپر چلیں ۔ اسے ساتھ لے کر میں قدم بہ قدم اوپر چلتا گیا " یہ لفافہ اس نے کہا ۔ میں نے ابھی ہرکارے سے لیا ہے ۔ تمہارا نام پوچھتا پوچھتا بیچارہ ہماری گلی میں جا نکلا ۔ وہاں بھی تو ایک صاحب احمد نام رہتے ہیں نا ۔ کسی نے اُن کا پتہ بتا دیا ۔ اتفاق سے میں بھی وہاں موجود تھا ۔ میں نے کہا ۔ یہ ان کا نہیں ہے ۔ میرے دوست کا ہے ۔ یہ کہہ کر میں نے دستخط کر دیئے ۔ اور لے کر سیدھا تمہارے ہاں چلا آیا ۔

اتنی دیر میں ہم تقریباً تمام قدمچے طے کر آئے تھے ۔ اور آخری قدم کوٹھے کی چھت پر پڑتا تھا ۔ میں نے کہا ۔ انور صاحب ۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ۔ یہ تار بھائی نے لکھنؤ سے دیا ہے ۔ اُنہوں نے کہا ہے ۔ کہ کل انٹرویو ہے ۔ رات کی گاڑی سے ہی سوار ہو جاؤ ۔

میں نے کلاک کی طرف دیکھا ۔ تو گیارہ بجنے میں ایک منٹ باقی تھا ۔ ہاں تو گاڑی کتنے بجے چھوٹتی ہے ۔ میں نے انور کی طرف مخاطب ہو کر کہا ۔

انور نے ذرا توقف کیا ۔ اور پھر تیزی سے بولا ۔ گیارہ بجیس پر جاتی ہے ۔ اگر اسی سے جانا ہے ۔ تو جلدی کرو جلدی ۔ اس کے بعد گاڑی بھی کوئی نہیں جاتی +

یہ سنتے ہی میں دوڑا دوڑا دوسرے بالاخانے پر گیا ۔ دیکھا ۔ تو بچے سب سو گئے تھے ۔ صرف اماں اور بڑی بہن لیٹی ہوئی کچھ باتیں کر رہی تھیں ۔ رات کی خاموشی اب پہلے سے زیادہ تھی ۔ گلی میں سے بھی لوگوں کی آمد و رفت کی آواز بہت کم آتی تھی ۔ میں نے کہا ۔ اماں جی بھائی کا تار آیا ہے ۔ اور میں نے اسی گاڑی سے جانا ہے ۔ یہ سن کر بہن اور اماں جی ایک دم اُٹھ بیٹھیں ۔ اور کہا ۔ بیٹا خیریت کا بھی ہے ۔ میں نے کہا ۔ ہاں آپ گھبرائیں نہیں ۔ میری ملازمت کے سلسلے میں مجھے بلایا ہے ۔ یہ کہہ کر میں اندر چلا گیا ۔ جلدی جلدی اپنے کچھ کپڑے اور ضروری چیزیں سوٹ کیس میں رکھیں ۔ اور اُسے ہاتھ میں لے کر والدہ سے اجازت مانگی ۔ اُنہوں نے کہا ۔ اچھا بیٹا ۔ جاؤ خدا حافظ ۔

میں ابھی دوسرے بالاخانہ پر پہنچا بھی نہ تھا ۔ کہ ریل کی سیٹی سنائی دی ۔ گھبراہٹ میں میرے منہ سے نکل گیا ۔ انور ! گاڑی تو آ بھی گئی ۔

نہیں انور نے کہا ۔ ابھی سے تمہاری گاڑی کہاں ۔ ابھی تو سوا نو ہی بجے ہیں ۔

میں نے کہا آؤ بھائی جلدی سے بستر باندھ لیں ۔ اعظم کو ٹانگہ لینے بھیج دیتا ہوں ۔

اعظم ! اعظم !! میں نے اوپر ہی سے آوازیں دینی شروع کر دیں ۔

جی حضور ۔ حاضر ہوا ۔

میں نے ساتھ ہی کہا ۔ یہاں آنے کی ضرورت نہیں جلدی جاؤ ۔ اور ایک ٹانگہ سٹیشن کے لئے لے آؤ ۔

وہ ٹانگہ لینے گیا ۔ اور ہم بستر لپیٹنے میں مصروف ہوئے ۔ ابھی بستر اچھی طرح بندھا بھی نہ تھا ۔ کہ اعظم نے نیچے ہی سے کہا ۔ حضور

آگیا ہے - میں نے کہا - اچھا جلدی اُوپر آؤ اور یہ بستر و سوٹ کیس بے جا اس پہ رکھو - - - - - - - - - - - - - - یہ سُنتے ہی اٹیشن پہ آگیا اور ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے گئے - ٹانگہ گلی کے کونے پہ کھڑا تھا - سوار ہوتے ہی میں نے کہا - لو بھائی دس منٹ باقی ہیں ذرا تیز چلانا -

ابھی لیجئے جناب - ٹانگے والے نے کہا - اور تڑاخ تڑاخ گھوڑے کے دو چابک لگائے - چابک کھاتے ہی گھوڑا ہوا ہو لیا - اور میں اعظم سے اتنا ہی نہ کہہ سکا کہ ذرا گھر کا خیال رکھنا - آن کی آن میں ہم سٹیشن پر پہنچ گئے - دیکھا تو گاڑی تیار کھڑی تھی - جھٹ سے نیچے اُترا - ٹانگے والے کو پیسے دئے - اور سیدھا ٹکٹ گھر کی طرف گیا - اتنے میں انور نے سوٹ کیس اور بستر اُتار کر قلی کے سر پہ رکھ دیا - لمبے لمبے قدم لیتے ہوئے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچے اور سامان ایک ڈبے میں رکھ دیا - سامان رکھنا ہی تھا کہ گارڈ نے سیٹی دی اور سبز جھنڈی ہلا دی - میں نے انور کو شکریہ ادا کیا - اور کہا بھائی کو سمجھا دینا - گاڑی چل دی - اور آہستہ آہستہ سٹیشن سے دُور نکل آئی - میں نے سوٹ کیس اور بستر کو ایک طرف رکھا - اور ایک تختے کے کونے پر بیٹھ گیا - گاڑی میں آٹھ دس سواریاں اور بھی تھیں - سب کے سب لمبی تانے سو رہے تھے - تھوڑی ہی دیر میں گاڑی سنسان جنگلوں سے گذرنے لگی - مطلع ابر آلود تھا - اور رات کی تاریکی میں گھومتے ہوئے درخت ایسے دکھائی دے رہے تھے - گویا بھوتوں کی بے شمار قطاریں آگے پیچھے بھاگی جا رہی ہیں - خاموشی - پوری خاموشی طاری تھی - اور گاڑی کی چھکا چھک کے سوا اور کوئی آواز سُنائی نہ دیتی تھی -

" کل انٹرویو ہے میں نے اپنے دل میں کہا - خدا جانے کیا کیا سوالات پوچھیں - یا اللہ تیری مدد چاہئے - اخبارات کا مطالعہ تو بہت کیا ہے - جغرافیہ و تاریخ کی بھی چند کتابیں پڑھ ہی لی ہیں - سائنس کی بھی موٹی موٹی باتیں یاد ہیں - دیکھا جائیگا - گھبرانے کی کیا بات - آخر انہی باتوں کے متعلق سوالات پوچھتے ہیں "

گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تھی - چھوٹے چھوٹے کئی سٹیشن گزر چکے تھے - رات کی مکمل تاریکی کا لبادہ اوڑھے بدستور اپنی حکمرانی میں سرشار تھی - اور ستارے چھپکے چھپکے سرگوشیاں کر رہے تھے -

کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد نیند نے مجھے بھی آگھیرا - اور میں بھی لگا آگے پیچھے ہچکولے کھانے - گاڑی کی نیند اچاٹ کرنے والی چھک چھک اب بھی جاری تھی - لیکن نیند نے آ ہی دبایا - اور میری آنکھ اُس وقت کھلی - جب لکھنؤ کا سٹیشن آگیا ؛

" قلی - قلی حضور - قلی چاہئے - " ایک قلی نے عین میرے دروازے کے سامنے آکر کہا - میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا - اور اور سامان اُٹھانے کے لئے کہا - میں بھی اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا -

سٹیشن پر کچھ زیادہ رونق نہ تھی - چند مسافر اُترے تھے - اور شاید اس سے بھی کم تعداد میں چڑھے ہونگے - میں نے بابو سے پوچھا - کیوں صاحب ! وقت کیا ہوگا ؟ دو بجے ہیں - اُس نے جلدی سے ٹکٹ لیتے ہوئے کہا -

باہر آکر میں نے ایک ٹانگے والے کو آواز دی - اور سامان ٹانگے میں رکھوا لیا - ٹانگے والا کچھ دیر چلا - اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہا - " کیوں حضور ! کہاں جائیے گا ؟

میں نے دل میں سوچا - کہ اس وقت بھائی کا مکان کون ڈھونڈھتا پھریگا - خدا جانے کن گلیوں میں ہو - یہی بہتر ہے - کہ کسی نزدیک کی سرائے میں چلو - صبح دیکھا جائیگا -

" کسی سرائے میں لے چلو " میں نے جواب دیا -

سٹراک - سٹراک - اس نے دو چابک گھوڑے کے رسید کئے - اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا -

سڑکوں پر سنسنی چھائی ہوئی تھی - اور کتوں کے بھونکنے یا گھوڑے کی ٹاپ کے سوا اور کوئی آواز سُنائی نہ دیتی تھی -

میں نہ جانے کن خیالات میں غرق رہا - اور ٹانگے والا کہیں کا کہیں نکل آیا - یہاں نہ بجلی کے قمقمے تھے - نہ صاف سڑک - نہ مکانات کی دو رویہ قطاریں تھیں - اور نہ شہری آبادی کی علامات - کوئی کوئی لالٹین تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑی اس طرح دکھائی دے رہی تھی - جیسے کوئی بھوت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہو - ٹانگہ ایک دم رُک گیا - میں نے کہا - یہ تم کہاں اُجاڑ میں لے آئے

" نہیں حضور - یہ دیکھئے - نزدیک ہی سرائے ہے - شہر میں آپ کو بہت تکلیف رہتی - اور وہاں آج کل بیوپاری بہت آئے ہوئے ہیں - جگہ بھی مشکل ہی ملتی ہے - میں نے ٹانگے سے اُتر کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی - ایسا معلوم ہوا - جیسے کسی ویرانے میں پہنچ گیا تھا - میں نے کہا - کہاں ہے سرائے ؟

حضور یہ سامنے ہی تو ہے - یہ دیکھیئے یہ سامنے سرائے ہی ہے

اور کیا ہے - میں نے دیکھا - تو سوائے دو چار درختوں کے جو سایے کی طرح خاموش کھڑے تھے - اور کچھ نظر نہ آیا - ٹانگے والے نے مجھے کچھ پریشان سا دیکھا - تو پھر بول اُٹھا -

حضور گھبرائیے نہیں - یہ سامنے سرائے ہی ہے - آپ جا کر ذرا آواز دیجئے - ابھی بھٹیارن دوڑی آئے گی - یہ فقرے اُس نے کچھ اس انداز سے کہے - کہ مجھے کچھ حوصلہ ہو گیا - میں نے جیب میں سے چھ آنے نکالتے ہوئے کہا - اچھا لو - تم اپنا کرایہ تو لو -

ٹانگے والا اپنے پیسے لے کر چلتا بنا - اور نزدیک ہی سڑک کے موڑ پر جا کر غائب ہو گیا ٭

میں نے جو مڑ کر دیکھا - تو ہُو کا عالم تھا - نہ کہیں بتّی نہ دیا - ہر طرف تاریکی ہی تاریکی - اور تاریکی بھی وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے - اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا - کہ کدھر جاؤں اور کسے بلاؤں - لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا - کہ چاروں طرف سے کالی کالی بلائیں میری طرف دوڑی آ رہی ہیں - جی چاہتا تھا - کہ زور سے ایک چیخ ماروں - اتنے میں کچھ فاصلے پر ایک مریل کُتّے کے بھونکنے کی آواز آئی - میں نے اپنا بستر بوریا اُٹھایا - اور اُسی طرف کو ہو لیا - ابھی کچھ دُور نہ گیا تھا - کہ چند ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں جا گھسا - اُف کچھ نہ پوچھو - ایسا معلوم ہوا - جیسے کسی نے میری جان نکال لی ہو - ٹوٹے پھوٹے شہتیر - گرے پڑے چھپر - اُونچی نیچی دیواریں سب کی سب مجھے بلائیں نظر آ رہی تھیں - معاً میرا پاؤں ایک گڑھے میں پڑا - اور میرے مُنہ سے زور کی ایک چیخ نکل گئی - کُتّا پھر بھونکا - اور مجھے کچھ ہوش آئی - میں اُسی رُخ پلٹا - کتا زیادہ ہی زیادہ بھونکتا - اور میں اُس کے عین قریب پہنچ گیا - میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سُنی - اور دیکھا کہ کوئی شئے کالے کالے سائے کی طرح میری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے - میں نے چاہا - کہ کچھ بولوں - لیکن خوف کے مارے ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکال سکا -

"ارے کون ہے" بھٹیارن نے پاس آ کر کہا -

بُڑھیا کی آواز سُن کر میری جان میں جان آئی - اور میں نے دل قوی کر کے کہا - "اماں مسافر ہوں -"

"آؤ - میرے ساتھ - بھٹیارن نے جلی بھُنی آواز میں کہا - اور بڑبڑ کرتی آگے آگے ہو لی ٭

اندر جا کر لیمپ جلایا - اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولی - اس سامنے والے کمرے میں لیٹ جاؤ - یہی ایک کوٹھری باقی ہے - اور یہ بھی کوئی دن کی ہے -

بُڑھیا نے لیمپ کوٹھری میں رکھ دیا - اور خود اسی طرح بڑبڑاتی چلی گئی - میں نے دیکھا - تو تمام دیواروں پر نمی کے آثار تھے ہر جگہ مٹی اٹی پڑی تھی - اور چھت ایسی بوسیدہ - کہ اب گری اور اب گری۔ مرتا کیا نہ کرتا - رات کے دو بجے اب اور کہاں جاتا - وہیں ایک چارپائی پر بستر بچھا لیا - اور دروازے کو قفل لگا دیا - ٹارچ نکال کر اپنے پاس رکھ لی - اور لیمپ بجھا کر لیٹ گیا - لیٹے لیٹے ابھی کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی - کہ مجھے ایسا معلوم ہوا - جیسے کوئی دروازہ کھول رہا ہو - میں فوراً ہی چیخ مار دیتا - لیکن معاً مجھے یاد آیا - کہ میں نے تو دروازے میں قفل لگایا ہوا ہے - دروازہ پھر کھٹکا - اور مجھے ایسا معلوم ہوا - جیسے کسی نے دروازہ کھول لیا ہے - میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا - اور میں سمٹ سمٹا کر گٹھری سی بن گیا - دل ہی دل میں مَیں نے بہتیری کوشش کی - کہ ٹارچ سے دیکھوں تو سہی کون ہے - لیکن باوجود زور لگانے کے میں اپنے ہاتھ کو نہ ہلا سکا - پھر بولنے کی کوشش کی - لیکن زبان سے بھی ایک لفظ نہ نکل سکا - اب مجھے ایسا محسوس ہوا - جیسے کمرے کے اندر کوئی شخص کچھ ڈھونڈھ رہا ہو - میں اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا - اتنے میں ایک ہاتھ میرے لحاف پر ٹٹولتا ہوا آیا - میں مُردے کی طرح اکڑا ہوا پڑا رہا - یہاں تک کہ وہ ہاتھ ٹٹولتا ٹٹولتا میری گردن کے پاس پہنچ گیا - اور مجھے ایسا محسوس ہوا - کہ اب یہ میرا گلا گھونٹنا چاہتا ہے - میں نے انتہائی زور سے وہ طلسم توڑا - اور بے اختیار ایک زور کی چیخ ماری - اب میرے ہاتھوں میں جان آ گئی - میں نے جھٹ سے ٹارچ کا بٹن دبایا - دیکھا تو قفل اُسی طرح لگا ہوا تھا - اور کمرے میں کوئی نہ تھا ٭

ڈر کے مارے میرا خون خشک ہو گیا - اور ہاتھ جہاں تھے - وہیں رہ گئے - دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا - کہ اس کی دھڑکن کانوں تک کو صاف سُنائی دے رہی تھی - کچھ دیر سہمے ہوئے کبوتر کی طرح بیٹھا رہا - سوچتا رہا - کہ ممکن ہے - یہ خواب ہو - لیکن خواب کیسے ہو سکتا تھا - میرے گلے کی شاہ رگ ابھی تک دُکھ رہی تھی - اور ایسا محسوس ہو رہا تھا -

جیسے کوئی اب بھی میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔ یونہی بیٹھے بیٹھے نیند پھر آنے لگی۔ میں نے دو چار مرتبہ تو سر جھنجھوڑ کر آنکھیں کھولیں۔ اور چاہا۔ کہ باقی رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹوں۔ لیکن کہاں۔ نیند آئے بغیر کب ٹلتی ہے۔ اور پھر ایسے میں جب باہر بوندا باندی ہو رہی ہو۔ اور ٹھنڈی ہوا کاٹنے کو آتی ہو۔

کئی بار میں نے چاہا۔ کہ اُٹھ کر باہر نکلوں اور بڑھیا کو اس واقعہ سے آگاہ کروں۔ لیکن روشندان میں سے دیکھا۔ تو اندھیرا گھُپ تھا۔ بجلی کی کڑک۔ بادل کی گرج۔ باہر کا نقشہ اور اس واقعہ کا تخیل تمام کے تمام میرے حوصلے کے مقابلے میں صف آرا تھے۔ اور بار بار اُسے پچھاڑ رہے تھے۔ میرے واسطے اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ لحاف لپیٹ کر دیوار سے لگ جاؤں۔ اور باقی رات یونہی بیٹھے بیٹھے گزار دوں۔ آخر یونہی کیا۔ لحاف کو چاروں طرف سے لپیٹ لیا۔ اور سمٹ سمٹا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں نیند جو آئی۔ تو لگے ہچکولے آنے۔ اب کیا تھا۔ سر گھٹنوں سے لگ گیا۔ اور غنودگی سی طاری ہو گئی۔

لیکن دل اب بھی خوف کے مارے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہر دو چار منٹ کے بعد میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ لیتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جو میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ تو معاً میری چیخ نکل گئی۔ اور کافی دیر تک مجھے اپنا پتہ نہ رہا۔ پھر جو کچھ ہوش آیا۔ تو ڈرتے ڈرتے روشندان کی طرف دیکھا۔ مگر اب وہ چیز غائب تھی۔ لیکن اُن دو خونی آنکھوں کا تصور جو لال انگارے کی طرح چمک رہی تھیں۔ اب بھی میرے تمام بدن میں کپکپی پیدا کر رہا تھا۔ اور خوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

ڈرتے ڈرتے میں نے اپنی ٹارچ جلائی۔ اور اِدھر اُدھر پھرا کر اطمینان کیا۔ کہ کوئی کمرے میں تو نہیں۔ خدا کا شکر ہے ہُوا۔ کہ کمرے میں سوائے میرے سوٹ کیس کے اور کچھ نہ تھا۔ اگر سامان کچھ زیادہ ہوتا۔ تو میں اسی شبہ میں رہتا۔ کہ شاید فلاں سامان کے پیچھے کچھ ہو۔ ٹارچ کو میں نے جلتا ہی رہنے دیا۔ اور خود ذرا درست ہو کر بیٹھ گیا۔ ابھی پوری طرح بیٹھنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ باہر سے "ہائے میں مر گیا" ہائے۔ ہائے کی آوازیں آنے لگیں۔ اور ہر نئی آواز نزدیک سے نزدیک تر ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے کہا۔ یا اللہ آج میں کس مصیبت میں آ پھنسا۔ صبح تک خیر نہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ آج مجھے موت ہی یہاں کھینچ لائی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی گھر کے تمام لوگوں کی صورتیں یکے بعد دیگرے آنکھوں میں پھرنے لگیں۔ آنکھیں بھر آئیں۔ اور میں سسکیاں لے کر رونے لگا۔ رویا اور خوب رویا۔ یہاں تک کہ میری آنکھ لگ گئی۔ اور مجھے اپنی سدھ بدھ نہ رہی ۔

صبح جب آنکھ کھُلی۔ تو تمام کمرہ روشن تھا۔ دھوپ کی ایک ننھی کرن خاکی ذرات سے اٹکھیلیاں کرتی اندر آ رہی تھی۔ میری طبیعت بھی کچھ ہلکی سی تھی۔ رات کی بھیانک تاریکی اور اس کی کالی کالی بلائیں اب بھاگ چکی تھیں۔ مگر اُن کا دھندلا سا تصور اب بھی باقی تھا۔

میں نے اُٹھتے ہی دروازہ کھولا۔ اور سیدھا بُڑھیا کے کمرے کی طرف گیا۔ بُڑھیا اپنے دروازے کے سامنے بیٹھی آگ جلا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ کیوں بیٹا! رات خیریت سے گزری۔ کمرہ ٹپکا تو نہیں۔ "ٹپکا" میں نے بُڑھیا سے کہا۔ ٹپکا تو نہیں۔ مگر اس میں تو کوئی بھوت رہتا ہے۔ خدا خدا کر کے میری جان بچی۔ ورنہ میں تو کبھی کا ہو لیا ہوتا۔

"نہیں بیٹا! خدا نہ کرے۔ اس میں بھوت کیوں ہونے لگا۔ یہ عمر گزری۔ میں نے تو کبھی ایسی بات سُنی نہیں۔ ہزاروں آئے۔ اسی میں ٹھہرے اور چلے گئے۔

اس پر میں نے بڑھیا کو رات کا تمام واقعہ سنایا۔ بُڑھیا کچھ دیر تو غور سے سنتی رہی۔ مگر جب میں نے اُن ڈراؤنی آنکھوں کا ذکر کیا۔ تو بولی۔ اُونہہ ہوں۔ آپ خواہ مخواہ ہی ڈرتے رہے۔ وہ تو میری بلّی کہیں چلی گئی ہوگی۔ وہ دیکھو اُس نے اندر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اندھیرے میں اب بھی اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ میں نے دیکھا تو واقعی ایک کالی موٹی بلّی کی آنکھیں اسی طرح چمک رہی تھیں۔ جیسے میں نے رات دیکھی تھیں۔

اس پر میں نے کہا "تو وہ ہائے ہائے کی آواز کیسی تھی؟"

کہنے لگی۔ وہ بھی آپ کو دھوکا ہُوا۔ وہ دیکھئے وہ سامنے جو بڑ کا درخت ہے۔ اس کی ایک کھوکھ میں اُلّو رہتا ہے۔ یہ کمبخت اسی طرح بولتا ہے۔ کبھی بچّوں کے رونے کی سی آواز نکالتا ہے۔ اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی کراہ رہا ہے۔ یہ سُن کر میں بہت کھسیانا سا ہُوا۔ اور اپنی بیوقوفی اور بُزدلی پر بہت نادم ہُوا۔ خیر میں نے کہا۔ شاید ایسا ہی ہو۔

یہ کہہ کر میں نے بڑھیا کو کوٹھڑی کا کرایہ دیا۔ اور ٹانگہ لے کر سیدھا بھائی کے گھر کو ہو لیا ۔ عنایت اللہ انبالوی بی۔ اے

واجد علی شاہ کی معزولی اور اس کے اسباب

(گزشتہ سے پیوستہ)

الحاق کی تمام تفصیلات اور جزئیات ہم گذشتہ نمبر میں بیان کر چکے ہیں۔ ان سے جو نتائج مترتب ہوتے ہیں۔ ان پر ہم ذیل میں بحث کرتے ہیں:-

مارکوئیس آف ڈلہوزی نے الحاق کی حکمت عملی پر جس دلیری اور بے باکی سے عمل کیا۔ اس کی مثال تمام ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ سچ ہے کہ اس پیش قدمی کی بدولت جو حالات پیدا ہوئے۔ ان کا مقابلہ اس کے جانشین کو کرنا پڑا۔ الحاق کی حکمت عملی کا آخری شکار اودھ کی سلطنت تھی۔ مگر اس کا اثر سب سے اول ظہور پذیر ہوا۔ ہر مورخ ۱۸۵۷ء کی شورش کا باعث اسی کو ٹھہراتا ہے۔ اور ہر سلیم الرائے سیاست دان اس کی مذمت کرتا ہے۔ اور بعض تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں۔ کہ یہ ایک ڈاکہ تھا۔ جو دن دہاڑے ڈالا گیا۔

اودھ کا خاندان ابتدا میں تیموریوں کے ماتحت تھا۔ وہ انہیں اپنا بادشاہ تصور کرتے تھے۔ اور ان کی اطاعت اپنا فرض جانتے تھے۔ مگر ۱۸۱۹ء میں انہوں نے لارڈ ماٹرا کے ساتھ مل کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہی لارڈ ماٹرا بعد میں مارکوئیس آف ہیسٹنگز کے نام سے مشہور ہوا۔ اور وہ وزارت کے درجے سے بڑھ کر بادشاہت کے منصب تک پہنچ گئے۔ اب اودھ میں ایک خاص انقلاب پیدا ہوا۔ وہ مطلق العنان تھے۔ ان کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ وہ آزاد مطلق تھے۔ اور وہاں کے بادشاہ تھے۔ مگر یہ سب کچھ ظاہرا ٹھاٹھ تھا۔ حقیقت میں وہ کمپنی کے غلام تھے۔ اور کمپنی کے سیاست دانوں نے انہیں تیموریوں کی بادشاہت مٹانے کے لئے ایک حریف کی صورت میں کھڑا کیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے۔ کہ ایسا کرنے سے تیموریوں کی ہر دلعزیزی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ لوگوں کی نظریں دہلی سے ہٹ کر لکھنؤ پر جم جائیں گی۔ اور اس طرح تیموریوں کے سیاسی اثر و رسوخ کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔ تو اودھ کا مٹانا بالکل آسان ہوگا۔

اودھ کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے بہت جلد یہ معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ان کی بادشاہت میں غلامی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ وہ بظاہر خود مختار رہتے۔ مگر سلطنت کی حکمت عملی میں ان کا کوئی ہاتھ نہ ہوتا تھا۔ وہ سیاسی معاملات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پابند تھے۔ یہ ان کی غداری کا پہلا ثمر تھا۔ کہ انتہائی وفا شعاری اور خیر خواہی کے باوجود وہ روز بروز کمپنی کے محتاج ہوتے چلے گئے۔ ایک ایک کر کے ان سے ہر قسم کے سیاسی اختیارات چھین لئے گئے۔ ان کی مثال بالکل اس پرندہ کی طرح تھی۔ جو ایک بہت بڑے پنجرے میں بند ہو۔ اور اس قید کی حالت میں ایک ایک کر کے اس کے تمام پر نوچ لئے جائیں۔

کمپنی کے اہلکار اور برطانوی حکومت کے کارندے بڑے شد و مد اور جوش و خروش سے ان کی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ اور اپنے اخلاص کے لمبے چوڑے قصیدے پڑھتے تھے۔ اور اس دوستی کے پردے میں ضرورت کے وقت ان سے زیادہ سے زیادہ مالی مدد حاصل کرتے تھے۔ اور شاہان اودھ جوش وفا میں اس دوستی کے پودے کو اپنے خون سے سینچنے میں بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ سرکار کمپنی نے وقتاً فوقتاً ان خدمات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ چنانچہ سر ہنری لارنس اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں:-

"ہندوستان میں کوئی حصہ ایسا نہیں جو اودھ سے زیادہ انگلستان میں معرض بحث میں آیا ہو۔ افغانستان۔ اور پنجاب تو جدید مسائل ہیں۔ ان سے نصف صدی پیشتر

اہل انگلستان کو ہندوستان کے فقط ایک ہی صوبے کا علم تھا۔ جو اپنے داخلی معاملات میں برائے نام آزاد تھا۔ اور جس نے وقتاً فوقتاً ایسٹ انڈیا کمپنی کو مالی مشکلات سے نجات دلائی ہے ؛

ہم ان نامرغوب لوگوں میں سے ہیں۔ جو خیال کرتے ہیں۔ کہ سیاسیات اور اخلاقیات کسی حالت میں بھی ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ اور ایک دیانت دار انسان لازمی طور پر ایک دیانت دار افسر بھی ہو ؛

اودھ کے معاملات اور حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ اس سلسلے میں ہم سخت لغزش کھا چکے ہیں۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ وارن ہیسٹنگز لارڈ ہیسٹنگز مارکوئس لارڈ ویلزلی اور لارڈ آک آکلینڈ نے جو سلوک بحیثیت گورنر جنرل مفلوج اور اپاہج اودھ کے ساتھ کیا۔ وہ پرائیویٹ حیثیت میں کبھی اس سے روا نہ رکھتے۔ اودھ ہماری ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا باب ہے۔ جسے پڑھ کر ہماری گردن شرم اور ندامت سے جھک جاتی ہے۔ اور عبرت و بصیرت کا وہ دفتر ہے جس کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک سیاست دان جب ایک خاص مصلحت کے بعد عوام کے فائدے کی خاطر بُرائی اور بھلائی کا ایک معیار قائم کر لیتا ہے۔ تو وہ اپنا زاویۂ نگاہ تبدیل کرنے کے لئے کس قدر گر جاتا ہے۔ اودھ کے مسائل پر بحث کرنے والے جو واقعات پیش کرتے ہیں۔ سب اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ کہ اس صوبہ میں برطانوی مداخلت وہاں کے دربار اور عوام کے لئے اتنی ہی مضرت رساں اور متعصبانہ تھی۔ جتنی برطانوی نام کے لئے شرمناک ہے۔ میں اس جگہ کرنل سدرلینڈ کے الفاظ دُہراتا ہوں۔ جو ایک قابل اور متین مصنف تھے۔ آپ لکھتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں کوئی ریاست ایسی نہیں جس کے معاملات میں ہم نے اتنی باقاعدگی کے ساتھ بیقاعدہ دخل دیا ہو۔ جتنا کہ ہم نے اودھ کے مسائل میں دیا ہے وہ آگے چل کر بڑی انصاف پسندی سے کہتا ہے۔ کہ یہ مداخلت اس سلطنت سے زیادہ آدمیوں کے حق میں تھی۔ مختصر یہ ہے۔ کہ ہم جہاں سے ورق اُلٹ کر دیکھتے ہیں۔ ہمیں اپنی مداخلت کے تباہ کن اثرات نمایاں نظر آتے ہیں ؛

" اگر کوئی تدبیر ایسی ہو سکتی ہے۔ جس سے بدنظمی کو زیادہ فروغ حاصل ہو۔ تو وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ کہ ایک دیسی والئے ملک اور اس کا وزیر غیر ملکی تلواروں کے بھروسہ پر حکومت کرے۔ اور ہر معاملہ میں برٹش ریذیڈنٹ کے اشارہ کا محتاج ہو۔ یہ تینوں خواہ کتنے ہی قابل۔ نیک اور دُوراندیش کیوں نہ ہوں۔ سلطنت کی گاڑی ان کے ہوتے ہوئے آسانی کے ساتھ حرکت نہیں کر سکتی۔ ان میں سے ہر ایک فتنۂ عظیم تو پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھلائی نہیں کر سکتا۔ خاص کر اس وقت جب وہ ایک دُوسرے کی تخریب پر تُل جائے۔ اور ایک دُوسرے کے کام میں روڑے اٹکاتا رہے۔"

(کلکتہ ریویو ۱۸۴۵ء)

یہ اس اودھ کی تصویر ہے۔ جس کی دولت مندی۔ زرخیزی اور قدرتی پیداوار کی فراوانی کو برطانوی لوگ ہمیشہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس کی یہی طبیعی صلاحیت اس کی تباہی کا باعث بنی۔ چنانچہ ایک انگریز مقالہ نگار اودھ کی انہی صلاحیتوں پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے

" موسم سرما میں اودھ سے بڑھ کر کسی اور جگہ کی آب و ہوا میں وہ لطافت اور عمدگی نہیں ہوتی۔ جو یہاں موجود ہوتی ہے۔ اکتوبر سے لے کر برسات کے آغاز تک یورپ کا کوئی علاقہ ترائی کی آب و ہوا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

(کلکتہ ریویو ۱۸۵۶ء)

آگے چل کر یہی مقالہ نگار تجارت کے متعلق بحث کرتا ہے۔ اور مختلف شواہد سے یہ ثابت کرتا ہے۔ کہ ایک ہوشیار تاجر تھوڑی سی محنت کے ساتھ کام کرے۔ تو وہ ایک مدّت قلیل میں مالا مال ہو سکتا ہے۔ اودھ کی یہ خوبیاں اس کے حق میں وبال بن گئیں۔ اور سرکار کمپنی نے اپنی تجارتی اور مُلکی اغراض کے لئے اسے اپنی جولانگاہ بنایا۔ اور اس پر ہمیشہ کے لئے قبضہ کر لیا ؛

کمپنی کے عمال بڑے شد و مد سے اس بات کا دعوےٰ کرتے تھے۔ کہ اودھ کے لوگ بادشاہ کو پسند نہیں کرتے۔ وہ اس کی حکومت سے تنگ آ چکے ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ یہ سلطنت بہتر ہاتھوں میں چلی جائے۔ تاکہ ان کی مصیبتیں کم ہو جائیں۔ مارکوئیس آف ڈلہوزی کے مکتوبات

اور اینگلو انڈین حضرات کی ڈائریاں اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہیں مگر حقیقت یہ ہے۔کہ حالات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔کہ ان الزامات کو اصلیت سے کوئی تعلق نہیں۔چنانچہ ایک غیر مسلم مؤرخ واجد علی شاہ کی معزولی کا تذکرہ کرتا ہوا کہتا ہے۔کہ:۔

" لوگوں میں زبردست ہیجان پیدا ہوا۔قیامت ظاہر ہوئی۔ سلطنت کے ارکان مملکت کے سردار شہر کے چھوٹے بڑے تمام اضطراب کے بھنور میں گر پڑے۔اور بالکل بے تاب ہو گئے۔ہر طرف رونے دھونے اور چیخنے چلانے کی صدائیں آتی تھیں۔ہر طرف غم و الم کا تصرف تھا۔چھوٹے بڑے جوان اور بوڑھے بادشاہ کے لئے افسوس کر رہے تھے۔ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔البتہ نواب علی نقی خاں کو جسے وہ سلطنت کا خراب کرنے والا اور ملک کے الحاق کا باعث سمجھتے تھے۔غلیظ اور گندی گالیاں دیتے تھے۔ اس کی ہجو میں شعر لکھے گئے۔جسے لوگ کوچہ بکوچہ اور محلہ بمحلہ پڑھتے تھے۔اس کے اندوہ واقعہ کے ظاہر ہونے کے بعد گردونواح کے راجاؤں اور زمینداروں نے بادشاہ کے حضور میں عرضداشتیں بھیجیں۔کہ اگر آپ حکم دیں۔تو ہم آگے بڑھیں۔اور انگریزوں کے ساتھ جنگ کریں۔اور آپ پر جان نثار کریں۔اور کسی کو دریائے گنگا عبور کرنے کی مہلت نہ دیں۔"

{ بوستان اودھ از راجہ درگا پرشاد
تعلقدار رئیس اعظم سندیلہ صفحہ ۱۱۳-۱۱۴ }

علاوہ ازیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔کہ جب کمپنی کے اس ارادے کی بھنک سلطنت کے امیروں اور وزیروں کے کان میں پڑی۔کہ عنقریب اودھ پر سرکار کمپنی قبضہ کرے گی۔تو ۱۸؍ اگست ۱۸۵۵ء کو اودھ کے دو سو امیروں نے ایک پرائیویٹ مجلس منعقد کی۔جس میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی۔اور فیصلہ ہوا۔کہ ایک لاکھ پچاس ہزار پونڈ سالانہ رشوت اور ایجی ٹیشن کے طور پر صرف کیا جائے۔تاکہ ملک کا الحاق رک جائے۔اس اہم مجلس کا صدر ایک پچانوے سالہ بوڑھا سردار قاسم علی تھا۔اس نے اس مسئلہ پر متواتر دو گھنٹے تقریر کی۔اور آخر تقریر کرتا کرتا بے ہوش ہو گیا۔دوران تقریر میں اس نے کہا۔کہ میں سلطنت اودھ کے ہلالی جھنڈے تلے پیدا ہوا۔اس شاہی خاندان کی عظمت ختم ہو چکی ہے۔مگر رعایا کے دلوں میں ابھی تک اس کا احترام باقی ہے۔ہمیں بیل کی استقامت اور لومڑی کی مکاری کے ساتھ اس الحاق کا مقابلہ کرنا چاہئے۔فرنگی سونے کے عاشق ہیں۔مگر اودھ کے رہنے والے اپنی آزادی کو سونے سے زیادہ عزیز جانتے ہیں۔آؤ عیسائیوں کو پرائیویٹ اور شاہی خزانوں سے توڑے پیش کریں۔کیا یہ لوگ اپنے پیشروؤں جیسے نہیں۔اسی طرح دوسرے امیروں نے بھی اس کی ہمنوائی کی۔دیگر مقامات پر بھی اس قسم کی مجالس برپا ہوئیں۔رسالے شائع کئے گئے۔اور انہیں مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا۔ان رسالوں میں مسلمانوں کی مذہبی حمیت سے اپیل کی گئی۔

(برٹش انڈیا جلد دوم صفحہ ۲۰۹-۲۰۹)

اس کے علاوہ ایک اور اہم نقطہ ہے۔جسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔بہت سے اینگلو انڈین اور یورپین شاہان اودھ کی ملازمت میں تھے۔یہ اودھ کے بادشاہوں کا نمک کھاتے تھے۔مگر جب موقع پاتے۔تو بڑے شدومد سے ان کے خلاف پروپاگنڈا بھی کرتے تھے۔جس طرح کسی زمانے میں آرمینیا والے ترکوں کو بدنام کرنے کے لئے اور اہل یورپ کے دل میں ان کے متعلق نفرت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے غلط سلط باتیں پھیلاتے تھے۔اسی طرح یہ لوگ اودھ کے خلاف پراپاگنڈہ کر رہے تھے۔ پریس پے درپے یہ آواز بلند کر رہا تھا۔کہ اودھ کے الحاق کے سلسلے میں تساہل سے کیوں کام لیا جا رہا ہے۔اس پر فی الفور قبضہ ہونا چاہئے۔چنانچہ مارکوئیس آف ڈلہوزی کے ایک مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ

" ایڈنبرا ریویو میں ۱۸۵۵ء میں ایک مضمون اسی موضوع پر شائع ہوا۔"

(مارکوئیس آف ڈلہوزی کے نجی خطوط صفحہ ۳۶۳)

اسی طرح کلکتہ ریویو میں سکاٹ لینڈ کے ایک پادری ڈاکٹر ڈف نے ایک زبردست مقالہ بعنوان "فتوحات کا دور" "دور" کیا یہ ختم ہو چکا ہے۔" سپرد قلم کیا۔جس میں فلسفیانہ انداز میں بحث کرتے ہوئے پادری صاحب لکھتے ہیں:۔

" مشرقی سلطنتوں نے فتوحات ترک کر دی ہیں جن کا

اثر یہ ہے - کہ وہ مرعوب ہو گئے ہیں - ہمارے گرد و پیش ہر جگہ ان کے قصر شاہی کے گرنے کا شور سنائی دے رہا ہے ... ... اودھ کی سلطنت شاید انگریزوں کی اس غلطی کی شاندار مثال ہے - جو وہ فتوحات کے سلسلے میں کر رہے ہیں - "

اودھ کی فتح کی ترغیب دلاتا ہوا وہ لکھتا ہے کہ

"آج وہاں تشدد کا دور دورہ اس واسطے ہے - کہ ہم تشدد کی حمایت کرتے ہیں - ہم اسے روک سکتے ہیں - ہمارے گزٹ میں ایک سطر شائع ہو جانے سے بادشاہ - اس کے خواجہ سرا - حرم اور جیکلہ دار سب کا خاتمہ ہو سکتا ہے - اودھ میں کوئی فوج نہیں - تمام ہندو آبادی ہماری حامی ہے - ہمارے سپاہیوں کے عزیز تمام کے تمام اضطراب کے ساتھ اس الحاق کا انتظار کر رہے ہیں - باقی رہے مسلمان - تو ان کی کوئی ایسی تعداد نہیں اور نہ ہی وہ منظم ہیں - گوروں کی دو پلٹنیں اس قبضہ کے لئے کافی ہیں - اور یہ دو پلٹنیں ہم مہیا کر سکتے ہیں - باقی رہا معاہدہ کا سوال - اس کا جواب آسان ہے - ہم فقط بادشاہ سے ظلم کرنے کی طاقت چھین لیں گے - اسے محاصل سے محروم نہیں کریں گے - یہ اسے اس واسطے دیا جائیگا - کہ وہ عیش و آرام کی زندگی بسر کر سکے ؎

(کلکتہ ریویو جولائی ۱۸۵۵ء)

یہ پراپگنڈا آخر رنگ لایا - اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر مجبور ہو گئے - کہ وہ اودھ کے الحاق کی تجویز کو منظور کر کے اسے برٹش انڈیا میں شامل کرنے کے احکام نافذ کر دیں ؎

جہاں تک ملک کی بدنظمی کا تعلق ہے - سر جان کین کے اس قول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ "ہم جس ملک پر قبضہ کرنا چاہتے - پہلے اس کے حکمران کو بدنام کرتے ہیں - " اگر حالات کا مطالعہ کیا جائے - تو اس پروپاگنڈا کا طلسم بھی بڑی آسانی سے ٹوٹ سکتا ہے ؎

ان شواہد اور حقائق کے ہوتے ہوئے ایک انصاف پسند انسان بڑی آسانی سے کہہ سکتا ہے - کہ الحاق اودھ کے سلسلے میں خاندان اودھ کے ساتھ سخت بے انصافی ہوئی - اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس اس الحاق کے جواز میں کوئی دلیل نہیں - یہاں تک کہ سر جان کین کو کہنا پڑا کہ :-

"اس الحاق نے اہل ہند کے دلوں پر بہت برا اثر کیا - اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں - کیونکہ یہ کہا جا سکتا ہے - کہ جب ہم نے اپنے سب سے زیادہ وفادار معاون کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے - تو پھر کون ہمارے ہاتھ سے محفوظ رہ سکتا ہے - "

(سپائی وار جلد اول صہ ۱۵۲)

(پروفیسر) علم الدین سالک

مختار

بھوکی

وہ بھوکی تھی۔

لیکن کسے خبر؟

کاش کسی کا بھوکا ہونا بھی سماج کا کوئی گناہ ہوتا! اس کی بھی خبر لوگوں میں اسی طرح بجلی کی سُرعت سے پہنچ جایا کرتی۔ جس طرح کسی کے حرامی بچہ ہونے کی۔

فلسفی نے کہا۔ کہ وہ اس لئے بھوکی ہے۔ کہ اس کا معدہ خالی ہے

مولوی نے کہا۔ کہ وہ اس لئے بھوکی ہے۔ کہ رزق کا دروازہ اس پہ بند ہے۔

سیاست دان نے کہا۔ کہ وہ اس لئے بھوکی ہے۔ کہ اسے ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں۔

شاعر نے کہا۔ کہ وہ اس لئے بھوکی ہے۔ کہ اس کے حسین لعلیں لبوں پر پپڑیاں جم جائیں اور وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین اور دلفریب ہو جائیں۔

افسانہ نویس نے کہا۔ کہ وہ اس لئے بھوکی ہے۔ کہ اس کے مرحوم شوہر نے کوئی ورثہ نہیں چھوڑا۔

قانون دان نے کہا۔ کہ وہ اس لئے بھوکی ہے۔ کہ پیداوار کم اور آبادی زیادہ ہے۔

پیٹ بھرے نے کہا۔ کہ وہ اس لئے بھوکی ہے۔ کہ اُسے روٹی نہیں ملی۔

بھوکے نے کہا۔ کہ وہ اس لئے بھوکی ہے۔ کہ بہت سے لوگ بھوکے ہیں۔

غرضکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ بھوک کی غرض اور وجہ کچھ بھی ہو۔ وہ بھوکی تھی۔ روٹی کا ٹکڑا کھا کر شیر مال کی بھوکی نہیں۔ بلکہ سوکھی روٹی کی بھوکی۔۔۔۔ ایسی بھوکی کہ فلسفہ، مذہب، سیاست، شعر، افسانہ، قانون، معاشیات، امیری، غریبی اور ایسے ہی دُنیا کے تمام لوازمات اس کی آنکھوں میں صرف ایک تصویر، اس کے کانوں میں صرف ایک آواز اور اس کے دماغ میں صرف ایک خیال پیدا کرتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روٹی!

فلسفہ کا این و آں، مذہب کا گناہ و ثواب، سماج کا اچھا اور بُرا قانون کا جائز و ناجائز اس کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اسے تو روٹی چاہئے تھی۔ صرف روٹی۔ ساری دُنیا سمٹ کر اس کے دل میں صرف ایک خواہش بن گئی تھی روٹی! بھوکا انسان دماغ سے نہیں سوچتا۔ وہ اپنے معدے سے سوچتا ہے۔ روٹی! روٹی!! روٹی! بس یہی ہوس۔

وہ بیتاب ہو کر اپنے ویران بھوکے گھر کی چہار دیواری سے نکل کر سڑک پہ ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا دماغ بھی دوسرے فقیروں کی طرف اس قدر مختل تھا۔ کہ وہ ان ہی لوگوں کو دولت کی فراوانی کی دعائیں دیتی۔ جن کے ہاتھوں میں دولت سمٹ کر آنے کی وجہ سے آج وہ اور اسی کی طرح اس کے سینکڑوں بھائی، بہن سڑک پہ ایک پیسہ کے لئے ایڑیاں رگڑتے۔

قبل اس کے کہ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پہ ایک آدھ بھولا بھٹکا پیسہ گرتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سماج کے ٹھیکیدار نے فیصلہ کر دیا۔ کہ وہ بے غیرت ہے۔

مولوی نے فتویٰ دے دیا۔ وہ بے حیا ہے۔

ایک نوجوان نے کہا۔ نہیں وہ حسین ہے۔ اور اس کے ہاتھ پہ پیسہ رکھ دیا۔

اس کے پاس عصمت بھی تھی۔ عزت بھی۔ لیکن کام آئی۔ تو اُس کی جوانی۔

دن بھر بھیک مانگ مانگ کر اُسے کیا ملتا؟ چند پیسے۔ وہ

پہلے بھی بھوکی تھی ۔ اور اب بھی ۔ وہ پہلے بھوکی تھی ۔ تو اس کی بھوک میں صرف مایوسی تھی ۔ لیکن اب جو بھوکی تھی ۔ تو اس بھوک میں زمانہ کی تلخی بھی شامل تھی ۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک نامعلوم جذبۂ انتقام بھی — پہلے کی نسبت وہ اب زیادہ بھوکی تھی ۔

یہ وہ سب دروازوں پر دستک دیتے دیتے ہار گئی ۔ تو اُس نے گناہ کا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے ۔ کہ یہ دروازہ خود اس کے پاس آ گیا ۔ یہ دروازہ کبھی بھی کسی پر بند نہیں ہوتا ۔ وہ بے تامل اندر داخل ہو گئی .. ..

ایک سال میں یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا ۔

وہ پھر بھکارن تھی ۔ اور ساتھ ہی ساتھ بیمار بھی ۔ ایک بدصورت میلا کچیلا لڑکا بھی اس کی گود میں تھا ۔ اُس نے پھر دنیا کے سامنے ہاتھ پھیلایا — روٹی !

سماج نے کہا ۔ یہ بدمعاش ہے ۔ اسے دھتکار دو ۔ مذہب نے کہا ۔ یہ جہنمی ہے ۔ اسے سنگسار کر دو ۔ قانون نے کہا ۔ اس کا سوال ہمیشہ ہے ۔ ہماری پوری کتاب میں کوئی دفعہ روٹی کی نہیں ۔

.. ..

وہ بھوکی تھی ، ننگی تھی ، بیمار تھی ، اس کے کیڑے پڑ رہے تھے ۔ وہ سڑ رہی تھی ۔ اُس نے خودکشی کرنی چاہی ۔ لیکن بھوکے کو تو خودکشی کرنا بھی نہیں آتا ۔ وہ پکڑ لی گئی ۔

سماج نے کہا ۔ یہ پاگل ہے ۔ اپنی جان دے رہی تھی !

مذہب نے کہا ۔ یہ کافر ہے ۔ حرام موت مر رہی تھی !

قانون نے کہا ۔ یہ مجرم ہے ۔ اسے جیلخانے لے چلو !

اُس نے کہا ۔ میں بھوکی ہوں ۔ مجھے مرجانے دو ۔ یا روٹی دو ۔

قانون نے کہا ۔ تم بھوکی تھیں ۔ تو اس کے لئے ہمارے پاس کوئی دفعہ نہیں ۔ لیکن تم مرنا چاہتی تھیں ۔ اس کے لئے تمہیں سزا ملنی چاہیئے +

وجاہت سندیلوی
(اجمل ۔ بمبئی)

تنہائی !

کی ہے مری تنہائی نے یہ عقدہ کشائی
ہے پیکرِ ہر گُل میں تری جلوہ نمائی

ہے جس کی چمک باعثِ تخلیقِ دوعالم
تنہائی میں دیتے ہیں وہ انوار دکھائی

تنہائی میں گھوم آتا ہوں میں عرش کے اُس پار
تنہائی میں ہو جاتی ہے گردوں پہ رسائی

تنہائی میں دُھل جاتا ہے سب میل خرد کا
تنہائی میں ہے دیدۂ باطن کی صفائی

آجاتے ہیں اکثر مری ادراک کی زد میں
وہ راز جو کرتے ہیں سدا چشم نمائی

سینے میں چھپا رکھی ہے جس حور کی تصویر!
کرتی ہے مرے سامنے یہ نغمہ سرائی

"یہ شمس و قمر تیرے ہی قدموں کے نشاں ہیں
عالم ترے انوار کی ہے عکس نمائی

راتوں کو جو بجھ جاتے ہیں افلاک پہ تارے
کرتے ہیں حقیقت میں تری ناصیہ سائی

یہ سوئی ہوئی جھیل یہ نکھرا ہوا سبزہ!
سب تیرے تجلّی کی ہے اعجاز نمائی"

تنہائی میں المختصر اے میرے حزیں دوست!
گر جاتی ہے اکثر مرے قدموں میں خدائی

احمد ندیم قاسمی

ڈاکٹر صاحب کی نجات

انڈین ہیڈ (کینیڈا) سے کچھ فاصلہ پر میں گشت کر رہا تھا۔ کہ مجھے فساد کی خبریں موصول ہوئیں۔ اُن خطوں میں خبر رسانی کا طریقہ ذرا عجیب سا ہے۔ اور اس سے زیادہ حیرتناک۔ جس شخص نے مجھے اطلاع دی۔ وہ ایک معدن کن تھا۔ خشک مدفون آنکھیں۔ اور ناقابل جاذبیت شخصیت کا انسان۔ اُس نے مجھے روکا۔ جب کہ میں ایک معدنیاتی گاؤں سے اپنے گھوڑے پر سوار گزر رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا گاؤں جو کُلّی طور پر چند شکستہ اور کثیف مکانوں پر مشتمل تھا۔ اور یہی — کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی قیام گاہیں تھیں۔

جب میں ٹھہرا۔ تو وہ میرے پاس اپنی ایک مخصوص جنبش دیتے ہوئے اور اپنے انگوٹھے کو اپنے کاندھے پر ایک خاص انداز سے جماتے ہوئے آیا۔

"دیکھا اس آفت کو؟"

"کیا معاملہ ہے؟" میں نے اُس سے آہستہ سے پوچھا۔

"آپ نے بھی گاؤں کے متعلق کسی خاص بات کا اندازہ لگایا۔"

"نہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہؤا"

اس نے ایک برجستہ اور تند قہقہہ لگایا۔ اور زمین پر بڑے مزے سے تھوکا۔

"خوب" — اُس نے آہستگی سے آواز کو کھینچتے ہوئے کہا۔ "میری رائے میں یہ تمام پولیس والے نکمے ہوتے ہیں۔"

میری بیتابی زیادہ ہو رہی تھی۔

"اگر واقعی تم مجھے کچھ بتا سکتے ہو،" میں نے مختصراً کہا۔ "تو ایکدم کہہ ڈالو، اور اگر کچھ واقفیت نہیں ہے۔ تو تشریف لے جائیے۔ فوراً۔"

اُس نے میری طرف کج نگاہی سے دیکھا۔

"یہ بات ہے"؟

"جی ہاں۔"

پھر اُس نے زہرخند کے ساتھ دنداں نمائی کی۔

"بہت اچھا حضرت پولیس مین" اس نے کہا۔ "میں آپ کو بتاتا ہوں ہمارے آپس کے مباحثہ سے کیا فائدہ۔ میرا خیال ہے۔ کہ اس جگہ آپ اور میں صرف دو ہی متنفس رہ گئے ہیں۔"

میں غلط انداز نگاہوں سے جھونپڑی نما مکانوں کے مجموعہ کو دیکھ رہا تھا۔ دو ایک عورتیں اپنے گھروں سے باہر برتن وغیرہ صاف کرنے میں مصروف تھیں۔ اس کے علاوہ انسانی زندگی کا اور کوئی نشان موجود نہ تھا۔ اس کا خیال صحیح معلوم ہوتا تھا۔ صرف ہم دو۔ جہاں تک میری نظر کام کر رہی تھی۔ وہاں تنہا تھے۔

اُس نے اپنا سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں ایک "نیم حکیم صاحب" تشریف لائے تھے۔ "ڈاک مارٹن" اُن کا نام تھا۔ اپنی تیار کردہ مخصوص ادویات فروخت کر رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ گھڑیاں بھی مُفت تقسیم کی تھیں۔ اور وہ سب از کار رفتہ ہیں۔ یہ تھی جعلسازی۔ اور مجھے شروع ہی سے معلوم تھا لیکن جب میں نے اس کی اطلاع لڑکوں کو دی۔ تو وہ بگڑ گئے۔ چنانچہ میں نے انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ پھر کیا تھا۔ اُنہوں نے خوب رقم رولی اور رات کو فرار ہو گئے۔ گھڑیوں کو چلنا تھا۔ اور نہ وہ چلیں۔ ہر ایک گھڑی میں کچھ نہ کچھ نقص ضرور تھا۔ ہر ایک اُن کے دام فریب کا اسیر تھا۔ مجھے اس پر ہنسی آتی ہے!

اس نے پھر تھوکا زور دیتے ہوئے۔

"یہ سب کہاں گئے ہیں؟" میں نے پُوچھا۔ "ڈاکٹر کے تعاقب میں؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جبھی یہ بات تھی۔" اور میرا خیال ہے۔ کہ فساد کا اندیشہ زیادہ ہے۔

اس کا لہجہ معمولی تھا۔ مگر میں غور کر رہا تھا۔ کہ اس کی توقع کے

مطابق فساد کا امکان ضرور تھا - میں اس کا پورا مطالعہ کر چکا تھا۔ وہ اپنے مزدوروں کے حلقے میں ہر دلعزیز نہ تھا ــــ حقیقتاً وہ بے مروتی کا آئینہ دار تھا - اور چونکہ وہی ایک ایسا واحد آدمی تھا - جو ڈاکٹر کے فریب کا شکار نہ ہوا - اس لئے غالباً وہ اور بھی پس پشت ڈال دیا گیا تھا - اب اسے موقع ملا تھا - کہ وہ ان مزدوروں سے اپنی توہین کا انتقام لے -

اُس نے چاروں طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا - اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپاتے ہوئے مجھ سے دبی ہوئی آواز میں کچھ کہا - جس نے گویا میرے خیال کی تائید کی - اُس نے مجھ سے کہا تھا - کہ تمام مزدور شراب میں مدہوش ہیں - جو قطعی قرین قیاس تھا - بہت ممکن ہے - کہ غم غلط کرنے کی وجہ سے اُنہوں نے نشہ کیا ہو - لیکن اس سے میرے خیالات میں بالکل پختگی ہو گئی - کہ میرا مخبر بے چین تھا - کہ میں کچھ کر دکھاؤں اور اسے عمل میں لاؤں - دماغی طور پر میں نے طے کر لیا - کہ اگر ممکن ہوا - تو میں اس سے گریز کرونگا -

اُس کا خیال تھا - کہ "ڈاکٹر" کا تعلق ایک سفری میلے اور سرکس سے ہے - اور وہ یہاں ایک بڑے قصبے سے جو تقریباً ۸ میل کے فاصلے پر تھا - آیا تھا - اور بلاشبہ وہ وہیں واپس گیا - بہرکیف وہی مقام تھا - جہاں یہ سب لڑکے گئے ہوئے تھے +

میں نے تیزی سے گردن ہلاتے ہوئے اس کی خبر رسانی کا شکریہ ادا کیا - اور ایک ہی ایڑ میں "ریڈی" کو ہوا کر دیا - میرے ایکدم رخصت ہو جانے پر وہ کچھ جز بز سا معلوم ہوا - لیکن دو ایک سیکنڈ کے بعد جب میں اپنی زین میں پشت کی جانب مڑا - تو دیکھا - کہ وہ دفور مسرت میں اپنے دونوں ہاتھوں کو مل رہا تھا - اُس پُرلطف اذیت پر جو عنقریب اُس کے ساتھیوں پر نازل ہونے والی تھی -

جب میں وہاں پہنچا - تو صورت حالات "ڈاکٹر" صاحب کے لئے بدتر ہو چکی تھی - میلہ کوئی وسیع نہ تھا - اور جاذبیت کا مرکز صرف ڈاکٹر صاحب کی پیٹنٹ ادویات کی دوکان تھی - اس کے چاروں طرف ایک جم غفیر تھا - اور اکثر کے ہاتھوں میں لاٹھیاں یا کسی نہ کسی قسم کا ہتھیار تھا - وہ ڈاکٹر صاحب کی شان میں مغلظات بک رہے تھے - مگر وہ پوری متانت کے ساتھ خاموش ہاتھ باندھے ہوئے اپنی دوکان کے سامنے کے اونچے حصے پر کھڑے تھے - وہ تبسم ریزی فرما رہے تھے - مجھے اُن کی اس غیر معمولی جسارت پر سخت حیرت ہوئی - مجھے پہلی ہی نظر میں روشن ہو گیا - کہ وہ اپنی اس بے اعتنائی سے اُن مزدوروں کی آتش غیظ کو اور مشتعل کر رہا تھا - مجھے ایسا معلوم ہوا - کہ وہ لوگ حقیقتاً اپنا معاملہ طے کرنا چاہتے ہیں لیکن فی الحال اُنہوں نے گالیوں اور دھمکیوں ہی پر قناعت کی تھی - اکثر مزدور نشہ میں چور تھے - اور باقی ہجوم محض سرسری طور پر تماشا کرنے کے لئے جمع ہو گیا تھا -

جب میں نے اپنا گھوڑا بڑھایا - تو وہ ذرا منتشر ہو گئے

"کیا مطلب ہے اس بیہودگی کا" ؟ میں نے ڈانٹ کر پوچھا -

چند لمحات کے لئے خاموشی ہو گئی - لیکن پھر پیشتر سے زیادہ شور و غوغا کا طوفان برپا ہو گیا - اُنہوں نے شراب پی رکھی تھی - اس میں کچھ شک ہی نہ تھا - اور اس حالت میں کسی کو بھی قانون کا لحاظ نہ تھا - اس حصے کی کانوں میں کام کرنے والا طبقہ بالعموم جاہل اور سخت تھا - لیکن وہ اصولاً قانون کے تابع اور سادہ لوح تھے - یہ محض شراب کا اثر تھا - کہ وہ اس وقت قابو سے باہر ہو گئے تھے -

شور و غل کے باعث کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے - ہر لمحہ مجھے خوف تھا - کہ کہیں یہ مغلوب الغیظ انسان ڈاکٹر کی دکان کے پرخچے نہ اُڑا دیں - اور اُن پر قاتلانہ حملہ نہ کر دیں -

"لاؤ ہمارے دام واپس کر دو" وہ چیخ رہے تھے -

"ناپاک چور !"

"بدمعاش کہیں کے ! ٹھہر جا میں بتاتا ہوں تجھے !"

"لگا دو آگ اس کی دوکان میں - ہاں ! - ہاں !"

اور اسی قسم کے ہزاروں ناقابل اعادہ فقرات

اُن کی اذیت رسانی میں ترقی ہو رہی تھی - بہرحال اُسے کسی طرح اُن کی اس حماقت سے بچانا ضروری تھا - کاش میں اُسے کسی طرح وہاں سے لے جا سکتا - مگر اپنے اثاثہ کو وہیں چھوڑ کر تنہا نکل جانے کی تجویز پر اُسے ترغیب دینے میں شاید میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکتا تھا - اور بالفرض محال ایسا ہو بھی جاتا - تو اُسے اس نرغہ سے نکال لے جانا بھی ایک حل طلب معمہ تھا - گاؤں سے باہر کچھ ہی فاصلہ پر سرکس کا قیام تھا - چنانچہ اگر میں اس کے لئے صرف ایک گھوڑے کا انتظام کر سکتا - تو وہ بآسانی بہت دور نکل جاتا - قبل اس کے کہ مزدوروں کو اس کی خبر بھی ہوتی - فوراً میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی -

میں اپنے گھوڑے پر سے اُتر پڑا - اور اُس کے پاؤں میں رسّی باندھ کر چھوڑ دیا - پھر ڈاکٹر صاحب کی دکان کی پشت پر گیا اور بیچ میں

سے گزرتا ہؤا دوکان کے چبوترے پر اس کے برابر کھڑا ہو گیا - وہ اپنے کاندھوں کو ہلاتے ہوئے میری طرف متوجہ ہؤا - چیخ پکار کا طوفان کافی خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا - لیکن میری موجودگی کی وجہ سے لوٹ کھسوٹ کی انہیں جرأت نہ ہو سکی -

"گولی ماریئے اس دوکان پر" میں نے ذرا ترش لہجے میں کہا -

"اب یہاں زیادہ قیام کرنا حماقت کی دلیل ہو گی -"

"اگر میں یہاں سے اس طرح چلا گیا - تو یہ میری دوکان تباہ کر دینگے - اور صرف یہی میرا ذریعۂ معاش ہے -"

اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا -

"سُنیئے، اگر آپ نے میرے کہنے پر عمل نہ کیا - تو میں آپ کی مدد سے معذور ہونگا -" یہ کہتے ہوئے میں مُڑا اور باہر نکلنے لگا -

مجمع کا مجھے باہر جاتے دیکھنا تھا - کہ انہوں نے آزادانہ بدبخت ڈاکٹر صاحب پر خاک دھول - پتھر اور گندی چیزیں پھینکنی شروع کر دیں میرے کانوں میں اُس کی چیخ کی آواز آئی - جب کہ کوئی بھاری سی چیز اُس کے چہرے پر آ کر گری -

وہ خوفزدہ ہو کر میرے پیچھے بھاگا -

"مجھے یقیناً یہاں سے بھاگ جانا چاہیئے - آپ کی رائے بالکل درست ہے - وہ میرا خون کر دیں گے - خونخوار کتے ہیں یہ" اس نے اُن کی طرف فرطِ غیض میں اپنی مٹھیاں ہلاتے ہوئے کہا -

"ہاں - ذرا ادھر دیکھیئے -" میں نے رُوکھے پن سے کہا - "آپ اسے خوب سمجھ لیجئے - کہ میں آپ کی مدد محض اس خوف کی وجہ سے کر رہا ہوں - کہ اگر آپ یہاں سے نہ گئے - تو یہ آپ کا لہو پی جائیں گے - لیکن اس وقت بھی میری قطعی رائے آپ کے متعلق یہ ہے - کہ آپ پکے دغاباز ہیں -"

اُس نے کچھ جواب نہ دیا -

اگر اب بھی آپ ان لوگوں کے دام واپس کر دیں - تو معاملہ بالکل ٹھیک ہو جائیگا ---- مگر نہیں ---- مجھے اس میں شک ہے - وہ محض آپ کے خون کے پیاسے ہیں -

"میں ایک دمڑی نہیں دونگا -" اس نے کرخت استقلال کے ساتھ کہا -

لکڑیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں ہم سُن رہے تھے - وہ دوکان کے بالائی حصے میں گھس چکے تھے - اور اپنی غارت گری شروع کر دی تھی - اس سے ڈاکٹر صاحب کے حواس بالکل زائل ہو گئے -

"کسی طرح مجھے نکالیئے -" اُس نے خوف زدہ آواز میں کہا "کسی طرح ان وحشیوں سے نجات دلوایئے !"

"پیڈی" مجمع کی نگاہوں سے پوشیدہ دوکان کے عقب میں بندھا ہؤا تھا -

میں نے اُسے کھولا اور ڈاکٹر صاحب کو بدقت زین میں دھکیلا -

"میں آپ کا یقین کر رہا ہوں -" میں نے آہستہ سے کہا - "اس گھوڑے پر دو چار میل سواری کیجئے - اور پھر اسے چھوڑ دیجئے - وہ خود واپس آ جائیگا - اور آپ کافی محفوظ فاصلے پر پہنچ جائیں گے - کیا میں آپ کا یقین کروں ؟"

"یقیناً -"

وہ چشم زدن میں غائب ہو گیا - میں فوراً دوکان کے سامنے پہنچا - کچھ آدمی چبوترے پر چڑھنا چاہتے تھے - دوکان میں خاک دھول کا ڈھیر لگ چکا تھا - مگر مجھے دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئے -

میں نے اُن سے مدلّل گفتگو کی کوشش کی - میں نے انہیں سمجھایا - کہ "حکیم صاحب" ان کے دام لینے کے لئے گئے ہیں - اور بلاشبہ تھوڑی دیر بعد اُن کی ادائگی ہو جائے گی - لیکن ادائگی کے اطمینان سے انہوں نے کچھ دلچسپی ہی نہ لی -

"ہم تو محض ڈاکٹر صاحب کو چاہتے ہیں -" انہوں نے وحشیانہ آواز میں کہا - لیکن اس سے زیادہ اور کچھ انہیں جرأت نہ ہو سکی - مدہوشی کے باوجود وہ میری سُرخ پٹیاں دیکھ رہے تھے - اور ان کا احترام اُن کے دلوں میں موجود تھا -

باقی ہجوم یہ دیکھ کر کہ اب نقضِ امن کا کچھ اندیشہ نہیں رہا منتشر ہو گیا - اور صرف معدن کن رہ گئے - اب مجھے صرف مدہوش آدمیوں سے واسطہ تھا - اگر وہ اپنے ہوش و حواس میں ہوتے - تو شاید میں اپنی اس سازش میں ہرگز کامیاب نہ ہوتا - میرے اور ڈاکٹر صاحب کے پس منظر چلے جانے پر انہیں یقیناً فریب کا شبہ ہوتا - لیکن اس کا اس طرح غائب ہو جانا اُن کے ذہن ہی میں نہ آیا - انہیں معلوم تھا - کہ اس کے پاس دوکان کے قریب کوئی گھوڑا نہ تھا - اور یہ خیال کہ میں اپنا گھوڑا اُسے دے دونگا - اُن کے اعتقاد و ادراک کی حدود سے باہر تھا - مگر یہ واضح رہے - کہ میں کسی اور گھوڑے کے ساتھ ہرگز ایسا نہ کرتا - مجھے یہ اعتماد تھا - کہ "پیڈی" میرے پاس حسبِ معمول فوراً واپس آ جائیگا -

میں محسوس کر رہا تھا - کہ مزدور میرے قبضۂ تحکّم سے نکلے جا رہے

تھے - اور میں کیا خوش ہوا - کہ عین وقت پر دکان کے پیچھے سے میرے گھوڑے کی مخصوص ہنہناہٹ میرے کانوں میں آئی - میں دوکان میں سے جھپٹا - اور فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا - اس تیز سفر سے "پیڈی" بھی تھک کر چور ہو چکا تھا -

میں پھر مجمع کے روبرو آیا - کہ دیکھوں آخر حالات کیا ہیں !

مزدور دکان کے اندر گھس چکے تھے - اور ہر چیز کو مجنونانہ طریق سے توڑ رہے تھے - گھڑیاں - بوتلیں اور ہر وہ چیز جس کا تعلق ڈاکٹر صاحب کے دواؤں کے بیش بہا صندوق سے تھا - زمین پر پڑی تھی - اور روندی جا رہی تھی - انہیں روکنے کی میں نے کوئی کوشش نہ کی - میں جانتا تھا - کہ وہ بیکار ہوگی !!

پھر شور اٹھا - "کہاں ہے یہ ڈاکٹر کا بچہ ؟"

دکان کے عقب کے چھوٹے کمرہ میں اور گوشہ گوشہ میں انہوں نے اس کی تلاش کی - اور جب اپنی کوششوں میں ناکام رہے - تو مجھے مشتبہ نظروں سے گھورنے لگے - میں گھوڑے بیٹھا متانت سنجیدگی سے بیٹھا ہوا انہیں دیکھتا رہا -

وہ آپس میں بڑبڑا رہے تھے - کہ "ڈاکٹر" کو غائب کر دینا میرا ہی کام تھا - مگر پھر وہ اپنی ان تباہ کاریوں کو فاتحانہ اور مسرور انداز میں دیکھنے میں مشغول ہو گئے - مجھے اپنی سپاہیانہ سُرخ پیٹیوں کے اقتدار پر اعتقاد قطعی تھا - ایک سوار سپاہی پر حملہ اُن کی ہمت سے بالاتر تھا - شاید انہیں میری بندوق اور اُس کی گولیوں کا جو اُن کی ہلاکت کے لئے کافی تھیں - خوب احساس تھا ہر ایک چیز جو انہیں مل سکی - اس کو تباہ و برباد کر کے اُنہوں نے دوکان کے ڈھانچے کو نذر آتش کر دیا - فلک رسا شعلوں کا آتشیں منظر دیکھنے کے لئے منتشر ہجوم پھر جمع ہو گیا - اس وقت مجھے خیال ہوا - کہ مجھے رخصت ہو جانا چاہیئے - اُن کے خلاف کسی قسم کی قانونی کارروائی بے سود تھی - احتیاطاً میں نے دو ایک گرفتاریاں کیں - اس سے زیادہ میں چاہتا بھی نہ تھا - ڈاکٹر صاحب کو سزا مل چکی تھی - جس کے وہ مستحق تھے - اس کا مجھے خیال ہی نہ تھا - کہ اپنے "مخبر" کے جذبات کو بے کار گرفتاریوں سے ٹھنڈا کروں ؛

مجھے اطمینان تھا - کہ میں نے قطعی وہی کام کیا تھا - جس کی مجھ سے توقع کی جاتی - ڈاکٹر صاحب کو سخت سزا مل چکی تھی - یقیناً حسب حال - کیونکہ جرم کی ابتدا اُن ہی کی ذات سے ہوئی - لیکن ساتھ ہی ساتھ میں نے قانون شکنی کو روکا - جس میں یقیناً اس کی موت کا امکان تھا —— مدہوش اور مغلوب الغیظ مزدور اس حالت میں سب کچھ کرنے پر تُلے ہوئے تھے -

اُس رات کو مسرور جذبات سے پُر میں اپنی "بیریک" میں واپس آیا - دن بھر کا کام خوش اسلوبی سے انجام دینے پر میرا دل مطمئن تھا ؛

(ترجمہ) عطاءاللہ خاں حفیظی (جرنلسٹ)

غزل

خرقِ کیفِ شراب ہوتا ہے — کتنا رنگیں شباب ہوتا ہے
حُسن جب بے حجاب ہوتا ہے — منفعل ماہتاب ہوتا ہے
دلکش عہدِ شباب ہوتا ہے — ایک رنگین خواب ہوتا ہے
عیش بھی بے شمار کرتا ہوں — رنج بھی بے حساب ہوتا ہے
جس نے ناکامیاں نہ دیکھی ہوں — وہ کہاں کامیاب ہوتا ہے
ہجر کہتے ہیں جس کو اہلِ جہاں — جلگنے کا عذاب ہوتا ہے

زندگی کیا ہے اے شہید مگر
ایک موہوم خواب ہوتا ہے

قربان حسین شہید

یومِ اُردو

مُلک کے مشاہیر ہندو رہنماؤں کی تقریروں کا خلاصہ

پنڈت کرشن پرشاد کول

اُردو کے مایۂ ناز ادیب جناب پنڈت کرشن پرشاد کول نے لکھنؤ میں یوم اُردو کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے ایک جامع و مانع پُر مغز صدارتی تقریر فرمائی جس میں آپ نے زبان اُردو کی مختصراً تاریخ بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ کہ یہ زبان نہ مسلمانوں کی ہے اور نہ ہندوؤں کی۔ بلکہ دونوں کے اختلاط اور میل جول سے پیدا ہوئی۔ اور اُس کی آبیاری میں دونوں نے اپنے خون پانی کئے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ کہ میری مادری زبان اُردو ہے اور میری تمام جماعت (جسے کشمیری پنڈت کہا جاتا ہے) کی پیدائشی زبان بھی یہی ہے۔ ہمارے گھروں میں مستورات بھی یہی زبان بولتی ہیں۔ جو اس وقت میں بول رہا ہوں۔ ممکن ہے۔ کچھ ہندو ایسے بھی ہوں جن کے یہاں یہ زبان نہ بولی جاتی ہو۔ لیکن میں یہ عرض کرونگا۔ کہ ہمارے یہاں کی خواتین جب دوسری برادری کی ہندو خواتین سے ملتی جلتی ہیں۔ تو اپنے مفہوم و مطلب کو اسی زبان میں ادا کرتی ہیں۔ اور تمام ہندو عورتیں اس کو بخوبی سمجھ لیتی ہیں۔

آگے چل کر آپ نے فرمایا۔ کہ آج کل تحصیل حقوق کیلئے ایجی ٹیشن اور ہنگامہ آرائی ایک ضروری چیز ہے۔ آپ بھی اُردو کے تحفظ کے لئے ایجی ٹیشن کیجئے۔ اور احتجاج کے ممکن طریقے استعمال فرمایئے۔ لیکن اگر اردو کو زندہ رکھنا مقصود ہے۔ تو آپ کو ٹھوس کام کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اور وہ یہ کہ آپ اُردو کو ایسی زبان بنانے کی کوشش کریں۔ جسے بازاروں میں سمجھا جا سکے۔ مغلق الفاظ خواہ فارسی اور عربی کے ہوں۔ یا سنسکرت کے ان کو استعمال کرنے سے پرہیز فرمایئے۔

اُردو میں قوت جذب ہے۔ اور وہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو بڑی آسانی سے اپنا لیتی ہے۔ ایک لفظ ایڈیٹر ہے۔ جسے ہر شخص بہ آسانی سمجھتا اور بولتا ہے۔ اب کیا ضرورت ہے۔ کہ اُس کی بجائے آپ مدیر کا لفظ استعمال کریں۔ لفظ تھرمامیٹر عالم، جاہل تعلیم یافتہ غیر تعلیم یافتہ بولتا اور سمجھتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی مطلق حاجت نہیں معلوم ہوتی۔ کہ آپ اس کا ترجمہ مقیاس الحرارت استعمال کیجئے۔ جس کو سوائے تعلیم یافتہ حضرات کے دوسرا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ غرضکہ جب تک اُردو کو آپ عام فہم اور سلیس نہ بنائیں گے۔ اُردو کے مخالفین کے مقابلہ میں آپ کا کامیاب ہونا مشکل ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ کہ ہمارا یہ مطالبہ ہمارے مقصد کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ کہ اُردو کو ہندوستان کی قومی زبان بنایا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ حامیان ہندی ضد میں آکر اس کے خلاف یہ مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ کہ ہندی کو ملکی زبان قرار دیا جائے۔ میری رائے یہ ہے۔ کہ آپ اس مطالبہ پر اصرار نہ کریں۔ بلکہ حکومت پر یہ زور ڈالیں۔ کہ وہ سرکاری اسکولوں میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی تعلیم لازمی قرار دے دے۔ جب ہندو طلبا کے لئے اُردو پڑھنا اور مسلمانوں کے لئے ہندی پڑھنا ضروری ہو جائیگا۔ تو زیادہ نہیں پچیس سال ہی کے بعد ایک ایسی زبان معرض وجود میں آجائیگی۔ جو ہندی اور اردو دونوں سے مشترک ہوگی۔ اور جس پر نہ ہندوؤں کو اعتراض ہوگا اور نہ مسلمانوں کو۔ البتہ اتنا ضرور ہے۔ کہ اس پیدا شدہ زبان پر اُس زبان کا اثر غالب ہوگا۔ جس کا معیار بلند ہو۔ اور جس زبان کا معیار سست ہوگا۔ اس کا رنگ اس میں بہت کم آئیگا۔ حامیان ہندی مجھے معاف کریں گے۔ اگر میں یہ کہوں۔ کہ اردو بہ نسبت ہندی کے زیادہ خوبیوں کی حامل ہے۔ اور اس لئے میرا عقیدہ ہے۔ کہ اس طرح جو زبان بنے گی۔ اس میں اُردو کا اثر غالب رہے گا۔ اور ہندی پر دوی آجائیگی۔ حامیان اردو کے لئے اس کے سوا مفر کی [illegible] صورت نہیں ہے۔ کہ وہ گورنمنٹ سے پوری قوت کے ساتھ اپنے اس مطالبہ کو منظور کرائیں۔ کہ

سرکاری درسگاہوں میں اردو اور ہندی دونوں کی تعلیم لازمی کردی جائے ۔

پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی

منشی پیارے لال صاحب شاکر نے ایک ریزولیوشن پیش کرتے ہوئے ایک نہایت پُرمغز اور پُراز معلومات تقریر کی۔ آپ نے حاضرین جلسہ کو اردو کی ہمہ گیری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا۔ کہ ہندوستان میں درحقیقت اردو دو طبقوں اور دو ملتوں کی زبان ہے۔ اس کو کسی ایک طبقہ یا ایک فرقہ کی زبان کہنا ٹھیٹھ غلطی ہے۔ اردو کے متعلق ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ ہاں صرف اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کہ اسلامی دور حکومت میں اردو زبان نے ترقی کی۔ لیکن اس کو خالص اسلامی زبان کہنا غلط ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ کہ حیدرآباد سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں اردو کے یورپین شعرا کا ذکر ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ زبان اردو کی ترقی میں نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کا ہاتھ ہے۔ بلکہ اس کی ترقی میں یورپین اور فرانسیسی شعرائے اردو کا بھی ہاتھ ہے۔ اس کے بعد آپ نے اردو کے فرانسیسی شعرا اور ادبا کے نام لئے۔ اور فرمایا کہ اردو زبان ہندوستان میں سترھویں صدی میں بھی موجود تھی۔ اس کے بعد آپ نے اردو کی ہمہ گیری کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ کہ اردو زبان میں اس قدر ہمہ گیری ہے۔ کہ ہندوستان کے کسی صوبہ میں چلے جائیے۔ آپ کو اردو شعرا ضرور ملیں گے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ہندی کا کوئی شاعر نہ ملے گا۔ آپ نے کہا۔ اسی طرح ریل پر آپ ہندوستان کے کسی صوبہ اور کسی درجہ میں سفر کیجئے۔ ٹکٹ پر اس صوبہ کی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی لکھی ہوئی ملیگی۔ لہذا ماننا پڑیگا۔ کہ حکومت بھی ہندوستان کی زبان اردو مانتی ہے۔ اسی طرح سکہ رائج الوقت پر دیکھ لیجئے۔ چونی۔ اٹھنی۔ روپیہ اور نوٹ سب پر آپ کو اردو ملے گی ۔

راجہ نریندر ناتھ

راجہ نریندر ناتھ صاحب نے فرمایا۔ کہ اس میں مطلق شبہ نہیں۔ کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو ہے۔ میرے گھر میں اردو بولی جاتی ہے۔ آنریبل سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب نے فرمایا۔ کہ اگر مہاتما گاندھی اور کانگریس اردو زبان کو قومی زبان تسلیم کرلیں۔ تو وہ حصول آزادی کی جدوجہد کے میدان میں سب سے آگے بڑھ جائیں گے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ اگر کانگریس پورے طور پر ماس کنٹیکٹ کے پروگرام کو کامیاب بنانا چاہتی ہے۔ تو اُسے اردو سے کام لینا پڑیگا۔ یہ ایک قابل لحاظ واقعہ ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلم فرمانرواؤں نے اردو کی خاطر خود اپنی زبان کو قربان کردیا۔ اور اردو کی سرپرستی کرکے ملک کے تمام طبقوں کے درمیان یگانگت سی پیدا کردی تھی۔ اور مختلف تہذیبوں کو اردو کے ذریعے متحد کیا ۔

ڈاکٹر ایس۔ ایس بھٹناگر

ڈاکٹر بھٹناگر صدر جلسہ نے اپنے پُرمغز خطبۂ صدارت میں اردو زبان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔ کہ اردو کے دشمن ہندوستان کے دشمن ہیں۔ پنجاب اردو کی حمایت و خدمت میں پیش پیش رہا ہے۔ اور اب پنجاب ہی کا فرض ہے۔ کہ اردو کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے کے لئے کوشش کرے۔

اس سلسلۂ بیان میں اُنہوں نے حکومت پنجاب کو توجہ دلاتے ہوئے اپیل کی۔ کہ حکومت کو چاہئے۔ کہ ہر ممکن طریقے سے اردو کی سرپرستی کرے۔ کیونکہ فرقہ دارانہ مسئلے کے تصفیے کا یہی سب سے زیادہ یقینی طریقہ ثابت ہوگا ۔

رائے بہادر آر۔ بی جیلنی

آپ نے فرمایا۔ کہ ہندوستانی وہ زبان ہے۔ جو اس ملک میں آج سے سینکڑوں برس پہلے ہندو مسلمانوں کے باہمی اختلاط سے معرض وجود میں آئی۔ اور جس میں تمام ان زبانوں کے الفاظ جو اس وقت ملک میں رائج تھیں۔ حسب ضرورت داخل ہوئے۔ ان میں سنسکرت عربی فارسی اور بھاشا سب شامل ہیں۔ یہی زبان اگر فارسی رسم الخط میں لکھی جائے۔ تو اردو ہے۔ اور اگر ناگری حروف میں لکھی جائے۔ تو ہندی اس کا نام ہے۔ اس ملک میں وہی زبان مشترک اور عام ہونے کا حق رکھتی ہے۔ جو اسی ملک کی پیداوار ہو۔ اور ملک کی جملہ اقوام کے باہمی تبادلہ خیال کا ذریعہ ہو۔ اردو کسی اسلامی ملک یا مسلمانوں کی زبان نہیں۔ یہ باہر سے ہمارے یہاں نہیں آئی۔ یہ اسی ملک کی مشترکہ زبان ہے۔ جو ملک کے ہر حصے میں بولی جاتی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کا جاننے والا ملک کے ہر حصہ میں جاکر اپنا مطلب سمجھا سکتا ہے۔ ا [illegible] سرے کا سمجھ سکتا ہے۔ اس کا نام ہی اردو اس لئے ہے۔ کہ اُر [illegible] یعنی لشکرگاہ

سکے ہیں - جہاں ہر قوم کے آدمی جمع ہوتے ہیں - اس میں شبہ نہیں - کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مختلف زبانیں رائج ہیں - مگر اُردو کو ہی یہ مرتبہ حاصل ہے - کہ وہ ہر صوبہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس لئے یہ زبان ملک کی مشترکہ زبان کہی جانے کی مستحق ہے ؂

زبان ایک دن میں تیار نہیں ہوا کرتی - بلکہ ملک کی معاشرتی حالت کا نتیجہ ہوتی ہے - اور چونکہ یہ حالات بدلتے رہتے ہیں - اس لئے زبان میں بھی اس کے ساتھ رد و بدل ہوا کرتا ہے - اور اس تبدیلی کے ساتھ اب ضرورت و امزہ کے موافق ہے - محاورے اور بولیوں کا فرق کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا ہے - یوں تو مختلف اضلاع میں مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں - اور ایک ہی علاقہ میں مختلف طبقات میں بولنے کا اختلاف ہے - مگر اس کے یہ معنی نہیں - کہ اُن کی زبان علیحدہ ہے -

اس زبان میں علوم جدیدہ کی تعلیم کا بھی تجربہ ہو چکا ہے - اور وہ کامیاب ثابت ہوا - ۱۸۲۹ء میں حکومت کی طرف سے انگریزی علوم جدید کی کتابوں کے ترجمے اردو میں کئے جانے کا سلسلہ جاری ہوا - اور یہ ترجمے دہلی کالج میں پڑھائے گئے - اس کی سالانہ رپورٹ میں مسٹر گارگل نے لکھا کہ مشرقی شعبہ کا طالب علم اپنے مغربی شعبہ والے حریف سے کہیں بڑھا ہوا ہے - گورنمنٹ صوبہ متحدہ کی تعلیمی رپورٹ ۱۸۵۳-۵۴ء میں تحریر ہے - کہ اردو کے ذریعے سے دہلی کالج میں جو سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے - وہ قابل تعریف ہے - زمانہ حال میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کی مثال آپ کے سامنے موجود ہے - اس یونیورسٹی میں مغربی طب اور سائنس اور علوم جدیدہ کی تعلیم سب اُردو میں ہوتی ہے - اور نتائج سب قابل تحسین ہیں - انگلستان کے میڈیکل بورڈ اور دیگر ماہرین علوم و فنون نے اس کا معائنہ کرکے اس کو علمی تحقیقات کا مخزن اور اس میں اردو کے ذریعے سے تعلیم کو بے حد تسلی بخش تسلیم کیا ہے - ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی - کہ اس زبان کو جو صدیوں سے ملک کی زبان کا کام دے رہی ہو - کیوں نہ ملک کی زبان مانا جائے - میں اس مسئلہ پہ کہ اُردو کا نام ہندوستانی رکھا جائے - کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا - ہم کو کام سے واسطہ رکھنے کی ضرورت ہے - ہندوستان کو ایک مشترکہ زبان کی ضرورت ہے - اور یہ زبان ہمارے یہاں پہلے سے موجود ہے - جس کو ملک کی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہے - اس کی تلاش میں ہم کو سات سمندر پار جانے کی ضرورت نہیں - حقیقی ضرورت یہ ہے - کہ ہم اردو کو ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے ہردلعزیز بنائیں - اور اس کو فرقہ وارانہ تعصب سے پاک رکھیں اور اس کی ترقی و اصلاح کے لئے کوشش کریں ؂

سر تیج بہادر سپرو

سر تیج بہادر سپرو نے فرمایا - کہ ڈھائی سو برس گزرے - جب کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے میل جول سے ایک ایسی مشترکہ زبان بنی جسے ہم اُردو کہتے ہیں - لیکن افسوس ہے کہ آج یہ کہا جا رہا ہے - کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے - ہندوؤں کی زبان تو ہندی ہے - بدنصیبی سے آج کل ہندوستان میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے - جو ہندوؤں سے یہ کہتا ہے - کہ اُنہیں صرف ہندی کو فروغ دینا - اور ہندی ہی کی اشاعت کرنا چاہئے - میں نہیں سمجھتا - کہ اس قسم کے لوگ ہندوستان میں ایک مشترک زبان میں تفریق کرکے کیا پائیں گے - اس خراب ذہنیت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا - کہ وہ زبان جس کو ہندو مسلمان سبھی بولتے اور سمجھتے ہیں - وہ مسلسل مشکل بنائی جا رہی ہے - اور روز بروز اس کی اعلیٰ رُوح کا خون ہو رہا ہے - اگر اُردو زبان کو مسلمان صرف اپنی زبان کہیں - تو یہ اُن کی سخت غلطی ہے - اسی طرح اگر ہندو اُردو زبان کو مسلمانوں کی زبان سمجھیں - تو یہ اُن کی ناواقفیت ہے - حقیقت یہ ہے - کہ اُردو زبان ہم ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ اور مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے - جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے - اور یہی وہ زبان ہے - جو قریب قریب ہر صوبہ میں کم و بیش بولی اور سمجھی جاتی ہے ؂

ہندی ایک بناوٹی اور مصنوعی زبان ہے

مجھے یہ دیکھ کر بڑا قلق ہوتا ہے - کہ تقریباً چالیس پچاس سال سے یہ کوشش ہو رہی ہے - کہ عوام غیر فطری طور پہ ایک بناوٹی زبان کو سیکھیں - اور اس زبان سے کنارہ کشی اختیار کریں - جو فطری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے - اور اُن کی آپس کی رواداریوں اور صدیوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہے ؂

لوگ مجھے جماعت سے بھٹکا ہوا ایک فرد کہتے ہیں - کہیں - لیکن کوئی سمجھدار آدمی ایسے لوگوں کو اپنے آبا و اجداد کا سپوت نہیں کہہ سکتا - جو اپنے سلف کی قربانیوں کو جان بُوجھ کر بھُلا بیٹھیں - اور اپنی پائی ہوئی ایک مقدس میراث کو سر بازار لٹا دیں - میرا یہ دعویٰ ہے - کہ وہ زبان یعنی اُردو جو قطعاً وقت کی فطری ضرورت سے پیدا ہوئی ہے - مٹائی نہیں جا سکتی - اگر چند مٹھی بھر آدمی فرقہ وارانہ سوال پیدا کرکے اکثریت کے زعم میں اسے

مٹانا چاہتے ہیں۔ تو یہ ایک سودائے خام ہے۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر مسلمان بھی اُردو کو اپنی ہی زبان کہنے لگے ہیں۔ لیکن یہ اُن کی سخت غلطی ہے اگر مسلمانوں نے اُردو کی اشاعت میں بہت کچھ کیا ہے۔ تو ہندوؤں نے بھی کسی حالت میں اُردو کو ترقی دینے میں کمی نہیں کی۔ اردو ہمیشہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جائداد رہی ہے۔ اور ہے۔ اگر ہندو اُردو کو تباہ کرتے ہیں۔ تو اس کے معنے یہ ہیں۔ کہ وہ خود اپنی ہی جائداد کو تباہ کر رہے ہیں۔

زبان کا سوال ہندو مُسلم سوال نہیں ہے

میں جو زبان بولتا ہوں۔ میں نے کسی مولوی اور پنڈت سے نہیں پڑھا۔ بلکہ وہ ہمارا پدری ترکہ ہے۔ جس طرح باپ دادا سے سُنتے چلے آئے ہیں۔ اسی طرح ہم بولتے ہیں۔ میں اس وقت بھی جو آپ کے درمیان موجود ہوں۔ تو اس وجہ سے نہیں۔ کہ میں آپ لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔ اور نہ میں اس معاملہ کو صرف آپ کا معاملہ سمجھ کر آپ کا ساتھ دینے آیا ہوں۔ بلکہ میں اس لئے آیا ہوں۔ کہ وہ ترکہ جو ہمارا پدری ترکہ ہے۔ اُسے محفوظ کرنے اور محفوظ رکھنے میں حصّہ ہی نہ لُوں۔ بلکہ اُن چیزوں کا رد کروں۔ جو اس کے پامال کرنے میں استعمال کی جا رہی ہیں۔ یہ ہمارا حق ہے۔ اور بحیثیت ہندوستانیوں کے ہمارا فرض ہے ہمیں اس معاملہ میں ایک دوسرے کا لحاظ کرنا ہوگا۔ ملک میں سیاسی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر زبان کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ جس پر ہاتھ ڈالا جائے۔ یہ ضرور ہے۔ کہ یہ زبان تمام صوبوں میں بولی اور سمجھی جانے کے لحاظ سے یکساں مرتبہ نہیں رکھتی۔ اور نہ کسی زبان کے لئے ایسا ممکن ہے۔ مگر پھر بھی ہر جگہ سمجھی جانے کی وجہ سے قومی زبان ہونے کا مرتبہ رکھتی ہے۔ تو ایسی صورت میں کسی کا یہ کہنا کہ ہم تو سنسکرت الفاظ کا استعمال کریں گے۔ کہاں تک مناسب اور حق بجانب ہو سکتا ہے۔ اور ہمارے لئے یہ کہاں تک جائز ہے۔ کہ ہم کسی کے کہنے سے اپنے ادب کو خراب کر لیں۔ اور ہم سب کچھ کھو دینے کے بعد اُس کو "ہندوستانی" زبان بھی کہیں۔

ہندوستانی کی اصطلاح دھوکے کی ٹٹی ہے

میں "ہندوستانی" کو ایک دھوکہ کی ٹٹی سمجھتا ہوں۔ جس کے ذریعے یقیناً خود غرض لوگ اپنے خود ساختہ پیمانہ سے زبان اور ادب کو ماننا چاہتے ہیں۔ حضرات میں آپ کی کوشش میں ہر طریقہ سے شامل ہوں۔ اگر آپ بھی اپنی قومی زبان کی وراثت کو اپنی اصلی حالت میں محفوظ رکھیں۔ اور اپنی قومی زبان "اردو" کو "اُردو" کہنے سے نہ ڈریں۔ اور اعلان کے ساتھ کہیں۔ کہ ہماری زبان "اردو" ہے۔ اور اس کی عبارت کو ایسی سلیس بنائیں۔ کہ اس کی اشاعت روز بروز بڑھتی جائے۔ تو میں ہر حیثیت سے آپ کے ساتھ ہوں۔

اگر کوئی صاحب اپنی طرف سے عربی کے الفاظ قصداً استعمال کریں گے۔ تو وہ اُردو کی خدمت نہ ہوگی۔ اگر ہندو بھائی اپنی قومی زبان میں سنسکرت کے الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر بھریں گے۔ تو سمجھ لیں۔ کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے اپنی قومی زبان کی بنیاد کو ہلا رہے ہیں۔

میں چاہتا ہوں۔ کہ "اردو" روز بروز ترقی کرے۔ اور آپ میں یہ اخلاقی جرأت ہو۔ کہ آپ لفظ اُردو کو استعمال کرنے میں نہ شرمائیں۔ اور خواہ مخواہ اسکے بجائے لفظ "ہندوستانی" استعمال کرنے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ یہ زبان ہمارے آباؤ اجداد کا ایک ناقابل تقسیم مشترکہ اور مقدس ترکہ ہے۔ جن کی نہ تصحیح بدلی جا سکتی ہے نہ نام۔

رباعی

کعبے کی طرف دور سے سجدہ کر لوں
یا پیکرِ پاک اور نظارہ کر لوں
مہمان ہے کچھ دیر کی جاتی دنیا
اب اور گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

"یاس یگانہ"

صفحۂ اطفال

"کاغذ کی کہانی"

پیارے میو! تمہیں کاغذ کی ہر روز ضرورت پڑتی ہے۔ تم اس پر حساب کے سوال حل کرتے ہو۔ املا کی مشق کرتے ہو۔ اپنی چیزوں کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے اس میں لپیٹ کر رکھتے ہو۔ اور جب بارش ہوتی ہے تو اس کی ناؤ بنا کر اسے پانی میں تیراتے ہو اور ؎

میری ننھی سی ناؤ چلی جل میں

گا کر خوش ہوتے ہو۔ خیال کرو۔ کہ اگر کاغذ کا وجود دنیا سے اُٹھ جائے۔ تو ہم سب کو کتنا نقصان ہو۔ اس وقت کاغذ اتنا عام ہے۔ کہ یہ خیال تمہارے ذہن میں مشکل ہی سے آئیگا۔ لیکن تم جانتے ہو۔ کہ تاریخ میں کوئی نہ کوئی وقت تو ایسا ضرور ہوگا۔ جب کاغذ تیار نہ ہوا ہو۔ بتاؤ کہ اس وقت دنیا کی کیا حالت ہوگی؟ نہ یہ سکول ہونگے نہ یہ ایجادیں۔ نہ حکومت کا انتظام۔ نہ فنون نہ سائنس نہ ماضی نہ مستقبل۔ غرضکہ وہ تمام چیزیں جن کے بل بوتے پر ہم سب اپنے آپ کو مہذب کہتے ہیں۔ اس دنیا میں موجود نہ ہونگی۔

پیارے میو! تم سچ جاننا۔ کہ ان سب کے لئے کاغذ کی ضرورت ہے۔ ہم ترقی اسی وقت کر سکتے ہیں۔ جب ہمیں معلوم ہو۔ کہ ہم سے پیشتر کون کون سی ترقیاں ہو چکی ہیں اس علم کو تاریخ کہتے ہیں۔ اور تاریخ کاغذ پر ہی لکھی جاتی ہے۔ اگر کاغذ نہ ہوتا۔ تو گزشتہ ترقیوں کا ہمیں کیا پتہ ہوتا۔ ہم ان میں اضافہ کیونکر کرتے۔ اور ان کی مزید اصلاح کس طرح کرتے۔ ہماری جتنی بھی چیزیں ہیں۔ اُنہوں نے آہستہ آہستہ ترقی کی ہے۔ اگر ترقی کے گزشتہ مرحلوں کا علم نہ ہو۔ تو مزید ترقی ایک دیوانے کا خواب بن کر رہ جائے۔

پہلے لوگ ہڈیوں۔ لکڑیوں اور درختوں کی چھال پر تصویریں بنایا کرتے تھے۔ تا کہ یادداشت کے کام آئیں۔ لیکن تم جانتے ہو۔ کہ یہ طریقہ بہت ناقص تھا۔ آخر یہ چیزیں محفوظ رہنے والی تو ہیں نہیں۔ اس کے بعد بھوج پتر کا رواج ہوا۔ تم میں سے جو پیارے کسی بڑے شہر کے عجائب گھر میں گئے ہونگے۔ اُنہوں نے اب بھی

وہاں پر اس چیز کو دیکھا ہوگا۔

اصلی کاغذ سب سے پہلے چینیوں نے ایجاد کیا تھا۔

ڈاکٹر سٹین نے کچھ عرصہ ہوا۔ دیوار چین کے ایک ویران گھنٹہ گھر سے ایک کاغذ کا ٹکڑا برآمد کیا تھا جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے۔ کہ یہ دنیا میں سب سے پرانا اور قدیم ہے اس کے نزدیک سے جو چیزیں برآمد ہوئیں۔ ان سے پتہ چلا تھا۔ کہ اس کا تعلق تقریباً حضرت مسیح کی پیدائش کے زمانہ سے ہے۔

آٹھویں صدی میں کاغذ بنانا عربوں نے بھی سیکھ لیا۔ اور اسے انہوں نے اپنے چینی قیدیوں سے سیکھا تھا۔ جب عربوں کی فتوحات کا سلسلہ یورپ تک پہنچا۔ تو اس کے ساتھ ہی کاغذ بھی وہاں پہنچ گیا۔

انگلستان نے کاغذ بنانا پندرھویں صدی میں سیکھا۔ اور اس کے تین صدی بعد کاغذ بالکل عام ہو گیا۔ اب یہ ہر سال اتنی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ کہ اگر اسے بچھا کر ایک میل چوڑا راستہ بنایا جائے۔ تو اس سے دنیا کے گرد دو مرتبہ چکر کاٹا جا سکتا ہے۔ اور اگر اس سے ایک انچ چوڑا فیتہ بنایا جائے۔ تو اس کی مدد سے سورج اور زمین کا درمیانی فاصلہ تیس مرتبہ ناپ سکتے ہیں ٭

پروفیسر چرنجیو لال ایم۔ اے

میری ایک سہیلی

میری ایک سہیلی ہے۔ اس کا نام شمس ہے۔ وہ میری ہم وطن بھی ہے۔ بڑی ذہین اور علم کا شوق رکھنے والی ہے۔ میں اپنی اس سہیلی کی بڑی عزت کرتی ہوں۔ کیونکہ وہ عزت کی مستحق ہے۔ اس کی صحت اچھی نہیں۔ اپنا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے ہی میں گزارتی ہے۔ ماں باپ اور اُستانیوں کا بڑا ادب اور لحاظ کرتی ہے۔ جو کچھ کہنا چاہتی ہے۔ پہلے اس پر غور کر لیتی ہے۔ اس لئے اس کی بات چیت میں کوئی فقرہ اور کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا۔ جو کہنے کے قابل نہ ہو۔ یا کسی کا دل دکھائے۔ بات کم کرتی ہے۔ باتونی نہیں ہے۔ مگر جب کچھ بولتی ہے۔ اپنی بات کو تولتی ہے۔

رشتہ داروں میں اس کے سلیقے اور تمیزداری کا چرچا ہے۔ نویں جماعت میں تعلیم پاتی ہے۔ انگریزی۔ اردو فارسی۔ تاریخ، جغرافیہ غرض کہ اپنی جماعت کے تمام مضامین جی لگا کر پڑھتی ہے۔ امتحانات میں ہمیشہ پاس ہوتی ہے۔ کنبے کی بڑی بوڑھیاں اس کے تعلیمی شوق۔ ادب آداب اور سلیقے کو دیکھ کر عش عش کرنے لگتی ہیں۔ بڑی میٹھی زبان پائی ہے۔ جس سے بات کرتی ہے۔ اُسے اپنا بنا لیتی ہے۔ کسی کو اس کی کسی بات سے شکایت

نہیں ہوتی۔

مجھے ہمیشہ خط لکھتی رہتی ہے اور اپنے ہر خط میں کام کی باتیں لکھتی ہے۔ فضولیات اور بے کار باتوں سے اس کا خط پاک ہوتا ہے۔

کشیدہ کاری کے کام میں بہت ہوشیار ہے۔ اس کے کاڑھے ہوئے کامدانی کے دوپٹے۔ پلنگ کی چادریں میز پوش، تکیوں کے غلاف دیکھ کر بے اختیار مُنہ سے واہ واہ نکل جاتی ہے۔ میری تمام سہیلیوں میں یہ سہیلی سب سے زیادہ ہنرمند۔ ذہین وفطین اور علم وتعلیم کی شوقین ہے ہر علم پڑھنے والی تمام لڑکیوں کو شمس بیگم کی طرح علم کا شوق پیدا کرنا چاہئے۔ اپنی گفتگو۔ اپنی چال ڈھال میں اس کی پیروی کرنی چاہئے۔

مجھے اُمید ہے (خدا کرے یہ اُمید پوری ہو اور خدا نے چاہا ضرور پوری ہوگی) کہ میری یہ سہیلی اپنی زندگی عزت اور آرام سے گزارے گی۔

کیونکہ نیک لڑکیوں کی زندگی ضرور کامیاب ہوتی ہے۔

عابدہ سلطان عزیز مغل منزل

نجیب آباد (یو۔پی)

خرگوش اور بھوکا آدمی

مدت کی بات ہے۔ کہ ہندوستان کے جانور بھی آدمی کی طرح دانا ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف بول سکتے تھے۔ بلکہ سوچ بھی سکتے تھے۔ اور یہ صفت ہر آدمی میں بھی نہیں ہوتی۔

چار جانور تو خصوصاً مشہور تھے۔ خرگوش، گیدڑ، بندر، اور اُدّھر یہ سب بہت نیک تھے۔ اور پجاریوں کی طرح بنارس کے جنگل میں رہتے تھے۔ وہ دُنیوی خواہشوں کو ترک کر چکے تھے۔ خیرات کرتے اور روزے رکھا کرتے تھے۔

ایک روز شام کا ذکر ہے۔ کہ ایک غریب مسافر جنگل سے گزر رہا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ کہ گیدڑ ایک لکڑی کے ٹکڑے پر بیٹھا نہایت سنجیدگی سے سوچ رہا ہے۔

"اچھے جانور" مسافر نے کہا۔ "مجھے خیرات کے طور پر کچھ کھانے کو دو۔"

"بہت خوشی سے" گیدڑ نے جواب دیا۔ "خوش قسمتی سے مجھے آج شکار مل گیا تھا۔ میں اپنی غار سے تمہارے لئے گوشت لے آتا ہوں۔"

"لیکن میں گوشت نہیں کھاتا" مسافر نے جواب دیا۔ اور چلا گیا۔

اس اثنا میں اُس نے اُدّھر کو ندی کے درمیان ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ کسی سوچ میں غرق تھا۔ مسافر نے اس کے پاس بھی اپنی التجا دُہرائی۔

اُدھر نے بچھلی پیش کی۔ لیکن مسافر نے انکار کر دیا۔ آگے جا کر مسافر کی بندر سے ملاقات ہوئی جو ایک ٹہنی سے لٹک رہا تھا۔ اور کچھ سوچ رہا تھا۔ مسافر نے اپنی آرزو ظاہر بھی نہ کی تھی۔ کہ بندر نے خود بخود اس کو کھانے کے لئے آم دیئے۔ لیکن مسافر نے پھل کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ اور چلا گیا۔

آخر وہ ایک خرگوش کو ملا۔ جو اوس سے بھری ہوئی گھاس میں لیٹا چاندنی رات میں کسی خیال میں محو تھا۔

"خیرات۔ میں بھوکا مر رہا ہوں۔" مسافر نے کہا۔

اب خرگوش کے پاس دینے کو گھاس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اُس نے سوچا۔ کہ میں بھوکے آدمی کو اپنے تئیں دے ڈالوں۔

رحم دل خرگوش نے کہا۔ "کچھ آگ جلاؤ۔ تمہارے لئے جلدی کھانا تیار ہو جائیگا۔"

مسافر نے لکڑیاں اکٹھی کیں۔ اور پتھروں پر آگ جلائی۔ جب پتھر بہت گرم ہو گئے۔ تو خرگوش نے اپنے تئیں ان پر گرا دیا۔

خدا کی قدرت دیکھئے۔ کہ پتھر گرم نہ تھے۔ اور وہاں پھولوں میں خرگوش لیٹ رہا تھا۔ اُس نے سر اُٹھایا۔ اور مسافر سے کہا۔ "یہ کیا؟ آگ پھر جلاؤ۔ میں اسی طرح ٹھنڈا پڑا ہوں۔"

اُسی وقت مسافر ایک فرشتے کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ اور کہا۔ "میں صرف تمہارا امتحان لینے کے لئے آیا تھا۔ تمہاری خیرات کی کوئی حد نہیں۔ میں تمہاری تصویر چاند پر بناؤنگا۔ تاکہ انسان ہمیشہ تم کو دیکھا کرے۔ اور یاد کیا کرے۔"

یہ کہہ کر اس نے پہاڑ کو توڑا۔ جس میں سے ایک قسم کا پانی سا نکلا۔ اس نے پہاڑ کی چوٹی کو قلم بنایا۔ اور خرگوش کی تصویر چاند پر بنا دی۔ ہندوستانی بچے اب تک رات کو یہ تصویر ایک دوسرے کو دکھاتے ہیں ؁

پریمیو! تم بھی خیرات اور نیکی کرنا سیکھو۔ تاکہ تمہارا نام بھی خرگوش کی طرح روشن ہو جائے ؁

(ثریا واحد علی جماعت ہشتم۔ لاہور)

پیسے اور بچے کی بات چیت

ایک بچہ ہاتھ میں پیسہ لئے اُسے اُلٹ پلٹ رہا تھا - پیسے نے پوچھا - کیا دیکھ رہے ہو میاں صاحبزادے؟ بچے نے کہا - کچھ نہیں، ایک پیسے کو دیکھنا ہی کیا ہے ؟

پیسہ - کیا ایک پیسہ کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا؟

بچہ - ایک پیسہ تو کیا چیز ہے - چار پیسوں کو بھی میں کچھ نہیں سمجھتا - کتنے پیسے میرے ہاتھ میں آئے اور خرچ ہو گئے - اسی طرح کتنے آئیں گے اور کتنے جائیں گے -

پیسہ - ہاں یہ تو صحیح ہے - کہ تمہیں بہت سے پیسے ملے - اور تم نے خرچ بھی بہت سے پیسے کئے - لیکن تم جو مجھے بے حقیقت سمجھتے ہو - یہ تمہاری نادانی ہے -

بچہ - آپ میں کیا ایسی خاص بات ہے - جو آپ اپنے کو اس قدر افضل اور بزرگ سمجھتے ہیں - کیا آپ ایک پیسہ کی جگہ سولہ آنے کی قیمت کے ہیں ؟

پیسہ - جو کچھ خصوصیت ہے - وہ صرف میری ذات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے - بلکہ ہر پیسہ بجائے خود میری ہی طرح خصوصیت رکھتا ہے -

بچہ - تو تمہارا یہ مطلب ہے - کہ تم قوم کے معزز اور قابل احترام ہو -

پیسہ - ہاں میں تمہیں یہی سمجھانا چاہتا ہوں -

بچہ - لیکن میں آپ کی اصلیت سے بخوبی واقف ہوں - تانبے کے ایک حقیر ٹکڑے کے سوا آپ میں اور کیا رکھا ہے - اگر آپ سے بادشاہ کی تصویر اور اس کے ساتھ کی عبارت علیحدہ کر دی جائے - تو کوئی آپ کو چھوئے بھی نہیں -

پیسہ - یہ تمہاری نادانی ہے صاحبزادے - جو مجھے صرف تانبے کا ایک ٹکڑا سمجھتے ہو - میری حقیقت تانبے کے ٹکڑے میں نہیں - بلکہ بادشاہ کی اسی تصویر اور اس کے ساتھ کی عبارت میں پوشیدہ ہے جس کا آپ نے معمولی طور پر ذکر کر دیا ہے -

بچہ - بھئی تم جو کہتے ہو - وہ بھی تسلیم - تم پر بادشاہ کی جو تصویر اور اس کے ساتھ جو عبارت ہے - وہ میرے سر آنکھوں پر - پھر بھی تمہاری قیمت رہے گی تو وہی تین پائی یا روپیہ پاؤنڈ بن جاؤ گے؟

پیسہ - تین پائی تمہارے نزدیک کوئی چیز ہی نہیں ہے ؛ میں تو کہتا ہوں - ضرورت پر ایک پائی بھی بہت ہے -

بچہ - اپنے منہ میاں مٹھو بننا اسی کو کہتے ہیں -

پیسہ - آخر تو بچے ہی ہو نہ - بغیر سمجھائے تمہاری سمجھ میں بات نہیں آسکتی - اچھا بتاؤ - تمہیں ایک پیسے کے کاغذ کی ضرورت ہو - تو کیا کروگے ؟

بچہ - بازار جا کر خرید لاؤنگا -

پیسہ - کاہے سے خرید لاؤگے ؟

بچہ - پیسے سے -

پیسہ - اگر پیسہ نہ ہو ؟

بچے نے کچھ جواب نہیں دیا -

پیسہ - اگر قلم کی ضرورت ہو ؟

بچہ - اس کو بھی خریدا جا سکتا ہے -

پیسہ - اگر پیسہ نہ ہوگا - تو کاہے سے خریدوگے ؟

بچہ - پیسہ نہ کیسے ہوگا ؟

پیسہ - مان لو کہ اگر نہ ہو ؟ یہ واقعہ بھی ہے - کہ اکثر تمہارے پاس پیسہ نہیں ہوتا - بچے نے پھر کچھ جواب نہیں دیا -

پیسہ - اگر تمہارے پاس روشنائی نہ ہو -

بچہ - اگر پیسہ موجود ہو - تو بازار سے خریدی جا سکتی ہے -

پیسہ - اور اگر پیسہ نہ ہو تو ؟

بچہ - بغیر پیسہ کے کوئی چیز کیسے مل سکتی ہے -

دکاندار کی آنکھوں میں دھول تو جھونک نہیں سکتے - نہ اس کی دکان پر ڈاکہ ڈال سکتے ہیں -

پیسہ - اگر کاغذ کی ضرورت پڑنے پر کاغذ - قلم کی ضرورت پڑنے پر قلم - اور روشنائی کی ضرورت پڑنے پر روشنائی نہ ملے - تو کام کیسے چل سکتا ہے ؟ اسی طرح کی اور ہزاروں چیزیں ہیں - جو ایک ہی پیسے میں مل سکتی ہیں - لیکن ان کے لئے بھی پیسہ ضروری ہے - نمک ہی کو لے لو - کتنی معمولی چیز ہے - لیکن تمہارے پاس ایک پیسہ نہ ہو - تو تمہارا کھانا ہی خراب ہو جائے - یا پھر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ - جب کام چلے - تم بازار جاؤ - کوئی چیز خریدنا چاہو - چیز بڑے کام اور فائدے کی ہو - تمہارے پاس پیسے بھی ہوں - لیکن قیمت سے ایک پیسہ کم ہو - تو تمہیں بتاؤ - کہ وہ چیز تمہیں مل سکتی ہے ؟ پھر تمہیں ایک پیسہ کو ایک نہ سمجھنا چاہیئے - ایک ہی ایک پیسہ کرکے ایک آنہ اور ایک ہی ایک آنہ کرکے روپیہ بنتا ہے - لہذا میں ایک پیسہ بھی ہوں - اور روپیہ بھی - اور سب کچھ ہوں +

(ابو محمد امام الدین بنارس)

مرزا جی نے روزہ رکھا

یوں تو مرزا جی کو مرزائن سے بھی زیادہ اللہ میاں کا ڈر تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اکثر توبہ استغفار بھی کیا کرتے تھے۔ جب کبھی زور کی آندھی آتی۔ مرزا جی گڑگڑا گڑگڑا کر "آیتہ الکرسی" پڑھنے لگتے۔ طوفانی بارش ہوتی۔ تو یا اللہ توبہ یا اللہ توبہ" کا ورد فرماتے۔ اور بجلی کڑکتے وقت تو انہیں مارے خوف خدا کے پلنگ کے نیچے تک چھپتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ مگر ان تمام خداپرستیوں کے باوجود رمضان شریف کے تیس روزے رکھنا مرزا جی کے بس کا کام نہ تھا۔ یہ بات نہیں۔ کہ وہ روزوں کے قائل ہی نہ تھے۔ قائل تھے اور اتنے قائل۔ کہ بال بچوں سے لے کر امامن خادمہ تک کو روزہ داری کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔ شام کو گھر کے روزہ داروں میں بیٹھ کر افطاری کھانا۔ اور روزانہ سحری کھانے کیلئے سب سے پہلے اُٹھنا مرزا جی نے کبھی ناغہ نہیں کیا۔ کبھی کبھی واعظانہ انداز میں افطار و سحری کے فضائل بھی بیان کیا کرتے تھے۔ مگر خود اُنہیں روزہ رکھتے کسی نے نہیں دیکھا۔

اپنی بے روزہ داری کے حق میں مرزا جی کے پاس دلیلیں بھی تھیں کبھی فرماتے۔ کہ خدا کو مجھ گنہگار کے روزے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تم سب کے طفیل میں مجھے بھی بخش دیگا۔ کبھی کہتے۔ ارے بھائی میرا تو روز روزہ ہے۔ حقّہ اور افیون کے سوا دن میں کھاتا ہی کیا ہوں۔ مرزا جی کو حقّے اور افیون کی سخت عادت تھی۔ اور سچ پوچھو۔ تو یہی عادت ان کی بے روزہ داری یا روزہ خواری کا سبب بنی۔ کبھی کبھی کہا کرتے تھے۔ کہ اگر روزے میں حقّہ اور افیون کی اجازت مل جائے۔ تو میں ابھی روزہ رکھنے کے لئے تیار ہوں۔ کوئی زیادہ کہتا سنتا۔ تو مرزا جی ایک ٹھنڈا سانس بھر کر فرمایا کرتے کہ "بڑے بڑے روزے رکھے۔ بڑی بڑی نمازیں پڑھیں۔ اب یہ سب تم لوگوں کا حصّہ ہے۔"

شروع رمضان شریف میں ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا۔ کہ مرزا جی کو جاڑے سے بخار آگیا۔ اور موٹے موٹے لحاف اوڑھا دینے پر بھی کپکپی نہ گئی۔ اس پر مرزائن نے کہا۔ یہ سب تمہاری بے روزہ داری کا وبال ہے۔ اللہ سے ڈرو۔ تو وہ بھی تم پر رحم کرے وقت کی بات ہوتی ہے۔ اتفاق سے مرزا جی کے دل پر لگ گئی۔ جب ذرا کپکپی کم ہوئی۔ تو مرزا جی نے لحاف کے روشندان سے سر نکال کر کہا۔ اچھا بھائی طبیعت ٹھیک ہو جائے۔ تو روزہ رکھونگا۔ مگر دیکھنا افطار اور سحری کے وقت "چنیا بیگم" اور حقّہ کا اچھی طرح انتظام رکھنا۔

آخر ایک دن مرزا صاحب نے روزہ رکھ کر اللہ میاں پر احسان کا چھپّر لادنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ اور سر شام ہی سے سحری وغیرہ تیار کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ چار بجے آخر رات کو جب سحری کا گولہ دغا۔ تو مرزا جی کھانس کھنکار کر پہلے ہی بیدار ہو چکے تھے۔ گھر والوں کو جگایا۔ اور سب سے پہلے کھا پی کر حقّہ گڑگڑانے لگے۔ اس وقت مرزا جی ذرا مزے میں تھے۔ چونکہ کل ان کا روزہ تھا اس لئے جنت میں ان کیلئے ابھی سے جگہ ریزرو کر دی گئی تھی۔ بولے "کیوں چھمّی کی ماں۔ بھلا جنت میں افیم اور حقّہ ملیگا کہ نہیں" ہنستے ہنس دیئے۔ مرزائن نے تنبیہاً کہا۔ "بیکار کی باتیں نہ کرو۔ اب حقہ چھوڑو وقت ختم ہو رہا ہے۔" "ارے کیا کہا۔ وقت ختم ہو رہا ہے میرا وقت ابھی سے۔" مرزا جی نے گھبرا کر مرزائن سے پوچھا۔ مرزائن نے سر کھپا کر سمجھایا۔ کہ تمہارا وقت نہیں سحری کا وقت ختم ہو رہا ہے تب جا کے مرزا جی کے جان میں جان آئی۔

گیارہ بجے دن تک تو کوئی خاص حادثہ ظہور میں نہیں آیا۔ اور مرزا جی نے اپنے روزے کے چھ ساڑھے چھ گھنٹے اطمینان سے بسر کر لئے۔ مگر بارہ ایک بجے سے مرزا جی کچھ تبدیل ہونے شروع ہوئے۔ جس کمرے میں مرزا جی بیٹھے روزہ رکھ رہے تھے۔ اس کے قریب امامن کہیں زور سے بول دی۔ آپ نے ڈانٹ کر کہا۔

" سر کھائے جاتی ہے چڑیل۔ دیکھتی نہیں آج میرا روزہ ہے" مرزا جی نے جی بہلانے کیلئے ایک اخبار اُٹھا لیا تاکہ شمالی چین کے محاذ جنگ سے افیون سستی ہونے کی کوئی خبر ڈھونڈھ نکالیں۔ اخبار پڑھ رہے تھے۔ کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ کوئی شخص کان کا درد جھڑانے آیا ہے۔ واضح ہو کہ مرزا جی کو کان کا درد جھاڑنے کے فن میں خاصی مہارت تھی۔ ویسے تو وہ بہت نرم دل آدمی تھے۔ مگر آج جونہی آنے والے شخص کی غرض معلوم ہوئی۔ مرزا جی نے کڑک کے کہا۔ "کہ دو ہسپتال جائے۔ آج ہم کان وان نہیں جھاڑتے۔ دیکھتے نہیں ہیں۔ کہ میں روزے سے ہوں۔ چل دیئے وہاں سے تنگ کرنے کو"

وہ غریب کان دبائے چلا گیا۔ اور باہر نہ جانے کیا کہہ دیا۔ کہ محلے بھر میں اس عظیم الشان حادثے کی خبر پھیل گئی۔ کہ مرزا جی نے روزہ رکھا ہے۔ ان کے ملنے والوں میں اس خبر سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ کسی نے کہا۔ مبارک باد دینے چلیں۔ کسی نے سوچا تعزیت کرنے۔

ایک صاحب ڈیوڑھی میں داخل ہوئے ہیں۔

" السلام علیکم۔ مرزا جی سنا ہے آج آپ نے روزہ رکھا ہے۔ بڑا کام کیا۔ مبارک ہو۔"

" وعلیکم۔ ہاں بھائی آج میرا روزہ ہے۔ مرزا جی نے نحیف آواز میں جواب دیا۔

دوسرے صاحب داخل ہوتے ہیں۔

" آداب عرض ہے مرزا جی سنتے ہیں۔ آج آپ روزے سے ہیں۔ لگ تو بہت رہا ہوگا۔ میں نے سوچا چلو طبیعت دریافت کر آؤں

مرزا جی نے کہا۔" ہاں میاں لگتا وگتا کیا۔ بس افیون اور حقے کی طلب ذرا ستا رہی ہے۔"

یہ لوگ مزاج پرسی کر کے چلے گئے تو مرزا جی نے بڑبڑانا شروع کیا "کیا مصیبت ہے۔ روزہ رکھا ہے تو کسی کا کیا اجارہ۔ جسے دیکھو۔ روزہ روزہ پکارتا چلا آرہا ہے۔ تماشہ بنا لیا ہے میرا۔" اتنے میں شبراتی منہیار نے آکر سلام علیک کی۔ اور کہا۔" میاں سنا ہے۔ آج تم نے بھی روزہ رکھا ہے۔" اب کے مرزا جی چڑ گئے۔ اور جھنجھلا کر بولے۔" کیا مطلب ہے؟ یہ کیوں روزہ … تو کسی کا کیا گناہ کیا ہے … اب جو کوئی میرے پاس آیا۔"

چھمی اور منو میں جب لٹو گھمانے پر لڑائی ہو جاتی تھی۔ تو مرزا جی فیصلہ کر دیا کرتے تھے۔ آج بھی کہیں منو نے چھمی کا لٹو چھین لیا۔ چھمی نے ظلم کی فریاد لے کر روتی ہوئی مرزا جی کے کمرے کی طرف دوڑی۔ کہ " دیکھو دادا منوا نے میرا لٹو چھین لیا۔" مرزا جی نے اس زور سے ڈانٹا۔ کہ بیچاری سہم کر اُلٹے پاؤں بھاگ گئی۔ گھر میں مرغیاں پلی ہوئی تھیں۔ ایک مُرغے نے کہیں مرزا جی کے سر پر ککڑوں کوں بول دیا۔ مرزا جی نے ڈنڈا اُٹھا کر مُرغ کے جو مارا۔ تو حقہ پر سے چلم گر کر صاف دو ٹکڑے ہو گئی۔ مُرغا دُور جا کر پھر ککڑوں کوں بولا۔ اور مرزا جی کھسیانے ہو کر بولے۔" اب کے ادھر آیا۔ تو ذبح کر کے افطاری بنا ڈالوں گا۔

پانچ بجے کے قریب جب مرزا جی کے روزے کا پارہ ایک سو اسّی ڈگری پر چڑھا ہوا تھا۔ مرزائن نے آکر کہا۔" دہی بڑے پھلکیاں۔ سموسے اور کچالو تیار کر لئے گئے ہیں۔ کہو تو تمہارے لئے مٹر کی پھلیاں اور تل دی جائیں۔" مرزا جی نے کہا۔" بھاڑ میں جائیں مٹر کی پھلیاں۔ حقہ بھی کسی نے بھرا یا نہیں۔ اور افیون کہاں ہے۔ جلدی لا کے رکھو۔" "آگ لگے تمہاری افیون کو۔ جو بات پوچھی ہو بتلاتے نہیں۔ روزہ رکھا ہے۔ تو کیا کسی پر احسان کیا ہے"۔ مرزائن نے مرزا جی کے نہلے پر دہلا اثر کیا۔ اور باورچی خانہ کی طرف چلدیں۔

آخر امامن نے حقہ بھرا۔ افیم کی پیالی لا کر رکھی۔ اس کے بعد اور افطاری کا سامان بھی سامنے رکھ دیا گیا۔ اس دن چھمی کی طرف کچھ ابر ہو رہا تھا۔ مرزا جی بے چینی کے ساتھ آنے والی ساعت کے انتظار میں مصروف ہو گئے۔ ایک طرف بچوں کی شرارت پر ڈانٹتے پھٹکارتے جاتے تھے۔ دوسری طرف پہلو بدل بدل کر کہتے جاتے تھے یہ اُوہ۔ ابھی تک وقت نہیں ہوا۔" مرزا جی کی گھڑی سواچھ بجا رہی تھی۔ اور اُنہیں اپنی گھڑی پر پُورا بھروسہ تھا۔" اب پندرہ منٹ رہ گئے" مرزا جی نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ کسی نے کہا۔ " ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے" مرزا جی تاؤ میں آتے ہوئے بولے۔ " کیا میری گھڑی غلط ہو سکتی ہے۔ دیکھو نا۔ ایلو چھ بج کر سولہ منٹ ہو گئے" مرزا جی حسرت کے ساتھ افیون حقہ اور افطاری پر نظر ڈال کر پھر بولے۔" ابھی چودہ منٹ باقی ہیں۔" مرزائن بولیں کہیں وقت سے پہلے نہ افطار لینا۔ یہ دیکھو امامن باہر سے … کہہ رہی ہے۔ ابھی گولہ دغنے میں آدھ گھنٹہ ہے۔ مرزا جی … " بکومت۔ کیا مجھے بیوقوف سمجھ لیا ہے۔ گولہ آٹھ بجے

رات کو دغے۔ تو اس کا میں ذمہ دار ہوں۔ وہاں کی گھڑی گڑ بڑ ہو گی۔ میری گھڑی کبھی غلط وقت نہیں دیتی۔"

قصہ کوتاہ، گھر والے لاکھ منع کرتے رہے۔ مگر مرزا جی نے اپنی گھڑی کے مطابق روزہ افطار کر ہی لیا۔ جب پندرہ منٹ بعد گولہ دغا۔ تو مرزائن اور تمام گھر والوں کی رائے تھی۔ کہ بڑے میاں کا روزہ نہیں ہوا۔ مگر مرزا جی کو یقین تھا۔ کہ میرا روزہ ہوا اور سب سے بڑھ چڑھ کر ہوا۔ کیونکہ میں نے بڑی محنت سے روزہ رکھا تھا۔ اور میری گھڑی کبھی غلط وقت نہیں دیتی ✦

احسن عثمانی

غزل

خبر ہے کچھ وہ سرکش ہیں کہ بُت کعبہ میں لا ڈالے — بنائے آپ نے بندے خدا ہم نے بنا ڈالے

جو آئے اپنے ہاتھوں جیسی کرنی ویسی بھرنی ہے — مصیبت ہے وہی بندہ اٹھائے اور خدا ڈالے

زمیں کے دل سے لَو نکلے ستارے تک بھڑک اٹھیں — جہاں سایہ تمہارا جلوۂ صبر آزما ڈالے

عجب کیا کوئی بگڑے دل تمہارے نامرادوں میں — اُٹھے اور اپنی بگڑی آپ ہی اِک دن بنا ڈالے

نہ جانے کب کی نیکی تھی کہ آڑے آگئی ورنہ — حسینوں نے ترے وحشی پہ ڈورے بارہا ڈالے

محبت کھیل ہے کوئی وہ جلوہ کیا تماشا ہے — بہت پردے ابھی ہیں اور بہت پردے اُٹھا ڈالے

مجھے کیا پوچھتے ہو اب مری پرسش سے درگذرو — انہیں پوچھو مری آہوں نے جن کے دل ہلا ڈالے

بہت مدِ مقابل کرلئے پیدا محبت میں — ہمارا حوصلہ دیکھو کہ دل سے دل بنا ڈالے

یہ نیک و بد یونہیں دنیا کو حسبِ حال رہنے دیں — نہ دوزخ کوئی دہکائے نہ جنت کی بنا ڈالے

ستم جائز سہی رسمِ محبت میں مگر اتنا — کہیں ایسا نہ ہو یہ رسم ہی دُنیا اُٹھا ڈالے

جنابِ نجمؔ یہ دیوانگی بھی بے مزہ ٹھہری
وہ کہتے ہیں بہت سے ایسے دیوانے بنا ڈالے

نجمؔ آفندی

بزمِ انتخاب

پیلا لیپ

[illegible]ی شہر میں ایک ڈاکٹر رہتا تھا - اُس کا ایک پیلا لیپ بہت [illegible]در تھا - اس لیپ کا یہ گُن بتایا جاتا تھا - کہ جو انسان اسے ایک بار اپنے بدن پر چوٹی سے ایڑی تک لگا لیتا تھا - وہ زندگی کی تکلیف سے گناہ کی قید سے اور موت کے ڈر سے ہمیشہ کیلئے چھوٹ جاتا تھا - یہی باتیں ڈاکٹر نے اپنے اشتہار میں چھاپی تھیں - اور شہر والے بھی یہی باتیں کہہ کہہ کر اس لیپ کی بڑائی کیا کرتے تھے - جو سُنتا تھا - اُس کی یہی خواہش ہوتی تھی - کہ وہ بھی اس لیپ کو اپنے بدن پر لگا لے - جب کبھی کسی آدمی کے یہ لیپ لگایا جاتا تھا - تو لوگ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے -

اسی شہر میں کسی بڑے گھر کا ایک جوان تھا - جس کو کسی بات کی فکر نہ تھی - لیپ لگانے کی بات وہ ہمیشہ ٹالتا رہا - کوئی گھر والا لیپ لگانے کے لئے اُسے کہتا تو وہ جواب دیتا " ایسی کیا جلدی ہے کل دیکھا جائیگا -" جب کل آتا - تو پھر اگلے دن پر بات ٹل جاتی - ایسے ہی بہت دن بیت گئے - ایک دن اُس کا ایک دوست اچانک چھڑکاؤ کرنے کی گاڑی کے نیچے آکر مر گیا - مرنے والا اُس جوان کی عمر کا تھا - اور اسی کی طرح رہتا سہتا بھی تھا - اس اچانک موت سے اس جوان کا دل دھک دھک کرنے لگا - اُس نے سوچا - کہ اب تو لیپ لگا لینا ہی اچھا ہے - اسی روز شام کو اُس کے گھر بار کے سب لوگ اکٹھے ہوئے - باجے بجنے لگے - اور اس دھوم دھام کے ساتھ اس کے بدن پر وہ لیپ لگایا گیا - لیپ لگانے میں بڑی تکلیف ہوئی تھی - وہ چیختا چلاّتا رہا - مگر اس کے بدن پر اوپر تلے تین بار لیپ لگا - باجے کے شور میں اس کے چیخنے چلاّنے کی آواز پر کسی نے دھیان نہیں دیا - لیپ لگانے کے بعد اُس پر وارنش بھی کر دی گئی - تاکہ وہ اور بھی پکاّ ہو جائے - ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے - اُس نے کہا - کہ" اس سے پہلے ایسا پکاّ کام میں نے کبھی نہیں کیا تھا -"

لیپ لگانے کے لگ بھگ دو مہینے کے بعد لوگ اس جوان کو چارپائی پر ڈال کر ڈاکٹر کے گھر لے گئے - ڈاکٹر کے سامنے آتے ہی اس جوان نے چلاّ کر کہا " ڈاکٹر صاحب ! تم نے تو کہا تھا - کہ میں زندگی کی تکلیفوں سے چھوٹ جاؤنگا - یہ دیکھو - میں بھی اسی گاڑی کے نیچے آ گیا - جس سے میرا دوست کچلا گیا تھا - میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے"

ڈاکٹر نے جواب دیا - " یہ تو بہت بُرا ہؤا - میں تو سمجھتا ہوں - کہ مجھے ایک بار پھر تمہیں اس لیپ کا گُن بتا دینا چاہیئے - ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنا کوئی ایسی بھاری تکلیف نہیں ہے - نہ ایسے دُکھوں سے میرا لیپ کسی کو بچا سکتا ہے - پیارے دوست گناہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ڈرنا چاہیئے - میں نے تمہیں گناہ سے بچانے کی کوشش کی ہے - جب تمہارا دل گناہ کی طرف کھنچنے لگے - تو میرے لیپ کو اُلاہنا دینا ! "

جوان نے کہا - " اچھا یہ بات ہے - مجھے یہ بات نہیں معلوم تھی - بڑی بھول ہوئی - خیر اب تم میری ٹانگ کی خبر لو - کسی طرح اسے ٹھیک کر دو - تو مجھ پر احسان ہوگا ۔"

ڈاکٹر نے کہا - " یہ میرا کام نہیں ہے - ہاں اگر یہ لوگ تمہیں گلی کے نکڑ پر اس جرّاح کے یہاں لے جائیں - تو مجھے یقین ہے - کہ تمہاری ٹانگ کو ٹھیک کر دیگا -"

.. ..

اس بات کو تین برس گزر گئے - ایک دن وہ جوان دوڑتا ہؤا ڈاکٹر کے پاس آیا - وہ بہت گھبرایا ہؤا تھا - اُس نے ڈاکٹر سے کہا - " کہو ڈاکٹر صاحب ! اب کیا کہتے ہو ؟ تم نے تو کہا تھا - کہ میں گناہ کے بندھن سے چھوٹ جاؤنگا - یہ کیا ہو گیا ' میں نے دھوکا دیا ہے - آگ لگائی ہے - خون کیا ہے -"

ڈاکٹر نے کہا " اُف یہ تو بہت بُری بات ہوئی - اچھا ' ذرا اپنے کپڑے تو اُتارو -"

جوان نے کپڑے اُتار ڈالے۔ ڈاکٹر نے بہت اچھی طرح اُس کے بدن کو دیکھا۔ سر سے پاؤں تک ہر جگہ کی جانچ کی۔ اس کے بعد اُس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ لیپ بالکل ٹھیک ہے۔ کہیں ذرا سا بھی نہیں اُکھڑا۔ تین برس کے بعد بھی لیپ ایسا اچھا ہے۔ جیسے آج ہی لگا ہو! اور ۔ ۔ ۔"

اس جوان نے بات کاٹ کر کہا۔ "لیپ کے ویسا ہی اچھا ہونے سے فائدہ کیا؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "فائدہ کیسے نہیں؟ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مجھے پھر اس لیپ کا گُن بتانا پڑیگا۔ یہ لیپ آدمی کو گناہ سے نہیں بچاتا۔ بلکہ اُس کی سزا یا نتیجہ سے بچاتا ہے۔ اس لیپ کا فائدہ چاہے اس دُنیا میں دکھائی نہ دے۔ مگر اگلی دُنیا میں تم خود دیکھ لوگے۔ تھوڑے لفظوں میں اتنا کہہ دینا بس ہے۔ کہ یہ لیپ لگا کر میں نے تمہیں موت سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ مرنے لگو۔ تو اس لیپ کو بُرا کہنا۔"

جوان نے کہا "اوہو! یہ بات ہے۔ مجھے اس کی خبر نہ تھی۔ بڑی بھول ہوئی۔ خیر جو کچھ ہوا۔ وہ تو ہو گیا۔ اب یہ بتاؤ۔ کہ میں نے بیگناہوں پر جو اتنے ظلم کئے ہیں۔ اُن کی تلافی کیسے ہوگی؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "یہ بتانا میرا کام نہیں ہے۔ اس گلی کے دوسرے سرے پر تھانہ ہے۔ وہاں جا کر تم اپنے آپ کو حوالہ کر دو۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اس سے تمہیں شانتی مل جائیگی۔"

. . . . .

چند ہفتے کے بعد ڈاکٹر کو اُسی شہر کے جیل خانہ میں بلایا گیا۔ ڈاکٹر پہنچا۔ تو اس جوان نے زور سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب اب کیا کہتے ہو۔ یہ دیکھو میں سر سے پاؤں تک تمہارے لیپ سے لپا ہُوا ہوں۔ پھر بھی میری ٹانگ ٹوٹی۔ کوئی گناہ مجھ سے نہیں بچا۔ اور اب مجھے کل پھانسی ہوگی۔ ڈر کے مارے میری یہ حالت ہو گئی ہے۔ کہ مُنہ سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں نکلتی۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا "سچ مچ یہ تو بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ لیکن اس کا بھی یقین رکھو۔ کہ اگر تم نے یہ لیپ نہ لگوایا ہوتا۔ تو اس وقت ڈر کے مارے تمہاری حالت بہت زیادہ خراب ہوتی۔"

(ہندوستانی)

سعودی حکومت میں تعلیم کی رفتار

حجاز میں سرکاری مدرسوں کی تعداد ۴۶ ہے۔ جن میں پانچ ہزار سے زیادہ طلباء تعلیم پاتے ہیں۔ غیر سرکاری درسگاہیں ۱۸ ہیں۔ جن میں پڑھنے والوں کی تعداد تین ہزار نوسو ستر سے زیادہ ہے۔ جدہ۔ مدینہ۔ طائف اور ینبع کے سوا باقی تمام ملحق مدرسوں میں شروع سے پانچ سال تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تمام ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں دینی علوم کے ساتھ جدید علوم بھی اسی طریقہ پر پڑھائے جاتے ہیں۔ جس طریقہ پر یہ تمام ترقی یافتہ ملکوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ حکومت عربوں سے جہالت کو دُور کرنے کے لئے فوقانی تعلیم کو پھیلانے کی پوری جد و جہد کر رہی ہے۔

سرکاری مدرسے۔ پایۂ تخت میں اس قسم کے بارہ مدرسے ہیں۔ (۱) مدرسہ تحضیر البعثات (۲) معہد علمی سعودی (۳) مدرسہ عزیزیہ ابتدائی (۴) مدرسہ عزیزیہ فوقانی (۵) مدرسہ سعودیہ ابتدائی (۶) مدرسہ سعودیہ فوقانی (۷) مدرسہ فیصلیہ ابتدائی (۸) مدرسہ فیصلیہ فوقانی (۹) مدرسہ رحمانیہ ابتدائی (۱۰) مدرسہ رحمانیہ فوقانی (۱۱) مدرسہ محمدیہ فوقانی (۱۲) مدرسہ خالدیہ فوقانی۔

ان سے ملحق مدرسے کل ۳۴ ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔ جدہ میں تین، دو فوقانی اور ایک ابتدائی، مدینہ میں تین۔ دو فوقانی اور ایک ابتدائی، طائف میں دو۔ ایک فوقانی اور ایک ابتدائی، ینبع میں دو ایک فوقانی دوسرا ابتدائی، وجہ، ضبا، املج، علا، تبوک، قنفذہ، جیزان، ینبع النخل، ابہا، صبیا، ابی عریش، بیشہ، ظفیر، رابغ میں ایک ایک فوقانی مدرسہ، نجد اور احسا میں نو مدرسے ہیں۔ جو کُل کے کُل فوقانی ہیں۔

غیر سرکاری مدرسے۔ مدینہ میں اس قسم کے آٹھ مدرسے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں (۱) مدرسۃ العلوم الشرعیۃ (۲) دارالایتام (۳) مدرسۃ النجاح (۴) مدرسۃ التربیۃ والتعلیم (۵) مدرسہ الخیریہ۔ (۶) دارالحدیث (۷) مدرسہ التہذیب (۸) مدرسۃ القرأۃ والتجوید۔ ان مدرسوں میں نو سو سے زیادہ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔

مکہ میں دس مدرسے ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) مدرسۃ الفلاح یہاں ابتدائی۔ ثانوی۔ فوقانی تینوں طرح کی تعلیم ہوتی ہے۔ طلبہ کی تعداد چھ سو سے زیادہ ہے۔

(۲) مدرسۃ صولتیہ۔ یہاں بھی تینوں طرح کی تعلیم ہوتی ہے۔ اور طلبہ کی تعداد چھ سو سے زیادہ ہے۔

(۳) مدرسۃ الفخریہ۔ یہاں صرف ابتدائی اور فوقانی تعلیم ہوتی ہے۔ اور طلبہ کی تعداد چار سو سے کچھ زیادہ ہے۔

(۴) مدرسۃ الترقی - یہاں بھی صرف ابتدائی اور فوقانی تعلیم ہوتی ہے - مگر طلباء کی تعداد ایک سو بیس سے کچھ زیادہ ہے ؎

(۵) مدرسۃ الفائزین - صرف فوقانی تعلیم ہوتی ہے - اور طلبہ کی تعداد دو سو سے کچھ اوپر ہے ؎

(۶) مدرسۃ العلوم الدینیہ - تعلیم فوقانی اور ابتدائی ہے - اور پانچ سو سے کچھ زیادہ طلبہ تعلیم پاتے ہیں ؎

(۷) مدرسۃ النجاح } یہ دونوں شبینہ مدرسے ہیں - جو ان پڑھ
(۸) مدرسۃ التعاون } لوگوں کی تعلیم کے لئے قائم کئے گئے
ہیں - پہلے کی تعداد سو اور دوسرے کی پچاس ہے ؎

(۹) مدرسۃ الماحی - تعلیم فوقانی ہے - اور طلبہ کی تعداد سو ہے ؎

(۱۰) مدرسۃ الفلاح - یہ مدرسہ جدہ میں ہے - ابتدائی - ثانوی - فوقانی تینوں طرح کی تعلیم ہوتی ہے - اور طلبہ کی تعداد چار سو ہے ؎

اوپر جن غیر سرکاری مدرسوں کے نام لئے گئے ہیں - ان میں ایک خاص لحاظ سے قابل ذکر مکہ معظمہ کا مدرسہ صولتیہ اور مدرسہ فخریہ - اور مدینہ منورہ کا مدرسۂ شرعیہ ہے - یہ وہ مدرسے ہیں - جو ہندوستانی مسلمانوں کے چندوں سے قائم ہیں - اور اس سرزمین اقدس میں علم دین کی بڑی خدمت کر رہے ہیں - مدرسہ صولتیہ پرانا مدرسہ ہے - جو بنگال کی صولت النساء بیگم کی یادگار - اور مولانا رحمۃ اللہ صاحب کیرانوی کی ذات بابرکات کا فیض ہے - اور مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ میں شریف حسین کے اخیر زمانہ میں مولانا سید احمد صاحب فیض آبادی کی مخلصانہ سعی و کوشش کا نتیجہ ہے - اور بہت کچھ ہماری اعانتوں کا محتاج ہے - صولتیہ اور مدرسہ شرعیہ کی اپنی پختہ سنگی عمارتیں ہیں ؎

"معارف"

شاہ کیرول

ملکہ وکٹوریہ شاہ کیرول کی پڑنانی تھیں - اسی لئے انگلستان اور برطانوی مقبوضات کے اخباروں میں ان کا ذکر بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا جاتا ہے - مگر غالباً شاہ کیرول کی عالمگیر شہرت کی اصل وجہ انگلستان کے شاہی خاندان سے قرابت داری نہیں ہے - بلکہ ان کی اپنی رومانی زندگی ہے - دور جدید بہت زیادہ سنسنی پسند ہے - ایک والئ ملک کے افسانہائے عشق سے بڑھ کر دنیا کی اور کونسی چیز زیادہ سنسنی خیز ہو سکتی ہے - شاہ کیرول کی زندگی ابتداہی سے کیوپڈ کے کارناموں کا ایک دلآویز ورق بنی رہی ہے - اور اخبارات نے اس چمکیلے ورق پر حاشیہ آرائیاں کرنے میں پوری مستعدی کا ثبوت دیا ہے - اس لئے اخبارات کے شاہ کیرول کی زندگی میں حقیقت سے زیادہ ایک رنگین افسانہ معلوم ہوتی ہے -

تاریخی مماثلت کے دلدادگان کو رومانیہ کے شاہ کیرول دوم اور انگلستان کے شاہ چارلز دوم میں بہت سی باتیں مشترک ملیں گی - دونو چند سال تک جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے - اور دونو عوام کی تحریک کے نتیجہ کے طور پر دوبارہ تخت نشین ہوئے - دونو کی زندگیوں میں عورتوں نے اہم پارٹ ادا کیا - جس طرح چارلز دوم کے تدبر کے متعلق مؤرخین کی رائے رفتہ رفتہ بہتر ہوتی گئی - اسی طرح توقع کی جاتی ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائیگا تاریخ اور ہمعصر مؤرخین شاہ کیرول کے کے بارے میں زیادہ موافقانہ رائے کا اظہار کریں گے ؎

انسان کا کردار اس کی ابتدائی زندگی ہی میں تشکیل پاتا ہے - شاہ کیرول کی زندگی پر ان کی ابتدائی تعلیم نے بڑا اثر کیا - جن خصوصیات نے انہیں ان کے ملک میں ایک عظیم شخصیت کا آدمی بنایا - ان کی تہ میں یہی ابتدائی تعلیم ہے - اسی طرح ان کے کردار کی وہ خصوصیات بھی جنہوں نے انہیں اخبارات کے صفحات پر بار بار چمکایا ہے - ان کی ابتدائی زندگی کے طرز تربیت پر مبنی ہیں - تاج و تخت کا موزوں حقدار ثابت ہونے کے لئے آپ کی بڑی احتیاط کے ساتھ تربیت کی گئی - اس سے شاہ کیرول محنت و مشقت کے خوگر تو ضرور ہو گئے - مگر جب جوانی میں آپ کو آزادی ملی - تو بچپن کی سخت گیریوں کا ردعمل ہوا - اس اعتبار سے شاہ کیرول کی زندگی سابق شاہ ایڈورڈ ہشتم سے مشابہ ہے ؎

شاہ کیرول کی تربیت آپ کے چچا شاہ کیرول اول نے کی - پیرانہ سال بادشاہ کا اکلوتا بیٹا طفلی میں انتقال کر گیا تھا - جس کے بعد انہوں نے اپنے بھتیجے کو اپنا جانشین اور اپنی شفقتوں کا مرکز بنا لیا - وہ نسل کے اعتبار سے ہوہین زولرن تھے - اور بچوں کی تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات بہت سخت تھے - اس لئے نو عمر کیرول کو یکے بعد دیگرے کئی ملٹری ٹیوٹروں کے حوالے کیا گیا - نوجوان کیرول کو ان سخت گیر استادوں کے پاس دس دس گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا تھا - اور انہیں اپنے کسی ہم عمر دوست سے ملنے نہیں دیا جاتا تھا - رجمنٹ میں شامل ہونے تک آپ کی دو بہنیں ہی آپ کی رفیق ہیں ؎

اپنے چچا کے انتقال پر شاہ کیرول کو کسی قدر آزادی نصیب

ہوئی۔ اور آپ نے فوراً بوائے سکاؤٹ تحریک کی تنظیم شروع کر دی۔ رومانیہ میں آپ ہی سکاؤٹنگ کے بانی مبانی ہیں۔ اور اب تک بڑے جوش و خروش اور سرگرمی سے اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔ شاہ کیرول کے دوسرے اشغال موٹر چلانا اور ہوا بازی ہیں جس وقت آپ نے یہ شغل اختیار کئے تھے۔ اس وقت فنی اعتبار سے یہ دونو اپنی ابتدائی حالت میں تھے۔ جنگ عظیم شروع ہوئی۔ تو شاہ کیرول کو اپنے ان اشغال کو خیرباد کہنا پڑا۔ کیونکہ آپ فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اور جب تک لڑائی جاری رہی۔ برابر اس میں حصہ لیتے رہے۔ جنگ کے چند ہی دن بعد ہی ایک واقعہ پیش آیا۔ جس کی تفصیلات بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں۔ یہ واقعہ کیرول کی آزادی کا پہلا ثمر تھا۔ اور اس سے یہ بھی ظاہر تھا۔ کہ اگر یہ روش جو اختیار کر لی گئی ہے۔ ترک نہ کی گئی۔ تو آئندہ بھی مصائب کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اپنے والدین کو اطلاع دیئے اور ان سے اجازت لئے بغیر انہوں نے رومانیہ کے ایک جنرل کی لڑکی سے شادی کر لی۔ یہ کیرول کا پہلا معاشقہ تھا۔ جو طرفین کے لئے تباہ کن ثابت ہوا۔ جب ملکہ اور بادشاہ نے کیرول کی شادی کا حال سنا۔ تو انہوں نے اصرار کیا۔ کہ یہ رشتہ منقطع کر دیا جائے۔ اور کیرول کو بے عزتی کے ساتھ باہر بھیج دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں کیرول کی شادی یونان کی شہزادی ہیلین کے ساتھ کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ یہ شادی بھی اندوہناک ثابت ہوئی۔ گو اس کی ناکامیابی کی وجوہات مختلف تھیں۔ ۱۹۲۸ء میں شاہ کیرول نے بیوی کو طلاق دے دی۔ مگر اس سے تین برس پہلے وہ اپنے بیٹے کے حق میں دست بردار ہو کر میڈم لیپسکو کی معیت میں فرانس چلے آئے تھے عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اسی معاشقہ کی وجہ سے شاہ کیرول تاج و تخت سے دست بردار ہوئے تھے۔ مگر جہاں تک واقعات کا تعلق ہے آپ کی دست برداری کی تہ میں سیاسی وجوہات کام کر رہی تھیں۔ شاہ کیرول ابتدا ہی سے ذہنی آزادی کے دلدادہ تھے۔ جو ذہنی آزادی ان کے نجی تعلقات میں دکھائی دیتی تھی۔ وہی انہوں نے شاہانہ حیثیت میں بھی قائم رکھنی چاہی۔ انہوں نے دستوری مشین کا پرزہ بن کر نام کا بادشاہ بننے سے انکار کر دیا۔ مگر ان کے وزرا کو ان کی اس روش پر اعتراض تھا۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ نے تاج و تخت چھوڑ دیا۔

مگر یہ فیصلہ حالات کا آخری فیصلہ نہ تھا۔ ان پانچ برس میں جو آپ نے جلاوطنی میں بسر کئے شاہ کیرول اپنی واپسی کے لئے زمین ہموار کرتے رہے۔ بظاہر وہ نیول کے مقام پر خاموش زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر خفیہ طور پر وہ برابر تاج و تخت دوبارہ حاصل کرنے کے لئے منصوبے باندھ رہے تھے۔ آخر ایک دن ہوائی جہاز میں تن تنہا وہ اپنے ملک کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس جہاز کو ایک فرانسیسی چلا رہا تھا۔ جسے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ کہ اس کے ساتھ کون کس غرض سے رومانیہ جا رہا ہے۔

شاہ کیرول کا اس طرح فوری طور پر رومانیہ کی طرف روانہ ہو جانا ایک جوا تھا۔ کیونکہ نہ تو انہیں رومانیہ والوں کی طرف سے کوئی دعوت موصول ہوئی تھی۔ اور نہ رومانیہ میں اس وقت کوئی ایسی سیاسی جماعت تھی۔ جو انہیں تخت و تاج واپس دلانے کے لئے سرگرم عمل ہو۔ مگر اس کے باوجود شاہ کیرول اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اور رومانیہ کی قومی اسمبلی نے انہیں بلا اختلاف رائے تخت پر بٹھا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ شاہ کیرول بالکل ٹھیک وقت پر رومانیہ پہنچے تھے۔ چونکہ وہ جلاوطنی میں بھی رومانیہ کے حالات سے خبردار رہتے تھے۔ اور وہاں کی اندرونی سیاسیات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اس لئے وہ بالکل مناسب موقع پر اپنے ملک میں نمودار ہو گئے۔ یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ اس کے بعد سے شاہ کیرول نے اپنی حیثیت بہت مضبوط کر لی ہے۔ انہوں نے پارٹی سسٹم اڑا کر وزیروں کی ایک کونسل مقرر کر دی ہے۔ اور اس کونسل کی صدارت وہ خود کرتے ہیں۔ مگر رومانیہ کی حکومت ڈکٹیٹرشپ نہیں ہے۔ فیسزم کو بھی اسی طرح سختی سے دبایا جاتا ہے۔ جس طرح کمیونزم کو ٭

"ریاست"

ایک بڈھے کا خط

خدا بخشے۔ جوانی بھی عجب نعمت عظمیٰ تھی۔ صورت شکل۔ ہاتھ پاؤں۔ ڈیل ڈول۔ آنکھ ناک۔ چہرہ مہرہ۔ وضع قطع۔ بات چیت۔ چال ڈھال۔ نشست برخاست۔ تیور۔ ہنسنا رونا۔ مسکرانا۔ غصہ۔ منانا روٹھنا۔ خفا ہونا۔ بگڑنا۔ طرز گفتگو غرض ہر ادا دلفریب معلوم ہوتی تھی۔ جو سیکھنا چاہتے تھے۔ جلد سیکھ لیتے تھے۔ جو یاد کرنا چاہتے تھے۔ یاد ہو جاتا تھا۔ دماغ میں آٹھ گھنٹہ لگاتار محنت کرنے کی طاقت تھی۔ آنکھوں میں کافی روشنی تھی۔ ہاتھ پاؤں قابو میں تھے۔ کام سے جی نہ ہارتا تھا۔ اس وقت کے بعض اشغال جن

کا تذکرہ کرتے ہوئے آج ہمیں شرم آتی ہے - سرمایۂ عزت تھے شطرنج کھیلنے بیٹھے - تو اُسی کے ہو رہے - گنجفے کی بازی لگائی - تو بغیر خلال دیئے کھانا پینا حرام تھا - چوسر بھی - تو ہر داؤں پر پو بارہ آتے تھے - لیکن وقت پر ہمیں کانے دغا دے جاتے تھے - بٹیر بازی - مرغ بازی - کبوتر بازی - کنکوا بازی - تاش وغیرہ سے دلچسپی لیتے تھے - اور پھر علمی مشاغل بھی جاری تھے - کبھی علم معانی و بیان کا تذکرہ تھا - کبھی صنائع بدائع کی بحث - کبھی صرفی نحوی تحقیقات - کبھی شاعرانہ نکات - ورزش کا شوق ڈنبر مگدر کی طرف مائل کرتا تھا - نہانا دھونا نکھرنا - دوست احباب کی ملاقات - اس پر تلاش معاش کا بار جب اپنے سر پہ آپڑا - تو جوانی کچھ کشیدہ خاطر ہو گئی - وہ تو بے فکری چاہتی تھی - اب روٹھنے والی کو منانے کی فکر ہوئی - اطبا کو پنچ بنایا - ڈاکٹروں کو درمیان میں ڈالا - ادویہ کا استعمال کیا - اندیہ مناسبہ کا اضافہ کیا - مگر جب دل میں کدورت آجاتی ہے - تو صفائی محال ہے ؎

آخر اس خفگی کا اثر پڑنے لگا - موئے سفید برآمد ہوئے - ظلمات میں نور ہویدا ہؤا - بالوں میں ہرچند خضاب لگایا لیکن وہ رنگ نہ آیا - جابجا سے مُنہ کالا ہو گیا - لوگوں نے اس خفت کا نام صبح کا ستارہ رکھ دیا - آنکھوں کی بینائی میں فرق آگیا کبھی رات کو مچھر کی ٹانگ دیکھ بھال لیتے تھے - اب تو دن کو ہاتھی نہیں سُوجھتا - نزلے کی شکایت رہتی ہے - کچھ ہی زمانہ گزرا تھا - لوگ سترا بہترا کہنے لگے - دانت گر گئے - مُنہ پوپلا ہو گیا - کسی نے گورِ بے استخواں کی پھبتی کہی - کسی نے کہا - چمڑے کی چوں چوں ہے - آئینے میں دیکھئے - تو مُنہ بٹوا سا معلوم ہوتا ہے - ہر بات میں زبان لپلپاتی ہے - رال بہتی ہے - چہرے کی جھرّیاں اُلّو کا نشک ڈال رہی ہیں - گردن ہر بات پر نہیں نہیں کرتی ہے ناک سُوکھ کر چھوارا ہو گئی ہے - دانتوں کا چوکا لگایا ہے - مگر کہیں کرائے کے ٹٹو سے کام چلتا ہے - کمر کمان ہو گئی ہے - قدم قدم پہ پانسے کی طرح ڈھلکتے ہیں - غم سے بتاسے کی طرح پگھل رہے ہیں - چلنے میں لڑکھڑاتے ہیں - کوئی پاس تک بیٹھنے کا روادار نہیں - جوان دُور ہی سے سلام کرتے ہیں - بچّے صُورت سے ڈرتے ہیں - کوئی کہتا ہے - خضر علیہ السلام تشریف لائے ہیں - مُنہ سے خواہ مخواہ بدحواسی کی بات نکل جاتی ہے - لوگ کہتے ہیں - سچ ہے - بُوڑھا بالا برابر ہوتا ہے - نہ بھوک کی خواہش ہے نہ پیاس ہے - دُنیا کی ہر چیز سے دِل اُداس ہے ؎

کسی غذا میں مزا نہیں ملتا - کوئی چیز طبیعت خواہش سے نہیں لیتی - نہیں کھاتے تو ضعف سے نڈھال ہو جاتے ہیں کھاتے ہیں تو سانس پھول جاتی ہے - نوالہ کیونکہ چبائیں - مسوڑوں سے پلپلا کر گھنٹوں میں پانی کے سہارے حلق سے اُتارا - تو کبھی دست آرہے ہیں - کبھی قبض ہے - کبھی نبض میں سرعت ہے - خلطوں میں بلغم سوا ہو جاتا ہے - تو سردی دبا لیتی ہے - بصارت میں سماعت میں فرق آگیا ہے - رات دن مرنے کا تصوّر رہتا ہے - مسافر سفر کو آمادہ ہے - لیکن توشہ نہیں - ہر وقت خدا سے لو لگی ہے - لوگوں کی نگاہوں میں حقیر ہیں - حج کو بہت جی چاہتا ہے - مگر کوئی ساتھ لے چلنے کا اقرار نہیں کرتا - اور تو اور اپنے لڑکے نفرت کرتے ہیں - کہتے ہیں - ابّا تو سٹھیا گئے ہیں - جو بات ہے - بدحواسی کی - جو کام ہے حماقت کا - بی بی لڑکوں کی طرفدار بن جاتی ہے - اور کہتی ہے - یہ تو ہمیشہ کے بدمزاج ہیں - ہم ایسے تھے - جو اِن کے ساتھ نباہ کیا - نوکر چاکر خاطر میں نہیں لاتے سب رُوکھی سے جواب دیتے ہیں - کام سے جی چُراتے ہیں - سامنے سے ہٹ جاتے ہیں - انہیں باتوں سے جی زندگی سے سیر ہو جاتا ہے - مَوت اچھی معلوم ہوتی ہے - مگر اس پر بھی اختیار نہیں - ہم سے ملک الموت بھی بیزار ہے - علمی مشاغل بھی ترک ہو گئے - کتابیں کیا دیکھیں - بینائی میں فرق - عینک بھی مدد نہیں کرتی - لکھ نہیں سکتے - قلم سرکشی کرتا ہے - ہاتھ کانپتا ہے - کتابوں کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا - پڑھے لکھے چوپٹ ہو گئے - صرف نحو منطق سب بھول بیٹھے - کوئی میلہ ہم سے نہ بچتا تھا - مگر اب جائیں - تو ہنسے جائیں - گھوڑی کی سواری کا ہمیشہ سے شوق تھا - مگر اب تو کمر میں بوتہ نہیں - ران نہیں جمتی - مُنہ زور قابو میں نہیں - باگ چھٹی جاتی ہے - حواس خمسہ معطل ہیں - فقط زبانی جمع خرچ ہے - پیرِ ضعیف مردِ کہنہ - بُوڑھا یا بُڈھا کہو - یا شہید غمزہ - جوانی کی کوئی زندہ دلی کی حرکت سرزد ہو جاتی ہے - تو لوگ قہقہہ اُڑاتے ہیں - اور کہتے ہیں - ہر چیز سِن سے اچھی معلوم ہوتی ہے ؎

بڑے میاں قبر میں تو پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں - مگر چونچلے

نہیں جاتے - یہ شتر غمزے جان کے ساتھ آتے ہیں - جنازے کے ساتھ جائیں گے - کھانا اگر چار چار روز نہ کھاؤ - تو بھوک نہیں لگتی - اور چار لقمے بھی کھا لو - تو پیٹ میں قراقر اور ریح رہتا ہے - نہ نمک سلیمانی فائدہ کرتا ہے - نہ بیچم صاحب کی گولیاں - اس پر لوگ کہتے ہیں - کیا بے حیا زندگی ہے۔ بڈھا مرنے کا نام نہیں لیتا - معلوم ہوتا ہے - اس کے پاس شاہی کی کھڑچن ہے - یہ اگلی ہڈیاں ہیں - کہ اس سن میں حس و حرکات کرتے ہیں - اب کے زمانے والے تو چالیس پچاس یا ساٹھ کے اندر ہی خدا گنج سدھار جاتے ہیں ⁂

ہمارے بڈھے دوست کا خط ہے - جسے ہم نے القاب و آداب اور کچھ پرائیویٹ باتوں کے نکالنے کے بعد کچھ کچھ ترمیم کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا ہے (دلگداز)

اطلاع

دفتر شاہکار میں پانچ کوپن ایسے وصول ہوئے ہیں جن پر کسی کا پتہ نہیں - لہذا گزارش ہے کہ جن حضرات نے رقومات دفتر کو ارسال کی اور ان کو رسید نہیں پہنچی وہ پندرہ یوم کے اندر اندر دفتر کو اطلاع اور آئندہ خط و کتابت اور ترسیل زر کے معاملات میں احتیاط کرنی چاہیئے - تمام حضرات اپنا مکمل اور مفصل پتہ لکھ کر بھیجا کریں - تاکہ کسی قسم کی دقت واقع نہ ہو -

منیجر شاہکار لاہور

تبصرات

رسالہ معارف اعظم گڑھ اب تک ملک کا واحد ماہنامہ تسلیم کیا جاتا تھا جو اسلامیان ہند کی علمی، مذہبی اور سیاسی رہنمائی کر رہا تھا - لیکن ترجمان القرآن، برہان اور قائد کے اجراء سے معارف کو اکٹھے تین رفقائے کار میسر آ گئے -

ترجمان القرآن: یہ مذہبی ماہنامہ پہلے حیدر آباد دکن سے جاری ہوا تھا - لیکن اپنے مدیر شہیر مولینا ابوالاعلیٰ مودودی کے نقل مقام کے ساتھ یہ بھی حیدر آباد سے پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور سے شائع ہو رہا ہے - ترجمان القرآن کے فاضل مدیر قرآن و اسلام کی تعلیمات کو جس مبصرانہ انداز میں مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں اس سے ان کی ذہنی بصیرت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے -

تعلیمات قرآنیہ کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ ملک کی سیاسیات حاضرہ پر اسلامی نقطہ نگاہ سے جو سیر حاصل مباحث ترجمان پیش کر رہا ہے اس امتیاز میں کوئی معاصر اس کا حریف نہیں - مدیر موصوف کا سلجھا ہوا دلکش انداز بیان دل پذیر اور مسکت طریق استدلال، ہر نصفت پژوہ شخص کو اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے -

ترجمان القرآن کا زیر تبصرہ نمبر ۲۰×۲۶/۸ تقطیع کے ۲۴۰ صفحات کی ضخامت رکھتا ہے - اس نمبر میں سیاسیات حاضرہ پر ایک طویل تبصرہ ہے - جو اہم اور مفید عنوانات پر حاوی ہے - ذیل کے چند عنوانوں سے تبصرے کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :-

(۱) مسلمانوں کی غلط نمائندگی اور اس کے نتائج -
(۲) قوم پرستوں کے نظریات -
(۳) آزادی کی فوج کے مسلمان سپاہی -
(۴) جنگ آزادی کا مطمح نظر
(۵) قومی، جمہوری لادینی اسٹیٹ -
(۶) بنیادی حقوق - (۷) ہمارا نصب العین اور طریقۂ کار -

ان مباحث میں ہر بحث بجائے خود حزد افروز ہے - فاضل مدیر نے ملک کے موجودہ سیاسی مسائل کا تجزیہ جمہوریت اور آزادی کے مروجہ خوشنما نظریات کی تحلیل، قوم پرستوں کی باطل آرائی کی اصلیت کانگریس اور کانگریسی رہنماؤں کے اعلانات کا پس منظر نہایت قابلیت و جرأت سے پیش کیا ہے -

ہماری رائے میں ترجمان القرآن کا یہ نمبر اس قابل ہے کہ ہر حق طلب ہندوستانی اور ہر حق پرست مسلمان اسے حرز بازو بنائے -

اور ان قابل قدر خیالات کو جو اس نمبر میں مدیر ترجمان القرآن نے پیش کیے ہیں - ملک کے اخبارات و رسائل اپنے صفحات میں نقل کر کے ہندوستان کے تمام آباد گوشوں تک پہنچائیں - اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے اور رسالہ ترجمان القرآن کا سالانہ چندہ پانچ روپے جس میں یہ نمبر بھی خریدار کو بھیجا جائے گا - دارالسلام پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور پنجاب کے پتے پر دفتر رسالہ ترجمان القرآن سے طلب کیجئے!

رسالہ برہان (قرول باغ نئی دہلی)

دہلی میں ندوۃ المصنفین کے نام سے چند فضلائے دارالعلوم دیوبند نے ایک مذہبی و علمی ادارۂ تصنیف و تالیف قائم کیا ہے - ماہنامہ برہان اسی ادارے کا آرگن ہے جو چند ماہ سے مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے فاضل دیوبند کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے -

برہان بھی ایک مذہبی و علمی ماہنامہ ہے - علوم اسلامیہ کی ترویج و تبلیغ اس کے اجراء کا مقصد اہم ہے - جامعہ اسلامیہ دیوبند کے فضلاء علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل کے ساتھ ذوق و شوق میں اردو زبان اور اردو ادب سے عموماً ناآشنا رہتے ہیں - اسی لئے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے نوجوان ان کی رہبری و قیادت مذہبی سے بے اعتنا رہا کیے - اور وہ جماعت ... سے فضلائے دیوبند کی مسلسل بے اعتنائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری درسگاہوں کے تعلیم یافتہ میدان خالی پا کر علم بردار سیادت بن گئے - مگر افصح المودبین (وقت) کی تنبیہات مسلسل نے آخر ان بے نیازوں کو اس مہلکۂ سرمستی سے نکالا - اب اگرچہ ایسے بے وقت ان کی آنکھ کھلی ہے کہ

"یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا"

لیکن ان کے ممتاز علم و فضل اُن کی غیر معمولی قابلیت و استعداد ان کی جامعیت و تبحر سے یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ اپنے طفرات (؟) سے دوری منزل کو طے کریں گے اور آگے بڑھ کر اہل علم کے کاروان رفتہ کی امارت و سیادت بھی انہیں کا کارنامۂ تقدیر بنے گی -

ماہنامہ برہان کا قابل مدیر جامعۂ دیوبند کا فاضل اور یونیورسٹی کا ایم - اے ہے - علوم مغربیہ میں بھی مہارت کا مالک ہے - اس کی اس امتیازی جامعیت نے اسے ایک روشن خیال مگر متصلب عالم دین کی حیثیت بخشی ہے - ماہنامۂ برہان کے صفحات میں علوم دینیہ پر اس کے شگفتہ اور ایمان افروز مقالات پڑھ کر بہ نور یقین یہ پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ برہان بہت جلد ملت اسلام کے لئے چراغ منزل بنے گا -

اس رسالے میں فاضل مدیر کے علاوہ مسائل دینیہ پر جامعہ اسلامیہ دیوبند کے دوسرے منتخب علماء کے مقالات بھی شائع ہوتے ہیں - برہان کی کتابت باصرہ افروز، کاغذ قیمتی اور ۲۶×۲۰/۸ تقطیع کے ۸۰ صفحات کی ضخامت رکھتا ہے - سالانہ چندہ پانچ روپے -

دفتر رسالہ برہان قرول باغ نئی دہلی سے خریداری کی درخواست کی جائے -

قائد :- اس نام کا مذہبی و سیاسی ماہنامہ مراد آباد سے جاری ہوا ہے - اس کی تہذیب و ترتیب بھی فضلائے دیوبند کے سپرد ہے -

ماہنامہ قائد ملکی و اسلامی سیاسیات پر ٹھوس مضامین شائع کرتا ہے - اس کے ہر نمبر کے مضامین اپنی گراں قدر نوعیت کے اعتبار سے ... اور بصیرت افزا ہوتے ہیں - ملکی آزادی کی تحریکیں اور کانگریس کے نقطۂ نظر کی تائید اس کا مقصد اشاعت ہے -

ترجمان القرآن کانگریسی رہنماؤں کی تلبیس و تزئین اباطیل کو بے نقاب کر رہا ہے اور قائد کا مسلک اس سے مختلف ہے - وہ اسلامی ... کو کانگریس کی جدوجہد آزادی میں شرکت کی دعوت دیتا ہے - اپنے اپنے مسلک کے دونوں پرچے مخلص مبلغ ہیں -

ہم ملک کی سیاست حاضرہ سے دلچسپی رکھنے والے مسلمانوں سے دونوں ماہناموں کے مطالعے کی سفارش کرتے ہیں - قائد کا زیر تبصرہ نمبر اتاترک نمبر ہے - غازی اتاترک کے سوانح موت و حیات پر اب تک جو کچھ اخبارات میں شائع ہو چکا ہے قائد میں اس سب کچھ کے ساتھ اور بہت کچھ جدید معلومات فراہم کی گئی ہیں -

قائد اپنی معنوی خوبیوں میں رسالہ برہان کے قریب اور ظاہری شان میں اس سے دور ہے - اس کا سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ بارہ آنے ہے اس قیمت میں اسے "گراں بہ حکمت و ارزاں بہ قیمت" کہا جا سکتا ہے -

ملنے کا پتہ - دفتر رسالہ قائد مراد آباد -

نوٹ :- حسب ذیل رسائل، اخبارات اور کتابیں دفتر شاہکار کو بہ غرض اظہار رائے موصول ہو چکی ہیں - آئندہ نمبر میں ان پر تبصرہ کیا جائے گا -

سالنامے = رسالہ ادبی دنیا - عالمگیر، ساقی، ادب لطیف، پیام تعلیم، رہنمائے تعلیم کا تپ دق نمبر - رسالہ سب رس حیدر آباد کا دکن نمبر -

ماہنامے = انیس - پھول باغ، الزہرا، مشعل، بیسویں صدی، دلگداز، اخوت - نور - تعلیمی گزٹ - ہندوستانی -

اخبارات = رہبر وطن - پیغام حیات - سدا بہار، نظام گزٹ، ۴۴

کتابیں :- (۱) مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل (۲) پاگل (۳) اردو کے سو شعر ضرب الامثال (۴) اردو کے سو شعر ... [illegible]
سو شعر ... (۶) اردو کے سو شعر ... (۷) ... [illegible]

نگران:۔ پروفیسر تاجور

شاہکار لاہور

جائینٹ ایڈیٹر:۔ خواجہ محمود جاوید ایم۔اے

چندہ:۔

سالانہ چھ ۶ روپے۔ششماہی تین روپے آٹھ آنے۔نادار خریداروں سے للعہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی۔نمونہ پانچ آنے

جلد (۸) فہرست مضامین بابت ماہ مارچ ۱۹۳۹ء نمبر (۶)

تصاویر:۔ سہ رنگی:۔(۱) پامال خیال۔یک رنگی:۔(۲) لینن۔(۳) مراکش کا ایک خوشنویس۔

ایم ادی حسن ... پرنٹر و پبلشر نے ... الیکٹرک پریس ... لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار ... میاں علی محمد سٹریٹ (۴۵) ... (خواجہ ... روڈ)

مختصرات

پنجاب کی اتحادی حکومت اور سبھائی اخبارات

سکندر گورنمنٹ کے متعلق اسکے آغاز قیام سے سبھائی پریس کی دلی حسرتوں کا خون جلی سرخیوں کی صورت میں چھلکتے چھلکتے اب دامان و آستیں پر صرف گلکار نظر آتا ہے۔ سر سکندر اور اُن کے کابینۂ وزارت کا جلال ریز تصور سبھائی ذہنیت اور سبھائی صحافت کے حق میں ہلاکت بار عذاب زندگی بن گیا ہے۔ اِدھر پنجاب کی مجلس قانون ساز کے نام نہاد کانگریسی ممبر دماغی توازن قائم رکھنے سے اظہار عجز کر رہے ہیں۔ اُن کی خفیف الحرکاتیاں دیکھ کر ہر صاحب بصیرت یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر قومی زندگی کے علمبردار یہی حضرات ہیں۔ تو پھر قومی زندگی کا خدا حافظ ہے۔ پنجاب اسمبلی میں اپوزیشن پارٹی کے اکثر ارکان تعلیم یافتہ ہیں اور اُن میں سے بعض تو آل انڈیا شہرت کے لیڈر بھی سمجھے جاتے ہیں۔ مگر ان آل انڈیا لیڈروں کی زیر سیادت اسمبلی ہال میں یہ تعلیم یافتہ ارکان جو طوفان بے تمیزی برپا کر چکے ہیں۔ اسے دیکھ کر کون یہ دعوے کر سکتا ہے۔ کہ "تعلیم انسان کو انسان بناتی ہے"۔

سچ تو یہ ہے کہ ہمارے صوبے کی مجلس قانون ساز کے تہذیب سوز ہنگامے صوبے کی تاریخ سیاست کے بدنما داغ بن رہے ہیں۔ اس صوبے میں اہنسا کے پجاریوں نے جس نوعیت کا ناروا تشدد اختیار کر رکھا ہے اس پر کوئی قوم پرور انسان اظہار فخر و مباہات نہیں کر سکتا۔ حکومت پنجاب کی حد سے بڑھی ہوئی مسلسل رواداری کو بزدلی پر محمول کر کے کانگریس اور کانگریسی ذہنیت کم سے کم پنجاب میں تو بے نقاب ہو گئی ہے۔ مہاتما گاندھی کی جے بولنے والے پنجابیوں کے مجلسی آداب کو مہاتما جی کے اعلانات کی روشنی میں دیکھا جائے تو دیکھنے والی آنکھ حیرت زدہ ہو جاتی ہے۔ عدم تشدد کے پیغمبر کی اُمت پنجاب کی مجلس نمائندگان میں جس غیر انسانی تشدد کا مظاہرہ کرتی رہی ہے۔ اُس کا اندازہ اسمبلی کے گذشتہ اجلاس کی کانگریسی غوغا آرائیوں سے کیا جا سکتا ہے۔ میاں نوراللہ ایم ایل اے اسمبلی کے ایک زمیندار ممبر ہیں۔ اُن کے حلقے کے کسانوں نے اپنی نمائندگی کے لئے اُنہیں مجلس قانون ساز میں بھیجا ہے۔ وہ جب تک اس مجلس کے ممبر رہینگے اپنی زمیندار برادری کے حقوق کی حمایت کرینگے۔ اگر اُنہیں کسی غلط فہمی کے سبب اپنی رہبر حکومت زمیندارہ پارٹی سے اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے۔ تو یہ کوئی غیر معمولی حادثہ نہیں۔ اُن کا حکومت سے خفا ہو کر رشتۂ اتحاد توڑ دینا یہ بھی کوئی ایسا اہم واقعہ نہ تھا۔ جس پر معاندین حکومت اور اُن کے بے اصول اخبارات طوفان برپا کر رہے ہیں۔ آج وہ اپنی پارٹی سے کشیدہ ہو گئے ہیں۔ غلط فہمیاں دُور ہو جائینگی۔ تو کل بچھڑے ہُوئے ساتھیوں سے آملینگے۔ ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ زمینداروں کے حقوق سے غداری کر کے مہاجنی جماعت کا ساتھ دینگے۔ مضحکہ انگیز خوش فہمی ہے۔

مہذب ممالک کی پارلیمنٹوں میں دن رات ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ اِن واقعات کا تواتر بڑھتے بڑھتے اب اہل ملک کیلئے در خور اعتنا بھی نہیں رہا۔ لیکن کانگریسی اخبارات اور اسمبلی کے کانگریسی ممبروں نے اس صوبے کے معمولی سے واقعے کو قیامت صغریٰ بنا کر شور و غوغا سے آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہے۔ سکندر گورنمنٹ میاں نوراللہ اور اُن کے اور ساتھیوں کے الگ ہو جانے کے بعد بھی اس قدر اہم اکثریت کی مالک ہے۔ کہ اپوزیشن پارٹی کے زور آزما اُسے مرکز ثقل سے ہٹانے کے صرف خواب دیکھ سکتے ہیں۔ اُن کے پریشاں خوابوں کی تعبیر اُن کی قسمت میں نہیں لکھی۔ سبھائی پریس مدت سے اپنے قارئین کو برابر فریب تسلی میں مبتلا رکھنے کی سعی ناکام میں منہمک نظر آتا ہے۔ ان اخبارات کی صحافتی دروغ بافیوں پر اتنی حیرت نہیں جس قدر تعجب اُن اخبار بینوں کی خوش فہمی اور فریب پذیری پر آتا ہے جو دو سال سے مسلسل اتحادی حکومت کی برہمی اور شکست قیام کے سلسلے میں نت نئی تراشیدہ خبروں کو پڑھ رہے ہیں۔ ان خوش خبریوں کے حسرتناک انجام کو دیکھ رہے ہیں۔ اور پھر بھی سبھائی پریس کی صداقت نگاری کے متعلق ان کے ایمان و اعتقاد میں تذبذب پیدا نہیں ہوتا۔ پنجاب سناتن دھرم پرتی ندھی سبھا کے جنرل سیکرٹری نے ایک بھرے جلسے میں اپنی مہاجنی برادری کو یہ مژدۂ جاں بخش سنایا تھا کہ "اتحادی حکومت کے بیس ممبروں کے استعفے اس وقت میری جیب میں پہنچ چکے ہیں اور بہت سے ممبر صبح شام میں مستعفی ہونے والے ہیں۔ اور اب کوئی دن جاتے ہیں۔ کہ سر سکندر اور اُن کا کابینۂ وزارت بیک بینی و دو گوش رہ جائیگا"۔ آج اس اعلان کو کئی ماہ بیت چکے ہیں لیکن ان استعفوں کو سیکرٹری صاحب کی جیب

نکلنا نصیب اب تک نہیں ہوا بیسیوں صبح و شام گزر گئے مگر اتحاد پارٹی کا قلعہ بدستور غیر مفتوح نظر آتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان نام نہاد اخبارات اور فریب کار جتھیداروں کی ان دروغ آرائیوں کا مقصد کیا ہے۔ کیا صرف غلط اطلاعات اور بے حقیقت اعلانوں سے اتحادی حکومت ٹوٹ سکتی ہے کیا یہ عقلمند لوگ اس وہم کا شکار ہو گئے ہیں کہ عوام الناس کو مستقل طور پر تاریکی میں رکھا جا سکتا ہے؟

مارکیٹنگ بل پر جو فسق و فجور اپوزیشن پارٹی نے اسمبلی میں برپا کیا ہے۔ پنجاب کی تاریخ سیاست پر یہ بدنما داغ ہمیشہ کے لئے ثبت ہو چکا ہے اپوزیشن پارٹی کے بعض شوریدہ سر ممبروں نے مجلس قانون ساز کے قائمقام صدر کی جو پے در پے توہین کی اُسے دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ پنجاب کی کانگریس کوئی جمہوری جماعت ہے۔ سر سکندر اور اتحادی وزراء کو ہٹلر اور مسولینی بنانے والے اپنے گریبانوں میں مُنہ ڈال کر نہیں دیکھتے۔ دنیا بھر کے آئینی ممالک کی مجالس قانون ساز میں اسپیکر کی ذات تمام جماعتوں کے احترام و فرمان پذیری کی حقدار سمجھی جاتی ہے۔ ہر ملک کی پارلیمنٹ میں اسپیکر کا منصب جماعتی مخالفت سے بلند خیال کیا جاتا ہے مگر پنجاب اسمبلی کی اپوزیشن پارٹی نے اسپیکر کے خلاف جو ہنگامہ توہین و تضحیک برپا کیا حد درجہ افسوس ناک بلکہ شرمناک تھا۔

ان ہنگامہ پرستوں نے صدر کے لئے ضبط قائم رکھنا ناممکن بنا دیا اُس کے احکام کو پرکاہ بنا کر مجلس کے وقار کو درہم برہم کر دینے میں مطلق تامل نہ کیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد "آرمز ایکٹ" کے متعلق پریمیر کی ضروری تجویز پر چیخ پکار کرنے کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں۔ کہ اپوزیشن پارٹی پنجاب اسمبلی کو بدستور بُدھو کی چوپال کی حیثیت میں اپنے غوغائیوں کی شورش پرستیوں اور خفیف الحرکاتیوں کا میدان بنانے پر مصر ہے۔

پنجاب اسمبلی میں آنریبل سر چھوٹو رام نے مارکیٹنگ بل پاس کرایا تو کانگریسی ممبروں نے اپنی ساہوکارانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آسمان سر پر اُٹھا لیا لیکن اتحادی وزیر کے قدم بہ قدم چل کر سرحد کی کانگریسی وزارت بھی اپنی مجلس قانون ساز میں اسی نام اور اسی مقصد سے منڈیوں کے ساہوکارانہ غصب و بددیانتی کو دور کرنے کے پیش نظر بل پیش کر رہی ہے تو کانگریسی رہنما اور اخبارات مُنہ میں گھونگنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔ سر چھوٹو رام اور سر سکندر کو جس گناہ پر گردن زدنی قرار دیا جا رہا ہے وہی گناہ سرحد کی کانگریسی وزارت بھی کر رہی ہے۔ مگر ڈاکٹر خان سے باز پُرس کرنے کی کسی اخبار میں جرأت نہیں۔

"ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا"

بات صرف اتنی ہے کہ سر سکندر کا کابینہ کانگریسی نہیں۔ اس لئے اُس کے ہر کارنامے کو ایک خوفناک ظلم کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پنجاب کی کانگریس اپنی انہیں چھچھوری حرکتوں سے خود ملک کے کانگریسیوں میں بدنام ہو رہی ہے۔ دوسرے صوبوں کے کانگریسی رہنما پنجاب کی کانگریس پارٹی کی انہیں بے اصولیوں کے سبب یہ رائے رکھنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ کہ پنجاب کی کانگریس بوگس کانگریس ہے اور پنجابی کانگریسی کانگریس کے وقار کو تباہ کر رہے ہیں"

ہائی کمانڈ کی ہٹلر گردی

کانگریس ایک جمہوری جماعت کہلاتی ہے۔ جمہوری نظام حکومت قائم کرنے کے لئے اس کا وجود ظہور پذیر ہوا تھا۔ کانگریسی رہنماؤں کی زبان جمہوریت کی حمایت میں آٹھ پہر چلتی رہتی ہے۔ ہٹلر اور مسولینی کانگریس کے دربار میں سب سے بڑے مجرم گردانے گئے ہیں۔ کیونکہ وہ شخصی آمریت اور شخصی حکومت کے حامی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ادعائے جمہوریت کانگریس کی باگ ڈور ایک شخص واحد کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کی چشم و ابرو کے اشارات کانگریسی ادارات کے لئے الٰہی قانون بنے ہوئے ہیں۔ نو صوبوں کی کانگریسی حکومتیں اُسی کے شخصی اقتدار کے محور پر گردش کر رہی ہیں۔ وہ جس سے خوش ہوتا ہے اُسے پستی خاک سے اُٹھا کر مسندِ افلاک پر بٹھا دیتا ہے۔ جس سے ناخوش ہو آبادز میں کی وسعتیں اُس کے لئے ایک قبر کی گنجائش سے انکار کر دیتی ہیں۔

اس کانگریسی برہم دیوتا کے چند حاشیہ نشین ٹیپل، راجندر بابو اور جمنالال بجاج بجائے خود نادر شاہی غرور میں مبتلا ہیں۔ شریمان کھارے اور ایم این رائے کی وطن پرستی اور خدمت وطن کے لئے عمر بھر کی قربانیاں اس لئے بیکار ہو جاتی ہیں۔ کہ سردار ٹیپل کے لئے اُن کی پیشانیوں میں سجدہ ہائے پرستاری نظر نہیں آتے۔ کانگریس کا آئین ہندوستانی ریاستوں میں عدم مداخلت کے لئے ہزار شور بلند کرے۔ آخر کاغذ کا پُرزہ ہے۔ ہائی کمانڈ کی زندہ طاقتوں کا حریف نہیں بنایا جا سکتا۔ ٹیپل اور بجاج کی شخصیتیں کانگریس کے کاغذی دستور العمل سے بہرحال بلند و برتر ہیں۔

سبھاش بابو جمہوری انتخاب میں اکثریت کی رائوں سے لاکھ

صدر منتخب ہو جائیں۔ ہائی کمانڈ کے ہمالیہ صفت اقتدار سے اکثریت کا اعتماد ٹکر نہیں لے سکتا۔ سبھاش بابو کے لئے یہ جمہوری ہر دلعزیزی بہت مہنگی پڑیگی۔ اُن کی جاں بخشی اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ کہ شیوگاؤں کے باسی کی چوکھٹ پر سر رکھ دیں۔ ورنہ لکھ رکھیں کہ انہیں مسند صدارت سے گرانے کے لئے ہائی کمانڈ کے دیوتاؤں کی "آتمک شکتی" نظام عالم کو درہم برہم کرنے سے بھی گریز نہ کریگی۔

آزاد ہندوستان کی تعمیر اسی ہٹلرازم سے ہو رہی ہے۔ گورنر شاہی اپنا جانشین گاندھی گردی کو بنا کر جائیگی۔ ۳۵ کروڑ ہندوستانی آج مٹھی بھر انگریزوں کے غلام کہلاتے ہیں کل کانگریس ہائی کمانڈ کے چہار درویش کی ٹولی ان پر خدائی کریگی۔

"وائے گر از پس امروز بود فردائے!"

سکھ نیشنل کالج کو دو لاکھ کا دان

سکھ نیشنل کالج کو ہز ہائینس مہاراجہ پٹیالہ نے دو لاکھ کے عطیئے سے نوازا ہے۔ اس حاتمانہ امداد کے لئے مہاراجہ پٹیالہ صوبے کے تمام تعلیمی حلقوں کی جانب سے شکریے کے اور کالج کے ارباب حل و عقد مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مہاراجہ بہادر نے اپنی تخت نشینی کے بعد ہی سے جس بیدار ضمیری اور رعایا پروری اور استحقاق پذیری کا ثبوت دیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ صحیح معنی میں اپنے آبائی تخت و تاج کے وارث ثابت ہوئے ہیں۔

اُن میں نہ عہد قدیم کا تاجدارانہ سزدرہے نہ وہ اپنی عشرت پرستی، وہ اپنی رعایا میں فرقہ وارانہ امتیاز بھی روا نہیں رکھتے۔ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اپنی رعایا کی تکالیف سے ذاتی طور پر باخبر رہتے ہیں۔ اُن کی فیاضی جا و بے جا، مستحق و غیر مستحق کی تمیز کو نظر انداز نہیں کرتی۔

سکھ نیشنل کالج جن اعلیٰ مقاصد اور بلند مطمع نظر کی تحصیل و تکمیل کے لئے قائم کیا گیا ہے اور جس قابل قدر ایثار اور شبانہ روز محنت و انہماک سے اس کے مخلص کارکن صوبے کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اُس کے پیش نظر ناممکن تھا۔ کہ بیدار ضمیر اور قدر شناس تاجدار پٹیالہ کی نگاہ التفات سکھ نیشنل کالج کو نظر انداز کرتی۔

ہم اس کامیابی پر کالج کے ایثار شیوہ، قابل اور مخلص پرنسپل سردار نرنجن سنگھ کو دلی مبارک پیش کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ کہ اُن کی مخلصانہ جدوجہد اور بے غرض خدمات ہی کا نتیجہ ہے کہ اتنی قلیل مدت میں حیرت انگیز طور پر ایک قلیل میدان علوم و فنون کے ایک ایسے عظیم القدر ادارے میں تبدیل ہو گیا۔ جس پر کوئی قوم فخر کر سکتی ہے۔ سکھ نیشنل کالج کا کوئی ماضی نہیں مگر اس کا درخشاں حال ایک تابناک مستقبل کا پتہ دے رہا ہے۔

تاجور

دیہاتی مدرسین کا حال زار

دیہاتی مدارس کے مدرسین عام طور پر تعلیم و تربیت کے فرائض کی انجام دہی میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کی ناکامی اور غیر مقبولیت کے متعلق بہت کم غور کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بے قصور ہوتے ہیں۔ اُن کی غیر مقبولیت کے بہت سے وجوہات ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مدرس جس گاؤں میں تعلیم کے واسطے تعینات کیا جاتا ہے۔ وہ وہاں کا باشندہ نہیں ہوتا۔ اس کے رسم و رواج اور فضا سے وہ غیر مانوس ہوتا ہے ماحول کی بیگانگی اور گاؤں والوں کی اجنبیت کامیابی کی منزل تک پہنچنے نہیں دیتی۔ دیہات کے لوگ اس کے ساتھ بیرخی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ مدرسہ اُن کو اپنے ماحول، رسم و رواج اور فضا کا ہمنوا نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بمجبوری مدرسہ میں بھیجتے ہیں۔

واردھا سکیم کے ترتیب دینے والوں نے اس راز کو بخوبی سمجھ لیا ہے۔ جن لوگوں نے اس رپورٹ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اُن کو علم ہوگا کہ وہ بھی مدرسین کی ناکامی کے یہی وجوہات بیان کرتے اب اگر ایک مدرس رہنے والا لاہور کا ہو اور لگایا جائے قصور کے کسی گاؤں میں تو وہ کیا اپنے فرائض کی انجام دہی میں کامیاب ہو سکتا ہے نہ دیہات والے اس سے مانوس ہونگے۔ نہ وہ دیہات والوں سے، مدرسہ ہمیشہ ناکام ثابت ہوگا۔ اور مدارس محکمہ تعلیم میں ناقابل سمجھا جائیگا

گزشتہ ہندوستان میں دیہات کے مدرسین کی دیہات والے بڑی قدر کرتے تھے۔ وہ مدرس کہیں باہر کا نہیں بلکہ اُسی گاؤں کا ہوتا تھا۔ اور درس و تدریس کا سلسلہ صرف اُسی کی ذات تک ختم نہ ہو جاتا۔ بلکہ نسلاً بعد نسل یہ عہدہ اُسی کے خاندان میں منتقل ہوتا رہتا تھا۔ وہ اُس کو صرف مدرس نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ سچا رہنما اور ہادی بھی جانتے تھے۔ مولوی، پنڈت، امام، حکیم، وید، پیر اور گرو اُن کے لئے سب کچھ وہی ہوتا۔ گاؤں کے رہنے والے سچے دل سے اس کے ہمدرد ہوتے۔ اور اُس کو اپنا ہمدرد سمجھتے تھے۔ وہ گاؤں والوں کا خیر اندیش اور اُن کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے فرائض نہایت تن دہی اور دیانتداری سے انجام دیتا تھا۔ گاؤں کے نوّے فیصدی لوگ اس

گے اور اس کے خاندان کے شاگرد ہوتے تھے۔ وہ اُس کو غیر نہ سمجھتے تھے اُس کا ایک معمولی سا اشارہ بھی اُن کے لئے بہت ہوتا تھا۔ لیکن آجکل یہ عالم ہے کہ مدرسین کی قطعاً پروا نہیں کی جاتی اس لئے کہ وہ غیر ہوتا ہے۔ گاؤں کی بستی سے کسی قسم کا بھی اس کا تعلق نہیں ہوتا۔ مدرس دیہات والوں سے بیگانہ رہتا ہے۔ اور دیہات والے مدرس سے۔ چونکہ مدرس کی تنخواہ نہایت قلیل ہوتی ہے اور ضروریات زندگی فراہم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ گھر بار اور اہل وعیال سے دور پھینکدیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ ہر وقت بے چین رہتا ہے۔ یہ بے چینیاں روز بروز ترقی کرتی جاتی ہیں۔ اور پھر دوسرے بھی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس حالت میں اگر اس کے متعلق شبہات اور بدگمانیاں پیدا ہوں۔ تو جائز ہیں۔ اور یہی ہوتا بھی ہے۔ گاؤں والے اس کو ناقابل اعتماد سمجھتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ اپنے بچے ایسے لوگوں کے حوالے کردیں۔ جن کے متعلق اُن کے دل میں شکوک ہیں۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ مدرس کو ملازمت کے لئے درخواست کرنے سے پہلے ان تمام باتوں کے متعلق غور کر لینا چاہیئے۔ لیکن یہ جواب غلط ہوگا۔ ملازمت کے متعلق غور و فکر وہ لوگ کرتے ہیں۔ جو فکر معاش سے بے نیاز ہوں۔ اور جس غریب کو اہل وعیال کی فکریں سر اُٹھانے کی مُہلت نہیں دیتیں۔ وہ ملازمت کے متعلق کیا غور کریگا۔ وہ اگر چار دن کے لئے بیکار ہو جائے۔ تو موت آجاتی ہے۔ زندہ رہنے کو دل نہیں چاہتا۔ بال بچوں کی تکالیف اُس کی روح کو تحلیل کر دیتی ہیں اور وہ زندہ درگور ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مستحق مبارک باد ہیں۔ کہ اُن کی کمیٹی حالات واقعات کا صحیح جائزہ لینے میں کامیاب ہو گئی۔ اور مدرسین کی تکالیف کا بالکل درست علاج معلوم کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ واردھا سکیم میں مدرسین کے لئے یہ بات ضروری قرار دی گئی ہے کہ وہ اسی گاؤں کا ہو جہاں کے مدرسہ میں اس کو لگایا جائیگا۔ اور ابتدا میں مدرس کو صرف پانچ سال کے عرصے کے لئے بطور امتحان بیس روپے ماہوار تنخواہ پر مقرر کیا جائیگا۔ تاکہ اندازہ ہو جائے۔ کہ یہ اس گاؤں کے ماحول سے مانوس ہے یا نہیں۔ اگر پانچ سال کے دوران میں وہ کامیاب ثابت ہو تو پھر پچیس سال کے لئے اُسی گاؤں میں مستقل کر دیا جائے۔ اور پانسو روپے سالانہ کی اوسط سے اُس کو تنخواہ وغیرہ دی جائے لیکن اس مدرس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے دل میں ملک وقوم کا درد ہو۔ دیہات کے لوگوں کا وہ لیڈر اور اُن کے بچوں کا اُستاد سمجھا جائیگا۔

پنجاب گورنمنٹ کو چاہیئے۔ کہ وہ اس مسئلہ کی طرف توجہ کرے۔ اگر لوکل پارٹیز کو ہدایت جاری کر دی جائے کہ مدرس اسی جگہ معین کئے جائیں جہاں کے وہ باشندے ہوں۔ اور مدرس کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا جائے۔ کہ اس کا تبادلہ وہاں سے نہ ہوگا۔ تو وہ نہایت تسلی بخش کام کریگا۔ اگر کسی علاقے میں بہت سے مدرس ہوں۔ تو یہ ہو سکتا ہے کہ قریب ترین مدرسوں میں ان کو لگا دیا جائے۔ اس طرح بہت سے نکمے مدرسے بھی کارآمد اور مفید بن جائیں گے۔ دیہات کے لوگ ہنسی خوشی اپنے بچوں کو مدرسوں میں بھیجیں گے تعلیم اس طرح سے بہت زیادہ مقبول ہو سکتی ہے۔ اور موجودہ تمام مشکلات کا انسداد ہو سکتا ہے۔

مدرسین کا فرض ہوگا کہ وہ طلبا کے دل میں خدمتِ وطن کے جذبات پیدا کریں۔ اور اُن کو بتائیں کہ وہ مستقبل قریب میں ایک قوم کی شیرازہ بندی کرنے والے بنیں گے۔ انہی کی بدولت ملک وقوم سے جہالت کی تاریکی دُور ہوگی۔ جو مدرس اپنے فرائض میں کامیاب ہو اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

جتنا روپیہ تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اتنے فوائد ونتائج مترتب نہیں ہوتے۔ یہ حالت صرف پنجاب کی نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر صوبہ کا یہی عالم ہے۔ اور جب تک دیہاتوں کی فضا اور ماحول کے مناسب حال مدرس نہ پیدا کئے جائیں گے۔ اس وقت تک یہی حالات رہیں گے۔ اکثر اوقات یہ معلوم کر کے بے حد قلق ہوتا ہے۔ کہ بعض نہایت قابل اور کامیاب مدرس اپنے گھر سے بہت دُور دراز فاصلے پر تبدیل کر دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی قابلیت کے اظہار سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ اکثر بورڈ مدرسین کے تبادلے سے بہت خوش ہوتے ہیں وہ ان کو تکلیف پہنچانے میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ اور جی کھول کر تبادلے کرتے ہیں۔ لیکن یہ روش نہایت خطرناک ہے۔ جس کے نتائج تعلیمی اغراض ومقاصد کی تکمیل میں ایک زبردست رکاوٹ ہیں۔

جدید مطبوعات

کافی سے زیادہ جدید تصنیفات، سالنامے، خاص نمبر اور ماہنامے دفتر شاہکار کو بغرض اظہار رائے وصول ہو چکے ہیں۔ جن پر تبصرے کے لئے زیر نظر پرچہ میں ایک پوری کاپی وقف کر دی گئی ہے۔ لیکن پھر بھی سالنامہ ادبی دنیا، نیرنگ خیال اردو کا اقبال نمبر بعض نئے ماہنامے اور نئی کتابیں رہ گئیں۔ آئندہ پرچہ میں اُن کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا جائیگا۔

طالب فارسی

بیوی سے پہلی جنگ کی داستان

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

بیوی :- ہاں ہاں تمہیں مار کر بھی جیوں گی۔ برابر جیئے جاؤں گی۔ جم جم جیوں گی۔ میں کیوں مر جاؤں۔ میرے بدلے وہ مر جائیں جو میرے مرنے کے رات دن خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ میری تو جوتی بھی نہیں مرے گی۔ اسی طرح چھاتی پر مونگ دلتی رہوں گی۔ رہے میرے مہر وہ الٰہی مور مجھے ملیں گے۔ جھنڈے کے تلے وصول لوں گی۔ خاطر جمع رکھو میرے مہر مُردے کا مال نہیں کہ جس کا جی چاہا دبا لیا۔

ہم :- مگر لو گی کس سے مہر؟

بیوی :- اُس سے لوں گی جس کے ہاتھ میں پنچوں نے میرا ہاتھ دیا تھا۔

ہم :- وہ کون نیک بخت تھا؟ ہم بھی تو سنیں اُس کا نام۔

"کس گراں بار کو اٹھتی تھی قیامت لے کر"

بیوی :- نیک بخت تھا یا بد بخت یہ تو وہ جانے۔ تم بھی سن لو گے وہ کون تھا۔ گھبراؤ مت۔ جب گھر پر قرقی آئے گی، گھر بار نیلام پر چڑھے گا۔ نیلامی کا ڈھنڈورچی گلی گلی نام پکارتا پھرے گا۔ اُس وقت تمہیں سب سے پہلے معلوم ہو جائے گا کہ مہر کس نیک بخت سے وصول لے جا رہے ہیں؟ اور مہر دینے والے کا کیا نام ہے؟ اس وقت یہ شاعری واعری سب بھول جاؤ گے! میں خدا نہ کرے کوئی آئی لگائی نہیں۔ خاندان کی بیٹی ہوں۔ خدا رہتی دنیا تک میرے خاندان کو رکھے۔ میرے خاندان کی کسی بیٹی کا مہر آج تک مارا نہیں گیا۔ بڑے بڑے تیس مار خاں نہیں دبا سکے اور تم تو بے چارے حیثیت ہی کیا رکھتے ہو؟ بقول شخصے ننگ دھڑنگ مست قلندر، تمہاری بھلا کیا بھسری ہے، جو میرے مہر دبا لوگے عدالت آخر عدالت ہے۔ کوئی مشاعرے کی محفل نہیں، وہاں قانون چلتا ہے۔ شاعری نہیں چلا کرتی۔ وہاں جناب کی حضرات مطلع عرض ہے" کو کوئی نہیں سُنے گا۔ میرے مہر تم ہضم نہیں کر سکتے۔ تمہارے پیر سے بھی رکھوا لوں گی۔

ہم :- ہمارے پیر تو دس سال گزرے اللہ کو پیارے ہو چکے۔ اُن کی قبر پر سمن کی تعمیل کراتی پھرنا۔ رہے ہم۔ تم جانتی ہو ہمارے پاس معہ چند کپڑے، ہنر ال شاپ کا سستا سا جوتا، نسوار کی ڈبیہ، گھڑ دوڑ کی لاٹری کا ٹکٹ، قرضخواہوں کی دو چار ڈگریاں اور کرایہ کا مکان ہے۔ یہ سب کچھ سامان تم بغیر مقدمے کے بھی لے سکتی ہو۔

بیوی :- تنخواہ مٹی کا نام نہ لیا۔ اُسے بھول ہی گئے!

ہم :- جب تم جا رہی ہو، تو نوکری کر کے کیا کریں گے۔ کمبخت پرائی تابعداری، یہ سب جھنجھٹ تو تمہارے کارن کر رہے تھے۔ اِدھر تمہارا ٹانگہ اسٹیشن سدھارے گا، اُدھر ہمارا استعفا دفتر روانہ ہو جائے گا۔

بیوی :- اور یہ کُتّے بلّے کیا زہر مار کریں گے؟

ہم :- ہم تو اِن بلونٹوں[1] کے خریدار بنتے نہیں۔ اِس کباڑ کو بھی ساتھ لیتی جانا۔ ان کی آٹھ پہر کی ہاہا کار سے ہم پہلے ہی سے اُکتائے ہوئے ہیں۔

بیوی :- کیوں میں جہیز میں انہیں ساتھ لائی تھی؟

ہم :- ہم بھی چڑھاوے کے ساتھ انہیں نہیں لے گئے تھے۔

بیوی :- اِس اپنی علّت کو سنبھالو! میں میکے سے تنہا آئی تھی۔ تنہا ہی جاؤں گی۔ اللہ رکھے میرے باپ کے ہاں میرے لئے سب کچھ ہے۔

ہم :- یہ علّت ہے یا بیماری، جو کچھ بھی ہے آخر تمہارے قدموں ہی کا صدقہ ہے۔ ہم تو جب کنوارے تھے، چھڑے چھٹانک تھے۔ [illegible]ے چھٹانک ہی رہنا چاہتے ہیں۔ اللہ رکھے تمہارے باپ

[1] بلی کے بچے۔

کے ہاں سب کچھ ہے، جہاں بیٹی کو پالیں گے، نواسی، نواسوں کو بھی
مُنہ کا نہ دیکھ سکیں گے۔

بیوی:۔ واہ کیا کہنے، تری مری آخور میں کیوں سمیٹنے لگی تھی۔
اِس گھر مرات ہوئے میں کیسی منحوس گھڑی آئی تھی، ساری جوانی غارت
کر دی۔ میرا گلاب کا سا رنگ اُلٹے توے سے بدل گیا۔

ہم:۔ ہمارے لئے بھی تمہارا آنا کچھ راس نہیں آیا۔ تمہارے
تشریف لانے سے پہلے ہم بھی جوانِ رعنا تھے، جس طرف کو نکل جاتے
تھے، وہ گلیاں سج جاتی تھیں۔ محفل کا سنگھار سمجھے جاتے تھے، جوانی
پھٹی پڑتی تھی۔ کبھی لوگ ہماری تصویریں لیا کرتے تھے۔ رستہ چلتے ہمیں
گھڑی بھر دیکھنے کو کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہی ہم ہیں، اب ہمیں کوئی
دیکھے ناک پکڑے سے دم نکلتا ہے۔ آٹھویں دن ڈاکٹر یوسف انجکشن
کی شیشی لئے دکھائی دیتے ہیں۔ ۲۹ تاریخ کی عید کا چاند سب سے
پہلے ہم دیکھا کرتے تھے، اب عینک میں بھی ایک ایک حرف کے
چار چار نظر آتے ہیں۔ دو قدم چلتے ہیں تو دم پھول جاتا ہے۔ اپنی اور
تمہاری زندگی کا نتیجہ بن کر رہ گئے ہیں۔ تمہارے قدموں کی برکت سے
خود ہماری جوانی خاک میں مِل گئی۔ ہم کس سے شکایت کریں۔

بیوی:۔ میرے قدم؟ میرے قدم تو ایسے ہیں کہ ۲۵ رُپلّی
سے دو سو روپے پا رہے ہو۔ جوانی اپنے کرتوتوں سے خاک میں
ملائی ہو گی۔ میں اس ذق ذق بق بق کو سننا نہیں چاہتی، اپیل کا وقت
آ رہا ہے، میرے مہر دلواؤ سیدھے ہاتھ سے۔

ہم:۔ کہہ تو دیا کہ ہم تمہاری دعا سے دو ہزار کے قرضدار ہیں۔
اپنے ساتھ ہمیں بھی لے چلو، قرضداروں اور ڈگریوں سے تو پیچھا چھوٹیگا۔

بیوی:۔ تمہارا کیا اچار ڈالوں گی لے جا کر!

ہم:۔ بدمزہ تو نہیں ہو گا۔

بیوی:۔ میں کوئی خدا نہ کرے، آدم خور ہوں۔

ہم:۔ ہمیں تم آدمی کب سے سمجھنے لگیں؟ بیوی!

بیوی:۔ چلو کیسی بیوی، کس کی بیوی، ہو گی کوئی چڑیل تمہاری
بیوی، مجھے بیوی بیوی مت کہا کرو۔

ہم:۔ کیوں تم سے ہمارا نکاح نہیں ہوا تھا۔ اور بیوی نہیں ہو
تو مہر کا ہے کے مانگتی ہو۔ ہم اب تک اِسی دھوکے میں رہے کہ جس
سے ہمارا نکاح ہوا تھا وہ عورت ہے۔ آج تمہاری زبانی سنتے ہیں کہ وہ
چڑیل ہے۔

بیوی:۔ مہر۔ مہر تو تم سے ایسے رکھوا لوں گی۔ جیسے آج کا دن
نہیں بھولے گا۔ تم کو جیل کے بھاٹک میں، چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹھے پڑ
جائیں گے، میاں ہوکس ہوا ہیں، بڑے علّامہ ظریف بنے پھرتے
ہو، سب علاّنگی وِلاّنگی بھول جاؤ گے۔

ہم:۔ یہ پنجاب ہے پنجاب بیگم! اتحاد پارٹی کی حکومت ہو رہی
ہے۔ قرضہ نہ دے سکنا یہاں جرم نہیں، نہ مقروض کو لال بھاٹک دیکھنے
اور چکّی پیسنے کا خطرہ، ہم اپنی علاّنگی بھولیں یا نہ بھولیں، کسی طرح تم
ہمیں بھول جاؤ۔

بیوی:۔ میں تو مقدمہ دلّی میں کروں گی، پنجاب سے مجھے کیا
واسطہ، وہاں تو اتحادی حکومت نہیں۔

ہم:۔ کسی پڑھے لکھے کے سامنے یہ مت کہہ بیٹھنا، تمہیں یہ
بھی خبر نہیں؟ کہ دلّی پنجاب میں داخل ہے، وہاں کی عدالتیں پنجاب
ہائی کورٹ کے ماتحت ہیں۔

بیوی:۔ خدا نہ کرے، دلّی پنجاب میں داخل ہو۔ وہاں شاہ جارج
پنجم کی حکومت ہے، دلّی پرانی راجدھانی ہے، میں اِن چکموں میں نہیں
آؤں گی۔

ہم:۔ یک نہ شُد دو، شاہ جارج پنجم کو فوت ہوئے مدّت
ہو گئی، اُن کے بعد یکے بعد دیگرے دو بادشاہ گدی پر بیٹھ چکے
ہیں۔ جارج پنجم کی حکومت تو شاید اب دوسری دنیا میں قائم ہوئی ہو گی
بس پھر وہیں مقدمہ دائر کر دینا، مگر اس کے لئے تمہیں یہ چولا بدلنا پڑیگا۔
کیونکہ اُن کی حکومت کی سرحد قبر سے آگے شروع ہوتی ہے۔

بیوی:۔ مرنے سے پہلے زندگی میں کنوئیں جھکواؤں گی۔
پھر مروں گی، اور حشر میں میرا ہاتھ ہو گا اور تمہارا گریبان، جب تک جہنم
رسید نہ کرا دوں گی۔ دم نہ لوں گی۔

ہم:۔ کنوئیں تو جتنے کہو ہم جھانکنے کو تیار ہیں۔ باقی حشر میں گریبان
گیری کی دھمکی بھی بیکار ہے، ہم وہاں کوئی قمیص پہن کر تھوڑا ہی جائینگے
نہ گریبان ہو گا۔ نہ تمہارے ہاتھ کو زحمت کرنی پڑے گی۔

بیوی:۔ قیامت میں میرے مہر نہ دے سکو گے تو تمہاری
ساری نیکیاں گن گن کر رکھوا لوں گی۔

ہم:۔ اطمینان رکھو، یہ مطالبہ بھی تمہارا بیکار ہی جائے گا۔

تمہاری دعا سے ہم نے اپنی یاد میں کوئی نیکی ہی نہیں کی، ہاں اگر یہ ہمارے گناہ لے کر تمہارا مہر اُتر جائے تو یہ جنس ہمارے پاس انبار وں ہے گنتے گنتے تھک جاؤ گی اور پھر بھی گناہ ختم ہونے میں نہ آئیں گے۔

بیوی:۔ مجھے کیا چولہے میں ڈالتے ہیں تمہارے گناہ تمہیں کو اللہ روزی نصیب کرے۔ نیکی سے کورے نکلے تو اپنے سارے گناہ تمہارے منہ پر ماروں گی ہیب کے حقے کی بھی سزا بھگتنی پڑے گی۔ دوزخ سے کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

ہم:۔ اور تم کہاں جاؤ گی؟

بیوی:۔ کہاں جاتی۔ جنت میں جاؤں گی۔

ہم:۔ جنت میں ہمارے بغیر کیسے رہو گی۔ تمہارا دل اکیلے پن سے نہیں گھبرائے گا؟

بیوی:۔ اکیلی کیوں رہنے لگی تھی۔ ہر جنتی کو خدمت کے لئے ستر حوریں ملیں گی۔ میں بھی حوروں کے جمگھٹ میں رہا کروں گی" ہمارے بغیر" کیا خوب! ہو نہ ہیب کے بڑے چہیتے کہ تمہارے بغیر جنت میں جی گھبرائے گا؟

ہم:۔ بھلا حوریں تمہارے کس مصرف میں آئیں گی۔ اپنی جنس کے ساتھ چار دن بھی نہ کاٹ سکو گی۔ دیکھ لینا پھر ہمیں کو یاد کرو گی۔ ہم اچھے ہیں یا بُرے۔ آخر تمہارے دولھا ہیں۔ ہمارے بغیر تو جنت میں گھڑی بھر بھی تمہیں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔

بیوی:۔ حوریں میری خدمت کریں گی۔ اپنی جنس کے ساتھ رہنے سہنے سے کوئی کیوں اکتانے لگا۔

"کند ہم جنس با ہم جنس پرواز"

کیوں نہیں، تمہارے بغیر ضرور جنت میں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔ تمہارے ساتھ رہ کر دنیا میں بڑا مزہ اُٹھایا ہے جو جنت میں اُٹھاؤں گی۔ میری دنیا کو تو جہنم بنا دیا۔ تمہیں ساتھ رکھ کر کیا اپنی عقبیٰ بھی خراب کرو نگی۔ تمہارا ساتھ تو جنت کو بھی جہنم بنا دے گا۔ تو بہ میں جنت میں تمہارے ساتھ رہوں۔

ہم:۔ اچھا پھر ہم تو دوزخ میں کسی شریف سی دوزخن سے دو بول پڑھا لیں گے۔ تم کیا کرو گی۔ وہاں تو نیلی تہمد اور لمبی داڑھی والے مسجدوں کے اماموں سے واسطہ پڑے گا۔ اور سنتے ہیں کہ جنتی خواتین کا نکاح جنتی مردوں سے ہو جائے گا۔ یقیناً تم بھی ضرور کسی ملا مولوی کے حوالے کر دی جاؤ گی۔ بلکہ ہمیں تو محلے کی مسجد کے امام سے خطرہ ہے، یہ کمبخت کہیں وہاں تم پر حق شفعہ نہ جتانے لگے۔

بیوی:۔ اُس سے کسی اپنی قلماقنی کا نکاح پڑھوا دینا۔ تمہارے خاندان میں درجنوں ملانیاں بھری پڑی ہیں۔ مراتی ملا نے اپنی ذات برادری کو چھوڑ کر مجھ پر حق شفعہ کیوں جتانے لگے۔ میری طرف تو کسی نے آنکھ بھر کر بھی دیکھا تو آنکھیں نکلوا دوں گی۔

ہم:۔ عورت مرد دونوں سے مل کر زندگی کی تکمیل ہوا کرتی ہے تم نے مرد کے بغیر نیم زندگی گزاری تو جنت سے تو تمہاری دنیا ہی بہتر رہی۔ نہیں بیوی! بھلا کوئی بات ہے۔ جنت میں "کنوار کوٹلہ" تو تمہارے لئے بننے سے رہا۔ یہی ہوگا کہ شادی کی لاٹری میں کوئی مردہ شو ملا تمہارے نام بھی نکل آئے گا۔ آخر مُلّے جب دنیا میں دو دو تین تین ملانیوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تو جنت میں تو تم جانو ملّوں کو سوراج مل جائے گا۔ اپنے راج پاٹ میں یہ یک و تنہا تو رہ نہیں سکتے۔ وہاں مُنہ چھٹ کھانے کو ملے گا۔ رنگ برنگے مرغن کھانے کھا کھا کر ملا نے کوئی رنگ لائے بغیر تھوڑا ہی رہیں گے۔ ہر ملے کے ہاں جنت میں آٹھویں دن ولیمے کی دیگ چڑھی نظر آئیگی۔

بیوی:۔ ہاں ہاں کہہ تو دیا۔ تمہاری برادری کی ملانیاں جنت میں ملّوں کے گھر بسائیں گی۔ وہی کہاوت "جیسی رُوح ویسے فرشتے" خبردار جو تم نے میرا نام ملّوں مراتیوں کے ساتھ پھر لیا۔ وہ وہ سناؤنگی کہ دھلی نہ چھٹیں گی۔ تمہارے نام کی غیرت بھی دنیا سے ناپید ہو گئی۔ کون سا ایسا مردوا ہوگا جو اپنی جُرواکے نکاح غیر مردوں سے کراتا پھرے "یا بے شرمی تیرا ہی آسرا ہے۔"

ہم:۔ جب دنیا ہی میں ہماری بیوی بننے سے انکاری ہو، جب کہ ہمارے تمہارے نکاح کا قاضی حواس خمسہ کے ساتھ زندہ ہے۔ نکاح کے گواہ اور برات کے براتی پچانوے فی صدی جی رہے ہیں۔ تو قیامت میں جہاں نفسی نفسی پڑی ہوگی۔ وہاں تم سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ ہمیں اپنا شوہر تسلیم کرو گی۔ پھر جب ہم تمہارے شوہر تمہارے قول کے مطابق دنیا میں نہ دین میں۔ تو ہمارے لئے تم دنیا کی کروڑوں عورتوں کی طرح صرف ایک عورت ہو جس سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ تو اب تمہیں بتاؤ کسی ملا مولوی سے تمہارے نکاح کا ذکر ہمارے لئے بے غیرتی کیوں بن گیا۔ اس کے علاوہ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی تم ہماری بیوی جبھی تک ہو جب تک ہمارا تمہارا ساتھ ہے۔ وہ بھی اسی صورت میں کہ دونوں کی زندگی میں کوئی

حادثہ خلع واقع نہ ہو۔ مختصر یہ کہ زیادہ سے زیادہ قبر کے حدود تک ہم تم میاں بیوی ہیں۔ اس کے بعد تم کون اور میں کون۔ دوسری دنیا میں دونوں جنتی بن گئے تو فریقین کی رضامندی پر پھر تجدید نکاح ہو سکتی ہے۔ ورنہ اپنی اپنی راہ اور اپنی اپنی منزل۔ ایک بات تو طے شدہ ہے کہ جنت ہو یا دوزخ۔ کنواروں اور رنڈوں کے لئے وہاں گنجائش نہیں۔ تمام مجرد حکماً مرکب بنائے جائیں گے۔ پھر جب ہم سے تم بیزار ہو اور دوسری دنیا میں اس تجربے کو دوہرانا پسند نہیں کرتیں تو ظاہر ہے کہ وہاں کسی جنتی کی قسمت ضرور پھوٹے گی۔ اور ہمیں بھی دوزخ میں سہرا باندھنا ہی پڑے گا۔ اور یہ بھی تم جانتی ہو۔ کہ زیادہ نمازیں پڑھنے والے جنت میں جائیں گے۔ مسجدوں کے موذن، امام، میاں جی، مولوی ملانے یہی کلاس بس جنت کی مالک بنے گی۔ کوئی اونچے خاندان کا عیش پرست پٹھان یا مغل تو وہاں جانے سے رہا۔ ہماری مسجد کا اندھا امام آٹھ پہر وضو بے وضو نمازیں ٹرخاتا رہتا ہے۔ ٹوٹتی رات جب ذکر جہری کرنے لگتا ہے تو شہر بھر کے ڈربا نشینوں میں اذان کا کمپٹیشن شروع ہو جاتا ہے۔ وہی وقت میٹھی نیند کا ہوتا ہے مگر بلند بانگ حریفوں کی ککڑوں کوں، کیا مجال جو کسی کو نیند کی اجازت دے۔ تو حافظ جیونا کی یہ بہشت پھری ہو حق ضرور اسے ستر حوروں کا آقا اور چار ملانیوں کا میاں بنا کے چھوڑے گی۔ کیا عجب ہے کہ تمہاری جمعرات کی دودھ کی کھیریں اسے یاد آ جائیں اور "ہل جزاء الاحسان الا الاحسان" کے قرآنی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حق نمک اور حق شفعہ کا دعویٰ کر بیٹھے۔ اس میں برا ماننے کی کونسی بات ہے۔ جنت میں جا کر تو اس کے دونوں پٹ کھل جائیں گے۔ چیچک کے داغ رہیں گے نہ آبنوسی رنگ۔ چودھویں رات کے چاند کو شرمانے لگے گا۔ تمہیں انکار کرنے کی گنجائش کب رہے گی۔

بیوی: تمہارے کہنے کی بہت سی نمازی بوڑھیاں بھی تو جنت میں جائیں گی۔ دنیا میں اپنے مُلنٹوں کی آٹھ پہری مار دھاڑ سے وہ مجھ سے زیادہ اپنے مُلّوں کی صورت سے بیزار گئی ہیں۔ اُن کے مُلّے تو تمہارے ساتھ جہنم رسید ہو جائیں گے۔ اُن کا رنڈاپا انہیں نیلی تہمد اور لمبی داڑھی والوں کی مہربانی سے سہاگ میں تبدیل ہوگا۔ یقیناً جنت میں مسجد کے اماموں، تکیے کے مجاوروں اور مکتب کے میاں جیوں کی تقدیر انہیں سے پھوٹے گی۔ یہ لوگ اُن کا حق نمک بھی ادا کریں گے اور حق شفعہ بھی اُن پر جتائیں گے۔ مراثی مُلّانے میرے کیا لگتے ہیں۔ وہ جنت میں جا کر آفتاب بن کر چمکیں یا مہتاب کی صورت دمکیں۔ تمہارے وہ چاند تارے تمہاری مرحومہ بوڑھیوں کی اندھیری تنہائیوں کو روشن کریں گے۔ مجھ سے ملنٹوں کا کیا واسطہ؟

بس اب چلیا کہ بند کرو یوں ہی میرے منہ سے کوئی اچھی بُری نکل جائے گی۔

ہم: ملنٹوں سے اتنی نفرت تھی تو ہمارے خاندان میں زحمت جلوہ کیوں گوارا کر لی۔ کسی ورڈھ منڈے زنانہ صورت بابو کا گھر بسایا ہوتا۔ ملا برادری نہ ہوتی تو تمہیں قبولتا کون؟ دعا دو ہمیں اور ہماری برادری کو آج ان پڑھ ہونے کے باوجود ایک عالم کی بیوی بنی بیٹھی ہو۔ ورنہ دانتوں کی طرح جونڈا بھی سپید ہو جاتا اور کنوار کوٹھلے سے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔ تم جانو جوانی اندھی بھی ہوتی ہے اور دیوانی بھی۔ اونچی اونچی دیواریں کُدوا دیتی ہے۔ ہم تم سے شادی کرنے کا ایثار نہ کرتے تو آج جانے کہاں کہاں تم کھل کھاتی ہیر بنی بھٹکتی پھرتی ہوتیں۔ وہ تو کہو تمہاری قسمت سے خدا نے اپنی بے کس مخلوق کے لئے ہمارے دل میں جذبۂ رحم اسقدر کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ کہ بقول داغ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کسی کے دُکھ درد کو ہم دیکھ ہی نہیں سکتے۔ تمہاری بے لبی اور بیکسی کا حال ہمیں کلو بوا سے جیسے ہی معلوم ہوا ہم تڑپ اُٹھے اور سب امیر گھرانوں کی منتظر امیدوں کو خاک میں ملا کر تمہارے متعلق سفارش منظور کر لی۔

بیوی: بس کچھ نہیں کہتی۔ اس ہاتھ بھر کی لم دراز جلیبا سے خدا ہی سمجھے۔ مٹی جھوٹ کے طوفان اُٹھائے چلی جاتی ہے ذرا نہیں جھجکتی۔ خدا کرے کالا دانہ نکلے۔ جھوٹ بول بول کے چہرے کا نور سب کا سب اُڑ چکا ہے، آئینے میں ذرا منہ دیکھو۔ کیسی پھٹکار برستی ہے۔

اس تُو تُو میں میں نے بڑھتے بڑھتے تُرشی سے تلخی اختیار کی۔ آوازوں کی موسیقی گرج میں تبدیل ہونے لگی۔ زبانوں کو کمک پہنچانے کے لئے ہاتھوں میں قوت ارادی نے جوش مارا اور قریب تھا کہ انسانی تہذیب رجعت قہقری کر کے اپنے آغاز پر پہنچ جائے کہ حریف ہوشمند

نے دست بدست تبادلۂ خیالات میں اپنے آپ کو کمزور پاکر اچانک پینترا بدلا۔ اور اپنا آخری وار کر دیا۔ یعنی رونا شروع کر دیا۔ آپ اگر بیوی والے ہیں۔ تو جانتے ہوں گے کہ بیوی جب اپنی غیر منطقی جنگ میں عاجز ہونے لگتی ہے۔ تو میدان جیتنے کے لئے آخری بار ایک فیصلہ کن کاری ضرب لگاتی ہے۔ اس کا بے پناہ ہتھیار اس کا آنسو ہے عورت کے آنسو سے تیز تر کوئی ہتھیار کبھی کسی میدانِ جنگ میں نہیں لایا گیا۔

ہمارے پاس اس وار کو روکنے کے لئے کوئی ڈھال نہ تھی۔ پہلے تو جی میں آیا کہ ہم بھی رونا شروع کر دیں۔ مگر عزتِ صنفی نے اجازت نہ دی۔ دفتر کی حاضری کی آڑ پکڑ کر پس پا ہو گئے۔

سارے دن دوستوں میں گھوم پھر کر شام کو گھر میں گھسے تو ہمارے کشمیری نوکر نے جو اردو کو صحیح بولنا کشمیری زبان کی ہتک سمجھتا ہے گھر میں قدم رکھتے ہی یہ دردناک خوشخبری سنائی:۔

"میاں تو کہاں گئی تھی۔ ہم تجھے ساری واڑی کھوجتا رہا بیگم صاحب آج بوت روتا رہا۔ کانا بھی نہیں کایا۔"

اس خبر نے ہمیں اپنے مرکز سے ہلا دیا۔ "آیت الکرسی" پڑھتے ہوئے بیگم کے پاس پہنچے، وہ بظاہر سو رہی تھیں، مگر درحقیقت انہوں نے سونے میں جان ڈال رکھی تھی۔ ہم نے کہا۔ بیگم بیگم، یہ کیا وقت ہے سونے کا؟ سوئے چلی جاؤ گی؟۔

ہماری آواز سے وہ کسمسا کر اُٹھیں۔

بیوی:۔ کیا ہے۔ کیوں مجھے تنگ کیا جا رہا ہے۔

ہم:۔ تم نے کھانا کھا لیا؟۔

بیوی:۔ تم کون پوچھنے والے؟

ہم:۔ ہم کون، تمہارے پیارے شوہر۔

بیوی:۔ صورت گم کر و اپنی، مجھ سے کلام مت کرو۔ کیوں رے فضلو! دلی کو گاڑی کس وقت جاتی ہے؟۔

ہم:۔ کیوں خیر تو ہے۔ کہاں کا ارادہ ہے؟

بیوی:۔ جہاں سینگ سمائیں گے، وہاں جائیں گے۔

ہم:۔ سینگ تو یہاں بھی سما سکتے ہیں اور نہ سما سکیں تو تھوڑے تھوڑے تراشوا لو۔

بیوی:۔ جاؤ یہاں سے اپنا منہ کالا کرو! مجھے مت چھیڑو!

ہم:۔ ہمارا منہ تمہاری دعا سے پہلے ہی کالا ہے۔ گورے منہ! اسے پسند کریں تو اپنا منہ کالا، یا نیلا کر سکتے ہیں۔

بیوی:۔ تم مجھے جینے کر چھوڑو گے یا نہیں؟

ہم:۔ ہم نے تمہیں باندھ کب رکھا ہے جو جینے یا مرنے کے لئے تمہیں چھوڑیں۔

بیوی:۔ تمہاری یہی حرکتیں رہیں تو میرے لئے جینا دوبھر ہو جائے گا۔ یہ ہر وقت کی چھیڑ خانی مجھے گور کے کنارے لگا کے رہے گی۔

ہم:۔ تم مرنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئیں۔ تمہارے بدلے تمہاری تین جوان بہنیں مر چکیں۔ تمہیں بھی مرنا ہوتا تو جوان ہی مر جاتیں۔ اب کیا مرو گی۔ مرنے کا وقت تو گزر چکا ہے۔

بیوی:۔ تم میرا مرنا چاہ رہے ہو؟

ہم:۔ شاید اسی لئے تم مرنے کا نام نہیں لیتیں۔ ہماری ضد میں جینے کی زحمت اٹھا رہی ہو۔

بیوی:۔ میں تو سمجھے ہوئے ہوں۔ خوب جان چکی ہوں۔ تم مجھے گور کے گڑھے تک پہنچا کے رہو گے۔ جب تمہارا کلیجا ٹھنڈا ہوگا، اچھا پھر یوں ہی سہی۔ مر کے بھی دکھائے دیتی ہوں۔ تم نے میری زندگی اجیرن بنا رکھی ہے۔ اس پر بھی تمہیں صبر نہیں تو لو یہ کھٹکا بھی مٹائے دیتی ہوں۔ ع

تم یہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا"

ہم:۔ ارے تم تو شاعری کا ذوق بھی رکھتی ہو۔ واہ بیوی! اب بتایا ہے، جب مرنے کا ارادہ کر رہی ہو۔ وہ ایک گھنٹے میں مرحومہ بن جاؤ گی۔ پہلے سے معلوم ہوتا تو وہ غزل کے شاعری کیا کرتے۔ ایک ایک گیارہ بنتے ہیں۔ دونوں کی مشترکہ شاعری کا بلب دنیائے شاعری کو جگمگا سکتا تھا۔

بیوی:۔ تم اب آخری وقت مجھ سے کسی کا خون کراؤ گے۔ خدا کے لئے مجھے چین سے مرنے دو۔ اپنی کہیں صورت گم کرو۔ اس بان کو لقوہ مارے۔ مٹی چلے ہی جاتی ہے۔

ہم:۔ اچھا لو جاتے ہیں۔ اپنی صورت گم کئے لیتے ہیں۔

بیوی:۔ کہیں باہر نہ چلے جانا، مجھے آخری بات کرنی ہے۔

ہم:۔ کہو تو یہیں بیٹھے رہیں۔

بیوی:۔ خدا کے واسطے صورت گم کر و اپنی۔ میں آپ بلا لوں گی۔

ہم: کسی پہلو راضی نہیں، عجب ضیق میں جان ہے۔

یہ کہہ کر ہم باہر بیٹھک میں جا بیٹھے۔ جانے کو چلے تو گئے مگر ہمارے دل و دماغ پر جو گزر رہی تھی وہ ہمیں جانتے ہیں۔ بیوی کی قوتِ ارادی کا ہمیں بارہا تجربہ ہو چکا تھا، وہ بات کی پکّی، حوصلے کی بلند اور ضد کی پوری ہیں۔ ان کی عادات و صفات پر جتنا غور کرتے تھے، دماغ چکّر کھانے لگتا تھا، دل کلاک کے پنڈولم کی طرح ہل رہا تھا، اپنے مرکزِ ثقل سے ہم دُور جا پڑے تھے، بار بار سوچتے تھے، اب کیا ہوگا؟ بیوی سے ہمیں محبت بھی ہے۔ یہ محبت اس وقت طوفانی صورت اختیار کر رہی تھی۔ اِدھر سُسرال والوں کے قانونی پروٹسٹ، تماشا پسند پبلک کی ہنگامہ آرائی، خدائی فوجدار پولیس کی جبری آستاں گیری، بلیک میلر اخبارات کی جلی سرخیاں، یہ خطرات بھیانک مستقبل کے بھیس میں ہمیں لرزا رہے تھے، گھر میں بدقسمتی سے کوئی بڑی بوڑھی بھی نہ تھی، جو دونو کو بزرگانہ انداز میں ڈانٹ ڈپٹ کر صلح کرا سکتی۔

انہیں خیالات میں غلطاں پیچاں تھے کہ اندر سے ملازم نے آکر کہا۔

”میاں بیگم صاب بلاتا ہے، تو جلدی چلے گی۔“

ملازم کا یہ فقرہ کانوں پر گھَن کی طرح بجا اور ہم سورۂ اخلاص پڑھتے ہوئے گھر میں پہنچے، بیوی لباسِ فاخرہ پہنے، نوک پنجے سے لیس ہماری منتظر تھیں۔ جیسے کمرے میں گھُسے۔ اُنہوں نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ یہ وہ کٹھن گھڑی تھی کہ ہمارے دل کی غیر معمولی حرکت میں آواز پیدا ہو رہی تھی، کواڑ بند کرنے سے ہمیں ایک شُبہ اور ایک خطرہ اور پیدا ہو گیا، شُبہ تو یہ گزرا کہ کہیں اپنے ساتھ ہمیں بھی تو لاش میں تبدیل کرنا نہیں چاہتیں۔ دل کے وسوسے یقین بن کر ڈرانے لگے۔ ہمیں خواہ مخواہ محسوس ہونے لگا، کہ اُن کے پاس وہ لامبا خنجر نما چاقو ہے۔ جو پچھلے سال ہم وزیر آباد سے خرید کر لائے تھے۔ اب کوئی دم جاتا ہے کہ یہ اپنی جگہ سے جست کر کے وہ سموچا خنجر ہمارے سینے میں اُتار دیں گی اور اُسی سے اپنی مشکل بھی آسان کر لیں گی۔ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے کہ نامراد خنجر خریدنے کی بیہودگی کیوں کی تھی۔ ہائے کیا اِسی لئے اس خوبصورت موت پر دو روپے صرف کئے تھے کہ سب سے پہلے خریدار ہی پر اس کا وار ہوگا۔

خطرہ یہ پیدا ہوا کہ اگر بیوی نے رحم کھا کر ہماری جان بخشی کہ بھی دی۔ تو اس کی خودکشی کی تحقیقات کے سلسلے میں یہ بدبخت نوکر پولیس کے ہتھے چڑھ کر عدالت میں پولیس کی بولی بولنے لگے گا۔ اور عینی شاہد کی پوزیشن میں اپنی غلط سلط اردو سے ہماری نظمِ ہستی کو نثر بنوا کے چھوڑے گا۔ نقاشِ خیال نے فوراً ہمارے دماغ میں سیشن جج کی عدالت تعمیر کر دی جس میں سیہ پوش وکیلوں کی دردناک چہل پہل، تماشائیوں کی آرجار، لال پگڑیوں کی بھرمار، ملزم بیڑی ہتکڑی سے آراستہ، پولیس کے رپورٹروں کا ہجوم، سیشن جج کے چہرے پر موت کا سا جلال، سرکاری وکیل کے خوفناک دلائل۔ اپنے وکیل کی بے بسی۔ نوکر کی عینی شہادت کہ

”ہاں حضور بیگم صاب سے میاں ہر دہاڑی لڑتی تھی، اُسے بیوی کو ہر روز سوٹی کے نال مارتی تھی۔ بیوی ہر دیلے روتا تا۔ میاں گالی بھی نکالتی تھی اور لڑائی کے دہاڑے میاں کہتی تھی۔ میں تمہاری جان نکالوں گے۔ ہم سے کئی ویلے میاں بولی۔ ہم تجھے امام دیگی تو بیوی کے کانے میں زہر ملا دے گی۔ ہم انکار کیا۔ میاں خفا ہو گئی۔ بولی تجھے نکالوں گے ہم کہا بھادیں ہم نوکری چھوٹ جائے۔ ام بیوی کو زہر نہیں کھلائے گی۔ ایک دہاڑے ہم دیکھا میاں بیوی کی دوا میں وہی پوڑی جیب سے نکال کے ڈال دیا جو تسا ہمیں کھلانے کو دینے لگی تھی۔ بیوی دوا پیا اُس کا طبیعت خراب ہو گیا بولا ہمارے پیٹ میں آگ اے۔ ہم میاں کے خوف سے چُپ رہی۔ بیوی بےہوش ہو گیا اور مر گیا۔“

موت اپنے جبڑے کھولے ہوئے ہماری نگاہِ تصور پر خیرگی طاری کر رہی تھی۔ سنٹرل جیل۔ پھانسی کی کوٹھڑی طوق و سلاسل پھانسی کی ریشمی رسّی۔ مجسٹریٹ کی نگرانی میں پولیس گارد کی ”چلو پڑھو خدا کو یاد کرو“ ریشمی جھولے میں جان کنی کے ہچکولے۔ زمین و آسمان کے درمیان اپنی معلق لاش اِس ڈرامے کا یہ دردناک پس منظر اُس وقت پیش منظر بن رہا تھا۔

دل پر یہ کچھ بیت رہی تھی مگر خدا کی مہربانی کہ جرأت مردانہ اپنی نمائش میں ثابت قدم اور چہرے کا رنگ بحال تھا۔ زبان و دماغ کا ساتھ دئے جا رہی تھی۔ دماغ دل کی سراسیمگی سے مطلق متاثر نہ تھا۔ دل و دماغ کی اسی کشمکش کے دوران میں بیگم صاحبہ یوں فرمانے لگیں۔

بیوی:۔ جانتے ہو میں نے تمہیں اِس وقت کیوں بلایا ہے؟

ہم:۔ ہاں جانتے کیوں نہیں؟ پچھلے ہفتے تم ”چھوٹے میاں“ کی

رسم عقیقہ کی تقریب کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ اسی سلسلے میں انتظام سے متعلق کوئی مشورہ کرنا چاہتی ہوگی۔ ہمیں تم سے زیادہ فکر ہے ۔۔۔۔

۱۲ من دہرہ دون کی باسمتی کے چاولوں کا آرڈر دے دیا گیا ہے ۔

ایک من خالص گھی کی فراہمی نتھو خاں ضلعدار کے ذمے لگا دی ہے

شیرمالوں کے لئے دودھ وقت کے وقت حاجی حلوائی کے ہاں سے منگا لیا جائے گا۔

بکروں کی قیمت علیا بکر قصاب کو دیدی گئی ہے۔ دعوتی خطوط کے چھپوانے کا کام منشی اعجاز احمد نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ کریم بخش نائی ہمارا خاندانی نائی ہے۔ چھیدو نائی پڑوسی ہے تو کیا کریم بخش ہمارے باپ کی حجامت بناتا رہا۔ بچپن میں ہمارا سر مونڈتا تھا۔ اب دوسرے تیسرے دن خط بنا جاتا ہے۔ تمہیں تو یاد نہ ہوگا۔ ہمارے سامنے کی بات ہے جب تم بچی ہی تھیں۔ تمہارا سر بھی وہی مونڈا کرتا تھا۔ ایک دفعہ تمہارے گنج کی پھڑیا میں غلطی سے اُسترا لگ گیا تھا۔ تو تمہارے اباؔ نے اُسے بہت ڈانٹا تھا۔ بلکہ عقیقے میں ایک جیکٹ بھی رسید کر دیا تھا۔ وہ تو کہتا ہے اور سچ کہتا ہوگا۔ سچا آدمی ہے۔ کہتا تھا کہ میں نے تو بیگم صاحبہ یعنی آپ کی ساس کا بھی بچپن میں سر مونڈا ہے۔ سو بیوی ہم کریم بخش کی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بڑا مسخرہ ہے۔ بوڑھا ہوگیا مگر کمبخت نے مسخرہ پن نہیں چھوڑا۔ کہتا تھا میاں چھوٹی بیگم کی طرح ان کی والدہ صاحبہ کے سر میں بھی گنج کے داغ تھے اور اللہ بخشے میری ساس سنایا کرتی تھی کہ حضور کی علیا ساس "گنجی زہرہ" کے نام سے مشہور تھیں۔ حضور آپ کی سسرال میں کئی پیڑیوں سے گنج خاندانی نشان کی طرح چلا آتا ہے۔

بیوی:۔ صبح کی چائے میں باورچی نے بھنگ کے پتے تو نہیں ڈال دئے تھے؟ خیریت تو ہے۔ یہ دیوانہ پن دماغ پہ کیوں سوار ہے؟ کس کا عقیقہ؟ بھاڑ میں جاؤ تم اور "چھوٹے میاں" کو تو کیا کہوں۔ تمہیں اس وقت عقیقے کی سوجھ رہی ہے؟ اور اس مراقی کریم نیٹے کا دماغ تو نہیں چل گیا؟ اتنی جوتیاں لگواؤں گی کہ کھیلی سا سر پلپلا ہوجائے گا۔ تم گنجے ہوگے یا یہ موا دو دمڑی کا کمین۔ مجھ سے اور میرے خاندان سے ستر پہرے دور۔ نوج کوئی ہمارے ہاں گنجا ہوا ہو۔ ہاں تمہارے خاندان میں گنجے، کُتڑے، لُولے لنگڑے کوڑھی کلنکی سب قسم کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

عقیقہ مرے مرے پیچھے تم کرتے رہنا۔ مجھ نصیبوں جلی کو چھوٹے میاں کی یہ بہار دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔ میں نے تمہیں اس وقت اس لئے بلایا ہے کہ میں جینے سے تنگ آچکی ہوں۔ تمہارے آئے دن کے ظلم وستم سہتے سہتے میرا کلیجہ چھلنی ہوگیا۔ اب میں یہ سُنا تم نے؟

ہم:۔ ہاں سُنا .... ہم نے۔ اب تم حج کو جانا چاہتی ہو۔ بڑا مبارک خیال ہے۔ ہمیں بھی ساتھ لے چلنا۔ حاجی حجن کی جوڑی خوب رہے گی۔ ہماری زندگی باقی رہی تو خیریت سے دونوں واپس آجائیں گے اور اگر خدا نے ہمارے آئے دن کی دعاؤں کو پذیرا کر لیا تو تمہیں "جنت البقیع" کے سپرد کر کے ہم اکیلے ہی واپس چلے آئیں گے۔

بیوی: میری بات نہیں سنو گے؟ شرارتیں کئے ہی جاؤ گے آخر میرے ستانے میں تمہیں کیا مزہ آتا ہے؟

ارے میں یہ کہہ رہی ہوں کہ میرا ارادہ خودکشی کرنے کا ہے۔

ہم:۔ کیا کہا خودکشی؟

بیوی: ہاں ہاں خودکشی۔ بہرے بھنڈ! خودکشی۔ اب بھی سنا کہ نہیں؟

ہم:۔ زندگی بھر میں سب سے زیادہ کام کی بات تمہارے منہ سے آج سُنی ہے۔ ہمارے بھی کان کھل گئے۔ خودکشی۔ یعنی اپنی جان پر کھیل جانا کتنا پاکیزہ خیال ہے!! خدا راس لائے۔ آمین۔

واقعی یہ دنیا رہنے کے قابل بھی نہیں۔ خدا رسیدہ لوگ اس نمائشی جلوے سے منہ پھیرتے ہی دیکھے گئے۔ مہاتما بدھ نے فانی دنیا کا عبرتناک انجام دیکھ کر اپنا راج پاٹ چھوڑ کر نروان حاصل کر لیا تھا۔ مہاتما بدھ کا نروان کا نظریہ بالکل درست ہے۔ انسان کی دائمی نجات نروان کے بغیر ناممکن ہے۔ نروان کا سب سے سیدھا اور مختصر راستہ خودکشی ہے۔ بات بڑے ٹھکانے کی کہی ہے تم نے۔ ماشاءاللہ۔ تمہاری ذہانت کی قسم کھانی چاہیئے! مہاتما بدھ برسوں غور وفکر کے بعد جس روشن فیصلے پر پہنچے تم نے بہ یک نظر اس منزل کو دیکھ لیا۔ بڑی پہنچی ہوئی بزرگ ہو۔ سچ کہا ہے کسی نے

"سو سیانے ایک مت"

بالغ نظر لوگوں کے خیالات کی ہم رنگی کیسی حیرت خیز ہوتی ہے۔

بیوی:۔ میں تم سے اس وقت مہاتما بدھ کے نروان پر کوئی سرمن نہیں سننا چاہتی۔ اس دخل در معقولات کو ختم کرو اور بات

میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ ہاں تو سن لیا تم نے؟ میں خودکشی کا ارادہ کر چکی ہوں۔

ہم:۔ ضرور کرو! ہماری مخلصانہ امداد ہر وقت حاضر ہے۔

بیوی:۔ ہاں بس اب خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ہم:۔ کوئی چارہ ہو بھی کیا سکتا ہے؟ ہم اس سلسلے میں تمہاری کیا امداد کر سکتے ہیں؟

بیوی:۔ مجھے آپ کی امداد و مداد کی ضرورت نہیں۔ آپ ہی کے کارن یہ خون کی رینی کھیلنے پر مجبور ہوئی ہوں۔

ہم:۔ اجی ہم کس لائق ہیں۔ فانی دنیا کے بے عقل بیچاری ہمارے متعلق یہ سب کچھ حسن ظن ہے" ورنہ ہم کیا ہماری ہستی کیا؟"

بیوی:۔ یہ "تو تو" بند نہیں ہوگی؟

ہم:۔ خودکشی کے ساتھ ہی بند ہو جائے گی۔ تم نے اردو کے یہ محاورے تو سنے ہوں گے۔ فلاں آدمی کی "زبان بند ہو گئی" یعنی چل چلاؤ ہے۔ خصوصاً عورت ذات کی زندگی کا مرکز تو اس کی زبان ہی ہوتی ہے۔ کسی عورت کی موت پر یقین ہی اس وقت کرنا چاہیئے۔ جب اس کی زبان بند ہو جائے۔

بیوی:۔ عورتوں کی زبان کا رونا خوب رویا جاتا ہے۔ مردوں کی زبان کو کس دن لقوے نے مارا تھا؟ چپو گے نہیں تم؟

ہم:۔ ہم بول کب رہے ہیں؟ اور بول ہی کیا سکتے ہیں؟ ہمیں بولنے کی مجال ہی کب ملی ہے؟ ۱۸ سال کی ازدواجی زندگی میں ہمیں بولنا ہی نصیب کب ہوا؟ ہمارے حصے کا بولنا بھی مہروں کی طرح تمہارے حصے میں آ گیا تھا۔

بیوی:۔ خیر یہ فیصلہ تو قیامت میں ہوگا۔ یہاں تم چاہے جتنی باتیں بنا لو۔ بہرحال میں نے اب جان پر کھیلنے کی ٹھان لی ہے۔

ہم:۔ یہ کھیل ہے تو بڑا دلچسپ، ہمت شرط ہے۔ بقول شخصے۔ "ہمت مرداں مدد خدا"

تم ضرور خودکشی کرو۔ تمہاری یہ نیکی ہمارے گناہوں کا بھی کفارہ بن جائے گی۔ ہاں خوب یاد آیا۔ پنجاب کے چند مخلص اور خاموش کار رہنماؤں نے ملک کی بے تحاشا بڑھتی ہوئی ....

...... آبادی اور موجودہ بیکاری و بدحالی کے پیش نظر انجمن خودکشانِ پنجاب کے نام سے ایک سبھا بنا رکھی ہے۔ مہاتما گاندھی اس کے سرپرست ہیں اور خان عبدالغفار خاں صدر۔ ہمیں سب نے اصرار کر کے سیکرٹری بنا دیا ہے۔

اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ صوبے کی بے ضرورت آبادی کو لائف کنٹرول کے اصول کا پابند بنایا جائے۔ رضاکارانہ خودکشی کا پرچار ہو اور جو لوگ زندگی کی کشمکش سے اکتا گئے ہوں ان کو ممبر بنا کر خودکشی کے متعلق سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ سردست ذرائع خودکشی حسب ذیل تجویز کئے گئے ہیں۔

ریل کی پٹڑی پر شب خوابی، راوی میں بھاری پتھر باندھ کر غوطہ خوری، شاہی مسجد کے مینار غربی سے مشق پرواز۔ ریوالور سے سرگوشی، اور اخیر نمبر ہے "پڑیا" کا۔

کپڑوں پر پٹرول چھڑک کر روشنی پھیلانے کے ہم خلاف ہیں۔ بس تم بھی اس کی ممبر بن جاؤ۔ پانچ روپے ممبری کی فیس ہے۔ "نیک صلاح کا پوچھنا کیا" آج ممبری کے فارم پر دستخط کر دو۔ انجمن کی انتظامیہ کمیٹی کا آج شام کو جلسہ ہے۔ نئے ممبروں کے فارم اس میٹنگ میں پاس ہوں گے۔ تمہارا فارم بھی اس میں پیش کرا دیا جائے گا۔ اور چونکہ تمہیں زندگی دوبھر ہو رہی ہے۔ ذرائع خودکشی میں جس صورت کو پسند کرو گی اس کے متعلق فوری سہولتیں ہم پہنچا دی جائیں گی۔ تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا اور انجمن کے جلسے میں ہمارے لئے شکریئے کی قرارداد پیش ہو جائے گی۔

ہمارے خیال میں ریل کی پٹڑی پر شب گزاری زیادہ مناسب رہے گی۔ بادامی باغ کے اسٹیشن سے ایک میل ادھر رات کو سناٹا ہوتا ہے۔ وہاں تمہیں پہنچا دیں گے۔ لائل پور کو جانے والی ۱۲ بجے شب کی آخری گاڑی تمہاری روح کو سیدھی جنت میں لئے چلی جائے گی۔

کل صبح کے اخبارات میں چار کالمی سرخیوں سے تمہاری سنسنی خیز خودکشی کی خبر اور ہمارے نام تمہارا آخری خط جس میں خودکشی کی وجہ تحریر ہوگی شائع ہو جائے گا۔ خط کی عبارت ہم خود بنا لیں گے۔ خط حسب ذیل ہوگا۔

پیارے علامہ!

میرا آخری سلام لو! میں بہت دنوں سے مہاتما بدھ کو خواب میں دیکھ رہی تھی۔ وہ ہر بار مجھے نصیحت فرماتے تھے کہ

غمخانۂ ہستی رہنے کی جگہ نہیں ہے جس طرح

ہو اپنی مادی اور فانی زندگی کو ختم کر کے نروان حاصل کر لو!" اُن کی الہامی نصیحت نے میری تاریک رُوح کو منوّر کر دیا اور میں رضا کارانہ خودکشی کے لئے بیقرار رہنے لگی۔ آج مجھے موقعہ مل گیا کہ مہاتما بدھ کی نصیحت پر عمل کروں۔

مجھے اعتراف ہے کہ آپ ایک شریف ترین اور وفادار شوہر کی حیثیت میں معیاری انسان ہیں۔ آپ کے ساتھ میری زندگی بہشت کی سی زندگی بسر ہوئی۔ کاش یہ زندگی فانی نہ ہوتی۔ میں نروان اسی لئے حاصل کر رہی ہوں تاکہ دوسری دُنیا میں آپ اور میں ایک بلند اور ابدی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ میری اچانک خودکشی کا جو صدمہ آپ کو ہوگا مجھے اُس کا صحیح اندازہ ہے اور صرف یہی جاں گُسل احساس مجھے اب تک نروان حاصل کرنے سے روکتا رہا۔ لیکن میں سوچتی ہوں کہ ایک نہ ایک دن یہ فانی اور ناقابلِ اعتنا زندگی موت کے ہتھیار سے پاش پاش ہو جائے گی اور اس طرح آپ میں مجھ میں جدائی بہرحال نوشتۂ تقدیر بن کر رہے گی۔ اس لئے اس حیات فانی کو حیات ابدی میں تبدیل کرنا محبّت کا ایک مقدس فرض ہے جسے ادا کرنا تکمیل محبت کے لئے ناگزیر ہے۔ آپ کی غمناک تنہائی کو خیال کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر اس یقین کی روشنی میں آپ سے جدا ہو رہی ہوں کہ ہم اور آپ بہشتِ جاوداں میں حیاتِ سرمدی کے مالک بنیں گے۔ سردست آپ غم غلط کرنے کے لئے ایک شادی ضرور کر لیں تاکہ نظام خاندان میں ابتری نہ پیدا ہو۔ اُس خاتون کی خوش نصیبی تمام عالم نسواں کے لئے قابلِ رشک ہو سکتی ہے جو آئندہ آپ کے نکاح میں آئے گی۔ دیکھئے اگر آپ نے میرے سوگ میں شادی نہ کی یا اس سلسلے میں تاخیر کی تو میری رُوح نروان حاصل کر کے بھی بیقرار رہے گی۔ مجھے توقع ہے کہ آپ اپنی پرستار بیوی کی اس آخری وصیت کو فراموش نہ فرمائیں گے۔

مہر کا روپیہ وقتاً فوقتاً جو مجھے آپ سے وصول ہوتا رہا میں نے اپنے بھائی کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ میرے زیورات بھی اُنہیں کی تحویل میں ہیں۔ میری رسم تجہیز و تکفین کے بعد آپ اُن سے تمام روپیہ وصول کر لیں۔ یہ روپیہ بچّوں کی تعلیم و تربیت پر صرف کریں اور اس میں سے ۲۵ ہزار روپیہ اپنی ہونے والی بیوی کو بطور مہر معجل ادا کر دیں۔ لیجئے رخصت۔ خدا آپ کا حافظ و ناصر بنے۔

راقمہ خورشید جہاں بیگم
اہلیہ علامہ ظریف
۳ رجون ۱۹۳۸ء

اس خط کی اشاعت سے جہاں زندگی کے متعلق تمہاری بلند نظری پر دنیا تحسین و آفرین کے پھول برسائے گی۔ وہاں ہمیں کئی فائدے پہنچ جائیں گے۔

اوّل تو یہ کہ تمہاری بزم ماتم لال پگڑی والوں کی منحوس شمولیت سے پاک رہے گی۔ دوسرے یہ کہ تمہارا شورہ پشت بھائی اخبارات میں تمہارا خط پڑھ کر ہمیں قانونی دھمکیاں دینے کی بجائے سیدھا سرحد کے آزاد علاقے کو بھاگ جائے گا اور فرنٹیر میل سے راہِ فرار اختیار کرے گا۔ ہمیں اس خودکشی کی مہم میں تمہارے بھائی کی شورہ پشتی کا پہلو زیادہ فکرمند کر رہا ہے۔ یہ خط شائع ہوا تو وہ لاہور پہونچ کر سیدھا کوتوالی پہنچے گا۔ تم تو رضا کارانہ خودکشی کر رہی ہے وہ اپنی خفیف الحرکاتیوں سے ہمارے جبری نروان کا انتظام کرانے کی جدوجہد میں رات دن ایک کر دے گا۔ اُس کی بیوی کی قانون دانی سے بھی تم واقف ہی ہو وہ عورت نہ ہوتی تو مسٹر جناح کی ٹکر کی وکیل بنتی۔ تم جانتی ہو اپنے سگے بھائیوں کے وارنٹ کئی بار نکلوا چکی ہے۔ تمہاری خودکشی کی سُن گُن اس کے کانوں تک پہنچی تو اپنے سارے مقدمات ملتوی کر کے اپنے بے قانون اور بے دماغ زن مرید کو لے کر جسے وہ پیار میں "مُنیا بندو" کہا کرتی ہے لاہور پہنچے گی اور وہ قانونی طوفان ہمارے خلاف برپا کرے گی کہ سنٹرل جیل کے پھانسی گھر میں تمہارے چہلم سے پہلے ہی پہلے ہمیں جبری نروان کی سعادت دلا کے دم لے گی۔ تمہارا خط ہمیں اس قانونی بھُول بھلیاں کی عدالتی ہنگاموں سے بھی بچالے گا۔

تیسرا بڑا فائدہ یہ پیشِ نظر ہے کہ تمہارے خط میں ہماری شوہرانہ وفاداری کا حال پڑھ کر چاروں طرف سے شادیوں کے پیامیات بارش کی طرح برسنے لگیں گے۔ کہ ہمارے لئے انتخاب کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم تمہارے چہلم اور اپنے ولیمے کی رسمیں ایک ساتھ ہی انجام دینے کے قابل ہو جائیں گے۔

بیوی:۔ ان دو رسموں کے ساتھ تمہاری تجہیز و تکفین کی رسم بھی شامل ہو جائے تو "یہ یک کرشمہ سہ کار" کی مثل صادق آجائے۔ میرا جی جلائے جاؤ گے؟ باز نہیں آؤ گے؟ کیا پاکیزہ خط تجویز کیا ہے۔

کیا کہنے تمہارے۔ تم سے مجھے مہر وصول ہوتے رہے اور میں اپنے بھائی کے سپرد کرتی رہی اور زیورات بھی اُنہی کی تحویل میں ہیں۔" اے سبحان اللہ۔ مہر ادا کرنے والوں کی صورت تو دیکھو دھڑا دھڑ نور برس رہا ہے اور زیورات؟ زیورات اِس اجڑے گھر میں مجھے کس دن پہننے نصیب ہوئے تھے۔ جوڑے پر مانگے تانگے کے چند زیور چڑھائے تھے جو چوتھی کے دن اُتروا لئے گئے تھے۔ تم "وفادار شوہر" نے میکے کا تمام زیور ایک ایک کر کے جب تک بیچ نہ ڈالا چین نہ آیا۔ میرے بھائی کا صبر مفت سمیٹا جا رہا ہے۔ اپنا کاروبار چھوڑ کر چار سال تک چند روپلی پر تمہاری خدمت کرتا رہا۔ اس کا یہ اجر نہ دو گے تو اور کیا دو گے؟ شاباش تمہیں! آخر عالمِ دین ہو نا؟ اسلام اور مسلمانوں کی کشتی کے ناخدا۔ تمہیں جیسے علمائے دین نے امت کی کشتی ڈبوئی ہے۔ خدا کا ڈر نہ قیامت کی پکڑ دھکڑ کا خوف۔ اچھے عالم دین ہیں۔ تم سے تو یہودی اور مجوسی کہیں اچھے ہیں۔

انجمن خودکشاں پنجاب تمہیں مبارک۔ تم اسی کے طریقوں پر اپنی اور اپنی آباؤں کی رسم خودکشی ادا کرنا۔ مجھے اپنے طریقے پر مرجانے دو! لو دیکھو!

یہ پسا ہوا کانچ ہے۔ میں اسے پھانک کر زندگی ختم کرنا چاہتی ہوں" پڑیا دیکھ کر ہماری رُوح کپکپا کرنے لگی۔ یہ اِنجھر وہ ہماری بھاوج سے تازہ تازہ سیکھ کر آئی تھیں۔ ہماری بھاوج نے جب بھائی صاحب کو کانچ کی پڑیا دکھائی تھی۔ تو انہوں نے فوراً اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ دئے تھے۔ حالت ہماری بھی دگرگوں ہوگئی۔ اور قریب تھا کہ ہم بھی بھائی صاحب کی پیروی کرتے ہوئے اس میدان سے پسپا ہو جائیں۔ مگر خدا نے ہماری بڑی مدد کی۔ اور اس وقت ہمیں الہام سا ہوا۔ کہ اِس وقت ہار مان گئے۔ تو یاد رکھنا بڑے کھٹے کھاؤ گے۔ آٹھویں دن پڑیا کا تماشا ہوا کرے گا۔ تمام شوہرانہ اختیارات سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اور اس ابتدا کی انتہا تمہیں اُس شہزادے کا ہم قسمت بنا دے گی۔ جو شرطِ شادی کی ادائیگی کے طور پر ہر صبح بیوی کے ہاتھ سے ناشتے کی بجائے سو جوتیاں کھایا کرتا تھا۔ اِس لئے عافیت چاہتے ہو۔ تو گربہ کشتن روزِ اوّل کے اصول پر کاربند رہ کر میدان میں ڈٹے رہو۔ یہ خیال آتے ہی ایک منٹ کی چوتھائی میں ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو ہم ہار نہیں مانیں گے۔ یہ دل میں ٹھان کر ہم نے کہا بیوی ذرا ٹھہرو! اور دوڑ کر صراحی سے ایک گلاس پانی بھر لائے۔ بیوی کی طرف بڑھا کر کہا۔ لو بسم اللہ کر کے سفوفِ مشکل کشا پھانک کر اوپر سے پانی کا یہ گلاس ڈگڈگا کر پی جاؤ۔ تاکہ گلے میں اُچھو نہ لگے اور پڑیا اپنے جلوے دکھانے میں دیر نہ کرے۔ بیوی کے استادِ ازل یعنی ہماری بھابی جان نے یہ ہتکنڈہ سکھاتے ہوئے غالباً یہ ہدایت کر دی تھی کہ اس کرتب کو دھمکی کی حدود سے آگے نہ بڑھنے دینا۔ یا پھر یہ بات ہے کہ جان بڑی پیاری ہے اور جان پر کھیل جانا سب سے مشکل کھیل ہے۔ جو کچھ بھی ہو۔ ہوا یہ کہ خلافِ توقع پڑیا انہوں نے ہمارے منہ پر مار گلاس دیوار پر پٹخا اور چمک کر کہتی کیا ہیں "تمہیں جو مر جاؤ"۔ اس اعترافِ شکست نے ہمارے خون میں مسرت کی لہر دوڑا دی۔ قریب تھا کہ سرورِ فتحمندی میں ہم رقص کرنے لگیں۔ رُوح پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور نپولین کے فاتحانہ انداز میں بولے بس۔ بس تریا کی تمام شد ذرا سی پڑیا بھی نہ پھانکی گئی۔ ہم نہ کہتے تھے کہ پنگوڑا ہلانے والا ہاتھ صرف پنگوڑا ہی ہلا سکتا ہے۔ نہ ہوئے ہم تمہاری جگہ۔۔۔ ایک کی بجائے چار پڑیاں پھانک کر دکھا دیتے۔ اب تو مانو گی کہ مرد خدا کا خلیفہ ہے۔ بیوی کا حاکم ہے۔ اشرف المخلوقات کہلانے کا حقدار ہے۔

بیوی:۔ مرے مرتے کے ساتھ راہ چلتے کے ساتھ مرنا بے وقوفی ہے۔ تمہارا کیا ہے۔ میں مر جاؤں گی کوئی اور مسٹنڈی بٹھاؤ گے مفت میں اپنی جان گنوا بیٹھوں۔ کس نے کہا ہے۔ تمہارے نزدیک میری زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ میرے باپ بھائی سے تو پوچھو... اس وقت انہیں کے خیال نے میرا خیال پلٹایا ہے۔ بوڑھے باپ کو تین جوان بیٹیوں کی موت نے پہلے ہی ادھ موا کر دیا ہے۔ میری موت کا غم اُسے مار ہی ڈالتا۔ اِدھر ماں جایا بھائی کسر پیٹ لیتا۔ تمہارا کیا جاتا میرے ساتھ آج ڈامیکہ بھی مٹ جاتا۔ تم مر جاؤ تو تمہارے میکے میں

تم جیسے پلٹنیوں بھرے پڑے ہیں - تمہاری کمی کسی کو محسوس بھی نہیں ہوگی یہ کہہ کر وہ اٹھیں اور دوسرے کمرے میں جاکر انہوں نے کواڑ بند کر لئے۔ ہمیں شبہ ہے کہ انہیں بھوک نے بہت ستا رکھا تھا ۔ اُس کمرے میں دودھ کی کھیر بھری دیگچی رکھی تھی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سارا غصّہ غریب کھیر پر اُتارا - یہ شبہ ظن سے اور ظن پھر یقین سے اس لئے ترقی کرگیا - کہ ہمارے شام کے کھانے پر سب کچھ تھا مگر مرحوم کھیر نہ تھی - انجام کار وہ دو تین دن روٹھی رہیں - ندامت شکست کا اثر تو مہینوں باقی رہا - گفتگو بھی کچھ مدت بند رہی - ہم سے کچھ کہنا ہوتا تو دیوار کو انٹر پریٹر بناکر ہماری طرف سے منہ پھیر کر کہتیں - ہم بھی دیوار ہی ہی کو بات کا جواب دیدیا کرتے - جب اِس اِن ڈائرکٹ بات چیت سے تنگ آگئیں - تو ڈائرکٹ گفتگو کا افتتاح کرتے ہوئے آخر ایک دن بولیں - بات کرنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر کیا کروں بہشتی زیور میں رسول اللہ کی حدیث پڑھی ہے کہ کسی مسلمان بھائی کو دوسرے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ گفتگو بند کرنی جائز نہیں - خدا کا خوف اور رسول اللہ کا ڈر نہ ہوتا تو تم سے زندگی بھر نہ بولتی -

ہم نے کہا - تم نے ہم سے ناحق بات چیت شروع کی - رسول اللہ نے دو مسلمان بھائیوں کا لفظ استعمال کیا ہے - میاں بیوی بھائی بھائی تو نہیں ہوا کرتے - تم اگر بول چال یونہیں بند کئے رکھو تو ہمیں مطلق تکلیف نہ ہوگی اور نہ رسول اللہ ناراض ہوں گے - آخر بیر زبان چلانے ہی کا یہ نتیجہ ہے - تمہاری جیتی جان جاتی اور خیر ہمارا تو کیا بگڑتا - اور بگڑنے کی بات بھی سچی ہے - تمہارے چالیسویں تک گھر سونا پڑا رہتا - بچوں کو تم اور ہمیں تمہاری نیکیاں یاد آآ کر الگ تکلیف پہنچاتیں - خودکشی کی حرام موت تمہیں جہنم رسید کرکے تمہاری عاقبت بھی خراب کرتی - یہ مانا کہ کچھ دن تعزیت کے مہمانوں سے چہل پہل ضرور ہو جاتی - پھر تمہاری قائم مقام کے خیر مقدم کی تیاریوں میں ہمارا جی بہل جاتا - مگر تم تو سو فیصدی نقصان میں رہتیں - اِس لئے مصلحت اسی میں ہے کہ ہم دونوں گونگے کا گڑ کھالیں - بس دیوار ہی کے ذریعے گفتگو ہوا کرے - احتیاط اِسی میں ہے -

بیوی :- میری موجودگی میں کوئی قائم مقام گھر میں قدم رکھ کے دیکھے غلیانی کی گُدّیں کاٹ کر رکھ دوں - کیسی مصلحت کس کی بیوی - ہم ضرور بولیں گے - تمہیں بولنا پڑے گا -

ہم :- اچھا چلو تمہاری خاطر ہم یہ ایثار بھی گوارا کرلیں گے -

صلح کی گفتگو جاری تھی کہ گھڑی کا الارم زور سے بجا - ہم ہڑبڑا کے لاحول پڑھتے ہوئے نیند سے چونکے ہوکر اُٹھ بیٹھے - اتنے میں بیگم کی محبت بھری آواز کان میں آئی - اجی آج کب تک سوئے چلے جاؤ گے؟ نوکر دیر سے چائے لئے کھڑا ہے - اٹھو بھی کلی کرکے ناشتہ کرلو - چائے ٹھنڈی ہوئی جاتی ہے -

مرزا غالب نے غالباً ہمارے ہی لئے کہا تھا کہ ؎

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

"علامہ ظریف"

جوشِ شباب

جو خلش گاہ گاہ تھی پیارے — وہ مری اِک نگاہ تھی پیارے
لاکھ میں تم کو انتخاب کیا — اپنی اپنی نگاہ تھی پیارے
انبساط وصال کچھ بھی نہیں — ہجر سے رسم و راہ تھی پیارے
تم کو شاید وہ یاد ہو عالم — ہم سے تم سے بھی راہ تھی پیارے
نادم جور جس نے تم کو کیا — بھولی بھٹکی سی آہ تھی پیارے
کر بھی دینا تھا ترک ذوقِ ستم — در حقیقت گناہ تھی پیارے
مسکراتی سی اِک تمہاری نظر — حاصل صد گناہ تھی پیارے
تجھ سے ملنے کی کاوشِ بیکس کو — اِک خلش گاہ گاہ تھی پیارے

غریب شہزادہ

سُنا ہے میں نے اِک طالب سے عبرتناک افسانہ		کہ جس نے آنسوؤں سے بھر دیا آنکھوں کا پیمانہ
کہ دہلی میں سلاطینِ مغل کی اِک نشانی تھی		سراپا وقفِ استبداد اُس کی زندگانی تھی
قلی گیری کبھی جاکر وہ اسٹیشن پہ کرتا تھا		کبھی پانی گھروں میں اہلِ سرمایہ کے بھرتا تھا
کبھی رنگین مزاجوں کو سُنا دیتا تھا افسانے		پکاتا تھا رئیسوں کے لئے جاکر کبھی کھانے
کبھی فاقے گذر جاتے تھے دو دو اس کے بچوں پر		مگر صبر و سکوں سے کام لیتا تھا حیا پرور
شرافت روکتی تھی مانگنے سے بھیک در در کی		نجابت دیکھتی تھی چال چرخِ سفلہ پرور کی
جو عید آتی تو اس کے گھر میں بچھتی تھی صفِ ماتم		بلکنا رُوٹھنا وہ ناسمجھ اطفال کا پیہم!
زمانے بھر میں شادی اور وہ محرومِ عشرت تھا		سلاطینِ مغل کا لختِ دل وقفِ مصیبت تھا
غرض ان آفتوں میں زندگانی کٹ گئی ساری		زمانہ ہر طرح کرتا رہا اُن کی دل آزاری
اِسی عالم میں رخصت ہو گیا گلزار ہستی سے		ہزاروں حسرتیں لیکر گیا دنیا کی بستی سے
فنا ہو کر بھی حالت قابلِ عبرت رہی اُس کی		کہ بے گور و کفن دو روز تک میت رہی اُس کی
وہ عالم بیکسی کا اور وہ بیوہ کی مجبوری		یتیمی اِک طرف بچوں کی اور اِک سمت معذوری

کفن کے واسطے پیسے کہاں سے لاتی بیچاری کہاں سے دفن کا سامان کرسکتی تھی دُکھیاری

نہ ساماں تھا، نہ بستر تھا، نہ کوئی چارپائی تھی ہُوئے تھے تین دن بچوں نے روٹی بھی نہ کھائی تھی

پڑا تھا شاہزادے کا جنازہ اِک چٹائی پر عروسِ دہر لعنت ہے تری اس بیوفائی پر!

وہ نوحہ لاش پر معصوم بیکس نونہالوں کا! کلیجہ شق ہُوا جاتا تھا جس سے سننے والوں کا!

نتیجے غفلتوں کے قوم کو قدرت دکھاتی تھی! اُداسی خیمہ زن تھی بیکسی آنسو بہاتی تھی!

اُٹھی چندے سے آخر کار میّت ابنِ سلطاں کی
لرز اُٹھی زمیں بھی خطۂ گورِ غریباں کی

یہ میّت اُسکی تھی جو گُل تھا اِک بُستانِ شاہی کا کہ عالمگیر ثانی کا حقیقی وہ پڑوتا تھا!

وہ عالمگیر ثانی تھا جو بھارت راج کا مالک وہ عالمگیر ثانی تھا جو تخت و تاج کا مالک

غنی جس کی بدولت ہو گئے محتاج دنیا کے جو تھے اس کے مصاحب آج ہیں سرتاج دنیا کے

مگر اولاد اس کی اس طرح پامال ہوتی ہے
ہماری قوم لیکن نشۂ غفلت میں سوتی ہے

طالب فارسی

تصحیح

ناک زکام

یوپی میں رام پور اور بریلی میں عام طور پر اور پنجاب میں ایک مشہور افسانہ نگار ناک کو مذکر استعمال کرتے ہیں۔ ایک افسانے کی سُرخی ہے۔ "مڑا ہوا ناک"

حالانکہ یہ لفظ (ناک) ہندوستان میں مرکزی عمومیت کے ساتھ مونث استعمال ہوتا ہے۔

اسی طرح یوپی کے ایک مشہور ادیب زکام کو ذکام لکھتے ہیں۔ اُن کی متعدد تحریروں میں جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئیں۔ زکام کا لفظ "دال معجمہ سے لکھا دیکھا گیا ہے۔

مزید برآں یہ کہ روہیلکھنڈ کی خواندہ خواتین بھی "میرا زکام ہو رہا ہے" بولتی ہیں۔ یہ استعمال بھی غلط ہے۔ زکام میں زائے معجمہ (ز) ہے ذال معجمہ (ذ) نہیں۔ "مجھے زکام ہے یا زکام ہو رہا ہے۔" بولنا چاہیئے۔ میرا زکام ہو رہا ہے۔ غلط ہے۔

خلاصۂ تصحیح

مڑی ہوئی ناک ، ناک کٹ گئی ، زکام ، مجھے زکام ہو رہا ہے۔

تاجور

بدگمانی

اصغر اور سلیمہ کے لئے لکھنؤ نئی جگہ نہ تھی - گھر کا کام دھندا تھا۔ کبھی کبھی سلیمہ کے سکول اور کالج کی سہیلیاں اور استانیاں ہی آجاتی تھیں اس کا وقت خوب گزرتا تھا - اصغر کے لئے کالج، کلب اور مطالعہ تھا - پھر سلیمہ کی گھریلو زندگی ایک نغمہ تھی - ان کا گھر ایک چمنستان تھا جس میں ہر طرف محبت کے پھول تھے جس کی فضا میں محبت ہی محبت مہک رہی تھی -

سال سوا سال ہوا تھا کہ اصغر کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا - سلیمہ کو وہ درجہ نصیب ہوا - جو ہر عورت کی عزیز ترین آرزو ہے - یعنی اصغر کی خدمت اور گھر کی دیکھ بھال کے علاوہ ننھے حمید کی پرورش بھی سلیمہ کے فرائض میں شامل ہوگئی - اب سلیمہ کے مشاغل میں ایک نیا لطف پیدا ہوگیا تھا - سلیمہ ایک خوبصورت اور سلیقہ شعار بیوی تھی - اور اب تو وہ ایک بچے کی ماں بھی بن چکی تھی اصغر کے لئے اولاد کا تجربہ نیا اور دلچسپ تھا - اسے بخوبی معلوم تھا کہ عورت کا کیا درجہ ہے - جب وہ دیکھتا کہ سلیمہ محبت بھری نگاہوں سے حمید کو دیکھ رہی ہے - اس کا دل باغ باغ ہوجاتا - اصغر کی نگاہ میں عورت کی وقعت اور ایک بچے والی ماں کا وقار بہت زیادہ ہوگیا - سلیمہ سے باتیں کرنا، حمید کو پیار کرنا - گھر کے معاملات میں دلچسپی لینا اس کا بہترین شغل تھا . . . . . کالج کے مشاغل اور روزانہ مطالعہ کی کثرت کے باعث اُسے فرصت کم ملتی تھی - تاہم اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ اس کا جو کچھ وقت گزرتا - وہ جنت کی گھڑیاں تھیں - سلیمہ کی توجہ کے دو دعویدار ہوگئے تھے - مگر کبھی کبھی ماتا کا غلبہ اصغر کو منتظر چھوڑ دیتا تھا لیکن اصغر فطرت مادری کے مطالبات کو خوب سمجھتا تھا - مسکرا کر سلیمہ سے ہمدردی کرنے لگتا - اگر کبھی عدم توجہ کا شکوہ ہوتا تو سلیمہ کا جواب کہ جان دونوں میں پڑی رہتی ہے - اصغر کا سارا گلہ کافور کر دیتا - اصغر اور سلیمہ کی زندگی جنت کا نمونہ تھی - ننھا حمید بیٹھنے لگا - گھٹنوں چلتے چلتے پاؤں بھی چلنے لگا -

سلیمہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی - مگر گھر کی مالکہ اور حمید کی ماں ہونے کے لحاظ سے بہت کامیاب رہی - اگرچہ گھر میں ماما اور "آیا" بھی تھیں - مگر سلیمہ کے انتظام کی یہ کیفیت تھی - کہ گھر میں ہر چیز اپنی مناسب جگہ پر نظر آتی تھی - اور ہر کام اپنے وقت پر انجام پاتا تھا - سلیمہ نے کبھی کوئی کام نوکروں کے سہارے نہ چھوڑا - باورچی خانہ کے کام میں بھی سلیمہ کا سلیقہ قابلِ تعریف تھا - وہ باورچی کی محتاج نہ تھی - کھانا پکانے کے معاملے میں وہ بڑی سلیقہ شعار اور دوسروں کے لئے نمونہ تھی - ایسے موقعوں پر اصغر کی حاضری - چائے - کھانا اور لباس اوقات دوست واحباب کی دعوتوں کا اہتمام یوں انجام پاجاتا - کہ اصغر کو معلوم بھی نہ ہوتا تھا - کہ گھر میں باورچی ~~ہے~~ نہیں - اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود سلیمہ کی ایسی سلیقہ شعاری غیر معمولی بات تھی - اصغر قدامت پسند نہ تھا - وہ عورت کے متعلق پردے کو ضروری نہ سمجھتا تھا - قدیم خیالات کے بارے میں اس کی یہی رائے تھی کہ سورج زمین کے گرد چکر نہیں لگاتا - بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے - چنانچہ اصغر اور سلیمہ بے تکلف گھر سے باہر نکلتے تھے - کالج کی اکثر تقریبوں میں سلیمہ کی شرکت ایک پُرلطف اخلاقی اضافہ تھا - یہ معمول سا ہوگیا تھا - کہ اصغر اور سلیمہ حمید کو پرامبولیٹر میں بٹھا کر شام کو کالج گراؤنڈ میں چلے آتے - ماں باپ تو ٹینس اور بیڈمنگٹن میں لگ جاتے اور حمید میاں کالج کے لڑکوں کی گودیوں میں اڑے اڑے پھرتے - گراؤنڈ میں حمید کالج کے طلبا کے لئے ایک نئی چیز تھا - کالج کے لڑکے شرارت اور شوخی میں مشہور ہیں لیکن کبھی سلیمہ ان میں پہنچ جاتی - تو لڑکوں میں متانت اور سنجیدگی کی ایک رَو دوڑ جاتی بلکہ بعض شرمیلے چہروں پر تو حجاب کی سرخیاں جھلک اٹھتیں - "مسز" اصغر ہونے کے علاوہ سلیمہ کی ذاتی شخصیت ایسی تھی کہ کالج کے تمام لڑکے احترام کرتے تھے - بلکہ بعض آزاد رَو لڑکوں نے سبق حاصل کیا کہ جس مجلس میں عورتیں اور لڑکیاں ہوں وہاں کیسے آدابِ مجلس کی ضرورت ہے اور مجلس میں عورت کی موجودگی مردوں کے لئے کیا کیا فرائض عاید کرتی ہے -

وقت گزر رہا تھا - بڑی لطف سے زندگی بسر ہورہی تھی - اس عرصہ میں ثریا پیدا ہوئیں - حمید کے لئے ایک ساتھی اللہ میاں نے

بھیجدیا - خدا کے فضل سے گھر میں پہلے ہی رونق تھی - اب دوبالا ہو گئی - اصغر کے دوستوں نے مبارکبادیں دیں - اصغر اور سلیمہ کی خوشی کی انتہا نہ تھی - سلیمہ کے مادری مشاغل میں چاندسی ثریا بھی شامل ہو گئی -

لکھنؤ کی برسات بڑی پُر لطف ہوتی ہے - ہر طرف سبزہ لہکتا نظر آتا ہے - گلی کوچہ، چھت منڈیر، جدھر دیکھو سبزہ زار بن جاتا ہے - باہر جاؤ تو اُودی اُودی گھٹائیں اُمڈی ہوئی دکھائی دیں گی - بلا کا پُر کیف منظر ہوتا ہے - ایسا محسوس ہونے لگتا ہے - کہ آسمان سبز پوش زمین سے ہم آغوش ہونے کی تمنا میں جھکا آرہا ہے - انہی ایام میں ایک نئے پروفیسر مسٹر رفیق کالج میں مامور ہوئے تھے - اصغر کے ہاں ان کی دعوت تھی - مسٹر رفیق اصغر کے ہم جماعت اور اپنے ہم عصروں میں قابل و کامیاب طلبا میں سے تھے - دونوں ایک ہی سال میں تعلیم سے فارغ ہوئے - اصغر فیض آباد چلے آئے تھے اور رفیق مزید مطالعہ کے لئے ولایت روانہ ہو گئے - رفیق نے اپنے ولایت کے قیام میں تعلیم ہی میں نمایاں شہرت حاصل نہیں کی - بلکہ "سپورٹس" میں بھی اچھے اچھے کھلاڑیوں کے ہم پلہ رہے - انگریزی ادب اور علم تاریخ میں خاص ملکہ اور عربی و فارسی ادب سے وسیع واقفیت تھی - ولایت سے واپسی پر جب مصر سے گزر ہوا - تو ایک سال کے لئے وہیں ٹھہر گئے - اور عربی زبان اور اسلامیات میں قابل رشک استعداد حاصل کی - رفیق چار بہنوں میں ایک بھائی تھا - بھائی بہنوں میں بہت محبت تھی - جب ولایت سے واپس ہندوستان آیا - سب بہنیں اپنے اپنے گھر رخصت ہو چکی تھیں - ملازمت کا سلسلہ ہوا - تو پٹنہ چھوڑ لکھنؤ میں قیام کی صورت ہو گئی - اور اپنے عزیزوں سے اور بھی دور آپڑے - طالب علمی کے ایام میں رفیق اور اصغر کے تعلقات رسمی نہیں بلکہ برادرانہ تھے - چنانچہ رفیق کی آمد اصغر کے لئے ایک مژدۂ جانفزا تھی - سلیمہ کا رفیق سے تعارف ہو چکا تھا - اس کے بعد دو ایک بار کالج کی پارٹیوں میں ملاقات کا اتفاق ہوا - پھر اصغر کے ہاں بھی رفیق چائے میں شریک ہوئے تھے - حمید کی سالگرہ تھی - اس تقریب پر مسٹر رفیق بھی خاص مہمان کی حیثیت سے مدعو تھے -

شام تھی - سلیمہ دعوت کے انتظام میں لگی تھی - اصغر اور رفیق کالج سے اکٹھے آئے - بارش ہو رہی تھی - انہوں نے برساتی کوٹ اتارے بوٹ صاف کئے - ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے - رفیق کی طبیعت میں تکلف نہ تھا - اور پھر اصغر ایسے دیرینہ دوست کے گھر میں تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی - حمید آئے - رفیق اس کے ساتھ کھیلنے لگے - پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں - اتنے میں سلیمہ آئیں - مسٹر رفیق سے ملاقات ہوئی - حمید کی سالگرہ کے لئے مبارکباد دی - برسات کی کثرت کا شکوہ کیا -

سلیمہ:- تشریف لائیے - کھانا تیار ہے -

اصغر:- ہمیں کیا عذر ہے -

مسٹر رفیق:- تو آپ کھانے کے اہتمام میں مصروف تھیں - ہمیں معلوم نہ تھا - ورنہ ہم آپ کا ہاتھ بٹاتے -

سلیمہ:- تو آپ کو بھی کھانا پکانے کا شوق ہے - ہمارے اصغر صاحب تو کبھی باورچی خانہ کے پاس نہیں پھٹکتے -

رفیق:- کیوں نہیں - ہمیں ہماری باجی اور آپاؤں کو چھٹیوں میں اور کام ہی کیا تھا - گڑیوں کے بیاہوں کا زمانہ گیا - تو پکنک اور پارٹیوں کے دن آگئے تھے - لیکن یہ تو پرانی باتیں ہیں اور وہ بیچاری اپنے گھروں کو چلی گئیں - مگر نہیں - مجھے اب تک ترکیبیں یاد ہیں - ہم ضرور کسی روز آپ کو کھانا پکا کر کھلائیں گے -

سلیمہ:- ضرور - میں بھی اپنی سہیلیوں کو مدعو کر لوں گی -

اصغر:- لیجئے - پہلے اپنا نمونہ تو دکھائیے - بارش تو بڑھتی ہی جاتی ہے - مغربی انداز پر برابر کے کمرہ میں میز پر کھانا چنا تھا - انگریزی ہندوستانی مختلف قسم کے کھانے تھے - سب مل کر کھانے میں شریک ہوئے - حمید میاں بھی سلیمہ کے برابر موجود تھے - ننھی ثریا اپنی ماں کے بستر میں سو رہی تھی - اس وقت گفتگو کا کا کوئی خاص موضوع نہ تھا - کھانے کے متعلق مصر میں مغربی رنگ کا ذکر آیا - رفیق یورپین تہذیب سے متاثر تو تھے - مگر بالکل یورپین نہ تھے - اصغر کو مغربی تہذیب کے دیرپا ہونے میں کلام تھا - لیکن سلیمہ نے کہہ ہی دیا -

سلیمہ:- مغربی تہذیب خواہ کتنی ہی دلپذیر ہو - مشرق مشرق ہی ہیگا -

رفیق:- لیکن مصر تو بالکل یورپ بن رہا ہے -

اصغر:- ذرائع نقل و حمل کی ترقی اور اختلاط کا نتیجہ ہے کہ دنیا ایک رنگ ہو رہی ہے - مصر تو بہت قریب ہے - جاپان کو دیکھئے -

سلیمہ:- یہ تو کوئی بات نہیں - عرب کا قرب اور مشرقی شعار مصر کو یورپ سے ہمیشہ جدا رکھیں گے -

اصغر:- خیر اس وقت بارش سے زمین و آسمان ایک ہو رہے ہیں۔

رفیق:- فرمائیے۔ یہ تو بات ہے۔

نوکرانی نے کھانا بڑھایا۔ اِدھر اُدھر کی اور باتیں ہونے لگیں۔

رفیق کی اپنی قیام گاہ تھی۔ مگر آنے جانے۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ کھانے پینے کے اعتبار سے اصغر کا گھر غیر نہ تھا۔ رفیق سے حمید اور ثریا بہت مانوس ہو گئے تھے۔ رفیق ان ننھے ننھے بچوں کو بہت پیار کرتا تھا۔ سلیمہ کے لئے رفیق کے دل میں بہت عزت و وقعت تھی۔ رفیق کے لئے سلیمہ ایک عزیز دوست کی اہلیہ ہی نہ تھی۔ بلکہ اسے سلیمہ سے کچھ اُنس سا ہو گیا تھا۔ اس کی بھی چار بہنیں تھیں۔ وہ اکثر بڑے پیار اور تپاک سے ان کا ذکر کرتا تھا۔ بچپن کے رفیقوں اور ساتھیوں کی یاد آتی ہے۔ اور جہاں کہیں گذشتہ واقعات کا بدل سا بھی ملتا ہے۔ ایک مناسبت کا پیدا ہو جانا فطرت کا تقاضا ہے۔ جہاں تک اصغر کے گھر اور سلیمہ کا تعلق تھا۔ رفیق غیر نہ تھا۔ رفیق بے تکلف تھا۔ وہ ان جذبات و عادات کا اظہار کرتے مضائقہ نہ کرتا تھا۔ بھائی بہنوں کے رشتے کو قابل عزت و احترام بتاتی ہیں۔ سلیمہ کا بھی اپنا کوئی حقیقی بھائی نہ تھا۔ اس کو بھائی اور بھائی کے قابل قدر رشتے کی متاع نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔ مسٹر رفیق کا قرب اس کے لئے اُس ہمصفیری کا ذریعہ ہو گیا تھا۔ جو ایک اچھی لڑکی کے دل میں اپنے بھائی کے لئے محبت بھرے جذبات اور جاں نثاری کی آرزو پیدا کرتی ہے۔ اگر گھر میں یہ حالت تھی تو گھر سے باہر کچھ مختلف نہ تھی۔ اصغر رفیق سلیمہ اور بچے بے تکلف سیر و تفریح کے لئے آتے جاتے تھے۔ اگر اصغر نہ ہوتے تو سلیمہ نے کبھی تکلف نہ کیا۔ بچوں کو ساتھ لیا رفیق کے ہمراہ کالج پہنچ گئیں۔ اور اگر بچے گھر رہے۔ تو رفیق کے ہمراہ کالج یا بازار جانے میں چنداں مضائقہ نہ کیا۔ اس کے علاوہ کھیل تماشا سودا سلف کے معاملہ میں سلیمہ اور رفیق کا ساتھ ایک معمولی بات تھی۔ بیشک سلیمہ بعض ذاتی اور گھر کے معاملات میں اصغر کی نسبت رفیق سے زیادہ بے تکلفی سے مشورہ کر لیتی تھی۔ اگر سچ کہا جائے۔ تو رفیق اور سلیمہ کی طبیعتیں ہموار واقع ہوئی تھیں۔ ان کے بعض شوق و شغل مشترک تھے۔ اصغر اس صورت حال سے واقف تھا۔ اس نے کبھی اس ہم آہنگی کو قابل توجہ نہ جانا۔ اگر کبھی مصروفیت کے باعث فرصت نہ ہوئی۔ تو سلیمہ کو رفیق کے ہمراہ چھوڑ اپنے کام کو چلدیا۔ رفیق کے علاوہ کون تھا جس پر وہ بھروسہ کر سکتا تھا۔ اسے اطمینان تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی عزت و احترام کرتے تھے۔ ان کے درمیان برادرانہ محبت اور دوستانہ اعتماد تھا۔ دن گزر رہے تھے۔ بہت اچھے گزر رہے تھے۔ مگر کالج کی مصروفیت کے باعث اصغر کو کم فرصت ملتی تھی۔ رفیق کی فرصت کا وقت زیادہ تر مطالعہ میں گزرتا تھا۔ تاہم بچوں سے دل بہلانے اور سلیمہ کے ساتھ گفتگو اور سیر تفریح کرنے کے لئے کافی مہلت مل جاتی تھی۔

اکثر ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ اصغر کے واپس آنے سے پہلے ہی رفیق اور سلیمہ بچوں کو لیکر سیر کے لئے چلے جاتے تھے۔ سلیمہ رفیق کی باتوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگی تھی۔ اس کے لئے فرمائشی کھانے تیار کرتی اور داد چاہتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ ان کے مابین کچھ سرگوشیاں اور رازداریاں ہو جاتیں گاہے گاہے کسی شوق کی چیز کے متعلق سلیمہ رفیق کی رائے کو ترجیح دے دیتی۔ اس کا خیال تھا اور ایک حد تک صحیح خیال تھا کہ ایسے چھوٹے چھوٹے معاملوں میں اصغر کوئی گرمجوشی نہ دکھاتے تھے اور غریب سلیمہ کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ یہ اصغر کی طبیعت کا تقاضا تھا۔ مگر رفیق کی طبیعت کچھ اور تھی۔ اس کے مزاج میں قدرے رنگینی تھی۔ وہ ادنیٰ سی ادنیٰ بات میں بھی بات پیدا کر دیتا تھا۔ یہ اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ مگر اصغر ایسی باتوں پر بہت کم دماغ سوزی کرتا تھا۔ یہ اپنی اپنی طبیعت ہے۔ یہی باتیں تھیں کہ سلیمہ اور رفیق آپس میں بہت مانوس ہو گئے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ رفیق اور سلیمہ اصغر سے بغیر پوچھے بعض تقریبوں میں شریک ہو جاتے۔ یہ اصغر کی اعلیٰ ظرفی اور وسعت نظری تھی۔ کہ وہ ایسا کر جاتے تھے۔ رفیق اور سلیمہ میں اس درجہ اخلاص اور بے تکلفی تھی۔ کہ ان دونوں میں کوئی رسمی انداز تخاطب تھا ہی نہیں۔

کچھ مہینے اسی طرح گزرے۔ اصغر نے کبھی خیال نہ کیا کہ اس آزادی کے کیا معنی ہیں۔ ایک دن وہ کالج سے ذرا دیر سے گھر پہنچا۔ رفیق اور سلیمہ باہر گئے ہوئے تھے۔ بچے تو آیا کے ساتھ واپس آ گئے تھے۔ مگر رفیق اور سلیمہ واپس نہ لوٹے تھے۔ یہ صورت دیکھ کر اصغر کو ملال ہوا وہ بہت آزردہ خاطر ہو گیا۔ اس بعد اصغر کالج سے بھی کچھ خوش نہ آیا اسے وہم سا ہوا۔ دل میں شک گزرا۔ پھر کچھ یقین سا ہو گیا۔ یہ پہلی بدگمانی تھی۔ اتنے میں رفیق اور سلیمہ بھی آ گئے۔ اصغر کو پریشان سا دیکھ کر دونوں نے وجہ پوچھی۔ اصغر نے سلیمہ سے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ اچھا ——— آپ آ گئیں ——— میں ذرا تھک گیا ہوں۔

سلیمہ اس طنز کو کچھ بھی نہیں اور تھکن کو معمولی سی بات سمجھ کر بھول بسر گئی۔

یہ ذہنی کشمکش اصغر پر اپنا اثر چھوڑ گئی۔ اس کے بعد اس کا چین اور اطمینانِ قلب کم ہو گیا۔ وہ اپنے گھر میں ایک ناقابلِ برداشت تنہائی محسوس کرنے لگا۔ اس کی زندگی میں اجنبیت سی پیدا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ اُس کے لئے سارا گھر سنسان تھا۔ سلیمہ کی موجودگی میں بھی وہ پہلی سی مسرت و راحت محسوس نہ کرتا تھا۔ بلکہ اسے ایک قسم کی کوفت، بیگانگی اور بیزاری محسوس ہونے لگی۔ اسے پہلے بچوں سے محبت تھی۔ مگر اب وہ انہیں یتیم اور مسکین خیال کرنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا۔ گویا حمید اور ثریا کسی حقِ شفقت سے محروم ہو رہے ہیں اور ان معصوموں کو آغوشِ مادر نے چھوڑ دیا ہے۔ اصغر رفیق کی رفاقت سے بیزار ہی نہ تھا۔ بلکہ اسے ایک ناقابلِ برداشت غاصب، خائن۔ دوست کُش اور احسان فراموش سمجھنے لگا۔ اصغر اپنے آپ کو ایک واجب الرحم مظلوم جانتا تھا۔ آئے دن کی ایسی ذہنی کشمکش اور دل کے غبار نے اس کے دماغ کو دوزخ اور قلب کو ہاویہ بنا دیا تھا۔ اپنے دل کا یہ خوفناک ماجرا اس نے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ کسی کو کیا معلوم کہ اصغر پر کیا گزر رہی تھی اور رفیق اور سلیمہ کے تو فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا۔ اتنے میں رفیق کے گھر سے تار آیا اور وہ فوراً پٹنہ چلا گیا۔ سلیمہ اس کے دفعتہً چلے جانے سے مغموم بھی ہو گئی۔ اصغر کو ظاہراً فرصت کم۔ رفیق غیر حاضر۔ سوائے اس کے کہ سلیمہ حمید اور ثریا سے دل بہلائے اور کوئی تفریح کا شغل نہ تھا۔

چند روز بعد رفیق لکھنؤ پہنچ گیا۔

اصغر کی طبیعت کا کچھ ایسا انداز ہو گیا تھا۔ کہ وہ گھر میں زیادہ وقت گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ کہ رفیق یا سلیمہ دیدہ و دانستہ اصغر کی موجودگی یا شرکت سے پہلو تہی کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں اصغر کی توقیر و بزرگی کا احترام بدستور تھا۔ اصغر اپنے خیالات سے مجبور تھا۔ گھر میں دیر سے پہنچنا اور کچھ نہ کچھ عذر کر دینا اس کا معمول ہو گیا تھا۔ رفیق یا سلیمہ کو کبھی خیال نہ آیا۔ کہ اصغر کا اس کے ساتھ شامل نہ ہونا کسی خاص وجہ سے ہے۔ انہی ایام میں ایک روز کا واقعہ ہے کہ اصغر دیر سے گھر پہنچا۔ رفیق اور سلیمہ سیر کے لئے گئے ہوئے تھے حمید اور ثریا موجود تھے۔ مگر دونوں سو رہے تھے۔ نوکر کام کاج میں لگے تھے۔ اصغر آیا۔ بچوں کو سوتے پایا اور ان کی ماں کو غیر حاضر۔ نوکر نے آکر چائے کے لئے پوچھا۔ مگر اصغر نے مسکرا کر منع کر دیا۔ نوکر چلا گیا۔ اصغر بچوں کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ مضطرب سا تھا۔ انتظار کر رہا تھا۔ مگر سلیمہ واپس نہ آئی تھی۔ وہ پھر بیٹھ گیا۔ اُٹھ کر بچوں کے پاس گیا۔ ان کو دیکھا۔ بغور دیکھا۔ بڑی ہمدردی سے دیکھا۔ پھر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ اتنے میں رفیق اور سلیمہ ہنستے ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ اصغر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں میں غصہ۔ چہرہ بے طور۔ لہجہ میں سختی اور کرختگی۔ ان کے روبرو ہو کر بولا۔

اصغر:۔ رفیق یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے گھر میں قدم نہ رکھنا۔

رفیق:۔ اصغر۔

اصغر:۔ بس جاؤ۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ یہ کہا اور بچوں کے پاس چلا گیا۔

رفیق اور سلیمہ کی یہ کیفیت تھی۔ گویا آسمان ٹوٹ پڑا۔ جہاں تھے۔ وہیں کھڑے رہ گئے۔ کسی کے منہ سے بات نہ نکلی۔ چند لمحے خاموش کھڑے زمین تکتے رہے۔ رفیق لوٹا اور چلا آیا۔

سلیمہ نے وہیں سے بغیر نگاہ اُٹھائے رفیق کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بے بسی کے عالم میں بولی:۔

سلیمہ:۔ بھائی!

رفیق:۔ بہن! اور چلا گیا۔

سلیمہ کی آواز میں درد اور لہجہ میں بیکسی تھی۔ رفیق نے نظر نیچی کئے جواب دیا۔ جواب صرف ایک لفظ تھا۔ کمرہ میں سکوت تھا۔ "بھائی" اور "بہن" کی صدا گونج رہی تھی۔ اس صدا میں ایک بھائی بہن کا احتجاج تھا۔ کاش اصغر یہ احتجاج اپنے کانوں سے سُن سکتا۔

سلیمہ حیران کھڑی تھی۔ کیوں اور کہاں کھڑی تھی۔ رہے یا چلی جائے۔ یہ خواب تھا یا بیداری۔ اسے کچھ تمیز نہ تھی۔ اصغر کے خلاف توقع اور غضبناک رویہ سے سلیمہ کے حواس سلب ہو چکے تھے۔ وہ ایک بےحس چیز ہو گئی۔ اصغر پھر ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہ بڑے طیش میں تھا۔ سلیمہ بدستور سر جھکائے کھڑی تھی۔

اصغر:۔ یہاں کیوں کھڑی ہو۔ تم بھی جاؤ۔

سلیمہ:۔ (سر اٹھا کر) آپ کو کیا ہو گیا۔ میں کہاں جاؤں۔

اصغر:۔ جہاں چاہو۔

سلیمہ:۔ ہم نے کیا کیا ہے۔

اصغر:۔ "ہم"! تم اپنے دل سے پوچھو۔

سلیمہ:۔ میرے دل میں آپ ہیں۔ میرا دل بچوں میں ہے۔

اصغر:۔ تمہارا دل پتھر ہو گیا۔ اب بچے تمہارے نہیں۔

سلیمہ:۔ میں ان کی ماں ہوں۔ آپ کس لئے اتنا ظلم کرتے ہیں۔

اصغر :۔ رفیق .... چلی جاؤ۔

سلیمہ :۔ اصغر۔ میں آپ کی بیوی ہوں۔

سلیمہ کے اس جواب میں احتجاج تھا۔ غیرت نسوانی سے اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ مگر اُس نے صبر کیا۔

سلیمہ نے آخری بار اصغر کو مظلومانہ نگاہوں سے دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔

اصغر نے جوں توں کر کے تنہا بچوں کے ساتھ رات کاٹی۔ صبح ہوئی۔ حمید اور ثریا کا حال بے حال تھا۔ ماں کو یاد کرتے روتے اور بلبلا اُٹھتے تھے۔ بچوں کی طبیعت تھی۔ بہلتے بہلتے بہل گئے۔ جدائی کی شدت کم ہوئی۔ صبر آگیا۔ اڑھائی سال اور سال بھر کی عمریں ہی کیا تھیں۔ جس کسی نے پیار کیا، دلاسا دیا۔ حمید اور ثریا کے لئے وہ ماں ہو گیا۔ لیکن ان کی تنہائی اصغر کے لئے عذاب تھی۔ اصغر کا غصہ تحلیل ہوتا گیا۔ لیکن کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ سلیمہ اس کی زندگی کا حصہ تھی۔ دفعتہً بدگمانی کے حجاب میں چھپ گئی۔ مگر اصغر اپنے یقین پر قائم تھا۔ جو کچھ اس نے دیکھا۔ سوچا۔ اس کے مطابق صحیح کیا۔ البتہ بچوں کی وجہ سے پریشانی تھی۔ بہت شدید پریشانی تھی۔ مگر ہوتے ہوتے یہ بھی مفقود ہو گئی۔ رشتے داروں کا خیال تھا۔ ان کی بھی تسلی کی جا سکتی ہے۔ اصغر کا یکطرفہ بیان سلیمہ کی گنہگاری کے لئے کافی تھا۔ باقی لوگوں کا کیا کہنا۔ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ سو سلیمہ کو سب بھول گئے۔ لیکن چوبیس گھنٹے میں ایک وقت ضرور آتا تھا۔ جب اصغر کو اپنے رویہ اور سلوک پر غور کرنا پڑتا تھا۔ کیا سلیمہ اور رفیق اس سلوک کے مستوجب تھے۔ وقت کے ساتھ یہ سوچ بچار کچھ انتقامی سی شکل اختیار کر رہا تھا۔ جس سے بچنا اصغر کے لئے ناگزیر ہو رہا تھا۔

رفیق جانے کو تو چلا گیا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ایسا کیوں ہوا۔ اسے دیوانہ بنا رہا تھا۔ چلے جانے کے بعد جو کچھ سلیمہ کے ساتھ گزری۔ اس نے نہ دیکھی نہ سُنی۔ اُس نے صرف اصغر اور اپنے متعلق قدرے غور کیا اور فوراً فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ دوسری ہی صبح استعفٰے داخل کر دیا اور وجہ خانگی معاملات بیان کر دی۔

اس اچانک فیصلہ پر لوگوں کو تعجب اور افسوس ہوا۔ ایک ایسے ہونہار نوجوان پروفیسر کا چلے جانا طلبا اور کالج کے لئے نقصان تھا۔ استعفٰے منظور ہو گیا۔ اور لوگوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ رفیق اپنے وطن کو جانے کے لئے تیاری کر رہا تھا۔ تو اسے معلوم ہوا۔ کہ سلیمہ بھی گھر سے چلی گئی ہے اور اس کا پتہ نہیں۔ اسے اس واقعہ کا بہت ملال ہوا۔ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً لکھنؤ سے چلے جانے کا عزم کر لیا تھا۔ اسے ٹھہرنا ہرگز گوارا نہ تھا۔ وہ چلا گیا۔

سلیمہ کدھر چلی گئی۔ کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ اپنے سسرال پہنچی یا اپنے ماں باپ کے گھر۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ وہ لکھنؤ میں نہ تھی۔

اصغر کی خانہ ویرانی کو اڑھائی تین سال گزر چکے تھے۔ اصغر نے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کے لئے بڑی تکلیف اٹھائی۔ حمید اور ثریا نے ہوش تو سنبھالے۔ مگر انّاؤں ماماؤں کی گودیوں میں۔ ان کے چہروں پر وہ شگفتگی نہ تھی جو آغوش مادری کا ثمر ہے۔ جب تک اصغر کالج میں رہتا۔ حمید اور ثریا۔ بہلے رہتے تھے۔ جب باپ آتا تو اسے دوڑ کر لپٹ جاتے۔ لیکن ان میں دن بدن ماں کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ ان کے ننھے ننھے دل بہلانے سے بہلتے نہ تھے۔ وہ کسی نہ کسی وقت اصغر سے ضرور پوچھتے تھے۔ کہ "امی جان کہاں ہیں؟" "امی جان نہیں آئیں؟" "ابا امی جان کو نہیں لائے؟" "ہمیں وہی پیاری امی جان دو۔"

ان معصوموں کا مطالبہ اصغر کے لئے ایک روحانی کشمکش تھی۔ اگر اسے یقین تھا۔ کہ سلیمہ قصور وار تھی۔ تو حمید اور ثریا کا کیا قصور تھا۔ کہ انہیں ماں کی ممتا سے محروم کر دیا جائے۔ اصغر ماں اور باپ دونوں کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ مگر وہ حمید اور ثریا سے شرمسار رہتا۔ جب وہ "امی جان" والا سوال کرتے۔ اصغر ان سے آنکھیں نہ ملاتا تھا۔

ایک روز حمید اصغر سے باتیں کر رہا تھا۔ ننھی ثریا اپنی چینی کی چھوٹی بڑی گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ یہ گڑیاں ایک خوبصورت پٹاری میں رکھی تھیں۔ اصغر انہیں طرح طرح کے حیلوں سے بہلا رہا تھا۔ دفعتہً ثریا دو گڑیاں اصغر کو دکھا کر بولی۔

ثریا :۔ اماں جان (چھوٹی گڑیا دکھا کر) یہ ثریا ہے اور (بڑی گڑیا دکھا کر) یہ اس کی امی جان ہے۔

حمید :۔ ابا جان۔ ہماری امی جان کیا ہوئیں۔

اصغر :۔ (گھبرا کر) وہ اللہ میاں کے گھر چلی گئی۔

حمید :۔ تو اللہ میاں سے کہہ دیجئے کہ ہماری امی جان کو بھیج دے۔

اصغر :۔ (پریشان ہو کر) کیوں۔

حمید :۔ اللہ میاں سے کہہ دیجئے ہم اکیلے ہیں۔

ثریا: - اللہ میاں سے کہہ دیجئے ہم اکیلے ہیں - (گڑیاں دکھا کر) یہ دیکھو یہ امی جان ہے اور یہ اس کی ثریا -

اصغر: - مگر تم اکیلے نہیں - میں تمہارے پاس ہوں -

حمید: - آپ ابا جان ہیں - امی جان نہیں -

ثریا: - آپ امی جان نہیں - (گڑیاں دکھا کر) یہ دیکھو امی جان - اور یہ دیکھو اس کی ثریا -

یہ باتیں سُنکر اصغر بیتاب ہو گیا - وہ سب کچھ دے سکتا تھا - حمید اور ثریا ماتا کے بھوکے تھے - اصغر کے پاس ماتانہ تھی - وہ بہانہ کر کے اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا - یہ ایسا عذاب تھا جس سے اس کی رُوح کانپ رہی تھی -

تھوڑی دیر گزری تھی کہ حمید نے ایک کھُلا لفافہ یہ کہہ کر اصغر کے ہاتھ میں دے دیا کہ یہ چٹھی آپ کی ہے - ثریا پھاڑ ڈالے گی - واقعی یہ چٹھی تھی - رفیق کی تحریر تھی - یہ چٹھی سلیمہ کے نام تھی - اصغر نے فوراً لفافہ لیا - دیکھ کر حیران ہو گیا - تیور بدل گئے - پیشانی میں بل پڑ گئے - حمید سے پوچھا کہ چٹھی کہاں تھی - وہ صرف اتنا بتا سکا - کہ ثریا کی گڑیوں کی پٹاری میں تھی - اصغر اس لفافہ کو چھُونا نہیں چاہتا تھا - وہ اس خط کو پڑھنا نہیں چاہتا تھا - پرایا خط تھا - رفیق کا خط سلیمہ کے نام تھا - خط میں کیا لکھا تھا - کب لکھا تھا - یہ خط آج کہاں سے نکل آیا - تجسس غالب آیا - پڑھ نکال کر پڑھا - یہ ایک پُرانا خط تھا - جو پٹنہ سے رفیق نے سلیمہ کے نام لکھا تھا - وہ یہ تھا -

پٹنہ

پیاری بہن سلیمہ! دعا - میں نہایت پریشانی میں لکھنؤ سے چلا اور اب تک اسی پریشانی میں ہوں - کہ ابھی تک آپ کی ہونے والی بھاوج کی طبیعت رو بصحت نہیں - زندگی کی توقع بہت ہی کم رہ گئی ہے - مجھے امید ہے کہ تم اپنے بھائی کی پریشانی کو دعاؤں سے دور کرو گی - یہاں تمہاری چار بہنیں دعا اور دوا دونوں سے ان کی تیمارداری اور خدمت کر رہی ہیں - تم پانچویں بہن دُور ہو - دعاؤں سے نزدیک ہو سکتی ہو - میں نے بھائی اصغر کو اپنی پریشانی سے اس لئے آگاہ نہ کیا - کہ جس دن میں وہاں سے چلا ہوں - وہ تھکے ہوئے اور پریشان سے معلوم ہوتے تھے - تم سے کہے بغیر نہیں رہ سکتا - مجھے تمہاری فرشتہ سیرتی اور نیکی سے قبولیت دعا کی قوی امید ہے - اللہ تعالیٰ نیکوں کی دعا جلد قبول فرماتا ہے - بس تمہارا کام یہ ہے کہ جبتک ان کی صحت کامل کی اطلاع نہ دوں - تم برابر دعا کرتی رہو - اور بھائی صاحب کی کیفیت مزاج سے اطلاع دینا -

عذرا (مریضہ کا نام) کی اس نازک حالت نے میرے استقلال کو مضمحل اور سکون و طمانیت کو مجروح کر دیا ہے - خط کی بے ربطی - الفاظ کا ناہموار اور بے جوڑ ہونا اس کا شاہد اور لائق درگزر ہے - میں جانتا تھا کہ مجھے دنیا میں اگر کسی سے محبت ہے تو دو بہنوں سے ہے - ایک بڑی آپا سے اور دوسری سلیمہ یعنی تم سے - لیکن آج پہلی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا کہ نامعلوم طور پر تمہاری ہونے والی بھاوج سے بھی خاص تعلق خاطر ہے اور ایسا ہے جیسا کہ میری پریشانی سے تم پر بھی ظاہر ہو گیا - اب میں تم سے دعا کا خواستگار رہوں - اور بس - حمید اور ثریا کو پیار

دعا کا طالب رفیق

آج یہ خط پڑھ کر اصغر کو معلوم ہوا کہ سلیمہ اور رفیق کس دنیا میں چلتے پھرتے تھے - ان کے کیا تعلقات تھے - ان کے درمیان کیا رشتہ تھا - رفیق کے دل میں سلیمہ کا کس درجہ احترام تھا - اصغر کی آنکھوں نے اسے جو کچھ دکھایا وہ حقیقت سے کسقدر دُور اور غلط تھا - رفیق سلیمہ کو اپنی پانچویں بہن کہتا ہے - اسے فرشتہ سیرت و نیک دل مانتا ہے - اسے ان نیکوں میں شمار کرتا ہے - جن کی دعاؤں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ حاصل ہے - رفیق کو اپنی اور اپنے کنبے کی مصیبت میں سلیمہ کی دعاؤں پر کتنا بھروسہ ہے - کہ صرف اس کی مسلسل دعاؤں کا طلبگار ہے - بیشک یہ اخلاص و اعتقاد ایسے پست سیرت اشخاص کو نصیب نہیں ہو سکتا - جیسا کہ اصغر نے رفیق کو سمجھ رکھا تھا - اور یقیناً ایک اخلاق باختہ عورت کی نسبت پاکبازی و پاکدامنی کے اعتراف کی توقع اس قماش کے بد اخلاق مرد سے ہرگز نہیں کی جاسکتی جیسا کہ رفیق کے متعلق اصغر نے فرض کر لیا تھا - پھر رفیق کو اللہ کی ذات پر کتنا بھروسہ ہے - وہ خدا پرست ہے - اپنی منگیتر کی علالت سے کیسا پریشان اور متردد ہے - وہ بڑا ہی نیک اور سعادتمند نوجوان ہے - اپنی پریشانیوں میں رفیق کو اپنے عزیز دوست اصغر کی تھکن اور پریشانی فراموش نہ ہوئی - منگیتر قریب المرگ ہے - مگر وہ اصغر کے خیال سے غافل نہیں

بلکہ کیفیت مزاج معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اگر رفیق کے متعلق اصغر کا قیاس صحیح ہوتا اور سلیمہ اور رفیق کے تعلقات میں وہ قبیح کثافت ہوتی جس کا اصغر نے شک کیا تھا۔ تو رفیق کو کیا ضرورت تھی کہ اپنے حریف کے لئے ایسی خفیف بات پر اتنا متردد ہوتا۔

اصغر کے لئے یہ خط بصیرت افروز تھا۔ آئینہ صداقت تھا۔ اسے اپنی غلطی صاف نظر آنے لگی۔ اس کی عقل پر گمراہی کے جو پردے پڑے ہوئے تھے۔ دم بدم چاک ہو رہے تھے۔ سلیمہ اور رفیق کے گھر سے نکال دئے جانے کا آخری منظر اس کے پیش نظر تھا۔ وہ پھر دیکھ رہا تھا۔ کہ سلیمہ اسے مظلومانہ نگاہوں سے تک رہی ہے۔ اصغر کو یقین ہوگیا کہ اس نے ایک دوست اور اپنی بیوی پر بڑا ظلم کیا بلکہ رفیق اور سلیمہ مظلوم ہیں۔ اب اس کے غلط قیاس کے تباہ کن نتائج کا وسیع نقشہ اس کے سامنے تھا۔ گھر کی تباہی۔ بچوں کا ایک شفیق ماں سے جدا ہو جانا۔ ایک نیک سیرت اور غیور بیوی کا ناکردہ گناہ کی پاداش میں بے پناہ صدمے اٹھانا اور اپنے بچوں، گھر بار اور خاوند سے جدا ہوکر بے ٹھکانے ہو جانا۔ پھر رفیق ایسے دوست کو ذلیل و خوار کرنا۔ ان خیالات نے اصغر کو ایکدم پاگل سا بنا دیا۔ وہ بے چین ہوگیا۔ وہ اپنے کئے پر نادم تھا۔ تلافی کی کوئی راہ نہ تھی۔ سلیمہ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اس کا کہیں ٹھکانا نہ معلوم نہ تھا۔ وہ اسے بھول چکا تھا۔ وہ اپنی نفرت سے مغلوب ہوکر انتقام لے چکا تھا۔ رفیق کی اس دن کے بعد شکل نہ دیکھی تھی۔ کوئی خط و کتابت نہ تھی۔ رفیق ملازمت چھوڑ گیا تھا۔ اس کی غیرت و شرافت نے گوارا نہ کیا کہ لکھنؤ میں رہے۔ اصغر اپنے کئے پر نادم تھا۔ خجل تھا شرمسار تھا۔ وہ بے بس ہوگیا۔ وہ اپنے کئے کی کیا تلافی کر سکتا تھا۔ اصغر کو آج اپنی خانہ ویرانی کا احساس ہوا۔ آج سلیمہ کی جدائی اس سے انتقام لے رہی تھی۔ وہ گھبرا کر حمید اور ثریا کے پاس آیا۔ انہیں اٹھا کر گلے لگایا۔ ان کے پاس بیٹھ گیا۔ ثریا گڑیوں کو پٹاری میں رکھ رہی تھی۔ اصغر نے دیکھا کہ یہ سلیمہ کی پٹاری تھی۔ حمید نے بتایا کہ امی جان کا خط اسی پٹاری میں تھا۔ اصغر کو یاد آیا کہ سلیمہ نے یہ پٹاری کس شوق سے خریدی تھی۔ وہ اس میں سوئی تاگا رکھتی تھی۔ اب اصغر جدھر دیکھتا تھا سلیمہ کھڑی نظر آرہی تھی۔ اس کی آخری مظلومانہ نگاہیں اسے تکتی دکھائی دیتی تھیں۔ جس چیز پر نظر ڈالتا تھا۔ برابر میں سلیمہ کھڑی تھی۔ اصغر پر ایک وحشت طاری ہوگئی۔ اس نے نوکر کو بلایا۔ حمید اور ثریا کو ساتھ لیا۔ اور سیر کے لئے گھر سے نکل گیا۔

گھر سے باہر کھلی ہوا تھی۔ پاس ہی ایک باغ تھا۔ اصغر بچوں کو لیکر وہاں جا بیٹھا۔ بچے خوش تھے۔ وہ انہیں گود میں لئے بیٹھا تھا۔ آج وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اُن کا صرف محافظ ہے۔ وہ کسی کے بچے ہیں۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا کہ حمید اور ثریا سلیمہ کے بچے ہیں۔ وہ ایک بے پتہ ماں کے بچے ہیں۔ مظلوم بچے ہیں۔ ان کی ماں پتہ لگانے اور اس کی امانت اس کے آغوش میں پہنچانے سے کچھ قدرے تلافی ہو سکتی ہے۔

اصغر ایسے خیالات میں غرق تھا کہ سامنے سے میر بشارت آپہنچے۔ میر بشارت اللہ ایک نیک۔ پرہیزگار بزرگ تھے۔ کسی زمانے میں کالج میں پڑھاتے تھے۔ کالج سے قدیم تعلقات کے سلسلہ میں اب بھی موجودہ استادوں سے مراسم تھے۔ بڑے تجربہ کار۔ بے غرض اور مردم شناس انسان ہیں۔ کسی زمانے میں اصغر اور رفیق بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اگرچہ عمر کا فرق تھا۔ تاہم دوستانہ مراسم تھے۔ مگر اصغر اور رفیق کو میر صاحب سے ایک گونہ عقیدت ہوگئی تھی۔ آپس میں مزاج پرسی اور بچوں کو پیار کرنے کے بعد میر صاحب نے اصغر کی پریشان صورت دیکھ کر وجہ پوچھی۔ مگر اصغر کچھ کہہ نہ سکا۔ باتوں باتوں میں رفیق کا ذکر۔ اس کے ملازمت چھوڑ جانے کا واقعہ معرض گفتگو میں آگیا۔ جس کے متعلق میر صاحب نے یہ بھی کہا۔ کہ رفیق ایک نہایت نیک طینت اور خوشخصال آدمی ہے۔ نیز ذکر کیا کہ رفیق کے لائق ایک اسامی پھر کالج میں خالی ہے۔ اگر ایک درخواست کر دی جائے۔ تو رفیق جیسے قابل پروفیسر کا مقرر ہو جانا کوئی مشکل نہیں۔ میر بشارت نے مشورہ دیا۔ کہ اصغر ضرور رفیق کو فوراً مطلع کرکے درخواست کرا دے۔ یہ تاکید کرکے میر بشارت اللہ تو رخصت ہوئے اور اصغر نے وعدہ کیا کہ رفیق کو مطلع کرے گا۔ لیکن کیونکر؟۔

اصغر تو پہلے اپنے کئے پر پچھتا رہا تھا۔ میر بشارت اللہ ایسے بزرگ کی رفیق کے متعلق رائے ایک اور تازیانہ تھی۔ جس کے باعث اصغر کو ایک شدید روحانی تکلیف محسوس ہونے لگی۔ اس کے علاوہ میر صاحب سے وعدہ کر لیا تھا کہ رفیق کو مطلع کرے گا۔ اس کا ایفا کرنا لازم تھا۔ اصغر نے اس موضوع پر تھوڑی دیر غور کیا۔ اور فوراً رفیق کو ذیل کا خط لکھا۔

لکھنؤ

میرے پیارے رفیق۔ مجھ سے جو کچھ ہوا۔ اس کے بعد یہ خط لکھنا بڑی بھاری جسارت ہے۔ میں نے اپنے کئے کی بہت سزا پائی۔ سزا پا رہا ہوں۔ اور نہیں معلوم کب تک

سزا پا رہا ہوں گا۔ میرے لئے زندگی ایک مسلسل صدمہ ہے۔ میں انسان ہوں۔ فرشتہ نہیں۔ سہو و خطا میرے خمیر میں ہے۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔ تم بھی انسان ہو۔ بھول جاؤ۔ معاف کردو۔ میں دو رفیق کھو بیٹھا ہوں۔ کوئی صورت تلافی کی نظر نہیں آتی۔ میں نادم ہوں میں ندامت کے سمندر میں ڈوب چکا ہوں۔ جو شخص ڈوبا ہوا ہو۔ اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ میں آواز نہیں نکال سکتا۔ تم میری ڈوبی ہوئی آواز سنو۔ مجھے سہارا دو۔

آج میر بشارت اللہ صاحب ملے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کالج میں ایک اسامی خالی ہے اور آپ اس کے لئے درخواست کریں۔ وہ دعا کریں گے۔ انہوں نے بہت تاکید کی ہے۔ بس فوراً لکھنؤ آ کر درخواست کر دو۔ اور کیا لکھوں۔ والسلام۔

اصغر

چوتھے روز اصغر کو رفیق کا خط ملا۔ جسے اصغر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ لکھا تھا:۔

پٹنہ۔

ڈیر اصغر۔ اسلام علیکم۔ آپ کا خط ملا۔ اس توجہ کے لئے شکریہ عرض ہے۔ مجھے آپ اور آپ کا گھر یاد ہے۔ آپ کی کرم فرمائیوں کے لئے مشکور ہوں۔

فراموشی کا خواہاں

رفیق

اس خط کا اختصار اصغر کے لئے ایک زخمی دل کی بے اعتنائی کا تازیانہ تھا۔ اس میں ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا تھی۔ جس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا اثر رکھتا تھا۔ اصغر کو یہ جواب برداشت کرنا پڑا۔ یہ تلافی کی ایک منزل تھی۔ اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ اصغر ایک فہیم آدمی تھا۔ وہ رفیق کو مدت سے جانتا تھا۔ کہ وہ بڑا غیور ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ خاص اصول و شعار کا پابند ہے۔ اب چند دنوں سے رفیق کی وہ خوبیاں بھی آشکارا ہو گئی تھیں۔ جن پر خاص حالات اور اصغر کے پست جذبات نے پردہ ڈال دیا تھا۔ وہ خود ایک معقول آدمی تھا۔ اپنی غلطی تسلیم کر لینا بھی معقولیت اور ہمت کا کام ہے۔ اصغر رفیق کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے دوبارہ حاصل کرنے کا دل سے آرزومند تھا۔

اسی صورت میں چند ہفتے گزر گئے۔ اصغر کو ایک مسلسل روحانی عذاب ستا رہا تھا۔ اب اس کی توجہ حمید اور ثریا کے لئے وقف تھی۔ سلیمہ کی یاد ہر وقت ستا رہی تھی۔ گھر سنسان تھا۔ دوزخ تھا۔ اصغر خاموشی میں سلیمہ کی آوازیں سنتا تھا۔ جب بچوں کو دیکھتا تھا تو ان کی معصوم نگاہوں میں "امی جان" کے لئے اسے ایک خاموش مطالبہ نظر آتا تھا۔ اب اس کو سلیمہ کی جستجو ہوئی۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ عزیز و اقارب سے بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کیا سلیمہ اسے بھول گئی تھی۔ کیا سلیمہ اپنے جگر پاروں کو بالکل فراموش کر بیٹھی تھی۔ کونسی ماں ایسا کر سکتی ہے۔ کوئی نہیں۔ سلیمہ نے اپنے بچوں کو بھلایا نہ تھا۔ جدائی کے صدمے اٹھا رہی تھی۔

اصغر کو رفیق نے جواب لکھا تھا۔ وہ رفیق سے مایوس نہ ہوا تھا۔ اسے رفیق کے مل جانے کی امید تھی۔ مگر سلیمہ کا خیال لاکھوں خوفناک وسوسے پیدا کر دیتا تھا۔

انہی دنوں میں کچھ ہوا چلی۔ کہ بچوں میں بیماری پھیل گئی۔ یہ متعدی بیماری بھی کمبخت بہت خطرناک اور مہلک تھی۔ اصغر کو بھی معلوم ہوا۔ ضروری احتیاط کی گئی۔ اسے حمید اور ثریا کی فکر تھی۔ چھٹی لیکر انہیں باہر لے جانے کا [illegible] وہ ہی کیا تھا کہ ثریا کی طبیعت بگڑی اور پھر حمید بیمار ہو گیا۔ اصغر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بچوں کی بیماری کبھی دیکھی نہ تھی۔ تیمارداری کبھی کی نہ تھی۔ نوکروں پر بھروسہ نہ تھا۔ ڈاکٹروں کو اپنے علاج پر اعتماد نہ تھا۔ بہرحال جو کچھ مشورہ ملتا۔ اصغر اکیلا اس پر عمل کر رہا تھا۔ دن رات ایک کر دیا تھا۔ نرسیں بھی مدد کرتی تھیں۔ اس ناگہانی مصیبت میں ہر وقت سلیمہ کو یاد کرتا تھا۔ اس کے لئے زیادہ روح فرسا رنج اس بات کا تھا کہ سلیمہ۔ مظلوم سلیمہ۔ اپنی دو نشانیاں چھوڑ گئی تھی اور وہ دونوں مٹی جا رہی ہیں۔ وہ تیمارداری کر رہا تھا۔ وہ دعا مانگتا تھا۔ حمید ثریا اور سلیمہ کے لئے۔ اس مصیبت میں وہ تنہا تھا۔ سوائے اللہ کی ذات کے کوئی سہارا نہ تھا۔ حمید اور ثریا کی حالت اب اس کی تاب و طاقت سے باہر ہو گئی تھی۔ وہ بے بس ہو گیا۔ مایوس ہو چکا تھا کہ اسے رفیق کا خیال آیا۔ فوراً اسے ارجنٹ تار دیا کہ "جاں بلب ہوں۔ فوراً پہنچو۔ دیکھ لو۔ اصغر"

اس پیغام سے اس کی کچھ ہمت سی بندھ گئی۔ کچھ سہارا ملا۔ رفیق کا انتظار کرنے لگا۔

جب رفیق کو یہ تار ملا - تو پڑھ کر بے تاب ہوگیا - فوراً اسٹیشن پر پہنچا - لکھنؤ کی گاڑی میں پورا ڈیڑھ گھنٹہ تھا - یہ قیامت کا انتظار تھا - تار ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ اصغر جاں بلب ہے۔ رفیق کا یہ جی چاہتا تھا کہ پر لگا کر اُڑ جائے - اور کسی طرح اسے زندہ دیکھ پائے - گاڑی آئی - ٹھہری - رفیق سوار ہوا - گاڑی روانہ ہوگئی - اُس وقت رفیق کے دل میں اصغر کی بیماری اور بربادی بچوں کی یتیمی کے خیالات رہ رہ کر آ رہے تھے بیبلیمہ کا اسے پتہ نہ تھا - کہ زندہ ہے یا دا آگئی - دوسرے دن لکھنؤ سٹیشن پر پہنچا - مگر راستہ میں احتیاطاً لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹر بینرجی کو بھی ساتھ لیتا گیا - مکان پر پہنچا - دروازہ پر دستک دینے کی تاب نہ تھی - گھر میں داخل ہوا - کمرہ میں جاکر داخل ہوا - ایک آرام کرسی پر اصغر نڈھال پڑا ہے - دائیں طرف چارپائی پر حمید پڑا ہے - سوکھ کر کانٹا ہوگیا ہے - کرسی کے بائیں جانب ثریا پڑی ہے بیشت استخواں تو ضرور ہوگئی ہے - مگر ظاہرا حالت اچھی ہے - برابر میں گڑیوں کی پٹاری رکھی ہے -

رفیق کے ساتھ ڈاکٹر بینرجی بھی کمرہ میں پہنچ گیا تھا - ان کے آنے سے اصغر نے آنکھیں کھولیں - رفیق کو گلے لگایا - بچوں کا حال بتایا - ان تینوں کی حالت دیکھ کر رفیق کو بہت رنج ہوا - اصغر کی تسلی وتشفی کی - ڈاکٹر بینرجی نے بچوں کی نبض دیکھی - تھرمامیٹر لگایا - سینے دیکھے - پھر احتیاطاً اصغر کا معائنہ کیا - نسخے تجویز کیے - ڈاکٹر تجربہ کار تھا - تسلیاں دیتا رہا - نوکروں کو دوا کے لئے دوڑایا - اصغر بچوں کی چارپائیوں کے درمیان کرسی پر بیٹھا اپنی اس متاع کو دیکھ رہا تھا کہ دونوں جگر گوشے ہر سانس کے ساتھ تحلیل ہو رہے ہیں -

ڈاکٹر بینرجی نے رفیق کو ایک طرف لے جاکر بتایا - لڑکی تو خطرناک منزل سے نکل چکی ہے - مگر بیماری کے دوسرے حملہ سے احتیاط کی سخت ضرورت ہے - لیکن لڑکے کی حالت تشویشناک ہے - خطرناک مرحلہ دو ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچے گا - اگر وہ دورہ خیریت سے گزر جائے - تو کوئی خطرہ نہیں - بشرطیکہ احتیاط کی جائے اور اس کے لئے ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے - جو یہیں حاضر رہے - مگر مجھے فرصت نہیں - البتہ اگر پسند کرو - تو میں لیڈی ڈاکٹر صدیقہ کی سفارش کرتا ہوں - اور میں اسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ آپ کی مدد کر دے - باقی کام ان بچوں کی ماں اور نرس کرے گی - بچوں کی ماں کے متعلق رفیق تذبذب میں تھا - کہ ڈاکٹر بینرجی کو کیا جواب دیا جائے لیکن خاموشی بہتر سمجھی - اصغر کے متعلق ڈاکٹر نے تجویز کیا کہ اسے آرام کی سخت ضرورت ہے - دن رات کی تیمارداری اور فکر نے اس کی حالت واقعی سخت نازک کر دی ہے - اس لئے اسے فوراً بچوں سے علیحدہ کر دینا چاہیئے -

لیڈی ڈاکٹر صدیقہ کے متعلق ڈاکٹر بینرجی نے اتنا اور کہا کہ وہ پردہ کرتی ہیں - تھوڑا عرصہ ہوا - لکھنؤ میں آئی ہیں - لیکن بچوں کی بیماریوں میں بہت اچھا تجربہ ہے - بڑی ہمدرد ہیں - غریبوں کے لئے ایک رحمت ہیں اور اس بیماری میں تمام شہر میں بہت کام کیا ہے اور اچھا کام کیا ہے - مریض اور تیماردار سب تعریف کرتے ہیں - گولہ گنج میں مکان ہے -

رفیق نے اصغر سے مشورہ کیا - اسے آرام کرنے کی تاکید کی - ڈاکٹر نے نیند کی پڑیا دی تھی - وہ کھلائی - مگر اصغر کے لئے نیند کہاں تھی - پھر لیڈی ڈاکٹر صدیقہ کے متعلق پوچھا - اور اس کا پتہ پوچھا - اصغر نے اپنی لاعلمی ظاہر کی - لیکن اس کے بلانے کی نسبت ڈاکٹر سے اتفاق کیا -

فوراً ہی رفیق تو ڈاکٹر بینرجی کی تجویز کردہ دوائیں لینے چلا گیا - اور خود ڈاکٹر بینرجی لیڈی ڈاکٹر صدیقہ کو لانے کے لئے روانہ ہوگیا -

اصغر کرسی پر بیٹھا ثریا کو دیکھ رہا تھا - وہ بڑی گڑیا اور چھوٹی گڑیا کو برابر لٹائے تھی - کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی - یہ منظر دیکھ کر اصغر کو اس بچی کی اس روز کی باتوں کا خیال آگیا - وہ بہت رنجیدہ خاطر ہوا پھر لوٹ کر حمید کو دیکھا - وہ بے ہوش پڑا تھا - اسے دیکھ کر اصغر کے دل میں خدا جانے کیا کیا خیال گزرنے لگے - ایک صورت تسلی کی ضرور تھی کہ رفیق پہنچ گیا - اصغر کچھ نہ کر سکتا تھا - وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا -

اتنے میں ڈاکٹر بینرجی کے پہنچنے کی آواز آئی - اس کے ساتھ ایک خاتون برقعہ پہنے داخل ہوئی - ایک ہاتھ میں ہینڈ بیگ تھا - دوسرے میں سینہ دیکھنے کا آلہ - یہ لیڈی ڈاکٹر صدیقہ تھی جب یہ دونوں ڈاکٹر کمرہ میں داخل ہوئے - اصغر بدستور پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا اور بیٹھا رہا - وہ بہت مایوس تھا - ڈاکٹر بینرجی نے بچوں کا معائنہ کرایا - سب مریضوں کے متعلق ہدایات دیں - جو دوائیں اور علاج تجویز کئے تھے ان سے ڈاکٹر صدیقہ کو آگاہ کیا - بڑے مریض یعنی اصغر کے لئے آرام کی ضرورت بتائی اور نیند کی مزید دوا دینے سے منع کیا - ڈاکٹر صدیقہ جب بچوں کا معائنہ کر رہی تھی - تو ڈاکٹر بینرجی نے دیکھا

کہ صدیقہ کے ہاتھ کانپ رہے ہیں ۔ اُس کی آواز میں رکاوٹ ہے ۔ اور اُس کا ہاتھ بار بار برقعہ کی آنکھوں کی طرف اُٹھتا ہے ۔ ڈاکٹر بینرجی ڈاکٹر صدیقہ کے متعدد مریضوں کا علاج کر چکا تھا ۔ اُس نے ان باتوں کا کوئی نوٹس نہ لیا ۔ البتہ جب اُس نے دوبارہ حمید کی خطرناک حالت کے متعلق ذکر کیا اور احتیاط کے بارے میں تاکید کی ۔ تو اُس نے ڈاکٹر صدیقہ کے جسم میں ایک لرزہ سا نوٹس کیا ۔ اور دیکھ کر ڈاکٹرنی صاحبہ سے کہا ۔ گھبرانے کی بات نہیں ۔ یہ بچہ بھی اچھا ہو جائے گا ۔ لڑکی کے متعلق فکر نہیں رہے گا ۔ ڈاکٹر صدیقہ نے پانی کے لئے اشارہ کیا ۔ ڈاکٹر بینرجی کے برابر صراحی تھی ۔ اس میں سے پانی لیکر ڈاکٹر صدیقہ کو پلا دیا ۔ جب ڈاکٹر بینرجی چلا گیا ۔ اصغر کرسی پر بیٹھا ثریا کو دیکھ رہا تھا ۔ ڈاکٹر صدیقہ حمید کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی ۔ وہ چپ اُس کے منہ کو تکتی رہی

تھوڑی دیر ہوئی تھی ۔ حمید زور سے کراہا ۔ اور انگڑائی لی جس سے اُس غریب کا سارا جسم کھنچ گیا اور اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں ۔ اس کے منہ سے صرف "امی جان" کے الفاظ نکل سکے ۔ اور نڈھال ہو گیا ۔

لیڈی ڈاکٹر نے برقعہ اوڑھا تھا ۔ وہ فوراً اٹھی ۔ حمید کی نبض دیکھی ۔ اُس کا سینہ سہلانے لگی ۔ پھر اُٹھ کر چند قطرے دوا کے حلق میں ڈالے ۔ مریض کو کچھ سکون سا ہو گیا ۔

اصغر حمید کے "امی جان" کے الفاظ کی تاب نہ لا سکا ۔ اس میں حمید کو دیکھنے کی بھی ہمت نہ رہی تھی ۔ وہ رومال آنکھوں پر رکھ کر باہر چلا گیا ۔

اب بچوں کے پاس صرف لیڈی ڈاکٹر صدیقہ رہ گئی تھی ۔ اس نے فوراً اپنے برقعہ کا پلہ اُٹھایا اور نہایت بے تابی کے ساتھ حمید کی پیشانی آنکھوں اور ہاتھوں کے بوسے لئے ۔ اس کے رخساروں سے اپنے رخسار لگائے ۔ اور بار بار بلائیں لیں ۔ پھر اُٹھ کر ثریا کے پاس آئی ۔ چوما اور چھاتی سے لگا کر پھر لٹا دیا ۔ حمید کو اٹھا کر گلے لگانے کو تھی ۔ لیکن اُس کی نازک حالت کا خیال کر کے اپنے سینے کو اس کی چھاتی سے لگا دیا ۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے ۔ حمید نے ذرا آنکھیں کھولیں ۔ ڈاکٹرنی صدیقہ کی طرف بانہہ پھیلائے ۔ مگر نقاہت سے رہ گئے ۔ اور سارے جسم میں ایک تھرتھراہٹ سی پیدا ہوئی ۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ۔ لیڈی ڈاکٹر نے پھر اُٹھ کر حمید کے حلق میں دوا ڈالی ۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور بند کر لیں ۔ اس وقت ڈاکٹر صدیقہ کا چہرہ کھلا تھا ۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے ۔ وہ چارپائی کی پٹی کے برابر بیٹھی تھی ۔ جب حمید کی یہ حالت دیکھی ۔ بے تاب ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے ۔ وہ رو رو کر دعا مانگ رہی تھی ۔ اسی حالت میں کئی منٹ گزر گئے ۔ حمید آنکھیں بند کئے لیٹا تھا ۔

اتنے میں اصغر کمرے میں آیا ۔ تو دیکھا کہ لیڈی ڈاکٹر ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہی ہیں ۔ لیکن جب ذرا غور سے دیکھا تو حیران ہو گیا ۔ آنکھیں بھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ سر نیچے کئے ڈاکٹرنی کے بالمقابل چارپائی کی پٹی کے پاس بیٹھ گیا اور دیر تک رو رو کر اس بچے کے لئے ڈاکٹرنی کی دعا میں شریک رہا ۔ یہ دونوں دیر تک بارگاہ باری تعالیٰ میں دعا مانگتے رہے ۔

ڈاکٹرنی دعا ختم کر کے حمید کو تک رہی تھی ۔ اصغر ابھی تک دعا میں مشغول تھا کہ رفیق دوائیں لئے کمرے میں داخل ہوا ۔ میز پر دوائیں رکھ دیں ۔ لوٹ کر کیا دیکھتا ہے کہ سلیمہ حمید کی چارپائی کے برابر بیٹھی حمید کے منہ کو تک رہی ہے ۔

رفیق کی حیرت کی کوئی حد نہ تھی ۔ اس نے پاس جا کر بلایا ۔ کہ بہن سلیمہ! ادھر ڈاکٹرنی نے بچشم تر نگاہیں اُٹھا کر جواب دیا ۔ بھائی رفیق اصغر کا سر چارپائی کی پٹی پر رکھا تھا ۔ اور وہ رو رہا تھا ۔ یہ آواز سن کر حمید نے آنکھیں کھولیں ۔ دیکھا اور مسکرایا ۔ اپنے ہاتھ امی جان کی طرف بڑھائے ۔ سلیمہ نے اپنے ہاتھوں میں لئے ۔

حمید اور ثریا کو چند روز بعد اللہ نے صحت کلی بخشی ۔ ڈاکٹر بینرجی کا علاج تو جاری رہا تھا لیکن غسل صحت کے روز وہ بالخصوص مبارکباد کے لئے آئے ۔ اور بچوں کی ماں سلیمہ ۔ لیڈی ڈاکٹر صدیقہ کو بڑے خلوص سے مبارکباد دیں ۔

عباد اللہ بی ۔ اے

پردیس کی زندگی نہ پوچھو کیا مجھ پہ گذر گئی نہ پوچھو
ممکن ہے کہ تم کو ہو ندامت مجھ سے مری بیکسی نہ پوچھو!

ماہر القادری

افکارِ تازہ

زندگی خواب تھی کہ بھول گیا مجھ سے تعبیرِ حسنِ خواب نہ پوچھ
اب ٹھہرتی نہیں نظر بھی کہیں! کاوشِ طرزِ انتخاب نہ پوچھ

زمانہ

اللہ ری شوخیاں کہ جب آتا ہے اُن کو رحم ہم کو پیام بھیجتے ہیں وہ قضا کے ہاتھ

خیام

آپ کو اندازۂ ظرف نگاہ و دل تو ہو آیئے جلوؤں کو اپنے آزماتے جائیے

شاعر

لے گئے دل وہ باتوں باتوں میں لُٹ گیا گھر مجھے خبر نہ ہوئی!
خونِ دل سے بھی آبپاشی کی شاخِ اُمید بارور نہ ہوئی

نبضیں چھٹی چھٹی سی ہیں تاروں کی دیکھنا کیوں آسماں پہ آنکھ اُٹھانے لگے ہو تم

ادبِ لطیف

عشرتِ زندگیٔ عشق نہ پُوچھ موت عینِ حیات ہوتی ہے

ساقی

عجب حوصلہ ہم نے غنچوں کا دیکھا تبسّم پہ ساری جوانی لٹا دی!

عالمگیر

دل میں دہک رہا ہے شگفتہ کنول کا پھول یہ شعلہ در کنار تری آرزو نہ ہو
دُنیا اُلٹ رہی حجاباتِ زندگی! اے پردہ دار! کہیں ان میں تُو نہ ہو

مدینہ



مراکش کا ایک خوشنویس



لینن
سوویت روس کا پہلا آمر

مشاہیرِ عالم

لینن

ملک روس میں دریائے والگا کے کنارے ایک شہر ہے جس کا نام سیمبرسک ہے۔ اس شہر کی قسمت میں لکھا تھا کہ بیسویں صدی کے مشہور و معروف انقلابی آدمی وہاں پیدا ہو کر ملکی تاریخ میں ایک عظیم ردوبدل کریں۔ زارِ روس جس کا نام سنتے ہی دنیا کے بڑے بڑے آدمی تھرا جاتے تھے۔ اس کے ہاتھ سے نیست و نابود ہو اور وہ ایک ایسی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو جس کے اصول ساری دنیا سے جداگانہ ہوں۔ اس گاؤں میں ۱۰ اپریل ۱۸۷۰ء کو ایک نہایت معزز اور شریف باپ کے ہاں یہ بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام والڈمیر لینن رکھا گیا۔ لینن کے والد حکومت کی طرف سے مشیر تھے۔ اور اس عہدہ کے علاوہ نیشنل اسکول کے مہتمم اعلیٰ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ لینن کے بڑے بھائی کا نام الیگزنڈر تھا۔ لینن شہر کے گرامر اسکول میں تعلیم پاتے تھے۔ ان کی عمر ۱۷ سال کی تھی۔ وہ انٹرنس میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے بھائی کے زیرِ اثر تمام انقلابی کتابوں سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ صبح کے ناشتہ کے بعد شام تک ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ انقلابی رسائل کتابیں اور دیگر لٹریچر کے مطالعہ میں منہمک رہتے۔ انہیں کتابیں پڑھنے سے خاص شغف تھا اور جب وہ سائبیریا میں جلاوطن کئے گئے تو اکثر وقت مطالعہ میں ہی گزارتے تھے۔

وہ اپنے بھائی الیگزنڈر کے نقشِ قدم پر چلنا باعثِ فخر سمجھتے۔ ہر بات میں اس کی تقلید اپنے لئے نجات کا ذریعہ خیال کرتے۔ مارکس کی کتاب کاپٹیل الیگزنڈر کی تحریک سے لینن نے پڑھی۔ دونوں بھائی گھنٹوں کتاب پر تنقید کرتے اور شہر میں مارکس کے اصولوں کی اشاعت کو کارِ ثواب سمجھتے۔

الیگزنڈر ایک خفیہ انقلابی پارٹی کے ممبر تھے ۱۸۸۷ء میں ان کی پارٹی نے زار الیگزنڈر سوئم کو ہلاک کر دینے کی خفیہ سازش کی۔ یہ طے پایا کہ الیگزنڈر کو زار کے قتل کے لئے متعین کیا جائے۔ پیٹرزبرگ میں زار پر بم پھینکا جائے اور اس طور پر ظلم و تعدی کا ہمیشہ کے لئے استیصال کر دیا جائے۔ مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ ؏

حریفِ آرزو خود بن چکی ہے انجمن دل کی

سازش کا رازِ طشت از بام ہو گیا اور تمام کی تمام پارٹی گرفتار کر لی گئی۔ لینن کے بھائی الیگزنڈر اور ان کے چار رفقاء کے لئے سزائے موت تجویز ہوئی۔ لینن اس وقت طالب علم تھے اور بھائی کے قتل کا ان کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ انہوں نے اس وقت سے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے ملک کو زار کے استبداد سے رہائی دلانے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔

لینن بیان کرتے ہیں کہ اس وقت ملک کی حالت اسقدر قعرِ مذلت میں گر چکی تھی کہ لوگ بادشاہ کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانا بھی گناہِ عظیم سمجھتے تھے۔ پھانسی سے قبل جب ان کی والدہ اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے سیمبرسک سے پیٹرزبرگ جانے والی تھیں تو کوئی شخص اس بڑھیا کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ لوگ کہتے کہ قیدی کی والدہ کے ساتھ سفر کرنا بدترین فعل ہے۔ لوگوں کی بزدلی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ وہ ان کے خاندان کے کسی فرد سے بات تک کرنا جرم سمجھتے تھے۔

لینن کی بیوی کروپسکیا لکھتی ہیں کہ لینن کو اپنے بھائی سے بہت زیادہ محبت تھی وہ اکثر اپنے بھائی کا تذکرہ مجھ سے کیا کرتے اور اس کے قتل پر محبت کے آنسو بہاتے۔ دونوں بھائیوں کے محسوسات اور خیالات تقریباً ایک جیسے تھے۔ الیگزنڈر کو زار کی حکومت سے سخت نفرت تھی۔ وہ اپنی موت کے بعد تمام جذبات وارثتاً لینن

کے لئے چھوڑ گیا۔

گرامر اسکول کی تعلیم کی تکمیل پر لینن بیرسٹری کے لئے کازان یونیورسٹی میں داخل ہوئے ۔ اس اثنا میں ان کے عقائد..... مارکس کی تقلید میں پختہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے کازان یونیورسٹی کے طلبا کی انقلابی مجلس میں شرکت کی مگر انہیں اس جرم کی پاداش میں دارالعلوم سے نکال دیا گیا۔ اور جلاوطن کر کے کاشینو بھیج دیا گیا۔

۱۸۸۹ء میں کاشینو میں سخت قحط برپا ہوا۔ وہاں امدادی انجمنیں قائم ہوئیں۔ ایک انجمن کے جلسہ میں امداد کے لئے تقریریں ہو رہی تھیں۔ لینن وہاں موجود تھے۔ وہ بغور تقریروں کو سنتے رہے۔ مگر وہ زیادہ دیر تک اپنے جذبات کو دبا نہ سکے۔ پلیٹ فارم پر آکر کہنے لگے۔ کہ یہ تمام امدادی انجمنیں فضول اور بے کار ہیں۔ لوگوں کے اضطرار کی وجہ سے حکومت کا ظلم ہے۔ ان خیالات کی وجہ سے انہیں وہاں سے بھی نکال دیا گیا۔ کچھ عرصہ تک ہراساں و پریشاں پھرنے کے بعد وہ پیٹرز برگ پہنچے اور از سر نو بیرسٹری میں داخل ہو کر امتحان پاس کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پیٹرز برگ میں انہوں نے پریکٹس شروع کی مگر اس جوشیلی طبیعت کو اس پیشہ میں کیسے سکون حاصل ہو سکتا تھا۔ ایک سال کی پریکٹس کے بعد انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آئندہ زندگی کے لئے محض انقلابی پروپاگنڈے کو اپنا ذریعہ عمل بنائیں گے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی انہوں نے بیرسٹری کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ زناف اپنی کتاب "لینن" میں رقمطراز ہے کہ جب لینن بیرسٹری کے تجربے مجھ سے بیان کرتے تو میں ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ جاتا۔

۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۳ء تک انہوں نے روس کے مختلف شہروں اور قصبوں میں سفر کیا۔ وہ بڑی احتیاط سے اپنے خیالات کی اشاعت کرتے۔ انہیں عموماً جستجو رہتی تھی۔ کہ کسی طور پر انہیں اپنے ہم خیال ملجائیں تاکہ وہ مارکس کے اصولوں کی اشاعت کر سکیں۔ اکثر انقلابی لوگوں کو ان کے لائحہ عمل سے اختلاف ہوتا اور وہ انہیں فضول قرار دے کر پہلو تہی کر لیتے۔ معترضین کہتے کہ روس کے عوام زمیندار ہیں۔ اس لئے مارکس کے اصولوں اور اغراض و مقاصد کی کامیابی ناممکن العمل ہے۔ لینن اعتراضوں کی قطعاً پرواہ نہ کرتے اور آہستہ آہستہ اپنے اصولوں کو واضح کرنا اپنے مشن کا اولین مقصد سمجھتے۔

لینن کی بڑائی اس راز میں مضمر تھی کہ وہ ایک عملی کام کرنے والے شخص تھے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ کسانوں اور مزدوروں میں کام کرنا کامیابی کی کلید ہے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ جب تک کسانوں اور مزدوروں میں کام کرنے والی پارٹی پیدا نہیں کرتے انہیں کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ وہ تاڑ گئے تھے کہ بڑے بڑے جلسوں میں تقریروں سے وہ مطلب حاصل نہیں ہو سکتا جو چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کو قائل کرنے سے ہوتا ہے

لینن اکثر فیکٹریوں میں جاتے مزدوروں سے تبادلۂ خیالات کرتے۔ اپنی کہتے ان کی سنتے۔ مایوسی کو پاس نہ پھٹکنے دیتے۔ سر دھنتے اور پکار پکار کر انہیں سمجھاتے۔ ؎

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا نادان خیالی دیوتاؤں کے لئے
سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بالآخر مزدوروں پر تقریروں کا اثر ہونا شروع ہو گیا۔ وہ جب مزدور اور کسان کی مفلسی و بیکسی اور حکومت کے ظلم بیان کرتے تو سامعین کے دلوں پر چوٹ سی لگتی اور یہ تقریریں آگ پر تیل کا کام دیتیں۔

انہوں نے لوگوں کی اقتصادی حالت پر پمفلٹ لکھے وہ لوگوں کو سمجھاتے کہ مزدور اور کسان کا گلا گھونٹنے کا نام زار کی حکومت ہے اور کہتے ؎

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

اور نہایت غور و خوض کے بعد اس بیماری کا صرف یہی علاج تجویز کرتے

انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!!

الغرض ان ذرائع سے لینن کو بڑی کامیابی ہوئی۔ ایک انجمن "آزادیٔ غربا و مزدوراں" کی بنیاد پیٹرز برگ میں رکھنے میں وہ کامیاب ہو گئے۔ اس انجمن کے معرض وجود میں آتے ہی جابجا ہڑتالیں ہونے لگیں۔ جو ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۷ء کے ہیبتناک انقلابوں کا پیش خیمہ تھیں۔ اس جگہ لینن کی بیوی کروپسکیا کا بیان نقل کرنا خالی از لطف نہ ہوگا

وہ لکھتی ہیں لینن ۱۸۹۳ء کے موسم بہار میں پیٹرز برگ وارد ہیں وارد ہوا۔ میرا تعارف سال کے اخیر میں ان سے ہوا۔ عام طور پہ مشہور تھا کہ مارکس کا ایک پیرو صوبہ والگا کا باشندہ شہر میں آ گیا ہے۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس نو وارد سے تبادلۂ خیالات کروں۔ پہلی دفعہ میں ان سے ایک تقریب پر ملی۔ وہ خاموش تھے۔ مگر ان کی آنکھ کا اضطراب ان کی ذہانت کا پتہ دیتا تھا۔ اور حاضرین کو متاثر کرتا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں میرے تعلقات ان سے زیادہ مستحکم ہو گئے۔ وہ اس وقت انقلابی پروپاگنڈے میں مصروف تھے۔ اور میں ایک سنڈے اسکول میں معلمہ تھی۔ ہزاروں مزدوروں کی جماعت کے ممبر تھے۔ میرے اسکول میں تقریباً چھ سو سے زائد مزدور لکھنے پڑھنے کے لئے آتے۔ استانیوں سے ایسی عقیدت تھی کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ میں پیٹرز برگ کے مضافات میں رہتی تھی۔ اور لینن ہر اتوار کو مجھ سے ملنے آتے۔ گھنٹوں گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔ وہ مزدور اور کسان کے مصائب کا ذکر کر کر کے آنسو بہاتے۔ ان کے معاملات میں انتہائی دلچسپی کا اظہار کرتے وہ کہتے ہمارا فرض اولین ہے کہ دستکاروں میں انقلاب پیدا کریں اور انہیں ظلم سے نجات دلائیں۔ وہ "کاپٹیل" سے اکثر حصے مزدوروں کو پڑھ پڑھ کر سناتے۔ حالات و کوائف کے بیان سے لوگوں میں ہیجان پیدا کرتے وہ کہتے حکومت کو بدل ڈالنا لوگوں کے اپنے بس کی بات ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر پولیس بڑے غور سے ممبروں کی جانچ پڑتال رکھتی۔ مگر لینن کی نگرانی ایک اہم کام تھا۔ وہ پیٹرز برگ کے تمام راستوں کو جانتے تھے۔ سازشی چالوں میں انہیں ملکۂ خداداد تھا۔ سوسائٹی کے ممبروں کے انہوں نے علیحدہ علیحدہ نام رکھ چھوڑے تھے اور انہیں ناموں پر ان سے خط و کتابت کے لئے لفظوں کا طرز املا ایجاد کیا تھا۔ وہ اسی طریقہ کے مطابق آپس میں خط و کتابت کرتے اس سے پولیس کو زیادہ حیرانی ہوتی اور وہ زیادہ کوشش سے ہمارا تعاقب کرتی۔ خدشہ بڑھ گیا۔ اس لئے لینن کی یہ حالت ہو جائے ہر ...... کہ کوئی شخص اُن کا جانشین مقرر کیا جائے۔ چونکہ میں ان کے طریق کار سے کافی حد تک واقف تھی اور وہ ازراہِ مہربانی مجھ پر زیادہ اعتماد رکھتے اس لئے مجھے ان کی جانشینی کا فخر حاصل ہوا۔"

لینن بہت بڑے مردم شناس تھے۔ وہ لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں فوراً بھانپ لیتے کہ کون کون ان کے لئے کارآمد اور مفید ہو سکتا ہے۔

۱۸۹۵ء میں لینن لیبر کے اجلاس میں شمولیت کے لئے برلن گئے۔ وہاں سے وہ سوئٹزرلینڈ پہنچے۔ جہاں ان کی ملاقاتیں السٹنگ اور سلوتسن سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہاں سے وہ ایک ایسا صندوق اپنے ساتھ لائے جس کے اندر خفیہ خانہ تھا۔ وہ تمام انقلابی لٹریچر اس تہ خانے میں محفوظ رکھتے۔

جاسوسوں کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ وہ زیادہ دیکھ بھال کرنے لگے۔ ان کی بیوی رقمطراز ہیں جو کہ "میری ایک چچیری بہن محکمۂ رجسٹری میں بطور محرر ملازم تھیں۔ آدھی رات کو ایک جاسوس ان کے پاس آیا اور لینن کا پتہ دریافت کیا۔ جاسوس نے کہا تمہیں خوب معلوم ہے کہ یہ شخص تختۂ حکومت کو الٹنا چاہتا ہے تمہیں نے اس کے بھائی کو پھانسی دلائی تھی اور وہی ریشمی رسہ اب لینن کے گلے کا منتظر ہے۔ میری بہن نے مجھ سے بعد التجا کہا کہ میں انہیں خطرہ سے آگاہ کر دوں۔ جب میں نے لینن سے اس کا ذکر کیا۔ تو انہوں نے مسکرا کر کہا: جو رات مجھے قبر میں آنی ہے وہ کبھی باہر نہیں آ سکتی۔"

پارٹی کے قبضہ میں ایک پریس تھا۔ پولیس کی ان تھک کوششوں کے باوجود یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کس مقام پر ہے۔ ان کی پارٹی روزانہ اخبار جاری کرتی اور وہ لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر مفت تقسیم کیا جاتا۔ پیٹرز برگ کی اقامت کے دوران میں لینن نے ایک زبردست پارٹی پیدا کر لی تھی۔ مزدوروں اور کسانوں میں ان کے اصولوں کی اشاعت بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ وہ لوگوں میں احساس پیدا کر چکے تھے اور حکومت کے خلاف ایک طوفان برپا تھا۔ تلاطم خیز موجیں لوگوں کے دلوں سے اٹھ اٹھ کر بحر بیکراں کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ آخر کار پولیس نے جو دن رات ان کی تلاش میں تھی ان کو چند رفقاء کے ساتھ گرفتار کر لیا۔

حراست کے بعد لینن کی پارٹی نے جیل خانہ میں ان سے خط و کتابت کا سلسلہ پیدا کر لیا۔ ان دنوں قیدیوں کو کتابیں جیل خانہ کے اندر بہم پہنچائی جا سکتی تھیں۔ لینن کے رفیق کتابوں کے اندر نقطوں سے جو انہوں نے ایجاد کر رکھے تھے۔ اپنا مفہوم ان تک پہنچا دیتے۔ لینن ان کے جواب میں اور نقطے ڈال دیتے اور اس

طرح سلسلۂ پیام جاری رہتا۔ لینن کے پیام سے ان کے رفیقوں کو تسکین رہتی۔ اس اثنا میں ان کی بیوی بھی گرفتار ہو کر جیلخانہ پہنچ گئیں۔

کچھ عرصہ کے بعد حکومت نے انہیں رہا کر دیا۔ مگر ان کی بیوی ابھی جیل ہی میں تھیں۔ جیل سے رہا ہو کر انہوں نے پھر انقلابی پروپیگنڈا نہایت زور و شور سے جاری کر دیا۔ جس کی وجہ سے حکومت نے انہیں سائبیریا میں جلا وطن کر دیا۔

جب کروپیکیا جیل سے رہا ہوئیں۔ تو انہوں نے حکومت کے پاس درخواست کی کہ لینن سائبیریا میں ہیں۔ اس لئے اسے بھی وہاں جانے کی اجازت دی جائے۔ حکومت نے ان کی درخواست منظور کر لی۔

لینن کی سائبیریا کی زندگی کے واقعات بیان کرنے کے لئے ہم کروپیکیا کے مرہون منت ہیں۔ جنہوں نے تفصیلی طور پر اس داستان کو سپرد قلم کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ "سفر میں میری والدہ میرے ہمراہ تھیں۔ یکم مئی ۱۸۹۸ء کا دن تھا۔ جب ہم نے سفر اختیار کیا مقام کرسنک میں ہمیں ایک رشتہ دار ملا جو جلاوطنی میں اپنی زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ اس کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ اس نے سوشلسٹ لوگوں سے ہماری ملاقاتیں کرائیں۔

اگلی شام کو ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ لینن گھر پر موجود نہ تھے۔ وہاں کے لوگ فطرتاً بیحد صفائی پسند اور شوقین ہیں۔ ان کے گھر عمدہ خود ساختہ قالینوں سے مزین رہتے ہیں۔ لینن وہاں بہت ہر دلعزیز تھے۔ ہمارے پہنچنے کے دو گھنٹے بعد وہ بھی آ موجود ہوئے۔ میرے اور میری والدہ کے لئے دو علیحدہ کمرے مکان میں سے دیئے گئے۔ رات ہم نے باتوں میں کاٹی۔ لینن نے ریلوے کے ایک برخاست شدہ ملازم کی مدد کی تھی جو اپنے عہدہ پر بحال کر دیا گیا تھا اس لئے ان کی قانونی قابلیت کا شہرہ ہو گیا تھا۔ لوگ ان کے پاس قانونی مشوروں کے لئے آتے تھے اور لینن عوام کی ہر طرح امداد کرتے تھے۔"

جلاوطنی کی حالت میں لینن کو آٹھ روبل وظیفہ ماہانہ ملا کرتا تھا اس وقت ہر چیز سستی تھی۔ ہفتہ میں ایک دفعہ ان کے لئے بھیڑ ذبح کی جاتی اور ہفتہ بھر وہ اس کا گوشت کھاتے۔ چونکہ صاحبِ خانہ اکثر مخمور رہتا۔ اس لئے وہ اس کا مکان چھوڑ کر دوسرے میں چلے گئے۔ چار روبل میں ان کو نصف مکان معہ باغ اور ٹینس کورٹ کے مل گیا۔ کروپیکیا اور اس کی ماں گھر کا انتظام کرتیں۔

شام کے وقت لینن کتابوں کا ترجمہ کرتے۔ پمفلٹ لکھتے۔ اور انقلابی اغراض و مقاصد پر تبصرہ کرتے۔ سائبیریا کے اس گاؤں میں جہاں وہ مقیم تھے۔ سوائے شکار اور کتابوں کے انہیں اور کوئی شغل نہ تھا۔ ان کی بابت عام طور پر مشہور تھا کہ افسانوں سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ مگر کروپیکیا بیان کرتی ہیں کہ یہ محض بے بنیاد بات تھی۔ برعکس اس کے وہ افسانہ پڑھنے میں خاص دلچسپی لیتے۔ گاؤں میں ڈاک یہ دو مرتبہ آتا اور ان کے دوست پیٹرز برگ سے کتابیں، اخبارات اور رسالے کثرت سے ارسال کرتے رہتے۔ لینن کی ماں انہیں نہایت باقاعدگی سے خطوط لکھتیں اور اپنے بچے کو اکثر تحفے تحائف بھیجتی رہتیں۔

لینن کو شطرنج سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ ایک دوسرے جلاوطن کے ساتھ اس میں مشغول رہتے۔ انہیں شطرنج سے اسقدر شغف تھا۔ کہ اکثر خواب میں چلا اٹھتے۔ "اگر تم نے اپنے وزیر کو ہلایا تو میں تمہیں مات دے دوں گا" لینن اکثر کہتے کہ شطرنج کا شوق مجھے والد سے ترکہ میں ملا ہے۔

جلاوطنی کی میعاد ختم ہونے کے بعد انہوں نے شطرنج کھیلنا قطعاً ترک کر دیا۔ کہتے تھے کہ یہ محض تضیع اوقات کا ذریعہ ہے اور پروگرام میں حارج ہوتا ہے۔

انہیں لاطینی زبان سے گہری دلچسپی تھی۔ کیونکہ وہ رومن طریق پر فصاحت و بلاغت حاصل کرنے کے شائق تھے۔ ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اہل رومن کی طرح فصیح و بلیغ تھے اور بسا اوقات ان کی تقریریں پرانے رومن خطیبوں سے ٹکر کھاتی ہیں۔ سائبیریا میں انہوں نے ایک خفیہ اخبار "اسکارگا" اجرا کیا۔ جس میں دل ہلا دینے والے واقعات ہوتے۔ وہ رات کو بہت کم سوتے اور ہر وقت تجاویز پر غور کرتے رہتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے قویٰ میں ضعف واقع ہونے لگا۔ اخبار کے سلسلہ میں سائبیریا کی پولیس نے لینن کے مکان کی تلاشی لی۔ انقلابی لٹریچر اور پوشیدہ خطوط الماری کے نچلے خانے میں تھے۔ کروپیکیا نے پولیس کے افسر کو ایک بہت اونچی کرسی بیٹھنے کے لئے دی۔ جب وہ الماری کے اوپر کے خانے تلاش کرتے کرتے تھک گیا تو لینن نے انہیں

یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ان میں مذہبی لٹریچر ہے۔

مارچ ۱۹۰۰ء میں لینن کی جلاوطنی کی میعاد ختم ہو گئی تو انہوں نے یوروپین روس کی طرف مراجعت کی۔ یہاں آکر انہوں نے پھر اپنا کام شروع کیا اور اخبار "اسکارا" از سر نو جاری کیا۔ اسکارا کے لفظی معنی شعلہ کے ہیں۔ اور "اسکارا" کے سرورق پر یہ ضرب المثل لکھی رہتی ہے "یہ شعلہ بھڑک کر ظلم و تعدی کا خاتمہ کر ڈالے گا۔"

بعض وجوہات کی بنا پر ۱۹۰۲ء میں انہیں ملک چھوڑنا پڑا۔ پیرس میں انہوں نے لیکچروں کا ایک سلسلہ بعنوان "اکاڈیمی فار سوشل سائنس" شروع کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اگر روس کی دولت ان کے قبضہ میں ہو تو وہ اسے کس طرح خرچ کریں۔ انہوں نے پیرس میں بانگ دہل کہدیا کہ زار روس کی حکومت کا خاتمہ کرنے سے وہ روس میں ناداری کا خاتمہ کرینگے۔ وہ کہتے "میں ظلم کا خاتمہ ظلم سے کرنے کیلئے تیار ہوں"

۱۹۰۳ء میں انہوں نے دوسری کانگرس سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی میں شرکت کی کانگرس میں پارٹی دو حصوں میں منقسم ہو گئی بالشویک کے معنی اکثریت کے ہیں۔ اس لئے اس پارٹی کو جو اکثریت میں تھی بالشویک کے نام سے پکارا گیا اور اقلیت کو منشویک سے منسوب کیا گیا۔ ہر دو لفظوں کے لفظی معنی اکثریت اور اقلیت کے ہیں۔ چونکہ روس میں موجودہ حکومت اکثریت پارٹی کی ہے اس لئے اسے بالشویک کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی بتلانا ضروری ہوگا کہ لینن نے ایک نہایت معمولی اختلاف کی بنا پر پارٹی کو دو حصوں میں منقسم ہو جانے دیا۔ اور عزیز ترین دوستوں سے کنارہ کشی کر لی۔ انہوں نے بڑی بیرحمی سے اپنے رفیقوں کی مخالفت کی اور اپنی تشریح کو جو مارکسٹ اصولوں پر مبنی تھی۔ ترجیح دی۔ یہ وہ وقت تھا جب ان کی شہرت کو تکبر نخوت اور بیرحمی کا گھن لگ چکا تھا۔ ان کے سب سے زیادہ عزیز دوست ٹراسکی کا خیال جو انہوں نے اپنی کتاب "انقلاب روس" میں ظاہر کیا یہ ہے۔ "باوجودیکہ وہ قابل انسان تھا مگر اس نے پارٹی کا نہایت احمقانہ قتل عام کر کے اس کا خاتمہ کر ڈالا۔"

مئی ۱۹۰۵ء میں کانگرس آف سوشل ڈیموکریٹک کا تیسرا اجلاس لندن میں منعقد ہوا۔ صرف لینن کے رفیقوں اور دوستوں نے اس میں شرکت کی لینن نے خطبۂ صدارت میں کہا "زار روس کا خاتمہ ضروری ہے اور روس کو قعر مذلت سے اٹھانے کے لئے ایک مضبوط ڈکٹیٹر کی ضرورت ہے۔" اس وقت وہ بالشویک پارٹی کے مسلمہ لیڈر تسلیم کئے جاتے تھے۔

تیسری کانگریس کے بعد وہ پھر پیٹرز برگ آ گئے۔ پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ ان کی جیب سے دو ہزار روبل کے نوٹ اور کچھ دستاویزیں برآمد ہوئیں۔ پولیس نے دو ہزار روبل ہضم کرنے کے لئے دستاویزوں کو آگ لگا دی اور لینن کو بری کر کے رپورٹ کر دی کہ ان کے پاس سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی۔ ان کی بیوی کا بیان ہے کہ اگر وہ دستاویزیں پڑھی جاتیں تو یقیناً لینن کیلئے سوائے موت کے کوئی اور سزا تجویز نہ ہوتی۔ روس میں ایک ہفتہ قیام کے بعد وہ پھر دوسرے ممالک کی جانب چلے گئے اور اپنی بیوی کو اکثر اپنے حالات لکھتے رہتے۔ مگر تفصیل کے بارے میں محتاط ہو گئے۔

لینن کی والدہ کو ان سے خاص محبت تھی۔ وہ بیچاری جب ان کے دیکھنے کو ترس گئیں تو انہوں نے ضعیف العمری میں پراگ کا سفر اختیار کیا جہاں وہ مقیم تھے۔ پراگ میں انہوں نے اپنا نام ٹڈالک رکھ لیا۔ جب بیچاری بڑھیا پراگ میں پہنچی تو معلوم ہوا اس کا بیٹا میونخ پہنچ گیا ہے۔ محبت کشاں کشاں اسے وہاں لے گئی۔ لینن کی بیوی ان کے ہمراہ تھی۔ بڑی مشکل سے لینن کو تلاش کیا اور تینوں اکٹھے زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔

ان ایام میں لینن اپنی کتاب "کیا کرنا چاہیئے" لکھنے میں مصروف تھے۔ شام کے وقت وہ بیوی اور ماں کو ہمراہ لے کر سیر کے لئے نکل جاتے اور راستے میں چپکے چپکے کتاب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے۔

اخبار "اسکارا" کا انہوں نے پھر اجرا کیا۔ وہ خفیہ طور پر اسے لکھواتے چھپواتے اور اس کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتے۔ چونکہ انہیں اکیلے ہی یہ سب کام سرانجام دینا پڑتا۔ اس لئے وہ تھک کر چکنا چور ہو جاتے مگر مایوسی کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دیتے۔ بالآخر پریس کے مالک نے اخبار مذکور چھاپنے سے انکار کر دیا۔ آخر یہ طے پایا کہ لندن کا عزم کیا جائے۔

راستے میں بھٹکتے پھرنے کے بعد وہ لندن پہنچ گئے۔ اسٹیشن پر ان کے رفیق ایلک سیو نے ان کا استقبال کیا۔ اس دن لندن میں دھند کا زور تھا اور تمام شہر پر اندھیرا محیط تھا غریب الوطنی

سرمایہ کی کمی مصائب کا ہجوم اور اس پر مستزاد ان کے دلِ حزیں کو بیقرار کرنے کے لئے کافی سے زیادہ جانکاہی کے سامان تھے۔

اگرچہ سائیبیریا کی جلاوطنی کے زمانہ میں انہوں نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ روسی زبان میں کیا تھا۔ مگر لندن میں پہنچ کر انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی زباندانی ان کے خیالات کی ترجمانی کے لئے ناکافی تھی۔ وہ لیکچروں میں جاتے اور ہائیڈ پارک میں اپنا زیادہ وقت تقریریں کے سننے میں صرف کرتے۔ ان کا تعارف دو ایسے انگریزوں سے ہو گیا جنہیں روسی زبان سیکھنے کا شوق تھا اور اس کے عوض لینن نے ان سے باقاعدہ طور پر انگریزی زبان سیکھنی شروع کی۔

لندن کی سیاحت میں وہ تمام دن بس کی سواری میں گزار دیتے وہ بس کے اوپر بیٹھ کر لندن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتے زیادہ وقت ان کا مزدور پیشہ لوگوں میں گزرتا۔ وہ کتب خانوں میں پہنچتے، سستے ہوٹلوں میں اور قہوہ خانوں میں لوگوں سے تبادلۂ خیالات کرتے۔ گرجوں میں جا کر لوگوں کے مذہبی احساسات کا اندازہ لگاتے۔ ایک دن سوشل ڈیموکریٹک گرجے میں گئے۔ جہاں ایک مزدور نے انجیل کا درس دینے کے دوران میں کہا کہ جس طرح یہودی مصر سے بھاگے تھے۔ اسی طرح ہم سرمایہ داری سے بھاگ کر سوشلزم کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ درس کے بعد تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر دعا کی کہ اے خداوندا ہمیں سرمایہ داروں سے نجات دلا کر اپنی عافیت میں لے لے۔

وہ ہر روز مارکس کی قبر پر جاتے اور گھنٹوں اس سوشلزم کے پیغمبر کے مقبرہ پر سکوت کے عالم میں عقیدتمندی کے پھول نچھاور کرتے۔

لندن میں انہوں نے ایسٹر کے فرضی نام سے وقت گزارا۔ ان کی صاحب خانہ انہیں جرمن خیال کرتی تھی۔ چونکہ انگریزی خوراک ان کی طبیعت کے موافق نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ چند سستے کمرے کرائے پر لیکر خود اپنی خوراک کا انتظام کر لیں۔

اسی اثناء میں پبلک نیوبان کراچمن اور ٹراسکی روس کے مختلف قید خانوں سے بھاگ کر لندن پہنچ گئے تھے جو سب لینن کے ہاں اکٹھے ہوتے اور روس میں ایک عظیم انقلاب پیدا کرنے کی تجاویز پر غور کرتے۔

کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے ٹراسکی کو پیرس بھجدیا اور خود جینوا جانے کا ارادہ کر لیا۔ مگر تشویش اور غم کی وجہ سے انہیں ایک خاص قسم کا مرض لاحق ہو گیا تھا جس کی وجہ سے انہیں سفر ملتوی کرنا پڑا۔ روپیہ ان کے پاس نہ تھا جس سے وہ کسی معالج کو بلا کر دوا کراتے۔ آخر ٹوٹکوں سے کچھ افاقہ ہوا اور ۱۹۰۳ء میں جینوا جانے کے لئے انہوں نے لندن کو خیرباد کہا۔ سفر میں انہیں شدت کا بخار ہو گیا۔ جینوا پہنچ کر غرباء کے محلے میں ایک کم حیثیت مکان کرایہ پر لیکر اقامت اختیار کی۔ چند روز بعد جب افاقہ ہو گیا تو پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ وہ اپنی کتابوں کے صندوقوں کو بطور کرسی اور میز کے استعمال کرتے تھے۔

جینوا میں انہوں نے اپنے مکان پر ایک مجلس منعقد کی جس میں تمام جلاوطنوں نے شمولیت کی۔ ٹراسکی بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ شام کو سب کے سب کیفے لینڈ روڈ میں جمع ہوتے "اسکارہ" کے لئے مضامین سوچتے۔ بحثیں ہوتیں۔ تنقیدیں لکھتے اور مادرِ وطن کو ظلم سے نجات دلانے کے لئے اپنی جانوں کو جوکھوں اور خطروں میں ڈالتے ۱۹۰۵ء میں روسیوں کی ایک جماعت جینوا بھیجی اور کہا کہ ہم "اسکارا" کو روس میں چھاپنے اور تقسیم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر انہیں یہ تجویز پسند نہ آئی۔ ۱۹۰۵ء میں لینن نے فن لینڈ جانے کا ارادہ کیا۔ مگر بعض وجوہات کی بنا پر انہیں ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اور وہ یک لخت روس جا پہنچے۔

یہ وہ وقت تھا جب روس میں جاپان کی فتح کی وجہ سے ایک ہیجان برپا تھا شکست کی وجہ سے پہلا انقلاب شروع ہو چکا تھا۔ ملک میں لینن کا داخلہ قانوناً بند تھا۔ اس لئے ان کی پارٹی نے خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے انہیں قطعی طور پر منع کر دیا کہ وہ کسی تحریک میں حصہ نہ لیں۔

۱۹۰۵ء کے ماسکو کے انقلاب کو لینن بہت اہمیت دیتے تھے۔ جب ماسکو کی گلیوں میں انقلاب پسند حکومت کے سپاہیوں سے لڑتے تو لینن وہاں پہنچتے۔ واقعات کی تفصیل دریافت کرتے اور صحیح واقعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ کہتے "یہ پہلی لڑائی ہے۔ جس میں روس کے مزدوروں نے حکومت کے خلاف حصہ لیا ہے اور تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔"

جب مزدور اور کسان کے مقابلہ میں حکومت کی ایک نہ چلی تو بالشویک پارٹی کو خلافِ قانون اور ناجائز قرار دیا گیا۔ مگر خفیہ طور

پر پارٹی نے اپنی جد و جہد جاری رکھی۔ ۱۹۰۶ء میں پولیس کو پتہ چلا کہ لینن روس میں موجود ہیں۔ اس لئے ان کی حراست کا وارنٹ جاری ہوا۔ مگر وہ وارنٹ کی تعمیل سے قبل فن لینڈ پہنچ گئے ۔ جہاں ہزاروں مزدور ان کے استقبال کے لئے آئے اور انہیں سر اور آنکھوں پہ بٹھا کر لے گئے۔

۱۹۰۷ء میں لینن فن لینڈ سے پیرس پہنچے۔ جہاں مشہور و معروف افسانہ نویس گورکی سے ان کے مراسم بہت زیادہ ہو گئے۔ پیرس کے اخبار نے ازراہ استحقار لکھا کہ ہم روس کی آدھی سلطنت اس شخص کو دینے کے لئے تیار ہیں۔ جو لینن زناف اور کیمنو کے علاوہ کسی چھوٹے بالشویک کا نام بتلائے ۔ ۱۹۱۲ء تک وہ مختلف ممالک میں سرگرداں رہے ۔ ۱۹۱۳ء میں انہوں نے گیلیکا میں ایک خفیہ روسی انجمن کی بنیاد ڈالی۔ روسی انقلاب پسند جوق در جوق ان کے پاس مشورہ کے لئے آ پہنچے۔ وہ اسی دھن میں لگے ہوئے تھے کہ جنگِ عظیم چھڑ گئی۔

جنگِ عظیم کے دوران میں وہ آسٹریا جا پہنچے ۔ جہاں انہیں روسی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے دوستوں کی تشویش بہت بڑھ گئی ۔ انہوں نے وائنا میں وکٹر آلڈر کو تار دیا جن کی وساطت سے وہ رہا کئے گئے۔ وہاں سے وہ سوئٹزرلینڈ پہنچے۔ ان تمام ایام میں ان کی وفادار بیوی ان کے ساتھ رہیں۔ وہ باقاعدہ طور پر ان کے مصائب میں حصّہ لیتیں ۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک وہ سوئٹزرلینڈ میں مقیم رہے اور ان تمام مجلسوں اور کانفرنسوں میں شمولیت کرتے جو ...... روس کی آزادی کے لئے منعقد ہوتیں لینن برملا کہتے کہ ہر ممکن طریقہ سے جنگِ عظیم کا خاتمہ کر ڈالنا چاہیئے۔ وہ علی الاعلان کہتے کہ روس کی خوش قسمتی اس امر میں ہے۔ کہ جنگِ عظیم میں اسے شکست ہو جائے اور زار کی سلطنت کا خاتمہ ہو جائے ۔ وہ دن دور نہیں کہ روس میں انقلاب عظیم پیدا ہو گا۔ اور ظلم و ذلّت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔

لینن کی پیشگوئی انقلاب کے بارہ میں پوری ہو کر رہی۔ فروری ۱۹۱۷ء میں انقلاب برپا ہوا۔ انقلابیوں نے عدالتوں کو آگ لگا دی ۔ بری اور بحری فوجوں میں غدر برپا ہو گیا ۔ باقاعدہ طور پہ جنگ شروع ہو گئی۔ اور چند روز بعد روس کو معزول کر کے جمہوری سلطنت قائم کی گئی۔ تاریخ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ کہ زار روس اور ان کے خاندان سے کیا سلوک ہوا۔ لینن نے فوراً روس پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کی ۔ مگر حلیفیوں نے انہیں پاس پورٹ دینے سے انکار کر دیا۔ سویڈن سے انہوں نے ایک جعلی پاس پورٹ بنوا لیا۔ مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ جہاز والے بنظر غائر پاس پورٹوں کا معائنہ کرتے ہیں تو انہوں نے یہ ارادہ ترک کر ڈالا۔ وہاں سے وہ جرمنی پہنچے ۔ اور جرمنی سے روس ۔ انہیں خطرہ تھا کہ روس پہنچتے ہی ان کی گرفتاری عمل میں لائی جائے گی ۔ مگر ان کی توقع کے خلاف ہزارہا اشخاص اسٹیشن پر ان کے خیر مقدم کے لئے موجود تھے ۔ باقاعدہ طور پر ان کا جلوس نکالا گیا ۔ اور وہ راستہ میں جابجا تقریریں کرتے اپنے مکان پر جا پہنچے ۔

روس میں عارضی حکومت قائم ہو چکی تھی مگر وہ بالشویک پارٹی کے اصولوں پر مبنی نہ تھی ۔ ۱۷ اپریل ۱۹۱۷ء کو لینن نے اخبار پر ودا میں اپنی پارٹی کا پروگرام شائع کیا۔ جس میں وضاحت کے ساتھ بتایا کہ جلد سے جلد وہ علاقے آزاد کر دئے جائیں گے جو حکومت نے ملحق کر رکھے ہیں۔ حکومت لوگوں کے ہاتھ میں دی جائے گی اور اصلی معنوں میں جمہوریت ہو گی ۔ پولیس اور فوج کے محکمے اڑا دئے جائینگے تمام زمین دستکاری حرفت اور صنعت سلطنت کی ملکیت تصور ہونگے۔ بنکوں کا خاتمہ کر ڈالا جائے گا ۔ کوئی متنفس روس میں بھوکا نہ رہیگا۔ یہ ضروری ہوگا کہ تمام لوگ پیٹ بھر کر کھانا کھائیں۔ بجائے اس کے چند لوگ پلاؤ یا قورما کھا کر مست رہیں اور دوسرے پیٹ پر پتھر باندھ کر فاقہ کریں۔

عارضی حکومت کے ارباب بست و کشاد کو لینن کی تجاویز پسند نہ آئیں ۔ اس لئے انہوں نے لینن کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا وہ بھاگ نکلے ۔ ان کی گرفتاری کے لئے دو لاکھ کا انعام مقرر ہوا۔ لینن نے ایک دوست کے ہاں پیٹرز برگ کے نواح میں ایک گاؤں میں پناہ لی۔ جب وہ چھپتے چھپتے اکتا گئے تو ایک دن قریب کے سرکاری جنگل میں اپنی بندوق لے کر نکل گئے۔ جنگل کے افسر نے انہیں دیکھ پایا۔ ان سے بندوق چھین لی　　　اور انہیں بہ جبیں ہوا۔ خیر گزری کہ لینن کا میزبان وقت پر آ پہنچا اور اس کو یہ کہہ کر ٹال دیا ۔ کہ میرا مہمان فن لینڈ کا رہنے والا ہے اور روسی قطعاً نہیں جانتا۔

موسم سرما کے آغاز میں لینن اور زناف نے پھر ملک کو الوداع کہا اور فن لینڈ جا پہنچے ۔ وہاں لینن ...... جعلی پاس پورٹ بنانے

ہیں کامیاب ہوئے اور بھیس بدل کر جرمنی جا پہنچے۔ جرمنی سے وہ ہر روز ایک مقالہ "افتتاحیہ" "اسکارا" کے لئے لکھ کر ایک ریلوے آفیسر کی وساطت سے پیٹرز برگ بھیج دیتے۔

جرمنی میں قیام کے زمانہ میں لینن کی ایک پولیس افسر سے بہت دوستی ہو گئی جو ہر طرح سے ان کی امداد کرتا۔ جوں جوں روس میں واقعات وحشتناک اختیار کرتے۔ لینن گھبراتے۔ بالآخر انہوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ روس کے سرحدی علاقہ میں مقیم ہو جائیں تاکہ موقعہ پر فوراً روس پہنچ جائیں۔ پولیس افسر کے ذریعہ سے وہ جعلی پاسپورٹ بنانے میں کامیاب ہو گئے اور حجام سے مصنوعی بال اور لمبی داڑھی حاصل کر لی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء کے آغاز میں وہ پیٹرز برگ پہنچ گئے۔ ۲۴ اکتوبر کو دوسرا انقلاب زور شور سے شروع ہو گیا۔ ۲۵ اکتوبر کو انقلابیوں نے عارضی حکومت ۔ ۔ ۔ ۔ پر قبضہ کر لیا اور ۷ نومبر کو ملک کے تمام ڈاکخانے ان کے ہاتھ لگ گئے۔ فوجوں نے عارضی حکومت کے خلاف اعلان کر دیا اور بالشویک پارٹی سے جا ملے۔ وزیر اعظم جس نے عارضی حکومت قائم کر رکھی تھی بھاگ نکلا۔ اور بالشویک پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ لینن نے ایک جلسہ منعقد کیا اور زبردست تقریر کی۔ اگلی صبح کو انقلابیوں نے ملک پر پورا قبضہ کر لیا اور لینن جمہوریت کے صدر اولین انتخاب کئے گئے۔

صدر ہوتے ہی انہوں نے فوجوں کو ترتیب دی۔ ملک میں امن قائم کیا۔ جن علاقوں میں سخت قحط برپا تھا۔ وہاں خوراک بہم پہنچانے کے انتظام کئے اور پھر جرمنی سے عارضی صلح کر لی۔ پیٹرز برگ کی جگہ ماسکو دارالسلطنت بنایا تو لوگوں نے اس تبدیلی کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا۔ مگر لینن نے برہم ہو کر کہا اگر پھر لڑائی چھڑ جائے تو جرمن فوراً پیٹرز برگ پر قبضہ کر لے گا۔ مگر ماسکو پہنچنا کارے دارد کا معاملہ ہے۔ ماسکو میں وہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتے۔ ایک معمولی مکان میں سکونت تھی اور سوائے ملکی بہبودی کے ان کے پیش نظر کچھ نہ تھا۔

۱۹۱۸ء میں دورا الیکن نے لینن پر حملہ کیا۔ وہ سخت زخمی ہوئے۔ اور عرصہ دراز تک ہسپتال میں صاحب فراش رہے۔ ان کی بیماری کے زمانہ میں پھر ابتری پھیل گئی اور ملک بھر میں مہیب خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔ بالشویک پارٹی نے نہایت بردباری سے کام لے کر ان خانہ جنگیوں کا خاتمہ کیا اور ملک پر پھر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ لینن اس زمانہ میں بھی جبکہ وہ سخت بیمار تھے روزانہ رپورٹیں سنتے اور مناسب احکام جاری کرتے۔ ملک کی حالت دگرگوں تھی خوراک کی کمی سے قحط برپا تھا۔ دوسری طاقتوں نے تمام راستے مسدود کر رکھے تھے اور باہر سے غلہ کی آمد و رفت بند تھی۔ لینن ایک مدبرانہ چال چلے۔ اغراض و مقاصد کو بالائے طاق رکھ کر سوویٹ اصولوں کو یک قلم منسوخ کر دیا اور حکم دیدیا کہ ہر متنفس کی جائیداد علیحدہ علیحدہ ہو گی کرنسی کا اجرا کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ چند ماہ کے اندر ہی پھر دکانیں کھل گئیں۔ امریکہ اور مغربی یورپ سے غلہ آنا شروع ہو گیا۔ اقتصادی حالت بہتر ہو گئی۔ لوگ کاروبار میں دلچسپی لینے لگے اور لینن کے تدبر کا یہ ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ اگرچہ یہ بات کمیونسٹ اصولوں کے خلاف تھی مگر وہ سمجھتے تھے کہ ان کے سامنے لوگوں کا مفاد ہے۔ نہ کہ اصولوں کی اندھا دھند پیروی، ان کی پارٹی کے لوگ ان سے بگڑے۔ مگر انہیں اس کی بھی چنداں پرواہ نہ ہوئی۔

لینن کو اپنے اوپر بہت اعتماد تھا۔ ان کی تمام زندگی اس امر کی شاہد ہے کہ راستی کے معاملے میں وہ اپنے عزیز ترین دوستوں کی بھی پرواہ نہ کرتے بلکہ بسا اوقات بیوی کو بھی نظر انداز کر جاتے۔ وہ اصول کے لئے پارٹی اور دیگر رفقا کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتے وہ کبھی خطرات سے مرعوب نہ ہوتے۔ بلکہ قومی مفاد کے لئے ہر خطرہ میں کود نے کے لئے تیار رہتے۔ غربت افلاس اور جھگڑوں میں بحیثیت ڈکٹیٹر ہونے کے ان کی بعینہ وہی حالت تھی جو ہر مزدور کی تھی۔ لفظ کامریڈ ان کی ایجاد کردہ اصطلاح ہے۔

شروع شروع میں لوگ اس کی بڑی ہنسی اڑاتے۔ آزادی کے لئے وہ خون گرانے کی مطلقاً پرواہ نہ کرتے۔ جب وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہوتے تو ان کی طبیعت پر کوئی خاص اثر نہ ہوتا۔ کئی کئی دن تک وہ فاقہ کشی کرتے مگر اصول سے ذرہ بھی نہ ہٹتے۔ مزدور کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے اور ہر ممکن طریقہ سے اس کے علاج کی سعی کرتے۔ بحیثیت ڈکٹیٹر وہ مزدوروں، سپاہیوں، کسانوں اور غریبوں کے پاس گھنٹوں کھڑے ان کی تکلیف کا ماجرا سنتے رہتے اور ان کے رفع کرنے کی امکانی تدابیر عمل میں لاتے۔ وہ محض کمیشنوں کی رپورٹوں پر اکتفا نہ کرتے۔ بلکہ خود گاؤں گاؤں پہنچ کر حالات کا اندازہ لگاتے اور اس کے دفعیہ کی حیثیت سے

پیش آتے۔

انہیں امیرانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹھاٹھ سے سخت نفرت تھی۔ ان وجوہات کی بنا پر جہاں ان کا پسینہ گرتا وہاں لوگ اپنا خون بہاتے۔ ۱۹۱۹ء کے قحط کے زمانہ میں ان کے گھر میں ایک وقت سے زیادہ کا کھانا نہ ہوتا۔ لوگ خود بھوکے رہ کر ان کے لئے کھانا لاتے تو وہ کہتے میں اسے بدترین فعل سمجھتا ہوں کہ لوگ بھوکے رہیں اور میں خود عیش کی زندگی بسر کروں۔

اٹلی کے ماہی گیر لینن کے حسنِ اخلاق کے گرویدہ تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے گورکی سے لینن کے متعلق دریافت کیا کہ ان کا کیا حال ہے۔ جب گورکی نے بتلایا کہ لینن ملک کے ڈکٹیٹر مقرر ہو چکے ہیں۔ تو ماہی گیروں نے کہا بخدا وہ لوگوں کی بہتری کے لئے ڈکٹیٹر بنا ہے۔ وہ نہایت ہی ایماندار اور روشن ضمیر انسان ہے۔

۱۹۰۷ء میں لندن کے مزدوروں نے ان کی بابت کہا کہ وہ اصلی معنوں میں ہمارا کامریڈ ہے۔ لینن بڑے مردم شناس تھے۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو فوجی جرنیل مقرر کیا جو فوج کے ابتدائی مراحل سے بھی ناآشنا تھے۔ ان لوگوں کو کمانڈر مقرر کیا جنہوں نے کبھی تلوار کو چھوا تک نہیں تھا۔ ایڈیٹروں کو سفیر مقرر کر کے دور دراز ملکوں میں بھیجا اور کسانوں کو ملکی حکومت کے اندر ایسے عہدے دئے کہ اہلِ دنیا سن کر حیران رہ گئے۔ لیکن ان سب عہدہ داروں نے اپنے فرائض اس خوش اسلوبی سے انجام دئے کہ ان سب کا تقرر لینن کا ایک معجزہ تصور ہوتا ہے۔ روسی سلطنت کا آئین دنیا میں آپ ہی اپنی مثال ہے۔

غم، پریشانیاں، تشویش، فاقے، افلاس، غربت یہ تمام افکار ومصائب اور روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنا آخر اپنا رنگ لایا۔ مارچ میں انہیں دائیں جانب فالج گرا اس حالت میں بھی وہ سلطنت کے کاموں میں باقاعدہ حصہ لیتے رہے۔ انہوں نے ہر ممکن دوا کی مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

مرض کی حالت میں بھی انہوں نے تین معرکتہ الآرا تقریریں کیں۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے لکھنا سیکھ لیا تھا۔ جس سے جملہ کاروبار سلطنت کرتے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کی حالت رو بصحت ہو گئی۔ مگر یہ عارضی تغیر تھا۔ کرسمس کے موقعہ پر انہوں نے بیکس غریب بچوں کے لئے کرسمس ٹری بنوائے اور بچوں کو اپنے مکان پر بلا کر خود ان کی خوشیوں میں شامل ہوئے۔ آخر بیماری پھر عود کر آئی۔ انہیں پہلے ہی معلوم ہو گیا کہ وقت قریب آ رہا ہے۔ وہ اس سے قطعی ہراساں نہ ہوئے۔ رشتہ داروں کو تسلی دیتے۔ دوستوں کو اتفاق کی نصیحت کرتے اور کہتے میری موت میں بھی ایک راز مضمر ہے ع

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

بالآخر ۲۱ جنوری ۱۹۲۴ء کو شام کے چھ بجے لینن اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ڈاکٹروں نے ان کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا اور انہیں تعجب ہوا کہ یہ شخص انتہائی علالت میں کس طرح اتنی دیر زندہ رہا۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ وہ اپنے آپ کو ملک وملت کی خاطر قربان کر گیا۔

ان کے انتقال کے بعد ان کی قدر ومنزلت کے اصلی جوہر یورپ پر ظاہر ہوئے۔ ان کی زندگی میں بیرونی پریس انہیں ڈاکو اور جرمن جاسوس خیال کرتا لیکن سچائی ظاہر ہونی شروع ہوئی اور بڑے بڑے مورخوں اور مصنفوں نے ان پر کتابیں لکھیں۔ کارل کاٹسکی اور آٹو کیدر نے لکھا کہ وہ ایک عظیم الشان ہستی تھی جو دنیا سے اٹھ گئی۔ پال لیو نے کہا کہ وہ اعلیٰ پایہ کا مدبر تھا۔ ہیرٹ نے کہا کہ وہ خاص قابلیت کا انسان تھا۔ دل قومی درد سے لبریز تھا۔ ٹامس مین نے اعتراف کیا کہ وہ مجسم ۔ ۔ ۔ ۔ تنظیم تھا۔ اس کی قوتِ ارادہ بلا کی تھی۔ رومن نے عقیدت کے پھول چڑھائے۔ مشہور ومعروف انگریز انشاء پرداز رسل نے لکھا کہ لینن کی موت نے دنیا کو ایک جلیل القدر انسان کے جذبات سے محروم کر دیا۔ وہ ایک نکتہ رس فلسفی اور عملی کام کرنے والا انسان تھا۔ برنارڈ شاہ نے خون کے آنسو بہائے اور کہا کہ وہ دن دور نہیں جبکہ لندن میں لینن کا بت جارج واشنگٹن کے پہلو میں نصب کیا جائے گا۔ آج انگریزی پریس لینن کے خلاف ہے۔ کل وہ جارج واشنگٹن کے خلاف زہر اگلتا تھا۔

مزدوروں اور کسانوں کی محبت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے لینن کی موت کی خبر کا باور کرنے سے بالکل انکار کر دیا۔ اور کہنے لگے کہ لینن نے موت کا بہانہ کیا ہے۔ تاکہ یہ دیکھیں کہ ملک کے وزرا کس طرح کام کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ پھر ہم میں آ جائیں گے اور اچھا کام نہ کرنے والوں کو ان کی

بدکرداری کی سزادیں گے۔

یہ کہنا مبالغہ آمیز نہیں کہ لینن واحد شخص تھا... جس نے زار روس کی ظالم سلطنت کا خاتمہ کیا۔ وہ پیٹر اعظم سے کسی حیثیت میں کم نہ تھے۔ لینن پیٹر اعظم کے مداح تھے۔ انہوں نے پیٹروگریڈ کے شہر میں کوئی تبدیلی نہ ہونے دی۔ وہ کہتے کہ پیٹر پہلا انقلابی شخص تھا اور ان کی تعمیرات میں مداخلت کرنا گناہ ہے۔

لینن کی کامیابی کا راز اسی امر میں تھا کہ وہ کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم پہ ملک بھر کی تنظیم کو محمول کرتے تھے۔

لینن نے تمام ملک میں کاشت کا سائنٹفک طریق پہ رائج کیا۔ گاؤں گاؤں بجلی لگادی۔ انگریز، امریکن اور جرمنی انجنیروں کو ان کے ملکوں سے بلا بلا کر چند دنوں میں ان کی امداد سے ملک کی کایا پلٹ دی۔ ماسکو میں ایک درس گاہ قائم کی جس سے وہ لوگوں کی ذہنیت اور استعداد کا اندازہ لگاتے اور ہر شخص کے سپرد وہی کام کیا جاتا جو اس کا اہل نظر آتا۔

یہ دراصل قابل غور بات ہے کہ آٹھ سال کے قلیل عرصہ میں لینن نے ملک کی کس طرح کایا پلٹ دی، جہاں سینکڑوں آدمیوں میں سوائے چند ایک کے لکھا پڑھا نظر نہ آتا تھا۔ وہاں ۱۹۲۵ء میں کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو ان پڑھ ہو۔ سفری اسکول اور لازمی تعلیم نے وہ اعجاز کر دکھایا کہ اس سے پیشتر نظر نہیں آیا تھا۔ شفاف سڑکیں۔ نہریں صنعت وحرفت کے کارخانوں کا جال اس طور پر ملک میں پھیلا گویا وہ زمین کی خودرَو پودھیں۔

الغرض اس انیس سالہ بچے نے جو پیشگوئی کی تھی کہ زار کی سلطنت کو وہ تباہ کرے گا۔ حرف بحرف سچی نکلی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ گمنامی میں دربدر پھرنے والا انسان ایک عظیم الشان سلطنت کی طرح ڈالے گا۔ کسے معلوم تھا کہ ایک فاقہ مست انسان بنی نوع انسان کو ظلم وتعدی کی زنجیروں سے نجات دلا کر امن وعافیت کی ایک لہر دوڑا دے گا۔

جب اس نے پہلی اور دوسری کانفرنسیں قائم کیں اور کہا کہ تیسری کانفرنس کے بعد روس میں تھرڈ انٹرنیشنل کی حکومت ہوگی۔ تو عوام اس پہ آوازے کستے اور اس کی دماغی توازن کی صحت میں شک وشبہ کرتے۔ مگر قدرت دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی کہ اس کی بے لوث قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاسکتیں۔

ہمیں اس سے غرض نہیں کہ لینن کی وفات کے بعد ملک میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ ہمیں اس سے بھی واسطہ نہیں کہ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ جن کی نیت پر دنیا شک کرتی ہے ہمیں اس سے بھی بحث نہیں کہ وہ پھر گمراہی کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں۔ مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ صدیوں بعد جب روسی ماں اپنے ننھے بچے کو زار روس کے ظلموں کا افسانہ سنائے گی تو اس کی آنکھوں سے محبت کے آنسو جاری ہوں گے۔ وہ جھوم کر کہے گی کہ عرصہ ہوا ایک شخص لینن نے ہمیں ظلم وتعدی سے نجات دلائی تھی۔

کے۔ اے حمید (بی۔ اے لنڈن)
بیرسٹر ایٹ لا

غزل

مجھے کس طرح تیری سربلندی کا یقین ہوتا / اگر تیری طرح سر اک اور بھی کوئی کہیں ہوتا
یہ جلووں کی فراوانی بجا! یہ لذتیں برحق! / مگر کہتا ہے دل لے کاش تو پردہ نشیں ہوتا
مری رفعت پسندی کو اگر دنیا نہ ٹھکراتی! / مرے قدموں تلے اک روز یہ چرخِ بریں ہوتا
کٹھن ہیں راستے لیکن نہ کچھ پروا مجھے ہوتی / اگر تو اس سفر میں بے کسوں کا ہمنشیں ہوتا
میں تب کہتا کہ کوئی مصلحت ہے حُسن کے پردے میں / اگر یہ سارا عالم عشق کے زیرِ نگیں ہوتا!
ندیم اک وہ اگر مجھ کو ذرا ہنس کر بلا لیتے / جہاں سارا مرے خوانِ سخن کا ریزہ چیں ہوتا

احمد ندیم قاسمی

دُنیا

دفتر کے مطالبہ پر عزیزہ فاضلہ شرافت بیگم اعجاز ادیب فاضل و منشی فاضل پنجاب یونیورسٹی نے ذیل کی سبق آموز مسلسل غزل عنایت کی ہے۔

خیالات کی پاکیزگی، الفاظ کی موسیقی۔ مصرعوں کی ہم آویزی، برجستگی اور انداز نگارش کی طرفگی نے اس غزل کو شاعری کا دلپذیر نمونہ بنا دیا ہے۔ اُمید ہے کہ ملک کی اکثر جدید تعلیم یافتہ خواتین شبابی قسم کی یک رنگ و بد آہنگ نظم نگاری کی دلدادہ نظر آتی ہیں۔ اُن کے لئے یہ رُوح فروز غزل نشانِ راہ بن سکے گی۔ (ادارہ)

گُل بہ آغوشِ خار ہے دنیا ــــ خار گیا خارزار ہے دنیا
اِس کے جلوے نمائشی جلوے ــــ اِک چراغِ مزار ہے دنیا
دہرِ بے اعتماد پر مت بھول ــــ وقتِ بے اعتبار ہے دنیا
لے سبق حادثاتِ دوراں سے ــــ عبرت آموزگار ہے دنیا
اہلِ دنیا ہیں خلفشار پسند ــــ عرصۂ کارزار ہے دنیا
عہد پیماں شکن بھی ہے کمزور ــــ اس سے ناپائیدار ہے دنیا
اس کی نیرنگیاں خدا کی پناہ ــــ گردشِ روزگار ہے دنیا
کل یہی ہوگی تیری دشمنِ جان ــــ آج اگر جاں نثار ہے دنیا
نت نئے رُوپ یہ بدلتی ہے ــــ مثلِ لیل و نہار ہے دنیا
خرمنِ آرزو و ارماں کی ــــ برقِ بے زینہار ہے دنیا
خاک اُڑتی ہے اس گلستاں میں ــــ گلشنِ بے بہار ہے دنیا

جُرم ہے اس میں رفعتِ پرواز
سرفرازوں کی دار ہے دنیا

شرافت بیگم اعجاز ادیب فاضل و منشی فاضل

انوکھا جوہری

محترمی جناب مدیر ماہنامہ "شاہکار"

تسلیم۔ اس عریضے کے ساتھ ایک افسانہ "انوکھا جوہری" ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ یہ افسانہ میں نے ریڈیو میں براڈ کاسٹ کرنے کی غرض سے لکھا تھا۔ مگر ریڈیو والوں نے اسے یہ لکھ کر واپس کر دیا کہ "افسانہ خوب ہے مگر ہمارے کام کا نہیں"۔ آپ اس افسانے کو فنی نقطۂ نگاہ سے ملاحظہ فرمائیں اور پھر ریڈیو والوں کی بے دماغی کا اندازہ فرمائیں۔

میرے افسانے ہندوستان کے مقتدر ماہناموں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ افسانوی ادب کا مطالعہ میری فرصتوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ ایک مدت سے فن افسانہ نگاری سے متعلق مغربی لٹریچر کو زیر مطالعہ رکھتا ہوں۔ لہٰذا رسائل کے ماہر فن مدیر میرے افسانوں کو محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

مگر بدقسمتی سے سیکڑوں دوسرے بلند رتبہ انشا پردازوں کے ساتھ ہی میں بھی چونکہ ریڈیو والوں کے شرف قرابت وسعادت ہم مشربی وہم مجلسی سے محروم ہوں۔ اس لئے ریڈیو کے کارکنوں کی نگاہ التفات کا مستحق نہیں! —— گذشتہ چند ماہ کا یہ واقعہ لاہور کے ادبی حلقوں میں باعث تفریح رہا ہے کہ لاہور ریڈیو اسٹیشن کے اسسٹنٹ پروگرام منیجر نے مجلس بخارائی کے ایک ممبر سے ریڈیو کے لئے افسانہ لکھنے کی فرمائش کی۔ اس غریب نے اپنی ادبی زندگی میں کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھا تھا۔ نہ وہ اس فن سے کچھ دلچسپی رکھتا تھا۔ اس لئے یہ صحیح عذر پیش کیا کہ "میں افسانہ نگاری سے نابلد ہوں" مگر پروگرام منیجر کی بے کمال نوازی نے بہ اصرار تمام اسے افسانہ لکھنے پر مجبور کیا اور اسکی پہلی مشق ریڈیو کے ذریعہ براڈ کاسٹ کی گئی۔ ریڈیو والوں کا خود سرانہ سلوک فن کار ادبار کے لئے جسقدر صبر آزما ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ فرمائیے! اس واقعے کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا یہ دعویٰ غلط ہو گا کہ دلی، لاہور، پشاور، لکھنؤ اور بمبئی کے ریڈیو اسٹیشنوں پر بخاری امت کا تسلط احباب نوازی اور اقارب پروری پر پبلک فنڈ کا بیجا استعمال کر رہا ہے۔ بہت سے ماہرین ادب انشار کے افادات سے ملک کو محروم کیا جا رہا ہے۔ اور غیر مستحق احباب واقارب کو اردو ادب کی تاریخ میں "زبردستی داخل کیا جا رہا ہے"۔

پرشوتم لال ضیاؔ بی۔ اے

دکان کی روپہلی محراب سے آویزاں سائن بورڈ پر لکھا تھا ——

"سیٹھ رگھو دمن جوہری" شیشے کے بیرونی شوکیس ایک خاص اسلوب سے مرتب تھے۔ اور ان میں سجائے ہوئے زیورات نہایت دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔ دکان کے اندر رگھو دمن ایک معزز خریدار سے تاجرانہ گفتگو کر رہا تھا۔ دفعتہً اس کی گھڑی کی وزنی زنجیر میز پر پڑے ہوئے گلدستے سے ٹکرائی۔ خریدار اور دکاندار دونوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ خریدار نے جھکتے ہوئے دریافت کیا "کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں جناب؟"

رگھو دمن کی پھرتیلی اور لمبی لمبی انگلیاں تھرا گئیں۔ جب اس نے لاکٹ کو کھول کر خریدار کو پیش کیا۔ کچھ دیر غور سے دیکھنے کے بعد خریدار نے پوچھا۔ کیا یہ لاکٹ بھی فروخت کے لئے ہے مسٹر دمن؟"

"کیا فرمایا؟ یہ لاکٹ! میں اسے جدا نہیں کروں گا جناب" رگھو دمن نے ایک سرد آہ بھر کر نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

یکایک خریدار نے چونک کر کہا۔ "یہ کیا؟ اس سے تو کچھ بال چمٹے ہوئے ہیں اور پھر بال بھی اس قدر سیاہ اور لطیف!"

دمن مسکرا دیا۔ "میں خوب جانتا ہوں اسے" یہ کہتے ہوئے اس نے بیتابی سے لاکٹ کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"اگر میں یہ دریافت کروں کہ آپ کو اسے بیچنے سے انکار کیوں ہے۔ تو آپ برا تو نہ مانیں گے؟ خریدار نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

دمن کے شانوں کو جنبش ہوئی۔ "یہ داستان بہت پرانی ہے صاحب —— جب میں عہد شباب میں کلکتے کے ایک کالج میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔"

سنجیدہ تاجر نے جھکتے ہوئے اپنی عینک اتار کر میز پر رکھ دی۔

لاکٹ سیاہ مخمل کے پیڈ پر چمک رہا تھا۔

"میں نے ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں یہ فیصلہ کیا" دمن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "کہ اس بار مہاراشٹر کے ساتھ ساتھ امرکنٹک، کپل دہارا، اور بندھیاچل کی رومان انگیز وادیوں کی سیر کی جائے پھر کیا تھا، چھٹے ہی روز میں نے اپنے آپ کو ہمیمنی بالا کے مشہور ہوٹل میں ایک سیاح کی حیثیت سے مقیم پایا۔ یہ ہوٹل ایک قلعے میں واقع تھا۔ رات کے وقت میرے کمرے میں کوئی مصنوعی روشنی تو تھی نہیں البتہ مشرقی کھڑکی سے چاند کی کرنوں کا ایک سیلاب سا امڈا چلا آرہا

تھا۔ مجھ پر خوشگوار غنودگی کا عالم طاری ہونے لگا۔ اور میں بستر خواب پر لیٹ گیا۔ ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ میری نگاہوں میں ایک سایہ سا گھوم گیا۔ مجھے اُٹھ کر بیٹھ جانا پڑا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک مستِ شباب، نوخیز حسینہ بڑے دروازے میں کھڑی چاند کی مسکراتی ہوئی کرنوں کو اپنے سحر پاش تبسم سے شرمانے میں مشغول ہے۔"

خریدار کی نظریں فوراً لاکٹ سے جُدا ہو کر دمن کے چہرے پر جم گئیں۔

"میں ایک نامعلوم جذبۂ بے اختیار کے زیر اثر اُس سراپا جمال کی طرف بڑھا۔"

دمن کا سانس تیز ہو گیا۔ "لیکن وہ جلدی سے کمرے کو چھوڑ گئی۔ صبح ہوتے ہی میں نے ہیمنتی بالا سے اِس غیر معمولی مشاہدے کا ذکر کیا تو وہ ہنس کر بولی۔ "آپ نے صرف خواب دیکھا ہو گا۔ خواب۔ میرے یہاں صنفِ نازک کا کیا کام؟ اِس جگہ تو صرف آپ ایسے چند مسافر یا دو ایک مصوّر قیام پذیر ہیں اور بس"۔ اس غیر متوقع جواب سے میری تسلّی نہ ہوئی۔ دوپہر کو میں بندھیاچل کی سیر کے لئے نکل گیا۔ لیکن میرا دل قلعے کی چار دیواری میں اُس زہرہ جبیں کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ جس کے سبب میرے بے چین ارمان اور بیتاب تمنائیں نربدا کی مچلتی ہوئی موجوں کے ساتھ ساتھ سر دھنتی اور لڑکھڑاتی بہی جا رہی تھیں۔ پہاڑ کی بلندی پر تعمیر کئے ہوئے مندر مجھ سے تعریف حاصل کرنے میں ناکام تھے۔ میرا ناصبور دل تو اُسی کافر ادا، رشکِ قمر کے دلفریب تصوّر کی آغوش میں محوِ اضطراب تھا۔ میری بیقراری اس درجہ بڑھ گئی کہ شام ہونے سے پہلے ہی مجھے قلعے کی جانب لوٹنا پڑا۔ میری نظر ایک چھوٹے سے کمرے کی دیوار پر پڑی۔ جھٹ پٹے کی مدھم روشنی میں مجھے ایک سنہری فریم میں اُسی ملکۂ لطافت کی غیر مکمل روغنی تصویر دکھائی دی۔ یقیناً وہ کسی مصوّر کے لئے ماڈل ہو گی، میرے دل نے کہا، جو اُسے ایسے دُور افتادہ اور پرسکون قلعے میں لا کر اپنی زندگی کا عدیم المثال شاہکار تیار کر رہا ہے۔"

"کھانا کھا چکنے کے بعد میں اپنے کمرے سے چہل قدمی کے خیال سے برآمدے میں نکل آیا۔ کمرے میں واپس جانے پر میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میرا لیمپ بجھ چکا ہے اور کرسی بھی اپنی ٹھیک جگہ پر نہیں۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے کمرے میں اکیلا نہیں ہوں۔ اسی تذبذب میں مجھ پر ایک گونہ بیخودی چھانے لگی۔ مجھ پر عطر بار سانسوں کا جادو چل چکا تھا۔ چند ہی لمحوں میں خاموشی کا یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ نظّارہ سوز جلوہ ایک لطیف سی سرسراہٹ کے ساتھ بڑے دروازے کی سمت بڑھا اور مجھے لرزہ براندام چھوڑ کر غائب ہو گیا۔"

خریدار کے ہاتھ لاکٹ پر تھے اور اُس کی آنکھیں دکاندار پر۔

"جیسا کہ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں میں نے یہ تمام ماجرا ہیمنتی بالا سے بیان کر دیا۔ جس نے مجھے ہنسی ہنسی میں صرف یہی کہہ کر ٹال دیا، معاف کیجئے گا۔ آپ بہت خوفزدہ سے نظر آ رہے ہیں! میں امید و بیم کی حالت میں اپنے کمرے میں واپس آ کر لیٹ گیا۔ لیمپ کی مرتعش روشنی کے کیف آفریں عکس سے فضا کے ذرّے ذرّے میں مجھے فردوس نظر آتا تھا۔ ابھی کوئی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ میری بیقراری کی دیوی کمال نزاکت سے کمرے میں داخل ہوئی اور میرے نزدیک آ بیٹھی۔ میں دیوانہ سا ہوا جا رہا تھا۔ میرے خون میں فرطِ محبت سے ایک لہر دوڑ گئی۔ یک لخت وہ میرے نقدی والے رومال پر جھپٹی اور تیزی سے اُٹھ بیٹھی۔ چند لمحے پیشتر کی سرور پاش رنگینی کے بعد یہ تلخ تجربہ میری بیخودی کے لئے زہر قاتل ثابت ہوا۔ آنِ واحد میں میرا ہاتھ اُس کے سیاہ اور لطیف بالوں میں اُلجھ گیا میں اپنی گرفت کو اور زیادہ مضبوط کرنے ہی والا تھا کہ وہ مجھے جھٹکا دے کر نکل گئی۔ چند منٹ تک مجھ پر جانے کیسی کیفیت طاری رہی۔ جب ذرا ہوش آیا۔ تو میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں میں کچھ بال ہیں۔ انہیں سلجھانے پر مجھے معلوم ہوا کہ بالوں کے ساتھ اُس ستم شعار حسینہ کا طلائی لاکٹ بھی میرے پاس آ گیا ہے اور وہ لاکٹ یہی ہے جس پر اس وقت ہم دونوں کی نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔" دمن نے بڑی ملائم آواز میں کہا۔

"لیکن وہ تھی کون؟ آپ نے معلوم کیا؟" خریدار کی دلچسپی بڑھ گئی۔

"معلوم کیوں نہ کرتا؟" دمن نے مدبرانہ انداز میں جواب دیا۔ "اسی صبح میں نے یہ تمام حقیقت نہایت سخت لہجے میں ہیمنتی بالا سے کہی جس پر وہ سہم کر بولی: وہ تھی میری لڑکی۔ موہنی بالا۔ جو آج سے دس سال پہلے انتقال کر چکی ہے۔ شاہزادہ ٹراونکور کو اسی قلعے میں اُس سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن بعد میں شہزادے کی بیوفائی سے موہنی کا دل ٹوٹ گیا۔ اسی یاس کے عالم میں وہ چٹان سے کود پڑی۔ اس وقت سے آج تک ہر سال اُس کی رُوح اِس حادثۂ مہلک کے دن قلعے میں آیا کرتی ہے۔ اتفاق سے آپ کے قیام ہی میں وہ تاریخی دن آ گیا ہے۔"

"لیکن۔" جواہرات کے خریدار نے دمن سے سوال کیا۔ "آپ

بالوں اور لاکٹ کے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں" دمن نے مسکرا کر کہا "یہ منتی نے موہنی کی روح کا قصہ صرف لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے گھڑ رکھا تھا۔ مقصد اس کا ہوٹل کے مسافروں کو موہنی کے ذریعے سے لوٹنا تھا۔ بہرحال کچھ بھی ہو۔ موہنی کے زہد شکن حسن کی یاد کا تقاضا ہے کہ اس رومان پرور ساحرہ کے بالوں اور لاکٹ کو ہر وقت اپنے پاس رکھوں۔"

نوجوان خریدار نے لاکٹ کو میز سے اٹھایا اور محبت بھرے الفاظ میں کہا "تو کیا آپ اس کے بیس پونڈ نہیں لے سکتے؟"

"مگر یہ اس کی قیمت نہیں ہو سکتی۔" دمن نے انکار کرتے ہوئے کہا "کسی محبوب یادگار کی قیمت بیس پونڈ نہیں ہوا کرتی۔"

"یادگار ہی کے لئے تو میں بیس پونڈ پیش کر رہا ہوں۔ ورنہ زیور تو صرف کوئی پانچ ایک پونڈ کا ہوگا۔" خریدار نے التجا کی۔ "موہنی کی یاد کا واسطہ دیتا ہوں۔ لاکٹ میرے حوالے کیجئے جناب۔"

"بالکل نہیں جناب۔ آپ مجھے خواہ مخواہ مجبور فرما رہے ہیں۔"

رپو دمن نے احسان کی نظریں گاڑتے ہوئے کہا "خیر اگر آپ واقعی ۔۔۔"

لاکٹ کے نئے مالک نے لاکٹ کو جیب میں کمال حفاظت سے رکھ لیا اور دمن سے ہاتھ ملا کر دکان سے باہر نکل گیا۔ شام کو سیٹھ رپو دمن گھر پہنچے تو اُن کی بیوی نے بڑے فخر سے کہا "دیکھئے میں کیسا اچھا کھانا تیار کر سکتی ہوں!"

"واقعی!" دمن نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن یہ بھی تو خیال فرمائیں کہ میں کیسی انوکھی تجارت کر سکتا ہوں۔ ابھی آج ہی ایک لاکٹ بیس پونڈ کو فروخت کیا ہے!"

"دیکھئے۔ میرے حال پر رحم کیجئے" بیوی نے درد بھری آواز میں کہا۔

"آپ کب تک نوجوانوں کو یہ رومان انگیز افسانے سُنا سُنا کر دھوکا دیتے رہیں گے؟ ہر روز میرے بالوں کو کاٹنے کی بجائے اب انہیں سفید ہونے کے لئے چھوڑ دیجئے!"

پرشوتم لال ضیا بی۔ اے

آجکل

لاہور چل کہ یار غزل خواں ہے آجکل
یعنی چراغِ خلوت رنداں ہے آجکل

اپنی جفاؤں پر وہ پشیماں ہے آجکل
تجدید اشتیاق کا ساماں ہے آجکل

پھر مہرباں وہ خسروِ خوباں ہے آجکل
پھر ہوش و عقل شعلہ بداماں ہے آجکل

ساقی نے پھر بلائے ہیں احباب بادہ نوش
یعنی شکست توبہ کا ساماں ہے آجکل

آزاد ہیں زمان و مکان کے قیود سے
ہر لحظہ سجدۂ درِ جاناں ہے آجکل

ساقی کے التفات سے مستی فضا میں ہے
ہر اک گدائے میکدہ سلطاں ہے آجکل

اس شاہدِ خیال کی رنگینیٔ خرام
قدموں میں اس کے ایک گلستاں ہے آجکل

اللہ رے اس مغنیٔ آتش نفس کی لے
توبہ! کہ اس سے روح بھی رقصاں ہے آجکل

کیا پوچھتے ہو رنگ ضیا رہنِ میکدہ
سجادہ و قبائے زرافشاں ہے آجکل

(محمد ضیاء الاسلام بی ایس سی۔ پی سی ایس۔ ڈپٹی کلکٹر)

مختار

جرمن نسل کا ایک اُردو شاعر

اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں اُردو شاعری شباب پر تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی میں شاہ نصیر اور حضرت ذوق کی گرم جوشیوں نے اُردو شاعری کا پایہ بہت بلند کر دیا تھا۔ اُمرا اور رؤسا میں بھی شاعری کا مذاق پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ شعرا کی رفاقت کا دم بھرنے لگے تھے ان کی اعانت و سرپرستی نے اُردو شاعری میں نئی جان ڈال دی تھی۔ جا بجا مشاعرے ہوتے تھے۔ اور باقاعدہ ہوتے تھے۔ اور بعض مشاعرے بہت کامیاب اور بارونق مشہور تھے منجملہ ان کے نواب ظفریاب خاں المتخلص صاحب کے مشاعروں کی بڑی دُھوم تھی اور مشاہیر شعرا ان میں بالالتزام شریک ہوتے تھے۔ "مجموعہ نغز" اور "گلشن بے خار" نے ان مشاعروں کا ذکر کیا ہے

"مجموعہ نغز" اُردو شعرا کا وہ قابل قدر تذکرہ ہے جس کی بنیاد پر آزاد نے "آب حیات" کی عمارت کھڑی کی ہے۔ میر قدرت اللہ قاسم نے صاحب کے علاوہ ان کے محب خاص امیر کا بھی ذکر کیا ہے لیکن آزاد نے کسی یورپی نسل اُردو شاعر کو آب حیات میں جگہ نہیں دی۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے۔ کہ اُس زمانے کے یورپین اُردو شاعروں کو بیشتر شاہ نصیر سے تلمذ تھا اور شاہ نصیر کو حضرت ذوق کے بگاڑ کے باعث شاگردانِ ذوق کو شاہ نصیر اور اُن کے شاگردوں سے دلی بغض ہو گیا تھا۔ اگر آزاد نے اس بے توجہی اور جنبہ داری سے کام نہ لیا ہوتا۔ تو بہت سے اُردو شعرا کا نام و کلام مٹ نہ جاتا۔ صاحب کے علاوہ ڈائس سوبر، طوماس، امیر، فراسو، وغیرہ اُس زمانے کے ممتاز یورپین اُردو شاعر تھے اور اتفاق سے سب شاہ نصیر ہی کے شاگرد تھے۔ آب حیات کا ان سب کے تذکرہ سے بالکل عاری ہونا محض سہو پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہی ہو سکتی ہے۔

کپتان فراسو اپنے زمانہ کے نہایت ممتاز اور باکمال اُردو شاعر تھے اور اُن کی اُردو شاعری کی بڑی شہرت تھی۔ اُن کی قادر الکلامی اور پُرگوئی کا عام طور پر اعتراف کیا جاتا تھا۔ تصنیف و تالیف کا اُنہیں بیحد شوق تھا کئی دیوان اور بہت سی دیگر تصنیفات اُنہوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں نے فراسو کو خیراتی خاں دلسوز کا شاگرد بتایا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے اُنہیں شاہ نصیر دہلوی سے تلمذ تھا۔ چنانچہ شور میرٹھی نے اپنی مثنوی میں "دہلی مرحوم" کے بیان میں شاہ نصیر کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں لکھا ہے

فراسو بھی شاگرد اُن کے ہوئے ✽ تھے قوم فرنگی میں شاعر بڑے

فراسو کے والد کا نام "آگسٹین کوئنس" تھا۔ وہ جرمن تھے اور بیگم سمرو کے ہاں فوج میں ملازم تھے۔ اُن کی اہلیہ ایک فرانسیسی خاتون تھیں۔ فراسو سردھنہ ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام فرانسس گاڈلیو کوئنس تھا اپنے وقت پر یہ بھی فوج میں ملازم ہوگئے اور بہت جلد ترقی کر کے کپتان کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ابتداً ان کی ماموری علیگڈھ میں قلعدار کی حیثیت سے ہوئی ؎ شور

فراسو کوئل میں تھے جو عالی وقار ✽ مرہٹہ کی جانب سے تھے قلعدار

خود بیگم سمرو ان پر بڑی مہربان تھیں چنانچہ ان کے کلام سے واضح ہوتا ہے۔ کہ ان کو بیگم صاحبہ کے دربار سے انعام و اکرام برابر ملتے رہتے تھے۔ بیگم صاحبہ کے دربار میں متعدد یورپین ملازم تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد (۱۸۳۶ء) سرکار انگریزی نے ریاست کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ تو سب لوگ تتر بتر ہوگئے۔

شور میرٹھی فراسو کے نواسے تھے۔ شور کی پہلی شادی ہنگامہ غدر سے قبل ہوئی تھی۔ شادی کر کے شور سردھنہ پہنچے تو فراسو نے بہت اعلیٰ پیمانہ پر جشن شادی رچایا۔ آٹھ روز تک بڑی رونق اور چہل پہل رہی۔ کوکلا ایک نامی طوائف تھی۔ جتنی غزلیں اُس نے محفل میں گا کر سنائیں، فراسو نے ان سب پر فی البدیہ غزلیں کہیں اس سے فراسو کی قادر الکلامی اور پرگوئی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کئی دیوان اُن کی یادگار ہیں۔ لیکن اب عرصہ سے نایاب ہیں۔ اُنہوں نے کثیر التعداد کتب تصنیف کیں۔ جن میں سے بہت سی تو ہنگامہ غدر میں تلف ہو گئیں۔ اور جو بچ گئی تھیں ان کا زمانہ نے نام و نشان مٹا دیا۔

راقم الحروف کو فراسو کی مندرجہ ذیل تصنیفات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

(۱) نظم انشا مسمی نسیم دلکشا منظوم رقعات کا مجموعہ ہے۔ جو مختلف اوقات میں مختلف حضرات کے نام لکھے گئے ہیں۔

(۲) مجموعہ قصاید۔ اس میں ۱۴ قصیدے شامل ہیں۔ جن میں تین مذہبی ہیں۔ اخیر میں بہت سے قطعات ہیں۔ جو تمام تر شخصی ہیں۔

(۳) دیوان ہجویات۔ اس مجموعہ میں لسٹو۔ خارشت مہجوار نزالہ باری کی ہجویات کے علاوہ سرو تھنہ کی رنڈی چندو کی ہجو۔ بڈھانے کی بھٹیاری کی ہجو اور ہجو مگنولال شامل ہیں۔

(۴) مجموعہ مثنویات۔ اس میں حسب ذیل ۱۴ مثنویاں ہیں۔
کشش عشق، چراغ خانۂ عشق، گلشن عشق، مطلع نور۔ افراط، نشاط، سامانۂ ایام۔ اندوہ ربا (خراب)۔ آتش سودا، دشت عبرا، شمع انوار، عالم شوق سرمایہ بہار، مجموعہ استہزا، تنبیہ الغافلین (فارسی)

(۵) نظم قطعات باوزان دوہرہ۔ بوزن مندارک مسمی مقطوع، رمل مسدس مقصور یعنی فعلن فعلن فاعلن، فعلن فعلن فاعلات۔ اس میں کم وبیش ۸۰۰ فردیات ہیں۔

(۶) مثنوی ظفر الظفر (فارسی) اس میں ہنگامہ غدر کی آپ بیتی بیان کر کے انگریزوں کی فتح وکامرانی کا تذکرہ کیا ہے۔

(۷) دیوان فارسی مع انتخاب فارسی۔ ابتدائً پچاس ساٹھ رباعیات ان بعد غزلیات ودیگر کلام فارسی مثل مبارکباد وغیرہ۔

(۸) دیوان ہزلیات۔ نہایت گندہ اور فحش کلام ہے۔

(۹) دیوان غزلیات۔ در صنعت تجنیس مکرر مسمی تحمل جوزا۔ قابل تعریف چیز ہے۔

(۱۰) قصیدہ مبارکباد فتح قلعہ بھرت پور۔ در بیان شجاعت و دلیری۔ صاحبان عالیشان انگریز بہادر دام صونتہ"

مذکورۃ الصدر تصنیفات نظم کے علاوہ اس دیوان کے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے جو لالہ سری رام کے کتب خانہ میں تھا معلوم ہوا ہے۔ کہ فراسو کا ایک دیوان علیگڈھ لائبریری میں بھی تھا جس کا مختصر انتخاب مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا ہے مگر اب وہ دیوان لائبریری میں موجود نہیں ہے۔ نہیں معلوم کیا ہوا۔ شور نے "وقائع غدر" کے نام سے ۱۸۶۲ء میں ایک کتاب لکھی تھی۔ جو ۱۸۶۴ء میں مطبع معدن فیض آگرہ میں طبع ہوئی۔ اس کتاب میں شور نے غدر کے عام کوائف قلمبند نہیں کئے۔ بلکہ ان تکلیفات ومصائب کا ذکر کیا ہے جن کا ان کے خاندان والوں کو ہرچند پور اور علیگڈھ میں سامنا کرنا پڑا تھا۔ فراسو ہرچند پور کے نامور رئیس اور زمیندار تھے۔ خود فراسو نے بھی مثنوی ظفر الظفر میں آپ بیتی سنائی ہے۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی دوپہر کو فراسو کے ملازمین نے خبر دی کہ میرٹھ اور دہلی کی افواج نے بلوہ کر دیا ہے۔ اور انگریزوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر رہے ہیں۔ فراسو نے ہنس کر ٹال دیا اور چشم نمائی کی کہ ایسی الٹی سیدھی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تھوڑی دیر میں چند مسافر وہاں سے گزرے۔ انہوں نے ملازمین کے بیان کی تصدیق کی اور بتایا کہ راستے میں انہوں نے کئی لاشیں پڑی دیکھی ہیں۔ اسی اثنا میں ہرچند پور کے نمبرداروں اور زمینداروں نے آکر کہا کہ جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ سننے والوں کے ہوش پراں ہوگئے۔

دوسرے تیسرے دن میرٹھ سے صحیح خبریں آئیں۔ تمام ضلع میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ لوٹ مار کی یہ کیفیت تھی کہ پرگنہ باغپت و بڑوت کے جاٹوں اور گوجروں کے گھر بھر گئے اور جب گھروں کے اندر مال غنیمت نہ سمایا تو چھپروں پر چن دیا۔ اس علاقہ میں فراسو کے سوا کوئی اور یورپین رئیس نہ تھا۔ عوام کو یقین تھا کہ ان کے پاس کافی مال ومتاع ہے۔ شرارت پسند گروہ ان کے خون کا پیاسا ہوگیا۔ موضع کاٹھ کے بہت سے لوگ فراسو کے قرضدار تھے۔ موضع میں ہزار پانسو آدمیوں کی ایک پنچائت ہوئی جس میں طے ہوا کہ ہرچند پور پر دوڑ لے جا کر شبخون مارنا چاہیئے۔ دوسری طرف سے خبر آئی کہ بڑوت کے جاٹوں اور گوجروں نے بھی فراسو کو تاکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں تشویش کو اور زیادہ کرنے والی تھیں۔

فراسو نے اپنے نواسہ جارج پیش شور سے کہا۔ کہ "میرا جام عمر لبریز ہو چکا ہے۔ مجھے مرنے کا غم نہیں ہے لیکن تم لوگ اپنی جان ومال کی خیر مناؤ۔ بہتر یہ ہے کہ اس مہینے کہیں چھپے رہو۔ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔" لیکن شور اور ان کے بھائی جانکو پیش اس تجویز پر کاربند ہونے پر رضامند نہ ہوئے۔ یہی بات چیت ہو رہی تھی کہ خبر آئی کہ دہلی سے چند انگریز جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں نہایت خراب وخستہ حالت میں موضع کھیکھڑہ میں پہنچے ہیں اور کسی بیراگی کے ہاں پناہ گزیں ہیں۔ فراسو نے خبر بھیج کر انہیں اپنے ہاں بلایا۔ دوسرے دن بیراگی انہیں ایک چھکڑے پر سوار کر کے ہرچند پور لایا۔ اس قافلہ میں چھوٹے بڑے ملا کر سترہ نفوس تھے۔ یہ واقعہ ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء کا ہے۔ ان لوگوں کی حالت بہت خستہ تھی۔ ایک ہفتہ تک ان لوگوں نے کھیکھڑہ کے ایک شکستہ مکان میں قیام کیا تھا۔ کھانے کو سوکھے ٹکڑوں کے سوا کچھ اور میسر نہ ہوا تھا کئی ان میں زخمی تھے۔ بالخصوص لفٹنٹ فارسٹ کی میم صاحبہ کی یہ حالت تھی کہ نشست وبرخاست دشوار تھی؎

غم کی تپش سے زخم جگر کا رات جو ٹانکا ٹوٹ گیا
طائر دل جو رشتہ بپا تھا فرصت پاکر چھوٹ گیا

دو ایک روز میں دو انگریز افسر ایک فوجی جمعیت کے ساتھ ہرچند پور آئے۔ سب سے ملاقات ہوئی۔ اپنے دکھ درد کی کہانی ایک دوسرے کو سنائی۔ آدھی رات تک اکل وشرب کا لطف رہا۔ رات کو ان لوگوں نے بھی فراسو کے یہاں قیام کیا۔ اس موقع پر شور کو خوب سوجھی۔ خیال کیا کہ یہ لوگ کل میرٹھ چلے جائیں گے۔ اگر ان سے کوئی تحریر مل جائے تو کیا عجب کہ کسی وقت فائدہ بخش ثابت ہو۔ چنانچہ شور نے کاغذ وقلم پیش کر کے درخواست کی کہ اگر اپنی رونق بخشی کے بارے میں دو حرف لکھ دیجے گا تو ہم پر احسان ہوگا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے یہ درخواست منظور کی۔ اور ہاتھ میں قلم لیکر کچھ ایسا لکھا کہ آگے چل کر سرکار نے چار گاؤں گنجائشی بصیغہ مالگذاری مرحمت کئے۔ دوسرے دن انگریزوں کا قافلہ میرٹھ کو روانہ ہو گیا۔ ان کیساتھ فراسو نے اپنے معتمد ملازم خدا بخش کو روانہ کر دیا۔ اور دس پانچ آدمی اور بھی ساتھ کر دیئے۔

۲۷ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی کے کوارٹر ماسٹر مسٹر ٹامس ہالنڈ مجروح وتباہ حال ہرچند پور پہنچے۔ ان کے ساتھ بہلسوہ (پرگنہ علی پور) کا ایک جاٹ مسمی مامراج بھی تھا۔ ہالنڈ صاحب کی مناسب مہمان داری کی گئی۔ ان کو صاف کپڑے پہنائے گئے۔ پشت پر تلوار کا خفیف زخم تھا اس کی مرہم پٹی کی گئی۔ روانگی کے وقت انہوں نے بھی ایک پروانۂ خوشنودی عطا فرمایا۔ ان کے لئے بھی سواری کا انتظام کیا گیا اور ملازمین کے ساتھ اُن کو بھی میرٹھ بھیج دیا گیا۔

۴ جون ۱۸۵۷ء کو ایک صاحب تشریف لائے۔ ان کا نام ڈاکٹر بیٹسن تھا۔ انہوں نے جوگیوں کا بھیس بنا رکھا تھا۔ گلے میں کئی مالا۔ ہاتھ میں تونبا، کاندھے پر مرگ چھالا۔ کُرتا اور دھوتی شنگرفی۔ ڈاکٹر بیٹسن ہند وستان کی کئی زبانوں سے واقف تھے کہیں کشمیری پنڈت بن گئے اور کہیں بیراگی۔ فراسو کے یہاں انہوں نے بھی مکھل کر باتیں کیں۔ حسب موقع ان کی بھی خاطر و مدارات ہوئی اور چلتے وقت انہوں نے بھی ایک سارٹیفکیٹ عطا کیا۔

تمام علاقہ میں یہ خبر مشہور ہوگئی۔ کہ فراسو نے برادری و قومیت کے پاس سے کئی انگریزوں کو اپنے یہاں پناہ دی اور بعد ازاں انہیں صحیح وسالم میرٹھ تک پہنچا دیا۔ سب لوگ فراسو کی جان کے دشمن ہوگئے حتیٰ کہ جو لوگ ان کے ٹکڑوں پر پلے تھے انہوں نے بھی نمکحرامی پر کمر باندھ لی۔ موضع بجرولی (پرگنہ برٹوت) کا جاٹ شاہ مل بیٹھے بٹھائے باغی بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور گرد و نواح کے ہزار بارہ سو بے فکروں کو جمع کر کے جا بجا غارتگری کرنے لگا۔ گاؤں والے اس کے مظالم سے تنگ آگئے۔ فراسو نے متعلقین کو تو جیسے تیسے میرٹھ بھیج دیا۔ خود اور بائی صاحبہ دونوں ہرچند پورہ میں رہ گئے۔ فراسو نے اپنے زمانہ شباب میں ایک جے پوری عورت کو اپنے گھر میں ڈال لیا تھا۔ جو عام طور پر "بائی صاحبہ" کے نام سے مشہور تھی۔ کم وبیش ساٹھ سال تک دونوں کا ساتھ رہا۔

بالآخر ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو شاہ مل نے ہرچند پور پہنچ کر فراسو کا گھر لوٹ لیا۔ فراسو کوٹھے پر چھپ گئے تھے۔ انہیں اور بائی صاحبہ کو باغیوں نے سخت اذیتیں دیں ضعیفی و ناتوانی کے باعث دونوں اتنے پست ہوگئے کہ کہیں ایک ماہ کے بعد ان کی حالت قدرے درست ہوئی۔ اس موقع پر ان کے دو ملازمین عظیم الدین اور خدا بخش نے ان کا بہت ساتھ دیا۔ اس واقعہ کے تیسرے دن شاہ مل بھی اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ انگریزی فوج اس کے تعاقب میں تھی۔ ایک موضع میں اسے جا لیا۔ اس کا تو تلوار سے کام تمام ہوا۔ اور اس کے ساتھیوں کو توپ و تفنگ سے اڑا دیا گیا۔ جولائی کے آخر میں فراسو اور بائی صاحبہ دونوں میرٹھ پہنچے اور قیام امن کے زمانہ تک وہیں مقیم رہے۔

فراسو کی وفات کے بارے میں شور نے وقائع غدر میں تحریر کیا ہے۔

...... ناگاہ ۱۵ جولائی ۱۸۶۸ء کو مسٹر فرانسس کونس صاحب نے بباعث کبرسنی دنیا دوں کو بدرود فرمایا۔ برکت ورونق خانہ فیض کاشانہ اپنے کو یک قلم اٹھایا۔ اگرچہ مرنا سب کو برحق اور جینا بے یا دالٰہی ناحق ہے۔ دلے ایک امیر کا انتقال فرمانا چشمۂ فیض کا بند ہو جانا ہے۔...

..... صاحب مرحوم اپنے دم قدم سے مجموعہ سخا وکرم بالفرو تھے۔ اور ملک الشعرا بھی مشہور تھے .... قبل از دو سال وفات اپنی کے تمامی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ ازاں خود کہ ایک لاکھ روپے کی تھی۔ مع چار دیہات دیگر عطیہ سرکار فیض آثار بائی صاحبہ زن غیر منکوحہ اپنی کو بذریعہ وصیت نامہ مصدقہ عدالت عطا فرما گئے۔ حق تلفی جمع وابستگان اپنے کی کہ ہمگی دس بارہ آدمی حی القائم ہیں فرما کر ان کو خاک میں ملا گئے۔

دل و دیدہ اپنے تھے آشنا سو وہ درد وغم میں پھنسا گئے
ہمیں جن سے چشم امید تھی وہی صاف آنکھیں چرا گئے۔

فراسو کی وفات کے بعد شور نے بڑے جوڑ توڑ کئے۔ تب کہیں وہ جائداد بائی صاحبہ کے قبضہ سے نکل کر خاندان میں منتقل ہوئی۔

شور کے چوتھے دیوان (مطبوعہ ۱۸۷۱ء) پر نواب محمد اشارت علی خاں صاحب رئیس قدیم شہر میرٹھ مخلص صدق نے تقریظ لکھی ہے۔ اس کے ضمن میں کچھ فراسو کا بھی ذکر ہے۔ لکھتے ہیں:۔

.... مسٹر فراسو کونس صاحب ان کے نانا بڑوت وغیرہ ضلع میرٹھ کے تحصیلدار تھے۔ حاضر و غائب خیر خواہ سرکار تھے۔ ایام غدر ۱۸۵۷ء میں بجلا دے خیر سگالی تین گاؤں سالم نسلاً بعد نسلٍ سرکار انگریزی

سے ان کو عطا ہوئے۔ ہوا خواہی میں نامزد جا بجا ہوئے۔ ماسوا اس

کے شاعر نامی گرامی شگفتگی ان کے کلام کی مشہور دُور دُور ہے۔

تذکرہ گلشن بے خار میں مذکور ہے۔"

فراسو کا کلام اگرچہ عام طور پر کمیاب و نایاب ہے لیکن راقم کو ان کا کلام کافی مقدار میں فراہم ہو چکا ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے ان کے مستند و قادر الکلام شاعر ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ ان کے کلام میں دلچسپی اور دلکشی غایت درجہ موجود ہے۔ ہر شعر ناخن بدل نظر آتا ہے۔ زبان بہت صاف اور شستہ اور بے تکلف لکھتے ہیں۔ ذیل میں ان کے کلام (غزلیات) کا مختصر انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

پھبتا ہے کیا ہی تجھ کو اے یار مسکرانا ٹک واسطے خدا کے یک بار مسکرانا
غنچوں کو اے ستم گر تیرے دہن کے آگے ہنسنا تو یک طرف ہے دشوار مسکرانا

ہمارا یار ہم سے جب تلک باہم نہ ہووے گا
جو دل میں درد ہے ہرگز دوا سے کم نہ ہووے گا

دم خفا مجھ سے ہوا، اور میں خفا دم سے ہوا
رفتہ رفتہ یہ مرا عالم ترے غم سے ہوا

سر بدن سے ہو جدا اور ہاتھ شانے سے جدا
پر نہ سر میرا ہو تیرے آستانے سے جدا

بیعت کروں نہ کیونکر پیر مغاں کی زاہد ہے دستگیر مستاں مشکل میں جام و مینا

دیکھا نہ جب سے پیرہن اس نو بہار کا دامن نہیں ہے ہات میں صبر و قرار کا

دیکھا ہر اک طرف کو محفل میں اے فراسو بیٹھے تھے ہم جدھر کو اس نے اُدھر نہ دیکھا

ایسا تو ہم نے کوئی سنگیں جگر نہ دیکھا ہم مر گئے تڑپ کر تم نے ادھر نہ دیکھا
دیر و حرم کے گھر ہیں گھر ہے بشر کا لیکن گھر میں خدا کے ہم نے انساں کا گھر نہ دیکھا

جو آپ کی دوری میں دل پر مرے غم گزرا فرہاد پہ کم گزرا مجنوں پہ بھی کم گزرا ؟
تھا رات فراسو کا میہماں وہ شیریں لب کیا کہئے مزا اُس سے جو کچھ کہ بہم گزرا

ضعفِ پیری نے سرِ راہ بٹھا کر مجھ کو کوکبِ چرخ سے بھی آنکھ لڑانا سیکھا !
اپنا ہی قصہ جانسوز فراسو تو لکھ یک قلم لکھنے سے کیوں ہاتھ اٹھانا سیکھا

چاہئے بیمار تیرے لعل لب کو چوس لے وقت مردن ہے ستی کو پان کا کھانا روا
کون بچتا ہے فراسو ہاتھ سے اس موت کے عاقبت سوئے عدم انساں کو جانا ہے روا

گُل کھاتے کھاتے سینہ یہ رشک چمن ہوا جو داغ دل اٹھا وہی لعل یمن ہوا !
رو کر اڑھائی چادر آب رواں اُسے مردہ کوئی جو آگے مرے بے کفن ہوا !
تا حشر رکھا مجھ کو امانت زمین نے میلا نہ میرا ایک بھی تارِ کفن ہوا
اک پل زدن میں چشموں کے چشموں کو بھر دیا دریائے اشک چشم کا جب موجزن ہوا
داغ وفا کا سکہ یہ عاشق چلا گیا بازار عشق میں جو وفا کا چلن ہوا

ہمراہ ہے فراسو کے اک لشکرِ طفول
مشہور اس کا وادی میں دیوانہ پن ہوا

مت میری لاش کو چمنِ یاسمیں میں داب اے رشک گُل تو اپنی گلی کی زمیں میں داب
ابرو کماں کے تیرِ ستم میں نے سینکڑوں رکھے ہیں تودۂ دلِ اندوہگیں میں داب
رو لو فراسو کھول کے دل بزمِ یار میں ! تا چند غم کو رکھو گے جانِ حزیں میں داب

گاتے ہیں قولِ معرفت مرغِ چمن علی الصباح ہلتے ہیں آ کے وجد میں سرو و سمن علی الصباح
بھولے فراسو عقل و ہوش محو ہوئے بیک نگاہ آج سنے جو رشک مہ تیرا سخن علی الصباح

رکھ اُس کے تصور میں صدا دیدۂ تر بند لازم ہے کہ کاشانۂ خلوت کا ہو در بند

روٹھ کر پھاڑو گریباں تم ہمارا کھینچ کر ہم منا لیں گے تمہیں دامن تمہارا کھینچ کر
اپنے تو بخت سکندر پر فراسو مت اکڑ دیکھ ذلت مر گیا آخر کو دارا کھینچ کر

ہو کیوں نہ مہر و ماہ کا دماغ آسمان پر دن رات جبہ سا ہے ترے آستان پر
قامت ہے مثل سرو، دہن غنچہ، رُخ چمن کیا ہی بہارِ حُسن ہے اس نوجوان پر

حیرت رہی نہ دیدۂ ماہتاب کو فقط ! تکتے رہے تمام ستارے پلنگ پر
پڑتی نہیں ہے کل کسی کروٹ ذرا مجھے پھرتا ہوں لوٹتا ہوا سارے پلنگ پر

اے دل مضطر تو زیرِ خاک نالوں کو نہ چھیڑ چین سے اب تو عدم کے سونیوالوں کو نہ چھیڑ
کیوں وبالِ جاں کیا چاہے ہے ناصح زندگی تیرہ بختِ اس زلف کے آشفتہ حالوں کو نہ چھیڑ
اے فراسوسن لقولِ شخص کیا ہے ف ، ئدہ دم میں خوش دم میں خفا ہو جانیوالوں کو نہ چھیڑ

بیٹھے ہیں غیر لوں مرے دلبر کے آس پاس ہو خار جس روش سے گُل تر کے آس پاس

گئی نہ دل سے ننہ خاک الفتِ معشوق ! برنگ خار ہوں بے جاں بدولتِ معشوق

آہِ سوزاں کا مری ہرگز اثر ہوتا نہیں ! لگیو لے بیدرد اس تیرے دل پرفن میں آگ

یار سے دور ہو گئے ہیں ہم سخت رنجور ہو گئے ہیں ہم
رات کوچۂ یار کے سَو بار تا بمقدور ہو گئے ہیں ہم
جلتے دل کی فراسو کرکے سیر موسیٰ طور ہو گئے ہیں ہم

ساتھ اپنے سدا لشکر ہے گریہ و نالہ کا ! شوکت اسے کہتے ہیں حشمت کے یہی معنی ہیں
ہم خاک ہوئے تو بھی نہ در سے ٹلے تیرے الفت اسے کہتے ہیں چاہت کے یہی معنی ہیں

اب کی جو ملے مجھ سے تو یار ہے اور میں ہوں
اس وعدہ خلافی کی تکرار ہے اور میں ہوں !
وہ دل مرا مانگے ہے میں وصل کا طالب ہوں
انکار ہے اور وہ ہے اقرار ہے اور میں ہوں
وہ دن گئے جب تیرا دیدار تھا اور میں تھا !
اب روبرو آنکھوں کے دیوار ہے اور میں ہوں

خوب نہیں اس قدر حُسن پہ کرنا غرور لے لے کے انگڑائیاں دیکھو ہو پرچھائیاں
تم جو فراسو سے یوں رہتے ہو ناخوش سدا کس نے یہ باتیں تمہیں سچ کہو سکھلائیاں

پڑے ہیں کاٹنے پیری میں اب عذاب کے دن
وہ نوجوانی کہاں اور کہاں شباب کے دن !
کہوں میں دل کے تڑپنے کی کیا حقیقت آہ
خدا کسی کو دکھائے نہ اضطراب کے دن !

کیوں نہ دل میرا کرے اب اضطراب آغوش میں
ایک شب بیٹھا نہ وہ خانہ خراب آغوش میں

نہ تختِ روم کی خواہش ہے نہ ملکِ شام لیتے ہیں
تمہارے نام کو ہم صبح سے تا شام لیتے ہیں !

روئے روشن ہے ترا پیشِ نظر دیکھیں تو آنکھ کرتے ہیں اُدھر شمس و قمر دیکھیں تو
خانۂ چشم تو اشکوں نے بہا بھی ڈالا ! آئے کیا خاک نظر، نورِ نظر دیکھیں تو
چشم سی چشم ہے دیکھیں تو تجھی کو دیکھیں تو ہی پھر آئے نظر ہم کو جدھر دیکھیں تو
چشمِ عالم میں ہو خورشید قیامت بے نور حشر کے روز مرے داغِ جگر دیکھیں تو
زلف و رُخ کا ہے تمہیں دھیان فراسو صبح کب تلک روؤگے تم شام و سحر دیکھیں تو

میں تو پڑا ہوں در پہ اُن کے ان کو کچھ فرمانے دو
بھولا تھا اس ناز کا میں بھی گالیاں مجھ کو کھانے دو

آیا وہ ایک روز نہ دیکھا کبھو اسے کیا لے کے میں کروں دلِ خانہ خراب کو

دل لے کے تم نے جی بھی لیا کیا مضائقہ کیا کام دوستی میں۔ کیا کیا مضائقہ
آنکھوں سے جو نہ دیکھا نہ کانوں سے تھا سُنا دکھلا ان آنکھوں نے وہ دیا کیا مضائقہ
دل کی تپش کو جی کے مرے اضطراب کو تم نے تو آزما ہی لیا کیا مضائقہ
خوشنود اس کو رکھا فراسو نے جان دی الفت کا پاس اُس نے کیا کیا مضائقہ

دردِ پُر غم ہے ناتوانی ہے مرگ کا نام زندگانی ہے
یہ جو دشمن غمِ نہانی ہے یہ بھی ایک اپنا دوست جانی ہے
غافل ہم اس سے وہ رہے ہم سے عمرِ رفتہ کی قدر دانی ہے
سوزِ دل کس طرح زباں پر آئے لب ہے خاموش بے زبانی ہے
قصر تعمیر کر چکے ہیں بہت منزلِ گور اب بنائی ہے
اور بھی اک غزل فراسو پڑھو ! اب یہ ہنگامہ شعر خوانی ہے

درِ جاناں پہ گر اپنی جبہ سائی ہوتی ! دیر و کعبہ میں ہماری نہ رسائی ہوتی
پشت پا مار کے ہم تختِ پہ دُور ہو جاتے جو میسر ترے کوچے کی گدائی ہوتی
غم و درد و الم، اندوہ فغاں کا ہے ہجوم ایک دل اُس میں بھی کس کس کی سمائی ہوتی

اپنی تقصیر نہیں یا زمانہ ہے برا ! کرتے ہم جس سے بھلا اس سے برائی ہوتی
عاشقی میں نہ خلل تیری فراسو آتا ! آنکھ ناصح کو اگر تو نے دکھائی ہوتی

آہ و فغان و گریہ و سوز تپاک و درد ! کیا ہم بھی ساتھ اپنے سہ انجام لے چلے

فلک پر ہے جو میزان اس کے دونوں پلّے ہیں خالی
مرے حق کے وہاں بھی جھکتے ہیں پلّے ترازو کے
خیالِ چشم موتی چور میں جس دم میں روتا ہوں
دُرِ خوش آب سے آتے نظر ہیں قطرے آنسو کے
بطرز زور و بل خم ٹھونکتا ہے بزم شعرا میں !
کبھی مضمون فراسو کو جو ہاتھ آتے ہیں بازو کے

کیوں اتر جائیں بھلا ہم خاطرِ دلدار سے اُسکا مطلب مجھ سے اور میرا ہے مطلب یار سے
بندش رشتہ ہے ہم کو اک بت عیار سے کب مسلمانوں کو میرے عار ہے زنار سے
یاس و غم کے ہوں مضامین جس میں وہ پڑھتے غزل
ہم تو ہوتے ہیں فراسو خوش ترے اشعار سے

شگفتہ زخم ہے داغِ جگر سے ! مرا سینہ بہارِ بے خزاں ہے
خدا پنہاں ہے اور بندہ ہے ظاہر نہاں بھی چشم بینا میں عیاں ہے
پڑی ایڑی پہ آ کر اس کی چوٹی ! زمیں کے سر بلائے آسماں ہے
کہاں سے آئی اور جاتی کدھر ہے یہ جوں ریگِ رواں عمر رواں ہے
زمینِ شعر بالا ہے فراسوؔ ! زمین شعر سے پستہ آسماں ہے

دل اس کے دم میں آتا وہ یار کس کا ہے کسی کے دل پہ بھلا اختیار کس کا ہے
لگا ہے تارِ نفس میں یہ ناخنِ مضراب کہو یہ پردے میں بجتا ستار کس کا ہے
کرو نہ نالہ و گریہ سدا فراسو تم !
وہ بے وفا ہے صنم غمگسار کس کا ہے

اس انتخاب سے ناظرین اندازہ فرما سکتے ہیں۔ کہ حضرت فراسو کو اپنے جذبات کے اظہار پر کہاں تک قدرت حاصل تھی۔ محاورے اور ترکیبیں الفاظ کی بندش، مضامین کی لطافت، زبان کی صفائی اور روزمرہ۔ — غرض ہر لحاظ سے ان کا کلام اس زمانہ کا بہترین کلام ہے۔ ایک ایک شعر متانت و دلچسپی کا نمونہ اور ان کے کمال سخن کا شاہد ہے۔ شوخی اور بے ساختہ پن کی چاشنی موجود ہے۔ پھر حشو و زوائد سے پاک اور محاسن صوری و معنوی سے لبریز و مملو۔ اور جب اس امر کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ یہ کلام اس شخص کا ہے۔ جس کو دنیا سے رخصت ہوئے پون صدی گذر چکی ہے۔ تو اس کے کمالِ فن اور قدرت کلام کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

دیگر اصنافِ سخن میں فراسو کا وہ دیوان خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے جو صنعت تجنیس مکرر میں ہے۔ آج کل تو کلام میں ایسی صنعتیں مفقود ہیں۔ اور پرانے شعرا میں بھی بعض نے ایک ایک دو دو غزلیں کہی ہیں لیکن فراسو نے اسی صنعت میں پورا دیوان کہا ہے۔ مثلاً ایک شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

سودا ہے زلفِ یوسفِ ثانی کا اسقدر
روتے ہیں ہم کھڑے سرِ بازار زار زار

دوسری قابلِ ذکر چیز دوہرہ کے اوزان میں فردیات ہیں۔ ان میں ہر قسم کے مضامین نظم کئے ہیں۔ اس کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

بادِ ہوائی زیست ہے آئی اور چلی دولہ کی سی برات ہے چھائی اور چلی

بے مرضی اللہ کی ہووے کب کچھ اور وہ چاہے تو آن میں ہووے سب کچھ اور

دل لینا کچھ اور ہے دلداری کچھ اور سر دینا کچھ اور ہے سرداری کچھ اور

جینے سے مرنا بھلا ہم تو مرتے ہیں ایسا جینا کیا کریں دُکھ ہی بھرتے ہیں

ابرو اس کی قتل پر میرے مٹک چلی منہ میں نے موڑا نہیں گردن ڈھلک چلی

چھاتی پر اپنے کھلے سر کے بال نہ ڈال
یہ سب ریشہ آم ہیں ان کو پال نہ ڈال

فراسو کے باب میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے یہاں حمد و نعت میں بھی کلام موجود ہے اور افراط سے ہے۔ کئی مسلسل نظموں کے علاوہ تقریباً تمام مثنویوں کا آغاز حمد و نعت سے ہوا ہے۔ بعض مثنویوں میں ساقی نامے ہیں۔ وہ بھی بالکل مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ دیگر یورپین شعرا اردو کے یہاں نعتیہ کلام قریب قریب مفقود ہے۔ صرف چار پانچ شعرا کے یہاں ایک آدھ نعتیہ غزل ہے اور بس۔ ہاں شور کے یہاں نعتیہ کلام کی کمی نہیں۔

شاکر میرٹھی

دورِ حاضرہ اور مسلمان

پیغامِ حیات

ہندوستان بھر میں اس وقت کونسا ایسا مسلمان ہوگا جسے موجودہ حالت کی اہمیت کا کچھ اندازہ نہ ہو اور جس کا دل اپنی قوم کے مستقبل کے لئے تڑپ نہ رہا ہو؟ ہماری نازک حالت ہمسایہ قوم کی تنظیم اور اقتدار ساری دنیا میں آزادی اور مساوات کے لئے جدوجہد ا ہندوستان کے مسلمان نیم جاہل سہی بہت غافل سہی۔ لیکن اب اتنے جاہل اور اتنے غافل بھی نہیں رہے کہ اس صریح حقیقت کے معنی بالکل نہ سمجھ سکیں۔ خدا بھلا کرے زمانے کا جس نے اپنی سختی سے اور ہمسایہ قوم کا جس نے اپنی بے اعتنائیوں سے ہماری اس جہالت اور غفلت کو بے چینی اور تھوڑی بہت علم و عمل کی خواہش میں تبدیل کردیا ہے۔

لیکن آج وہ زمانہ ہے کہ صرف کچھ نہ کچھ سمجھ لینا اور کچھ نہ کچھ کر دینا ہرگز کافی نہیں۔ آج صدیوں کے کام مہینوں میں اور برسوں کا پروگرام ہفتوں میں انجام پاتا ہے۔ سو اگر ہم ایک خوددار قوم کی باعزت زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں چاہیئے کہ پچھلے چند برس میں جو کچھ ہوا اور ہمارے اردگرد جو کچھ اب ہو رہا ہے اُسے غور سے دیکھیں۔ اور پھر سمجھیں کہ ہم کس حال میں ہیں اور ہمیں کیا کچھ کرنا چاہیئے؟

نئی دنیا

دُنیا کہاں سے کہاں نکل گئی! جنگ عظیم کے بعد کیا کیا تبدیلیاں ہو گئیں۔ اس پر ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۱۴ء کی ہولناک جنگ کا جو فیصلہ فتح اور شکست نے ۱۹۱۸ء میں کیا وہ محض عارضی تھا۔ یہ درست ہے کہ چند سال صرف ہمارے فتح مند اتحادیوں کے نام کا ڈنکا بجا اور اب بھی انگلستان کی سلطنت پر سُورج نہیں ڈوبتا۔ فرانس کا جھنڈا اب بھی اُدھر مراکش پر لہراتا ہے۔ اِدھر مشرقی ایشیا میں اور جاپان اپنی دن رات کی بم باری سے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالتا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دیکھو کہ گذشتہ بیس سال میں کتنی پرانی اور نئی قوموں نے طاقت پکڑی اور مہذب دنیا میں کیا کیا معاشری اور معاشی اور تمدنی انقلاب برپا ہُوئے ہیں جن سے دنیا گویا قطعاً ایک نئی دنیا بن گئی

اہلِ ہندوستان کے لئے نقشِ عبرت

پہلے ۱۹۱۷ء میں رُوس میں ایک نئی طاقت بلکہ ایک نئے اشتراکی تمدن کا آغاز ہوا۔ جنگ کے خاتمے پر یورپ میں کئی پہلی مظلوم قوموں کو نئی جمہوری حکومتیں عنایت ہوئیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اِن نام نہاد "قومی حکومتیں بسا اوقات کسی نہ کسی سیاسی غرض کے ماتحت طرح طرح کے اختلافات رکھنے والی قوموں کو یکجا کیا گیا جس سے ان اکثریتوں اور اقلیتوں کے درمیان مناقشات کا ایک خطرناک سلسلہ چھڑ گیا۔ چنانچہ چیکوسلواکیہ میں ستمبر ۱۹۳۸ء کے اخیر میں جو عجیب و غریب بین الاقوامی ڈراما کیا گیا۔ اُس کی کہانی ہم سب کو خوب یاد ہے۔ اتحادی جمہوریت پرستوں کی مہربانی سے جرمنوں کی ایک اقلیت کو زبردستی چیکوں اور سلوویکیوں کی ایک اکثریت کے ساتھ منسلک کردیا گیا تھا۔ ان خوددار جرمنوں کو یہ قوم پرستی پسند نہ آئی۔ چنانچہ بیس برس تک اقلیت اور اکثریت کے جھگڑے جاری رہے مگر مظلوموں کی شنوائی نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ جناب ہٹلر کی تیغ جگردار نے عالمگیر جنگ کی دھمکی دے کر اتحادیوں کو اپنا لوہا منوا لیا اور آخر یہ اقلیت اکثریت کے پنجے سے چھوٹ گئی۔ اِن حالات سے فائدہ اُٹھا کر سلوویک لوگوں نے بھی چیک اکثریت پر دباؤ ڈالا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب چیکوسلوویکیا ایک فیڈرل یا وفاقی ملک بن گیا ہے۔ جس میں چیکوں کی قومی مجلس الگ ہے اور سلوویکیوں کی الگ۔ ہندوستان کے قوم پرست اگر ان تازہ ترین حالات سے عبرت پکڑیں تو اس بدنصیب ملک کی قسمت کے دن پھر جائیں

مجلس اقوام کی حقیقت

اِن آدھا تیتر آدھا بٹیر قومیتوں کی بنیاد ورسائی کے عہدنامے میں (۱۹۱۹ء میں) رکھی گئی تھی۔ اس کے اگلے سال لیگ اقوام کی بنا پڑی جو فی الحقیقت صرف بعض جیتنے والی طاقت ور قوموں کی انجمن تھی۔ جن قوموں کی آواز یہاں نہ سنی جاتی تھی۔ اُنہوں نے مجبور ہو کر اپنی قومی تنظیم شروع کی۔ تاکہ اپنے زورِ بازو سے دنیا کی محفل میں اپنا سکہ بٹھائیں۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں مسولینی نے اطالیہ میں اور ۱۹۳۳ء میں ہٹلر نے جرمنی میں ایک مطلق العنان آمر بن کر اپنی اپنی قوم میں ایسی رُوح پھونکی۔ اور اُن کی ایسی تنظیم کی کہ دُور اندیش انگلستان نے اُن کی طرف پہلے نظرِ عنایت کی اور پھر دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا ۱۹۲۵ء میں ان سب قوموں کے درمیان لوکارنو کا سمجھوتا اور ۱۹۲۸ء میں بریاں کیلگ میثاق ہوا۔ جن کا مقصد جنگ سے پرہیز کرنا تھا۔ مگر غیر اتحادی قومیں طاقت کے مفہوم کو خوب سمجھ چکی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں جاپان نے

مانچوریا پر حملہ کر کے " مانچوکو او " کو اپنے سانچے میں ڈھالا۔ ۱۹۳۵ء میں اطالیہ نے ابی سینیا پر حملہ کر دیا اور ۱۹۳۶ء میں جرمنی نے رائین کے علاقہ میں اپنی فوجیں اُتار دیں۔ اسی سال اُدھر سپین میں ادھر چین میں خانہ جنگی کا بازار گرم ہوا۔ اور موقع پا کر جاپان نے ۱۹۳۷ء میں چین پر حملہ کر دیا۔ اور جرمنی نے سوڈٹینوں کو شہ دے کر اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سوڈٹین لینڈ کو جرمنی میں شامل کر لیا۔ اتحادی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ وہ فقط اپنے اتحاد کو مضبوط پکڑے بیٹھے رہے۔ بلکہ اب تو وہ ان غاصبوں کو دعوت خاص دے رہے ہیں۔ کہ آؤ اس اتحاد میں تم بھی شامل ہو جاؤ تا کہ دنیا میں امن وامان قائم رہے۔ لیکن امن وامان کیسا؟ جہاں طاقت کے احساس پر ہر ایک کی نیت لحظہ بہ لحظہ بدل جانے پر آمادہ ہو۔ وہاں جس کے ہاتھ جب لاٹھی آئیگی وہ تمدن کی بھینس کو اپنے ہی گھر کی طرف ہانک لے جائیگا۔

تاریک زمانے کا روشن پہلو

اس تاریک زمانے کا سب سے روشن اور سب سے حیرت انگیز واقعہ مصطفٰے کمال کا کارنامہ ہے جس نے اپنی جانبازی اور دُور اندیشی سے ایک گئی گذری قوم اور ایک مردہ ملک کو قومی تنظیم کے ذریعے سے ازسرنو زندہ کر دیا۔ دُنیا کی تاریخ میں کتنی مثالیں ہیں جہاں ایک ایسے کمزور گروہ نے اتنی بڑی بڑی منظم قوموں کا میدانِ جنگ میں اُتر کر یوں علانیہ مقابلہ کیا ہو۔ یونانیوں پر ترکوں کی فتح دراصل جنگ کے بعد انگلستان اور فرانس کی پہلی شکست فاش تھی۔ اور یہ سب کرشمہ صحیح قومی احساس اور مکمل قومی تنظیم کا تھا۔ اس کے بعد کمال نے جو کچھ کیا اُس سے دنیا واقف ہے۔ اُس نے ہر وہ کام کیا جس نے ترکوں کو اندرونی و بیرونی حیثیت سے ایک مضبوط قوم بنا دیا۔

ملک کے اندر معاشری اصلاح اور معاشی ترقی اور ملک کے باہر دوسری قوموں سے اور بالخصوص اسلامی ممالک سے اُس نے وہ معاہدے کئے۔ جن کے باعث ٹرکی کو مشرق و مغرب کے عین وسط میں ایک باوقار حیثیت حاصل ہو گئی۔

اہل ہندوستان کی پستی کا سبب

یہ ہے قومی تنظیم اور اُس کا نتیجہ۔ اِس کے برعکس جو قوم اپنے ربط وضبط سے اپنے آپ کو اس قابل نہیں بناتی کہ وہ اپنے تمام قومی معاملات میں صاحب اختیار ہو سکے۔ اُس کے اختیارات چھین لئے جاتے ہیں۔ اُس کی قومیّت مٹا دی جاتی ہے۔ یہ کسی دوسری قوم کا قصور نہیں۔ یہ مٹنے والی قوم کا اپنا قصور ہے کہ وہ یوں مٹ جائے۔ قدرت کا قانون اور خدا کا فرمان سب کے لئے یکساں ہے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ جو شخص اُوپر سے کُودے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ جو قوم اپنی سستی میں پڑی کراہے گی اُسے برباد کر دیا جائے گا۔ ساری تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہمارے اپنے زمانے کے واقعات بھی ہمیں یہی بتاتے ہیں۔ دُنیا مقابلے کا میدان ہے۔ زندگی جدوجہد کا نام ہے۔ جو قومیں جان کی بازی لگاتی ہیں وہ بازی لے جاتی ہیں یا پھر جان کھو دیتی ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج فلسطین میں کیا ہو رہا ہے۔ کوئی دن جاتا ہے کہ بالفور کا اعلان عملی طور پر منسوخ ہو جائے گا۔ اور عرب اپنی من مانی مراد پا لیں گے۔ لیکن یہ کیسے ہو گا؟ اتحاد اور قربانی سے جن کے بغیر نہ کبھی دنیا میں کچھ ہوا ہے نہ ہو گا

ساری اسلامی دنیا بیدار ہو رہی ہے۔ چالیس کروڑ مسلمانوں کے اندر ایک نئی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ ٹرکی، ایران، عرب، افغانستان آزاد ہو گئے ہیں۔ عراق اور مصر اور شام آزادی کے رستے پر ہیں۔ باقی اکثر اسلامی ممالک غیر ملکی حکمرانوں کے قبضے میں ہیں گو حریت کی رُوح اب روز و شب یہاں بھی اپنا کام کر رہی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ان سب سے جداگانہ ہے۔ اُنہیں نہ صرف اپنے غیر ملکی حکمرانوں سے بلکہ اپنے ملکی بھائیوں سے بھی معاملہ طے کرنا ہے۔ یک نہ شُد دو شُد!

یہاں ہمارے سامنے سب سے پہلے ایک عجیب وغریب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تم ہندوستان کے مسلمان کوئی قوم ہو ہی نہیں اگر اس بیان کا اور آج کل اس پر عمل کرنے کا نتیجہ دردانگیز نہ ہوتا تو واقعی یہ بات محض مضحکہ خیز تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ملک میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ اور روز بروز پیدا کئے جا رہے ہیں۔ جو بحیثیت قوم ہمارے لئے غایت درجہ خطرناک ہیں اور ہمارے تمام قومی اداروں کا خواہ وہ سیاسی ہوں یا تعلیمی، مذہبی ہوں یا معاشی، یہ قومی فرض ہے کہ وہ مسلمانوں میں قومی روح پیدا کریں اور قومی تنظیم کی طرف اپنی تمام تر توجہ مبذول کریں۔ اسے اچھی بات سمجھئے یا بُری اب سیاست معاشرت تعلیم اور معیشت سے الگ نہ ہے نہ ہو سکتی ہے اور اسلئے ایک تعلیمی ادارے کے پلیٹ فارم پر ایک غیر سیاسی آدمی کو بھی مجبوراً وہ باتیں کہنی پڑتی ہیں جو کل تک صرف ماہر سیاست دان پلیٹ فارم پر کہا کرتے تھے۔

قوم اور قومی تہذیب

قوم اور قومی تہذیب پر آج کل جگہ جگہ خوب گرما گرم بحث ہوتی ہے۔ ایک فریق کا خیال ہے کہ ہندوستانی ایک " قوم " ہیں، " یہ نیشن " کا ترجمہ ہے۔ نیشن کا نہ صرف لفظ یورپ سے آیا ہے بلکہ اُس کی موجودہ عملی صورت بھی یورپ ہی کی ایجاد ہے۔ یورپ نے چونکہ دنیا کے اکثر حصوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس لئے اُس کا طرز خیال دنیا بھر پر چھا گیا ہے۔ اب یورپ کی سب چیزیں اور یورپ کے سب خیالات ہمیں بھلے

معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نیشن ہے۔ لیکن ساتھ ہی یورپ کی ایک صدی کی حکومت نے غیر یورپین لوگوں کو اُس سے منحرف کر دیا ہے۔ اُدھر خود یورپ میں اپنی سیاسیات میں بے چینی اور اپنے فلسفۂ زندگی سے بے اطمینانی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ باوجود طاقتور اور مالدار ہونے کے یورپ خوش نہیں مطمئن نہیں مشینوں کے زور سے اُس نے اُٹھ کر قدرت پر ضرور ایک حد تک قابو پالیا لیکن اُس کا اپنا دل خدا جانے کیوں اندر ہی اندر بیٹھا جاتا ہے ؎

ہے دل کیلئے موت مشینوں کی حکومت ؛ احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

یورپ نے مشین بنا تو لی۔ لیکن وہ اُس کا صحیح استعمال نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم دماغ کی پیداوار ہے لیکن زندگی جو عمل سے جنت بھی اور جہنم بھی بنتی ہے اپنے عمل کے لئے ایک سچے دل کی محتاج ہے اور دل سچائی کو نہیں پا سکتا جب تک اُس کے سامنے ایک بلند نصب العین نہ ہو۔ ایسا نصب العین جو ایک فرد کو بہتر و قوی تر فرد بنانے کے ساتھ کُل نوعِ انسان اور ساری کائنات سے اس طرح وابستہ کر دے کہ وہ سب کی بہتری میں اپنی بہتری دیکھے۔ اور سب کی قوت سے اپنے لئے مزید قوت حاصل کرے۔

ہمارے وجود سے انکار

لیکن نیشنلسٹ اور سوشلسٹ ان خیالات کو وہم وگمان پکارتے ہیں۔ یا پھر فرقہ واری اور سرمایہ داری سے جا ملاتے ہیں۔ نیشنلسٹوں کے نزدیک جو کچھ ہے "سو نیشن" ہے جو خاص جغرافی حدود کے اندر محبوس رہتی ہے۔ اور بس چلے تو دوسروں پر ہاتھ صاف کیا کرتی ہے۔ سوشلسٹوں کی کائنات میں صرف مزدور کا ہر جگہ جلوہ ہے۔ اُن کی تاریخ تاریخی مادیت کی کارگاہ ہے۔ اور جہاں کوئی بھولے سے بھی خدا کا نام لے لے وہ بھوک اور روٹی کا نعرہ لگا کر اُس کا منہ نوچ لیتے ہیں۔

یہی نیشنلسٹ اور سوشلسٹ ہیں جو ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم اور قومی تہذیب کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ مگر اپنے دل کے اندر وہ ان کی طاقت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے کٹر ہم مذہب فرقہ پرستوں کے ساتھ مل کر دن رات ان کی بیخ کنی میں مصروف ہیں۔ شکر ہے کہ جب سے ان کی زمین دوز حرکات سطح پر آگئی ہیں اور یہ علانیہ ہماری قومیت اور قومی تہذیب پر جو یقیناً ہماری محبوب ترین متاع ہے۔ بمباری کرنے لگے ہیں۔ ہمارے کانوں پر بھی ذرا جُوں رینگنے لگی ہے۔

اس بارے میں ہم میں سے اکثر موجودہ ہندوستان کے محترم لیڈر پنڈت جواہر لعل نہرو کے خیالات سے خوب واقف ہو چکے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"مسلم قوم کے وجود کا خیال چند لوگوں کی قوت واہمہ کا کرشمہ ہے اگر اخبارات اس خیال کو اس قدر شہرت نہ دیتے تو یہ نام بھی بہت کم لوگوں نے سُنا ہوتا۔"

ہماری تہذیب کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ اسلامی تہذیب کیا ہے لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔"

لیکن وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ ناکامی کے اس پُر انکسار اعتراف کے ساتھ ہی اُنھوں نے ہماری تہذیب کی "نمایاں ترین علامتیں" عوام الناس میں دیکھ پائی ہیں یعنی "ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا، ایک خاص طریقے سے مونچھوں کو مونڈنا یا ترشوانا مگر ڈاڑھی کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دینا اور ایک خاص قسم کی ٹونٹی والا لوٹا۔" الحمدللہ کہ اس جسمانی تثلیث میں پنڈت جی نے مسلمانوں کے "ناقوم" گروہ کی وحدت کو ڈھونڈ پایا۔

اس عظیم الشان دریافت کے بعد پنڈت جی نے ایک اور کامیاب سائنٹیفک تجربہ کیا ہے۔ مسلمانوں کے قومی مطالبات کے متعلق فرماتے ہیں کہ:۔

"میں نے اس نام نہاد فرقہ وار مسئلے کا ایک دُوربین کے ذریعے سے معائنہ کیا ہے لیکن اگر کسی چیز کا وجود ہی نہ ہو تو نظر خاک آئے۔"

مسلمانوں کی قومیت کے بارے میں ہمارے مُلکی بھائیوں کے رویے پر ایک انگریزی مثل یاد آتی ہے کہ آدمی کا خیال اُس کی خواہش کے تابع ہوتا ہے یہ بھلے مانس چونکہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی قوت قائم نہ رہے۔ اس لئے وہ بلا دقت سمجھ لیتے ہیں کہ یہ قومیت موجود ہی نہیں۔

بصیرت افروز بیان

وطنیت و قومیت کے متعلق اُس عظیم الشان شخص کے ارشادات ہم مسلمانوں کے لئے مشعل راہ ہیں جو بیسویں صدی میں ہندوستان کا سب سے بڑا مسلمان گزرا ہے۔ اگر ہم مسلمان علامہ اقبالؒ کی دکھائی ہوئی راہ پر سلامتی سے چلنا سیکھ لیں تو حقیقت یہ ہے۔ کہ ہم اپنے کھوئے ہوئے مذہب کو پھر پالیں۔ اور دین و دنیا دونوں میں سرخرو ہو جائیں۔

اُس بصیرت افروز بیان میں جو مرحوم نے اپنی وفات سے ڈیڑھ مہینہ پہلے شائع کیا۔ اس قول پر کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں"۔ پھر لکھتے ہیں کہ "وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں

اور کل کچھ، ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اُس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ بعض نادان لوگ اس کی تائید میں حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لئے جب لفظ وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔"

اسلام کیا ہے؟

اسلام ایک مکمل "اجتماعی نظام" ہے جو بقول اقبال "عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر سیاسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اُس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اُس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔" "یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے، نہ انفرادی اور پرائیویٹ بلکہ خالصتہً انسانی ہے اور اُس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔" "ایسا دستور العمل صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔ پھر اس خطرناک نظریے کی کہ "مسلمان بہ حیثیت قوم تو اور ہو سکتے ہیں۔ اور بہ حیثیت ملت اور" - اور مذہب کو علیحدہ چھوڑ کر انہیں باقی اقوام ہند کی قومیت یا ہندوستانیت میں جذب ہو جانا چاہیئے" یعنی یہ کہ "مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں۔" اس بات کی تردید کر کے لکھتے ہیں کہ "قرآن کی رُو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم دین اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔" اور "نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اُس قانون الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔" بالفاظ دیگر بنی نوع انسان کو "اُن تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے۔ جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقام محمدی، یہ ہے نصب العین ملت اسلامیہ کا اس کی بلندیوں تک پہنچنے میں معلوم نہیں حضرت انسان کو کتنی صدیاں لگیں مگر اس میں بھی شک نہیں" کہ جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔"

غرض ہماری زندگی کے لئے ہمارا وطن نہیں بلکہ اسلام ہماری بنیاد ہے۔ وہی ہے ہمارا ماضی اور حال اور مستقبل۔ لہٰذا اگر ہم اپنے مستقبل کو شاندار بنانا چاہتے ہیں تو ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم دیکھیں کہ اسلام کیا ہے؟ اُس نے دنیا میں کیا کیا اور اب ہمیں کس طرح اُس کی پیروی کرنی چاہیئے۔ کہ ہماری زندگیاں اُس کی شان کے شایاں اور اپنے اور دنیا کے لئے موجب راحت و برکت ہو جائیں۔

پیغمبر اسلام جس وقت اپنا روحانی پیغام لے کر اُٹھے۔ دنیا کے مذاہب توہمات کا مجموعہ اور قوموں کے تمدن عیش و عشرت اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہو چکے تھے۔ ایم، این رائے لکھتے ہیں کہ "اسلام مذاہب میں سب سے آخری مذہب ہے اور سب سے بڑا مذہب۔" "اسلام کا عروج سب معجزوں سے بڑا معجزہ ہے۔" اور "اسلام کی حیرت انگیز کامیابی زیادہ تر اُس کے انقلابی مفہوم کی وجہ سے تھی۔ نیز اس وجہ سے کہ اُس نے عوام الناس کو اُس ناگفتہ بہ حالت سے رہائی دلائی۔ جو نہ صرف یونان اور رُوما بلکہ ایران اور چین اور ہندوستان کی قدیم تہذیبوں کے زوال و تخریب سے پیدا ہو گئی تھی۔" "اسلام کے انقلاب نے نوع انسان کو بچا لیا۔" ڈریپر اپنی مشہور تصنیف "یورپ کی عقلی ترقی کی تاریخ" میں لکھتا ہے کہ "دنیا کی تاریخ میں کسی شخص نے نوع انسان پر اتنا گہرا اثر نہیں ڈالا۔ جتنا بانیٔ اسلام نے" آریاؤں کا دلدادہ، مسلمانوں کا مخالف ہیول کہتا ہے کہ "یہ اسلام کے فلسفے کی وجہ نہیں تھی بلکہ اُس کے اجتماعی اصولوں کا باعث تھا کہ ہندوستان میں اتنے لوگوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔" اس کی تردید میں مسٹر رائے کا خیال ہے کہ "ہندوستان کے عوام میں اسلام کے اجتماعی پروگرام کی مقبولیت کی اصلی وجہ یہی تھی کہ اس پروگرام کی بنیاد ایک ایسے فلسفے پر تھی جو ہندو فلسفے سے بہتر تھا۔ ہندو فلسفے نے معاشرت میں جو ابتری ڈال دی تھی اسلام نے آ کر عوام کو اس مصیبت سے نکلنے کی راہ دکھائی۔"

اسلام کا فلسفہ

اسلام کا فلسفہ نہایت سادہ تھا اس قدر سادہ کہ اُسے فلسفہ کہہ نہیں سکتے۔ اُس نے مذاہب کے سب توہمات اور انسانی افکار کی سب اُلجھنوں کو چند سیدھے سادے اصولوں کے ذریعے سُلجھا کے رکھ دیا۔ اسلام کو ایک جاہل سے جاہل شخص بھی آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ اسلام نے دکھا دیا۔ کہ کائنات کی حقیقت کس قدر سادہ اور عام فہم اور انسان کے لئے کس قدر دلکش اور جانفزا ہے۔

یہ زمین و آسمان، یہ ساری دیکھی اور ان دیکھی کائنات صرف ایک رشتے میں پروئی ہوئی ہے اور وہ رشتہ خدا ہے۔ خدا کا کائنات سے

وہی تعلق ہے جو انسان کی رُوح کا اُس کے جسم سے ہے۔ خدا کائنات کے ذرّے ذرّے میں، روشنی کی کرن کرن میں، بڑے سے بڑے وجود اور چھوٹی سے چھوٹی ہستی کی رگ رگ میں جاری و ساری ہے۔ ہر شے جو کچھ ہے اُس سے ہے کیونکہ وہ ہر شے کی روح اور ہر رُوح کی زندگی ہے۔ مادہ اور روح دو چیزیں نہیں، یہ لاکھوں کروڑوں، یہ بے حد و بے حساب چیزیں یہ ساری کثرت فقط ایک وحدت سے ظہور میں آئی، اور فی الحقیقت اب بھی اسی کے اندر موجود ہے۔ جو کچھ ہے وہی ہے۔ اسی نے اس سب کچھ کو وہ شکل دی جو اس کی ہے۔ اس مادے میں جو بظاہر مُردہ تھا اس نے جان ڈال دی۔ اور ایک روحانی ہستی پیدا کر دی وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ (اور تم تو مُردہ تھے، پھر اُس نے تم میں جان ڈالی) یہ انفرادی رُوح خدا یعنی روح کائنات کا ایک جزو ہے یہ نامکمل ہے اپنے ارتقا کے لئے۔ یہ مادے کا لباس پہنتی ہے۔ اور زندگی کے درجے طے کرتی ہوئی روحِ کلی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، یہ فقرہ جو عموماً کسی کی دنیاوی موت پر بولا جاتا ہے۔ دراصل ابدی زندگی کی کیفیت بیان کرتا ہے۔ یہ اُس کا مختصر سفرنامہ ہے! ابدی زندگی کا پہلا خود شعوری کا مرحلہ اس دنیا کی زندگی ہے۔ خدا نے انسان کو اپنا نائب بنا کر اس دنیا میں بھیجا، اُسے فرشتوں پر ترجیح دی۔ اسے وہ چیزیں بتائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔ گویا علم و عمل میں اسے اپنا شریکِ کار بنایا۔ اسے طاقت دی کہ زمینوں اور پہاڑوں نے جس بارِ امانت کو اٹھانے سے انکار کیا (حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ) اسے انسان نے اٹھا لیا۔ دنیا میں سینکڑوں ہزاروں نعمتیں اُس کے لئے پھیلا دیں۔ کہ وہ ان سے لُطف اٹھائے۔ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً خدا نے انسان کو نیک پیدا کیا۔ اور اسے نیک و بد کی پہچان دی لیکن نیکی یا بدی اختیار کرنے میں اسے پوری آزادی دے دی کہ جو چاہے کرے اور اس کا پھل پائے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (جو شخص ذرہ برابر بھی بھلائی کریگا وہ اسے پالے گا۔ اور جو شخص ذرہ برابر بھی برائی وہ اسے بھگت لے گا)۔ اور نیکی بدی سب اپنے لئے ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ (جس کسی نے نیک کام کیا سو اپنے لئے) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اس دشوار مرحلے میں اکیلا چھوڑ دیا گیا ہے يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (خدا تمہارے لئے آسانی کرنا چاہتا ہے سختی نہیں کرنا چاہتا) اور پھر جہاں زندگی کی آزمائشیں آزمائیں فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ (تو میں تمہارے پاس ہی ہوں) خدا اس کے اک ہمدرد، اس کے اک ہم راز، اس کے اک دلی دوست کی طرح ہر وقت اس کے ساتھ ہے مگر انسان بھی تو ذرا توجہ کرے۔ فَاذْكُرُوْنِىْ اَذْكُرْكُمْ (تم مجھے یاد کرو میں بھی تمہیں یاد کروں گا)، وہ اس کے قریب اس کے دل میں رہ کر اُسے اگر وہ سُنے، چپکے ہی چپکے، دنیا و کائنات کا بھید بتاتا ہے۔ کائنات کا ایک مقصد ہے یہ فضول نہیں بنا دی گئی۔ مَا خَلَقْنٰهَا اِلَّا بِالْحَقِّ اس مقصد کی تکمیل میں اس کائنات کے بڑھانے اور بلند کرنے میں خدا ہر لحظہ منہمک ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ (وہ ہر روز کسی نہ کسی کام میں لگا رہتا ہے) یہ نہیں کہ کائنات کو چند روز میں بنا دیا اور پھر عرش پر جا بیٹھے۔ اسلام ارتقا کا قائل ہے۔ یہ زمین و آسماں۔ یہ مہر و ماہ۔ یہ ستارے اور اور سب کچھ، یہ بدلتے رہتے ہیں، بڑھتے رہتے ہیں۔ آفرنیش کا عمل جاری ہے اور جاری رہے گا۔ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ (پھر خدا اک اور پیدائش پیدا کرے گا)، ترجمان حقیقت نے کیا خوب کہا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

یہ زندگی موت پر ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ مختلف حالتوں اور مختلف درجوں سے ہوتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (اور قسم چاند کی جب وہ کامل ہو جائے کہ تم لوگ درجہ بدرجہ (رتبہ اعلیٰ پر) چڑھو گے) یعنی جس طرح پہلی رات کو ہلال باریک سا ہوتا ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے بدر الدجیٰ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی اس دنیا میں ابھی گویا زندگی کے پہلے دن میں ہے۔ اور اس کے بعد وہ زندگی کے خدا جانے کتنے مرحلے طے کرے گا۔ اور کیا سے کیا ہو جائے گا۔

خدا نے انسان کو زمین و آسمان میں محصور کر کے بظاہر عاجز کر دیا لیکن ساتھ ہی عقل بھی دی کہ ان پر قوت حاصل کر کے ان کو مطیع کر سکے۔ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝ علامہ اقبال اس کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ اگر تم زمین و آسمان کی حدود سے آگے بڑھ سکتے ہو تو بڑھ نکلو لیکن ہاں ان سے آگے بڑھ سکو گے تو صرف قوت سے!

دیکھو اسلام انسان کو خدا کے کتنا قریب لے گیا ہے۔ انسان کو کتنی آزادی دی گئی ہے۔ اس کے لئے کہاں تک ارتقا کی راہیں کھول دی گئی ہیں۔ وہ محض خدا کا مجبور غلام نہیں بلکہ خدا ہی کے حکم سے اُسے صاحبِ اختیار بنایا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ تُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ (تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے) کیونکہ ساری کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے لیکن خدا کی قدرت کاملہ کے ساتھ ساتھ خدا ہی کے حکم سے انسان کی آزادی اور اُس کی طاقت برابر قائم ہے۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (اور خدا نے تو اُن پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ اپنے اُوپر آپ ہی ظلم کرتے ہیں)، لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (انسان کوشش کے بغیر کچھ نہیں

پاتا، اور لَا یُغَیِّرُ اللّٰہُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ آپ اپنی حالت کو نہ بدلے) فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (پھر جب ارادہ کر چکو تو خدا پر توکل کرو) یعنی پہلے خود ارادہ کرو پھر خدا پر چھوڑ دو۔ یہ نہیں کہ ارادہ کئے بغیر ہر بات خدا پر چھوڑے رکھو۔ اس کے بعد بھی جو اپنی قسمت کا رونا روئے اُس سے خدا سمجھے۔ ہمارے قومی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

لیکن یہ مرتبہ مکمل ایمان، مسلسل توجہ اور مستقل ریاضت سے نصیب ہوتا ہے۔ جب سے ہم نے جسمانی کاہلی اور نفسی خود غرضی اور غلط قسم کے توکل پر تکیہ کیا اُس دن سے ہم انسانیت کے درجے سے گر گئے۔ اُس دن سے ہم اور ہماری قوم دین و دنیا دونوں میں اپنی جگہ کھو بیٹھے۔ حضرت عمرؓ اس تقدیر کے قائل نہ تھے جس کے آگے ہندوستان کے مسلمان کچھ عرصے سے سرنگوں ہو رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ۱۸ھ میں جب شام میں وبا پھیل جانے پر مسلمانوں کے لشکر کو کوچ کا حکم دینا چاہا۔ اور حضرت ابو عبیدہؓ نے طیش میں آ کر کہا۔ اے عمرؓ تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہو۔ تو اُنہوں نے جواب دیا۔ نَعَمْ اَفِرُّ مِنْ قَضَاءِ اللّٰہِ اِلٰی قَضَاءِ اللّٰہِ (ہاں تقدیر الٰہی سے بھاگتا ہوں مگر بھاگتا بھی تقدیر الٰہی کی طرف ہوں) یہ ہے آزادی اور تدبیر کا وہ رستہ جو آج کل کے زیاں کار مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ ہے اسلام کا نصب العین جس نے عرب کے بدوؤں میں علم و عمل کی وہ روح پھونک دی۔ جس کے فیض سے مشرق و مغرب کو اک نئی زندگی ملی۔ ہم بھول گئے ہیں کہ ہمارے پیغمبر نے ہمیں تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (اپنے آپ کو خدا کی صفات سے متصف کرو) کا حکم دیا تھا۔ کس قدر بلند مرتبہ تھا۔ جو اسلام نے انسان کو بخشا اور کس قدر ادنےٰ درجہ ہے جس پر آج اُس کے اکثر پیرو پہنچ چکے ہیں۔ اُن کے دل بجھ گئے ہیں۔ اُن کی ہمتیں پست ہیں۔ وہ کہتے ہیں جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ ہماری قسمت ہی ایسی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ کو وہ یہ معنی پہنانا چاہتے ہیں کہ خدا چاہے تو بغیر ہمارے ہاتھ ہلائے ہمیں مالا مال اور طاقت ور بنا دے۔ کَمْ مِنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ اور اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ ایسے لوگوں کے لئے ارشاد نہ ہوا تھا۔

اُس مذہب میں تقدیر پرستی کیسے ہو سکتی تھی جو بات بات میں عقل کی سند دے اور طلب کرے۔ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو) اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ (ایسے جاہلوں کے زمرے میں داخل ہونے سے پناہ مانگتا ہوں) ھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ۔ ھُمْ لَا یَتَذَکَّرُوْنَ۔ ھُمْ لَا یَتَفَکَّرُوْنَ۔ ھُمْ لَا یَتَدَبَّرُوْنَ۔ (وہ نہیں جانتے۔ وہ عقل نہیں رکھتے۔ وہ نہیں سوچتے۔ وہ فکر نہیں کرتے وہ غور نہیں کرتے۔)

عقلی نقطۂ نظر سے اسلام کے اصولوں کی تشکیل

علامہ اقبال جنہوں نے اپنے غیر فانی کلام میں مسلمانوں کی قوم کے لئے قرآن اور اسوۂ رسولؐ کی واضح و مکمل تشریح چھوڑی ہے اپنے سات انگریزی لیکچروں (مطبوعہ ۱۹۳۰ء) میں حالات حاضرہ کا لحاظ رکھتے ہوئے عقلی نقطۂ نظر سے اسلام کے اصولوں کی "تشکیل جدید" پیش کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے۔ جو زمانہ حال کے ترقی یافتہ ناخوش و بیزار انسان کو قلبی اطمینان بخش سکتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم فرماتے ہیں اسلام کے نزدیک حصول علم کے تین بڑے ذریعے ہیں۔ وجدان، فطرت، اور تاریخ۔ وجدان کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ اس کے ذریعے سے ہر شخص اپنے دل میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اور اُس کی آواز سنتا ہے۔ خدا اور انسان کے اس رشتے کے لئے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ خدا ہر بلانے والے کو جواب دیتا ہے۔ جو چاہے خود اس کا تجربہ کرے۔ وہ کبھی ناکام نہ رہے گا۔ تصوف اسی زبردست بنیاد پر قائم ہے۔ صدیوں سے دنیا کے کونے کونے میں تنہا انسانوں نے اسی راہ میں خدا کو اپنا ہم سفر پایا ہے۔ شبلیؒ کا قول ہے کہ صوفی دونوں جہان میں بجز خدا کے اور کسی کو نہیں دیکھتا۔" ایک اور صوفی ابو النصر سراج لکھتا ہے "عشق اُس آگ کا نام ہے جو عاشقوں کے دل اور سینے میں جلتی رہتی ہے۔ اور خدا کے سوا جو کچھ ہے اُسے جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔"

لیکن اسلام اسی قلبی اندرونی ثبوت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ ساتھ ہی عقلی بیرونی ثبوت بھی مہیا کرتا ہے۔ قرآن میں جا بجا عقل و علم کا ذکر ہے اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ (خدا کو علم ہے) وَمِنْھُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ اِلَّا اَمَانِیَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (اور بعض ان میں ان پڑھ ہیں جو بڑ بڑا لینے کے سوا کتاب الٰہی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اور وہ خیالی تکے چلایا کرتے ہیں اور بس) قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ (کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اُسی طریقے پر چلیں گے۔ جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو چلتے پایا۔ بھلا اگر اُن کے باپ دادا کچھ بھی نہ سمجھتے اور نہ راہ راست پر چلتے رہے ہوں۔ تو بھی وہ اُنہیں کی پیروی کئے جائینگے۔) خود قرآن کے معنی ہیں ایسی چیز جو پڑھی جائے۔ کتاب۔ سب سے پہلی آیت جو رسول کریم پر اُتری، سب سے پہلا لفظ جو رُوح کائنات نے عرب کے صحراؤں سے

دنیا بھر کے لئے نشر کیا علم سے متعلق تھا اقراء (پڑھ) اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (پڑھ خدا کے نام سے جس نے سب کچھ پیدا کیا۔ آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا خدا تو بڑا مہربان ہے۔ جس نے انسان کو علم سکھایا قلم کے ذریعے سے۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو اُسے پہلے معلوم نہ تھا) مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (جسے حکمت دی گئی بیشک اُسے بڑی دولت دی گئی) فطرت کا جا بجا ذکر ہے۔ تاریخ کی طرف جا بجا اشارے ہیں۔ یہ نہیں کہ انسان فقط اپنے آپ میں ڈوبا رہے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر و بے تعلق رہے۔ اسلام راہبوں کا مذہب نہیں۔ اسلام پہلا دین ہے جس نے دنیا سے صحیح ربط پیدا کیا۔ اسلام میں دین اور دنیا دونوں ملتے ہیں۔ اسلام کے اہل دین اہل دنیا ہیں اور اہل دنیا اہل دین۔ یہاں دین و دنیا کی تفریق مٹا دی گئی۔ دونوں ایک ہو گئے کہ اسلام میں دوئی ناممکن تھی۔

فطرت میں مشاہدے کی عادت یورپ نے مسلمانوں سے سیکھی۔ اور مسلمانوں نے قرآن سے۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کی ادل بدل میں اور جہازوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور مینہ میں جس کو خدا آسمان سے برساتا اور پھر اُس کے ذریعے سے زمین کو اُس کے مرے پیچھے پھر زندہ کرتا ہے اور ہر قسم کے جانوروں میں جو خدا نے روئے زمین پر پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے پھرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں۔ اُن لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔ قدرت خدا کی نشانیاں ہیں)

تاریخ کے ایک مسلسل تحریک اور ایک ارتقائی عمل ہونے کا نظریہ دنیائے حاضر نے ابنِ خلدون سے سیکھا۔ اس کا منبع بھی قرآن ہے۔ سینکڑوں جگہ ماضی کے واقعات کو بیان کیا ہے کہ اُن کے آئینے میں انسان اپنے حال و مستقبل کو سنوارے۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (تم سے پہلے بھی واقعات ہو گذرے ہیں۔ تو دنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ حق کے جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟ یہ لوگوں کے لئے ایک صریح بیان اور نیکوں کے لئے ہدایت اور نصیحت ہے) وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (یہ اتفاقات وقت ہیں جنہیں ہم لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں)

طبیعیات و تاریخ سے یورپ نے دنیا میں جو انقلاب پیدا کیا۔ اُس کا سرچشمہ مسلمانوں کا ہسپانیہ تھا۔ بریفالٹ اپنی کتاب "تشکیل انسانیت" میں لکھتا ہے کہ "سائنس سب سے بڑی نعمت ہے جو عربی تہذیب کے ہاتھوں دنیائے حاضرہ کو ملی"۔ تجربہ کرنے کا طریقہ جس نے یورپ کو دنیا بھر کا اُستاد اور مالک بنا دیا اُنہوں نے اوّل اوّل عربوں ہی سے سیکھا۔ اس طبیعیات اور طبعی طریقے کی بنیاد عرب کے صحراؤں میں قرآن کی تعلیم نے رکھی تھی۔

علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں کہ "اسلامی کلچر کے متعلق پہلا ضروری نکتہ جو قابلِ غور ہے۔ یہ ہے کہ وہ اپنی نظر ٹھوس محدود چیزوں پر جماتی ہے۔" "میں اس غلط فہمی کو قطعًا مٹانا چاہتا تھا کہ یونانیوں کے طرزِ فکر کا مسلمانوں کے کلچر کی نوعیت پر کچھ اثر پڑا۔" اس کے برعکس یونانی زیادہ تر افکار و نظریات میں دلچسپی لیتے رہے چنانچہ یہ یونانیوں ہی کے فلسفے کا اثر تھا کہ عربوں کی عملی روح تقریبًا دو صدیوں تک بروئے کار نہ آئی۔ پھر جب حکمائے اسلام سمجھے کہ "قرآن کے نزدیک کائنات کی بنیاد حرکت پر ہے، وہ محدود ہے اور اُس میں ترقی کی قابلیت ہے۔" تو اپنے یونانی استادوں سے باغی ہو کر اُنہوں نے اسلامی حُرّیت فکر کا جھنڈا بلند کیا۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ "دنیائے حاضرہ کے قدامت شکن طرزِ فکر کی بنیاد دراصل اُس بغاوت نے پڑی جو اسلام نے یونانی طرزِ خیال کے خلاف شروع کی"

ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام ایک انقلابی تحریک تھی۔ جس نے دنیا کی کایا پلٹ دی۔ جس نے بقول اقبالؒ مذہب اور روحانی تعلیم کی تکمیل کر کے علی الاعلان وحی اور پیغمبری کا خاتمہ کر دیا۔ اور نوعِ انسان کی باگ ڈور انسانی عقل کے ہاتھ میں دے دی۔ پھر تعجب ہے کہ آج کل کے کئی مسلمان اس قدر قدامت پسند ہیں۔ کہ مخالفین اسلام کے معنی ہی قدامت پسندی سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے ہر قسم کی قدامت پرستی کو مٹایا۔ اُس نے صرف پتھر کے بتوں کو نہیں توڑا۔ اُس نے پرانے خیالات، پرانے رسم و رواج غرض ہر پرانی چیز کی بزرگی کو بُت سمجھ کر پاش پاش کر دیا کیونکہ یہ سب نام نہاد بزرگیاں انسانی نفس کی ترقی کے راستے میں پتھر بن کر حائل تھیں۔ اُنہوں نے انسانی رُوح کو پتھرا دیا تھا۔ اسلام نے اپنے بُت شکن قدامت شکن طرزِ عمل سے انسانی آزادی کے لئے رستہ صاف کر دیا۔ سو سچا مسلمان وہی ہے جو قرآن کے لفظوں میں محض اندھا دُھند اپنے باپ دادا کے طریقے پر نہ چلتا رہے بلکہ جو ربّانی ہدایت کی روشنی میں خود اپنی عقل سے کام لے غرض اپنا وجدان، قدرت کا مشاہدہ، تاریخ کا مطالعہ، ٹھوس چیزوں پر نظر، عقل کی کسوٹی اسلام کے اصول ان سادہ بنیادی چیزوں پر مبنی تھے۔ اس سے انسان نے جو سمجھا وہ یہ تھا کہ کائنات جس کی روح خدا ہے ایک بڑھنے والی حرکت کرنے والی نشو و نما پاتی ہوئی آزاد برادری ہے۔ اور خدا کی باندھی ہوئی حدوں کے سوا جو فطرت میں مضمر ہیں سب رکاوٹیں اور بندشیں شیطان کے چرخے ہیں

جن کا مٹا دینا ہر مسلمان کا منصبی فرض ہے۔ حرکت کا وہ اصول جس سے یہ بندشیں ہر زمانے میں توڑی جاتی ہیں۔ اسلام میں اجتہاد کہلاتا ہے۔ جس کا مدعا یہ ہے کہ اسلام نے جو عام اصول انسانی معاشرت کی نشوونما کے لئے وضع کئے ہیں۔ اُن کی روشنی میں ہر زمانے کے حالات کے مطابق معاشری و تمدنی تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں۔ بلکہ ایسی تبدیلیوں کا عمل میں لانا ضروری ہے کیونکہ ان کے بغیر اسلام کی روح کبھی ہیکلِ انسانی میں ایک زندہ رُوح کی طرح اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتی۔

بقول اقبالؒ اسلام کے نزدیک زندگی کی روحانی بنیاد ابدی ہے۔ اور تنوع اور تغیر میں ظہور پذیر ہوتی ہے لہٰذا انسانی معاشرت کو اپنے اندر ثبات اور تغیر کے دو متضاد "مقولوں" کو تطابق دینا چاہیئے۔ اسلام نے اُدھر بعض مستقل قوانین نافذ کئے لیکن اِدھر تغیر کو قرآن کے لفظوں میں خدا کی ایک نشانی قرار دے کر حرکت کا وہ اصول وضع کیا جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اسلام کے سارے اندرونی و بیرونی نظام کی بنیاد وحدانیت پر ہے۔ مذاہب کے سارے توہمات معاشرت کے سارے امتیازات کو اسلام نے اپنی وحدت کے طوفان میں غرق کر دیا۔ خدا ایک ہے، یہ کائنات بھی اپنی بوقلمونیوں کے ساتھ ایک ہے۔ سو نوعِ انسان بھی سب کی سب ایک برادری ہے كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ مذہب کا مقصد یہی ہے کہ انسان کا رشتہ براہ راست خدا اور ساری کائنات سے پیدا کر دے جس سے اُس کے نفس کے اندر ایک ہمہ گیر رُوح دوڑ جائے۔ اس وحدت میں اُسے کوئی غیر نہ نظر آئے۔ پھر جب غیریت کے پردے اُٹھ جائیں۔ اور دل خود بخود محبت کے نرم رنگین رشتوں سے بندھ جائیں تو زندگی کی پیچیدگیاں آپ سے آپ سلجھتی جائیں گی۔ اسلام میں وحدت ہی کے سرچشمے سے اخوت اور حریت اور مساوات کی ندیاں لہریں لیتی ہوئی بہتی ہیں۔ توحید الٰہی کا لازمی نتیجہ توحید انسانی ہوتا ہے۔ اس انسانی حریت اور اخوت و اتحاد کو ہر وقت زندہ و تابندہ رکھنے کے لئے اسلام نے فرائض کا ایک نظام قائم کیا جس سے بیک وقت فرد اور جماعت کی بہتری مقصود تھی۔ نماز سے اگر مدعا صرف عبادت ہوتا تو فرشتوں کے بعد انسان کی تخلیق غیر ضروری تھی۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ان سب کا مقصد اگر ایک طرف فرد کا تزکیۂ نفس تھا۔ تو دوسری طرف انسانوں کی جماعت کو منظم و متحد اور مربوط و مضبوط کرنا تھا۔ انہیں سے وہ اتحاد پیدا ہوا جس نے امیر و فقیر کو پہلو بہ پہلو کھڑا کر کے مسلمانوں کی جماعت کو تنِ واحد بنا دیا۔ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ الْجَمَاعَةِ (جماعت کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے)۔ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ (اسلام جماعت ہی سے ہے)۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۔ عام مسلمانوں کو ہدایت تھی کہ خدا اور رسول کا کہا مانو لیکن ساتھ ہی رسول کو بھی یہ ہدایت تھی شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (سب معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو)

آنحضرتؐ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اسلام کی اس آزاد روح کو قائم رکھا حضرت عمرؓ جو اپنے ایثار و اجتہاد اور اپنے عزم و استقلال کے کارناموں کے باعث اسلام کی تاریخ میں ایک امتیازی مرتبہ رکھتے ہیں اسلامی روح کا ایک غایت درجہ پاکیزہ نمونہ تھے۔ وہ ہر بات میں دوسروں سے مشورہ لیتے تھے۔ ان کا قول تھا۔ لَا خِلَافَةَ اِلَّا عَنْ مَشْوَرَةٍ ۔ فَاِنِّیْ وَاحِدٌ كَاَحَدِكُمْ (میں بھی ایسا ہی ہوں جیسے تم میں سے کوئی ایک) ایک دفعہ وہ آستینیں چڑھائے بیت المال کے ایک اونٹ کے پیچھے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کسی نے کہا آپ تکلیف نہ کیجئے کسی غلام کو حکم دیجئے۔ فرمایا اَیُّ عَبْدٍ اَعْبَدُ مِنِّیْ (مجھ سے بڑھ کر خدا کا غلام کون ہوگا)، مساوات کا نمونہ محنت کا جذبہ امانت داری کا نظارہ اس سے بڑھ کر دنیا کی آنکھوں نے کم دیکھا ہوگا۔

تاریخ میں اگر کبھی اشتراکیت صحیح طور پر عمل میں آئی تو وہ اسلام کی پہلی صدی میں۔ انقلاب فرانس کا نعرۂ "حریت و مساوات و اخوت" ایک نعرہ ضرور تھا مگر اس پر عمل اول تو ہوا ہی تھوڑا اور جو ہوا وہ دس سال بھی قائم نہ رہ سکا۔ اور اس مدت میں بھی اخوت محض نام کو باقی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بغیر اس مخصوص اسلامی صفت کے حریت و مساوات کا صحیح معنوں میں قیام ناممکن ہے۔ ہر زمانے میں بہت سے غیر مسلم نکتہ چینوں نے اعتراف کیا ہے۔ کہ رنگ و نسل کا مسئلہ اگر کسی مذہب و ملت نے حل کیا ہے تو اسلام اور اہل اسلام ہی نے۔ ایک دفعہ سرداران قریش حضرت عمرؓ سے ملنے آئے۔ اتفاق سے حضرت بلالؓ بھی، جو ایک حبشی غلام تھے، موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے قریش کے سرداروں کو چھوڑ کر پہلے بلالؓ سے ملاقات کی۔ اس پر ابوسفیان برہم ہوگیا۔ تو ایک دوسرے حق شناس قریش سردار نے کہا کہ بھائیو ہم کو عمرؓ کی نہیں۔ بلکہ اپنی شکایت کرنی چاہیئے۔ اسلام نے سب کو ایک آواز سے بلایا لیکن جو اپنی شامت سے پیچھے پہنچے آج بھی وہ پیچھے رہنے کے سزاوار ہیں" آج کل اس انحطاط کے عہد میں بھی غالباً مسلمان ہی وہ قوم ہیں جن کو حبشیوں کے خلاف ان کے سیاہ رنگ کی بنا پر کوئی تعصب نہیں۔ یہ سب اسلام کا اثر ہے۔

اسلام اور اشتراکیت

چند برس سے روس میں ایک قسم کی اشتراکیت کا دور دورہ ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ روس نے بعض باتوں میں خاصی ترقی کی ہے۔ کیونکہ اس نے فاقہ مست مزدوروں کو سرمایہ داروں کی غلامی سے چھڑا دیا ہے لیکن کیا اس نے بہت سی انفرادی خصوصیتوں کو اور فرد کی آزادی کو کچل کے نہیں رکھ دیا۔ اسلام نے جماعتی آزادی اور مساوات بھی قائم کیں لیکن ساتھ ہی فرد کی آزادی بھی قائم رکھی اس

پر جبر نہ کیا۔ اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وجہ یہ تھی۔ کہ روحانیت نے خود بخود سب کے دل موم کر دیئے تھے۔ اور ساتھ ہی عمل کی روح بھی پھونک دی تھی۔ وراثت کے احکام سے سرمایہ داری ناممکن ہوگئی۔ جائیداد بہت سے حصوں میں بٹ گئی۔ اور پھر زکوٰۃ و خیرات سے اس میں اور کمی آگئی۔ سُود سرے سے جائز ہی نہ تھا۔ قمار بازیوں کو سختی سے روکا گیا۔ اجارے اور احتکار کو آنحضرت نے حرام قرار دیا۔ لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ اسلام نے زبردستی اور علی الاعلان امیری غریبی اور چھوٹے بڑے کے فرق کو قانوناً نہیں مٹایا۔ اسلام انسانی فطرت سے خوب آگاہ تھا۔ وَرَفَعْنَا بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ اُس نے مختلف طبقوں کے معاشری امتیازات کو جہاں تک ہو سکا کم کیا۔ اس طرح فرد کی آزادی بھی قائم رہی۔ اور طبقوں کے فرق بھی کم ہوتے گئے۔ اس غرض سے مختلف باتوں کی ترغیب دی گئی۔ اپنی جائیداد کو رفاہِ عام اور مفید کاموں میں خرچ کرنے کی ترغیب وقف کے طریقے سے دی۔ پیغمبر اسلام نے یہ کہہ کر امارت کی قدر کم کی۔ اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ (مجھے اپنی غریبی پہ ناز ہے) کام اور مزدوری کو یہ کہہ کر بلند کیا کہ "جو ہر حال میں لائق اور درست ہیں مگر نہ اپنے لئے اور نہ دوسروں کے لئے کام کرتے ہیں اللہ اُن پر مہربان نہیں"۔ "اللہ اُنہیں پر مہربان ہے جو اپنی روزی مزدوری کر کے حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ خود اپنے ہاتھوں سے معمولی مزدور کی طرح کام کرتے تھے۔ مدینے میں مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت خود اپنے ہاتھوں سے معمولی مزدور کی طرح کام کرتے تھے۔ مدینے میں مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت خود اپنے ہاتھوں سے اینٹیں اُٹھا کر لاتے۔ صحابہ عرض کرتے، ہم آپ پر قربان آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ لیکن آپ اپنے فرض سے باز نہ آئے۔ غزوۂ احزاب میں جب تمام صحابہ مدینے کے چاروں طرف خندق کھود رہے تھے۔ آپ بھی ایک ادنےٰ مزدور کی طرح کام کر رہے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ خدا اُس بندے کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے۔ پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین نے پچاس سال تک ان اصولوں پر عمل کر کے دکھا دیا۔ یہ ہے عملی اشتراکیت۔ یہ مرتبہ کبھی لینن اور سٹالن کو نصیب نہیں ہؤا۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا محرک صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ سچا ایمان جس سے صحیح قسم کی بے لاگ اخوت پیدا ہوتی ہے۔ اور سچا ایمان مادی دنیا کی پیداوار نہیں وہ صرف ایک روحانی کائنات کے احساس سے وجود میں آسکتا ہے۔

اسلامی جمہوریت کے اس اولین عہد میں ہر فرد ریاست کا رکن تھا حاکموں کی کوئی جماعت نہ تھی۔ چھوٹے سے چھوٹا آدمی امیرالمومنین پر علانیہ نکتہ چینی کر سکتا تھا۔ ہر شخص ریاست کا خادم تھا اور اپنی روزی کے لئے کچھ نہ کچھ کام کرتا تھا۔ اور ریاست اُن لوگوں کی پرورش کرتی تھی جو کام کرنے سے معذور تھے۔ غیر مسلموں کا بھی ہر بات کا دھیان رکھا جاتا تھا۔ جب حضرت عمرؓ ایک غیر مسلم کے خنجر سے شہید ہوئے۔ تو مرنے سے پہلے یہ وصیت کر گئے کہ ذمیوں سے جو اقرار ہے وہ پورا کیا جائے۔ اُن کے دشمنوں سے لڑا جائے۔ اور اُن کو اُن کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔

(اقتباس از "مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل" مصنفہ میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لاء)

حسیات

وہ صبح اپنی صبح نہیں وہ شام نہیں اب شاموں میں
وہ نکلے رشتہ جوڑنے والے مٹ ہی گئے معدوموں نے
محفل کی قیامت ذرا خاموشی قلب و جگر پر بارسی ہے!
دنیا میں خوشی کو دیکھ لیا موہوم نشے کی مستی ہے
کس شیرینی کا حال تھا وہ دور محبت کیا کہئے!
کیا جانے! کیوں اُڑ جاتی ہے نیند آنکھوں سے شب کو اکثر

وہ شیریں لمحے کھو ہی گئے ماضی کے سبک روگاموں میں
ہم اور ہی دُھن میں بیٹھے ہیں اب رس نہیں دل کے کاموں میں
اب جذب نہیں وہ یاروں میں وہ جوش نہیں ہنگاموں میں
جس مے کے نشے سے چُور ہیں ہم وہ مے ہی نہیں ان جاموں میں
اب تک بھی رنگینی کی مہک ہے بیت گئے ایاموں میں
دل انگارہ بن جاتا ہے ساون کی بھیگی شاموں میں!

وہ اپنے دل میں بستے ہیں ہم ان کے دل میں رہتے ہیں
جو اس کوچے میں بیٹھے ہیں جعفر ہے اُنہیں گمناموں میں

جعفر شیرازی

صفحۂ اطفال

"پیارا دیس"

ہمارا دیس دیوتاؤں کی سرزمین، پیغمبروں کی جنم بھومی اور گوروؤں رشیوں کا استھان ہے۔ ہمارے دیس کے پوِتر دریاؤں گنگا اور جمنا کا امرت جل زندگی بخشتا ہے۔

ہمالا سب سے اُونچا پربت ہمالہ ہے۔ ہمالیہ ہمارے دیس کا مینارِ روشنی ہے۔ اس کی بلند چوٹی مونٹ ایورسٹ آکاش سے باتیں کرتی ہے۔ بلندیوں کو ماپنے والے ہوائی جہاز بھی اس چوٹی پر نہ پہنچ سکے۔ ہمالیہ پربت ہمارے ملک کی فصیل یا شہرپناہ ہے۔ ہمارے دیس کی عظمت اور بلندی کے گیت آسمان کے ستارے بھی گاتے ہیں۔ ہمارے دیس کے کجلی بن، مہابن اور بندرابن خام پیداوار کے خزانے ہیں۔ ساری دنیا ان خزانوں سے جھولیاں بھرتی ہے۔ مگر ان میں کسی طرح کی کمی نہیں آتی۔

ہمارا دیس کسانوں کا دیس ہے جس میں ساڑھے سات لاکھ دیہات آباد ہیں۔ ان دیہات میں دیس کے ۳۵ کروڑ باشندے بستے ہیں۔

ہمارے دیس کا کسان ساری دنیا کا اَن داتا ہے۔ بھارت ورش کا اناج ملکوں ملکوں جہازوں میں بھر کر بھیجا جاتا ہے۔

ہمارا دیس دھرتی کا سورگ ہے۔ اسے ہندوستانی جنّت نشان کہتے ہیں۔ کشمیر ہمارے دیس کا لہلہاتا ہوا باغ ہے۔ رنگ رنگ کے پھولوں کی پھلواڑی کشمیر کے نت نئے پھل دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں ہوتے۔ ہم ہندوستانی ہیں۔ ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

بولو بھارت ورش کی جے (تاجور)

"ہمارا مذہب"

ہمارا مذہب ہمیں نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے۔ نیکیوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اور ان سب کے مجموعے کا نام خُلق ہے۔ خلق کا صرف یہ مطلب نہیں کہ انسان بُرے کاموں سے بچتا رہے۔ بلکہ خلیق اُس کو کہتے ہیں۔ جو ہمیشہ دوسروں کی عزت کرے۔ اور اپنی عزت کرانے کی کوشش کرتا ہو۔ وہ کسی کو نیک کام کرتے ہوئے جب دیکھے تو خوش ہوتا ہو۔ اس کا کوئی کام اپنی شُہرت کے لئے نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کی خاطر ہوتا ہے۔ وہ کسی کا عیب تلاش نہیں کرتا۔ اگر کسی سے غلطی ہو جائے۔ تو وہ سمجھتا ہے کہ ہوا کیا۔ اگر اس سے غلطی ہو گئی۔ غلطی انسانوں ہی سے ہوتی ہے۔ ہر ایک انسان کی طرف سے نیک گمان رکھتا ہو۔ جب کوئی اپنے قصور

کا اقرار کرے تو معاف کر دیتا ہے۔ محتاجوں کی مدد کرتا ہے۔ غریبوں اور مفلسوں کی روپے پیسے سے امداد کرتا ہے۔ اور اگر روپیہ پیسہ نہ ہو۔ تو ہاتھ پیر سے خدمت کرتا ہے۔ ہر انسان کو تکلیف میں دیکھ کر اسے تکلیف ہوتی ہے۔ ہمیشہ اپنے عیب ڈھونڈھتا رہتا ہے۔ اگر کوئی عیب نظر آجائے۔ تو اس کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ محبت کا سلوک کرتا ہے۔ جب کسی سے بات چیت کرتا ہے۔ تو نرمی ملائمت اور شیریں گفتاری سے۔

ویسے تو ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ میں خلیق ہوں۔ لیکن دراصل خلیق وہ ہوتا ہے جس میں یہ پانچ اوصاف ہوں۔ حکمت شجاعت عفت۔ سخاوت۔ عدالت ان پانچوں اوصاف کی مختصر تعریف یہ ہے۔

حکمت یہ ہے کہ انسان ہر معاملہ کو سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ ضروری کام کو نہ چھوڑے اور غیر ضروری کاموں میں دخل نہ دے ذہین ہو اور عقلمند۔ اس کی ہر طرف نظر رہے۔ عقل سے کام لے اور بیوقوفی کے کام نہ کرے۔

شجاعت یہ ہے کہ وہ بے خوف ہو کر نیک کام کرے۔ یہاں تک کہ نیکیوں کے کام کرنے میں اُس کو جان کی بھی پروا نہ ہو۔ مناسب اور غیر مناسب کا خیال رکھے۔ دنیا کی تکلیفوں سے پریشان نہ ہو۔ جلدی غصے میں نہ آجائے۔ نیکی کے کاموں میں اگر تکلیف بھی ہو تو گھبرا نہ جائے۔ اس کی ہر وقت یہ خواہش ہو کہ میں نیکیاں کروں۔ بُرائی سے پرہیز کرے۔ ہر ایک سے جھک کر ملے۔ دوسروں کی تکلیف سے اُس کو تکلیف اور دوسروں کی راحت سے اُس کو راحت ہو۔

عفت یہ ہے کہ بُرے کاموں سے شرم کرے۔ اچھی عادتیں اختیار کرے۔ لڑائی جھگڑوں سے دُور بھاگے۔ دنیاوی خواہشوں پر قابو رکھے۔ جو مل جائے اسی پر صبر و شکر کے ساتھ گزارا کرے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے جب کوئی بُری خواہش ہو۔ تو اس کو ٹھکرا دے۔ نیک اعمال پر قائم رہے۔ اور برائی کے ذریعہ دولت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔

سخاوت یہ ہے کہ خدا کی مخلوق کے لئے راحت و آرام کے سامان پیدا کرے۔ کنوئیں کھُدوائے۔ سبیل لگوائے۔ اگر قحط پڑ جائے۔ تو غریبوں اور محتاجوں کو کھانا کھلائے۔ اگر کسی سے قصور ہو جائے تو اُس کو معاف کر دے اور بُری عادتوں کو خوشی کے ساتھ چھوڑ دے۔

عدالت یہ ہے کہ ہمیشہ سچائی پر قائم رہے۔ کاروبار میں اپنے ہم جنسوں کی مدد کرتا رہے۔ اور ان کی تکلیفوں کو دُور کرے اپنے رشتہ داروں سے محبت کرے۔ اور اُن کی ہر طرح سے امداد کرتا رہے۔ اگر کوئی احسان کرے تو اس سے بڑھ کر اس پر احسان کرے۔ دیانتدار ہو۔ دوسروں کا حق ادا کرے۔ خدا کی طرف سے جو نعمت ملے اُس کا شکر ادا کرے۔

پریمیو! جس میں یہ تمام اوصاف ہوں اُس کو خلیق کہتے

ہیں۔ اور یہی ہمارے مذہبی اصول ہیں۔ جو خلیق ہو اور ان تمام اوصاف کا مالک ہو۔ اس سے زیادہ کسی کا خدا پر ایمان نہیں ہوتا۔

(طالب فارسی)

مٹی کا تیل کہاں سے آتا ہے؟

موہنی نے رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ ناناجی! آج تو تیل والا نہیں آیا۔ اور لیمپ اب بجھا چاہتا ہے۔ میں اپنا سبق کیوں کر یاد کروں گی۔

موہنی کی بات سُن کر اس کا بھائی سوہن ہنس پڑا۔ اور بولا روز تو پڑھتی ہے۔ امتحان ہو چکے ہیں۔ آج چھٹی منا لے۔ میرا دل تو آج کہانی سُننے کو کر رہا ہے۔ کیوں تُو بھی کہانی سننے کو تیار ہے؟

موہنی نے ناناجی کی طرف دیکھ کر کہا۔ اگر ناناجی اجازت دیں۔

ناناجی بولے۔ ہاں ہاں ضرور۔ رات کے اندھیرے میں کہانی سُننا بڑا اچھا معلوم دیتا ہے۔ (دونوں بچوں کے خوش کرنے کے لئے ناناجی نے کہانی شروع کی، آج میں تمہیں مٹی کے تیل کی ہی کہانی سُناتا ہوں۔

آج سے اسی سال پیشتر کی بات ہے۔ اُن دنوں میں بھی تمہارے جیسا ایک بچہ تھا۔ مجھے آج تم جیسا دیکھ رہے ہو۔ ویسا میں پہلے نہ تھا۔ تمام دانت مُنہ میں موجود تھے۔ کمر سیدھی تھی۔ اور گردن ڈگ ڈگ نہ کرتی تھی۔ صاف ستھرے گھروں میں ہم لوگ رہتے تھے۔ مکان کے ہر ایک کمرہ میں ایک ڈیوٹ لگا رہتا تھا۔ اس پر ایک مٹی کا چراغ رکھا جاتا تھا۔ اس چراغ میں سرسوں کا تیل بھرا رہتا تھا۔ رُوئی کی بتی پڑی رہتی تھی۔ اور اسی چراغ کی روشنی میں ہم لوگ اپنا تمام کام رات کے وقت کرتے تھے۔

موہنی بولی۔" کیا ناناجی اُس وقت مٹی کا تیل نہ تھا"؟

ناناجی کہنے لگے"ہاں بیٹی اُن دنوں مٹی کے تیل کو ہندوستان میں کوئی نہ جانتا تھا اور نہ کسی نے دیکھا تھا"۔

سوہن بول اُٹھا۔ ہاں ہاں ہمارے ماسٹر جی بھی کہتے تھے۔ کہ اُس وقت کے لوگ مٹی سے تیل کا بنانا نہیں جانتے تھے۔

ناناجی بولے۔ بیٹا مٹی سے تیل کا بنانا نہ اُس وقت کوئی جانتا تھا اور نہ اب کوئی بنا سکتا ہے۔ مٹی کا تیل تو مٹی سے نکالا جاتا ہے بنایا نہیں جاتا۔

موہنی پوچھنے لگی۔ ناناجی تب تو ہم اپنے گھروں ہی صحن میں سے مٹی کا تیل نکال لیا کریں گے۔ مگر نکالیں گے کیسے؟

ناناجی کہنے لگے۔ بیٹی! گھروں کے صحن میں سے مٹی کا تیل نہیں نکل سکتا۔ اور نہ ہی ہر جگہ مٹی کا تیل پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں صرف برہما میں مٹی کا تیل نکلتا ہے۔ سب سے زیادہ مٹی کا تیل یونائیٹڈ اسٹیٹس امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ کیلے فورنیا۔ ورجینا۔ کینیڈا۔ اوکوہاما۔ رومانیہ۔ روس اور انگلستان میں بھی مٹی کا تیل خوب نکلتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت جگہ یہ تیل پایا جاتا ہے بہت سے ایسے علاقے بھی ہیں۔ جہاں مٹی کا تیل ہے مگر ابھی تک نکالا نہیں گیا۔ مٹی کا تیل صرف زمین سے ہی نہیں نکالا جاتا۔ بلکہ کیلے فورنیا

کے پاس سمندر کے بیچ میں بھی مٹی کے تیل کے کنوئیں بنائے گئے ہیں۔

سوہن بول اُٹھا۔ کیا اِن کنوؤں میں سمندر کا پانی داخل نہیں ہوتا؟

ناناجی کہنے لگے۔ نہیں بیٹا! تیل کے کنوئیں پانی کے کنوئیں کی طرح نہیں ہوتے۔ وہ اس طرح بنائے جاتے ہیں۔ کہ پانی کا ایک قطرہ بھی اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ایسے کنوئیں بڑی بڑی مشینوں کی مدد سے کھودے جاتے ہیں اور لگ بھگ ایک میل سے ڈیڑھ میل تک گہرے ہوتے ہیں۔ جس طرح بڑھئی برمے سے لکڑی میں چھید کرتا ہے۔ اور زمین میں نل لگانے والے جس طرح زمین میں سوراخ کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح بورنگ مشینوں (بڑے بڑے برموں) کی مدد سے مٹی کے تیل کے کنوئیں کھودے جاتے ہیں۔ نلوں اور مشینوں کی مدد سے مٹی کا تیل اُوپر کھینچا جاتا ہے۔ اور اسے بڑے بڑے تالابوں میں جمع کیا جاتا ہے۔ اِن تالابوں میں بڑے موٹے نل لگاتے ہیں۔ یہ نل کارخانوں کی ٹنکیوں تک لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہیں نلوں کے ذریعہ کنوؤں سے تیل کارخانوں میں بھیجا جاتا ہے۔ بغیر صاف کیا ہؤا تیل کروڈ آئل کہلاتا ہے۔ اس تیل سے انجن اور مشینیں چلائی جاتی ہیں۔ کم صاف کیا ہؤا تیل ذرا پیلا ہوتا ہے۔ اس کے جلانے سے لیمپ یا لالٹین کی چمنی جلد سیاہ ہو جاتی ہے۔ اچھی طرح صاف کیا ہؤا تیل صاف اور سفید ہوتا ہے۔ اور یہی تیل آج کل ہر گھر میں جلایا جاتا ہے۔ بہت زیادہ صاف کیا ہؤا تیل خوشبودار تیلوں کو تیار کرنے میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ جسے عام طور پر وہائٹ آئل کہتے ہیں۔

موہنی چونک کر بولی۔ تو کیا میری تیل کی شیشی میں مٹی کا تیل ملایا گیا ہے؟

ناناجی بولے "ہاں بیٹی، ولایت سے بن کر جتنے خوشبودار تیل آتے ہیں۔ وہ سب اسی وہائٹ آئل سے تیار کئے جاتے ہیں۔ اور صرف تیل ہی نہیں ویسلین میں مٹی کے تیل کا جزو ہے۔ موم بتی مٹی کے تیل سے ہی بنائی جاتی ہے۔ موٹروں کو چلانے والا پٹرول بھی مٹی کا تیل ہی ہے۔ اس سے اور بھی سینکڑوں چیزیں تیار ہوتی ہیں مٹی کا تیل آنکھ اور پھیپھڑے کے لئے نقصان دہ ہے

موہنی بولی۔ تو اب میں کبھی اپنے سر میں مٹی کے تیل سے تیار کئے ہُوئے خوشبودار تیل نہ ڈالوں گی۔

سوہن بولا "میں ہرگز ایسی ویسلین استعمال نہ کروں گا"

(آنندشنکر پانی پتی)   (منقول از پریم)

"پریم" بچوں کا اتنا اچھا اخبار ہے کہ چھوٹی عمر اور بہت کم علمی استعداد کے بچے بھی متواتر ایک سال کے مطالعہ کی بدولت بہت اچھی قابلیت حاصل کر سکتے ہیں۔

بزمِ انتخاب

دنیا کی متموّل ترین عورت

ذیل کا مضمون لندن کے ایک پرانے انگریزی اخبار کا آزاد ترجمہ ہے

دنیا کی متموّل ترین عورت" مادام سوزدکی" کا شمار اول درجہ میں کیا جاتا ہے۔ اُس نے جاپان کی تجارت پر سب سے زبردست قبضہ حاصل کیا ہے۔ اس کی بعض تجارتی اسکیموں سے جاپانی وزارت اور ملک کے بہت سے بینکوں کو نقصان عظیم برداشت کرنا پڑا ہے۔ اس کا نام بیسویں صدی کے ماہرین تجارت میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ جب کسی کمپنی یا دکان کی نبیاد ڈالتی تھی۔ تو کسی شخص کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ دنیا میں اس کا کاروبار بڑے بڑے شہروں میں پھیلا ہوا ہے۔ جس میں لاکھوں مزدور کام کرتے ہیں۔ اس کے بڑے بڑے کارخانے چین۔ جاپان۔ امریکہ۔ آسٹریلیا۔ ملایا اسٹریٹ وغیرہ میں بکثرت موجود ہیں۔ اور اس کے تجارتی دفاتر۔ لندن۔ پیرس۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ برلن نیو یارک۔ ویلیڈی۔ واسٹک وغیرہ ممالک میں ہیں۔ قریباً دنیا کے ہر حصے میں اس کی جائیداد پھیلی ہوئی ہے۔

"مادام سوزدکی" جاپان کے ایک مشہور تاجر کے یہاں پیدا ہوئی تھی اس کے والدین نے اُس کی پرورش نہایت احتیاط اور توجہ سے کی۔ پانچ سال کی عمر میں اس نے تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ معمولی تعلیم کے بعد اُس کے والد نے اُسے تجارتی کاروبار کے اصول اور نکات بتائے۔ اس کی غیر معمولی قابلیت نے اُسے بہت جلد تجارتی دنیا میں طاق کر دیا۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں اُس کی شادی جاپان کے اوسط درجہ کے تاجر کے ساتھ کر دی گئی۔ مصری صاف کرنے کے ایک معمولی کارخانے میں اُس کے خاوند کے چند حصے تھے۔ جس میں چند مزدور کام کرتے تھے۔ لیکن" مادام سوزدکی" کی شادی کے بعد اُس کے کارخانے کو دن بدن فروغ حاصل ہوتا رہا۔ اور چند دنوں کے بعد ہی اُسے اس تجارت میں کافی فائدہ ہوا۔

۱۹۰۵ء میں اُس کے خاوند کا انتقال ہو گیا۔ شوہر کے انتقال کے بعد اُس نے مصری کے کارخانے کے تمام حصے فروخت کر ڈالے اور شہر "کوبے" میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے اس طرز عمل سے تاجروں کو خیال پیدا ہوا۔ کہ اب وہ تجارتی دنیا سے کنارا کشی اختیار کر کے تنہائی کی زندگی بسر کرے گی۔ لیکن حقیقت میں وہ ایک دوسری نئی کمپنی کی بنیاد ڈالنا چاہتی تھی۔ اور اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں منہمک تھی۔ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی اور رفتہ رفتہ خفیہ طور پر" سوزدکی اینڈ کمپنی" کی بنیاد عالم وجود میں آئی۔ جاپان کے بڑے بڑے کارخانوں کے حصے خرید لئے گئے۔ ابتدا میں اس کمپنی کے حصہ داران میں دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ لیکن جب "مادام سوزدکی" کو معلوم ہوا کہ کمپنی دن دُگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ تو اُس نے دوسرے حصہ داروں کا حصہ بھی خود خرید لیا۔ بیس سال کے بعد وہ سوزدکی اینڈ کمپنی کے ۹۸ فی صدی حصوں کی واحد مالک بن گئی۔ اسی بیس سال کی مدت میں اُسے قریباً پانچ کروڑ روپیہ کا نفع ہوا۔

"مادام سوزدکی" نے ایک قلیل مدت میں دنیا کے دولتمندوں کی فہرست میں نام پیدا کر لیا۔ اور اُس کی دولت کی شہرت دور دراز ممالک میں ہو گئی۔ لیکن وہ غریبوں میں ہر دلعزیز نہ ہو سکی۔ جس قدر روپیہ اُس نے جمع کیا تھا وہ تمام کا تمام غریبوں، بیواؤں کی رات دن کی محنت، جفاکشی اور خونریزی کا نتیجہ تھا۔ وہ مزدوروں کو اس قدر کم اُجرت دیتی تھی۔ کہ اُن کی روزانہ ضروریات بھی پوری نہ ہوتی تھیں وہ قرض لے کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے تھے جنگ عظیم کے زمانہ میں اُس نے دور اندیشی سے کام لے کر چاولوں کی منڈیوں پر قبضہ کر لیا۔ اور غلے کو گراں کر دیا۔ غلے کی گرانی سے مزدور ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ اور اُنہیں دو وقت روٹی بھی میسر نہ ہونے لگی۔ اور فاقوں کی نوبت آ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے کارخانے کے تمام مزدور اور غربا، اُس کے مخالف ہو گئے۔ اُن کے دلوں میں "مادام سوزدکی" کی کوئی وقعت نہ رہی اور وہ اُس سے نفرت کرنے لگے دن گزرتے گئے۔ مزدور مسلسل فاقے کرتے رہے۔ لیکن ان میں اب فاقے برداشت کرنے کی طاقت نہ رہی۔ اور اُن کے دل میں انتقام کا جذبہ پیدا ہوا۔ مزدوروں اور غریبوں کے ایک جم غفیر نے" سوزدکی اینڈ کمپنی" کی شاندار عمارت پر دھاوا بول دیا۔ اور آن کی آن میں اُس کی عالیشان عمارت کو جلا کر خاک کر ڈالا۔" مادام سوزدکی" اس نقصان عظیم کو برداشت

نہ کر سکی۔ اور اپنی جان بچانے کے لئے مرد کا بھیس بدل کر شہر "شنزوکی" کی طرف چلی گئی۔

"شنزوکی" جاپان میں چائے کی پیداوار کے لئے بہت مشہور ہے یہاں چائے بکثرت ہوتی ہے اور یہاں چائے کی منڈی پر بھی اس کا قبضہ تھا۔ چائے بھی گراں قیمت پر فروخت ہوتی تھی۔ یہاں کے لوگ چائے کی گرانی اور اُس کے بیجا وعیارانہ طرز عمل سے بہت بیزار تھے شہر "کوبے" سے مزدوروں کا ایک گروہ اُس کے تعاقب میں یہاں بھی آن پہنچا۔ لہٰذا اُسے یہاں بھی اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اُس کی جان خطرے میں محسوس ہونے لگی۔ مجبوراً "ٹوکیو" کے مشہور ہوٹلوں کو تار دیا۔ اور اپنی رہائش کے لئے چند کمروں کا انتظام کرنے کے لئے کہا۔ لیکن ہوٹل کا ہر مالک عوام کے غیض وغضب سے بخوبی واقف تھا اور انہیں خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ غصہ سے سیخ پا ہو کر ہمارے ہوٹل جلا ڈالیں اس لئے کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ ہوٹل کا ایک کمرہ بھی اُس کی رہائش کے لئے وقف کر سکے۔

عوام کے جوش غضب کی انتہا یہ تھی کہ وہ جس جگہ جاتی وہاں اُس کا تعاقب کرتے اور مسلسل نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے مشہور ہوٹل تو کجا اُسے شہر کی معمولی سرائے میں بھی ٹھہرنے کی اجازت نہ ملی۔ وہ بدحواس ہو گئی اور اس پریشانی کے عالم میں اُس نے جاپان کے وزیر داخلہ کو تار دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک لاکھ روپیہ مزدوروں اور غریبوں کی امداد کے لئے بذریعہ تار روانہ کر دیا۔ لیکن غریبوں نے کسی طرح کی بھی اُس کی مدد حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ اور وزیر داخلہ سے کہا کہ جو عورت ہمارے افلاس وغربت اور بربادی کا باعث ہے اُس کا ایک پیسہ بھی ہم پر حرام ہے۔

انتہائی پریشانی کی حالت میں وہ شہر "شنزوکی" سے بھیس بدل کر جاپان کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں روپوش ہو گئی۔ جہاں اُسے کوئی نہ پہچان سکے۔ اور جب تک لوگوں کا جوش وخروش ٹھنڈا نہ ہوا۔ وہ پوشیدہ طور سے اپنے دفاتر کو خطوط کے ذریعہ ضروری احکامات سے آگاہ کرتی رہی ایک طویل مدت کے بعد جب عوام کے دلوں سے اُس کا خیال مٹ گیا اور سب اُسے بھول گئے تو وہ گاؤں سے نکل کر شہر میں آگئی۔

مزدوروں کے جذبات کا احترام نہ کرنے سے اُسے کہیں سکونِ قلبی میسر نہ ہوا۔ اور اُس پر ثابت ہو گیا کہ راحت دولت سے نہیں خریدی جا سکتی۔ اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے غریب مزدوروں کی تکالیف کا احساس کرنا سرمایہ داری کے گورکھ دھندوں سے زیادہ ضروری اور لازمی ہے۔

اہلِ نظر و ارباب بصیرت کے لئے یہ واقعہ عبرت وبصیرت کی ایک کتاب ہے جس سے عموماً تمام لوگوں اور خصوصاً سرمایہ داروں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ (خیام)

مُغل باغات

بہار باغ دنیا میں چند روزہ کچی بہار ہے۔ دم زدن میں کھلی اور چشم زدن میں مرجھا کر رہ گئی۔ ابھی ابھی چمن غنچہ بنا ہوا تھا۔ کلی کلی من میں پھول رہی تھی۔ پھول کھل رہے تھے۔ غنچہ کا تبسم زیرِ لب زمانہ کو تہ وبالا کر رہا تھا۔ قیامت ڈھا رہا تھا۔ عروس چمن بہاروں پر تھی، گل نودمیدہ اُبھاروں پر تھا۔ دم کے دم میں نقشہ بدل گیا، کایا پلٹ گئی۔ ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی بہار نہ تھی۔ بادِ خزاں کے ہاتھوں گرم بازاری شاہد گل سرد تھی۔ گل فروش تہیدست، دامانِ باغباں بھی خالی نظر آیا۔ صحنِ چمن اُجڑ چکا تھا۔ مرغانِ چمن کہاں، وہ شاخ بھی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔

یہ ہے رنگ عالم فانی اور یہ ہے اس باغ کی کُل کائنات۔

تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔ مغل باغات کے مصنف کھپ گئے۔ خاک کو باغ بنانے والے دماغ اب خود تہِ خاک ہیں۔ وہ گل کھلانیوالی طبیعتیں مرجھا گئیں۔ آثار اور افسانے رہ گئے۔ اگر مصنف کی خو بو سے واقفیت ہو جائے تو تصنیف کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ گل وگلزار کا حال سننے سے پہلے گلزار نشینوں کا ذکر ہو جائے تو کیا بُرا ہے۔

خانہ بدوش شہسوار، ناوک فگن تیرانداز، تلوار کے دھنی، تیغ بدست سر بکف، گھر بار تج نکل کھڑے ہوئے۔ منغلائے سویاہ (مقابل آفتاب) کو چھوڑ ایران کا رُخ کیا۔ کچھ عرصہ تو حب وطن نے نہ چھوڑا۔ کہیں بستے لوٹ مار کی اور اپنے مغل میں آ ملے۔ پھر وہی سنگلاخ پہاڑ اور وہی جفاکشی برفانی جاڑے جھلسا دینے والی گرمیاں، کچھ روز تو یہ رنگ رہا، رفتہ رفتہ سرسبز وادیوں اور میدانوں نے اپنا رنگ جمایا۔ اور یہ مغلستان کے باشندے ایران اور ترکستان میں بسنے لگے۔ قدرت کے یہ اَلّھڑ فرزند مشاطۂ ایران کے دلدادہ ہو گئے۔

سرزمین چمنستان تھی۔ نباتات کی دولت سے مالامال، آبِ رواں اور لب جُو قدم قدم پر، مغلوں کی رنگین طبیعتیں اس ہرے بھرے خطہ کو دیکھ کر رنگ لائیں۔ برسوں کے دبے ہوئے جوش دل کھول کر نکالے۔ آبِ رواں کے

کنارے دل بھر کر دل کی پیاس بجھائی۔ دامانِ نگاہ ... دل سے بھر لیا۔ خدا معلوم کیا کیا گُل کھلائے ہونگے اور کیسے کیسے باغ بنائے ہونگے۔

لبِ جوئبار اور کنارِ آب کے دلدادہ، ہریاول کے متوالے، مر کر بھی گلوں ہی میں رہتے تھے۔ کابل میں بابر کا بنایا ہوا باغ ہے۔ اور مرنے والا بعد مرگ بھی وہیں موجود۔ شاہانِ مغلیہ کا چراغ گُل ہو گیا۔ وہ چمن اُڑ گیا آندھیاں آتے آتے، پر اب بھی ہندوستان میں مختلف مقامات پر ان کی یادگار باغات موجود ہیں۔ جہاں کہیں بھی کسی باغ کا نام "شاہ لمار" سنئے سمجھ لیجئے کہ یہ کسی نہ کسی مغل بادشاہ کا بنایا ہوا ہے۔ "لمار" اُن کی زبان میں باغ کو کہتے تھے "شاہ لمار" وہ باغ ہوا جو بادشاہ نے بنوایا ہو۔

عیش و نشاط کے دلدادہ جہانگیر نے سرزمینِ کشمیر میں شاہ لمار تیار کرایا۔ نور جہاں اس کی شریکِ زندگی نے پہلو بہ پہلو نشاط کی طرح ڈال دی۔ مغل باغات میں سب سے مشہور یہی دو باغ ہیں۔ لاہور میں بھی ایک شاہ لمار ہے اور اچھا خاصا ہے۔ دہلی میں بھی ایک ہے پر قابل ذکر نہیں۔ تواریخ میں دہلی کے قریب ایک باغ کا ذکر ہے جس میں اورنگ زیب کی تاجپوشی ہوئی ہے۔ عالمگیر سلطنت کے مرکز مقام پر تاجپوشی مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اسی وجہ سے اس باغ کو اس رسم کے ادا کرنے کے واسطے منتخب کیا تھا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ بڑے بڑے امیر اس باغ کو دیکھنے کے متمنی تھے۔ اور غیر ممالک کے سفیر بمشکل اجازت حاصل کرتے۔ امرا بھی درخواستیں گذارتے۔

دہلی کے پاس ایک چھوٹا سا مقام ہے۔ "شاہدرہ" وہاں بھی شاہ لمار ہے۔ جو باغ بادشاہ بنواتا اُس کو شاہ لمار کہتے تھے۔ باقی دوسرے باغات جو بیگمات کے حکم سے بنائے جاتے اُن کے نام سے شہرت پاتے اور آج تک اُن کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ مثلاً قدسیہ باغ۔ روشن آرا باغ۔ قلعہ کے اندر دو باغ تھے۔ ایک آفتاب باغ دوسرا مہتاب باغ۔

باغ بنانا انسان کے خمیر میں ہے۔ کون ایسا صاحب دولت ہوگا جس نے یہ کھیل نہ کھیلا ہو۔ مغل ہر معاملہ میں اُپچ کی لیتے تھے اس میں بھی اُنہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ ہی جنت باغ بنائے اور کچھ اس شان سے کہ اور سب کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

خدا معلوم زمین چمن نے کیا کیا گُل کھلائے ہونگے جو ہم تک پہنچے۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ بیلا۔ چنبیلی۔ گلاب۔ سوسن۔ یاسمن۔ جوہی۔ چمپا موتیا۔ نرگس شہلا۔ نرگس۔ عبیر۔ سیوتی۔ گلاب۔ عباسی۔ چاندنی۔ شبو۔ گیندا داؤدی۔ گل تسبیح۔ ڈیلا چھوئی موئی۔ رائے بیل۔ بنفشہ۔ بستاں افروز۔ ریحاں نسرین و سورج مکھی۔ لالہ۔ نعمان۔ و گل شفتالو۔

ہریاول ہریاول سب ایک سی۔ ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ مغل اپنے باغات پر ایسا کیا جادو پڑھ کر پھونک دیتے تھے کہ من موہنا اور نظر فریب ہو جاتا تھا بندہ نواز مغل باغ کی یہ خصوصیت ہے کہ دروازہ میں گھستے ہی تمام کی تمام پھلواری بیک نظر آنکھوں میں سما جاتی ہے۔ دیدۂ دیدار طلب کو تجسس کرنا نہیں پڑتا۔ دامانِ باغبان اس کے روبرو پھیلا ہوتا ہے۔ عروس بہار بے حجاب نظر کے سامنے۔ یہ خصوصیت مغل باغوں میں کیوں تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی کیاریاں باغ میں جہاں تہاں نہیں بناتے تھے۔ دروازے کے سامنے ایک مسلسل مستطیل کیاری ہوتی تھی۔ بیچ میں نہر دونوں طرف گل پھول، پھولوں میں بھی یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ چھوٹے قامت کے پودے آگے۔ اُن سے بڑے اُن کے پیچھے اور اسی طرح بتدریج فوج کی طرح قد کے لحاظ سے پھلواری بوتے تھے۔ اس وجہ سے ایک نظر میں سارا باغ نظر کے سامنے آکر دل و دماغ پر اپنا پورا پورا اثر جما لیتا تھا۔ یہ راز ہے مغل باغات کی دلفریبی کا۔ دوسرے تمام باغوں میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ کہیں گلاب کا تختہ ہے کہیں موتیا کی کیاری۔ اس میں دماغ پر بار پڑتا ہے۔ نظر کو منظور نظر ڈھونڈھنا ہوتا ہے مغل باغات میں لطف بغیر کاوش کے مل جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ان باغوں میں سدا بہار رہتی تھی۔ ہر موسم میں کوئی نہ کوئی پھول نمو پر ہوتا تھا۔ اور یہ کیاری کبھی اُجڑتی نہ تھی۔

مغل تلوار آبدار کے پرستار، آبرو کے متلاشی۔ لبِ جُو اور آبِ رواں پر جان دیتے تھے۔ نہر۔ فوارہ اور آبشاریں ان کے چمن کے لئے لازم تھے۔ فوارے ایسے نہ تھے جیسے آج کل ہوتے ہیں کہ پڑی تلیاں بہ رہی ہیں جیسے کمیٹی کا نل کھول دیا ہے۔ وہ فوارے ہزارہ ہوتے تھے۔ پتلی پتلی پھواریں نکلتی تھیں۔ عروسِ چمن پر موتیوں کی نچھاور معلوم ہوتی تھی۔

مغل باغات کی ایک اور خصوصیت تھی اور اس کے بھی وہی موجد۔ طبقہ بہ طبقہ باغ بناتے تھے۔ ان سے پہلے اس قسم کا باغ نہیں بنا تھا۔ درجہ بدرجہ اُترتا چڑھتا ہوتا تھا۔ اس میں بھی یہ ہی تخیل تھا کہ دیکھنے والے کی نظر پر بار نہ پڑے۔ اس وضع کی بہترین مثال نشاط باغ ہے۔ سامنے سطح آب کہ اس سے نیچی سطح نہیں۔ پشت پر پہاڑ کی چوٹی، بیچ میں سیڑھیوں کی طرح طبقہ بہ طبقہ باغ۔ ہمارے خیال میں وضع کے لحاظ سے نشاط شالامار پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو نور جہاں کا بنوایا ہوا ہے۔

مغل جس طرح سبزہ زار اور پھولوں پر فریفتہ تھے۔ اسی طرح میوہ دار درختوں کے دلدادہ۔ ان کے واسطے شجرہا ور لطف نظر سے خالی نہ تھا

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ پھل شجر کا انتہائے کمال ہے۔ مغلوں کے باغات میں میوہ دار درخت لازمی تھے۔ بیچ میں کیاری نہیں پہلوؤں میں لگاتے اور ان میں قد و قامت کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ آخر میں سب سے اونچے درختوں کی باڑ لگاتے تھے اور بتدریج چھوٹے درخت لگاتے ہوئے کیاریوں تک پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح سارا باغ درختوں اور پھولوں کے دو پشتوں کی شکل بن جاتا تھا۔ اور جس زاویہ سے بھی دیکھئے۔ سبزہ زار ہی نظر آتا تھا۔

مغل باغات کے چربے اب بھی اُتارے گئے۔ مثلاً وائسرائے کی کوٹھی میں مغل باغ لگایا گیا۔ لیکن میوہ دار درختوں کی کسر رہ گئی اور مغل باغ کی تکمیل کے لئے یہ درخت جزو لازم ہیں ورنہ وہ دماغ پر صحیح کیفیت پیدا نہیں کر سکتا۔

عام طور پر مغل باغ کے گرد چاردیواری ہوتی تھی۔ پردہ کا لحاظ تھا۔ اور یہ بھی مصلحت کہ نظر باغ میں محصور ہو کر رہ جائے۔ اور گرد و نواح سے اثر نہ پڑ سکے ؎

وہ مالی نہ رہے یہ باغ کے دن کے
دنیا اسی کا نام ہے۔ رہے نام سائیں کا　(زمانہ)

اٹلانٹا

شاہ شونیس کی دلی خواہش تھی کہ اُس کے ہاں اولاد نرینہ تولد ہو لیکن اس کے برعکس جبکہ اُس کے ہاں دختر نیک اختر تولد ہوئی۔ تو اُس نے اُس کو جنگل میں لے جانے کا حکم دیا۔ لیکن اُس کی اُمیدوں کے برعکس جنگلی جانوروں نے اُس کو کسی قسم کی ایذا نہ پہنچائی اور وہ بالکل محفوظ رہی اس بے سروسامانی کی حالت میں ایک مادہ ریچھ نے اپنے دودھ سے اس کی پرورش کی۔ کچھ عرصے کے بعد چند جنگلی مردوں نے اس مادہ ریچھ کا کام تمام کر دیا۔ اور شہزادی کو اپنے گھر میں لا کر پرورش شروع کی۔ یہاں پر وہ تیز دوڑنے میں خوب ماہر ہو گئی۔ بالآخر ایک مرتبہ جبکہ وہ شہر میں لائی گئی۔ شونیس نے اُس کو پہچان لیا اور محل میں رہنے کا حکم دیا۔

اس شہزادی کا نام اٹلانٹا تھا۔ وہ کنواری دیوی کی، جس کا نام ڈائنا تھا پرستش کرتی تھی اور اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ مجرد یعنی کنواری رہے۔ جبکہ اس کے طلبگاروں نے شادی کے لئے مجبور کیا تو اُس نے یہ قاعدہ بنایا۔ کہ وہ اُس سے ایک دوڑ لگائیں۔ اگر وہ یعنی طلبگاروں میں سے کوئی دوڑ مذکور میں جیت جائے تو وہ اس سے شادی کرنے کا مستحق ہوگا۔ لیکن وہ جو کہ دوڑ مذکور میں شکست سے دوچار ہوگا۔ تہ تیغ کر دیا جاویگا۔ اس طرح متعدد بوالہوسوں نے اُس سے شادی کی درخواست کی۔ دوڑ میں شکست سے دوچار ہوئے اور موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔

ایک دن ملینین، شاہ امفی ڈمیس کا لڑکا شکار کھیلتا کھیلتا کسی خیال سے شاہ شونیس کے شہر جا پہنچا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اُس نے اٹلانٹا اور اس کے طالب کے مابین دوڑ ہوتے ہوئے دیکھی۔ اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جبکہ اُس نے دیکھا کہ ثانی الذکر شکست سے دوچار ہوا۔ اور تہ تیغ کر دیا گیا۔ ایک معمر شخص نے اٹلانٹا کے بارے میں اُس کو مطلع کیا۔ نیز یہ کہا کہ وہ اُس کو حاصل کرنے کی بیکار سعی نہ کرے۔ کیونکہ اٹلانٹا نے سوگند کھائی تھی کہ وہ اسی شخص سے شادی کرے گی جو کہ دوڑ میں گوئے سبقت لے جائیگا۔

دوڑ دیکھ کر وہ گھر پہنچا۔ اُس کا قلب مضطر و بیقرار تھا۔ اُس کو اب شکار وغیرہ کی جانب کوئی رغبت نہیں تھی۔ اُس کا یہی ایک مقصد تھا ——— کہ وہ اٹلانٹا کو حاصل کرے ——— چند ایام کے بعد وہ پھر شونیس کے شہر کی جانب روانہ ہوا۔ یہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ ایک دوسرے نوجوان نے اٹلانٹا سے دوڑ لگائی اور وہ بھی شکست سے دوچار ہوا۔ اور تہ تیغ کر دیا گیا ———

لیکن اٹلانٹا کو حاصل کرنے کی تمنا جو کہ اس کے دل و دماغ میں سمائی ہوئی تھی۔ نہایت ہی مستحکم تھی اُس نے ارادہ کیا کہ وہ خود شونیس کے پاس جائے۔ اور شادی کی درخواست کرے۔ شاہ شونیس ایک تخت پر جلوہ افروز تھے۔ وہ اس تخت کی جانب بڑھا۔ مگر راہ میں ایک ضعیفہ حائل ہوئی اور اُس نے کہا کہ وہ اٹلانٹا کو حاصل کرنے سے باز آئے اور مفت میں جان نہ گنوائے۔ نیز یہ کہا کہ وہ پریم کی دیوی سے اُس کی کامیابی کی دعا کرے گی کہ دیوی مذکور اُسے کوئی اور دوشیزہ دلوائے۔ مگر ملینین نے ان الفاظ کی جانب اصلاً اپنی توجہ مبذول نہ کی۔

جب شونیس کو معلوم ہوا کہ ملینین، اٹلانٹا کو حاصل کرنے کے لئے بہت مضطر و بیقرار ہے تو اُس نے ایسا کرنے سے منع کیا۔ مگر ملینین نے اصرار کیا کہ وہ ضرور اٹلانٹا سے ایک دوڑ لگائے گا خواہ اُسے موت کے گھاٹ ہی کیوں نہ اُتار دیا جائے ——— اس پر شاہ شونیس نے کہا کہ وہ کچھ وقفہ انتظار کرے اور اس وقفہ کے اندر خدائی مدد کا طلبگار ہو۔ اس طرح شاید وہ جیت سکے ——— ملینین رضامند ہو گیا اور وہاں سے ارگولیس جہاں کہ پریم کی دیوی کا مندر ہے، پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے دیوی مذکور سے التجا کی کہ وہ اپنے پریم میں بالکل سچا ہے اور سوائے اٹلانٹا کو اپنی زوجیت میں لانے کے اور دیگر کوئی مقصد نہیں رکھتا ہے۔

پریم کی دیوی ملینین کے روبرو نمودار ہوئی اور مدد کرنے کے لئے رضامند

ہوگئی۔ اُس نے اُس کو تین سنہری سیب دیئے۔ نیز نصیحت کی کہ جب وہ اٹلانٹا سے دوڑ لگائے اور اٹلانٹا اُس سے دوڑ میں گوئے سبقت لے جائے تو وہ فوراً ایک سیب پھینک دے۔ نیز ان سیبوں کی خاصیت بتائی کہ جو کوئی ان کو دیکھ لیتا ہے ان کو اٹھانے سے باز نہیں رہتا۔ اسی طرح اٹلانٹا اس کو لینے کے لئے جائے گی اور وہ دوڑ میں جیت جائے گا۔ وہاں سے وہ شونیس کے شہر پہنچا اور اٹلانٹا سے دوڑ لگائی۔ دوڑ میں اٹلانٹا آگے بڑھ گئی۔ ملینن نے فوراً ایک سیب پھینک دیا۔ وہ لینے کے لئے جھکی اور وہ آگے بڑھ گیا۔ غرضیکہ دوبارہ اور سہ بارہ ایسا ہوا۔ آخر کار ملینن کے سر پر کامیابی کا سہرا بندھا اور اٹلانٹا شکست سے دوچار ہوئی اور اُس کی شادی ملینن سے ہو گئی ——!

اس طرح دوڑ کا رواج ختم ہوا —— دوڑ —— ! جس سے کہ متعدد نوجوان موت کے مُنہ میں گئے تھے ——!

"کلیم"

فاقہ میں کیا حالت ہوتی ہے؟

آج سے پینتیس ۳۵ سال پہلے کا ذکر ہے میں اپنے پیدائشی گھر میں گیا۔ شام کا وقت تھا میری مرحومہ بیوی حبیب بانو روٹی پکا رہی تھی۔ دال پک چکی تھی۔ میں نے مرحومہ سے کہا کہ ایک مہمان آگئے ہیں۔ روٹی اور پکا لو، وہ بولیں گھر میں بس پاؤ بھر آٹا تھا اور وہ میں نے پکا لیا۔ آٹا اور لا دو تو پکا دوں۔ میں نے کہا میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے جس کا آٹا لاؤں۔ اور قرض نہ لینے کا میں نے عہد کر رکھا ہے۔ اگر ہم اور تم آج کی رات کچھ نہ کھائیں اور مہمان کو یہ روٹی دے دیں۔ تو ایک رات فاقہ سے کچھ ہرج نہ ہوگا۔ مرحومہ نے جواب دیا اچھا یہ کھانا مہمان کے لئے لے جاؤ۔ مگر صبح کیا ہوگا۔ اور مہمان کو صبح کیا کھلاؤ گے۔ میں نے کہا وہ صبح نماز پڑھتے ہی جانے کو کہتے ہیں اور ہمارے تمہارے لئے صبح خدا کوئی اور سامان کر دیگا۔

چنانچہ وہ دال روٹی مہمان کو کھلا دی اور عشا کے بعد پلنگ پر آ کر لیٹ رہا۔ اس زمانہ میں مجھ کو پان کھانے کی عادت نہ تھی مگر میری مرحومہ بیوی بکثرت پان کھاتی تھیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ تمہارے پاس پان بھی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا ہاں پان موجود ہیں۔ اگر تم بھی ایک پان کھا لو تو بھوک کی تکلیف جاتی رہے گی۔ میں نے کہا مجھے کچھ تکلیف نہیں۔ اور میں پان کھانا نہیں چاہتا مگر مجھ کو اس بات سے تکلیف ہے۔ کہ تم کو میرے گھر میں آج کی رات فاقہ کرنا پڑا۔

مرحومہ نے جواب دیا اگر مجھے فاقہ سے تکلیف ہوتی تو میں ابھی اماں کے ہاں سے روٹی لے آتی (میری مرحومہ ساس کا گھر دروازے کے سامنے تھا۔) مگر مجھ کو اپنے گھر کی حالت اماں کے سامنے ظاہر کرنے سے شرم آتی ہے۔ اور میں یہ حالت ان سے یا کسی اور سے کہنا نہیں چاہتی۔ لیکن تم کو قرض سے عہد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جو ایسا مشکل عہد کر لیا۔ میرے پاس زیور موجود ہے اُس کو فروخت کر دو یا رہن رکھ دو۔ جب خدا دے گا۔ زیور اور بن جائیگا۔ میں نے کہا میں یہی سوچ رہا ہوں کہ صبح کوئی زیور رہن رکھ کر مہینہ بھر کا آٹا دال بھر لیں گے۔ مگر میرا دل مجھ کو کچھ غیرت دلاتا ہے کہ بیوی کا صدمہ کھانا پڑیگا۔ مرحومہ نے کہا صدمہ کی کیا بات ہے۔ کیا ہم اور تم غیر ہیں۔ سویرے ضرور میری بالیاں رہن کر دینا۔

فاقہ کی پہلی رات تھی۔ بچپن میں بحالت بیماری شاید کئی رات دن کھانا نہ کھایا ہوگا۔ مگر مفلسی کا فاقہ پہلی دفعہ پیش آیا تھا۔ اور مجھے اب تک یاد ہے کہ صرف اس خیال سے کہ ہمارے گھر میں آٹا نہیں ہے۔ میری بھوک چوگنی ہو کر مجھے ستا رہی تھی اور میں بیوی کے سامنے شرم و ندامت سے پانی پانی ہو رہا تھا۔

وہ تو رات کے گیارہ بجے سو گئیں۔ مگر مجھے دو بجے تک نیند نہ آئی کروٹیں بدلتا رہا۔ اور مجھ کو اپنی غریبی اور مفلسی پر کئی دفعہ رونا آیا مگر اس خیال سے تسلی ہوتی رہی کہ ہم سید ہیں اور فقیروں کے خاندان سے ہیں۔ جن کے ہاں فقر و فاقہ فخر ہوا کرتا ہے۔ میرا کلیجہ بھوک کے مارے ٹوٹ رہا تھا اور کانوں میں کونین کھانے سے جو سائیں سائیں سی آوازیں آیا کرتی ہیں۔ وہی آوازیں آ رہی تھیں اور ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ معلوم ہوتی تھی۔

فاقہ کی رات گذر گئی۔ صبح کو مہمان بھی چلے گئے اور میں دن بھر کتابوں کا بیس سیر بوجھ سر پر رکھ کر پھیری میں پھرتا رہا۔ مگر ایک کتاب بھی نہ بکی۔ اور دن بھر کچھ نہ کھایا۔ میرا مُنہ خشک ہو گیا تھا۔ زبان اور تالو میں کڑواہٹ ہوتی تھی۔ مگر رات کی سی تکلیف نہ تھی۔

شام کو گھر میں آیا تو دیکھا بیوی نے آگ جلا رکھی ہے۔ اور باورچی خانہ میں کچھ پکا رہی ہیں۔ میں نے کہا کیا پکا رہی ہو۔ ہنس کر بولیں۔ بیٹھو ابھی باہر آتی ہوں۔

وہ باورچی خانہ سے باہر آئیں اور چپکے سے کہا۔ پڑوس میں چچا ظہور علی رہتے ہیں۔ آمنے سامنے گھر ہے۔ اگر آگ نہ جلاتی اور چولھے میں آگ نہ جلتی تو وہ پوچھتے اور بات کھل جاتی اس لئے فقط آگ جلائی تھی۔ تم بتاؤ۔ کیا حال ہے۔ اب تیسرا وقت ہے اور تیسرے وقت تو مردار بھی حلال ہو جاتا ہے۔

قرض کا عہد توڑ دو۔ اور یہ بالیاں لے جاؤ اور ان کو گروی کر دو۔ میں نے کہا جہاں اللہ نے دو وقت کا صبر دیا ہے۔ وہاں تیسرے وقت کا صبر بھی دے دیگا۔ کل صبح دیکھا جائیگا۔ آج تو اور فاقہ کر لو۔

ہم دونوں یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر دروازہ پر کسی نے آواز دی میں دروازہ پر گیا تو معلوم ہوا کہ دو مہمان آئے ہیں۔ مجھے یہ بات سُن کر چکّر آنے لگا۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اب مہمانوں کے واسطے کیا کروں۔ مگر میں باہر گیا اور مہمانوں سے ملا۔ اور درگاہ کے حجرے میں لے جا کر اُن کو ٹھہرایا۔ اُنہوں نے کہا۔ ہم نیاز کا کھانا پکوا کر ساتھ لائے ہیں۔ نیاز دے دیجئے۔ اور ہمارے ساتھ کھائیے۔ وہ پراٹھے اور میٹھے چاول پکا کر لائے تھے۔ میں نے نیاز دی اور کہا میرا کھانا مجھ کو دے دیجئے کہ میں گھر میں بیوی کے ساتھ کھانا چاہتا ہوں۔ اُنہوں نے مجھے کھانا دے دیا۔ اور میں وہ لے کر گھر آیا۔ اور ہم دونوں نے بڑے مزے سے بڑی بھوک کی حالت میں وہ کھانا کھایا۔

وہ دن ہے اور آج کا دن۔ ہزاروں قسم کے مزیدار کھانے کھائے۔ مگر کسی کھانے میں وہ لذت نہ آئی جو فاقہ والی رات کی دوسری شام کو آئی تھی فاقہ میں ایک مزہ ہوتا ہے۔ اور میں فاقہ کش بھائی بہنوں کی لذتوں کو آج کل کی فارغ البالی میں بحالت تصور اکثر سوچا کرتا ہوں۔

(پھول باغ)

تبصرات

سالنامہ ساقی دہلی ۱۹۳۹ء

ہندوستان کے ماہناموں میں ساقی ایک ممتاز حیثیت کا ماہنامہ ہے۔ جس کے خاص نمبر معیاری ہوتے ہیں۔ سالنامہ ۱۹۳۹ء بھی اپنی مخصوص خصوصیات کا حامل ہے۔ ادبی و تاریخی مقالات اور افسانے بصیرت افروز ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ "فارسی غزل اور جفائے محبوب" "جاپانی پہلوان" "واؤ" ڈرامہ میں مکالمہ کی حیثیت "لال نہر" "ایران کی قدیم تاریخ" اور "زندگی کی اندھیری راتیں" بہت خوب ہیں۔ حصہ نثر کی نسبت حصہ نظم کمزور ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب کاغذ عمدہ حجم ۲۸۰ صفحات۔ قیمت عہ۔ دفتر ماہنامہ "ساقی" دہلی سے طلب کریں۔

ماہنامہ "سب رس" کا حیدرآباد نمبر

حیدرآباد دکن کے ادارہ ادبیات اردو کا ماہنامہ "سب رس" اپنی مختصر سی زندگی میں کافی ترقی اور شہرت حاصل کر چکا ہے۔ غالباً "سب رس" کی زندگی کا یہ دوسرا سال ہے۔ اس قلیل مدت میں اقبال نمبر، محرم نمبر شائع کر چکا ہے اور اب دکن نمبر شائع کیا ہے۔ جو گذشتہ تمام خاص نمبروں کی نسبت فائق ہے۔ یہ نمبر دکن کی ایک مکمل تاریخ ہے جس کی موجودگی دوسری تاریخی کتب سے بے نیاز کر دیتی ہے یہ خاص نمبر ۸۰ مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ مضمون نگار حضرات میں زیادہ تر دکن کے اہل قلم ہیں۔ یا وہ حضرات ہیں جو مختلف مقامات سے جا کر وہاں کی ادبی محفلوں میں شامل ہو چکے ہیں۔ تمام مضامین تاریخی ہیں۔ سلاطین و مشاہیر بیجاپور، مشاہیر احمد نگر سلاطین گولکنڈہ، مشاہیر گولکنڈا سلاطین آصفی، وزرائے آصفی اور اُمرائے آصفی کی اسی تصاویر اور آٹھ دیگر تصاویر شامل کتاب ہیں۔ سرورق سادہ ہے۔ لیکن اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن و برار کی شبیہ سے دلکش بن گیا ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب حجم ۲۱۶ صفحات۔ قیمت عہ

سالنامہ بیسویں صدی ۱۹۳۹ء

عام لٹریچر پیش کرنے کے حق میں ماہنامہ بیسویں صدی کو اس وقت امتیازی حیثیت حاصل ہے اور پھر سالانہ قیمت بھی مختصر۔ معاصر موصوف کا نام جتنا اچھا ہے اتنا ہی اچھا کام بھی ہے۔ ہر مہینے میں فلم سٹاروں کی تصاویر سے رسالہ آراستہ کیا جاتا ہے۔ عام فہم اور عام پسند افسانے، غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ ہم اپنے معاصر کا خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ایک ایسا بھی رسالہ ہونا چاہئیے۔ جو عوام کے دل و دماغ کی تسکین کے سامان فراہم کر سکے اس کا سالنامہ بھی اپنی مخصوص خصوصیات کا حامل ہے۔ ۵۴ مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ جن میں ۲۲ افسانے ہیں۔ متعدد فلم ایکٹرسوں کی تصاویر۔ ٹائیٹل بھی نام کے لحاظ سے بہت خوب ہے۔ حجم ۱۰۶ صفحات۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ کاغذ عمدہ قیمت صرف ۸/۔ دفتر بیسویں صدی لاہور سے طلب کیجئے۔

تیج ویکلی دہلی کا افسانہ نمبر

دہلی کا مشہور اخبار تیج ویکلی خاص نمبر کثرت سے شائع کرتا ہے۔ بہت

مقبول اور کامیاب پرچہ ہے۔ اب افسانہ نمبر شائع ہوا ہے۔ سرورق تین رنگ کا نہایت دیدہ زیب۔ ۳۲ افسانے اور آٹھ منظوم افسانے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کی نظم اور سیماب اکبر آبادی کا افسانہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ ایک صفحہ پر "فیڈریشن" کا افسانہ کارٹون کی صورت میں دیا گیا ہے آرٹ پیپر کے آٹھ صفحات پر تصویریں ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ حجم ۸۴ صفحات قیمت صرف ۲

ماہنامہ دلگداز لاہور کا اتاترک نمبر دلگداز حضرت نشتر جالندھری کی ادارت میں نکلتا ہے۔ اس کا نیا دَور پہلے دَور سے بہتر ہے۔ عالم نسواں اور بچوں کی دنیا کے تحت میں بچوں اور عورتوں کے مذاق کے مضامین کے مستقل ابواب ہیں۔ جنوری میں دلگداز کا اتاترک نمبر نکلا ہے۔ غازی مصطفٰے کمال پاشا کی ناگہانی موت نے دنیا کے ہر طبقے، ہر قوم اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں کو پامال کر دیا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس وقت ہندوستانی صحائف خاص نمبر شائع کر کے مرحوم کی یادگار قائم کریں۔ دلگداز کا یہ اقدام قابل تحسین ہے۔ اس نمبر سے اتاترک مرحوم کی زندگی اور ٹرکی کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ مضامین ٹھوس اور پراز معلومات ہیں۔ نظمیں درس و پیام اور رنج والم کی حامل ہیں۔ ٹائیٹل سادہ مگر دیدہ زیب جس پر غازی مرحوم کی مختلف تصاویر ہیں اور سات تصاویر اندرونی صفحات پر ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ قیمت صرف ٦ر۔ دفتر دلگداز کشمیری بازار لاہور سے طلب کیجئے۔

سالنامہ ادب لطیف لاہور ۱۹۳۹ء سالنامہ ادب لطیف ۸۳ مضامین نظم ونثر کا گلدستہ ہے۔ حصہ نظم میں جوشؔ ملیح آبادی اور سیمابؔ اکبرآبادی کی نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ افسانے قریب قریب سب اچھے ہیں۔ تاریخی مقالات و علمی مضامین ہیں "ہندوستان کی حرفتی ناقابلیت کے اسباب" "دنیا کا بہترین بُت تراش" بہت خوب ہیں۔ مزاحیہ مضامین بھی دلچسپ ہیں لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ مدیر ادب لطیف کو نظم اور افسانوں سے بہت زیادہ دلچسپی یہی وجہ ہے کہ نظموں غزلوں اور افسانوں کے مقابلہ میں علمی ادبی اور تاریخی مقالات بہت کم ہیں۔ متعدد ادبا و شعرا کی یک رنگ تصاویر زینت سالنامہ ہیں۔ ٹائیٹل خوبصورت اور جاذب توجہ ہے۔ حجم ۲٦۰ صفحات۔ کتابت و طباعت خوب ہے۔ کاغذ عمدہ قیمت عمر دفتر ادب لطیف لاہور سے طلب کیجئے۔

رہنمائے تعلیم لاہور کا تپ دق نمبر رہنمائے تعلیم لاہور کا تپ دق نمبر اس قابل ہے کہ اس کو لائبریریوں میں جگہ دی جائے۔ تمام مضامین تحقیقی ہیں اور ان کے مطالعہ سے ایڈیٹر کے طبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ ۸۷ مضامین نظم ونثر کا مجموعہ ہے۔ لیکن بہت دلکش اور پُراز معلومات، یہ درست ہے کہ حصہ نثر کی نسبت حصہ نظم کمزور ہے لیکن مضامین نثر کی بلند آہنگی اس کمزوری کو بھی چھپائے ہوئے ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے لیکن کاغذ سر یا مپوری ہے۔ قیمت عا ر۔ دفتر رہنمائے تعلیم لاہور سے طلب کیجئے۔

سالنامہ عالمگیر عالمگیر ایک پرانا اور مقبول ماہنامہ ہے کئی رسالے جاری ہوئے اور بند ہو گئے۔ مگر اس کے پائے استقلال کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ اور اس کا معیار بھی اردو کے عام پرچوں سے بہت بلند ہے۔ اور خاص نمبر شائع کرنے میں تو اُس کا پلہ سب سے بھاری ہے۔ اس سال کا سالنامہ مضامین اور تصاویر کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ مشاہیر شعرا کا کلام۔ علمی ادبی اور تاریخی مضامین اور افسانے اخلاق آموز ہیں۔ کل پچھتر مضامین ہیں جن میں نظم کا حصہ زیادہ ہے گیارہ تصویریں ہیں جن میں سے چار سہ رنگی اور سات یک رنگی، سرورق تین رنگوں کا اور بہت ہی دیدہ زیب لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ حجم ۲۱۲ صفحات قیمت عہ دفتر عالمگیر لاہور سے طلب کیجئے۔

ماہنامہ پھول باغ یہ رسالہ پٹیالہ سے جاری ہوا ہے۔ گوربچن سنگھ کوشاں سنگت پوری ایڈیٹر ہیں۔ پٹیالہ جیسے دور افتادہ مقام سے ایک ادبی پرچے کا نکلنا تعجب اور بہت زیادہ تعجب ہے لیکن مضامین نثر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ترقی کریگا۔ البتہ نظموں کا انتخاب ابھی توجہ طلب ہے۔ زیر نظر پرچہ میں "فاقہ میں کیا حالت ہوتی ہے" اچھا مضمون ہے اور "اہلیا بائی" تاریخی مقالہ بھی بصیرت افروز ہے۔ قیمت سالانہ للعہ ر کاغذ اچھا لکھائی چھپائی معمولی۔ دفتر رسالہ پھول باغ سرہندی دروازہ پٹیالہ سے طلب کیجئے۔

ماہنامہ مشعل اس نام کا ایک رسالہ پشاور سے جاری ہوا ہے تعلیمی رسالہ ہے۔ گورنمنٹ ٹریننگ سکول پشاور کی کوششوں کا نتیجہ ہے تعلیمی نقطہ نظر سے مضامین اچھے ہوتے ہیں۔ عوام کی دلچسپی کے سامان مفقود ہیں اور ہونا بھی یہی چاہیئے۔ لیکن ابھی معیار اور بلند ہونا چاہیئے۔ کاغذ سر یا مپوری۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ سرورق سادہ۔ گورنمنٹ ٹریننگ سکول (مردانہ) پشاور سے طلب کیجئے۔ قیمت سالانہ سے ر

ہندوستانی یہ رسالہ بانکی پور پٹنہ سے جاری ہوا ہے بہار کے مشہور افسانہ نویس جناب سہیل ایڈیٹر ہیں۔ رسالہ ادبی ہے۔ لیکن سیاسیات پر بھی رائے زنی ہوتی ہے۔ ادب و افسانوں کا بیشتر حصہ ہوتا ہے۔ کسی نمبر میں شاذ کوئی دلچسپ اور سنجیدہ مضمون بھی نظر آجاتا ہے۔ رسالہ کا مقصد نام سے ظاہر ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان "ہندوستانی" کی اشاعت کا علمبردار ہے۔ بہت زیادہ آسان زبان استعمال کی جاتی ہے۔ غیر مانوس الفاظ اور ترکیبوں سے پرہیز ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا تو اُردو اور ہندی دونوں کے ہم معنی لفظ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اکثر الفاظ کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً سرمایہ داری کے لئے "پونجی" تنظیم کے لئے "سنگھٹن" سیاسی کے لئے "راج نیتک" مستقبل کے لئے "بھوشیہ" تجویز کے لئے "پرستاد" وغیرہ سہیل صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ سلامت روی اور اعتدال ہر چیز کے لئے پہلی شرط ہے۔

حجم ۶۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ قیمت سالانہ ہے فی پرچہ ۴ر۔ ہندوستانی پریس بانکی پور پٹنہ سے طلب کیجئے۔

"الزہرا" یہ عورتوں کا رسالہ جالندھر سے جاری ہوا ہے۔ مضامین اخلاق آموز ہوتے ہیں اور عورتوں کے لئے مفید خصوصاً مسلمان عورتوں کے لئے افسانے بکثرت ہوتے ہیں۔ علمی اور تاریخی مضمون بہت ہی کم۔ ابھی مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ حجم ۶۴ صفحات۔ کاغذ سرا مپوری لکھائی چھپائی غنیمت ہے۔ قیمت سالانہ عہ فی پرچہ ۳ر

انیس انجمن انیس اردو الہ آباد کی طرف سے یہ رسالہ جاری ہوا ہے۔ حبیب الہ آبادی ایڈیٹر ہیں۔ مضامین بہت زیادہ پرانے نقل کردیئے جاتے ہیں۔ مثلاً مولانا ظفر علی خاں کا مضمون "تولہ بھر ریڈیم" "جوش ملیح آبادی کی نظم" "شریک زندگی" اور یہی ایک نظم اور ایک مضمون تمام رسالہ میں اس قابل ہیں کہ جن کو علمی طبقے کے لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ رسالہ کے صفحات سیاہ کئے گئے ہیں۔ حبیب صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ انیس کو عام ادبی رسالوں کی سطح پر لانے کی کوشش کریں۔ کاغذ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔ قیمت سالانہ ۱۲ ہے فی پرچہ ۵ر

ماہنامہ نور یہ مسلمانوں کا مذہبی رسالہ ہے۔ جالندھر سے جاری ہوا ہے۔ اسد اللہ خاں صاحب ایڈیٹر ہیں۔ اس کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ قرآن حکیم اور احادیث نبوی کی تبلیغ ہو۔ اور اپنے مقصد میں یہ رسالہ کامیاب نظر آتا ہے۔ ایک صفحہ بچوں کا بھی رکھا گیا ہے۔ عام طور پر بچوں کے مضامین سادے اور آسان الفاظ میں ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی افسانے بھی دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ سبق آموز ہوتے ہیں۔ حجم ۶۴ صفحات۔ کاغذ سرا مپوری، لکھائی چھپائی اچھی ہوتی ہے قیمت سالانہ ایک روپیہ فی پرچہ ۱ر۔ دفتر "نور" بازار شیخاں شہر جالندھر سے طلب کیجئے۔

ماہنامہ ندیم یہ رسالہ صوبہ بہار گیا سے جاری ہوا ہے۔ علمی، ادبی اور اخلاقی مضامین ہوتے ہیں۔ افسانے دلچسپ سبق آموز اور بلند معیار کے ہوتے ہیں۔ مذہبیات کا بھی حصہ ہوتا ہے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مذہبی رسالہ ہے مگر یہ حصہ ایک جزو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ نظمیں اور غزلیں سبق آموز، عام رسالوں سے اس کا معیار بہت بلند ہے۔ سیاسیات میں بھی حصہ لیا جاتا ہے۔ کاغذ عمدہ لکھائی چھپائی دیدہ زیب حجم ۷۶ صفحات قیمت سالانہ للعہ کچہری روڈ گیا (صوبہ بہار) دفتر "ندیم" سے طلب کیجئے۔

کمال اتاترک اس نام کی ایک کتاب علمیہ بک ڈپو کشمیری بازار لاہور نے چھپوائی ہے۔ یہ ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں مصطفٰے کمال پاشا کی مکمل و مفصل سوانح عمری پیش کی گئی ہے۔ اصل کتاب کے مؤلف محمد توفیق مصری ہیں۔ ترجمہ مرزا اکرم الٰہی خاموش نے کیا ہے۔

ترجمے کا کمال یہ ہے کہ اصل تصنیف کے تمام الفاظ بھی محفوظ رکھے جائیں اور محاورے کی صحت و فصاحت بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے ان خوبیوں کے علاوہ ترجمے میں اتنی روانی اور اتنی بے تکلفی ہو کہ اُس پر تصنیف کا دھوکا ہو۔ جب اس معیار کے پیش نظر مرزا اکرم الٰہی خاموش کے ترجمے پر ناقدانہ نظر ڈالی جاتی ہے۔ تو کہنا پڑتا ہے کہ ترجمہ کامیاب ہے کیونکہ اصل کتاب کی تمام خوبیاں پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

شروع سے آخر تک کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ از خود پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ انداز بیان میں دلکشی ہے، سب سے بڑی خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ نہ تو ممدوح کی اتنی زیادہ تعریف کی گئی ہے کہ مبالغہ کا گمان ہو اور نہ اتنی کم کہ اُس کی حیثیت سے بھی اُس کو گرا دیا جائے۔ جو کچھ لکھا گیا ہے حقیقت و واقعیت کا آئینہ دار ہے۔ تصویر کے دونوں رُخ پیش کئے گئے ہیں۔ حرف گیری کی گنجائش نہیں۔

تعلیمی اعتبار سے بھی یہ کتاب بہت مفید ہے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ ملک کی تمام ٹیکسٹ بک کمیٹیاں مدارس کے لئے اس کتاب کو منظور کریں تاکہ مترجم اور پبلشر کی حوصلہ افزائی ہو۔

لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ کاغذ عمدہ حجم ۲۸۸ صفحات۔ جلد نہایت نفیس۔ جلد کا کور مصطفٰے کمال کی چھ تصویروں سے مزین۔ قیمت

صدر علمیہ بک ڈپو لاہور سے طلب کیجئے۔

تاریخ الہ آباد حصہ اول تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے اس کتاب کا پایہ بہت بلند ہے۔ مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی مؤلف ہیں۔ مؤلف نے اپنی تاریخی معلومات کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے۔ کتاب کے پچیس ۲۵ ابواب ہیں بعض مختصر اور اکثر مفصل شروع میں مصنف کی تصویر ہے۔ اس کے علاوہ نو تصویریں اور بھی شامل کتاب ہیں۔ دو سہ رنگی اور سات یکرنگی۔ کتاب کے مؤلف تصویر سے ضعیف العمر معلوم ہوتے ہیں لیکن اندازِ تحریر دلکش اور شباب ریز ہے۔ اندازِ بیان میں اتنی روانی ہے کہ مجبوراً داد دینی پڑتی ہے۔

اس تاریخ میں دو بہت بڑی خوبیاں ہیں۔ اجمالی حیثیت سے تو یہ ہندوستان کے مغل حکمرانوں کی تاریخ ہے اور تفصیلی حیثیت سے الہ آباد کی تاریخ ہے۔ اور تیسری حیثیت یہ بھی ہے۔ کہ جہانگیر کے لڑکے خسرو کی مفصل سرگذشت کی آئینہ دار ہے۔

ہر لحاظ سے کتاب جامع ہے اور اس قابل ہے کہ ہندوستان کی لائبریریاں اس سے مزین ہوں۔ بلکہ اگر الہ آباد کی ٹیکسٹ بک کمیٹی مڈل کے لئے منظور کرے۔ تو بہت زیادہ مفید ثابت ہوگی۔

ہندوستان کے مصنفین کی بہت کم ایسی تصنیفات ہوتی ہیں جو ٹھوس بھی ہوں اور دلچسپ بھی اور تاریخی مضامین تو اتنے رُوکھے پھیکے ہوتے ہیں کہ بہت کم لوگ پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ الہ آباد کے پڑھنے والے اس کی دلچسپی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور یہ مؤلف کا کمال ہے۔ ہندوستان کو ایسے مؤلفوں کی اور ایسی تصنیفات کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

کتاب کا آغاز خسرو باغ سے ہوتا ہے اور صرف خسرو باغ کی تفصیلات ۱۰۸ صفحات میں ختم ہوئی ہیں۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے اختصار کی کوشش کی ہے۔ اگر حسب منشا لکھنے کا موقع ملتا تو اس کے لئے دفتروں کی ضرورت تھی۔ پھر لطف یہ ہے کہ شروع سے آخر تک پڑھ جائیے کہیں کوئی جملہ فضول یا بھرتی کا نہ ملیگا۔ مختصر یہ کہ بڑی دلچسپ کتاب ہے لکھائی چھپائی دیدہ زیب، کاغذ عمدہ، مجلد۔ نہایت نفیس اور عمدہ جلد اور قیمت صرف للعہ۔ کتابستان الہ آباد سے طلب کیجئے

پاگل اس کتاب کا نام تو عجیب ہے لیکن ہے ہوشمندوں کے پڑھنے کے قابل، سید بشیر ہندی کی تصنیف ہے اور نہایت پُرمغز تصنیف پینتیس ۳۵ مضامین کا مجموعہ ہے جو نہایت بصیرت افروز اور سبق آموز ہیں لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ کاغذ معمولی۔ حجم ۱۸۰ صفحات مجلد قیمت ۸ر گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو ہسپتال روڈ لاہور سے طلب کیجئے

شہید بچارن یہ تاریخی افسانہ عبدالستار صاحب قمر اجنالوی کی تالیف ہے جس کا دیباچہ ہندوستان کے مشہور ادیب حضرت عبدالرحیم شبلی بی کام کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ افسانہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ مصنف نے اپنے قلم کی سحر کاریوں کی بدولت مختصر سے تاریخی مقالہ کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ مجبوراً داد دینی پڑتی ہے اور اس قدر دلچسپ بنا دیا ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ جن حضرات کو مذہبی اور تاریخی مضامین سے دلچسپی ہے وہ یہ افسانہ ضرور پڑھیں۔ مگر یہ واضح رہے کہ تاریخی مضامین جیسے خشک ہوتے ہیں ایسا یہ افسانہ خشک نہیں۔ دلچسپ اور بہت زیادہ دلچسپ ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ سیٹھ آدم جی عبداللہ بمبئی والے نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب، قیمت ۶ر۔
سیٹھ آدم جی عبداللہ اینڈ کمپنی پبلشرز بمبئی والے نولکھا بازار لاہور سے طلب کیجئے۔

سخنورانِ دکن عہدِ عثمانی کے شعرا کا یہ ایک مبسوط تذکرہ ہے۔ جس کے مؤلف سید تسکین عابدی ہیں۔ شروع میں نیاز فتحپوری۔ اختر قریشی ایڈیٹر سفینۂ نسواں اور مولانا تمکین کاظمی کے دیباچے ہیں۔ کتاب دلچسپ ہے۔ اس عہد کے تمام شعرا کے مختصر حالات اور اُن کا منتخب کلام پیش کیا گیا ہے۔ مؤلف کی محنت قابلِ داد ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب، کاغذ عمدہ۔ حجم ۳۸۴ صفحات۔ قیمت سے ر۔
زاویہ ادبیہ حیدر آباد دکن سے طلب کیجئے۔

طالب فارسی

نگراں:۔ پروفیسر تاجور

شاہکار

جائنٹ ایڈیٹر:۔ خواجہ محمود جاوید۔ ایم۔ اے

چندہ

سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے آٹھ آنے۔ نادار خریداروں سے للعہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی۔ نمونہ پانچ آنے

جلد (۹) فہرست مضامین بابت ماہ اپریل ۱۹۳۹ء نمبر (۱)

تصاویر:۔ سہ رنگی (۱) مامتا۔ یک رنگی (۲) تصویر تصور (۳) ایک پہاڑی پر سے قاہرہ کا دلکش نظارہ (۴) مسٹر کے اے حمید بی اے (لندن) بیرسٹر

ایم ہادی حسن اختر ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار بمکان میاں علی محمد میاں علی محمد سٹریٹ (۲۵ ۱۳۴ سی بیڈن) خواجہ دل محمد روڈ لاہور سے شائع کیا

مختصرات

اُردو زبان اور کانگرس

اب یہ حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے کہ اُردو زبان کے متعلق کانگرس کی پالیسی قطعی طور پر منافقانہ قرار پا چکی ہے۔ اور اس سلسلے میں کانگرس کے مسلمان رہنماؤں کی چشم پوشی ناقابل تاویل اور ناروا رواداری کے ذیل میں آگئی ہے۔ کانگریسی ہندوؤں کی زبان کیلئے اُردو الفاظ ناگفتنی بن گئے ہیں۔ کانگریس کے تمام نظم و نسق پر سنسکرتی چھائی ہوئی ہے۔ انگریزی الفاظ اور انگریزی زبان میں خطبۂ صدارت سے کانگریس اور کانگریسی رہنماؤں کو کسی قسم کا پرہیز نہیں لیکن اُردو زبان سے اُنہیں خدا واسطے کا بیر پڑ گیا ہے۔ یہ حضرات سنسکرت نما ہندی نوآموزوں کی طرح لکھنے اور بولنے کی مشق کر رہے ہیں۔ سیدھی سادھی زبان کو بہ تکلف سنسکرت کے مغلق الفاظ سے گراں بار بنا رہے ہیں۔ اور اسے اپنا ایک قومی فرض سمجھتے ہیں۔

اخبار مدینہ جو ایک مقتدر کانگریسی اخبار ہے۔ اور جو مسلم لیگ اور لیگی رہنماؤں کے خلاف ابتدا سے آگ اُگلتا رہتا ہے۔ مجبور ہو کر اُسے بھی اُردو زبان کے متعلق کانگریسی عیاری کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

تری پوری کانگریس کا اصلی خطبۂ صدارت انگریزی زبان میں تھا۔ اس کا ترجمہ ہندی نما سنسکرت میں کیا گیا۔ کسی ڈیلی گیٹ کے پھوٹے مُنہ سے یہ نہ نکلا۔ کہ امپیریل ازم کے خلاف جہاد کرنے والی نمائندہ جماعت امپیریل زبان کو حرزِ جان کیوں بنائے ہوئے ہے۔ یُوپی اور بہار کی مادری زبان وہی ہے جو شمالی ہندوستان کی زبان ہے اور جس بدبخت کا نام اردو ہے۔ لیکن ان صوبوں کے کانگریسی رہنماؤں میں بہ ہمہ دیوتا نے اوتار لے لیا ہے۔ یہ لوگ سنسکرت نما ہندی نہ لکھ سکتے ہیں۔ نہ بولنے پر قادر ہیں۔ سیکھتروں کی طرح دس بیس فقرے سنسکرت کے الفاظ میں ہندی کے حروف ربط لگا کر اُنہوں نے یاد کر لئے ہیں۔ اپنی تقریر کی ابتدا اُنہیں الفاظ سے کرتے ہیں اور جب سنسکرت کے رٹے ہوئے شبدوں کا یہ ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے۔ یا تقریر کرتے کرتے جوش میں آجاتے ہیں۔ تو پھر شمالی ہند کی آسان اُردو نہیں بلکہ ابوالکلام کی خطیبانہ زبان بولنے لگتے ہیں۔

تری پوری کانگریس کے تمام پوسٹر۔ ٹکٹ۔ رضاکاروں کے بلّے انتظامی دفتروں کے سائن بورڈ سنسکرتی الفاظ اور دیوناگری رسم الخط میں تیار کئے گئے تھے۔ آنریبل وجے لکشمی مسز پنڈت وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ (یوپی) کے خاندان کی اُردو مستند اور مسلمہ سمجھی جاتی ہے۔ مگر مسز پنڈٹ بھی رام راجیہ کے خوابِ پریشاں کی تعبیر سنسکرت بولنے کی مشق میں دیکھنا چاہتی ہیں۔

اخبار مدینہ کے رپورٹر کو کانگریس کی نئی بھاشا سنسکرت نما ہندی اور دیوناگری رسم الخط نہ جاننے کے سبب تری پوری میں جن تکالیف کا سامنا ہوا اسی کے الفاظ میں ملاحظہ طلب ہے۔

"اس سال کانگرس کے سالانہ اجلاس کے لئے جبل پور سے پندرہ بیس میل دُور دریائے نربدا کے کنارے ایک غیر آباد جگہ کو آباد کیا گیا تھا۔ یہ جگہ ریلوے اسٹیشن سے بہت فاصلہ پر تھی اور یہاں تک پہنچنے کے لئے ریلوے کی برانچ لائن کے خاک آلود سفر کے علاوہ ایک طویل مسافت لاری پر بھی طے کرنا پڑتی تھی۔ منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد لاری میں سے اسباب اُتار کر زمین پر رکھ دیا جاتا تھا۔ اور آنے والا انسان اپنی آئندہ قسمت پر غور کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نووارد گھبرا گھبرا کر رضاکاروں سے پوچھتے تھے کہ "کہاں ٹھیریں"؟ اس پر اُنہیں نہایت سادگی سے اکثر یہ جواب ملتا تھا کہ "جہاں آپ کا جی چاہے" میں نے ایک رضاکار سے پوچھا۔ "انکوائری آفس کہاں ہے"؟ بولا "ہندی میں کہئے"۔ میں نے کہا۔ "تحقیقات کا دفتر"۔ کہنے لگا۔ "مجھے پتہ نہیں"۔ میں نے پھر پوچھا کہ "اگر کسی کو کچھ بات معلوم کرنا ہو۔ تو کہاں جائے"؟ اس پر اُس نے کہا۔ "آپ پوچھ تانچھ منڈل چلے جائیے"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کانگریس کے بسائے ہوئے اس نگر میں جس کا نام وشنو نگر رکھا گیا تھا انکوائری آفس کا نام "پوچھ تانچھ منڈل" ہے"۔

"زبان کے بارے میں اس کانگریس کا فیصلہ صاف طور سے دیوناگری کے حق میں معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ والنٹیروں کے بلّے، امتیازی نشان، چٹیں، سائن بورڈ، ٹکٹ غرضکہ تمام چیزیں صرف ہندی رسم خط میں تھیں۔ نمائش گاہ میں بھی ہر چیز کا نام وغیرہ صرف ہندی میں تھا۔ اور اس لئے جو لوگ ہندی سے ناواقف تھے۔ وہ اپنے آپ کو اس اجلاس کی فضا میں پردیسی سا محسوس کرتے تھے۔ ہندی کی یہ طرفداری صرف رسم خط ہی کی حد تک نہ تھی۔ بلکہ الفاظ بھی وہی استعمال کئے گئے تھے۔ جو آج کل صرف سیاسی دنیا میں سُنے جاتے ہیں۔ چنانچہ

یہ دلچسپ منظر آپ کے نامہ نگار نے کئی بار خود دیکھا کہ اگر کوئی شخص نمائش کا ٹکٹ لینے کے لئے ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر کھڑا ہو کر یہ کہتا تھا کہ "نمائش کا ٹکٹ، دے دو" تو اُس سے یہ کہا جاتا تھا کہ "نمائش کا ٹکٹ یہاں نہیں ملتا - یہاں پری درشنی کے ٹکٹ بکتے ہیں۔"

البتہ بعض بعض مقامات پر اُردو رسم خط نظر آتا تھا۔ مثلاً دو چار جگہ "ہندوستانی ہوٹل" لکھا تھا۔ ڈیلیگیٹوں کے کیمپ میں صوبوں کے نام اُردو میں بھی تھے۔ اسی طرح دو چار اور جگہوں پر اُردو کی شنوائی کر لی گئی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی تحریر اُردو میں نہ تھی۔ والنٹیروں اور ڈیلیگیٹوں کو جو بِلّے دیئے گئے تھے وہ صرف ہندی میں تھے۔ وزیٹروں اور اخبارات کے نمائندوں کو جو ٹکٹ دیئے جاتے تھے۔ اُن کا خط صرف ہندی تھا حتّٰے کہ لاؤڈ اسپیکر کے جو "بھونپو" جگہ جگہ لگے ہوئے تھے۔ اُن پر بھی صرف ہندی لکھی تھی۔ غرضکہ اس فضا میں آنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے وہ سیاسی لیڈر جو اس نگر میں جمع ہُوئے تھے۔ آئندہ ہندوستان کی زبان کے متعلق ہندی کے سوا اور کسی زبان کو لائق التفات ہی نہیں سمجھتے۔ اُردو رسم خط کہیں کہیں استعمال ضرور کیا گیا تھا مگر جس انداز سے استعمال کیا گیا تھا اُس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ یہ ایک وقتی چیز ہے جو محض "فریب نظر" کے طور پر آ گئی ہے۔ گذشتہ سال بندے ماترم پر کافی ایجی ٹیشن تھا اس لئے اُس سال کھلے اجلاس میں بندے ماترم کے بعد اقبالؒ کا ترانہ بھی پڑھوا دیا گیا تھا لیکن اس سال یہ ندارد تھا۔ اس سال اس ترانہ کی جگہ گنتی کے چند اُردو کے بورڈوں نے لے لی تھی۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ اگر اُردو کا ایجی ٹیشن کچھ مندھا پڑ گیا تو آئندہ سال اقبالؒ کے ترانہ کی طرح یہ چند بورڈ بھی غائب ہو جائینگے۔

نمائش گاہ کے سلسلہ میں میں یہ کہنا بھول گیا کہ یہاں دو بورڈ اُردو خط میں بھی تھے۔ جن میں سے ایک پر "سیو پرانت" لکھا تھا اور دوسرے پر "کیرل" لیکن میں نہ سمجھ سکا۔ کہ اس کا مطلب کیا ہے۔"

"مجلس استقبالیہ اور کھلے اجلاس کے صدارتی خطبے ہندی زبان میں لکھے گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود عام بول چال کی رائج الوقت زبان کے الفاظ کو بیچ بیچ میں استعمال کر کے اپنی بے تعصبی کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس لحاظ سے گذشتہ سال کے صدارتی خطبوں کے مقابلہ میں یہ خطبے بہت بڑی حد تک اطمینان بخش تھے۔ لیکن یہ کہنا کسی صورت سے بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ اُس زبان میں لکھے گئے تھے جو شمالی ہند کے عام پڑھے لکھے لوگوں میں رائج ہے۔ چونکہ یہ خطبے ہندی یا اُردو کسی زبان میں بھی نہیں چھاپے گئے۔ اجکی [illegible] تخریبی سیاست کی وہ بدنظمی ہے جو آخر وقت تک باقی رہی، اس لئے افسوس ہے کہ اس دعوے کے ثبوت میں اُن کی عبارتیں یہاں نقل نہیں کی جا سکتیں۔ اخبارات میں جو خطبے شائع ہوئے ہیں اُن کے الفاظ کی ذمہ واری زیادہ تر رپورٹروں پہ ہے۔"

"مقرروں میں سے بھی ایسے افراد کی تعداد کافی تھی جنہوں نے پُرانے دستور کے خلاف اس سال رائج الفاظ کے بائیکاٹ کرنے سے ایک حد تک اجتناب کیا مگر پھر بھی ان کے الفاظ کی نشست کچھ اس طرح کی ہوتی تھی۔ جسے ہم اُس زبان کی نشست نہیں کہہ سکتے جو ہمارے درمیان رائج ہے۔ یعنی اُن کی زبان میں بے ساختگی نہیں بلکہ ترجمہ پن پایا جاتا تھا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں الفاظ کی نشست بالکل مختلف ہے اس لئے جب کوئی ہندی پرست اپنی بے تعصبی کو ثابت کرنا چاہتا ہے تو اُس کی زبان کچھ ٹوٹی ہوئی سی زبان ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس کے جملے پھیکے پھیکے اور بے ربط سے نظر آتے ہیں۔ زبان کی چُستی الفاظ کی شوکت اور نشست کی خوبی سے جو فصاحت و بلاغت پیدا ہوتی ہے۔ وہ باقی نہیں رہتی۔ لیکن یہ احتیاط بھی صرف چند افراد ہی کی طرف سے (جن میں راجندر بابو بھی شامل ہیں۔ عمل) میں آئی تھی۔"

"ایک بات بڑی حیرت انگیز تھی اور وہ یہ کہ ہندی کے نامانوس الفاظ اور نامانوس بندشیں صرف وہی لوگ استعمال کرتے تھے جو یُو۔ پی۔ بہار یا سی پی کے رہنے والے تھے۔ یعنی جن کی مادری زبان ہندوستانی ہے۔ لیکن وہ لوگ جن کی مادری زبان ہندوستانی نہیں ہے۔ یعنی جو سندھ، میسور، بنگال اور پنجاب وغیرہ سے آئے تھے۔ وہ اگر ہندوستانی بولتے تھے تو اُن کی زبان میں اور "مدینہ" کی زبان میں بہت کم فرق ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر میں یہاں مسٹر بنکم مکرجی (بنگال)، کی تقریر کے چند جملے نقل کرتا ہوں۔

"افسوس ہے کہ ہم لوگ سیاسی خیالات کو سامنے رکھ کر بہت کم غور کرتے ہیں۔ اور خالص سیاسی ڈھنگ سے ان باتوں پر روشنی نہیں ڈالتے۔ لیکن کم سے کم ہمارے بزرگ لیڈروں کو تو اتنا سوچنا چاہیئے تھا۔ کہ کیا یہ بات مہاتما جی کی شان کے خلاف نہیں۔ کہ آپ کچھ لوگوں کو ان کی ذات کے موافق بنائیں اور کچھ کو مخالف۔ اس لئے میں آپ سے درخواست کرونگا کہ خدا کے لئے ہمارے سامنے یہ سوال نہ لائیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہو اتفاق سے ہو۔ تاکہ کسی کو رنجش نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہمارے لئے کام کرنا ناممکن ہو جائے گا۔"

اب سندھ کے ایک ڈیلیگیٹ مسٹر آر کے سدھوا کے چند جملے سنئے "کانگریس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمیں برٹش شہنشاہیت سے کسی

قسم کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور ہم ہندوستان میں مکمل آزادی لینگے ہم ریاستوں میں جواب دہ حکومت چاہتے ہیں۔ اگر ہمیں جوابدہ حکومت نہ دی گئی تو یاد رکھیئے کہ یہ راجہ اور نواب ختم ہو جائینگے۔"

تعجب ہے کہ مسٹر جے پرکاش نارائن جو نہ صرف بہار کے رہنے والے ہیں۔ بلکہ جو سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ آزاد خیال بھی سمجھے جاتے ہیں اُن کی زبان یہ تھی۔

"ہمارے پرستاؤ کی کھلی اُڑائی گئی۔ پرنتو اب سمے آگیا ہے کہ ہندوستان اپنے بھاگیہ کا فیصلہ کرے۔ اس میں کتنی سپھلتا ہوگی اس کو میں نہیں جانتا ۔ ۔ ۔"

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جب آپ جوش میں آجاتے تھے تو اس بناوٹی زبان کا خیال دل سے نکل جاتا تھا اور پھر ٹھیک ٹھیک الفاظ آپ کی زبان پر آنے لگتے تھے۔ لیکن آپ کی کوشش یہی تھی کہ وہ زبان بولیں جو آج نہیں بلکہ آج سے ہزاروں سال پہلے بولی جاتی تھی۔"

(اخبار مدینہ مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۹ء)

اس بیان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کانگریس اور کانگریسی رہنما ملک کی اکثریت کو اس لئے کہ اُردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد ملک میں تیس کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ کس فریب میں مبتلا کرنے کی فکر میں ہیں اور کانگریس کا یہ اعلان کہ "شمالی ہند کی زبان ملکی زبان بنائی جائے گی" کس درجہ غلط اور مغالطہ آمیز ہے۔

اُردو زبان سے متعلق ہندو مہاسبھا کے معاندانہ رویّہ کی ہم تعریف کرتے ہیں کیوں کہ مہاسبھا جو کچھ دل میں رکھتی ہے۔ اُسے کھلے بندوں کہنے کی جرأت بھی دکھاتی ہے۔ مہاسبھا کسی کو دھوکے میں رکھنا پسند نہیں کرتی۔ وہ مسلمانوں کو ہندوستان کا یہودی سمجھتی ہے۔ تو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اس کا اظہار بھی کرتی رہی ہے۔ مسلمان اور دوسری غیر ہندو اقوام ہندو مہاسبھا کے عقائد و رجحانات سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ اس لئے کہ مہاسبھا انہیں عریاں الفاظ میں خود آگاہ کرنے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کرتی۔ موجودہ سیاسی منافقت کے دور میں مہاسبھا کی یہ جرأت گفتار تمام ہندوستانی اقوام کی تحسین و آفرین کی مستحق ہے کہ ہر ایک قوم کو سوائے ہندوؤں کی موجودہ و آئندہ جدوجہد سے متنبہ ہو کر اپنی حفاظت اور اپنے ملی حقوق کی حمایت کی تدابیر سوچنے کا موقعہ حاصل ہو گیا ہے۔ مگر کانگریسی مدبروں کی ڈپلومیٹک چال کے جال میں ہر قوم بری طرح گرفتار نظر آتی ہے "ہاتھی کے کھانے کے دانت اور دکھانے کے اور" یہ مثل کانگریسی ڈپلومیسی پر پوری طرح چسپاں ہو جاتی ہے۔

"آزاد ہندوستان میں سب کے حقوق برابر" کا فقرہ ہر کانگریسی رہنما کا تکیہ کلام بن رہا ہے لیکن یہ منافقانہ ہے۔ کانگریسی لیڈروں کی عملی سیاست اس فقرے کو دوسری قوموں کے لئے دام تزویر بنانا چاہتی ہے۔

اُردو زبان یہ حق رکھتی ہے کہ آزاد ہندوستان کی مشترکہ زبان بنائی جائے۔ کیونکہ کئی صدیوں سے غلام ہندوستان کی مشترکہ زبان بھی یہی چلی آتی ہے۔ اسے مسلمانوں اور قرآن کی زبان کہہ کر مٹانے والوں کو کان کھول کر سُن لینا چاہیئے۔ کہ اُردو زبان کے معاملے میں کوئی سمجھوتا اور کوئی قرارداد منظور نہیں کی جائے گی۔ اُردو ہندوستانی اقوام کے اتحاد کے لئے عالم وجود میں آئی تھی۔ مسلمانوں نے انتہائی رواداری سے کام لے کر اپنی فارسی زبان کو قربان کر کے اسے اس لئے ملکی زبان کی حیثیت میں قبولا تھا۔ کہ اس کے ذریعہ اقوام ہند میں باہمی اتحاد پیدا ہوگا۔

ورنہ ہم مسلمانوں کو ہندی کی طرح اُردو سے بھی کوئی واسطہ نہیں اگر اُردو کو پامال کرنے کی یہ کانگریسی پالیسی اسی طرح جاری رہی۔ تو ہم

"بر ہر دو لعنت"

کہہ کر دونوں سے دست بردار ہو جائیں گے اور پھر ہمارا مطالبہ فارسی کو اسلامیان ہند کی زبان تسلیم کرانے سے متعلق ہوگا۔ ہندوستان میں پاکستانی تحریک کانگریسی ڈپلومیسی کا براہ راست ردّ عمل ہے۔ اس کی نشوونما کانگریس کے منافقانہ سلوک کے زیر سایہ ہو رہی ہے۔ اگر کانگریس اپنی دو رُخی پالیسی پر اسی طرح مصر رہی تو پاکستانی تحریک کا خواب ایک نہ ایک دن ضرور اپنی تعبیر سے ہمکنار ہو جائیگا۔

رواداری جب بُزدلی اور کمزوری پر محمول کی جانے لگے۔ تو اینٹ کا جواب پتھر زندگی کا کفیل ہو جاتا ہے۔

گنہگار فرشتے

اُستاد ایک اخلاقی رہنما اور روحانی رہبر کی حیثیت میں بڑی ذمہ داریوں کا حامل ہے اسی کے اخلاق و کردار پر طلبہ کی آئندہ زندگی کی بہبودی کا انحصار ہے۔ تعلیمی خدمت کے لئے انسان کو فرشتہ بننے کی ضرورت ہے تا کہ اس کے شاگرد کم سے کم نیک انسان تو بن سکیں۔

اکثر اساتذہ اپنی ان ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہوئے اپنے اخلاق و اطوار کو نکوکاری کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں لیکن ان فرشتوں کی جماعت میں گنہگاروں کا ایک غول بیابانی بھی استادی کا رُوپ بھرے اپنی ناشائستہ عادات و صفات سے اپنی مقدس جماعت اعمائن کی تقدیس

معمور روایات کو بدنام کرتا پھرتا ہے۔ ان کالی بھیڑوں کو اپنی جماعت میں سے نکالنے کی ذمہ واری قابل احترام اساتذہ اور حضرات افسران معائنہ پر عائد ہوتی ہے۔ بورڈز تحریک کے رہنماؤں کو بھی ایسے "بدنام کنندہ نکونامے چند" نام نہاد استادوں کی نگرانی کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہی حضرات تحریک کو بدنام اور ناکام بنانے کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ہمیں کئی سال سے اس گروہ کی بددیانتیوں کا مسلسل تجربہ ہو رہا ہے اور اب ہم بھی یہ ارادہ کر چکے ہیں کہ ایسے لوگوں کا تعارف محکمہ تعلیم کے ذمہ وار افسران سے وقتاً فوقتاً کراتے رہینگے۔

تازہ واقعہ یہ ہے کہ

قلعہ سوبھا سنگھ کے ایک ماسٹر صاحب دفتر شاہکار میں پہنچے۔ شاہکار کی خریداری کا شوق اور اپنی تنگدستی کا رونا رو کر رعایتی چندے میں شاہکار کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم نے اپنی مروت کے جذبے سے مجبور ہو کر ان کے شوق ادب کا احترام کیا۔ چندہ ادا کر کے ارشاد فرمانے لگے کہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے نام کی رسید دی جائے۔ اور چھ روپے (یعنی پورے چندے) کی رسید دی جائے۔ اس طرح وہ اسکول کو دھوکا اور دفتر شاہکار کو فریب کارانہ طور پر نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ اور رعایتی رقم اپنی جیب میں ڈالنے کے خواہشمند ہوں گے۔ دوسرا واقعہ ضلع گورداسپور کے مڈل اسکول کے ایک ہیڈ ماسٹر کا ہے۔ یہ بزرگوار بھی کتابوں کا کمیشن اپنی جیب کا حق سمجھ رہے ہیں۔ کیونکہ اسکول کے نام رسید پورے چندے کی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نام کی اشاعت ہم سردست روکے لیتے ہیں۔

حضرات اساتذہ ذرا انصاف کریں۔ کہ ایسے موذی اور بددیانت لوگ اس قابل ہیں کہ قوم کے بچے ان کے سپرد کئے جائیں۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے انہیں لوگوں کی شان میں فرمایا تھا کہ

"گر ہمیں مکتب است و ایں مُلّا
کار طفلاں خراب خواہد شد"

(نامجور)

پبلشرز کی حریص فطرت کے نتائج

پنجاب گورنمنٹ نے لازمی تعلیم کا نفاذ کر کے علم نوازی کا ثبوت ضرور دیا ہے۔ لیکن کبھی اس بات پر غور نہ کیا گیا کہ عوام اپنے بچوں کو تعلیم دلانے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنی اولاد پیاری ہوتی ہے اور اتنی پیاری ہوتی ہے کہ جس سے زیادہ کوئی دوسری چیز عزیز نہیں ہو سکتی۔ غریب ہوں یا امیر سب کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ اس محبت اور اُلفت کے باوجود اکثر ماں باپ اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے سے گھبراتے ہیں اور بعض لوگ تو سکول میں بھیج کر تھوڑے عرصہ کے بعد اُٹھا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا صوبہ مجبور و کم مایہ زمینداروں سے آباد ہے۔ وہ بمشکل اپنا گزارا کرتے ہیں۔ اور اُن میں اتنی مقدرت نہیں کہ اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے اخراجات بھی برداشت کر سکیں۔ لیکن محبت پدری سے مجبور ہو کر خود ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کرنا گوارا کرتے ہیں۔ اور بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں۔ مگر تھوڑے عرصہ میں اس قدر زیر بار ہو جاتے ہیں۔ کہ گھبرا کر بچوں کو اسکول سے اٹھا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض بچوں کی تعلیم نامکمل رہ جاتی ہے اور بعض کی ہوتی ہی نہیں

وجہ اُس کی یہ ہے کہ مدرسین کی تنخواہیں اس قدر کم ہوتی ہیں۔ کہ بسر اوقات نہیں کر سکتے۔ وہ اس آمدنی کو قائم رکھتے ہوئے آمدنی کی توسیع و ترقی کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اور پبلشرز کی حریص فطرت کے دام فریب میں مبتلا ہو کر طلبا پر ظلم کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طالب علم کو درسی کتب کے علاوہ پندرہ پندرہ سولہ سولہ سپلیمنٹری ریڈرز خریدنا پڑتی ہیں۔ اور ان میں سے اکثر محکمہ کی طرف سے منظور نہیں ہوتیں۔ مدرسین کو پبلشرز کی طرف سے کم از کم پچیس فیصدی اور زائد سے زائد چالیس فی صدی کمیشن ملتا ہے۔ اس کمیشن کے لالچ میں طلباء کے گلے پر چھُری پھیری جاتی ہے اور اس کا بوجھ والدین کے سر پڑتا ہے۔ وہ غریب برداشت کرتے ہیں لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے تو اپنے بچوں کو اسکول سے اُٹھا لیتے ہیں۔

ہر اسکول میں کلاس لائبریریاں ہوتی ہیں۔ جس کا انتظام محکمے کی طرف سے ہوتا ہے اور ان لائبریریوں میں قریب قریب ہر موضوع پر کتابیں ہوتی ہیں۔ اور وہ بچوں کے مطالعہ کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیشہ نئی نئی کتابیں پبلشرز منظوری کے لئے محکمے میں پیش کرتے رہتے ہیں اور ان میں سے اکثر منظور ہو جاتی ہیں۔ مدرسین وہ کتابیں اپنی اپنی لائبریریوں کے واسطے خرید سکتے ہیں۔ تاکہ کسی کتاب کی اُن کی لائبریری میں کمی نہ رہے اور نادار طلباء پر ظلم بھی نہ ہو۔

لازمی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ اگر مدرسین کی تنخواہیں بھی بڑھا دی جائیں۔ اور محکمے کی طرف سے اسکول لائبریریوں کو اس قدر کتابیں دی جائیں کہ طلباء کو درسی کتب کے سوا کسی کتاب کے خریدنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ بلکہ مدرسین کے لئے یہ حکم نافذ کیا جائے۔ کہ وہ کتب نصاب کے

علاوہ طلبار کو کسی کتاب کے خریدنے کی تحریک بھی نہ کر سکیں۔ تو پھر کوئی اپنے بچوں کی تعلیم سے گریز نہ کرے گا۔ طلبار غیر ضروری کتابوں پر پیسے ضائع کرنے سے محفوظ رہیں گے۔ اور ان کتابوں کی اشاعت بھی بند ہو جائیگی۔ جو محکمے کی طرف سے منظور نہ ہونگی۔ اس تجویز پر اگر محکمے کی طرف سے عمل شروع ہو جائے تو پھر کوئی شخص اپنے بچوں کو تعلیم دلانے سے گریز نہ کریگا ورنہ ہمیشہ یہی حال رہیگا اور لازمی تعلیم کامیاب نہ ہو سکیگی۔ اور اگر ظلم وتشدد کی بدولت حکومت کامیاب بھی ہوگئی۔ تو یہ بے انصافی اور ناجائز صورت ہوگی۔ جس کو کوئی منصف مزاج اور انصاف پرور پسند نہیں کر سکتا۔

مرکزی دواخانہ لاہور

یونانی طب کی سرد بازاری اور بے رواجی کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ایک مدت دراز سے یونانی دواخانے تجارتی لوٹ مچائے ہوئے ہیں۔ اُن بازاری عطاروں سے قطع نظر جن کی ایک ہی بوتل بہ یک وقت متضاد تاثیر کے مختلف شربت اُنڈیل سکتی ہے۔ اکثر اشتہاری دواخانے مرکبات میں قیمتی اجزا پوری مقدار میں نہیں ڈالتے۔ اپنے بڑے بڑے ناموں کی شہرت سے پبلک کو فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ یہ ایک واقعیت ہے کہ سچے موتیوں کی بجائے سچا سیپ عام دواخانوں میں استعمال ہو رہا ہے اصلی مُشک و عنبر اول تو بازاروں میں ناپید ہیں۔ پھر جیسے کچھ بھی مل جاتے ہیں۔ اُن کی پوری مقدار دواخانوں کے مرکبات میں نہیں ڈالی جاتی۔ سونے کے کشتے کی بجائے دس پانچ طلائی ورق ڈال دیئے جاتے ہیں۔ ان مرکبات کی قیمت اور لاگت میں کوئی تناسب نہیں ہوتا۔ آنوں کی لاگت کی دواروپوں کی قیمت پر اصلی نام سے فروخت کی جاتی ہے۔ جب نسخے کے تمام اصلی اجزار پوری مقدار میں مہیا نہ کئے جائیں۔ تو اس کا استعمال ازالہ مرض میں کیونکر امداد دے سکتا ہے۔ مریض بیچارہ مرکبات کی مشتہرہ قیمت ادا کر کے جب انہیں بے اثر پاتا ہے تو اصل حقیقت سے بے خبر رہ کر طبیب کی تشخیص اور ناقابلیت کو اس کا ذمہ وار ٹھیرا دیتا ہے۔ اور نتیجۃً یونانی طریقہ علاج ہی سے بدظن ہو جاتا ہے۔

اسی مصیبت کے پیش نظر سر اقبال مرحوم نے باصرار تمام زبدۃ الحکما حکیم محمد حسن قرشی پرنسپل طبیہ کالج کو دواخانہ قائم کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اور انہیں مشکلات کا احساس کر کے فخر الحکما حکیم خورشید علی خاں صاحب رام پوری نے اپنی زیر نگرانی مرکزی دواخانے کے نام سے ایک دواخانہ قائم کیا ہے۔ مرکزی دواخانے میں جو مرکبات تیار ہوتے ہیں۔ دواخانے کے دواساز کو سامنے بٹھا کر حکیم صاحب تمام قیمتی اور اصلی دوائیں خود نسخے میں ملاتے ہیں۔ اور اس بارے میں انہیں اس قدر احتیاط مدِ نظر ہے کہ جب تک نسخے کے اصلی اجزار پوری مقدار میں مہیا نہ ہو جائیں۔ وقتی ضرورت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور نسخے کی دوا کو معرضِ التوا میں ڈال دیتے ہیں۔

سچے موتی، مشک، عنبر اور اسی قسم کے دیگر قیمتی اجزار کی خریداری میں بھی بہت کچھ احتیاط برتی جاتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ یونانی طریقہ علاج پسند کرنے والوں کی ایک بڑی تکلیف اور ضرورت مرکزی دواخانے کے قیام سے رفع ہو جاتی ہے۔ مرکزی دواخانے میں حکیم صاحب کے ضدا و پنجاہ سالہ مجربات بھی اس دواخانے کو شانِ امتیاز بخشے ہوئے ہیں۔ ہم ضرورتمند پبلک کو ذاتی طور پر اطمینان دلاتے ہیں۔ کہ مرکزی دواخانہ چوک لوہاری منڈی لاہور کے پتے پر جس قسم کی یونانی ادویہ طلب کریں گے۔ وہ فن دوا سازی کے صحیح اصول پر تیار ملینگی اور ان کے تمام اجزار مطابق نسخہ اس میں ملائے گئے ہونگے۔

اہلِ قلم حضرات

شاہکار ایک تعلیمی ماہنامہ ہے اس کا معیار عام رسائل سے بہت بلند ہے اور ہمیشہ بلندپایہ مضامین نظم ونثر شائع ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود نو آموز حضرات کے مضامین بکثرت آتے ہیں۔ جو کسی صورت سے بھی ہم شائع نہیں کر سکتے۔ اب اگر ہر ایک مضمون بھیجنے والے کو خط لکھ کر یہ بتایا جائے کہ اُن کا مضمون شاہکار کے معیار کے مطابق نہیں ہے اور شائع نہیں ہو سکتا تو اس کے لئے ایک بڑے عملے کی ضرورت ہے جس سے صرف خطوط نویسی کا کام لیا جائے۔ لہٰذا گذارش ہے کہ جن حضرات کے مضامین شاہکار میں شائع نہ ہوں اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ مضامین ہمارے معیار کے مطابق نہیں ہیں۔

جو مضامین مفید اور کارآمد ہوتے ہیں وہ ضرور شائع کئے جاتے ہیں اور صاحبِ مضمون کا دفتر کی طرف سے شکریہ بھی ادا کیا جاتا ہے۔

تصحیح

شاہکار کے فروری نمبر میں صفحہ ۱۹ پر ایک غزل شائع ہوئی ہے۔ یہ غزل حضرت آثر چکوالی کی ہے۔ کاتب کی غلطی سے غزل کے نیچے حضرت آثر کا نام نہیں لکھا گیا۔ ہمیں اس غلطی کا افسوس ہے۔ اب تک اس غلطی کی تصحیح ہو جانا چاہیئے تھی لیکن نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ فروری کا پرچہ جب مرتب کیا گیا ہے۔ اس وقت گوپال متل صاحب مدیر معاون تھے۔ اور اس کے بعد وہ روزنامہ [illegible] چونکہ مجھے علم نہ تھا اور نہ اس صفحے پر میری نظر پڑی۔ اس لئے اب تک اس غلطی کا اعلان نہ ہو سکا۔

(طالب فاسی)

غزل

اے لشکرِ غم ٹھہر نہ دغا دے زباں کہیں
مُنہ سے نکل نہ جائے مرے الاماں کہیں

قائم ہے یُوں بہارِ زمین و زماں کہیں
جانِ بہار ہے کوئی آرامِ جاں کہیں

صیّاد کے کرم پہ ہے گلچیں کے رحم پر
تنکوں کا گھر قفس ہے کہیں آشیاں کہیں

میں سوچتا ہُوں غم کا یہ ردِ عمل نہ ہو!
ہونٹوں پہ کھیلتا ہے تبسّم جہاں کہیں

ہنس لیں جو ہنس رہے ہیں مرے اشک و آہ پر
ہوتی ہے اس سے محنتِ غم رائیگاں کہیں

دم بھر ٹھہر گئے تھے اب اُٹھنے کو ہیں قدم!
رہ جائیگی زمین کہیں آسماں کہیں

ہر اہلِ دل کو ہے مرے نام و نشاں کی فکر
کر دیں مجھے تصدّق نام و نشاں کہیں

تم کو نصیب اور ہوں جینے کی لذّتیں!
کیا جانو تم کہ موت ہے آرامِ جاں کہیں

منزل یہ کونسی ہے کہ بے مدعا ہے دل!
آخر کو تھک کے رہ ہی گیا کارواں کہیں

دُنیا سے اعتبارِ محبت کا اُٹھ چکا
اِک اعتقاد ہے وہ نہ ہو رائیگاں کہیں

صیّاد یہ قفس یہ مری شاخِ آشیاں
رہتے ہیں ایک شاخ پہ دو آشیاں کہیں

میں اُن کے سامنے بھی گنہگار جاؤں گا
مجھ سے الگ نہ ہوگی مری داستاں کہیں

ہنستے ہو فکرِ زندگیِ جاوداں پہ کیا!
مانگو دعا کہ موت نہ ہو جاوداں کہیں

جاتی ہوئی بہار سے کچھ پھول لائے ہیں!
دیکھیں تو کوئی صاحبِ دل ہے یہاں کہیں

ہندوستان بھی جائے گا اُردو زبان کے ساتھ
ہندوستان سے جاتی ہے اُردو زباں کہیں

میرے سخن میں نجمؔ جھلک اُس زباں کی ہے
چُھپتی نہیں ہے میرؔ کی سُتھری زباں کہیں

نجم آفندی

شہزادی فردوس قدر

شہبازؔ مرزا پرانی وضع کے آدمی تھے۔ بڑے خوش مزاج۔ خلیق اور ملنسار تھے۔ محلہ کے چھوٹے بڑے سب ان کی عزت و احترام کرتے اور نوجوان تو ان کی باتوں کا خوب لطف اٹھاتے تھے۔ بعض اوقات سامعین کا اچھا خاصا مجمع ہو جاتا تھا۔ شہبازؔ خوشنویس بھی اچھے تھے۔ محلہ کے سب لڑکے انہیں سے اصلاح لیا کرتے۔ وہ اپنے شاگردوں سے بہت محبت و مروت سے پیش آتے اور اکثر غور کرتے کہ ملک کے کیسے کیسے ہونہار نوجوان بیکاری اور بے بسی کا شکار ہو رہے ہیں۔ باتوں کے لئے مرزا کا ذخیرہ معلومات زیادہ وسیع نہ تھا۔ عموماً ان کا موضوع گفتگو میدان جنگ کے افسانوں تک محدود رہتا تھا البتہ انداز بیان کچھ ایسا دلفریب تھا۔ کہ لڑکے گھنٹوں چپ چاپ بیٹھے سنا کرتے اثنار بیان میں اگر کبھی جوش میں آجاتے۔ تو اُن کی پیشانی پر جو تلوار کا نشان تھا وہ سرخ ہو جاتا۔ واقعی ان کی گفتگو غضب کی جوش آفرین اور جرأت آموز ہوتی تھی۔ اگر کبھی کوئی اُن سے اُن کی زندگی کے متعلق سوال کر بیٹھتا۔ تو ہمیشہ مسکرا کر طرح دے جاتے۔ کہ اچھا سنائینگے۔

شہبازؔ مرزا ایک روز اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں ایک نازک سی چھڑی تھی۔ اسے بغور دیکھنے لگے۔ پھر نہ معلوم جی میں کیا آئی۔ کہ دفعتہً دیوان خانے میں چلے گئے۔ دروازوں کے پردے چھوڑ دیئے۔ الماری میں سے کاجل کی پڑیا۔ وارنش کی شیشی اور کٹوری نکالی۔ کاجل اور وارنش ملا کر چھڑی پر پالش کرنا شروع کر دیا۔ یہ پتلی سی چھڑی تھی۔ تُن کی لکڑی اور شنگرفی رنگ تھا۔ مگر سیاہ پالش لگانے سے آبنوس بن گئی۔ ایک بے حیثیت چھڑی شہبازؔ کی ذراسی توجہ سے ایک چیز بن گئی۔ پھر اُنہوں نے مُوٹھ سے پکڑ کر اُسے ہاتھ میں تولا۔ بھلا اس کے وزن میں کیا فرق آسکتا تھا۔ مگر اب شہبازؔ مرزا کو ایک اور سُوجھی۔ فوراً چھڑی ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو گئے اور سہرا۔ بغل۔ کنپٹی۔ سینے۔ ٹخنے وغیرہ کے ہاتھ چلانے لگے۔ دیوانخانہ اکھاڑا تھا۔ کہ میدان کارزار؟ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ شہبازؔ کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ ہوا میں کالے سانپ کی طرح لہرا رہی تھی۔ گویا شہبازؔ ہوا کو تلواریں مار رہے تھے۔ جب کبھی ان کا "ہوائی" حریف کاری ضرب کھا کر گر جاتا تو شہبازؔ فوراً قدم بڑھا آبنوسی شمشیر اس کے سینے پر الف کر دیتے۔ اور پھر پیچھے ہٹ کر للکارتے کہ دیکھا یہ ہاتھ!

جب دیوانخانے میں یہ جنگی تماشا ہو رہا تھا۔ کہ دروازے سے آواز آئی اور شہبازؔ فوراً اس اکھاڑے سے نکل آئے۔

شہباز مرزا۔ (ذرا سانس لے کر) کون صاحب ہیں؟

آواز۔ ضیغم!

شہباز۔ آخاہ۔ ضیغم مرزا۔ آیئے۔ چلے آیئے۔

پردہ اُٹھا اور ضیغم مرزا نمودار ہوئے۔ سر پر ٹوپی۔ گلے میں ڈوریئے کا کرتا۔ جس کے گریبان اور کندھوں پر چنبیلی کی بیل تھی۔ چست پائجامہ۔ پاؤں میں کامدار جُوتا۔ ان سب پر ان کے علاوہ ہلکے سے کاسنی رنگ کی اکہری دولائی اوڑھے تھے۔ ایک بازو دولائی کے اندر تھا۔ اور دوسرا باہر۔ اس کی تنگ آستین کی موہری پر باریک زنجیرہ ٹنکا تھا۔ ضیغم کے چہرہ کا رنگ فق۔ آنکھوں میں وحشت اور انداز میں سراسیمگی تھی۔ چنانچہ دیوانخانے میں آتے ہی دائیں بائیں۔ آگے پیچھے نظر دوڑائی۔ ضیغم کے طور بے طور دیکھ کر شہباز مرزا حیران سے ہو گئے اور بولے۔

شہباز۔ میاں ضیغم۔ کیوں خیریت تو ہے۔ کہئے کہئے۔ یہاں تیسرا کوئی نہیں۔

ضیغم۔ کیا عرض کروں۔ سان نہ گمان۔ خواہ مخواہ کی مصیبت گلے پڑ گئی۔ اماں جان نے بڑی تسلیاں دیں۔ بیگم نے بھی کہا کہ ڈرنے کی کیا بات ہے لیکن میں نے یہی سوچا کہ آپ ہی اس پریشانی کا حل تجویز فرما سکتے ہیں اس لئے حاضر ہوا ہوں۔

شہبازؔ۔ اماں آیئے۔ بیٹھئے تو سہی۔ سنایئے تو آخر قصہ کیا ہے۔

ضیغم۔ صاحب اس بلا سے نجات پائیں تو بیٹھ بھی جائینگے۔

شہبازؔ۔ آپ بہت پریشان ہیں۔ ایسی کیا قیامت ہو گئی۔ ماجرہ کیا ہے؟

ضیغم۔ قیامت سی قیامت! لیجئے سنئے۔ سالن بے مزہ سا تھا۔ والدہ نے کہا کہ ڈربہ میں کوئی انڈا ہو تو اُٹھا لاؤ۔ خاگینہ تیار کر دوں۔ ہم نے مرغیوں کا ڈربہ جا دیکھا۔ فرش پر کوئی انڈا نہ تھا۔ ڈربہ کی چھت میں ٹٹولا۔ وہاں بھی کچھ نہ تھا

شہباز۔ (مسکرا کر) تو گویا ڈربہ کی چھت میں انڈا ہو سکتا ہے۔ یہ کن مرغیوں کا ذکر ہے۔

ضیغم۔ آپ سنئے تو سہی۔ ہاں تو ڈربہ میں جب ذرا بڑھا کر ہاتھ مارا۔ تو ایک ایسی چیز پر پڑا۔ جو ہاتھ کے ساتھ ہی باہر چلی آئی۔ اسے جو دیکھا۔ تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

شہباز۔ وہ کیا چیز ہے کیا سانپ پر ہاتھ جا پڑا تھا۔

ضیغم۔ حضرت سانپ سے تو کبھی اتنا خوف نہیں کھایا۔ میں گھبرا کے اُٹھا

کو والدہ کے پاس لے گیا۔ وہ بولیں کہ ابا جان مرحوم نے رکھ دی ہوگی۔ اور کہ اللہ جنت نصیب کرے دادا شہید تو ان چیزوں کے دھنی تھے اور ادھر سے بیگم جو آئیں اُنہیں تو بس ایک مذاق ہاتھ لگ گیا۔

شہباز۔ بھئی آپ تو پہیلیاں بُوجھواتے ہیں۔ آخر وہ چیز کیا ہے۔

ضیغم۔ پہیلی نہیں صاحب۔ یہ لیجئے (دلائی کے نیچے۔ بغل سے تلوار نکال کر دیتا ہے) اب ذرا غور کیجئے۔ ابّا جان مرحوم نے رکھی ہو یا دادا جان اس کے دھنی ہوں۔ ہوا کریں۔ وہ زمانہ اور تھا۔ اب اگر کوئی اسے ہمارے پاس دیکھ پائے۔ ہم تو دھر لئے جائیں۔

شہباز مرزا نے تلوار لے کر اسے بغور دیکھا۔ اس کا دستہ سنہری اور پرتلے کی جھلک نیلگوں تھی۔ دستے کے نقش و نگار اور پرتلے کی مُہر پڑھی۔ تلوار کی باڑ دیکھی۔ اور اس کی نوک کو بڑے غور سے دیکھا۔ شہباز نے ضیغم مرزا کو پُر ملال نظروں سے دیکھ کر سرد آہ بھری اور یوں مخاطب ہوئے

شہباز۔ بس یہ گھبراہٹ تھی۔ اتنی سی بات پر حواس کھو بیٹھے۔ یہ تلوار آپ کے والد مرحوم نے رکھ دی ہوگی۔ اس کی آب کو قائم رکھنا یہ ان لوگوں کی آبرو تھی۔ ان چیزوں کے جوہر وہی لوگ جانتے تھے۔ یہ مرزا تہور بیگ کی صنعت ہے۔ دیکھو یہ اس کا نقش ہے۔ تہور بیگ اپنے فن میں یکتا تھے۔

ضیغم۔ مگر حضرت۔ یہ ہمارے کس کام آسکتی ہے۔

شہباز۔ افسوس یہ دن بھی دیکھنے تھے۔ کہ آج سپاہی زادے تلوار کی صورت سے لرزہ براندام نظر آتے ہیں۔ ہم تمہیں قصہ سناتے ہیں۔

یہ کہہ کر شہباز الماری کی طرف بڑھے۔ اور اس میں سے ایک بقچی لی۔ اُسے کھولا۔ دونوں ہاتھوں میں ایک آہنی زرہ اُٹھا کر ضیغم کو دکھانے لگے۔

یہ ایک نایاب چیز تھی۔ دیکھنے سے دُھوپ چھاؤں کی کیفیت نظر آتی تھی۔ کڑی میں کڑی پیوستہ تھی۔ لچک کا یہ انداز تھا۔ گویا مٹھی میں ریشم کا رومال دبا رکھا ہے۔ زرہ ہر پہلو سے بے نقص تھی۔ صرف سینہ پر ایک شگاف تھا شہباز نے ضیغم کو زرہ دکھا کر کھونٹی پر ٹانگ دی۔ ضیغم یہ دیکھ کر اور بھی حیران ہوگیا۔ اور کہے بغیر نہ رہ سکا۔

ضیغم۔ جناب ہم کچھ نہیں سمجھے۔ ابا جان کے زمانہ میں یہ چیزیں درکار ہونگی۔ مگر آج کل تو بالکل بیکار ہیں۔

شہباز۔ میاں! تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ تلوار کس کے ہاتھ میں تھی اور یہ زرہ کس کے جسم پر۔ یہ شجاعت کی نشانیاں ہیں۔ بیکار نہیں ہوسکتیں۔ یہ تلوار جسے تم سانپ سے بدتر سمجھ رہے ہو۔ تہور بیگ کا کام ہے۔ اور یہ زرہ بھی تہور بیگ کی صنعت گری ہے۔ اور زرہ میں یہ شگاف اسی تلوار کا گھاؤ ہے جس سے ایک سفاک و محسن کش جہنم رسید ہوا۔ اور ہاں! وہ شمشیر زن ایک یتیم دوشیزہ تھی۔ جس نے اسی تلوار سے اپنے باپ کے قاتل کا خاتمہ کیا۔

شہباز کی تقریر میں بڑا ولولہ تھا۔ وہ تلوار ہاتھ میں لئے فرش پر بیٹھ گیا۔ ضیغم حیران ضرور تھا مگر اب اس کے حواس باختہ نہ تھے۔

ضیغم۔ ہم نے تو کبھی یہ ماجرا سُنا نہیں۔ البتہ دادی اماں . . . .

شہباز۔ (بات کاٹ کر) سنو! ہم سناتے ہیں۔ خالہ اماں کا حافظہ بڑھاپے کے باعث ناقص ہوگیا تھا۔ وہ قصہ میں قصہ چھیڑ دیتی تھیں۔ اُن کا یہ فقرہ کہاں بیٹا! تو میں کیا کہہ رہی تھی۔ تکیہ کلام بن گیا تھا۔

سنو! ہم سناتے ہیں۔ مرزا تہور بیگ فرغانہ کا صیقل گر تھا۔ سپاہی تھا ایک جانباز سپاہی تھا۔ وطن چھوڑ ہندوستان میں آپہنچا۔ آگرہ میں ایسے لوگوں کی قدر تھی۔ یہاں سلسلہ ملازمت ہوگیا۔ تہور بیگ کام کا آدمی تھا۔ ہوتے ہوتے اسلحہ خانہ کا داروغہ بن گیا۔ ایک مرتبہ تہور بیگ کی کسی راجپوت سے تکرار سی ہوگئی۔ ترک بچہ اور مزاج کا سخت تو پہلے ہی تھا۔ تلوار کا ایک ہاتھ چھوڑ دیا۔ ایک راجپوت کا قتل بادشاہ کو بہت ناگوار گذرا۔ بریت کے لئے اشتعال وغیرہ عذر پیش کئے گئے۔ مگر کوئی سماعت نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تہور بیگ کو ملک بدر کر دیا۔ یہ بڑی رعایت تھی۔ لیکن تہور بیگ شکستہ خاطر ہوگیا۔ واپس وطن تو کیا جاتا۔ مُنہ اُٹھا کر دکن کو چل دیا۔

دکن کا مسئلہ شاہانِ ہند کے لئے ہمیشہ ٹیڑھی کھیر رہا ہے۔ مارتے چین نہ چھوڑتے آرام۔ دکن کی طوائف الملوکی اور مسلسل ریشہ دوانیاں مرکزی حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ تھیں۔ اور آئے دن کے فتنے شاہی فوجوں کو پابہ رکاب رکھتے تھے۔ اگر احمد نگر، بیجاپور وغیرہ کی سرکشی کا خاتمہ ہوا۔ تو ادھر مرہٹوں نے سر اُٹھایا اور اُدھر گولکنڈہ نے پاؤں پھیلا لئے۔ یہ ایک نیام و دو شمشیر کا معاملہ بھلا شہنشاہ ہند کو کب گوارا ہوتا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہی موقعہ تھا۔ کہ شاہی فرمان جاری ہوا۔ لشکر روانہ ہوئے۔ اور قیصر مرزا سپہ دار نے فوراً غازی گڑھ میں آکر ڈیرے ڈال دیئے۔ ایک طرف مرہٹوں کو دبایا۔ دوسری جانب گولکنڈہ کو للکارا۔ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ اور قیصر مرزا برابر قدم جمائے صوبیداری کرتے رہے۔

ضیغم۔ آپ نے تلوار کا ذکر چھیڑا تھا۔ یہاں گولکنڈہ اور مرہٹے کیسے آگئے۔

شہباز۔ صاحبزادے! صبر تو کرو۔ ہم سنا رہے ہیں۔ ہاں تو قیصر مرزا اس امن سوز اور فتنہ پرور علاقہ میں صوبیداری کرتے رہے۔ قیصر مرزا بڑے منصف مزاج اور شفیق سپہ سالار تھے۔ ادنےٰ سے ادنےٰ سپاہی کا بھی خیال رکھتے۔ اور سپاہیوں کو بھی اُن کے لئے جان قربان کر دینے میں دریغ نہ ہوتا تھا۔ سلطان

قیصر مرزا ایک بیدار مغز حاکم اور ہر دلعزیز منتظم تھے۔ جنگی ہنگامہ آرائیوں کے باوجود اُن کی بہترین کوششیں ملک کے امن اور رعایا کے فلاح و بہبود کے لئے وقف تھیں۔ بڑے مردم شناس تھے مگر تقدیر کے معاملہ میں تدبیر و تجربہ بیکار ہے۔ انہی ایام میں ایک شخص ہیبت جنگ نامی غازی گڑھ پہنچا اُس کا پیشہ سپہ گری اور ظاہرہ طور طریقہ میں بہت اچھا تھا۔ حیلے وسیلے سے کام لے کر اُس نے قیصر مرزا کے دربار تک رسائی کی۔ پہلے درباریوں میں شامل ہُوا۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے سلطان کے مزاج میں دخل حاصل کیا اور کچھ عرصہ کے بعد معتمد خاص بن گیا۔ ہیبت جنگ بڑا چلتا پرزہ تھا۔ اپنے اثر و رسوخ سے ہر شعبہ پر حاوی ہوگیا۔ پھر ایسے جوڑ توڑ کئے کہ نواحی علاقہ کے آدمی فوج میں بھرتی کر کے ایک نئی جمعیت پیدا کرلی۔ اور پرانے جان نثاروں کی حوصلہ شکنی کر کے انہیں قیصر مرزا سے بیزار کردیا۔ یہ سلسلہ جاری تھا۔ اور قیصر مرزا کو کوئی خبر نہ تھی۔ کہ خود اس کے خلاف ایک گہری سازش لمحہ بہ لمحہ تقویت پکڑ رہی ہے۔ آخر ایک دن موقعہ پاکر اس ہیبت جنگ نے قیصر مرزا کو قتل کر ڈالا۔ اور خود تمام علاقہ پر قابض ہوگیا۔ قیصر مرزا کی بدنصیب بیگم نے اپنے لڑکے جعفر اور لڑکی فردوس قدر کو ساتھ لیا۔ اور یہ تینوں اپنی جان بچانے کے لئے صرف چند جاں نثاروں کی معیّت میں غازیگڑھ سے بھاگے۔ یہ بے خانماں قافلہ دشمنوں سے بچتا۔ راستے کی مصیبتیں اُٹھاتا اجمیر پہنچا۔ مگر ظالم ہیبت جنگ نے یہاں بھی ان غریبوں کا پیچھا نہ چھوڑا۔

ضیغم۔ یہ ہیبت جنگ بڑا بے ایمان نکلا۔ کہ قیصر مرزا ایسے محسن کو قتل کر ڈالا۔

شہباز۔ سنتے جاؤ۔ محسن کُشی کوئی نئی بات نہیں۔ یہ پرانی رسم ہے۔ اس خونریز واقعہ کے متعلق آگرہ میں بڑے غیظ و غضب کا اظہار ہُوا۔ فوراً بیگم قیصر مرزا کی تلاش اور امداد کے لئے فرمان جاری ہوئے۔ اور غدار ہیبت جنگ کی سرکوبی اور دکن کے فتنہ انگیز سلاطین کی گوشمالی کے لئے ایک جرار لشکر روانہ کیا گیا۔ مگر دکن میں ایک اتحاد ثلاثہ کی صورت قائم ہوچکی تھی۔ یعنی والئے گولکنڈہ۔ ہیبت جنگ اور مرہٹوں کے منتشر گروہ مرکزی حکومت کے خلاف متحد ہوگئے تھے۔ شاہی فوجیں دو منزلہ سہ منزلہ کوچ کرتی دکن کی طرف بڑھیں۔ راستے میں جو سدِّ راہ ہُوا۔ اسے تاخت و تاراج کیا۔ جس نے مزاحمت کی اُس کو ٹھکانے لگایا۔ مگر ایسی رکاوٹوں سے ہیبت جنگ کو فائدہ اُٹھانے کا موقعہ مل گیا۔

ہیبت جنگ بڑا عیار اور چالاک آدمی تھا۔ ظالم اور عیاش۔ رعایا کے حقوق سے بے پروا۔ اپنے فرائض سے بےفکر۔ لوگ اس کے جور و جفا سے نالاں اور ہمسائے اس کی دراز دستی سے خوف زدہ تھے۔ اُس نے پہلے تو قیصر مرزا کے باقی ماندہ خیر خواہوں پر ہاتھ صاف کیا۔ اور پھر ہمسایہ ریاستوں کو مرعوب کر کے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ ہیبت جنگ کو بیگم قیصر مرزا کے بچ کر نکل جانے کا بہت رنج بلکہ ایک گونہ خدشہ لگا رہتا تھا۔ وہ ایک دلیر سپاہی تھا۔ اور قسمت آزمانے میں بہت بیدھڑک۔

ہیبت جنگ قدم جما چکا تھا۔ کہ وہی تہور بیگ بھی اِدھر آنکلا۔ آدمی کام کا تھا۔ اور ہیبت جنگ کو ایسے لوگوں کی ضرورت تھی۔ کیونکہ تہور بیگ سپاہی تھا۔ اور صنّاع بھی۔ ہیبت جنگ نے توپ خانہ کا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ تہور بیگ نے تھوڑے عرصہ میں محنت اور ہُنر کے بل پر اپنے نئے آقا کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اور یونہی ایک عرصہ گذر گیا۔

ضیغم۔ مگر تعجب ہے۔ کہ تہور بیگ ایسا غیور سپاہی ہیبت جنگ کی ملازمت اختیار کرے۔

شہباز۔ ارے میاں ذرا تو صبر کرو۔ سنو تو۔ شاہی فوجوں نے جب دکن پر چڑہائی کی۔ تو ہیبت جنگ کو ایک طرف چھوڑا۔ اور گولکنڈہ کا جا محاصرہ کیا کیونکہ اس وقت یہی ایک ریاست تھی جس کے اشارہ پر یہ فتنے اُٹھتے رہتے تھے۔ مگر گولکنڈہ کے ہوا خواہ بھی تیار تھے۔ ان کا منصوبہ تھا کہ شاہی فوجوں کو ادھر مصروف رکھ کر نرغے میں لے لیا جائے۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اگرچہ ہیبت جنگ متعدد بار شاہی فوجوں سے شکست کھا چکا تھا۔ مگر اس مرتبہ اسے اپنی اور اپنے حلیفوں کی طاقت پر بہت بھروسہ تھا۔

غازیگڑھ کا قلعہ ایک بلند پہاڑی پر واقع تھا۔ یہ بڑا محفوظ مقام تھا۔ جہاں دشمن کے لئے پہنچنا بہت دشوار بلکہ سراسر خطرناک تھا۔ ہیبت جنگ اپنی فوج لے کر قلعہ سے نکلا۔ اور نیچے اُتر کر پہاڑی کے دامن میں ندی کے کنارے ڈیرے ڈالدیئے۔ یہاں پہلے ہی نواحی علاقوں سے فوجیں آ آکر جمع ہو رہی تھیں۔ اور یوں ایک جرّی لشکر کوسوں میں پھیلا پڑا تھا۔ قدم قدم پر لشکری ہنگامے۔ بھیڑ بھاڑ۔ خیمے ڈیرے۔ رکھ رکھاؤ۔ ایک عجب قابل دید کیفیت تھی۔ لشکر کی اس ہنگامہ آرائی میں کسی نووارد کی آمد کوئی قابل توجہ واقعہ نہ تھا۔

یہ فضا، پہاڑ کا دامن، نہر کا کنارہ۔ پیچھے پہاڑیاں۔ سامنے میدان جا بجا سنگلاخ۔ ٹیلے۔ کہیں کہیں کھجور کے درخت اور اس منظر پہ دکن کی ڈھلتی ہوئی دوپہر کا وقت ایک ہیبت ناک اثر پیدا کر رہا تھا۔ جانباز سپاہی جوش شجاعت سے سرشار تھے۔ اور سرفروشی و زور آزمائی کے لئے بیقرار۔

ضیغم۔ خوب!

شہبانہ۔ لشکر کی یہ کیفیت تھی۔ تہور بیگ توپخانہ اور صیقل خانہ کا معائنہ کر کے ہیبت جنگ کے کیمپ کی طرف جا رہا تھا۔ جب نہر کے کنارے سڑک پر پہنچا۔ تو سامنے سے ایک نوجوان سوار دکھائی دیا۔ جس کی طرف سب کی نگاہیں اُٹھ رہی تھیں۔ یہ جوان شکل صورت کا نہایت حسین وجمیل اور ایک برق رفتار عربی گھوڑے پر سوار تھا۔ لباس ہتھیار اور سواری کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ نوجوانی اور رعنائی کے مطابق شمشیر زنی کے فن میں بھی بڑا مشاق ہوگا۔ پیچھے پیچھے ایک لڑکا گھوڑے پر آ رہا تھا۔ جس کے ایک پہلو پہ تلوار اور کمر میں پیش قبض اور دوسرے پہلو پر باگ ڈور تھی۔

تہور بیگ اس سوار کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ بلا ارادہ اپنا گھوڑا روک کر اُسے دیکھنے لگا۔ سوار نے برابر سے گزرتے ہوئے تہور بیگ پر ایک تبسم نگاہ ڈالی اور نکل گیا۔ تہور بیگ حیران تھا۔ مگر سوار کے اس انداز سے جرأت پا کر اُس کے پیچھے ہو لیا۔ اور برابر پہنچ کر مناسب انداز میں سلام کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ تہور بیگ کچھ دریافت کرے۔ نوجوان بولا۔ "آپ مرزا تہور بیگ ہیں۔ یہ اتفاقی ملاقات باعث مسرت ہے۔ میں نے آپ کے فن اسلحہ سازی کی بہت تعریف سُنی ہے۔ میرے لئے بڑی خوشی ہوگی اگر آپ کل شام بعد مغرب سرائے چشتیہ میں قیام گاہ پر تشریف لائیں۔ انکار نہ کیجئے گا۔ رہبری کے لئے معتبر آدمی پیغام لے کر حاضر ہوگا۔" نوجوان نے اتنا کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر تیر کی طرح آگے نکل گیا۔ تہور بیگ حیران تھا۔ اس بے تکلفانہ گفتگو کے بعد مخاطب کا تعاقب کرنا وضعداری کے خلاف تھا۔ اس لئے واپس چلا آیا۔

تہور بیگ نوجوان کے بانکپن پر غور کرنے نہ پایا تھا۔ کہ اس کی گفتگو رعب حسن، انداز دعوت اور سحر انگیز متانت سے اور بھی مسحور ہوا۔ وہ کیمپ کی بجائے اپنی قیام گاہ پر پہنچا۔ دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ تہور بیگ نقاش تھا۔ مصور تھا۔ نوجوان کی شکل کا نقشہ باندھتا تھا۔ اپنے حافظے کی گہرائیوں میں بار بار ٹٹولتا تھا۔ کہ آج سے پہلے ایسی صورت کہاں اور کس روپ میں دیکھی ہے۔ مگر ذہن ہر بار مایوس کر دیتا تھا۔ ناچار اس اُمید پر اس خیال کو چھوڑ بیٹھا کہ کل بعد مغرب دیکھا جائیگا۔ مگر دوسری صبح اور سارا دن بڑی بیقراری میں گذرا۔ لشکر میں گیا۔ اسلحہ جات کا معائنہ کیا۔ ہیبت خاں کے دربار میں پہنچا۔ وہاں بھی طبیعت اُچاٹ رہی۔ دن ڈھلے قیام گاہ پر آیا اور سرِ شام سے پیغامبر کی راہ دیکھنے لگا۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ پیغامبر کا انتظار تہور بیگ کو بیقرار کر رہا تھا۔ اتنے میں خیمہ کے باہر گھوڑے کی ہنہناہٹ اور سوار کے اترنے کی آہٹ سنائی دی۔ تہور بیگ نے اندر آنے کے لئے کہا۔ پردہ اُٹھا۔ اور وہی لڑکا داخل ہوا۔ جو نوجوان سوار کی اردلی میں تھا۔ اس کی عرق آلود پیشانی سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ بہت تیز رفتاری سے آیا ہے۔ ایک بازو گھائل تھا۔ زخم پر پٹی بندھی تھی۔ تازہ زخم تھا۔ خون بہہ رہا تھا۔ لڑکے نے فوجی سلام کیا۔ اور جراُتمندانہ انداز میں خطاب کرتے ہوئے بولا۔

لڑکا۔ "خاتون دکن" نے کل کی بر سرِ راہ ملاقات کے لئے معذرت کی ہے اور مجھے آپ کی خدمت میں عرض کرنے کے لئے یہ حکم ہوا ہے۔ کہ آپ بے خطر ہماری فرودگاہ پر تشریف لے چلیں۔

تہور بیگ۔ (نہایت تعجب سے) تو کیا وہ شہسوار کوئی خاتون ہیں؟ وہ کون ہیں؟

لڑکا۔ میں سرِدست اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ آپ اطمینان رکھیئے۔ یہ خادم آپ کو بحفاظت تمام لشکر میں پہنچا دیگا۔

تہور بیگ۔ بازو پر یہ لعل بدخشاں کہاں سے ہاتھ لگا۔

لڑکا۔ (بے پروائی سے) یونہی خراش سی ہے۔ پیغام لئے ادھر آ رہا تھا راستہ میں جنگل سے دو رہزن نکلے۔ ایک نے گھوڑا طلب کیا۔ اور دوسرے نے تلوار۔

تہور بیگ۔ پھر کیا ہوا؟

لڑکا۔ ہونا کیا تھا۔ گھوڑا باہر کھڑا ہے اور تلوار یہ موجود ہے۔

تہور بیگ۔ زندہ باش! مگر وہ نافرجام کدھر گئے۔

لڑکا۔ ایک زخم کھا کر جنگل کو بھاگ گیا۔ دوسرے کا لاشہ راستہ میں پڑا پائیے گا۔

تہور بیگ اور لڑکا خیمہ سے باہر نکلے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر سرائے چشتیہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ نصف سے زیادہ منزل طے ہو چکی تھی۔ چاند نکل آیا۔ جنگل کے قریب پہنچے۔ سڑک کے کنارے ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔

تہور بیگ۔ کیا یہی وہ بُزدل ہے۔

لڑکا۔ جی ہاں۔ یہیں حملہ ہوا تھا۔

تہور بیگ نے گھوڑے سے اُتر کر دیکھا کہ یہ ہیبت جنگ کے ایک سپاہی کا لاشہ ہے۔ وہ افسوسناک لہجہ میں بولا۔

تہور بیگ۔ سپہ دار اور سپاہی ایک ہی قماش کے درندے ہیں۔ اچھا ہے۔ اس مردود کی لاش چیل کوے کھائیں۔

لڑکا۔ نہیں جناب مسلمان سپاہی کا لاشہ ہے جس کا دفن کفن لازم ہے۔

دفن کر دیا جائیگا۔

تہور بیگ پہلے ہی برہم تھا۔ یہ سن کر تاؤ کھا گیا۔ مگر چپ رہا اور آگے چل پڑا۔ تھوڑی دور پر سرائے چشتیہ کے چراغ نظر آنے لگے اتنے میں منزل پر پہنچ گئے۔ نوکر موجود تھے۔ گھوڑے اُن کے سپرد کئے۔ اور یہ دونوں قیام گاہ میں داخل ہوئے۔ اب تہور بیگ کو آنے والے واقعات کا انتظار تھا۔ یہ مکان ایک سنگین اور مضبوط عمارت تھی۔ اونچا دروازہ۔ ڈیوڑھی۔ کشادہ صحن اور پھر ایک عالیشان دیوانخانہ تھا۔ جس کے دروازوں پر اندر باہر پردے پڑے تھے۔ لڑکا داخل ہوا۔ اور تہور بیگ کے متعلق اطلاع کر کے اسے اندر لے گیا۔ اور خود واپس چلا آیا۔ اس وسیع دیوان خانہ کے اندر کوئی خاص سامان آرائش نہ تھا۔ سادہ دیواریں سنگ مرمر کا فرش۔ اس پر ایک ترکمانی قالین۔ وسط میں ایک شمعدان جس میں شمعیں روشن تھیں۔ ایک طرف جانماز بچھی تھی۔ اور دوسری طرف سامنے ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ جس پر پردہ پڑا تھا۔ ایک کونے میں دیوار سے ایک فولادی زرہ آویزاں تھی اور اس کے پاس ہی چند تلواریں خنجر اور کٹاریں فرش پر بکھری پڑی تھیں۔ دیوان خانہ کے صدر میں جانماز کے برابر ایک خاتون بیٹھی تھی وہ مہمان کی آمد پر کھڑی ہوگئی۔ آداب وسلام کے بعد تہور بیگ کو بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ اور خود بھی اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تہور بیگ نے شکریہ ادا کیا۔ اور کمرہ کے پردہ کی طرف پشت کر کے بیٹھ گیا۔

اب تہور بیگ ایک عورت کے نہیں بلکہ ایک نوجوان حسین لڑکی کے روبرو تھا۔ یہ خاتون سفید لباس پر ململ گیری لبادہ پہنے اور سر پر سیاہ رومال اوڑھے ہوئے تھی۔ سنہری پٹی میں خنجر لگا رکھا تھا۔ مگر اس سادگی کے باوجود تہور بیگ اس کے جلال حسن کی تاب نہ لا سکا۔ وہ ایک پیکر نور کے روبرو تھا۔ جس کی تنویر سے تمام دیوان خانہ روشن ہو رہا تھا۔ ظاہری جمال کے علاوہ اس کے دل کی روشنی چہرے کو منور کئے ہوئے تھی۔ اس کی روح کی شعاعیں اس کی آنکھوں سے جلوہ ریز تھیں۔ اس کے باریک لبوں کی بندش اس کے عزم بے پایاں کا پتہ دے رہی تھی۔ اس کے متین انداز میں وقار تھا۔ جو اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ دیتا تھا۔ وہ یہی خاتون تھی جسے تہور بیگ نے کل مردانہ لباس میں گھوڑے پر سوار دیکھا تھا۔

خاتون - راستہ دور اور دشوار ہے اور پھر یہ وقت۔ آپ کو ناگوار تو ضرور گذرا ہوگا۔

تہور بیگ - ہرگز نہیں۔ یہ بہت بڑا فخر ہے۔ کہ یہ معمولی سپاہی "خاتون دکن" کی خدمت میں شرفِ باریابی حاصل کر رہا ہے (اس وقت باہر سے آکر اسی لڑکے نے کھانے کے متعلق دریافت کیا)

خاتون - آپ حیران تو ہونگے کہ آپ کو یہاں آنے کی کیوں تکلیف دی گئی ہے۔ میں عرض کرونگی۔ لیکن کھانا تیار ہے۔

تہور بیگ - بہت خوب۔ بسم اللہ

لڑکے نے دسترخوان بچھایا اور کھانا لا کر چُن دیا۔ باجرہ کی ٹکیاں مکی کا دلیا۔ ہرن کے کباب۔ اونٹ کے دُودھ کی کھیر۔ املی کی چٹنی۔ پانی کی صراحی۔ اور پانی پینے کے لئے مٹی کے دو پیالے تھے۔ خاتون اور تہور بیگ نے کھانا کھایا۔ اس اثنا میں لڑکا حاضر رہا۔ جب یہ دونوں کھانے سے فارغ ہوئے۔ تو لڑکے نے دسترخوان بڑھایا۔ اور چلا گیا۔ اس دوران میں اور باتوں کے سلسلہ میں جنگی تیاریوں کا بھی ذکر ہوتا رہا۔ توپ خانہ کے ذکر کے متعلق تہور بیگ کا انداز اور لہجہ ذرا فخریہ تھا۔ مگر خاتون بولی۔

خاتون - توپ کی ایجاد شخصی شجاعت کو فنا کر رہی ہے۔ اور یہ دُون ہمتی ہے کہ فوج اور شہری لوگوں کو مقابلہ کا موقعہ دیئے بغیر توپوں سے اُڑا دیا جائے۔ میں تو کہوں گی کہ تلوار ہی سے شخصی شجاعت کو قیام ہے۔ اور تلوار ہی قوموں کی بقا کا ذریعہ ہے۔ سنا ہے کہ آپ نے تو تلوار کی صنعت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ مگر اس بوالعجبی پر حیران ہوں کہ آلات سازی کے کمال فن سے دست بردار ہو کر آپ نے توپ خانہ کی افسری کو پسند کیا۔ افسوس دنیا کی ہوس ملک گیری شجاعت کو مٹا کر اہلِ کمال سے اپنی تباہی کے سامان بنوا رہی ہے۔

تہور بیگ - بجا ارشاد ہوا۔ مگر ملک گیری کی ہوس اپنے تباہ کار ہنگاموں کے نتائج سے بے اعتنا رہی ہے۔ ایجادات واختراعات سے اہلِ کمال کی غرض اس کے سوا کچھ نہیں۔ کہ قدرت کی غیر مفتوح طاقتوں کو بنی نوع انسان کی بہبودی اور خدمت کے لئے مسخر کیا جائے۔ اور اگر بندگان حرص وآز ان کے کمالات کو عالمِ انسانیت کی تباہی کے لئے استعمال کریں۔ تو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ قدرت کا منشا یہی ہے۔

دورانِ گفتگو میں تہور بیگ کی نظر زرہ اور تلواروں پر جا پڑی۔ نامدار صناع نے ان شجاعت افروز آلات کی تابش وطلعت میں خاتون کے ارشاد کی صداقت کو بے نقاب دیکھا۔ اور اب اسے یہ محسوس ہوا کہ توپ خانے کی افسری نے اسے کس سطحِ بلند سے نیچے پھینک دیا ہے۔

خاتون - میں آپ کو یہ تکلیف دینے کا مدعا عرض کرتی ہوں۔ اگر اس وقت

دکن میں کوئی ہماری مدد کر سکتا ہے۔ تو وہ آپ ہیں۔ آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ ہیبت جنگ اس علاقہ پر کیسے کیسے ظلم و ستم ڈھا رہا ہے۔ تمام ملک اس کے جور و جفا سے چیخ اُٹھا ہے۔

تہور بیگ۔ اچھی خاتون۔ قطع کلام کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ میں تو صناع ہوں۔ سپاہی ہوں۔ مجھے سلطان ہیبت جنگ کے اعمال و اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔

خاتون۔ مگر میں تو اپنے غریب ملک کی تباہی و بربادی سے چشم پوشی نہیں کر سکتی۔ میں کسی صورت میں مظلوم رعایا کو اس کافر کے پنجۂ استبداد میں نہیں چھوڑ سکتی۔

تہور بیگ۔ محترم خاتون۔ سلطان ہیبت جنگ میرے کمال فن کے قدر شناس ہیں اور میری ایجادات کے معاملہ میں بے دریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں۔

خاتون۔ تاکہ دکن اور رعایائے دکن تباہ ہو جائے۔ کیا آپ ایسے بہادر سپاہی کا فرض نہیں ہے۔ کہ ملک کی حفاظت کرے اور ظالموں کو سزا دے۔ کیا کوئی ترغیب آپ کو مظلوموں کی امداد پر آمادہ نہیں کر سکتی؟

تہور بیگ۔ محترم خاتون سردست میں آپ کی یہ خدمت کر سکتا ہوں کہ آپ کو ہیبت جنگ کی دسترس سے بحفاظت تمام باہر پہنچا دوں۔ کیونکہ اگر اُنہیں آپ کا اور آپ کے منصوبوں کا پتہ لگ گیا۔ تو کبھی آپ کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔

خاتون۔ مجھے جان کی پروا نہیں۔

تہور بیگ۔ تو محترم خاتون مجھے تو اس خطرناک دلچسپی سے معذور فرمائیں

خاتون۔ یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ پھر سن لیجئے۔ اور صاف "ہاں" یا "نہ" میں فیصلہ کن جواب دیجئے۔ میں پوچھتی ہوں کہ آپ کو کوئی ترغیب یا ترکیب ہماری مدد پر آمادہ کر سکتی ہے۔ یا نہیں؟

تہور بیگ۔ نہیں!

خاتون۔ تو پھر جو لوگ آپ کو بحفاظت لشکر میں پہنچا سکتے ہیں۔ وہ اس راز کو مخفی رکھنے کے لئے آپ کو خاموش بھی کر سکتے ہیں۔

تہور بیگ۔ (دفعتہً طیش میں آ کر) افسوس یہ بات میں اس محترم خاتون کی زبان سے سن رہا ہوں۔ جو میری میزبان ہے۔ اگر یہ دھمکی کوئی مرد دیتا تو۔۔۔

پُشت سے آواز۔ ایک مرد بھی یہی بات کہتا ہے۔

تہور بیگ تلملا کر کھڑا ہو گیا۔ مگر لوٹ کر کیا دیکھتا ہے۔ کہ وہی لڑکا ہاتھ میں تلوار لئے کھڑا ہے۔ اگرچہ اُس کے چہرہ پر کسی غیر معمولی جذبات کا اثر نہ تھا۔ لیکن اب اُس کے انداز میں ایک اور شان تھی۔ تاہم تہور بیگ نے جواب دیا۔

تہور بیگ۔ تم اور یہ جرأت۔ ایک سپاہی زادے کے مقابلے میں۔

لڑکا۔ بیشک! میں جعفر ابن قیصر اور حسب وعدہ محافظ بھی۔ لو دیکھو۔

یہ کہہ کر جعفر نے تہور بیگ کو ایک انگوٹھی دی۔ جسے تہور بیگ نے بغور دیکھا اور پہچان کر آنکھوں سے لگایا۔ قیصر مرزا کا نام سنتے ہی تہور بیگ کو اپنے شہید سپہ سالار کا زمانہ یاد آیا۔ پھر جعفر کے بچپن کی یاد تازہ ہو گئی۔ جسے اُس نے گودیوں میں کھلایا تھا۔ اور اب اس کے سامنے کھڑا مقابلہ کا جواب دے رہا تھا۔ تہور بیگ نے سپاہیانہ انداز میں کھڑے ہو کر جعفر کو تلوار پیش کی۔ اور بولا۔

تہور بیگ۔ بلند اقبال شہزادے۔ ایک ادنٰے جاں نثار کو کیوں آزمایا جا رہا ہے۔ اس کی لاعلمی لائق درگذر ہے۔ یہ تلوار اور یہ سر دونوں نذر ہیں مگر موجودہ حالات کا یہ اقتضا ہے کہ رات کی تاریکی میں اس خطرہ زار سے نکل جائیں۔ خانہ زاد آپ کا ایک کمترین فدائی ہے۔ مجھے جب سے اپنے سپہ دار کی شہادت کا علم ہوا ہے۔ انتقام لینے کے لئے اُس کے قاتل ہیبت جنگ کی ملازمت میں شامل ہو گیا ہوں۔ تردد نہ فرمایئے ہیبت جنگ کی جفاکاریوں کا کاسہ لبریز ہو چکا ہے۔ یہ خادم اجازت اور اعتماد کا متمنی ہے۔ مگر آپ کا یہاں رہنا مصلحت نہیں۔

جعفر۔ ہمیں آپ پر پورا بھروسہ ہے۔ مگر اس کا جواب "خاتون دکن" دینگی۔ (یہ کہا اور چلا گیا۔)

تہور بیگ۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس معصوم چہرہ میں اپنے شہید سلطان کا عکس دیکھ رہا ہوں۔ اگر میری زبان سے کوئی کلمہ خلافِ ادب نکل گیا ہو تو اُس کے لئے معذرت کا خواستگار ہوں۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ میں کس عالی تبار خاتون کی خدمت میں حاضر ہوں۔

خاتون۔ آپ فردوس قدر سے ہمکلام ہیں۔

تہور بیگ۔ کیا! میری آقا فردوس قدر (جھک کر زمیں بوس ہوتا ہے) جان نثار حاضر ہے۔ ارشاد عالی! مگر محترم شہزادی آپ کا مبارک نام اس سفاک قاتل کی محفل میں بار بار آیا ہے۔ اور ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر۔ اس لئے آپ کا یہاں قیام رکھنا دیدہ و دانستہ خطرے میں جان ڈالنا ہے۔ خدا نہ کرے۔ اگر اس غدار کے کانوں میں کسی طرح یہ بھنک پڑ گئی۔ جانے کیا حشر برپا کرے۔ میرے سارے منصوبوں پر پانی پھر جائے گا۔

فردوس قدر۔ مگر میں نے ہیبت جنگ کو اپنی آمد سے مطلع کرکے ملاقات کے لئے وقت بھی مقرر کر لیا ہے۔ اور اسی لئے آپ سے مدد چاہتی ہوں۔

یہ کہہ کر فردوس قدر کھڑی ہو گئی۔ اور تہور بیگ کو وہ زرہ دکھائی جو سامنے دیوار پر آویزاں تھی۔

تہور بیگ۔ (حیرت و تجسس سے) ارشاد عالی؟

فردوس قدر۔ اس زرہ کو کوئی تلوار کاٹ نہیں سکتی۔ یہ تمام تلواریں آزما دیکھی ہیں۔ ہیبت جنگ اسی قسم کی ایک زرہ ہر وقت پہنے رہتا ہے۔ یہ زرہ تو آپ کی تیار کی ہوئی ہے۔ اور غالباً ہیبت جنگ والی زرہ بھی آپ نے بنائی ہوگی۔

تہور بیگ۔ میں نے یہ زرہ سپہ دار شہید کے لئے تیار کی تھی۔ اور جس زرہ کا آپ ذکر فرماتی ہیں۔ اس کے متعلق مجھے خوب معلوم ہے۔ وہ بھی انہی کشتنی ہاتھوں کا کام ہے۔

فردوس قدر۔ لیکن کیا بات ہے کہ سب تلواریں بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔

تہور بیگ۔ عالی قدر شہزادی۔ اس ساخت کی زرہ کو چاک کرنے کے لئے تلوار کو خاص طور سے آب دے کر نہایت ہی باریک اور چوکور شکل نوک بنائی جاتی ہے۔ جو ایک وار میں صرف ایک کڑی میں گھر کرکے برابر کی کڑیوں کو چاک کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن میری آقا اس سنگدل پر حملہ کرنے کے لئے ایک غیر معمولی شجاعت کار سپاہی کی ضرورت ہے۔

فردوس قدر۔ ہاں معزز صناع سچ کہتے ہو۔ کیا سلطان قیصر مرزا کا کوئی جانشین اس کام کے لئے موزوں نہیں ہوگا۔ آپ صرف اس قسم کی تلوار تیار کر دیجئے۔ بس اس وقت آپ کی یہی امداد بہت بڑی مدد ہوگی۔

تہور بیگ۔ آخر سے کس گراں بار کو اٹھی ہے قیامت لے کر۔ کیا شہزادہ جعفر کو اس جان جوکھوں میں ڈالا جائے گا۔

فردوس قدر۔ نہیں۔ بلکہ یہ مہم فردوس قدر انجام دیگی۔

تہور بیگ۔ تہور کی موجودگی میں شہزادی کا یہ خطرناک عزم میری جاں نثاری پر ضرب ہے۔

فردوس قدر۔ نہیں تہور بیگ تم سے ابھی بہت کام لینے ہیں۔ یہ مہم تو قدرت میرے ہی کمزور ہاتھوں سے سر کرائیگی۔ ملاقات کی تاریخ قریب ہے فرصت مطلق نہیں۔ ملاقات کا وقت قریب ہو رہا ہے۔ بس تم تمام کام چھوڑ کر اس تلوار کی تیاری میں مصروف ہو جاؤ۔ جو سفاک اور غاصب کی زرہ کے ساتھ اس کے سینے میں پیوست چلی جائے۔ اب تک میں تم سے درخواست کر رہی تھی۔ کہ تم مجھ سے اور میرے حقوق کی عظمت و قدر سے بے خبر تھے۔ اب میں تمہیں حکم دیتی ہوں۔ کہ کل آفتاب غروب ہونے کے بعد مطلوبہ تلوار مجھ تک پہنچا دو۔ خدا نے کامیاب کیا۔ تو تم جانتے ہو۔ کہ میں اپنے خاندان کی روایات قدر شناسی کا احترام کرونگی۔

تہور بیگ۔ محترم شہزادی! آپ کے معصوم ہاتھ اس کے ناپاک خون سے آلودہ نہیں ہونے چاہئیں۔ میں خود اس بات کا بیڑا اٹھا چکا ہوں۔ کہ ہیبت جنگ سے سلطان شہید کے خون کا بدلہ لوں۔

فردوس قدر۔ نہیں! میں تمہارے جذبہ جاں نثاری کی قدر کرتی ہوں۔ مگر ہماری داستان درد کا بہترین خاتمہ یہ ہے۔ کہ میں اس موذی کا کام تمام کروں۔ تمہیں معلوم نہیں اس خونخوار درندے نے ہمارے اوپر کیا کیا ستم ڈھائے ہیں۔ سلطان قیصر مرزا کو قتل کیا۔ ہمیں یتیم اور ہماری ماں کو بیوہ کر دیا۔ پھر والدہ صاحبہ مرحومہ کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ جب ان کی طرف سے اس کا ذلیل پیغام ٹھکرا دیا گیا۔ تو اس خونریز نے انہیں زہر دلوا کر ختم کرا دیا۔ اسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ میرے لئے بھی پیغام بھیجتا رہا۔ اور اب جعفر مرزا کی جان کے درپے ہے۔ والدہ اس کی جفا کاریوں کا شکار ہو گئیں۔ اُن کا آخر وقت تھا۔ مگر ان کا انتقامی عزم بدستور تھا۔ اس وقت میں نے عہد کیا تھا۔ کہ میں انتقام لونگی۔ اور اگر میں پورا نہ کر سکی۔ تو جعفر اور اگر وہ بھی قاصر رہا۔ تو جو اللہ کو منظور۔ مزید برآں باپ کی رعایا کی بدحالی۔ ملک کی تباہی۔ یہ زندگی کس کام آئیگی۔ بس میں نے جو حکم دیا ہے۔ اُس کی تعمیل کرو۔

اس تقریر کا یہ اثر ہوا۔ کہ فردوس قدر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس کا نورانی چہرہ ارغوانی ہو گیا۔ مگر اس کے انداز میں متانت اور عزم میں استقلال تھا۔ تہور بیگ اس زلزلہ انگیز عزم کی تہ داد دے رہا تھا۔ مگر خاموش۔

تہور بیگ۔ شہزادی میں آپ کے عہد کا احترام کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس منتقم حقیقی نے آپ ہی کو اس کام کے لئے مامور کیا ہے۔ ورنہ میرے لئے ہزاروں موقعے میسر آئے مگر قدرت ہر بار اچانک طور پر مجھ میں اور ہیبت جنگ میں دیوار حائل بن بن گئی۔ آج میں اپنی بصیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ سعادت آپ کا کارنامۂ تقدیر بن چکی ہے۔ میں آج سے بہت پہلے اپنے طور پر یہ فیصلہ کر چکا ہوں۔ کہ یہ لشکر جو کرنول میں ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ گولکنڈہ کی کمک کے لئے جانے نہ پائے۔ اور انشاءاللہ نہیں جانے پائے گا۔ زندگی بخیر کل اسی وقت تلوار لے کر حاضر خدمت ہونگا۔ ہاں ایک عرض ہے۔ شہزادی کو کب اور کس تقریب سے دعوت دی گئی ہے۔

فردوس قدر نے قریب ہو کر تہور بیگ کو آہستہ سے اس سوال کا جواب دیا۔ اور خدا حافظ کہتے ہُوئے رخصت کیا۔

تہور بیگ آداب بجا لا کر رخصت ہوا۔ گھوڑے تیار تھے۔ جعفر بھی آ پہنچے۔ تہور بیگ نے رکاب پکڑ کر سوار کرانا چاہا۔ مگر جعفر نے منظور نہ کیا۔ اور خود ہی سوار ہو گئے۔ نصف شب گزر چکی تھی۔ یہ دونوں سوار سرپٹ جا رہے تھے۔ راستے میں کچھ آدمی ملے۔ جو حملہ آور سپاہی کی لاش دفن کر کے واپس آ رہے تھے۔ اتنے میں لشکر کی حد پر پہنچ گئے۔ جہاں تہور بیگ نے شکریہ ادا کر کے بڑے ادب و احترام سے شہزادے کو رخصت کیا۔ اور اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر تلوار کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

دوسرے روز حسب وعدہ تہور بیگ سرائے چشتیہ میں پہنچا۔ فرودگاہ پر حاضر ہوا۔ شہزادہ جعفر منتظر تھا۔ اطلاع کر کے تہور بیگ کو اندر لے جا کر فردوس قدر کی خدمت میں حاضر کیا۔ تہور بیگ آداب شاہی بجا لایا۔ اور اجازت پا کر بیٹھ گیا اور تلوار پیش کی۔ فردوس قدر نے تلوار کو بغور دیکھا۔ اور اسی زرہ پہ آزمایا۔ چنانچہ فردوس قدر کے ایک ہی ہاتھ سے تلوار کڑیاں کاٹتی ہُوئی زرہ کے پار نکل گئی۔ فردوس قدر نے تلوار کو بہت پسند کیا۔ اور شکریہ ادا کیا۔ البتہ جب دستے کے وزن اور اس پر خوبصورت سنہری کام کا ذکر کیا گیا۔ تو تہور بیگ نے اس کا مقصد یوں بیان کیا۔ کہ دستے کا وزن دست و بازو کی طاقت کے ساتھ شامل ہو کر زرہ کاٹنے میں معین ثابت ہوگا۔ اور اسی لئے سونا استعمال کر کے دستے کو اور بھی وزنی بنا دیا ہے۔ تاکہ کلائی کا ذرا سا اشارہ وزن سے کام لے سکے۔ پھر کچھ باتیں ہیبت جنگ کے ارادوں اور جنگی تیاریوں کے متعلق ہوئیں۔ اس کے بعد تہور بیگ رخصت ہوا اور لشکر میں تنہا واپس آ گیا۔

ہیبت جنگ بڑا محتاط اور دوربیں سپاہی تھا۔ اسے رعایا اور فوج کے متعلق تمام معلومات رہتی تھیں۔ ہر کام کا خود معائنہ کرتا تھا۔ اور اپنے احکام کی تعمیل کے معاملہ میں بڑا سخت گیر تھا۔ کوچ کا حکم دیا جا چکا تھا۔ جابجا فوجیں سفر کی تیاری میں مصروف تھیں۔ مگر روانگی سے پہلے آگ لگ جانے سے گولہ بارود کا تمام ذخیرہ اُڑ گیا۔ جس سے خیال ہوا۔ کہ شاید لشکر کی روانگی ملتوی کر دی جائے۔ مگر ہیبت جنگ ان باتوں کو خیال میں لانے والا نہ تھا۔ چنانچہ سابق ہدایات جاری رہیں۔ صرف تہور بیگ کو اتنا حکم دیا گیا۔ کہ توپ خانہ کے لئے تازہ سامان تیار کیا جائے۔ روانگی سے پہلے ہیبت جنگ نے فوج کا معائنہ کیا۔ اور پھر اپنے خیمے میں گیا۔ یہ وقت سفیروں اور وکیلوں سے ملاقات کے لئے مقرر تھا۔ ہیبت جنگ کی قیام گاہ اس کی شان کے شایاں تھی۔ اس وقت ہیبت جنگ تمام دکن پر چھا رہا تھا۔ والیانِ دکن کو آگے رکھ اور مرہٹوں کو پیچھے لگا مرکزی حکومت کو اُس کے مرکز ثقل ملا دینے کے ارادے رکھتا تھا۔ شاہی خیمے کے باہر بڑا انتظام تھا۔ قدم قدم پر پہریدار برہنہ تلواریں لئے دم بخود کھڑے تھے۔ خیمے کے اندر شاہانہ ٹھاٹھ تھا۔ ایک مرصّع تخت پر ایک زرکار کرسی تھی۔ دائیں بائیں مشیرانِ کار کے لئے چوکیاں تھیں، ہیبت جنگ خیمے میں اراکینِ حکومت کے ساتھ داخل ہوا۔ اور شاہی مسند پر بیٹھ گیا۔ اراکین حفظِ مراتب کے مطابق کھڑے تھے۔ پہلے ہمسایہ ریاستوں کے سفیر آتے جاتے رہے۔ پھر چند وکیل پیش ہوئے۔ اور ہدایات لے کر رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد قیصر مرزا کے یتیم بچوں کے وکیل منصور نامی کی اطلاع ہوئی اور اُسے طلب کیا گیا۔

منصور پیش ہوا۔ اُس نے معمولی آداب کیا اور اس مقام پر ٹھہر گیا جو وکیلوں کے لئے مقرر تھا۔ اراکینِ حکومت نے منصور کے اس اندازِ تسلیم کو شاہی آداب کے خلاف سمجھا۔ اُن کی نظریں اُٹھیں۔ لیکن منصور کے چہرے پر پہنچ کر جم گئیں۔ منصور ایک حسین و جمیل جوان تھا۔ اُنیس بیس کا سن۔ سادہ فوجی لباس۔ کمر میں تلوار۔ خود سے رخساروں کے برابر سیاہ کاکل نکل رہے تھے۔ قدرے پریشان تو تھے۔ مگر قابل توجہ نہ تھے پُر جلال چہرہ۔ سیاہ آنکھیں۔ لیکن نگاہیں؛ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ کن گہرائیوں سے آ رہی ہیں۔ چال سپاہیانہ اور انداز میں متانت اور وقار تھا۔

ہیبت جنگ نے منصور کو دیکھا۔ اس کے بے پروایانہ انداز کو ملاحظہ کیا اور مسکرا دیا۔ پھر اس کے سراپا کو نگاہ تجسس سے دیکھا اور مخاطب ہوا۔

ہیبت جنگ۔ فردوس قدر نے آپ کو اپنا وکیل مقرر کر کے بھیجا ہے۔ اُنہوں نے مراسلہ میں یہ بھی رقم کیا ہے۔ کہ وہ دونوں بہن بھائی منصور یعنی آپ کے ہر قول۔ فعل۔ عمل اور عہد و پیمان کے پابند ہونگے۔

منصور۔ مختار نامہ کا یہی مقصد و مطلب ہے۔

ہیبت جنگ۔ وہ خود یہاں کیوں نہیں چلی آتیں۔

منصور۔ شہزادی فردوس قدر یہاں کیسے چلی آئیں۔ جبکہ سپہ دار یعنی آپ سے کوئی شرائط طے نہیں ہُوئیں۔

ہیبت جنگ۔ ہم انہیں اپنے دل میں جگہ دے چکے ہیں۔ کیا اُنہیں ہمارے سلطان خود مختار ہونے کی مزید تصدیق درکار ہے۔ کیا یہ زیبا ہے۔ کہ سلطان وقت سے سرتابی کی جائے۔ اُن کی والدہ بھی اسی ہٹ پر اڑی رہیں۔

منصور۔ بہتر ہے اگر اس وقت ملکہ مرحومہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ موجودہ معاملہ شہزادی اور اُن کے بھائی کا ہے۔

ہیبت جنگ - تو کیا ان تیموں کی مدد سے دریغ کیا گیا ہے - اگر قیصر مرزا کی اولاد جانشین نہ ہوئی - تو اُن کی آل تو حکومت کرے گی - اگر پوتے نہ ہوئے تو نواسے تو اس تخت کے وارث ہونگے -

منصور - افسوس واقعات سپہ دار کے بیان کی تصدیق نہیں کرتے - مجھے یہ کہنے کی اجازت ہے کہ شہزادی آپ کو ایک غدار اور قاتل سے کم سلوک کا مستحق نہیں سمجھتی ہیں - اور آپ کے پیغام نکاح کو وہ اپنی خاندانی عظمت کے حق میں ایک ناقابل برداشت گستاخی تصور کرتی ہے -

منصور کے اس فقرے پر درباریوں نے تلواریں کھینچ لیں - مگر ہیبت جنگ نے اُنہیں روک دیا - اور کہا -

ہیبت جنگ - اوبے ادب - یہ گستاخی ہماری شان میں - تم وکیل ہو - اس لئے رعایت ہے - ورنہ

منصور - (استقلال سے) میرا قول شہزادی فردوس قدر کی زبان ہے وہ اس مجمع کو نابکار رہزناں اور آپ کو اُن کا سرغنہ سمجھتی ہے - اور جب تک اُس کے دم میں دم ہے - اپنے ماں باپ کے قتل اور اپنے رفیقوں کے خوں کا بدلہ لئے بغیر صبر نہ کرے گی -

درباری - عالیجاہ - جاں نثاروں کو اجازت دیجئے - کہ اس دریدہ دہن کی زبان کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے -

منصور - سفاک ڈاکو کے نابکار ساتھیو! خبردار! میری تلوار سلطان قیصر مرزا کی مقدس امانت ہے - تمہاری گردنوں کو سرفراز نہیں کر سکتی - (تلوار نیام سے نکال کر) یہ تلوار سلطان قیصر مرزا اور اُس کی شہید ملکہ کے خونِ ناحق کا انتقام لینے کے لئے قدرت نے میرے سپرد کی ہے - یہ

تمہارے بے مغز سروں کے لئے نہیں ہے - لو دیکھو! یہ درخشاں موت تمہارے اس کفر کیش آقا اور بدگو ہر جتھہ دار کے سیاہ باطن سینہ کو منور کیا چاہتی ہے -

حیرت زدہ درباریوں نے منصور کے منہ سے ایک جلال ریز نعرہ اللہ اکبر سنا - اور اُن کی غیرت پاش آنکھوں نے دیکھا - کہ ایک بے آواز بجلی کوند کر ہیبت جنگ کے سینے پر گری - اور وہیں ساکن ہو گئی - پینترا بدلتے ہوئے منصور کے سر سے خود گرا اور اُس کے سیاہ کاکل پریشان گیسوؤں میں تبدیل ہو گئے - زخمی ہیبت جنگ لڑکھڑا کر یہ کہتے ہوئے گرا -

ہیبت جنگ - آہ کیا ایک عورت!

منصور - نہیں سیاہ کار! عورت نہیں! شہزادی فردوس قدر!

غضب ناک درباری تلواریں سونت کر آگے بڑھنے کو ہی تھے - کہ عقب سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا - اور آواز آئی - "خبردار غدارو" اس آواز پر سب کی نگاہیں اُس کی جانب پلٹ گئیں - دیکھتے کیا ہیں کہ جعفر اور اُس کے ساتھ جانبازوں کا ایک دستہ تہور بیگ کی سرکردگی میں آ پہنچا ہے -

تہور بیگ - جان کی خیر چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال دو - آج اس جہنم رسیدہ لاش پر سلطان جعفر مرزا کے ایوانِ حکومت کی بنیاد رکھی جاتی ہے (مسلسل اور متحد نعرہ) "سلطان جعفر مرزا زندہ باد"

فردوس قدر - اے خدائے برتر و برحق! قیصر مرزا کے بیکس تیمیم اپنی فریادرسی کے لئے تیرا شکریہ بجا لاتے ہیں -

عباداللہ

غزل

الگ پہلے نگاہوں سے حجاب رنگ و بُو کرتے
نیازِ عشق کامل کو سراپا آرزو کرتے

جنونِ عشق میں پیدا کچھ اتنی آبرو کرتے
مآل اندیشیاں ہی عشق کا اک راز تھیں ورنہ

عجب دلکش مناظر ہیں سکونِ بزم فطرت کے
علاجِ دردِ فرقت کیا یہی کرنے کو آئے ہیں!

پھر اس کے بعد اس گلشن میں تیری جستجو کرتے
اسی سجدے میں رو رو کر ادا فرضِ وضُو کرتے

بیابانوں کے کانٹے جیب و دامن میں رفُو کرتے
ابھی اہلِ طلب کچھ اور فکر و جستجو کرتے

یہیں سے تیری اے جانِ تمنا جستجو کرتے
جنہیں شرم آتی ہے بالیں پہ میری گفتگو کرتے

ہم آہنگ نوائے سازِ وحدت کاش دل ہوتا!
کہ شاطر رشک پھر مجھ پہ بھی اہلِ آرزو کرتے

محمد صدیق شاطر سیالکوٹی

فقیر شہزادہ

سن اٹھائیس کے کچھ دن جو دلّی میں مجھے گزرے — تو خونِ دل سے تر رہنے لگے آنکھوں کے پیمانے
وہ دلّی ہے نشانی جو کہ عہدِ شاہجہانی کی — گھٹائیں جس پہ برسیں حادثاتِ ناگہانی کی
جہاں کے ذرّے ذرّے کو زمانے پر فضیلت تھی — اِسی دلّی میں دیکھیں بارشیں ادبار و ظلمت کی
اسی دلّی کے گلزاروں کو پامالِ خزاں دیکھا — رہینِ منتِ صیّاد ہر اک آشیاں دیکھا
مسلماں حکمرانوں کی ادائے دلستاں دیکھی — مغل گلزار کی ہر اِک کلی وقفِ خزاں دیکھی

متاعِ تاجداری صرفِ خوابِ استراحت تھی
مقابر تھے شہنشاہوں کے یا تصویرِ عبرت تھی

گزر اِک روز دریا گنج سے شب کو ہوا میرا — دماغ و دل میں طوفانِ تخیّل کارفرما تھا
چلا جاتا تھا میں بہتا ہوا انوارِ فطرت میں — مرا دل محو تھا رنگینیٔ اسرارِ قدرت میں
سُنا ناگاہ کہتا ہے کوئی اللہ کا بندہ — "دعا دیتا جو دو باتیں کوئی میری بھی سُن لیتا"
ضعیف و ناتواں آواز نے دہلا دیا دل کو — میں اُلٹے پاؤں پلٹا دیکھنے اس نیم بسمل کو
بساطِ خاک پر اِک کشتۂ ظلم و ستم دیکھا — کہ ڈھانچا ہڈیوں کا صیدِ افکار و الم دیکھا
کتابِ زندگانی دے رہی تھی درسِ عبرت کا — مفسر تھا ہر اِک جز اس کے افلاس و مصیبت کا

پڑی تھیں جھریاں چہرے پہ اور آنکھوں میں تھے حلقے
عروسِ موت کے آغوش میں جانے کے ساماں تھے

عرق ماتھے پہ لیکر موت کا پیغام آیا تھا
نویدِ زیست لیکر نزع کا ہنگام آیا تھا

کلی افسردہ دل کی بےکسی میں کھلنے والی تھی
فراغت زندگی کی کشمکش سے ملنے والی تھی

پڑا تھا بیکس و مجبور ٹوٹی سی چٹائی پر
وہ ڈھانچا ہڈیوں کا بار تھا جو کل خدائی پر

نگاہِ حسرت آگیں پہلے اس نے مجھ پہ اک ڈالی
ہلے پھر اس کے لب کمزور سی آواز یہ نکلی

ذرا بیٹھو یہاں اور سرگزشتِ زندگی سن لو
کہ میرے ساتھ کی دنیا نے کیونکر بے رخی سن لو

اٹھا جب سے کہ میرے سر سے سایہ باپ دادا کا
خوشی کا ایک دن بھی آج تک میں نے نہیں دیکھا

مری دنیا حوادث اور طوفانوں کی دنیا تھی
ازل سے برق میرے خرمنِ ہستی پہ شیدا تھی

نہ کوئی مونس و ہمدم نہ بیوی ہے نہ بچے ہیں
اجل کی گود میں وہ فاقہ کش مدت سے سوتے ہیں

وہ فاقے کرتے کرتے مر گئے اب میں بھی جاتا ہوں
مگر میں کون ہوں لو آج یہ تم کو بتاتا ہوں

چچا تھا میرے والد کا ظفر میں خانہ ویراں ہوں
وہ تھا آفت رسیدہ حکمراں میں فاقہ ساماں ہوں

سناتا اور کچھ لیکن زباں یارا نہیں دیتی
اجل آئی ہے مجھ سے چھیننے کو فرصتِ ہستی

یہ کہہ کر شاہزادہ ہو گیا رخصت زمانے سے
سبق عبرت کا لیکن دے گیا اپنے فسانے سے

طالب فارسی

مشاہیرِ عالم

آسکر وائلڈ

آسکر فنگل افلا ہارٹی ویلز وائلڈ ۱۸۵۴ء میں بمقام ڈبلن پیدا ہوا۔ اس کے والد مشہور و معروف ڈاکٹر تھے۔ جب اسے اسکول میں داخل کرایا گیا۔ تو اس نے اپنے نام سے لفظ فنگل حذف کر دیا۔ اور بڑے ہو کر صرف آسکر وائلڈ پر اکتفا کیا۔

بچپن میں آسکر کے متعلق عوام کا خیال تھا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کی طرح خوبصورت اور ذہین نہیں ہے۔ دونوں بھائیوں کو اعلےٰ درجہ کی تعلیم دی گئی اور دونوں کو "شاہی پورٹر اسکول" میں بطور بورڈر داخل کرایا گیا۔ داخلے کے وقت آسکر نو سال کا تھا۔ ان دنوں میں اس کے والد سر ولیم وائلڈ پر ایک عورت مس ٹریور نے ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے تمام ڈبلن سوسائٹی میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ مس ٹریور ایک مشہور و معروف پروفیسر آف میڈیکل جیورسپروڈنس کی دختر تھیں۔ اگرچہ واقعات مقدمہ آسکر کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تاہم اس کا ضمناً ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مس ٹریور کا بیان تھا کہ ڈاکٹر مذکور نے جب وہ اس کے زیر علاج تھی۔ کلورا فارم سنگھا کر اس کی عصمت دری کی اور اس واقعہ کی تشہیر کر کے اسے بدنام کیا۔ جانبین کی طرف سے مشہور وکلا پیش ہوئے۔ عرصہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مسٹر ولیم وائلڈ کو دو ہزار پونڈ بطور جرمانہ ادا کرنے پڑے۔

آسکر کی والدہ نہایت ذکی عورت اعلیٰ درجہ کی ادیب اور بلند پایہ شاعرہ تھیں۔ ان کا تخلص سپینذرا تھا۔ ان کو اپنے شوہر پر اسقدر اعتماد تھا کہ مقدمہ کے فیصلہ کے بعد بھی وہ اسے بیگناہ اور سازش کا شکار سمجھتی رہیں۔ اسکول میں آسکر نے اپنے مطالعہ کو سات سال تک جاری رکھا۔ جب اس کا سن سترہ سال کا ہوا تو وہ شاہی وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ جو مقابلے کے امتحان سے دیا جاتا ہے۔ ڈبلن میں اس کو ٹرنٹی کالج میں داخل کرایا گیا۔

آسکر کے ایک ہم جماعت نے اس کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ جو نیشن میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اس نے تحریر کیا ہے:-

"آسکر کی عمر تیرہ یا چودہ سال کی ہوگی۔ جب مجھے اس کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ میں تقریباً اس کا ہمعصر تھا۔ وہ اسکول کے کھیلوں میں قطعاً دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ کشتی چلانے سے اسے خاص نفرت تھی۔ طلبا خیال کرتے تھے کہ وہ ایک دلچسپ گفتگو کرنے والا لڑکا ہے۔ اسکول کے لڑکوں میں وہ جب قصے کہانیاں سناتا تو سب ہنسی کے مارے لوٹ جاتے۔ اس عمر میں بھی افسانہ بیان کرنے میں وہ خاص مہارت رکھتا تھا۔ وہ طبعاً خوش پوش اور فیاض تھا۔ ظرافت اس کی طبیعت میں بھری ہوئی تھی۔ ایک دفعہ ہم لڑکوں پر سوار ہو کر گھوڑ دوڑ کھیل رہے تھے۔ کہ میرے گھوڑے نے اس کے گھوڑے کے ٹکر ماری جس سے آسکر گر گیا اور اس کا بازو ٹوٹ گیا۔ اگرچہ میں نے شرارتاً اس کو گرایا تھا۔ مگر اس وجہ سے اس کی طبیعت میں ذرا بھی ملال نہ آیا۔ بلکہ تمام عمر اس واقعہ کو ہنسی ہنسی میں بیان کرتے رہے۔

ریاضی اور سائنس سے اسے دور کا لگاؤ بھی نہیں تھا۔ وہ اکثر سائنس اور ریاضی کے استادوں کی ہنسی اڑایا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں ڈکنس اعلےٰ پایہ کا افسانہ نویس نہیں تھا۔ اس نے اوائل عمر ہی میں یونانی زبان میں کافی استعداد پیدا کر لی تھی۔ تھیوجینڈ ایڈ۔ پلیٹو اور ورجل اس کو زبانی یاد تھے۔ سر ایڈورڈ سلیوان جو اس کے ہم جماعت تھے بیان کرتے ہیں "وہ اسکول کے تمام لڑکوں کے عجیب عجیب نام مشہور کر دیا کرتا تھا۔ بیسیوں شعراء کے دیوان اس نے حفظ کر رکھے تھے۔ علم انشاء اور علم ادب میں اس نے اتنی قابلیت پیدا کر لی تھی کہ تمام عالم و فاضل اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔

۱۹ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو وہ ٹرنٹی کالج ڈبلن میں داخل ہوا۔ اس نے کالج میں نمایاں ترقی حاصل کی۔ اور اعلےٰ پایہ کا انشاء پرداز تصور ہونے لگا۔ کالج میں کوئی انعام یا وظیفہ ایسا نہ تھا جو مقابلہ میں اس نے حاصل

نہ کیا۔ وہ دن رات مطالعہ میں مصروف رہتا۔ اعلیٰ درجہ کے انگریزی مصنفوں کا کلام زبانی یاد کرنے میں خاص دلچسپی لیتا۔ خصوصاً سوابرن اور جان ایڈنگٹن کی تصنیفات سے اسے گہری دلچسپی تھی۔

مذہبی اور پولٹیکل معاملات سے وہ ہمیشہ کنارہ کشی کرتا تھا۔ اس کا شغل دن رات پڑھنے لکھنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس کی علمی قابلیت کی وجہ سے ڈبلن میں ہر شخص کی خواہش تھی کہ ان کے بچوں کی دوستی اس نوجوان سے ہو جائے۔ آسکر نے برکلے میڈل کے لئے یونانی زبان میں ایک مضمون لکھ کر پڑھا۔ اور اوّل درجے کا انعام حاصل کیا۔ ڈبلن سے فارغ التحصیل ہوکر ۱۱۔ جولائی ۱۸۷۴ء کو اس نے آکسفورڈ کے داخلے کا امتحان دیا اور اوّل رہا۔ اس کی کامیابی خاص طور پر آکسفورڈ گزٹ میں شائع کی گئی۔ جب اس کا سن بیس سال سے متجاوز ہوا وہ ماڈرن کالج میں داخل ہو گیا جس طرح اس نے اسکول کی نسبت ڈبلن کالج میں زیادہ علمیت اور شہرت حاصل کی تھی اسی طرح اس نے آکسفورڈ میں بہ نسبت ڈبلن کالج کے امتیازی خصوصیت پائی۔ ۱۸۷۶ء میں اس نے ماڈریشن میں اعلیٰ درجہ کا انعام حاصل کیا۔ آکسفورڈ میں اس کی شہرت کا آفتاب پوری آب و تاب سے چمک اٹھا۔ اس کا اپنا بیان ہے:۔

"مجھے آکسفورڈ میں داخل ہونے سے وہ مسرت حاصل ہوئی جو کبھی نہ ہوئی تھی۔ آکسفورڈ کے ٹینس لان ایسے ہیں گویا مخمل کا فرش بچھا ہے۔ تماشائی بیخود ہو جاتے ہیں۔ آہ آکسفورڈ جادو بھری فضا اور سنہری روپہلی وادی۔ نہ رعب کا اثر نہ روپے کا لالچ۔ دن رات پڑھنے اور لکھنے کے سوا کسی کو اور مصروفیت نہیں۔"

فرینک ہیرس نے ایک دفعہ اس سے دریافت کیا۔

آسکر کیا تم نے آکسفورڈ میں مہافی سے بڑھ کر کوئی استاد دیکھا؟ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا "ہاں وہاں ایسے استاد ہیں جن کو دنیا کا استاد کہنا بجا ہے۔ مثلاً وہاں رسکن تھے۔ جن کے پایہ کا مصنف دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میں رسکن کو انگلستان کا افلاطون تصور کرتا ہوں۔ وہ سچائی کا پیغمبر تھا۔ پھر وہاں پیٹر تھے۔ وہ ایسے عالم تھے کہ ان سے بڑھ کر کوئی نثر لکھنے والا پیدا نہیں ہوا۔ وہ مجھ پر بڑے بھائی کی طرح شفقت رکھتے تھے۔ جب وہ بات کرتے تھے۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عندلیب باغ میں چہک رہا ہے۔"

ابھی آسکر وائلڈ نے آکسفورڈ سے ڈگری حاصل نہ کی تھی کہ اس کے والد سات ہزار پونڈ کی جائداد اپنی رفیقۂ حیات کے نام چھوڑ کر ۱۸۷۶ء میں دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اس آمدنی سے وہ غریبانہ زندگی بسر کر سکتی تھی۔ اس کی والدہ نے کچھ رقم اسے آکسفورڈ بھیجی تاکہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔ اس وقت اس کو روپیہ کی اشد ضرورت تھی۔

۱۸۷۷ء میں آسکر پروفیسر مہافی کے ساتھ عازم یونان ہوا۔ اس کو یونان اسقدر پسند آیا کہ تعطیلات ختم ہونے پر بھی آکسفورڈ نہ پہنچا۔ کالج کے پروفیسروں نے غیر حاضری پر اس کو پچاس پونڈ جرمانہ کیا۔ مگر جب اس نے گریٹ اور نیوڈیکٹ کے انعامات اول درجہ پر حاصل کئے۔ تو جرمانہ کی رقم واپس دیکر اس کا جرمانہ معاف کیا گیا۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میں یونان کے سفر کے بعد یونانی ٹمپل کو ماردتی لیورا پر اور سپین کو علی الترتیب ان دونوں پر ترجیح دیتا ہوں۔

دورانِ قیام آکسفورڈ وہ موسم گرما کی تعطیلات اکثر ڈبلن میں بسر کرتا تھا اور زیادہ وقت اپنے پرانے ساتھی ایڈورڈ سلوان کے ہاں گزارتا تھا۔ ایڈورڈ سلوان بیان کرتا ہے:۔

"جب وہ مجھ سے ملتا تو بسا اوقات ایکٹروں اور ڈراموں کا ذکر کرتا رہتا۔ اوائل عمر ہی سے اس کی طبیعت ڈراموں اور ایکٹروں سے مانوس تھی۔ وہ ایلن ٹیری کی تعریف میں بیحد رطب اللسان تھا لیکن بعد میں مسٹر لنگاری اور میری اینڈرسن کو بھی بنظرِ استحسان دیکھنے لگا۔"

آغاز میں اس نے "ایکسونی سینٹ" اپنی ہمشیرہ کی یادگار میں لکھی جو بچپن میں انتقال کر گئی تھی۔ اس نظم میں آسکر نے ہمشیرہ کو اس روشنی سے تشبیہ دی ہے۔ جو گھر کو منور کر دیتی ہے۔ اس وقت اس کے بھائی وائلڈ لنڈن میں ایک روزنامہ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہو چکے تھے۔ انہوں نے آسکر کو مشہور کرنے کی بیحد کوشش کی۔ وہ آسکر کی نظم و نثر پر تنقیدی مضامین لکھتے اور مقالہ افتتاحیہ میں بڑے زور و شور سے اس کا ذکر کرتے۔ ٹرنٹی کالج میگزین میں آسکر کی چند نظمیں "کتابا" کے عنوان سے شائع ہوئیں اور عوام الناس پر ان کا خاص اثر ہوا۔ ۱۸۷۸ء کے اختتام پر آسکر نے آکسفورڈ سے اوّل درجہ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کا خیال تھا کہ جس طرح اسے آکسفورڈ میں کامیابی ہوئی ہے۔ اسی طرح لنڈن میں کامیاب ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ اس کو یقین تھا کہ وہ ہر جگہ کامیابی حاصل کرے گا۔ مگر اس کو یہ مقولہ

یاد نہیں تھا کہ وہ طلبا جن کو یونیورسٹیوں میں نمایاں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ عملی زندگی میں اکثر ناکام رہتے ہیں"۔

آسکر زندگی کی فریب کاریوں سے بالکل ناآشنا تھا۔ وہ دارالعلوم کے اس خوشنما پھول کی مانند تھا۔ جو آرام طلب طلبا سونگھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ آکسفورڈ سے تن آسانی سیکھ آیا تھا۔ خود پسندی کو اس کی طبیعت میں بہت دخل تھا۔ وہ خواہشات نفسانی کی روک تھام کرنا نہیں جانتا تھا۔ لذتِ شہوانی کا مرید ہونا اس کی فطرت ثانی ہو چکی تھی۔ وہ ہر وقت اس گڑھے میں کودنے کے لئے تیار رہتا۔ جہاں اسے فضول لذت کا موقعہ ملتا۔ ان حالات کے ماتحت زندگی کی کشمکش اور تگ ودو میں ترقی اور کامیابی کا کیا موقعہ مل سکتا تھا۔

آکسفورڈ سے فارغ التحصیل ہو کر آسکر لنڈن میں مقیم ہو گیا۔ جہاں کہیں وہ جاتا مسز لنگارٹی کی خوبصورتی کی تعریف کرتا اور کہتا کہ وہ تو وینس دیوی سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ لیڈی آرچی کے اخلاق کے متعلق تعریفوں کے پل باندھ دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام شہر میں مشہور ہو گیا۔ سوسائٹی کے ہر فرد ولبشر کے مکان کا دروازہ اس کے استقبال کے لئے ہر وقت کھلا رہتا۔ اس کا تعارف نہ صرف ایکٹر اور ایکٹرسوں سے ہو گیا۔ بلکہ اس کو اس بات کا فخر تھا کہ لارڈ لٹن۔ لیڈی شروبری۔ لیڈی ڈارتھی۔ نیوبل۔ لیڈی ڈیگرے۔ مسز جیومین۔ ہارڈی۔ میریڈیتھ۔ براؤننگ۔ سوائمبرن۔ اور میتھیو آرنلڈ اس کے ذاتی دوستوں میں سے ہیں۔ مے فیر میں جن لوگوں کو اہل دماغ اور اہل قلم سے ذرا بھی رغبت تھی وہ اسے خوب جانتے تھے۔ وہ ان سب لوگوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ مگر اس ہر دلعزیزی کی وجہ سے آسکر کی مالی حالت میں اضافہ نہ ہوا۔ بلکہ اس کو احباب کی خاطر ومدارت کے مصارف برداشت کرنے پڑتے اور وہ بہت زیر بار ہو گیا۔ وہ باتوں کا دھنی بھلا کام میں کیسے دل لگاتا۔ تھوڑی بہت آبائی جائداد جو اسے ترکہ میں ملی تھی اس کو بھی گرو رکھنا پڑا۔

اس میں کلام نہیں کہ لنڈن میں مارس اور وسلر کی صحبت سے اسے وہ فائدہ حاصل ہوا جس کا بیان تحریر سے باہر ہے۔ پہلے وہ اس پھول کی مانند تھا جو ابھی کتم عدم میں ہو۔ مگر ان دونو کی صحبت نے شبنم کا کام کیا اور غنچہ ناشگفتہ کو ہمیشہ کے لئے وا کر دیا۔

آسکر نے اپنی نظموں کا مجموعہ لنڈن میں شائع کیا۔ اکثر نظمیں ایلن بری کی شان وشوکت کی ترجمان ہیں۔ وہ ایک صاحب ثروت اور ذی اقتدار خاتون تھی۔ اس لئے وہ مصنف اور تصنیف کی ہر جگہ تعریف کرتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ بہت جلد مشہور ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض نظمیں نہایت اعلیٰ پایہ کی ہیں۔ اتھینیم نے بعض نظموں کو اس مجموعے سے نقل کر کے جو عزت اس کو اور اس کے مصنف کو بخشی اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اتھینیم کی پوزیشن سے واقف ہیں۔ اتھینیم نے ان پر تنقیدی مضمون لکھا۔ اگرچہ وہ بظاہر کچھ سخت ہے۔ مگر یہ کہنا انصاف سے بعید نہیں ہوگا۔ کہ زیادہ سختی سے کام نہیں لیا گیا۔

آسکر نے امریکہ میں لیکچروں کا ایک سلسلہ قائم کرنے کا فیصلہ اور اس ارادہ کی تکمیل کیلئے امریکہ کا راستہ لیا۔ جب منزل مقصود پر پہنچا تو محرر محصول نے محصول والی اشیا کی بابت دریافت کیا۔ تو اس نے نہایت بے تکلفی سے جواب دیا کہ میرے پاس سوائے دماغ کے کوئی چیز قابل محصول نہیں۔

نیو یارک میں اس کے لیکچروں کا عنوان "انگریزی تہذیب کا آغاز اور گھروں کی آرائش" تھا۔ ۹۔۱۰ جنوری ۱۸۸۲ء کو اس کے ہر دو لیکچر چکرنگ ہال میں ہوئے۔ اس میں اسے یہاں تک کامیابی ہوئی کہ میجر پال نے اس کی خدمات دیہات میں لیکچر دینے کے لئے حاصل کیں۔ مگر آسکر ناکام رہا اور اپنا پروگرام پورا نہ کر سکا۔ اسے بصد حسرت ویاس امریکہ کو الوداع کہنا پڑا۔ چنانچہ اپریل ۱۸۸۳ء میں وہ واپس لنڈن پہنچ گیا۔ اپنے ڈرامہ "ویرا" کی کامیابی دیکھنے کے لئے آسکر ستمبر ۱۸۸۳ء کو پھر نیو یارک پہنچا۔ ڈرامہ میری پر سکاٹ نے یونین تھیٹر میں دکھایا تھا۔ ڈرامہ کو پوری کامیابی نہ ہوئی۔ یہ ناکامی کوئی تعجب انگیز نہ تھی۔ کیونکہ ڈرامہ میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ جسے عام قابلیت کا انسان نہ لکھ سکتا ہو۔ ستمبر ۱۸۸۳ء کو آسکر نے پھر سے لنڈن مراجعت کی۔ اس دفعہ اس نے لنڈن میں لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے کی نسبت اس میں زیادہ کامیابی ہوئی۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکا۔ ہم اس کی بابت یہ ضرور کہیں گے کہ جب اس کی جیب میں دو تین سو پونڈ ہو جاتے تو وہ دنیا ومافیہا سے اس طرح بے نیاز

ہو جاتا - گویا کہ اسے قارون کا خزانہ مل گیا -

جب آسکر کو لندن میں بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آئی - تو مایوس ہو کر پیرس کی جانب رُخ کیا اور فرانسیسی زبان کی تکمیل پر متوجہ ہوا - پیرس میں اس نے ایک چھوٹے سے ہوٹل "کوے والیٹر" میں قیام کیا اور تھوڑے سے ہی دنوں میں تمام اہل قلم سے تعارف کر لیا - وکٹر ہیوگو سے لے کر پال فورس تک اس کے دوستوں میں تھے - پیرس کے دوران قیام میں اس نے اسقدر مطالعہ کیا کہ فرانسیسی پر وہ مادری زبان کی طرح قادر ہو گیا - پیرس میں اس نے ایک ڈرامہ "ڈچز آف پاڈوا" لکھا - یہ ڈرامہ "ویرا" سے بھی ادنیٰ حیثیت کا ہے ۱۸۹۱ء میں وہ اس کے زیر نگرانی نیویارک میں دکھایا گیا مگر مقبول نہ ہوا - چند ماہ کے بعد وہ پھر لندن لوٹ آیا اور اپنی والدہ کے مکان کے پاس چند کمرے کرایہ پر لے کر رہائش اختیار کی - اس کی والدہ کو اس کا سارا کلام زبانی یاد تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کا بیٹا دنیا میں ضرور کامیاب ہوگا -

آسکر فطرتاً نہایت فضول خرچ تھا - اس کی خواہش تھی - کہ نہایت عمدہ مکان ہو - نفیس لباس اور پُر تکلف کھانے ہوں - لطیف شراب اور دوستوں کی مجالس ہوں - رقص و سرود کی محفلیں ہوں - غرضکہ عیش و عشرت کے تمام سامان مہیا ہوں - مگر بغیر کافی آمدنی کے یہ کس طرح ممکن تھا - بلکہ برعکس اس کے ہر وقت یہ خطرہ دامنگیر تھا - کہ اس کی شہرت کا جہاز غربت کے دریا میں نہ ڈوب جائے - آخر سوائے شادی کے کوئی اور تدبیر بن نہ آئی - آسکر نے مس کانسٹنس لائیڈ سے عقد کر لیا جو ایک بیرسٹر کی صاحبزادی تھی - مس کانسٹنس کی ذاتی آمدنی چند سو سالانہ تھی - جو آسکر کی فضول خرچی کے مقابلہ میں بالکل ناکافی تھی - میاں بیوی نے ٹائٹ اسٹریٹ کے ایک مکان میں رہنا شروع کیا - مگر آسکر کی لاابالی طبیعت کو کس طرح سکون و قرار ہو سکتا تھا - وہ اس نوگرفتار پرندے کی طرح تھا جو پر پھڑپھڑاتا ہو مگر رہائی دشوار ہو - آخر اس نے بغیر بیوی کے اکیلے ہی لوگوں کی دعوتیں قبول کرنی شروع کیں - وہ بیچاری گھر پر اکیلی رہتی - حتیٰ کہ خداوند تعالیٰ نے اسے بچے عطا کئے اور وہ ان میں مشغول ہو گئی -

فرینک ہیرس بیان کرتے ہیں کہ ۱۸۹۲ء میں آسکر بری طرح موٹا ہونا شروع ہو گیا - اس کے جسم سے ایک خاص قسم کا پسینہ نکلنے لگا - جس کی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کرنے لگے - مگر عورتوں کی مجلس میں اس کی ہر دلعزیزی کم نہ ہوئی - ایک مسز جیون نے مجھ سے دریافت کیا - کیا تم آسکر کو جانتے ہو؟ وہ کسقدر قابل اور ہوشیار انسان ہے - اور جب میں نے بتایا کہ آسکر سے میرے دیرینہ مراسم ہیں تو وہ بہت خوش ہوئی -

امریکہ کے ایک پبلشر نے اسے لکھا کہ اگر وہ ایک لاکھ لفظوں کا افسانہ لکھے تو پبلشر مذکور اسے پانچ ہزار ڈالر بطور اجرت پیش کریگا - اس نے بے تکلفی سے جواب دیا کہ انگریزی زبان میں اتنے الفاظ نہیں ہیں - لہذا وہ افسانہ لکھنے سے معذور ہے - ۱۸۸۶-۸۷ء میں اس کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب ہوا - اس کے ہاں دو بچے پیدا ہو چکے تھے - بجائے اس کے کہ وہ اب متانت سنجیدگی اور امن کی زندگی بسر کرتا - روز بروز اس کی زندگی وحشیانہ اور آوارہ ہوتی گئی - ۱۸۸۶ء کے قریب لندن میں اس کے متعلق عجیب و غریب چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں - جب اس کی کتاب "ڈبلیو ایچ کی پورٹریٹ" ایک میگزین میں چھپی تو عوام الناس کے شکوک یقین میں تبدیل ہو گئے - اس میں شک نہیں کہ اوائل سے ہی لوگ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے - مگر ۱۸۹۱ء میں جب اس کی دوسری کتاب ڈورین گرے چھپی تو لندن میں اس کے خلاف علانیہ مظاہرے ہونے لگے - اور سوسائٹی میں اس کی مخالفت کار ثواب ہو گئی - اس کی وفات کے بعد ڈورین گرے کی تصویر کے متعلق لوگوں کے خیالات تبدیل ہو گئے - اور اب وہ نہایت بلند پایہ کتاب تصور ہوتی ہے - قابل مصنف دیگر باتوں کے علاوہ اس میں رقمطراز ہے - کہ گناہوں کے مرتکب ہونے سے انسان کے چہرے پر ایک تغیر سا رونما ہوتا ہے - ڈورین گرے نے اپنی ایک قد آدم تصویر ایک کمرہ میں چھپا رکھی ہے - وہ ہر روز آ کر اسے دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ تصویر پر خطرناک اور مہیب تغیر واقع ہو رہا ہے وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا - آخر تنگ آ کر خودکشی کر لیتا ہے - فرینک ہیرس لکھتے ہیں "ڈورین گرے" میں شروع سے آخیر تک وہ شراب بھری ہے - جو ہر ایک کو مدہوش کر دیتی ہے - عوام کو امید تھی کہ آسکر عنقریب کوئی ایسی کتاب لکھے گا جو اس کی بدنامی کے دھبوں کو دھو ڈالے گی - چنانچہ ۱۸۹۳ء میں اس نے فرانسیسی زبان میں ڈرامہ سلیمن لکھ کر لوگوں کی امیدوں کو پورا کر دیا - اس کے بعد

اُنہوں نے متعدد اعلیٰ پایہ کے ڈرامے یکے بعد دیگرے لکھے۔ جن کو دیکھ کر اہلِ قلم و اہلِ دماغ حیران رہ گئے کہ قدرت نے اس شخص کو کیسا عظیم الشان دماغ ودیعت کیا ہے۔ ۱۸۹۴ء میں سیزرا نے اسے پیرس کے اسٹیج پر دکھایا اور پریذیڈنٹ جمہوریہ فرانس متواتر تین مرتبہ دیکھنے کے لئے آئے۔

مسٹر رابرٹ ہالس کا خیال ہے کہ سلیموں سے بڑھ کر کوئی ڈرامہ آجتک کسی زبان میں نہیں لکھا گیا۔ مصنف کو خود اس بات کا احساس تھا کہ سلیموں اس کے بہترین ڈراموں میں سے ہے۔ سلیموں انگلستان میں مقبول عام نہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ آسکر نے ڈرامہ میں مذہب پر ایک کاری ضرب لگائی تھی۔ انگلستان کے لوگ اس وقت مذہبی عقائد کے پابند تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ محض ان کے جذبات کو ٹھیس لگانے کے لئے یہ ڈرامہ لکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ڈائرکٹر آف پلیز نے اس کو اسٹیج پر دکھانے کی اجازت نہ دی۔ اہل جرمن کو ڈرامہ بہت پسند آیا۔ اور انہوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کرا کے اسٹیج پر دکھایا۔ وہاں اس کی اتنی قدر دانی ہوئی کہ تمام یورپ میں اس کی ساکھ قائم ہوگئی۔ اہلِ انگلستان کو رشک بلکہ حسد ہوا کہ ان کا اپنا مصنف اس پایہ کی کتاب لکھے اور وہ مستفید نہ ہوں۔ فوراً انگریزی میں ترجمہ کیا گیا اور لندن کے تھیٹر ڈوڈری لین میں دکھایا گیا۔ آج سلیموں کا ترجمہ تقریباً دنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کا لب لباب حافظ کے ایک شعر میں پوشیدہ ہے۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر مے کنند
چوں بخلوت مے روند آں کار دیگر مے کنند

۱۸۹۲ء میں فرینک ہیرس نے ایک دعوت دی۔ جس میں آسکر بھی مدعو کیا گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک دوست کو لیتا آیا۔ جو کہ ایک کم ظرف لڑکا تھا۔ کھانے کے دوران میں وہ نوعمر دوست آسکر سے ناراض ہوگیا اور آسکر کی منتیں کرنے کے باوجود وہ اس سے راضی نہ ہوا بلکہ اس سے بولنا تک گوارا نہ کیا۔ فرینک نے آسکر کو کہتے سنا "للہ مجھے معاف کر دو۔ مجھے مغالطہ ہوا ہے۔ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا" مگر وہ جواب دیئے بغیر کھانا چھوڑ کر چل دیا۔ لوگ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایک نوعمر جاہل کم ظرف لڑکے اور آسکر میں کونسی بات مشترک تھی۔ جو ان کی دوستی کا باعث تھی چنانچہ ایسی باتوں سے لوگ آسکر سے متنفر ہونے لگے۔

مسٹر الگزینڈر کے اصرار پر اس نے ڈراما لیڈی ونڈمیرز فین لکھنا شروع کیا۔ مسٹر الگزینڈر نے اسے سو پونڈ دیا اور وعدہ کیا۔ کہ اگر وہ ڈرامہ جلد شائع کر دے تو ایک معقول رقم بطور ہدیہ آسکر کو پیش کی جائے گی۔ پہلے دن جب ڈرامہ اسٹیج پر دکھایا گیا۔ تو عوام نے پسند نہ کیا۔ اس کے سمجھنے کے لئے دماغ کی ضرورت تھی۔ لیکن عوام ایک عمدہ اور ارفع چیز کے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ دوسرے دن وہی ڈرامہ پھر دکھایا گیا۔ لندن کے بہترین مصنف دیکھنے کے لئے آئے اور انہوں نے اعتراف کیا کہ مصنف نے وہ چیز پیدا کی ہے جو ادبی دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کر دے گی۔ بعضوں نے اسے شیکسپیر کے ڈراموں مچ۔ اے ڈو۔ اور ایزیو لائک اِٹ سے بہت ارفع و اعلیٰ قرار دیا۔ "پنچ" نے اس پر بلند پایہ تنقیدی مضمون لکھا اور لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ جن دنوں متذکرہ بالا ڈرامہ دکھایا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام لندن آسکر کے قدموں میں ہے۔ لوگوں نے محسوس کیا۔ کہ آسکر بہترین اہلِ قلم ہے دی ہیپی پرنس اینڈ ادر سٹیلز ۱۸۹۰ء کے قریب چھپیں۔ اس کو چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنے میں خداداد ملکہ تھا۔ وہ کہانی میں اس قسم کے جذبات پیدا کر دیتا تھا کہ پڑھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

"لارڈ آرتھر لیولز کرائمیز اینڈ ادر سٹوریز" متذکرہ بالا کہانیوں کے کچھ عرصہ بعد چھپیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ بقول ایچ۔ جی۔ ویلز وہ ایک قادر الکلام شخص تھا۔ اس کی کشید کی ہوئی شراب اس بلا کی تھی کہ سونگھنے سے ہی سرشار کر دیتی۔ پیمانوں میں ایسی چھلکتی کہ ولیوں کو موہ لیتی اور بڑے بڑے صوفی انتہائی شوق کے ساتھ اسے چکھنے پر آمادہ نظر آتے۔ ایک دفعہ ایک شخص آسکر کے کلام کی ہجو کر رہا تھا۔ میربڈ بہت دیر تک سنتے رہے اور پھر صرف اسقدر کہا کہ ع

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

۱۸۹۲ء میں اس کی کتاب "اینٹنشنز" بڑی آب و تاب سے نکلی۔ اس میں مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے اور نہایت دلچسپ مقالے درج کئے گئے ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں پہلی بار آسکر کی ملاقات لارڈ ڈگلس سے ہوئی۔ آسکر کی عمر اس وقت ۳۶ سال کی تھی اور ڈگلس کا سن ۲۱ سال کا۔ وہ صنفِ لطیف کی طرح نازک اور حسین تھا۔ وہ اسقدر خوبصورت تھا کہ لوگ

اسے فرشتہ سے مشابہت دیتے تھے۔ اسے علم و ادب اور شعر اپنی والدہ سے وراثتاً ملا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں آسکر اس کا گرویدہ ہوگیا۔ وہ دن رات اس کی خاطر و مدارات میں مشغول رہتا۔ ہوٹلوں میں پُرتکلف دعوتیں دیتا اور لارڈ مذکور کے ہر حکم کی تعمیل ضروری سمجھتا۔ قدرتی طور پر یہ ضیافتیں بغیر روپیہ کے سرانجام نہیں پا سکتی تھیں۔ ان کی آمدنی میں کافی کمی ہو چکی تھی۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور پرانی داستان جسے لوگ بھول چکے تھے۔ پھر دلوں میں تازہ ہوگئی۔ اسی دوران میں آسکر اور ڈگلس کے چند ناشائستہ خط پکڑے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لارڈ مذکور کو انگلستان چھوڑ کر مصر جانا پڑا۔ جہاں وہ لارڈ کرومر کا سیکرٹری مقرر ہوگیا مگر ایک سال کے بعد استعفا دیکر واپس لندن چلا آیا۔

اس ضمن میں یہ ذکر کرنا از حد ضروری ہے کہ لارڈ ڈگلس کے والد کوئینبری کے تعلقات ماں بیٹے دونوں سے بہت کشیدہ تھے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ قصور کس کا تھا۔ ہمیں اس سے بھی سروکار نہیں کہ کون مورد الزام تھا۔ مگر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہم لارڈ ڈگلس کی کتاب "آسکر وائلڈ اور میں" کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے۔ لارڈ مذکور نے اس کتاب میں اپنے والد کا ذکر نہایت نازیبا الفاظ میں کیا ہے اور لوگوں کی نظروں میں انہیں حقیر و ذلیل انسان ثابت کرنے کی بے سود کوشش کی ہے۔ قدرتاً لارڈ کوئینبری کو یہ ناپسند تھا کہ اس کا لڑکا ایک ایسے شخص کو دوست بنائے جو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہو۔ انہوں نے ہر طرح کوشش کی کہ آسکر اور ڈگلس کی دوستی کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر ڈگلس باز نہ آیا۔ اس کی والدہ ہر ناجائز بات میں اس کی حمایت کرتی تھی۔ آخر تنگ آکر اس نے بیٹے اور بیوی کو گھر سے نکال دیا۔

آخر لارڈ کوئینبری انسان تھا۔ اس کے پہلو میں دل تھا اور دل میں بیٹے کی محبت۔ پھر منت سماجت کی کہ اپنے اطوار سدھار لو۔ مگر نوجوان بیٹے کو بڈھے باپ کی نصیحت پسند نہ آئی۔ تنگ آکر باپ نے بیٹے کو آخری خط لکھا۔ جس کے بعض حصے لکھے بغیر مضمون کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے لکھا۔

"الفرڈ"، میری حسرت و یاس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی جب میں محسوس کرتا ہوں کہ تم آوارہ زندگی بسر کرتے ہو۔ مجھے تمہارے خطوط ملے۔ میں ان کا مفصل جواب لکھنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر تم ان کے متعلق بالمشافہ گفتگو کرنا چاہو۔ تو فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ میں تمہارا باپ ہوں اور تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ میرے دل میں تمہاری کس درجہ محبت ہے۔

جب تم آکسفورڈ میں فضول وقت گنوا رہے تھے۔ تو تم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ تم سول سروس کی تیاری میں مشغول ہو۔ تم نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ کہ تم فارن سروس میں جانے والے ہو۔ اور آخر فریب کاری سے تم نے مجھ سے روپیہ وصول کیا۔ کہ تم بیرسٹری میں داخل ہوگئے ہو۔ خیال کرو۔ کیا یہ تمام فریب کاریاں ایک سپوت کے لئے جائز ہیں؟ مجھے اب نہایت تکلیف دہ مضمون کی طرف رجوع کرنا ہے میں اس بدنام شخص سے تمہاری دوستی قطعاً ناپسند کرتا ہوں۔ میں تمہیں نہایت قلق سے لکھتا ہوں کہ اگر تم نے اس شخص سے قطع تعلق نہ کیا تو میں تمہارے اور تمہاری والدہ کے جملہ اخراجات بند کردوں گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں تمہیں عاق کردوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ ایک باپ جب اپنے بیٹے کے متعلق عجیب و غریب باتیں سنتا ہے تو اس پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس دن جب میں نے تمہیں اور وائلڈ کو اکٹھے دیکھا۔ تو میرے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یقین جاننا میں متواتر ایک ہفتہ نہ سو سکا۔ مجھے انتہائی رنج سے اختلاج قلب کا دورہ ہوگیا۔ میں نے سُنا ہے جو ممکن ہے غلط ہو کہ آسکر کی بیوی ان واقعات کی بنا پر طلاق حاصل کرنے والی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ میرے بیٹے میرے احساسات کا خیال کرو اور یقین رکھو کہ بعض اوقات اس پریشانی سے میرا جی چاہتا ہے کہ آسکر کو گولی کا نشانہ بنا دوں۔"

تمہارا غمزدہ باپ کوئینبری

خط کے جواب میں الفرڈ نے باپ کو بذریعہ تار لکھا ہے کہ "تم عجیب الخلقت انسان ہو" اور خط میں لکھا۔ "میں کبھی ان باتوں پر عمل نہیں کرسکتا۔ میں بالغ ہوں۔ آپ کی دھمکیوں کی مجھے ذرہ پروا نہیں۔ میں آپ کا خط پانے کے بعد کئی موقعہ متعدد ہوٹلوں میں آسکر کے ساتھ گیا۔ تاکہ لوگ دیکھ کر آپ کو مطلع کریں اور آپ کے غم و غصہ کی آگ زیادہ بھڑکے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ اگر آسکر نے آپ پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کردیا تو آپ کو سات سال کی سزا ہوسکتی ہے۔"

لارڈ کوئینبری طبعاً بہت ضدی تھے۔ انہوں نے ہر جگہ آسکر کو

بدنام کرنا شروع کیا اس پر عجیب قسم کے الزام لگاتے۔ حتیٰ کہ ایک پوسٹ کارڈ پر تمام الزامات لکھ کر آسکر کی کلب میں چھوڑ آئے۔

فرینک ہیرس اپنی کتاب "امپریشن اباؤٹ آسکر وائلڈ" میں لکھتے ہیں کہ آسکر میرے پاس اضطراب کی حالت میں آیا اور مجھ سے تمام قصہ مفصل بیان کیا اور کہنے لگا۔ کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے اور میں کوئینزبری پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کرنے والا ہوں۔ میرے قانونی مشیر کی رائے ہے کہ میرا مقدمہ بہت مضبوط ہے۔" میں اس سے بہت متاثر ہوا اور کہا خدا کے لئے یہ حماقت نہ کر بیٹھنا کوئی جیوری باپ کے خلاف رائے نہیں دیگی۔ تم نہیں جانتے کہ لوگوں کی رائے تمہاری بابت کیا ہے۔ لوگ تمہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور میرا خیال ہے۔ کوئی شخص بھی تمہارے حق میں گواہی دینے پر آمادہ نہ ہوگا۔ آسکر میری بات مان لو اور اپنی بیوی کو لیکر فوراً انگلستان سے باہر چلے جاؤ۔ ان باپ بیٹے کو آپس میں نمٹ لینے دو۔ برنارڈ شا کو میں نے دوپہر کے کھانے پر کیفے رائل میں مدعو کیا ہے۔ وہ نہایت ذی ہوش اور عقلمند آدمی ہے۔ تم بھی اس میں شریک ہونا اور ہم سب اس پر غور کریں گے۔

آسکر وقت مقررہ پر کیفے رائل آیا اور ڈگلس کو بھی ہمراہ لے آیا۔ میں نے برنارڈ شا سے آسکر کے متعلق مشورہ لیا وہ قطعی طور پر میری رائے سے متفق تھے۔ مگر ڈگلس بہت برہم ہوا۔ اور جاتے ہوئے کہنے لگا۔ "معلوم ہوتا ہے تم لوگ آسکر کے دوست نہیں ہو۔"

برنارڈ شا اپنی کتاب "مائی میمائرز آف آسکر وائلڈ" میں رقمطراز ہیں۔ اگر آسکر کے اپنے اختیار میں ہوتا تو وہ دعوے کرنے کی حماقت نہ کرتا۔ مگر الفرڈ ڈگلس اس پر بے طرح چھایا ہوا تھا۔ وہ کسی امر میں ڈگلس کی ناراضی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کاش ایسے قابل انسان کا تعارف ڈگلس سے نہ ہوتا۔"

آسکر کے دوستوں نے لاکھ سمجھایا۔ مگر اس نے ایک نہ سُنی اور دوستوں کے مشورہ کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ لارڈ کوئینزبری نے دعوے کے جواب میں ان تمام الزامات کو انہوں نے آسکر پر لگائے تھے سچا ثابت کر دیا۔

مقدمہ ۳ اپریل ۱۸۹۵ء کو مسٹر جسٹس کالن کے روبرو پیش ہوا۔ جانبین سے نامور وکلا پیش ہوئے۔ استغاثہ کی طرف سے سرایڈورڈ کلارک۔ کیو۔ سی وغیرہ تھے۔ ملزم کے وکلا مسٹر کارسن اور جی۔ ڈی۔ گل تھے۔ آسکر پر کئی دن جرح ہوتی رہی۔ وہ واقعات جن کا علم صرف چند لوگوں کو تھا۔ طشت از بام ہو گئے۔ آسکر اور ڈگلس کے خطوط پڑھے گئے۔ جن کو سُن کر عوام الناس انگشت بدنداں رہ گئے۔ آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ جیوری نے فیصلہ دیا کہ ملزم نے جو کچھ کہا ہے وہ عوام الناس کی خیر خواہی کے لئے ہے۔ اس لئے ملزم بری کیا جاتا ہے اور ملک ان کی کارگزاری کا شکر گزار ہے۔

لارڈ کوئینزبری کی رہائی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس نے آسکر کے خلاف مقدمہ فوجداری شروع کر دیا۔ مجسٹریٹ سرجان برج نے اس کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا۔ اور پولیس نے اسی شام گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔

آسکر کے دوستوں نے بیحد کوشش کی کہ اسے ضمانت پر رہا کرا لیا جائے۔ مگر مجسٹریٹ نے انکار کر دیا۔ پولیس نے اس کے دوستوں کی ملاقات کی عرضی بھی نامنظور کر دی۔ حتیٰ کہ اسے کپڑے دینے تک سے انکار کر دیا۔ مقدمہ پیش ہوا۔ مگر چونکہ جیوری کی رائے متفق نہ تھی۔ اس لئے از سر نو مقدمہ کی سماعت کی تاریخ مقرر ہوئی۔

اس مرتبہ دوستوں کی کوشش بار آور ہوئی اور وہ ضمانت پر رہا کیا گیا۔ دوران ضمانت آسکر کے عزیز دوست فرینک ہیرس آدھی رات کے وقت اس کے پاس آئے اور بصد منت وسماجت کہا۔ تم انگلستان سے بھاگ جاؤ۔ تمہاری رہائی ناممکن ہے۔ اخبارات اور عوام تمہارے خلاف ہیں۔ جیوری کا ان کی رائے سے متاثر ہونا اغلب ہے۔ میں نے ایک جہاز کا انتظام کر لیا ہے۔ جو ٹیمز میں یہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم کل طلوع آفتاب سے پہلے انگلستان سے نکل جائیں گے۔ میں تمہارے لئے کپڑے اور اشیائے ضروری جہاز میں چھوڑ آیا ہوں۔ کافی روپیہ کا بندوبست کر لیا ہے۔ گاڑی دروازے پر کھڑی ہے۔ مقدمہ کی تاریخ ایک ماہ کے بعد ہے۔ میں تمہیں اٹلی، سویڈن جہاں تم پسند کرو چھوڑ آؤنگا تمہارے تمام اخراجات کا میں ذمہ دار ہوں۔ آسکر! پانچ سات سال بعد دنیا تمام باتیں بھول جائے گی۔ اور اس دوران میں تم علم وادب کی وہ مے کشید کر سکتے ہو کہ ملک تمہیں واپس لینے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

لیکن اسے یہ رائے پسند نہ آئی اور جواب دیا "فرینک! یہ بزدلی ہے۔"

آخر ۱۵ مئی ۱۸۹۵ء کا منحوس دن آگیا۔ شنوائی ہو کر رہی اور اولڈ ہیلی کی عدالت سے آسکر کو دو سال قید بامشقت کا حکم ملا۔ آسکر کے مخلص دوست فرینک کی تشویش کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ روئے پیٹے۔ مرافعے دائر کئے۔ لیکن کوئی پیش نہ چلی۔ قید میں جیل والوں نے وہ وہ تکلیفیں دیں کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فرینک ہیرس حکام کے پاس جاتے کہ کسی طرح آسکر کو آرام ملے۔ مگر تقدیر کے نوشتے کو کون مٹا سکتا ہے۔ ایام اسیری میں آسکر نے "دی پروفنڈس" لکھا۔ وہ اتنا لطیف کلام ہے۔ کہ بقول حکیم برگساں" وہ آسمانی دعائیں ہیں جو ایک ستم رسیدہ دل سے نکل کر آسمان کی طرف جاتی ہیں۔"

بالآخر فرینک کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ حکومت نے اس کی سزا میں چھ ماہ کی تخفیف کر دی۔ رہائی کے وقت وہ جیل خانہ پہنچے اور آسکر کو ساتھ لے آئے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ سزا کے بعد آسکر عبرت پکڑتا۔ تو یہ کرتا اور نئی زندگی کا دور شروع ہوتا۔ مگر جبل گردد جبلت بر نگردد کا مقولہ اس کے صادق آیا۔ رہائی کے بعد اسے کوئی آدمی اعلیٰ سوسائٹی میں قبول نہ کرتا تھا مگر لا ابالی طبیعت کو اس کی بھی چنداں پروا نہ تھی۔ فرینک سر پیٹتے۔ سمجھاتے۔ مگر وہ ٹال جاتا اور کہتا :-

"فرینک! میں مجبور ہوں۔"

فرینک کو دن رات یہی دھن رہتی کہ آسکر کسی طرح پھر لکھنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے سینکڑوں تدبیریں کیں مگر کوئی کارگر نہ ہوئی۔ آسکر کو لارڈ ڈگلس سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ مگر فرینک بضد تھے کہ اس سے نہ ملو۔ آسکر کی طبیعت بے قابو تھی۔ آخر اس نے ایک طویل خط فرینک کو اس معاملہ کی بابت لکھا جس کا مفہوم یہ تھا ؎

دو گونہ رنج و عذاب است جان مجنوں را
بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ

رہائی کے بعد آسکر نے پیرس میں سکونت اختیار کر لی اور اپنا نام سیبسٹین میلیتھ رکھا۔ افسوس کہ ایک عظیم الشان ہستی جس کی زندگی بصورت دیگر قابل تقلید اور باعث تعظیم ہوتی۔ اس طرح دنیا سے رخصت ہوئی کہ سوائے حسرت و افسوس کے کوئی چارہ نہیں۔

۱۸۹۸ء میں ریڈنگ جیل کے متعلق جہاں وہ قید تھا۔ اس نے ایک نظم لکھی جس کا مطلب یہ تھا کہ میں جانتا ہوں اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہر ایک کو یہی معلوم ہوتا کہ جو زنداں آدمیوں نے بنایا ہے اس کی تعمیر میں انہوں نے بے شرمی کی اینٹیں صرف کی ہیں اور ظلم کی آہنی سلاخیں لگائی ہیں۔ ہمارے حضرت مسیح دیکھ لیں کہ آدمیوں کے ہاتھوں ان کے بھائیوں کی کیا گت بنتی ہے۔

جیل میں انہوں نے "اپالوجی فار ہز لائف" لکھی اور رہائی کے وقت تحفتہً داروغہ جیل کو دے آئے۔ وہ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں آسکر نے گناہ و ثواب پر نہایت فاضلانہ بحث کی ہے۔

الغرض وہ بدنصیب انسان گمنامی اور ذلت کی زندگی بسر کر کے ۳۰ نومبر ۱۹۰۱ء کو پردۂ عدم میں روپوش ہو گیا اور اہل دنیا کے لئے درس عبرت و بصیرت چھوڑ گیا۔ کہ جو لوگ زندگی کی راہ مستقیم سے ذرا بھی منحرف ہوتے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے قعر مذلت میں گر جاتے ہیں۔

ہمیں اس کی زندگی کے واقعات سے کچھ تعلق نہیں لیکن اس کی تصنیفات کے متعلق ہم ضرور کہیں گے کہ آرٹ اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کے کلام میں لفظوں کی رنگینی۔ محاوروں کی بندش۔ تمثیلات کی بھرمار۔ استعاروں کے استعمال اور تشبیہ مجازی کو اتنا دخل ہے کہ ایک عالم سے عالم خراج تحسین ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مغرب و مشرق میں اس کا کلام پڑھنے والے موجود ہیں اور اردو ادبیات کے نئے دور پر اس کے اثرات بہت زیادہ ہیں۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ادبی کارنامے ابدالآباد تک قائم رہیں گے۔

کے۔ اے حمید۔ بیرسٹر ایٹ لار

حقائق و معارف

جس گیت کو زندگی نے گایا — سچ یہ ہے وہ گیت تھا پرایا
ہستی کا فریب کھانے والو! — شعلوں کو سمجھ رہے ہو سایا[1]

اس طرح میں آہ کر رہا ہوں — گویا کہ گناہ کر رہا ہوں
سورج کی جبیں عرق عرق ہے — ذرّوں پہ نگاہ کر رہا ہوں
دُنیا مرے راستہ سے ہٹ جائے
اپنے کو تباہ کر رہا ہوں

جس سمت تری نگاہ مُڑ جائے — ٹوٹا ہوا آئینہ بھی جُڑ جائے
ساقی کی اگر نہ ہو نوازش — مے جام سے پھول بن کے اُڑ جائے

یہ ہاتھ، یہ پھول سی گلابی! — یہ آنکھ، یہ عارضِ شبابی!
اے رحمتِ حق! معاف کرنا — بننا ہی پڑا مجھے شرابی

آئینۂ غم کو توڑتا ہوں — ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑتا ہوں
مزدور کو کر رہا ہوں بیدار — دولت کا لہو نچوڑتا ہوں

جینے کا پیام دے رہا ہوں — ہستی کا جہاز کھے رہا ہوں
ٹھکرا کے غمِ نشاطِ فردا — دُنیا سے خراج لے رہا ہوں

ہر عُقدۂ زیست کھولتا ہوں — ہستی کی رگیں ٹٹولتا ہوں
ذرّے ہوں کہ چاند یا ستارے — ہر شے کو نظر میں تولتا ہوں

ہستی کا اگر فریب کھُل جائے — آئینۂ دل سے گرد دُھل جائے
یہ کیف، یہ رنگ و بُو کا عالم — موسم بھی شراب میں نہ گھُل جائے

ماہر القادری

[1] سایہ

دورِ حاضرہ اور مسلمان

گذشتہ سے پیوستہ

اسلام اور اشتراکیت

ہر شخص کو خود غرضی مٹانے کی تعلیم دی گئی اور ایک دوسرے کو بے لوث مدد کی ہدایت کی گئی۔ اس طرح لوگوں کے لطیف جذبات اُبھرے۔ اور بغیر کسی جماعتی جنگ کے مساوات مناسب حد تک خود بخود قائم ہو گئی۔ اسلام نے ایمان کی روشنی میں انفرادیت و اجتماعیت کے ملاپ سے صحیح قسم کی اشتراکیت وضع کی اور یہ اشتراکیت پچاس سال تک عملاً قائم رہی۔

اسلام کی اعتدال پسندی

یہ تھا صحیح اعتدال کا راستہ۔ اسلام اعتدال کا مذہب تھا۔ وہ انسانی فطرت کے مطابق تھا۔ اس کی یہ تعریف کی گئی۔ فِطْرَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا (خدا کی فطرت جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا) یہ ایک خیالی مذہب نہ تھا بلکہ تمام انسانوں کے لئے ایک عملی نظام تھا جس پر کاربند ہونا اُن کے لئے آسان تھا کیونکہ یہ انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔ ارسطو نے میانہ روی کو اخلاق کی تکمیل سمجھا ہے۔ ذرا دیکھو۔ اسلام نے میانہ روی اختیار کرتے ہُوئے اسلامی معاشرت کی بہتری کے لئے کیسے اخلاق پیش کئے۔ ایک مصنّف لکھتا ہے۔ کہ کسی مذہب نے اخلاق پر اتنا زور نہیں دیا جتنا اسلام نے۔ قرآن کا ایک ایک صفحہ اخلاقی ہدایات سے بھرا پڑا ہے۔ انسانی نفس کا گہرا مطالعہ ہے۔ اور اُس کے لئے قابلِ عمل نصیحتیں ہیں۔ جابجا تزکیۂ باطن کی ہدایت ہے کہ بغیر سخت کوشش کے اور بغیر مصائب کی آزمائشوں کے رُوحانی ترقی ناممکن ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی یقین دلادیا ہے کہ خدا انسان کے لئے آسانی چاہتا ہے۔ اُسے خواہ مخواہ مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

اسلام کی صداقت پسندی

"ہمیشہ سچ بولو اور جلنے بُوجھے سچ بات کو نہ چھپاؤ۔ اچھی بات مُنہ سے نکالو اور سیدھی سیدھی بات کہہ دیا کرو۔ لیکن بحث جب کرو عمدہ پیرائے میں اور اپنی آواز نرم رکھو۔ نیکی کی تعلیم دو۔ لیکن یہ نہ ہو کہ لوگوں کو تو نیکی کرنے کو کہو۔ اور اپنے نفس کو بُھولے رہو۔ اور نیکی یہ نہیں کہ نماز میں اپنا مُنہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لیا۔ بلکہ اصل نیکی ہے ایمان میں اور اپنوں اور غیروں کی مدد کرنے میں اور نماز اور زکوٰۃ میں اور ایفائے عہد میں اور مصیبت اور ہلاچلی کے وقت ثابت قدم رہنے میں کہ یہی ہے سچائی اور یہی ہے پرہیزگاری۔ اور مصیبت آنے پر ڈٹ جاؤ۔ اور خدا کی رحمت سے کبھی نااُمید نہ ہو۔ بلکہ ہمیشہ صبر و صلوٰۃ کا سہارا پکڑ و اور یقین کئے رہو کہ اگر تمہارا ایمان صحیح ہے تو آخر کار تم ہی غالب رہو گے"۔

غرض اسی طرح زندگی کے ایک ایک مرحلے کے لئے ہدایتیں ہیں نصیحتیں ہیں۔ تسلیاں ہیں ہر طرح انسان کا دل بڑھایا ہے۔ اُسے ہمت دلائی ہے۔ اُسے برائیوں سے روکا ہے۔ لیکن بالعموم زندگی کا اچھا پہلو پیشِ نظر ہے اور انسان کو دنیا و آخرت دونوں سے فیضیاب ہونے کی ترغیب دی ہے۔ مسلمان دونوں جہاں سے مادی اور روحانی دونوں زندگیوں سے لطف اُٹھانے کا آرزومند ہے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً۔

امتیازی خصوصیت

جیسا کہ کہا جا چکا ہے اسلام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ اعتدال کا راستہ دکھاتا ہے۔ مثال کے طور پر غور کرو کہ زمین کو خدا کی مِلک ٹھہرایا لیکن موروثی جائیداد کو ناجائز قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس طرح اُس کی تقسیم کر دی کہ سرمایہ داری ناممکن ہو گئی۔ مرد کو عورت پہ کہنے کو فوقیت دی۔ لیکن ساتھ ہی ایک دوسرے پر دونوں کے حقوق برابر کر دیئے۔ تاکید کی کہ بدی کا جواب نیکی سے دو۔ (اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ) لیکن ساتھ ہی اجازت دے دی۔ کہ ضرورت کے وقت سختی کا جواب سختی سے دیا جائے۔ اور اس میں بھی ہر حال میں زیادتی سے روکا۔ ایک طرف یہ کہا کہ اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ اور دوسری طرف یہ سمجھا دیا کہ وَالصُّلْحُ خَیْرٌ (صلح بہتر ہے) فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی ٹھیرایا۔ اور بخیلوں کو دوزخ کی آگ سے ڈرایا۔ اور ہدایت کی کہ اپنا ہاتھ نہ تو اتنا کھینچو کہ گویا گردن سے بندھا ہے۔ اور نہ بالکل اُس کو پھیلا ہی دو۔ کہ بس تہی دست بیٹھے رہ جاؤ۔ اور پھر لوگ تم کو لگیں ملامت کرنے۔ اپنے ماں باپ سے نیک سلوک کرو۔ اور نرمی سے بات کرو۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جو کچھ تمہارے باپ دادا کرتے چلے آئے۔ اندھا دھند اُسی راہ پر چلے چلو۔ اسی طرح فرد اور جماعت کے

معاملے میں انفرادیت اور اجتماعیت کی خوبیوں کو اعتدال کی راہ پر جمع کر دیا ہے۔ تاکہ اِدھر نوعِ انسان کی تنظیم ہوتی جائے۔ اور اُدھر فرد کے لئے ارتقاً کا رستہ صاف کُھلا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر ایک بات میں افراط تفریط کے اندر جہاں میانہ روی لازم قرار دی ہے۔ وہاں انسان کو گویا اپنی عقل و تمیز سے کام لینے کی راہ دکھائی ہے اور یہی مذہبِ اسلام کی خوبی ہے۔ کہ باوجود ان ہدایتوں کے اُس نے انسان کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔ کہ وہ اپنی قوت تمیز سے خود کام لے اور ہر بات میں دیکھے کہ اُسے کس حد تک کیا کرنا چاہیئے۔ بعض لوگوں کو قرآن میں تضاد نظر آتا ہے۔ یہ قوت تمیز کی کمی ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کی آزادی کو ہر طرح سے برقرار رکھا ہے یہاں تک کہ جبر و اختیار کے معاملے میں بھی اختیار کے اختیار کر لینے کا اختیار بھی اُسی پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد کون اس دعویٰ کو باطل کر سکتا ہے۔ کہ :-

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے)

پیغمبر اسلام اور اُس کی شخصیت

اسلام نے اپنا پیغام دُنیا تک پیغمبر اسلام کے ذریعے سے پہنچایا۔ مولانا شبلی اپنی مشہور تصنیف "سیرۃ النبی" کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔ کہ "عالمِ کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے۔ کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے۔" پھر لکھتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول کا سب سے زیادہ کامل طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے۔ نہ جبر و زور سے کام لیا جائے بلکہ فضائل اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم سامنے آجائے۔ جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو جس کی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے۔ اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامرِ سلطانی بن جائے۔" پیغمبر اسلام ایک ایسی ہستی تھے۔ بقول اقبال "پیغمبر اسلام قدیم اور جدید دنیا کے عین درمیان کھڑے معلوم ہوتے ہیں۔" تاریخ انسانی میں جہاں وہ قدم دھرتے ہیں پُرانا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ کیا آئے کہ دنیا میں ایک انقلاب آگیا۔ بقول شبلی "صنم خانوں میں خاک اُڑنے لگی۔ بُت کدے خاک میں مل گئے۔ شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا۔ نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے بکھر گئے۔ توحید کا غلغلہ اُٹھا چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی۔ آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اُٹھا۔" کارلائل کہتا ہے۔ "یہ عرب لوگ، یہ آدمی محمدؐ اور وہ ایک صدی۔ کیا ایسا معلوم نہیں ہوتا گویا ایک چنگاری تھی کہ گری، صرف ایک چنگاری اُس دنیا پر جو سیاہ فضول سی ریت کی دُنیا معلوم ہوتی تھی لیکن نہیں دیکھو کہ وُہی ریت بھک سے اُڑنے والی بارُود ثابت ہوئی۔ جو دہلی سے لے کر غرناطہ تک شعلہ بن کر آسمان تک جا پہنچی۔"

ہمارے نبیؐ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ دُنیا کو یاد ہے۔ اس کہانی کے لئے ایک جداگانہ صحبت درکار ہے۔ عرب اور دنیا بھر کی وہ ذلیل حالت، آپ کے دل میں وہ ربانی آواز، وہ غار حرا کا تحنّث، وہ دعوتِ اسلام، ابوطالب کو وہ جواب کہ "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤنگا۔" وہ آپ کو اور آپ کے پیرؤوں کو اذیتیں اور عذاب، وہ شعب ابوطالب کے کٹھن دن، وہ غار ثور کی تنہا راتیں، وہ دشمن کی آہٹ پر اپنے غم زدہ دوست کو تسلی لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ وہ مدینے کا قیام، مہاجرین و انصار کی مواخات وہ بدر اور اُحد اور خندق کی صعوبتیں اور آزمائشیں اور کامرانیاں، وہ سلاطین کو دعوتِ اسلام۔ وہ فتح مکہ، وہ کعبے میں داخلہ اور اذان، وہ نعرۂ حق۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

(حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی)

اور پھر وہ آخری خطبے کی ہدائتیں اور وہ قول کہ "میں تم میں ایک چیز چھوڑ جاتا ہوں۔ اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا۔ تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ وہ چیز کیا ہے؟ خدا کی کتاب!"

پیغمبر اسلام کے متعلق ایک بات غیر معمولی اور قابل ذکر ہے۔ کہ باوجودیکہ آپ کا ایک ایک کام معجزے کا مرتبہ رکھتا تھا، باوجودیکہ آپ کے کارنامے نے دنیا کی تاریخ کا رُخ پھیر دیا۔ اور آپ اپنے پیرؤوں کو جان و دل سے زیادہ عزیز تھے لیکن آپ نے خود کئی بار فرمایا کہ میں تو فقط تم جیسا ایک آدمی ہوں اور صرف یہی نہیں بلکہ اُن کی اس طرح تربیت کی کہ آج تمام بڑے مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے پیرو نہ اپنے پیغمبر کی پرستش کرتے ہیں نہ اُسے خدا کا اوتار مانتے ہیں بلکہ اُسے ایک اپنی طرح کا انسان جانتے ہیں جس نے نوعِ انسان کو خدا کی وحدت کا پیغام دیا۔ قرآن اور اُسوہ رسول اور ان کے تتبع میں خلفائے راشدین کا طرزِ عمل اور مسلمانوں کے صدیوں کے عروج و زوال کے اندر قرآنی تہذیب کی اجتہادی شان! یہ ہے اسلام اور اُس کا کارنامہ! ہمیشہ قائم ہمیشہ رواں!!

تاریخ اسلام پر سرسری نظر

اب ہم مسلمانوں کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

اسلام نے مسلمانوں میں زندگی کی ایک ایسی رُوح پھونک دی۔ جس کے لئے اُس وقت کی مردہ بےبس دنیا ترس رہی تھی۔ فطرت کے قانون کے

مطابق دنیا کی گئی گذری قومیں اُس ہمہ گیر تمدن سے محروم نہ رہ سکتی تھیں جس نے اسلام کی تعلیمات سے پیدا ہو کر فروغ پایا۔ عرب اپنے جزیرہ نما سے نکلے اور کامیابی نے قدم قدم پر اُن کے پاؤں چُومے۔ مصر، ایران اور رُوم کی سلطنتیں اپنے مذہبی و معاشرتی انحطاط کے باعث کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ لیکن اتنی کمزور بھی نہ تھیں کہ عرب کے بدوؤں کے آگے سرنگوں ہو جاتیں۔ یہ در اصل ایک محکم ایمان کی نت نئی طاقت تھی جس کا سیلاب ہر قسم کے خس و خاشاک کو بہا لے گیا۔ یہ تینوں قدیم سلطنتیں حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں فتح ہو گئیں۔ حضرت عمرؓ کا عہد جس طرح فتوحات میں اُسی طرح ملکی نظم و نسق میں بھی ہمیشہ یادگار رہیگا تاریخ اور سنِ ہجری، امیر المومنین کا لقب، قیاس کا اصول۔ قرآن مجید کی ترتیب، با جماعت نماز تراویح، فجر کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ، مساجد میں وعظ کا طریق۔ ان خالص مذہبی ایجادات کے علاوہ عدالتیں فوجی نظام، رضاکاروں کی تنخواہیں۔ دفتر مال۔ پیمائش، مردم شماری۔ نہریں صوبوں کی تقسیم، پرچہ نویس، مہمان خانے، عیسائیوں اور یہودیوں کے روزینے۔ وقف کا طریقہ سب فاروق اعظم کی اختراعیں تھیں۔ سپنگر، عمرؓ کو "سب زمانوں کا سب سے بڑا مدبر" پکارتا ہے۔

اسلامی تاریخ کے دوائر

اسلامی تاریخ کے پانچ بڑے دور ہیں پہلا متحدہ حکومت کا دور ۶۲۲ء یعنی ہجرت نبوی سے شروع ہو کر ۸۳۳ء تک۔ دوسرا انتشار کا دور ۸۳۳ء سے ۱۲۵۸ء تک۔ تیسرا دور تیرھویں صدی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک جس میں موجودہ زمانے کی سلطنتیں یعنی ترکی ایران وغیرہ تشکیل پاتی اور اقتدار حاصل کرتی ہیں۔ چوتھا زوال و انحطاط کا دور اٹھارویں صدی کے وسط سے لے کر ۱۹۱۸ء تک۔ پانچواں دور ۱۹۱۹ء سے تا حال اسلامی نشاۃ الثانیہ کا زمانہ۔

شاہی خاندانوں کے لحاظ سے اسلامی تاریخ کی تقسیم

یوں ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد ۶۶۱ء سے ۷۴۹ء تک بنی اُمیہ دمشق میں حکمران رہے اور ۷۴۹ء سے ۱۲۵۸ء تک عباسیہ خاندان کی حکومت بغداد میں قائم رہی۔ عباسی دور اگرچہ دنیوی اور تمدنی حیثیت سے اسلامی تہذیب کے معراج کمال کا زمانہ تھا۔ مگر اسی عہد میں مال و دولت کی زیادتی اور سلطنت کی وسعت کی وجہ سے انتشار کی ابتدا ہوئی مغرب کی طرف ۷۵۶ء سے ہسپانیہ، ۷۸۵ء سے مغرب الاقصیٰ اور ۸۰۰ء سے مصر و طرابلس میں جداگانہ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ہسپانیہ میں قرطبہ کے اُموی خاندان (۷۵۶ء تا ۱۰۳۱ء) کے بعد ملوک الطوائف مرابطین موحدین اور غرناطہ کے بنو احمر نے ۱۴۹۲ء تک حکومت کی۔ مغرب الاقصیٰ میں ادریسی، اغلبی، فاطمی، علویہ، اسماعیلیہ اور ایوبیہ خاندان ۱۲۵۰ء تک حکمران رہے۔

یہ مغربی ملکوں کا حال تھا۔ مشرق کی طرف اور بھی کھچڑی پک رہی تھی۔ ملوکِ طاہریہ، صفاریہ، سامانیہ، غزنویہ، سلاطین دیلم۔ اسماعیلی شیعہ۔ سلجوقی خاندان۔ سلاطین خوارزم، شاہان کرمان، اتابکانِ شیراز، ازبک اور ہندوستان میں پہلے پٹھان اور تُرک اور پھر مغل بادشاہ حکمران رہے خود بغداد میں ۸۳۳ء سے ترکی غلاموں کی فوجی طاقت روز بروز بڑھتی گئی اور ۹۴۴ء سے بُویہ سلاطین نے اقتدار حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ خلفا صرف نام کے بادشاہ رہ گئے۔

۱۲۵۸ء میں منگولی قوموں نے بغداد پر حملہ کر کے اسلامی تہذیب کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد زمانہ حال کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ عربوں کی تہذیب کی جگہ مختلف مملکتیں قائم ہو گئیں۔ اِدھر ترکی، ایران، افغانستان اور ہندوستان اور اُدھر شمالی افریقہ میں مصر، طرابلس، طونس، الجبرا اور مراکش۔ باقی جن ملکوں میں اسلام پھیلا مثلاً ادھر چین، سماٹرا جاوا میں اُدھر وسطی افریقہ میں، وہاں کوئی مستقل آزاد اسلامی حکومتیں قائم نہ ہو سکیں۔

اسلام کے پھیلنے اور اسلامی حکومتوں کے قیام کی متعدد وجوہ تھیں۔ امن و امان کی خواہش اور ضرورت، مسلمانوں کی مذہبی رواداری، علوم و فنون کی سرپرستی، اسلام کا ایک فطری مذہب ہونا۔ اسلامی حریت و مساوات کے اصول، پُرانے مذاہب اور سلطنتوں کی ذلت و پستی اور سب سے بڑھ کر اسلام کی روحانی طاقت جس کا اظہار مسلمانوں کی قوتِ ایمان اُن کی وسعت نظر اور اُن کے عزم و استقلال میں ہوا۔

اسلامی تمدن کی شان و شوکت

اسلامی تمدن کی شان و شوکت بغداد اور قرطبہ میں نظر آئی بغداد کی آبادی بیس لاکھ تھی۔ وہ چالیس شہروں کا مجموعہ تھا۔ اُس کا پھیلاؤ ایک طرف بیس میل اور دوسری طرف چھ میل سے کم نہ تھا۔ یہاں ۶۵۰۰۰ حمام تھے۔ اور عام سرگرمی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تقریباً ایک لاکھ آدمی ہر روز کشتیوں میں دریا کو عبور کرتے تھے۔ خلیفہ منصور کے بیت المال میں اٹھہتر کروڑ درہم جمع تھے۔ ہارون کی وفات پر خزانے میں نوّے کروڑ درہم تھے۔ (ایک درہم تقریباً ٦ کے برابر ہوتا تھا)، مقام سراف میں ایک شخص کا سرمایہ ۶ کروڑ درہم تھا۔ وہ دریائی تجارت کرتا تھا۔ ایک تاجر نے ایک وقف کے لئے ۱ لاکھ دینار

وقف کئے۔ (ایک دینار تقریباً پونے آٹھ روپے کے برابر ہوتا تھا)

چارلز اومین اپنی کتاب "انگلستان نارمن فتح سے پہلے" میں لکھتا ہے کہ آکسفورڈ کے عجائب خانے میں ایک عجیب وغریب سکہ ہے۔ جس کے ایک طرف Offa Rex کندہ ہے اور دوسری طرف بغداد کے دو سکہ گروں کا نام عربی حروف میں لکھا ہے۔ یہ بادشاہ اوفا انگلستان میں آٹھویں صدی عیسوی میں مرشیا کا حکمران تھا۔ یعنی انگلستان کے سکے ڈھلنے کے لئے بغداد بھیجے جاتے تھے۔

اُدھر ہسپانیہ میں قرطبہ بھی ایک بے نظیر شہر تھا۔ اس کی آبادی دس لاکھ سے زائد تھی۔ اس شہر میں ۳۸۰۰ مسجدیں، ۶۰۰۰۰ محل اور عالیشان مکان دو لاکھ متوسط لوگوں اور غریبوں کے گھر اور سات سو حمام تھے۔ اس کی شہرت جرمنی کے پرلے سرے تک پہنچ گئی تھی۔ سکسن نن روسس وتھا اسے "زینت عالم" کا لقب دیتی ہے۔ مغربی سیاح بیان کرتے ہیں کہ رات کو انسان دس میل تک اُس کے چراغوں کی روشنی میں چل سکتا تھا۔ اس کے سات سو برس بعد تک لندن کے کوچوں میں ایک لیمپ بھی نہ تھا۔ قسم قسم کی دکانیں اور نمائش گاہیں گویا حال کے یورپی شہروں کا نمونہ تھیں۔ گھروں میں گرمی میں زمین دوز راستوں سے ٹھنڈی اور خوشبودار ہوائیں آتیں۔ کمروں کی آرائش کے لئے ہاتھی دانت کی میزیں اور مرصع کار تپائیاں ایرانی قالین اور بلور کے کام کئے ہُوئے پھولدان اور بیسیوں اور ایسی چیزیں تھیں۔

عبدالرحمٰن الناصر کی آمدنی یورپ کی ساری حکومتوں کی مجموعی آمدنیوں سے بڑھ کر تھی۔ جس سے مسلمانوں کی وسیع تجارت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہسپانیہ کے مسلمانوں کے پاس ایک ہزار تجارتی جہاز تھے۔ اشبیلیہ میں جس کی آبادی تین لاکھ تھی۔ چھ ہزار ریشم کے کام کرنے والے تھے۔ اور اشبیلیہ کے آس پاس زیتون نکالنے کی ایک لاکھ چکیاں تھیں۔

علوم وفنون کی ترقی

علوم وفنون کی ترقی اور علم کی قدردانی جیسی مسلمانوں کے عہد میں ہُوئی دنیا کی کوئی قوم اُس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

الحاکم ثانی کے کتب خانے میں چھ لاکھ جلدیں تھیں اور ان کی فہرستیں ہی ۴۴ جلدوں میں تھیں۔ قاہرہ کے کتب خانے میں ایک لاکھ قلمی نسخے تھے۔ جن کی جلدیں نہایت دیدہ ریزی اور کمال عرق فشانی سے تیار کی گئی تھیں۔ طلباً کو قاہرہ میں عاریتاً کتابیں لینے کی عام اجازت تھی۔ یورپ کی اُس وقت کی علم پسندی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ زمی نیز ریکس الاسا قفہ نے غرناطہ کی اسی ہزار کتابیں کو شہر کے چوک میں ایک جاہل ترگروہ کے سامنے جلوا دیا اور اہل یورپ نے اُسے سراہا کہ اُس نے کفر کی بیخ کنی کرنے میں مسیحیت پر بڑا بھاری احسان کیا ہے۔ کتابوں کے جمع کرنے اور علوم کو ترقی دینے کا عربوں کو اس قدر خیال تھا۔ کہ جب کوئی امیر خود مختار ہو جاتا۔ تو فوراً اپنے کتب خانے عوام کے لئے کھلوا دیتا۔ اور عالموں اور حکیموں کی محفلیں جما کر اپنے رقیبوں اور ہم عصروں کے مقابل میں رعایا سے داد چاہتا۔ گبن لکھتا ہے کہ ایک وزیر کی نسبت مذکور ہے۔ کہ اُس نے دو لاکھ دینار ایک کالج کے قائم کرنے کے لئے دیئے۔ اور بعد میں اُس کو انتظام کے لئے وہ پندرہ ہزار دینار یعنی ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ سالانہ دیتا رہا۔ اس درس گاہ میں ۶۰۰۰ طالب علم تعلیم پاتے تھے۔ ڈریپر نے لکھا ہے کہ ایک عالم نے اس وجہ سے سلطان بخارا کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا کہ اُس کی کتابیں لادنے اور لے جانے کے لئے چار سو اُونٹوں کی ضرورت ہوتی۔ اُس زمانہ کے علما محض گوشہ نشین نہ ہوتے تھے مشہور عرب مؤرخ ابن خلدون پہلے طولس سے فیض گیا۔ پھر غرناطہ، پھر پٹیر طالم کی طرف سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ پھر قاہرہ گیا۔ پھر مشرق کی طرف چل دیا۔ یہاں تک کہ ہم اُسے تیمور کی لشکرگاہ میں دیکھتے ہیں۔ ۱۴۰۶ء میں وہ قاہرہ میں ۷۵ برس کی عمر میں مرگیا۔ ہسپانیہ میں اُن دنوں ہر شخص لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ اور یورپ کے جو لوگ پُرانے یا نئے علوم میں دسترس حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ بلاتکلف ہسپانیہ کے دارالعلوموں میں آتے اور تحصیل علم کرتے۔ راجر بیکن عربوں کا شاگرد تھا۔ جربرٹ جس کے علم وفضل کا یورپ میں اس قدر رُعب تھا کہ وہ شیطان کا شاگرد سمجھا جاتا تھا۔ اور جس نے عربی ہندسوں کو رواج دیا۔ اور پہلے پہل گھڑیاں بنائیں۔ دامز بری کہتا ہے کہ اُس کا سارا "علم" عربوں سے چرایا ہُوا تھا۔ "مورخوں کی تاریخ دنیا" میں لکھا ہے کہ اطالوی لینارڈو، ہسپانوی ریماں، انگریز راجر بیکن، فرانسیسی آرنلد بلکہ پندرھویں صدی سے پہلے کے سارے کے سارے یورپین مصنفین نے سائنس کے جملہ علوم میں جو کچھ بھی لکھا۔ وہ تمام یا عربوں کی کتابوں کی حرف بہ حرف نقل تھی۔ یا کچھ حاشیہ آرائی کر کے اُنہیں پیش کیا گیا تھا۔ قرطبہ کا دارالعلوم قاہرہ کے ازہریہ اور بغداد کے نظامیہ سے کچھ کم نہ تھا۔ ہر شعبہ تعلیم کا ایک سرکردہ تھا۔ جو معاصر علاموں میں سے انتخاب کیا جاتا تھا۔ مذہب کی کوئی شرط یا قید نہ تھی۔ یہودی اور عیسائی علامہ اکثر مقرر کئے جاتے تھے۔ ڈریپر کہتا ہے ہمیں شک ہے۔ کہ آج کل بھی کوئی یورپین قوم ایسی آزاد خیالی کا ثبوت دے سکتی ہے یا نہیں؛ مباحثوں میں اکثر خلیفہ بھی موجود ہوتا تھا۔ اور ہر شعبۂ تعلیم کے مدرس اپنے اپنے شعبے کی خلعتیں پہنے بحث میں شریک ہوتے۔ شلین لےلینپول کہتا ہے کہ انگریزی دارالعلوموں کے جُبے اور قبائیں Robes + gown انہیں عربی دارالعلوموں سے لئے گئے۔ بعض درسگاہوں کے دروازوں پر یہ حروف کندہ ہوتے تھے "دنیا

چار چیزوں سے قائم ہے حکیموں کا علم، بادشاہوں کا عدل، پاکبازوں کی عبادت اور بہادروں کی شجاعت۔"

یونان کا علم و حکمت

یونان کا علم و حکمت عربوں ہی کے ذریعہ سے یورپ میں پہنچا۔ لبری کہتا ہے کہ عربوں کا نام تاریخ میں سے مٹا دو۔ اور پھر دیکھو کہ کس طرح علم ادب کی نشاۃ الثانیہ کئی صدیاں پیچھے جا پڑتی ہیں۔ موسیو سدی یوں کہتے ہیں۔ کہ "عربوں کے وہ علم ادب کے بھرے ہوئے خزانے، اُن کی ذکاوت و علمیت کی لاتعداد تصنیفات اُن کے طبعی اکتشافات و ایجادات یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں۔ کہ اُن کے دماغ ان عقلی مساعی میں روز و شب منہمک رہتے تھے۔ اُن کے ان کارناموں کو دیکھ کر اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ کہ وہ ہر علم و فن میں ہمارے اُستاد تھے۔ ایک طرف اُن کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ، اُن کے بحری و بری سفر اُن کی سوانح عمریاں اور دوسری طرف اُن کی بے مثال صنعت و حرفت اور ایک ایسی طرز تعمیر جو نئے تصورات سے معمور ہے۔ یہ باتیں ہیں۔ جو اُنھوں نے ہمارے لئے ترکے میں چھوڑیں اور ہم اُن سے مدتوں متمتع ہوتے رہے"

عربی تمدن اور عربی زبان کے اثر کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ Tournament (دوران) Squadron (عسکر) Arsenal (دار الصناعۃ) Tariff (تعریف) Admiral (امیر الماء) اور سینکڑوں اور ایسے ادارے اور الفاظ یورپ والوں نے عربوں ہی سے سیکھے۔ ایک فرانسیسی مصنف کہتا ہے۔ کہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ردیف اور قافیہ یورپ میں عربوں ہی سے آیا۔

یورپ کے تمدن پر عربوں کے اثرات

عربوں نے یورپ کے تمدن کے ایک ایک شعبے پر اپنا اثر چھوڑا ہے۔ قرونِ وسطےٰ میں یورپ کی جو حالت تھی اُس کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ یورپ کے تمدن کی صرف ایک مثال کافی ہے۔ جادو پر عام اعتقاد تھا اور جنیوا میں تین ماہ میں پانچ سو "جادوگر" اور "جادوگرنیاں" جلا دی گئیں۔ اُدھر ہسپانیہ میں ایک باقاعدہ سلطنت قائم ہونے سے اور اِدھر صلیبی لڑائیوں کی وجہ سے عرب تمدن اور عرب نظم حکومت کا گہرا اثر یورپ پر پڑا۔ اُموی خلفاء کے زمانے میں اور اُن کے بعد ہسپانیہ کی حکومت متعدد شعبوں میں تقسیم کی گئی۔ اور اس میں شک نہیں کہ یورپین قوموں نے تقسیم حکومت کے بعض اصول اُنہیں سے اخذ کئے بلکہ سید امیر علی کا خیال ہے کہ یہ تقسیم بعض حیثیتوں سے آج کل کی حکومتوں کی ترتیب سے بڑھ چڑھ کر تھی۔

عرب تمدن کے معاشرتی و اخلاقی اثرات کا یہ حال ہے کہ غریب لوگوں بالخصوص مزدوروں اور صناعوں کے حقوق، عورتوں کی مناسب آزادی، بہادرانہ برتاؤ۔ سپاہگری کا قانون (Knight hood) نرمی، انکسار، صاف گوئی راستبازی۔ رواداری، پھر گھروں میں آرائش میز کرسیاں کانٹے چمچے نیپکن رومال، رات کو سوتے وقت کپڑے بدلنا (قماش النوم) اکثر غسل کرنا چوگان، ٹینیس (لُبُّ الکرہ) کرکٹ، شطرنج، گھڑدوڑ، پھر حفظانِ صحت، کوچوں کی صفائی اور تمدن کی اور بیسیوں باتیں یورپ نے عربوں ہی سے سیکھیں۔

مذہبی اثرات

مذہبی اثرات کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ لُوتھر اور دوسرے مصلحین کی پراٹسٹنٹ اور دوسری اصلاحی اور بدعتی تحریکات جنھوں نے یورپ کی کایا پلٹ دی۔ اور اُس میں آزادی کی رَو دوڑا دی۔ اسلام ہی کے اثر سے ظہور میں آئیں۔ چنانچہ ڈریپر اسلام کو "جنوب کی اصلاحی تحریک" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اگر مسلمان یورپ میں نہ آتے۔ تو یورپ آج تک انتہائی رومن کیتھلک بُت پرستوں کا شکار رہتا۔

عقلی اثرات

عقلی اثرات میں کس کس علم کا ذکر کیا جائے۔ کیمیا، طب، جراحی، ہیئت، جرثقیل، طبقات الارض، جغرافیہ تاریخ، اعداد و شمار، حکایات و امثال، کتب رجال، فن سوانح نگاری، دائرۃ المعارف یعنی انسائیکلوپیڈیا لغات، ریاضی، موسیقی، کونسا علم ہے۔ جو یورپ نے اُن سے اخذ نہیں کیا۔ خود یورپین مورخین کے بیان کے مطابق کاغذ، قطب نما، اور بارود جن سے تمدن میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا۔ دراصل عربوں کی ایجادیں تھیں۔ چاول نیشکر، روئی کا استعمال بھی اُنہیں سے یورپ نے سیکھا۔ یورپ کے پہلے طبی کالج کی بنا عربوں کے ہاتھوں صقلیہ کے شہر سلرنو میں پڑی۔ یہ صدیوں تک یورپ والوں کا مرکزی طبی مدرسہ بنا رہا۔ بے ہوشی کی دوا دینا۔ ریشمی ٹانکوں کا استعمال جاری خون کو ٹھنڈے پانی سے بند کرنا۔ یہ سب اُنہیں کی ایجادیں ہیں مشہور طبیعیات دان ابن ہیثم نے انعکاس، انعطاف، رویت، فریب نظر وغیرہ پر روشنی ڈالی۔ اور بتایا کہ فضا کی گہرائی ۵۸½ میل تک ہے۔ اسی حکیم کے متعلق ڈیپر کہتا ہے۔ کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے یورپ میں حیوانات کی تدریجی ترقی یعنی مسئلہ ارتقا کی تلقین کی۔ بحری سفروں کا اُن کو اس قدر شوق تھا

کہ بعضوں کا خیال ہے کہ وہ امریکہ تک پہنچ چکے تھے۔ فاطمی خلفا نے اطالوی بحری قزاقوں کے جواب میں ایک طاقتور بیڑا تیار کیا تھا۔ جس سے اُنہوں نے پہلے اطالیہ کے تھوڑے سے حصے کو زیرنگیں کیا۔ اور پھر ۹۶۶ء میں صقلیہ پر قبضہ جما لیا۔ ہیئت سے اُن کو اتنی دلچسپی تھی کہ بقول ڈریپر "عربوں نے اپنا نام آسمان کے ستاروں پر لکھ رکھا تھا" عربوں کی موسیقی کے متعلق بھی ایک باتیں دلچسپ ہیں۔ عربوں ہی سے یورپ نے موسیقی کو ہندسوں میں قلم بند کرنا سیکھا۔ کئی ساز اُن کی ایجاد ہیں۔ لفظ Lute عربی "العود" سے ماخوذ ہے۔ یورپ کی موسیقی پر عربوں نے خاصہ اثر ڈالا۔ ڈیارڈو کہتا ہے کہ میں نے ماسکو میں کریملن کے میناروں کے نیچے اُنہیں راگنیوں کو سُنا جو میں اُس سے پہلے الحمرا کے باغوں میں سُن چکا تھا۔ دونوں جگہوں میں اُن لوگوں کی زبان سے میں نے عربی موسیقی کی زندہ گونج سُنی۔ تعمیرات میں مسلمانوں کا کارنامہ آج تک دنیا کے سامنے ہے۔ یورپ میں بڑی بڑی تعمیروں کے موقع پر عموماً عربوں سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ چنانچہ پیرس کے مشہور گرجا نوتردام کی تعمیر کے وقت عرب میر عمارت بلائے گئے تھے۔

ایسی تھی اسلامی تہذیب اور ایسے تھے اُس کے اثرات۔ یہ محض چند اشارے ہیں۔ اس کے پورے بیان کے لئے اُن ہزاروں لاکھوں کتابوں کو دیکھو۔ جو مسلمانوں نے اپنی یادگاریں چھوڑیں۔ اُن سینکڑوں تصنیفات کو پڑھو۔ جو خود انصاف پسند یورپین مصنفین نے لکھی ہیں۔ اور جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اسلام کا نعرہ بلند نہ ہوتا۔ اگر اُس کی تہذیب یوں اپنا کام نہ کرتی تو نہ یورپ کا تمدن اپنے موجودہ کمال پر پہنچتا اور نہ دنیا اِس طرح آزادی اور جمہوریت اور اشتراکیت کے اصولوں سے واقف ہوتی۔

جُوں جُوں اسلام کے دَورِ اوّل کا روحانی جذبہ کمزور پڑتا گیا۔ دنیاوی جاہ و جلال کی خواہش بڑھتی گئی۔ جمہوری اصول بالائے طاق رکھے گئے۔ جبر و عدل کا فرق نمایاں ہوتا گیا۔ ایثار کی جگہ خود غرضی نے لے لی۔ عیش و عشرت نے آ کر بہادر سپاہیوں کو آرام طلب امیر بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی مسلمان روز بروز اپنے اسلامی مرتبے سے گرتے گئے۔ اور قدرت کے قانون کے مطابق اُن کے زوال کی صورتیں پیدا ہوتی گئیں۔

نواب محسن الملک نے مسلمانوں کے تمدن کے یہ اسباب تنزل بیان کئے ہیں۔ اوّل۔ خلافت کا جمہوری سے شخصی سلطنت ہو جانا اور خلفا اور سلاطین کا خود مختار ہو کر شریعت کے احکام کا پابند نہ رہنا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک خلیفہ تھے حضرت علیؓ کہ اپنے بھائی عقیل کو ایک درم حصہ معینہ سے زیادہ نہ دیا۔ اور ایک خلیفہ وہ تھے کہ رکاب سے پاؤں نکالنے کے اتول ایک صوبے کی آمدنی خوشامد کرنے والوں کو بخش دی۔ ایک خلیفہ تھے حضرت عمرؓ کہ جب اُن کے پاس رُوم کا سفیر آیا تو زمین پر فرش تک نہ تھے۔ اور ایک تھے خلیفہ مقتدر باللہ جن کی جلو میں سات ہزار خواجہ سرا اور جن کی ڈیوڑھی پر سات ہزار دربان اور جن کے محل میں ۳۸ ہزار مشجر زربفت کے پردے پڑے تھے۔ ان بعد کے حکمرانوں کی رعایا کا مزاج بھی ویسا ہی ہو گیا مذہبی جوش اور دلی ولولہ دولت کی افزائش سے سرد پڑ گیا اور وہ محنت کی بجائے دولت کے خواہاں ہو گئے۔

مسلمانوں کے زوال کا دوسرا سبب اسلام میں اختلاف کا پیدا ہونا اور مسلمانوں کا متفرق فرقے ہو جانا تھا۔ اکثر آفتیں جو مسلمانوں پر نازل ہوئیں اُس کا سبب یہی تھا۔

تیسرا سبب مسلمانوں میں قومی آزادی کا نہ ہونا تھا۔ جس سے وہ خود مختار بادشاہوں کے غیر محدود اختیارات کی روک تھام کرتے۔

چوتھا سبب تھا۔ تعلیم و تہذیب کی ترقی کا سلسلہ برابر جاری نہ رہنا ایک بادشاہ کے عہد میں روم اسکندریہ اور ایران سے صدہا اُونٹ کتابوں سے بھرے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ ترجمہ ہو رہا ہے۔ فلسفہ و حکمت کا بازار گرم ہے۔ تعلیم کی راہیں کھلی ہیں۔ دوسرے کے زمانے میں سارا دفتر ہی اُلٹا نظر آتا ہے۔ تحصیل حکمت پر کفر و الحاد کے فتوے جاری ہیں۔ کتابیں جل رہی ہیں۔ حکیموں پر کوڑے پڑ رہے ہیں۔ غرض اتنی آزادی نہ ملی۔ کہ دماغی ترقیوں کا سلسلہ مسلسل طور پر جاری رہ سکتا۔ اُدھر تقلید کی عادت نے عوام کو تحقیق کا شوق نہ دلایا۔

پانچواں سبب غلط مذہبی خیالات تھے۔ یہ سب سے بڑا سبب تھا مسلمانوں کے دین و دنیا کا اور علم و تہذیب کے زوال کا۔ پاک مذہب کی پاک تعلیم کو جھوٹے توہمات اور رسموں نے آ کر مکدر کر دیا۔ سچا اسلام ایک فطری مذہب تھا جس کے معنے تھے کہ انسان اُس استعداد کو کام میں لائے۔ جو خدا نے انسان میں رکھی ہے۔ یہی استعداد ہے عقل، یہی ہے ایمان، امام غزالیؒ نے ایمان کی یوں تعریف کی ہے۔ اَلْاِیْمَانُ مَعْرِفَۃُ الْاَشْیَاءِ عَلٰی مَاھِیَ عَلَیْہِ۔ (ایمان ہے چیزوں کی ماہیت کا پہچاننا) اور یہی مطلب ہے اُس حدیث کا کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ (ہر شخص فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے)، یعنی "کوئی چیز جو خلاف فطرت ہو اور انسان کی دماغی قوتوں اور روحانی خوشیوں اور دنیاوی ترقیوں کو روکے۔ اسلام اُس کا کبھی حامی نہ ہوگا" "مسلمان فقط اپنی بہادری اور شجاعت پر نازاں رہے اور زمانے کی تبدیلی کا اندازہ نہ کر سکے۔ دنیا میں وہ ہر جگہ طرح طرح نیچے ہی نیچے گرتے گئے۔ اپنی کوتاہیوں کو اُنہوں نے قسمت کے سر تھوپا اور آپ غفلت کی نیند سو

رہے۔ وہ اپنی کاہلی کے باعث اسلامی اصولوں پر جدید حالات کی روشنی ڈالنے سے قاصر رہے۔

اسلامی قوانین

اسلامی شرع و قوانین کے جامد ہوجانے کی یہ وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ عباسیہ سلطنت کے شروع میں جب یونان کے فلسفے کا اثر سے عقلیت کی تحریک پھیلی اور مسائل دین میں اختلاف پیدا ہوا تو قدامت پسندوں نے شریعت کی قیود کو اور سخت کردیا دوسرے راہبانہ تصوف کے اثر سے جو زیادہ تر غیر اسلامی فضا میں پھولا پھلا بعض نہایت قابل مسلمان عملی کاموں سے کنارہ کش ہوگئے اور نظام شریعت معمولی لوگوں کے ہاتھ میں آگیا جن کی عوام اندھا دُھند تقلید کرنے لگے تیسرے تیرھویں صدی کے وسط میں بغداد کی تباہی نے اصلی اسلامی تمدن کے ساتھ اسلامی فکر اور اسلامی اجتہاد کا بھی خاتمہ کر دیا۔

ترک اسلامی تہذیب کے علمبردار نہ تھے

۱۲۵۸ء میں بغداد کی تباہی کے بعد اسلامی تمدن کا مشرق میں اور ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی تسخیر کے بعد مغرب میں خاتمہ ہوگیا۔ یہ درست ہے کہ ہسپانیہ سے مسلمانوں کے اخراج سے پہلے ہی ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے مسیحیت کے ہاتھ سے قسطنطنیہ کا شہر چھین لیا۔ اور اس کے بعد اُنہوں نے ۱۶۸۳ء میں وی آنا کا محاصرہ کرلیا۔ اور بحر روم میں لیپانٹو کی بحری جنگ (۱۵۷۱ء) تک اُن کی بحری سطوت کا ڈنکا بھی بجتا رہا لیکن سچ یہ ہے کہ ترک محض حملہ آور فاتح تھے۔ وہ اسلام کے نام لیوا ضرور تھے۔ لیکن وہ حقیقی اسلامی تہذیب کے علمبردار نہ تھے۔ مغرب میں قرطبہ کی عظمت کے مٹ جانے کے بعد بقول شخصے "ترک اور قرطبہ نہ بنا سکے"۔ اِس کے بعد مسلمانوں کی شان و شوکت کے جو نظارے دنیا نے دیکھے۔ اُن کا ہم اسلام کے نام میں فخر سے پیش نہیں کر سکتے۔ وہ ایسے ہی کام تھے۔ جیسے تاریخ کی آنکھوں نے اور ملکوں میں اور قوموں کو کرتے دیکھا۔ لیکن اِسے قاعدہ کلیہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً ہندوستان کو ذلّت سے نکالنے میں مسلمان حکمرانوں نے نوعِ انسان کی بڑی بھاری خدمت انجام دی۔ جیسا کہ خود بعض ہندوؤں نے اعتراف کیا ہے۔

تیرھویں صدی کے شروع سے مسلمانوں کی اخلاقی پستی کے باعث اسلام کی اصلی قوت روز بروز کمزور پڑتی گئی۔ اور پانچ صدیوں تک یہی انحطاط کی حالت برقرار رہی۔ گو اسی زمانے میں اُدھر مغرب میں ترکوں نے اور اِدھر مشرق میں پٹھانوں اور ایرانیوں اور مغلوں نے اپنی فوجی طاقت کی بنا پر اسلامی جھنڈا دُنیا کے سامنے بلند کئے رکھا۔

قلب اسلام میں زندگی کی برقی لہر

پھر جب اٹھارویں صدی کے شروع میں اُدھر ترکوں کی اور اِدھر مغلوں کی طاقت سرنگوں ہونے لگی۔ اور ایسا معلوم ہوا۔ کہ اب اسلام ہر حیثیت سے زوال پر آمادہ ہونے کو ہے تو عرب کے صحرا میں یعنی عین قلب اسلام کے اندر زندگی کی اِک برقی رَو دوڑ گئی۔ یعنی وہابی تحریک اُٹھی جس سے بعد میں طرابلس کی سنیوسی تحریک، ایران کی بابی تحریک اور ترکی و مصر و ہند کی (پان اسلامک یعنی) اتحاد اسلامی کی عالمگیر تحریک پیدا ہوئی۔ یہ امر غور کے قابل ہے۔ کہ اگرچہ وہابی تحریک نے ماضی کو تنقیدی نظر سے نہ دیکھا۔ لیکن وہ خالصۃً آزادی کی روح کا ایک زبردست اظہار تھی۔ جس نے دنیائے اسلام کے مردہ جسم میں از سرِ نو اِک جان سی ڈال دی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ قدرت کو ابھی یہ منظور نہ تھا کہ اسلام گئی گذری قوموں کے زمرے میں شامل ہو کر مٹی میں مٹی ہو جائے۔ بلکہ اُسے اسلام کو دوبارہ زندہ کر کے دنیا میں اُس سے کچھ کام لینے تھے۔ جن کی نوعیت ابھی زمانے کی آنکھوں سے پوشیدہ تھی۔

مسلمان ملکوں میں آفت پر آفت آئی۔ ترکی کے یورپی علاقے ایک ایک کر کے اُس کے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی۔ اُنیسویں صدی کے شروع میں خود ہماری آنکھوں نے اسلامی ممالک پر بجلیاں گرتی دیکھیں۔ طونس اور الجیریا پہلے چھن چکے تھے۔ مصر کی آزادی بمشکل نام کو باقی تھی۔ افغانستان ایک محروسہ علاقہ بن چکا تھا۔ عرب کے اطراف و جوانب پر انگریزوں کی گرفت تھی۔ اب مراکش اور طرابلس لُٹ گئے۔ ایران کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔ بلقانی ریاستیں مل کر ترکی پر ٹوٹ پڑیں۔ اس کے بعد جنگِ عظیم آئی۔ اسلامی ملکوں نے ایک کروٹ لی۔ تو غنیم نے ایسا چھاپہ مارا۔ کہ ساری رہی سہی قوت گویا ایک آن کی آن میں ختم ہوگئی

لیکن نہیں یہاں کچھ اور ہونے والا تھا ؎

عروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا + سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے + تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

اور شاعر قوم نے یہ بھی دیکھا کہ ؎

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے + شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

جنگِ عظیم اور ترکوں کی زندگی

جنگِ عظیم میں مر جانے کے بعد ترکی کا دوبارہ جی اُٹھنا دنیائے حاضرہ کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ مصطفےٰ کمال کی فتوحات نے اسلامی دنیا میں بجلی سی دوڑا دی۔ یورپ کی تمام کامران طاقتیں ایک طرف تھیں "مرحبا"

دوسری طرف۔ یہ غیر متوقع فتح لاکھوں اُمیدوں کا عنوان بن گئی۔ عالمِ اسلام سے اللہ اکبر کی صدا اُٹھی۔ ایران نے رہائی پائی۔ عرب آزاد ہؤا، افغانستان، مصر، عراق اپنی باگ ڈور آپ سنبھالنے لگے۔ شام نے آزادی کا وعدہ لے لیا۔ فلسطین نے جان و مال کی بازی لگا دی۔ ۱۹۳۷ء میں شاید صدیوں کے بعد چند اسلامی طاقتوں نے ایک اسلامی اتحاد قائم کیا۔ یعنی ترکی، عراق، ایران اور افغانستان کے درمیان سعد آباد کا معاہدہ ہو گیا۔ اُمید کی جاتی ہے کہ عنقریب اور اسلامی ممالک بھی اس معاہدے میں شریک ہوں گے۔ اس بیسویں صدی میں جب کہ دین مذہب کا مضحکہ اُڑانا بعض حلقوں میں ترقی کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے۔ ایک اسلامی اتحاد کا قیام اور اُس کی توسیع کی قوی اُمید فی الواقع ایک معجزے سے کم نہیں۔ اور تو اور ہندوستان کے مسلمان بھی باوجود اپنی جبلی کمزوریوں اور تفرقوں کے اپنے تئیں ایک اسلامی قومی جمعیت میں مجتمع و منظم کرنے کے آرزومند نظر آتے ہیں۔

ہندوستان میں اسلام کی کہانی

قدرتی طور پر ہمارے لئے ایک خاص دلچسپی اور اہمیت رکھتی ہے کیونکہ گو ہمیں اپنے روحانی سرچشمے سے دلی لگاؤ ہے۔ لیکن اس سرچشمے سے جس ندی کو ہمارے روحانی بزرگ کاٹ کر یہاں لائے تھے اب اُسی کے کنارے ہماری زندگیاں اُمید و بیم کی حالت میں گزر رہی ہیں۔

مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں لیکن یہیں وہ تقریباً سات صدیاں حکومت کر چکے ہیں۔ اور اس ملک کی اکثریت پر، یہاں کے سارے ماحول پر اُنہوں نے ایک خاص اثر چھوڑا ہے جس کو برقرار رکھنے کیلئے آج اُنکی قومی روح تڑپ رہی ہے۔

مسلمانوں کی آمد پر ہندوستان کی معاشرتی، تمدنی اور مذہبی حالت بہت خراب تھی گو یا ایک زمانے میں ہندوؤں کے تمدن نے اس ملک کو بام ترقی پر پہنچا دیا تھا۔ اور زندگی کے مختلف شعبوں میں کمال حاصل کیا تھا۔

مسلمان جب یہاں آئے تو اُنہوں نے دیکھا کہ اُنکے اور ہندوؤں کے مذہب و معاشرت میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن باوجود اسکے اُنہوں نے رواداری سے کام لیا اور عام طور پر نہ صرف ہندوؤں کے مذہب میں مطلق مداخلت نہ کی۔ بلکہ خود اورنگزیب نے ہندوؤں کے مندروں کے لئے جاگیریں عطا کیں۔ یہ درست ہے کہ بعض حملہ آوروں نے لُوٹ مار کی۔ لیکن کس قوم کی تاریخ ایسے واقعات سے خالی ہے۔ خود آریاؤں نے ہندوستان کے اصلی باشندوں کے ساتھ جو سلوک کیا۔ اُس کے مقابل میں بیچارے محمود غزنوی کے حملے بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ گو اب یہ بخوبی ثابت ہو چکا ہے۔ کہ جب تک پنجاب کے راجہ جے پال نے غزنی پر متعدد حملے نہ کئے۔ محمود نے ہندوستان کا رُخ نہ کیا۔ اسلام ہر مسلمان حملہ آور اور حکمران کے طرزِ عمل کا ذمہ وار نہیں بننا چاہتا۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان حملہ آوروں اور حکمرانوں پر الزامات بہت کچھ انگریز اور بعض ہندو مؤرخین کی زیادتی اور تعصب کی تخلیق ہیں۔ پروفیسر بی ایم سین لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ کو از سرِ نو لکھنے اور اُس میں سے دل آزار باتیں نکال دینے کی اشد ضرورت ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان کی بہتری کے لئے جو کچھ کیا۔ اُس کا اعتراف پروفیسر رام پرشاد کھوسلہ، مسٹر ایم این رائے اور دوسرے ہندو مصنفین اب صاف لفظوں میں کر رہے ہیں۔ مسٹر کھوسلہ مغل حکومت کے بڑے مدّاح ہیں۔ حکومت نرم دل تھی۔ رعایا خوش تھی اور خوشحال تھی۔ مغلوں کا عدل و انصاف دنیا کے لئے ایک نمونہ تھا۔ مغل گو کہنے کو مطلق العنان تھے۔ لیکن اُن کے پیشِ نظر ہمیشہ رعایا کی بہبود تھی۔ مسٹر کھوسلہ کی رائے ہے کہ اگر مغلوں کی حکومت ہند میں قائم رہتی تو ہندو مسلمانوں کا مسئلہ کبھی پیدا ہی نہ ہوتا۔ مسٹر رائے کہتے ہیں کہ ہندو مت میں اسلام کے آنے سے بیداری پیدا ہوئی اور کبیر، نانک، تکارام اور چیتنیہ وغیرہ جیسے مصلحین پیدا ہوئے۔ جنہوں نے ہندو مذہب کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس ہندوستان میں جس میں ذات پات نے پڑوسی کو پڑوسی کا غلام بنا دیا تھا۔ جس میں سیاسی اتحاد نام کو باقی نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ چند نیک دل علماء میں غور و فکر کا زبردست مادہ موجود تھا۔ لیکن اکثر لوگ مذہبی رسوم و توہمات میں دھنس کر عمل کی سرگرمیوں کے ناقابل ہو گئے تھے اُس ہندوستان میں جب مسلمان فاتحین کا قدم آیا۔ تو یہ سویا ہؤا ملک بیدار ہو گیا۔ ڈرا، گھبرایا، کانپا لیکن جاگ اُٹھا۔ اور اک نئی زندگی سے دوچار ہؤا۔ برابری، بھائی بندی، آزادی، کوئی پروہت نہیں، کوئی شودر نہیں۔ کوئی اونچا نہیں، کوئی نیچ نہیں، نہ مورتیوں کا پوجنا نہ بھینٹ چڑھانا، نہ آواگون کی مسلسل زنجیریں۔ صرف آسمان پر ایک خدا اور زمین پر اُس کے بندے سب آپس میں اور خدا کے سامنے برابر، ان خیالات نے بہت سے لوگوں اور بالخصوص بعض پچھڑے مذہبی آدمیوں اور نیچ ذاتوں پر بے حد اثر ڈالا۔ اور وہ خود بخود اس سادہ آزادی بخشنے والے مذہب کی طرف کھچے چلے آئے۔ وحدانیت کی تلوار نے کثرت کی گتھیوں کو کاٹ کے رکھ دیا۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستان کا پہلی بار بیرونی دنیا سے ایک گہرا رشتہ قائم ہو گیا۔ مسلمانوں میں جوش اور ولولہ اور جہانگیری اور جہانبانی کے جو جذبات تھے۔ ہندوستان کے باشندوں کی غم پسندی اور عزلت گزینی میں اُن سے ایک حرکت پیدا ہوئی۔ غرض ہندوستان وہ ہندوستان نہ رہا۔ موجودہ

ہندوستان ہیں مسلمانوں کا خاص حصہ ہے۔ ہندوستان کا نام بھی مسلمانوں ہی کا دیا ہوا ہے۔

عہد اسلامی سے تاریخ میں انقلاب

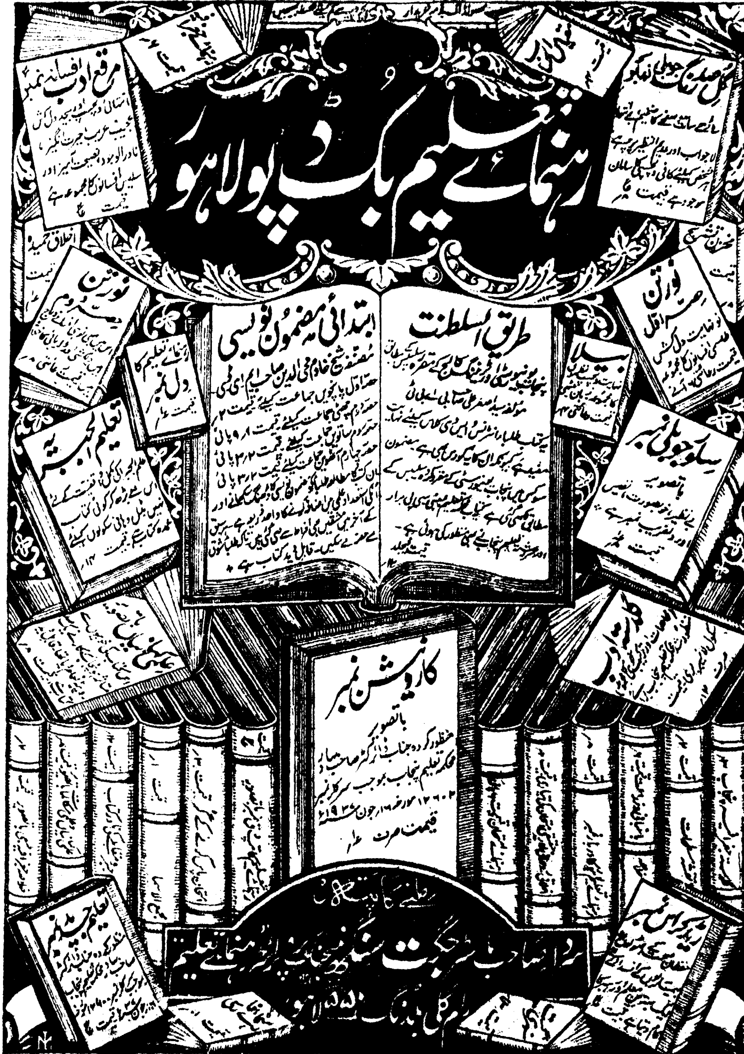
مسلمانوں کا عہد شروع ہوتے ہی تاریخ کا رُخ بدل جاتا ہے۔ ایک دلیر فاتح زندہ قوم کا سیلاب آتا ہے۔ جو صدی ڈیڑھ صدی میں سینکڑوں ہزاروں میل کی مسافت طے کر جاتا ہے۔ لیکن یہ لوگ نرے فاتح نہ تھے۔ فتوحات کے بعد اُنہوں نے یہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ اور ایک باقاعدہ حکومت قائم کر کے ملکی نظم و نسق اور رفاہِ عام کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ مثال کے طور پر صرف اک فیروز تغلق کے عہد میں ایک ۱۰۰ سو نہریں، دو ۲۰۰ سو سرائیں۔ پانچ ۵۰۰ سو شفاخانے ایک ۱۰۰ سو پُل اور بیسیوں قسم کے اور مفید ادارے قائم ہُوئے۔ محمد تغلق کے عہد میں صرف دہلی کے شہر میں ایک ہزار چھوٹے بڑے مدرسے اور ستّر شفاخانے تھے جن میں غربا کا مفت علاج ہوتا تھا۔ شیر شاہ نے صرف پانچ سال حکومت کی۔ لیکن اُس کی انتظامی اصلاحات سے فی الحقیقت مغلیہ عظمت کی بنیاد پڑی۔ مغلوں کی سلطنت نے تاریخ ہند کا ایک نیا ورق پلٹا۔ یکے بعد دیگرے چھ زبردست فرماں روا تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہُوئے۔ جن کے عہد میں دو سو سال تک ہندوستان میں ایسا امن و امان قائم رہا اور ملک نے ایسی ترقی کی۔ کہ صدیوں میں دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر شاہجہان، اورنگ زیب ان کا شہرہ مشرق سے مغرب تک جا پہنچا۔ دنیا بھر میں مغل اعظم کا چرچا تھا۔ حکومت کا نظم و نسق ایسی مضبوط بنیادوں پر رکھا گیا۔ کہ آج تک اُس کی کئی خصوصیات حکومت کا جزو ہیں۔

عہدِ مغلیہ کے مادی و علمی کارنامے اب تک ہندوستان کی معاشری زندگی کا جزو بنے ہوئے ہیں۔ ہندوستانی خوراک، لباس، طرزِ بود و باش، گفتگو آداب مجلس یہ جو کچھ آج ہیں خاصی حد تک مغلیہ وقتوں کی ہی ایجادات ہیں۔ پھر فنونِ لطیفہ میں مغلیہ نقاشی، مغلیہ فنِ تعمیر اور علم ادب اور شاعری اور موسیقی اور مصوری کا مذاق یہ سب مغلوں ہی کے زمانے کی تخلیق ہیں۔ صرف اِک تاج محل اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ کہ مغلیہ تہذیب دنیا کی عظیم ترین تہذیبوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اُن کی شائستگی اور علم پروری داد کے لائق تھی اورنگ زیب کے عہد میں صرف ٹھٹہ (سندھ) میں بقول ہملٹن ۴۰۰ مدرسے تھے۔ اور میکس مولر کہتا ہے کہ بنگال میں انگریزوں کی آمد کے وقت اسّی ہزار مدرسے تھے۔ میجر باسو نے لکھا ہے کہ وہ دولتمندی اور آرام اور چین کا نقشہ جو شاہجہان کے وقت میں دیکھنے میں آتا تھا۔ بلاشبہ بے مثل و بے نظیر تھا۔

ایک انگریز سیاح کہتا ہے کہ اُس زمانے میں شہر آگرہ شہر لندن سے زیادہ بڑا تسلیم کیا جاتا تھا۔ ملک میں قسم قسم کی صنعتیں پھولیں پھلیں۔ جن سے ہندوستان ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ ہندوستان میں جہاز تک بنتے تھے یہاں تک کہ انگریز اور ڈچ لوگوں نے اپنے کچھ جہاز یہاں بنوائے۔ سُورت کا ایک تاجر عبدالصمد کئی سَو تجارتی جہازوں کا مالک تھا۔ ملک کا سکّہ اُس وقت کے تمام یورپی سکّوں پر فوقیت رکھتا تھا۔ پروفیسر برج نرائن اپنی کتاب "ہندوستان کی معاشی زندگی" میں لکھتے ہیں۔ کہ اُس زمانے کا مزدور اوسطاً آج کل کے مزدور سے زیادہ خوش حال تھا۔ رواداری کی انتہائی مثال اکبر کی حکمت عملی ہے۔ جس نے ہندوؤں کا دل موہنے کے لئے ایسی ایسی تدابیر اختیار کیں۔ جن سے مسلمانوں کے دل میں بعض جائز شکایات پیدا ہو گئیں۔ اور آگے چل کر اورنگ زیب کے عہد میں اُن کا تدارک ضروری سمجھا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اکبر اور خصوصاً جہانگیر اور شاہجہان کے عہد میں ان بادشاہوں کی نرمی اور رعایا پروری سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر بعض مفسدہ پرداز ہندوؤں نے مسلمانوں پر ظلم و تعدی کرنا شروع کر دیا تھا جیسا کہ شاہجہان نامہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہندو مسلمان عورتوں سے بہ جبر شادی کرتے تھے اور اُن کو گھروں میں ڈال لیتے تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مسجدوں کو توڑ کر اپنی عمارتوں میں داخل کرتے تھے۔ یا اُن کی جگہ مندر بنا لیتے تھے۔ مسلمان ان باتوں سے بہت آزردہ تھے۔ اورنگ زیب نے صرف اِن زیادتیوں کی روک تھام کی۔ اُس میں بعض اور نقائص سہی۔ لیکن اُس نے کبھی کسی قسم کا کوئی ظلم نہیں۔ بلکہ بقول پروفیسر کھوسلہ "عدل میں اورنگ زیب اپنے سب بزرگوں سے سبقت لے گیا۔ ملک کا ادنےٰ سے ادنےٰ آدمی بادشاہ تک رسائی پا سکتا تھا۔ مشہور بنگالی عالم سر پی رائے لکھتے ہیں۔ کہ "اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا گورنر جنرل بنایا۔ وائسرائے بنایا یہاں تک کہ اُس نے خالص اسلامی صوبے افغانستان پر بھی جو نائب دارالسلطنت مقرر کیا۔ وہ ہندو راجپوت ہی تھا۔" پروفیسر کھوسلہ اپنی کتاب "مغل بادشاہت اور اُمراء" میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کے مغلیہ شاہنشاہوں کے حق میں ہمیں یہ بات ماننی پڑتی ہے۔ کہ وہ عام طور پر اُس زبردست طاقت کا جو اُنہیں حاصل تھی۔ غلط استعمال نہ کرتے تھے اُن کی استبدادی بادشاہت دراصل عوام کی دلی حمایت پر مبنی تھی۔ اور سیاسی طور پر اُنہوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ برادری کا درجہ عطا کیا۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو مقامی حالات کے سانچے میں ڈھال لیا اور یہی اُن کی طاقت

"کارا زتھا" یہ ہے ہندوستان میں مسلمانوں کا کارنامہ۔ اس بیان کے بعد کسی کا یہ کہنا کہ ہندوستان کے مسلمان یہاں اجنبی بنے رہے۔ یا اب اجنبی اور غیرملکی ہیں خود ہندوستان پر ظلم کرنا ہے۔

اقتباس از مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل مصنفہ میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لار



افکارِ تازہ

ہاں انہی نظروں سے پھر دیجے فریبِ التفات
میری ہستی سے مجھے پھر دُور کرتے جائیے

حاصلِ فکر و نظر ایک بھی جلوہ نہیں
اب نہ رہا غالباً دل بھی تری جلوہ گاہ
"معارف"

یہ کس کی ہے تجلّی گاہ کس کا آستانہ ہے
تڑپ اُٹھے ہیں کیوں سجدے جبیں میں نے کہاں رکھدی
فنا انجام ہے میرا فنا کی سمت مائل ہوں
جھکی جو شاخِ گُل اس پر بنائے آشیاں رکھدی
"عالمگیر"

دام و قفس کی یاد نہیں چھوڑتی ہمیں
آزاد ہو کے اور گرفتار ہو گئے

ہزار دل کو مٹا کر مجھے دیا اک درد
اس ایک درد کو پھر دل بنا دیا تُو نے

وہ بھی ہے اِک مقامِ عشق جہاں
ہر تمنّا گناہ ہوتی ہے

تھا مژدۂ بہار پیامِ شکستِ رنگ
دل خوں ہو گیا گُل و گلزار دیکھ کر
"دلگداز"

آس اُس در سے ٹُوٹتی ہی نہیں
جا کے دیکھا نہ جا کے دیکھ لیا

"ادبی دنیا"

خودکشی کا راز

طبیہ کالج کے ایک طالب علم ناصر خاں نے نشاط ہوٹل کے کمرہ ۲۱ میں منتقل ہونے کا تہیہ کر لیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں گذشتہ تین ہفتے میں تین اشخاص کھڑکی کے چوکھٹے سے لٹکے ہوئے پائے گئے تھے۔ تعجب خیز امر یہ تھا کہ تینوں اموات جُمعہ کے دن واقع ہوئیں۔

پہلا شخص ایک جاپانی سوداگر تھا۔ اُس کی لاش ہفتے کی شام کو ملی تھی۔ لیکن ڈاکٹروں کی رائے یہ تھی کہ موت جمعہ کی شام کو پانچ اور چھ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ اس کا جسم ایک ہک میں لٹکا ہوا تھا اور پردے کی موٹی ڈوری اُس کے گلے میں تھی۔ کھڑکی نیچی ہونے کی وجہ سے اُس کی ٹانگیں زمین سے لگی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُسے اپنے ارادے کی تکمیل میں حد درجہ قوت ارادی سے کام لینا پڑا ہوگا۔ مزید معلومات بہم پہنچنے پر یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ تھا۔ علاوہ ازیں اُس کی آمدنی بھی معقول تھی اور وہ اپنی موجودہ زندگی سے خوش تھا مگر اُس کی لاش کے پاس کوئی تحریر یا نشان ایسا نہ ملا جس سے خودکشی کی وجہ معلوم ہوسکتی۔

دوسرا شخص ایک ایکٹر تھا جو اس واقعہ کے دو دن بعد اسی کمرہ میں آکر ٹھہرا۔ جمعہ کی شام کو جب وہ تھیٹر میں نہ پہنچا تو منیجر نے ایک نوکر اُس کو دیکھنے کے لئے بھیجا۔ نوکر نے آکر دیکھا۔ تو اس کا مردہ جسم کھڑکی میں بالکل اسی طرح لٹک رہا تھا جس طرح کہ جاپانی کا۔ یہ اپنے تھیٹر کا سب سے زیادہ ہردلعزیز ایکٹر تھا اور بہت زیادہ تنخواہ پر کام کر رہا تھا۔ اس کی عمر کوئی پچیس کے لگ بھگ ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے پورا لطف اُٹھا رہا تھا۔ اس مرتبہ بھی کوئی تحریر نہ ملی اور اس موت کی وجہ بھی صیغہ راز میں رہی۔

ہوٹل کا مالک نور احمد ان حادثات سے بہت پریشان ہوا۔ اور فوراً ہی اُن کی اطلاع سپرنٹنڈنٹ پولیس کو دی۔ سپرنٹنڈنٹ نے نہایت ہی ہمدردی ظاہر کی اور کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں میں اسی وقت رستم علی خاں انسپکٹر پولیس کو آپ کی مدد کے لئے بھیج رہا ہوں۔ اور کچھ دیر بعد خود بھی موقعہ واردات پر پہنچوں گا۔

رستم علی خاں نہایت جہاندیدہ انسپکٹروں میں سے تھا۔ اُس نے خون اور ڈکیتی کے بہت سے سربستہ راز کھولے تھے اور ایسی پُراسرار جگہوں میں جانے سے بالکل نہ گھبراتا تھا۔ اُس نے کہا کہ اُس کمرہ میں میں خود رہونگا اور اس راز کو معلوم کر کے چھوڑوں گا۔ چنانچہ رات کو کھانا کھانے کے بعد وہ نہایت اطمینان سے لیٹ گیا۔

اس کے بعد ہر روز صبح اور شام کو رستم علی خاں تھانہ جاتا اور اپنا بیان لکھواتا۔ چند روز تک اس کے بیانات میں کوئی بات قابل ذکر نہ آئی۔ لیکن منگل کی شام کو اُس نے بتایا کہ میرا خیال ہے میں نے اس راز کو معلوم کر لیا ہے۔ مگر جب اس سے تفصیل طلب کی گئی تو اُس نے کہا آپ مہربانی فرما کر اس کے لئے زور نہ دیں۔ کیونکہ میں ابھی یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا تعلق اُن دو اموات سے بھی ہے۔ نیز اُسے یہ بھی خیال تھا کہ اگر یہ بات غلط ثابت ہوئی تو میرا مضحکہ اُڑایا جائے گا۔

پس اُس نے وہ بات دل ہی دل میں رکھی۔ اور کسی سے اس کا ذکر نہ کیا۔ جمعرات کی شام کو وہ کچھ زیادہ سنجیدہ تھا۔ مگر اب بھی اُس نے اپنے بیان میں اس بات کا ذکر نہ کیا۔ جمعہ کی صبح کو وہ کچھ جوش میں آیا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پس اُس نے کسی قدر مذاق اور کسی قدر سنجیدگی کے عالم میں کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھڑکی میں کوئی غیر معمولی کشش ہے لیکن یہ نظریہ ابھی تک اُس کے سامنے تھا کہ خودکشی کی اموات سے اس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اُسی روز شام کو وہ تھانہ نہ پہنچا۔ دیکھنے پر معلوم ہوا۔ کہ وہ اُسی کھڑکی میں ہک سے لٹکا ہوا تھا اس صورت میں بھی تمام حالات بالکل پہلے سے تھے۔ ٹانگیں فرش سے رگڑ کھا رہی تھیں۔ کھڑکی بند تھی اور دروازہ کھلا۔ لٹکنے کے لئے پردے کی رسّی استعمال کی گئی تھی۔ اور موت تقریباً چھ بجے شام واقع ہوئی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور زبان باہر لٹک رہی تھی۔

تیسری خودکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہوٹل کے کمرے دھڑا دھڑ خالی ہوگئے اور سوائے ایک غریب کلرک کے باقی سب لوگ اِدھر اُدھر چل دیئے۔ اِس غریب کو یہ فائدہ پہنچا۔ کہ کمرہ کا کرایہ ایک تہائی ہوگیا۔ اور ہوٹل کا مالک پہلے سے زیادہ مہربانی سے پیش آنے لگا۔ نور احمد کے لئے اس وقت بڑی مشکل یہ تھی کہ اخبارات اِن واقعات کے متعلق تقریباً خاموش تھے۔

انتخابات کے دن تھے۔ اور گہما گہمی کا زمانہ۔ اُدھر اُفق مغرب پر سیاسی جنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ تمام اخبارات کے کالم انہی خبروں سے سیاہ کئے جاتے تھے۔ کُھلے دن ہوتے تو ممکن تھا۔ اخبارات کے ایڈیٹر انہی واقعات پر طرح طرح کی حاشیہ آرائیاں کرتے۔ نت نئی سرخیاں ڈھونڈتے مگر اب تو اس کے متعلق جو خبر بھی چھپتی تھی وہ صرف اتنی جتنی کہ پولیس والے بیان کرتے اور وہ بھی کہیں کونے کھترے میں جہاں کسی کی نظر شاذ ہی پڑے۔

ان واقعات کے متعلق ناصر خاں کی معلومات بہت محدود تھیں۔ اسے صرف انہی باتوں کا علم تھا جو اُس نے اخبارات میں پڑھی تھیں۔ بہرحال آخری خودکشی کے دو ہفتے بعد وہ اس کمرے میں آ اُترا اور اُس کے بعد جو کچھ اُس کے تجربہ میں آیا وہ اپنی ڈائری میں لکھتا گیا۔

ناصر خاں [illegible] طبیہ کالج کی ڈائری

پیر ۲۰ فروری۔ کل رات میں اس کمرے میں آگیا تھا۔ بستر کھول دیا تھا۔ سوٹ کیس اور کتابیں قرینے سے رکھ دی تھیں۔ رات بھر آرام سے سویا۔ کوئی گھبراہٹ یا پریشانی نہیں ہُوئی۔ صبح چھ بجے نوکر نے جگا دیا۔ میں اُٹھا، نہایا اور کپڑے پہن کر چائے کے لئے تیار ہو بیٹھا۔ ہوٹل کے مالک نے میرے لئے بہت عمدہ چائے بھیجی۔ چائے پی کر کچھ دیر بیٹھا۔ اخبار پڑھتا رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کمرے میں رہنا خطرہ سے خالی نہیں لیکن میں یہ بھی جانتا ہُوں کہ اگر میں نے اس راز کو کھول لیا۔ تو تقدیر جاگ اُٹھے گی۔ دنیا میں روٹی کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ ممکن ہے۔ میرے لئے ترقی کرنے کا یہی وسیلہ ہو۔ میں اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دُونگا اور اس عقدہ کو حل کرنے کی پوری کوشش کرونگا۔ اس جگہ آنے کے لئے اور لوگوں نے بھی ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن نہ جانے کیوں سپرنٹنڈنٹ نے مجھے ہی اس کام کے لئے موزوں سمجھا۔ اب میرے پاس ایک ریوالور ہے اور ایک پولیس والوں کی سیٹی۔ علاوہ ازیں ٹیلیفون ہر وقت میرے سامنے رہتا ہے۔ ہوٹل کے مالک نور احمد نے مجھے ہر طرح کی آزادی دی ہُوئی ہے۔ میں جو چاہوں کھاؤں اور جو چاہوں منگواؤں۔ اُس کے لئے مجھے ایک کوڑی بھی ادا نہ کرنی پڑے گی۔ رات کو پہرہ دینے والے سپاہیوں کو حکم ہے کہ وہ بار بار میرے کمرے کے پاس سے گذریں اور سیٹی بجتے ہی فوراً میری امداد کو پہنچیں۔

منگل یکم مارچ۔ کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ نہ کل اور نہ آج۔ ہوٹل کا مالک نور احمد بار بار میرے کمرے میں آتا رہتا ہے۔ اور ہر دفعہ کوئی نہ کوئی چیز میرے لئے لے آتا ہے۔ آج اُس نے خودکشی کے واقعات پھر دُہرائے ہیں۔ ایجنٹ کی خودکشی کی وجہ وہ یہ بیان کرتا ہے۔ کہ اِسے کسی جوان عورت سے محبت تھی۔ گذشتہ سال تو وہ اُس کے پاس آتی رہی۔ مگر امسال دیر سے نہیں آئی۔ جاپانی سوداگر اور انسپکٹر کے بارے میں وہ کوئی خود ساختہ وجہ نہیں بیان کر سکتا۔ میں جانتا ہُوں کہ یہ دلائل بالکل لغو اور بے معنی ہیں۔ مگر اس خیال سے کہ وہ کچھ دیر بیٹھا رہے میں اس کی باتیں سنتا رہتا ہُوں۔

جمعرات ۳ مارچ۔ ابھی تک کوئی خاص بات نہیں ہُوئی۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ دن میں کئی بار ٹیلیفون پر مجھ سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ میں اُسے کہہ دیتا ہُوں۔ کہ ابھی معاملہ بالکل درست ہے۔ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں نے اپنی کتابیں نکال لی ہیں۔ اور کام کرنا شروع کر دیا ہے یک تیر دو نشانہ۔ اس تنہائی سے دو فائدے ہونگے۔ امتحان کی تیاری بھی ہو جائیگی۔ اور یہ گورکھ دھندا بھی کُھل جائیگا۔

جمعہ ۴ مارچ ۱۲ بجے۔ ابھی ابھی میں نے نہایت عمدہ کھانا کھایا ایسا اچھا کھانا عام طور پر دعوتوں میں ہُوا کرتا ہے۔ نور احمد صاحب میری بہت تواضع کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں میں کوئی دن کا مہمان ہُوں ممکن ہے میں بھی خودکشی کر لوں۔

پردے کی نئی رسّی میں نے اچھی طرح دیکھ لی ہے۔ اس میں گرہ بہت ہی مشکل سے دی جا سکتی ہے۔ البتہ ہے بہت مضبوط۔ میرے دل میں پھانسی لینے کا کوئی خیال نہیں ہے۔ میں اپنی میز کے پاس بیٹھا ہُوں۔ دائیں طرف ریوالور رکھا ہے۔ اور بائیں طرف ٹیلیفون۔ مجھے کوئی ڈر بھی محسوس نہیں ہوتا۔ ہاں اس راز کو جاننا ضرور چاہتا ہُوں۔

چھ بجے کچھ نہیں ہوا۔ خودکشی کا وقت آیا اور ختم ہو گیا۔ اس سے انکار نہیں کہ کئی بار کھڑکی کی طرف جانے کی خواہش ضرور پیدا ہوئی لیکن اس کی وجوہات کچھ اور تھیں۔ پانچ اور چھ بجے کے درمیان سپرنٹنڈنٹ نے مجھے تقریباً دس مرتبہ بلایا۔ نور احمد صاحب بھی مطمئن ہیں کہ کم از کم ایک شخص تو ہفتہ تک اس کمرہ میں پھانسی لئے بغیر رہا۔ یہ ایک معجزہ ہے معجزہ۔

پیر ۷ مارچ۔ مجھے یقین ہے کہ اب یہاں کوئی نئی بات معلوم نہ ہوگی میرا خیال ہے کہ پہلی تین اموات محض اتفاقیہ تھیں۔ لیکن میں ابھی یہیں رہونگا اس میں میرا حرج بھی کیا ہے۔ ہر طرح کا آرام ہے۔ ہر چیز مفت ملتی ہے۔ صحت بھی اچھی ہو گئی ہے۔ اور [illegible] بڑھ گیا ہے۔ اور پھر یہ کہ میں نے

امتحان کی تیاری بھی کرلی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ٹھہرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔

بدھ ۹ مارچ۔ میں نے ایک قدم اور اُٹھایا ہے۔ بملا کا تو میں نے ذکر بھی نہیں کیا۔ میرے یہاں ٹھہرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اس خوفناک وقت میں کھڑکی کے پاس جانے کا سبب بھی یہی تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس کا کیا نام ہے۔ خدا کرے اس کا نام یہی ہو۔ یہ نام مجھے بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں آنے کے دو چار دن بعد ہی میں نے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس تنگ گلی کے پار رہتی ہے۔ اور اُس کی کھڑکی میری کھڑکی کے بالکل سامنے ہے۔ وہ وہاں پردے کے پیچھے بیٹھی رہتی ہے۔ اس سے پہلے کہ مجھے اس کی موجودگی کا علم ہو اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اور صاف طور پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ میرے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن میں اس قسم کا شخص نہیں ہوں۔ میری ہمیشہ سے عادت ہے کہ میں اپنے رشتہ کی عورتوں سے بھی بہت کم ملتا جلتا ہوں۔ اور اب اس صورت میں کہ تعلیم کے لئے لاہور آیا ہُوا ہوں اور اتنا غریب ہوں کہ اپنے نان نفقہ کا بھی انتظام نہیں کر سکتا۔ مجھے ایسی باتوں سے کیا واسطہ۔ لیکن اب چونکہ ایک بیوقوفی ہو گئی ہے اور مراسم بھی بڑھ گئے ہیں۔ اسے یُونہی چلنے دو۔

پہلے پہل تو مجھے خیال بھی نہ تھا۔ کہ میں اپنے ناواقف پڑوسی سے اس قدر میل جول بڑھاؤں گا۔ لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے اسی سے اس عقدہ کی گرہ کھل جائے۔ میں نے اُس کی طرف گاہے گاہے دیکھنا شروع کر دیا ہے اور پھر یہ بھی کہ انسان تمام دن پڑھتے پڑھتے بھی تھک جاتا ہے۔ اس سے ذرا تفریح بھی ہو جاتی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے۔ کہ وہ اس گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ اس کے گھر میں تین کھڑکیاں ہیں لیکن وہ میری کھڑکی کے مقابل بیچ والی کھڑکی میں بیٹھتی ہے۔ تمام دن پڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کے کمرے میں روشنی کبھی نہیں دیکھی۔ اور نہ اُس کی صورت اچھی طرح دیکھی ہے۔ پردے کے پیچھے اس کے بال کالے اور گھنگریالے دکھائی دیتے ہیں۔ ناک پتلی اور چھوٹی ہے۔ ہونٹ زرد ہیں اور دانت چھوٹے چھوٹے۔ اس کی پلکیں لمبی ہیں۔ اور جب وہ نظر اُوپر اٹھاتی ہے۔ تو اُس کی آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں۔ ایک بات اور ہے وہ یہ کہ اس کا لباس ہمیشہ سیاہ ہوتا ہے۔ اور اپنے ہاتھوں کو دستانوں میں چھپا کر رکھتی ہے۔ اس پر بھی اُس کی اُنگلیاں ایسی پتلی نظر آتی ہیں جیسی کسی مکوڑے کی ٹانگیں۔ میرا اور اُس کا تعلق یُونہی سا ہے۔ مگر اس پر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم دیرینہ ملاقاتی ہیں۔ ان تعلقات کی بنا یوں پڑی کہ ایک دن اُس نے میری طرف دیکھا۔ اور میں نے اُس کی طرف اور پھر ہر روز ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ایک دن جب میں نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی۔ اور میں بھی مسکرا دیا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہے۔ آج بھی ابھی ابھی میں اُس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ اور وہ ہلکا سا تبسم لئے ہُوئے پردے سے دُور چلی گئی۔

جمعرات ۱۰ مارچ۔ کل رات میں دیر تک کتابیں لئے بیٹھا رہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے بہت کم کام کیا۔ میرا بہت سا وقت بملا کے متعلق ہوائی قلعے تعمیر کرنے میں صرف ہو گیا۔ صبح اُٹھ کر جب میں کھڑکی کے پاس گیا۔ تو بملا پہلے سے وہاں موجود تھی۔ میں نے اُسے سلام کیا۔ اُس نے سر ہلا دیا اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

میں نے بہت چاہا کہ میں کچھ کام کروں مگر طبیعت اس قدر بے چین تھی کہ میں بیٹھ نہ سکا۔ پھر کھڑکی کے پاس آ گیا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اپنا پردہ ایک طرف کر دیا۔ اور اُسی لمحہ اُس نے بھی ایسا کیا اور ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم کوئی ایک گھنٹہ تک یُونہی بیٹھے رہے۔ اس کے بعد وہ اپنے کام میں لگ گئی۔

ہفتہ ۱۲ مارچ۔ دن بہت جلد گزر رہے ہیں۔ کاپی لے کر کام کرنے بیٹھ جاتا ہُوں سگرٹ سُلگا لیتا ہُوں۔ لیکن ایک لفظ نہیں پڑھتا۔ بار بار کوشش کرتا ہُوں مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ پھر کھڑکی کے پاس چلا جاتا ہُوں ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں اور گھنٹوں اسی طرح کرتے رہتے ہیں۔

کل چھ بجے شام بہت بے چینی محسوس ہُوئی۔ اندھیرا ہوتے ہی مجھے ہلکا ہلکا ڈر لگنے لگا۔ کچھ دیر میز کے سامنے بیٹھا رہا۔ مگر کھڑکی کی طرف جانے کی خواہش اس قدر بڑھتی جا رہی تھی کہ میں اس پر غالب نہ آ سکتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ میں اپنے آپ پھانسی دے لوں۔ نہیں بلکہ بملا کو دیکھنے کے لئے۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور پردے کے پیچھے جا کھڑا ہُوا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا ہونے کے باوجود وہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی اور اُس کی نظروں کے تیر میرے دل کے پار ہو رہے تھے۔ اب مجھے کچھ اطمینان سا محسوس ہُوا۔ اور میں پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

پیر ۱۴ مارچ۔ اب میں کتابوں کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ تمام تمام دن کھڑکی کے سامنے گذارتا ہُوں۔ اندھیرا ہونے پر بھی وہیں بیٹھا رہتا ہُوں۔ اور جب وہ دکھائی نہیں دیتی تو آنکھیں بند کر کے اُسے دیکھتا

رہتا ہوں۔ میری ڈائری اب بالکل بدل گئی ہے۔ اب اس میں سوائے بملا کے اور کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ یہ میرا قصور ہے مگر میں کیا کروں مجبور ہوں۔

بدھ ۱۶ مارچ۔ میں نے اور بملا نے ایک نیا کھیل شروع کر دیا ہے اور ہم تمام دن یہی کھیلتے رہتے ہیں۔ میں اسے اشارہ کرتا ہوں اور وہ مجھے میں اپنی انگلیوں سے شیشے پر ٹپ ٹپ کرتا ہوں تو وہ بھی کرتی ہے۔ اور اتنی جلدی کرتی ہے کہ میں حیران رہ جاتا ہوں۔ کہ اسے میری حرکت کا پہلے سے کیوں کر پتہ لگ جاتا ہے۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہوں تو وہ بھی مسکرا دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ جو کچھ میں کرتا ہوں وہ بھی کرتی ہے۔ بلکہ ابھی میرا ارادہ ہوتا ہے اور اس سے اس حرکت کا اظہار ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دلوں میں ٹیلیفون لگا ہوا ہے۔ بعض اوقات اُس کی اور میری حرکات ایک ہی وقت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور ان میں ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی میں مختلف حرکات کرتا ہوں۔ پھر انہیں دُہراتا ہوں۔ تیسری مرتبہ پھر کرتا ہوں مگر تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ چوتھی مرتبہ پھر کرتا ہوں۔ اور کہیں کہیں ترمیم کر دیتا ہوں۔ لیکن حیرانی یہ ہے کہ وہ میرے ساتھ ساتھ سب کچھ کرتی رہتی ہے اور ذرہ برابر بھی غلطی نہیں کرتی۔ میرا تمام وقت یونہی گذر جاتا ہے۔ اور میں بالکل یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں نے وقت ضائع کیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کوئی نہایت ضروری کام انجام دیا ہے۔

جمعرات ۱۷ مارچ۔ آج کچھ عجیب طرح کا جوش چڑھا ہوا ہے۔ کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں تک کہ کھانے کے لئے بھی کوئی رغبت نہیں ہے۔ جی یہ چاہتا ہے کہ بس کھڑکی کے پاس بیٹھا رہوں اور اُسی کے ساتھ کھیلتا جاؤں۔ میرا خیال ہے کہ کل ضرور کوئی نہ کوئی بات ہوگی

جمعہ ۱۸ مارچ۔ ہاں ہاں! آج ضرور کوئی بات ہوگی۔ میں بہت اُونچا بولتا ہوں تو مجھے اپنی آواز سُنائی دیتی ہے۔ یہ ——— یہ ہے وہ بات جس کے لئے میں یہاں ٹھیرا رہا ہوں۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ مجھے ڈر محسوس ہو رہا ہے۔ اور سب سے بڑا ڈر یہ ہے کہ جو حال مجھ سے پہلے اس کمرہ میں ٹھہرنے والوں کا ہوا ہے وہی میرا بھی ہوگا۔ جی یہ چاہتا ہے کہ زور سے چیخ ماروں۔

چھ بجے۔ میں چاہتا تھا کہ جلدی سے کچھ لکھ لوں اور پھر اپنا کوٹ اور پگڑی پہن لوں۔ پانچ بجے کے بعد سے میری طاقت زائل ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ چھ بجنے پر ضرور کچھ نہ کچھ ہو جائیگا۔ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا مگر کھڑکی کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی مجھے کھینچ رہا ہے

خودکشی کرنے والوں کی لاشیں مجھے اپنے سامنے نظر آ رہی تھیں۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ مجھے بملا بھی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ میں خودکشی کروں۔ مجھے اگر ڈر لگتا تھا تو بملا اور اس کھڑکی سے۔ میں چاہتا تھا۔ کہ کھڑکی کی طرف نہ جاؤں۔ مگر مجبور تھا . . . .

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جھٹ رسیور اُٹھایا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سُنوں۔ میں نے چلا کر کہا۔ آؤ ——— آؤ اور جلد آؤ۔

بجنے کے ساتھ ہی میری گھبراہٹ دُور ہو گئی۔ اور میں ٹھیک ہو بیٹھا۔ اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کیا۔ اور سوچا کہ سپرنٹنڈنٹ کو کیا بتانا چاہیئے۔ اس کے بعد ہی میں کھڑکی کے پاس گیا۔ اور بملا کی مزاج پُرسی کی۔ اُس نے بھی میرا مزاج پوچھا اور مسکرا دی۔

اس کے پانچ منٹ بعد سپرنٹنڈنٹ صاحب آ گئے۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ بالآخر میں نے ان تمام واقعات کی۔ وجہ معلوم کر لی ہے لیکن آپ مہربانی فرما کر مجھ سے آج نہ دریافت فرمائیں۔ مستقبل قریب میں ہی میں اس کے متعلق قابل ذکر معلومات بہم پہنچاؤنگا۔ میری غیر معمولی حالت اور مزاج کو دیکھتے ہُوئے اُنہوں نے کہا کوئی بات نہیں۔ آپ اپنے کام میں لگے رہیئے۔ اور جس وقت بھی میری ضرورت ہو۔ مجھے اطلاع دیجئے۔ اس کے بعد اُنہوں نے کہا۔ آیئے میں آپ کو ذرا باہر سیر کرا لاتا ہوں ہر وقت اکیلے بیٹھنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ میرا دل تو نہ چاہتا تھا کہ میں کمرے سے باہر نکلوں۔ مگر طبیعت پر جبر کرتے ہُوئے ہاں کر دی اور اُن کے ساتھ باہر چلا گیا۔

ہفتہ ۱۹ مارچ۔ کل رات ہم لارنس باغ میں گئے۔ شملہ پہاڑی پر پھرے۔ مانسرور ہوٹل میں چائے پی اور پھر واپس آئے۔ میری طبیعت واقعی سنبھل گئی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کا کہنا درست نکلا۔

آج صبح جب میں کھڑکی کے پاس گیا تو بملا کی نگاہیں ملامت آمیز تھیں۔ لیکن ممکن ہے یہ میرے ہی تخیل کا نتیجہ ہو۔ کیونکہ اُسے کیسے معلوم ہوا۔ کہ میں کل رات کہیں گیا تھا۔ یہ حالت ایک لمحے کے لئے رہی۔ پھر وہ مسکرا دی اور میں بھی مسکرا دیا اور ہم وہ ہی بدستور کھیلتے رہے

اتوار ۲۰ مارچ۔ آج کا دن بھی یُونہی گذرا۔

پیر ۲۱ مارچ۔ آج بھی ہم کھیلتے رہے۔

منگل ۲۲ مارچ۔ آج بھی ہم وہی کچھ کرتے رہے۔ کبھی کبھی میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے؟ میں چاہتا کیا

ہوں ؟ لیکن مجھے اس کا جواب نہیں بن پڑتا۔ کیونکہ میں سوائے اس کے ساتھ کھیلتا رہوں اور کچھ نہیں چاہتا۔ گذشتہ چند دنوں سے ہم آپس میں باتیں کرتے رہے ہیں لیکن الفاظ سے نہیں بلکہ اشاروں سے اور ہم ایک دوسرے کو خوب سمجھ لیتے ہیں۔

میرا خیال درست نکلا۔ بملا نے گذشتہ جمعہ بھاگ جانے پر مجھے ملامت کی۔ میں نے اس سے معافی مانگ لی اور اقرار کیا کہ آئندہ کبھی نہیں جاؤنگا۔ اور اُس نے میرے سراپا پر ایک محبت بھری نظر ڈال کر معاف کر دیا۔

جمعرات ۲۴ مارچ۔ میں نے ایک نئی بات معلوم کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں بملا کے ساتھ نہیں کھیلتا۔ بلکہ وہ میرے ساتھ کھیلتی ہے اُس کی وجہ سُنو۔

کل رات جب میں اپنے کھیل کے متعلق سوچ رہا تھا تو میں نے پانچ پیچیدہ حرکات لکھ کر رکھیں۔ اور گھنٹوں اُن کی مشق کی۔

آج صبح میں کھڑکی کے پاس گیا تو مزاج پُرسی کے بعد اپنی حرکات شروع کیں۔ میں حیران تھا کہ وہ اُنہیں کتنی تیزی سے دُہراتی تھی۔ اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو نوکر میرے بوٹ پالش کرا کے لایا تھا۔ میں نے بوٹ لے لئے اور دروازہ بند کر دیا۔ اتفاق سے میری نظر اُس کاغذ پر پڑی۔ جس پر میں نے چند حرکات لکھ کر رکھی تھیں۔ لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ بملا کے سامنے میں نے اُن حرکات میں سے ایک بھی نہ کی تھی تو میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ میں لڑکھڑایا اور اگر کرسی کا بازو نہ پکڑتا تو ممکن تھا گر پڑتا۔ مجھے اسی پر یقین نہ آتا تھا۔ میں نے اپنا کاغذ پھر اُٹھایا اور بار بار پڑھا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ اُن تمام حرکات میں سے جو میں نے کھڑکی کے سامنے کی تھیں ایک بھی اپنی نہ تھی۔ اسی لمحہ مجھ میں قوت پھر آ گئی۔ میں نے اُن حرکات کو بغور پڑھا اور ذہن میں بٹھانے کی پوری کوشش کی۔ پھر کھڑکی کے پاس گیا۔ اور اس بات کا خیال رکھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ لیکن جو حرکات میں کرنی چاہتا تھا اُن میں سے ایک بھی نہ کر رہا تھا۔

میں نے چاہا کہ اپنی اُنگلی ناک پر رکھوں مگر اُس کی بجائے شیشے کو چُوم لیا۔ کھڑکی کے شیشے پر ٹپ ٹپ کرنی چاہی مگر ہاتھ بالوں میں پھیرنا شروع کر دیا۔ مجھے اب معلوم ہُوا کہ بملا میری حرکات کی نقل نہیں کرتی بلکہ میں اُس کی حرکات کی نقل کر رہا ہوں۔ یہ سب کچھ میں اس تیزی اور پھرتی سے کرتا ہُوں کہ میری خود سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ سب حرکات اتنی تیزی سے کس طرح دُہرا لیتا ہوں۔

اُف۔ میں جو اس قدر مغرور تھا کہ اُس کے خیالات کی رَو اپنی مرضی سے موڑ سکتا تھا اب خود اس کے زیر اثر ہوں۔ اور اس کا اثر مجھ پر اس قدر غالب ہے کہ میں اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد میں نے اور تجربے کئے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی جیبوں میں ڈال لئے اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اب انہیں باہر نہ نکالونگا۔ پھر میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا مسکرائی اور شہادت کی اُنگلی سے میری طرف اشارہ کیا۔ میں ذرا بھی نہ ہلا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ میرا دایاں ہاتھ باہر نکلنا چاہتا ہے۔ میں نے اپنی اُنگلیوں سے جیب کے اندرونی کپڑے کو زور سے پکڑ لیا۔ لیکن ذرا سی دیر بعد ہی میری اُنگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ میں نے اپنا ہاتھ باہر نکالا۔ اور شہادت کی اُنگلی سے اسی طرح اُس کی طرف اشارہ کیا۔

اُف! میں تو یہاں انکشاف کے لئے آیا تھا۔ دفع۔ دور۔ کونسا انکشاف اور کس کا انکشاف۔ میں تو اپنی بملا کے احکام کی تعمیل کرونگا مجھے اور کسی کام سے کوئی مطلب نہیں۔

جمعہ ۲۵ مارچ۔ میں نے ٹیلیفون کی تار کاٹ دی ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ بیوقوف بڈھا سپرنٹنڈنٹ بار بار مجھے تنگ کرے۔ اور خاص طور پر اس وقت جبکہ میری قسمت کا فیصلہ ہونیوالا ہو۔

یا اللہ! میں یہ سب کچھ کیوں لکھ رہا ہوں۔ اس کا ایک لفظ بھی صحیح نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میری قلم پکڑ کر مجھ سے یہ لکھوا رہا ہے میں —— میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ کر رہا ہوں وہی لکھوں لیکن جو کچھ لکھ رہا ہوں وہی کرنا چاہتا ہوں۔ حقیقتاً میں یہ چاہتا ہوں کہ ٹیلیفون کی تار . . . . . اُف میں نے کاٹ دی۔ مجھے کاٹنی پڑی۔

آج صبح بھی ہم کھڑکی کے پاس کھڑے یہی کھیل کھیلتے رہے کل سے ہمارا کھیل بدل گیا ہے۔ وہ چند ایک حرکتیں کر دیتی ہے اور میں اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن آخر کار ہار ماننی پڑتی ہے اور اس کا ہر حکم بجا لانا پڑتا ہے۔ اس پر یہ کہ مجھے اس سے اتنی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

ہم اسی طرح کھیلتے رہے۔ دفعتہً وہ اُٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تاریکی کی وجہ سے میں اسے دیکھ نہ سکا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ اندھیرے میں غائب ہو گئی ہے۔ لیکن جلد ہی وہ اپنے ہاتھ میں میرے جیسا ٹیلیفون لئے ہوئے باہر آئی اور کھڑکی کی دہلیز پر رکھ دیا۔ پھر ایک چاقو لیا اور اُس کی تار کاٹ کر

واپس چلی گئی۔

پندرہ منٹ تک میں نے اپنے آپ کو روک رکھا۔ میرا خوف پہلے کر کہیں زیادہ ہوگیا۔ آخرکار میں ٹیلیفون اُٹھا کر کھڑکی کے پاس لایا۔ تار کاٹ دی اور اُسے پھر اُس کی جگہ پر رکھ دیا۔ ٹیلیفون کی تار اس طرح کاٹی گئی۔

اب میں میز کے سامنے بیٹھا ہُوں۔ چائے پی لی ہے۔ نوکر ابھی ابھی چائے کے برتن لے کر گیا ہے۔ میں نے اس سے وقت پوچھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میری گھڑی کا وقت صحیح نہیں ہے۔ اب پانچ بجکر پندرہ منٹ . . . . . پانچ بج کر پندرہ منٹ . . . . .

مجھے معلوم ہے کہ اگر میں نے اب بملا کی طرف دیکھا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریگی۔ اور وہی کچھ مجھے بھی کرنا پڑیگا۔ خیر کچھ بھی ہو میں اُس کی طرف دیکھتا ہُوں۔

وہ اپنی جگہ بیٹھی ہے اور مسکرا رہی ہے۔ کاش . . . . میں اپنی نظریں دوسری طرف پھرا سکتا۔ اب وہ پردے کی طرف جا رہی ہے۔ وہ رسّی نکال رہی ہے۔ اس کا رنگ سُرخ ہے۔ ایسا سرخ جیسا میری رسّی کا۔ اب وہ گرہ دے رہی ہے۔ پھسلتی ہوئی گرہ۔ اب اُس نے رسّی کو کھڑکی کے ہُک میں لٹکا دیا ہے۔

اب وہ بیٹھ گئی ہے اور مسکرا رہی ہے۔

. . . . نہیں، یہ خوف نہیں ہے۔ اسے ہم خوف نہیں کہہ سکتے۔ یہ کیفیت جس کا مجھے اب تجربہ ہو رہا ہے جنوں خیز دہشت ہے لیکن اس پر بھی میں اسے دنیا کی کسی چیز سے بدلنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ مجبوری ہے لیکن ایسی جو اپنی نوعیت اور قوت کے اعتبار سے بالکل انوکھی ہے۔ اور جس کی ناگزیر تندی کا مجھے احساس تک نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ میں کھڑکی کے پاس جا کر جو کچھ وہ چاہتی ہے کر سکتا ہُوں۔ لیکن ابھی میں اپنے آپ کو روک رہا ہُوں۔ کشمکش میں ہُوں اور چاہتا ہُوں کہ اس سے بچا رہُوں۔ لیکن میں محسوس کر رہا ہُوں کہ یہ خواہش ہر لحظہ بڑھتی جا رہی ہے پس ابھی میں اپنی جگہ پر بیٹھا ہُوا ہُوں۔ . . . . .

میں جلدی سے دوڑ کر کھڑکی کے پاس گیا اور جو کچھ وہ چاہتی تھی کر دیا۔ یعنی یہ کہ پردے کی رسّی لی۔ اسمیں گرہ دی اور اسے ہُک میں لٹکا دیا

اب میں اُس کی طرف نہیں دیکھونگا میں یہیں ٹھیرونگا۔ اور اس کاغذ کے پُرزے کو دیکھتا رہونگا۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر اب میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ تو وہ کیا کریگی۔ اب چھ بجے کا وقت ہے اگر میں نے اُس کی طرف دیکھ لیا۔ تو مجھے اُس کا حکم ماننا پڑیگا۔ مجھے اُس کا . . . .

میں اُس کی طرف نہیں دیکھونگا۔ ہرگز نہیں۔ . . . .

میں ہنس رہا ہُوں۔ زور سے ہنس رہا ہُوں۔ نہیں۔ میں نہیں ہنس رہا۔ مجھے کوئی ہنسا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ اسی لئے کہ میں اس کی طرف . . . . . میں بالکل نہیں چاہتا۔ لیکن میں یہ یقینی طور پر جانتا ہُوں کہ میں ضرور دیکھونگا۔ ضرور . . . ضرور اور بالضرور اور پھر . . . . . پھر

انتظار کے ساتھ ساتھ میری تکلیف بڑھ رہی ہے۔ اب میں جلد جلد لکھ رہا ہُوں تاکہ زیادہ دیر تک یہاں بیٹھا رہ سکُوں۔ تاکہ ان الم انگیز لمحات کو اور طول دے سکوں اور آخرکار اس انتہائی خواہش کو محبت کے ناپیدا کنار سمندر میں غرق کر دُوں۔

پھر . . . پھر ڈر لگ رہا ہے۔ میں جانتا ہُوں کہ میں اُس کی طرف دیکھونگا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھونگا۔ اور اپنے آپ کو پھانسی دے لونگا۔

لیکن مجھے اس بات کا ڈر نہیں ہے۔ . . . بالکل نہیں ہے کیونکہ یہی میری خوشی ہے۔ اور اسی میں میری زندگی۔ دنیا کی کوئی چیز مجھے اس سے زیادہ پیاری نہیں۔

ڈر کی وجہ کچھ اور ہے —— اور جس کا اس کے ساتھ تعلق ہے اور جو اس کے بعد واقع ہوگی۔ نہ معلوم وہ کیا ہوگی۔ لیکن ہوگی ضرور کیونکہ میری مسرّت کا جام بالکل لبریز ہے۔ اس سے زیادہ خوشی مجھے کبھی نہیں ہُوئی۔ اس کے بعد یقیناً کوئی خوفناک واقعہ پیش آئیگا۔

مجھے اس سے کیا میں اس کے متعلق کیوں سوچوں . . . میں چاہتا ہُوں کچھ لکھ لوں۔ جلد جلد لکھ لوں۔ بغیر سوچے سمجھے لکھ لوں . . . لکھ لوں خواہ کچھ بھی ہو . . . . . .

میرا نام —— ناصر خاں . . . ناصر خاں . . . ناصر اُف میں اور کچھ نہیں لکھ سکتا۔ ناصر خاں . . . . ناصر . . اب میں اُس کی طرف دیکھتا ہُوں۔ . . . بس . . . بس زیادہ نہیں . . . . ناصر خاں . . . . ناصر

سپرنٹنڈنٹ نے چھ بج کر پانچ منٹ پر بار بار ٹیلیفون کیا۔ اور جب کوئی جواب نہ ملا تو فوراً نشاط ہوٹل کے کمرہ ۴۶ میں پہنچا۔ دیکھا تو ناصر خاں طالب علم طبیہ کالج کی لاش بالکل اسی طرح لٹک رہی تھی۔ جس طرح کہ پہلی تین لاشیں۔ البتہ اس کے چہرے کی بناوٹ قدرے مختلف تھی۔ دہشت اور خوف کے مارے اس کے ہونٹ بل کھائے ہُوئے تھے۔ آنکھیں کھلی

ہُوئی تھیں اور چہرے سے باہر نکلی پڑتی تھیں۔ کھُلے ہُوئے ہونٹوں کے درمیان دانتوں کی دونو قطاریں مضبوطی سے ملی ہوئی تھیں۔

اُس کی ڈائری سامنے میز پر پڑی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ نے اُسے اُٹھا کر پڑھا اور گلی کے پار اُس گھر میں گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہؤا کہ یہ مکان عرصہ دراز سے خالی پڑا ہے۔

(ماخوذ) **ایم۔ عنایت۔ بی۔ اے۔**

گُلِ خودرَو

آہ! لاعلموں کے حق میں معمولی، تنگ نظروں کے پاس بدرو، خودغرضوں کے لئے بے سُود، ناحقیقت آشنا کے لئے فضول

میں تجھے خوب جانتا ہُوں۔ خوب پہچانتا ہُوں

ہاں دل وجان سے قدر کرتا ہُوں۔ آ، قریب آ، تُو خود میرے قریب آ، تو خود میرا ہو جا۔ میں زبردستی تیری طرف ہاتھ بڑھانا نہیں چاہتا۔ میں تجھے زبردستی اپنا بنانا نہیں چاہتا۔ میں سفاک نہیں، ظالم نہیں، بے رحم نہیں، ناحقیقت شناس نہیں نہیں! آ، میرے قریب آ، اور قریب آ۔ میں تیری عزت کرتا ہُوں، تیرا شیدائی ہُوں۔ تجھ پر فریفتہ ہُوں ——— ہاں ——— میرے دل کی گہرائیوں میں تیری محبت جاگزیں ہے۔ لیکن ایسی محبت نہیں کہ تیرے کلیجہ کو چھید کر سوراخ کر دوں ——— میرے ہر رگ وریشہ میں تیری خواہش کا جذبہ موجزن ہے۔ لیکن ایسی نہیں جو ایک کمسن اور ناسمجھ کے ہاتھ تجھے مسل کر پھینکنے کے لئے ظاہر کریں ——— میں تجھے اپنے سرو سینہ سے لگانا چاہتا ہُوں، تجھے پیار کرنا چاہتا ہُوں۔ لیکن اس طرح نہیں جیسے کوئی تتلی بظاہر تجھے اپنے سینہ سے لگاتی اور چُومتی نظر آئے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے سارا رس اور شیرینی چُوس کر اُڑ جائے ——— میں تیری خوبصورتی کا مداح ہُوں لیکن اوروں کی طرح ہرجائی نہیں ——— میں جانتا ہُوں کہ تُو خودرَو ہے، قدرت نے تجھے اُگایا۔ قدرت نے تجھے سینچا، قدرت نے تیری رکھوالی کی، اِسی لئے میں تیری قدر کرتا ہُوں۔ ——— تو مجسم حسن ہے، اس لئے کہ تُو سادگی کا کامل نمونہ ہے، تو از سرتاپا اسرارِ قدرت کا حامل ہے

تیرے ہر رگ وریشہ میں چشمِ بینا کے لئے قدرت کے ہزاروں دفتر ہیں تو اُن کی طرح نہیں جنہیں انسان نے بویا، انسان نے سینچا۔ انسان نے دیکھ بھال کی۔ تیری خوبصورتی کاٹ چھانٹ سے مستغنی ہے، تیرا حُسن تعریف سے بے نیاز ہے، تیری قیمت قدر سے بے پروا ہے ——— تو ان پھولوں کی طرح نہیں جو اپنی تیز بُو اور شوخ و بھڑکیلے رنگ کے ذریعہ ہر ایک کو اپنی طرف مائل کرتے اور نظروں میں ہلکے بنتے ہیں، تو ان پھولوں سے کہیں بالاتر ہے جن کی نشو و نما انسانی مرضی کے تابع ہے اور جن کے جسم پر کاٹ چھانٹ کے ذریعہ ہزاروں زخم لگائے جاتے ہیں

یہی نہیں! ——— تیری ہستی ایسے تمام گلوں سے اعلیٰ وارفع ہے جو صرف دکھاوے کے ہیں کسی کام کے نہیں۔

لیکن! ——— یہ تو رنجیدہ کیوں ہے! تجھے غم کس بات کا ہے!! تو سرنگوں کیوں ہے!!! ——— ہاں ——— سمجھا، جان گیا۔ ہُوں، دیوانہ کہیں کا! رنج و فکر دل سے دور کر۔ دیکھ تجھ سے اونے درجہ اور گرے ہُوئے رتبہ کے ساتھی کیسے خوش اور کامراں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کسی کو وہ گوہرِ یکتا نصیب نہیں جو تجھ میں ہے ——— لیکن آہ ——— میرے دل میں ٹیس ہوتی ہے تیری محبت کا ولولہ میرے دل میں ٹھنڈا ہوتا نظر آتا ہے جب میں دیکھتا ہُوں کہ تُو اپنی آنکھوں میں آپ پست ہو رہا ہے دیوانہ ہؤا ہے؟ ——— اُٹھ، آنکھیں کھول، دیکھ، زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔ اپنی قدر و قیمت جان کہ تُو دُرِ یتیم ہے۔

ایم اسمٰعیل بی اے۔ ابتدائی (عثمانیہ)

عجب عبرت فزا منظر ہے اِس ویران بستی کا
ٹھہر کر دیکھ لیں دم بھر تماشا بزمِ ہستی کا

عزیز لکھنوی

خودی و طمانیتِ قلب

نفس نفس میں ہے سازِ حیات کا بم و زیر
تُو کیوں ہے عقدہ کشائی کی فکر میں دلگیر
خدا کے لطف و کرم کا طویل سلسلہ ہے
یہ خُوب و زشت و فراز و نشیب کی زنجیر

اِسی جہاں میں وہ اہلِ نظر بھی بستے ہیں!
جو دیکھتے ہیں رگِ سنگ میں بھی تارِ حریر
بھڑکتی آگ کو جو بوستاں سمجھتے ہیں!
کڑکتی دھوپ بھی جن کے لئے ہے ابرِ مطیر
ہیں زندہ آج بھی وہ بندگانِ استغنا
جو اپنی روح سے لیتے ہیں کارِ بدرِ منیر
سُن ایک بندۂ درویش کی صدائے دوست
کہ خواب سے بھی ہے تاریک خواب کی تعبیر
سُنا رہا ہے کسے تُو فغانِ نیم شبی؟
کہ چھیڑنے سے کبھی بولتی نہیں تصویر
کوئی بھی مجھ کو شکایت نہیں زمانے سے
کہ دل غنی ہے مرا۔ نرم دل ہے۔ پاک ضمیر
فراقِ یار کی اکثر طویل راتوں میں!
سُنا ہے میں نے کہیں سے یہ نسخۂ اکسیر
بنائے فتنہ ہے یہ امتیازِ پست و بلند
سمجھ سکو تو دلِ مطمئن ہے گنجِ خطیر
یہ تیرا عقل و خرد کا سبو چھلک جائے
اگر میں کرنے لگوں ذرّے ذرّے کی تفسیر
یہ آسمان و زمیں۔ آب و خاک۔ آتش و باد
یہ ننھے ننھے ستارے یہ مہر و ماہ و منیر

یہ قہقہوں کے پسِ پردہ آنسوؤں کی جھڑی
یہ سُرخ سُرخ جوانوں کے پیچھے مردِ فقیر
یہ موجِ تُند چٹانوں پہ سر پٹختی ہُوئی!
کنارے بیٹھا ہوا اک غریب ماہی گیر
یہ دندناتا ہوا ایک پیرِ تیغ بدست
یہ لڑکھڑاتا ہوا اک جوانِ بے شمشیر
یہ انقلاب کی آواز! خُون کی دعوت!
یہ خود پرست رئیسوں کے بد سرشت مشیر
کئی ہزار نظارے ہیں میری نظروں میں
سمجھ میں آتی نہیں جن کی انتہا و اخیر
تُو اپنی رُوح کو اُس قید سے رہائی دِلا
اثر سے جس کے تیری زندگی ہے اِک زنجیر
اگر تُو غور سے دیکھے تو ذرّے ذرّے میں
دکھائی دے گی تجھے ایک دلکشا تحریر
”سرورِ شوق سے تُو اپنا کام کرتا جا،
خدائی بھر میں نہیں ہے کہیں بھی تیری نظیر
ہر ایک فرد کی اِک شاہراہ مقرر ہے
ہے جس پہ گرمِ سفر صبح و شام ہر رہگیر
وہ دوسروں کی حقیقت بھی جان جائے گا
جو کرنی جانتا ہے اپنی عزت و توقیر
یہاں چمکتا ہے بس اُس کا نیرِ اقبال
ہے جس کی رُوح پہ چھایا ہوا خودی کا جمال“

احمد ندیم قاسمی

مختار

اقبالؔ کا تصوّرِ خودی

اگر آپ کسی سے پوچھیں کہ اقبالؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے۔ تو وہ یہی کہے گا کہ ان کی شاعری فلسفیانہ شاعری ہے۔ یہ سن کر شاید آپ کے ذہن میں اُلجھن پیدا ہو کہ بھلا فلسفہ شعر کیونکر ہو سکتا ہے فلسفہ تو حقیقت کی خشک اور بے جان تعبیر ہے۔ اور شعر اُس کی زندگی سے چھلکتی ہوئی تفسیر۔ فلسفی صورت کائنات کا ذہنی ادراک کرتا ہے۔ اور اپنے ادراکات کو مجرد تصورات میں بیان کر دیتا ہے۔ جو ہماری لوح فکر پر درج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بہ خلاف اس کے شاعر نبض کائنات کی تڑپ، قلب حیات کی دھڑکن کو محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے احساسات کو متحرک نقش اور نغمے میں ادا کرتا ہے۔ جو ہمارے دل میں اُتر کر خون کے ساتھ گردش کرنے لگتا ہے

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

کیا اقبالؔ کے شعر کو فلسفیانہ شعر کہنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ حکمت کے نظریات کی طرح سوز و درد، زندگی اور حرکت سے خالی ہے؟

جسے اقبالؔ کے کلام سے ذرا بھی مس ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں۔ اقبالؔ کی شاعری تو آب حیات کا خزانہ ہے۔ جس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے اُبلتے ہیں۔ جن سے سیراب ہو کر مایوس دلوں کی خشک اور بنجر زمین میں جان پڑ جاتی ہے۔ اور اُمید کی کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔

بات یہ ہے کہ جب شعر کے لئے فلسفے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو فلسفے کی صرف ایک ہی صنعت مدِنظر ہوتی ہے۔ یعنی موضوع کی کلیت اور ہمہ گیری۔ اقبالؔ کا کلام فلسفیانہ اس معنی میں ہے۔ کہ وہ ایک کُلی تصویر حیات پیش کرتا ہے۔ اس کا موضوع فرد اور ملت کی زندگی کا ایک جامع نصب العین ہے۔ جسے ہم فلسفۂ تمدن کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ اگر طرز ادا کو دیکھئے۔ تو وہ اُسی سوز و گداز، رنگ و آہنگ سے لبریز ہے۔ جو ایشیائی شاعری کی جان ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں۔ کہ اقبالؔ کا خطاب انسانوں کی صرف ایک جماعت یعنی مسلمانوں سے ہے۔ کُل نوعِ انسانی سے نہیں۔ اُن کے پیشِ نظر ملت کا نصب العین ہے۔ جو انسانیت کے مقابلے میں بہت تنگ اور محدود ہے۔ اس سے زیادہ وسیع مشرب تو ہندوستان اور ایران کے غزل گو شاعروں کا ہے۔ جو عام انسانی زندگی کے جذبات و کیفیات کے مصور ہیں۔ مگر ذرا غور سے دیکھئے تو محض جذبات و کیفیات کی مصوری اور چیز ہے۔ اور زندگی کے ایک مکمل تصور کی تعمیر اور چیز ہے۔ جذبات کل انسانوں میں یکساں ہیں۔ لیکن نصب العین حیات کی تشکیل میں اختلاف پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ایک عالمگیر انسانی تمدن کا خیال ہر زمانے میں بعض لوگوں کے پیش نظر رہا ہے۔ اور اب بھی ہے۔ لیکن محض مجرد تصور یعنی فلسفے کی شکل میں۔ اس تصور کو کسی ایک شخص کے قلب سے بھی وہ زندہ تعلق پیدا نہیں ہوا۔ جو اُسے موضوع شعر بنانے کے لئے ضروری ہے۔ اب تک ہر شاعر اس پر مجبور ہے۔ کہ انسانیت کا عکس کسی خاص ملت یا قوم کے آئینے میں دیکھے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم اور ملت کے تصورات میں کون زیادہ وسیع ہے۔ اگر آپ قوم سے اہل مغرب کی اصطلاح میں وہ جماعت مراد لیں۔ جس میں قدر مشترک محض نسل اور وطن ہے۔ اور ملت اقبال کے محاورے میں اس گروہ کو کہیں جس کے لئے ایک روحانی اور اخلاقی نصب العین رشتۂ اتحاد کا کام دیتا ہے۔ تو یہ ماننا پڑے گا کہ ملت کے تصور کا وسیع تر اور انسانیت سے قریب تر ہونا ممکن ہے۔ اس لئے کہ نسل و وطن کا فرق دنیا میں ہمیشہ سے ہے۔ اور ہمیشہ رہیگا۔ اور اگر اس پر زور دیا جائے۔ تو نوع انسانی میں اتحاد پیدا ہونا محال ہے لیکن ایک اخلاقی اور روحانی نصب العین کا کل انسانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے متحد کر دینا کم سے کم خیال میں آسکتا ہے۔ دیکھنا اصل میں یہ ہے کہ جو نصب العین اقبالؔ کے ذہن میں ہے۔ وہ کیا ہے اور کیسا ہے۔ محض یہ بات کہ وہ ملت کے تصور سے وابستہ ہے۔ اُسے تنگ اور محدود کہنے کے لئے کافی نہیں۔

اقبالؔ کی شاعری اور اُن کے نصب العین زندگی کو اچھی طرح سمجھنے

کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ ہم اس نقش کو اُس کے تاریخی پس منظر کے ساتھ دیکھیں جب اُفقِ ہند سے وہ ہلال تو نمودار ہوا۔ جو ایک دن فلکِ شعر پر ماہِ کامل بن کر چمکنے والا تھا۔ اس وقت عموماً مشرق اور خصوصاً عالمِ اسلام پر حزن و یاس کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سب سے بدتر حالت ہندوستان کے مسلمانوں کی تھی۔ جہل اور غلامی کی بدولت اُن کے دلوں میں زندگی کی آگ سرد پڑ چکی تھی۔ اور جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھئے راکھ کے ڈھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مغربی فاتحوں کی ہیبت، مغربی تمدن کی صولت مسلمانانِ ہند کے قلب و دماغ پر مستولی تھی۔ وہ اس بے پناہ قوت سے ڈر کر بھاگنا چاہتے تھے مگر یہ مقناطیس کی طرح اُنہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس زمانے میں ایک باہمت، خوددار اور مدبر مسلمان سید احمد خاں نے جسے یقین تھا کہ ملتِ اسلامی کی سطحی کمزوری کی تہ میں فولاد کی قوت پنہاں ہے۔ مسلمانوں کو اس پر اُبھارا کہ وہ بے تکلف اپنی زندگی کو مغربی تمدن سے رگڑ کھانے دیں۔ اس رگڑ سے ابتدا میں انہیں سخت صدمہ پہنچا۔ مگر اسی سے وہ چنگاریاں بھی نکلیں۔ جنہوں نے اُن کے دلوں میں غیرت و حمیت کی آگ بھڑکا دی۔

تدبیرِ سیاست کو چھوڑ کر صرف شعر کے میدان کو دیکھئے۔ تو آپ کو دو ممتاز صورتیں نظر آئیں گی۔ جنہوں نے مسلمانوں کے مرعوبی اور مایوسی کے طلسم کو توڑا۔ اور اُن میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ایک "حالی" جس نے سوز و درد سے ملت کو اُس کے عروج و زوال کی داستان سُنا کر گذشتہ عظمت و اقبال کی یاد تازہ کر دی۔ اور موجودہ پستی و نکبت پر غیرت دلائی۔ دوسرے "اکبر" جس نے ظرافت کے پیرائے میں مسلمانوں کو غیروں کی ذہنی غلامی کی ذلت سے آگاہ کیا۔ اور ان کی نظر میں اپنے مذہب و تمدن کا احترام دوبارہ قائم کر دیا۔ "حالی" جدت پسند تھے۔ قدیم تہذیب کی خرابیوں پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے۔ اور جدید تہذیب کی خوبیوں کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ "اکبر" قدامت پسند تھے۔ نئی روشنی کی ہر چیز پر ہنستے تھے۔ اور پرانی روشنی کی ہر چیز کو سراہتے تھے۔ مگر دونوں نے مسلمانوں میں عزتِ قومی کے جذبے کو اُبھارا۔ اپنی مدد آپ کرنے کا حوصلہ دلایا اور یاس کی تاریکی میں اُمید کی ایک جھلک دکھائی۔

لیکن ان دونوں بزرگوں کی نظر بات کی تہ تک نہیں پہنچی۔ اُنہوں نے بیمار قوم کا مرض تو تشخیص کر لیا لیکن اس مرض کا سبب نہیں پہچان سکے "اکبر" نے مسلمانوں کے تنزل کا باعث یہ قرار دیا کہ وہ اپنے مرکز یعنی مذہب سے منحرف ہو گئے اور حالی نے یہ کہا کہ وہ اجتہادِ فکر اور وسعتِ نظر چھوڑ کر تقلید پرست اور تنگ خیال بن گئے۔ مگر دونوں میں سے کسی نے یہ نہ بتایا کہ آخر اُن کے مرکز سے منحرف ہونے یا تقلید و تعصب اختیار کر لینے کی وجہ کیا تھی۔ اس وجہ کے معلوم کرنے کے لئے اقبال کی فلسفیانہ نگاہ کی ضرورت تھی۔ شاید مورخ یہ کہے کہ دولت اور حکومت نے مسلمانوں کو کاہل اور عیش پرست بنا دیا۔ اور اسی کاہلی اور عیش پرستی نے اُنہیں رفتہ رفتہ فعالیت اور حرکت سے محروم کر کے انفعالیت اور جمود میں مبتلا کر دیا۔ لیکن "اقبال" جس کی نظر تاریخ کے ساتھ ساتھ فلسفۂ تمدن اور فلسفۂ نفس پر بھی عبور رکھتی تھی۔ اس توجیہہ کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک اولوالعزم قوم میں جس نے اپنی عظمت و سطوت کا سکہ دنیا پر بٹھا دیا ہو جسمانی تعیش اور کاہلی کی لہر جب تک اُس کے اندر روحانی تعیش اور کاہلی کا زہر نہ بھرا ہو، ہرگز اس حد تک نہیں پہنچ سکتی۔ کہ اس کے قوائے ذہنی اور عملی کو ماؤف کر دے۔ یہ روحانی تعیش اور کاہلی اقبال کے نزدیک وحدت وجود کے عقیدے پر مبنی ہے۔ جو مسلمانوں میں غیر اسلامی اثرات سے پیدا ہوا۔ اور جس نے انفرادی نفس کے وجود کو باطل قرار دے کر اُن کے دلوں سے فردی اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو مٹا دیا۔ اور اس طرح مذہب و اخلاق کی جڑ کو کھوکھلا کر دیا۔ اور سعی و عمل کے ذوق کو فنا کر دیا۔ اس اجمال کی تفصیل خود اقبال سے سنئے۔

"مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب مماثلت ہے۔ اور وہ یہ کہ جس نکتہ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اُسی نکتہ خیال سے شیخ محی الدین عربی اُندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی۔ جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور اُن کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ اُن تھک مفسر تھے۔ اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحد الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ چودہویں صدی کے تمام عجمی شعرا اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی۔ جو جزو سے کُل تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے۔ اُنہوں نے جزو و کُل کا دشوار گذار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے "رگِ چراغ" میں "خونِ آفتاب" اور "شرارِ سنگ" میں "جلوۂ طور" کا مشاہدہ کیا۔"

"مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا۔ مگر ایرانی شعرا نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا۔ یعنی اُنہوں نے دل کو اپنا آماج گاہ بنایا۔ اور اُن

کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخرکار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر تمام اسلامی قوم کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔"

وحدت وجود کا مسئلہ جس کی طرف مندرجہ بالا عبارت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ ہے کہ وجودِ حقیقی صرف خالقِ کائنات کی ذات ہے مخلوق جس میں عالمِ طبیعی اور انسان سبھی داخل ہیں۔ محض اعتباری اور موہوم وجود رکھتے ہیں۔ اور اسی ایک نورِ ایزدی کے پرتو ہیں۔ ہم نے اپنی کوتاہ بینی سے ان اصنامِ خیالی کو حقیقی سمجھ لیا ہے اور تعینات کے ان پردوں نے ہمیں معرفتِ ذات سے محروم کر دیا ہے۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم + کر دیا کافر اس اصنامِ خیالی نے مجھے

(غالب)

اصل میں یہ احساسِ وحدت ایک کیفیت ہے جو قلبِ حال پر ایک خاص وقت میں آناً فاناً گذر جاتی ہے مگر جب زبانِ قال اسے تصورات کے جال میں پکڑ کر رکھنا چاہتی ہے۔ تو الفاظ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ انہیں الفاظ کو شاعر اُڑاتے ہیں اور نظم کا خوشنما لباس پہنا کر اس قدر دلکش اور دلفریب بنا دیتے ہیں۔ کہ سننے والوں کا دل و دماغ مسحور ہو جاتا ہے۔ یہی وہ تصوف ہے جس کے متعلق شیخ علی حزیں نے کہا ہے۔ کہ "برائے شعر گفتن خوب است" اگر یہ قیل و قال محض تفریح کے لئے ہو تو کوئی حرج نہیں، مگر غضب تو یہ ہے کہ جو قوم عیش و عشرت میں پڑ کر زندگی کی کٹھن ذمہ داریوں سے گھبرانے لگتی ہے۔ اور اُن سے بچنے کا حیلہ ڈھونڈھتی ہے۔ وہ اس متصوفانہ شاعری کو اپنا فلسفۂ حیات بنا لیتی ہے۔ کائنات کا موہوم ہونا، نفسِ انسانی کا بے حقیقت اور زندگی کا بے ثبات ہونا۔ سعی و عمل کا لاحاصل ہونا وہ خیالات ہیں جو شعر کے میٹھے سروں میں تھکی ہوئی قوم کو لوریاں دے کر سلا دیتے ہیں۔ پھر جب اپنی غفلت کی بدولت وہ دولت و حکومت قوت و اقتدار کھو بیٹھتی ہے۔ تو یہی دلفریب نغمے جو پہلے صبر و سکون اور کیف و سرور کا ثبوت ہوتے تھے۔ اب قنوت و یاس اور حزن و ملال کا باعث بن جاتے ہیں۔ اور اسے ایک بار گرنے کے بعد پھر اُٹھنے نہیں دیتے۔ یہی ماجرا تھا جو مسلمانوں پر گزرا اور جس نے ان میں بے مرکزی، بے اصولی اور بے عملی پیدا کر دی۔ مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی مرض کا یہ سب سے بڑا سبب تھا۔ جسے حکیمِ ملت اقبال نے پہچانا اور جس کے ازالے کی کوشش میں اُنھوں نے اپنی مسیحائی کی خداداد قوت صرف کی۔

اس عقیدے کو جو اقبال کے نزدیک ملتِ اسلامی کے زوال کی حقیقی وجہ ہے وہ "نفیٔ خودی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسے "اثباتِ خودی" کے نظریے سے رد کرنا چاہتے ہیں۔ خودی یا انانیت کا لفظ اُردو میں کبر و غرور کے معنوں میں آیا کرتا ہے۔ مگر اقبال نے اِسے ایک فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر اس احساس اور عقیدے کے لئے استعمال کیا ہے۔ کہ فرد کا نفس یا 'انا' گو ایک مخلوق اور فانی ہستی ہے۔ لیکن یہ ہستی اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پائیدار اور لازوال ہو جاتا ہے۔ اسرارِ خودی کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔ "یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ عام طور پر اُردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعیینِ ذات ہے۔"

یہی خودی کا تصور اقبال کے فلسفۂ حیات و کائنات کی بنیاد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فلسفے کا آغاز ایک حیرت اور اُلجھن سے ہوتا ہے۔ وہ سوال جس نے اقبال کو اُلجھن میں ڈالا یہ ہے۔" یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی جذبات و تخیلات مستفید ہوتے ہیں یہ پُراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کا شیرازہ بند ہے۔ یہ خودی، یا انا، یا میں، جو اپنے عمل کی رُو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رُو سے مضمر ہے۔ جو تمام مشاہدات کی خالق ہے۔ مگر جس کی لطافت نگاہوں کے گرم مشاہدے کی تاب نہیں لا سکتی۔ کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے۔ یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنے فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغِ مصلحت آمیز میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد اور اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے علما اور حکما نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کیلئے دماغ سوزی نہ کی ہوگی مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر کہ اُن کی افتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں۔ کہ انسانی انا محض ایک فریبِ تخیل ہے۔ اور اِسی پھندے کو گلے سے اُتارنے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جن کے لئے اُن کی فطرت متقاضی تھی۔ ...... مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک ایک نہایت زبردست پیغامِ عمل تھی مگر اس تحریک کے نزدیک "انا" ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے۔ ...... میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ اس حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔"

آیئے اب یہ دیکھیں کہ جس خیال کو اقبال نے یہاں مجمل طور پر نثر میں بیان کیا ہے۔ اس کی تفصیلات اس باکمال سخنور کے فیضِ طبع سے شعر کا جامہ پہن کر کس قدر دلنشیں اور دل آویز، روح پرور اور روح افزا، جاں نواز اور جاں بخش بن جاتی ہیں۔

اقبال کے نزدیک کائنات کی اصل ایک وجود بسیط ہے جس کے اندر شعور اور ارادے کی قوتیں مضمر ہیں۔ ان قوتوں کو فعل میں لانے کے لئے اُس نے آپ کو خود اور غیر خود یا فلسفے کی اصطلاح میں موضوع اور معروض میں تقسیم کر دیا۔ غیر خود کی علت غائی یہ ہے کہ وہ خودی کے مشاہدے کے لئے آئینے کا اور اس کے عمل ارتقاء کے لئے معمول بہ کا کام دے۔ خودی اپنی تکمیل اور استحکام کے لئے غیر خود سے ٹکراتی ہے۔ اور اسی تصادم کے ذریعے سے اس کی اندرونی قوتیں نشوونما پاتی ہیں اور وہ بتدریج سلسلہ ارتقا کو طے کرتی ہے۔ اس کی ہستی مسلسل حرکت اور عمل پیہم کشمکش اور کارزار ہے۔ جس نسبت سے کوئی شے اپنی خودی میں مستحکم اور غیر خود پر غالب ہے۔ اُسی نسبت سے اس کا درجہ مدارج حیات میں متعین ہوتا ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است   ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد   آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او   غیرِ او پیداست از اثباتِ او
سازد از خود پیکرِ اغیار را   تا فزاید لذتِ پیکار را
چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است   پس بہ قدرِ استواری زندگی است
چوں زمیں بر ہستیِ خود محکم است   ماہ پابندِ طوافِ پیہم است
ہستیِ مہر از زمیں محکم تر است   پس زمیں مسحورِ چشمِ خاور است

اس سلسلہ ارتقا کی آخری کڑی انسان ہے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات   خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
ازل اُس کے پیچھے ابد سامنے   نہ حد اُس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی   ستم اُس کی موجوں کے سہتی ہوئی
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر   ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے   فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

مخلوقات میں باعتبار مدارج انسان اسی لئے سب سے برتر ہے کہ اس کی ذات میں خودی کو اپنا اور اپنے مقصد کا شعور حاصل ہو جاتا ہے اور یہی شعور اُسے اور سب چیزوں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ بھی اور مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہے۔ مگر اس کی ہستی محض اعتباری نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اس کے مقابلے میں عالمِ فطرت کا وجود محض اضافی اور انسانی ادراک و مشاہدے کا پابند ہے۔

ایں جہاں چیست صنم خانۂ پندارِ من است   جلوۂ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے او را   حلقہ ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من   چہ زماں و چہ مکاں شوخیِ افکارِ من است

جہاں را فربہی از دیدنِ ما   نہالش رستہ از بالیدنِ ما
جہاں غیر از تجلی ہائے ما نیست   کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست
جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما   ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما
خودی او را بہ یک تارِ نگہ بست   زمین و آسمان و مہر و مہ بست

یہ قول ڈیکارٹ کے انا یا خودی کی ہستی بدیہی ہے۔ اس لئے کہ اُسے بلاواسطہ اپنا شعور ہوتا ہے۔ درانحالیکہ غیر خود یعنی عالم فطرت کی ہستی دلیل کی محتاج ہے۔ اگر انسان کو اپنے وجود میں شک ہو تو یہ شک خود اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی شک کرنے والا موجود ہے۔

اگر گوئی کہ "من" وہم و گمان است   نمودش چوں نمودِ ایں و آں است
بگو با من کہ دارائے گماں کیست   یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست
جہاں پیدا و محتاجِ دلیلے   نمی آید بہ فکرِ جبرئیلے
خودی پنہاں ز حجت بے نیاز است   یکے اندیش و دریاب ایں چہ راز است
خودی را حق بداں باطل مپندار   خودی را کشتِ بے حاصل مپندار

جس طرح انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اپنی خودی کا شعور ہے۔ اسی طرح اس کی منزل مقصود یہ ہے کہ خودی کو روز بروز مضبوط اور مستحکم کرتا جائے۔ جیسا کہ ہم اُوپر کہہ چکے ہیں۔ خودی کے استحکام کی یہی صورت ہے۔ کہ انسان غیر خود سے یعنی اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا رہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے لئے نئے نئے مقاصد متعین کرتا ہے اور اُنہیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم رہتا ہے۔ اس میں اسے اپنے ماحول میں تصرف کرنا، اپنی راہ سے روکاوٹوں کو دور کرنا اور مشکلات کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آنا پڑتا ہے۔ اس طرح اس کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی رہتی ہیں۔ اور اس کے سینے میں خودی کی آگ روز بروز زیادہ مشتعل ہوتی جاتی ہے۔

زندگانی را بقا از مدعا است   کاروانش را درا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است   اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا   سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم — از شعاع آرزو تابندہ ایم

یہ سوزِ آرزو طالب خودی کو دم بھر چین نہیں لینے دیتا۔ ایک مقصد کے حاصل ہوتے ہی وہ ایک بلند تر مقصد کے حصول کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ اور اسی طرح راہ طلب میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی بے قراری اور بے چینی، اسی سعی پیہم اور جہد مسلسل کا نام زندگی ہے۔ سکون خواہ وہ بہشت کا سکون کیوں نہ ہو۔ روح انسانی کے لئے موت کا پیام ہے۔

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نہ سازد — دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے — تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے — سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
چو ز بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم — غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نو بہارے
دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے — نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

خودی کے منازلِ ترقی اس عالم زمان و مکاں کی تسخیر پر ختم نہیں ہوتے۔ شاعر کی چشم تخیل انسان کے جہد و عمل کے لئے اس کے ماورا نئے نئے میدان دیکھتی ہے۔

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر ! — طلسم زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیٔ فکر و کردار کا

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اس راہ میں ایک رہنما کی ضرورت ہے اور وہ رہنما عشق ہے۔ عشق اس مرد کامل کی محبت کو کہتے ہیں جو معرفت نفس کے مدارج سے گزر کر خودی کی معراج پر پہنچ چکا ہے۔ محبت کا دوسرا نام تقلید ہے لیکن یہاں عشق اور تقلید کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ عاشق اپنے آپ کو معشوق کی ذات میں یا مقلد اپنے آپ کو مرشد کی ذات میں کھو دے۔ یا اس سے روحانی قوت مستعار لے کر مصنوعی تقویت حاصل کرے۔ بلکہ یہ ہیں کہ وہ اس برتر شخصیت سے تکمیل خودی کا راز سیکھے۔ اور خود اپنی قوتوں کو نشو و نما دے کر اپنی شخصیت یا خودی کو استوار کرے۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است — زیر خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر — زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
کیمیا پیدا کن از مشت گلے — بوسہ زن بر آستان کاملے !
کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق — ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
عاشقی محکم شو از تقلید یار ! — تا کمند تو شود یزداں شکار !

خام کاروں کو عشق خود فراموشی اور از خود رفتگی سکھاتا ہے۔ مگر پختہ کاروں کو خود شناسی اور خودداری کا سبق دیتا ہے۔

بہر دل عشق رنگ تازہ بر کرد — گہے با سنگ و گہ با شیشہ سر کرد
ترا از خود ربود و چشم تر داد — مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

ایک لافانی نصب العین کی محبت فانی انسان کی خودی کی تکمیل کر کے اسے بھی لازوال بنا دیتی ہے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

طلبِ ہدایت کے لئے کسی مرد کامل کے آگے سر نیاز جھکانا تو خودی کو مستحکم کرتا ہے۔ لیکن مال و دولت، جاہ و منصب کے لئے ارباب اقتدار کا دست نگر ہونا اسے ضعیف کر دیتا ہے۔ فقر و استغنا خودی کی سب سے اہم شرط ہے۔

اے فراہم کردہ از شیراں خراج — گشتۂ روبہ مزاج از احتیاج
از سوال افلاس گردد خوار تر — از گدائی گدیہ گر نادار تر !
از سوال آشفتہ اجزائے خودی — بے تجلی نخل سینائے خودی
وائے بر منت پذیر خوان غیر — گردنش خم گشتۂ احسان غیر
اے خنک آں تشنہ کاندر آفتاب — می نخواہد از خضر یک جام آب
چوں حباب از غیرت مردانہ باش — ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

سوال اور گدائی صرف اسی کا نام نہیں کہ مفلس دولتمند کا طفیلی بن جائے۔ بلکہ دولت جمع کرنے کا ہر طریقہ جس میں انسان خود محنت کرنے کے بجائے دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھائے۔ اقبال کے نزدیک گداگری میں داخل ہے یہاں تک کہ وہ بادشاہ بھی جو غریبوں کی کمائی پر بسر کرتا ہے۔ سوال اور دریوزہ گری کا مجرم ہے۔

میکدے میں ایک دن اک رند زیرک نے کہا — ہے ہمارے شہر کا سلطاں گدائے بے نوا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے — کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا
اس کے آب لالہ گوں کی خون دہقاں سے کشید — تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا

ایسے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی   دینے والا کون ہے مردِ غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج   کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

گدائی اور فقر میں زمین و آسماں کا فرق ہے۔ گدائی مال دنیا کی احتیاج اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا ہے۔ فقر مادی لذتوں سے بے نیاز ہو کر کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرنا، نوامیس فطرت پر حکمرانی کرنا۔ دنیا میں امن و انصاف کا ڈنکا بجانا۔ مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلانا ہے۔

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل؟   یک نگاہِ راہ بیں یک زندہ دل!
فقر خیبر گیر با نانِ شعیر!   بستۂ فتراک او سلطان و میر
فقر بر کروبیاں شبخوں زند   بر نوامیس جہاں شبخوں زند
باسلاطیں درفتد مردِ فقیر   از شکوہِ بوریا لرزد سریر
از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر   وارہاند خلق را از جبر و قہر
برنیفتد ملتے اندر نبرد   تا درو، باقی است یک درویش مرد
آبروئے ما ز استغنائے اوست   سوزِ ما از شوقِ بے پروائے اوست

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری   اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری   اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ   فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی   ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری   کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری!
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا   تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

جب خودی عشق و محبت اور فقر و استغناء سے مستحکم ہوتی ہے۔ تو کائنات کی ساری قوتیں انسان کے قبضے میں آجاتی ہیں۔

از محبت چوں خودی محکم شود   قوتش فرماں دہِ عالم شود!
پنجۂ او پنجۂ حق می شود!   ماہ از انگشت او شق می شود!

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گل کوشند   ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بہ جلوت اندو کمندے بہ مہر و مہ پیچند   بہ خلوت اندو زمان و مکاں در آغوشند

مگر خودی کی غیر محدود قوت تعمیر و تخریب دونوں کا کام کر سکتی ہے خودی سے تعمیر کا کام لینے کے لئے توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی تادیب و تربیت بھی ضروری ہے بے قید اور بے تربیت خودی کی مثال شیطان ہے جس کے متعلق اقبال کا نظریہ نہایت دلچسپ ہے۔ وہ بھی گوئٹے کی طرح اسے بدی کی قوت نہیں بلکہ خودی اور تخلیق کی عظیم الشان قوت سمجھتے ہیں۔ جو محبت و اطاعت کی راہ مستقیم سے بھٹک گئی ہے۔ خودی کی تادیب و تہذیب کا پہلا درجہ اطاعت ہے یعنی اس قانون حیات کی پابندی جو خالق عالم نے ہر مخلوق کے لئے مقرر کیا ہے۔

ہر کہ تسخیرِ مہ و پرویں کند!   خویش را زنجیریِ آئیں کند!
باد را زندانِ گل خوشبو کند   قیدِ بو را نافۂ آہو کند
می زند اختر سوئے منزل قدم   پیش آئینے سرِ تسلیم خم!
سبزہ بر دینِ نمو روئیدہ است   پائمال از ترکِ آں گردیدہ است
لالہ پیہم سوختن قانونِ او   رقص پیدا در رگِ او خونِ او
قطرہ ہا دریاست از آئینِ وصل   ذرہ ہا صحرا است از آئینِ وصل
باطنِ ہر شے ز آئینے قوی!   تو چرا غافل ازیں ساماں روی
باز اے آزادِ دستورِ قدیم   زینتِ پا کن ہماں زنجیرِ سیم
شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو!   از حدودِ زندگی بیروں مشو

دوسرا درجہ ضبطِ نفس ہے یعنی انسان اپنے نفس کی ادنیٰ قوتوں کو جن کی سرکشی کی کوئی حد نہیں ہے۔ قابو میں لائے خصوصاً نفسانی محبت اور خوف کے جذبات پر جو سب سے زیادہ قوی ہیں، غالب آئے۔

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است   خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمامِ او بکف   تا شوی گوہر اگر باشی خزف
طرحِ تعمیرِ تو از گل ریختند   با محبت خوف را آمیختند
خوفِ دنیا خوفِ عقبیٰ خوفِ جاں   خوفِ آلامِ زمین و آسماں!
حبِ مال و دولت و حبِ وطن   حبِ خویش و اقربا و حبِ زن
تا عصائے لا الہ داری بدست   ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد   فارغ از بندِ زن و اولاد شد

ان دونوں مدارج سے گزرنے کے بعد انسان اس درجے پہ فائز ہوگا۔ جسے انسانیت کا اوجِ کمال سمجھنا چاہیئے۔ یہ نیابتِ الٰہی کا درجہ ہے اور اسے حاصل کرنا ارتقائے خودی کا بلند ترین نصب العین ہے۔ اسی کی تلاش میں نوعِ انسانی ہزارہا سال سے سرگرمِ سعی ہے۔ اور اسی کی انتظار میں کائنات روزِ ازل سے بے قرار ہے۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است   بر عناصر حکمراں بودن خوش است

نائب حق ہمچو جانِ عالم است　　ہستی او ظلِ اسمِ اعظم است
از رموزِ جزو و کل آگہ بود　　در جہاں قائم بامر اللہ بود!

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا　　اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو　　در سوادِ دیدہ ہا آباد شو!
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی　　کاروانِ زندگی را منزلی
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر　　از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں + کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات　　ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دلِ بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل اُس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو!　　رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں　　ورنہ یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ　　حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

ہم نے اُوپر اس مافوق انسانی قانون کا ذکر کیا ہے جس کی پابندی خودی کی تکمیل کے لئے لازمی ہے۔ یہ فرد اور ملت کے ربط کا قانون ہے۔ جسے اقبالؔ "بے خودی" کہتے ہیں۔

ایران اور ہندوستان کے شعرا نفسِ انسانی کو قطرے سے اور ذاتِ ایزدی کو دریا سے تشبیہ دیتے آئے ہیں۔ اقبالؔ قطرہ و دریا کی تمثیل سے فرد و ملت کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک قطرے کے دریا میں مل جانے سے اس کی ہستی فنا نہیں ہو جاتی بلکہ اور استحکام حاصل کر لیتی ہے۔ وہ بلند اور دائمی مقاصد سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس کی قوتیں منظم اور منضبط ہو جاتی ہیں اور اُس کی خودی پائیدار اور لازوال بن جاتی ہے۔

فرد تا اندر جماعت گم شود　　قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
فرد تنہا از مقاصد غافل است　　قوتش آشفتگی را مائل است
قوم با ضبط آشنا گرداندش　　نرم رو مثلِ صبا گرداندش
چوں اسیرِ حلقۂ آئیں شود　　آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اب تک ہم نے اقبالؔ کے کلام سے تصورِ خودی کے وہ عناصر منتخب کر کے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں۔ جو عالمگیر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبالؔ کا سارا فلسفہ اسلامیت کی روح سے لبریز ہے اور ان کے صحیح مخاطب مسلمان ہیں۔ لیکن ایک سچے شاعر کی طرح اُن کے دل میں سارے جہاں کا درد ہے۔ اُن کی محبت کل نوعِ بشر کو محیط ہے۔ اور ان کا پیام ایک حد تک سب انسانوں کے لئے عام ہے۔ وہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو اپنی خودی کی تربیت اور اپنی مخصوص ملی روایات کی حفاظت کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ وہ زندگی کے صحیح نصب العین سے قریب تر پہنچ جائیں۔

من نگویم از بتاں بیزار شو　　کافری شائستۂ زنار شو
اے امانت دارِ تہذیبِ کہن　　پشت پا بر مسلکِ آبا مزن
گر ز جمعیت حیاتِ ملت است　　کفر ہم سرمایۂ جمعیت است
تو کہ ہم در کافری کامل نۂ　　لائقِ طوفِ حریمِ دل نۂ
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور　　تو ز آذر من ز ابراہیم دور
قیس ما سودائی محمل نشد　　در جنونِ عاشقی کامل نشد

اُن کے کلام سے بے شمار اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جن میں اُنہوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت کل نوعِ انسانی سے خطاب کیا ہے لیکن ہمارے اس دعوے کا کہ اقبالؔ کے فلسفۂ خودی کا جاں بخش پیام صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے کل انسانوں کے لئے ہے قطعی ثبوت "پیامِ مشرق" کے دیباچے سے ملتا ہے جس کے چند جملے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم اس وقت اس وجہ سے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں۔ ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی اضطراب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے۔ اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے۔ کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی۔ جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون اجس کو قرآن نے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِاَنْفُسِهِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی پہلو پر حاوی ہے۔ اور میں نے اپنے فارسی کلام میں اسی صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابل احترام ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ اقبال کا نصب العین افراد و اقوام کی نگاہ کو "جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید و تولید" ہے۔ اسی کو اُنہوں نے اپنی تصانیف میں مدِنظر رکھا ہے۔ اور اسی کا پیام مغرب و مشرق کو دینا چاہتے ہیں۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ خالص فلسفیانہ نظریے کی حیثیت سے انسانیت کا ایک عالمگیر تصور ممکن ہے۔ لیکن جب اس تصور کو ایک زندہ نصب العین کی صورت میں پیش کرنا ہو۔ تو وسیع سے وسیع نظر رکھنے والا بھی اس پر مجبور ہے۔ کہ انسانیت کی تصویر کسی خاص ملت کے آئینے میں دیکھے۔ اقبال کے لئے ملت بیضائے اسلام اس آئینے کا کام دیتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی خودی کی حقیقی تکمیل اور فرد و ملت کا حقیقی ربط صرف اسلام ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں فرد اور ملت کا رشتۂ اتحاد، نسل یا وطن کا محدود تصور نہیں بلکہ توحید اور رسالت کا وسیع اور ہمہ گیر عقیدہ ہے۔

باوطن وابستہ تقدیرِ اُمم   برنسب بنیادِ تعمیرِ اُمم
اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ   باد آب و گِل پرستیدن کہ چہ
ملت مارا اساس دیگر است   ایں اساس اندر دل ما مضمر است
مدعائے ما مآلِ ما یکیست   طرز و انداز خیالِ ما یکیست
لا الٰہ سرمایہ اسرارِ ما   رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما
ملت بیضا تن و جاں لا الٰہ   ساز مارا پردہ گرداں الا اللہ

از رسالت در جہاں تکوینِ ما   از رسالت دینِ ما آئینِ ما!
از رسالت صد ہزار ما یک است   جزو ما از جزو ما لا ینفک است
از میانِ بحر او خیزیم ما   مثلِ موج از ہم نمی ریزیم ما
دینِ فطرت از نبی آموختیم   در رہِ حق مشعلے افروختیم
ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست   ایں کہ ما یک جانیم از احسانِ اوست
قوم را سرمایۂ قوت ازو   حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازو

فرد کو حقیقی آزادی ملت اسلامی ہی کے اندر حاصل ہوئی۔ کیونکہ اسی ملت نے نوعِ انسانی کو حقیقی معنوں میں حریت، مساوات اور اخوت کا نمونہ دکھایا۔ توحید کے عقیدے نے نسل و نسب کے امتیاز کو مٹا دیا۔ غریبوں کو امیروں کے اور زیردستوں کو زبردستوں کے تسلط سے آزاد کر کے عدل و انصاف کی حکومت قائم کی۔ اور اسلام کے رشتے سے انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔

اُمتے از ما سوا بیگانۂ   بر چراغِ مصطفٰے پروانۂ
ناشکیبِ امتیازات آمدہ   در نہادِ او مساوات آمدہ
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکیست   بوریا و مسند دیبا یکے است

عشق را آرامِ جاں حریت است   ناقہ اش را ساربان حریت است
موسٰی و فرعون و شبیر و یزید!   ایں دو قوت از حیات آمد پدید
زندہ حق از قوتِ شبیری است   باطل آخر داغِ حسرت میری است
ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست   پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست
کُلُّ مومن اِخوۃٌ اندر دلش   حُریت سرمایۂ آب و گلش

تکمیل خودی کی ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ نفس زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو جائے۔ اور یہ بات بھی ملت اسلامی کے اندر حاصل ہو سکتی ہے جو خود حدود زمانی و مکانی سے بالاتر ہے۔ اس لئے کہ اس کا اساس نسل و وطن کا مادی تخیل نہیں بلکہ توحید و رسالت کا روحانی عقیدہ ہے۔ نسل فنا ہو سکتی ہے۔ وطن کا رشتہ ٹوٹ سکتا ہے۔ مگر کلمۂ توحید کا رشتہ لافانی اور لازوال ہے۔

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست   بادۂ تندش بہ جامے بستہ نیست
عقدۂ قومیتِ مسلم کشود!   از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد   بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد   چوں فلک در شش جہت آباد شد

اُمتِ مسلم ز آیاتِ خدا است   اصلش از ہنگامۂ قَالُوْا بَلٰی است
تا خدا اَنْ یُّطْفِئُوْا فرمودہ است   از فسردن ایں چراغ آسودہ است
رومیاں را گرم بازاری نماند   آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست   رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام شد   استخوانِ او تہِ اہرام شد
در جہاں بانگِ اذاں بود است و ہست   ملتِ اسلامیاں بود است و ہست

ملت اسلامی کے لئے قرآن کریم آئین حیات کا اور اخلاق محمدی اُسوۂ زندگی کا کام دیتا ہے۔ آئین الٰہی پر عمل کرنے سے اس کی سیرت میں پختگی اور آداب محمدی کی پیروی سے حسن اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مرکز مشہود کعبہ اور اس کا نصب العین حفظ و نشر توحید ہے۔

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست   زیر گردوں سرِّ تمکین تو چیست
آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم   حکمت او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات   بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
از یک آئینی مسلماں زندہ است   پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است

ملت از آئینِ حق گیرد نظام   از نظامِ محکمے گیرد دوام
ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات   بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

غنچہ از شاخسارِ مصطفےٰ   گل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت   بہرۂ از خلق او باید گرفت!
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است   در جہاں دست و زبانش رحمت است

قوم را ربط و نظام از مرکزے   روزگارش را دوام از مرکزے
راز دار رازِ ما بیت الحرام   سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام
تو ز پیوند حریمے زندۂ!   تا طواف او کنی پایندۂ
در جہاں جانِ اُمم جمعیت است   در نگر سرِّ حرم جمعیت است

زانکہ در تکبیر رازِ بود تست   حفظ و نشر لاالٰہ مقصود تست
تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے   گر مسلمانی نیاسائی دمے
آب و تابِ چہرۂ ایام تو   در جہاں شاہد علی الاقوام تو
نکتہ سنجاں را صلائے عام دِہ   از علوم اُمّیے پیغام دہ
تا بدست آوردِ نبضِ کائنات   وانمود اسرارِ تقویمِ حیات
در جہاں وابستۂ دینش حیات   نیست ممکن جز بہ آئینش حیات

یہ یک آئینی و یک جہتی، ہم مرکزی اور ہم مقصدی ملت کو متحد کر کے ایک نفس واحد بنا دیتی ہے اور اس میں ایک اجتماعی خودی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی مجموعی قوت فرد کی خودی کو تقویت پہنچاتی ہے اور وسیع تر اور محکم تر بناتی ہے۔ یہ ملت کا احساس خودی بھی فرد کے احساس خودی کی طرح اسی سے توسیع اور استحکام حاصل کرتا ہے۔ کہ کارزار حیات میں عالم خارجی کی قوتوں کا مقابلہ کرے۔ علم کے ذریعے سے ان کی حقیقت کو پہچانے اور عمل کے ذریعے اُنہیں تسخیر کرے۔ عالم اسباب کو حقیر جان کر ترک کر دینا غفلت کی انتہا ہے۔ یہ فرد اور ملت کا میدانِ عمل اور اُن کی عقل اور ارادے کی تربیت گاہ ہے۔ اگر انسان علم کی مدد سے اپنے خارجی ماحول پر غالب نہ آئے۔ تو اس سے مغلوب ہو کر ہلاک ہو جائے گا۔ اس لئے علم اشیا بھی معرفت نفس کی طرح خودی کے نشوونما کے لئے ناگزیر ہے

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد   عالمے از ذرۂ تعمیر کرد
کوہ و صحرا، دشت و دریا، بحر و بر   تختۂ تعلیم ارباب نظر
اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتۂ   عالمِ اسباب را دوں گفتۂ
خیز و وا کن دیدۂ مخمور را   دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را
غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است   امتحانِ ممکناتِ مسلم است
کاروان رہگذار است ایں جہاں   نقدِ مومن را عیار است ایں جہاں
گیر او را تا نہ او گیرد ترا   ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا!

جستجو را محکم از تدبیر کُن   انفس و آفاق را تسخیر کُن
چشم خود بکشا و در اشیا نگر   نشہ زیر پردۂ صہبا نگر
تا قوی از حکمت اشیا شود   ناتواں باج از توانایاں خورد
علم اشیا اعتبار آدم است   حکمت اشیا حصار آدم است

ملت کے احساس خودی کی توسیع کے لئے عام کائنات اور تسخیر کائنات کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ وہ اپنی تاریخ اور اپنی روایات کی یاد کو دل میں تازہ رکھے۔ تاریخ اقوام کی زندگی کے لئے قوت حافظہ کا حکم رکھتی ہے۔ حافظہ ہی وہ چیز ہے جس سے فرد کے مختلف ادراکات میں ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے۔ جب خارجی حیات کے ہجوم میں اسے "میں" یا "انا" کا مرکز ہاتھ آتا ہے تو یہی حافظہ اس احساس خودی کی حفاظت کرتا ہے۔ بلکہ اسی طرح تاریخ سے ملت کی زندگی کے مختلف ادوار میں ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی شیرازہ بندی اس کے شعور خودی کی کفیل اور اس کے بقائے دوام کی ضامن ہے۔ وہی قومیں دنیا میں زندہ رہتی ہیں جو اپنے حال کا رشتہ ایک طرف ماضی سے اور دوسری طرف مستقبل سے استوار کرتی ہیں۔ زندگی نام ہی اس احساس تسلسل کا ہے۔

کودکے را دیدی اے بالغ نظر   کو بود از معنی خود بے خبر
نقش گیر این و آں اندیشہ اش   غیر جوئی غیر بینی پیشہ اش
تازہ آتشگیری افکار او!   گل فشانند چک پندار او
چشم گیرائش فتد بر خویشتن   دستکے بر سینہ می گوید کہ "من"
یاد او با خود شناسائش کند   حفظ ربط دوش و فردائش کند
ایں "من" نوزادہ آغاز حیات   نغمۂ بیداری سازِ حیات

ملت نوزادہ مثل طفلک است　　طفلکے کو در کنار مادر است!
بستہ با امروز او فرداش نیست　　حلقہ ہائے روز و شب درپاش نیست
چشم ہستی را مثال مردم است　　سینہ را بینندہ و از خود گم است
صد گرہ از رشتہ او واکند　　تا سر تار خودی پیدا کند
گرم چوں اُفتد بہ کار روزگار　　ایں شعور تازہ گردد پایدار
نقشہا بردارد و اندازد او　　سرگذشت خویش را می سازد او
قوم روشن از سواد سرگذشت　　خود شناس آمد زیاد سرگذشت
نسخۂ بود ترا اے ہوشمند!　　ربط ایام آمدہ شیرازہ بند
ضبط کن تاریخ را پائندہ شو　　از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
سر زند از ماضی تو حال تو　　خیزد از حال تو استقبال تو
مشکن ار خواہی حیات لازوال　　رشتۂ ماضی ز استقبال و حال
موج ادراک تسلسل زندگی است　　مے کشاں را شور قلقل زندگی است

اُوپر کے صفحات میں اقبال کے تصور خودی کے دو پہلو آپ کے سامنے آگئے۔ ایک یہ کہ خودی کا غیر خود یعنی عالم خارجی سے، دوسرے یہ کہ اس کا نفس اجتماعی یعنی ملت سے کیا تعلق ہونا چاہیئے۔ ابھی ایک تیسرا پہلو باقی ہے۔ جو ان دونوں سے زیادہ نازک اور لطیف ہے اور وہ یہ ہے کہ فرد کا بہ حیثیت مخلوق کے اپنے خالق سے صحیح علاقہ کیا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ خودی غیر خود سے ٹکرا کر اور اس کی قوتوں کو تسخیر کرکے استحکام اور توسیع حاصل کرتی ہے۔ اپنی فطرت کے قانون کی پابندی سے یعنی توحید و رسالت کے روحانی عقیدے کی بنا پر ملت کے حبل متین میں مربوط ہوجانے سے پائیدار اور لازوال بن جاتی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ محدود لازوال ہستی اس ذات لایزال سے جس نے اس کو اور کل کائنات کو پیدا کیا۔ کیا رشتہ رکھتی ہے۔

اب تک اقبال کے کلام کا موضوع فلسفہ نفس اور فلسفہ تمدن کے مسائل تھے۔ جن میں جذبات کو بہت کم دخل ہے۔ جذبات شاعری کی جان ہیں۔ اور خشک فلسفیانہ مسائل میں جو جذبات کے کیف اور رنگ سے خالی ہوں۔ شعریت پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ اقبال کا کمال فن ہے کہ اُنہوں نے حکمت کو اپنے سوز دل کی حرارت سے شعر بنا دیا۔ یہ ان کے حصے کی چیز ہے جس میں ایشیا کے قدیم و جدید شاعروں میں بہت کم ان کے ساتھ شریک ہیں۔ جہاں واردات قلب کو تمام تصورات کا جامہ ہکا سا باریک پہنا کر الفاظ میں ادا کرنا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ مرحلہ ایشیائی شاعر کے لئے سب سے زیادہ آسان ہے۔ اس لئے کہ یہ احساسات اس کی طبیعت میں رچے ہوئے ہیں۔ اور پھر اُن میں کچھ اس درجہ شعریت ہے کہ خود بخود شعر کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں مگر دوسرے لحاظ سے دیکھئے تو یہ میدان اس قدر پامال ہوچکا ہے کہ اس میں کوئی نئی راہ نکالنا نہایت مشکل ہے۔ لیکن اقبال کا طرز خیال ہی سب سے جدا ہے۔ اس لئے ان کے تصرف نے خود بخود اپنے لئے ایک نیا راستہ پیدا کر لیا ہے۔ اور وہ اسی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ جو ان کے فلسفۂ حیات کی منزل ہے۔ یہی وہ نازک مقام ہے جس میں روحانیت کا ذوق رکھنے والی طبیعتیں آکر کھو جاتی ہیں۔ بادۂ معرفت کے پہلے ہی جام میں علم کائنات اور احساس خودی کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہ اقبال ہی کا ظرف ہے کہ عالم بے خودی میں بھی اُنہیں اتنا ہوش رہتا ہے۔ کہ اس امانت کو نہیں بھولتے۔ جو خدا نے انسان کے سپرد کی ہے

ہم نے اوپر کہا تھا کہ طالب خودی اس "مرد خدا" کی محبت میں جو مدارج خودی میں اس سے برتر ہے۔ سرشار ہوجاتا ہے۔ پھر کیا ٹھکانا ہے اس کیف و مستی کا جو خودی کے مبدا و منتہا، اور خالق و پروردگار یعنی خدائے تعالےٰ کی محبت اس کے دل میں پیدا کر دیتی ہے۔ انسان اپنے دائرہ ارتقاء میں خودی کے کل مراحل طے کرنے کے بعد بھی ناقص و ناتمام ہی رہتا ہے۔ اور کمال و تمام کا وہ جلوہ جو اسے ذات مطلق میں نظر آتا ہے اس کے دل کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اسی کشش کا نام عشق حقیقی ہے۔ عشق کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔ آرزو و جستجو، دیدار، وصل۔ قدیم صوفی شعرا کے یہاں اس تیسری منزل کا تصور یہ ہے کہ طالب مطلوب کے اندر اس طرح فنا ہوجائے جیسے قطرہ دریا میں محو ہوجاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ محدود و نامحدود کے وصل کا اس کے سوا کوئی تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ مگر اقبال کے نزدیک اس عشق کی صرف دو ہی منزلیں ہیں۔ پہلی منزل سوز وگداز آرزو کی ہے۔ دوسری کیف دیدار کی جو راحت بخش بھی ہے۔ اور اضطراب افزا بھی۔ تیسری کوئی منزل نہیں۔ لذت دیدار سے کامیاب ہونے کے بعد بھی نفس انسانی روح مطلق سے جدا رہتا ہے۔ اور درد جدائی سے تڑپتا ہے۔ یہی اُس کی فطرت ہے اور یہی اُس کی تقدیر۔

اب اس اجمال کی تفصیل اقبال کے کلام میں ملاحظہ ہو۔ صوفی شعرا کے نزدیک عالم شہود کی تخلیق کی غایت یہ ہے۔ کہ شاہد مطلق اس آئینے میں اپنے جمال کا نظارہ کرے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں (غالبؔ)

اقبال کا بھی یہی خیال ہے۔

صورت گرے کہ پیکر روز و شب آفرید　　از نقش ایں و آں بتماشائے خود رسید

فرق یہ ہے کہ اوروں کے نزدیک ماسوا محض موہوم ہے۔ اور اقبال

کے نزدیک موجود۔ غالب کہتے ہیں۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

مگر جیسا کہ ہم اُوپر لکھ چکے ہیں۔ اقبال کے خیال میں کائنات کے اندر حیات حقیقی یعنی خودی کی قوت مضمر ہے۔ اور اس اعتبار سے مظاہر کائنات محض وہم ہی وہم نہیں ہیں بلکہ کم سے کم بالقوۃ وجود رکھتے ہیں۔ جب یہ قوت رفتہ رفتہ ارتقا پاکر انسان کی ذات میں شعور اور ارادہ حاصل کرلیتی ہے تو اس کا وجود نمایاں ہوجاتا ہے۔ میلاد آدم دنیا میں ایک نئے دورِ حیات کا آغاز ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی نیستی کا شعور اور ہستی مطلق کی معرفت کا حوصلہ رکھتا ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد — حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہان مجبور — خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل ! — حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوش حیات — چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

یہ نیا مخلوق سوز و سازِ آرزو سے معمور ہے۔ اس کے دل میں ابتدا سے نہ صرف اپنی محدود حقیقت بلکہ ذات ایزدی کی نامحدود حقیقت کا محکوم بننے کی لگن ہے۔ وہ زبانِ حال سے کہتا ہے۔

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن — دل و کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن
بہ گدازہائے پنہاں بہ نیازہائے پیدا — نظرے ادا شناسے بہ حریم ناز کردن
گئے جز یکے نہ دیدن بہ ہجوم لالہ زارے — گہے خار نیش زن را ز گل امتیاز کردن
ہمہ سوز ناتمامم ہمہ درد آرزویم — بہ گماں دہم یقیں را کہ شہید جستجویم !

پہلے اس کی آرزو صرف یہیں تک محدود ہوتی ہے۔ کہ ماسوا کے پردے سامنے سے ہٹ جائیں۔ اور شاہد مطلق کا جمال بے حجاب نظر آئے۔

چند بروئے خود کشی جلوۂ صبح و شام را — چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را
بر سرِ کفر و دیں فشاں رحمت عام خویش را — بند نقاب برکشا ماہِ تمام خویش را

اگر وہ طاقت دیدار رکھتا ہے۔ تو یہ آرزو پوری ہوسکتی ہے مگر صرف اس حد تک کہ کبھی کبھی حسن مطلق کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور آناً فاناً چھپ جاتی ہے۔

نہ ایں عالم حجاب او را نہ آں عالم نقاب او را — اگر تابِ نظر داری نگاہے می تواں کردن

افلاک سے آتے ہیں نالوں کے جواب آخر — کرتے ہیں خطاب آخر اُٹھتے ہیں حجاب آخر

نہ دیگراں چہ سخن گسترم ز جلوۂ دوست — بہ یک نگاہ مثالِ شرارہ می گزرد

تو ز راہ دیدۂ ما بہ ضمیر ما گذشتی — مگر آں چناں گذشتی کہ نگہ خبر نہ دارد

مگر اس سے طالب دیدار کی تسکین نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کا اضطرابِ قلب اور بڑھ جاتا ہے اور اسی کشمکش سے عاجز آکر وہ چاہتا ہے کہ بحرِ وجود اپنی کشش کو اور بڑھا دے۔ اور اس کے قطرۂ خودی کو اپنے آغوش میں لے کر سکونِ دائمی بخشے۔

فرصت کشمکش مدہ ایں دلِ بیقرار را — یک دو شکن زیادہ کُن گیسوئے تابدار را

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر — ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں — یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تُو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجُو — یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

لیکن اس دیدار و وصل میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں قطرہ دریا میں مل کر اپنی خودی کو فنا نہ کر دے۔ اور یہ بات اقبال کو کسی طرح گوارا نہیں۔

اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اُولیٰ — نہ گیرد با من ایں سودا بہا از بس گراں خواہی

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزِ وجود من — بہ ایں قیمت نہ می گیرم حیات جاودانی را

وہ ایسا وصل نہیں چاہتے جس میں قطرے کا انفرادی وجود مٹ جائے لیکن اُن کے خیال میں یہ اندیشہ بے جا ہے۔ دیدار و معرفت الٰہی سے خودی کی آب و تاب کم نہیں ہوتی۔ بلکہ اور بڑھ جاتی ہے۔

کمال زندگی دیدارِ ذات است — طریقش رستن از بندِ جہات است
چناں با ذات حق خلوت گزینی — ترا او بیند و او را تو بینی !
منوّر شو ز نور "من یرانی" — مژہ برہم مزن تو خود نہ مانی !!
بہ خود محکم گذر اندر حضورش ! — مشو ناپید اندر بحرِ نورش
چناں در جلوہ گاہ یار می سوز — عیاں خود را نہاں او را برافروز

اگر قطرے کے دل میں کبھی اپنی کم مائیگی کا خطرہ گزرتا ہے۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ دریا کے آگے اُس کی ہستی معدوم محض ہے۔ تو خود بحرِ حقیقت اس کی خودی کی بقا کی ضمانت کرتا ہے۔

یکے قطرۂ باراں ز ابرے چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید !
کہ "جائے کہ دریاست من کیستم — گر او ہست حقا کہ من نیستم"
ولیکن ز دریا برآمد خروشش — ز شرم تنک مائگی رو مپوشش
ز موج سبک سیر من زادۂ — ز من زادۂ در من اُفتادۂ
بیا سائے در خلوت سینہ ام — چو جوہر درخش اندر آئینہ ام
گہر شو در آغوشِ قلزم بزی — فروزاں تر از ماہ و انجم بزی

اسی طرح قطرۂ ناچیز میں جوشِ عشق وہ ظرف پیدا کر دیتا ہے۔ وہ دریا کو اپنے آغوش میں لینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

درسینۂ من دمے بیاسائے　　از زحمت و کلفت خدائی

حفظِ خودی کا خیال عشق کے منافی نہیں بلکہ عینِ عشق ہے۔ حسن کا عیار عاشق کا دل ہے اور بزمِ حسن کا فروغ عاشق کے دم سے ہے۔ وہ اپنی خودی کی حفاظت اپنے لئے نہیں بلکہ معشوق کی خاطر کرتا ہے۔

خدائے زندہ بے ذوقِ سخن نیست　　تجلی ہائے او بے انجمن نیست

کہ برقِ جلوۂ او برجگر زد؛　　کہ خود آں بادۂ و ساغر بہ سوزد

عیارِ حسن و خوبی از دلِ کیست　　مہ او در طوافِ منزلِ کیست

الست از خلوتِ نازکہ برخاست؟　　بلیٰ از پردۂ سازکہ برخاست؟

اگر مائیم گرداں جامِ ساقی است　　بہ بزمش گرمی ہنگامہ باقی است

مرا دل سوخت بر تنہائی او　　کنم ساماں بزم آرائی او

مثالِ دانہ می کارم خودی را　　برائے او نگہ دارم خودی را

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ محدود کا حقیقی وصل نامحدود سے یہی کہ اس کے اندر محو ہو جائے۔ بندے اور خدا کا یہ وصل جو اقبال کے پیشِ نظر ہے۔ حقیقت میں وصل نہیں ہے۔ یہ ایک خاص حالت ہے۔ جس میں سکون حاصل نہیں ہوتا بلکہ سوز و ساز فراق اور بڑھ جاتا ہے۔

او در من و در دے ہجراں کہ وصالست ایں　　اے عقل چہ می گوئی اے عشق چہ فرمائی

از خود را بریدن فطرتِ ماست　　تپیدن نارسیدن فطرتِ ماست

نہ ما را در فراق او عیارے　　نہ او را بے وصالِ ما قرارے

نہ او بے ما نہ ما بے او چہ حال است　　فراقِ ما فراقِ اندر وصال است

کبھی درد فراق میں اقبال اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں۔ کہ سوز و گداز کا یہ کیف انسان ہی کا حصہ ہے۔ خدا اس سے محروم ہے۔

سوز و گداز حالتے است بادہ ز من طلب کنی

پیش تو گر بیاں کنم مستی ایں مقام را

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی

مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

کبھی شوخیٔ تخیل سے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بندۂ خدا کے ہجر میں بے چین ہے اُسی طرح خدا بھی بندے کے فراق میں بے قرار ہے۔

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجوست　　چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزوست

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں　　کارِ جہاں دراز ہے۔ اب مرا انتظار کر

بہر حال یہ جدائی انسان کے لئے مبارک ہے۔ کیونکہ یہی اس کی خودی کی وجہ حیات ہے۔

جدائی عشق را آئینہ دار است　　جدائی عاشقاں را سازگار است

اگر ما زندہ ایم از دردمندی است　　وگر پائندہ ایم از دردمندی است

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق

وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

گرمیٔ آرزو فراق لذتِ ہائے و ہو فراق　　موج کی جستجو فراق، قطرے کی آبرو فراق

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اس نظریہ حیات کا جو اقبال نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ فلسفی شاعر دنیا میں ایک ایسا دل لے کر آیا۔ جو سوزِ حیات اور دردِ کائنات سے لبریز تھا اور ایک ایسا دماغ جو زندگی کے اسرار و معارف کا محرم تھا۔ اس نے دنیا کو ایسی حالت میں پایا کہ مشرق خصوصاً اسلامی مشرق جو ابھی تک خوابِ غفلت میں مدہوش تھا۔ کسمسا کر کروٹ بدلنا چاہتا ہے مگر غلامی کا کابوس جو اس کے دل و دماغ پر مسلط ہے اُسے ہلنے نہیں دیتا۔ مغرب جس نے اپنی بیدار مغزی سے ربعِ مسکوں پر اپنا سکہ بٹھا لیا ہے۔ طمع و نخوت کے نشے میں چور، انقلاب کی ان قوتوں سے جو خود اس کے اندر سے اُبھر رہی ہیں، ٹکرایا چاہتا ہے۔ اس کا دل کُڑھا ایشیا کی بے حسی اور بے بسی پر جو قیدِ مذلت میں گرفتار ہے اور کچھ نہیں کرتا اور یورپ کی ناعاقبت اندیشی پر جو قعرِ ہلاکت میں گرنے والا ہے۔ اور کچھ نہیں دیکھتا۔ اس نے ایک کی بے عملی اور دوسرے کی بے صبری کے اسباب پر غور کیا اور اُس کی حقیقت بین نظر سطحی چیزوں سے گزرتی ہوئی اُن تصوراتِ حیات پر جا کر پڑی جن پر ان دونوں تہذیبوں کی بنیادیں قائم ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ایشیا کے قوائے ذہنی کو ماؤف اور اس کے دستِ عمل کو شل کرنے والا نفیٔ خودی اور نفیٔ کائنات کا فلسفہ ہے۔ اب رہا یورپ تو اس میں شک نہیں کہ اس نے اثباتِ خودی کی اہمیت کو سمجھ کر میدانِ عمل میں قدم بڑھایا اور فرد و جماعت کے ربط سے اپنی زندگی کو استوار بنایا لیکن چونکہ اس ربط کی بنیاد کسی عالمگیر روحانی عقیدے پر نہیں بلکہ نسل و وطن کے تنگ مادی نظریے پر تھی۔ اس لئے بہت جلد اس کے اندر انتشار کی قوتیں نمودار ہو گئیں۔ صحیح نصب العین اقبال کے نزدیک اسلام کا ہے۔ جس نے ایشیا کی روحانیت اور یورپ کی عملیت کو سمو کر دنیا کو دینِ فطرت کی راہ دکھائی۔ مگر گردشِ زمانہ

سے اسلام کے پیرو بھی وحدت وجود کے عقیدے کی بدولت جو نفی خودی اور نفی کائنات کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی غفلت و جمود کا شکار ہو گئے۔ جو ایشیا کی اور قوموں پر طاری تھا۔ اس کی سزا اُنہیں یہ ملی۔ کہ یورپ کی ذہنی اور سیاسی غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہو کر ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کے بعد اقبالؔ اپنے جاں بخش اور جاں فزا نغمۂ اُمید سے ملت اسلامی کو غفلت سے جگاتا ہے۔ تاکہ وہ اس خدمت کو جو خدا نے اُس کے سپرد کی ہے۔ پورا کرے اور دنیا کو اس روحانی اور مادی ہلاکت سے جو آج چاروں طرف منڈلا رہی ہے۔ نجات دے۔ اقبالؔ کی نظر مشرق و مغرب میں ایک زبردست سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے آثار دیکھتی ہے۔ اور اسے صحیح راہ پر لگانے کے لئے وہ پہلے مسلمانوں کے اور پھر کل اقوام عالم کے قلوب میں ایک روحانی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے وہ دنیا سے اُٹھ گیا۔ مگر اُس کا پیام فضائے عالم میں گونج رہا ہے۔ اور گونجتا رہیگا۔

(ڈاکٹر سید عابد حسین از رسالہ اُردو اقبال نمبر)

یادِ ماضی

احساس یادِ ماضی تکلیف دے رہا ہے
پھر امتحانِ ضبط فریاد لے رہا ہے
احباب لکھ رہے ہیں خطوں میں گذشتہ باتیں
یاد آرہی ہیں جن سے رُومان خیز راتیں
دُہرا رہی ہے دُنیا میرا ہی اِک فسانہ
دل کی تباہیوں کا ہے قصّہ خواں زمانہ
پھر میرے رازِ غم کی تشہیر ہو رہی ہے
تقدیر ہنس رہی ہے تدبیر رو رہی ہے
پھر میرے سامنے ہے بیتا ہوا زمانہ !
گیسو کی طرح اُن کے بکھرا ہوا زمانہ !
پھر چھائے جا رہے ہیں مجھ پر وہی مناظر
جن کا سوائے میرے کوئی نہ تھا مصوّر
آنسو بہا کے دل کی تسکین کر رہا ہُوں
معیارِ عاشقی کی توہین کر رہا ہُوں
پھر ایک بیوفا کی یاد آرہی ہے مُجھ کو !
بیچین کر رہی ہے تڑپا رہی ہے مجھ کو
پھر ارضِ تاج اپنی جانب بُلا رہا ہے
جمنا کا سین دِل میں لہریں اُٹھا رہا ہے
پھر سو رہی ہے دُنیا، پھر گِن رہا ہُوں تارے
جمنا کی تند موجیں کرتی ہیں پھر اشارے
لیکن میں چاہتا ہُوں سب کچھ یہ بھول جاؤں
یعنی فریبِ ماضی اب حال میں نہ کھاؤں
برسوں بنا رہا ہُوں تقدیر کا نشانہ
ناکامیوں کا میری شاہد ہے اِک زمانہ !
لاکھوں دِلِ حزیں پر صدمے اُٹھا چکا ہُوں
معصوم حسرتوں کو جبراً مٹا چکا ہُوں !
میں نے بھی احترامِ عشق و وفا کیا ہے
میرا بھی خیر مقدم ہر بزم میں ہُوا ہے !

میں بھی کبھی جواں تھا یہ بے حسی نہیں تھی
جیسی ہے آج حالت ایسی کبھی نہیں تھی
میں نے بھی زندگی میں اِک بار کی ہے اُلفت
اب تک بنا ہُوا ہوں دل کا سہیمِ قسمت
میں نے بھی دل دیا تھا اِک بیوفا حسیں کو
تر کر چکا ہوں میں بھی اشکوں سے آستیں کو
میں بھی فریبِ اُلفت اُلفت میں کھا چکا ہوں
اِک دُشمنِ وفا پرستی مٹا چکا ہُوں
میرا بھی سر جُھکا ہے حُسنِ بُتاں کے آگے
میں بھی ہُوا ہوں رسوا سارے جہاں کے آگے
میں بھی خرابِ حسرت، بربادِ آرزو ہُوں !
آوارۂ محبت ، ناکامِ جستجو ہُوں !
اللہ وہ مرے دن، اللہ وہ زمانہ !!
تصنیف کر رہی تھی ہر سانس اِک فسانہ
اب وہ گذشتہ باتیں کیوں یاد آرہی ہیں
بیٹھے بٹھائے ناحق وحشت بڑھا رہی ہیں

میرے قریب آئے ہرگز نہ یادِ ماضی
میری وُہی رضا ہے جس میں رہے وہ راضی
گھیرے ہُوئے ہیں جلوے لیکن نظر وہیں ہے
اب میری زندگی بھی میرے لئے نہیں ہے

اب زندگی کا عرفاں اتنا ہی رہ گیا ہے
دشمن بھی دوست اپنا رہزن بھی رہنما ہے

سیفؔ اکبر آبادی

صفحہ اطفال

ادبی کھیل

پریشان حال　　فارغ البال　　مرفہ الحال
آسودہ حال

عزیز حسن۔ قاضی فیض محی الدین صاحب کا تیار کردہ ادبی کھیل بہت ہی خوب تھا۔

کرم سنگھ۔ مجھے بھی بہت پسند آیا۔

جمیل۔ تاش کو رکھو طاق پہ اور ادبی کھیل شروع کرو۔

رام چندر۔ اچھا! "پریشاں حال" کے لفظ کو فقرے میں استعمال کرو۔

جمیل۔ یہ کونسی مشکل بات ہے؟ لو سنو فقرہ!

نظیر دو سال تک بیکار رہنے کے سبب پریشاں حال رہا۔ دو سال کے بعد بیچارے کو ایک اچھی ملازمت نصیب ہوئی اب خدا کے فضل سے فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

عزیز۔ فارغ البالی کیا بھئی!

جمیل۔ عزیز! عربی میں دل کو بال کہتے ہیں۔ فارغ کے معنی ہیں خالی۔ فارغ البال، وہ شخص جس کا دل غم و فکر سے خالی ہو۔ اور فارغ البالی بے فکری کو کہتے ہیں۔ جب کوئی اطمینان اور آرام کی زندگی بسر کرتا ہو تو کہا کرتے ہیں۔

وہ آدمی فارغ البال ہے۔ اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

رام چندر۔ میں نے ایک کتاب میں اسی وزن پر ایک اور لفظ بھی پڑھا ہے۔ "مرفہ الحال" اس کے کیا معنی ہوئے جمیل!

جمیل۔ مرفہ الحال، فارغ البال اور آسودہ حال، ان سب لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ یعنی خوش حال اور بے فکری سے زندگی بسر کرنے والا۔

عزیز۔ جمیل میاں تم تو کہتے ہو۔ بال عربی میں دل کو کہتے ہیں۔ مگر ہم نے تو بال کے معنی جسم کے بال پڑھے ہیں جیسے شاعر کا شعر ہے ۔

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ + اب توقع نہیں رہائی کی!

جمیل۔ عزیز! اس شعر میں بال کے معنی جسم کے بال کے نہیں بلکہ یہاں بال کا ترجمہ ہے بازو اور بازو کے معنی میں بال فارسی کا لفظ ہے۔ عربی کا نہیں۔ اور اُردو میں بال کے معنی جسم یا سر کے بال کے ہیں۔ اس معنی میں بال نہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ نہ فارسی کا بلکہ ہندی یا اُردو کا لفظ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھو کہ عربی

زبان میں بال کے معنی ہوئے دل۔ اور فارسی میں بازو۔ اور اُردو میں جسم کے بال۔ جیسے عربی فارغ البال، فارسی بال وپر اور ہندی یا اُردو۔ سر یا جسم کے بال۔

رام چندر۔ مگر اُردو میں بال کے ایک اور معنی بھی تو ہیں۔

جمیل۔ ہاں۔ آئینے یا برتن میں دراڑ جو پڑ جاتی ہے۔ اُسے بھی بال کہتے ہیں۔ جیسے "آئینے میں بال پڑ گیا"۔ تاجور

برٹش میوزیم

لنڈن کے برٹش میوزیم (عجائب خانہ) کا نام سبھی پڑھے لکھے آدمی جانتے ہیں۔ کہنے کے لئے تو یہ ایک میوزیم یا ایک عجائب خانہ ہے۔ لیکن اصل میں اسے علم کا خزانہ کہنا چاہیئے۔ یہ دنیا میں سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔ اور جیسی جیسی عمدہ کتابیں یہاں جمع ہیں۔ ویسی کہیں نہیں مل سکتیں۔

پیارے بچوں کو یہ سُن کر حیرت ہوگی۔ کہ برٹش میوزیم جس پر آج انگریزوں کی قوم کو بہت ناز ہے۔ ۱۷۵۳ء میں بہت چھوٹے پیمانہ پر قائم ہوا تھا۔ اس کی کہانی اس طرح ہے کہ لندن میں ایک شخص ولیم کورٹنیس کو پُرانی تصویریں۔ سکے اور کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اور اُس نے برسوں کی محنت اور روپیہ خرچ کرنے کے بعد بہت سی اچھی چیزیں جمع کر لی تھیں۔ اس زمانے میں انگلستان کے بادشاہ کا درباری ڈاکٹر سلون نامی بہت علم دوست تھا۔ اُس نے بھی یورپ کے کئی ملکوں کی سیر کر کے بہت سی پُرانی چیزیں جمع کر لی تھیں۔ جب اِسے ولیم کورٹنیس کے ذخیرہ کا علم ہوا۔ تو وہ اُس سے ملا۔ اور اُسے سمجھایا۔ کہ تم نے جو عمدہ عمدہ کتابیں اور تصویریں جمع کی ہیں۔ وہ تمہارے مرنے کے بعد برباد ہو جائیں گی۔ اگر تم اپنا ذخیرہ مجھے دے دو تو میں اس میں اپنی جمع کی ہوئی چیزیں شامل کر کے ایک قومی عجائب خانہ قائم کر دُوں۔ اس طرح چیزیں بھی محفوظ رہیں گی۔ اور ہم دونوں کا نام بھی زندہ رہے گا۔ ولیم کورٹنیس راضی ہو گیا۔ اور اُس نے سارا سامان ڈاکٹر سلون کو دیدیا۔

ڈاکٹر سلون نے ایک چھوٹے سے مکان میں جس کا نام مانٹیگو ہاؤس تھا۔ یہ سارا سامان رکھ کر اس کا نام برٹش میوزیم (برطانوی عجائب خانہ) رکھا۔ اور اِسے قوم کی نذر کر کے انتظام کے لئے ایک کمیٹی بنا دی۔

ڈاکٹر سلون بہت بااثر اور معزز آدمی تھا۔ بادشاہ کے تمام امیروں سے اس کی دوستی تھی۔ جہاں اسے کوئی پرانی کتاب تصویر یا کوئی اور چیز ملتی اپنے نئے عجائب خانہ کے لئے مانگ لیتا اور یوں بھی لوگ نئی نئی چیزیں بھیجتے رہتے تھے۔ میوزیم قائم ہونے کے سال دو سال بعد ہی ڈاکٹر سلون کے ایک دوست نے جو آکسفورڈ کا ارل یا نواب تھا۔ اپنا سارا عظیم الشان کتب خانہ برٹش میوزیم کو دے دیا۔

اس کتب خانہ کے ملتے ہی برٹش میوزیم کی دُھوم سارے انگلستان میں مچ گئی اور ملک بھر سے پڑھے لکھے آدمی اُسے دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ اب کتابوں اور دوسری چیزوں کی آمد

کا سلسلہ بھی اتنا بڑھ گیا۔ کہ مانٹیگو ہاؤس میں رکھنے کے لئے جگہ نہ رہی۔

جب انگریزوں کے بادشاہ کو اس میوزیم کی ترقی کا حال معلوم ہوا۔ تو اُس نے حکم دیا کہ اس کام کے لئے ایک بہت بڑی عمارت تیار کی جائے۔ چنانچہ عمارت تیار ہوئی۔ اور برٹش میوزیم اُس میں تبدیل کر دیا گیا۔ برٹش میوزیم کی عمارت میں مختلف وقتوں میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ اور آج اس کا شمار عالیشان عمارتوں میں ہے۔

بچوں کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ برطانیہ کے سارے آدمی اس میوزیم سے خوش تھے بلکہ بہت لوگ اس کے مخالف تھے بہت عرصے تک اس کی مخالفت رہی۔ ۱۸۳۳ء میں برٹش میوزیم کو نئی نئی کتابیں وغیرہ خریدنے کے لئے ایک لاکھ پونڈ کی ضرورت ہوئی۔ پارلیمنٹ نے یہ رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اور اُس کے ایک ممبر نے بھرے اجلاس میں کہا کہ برطانوی قوم کو اس میوزیم سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو تھوڑے آدمی جنہیں کتابوں کا کیڑا کہنا چاہیئے وہاں جا کر فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اُنہی کو اس کے خرچ کا انتظام بھی کرنا چاہیئے۔ ساری قوم پر بوجھ ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب پارلیمنٹ سے رقم نہ ملی۔ تو برٹش میوزیم کا انتظام کرنے والوں کو مجبوراً لاٹری ڈال کر ایک لاکھ پونڈ کی رقم پوری کرنا پڑی۔ لیکن اب یہ بات نہیں ہے۔ برٹش میوزیم قائم کرنے والوں کی کوشش تمام مخالفت پر غالب آئی۔ آج انگریزوں کی ساری قوم اس پر فخر کرتی ہے۔

برٹش میوزیم کے لئے دنیا کے قریب قریب سبھی ملکوں کی کتابوں کی خریداری یا تحفہ میں حاصل کرنے کے علاوہ انگریزوں کا جس ملک پر بھی قبضہ ہوا۔ اُنہوں نے اُس ملک کے شاہی کتب خانہ کو برٹش میوزیم میں بھیجنے کی کوشش کی۔ مغل بادشاہوں برما کے راجاؤں۔ مرہٹوں اور نواب بنگال اور ٹیپو سلطان وغیرہ کی بربادی کے بعد ہندوستان کے عالیشان کتب خانوں کا بھی بڑا حصہ برٹش میوزیم میں پہنچ گیا۔

برٹش میوزیم میں جو مختلف کتب خانے ہیں۔ ان میں سب سے بڑے ذخیرے کا نام "کنگس لائبریری" (بادشاہ کا کتب خانہ) ہے۔ اسے انگلستان کے بادشاہ جارج سوم نے جمع کرنا شروع کیا تھا۔ یہ کتب خانہ پہلے بادشاہ کے محل میں تھا اور اس کا خرچ دو ہزار پونڈ سالانہ تھا۔ جب جارج چہارم بادشاہ ہوا۔ تو اُسے اپنے عیش و آرام کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوئی۔ اور اُس نے یہ کتب خانہ روس کے بادشاہ کے ہاتھ فروخت کرنا چاہا۔ انگریزوں کو جب یہ حال معلوم ہوا۔ تو وہ بہت رنجیدہ ہوئے۔ وزراء نے بادشاہ کو سمجھایا کہ وہ اپنا کتب خانہ رُوس کے ہاتھ نہ بیچے۔ لیکن بادشاہ بہت ضدی تھا۔ اُس نے صاف کہہ دیا کہ اپنے بزرگوں کی چیز پر مجھے اختیار ہے۔ مجھے اس وقت روپیہ کی ضرورت ہے اور میں اس کتب خانہ کو ضرور بیچوں گا۔ اگر تمہیں یہ بہت پیارا ہے۔ تو جو قیمت روس کا بادشاہ دے رہا ہے۔ وہی دے کر تم خرید لو۔

وزیر نے سارا حال اپنی قوم کو سنایا۔ انگریزوں نے دو ہفتوں کے اندر ہی آپس میں چندہ کر کے رقم جمع کر لی۔ اور بادشاہ کو قیمت دے کر کتب خانہ خرید لیا۔

(تارا سنگھ)

(منقول از پریم)

بزمِ انتخاب

بھوکوں کا خدا

سڑک کولتار کی بنائی جارہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف کولتار پگھلانے کی مشین اور اُس کے نزدیک سڑک بنانے کا سیاہ انجن آنے والے انقلاب کی طرح اس انتظار میں کھڑا تھا کہ موقع پاتے ہی اُن تمام چیزوں کو جو اُس کی زد میں آئیں کچل کر نشیب و فراز کو ہموار کر دے۔ دُھول کا غبار فضا میں غریبوں کی آہوں کی طرح پھیل رہا تھا۔ عورتوں کی ایک جماعت ہاتھوں میں تاروں کے بڑے بڑے برش لئے سڑک صاف کرنے میں مصروف تھی۔ اُن کے پیچھے کچھ مزدور سوپ کے ذریعہ دُھول اُڑا رہے تھے۔ دُھول اُن کے چہروں پر غازہ کا کام کر رہی تھی۔ وہ ان چھوٹے درجہ کے عیسائیوں کی طرح حسین معلوم ہوتے تھے جن کی خوبصورتی غازہ کریم کی مرہونِ منت ہے۔ اوورسیر اور مکدم انجن کے نزدیک کھڑے حُسن آوارہ کی غیر ارادی حرکتوں اور شرم و حیا سے بے نیاز جسم کے بعض حصّوں کی برق پاش عریانیوں کو جو اُن کے شعلۂ معصیت کو ہوا دے رہی تھیں۔ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

شنکر دوڑا ہوا آیا اور ایک سُوپ اُٹھا کر مزدوروں میں شامل ہونے ہی والا تھا کہ اوورسیر چلایا "کیوں بے! بے ایمان!! اتنی دیر سے آتا ہے۔ اس طرح کہیں مزدوری کی جاتی ہے؟"

"بابو جی! آج آنکھ نہ کُھلی۔ معاف کرو۔ اب ایسا نہ ہوگا" شنکر نے کانپتے ہُوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس طرح مزدوری نہیں کی جاتی۔ آج تم کو صرف آدھے دن کی مزدوری دی جائیگی۔ اوورسیر نے گرجتے ہوئے کہا" یہ سرکاری کام ہے۔ یہاں دھاندلی نہ چلے گی۔ جاؤ مزہ کرو۔ اب دو بجے آنا"

"بابو جی غریب آدمی ہوں" شنکر نے رحم کی بھیک مانگی۔ "آج معافی دو۔۔۔ ابھی تو ساڑھے سات بجے ہیں ۔۔۔ صرف آدھے گھنٹے کی دیر ہوئی سرکار!"

مکدم نے اوورسیر کے کان میں آہستہ آہستہ کچھ کہا۔ جس کو سنتے ہی اوورسیر نے شنکر کا قصور معاف کرتے ہُوئے کہا۔ "اچھا جاؤ آج معاف کیا آئندہ ایسا نہ کرنا ۔۔۔"

~~~~~

شنکر سوپ لئے مزدوروں میں شامل ہو گیا۔ وہ زور زور سے ہاتھوں کو نصف دائرے کی شکل میں گردش دے کر دُھول اُڑانے لگا۔ موہن نے جو اُس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ آہستہ سے دریافت کیا۔ "بچ گئے؟"

"ہاں! بال بال بچ گیا" اُس نے مسکراتے ہُوئے ایک نظر اوورسیر اور مکدم پر ڈال کر اطمینان کر لیا۔ کہ وہ اپنی باتوں میں مشغول ہیں۔ "کل رات موتی مجھے زبردستی "رام لیلا" لے گیا۔ دو بجے رات کو میں گھر آ کر سویا تھا۔ بھلا صبح جلدی آنکھ کیسے کھلتی ۔۔۔ اور اس سردی میں تو بھیا ۔۔۔ گودڑی چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ۔۔۔ آج بابو جی کچھ خوش معلوم ہوتے ہیں۔ مجھ پر بڑی کرپا کی"

مکدم نے اُنہیں باتیں کرتے دیکھ لیا۔ وہیں کھڑے کھڑے ڈانٹ بتائی "کیوں بے! باتیں کر رہا ہے؟ ۔۔۔ ایک تو دیر سے آتا ہے اور پھر دوسروں کو بھی باتوں میں لگاتا ہے۔ ابھی کان پکڑ کے نکال دونگا"

وہ پھر مستعدی سے کام کرنے لگا۔ لگاتار محنت سے اس کے جسم میں گرمی آگئی۔ اُس نے پیشانی کے پسینے کے قطرات اُنگلیوں سے اُتار کر اپنی میلی دھوتی سے پونچھ لئے۔ اب وہ سستانے کے لئے ذرا ٹھہرا۔ اپنے گردوپیش کی چیزوں پر ایک نظر ڈالی ۔۔۔ عورتوں کی جماعت میں شانتی کو دیکھ کر چونک پڑا۔

"کیا بات ہے؟" موہن نے اپنا کام کرتے ہُوئے بغیر گردن اُٹھائے پوچھا۔
~~~~~

"شانو یہاں کیسے؟" شنکر نے حیرت سے دریافت کیا۔

"اُس کی ماں بیمار ہے اُس کی جگہ کام کرنے آئی ہے۔"

"پگلی بڑھیا، مرتی بھی تو نہیں۔" شنکر نے نفرت سے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔ "شانو کا باپ زندہ ہوتا تو کب کا میرا بیاہ ہو چکا ہوتا ــــ بڑھیا سے کہتا ہوں میرا بیاہ کر دے۔ میری بچپن کی بات ہے۔ تو بھی میرے ہی یہاں آ رہنا۔ مگر وہ تو پگلی ہے پگلی ــــ جوان لڑکی کو ان بے ایمانوں میں (اُس نے اودر سیر و مکدّم کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا) کام کرنے بھیجدیا۔

اودرسیر و مکدم سڑک کے کنارے دھوپ میں کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ مکدم کہہ رہا تھا۔ "اُس کے باپ اور شنکر کے باپ میں بڑی دوستی تھی۔ شنکر اور اُس کی بچپن میں بات بھی ہو گئی تھی۔ لیکن شنکر کی ماں کے مرنے کے بعد شنکر کے باپ نے ایک نیچ ذات عورت کو گھر ڈال لیا اسی وجہ سے گاؤں والوں نے اُسے برادری سے نکال دیا۔ دونوں کے باپ مر چکے ہیں۔ دونوں میں اب بھی بڑا پریم ہے۔ اب تک دونوں چھپ چھپ کر ملتے ہیں ــــ شنکر لاکھ خوشامدیں کرتا ہے۔ مگر بڑھیا راضی نہیں ہوتی۔"

"بس اب اس کہانی کو ختم کرو۔ اور کوئی مطلب کی بات کرو ــــ" اودرسیر نے بات کاٹ کر کہا۔

"بڑھیا ہے تو بڑی لالچی۔" مکدم نے جواب دیا۔ "چاندی کے دو چار سکے اُسے موم کر سکتے ہیں۔ مگر شنکر کی طرف سے اُسے بڑا خطرہ ہے۔"

"سنو! سنو!" اودرسیر کہنے لگا۔ "بڑھیا کو اس بات پر راضی کرو کہ وہ شانتی کو میرے ہاں گھر جھاڑنے پر نوکر رکھا دے۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔ مگر شنکر بڑھیا کو نہ بہکا دے۔" مکدم نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"ارے یار! تم بھی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔" اودرسیر نے مکدم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں نے ایسے سینکڑوں کھیل کھیلے ہیں۔ بڑھیا کیا اور بڑھیا کی لڑکی کیا ــــ شنکر کا گاؤں میں رہنا مشکل کر دونگا۔ کھانا کھانے کے لالے پڑ جائیں گے۔ بھیک بھی نہ ملے گی۔"

"کہو بھابی کیسی ہو؟" مکدم نے بڑھیا کی جھونپڑی میں داخل ہو کر پوچھا۔

"اچھی ہوں بھیا۔" بڑھیا نے جواب دیا۔ "اپنے دن گن رہی ہوں۔ خبر نہیں کب سانس ٹوٹ جائے ــــ کہو کیسے آنا ہوا؟ کیا آج کام پر نہیں گئے؟"

"بابو جی نے تمہاری خبر لانے بھیجا ہے۔"

"بڑی کرپا کی بابو جی نے"

"ہاں اُنہیں تمہارا بڑا خیال ہے۔ وہ تو شانتی سے تمہارا حال سُن کر خود آنے والے تھے۔ لیکن پھر کام کی وجہ سے نہ آ سکے۔"

"بابو جی بڑے اچھے آدمی ہیں۔ غریبوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ ایسا آدمی آج کل ملنا بڑا مشکل ہے ــــ شانتی تو کام کر رہی ہے نا؟ ــــ بھیا اُس کا یہ کام کا پہلا دن ہے تم ذرا اُس کا خیال رکھنا کہیں گھبرا نہ جائے۔

"تم کیسی باتیں کرتی ہو بھابی وہ تو اپنی لڑکی ہے۔ مگر بابو جی کا خیال ہے۔ یہ کام اس کے بس کا نہیں۔ اگر تم راضی ہو تو بابو جی اس کو اپنے گھر جھاڑنے پر نوکر رکھنے کو تیار ہیں ــــ پانچ روپے ملیں گے ــــ میرا خیال ہے تم ضرور اس کو نوکر رکھا دو۔ پانچ روپے آجکل کہاں ملتے ہیں۔ اور کام بھی پھر زیادہ نہیں"

بڑھیا کچھ سوچ میں پڑ گئی۔

"کیا حرج ہے بھابی!" مکدم نے جال پھیلاتے ہوئے کہا۔ "بابو جی بڑے اچھے آدمی ہیں ہم لوگوں پر بڑے مہربان ہیں۔"

"یہ سب ٹھیک ہے بھیا مگر . . . . "

"مگر کیا؟"

"میں . . . تو . . . جوان لڑکیوں کو بڑے گھروں میں نوکر رکھنا پسند نہیں کرتی . . . بابو جی کو تو کچھ نہیں کہتی۔ مگر بڑے لوگ ہوتے بڑے خراب ہیں۔ وہ ہماری محنت کی طرح عزت و آبرو کو بھی اپنا زر خرید غلام سمجھتے ہیں میں تم کو گاؤں کی بہت سی لڑکیاں بتا سکتی ہوں۔ جو بڑے گھروں میں خراب ہو گئیں۔"

"نہیں! نہیں!! ایسا نہ کہو بھابی۔" مکدم نے تیزی سے جواب دیا۔ "بابو جی بڑے اچھے آدمی ہیں۔ وہ لوگ حیوان ہیں جو دوسروں کی بہو بیٹیوں پر بُری نظر ڈالتے ہیں۔"

مکدم نے بڑھیا کو ایسے سبز باغ دکھائے کہ بڑھیا راضی ہو گئی۔

رات شنکر روٹی کھا کر بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ کہ موہن آیا "شنکر کچھ سُنا، کل صبح سے شانو بابو جی کے گھر کام کرنے جائے گی۔ برتن مانجھنے اور گھر جھاڑنے کے پانچ روپے مہینہ ملیں گے۔"

"سچ کہو" شنکر نے تعجب سے پوچھا۔

"میں ابھی روٹی کھا کر یہاں آ رہا تھا۔ راستہ میں شانتی کے گھر میں شور سُن کر ٹھہر گیا۔ بڑھیا شانتی پر برس رہی تھی۔ شاید اُس نے انکار کیا ہوگا۔"

"تو کیا وہ راضی ہو گئی؟"

"یہ میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن بڑھیا اُس سے کہہ رہی تھی۔ "مجھے دن بھر کی محنت کے بعد بازار کے بازار صرف پندرہ آنے ملتے ہیں اور تجھے تو

پانچ روپے مہینہ ملے گا۔ آئی دولت کو لات نہیں مارتے۔ کب تک میرے سہارے بیٹھی رہے گی۔ میرے تو اب ہاتھ پاؤں نہیں چلتے۔ اگر تجھے ذرا بھی میرا خیال ہے۔ تو یہ نوکری ضرور کرلے۔ آخر کسی طرح پیٹ بھی تو بھرنا ہے نا"

شنکر نے چلم کا دھواں آسمان کی طرف چھوڑ کر نفرت سے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا "چاندی کے چند چمکدار ٹکڑوں پر بھوکا اس طرح گرتا ہے جیسے سڑے ہوئے گوشت پر گدھ۔ بھوک ہمیں پاپ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اوپر میشور! —— نہیں نہیں!! بھوکوں کا خدا تو پیسہ ہے۔ (ساقی)

تلمیحات جن کی بنا اوہام پرستی ہے

اُردو زبان میں تلمیحات کی ابتدا اُس وقت ہوئی۔ جب سادہ خیالات اور حقیر باتوں کے اظہار کے لئے تفصیل اور طوالت درکار ہوتی تھی۔ لیکن جتنی زبان میں ترقی ہوتی گئی۔ طویل قصص اور لمبے واقعات کے لئے مختصر الفاظ اور خاص خاص اشارے وضع کئے گئے۔ حتیٰ کہ جہاں کسی گفتگو یا تحریر میں اُن میں سے کوئی لفظ مذکور ہوتا۔ سامع یا قاری کا ذہن فوراً اُس گذرے ہوئے واقعہ یا قصہ کی جانب متبادر ہو جاتا۔ اور واقعات پارینہ یا حالاتِ گذشتہ آنکھوں کے سامنے آجاتے تھے۔ ان مشارٌالیہ الفاظ کو "تلمیح" کہتے ہیں۔

تلمیحات مروجہ چار قسم کی مشہور ہیں۔

(۱) تاریخی۔ جن کا ماخذ تاریخی واقعات ہیں۔

(۲) مذہبی۔ جو عقائد اور رسومات پر مبنی ہیں۔

(۳) جن کو قصص مفروضہ پر محمول کیا جاتا ہے۔

(۴) جو ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی پر بنا رکھتی ہیں۔

مؤخر الذکر میں سے چند ایک قارئین "خیام" کے تفنن طبع کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔

جامِ جہاں نما۔ اس کا قصہ یوں ہے۔ کہ شاہ ایران جمشید کے پاس ایک پیالہ تھا۔ جس میں تمام دنیا نظر آسکتی تھی۔ اور علم ہیئت پر بھی اس سے روشنی پڑتی تھی۔ لوگ اسے نادر الوجود خیال کرتے تھے۔ لکھا ہے کہ جمشید اس میں شراب بھی پیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی تائید غالبؔ نے بھی کی ہے ؎

اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے میرا جامِ سفال اچھا ہے

مارِ ضحاک۔ مارِ ضحاک سے مراد کیانی بادشاہ ضحاک کے وہ مشہور سانپ ہیں جو اس کی حفاظت کرتے تھے۔ لکھا ہے کہ اس کے دونوں شانوں پر دو ناسور تھے جن کا علاج اطبّائے وقت نے یہ بتایا کہ روزانہ صحیح الجسم نوجوان آدمی کے سر کا بھیجا اُن زخموں میں بھرا جائے۔ چنانچہ ظالم بادشاہ نے اپنی جان بچانے کی خاطر ملک کے نونہالوں کو موت کے گھاٹ اُتارنا شروع کر دیا۔ اُس کا ظلم و ستم رعایا پر اتنا بڑھ گیا۔ کہ وہ آج تک اپنے ظلم اور اُس کے سانپ اُس کا موجب ہونے کے لئے بدنام ہیں۔

ماہِ نخشب۔ کہتے ہیں حکیم عطا ابن مقنع نے ایک پارے کا چاند بنایا جو تاریک راتوں میں کنوئیں سے نکل کر روشنی پھیلایا کرتا تھا۔ چاند کا طلوع و غروب حکیم کی مرضی پر تھا۔ لوگ اسے معجزہ تصور کرتے تھے۔ اب بھی "ماہِ سر کوہ" بولا جاتا ہے۔ ذوقؔ نے اس کو اس طرح باندھا ہے ؎

ماہِ نخشب کی طرح ہو تا عیاں ہوں سرِ کوہ
اور ابھی پل میں جو دیکھو تو عیاں ہوں نہ نہاں

جُوئے شیر۔ فرہاد شیریں کے عشق میں مخمور تھا۔ اُسے کہا گیا کہ اگر تو شیریں سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ تو سامنے کے پہاڑ سے ایک دودھ کی نہر کھود کر لا۔ چنانچہ اب تک "جوئے شیر لانا" کسی امرِ محال کے کرگزرنے پر بولا جاتا ہے ؎

کاٹے کاٹے سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جُوئے شیر کا

تانا شاہی مزاج۔ ابوالحسن تانا شاہ والئ گولکنڈہ انتہا درجہ کا نازک مزاج اور نفیس الطبع تھا۔ اس کی ایک نواسی بھی اُس کی مثل تھی۔ اب بھی کسی کی نازک مزاجی پر حرف رکھنا ہو تو کہتے ہیں کہ "تم نے تو تانا شاہ اور اُس کی نواسی کو بھی مات کر دیا۔

درفشِ کاویانی۔ سے مراد وہ جھنڈا ہے جس کو کاوا آہنگر نے غم و غصہ کی حالت میں دھونکنی پھاڑ کر بغاوت کے لئے بنایا تھا۔ اور جس کی بدولت فریدوں صاحب تاج و تخت ہوا تھا۔ یہ جھنڈا چیتے کی کھال کا تھا۔ لیکن بعد کو اس پر سونا اور جواہر مڑھ دیئے گئے۔ اہل ایران کا خیال تھا کہ اس پر کوئی متبرک نقش کندہ ہے اور جملہ فتوحات اور ضحاک کے مظالم سے رہائی اسی جھنڈے کی بدولت ہوئی ہے اس لئے وہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

نادری حکم۔ یہ اشارہ ہے اس حکم "بزن" کی طرف جو نادر شاہ نے اپنی سپاہ کی خستہ حالی سے غضبناک ہو کر قتل عام کے لئے دیا تھا۔ وقت موجودہ میں بھی کسی کو رُعب میں لاکر حکم دینے کو "نادری حکم" کہتے ہیں۔

رستم و دستان۔ رستم ایک ایرانی پہلوان تھا۔ اس کے دادا کا نام دستان تھا۔ یہ والئ ایران کا سپہ سالار بھی تھا۔ جرأت و بہادری میں لاثانی تھا اس

نے سات دشوار گزار منزلیں ماری تھیں۔ جنہیں ہفتخوانِ رستم کہتے ہیں۔ ان میں سے کسی میں تو اس نے دیو سے لڑائی کی ہے۔ اور کہیں ساحرہ کو قتل کیا ہے۔ غرضیکہ کئی دیو اور غول مقابلے میں آئے۔ اور یہ فتحمند اور کامران لوٹا۔ شاہِ وقت کے لئے بھی اُس نے اکثر لڑائیاں لڑی ہیں۔ فردوسی نے رستم کی جنگ کے دہشتناک خاکے کھینچے ہیں۔ وہ جہاں جاتا فتح و نصرت کے ساتھ واپس آتا۔ اسی لئے رستم کی بہادری بطور ضرب المثل کے استعمال ہوتی ہے۔

زرقا الیمامہ۔ زمانہ جاہلیت میں یمامہ کی رہنے والی ایک عورت تھی جس کی نظر اتنی تیز تھی کہ وہ ایک دن کی مسافت پر سے آنے والے کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ چنانچہ اہل قریہ کو اُس کی دوربینی سے بہت فائدہ پہنچا تھا۔ اور وہ دشمن کے خطرہ سے اپنے آپ کو بہ آسانی بچا سکتے تھے۔ اس عورت کی بعید نظری ضرب المثل بن گئی تھی۔ ابصر من زرقاء الیمامہ۔

مہرہ مار - یعنی سانپ کا من۔ سُنا ہے کہ اندھیری راتوں میں جب سانپ خوشی کی حالت میں ہوتا ہے۔ تو وہ ایک جوہر اُگلتا ہے اور اُس کی روشنی میں اٹھلاتا و کھیلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس کے ہاتھ میں یہ من آجائے وہ مدت العمر تک زہریلے سانپ کے زہر سے مامون و مصئون رہیگا۔ علاوہ ازیں اس پر تمام دنیا کے مخفی خزائن و دفینے آشکارا ہوجائینگے۔ اب بھی نادر اور ناممکن الحصول امور کے لئے بولا جاتا ہے۔

گوہر شب چراغ۔ لکھا ہے کہ گوہر شب چراغ کو لے کر دریائی گائے دریا سے باہر آتی ہے اور اس کی روشنی میں رات کو چرتی ہے۔ اور بعد سیر ہونے کے اس جوہر کو دوبارہ نگل کر واپس دریا میں چلی جاتی ہے۔ اسے شب چراغ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی روشنی بہت دور دور تک پھیل کر زمین کو بقعہ نور بنا دیتی ہے۔ دور حاضرہ میں اعلےٰ درجہ کے نایاب موتی اور لعل کو "شب چراغ" سے تعبیر کرتے ہیں۔

سنگ پارس۔ مشہور عام میں سنگ پارس ایک ایسا پتھر ہے جو کسی دھات سے اگر چھو جائے۔ تو اُسے فوراً سونا بنا دیتا ہے۔ آج بھی لوگ دولتمند ہونے کے لئے پارس پتھر کی جستجو میں رہتے ہیں۔ کسی کو دولت مل جانا "پارس ہاتھ آنا" کہلاتا ہے۔

ظلِ ہما۔ ایک معروف الاسم اور مجہول بالجسم جانور کا نام ہما ہے۔ روایت ہے کہ جس کے سر پہ اپنا سایہ ڈال دیتا ہے۔ اس کو دولت و بادشاہت مل جاتی ہے۔ "ظلِ ہما" ضرب المثل ہے۔ مولانا حالی کا ایک مصرعہ ہے ؎

سایہ تیرے شہپر کا بہ از بالِ ہما ہے

گاؤ زمین۔ کہتے ہیں کہ زمین کا بوجھ ایک گائے کے سینگ پر ہے یہ گائے مچھلی کی پشت پر کھڑی ہے۔ جب گائے تھک جاتی ہے۔ تو زمین کا بوجھ ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر منتقل کرتی ہے۔ تو بھونچال آجاتا ہے۔ ہندوؤں کی روایاتِ قدیمہ میں اس گائے کا ذکر ہے۔

اُلّو بولنا۔ اس سے مراد اُلّو کا عالم یا ویران ہونا ہے۔ مشہور ہے کہ اُلّو جہاں بولتا ہے وہ جگہ برباد ہو جاتی ہے۔ جہاں تک اُس کی آواز پہنچتی ہے نحوست چھا جاتی ہے۔ اس کی آواز نہایت پُرہیبت ہوتی ہے۔ اور وہ بربادی و ویرانگی کا خواہاں ہوتا ہے۔ اسی لئے پرانے مقبرے اور ویران جگہیں اس کا مامن ہوتی ہیں۔

پردہ داری می کند در قصر کسریٰ عنکبوت
بوم نوبت میزند بر گنبد افراسیات (خیام)

سندھ کی رانیاں

سنہ [illegible]ھ میں شمالی ہند اور دکن متعدد چھوٹی چھوٹی ہندو سلطنتوں میں منقسم ہوگیا تھا۔ اسی لئے ان سلطنتوں میں غضب کی آن بان رہتی تھی۔ تمام ریاستیں ایک دوسرے کو ذبح کر ڈالنے کی غرض سے تلواروں پر سان رکھے رہتی تھیں۔ قوی کمزور کو اپنے آہنی پنجے میں جکڑنے کی تاک میں لگا رہتا تھا۔ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے۔ جب یہاں مسلمانوں کی حکمرانی تو کیا اُن کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ مگر اب مسلمانوں کی کامیابی و اقبالمندی کا جھنڈا آسمان ہند پر لہرانے والا ہی تھا۔ اس زمانہ میں سندھ کا خود مختار حکمران راجہ داہر تھا۔ وہ اپنے دارالسلطنت میں تختِ شاہی پر متمکن تھا۔ جب اس پر واضح ہوگیا کہ مسلمان عنقریب ہی آسمانِ ہند پر گھٹا بن کر چھا جانے والے ہیں تو مارے خوف و دہشت کے اس کی سانس پھولنے لگی۔

تواریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس راجہ کی سلطنت غیر معمولی طور پر وسیع تھی۔ اس نے اپنی قوتِ بازو سے سندھ سے لے کر ساحل کشمیر تک فتح کیا تھا۔ یہ اپنے زمانہ کا ایک جلیل القدر حکمران تھا۔ اس کی دو رانیاں تھیں رانی بائی اور رانی لودیا بائی جو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نامناسب نہ ہوگا اگر پہلے مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہونے کا سبب بیان کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر مذکورہ بالا افراد کے حالات کو روشنی میں لانا ناممکن ہے۔

چند عرب بغرضِ تجارت سیلون سے بحری سفر کرتے ہوئے قلمرو کے اندر دیبل نامی ایک بندرگاہ کے قریب سے گذر رہے تھے۔ اسی درمیان میں عربوں کا ایک جہاز بحری ڈاکوؤں نے لُوٹ لیا۔ یہ ان کا موروثی پیشہ چلا آتا

تھا۔ اس موقعہ پر چند جانیں بھی تلف ہوئیں۔ چونکہ یہ واقعہ راجہ داہر کی حدود سلطنت ہی میں پیش آیا تھا۔ لہٰذا اسلامی سلطنت کے مشرقی حصہ کے گورنر حجاج نے راجہ داہر سے مطالبہ کیا۔ کہ جو نقصان عربوں کا مندرجہ بالا واقعہ سے ہؤا ہے اُس کا تاوان ادا کرو۔ اور اس مطالبہ کے حصول کے لئے قاصد کے ہاتھ پیغام بھیجدیا۔ مگر راجہ داہر نے تاوان دینے سے کُھلے لفظوں میں انکار اور اس واقعہ کی تمام ذمہ داری بحری لٹیروں کے سر تھوپ دی۔ ساتھ ساتھ اپنی طاقت کے زعم میں مسلمانوں کے خلیفہ کو دھمکیاں بھی دیں۔

جب یہ خبر گورنر حجاج کے ذریعہ مسلمانوں کے خلیفہ ولید بن عبدالملک کو پہنچی۔ تو اُس کے قہر و عتاب کی بجلیاں چمکیں اور شعلۂ انتقام بھڑک اُٹھا لہٰذا اُس نے اپنی فوجوں کو سندھ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ اب کیا تھا۔ مسلمانوں کی قسمت کا ستارہ جگمگانے لگا۔

مسلمانوں کی یہ یورش ایک زبردست نتیجے کی حامل تھی۔ راجہ داہر نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کی تیسری[1] فوج بھی معرکہ جنگ میں آپہنچی تو اُس کے ہوش و حواس معطل ہو کر رہ گئے۔ اس خطرناک معرکہ سے نجات پانے کے لئے کوئی موافق تدبیر اُس کے ذہن میں نہ آئی۔ انجام کار وہ خود ایک جرّار فوج کی کمان ہاتھ میں لے کر میدان جنگ میں اُتر پڑا۔ قلعہ راوا کے بیرونی حصہ میں جنگ شروع ہوئی۔ لڑائی بڑے زور سے ہونے لگی۔ کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ اور راجہ داہر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

رانی بائی اپنے پتی راجہ داہر کے ہمراہ محاذ جنگ میں موجود تھی۔ جب اُس نے راجہ کو قتل ہوتے دیکھا۔ تو اس پر ذرا بھی انتشار و سراسیمگی کی کیفیت طاری نہ ہوئی۔ نہایت اطمینان اور ہوشیاری سے اُس نے اپنی شکست خوردہ فوج کو قلعہ راوا میں داخل ہو جانے کا حکم دیا۔ لڑائی میں رانی کے ہمراہ اُس کا جوان لڑکا جیسیا اور اُس کی لڑکیاں نیز چند معزز خواتین بھی تھیں۔ مہاراجہ جیسیا نے لڑائی سے منہ موڑنا مصلحت نہ سمجھا اور مسلمانوں کا جواب ترکی بہ ترکی دینا چاہا۔ مگر اس کی ماں رانی بائی نے موقعہ کو نازک دیکھ کر کہا۔ "بیٹا! ٹھنڈے مزاج سے کام لو۔ گھبرانے اور پریشان ہونے سے تم فتح نہیں پا سکتے۔"

اس کے بعد رانی بائی نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور شاہی محل میں تمام درباریوں کو مجتمع کر کے ایک پُرجوش تقریر کی۔ "بھائیو! اس نازک و خطرناک گھڑی میں انتہائی غم و یاس کے ساتھ میں آپ لوگوں کو مطلع کرتی ہوں۔ کہ گو میں بالکل بے یار و مددگار رہ گئی ہوں۔ فوجیں منتشر ہو گئیں۔ راجہ مارا گیا ہے تاہم ہماری کامیابی کی ایک صورت نظر آتی ہے وہ یہ کہ قلعہ راوا کی حفاظت اُس وقت تک کئے جائیں۔ جب تک اور فوجیں دوسری سلطنتوں سے نہ منگالی جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس جہاد کے آخری مرحلے تک آپ لوگ میرا ساتھ دینے سے مُنہ نہ موڑیں گے۔ ایشور کرے آپ لوگ خوش قسمت ثابت ہوں۔"

تجویز بالا کو عمل میں لانے کے لئے رانی نے ایک حکمران کی حیثیت سے اپنے لڑکے کو قلعہ راوا سے برہمن آباد جانے کو کہا تاکہ وہاں سے وہ دوسری سلطنتوں سے کچھ فوج لے کر دشمنوں کے شہر میں وارد ہونے سے قبل پہنچ جائے۔

فرمانبردار لڑکے کے دل پر ماں کی باتوں کا یہ اثر ہؤا۔ کہ فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر دشمنوں سے بچتا ہؤا شہر سے نکل گیا۔

جیسیا کے چلے جانے کے بعد رانی نے حکم صادر کیا۔ کہ شہر کے تمام باشندے دشمنوں سے لڑنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

رانی پندرہ ہزار سپاہ پر کمانڈ کر رہی تھی اور اُنہیں یہ کہہ کر ہمت و جوش دلا رہی تھی۔ کہ بہادرو کٹ جانا، مر جانا مگر لڑائی سے منہ نہ موڑنا آج تمہاری بہادری و جوانمردی کے جوہر دکھانے کا دن ہے۔

ایک عورت کی زبانی جب بہادر سپاہیوں نے یہ پُرجوش کلمات سنے تو ان پر سیمابی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور لڑنے کے لئے بیچین ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر رانی کے خشک لبوں پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اب جیسیا کا بے چینی سے انتظار کیا جانے لگا۔ رانی کے سپاہی قلعہ کی نگہبانی میں مصروف ہو گئے۔

محمد بن قاسم مسلمانوں کی فوج کا کمانڈر انچیف نہایت ہی ہوشیار ذہین، رحم دل اور شجاع تھا۔ ہر گام پر کامیابی کا پرچم لہراتا رہا۔ سابقہ لڑائیوں کے دلیرانہ اور شجاعانہ کارناموں نے اس کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ مزید جنگ و جدل کے بغیر اس کی فتح اور حکومت تسلیم کر لیں۔ لیکن جب اُس نے مخالفین کا رنگ بدلا ہؤا پایا۔ تو اپنا قدم شہر کی طرف بڑھایا۔ اور نعرۂ جنگ بلند کر دیا۔ اس کی فوج نے شہر پناہ کا محاصرہ کر لیا اور فلک شگاف شور مچاتے ہُوئے لڑنے مرنے کے لئے شمشیر بکف ہو گئے۔ اس طوفان نیز یلغار سے حریفوں میں کھلبلی مچ گئی۔ تیروں کی بارش سے خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ تلواروں کی جھنکار سے دشمنوں کی جان جوکھوں میں

---

[1] اس کے قبل خلیفہ نے دو فوجیں راجہ داہر سے لڑنے کے لئے بھیجی تھیں مگر اُنہیں ناکامیابی ہونے پر تیسری فوج خلیفہ نے جنرل محمد بن قاسم کے ماتحت روانہ کر دی۔

پڑ گئی۔

دورانِ جنگ میں رانی بائی اپنی فوج کے ہمراہ نہیں تھی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ اُس کی سپاہ پسپا ہو رہی ہے تو وہ بذاتِ خود میدانِ کارزار میں جانے کے لئے کمربستہ ہوگئی۔ لیکن اُس کی سہیلیوں نے اُسے یہ کہہ کر روکا۔ کہ رانی دیدہ دانستہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہی ہو۔

"تمہاری یہ بزدلانہ نصیحت میرے عزمِ راسخ کو ذرا بھی کمزور نہیں کر سکتی۔" رانی جوش سے مسکراتی ہوئی بولی۔

اس کے بعد رانی بائی محاذ جنگ پر پہنچی اور اپنے سپاہیوں کو اُن کی سرفروشانہ اور دلیرانہ مساعی کی مبارکباد دیتی ہوئی سیم وزر سے مالا مال کرنے لگی۔ لیکن وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

قاسم نے اپنے سپاہیوں کو جوش دلانے کے لئے کہا "بہادرو! جلد سے جلد جامِ شہادت نوش کرو۔ حوریں جنت میں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

مسلمانوں کا یہ سننا تھا کہ "اللہ اکبر" کا نعرہ لگاتے ہوئے بھوکے شیروں کی طرح رانی کے سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے اور قلعہ راوا کو مسمار کرنے کے لئے ہلّہ بول دیا۔ یہ خوفناک حالت دیکھ کر اہلِ قلعہ حواس باختہ ہو گئے۔ اور بدحواسی کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ مسلمانوں کا ٹڈی دل بڑھتا گیا۔ بالآخر اُنہوں نے قلعہ کے دروازہ کو توڑ دیا۔ یہ نازک اور خطرناک حالت دیکھ کر رانی بائی نے شاہی محل کی تمام عورتوں کو بلایا۔ اور ایک دلگداز آواز میں کہا: "جیسیا ہنوز نہیں آیا۔ مگر قاسم پہنچ گیا ہے۔ دیوتاؤں کی بڑی کرپا ہوگی اگر ہم لوگ اُن کے خوفناک پنجے سے نجات پا جائیں۔ ورنہ ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔ بس اب جیسیا کے انتظار کے لئے صورتِ حال نے کوئی لمحہ نہیں چھوڑا۔ جاؤ جلد جاؤ۔ لکڑیاں تیل اور روئی جمع کر کے چتا بناؤ۔ تاکہ ہم لوگ اپنے کو جلا ڈالیں۔ چونکہ ہماری بہتری اسی میں ہے۔ کہ "رسم جوہر" ادا کریں۔ اس کے بعد دوسری دنیا میں اپنے پیارے پتی کے چرنوں پر جا جھکیں۔ اور ہماری آتما کو شانتی ملے۔ مگر ہاں! اگر تمہیں دنیا کی کوئی خواہش مرنے پر مجبور نہیں کرتی ہے۔ تو زندہ رہ سکتی ہو۔"

رانی کے حکم کی تعمیل میں عورتوں نے ذرا بھی تامل نہ کیا۔ رانی کے کہنے کے مطابق سب سامان مہیا کیا گیا۔ بالآخر سو عورتیں اس عالیشان محل میں مجتمع ہوئیں اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود کر "رسم جوہر" کو ادا کر دیا۔

اس سنسنی خیز واقعہ کی خبر مسلمانوں کو ملی تو اُنہوں نے شاہی محل کی باقی عورتوں کو اس بدترین خودکشی سے بچا کر قید کر لیا۔ اس کے ساتھ وہ عورتیں بھی قید کی گئیں۔ جنہوں نے دورانِ جنگ میں سپاہیوں کو مدد پہنچائی۔ رانی لودیا بائی بھی جو شہر پناہ پر تھی۔ وہ بھی قید کر لی گئی۔

ان دنوں لڑائیوں میں مال وزر لوٹنے کے علاوہ عورتیں بھی قید کی جاتی تھیں۔ اس روز کی لڑائی میں رانی لودیا بائی راجہ داہر کی دوسری بیوی اور راجہ کی دو لڑکیاں پرملا دیوی اور ثریا دیوی جو اپنی ماں رانی بائی کے ساتھ اُس وقت نہیں تھیں جب وہ دہکتی ہوئی چتا میں جل کر بھسم ہو گئی تھیں۔ یہ سب گرفتار کر لی گئیں۔

جنرل محمد بن قاسم شاہی قیدی عورتوں کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آیا۔ اور مسلمانوں کی رسم کے مطابق اُن کے چہرہ پر نقاب ڈلوایا۔ اور ان کے لئے معقول حفاظت کا انتظام کر کے اُن کے رہنے کے لئے عالیشان کمرہ دیا۔ جب راجہ کے سپاہی خائف ہو کر بھاگ گئے اور میدان کارزار سرد پڑ گیا۔ تو قاسم قیدیوں کو دیکھنے کے لئے آیا۔ راجہ داہر کی بیوی لودیا بائی کی خوبصورتی اور عقلمندی سے جنرل قاسم کا دل بہت متاثر ہوا۔ رانی بڑی دوراندیش اور عاقلہ عورت تھی۔ قاسم اُس کی عاقلانہ گفتگو سن کر حیران و ششدر رہ گیا۔

قلعہ راوا کی حفاظت کے لئے ایک فوج بھی نہ پہنچی۔ سب تباہ و برباد ہو گئی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی فوج نے قلعہ الور کو کوچ کیا۔ بادشاہ کے مرنے کی خبر ہنوز دارالسلطنت میں نہیں پہنچی تھی۔ یہاں لڑائی کی مزید تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ جب مسلمانوں کی فوج کو آتے دیکھا۔ تو قلعہ الور کے محافظوں نے خیال کیا۔ کہ راجہ داہر مسلمانوں کو گرفتار و قید کر کے لا رہا ہے اس بنا پر دُور ہی سے وہ لوگ مسلمانوں پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کرنے لگے۔

مسلمانوں کے فاتح جنرل نے ان لوگوں کے پاس پیغام بھیجا۔ کہ راجہ داہر قتل کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا ہماری حکومت اور فتح بغیر تشدد کے قبول کر لو۔ اور تلواریں میانوں میں ڈال دو۔ ورنہ تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

اس پیغام کو مخالفین نے مضحکہ انگیزی اور مذاق پر محمول کیا۔ اس لئے جنرل قاسم نے لڑنا ہی مصلحت سمجھا۔ کیونکہ بغیر جنگ کئے قبضہ پانا محال تھا۔ اس کے بعد بھی رحمدل جنرل نے رانی لودیا بائی سے کہا کہ آپ انہیں یقین دلائیں۔ کہ اُن کا راجہ مارا گیا ہے۔ اور اُن کا خون ناحق بہانا میں اچھا نہیں سمجھتا۔

اس تجویز کو رانی لودیا بائی نے منظور کر لیا۔

رانی قلعہ کی دیوار کے نیچے اتنا قریب کھڑی ہو گئی۔ جہاں سے اُسے

اہل قلعہ بخوبی پہچان سکیں۔ لعدازیں اس نے وہاں سے چند معززافسروں کو بلایا۔

چند معزز افسر شہر پناہ پر ظاہر ہوئے۔ رانی نے اپنے چہرہ سے نقاب اُٹھا دیا۔ تاکہ وہ لوگ اُسے بخوبی پہچان سکیں۔ اور اُنہیں اپنی طرف مخاطب کرکے ایک درد بھری آواز میں بولی " میں رانی لودیا بائی راجہ داہر کی بیوی ہوں۔ ہمارا راجہ قتل کر دیا گیا ہے۔ اس لئے قاسم کے سامنے سر تسلیم خم کر دو۔ بصورت دیگر تمہیں ہلاکت وتباہی کا سامنا کرنا پڑیگا۔ کیونکہ وہ جو کچھ کہتا تھا بالکل صحیح و درست ہے " اس کے بعد اُس کی سیاہ سیاہ پلکوں میں آنسو کے موٹے موٹے قطرے تھرتھرانے لگے۔ آنسوؤں کو آنچل سے پونچھتی ہوئی رانی سوز وگداز میں بھری ہوئی آواز میں وہ نغمہ الاپتی۔ جو " رسم جوہر " کی ادائیگی کے وقت گایا جاتا ہے۔ جس سے ساری فضا تھرا جاتی ہے۔

ایک شخص بولا " رانی تم غلط کہہ رہی ہو۔ تمہاری ایسی کھلی سازش میرے سامنے نہیں چل سکتی۔ تمہیں شرم وغیرت نہیں آتی۔ کہ اپنے راجہ کی عزت کو ترجیح دیتی ہو۔ ہم بہادر ایسے نہیں ہیں۔ کہ تمہارے ناجائز رویہ سے متفق ہو جائیں "۔

مختصر یہ کہ کچھ دنوں کی خونریزی کے بعد مسلمانوں کا قلعہ پر قبضہ ہو گیا جنرل قاسم نے اس نقصان کی تلافی کے لئے ایک خطیر رقم کا مطالبہ کیا ہے لیکن جب دیکھا کہ اس ملک کے باشندے مزدور وکسان ہیں۔ جن کی روزی کا انحصار کاشتکاری پر ہے تو اُس نے اپنے شرائط واپس لے لئے۔ تاکہ مزدوروں اور کسانوں کو تکلیف وپریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کہتے ہیں اُس نے لگان بھی کم کر دیا۔ مختصر یہ کہ قاسم نے انتظام سلطنت کو خوب اچھی طرح سے نبھایا۔ متواتر تین برس تک سلطنت کرنے کے بعد جب وہ وطن واپس گیا۔ تو دشمنوں کی سازش سے شہید کر دیا گیا۔ (ہند)

تبصرات

سالنامہ ادبی دنیا موجودہ ادبی رسائل میں ادبی دنیا بہترین پرچہ ہے اور اس کے سالنامے تو بہت زیادہ دلچسپ اور معیاری ہوتے ہیں۔ سال رواں کا سالنامہ گزشتہ تمام سالناموں کی نسبت اچھا ہے۔ علمی ادبی، تاریخی اور اخلاقی مضامین، دلچسپ اور سبق آموز افسانے بصیرت افروز ڈرامے، کیف آور اور اثر انگیز نظمیں اس قابل ہیں کہ بار بار ان کا مطالعہ کیا جائے۔

اس مجموعہ میں ۷۷ مضامین نظم ونثر ہیں۔ ۱۷ افسانے اور ڈرامے، دس علمی ادبی اور تاریخی مضامین اور ۴۹ نظمیں ہیں۔ تصاویر نظر فریب اور دیدہ زیب ہیں۔ کل ستائیس تصویریں اور سب کی سب اچھی ہیں۔ اور بعض تو بہت زیادہ اچھی ہیں۔ اس قدر خوبیوں کے باوجود قیمت صرف عہ۔

اُردو کا اقبال نمبر آج تک کافی تعداد میں اقبال نمبر نکل چکے ہیں۔ اور اقبال کی شاعری کے متعلق مضامین تو عام طور پر رسائل میں نکلتے رہتے ہیں۔ لیکن اُردو کے اقبال نمبر نے تمام پر فوقیت حاصل کر لی۔ آج تک اس قسم کے سیر حاصل مضمون شائع نہیں ہوئے۔

اُردو کے اقبال نمبر میں آٹھ مضمون ہیں۔ اقبال کا تصور خودی، رومی نطشے اور اقبال، اقبال اور آرٹ، اقبال کی شخصیت اور اُس کا پیغام، اقبال کا ذہنی ارتقار، اقبال کا تصور زمان، علامہ اقبال کی آخری علالت، اقبال اور اُس کے نکتہ چیں، یہ تمام مضامین نہایت گہرے مطالعہ کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اور پُر از معلومات ہیں۔ قیمت صرف ۱۲ر۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی سے طلب کیجئے۔

رتن کا کرن نمبر " رتن " ایک تعلیمی ماہنامہ ہے۔ بچوں کے لئے یہ بہت مفید پرچہ ہے اکثر خاص نمبر بھی نکلتے رہتے ہیں۔ اب کرن نمبر نکلا ہے۔ مضامین نہایت دلچسپ اور مفید ہیں۔ اور واقعی بچوں کا رسالہ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ نہایت دیدہ زیب سرورق۔ اور بہت سی تصویریں پرچہ میں شامل ہیں۔ رتن کا سالانہ چندہ عار ہے۔ اور خاص نمبر بھی اس چندے میں ملتے ہیں۔ ریاست جموں دفتر رتن سے مل سکتا ہے۔

بیسویں صدی کا خاص نمبر بیسویں صدی کے خاص نمبر کثرت سے شائع ہوتے رہتے ہیں ویسے تو عام نمبروں کے مضامین بھی اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن خاص نمبروں کے لئے خاص طور پر مضامین حاصل کئے جاتے ہیں۔ اپریل کا خاص نمبر ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ موجودہ دور کے مشہور شعرا کی نظمیں، مسلم الثبوت

افسانہ نگاروں کے افسانے اور بہترین اخلاقی مضامین زینت رسالہ ہیں۔ سرورق دیدہ زیب، کاغذ عمدہ لکھائی چھپائی ناقابل اعتراض۔ حجم ۱۰۶ صفحات، ان سب خوبیوں کے باوجود خاص نمبر کی قیمت ۴؍ اور رسالانہ چندہ عہ؍

مولوی کا شہید نمبر اس نمبر میں خلافت راشدہ اور واقعاتِ کربلا پر روشنی ڈالی گئی۔ لیکن نہایت متعصبانہ حیثیت سے۔ یہ زمانہ ان قصوں کے چھیڑنے کا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے اسلامی جماعتوں میں اور زیادہ کشمکش پیدا ہوتی ہے اور دشمن کو تقویت پہنچتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ نمبر یا اسی قسم کے اور رسالے یا کتابیں مسلمانوں کو دیکھنے بھی نہ چاہیے۔

دیپک لاہور یہ نیا رسالہ لاہور سے جاری ہوا ہے۔ مضامین اچھے ہیں۔ اُمید ہے دیپک ترقی کریگا۔ بشرطیکہ موجودہ ادبی رسائل کی سطح پر لانے کی کوشش کی گئی۔ سالانہ چندہ ۳ؑ؎ ہے۔

تعمیر یہ نیا ماہنامہ حضرت احسان دانش کی سرپرستی میں جاری ہوا ہے۔ زیرِ نظر پرچے میں احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، الطاف مشہدی اور عبدالرحیم شبلی کی نظمیں اور مضامین اچھے ہیں۔ سرورق سادہ مگر دیدہ زیب ہے۔ کاغذ اور کتابت عمدہ ہے۔ اور قیمت سالانہ للعہ؍۔ دفتر رسالہ تعمیر ۴۲ فلیمنگ روڈ لاہور سے مل سکتا ہے۔

ترانہ وطن صدق جائسی کی یہ نظم ہے اور بہترین نظم ہے۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدر آباد دکن کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ قیمت صرف ا؍

درسِ غالب یہ کتاب پیرزادہ ابراہیم ضیف صاحب کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے اور اس میں غالب کا کلام ایک بالکل نئی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ کتاب قابل مطالعہ ہے۔ قیمت صرف عہ؍۔ شیخ محسن علی پروپرائیٹر مظفر بک ڈپو اندرون لوہاری گیٹ لاہور سے طلب کیجئے۔

سُرورِ مستی پنڈت نرمل چند پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور اس کتاب کے مصنف ہیں۔ جس میں موجودہ اسباب تنزل اور زندگی کے ہر پہلو پر نہایت وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف کا فلسفیانہ اندازِ بیان مستحق داد ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر ہندوستانی کے لئے ضروری ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔ ستیہ گیان پبلشنگ سوسائٹی اکاڑہ پنجاب سے طلب کیجئے۔

اُردو کے سو شعر مکتبہ جامعہ دہلی کی جدت پسندی نے اُردو نظم کی کتابوں میں ایک نئی روش کا اضافہ کیا۔ اور وہ روش اتنی مقبول ہوئی کہ اب اکثر کتب فروش اُردو کے سو شعر کتابی صورت میں چھاپتے ہیں اور اس چیز کو روز بروز مقبولیت حاصل ہو رہی ہے پہلے اس ادارے کی طرف سے میرؔ۔ دردؔ۔ غالبؔ۔ مومنؔ۔ داغؔ۔ اکبرؔ۔ حسرتؔ جوشؔ۔ جگرؔ۔ فانیؔ اور اصغرؔ کے سو سو شعر شائع ہوئے اور وہ مقبول ہوئے اب اس قسم کی پانچ جلدیں اور شائع ہوئی ہیں۔ جن میں دوائر کا لحاظ ہے۔ پہلی جلد میں متقدمین کے سو شعر ہیں۔ دوسری میں متوسطین تیسری میں متاخرین چوتھی میں دور حاضرہ اور پانچویں میں ضرب الامثال ہیں۔ ضرب الامثال میں دوائر کا لحاظ نہیں ہے بلکہ تمام شعرا کے وہ شعر چن لئے گئے ہیں جو مثال کے طور پر موقعہ بموقعہ پڑھے جاتے ہیں۔ یہ پانچوں جلدیں ایک انوکھا تحفہ ہیں۔ اہلِ ذوق ضرور مطالعہ کریں قیمت دور متقدمین ۴؍ دور متوسطین ۴؍ دور متاخرین ۴؍ دور حاضرہ ۴؍ ضرب الامثال ۴؍ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ مکتبہ جامعہ دہلی سے طلب کیجئے۔

طالب فارسی

یوپی کے شاہی طبیب

عالی جناب فخر الحکماء حکیم محمد خورشید علی خاں صاحب قبلہ رام پوری کی زیر نگرانی

مرکزی دواخانہ لوہاری منڈی لاہور

میں

چند ایسی اکسیر دوائیں تیار کی گئی ہیں جو حکیم صاحب کے طبی خاندان میں ڈیڑھ سو سال سے بے شمار مایوس العلاج مریضوں کو حیرت انگیز حد تک شفا بخش چکی ہیں - ان دواؤں کے ہزاروں بار تجربے میں آزمائے ہوئے نسخے صرف حکیم صاحب کے خاندان میں سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں - دلی، لکھنو کے مشہور دواخانوں میں بھی ایسی اکسیر اور تیر بہدف دوائیں نہیں مل سکیں گی - حکیم صاحب قبلہ نے اپنی نگرانی میں اپنے خاندانی نسخہ جات کے مطابق یہ دوائیں تیار کرائی ہیں -

ان دواؤں میں سچے موتی، مشک، عنبر اور سونے کے تحلیل کئے قیمتی اجزاء بالکل اصلی ہیں - ملک کے عام مشہور اور غیر مشہور دواخانوں کی سچے موتیوں کی جگہ سچا سیپ، مشک وغیرہ کی اصلی مقدار کی جگہ صرف ان کی خوشبو نہیں بلکہ تمام قیمتی اجزاء اور حل کردہ جواہرات بالکل اصلی ہیں - اس بارے میں حکیم صاحب قبلہ اسقدر احتیاط برتتے ہیں کہ مرکزی دواخانے کے دواسازوں کو اپنے سامنے بٹھا کر نسخے کے تمام قیمتی اجزاء پوری مقدار میں اپنے خاندانی نسخہ جات کے مطابق اپنے ہاتھ سے خود ملاتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ بے شمار ایسے مریض جن میں حکیموں اور ڈاکٹروں نے جواب دیدیا تھا حکیم صاحب کے علاج اور "مرکزی دواخانے" کی دواؤں کا استعمال کر کے بالکل تندرست اور شفایاب ہو چکے ہیں - مردوں اور عورتوں کی مخصوص بیماریوں کی چند تیر بہدف دوائیں "مرکزی دواخانہ لوہاری منڈی لاہور" سے منگا کر ضرورتمند حضرات ایک بار استعمال کر کے دیکھیں، انہیں خود حکیم صاحب قبلہ کی مسیحائی اور ان جادو اثر دواؤں کی خوبیوں کا خود اندازہ ہو جائے گا - ان دواؤں کے فائدے بیان کرنے سے قانون اور شرم ہمیں روکتے ہیں - اس لئے ہم صرف اتنا عرض کر سکتے ہیں کہ "مرکزی دواخانے" کی حسب ذیل دوائیں بے شبہ کراماتی اثر رکھتی ہیں - ذاتی تجربہ کر کے ہماری گزارش کی تصدیق کیجئے - یہ دوائیں نہایت قیمتی اجزاء سے تیار ہوئی ہیں اس لئے بیحد زود اثر ہیں

(۱) روغن عجیب :- اس کی تفصیل بذریعہ تحریر دریافت فرمائیے - **(۲) آب حیات** :- سچ مچ نئی زندگی بخشنے والی ہے - قیمت فی شیشی دس روپے - **(۳) اکسیر خاندانی** :- جریان اور سیلان الرحم وضعف اعضاء رئیسہ کے لئے اکسیر اعظم کا کام دیتی ہے - قیمت فی شیشی نو روپے **(۴) اکسیر باہ** :- قوت باہ بوڑھوں اور غلط کار نوجوانوں کیلئے بیحد اثر انگیز ہے قیمت پانچ روپے **(۵) طلاء نایاب** :- اس کے اثر کے بیان سے شرم روکتی ہے - قیمت فی شیشی چھ روپے **(۶) حب امساک خاص** :- جادو اثر اور بے ضرر گولیاں ہیں - قیمت فی شیشی تین روپے بارہ آنے - **(۷) طلاء خاص** :- اس کی تعریف خلاف تہذیب ہے - ذاتی تجربہ کرنے سے اس کی حیرت انگیز تاثیر کا اندازہ ہو سکتا ہے - فی شیشی ایک روپیہ بارہ آنے - **(۸) روغنی** :- یہ طلاء بہت قبولیت حاصل کر چکا ہے - آگے کچھ نہ پوچھئے - قیمت فی شیشی دو روپے **(۹) اکسیر دمہ** :- دمہ کتنا ہی پرانا اور کیسا ہی سخت ہو ہمیشہ کے واسطے مٹ جاتا ہے - دمہ کے ہزاروں مریضوں کو شفا بخش چکی ہے - چالیس روز کی خوراک کے دام جو ایک مریض کے لئے کافی ہے دس روپے - **(۱۰) روغن قوبا** :- داد خواہ خشک ہو یا تر کتنا ہی پرانا یہ تیل داد کا نشان تک مٹا دیتا ہے - قیمت فی شیشی ایک روپیہ -

نوٹ :- (۱) ہر دوا کے ساتھ ترکیب استعمال کا پرچہ ساتھ ہوگا - ان تمام دواؤں کے اثرات وکیفیات کی تفصیل بذریعہ خط وکتابت دریافت فرما سکتے ہیں محصول ڈاک وخرچہ پیکنگ خریدار کے ذمے ہوگا - چند دوائیں ساتھ منگانے سے محصول ڈاک میں کمی آجاتی ہے - (۲) جو مریض حکیم صاحب قبلہ سے مشورہ لینا چاہیں اپنے مرض کے مفصل حالات لکھ کر بھیجدیں - مخصوص بیماریوں کے متعلق خط وکتابت پوشیدہ فائل میں رکھی جاتی ہے - جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے -

جنرل مینجر مرکزی دواخانہ لوہاری منڈی لاہور

نگران:- پروفیسر تاجور

جائنٹ ایڈیٹر:- خواجہ محمود جاوید ایم - اے

شاہکار

چندہ

سالانہ چھ روپے - ششماہی تین روپے آٹھ آنے - نادار خریداروں سے للعہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی - نمونہ پانچ آنے

جلد (۹) — نمبر (۲)

فہرست مضامین بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۳۹ء

تصاویر:- سہ رنگ (۱) عالم تحیر - یک رنگ (۱) پرشکن روس کا مایۂ ناز شاعر (۲) الجیریا کا ایک دیہاتی نظارہ -

ایم ادیب حسن اختر پرنٹر پبلشر [illegible] میں چھپا کر دفتر شاہکار بر مکان میاں علی محمد - علی محمد سٹریٹ ۵ ۴ سی بیڈن روڈ (خواجہ دل محمد روڈ) لاہور سے شائع کیا

مختصرات

یومِ اقبالؒ

۲۱ اپریل ۱۹۳۹ء کا دن ہندوستان میں ہمیں اُس حادثۂ عظیم کی درد آفریں یاد دلاتا ہے جس کے صدمے سے معمورۂ انسانیت اپنے مرکزِ ثقل سے ہٹ گیا تھا - آہ! اِس روز سیاہ کے آفتاب کے ساتھ عالمِ انسانی کا مہر جہانتاب بھی غروب ہوگیا - موجودہ دُنیا کے عظیم ترین مفکر پیغمبر بے کتاب اور الہام نوا شاعر اقبال کو گذشتہ سال اس ماہ کی اسی تاریخ ہم نے سیکڑوں من مٹی کے نیچے دفن کیا تھا -

مردہ پرست ہندوستان نے اقبال کی زندگی میں اس کی حقیقی عظمت کا بہت کم احساس کیا - اُس کے مرنے کے بعد آج ہم محسوس کر رہے ہیں کہ قضائے مُبرم کے بے پناہ چنگل نے ہم سے کیسا عظیم المرتبت رہنما چھین لیا -

"آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں"

اگرچہ یہ سچ ہے کہ اقبال پر اصطلاحی موت طاری ہو چکی ہے - کہ قضا و قدر کی گرفت عام سے خدا کے برگزیدہ پیغمبر بچے کیسی با جبروت شہنشاہ کو پناہ مل سکی - مگر اس میں بھی جائے کلام نہیں کہ اقبال کی سرمدی تعلیمات کے پیشِ نظر اُس کی حیاتِ جاوداں پر موت کبھی فتح نہ پا سکے گی -

اقبال اُن عناصر مرتبہ کا اصطلاحی نام تھا - جو ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو منتشر ہو کر اپنے اپنے مرکز میں جذب ہو گئے - لیکن حقیقی اقبال جس کی صدائے حیات افروز ہاتف غیب کی ندائے حق سے ہم آہنگ ہو کر ہمیں سنائی دے رہی ہے - مرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا تھا - وہ آج بھی زندہ ہے اور آج کی طرح زندہ رہے گا - اُس کی زندگی ثوابت و سیارہ کے وجود کی طرح ابد قرار ہے -

بعض سطحی نظر رکھنے والے نقاد اقبال کو ملی شاعر بتا کر اُس کی شاعرانہ شخصیت کو محدود ثابت کرنے پر مصر نظر آتے ہیں - اُن کے خیال میں اقبال وطن پرستی کا مخالف ہے - ہندوستان سے محبت نہیں رکھتا - اُس کی نگاہ ارض حجاز کو کعبۂ عقیدت بنائے ہوئے ہے -"

حقیقت یہ ہے کہ اقبال ایک بلند نظر مفکر کی حیثیت میں عمر بھر کے غور و تامل کے بعد یہ رائے رکھنے پر مجبور ہوا کہ زندگی اور کائنات سے متعلق آج تک جسقدر نظریے دنیا کے مختلف مذاہب اور مفکرین نے پیش کئے ہیں اُن کے مقابلے میں حیات انسانی کے بارے میں اسلامی نظریہ زیادہ عملی، زیادہ مفید اور عالم انسانیت کو اس کے بلند نصب العین تک پہنچانے کے لئے سب سے زیادہ موثر ہے - یہ محض ایک حُسنِ اتفاق ہے کہ اقبال کی فکر بلند اسلام و قرآن کی تعلیمات سے ہمعناں ہو گئی - آج دُنیا کے بلند نظر مفکر اقبال کے نقطۂ فکر کی تائید کر رہے ہیں - آج تک کسی متنفس نے بھی برنارڈ شا کی عالمگیر شخصیت کو یہ کہہ کر محدود کرنے کی عقلمندی نہیں کی کہ برنارڈ شا ایک اسلامی مفکر ہے اور بس -"

یہ امر ایک اتفاقی واقعہ ہے کہ اقبال مسلمان ہے اور مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہے - لیکن اگر وہ غیر مسلم بھی ہوتا تو یقیناً اُس کے غور و فکر کی رسائی اُسے اِسی سطحِ بلند پر فائز کرتی جس پر ایک مسیحی مفکر (برنارڈ شا) کا صحیح ذوقِ جستجو اُسے منزلِ مقصود پر پہنچانے میں کامیاب ہوا ہے -

اصل یہ ہے کہ اقبال عالم انسانیت کا شاعر ہے - وہ حیاتِ انسانی کے لئے جو نقطۂ عروج تجویز کرتا ہے اسلام و قرآن بھی اُس کی اِس بالغ نظری کی تائید کرتے ہیں - دُنیا کے بلند ترین مفکر اس کے موئد نظر آتے ہیں - جرمن مفکر گوئٹے برطانوی فلسفی برنارڈ شا اور ہندی قائد اعظم مہاتما گاندھی اپنے اپنے رنگ میں اقبال کی ہمنوائی کر چکے ہیں -

باقی یہ خیال کہ اقبال کو ہندوستان سے محبت نہیں - اس کی تعلیمات سے افسوسناک بے خبری اور یا حاسدانہ تنگ نظری پر اِس کی

بنیاد ہے۔

وطن سے محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے۔ پھر اقبال جیسا بلند رتبہ انسان اس جذبے سے کیونکر خالی رہ سکتا ہے۔ اس کے کلام میں متعدد جگہ ہندوستان کا ذکر باندازِ دل سوزی و محبت آتا ہے۔ وہ اپنے آبائی وطن کشمیر، وطن ثانی سیالکوٹ اور وطن اقامت لاہور سے بھی والہانہ محبت رکھتا تھا۔ ہندوستان کی غلامانہ پامالی پر اس کے دردناک نالے ہر گوش شنوا نے سنے ہوں گے۔

ایک درد آشنا انسان جو ساری دُنیا کو آزاد دیکھنے کا متمنی ہو۔ جو غلامی کو کسی قوم کے لئے عذاب زندگی خیال کرتا ہو، جو مزدوروں کا غمخوار لقیب۔ آقائی اور سرمایہ داری کا علے الاعلان مخالف غلام قوموں کو آزادی حاصل کرنے پر ابھارنے والا ہو، اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ اپنے ملک و وطن سے جسے صدیوں کی غلامی نے پامال اور سرمایہ داری نے بدحال کر رکھا ہے محبت نہیں کرتا کس قدر بے انصافی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وہ مروجہ سیاسی وطن پرستی کا سخت مخالف ہے کیونکہ وہ بداہتہً دیکھ رہا ہے کہ دنیا میں اس وقت تمام خونریزیاں وطنی حدود اور رنگ ونسل کے امتیازات کی بنا پر ہو رہی ہیں۔ ہر قوم اپنے سوا تمام اقوام عالم کو زیر اور اپنا غلام بنانے کی جدوجہد میں مبتلا ہے۔ ہر حکومت اپنے ملکی حدود کی توسیع کے لئے کفن بردوش نظر آتی ہے۔ آمریت و جمہوریت کے لباس میں نظام سرمایہ داری کمزور قوموں اور بے بس مزدور جماعتوں کو کچل رہا ہے۔ اور اس درندگی و سبعیت کا نام وطن پرستی پڑ گیا ہے۔ پھر اگر ایسی ملعون وطن پرستی کا اقبال مخالف ہے اور اس کے مقابلے میں انسانی برادری قائم کرنے کی ہدایت کرتا ہے تو اُسے وطن کا مخالف بتانا کیونکر روا ہوگا۔

حُب الوطنی اور مروجہ وطن پرستی میں فرق نہ کرنے والے حضرات ہی اقبال کے متعلق ایسی غلط رائے قائم کر سکتے ہیں۔ ورنہ جو اہلِ نظر چشم بصیرت رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اقبال کسی وطن دوست سے کم محبِ وطن نہیں۔ البتہ وہ وطن پرست نہیں بلکہ خدا پرست ہے۔

وہ خدا کے بعد بے امتیاز رنگ ونسل تمام خلق خدا سے محبت رکھتا ہے اور جغرافی حدود کو توڑ کر سارے عالم انسانیت کو محبت و اخوت کے رشتہ استوار میں منسلک دیکھنے کا متمنی ہے۔

"خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے۔
مَیں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا"

"بانگ درا" کا نیا شوالہ، ہمالہ، میرا وطن، ہندی ترانہ اگر پرانا ہو کر نظری ہو چکا ہے تو "ضرب کلیم" کی "شعاعِ امید" کو شب کور نقادوں کی نگاہ کیوں نہیں دیکھ سکتی؟ اقبال نے ذیل کے اشعار میں "ہند" کے لفظ سے عرب و حجاز کا کونسا حصّہ مراد لیا ہے؟۔

"اِک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگۂ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرناب
اِس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کیلئے ہر بحر پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بُتخانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب"

اقبال جب دنیا کی غلام اقوام کو ان کی غلامانہ زندگی پر عار دلاتا ہے تو کیا دنیا کے اس سب سے بڑے غلامستان کی ۳۵ کروڑ غلام آبادی اس کے پیغام حریت کی مخاطب نہیں ہوتی؟

کیا یہ پیغمبر حریت و آزادی جو دنیا بھر کے غلاموں، مزدوروں اور کسانوں کو آقائی اور سرمایہ داری کے پنجۂ استبداد سے رہائی حاصل کرنے کے لئے زندگی بھر اُبھارتا رہا خود اپنے محبوب وطن کو غلام بے بس اور فاقہ مست دیکھنا گوارا کرتا تھا؟

یوم اقبال کی گزشتہ تقریب نے جو ہندوستان و بیرون ہند کے اکثر ممالک میں منائی گئی۔ تنگ نظر نقادوں کی کم نگاہی کا ناطق ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ لاہور چونکہ اقبال کا وطن اقامت بلکہ

گہوارۂ ابدیت بھی ہے یہاں "اقبال ڈے" کی تقریب سے مرکزی شان نمایاں تھی۔

۹ - ۱۰ - ۱۱ اپریل کو اس تقریب کے سلسلے میں جو عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی اس کے مختلف اجلاسوں کے فرائض صدارت حسب ذیل حضرات نے انجام دیئے۔

۱- ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر ریاست بہاولپور

۲- آنریبل میاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم پنجاب۔

۳- استاذی حضرت مولینا عبید اللہ سندھی۔

۴- ڈاکٹر عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اردو (ہند) وغیرہم۔

ہر اجلاس میں اقبال کی شاعری اور تعلیمات پر ملک کے بلند پایہ نقادوں نے خود افروز مضامین پڑھے۔ اردو کے مشہور سحر طرازوں نے اقبال پر نظمیں پڑھیں۔ عمائد ملک نے اقبال کی شاعرانہ عظمت پر تقریریں کیں۔

ان گرانمایہ تقاریر میں آنریبل نواب سردار سر سکندر حیات خاں صاحب وزیر اعظم پنجاب کی تقریر بہت دلنشین تقریر تھی۔

مقررین اور نقادوں میں ذی رتبہ مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو ہندو اور پارسی بھی تھے۔ اور اس حیثیت سے نہ صرف لاہور کی تقریب یوم اقبال بلکہ اس سلسلے میں تمام ملک کی تقاریب نمائندہ حیثیت رکھتی ہیں۔

حکیم مشرق و شاعر ایشیا کی باعظمت یاد کا اس سے زیادہ محبت آمیز مظاہرہ تصور میں بھی نہیں آسکتا جیسا یوم اقبال کی تقاریب میں چشم تماشا نے دیکھا۔

مولینا رومی کا ارشاد زریں:-

"شاعری جزوے است از پیغمبری"

اگر غلط نہیں ہے تو پھر گرامی مرحوم کا یہ ملہمانہ اعتراف بھی شائبۂ ریب و شک سے منزہ و مبرا ہے۔ کہ

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

تاجور

بورڈ ٹیچرز یونین کانفرنس

مدرسین کے حقوق بہت زیادہ ہیں، یہی وہ طبقہ ہے جو ملک و قوم کے مستقبل کی تعمیری خدمات انجام دیتا ہے، قومی گلزار کے باغبان بصحیح معنوں میں صرف مدرسین ہوتے ہیں لیکن انہی کے خدمات و حقوق نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں اور وہ نظر انداز کرتے ہیں۔ جہاں کے فیض و برکات کی بدولت برسر اقتدار نظر آتے ہیں، مدرسین کی اس قدر اہم خدمات کا یہ صلہ نہیں کہ ان کے حقوق نظر انداز کئے جائیں اور ان کی آواز کو "صدا بصحرا" سمجھ کر کوئی وقعت نہ دی جائے۔

ایک عرصے تک مدرسین کے حقوق کی پامالی ہوتی رہی اور اب تھوڑی مدت سے بورڈ ٹیچرز یونین کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ جس کے اجلاس سال بسال ہوتے رہتے ہیں۔ یونین نہایت شاندار کام کر رہی ہے، چوتھا سالانہ جلسہ ۱۰ اپریل ڈی-اے-وی ہائی اسکول لاہور کے ہال میں زیر صدارت خان بہادر مشتاق احمد صاحب ایم-ایل اے پارلیمنٹری سیکرٹری انعقاد پذیر ہوا، پنجاب کے مختلف مقامات سے سینکڑوں کی تعداد میں مدرسین نمائندگی کیلئے تشریف لائے تھے۔ پہلے صدر مجلس استقبالیہ نے اپنا خطبہ صدارت پڑھا جس میں حاضرین کے خیر مقدم کے علاوہ بورڈ ٹیچرز یونین کی تعلیمی خدمات اور بہت سی شکایات کا تذکرہ تھا۔

خان بہادر مشتاق احمد صاحب ایم-ایل-اے نے ایک بصیرت افروز تقریر کے دوران میں فرمایا کہ "حکومت بورڈ ٹیچرز یونین کی تنظیم کو بنظر استحسان دیکھتی ہے۔ اس واسطے کہ موجودہ حکومت کو ایسی ہی منظم جماعتوں کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ عوام کے جذبات اور ضروریات کا اندازہ ہو سکے، بورڈ ٹیچرز یونین ملک کی ترقی اور شعل ہدایت کی علمبردار ہے، یونین کی خدمات کا معاوضہ نہیں دیا جا سکتا، یہ صحیح ہے کہ مدرسین کی تنخواہیں قلیل ہیں، لیکن حکومت بھی محاصل کے محدود ہونے کی وجہ سے مجبور ہے۔ ورنہ قوم کے بنانے والے مدرسین کے ساتھ ہر ذی ہوش کی ہمدردی ہے، اس وقت موجودہ نظام تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے اور گورنمنٹ نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے نصاب تعلیم میں اصلاح و ترمیم کر رہی ہے، میں گورنمنٹ کو مشورہ دوں گا کہ اس سلسلہ میں گورنمنٹ کو آپ کی یونین کے مفید مشوروں سے بھی فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے، مدرسین میں مذہبی تعلیم کی ترویج کے اہم مسئلہ میں بھی آپ کی جماعت اپنے تجربات سے رہنمائی کر سکتی ہے، تعلیم کا مقصد حصول ملازمت نہیں۔ اس غلط نظریہ کو دور کرنا چاہیئے، یہ صحیح ہے کہ وہ عملہ کی وجہ سے آپ کو بہت سی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور بعض لوکل باڈیز کے ارکان اپنی نمائندگی اور اثر سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

حکومت اس کی اصلاح کے لئے غور کر رہی ہے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری کامل ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔"

معزز صدر کی تقریر کے بعد ذیل کی قراردادیں منظور ہوئیں:-

(۱) بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ سالانہ اجلاس پنجاب گورنمنٹ اور وزارت تعلیم کا شکر گزار ہے کہ بورڈ ٹیچروں کو پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کی ممبری کے لئے اجازت دی گئی۔

(۲) پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ اجلاس بالاتفاق رائے درخواست کرتا ہے کہ جس طرح پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی اور جس طرح کرنال اور جہلم کے ڈسٹرکٹ بورڈوں نے اضلاعی بورڈ ٹیچرز یونین کو منظور کر لیا ہے اسی طرح دوسرے ڈسٹرکٹ بورڈ بھی اضلاعی بورڈ ٹیچرز یونین کی حوصلہ افزائی کریں۔

(۳) پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ سالانہ اجلاس آنریبل وزیر تعلیم کی خدمت میں مخلصانہ درخواست کرتا ہے کہ ایسے مدرسین جن کی تنخواہ پچاس روپے تک ہو ان کے بچوں کی سالم فیس معاف کر دی جائے۔ اور دو سو پچاس تک تنخواہ پانے والے مدرسین کے بچوں کی نصف فیس معاف کی جائے۔ نیز مدرسین کے مستحق بچوں کے لئے کالج کی تعلیم کے واسطے ہر سال چند وظائف مخصوص کئے جائیں۔

(۴) پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ چوتھا سالانہ اجلاس آنریبل وزیر تعلیم سے مؤدبانہ درخواست کرتا ہے کہ نئے ریگولیشنز کے تحت میں لائبریری فنڈ کے لئے یونین فنڈ میں سے بیس فیصدی حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ جو نسبتاً ناکافی ہے، لہذا درخواست ہے کہ لائبریری فنڈ کے تناسب کو بڑھا کر ہائی اسکولوں میں تیس فیصدی کیا جائے۔ اور ورنیکلر مڈل اسکولوں میں پچاس فیصدی۔

(۵) پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ چوتھا سالانہ اجلاس پنجاب گورنمنٹ سے درخواست کرتا ہے کہ اضلاعی حکموں کے نام خاص ہدایات جاری کی جائیں کہ پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین سے ملحقہ کوئی وفد اگر اضلاعی یونین کی نمائندگی کرے تو شرف سماعت بخشا جائے اور ان تمام شکایات اور جائز مطالبات پر ہمدردانہ توجہ کی جائے۔

(۶) پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ چوتھا سالانہ اجلاس پنجاب گورنمنٹ کی خدمت میں مودبانہ التماس کرتا ہے کہ بورڈ ٹیچرز کے ابتدائی گریڈ کی تنخواہیں اس قابل نہیں ہیں کہ ایک باعزت زندگی کے اخراجات کی کفیل ہو سکیں۔ لہذا ضرورت ہے کہ ان کی تنخواہوں میں مناسب اضافہ کیا جائے اور پرائمری ٹیچرز کی تنخواہ از راہ نوازش پچیس روپیہ ماہانہ مقرر کی جائے۔

(۷) بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ چوتھا سالانہ اجلاس آنریبل وزیر تعلیم سے درخواست کرتا ہے کہ ٹریننگ اسکولوں میں داخلے کی پرسنٹیج شہری اور دیہاتی طلبا کے لئے مقرر کر دی گئی ہے، اسی طرح از راہ کرم اساتذہ کے بچوں کے لئے بھی پندرہ فیصدی داخلہ کی نسبت مقرر کر دی جائے۔

(۸) پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ چوتھا سالانہ اجلاس محکمۂ تعلیم سے درخواست کرتا ہے کہ ٹرینڈ ٹیچروں کی مستقل اسناد پر ریمارکس دینے کا نیا قاعدہ براہ کرم منسوخ کیا جائے۔ کیونکہ اس طریقے سے اساتذہ کی اسناد کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے اور اقدامات ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

(۹) پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ چوتھا سالانہ اجلاس گورنمنٹ اور لوکل بورڈوں سے درخواست کرتا ہے:-

(الف) کہ ٹیچرز کو ان کے پراویڈنٹ فنڈ میں سے مناسب قرضہ لینے میں آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ تاکہ ان کا اندوختہ ان کی ضرورت کے وقت کام آسکے۔

(ب) ٹیچرز کو ان کے پراویڈنٹ فنڈ پر اس شرح سے سود دیا جائے جس پر کہ لوکل باڈیز کو ایسے ہی روپے پر ملتا ہے۔

(ج) پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ ٹیچرز کو ریٹائر ہونے کے بعد فوراً ہی دیدیا جائے۔ تاخیر کرنے کی صورت میں اس پر سود لگایا جائے، اس تاریخ تک کہ جس تاریخ کو ادا کیا جائے۔

(۱۰) پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ چوتھا سالانہ اجلاس محکمۂ تعلیم سے درخواست کرتا ہے کہ ورنیکلر فائنل کے امتحان کے ممتحن مقرر کرنے میں بورڈ اور دوسرے اسکولوں کے ورنیکلر ٹیچرز کو مقدم سمجھا جائے۔

(۱۱) پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ اجلاس پنجاب گورنمنٹ کو ادب کے ساتھ اس امر کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کہ لوکل باڈیز کے دیگر ملازمان باستثناء مدرسین اگر ان کو برطرف یا جرمانہ کیا جائے تو اپیل کر سکتے ہیں، لیکن مدرسین اپیل نہیں کر سکتے، یونین کا یہ چوتھا اجلاس لوکل باڈیز کے افسران کے اس فیصلے کے خلاف التماس کرتا ہے کہ ٹیچرز کو یہ حق دیا جائے کہ وہ ڈپٹی کمشنر یا کمشنر سے اپیل کر سکیں۔

(۱۲) یونین کا یہ اجلاس محکمۂ تعلیم سے درخواست کرتا ہے کہ تعطیلات گرما اور گزیٹڈ چھٹیوں کے دوران میں کوئی ریفریشر کورس نہ کیا جائے اور جو استاد ان کورسوں میں شمولیت کریں انہیں معقول سفر خرچ دیا جائے۔

(۱۳) یونین کا یہ اجلاس محکمۂ تعلیم سے درخواست کرتا ہے کہ آئندہ ورنیکلر فائنل کے نتیجے کا تناسب (پرسینٹیج) شمولیت کرنے والے طلبا کی اصل تعداد سے لگانا چاہیئے۔

(۱۴) یونین کا یہ اجلاس ارباب حل و عقد سے استدعا کرتا ہے کہ ٹریولنگ الاؤنس کے متعلق بورڈ ٹیچرز کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ کیا جائے۔ بلکہ بورڈ کے دوسرے ملازموں کی طرح ٹیچرز کو بھی بنیادی تنخواہ کی رو سے ٹریولنگ الاؤنس دلایا جائے۔

(۱۵) یونین کا یہ اجلاس محکمۂ تعلیم کو اس امر کی طرف متوجہ کرانے کی جرأت کرتا ہے کہ بعض اوقات ایک ٹیچر کو ایسے اسکول میں لگا دیا جاتا ہے جہاں وہ تسلی بخش کام نہیں کر سکتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر تسلی بخش چند رپورٹس کے بعد برطرف کر دیا جاتا ہے۔ لہذا درخواست ہے کہ ایسے حالات میں مدرس کو کسی مناسب مقام پر تبدیل کر دینا چاہیئے۔ تاکہ اس کے کام کا ٹھیک اندازہ ہو سکے۔

(۱۶) یونین کا یہ اجلاس محکمۂ تعلیم سے درخواست کرتا ہے کہ مڈل اور ہائی اسکولوں کی طرح پرائمری اور ورنیکلر مڈل اسکولوں میں بھی چھٹیوں کی مدت کو بڑھا کر دو ماہ کر دیا جائے۔

(۱۷) یونین کا یہ اجلاس تمام ان اساتذہ سے درخواست کرتا ہے جو اسّی روپے ماہانہ یا اس سے زیادہ تنخواہ لیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک "بورڈ ٹیچر" کا خریدار بن جائے۔ نیز بورڈ اسکولوں کے سٹاف کا ہر ایک ممبر "بورڈ ٹیچر" کی کم از کم ایک کاپی ضرور خرید لیا کرے۔

(۱۸) یونین کا یہ اجلاس لوکل باڈیز سے درخواست کرتا ہے کہ ایجنڈے میں کسی ٹیچر کے خلاف کوئی ریزولیوشن ہو تو موخر الذکر کے پاس اس کی ایک نقل بھیج دینا چاہیئے۔

(۱۹) (الف) یونین کا یہ اجلاس محکمۂ تعلیم سے درخواست کرتا ہے کہ بورڈ ٹیچروں کے لڑکوں کی فیس کی رعایت ان کے وظیفے حاصل کر لینے پر منسوخ نہ کی جائے۔

(ب) یونین کا یہ اجلاس ڈسٹرکٹ بورڈ کے ساتھ جالندھر ڈسٹرکٹ کے جانبدارانہ رویہ کو سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ باوجود تنخواہوں میں تیس فیصدی تخفیف کے ٹیچرز کو اپنی ایک ماہ کی تنخواہ چندہ کے طور پر کٹوانے کے لئے مجبور کیا گیا ہے، اس کے علاوہ ان کی تخفیف شدہ تنخواہوں کا ایک اچھا خاصا حصہ ان کی ذاتی تنخواہ کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ اجلاس گورنمنٹ سے درخواست کرتا ہے کہ ان شکایات کا خاطر خواہ استیصال کیا جائے۔

(۲۰) یونین کے اس اجلاس کی پنجاب گورنمنٹ سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ چند لوکل باڈیز نے اپنے پاس کئے ہوئے ریزولیوشنز اور منظور کردہ مطالبات کے خلاف غیر معین عرصے کے لئے ٹیچرز کی تنخواہوں کے اضافہ کو بند کر دیا جائے، اور تنخواہوں میں تخفیف بھی کی ہے، ان لوکل باڈیز کے ماتحت دوسرے محکمہ جات ان ظالمانہ پابندیوں سے مستثنےٰ کر دیئے گئے ہیں۔ یہ پنجاب ایجوکیشنل کی دفعہ ۲۳ کے صریح خلاف ورزی ہے، اس لئے درخواست ہے کہ لوکل باڈیز کے نام ہدایات جاری کی جائیں کہ وہ اعتدال پسندی کی روش اختیار کریں۔

(۲۱) یونین کا یہ اجلاس وزیر ترقیات سے درخواست کرتا ہے کہ تمام لوکل باڈیز کو یہ احکامات ملنے کے باوجود کہ وہ اپنے ملازمان پر پیشہ وارانہ ٹیکس نہ لگائیں۔ کچھ ڈسٹرکٹ بورڈوں نے امرتسر جن میں سے ایک ہے یہ ٹیکس ٹیچروں پر لگا رکھا ہے، یونین کی گورنمنٹ سے درخواست ہے کہ لوکل باڈیز کے نام نئے احکامات جاری کئے جائیں۔ جن کی رو سے ٹیچرز کو اس مصیبت سے نجات حاصل ہو۔

(۲۲) یونین کا یہ اجلاس تمام بورڈ ٹیچروں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ عالی ہمتی سے کام لے کر جہالت اور بے علمی کے خلاف اپنی جد و جہد جاری رکھیں۔ جس کی ابتدا انہوں نے پچھلے سال کی ہے اور یہ اجلاس توقع کرتا ہے کہ آنریبل وزیر تعلیم کی اپیل کے جواب میں ہر ایک ٹیچر اسکول اپنا فرض سمجھتے ہوئے کم سے کم ایک عمر رسیدہ آدمی کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنا دے گا۔

(۲۳) یونین کا یہ اجلاس اس تعلیمی ادارہ کی طرف تمام بورڈ ٹیچروں کو متوجہ کرتا ہے جو ضلع گورداسپور کی یونین کے زیر سایہ جاری کیا گیا ہے۔ یہ تعلیمی ادارہ قاضی عبدالحق صاحب پراپیگنڈا سیکرٹری کی نگرانی میں بالغان کی تعلیم کا ایک نیا طریقہ دریافت

کرنے میں کامیاب ہوا ہے، اور اس طریقہ تعلیم کی تشریح کے لئے ایک پرائمر بھی ایڈٹ کی گئی ہے، اس پرائمر کے متعلق دعویٰ ہے کہ پندرہ دن کے اندر اندر یہ پرائمر پڑھ کر ایک بالغ جاہل لکھنے پڑھنے کے قابل بن سکتا ہے، یہ اجلاس تمام بورڈ ٹیچرز سے درخواست کرتا ہے کہ بالغان کی تعلیم کے لئے یہ قاعدہ پڑھا کر مصنف کی محنت سے استفادہ کیا جائے۔

(۲۴) یونین کا یہ اجلاس محکمۂ تعلیم کو اس امر کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ محکمہ کے ایک سرکلر کی رو سے ایس - وی کلاسز پانچ سال کے لئے بند کر دئے گئے ہیں، اور یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ ایس - وی کلاسز کا نیا داخلہ صرف ان لوگوں کے لئے محدود رکھا جائے گا جو کہ دو سال تک ٹریننگ حاصل کر چکے ہوں، اس صورت سے وہ ہزارہا جے - وی پاس ٹیچرز جو پہلے سے سروس میں ہیں ایس وی پاس کرنے سے محروم ہو جائیں گے، یونین کا یہ اجلاس محکمہ کے ارباب حل و عقد سے ملتمس ہے کہ نارمل پاس ٹیچروں کی ٹریننگ کیلئے کوئی انتظام کیا جائے۔ جو کہ پہلے ہی ملازم ہیں۔

(۲۵) یونین کا یہ اجلاس باتفاقِ رائے یہ قرارداد منظور کرتا ہے کہ ایک سب کمیٹی کی تشکیل کی جائے جو محکمۂ تعلیم کو پرائمری تعلیم کے موجودہ سیلبس میں ترمیم و تنسیخ کے مشورے دے۔

(۲۶) پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کا یہ اجلاس صوبہ کے مشہور و مقتدر ماہنامہ "شاہکار" کے معزز ایڈیٹر کا دل سے شکر گزار ہے جو اس تحریک میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں اور ہر سال یونین کے ریزولیوشن اور مطالبات شائع کر کے پنجاب میں اصلاح تحریک تعلیم کو فروغ دیتے ہیں، ایڈیٹر "شاہکار" کو اچھی طرح علم ہے بورڈ ٹیچرز یونین پنجاب کے مختلف مدارس میں کام کرنے والے اسی فیصدی اساتذہ کی نمائندگی کرتی ہے۔

ان قراردادوں کے بعد عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ ممتاز علی صاحب عامری . . . . اور صوفی محمد یوسف عامری کی تجویز اور صوفی محمد یوسف ایم۔ ایس سی کی تائید سے سید اختر احسن صاحب چیف ایڈیٹر بورڈ ٹیچر ہیڈ ماسٹر ایم - بی ہائی اسکول بٹالہ پنجاب بورڈ ٹیچرز یونین کی قیادت و صدارت کے لئے منتخب ہوئے ——

پریذیڈنٹ :- سید اختر احسن بی - اے - بی ٹی ہیڈ ماسٹر ایم - بی ہائی اسکول بٹالہ۔

وائس پریذیڈنٹ :- سردار الیشر سنگھ بی - اے - بی - ٹی ہیڈ ماسٹر ڈی - بی ہائی اسکول اماری۔

جنرل سیکرٹری :- ذوالفقار محمد منور قریشی ایڈیٹر بورڈ ٹیچرز بٹالہ ——

آڈیٹر :- قاضی عبدالحق ایم - اے - ایم - او - ایل - پٹھانکوٹ - لالہ دمودر داس ایم - بی ہائی اسکول جنڈیالہ گرو ——

چیف آڈیٹر :- محمد علی باجوہ لائل پور۔

۸½ بجے شام کو مجلسِ مشاعرہ منعقد ہوئی - پروفیسر خواجہ دل محمد صاحب صدر تھے - متعدد شعراء کے علاوہ پروفیسر سید محمد جعفری، حضرت نصیر بٹالوی - ابنِ ذوالفقار منور قریشی اور صدر مشاعرہ نے اپنے بہار آفریں کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا -

دوسرے دن صبح کو ۸ بجے سید اختر احسن بی - اے بی ٹی چیف ایڈیٹر بورڈ ٹیچر کی صدارت میں دوسرا اجلاس ہوا، طویل بحث و تمحیص کے بعد متعدد قراردادیں منظور کی گئیں جن کا ذکر پہلے اجلاس کے ذکر میں ہو چکا ہے، لالہ سورج بھان ایم - اے (لنڈن) ہیڈ ماسٹر ڈی - اے - وی ہائی اسکول لاہور نے ایک تقریر کے دوران میں یونین کے شکریہ کی قرارداد کا موزوں الفاظ میں جواب دیا اور لنڈن ٹیچرز ایسوسی ایشن کا مختصر حال بیان کرتے ہوئے تمام پنجاب کے اساتذہ سے مشترکہ طور پر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی اپیل کی - اور آخر میں سید اختر احسن صدر جلسہ نے ایک طویل، پُرجوش اور رُوح پرور تقریر فرمائی جس میں یونین کے آئندہ لائحہ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے اراکین سے مصائب و آلام کے مقابلہ میں ثابت قدمی سے سینہ سپر ہونے کی تلقین کی - آپ کا دلپذیر اسلوب بیان اور پُرجوش تقریر اساتذہ کو یقیناً تمام سال سرگرم عمل رکھنے میں کامیاب ثابت ہوگی۔

طالب فارسی

ڈاکٹر بی جلال الدین ڈینٹل سرجن لاہور

پنجاب کے مشہور ماہر امراض دندان ڈاکٹر اے جلال الدین جن کی لیبورٹری پنجاب کے تاریخی مشاہیر کے بیمار دانتوں کا ایک میوزیم ہے - اور جن کے التفات دست دراز نے ہمیں بھی خواہ مخواہ مشاہیر کے زمرے میں خیال کر کے کچھ تبرکات ہمارے منہ سے بھی یادگار کے طور پر اگلوا لئے ہیں - اپنی صنعتِ دنداں رُبائی کو متعدی بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں - چنانچہ ان کے قابل ولی عہد ڈاکٹر بی

جلال الدین یورپ کے مشہور معملوں میں دنداں سازی و علاج دنداں کے متعلق تکمیل تعلیم و تجربہ کے بعد لاہور میں تشریف لا چکے ہیں اور اُن کے دوسرے صاحبزادے ڈاکٹر سی جلال الدین اسی فن کی تحقیق و تکمیل کی غرض سے یورپ کی جانب پر تول رہے ہیں۔ امید ہے کہ اُن کے آتے آتے اِن کے بھائیوں کی ایک اور جوڑی یعنی ڈاکٹر ڈی ڈی جلال الدین بھی پر پُرزے نکال کر تیار ہو چکے ہوں گے۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر اے جلال الدین کو دانتوں کی بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مردانِ نبرد کار و دنداں شکار لیفٹیننٹوں کا ایک کارواں میسّر آگیا ہے۔ اب۔

"اپنے دانتوں سے رہیں صاحبِ دنداں ہوشیار"

دانتوں کے معاملے میں یہ جلالی فوج کسی سمجھوتے کی قائل نہیں لیس یا تو دانت غیر مشروط طور پر فوراً اُن کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ یا پھر دائمی جلاوطنی کے مصائب جھیلنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

امیر مینائی لکھنوی فرماتے ہیں:-

"دہن سے دانت جو نکلا تو یہ ہوا معلوم
اِک اور کھل گئی کھڑکی قضا کے آنے کی"

یہ سچ ہے تو آدھے لاہور کی خیر نہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر اے جلال الدین نے ہر باشندہ لاہور کے منہ میں قضا کے آنے کی بہت سی کھڑکیاں کھول دی ہیں۔

بہر حال اب ڈاکٹر بی جلال الدین ڈینٹل سرجن کے ہاتھ بھی دیکھنے ہیں۔

"اگر پدر نتواند پسر تمام کند"

مگر یہاں "نتواند" کا سوال ہی نہیں ہے کہ۔ باپ، بیٹا روح القدس مل جل کر دانتوں کی ہر مہم سر کر لیتے ہیں۔

دُھوئیں کے اثرات

جسمانی نشو و ارتقا کے لئے صاف ستھری ہوا اور لطیف فضا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ اسی چیز پر انسانی صحت کا مدار ہے۔ موجودہ دَور میں طبیبوں کی کوئی کمی نہیں گلی گلی ڈاکٹر ملتے ہیں اور حتی الامکان ہر ایک اپنی صحت درست رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر بھی کامیابی نہیں ہوتی ہر گھر میں کوئی نہ کوئی بیمار ضرور ملتا ہے۔ اور اکثر خاندان تو ایسے ملیں گے جہاں ہمیشہ ہر ایک بیمار ہی رہتا ہے۔ اور اُن کی تمام آمدنی ڈاکٹروں کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس پریشانی اور تکلیف کے باوجود ابھی تک یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی گئی کہ بیماریوں کا غلبہ ہوتا کیوں ہے۔

اس سلسلے میں حکومت بنگال کی کوششیں نہایت مفید اور نتیجہ خیز ہیں۔ مضرت رساں دھوئیں کے انسداد کے کمیشن نے جو خدمات کی ہیں وہ قابلِ ستائش ہیں۔ اس کمیشن نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بیماریوں کے غلبہ کی اصل وجہ کیا ہے۔ سال گزشتہ دس جلسے کئے۔ یورپ و امریکہ کے تحقیقاتی اداروں سے استفادہ کیا۔ دھوئیں کے ماہروں سے تعلقات پیدا کر کے ان کی معلومات سے فائدہ اُٹھایا۔ اور اب کمیشن کے ممبروں پر یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ دھواں انسانی صحت کا دشمن ہے۔ اسی کی وجہ سے فضا کثیف اور مکدر ہو جاتی ہے۔ اسی کے سبب سورج کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ اور اس روشنی کے تمام فوائد سے ہم کو محروم کر دیتا ہے۔ دھوئیں کی موجودگی میں سورج کی روشنی تاریکی سے بدل جاتی ہے۔ اور کرۂ ہوائی میں ایسے مضرت رساں عناصر کا غلبہ ہو جاتا ہے جن کی وجہ سے ہزاروں قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

کارخانوں کی چمنیاں، گھروں کی انگیٹھیاں اور ریل کے انجن کا دھواں بہت زیادہ نقصان پہنچا رہا ہے۔ بنگال کی حکومت کی طرف سے سال گزشتہ ۳۴۵۹ کارخانوں کے معائنے کئے گئے۔ ۱۴ قانونی نوٹس دیئے گئے۔ اور چھ کے خلاف مقدمات چلائے گئے ۱۴۰ دخانی جہازوں اور ۱۲۱ ریل کے انجنوں کے افسرانِ متعلقہ کو شکایتی خطوط لکھے گئے۔ اور اُن کو ۳۵ روپے سے ۱۷۵ روپے تک جرمانے کی سزائیں دی گئیں۔ مرکزی دھواں مشاہدہ گاہ سے ۶۶۸۲ قسم کے دھوئیں دیکھے گئے۔ اس کمیشن کو حکومت کی طرف سے اسّی مربع میل کا علاقہ دیا گیا ہے۔ جہاں صرف دھوئیں کے متعلق تحقیقات ہوتی ہے اور یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ کوئلے کی جگہ برقی قوت سے کارخانے چلائے جائیں اور گھر کی ضروریات پوری کی جائیں۔ ہمیں اُمید ہے۔ کہ گورنمنٹ پنجاب بھی حکومت بنگال کے اس بیمثال اقدام کی تقلید کرے گی۔

طالب فارسی

گھسیارا شہزادہ

جہان آباد میں رہتا تھا طالب ایک گھسیارا مصیبت میں بسر کرتا تھا اپنی عمر بے چارا
ضعیف العمر تھا چہرے پہ آثارِ شرافت تھے نقوشِ ظاہری سب آئینہ دارِ وجاہت تھے
کچھ ایسا تنگ دستی کی بدولت زار رہتا تھا زمانے کی نگاہوں میں ذلیل و خوار رہتا تھا
نہالِ زندگی محرومِ لطفِ زندگانی تھا سہے تھے ظلم کچھ ایسے کہ اس کا خون پانی تھا

زباں محوِ فغاں آنکھوں میں تھا اشکوں کا اک طوفاں
شکن ماتھے کی تھی تفسیر جورِ گردشِ دوراں

کئی دن گھانس بکتی ہی نہ تھی آفت رسیدہ کی گزرتی تھی یونہیں فاقوں میں اس غم آفریدہ کی
جو مشکل سے کبھی دو تین آنے گھانس کے ملتے تو فاقے ٹوٹتے تھے اس کے ننھے ننھے بچوں کے
یہ حسرت تھی کبھی تو اپنے بچوں کو وہ خوش دیکھے مگر سامان عشرت کے مہیا ہو نہ سکتے تھے
شرافت کا دکھایا مفلسی میں بھی کمال اس نے غیور ایسا کہ پھیلایا نہیں دستِ سوال اس نے
بلکنا روٹھنا بچوں کا وہ برداشت کرتا تھا زباں پر تھا نہ لیکن انقلابِ دہر کا شکوا

ملا روزِ ازل مقسوم وہ آفت زدہ اس کو
کہ رکھا زندگی بھر مشکلوں میں مبتلا اس کو

کسی نے رحم کھا کر کوٹھری رہنے کو اک دی تھی کہ جس میں دن کو بھی رہتی تھی شب کی جیسی تاریکی
مگر وہ کوٹھری زینت محل کا ایک حصہ تھی کہ جس سے یاد تازہ ہوتی تھی سلطانِ دلی کی

وہی زینتِ محل آرام گاہ خسروِ باذل بہادر شاہ کا خلوتکدہ قصر بانگاہِ باذل
کہ سنگ و خشت جس کے محرم اسرارِ شاہی تھے وہاں کی خاک کے ذرّے تھے یا گلزارِ شاہی تھے
ستارے جس کی شانِ دلبری پر جان دیتے تھے مہ و خورشید جس کے حُسن پر ایمان دیتے تھے
حسینوں کی ادائیں جس کے آگے ہیچ ہوتی تھیں دوشالے تان کر شہزادیاں جس گھر میں سوتی تھیں

وہی ایوانِ شاہی آجکل برباد و ویراں تھا
کہ جو عہدِ بہادر شاہ میں رشکِ گلستاں تھا

مگر زینت محل میں خوش نہ رہتا تھا وہ دُکھیارا کیا کرتا تھا صرفِ اشکباری خونِ دل سارا
تصوّر میں کوئی نظارہ کچھ ایسا سمایا تھا زمانے بھر سے جس نے اس کو بیگانہ بنایا تھا

سکوں مفقود تھا دل میں خیالات پریشاں تھے
در و دیوار اس کے واسطے وحشت کا ساماں تھے

بہت کچھ کوشش کرتا رہا بدبخت گھسیارا ہوا پیدا نہ اس کے درد کا لیکن کوئی چارا
انہی آلام سے گھبرا کے اک دن خودکشی کر لی خود اپنی آہ سے خاموش شمعِ زندگی کر لی
خبر اہلِ محلہ میں یہ بجلی کی طرح پھیلی ہوئیں فکریں پھر اس بیکس کی میّت دفن کرنیکی
سرِ بالینِ میّت آ کے اہلِ درد نے دیکھا پڑا تھا ایک کاغذ جس پہ یہ مضمون لکھا تھا

"بہادر شاہ کا نورِ نظر آرامِ جاں میں تھا
مگر اہلِ جہاں کے واسطے بارِ گراں میں تھا"

طالب فارسی

السنۂ ہندوستان

زبان کے تغیرات سے پتہ چلتا ہے کہ آفرینش دُنیا سے لیکر آجتک اس نے ہزاروں مدّ و جذر دیکھے۔ کہیں اس کے تھوڑے الفاظ نے بہت معنے پیدا کر دیئے۔ کہیں بہت الفاظ استعمال ہوئے مگر مطلب تھوڑا نکلا۔

جسقدر تمدنی ترقی ہوتی گئی اسیقدر الفاظ کی کثرت نے زبان کو شستہ بنا دیا۔ یا یوں کہئے۔ جسقدر ضروریاتِ زندگی بڑھتی گئیں زبان کی ترقی ہوتی گئی۔ یعنی زبان کی ترقی تمدن کی ترقی۔ تہذیب کا ارتقا لغت کی وسعت پر دلالت کرتا ہے۔ زبان کی یہ خوبی ہے کہ اس میں وُسعت الفاظ ہو معنی کی کثرت ہو۔ استعارے اور تشبیہات کا فقدان نہ ہو۔

تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ علم کی ترقی کے ساتھ زبان میں تبدیلیاں ہوتی چلی آئیں ہیں۔ چنانچہ تاریخ عالم سے ثابت ہوتا ہے کہ دُنیا میں زبانوں کی ماں یعنی اُم السنہ بابلی یا کلدانی زبان ہے۔

کیلٹک - ٹیوٹانک یا گاتھک یورپ کی زبانیں کہلائیں۔ اتھوپک حبشہ کی۔ عرب میں عربی۔ ایران میں فرس باستانی جو پہلوی کہلائی اور اب اسی کا نام فارسی ہے۔

سنسکرت زرتشتی زبان کا کچھ بگڑ کے یا ردّ و بدل کر کے نام ہوا جو در اصل آتش پرست پارسیوں کے فرقہ کی زبان تھی۔ مذہب پارسیان کو دین کرت بھی کہا گیا ہے۔ اسی زبان میں پارسیوں کی مذہبی کتاب ژند و اوستا لکھی گئیں۔ تھوڑے سے الفاظ کے ردّ و بدل سے اب بھی ہندوؤں کی مذہبی کتاب "رگ وید" کی زبان ثابت ہوتی ہے۔ فرس قدیم یا فرس باستانی ۵۵۰ھ تا ۳۳۰ھ قبل مسیح ایران کی زبان رہی۔ اور زبان "اوستا" پارسیوں کے پیغمبر زرتشتی "سنہ ۱۰۰۰ قبل مسیح وجود میں آئی۔ یہ اصل میں سامی زبان ہے۔ اور وہی رسم الخط ہے۔ سامی زبان حقیقت میں بابلی یا کلدانی زبان ہے۔

یہ بھی ثابت ہے کہ ٹیوٹانک قومیں ایران سے آئیں اور ایشیا کوچک میں آباد ہوئیں اور پھر مغرب کی سمت روانہ ہوئیں۔ اس لئے کہ انہوں نے جو دریا۔ پہاڑ اور مقامات کے نام رکھے وہ آج تک وہی موجود ہیں۔

علم الالسنہ کے جاننے والے متفقہ اس کو مانتے ہیں کہ "سنسکرت" جو ہندوستان کی پُرانی زبان کہی جاتی ہے یا جو اور ہندوستانی زبانیں اس سے نکلیں۔ اس کا ماخذ بھی وہ ہی ہے جس سے "یونانی" اور "لاطینی" زبانیں نکلیں۔

ہندو اپنے کو "ایرین" یا "آریا" کہتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایران سے آئے۔ جس وقت ان لوگوں نے ایران سے ہجرت کی ہے یہ وہی زمانہ تھا جب زبان "زرتشتی" ایران میں رائج تھی۔

وارس محقق فرانس اور باختر مورخ ایران نے اس امر کو مفصل لکھا ہے اور مثالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسی کو زبان پہلوی کہا گیا ہے جو شاہانِ اسلام کے ایران پر تسلط ہونے پر عربی رسم الخط میں لکھی گئی اور اب اس کو فارسی کہتے ہیں۔

"آریا" سنہ ۱۵۰۰ قبل مسیح ہندوستان میں آئے اور اقوام قدیم ہندوستان یعنی دسدیدی (دراور) وغیرہ سے واسطہ پڑا۔ اس سے بحث نہیں ہے کہ ان لوگوں کی کیا زبان تھی۔ یہ ضرور ہے کہ متمدن آریوں کی زبان سے ضرور اختلاف تھا۔

جب ہندوستان میں سنسکرت کو جنگلی اقوام (بقول آریا صاحبان) سے سابقہ پڑا تو ان کی زبان کے الفاظ کو بھی اپنے آغوش میں جگہ دینی لازمی ہو گئی۔ اس لئے کہ ہمیشہ سے یہی قاعدہ کلیہ زبانوں کے بننے بگڑنے کا رہا ہے۔ جو آج بھی صحیح ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر حرف "ڑ" کا عمل دخل زیادہ ہو گیا۔ جس کا زبان زرتشتی پہلوی یا فارسی میں کہیں پتہ نہیں ہے اور اسی طرح بہت سے حروف اس میں شامل ہوئے۔ ز۔ ذ۔ ض۔ ظ کی جگہ "ج" نے لے لی اور بے محابا استعمال ہونے لگی۔ گویا یہ الفاظ دیگر زبان ہندی نے جنم لیا اور عوام کی زبان کہلائی۔ سنسکرت برہمنوں کی "خاص زبان"

محدود ہو کر رہ گئی۔ اس لئے اور بھی کہ غیر برہمن اگر سنسکرت کی تعلیم کی طرف رغبت بھی کرتا تھا تو معمولی سزا پہ اکتفا نہیں کی جاتی تھی - بلکہ واجب القتل تھا - دیسی زبان سے مل کر سنسکرت کا نام پراکرت (طبعیٔ غیر مہذب) ہوا -

زمانہ سلطنت مہاراجہ بکرماجیت ۵۶ قبل مسیح میں درباری زبان سنسکرت (دیوبانی یا زبان الٰہی) تھی - بازاری زبان 'پراکرت' تھی - سنسکرت کے مشہور شاعر کالیداس کی ناٹک شکنتلا اس کی شاہد ہے -

ہندوستان میں "بدھ" مت (مذہب) کا زور ہونے پر "پراکرت" کا عروج ہوا اور دسویں صدی عیسوی تک یہی زبان ملک پر حکمرانی کرتی رہی - سنسکرت محض پشتنی زبان تھی -

(ابن خلدون) ۶۷۴ء زمانہ سلطنت شاہان امویہ میں عربوں نے بسلسلہ تجارت ساحل سمندر جنوبی ہندوستان - سورت اور سندھ میں قدم رکھا - ایک دوسرے کے اظہار خیال کی ضرورت ہوئی نئی زبان کا نشو و نما ہوا -

دراصل "بھاشا" کی "جنم بھومی" کے یہی مقامات تھے - مگر ۷۱۲ء میں عرب مجاہد اسلام محمد بن قاسم اور بعد کو دیگر مجاہدین اسلام افغانستان و ایران، ہندوستان آئے: عربی فارسی کو بھاشا نے اپنی آغوش میں جگہ دی۔

۱۱۹۱ء زمانہ سلطنت شہاب الدین غوری میں ہندوستان کی زبان "ہندی بھاشا" کہلائی - اس کی نظیر چند کوی شاعر کی کتاب "پرتھی راج راسا" میں ملے گی - عہد سلطنت شاہان خلجی ۱۳۲۵ء امیر خسروؒ کی تصانیف سے اور دیوان ولی دکنی سے پتہ چلتا ہے - کہ اس زمانہ میں بھاشا کی خوب ترقی ہوئی -

۱۴۸۸ء عہد بہلول لودی میں ہندوؤں نے اور خصوصاً کائستھوں نے "فارسی" میں بڑی ترقی کی - اس زمانہ میں عربی اور فارسی کا بہت زور رہا - مگر "بھاشا" کا رنگ غالب رہا - چنانچہ کبیر داس بنارسی کے دوہے - گرو نانک صاحب کی تصانیف اور بابا تلسی داس کی رامائن اس کی شاہد ہیں - (شہاب الدین تا ابجا از علم الحروف ماہر)

شہنشاہ اکبر اعظم کے زمانہ میں مسلمانوں نے سنسکرت اور بھاشا میں بڑی ترقی کی - ملک محمد جائسی کی رامائن - شاہزادہ دانیال اور عبدالرحیم خاں خاناں کی بھاشا نظمیں آج بھی یادگار ہیں -

چونکہ اکبر اعظم نے اکبر آباد (آگرہ) جو متھرا سے قریب تر ہے اور جس کا دوسرا نام برج بھی ہے اپنا دارالسلطنت قرار دیا - اور ہر قسم کے ماہرین علم جمع ہوئے - اس گنگا جمنی زبان کا نام "برج بھاشا" ہوا۔

"اردو"

"اردو" کے معنی لشکر کے ہیں - مجاہدین اسلام تمامی لشکری تھے - ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں تصادم ہوا - الفاظ کی تراش خراش لازمی تھی - ایک نئی زبان کا آغاز ہوا - چونکہ حقیقتاً لشکری زبان تھی - "برج بھاشا" سے "اردو" کی نسبت ہوئی - یہ رشتہ ایسا مبارک و مسعود ثابت ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں لوگ "اردو" بولنے اور سمجھنے لگے - غرض یہ کہ یہ گلے کا ہار ہوگئی -

تمدن اور محسوسات نے الفاظ کی کثرت کر دی - تعلقات بڑھ گئے - زبان میں شستگی اور پاکیزگی پیدا ہوگئی - یہاں تک کہ علاوہ مسلمانوں کے دوسری قوموں نے اس کو شیر مادر سمجھا - شعر و شاعری سے ارفع و اعلیٰ بنایا -

شہنشاہ جہانگیر نے "بھاشا" کی اعلیٰ نظموں پہ انعام و اکرام سے شاعروں کو مالا مال کیا - ملا نوری - شیخ شاہ محمد بلگرامی - جہانگیری بھاشا، کے مشہور شاعر گزرے ہیں - شاہجہانی عہد ۱۶۴۸ء میں "اردو" کو "اردوئے معلیٰ" کا خطاب ملا -

برطانیہ کے ابتدائی دور میں مسٹر فرگوسن اور جنرل ولیم پارک کی "لغات اردو" کا خاص تصانیف میں شمار ہوتا ہے جو ۱۷۷۳ء اور ۱۷۸۵ء میں لندن میں شائع ہوئیں - انیسویں صدی میں "اردو" کا بیت الحکمت فورٹ ولیم کلکتہ میں قائم ہوا اور ڈاکٹر گلکرسٹ اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے - ہندوستان کے ادیب جمع کئے گئے - اردو کی بہترین تصانیف تیار کی گئیں اور وہیں طبع ہوئیں -

۱۸۳۵ء میں برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان کے دفاتر جو اب تک فارسی میں تھے ان کو "اردو" میں کر دیا - ملک کی تعلیمی زبان "اردو" قرار پائی - (نظام الملک طوسی مصنفہ مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری و جامع تواریخ قاضی فقیر محمد کلکتہ)

اسلامی دور ختم ہوا - انگریزی نے ہندوستان کی زبانوں میں ہل چل مچا دی - نئی وضع قطع کے الفاظ کی بھرتی ہونے لگی - "اردو" بیچاری کیا بچتی - اس کی گھٹی میں ایسی صلاحیت کا امرت ڈالا گیا تھا - حافظہ زبردست - قوت قبولیت لاجواب - سنسکرت ہو یا ہندی عربی ہو یا ترکی - لیٹن ہو یا فرنچ - غرض یہ کہ دنیا بھر کی اجارہ دار - اس

لئے سب کو سر آنکھوں پر لیا۔ ایسی خاطر و مدارات کی کہ فی زمانہ یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ اس کو "اردو" کہیں یا "ہندوستانی"۔ حضرت کچھ ہی کہئے یہ تو "اردو" ہی رہے گی۔ چاہے ہندی سمیلن بنے۔ مہاتما مدد کو آئیں۔ فلمی دنیا کے ذریعہ اس کی مٹی پلید کریں۔ انمل بے جوڑ کرخت اور غیر مانوس الفاظ کے ذریعے سے کونسلوں میں اور اسمبلیوں میں سوال و جواب کریں "اردو" بے خانماں ہو جائے گی۔ مگر رہیگی "اردو"۔

طرفہ ترین لطیفہ یہ ہے کہ منو سمرتی بانی قانون مذہبی ہندوستان نے جب ذات پات کی تفریق کی اور ہندوستان کے اصل باشندوں کو آریوں کی دائمی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا تو ان کو نیچ ذات یا اچھوت یا بقول گاندھی جی ہریجن (ہری بمعنی خدا یعنی خدا کے جنے) قرار دیا۔ ان کی شناخت بے منت غیرے کا وہ لاجواب طریقہ ایجاد کیا کہ زمانہ حاضرہ تو کیا بلکہ سلف سے لیکر آجتک کسی سے نہ ہو سکا۔ وہ یہ کہ خط پیکانی جس کو میخی و سماری ARROW بھی کہتے ہیں اس کی ابجد کا ہر طبقہ کی پیشانی پر جداگانہ قشقہ (تلک) کلنگ کا ٹیکہ کہئے یا استمراری پٹہ غلامی ...... جو شخص خط پیکانی جانتا ہے وہ بلا تکلف و بلا تعارف برہمن، چھتری سے لیکر بھنگی چمار کی خود بہ خود شناخت کر سکتا ہے۔ یہ تلک یا قشقہ ہندوؤں کی شریعت میں ہر عبادت کے بعد لگانا لازم و واجب ہے۔ ان نشانات کی وجہ سے آج بھی ہندوؤں میں ذات پات چھپائے نہیں چھپتی۔

سید عابد حسین جعفری اکبر آبادی (علیگ)

بادۂ شیراز

رشک صنوبر و گلاب، غیرتِ لالہ و سمن　　من کہ خزانِ باغِ خود، تو کہ بہار ہر چمن

عشق بشکل کوہکن، حسن برنگ پیر زن!　　عشق تمام سادگی، حسن تمام مکر و فن

اے کہ! ترا بہ ہر نفس بربط و چنگ سازگار　　وقت خرامِ ناز تو، گرمیٔ راہ نغمہ زن

بر ورق جہاں نوشت مختصر عجب حکایتے　　حسن شکست جام دل، عشق دریدہ پیرہن!

محرمِ کیف سرمدی کرد دل و نگاہ را!!　　بادۂ ساغر نوی، ساغر بادۂ کہن!

از نظر و عمل بساز، عالمِ خود، جہانِ خود　　در رہِ شوق و آرزو، راہنما نہ راہزن!

غنچۂ شوق چیدہ ام، در شب ماہ دیدہ ام　　جانِ بہار گلستاں، روح روانِ انجمن

صبح مرا خراب کرد، خال جبینِ پارسی　　شام مرا تباہ کرد، قشقۂ دختِ برہمن

در نظر جمال بیں، بہ زہزار بحر و بر　　قطرۂ شبنم سحر، بر سرِ برگِ نسترن

فرقِ نیاز و ناز بیں، محرمِ راز دہر شو　　حسنِ عزیز ہر کجا، عشق غریب در وطن

ماہرِ خستہ حال را، شاعرِ خوش مقال را
شومیٔ بخت واژگوں، آہ! فتاد در دکن

ماہر القادری

چور

چوہدری رام داس سود پر روپیہ چلاتا تھا۔ شہر میں اس کی ساکھ اچھی تھی لیکن تھا بہت سخت گیر۔ پانچ روپے سینکڑہ سود لیتا اور ایک کے دس لکھواتا۔ رامداس کے تین بیٹے تھے۔ بڑا لچھمن داس کسی دفتر میں ملازم تھا۔ اس سے چھوٹا جیون داس دکان کرتا تھا اور سب سے چھوٹا روپ لعل تھا۔ جس نے ابھی ابھی بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔

ایک روز جب تینوں لڑکے موجود تھے رامداس نے روپ سے کہا:۔

"اب تم کوئی کام بھی کروگے یا یونہی بیکار بیٹھے رہوگے؟"

"میں تو چور بنوں گا پتاجی!" روپ لعل نے بیباکانہ جواب دیا۔

"چور!" لچھمن داس نے حقارت سے کہا۔ "یہ سب سینما دیکھنے کی کرامت ہے۔ بےشرم کہیں کا۔"

"چور؟" جیون داس نے تعجب سے کہا۔ "بیشک اسی سے بڑوں کا نام بھی تو روشن ہوگا۔"

"تو کیا دنیا میں کوئی چوری نہیں کرتا؟" روپ لعل نے پوچھا۔

"جو چوری کرتا ہے وہ قید بھی تو ہوتا ہے" لچھمن نے جواب دیا۔

"یہ تو قسمت کی بات ہے۔" روپ لعل نے کہا۔

"ابے!" باپ نے غصے سے کہا "یہ تو بک کیا رہا ہے؟"

"آپ تو مفت میں ناراض ہوتے ہیں پتاجی!" روپ کہنے لگا "آپ ہی بتلائیے پھر میں کروں کیا؟"

"تو آباد دنیا میں تمہارے لئے کوئی کام ہی نہیں۔" باپ نے پوچھا "یہ شہدوں ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔"

"کام تو یہی ہے نا!" روپ لال کہنے لگا "کہ یا تو کسی دفتر میں ملازمت کرلوں یا دکان کروں۔ سو بھائی کو دیکھ لیجئے۔ دس سال نوکری کرتے ہوگئے۔ لیکن ابھی سو روپے بھی تنخواہ کے نہیں ہوئے۔ اور پھر اس جیون ہی کو دیکھئے۔ صبح سے آدھی رات گئے تک دکان پر بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ تعلیم کا تو کم از کم یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان عمر بھر کولھو کا بیل بنا رہے۔"

"اور تعلیم چور بننے کو بھی تو نہیں کہتی۔" بڑا بھائی بولا "تعلیم کا مقصد تو یہ ہے کہ انسان اس کی بدولت عزت اور آبرو سے زندگی بسر کرے۔"

"اجی جناب!" روپ نے بڑے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چار پیسے پلے ہوں تو کوئی عزت بھی کرتا ہے۔"

"تو تم چور بن کر روپیہ کمانا چاہتے ہو۔" باپ نے غصہ سے پوچھا۔

"ہاں پتاجی!" روپ لعل نے جواب دیا۔

"اور عمر بھر جیل میں چکی پیسو۔" رامداس نے طنزاً کہا۔

"اپنی اپنی قسمت ہے" روپ لعل نے جواب دیا۔

"ڈوب نہیں مرتے ایسی بات کہتے ہو۔" باپ نے گرج کر کہا۔ "چل دور ہو یہاں سے۔ میں تیری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔"

اور پاس سے بڑا بھائی بولا۔

"کوئی سن لے تو برادری میں ناک کٹ جائے۔"

اس وقت تو روپ لعل چپکے سے اٹھ کر چلا گیا۔ لیکن رات کو جب گھر والے سوتے تھے۔ اس نے ماں کی صندوقچی میں سے طلائی کنگن کی ایک جوڑی اور کچھ نقدی نکال اور اسٹیشن کی راہ لی۔

آج اس واقعہ کو پندرہ بیس سال گزر چکے تھے۔ امتداد زمانہ کے باعث چوہدری رام داس کا بیوپار بند ہوچکا تھا اور اب وہ دیوالیہ تھا۔ جیون داس کی دکان بھی کساد بازاری کے باعث کچھ برائے نام ہی چل رہی تھی۔ اس کا بال بال قرضے میں بندھا ہوا تھا۔ لے دے کر لچھمن داس کے سو پچاس تھے اور اسی پر سب کی گزران تھی۔ رامداس کو جو کبھی [illegible] کا خیال آتا تو وہ آہ بھر کر کہا کرتا کہ کم بخت کہیں جیل میں پڑا سڑ رہا ہوگا۔

ایک روز شام کے بعد ایک موٹر مکان کے سامنے آکر رکی۔ اور ایک شخص انگریزی لباس پہنے اترا اور اندر چلا گیا۔ یہ روپ لعل تھا۔ لچھمن اور جیون چولہے کے پاس بیٹھے روٹی کھا رہے تھے اور بوڑھا رامداس کھاٹ پر پڑا کھانس رہا تھا۔ روپ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر باپ کو سلام کیا۔

"ارے!" بڑے بھائی نے تعجب سے کہا - "روپ!"

"روپ!" جیون کے منہ سے نکلا اور ہاتھ جس میں گلاس تھا کانپنے لگا۔

"روپ!" بوڑھے باپ نے رقت بھری آواز سے کہا - "دیا ہے تیری بھگوان۔"

کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد روپ لعل بولا :-

"پتاجی! یہ گھر کا نقشہ کیسے بدل گیا!"

"قسمت بیٹا!" باپ نے کھانستے ہوئے جواب دیا - ڈھلتی کا زمانہ ہے - سدا بہار بھی تو کبھی کسی نے دیکھی نہیں - دیا ہے بھگوان کی جی رہے ہیں - تم کہو یہ دھن دولت کیسے پائی؟"

"پتاجی!" روپ لعل بولا - "آپ کو یاد ہے میں نے کہا تھا کہ میں چور بنوں گا -"

"ارے رام!" بوڑھا رامداس خوفزدہ آواز سے بولا "چور!"

"چور!" لچھمن نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا - "رام! رام!"

"یہ چوری کا مال ہے"۔ جیون نے کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "توبہ ہے میری!"

"جی ہاں!" روپ لعل کہنے لگا - "یہ چوری کا مال ہے - پتاجی سنئے! میں نے یہاں سے جانے سے پہلے ماتاجی کے طلائی کنگن اور کچھ نقدی نکالی - یہ میری پہلی چوری تھی - یہاں سے میں بمبئی پہنچا - اور ایک ایسی جگہ مکان لیا جہاں آس پاس صرف مزدور لوگ رہتے تھے - یہاں میں نے مزدوروں سے میل ملاپ پیدا کیا - جب یہ لوگ کام پر جاتے تو میں ان کے گھروں پر جا کر ان کے بال بچوں کی سیوا کرتا - کام سے فارغ ہو کر کچھ لوگ میرے پاس آ بیٹھتے میں طرح طرح سے انہیں روپیہ کمانے کی ترغیب دیتا - ساتھ ہی میں نے اِدھر اُدھر اور لوگوں میں بھی کچھ رسوخ پیدا کر لیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں "مزدور بیمہ کمپنی" کے نام سے کام شروع کر دیا - ہوتے ہوتے شہر کے چند ایک سرمایہ دار بھی میں نے ساتھ شامل کر لئے - دو سال کے عرصے میں کام چل نکلا - میں اس کمپنی کا تنخواہ دار سیکرٹری تھا - لیکن تنخواہ صرف اسقدر لیتا جس سے بسر اوقات ہو سکے - چند ایک سال میں میں نے مختلف طریقوں سے ایک معقول رقم کمپنی کے کاروبار میں سے اڑا لی اور کسی کو شبہ تک نہ ہوا۔ لیکن جب بھانڈا پھوٹنے کا ڈر ہوا تو میں نے چپکے چپکے کمپنی کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا - کہ یہ کمپنی صرف مزدوروں کے فائدے کے لئے تھی - لیکن اب اس پر سرمایہ دار قابض ہو گئے ہیں - آخر ڈائرکٹروں کو کچھ شبہ ہوا اور انہوں نے مجھے کمپنی کی ملازمت سے برطرف کر دیا - پتاجی! یہ میری دوسری چوری تھی -

---

اب میں نے فلم انڈسٹری کی طرف توجہ کی - اس مقصد کے لئے میں نے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور چند ایک نوجوان سرمایہ داروں کو عیش و عشرت کی نئی نئی راہیں دکھلا کر ہتھے پر چڑھایا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک فلم کمپنی قائم کر لی - ہر طرف سے بے روزگار ایکٹروں اور ایکٹرسوں اور ڈرامہ نگاروں کی درخواستیں آنے لگیں - اس کمپنی میں بھی میں بحیثیت سیکرٹری کام کرتا تھا - ایکٹر جب ملاقات کے لئے آتے تو انہیں باتوں ہی باتوں میں ٹال دیا جاتا - لیکن ایکٹرسوں کو کئی کئی دن تک مہمان رکھا جاتا - کوئی سال بھر کے بعد ایک فلم کی تیاری ہونے لگی اور میں نے یہاں بھی خوب ہاتھ رنگے اور آخر بہت سا روپیہ خورد برد کر لینے کے بعد کمپنی سے علیحدہ ہو گیا - چونکہ ڈائرکٹروں یا مالکوں کے مجھے بہت خوفناک راز معلوم تھے - اس لئے کسی کو بازپرس کی ہمت نہ ہوئی - پتاجی! یہ میری تیسری چوری تھی -

---

بھگوان کی دیا سے شہر میں میری ساکھ اچھی تھی - اب میں اپنے ڈھب کے چند ایک آدمیوں کو ساتھ ملا کر "غریبوں کے بنک" کے نام سے کاروبار شروع کیا - تھوڑے ہی عرصے میں کام چل نکلا - مجھے جب موقع ملتا بنک سے روپیہ اڑا لیتا - اس عرصے میں کسادبازاری کے باعث دو ایک بنک دیوالئے ہو گئے - لیکن غریبوں کے بنک کی ساکھ قائم رہی اور بڑے بڑے سرمایہ دار بھی اس میں شامل ہو گئے - اس بنک کا سب سے بڑا ڈائرکٹر ایک مہاجن تھا - اسے مجھ پر بہت اعتماد تھا - جو کاغذات میں پیش کرتا وہ دیکھے بھالے بغیر ہی دستخط کر دیتا - پھر میرے ہی صلاح مشورے سے اس مہاجن نے بنک کا بہت سا روپیہ بیج کے طور پر استعمال کر لیا - اس سے مجھے اور بھی ہاتھ رنگنے کا موقع ملا -

آخر میں نے دوسروں ڈائرکٹروں سے سب راز کہہ دیا - کچھ چھان بین کے بعد مجھے بنک سے علیحدہ کر دیا گیا - لیجئے! یہ میری چوتھی چوری تھی -

---

تو قصہ مختصر میں نے اپنی ہتھکنڈوں سے خوب روپیہ پیدا کیا - اب بھگوان کی دیا سے دولت بھی ہے اور عزت بھی"

"اور جو کہیں پھنس جاتے؟" بڑے بھائی نے کہا -

"جب روپیہ پاس ہو تو سب مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں اور بگڑے کام بن جاتے ہیں - سوتپ لعل نے جواب دیا -

"لیکن ہے تو پاپ کی کمائی!" لچھمن نے حقارت سے کہا - "نرگ کا نوالہ!"

"جانے آپ پاپ کسے کہتے ہیں" روپ نے ہنس کر کہا

"دنیا نام ہی نرگ کا ہے - پاپ ہوگا تو کسی مہاپرش کے لئے ہوگا - ہم دنیا دار کیا جانیں کہ پاپ کس بلا کا نام ہے - انسان جو کچھ کرتا ہے یا تو مجبور ہو کر کرتا ہے یا اس کی کوئی خاص وجہ ہوتی ہے - یہ اور بات ہے کہ کوئی اسے پاپ سمجھے یا ایک ضرورت سمجھ کر کرے - پتاجی نے مجھے تعلیم دلوائی اور دنیا سے میں نے دولت پیدا کرنے کا ڈھنگ سیکھا دنیا کا دستور یہی ہے کہ بیٹا باپ کے نقشِ قدم پہ چلتا ہے لیکن میں تو یہ آج تک نہیں سمجھ سکا کہ جو کام ایک باپ اپنے لئے روا سمجھتا ہے وہ بیٹے کے لئے ناروا کیونکر ہوا -"

"دیا ہے تیری بھگوان" کہہ کر بوڑھے راما آس نے آنکھیں بند کر لیں -

ایم - اسلم

نقوشِ احساس

شاید یہ انتہائے عنایاتِ یاس ہے — محسوس ہو رہا ہے کہ دنیا اُداس ہے
میں اپنے ذوقِ رنگ پرستی کو کیا کروں — اُس گل میں مانتا ہوں نہ بُو ہے نہ باس ہے
خوشبو اُڑی ہے پھول کے سینے کو چیر کر — کہتے ہیں جس کو گل وہ جنوں کا لباس ہے
آسودہ ہوگی کیا مری بیتابیٔ دوام — دل اِک تشنگی ہے، نظر ایک پیاس ہے
اے موسمِ بہار! تُو لے جا اسے بھی ساتھ — میرا شباب بھی ترے پھولوں کی باس ہے
اللہ رے بے نقابیٔ احوالِ عاشقی ! — ہر مضطرب نگاہ میں اِک التماس ہے
ہے ہاتھ کانپتا ہؤا لرزاں ہے جامِ مے — ساقی! یہ میرے شوق کا رقصِ سپاس ہے
میں بھی حرم نشیں ہُوں، مگر اتفاق سے — مُجھ کو ہوائے دَیر بھی تھوڑی سی راس ہے
اے چارہ گر علاج کی زحمت ہے ایک وہم — اِک درد ہے کہ میری رگِ جاں کے پاس ہے
مے ہو کہ زہر کچھ تو میسر ہو لے عدم — حد سے فزوں جراحتِ ہوش و حواس ہے

سید عبدالحمید عدم

علم و عمل

بتاتا ہے ہمیں تہذیب کا چڑھتا ہوا دھارا   نقوشِ علم سے اُونچا ہے اب اقوام کا پارا
زمانہ کام کی باتوں سے استمزاج کرتا ہے   وبالِ دوش ہے تقویمِ پارینہ کا پُشتارا
جہاں تاریخ شانِ طاقِ کسریٰ پیش کرتی ہے   لُبھا لیتا ہے دل تعمیرِ عہدِ نو کا نظارا
نکمّی چیز ثابت ہو رہا ہے علم بے صنعت   نہیں حاصل کسی صنعت پہ علمِ محض کو یارا
بھٹکتے پھر رہے ہیں عالمانِ بے عمل ہر سُو   اُنہیں کہتی ہے دُنیا کم سمجھ - نافہم - ناکارا
کتابوں تک رہی تھی رات دن سر مغزنی جن کی   وُہی سر مغزنی ثابت ہُوئی اُن کے لئے آرا!
اسیرِ لفظ و معنے - فلسفی و منطقی پاکر !!   درِ تحقیق سے سائنس نے اُن سب کو دُتکارا
خلافِ کارگاہِ وقت - دُنیائے ترقّی نے   چڑھے تھے جو ہمالہ پر اُنہیں پستی میں دے مارا
تخیّل کا سہارا ڈھونڈنے سے کچھ نہیں حاصل   تخیّل سے پرے ہے اقتصادیات کا چارا
عمل پر منحصر ہیں آج کل قسمت کی اصلاحیں   گئے وہ دن بڑی شے تھا منجّم کے لئے تارا
عمل کہتا ہے ناممکن کو ممکن سے بدل ڈالو !   عمل کہتا ہے کوئی شے نہیں "ناچیز" بیچارا
زمین و آسماں کا فرق ہے صنّاع و عالم میں   غرض ہارا ہوا جیتا - غرض جیتا ہوا ہارا !

مگر دُنیا میں صنعت کے لئے تعلیم لازم ہے   کہ بے تعلیم ہر سعیِ عمل ہے ہیچ - ناکارا
ترقّی کرتے ہیں علم و عمل اب متحد ہو کر   بہت بالا تھا اِک نجّار کی طاقت سے طیّارا
مشینیں علم کی تفتیش سے پیدائے عالم ہیں !   عمل کے واسطے ردّی تھا لوہا اور انگارا !
عمل کے ہات "نشر الصوت" پر قابو نہ رکھتے تھے   فضا میں برق کی لہریں پھرا کرتی تھیں آوارا
منظّم تھی کہاں بجلی میں مقناطیس کی طاقت   مرتّب تھے کہاں گیسوں میں سمّیاتِ ہمہ پارا

اِسی باعث محبّانِ عمل یہ رائے دیتے ہیں
عمل کے ساتھ بہنا چاہیئے تعلیم کا دھارا

سحر رامپوری

جعلی شہزادے

(۱) جعلی تیمور تاش

چنگیز خاں کی ساتویں پشت میں ایک نامور بادشاہ سلطان ابوسعید بہادر خاں گزرا ہے۔ اس کے درباری امیروں میں امیر چوپان کو جو اقتدار حاصل تھا۔ اس سے بادشاہ خود بھی خائف رہتا تھا۔ صاحب اویماق مغل اس کے اثر و اقتدار کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے:۔

"سلطان جمیع کاروبار بہ امیر چوپان سپردہ بود۔ او بہ حکومت دیار و امصار و اعاظم مہمات و کاروبار بمرامان خاندان خویش مقرر داشت و بر ہمہ امرا التفوق جستہ و در تمامت ایران و خراسان و عراق و عجم و روم وغیرہ دیار متعلقان او مستولی بودند"

آخر ایک وقت ایسا آیا کہ بادشاہ چوپانیوں کے پنجہ سے اپنے آپ کو اور اپنے ممالک کو نجات دینے کی تدابیر سوچنے لگا۔ یہاں تک کہ بادشاہ نے حکم دے دیا کہ:۔

"ہر جا چوپانیاں را یابند بکشند و بہ امرائے خراسان نوشت کہ چوپان را بہ سزا رسانند"

چنانچہ اس سلسلے میں امیر چوپان۔ اس کا فرزند جلاد خاں و دمشق خواجہ اور تیمور تاش امیر سیورغان اور دوسرے فرزند اور اس کے کئی خویش و اقارب موت کے گھاٹ اتارے گئے اور جو بچ رہے وہ سیاسی اقتدار سے محروم کر دیئے گئے۔

سلطان ابوسعید بہادر خاں نے بعمر ۳۲ سال ۷۳۶ھ میں لاولد وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد کچھ چوپانیوں نے اس خیال سے کہ:۔

"چوں سلطان پسرے نداشت کہ وارث مملکت شود ازیں وجہ انقلابے عظیم در سلطنت او پیدا شدہ"

پھر سر نکالا۔ اور دفعتہً اسقدر زور پکڑ لیا کہ سلطان مرحوم کی والدہ کو امرا سے مخاطب ہو کر کہنا پڑا کہ جب سلطان ہی نہیں رہا تو میری طرف سے سلطنت جس کو چاہو دے دو۔ مگر چوپانیوں میں سے کسی کو نزدیک نہ آنے دو۔ چنانچہ سلطان کے بعد ارپا خان۔ اس کے بعد موسیٰ خان اور اس کے بعد سلطان محمد خان یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوتے رہے۔

سلطان محمد خاں کے عہد ۷۳۷ھ میں امیر حسن نام ایک چوپانی سلاوز سردار نے امیر چوپان کا ایک جعلی فرزند تیمور تاش کے نام سے (جو سلطان ابوسعید خاں کے زمانہ میں قتل ہو چکا تھا) پیدا کر کے یہ مشہور کر دیا کہ تیمور تاش جو روم کا حاکم ہے اور امیر چوپان کا فرزند ہے ہنوز زندہ ہے اور وہ روم سے آ رہا ہے۔ یہ جعلی تیمور تاش اس کا ایک غلام قراجری نام تھا۔ جو شکل و صورت میں تیمور تاش سے ملتا جلتا تھا۔ امیر حسن نے تیمور تاش کے نام پر بہت سے امیر اپنی طرف کر لئے۔ خصوصاً اس زمانہ کے امیروں میں امیر پیر حسین ابن محمد بن چوپان ایک نامور امیر تھا اس کے ساتھ مل جانے سے امیر حسن چوپان اور جعلی تیمور تاش کی ہمت بہت بڑھ گئی۔ سلطان آخر مقابلہ کو نکلا۔ لیکن عین لڑائی میں گرفتار ہو گیا اور چوپانیوں نے اس کو قتل کر دیا۔ یہ ۱۰ ذی الحجہ ۷۳۸ھ کا واقعہ ہے۔

اس واقعہ کے بعد جعلی تیمور تاش اپنی فوج لے کر سلطانیہ میں آیا۔ جہاں بادشاہ رہا کرتا تھا۔ اس خوشنما اور بارونق شہر کو ظالموں نے جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔

اس قدر عظیم فتح و نصرت کے بعد قراجری غلام کو جو امیر حسن چوپان کے بل بوتے پر بادشاہی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ خود بادشاہ بننے کی آرزو پیدا ہوئی۔ چنانچہ صاحب اویماق مغل لکھتے ہیں:۔

"قراجری خیال استقلال بہ دل مستقل کردہ"

امیر حسن کو جب قراجری کے اس ارادے کی خبر ہوئی تو بہت سٹ پٹایا اور کہلا بھیجا ؎

منم ساختم مہتر ایں و آں
وگرنہ گدائے بُد از ترکماں

لیکن قراجری غلام پر اس طعن و تشنیع اور اس کی تندی و ناراضگی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر دونوں میں تبریز کے مقام پر لڑائی ہوئی اور قراجری

شکست فاش کھا کر ایسا گم ہوا کہ پھر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔

(۲) جعلی مرزا حسین پسر شاہرخ مرزا

شاہرخ مرزا حاکم خراسان مرزا سلطان ابوسعید کی اولاد سے تھا۔ شاہرخ مرزا نے اکبر کے زمانہ میں بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ وہ اکبر کے مقربین میں سے تھا۔ اس کے کئی فرزند تھے۔ اس کا ایک بیٹا مرزا سلطان حاکم بدخشاں بھی رہا ہے۔ مگر آخر میں یہ سب لوگ خاندانی نسبت کی وجہ سے اکبر کے دربار ہی میں آ گئے تھے۔ شاہرخ کا ایک فرزند مرزا حسین نام بھی تھا۔ جہانگیر تزک میں کئی جگہ شاہرخ اور اس کے فرزندوں کا ذکر کرتا ہے۔ مرزا حسین نے ایک مرتبہ دعوئے خودسری کیا تھا۔ وہ اس لڑائی میں قتل ہو گیا یا کسی اور موت سے مر گیا۔ بہرحال دنیا سے اس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لیکن شر پسندوں اور مفسدوں میں سے کوئی نہ کوئی جعلی مرزا حسین کے نام سے کھڑا ہو کر فتنہ و فساد پیدا کر دیتا تھا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ ولی خاں حاکم ماوراء النہر کے بھتیجے امام قلی خاں نے ایک مفسد کو جو مرزا حسین خلف مرزا شاہرخ کے نام سے مشہور ہو رہا تھا قتل کر دیا۔

سنہ ۱۰۱۵ھ کے واقعات میں جہانگیر لکھتا ہے کہ میں ہمیشہ سے سن رہا تھا کہ مرزا حسین پسر شاہرخ مرزا کو ازبکوں نے مروا ڈالا ہے لیکن انہی ایام میں میرے پاس ایک عرضی آئی جس کا راقم مرزا حسین خلف شاہرخ مرزا تھا۔ وہ ایک لعل پیازی قیمتی سہ سد روپیہ میری نذر کے لئے بھی لایا تھا۔ مدعا اس عرضی کا یہ تھا کہ مجھے کچھ فوج عنایت کی جائے تاکہ میں اس کی مدد سے بدخشاں ازبکوں سے لے سکوں۔ میں نے خنجر مرصع اس کو دے کر فرمان لکھوایا۔ اگر تم فی الواقعہ شاہرخ کے بیٹے مرزا حسین ہو تو بے دھڑک میرے پاس چلے آؤ۔ میں فتح بدخشاں کے لئے ضرور فوج تمہارے ہمراہ کر دوں گا۔

اس فرمان کا کوئی جواب نہ آیا۔ جہانگیر لکھتا ہے مرزا شاہرخ کو بدخشاں سے آئے ہوئے قریباً ۲۵ سال ہو چکے ہیں۔ چونکہ ازبک قوم بدخشانیوں پر ہمیشہ تشدد اور ظلم روا رکھتی ہے۔ اس لئے بدخشانی جس نوجوان کو وجیہ اور لائق دیکھتے ہیں۔ اسے شاہرخ کا بیٹا مشہور کر کے ایک جماعت کھڑی کر لیتے ہیں اور پھر ازبکوں سے جنگ کرتے ہیں ازبک جنگ میں کامیاب ہو کر اس جعلی مرزا حسین کا سر کاٹ لیتے ہیں اور نیزے پر رکھ کر تمام شہر میں اس کی تشہیر کرتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد بدخشانی پھر ایک مرزا حسین پیدا کر لیتے ہیں۔ پھر وہ لڑائی میں گرفتار ہو کر قتل کیا جاتا ہے اور اسی طرح اب تک کئی مرزا حسین قتل ہو چکے ہیں۔ جس طرح یہ مشہور ہے کہ اگر کسی دیو کو مارا جائے تو اس کے ہر قطرۂ خون سے اور دیو پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مرزا حسین کے قتل کے بعد بھی اور کئی مرزا حسین پیدا ہو جاتے تھے۔

جعلی شہزادہ خسرو

خسرو جہانگیر کا فرزند تھا۔ جس نے سال اول جلوس جہانگیری میں باپ سے بغاوت کر کے لاہور پر یورش کی تھی اور جس کو بعد میں جہانگیر نے لاہور ہی کے قلعہ میں نظربند کر رکھا تھا۔ جہانگیر کے چھٹے سال جلوس میں صوبہ بہار کے ایک مجہول النسب شخص قطب نام نے جو پٹنہ کے متصلہ گاؤں اوجھیہ کا رہنے والا تھا اور بہ لباس درویشی پھرا کرتا تھا یہ دعوٰی کر دیا کہ میں شہزادہ خسرو ہوں۔ جو لاہور سے بھاگ کر بہ لباس فقیری یہاں تک پہنچا ہوں۔ اگر عوام میرے مددگار ہو جائیں گے اور مجھے کامیاب بنا دیں گے تو میں ان کو ہر طرح خوش رکھوں گا۔ اور قابل اور معتمد لوگوں کو اعلیٰ عہدے اور جاگیریں عطا کروں گا۔ اس نے اپنی آنکھوں کے گرد کچھ نشان بنا رکھے تھے۔ وہ لوگوں کو دکھاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ نشان ان کٹوریوں کے ہیں جو قید خانہ میں میری آنکھوں پر کسی گئی تھیں۔ جہانگیر اپنی تزک میں اس مجہول شخص کے اس فتنہ و فساد کی وجہ یہ لکھتا ہے کہ جن ایام میں یہ حادثہ پیش آیا ان دنوں افضل خاں صوبہ بہار کا حاکم تھا۔ وہ اپنی جاگیر میں جو گورکھپور کے پاس اور پٹنہ دارالحکومت بہار سے ساٹھ کوس کے فاصلہ پر تھی گیا تھا۔ اور انتظام حکومت۔ شہر اور قلعہ شیخ بنارسی اور اپنے دیوان غیاث زین خان کے سپرد کر گیا تھا۔ چونکہ ان اطراف میں کسی دشمن کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اس لئے حاکموں اور منتظموں کی غفلت سے اس مجہول شخص کو ایک جمعیت بنا کر فتنہ و فساد کا موقعہ مل گیا۔ یہاں تک کہ اس نے جعلی شہزادہ خسرو بن کر بہت سے سوار اور پیادے جمع کر لئے جو یکدم شہر میں داخل ہو کر سیدھے قلعہ میں پہنچ گئے۔ شیخ بنارسی اور غیاث خان کھڑکی سے نکل کر دریائے گنگا کے کنارے آئے اور کشتی پر سوار ہو کر افضل خان کے پاس روانہ ہو گئے۔

باغیوں نے قلعہ میں داخل ہو کر افضل خان کے مال و اسباب کے علاوہ خزانۂ شاہی پر بھی قبضہ کر لیا اور جب خزانہ ان کے قبضہ میں

آگیا۔ ان کی جمعیت میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ افضل خاں نے گورکھپور میں اس حادثہ کی خبر سنی۔ اس اثنا میں شیخ بنارسی اور غیاث خاں بھی وہاں پہنچ گئے اور بعض لوگوں کے خطوط بھی پٹنہ سے اس مطلب کے آئے کہ یہ شخص خسرو نہیں ہے بلکہ کوئی جعل ساز ہے اور ملک میں فتنہ و فساد کھڑا کرکے اپنی قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہے۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ افضل خاں پانچ دن میں پٹنہ پہنچ گیا۔ ادھر جب اس حرامزادے نے اس کے آنے کی خبر سنی تو قلعہ کو اپنے ایک معتمد کے حوالے کرکے خود اس کے مقابلہ کو نکلا۔ حالانکہ اس کے پاس کافی جمعیت سوار اور پیادوں کی ہوگئی تھی۔ لیکن ایک مختصر لڑائی کے بعد اس کی جماعت تتر بتر ہوگئی اور وہ اپنے تھوڑے سے ہمراہیوں کو لے کر قلعہ کی طرف دوڑا تاکہ قلعہ بند ہوکر مقابلہ کرے۔ لیکن افضل خاں بھی اس آندھی کے پیچھے ایک بگولہ کی طرح آیا۔ اور ابھی قلعہ کا دروازہ بند نہ ہوا تھا کہ افضل خاں بھی وہاں پہنچ گیا۔ آخر وہ گھبرا کر افضل خاں کے دیوان خانہ میں چلا گیا۔ اور وہاں تین پہر تک تیر اندازی کرتا رہا۔ جس سے افضل خاں کے تیس آدمی مارے گئے۔ لیکن اس اثنا میں اس کے اپنے ساتھی بھی ہلاک ہو چکے تھے۔ جب وہ تنہا رہ گیا۔ تو افضل خاں سے جان کی امان طلب کرکے باہر آگیا۔ مگر افضل خاں نے اس کا فساد قطعی طور پر مٹانے کے لئے اس کو اسی دن مروا ڈالا۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ چونکہ یہ واقعہ افضل خاں اور اس کے معتمدوں اور منتظموں کی غفلت سے پیش آیا تھا۔ اس لئے میں نے ان تینوں کو آگرہ بلوایا اور حکم دیا کہ ان سب کے سر اور داڑھیاں منڈوا کر اور ان کو اوڑھنیاں (عورتوں کے کپڑے) پہنا کر گدھوں پر سوار کرو اور شہر اور بازار میں ان کی خوب تشہیر کرو۔ تاکہ دوسرے غافل اور آرام طلب حاکموں کو عبرت حاصل ہو۔

(۴) جعلی داراشکوہ

داراشکوہ شاہجہان کا بدنصیب بیٹا اور عالمگیر کا معتوب برادر بزرگ تھا۔ داراشکوہ ایک لڑائی میں عالمگیر کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہوگیا اور اس کے بیٹے سلیمان شکوہ اور ایک اور عالمگیر کے حکم سے نظر بند کر دیئے گئے۔

لیکن ۱۰۷۳ھ کا یہ عجیب واقعہ ہے کہ صوبہ گجرات (دکن) میں جبکہ وہاں میرزا لہراسپ ملقب بہ مہابت خاں (۱۰۷۲ھ تا ۱۰۷۷ھ) صوبہ دار تھا۔ تو بلوچ قوم کے ایک شخص نے بہرم گاؤں اور چنوال کے نواح میں داراشکوہ ہونے کا دعویٰ کیا اور بہت سے فتنہ جو اوباش اس کے ساتھ مل کر ملک میں اودھم مچانے لگے۔ گجرات کے گرد و نواح میں اس جعلی شاہزادہ کی شورش نے وہ فتنہ و فساد برپا کیا کہ صوبیدار کو ایک مصیبت کا سامنا پیش آگیا اور جب اس علاقہ کے کوہلی گجروں کا سردار دودا بھی ان باغیوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔ تو یہ شورش صوبہ کے اطراف و اکناف میں پھیل گئی۔ گجروں کا یہ سردار ایک بہادر اور مشہور ڈاکو تھا۔ اس نے ملک میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ جہاں جاتا مصنوعی داراشکوہ کے نام پر قتل و غارت کئے جاتا اور اس کی بادشاہی کا سکہ بٹھائے جاتا۔ آخر مہابت خاں ایک جرار لشکر لے کر نکلا۔ اپنی فوجی شجاعت کے علاوہ اس نے کئی حکمت عملیوں سے کام لیا۔ چنانچہ اس کی حسن تدبیر سے کچھ عرصہ کی ہنگامہ آرائیوں کے بعد یہ فتنہ فرو ہوگیا۔ مہابت خاں نے جعلی شہزادہ اور اس کے معاون کوہلی کی جمعیت کو پراگندہ کرکے باغیوں کو قرار واقعی سزا دی اور جعلی داراشکوہ نے راہ فرار اختیار کرکے اپنی جان بچائی۔ اس واقعہ کے بعد اس کی زندگی اور موت کا کسی کو علم نہیں ہوسکا۔

مصنوعی شاہ شجاع

عالمگیر کا بھائی شاہ شجاع عالمگیر کے خوف سے بنگال چھوڑ کر اراکان (آسام) بھاگ گیا تھا۔ لیکن راجہ اراکان نے بدعہدی و بے مروتی کرکے شجاع کو اس کی اولاد سمیت دریا میں غرق کرا دیا۔

جب عالمگیر بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اور باپ کو قلعہ میں نظر بند کرکے تخت پر بیٹھا تو افغانستان میں اس انقلاب کی وجہ سے ایسی ہل چل شروع ہوگئی کہ گورنر کابل اور اس کے ماتحت حکام کو اس مفسدہ کی روک تھام کے لئے انتہائی کوشش سے کام لینا پڑا۔

افغانستان کے فساد کو تقویت اس لئے زیادہ ہوگئی کہ ایک اجنبی شخص نے یوسف زئی قوم کے پاس اپنے شجاع ہونے کا دعویٰ ظاہر کیا اور کہا کہ وہ عالمگیر سے جان بچا کر ان کے ملک میں آگیا ہے۔ اگر انہوں نے اس کی مدد کی تو وہ ہر طرح ان کیلئے آرام و آسائش کے سامان بہم پہنچائے گا۔ اور اس کے سخت گیر گورنروں کے احکام سے خلاصی دلائے گا۔

افغانوں اور خصوصاً یوسف زئیوں نے اس کو اصلی شجاع سمجھ کر اس کا ساتھ دیا۔ جوں جوں ملک میں اس کی شہرت ہوتی گئی۔ لوگ جوق در جوق اس کے پاس جمع ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ دیہاتیوں کا ایک

جم غفیر مصنوعی شاہ شجاع کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا۔ اب اس نے مقام نوابیلہ کے سامنے کھانہ کے متصل بادشاہی فوج کا مقابلہ کیا۔ اور اس کو شکست دی۔ اس کے بعد دریائے اٹک کو عبور کر کے چھچھ کے علاقہ میں داخل ہو گیا۔

کامل بیگ نام ایک شخص بادشاہ کی طرف سے قلعہ دار اٹک تھا۔ اس نے مراد علی گکھڑ سے مدد لے کر مصنوعی شاہ شجاع کے ساتھ جنگ شروع کی۔ لڑائی میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ طرفین کے کئی آدمی نہنگ اجل کا شکار ہو گئے۔ آخر یوسف زئیوں کے دہقانی لشکر کو شکست نصیب ہوئی۔ جو تلوار اور تیر و تفنگ سے بچے وہ دریائے اٹک میں ڈوب گئے۔ تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ مصنوعی شاہ شجاع کوہ سوات کی طرف چلا گیا۔ جہاں وہ کچھ مدت کے بعد اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر مر گیا۔ اور افغانستان نے امن و عافیت کا سانس لیا۔

(۶) احمد شاہ درانی کا جعلی چچا

احمد شاہ درانی کی وفات (۱۷۷۲ء) کے بعد اس کے فرزندوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ لیکن جب اس کے فرزند کلاں تیمور شاہ نے اپنے باپ کے وزیر شاہ ولی خاں اور اس کے دو بیٹوں اور بھانجوں کو قتل کرا کے ملک میں کچھ امن و امان پیدا کیا تو ایک شخص جس کا نام عبدالخالق تھا اپنے آپ کو احمد شاہ درانی کا چچا مشہور کر کے سلطنت کا دعویٰ کرنے لگا۔ قندہار کے درانی اس کی مدد پر کھڑے ہو گئے۔ اور اس نے تھوڑے سے ہی عرصہ میں اسقدر زور پکڑ لیا کہ ساٹھ ہزار پیدل نہیں۔ بلکہ سوار فوج اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی۔

تیمور شاہ بادشاہ تھا۔ مگر اسقدر فوج اس کے پاس بھی نہ تھی۔ وہ اپنے باپ کے مصنوعی چچا کی فوج اور اس کے اثر و اقتدار کا حال سن سن کر سہم رہا تھا۔ اس کے پاس اس وقت صرف چھ ہزار باقاعدہ فوج تھی اور وہ بھی ایسی تھی کہ اگر باپ تیمور کی فوج میں ہے، تو بیٹا عبدالخالق کی فوج میں ہے۔

عبدالخالق یہ جمعیت کثیر لے کر قندھار سے کابل کی طرف روانہ ہوا۔ تیمور شاہ اپنی تھوڑی سی دو دلی فوج کے ساتھ عبدالخالق کا راستہ روکنے کے لئے کابل سے باہر نکلا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ طرفین میں مقابلہ شروع ہونے سے پیشتر ہی عبدالخالق کے تین نامور سردار محراب خاں۔ پاینده خاں اور دلدار خاں اس کی رفاقت ترک کر کے تیمور شاہ سے آملے۔ جس سے تیمور شاہ کو اپنی سلطنت کے بچاؤ کا بہت کچھ یقین ہو گیا۔

بہر حال لڑائی شروع ہوئی۔ اس معرکۂ عظیم میں دونوں طرف کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ لیکن آخر عبدالخالق کو شکست ہوئی۔ اور وہ گرفتار کر کے تیمور شاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ تیمور شاہ نے اس کی دونوں آنکھیں نکلوا ڈالیں اور اس کی فوج کے سرداروں کو چن چن کر قتل کرایا۔ عبدالخالق کی فوج کے جو تین سردار پہلے ہی اس کے ساتھ آملے تھے۔ ان کو منصب اور خلعت عطا کئے۔ ان میں پاینده خاں بارک زئی وہی سردار ہے جو امیر دوست محمد خاں فرمانروائے کابل کا باپ تھا۔

(۷) کشمیر کا ایک جعلی راجہ

کشمیر میں اُچل کے نام سے ایک راجہ ۱۱۰۱ء سے ۱۱۱۱ء کے درمیان گزرا ہے۔ اس کے عہد میں راجہ کلش کے بیٹے بھوج اور دیولیشور کے بیٹے بھک نے وقتاً فوقتاً تخت کشمیر لینے کے لئے فوج جمع کی۔ لیکن بھوج تو مارا گیا اور بھک نے بھاگ کر جان بچالی۔

یہ تو پھر شہزادے تھے۔ لیکن ان کی دیکھا دیکھی ایک مالدریجی نے جو بڑا ہوشیار، چالاک اور سازشی تھا اپنے آپ کو شاہی نسل سے ظاہر کر کے فوج جمع کرنی شروع کی۔ بہت سے بے فکرے اس کے ساتھ مل گئے۔ بلکہ نواحات کے والیان ریاست بھی کچھ تو اس کے دھوکے میں آ کر اس کے اشاروں پر ناچنے لگے اور کچھ فساد برپا کر کے لوٹ مار کرنے اور مال غنیمت لینے کی غرض سے اس کے معاون بن گئے اور انہوں نے اس کی اسقدر عزت و تکریم کی کہ وہ بے وقوف تکبر اور غرور میں آ کر تن تنہا ہی دارالحکومت میں آ گیا۔ راجہ کے آدمیوں نے اس کو فوراً پہچان کر گرفتار کر لیا۔ اور اس کی تشہیر کرنے کے لئے اس کی ناک کاٹ ڈالی۔ اس کے بعد جب اس بے وقوف کو جس نے چند دنوں کے لئے بدنام شہرت حاصل کر لی تھی۔ دارالحکومت میں لوگ بادرچیوں اور خوانساماؤں کی طرح کھانے پینے کی اشیاء اور سبزی ترکاری خریدتے ہوئے دیکھتے تھے تو اس کا پُر لطف مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔

(۸) جعلی شہزادہ پشوراسنگھ

شہزادہ پشوراسنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ شیر پنجاب کا بیٹا تھا۔ اور اگر راجہ جواہر سنگھ وزیر کی تحریک سے ملک فتح خاں ٹوانہ اور سردار چتر سنگھ اٹاری والا کے ساتھ دغا کر کے اٹک کے قلعہ میں اس کا گلا نہ گھونٹ دیتے تو گمان غالب تھا کہ راجہ ہیرا سنگھ اور پنڈت جلا کا اقتدار ختم ہونے کے بعد تخت پنجاب اسی کے قدم چومتا۔ اس لئے کہ دوسرے سرداروں کی نسبت سکھ فوج اس کی زیادہ طرفدار تھی۔ لیکن مہاراجہ شیر سنگھ اور اس کے وزیر راجہ دھیان سنگھ اور ہیرا سنگھ وغیرہ کے قتل کے بعد مہارانی جنداں کے بھائی راجہ جواہر سنگھ نے دلیپ سنگھ نابالغ کو مہاراجہ بنا کر اپنی سرپرستی کرنے کے لئے سب سے پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالغ وجیہہ اور اولوالعزم فرزند پشاوراسنگھ کا کانٹا دور کرنا ضروری سمجھا۔ لیکن پشاوراسنگھ کا اقتدار اس کے قتل کے بعد بھی استقدر قائم تھا کہ جب پنجاب میں انگریزی تسلط اپنے قدم جما چکا تھا اور سکھ حکومت پنجاب سے رخصت ہو چکی تھی۔ پھر بھی ۱۸۵۳ء میں یہ مشہور ہو گیا کہ شاہزادہ پشاوراسنگھ زندہ ہے۔ نادر خاں گکھڑ نے اس افواہ کو مشہور کر کے پشاوراسنگھ کے نام سے ایک فرضی شاہزادہ کھڑا کیا اور علانیہ باغی ہو گیا۔ صاحب کمشنر نے جو دو سکھ سردار نادر خاں کے پاس اس فساد کو روکنے کے لئے روانہ کئے۔ وہ بھی بمشکل اپنی جان بچا کر واپس آئے۔

آخر چند دنوں کے بعد نادر خاں پکڑا گیا اور اس کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ فرضی شہزادہ کا کچھ پتہ نہ چلا کہ اس کو زمین نگل گئی، یا آسمان کھا گیا۔

محمد الدین فوق

غزل

صدرِ محفل اُٹھ گیا ہے تو بھی اپنا سر اُٹھا
شمع کے قدموں سے پروانوں کی خاکستر اُٹھا

خاکِ میخانہ پہ ہوں دُنیا کے سرکش سرنگوں
میرے ساقی پھر اُسی انداز سے ساغر اُٹھا

وہ اُفق کے پاس تھراتی ہے سورج کی کرن
رونے والے اب تو آنسو پونچھ اب تو سر اُٹھا

سخت جانوں کو حوادث کی کوئی پروا نہ تھی
اُس طرف طوفاں اُٹھا اور اِس طرف لنگر اُٹھا

سر جھکا کر اپنے مستقبل کی تصویریں نہ دیکھ
وہ جہاں کا سر جھکانا ہے تو اپنا سر اُٹھا

تُو نے دیکھا! میری تقدیر اور پلٹا کھا گئی
خاطرِ مجموع سے بیٹھا تھا اور ششدر اُٹھا

شاید اب مستوں پہ ترس آجائے ساقی کو ندیم!
وہ ہوا سنکی، وہ رُت بدلی، وہ ابرِ تر اُٹھا!

احمد ندیم قاسمی

دُنیا

حضرت مدیر شاہکار۔ دُنیا کے متعلق مکرمہ شرافت بیگم اعجاز کے خیالات منظوم پڑھ کر میں بھی اپنے مشاہدات تخئیل پیش کرتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ محترمہ اعجاز نے "تارک الدنیا" سنیاسیوں کا نظریہ بکمال خوبی و مہارت بیان کیا ہے۔ لیکن "لا رہبانیۃ فی الاسلام" کے مطابق دُنیا اس کم بینی کی مستحق نہیں ہے کہ اس کی بستیوں کو رسوا کر کے اس کی دلچسپیوں کو بالکل نظر انداز ہی کر دیا جائے۔ خدا کی صنعت کو دیکھنے کے لئے ژرف نگاہی کی ضرورت ہے۔ نیز اس قسم کی رہبانیت آمیز تعلیم سے بنی نوع انسان کی روح کار پر ضرب پڑتی ہے۔ جس کا نتیجہ عالمگیر تن آسانی اور عزلت گزینی کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ "تنازع للبقاء" کی جدوجہد کے حق میں یہ افسردہ پیغام حد درجہ موجب تعطل و بد دلی ثابت ہوگا۔

(اودے سنگھ شائق سرکاری وکیل رہتک)

آپ نے جس بلند سطح سے دُنیا کے روشن پہلوؤں پر نگاہ ڈالی ہے اور جس حسین پیکر میں دُنیا کو اہلِ دُنیا کے روبرو جلوہ دیا ہے۔ مجھ جیسے ناکام زندگی کے دل میں بھی زندگی کی تمنّا پیدا کر دی ہے۔

(مدیر شاہکار)

جلوۂ کردگار ہے دُنیا ۔۔۔ تا ابد پائدار ہے دُنیا

میری آنکھوں سے دیکھ دُنیا کو ۔۔۔ کس قدر زرنگار ہے دُنیا

زندگی اس جگہ سنورتی ہے ۔۔۔ زندگی کی بہار ہے دُنیا

اس کا فردا ہی عشرتِ امروز ۔۔۔ جنتِ انتظار ہے دُنیا

ذرہ ذرہ سے حُسن پیدا ہے ۔۔۔ عشق کا شاہکار ہے دُنیا

ہے بہشتِ نگاہِ ژرف نگر ۔۔۔ پست بینوں کی دار ہے دُنیا

آفرینش کے وہ حسیں نغمے ۔۔۔ اُن کی آئینہ دار ہے دُنیا

ہر کرن ہے یہاں پیامِ عمل ۔۔۔ عرصۂ کارزار ہے دُنیا

یہ تو سب کچھ ہے لیکن اے شائق
مجھ سے ناسازگار ہے دُنیا

اودے سنگھ شائق

موم بتّی

کہا جاتا ہے کہ سائنس کی نت نئی ایجادات اور مشینوں کے ظہور نے بہت سی چھوٹی چھوٹی دستی صنعتوں کو تباہ کر ڈالا ہے اور اب ان کا احیا کسی صورت میں ممکن معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن تباہی کی ذمہ داری شاید سائنس اور مشینوں پر اسقدر عائد نہیں ہوتی، جتنی کہ اس ذہنیت پر، جس کے مطابق اگر ایک طرف "افرنگ ہے مشینوں کے دھوئیں سے تاریک"، تو دوسری طرف پیچھے دھاگے اور لکڑی کے چرخے سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ زمانہ بجلی اور مشین کا زمانہ ہے، جو کام کسی زمانے میں انسانی ہاتھوں سے مہینوں میں پورا ہوتا تھا، وہ آج مشینوں کی بدولت دقیقوں اور ثانیوں میں تکمیل پاتا ہے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی صنعتیں ایسی ہیں کہ جب تک اُنہیں مشینوں کی مدد سے عظیم پیدا آوری (Mass Production) کے اصول پر لایا نہیں جاتا۔ بین الاقوامی بازار میں ان کے لئے جگہ تلاش کرنا بے سود ہے۔ چنانچہ آجکل پیچیدہ سے پیچیدہ چیزیں ہی نہیں جو دستی محنت سے کسی صورت میں تکمیل پذیر ہو نہیں سکتیں بلکہ معمولی اور سادہ سے سادہ چیزیں بھی جو بہ آسانی دستی محنت سے مکمل ہو سکتی ہیں، ان میں سے اکثر مشینوں کی مدد سے بنائی جاتی ہیں۔ جہاں برقی قمقموں (Electric Bulbs.) کی نازک اور پیچیدہ صنعت مشینوں کی مرہون ہے، وہاں معمولی سی موم بتیوں کی آسان اور سادہ صنعت بھی مشینوں کی منت کش ہو چکی ہے — حقیقت یہ ہے کہ کئی چھوٹی چھوٹی اور معمولی صنعتوں کو بھی سائنس کی مدد سے سنوارا جا سکتا ہے۔ اور مشینوں کی بدولت پیداوار کی رفتار تیز کی جا سکتی ہے۔ اور بین الاقوامی بازار کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک مثال موم بتی کی ہے۔ جو آجکل بہت کم استعمال ہوتی ہے۔ مٹی کے تیل اور برقی چراغوں کی موجودگی میں اگرچہ بظاہر اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن بعض عبادت خانوں میں آج کل بھی اس کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جب کبھی برق کی رسد عارضی طور پر بند ہو جاتی ہے اور برقی چراغ گُل ہو جاتے ہیں تو اکثر موم بتی کی روشنی ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ غرض اس قسم کی بعض وجوہات کی بناپر اس زمانے میں بھی موم بتیوں کی مانگ موجود ہے۔ ایک طرف سائنس اور مشینوں کے ظہور نے اس صنعت کی مانگ کو بتدریج گھٹا دیا ہے تو دوسری طرف سائنس اور مشینوں ہی کی مدد سے یہ صنعت اس زمانے میں بھی اپنا وجود برقرار رکھنے کے قابل ہو گئی ہے اور بازار کی کم سے کم مانگ کو بھی کم سے کم قیمت پر بہتر سے بہتر صورت میں پورا کر رہی ہے۔ گذشتہ زمانے سے آج تک اس صنعت نے سائنس کی تحقیقات کا جو کچھ اثر قبول کیا ہے اور جس طرح موم بتیاں مشین کے ذریعے تیار کی جاتی ہیں، وہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔

تیل اور بجلی کے زمانے سے قبل موم بتیوں کا استعمال بکثرت ہوتا تھا۔ اول اول یہ سیال ٹیلو (Tallow) اور بعض اور قسم کی چربیوں سے بنائی جاتی تھیں۔ اور بعد میں وھیل مچھلی (Whale) کی کھوپڑی سے نکالی ہوئی موم سے بنائی گئیں۔ جہانتک روشنی، نفاست اور قیمت کا تعلق ہے، وھیل کی موم سے بنی ہوئی بتیاں چربی کی بتیوں سے بہتر اور ارزاں ثابت ہوئیں۔ لیکن ایک نقص ان میں یہ پایا گیا کہ وہ بہت جلد پگھل جاتی تھیں اور پگھلی ہوئی موم رائگاں جاتی تھی۔ لہٰذا ایسی موم بتیوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ جو بیک وقت سستی ہوں اور دیر میں پگھلتی ہوں۔ انہی دنوں شیورل (Chevreul) نامی ایک فرانسیسی سائنسدان نے مختلف قسم کی چربیوں پر تجربے کرنے کے بعد اعلان کیا کہ چربیوں کے اجزاء بعض ترشیوں (Acids) پر مشتمل ہیں۔ جن میں سے ایک آسٹرین (Stearine) ہے جو موم بتی کی مطلوبہ ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔ اس کے بعد پچیس سال تک اسٹیرین کی بتیوں کا بازار گرم رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۱ء میں پیرافینی موم (Paraffin Wax) کا ظہور ہوا۔ یہ ایک سفید شفاف اور نفیس موم ہے جو پیٹرولیم (Petroleum) کی تقطیر (Disti-llation) سے برآمد ہوتی ہے۔ ظاہری دلکشی اور پیداوار کی بہتات کی وجہ سے اگرچہ اس قسم کی موم اسٹرین پر مقدم ثابت ہوئی، لیکن اس میں ایک نقص یہ موجود تھا کہ اس سے بنائی ہوئی موم بتی معمولی سی گرمی کیا

نرم ہو جاتی تھی - لہٰذا دونوں کی خوبیوں کو یکجا کرنے کے لئے دونوں کے مناسب اوزان کو ملایا گیا - اس طریقے سے جو موم بتیاں تیار ہوتی تھیں، وہ نفیس، شفاف اور دلکش ہی نہیں بلکہ سخت بھی ثابت ہوئیں - یہی طریقہ آج کل بھی رائج ہے -

ایک اچھی موم بتی کے لئے اچھی طرح جلنے والی بتی کی ضرورت ہوتی ہے - دراصل بتی موم بتی کی جان ہے - اور موم بتی کی صنعت کی بقا کا راز بہت بڑی حد تک مؤثر طور پر جلنے والی بتی میں مضمر ہے - اوّل اوّل یہ بتی باریک دھاگوں کو بٹ کر بنائی جاتی تھی - اس صورت میں بتی کا جلا ہوا حصہ نیچے گر جانے کی بجائے یونہیں سیدھا کھڑا رہتا تھا اور بتی کے جلنے میں مخل ہوتا تھا، اور جلے ہوئے حصے کو نکالنے کے لئے تھوڑی تھوڑی دیر میں گل گیر یا گل تراش کا استعمال ضروری تھا۔

۱۸۲۵ء میں کیم بیرس (Camla ceres) نامی ایک فرانسیسی نے دریافت کیا کہ اگر بٹی ہوئی بتیوں کے عوض بُنی ہوئی بتی استعمال کی جائے تو گلتراش سے بے نیازی حاصل ہو سکتی ہے - کیونکہ بُنی ہوئی بتی کا جلا ہوا حصہ خود بخود جھک کر گر جاتا ہے - دراصل یہی وہ سیدھی سادی دریافت ہے - جس نے بڑی حد تک موم بتی کی صنعت کو تباہ ہونے سے بچایا ہے - اس سلسلے میں ایک اور اہم دریافت بتی کو پاک کرنے سے متعلق ہے: روئی میں راکھ اور بعض چھوٹے چھوٹے معدنی ذرات موجود ہوتے ہیں - جن کی وجہ سے بتی بخوبی جل نہیں سکتی، اور بعض اوقات گل ہو جاتی ہے - ان اجزاء سے رہائی حاصل کرنے کے لئے بتی کو بوریکس (Borax) اور امونیا سلفیٹ (Ammonia Sulphate) میں بھگو لیا جاتا ہے - یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا ہے -

موم بتی کی صنعت اگرچہ مذکورہ دریافتوں اور طریقوں کی بہت کچھ ممنون ہے، لیکن موجودہ زمانے میں اس صنعت کی بقا کے لئے ان سے بھی سوا ایک چیز کی ضرورت ہے - یعنی پیداوار کی رفتار تیز کرنے کے لئے مشینوں کا استعمال - چنانچہ دیگر صنعتوں کی طرح آج موم بتی کی صنعت کو بھی عظیم پیداوار - مقدار (mass Production) کے اصول پر لایا جا چکا ہے اور صنعت سے متعلق تمام کام مشینوں سے انجام دئیے جاتے ہیں - اوّل اسٹیرین اور پیرافینی موم کو پاک کر لیا جاتا ہے، اور اس کے بعد دونوں کے مناسب اوزان کو اچھی طرح ملا دیا جاتا ہے اور ان کا سیّال آمیزہ ڈھالنے والی مشینوں کے کمروں میں منتقل کیا جاتا ہے - ہر ڈھالنے والی مشین کئی سانچوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر سانچے کے وسط میں بتی ایک خاص طریقے سے استادہ کی جاتی ہے - سانچوں کے بالائی حصّہ پر ایک نالی کے ذریعے سیال موم سانچوں کے اندر پہنچائی جاتی ہے - ہر بیرونی حصّے میں سانچے کے اطراف پانی کے کمرے موجود ہوتے ہیں - جن میں سرد پانی پہنچانے پر تقریباً بیس دقیقوں میں سانچے کے اندر موم اچھی طرح جم جاتی ہے - اب بنی بنائی موم بتیوں کو باہر نکال لیا جا سکتا ہے - اگر کسی کارخانے میں پانچ سو ڈھالنے والی مشینیں موجود ہوں اور ہر مشین بیس درجن سانچوں پر مشتمل ہو تو بیس دقیقوں کے اندر بہ آسانی ایک لاکھ بیس ہزار موم بتیاں تیار کی جا سکتی ہیں گویا فی ثانیہ سو بتیاں تیار ہو سکتی ہیں -

سید بشیر الدین
بی - اے

رُباعی

گزرا ہوا وقت ہاتھ کیونکر آئے؛ پودا مرجھا گیا تو پھل کیا لائے؛
ناحق جھوٹی تسلیوں کی دُھن میں چوکا اک بُوند کا گھڑے ڈھلکائے

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

سوتیلی ماں

جب منشی راما کانت کی بیوی کا انتقال ہوا تو منشی جی کا بیٹا موہن پندرہ سال کا تھا، گھر میں صرف منشی جی کی ماں تھیں، وہی تمام کام کرتیں۔ منشی جی کی بیوی کے مرنے کی دیر تھی، چاروں طرف سے شادی کیلئے پیام آنے لگے۔

منشی جی نے ان پیغامات کا تذکرہ اپنی ماں سے کیا، ماں سن رسیدہ اور جہاندیدہ تھی۔ بولی ——— "بیٹا! اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو میری رائے یہ ہے کہ اب تم اس جھنجھٹ میں نہ پھنسو۔ اس لئے کہ تمہارے ایک بیٹا ہے، اب تمہیں صرف اپنا ہی نہیں بلکہ موہن کا بھی خیال کرنا چاہیئے اور پھر آمدنی کا یہ حال ہے کہ مشکل سے قرض اُدھار کرکے مہینہ ختم ہوتا ہے، اگر تم کو گھر ہی بسانا ہے تو دو چار سال میں موہن کی شادی کرکے گھر بسا لینا۔"

منشی جی بولے ——— "اماں تمہیں سوچو مجھے کوئی پانی دینے کو چاہیئے کہ نہیں، آج تو تم ہو لیکن کل کو کوئی روٹی کا بھی پوچھنے والا نہیں۔ پھر لڑکے کے لئے بھی ماں کی ضرورت ہے ماں تو تم مرہی گئیں۔ تو بہو کو کون سنبھالے گا؟ کون دیکھ بھال کریگا۔ پھر اگر میں بیمار ہو جاؤں تو میری خدمت کون کریگا؟"

"بیٹا! میں نے جو مناسب سمجھا کہہ دیا۔ اب جیسی تمہاری خوشی؟"

"لوگ کہتے ہیں وہ کام کاج میں بہت ہوشیار اور سلیقہ مند ہے اور بچوں سے بہت محبت کرتی ہے، یہ بھی کہتے ہیں کہ پیسے کا کام پائی سے کرنے والی ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے ایسی ہی بہو کی تو ضرورت ہے۔ جو موہن کو آرام سے رکھے اور اپنا گھر دیکھے، اب کیا چاہیئے۔"

موہن کا نام لیتے ہی ماں رونے لگی۔ "ہائے، وہ بیچاری مرنے کے قابل تھی؟ یہ سب ایشور کی مرضی ہے"

منشی جی باہر چلے گئے۔

(۲)

کچھ دنوں کے بعد منشی جی کی شادی ہو گئی، نئی بہو آئی، وہ گھر کے تمام کاموں میں حصّہ لینے لگی اور پیسے کا کام پائی میں چلنے لگا، ماں خوش تھی کہ بہت اچھی بہو ملی۔ منشی جی بھی نئی بیوی سے بہت محبت کرتے گرہستی میں اس کو ہوشیار دیکھ کر منشی جی اپنے دوستوں سے اس کی تعریف کے پُل باندھ دیتے۔

وہ ایک بار شانتا دیوی یعنی نئی بہو نے اشارے سے کہا ——— "اماں جب تمہیں گرہستی سنبھال سکتی تھیں تو مجھے بیاہ کر لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بیٹی! بڑی خوشی کی بات ہے، کہ اب تمہیں گرہستی سنبھال لو گی اور مجھے چھٹی ہو جائے گی۔ ماں کُنجی شانتا کو دیکر بیفکر ہو گئی ماں نے اشارہ سمجھ کر جواب دیا۔

شانتا موہن کو پھوٹی آنکھ بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔ موہن باہر سے آیا تو بولا ——— "چچی مجھے پانچ روپے دیدو میں کتاب لینے چوک جاتا ہوں۔"

"ابھی روپے نہیں ہیں۔"

"تم کہتی ہو روپے نہیں ہیں اور امتحان کو صرف پندرہ روز اور رہ گئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، امتحان سر پہ اور کتاب کا کہیں پتہ نہیں، کیسے کام چلے گا؟"

"کسی سے مانگ کر کیوں نہیں پڑھتا؟"

"جب باپ کے پاس سے پیسہ نہیں نکلتا تو دوسرا کیوں دینے لگا ———؟"

"ٹھیک ہے جب تیرا باپ ہی مرگیا تو میں کس کی کمائی دونگی۔ آج آنے دو تو کہتی ہوں کہ تمہارا لاڈلا کہتا ہے کہ میرا باپ تو مرگیا!"

"کیوں ناحق تہمت لگاتی ہو، میں نے مرنے جینے کا تو نام تک نہیں لیا۔"

چُپ رہ۔ بے حیا جھوٹا، بدمعاش کہیں کا۔

میرے ہی منہ پر کہنا ہے مجھی کو جھوٹا بناتا ہے۔"

موہن آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور باہر چلا گیا۔

شام کو منشی جی آئے تو شانتا چارپائی پر پڑی تھی منشی جی نے جلدی سے کپڑے بدلے اور شانتا کے پاس جا کر بولے۔

"کیسا مزاج ہے؟"

"مزاج کو کیا ہوا ہے، مجھ سے موت بھی بھاگتی ہے کیونکہ میں بدقسمت ہوں، کیا یہی گھر تھا جس میں رات دن کچھ کچھ ہوتی رہتی ہے؟"

"شانتا تو نری پاگل ہے۔ تیری شادی مجھ سے ہوئی ہے یا کہ گھر سے؟ اگر موہن نے کچھ کہا ہے تو بتا میں اس کا ذمہ دار نہیں اس لئے کہ وہ بھی جوان ہو گیا۔"

"تمہیں کو تو کہتا تھا کہ میرا باپ مر گیا اور نہ جانے کیا کیا بکتا تھا، میں نے منع کیا کہ کیول ان کو کوستے ہو تو مجھے مارنے دوڑا اور کہتا ہے تم دونوں کا منہ دیکھنا پاپ ہے۔"

"کیوں لڑتا تھا؟ کہاں گیا؟"

"لڑتا تھا کہ بیس روپے دیدو، میں نے کہا تنخواہ ملیگی تو کل دونگی۔ آج میرے پاس بیس روپے نہیں ہیں۔ تو تمہارا نام لیکر کہنے لگا۔ "اب میں سمجھ لوں کہ وہ مر گئے۔ اس پر میں نے منع کیا۔ روپے کیلئے اُن کو نہ کوسو، تو مجھے مارنے دوڑا۔"

"ہے کہاں؟"

"میں کیا جانوں، تمہاری ماں پنڈت جی کے یہاں گئی ہیں۔ انہیں کے پاس گیا ہوگا۔ ابھی وہ بھی تو رج لے کر آتی ہوں گی۔"

"اچھا تو اماں بھی اسے شہ دیتی ہیں؟"

"تو کیا تم سمجھتے تھے، وہ اچھی باتیں سکھائیں گی، وہ تو مجھے بھی پھوٹی آنکھوں نہیں دیکھ سکتیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا ان لوگوں کا میں نے کیا نقصان کیا ہے؟"

"کچھ نہیں، میں ہی کانٹا ہوں۔ مگر اس میں میرا کیا قصور، تمہیں چاہیئے تھا کہ سب کی رائے سے شادی کرتے، میں جب گہنے اور کپڑے پہنتی ہوں تو ماں جی روتی ضرور ہیں۔ کیا میں نے موہن کی ماں کو مار ڈالا، پھر جب میں نے اس کے باپ ہی کو لے لیا۔ تو گہنے اور کپڑے کی بات ہی کیا۔"

"تو موہن کا کیا بگڑتا ہے؟"

"کیوں نہیں بگڑتا، سب سے اپنا رونا روتا پھرتا ہے۔ گھر گھر شکائتیں کرتا ہے۔"

"اس کا یہی طور ہے تو بھی کیا رہتا ہے۔ روئے گا!"

کسی نے منشی جی کو باہر سے آواز دی وہ باہر چلے گئے۔

(۴)

موہن اپنی دادی کے پاس بیٹھا تھا۔

باہر سے منشی جی نے آواز دی۔ موہن یہاں آ، آجکل تیرا مزاج بہت بڑھ گیا ہے۔ تو تیرے لئے میرے گھر میں جگہ نہیں ہے۔ اب تو بھی جوان ہے جا کما کھا۔

"کیوں تم دونوں کے دونوں اس کے پیچھے پڑے رہتے ہو، اس نے تمہارا کیا نقصان کیا ہے؟" بوڑھی ماں نے روکر جواب دیا۔"

"چپ رہو، تمہیں نے اس کو چڑھا رکھا ہے۔" منشی جی بولے۔

"میں نے کیا سر چڑھا رکھا ہے۔ البتہ ظلم نہیں دیکھا جاتا، میں کہتی ہوں اس کی ماں مر گئی تو کیا اسے بھی مار ڈالنا چاہتے ہو؟"

"اس کو مارتا کون ہے، لیکن میں نے اس کی زندگی بھر کا ٹھیکہ تو لیا نہیں ہے۔ ہاتھ پیر والا ہوا، کما کھاتا کیوں نہیں۔ میرے اور بھی تو بچے ہیں، کیا صرف اسی کو پالنا ہے، اب وہ میرے گھر میں نہیں رہ سکتا۔"

"خیر جیسی تمہاری مرضی، میں بھی تو گاؤں جانا چاہتی ہوں۔ پھر تمہارے جو جی میں آئے کرنا۔"

"میں تمہیں بھی نہیں روک سکتا، تم دونوں جاؤ، تمہاری وجہ سے میں اپنا گھر برباد نہیں کر سکتا۔"

"تو آج شام کی گاڑی سے میں جاتی ہوں، تمہارے جو جی میں آئے کرنا۔"

"شوق سے، میں نے بہت برداشت کیا۔ اب نہیں برداشت ہوتا۔"

"یہ سب نخرے ہیں۔ وہاں بھی تو سب کچھ یہیں سے جاتا ہے وہ لوگ کوئی دھنا سیٹھ تو نہیں۔" شانتا آکر بولی۔

بوڑھی ماں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ شانتا خاموش ہو گئی، اور موہن باہر چلا گیا۔

"کیا کھانا تیار ہے شانتا؟ مجھے ایک دوست سے ملنے جانا ہے۔ بارہ بجے کا وقت دیا ہے۔" منشی جی نے کہا۔

"چلیئے کھانا تیار ہے، ابھی بہت وقت ہے۔"

جب شانتا اور منشی جی دونوں چلے گئے تو بڑھیا کو موہن یاد آیا، بڑھیا نے اِدھر اُدھر تلاش کیا، مگر کہیں پتہ نہ چلا، اس نے سوچا۔ آج رات کو ہم دونوں کو چلا ہی جانا چاہیئے۔ جس گھر میں اپنی کوئی حیثیت نہ ہو۔ وہاں رہنا بیکار ہے، جا پتے بیٹے کو نکال سکتا ہے اس کے نزدیک میری کیا حقیقت ہے۔ پھر سوچنے لگی ۔۔ اگر موہن کو وہ لیکر چلی گئی تو اس کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ اور اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ پھر بڑھیا نے سوچا۔ کیوں نہ سال دو سال اور گذار دوں جس سے موہن کی ایک روٹی کا ٹھکانا ہو جائے، پھر دیکھا جائے گا۔ یہ سب سوچتے سوچتے بڑھیا رونے لگی۔

(۴)

آج موہن آٹھ روز سے غائب ہے۔ گھر میں سب لوگ خوش ہیں۔ کسی کو اس کا غم نہیں، صرف اس کی دادی ہے، جو نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے، اور نہ کسی کو اس کی طرف توجہ کرنے کی پروا ہے۔

"تم نے موہن کو نکال ہی کر دم لیا۔ اچھی بات ہے مجھے بھی گاؤں پہنچا دو، میں اب تمہارے یہاں رہنا پاپ سمجھتی ہوں۔" بوڑھی ماں نے منشی جی سے کہا۔

"جانا ہے تو جاؤ، نہ میں نے موہن کو نکالا ہے، اور نہ تمہیں کو جانے کو کہتا ہوں۔ اور پھر موہن کوئی لڑکی تو ہے نہیں، کہ جو چلا گیا تو بدنامی ہوگی۔ اچھا ہوا اپنا کمائے کھائے، میں اسے بُرا نہیں سمجھتا۔"

"دیکھو اماں رات دن کا رونا اچھا نہیں۔ خاموشی کے ساتھ رہنا ہو تو رہو۔ اور اگر گھر جانے کو جی چاہتا ہو تو جا سکتی ہو، تم کو کوئی باندھے تو ہے نہیں، آج تم نے ناحق سوہن کو پیٹا ہے، بری ہوں۔ تو میں نہ کہ سوہن، سوہن بھی تمہارا ہی ہے۔ لیکن میری دشمنی بچے سے نکالنی اچھا نہیں ہے۔" شانتا نے کہا۔

"ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ان کیلئے گھر ہی جانا اچھا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں۔ یہ رات دن ہم لوگوں کو زندگی دوبھر کر دینگی۔" منشی جی نے کہا۔

شانتا منہ بنا کر بولی "میری تو آپ نے مٹی خراب کر دی، اور کیا؟" اور آنکھوں میں جھوٹا آنسو بھر کر چلی گئی۔

منشی جی شانتا کے ساتھ کمرے میں جا کر بولے۔ "شانتا تم روتی کیوں ہو۔ تمہارا رونا دیکھ کر میں اپنے آپکو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ پیاری تم میرا خیال کر کے خوش رہا کرو۔"

"کیوں نہ خوش رہوں گی، یہ سب خوش ہی رہنے کی باتیں ہیں نا؟"

"اجی یہ دنیا ہے، سب اپنا اپنا رونا رویا ہی کرتے ہیں۔"

سوہن باہر سے آکر باپ کی گود میں بیٹھ گیا۔ منشی جی اسے لیکر باہر چلے گئے۔

بوڑھی ماں گاؤں چلی گئی، اور شانتا کی ماں اور بھائی آ گئے، اس طرح گھر میں جو دو آدمی کی کمی ہو گئی تھی، وہ پوری ہو گئی۔

اب منشی جی اور شانتا دونوں خوش ہیں۔

ایک دن منشی جی نے کہا "شانتا گاؤں روپے بھیجنے ہیں۔ بھیا کا خط آیا ہے کہ کھیتی میں کچھ ہوا نہیں، اور ایک بیل بھی مر گیا ہے۔ لکھا ہے کہ روپے کے بغیر گھر میں بڑی تکلیف ہے۔ اس لئے کچھ روپے دو تو بھیجدوں۔"

"کیا یہاں ڈال میں روپے پھلتے ہیں، یا اناج ہے کہ سب کو مٹھی مٹھی بانٹ دیا جائے۔ سب کے بال بچے ہیں، ہمارے کوئی کھانے والا نہیں ہے کیا؟"

"ماں اور بھائی کو کھلانا میرا فرض ہے۔"

"تو ماں چلی کیوں گئی؟"

"تم بھی عجیب ہو، خیر جو لکھا تھا تم کو بتا دیا، اب جیسی تمہاری رائے ہو۔"

"کچھ نہیں جائے گا، سبھی کے گھر ہوتا ہے، ہاں میں تو بھول ہی گئی تھی، سنار کے ہاں سے میرا کڑا نہیں آیا، آج ہی تو دینے کو کہا تھا۔"

"مجھے بھی یاد نہیں تھا۔ اسے سو روپے دینے ہیں۔"

"میں روپے دیتی ہوں۔ آپ جا کر لیتے آیئے۔ کیونکہ مسز مالویہ کے یہاں کل مونڈن ہے۔ مجھے بھی نوید دیا ہے۔"

"اچھا تو روپے دو۔ میں جا کر لا دوں، نہیں تو تم ہمیں کو الزام دھروگی۔"

شانتا روپے دیتی ہوئی بولی۔ ماں کے لئے ایک اچھی سی ساری بھی لیتے آیئے گا۔ ان کو بھی بلایا ہے۔

منشی جی بہت اچھا کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

(۵)

دادی کے مرنے کی خبر پا کر موہن کلکتہ سے آیا ہے، جب اسے کام کاج سے فرصت ہوئی تو اس نے اپنے چچا سے کہا۔

"چچا میں روپے دیتا ہوں میرے لئے مکان بنوا دیجئے۔"

منشی گنگا پرشاد بولے "گھر تو موجود ہی ہے۔ گھر بنوا کر کیا کرو گے؟ اسی میں کیوں نہیں رہتے؟ اور تمہیں یہاں رہنا ہے۔ یا کلکتہ؟"

"پھر بھی گھر کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے!"

"پہلے اپنی شادی کر لو، پھر گھر کی فکر کرنا، بھیا نے تو ہم لوگوں کو چھوڑ ہی دیا، تمہیں کو دیکھ کر ہمیں بھی صبر ہے، اور کیا بیٹا جب سے تمہاری ماں مری تمام گھر برباد ہو گیا۔"

"گھر وغیرہ ہو جائے تو شادی بھی اچھی معلوم ہو، میں سوچتا ہوں کل پنڈت جی کو بلا کر ساعت وغیرہ پوچھ لوں، پھر دیکھا جائے گا۔"

"بھیا سے پوچھ لو، تمہارے باپ ہیں، وہ سنیں گے تو ناراض ہوں گے، کہ ہم سے نہیں پوچھا۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں نے ان کو اسی روز سمجھ لیا، جس روز انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا، اور میرے لئے دادی کو بھی، جو ان کی ماں تھیں، وہ سب کچھ اپنی بیوی ہی کو سمجھتے ہیں، تو مجھے ان کی کوئی پروا نہیں۔"

(۶)

منشی جی کے مرنے کے بعد شانتا گاؤں میں چلی آئی۔ اسے موہن کے چچا کے ہاں رہتے ہوئے چھ مہینے ہو گئے، اسی درمیان میں لڑائی جھگڑا گالی گلوچ سب کچھ ہو گیا۔

ایک روز موہن کی چچی اپنے شوہر سے کہنے لگی۔ کیا تم میری جان لینے پہ تُلے ہو، جو اسے گھر میں رکھا ہے۔ پھر کیا وہ مجھے کوئی گٹھڑی دے گئے ہیں، وہ شوہر کو کھا چکی، اب ہمیں کھانے پر لگی ہے اس کیلئے میرے گھر میں رہنے کی جگہ نہیں۔ جس طرح تم نے اُسے گھر میں رکھا ہے اسی طرح نکال بھی دو۔ میں اسے اپنے گھر رکھنا نہیں چاہتی۔

"تم چپ رہو، میں اسے موہن کے گلے باندھوں گا۔ جو اس کا بیٹا ہے، میرے اوپر اس کا کوئی حق نہیں۔ ابھی تو میں نے اسے اس لئے رکھ لیا ہے کہ گاؤں کے لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ پھر وہ ابھی جوان ہے، کچھ بُرا بھلا کر بیٹھے تو بدنامی ہمیں لوگوں کی ہوگی۔ تم تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتی، مجھے یہ رات دن کا جھمیلا پسند نہیں پھر انہیں چاہیئے ان کے بچوں کو چاہیئے۔ آج ان کے سوہن نے میرے رتن کو بہت پیٹا ہے۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جب میں نے اسے ڈانٹا تو کہنے لگی کہ میرے بچے کو دیکھ کر جلتی کیوں ہے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے، جب بھی میں ان کو دودھ کے گھونٹ پینے کو دوں۔"

منشی جی نے اس کے جھگڑے کا حال اپنی ماں کی زبانی سُنا تھا۔ چپکے سے اٹھ کر موہن کے گھر کی راہ لی۔

(۷)

منشی جی موہن کے یہاں جا کر کہنے لگے۔ بیٹا! سوہن کی ماں کو اب تمہیں اپنے گھر رکھو، میرا حال تو تم سے چھپا نہیں۔ میں تمہارے باپ کا بھائی ہوں۔ اور تم ان کے لڑکے ہو۔ تمہارے پر ان کا حق بھی ہے، چھ مہینے ہو گئے، اور تم نے ایک پیسہ بھی نہ دیا اور نہ کبھی خبر ہی لی۔

"اس کو پیسے دینا اور اس کی خبر لینا میں پاپ سمجھتا ہوں۔"

"کیا یہی جواب ہے وہ تمہاری سوتیلی ماں ہے، اس کے بچے تمہارے بہن بھائی نہیں؟"

"ان کے باپ مر گئے ماں تو زندہ ہے۔ بچوں کی پرورش کرنا اس کا فرض ہے میرا نہیں۔"

"تو مجھے اس کیلئے پنچایت کرنی ہوگی۔ کہیں کچھ بُرا بھلا ہوا تو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ تمہیں سوچو ابھی جوان عورت ہے کسی کے دل کا حال کون جانے۔"

"میں اس کیلئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میرے لئے اپنے ہی بال بچے مشکل ہو رہے ہیں۔"

"تو بہت بے شرم ہے۔ تیرے لئے عزت کی بھی کوئی قیمت نہیں، تو اپنے فائدے ہی کی وجہ سے ایسا کہتا ہے۔"

"مجھے اپنی بزرگی کی وجہ سے اپنے بچوں کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جو کچھ بھی میرے گھر میں ہے وہ صرف میرا ہی نہیں ہے۔ اس میں میرے بچوں اور بیوی کا بھی حصہ ہے۔ اب میں پہلے کا وہ موہن نہیں، جس کی ہر چیز اپنی تھی۔ اب میرے اوپر بھی اپنی بیوی اور بچوں کی ذمہ داری ہے، سوہن کی ماں کو اپنے یہاں رکھنے کے

معنی یہیں کہ میں اپنے بچوں کے منہ کا لقمہ اپنے باپ کے نام کھلا دوں اور پھر جو باپ اپنی اولاد کیلئے قربانی نہیں کر سکتا، اس کیلئے بیٹے کے قربانی کرنے کی کوئی ضرورت میں نہیں سمجھتا، پھر آپ عورتوں کو بیوقوف کیوں سمجھتے ہیں، یہ آپ ان کے ساتھ بے انصافی کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا موقع نہیں دیتے۔ ان کو خود ہی اپنے شوہر کی عزت کا خیال ہوگا۔" "مجھ سے آپ سے زیادہ"۔ کیونکہ شوہر کو سب سے پیاری چیز بیوی ہے۔ اس لئے وہ بھی اپنی عزت کو اس کی عزت سمجھے گی۔ اس کے فرض کو اپنا فرض خیال کرے گی۔ اگر ہم لوگ اس کے بوجھ کو اپنے اوپر لے لیں گے۔ تو کہنے کو ہوگا کہ جبتک زندہ تھا اس وقت تک اس کا تھا اور مرگیا۔ تو دوسروں کا ہو گیا۔ نیک اور خود دار عورت اس کو اپنی بے عزتی خیال کرے گی۔ اور یہ ہے بھی شرم کی بات۔"

"آج ایسے کر رہے ہو، کل کو بُرا بھلا ہو گیا تو پتے پر گوشت بچھ جائے گا۔ اور پھر بات کرنے کے قابل نہ رہو گے۔ ابھی بچے ہو، ذرا سی انگریزی پڑھ لی اور ولائت کا خواب دیکھنے لگے۔ یہ ہندوستان ہے۔"

"مجھے تو یہی پسند ہے کہ عورت مرد دونوں کیلئے سماج کا ایک ہی حکم ہونا چاہئے۔ اگر چچی کی خواہش ہو تو جس سے چاہیں شادی کرلیں۔ میں کبھی اسے بُرا نہ کہوں گا بلکہ اور خوش ہوں گا۔ یہ تو عورتوں کے ساتھ صریحاً بے انصافی ہے کہ مرد تو بوڑھے ہو جائیں جب بھی شادی کر سکتے ہیں اور عورت بیچاری ابھی جوان ہی رہے تو اسے ستی ہونے کی تلقین کرے، مردوں نے ان پر اپنی حکومت جتانے کے لئے ان کے ساتھ یہ بے انصافی کی ہے، میں اسے درست نہیں سمجھتا۔"

"تو نے اپنی طبیعت کو اسقدر ذلیل کر دیا ہے کہ بات کرنے سے نفرت ہوتی ہے۔"

"تو رہنے دیجئے مجھ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی، آپ جیسا مناسب سمجھئے کیجئے۔ میرے باپ کا آپ پر بھی تو کچھ حق ہے۔ اور پھر جو پندرہ سال تک میری پرورش کی تو اس کا احسان مجھ پر نہیں جو آپ پر کیا وہ ان کا احسان ہے۔ اس کا ادا کرنا آپ پر فرض ہے۔ مجھے تو انہوں نے پیدا کیا تھا، اگر پرورش نہ کرتے تو سرکار گردن ناپتی۔ لیکن آپ کے لئے تو وہاں بھی گنجائش نہ تھی۔"

چچا نے جب دیکھا کہ موہن کے سامنے چلنے والی نہیں ہے اور وہ مجھے ہی اُلٹا پھنسانا چاہتا ہے۔ تو موہن سے بولے "اچھا ٹھیک ہے بیٹا! اب میں جاتا ہوں۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے، بُرا نہ مانئے گا۔"

"نہیں بیٹا، بُرا ماننے کی کیا بات ہے، ابھی تک میں اپنے کو بھائی سے الگ سمجھتا تھا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے الگ نہ تھے۔"

"جی ہاں، اگر میری ماں میری حقیقی ماں ہوتی اور انہیں آپ الگ کر دیتے تو میں ان کا ذمہ دار بھی تھا، مگر ان کے ساتھ دوسری بات ہے۔"

(۸)

شانتا بغل والے کمرے میں جا کر موہن اور اس کے چچا کی تمام باتیں سُن رہی تھی۔ پہلے تو اس کے جی میں آیا کہ موہن کا منہ نوچ لے۔ کہ اس کے باپ ہی نہ اسے بیاہ کر لائے تھے، وہ موہن سے پوچھنا چاہتی تھی، تو مجھے کیوں نہیں رکھے گا، تو کیوں نہیں میرے بچوں کی پرورش کرے گا۔ تیرے بچے ہیں تو کیا یہ پڑے ہوئے ملے ہیں۔ جوان کی پرورش نہیں کرے گا۔ پھر موہن کی بات کو دُہرایا، کہ "میری حقیقی ماں ہوتی تو میں اس کا ذمہ دار تھا۔" اس کا کہنا ٹھیک ہی ہے۔ کہ جب باپ بیٹے کیلئے ایثار نہیں کر سکتا تو بیٹا باپ کے لئے کیوں جان دے، وہ اپنے بیوی بچے کو چھوڑ کر اپنے باپ کے بیوی، بچوں کیلئے کیوں جان دے۔

ان واقعات پر غور کرتے کرتے اس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو نکلنے لگے۔ جو کچھ بھی موہن نے کہا تھا وہ تمام باتیں اسے بالکل درست معلوم ہوئیں۔ اس نے پھر سوچا۔ جب موہن کے باپ گھر روپیہ بھیجنے کے لئے کہتے تو میں ایک نہ ایک عذر کر دیا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ماں کے لئے بھی روپیہ نہ بھیج سکے۔ تو مجھے ان بداعمالیوں کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ مجھے موہن اور اس کے چچا کے گھر کھانے کا حق حاصل ہے۔ میرا اس گھر میں کھانا بھیک مانگ کر اور خیرات کے کھانے سے بھی بُرا ہے، جس روز یہ لوگ چاہیں ہمیں باہر نکال سکتے ہیں۔

اس نے غور کرنے کے بعد موہن اور اس کے چچا کے ہاں

رہنے کا ایک ذریعہ سوچا، کہ وہ ان کے گھر میں خادمہ کی طرح کام کرے اور انہیں کے یہاں کھائے۔ اگر اس پر بھی یہ لوگ کھانا دیدیں تو یہ ان کی نیک نیتی ہے۔ اس لئے کہ بھابی بھی تو کام کرنے کے بعد ہی کھانا کھاتی ہیں۔ اسے خود اپنی ذات سے نفرت محسوس ہونے لگی اور ایکبار تو اس نے خودکشی تک کرنے کا تہیہ کر لیا۔

اس نے دوسروں کی حالت سے اپنی حالت کا مقابلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی ہی نظر میں ان قابل تقلید مردوں اور عورتوں کے بالمقابل سماج کی قاتل ثابت ہوئی۔ اس وقت اس کے دل کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرے اور اپنا کالا منہ کسی کو نہ دکھائے۔ اس نے اپنے گناہوں کے لئے ایشور سے معافی مانگی۔

(۹)

شانتا رات دن کام کیا کرتی۔ صبح سب سے پہلے اٹھتی اور رات کو سب کے بعد سوتی۔ جب تمام عالم نیند کی آغوش میں محو خواب ہوتا تو وہ گھر کا کام کاج کیا کرتی۔ شانتا نے اپنی جیٹھانی سے کہا۔ بھابی میں آٹا گھر ہی میں پیس لیا کروں گی۔ باہر پسائی دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

"تم کیا کرو گی، تم تو مجھے کچھ کرنے ہی نہیں دیتیں۔ تمہاری ہی وجہ سے میں روز بروز کاہل ہوتی جا رہی ہوں۔ اس پر تم موہن کے یہاں بھی کام کر آتی ہو۔ تمہیں اتنا کام نہ کرنا چاہیئے۔"

"آپ خاموش رہا کیجیے۔ میں کوئی چھوٹی موٹی ٹھنوڑی ہی ہوں جو ذرا سا کام کرنے میں مر جاؤں گی۔"

"شانتا سچ مچ تم نے مجھے کاہل بنا دیا اور روز بروز بناتی جا رہی ہو۔ آخر میری کیسے گذریگی؟"

"آپ مجھ سے بڑی بھی تو ہیں۔ کیا ہمیشہ کام کرتی چلی جائینگی۔ میں تو موجود ہی ہوں، آپ کو اس کی کیا فکر کیسے گذرے گی۔"

"تم کیوں اسقدر کام کرتی ہو۔ میں ڈرتی ہوں کہ کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ۔"

"بیمار کیوں پڑ جاؤں گی؟ میرا تو دل چاہتا ہے آپ کے پاؤں دھو کر پیوں۔ میری قسمت بڑی اچھی تھی جو آپ لوگ مل گئے۔

اب مجھے اور کیا چاہیئے؟"۔

"ہم کو کیوں ہر وقت شرمندہ کرتی ہو۔ میں نے تمہارے لئے کیا کیا ہے۔ بلکہ تم نے ہی مجھے خرید لیا ہے۔"

شانتا دونوں ہاتھوں سے بھابی کا منہ بند کرتی ہوئی بولی۔

"کیوں مجھ ذلیل کی تعریفوں کے پل باندھتی ہیں۔ میں آپ کی خادمہ بننے کے قابل بھی تو نہیں، یہ تو میں اپنے پہلے جنم کے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہوں۔"

بھابی پیار سے اُسے گلے لگا کر بولی: "تو میری منہ بولی بیٹی ہے۔"

شانتا بھابی کے سینے پر سر رکھ کر روتی ہوئی بولی: "آج سے مجھے اپنی بیٹی ہی سمجھئے گا۔"

بھابی نے خوش ہو کر کہا: میں تو تجھے بیٹی ہی سمجھتی تھی پگلی۔

باہر سے منشی جی نے آ کر کہا۔ اچھا اب شانتا بہو سے بیٹی ہو گئی ہے۔

شانتا اپنی شرم کو چھپانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔ جی بہو سے بیٹی بننے میں مجھے زیادہ آرام ہے۔

منشی جی ہنس کر رو دیئے۔

(۱۰)

ایک روز منشی جی موہن کے پاس جا کر کہنے لگے۔ موہن میں تمہیں اپنے یہاں رہنے کو کہنے آیا ہوں۔

موہن چچا کے پیروں سے گر کر بولا۔ "میری تو پہلے ہی سے یہی خواہش تھی کہ سب لوگ ایک ہی جگہ رہیں، لیکن شرم کی وجہ سے میں کہہ نہ سکتا تھا، میں بالکل تیار ہوں۔"

اسی روز سے سب لوگ ایک ہی جگہ رہنے لگے۔ اب بھی گاؤں میں شانتا کا گھر گھر تذکرہ ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کے سامنے وہ بطور نمونہ پیش کیجاتی تھی۔

اب شانتا اپنے لئے نہیں بلکہ سب کی خدمت کیلئے تھی پہلے اس شانتا کی صورت جو سونے چاندی اور قیمتی کپڑوں میں اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اب رات دن کی محنت مشقت سے اس کا چہرہ کندن کی طرح دمکتا رہتا تھا۔ وہ اپنے کو سب کی خادمہ سمجھ کر کام کیا کرتی تھی۔ مگر سب کے دل کی رانی تھی۔

شورانی زوجہ منشی پریم چند (مرحوم)

کیرکٹر کا اثر

کیرکٹر انسانی زندگی کی معراج اور اس کا نصب العین ہے۔ یہی اُس کی زینت ہے اور اسی سے اُس کا پایہ بلند ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جب کیرکٹر ضائع ہو جاتا ہے تو سب کچھ کھو جاتا ہے۔

ان چند سطور میں میں نے اپنی پوری کوشش کی ہے کہ آئے دن کے واقعات بیشمار تاریخی مثالوں اور مشاہیر کے سوانح حیات سے انفرادی کیرکٹر کی اہمیت پورے طور پر واضح کر دوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں۔ کہ ہر ایک دل و دماغ پر تاریخی واقعات اور بہترین اشخاص کی سوانح حیات کا گہرا اثر پڑتا ہے۔

جس طرح لگاتار محنت، ہمت اور استقلال سے کسب معاش کے بہت سے اعلےٰ ذرائع حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مسلسل دوڑ دُھوپ کے بعد انسانی زندگی کی معراج یعنی کیرکٹر کو بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ عمدہ کیرکٹر حاصل کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ ہم اپنی ذات میں سچائی، پاکیزگی، رحم، راستبازی، شجاعت، پاک دامنی اور نیکی کی حمیدہ صفات پیدا کریں۔

مارٹن لوتھر نے ایک بڑے مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کسی ملک کی خوشحالی کا انحصار اس کی دولت کے انباروں، محکم قلعوں یا فلک بوس عمارتوں پر نہیں بلکہ اس کے تربیت یافتہ شہریوں، قابل اور روشن دماغوں اور نیک کیرکٹر رکھنے والے لوگوں پر ہے۔

کیرکٹر دنیا کی وہ زبردست متحرک طاقت ہے۔ جو انسانی فطرت کو ایسے بلند ترین مقام پر لے جاتی ہے۔ جہاں اس کی ہستی دیگر عام افراد سے بالکل ممتاز نظر آتی ہے۔ راستباز، مستعد، اعلےٰ مقاصد اور بلند اصول رکھنے والے انسان زندگی کی ہر منزل پر ہر قوم، ملک اور ہر زمانے میں خراج تحسین حاصل کرتے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگیاں ہمارے لئے بہترین مشعل راہ ہیں اور اُن کی روشنی میں قدم اُٹھانا اور بڑھتے چلے جانا ہمارا فرض ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خداداد استعداد و قابلیت کے انسان ہمیشہ عوام سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں۔ کہ زبردست کیرکٹر کے حامی ہر چھوٹے بڑے، بچے اور بوڑھے کے دل و دماغ کو اپنی طرف اس طرح کھینچ لیتے ہیں۔ جیسے مقناطیس لوہے کو۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اکثر صورتوں میں اُن کا سر اپنے سامنے جُھکا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلا شخص دماغی قوت کا کرشمہ ہے اور دوسرا روحانی طاقت کا مجسمہ۔ پہلے کا تعلق دماغ سے ہے اور دوسرے کا دل سے۔ جہاں ایک کی تعریف کی جاتی ہے تو دوسرے کی پیروی۔ لیکن آخری فتح ہمیشہ دلی طاقت کے ہاتھ رہی ہے۔

یہ درست ہے کہ ہر بڑا آدمی مکروہات سے بمشکل محفوظ رہ سکتا ہے لیکن ہر شخص اتنا ضرور کر سکتا ہے کہ اپنے فرائض کو ایمانداری، مستعدی اور اپنی پوری قابلیت سے انجام دے۔ قدرت کے عطیات کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھائے۔ اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے انتہائی جدوجہد کرے۔ اور معمولی کاموں میں بھی سچا، منصف مزاج، ایماندار اور وفاشعار رہنے کی سعی کرے۔

ممکن ہے بادی النظر میں معمولی فرائض کی انجام دہی کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی ہو۔ لیکن اعلےٰ کیرکٹر اور زندگی کا بلند ترین نصب العین اسی میں مضمر ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ معمولی فرائض کے مجموعے ہی کا نام زندگی ہے۔ کسی شخص کا کیرکٹر اس کے بحیثیت مصنف، مقرر یا مدبر ہونے سے نہیں پہچانا جاتا۔ بلکہ اُن اطوار سے دیکھا جاتا ہے۔ جن کی رُو سے وہ اپنے ماتحتوں، دوستوں اور رشتہ داروں سے پیش آتا ہے۔ اُن سے معاملہ کرتا ہے اور اپنے معمولی فرائض کی ہر تفصیل پر گہری نظر ڈالتا ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص دولت، جائیداد، علمیت، قابلیت اور جسمانی طاقت سے بے بہرہ ہو۔ لیکن اس پر بھی پاکیزہ رُوح اور طاقتور دل کا مالک ہو۔ اپنے فرائض مستعدی اور ایمانداری سے انجام دیتا ہو۔ زبان کا سچا اور اصول کا پابند ہو۔

ہر وہ شخص جو اپنے فرائض کی انجام دہی میں دل و جان سے کوشش کرتا ہے۔ قدرت کے اُس منشار کو پورا کرتا ہے۔ جس کے لئے اُسے پیدا کیا گیا ہے۔ اور اس طرح اپنے اندر صحیح انسانی کیرکٹر کی عظیم الشان عمارت کی بنا ڈالتا ہے۔

دماغی نشو و نما اور پاکیزگی و اعلےٰ کیرکٹر میں یقینی طور پر کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ جارج ہربرٹ کا قول ہے کہ نئی زندگی کا ایک لمحہ عالمانہ زندگی

کے ایک گھنٹے سے بہتر ہے۔ اس لئے نہیں کہ علم کی تحقیر مقصود ہے۔ بلکہ اس لئے کہ نیکی سے اس کا تعلق ہونا لازمی و لابدی ہے۔ لعض اوقات بہترین دماغوں کو ذلیل ترین اخلاقی جرائم میں گرفتار پایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص آرٹ، لٹریچر اور سائنس میں فاضل اجل ہے۔ لیکن ایمانداری۔ نیکی۔ سچائی اور فرض شناسی کی ترازو میں اس کا پلہ ایک معمولی دیہاتی کے برابر بھی نہیں جھکتا۔

پرتھینز نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ آپ اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ عالم لوگوں کی عزت کرنی چاہیئے۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہے دیتا ہوں۔ کہ آپ اس بات کو نہ بھول جائیے کہ ممکن ہے ایک شخص وسیع النظری، فراخدلی، عمدگیٔ اطوار، زمانہ شناسی قوت عمل، ایمانداری، مروت اور سچائی سے بے بہرہ ہو اور اس پر بھی وہ عالم بے بدل ہو۔

سر والٹر سکاٹ کی تقریر کے دوران میں ایک شخص نے کہا کہ ادبی قابلیت کا حاصل کرنا زندگی کی معراج ہے۔ اور اسے تمام دوسری خوبیوں سے بالاتر سمجھنا چاہیئے۔

اس پر والٹر سکاٹ نے کہا۔ خدا کی پناہ۔ اگر زندگی کا صحیح معیار یہی قرار دے دیا جائے۔ تو یہ دنیا کس قدر بے مایہ اور بے وقوف رہ جاتی ہے میں نے کافی سے زیادہ مطالعہ کیا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں اور تربیت یافتہ دماغوں سے گفتگو کی ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے غریب لوگوں، ان پڑھ عورتوں اور مردوں سے اس وقت جبکہ وہ مشکلات اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کر رہے تھے۔ ان سے کہیں زیادہ پاکیزہ اور بلند کلمات سُنے ہیں۔

کیرکٹر کی بلندی اور دولت میں علمیت سے بھی کہیں کم تعلق ہے اس لئے کہ یہ اُسے اعلےٰ وارفع بنانے کی بجائے تباہ و برباد کرتی ہے۔ دولت کا ایسے ہاتھوں میں ہونا جن کے ارادے پست، ہمتیں شکستہ اور جذبات متلاطم ہوں۔ اُن کے لئے باعث ہلاکت ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ایسے جال میں پھنس جائیں۔ جس سے چھٹکارا محال ہو اور ایسے گڑھے میں جا گریں جہاں ان کی زندگی نہ صرف اُن کے لئے وبال ہو بلکہ ملک و قوم کے لئے باعثِ ننگ و عار ہو۔

ایک ایسا شخص جو دولت سے محروم ہے لیکن محنت، کفایت شعاری اور راستبازی کے خزانوں کا مالک ہے بلند ترین انسانوں کی صف میں جگہ لے سکتا ہے۔ لیکن وہ شخص جو دنیاوی وجاہت کا علمبردار اور سونے چاندی کے انبار لئے ہوئے ہے۔ ممکن ہے اس صف کے ادنےٰ ترین مقام پر بھی کھڑا نہ ہو سکے۔

(Burns) برنز کے والد نے اُسے نصیحت کی کہ بیٹا خواہ تمہاری جیب میں ایک فاردنگ تک نہ ہو اپنا کام بلند ہمتی سے کرتے رہنا۔ کیونکہ انسانی زندگی ایمانداری اور بلند ہمتی کے بغیر قابل قدر نہیں ہے۔

کون نہیں جانتا کہ رسول اکرم نے قریش کے زر و مال کو ٹھکرا دیا۔ مہاتما بدھ نے شاہی خزانوں پر لات مار دی۔ رام چندر نے عیش و عشرت پر تھوک دیا۔ اور دنیا کے سامنے اپنی عدیم المثال زندگی کی شمعیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روشن کر گئے۔

پروٹسٹنٹ مذہب کا بانی لوتھر خراو اور گھڑیوں پر گذارہ کرتا رہا۔ مسلمانوں کے رہنما نے بکریاں اور اُونٹ چرا کر اپنی روزی کمائی۔ مہاتما بدھ اور گورو نانک نے فقیروں اور سادھوؤں کی زندگی اختیار کی۔ لیکن اس پر بھی شہنشاہوں نے اُن کی پیروی کو فخر سمجھا۔ اور ان کی قدمبوسی کو سعادت جانا۔ اور جب وہ اس جہانِ فانی سے اوجھل ہو گئے۔ تو لوگ لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ان کے نقش قدم پر چلتے رہے اور چلتے رہینگے۔

کیرکٹر دنیا کی بہترین دولت اور اعلےٰ ترین خوشحالی ہے ایک موقع پر سر بنجمن رڈیارڈ نے کہا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص امیر یا بڑا ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ عقلمند ہو لیکن یہ لازمی ہے کہ ہر شخص ایماندار ہو۔

اچھے اصولوں کے بغیر انسان کی زندگی ایک ایسے جہاز کی مانند ہے جو کمپاس کے بغیر سر ہوا کے رُخ کے ساتھ ادھر اُدھر ہچکولے کھا رہا ہو۔ زندگی کے معاملات میں خواہ وہ کسی قسم کے ہوں سمجھ۔ دماغ اور استعداد علمی اس قدر اثر انداز نہیں ہوتی۔ جس قدر ضبط نفس، صبر، قوت فیصلہ اور دلی طاقت۔ یا یہ کہ دماغ وہ کام نہیں کرتا جو کیرکٹر انجام دیتا ہے۔

سچائی کیرکٹر کی جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب کے بانی نے سچ بولنے اور جھوٹ سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے پیغمبر اسلام نے جب ایک پہاڑی پر چڑھ کر یہ کہا۔ کہ اے لوگو اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے ایک بڑا لشکر ہے تو کیا تم یقین کر لوگے۔ تو سب نے کہا کہ ہاں اس لئے کہ ہم نے آپ کو چالیس برس کی زندگی میں کبھی جھوٹ بولتے نہیں سُنا۔

ممکن ہے ابتدا میں غربت اور مصیبتیں اچھے لوگوں کے بہترین خصائل کو چُھپا رکھیں۔ اور لوگ اُنہیں کچھ سے کچھ سمجھتے رہیں۔ لیکن اگر وہ صبر اور استقلال کے ساتھ اپنے ارادوں پر قائم رہے۔ تو یقیناً لوگ آخر کار

اُن کی عزت کرینگے۔ اور اُن پر بھروسہ کرینگے۔ مصطفٰے کمال کی زندگی اس امر کا بین ثبوت اور جیتی جاگتی مثال ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ شخص جسے ڈاکو۔ دغاباز اور باغی کے نام سے خطاب کیا جاتا تھا اپنی اولوالعزمی مستقل مزاجی اور نیک نیتی کے سبب اپنے ملک کا سب سے بڑا حامی اور نجات دہندہ کہلایا۔ اس کی شجاعت اور عزمِ راسخ کا سکہ بڑی بڑی سلطنتوں کے دل پر بیٹھ گیا۔ اور اس کے کیرکٹر کی زبردست طاقت کے سامنے ہر چھوٹے بڑے کا سر جھک گیا۔ دنیا کی تاریخ اس قسم کی بیشمار نادر مثالوں سے مزین ہے۔ اور اس کا ایک ایک لفظ شاہد ہے۔ کہ فتح کا سہرا ہمیشہ کیرکٹر کے سر رہا۔

کہا جاتا ہے۔ کہ اگر شریڈان میں کیرکٹر کی قابل اعتماد قوت ہوتی۔ تو ممکن تھا کہ وہ شخص دنیا پر حکومت کر جاتا۔ لیکن کیرکٹر کی کمی سے اُس کی دوسری خوبیاں بھی کوئی زیادہ اچھا کام نہ دے سکیں۔

ایک مرتبہ ویلینی اپنی تنخواہ کے لئے اس پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ اس نے تلخی سے کہا۔ تم اپنی حیثیت سے بڑھ کر بول رہے ہو۔ اس پر ویلینی نے اُسی تُندی سے جواب دیا۔ نہیں جناب میں اپنا اور آپ کا فرق خوب سمجھتا ہوں۔ پیدائش، والدین اور تعلیم کے لحاظ سے آپ مجھ پر فوقیت رکھتے ہیں۔ لیکن زندگی چلن اور برتاؤ میں آپ سے بڑھ کر ہوں۔

اس کے مقابلے برک جو اسی کا ہم وطن ہے نہایت زبردست کیرکٹر کا مالک تھا اور اُس نے چھوٹی عمر میں ہی پارلیمنٹ میں جگہ حاصل کر لی تھی۔

جس طرح ایک چھوٹے سے چھوٹے بال کا بھی سایہ پڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہر چھوٹے سے چھوٹا کام کیرکٹر پر اثر انداز ہوتا ہے کسی معمولی سے معمولی خراب عادت کو اپنے اُوپر قابو نہ پانے دو۔ ورنہ یقین رکھو کہ وہی عادت ایک نہ ایک دن آپ پر حکومت کریگی۔ سگرٹ نوشی کی عادت معمولی سمجھ کر اختیار کر جاتی ہے لیکن اس کی طاقت کا اثر اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان کوشش کے باوجود اس سے رہائی نہیں پا سکتا۔ یہی حال دوسری معمولی عادات کا ہے۔

یہ یقینی امر ہے کہ ہر کام ہر خیال اور ہر حس ہماری عادت، مزاج اور تربیت پر اثر ڈالتی ہے اور اس طرح کیرکٹر کی عمارت میں اچھی یا بُری اینٹ ہر وقت لگتی رہتی ہے۔ رسکن کا قول ہے کہ میری زندگی کی کوئی بیوقوفی یا قصور ایسا نہیں جو میرے مقابلے میں آ کر میری خوشی کو دُور اور میری سمجھ و دور اندیشی کو کافور نہ کر دیتا ہو لیکن اس کے برعکس گذشتہ زندگی کی ہر جدوجہد، سچائی کی ہر کرن اور نیکی کا ہر ذرہ میری مدد کرنے کے لئے تیار اور اس آرٹ پر قابو پانے کے لئے ہر وقت میرا معاون و مددگار رہتا ہے۔

عمل ورد عمل (action اور Reaction) کا طبعی اصول کیرکٹر کے معاملے میں بھی بالکل صحیح اُترتا ہے۔ اچھے اعمال اپنے عامل پر بار بار اثر ڈالتے ہیں۔ اور یہی حال بُرے اعمال کا ہے۔ سینٹ برنارڈ نے کہا کہ سوائے میرے اور کوئی مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہر وہ تکلیف جو میں برداشت کرتا ہوں۔ خود اپنے ساتھ لئے پھرتا ہوں۔ اور سوائے اس کے کہ اپنے قصور کا بدلہ پاؤں۔ درحقیقت میں کبھی کوئی تکلیف نہیں اُٹھاتا۔

بہترین کیرکٹر پیدا کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ متواتر جدوجہد کی جائے۔ اپنے اعمال پر تنقید کی جائے۔ اور اپنے آپ کو ضبط اور قابو میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ممکن ہے ان حالات میں ڈگمگانے ٹھوکریں کھانے، شکست کا مُنہ دیکھنے، مشکلات کا سامنا کرنے اور خواہشات پر قابو پانے کی شدید تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن اگر روح میں طاقت اور دل میں راستبازی ہے تو ہر شخص کو یقین کامل رکھنا چاہیئے کہ فتح کا سہرا اسی کے سر ہے۔

دنیا کی بڑی بڑی مثالوں کی روشنی و رہنمائی میں ہر شخص کے لئے نہ صرف ضروری بلکہ فرض ہے کہ وہ کیرکٹر کے بلند ترین معیار کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کا نصب العین روحانیت ہو نہ کہ دولت، سچائی ہو نہ کہ دنیاوی وجاہت۔ نیکی ہو نہ کہ دماغی قوت، راستبازی اور ایمانداری ہو نہ کہ طاقت اور رسوخ۔ (باقی آئندہ)

ایم عنایت بی۔ اے۔

رُباعی

ہے بادۂ ناب کا سا عالم دنیا
بالکل ہے سراب کا سا عالم دنیا
ہر چیز نظر آتے ہی چُھپ جاتی ہے
گویا کہ ہے خواب کا سا عالم دنیا

دیس راج شرما بی سی ڈی (فرنچ)

بھگوڑا

ہم سرنگیر کلب گھر کے چبوترے پر چنار کے درختوں کے تلے محوِ استراحت تھے۔ پاس ہی دریائے جہلم محوِ خرام تھا۔ کشتیاں دریا کے دونوں کناروں پر بندھی تھیں۔ شکاری لوگ ہمارے پاس سے گذر رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر کشمیر کی برف پوش شکارگاہیں نیلگوں آسمان میں سرکشیدہ نظر آرہی تھیں نظارہ فردوس نگاہ تھا۔

ہندوستان کی میدانی کشمکش کی زندگی کے مقابلے میں یہ ماحول حد درجہ پُرامن تھا۔ ہم ایامِ رخصت بڑے مزے سے بسر کر رہے تھے۔ مختلف النوع موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی۔

منٹگمری نے کہا۔" ماحول اور شخصیت کا بھی کیا عجیب تعلق ہے جب کبھی میں یہاں آتا ہوں تو بے اختیار ٹامی یاد آجاتا ہے۔ اس کی غریب الوطنی اور بےکسی کی موت واقعی المناک ہے۔ ہے تو حماقت لیکن وقت آنے پر میں کسی مہذب سرزمین میں احباب کے درمیان مرنا پسند کرونگا۔"

میں نے دماغ پر زور ڈال کر کہا۔" ٹامی؟ ہاں ایک ٹامی تھا تو۔ مدت گزری میں نے اِسے کرسمس کے موقعہ پر لاہور میں دیکھا تھا۔ وہی نا ٹھنگنا سا۔ گٹھے ہوئے جسم کا ہنس مکھ سا آدمی؟"

"ہاں ہاں وہی" منٹگمری نے کہا۔" واقعی بڑا ہنس مکھ تھا۔ اگر آج وہ یہاں ہوتا تو عجیب عجیب قصے سناتا۔ اس کا طرزِ بیان غضب کا دلکش ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۱۴ء کے موسم گرما میں وہ لداخ کی سرحد پر شکار کھیلنے کے لئے گیا تھا۔ اور وہیں مرگیا۔ اس کی موت کا سبب کسی کو معلوم نہیں اور نہ اس کی لاش دستیاب ہوئی۔ اس کے ہمراہی شکاری کا بیان ہے۔ کہ ایک صبح جب کہ پارٹی کوہ ننکن کے نزدیک خیمہ زن تھی وہ اچانک روپوش ہوگیا۔ بہتیری تلاش کی گئی۔ مگر بے سود۔ آخر یہ فرض کر لیا گیا۔ کہ وہ کسی کھڈ میں گر کر جاں بحق ہوگیا ہوگا۔"

اب جانسن نزدیک کھسک آیا اور کہنے لگا۔" میں تمہیں ٹامی کے متعلق نہایت عجیب خبر سنانے لگا ہوں۔ کیونکہ اب مجھے یارائے اخفا نہیں مگر اقرار کرو۔ کہ یہ راز فاش نہ کروگے۔ اقرار کرو۔"

ہم نے اقرار کیا اور ہمہ تن گوش ہوگئے۔ اس نے بیان کیا۔

"ٹامی گذشتہ [illegible]ت ہوا ہے۔ بہرحال وہ آج سے تین سال پہلے جیتا جاگتا تھا۔ کیونکہ میں نے بچشم خود اُسے دیکھا اور اُس سے باتیں کیں۔"

منٹگمری نے فرطِ استعجاب سے کہا۔" ہیں گزشتہ سال؟ کہیں بھنگ تو نہیں پی گئے۔ ۱۹۲۰ء میں مجھے اس کے لواحقین کے پاس ٹھیرنے کا اتفاق ہوا۔ اور اُنہوں نے مجھے وہ لوحِ مزار بھی دکھائی۔ جو اُنہوں نے گاؤں کے گرجے میں اُس کی یاد میں ٹکائی تھی۔"

"میں کیسے مان لوں۔ بخدا میں نے اُسے تین سال ہوئے دیکھا تھا۔ میں تمہیں سارا قصہ سناتا ہوں۔"

تین سال کا ذکر ہے میں رخصت لے کر لہ اور اس سے پرے شکار کی غرض سے گیا۔ ایک دفعہ پہلے بھی شاہراہ عام سے وہاں پہنچا آیا تھا۔ لہٰذا اس دفعہ نیا راستہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ میں سرو وادی میں سے ہوتا ہوا اس سڑک پر سے گیا۔ جو ننکن کے دامن کے ساتھ ساتھ گذرتی ہوئی دودرون کی راہ لہ میں پہنچ جاتی ہے۔ راہ بہت دشوار گذار اور برف سے مسدود تھی۔ درآس سے میں مشرق کے رُخ ہولیا۔ تمام سفر میں پہلی دفعہ مجھے ایک بلاس نامی تبتی آدمی نظر آیا۔ وہ ایک زندہ دل انسان تھا۔ اُس کی آنکھیں بادام اور رخسار پھولوں سے مشابہ تھے۔ وہ نہایت گندہ تھا۔ مگر اُس آب و ہوا میں نہانے کی ہمت کس کو پڑتی ہے وہ ہندوستانی زبان نہ جانتا تھا۔ لیکن میرا شکاری اس کی زبان سے واقف تھا۔ وہ بطور ترجمان نہایت مفید ثابت ہوا۔ تبتی نے کہا۔" میرا گاؤں رندہ صرف دو پڑاؤ آگے ایک خانقاہ کے متصل ہے۔ لاما آپ کو وہ جگہ دکھانے میں کوئی اعتراض نہ کریگا۔ بشرطیکہ آپ اسے انعام کا لالچ دیں۔"

دو دن بعد میں رندہ پہنچ گیا۔ علاقہ بنجر اور ویران تھا۔ صرف ایک آدمی ہمیں سڑک پر ملا۔ اور سوائے اس گاؤں کے آبادی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا لبِ دریا میں نے اپنا خیمہ نصب کرایا۔ خانقاہ ایک وسیع سفید عمارت پر مشتمل ایک بلند پہاڑی پر واقع تھی۔ میرے پہنچتے ہی کئی لاما لمبے سرخ چغے اور عجیب وضع کی ٹوپیاں پہنے میرے استقبال کے لئے پہاڑی سے اُترے۔ بظاہر وہ مجھے دیکھ کر خوش تھے۔ اور کسی نامعلوم زبان میں جلدی جلدی گفتگو کرتے تھے۔ ان کے گندے مگر متبسم چہرے بہت دلفریب تھے۔ میرے شکاری

نے پھر ترجمان کا فرض ادا کیا۔ اور بتایا کہ لاما متمنی تھے کہ میں اُن کی خانقاہ تک چلوں۔ لہٰذا میں نے کل صبح وہاں جانے کا وعدہ کیا۔

رات بھر سردی کی وجہ سے میں بالکل سو نہ سکا۔ رُکدہ سطح سمندر سے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ حالانکہ میں نے دو اُونی کوٹ اور موزے پہن رکھے تھے۔ پھر بھی میرا جسم ٹھٹھر رہا تھا۔ نیچے دریا اپنی موجوں سے اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ اور خیمے کے باہر ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی جب جون میں یہ حال تھا تو خدا معلوم وہ لاما موسم سرما وہاں کیسے بسر کرتے ہونگے۔ مجھے بتایا گیا کہ بعض اوقات بہتا دریا بھی یخ بستہ ہو جایا کرتا ہے

دوسری صبح کو ہم پیچدار پگ ڈنڈیوں پر سے گذرتے ہوئے پہاڑی پر چڑھے۔ دروازے پر بہت سے لاما پیشوائی کو آئے ہوئے تھے۔ اور مجھے تنگ دروازہ کے ذریعہ ایک کشادہ صحن میں لے گئے۔ جہاں گورو لاما نے میرا خیر مقدم کیا۔ یہ شخص معمر تھا چہرے پر جھُریاں اور بال سفید تھے۔

خانقاہ میں بیشتر مرد تھے اور خال خال عورتیں۔ ہر ایک میری طرف متعجب نگاہوں سے دیکھتا۔ گورو لاما آگے آگے ہو لیا۔ اور صحن عبور کر کے ایک زینہ کے ذریعے عبادت گاہ میں پہنچے۔ اندر بہت سے لاما دو رویہ بیٹھے مصروفِ عبادت تھے۔ اور "ادم منے پدمے ہم" کا وظیفہ کر رہے تھے

عبادت گاہ میں زیادہ روشنی نہ تھی۔ صرف دو تین چراغ اور اُن کی روشنی بھی مدھم، بہت مدھم۔ باہر سے آکر پہلے تو مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ مگر رفتہ رفتہ میری آنکھیں دھندلی روشنی سے مانوس ہو گئیں۔ لاماؤں کی قطاروں پر نظر دوڑانے سے مجھے ان میں ایک بالکل نرالا شخص دکھائی دیا۔ کسی نامعلوم وجہ سے وہ میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کی صورت آشنا سی معلوم ہوئی اور میں اُسے بغور دیکھنے لگا۔ اس نے بھی مجھ پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر منہ پھیر لیا۔

مجھے پُر اسرار اور عالیشان عبادت گاہ دکھائی گئی۔ چھت میں چینی طرز کے نقش و نگار دروازوں میں ریشمی پردے آویزاں۔ کمرے کے چاروں طرف بدھ اور دیگر خدا رسیدہ لاماؤں کے مجسمے تھے۔ اور دیواروں پر دیوتاؤں اور راکھشسوں کی تصاویر سے گل کاری ہوئی ہوئی تھی۔ مجسموں میں سے کئی ایک بیش بہا تھے۔ میں ترجمان کی وساطت سے لاما گورو سے گفتگو ابھی کر رہا تھا۔ کہ عبادت ختم ہو گئی اور پجاریوں کی قطاریں باہر نکلنا شروع ہوئیں ان میں سے میں نے وہی شخص دیکھا۔ جس سے مجھے خاص دلچسپی سی ہو گئی تھی۔ اُس نے بھی میری طرف دزدیدہ نظر سے دیکھا اور اس کے لبوں پہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے اِسے تقدوآنے سے پہلے بھی کہیں ضرور دیکھا ہے۔ میں اُس کے خدوخال اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ مگر جو کچھ بھی دیکھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دوسروں سے بالکل مختلف تھا۔ حافظے پر زور دینے سے بھی جب کچھ یاد نہ آیا۔ تو میں نے شکاری سے کہا "گورو لاما سے پوچھو کہ وہ آدمی کہاں سے آیا ہے۔ وہ دوسروں سے بالکل نرالا ہے۔"

"کون سا؟" لاما نے بے پروائی سے کہا۔

وہ آدمی اب دروازہ پر پہنچ چکا تھا۔ اور میرا دل گواہی دے رہا تھا۔ کہ اگر وہ ایک دفعہ دروازہ سے نکل گیا۔ تو میں پھر اسے کبھی نہ دیکھ سکونگا تجسس کے غلبہ کی وجہ سے سب کو چھوڑ کر میں اُس کی سمت بھاگا۔ اور اُسے دروازہ پر جا لیا۔ وہ پیچھے مڑا۔ ایک دو لمحے ہم خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر میں نے فوراً نامی کو شناخت کر لیا۔ اس کا چہرہ نسبتاً دبلا اور ملاحت لئے ہوئے تھا۔ تپش آفتاب اور سرد ہوائیں اس کے چہرے پر اثر انداز تھیں۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں کے گرد حلقے نمودار تھے۔ مگر لاریب تھا وہ نامی ہی۔ اس کی شکل و شباہت میں یہ تغیر دیکھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔

اُس نے دیوار کا سہارا لے کر دبی آواز میں کہا۔ "تو تم نے مجھے پہچان لیا ہے، سالہا سال سے مجھے یہی کھٹکا لگا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک دن ایسا ہو کر رہیگا۔"

وہ دھیمی آواز میں رُک رُک کر بولتا تھا۔ گویا الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مادری زبان کو صحیح ادا کرنے کے لئے طبیعت پر زور دے رہا ہے۔ اُس کی آواز اور نگاہوں میں یاس ہی یاس تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "نامی تم یہاں کیا کر رہے ہو ہم تو تمہیں مردہ تصور کرتے تھے۔"

اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میرے ساتھ جلدی جلدی چلے آؤ۔"

میں اُس کے پیچھے ہو لیا۔ اپنے کمرے میں جا کر وہ فرش پر گر پڑا۔ اور اس طرح لرزنے لگا۔ گویا اُسے بخار ہے۔ لرزے کا بخار۔ کہنے لگا۔ "فرش ہی پر بیٹھ جاؤ اور میں تمہیں ساری سرگزشت سناتا ہوں۔ مگر خدا شاہد ہے۔ یہ کام بہت مشکل ہے۔ شاید تم نہ سمجھ سکو۔"

میں بیٹھ گیا اور ہمہ تن گوش منتظر رہا۔ داستان کا بیان کرنا واقعی اس کے لئے کٹھن معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے میں نے اُسے سنبھلنے کے لئے وقت دیا۔

کچھ دیر کے بعد اُس نے یوں بیان شروع کیا۔

"تمہیں یاد ہوگا کہ میں ۱۹۱۴ء کے موسم گرما میں انبالہ سے شکار کھیلنے یہاں آیا تھا۔ مجھے کوئی خبر نہیں اب کونسا سال ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ یہ صدیوں کی بات ہے۔ یہاں دنوں۔ مہینوں اور سالوں کا کوئی شمار نہیں۔ اور نہ وقت کا احساس ہے۔ مجھے خوب یاد ہے اک دن میں نے خانقاہ کے نزدیک ڈیرہ ڈالا۔ پاس ہی ایک اور خیمہ نصب تھا۔ جس میں ایک اور انگریز بیمار پڑا تھا۔ اسی شام پنسل سے لکھا ہوا ایک رقعہ مجھے ملا۔ انگریز نے مجھے اپنے ڈیرے پر بلایا تھا۔ تاکہ مجھ سے ایک راز کی بات کہہ سکے۔ چنانچہ میں وہاں گیا۔ وہ مخدوش حالت میں تھا۔ میں اُس کا چہرہ مرتے دم تک نہ بھولوں گا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ کہ اسے سرینگر سے بذریعہ ہرکارہ پلٹن کی طرف سے پیغام وصول ہوا ہے۔ کہ جرمنی سے جنگ چھڑ گئی ہے اور اسے فوراً حاضر ہو جانے کا حکم ہوا ہے۔ کسی نہ کسی طرح اسے سرینگر پہنچنا تھا۔ مگر اتنا لمبا سفر طے کرنے کے وہ قابل نہ تھا۔ بیمار تھا۔ بہت زیادہ۔ اسے معلوم تھا کہ میں بھی فوجی افسر ہوں اور غالباً مجھے بھی واپس جانا ہوگا۔"

یہاں ٹامی رُک گیا۔ کچھ دیر کامل سکوت رہا۔ اُس نے رحم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا "اگر تمہیں کہانی بیان کرنے سے کوئی ذہنی تکلیف ہوتی ہے تو جانے دو۔ میں ایک دو دن یہیں ہوں۔ پھر سہی"

"نہیں نہیں مجھے سنا ہی لینے دو۔ میں کسی نہ کسی طرح ختم کر لُونگا۔ میری رُوح پر ایک قسم کا بوجھ ہے اور میں نارِ جہنّم میں پُھنک رہا ہُوں۔"

اور سنبھل کر کہنے لگا۔ "میں لڑکپن سے بُزدل ہوں۔ تعلیمی زندگی میں سکول کے تمام طلبا پر کھیلوں کے لحاظ سے مجھے خاص امتیاز حاصل تھا۔ مگر پھر بھی کھیل کے آغاز میں ہمیشہ میرا دل کانپ جاتا۔ لیکن چونکہ کھلاڑی اچھا تھا میری بُزدلی پر پردہ پڑا رہا۔ چونکہ میں بڑھ بڑھ کے باتیں بنایا کرتا۔ اس لئے میرے ہم چشم مجھے دلاور بھی سمجھتے۔ آہ دنیا لوگوں کے متعلق کیسا غلط اندازہ لگاتی ہے۔ چہرہ دیکھ کر لوگ فوراً رائے قائم کر لیتے ہیں اور باتوں میں آجاتے ہیں میں بُزدل تھا۔ لیکن یہ نہ چاہتا تھا کہ لوگ اس بات کو تاڑ جائیں۔ گوناگوں خطرات کے ڈر سے میں فوج میں ملازمت کرنا نہ چاہتا تھا۔ مگر چونکہ گھر کے سب آدمی فوجی ملازم تھے۔ مجھے بھی یہی ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ اس میں لیت و لعل کی گنجائش نہ تھی۔"

یہاں ٹامی پھر رُک گیا اور میرے چہرے پر ایک استفہامیہ نگاہ ڈالی گویا وہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ مجھے اس سے ہمدردی ہے یا نفرت۔ اس کی رگیں تن گئیں۔ اور وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہو گیا۔ میں بھی اُس کے سنبھلنے کا منتظر رہا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے سلسلہ کلام یوں جاری کیا۔

"جب میں نے جنگ عظیم چھڑ جانے کی خبر سُنی۔ سمجھ گیا۔ اب خیر نہیں۔ میری حالت غیر ہو گئی مگر بیمار انگریز نے اِدھر خیال نہ کیا۔ اس کے تمام تر خیالات کسی نہ کسی طرح پلٹن میں واپس پہنچ جانے پر مجتمع تھے۔ میں نے اُسے کہا "مجھے تو جنگ کی کوئی خبر موصول نہیں ہُوئی۔ یونہی کسی نے افواہ اُڑا دی ہو گی۔ میں زرِ کثیر خرچ کر کے یہاں تک آیا ہُوں۔ جب تک مجھے اپنی پلٹن سے خبر نہ آئے میں واپس نہیں جانے کا۔ غرض میں نے ہر اک عذر پیش کیا۔ مجھے خواہ مخواہ ڈھیٹ بننا پڑا۔ کیونکہ گولہ باری کے خیال ہی سے میرے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ میں سمجھا۔ جتنی دیر ہو گی اتنا ہی میرے لئے سلامت رہنے کا زیادہ موقعہ ہے۔

اس انگریز نے مجھے عجیب نگاہ سے دیکھا اور پھر میری طرف سے مُنہ پھیر کر کہنے لگا۔ "میں بغیر آپ کی مدد کے بھی سرینگر پہنچ سکتا ہُوں۔ آپ کو میں نے ناحق زحمت دی۔ تشریف لے جائیے۔"

اگلی صبح وہ سرینگر روانہ ہو گیا۔ اور مجھے خبر مل چکی ہے۔ کہ وہ راہ میں جاں بحق ہو گیا۔ جب میں اپنے خیمے میں واپس آیا۔ تو خوف سے نیم پاگل سا تھا۔ بستر پر لیٹ کر اس خوف کے بھوت سے جنگ کرنے لگا۔ مگر بے سُود جوں جُوں دن چڑھتا گیا۔ میں جنگ کے خیال سے لرزہ براندام ہوتا گیا۔ اگلے دن میں نے وہیں مقام رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاکہ میری طبیعت کچھ سنبھل جائے کاش تم میری دلی کیفیت کا تصور کر سکتے۔ تم اوسط درجے کی دلیری کے مالک ہو۔ اس لئے سجدۂ شکرانہ بجا لاؤ۔"

وہ حقارت آمیز ہنسی ہنسا۔ اُس کی پیشانی عرق آلود تھی اور رگیں تنی ہُوئی۔

"میں اُس دن بالکل نہ سویا۔ اور تمام رات جنگ کا مہیب نظارہ میری آنکھوں کے سامنے رہا۔ پَو پھٹتے ہی میں نے بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر کہاں بھاگوں کس طرح بھاگوں۔ مجھے علم تھا کہ وہاں سے پندرہ میل آگے ایک خانقاہ ہے۔ ایک دفعہ وہاں پہنچ جاؤں۔ تو پھر محفوظ ہُوں۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ شکاری کو جگا کر کہا۔ کہ میں اکیلا ہی شکار کو جا رہا ہُوں شام سے پہلے میرا انتظار نہ کرنا اور سیدھا خانقاہ کا رُخ کیا۔ مسافت لمبی تھی مگر خوف نے میرے قدموں میں پر لگا دیئے تھے۔ میں محسوس کرنے لگا۔ کہ اب دنیا سے میرا تعلق منقطع ہونے کو ہے۔ اور آج سے ہی میں ہم وطنوں یا مہذب دنیا کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ گرتا پڑتا میں خانقاہ کے دروازے پر جھٹپٹے کے قریب پہنچا۔ کچھ لاماؤں نے جو ندی سے پانی لانے جا رہے تھے۔ مجھے زمین پر بیہوش پایا۔ کچھ دن تک میں زندگی اور موت کے درمیان معلق رہا۔ لاماؤں نے میری تیمارداری اور غور و پرداخت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔

ان کے طفیل مجھے دوبارہ وہ زندگی عطا ہوئی۔ جس سے مجھے اتنا پیار تھا۔ بستر پر پڑا میں اپنی بزدلی پر خود کو کوسا کرتا۔ بزدل کو دنیا میں زندہ رہنے کا کیا حق ہے۔ مگر خودکشی کی بھی تو ہمت نہ تھی۔ میں نے اسی خانقاہ میں بود و باش کا فیصلہ کر لیا۔ خوش قسمتی سے ایک لاما ہندوستانی سمجھ سکتا تھا۔ میں نے اُس سے استدعا کی کہ گورو لاما سے اس معاملے میں گفتگو کرے۔ گورو لاما نہایت شفیق انسان تھا۔ وہ بغیر تحقیق حالات کے مجھے وہاں رکھنے پر رضامند ہو گیا۔ اس دن سے میں یہیں ہوں۔ مجھے خیال تھا کہ کوئی مجھے شناخت نہ کر سکیگا۔ مگر تم نے مجھے پہچان لیا ہے"۔

جب ٹامی کی کہانی قریب الاختتام تھی۔ اُس کے الفاظ اُکھڑے اُکھڑے نکلتے تھے۔ اور اس کے چہرے پر مکمل یاس کے آثار ہویدا تھے۔ اس نے پرجوش نگاہ مجھ پر ڈالی۔ میں نے مشفقانہ انداز سے اُسے دلاسا دیا۔ گو حقیقتاً میں اس سے صد درجہ متنفر تھا۔

"یہ کہانی بیان کر دینے سے میرے دل کا ایک بھاری بوجھ اُتر گیا ہے۔ یہ راز میرے اندر نارِ جہنم دہکائے رہتا تھا۔ اچھا اب تم جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور بغیر اِک لفظ کہے باہر نکل آیا۔ میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ تیزی سے صحن عبور کر کے دروازے پر پہنچا۔ شکاری اور گورو لاما نے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کی مگر میرا جی اس وقت باتیں کرنے کو نہ چاہا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے جیب سے کچھ نقدی نکال کر گورو لاما کے ہاتھ میں دی۔ اور رخصت ہو گیا۔ خیمہ میں پہنچ کر میں نے حکم دیا کہ فوراً یہاں سے ڈیرہ اُٹھا لو۔ مجھے وہاں ضرورت سے ایک لمحہ بھی زیادہ ٹھیرنا ناگوار تھا۔ میں نے آخری بار ٹامی کو تب دیکھا تھا۔ مگر ابھی کہانی ختم نہیں ہوئی۔ گزشتہ موسم سرما میں جب پھر میں رخدہ سے دس میل اِدھر خیمہ زن ہوا۔ دورانِ قیام میں خانقاہ کے ایک لاما سے میری ملاقات اور گفتگو ہوئی۔

قدرتاً ٹامی کا ذکر بھی درمیان میں آ گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ٹامی اس موسمِ بہار میں راہئ ملک عدم ہوا۔ وہ واقعی نہایت بہادر شخص تھا۔

"بہادر" کا لفظ ٹامی کے متعلق سُن کر میں حیران رہ گیا۔ مگر اُس نے مجھے بتایا کہ دوسروں کو بچانے کی خاطر وہ اپنی جان پر کھیل گیا۔ اس علاقے میں سخت ہیضہ پھیل گیا۔ یہاں کے لوگ ایسے صاف رہنے کے عادی نہیں نہ حفظانِ صحت کے اصول پر کاربند۔ وبا خوب پھیلی۔ یہاں کی آبادی مختصر ہے۔ لیکن فرشتۂ اجل نے جی کھول کر خراج وصول کیا۔ خانقاہ رخدہ چونکہ الگ تھلگ ہے۔ وہاں تک وبا کا اثر نہ ہوا۔ مگر گورو لاما نے کچھ لاماؤں کو دیہات میں امداد پر مامور کرنا اپنا فرض سمجھا۔ اور اُنہیں یہ ہدایت کی کہ جب تک وبا کا قلع قمع نہ ہو لے۔ تب تک واپس خانقاہ میں نہ آئیں۔ رضاکار گویا موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ ٹامی سب سے پہلا شخص تھا جس نے اپنی خدمات پیش کیں۔ اُس نے تن من دھن ہر ایک صورت سے مریضوں کی تیمارداری کی۔ اور بہت سی جانیں بچائیں۔ بلکہ نااُمیدی کے ماحول کو تبدیل کرنے کی پوری کوشش کی۔ اُس نے یہ ثابت کر دکھایا۔ کہ اگر انسان تہیہ کر لے تو بیماری پر غالب آ سکتا ہے۔ وہ ایک پچکاری کے ذریعہ مریضوں کے جسم میں نمک اور پانی داخل کر کے اُنہیں بچاتا رہا۔ وبا رُو بہ انحطاط تھی۔ کہ ٹامی خود اس کا شکار ہو گیا۔ انہی ہتھیاروں سے جن سے اُس نے سینکڑوں جانیں بچائی تھیں۔ خود بھی بیماری کا مقابلہ کیا۔ مگر جانبر نہ ہو سکا۔

ایک موقعہ پر وہ بزدل ثابت ہوا۔ اور دوسرے پر جیالا۔ انسانی فطرت بھی بالائے فہم ہے۔

اُلفت بی اے (وزیر آبادی)

غزل

کام آئی نہ اُلفت میں انساں کی ہنرمندی
کیا ہوتا نہ ہوتی گر تائید خداوندی

صحرائے محبت ہے کس درجہ گراں مجھ پر
ہر برگِ شکستہ کو ہے دعوئے الوندی

تنقید نہ کر مری بُت خانہ پرستی پر
پتھر اسی پردے میں کرتا ہے خداوندی

اے عشق ترا عالم بھولا ہے نہ بھولے گا
پُرکیف سی آزادی، رنگین سی پابندی

وہ حسن و محبت کے ہنستے ہوئے نظارے
وہ ایک نظر جس میں دونو کی رضامندی

دیس راج شرما بی۔ سی۔ ڈی (فرنچ)

محبت اور نفرت کی کشمکش

ہندوستانی زندگی کا ایک روشن پہلو

اگر میں سیٹھ دینار سے بجائے دس کے دو سال قبل شادی کر لیتی تو شاید یہ کہانی کبھی سپردِ قلم نہ ہوتی۔

دس سال قبل میرے بڑے لڑکے داؤد کے نزدیک سیٹھ دینار سے بہتر کوئی شخص نہ تھا۔ اس وقت داؤد کی عمر آٹھ سال کی تھی جب وہ سولہ سال کا ہوا اور میں نے دوبارہ شادی کر لی تو اس کے لئے دنیا المناک ہو گئی۔

میرا پہلا شوہر سید مودودی راہئ ملکِ عدم ہو گیا اور اپنے پیچھے چار یتیم اور ایک بیوہ چھوڑ گیا۔ دوسری مصیبت یہ کہ ایک قطعہ زمین تھی تو اس پر بھی قرضے کا بھاری بوجھ تھا۔

سیٹھ دینار میرے شوہر کا گہرا دوست تھا۔ اور وہ ہمارے فارم پر کام کیا کرتا۔ اس کو تمام ہدایات وغیرہ مکان سے باہر ہی دی جایا کرتی تھیں۔ وہ ایک اونچے قد کا جوان تھا اور سب سے عجیب بات اس میں یہ تھی کہ اس کے بال نہایت چمکیلے تھے اور آنکھیں گہری نیلی۔ سیٹھ کو چوب فروشی اور آرا کشی میں خاص مہارت تھی۔ چنانچہ میرے شوہر کے فوت ہو جانے کے بعد اس نے یہی پیشہ اختیار کیا۔

چونکہ سیٹھ میرے خاوند کا بے تکلف دوست تھا۔ اس لئے میں اس سے پردہ نہیں کیا کرتی تھی۔ جب مودودی کو فوت ہوئے کچھ عرصہ گزر گیا تو میں سیٹھ سے بے تکلف ہو گئی اور اس سے اکثر اپنے کام میں مشورہ لیا کرتی۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت بھی آیا جب ہماری ملاقات پہلی سی نہ رہی اور اس کا مفہوم بالکل بدل گیا۔

ایک روز اس کا ہاتھ اتفاقاً میرے ہاتھ سے چھو گیا تو میرے بدن میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ سیٹھ اکثر مجھے کہا کرتا تھا۔ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور تم سے شادی بھی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں ہمیشہ اس خیال کو مالی بنا پر مسترد کر دیا کرتی تھی۔

میں اکثر اپنا چہرہ شیشہ میں دیکھتی اور خدا کا شکر بجا لاتی کہ میرے بال سیاہ اور گھونگھریالے ہیں اور مجھے یہ بھی امید تھی کہ میرے رخساروں کی سرخی جلد ناپید نہ ہو جائے گی اور میرے بدن کی نرم و نازک کھال پر زمانے کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اسی طرح زمانہ گزر گیا۔ سیٹھ نہیں چاہتا تھا کہ میں اپنے فارم پر کام کروں۔ لیکن میں سعی و کوشش کام کرتی اور آخر تمام قرضہ اُتر گیا۔ اس اثنا میں سیٹھ کو شدید خسارہ پڑا اور اس کا کام بند ہو گیا۔ وہ کئی ہفتے تک گھر سے باہر نہ نکلا۔ بلکہ ہر وقت کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ آخر ایک روز میں جی کڑا کر کے اس کے گھر گئی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"اندر آ جاؤ سارہ! — میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جب میں بیٹھ گئی تو اس نے کہا۔

"سارہ! ہم دونوں ۳۰ سال سے زیادہ عمر کے ہو گئے ہیں۔ بچوں کے لئے شاید یہ زیادہ عمر ہو لیکن میرے اور تمہارے لئے نہیں۔ میں عرصۂ دراز تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا ہوں اور میں نے کبھی بھی اتنا وقت کسی اور بات پر ضائع نہیں کیا — لکڑی کا بھاؤ گر گیا ہے۔ اور میری آمدنی صفر کے برابر رہ گئی ہے۔ لیکن سارہ! میں نے دریائے جہلم سے دس میل پرے ایک جگہ معلوم کی ہے۔ وہاں عمدہ چوب کا کثیر ذخیرہ ہے۔ عام لوگوں کے لئے وہاں پہنچنا مشکل ہے۔ اگر میں اپنا کام شروع کروں تو مجھے پوری امید ہے کہ میں موجودہ مشکلات سے مخلصی حاصل کر سکوں گا۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ ہمیں دیر نہیں کرنا چاہئیے اور جلد از جلد نکاح کر لینا چاہئیے۔"

اس کے بعد اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

میرے پاس ابھی تھوڑی سی پونجی موجود ہے ۔ میں اُس سے آراکشی کے کارخانے کے لئے کافی زمین خرید سکتا ہوں ۔ قریب ہی اتنی لکڑی مل سکتی ہے جو عرصہ دراز کے لئے کافی ہوگی ۔ دریا کے نزدیک رہنا بھی ہمارے لئے نہایت مفید ہوگا ۔ علاوہ قدرتی منظر کے ہمیں شہتیریاں بہانے میں بھی آسانی رہے گی اور آگ سے بھی ہم محفوظ رہیں گے ۔ اسی طرح کئی دوسرے اخراجات بچ جائینگے ۔ اور تم ـــــ سارہ! میرے ساتھ آؤگی تو اپنا موجودہ فارم ٹھیکے پر دے سکتی ہو ۔ دریا کا کنارا تمہیں اور تمہارے بچوں کے لئے نہایت مفید رہے گا ۔ ہم شادی کو کئی سال سے ملتوی کرتے آئے ہیں لیکن اب زیادہ انتظار مشکل ہے ۔ تمہارے بغیر میری دنیا سونی ہے ۔ اگر تم میرے ساتھ رہو تو مجھے کام کرنے کی بھی زیادہ ترغیب ہوگی ـــ"

سیٹھ کی تقریر سُن کر میرے آنسو نکل آئے اور سوائے حامی کوئی جواب نہ دے سکی ۔ گھر جاکر جب میں نے اپنے بچوں کو سنایا کہ میں سیٹھ سے شادی کرنے لگی ہوں تو چھوٹے بچے میری طرف دیکھنے لگے ۔ داؤد تو یہ خبر سنتے ہی زرد پیلا ہوگیا اور جھٹ بول اٹھا :-

"نہیں ماں! تم ایسا نہیں کرسکتیں ۔ تمہاری عمر اب کافی ہوگئی ہے"

"میں تمہارے لئے کافی عمر کی ہوں ۔ مگر اُس کے لئے نہیں جس کی عمر ۵۳ سال کی ہے ۔"

"ہم تمہارے ہیں ۔ اُس شخص کے نہیں ہو سکتے ۔"

"داؤد پیارے ـــــ! تم اُس کو شخص کیوں کہتے ہو ـــ چند منٹ قبل وہ تمہارا چچا تھا ۔ لیکن اب تم اسے ایک معمولی شخص کہتے ہو ۔"

داؤد چُپ ہوگیا ۔ لیکن اس کی آنکھوں سے نفرت کے آثار ظاہر تھے ۔ میرے چھوٹے لڑکے محبوب نے کہا ۔

"تو ماں! کیا وہ یہاں رہیں گے؟ مجھے چچا سیٹھ پسند ہیں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں ہم سے چھین کر لے جائیں ۔"

"بُوبی ـــــ!" میں نے پیار سے کہا ـــ "یہاں تو نہیں البتہ ہم سب اُس کے ساتھ جاکر دریائے جہلم پر رہیں گے ۔ وہ تمہارا شفیق باپ بن جائے گا ۔"

چھوٹے سب لڑکوں نے اس خیال کو پسند کیا اور کہا ۔

"دریا پر بڑا مزا رہے گا ۔"

لیکن داؤد نے پھر کہا ۔

"ہاں! ــــ تمہاری شادی ابا جان سے ہوئی تھی ۔ اب تمہارا کسی اور شخص سے شادی کرنا مناسب نہیں ہے ۔"

یکدم مجھے معلوم ہوا کہ میرا ننھا سا داؤد اب جوان ہوچکا تھا ۔ وہ مجھے سولہ برس کا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا معلوم ہونے لگا ۔ جب وہ مجھ سے مخاطب ہوتا تو اس کا لہجہ نہایت کرخت ہوتا اور وہ سیٹھ کا نام نہایت درشتی سے لیتا ۔ پھر اُس نے کہا ۔

"ہر کوئی جانتا ہے کہ سیٹھ ہمیشہ ناکام رہا ہے وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے وہی خراب ہو جاتا ہے ۔"

"یہ تم نے کہاں سے سُنا داؤد!" میں نے پوچھا ۔

"ہر کوئی جانتا ہے ۔" اس نے جواب دیا ۔

پھر زور زور سے یہ کہتے ہوئے کہ میں اُس سے نفرت کرتا ہوں میں اُس سے نفرت کرتا ہوں ۔" وہ کمرے سے باہر نکل گیا ۔

باوجود ان سب باتوں کے میں نے سیٹھ سے شادی کرلی ۔ میں نے دیکھا کہ سیٹھ کے چہرہ پر مسرت و انبساط کی لہریں موجیں مار رہی تھیں ۔ اس نے مجھ سے کہا ۔

"سارہ پیاری ـــــ! میں چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ خوش رہو اور میں تمہیں خوش رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں گا ۔ سارہ! تم جانتی ہو کہ اگر میں کچھ کماؤں گا تو وہ سب تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے ہوگا ۔"

اگلے دن داؤد میرے پاس آیا ۔ اس کے چہرہ پر شرمندگی کے کچھ آثار تھے ۔ وہ مجھ سے کہنے لگا ـــ "ماں! میں نے تم سے ایک بات کرنی ہے ۔"

"کیا؟ ـــ" میں نے پوچھا ۔

"ماں!" ـــ اس نے کہا ـــ" اس دن شاید میں تمہارے ساتھ گستاخی سے پیش آیا تھا ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تم نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے ۔ میں بہت جلد اِس قابل ہو جاؤں گا کہ تمہارے گزارے کا کفیل ہو سکوں ـــ ماں! میں صرف یہ چاہتا ہوں ۔ کہ تم ہمارے سوا کسی کی نہ بنو ۔"

میں نے کہا "داؤد! مجھے تمہارا بہت خیال ہے ۔ میں نے اچھی طرح اس پر غور کر لیا ہے کہ جو میں کر رہی ہوں وہ تمہارے ہی فائدہ کے لئے ہوگا ۔ اب تم سکول میں پڑھتے رہو سال دو سال تک میں تمہیں کالج بھیج سکوں گی ۔"

"لیکن ماں! مجھ سے وعدہ کرو کہ تم سیٹھ کے پاس نہیں جاؤ گی ——— وعدہ کرو۔"

"میں تم سے وعدہ نہیں کر سکتی داؤد!" میں نے قدرے رقت سے کہا۔ "کیونکہ میں نے کل سیٹھ سے شادی کر لی ہے۔"

داؤد یہ خبر سن کر ناراض ہو گیا اور چپ چاپ کمرہ سے باہر نکل گیا۔ کاش ——— میں وہ تمام منظر کھینچ سکتی جو اگلے روز میں نے سیٹھ کے گھر پہنچ کر دیکھا۔ ایک خوبصورت پہاڑی پر ہمارے لئے ایک خاص بنگلہ تیار کیا گیا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ اور دریا کا منظر اسقدر خوشگوار تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ سیٹھ نے مجھ سے کہا۔

"سارہ! ابھی یہ بنگلہ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن جب ہم اس میں فرنیچر کر لیں گے اور ارد گرد بیلیں اور پودے بھی اُگ آئیں گے۔ تو منظر نہایت سہانا ہو جائے گا۔"

ہم اپنے اِس نئے گھر میں آباد ہو گئے۔ سیٹھ سارا دن محنت کرتا تھا۔ اتنی مشقت سے کام کرتے ہوئے میں نے اور کسی شخص کو نہیں دیکھا۔ وہ صبح چار بجے بیدار ہوتا اور رات کے بارہ بجے گھر واپس آتا۔ وہ ہر کام کی خود نگرانی کرتا اور کاریگروں کو مفصل ہدایات دیتا رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے ارد گرد کی تمام "ملوں" کو شکست دیدی اور اب اس کے مقابلہ میں کوئی نہ ٹھہر سکتا تھا۔

داؤد سیٹھ سے حتی الوسع کنارہ کش رہتا۔ سیٹھ نے بہت کوشش کی اس کے لئے تمام خوشی کے سامان مہیا کرے۔ لیکن شاید اسے سیٹھ سے کوئی خدائی بیر تھا۔ سیٹھ اپنے کاموں میں اسقدر مشغول رہتا کہ اسکو داؤد کی نفرت پر غور کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ میں اکثر راتوں کو جاگتی اور سوچتی کہ آیا ان دونوں میں اتحاد و موانست پیدا کرنے کا بھی کوئی ذریعہ ہے۔

آخر جب موسم بہار آیا۔ تو ہم نے سب بچوں کو اسکول میں داخل کر دیا۔ اور کچھ عرصہ کے لئے نفرت کا خیال جاتا رہا۔

سیٹھ دن رات محنت کرتا۔ اس نے پانچ ہزار روپے خرچ کر کے ایک نئی مشینری خرید لی۔ اور اس نے اپنی تجارت کو چمکانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ہر روز وہ کارخانے میں کوئی ایسا معرکہ سرانجام دے دیتا جو اس کے ساتھیوں کو مافوق العادت معلوم ہوتا۔ لیکن آئندہ موسم سرما میں ایک غیر متوقع حادثہ ظہور پذیر ہوا ——— یعنی جس بنک کے ساتھ ہمارا حساب تھا۔ وہ ٹوٹ گیا اور سیٹھ کو شدید خسارہ پڑا۔

میں نے اس سے کہا کہ کسی اور بنک سے قرض اٹھالو۔

لیکن اس نے جواب دیا کہ آجکل لکڑی کا بھاؤ اسقدر گر چکا ہے کہ کوئی شخص اس کے نام پر قرض دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ البتہ میں گھر کے اخراجات چلانے کے لئے کچھ روپیہ لے سکتا ہوں۔ کیونکہ اب ہمارا اندوختہ بھی ختم ہو چکا ہے۔

لیکن میں نے اس پر زور دیا کہ وہ بنکوں سے ضرور کچھ قرض لینے کی کوشش کرے۔

آخر اس نے بہت غور و فکر کے بعد ایک تجویز نکالی۔ کہ بجائے شہتیریاں تیار کرنے کے صندوق بنائے جائیں۔ کیونکہ اُن دنوں اس کام میں زیادہ فائدہ تھا۔ مگر صندوقوں کے لئے نیا کارخانہ بنانے پر ہزاروں روپیہ درکار تھا۔

اس فکر میں سیٹھ نڈھال ہو گیا اور کہنے لگا:۔

"سارہ! ——— میں نے تم سے شادی کر کے تمہیں اور تمہارے بچوں کو تکلیف دی ہے۔ مجھے اس وقت شادی کرنی چاہیئے تھی۔ جب میری تجارت خوب فروغ پر ہوتی۔"

لیکن میں نے اُسے تسلی دی اور کہا کہ میں ہر حال میں تمہاری فرمانبرداری کروں گی۔ تمہیں فکر نہیں کرنی چاہیئے۔ ہم ضرور اس مصیبت پر غلبہ پالیں گے۔

اگلی صبح میں نے سیٹھ سے کہا کہ مجھے بچوں سے ملنے کے لئے جانے کی اجازت دو۔ میں آتی دفعہ اپنے پرانے فارم میں سے بھی ہوتی آؤں گی۔ اُس نے مجھے بخوشی اجازت دیدی۔ بچے مجھے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں سیٹھ کے بارہ میں داؤد سے گفتگو کرتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔ لیکن آخر میں نے اس سے سب کچھ بیان کر دیا۔ اور تجویز پیش کی کہ اس کے کارخانے کو چلانے کا صرف یہی طریقہ ہے۔ کہ ہم اپنا فارم "گروی" رکھ دیں۔

میں نے داؤد کو تمام بات اچھی طرح سمجھا دی مگر وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور کہنے لگا۔

"ماں! ——— تم پاگل ہو۔ تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتیں۔ کئی سال محنت کر کے ہم نے خود اپنی زمین کو واگذار کرایا ہے۔ اب تم پھر اسے "رہن" رکھنا چاہتی ہو ——— چور سیٹھ ——— وہ ہمارا سب روپیہ برباد کرنا چاہتا ہے۔"

"بس بس داؤد! تمہیں ایسی باتیں نہیں کہنی چاہیئے۔ بے شک تم میرے بیٹے ہو۔ لیکن تم حد سے باہر نہیں جا سکتے۔"

آخر میں نے اپنے ایک واقف کار "بنکر" کے ذریعہ فارم کو رہن رکھوا دیا۔ اور گھر آ کر تمام روپیہ سیٹھ کے سامنے ڈال دیا۔ شکر گزاری کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

سیٹھ نے صندوق بنانے کی مشینری خرید لی اور پوری محنت کر کے اس کام کو خوب چمکایا۔ ارد گرد کے علاقہ میں پھلوں کے باغات تھے۔ جن کے مالکوں کو صندوقوں کی ضرورت رہتی تھی۔ سیٹھ نے کوشش کر کے ان سب سے آرڈر حاصل کئے اور ہمارا کارخانہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔

داؤد پہلے ہی سیٹھ سے ناراض تھا۔ اب وہ گالی گلوچ پر اتر آیا۔ لیکن ہم نے سمجھا بجھا کر اسے کارخانے ہی میں کسی کام پر لگا دیا۔

اس دوران میں ہمیں معلوم ہوا کہ داؤد ایک معمولی گھرانے کی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ وہ کارخانے کے نزدیک رہتی تھی اس کی شہرت اچھی نہ تھی۔ اس لئے سیٹھ نے داؤد کو وہاں جانے سے منع کیا۔

ایک روز داؤد اپنے کام سے ایک گھنٹہ غیر حاضر رہا۔۔۔ سیٹھ نے ادھر ادھر کے آدمیوں سے پوچھا کہ آیا انہوں نے داؤد کو کہیں دیکھا ہے۔ لیکن کوئی پتہ نہ چلا۔ جب داؤد واپس آیا تو سیٹھ نے اس سے پوچھا۔

"تم کہاں رہے ہو؟"

"جہاں میری مرضی" ــــ اس نے جواب دیا۔

"داؤد ــــــ! تم میرے ملازم ہو۔ تم بغیر اجازت کہیں نہیں جا سکتے۔ اچھا تمہارے پاس کیا عذر ہے؟"

"میں زیادہ دیر تک باہر نہیں رہا۔" وہ بولا۔

"زیادہ دیر تک نہیں رہا؟ ــــــ تم کم از کم ایک گھنٹہ غیر حاضر رہے ہو۔ میں نے تمہاری ہر جگہ تلاش کی لیکن تم نہ ملے" پھر انہوں نے کسی سے آواز دی۔

"اس سے پوچھو کہیں یہ "زہرا" کے پاس تو نہیں گیا تھا۔"

"اچھا تو تم وہاں گئے تھے؟" ــــ سیٹھ نے غصہ سے کہا۔ "تم روز بروز بگڑتے جاتے ہو۔ میں نے تمہیں کئی بار کہا ہے کہ زہرا کے پاس نہ جایا کرو۔ وہ بدنام ہے۔ اگر تم سارہ اور میرے استاد سید مودودی کے لڑکے نہ ہوتے تو میں تمہاری یہ حرکت برداشت کر لیتا ــــ لیکن اب میں ہرگز برداشت نہیں کرونگا اگر تم میرے احکام نہیں مان سکتے تو یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

یہ سنکر داؤد کو غصہ آ گیا۔ اس نے گھونسہ تانا اور زور سے سیٹھ کے منہ پر دے مارا۔ سیٹھ مشین کے پٹے میں گر پڑا۔ اگر کارخانے کا ایک ملازم بڑھ کر اس کو بچا نہ لیتا تو سیٹھ کا خاتمہ یقینی تھا۔ یہ حادثہ دیکھ کر تمام کارخانے میں سنسنی پھیل گئی لیکن سیٹھ جلدی ہوش میں آ گیا۔ اس نے تمام ملازموں کو اپنے کام پر جانے کا حکم دیا اور خود بھی مصروف ہو گیا۔

مجھے اس حادثے کا کبھی علم نہ ہوتا۔ اگر داؤد خود ہی شام کو آ کر مجھے یہ نہ بتاتا کہ ماں! ــــ میں اس کو یقیناً جان سے مار دیتا اگر وہ ملازم اس کو آ کر بچا نہ لیتا۔

میں نے پوچھا ــــــ "کیا ہوا؟"

اس نے واقعہ سنایا اور کہا۔

"میں نے غصہ میں آ کر یہ حرکت کی ہے۔ میرا منشا یہ ہرگز نہ تھا۔ میں آج رات روٹی نہیں کھا سکتا ــــ ماں! میری طرف غصہ کی آنکھ سے مت دیکھو۔ میں اپنے کئے پر نادم ہوں۔ میں نے زہرا کو کہا تھا کہ میں تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔ مگر وہ یہ سن کر رونے لگی تھی اور اسے میری جدائی گوارا نہ تھی۔ جب میں اپنا آخری پیغام اسے دیکر آیا تو سیٹھ نے مجھ سے جواب طلبی کی اور سب آدمیوں کے سامنے مجھے شرمندہ کیا ــــــ میں کچھ دیر کے لئے دریا پر جا رہا ہوں۔ وہاں مچھلیاں پکڑ کر جی بہلاؤں گا ماں ــــ! جب سیٹھ آئے تو اسے کہہ دینا کہ میں آج اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک ضروری بات کہنا ہے۔"

مجھے داؤد کی باتیں سنکر شدید رنج پہنچا۔ اف ــــ وہ اس شخص کو مار دینے لگا تھا۔ جس کو میں اسقدر چاہتی ہوں۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا ــــ "اچھا بیٹا! جاؤ۔ مگر دریا میں بھنور سے محتاط رہنا۔"

دریا ہمارے گھر سے دکھائی دیتا تھا۔ آدھ میل نیچے خطرناک بھنور تھے۔ اور پانی کی رفتار بہت تیز ہو جاتی تھی۔ اس لئے مجھے ہر دم فکر رہا اور میں کھڑکی سے دیر تک داؤد کو

دیکھتی رہی - پھر میں نے خدا سے دعا کی کہ اے اللہ! میں نے اس بچے کے لئے ہر ممکن قربانی کی ہے - مگر مجھے اپنے شوہر سے بھی شدید محبت ہے - میں نہیں چاہتی کہ ان دونوں کے درمیان یہ نفرت و حقارت کا جذبہ قائم رہے - اے خدا —— ! کوئی بہتری کی صورت پیدا کر!

داؤد نے تھوڑی دیر تک کنارے کنارے کشتی چلائی اور پھر وہ نیچے کی طرف چلا گیا - اچانک میں نے کھڑکی میں سے دیکھا - کہ وہ بھنور میں پھنس گیا اور اس کی کشتی زور سے ایک چٹان کے ساتھ ٹکرا گئی -

مجھ پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو گیا - میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں - اور مجھے یقین ہو گیا کہ داؤد آج نہیں بچے گا - اتنے میں ایک آواز آئی —— وہ زندہ ہے، وہ زندہ ہے -" پھر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے آدمی اسے کہہ رہے ہیں —— "سنبھلے رہو داؤد! —— سنبھلے رہو!!"

میں نے دیکھا سیٹھ اور اُس کا وفادار ملازم دوڑے دوڑے داؤد کی طرف جا رہے ہیں - سیٹھ نے دریا میں چھلانگ لگا دی - مجھے بہت خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ بھی گرداب میں نہ پھنس جائے - لیکن آخر بہت کوشش کے بعد داؤد کو بچا لیا گیا - اگرچہ پانی سیٹھ کو دھکیلے لئے جا رہا تھا - تاہم اس کے ملازم نے کشتی کی مدد سے دونوں کو باہر نکال لیا - سیٹھ اس کشمکش میں تقریباً بے ہوش ہو گیا اور جب اس کو کنارے پر لایا گیا تو اس میں ہلنے کی سکت باقی نہ رہی تھی - اس کے بعد داؤد تو اچھا ہو گیا لیکن ہمیں سیٹھ کی زندگی کا خطرہ پڑ گیا -

سیٹھ مسلسل محنت و مشقت کے باعث پہلے ہی کمزور تھا - اس حادثے نے اس کو زیادہ نحیف بنا دیا - خوش قسمتی سے سیٹھ کی آہ و زاری نے داؤد کے دماغ پر اچھے اثرات چھوڑے اور وہ اس کی زندگی میں زیادہ دلچسپی لینے لگا - وہ دن رات سیٹھ کی تیمارداری میں مصروف رہتا اور اس نے علاج معالجہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا -

بیماری کے ایام میں سیٹھ کا کاروبار سنبھالنے والا کوئی نہ تھا - اس لئے اُسے زیادہ فکر تھی - ایک روز جب اُس کو کچھ ہوش آیا تو داؤد نے مجھ سے کہا -

"ماں —— ! وہ اچھا ہو گیا ہے - مجھے اس سے کچھ کہنا ہے ایک ضروری بات ہے - میں نے کئی دن سے اُسے روکے رکھا ہے میں نے یقیناً زیادتی کی اور اس پر حملہ کیا -"

"چپ رہو داؤد!" میں نے کہا —— "آخر یہ سب تمہارا ہی تو قصور نہیں تھا -"

"نہیں ماں! مجھے! مجھے بات ختم کر لینے دو - جب میں بچہ تھا تو اس سے اپنے باپ کی طرح محبت کرتا تھا - لیکن جب تم نے اس سے شادی کر لی تو میں اپنے دل میں اس کے متعلق ایک نفرت محسوس کرنے لگا - اس روز جب میں دریا پر گیا تھا - جس دلیری سے اس نے میری جان بچائی - اُس کا میری طبیعت پر گہرا اثر پڑا - میں نے اسی دن فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے سیٹھ سے معافی مانگنی چاہیئے -"

اچانک رات کی تاریکی کو چیرتی ہوئی ہمیں کارخانے کے وسلوں کی آوازیں آئیں - جن کو سُنکر ہمارا دل دہل گیا - اف خداوندا —— ! کارخانے کو آگ لگ گئی تھی - میں دیکھنے کے لئے کھڑکی کی طرف دوڑی - کارخانے کی عمارت سے دھواں اور شعلے نکل رہے تھے - اور آدمی مشعلیں اُٹھائے بھاگ کر اس طرف جا رہے تھے - میرے دیکھتے ہی دیکھتے داؤد بھی سیٹھ کے بستر سے کودا اور مل کی طرف بھاگا -

آئندہ کا نصف گھنٹہ ایک خواب کی طرح تیزی سے گزر گیا - سیٹھ جاگ چکا تھا - آگ کا حال سُنکر اُس کے جسم میں ایک تیزی اور حرکت پیدا ہوئی - اس کا خون جوش مارنے لگا - اور وہ بار بار کوشش کرتا تھا کہ بستر سے نکل کر کارخانے کی طرف بھاگ جائے - لیکن اُس کی ناتوانی اُسے یہ اجازت نہ دیتی تھی - میں اُس کو پکڑ پکڑ کر روکتی - اُس کے چہرہ پر پسینے کے آثار ظاہر تھے! اچانک اُس نے چلّا کر کہا -

"سارہ! میری تمام امیدوں پر پانی پھر گیا - سب کچھ تباہ ہوا جا رہا ہے مجھے جانے دو -"

"تم نہیں جا سکتے سیٹھ! یہ بالکل ناممکن ہے - وہاں جانے سے تمہارا حال اور بگڑ جائے گا - اگر ہمارا کارخانہ تباہ بھی ہو گیا تو ہم ازسرِ نو اپنا کام شروع کر دیں گے اور امید ہے کہ ہم اپنے نقصان کی تلافی کر سکیں گے -"

یہ سُنکر سیٹھ چپ ہو گیا - اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ظاہر ہوئی - اس نے جواب دیا -

تم ٹھیک کہتی ہو سارہ!"

پھر اُس نے مجھ سے دریافت کیا کہ داؤد کہاں ہے ؟ مجھے خواب میں ایسا محسوس ہوا ہے کہ وہ مجھے پھر سے چچا کہہ رہا ہے"

"یہ خواب نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "داؤد اب بالکل بدل چکا ہے۔ شاید تم اندازہ بھی نہ کر سکو۔"

کچھ دیر کے بعد باہر سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اور کسی نے ہم سے کہا۔ "بجھ گئی بجھ گئی" ــــ یہ آواز داؤد کی تھی۔ وہ یکایک اندر آگیا اور کہنے لگا۔

"اوہو۔ میں چچا سیٹھ کو تو بالکل بھول گیا۔ مجھے اس کا افسوس ہے ــــ چچا جان! ہم نے آگ بجھا دی۔"

سیٹھ کے چہرے پر مسرت کے آثار ظاہر ہوئے اور اس نے کہا۔

"شاباش بیٹا ــــ! تیری آواز مجھے کسقدر میٹھی معلوم ہو رہی ہے۔"

پھر سیٹھ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"سارہ! آج میں مل کے تمام مزدوروں سے ملاقات کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں جلدی اچھا ہو جاؤں گا۔"

"لیکن میں اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ ڈاکٹر کا حکم ہے کہ ان سے کوئی ملاقات نہ کرے۔"

"اس کی پروا نہ کرو۔ مجھے ان سے ملنا ضروری ہے۔" سیٹھ نے جواب دیا۔ رات کو تمام مزدور آئے۔ نگران نے آگے بڑھ کر آگ کا سارا حال سنایا اور کہا کہ آگ زیادہ تر برادے میں لگی تھی۔ اور مشین کو نقصان نہیں پہنچا سکی۔ لیکن آگ کا بجھانا ایک معجزہ ہوا۔ کیونکہ ہم میں سے ایک شخص ایسا تھا جس نے نہایت سرعت اور تیزی سے کام کیا۔ اس نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر آگ وہاں سے بجھانی شروع کی جہاں تیل کا ذخیرہ تھا اور خطرہ تھا کہ سارا کارخانہ بھک سے اُڑ جاتا ــــ وہ شخص داؤد تھا۔"

اتنے میں داؤد آگے بڑھا اور بولا۔

"میں نے کچھ خدمت سرانجام نہیں دی۔ لیکن جو کچھ بھی کیا ہے۔ چچا سیٹھ ــــ! وہ سب آپ کے لئے تھا چچا جان! میں سب آدمیوں کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ اس دن میں نے غلطی کی۔ میں معافی مانگتا ہوں۔"

پھر وہ دوزانو ہو کر سیٹھ کے بستر کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ پھر کہنے لگا۔

"چچا! بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو صحت نصیب ہوئی میں کئی دن سے ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کروں جب تک آپ بیمار ہیں آپ کوئی فکر نہ کریں۔ ہم سب لوگ محنت کر کے کارخانے کو چلاتے رہیں گے۔"

یہ بتانا لاحاصل ہے کہ سیٹھ کو یہ الفاظ سنکر کسقدر خوشی ہوئی۔ اس کو بعجلت صحت ہونے لگی۔ ہم نے نہایت قلیل عرصہ میں ہی اپنے تمام قرضے بیباک کر دیئے۔ اور ہمارا کام پہلے سے بھی بہت زیادہ بڑھ گیا۔

داؤد اسسٹنٹ فورمین کی حیثیت سے کارخانے میں کام کرتا رہا۔ اس سال وہ کالج جا رہا ہے۔ تعلیم کے بعد اگر اس کی مرضی ہوئی تو سیٹھ کی تجویز ہے کہ اس کو "مویشیوں کا ہسپتال" کھول دیں گے۔

میرے باقی تین بچے جوان ہو رہے ہیں۔ ان کو فیکٹری ہی میں کام دے دیا گیا ہے۔ اور ہم ہنسی خوشی دن گزار رہے ہیں۔

(ترجمہ) **قمر فاروقی (راجنالوی)**

پیری تمام ذکرِ جوانی میں کٹ گئی ــــ کیا رات تھی کہ اک کہانی میں کٹ گئی

آنکھوں کو شغلِ گریہ رہا رات دن عزیزؔ ــــ دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی

عزیزؔ لکھنوی

افکار تازہ

دل کو مٹا کے عشق میں دل کی طرف کبھی نہ دیکھ   ہو کے نثار زندگی حاصل زندگی نہ دیکھ
عشق فنا کا نام ہے عشق میں زندگی نہ دیکھ   جلوۂ آفتاب بن ذرّے میں روشنی نہ دیکھ

اجمل

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے   جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

جہاں تک آنکھ میں آنسو تھے رو کے دیکھ لیا   کہ دل کی آگ کا ممکن نہیں بجھا دینا

دلگداز

پھر خمار غم ہوا غم کو پھر نظر لگی   پھر مجھے ستم شعار دیکھتا چلا گیا

زمانہ

حُسن ہے کس شمار میں عشق ہے کس قطار میں   عمر تمام ہو چلی اپنے ہی انتظار میں

ساری دُنیا مرے تخیّل کی   تم ہنسے ہو تو مُسکرائی ہے

ابھی واقف نہیں دُنیا محبّت کی حقیقت سے   حقیقت میں محبّت ہی تو حُسنِ زندگانی ہے

خیام

انہیں میرا بیاں بھی خامشی معلوم ہوتا ہے   مجھے اُن کی خموشی داستاں معلوم ہوتی ہے
ارے یہ کون مجھ کو دل کے ویرانے میں لے آیا   یہاں تو وسعتِ کون و مکاں معلوم ہوتی ہے

تعمیر

زُودِ پشیماں

روس کے ایک شہر میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ جس کا نام آکسینو تھا شہر میں اس کی کئی ایک دوکانیں اور رہائشی مکان تھے۔ آکسینو بلند بالا اور حسین جوان تھا۔ نوجوانی میں تو شراب پی کر گلی کوچوں میں لڑتا پھرتا تھا۔ مگر شادی کے بعد یہ تمام بد عادتیں چھوٹ گئیں۔ البتہ کبھی کبھی ماسے پی لیا کرتا تھا۔ مگر وہ بھی تھوڑی سی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے۔"

ایک دفعہ وہ سوداگری کا سامان لے کر جانے لگا۔ تو اس کی بیوی نے کہا" رات میں نے بہت بُرا خواب دیکھا ہے جس سے میرا دل دہلا جاتا ہے۔ آج سفر ملتوی کر دو۔" آکسینو نے ہنس کر کہا" ڈرنے کی کونسی بات ہے۔" بیوی نے جواب دیا" یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم لیکن میرا دل بیٹھا جاتا ہے رات میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تم سفر سے واپس آگئے ہو۔ اور تمہارے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں۔"

آکسینو نے کہا" یہ تو بڑا اچھا شگون ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ اس سفر میں بہت فائدہ ہوگا۔ اور میں تمہارے لئے بہت سے تحفے لے کر آؤنگا۔"

یہ کہہ کر آکسینو سفر کو روانہ ہو گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ راستے میں ایک واقف سوداگر مل گیا۔ اور دونوں ایک ہی سرائے میں شب باش ہو گئے۔ آکسینو کی عادت تھی کہ رات کو ذرا دیر سے سویا کرتا تھا۔ وہ پچھلے پہر ذرا سویرے اُٹھا۔ سرائے والے کو بل ادا کیا۔ اور اپنے ساتھی کو سوتا چھوڑ کر سفر کے لئے روانہ ہو گیا۔ پچیس میل چلنے کے بعد وہ ایک سرائے میں ٹھہر گیا اور برآمدہ میں بیٹھ کر اپنا ستار بجانے لگا۔ سرائے کے دروازے کے سامنے ایک اور گاڑی آکر رکی۔ اس میں سے ایک پولیس افسر اور دو سپاہی اُتر کر آکسینو کے پاس آئے۔ افسر آگے بڑھ کر اس سے پوچھنے لگا" تم کون ہو اور کہاں سے آ رہے ہو۔" آکسینو نے بے کم و کاست سب کچھ بتا دیا۔ مگر افسر کی تسلی نہ ہوئی اور وہ برابر جرح کرتا رہا" تم نے رات کہاں بسر کی تھی۔" "تمہارے ساتھ کوئی اور مسافر بھی تھا۔" "تم اس قدر سویرے سے کیوں سرائے سے چل دیئے۔" وغیرہ وغیرہ۔

آکسینو حیران تھا کہ ان سوالوں کا مطلب کیا ہے۔ آخر میں بجبیں ہو کر کہنے لگا۔" آپ تو اس طرح سوال کر رہے ہیں جیسے میں کوئی چور یا ڈاکو ہوں۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میں اپنے کاروبار کے سلسلہ میں جا رہا ہوں۔" افسر نے کہا" میں پولیس کا آدمی ہوں۔ رات تم جس مسافر کے ساتھ سرائے میں مقیم تھے۔ وہ صبح مردہ پایا گیا اور میرا فرض ہے کہ میں تمہاری تلاشی لوں۔" یہ کہہ کر افسر نے سپاہیوں کی مدد سے آکسینو کے سامان کی تلاشی شروع کر دی۔ دورانِ تلاش میں ایک تھیلے میں سے خون آلود خنجر برآمد ہوا۔

افسر نے کہا" یہ خنجر کس کا ہے؟"

آکسینو خون آلود خنجر دیکھ کر سہم سا گیا۔ اور باوجود کوشش کے کوئی جواب نہ دے سکا۔

"اس خنجر پر خون کے دھبے کیسے ہیں؟" افسر نے پوچھا

آکسینو گھبرا گیا" میں ——— مجھے نہیں معلوم ——— نہیں یہ خنجر میرا نہیں ہے۔"

افسر بولا" آج صبح مسافر سرائے میں مردہ پایا گیا۔ تمہارے سوا اور کون اُس کا قاتل ہو سکتا ہے۔ کمرہ اندر سے مقفل تھا۔ اور تمہارے سوا وہاں کوئی اور تھا بھی نہیں۔ خنجر تمہارے سامان سے برآمد ہوا ہے۔ تمہارا چہرہ تمہارے جرم کی شہادت دے رہا ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ کس طرح قتل کیا ہے اور کتنا مال ہضم کیا ہے؟"

آکسینو نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ نہ تو میں نے قتل کیا ہے۔ نہ خنجر میرا ہے اور یہ روپیہ جو میرے پاس ہے میرا ذاتی ہے جو میں گھر سے تجارت کے لئے لے کر چلا تھا۔" اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ مجرم کی طرح کانپ رہا تھا۔

سپاہیوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر گاڑی میں ڈال دیا۔ اور اس کا مال و اسباب چھین لیا۔ اس کے وطن سے چال چلن کی تحقیقات کرائی گئی۔ جس سے صرف یہ معلوم ہو سکا۔ کہ ابتدا میں شراب نوشی کی عادت ضرور تھی مگر اب شراب چھوڑ دی ہے۔ اور کسی قسم کی خرابی اس کے چال چلن میں نہیں ہے۔

عدالت میں چوری اور قتل کے الزام میں مقدمہ پیش کر دیا گیا۔ جب یہ خبر آکسینو کی بیوی کو ہوئی۔ وہ روتی پیٹتی چھوٹے چھوٹے بچوں کو ہمراہ لے کر اپنے خاوند سے جیل میں ملنے آئی۔ بہزار دقت ملاقات کی اجازت لی۔ دورانِ ملاقات میں اُس نے کہا" بھلا۔ بتاؤ تو میں تمہارے لئے کیا کر

سکتی ہوں؟

"زار روس کی خدمت میں رحم کی درخواست کرنا چاہیئے۔ کہ ایک بےگناہ کو تختہ دار سے بچایا جائے۔" آکسینو کچھ دیر سوچ کر بولا۔

بیوی غریب نے کہا "یہ تو میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔ مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔"

آکسینو یہ سن کر خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے سے یاس ٹپک رہی تھی۔

بیوی پھر بولی۔ "دیکھو میں نے اسی وقت کہا تھا کہ سفر ملتوی کر دو۔ مگر تم نے ایک نہ مانی۔ سچ سچ بتا دو۔ کیا یہ قتل تمہارے ہی ہاتھوں ہوا ہے؟"

"افسوس ہے تم بھی مجھ پہ شک کرتی ہو اور مجھے مجرم سمجھ رہی ہو۔" آکسینو نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگا اتنے میں ایک سپاہی نے بیوی بچوں کو باہر نکال دیا۔ یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔

بیوی بچوں کے رخصت ہونے کے بعد وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس واقعہ کی حقیقت کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہے اس سے رحم کی دعا مانگنا چاہیئے۔ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے زار روس کو درخواست بھیجنے کا خیال ترک کر دیا اور خدا پر بھروسہ کر کے خاموش ہو رہا۔ عدالت نے حکم سنا دیا۔ کہ مجرم کو کوڑے لگائے جائیں اور سائبیریا کی کانوں میں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ اور آکسینو چھبیس سال تک سائبیریا میں رہا۔ اس کے سر کے بال سفید ہو گئے۔ داڑھی بڑھ گئی۔ طبیعت کی شوخی بالکل جاتی رہی۔ اب وہ بالکل بوڑھا تھا۔ لوگ اسے پیار سے "دادا" کہہ کر پکارتے تھے۔ قید میں اس نے موچی کا کام سیکھ لیا۔ قیدی اس کا احترام کرتے تھے۔ اس تمام عرصہ میں گھر سے کوئی خیر خبر نہیں آئی اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بیوی بچے زندہ ہیں یا مر گئے۔

ایک روز کچھ نئے قیدی جیلخانہ میں آئے۔ سب پرانے قیدی ان کے آس پاس جمع ہو کر باتیں پوچھنے لگے۔ انہی قیدیوں میں ایک شخص اپنی گرفتاری کی وجہ بیان کرنے لگا۔ "دوستو! میں نے گاڑی میں سے ایک گھوڑا کھولا تھا۔ اس بنا پر مجھ پر چوری کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا گیا۔ حالانکہ میں نے بہتیرا کہا کہ میرا منشا چوری کا نہ تھا۔ بلکہ میں گھر جلدی پہنچنا چاہتا تھا اور وہاں پہنچ کر گھوڑے کو چھوڑ دیتا مگر کسی نے میری بات نہ سنی اور یہی کہے گئے کہ تم چور ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے قبل بھی میں کئی ایک جرم ایسے کر چکا تھا کہ مجھے بہت پہلے یہاں پہنچ جانا چاہیئے تھا مگر جب تو چھوڑ دیا۔ اور اب بےگناہ ہوں تو بلاوجہ مجھے سزا دے دی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ جگہ میرے لئے کوئی نئی نہیں ہے۔ پہلے بھی یہاں تھوڑے دن رہ چکا ہوں۔"

جب یہ قصہ سنا چکا تو ایک شخص نے پوچھا۔ تمہارا وطن کہاں ہے اور نام کیا ہے۔ اس نے اپنا نام میکار بتایا۔ اور وطن وہی جو آکسینو کا تھا۔

آکسینو اپنے شہر کا نام سن کر چونک پڑا۔ اور کہا "تمہیں ایک سوداگر آکسینو کے بال بچوں کا بھی کچھ حال معلوم ہے۔ وہ زندہ ہیں یا مر گئے۔" میکار نے کہا۔ "بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ سب بڑے مزے میں ہیں۔ اگرچہ ان کا باپ ہماری طرح گنہگار تھا اور جلاوطنی میں اپنی زندگی گزار رہا ہے۔ مگر دادا! یہ تو بتاؤ تم یہاں کیسے آ پھنسے؟"

آکسینو بھولی ہوئی باتوں کو یاد کر کے اپنے زخم ہرے کرنا نہیں چاہتا تھا صرف اتنا کہا۔ اور خاموش ہو گیا۔ "چھبیس سال سے میں بھی اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔" میکار نے کہا۔ "دادا! وہ کونسے گناہ ہیں؟" آکسینو تو خاموش ہو گیا مگر دوسرے قیدیوں نے تمام ماجرا بیان کر دیا۔ میکار یہ سن کر بہت حیران ہوا اور کہا۔ "دادا! تم تو اتنی جلدی بوڑھے ہو گئے۔" قیدیوں نے اس کو حیران دیکھ کر پوچھا "کیا تم آکسینو کو جانتے ہو۔" میکار نے جواب دیا۔ "یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہماری ملاقات یہاں ان حالات میں ہوئی ہے" میکار کے بشرے اور طرز کلام سے آکسینو کو شبہ پیدا ہو گیا۔ کہ یہ شخص اصلی قاتل سے ضرور واقف ہے۔ اس نے کہا۔ "تم نے بھی اس واقعہ کا ذکر سنا ہوگا۔ اور ممکن ہے مجھے کہیں دیکھا بھی ہو۔" میکار نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ "مدتیں ہو گئیں اب تو یاد بھی نہیں۔" آکسینو نے کہا۔ "یہ تو تم نے سنا ہو گا کہ مسافر کو کس نے قتل کیا تھا۔" میکار نے ہنس کر کہا۔ "جس کے سامان سے خنجر نکلا اسی نے مارا ہو گا۔ فرض کرو کسی اور نے ہی مارا مگر اس کا ثبوت کیا ہے" یہ سن کر آکسینو کو پورا یقین ہو گیا۔ کہ اصلی قاتل یہی ہے۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔ بیوی بچوں کی تنہائی اور اپنی بےگناہی پہ روتا رہا۔ بار بار دل میں خیال آتا تھا کہ اس زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ اسی طرح پندرہ دن بےچینی میں گذر گئے۔

ایک رات اسی پریشانی میں وہ قید خانہ میں ٹہل رہا تھا کہ اسے قیدیوں کی خوابگاہ کی دیوار سے اینٹیں سرکتی نظر آئیں۔ رفتہ رفتہ خاصا بڑا سوراخ ہو گیا اور میکار اس میں سے نکل کر آکسینو کے سامنے آ موجود ہوا۔ اور کہا۔

"ہش! خاموش رہو۔ ہم دونوں نکل چلیں گے۔ اگر تم نے شور مچایا تو میرے تو کوڑے پڑیں گے ہی مگر میں تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔" آکسینو نے غصہ میں کہا۔ "میں بھاگنا نہیں چاہتا۔ تم مجھے پہلے ہی زندہ در گور کر چکے ہو اب مارنے کی کیا ضرورت ہے۔" دوسرے دن جب قیدی کام پر جانے

لگے۔ تو سپاہیوں کی نظر سوراخ پر پڑ گئی۔ باقاعدہ تفتیش ہوئی۔ مگر سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آکسینو اپنی سچائی اور دیانت کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ جیلر نے اُس سے بھی پوچھا۔ مگر اُس نے صرف یہ جواب دیا۔ "جنابِ عالی! مجھے علم ہے مگر بتاؤں گا نہیں۔ میں آپ کے قبضہ میں ہوں جو چاہے کیجئے"۔ جیلر نے ہرچند کوشش کی مگر آکسینو نے مطلق نہ بتایا۔ مجبوراً معاملہ کو رفع وگذشت کرنا پڑا۔

اُسی رات کو جب آکسینو اپنے پلنگ پر لیٹا تھا۔ میکار چپکے سے آکر اُس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ آکسینو نے غصہ ہو کر کہا۔ "تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟ یہاں کیوں آئے ہو؟" میکار خاموش بیٹھا رہا۔ آکسینو غصہ سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو۔ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ میں پہریدار کو آواز دیتا ہوں۔" میکار نے جھک کر کہا "آکسینو مجھے معاف کرو۔ میں نے ہی مسافر کو قتل کیا تھا۔ اور خنجر تمہارے سامان میں چھپا دیا تھا۔ میں مارنا تو تم کو بھی چاہتا تھا۔ مگر تم بچ گئے۔ اور میں کھڑکی کی راہ سے بھاگ گیا۔" یہ کہہ کر وہ آکسینو کے قدموں میں گر پڑا۔ اور کہنے لگا۔ "خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے جرم کا اقرار کر دونگا۔ اور تم رہا ہو کر اپنے وطن چلے جانا۔" آکسینو نے کہا۔ "اب سب کچھ بیکار ہے۔ تمہاری وجہ سے مجھے چھبیس سال یہاں رہنا پڑا۔ میری بیوی مر چکی ہوگی۔ بچے بھول چکے ہونگے۔ اب کس کے پاس جاؤں اور کس لئے جاؤں؟" میکار نے کہا "جب میرے کوڑے لگے تھے تو اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی اب، تم کو دیکھ کر ہو رہی ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ تم نے مجھ پر مزید عنایت یہ کی۔ کہ دیوار کے سوراخ کا واقعہ جیلر کو نہیں بتایا۔ تمہیں مسیح کا واسطہ مجھے معاف کر دو۔"

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آکسینو بھی بھرا بیٹھا تھا۔ وہ بھی خوب دل کھول کر رو دیا۔ اور کہا۔ "میکار! میں نے تمہیں معاف کیا۔ خدا بھی تمہیں معاف کرے۔"

رونے سے دل کی بھڑاس کم ہو گئی۔ اب اسے گھر جانے کی آرزو نہ تھی۔ صرف موت کا انتظار تھا۔ آکسینو کے منع کرنے کے باوجود میکار نے اقبالِ جرم کر لیا۔ لیکن اِدھر آکسینو کی رہائی کا حکم آیا۔ اُدھر اُس کی روحِ تنِ خاکی سے پرواز کر گئی۔

(ٹالسٹائی) (مس) **فہمیدہ اختر** ایس۔ ایم۔ آئی

حسین دھوکے

حُسن کو گدگدائے دیتے ہیں — لیجئے مسکرائے دیتے ہیں
کس نے لُوٹی نگاہ کی دولت؟ — دیکھئے ہم بتائے دیتے ہیں
کتنے پُرکیف اِن کے نغمے ہیں — دل کو جو دل بنائے دیتے ہیں
وصل رنگین کے ہیں ترے مژدے — غم کو جو غم بنائے دیتے ہیں
اِس سے حاصل حیات دلکش ہے — درد کو کیوں اُٹھائے دیتے ہیں
قہقہے سے یہ کیسے کوند گئے؟ — بجلیوں کو جلائے دیتے ہیں؟
لذت ہجر یار کے صدقے — ہر خوشی ہم بھلائے دیتے ہیں!
ہنس رہے ہیں فلک پہ جو تارے — یاد اُن کی دلائے دیتے ہیں!

کاش مجھ سے بھی مل لئے ہوتے
دل کو جو یُوں جگائے دیتے ہیں

—— کنیز فاطمہ **کاشش** ایم اے ہندی (کانپوری)

مختار

گداگر

اگرچہ اس کی موجودہ حالت نہایت ہی قابلِ رحم تھی۔ لیکن اُس نے کبھی اچھے دن بھی دیکھے تھے۔ وہ اپاہج تھا۔ اُس کی دونوں ٹانگیں گاڑی کے نیچے آ کر کٹ چکی تھیں۔ اُسی دن سے اُس نے بھیک مانگنا شروع کر دی تھی۔ کندھوں کے نیچے دو لکڑیوں کے سہارے وہ اپنے آپکو سڑکوں پر اور گلی کوچوں میں لئے پھرتا۔ اس کے کندھے اس کے جسم کا بوجھ اُٹھانے کے باعث کانوں سے بھی اُوپر نکل گئے تھے۔

وہ ایک یتیم بچہ تھا۔ جسے محلے کے پادری نے ایک صبح بدرو کے کنارے پڑا پایا تھا۔ خیرات کے ٹکڑوں پر اُس کی پرورش ہوئی تھی۔ تعلیم سے بالکل وہ بے بہرہ تھا۔ بدحواسی میں وہ ایک گاڑی کے نیچے آ گیا تھا۔ جس سے ہمیشہ کے لئے ٹانگوں سے محروم ہو گیا تھا۔ اب وہ صرف یہ جانتا تھا کہ بھیک مانگنے کے لئے ہاتھ کس طرح پھیلایا جاتا ہے۔

کچھ مدت تک وہ ایک نیک دل بیوہ کے ہاں رہا۔ جس نے اُسے اپنے مرغی خانہ کے قریب تھوڑی سی جگہ دے رکھی تھی۔ وہاں وہ گھاس پھوس کے بستر پر رات کو پڑا رہتا۔ کبھی کبھی چند ٹکے اور رُوکھا سُوکھا ٹکڑا بھی مل جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ بھی اب مر چکی تھی۔

گاؤں کے لوگ اس بدشکل بھدے فقیر کو گذشتہ چالیس سال سے روزانہ دربدر اپنی بھدی لکڑیوں کا سہارا لئے بھیک مانگتے دیکھتے دیکھتے تنگ آ گئے تھے۔ اُسے آتا دیکھ کر لوگ نفرت سے مُنہ پھیر لیتے۔ بچے اُس کے گھناؤنے انداز سے ڈر کر بھاگ جاتے۔ عورتیں اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیتیں۔ اس بدنصیب، سیاہ بخت فقیر نے اپنی زندگی کے گذشتہ ایام اپنے ہم جنسوں کے ہاتھوں ناقابلِ بیان ظلم سہہ سہہ کر گذارے تھے۔ وہ ان دو تین گاؤں سے کبھی باہر نہیں گیا تھا اس کے لئے درختوں کی اُس قطار کے پرے جو اُسے اُفق پر نظر آتی تھی۔ دنیا کی حدود ختم ہو جاتی تھیں جب گاؤں کے رہنے والے جو اُس سے تنگ آ چکے تھے۔ کہتے "تم کسی اور گاؤں میں کیوں نہیں چلے جاتے"۔ تو وہ کچھ سہم سا جاتا اور اُس سے کوئی جواب بن نہ آتا۔ اُسے کسی نئی جگہ جانے میں ہزاروں خطرات نظر آتے تھے۔ ناآشنا ہمدردی سے خالی صورتیں اُن کا اس پر آوازے کسنا۔ اُن کا اس کی بےبسی اور بےچارگی کا مضحکہ اُڑانا۔ شریر لڑکوں کا اس کے گرد جمع ہو کر اُسے تختۂ مشق بنانا۔ اور پھر پولیس گویا اسے ساری دنیا ہی دشمن نظر آتی تھی۔ وہ پولیس سے بہت گھبراتا تھا۔ جب کبھی سپاہیوں کو انوکھی وردیاں پہنے دیکھ لیتا۔ تو غیرمعمولی پھرتی سے وہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا۔ اپنی لکڑیاں زمین پر پھینک دیتا۔ اور زمین پر خرگوش کی طرح سکڑ کر اس طرح پڑا رہتا۔ گویا کوئی پرانا کپڑا ہے۔ پولیس سے اسے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ لیکن اس سے خوف کھانا اُس کی فطرت میں داخل تھا۔ شاید یہ خوف اُسے والدین سے ورثہ میں ملا تھا۔ جنہیں دیکھنا کبھی اُسے نصیب نہ ہوا تھا۔ اُس کے لئے کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ تھی۔ زمین اپنی انتہائی وسعت کے باوجود بھی اس کے لئے تنگ تھی۔ پرندے بھی اپنے لئے گھونسلا بنا لیتے ہیں۔ لیکن یہ انسان، بدقسمت انسان اس سے بھی محروم تھا۔ گرمیوں میں تو آسمان کے نیچے ہر کہیں رات بسر ہو سکتی ہے مگر سردیوں میں اصطبلوں میں اور گھاس کے انباروں میں وہ پناہ لیتا اور رفتہ رفتہ اس کی اِسے خوب مہارت ہو گئی تھی۔ صبح سویرے ہی قبل اس کے کہ اس کی موجودگی کا علم ہو وہاں سے چل دیتا۔ اُسے وہ تمام سوراخ یاد تھے۔ جن کے ذریعے کسانوں کی ویران جھونپڑیوں میں داخل ہونا ممکن تھا۔ سختیاں سہہ سہہ کر اس کے بازوؤں میں حیرت انگیز قوت آ گئی تھی۔ وہ اکثر اوقات محض ہاتھوں کے زور سے گھاس کے انباروں پر چڑھ جاتا اور اگر اس کے پاس کھانے کا سامان ہوتا تو تین تین چار چار دن وہیں پڑا رہتا۔

وہ جنگلی جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ انسانوں کے درمیان اپنے ہم جنسوں کے درمیان جنہیں اشرف المخلوقات ہونے پر فخر ہے، رہتا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ کسی کو اُس سے اُلفت نہ تھی۔ کسی کو اُس کی حالتِ زار پر کبھی رحم نہیں آیا تھا بلکہ برعکس اس کے

اس علاقے کے باشندوں کو اُس سے خدا واسطے کا بَیر تھا۔ وہ اُسے نفرت سے "کھڑپال" کہتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنی لکڑیوں کے درمیان گرجائے گھنٹوں کی طرح لٹکتا رہتا تھا۔ دو دن سے اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کوئی اُسے کچھ دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ ہر ایک کا پیمانۂ صبر لبریز ہوچکا تھا۔ گاؤں کی عورتیں اسے دُور سے آتا دیکھ کر چلاتیں "دور ہوجاؤ بے شرم نابکار کہیں کے۔ آج پھر آگئے ہو۔ ابھی تین دن ہوئے میں نے تمہیں روٹی کا ٹکڑا دیا تھا" اور وہ خاموشی سے دوسرے دروازے کی طرف چل دیتا۔ جہاں اس سے پھر ایسا ہی سلوک ہوتا۔ عورتیں دروازے پر کھڑی ہوکر ایک دوسری سے کہتیں "ہم اس وحشی کو سارا سال کس طرح مفت میں روٹیاں کھلا سکتے ہیں" لیکن آہ اس وحشی کو ہر روز کھانے کی ضرورت تھی۔

وہ یکے بعد دیگرے تین گاؤں پھر چکا تھا۔ جہاں سے اُسے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ملا تھا۔ اب صرف ایک گاؤں سے کچھ ملنے کی اُمید ہوسکتی تھی۔ لیکن وہاں پہنچنے کے لئے اسے پانچ میل چلنا پڑتا تھا اور وہ اس قدر تھکا ہوا تھا۔ کہ ایک قدم اُٹھانا بھی اُسے دوبھر تھا۔ اس کی جیب اور معدہ دونوں خالی تھے۔ لیکن اس اُمید موہوم پر کہ شاید وہاں سے کچھ مل جائے وہ چل پڑا۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ سخت سرد ہوا چل رہی تھی۔ اور درختوں کی ننگی ٹہنیوں میں سے ایک خوفناک آواز پیدا کرتی ہوئی گذرتی تھی۔ سیاہ بادل آسمان کو گھیرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی بادل کی دل دہلا دینے والی گرج بھی سنائی دیتی تھی اپاہج فقیر سردی اور بھوک سے نڈھال آہستہ آہستہ لکڑیوں کو باری باری اُٹھاتا اور ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ سہارے جس میں ابھی کچھ بوجھ سہارنے کی سکت باقی تھی۔ قدم بڑھاتا چلا جارہا تھا۔ کبھی کبھی کسی پتھر پر سستانے کے لئے بیٹھ بھی جاتا۔ بھوک کی شدت سے اس کی انتڑیاں ایک دوسری کو کھانے کے لئے بیقرار ہورہی تھیں۔

اُس کے پریشان دماغ میں صرف ایک خیال ایک دہم جاگزیں تھا۔ بھوک نے اس کی دماغی تمام طاقتیں سلب کرلی تھیں۔ اسے رہ رہ کر کھانے کا خیال آتا تھا۔ لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ کہ اس کی یہ خواہش یعنی کھانے، چبانے۔ اور نگل جانے کی خواہش جو ہر جاندار یکساں طور پر محسوس کرتا ہے۔ کس طرح پوری ہوگی۔ وہ متواتر تین گھنٹے چلتا رہا۔ اور جب اُسے گاؤں کے درختوں کے جھنڈ نظر آئے تو اُسے اپنے تھکے ماندے جسم میں ایک نئی طاقت محسوس ہوئی۔ اور وہ راستے کی ساری کلفت بھول گیا۔

اسے گاؤں سے باہر ایک کسان ملا جس کے آگے اُس نے دستِ سوال دراز کیا۔ کسان نے تیوری چڑھا کر کہا "اچھا تم ہو۔ تم پھر آگئے ہو۔ تو کیا ہمیں تم سے کبھی چھٹکارا نصیب نہیں ہوگا" بے چارا اپنا سا مُنہ لے کر رہ گیا ناگوار الفاظ اور دو چار گالیوں کے سوا کسی دروازے سے اُسے کچھ نہ ملا۔ اس نے ایک ایک دروازے پر دستک دی لیکن بےسود اُسے کچھ نہ ملا۔

پھر دوبارہ کھیتوں میں کسانوں کی جھونپڑیوں میں گیا۔ بھوک سے وہ اب اس قدر مضمحل ہو رہا تھا کہ اپنی لکڑیوں کو بمشکل زمین سے اُٹھا سکتا تھا لیکن یہاں بھی اسے مایوسی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

جب وہ سب طرف سے مایوس ہوگیا۔ تو ایک نہر کے کنارے جو ایک کھیت میں سے بہتی تھی بیٹھ گیا۔ اپنی لکڑیاں اُس نے ایک طرف رکھ دیں اور بھوک سے نڈھال بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اب وہ اس قابل بھی نہ تھا۔ کہ اپنی ناقابل بیان خستہ حالی کو پوری طرح محسوس کرسکے۔ وہ بیٹھ کر خدایا اس کے بندوں کی طرف سے کسی غیبی مدد کا انتظار کرنے لگا۔ ایک اُمید موہوم جو ہر طرف سے مایوس ہوچکنے کے باوجود ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ہوتی ہے۔ اس کو ڈھارس دے رہی تھی۔ دسمبر کا مہینہ اور اس قدر کڑا کے کا جاڑا، باد صرصر کے منجمد کردینے والے جھونکے، ان آسمانی آفتوں کے علاوہ تین دن کا بھوکا۔ لیکن ابھی تک زندہ تھا—— آہ انسان بھی کس قدر سخت جان ہے

اسے سامنے چند مرغیاں نظر آئیں وہ زمین پر نظر گاڑے آہستہ آہستہ دانے دُنکے کی تلاش میں پھر رہی تھیں۔ وہ زمین سے اپنی چونچ میں کبھی کوئی دانہ اور کبھی کوئی کیڑا اُٹھالیتیں اور اسے نگل کر پھر تلاش میں مصروف ہوجاتیں کچھ دیر تو وہ خاموشی سے بغیر کچھ سوچے سمجھے اُنہیں دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اس کے دل میں نہیں بلکہ اس کے معدے میں انتڑیوں میں ایک خیال پیدا ہوا۔ کہ ان میں سے ایک مرغی . . . . خشک لکڑیوں کی آگ پر . . .

اس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اور آنکھیں چمک اُٹھیں۔

اُسے یہ خیال نہ آیا کہ وہ چوری کرنے لگا ہے۔ اُس نے ایک پتھر اُٹھایا جو پاس ہی پڑا تھا۔ اور ایک مرغی کے اس طرح مارا کہ وہ وہیں نیم جان ہو کر پھڑپھڑانے لگی۔ دوسری مرغیاں ڈر کر ادھر اُدھر بھاگ گئیں۔ اس نے اپنی لکڑیاں سنبھالیں اور اپنا شکار اُٹھانے کے لئے بڑھا۔ ابھی اُس نے اُس پر ہاتھ رکھا ہی تھا۔ کہ اُس کی پُشت پر ایسی چوٹ لگی۔ کہ اُس کی لکڑیاں چھوٹ گئیں۔ اور وہ وہاں سے کئی قدم پرے جا گرا۔ دہقان نے جو مارے غصے کے دیوانہ ہورہا تھا۔ اُسے بُری طرح زدوکوب کرنا شروع کردیا۔ وہ بے یارو مددگار بے دست و پا زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ دہقان کا شور سُن کر مزدور بھی آگئے۔ اور اُنہوں نے بھی اس کے مارنے میں اپنے آقا کا ہاتھ بٹایا۔ جب سب مارتے مارتے تھک گئے تو اُسے مکان میں بند کردیا اور پولیس کو بلانے

کے لئے آدمی بھیج دیا۔

وہ بے چارا زخمی، آدھ مؤا۔ بھوک سے نڈھال فرش پر پڑا رہا۔ شام ہوئی۔ رات گذری۔ صبح نمودار ہوئی۔ لیکن اُسے اب تک کھانے کے لئے کچھ نہیں ملا تھا۔ دوپہر کے وقت پولیس آئی۔ غیر معمولی احتیاط سے دروازہ کھولا گیا۔ کیونکہ اُنہیں ڈر تھا کہ چور کہیں حملہ نہ کر دے۔ کسان کا بیان تھا۔ کہ اُس نے اُس پر حملہ کیا تھا۔ اور اگر مزدور اس کی مدد کو نہ آجاتے تو خدا جانے اس پر کیا گذرتی۔ سپاہی نے کہا "اُٹھو"۔

لیکن اُس میں تو حرکت کرنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ اُس نے کھڑا ہونے کی بہتیری کوشش کی مگر سب بے سود۔

سپاہی نے یہ سمجھ کر کہ وہ بہانہ کر رہا ہے۔ اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر ٹکڑیوں پر لٹکا دیا یعنی کھڑا کر دیا۔

اب اُس پر ایک بے پناہ خوف طاری ہو گیا۔ پولیس کا خوف جو اُس کی فطرت میں داخل تھا۔ اُس کی حالت بالکل اس چوہے کے مشابہ تھی۔

جو بلی کے پنجوں میں ہو اور زندہ ہو، وہ ایک غیر معمولی فوق الفطرت کوشش سے کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

"چلو" سپاہی نے حکم دیا۔

وہ چل پڑا سب نے اُسے جاتے دیکھا۔ عورتوں نے اُس پر آوازے کسے۔ مردوں نے اُس کا تمسخر اُڑایا "شکر ہے کہ اس سے چھٹکارا نصیب ہوا"۔ سب نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

وہ دو سپاہیوں کے درمیان چلتا گیا۔ خدا جانے اس میں اتنی ہمت کیسے آئی وہ شام تک چلتا رہا۔ لیکن اس کا پریشان دماغ شکستہ حالی کے احساس سے قاصر تھا۔

لوگ جو اُسے راستے میں دو سپاہیوں کے درمیان چلتا دیکھتے۔ رُک جاتے اور ایک دوسرے سے کہتے "شاید کوئی چور ہے"۔

"دورِ جدید"

ابرِ بہار

کیف و رنگ و نور کے پرچم سے لہراتا ہوا
آ رہا ہے ابر گاتا، رقص فرماتا ہوا!!

مائلِ صد بیخودی خبطِ شعور و ہوش ہے
زندگی کے میکدے میں شورِ نوشانوش ہے

ہو رہی ہے کیف کی تقسیم ہر ہر گام پر
اور ٹھیرتی ہی نہیں دل کی نظر انجام پر

مضمحل افکار میں رعنائیاں سی بھر گئیں
رُوح کو اور دل کو جو احساس پیدا کر گئیں

چار سُو مدہوشیوں کے رنگ چھا جانے لگے
رنگ و بُو کے کارواں در کارواں آنے لگے

ساقیٔ خوش وقت نے ساغر اُٹھایا جھوم کر
کیف نے انگڑائی لی، صہبا کا دامن چوم کر

طائرانِ گلستاں کو کچھ خزاں کا غم نہیں
خشک سالی کا اب ان کے واسطے عالم نہیں

ذرّے ذرّے سے چھلک اُٹھی شرابِ شعلہ رنگ
خود بخود بجنے لگے رعنائیوں کے سازِ چنگ

بزمِ ہستی بن گئی ہے سر بسر کیف تمام
کتنا رفعت آشنا ہے جوشِ مستی کا مقام

آثر چکوالی بی اے

صفحہ اطفال

ہمارے دیس کی بہار

ہمارے دیس کی بہار برسات ہے۔ کبھی برسات ہمارے لئے رحمت بن کر آیا کرتی تھی۔ گھر گھر جھولے گاڑے جاتے تھے۔ دن رات گھروں کی لڑکیاں برساتی گیت گایا کرتیں۔ ہر گھر پکوان پکتا۔ ساون کی جھڑی میں آموں کا نوروز منایا جاتا۔ باغوں میں بازار لگ جاتے۔ عورتیں رنگ برنگ کی ساڑیاں پہن کر جاتیں۔ نت نئی چُنیاں رنگوائی جاتیں۔ غرضکہ برسات کے سبب جنگل میں منگل منایا جاتا تھا۔ توری ترکاری کے رنگ برنگے پھولوں میں رات کو جگنوؤں کی جگ مگ جگ مگ عجیب بہار دیا کرتی تھی۔

کبھی ہندوستانی کسان کے دل کی کلی برکھا رُت کی ہواؤں ہی سے کھلا کرتی تھی۔ کھیتی باڑی کی لہر بہر دیکھ دیکھ کر کسان کا دل بلیوں اُچھلنے لگتا تھا۔

آج بھی ہندوستان میں برسات کا موسم ہے۔ لیکن جگہ جگہ سیلابوں نے تباہی مچا رکھی ہے۔ گاؤں کے گاؤں بہاؤ کے ساتھ بہے جا رہے ہیں۔ سیکڑوں آدمی اور ہزاروں ڈھور ڈنگر لاشوں کی صورتوں میں خوفناک طوفان کی ڈراؤنی لہروں میں بہے جاتے ہیں۔ کھیتی باڑی کی بربادی کا کیا ذکر جب کسانوں ہی کا تھل بیڑا کہیں لگتا دکھائی نہیں دیتا۔ ہزاروں لوگ اپنے مکانوں کی چھتوں پر سیلاب کے ڈر سے چمٹے بیٹھے ہیں۔ چھتیں بوجھل ہو ہو کر دھڑام دھڑام گر رہی ہیں۔ چھتوں پر بیٹھنے والے ملبے کے نیچے پانی میں دبے پڑے ہیں۔ کوئی مدد پہنچانے والا نہیں۔ معصوم بچے بجلی کی کڑک اور بادل کی گڑگڑاہٹ سے سہم سہم کے ماؤں سے چمٹے جاتے ہیں۔ مائیں بیچاریاں بے بس ہیں۔ ان ننھی جانوں کے لئے کوئی پناہ کی جگہ نہیں پاتیں۔

بڑے بڑے تجارتی شہروں میں بند ٹوٹنے کے سبب لت گت پانی آگیا ہے۔ بازاروں میں کشتیاں چل رہی ہیں لاکھوں روپے کا تجارتی سامان غارت ہوگیا۔ غریب سوداگروں کے اب دیوالے نکل جائینگے۔ ہندوستان کی ساکھ ٹوٹ جائیگی

پہلے زمانے کی برکھا رُت رنگ رلیاں منانے آیا کرتی تھی۔ آج کل کی برسات خُون کے آنسو رُلانے آتی ہے۔

پہلے برسات کا موسم خوشیوں کا پیغام لاتا تھا۔ ہر شخص خوشی میں جھومتا نظر آتا تھا۔ گھر گھر خوشی کے شادیانے

سمجھتے تھے۔

اب برسات آسمانی آفت بن کر آتی ہے۔ نہ کوئی سنتا ہے نہ کسی کو رونے کی تاب۔ ہر شخص پر بدحواسی چھائی ہوئی۔ ہر ایک کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

گھر کی بربادی، مال کی بربادی، جان کی بربادی، ان بربادیوں پر رونے کی کسے تاب ہے۔ ہر ایک کو چپ لگی ہوئی ہے۔ "الٰہی خیر کیجو"۔ "پرماتما دیا کر"۔ ہر ایک کی زبان پر یہی فقرہ ہے۔ برکھا رُت کی وہ رنگ رلیاں قصے کہانیاں بن گئیں۔ وہ پکوان پکنا اور ساون میں آموں کا نوروز۔ باغوں کے جھولے۔ خواب وخیال ہو گئے۔ مگر یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے ذمہ وار ہم خود ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم سے خدا ناراض ہے۔ ناراض نہ ہوتا تو برسات کو ہمارے لئے قیامت کی گھڑی نہ بناتا۔ ناراض کیوں ہے؟ اس لئے کہ ہم نے خدا کی بندگی چھوڑ دی۔ انسانوں کے بندے بن گئے۔ خدا کی غلامی سے نکل کر اپنی بُری خواہشوں کے غلام بن گئے۔ خدا کو دلوں سے بھلا دیا۔ دل کے مندر میں انسانوں کی پوجا شروع کر دی۔ اپنا آقا اور معبود بنا لیا۔

اے خدا ہم اچھے ہیں یا بُرے ہیں۔ آخر تیرے بندے ہیں۔ ہمارے کرموں پر نہ جا۔ اپنی دیا کو سامنے رکھ۔ ہمارے پاپ اپنی رحمت کے پانی سے دھو ڈال! اور ہمارے من میں پوترتا (پاکیزگی) پیدا کر۔ ہمیں پاپ کے ٹیڑھے راستے سے ہٹا کر سچائی کی سیدھی پگ ڈنڈی پر ڈال دے۔ ہمیں اپنا بندہ بنا کر جھوٹے آقاؤں کی غلامی سے نجات دے۔

تاجور

ہمارا مذہب

ہمارا مذہب تہذیب وانسانیت ہے۔ وہ انسان انسان نہیں کہا جا سکتا جس میں تہذیب وانسانیت نہ ہو۔ پچھلے زمانے کے بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے لوگ انسانیت کے مفہوم کو نہ سمجھتے تھے۔ تہذیب ان میں نام کو نہ تھی۔ لیکن اس وقت بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے۔ جنہوں نے اپنی جانیں قربان کر کے اپنی قوم کو تہذیب وانسانیت سکھلائی۔ اور ان کے نام آج تک زندہ ہیں۔ آج ہم روما کا ایک واقعہ سُناتے ہیں۔ اس واقعہ کو پڑھ کر ہر ایک سمجھ سکتا ہے۔ کہ تہذیب وانسانیت کے کیا فائدے ہیں۔ اور حیوانیت ودرندگی کے کیا نقصانات ہیں۔

پچھلے زمانے میں روما والوں کا یہ دستور تھا۔ کہ اپنے دل بہلاوے کے لئے یہاں اور بہت سے کھیل تماشے کرتے تھے۔ وہاں وہ تلواروں سے بھی لڑتے تھے۔ اور اس کھیل میں کھیلنے والے لہولہان ہو جاتے تھے۔ روما والوں کو اس کھیل میں جتنا لطف آتا۔ اتنی کسی دوسرے کھیل میں اُن کی دلچسپی نہ ہوتی۔ وہ لوگ اس خونریزی کو کھیل تماشا سمجھتے۔ اور جب اس قسم کا تماشا ہوتا۔ تو سارے شہر میں چھٹی ہو جایا کرتی۔ سکول بند ہو جاتے۔ دفاتر میں چھٹیاں ہو جاتیں۔ کچہریاں اور عدالتیں سنسان ہو جاتیں۔ غرض

ہر محکمے اور ہر قسم کے لوگ یہ تماشا دیکھنے آجاتے۔ امیر، وزیر، مجسٹریٹ اور تمام اعلیٰ افسروں کے علاوہ خود قیصر روم بھی موجود ہوتا۔ اور یہ لوگ بڑی بیتابی سے اس خونریزی کا انتظار کرتے تھے۔

تماشا جس وقت شروع ہوتا۔ تو پہلے جانور لڑائے جاتے ان بے زبانوں کی جانیں ضائع ہوتیں اور دیکھنے والے خوش ہوتے اور جب جانوروں کا وقت ختم ہوجاتا تو پھر رومی پہلوان اکھاڑے میں تلواریں لے کر نکلتے اور خوب آپس میں لڑتے۔ ان کے بدن سے خون کے فوارے نکلتے اور جتنی زیادہ خونریزی ہوتی۔ اتنا ہی زیادہ تماشے کو کامیاب سمجھا جاتا۔ یہ تماشا رات تک ہوتا تھا۔ بلکہ اکثر تو ساری ساری رات گزر جاتی۔ اور اس خونریزی کا اثر یہ ہوتا کہ دیکھنے والے بیہوش ہوجایا کرتے تھے۔

رُوما میں اس قسم کے تماشوں کا رواج چوتھی صدی عیسوی کے [illegible] رہا ہے۔ اور اس کھیل کی بدولت لاکھوں ایسی جانیں ضائع ہوگئیں۔ جن سے ایسے اور بہت سے کام لئے جا سکتے تھے۔ جو قوم اور ملک کے لئے بے حد مفید ثابت ہوتے۔ ۴۰۴ء میں ایک بڈھا درویش یہ ارادہ کرکے اُٹھا۔ کہ اگر میری جان ضائع ہوجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس وحشیانہ کھیل کو بند کرا کے چھوڑوں گا۔ یہ درویش بالکل گمنام اور غیر معروف تھا۔ وہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ دنیا والوں سے ملنا جلنا پسند نہ تھا مگر اُس کے دل میں قوم کا ایسا درد تھا۔ کہ صرف اس خونریزی کو بند کرنے کے لئے اُس نے اپنی جان قربان کرنے کا ارادہ کرلیا۔ وہ دُور دراز کا سفر طے کرکے روما پہنچا۔ اس وقت نہ تو وہ رُوما والوں میں سے کسی کا واقف تھا۔ اور نہ اِس سے اہلِ رُوما واقف تھے۔

ایک دن قیصر رُوم کی طرف سے اعلان ہُوا کہ پہلوانوں کی خُونریز لڑائی فلاں روز فلاں اکھاڑے میں ہوگی۔ جب وہ دن آیا تو اہلِ رُوما جوق درجوق آنے لگے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں بہت زیادہ مجمع ہوگیا۔ یہ درویش بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ اپنے ارادے میں مضبوط تھا۔ لڑنے والے تیز برچھیاں اور تلواریں لے کر اکھاڑے میں اُترے۔ اس درویش کے دل کو یہ خیال بھی دہلا دیتا تھا۔ کہ یہ لڑائی اُس وقت تک ختم نہ ہوگی۔ جب تک ان دونوں لڑنے والوں میں سے ایک کی زندگی کا خاتمہ نہ ہوجائے۔ بڈھا درویش ان دونوں پہلوانوں کو اکھاڑے میں دیکھ کر بیتاب ہوگیا اکھاڑے میں کود پڑا۔ اور لڑنے والے پہلوانوں کے بیچ کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا کہ بس ناحق خون بہانے سے باز آؤ"

یہ دیکھ کر چاروں طرف شور مچ گیا۔ ہر طرف سے لوگ کہنے لگے کہ اس کمبخت بوڑھے کو یہاں سے نکالو۔ مگر وہ کب ہٹنے والا تھا۔ لڑنے والوں نے اس کو دھکا دے کر ہٹانے کی کوشش کی۔ اور لڑائی شروع کرنے کو تیار ہوگئے۔ مگر وہ درویش پھر چمکتی ہوئی تلواروں کے بیچ میں آگھسا۔ اور پھر اُن کو اس خونریزی سے روکنے لگا۔ پھر اہلِ تماشا نے چلاّ کر کہا کہ اس کو مار ڈالو۔ حاکم نے بھی اس بات کو منظور کرلیا۔ لڑنے والوں نے

قیصر روم کا اشارہ پاتے ہی اس درویش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اور اس کی لاش کے اُوپر پاؤں رکھ کر لڑنے کے لئے آگے بڑھے۔

بوڑھے درویش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اور اُس نے بڑی خوشی سے اپنی جان قربان کی۔ لیکن اس کی قربانی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ خود بخود سارے تماشائیوں کے دل میں یہ بات کھٹکنے لگی۔ کہ یہ اُن سے غلطی ہُوئی۔ کہ ایک نیک انسان جو ان کو درندگی سے باز رکھنے کے لئے آیا تھا۔ اور انسانیت و تہذیب کا سبق دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ اتنا بُرا سلوک کیا گیا۔ جو حیوان کیا کرتے ہیں وہ اپنی سنگدلی اور بے رحمی پر بڑے شرمندہ ہُوئے اور جس روز کہ اس بڈھے درویش نے اپنی جان کی قربانی دی تھی۔ اُسی روز سے رُوما کی تماشاگاہ میں اس قسم کے خونریز کھیل تماشے بند ہوگئے۔

انسانیت اور تہذیب ہم کو خونریزی اور لڑائی جھگڑوں سے الگ رہنے کا سبق دیتی ہے۔ انسان وہ ہے جس کے دل میں دوسروں کی ہمدردی ہو۔ مہذب وہ ہے جس میں جانوروں کے جیسے خصائل موجود نہ ہوں۔ یہی دو اصول ہیں جن پر اگر ہم عمل کریں۔ تو انسان بن سکتے ہیں۔ اور یہی ہمارا مذہب ہے۔ (طالب فارسی)

منقول از پریم

نقوشِ جمیل

میرا جامِ شکستہ، جامِ ہوش افزا نہ ہو جائے　　کہیں برہم نہ سب کیفیتِ مےخانہ ہو جائے
نگاہِ شوق جو فی الحال ہے اِک رازِ درپردہ　　اگر رُوداد بن جائے، اگر افسانہ ہو جائے
دکھائے شعبدہ گر عشق اِ جلنے کی وہ کیفیت　　زبانِ شمع فریادِ غمِ پروانہ ہو جائے
وہ مجھ کو دیکھتے ہیں اب نگاہِ مہر آگیں سے　　ذراسی بات سے لیکن اگر افسانہ ہو جائے
ہوس سے بھر نہ اے عقلِ خرومایہ میرے دل کو　　یہ میرا دین ہے ظالم کہیں دنیا نہ ہو جائے

شہید اپنی یہ چشمِ خشک اگر ہو مائلِ طوفاں
تو دنیا دیکھ لے دریا بکفِ پیمانہ ہو جائے

قربان حسین شہید

بزمِ انتخاب

موجودہ سائنس کی ترقی

"برلن میں ایک سکول تیار ہو رہا ہے۔ جس کی دیواریں کوارٹس سے تعمیر کی جائیں گی۔"

یہ خبر جو روزنامۂ نیویارک امریکن سے مقتبس ہے۔ بادی النظر میں معمولی معلوم ہوتی ہے۔ فی الواقعہ ایک عظیم الشان انقلاب کا پتہ دیتی ہے۔ آفتاب کی وہ شعاعیں جو نظر نہیں آتیں۔ اور جن کا اصطلاحی نام الٹرا وایولیٹ نہایت صحت افزا ہیں۔ مغربی ہسپتالوں میں اُم الصبیان کا علاج ان ہی شعاعوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ دقت یہ ہے کہ یہ ناد نبفشی شعاعیں شیشے میں سے نہیں گذر سکتیں۔ ماہرین سائنس نے ایک خاص شیشہ تیار کیا ہے۔ جسے کوارٹس کہتے ہیں۔ اب ہسپتالوں میں عام شیشے کی بجائے یہی کوارٹس استعمال ہو رہا ہے اور برلن میں ایک ایسے مدرسے کی تعمیر جس کی دیواریں بھی کوارٹس سے بنیں گی۔ اور طلبا ء سکول کی چار دیواری میں رہ کر اس نئی روشنی کی وجہ سے ویسے ہی صحت مند ہونگے۔ جیسے سمندر کی کھلی ہوا میں رہنے والے۔

ایک مغربی عالم نے جدید سائنس کو ایک ایسے کولمبس سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا ہر قدم نئی سرزمینوں کی طرف اُٹھتا ہے۔ سائنس کی ایجادات سے ہم عملی طور پر اس قدر متاثر ہیں کہ ہمیں اس کی رفتار ترقی محسوس نہیں ہوتی۔ ہر ایجاد خاموش تاثر کے ساتھ ہماری طبعی اور ذہنی زندگی کو منقلب کر رہی ہے۔ ہم مغربی سائنس کے محیر العقول انکشافات کو "مادہ پرستی کے مظاہرات" کہتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے۔ لیکن کیا ہماری "روحانیت" کے جملہ ذرائع اس "مادہ پرستی" کی تاب لا سکتے ہیں۔ ہم "مغرب کی تقلید نہ کرو" کہتے ہوئے بھی اس کی تقلید کرنے پر مجبور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بیسویں صدی میں تمام دنیا کم و بیش تیس ہزار سائنس دانوں کے رحم پر ہے۔ چند سال سے پہلے ہندوستان میں نیل کی کاشت ہوا کرتی تھی۔ مغرب کے کیمسٹ نے کوئلے اور کول ٹار سے نیل نکالا اور ہمیں اسی کیمیاوی نیل کے بغیر چارہ نہ رہا۔ مٹی کے تیل کی صنعت کا ایک تاریک پہلو یہ تھا۔ کہ لاکھوں روپیہ ایسے تاریک کنوئیں کھودنے میں صرف ہو جاتے تھے۔ جو بالآخر خشک ثابت ہوتے تھے۔ ہنگری کے ایک سائنسدان نے مختلف مقامات پر کشش زمین کے تغیرات ناپنے کا ایک آلہ تیار کیا۔ ایک اور ماہر سائنسدان نے آئینسٹن کے "نظریہ اضافیت" کی آزمائش کے لئے اسی قسم کا ایک اور آلہ بنایا۔ تیل کے سوداگروں کو اس کا علم ہوا۔ اُنہوں نے ان ہی ماہرین سائنس کی مدد سے مٹی کے تیل کی گہرائی معلوم کرنے کے آلات تیار کئے۔ اب دنیا مجبور ہے کہ وہ یا تو ان ہی سے مستفید ہو یا گھاٹے میں رہے۔

یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ دس میں سے نو ایجادیں محض حُسنِ اتفاق کا نتیجہ ہیں۔ کولمبس نے ہندوستان کو آنے کی کوشش میں امریکہ دریافت کر لیا موجودہ سائنس کی روش بھی کولمبس کی طرح ہے۔ اور اب یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ سائنس کے میدان میں "اصول و نظریہ" اور "فعل و عمل" کے مابین کوئی خط امتیازی نہیں۔ جو آج نظریہ ہے۔ وہ کل عملی حقیقت ہے۔ آئینسٹن نے مدت العمر فکر و غور کے بعد اپنی مشہور تھیوری پیش کی۔ اس نے کہا جو نتائج میں نے مستخرج کئے ہیں۔ اگر وہ واقعی صحیح ہیں تو ماننا پڑیگا۔ کہ جب کسی اشارہ کی شعاع آفتاب کے دائرہ کشش میں سے گزرتی ہے۔ تو اس کشش کی قوت کے اندازہ سے خمیدہ ہو جاتی ہے۔ ماہرین سائنس نے یہ دعوےٰ سُنا تو کہا کہ

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

ایک مادی شے تو خمیدہ ہو سکتی ہے۔ لیکن شعاع کا خم کھا جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ شعاع نہ ہوئی شہتوت کی چھڑی ہوئی۔ گذشتہ سورج گرہن کے موقعہ پر بہت سے اہل نجوم نے آفتاب کی عکسی تصاویر لیں۔ اور دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ آئینسٹن کا دعوےٰ درست تھا۔ ادھر ماہرین برق نے اپنی لیبوریٹریوں میں مسلسل تجربات سے اس امر کو پایۂ تصدیق تک پہنچا دیا۔ کہ مادہ اور قوت میں کوئی فرق نہیں۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ اب ایک جاپانی کیمسٹ نے اسی اصول کے ماتحت پارے کو سونے اور سونے کو پارے میں تبدیل کر دیا ہے۔ (دورِ جدید)

نوبل پرائز کی کہانی

ایلفرڈ نوبل، سویڈن کی راجدھانی، سٹاک ہالم میں ۲۱ر اکتوبر ۱۸۳۳ء کو پیدا ہوا تھا۔ اُس کا باپ اے نوایل نوبل اپنے زمانہ کا مشہور آدمی تھا۔ یہ شخص بلا کا محنتی تھا۔ اور بعض خاص قابلیتوں کا مالک۔ معمار کی حیثیت سے تعلیم پانے کے بعد وہ محض چھبیس سال کی عمر میں جیومیٹری کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔

اور چونکہ یہ کام اُس کی خداداد قابلیتوں کے لئے کافی میدان بہم نہیں پہنچاتا تھا۔ اس لئے اُس نے روس کے دارالسلطنت سینٹ پیٹرز برگ میں انجینئری اور جہاز سازی کے کارخانے کھولے اور ساتھ ہی تارپیڈو بنانے کا کام بھی شروع کر دیا۔ تقریباً بیس برس تک یعنی جنگ کریمیا کے ختم ہونے کے کچھ دن بعد تک اُس نے ان کارخانوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ چلایا۔ لیکن چونکہ اس لڑائی سے روسی حکومت کی مالی حالت بہت کچھ خراب ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ ان کارخانوں کے لئے کافی کام نہ دے سکتی تھی۔ اس لئے اُس نے انہیں اپنے ایک بیٹے لوئی کے سپرد کر دیا اور خود اسٹاک ہالم واپس آگیا۔ جہاں وہ اپنے دوسرے بیٹوں کی مدد سے پھٹنے والے گولے بنانے کی ترکیب معلوم کرنے میں مشغول ہو گیا۔

اُس وقت تک بھک سے اُڑنے والی جو چیز بنی یا صنعتی کارخانوں میں استعمال کی جاتی تھی۔ وہ ایک قسم کا کالے رنگ کا پاؤڈر تھا جو زور سے دھماکا پیدا کیا کرتا تھا۔ نائٹرو گلیسرین اگرچہ چند سال پہلے فرانس میں دریافت ہو چکا تھا۔ مگر وہ اتنا خطرناک مسالہ تھا کہ اُس کا استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اکتوبر ۱۸۶۳ء میں الفریڈ نوبل نے ایک ایسے پھٹنے والے مادہ کا پیٹنٹ کرایا جو نائٹرو گلیسرین اور معمولی بارود کا مرکب تھا۔ لیکن نائٹرو گلیسرین کے استعمال سے کئی سال تک خوفناک حادثے پیش آتے رہے۔ جن میں سب سے بڑا حادثہ شہر برسیلز میں ۱۸۶۸ء میں واقع ہوا۔ جس میں ایک درجن آدمی مر گئے تھے اور بیسیوں زخمی ہوئے تھے۔ اس واقعہ کے چار سال پہلے بھی ایک حادثہ ہوا تھا۔ جس میں الفریڈ کے چھوٹے بھائی آسکر امیل کی صرف اکیس سال کی عمر میں جان ضائع ہوئی تھی اور ہیلن برگ کا کارخانہ بھی تباہ و برباد ہو گیا تھا انہی حادثوں کی وجہ سے انگلستان میں پھٹنے والے مادے کے خلاف سخت نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور بعض دوسرے ملکوں نے بھی اس کے استعمال کے خلاف تجویزیں منظور کیں۔

الفریڈ نوبل نے ۱۸۶۷ء میں ڈائنامیٹ ایجاد کیا۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے وزن سے تین گنا نائٹرو گلیسرین جذب کر لیتا تھا۔ اسی آمیزش کا نتیجہ تھا کہ نائٹرو گلیسرین جیسی خوفناک چیز معمولی بارود سے بھی کم خطرناک ہو گئی اور سردی۔ گرمی یا پانی کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ چیز آج بھی پہاڑوں میں راستے بنانے اور چٹانوں کے اُڑانے میں کام آتی ہے۔ اس ایجاد کے بارہ سال بعد الفریڈ نے بیلسٹائٹ کا پیٹنٹ کرایا جو ایک قسم کا آتشگیر سفوف ہے جس میں آگ لگنے پر بھی دھواں نہیں نکلتا۔ اس ایجاد سے لڑائی کے طریقوں میں زبردست انقلاب ہو گیا۔

اس صنعت کو جوں جوں ترقی ہوئی، نوبل کا نام دنیا میں مشہور ہوتا گیا سان ریمو میں اُس نے ایک بہت بڑی لیبورٹری بنائی اور اپنے رہنے کے لئے ایک مکان بھی بنایا۔ جس کا نام اگرچہ (My Nest) یعنی "میرا گھونسلا" تھا۔ لیکن لوگ ہمیشہ اُسے "نوبل ولا" یعنی "نوبل کا محل" کہہ کر پکارا کرتے تھے

الفریڈ نوبل نے ایک اور چیز ایجاد کی، جس کا نام مصنوعی گٹاپارچہ ہے آج کل موٹر اور بجلی کا زمانہ ہے۔ مگر اسے ڈائنامیٹ کی دریافت سے کسی طرح کم نہ سمجھنا چاہیئے۔ اسی کے سلسلے میں نوبل بھاری بھاری گولے پھینکنے والی توپیں بھی ڈھالا کرتا تھا۔

نوبل نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ اس کا سارا وقت یا تو لیبوٹری میں گزرتا تھا یا سویڈن سے اٹلی اور اٹلی سے سویڈن اور دوسرے ملکوں میں آنے جانے میں صرف ہوتا تھا۔ بات یہ ہے کہ گرہستی کا سکھ اُٹھانے کے لئے اُس کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ پروفیسر لوئی ہنری کا جس نے سب سے پہلے الفریڈ نوبل کے حالات ایک فرانسیسی میگزین میں لکھے، بیان ہے کہ اُس کی ماں ہی اُس کے لئے محبت و پریم کی دیوی ہے۔ اور اُس کے سب بچے بھی اپنی ماں سے بڑی محبت اور عزت کے ساتھ پیش آیا کرتے تھے۔ ماں کا انتقال ۱۸۸۹ء میں چھیاسی سال کی عمر میں ہوا۔ اس واقعہ کے سات سال بعد الفریڈ نوبل کا بھی سان ریمو میں ۱۸۹۶ء میں انتقال ہو گیا۔

الفریڈ کی صحت کبھی اچھی نہیں رہی۔ وہ طبعاً گوشہ نشین واقع ہوا تھا۔ اُس کی زندگی بہت سادہ تھی۔ اور دولتمند ہونے کے باوجود اُس میں گھمنڈ نام کو نہ تھا۔ اپنی ایجادوں کی عظیم الشان کامیابی کی وجہ سے اُس نے اتنی دولت پیدا کر لی تھی کہ لوگ اُس کا اندازہ ساڑھے چار کروڑ فرانک کرتے تھے۔ مرنے سے کئی سال پہلے سے اُس نے سوچنا شروع کیا تھا کہ اتنی بڑی دولت کس کام میں صرف کرے۔ ساٹھ برس کی عمر میں اُس کے پاس تقریباً تین کروڑ روپے تھے جن کا وہ بلاشرکت غیرے تنہا مالک تھا۔ نوبل ہر وقت اسی سوچ بچار میں رہتا تھا۔ کہ یہ تین کروڑ روپیہ کس کام میں صرف کیا جائے۔

نوبل ٹرسٹ کے ایک ٹرسٹی مسٹر سولمین انجینئر کا بیان ہے کہ نوبل کا ہمیشہ سے یہی خیال تھا کہ "دولت کسی واحد شخص کو نہ ملنا چاہیئے۔ جس نے اُس کے لئے کبھی محنت نہ کی ہو اور نہ ایسے شخص کو ملنی چاہیئے۔ جو صرف اس وجہ سے اُسے حاصل کرنا چاہے کہ وہ فلاں کا بیٹا ہے یا بھتیجا ہے"۔ نوبل کا یہ بھی خیال تھا کہ "رشتہ داروں کے لئے کروڑوں روپیہ چھوڑ مرنا سخت بیوقوفی ہے"۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "ذاتی محنت کے بغیر کسی کو کوئی بڑا ورثہ چھوڑنا اُسے ہمیشہ کے لئے سُست، ناکارہ اور اپاہج بنا دینے کے برابر ہے"۔ وہ اپنے

رشتہ داروں سے صاف صاف کہہ دیا کرتا تھا کہ میرے روپے کا آسرا نہ کرو میرے بعد میری دولت تمہیں نہ ملے گی۔" موت سے چند دنوں پہلے نوبل نے اپنے دو دوستوں سے کہا۔ کہ" ذاتی عقیدہ سے میں سوشل ڈیماکراٹ ہوں"۔ لیکن عملی حیثیت سے میں حد سے آگے بڑھنے کے خلاف ہوں۔ اور میرا تجربہ ہے کہ بڑا ورثہ انسان کو بیکار بنا دیتا ہے۔ اس لئے ہر مالدار شخص کو اپنی دولت کا صرف تھوڑا سا حصہ اپنے بچوں اور دوسرے وارثوں کے لئے چھوڑنا چاہیئے۔ تاکہ وہ اُس کی مدد سے دنیا میں اپنے لئے ایک راستہ پیدا کرسکیں۔ وہ کہتا تھا کہ کس قدر ظلم کی بات ہے کہ جائیدادیں ایسے لوگوں کے لئے چھوڑی جائیں۔ جنہوں نے اُن کے حاصل کرنے میں ذرا سی محنت بھی نہیں کی ہے۔ بڑی میراث ملنے سے دماغی طاقت پوری پوری ترقی نہیں کر سکتی اور ذاتی جدّوجہد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ محنت ہی سے انسان اپنے آپ کو پوری طرح اُبھار سکتا ہے۔" اسی خیال سے نوبل نے اپنے رشتہ داروں کو صرف تین لاکھ روپے چھوڑے۔

موت سے چند مہینے پہلے نوبل نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ" میں باکار آدمی کے لئے ایک پیسہ بھی چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ میں اُسے اپنا کام بند کرنے کی رغبت دلاتا ہوں۔ میں ایسے خیالی آدمی کی امداد کرنا پسند کرتا ہوں۔ جو طرح طرح کی مشکلوں سے گھرا ہو۔"

انہیں خیالات کو عمل میں لانے کے لئے اُس نے وصیّت کی۔ کہ تمام سرمایہ سے ایک انعامی فنڈ قائم کیا جائے۔ اس وصیّت کے جو ۲۷ نومبر ۱۸۹۵ء کو لکھی گئی تھی، بعض حصے یہ ہیں۔

"کل رقم کے پانچ برابر حصے کئے جائیں اور ایک حصہ اُس شخص کو دیا جائے جس نے فزیکل سائنس میں کوئی اہم دریافت کی ہو۔ دوسرا حصہ اُس شخص کو دیا جائے۔ جس نے کیمسٹری میں کوئی کام کی بات دریافت کی ہو۔ تیسرا حصہ فزیالوجی کی اہم دریافت کرنے والے کو دیا جائے۔ چوتھا حصہ اُس شخص کو دیا جائے جس نے مختلف قوموں میں بھائی چارہ کے خیالات پھیلانے، فوجیں کم کرنے اور امن پھیلانے کے سلسلہ میں سب سے اچھا کام کیا ہو۔

میری دلی خواہش ہے کہ ان انعامات کی تقسیم کے وقت نسل، قومیت ذات پات، رنگ اور مذہب کا ہرگز کوئی لحاظ نہ کیا جائے۔ کیونکہ میرا اصلی مدعا یہ ہے کہ یہ انعامات صرف ایسے ہی آدمیوں کو دیئے جائیں۔ جو واقعی اُن کے مستحق ہوں۔ خواہ وہ میرے ہموطن ہوں یا کسی غیر ملک کے باشندے ہوں۔"

اپنی دولت کو اس طرح تقسیم کرنے سے نوبل کا مقصد یہ تھا کہ سائنس کی تحقیقات کرنے والوں کے لئے جو دن رات علمی تجربوں میں لگے رہتے ہیں اور بڑی سے بڑی دریافت کرنے کے باوجود غربت و افلاس میں زندگی بسر کرتے اور اُسی حالت میں مر جاتے ہیں۔ آسانیاں پیدا کی جائیں۔ وہ ایسے لوگوں کو نہ صرف اُن کی محنت کا صلہ دینا چاہتا تھا۔ بلکہ ہونہار آدمیوں کے لئے ترقی کے موقعے بھی مہیا کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود کیمسٹ تھا۔ اس لئے اُس نے سب سے پہلے سائنس کی تحقیقات کو جگہ دی۔ وہ ڈاکٹر لوئی پاسچر کا بھی بیحد مداح تھا۔ اور چونکہ اُس کی خراب رہا کرتی تھی۔ اس لئے تیسرا انعام ڈاکٹری اور فزیالوجی کے لئے رکھا گیا۔ چوتھا انعام لٹریچر کے لئے رکھا۔ پروفیسر سنزی کا بیان ہے کہ آخری عمر میں نوبل کو شاعری سے خصوصاً بائرن کی شاعری سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے لٹریچر کو بھی اُس نے انعامات میں شامل کر لیا۔ پانچواں انعام اُس نیک مقصد کے لئے ہے جس نے آج بھی دُنیا کی توجہ کو سب سے زیادہ اپنی طرف کھینچ رکھا ہے۔

نوبل کو بین الاقوامی امن کی جدّوجہد سے بیحد دلچسپی تھی۔ اُس کی وصیّت میں اگرچہ اس انعام کو آخری جگہ دی گئی ہے۔ لیکن نوبل نے خود اُس کے بارے میں یہ لکھا ہے۔ کہ

"میں چاہتا ہوں کہ اپنی دولت کا بڑا حصہ ایسے انعام کی بنیاد ڈالنے میں صرف کردوں۔ جو اُس شخص کو دیا جائے۔ جو یورپ کو عالمگیر امن کی جانب ترقی کرنے پر مائل کردے۔"

نوبل سویڈن میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن فرانس، اٹلی اور دوسرے ملکوں میں بھی برسوں رہا۔ ان سب ممالک کے حالات دیکھ کر اُس کو خیال ہو گیا تھا۔ کہ پرانی دنیا کا نظامِ حکومت بالکل بگڑا ہوا ہے۔ اس لئے اس کی خواہش تھی کہ یورپ کا نظامِ تمدن بھی ممالک متحدہ امریکہ کی طرز پر قائم ہو تاکہ ان ملکوں میں جنگی تیاریوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اور اُس کے بجائے عقل و قانون کا راج قائم ہو۔ اسی لئے اُس نے ہمیشہ کے لئے ایک لاکھ دس ہزار روپے کی سالانہ رقم اُس شخص یا انسٹی ٹیوشن کو دینی منظور کی۔ جو دنیا کی قوموں کے درمیان برادرانہ امن و صلح کو سب سے زیادہ ترقی دے اور فوجوں اور ہتھیاروں میں کمی کرا کر دنیا کا امن و امان قائم رکھے۔ اور باہمی صلح کو ترقی دینے کی کوشش کی ہو۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ نوبل کے مرنے کے بعد اس کے کسی رشتہ دار نے اپنا حصہ لینے کے لئے عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ وصیّت پر ۲۹ جون ۱۹۰۰ء کو شاہی منظوری ہوئی۔ اور انعامات پہلی مرتبہ ۱۹۰۱ء میں دیئے گئے۔ یہ انعامات ہر سال ۱۰ دسمبر کو دیئے جاتے ہیں۔ جو مسٹر الفریڈ نوبل کی وفات کا دن ہے۔

ہر انعام کی رقم دس ہزار پونڈ ہوتی ہے۔ لیکن دفتر کا خرچ نکال لینے کے بعد ہر انعام میں صرف آٹھ ہزار پونڈ کی رقم بچتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ڈپلوما اور سونے کا تمغہ بھی دیا جاتا ہے۔ جس پر نوبل کی تصویر نقش ہوتی ہے۔ مگر کامیاب اُمیدوار کو اُس کے لینے کے لئے سویڈن جانا پڑتا ہے۔

پچھلے اڑتیس سال میں ہندوستان کے دو نامور ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور سرسی۔ وی رامن کو بھی یہ انعام ملا ہے۔ (زمانہ)

موت

اور فرض بھی کرو، بالآخر، کہ موت سب کا خاتمہ ہی کر دیتی ہے۔ مان بھی لو کہ یہ ایک دائمی نیند ہی ہے۔ پھر بھی یہ ایک بہترین چیز ہے۔

جاودانی مسرت کا کیا کہنا! جن سے ہمیں محبت ہے اور جنہیں ہم سے محبت ہے اُن کے پاس ہمیشہ ہمیشہ رہنا بھی خوب ہے مگر ان دونوں کے بعد، سب سے اچھا جاودانی سکون کی خوابناک چادروں میں لپٹ جانا ہے دائمی زندگی ضرور بہترین شے ہے۔ مگر عنقا ہے۔ اس لئے دائمی نیند ہی کو بہترین ماننا پڑے گا۔ اور کیوں نہیں؛ موت کے سایہ دار کناروں تک بحرِ مصیبت کی موجیں نہیں پہنچ سکتیں۔ وہ آنکھیں جن پہ دائمی تاریکی کا پردہ پڑ چکا ہو۔ گرم گرم آنسوؤں کی سوزش کبھی محسوس نہیں کرتیں۔ ان لبوں سے، جن پر سردی مہر لگ چکی ہو۔ حسرت و یاس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کبھی نہیں نکلتے۔ جو دل خاکستر ہو گئے۔ وہ نہیں ٹوٹتے۔ مردے نہیں روتے۔ قبر کے اندر کوئی روتا ہوا غم نہیں چھپا بیٹھا ہے اور اس مستقل تاریکی میں کوئی کانپتا خوف نہیں رینگ رہا ہے۔

میں یہی سمجھوں گا کہ میں نے جنہیں چاہا اور کھو بیٹھا۔ وہ مرنے والے زمین میں واپس چلے گئے۔ مٹی میں مل گئے۔ دنیا کے بنیادی عناصر جزو بن گئے

مع:۔ "خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں"

میں انہیں غیر شعوری خاک ہی یاد کروں گا۔ میں یہی تصور کروں گا۔ کہ وہ قریب قریب ایک بھولے ہوئے خواب کے گم گشتہ مناظر نہیں ــــ اور جب وہ مجھے یاد آئینگے تو میں یہ سوچوں گا کہ وہ جھرنوں میں، شور و شغب کے ساتھ بہہ رہے ہیں۔ یا ہواؤں میں بادلوں کے دوش پر اُڑ رہے ہیں۔ یا روشنیوں اور شعاعوں کی گود میں دوسری دوسری دنیاؤں کے ساحلوں سے ٹکرا رہے ہیں۔

ایسا سمجھنا کہیں بہتر اور زیادہ اطمینان بخش ہے۔ اس خوف سے ــــ خواہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو ــــ کہ میرے چہیتوں کی عریاں روحیں ایک کہ خدا کے قبضے میں ہیں۔ اور اس کی "سزا و جزا" کا شکار ہو رہی ہیں۔

میں تو مرنے والوں کو وہیں چھوڑ دوں گا۔ جہاں خود نیچر انہیں چھوڑتی ہے اور اُمید کا جو کوئی حسین پھول میرے دل میں کھلے گا۔ میں اسے آہوں کی ہوا اور آنسوؤں کی بارش سے سینچتا رہوں گا۔ (کلیم)

صبح سے شام تک

صبح سڑک کے کنارے ٹاٹ کے ایک میلے ٹکڑے کے نیچے سے اس نے سر اُٹھایا۔ پیٹ کی آگ نے اُسے رات بھر چین سے سونے نہیں دیا تھا۔ میلے اور لٹکتے ہوئے بالوں کو چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے اُس نے انگڑائی لی۔ رات ٹھنڈک زیادہ تھی اسے پسلی میں ہلکا ہلکا سا درد محسوس ہوا۔ ٹاٹ کو لپیٹ کر اُس نے سڑک کے کنارے درخت کی جڑ سے لگا کر رکھ دیا ــــ یہ ٹاٹ اس کے پاس ایک سال سے تھا۔ دن بھر درخت کی جڑ سے لگا رہتا اور شام کو آکر وہ اس میں لپٹ کر پڑ رہتی۔ ٹاٹ کے چوری ہو جانے کا کبھی اُسے خیال بھی نہیں آیا تھا۔

آج عرصے کے بعد اُس نے صبح صبح اُٹھ کر قریب کے نل میں اپنی پھٹی ہوئی میلی قمیض اور بوسیدہ شلوار کو دھویا۔ سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ وہ شہر کے ان محلوں کی طرف روانہ ہو گئی۔ جہاں کچھ ملنے کی اُمید تھی ہوٹل، دوکانیں، مکان، سرکاری اور غیر سرکاری آفس۔ ریلوے اسٹیشن ٹرام اور بس اسٹینڈ۔ کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں روٹی کے چند ٹکڑوں کے لئے اس نے ہاتھ نہ پھیلایا ہو۔ لیکن دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد اسے صرف دو پیسے ملے تھے۔

شام کے پانچ بجے ہونگے۔ جب اُس نے نل کے پانی سے اپنے اُلجھے ہوئے بالوں کو تر کیا اور انگلیوں کی مدد سے ایک بے ڈھنگی سی مانگ نکالنے میں کامیابی حاصل کی۔ کپڑے کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو جو ابھی تک سر اور سینے کو چھپائے رہتا تھا اُس نے حقارت کے ساتھ ایک طرف پھینک دیا اور خود بخود بڑبڑائی۔

"شرم؟ ــــ بہت دن شرم کر کے دیکھ لیا اب بے شرم بھی بن کر دیکھنا چاہیئے"۔

سوکھے ہوئے ہونٹوں اور پریشان آنکھوں کو اُس نے اچھا بنانے کی کوشش کی ــــ نقاہت اور پیٹ کی جلن کے باوجود اُس نے اکڑ کر چلنا شروع کیا۔

پان والے کی دوکان کے پاس سے گذرتے ہوئے اُس نے بڑے آئینہ میں اپنا مُنہ دیکھا ـــــ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آوارگی اور بے شرمی کا مکمل نمونہ ہے بھی یا نہیں ـــــ شاید وہ خود اپنی بے حیائی کا اندازہ نہ کر سکتی تھی لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ جب پان والے نے بغیر مانگے ہوئے پان اُس کی طرف بڑھایا۔ تو وہ قدرے بشاش نظر آنے لگی۔

"بے حیائی کی پہلی جیت ـــــ" اُس نے دل میں کہا اور پان لینے کے لئے ایک لچک کے ساتھ آگے بڑھی۔ پان والے نے پان دیتے ہوئے اُس کے ہاتھ میں چٹکی لی۔ اور وہ تیوریوں پر بل ڈال کر آگے بڑھی

پان کھا کر اُس کا چہرہ پہلے سے زیادہ بشاش نظر آنے لگا۔ اس نے خود محسوس کیا جیسے اس میں ایک طرح کی اُمنگ پیدا ہو گئی ہے۔

سڑک پر چلتے چلتے ایک منچلا اُس کو دھکا دے کر نکلا اور قریب سے ایک پنڈت جی اپنے ساتھی سے کہتے ہوئے گذرے۔

"کلجگ ہے بھیا کلجگ،، جو کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔ اب اس بے حیائی کو دیکھو۔ کُھلا سر، اُٹھا ہوا سینہ، لال مُنہ ـــــ اور چل رہی ہے اس طرح جیسے اپنی ننگی کی کچھ پرواہ ہی نہیں ہے۔ پہننے کو نہیں تھا تو ڈوب مرنے کو تو تھا ـــــ ہے ایشور"

"پنڈت جی کچھ دلو نا ـــــ" اُس نے قریب آ کر ہاتھ پھیلا کر اور کچھ مسکرا کر سوال کیا۔

پنڈت جی نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا اور سمٹ کر سڑک کے آخری کنارے سے چلنے لگے ـــــ اور اُس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

لوگوں کی نظر تو پڑنے لگی ہے ـــــ اُسے اس بات کی خوشی تھی اگر کھانے کو مل جائے تو وہ اور زیادہ بے حیائی کے ساتھ اپنا کام انجام دے سکتی ہے۔

اس نے پکوڑی والے کو تاکا اور اس کے خوانچے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار پانچ خوانچے والے اکٹھا ہو گئے اور کچھ بانکے نوجوان بھی پکوڑی کھانے کے بہانے کھڑے ہو گئے۔

خوانچے والے نے خوانچے والے کو اشارہ کیا۔ نوجوان نے پکوڑی کھاتے ہوئے اپنے ساتھی کو کہنی ماری۔ راستے سے گذرتے ہوئے ایک بنگالی بابو نے اپنے ساتھی کا ہاتھ دبایا ـــــ اُس نے یہ سب کچھ دیکھا۔ شکار جال میں آ رہا تھا۔

"کچھ ہمارے حصہ کا بھی ہے۔" اس نے ایک گہری سانس کے ساتھ بغیر کسی کی طرف متوجہ ہوئے کہا۔

"صاحب پیسہ دینگے" ایک منچلے خوانچے والے نے اپنے گاہک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ اور نوجوان گاہک نے اپنے ساتھی سے " دو بھئی ایک پیسہ دو" کہہ کر اپنی جیب سے بھی ایک پیسہ نکالا ـــــ خوانچے والوں نے ایک ایک دو دو پکوڑیاں کر کے اس کی طرف بڑھائیں

جب اُس نے کرزن پارک میں قدم رکھا تو وہ خاصی چاق و چوبند تھی۔ آج ایک عرصہ کے بعد اسے پیٹ بھر کھانا، کافی پیسے اور پان ملے تھے۔ اس کے چہرے پر شگفتگی تھی اور وہ اپنے کو زیادہ سے زیادہ آوارہ اور بے شرم بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے سینہ کو اور ابھار کر چلنا شروع کیا ـــــ اب شام ہو چکی تھی۔ پارک میں تھوڑا تھوڑا اندھیرا بھی ہو چلا تھا۔ وہ ایک چمن سے دوسرے چمن میں مسکراتی اور گنگناتی پھر رہی تھی۔

اگر کسی نے اُسے بے شرم کہا۔ تو اُس نے اُس کے سامنے ہی ایک ہلکا سا قہقہہ لگا دیا ـــــ اگر کسی نے آوارہ کہا تو اُس نے مسکرا کر اس سے چند پیسوں کی فرمائش کی اور اگر کوئی اس سے بچ کر نکلا۔ تو اس کو دھکا دے کر نکلنا اس نے اپنا فرض سمجھا۔

آج اُس نے بے شرم بن کر ان لوگوں سے خوشی خوشی باتیں کیں۔ اور پیسے وصول کئے جو کل تک اس کو شرم کی وجہ سے قریب بھی نہ آنے دیتے تھے۔

رات کو جب وہ اپنے میلے ٹاٹ میں لپٹ کر لیٹ چکی تھی۔ تو اُسے اپنے جیب میں بھرے ہوئے پیسوں کی بھی فکر تھی ـــــ آج وہ مطمئن اور خوش تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اطمینان کی نیند آئی تھی۔

ہماری سماج ایسے مانگنے والوں اور والیوں کو پیدا کر کے خوش ہوتی ہے۔ (ہند)

رُباعی

یا دامنِ فطرت میں ہے کانٹا اٹکا
یا کوئی مسافر ہے کہیں سے بھٹکا
بیداریٔ بے لطف ہے ہستی، انور
یا خواب میں محسوس ہوا ہے جھٹکا

لطیف انور

صاف آنکھیں

لفٹننٹ کرنل اے۔ایم۔ڈِک۔او۔بی۔ای۔ایف۔آر۔سی۔ایس۔آئی۔ایم۔ایس کا صدارتی ایڈریس جو آپ نے ۱۸۔مارچ ۱۹۳۴ء کو برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن پنجاب برانچ کے اجلاس پر پڑھا۔اور سالِ رواں میں حکمۂ حفظانِ صحت کی طرف سے اشاعت ہوئی۔

ایسے موقع پر آپ مجھ سے یہ توقع نہیں کریں گے کہ میں اپنے کسی مرغوب موضوع پر پیشہ وارانہ حیثیت سے بحث وتحمیص کروں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہوگا۔جس کے لئے مناسب مقام شعبہ سائنس ہے۔لیکن مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ایسے امور کے متعلق عام اصولوں کے بارہ میں کسی قسم کی رہنمائی کے خواہاں ہیں۔ جن کے بارہ میں برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن دلچسپی رکھتی ہے اور جن کے متعلق وہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کرسکتی ہے۔ میں یہاں یہ دُہرانا نہیں چاہتا کہ ہم نے بطور ڈاکٹروں کے یا بحیثیت ایک انجمن کے کیا کچھ کیا ہے۔اور نہ ہی میں ان فوائد کا ذکر کروں گا۔جو ہمارے پیشہ کی بدولت نسلِ انسانی کو پہنچے ہیں۔(اگرچہ ایک ایڈریس کیلئے یہ ایک نہایت ہی دلفریب موضوع ہوگا) نہ ہی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مستقبل میں کیا ہوگا۔یہ ہم نہایت محفوظ طریق پر اپنے گریجویٹوں اور طلباء کے ہاتھ میں چھوڑ سکتے ہیں۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج ان طلباء کو پنجاب کی آیندہ طبّی تاریخ میں نمایاں جگہ لینے کے متعلق ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔برخلاف اس کے میں زمانۂ حال اور اس کام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔جو اس وقت ہمارے سامنے ہے اور میں نے اپنے موضوع کا عنوان رکھا ہے"صاف آنکھیں" یہی ایک ایسا خیال ہے۔جسے تصورات کی دنیا میں عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔

میں سائنٹفک نہیں ہوں گا۔اور ایک بات بھی ایسی نہیں کہوں گا۔جو آپ نہیں جانتے یا جن کے متعلق غیر پیشہ ور اصحاب کو علم نہیں۔بلکہ میں بعض ایسے امور کے متعلق ذکر کروں گا۔جن کا سب کو علم ہے اور انہیں یکجا کرنے کی کوشش کروں گا۔تاکہ برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن۔پنجاب کے ارکان کو ان کے روزمرّہ کے فرائض سے کسی حد تک واقفیت ہو جائے۔

پنجاب گزشتہ زمانہ میں آنکھوں کے بہت مشہور سرجنوں کا گہوارہ رہا ہے۔آج بھی یہاں بہت سے ممتاز ڈاکٹر کام کر رہے ہیں اور نوجوانوں پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ مستقبل میں نمایاں حصّہ لیں گے۔ لاہور اور نیز امرتسر میں طلباء کو امراضِ چشم کے متعلق تعلیم دی جاتی ہے۔یہ آخری امتحان کا ایک لازمی جزو ہے۔پنجاب میں ایسے بہت ہسپتال ہیں۔جہاں امراضِ چشم کا علاج کیا جاتا ہے۔آدمی اور ہسپتال ہر وقت اس کام کے لئے تیار ہیں اور جہاں تک کام کے اس حصّہ کا تعلق ہے۔یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کافی ہے اور قابلیت کے ساتھ انجام دیا جا رہا ہے۔

یہ کام کیا ہے؟

۱۔ موتیا بند کا رفع کرنا اور کالے موتیا بند کے بعض اپریشن۔ موتیا بند عُمر کے آخری حصّہ میں آتا ہے۔اور کوئی چیز اس کا انسداد نہیں کرسکتی۔کالا موتیا بند زندگی کے درمیانی حصّہ گزر جانے کے بعد ہوتا ہے اور اس کا سدِّ باب یا علاج نہیں ہوسکتا۔ایسے حالات میں عملِ جراحی صرف ایک عارضی تدبیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں یہاں کالے موتیا بند کے متعلق کچھ پیشہ وارانہ نقطۂ خیال سے کہنا چاہتا ہوں۔ٹریفائننگ کا اپریشن بجائے اریڈیکٹمی کے زیادہ کرنا چاہیئے(بدقسمتی سے اریڈیکٹمی پنجاب میں زیادہ رائج ہے)۔

۲۔ آنکھوں کی سوزش کا کہنہ مرض۔ککرے اور اُن کے مابعد اثرات۔دُھند۔آنکھوں میں زخم ہوجانا۔اور پلکوں کا اندر کی طرف مُڑجانا۔ان امراض کا انسداد ہوسکتا ہے۔لیکن ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔میرے خیال میں ککروں کا مکمل علاج کوئی نہیں۔

۳۔ ضربات۔ان کے لئے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔

۴۔ عینک۔

ایک اور پیشہ ورانہ اصول۔کسی شخص کو اجازت نہیں ہونی

چاہیئے کہ وہ سلور نائٹریٹ کو قطروں کی صورت میں ڈالے اور ۲ فیصدی سے زیادہ طاقت کے سلور نائٹریٹ کو آنکھوں میں ڈالنے کی ممانعت ہو جانی چاہیئے۔ پنجاب کو امراضِ چشم کے متعلق کام کے بارہ میں اطمینان حاصل ہو گیا ہے اور وہ اب ملاح کی طرح چپوؤں کے سہارے آرام کر رہا ہے۔ وہ باقاعدہ طور پر تسلیم شدہ راستوں میں اپنی کشتی چھوڑ دینے کے لئے خوشی کے ساتھ رضامند ہے۔ لیکن اس تمام کام کا کیا فائدہ ہوا ہے۔ صرف ایک حد تک شخصی تکلیف کو کم کیا گیا ہے۔ حال میں ہم نے آہستہ آواز میں انسداد بے بصری کے الفاظ سُننے شروع کئے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ پنجاب میں یہ آواز نہایت ہی باریک اور دبی ہوئی ہے۔ ہم اسے جاری رکھ کر مطمئن ہو رہے ہیں۔

آپ میں سے بعض اصحاب نے آنجہانی مسٹر سی۔ جی۔ ہینڈرسن کے کام کے متعلق سُنا ہو گا۔ جو بمبئی اور سندھ میں تحریک بے بصری کے بانی تھے۔ وہ ڈاکٹر نہیں تھے۔ بلکہ آئی سی۔ ایس افسر تھے اور وہ اس کام کو جاری رکھنے کی غرض سے ریٹائر ہو گئے تھے۔

آؤ ہم پنجاب میں انسداد بے بصری کے الفاظ کو پنجاب کے کونے کونے میں پھیلا دیں۔ اس معاملہ میں طب کا پیشہ صوبہ کی رہنمائی کر سکتا ہے کس طرح؟ یہاں چند بڑے بڑے امور کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

۱۔ آنکھ ایک نازک عضو ہے لیکن قدرت نے اس کی حفاظت کا سامان بھی مہیا کر دیا ہے۔ بھوئے اسے خود بخود کام کرنے کیلئے ڈھانپے ہوئے ہیں۔ پلکیں جو اس کو چھپانے کے لئے پردے کا کام دیتی ہیں اور آنسو جو انہیں دھو کر صاف کرتے ہیں اور خارش پیدا کرنے والا مادہ دُور کرتے ہیں۔

۲۔ ہم آنکھوں کے غدود میں جراثیم کو مارنے کے لئے آنکھ کو نقصان پہنچائے بغیر کافی طاقت کی ادویات استعمال نہیں کر سکتے۔

۳۔ ہمیں صرف اسی راستہ میں امید نظر آتی ہے کہ ہم آنکھوں میں بہت زیادہ چھوت پہنچنے کا انسداد کریں۔ تھوڑی بہت چھوت کا جو ہم سب کو لازمی طور پر لگتی ہے۔ قدرت خود انتظام کر سکتی ہے۔ چھوت کے انسداد سے چھوٹے اور بڑے بچّوں۔ بالغوں۔ ادھیڑ اور بوڑھی عمر کے لوگوں کو آنکھوں کی سوزش اور ککروں سے بچایا جا سکتا ہے۔ جن سے زخم۔ دھند ہو جاتے ہیں اور پلکیں اندر کی طرف مُڑ جاتی ہیں۔ جو ساری عمر کے لئے ناگفتہ بہ تکالیف کا باعث ہوتے ہیں۔ اور جن کی بدولت بینائی جاتی رہتی ہے۔ ہم ان کا انسداد کر سکتے ہیں۔ تو پھر ہمیں ایسی چیزوں کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ جن کا ہم سدِ باب نہیں کر سکتے۔ مثلاً موتیا بند اور کالا موتیا بند۔ چھوت کیا ہے گندی۔ گندی آنکھیں اور پلکیں۔ گندے چہرے۔ گندی انگلیاں۔ گندے کپڑے۔ گندی مکھیاں اور گندی عادات۔ صاف عادات۔ صاف کپڑوں۔ صاف انگلیوں اور صاف چہروں سے آنکھیں بھی صاف رہتی ہیں۔ البتہ پنجاب میں صاف مکھیاں نہیں۔ کسی گرد و غبار والی جگہ میں چلنے کے بعد ذرا اپنی پلکوں کو دیکھو۔ ہر پلک پر غبار اور دھول کی ایک تہہ جمی ہو گی۔ جس سے آنکھوں میں خارش رہتی ہے اور ایک گندی مکھی اس گرد و غبار میں نہایت آسانی کے ساتھ غسل کر سکتی ہے۔

صرف مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کرنے کی ضرورت ہے:۔

۱۔ ہر ایسے شخص سے گریز کیا جائے جس کی آنکھیں سُرخ ہو جائیں یا جس کی آنکھوں میں سے پانی نکلتا ہو۔ اسی قسم کی آنکھوں سے بہت زیادہ وسیع پیمانہ پر چھوت لگتی اور پھیلتی ہے۔ دن ہو یا رات۔ ایسے لوگوں کے ساتھ رہنا یا ملنا جلنا جن کی آنکھوں میں سُرخی ہو جائے۔ یا جن سے پانی بہتا ہو۔ خود چھوت کو دعوت دینا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ در اصل صحیح معنوں میں ملا جُلا جائے۔ مکھیوں کی ٹانگوں اور منہ اور نیز گندی انگلیوں۔ رومال۔ تولیہ۔ یا سُرمہ کی سلائی سے بھی چھوت پھیل سکتی ہے۔

میرا نصب العین یہ ہے کہ روز مرّہ کے کام کے طور پر منہ اور آنکھوں کو دھو کر صاف کیا جائے اور قدرت کو موقع مل جائے گا۔ لیکن دوسرے لوگوں کی آنکھوں سے جن سے پانی بہتا ہو۔ چھوت سے بچنے کے لئے نہایت سرگرمی سے کام کرنا چاہیئے۔ لڑکوں۔ لڑکیوں۔ آدمیوں اور عورتوں کو بتانا چاہیئے اور انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ یہ بہت ہی

سہل معلوم ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر کا فرض نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ اس کا کام نہ ہو لیکن تاوقتیکہ ڈاکٹر لوگوں کو یہ مشورہ نہ دیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ کچھ کام بھی نہیں ہوگا — انسداد آسان ہے اور ہمارے پاس علاج کوئی نہیں۔

انسداد بے بصری کا دارومدار صاف آنکھوں۔ صاف ہاتھوں اور صاف عادات پر ہے۔ اس کے متعلق کامیابی کا راز تعلیم اور نشرواشاعت کے کام میں مضمر ہے۔ ہم ڈاکٹروں کو یہ کام شروع کرنا چاہیئے اور پروپیگنڈا کے شعلوں کو بھڑکائے رکھنا چاہیئے اور میں اس وقت کا منتظر ہوں جب کہ ڈاکٹر موتیابند دور کرنے کے متعلق عمل جراحی کی تعداد کے بجائے اس امر پر فخر کریگا۔ کہ اس نے اتنے اشخاص کی آنکھوں کو چھوت لگنے سے بچایا ہے۔

میں اس امر پر غور نہیں کر رہا ہوں کہ ان لوگوں کے لئے کیا کیا جائے۔ جو فی الحقیقت اندھے ہیں۔ یا جو امراض چشم میں مبتلا ہیں۔ جہاں تک علاج کا تعلق ہے۔ ہم اس کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔ خاص مدارس۔ خاص ادارے۔ بریلی (جہاں اندھوں کو پڑھایا جاتا ہے) وغیرہ۔ ہر ایسی تجویز کا لازمی حصہ ہیں۔ جو اندھوں کی غورو پرداخت کے لئے مرتب کی جائے اور وقت آنے پر یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ لیکن اس کے لئے روپیہ درکار ہے۔ ہمیں پنجاب میں آنکھوں کے سفری سرجنوں یا کیمپوں کی ضرورت ہے۔ اگر صاف آنکھوں کا خیال لوگوں کے گھروں میں پہنچ جائے۔ تو پنجابیوں میں اتنی لیاقت ہے کہ وہ اسے فوراً سمجھ لیں۔ دیکھو انہوں نے امراض چشم کے موسموں کے خیال کو کتنی ترقی دی ہے۔

صاف آنکھوں کا امکانات۔ موافقات اور ہم رسانی آب کی بہتری کے متعلق عام حفظان صحت کے انتظامات۔ مکھیوں کا انسداد۔ معاشرتی اور تعلیمی مسائل سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ اس کا تعلق اصلاح دیہات کے کام سے ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے جو اس وقت مسٹر برین سے شروع کیا ہوا ہے۔ یہ تحریک مسلسل پر جاری ہے اور لازمی طور پر ترقی کرے گی اور اب وقت اور موقع ہے کہ "صاف آنکھوں" کو اس کا جزو قرار دیا جائے۔

ایک عالمگیر سکیم کا بالتفصیل پیش کرنا ممکن نہیں لیکن میں چند لازمی امور کے متعلق بعض خیالات کا اظہار کروں گا۔

۱۔ مسٹر ہینڈرسن کے کام نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ ہر گاؤں میں ایک بارسوخ شخص کو تیار کرنا چاہیئے۔ کہ وہ "صاف آنکھوں" میں ذاتی طور پر دلچسپی لے۔ یہ شخص سرکاری افسر یا ڈاکٹر نہ ہو۔ کیونکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی مدد آپ کی جائے۔ ایک رضاکار دیہاتی انجمن تو بہترین نصب العین ہے۔ اس سلسلہ میں حکام ضلع امداد دے سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ دلچسپی لیں۔ تو انہیں بہت جلد معاونین مل جائیں گے۔ نیز مزدور ملازم رکھنے والوں کو بھی دلچسپی لینی چاہیئے۔

۲۔ اس تحریک کے متعلق سب سے زیادہ ضروری شخص سکول کا ہیڈ ماسٹر ہے۔ بچوں کے دماغ میں صاف آنکھوں کا خیال ذہن نشین کرانے کے لئے اس سے بہتر اور کون شخص ہو سکتا ہے۔ سکول کے بچوں سے یہ خیال والدین تک پھیلانا نہایت سہل ہے۔ ہیڈ ماسٹران بچوں کو جن کی آنکھیں سُرخ ہوں۔ یا جن میں سے پانی بہتا ہو۔ دوسرے بچوں سے الگ رکھ کر چھوت کا انسداد بھی کر سکتا ہے۔ سرخ یا جن میں سے پانی بہتا ہو۔ اس قسم کی آنکھوں کی پہچان کے لئے کسی قسم کی لمبی واقفیت کی ضرورت نہیں اور یہی وہ آنکھیں ہیں جن سے چھوت پھیلتی ہے۔ ذاتی طور پر میں اسے بعید از دانشمندی سمجھتا ہوں۔ کہ غیر پیشہ ور اصحاب کو امراض چشم کا علاج کرنے دیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر مریض کو جس کی آنکھ سُرخ ہو یا اس میں سے پانی بہتا ہو۔ فوراً قریب ترین ڈاکٹر کے پاس بھیج دینا چاہیئے۔ آنکھوں کو نمک اور پانی سے دھونا اور ان میں ارنڈی کے تیل کا ایک قطرہ ڈالنے سے عارضی تدبیر کے طور پر کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور صرف اسی حد تک میں غیر پیشہ ور اصحاب کو اجازت دینے کے لئے تیار ہوں۔ اس سلسلہ میں یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ لڑکیوں کو صاف آنکھوں کے متعلق ہدایت کی جائے۔ لڑکوں کے لئے بھی یہ ضروری ہے۔ لیکن لڑکیوں کے لئے بہت زیادہ ضروری ہے اور میں اس پہلو پر سب سے زیادہ زور دینا چاہتا ہوں۔ میرا یہ خیال ہے کہ اسکول کا استاد اور استانی صاف ہاتھوں اور آنکھوں کی تلقین کریں اور ان بچوں کو جن کی آنکھیں سُرخ ہوں۔ یا ان میں سے پانی بہتا ہو۔ اس وقت تک الگ رکھیں۔ جب تک کہ وہ ڈاکٹر کے علاج سے اچھے نہ ہو جائیں۔ اس طرح وہ اس تحریک میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں صاحب ڈائرکٹر محکمہ تعلیم معلمین کے نام ہدایات جاری کرنے

اور اپنے معائنوں کے دوران میں امداد دے سکتے ہیں۔ آنکھوں کی غور و پرداخت کے متعلق سبق اسکولوں کی کتابوں میں شامل کئے جا رہے ہیں۔

۳۔ محکمہ صحت عامہ کے حکام ہمارے ساتھ ہیں اور ان کے پاس تعلیمیافتہ عملہ ہے۔ جو صحت اور عام صفائی کی روشنی کو پھیلانے میں مصروف ہیں۔ ان کے ٹیکہ لگانے والے اس تحریک میں لے سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کا کام چیچک کے متعلق ہے۔ جو بے بصری کے اسباب میں سے ایک ہے۔ میری یہ تجویز ہے کہ ٹیکہ لگانے والوں کے ہاتھ میں خاص پروپگنڈا کا کام دیا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ ان کے فرائض کا ایک حصہ ہے۔

۴۔ ریڈکراس بالخصوص جونیر ریڈ کراس پروپگنڈ کے متعلق بہت کام کر رہی ہے۔ ان کی طرف سے تجربات اور لیکچروں کا انتظام کیا جاتا ہے اور اشتہار وغیرہ بھی تقسیم کئے جاتے ہیں۔

۵۔ دوسرے درجہ پر زچہ اور بچہ کی سود و بہبود کے مرکز ہیں یہاں ہمارا کام ماؤں اور نوزائیدہ بچوں کے متعلق ہے۔ نوزائیدہ بچوں کی آنکھ میں جو سرخی ہوتی ہے وہ بے بصری کا ایک اور سبب ہے۔ دائیوں کو بتانا چاہیئے کہ وہ بچوں کی آنکھوں کو دھو کر صاف کریں اور انہیں ہدایت کرنی چاہیئے کہ وہ آنکھوں میں ایک فیصدی کی طاقت کا سلور نائٹریٹ کا محلول ڈالیں۔ صرف یہی ایک صورت ہے جہاں اس کا استعمال جائز ہے۔ ۱۹۳۲ء میں پنجاب میں صحت کے مرکزوں کی تعداد ۸۳ تھی۔ ... ۲۵ ماؤں کو ہدایات دی گئیں اور ۱۳۰۰۰ ہونے والی مائیں مشورہ وغیرہ کے لئے آئیں۔ فرا ان اعداد پر غور کیجئے۔ ۴۰۵ دائیاں تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور ۵۱۷ نے سرٹیفکیٹ حاصل کئے۔ اس سلسلہ میں بھی لڑکیوں کی تعلیم بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

ہمارے پروپگنڈا میں قریب ترین ہسپتال کے متعلق معلومات بھی شامل ہونی چاہئیں۔ تاکہ مریضوں کو ایسے ویسے نام نہاد ڈاکٹروں کے پاس جانے سے روکا جائے۔ جو طاقت ور اور خارش پیدا کرنے والی ادویہ استعمال کرتے ہیں۔ جو اکثر اوقات بے بصری کا باعث ہوتی ہیں۔

بہتر مکان۔ بہتر خوراک۔ تازہ ہوا اور روشنی سے بچے چھوت کا مقابلہ کر سکیں گے اور ان کی آنکھوں میں جو سوزش ہو جاتی ہے اس کا انسداد بھی ہو جائے گا۔

یہی وقت ہے کہ اس تحریک کو جاری کیا جائے اور اسے اصلاح دیہات کے ساتھ ملحق کر دیا جائے۔

بڑے بڑے شہروں کے متعلق میں جالندھر کے اسکولوں میں امداد باہمی کے اصولوں پر کام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ایک ایسی سکیم ہے جو اپنا خرچ خود برداشت کر سکتی ہے اور اس نے ایک مثال قائم کر دی ہے کہ اس ضمن میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔

میں نہ تو کوئی تجویز پیش کر رہا ہوں اور نہ آنکھوں کی دوا کے متعلق انتظامات اور اس کی تقسیم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں میں کوئی نئی چیز تجویز نہیں کر رہا۔ اس سے بھی زیادہ ضروری یہ کہ کوئی ایسی چیز جس پر روپیہ صرف ہو۔ تحریک اصلاح دیہات جاری ہو چکی ہے اور یہ اتنی ٹھوس ہے کہ یہ لازمی طور پر ترقی کرے گی۔ اس کی شہرت کا وقت آ گیا ہے اور طبی نقطۂ خیال سے اس میں حصہ لینے کے لئے میں ہر مرد اور زنانہ ڈاکٹر سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ "صاف آنکھوں" کی اہمیت کو چاروں طرف پھیلائے۔ اس سے نہ تو کوئی مالی یا پیشہ دارانہ اور نہ ہی کوئی فوری صلہ ملیگا۔ عمر رسیدہ اور نوجوان دونوں یہ کام کر سکتے ہیں۔ فزلیشن بھی اور آنکھوں کے سرجن بھی۔

سہنری نان ڈایک نے ایک نظم کے دوران میں کیا خوب کہا ہے۔ "یہ ضروری نہیں کہ تیز چلنے والا دوڑ میں کامیاب رہے۔ یا طاقتور جنگ میں فتحیاب ہو۔

نہ ہی یہ ضروری ہے کہ راستباز شخص پر ہمیشہ نوازشیں ہوتی رہیں۔

یا صرف دانشمند شخص کو ہی روشنی حاصل ہو۔

بلکہ اکثر اوقات لڑکھڑاتے پاؤں یقینی طور پر منزل پر پہنچ جاتے ہیں اور وہ لوگ جو اندھیرے میں چل رہے ہوں۔ آفتاب رُشد کو طلوع ہوتے دیکھتے ہیں۔ رات کے وقت ہزار مرتبہ ملک شام کی فوجیں موت کے گھاٹ اترتی ہیں۔

ہزاروں مرتبہ ایسے شکست خوردہ جو گمنامی پر تھے دوبارہ بام شہرت پر پہنچے"۔

نوجوانوں کو میرا یہ پیغام ہے کہ وہ "صاف آنکھوں" کو اپنی

شاہکار لاہور

نگران:- پروفیسر تاجور

ایڈیٹر:- خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے

چندہ

سالانہ چھ روپے ششماہی تین روپے آٹھ آنے۔ نادار خریداروں سے للعہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی۔ نمونہ پانچ آنے

جلد (۹) — نمبر (۳)

فہرست مضامین بابت ماہ جون ۱۹۳۹ء

تصاویر:- (سہ رنگی) (۱) بہار پوش۔ (یک رنگی) (۲) فخر الحکماء حکیم خورشید علیخاں رامپوری (۳) ڈیزل ریل کار (۴) مراکش کا ایک مکتب

المنادی حسن اختر ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار واقعہ مکان میاں علی محمد، میاں علی محمد سٹریٹ ۵/۴ سی بیرون خواجہ دل محمد

مختصرات

وزیر تعلیم کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز

(۱) جب سے یہ گورنمنٹ برسر اقتدار آئی ہے اُس وقت سے اس صوبہ پر کثرت سے بلائیں نازل ہو رہی ہیں۔ قحط، اولے، فسادات اور کیا کچھ نہیں۔ میری تحریک کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں گورنمنٹ کے وزیر تعلیم میاں عبدالحی پر اعتماد نہیں۔

(۲) ہمارے وزیر تعلیم وہ ہیں۔ جن کے عہد میں رانچی مینٹل ہسپتال میں یورپین پاگلوں کے لئے ۳۹ ہزار روپیہ منظور ہوا۔ جب یہ حالت ہے تو ہم ان پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں۔

(۳) روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ لیکن پنجابیوں کے لئے نہیں۔ انہیں تو گوری چمڑی والوں سے ہمدردی ہے۔

(۴) کہتے ہیں کہ وزیر تعلیم دورے بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کا مقصد خدمت کرنا نہیں۔ بلکہ عیش پرستی ہے۔ حکومت کے نشہ کی یہ حالت ہے کہ ان کے تمام ماتحت افسران بھی فرعون بے سامان بنے ہوئے ہیں۔ یونہی زمینداروں کی ہمدردی کے بلند بانگ دعاوی کئے جاتے ہیں۔ مگر دراصل یہ پیٹ کے دھندے ہیں۔ انہیں تو اپنے روپیہ سے کام ہے۔

(۵) آئی سی۔ ایس اور آئی۔ ایم۔ ایس وغیرہ افسران کو اس حکومت کے عہد میں بھاری بھاری تنخواہیں دی جا رہی ہیں۔ یونینسٹ منسٹری ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتی۔ اتنی جرأت نہیں کرتی کہ ان کی تنخواہیں کم کر دے۔

(۶) وزیر تعلیم نے صوبہ کی تعلیم اور صحت کی طرف توجہ نہیں دی۔ وزیر ترقیات نے صوبہ کی صنعت کو بہتر بنانے کے لئے کچھ نہیں کیا۔

مذکورہ بالا اقتباسات اُس تقریر کے ہیں جو پنجاب اسمبلی کی اپوزیشن پارٹی کے ایک کانگریسی رکن نے پنجاب اسمبلی میں آنریبل وزیر تعلیم پنجاب کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش کرتے ہوئے کی۔ یہ تقریر اخبار پرتاپ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اخباری رپورٹر نے آنریبل ممبر کی اصل تقریر نہیں سنی بلکہ کسی سے پوچھ کچھ کر اخبار کو بھیج دی ہے۔ کیونکہ شائع شدہ تقریر اسقدر بے ربط۔ بے معنی۔ غیر متعلق اور غیر استدلالی ہے کہ اسمبلی کا کوئی ممبر تو درکنار کوئی معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی ایسی تقریر کر کے اپنی مضحکہ انگیز ژولیدہ بیانی اور دماغی افلاس کی رسوائی گوارا نہیں کرے گا۔

ہمارے خیال میں تو روزنامہ پرتاپ نے یہ تقریر ممبر موصوف کے نام سے منسوب کر کے اُن کے ساتھ ظالمانہ سلوک روا رکھا ہے۔

قارئین تقریر کے منقولہ فقروں پر غور کر کے خود ہی اندازہ فرمائیں کہ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان ایسی بے سروپا باتیں صوبے کی مجلس قانون ساز میں کر سکتا ہے۔

تقریر کی ابتدا اس فقرے سے ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو اقتباس نمبر ۱

"جب سے یہ گورنمنٹ برسر اقتدار آئی ہے۔ اُس وقت سے اس صوبے پر بلائیں نازل ہو رہی ہیں۔ قحط، اولے، فسادات اور کیا کچھ نہیں۔"

اس کے بعد ٹیپ کا بند یہ ہے کہ

"میری تحریک کا یہ مقصد ہے کہ ہمیں گورنمنٹ کے وزیر تعلیم پر اعتماد نہیں۔"

تقریر کے ان ابتدائی فقروں سے حسب ذیل خیالات مستنبط ہوتے ہیں:-

ا۔ گورنمنٹ نام ہے میاں عبدالحی وزیر تعلیم پنجاب کا۔

ب۔ کابینۂ وزارت سبز قدم منحوسوں کی ایک جماعت ہے۔

ج۔ قحط اور ژالہ باری کا وزیر تعلیم کی تعلیمی پالیسی سے براہ راست تعلق ہے

د۔ کابینۂ وزارت شب زندہ دار زہاد اور تپسوی سنیاسیوں سے مرتب ہونا چاہیئے۔ تاکہ صوبہ آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رہ سکے۔

(۲) "وزیر تعلیم کے عہد میں یورپین پاگلوں کے لئے ۳۹ ہزار روپیہ منظور ہوا۔ الخ"

واقعی وزیر تعلیم کی یہ لغزش اعتماد شکنی کی حد تک پہنچتی ہے ۔ وہ کسی صورت اس منصب کے اہل قرار نہیں دئے جا سکتے ۔ ان کے لئے مناسب تو یہ تھا کہ یورپین پاگلوں کو "مرن برت" دھارن کرنے پر مجبور کر دیتے اور سوراج دے کر رام لاجپت کے آرزو مندوں کی دماغی اصلاح کے لئے پاگل خانے سے آزاد کر دیتے۔

کیونکہ یورپین آبادی کسی قسم کا ٹیکس نہیں ادا کرتی ۔ پنجاب کے محکمہ حفظان صحت پر اُن کا کوئی حق نہیں ۔ یہاں کے پاگل خانے میں صرف وہ پنجابی داخل ہو سکتے ہیں ۔ جو "کالی چمڑی" رکھتے ہوں ۔ "چٹی چمڑی" رکھنے والا پاگل پنجابی ہو یا فرنگی اُسے انگلستان بھجوا دینا چاہیئے۔

(۴) "وزیر تعلیم کے دوروں کا مقصد عیش پرستی ہے" الخ

یقیناً ۔ کیونکہ دورے میں اُن کے ساتھ ہمیشہ طوائفوں ، مغنیوں ، اور ماہ وش ساقیوں کا ایک گروہ ہوتا ہے ۔ جب کسی مقام پر فروکش ہوتے ہیں ۔ وہاں کے تعلیمی اداروں کا معائنہ کرنے کے بجائے مجلس عیش و نشاط منعقد کر کے ساری فضا کو صلائے نوشا نوش اور نغمات سرود سے خمار بنا دیتے ہیں ۔ انہیں آنریبل ممبر کے بقول "اپنے پیٹ کے دھندے اور اپنے روپے سے کام ہے" ۔ حالانکہ ایک وزیر کو پیٹ پر پتھر باندھ کر صرف دوسروں کے روپے سے کام رکھنا چاہیئے۔

(۵) "آئی ۔ سی ۔ ایس اور آئی ۔ ایم ۔ ایس کے افسران جو قانوناً صرف وزیر ہند کے ماتحت ہیں ۔ وزیر تعلیم سے اتنا نہیں ہوا ۔ کہ اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر اُن کی بیش قرار تنخواہوں میں پچاس فیصدی تخفیف کر دے رہے آئی ای ایس چونکہ تعلیمات سے متعلق ہیں ۔ اس لئے ان کی تنخواہوں میں تخفیف کا مطالبہ معزز ممبر نے ناقابل ذکر خیال کیا ۔

(۶) "وزیر تعلیم نے صوبے کی تعلیم و صحت کی طرف توجہ نہیں دی وزیر ترقیات نے صوبے کی صنعت و حرفت کو بہتر بنانے کے لئے کچھ نہیں کیا ۔

اس مربوط و معنی آفریں تقریر کے حسب ذیل فقرے غالباً رپورٹر کے اندراج سے رہ گئے ۔ کہ

"این ڈبلیو ریلوے نے تیسرے درجے کے مسافروں کی راحت رسانی کا کچھ انتظام نہیں کیا ۔ ادھر حکومت کے ملٹری سیکرٹری نے فوجی اخراجات میں تخفیف کی کوئی ترمیم بھی منظور نہیں کی ۔ اور سب سے زیادہ اندھیر یہ ہے کہ پرسوں سے جھنڈا گوجر کی بھینس نے دودھ نہیں دیا ۔ اس لئے وزیر تعلیم پنجاب ہاؤس کا اعتماد کھو بیٹھے ہیں !!"

ان فقروں کے بعد پھر کون عقلمند کہہ سکتا ہے ۔ کہ وزیر تعلیم وزارت کی اہلیت رکھتے ہیں ۔ اور کہ اپوزیشن پارٹی کے آنریبل ممبر ۔ وزیر تعلیم پر عدم اعتماد کا ووٹ پیش کرنے میں حق بجانب ہیں ۔

وزیر تعلیم کے متعلق عدم اعتماد کی ساری گرفشاں تقریر اسی قسم کے زریں حقائق سے جگمگا رہی ہے ۔

صوبے کی بار کا ایک بے نظیر اور کامیاب ترین وکیل جو اپنی پانچ ہزار روپے ماہانہ کی وکالت چھوڑ کر اپنے دیرینہ تعلیمی تجربات کی روشنی میں صوبے کی تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے ۔ جس نے اپنے مختصر یکسالہ عہد وزارت میں تعلیمی رفتار کو برق رفتار میں تبدیل کر دیا ہے ۔ جس نے دو سو نئے مدارس صرف نسوانی تعلیم کے لئے جاری کرا دیئے ۔ اس کے ایثار ، بیدار دماغی ، شبانہ روز انہماک کا یہ صلہ دیا جا رہا ہے ۔ اگر ایسی جامع قابلیت و صفات کے حضرات بھی صوبے کی وزارتوں کے لئے نااہل سمجھے جاتے ہیں تو پھر اس عجیب و غریب سرزمین کی مافوق الفطرت آبادی پر حکومت کرنے کے لئے فرشتوں کا کوئی کابینہ وزارت ہی شاید شائستہ اعتماد سمجھا جا سکے گا۔

اس تقریر میں جو ناگفتنی الفاظ پنجاب کے کابینۂ وزارت اور خصوصاً وزیر تعلیم کی شان میں استعمال کئے گئے ہیں ۔ مجلس قانون ساز کے ایک ممبر کی شان سے گرے ہوئے ہیں ۔ صوبے کی پارلیمنٹ کے ایک ذمہ دار رکن اور اپنے علقے کے رہنما کی زبان سے ایک بلند حیثیت وزیر کی شان میں ایسے ناشائستہ الفاظ سن کر اس خیال کی صداقت آئینہ ہو جاتی ہے کہ

جدید تعلیم یافتوں میں لکھے پڑھوں کی کمی نہیں ہے
کوئی ہے بی اے کوئی ہے ایم اے مگر کوئی آدمی نہیں ہے

تاجور

نارتھ ویسٹرن ریلوے کی نئی تیز رفتار گاریاں

موٹر لاریوں کے ذریعہ سفر کرنے کا عام رواج ہے ۔ غرباء تو غرباء اب اچھی حیثیت کے لوگ بھی اکثر اوقات موٹر لاریوں کے ذریعہ سفر کرتے ہیں ۔ حالانکہ اس سواری میں جن تکالیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان کا تصور بھی دل دہلا دیتا ہے لاریوں کے مختلف اسٹیشن ہیں ۔ بعض اسٹیشنوں سے تو وقت کی پابندی کے ساتھ لاریاں روانہ ہو جاتی ہیں ۔ اور اکثر اسٹیشنوں پر وقت کی پابندی

قطعاً نہیں ہوتی۔ دو دو گھنٹے مسافر لاریوں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اور گرمی کی شدت سے پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں۔ گرمیوں میں تپش کی وجہ سے اول تو ویسے ہی ہر وقت برا حال رہتا ہے اور پھر لاری کا سفر اور بھی جان لے لیتا ہے۔

جن اسٹیشنوں پر وقت کی پابندی ہوتی ہے۔ وہاں یہ حال ہے کہ لاری اپنے معینہ وقت پر روانہ تو ضرور ہو جاتی ہے۔ لیکن دو دو قدم پر ٹھہر کر مسافروں کو بٹھایا جاتا ہے۔ اور اس کثرت سے سواریاں بٹھالی جاتی ہیں کہ دم گھٹنے لگتا ہے۔ سواری پر سواری بیٹھی ہوتی ہے۔ پسینے سے شرابور اور اس قدر تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ کہ اگر تھوڑے سے بھی اختیارات ہوں تو ہمیشہ کے لئے لاریاں بند کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس سے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں کہ موٹر لاریوں کے ذریعہ سفر کرنے والوں کو اور کیا کیا تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ لوگ اچھی طرح واقف ہیں جن کا اس مصیبت سے پالا پڑتا رہتا ہے۔

آئے دن اخبارات میں لاریوں کے تصادم کی خبریں پڑھی جاتی ہیں اور سینکڑوں جانیں ضائع ہوتی رہتی ہیں۔ فقط سواریوں کی جانیں ضائع نہیں ہوتیں۔ بلکہ راہ گیر بھی بکثرت موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر تانگہ یا بیل گاڑی وغیرہ سے تصادم ہوا۔ تو تانگہ اور بیل گاڑی کی سواریوں کے علاوہ گھوڑے اور بیل وغیرہ کی بھی شامت آجاتی ہے۔ اور اگر لاری الٹ گئی تو صرف سواریوں کا خون ہوا۔ مختصر یہ کہ موٹر لاریوں کی وجہ سے طوفان بدتمیزی برپا ہے اور موت کا بازار گرم رہتا ہے۔

انہی مشکلات کے پیش نظر نارتھ ویسٹرن ریلوے نے تیسرے درجہ کے مسافروں کی سہولت کے لئے ذیل کی لائنوں پر نئی اور تیز رفتار گاڑیاں جاری کی ہیں۔ جن کا نام ڈیزل کار رکھا گیا ہے۔

(۱) جالندھر سٹی۔ ہوشیارپور۔ کپورتھلہ۔ ٹانڈہ۔ اڑمڑ۔ دسوہا۔ اور لوہیاں خاص۔

(۲) امرتسر۔ ناروال۔ قادیان۔ بٹالہ اور گورداسپور

(۳) فیروزپور۔ موگہ تحصیل جگراؤں۔ لدھیانہ۔ بھٹنڈہ۔ دھوری اور سنگرور اس کے علاوہ ایک گاڑی روزانہ جالندھر سے لاہور آیا کریگی چنانچہ پندرہ مئی سے یہ گاڑیاں مذکورہ لائنوں پر کام کر رہی ہیں اور تیسرے درجہ کے مسافر نہایت آرام سے سفر کر رہے ہیں۔

مسٹر جارڈن پبلسٹی مینجر نارتھ ویسٹرن ریلوے کی طرف سے لاہور کے اخبار نویسوں کو ڈیزل کار میں لاہور سے امرتسر تک سفر کرنے کے لئے ۱۳ مئی کو مدعو کیا گیا تھا۔ لاہور سٹیشن پر فواکہات سے جرنلسٹوں کی تواضع کی گئی۔ اور ٹھیک ½ ۱۱ بجے گاڑی لاہور سے امرتسر کی طرف روانہ ہو گئی۔ گاڑی میں بیٹھنے پر ہر ایک جرنلسٹ محسوس کرتا تھا۔ کہ گاڑی میں جو سیٹیں مسافروں کے لئے مہیا کی گئی ہیں۔ نہایت آرام دہ ہیں۔ ایک گاڑی میں تقریباً ایک سو ایک مسافروں کے بیٹھنے کی جگہ موجود ہے۔ اس گاڑی کا انجن بھی اسی گاڑی کے اندر ایک طرف ہے۔ اور اس گاڑی کو ڈرائیور بآسانی دونوں طرف سے چلا سکتا ہے۔ انجن ۲۵۰ ہارس پاور کا ہے۔ اس انجن میں کروڈ آئل استعمال ہوتا ہے۔ اور دھواں بہت کم نکلتا ہے۔

یہ ڈیزل کار ہمیں ۴۵ منٹ کے اندر لاہور سے امرتسر لے گئی۔ امرتسر کے اسٹیشن پر نہایت شاندار لنچ دیا گیا۔ لنچ کے بعد مسٹر جارڈن نے فرمایا۔ کہ ان گاڑیوں کے متعلق تفصیلات سے واقفیت بہم پہنچانے کے لئے ہمارے جنرل مینجر نے اپنا نمائندہ بھیجا ہے۔ وہ ۲۸ سال سے پنجاب میں رہتے ہیں۔ اور ایک حیثیت سے پنجابی ہی ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد چیف سیلز مینجر نے ڈیزل کاروں کے متعلق واقفیت بہم پہنچائی۔ اور اعلان کیا کہ ڈیزل کاریں پندرہ مئی سے نارتھ ویسٹرن ریلوے کی مختلف لائنوں پر کام کرینگی۔

۲ بجے ہم امرتسر اسٹیشن سے لاہور کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ڈرائیور نے ہمیں بتلایا۔ کہ یہ ڈیزل کار ۲۹ منٹ میں لاہور سے امرتسر اور امرتسر سے لاہور پہنچ سکتی ہے۔ اور اس قدر تیز چلنے کے باوجود مسافروں کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ واپسی پر لاہور کے اسٹیشن پر پھر فواکہات سے تواضع کی گئی۔

ہماری رائے ہے کہ موٹر لاری میں سفر کرنے سے بدرجہا بہتر ہے کہ ڈیزل کاروں سے سفر کیا جائے۔ امید کی جاتی ہے کہ پبلک ان گاڑیوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھائے گی۔ کیونکہ ان گاڑیوں میں مسافر ہر لحاظ سے محفوظ رہتا ہے۔ اور راحت محسوس کرتا ہے۔ نہ تو اس گاڑی میں سفر کرنے والے مسافروں کی جان کا خطرہ ہے۔ نہ زخمی ہونے کا اندیشہ۔ نہ دم گھٹنے کی تکلیف سچ تو یہ ہے کہ نارتھ ویسٹرن ریلوے نے ڈیزل کاریں چلا کر پبلک کی سفری مشکلات کو راحت میں تبدیل کر دیا ہے ہم اس جدید انتظام پر نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ارباب انتظام کو مبارکباد دیتے ہیں اور پبلک سے پرزور سفارش کرتے ہیں۔ کہ پرائیویٹ لاریوں کے ذریعہ سفر کرنے کے جاں گسل خطرات کو دعوت دینے کے بجائے ڈیزل

کار کے ذریعہ سفر کریں۔

حکومت یُوپی ایک متقدر کانگریسی کی نظر میں

یُوپی کی کانگریسی وزارت ہندوستان کی تمام کانگریسی وزارتوں میں سب سے زیادہ قابلِ تحسین و ستائش سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس کے دورِ حکومت میں یوپی میں جس کثرت سے فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں۔ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ کانپور، الہ آباد اور بنارس تو جیسے فساد و بدامنی کے لئے وقف ہی ہو گئے ہیں۔ کانگریسی حکومت بجائے اس کے کہ ان فسادات کے حقیقی علل و اسباب کا تدارک ۔ اور بصیرت و دانشمندی سے ان کے انسداد کی کوشش کرے۔ استبداد و استبداد کے ذریعے فساد کا قلع قمع کرنا چاہتی ہے چنانچہ یوپی کی حکومت باشندگانِ بنارس پر جرمانہ لگانے کی تجویز سوچ رہی ہے۔

بابو شو پرشاد گپت بنارس کے ممتاز ترین کانگریسی اور آل انڈیا شہرت و امتیاز کے مالک ہیں۔ بنارس کا "گیان منڈل" ادارہ روزنامہ "آج" اور "کاشی ودیا پیٹھ" جو ہندوستان میں ہندی زبان اور ہندو تہذیب کی ترویج و احیا کی غرض سے قائم ہیں۔ بابو شو پرشاد ہی کی فیاضی و دریا دلی کے مرہونِ منت ہیں۔ اُنھوں نے حال ہی میں ایک مضمون شائع کرایا ہے۔ جس سے حکومت یُوپی کے خط و خال پر بہترین روشنی پڑتی ہے۔

بابو شو پرشاد صاحب اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں۔

"قابلِ غور امر یہ ہے کہ کانگریس کا ٹھیکہ لینے والے ہی صوبے کی حکومت کے مالک ہیں۔ کیا اسی لئے ایسی شہرت اور طاقت حاصل کرنے کی غرض سے پبلک نے اتنی قربانی کی تھی۔ کہ ان کے کہلانے والوں کی حکومت میں مہینوں کے لئے بنارس کا ٹھیکہ دیا جائے۔ اور ان کے کانوں پر جوں نہ رینگے۔ کیا اسی کے نتیجے کے طور پر جمہور میں اس یقین کو ترقی ہوگی کہ ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ اپنی حکومت اپنے ہاتھ میں لیں۔ میرے جیسا بدنصیب آدمی تو نہ جانے کیا کیا سوچ رہا ہے۔ جس کا میرے ہی دماغ میں چھپا رہنا بہتر ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ملیت کے لئے اس صوبے کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے اہلِ بنارس کی جان و مال کی حفاظت میں قطعاً ناکام ثابت ہو رہے ہیں باشندگانِ بنارس پر جرمانہ لگانے والے ہیں۔ یہ تو وہی مثل ہوئی "اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے"۔ کیا اس بے انصافی کی بھی کوئی حد ہے۔ یہ گیہوں کے ساتھ گھن پسنے کی کہاوت نہیں ہے بلکہ چند گھنوں کے پیسنے کے لئے جو گیہوں میں کہیں کہیں چھپے ہونگے۔ سارے گیہوں کو پیس کر اس کا ستیاناس کرنا ہے۔ اس حماقت اور مطلق العنانی کی تائید بے وقوف یا حضرت شیطان کی اُمت ہی کر سکتی ہے۔ میں نے تو اس کے متعلق "آج" کا شذرہ پڑھ کر سر نیچا کر لیا تھا۔ اور میں نے بھگوان سے پرارتھنا کی تھی۔ کہ اس شذرہ کے شائع ہونے سے پہلے ہی "آج" سے میرا تعلق منقطع ہو گیا ہوتا تو بہتر تھا۔

میں اب بنارس کی پبلک سے مؤدبانہ درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ کہ انہیں تعزیری پولیس کے تاوان کی جو سنتا ہوں ان پر عائد کیا جانے والا ہے دل و جان سے مخالفت کریں۔ اور ضرورت پڑے تو اس تاوان کی مخالفت جیل اور جرمانے کی سزا برداشت کرنے اور پٹنے کے لئے تیار رہیں۔ لیکن اس ناجائز اور غیر قانونی ٹیکس کے نہ دینے کا عہد کر لیں۔"

ایک آل انڈیا کانگریسی لیڈر نے حکومت یوپی کی ناکامی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ اس پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اُردو کو تباہ کرنے کا ایک اور خاص طریقہ

اُردو کے دشمن اُردو کو تباہ کرنے کا ایک خاص طریقہ عمل میں لا رہے ہیں۔ جس کی حامیانِ اُردو کو شاید خبر نہیں۔ کیونکہ اُردو اخبارات و جرائد میں اس کا کوئی تذکرہ دیکھنے میں نہیں آتا۔

ہندی میں "ز" "غ" "ف" "ق" وغیرہ حروف نہیں ہیں اس لئے ہندی رسم الخط میں "زمانہ" "غفلت" "فائدہ" "قاعدہ" وغیرہ الفاظ لکھے جاتے تھے تو اُردو کے تلفظ کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ہندی حروف کے نیچے نقطے لگا دیئے جاتے تھے۔ لیکن گذشتہ ستمبر میں "آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن" کا جو سترھواں سالانہ اجلاس ہوا تھا اس میں اس کے متعلق ایک ریزولیشن منظور کیا گیا ہے جو یہ ہے۔

"ہندی میں فارسی وغیرہ زبانوں سے آئے ہوئے الفاظ مثلاً "کاغذ" "فائدہ" وغیرہ میں نیچے نقطہ لگا کر لکھنا زبان کی صورت کو مسخ کرنا ہے۔ لہٰذا اس سمیلن کی رائے میں نیچے نقطے لگا کر لکھنے کا رواج ترک کر دینا چاہیئے"۔

دیکھا آپ نے اس تجویز کے ذریعہ اُردو الفاظ کو کس طرح برباد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

ساہتیہ سمیلن کے اس ریزولیشن کو کامیاب بنانے کے لئے طرح طرح کی کوششیں بروئے کار لائی جا رہی ہیں۔ چنانچہ گجپت سرن داس صاحب ایڈوکیٹ ڈیرہ دون اپنے ایک مضمون مطبوعہ ہفت روزہ "آج" بنارس میں اُردو رسم الخط پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"رسم الخط کے انتخاب میں ضد مناسب نہیں۔ آسان سے آسان اُردو لکھنے اور بولنے میں "س" "ص" "ث" کے فرق کو سمجھنا دشوار ہے ان کا تلفظ جب اہلِ عرب کرتے ہیں۔ تو ان کا فرق صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ مگر جب ہندوستانی مسلمان ان حرفوں کا تلفظ کرتے ہیں۔ تو کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔"

اس طرح اُردو کو برباد کرنے کے لئے ہر الٹا سیدھا پروپیگنڈا کام میں لایا جا رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ اول تو حامیانِ ہندی نے اپنی تقریر و تحریر اور روزمرہ کی گفتگو میں عربی اور فارسی کے مروجہ الفاظ کو نجس اور ناپاک سمجھ کر بالکل خارج ہی کر دیا ہے اور اگر سہو یا مجبوری سے عربی یا فارسی کے الفاظ استعمال بھی کرتے ہیں۔ تو ساہتیہ سمیلن کے ریزولیوشن کے مطابق اس کی صورت بالکل مسخ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ مقتدر سے مقتدر ہندی اخبارات و رسائل کو ملاحظہ فرمایئے۔ تو آپ "کاغذ" "غفلت" "قاعدہ" "فائدہ" وغیرہ الفاظ کو "کاگج" "گپھلت" "کائدا" "پھائدا" وغیرہ لکھا ہوا پائینگے۔

ہندی کے ایک اہلِ قلم نے ایک علمی مضمون لکھتے ہُوئے شاید کوئی ہندی الفاظ نہ ملنے کی وجہ سے "جذب" کا لفظ استعمال کیا تھا تو اسے "ججب" لکھا تھا۔

یہی حال مخالفین اُردو کی گفتگو کا ہے۔ آپ اس قسم کے لوگوں سے گفتگو کر کے دیکھ لیجئے وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود "غ" "خ" "ز" وغیرہ حروف کا تلفظ غلط کرینگے۔

جیسا کہ حامیانِ ہندی کا ارادہ ہے اگر خدانخواستہ اُردو کا رسم الخط ملک سے مٹ گیا۔ تو اُردو زبان کا نام و نشان بھی نہ رہیگا۔

تعلیم بالغان کے متعلق چند تجاویز

ہندوستان کی جہالت و ناخواندگی اس کی روشن پیشانی کے لئے ایک بدنما داغ ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ اب ملک میں اس داغ کے دور کرنے کے لئے آمادگی پیدا ہو گئی ہے بعض صوبوں میں ناخواندگی کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا گیا ہے۔ اور بعض صوبے اس کی تیاریوں میں سرگرم ہیں۔ اس موقعہ پر بیجا نہ ہوگا۔ اگر ناخواندگی کے ازالہ اور تعلیم کی ترویج کے لئے چند تجاویز پیش کی جائیں۔

(۱) ہر شہر اور ہر ضلع میں ترویج تعلیم کے لئے شہر اور ضلع کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ جو بطور خود بھی ناخواندگی کے دور کرنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لائیں اور اس سلسلے میں حکومت کی کوششیں کامیاب بنانے کے لئے بھی اس کے ساتھ تعاون کریں۔

(۲) جن اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ اور دوسرے نوجوان تعلیم بالغان کی غرض سے دیہاتوں میں کام کرنا چاہیں۔ ان کے لئے باقاعدہ حلقہ ہائے عمل متعین کر دیئے جائیں۔ تاکہ ہر جماعت کی کارگزاریاں نمایاں اور ممتیز ہو سکیں۔ اُمید ہے کہ اس طرح ہر جماعت ترویج تعلیم کے لئے زیادہ سے زیادہ دلچسپی اور حوصلہ مندی سے کام کرے گی۔

(۳) ہر صوبے کی حکومت کی طرف سے ایک ماہانہ بلیٹن جاری کیا جائے۔ جس کے ذریعہ پبلک کو بتایا جائے کہ ناخواندگی کے ازالہ اور تعلیم کی ترویج کے لئے کہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس بلیٹن میں ایک مقام کے پڑھنے پڑھانے والوں کے جو حالات شائع ہونگے۔ وہ دوسرے مقام کے پڑھنے پڑھانے والوں کے لئے ترغیب و تشویق کا باعث ہونگے بالغوں کی تعلیم کے لئے جہاں جہاں اسکول اور مدرسے کھولے جائیں اور اس کام میں حکومت اور پبلک کی طرف سے جو امداد و اعانت ملے۔ ان سب کی تفصیل اس بلیٹن میں شائع کی جائے۔

(۴) اُردو اور ہندی کے جتنے روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ان سب سے حکومت استدعا کرے کہ وہ عوام میں تحصیل علم کا ذوق پیدا کرنے کے لئے، جلی حرفوں اور بڑے بڑے ٹائپوں میں حروف شناسی کے ابتدائی اسباق شائع کرنے کا سلسلہ جاری کریں۔ ہفتہ وار اخبارات کو ہر اشاعت میں اور روزانہ اخبارات کو ہفتہ میں دو بار ایسے اسباق ضرور شائع کرنے چاہئیں۔

(۵) حروف شناسی کے ابتدائی اسباق کے متعلق متکلم فلمیں بھی تیار کرائی جائیں اور مختلف مقامات پر ان فلموں کی نمائش کر کے عوام کو حروف شناسی کے ابتدائی اسباق سے روشناس کرایا جائے۔

(۶) جس طرح دواؤں اور دوسری تجارتوں اور تفریحی چیزوں کے پوسٹر اور بورڈ شہر کے چوراہوں اور خاص خاص مقامات پر لگے ہوتے ہیں۔ اسی طرح حروف تہجی اور ابتدائی اسباق کے پوسٹر اور بورڈ تیار کرا کے شہر کے چوراہوں اور ان مقامات پر جہاں لوگ میلے، تماشے اور تفریح کی غرض سے جمع ہوتے ہوں۔ نیز ریل گاڑیوں میں لگائے جائیں۔ ان پوسٹروں اور بورڈوں میں حروف اور اسباق سے متعلق دلچسپ اور جاذب توجہ تصویریں بھی ہونی چاہئیں۔

اگر ان تجاویز پر عمل کیا جائے تو کچھ شک نہیں کہ اس سے ترویج تعلیم میں موثر اور گراں قدر مدد مل سکتی ہے۔

(ادارہ)

نوجوان بیوہ!

زُلف بے ترتیب، کپڑے ملگجے، چہرہ اُداس
ایک پژمردہ تمنّا، ایک غم انجام آس
پھول سے رُخسار کی سُرخی میں زردی کی جھلک
ہونٹ کُھملائے ہوئے سے، شبنم آلودہ پلک
ناخنوں کی کور پر مہندی کے دُھندلے سے نشاں
ہاتھ کہتے ہیں، ابھی توڑی گئی ہیں چوڑیاں
ہر طرف سے ہے دوپٹہ کی کناری تار تار
چھن چکی ہیں بجلیاں کانوں کی، اور گردن کا ہار
پائچوں کی بیل پر شکنوں کا عالم ہائے ہائے!!
یہ جوانی اور یہ فریاد و ماتم ہائے ہائے!!
اس قدر ویران نگاہیں، اس قدر حالت تباہ
جیسے دُنیا میں نہیں اس کے لئے کوئی پناہ
رُوح بھی غلطاں ہے اس کے دیدۂ خونبار میں
دل کی دھڑکن بھی ہے شامل نبض کی رفتار میں

اِک خزاں دیدہ کلی کی طرح مُرجھائی ہوئی
سر سے پا تک بیوگی ہی بیوگی چھائی ہوئی

ایک غم کی رات جس کی صبح ہو سکتی نہیں
اِک کلی جو اوس سے بھی منہ کو دھو سکتی نہیں
اِک بھیانک خواب جس کی خودکشی تعبیر ہے
ایک انساں جو غم و اندوہ کی تصویر ہے
اِک جواں اُمید جو سینہ میں گھُٹ کر رہ گئی
اِک سہاگن اپنے جو ساجن سے چھُٹ کر رہ گئی
اِک چمن جس پہ بہار آتے ہی بجلی گر پڑی
اِک مُسلسل مرگ، اِک پیہم قیامت کی گھڑی
ایک دُکھیاری نہیں جس کا کوئی جز بیکسی
ایک کہرے کی سحر، جس میں نہیں تابندگی

ایک حسرت جو اُبھرنے بھی نہ پائی تھی ابھی　　زندگی جس کے لئے پیغام لائی تھی ابھی
ایک نغمہ جو ابھی پُوری طرح گونجا نہیں　　ایک عورت جس نے دُنیا کو ابھی دیکھا نہیں
ایک شمعِ آرزو جلتے ہی جو گُل ہو گئی　　اِک صدا جو دل سے اُٹھی اور دل میں کھو گئی

ایک نورس پھول جو وقتِ سحر کمھلا گیا
اِک جوانی جس پہ دو دن میں بڑھاپا آ گیا

جانتا ہوں تیرے مستقبل کے پیچ و خم کو میں　　فطرتِ گیتی، مزاجِ ہستیٔ عالم کو میں
مُسکراہٹ بھی تری دُنیا کو ہوگی ناگوار　　شک میں ڈالے گا جہاں کو تیری آنکھوں کا خمار
تجھ سے بیاہی عورتیں ملتے ہوئے کترائیں گی　　دُور رہ کر تجھ سے ساون کی ملھاریں گائینگی
تیری پرچھائیں سے دُلہن کو بچایا جائے گا　　تجھ کو ہر تقریب میں نیچا دکھایا جائے گا
تیرے ہنسنے پر اُٹھیں گی عورتوں کی اُنگلیاں　　گھُور کر دیکھیں گی تجھ کو بن بیاہی لڑکیاں
تیری اُمیدوں سے لیگی فطرتِ ہستی خراج　　تجھ کو ٹھکرائے گا اِک اِک گام پر ظالم سماج
آرزوؤں پر تری پہرے بٹھائے جائیں گے　　رنج و غم کے تجھ کو افسانے سُنائے جائیں گے

دہر میں اب کوئی گنجائش نہیں تیرے لئے
یہ جہاں اور اس کی آسائش نہیں تیرے لئے

ماہر القادری

مرزا وفا

(۱)

شہر کا غلیظ اور مفلس ترین محلہ - اندھیری گلیاں، شکستہ اور غیر آباد دکانیں، اور نئے پیشہ وروں کیلئے آبکاری، گھروں کے دروازوں پر ٹاٹ کے پھٹے ہوئے پردے تختوں کی درازوں میں سے چراغوں کی مدھم روشنی - فاقہ زدہ کتوں کا ٹھہر ٹھہر کر اجنبیوں پر بے دلی سے بھونکنا - چار فرشتے ان گلیوں میں کسی کی تلاش کرتے پھر رہے ہیں -

پہلا فرشتہ - وفا مرزا اور اس محلہ میں - کوئی ہوش کی بات کرو -

دوسرا فرشتہ - حنانی آپ کب کا ذکر کرتے ہیں - اب تو وہ اس ظلمتکدہ کے بھی قابل نہیں رہا -

تیسرا فرشتہ - منانی! انہیں شاید اس زمانہ کا خیال ہے، جب وفا مرزا کی گنہگاریوں کا دور اپنے شباب پر تھا - اور وہ آسمانوں کو بھی اپنے قدموں کے قابل نہ سمجھتا تھا -

چوتھا فرشتہ - یزدانی! یہ وفا بڑا ظالم نکلا - کوئی نعمت ایسی نہیں جو اس پر نازل نہ ہوئی اور کوئی گناہ ایسا نہ تھا جو اس نے نہ کیا - مگر واہ رب العالمین تیری کیا شان کریمی ہے - وفا کا ہر معاملہ ہر بار نظر انداز کیا جاتا ہے

حنانی (پہلا فرشتہ چوتھے فرشتہ سے) مگر عرفانی یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی - اب اسے کہاں کہاں تلاش کریں -

منانی - بس کسی خرابات میں ہوگا یا کوئی عیش و نشاط کی محفل جمائے فسق و فجور میں مصروف آوارہ گردوں کو اکٹھا کئے بیٹھا ہوگا -

یزدانی - یا کسی بدررو میں اوندھے منہ پڑا ہوگا -

عرفانی - یا سر راہگذر خستہ و خوار پڑا ہوگا -

یزدانی - چلو ادھر کوزہ گروں میں چل دیکھیں -

حنانی - (کسی کو گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا دیکھ کر) یہاں تو دیکھو یہ کون بشر ہے -

یزدانی - اے شخص تو کون ہے؟

عرفانی - کوئی ابن آدم ہے - یہ وہی وفا تو نہیں -

منانی - (قریب سے پہچان کر) واہ رے انسان - ہم نے تمام شہر چھان مارا - اور تو یہاں بیٹھا ہے - کچھ اپنی خبر بھی ہے -

حنانی - رب العالمین - تو بہتر جانتا ہے - یہی وہ آدمی ہے جس کی دولت اور حسن نوازی کا تمام دنیا کو اعتراف تھا، اور اب اس منزل میں ہے - رب العالمین بیشک عزت اور ذلت تیرے اختیار میں ہے -

یزدانی - لیجئے اس رند خراباتی کے لئے سجدے کرائے تھے - ارے میاں کس رنگ میں ہو -

عرفانی - رنگ ونگ کیا پوچھتے ہو یہ سب نظر آرہا ہے - پکڑو اور لے چلو - اٹھو جی -

منانی - ارے سو رہے ہو - کچھ سنتے بھی ہو -

وفا مرزا - کون صاحب ہیں آپ - ہم ذرا محو خیال یار بیٹھے ہیں

حنانی - خوب! ذرا غور کیجئے - اس درجہ کو پہنچ گئے - رسی جل گئی، مگر بل نہیں گیا -

مرزا وفا - آپ تو کوئی صاحب ذوق ہیں - مگر وہ بل ہی کیا جو نکل جائے -

منانی - ارے بھلے مانس - یہ بحث کا وقت نہیں -

مرزا وفا - مگر آپ کون صاحب ہیں؟

یزدانی - ہم قدیم خیر خواہ ہیں - کچھ کام ہے - تشریف لے چلئے -

مرزا وفا - (گھٹنوں میں سر دیئے ہوئے) اللہ! تیرا شکر ہے - لاکھ لاکھ شکر ہے - کہ ابتک خیر خواہ باقی ہیں - خیر صاحبو! چلنا ولنا بھی دیکھا جائے گا - آپ کی کیا خاطر کروں، عجب بے سروسامانی ہے - کیا مضائقہ ہے - وہ شرم رکھے گا - آئیے تشریف رکھئے - (سر اٹھا کر دیکھتا ہے) کہاں بٹھاؤں چلو اس حوض کے کنارے بیٹھیں گے - ابھی چاند نکلیگا -

عرفانی - (دوسروں سے) اسے زیادہ طرح نہ دو - یہ سب بدمستی کی باتیں ہیں -

مرزا وفا - (اٹھتا ہے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے) معاف کیجئے - ذرا سہارا تو دیں - مگر یہ لباس بچانا - پیٹ کا لہو خشک نہیں ہوا -

(ذرا ہوش سے) آئیے تو سہی میرے مولا تو ہے تو کیا غم۔ مگر فرمائیے تو سہی۔ یہ کیا تقریب ملاقات ہے۔

حنانی - (وفا کی صورت سے متاثر ہو کر) تقریب ملاقات بھی معلوم ہو جائے گی۔

عرفانی - ہمیں معلوم نہیں۔ تم چلو۔

مرزا وفا - کہاں اور کیوں۔ تم میرے مہمان ہو۔ مجھے میزبانی کی خدمت سے محروم نہ کرو۔ میں ہر جگہ چلنے کیلئے تیار ہوں۔ مگر کچھ معلوم تو ہو۔

منانی - بتا دیتے ہیں۔ کیوں تکلف کیا ہے۔

یزدانی - سنو، بارگاہ رب العالمین میں چلو۔

مرزا وفا - سچ کہتے ہو کس منہ سے چلوں۔ کیا لے کر چلوں۔ (یکلخت بے ہوش ہو جاتا ہے) فرشتے غائب ہو جاتے ہیں۔

(۲)

بارگاہ رب العالمین - فرشتے ادب سے کھڑے ہیں۔ کچھ سربسجود ہیں۔ چار فرشتے ایک انسان کو اٹھائے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ اسے فرش پر رکھ دیتے ہیں اور خود سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ یہ انسان زخمی ہے۔ پیٹ سے خون آلود ہے۔ پھٹ رہی ہے۔ پیٹھ پر زخم ہیں۔ گوشت کے لوتھڑے اُڑ چکے ہیں۔ گھٹنوں کی چپنیں نکل چکی ہیں۔ حالت ستم زدہ مگر چہرے پر متانت اور استقلال ہے۔ اٹھ کر یوں دو زانو بیٹھ گیا ہے گویا مراقبے میں ہے۔ یہ فرشتے سجدے سے اٹھتے ہیں۔ اور ذکر و تسبیح شروع کرتے ہیں۔ جس میں دوسرے فرشتے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ زخمی انسان اٹھ کر حمد و ثنا میں مشغول ہو جاتا ہے بشکل سے گنہگاریوں کا اعتراف ظاہر ہے۔

فرشتے (مل کر) رب العالمین تو عالم الغیب۔ رحمٰن ہے۔ رحیم ہے۔ حیّ القیوم ہے۔ بے لسوں کا حامی اور بیکسوں کا مددگار ہے تو جبار ہے۔ قہار ہے۔ ظالموں اور گنہگاروں کو سزا دیتا ہے ارض و سما کا نظام تیری بہترین نعمت ہے۔ انسان کو ... اشرف المخلوق بنانا تیری ہی حکمت اور بخشش ہے انسان کو ظلم و فساد سے بچانا تیرا وعدہ اور تقدیر ہے۔ اے رب العالمین زمین والوں کو فساد کی لعنت سے بچا۔ کہ تیری مشیت پوری ہوتی رہے۔ ہم تیری تعریف کرتے ہیں۔

غیب سے ندا - کیا ہے۔

عرفانی - رب العالمین۔ تیرا حکم ہے کہ زمین والوں کی نگرانی اور رہنمائی کی جائے۔ یہ تیری کریمانہ عنایت ہے۔ پھر حکم ہے کہ فتنہ و فساد کرنے والوں کو پیش کیا جائے۔ یہ انسان بہت فسادی ہے۔ باغی ہے۔ لوگوں کو صراط مستقیم سے بھٹکاتا ہے۔ باری تعالیٰ تیرے بندوں کے لئے اس بشر کا وجود ایک خطرِ عظیم ہے۔

غیب سے ندا - کون؟ وفا۔

عرفانی - اے سمیع و علیم۔ یہی ہے وہ مرزا وفا اس کا ایک معاملہ نہیں۔ بلکہ سینکڑوں ہیں۔ تیری غفور الرحیمی ہے۔ کہ یہ ان حالتوں میں بھی زندہ رہا۔ تیری رحمتیں سب کیلئے ہیں۔

غیب سے ندا - ہاں! وفا کیا کہتا ہے۔ (وفا ادب سے کھڑا سن رہا ہے۔)

عرفانی - رب العالمین۔ وفا نے کیا کیا نہ کیا؟ اے عالم الغیب تو سب کچھ جانتا ہے۔ وفا جاہل نہیں۔ اسماء سے واقف ہے۔ اعمال و نتائج اور مکافاتِ کردار سے آگاہ۔ شرابیں پیں۔ اپنی ہیں۔ پرائی ہیں۔ قرض کی پینے لگا۔ پھر اپنی بنانے لگا۔ رندی و مستی گویا پیشہ کر لیا۔ نیک و بد کا فرق بالائے طاق رکھ دیا۔

ہمدانی - رب العالمین ایک بشر تیری نعمتیں اور برکتیں اپنی لذت اندوزیوں کے لئے یوں بے دردی سے برباد کر دے اور کوئی پرسش نہ ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ مسرف، محبت کا مستحق نہیں۔ اس نے نااہلوں سے دوستی کی۔ بدوں سے نیکی اور نیکوں سے بدی کی۔

منانی - رب العالمین۔ اس گمراہ نے صراط مستقیم کو چھوڑا۔ زندگی کے نہاکن راستے اختیار کئے اور تیری ہی نعمتوں کو لٹا کر مفلسی کا شکوہ کرنے لگا۔ اور احسان فراموش کر بیٹھا۔ امن کو برباد کیا اور بدامنی پھیلانے لگا۔

یزدانی - رب العالمین۔ تیری مشیت کا پاس لازم ہے۔ تیرے بندوں کے طبقے ہیں۔ ان کا فرق ضروری ہے۔ امیر و غریب کی تفریق اس لئے ہے کہ انسان تیرے احکام پر عمل اور تیری صفات کا مظہر ہو کر مساوات قائم رکھے۔

مگر یہ تیرا بندہ ان باتوں کا قائل ہی نہیں - اہلِ مال کو فنا کرنا اس کی تازہ ترین جدت ہے - اے رب العزت - تو خوب جانتا ہے - کہ کون ذلیل ہو - رب العالمین - انسان کی تہذیب و ترقی خطرے میں ہے - تو بچانے والا ہے - ہم نہیں جانتے کہ تیری کیا مرضی ہے - تو سب سے زیادہ جاننے والا ہے ہم تیری تعریف کرتے ہیں - یہ مرزا وفا حاضر ہے - رب العالمین حکم کر کہ ہم تعمیل کریں - تو ظالموں کا دوست نہیں تو سب کائنات پر قادر ہے -

فرشتے تعریف و تسبیح کے بعد اپنے اپنے مقام پر کھڑے ہو جاتے ہیں -

مرزا وفا جہاں تھا وہیں کھڑا ہے - بے کھٹکے کھڑا ہے ذہنی آسودگی چہرے سے ظاہر ہے - اب چہرے پر خاص رونق ہے - نگاہ فرش پر ہے - دونوں ہاتھ ناف کے برابر ہیں - بائیں ہاتھ کو دائیں سے سنبھالے ہے - دایاں پاؤں دوسرے سے ذرا آگے ہے - ایسے انداز سے کھڑا ہے - گویا یہ ہنگامہ کوئی بات ہی نہیں - اس شان سے کھڑا ہے - گویا اپنے گھر میں ہے -

غیب سے ندا - وفا! تو نے سُنا -

وفا مرزا - محیط نور میں دائیں، بائیں، آگے اوپر دیکھتا ہے - پیچھے (فرشتے رکوع میں ہیں) - تم کون ہو - کہاں ہو - کدھر ہو -

ندا - میں تیرا رب ہوں -

وفا - سنا ہے - دیکھا نہیں - کیوں کر کہوں کہ تو ہے -

ندا - تو مجھے دیکھ نہیں سکتا -

وفا - یہ لنترانیاں تو ہم ہمیشہ سنتے آئے ہیں -

فرشتے - اے انسان ادب!

ندا - وفا تجھے دیکھنے کی تاب ہے؟

وفا - اگر تاب نہیں تو یہ سرتابیوں کا کیا ہنگامہ ہے - (فرشتوں کی طرف اشارہ کر کے) اور یہ لوگ کسی کے معصوم بندے کو کیوں پکڑ لائے ہیں - اور کس گناہ کے طفیل -

ندا - وفا! میں تیرا رب ہوں - تو ہمارا ہی تو بندہ ہے - ہم نے بلایا ہے - (تیرے گناہ) تیری بے قاعدگیاں ابھی بیان کی گئی ہیں

وفا - روز ازل سے یہی سنتے رہے - کہ کہیں میرا رب ہے اور اسے دیکھنے کے لئے رسوا بھی ہوئے - اگر دیکھنے ہی کی آرزو جرم ہو سکتی ہے تو اے ہاتف غیب یہ بھی کوئی گناہ ہے - میں گنہگار ہی سہی - آ تو بھی گنہگار نواز ہو جا - آ! سامنے آ - دیکھ - کہ کیسا ستایا ہوا ہوں - اگر میں گنہگار ہوں - تو کبھی تو مجھے بھول گیا - تو کون ہے؟ کدھر ہے؟ کہاں ہے؟ اور کیا ہے؟

عرفانی - اے انسان ادب! یہ سوخیاں اسی ڈھیل کا نتیجہ ہیں جو روا رکھی گئی - رب العالمین یہ بشر بڑا مفسد ہے - تیری مشیت کا قائل نہیں -

وفا - اے ہاتف غیب - یہ مداخلت کیا معنی - اگر حقیقت ہے تو سامنے آ - کہ میرا شوق پورا ہو - دلِ بیتاب تسکین پائے کبھی انہی سے سجدے کرائے تھے - آج ان سے ذلیل نہ کرا - پیدا کئے کی شرم رکھ - سامنے آ - کہ تجھے دیکھنے کی ازل سے تمنا ہے -

فرشتے - اے انسان! ادب! ادب!!

وفا - (بے کسی کے عالم اضطرار میں سینے پر سر جھکا لیتا ہے - اے میرے رب تو کیوں مجھ بے بس کو بھول گیا؟

دفعتہً محیط نور میں اضطرار پیدا ہوتا ہے - فرشتے رکوع میں چلے جاتے ہیں -

ندا - وفا ہمارے پاس ہے - (فرشتے سجدے میں گر جاتے ہیں - (وفا سے) وفا - تیرا رب تیرے بہت قریب رہتا ہے - تو بھول جاتا ہے - تیرا رب تجھے ہر دم یاد رکھتا ہے -)

وفا - پھر یہ حجاب کیسا - روبرو ہو کے دکھا کہ میں کس منزل میں ہوں

محیط نور میں موج سی اٹھتی ہے - ایک پردہ آگے جاتا ہے - ایک تجلی ہوتی ہے اور ایک پردہ سا آتا ہے - محیط نور بدستور قائم ہو جاتا ہے - وفا بیقرار ہو کر آگے بڑھنے کو ہے - لڑکھڑاتا ہے کہ فرشتے لپک کر سہارا دیتے ہیں - وفا بے حس سا ہو کر وہیں رہ جاتا ہے - دائیں بازو سے پیشانی کو سہارا دیتا ہے -

فرشتے حمد و ثنائے الٰہیہ کے گیت گاتے ہیں - (؟)

وفا - میرے رب -

ندا - وفا -

وفا - میں تیرا بندہ ہوں -

ندا ۔ ہمیں ہمیشہ ناز ہے۔

وفا ۔ میرا نیاز قبول کر۔میرا حال مجھ سے سُن۔

ندا ۔ ہمیں معلوم ہے۔

وفا ۔ اپنی زبان سے سنا کر تسکین ہو جائے گی۔ انہیں بھی (فرشتوں کی طرف اشارہ کر کے) معلوم ہو جائے۔ کہ ہمارا بھی کوئی ہے۔

ندا ۔ کہو۔ یہ بھی گلہ جاتا رہے۔

وفا کھڑا ہے۔ انداز بے تکلف ہے۔ دونوں ہاتھ ناف کے برابر ہیں۔ نگاہ فرش پر ہے۔ کبھی کبھی ضرورت کلام کے لئے محیط نور پر اُٹھ جاتی ہے۔ اندازِ بیان کے لئے ہاتھوں میں ضرورت کے علاوہ کوئی حرکت نہیں۔

وفا ۔ میرے رب تو ہے۔ میں تیری (بہترین) تعریف ہوں۔ تو زندگی ہے۔ تو زمینوں، آسمانوں اور جملہ عناصر کا مالک ہے۔ تو قادر۔ قادرِ مطلق ہے۔ لیکن تیری تعریف میں ہوں میرے رب۔ جب تیری بارگاہ سے نکلا خوار ہوا۔ خجل رہا۔ پریشان پھرتا رہا۔ شراب و بدمستی کا الزام لگا ہے۔ جو شراب شروع میں پی تھی۔ وہ ازل میں کھنچی تھی۔ وہ جام اسی گھر میں پیا تھا۔ تیرے ہاتھ سے پیا تھا۔ جب یہاں سے نکالا گیا۔ اسی روح افروز جام کی تلاش میں جو ملا پی گیا۔ بیشک اپنی پی قرض کی پی۔ خود پی اوروں کو پلائی اور خوب پلائی۔ رسوا ہوا۔ بیشک اپنی بنا کر پینے لگا۔ کہ محتسب نے آ دھر لیا۔ تیرا ہی نسخہ تھا۔ کچھ چھال۔ کچھ گڑ۔ انگور کہاں میسر تھے۔ کچھ جَو۔ آنچ دکھانے نہ پایا تھا۔ کہ چالان کر دیا۔ (پیٹھ دکھا کر) تیرے بندوں نے۔ میرے رب تیرے بندے بڑے سخت ہیں۔ ان کے اپنے قوانین ہیں۔ امیروں کے لئے نہیں۔ غریبوں کیلئے ہیں۔ میرا یہ حال کر دیا۔

بیشک میں نے شراب پی۔ محض یہ بھولنے کے لئے کہ میں کیا تھا کیا ہو گیا۔ تیری بارگاہ سے کن ظالموں کے خرابات میں جا گرا۔

میرے رب میرا حال دیکھ۔ یہ اس شام کا ماجرا ہے۔ کہ ہوا میں کیف تھا۔ اُودی اُودی گھٹائیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں تھیں۔ میں نے دیکھا کہ تو ارغوانی اور سیاہ بادلوں کی آڑ لئے جا رہا ہے۔ سبزہ لہک پڑا۔ ڈالیاں جھوم اُٹھیں۔ ہر درخت خم بن گیا اور ہر برگ جام نظر آنے لگا۔ اس وقت بن پئے کون رہ سکتا تھا۔ اور اگر میں نے پی لی کیا غضب کیا تھا۔ میرے رب وہ منظر بہت جرأت آموز تھا میں کیوں نہ پیتا۔ تو نے دیکھا۔ میں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ تڑپ ازلی ہے۔ میں نے شیخ کا کیا بگاڑا تھا۔ اس نے کیوں منع کیا۔ کیوں روکا۔ بیشک میں نے خالی خم اس کے سر پر دے مارا۔ میں نے تیرا قانون نہیں۔ سوسائٹی کا قانون توڑا اور سزا پائی۔ اس جسمانی سزا میں بھی مجھے لطف ملتا تھا کہ تیری خاطر تیرے بندہ کا کیا حشر ہوا۔ اور تیرے بندوں کے ہاتھوں۔

میں نے شیخ کی گستاخی کی تھی۔ اس کی قائم کردہ شرع کو شارعِ عام پر توڑا۔ شیخ بھی تو پیتا ہے۔ وہ چھپ کر پیتا ہے۔ مگر پیتا ضرور ہے۔ وہ اپنے لئے پیتا ہے روز پیتا ہے میں تیرے لئے پیتا ہوں۔ جب ملتی ہے پیتا ہوں۔ جیسی ملتی ہے پی لیتا ہوں۔ جتنی مل جاتی ہے۔ پی جاتا ہوں۔ تیری خاطر ایک بے خودی چاہتا ہوں۔ مگر باخود ہو کر۔ شیخ خودی چاہتا ہے۔ بے خود ہو کر۔ میرے رب تیری عنایت ہے کہ میں صاحبِ خودی ہوں۔ ریاکار نہیں۔ نیک و بد سب تیرا ہے۔ جب تو یاد آیا۔ باقی سب بھول گیا۔

ندا ۔ وفا ہمیں معلوم ہے۔

وفا ۔ میرے رب۔ سب نعمتیں تیری ہیں۔ تو نے دیا بے حساب دیا۔ میں نے اوروں کو دیا۔ بے دریغ دے ڈالا۔ ننگوں کو کپڑا۔ بھوکوں کو کھانا۔ بے گھروں کو سردی میں مکان اور گرمی میں سایہ۔ تیری دی ہوئی نعمتوں میں دوسروں کو شریک نہ کرنا میرے رب کی توہین تھی۔ تو داتا ہے۔ میں بھنڈاری ہوں۔ تو اہل اور نااہل کو دیتا ہے۔ دنیا والے اہل اور مستحق کے قائل ہیں۔ میں تیرے ساتھ رہا۔ نااہل کو ساتھ لیا۔ تو نے دیا تو میں لے آ گئے دے ڈالا۔ جب تو نے نہ دیا۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ لیکن امیدوار رہا۔ تیرے کرم کا۔ یہ پرسش بھی تیرا کرم ہے۔

میرے رب اب یہ دُنیا بہت ظالم ہے۔

ندا۔ تو انصاف کر۔

وفا۔ میں تنہا ہوں۔

ندا۔ ہم تیرے ساتھ ہیں۔

وفا۔ میری مدد کر۔

ندا۔ تو مدد کا اہل بن۔

وفا۔ میرے رب۔ تیری رحمت کہاں ہے۔

ندا۔ تو تلاش کر سکتا ہے۔

وفا۔ میرے رب دنیا والے ریاکار ہیں۔ تیرے بندوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

ندا۔ تو خلوص سے کام لے۔ اور دھوکے کا پردہ اُٹھا دے۔

وفا۔ یہ دنیا بہت خراب ہے۔

ندا۔ اسے مٹا کر الگ ایک دنیا تعمیر کر لے۔

وفا۔ میرے رب۔ تیرے بندوں کی آزادی سلب کی جا رہی ہے

ندا۔ ہمارے بندوں نے آزادی کے جوہر گنوا دیئے۔

وفا۔ میرے رب کوئی رہنما نہیں۔

ندا۔ تو رہنما بن جا۔

وفا۔ یہ بار مجھ سے نہ اُٹھ سکے گا۔

ندا۔ پھر شکایت نہ کر۔ یہ آزمائش ہے۔

وفا۔ رب العالمین۔ تو مدد نہ کرے گا۔

ندا۔ بیشک مخلصوں کی ضرور مدد کی جاتی ہے۔

وفا۔ میرے رب۔ میں کیا کروں۔

ندا۔ سچ پر پردہ نہ ڈال اور جھوٹ کو مت چھپا۔ یہ تیری زندگی کا مقصد ہے۔

وفا۔ تمام لوگ مخالف ہو جائیں گے اور مار ڈالیں گے۔

ندا۔ سوائے اپنے رب کے کسی سے نہ ڈر۔ موت تیرے رب کا اٹل حکم اور حیات جاودانی ہے۔ پھر تردد کیسا۔

وفا۔ کیا میرے لئے یہی راستہ ہے۔

ندا۔ ہمیشہ تیرے رب کی یہی مرضی ہے۔

وفا سجدے میں چلا جاتا ہے۔ محیط نور میں ایک تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی فرشتے بھی سجدے میں گر جاتے ہیں۔ پھر سکون ہو جاتا ہے۔ خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ محیط نور بدستور قائم ہو جاتا ہے۔ فرشتے سجدے سے سرنگوں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وفا کو غائب پاتے ہیں۔ تعریف و حمد کرتے ہیں۔ محیط نور میں ایک لہر پیدا ہو کر غائب ہو جاتی ہے۔

منانی۔ رب العالمین۔ تو زمین اور آسمانوں کا مالک ہے۔

حنانی۔ رب العالمین۔ تو مشرق و مغرب چاند سورج اور ستاروں کا مالک ہے۔

عرفانی۔ رب العالمین۔ تو نے جن، فرشتوں اور انسانوں کو پیدا کیا۔

یزدانی۔ رب العالمین۔ تو غفور الرحیم ہے۔ تو اپنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔

(سب فرشتے مل کر) ۔ وفا مرزا پھر چلا گیا۔

ندا۔ تمام امور کے لئے وقت مقرر ہے۔

سب فرشتے۔ رب العالمین۔ کیا اب وہ فتنہ و فساد ترک کر دے گا۔

ندا۔ اِنّی اَعلَمُ مَا لَا تَعلَمُون۔

(میں جانتا ہوں اُن باتوں کو جنہیں تم نہیں جانتے)

محیط نور میں ارتعاش و اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ فرشتے سجدہ میں چلے جاتے ہیں۔

عباداللہ

ترانۂ جہاد

ملک کے مشہور مناظر نگار سحر کار حضرت احسان دانش نے ترانۂ جہاد کے عنوان سے ذیل کی حیات آفرین نظم سرانجام دے کر مسلم رضا کاروں کے لئے ایک شجاعت آموز رجز بہم پہنچایا ہے۔

یہ نظم پڑھنے اور سننے والوں کے شرائین میں زندگی کا خون تازہ دوڑا دے گی۔ ملی اجتماعات میں رضا کاران اسلام جب اس رجز کو بہ یک آواز پڑھیں گے تو جہات بازگشت تک کی فضائیں جلوہ ہائے حیات سے لبریز ہو جائیں گی۔ (تاجور)

مجاہدانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو

روش روش چمن چمن بڑھے چلو بڑھے چلو جبل جبل دمن دمن بڑھے چلو بڑھے چلو
بہ کُش بہ کُش بزن بزن بڑھے چلو بڑھے چلو!
مجاہدانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو!

زمین رشک آسماں تمہاری انجمن سی ہے رگِ جہاں میں خوں رواں تمہارے بانکپن سی ہے
رہے تمہارا بانکپن بڑھے چلو بڑھے چلو!
مجاہدانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو!

قدم اُٹھاؤ اس طرح زمیں کا دل دہل اُٹھے وہ نعرہ ہائے گرم ہوں کہ زنگِ چرخ جل اُٹھے
بہ نازشِ کمالِ فن بڑھے چلو بڑھے چلو!
مجاہدانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو!

جو کٹ سکے نہ بات پر وہ مرد کیا ہے کچھ نہیں وہ بیوفا ہے بیوفا جو بیوفا ہے کچھ نہیں
ہیں بے ثبات جان و تن بڑھے چلو بڑھے چلو!
مجاہدانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو!

جو موت سے ڈرا نہیں وہ شاد کام زندگی ڈرو نہ موت سے کہ موت ہے دوام زندگی
ہے دل کی زندگی لگن بڑھے چلو بڑھے چلو!
مجاہدانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو!
فضا خلاف ہے تو ہو شکوہ سے عَلَم اُٹھے ہے دھڑکنوں کی جو روش اسی طرح قدم اُٹھے
خوشی خوشی مگن مگن بڑھے چلو بڑھے چلو!
مجاہدانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو!
جو راہ میں پہاڑ ہوں تو بے دریغ اکھاڑ دو! اُٹھاؤ اس طرح نشاں فلک کے دل میں گاڑ دو!
ہے کھیل دار اور رسن بڑھے چلو بڑھے چلو!
مجاہدانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو!
وفا کا عہد باندھ کر وغا سے کھیلتے ہوئے لہو میں تیرتے ہوئے قضا سے کھیلتے ہوئے
دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو بڑھے چلو!
مجاہدانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو!
وہی نبرد کار ہے بساطِ روزگار میں جو مسکرا کے جان دے ہجومِ کارزار میں
کہاں کی گور کیا کفن بڑھے چلو بڑھے چلو!
مجاہدانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو!
بلند برچھیاں کرو! وہ رحمتِ خدا جھکی وہ زندگی کا در کھلا وہ سر کے بل قضا جھکی
سپاس خوانِ ذوالمنن بڑھے چلو بڑھے چلو!
مجاہدانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو!

احسان دانش

امیر تیمور اور کشمیر

ترکستان و خراسان بلکہ تمام وسط ایشیا میں سکہ بٹھانے کے بعد جب امیر تیمور نے ساری دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ تو اس کے لئے سب سے پہلے "زرکثیر" کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ تیمور اور اُس کے اُمراء و وزراء کی نظر ہندوستان پر پڑی۔ جس کو تیمور سے کئی سال پیشتر اسی کا ہم قوم...... چنگیز خاں پامال و تباہ کرکے بیشمار دولت یہاں سے لے گیا تھا۔ تیمور کے زمانہ میں سلطان محمود تغلق دہلی کا اور سلطان سکندر کشمیر کا بادشاہ تھا اور پنجاب[۱] میں شیخا گکھڑ اور اُس کے بھائی جسرت گکھڑ کا طوطی بول رہا تھا۔ اور یہ سنہ ۸۰۰ھ کا زمانہ تھا۔

امیر تیمور کے حملۂ ہند کو تیموری دربار کے ارکین اور سمرقند کے عام لوگ بھی بہت بڑی مشکلوں اور عظیم ترین مصائب کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ لیکن ان حالات میں اگر کوئی اطمینان کی صورت تھی۔ تو صرف یہ کہ اگر تیمور نے فتح پالی تو ہندوستان کی لوٹ سے سمرقند ایک دفعہ تو ضرور مالا مال ہو جائے گا۔

چنانچہ "ہیرلڈ لیمب"...... "تیمور" کے مترجم لکھتے ہیں۔ "تیمور کی روانگی کے بعد سمرقند میں اس بات کو سب تسلیم کرتے تھے کہ ہندوستان کے فتح کرنے میں بڑی بڑی مشکلیں حائل ہیں وہاں موسم بھی گرم ہے۔ بیماریاں بھی ہیں۔ اہل ہند کی زبان بھی ہم سے علیحدہ ہے۔ دریا اور غیر آباد جنگل بھی رستے میں بیشمار ہیں۔ اور وہاں کی سپاہ بھی زرہ پوش ہے اور وہاں ہاتھی بھی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ہندوستان میں دولت اتنی ہے کہ اگر مل گئی تو اس سے ساری دنیا فتح ہو سکے گی۔"

امیر تیمور ۸ محرم سنہ ۸۰۱ھ کو دریائے سندھ کے اُس کنارے پر پہنچا جہاں سلطان جلال الدین خوارزم شاہ نے چنگیز خاں سے بھاگ کر خیمے لگائے تھے۔ اسی مقام پر تیمور نے بھی ڈیرے ڈال دیے[۲]

بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ اٹک کے کنارے آنے پر امیر تیمور کو کشمیر کا حال معلوم ہوا۔ اور وہیں سے اُس نے والی کشمیر کے پاس اپنے ایلچی بھیجے۔ چنانچہ تاریخ ہند جلد دوم میں مولانا ذکا اللہ دہلوی صفحہ ۲۰۶ پر لکھتے ہیں۔ "اسی مقام پر سکندر بادشاہ کشمیر کا ایلچی آیا اور اس نے بادشاہ کی عبودیت اور اس کے اخلاص کا اظہار کیا۔ تیمور نے اس کو حکم دیا کہ سکندر شاہ اپنے لشکر سمیت دیپال پور میں آکر ہمارے لشکر کے ساتھ ملے۔"

لیکن یہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیمور سمرقند ہی میں کشمیر کے نام اور اس کے حالات سے کم و بیش آگاہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ "صاحب" تیمور" لکھتے ہیں[۳] "حملۂ ہند کے ارادہ کے دوران میں تیمور نے کشمیر کے متعلق بھی کچھ باتیں تحقیق کی تھیں اور اُس نے یہ بھی دریافت کر لیا تھا کہ کشمیر کے پہاڑوں کا سلسلہ ایسا ہے جو کشمیر اور چین کے درمیان حائل ہے۔"

اور یہ بھی غلط ہے کہ "تیمور نے سمرقند سے آتے ہوئے جب اٹک کے کنارے اپنے خیمہ و خرگاہ قائم کئے۔ تو اُس نے بادشاہ کشمیر کے پاس اپنے ایلچی اپنی متابعت و اعانت یا خراج کے لئے بھیج دئے۔" بلکہ جب وہ دہلی میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہو کر ایک لاکھ باشندوں کا قتل عام کر چکا اور دہلی کے خزانہ کو اپنی لوٹ گھسوٹ سے خالی کر چکا تھا اور تین ہفتہ کے قیام کے بعد جب وہاں سے واپس آرہا تھا تو رستے ہی سے اس نے اپنے ایلچی سکندر بادشاہ کشمیر کے پاس بھیجے تھے۔ بلکہ صاحب ظفر نامہ تیموری تو لکھتے ہیں کہ دہلی ہی سے تیمور

---

۱ از تیمور ترجمہ اردو صفحہ ۲۸۲

۲ تاریخ ہند جلد دوم مولانا ذکا اللہ دہلوی ۲۵۶ - ایڈیشن اول۔

۳ ترجمہ "تیمور" مصنفہ ہیرلڈ لیمب صفحہ ۲۸۲۔

نے اپنے معتمد کشمیر میں بھیجے تھے۔ اور یہ مصنف چونکہ امیر تیمور کا ہمعصر ہے اور اس کے ساتھ بھی رہا ہے۔ اس لئے اس کی تحریر سب سے زیادہ مستند ہے۔ یہ مصنف لکھتا ہے۔

"و از جملہ امیرزادہ رستم و معتمد زین الدین کہ از دہلی برسم اسالت بہ طرف کشمیر رفتہ بودند۔"

صاحب "اویماق مغل" نے بھی صفحہ ۲۹۳ پر سکندر بادشاہ کشمیر اور تیمور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "ایلچیان سکندر کشمیری متضمن اہل و انقیاد بہ حضور رسیدند۔ ایشاں را نواختہ قریب بہ حدود جموں رسید۔"

گو ان سطور سے واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شاہ سکندر کے ایلچی تیمور کے پاس اس وقت آئے جب وہ سمرقند سے آ کر اٹک کے کنارے مقیم ہوا تھا یا اس وقت انہوں نے باریابی حاصل کی جب وہ دہلی فتح کر کے واپس آ رہا تھا۔ لیکن جب ہم "قریب بہ حدود جموں رسید" کے واقعات پر ایک تاریخی نگاہ ڈالیں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ راجۂ جموں کو گرفتار کرنے کے بعد جب تیمور نے امیر زادہ رستم اور چند دوسرے تیموری شہزادوں کو لاہور بھیج کر شیخ کھوکھر کو شکست دی اور دہلی اور دیار ہند کی سلطنت سید خضر خاں کو عنایت کی۔ تو یہیں سے وہ سمرقند روانہ ہو گیا۔

ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ تیمور نے دہلی سے واپسی کے وقت ہی سکندر بادشاہ کشمیر کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے۔

پنڈت نونراج بھی جو بڈشاہی عہد کا مؤرخ ہے۔ زینہ ترنگنی میں تیمور اور کشمیر کے متعلق چند سطریں لکھتا ہے لیکن وہ اپنی تاریخ میں تیمور کا نام کہیں نہیں لکھتا۔ بلکہ اس کا نام صرف "ملیچھوں کا بادشاہ" لکھتا ہے۔ چنانچہ اس کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے "ملیچھوں کے بادشاہ نے سکندر کے زمانہ میں دہلی کو لوٹ لیا اور اس کو تباہ کر ڈالا اور جب وہ دہلی سے واپس آیا۔ تو اس نے بادشاہ کشمیر کو تحائف بھیجے" نونراج کے ان الفاظ نے کہ "جب تیمور دہلی سے واپس آیا تو اس نے بادشاہ کشمیر کو تحائف بھیجے" سارا معاملہ ہی صاف کر دیا ہے۔ اور کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہی باقی نہیں رکھی۔

امیر تیمور کے تحائف سکندر بادشاہ کو

یہ تو سب مؤرخوں نے تسلیم کیا ہے کہ امیر تیمور نے کشمیر کے بادشاہ سلطان سکندر کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ ایلچی بہر حال تیمور کی متابعت کا اعلان کرانے اور کوئی پیشکش لینے کی غرض ہی سے گئے تھے۔ اور چونکہ بادشاہوں کے ایلچی جب صلح صفائی کے ساتھ آتے جاتے ہوں تو ان کے ہاتھ ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کو تحائف بھی بھیجا کرتے ہیں اور اسی اصول پر تیمور نے بھی ہندوستان کے ہاتھیوں کی لوٹ سے دو ہاتھی کشمیر کے بادشاہ کو بھیجے۔ چنانچہ صاحب طبقات اکبری جلد سوم کے صفحہ ۴۳۳ پر لکھتے ہیں :-

"دریں ایام کہ حضرت صاحب قرآنی امیر تیمور بہ تسخیر ہند آمدند۔ فیل برائے سلطان فرستادند"

نونراج نے بھی زینہ ترنگنی میں اس تحفہ کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "دہلی سے واپسی کے وقت ملیچھوں کا بادشاہ کشمیر کے بادشاہ سکندر سے کسی قدر خائف تھا۔ اس لئے اس نے دو ہاتھی سکندر کو تحفہ کے طور پر بھیجے وہ ہاتھی ہمالیہ پہاڑ کی طرح تھے۔ جب انہوں نے (دریا) وتستہ کو عبور کیا۔ تو ہاتھی بہت شور مچاتے رہے۔ بادشاہ نے ان ہاتھیوں کو شاہی فیل خانہ میں بھجوا دیا۔"

نونراج نے بھی جو سکندر شاہ کشمیر کا قریب العہد اور اس کے فرزند زین العابدین عرف بڈشاہ کا درباری شاعر ہے۔ ہاتھیوں کا جو ذکر کیا ہے۔ وہ ضرور صحیح ہے۔ لیکن اس امر سے غالباً کسی کو اتفاق نہ ہوگا کہ وہ امیر تیمور جو آدھے ایشیاء کو روند چکا اور سارے افغانستان کو پامال کر کے ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک میں نہ صرف داخل ہو چکا بلکہ ایک لاکھ سے زیادہ انسان صرف دہلی کے شہر ہی میں قتل کر چکا تھا وہ کشمیر کے بادشاہ سے جو شاید اس کے ایک حملہ کی تاب بھی نہ لا سکتا۔ ڈرتا تھا۔

---

[1] ظفرنامہ تیموری مصنفہ میر شرف الدین علی یزدی قلمی نسخہ مصنف۔

مناظرِ کشمیر پر معتمدینِ تیمور کے خیالات

سلطان سکندر تیمور کی ہیبت و شوکت سے بے خبر نہ تھا۔ وہ دہلی کا حشر سن چکا تھا۔ راجۂ جموں کی گرفتاری اور اُس کے ملک کی تباہی سے بھی وہ ناواقف نہ تھا۔ پنجاب میں شیخا کھکھڑ کا جو انجام ہوا تھا اُس کا بھی اُسے علم تھا۔ ان حالات میں تیمور جیسے با جبروت بادشاہ نہیں بلکہ شہنشاہ کا اُس کو تحائف بھیجنا "کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آسماں رسید" کے مرتبہ سے کم نہ تھا۔ اُس نے تیمور کے معتمدوں اور ایلچیوں کا استقبال کیا اور ان کی خاطر تواضع اور مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ان کو کئی دن تک اپنا مہمان رکھا۔ ایلچیوں نے بھی خطۂ کشمیر کی دل کھول کے سیر کی اور آب و ہوائے کشمیر اور کشمیر کے مناظر نے جو اثر ان کے دلوں پر کیا۔ وہ صاحب ظفرنامۂ تیموری[1] کے ان الفاظ سے واضح ہو سکتا ہے

"و در نفس آں دشت ہموار کہ درمیان کوہسار واقع شدہ دہ ہزار قریہ معمور است مشحون بہ چشمہ ہائے خوشگوار و آب و سبزہ بہار وازشواہد جودت آب و ہوائے آں دیار آں است کہ حسن منظر واعتدال شمائل خوبانِ آنجا درالسنۂ سخنوراں ضرب مثل شدہ چنانکہ گفتہ باشند۔

شاہ ہمہ دلبرانِ کشمیر توئی ؎ خرم دل آں سیاہ کش میر توئی

آں شاہ کہ سوئے دلبراں کش تو بیند

؎ اندکے پائے ناز کش میر توئی

و در کوہ داستش انواع درختاں میوہ دار ہست و اثمارش بہ غایت خوب و سازگار۔"

و در وسط آں ہامون چنانکہ از طرف مشرقی و غربی ہر یک بیست فرسخ است تا بلدۂ مشہور بقرنغر[2] نام ہست کہ نشیمن حکام آں دیار ہے باشد۔ و بہ طریق بغداد نہرے عظیم درمیان آں جاری است کہ مقدار آبش از دجلۂ بغداد بے گذرد۔ و عجب آنکہ چناں آبے قوی مجموعے از یک چشمہ ہم دراں ولایت است و آں را چشمہ وہر گویند و اہالئے آں حما بر سرآں نہر قریب سی ہزار کشتی زنجیر بستہ اند۔ و راہ کشادہ ہفت جسد از اں جملہ در شہر نغر کہ مرکز ولایت و محلِ حکام است واقع گشتہ۔"

تیمور کے ایلچیوں کی کشمیر سے واپسی

معتمدانِ تیمور نے جن کے سرکردہ امیر زادہ رستم اور مولانا زین الدین تھے۔ سکندر کو تیمور کے احکام سے مطلع کیا۔ ان احکام کی کہیں تفصیل نہیں ہے لیکن بہرحال وہ اظہارِ متابعت کے لئے ہی تھے۔ چنانچہ صاحب ظفر نامۂ تیموری لکھتے ہیں "و در صحبت ایشاں (یعنی در مجلس بادشاہ سکندر) احکام لازم الاتباع بنام شاہ اسکندر والئ آں جا نفاذ یافتہ"

سکندر نے اپنی متابعت کا اظہار کیا۔ اور معتمدین تیمور کو بڑے اعزاز کے ساتھ کشمیر سے رخصت کیا۔ صاحب طبقات اکبری[1] لکھتے ہیں "سلطان ازیں معنے مباہات نمودہ، عرضداشت بہ ملازمت صاحب قرآنی مشتمل بر اخلاص و اظہار بندگی فرستاد و نوشت کہ ہر جا کہ حکم شود بہ ملازمت برسم۔ و ایلچیاں صاحب قرآنی را عنایت بسیار کردہ رخصت نمود۔"

بادشاہ کشمیر کو تیمور کے دیگر تحائف اور اُس کے نام حاضر ہونے کا فرمان

ایلچیوں نے صاحب قران کے پاس واپس آکر سلطان اور ایک خلعت زر دوزی اور ایک بیش قیمت گھوڑا معہ ساز و یراق مرصع بادشاہ کشمیر کو اظہارِ خوشنودی کے طور پر بھیجا۔ اور لکھا کہ جب ما بدولت و اقبال دہلی سے پنجاب کی حدود میں پہنچیں۔ تو وہ وہاں حاضر رہے۔ چنانچہ صاحب طبقات اکبری[2] لکھتے ہیں۔

---

[1] صفحہ ۳۴۵ قلمی پنجاب پبلک لائبریری لاہور

[2] اس شہر کا نام ایک جگہ بقرنغر (نگر) لکھا ہے۔ اور دوسری جگہ شہر نغر کی بجائے نگر صحیح لفظ ہے چونکہ شاہان کشمیر کا دارالحکومت سری نگر ہی تھا۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے نغر یا بقر سری نگر ہی کا بگڑا ہوا کوئی نام ہے

---

[1] جلد سوم صفحہ ۴۴۴ و ۴۴۳ ایڈیشن ۱۹۳۵ء رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔

[2] ۵۴ ״ ״ ״ ״ ״ ״

"چوں نسبت اخلاص و بندگیٔ او بہ عرض صاحب قرانی رسید، التفات بحال او فرمودہ خلعت طلا دوزی با اسپ و زین مرصع فرستادند۔ و فرمودند کہ چوں رایت جلال از دہلی بہ پنجاب موصوف گردد۔ او بہ ملازمت رسد۔"

بادشاہ کشمیر کی روانگی اور رستے ہی سے مراجعت

سلطان سکندر امیر تیمور کے حکم کے مطابق اُن ایام میں جبکہ صاحب قران کوہ شوالک سے فارغ ہو کر پنجاب کی طرف آ رہے تھے۔ بہت سے قیمتی تحائف لے کر کشمیر سے باہر نکلا۔ ابھی رستے ہی میں تھا کہ اُمرائے تیمور کا پیغام ملا۔ کہ سلطان کو مناسب ہے کہ صاحب قران کی شان کے مطابق پیشکش لائے۔ اور کم سے کم تیس ہزار گھوڑے اور ایک لاکھ اشرفی طلائی اُس نذرانہ میں ضرور شامل ہو۔ اس پیغام کی تعمیل سکندر کی طاقت سے باہر تھی اور خصوصاً اس حالت میں جبکہ وہ معہ ساز و سامان کشمیر سے باہر نکل چکا تھا۔ اُس نے پریشان ہو کر مولانا نورالدین کاشمیری کی سرکردگی میں اپنے ایلچی تیمور کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجے۔ کہ پیشکش بندگان حضرت کے لائق ہم نہیں پہنچ سکی۔ اس لئے چند روز توقف کے بعد حاضر ہوں گا۔ اس واقعہ کو صاحب ظفر نامہ تیموری اور صاحب طبقات اکبری نے بھی بیان کیا ہے۔ چنانچہ صاحب ظفر نامہ لکھتے ہیں۔

"مولانا نورالدین کہ از جانب او برسالت آمدہ بود۔ بوے پیوست و تقریر کرد کہ اُمرائے دیوان اعلیٰ مقرر فرمودہ اند کہ سی ہزار اسپ و صد ہزار دولت زر۔ از ہر یک بوزن دو مثقال و از کشمیر انسق فرمائید۔ و بوجہت امتثال آں امر بازگشت تا بعد از اتمام آں مہم دگر بارہ متوجہ شد"

تیمور کی چشم نمائی اپنے اُمراء کو بادشاہ کشمیر کے نام نامعقول پیغام بھیجنے کی وجہ سے۔

ظفر نامہ تیموری میں لکھا ہے جب بادشاہ کے "سمع عالی" تک یہ اطلاع پہنچی کہ امراء کے ایک نامعقول اور نامناسب پیغام کی وجہ سے سلطان سکندر کو رستے ہی سے واپس جانا پڑا ہے اور اس سے پیشکش ایسی طلب کی گئی ہے جو اُس کی طاقت سے باہر ہے تو اُس نے امراء کو سخت چشم نمائی کی۔ سلطان کے ایلچیوں پر شاہانہ نوازش کی اور فرمایا کہ ان لوگوں نے اپنی نالائقی کی وجہ سے شاہ سکندر کو بہت تکلیف دی ہے۔ اور اس کے ملک کی وسعت سے زیادہ اُس سے پیشکش طلب کی ہے۔ اس موقعہ پر صاحب ظفر نامہ تیموری کے ان الفاظ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ وہ لکھتا ہے

"بہ نور عقل کہ چراغ رخشاں و اخترے درخشاں است روشن و ہویدا است کہ از ہر مملکتے مبلغ مطالب باید نمود کہ درخواست و فسحت آں باشد تا شرائط نصفت و عدالت مرعی ماند۔ رسولاں صدق خدمتگاری و طاعت گذاری شاہ اسکندر بعرض ہمایوں رسانیدند و کمال اخلاص او در غلامی و خدمت گاری باز نمودند۔ عاطفت بادشاہانہ شامل حال او گشتہ فرمود کہ ہیچ باز نماند و بزودی متوجہ شود۔"

صاحب طبقات اکبری بھی اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ایلچیاں سلطان سکندر را نوازش نمودہ، فرمودند، کہ وزراء نامعقول گفتہ اند باید کہ سلطان بے دغدغۂ خاطر متوجہ ملازمت گردد۔"

ظفر نامۂ تیموری سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کے ایلچی نواح جموں میں جو موضع جوہان کے نام سے ہے۔ اس مقام پر تیمور کے حضور میں باریاب ہوئے تھے۔ اور تیمور نے نواح جموں کے مواضعات منسار اور بائلہ یا پائلہ کو تباہ کرنے اور وہاں سے بے شمار غلہ اور جنس حاصل کرنے کے بعد اس مقام پر آ کر ڈیرے ڈالے تھے۔ جوہان کا موضع بائگہ سے چار کوس تھا اور اُس دن سنہ ۸۰۱ھ کے جمادی الآخر کی اٹھارہویں تاریخ تھی اور دوشنبہ (یعنی منگل) کا دن تھا۔

بادشاہ کشمیر کے نام امیر تیمور کا فرمان دوبارہ حاضر ہونے کے متعلق

تیمور نے دوسرے ہی دن یعنی ۱۹ جمادی الآخر سہ شنبہ کو سکندر کے ایلچی واپس کر دئے اور ان کے ساتھ بادشاہ کے

مزید اطمینان کے لئے اپنے معتمد اعلیٰ مولانا زین الدین کو بھی روانہ کر دیا اور حکم دیا کہ آج سے ۲۸ یوم کے بعد بادشاہ دریائے سندھ کے کنارہ پہ آ کر ہم سے ملاقات کرے۔ امیر تیمور کے ایلچیوں نے حسب تیمور کے ان خیالات کا اظہار کیا تو شاہ سکندر بہت محظوظ ہوا۔

سلطان سکندر کی دوبارہ روانگی پنجاب کی طرف!

بادشاہ نے سامان سفر درست کئے جانے کے فوری احکام صادر کئے۔ امیر تیمور نے صرف چند دنوں کی مہلت دی تھی۔ اس لئے جلدی میں جو کچھ سامان درست ہو سکا وہی ہمراہ لے کے روانہ ہو گیا۔ اس سفر میں اس کے ساتھ امراء اور مصاحبین بھی تھے۔ لیکن کچھ تو تیمور کا معتمد مولانا زین الدین اپنی جمعیت کے ہمراہ خرابیٔ موسم کی وجہ سے کشمیر میں دیر سے پہنچا اور چند یوم سامان سفر میں لگ گئے۔ اس لئے بادشاہ ابھی بارہ مولا ہی پہنچا تھا۔ کہ اس کو تیمور کے اٹک سے پار ہو جانے کی خبر ملی۔ تیمور نے سلطان سکندر کو دو مرتبہ بلوایا۔ لیکن ایک مرتبہ اسے امرائے تیمور کے نامعقول پیغام کی وجہ سے واپس جانا پڑا اور جب دوسری مرتبہ آیا تو تیمور اس کا انتظار کر کے اٹک سے پار ہو گیا اور اپنے مستقر سمرقند کو چلا گیا۔ دونوں بادشاہوں کی ملاقات ہو جاتی۔ تو اس کے نتائج سکندر کی حکومت کے لئے یقیناً اچھے نکلتے۔ اس لئے کہ تیمور سکندر کے اخلاق اور اس کی متابعت سے بہت خوش تھا اور جب وہ خضر خان کو جو شاید کسی صوبہ کا مستقل حاکم بھی نہ تھا دہلی اور دربار ہند کا بادشاہ بنا جاتا ہے۔ تو سکندر کو جو اپنے ملک کا جس کی حدود دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھیں ضرور کچھ ملک اپنی طرف سے بھی دے جاتا۔

سکندر نے تیمور کے اٹک پار ہو جانے کی خبر سن کر واپسی کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اپنے ایلچی بیش قیمت تحائف و پیشکش کے ساتھ تیمور کی خدمت میں روانہ کر دیئے جیسا کہ صاحب طبقات اکبریؒ[1] لکھتے ہیں:۔

"چوں از بارہ مولا گذشت شنید کہ حضرت صاحب قرانی از آب سندہ گذشتہ متوجہ سمرقند شدند۔ ایلچیاں را با پیشکش بسیار بخدمت آں حضرت فرستادہ بشہر مراجعت نمود"

محمد الدین فوق

[1] جلد سوم صفحہ ۴۳۱ و ۴۳۲

نقوش جمیل

لطف، لطفِ تمام ہے شاید — فیض ساقی کا عام ہے شاید
سو چکا، مے خودی کی پی لی ہے — زیست مستی کا جام ہے شاید
مجھ کو سوگند تیری نخوت کی — تیرا عالی مقام ہے شاید
دورِ غمگین ہے دورِ حیات — میرا گردش میں جام ہے شاید
لغزشیں ہیں دماغ کے اندر — فکر محوِ خرام ہے شاید
وہ ہیں مغرور حسن پر اتنے — حسن کو بھی دوام ہے شاید
عرش شاید ہے منتہائے پرواز — فکر گردوں مقام ہے شاید
زندگی ایک بے کلی ہے شہید — سوز یہ ناتمام ہے شاید

قربان حسین شہید

غزل

لسان القوم حضرت مولانا عالم لکھنؤ کے سحر طراز شاعر ہیں۔ اور شعرائے لکھنؤ میں ایک "ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ کا تواجد آفریں کلام "مخزن" اور "مخزن" کے معاصرین میں شائع ہوتا رہا ہے۔ لیکن اب مدت سے نہایت خاموشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ادارہ "شاہکار" کے پیہم اصرار پر آپ نے ایک تازہ فارسی غزل عنایت فرمائی ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ آپ ہمیشہ "شاہکار" کو سرفراز فرماتے رہیں گے۔

طالب فارسی

یاد ایّام کہ بُودے دلِ دیوانۂ ما　　رونقِ پہلو و زینت دہِ کاشانۂ ما

کرد تسلیم ز دل مذہبِ رندانۂ ما　　بے خبر بُود بہ میخانہ بالآخر واعظ

رفت بر باد الم شیشہ و پیمانۂ ما　　ختم شد مے بہ صراحی ز سخائے ساقی

گوش کُن گوش ز دل نالۂ مستانۂ ما　　گردشِ چشم دہد نشۂ فرضی بحیات

رفت در کار دگر رونقِ کاشانۂ ما　　ختم شد زندگی چند نفس در فرقت

زیست بیکار نہ شد ضرب مثل شد عالم

بر زبانِ دگراں آمدہ افسانۂ ما!

عالم لکھنوی

ناداری

کمل کے پاس کیا نہیں تھا؟ ایک گرہستی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ سب ہی مہیا تھیں۔ لیکن آج اس کا شمار مجبور ترین گداگروں میں ہے جو لوگ اس کے رحم و کرم کے محتاج تھے۔ آج اس کو انہیں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پڑتا ہے۔ زمانے کا انقلاب بھی کتنا عبرت زا ہوتا ہے۔ اپنی گذشتہ زندگی کا تصور کر کے کمل اشکبار ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ بیٹھا اپنی حالت زار پر آنسو بہاتا رہا۔ اس کے بعد وہ پھر بھیک مانگنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

آفتاب غروب ہو گیا۔ زمین پر تاریکی پھیل گئی۔ گائے بھینسیں اپنے کھونٹوں پر آگئیں۔ چڑیوں نے درختوں پر بسیرا لے لیا۔ کمل کی ٹوٹی ہوئی جھونپڑی کے چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ "سیوتی!"

دروازہ کھل گیا اور اس کی شکستہ جھونپڑی ٹمٹماتے ہوئے دیا کی مدھم روشنی سے روشن ہو گئی۔ کمل نے اندر جا کر چاولوں کی چھوٹی سی پوٹلی سیوتی کے سامنے رکھ دی اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "سیوتی! پوٹلی کے چاول بمشکل تمام صرف تمہارے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ اس لئے آج تمہیں کھانا۔ مجھ کو کھانے کی خواہش نہیں ہے۔ میں یونہی سو رہوں گا۔"

سیوتی کچھ دیر حسرت بھری آنکھوں سے اپنے شوہر کا منہ تکتی رہی پھر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ "تم نہ کھاؤ گے۔ کیا تم نے آج بہت کھا لیا ہے؟"

کمل نے کہا۔ "نہیں، بہت تو نہیں کھا لیا، سیوتی! . . ."

"تو کیوں نہیں کھاؤ گے؟" سیوتی بولی۔

کمل نے کہا۔ "کیا پوچھتی ہو۔ ہم لوگ کیا تھے۔ کیا ہو گئے۔ اور آج ہماری کیا حالت ہے۔ تمام دن بھیک مانگنے پر بھی ایشور نے ہمیں پیٹ بھر چاول نہ دیئے۔ جس طرف جاتا ہوں مایوس ہو کر لوٹنا پڑتا ہے ہر شخص ٹھکرا دیتا ہے۔ آج نہ آندھی تھی نہ بارش۔ پھر بھی دن بھر میں دو مٹھی چاول ملے ہیں۔ جو ایک آدمی کے لئے بھی کافی نہیں اور ہم دو ہیں۔ تمہیں بتاؤ سیوتی کہ اس حالت میں انسان کو کیا بھوک لگے۔ فکر و تردد اور رنج و غم نے میری بھوک سلب کر لی ہے۔ مجھے چپ چاپ پڑا رہنے دو۔"

سیوتی نے شوہر کو تسکین دینے کی غرض سے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "آپ کو مطلق فکر نہ کرنی چاہیئے۔ انسان کے دن ہمیشہ یکساں نہیں گزرتے۔ آج ہم پر مصیبت ہے۔ کل ایشور راحت دے گا۔ ہم نے کسی کا برا نہیں کیا ہے۔ ہمارے دن ہمیشہ ایسے ہی نہ رہینگے۔ ایشور جو کچھ کرتا ہے۔ ہماری بھلائی کے لئے کرتا ہے۔"

سیوتی کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی کمل بول اُٹھا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ پھر ہمارے بھلے دن کیسے آئینگے۔ جسے دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔ جو ہائے ہائے کرتا پھرتا ہے۔ جو بھیک کے ٹکڑوں سے پیٹ بھرنے میں ہی اپنی سب سے بڑی خوش نصیبی سمجھتا ہے۔ اس کی بدنصیبی کی بھی کوئی انتہا ہے؟"

"پھر بھی ایشور بے رحم نہیں ہے۔ اس کی بخشش و عطا کا دریا ناپیدا کنار ہے۔"

"رہنے دو ایشور کے رحم و کرم کی داستان سرائی۔ تم ایشور کی کتھا سنا کر مجھ کو مطمئن نہیں کر سکتیں۔ اگر ایشور کی بخشش و عطا کی انتہا نہیں ہے تو کیوں مصیبت زدوں کی آہ و فریاد اور دردمندوں کی گریہ وزاری سنائی دیتی ہے؟ بہرکیف ان باتوں سے مجھ کو تسلی ہونے والی نہیں اس لئے جی چاہتا ہے کہ . . . . جا سیوتی، تو جا کر کھا لے۔"

سیوتی نہ زیادہ پڑھی لکھی تھی اور نہ زیادہ قابل اس لئے اس نے اپنی معمولی سمجھ کے مطابق شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کو شوہر کی راحت سے راحت حاصل ہوتی تھی۔ اور تکلیف سے تکلیف۔ اسی نہج سے اُس نے زندگی کا نصف حصہ بسر کر لیا تھا۔ وہ کمل کو چھوڑ کر کسی طرح کھا نہیں سکتی تھی۔ وہ بہت دیر تک سر جھکا کر اپنی ناداری اور فقر و مسکینی پر آنسو بہاتی رہی۔ پھر اُس نے اسی طرح اشک ریز آنکھوں سے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اگر تم نہ کھاؤ گے۔ تو مجھے بھی کھانے کی خواہش نہیں۔ میں تنہا نہیں کھا سکتی۔"

اب کمل اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ سیوتی سے لپٹ کر رونے لگا۔ سیوتی نے شوہر کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم رنج نہ کرو۔ میں تمہارے رنج و غم کو دور کرنے کی کوشش کرونگی۔"

کر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا" میری کتنی بڑی خوش قسمتی تھی۔ جو میں نے تم کو شریکِ زندگی بنایا۔ یہ کہتے ہوئے کمل کے جذبات بے قابو ہو گئے اور وہ سیوتی کی طرف دیکھ کر بے اختیار رو پڑا۔ کچھ دیر تک روتے رہنے کے بعد کمل نے کہا۔ تمہاری جیسی نیک اور باوفا عورت کو دھوکہ دینے سے بڑا گناہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

سیوتی کانپ اُٹھی۔ اُس نے کہا" خودکشی بہت بڑا گناہ ہے۔ تم اپنے کو اس میں ہرگز آلودہ نہ کرنا۔"

"گناہ ہو یا ثواب۔ میں نے اس پر تو غور نہیں کیا۔ اور نہ اس پر غور کرنے کی خواہش ہی ہے۔ مجھے انقلاب کی ضرورت ہے۔ میں اس مصیبتناک زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔ گداگرانہ زندگی سے موت سو درجے بہتر ہے سیوتی!"

"تمہیں آج سے بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں، تم گھر پر رہنا، بھیک مانگنے میں جایا کرونگی۔"

کمل تڑپ اُٹھا۔ وہ بخوبی سمجھ نہ سکا کہ سیوتی نے کیا کہا۔ اس نے کپڑے کے اندر سے ایک چیز نکال کر سیوتی کو دکھائی۔

سیوتی نے پوچھا" یہ کیا ہے؟"

"ایک چیز ہے"

"کونسی چیز؟"

"زہر!"

"زہر!" ــــ سیوتی کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اور اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اُس سے کچھ کہا نہیں گیا۔ اُس نے شوہر کے ہاتھ سے وہ چیز لے کر اپنی مٹھی میں بند کر لی۔

کمل نے اس چیز کو پھر اپنے ہاتھ میں لے کر ایک دفعہ سیوتی کے زرد چہرے کی طرف دیکھا اور کہا" ڈرتی ہے کیا سیوتی!"

سیوتی نے کچھ جواب نہیں دیا۔

کمل نے پھر پوچھا" ڈرتی ہے؟"

سیوتی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

کمل بولا" سیوتی! ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تمہارا ایشور پر بھروسہ ہے۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔"

کمل نے زہر کی پڑیہ کھولی۔ سیوتی نے معاً کمل کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور کہا" میں بھی مروں گی۔ تمہارے بعد میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔"

کمل کا دل لرزنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

سیوتی نے پھر کہا" میں بھی مروں گی۔ اس زہر کے دو برابر کے حصے کر کے ایک مجھ کو دو۔ اگر مریں تو دونوں مریں۔ اسی میں راحت ہے۔"

کمل کی زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ وہ کچھ دیر تک سیوتی کا منہ تکتا رہا۔ پھر اس نے زہر کے برابر دو حصے کر کے ایک حصہ سیوتی کو دیتے ہوئے کہا" سیوتی! یہ زہر نہیں ہے تریاق ہے۔"

دونوں نے بیک وقت اپنے اپنے ہاتھ کا زہر کھا لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سیوتی ساکت ہو گئی۔ اور اُس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ کمل نے سیوتی کے زرد چہرے کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور وہ بیہوش ہو گیا۔

دوسرے روز کمل کو ہوش آیا تو اُس نے دیکھا دو اجنبی آدمی اس کے نزدیک کھڑے ہیں۔ لیکن سیوتی کا پتہ نہیں ہے۔ اسے یہ بات خواب سی معلوم ہوئی اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کمل کو غذا دی گئی۔ تو اسے پورے طور پر ہوش آ گیا۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر خانے میں ہے۔ کمل کا دل اندوہ و قلق سے ٹکڑے ہونے لگا۔ وہ کتنا بدنصیب ہے کہ زہر کھا کر بھی اس کو موت نہیں ہوئی۔ انسان موت کے پنجے سے محفوظ رہنے کے لئے کیا کیا جتن کرتا ہے۔ لیکن وہ کتنی قدر و منزلت کے ساتھ موت کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ پھر بھی موت اس سے گریزاں ہے۔

یکایک اسے سیوتی یاد آ گئی۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ وہ اس سے زیادہ سوچ نہ سکا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔

دوسرے روز پولیس نے آکر اس کا بیان لیا۔ اور اسے سب سے علیحدہ رکھ کر پولیس نے کہا" عورت کا قاتل یہی ہے۔"

کمل سوچنے لگا۔ اُس نے واقعی سیوتی کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ اس کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا۔ اُس نے ایک دفعہ آسمان کی طرف دیکھ کر کہا" سیوتی! تم کہاں ہو۔ میں یہاں اکیلا ہوں۔"

عدالت کا کمرہ ہے۔ حاکم اور وکلاء بیٹھے ہیں۔ مجرم کو حاکم کے سامنے لایا جاتا ہے۔ حاکم سوال کرتا ہے" تم نے اپنی بیوی کو مارا ہے؟"

"ہاں حضور"

"کیسے؟"

"زہر سے"

"زہر کیوں دیا؟"

"حضور: میں اپنی داستانِ مصیبت کیا عرض کروں؛ میں اپنی زندگی سے بیزار ہو چکا ہوں۔ میں ایک دولتمند آدمی تھا۔ میرا گھر مال و دولت سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن ... اب دانے دانے کو محتاج ہوں۔ میں ایک دفعہ ایک مرض میں مبتلا ہو گیا۔ جس میں عرصہ تک مبتلا رہا۔ اسی درمیان میں میرا اکلوتا بیٹا مرگیا۔ اور ساتھ ہی میری تمام دولت و امارت بھی انقلاب زمانہ کی نذر ہو گئی۔ میرا اور میری بیوی کا بھیک کے ٹکڑوں پر گزر ہونے لگا۔ گداگری اور بھوک کی تکلیف میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ اور مجھے اپنی زندگی میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ زہر کھا کر اپنی اذیت ناک زندگی کا خاتمہ کر لوں گا۔ سیوتی میری شریکِ زندگی تھی۔ اس لئے میں نے زہر کے دو برابر حصے کئے۔ جن میں سے ایک میں نے کھایا اور دوسرا سیوتی نے۔ لیکن اسے تو ابدی سکین و راحت حاصل ہو گئی۔ اور میں ناقابلِ برداشت اذیت برداشت کرنے کے لئے ابھی تک زندہ ہوں۔ حضور میں واقعی قاتل ہوں۔ میں نے اسے زہر دیا۔ مجھے پوری سزا ملنی چاہیئے۔

کمل کا بیان سن کر تمام حاضرینِ عدالت بے چین ہو گئے۔ خود حاکم بہت دیر تک سر جھکائے مغموم بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے پوچھا "کیا تم معافی چاہتے ہو؟"

کمل نے ٹھٹھک کر کہا۔ میں معافی نہیں چاہتا۔ میں نے سیوتی کے ساتھ مرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر میں ایفائے وعدہ نہ کروں گا۔ تو وہ مجھے بے وفا سمجھے گی۔ اور مجھے زندگی کے باقی دن بڑی تکلیف و اذیت سے گزارنے پڑینگے۔ آپ مجھ پر رحم کر کے سزائے موت کا حکم دیجئے۔ مجھے معافی کی ضرورت نہیں ہے۔

لوگ کمل کی بات سُن کر دنگ رہ گئے۔ انسان موت سے بچنے کے لئے کتنی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کمل خوشی سے اس کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔ کیا موت اتنی راحت آگیں ہے؟ مگر کمل کو ان باتوں پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے اپنی حالت میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ تبدیلی ہونے پر اسے سکون حاصل ہو جائیگا۔

حاکم نے پھر پوچھا "کمل! کیا تم معافی چاہتے ہو؟"

"نہیں حضور، میں بیوی کا قاتل ہوں۔ مجھ کو سزائے موت دیجئے"

حاکم نے مجرم کو موت کی سزا دے دی۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر رب کو پرنام کیا۔ پولیس اس کو جیل لے گئی۔ عدالت پر ایک سناٹا چھا گیا۔

(ایک آسامی کہانی کا آزاد ترجمہ)

قمر الدین رام نگری

غزل

یگانگت میں روا نہیں ہے لحاظ، آدابِ گفتگو کا — جہاں مجھے "آپ" سے مخاطب بنا رہا ہے ہو محل ہے "تو" کا

جمالیاتی شاہدوں نے بتوں میں یہ وصف پا لیا ہے — چمن پرستوں کے تجربہ میں چمن ہی مرکز ہے رنگ و بو کا

مری حقیقت تری حقیقت سے آشنا بھی ہے بے خبر بھی — تو اک جھلک میرے سامنے کی - میں آئینہ تیرے روبرو کا

مزاج میں کچھ صلاحیت - کچھ نگاہِ ساقی کی دلبری سے — اگر میں پیتا ہوں ایک ساغر تو کیفیت پاتا ہوں دو سبو کا

وہ آب جو حسن کی سطح پہ کچھ گلاب کے پھول بہ رہے ہوں — ترے تبسم کو زیب دیتا ہے استعارہ اُس آب جو کا

سماج میں آبرو کے معنی ہیں دوسروں کی خوشی پہ چلنا — ہمیں چھپانی پڑے گی الفت - سوال باقی ہے آبرو کا

غمِ جدائی کی حزن سے رشمی مسلم نہیں ہے شاید — بنا ہے موضوعِ بحث ہر گھر میں خشک ہونا مرے لہو کا

مری بلندی پہ دل میں دونا مرے تنزل پہ شاد ہونا — یہی وطیرہ ہے ہر محب کا - یہی طریقہ ہے ہر عدو کا

غبار سے دل ہے صاف میرا، جنابِ زاہد کا صرف چہرہ — خدا کے نزدیک دیکھنا ہے - کسے سلیقہ نہیں وضو کا

ذلیل ہو کر تمہاری محفل میں آ کے ذلت کو کیا کروں میں — اگر اسی کا ہے نام عزت، تو ایسی عزت پہ میں نے تھوکا

جوان شاعر تو شاد اس لغویت سے دامن بچا چکے ہیں
مگر ضعیفوں میں اب بھی چرچا ہے "چاک دامانی و رفو" کا

شاد عارفی

عروسِ سحر

عروسِ صبح ضو فگن شعاعِ ماہتاب میں
ستارے جھلملا رہے ہیں فرطِ اضطراب میں

شفق نے غازہ مل دیا دلہن کے منہ کو چوم کر
حجاب میں عروسِ نو جھکی ہے شرم سے نظر

حسیں خواب دیکھ کر اُٹھا ہے نوشہ جواں
ہے رُخ پہ سہرا کرنوں کا جمال تاب و ضو فشاں

اُٹھا جو مسکرا کے وہ تو ذرّے سب چمک اُٹھے
ضیائے نور بار سے شجر حجر دمک اُٹھے

چلی برات دھوم سے عجیب آن بان سے
خدا کی شان ہے عیاں براتیوں کی شان سے

جلوس جنتِ نظر شکوہ خسروانہ ہے
نرالی آن بان ہے جلو میں اک زمانہ ہے

یہ رنگ دیکھ کر چمن میں غنچے مسکرا دئے
نقاب شاہدانِ بزم دہر نے اُٹھا دیئے

نسیم جھوم جھوم کر چلی گلوں کو چوم کر
شگفتہ ہے کلی کلی زمانہ جنتِ نظر

طرب کے ساز نغمہ زن وفورِ انبساط سے
چمن ومن ہرے بھرے ہیں جوشش نشاط سے

ہر اک نہالِ باغ کا اٹھان پر شباب ہے
شگوفے کھل رہے ہیں یا کہ نغمہ رباب ہے

خوشی میں جھومنے لگیں ہر اک شجر کی ڈالیاں
نہال ہو کے پتیاں بجا رہی ہیں تالیاں

ملی وہ دولتِ طرب شجر نہال ہو گئے
گلوں کے چہرے دیکھتے ہی لال لال ہو گئے

جدھر نظر اٹھایئے ہزار نغمہ ریز ہیں
ہر ایک سمت بوستاں میں پھول عطر بیز ہیں

چہک رہی ہیں قمریاں جہانِ لالہ زار میں
چکور و مور و فاختہ ہیں مستیٔ بہار میں

تڑپ رہی ہیں شوخیاں وفورِ انبساط سے
ہے عندلیب بیقرار جوشش نشاط سے

صراحیاں اُبل رہی ہیں خمکدوں میں جوش ہے
کہ باہر اپنے جامے سے ہر ایک بادہ نوش ہے

چنے ہوئے ہیں جام گل سجا ہوا ہے میکدہ
شراب شبنم سحر اُبل رہی ہے جابجا

طالب فارسی

کریکٹر کا اثر

(گذشتہ سے پیوستہ)

آج کی ان چند سطور میں کریکٹر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر یہ بتانا مطلوب ہے کہ اعلےٰ کریکٹر کا انسان اور اعلیٰ مقاصد رکھنے والی قومیں کس طرح ہر مشکل کا سر نیچا اور ہر مصیبت کے پہاڑ کو سُرمہ بنا کر سیدھی منزل مقصود کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کامیابی ان کی پیشانی کو چومتی ہے اور کامرانی ان کے سر پر سہرا باندھتی ہے۔

اچھے کریکٹر کا انسان اپنا راستہ نہایت دور اندیشی سے تلاش کرتا ہے اور پھر فرض کو شہرت اور ضمیر کی آواز کو دنیاوی تعریف پر فوقیت دیتا ہوا مردانہ وار بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کریکٹر کی تعمیر میں مثال کا بہت بڑا ہاتھ ہے لیکن وہ طاقت جو اپنی ذات سے پیدا ہو اس سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور یہی وہ طاقت ہے جو زندگی کو بلند اور خیالات کو اعلیٰ بناتی ہے۔ انسان کو انفرادی آزادی اور طاقت بخشتی ہے۔

ڈینیل نے کہا ہے کہ جب تک انسان اپنے آپ کو اپنے ہی سے بالاتر نہیں بناتا۔ اس کا وجود بالکل نکما ہے جس طرح کھڑا ہوا پانی کچھ عرصے کے بعد بدبودار اور ناقابل استعمال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ انسان جس میں نیکی، سچائی، ایمانداری، بلند ہمتی اور استقلال کی قوتیں مل جل کر عملی طاقت نہ پیدا کریں۔ آخر کار عضو معطل بن جاتا ہے۔

اس وقت جب قوت ارادی عمل کا کوڑا لگا کر کریکٹر کی سوئی ہوئی طاقتوں کو بیدار کرتی ہے۔ انسان فرض شناسی کی راہ میں قدم رکھتا ہے اور دنیاوی فوائد کو پس پشت ڈالتا ہوا انسانیت کے ایسے اونچے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے اس کی آواز نہ صرف اس کی زندگی میں بلکہ مرنے کے بعد بھی لوگوں کے کانوں میں گونجتی رہتی ہے اور ان کی زندگی کے سست گھوڑے کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے۔

لیکن راستبازی اور نیکی کی روح کے بغیر یہی قوت ارادی ایسے شیطانی کاموں کیلئے اکساتی ہے کہ آنے والی نسلیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان پر نفرت اور لعنت بھیجتی ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جنہوں نے ملکوں کو لوٹا، قتل و خون کے بازار گرم کئے اور فرعونی رنگ جمایا، اسی زمرے میں سے تھے۔ نمرود، شداد، فرعون، ہلاکو خاں ضحاک اور ہٹلر کا نام ایسے ہی لوگوں کی فہرست میں آتا ہے۔

وہ شخص جس کی قوت ارادی میں پاکیزگی کی روح، اعمال میں راستبازی کی چاشنی اور دماغ میں فرض شناسی کا احساس ہے ان سے بالکل مختلف ہے۔ وہ دنیاوی لین دین، روزانہ کاروبار اور خانگی زندگی میں منصف مزاج اور ایماندار ہوتا ہے۔ گھر کی چھوٹی سی حکومت میں بھی انصاف کی ایسی ہی ضرورت ہے۔ جیسی کہ ملکی حکومت کیلئے۔ اس لئے ہر ایسے بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے مشیر کاروں اور ماتحتوں سے انصاف کا برتاؤ کرے۔ اپنی بات کا پورا رہے اور اپنا کام ایمانداری سے کرے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہ کمزوروں اور مخالفوں کے ساتھ رحمدلی اور فراخ حوصلگی سے پیش آئے۔

مسٹر فوکس کے کریکٹر میں یہی بات تھی۔ وہ سب کے ساتھ ایک سی ہمدردی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اپنی عزت کا حد درجہ پاس تھا۔ ان کے متعلق ایک تاریخی واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص ان کے پاس پرامیسری نوٹ کے روپے لینے اس وقت پہنچا جبکہ وہ اشرفیاں گن رہے تھے۔ تاجر نے کہا کہ میرا قرض اس روپے میں سے دید یجئے۔ انہوں نے جواب دیا۔" نہیں یہ روپیہ شریڈن کو دینا ہے۔ اور اس کا قرض بلا تحریر ہے۔ اگر مجھے کوئی حادثہ پیش آ گیا تو وہ عدالت میں کیا دکھا سکتا ہے۔ اس پر تاجر نے کہا کہ پھر میں بھی اپنے قرض کو بلا تحریر قرض میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے کاغذ پھاڑ ڈالا۔ مسٹر فوکس پر اس بات کا بہت اثر ہوا۔ اور انہوں نے اس اعتماد کیلئے

تاجر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب شہر لندن انتظار کرے گا ۔ کیونکہ آپ کا قرضہ اس کی نسبت دیرینہ ہے ۔

اچھے کریکٹر کا انسان اپنی ضمیر کے زیر اثر کام کرتا ہے ۔ وہ اپنے ہر کام ہر بات اور ہر معاملے میں ضمیر کی آواز کو غور سے سنتا ہے ۔ اور اس پر عمل کرتا ہے ۔ کرومویل نے جب کومن ویلتھ کیلئے فوج اکٹھا کرنا چاہی تو اس نے پارلیمنٹ سے کہا کہ اس فوج میں میں ایسے سپاہیوں کی ضرورت ہے جنہیں اپنے اعمال کا صحیح احساس ہو ۔ اور اس کا نتیجہ اس کی مشہور زمان وہ رجمنٹ تھی جس کا نام آئرن سائڈ تھا ۔

اعلےٰ کریکٹر کا انسان بلند مقاصد، پاکیزہ خیالات، نیک جذبات اور گذشتہ اور موجودہ زمانہ کے بڑے لوگوں اور نیک کارکنوں کی دل سے قدر کرتا ہے ۔ یہ خصوصیت انتہائی درجہ کے شریف اور عظیم الشان شخصیتوں میں پائی جاتی ہے ۔

قوموں، خاندانوں، اور افراد کی خوشحالی کے لئے تعظیم کا ہونا ضروری ہے ۔ اس کے بغیر معاشرتی امن اور ترقی محال ہے اس لئے کہ تعظیم مذہب کا دوسرا نام ہے اور یہی وہ چیز ہے ۔ جو ایک انسان کو دوسرے سے اور پھر سب کو خدائے برتر سے وابستہ کرتی ہے ۔ اسی لئے بانیٔ اسلام نے فرمایا کہ "جنت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے ۔"

سر تھامس اوربری کا قول ہے کہ نیک اور عمدہ خیالات کا انسان عظمت سے محبت اور ذلت سے نفرت کرتا ہے ۔ حکومت و فرمانبرداری کرتے وقت پیشانی پر بل نہیں لاتا ۔ کیونکہ ان دونو کا مدعا ایک ہے ۔ جو شخص فرمانبرداری کرنا نہیں سیکھتا، وہ حکومت کرنا نہیں جان سکتا ۔

قوت ارادی یعنی وہ قوت جو خود بخود اندر سے پیدا ہو اعلیٰ کریکٹر کی جان ہے ۔ اس کا وجود زندگی ہے ۔ اور اس کے بغیر مایوسی، بے مردگی اور بے بسی ۔ پہاڑوں کو پرکاہ اور سمندروں کو چلو بھر پانی دکھانے والی یہی ہے ۔ اسی کی برکت سے کولمبس نے نئی دنیا معلوم کی ۔ سکندر نے ہندوستان پر لشکر کشی کی ۔ اور اتاترک نے اپنے ملک کی ایک ایک انچ زمین دشمنوں سے خالی کرا لی ۔

انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے کہ مضبوط آدمی اور آبشار اپنا راستہ خود بناتے ہیں ۔ حضرت عمرؓ ۔ خالدؓ ۔ صلاح الدین، طارق لوتھر، کرومویل، واشنگٹن، ہمپٹ، ویلنگٹن اسی قسم کے آدمیوں میں سے تھے ۔ اور ہٹلر، رضا شاہ اور مسولینی ایسے ہی لوگوں میں ہیں ۔

جو شخص صحیح معنوں میں لیڈر ہے وہ اپنی قسم کے دوسرے آدمیوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور ان میں ایسا جادو بھرتا ہے کہ وہ ہر فعل و حرکت، خیالات و اعتقادات میں اس کا ساتھ دینے لگتے ہیں ۔

ویرا کی لڑائی میں جبکہ سپین کی مرکزی طاقت ٹوٹ چکی تھی اور فوج میں بھاگڑ پڑ گئی تھی ۔ ایک جوان افسر ہیولاک نام آگے بڑھا اور اپنی ٹوپی اُتار کر بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو اپنی طرف بلایا اور ساتھ ہی گھوڑے کے ایڑ لگا کر فرانسیسوں کی فوج پر جا پڑا ۔ یہ دیکھ کر سپین والوں میں بجلی کی سی طاقت پیدا ہو گئی اور انہوں نے پورے زور سے حملہ کر دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسوں کی قطاریں ٹوٹ گئیں اور وہ پہاڑی پر سے بھاگ گئے ۔

نیک اور بڑے آدمی دوسروں کو نہ صرف اپنی طرف کھینچتے ہی ہیں ۔ بلکہ ان کے دماغوں کو روشنی اور کریکٹر کو بلندی بخشتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب کسی مستعد اور راستباز شخص کو کسی بڑے عہدے پہ فائز کیا جاتا ہے ۔ تو اس کے ماتحت اپنی رگوں میں بجلی کی سی طاقت محسوس کرتے ہیں ۔

جب لارڈ چیتھم کو وزیر مقرر کیا گیا تو اس کا اثر دفتر کے کونے کونے میں محسوس کیا گیا ۔ ہر وہ ملاح جو نیلسن کے ساتھ جہاز میں سفر کرتا اور یہ سمجھ لیتا کہ جہاز کا کپتان وہ ہے جو اپنے اندر اسی کے قسم کے جذبات محسوس کرتا ہے ۔

جب واشنگٹن نے یہ منظور کر لیا کہ وہ اپنے ملک کی فوجوں کی کمان کیا کرے گا تو ایسا محسوس ہوا گویا اُن کی طاقت دگنی ہو گئی تھی ۔ سنہ ۱۷۹۸ء میں اس وقت جب واشنگٹن تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا ۔ اور یہ خبر گرم تھی کہ فرانس اضلاع متحدہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے تو پریذیڈنٹ ادھم ۔ نے لکھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کا نام بطور کمانڈر استعمال کر لیں ۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ اس میں وہ اثر ہے جو ایک زبردست فوجی طاقت میں نہیں ۔

یرا تیس کی لڑائی جب اسلامی لشکر میں بہت پریشانی پھیلی تو ابوعبیدہ نے خالد بن ولید سے مدد طلب کی۔ خالد نے میدان میں آتے ہی کہا کہ میں خالد بن ولید آگیا ہوں۔ خالد کا نام سننا تھا کہ مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے میدان مار لیا۔

ان حالات میں شخصی کریکٹر جادو کا سا اثر رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ برطانوی فوج نے ساڈرون پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور سامنے کی طرف سے سولٹ حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ویلنگٹن موجود نہ تھا اور اس کا بہت بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ فوج میں اضطراب اور پریشانی تھی۔ لیکن جونہی ویلنگٹن ایک پہاڑی کی چوٹی پر نمودار ہوا۔ ان کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے اس جوش سے حملہ کیا کہ مخالف بھاگ گئے۔ اور انہیں فتح حاصل ہو گئی۔

پومپے نے ایک مرتبہ کہا کہ اگر میں اٹلی کی زمین پر پاؤں بھی ماردوں تو ابھی فوج نمودار ہو جائے۔ پیٹر کی ایک ہی آواز پر تمام یورپ اُٹھ کھڑا ہوا اور ایشیا پر ہلہ بول دیا۔ خلیفہ اسلام۔ حضرت عمرؓ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کی چھڑی سے ہی دشمن پر وہ لرزہ طاری ہوتا تھا جو کسی دشمن کی تلوار سے نہ ہو سکتا تھا۔

بعض آدمیوں کا محض نام ہی نقارے کی چوٹ ثابت ہوتا ہے اور اس سے دشمنوں کے زہرے آب ہو جاتے ہیں جب ڈوگلس اوٹربرن کے میدان میں زخمی پڑا تھا تو اس نے کہا کہ میرا نام لیکر زور سے نعرہ لگاؤ۔ کیونکہ ہمارے خاندان میں یہ روایت ہے کہ مردہ ڈوگلس بھی میدان مار لیتا ہے۔ یہ سُن کر اس کی فوج ایک نئی روح پیدا ہو گئی اور انہوں نے ایسا حملہ کیا کہ فتح حاصل ہو گئی۔

یہ ہیں وہ لوگ جو نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ مرنے کے بعد بھی لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور اپنے کریکٹر کی جگمگاتی روشنی میں انہیں اعلیٰ مقاصد اور بہترین منازل کی طرف لئے چلے جاتے ہیں۔ اُن کی مثال ایک ایسے گیس کی ہے جو ایک پہاڑی کی چوٹی پر جل رہا ہو اور چوٹی کی طرف آنیوالے تمام لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہو۔

یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے ملک کی رُوح ہیں۔ جب کسی ملک میں عرصہ تک ایسے لوگ نہیں پیدا ہوتے تو وہ یقیناً مردہ جسم کی طرح بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے۔

ایک فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ایسے لوگوں کے نام اور ان کی یاد ان کی قوم کا جہیز ہے۔ اور یہ ایک ایسا سرمایہ ہے جسے بیوگی، تباہی اور غلامی اس کے پاس سے چھین نہیں سکتی۔ وہ ملک جسے یہ احساس ہو کہ ایسے شاندار لوگ اس کے کارناموں کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ضائع اور برباد نہیں ہو سکتا۔ ان کی زندگی کی مثال ہر مردہ جسم میں جان ڈالتی ہے اور ہر خوابیدہ رُوح میں بیداری پیدا کرتی ہے۔

لیکن کسی قوم کی خصوصیات کا اندازہ لگانے کے لئے اس کے مشاہیر کا اندازہ لگا لینا ہی کافی نہیں بلکہ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ اس کے افراد کے کریکٹر کو دیکھا جائے۔

سکاٹ نے ایک مرتبہ واشنگٹن ارونگ سے کہا کہ کسی قوم کا کریکٹر اس کے چیدہ چیدہ لوگوں اور نیک دل شخصیتوں سے نہیں معلوم ہو سکتا بلکہ اُسے دیکھنے کے لئے ان لوگوں کا کریکٹر دیکھنا چاہیئے۔ جنہیں ہم ملک میں جگہ جگہ دیکھتے ہیں۔

جس طرح افراد کے لئے کریکٹر کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح اقوام کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ اپنے اپنے چال چلن کا خیال رکھیں اور کسی قوم کا کریکٹر درست رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے افراد کا کریکٹر عمدہ ہو۔ ان میں عالی حوصلگی، سچائی، ایمانداری، نیکی اور بلند ہمتی پائی جاتی ہو۔ ان میں ضبط تعظیم اور اپنے آپ پر قابو پانے کا مادہ ہو۔ اور وہ اپنے فرائض کو انجام دینے میں دل و جان سے کوشش کرتے ہوں۔ ان چند خصوصیات کا ہر قوم اور اس کے افراد میں ہونا ضروری ہے اور اگر وہ اس سے عاری ہے۔ تو سمجھ لے کہ دنیا کی دوسری قوموں میں اس کی کوئی عزت نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ اس قابل ہے کہ وقعت کی نظر سے دیکھی جائے۔

وہ قوم جو عیش اور دولت کو ہی اپنا خدا جانتی ہے یقینی طور پر غلط راستے پر ہے اس سے بہتر ہے کہ وہ ہومر کے خداؤں کو مان لے کیونکہ وہ دیوتا کم از کم ایک انسانی خوبی کو تو ظاہر کرتے ہیں۔

ہر ملک کی حکومت خواہ وہ کیسے ہی بلند کریکٹر کی مالک کیوں نہ ہو۔ کچھ عرصے کے بعد ویسی ہی بن جاتی ہے جیسی

وہ قوم جس پر وہ حکمران ہے۔ اگر اُن لوگوں کی عادات شستہ، اخلاق بلند اور ضمیر زندہ ہے تو ان کے حکمران بھی ایمانداری اور نیک نیتی سے حکومت کریں گے۔ لیکن اگر وہ بدچلن، بے ایمان اور بداعمال ہیں تو حکومت کا وہی رنگ اختیار کر لینا یقینی ہے۔ سیاسی قوانین خواہ وہ کتنے ہی بلند اور کیسی ہی فراخ حوصلگی سے بنائے جائیں۔ ایسے لوگوں کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے سے قاصر رہیں گے۔

افراد کی طرح قوموں کیلئے بھی شاندار ماضی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر انہیں یہ معلوم ہے کہ اُن کے آبا و اجداد دنیا کے سامنے شاندار کارنامے پیش کر چکے ہیں تو وہ یقیناً ان روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اپنے اخلاق کو اعلےٰ بنائیں گے اور ان کی زندگی سے متاثر ہو کر اُن سے بہتر اور اعلیٰ کام کرنے کا تہیہ کرینگے۔

دنیا کی تمام دوسری چیزوں کی طرح قوموں نے بھی زوال کے پنجے سے چھٹکارا نہیں پایا اور نہ پا سکتی ہیں۔ لیکن یہ زمانہ ان کیلئے ایسا ہی ہے جیسا کہ لوہے کے لئے وہ عرصہ جب وہ بھٹی میں رہتا ہے۔ اس دوران ان کا زنگ اور میل کٹتا ہے اور وہ پھر ترقی کرنے کے قابل بن جاتی ہیں۔

کسی قوم کے بڑا ہونے سے یہ مطلب نہیں کہ اُن کے پاس دولت کی فراوانی ہو۔ یا بہت بڑا علاقہ ان کے ہاتھ میں ہو۔ نہیں بلکہ حقیقی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اعلےٰ کریکٹر کی مالک ہو۔ بنی اسرائیل کس قدر چھوٹی قوم تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی زندگی کو کس قدر بلند کیا اور نسل انسانی کی تعذیبوں پر کس قدر گہرا اثر ڈالا۔ یونان کوئی بڑا ملک نہ تھا۔ ایتھنز کی آبادی زیادہ نہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ آرٹ۔ لٹریچر۔ فلسفہ۔ حب الوطنی اور بلند ہمتی میں کسقدر بڑھے ہوئے تھے۔

لیکن ان لوگوں نے بھی جب اپنے قومی امتیازات کو مٹا دیا تو خود بھی مٹ گئیں۔ ایتھنز میں جب غلاموں کی تعداد آزاد لوگوں سے بڑھ گئی اور ان کی خانگی زندگی برباد ہو گئی تو وہ پس گئے۔ روم میں جب عیش و عشرت اور راگ رنگ کا دور آیا تو تباہ ہو گئے۔ یہی حال دوسری سست اور عیش پسند حکومتوں کا ہوا ہے۔

بوڑھے برٹن نے ایک موقع پر کہا کہ وہ قوم جو ایمانداری سے محنت کرتے وقت پسینہ کا ایک قطرہ گرانے کی نسبت لڑائی میں نصف سیر خون بہہ جانے کو اچھا سمجھتی ہے یقینی طور پر فنا ہو جائے گی اور کوئی محنتی اور مستعد قوم اس کی جگہ لے لیگی۔

لوئیس چہاردہم نے کولبرٹ سے پوچھا یہ کیا وجہ ہے کہ فرانس جیسا بڑا اور آباد ملک ہالینڈ کو فتح نہ کر سکا تو اس نے جواب دیا۔ "حضور اس لئے کہ ملک کی عظمت اس کی حدود پر منحصر نہیں بلکہ لوگوں کے کیریکٹر پر ہے۔ یہ ان کی محنت، کفایت شعاری اور طاقت کا نتیجہ ہے کہ آپ اُن پر قابو نہیں پا سکتے"

ایسا ہی ایک واقعہ خالد بن ولید کے متعلق ہے کہ جب عبدالمسیح اپنی قوم کا نمائندہ بن کر اُن کے پاس آیا تو اس کے ہاتھ میں زہر کی ایک پڑیا تھی۔ خالد نے پوچھا یہ کیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ زہر کی پڑیا ہے۔ خالد نے کہا کس لئے لائے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ اگر آپ نے میری مرضی کے مطابق فیصلہ نہ دیا تو میں اسے کھا کر مر جاؤں گا۔ اور اپنی قوم کو منہ نہ دکھاؤں گا۔ خالد نے اس سے وہ پڑیا لی اور یہ کہہ کر کہ کوئی شخص اپنی موت سے پہلے یا پیچھے نہیں مرتا۔ حلق میں انڈیل لی۔ اور اس کے بعد صحیح و سالم بیٹھے رہے عبدالمسیح یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور اپنی قوم سے کہا کہ تم ان لوگوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جو موت کو اس قدر عزیز سمجھتے ہیں جتنا ہم زندگی کو۔

اگر کسی قوم کے افراد محض دولت سمیٹنے اور اپنی خوشی کے سامان جمع کرنے میں محو ہیں تو ایسی قوم بدقسمت ہے اور اس کا زوال قریب ہے۔ اور اگر وہ سچائی، ایمانداری، راستبازی اور انصاف کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتے تو دنیا میں ان کے رہنے کا کوئی حق نہیں اور وہ یقیناً مٹ جائیں گے۔

چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ جب کسی قوم کی دولت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اس کے افراد عزت۔ نیکی اور وفاشعاری کو پس پشت ڈال کر اپنی خوشی اور عیش سے کام رکھتے ہیں تو دن بدن گمنامی کی تاریکی کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں انفرادی اور محض انفرادی کریکٹر انہیں بچا سکتا ہے۔ اور اگر یہ بھی اتنا گر گیا ہو کہ پھر پیدا نہ کیا جا سکے۔ تو پھر کوئی امید باقی نہیں رہتی اور صفحہ ہستی سے اُن کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

ایم عنایت اللہ

غلطی کا اعتراف

میں ہسپتال میں قائم مقام نرس تھی اور بچہ زچہ کی خدمت پر مامور رہنا مجھے زیادہ مرغوب تھا میری ایک بسکد وست دستکار ڈیوڈ سے محبت ہوگئی اور کچھ دن لعد شادی بھی ہوگئی۔ وہ ہسپتال میں مریض تھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ ڈیوڈ نمونیہ کے حملے سے بمشکل جانبر ہوسکیگا لیکن ڈیوڈ کی قوت ارادی موت کے پنجۂ آہنی سے بھی قوی تر ثابت ہوئی۔ بعدازاں وہ خود کہا کرتا تھا "میں اس لئے جانبر ہوگیا۔ کہ میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اور میری خواہشات عموماً شرمندۂ تکمیل ہوجایا کرتی ہیں"۔

ہوا یوں کہ پہلی نظر میں ہی اُس نے میرے دل کو موہ لیا اور یہ محبت دوطرفہ تھی۔ پہلے ہی دن جب وہ اُٹھنے بیٹھنے کے قابل ہوا۔ اُس نے بے تکلف میرا نام لے کر پکارا۔ "روتھ ذرا ادھر تو آنا" اور جب میں اُس کے نزدیک گئی تو اُس نے محبت بھری نظریں میرے سراپا پر ڈالیں۔ میں لرزہ براندام ہوگئی۔ یہ دیکھ کر وہ کہنے لگا۔

"بس اب معلوم ہوگیا"

"کیا" میں نے نظر نیچی کر کے پوچھا۔

"یہی کہ ہم ایک دوسرے کے لئے تخلیق ہوئے ہیں"۔

اس وقت کا لطف مجھے تا زندگی فراموش نہیں ہوسکتا۔ میں اُس کی کرسی کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ سر اُس کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ اور دھیمی آواز میں کہا "میں تمہاری ہوں اور تمہاری ہی رہونگی۔ دنیا میں ہر ایک روتھ محبت کرنے کیلئے پیدا ہوتی ہے"۔

جھٹپٹا ہوگیا مگر میں اسی طرح سر اُس کے زانو پر رکھے بیٹھی رہی۔

ایک ماہ کے اندر اندر میں ڈیوڈ کی شریک حیات بن گئی۔ مجھے کچھ توقف کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ والدہ کی طبیعت علیل تھی۔ اور والد کو بیوپار میں خسارہ ہوا تھا۔ اور انہیں میری امداد کی ضرورت تھی۔ مگر ڈیوڈ کے اصرار نے میری ایک نہ چلنے دی۔ میری سہیلی سلی نے جب مجھے اسباب باندھتے دیکھا تو بے چاری آبدیدہ ہوگئی۔ اور کہنے لگی "یہ شادی مجھے تو پسند نہیں۔ وہ تُند مزاج اور سخت گیر ہے۔ تمہاری جیسی حلیم الطبع عورت کا اس کے ساتھ نباہ مشکل ہے"۔

"گھبراؤ نہیں سلی میں نباہ کرونگی" میں نے اُسے یقین دلاتے ہُوئے کہا۔

جب ڈیوڈ کے ساتھ میں نے اس کے مکان پر قدم رکھا۔ تو میں پھولی نہ سماتی تھی۔ میرا دماغ عرش پر تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی پہلے پہل جس پر میری نظر پڑی۔ وہ ڈیوڈ کی خادمہ خارجیہ تھی جو نئی دلہن کے لئے مکان آراستہ کرنے آئی تھی۔ وہ خوبرو مگر اکھڑ تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ طنزاً کہنے لگی۔

"اب گھر اس نئی نویلی کے حوالے ہے۔ ڈیوڈ جب بھی تمہیں میری ضرورت پڑے میں حاضر ہُوں"۔

اس کی یہ بے تکلفی مجھے ایک آنکھ نہ بھائی۔ مگر میں نے اس بات کو دل میں کوئی جگہ نہ دی۔

کاش میں ان دنوں ہفتوں بلکہ مہینوں کی وجد انگیز کیفیت سپرد قلم کرسکتی۔ ہماری محبت جنوں کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ کیونکہ میری فطرت محبت اور فیاضی میں انتہا پسند واقع ہوئی ہے۔

ایک بات سے میں خائف تھی۔ ڈیوڈ کاروباری معاملات میں نہایت سخت گیر تھا وجہ دریافت کرنے پر اُس نے کہا۔

"میری والدہ میرے بچپن ہی میں فوت ہوگئیں۔ اور میرے والد نے دوسری شادی کرلی۔ اور ہمارا گھر بار ننھے مُنّے بچوں سے بھر گیا۔ زچگی کی تکالیف میں نے بچشم خود دیکھی ہیں۔ خدا کی پناہ! بس اُس دن سے میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میرا گھر حسن اور امن وسکون کا گہوارہ ہوگا۔ رُوں رُوں کرتے بچوں کو تو میں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرسکتا"۔

یہ سُن کر میں دھک سے رہ گئی۔ "تو تمہیں بچوں سے نفرت ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"قطعاً" اُس نے فیصلہ کُن آواز میں جواب دیا۔

شادی ہُوئے پانچ برس گذر گئے۔ اس عرصہ میں ڈیوڈ کو کام میں بہت منافع ہوا۔ روپیہ عام تھا اس لئے بہت سے مقتدر اور باثر اشخاص سے ہماری شناسائی تھی۔ میری والدہ مرچکی تھی۔ اور والد

نے لندن چھوڑ دیہات میں کچھ اراضی خرید کر وہیں بود و باش اختیار کر لی تھی بہار کا پُر کیف موسم تھا۔ ڈیوڈ کاروبار سے متعلق بہت سے چکر اِدھر اُدھر لگاتا رہا۔ بوجہ عدیم الفرصتی وہ عموماً ہوائی جہاز پر سفر کیا کرتا۔ تساہل سے اسے فطری نفرت تھی۔ میری حالت میں ایک گونہ تغیر رُونما ہو رہا تھا۔ جو پہلے ایک واہمہ تھا۔ اب تیقن کی صورت میں دل میں جاگزیں ہو گیا۔ یعنی باوجود ڈیوڈ کی نفرت کے میں ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ جب ڈیوڈ حسب معمول سفر سے واپس آیا اور آتے ہی مجھے سینے سے لگا لیا۔ تو دوران گفتگو میں بالائی منزل میں ترمیم کا ذکر آ گیا۔ ہمارے مکان کی تیسری منزل کی چھت نسبتاً نیچی تھی۔ اس لئے اسے بلند کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے ایک کاغذ پر مجھے خاکہ سا بنا کر سمجھایا۔ یہاں بیٹھک ہو گی . . . . . . یہاں دو خوابگاہیں جن کے ساتھ غسل خانے بھی ملحق ہونگے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اپنی مایوسی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مگر ہمارے پاس پہلے ہی کافی جگہ ہے۔" کیونکہ کچھ عرصہ سے میرا اس منزل کو بطور زچہ خانہ استعمال کرنے کا خیال تھا۔

"مگر ہمیں بہت جگہ درکار ہو گی رد تھ۔ کیونکہ ہمارے بہت سے مہمان آیا کرینگے" پھر بھی اُس نے میرے خیال کی تائید نہ کی۔ رہ رہ کر میرے کانوں میں یہ اندرونی آواز آ رہی تھی۔ "تمہیں کسی نہ کسی روز اسے بتانا ہی پڑیگا۔ کتنی دیر چھپائے رکھو گی؟"

بہت رات گئے جارجیہ کے چلے جانے کے بعد ڈیوڈ کہنے لگا۔ "روتھ! ذرا اُوپر آنا تو۔ کھڑکیاں اور دروازے کہاں کہاں رکھنے ہونگے۔" اُس نے روشنی کر کے مجھے سارا نقشہ سمجھا دیا۔ اور کہا۔ "تم کل بازار جا کر غسل خانہ کے لئے سامان پسند کر آنا۔"

میں کیا جواب دیتی۔ اُس نے پھر کہا۔ "تم اس ترمیم پر کچھ خوش نظر نہیں آتیں۔"

آخرکار مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میرا تو مدت سے خیال تھا کہ یہاں زچہ خانہ خوب رہیگا۔ بجائے نشست گاہ کے اگر یہاں بچوں کے کھیلنے کا کمرہ بن جائے تو کیسا رہے۔ تم دریچے تو لگوانے لگے ہو۔ مگر خیال رکھنا ان میں سلاخیں ضرور ہوں ورنہ بچوں کے گر جانے کا اندیشہ ہے۔"

"خوب" اُس نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

میں اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر کے کہتی گئی۔ "اور باغ بھی لگوانا۔ بچوں کو پھول بہت بھاتے ہیں۔ اور کبوتر اور جھولا . . . . . . سردیوں کی شام کو ہم آتشدان کے سامنے بچوں کو لے کر بیٹھا کرینگے۔ جھولا جھلایا کرینگے اور لوریاں دیا کرینگے۔ ہے نا، ڈیوڈ پیارے"۔ میں نے ہاتھ اُس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔ مگر اُس نے جھٹک دیتے ہوئے کہا۔ "اس گھر میں زچہ خانہ کی کبھی ضرورت نہیں پڑنے کی۔ میں نے مدت ہوئی واضح کر دیا تھا کہ میں صرف بیوی چاہتا ہوں بچوں کی ماں نہیں۔ اور میرا گھر اصلی معنوں میں گھر ہوگا نہ کہ بچوں کا ہسپتال"

میں نے نسوانی جذبے کے ماتحت چیخ کر کہا۔ "تو تمہیں گھر نہیں بلکہ ایک نمائش گاہ کی ضرورت ہے اور مجھے تم بحیثیت بیوی نہیں بلکہ بطور ایک شرعی داشتہ کے پسند کرتے ہو۔"

اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "شاید۔ مگر یہ پھر بھی ایک بھدی بدشکل ماں سے بدرجہا بہتر ہو گی۔"

میں نے آنسوؤں کو پی کر ایک دفعہ اور کوشش کرنے کی ٹھانی اور کہا۔ "لیکن ڈیوڈ جب دو ہستیاں ہماری طرح جان نثار کرتی ہوں اور قوانین قدرت کے ماتحت زن و شوئی تعلقات رکھتی ہوں۔ تو کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم میں کوئی قابل الزام ہے اگر . . . . . ."

مگر اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "اگر نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو میں اس کا انتظام کر لونگا۔ ایک ڈاکٹر پر میرے کچھ احسانات ہیں اسے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ اگر میں اس سے کہوں کہ . . . . ."

میں سمجھ گئی۔ جوش میں آ کر میں کچھ کہنے ہی کو تھی۔ کہ خادمہ نے آ کر کہا۔ "فون پر کوئی آپ کو بُلا رہا ہے۔"

میں نے فون پر ڈیوڈ کو ایک ہوائی جہاز فوراً تیار کرانے کا حکم دیتے سُنا۔ میں ابھی اپنے خیالات میں غرق تھی کہ ڈیوڈ کار پر سوار ہو کر چلا گیا معلوم ہوا وہ عازم پیرس تھا۔ میں بدستور خیالات میں محو تھی۔ چند دنوں بعد ڈیوڈ واپس آ جائیگا۔ اس کی مرضی کے سامنے میری کچھ نہ چل سکتی تھی۔ اس کے رُوح فرسا الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ بڑے غور و فکر کے بعد انجام کے خوف سے صبح کاذب کے جھٹ پٹے میں میں نے اس گھر کو جہاں میں ارمانوں بھرا دل لے کر آئی تھی بصد یاس و حرمان خیرباد کہا۔ میں نے اپنے ساتھ کوئی سامان نہ لیا۔ صرف میرے جسم میں اک اور زندگی کی جنبش تھی اور یہ عورت کے لئے گرانبہا تحفہ ہوتا ہے۔

میں والدہ کے گھر چلی گئی۔ کوئی اور ہوتا تو سوالات کی بوچھاڑ کر دیتا اور میرے وہاں مقیم ہونے پر اعتراض کرتا۔ مگر والدہ کی موت کی وجہ سے

بچارا بے لنگر کے جہاز کے مانند تھا۔ یادرفتہ کی محویت نے اسے حال سے بالکل بے نیاز کر دیا تھا۔ اس کے پھونس کے جھونپڑے میں ایک گونہ طمانیت حکمراں تھی۔ میں بھی آلو۔ ٹماٹر اور دوسری ترکاریوں کی تخم ریزی میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ پڑوس میں ایک نہایت شریف گھرانہ آباد تھا وہاں سے کبھی کبھی میرے لئے پنیر آجاتا۔ اور میں ان کے لڑکے کی جس کے گھٹنے میں ضرب آگئی تھی مرہم پٹی کر آتی۔ گھر کی بوڑھی ہمسائی بار بار تاکیداً کہا کرتی "دردزہ شروع ہوتے ہی مجھے بلا لینا۔ بھولنا مت۔ سمجھیں؟"

خدا خدا کر کے وہ وقت آیا اور ہمسایوں کی گاڑی ہی ڈاکٹر کو شہر سے لے کر آئی۔ دردزہ کی شدت سے میں بے ہوش ہوگئی تھی۔

بی ہمسائی نے مجھے ہوش میں لاکر یہ مژدہ سنایا کہ میں بیک وقت خوبصورت توام لڑکوں کی ماں تھی۔ آہ! قدرت کی ستم ظریفی۔ ایک نہیں دو۔ اور ان کا باپ ان کی صورت سے بیزار۔ میں انہیں دیکھ کر روئی بھی اور ہنسی بھی۔ دو گلاب کے سے نازک بچے۔ ہرچند میرے دل میں ایک خارغم کھٹک رہا تھا مگر اس خیال سے کہ ڈیوڈ اُن کو دیکھتے ہی یقیناً ان سے پیار کرنے لگ جائیگا۔ پس جونہی کہ مجھ میں کچھ توانائی آئی میں نے قلم دوات اور کاغذ لے کر مندرجہ ذیل خط لکھا۔

ڈیوڈ پیارے۔

تم نے ایک دفعہ کہا تھا کہ انسان حقیقی معنوں میں کبھی خوش نہیں ہوسکتا جب تک اپنی خوشی میں دوسروں کو شریک نہ کرے۔ اب میں ماں ہوں (میں نے یہ نہ لکھا کہ دو بچوں کی ماں ہوں۔ کیونکہ میں اسے ناگہانی خبر سے خوش کرنا چاہتی تھی) اور میں اس خوشی میں تمہیں شریک کرنا چاہتی ہوں بواپسی لکھو کیا تم مجھے ابھی تک چاہتے ہو۔ اور تمہیں اب بھی میری ضرورت ہے کہ نہیں۔

راقم تمہاری روتھ

مزید یہ کہ دنیا میں ہرایک روتھ پیار کرنے کے لئے بنی ہے۔

اس دن کے بعد جب کسی موٹر کار کی آواز آتی میرا دل دھڑکنے لگتا۔ جب مجھے اُٹھنے بیٹھنے کی ہمت ہوئی تو میں نے اپنی کرسی ایسی جگہ رکھوائی جہاں سے ڈاکئے کو دور سے آتے دیکھ سکوں۔ کبھی کبھی ناتوانی کے باوجود جب بھی اباجان ڈاکئے کو دیکھنے میں سستی سے کام لیتے میں خود دروازے تک بھاگی بھاگی جاتی مگر مایوس لوٹ آتی۔

بچے پروان چڑھتے گئے۔ ایک کا نام میں نے ابا کے نام پر جان رکھا۔ اور دوسرے کا ڈیوڈ۔ کرسمس کے دن آگئے۔ شاید وہ اس تہوار پر ہی کوئی پیام بھیجے۔ میرا دل اس کی طرف سے کئی بہانے تراشتا شاید کاروبار میں زیادہ مصروفیت خط لکھنے میں مانع ہو۔ شاید میرا خط ہی اسے نہ ملا ہو۔ اور میں نے بھی تو بغیر اطلاع دیئے یوں وہاں سے چلے آنے میں عقل سے کام نہیں لیا۔ وغیرہ وغیرہ

دو دن بعد اخبار میں کرسمس کے جلسوں اور تماشوں کی تصاویر شائع ہوئیں۔ ایک تصویر ڈیوڈ اور جارجیہ کے اکٹھے ناچنے کی تھی۔ تصویر کو دیکھ کر جو میرے دل کا حال ہوا وہ صرف وہی سمجھ سکتے ہیں۔ جن کا سرمایۂ حیات تسکین قلب اور سہاگ کسی غاصب ہاتھ نے چھین لیا ہو۔ میری طرف سے ڈیوڈ کی بے اعتنائی کی وجہ جارجیہ تھی۔ اب میں نے بھی ڈیوڈ کو بھلا دینے کی کوشش کی۔

ایک دفعہ موسم بہار میں جب میرے لئے یکسر بے کیف تھا۔ میں نے اپنی سہیلی سلی کو بچوں کی ولادت اور والد کے ہاں بودوباش اختیار کر لینے کی اطلاع دی۔ اس محبت کی پتلی نے خوبصورت تصاویر۔ بچوں کے پڑھنے کی کتابیں اور ادنے کھلونے بھیجے اور لکھا "میں تمہیں ہمیشہ یاد کرتی رہتی ہوں"۔

بہار گذر گئی گرمیاں آگئیں۔ میں ابھی کمزور تھی۔ اباجان کہا کرتے۔ "روتھ تم چلا پھرا کرو۔ سیر کو جایا کرو۔ میں اور تمہاری والدہ اللہ بخشے ہر اتوار بحری سفر پر جایا کرتے تھے۔ اس سے طبیعت بشاش رہتی ہے چلوگی نا؟"

اپنی صحت کی تو مجھے چنداں پروا نہ تھی۔ محض اباجان کو خوش کرنے کے لئے میں نے رضامندی کا اظہار کیا اور اگست کے آخری اتوار جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک بچے کو میں ساتھ لے گئی اور دوسرے کو ہمسائی کے ہاں چھوڑ گئی۔ جاتے وقت تو کشتی میں بہت آدمی نہ تھے۔ مگر واپسی کے وقت کشتی بھرپور تھی۔ ہم ہنسی خوشی واپس آرہے تھے۔ کہ یکایک دھماکا ہوا اور کشتی پاش پاش ہوگئی۔ چیخ اور پکار سے ہنگامۂ محشر برپا ہوگیا۔ افراتفری میں کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ ملتی۔ میں ہاتھوں کے بل چل کر روتے بچے کی طرف لپکی۔ مگر گرتے پڑتے ہجوم نے مجھے روند ڈالا۔ مر مر کے میں بچے تک پہنچی ہی تھی کہ پھر ایک دہلا دینے دھماکا ہوا۔ پانی نے ہمیں گھیر لیا۔ میں نے بچے کو چھاتی سے لگا لیا اور ایک بہتے ہوئے تختے سے چمٹ گئی۔ آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو رہی تھی۔ لوگ مدد کے لئے پکار رہے تھے کہ میں کندھے پر ایک سخت چوٹ آنے سے بیہوش ہوگئی۔

عالم بیہوشی میں ایسا معلوم ہوا کہ کوئی میرا نام لے رہا ہے۔ "روتھ۔ مس روتھ"۔ مگر مجھ میں تاب تکلم کہاں تھی۔ کئی ہفتوں کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو واقعی بی ہمسائی میرے بالیں پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اور کہہ

رہی تھی۔ "مس روتھ تم بہت بیمار رہی ہو۔"

میں دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ مگر کمرے کا ساز و سامان گھڑکیاں۔ پردے مانوس سے معلوم ہُوئے اور میرا حافظہ بحال ہونے لگا۔ بی ہمسائی کی گود میں میرا بچہ تھا۔ مگر دوسرا . . . . . پھر فوراً جہاز کی تباہی کا نظارہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اور میں سسکیاں بھرنے لگی۔ مگر بی ہمسائی نے تسکین دیتے ہُوئے کہا۔ "ہیں ہیں مس روتھ! اب تو تم اچھی بھلی ہو۔ تمہارا بچ جانا معجزے سے کم نہیں۔ میرے لڑکے نے مجھے سب کچھ بتایا تھا۔ وہ تیر کر بچ نکلا۔ اور پھر تمہیں تلاش کرکے مع بچے کے بچا لایا۔"

"میرا بچہ! کیا وہ مرگیا ہے؟"

"اب سے دُور۔ وہ صحیح سلامت ہے۔ اُسے خفیف سی چوٹ آئی تھی مگر ڈاکٹر کی رائے ہے کہ وہ تندرست ہوجائیگا۔ ہاں اور پھر میرا لڑکا تمہیں کنارے پر چھوڑ کر بیچارے بوڑھے کو بچانے کے لئے . . . . .

"اباجان۔ آہ میں کیسی خود غرض ہوں کہ اُن کا مجھے خیال ہی نہ رہا۔"

"مگر وہ دیر سے پہنچا۔ اب اُس کی خاطر اپنی جان ہلکان نہ کرو۔ جو ہونا تھا سو ہوچکا۔"

اپنی تنہائی کے احساس کے ساتھ ہی مجھے اپنے بوڑھے باپ کا خیال آیا۔ جس نے اپنی ماں کی یاد میں تمام عمر بسر کردی تھی۔ اسی کی یاد میں وہ بحری سفر اختیار کیا تھا جس کے ختم ہونے سے پہلے وہ اُس کے پاس پہنچ گیا۔

ماہ ستمبر میری ہمسائی کا لڑکا سہارا دے کر مجھے دُھوپ میں بٹھانے لگا۔ اور شدہ شدہ میری توانائی عود کر آئی۔ سردیاں پورے جوبن پر تھیں جب میں بچوں کو لے کر اپنے والد کے مکان پر پہنچی۔ گائے کے لئے چارہ کی فراہمی اور امور خانہ داری کی غور و پرداخت نے میری تنہائی اور رنج کو زیادہ ناقابل برداشت بنادیا۔ چھوٹا ڈیوڈ اب پاؤں پاؤں چلنا سیکھ گیا تھا۔ مگر جان کی ٹانگ جو اس ہنگامہ میں مضروب ہوگئی تھی درست نہ ہوسکی۔ اور جب وہ چلنا سیکھ گیا تو صاف لنگڑاتا تھا۔

اگلی گرمیوں تک مجھ میں پوری طاقت آگئی۔ مگر میری آواز میں وہ پہلا سا لوچ نہ آسکا۔ پانچ سال میں اسی اراضی کی آمدن پر گذارہ کرتی رہی۔ لیکن چھٹے سال جب بچے مکتب جانے کے قابل ہُوئے۔ اور قریبی سکول دو اڑھائی میل کی مسافت پر تھا۔ تو میں نے محسوس کیا۔ کہ جان اتنا فاصلہ طے نہ کرسکیگا۔ لہٰذا میں نے لندن میں نقل مکان کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر وہاں پہنچ کر کئی گزشتہ واقعات کی یاد تازہ ہوگئی اور میں سلی کے لئے اُداس ہوگئی۔ میں اس کی ملاقات کو گئی اور جب اُس نے دروازہ کھولا تو متعجب نگاہوں سے میری طرف گھورنے لگی۔ میں نے اُس کی حیرانی دُور کرنے کے لئے کہا۔ "سلی میں ہوں روتھ!"

"روتھ؟ کیا مردے دوبارہ زندہ ہوسکتے ہیں۔ تمہارا نام تو غرق شدہ انسانوں کی فہرست میں تھا۔ تم اور تمہارا بچہ۔ اور یہ خبر پڑھ کر میں اتنا روئی تھی کہ ہچکی بندھ گئی۔"

میں خفیف آواز میں ہنسی اور اندر جاکر کہا۔ "سلّی! واقعی میرا بچ نکلنا ایک معجزہ تھا۔ ڈیوڈ بھی یہی خیال کرتا ہوگا۔ کیا اُس نے دوبارہ شادی کرلی ہے؟"

"میری بھولی بھالی لڑکی۔ کپڑے اُتارو۔ چائے پیو۔ ان بچوں کو دودھ پلاؤ۔ پھر جی بھر کے باتیں کرلینا۔ کیا تم اخبار نہیں دیکھا کرتیں۔"

"نہیں۔ کیونکہ اخبار دیکھ کر ایک دفعہ جو میرے دل پر گذری میرا جی جانتا ہے۔ اگر پھر پڑھوں تو نجانے اور کیا طوفان برپا ہو۔" چائے پُرتکلف تھی۔ بچے تو کھا پی کر آتشدان کے قریب ہی کرسی پر اُونگھ گئے اور ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔

"ہاں تو سلی میری بات کا جواب دو۔ کیا ڈیوڈ نے جارجیہ سے شادی کرلی۔"

"نہیں۔ لیکن یہ سب جارجیہ کا قصور تھا۔ سنو یہ تو تم جانتی ہو کہ وہ پیرس والی کمپنی خریدنے کے درپے تھا۔"

"ہاں تھا تو۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"وہ جارجیہ سائے کی طرح اُس کے ساتھ رہی۔ پھر اُس کے دوست ڈاکٹر نے کسی نامعلوم وجہ سے اپنے آپ کو گولی سے ہلاک کر ڈالا۔ ڈیوڈ پر مصیبت آن بنی اور جارجیہ اُسے چھوڑ کر بھاگ گئی۔"

"بے وفا کہیں کی۔ اگر میں ہوتی تو کبھی ایسا نہ کرتی۔"

"جونہی ڈیوڈ کے حالات رُوبہ اصلاح ہوجائینگے۔ وہ پھر آدھمکے گی" سلی نے دونوں بچوں کو اُٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا اور پوچھنے لگی۔ "ان کے نام کیا ہیں۔"

میں نے دونوں کے نام بتلائے۔ پھر مختلف موضوع زیر بحث رہے سلی نے کہا۔ "میں تمہیں کہیں نرس کا کام دلا دونگی۔ اور جب تک کام نہ ملے تمہیں میرے پاس ٹھیرنا ہوگا۔ تم جانتی ہو۔ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔"

"لیکن سلی میری، توخیر- ان دو بچوں کا شور تمہارا ناک میں دم کر دیگا"
"ہشت میں خود گیارہ بھائی بہنوں کی بارھویں بہن ہوں- بچوں سے کیسے تنگ آؤنگی"

غرضیکہ میں پھر ایک نرس کے سفید لباس میں نظر آنے لگی، بچے سکول جانے لگے- سلی کے مکان میں اب زندگی باقاعدہ بسر ہونے لگی- بچے، میں اور سلی اکٹھے ناشتہ کرتے- اور جب تک ہم دونوں کام سے واپس آئیں- ہمسایوں کی لڑکی میرے بچوں کی نگہداشت کرتی- میں اپنی متمول مگر مضطرب مریضہ کو روز مل مل کر نہلایا کرتی-

سلی نے ایک ماہر ڈاکٹر کا نام لیا- جو شاید جانؔ کو اچھا کر سکے اور ڈاکٹر نے بھی یقین دلایا- کہ مالش اور ورزش سے جانؔ بہتر ہو سکتا ہے گو لنگڑاپن بالکل رفع نہیں ہو سکتا-

دسمبر کا جاڑا جوبن پر تھا- ایک صبح جب میں نے اپنی مریضہ کے لئے اخبار خریدا- تو یہ خبر پڑھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا" ڈیوڈ اور اس کا جہازران برف کے طوفان میں گھر گئے- جہاز اب تک لاپتہ ہے"

پرچہ میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا- حالانکہ میں سمجھے بیٹھی تھی کہ اب وہ نام میرے دل کی دھڑکن کو تیز نہیں کر سکتا- تمام رات دل میں طوفان برپا رہا- میرے دل میں ڈیوڈ کا خیال رہ رہ کر آتا- اب جا کر مجھے پتہ لگا کہ میرا دل ابھی تک ڈیوڈ ہی کا ہے- دوسرا دن مختلف اخباروں کے ایڈیٹروں سے جہاز کے متعلق حالات دریافت کرنے میں گذر گیا مگر کوئی تسلی بخش خبر نہ ملی- تیسرے دن طیارہ جہاں گرا تھا وہیں پڑا پایا گیا . . . جہازران کے گھٹنے میں موچ آگئی تھی- لکڑی کا ایک ڈیوڈ ڈیوڈ کی آنکھوں پر جا لگا تھا- بایں ہمہ اس نے اپنا کوٹ جہازران کے اوپر ڈال دیا- اور خود امداد کی تلاش میں نکل پڑا- رات بھر پھرتے پھراتے صبح کے قریب اسے ایک دہقان نظر آیا- جہازران کے تو گھٹنے ہی پر خیر گذری مگر ڈیوڈ کی زخمی آنکھوں میں برف پڑ کر ورم کو زیادہ کرتی رہی- اور آنکھیں از حد خراب ہو گئیں- آخر شدت درد سے وہ بیہوش ہو گیا- اور ہسپتال میں داخل کر دیا گیا-

آہ- کاش گزرا ہوا واپس آسکتا- تاکہ میں ایک دفعہ پھر اُس کی بالیں پر ہوتی- مگر اب تو کوئی اور نرس اس کی تیمارداری میں مصروف ہوگی- مجھے اب اتنی مشق بھی نہ تھی کہ میں ایسے نازک بیمار کی ذمہ داری کا بار اُٹھا سکتی- سلی کی وساطت سے بیمار کی حالت دریافت کرتے رہنے سے مجھے اس کی روزانہ کیفیت معلوم ہو جاتی- پانچ دن تو اس کی جان کے لالے پڑے رہے- میری سانس اس کے لئے دعائے صحت تھی- چھٹے دن جب سلی نے مجھے بتایا کہ اب خطرہ کا مقام نہیں رہا- تو میری جان میں جان آئی- پھر وہ گھر بھیج دیا گیا- اور پتہ لگا کہ آنکھیں درست ہونے میں ابھی کافی عرصہ لگے گا-

میں بدستور اپنی امیر مریضہ کی خبر گیری کرتی رہی- مگر دل یہی چاہتا کہ کسی نہ کسی طرح اس کمرے تک میری رسائی ہو جائے جہاں ڈیوڈ آنکھوں پہ پٹی باندھے لیٹا ہوا تھا- دوسرے دن بعد دوپہر مجھے سلی ملی اور کہنے لگی" تمہارا ڈیوڈ نرسوں پر بڑی سختی کرتا ہے- تین کو نکال چکا ہے- پچھلی نرس کو اُس نے اس لئے نکال دیا- کہ جب کبھی وہ اس کے آگے انگلیاں چٹکاتا وہ ناک بھوں کیوں چڑھاتی تھی"

ایک منٹ تو میں خاموش رہی- پھر میں نے ہمت کر کے کہا" سلی اگر تم میری آواز سنو مگر دیکھ نہ سکو تو کیا مجھے پہچان لو؟"

" ہرگز نہیں- اب تمہاری آواز میں وہ پہلے جیسا لوچ نہیں رہا کم از کم میں تو نہ پہچان سکوں"

" اچھا تو سنو- میں ڈیوڈ کی نرس بنوں گی، میری امیر مریضہ کے لئے کسی اور نرس کو ڈھونڈھ لینا"

" پگلی تو نہیں ہو گئی ہو- تم اب تک اُس پر فریفتہ ہو مگر کیا خبر وہ بھی تمہاری پرواہ کرتا ہے یا نہیں- کیوں اپنی زندگی اپنا مستقبل تباہ کرتی ہو- کئی ڈاکٹر تمہیں معقول مشاہرہ پر ملازم رکھنے کو تیار ہیں"

میں نے ملتجیانہ آواز میں کہا" اگر مجھے یقین ہو جائے کہ اسے میرا خیال مطلق نہیں تو میں مجبوراً سب کچھ بھول جاؤنگی"

سلی بولی-" خیر- جیسے تمہاری مرضی"

جس دہلیز سے بارہ سال پیشتر ایک پُرارمان دل لئے کر اور دھڑکتے دل کی کیفیت کیساتھ آئی تھی- آج تمام تمناؤں کا مدفن دل لے کر پھر وہاں واپس آئی- ایک ملازم نے دروازہ کھولا- حیرانی یہ تھی کہ باوجود تاریکی اور اُمید و بیم سے دھڑکتے ہوئے دل کے میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے گھر میں آگئی ہوں- ڈیوڈ کمرے میں چہل قدمی کر رہا تھا- وہ نحیف سا ہو گیا تھا- اور بال کھچڑی ہو گئے تھے- مگر باوجود نقاہت اور عارضی اندھے پن کے اس کا عزم صمیم جس پر میں ہزار جان سے نثار تھی- بدستور قائم تھا-

میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا" میں نرس ہوں"

وہ ٹھیر گیا اور میری طرف رخ کیا- میں اس خیال سے کانپ اُٹھی

کہ کہیں وہ پٹی سے بھی مجھے دیکھ نہ رہا ہو۔

اُس نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے۔ کہیں اتنا لمبا تو نہیں کہ میں یاد ہی نہ رکھ سکوں۔"

"میرا نام روتھ ہے۔ . . . ہے نا مختصر سا؟"

"نہیں میں تمہیں روتھ کے نام سے نہیں پکاروں گا۔" اُس نے درشت لہجہ میں کہا۔

میں نے بمشکل ضبط کر کے پوچھا۔ "آپ ناشتہ کر چکے ہیں؟"

"خاک ناشتہ کر چکا ہوں۔ باورچی سمجھتا ہے کہ نظر کے ساتھ میری قوت ذائقہ بھی سلب ہو گئی ہے۔"

"تو میں آپ کے لئے تازہ چائے بنا لاتی ہوں۔" میں خوش تھی کہ میں کچھ خدمت تو کر سکونگی۔

دو ہفتے گذر گئے۔ مگر اب تک مجھ پر یہ نہ کھل سکا کہ آیا ڈیوڈ اس روتھ سے اب بھی محبت کرتا ہے۔ جو اُس کے ساتھ اسی کمرے میں بارہ سال پہلے رہ چکی ہے۔ اس کی طبیعت کچھ نرم ہو گئی تھی۔ ایک دن اُس نے مسکرا کر کہا۔ "جب انسان کی آنکھیں بند ہوں تو وہ دل کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔"

ایک دفعہ جب میں اُسے اخبار کا پرچہ پڑھ کر سنا رہی تھی۔ کسی نے مجھے فون پر بلایا۔ جو لڑکی میرے بچوں کی نگہداشت پر مامور تھی۔ بیمار ہو گئی میں عجیب اُلجھن میں تھی۔ جب تک میں یا سلی گھر نہ جائیں اُن کی نگرانی کون کرے۔

ڈیوڈ نے کہا "اُنہیں یہیں کیوں نہیں لے آتیں۔ کسی اور نرس کی نسبت دو بچوں کا شور بدرجہا بہتر رہیگا۔

میرے دل میں ایک اُمید کی جھلک پیدا ہوئی۔ اور میں نے جواب دیا۔ "میں اُنہیں خاموش رکھنے کی کوشش کرونگی۔"

اُس دن سے بچے بھی وہیں رہنے لگے۔ بعض اوقات خراب موسم میں بچے بالائی منزل میں کھیلا کرتے اور باوجود میری روک ٹوک کے ان کے دوڑنے کی آواز آتی رہتی۔ میں نے ڈیوڈ سے کہا۔ "اس سے آپ کو تکلیف تو نہیں ہوتی۔"

اُس نے کہا۔ "نہیں تو۔ میں نے سمجھ رکھا تھا کہ خاموشی وجہ سکون ہے۔ مگر اب مجھے خاموشی اور تنہائی سے ڈر لگتا ہے۔"

ایک دن جب میں دواساز کی دوکان پر نسخہ بنوانے گئی۔ میری غیر حاضری میں ڈیوڈ نے بچوں کو کمرے میں بلوایا اور اُن سے باتیں کرنے لگا۔ وہ خوش معلوم ہوتا تھا اور میری واپسی پر مجھ سے کہنے لگا۔ "میں تمہارے لڑکوں کی آواز سے اُنہیں پہچان سکتا ہوں۔ جان کی آواز ہلکی اور متین ہے۔ اور دوسرے کی سخت"

دن بدن ڈیوڈ کے لئے میں ناگزیر ہوتی گئی۔ ایک سہ پہر کو اُس نے مجھ سے نجی حساب کی پڑتال میں امداد چاہی۔ میں خطوط کا پلندہ اُٹھا لائی۔ اور اُس نے خاص کاغذات میز کے خانے سے نکالنے کو کہا۔

وہ نکال کر میں نے کہا "کچھ خطوط اور کاغذات نیچے الماری میں بھی پڑے ہیں۔ وہ بھی لیتی آؤں کیا؟"

"وہ جو شیشے کی الماری میں پڑے ہیں؟ نہیں وہ میرے نہیں ہیں اس میں جو چیز ہے کسی اور کی ملکیت ہے اور چابی بھی اُسی کے پاس ہے۔"

میں سمجھ گئی کہ وہ الماری جارجیہ کی ملکیت ہو گی۔ تو کیا اس کا مطلب تھا وہ پھر آئیگی۔ ایک دن جب ڈیوڈ کچھ متفکر سا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "ڈاکٹر کو فون پر بلا کر اس کم بخت دردسر کی کوئی دوا پوچھو۔"

میرے بچے بالائی منزل پر کھیل رہے تھے۔ میں نے اُنہیں بلا کر کہا "نیچے چلے جاؤ اور پڑھو۔ مالک کے سر درد میں اضافہ نہ کرو۔"

میں نے ڈاکٹر کو فون کیا۔ اُس نے ایک دوا بتائی اور میں وہ لینے کے لئے خود چلی گئی تاکہ نوکر دیر نہ کر دے۔"

واپسی پر کیا دیکھتی ہوں کہ دونوں لڑکے ہال میں مُنہ پھلائے کھڑے ہیں۔ بڑے نے کہا" امی۔ ہم سے بھاری قصور ہو گیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی طرف گیند پھینک رہے تھے۔ جان چُوک گیا اور اس الماری کا شیشہ ٹوٹ گیا ہے۔"

شیشہ جارجیہ کی الماری کا ٹوٹا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ شیشہ لگ جائے۔ حساس جان رو رہا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دیتے ہُوئے کہا" نہ رو بیٹا۔ ہم نیا شیشہ جڑوا دینگے"۔

میں کاغذات اور خطوط پر سے شیشے کی کرچیں اُٹھانے لگی۔ ذرا صاف کرنے کے لئے مجھے وہ تمام کاغذات اُٹھانے پڑے۔ ان میں کچھ قانونی دستاویزیں بنک کا حساب وغیرہ تھے۔ مگر ایک چھوٹے سے لفافہ پر جو میری نظر پڑی تو میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ کنپٹی کی رگ تیزی سے پھڑکنے لگی۔ یہ میرا خط ڈیوڈ کے نام تھا۔ جو آج سے چھ سال پہلے والد کے گھر سے لکھا ہوا تھا۔ اگر وہ ڈیوڈ کو مل جاتا تو جارجیہ کے قبضے میں نہ ہوتا۔ کیا یہی وجہ تھی کہ ڈیوڈ نے نہ ہی اس خط کا جواب دیا۔ اور نہ ہی مجھے ملنے آیا۔ اُوپر جاتے جاتے میں نے بصد مشکل آنسوؤں کو ضبط کیا۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس خبر کا

اس پر کیا اثر ہوتا ہے۔ میں نے اسے شیشہ ٹوٹ جانے کا تمام ماجرا سُنا دیا۔ اور کہا "جب میں شیشے کی کرچیں وہاں سے صاف کر رہی تھی۔ تو کاغذات میں ایک مکتوب تمہارے نام کا بھی نکلا۔ جو ابھی تک بند تھا۔ چھ سال پہلے کا مقام . . . . سے لکھا ہوا"۔

اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اُس نے خط کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا" آہ۔ اندھا ہونا بھی قہر الٰہی ہے۔ ذرا اسے کھول کر پڑھو تو۔ مگر پہلے یہ بتاؤ یہ ہے کس کا لکھا ہوا؟"

"روتھ کا" میں نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"روتھ کا؟ ناممکن!۔ اس نے مجھے کبھی خط نہیں لکھا۔ وہ مجھ سے متنفر تھی۔ تبھی تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی"۔

"ہرگز نہیں۔ خط سے تو کم از کم یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ ذرا سنئیے تو لکھا ہے:"

ڈیوڈ پیارے

تم نے ایک دفعہ کہا تھا۔ کہ انسان حقیقی معنوں میں کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔ جب تک اپنی خوشی میں دوسروں کو شریک نہ کرے۔ اب میں ماں ہوں۔ اور میں اس خوشی میں تمہیں شریک کرنا چاہتی ہوں۔ جواب میں لکھو کیا تم مجھے ابھی تک چاہتے اور تمہیں اب بھی میری ضرورت ہے کہ نہیں۔

راقم

تمہاری روتھ

مزید یہ کہ دنیا میں ہر ایک روتھ پیار کرنے کے لئے بنی ہے۔

"اس پر تاریخ کیا ہے؟" ڈیوڈ نے گھبرا کر پوچھا۔

"۲۱ دسمبر"۔

وہ اس طرح خاموش ہو گیا۔ کہ مجھے ڈر تھا وہ میری سسکیوں کی آواز نہ سُن لے۔ آخر کار اُس نے یوں مہرِ سکوت کو توڑا۔

"مجھے یاد ہے کہ کرسمس سے ایک دن پہلے میں شکار سے واپس آیا تو جارجیہ سے پوچھا کہ میرے نام کی کوئی چٹھی تو نہیں۔ شاید وہ میرے بار بار پوچھنے سے تنگ آ گئی تھی۔ ہم اسی کمرے میں تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ یہ بات سُن کر ہنسی اور میری بندوق لے کر کہا۔ جلدی کرو۔ مہمان آ رہے ہیں۔ اس نے میرا پستول لے کر ایک کونے میں رکھ دیا تھا۔ کیا یہ ابھی تک وہیں پڑا ہے؟"

"ہاں ہے تو۔ کیا تمہیں روتھ سے محبت تھی؟"

لیکن اس کے خیالات کہیں اور تھے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا"۔ اسی رات جارجیہ نے طلاق حاصل کرنے پر زور دیا"۔ وہ وحشیانہ ہنسی ہنسا۔" اور روتھ کی چٹھی آئی ہوئی تھی۔ اگر میں روتھ کے پیچھے جا کر اسے واپس لے آتا تو نہ وہ اس کشتی میں سوار ہوتی۔ اور نہ غرقاب ہوتی۔ بلکہ آج اس کمرے میں میری شریکِ تنہائی ہو کر میری غمگساری کرتی"۔

میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اشکِ مسرت میری آنکھوں میں چھلک اُٹھے۔ ڈیوڈ پھر بولا۔ کیا تمہیں معلوم ہے۔ اس بدذات ڈاکٹر نے دامِ تزویر پھیلانے کے لئے ایک دفعہ کیا کہا تھا؟ اُس نے کہا تھا کہ یہ احساس بڑا اطمینان بخش ہے کہ ایک گولی تمام مصائب کا خاتمہ کر سکتی ہے"۔

میں تاڑ گئی کہ ڈیوڈ کونے میں پڑے ہوئے پستول کو ٹٹول رہا تھا۔ میں چیخ مار کر اس کی طرف لپکی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔" ڈیوڈ۔ پیارے ڈیوڈ خدا کے واسطے اب ایسا نہ کرو۔ اب دن پھر گئے ہیں۔ میں خود کو ظاہر کرنے سے پیشتر جاننا چاہتی تھی۔ کہ آیا تم کو مجھ سے محبت ہے کہ نہیں۔ میں تمہاری روتھ ہوں۔

اُس نے پٹی کو کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا" نہیں۔ تم صرف میری ڈھارس بندھانے کے لئے ایسا کر رہی ہو"۔

"ڈیوڈ۔ پتہ ہے گم شدہ محبت کس طرح واپس آئی"۔

اُس نے تحکمانہ لہجے میں کہا"۔ ادھر آؤ" اور میری گردن کی رگ پر پیاسی دن کی طرح اپنے لب رکھ دیئے۔ جبکہ پہلے پہل ہسپتال میں رکھے تھے۔

میں نے کہا" اب تو تمہیں یقین ہو گیا ہے؟"

"ہاں ہاں۔ مگر روتھ تب تو میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ تھا مگر اب میں نابینا ہوں"۔

"مگر میرا دماغ تو ہے۔ میں تمہیں اپنی آنکھیں دے سکتی ہوں بلکہ تمہاری چھ آنکھیں ہونگی۔ لڑکے بھی تو جوان ہو کر تمہاری خدمت کرینگے"۔

اتنے میں بچوں کے سیڑھی پر سے اُترنے کی آواز آئی۔ ڈیوڈ ہنسا۔ اور میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

اتنے میں ڈیوڈ بولا" روتھ! میرے خیال میں بالائی منزل میں بچوں کے کھیلنے کے لئے کمرہ بنانے کی تجویز اچھی رہیگی۔ کیونکہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ وہ الماریوں کے شیشے توڑتے پھریں"۔

یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

اُلفت وزیر آبادی

میرا بوڑھا دوست

آج تیری آنکھیں بوجھل کیوں ہیں؟
آج تیرا چہرہ اداس کیوں ہے؟
آج تیری نظروں میں ناامیدی کیوں ہے؟
آج تو سر جھکائے اپنی کشتی میں بیٹھا کیا سوچ رہا ہے؟
آج تیرے ہونٹ ماضی کے گیت سے کانپتے کیوں ہیں؟
آج تو میرے پاس کیوں نہیں آتا؟
کیا کسی نے تجھے کچھ کہا ہے۔ کیا کسی سے تو روٹھ گیا ہے؟

(۲)

کشتی کو چلا چلا کر کیا تم بہت تھک گئے ہو؟
ماضی کی میٹھی باتیں یاد کر کے کیا تم اکتا گئے ہو؟
بوڑھے سینے پر ہاتھ پھیر کر تجھے اپنا شباب تو نہیں یاد آیا؟
حسین آنکھیں ——— امرت بھرے ہونٹ اور کالے
کالے بال دیکھ کر تمہیں اپنا محبوب یاد نہیں آیا؟
ندی کے پانی میں شام کو سورج دیکھ کر تمہارے سینے
میں بجھی ہوئی آگ تو نہیں سلگ اٹھی؟
جھرنے کے کنارے دور سے بانسری کی آواز سن کر کسی کا
خیال تو نہیں آیا؟
میرے بوڑھے دوست! آج تجھے کیا ہو گیا؟
کیا کسی نے تجھے کچھ کہا ہے۔ کیا کسی سے تو روٹھ گیا ہے؟

(۳)

کیا تم سوچ رہے ہو دنیا کی میزبانی اور مہمان نوازی کا
سلسلہ ہمیشہ ہی قائم رہے۔
کیا تم سوچ رہے ہو انسان صدیوں جی جی کر پاگل ہو جائے!
کیا تم سوچ رہے ہو زندگی کے بیکراں سمندر کا کوئی کنارہ
نہ ہو؟
کیا تم سوچ رہے ہو دن کا اجالا ہی رہے رات کبھی
نہ آئے!
دھوپ ہی روز نکلا کرے ——— بادل کبھی نہ چھائیں!
پھول ہی ہمیشہ کھلا کریں ——— خزاں کبھی نہ آئے!
سب کے ہونٹ ہنستے ہی رہیں۔ کسی کی آنکھیں کبھی نہ
روئیں!
کیا ہی سوچ رہے ہو تم ———؟
آخر تمہیں آج ہو کیا گیا!
تم غمگین کیوں ہو؟ کسی نے تمہیں کچھ کہا؟ کسی سے تم روٹھ
گئے ہو؟

(۴)

اُٹھ! آسمان کی طرف دیکھ اور پاگل ہو جا!
دیکھ، چلی ہے سواری بہت بہت دور سے!
سن ہُو ہُو کا شنکھ جو بجاتی آ رہی ہے آندھی!
خوف نہ کھا، یہ گڑگڑا رہے ہیں شاہی رتھوں کے پہیے!
زمین زور زور سے سانس لینے لگی ہے!
بوڑھے ساگر کی چھاتی دھڑ دھڑ کر کے کانپنے لگی ہے!
درختوں کے پتے ایک دوسرے کے پیچھے چھپنا چاہتے
ہیں!
ہوا، کھلے ہوئے پھولوں کی معصوم آنکھوں کو جلد جلد زبردستی
بند کر رہی ہے!
تاکہ یہ ننھی ننھی جانیں کانپ نہ اٹھیں، مہاراج اندر کی سواری
دیکھ کر!
اُٹھ رے بوڑھے ——— بھول جا سارا غم۔
آسمان کی طرف دیکھ اور پاگل ہو جا!
آج تجھے ہو کیا گیا؟ کس نے تجھے کیا کہا؟ کس سے تم روٹھ
گئے؟

(۵)

آ۔ تجھے پرانے بادشاہوں کے افسانے سناؤں!

آ تجھے جوگی اور جوگن کے پریم کی کہانی سناؤں!
آج کے بھیگے ہوئے دن ہیں، میں نے ایک ہی گیت لکھا ہے!
آ ــــ وہی تجھے سناؤں!
آ تجھے بتاؤں - دنیا کیا ہے! تم اور میں کہاں ملے تھے؟
تم اور میں پھر کہاں جائیں گے! پھر کہاں بسیں گے!
صدیوں سے ہم کسی طرح ایک دوسرے کی تلاش کرتے کرتے اس ندی کے کنارے آ کر مل گئے!
آ اجالا کر دیں ــــ اس جھونپڑی میں -
اور کاٹ دیں یہ بادلوں سے گھری ہوئی رات باتیں کرتے کرتے ہی!

(۶)

تجھے کیا ہو گیا ہے آج؟
کس بات کا تجھے خوف ہے؟
نہ ہم کبھی جدا ہوئے تھے - نہ ہم کبھی جدا ہوں گے!
ندی کے اس پار کشتی کے سرے پر تو بیٹھے گا -
اور ندی کے اس پار جھونپڑی کے در پر میں کھڑا رہوں گا -
تکتا رہوں گا تیری طرف ہی!
اگر تجھے یہی خوف ہے تو اٹھ!
باندھ اپنی کشتی کو امید کی چھوٹی سی رسی سے -
اس پرانے بید کے درخت کے ساتھ جو ندی کے کنارے رک گیا ہے!
اور آ میرے پاس!
آ تجھے میں چھپا لوں اپنے سارے پیار میں!
آ تجھے میں جگہ دوں اپنے من میں!
آ تیرے خاموش بڑھاپے کو ڈھک لوں اپنے پر جوش شباب سے!
کہ نہ دیکھ سکیں اس رقاصہ کی آنکھیں تجھے -
جو اپنا ابدی گیت گا گا کر روحوں کی خیرات مانگتی پھرتی ہے!

رونق کاشمیری

غزل

عمر ابد کا ماحصل عشق کا دور ناتمام
ہائے وہ مستی سحر ہائے وہ بیخودی شام

پہلے تال سوچ لیں ہمسفران سست گام
میری سرشت میں نہیں خواہش منزل و مقام

طائر خستہ بال کو دام بھی کنج آشیاں
مرغ چمن نورد کو گوشۂ آشیاں بھی دام

مستی رنگ و بو نہیں تیرے قیام کی امید
میکدۂ بہار سے گل کو ملا ہے ایک جام

اب بھی خدا پرست ہیں دیر و حرم کی قید میں
ہائے نگاہ نارسا ہائے مذاق ناتمام

خوبی و شان دلبری غمزہ و ناز ہی نہیں
حسن میں وہ ادا بھی ہے جس کا نہیں ہے کوئی کام

حاصل حسن روز و شب آپ کا ایک جلوہ ہے
رخ پہ تبسم سحر زلف میں رنگ و بوئے شام

چارۂ درد زندگی عقل نہیں شراب ہے
غمکدۂ حیات میں عقل ہے اک جنون خام

ذوق نظر کی مستیاں اہل نظر سے پوچھئے
جیسے کوئی پلا گیا بادۂ مشکبو کے جام

تاباں دہلوی

السنۂ ایرآن

ایرآن کا سب سے پہلا بادشاہ گیومرس (گیومرثیہ) تھا۔ ایرانی یا پارسی اس کو ابوالبشر کہتے ہیں۔ مورخین نے ایرآن کے آٹھ دور قائم کئے ہیں۔ چھ دور زیادہ روشن اور مشہور ہیں۔

دورِ اول ۔ آشوری ۱۰۰۰سنہ قبل مسیح یا بقول ڈاکٹر سپیگل (DR. SPEGAL.) جرمنی اس سے قبل کا زمانہ جس میں خط پیکانی یا میخی ARROW رائج تھا۔

دورِ دوم ۔ میڈیا MEDIA ۸۰۰سنہ قبل مسیح دوسرا دور ہے میڈیا ایرآن کا مغربی علاقہ تھا۔

تیسرا دور ۔ خحامنشی .AKIMINAN ۵۶۹سنہ قبل مسیح سے ۳۳۰سنہ قبل مسیح تک رہا۔ اس کی ابتدا سائرس شاہ ایرآن سے ہوتی ہے پیش دادی اور کیانی خاندان کے بادشاہ اسی سلسلہ میں ہیں۔ اس کے آخری بادشاہ کو سکندر اعظم نے شکست دیکر برباد کیا۔

اس دور کے خطوط کی کتابت خط پیکانی (میخی) قدیم فارسی یا اوستائی میں پائی جاتی ہے۔ نقش رستم اور کوہ بے ستون پر بھی کتبات ملے ہیں۔ یہ فرامین اور اعلانات ہیں۔ ان کتبات میں تقریباً چودہ ۱۴۰۰سو الفاظ ہیں۔ سکندر اعظم کے حملہ کے بعد طوائف الملوکی کا دور رہا۔ اس کے بعد ساسانیوں نے حکومت کی۔ اس طوائف الملوکی کے زمانہ کو وقفہ کہتے ہیں۔ یہ دور ۳۳۰سنہ سے ۲۲۶سنہ قبل مسیح رہا۔

وقفہ کے بعد ہر دور کے لوگ مل گئے ہیں۔ زبان فارسی مشترکہ ہو گئی مگر رسم الخط پیکانی رہا۔ فردوسی نے اس دور کو اشکانیاں کہا ہے۔

فرس قدیم یا فرس باستانی قدیم زبان ایران ہے۔ اس کا زمانہ شاہان ہخامنشی ۵۵۸سنہ تا ۳۳۶سنہ قبل مسیح رہا۔ فرس قدیم جو فرس ہخامنشی کہلائی اصل میں سامی زبان سے نکلی اور وہی رسم الخط رہا۔ چونکہ اشوریان کی عظیم مملکت ہخامنشی حکمرانوں کی مملکت کا جزو تھی۔ لہذا باہمی اختلاط کی وجہ سے سامی تمدن و علوم ایرآن میں آئے۔

مگر فرس قدیم کی زبان میں دقتیں واقع ہونے لگیں خط میخی یا پیکانی یا سماری جاری ہوا۔

عربی اور حبشی ابجد کلدانی زبان سے مشابہ ہیں اور عبرانی میں بھی یہی پائے جاتے ہیں۔ ایرانیوں نے حروف پ۔ چ، ژ، گ۔ اپنے یہاں زاید شامل کر لئے ہیں۔ ورنہ ابجد وہی ہے۔

زبان بابلی قدیم ترین تھی۔ اسی سے مصریوں نے سراغ یعنی .HIEROGLYPHIC جانوروں وغیرہ کی صورتیں بنا کر اپنا رسم الخط ایجاد کیا۔

دورِ پنجم ۔ یہ دور ۶۵۲سنہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس حکومت کا بانی اردشیر بن بابک تھا جس نے زرتشتی مذہب کو دوبارہ فروغ دیا۔ بہرام (گور)۔ نوشیرواں اور خسرو اسی خاندان سے تھے۔ آخری بادشاہ یزدجرد یا یزدگرد تھا۔ اس کی سلطنت کو مسلمانوں نے ۳۱سنہ ھ مطابق ۶۵۲سنہ میں ختم کیا۔

اس عہد کی زبان متوسط فارسی تھی جس کو عموماً پہلوی کہا جاتا ہے۔ اس میں تقریباً چھ لاکھ اٹھائیس ہزار الفاظ کہے جاتے ہیں۔ پہلوی سرکاری زبان تھی۔ خط پہلوی کا ماخذ بھی سماری (پیکانی یا میخی ARROW) ہے۔

مسلمانوں کے ایران پر قبضہ کرنے کے بعد بھی تین سو برس تک رسم الخط پہلوی رہا۔ عہد شاہ گشتاسپ میں جب زرتشت نے اپنا مذہب جاری کیا اور تعلیم کا عام رواج ہوا کتاب اوستا مختلف صوبوں کی زبان میں پھیل گئی۔ سب صوبوں کی زبان ایک تھی مگر لہجہ جدا گانہ تھا۔ دفتر انشا کا خط پہلوی تھا۔

پہلوی اور پارتوی زبان ہم معنی ہیں۔ پارتھیا کا قدیم نام فارسی سے پہلے پارتھوا تھا پھر پرتگو اور پرتھو سے پل ھو (پلہو)۔ پلہو سے پہلو بن گیا جس میں یائے نسبت لگا دی گئی۔

فارسی کے ساتھ دو زبانیں ژند اور اوستا بھی مشہور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زند اوستا کی کتاب کا جو متن ہے وہ

اوستا کہلاتا ہے اور اس کا ترجمہ وتفسیر جو پہلوی زبان میں ہے اس کو ژند کہتے ہیں اور پہلوی ژند کی تشریح مکرر کا نام پاژند ہے۔

یہ مصطلحات ہیں۔ اہل یورپ پہلوی سے فارسی متوسط (ساسانی) مراد لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا ایک رسم الخط ہے اس میں آرامی یا ہزوارش عنصر کی آمیزش ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہزوارش ایک حجہ کا نام ہے جو پہلوی میں استعمال ہوتا ہے۔ زرتشت بن پ اورشسپ۔ مادر دوغ داو۔ اوستا میں آپ کا نام زرہتوشتر دیا ہوا ہے اور خانوادہ سپی تما۔ آپ سنہ [illegible] قبل مسیح غرب ایران میں پیدا ہوئے اور سنہ ۶۲۰ قبل مسیح میں انتقال ہوا۔ مفصل حال پیدائش و وفات کتب ہائے "پہلوی" بوندہشن میں درج ہے۔ یہ دین کرت کہلایا۔ تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر پارسیان کا زمانہ سنہ [illegible] قبل مسیح تھا۔ زبان پہلوی میں آپ کا نام "زرتوشت" یا "زرتوہشت" دیا ہوا ہے بیس سال کی عمر میں آپ نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی تیس سال کی عمر میں تبلیغ مذہب شروع کی۔ بہت لوگ آپ کے مذہب میں شریک ہوئے اور مع تابعین آپ شاہ ایران گشتاسپ کے پاس گئے۔ اس نے بھی آپ کا مذہب قبول کیا۔ آپ کو اور آپ کے تابعین و مذہب کو بڑی تقویت ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد قریب قریب تمام ایران نے آپ کا مذہب اختیار کر لیا۔

کلمہ "اوستا" کے معنی کی تحقیق کیلئے پروفیسر اندریاس اور محقق المانی گلدنر نے کتاب کے اصل متن کو لیا ہے۔ اس میں ان کو احتمال ہے کہ اس کے معنی علم و دانش یا صحائف دینی و قانون مذہبی کے ہوں۔ "اوستا" پارسیوں کی مذہبی کتاب ہے اور بڑی بزرگ مانی گئی ہے۔ زبان پہلوی میں لکھی گئی۔ "اوستا" قدیم میں [illegible] باب ہیں۔ مورخین کا بیان ہے کہ چرم گاؤ پر بارہ ہزار پارے لکھے تھے۔ "اوستا" نہ تو ایک شخص نے لکھی اور نہ ایک وقت میں لکھی گئی نہ کہ ایک زبان میں ہے اور نہ ایک مقام پر لکھی گئی بلکہ مختلف اوقات میں مختلف اشخاص نے مختلف زبانوں میں لکھی۔ مگر سب کو پیغمبر زرتشت کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔

اس میں ان کے اشکار و اقوال ہیں جو دین زرتشتی کے بزرگان اولین تھے "اوستا" کو گاتہا بھی کہا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عہد ہخامنشیان ایران میں 'اوستا' کے دو نسخے تھے۔ سکندر اعظم رومی نے جب ایران کو فتح کیا۔ تو ایک نسخہ وہ ... اپنے ساتھ مقدونیہ لے گیا۔ اس میں سے طب۔ نجوم۔ فلسفہ و جغرافیہ وغیرہ یونانی میں نقل کر لیا۔ باقی اجزا غارت ہو گئے۔ اور کسی کو یاد بھی نہیں رہے۔

ساسانی حکمرانوں کے زمانہ میں 'اوستا' کو پھر سے جمع کیا گیا۔ کل ۳۴۸ باب جو کہیں کہیں سے دستیاب ہوئے یا لوگوں کو یاد تھے ... موجودہ 'اوستا' وہ نہیں ہے جو اصل قدیم تھی۔

محقق فرانس تتر کا عقیدہ ہے کہ 'اوستا' کی زبان جو مغربی ایران میں رائج تھی اس میں لکھی گئی اور یہی باختریانی مورخ ایران نے بھی لکھا ہے کہ 'اوستا' کی زبان سنسکرت سے ملتی جلتی ہے۔ گاتہا کی زبان رگ وید سے بہت مشابہ ہے۔ یہی خیال علامہ مسعودی مورخ عرب کا ہے۔

زمانہ خلافت عبدالملک بن مروان (بنی امیہ) ایران میں عربی کا بہت زور تھا۔ "اوستا" جو زبان پہلوی میں لکھی ہوئی تھی زبان کنونی جو ایران میں اس وقت رائج تھی لکھی گئی۔ زبان کنونی دراصل فارسی زبان ہے جو رسم الخط پہلوی میں لکھی جاتی تھی مگر عربی کے میل جول نے رسم الخط بدل دیا۔

پہلوی پہلو سے منسوب ہے۔ پہلو کے معنے شہر کے ہیں لہذا پہلوی اصل میں شہری زبان تھی۔ پہلوان بھی پہلو سے نکلا ہے۔ فارسی میں پہلو کے معنی توانا۔ دلیر۔ شجاع کے ہیں:۔

ز "پہلو" برون رفت کاؤس شاہ
بہ ہر سو ہمی گشت گرد سیاہ
یکے لشکر آمد ز "پہلو" بہ دشت
کہ از گرد ایشاں ہوا تیرہ گشت
ہمی بود تا یک زمان شہریار
ز "پہلو" برون رفت بہر شکار
(فردوسی)

سید عابد حسین جعفری اکبر آبادی

افکارِ تازہ

اِس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے
میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی!

اب برق نشیمن کو ہر شاخ سے کیا مطلب
جس شاخ کو تاکا تھا۔ وہ شاخ جلا ڈالی

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

دلگداز

دل مجروح چشمِ خونفشاں اسبابِ ویرانی
عطا کی کوئی حد بھی ہے مجھے وہ اور کیا دیتے

برداشت کر رہا ہے صدمات دو جہاں کے
کیا کام لے لیا ہے فطرت نے آدمی سے

عالمگیر

اِک پردۂ غفلت سے روپوش ہوں میں ورنہ
ہر ذرہ دو عالم کا بستا ہے مرے دل میں!

سب رس

مجھے اسیرِ قفس کیوں کہے ابھی کوئی
ابھی تو میرا نشیمن مرے خیال میں ہے

شاعر

دردہی اب ہے زندگی دل کی
زحمتِ چارہ گر کو کیا کہیئے

سامنے اشک ریز ہے شبنم
مسکراتی کلی کو کیا کہیئے

خیام

انجام

لمحاتِ حیات کی کمی و زیادتی کیا ہے؟

عمرے در رفتن او آوازِ پا نہ دارد۔

آرزوؤں اور ارمانوں کی خوش آیند اور پُرمسرت حیاتِ مستقبل کی اُمیدوں میں۔

اُمیدوں کے مقصد کو پہنچ جانے اور اس کی بے پایاں مسرت میں خوشی، رنج، شادی، غم، مصیبت، راحت، سکون و اضطراب ہیں ——

معاشی کشمکش میں ——

حیات انسانی کی کاغذی ناؤ آس و یاس کے تھپیڑوں کے سہارے اُمید اور مستقبل کے بے پایاں سمندر میں بہتی چلی جاتی ہے —— لیکن یہ خبر نہیں ہوتی کہ کتنی مسافت طے ہوئی —— ؟ منزلِ مقصود کہاں ہے اور کیا ہے —— ؟ کتنی مسافت اور باقی ہے —— راستہ طوفانی اور پُرآشوب ہے یا پُرامن —— ؟ کشتیِ حیات انسانی بہتی چلی جا رہی ہے —— اور بس —— شوقِ راحت منزل کی امید میں مسافر اپنی طے کردہ مسافت کو مڑ کر دیکھتا بھی نہیں —— اور اگر دیکھتا بھی ہے تو ایک نظر غلط انداز سے —— لاپرواہی سے —— اُس کو کیا دکھائی دیتا ہے —— ؟ —— ماضی کے کہر کے دھندلکے کے اُس پار ایک "یادِ ایام" کی دھندلی سی تصویر —— ؟ جس کو وہ دیکھتا ہے - کبھی ہنستا ہے اور کبھی روتا ہے —— اور پھر —— اس کے بعد وہ اپنے سفر میں پہلے سے زیادہ انہماک کے ساتھ سرگرم ہو جاتا ہے —— عمر کے اس قدر طویل سال —— جو دونوں ساعتوں —— لمحوں —— سے اپنی طویل مدت کو پوری کرتے جاتے ہیں —— اور جو ختم ہو چکتے ہیں وہ اس طرح گذر جاتے ہیں جس طرح ہوا کا ایک جھونکا جو کسی کے لئے نسیمِ فردوس کا کام دیتا ہے —— اور کسی کے لئے بادِ سموم —— عمر اس طرح کٹ جاتی ہے - جس طرح ستارہ "وہری" آسمانی دنیا پر صرف ایک رات کے لئے نمودار ہوتا ہے اور پھر مدتوں دکھائی نہیں دیتا ——

انسان کی طبیعت مائل بہ کثرت ہے —— وہ اپنے اردگرد عزیزوں —— دوستوں —— غمخواروں اور مددگاروں کا ہجوم دیکھنا چاہتا ہے —— جن کے دل اُس کے لئے ہر لمحہ دعوتِ خلوص دیتے ہوں ——

میں نے اپنی زندگی کا اولین حصہ ایسے ہی مونس اور دوست کی تلاش میں گذارا - میں اپنے دوستوں کو اسی نگاہ سے دیکھتا - جس نگاہ سے ایک کسان —— اپنے شریکِ حیات —— مونس —— اور وفادار —— جانوروں کو پرکھتا ہے —— یا ایک جوہری جواہرات کو کنکروں سے علیحدہ کرتا ہے —— میں سخت مضطرب تھا —— میرا یہ اضطراب بڑھتا جاتا تھا —— مجھے زندگی بے معنی اور بے لطف دکھائی دے رہی تھی —— میں ایسا محسوس کرنے لگا گویا میں کسی تاریک غار کی طرف بڑھتا جا رہا ہوں —— آخر کار میں نے ایک دوست کو پا لیا —— صادق —— بےغرض —— مخلص —— میں نے اس کے ساتھ راہِ حیات کی اٹھارہ (۱۸) منزلیں طے کیں —— اس مدت میں مَیں نے اس کو اور اس نے مجھ کو اچھی طرح پہچانا —— وہ نیک تھا —— اور شریف - میں یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ انسانی کمال کی تصویر انسانی چہرہ کے آئینہ میں اس سے زیادہ روشن اور واضح تر ہو سکتی ہے —— میں نے اُس کو عزت دی —— اور اپنی قلبی و روحانی بلندیوں میں اُس کی جگہ بلند ترین مقام پر انتخاب کی - جہاں اس سے بیشتر لطیف تخیلات کی بھی رسائی نہ تھی —— دونوں دلوں نے پیمانِ وفا سے اپنے آپ کو اُستوار کیا —— دونوں رُوحیں ایک دوسرے میں جذب ہو کر رہ گئیں —— ہم دونوں اپنی کشتیِ حیات کو کھیتے چلے جا رہے تھے —— یہاں تک کہ حوادثِ زمانہ کی طوفانی موجوں نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا —— میں اپنے وطن قاہرہ جانے پر مجبور ہو گیا —— افسوس و رنج —— روحانی تکلیف اور قلبی صدمہ جس کو کہتے ہیں —— آج مجھے معلوم ہوا —— اپنے دوست سے جدا ہوتے وقت —— اس کے بعد میرے اور اس کے درمیان ایک زمانہ تک خط و کتابت ہوتی رہی - رفتہ رفتہ اس سلسلے کی حرکت میں ایک بے معنی سستی پیدا ہوئی —— اور ایک زمانہ کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا —— نہ جانے کیوں —— ؟

میرا دل شکوک کا گہوارہ بن گیا — دماغ اُس کی اس لاپرواہی اور طرزِ فراموشی کی اُدھیڑ بن سے پُر ہو گیا — نہیں معلوم کہ کس نے اُس کو جادہ وفا سے پھیر دیا —؟

کئی دفعہ میں نے اُس کی طرف جانے اور اُس قدیم دوست کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حوادث زمانہ اور فلک پیر کی کج رفتاریاں بے پناہ تاریک غاروں کی طرح حائل راہ ہوتی رہیں —

ایک دن جبکہ میں — میرا دل — میری روح — اُس کے دیکھنے کے لئے بیتاب ہو گئے اور پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا — تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ — بہرصورت اُس سے ملوں۔

جب میں اُس سرزمین میں پہنچا جس کو دیکھنے کے لئے میں ایک مدت سے بیتاب تھا تو پہلے ہی دن رات کے پہلے حصہ میں اُس . . . . . . کے مکان کی طرف گیا — لیکن میں نے وہاں کیا دیکھا —؟ اس حسرت اور روحانی تکلیف کو اُس دن کے بعد آج تک فراموش نہ کر سکا۔

میری یادداشت میری رہنمائی کرتی ہے کہ جس وقت میں نے اس مکان کو چھوڑا تھا — وہ ایک چھوٹے سے فردوس کے مانند تھا — جس کے ہر ذرہ میں سعادت اور نیکی کی رنگینیاں نظر آتی تھیں۔ اس گھر کے رہنے والوں کے چہرے مسرت اور شادمانی کے مرقعے تھے — لیکن آج میں کیا دیکھ رہا ہوں — کہ جو میرے وہم و گمان کی رسائی سے بعید تر ہے — یہ گھر نہ تھا بلکہ میری نگاہوں کے آگے ایک سنسان اور ویران مقبرہ جس میں ہوا کی سرسراہٹ بھی روح کو وحشت میں ڈال دیتی تھی — نہ اس گھر کی کسی جانب سے کوئی آواز آرہی تھی اور نہ کوئی صورت ہی دکھائی دے رہی تھی — اور نہ اس کے در و دیوار کی درازوں سے چراغ کی روشنی — مجھے یہ گمان ہوا کہ شاید میں بھول گیا ہوں۔ اور یہ گھر کسی دوسرے کا ہے — جو ویران ہو گیا ہے۔ اور یہاں کوئی نہیں رہتا۔ میں انہیں خیالات میں محو تھا کہ یکایک اُس مکان سے کسی چھوٹے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی — پھر کچھ دیر بعد دروازہ کی درازوں سے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی نظر آئی جو دروازے سے قریب تر ہوتی گئی — پھر وہ روشنی دروازے کے قریب آگئی — زنجیر کے کھڑکنے کی آواز آئی — دروازہ کھلا — اور میں نے ایک چھوٹے بچے کا چہرہ اُس چراغ کی روشنی میں چمکتا ہوا دیکھا جو اس کے ہاتھ میں تھا — وہ ایک کثیف اور پھٹی ہوئی چادر میں لپٹا ہوا تھا — وہ کچھ دیر ٹھیرا رہا — مجھے اس کے معصوم چہرے میں اُس کے باپ کی شکل دکھائی دے رہی تھی — میں نے اُس کو اچھی طرح غور سے دیکھا اور پہچانا کہ یہ میرے دوست کا چشم و چراغ ہے — اس کی اُمیدوں کا مرکز ہے — اور گھر کی رونق — میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا باپ کہاں ہے؟"

اُس نے کچھ جواب نہ دیا — مجھے اپنے ہمراہ اندر آنے کا اشارہ کیا اور چراغ لے کر میری رہنمائی کرنے لگا۔ ہم ایک کھلے پراگندہ اور کثیف و غبار آلود مقام میں پہنچ گئے — جو شاید بیٹھنے کا کمرہ تھا — وہاں کثیف اور چیتھڑوں والے پردے لٹک رہے تھے — اگر اُس مکان کے در و دیوار پر کھدے ہوئے نقوش کے نشان باقی نہ ہوتے۔ تو میں کبھی نہ پہچان سکتا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں ہم کسی زمانہ میں نیک بختی اور سعادت کی گھڑیاں گذار چکے ہیں — مکمل ۱۲ سال — یہاں پہنچ کر لڑکے کے اور میرے درمیان کچھ مختصر سی گفتگو ہوتی۔

میں نے اس کو معلوم کرایا کہ میں کون ہوں؟ اس کے بعد اس سوال کو دُہرایا جو میں اس سے پہلے اس سے کر چکا تھا — تمہارا باپ کہاں ہے؟ اس مقام کو جس میں مجھے ایک ایک لمحہ ایک ایک سال کی طرح معلوم ہو رہا تھا — اُس نے مجھے اسی جگہ چھوڑا اور چلا گیا — کچھ دیر بعد واپس آیا اور کہا —

"میری والدہ آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں، جو میرے باپ کے متعلق ہے۔"

یہ سُن کر میرا دل بے اختیار دھڑکنے لگا — میرے دل میں مختلف شکوک پیدا ہوئے — "اُس نے کیوں نہ بتایا کہ اس کا باپ کہاں ہے۔"

"اُس کی ماں اُس کے باپ کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہے؟" — کیا؟

اسی اثنا میں مجھے کسی کے آنے کی آہٹ محسوس ہوئی — میں اس طرف متوجہ ہوا — دیکھا کہ ایک عورت سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی دروازے میں کھڑی —

اُس نے مجھے سلام کیا — میں نے جواب دیا —

اُس نے کہنا شروع کیا —

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے چلے جانے کے بعد زمانہ نے فلاں شخص کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

"نہیں" میں نے کہا "اس لئے کہ اس شہر سے جدا ہوئے کامل سات سال ہوئے۔ اس کے بعد آج پہلا دن ہے کہ میں اس شہر میں

آیا ہوں"۔

اُس نے کہا" کاش تم اُس سے جدا نہ ہوئے ہوتے۔ تم نے اُسے گناہوں سے بچا رکھا تھا۔ اور زمانہ کے مکروفریب کے آہنی پنجوں سے محفوظ — تمہارے جدا ہونے کے بعد اس کو شیطانوں کے ایک گروہ نے گھیر لیا — اور تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ وہ ایک بھولا بھالا — سادہ لوح جوان تھا — وہ ان کے شر سے محفوظ نہ رہ سکا — اُنہوں نے اُس کے لئے وہی چیزیں فراہم کیں جو ایک شیطان انسان کے لئے فراہم کرتا ہے — یہاں تک کہ وہ بے پناہ گناہوں میں گھر گیا — وہ بدبختی کے عقاب کے تیز پنجوں میں ایسا ہی دبا ہوا ہے جیسے ایک نادان کبوتر — تم ہماری اور اُس گھر کی حالت دیکھ رہے ہو — اب تک تو ہم اس نوبت پر پہنچے ہیں"۔

میں نے اُس سے کہا" محترم خاتون! آخر وہ کیسا شر ہے جس میں وہ پھنس گیا — وہ کونسی مصیبت ہے جو اس کو گھیرے ہوئے ہے"؟

اُس نے جواب دیا" میں سب قصہ بیان کرتی ہوں تم سن لو" پھر اُس نے کہا۔

"وہ ہمیشہ سے شریف آدمی رہا — اور سادہ لوح — مکروفریب سے دور — ایک دفعہ وہ ایک رئیس سے ملا۔ اور چند دنوں بعد دونوں کے درمیان بے حد دوستی ہوگئی — یہاں تک کہ وہ رئیس ایک لحظہ بھی اُس کی جدائی کو گوارا نہ کرسکتا تھا — ہر وقت — رات دن وہ اُس کے ساتھ رہتا — اور آجکل تو گویا وہ بالکل ہی بدل گیا ہے — نہ وہ اخلاق رہے اور نہ بیوی بچوں سے محبت — وہ کبھی کبھار یہاں آجایا کرتا ہے — اور گھر میں بھی آتا ہے تو رات کے آخری حصہ میں — میں ابتداً اُس رئیس کے اس نیک برتاؤ اور تعلقات پر رشک کرتی تھی۔ اور اس کی طرف سے میرے دل میں کوئی شک و شبہ نہ تھا۔ اسی لئے میں اُس کے اس وحشیانہ عمل — رنج — اہل اور بیوی بچوں سے لاپرواہی کا کوئی خیال نہ کرتی تھی — لیکن ایک دن میرے یہ خیالات حقیقت کی روشنی میں آگئے — جب وہ رات کو گھر لوٹا — سخت شاکی — المناک — نالاں اور غصہ اور اضطراب کی حالت میں — وہ جسم کے درد کی شکایت کرتا تھا — میں اُس کے قریب پہنچی اور میں سب معاملہ بھانپ گئی جب میں نے اُس کے منہ سے شراب کی بُو سونگھی — وہ بڑا رئیس جو بظاہر سخی اور نیک معلوم ہوتا تھا — ایک مکار فریبی اور میرے شوہر کے حق میں شیطان ثابت ہوا — اس نے اُس کو غلط راستہ پر چلایا اور ایک تنگ و تاریک گڑھے میں دھکیل دیا جس سے شاید ہی اب وہ چھٹکارا پاسکے اُس نے اُس کو اپنا ہم پیالہ و ہم نوالہ بنایا — جب مجھے یہ حقیقت معلوم ہوئی — تو میں اُس کے سامنے بہت روئی۔ اُس کے پیاروں کے واسطے دیئے۔ دہائی دی — اور اس قدر آنسو بہائے جس قدر میں بہا سکتی تھی — کہ وہ اپنی اس ذلت اور نکبت کی زندگی کو چھوڑ دے اور پھر دوبارہ اسی زندگی کو اختیار کرے جس میں وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ آج سے پہلے سعادت اور اطمینان کی سانس لے رہا تھا — لیکن — افسوس کہ اس کا اُس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

وہ شراب کی طرف کھچتا رہا — اور لہو و لعب میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی — اور اس میں کوئی تعجب نہیں۔ اس لئے کہ شر کے راستے سب ایک ہی ہیں وہ سب بدبختی کے اُس غار کو لے جاتے ہیں جس کے کنارے اگر کوئی شخص ایک دفعہ بھی کھڑا ہوجائے تو اُس کا اُس میں گرجانا یقینی ہے اور اس کے بعد اُس سے نکل آنا — ناممکن —

یہ شریف نوجوان جو کل تک اُس دوا کے پینے سے پرہیز کرتا تھا جس میں شراب کی بُو ہوتی۔ اور ایسی مجلس میں نہ بیٹھتا جس میں شرابی اکٹھے ہوتے تھے — آج وہی غیور نوجوان دن رات مسلسل شراب پیتا ہے — جوا کھیلتا ہے — اور بیہودگیوں میں مبتلا ہوگیا ہے — اس کو اس بات سے کوئی عار نہیں کہ کل تک وہ ایک شریف شوہر اور شفیق باپ تھا اور آج وہ اپنے اہل و عیال پر ظلم کرتا ہے — سخت کلامی کرتا ہے — مارتا ہے — جھڑکتا ہے۔ یہ غیور نوجوان اپنی شرافت اور عزت کو چھوڑ کر بخل کمینگی اور بدبختی کی طرف آگیا۔ وہ بعض راتوں کو اپنے مکان پر کمینوں کے مجمع کے ساتھ آتا — اور اُس کمرے میں جس میں کہ اُس کی بیوی اور بچے سوئے ہوتے — وہ سب گھس پڑتے — اور بیٹھ کر شراب پینا شروع کردیتے — مسلسل پیتے — یہاں تک کہ شراب اُن کی عقلوں کو پی جاتی اس کے بعد وہ شور مچاتے اور ناچنا شروع کرتے — اور شور و غوغا سے آسمان سر پر اُٹھا لیتے — ایک رات اُن میں سے بعض ایک دوسرے کے پیچھے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے اور برآمدے کی طرف سے میرے حجرے میں آگئے — وہ میری طرف گھور کر دیکھنے لگے۔ اُنہوں نے میرا دوپٹہ کھینچنے کی کوشش کی — میرا شوہر دیکھتا تھا — سنتا تھا — اور اُنہیں کچھ نہ کہتا تھا — اور نہ یہ طرز عمل اس کو بُرا معلوم ہوا — میں نے اپنے آپ کو اُن کے ہاتھوں سے چھڑایا اور بھاگ نکلی اور اس حالت میں کہ میرے

جسم پر لباس پورا نہ تھا ایک ہمسایہ عورت کے گھر پہنچی اور رات کا باقی حصہ وہاں بسر کیا۔" اُس کی آواز میں فرق پیدا ہوا۔ اُس کا لہجہ متغیر ہو گیا۔ اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ میں بھی دل ہی دل میں روتا رہا۔ کچھ دیر بعد اُس نے سر اُٹھایا اور پھر کہنا شروع کیا۔

"اسی طرح چند سال بیت گئے۔ یہاں تک کہ اس کے پاس جو کچھ مال و اسباب تھا سب خرچ ہو گیا۔ اب اُس کے لئے یہ لازم ہو گیا کہ وہ قرض لے۔ چنانچہ اُس نے قرض لیا۔ اور اس قرض کے آہنی پنجہ نے اُسے دبوچ لیا۔ قرض کا بوجھ بڑھتا گیا۔ اُس نے گھر کی ہر چیز رہن رکھ دی۔ لیکن وہ اس کے چھڑانے سے عاجز ہو گیا۔ جو کچھ گھر کا سامان بچا کھچا تھا وہ سب یا تو رہن ہو گیا یا بک گیا۔ اور آخر کار۔" اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ "یہ مکان بھی کہ جس میں ہم رہتے ہیں ہاتھ سے نکل گیا۔ اب صرف اس کے پاس شہر کی ملازمت کی قلیل تنخواہ کے سوا کچھ نہ رہا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ جب وہ ہر مہینہ اپنی تنخواہ پاتا۔ تو دن کی ایک ساعت تک اُس کو بمشکل اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ اس کے بعد یا تو وہ قرضخواہوں کی ملکیت ہو جاتی یا جوئے بازوں کی نذر۔"

اُس نے کہا۔ "یہ وہ سلوک ہے جو زمانہ کے ہاتھوں نے اُس کے ساتھ کیا اور جو سلوک میری ، لڈادر میر ے ، اتھ ہوا وہ میرا آخری زیور تھا جو میں نے اپنے زیوروں میں سے فروخت اور رہن ہونے سے بچا رکھا مجبوراً اُسے بھی فروخت کرنا پڑا۔ اور اس کے سہارے ہم ایک سال تک زندگی بسر کرتے رہے۔ اس کے بعد پھر اسی افلاس نکبت اور بدبختی کی تاریکی نے ہم کو گھیر لیا۔ میرا ایک قریبی رشتہ دار جو خود بھی مفلس ہے۔ اگر اپنے اور اپنے بچوں کے مُنہ سے چھینے ہُوئے نوالوں اور لقموں سے میری مدد نہ کرتا۔ تو میں اور میرے بچے فاقوں سے مر جاتے"۔ وہ کچھ رُک گئی۔ اس کے بعد اُس نے کہا۔

"میں خیال کرتی ہوں کہ آپ میں اتنی استطاعت ہے کہ اُس شخص کو جو آپ کا قدیم دوست ہے اس بدبختی کے بھنور سے نکالیں اور اس کو سعادت اور نیکی کا راستہ دکھائیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس کام کو جس سے دنیا کے سب لوگ عاجز آ گئے ہیں۔ اپنی نیکی اور سعادت کی روشنی میں بخوبی انجام دے سکیں گے۔ اگر آپ نے ایسا کیا۔ تو اس نعمت کا احسان ہم مرتے دم تک نہ بھولیں گے"۔ وہ بہت کبیدہ خاطر تھی۔ اُس کی آواز بھرا رہی تھی۔ اس نے اپنی گفتگو ختم کی۔ سلام کیا اور چلی گئی

میں نے اس کے لڑکے سے دریافت کیا کہ میں اُس کے باپ سے گھر پر کب مل سکتا ہوں۔؟ اُس نے کہا "صبح دفتر جانے سے پہلے آپ اُن سے مل سکتے ہیں"۔ میں اپنے قیام گاہ پر لوٹ آیا۔ لیکن کس طرح۔؟ کس حالت میں؟ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ دونوں پہلوؤں میں ایک قسم کی سوزش اور تڑپ تھی جو مجھے بار بار اُٹھاتی اور بٹھاتی تھی۔ دماغ پریشاں کن خیالات سے لبریز۔ اسی حالت میں وہ طویل رات جو نہ گذرنے والی تھی۔ گذر گئی۔

صبح کو اُٹھتے ہی میں اُس قدیم دوست کے گھر کی طرف چلا۔ جو کل تک۔ نیک۔ شریف۔ اور غیور و خوددار تھا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کونسی چیز تھی جو مجھے اس اضطراب کے ساتھ اُس کے پاس لے جا رہی تھی۔ میرے دل میں رنج و اضطراب کا طوفان تھا۔ ایسے شخص کی مانند جو اپنا روپیہ پیسہ مال و اسباب سب کچھ گھوڑ دوڑ کی شرط میں لگا چکا ہو اور یہ نہیں جانتا کہ ایک ساعت کے بعد وہ ایک متموّل انسان ہو گا یا ایک مفلس۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ چہرے دلوں کے آئینے ہوتے ہیں۔ جو اُس کی روشنی سے چمکتے ہیں۔ اور اس کی تاریکی سے مکدر ہو جاتے ہیں۔ میں اُس قدیم دوست سے سات سال ہوئے کہ جدا ہو گیا تھا۔ اور رفتار زمانہ نے میری یادداشت سے اس کی صورت بھی تقریباً بھلا دی تھی۔ مگر وہ روشنی جو بزرگی اور شرافت کے چہروں پر چمکا کرتی ہے۔ جس طرح آفتاب دنیا پر۔ اُس نے میری رہنمائی کی۔ جب میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اُس کو پایا۔ تو وہ ایک تاریک روشنی تھی۔ اُن روشنیوں میں سے جن کو میں پہچانتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید میں اُس صورت کو نہیں دیکھ رہا ہُوں جو زمانہ ماضی میں تھی۔ بلکہ اس کی جگہ میں ایسی صورت دیکھ رہا ہُوں جس کو میں نہیں جانتا۔ میں اُس نوجوان کی صورت اور شباب کو یاد کر رہا تھا۔ کہ جس کا چہرہ روشن اور خوبصورت تھا۔ اب میں اُس کی جگہ ایک بدبخت انسان کو دیکھ رہا ہُوں۔ جو اپنے وقت سے پہلے ہی بڑھاپے کو دعوت دے چکا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اور آنکھیں بھاری ہو چکی تھیں۔ پیشانی پر شکن۔ رخسار ڈھلے ہُوئے۔ کندھے اُبھرے ہُوئے اور سر اندر کو دھنسا ہُوا۔

ملاقات ہوتے ہی میں نے کہا "اے دوست تیری تو ہر چیز بدل گئی ہے۔ یہاں تک کہ تیری شکل بھی! مجھے سخت افسوس ہے۔ مجھے تمہارے کرتوتوں کا پتہ چل گیا ہے۔" اُس نے سر جھکا لیا اور

اس طرح خاموش رہا گویا اُس کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ میرے دل میں کیا ہے ——میں اس کے قریب ہوا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

——"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں کیا نصیحت کروں؟ اس لئے کہ کل تک تو تم مجھے نصیحت کیا کرتے تھے اور تم میرے لئے وہ آفتاب تھے جس نے میری زندگی میں تابانی پیدا کر دی —— تم میرے لئے اندھیری رات کے اُس ستارے کے مانند تھے جو بھٹکے ہوئے مسافروں کو راستہ دکھاتا ہے —— اور اب وہ وقت ہے کہ میں تمہیں تمہارے فرائض سے جو تمہارے پیدا کرنے والے نے تم پر اپنے اہل و عیال کی پرورش کے لئے عائد کئے ہیں آگاہ کر رہا ہوں —— اور یہ ایک تعجب خیز بات ہو گی۔ اگر میں یہ کہوں کہ تمہیں ان فرائض کی خبر نہیں ——" وہ خاموش سنتا رہا۔

میں نے کہا "میں تمہیں کس طرح عبرت دلاؤں۔ اور کونسی راہ دکھاؤں جس کو تم خود نہیں دیکھ سکتے۔ اور اُس سعادت کے حاصل کرنے کی رائے دوں جس کے حصول میں تیرے ہاتھ کوتاہ ہیں —— ؟ یا میں تمہارے کمزور بچوں اور مسکین بیوی کے لئے رحم کی التجا کروں۔ جن کا دنیا میں صرف تم ہی قوت بازو ہو —— اے دوست —— اور تیرے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں۔ تو بڑا رحمدل تھا —— تو اپنے دور کے رشتہ داروں اور دوستوں سے نیک سلوک کیا کرتا تھا —— اور یہ تو تیرے زندگی کے ساتھی ہیں —— اے دوست! تو وہ زندگی بسر کر رہا ہے جو کاہلوں اور بیکاروں کا شعار ہے وہ کوئی کام نہیں کرتے اور شرم و حیا کی وجہ سے لوگوں سے چھپتے پھرتے ہیں —— یہاں تک کہ اُن کو موت آجاتی ہے اور وہ اس عار اور بدبختی سے نجات پاتے ہیں —— اور تو تو اُن جیسا نہیں ہے —— اے بھائی! تو وہ رستہ چل رہا ہے۔ جو تجھے عنقریب گور تک پہنچانے والا ہے —— اور مجھے یہ پسند نہیں تو اس طرح خودکشی کرے —— اگر تو نے اپنی گذشتہ زندگی سعادت اور خوش بختی میں نہ گذاری ہوتی تو میں تجھے معذور سمجھتا اور کچھ نہ کہتا —— دیکھ کہ تو مالدار تھا فقیر ہو گیا! تو تندرست اور طاقتور تھا اور اب بیمار اور ضعیف! شریف تھا کمینہ ہو گیا —— اگر تو چاہتا ہے کہ اپنی گذشتہ زندگی کو لوٹائے تو اب بھی وقت باقی ہے —— اس راہ کو چھوڑ اور پھر دیکھ کہ تو کیا سے کیا ہو جائیگا! —— وہ خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا میں نے کہا "دوست! اب کافی ہے یہ بدبختی ہمارے لئے ہمیں اس سے زیادہ اس کی ضرورت نہیں —— اپنا ہاتھ ادھر دو اور عہد کرو! اس لئے کہ جب ہم ملے تھے تو خوش بخت تھے اور جب جدا ہو گئے تو بدبخت ہو گئے پس جبکہ ہم دوبارہ مل چکے ہیں اس لئے پھر وہی سعادت اور شرافت کی زندگی گذارنی چاہیئے" —— میں نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا لیکن اُس نے کوئی جنبش نہ کی —— "تجھ کو کیا ہو گیا ہے کہ تو اپنا ہاتھ بھی میری طرف نہیں بڑھاتا!" —— وہ رونے لگا —— کچھ دیر بعد اُس نے کہا "دوست! میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں جھوٹا بنوں یا قسم کو توڑ دوں"۔

میں نے جواب دیا "آخر وہ کونسی ایسی بات ہے جو تجھے ایفائے عہد سے روکتی ہے؟"

اُس نے کہا "مجھے عہد کرنے سے اُس بات نے روکا کہ میں ایک بدبخت انسان ہوں! اور نیک بختوں کی نیکی سے مجھے کوئی حصہ نہیں ملا"

میں نے کہا "کہ جب تو بدبخت ہونے کی استطاعت رکھتا ہے۔ تو پھر کیوں نیک بخت نہیں بن سکتا"

اُس نے کہا "نیک بختی آسمان ہے اور بدبختی ایک زمین کے مانند ہے۔ اور زمین کی طرف اُترنا بہ نسبت آسمان کی طرف چڑھنے کے زیادہ آسان ہے۔ اب میں دنیا کی بدبختیوں کے گڑھوں میں اُتر چکا اب میرے لئے کوئی راستہ باقی نہیں کہ میں ان تاریک گڑھوں سے نکلوں —— میں دنیا کی تلخیوں کے گھونٹ پی چکا ہوں —— اور اب میرے لئے یہ ضروری ہے کہ اب میں اُس کی تلچھٹ بھی پی جاؤں —— اب میں اس قدر مجبور ہوں کہ کوئی طاقت مجھے اس سے منع نہیں کر سکتی —— !"

میں نے کہا "دوست! تیرے اور خوش بختی کے درمیان ایک پختہ اور راسخ ارادے کے سوا اور کچھ نہیں —— تو ارادہ کرے اور پھر تو تمام بدبختیوں سے نجات پالیگا"

اُس نے کہا "میرے ارادے کی پختگی ارادوں کے آثار میں سے ہے۔ میں اُن لوگوں کی طرح ہو گیا ہوں جو اپنے شغل میں فنا ہو چکے ہوں۔ —— نہ میرا کوئی ارادہ ہے اور نہ اختیار —— اے دوست مجھے میرے حال پر چھوڑ دے —— تیری قسم کہ آج کے بعد میں اپنی بختی کا گلہ بھی نہ کرونگا"

اس نے پھر چیخ چیخ کر رونا شروع کیا —— اور سراسیمگی اور پریشانی کے عالم میں مجھے اپنی جگہ چھوڑ گیا —— میں نہیں جانتا کہ وہ کدھر گیا —— میں اپنی جائے قیام پر لوٹا۔ میرے دونوں پہلوؤں میں اس قدر شدید اضطراب تھا کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے ——

اُس دن کے بعد پھر مجھے معلوم ہوا کہ اُس رئیس نے اُس کو اپنی ملازمت سے اُس کے کام پر ناراضی کا اظہار کر کے نکال دیا ہے —— اور

اُس گھر کے مالک نے بھی . . . اپنے گھر سے نکال دیا۔ جس میں وہ اس کے بیوی بچے رہتے تھے۔ اُس نے ایک چھوٹا سا۔ کثیف اور گندہ مکان جو بہت ہی کم کرایہ کا تھا۔۔۔ لیا۔۔۔ میں صرف اُس کو بازاروں میں ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہوا دیکھتا تھا۔۔۔ دن گذرتے گئے۔۔۔ اور ساتھ ہی اُس کی عقل اور صحت بھی گھٹتی گئی۔۔۔ یہاں تک کہ وہ ایک سایہ کے مانند نظر آنے لگا جو ادھر اُدھر حرکت کرتا ہو۔۔۔ یا ایک موہوم خواب کی طرح۔۔۔ وہ راستہ میں پاگلوں کی طرح پھرتا رہتا۔۔۔ اور اپنے ارد گرد کی چیزوں پر مطلق توجہ نہ کرتا۔۔۔ وہ راستہ میں تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے ٹھیر جاتا اور ادھر اُدھر دیکھتا جیسے وہ کوئی کھوئی ہوئی چیز تلاش کر رہا ہے۔۔۔ اور پھر اپنے کپڑوں پر نگاہ ڈالتا جو تار تار ہو چکے تھے۔۔۔ بعض اوقات بچے اُسے دیوانہ سمجھ کر اُس کو ستاتے۔۔۔ اُس کے کندھے سے چمٹ جاتے۔۔۔ لیکن وہ انہیں جھڑک دیتا اور اپنے سے علیحدہ کر دیتا تھا۔۔۔ اور جب اس کا نشہ اُتر جاتا تو پھر وہ شراب خانہ کی طرف لوٹ جاتا اور شراب پیتا اور پھر مدہوش ہو جاتا تھا۔۔۔ چند ماہ اسی حالت میں گذر گئے۔۔۔ اس کی زندگی کا اب زیادہ حصہ پاگل خانوں میں گذرتا تھا لیکن جب کبھی وہ چوکیداروں کو غافل پاتا تو گھر کو آتا۔۔۔ اپنی بیوی کو مارتا اور اُس سے شراب کے دام حاصل کرتا اور شراب خانہ پہنچ کر شراب پیتا تھا۔۔۔ اس کی بیوی اب بھوک اور فاقوں سے بیتاب ہو گئی۔۔۔ اُس کے بچے بلک بلک کر روتے تھے اور وہ اُنہیں روتا دیکھ کر اور بھی زیادہ مضطرب ہو جاتی تھی۔۔۔ آخر کار اُس نے اپنے بچوں کو نوکری کے لئے بھیجا۔۔۔ اب بچے بھی زیادہ تر اُس سے جدا رہتے۔۔۔ صرف ایک ہمسایہ بوڑھی عورت رہ گئی تھی جو اُس کی مونس تنہائی تھی۔۔۔ وہ اُس بڑھیا سے اپنا رنج و غم کہتی اور دل ہلکا کرتی تھی۔۔۔ وہ اپنے شوہر کے ہاتھوں اس قدر مظالم برداشت کرنے پر بھی اس سے جدا ہونے کا خیال بھی نہ کرتی تھی۔۔۔ وہ جانتی تھی کہ ایک شریف عورت اپنے شوہر سے ہرگز بے وفائی نہیں کر سکتی۔۔۔

زمانہ کی نظروں میں یہ مصیبت جو وہ بھگت رہی تھی۔ کم نظر آئی۔۔۔ اور اب اُس نے ایک نئی مصیبت اُن کے کندھے پر رکھ دی۔۔۔ اُس عورت نے محسوس کیا کہ اس کے پیٹ میں کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔۔۔ وہ جان گئی کہ ایک نئے بدبخت کو وہ اس بدبختی میں جس میں وہ مبتلا تھی لانے والی ہے۔۔۔ وہ کچھ مہینوں تک تکلیف اُٹھاتی رہی۔ یہاں تک کہ اُس کے وضع حمل کا دن آ گیا۔۔۔ اُس کے پاس سوائے اُس بڑھیا کے اور کوئی نہ تھا جو اس کی مدد کرے۔۔۔ چنانچہ وہ سخت بیمار ہو گئی۔۔۔ کوئی طبیب بھی ایسا نہ تھا جو بغیر دام لئے علاج کرے۔۔۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مفلس کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔۔۔ اور جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا اس لئے کہ اُس دن کے بعد میں اُنہیں چھوڑ کر قاہرہ چلا گیا تھا، چنانچہ موت نے اُس کو آ دبوچا۔۔۔ اس کی نوزائیدہ بچی اُس کے پہلو میں رو رہی تھی۔۔۔ اور وہ موت کی ابدی نیند سو رہی تھی۔۔۔ وہ اپنے گھر لوٹا جبکہ اُس کا نشہ اُتر چکا تھا۔۔۔ تاکہ بیوی سے شراب کے دام لے اور اپنی آتش طلب کو بجھائے۔۔۔ چنانچہ وہ آیا۔۔۔ رات کے پہلے حصہ میں۔۔۔ اور اپنی بیوی کو پکارنا شروع کیا۔۔۔ جب وہ بہت چیخا اور پکارا اور جواب نہ پایا تو اُس کو ادھر اُدھر ڈھونڈھنے لگا۔۔۔ اس کی نظر اُس چادر پر پڑی جس کو وہ اوڑھے ہوئے موت کے آغوش میں سو رہی تھی۔۔۔ وہ اُس کے قریب گیا یہ سمجھ کر کہ وہ سو رہی ہے۔۔۔ اُس نے اُس کو ہلایا۔۔۔ پکارا۔۔۔ اُٹھانے کی کوشش کی۔۔۔ لیکن جب کسی قسم کی حرکت محسوس نہ ہوئی تو اُس نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔۔۔ اب اُس کو معلوم ہوا کہ وہ مر گئی ہے۔۔۔ چنانچہ وہ وہاں سے اضطراب۔۔۔ رنج۔۔۔ اور غم کی حالت میں اُٹھا۔ اور پیچھے ہٹا۔۔۔ نوزائیدہ بچی جو اُس کے پہلو میں سو رہی تھی۔۔۔ بے خبری میں اُس کے پاؤں تلے دب گئی۔۔۔ اُس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور اُس کے بعد وہ تڑپ کر ختم ہو گئی۔۔۔ اب وہ بالکل پاگل ہو گیا۔۔۔ اُس نے چیخ ماری۔ "ہائے میری بدبختی"۔ "ہائے میری بدبختی"۔۔۔ اور گھر سے سراسیمگی اور اضطراب کی حالت میں نکل پڑا۔۔۔ وہ اپنے سر کو دیواروں اور درختوں سے ٹکراتا اور "ہائے میری بدبختی"۔۔۔ "ہائے میری بیوی"۔۔۔ "ہائے میری بچی" کہہ کر روتا جاتا تھا۔۔۔ آخر کار وہ کچھ دیر بعد اسی عالم میں ایک تڑپتی ہوئی مچھلی کی طرح جو پانی سے باہر نکال لی گئی ہو زمین پر گر پڑا اور ایڑیاں رگڑنے لگا۔۔۔ وہ بیہوش ہو گیا۔۔۔ اس کے منہ سے کف جاری تھا۔۔۔ اس کے ارد گرد مغموم چہروں کا احاطہ تھا۔۔۔ سب اس کو دیکھتے اور حسرت سے آہ آہ کرتے چلتے تھے۔۔۔ کچھ دیر بعد وہ اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر گیا۔۔۔

(ماخوذ از منفلوطی)

ریاض جنیدی

مختار

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق

اس مضمون کا پہلا نمبر[1] سیاسیات کی الجھنوں میں پڑ کر خطرناک ہو رہا تھا - اِس لئے جیسا بھی بنا اُس کو وہیں ختم کر دیا گیا تھا ، لیکن اتنے دنوں میں غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب سیاسیات وہ پہلے کے سیاسیات نہیں رہے ، اب یہ سننے میں آتا ہے کہ سیاسیات کا اصلی میدان لاکھوں مربع میل کا وہ میدان نہیں ہے ، جس کو اگلے لوگ سلطنت و حکومت کہتے تھے ، بلکہ یہ دو بالشت کا پیٹ ہے اسی کی خاطر سب کچھ ہے ، اگلے زمانہ کے بھولے بھالے بزرگ کہا کرتے تھے - " خوردن برائے زیستن است ، نہ زیستن برائے خوردن ،، یعنی " کھانا جینے کے لئے ہے ، نہ جینا کھانے کے لئے " حضرت مسیح کہتے ہیں کہ " آدمی روٹی ہی سے نہیں جیتا " لیکن آجکل کی سیاسیات نے یہ دونوں مقولے جھٹلا دیئے ، اب یہ ہے کہ " جینا کھانے کے لئے ہے ، نہ کھانا جینے کے لئے ،، اور یہ کہ آدمی روٹی ہی سے جیتا ہے ، چنانچہ آج کل کے بولشوزم ، کمیونزم ، سوشلزم وغیرہ کی بنیاد زمین پر نہیں پیٹ پر ہے -

پیٹ کے لئے کھانوں میں سب سے ضروری کھانا کون سا ہے ، لوگ اپنے اپنے تجربہ اور عادت کے مطابق اس کے کئی جواب دے سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرا خیال ہے ، وہی اکثروں کا ہوگا ، یعنی یہ کہ کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا " ناشتہ " ہے ' صبح سویرے اُٹھ کر منہ میں کچھ پڑ جانے سے سارے دن کے لئے ڈھارس ہو جاتی ہے -

یہ عجیب بات ہے کہ " ناشتہ " کیلئے اکثر زبانوں میں بھوک توڑنے کی اصطلاح بن گئی ہے ، میں دو زبانیں جانتا ہوں ایک پورب کی اور ایک پچھم کی ، یعنی عربی اور انگریزی ، دونوں میں یہی بات ہے اس سے سمجھتا ہوں کہ اور زبانوں میں بھی کچھ ایسا ہی حال ہوگا ، عربی میں اس کو " فطور " کہتے ہیں ، اسی سے مسلمانوں کا افطار نکلا ہے ، اور جس سے افطار کریں اس کو افطاری کہتے ہیں - فطور کے معنی توڑنے کے ہیں ، یعنی روزہ کی بھوک کو توڑنا ، ہمارا ناشتہ بھی اسی قسم کا لفظ ہے ، فارسی میں اس کے معنی اس " بھوکے " کے ہیں ، جس نے صبح سے کچھ نہ کھایا ہو - (مؤید الفضلاء و برہان قاطع) اب دیکھئے کہ یہ نام تو اس آدمی کا تھا جس کے منہ میں صبح سے کچھ نہ پڑا ہو ، اور اب ہم اس چیز کو کہتے ہیں ، جو صبح سویرے کسی آدمی کو کھلا دی جائے - یعنی شخص کے بجائے چیز کا نام ہو گیا -

اسی معنی میں ایک اور لفظ " نہار " آپ بولتے ہیں " نہار منہ " یہ بھی فارسی ہے ، مگر دیکھئے کہ یہ فارسی ہندوستانی سے ایسا مل گیا ہے ، کہ گویا ہندوستانی ہی ہے - اس کی اصلیت " ناآہار " ہے - نا " نفی " کے لئے ہے اور " آہار " کے معنی غذا کے ہیں " ناہار " یعنی نہیں کھایا ہوا (برہان قاطع) اب اس سے ناہاری یعنی " نہاری " تیار ہوئی ، جو صبح کو نہار منہ کھائی جائے ، اور لکھنؤ اور دلی میں یہ خاص چیز ہے ، جو بازاروں میں پکی پکائی بہت چٹپٹی ملتی ہے -

" ناہار " سے " آہار " یاد آیا ، آہار آٹے کی اُس لیئی کو کہتے ہیں ، جو کا غذ اور کپڑے پر اس لئے چڑھائی جاتی ہے - کہ وہ مضبوط ہو جائے ، آپ سُن چکے کہ آہار غذا کو کہتے ہیں ، جو بدن کی تقویت کا باعث ہوتی ہے ، اس سے اس لیئی کو بھی کہنے لگے ، جو کاغذ اور کپڑے کی قوت کو بڑھا دیتی ہے (برہان قاطع)

ناشتہ کے طور پر جلدی جلدی جو کھانا پہلے تیار کر کے مہمان کے سامنے رکھ دیا جائے - عربی میں اس کو " سلفہ " کہتے ہیں - اسی سے " سلف " ، (اگلے لوگ) کا لفظ نکلا ہے ، عربی کا یہ سلفہ ہمارے ملک میں کھانے کے دسترخوان پر تو بار نہ پا سکا ، مگر پینے کی یارانہ محفل میں ایک ہزار برس کے بعد اس کو جگہ مل گئی ، نور الدین

---

[1] ہندوستانی جولائی ۱۹۳۸ء

جہانگیر کے زمانہ میں تمباکو امریکہ سے ہندوستان آیا - اور حکیم گیلانی کی پر حکمت ترکیبوں سے چلم، توا، حقہ اور نے کی شکل پیدا ہوئی - یہ تو امیروں کی باتیں تھیں، اس حقہ کی تیاری کے لئے بڑا وقت، بڑا سامان، اور ایک دو ملازم چاہیئے، اور غریبوں کے پاس نہ اتنا وقت نہ اتنا سامان، نہ ملازم، انہوں نے اپنے ہاتھ سے بھر کر سلفہ جلدی تیار کر لیا، اور دم لگا کر اپنے کام پر روانہ ہو گئے۔

تکلف کے کھانوں کو قابوں میں نکالتے ہیں، عربی میں لفظ "قعب" ہے اس کے معنی لکڑی کے پیالہ کے ہیں، جو لکڑی کو بیچ میں کھود کر بنایا گیا ہے (لسان) لیکن ترکی میں اور اس سے فارسی میں "قاب" کے معنی مطلق ظرف یا خانہ کے ہیں، اسی لئے عینک کے خانہ کو اور قلمدان کو قاب کہتے ہیں - اور پھر اسی سے کھانے کے بڑے برتن کو بھی ہمارے ملک میں قاب کہنے لگے۔

یہی حال "رکابی" کا بھی ہے، "رکاب" فارسی میں ہشت پہل پیالہ کو کہتے ہیں، اس سے "رکابی" بنی، اور اب وہ پھیلے ہوئے چوڑے ظرف کو کہتے ہیں، اور اسی سے ہندوستانی امراء میں رکابدار پیدا ہوئے، جو کھانے کا انتظام کرتے تھے، یا عمدہ عمدہ کھانے تیار کرتے تھے۔

روزمرہ کے کھانوں میں قلیہ قورمہ بہت عام چیزیں ہیں - قلیہ کی شکل عربی ہے، مگر معنی عربی نہیں، قلیہ کی عربی شکل قلیۃ ہو سکتی ہے - عربی میں "قلی" بھوننے کو کہتے ہیں اس سے قلیۃ بن سکتا ہے اور بھونے ہوئے گوشت کو کہہ سکتے ہیں، ہماری زبان میں قلیہ اس شوربہ وار گوشت کو کہتے ہیں جس میں کوئی ترکاری پڑی ہو، بلکہ اسی ترکاری کو قلیہ کہنے لگے ہیں، قورمہ تو ترکی معلوم ہوتا ہے -

شوربا تو صاف عربی کا شربہ ہے، مگر معنی بدل گئے ہیں، عربی میں شربۃ اس کو کہتے ہیں، جتنا ایک دفعہ پی لیا جائے - اس سے ایرانیوں نے شوربا بنا لیا اور گوشت کے پانی کو کہنے لگے - انہوں نے شوربا کو پھر شورباج بنا لیا، مگر ہماری ہندوستانی میں شوربا ہی رہا، بگڑا تو شروا ہو گیا -

اسی عرب "شرب" پینا سے ایرانیوں نے شراب اور شربت تیار کیا، اور ہم ہندوستانیوں نے قبول کر لیا - شراب کے عربی معنی ہیں، جو چیز پی جائے، یہاں تک کہ قرآن میں دودھ کو بھی کہا ہے، مگر ایرانیوں نے جس کو شراب کہا، اس سے متوالی شراب مراد لی - اسی سے یوروپی زبانوں میں "سیرپ" تیار ہوا، جو شکر پڑ کر میٹھا ہو گیا -

لیکن ایرانیوں کے اثر سے ہم نے پانی میں شکر گھول کر جو چیز تیار کی، اس کو شربت کا نام دیا، لفظ عربی ہے، اور معنی عجمی، عربی میں اس کے معنی فقط پینے کے ہیں -

میٹھے کے بعد نمکین چیز یاد آئی، کباب، صورت عربی ہے، معنی عربی نہیں، کبّ عربی میں اوندھے کرنے کو کہتے ہیں - اب جس گوشت کو اوندھا کر کے آگ پر رکھیئے، اس کو کباب کہیئے -

کھانے کے بعد تکلفات کی دوسری قسم فرش فروش ہیں -

قالین سے بڑھ کر خوشنما خوبصورت اور مضبوط فرش شاید ہی کوئی دوسرا ہو، جو زمین کے فرش پر نہیں بیٹھتے، وہ بھی کرسیوں کے نیچے اس کو بچھاتے اور اس سے لطف اُٹھاتے ہیں - مگر یہ کوئی نہیں بتاتا، کہ یہ آیا کہاں سے؟ ہندوستان میں تو اس کو مسلمان لائے، مگر مسلمانوں کو یہ ملا کہاں؟ تاریخ کا یہ بھید خود اسی لفظ کے اندر چھپا ہے -

ایشیائے کوچک میں آرمینیہ کے علاقہ میں ایک شہر کا نام قالیقلا ہے، چوتھی صدی ہجری میں یہ اسلامی حکومت کا آخری شہر تھا، اس کی طرف جب نسبت کی جاتی تھی، تو "قالی" کہتے تھے، عربی زبان کا ایک مشہور ادیب اور لغوی اسی نسبت سے "ابو علی قالی" کہلاتا ہے، یہ فرش قالین اسی شہر کی صنعت اور کاریگری ہے - اسی لئے اس کو "فرش قالی" پہلے نسبت کے ساتھ کہا گیا، پھر استعمال کی کثرت سے اس کا نام ہی قالی پڑ گیا، یاقوت رومی متوفی ۶۲۶ھ اپنے جغرافیہ معجم البلدان میں "قالیقلا" نیچے لکھتا ہے :-

وتعمل بقالیقلا هذا لا البسط	یہ فرش جس کا نام قالی ہے، قالیقلا
المسماة بالقالی اختصروا فی	میں بنایا جاتا ہے، لفظ میں ہلکے پن کیلئے
النسبة الی بعض اسمه لثقله	نسبت میں اختصار مد نظر رکھا ہے
(ج ۷، ص ۱۷ مصر)	(یعنی قالیقلائی کی جگہ صرف قالی کہا ہے)

مؤید الفضلا میں جو فارسی کا قدیم لغت ہے، اس کو "قالی" لکھا ہے ہے، اور ایک شعر نقل کیا ہے، فارسی شعراء نے بھی قالی ہی باندھا ہے اور جس چیز کو ہم غالیچہ کہتے ہیں، عجب نہیں کہ وہ قالیچہ ہو یعنی چھوٹا قالی، اب آخر "کا نون"، جو قالین میں ہے، وہ "ین" ہے، جو نسبت کے معنی وہ فرش بخشتا ہے، جیسے رنگ سے رنگین، قالین کے معنی وہ

رش جو قابلی کی طرح ہو ایک "ی" چونکہ پہلے سے موجود تھی اس لئے دوسری "ی" نہیں لگی، یہ تحقیق میری ایجاد ہے معلوم نہیں صحیح ہے یا غلط۔

تکلفات کی تیسری قسم مکانات ہیں۔ پہلے بڑے بڑے محلوں اور ایوانوں میں اور اب بڑی بڑی کوٹھیوں میں اس حصّہ کو جو نوکروں کے رہنے کے لئے بنائے جاتے ہیں، ہماری زبان میں شاگرد پیشہ کہتے ہیں، بیچارے مولوی نور الحسن صاحب نیّر مرحوم (نور اللغات کے مؤلف) نے ایک دفعہ مجھ سے استفسار فرمایا کہ اس کو شاگرد پیشہ کیوں کہتے ہیں، میں نے ظرافت سے کہا کہ مغل دربار وں میں جب بادشاہ پیری مریدی کرنے لگے، تو نوکر چاکر چیلہ کہلانے لگے جس کی شہادت تاریخوں کے علاوہ دہلی کا کوچۂ چیلان دے رہا ہے، اسی چیلہ کی فارسی شاگرد بنائی گئی، اور شاگرد پیشہ اس گروہِ خدام کا نام پڑا، اور اس سے ان کے رہنے کے حصّہ کو بھی شاگرد پیشہ کہنے لگے۔

کچھ دنوں کے بعد میں اپنی بڑی بچی شمیمہ بانو کو گلستاں پڑھا رہا تھا، اور وہ حکایت آئی جس میں پردہ اور علم کا مناظرہ ہے۔

این حکایت شنو کہ در بغداد		رایت و پردہ را خلاف افتاد

علم شاہی نے جھک کر پردۂ شاہی سے شکایت کی، کہ سفر میں اور لڑائیوں میں تو مارا مارا میں پھرتا ہوں، اور قربِ سلطانی تم کو حاصل ہے، تم نازنین کنیزوں کے ہاتھوں میں رہتے ہو اور

من فتادہ بدستِ شاگرداں

اس سے خیال آیا کہ شاہی ملازمین اور خدم و حشم کے معنوں میں یہ پرانا لفظ ہے، اور اسی سے شاگرد پیشہ ہے، اور ہماری زبان میں محلوں کے اس حصّہ کو کہنے لگے، جو خاص طور سے ان کے لئے بنائے جاتے ہیں۔

ایک ہندوستانی لفظ کی اصلیت پر مجھے بڑا تعجب آیا۔ ایک دفعہ میں عربی کا مشہور لغت تاج العروس دیکھ رہا تھا، کہ لفظ "راز" پر نظر پڑی، اس کے معنی اس میں استاد اور ماہر کے لکھے تھے، دفعتہً میرا دھیان اپنے ہندی لفظ راج اور راجگیر (معمار) کی طرف گیا، لیکن یقین نہیں آتا تھا۔ کہ عربی کا ایسا لفظ جو عربی میں بھی کتابوں اور تحریروں میں برتا نہ گیا ہو، وہ ہماری ہندوستانی میں کیسے آ گیا ہوگا۔ لیکن دل ہی کہتا تھا، کتابیں الٹیں پلٹیں، دیکھیں، مگر سراغ نہ لگا، اس سال کی گرمیوں کی تعطیل میں برادر عزیز پروفیسر نجیب اشرف ندوی سے پٹنہ میں نصاب الصبیان کی طرح کا ایک قلمی رسالہ فارسی عربی ہندی کا ملا جس میں فارسی اور عربی الفاظ کے مقابل ہندی الفاظ جمع کئے گئے ہیں اور شاید کسی ایرانی یا پارسی کی تصنیف ہو، مصنف کا نام اور زمانہ نہیں دیا ہے۔ رسالہ کا نام لسان فارسیات لکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ہندوستان کے کسی نووارد ایرانی کے لئے لکھا گیا ہو، تصنیف کا مقام گجرات ہے، اس میں پیشہ وروں کا باب دیکھ رہا تھا کہ لفظ راجگیر پر نظر پڑی، جس کے معنی اس نے کَرَز یعنی "کرنے والے" کے لکھے تھے، دل نے کہا مارت کا کانٹا آج نکل گیا، اور معلوم ہوا کہ صحیح لفظ راجگر ہے، پھر بھی پوری تشفی نہ ہوئی، خدا بخش خاں کے کتب خانہ میں چلا گیا، فارسی لغت کی کتابیں نکلوا کر دیکھیں مطلب کا پتہ نہ پایا، آخر فرہنگ رشیدی عبد الرشید ٹھٹوی میں یہ عبارت نکلی:۔

رازہ معمار و سرداران گلکاراں ہندی راج گویند لیکن
بدیں معنی عربی است عسجدی گوید

بیکے تیر ہمہ فاش کند ستر حصار		در برو کہ دہ بود تیر گل کار راز

اس عبارت نے پوری تشفی کر دی، واپس آ کر برہان قاطع میں دیکھا، تو یہ لکھا پایا۔

"و بنا رد گل کار را نیز گویند و بعربی طیان خوانند
بعضے گفتہ اند راز در عربی کلانتر و بزرگ بنایان باشند"

یعنی جس معنی میں ہم مستری کا لفظ بولتے ہیں۔

اچھا تو پھر مستری کیا لفظ ہے، خیال جاتا ہے، کہ یہ اصل میں مسطری ہے، مسطر اس آلہ کو کہتے ہیں، جس سے سطر سیدھی کی جاتی ہے۔ پرانے زمانہ میں ایک موٹے کاغذ پر موٹے تاگہ کو سیدھ سے ناپ کر آجکل کے رولدار کاغذ کی طرح سی دیتے تھے اور اس پر لکھنے کے کاغذ کو دبا کر سطروں کو ابھارتے تھے۔ تاکہ لکھنے میں سطریں سیدھی ہوں، یہ تو کاغذ کی بات چیت ہوئی۔ عمارتوں میں دیواروں کی سیدھ قائم کرنے کے لئے جس آلہ سے کام لیا جاتا تھا، وہ بھی مسطر ہوا اور اس مسطر سے جو ماہر فن دیکھ بھال اور ناپ جوکھ کر عمارت کی دیواروں کی سیدھ درست کرتا تھا وہ مسطری کہلایا، اور پھر جب وہ ہندوستانی زبانوں سے ادا ہوا تو مسطری کا مستری ہو گیا اور اب وہ ہماری زبان کا لفظ ہے اور ماہر کاریگر کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

بڑھیوں کی بول چال میں ایک لفظ "خراد" اور "خرادنا" ہے، میز کرسی یا پلنگ وغیرہ کے پایوں کو چھیل کر کہیں موٹا کہیں پتلا، کہیں گاؤدم وغیرہ مختلف شکلیں دیتے ہیں۔ یہ خالص عربی لفظ "خرط" ہے، عربی میں اس کے معنی لکڑی کے اس طرح چھیلنے کے ہیں، کہ اس کی اوپری پرت اتر جائے۔ اس سے خرّاط بنا، یعنی وہ آلہ جس سے لکڑی کو اس طرح چھیلا جائے، وہ خرّاط ہمارے ہاں خراد ہوا، اور اس سے خراد پر چڑھانا محاورہ اور خرادنا مصدر بنا، یہ لفظ اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ لکڑی کی یہ صنعت کاری مسلمانوں کے ذریعہ ہندوستان میں آئی اور پھیلی۔

معماروں کے ایک ضروری آلہ کا نام ہماری زبان میں ساہول ہے، لمبے تاگے میں ایک وزنی لوہے یا دھات کا گول لٹو سا بندھا ہوتا ہے، اس کو نیچے لٹکا کر اونچائی سے دیوار کی سیدھ دیکھتے ہیں، خوارزمی نے مفاتیح العلوم میں ایک آلہ کا نام شاقول لکھا ہے۔ اور اس کی تشریح یہ کی ہے :-

هو ثقل يشد به في طرف حبل يمد لا سفلا يحتاج اليه النجارون والبناؤن (لیڈن صفحہ ۲۵۵)

یعنی وہ ایک بوجھل چیز جو رسی کے کنارے باندھ کر نیچے لٹکائیں اس کی ضرورت بڑھیوں اور معماروں کو ہوتی ہے، اس تشریح سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہندی ساہول کی عربی صورت شاقول ہے، اور عربی میں ثقل کے معنی وزن کے لکھے ہیں۔ مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شاقول ثِق سے نہیں بلکہ ہیئت کی کتابوں میں بھی شاقول ہی دیکھا گیا ہے کیا وہاں بھی تصحیف ہوئی ہے۔

اسی کتاب میں بڑھیوں کے ایک اوزار کا نام "الکونیا" بتایا گیا ہے، اور اس کی تشریح یہ کی ہے کہ

يقدرون بها الزاوية القائمة (صفحہ ۲۵۵)

یعنی اس سے زاویہ قائمہ نکالتے ہیں، کوئی کچھ کہے ہو نہ ہو یہ لفظ کونیا" ہے، جس کو آج بھی ہمارے کاریگر بولتے اور برتتے ہیں۔ اب اس کا تلفظ "گُنیا" ہے یعنی وہ آلہ جس سے کونہ (زاویہ) ناپیں یہ ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ کی دو لکڑیاں ہوتی ہیں، جن کو بخط مستقیم جوڑ کر کونہ (زاویہ قائمہ) نکالتے ہیں، اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے۔ ◺

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ لفظ اتنے پرانے زمانہ میں ہندوستان سے غزنویوں کے زمانہ میں وسطِ ایشیا تک کیسے چلا گیا۔

اس کے بالمقابل ایک دوسرا لفظ ہے، جو وسط ایشیا سے ہندوستان آیا ہے، یہ جہاز کا لفظ ہے، جہاز دیکھنے میں تو عربی ہے مگر جس معنی میں یہ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے، وہ قطعاً ہندوستانی یا ہندوستانی فارسی ہے، اصل میں اس کے لفظی معنی تو "سامان کرنے" کے ہیں، اس سے تجہیز بنا، جس کے جہازیوں میں یہ معنی پیدا ہوئے۔ کہ کشتی میں سامان رکھ کر کہیں بھیجنا، یہ اصطلاح تیسری صدی ہجری میں پھیل چکی تھی، بزرگ بن شہریار کے سفرنامہ میں ہے۔

انہ جهز مركباً له الى الزابج (صفحہ) — اس نے اپنا ایک جہاز سامان لاد کر جاوہ بھیجا۔

یہ تو دریائی اصطلاح ہوئی، لیکن اس کے سو برس بعد یہ لفظ وسط ایشیا میں خشکی کے سامان تجارت کے معنوں میں سننے میں آتا ہے۔ حدود العالم میں جو ۳۷۲ھ کی تصنیف ہے، یہ لفظ ان معنوں میں بار بار آیا ہے۔ شروع شروع میں تو مجھے تعجب ہوا کہ یہ جہاز خشکی میں کیسے چلا، بعد کو سمجھ میں آیا کہ اب یہ لفظ سامان کرنے کے معنی سے قطع مسافت کر کے فقط "سامان" کی منزل میں پہنچا ہے۔

"و جہاز ہائے ہندوستان بدیں شہر کہا افتند و آنجا بردہ ہندو جہاز ہندوستان افتد، صفحہ ۴۲ (ایران)

اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ یہی جہاز بعد کو خشکی سے تری میں آگیا، اور سامان تجارت کے بجائے سامانِ تجارت لے جانے والے جہازوں کو خود جہاز کہنے لگے۔ ہندوستان میں اکبر کے زمانہ میں فرشتہ نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے۔

و بگفتۂ فرنگیاں جہازات متردد ساختند، (جلد ۲ صفحہ ۳۷ نولکشور)

اب ہماری زبان میں یہ لفظ مطلق جہاز کے معنی میں بولا جانے لگا، اور سامانِ تجارت اس سے رخصت ہو گیا۔

اسی سے ہماری زبان میں خوشی اور غم کے دو لفظ نکلے ہیں۔ ایک "جہیز" اور دوسرا "تجہیز" جہیز اس سامان کو کہتے ہیں جو شادی میں باپ کی طرف سے لڑکی کو ملتا ہے، اس معنی میں یہ لفظ بھی خالص ہندوستانی ہے۔ اس کی اصل جہاز ہے" سامان دینا" یا سامان کرنا، فارسی کے قاعدہ سے الف میں اِمالہ ہو کر جہاز سے جہیز ہو گیا ہے، اور اس جہیز پر اب کسی عرب یا ایرانی

کا قبضہ نہیں رہا۔

جہاز مردہ کے کفن دفن کے سامان کو بھی عربی میں کہتے ہیں۔ جس سے مصدر "تجہیز" بنا یعنی سامان کرنا اس سے ہماری زبان میں "تجہیز و تکفین" کا لفظ پیدا ہو گیا۔

ذرا سی مناسبت سے دیکھئے تو کیسے کیسے لفظ بنتا اور معنی بدلتا ہے، ذرا سی "ذرا" پر غور کیجئے کہ کیا یہ عربی کا "ذرّہ" نہیں جس کو آپ "ذرہ بے مقدار" کی صورت میں اچھی طرح پہچانتے ہیں، مگر استعمال کی کثرت سے مختلف ہو کر ذرا بہت ہی تھوڑے کے معنی میں ہو گیا، اور ایسا ہو گیا، کہ اب اس کو ذرّہ سے ذرا بھی تعلق نہیں رہا۔

ہماری زبان میں ایک لفظ مضمون کی "سرخی" یعنی عنوان ہے دیکھئے تو یہ سیاہی سے سرخی کیسے بن گیا، بات یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں قلمی کتابوں میں باب اور عنوان کو امتیاز کے لئے سرخی سے لکھا کرتے تھے۔ اب ہمارے زمانہ میں جب چھاپا ایجاد ہوا، تو خود باب کے یا مضمون کے عنوان کو سرخی کہنے لگے۔ چاہے آپ اس کو سیاہی سے ہی لکھیں، اس لفظ کی یہ توجیہ تو پہلے ہی سے ذہن میں آ رہی تھی۔ مگر اتفاق سے ایک پرانی قلمی کتاب سے سند بھی ہاتھ آ گئی، تو اپنے ذہنی الہام پر تصدیق کی مہر لگ گئی، شیخ نصیر محمود چراغ دہلی کے مرید سید محمد حسنی اپنے مکتوبات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"کیفیتِ دیباچہ کہ لقلم مبارک آن محبوب نشستہ بودند برائے سرخی نبشتنِ آن سپیدی نشستہ عین فرستادہ شدہ است در دیباچہ بنویسند۔ ۔ ۔ ۔ فات لفظ صلوٰۃ سرخی بنویسند، (کتبخانہ حکیم عبدالعزیز مشرقی جالندھر شہر)"

کاغذات کی مسل (م، س، ل) ایک عام دفتری اصطلاح ہے اس کی اصل عربی لفظ "مثال" ہے، سرکاری شاہی کاغذات کی اصل تو دفتر میں رہتی تھی۔ اور اس کی بعینہٖ نقل (مثال) لوگوں کے پاس بھیجی جاتی تھی، اس سے مثال کے دوسرے معنی فارسی میں شاہی فرمان کے پیدا ہوئے، اور اس کی جمع "امثلہ" اور "مُثل" ہیں، مثال اور مُثل نے مسل کی ہندی شکل اختیار کی۔ مثال اور امثلہ کا استعمال غالباً سلجوقیوں کے زمانہ سے رواج پایا، تاریخوں میں کثرت سے یہ لفظ آتا ہے۔

نستعلیق، ایک خاص فارسی خط کا نام ہے، یہ اصل میں "نسخ" و "نستعلیق" کی ہندی ترکیب ہے۔ ہندی ترکیب کا خاصہ ہے کہ جب دو لفظ ملا کر ایک بنائے جاتے ہیں، تو بیچ کے ایک دو حرف لفظ کو ہلکا کرنے کے لئے گرا دیتے ہیں، اس طرح نسخ و تعلیق مل کر نستعلیق بنا، عربی میں نسخ لکھنے اور نقل کرنے کو کہتے ہیں۔ اس مناسبت سے اہلِ عجم نے عربی خط کا نام نسخ رکھا تعلیق اور تعلیقہ کے نام سے اس نے فارسی شکل اختیار کی، اور ان دونوں سے ملکر نستعلیق خط بابر کے زمانہ میں بنا، یہ وہی خط ہے جس میں آج کل اردو لکھی جاتی ہے، یہ خط دوسرے شکستہ وغیرہ خطوں کے مقابلہ میں بہت بنا کر نہایت تکلف سے ٹھیر ٹھیر کر لکھا جاتا ہے، اس سے نستعلیق بول چال کی شکلیں پیدا ہوئیں، چراغ ہدایت میں ہے:-

"نستعلیق گوئی حرفہا را ساختہ گفتن، و عبادت را بتکلف اوا ساختن اشرف گوید۔"

ز نستعلیق گویا قوت لب، ریحانِ خط دائم،

اس سے ہماری زبان میں یہ وسعت پیدا ہوئی، کہ نستعلیق لباس، نستعلیق چال اور نستعلیق بول چال کہنے لگے۔

بعض لفظوں کی ظاہری شکل و صورت کیسا دھوکا دیتی ہے۔ کتنے ہندوستانی ایسے گورے چٹے ہوتے ہیں، کہ ولائتی معلوم ہوتے ہیں، اور بعض سانولے رنگ کے ایرانی بھی دیکھے ہیں، ہماری زبان کا ایک بہت ہی خوبصورت لفظ "چلبلا" ہے، جو غزل گو شاعروں کے ہاں خوب خوب کام آتا ہے، اس کی شکل تو ہندی ہے مگر ہے ایرانی، برہان قاطع میں ہے:-

"چلبلہ بضم اول و بائے ابجد بر وزن سنبلہ شتاب و اضطراب را گویند۔"

ہم سمجھتے تھے کہ اس کا تعلق ہمارے ہندی لفظ "چہل بل" سے ہے، اب غور کرنا پڑے گا۔

لفظ بھی کیا کیا صورت بدلتے ہیں۔ موٹے کپڑے کو ہم "گفش" کہتے ہیں، مگر یہ آیا کہاں سے، فارسی میں اس کی صورت "گبز" ہے۔ "بفتح اول و سکون ثانی و زائے نقطہ دار، ہر چیز گندہ و فربہ و سطبر را گویند" (برہان قاطع) اس کی دوسری شکل "غفص" کی ہے، صورت تو عربی ہے، مگر عربی نہیں۔

"احدی" کے معنی ہماری زبان میں سست اور کاہل کے ہیں۔

مگر اِن سست کاہلوں کی پیداوار تاریخی ہے - احدی ہے، اَحد کے معنی عربی میں ایک ہیں، وہ سپاہی جو فوج سے الگ اکیلا ڈیوڑھی کی خدمت پہ مامور رہتا تھا، اکبر نے اس کو احدی (اکیلا) کا لقب بخشا، یہ احدی کہلاتے تھے اور ڈیوڑھی پر پڑے رہتے تھے، کوئی کام کاج ان سے متعلق نہ تھا، اس لئے زبانِ خلق نے اس کو سست و کاہل کے معنوں میں کہہ کر پکارا، زبانِ خلق کو کون روک سکتا ہے -

ہماری زبان میں ایک لفظ "قلعی" ہے - آیئے اس کی بھی قلعی کھولیں - ہم لکھتے گو "قلعی" ہیں مگر بولتے "قلئی" ہیں ہماری زبان میں اس کے معنی سپیدی اور صفائی کے ہیں، برتنوں پر قلعی لی جاتی ہے اور مکانوں پر قلعی پھیری جاتی ہے -

یہ لفظ گو پرانی عربی کا نہیں، مگر پھر بھی عربی لغتوں میں ملتا ہے "قلعی" عربی میں (لسان) اور اس سے فارسی میں (مؤید الفضلاء) رانگے کو کہتے ہیں، مگر رانگے کو قلعی کیوں کہتے ہیں - لسان العرب کا بیان ہے کہ قلع ایک کان کا نام ہے جس سے رانگے کی بہترین قسم نکلتی تھی اس لئے اس کی طرف نسبت کر کے اچھے رانگے کو قلعی کہتے ہیں - اور چونکہ اسی رانگے سے تانبے کے برتنوں پر سپیدی کی جاتی ہے اس لئے اس کو قلعی کرنا کہنے لگے، پھر چونے سے بھی اگر مکانوں پر سپیدی کی جائے تو اس کو بھی قلعی کرنا کہدیا، ہماری زبان میں ان استعمالوں سے یہ معنی پیدا ہوئے، کہ کسی داغ دھبے یا کسی کے عیب کو اگر چھپایا جائے، تو وہ اس پر قلعی کرنا ہوا، اور اگر اس داغ دھبے اور عیب کو ظاہر کر کے سب کو دکھایا جاتا ہے - تو وہ قلعی کھولنا ہوا -

تماشا بھی عجیب تماشے کا لفظ ہے، لفظ تو عربی ہے، لیکن معنی عجمی ہیں - یہ "مشی" سے بنا ہے جس کے معنی چلنے کے ہیں - اس کو باب تفاعل میں لے گئے، تو تماشی ہوا، اور معنی باہم مل کر چلنا ہوئے عجمیوں نے تماشی کو اپنے قاعدہ سے تماشا بنالیا، جیسے تمنی کو تمنا بنادیا، چونکہ سیر و تفریح کے لئے چند احباب ساتھ مل کر چلتے ہیں، اس لئے خود سیر و تفریح کو تماشا کہنے لگے، اس کے بعد آگے بڑھے تو سیر و تفریح کے سامان کا بھی تماشا نام رکھا -

بجرمِ عشق تو مارا کشند غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست

(معارف) سید سلیمان ندوی

ناکام تمنّا

اُٹھ، کہ تیری منتظر ہے منزلِ مقصود، اُٹھ
دیکھ سوئے بامِ رفعت، جانبِ پستی نہ دیکھ!

آفتابِ عشق کی ہر اک کرن مہ در کنار
اے مہِ کامل مری سُونی سہی تُو پستی نہ دیکھ!

کود جا، بے خوف، شعلہ زار میں مثلِ خلیل
گر بقائے دائمی کی خواہش ہے تو پھر ہستی نہ دیکھ!

ناخدا بے دست و پا، محتاجِ توفیقِ خدا
چھوڑ دے طوفاں میں کشتی ساحلِ ہستی نہ دیکھ!

چھوٹنے پائے نہ ہنگام بلا دامانِ صبر
ناامیدی سے یہ بہتر ہے سوئے پستی نہ دیکھ!

مقبول رشیدی

مقامِ شاعر

ایک دن خدا نے عرش کی بلندی سے آواز دی۔

اے میرے بندو! دیکھو!! میں نے تمہارے لئے دنیا میں کیا کیا کچھ پیدا کیا۔ تمہارے رہنے سہنے کی خاطر زمین بنائی۔ اس کو دریاؤں۔ پہاڑوں جنگلوں ۔ ۔ ۔ ۔ وادیوں اور گلزاروں سے سجایا اور قیامت کے دن تک تمہیں اس آب و خاک کا وارث کیا۔ اُٹھو اور ان نعمتوں کو آپس میں بھائیوں بھائیوں کی طرح بانٹ لو۔

یہ سنتے ہی تمام پیر و جوان جو ہاتھ پاؤں رکھتے تھے دوڑے اور ہر ایک نے اپنی اپنی پسند اور اپنے اپنے مذاق کے مطابق زمین کا حصہ منتخب کر لیا۔ دہقان نے کشت زار کے ٹکڑے پر ہاتھ مارا اور آگے کا رُخ کیا۔ امیر زادے نے جنگل کو شکار کے لئے مناسب خیال کیا۔ اور اسے اپنے لئے چُن لیا۔ سوداگروں نے سونے چاندی کے انباروں پر نظر جمائی۔ اور بقدرِ ظرف جس قدر دولت سمیٹ سکتے تھے سمیٹ لی۔

زاہد گوشہ نشین نے شرابِ مقدس کے مٹکے کندھوں پر اُٹھائے اور مستی کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔

بادشاہ نے سڑکوں اور پلوں کو قبضے میں کیا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

اے لوگو! ٹھہرو!! میں تمہارا حاکم ہُوں۔ تمہاری ہر چیز کا مالک ہوں تم نے جو کچھ لیا ہے وہ میرا ہے۔ سب میرے سپرد کرو۔ ورنہ مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں طرح طرح کے ٹیکس اور محصول لگا کر تمہاری ہر چیز زبردستی چھین لُوں!!!

جب زمین کے اس طرح حصے بخرے ہو گئے اور ہر چیز کسی نہ کسی کے پاس پہنچ گئی۔ تو شاعرِ شیریں سخن دامن جھاڑتا ہُوا اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس کے حصے میں کچھ نہ آیا تھا۔ وہ ہر شئے سے محروم تھا۔ اس کے پلے کوئی چیز نہ پڑی تھی۔ زر اور زمین سب دوسروں کے ہاتھ میں جا چکے تھے۔ اس کے لئے اب کوئی چیز باقی نہ تھی۔ اس نے حسرت سے آسمان کی طرف مُنہ اُٹھایا۔ اور نہایت درد بھرے لہجے میں فریاد کی کہ:۔

اے میرے خدا! میں تیرا فرماں بردار بندہ ہوں۔ کیا تو مجھے اسی طرح تنہا اور بے خانماں ہی رکھے گا؟

بے زر و بے پر و بے بال و پریشاں ہوں میں
بے گل و بے ثمر و بے سر و ساماں ہوں میں

یہ کہہ کر وہ عرش کے پایہ پر گر پڑا۔ اور زار زار رونے لگا۔

غیب سے ندا آئی کہ:۔

اے شاعر! تو تخیلات کی دنیا میں گم رہتا ہے تو بحرِ جذبات میں غوطے لگاتا ہے تو اپنی دھن میں بلند و پست عالم کی سیر کرتا ہے۔ لیکن سمجھتا ہے کہ ع

تیرے جنوں کو تنگ ہے پہنائے کائنات

تو خاک نشیں ہو کر ساکنانِ فلک کی ہمنوائی کرتا ہے۔ تو فلسفہ حیات کی گتھیاں سلجھاتا ہے۔ تو حسن و عشق کے رموز آشکار کرتا ہے۔ تو حدیث دل کی تفسیر لکھتا ہے۔ تو محبت کی لذیذ حکایتوں کو مزے لے لے کر سناتا ہے۔ پھر بھی کہتا ہے کہ ع

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

تو وصال و ہجر کی رنگینیوں میں مست رہتا ہے۔ تو سارے جہان کا درد اپنے جگر میں لئے لئے پھرتا ہے۔ تو زمانے بھر کو خودی اور خودداری کا درس دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تُو جو بات کرتا ہے انوکھی اور نرالی کرتا ہے۔ تو دن کو رات اور رات کو دن بنا دیتا ہے۔ تو آسمان کے تارے توڑ کر لاتا ہے اور اپنی باتوں میں فرشتوں کو لگا لیتا ہے۔ تیرا مجھ سے شکوہ فضول ہے۔ جب زمین بٹ رہی تھی۔ دولت لٹ رہی تھی۔ دنیا کی نعمتیں تقسیم ہو رہی تھیں۔ تو اس وقت کہاں تھا؟ اگر تو کوشش کرتا اور ہمت سے کام لیتا۔ تو اس حالت کو کیوں پہنچتا؟ اس طرح مفلس اور تہی دامن کیوں رہتا؟ یہ تیری اپنی غفلت ہے!!

شاعر نے کہا:۔

"اے خدا میں تو تیرے حضور میں حاضر تھا۔ تیرے سامنے کھڑا تھا۔ میری آنکھیں تیری طرف لگی ہوئی تھیں۔ میرا سینہ تیرے نور سے

معمور تھا۔ میرے کان تیرے فردوسی نغموں کے سننے میں محو تھے۔ ع

ہر نغمہ تیرا حُسنِ تمنّائے گوش تھا

تیرے وصل کی شراب مجھے بے خود و سرمست کئے ہُوئے تھی۔ تیرے جلووں نے مجھے گھیر لیا تھا۔ مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا تھا۔ اسی وجہ سے زمین کی نعمتیں میرے ہاتھ سے نکل گئیں اور میں ان سے محروم رہ گیا۔ اب میری التجا سُن۔ میرا عذر قبول کر۔ میرے آنسوؤں کی لاج رکھ۔ میرے گناہوں کو بخش اور میرا حصہ مجھے عطا فرما۔

خدا نے جواب دیا:۔

اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ زمین دوسرے لے جاچکے۔ چمن، جنگل شکارگاہ اور بازار اوروں کے تصرف میں ہیں۔ میں ان کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دینا چاہتا۔ تجھے اقلیمِ سخن کی تاجداری پر قناعت کرنا پڑے گی۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ تو آ اور میرے ساتھ زندگی بسر کر۔ میرا دروازہ تیرے لئے ہر وقت کھُلا رہے گا۔ تو جب چاہے اور جتنے عرصے کے لئے چاہے آسکتا ہے۔ تیرے لئے کوئی روک ٹوک نہ ہوگی ؎

وگر از غمِ دنیا دل تو گشت ملول
نزدِ من آ کہ ترا یارِ وفادار منم

محمد عبداللہ قریشی

شاعر

ہر حسیں ذرّے میں ہے روحِ بہارِ کائنات
کھلتے رہتے ہیں مری بینش پہ اسرارِ حیات

میرے اشکوں سے تر و تازہ ہے ہر شاخِ چمن
میرے سینے میں ہے دریائے محبت موجزن

گاہ ناکامی میں سرسبز زندگی پاتا ہوں میں
گاہ امیدوں کے دھارے پہ بہا جاتا ہوں میں

گاہ میرے گام سے پیوست ہے عرشِ بریں
گاہ میری زد میں دنیا کا کوئی ذرہ نہیں

حُسن کے ہر جاں فزا جلوے پہ سر دھنتا ہوں میں
دھڑکنیں دل کی قریب و دُور سے سنتا ہوں میں

رقص کرتی ہیں گھٹائیں عرش پہ میرے لئے
کھول دیتی ہیں دریچے کیف کے میرے لئے

آتشِ جذبات میں تحلیل ہو جاتا ہوں میں
بربطِ تخیل کے نغموں میں کھو جاتا ہوں میں

صبح لاتی ہے پیامِ زندگی میرے لئے
شام لاتی ہے جنوں کی دلبری میرے لئے

میری ہاؤ ہُو سے ہے بزمِ جہاں نغمہ فروش
میرے سازِ دل کے آگے عقل کا بربط خموش

میں فقط عیش و طرب کے جام پی سکتا نہیں!
غم کی کیفیت سے خالی ہو کے جی سکتا نہیں!

حیرتِ نطق و تکلم ہے یہ خاموشی مری!
امتزاجِ شعلہ و شبنم ہے میری زندگی

گو نگاہِ اہلِ دنیا میں ہوں نقشِ ناتمام!
بخش دیتا ہوں مگر ہر چیز کو روحِ دوام

میرے دل میں شعلہ زن ہے اک مسلسل زیر و بم
یعنی لا محدود خوشیاں، اور لا تعداد غم

نامۂ ایثار و خلوص و عشق کی لکھتا ہوں بس!
زندگی کی داستاں میں حُسن بھر دیتا ہوں میں

چشمِ کم بیں کیلئے گو بے سر و ساماں ہوں میں
زندگی کے لفظ کا اک معنیٔ رخشاں ہوں میں

اثر چکوالی بی۔اے

نقوشِ جمیل

تری تلاش میں کہاں نہ جانے کھو گیا ہوں میں
کہ اک زمانہ ہو گیا ہے خود کو ڈھونڈتا ہوں میں

کمالِ عشق ہے مرا جو حُسن بن گیا ہوں میں
کہ اب تو پھروں آئینہ میں خود کو دیکھتا ہوں میں

نہ مجھ سے تو نگاہ پھیر غور کر کہ کیا ہوں میں
ترا ہی اک کرشمہ ہوں تری ہی اک ادا ہوں میں

تڑپ رہی ہے فطرت حسیں بھی جسکے شوق میں
جہانِ حُسن و عشق کا وہ طرفہ ماجرا ہوں میں

مقام اپنا کیا بتاؤں کائنات درد میں
مدارِ عشق کا بھی حسن کا بھی آسرا ہوں میں

مرے حصول میں ہیں صرف دو جہاں کی کوششیں
ہے کون تاجدارِ حسن جس کا مدعا ہوں میں

تُو یاد کر کہ بھول جا یہ تجھ کو اختیار ہے
مگر نہ بھولنا اسے کہ سخت بے وفا ہوں میں

یہ آہ میں نے کیا کیا یہ بھول مجھ سے کیا ہوئی
وگرنہ کون جانتا کہ تیرا آئینہ ہوں میں

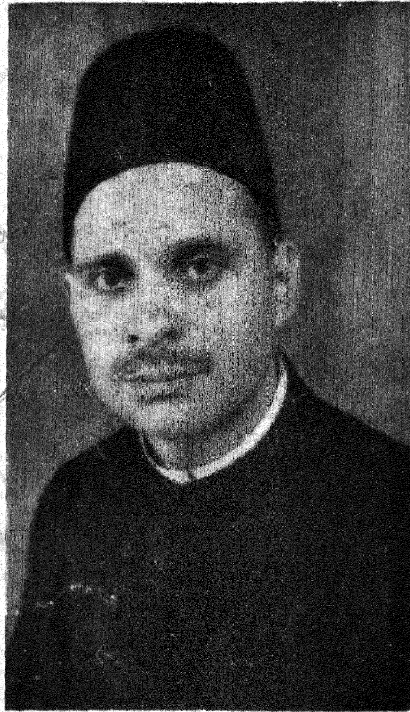
جو کہتے ہیں کہ حسن دوست حسنِ چشمِ شوق ہے
وہ آئیں تاب ہے اگر حجاب اُٹھا رہا ہوں میں

جو آسکے کوئی تو آئے اور منا سکے منائے
کہ آج ابد کو رُوٹھ کر کسی سے جا رہا ہوں میں

اُبل رہا ہے چشمۂ حیات چشمِ موت سے
وہ ارغنونِ عشق پر غزل سنا رہا ہوں میں

نہ پوچھ سوزِ ہجر سے ہیں کیا سخن میں گرمیاں
کہ حافظ آگ کائنات میں لگا رہا ہوں میں!

پروفیسر حافظ محمد کریم



فخر الحکما حکیم خورشید علی خاں رام پوری
چوک لوہاری منڈی لاہور



مراکش کا ایک مکتب

صفحہ اطفال

"ہمارا مذہب"

ہر انسان کا فرض ہے۔ کہ مخلوق خدا کی خدمت کرے۔ یہ اس کی خوشی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ نیک انسان وہ ہے۔ جو اپنی خوبیوں کا اثر ادنےٰ اور اعلےٰ سب پر ڈالے۔ جیسے کہ چاند اپنی روشنی جھونپڑوں پر بھی ڈالتا ہے اور محلوں پر بھی۔ اسی لئے ہر ایک کو چاند بھلا معلوم ہوتا ہے۔ انسانی فرائض یہ ہیں کہ وہ نیکیاں کرے۔ دشمن کے ساتھ بھی بُرا سلوک نہ کیا جائے۔ کیونکہ درخت اس کو بھی اپنے سائے سے محروم نہیں رکھتا جو اس کو کاٹتا ہے۔

مہمان نوازی، بیماروں کی خبرگیری، بھوکوں کو کھانا کھلانا پیاسے کی پیاس بجھانا، دوستوں کے دل کو کسی قسم کا صدمہ نہ پہنچنے دینا، دشمنوں کے ساتھ نیکیاں کرنا، اوروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف اوروں کے آرام کو اپنا آرام سمجھنا، اپنے اخلاق سے دشمنوں کو بھی دوست بنا لینا یہ سب باتیں ہمیں ہمارا مذہب سکھاتا ہے۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ مہمان نوازی صرف امیر کر سکتے ہیں۔ بلکہ امیروں کی نسبت غربا بہت زیادہ مہمان نواز ہوتے ہیں۔ تو آج ایک غریب اور نادار مہمان نواز کا قصہ سُن لو۔

سولھویں صدی عیسوی میں روس کے ملک پر ایک بادشاہ حکمران تھا۔ وہ بہت رعایا کا خیال رکھتا تھا۔ اکثر اوقات راتوں کو بھیس بدل کر اپنی رعایا کے حالات معلوم کرتا رہتا تھا۔ ایک دن ماسکو کے قریب گشت کرتے کرتے ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا نکلا۔ اور وہاں کے باشندوں سے رات بسر کرنے کی اجازت چاہی۔ لیکن کسی نے اُس کی مدد نہ کی۔ آخر بادشاہ ایک جھونپڑے کے قریب آیا۔ جہاں ایک نہایت غریب کسان بسر اوقات کرتا تھا۔ بادشاہ نے اُس سے کہا میں بہت تھکا ماندہ ہوں۔ اور رات ہوگئی ہے۔ اس لئے اگر ایک رات بسر کرنے کے لئے جگہ دو۔ تو بڑی مہربانی ہوگی۔ کسان مہمان کا ہاتھ پکڑ کر گھر لے گیا۔ اور جو کچھ رُوکھا سُوکھا موجود تھا۔ کھانے کے لئے حاضر کر دیا۔

کسان کے گھر اُسی دن بچہ پیدا ہوا تھا۔ لیکن وہ مہمان کی خاطر مدارات کی خوشی میں اپنے بچے کو بھول گیا۔ جب اُس نے مہمان کے آرام کے تمام سامان مہیا کر دیئے۔ تو اپنے نوزائیدہ بچہ کو اُٹھا لایا۔ اور مہمان کی گود میں دے دیا۔ مہمان نے پیشگوئی

کی۔ کہ "یہ بڑا خوش قسمت ہوگا" اور سب آرام سے سو گئے۔

جب صبح ہوئی اور بادشاہ بیدار ہوا۔ تو کسان سے یہ کہہ کر چلا گیا کہ مجھے ایک ضروری کام کے لئے ماسکو جانا ہے۔ تین گھنٹے کے بعد واپس آجاؤں گا۔ تم میرا انتظار کرو۔ کسان انتظار کرتا رہا۔

تین گھنٹے گزرنے کے بعد بہت زیادہ شور و غل کی صدائیں آنے لگیں۔ وہ باہر نکلا۔ اور دیکھا کہ اُس کا وہ رات کا مہمان شاہانہ لباس میں آرہا ہے۔

بادشاہ نے اس وقت کسان کو بتایا کہ میں روس کا بادشاہ ہوں۔ اور میں ہی رات تمہارا مہمان تھا۔ اور اب تمہارا بچہ ہمارے محل میں پرورش پائیگا۔ اور تم بھی باقی زندگی آرام سے بسر کرو گے

چنانچہ بادشاہ جب تک زندہ رہا۔ کسان کے کنبے کی پرورش کرتا رہا۔

کسان کا مذہب مہمان نوازی تھا۔ اور وہ اس مذہب میں پورا اُترا۔

(شہزادہ) محمد انور آزاد

"لارڈ بیڈن پاول کا بچپن"

لارڈ بیڈن پاول اپنے بچپن کا حال اس طرح لکھتے ہیں۔

کہ میرے اسکول کے پاس ایک جنگل تھا۔ اسکول سے زیادہ میں نے اس جنگل سے تعلیم حاصل کی۔ میں چوہوں۔ گلہریوں اور خرگوشوں کو بڑے غور سے دیکھتا۔ اور کبھی کبھی ان جانوروں میں سے کسی کو پکڑ کر اور بھون کر کھا بھی جاتا۔ مگر دھواں نہیں ہونے دیتا تھا۔ تاکہ شکاریوں کو میرا پتہ نہ چل سکے۔ خطرے کے وقت میں درختوں پر چڑھ کر ڈالیوں میں چھپ جاتا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ شکاری اُوپر بہت کم دیکھا کرتے ہیں۔ اس لئے بچپن ہی سے لوگوں کی نظروں سے اپنے کو چھپا کر کام کرنے کا ملکہ ہوگیا۔ اور آگے چل کر مجھ کو اس سے بہت فائدہ پہنچا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اصلی زندگی وہی ہے۔ جو خطرے سے گھری ہو۔ جو شخص اپنے کو خطرے میں نہیں ڈالتا اور خطرات سے بچنے کی ترکیبیں نہیں سوچتا وہ انسان نہیں ہے۔

ڈرامہ بھی بچوں کی زندگی کا ایک حصہ ہونا چاہیئے۔ میں بچپن میں ڈرامہ کرنے کی بھی مشق کیا کرتا تھا۔ مجھ کو گانے سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ میں ہر وقت گاتا رہتا تھا۔ آگے چل کر ان چیزوں سے بھی مجھے بہت مدد ملی۔

میں بچپن میں صورت بدلنے کی بھی مشق کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک فوجی افسر ایک جگہ بیٹھا گانا سن رہا تھا۔ میں نے فوج کے کمانڈنگ انچیف کی وردی حاصل کی۔ اور اسے پہن کر اور سفید ڈاڑھی مونچھ لگا کر وہاں پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور سب نے مجھ کو سلام کیا۔ لیکن جب اُن کو حقیقت معلوم ہوئی۔ تو وہ بہت ہنسے۔

دوسرے کی نقل بننا بھی ایک فن ہے۔ اور اس سے بہت سے کاموں میں خاص کر جاسوسی میں [illegible] مدد ملتی ہے

میں نے بہت دنوں تک غیر ملکوں میں جاسوسی کا کام کیا ہے۔

ہر شخص کو شہرت اور امتیاز حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ چنانچہ کوئی گانے میں کمال حاصل کر کے کوئی تصویر بنانے میں کوئی شاعری اور مضمون نگاری میں اور کوئی بُت سازی میں کمال حاصل کر کے امتیاز حاصل کرتا ہے۔

میں نے بھی ان کاموں کی مشق کی ہے۔ اور مجھے ان میں بہت لطف آتا ہے۔

جو لوگ کشتی چلانے کی مشق کرتے ہیں۔ ان میں خطرے کے مقابلے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لہروں کے درمیان سے کشتی کو لے جانا ہوا کے جھونکوں سے اسے بچانا بہادری اور ہمت کا کام ہے۔ پھر اس کے علاوہ اس میں مزہ کتنا آتا ہے۔ میں نے بچپن میں کشتی رانی کی مشق کی تھی۔ اس سے میرے دل میں جو حوصلہ پیدا ہوا۔ اس سے مجھے آگے بہت مدد ملی۔

شکار کھیلنا بھی اچھا کھیل ہے۔ اسے ہر شخص کو سیکھنا چاہیئے۔ جنگلی جانوروں پر نشانہ لگانا اور خود کو محفوظ رکھنا بھی مشق کا کام ہے۔ میں نے ایسے کاموں کی بہت مشق کی ہے۔ شکار کے وقت انسان کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ گھوڑا اس کا کتنا اچھا دوست ہے۔ کتنی تیزی سے وہ سوار اور خود کو خطرے سے باہر نکال لیتا ہے۔ یہ وہی جان سکتا ہے جس نے گھوڑے کی سواری کی ہے۔ شکار میں ہاتھی اور بھی معاون ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں میں نے ہاتھی پر سوار ہو کر چیتوں کے شکار کئے ہیں۔ میرا ہاتھی نہایت چالاک تھا۔ شیر کے حملے سے بھی وہ نہیں گھبراتا تھا۔ چٹان کی طرح ایک جگہ کھڑا رہتا تھا۔ ہندوستان اور برما میں ہاتھیوں سے اور بھی کام لئے جاتے ہیں۔ وہ لکڑی کے بڑے بڑے لٹھے اپنی سونڈ سے اُٹھا کر اُوپر اور نیچے رکھتے چلے جاتے ہیں۔ اگر کوئی لٹھا بھاری ہوتا ہے۔ تو اُسے دو ہاتھی اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔

میں نے دو قسم کی زندگی گزاری ہے جنگ اور امن کی۔ اور دونوں حالتوں میں مجھے اپنی اس اسکاؤٹ زندگی سے مدد ملی ہے جس کی میں بچپن ہی سے مشق کرتا چلا آرہا ہوں۔ اب بھی میرا دل یہی کہتا ہے کہ اس دنیا میں اگر انسان کو رہنا ہو۔ تو اسکاؤٹ بن کر رہے۔

(قمرالدین رام نگری)

احساسات

کیا زعم لئے مدِ نظر جاتا ہے … کس سمت مرا ذوق سفر جاتا ہے
نیند آتی ہے آغوشِ لحد میں انورؔ … یا سر سے کوئی بوجھ اُتر جاتا ہے

(۲)

بجھ جاتا ہے تربت میں چراغِ ہستی … آگے نہیں چل سکتا سراغِ ہستی!
مل جاتا ہے مٹی میں، اُبھرنا کیسا! … اے موت ترے ہاتھ سے داغِ ہستی!

لطیف انور

بزمِ انتخاب

پرل بک کے ناول

۱۹۳۸ء میں ادب میں نوبل پرائز مشہور ناول نویس پرل بک کو ملی ہے۔ امریکہ میں پیدا ہوئی۔ لیکن امریکہ سے زیادہ چینی ہے۔ ۱۸۹۲ء میں مغربی ورجینیا میں پیدا ہوئی۔ چار مہینہ کی تھی کہ والدین کے ساتھ چین گئی اور وہیں پرورش پائی۔ بولنا سیکھا تو پہلے چینی ہی میں۔ اس کے ناول چینی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اور واقعاتِ زندگی سے بالکل قریب وہ معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو اس طرح پیش کرتی ہے۔ کہ آنکھوں کے سامنے چینی زندگی کی تصویر چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اس کے ناول تخیلی نہیں واقعاتی ہوتے ہیں۔

دنیائے ادب میں پرل بک اجنبی نہیں۔ ۱۹۳۲ء میں اس کے (House of Earth) کو امریکہ میں اس سال کی بہترین تصنیف قرار دیا گیا۔ اور وہ انعام کی مستحق ٹھیری۔ اس کے دوسرے ناول East Wind, The Exile, Fighting Angle اور West Wind

صرف This Proud Heart ہی میں وہ اپنے خاص موضوع سے ذرا ہٹ گئی ہے اور چین سے دور اپنے امریکہ کی طرف متوجہ ہوئی ہے۔ اس ناول میں اُس نے کہانی لکھی ہے۔ ایک نوجوان ذہین عورت کی جو اپنی موجودہ بے کیف زندگی سے اُکتا گئی ہے۔ اور اپنے جوہر کو اُجاگر کرنے کا رستہ ڈھونڈتی ہے۔

Susan Gay end اس کی ہیروئن ہے۔ اس کے دل میں ایک نئی زندگی کی تڑپ پیدا ہو چکی ہے۔ لیکن اس کو راستہ نہیں ملتا۔ اس ناول کے کیرکٹر چین کے سادہ اور ان پڑھ دیہاتی نہیں۔ بلکہ وہ دوسری دنیا کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ بک کی اصلی خصوصیت اس کے Good Earth میں نمایاں ہے۔ چینیوں کی سادہ اور گھریلو زندگی کا نقشہ کھینچنے میں بک کو کمال حاصل ہے وہ چینی زندگی کی ایک تصویر بناتی ہے۔ اور اس میں اتنا شوخ رنگ بھر دیتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اب بول چلی۔ اس میدان میں اس کا کوئی مدِ مقابل نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ Andre Malraux اور Myra Page بھی دوسرے فن کے (Artist) ہیں۔ انہوں نے بھی چینی طرزِ معاشرت کی تصویر بنائی ہے۔ لیکن انہوں نے اس تصویر کے لئے رنگ شہروں سے لئے ہیں۔ ایسے شہروں سے جہاں جدید اور قدیم چین آپس میں دست و گریباں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تصویر ذرا دھندلی ہوتی ہے اور اس کے نقوش بھی مٹے مٹے ہوتے ہیں۔

شہری زندگی کی کشمکش سے دور تک دیہات ہی کو پسند کرتی ہے یہ وہی چین ہے جو بیدار بھی اور خوابیدہ بھی اور جس کی آبادی تمام سیاسی تبدیلیوں سے بے خبر۔

ایک دوسرے ناول Good Earth میں ایک چینی کاشتکار کے خاندان کی کہانی لکھی ہے۔ وانگ ایک بڑا خاندان ہے۔ ناول کی ابتداء وانگ لنگ کی شادی کے دن سے ہوتی ہے۔

"گھر میں عورت آرہی ہے۔ چلو ہم کو آرام ملے گا۔ صبح صبح آگ سلگانا۔ وہ تھک بھی جائیگی تو اس کے لڑکے اس کا ہاتھ بٹائینگے۔" وہ اسی خیال میں مست تھا۔ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ بیوی ذرا ناک مُنہ کی اچھی ہو۔

لیکن اس کا باپ اس کے خلاف تھا۔ خوبصورت عورت لاکر کیا کرینگے ہم کو تو ایسی عورت چاہیئے۔ جو گھر کا کام بھی کرے۔ اور بچے بھی پیدا کرسکے" وہ کہتا تھا۔

اس لئے وانگ لنگ نے مجبوراً ہوانگ خاندان کی ایک ملازم لڑکی سے شادی کی —— اُو۔ لاؤ ایک بے زبان جانور کی طرح جو بیس گھنٹے گھٹتی رہتی ہے۔ اس درمیان میں وانگ لنگ خاندان پر بہت سے انقلابات آئے وانگ لنگ اور لاؤ گھنٹوں کھیتوں میں خاموش کام کرتے۔ یہاں پر بک، جو نقشہ پیش کرتی ہے۔ اگرچہ وہ سادہ ہوتا ہے۔ لیکن دیہاتی زندگی کا ہو بہو چربہ ہوتا ہے۔ یہ نقشہ آئینہ ہوتا ہے۔ جس میں زندگی اپنے اصلی خدوخال میں ظاہر ہوتی ہے۔

ہوانگ خاندان گاؤں میں سب سے بڑا ہے۔ وانگ پر دولت کی دُھن سوار ہے۔ وہ ہوانگ سے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ گاؤں میں کال پڑا لوگ بھوکے مرنے لگے۔ مرتے کیا نہ کرتے۔ گھاس اور درخت کی پتیاں کھا کر زندگی بسر کرنے لگتے ہیں وانگ لنگ آکر روزی کی تلاش میں دکھن کی

طرف چلا جاتا ہے۔ یہاں کی شہری زندگی اُسے راس نہیں آتی۔ اُس کا دل اُداس رہتا ہے۔ شہر کے شور اور ہنگامے اس کے نزدیک بے معنی اور بیکار ہیں۔ تیس صدیوں کے بعد چین کی بیداری اُس کو خوفزدہ کئے ہوئے ہے ——— وہ ایک بار پھر لہلہاتے کھیت اور اپنے ہاتھ میں ہنسوا دیکھنا چاہتا ہے۔

دوسری جگہ وانگ دیکھتا ہے کہ مجمع میں ایک نوجوان جوشیلی تقریر کر رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے۔ کہ چین کے لئے انقلاب کی ضرورت ہے۔ ان بدیسیوں کو یہاں سے نکالنا ہمارا فرض ہے" ——— وانگ ڈر گیا۔ اس نے سمجھا کہ اس نوجوان کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔ کیونکہ یہاں وہ اپنے کو اجنبی محسوس کر رہا تھا۔

غرضکہ کہیں دیہاتی زندگی کی تصویر ہے۔ کہیں زندگی کی کشمکش اور کہیں انقلاب کی چنگاری دبی ہوئی ہے۔

وانگ کی تیسری نسل کی ایک خیالی تصویر پیش کرتی ہے۔ ... شیر دل وانگ نے اپنے کو سر سے پیر تک گھور کر دیکھا۔ اور "یہ وردی کیسی ہے؟" پوچھا۔

"یہ نئی انقلابی فوج کی وردی ہے۔" نوجوان نے جواب دیا "میرے باپ! تم نہیں سمجھ سکتے۔ تم کیا۔ تمہارے ایسے جتنے بڑھے ہیں۔ نہیں سمجھتے کہ چین کی حالت کتنی خراب ہے۔"

لیکن وانگ لنگ کا پوتا اُمید کے خلاف نکلا۔ ... وانگ لنگ کی روح مرنے کے بعد بھی اس کے کھیتوں میں منڈلاتی رہی۔

بک کا ایک دوسرا ناول The House of Earth ہے اس کی کہانی بھی چین کی دیہاتی زندگی کے متعلق ہے۔ اور یہ کہانی زبان، مکان اور وقت کے تابع نہیں۔ چین کا نام لیتے ہی ہم اپنے اندر اجنبیت اور خود کو بھول بھلیاں میں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ مسز بک کا کمال ہے کہ یہ اجنبیت پاس تک نہیں پھٹکتی۔

ان چینی کاشتکاروں کی رگوں میں وہی خون دوڑتا ہے۔ جو مصر کے (کاشتکار) Fellahin ہندوستان اور ناروے کے کسانوں کی رگوں میں ہے۔ ایک چینی پروفیسر نے بک پر تنقید کی تھی۔ کہ بک نے چینی زندگی کے صرف تاریک رخ کو پیش کیا ہے اور روشن پہلو پر کوئی روشنی نہیں ڈالی اور یہ کہ اُن کے ناول کے کیرکٹر اونچے طبقہ والے سے تعلق نہیں رکھتے۔

"یہ سچ ہے کہ میں نے چینی زندگی کے تاریک رُخ کو پیش کیا ہے۔ لیکن پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ ناول زندگی کی حقیقت سے کتنی دور ہیں ... بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ خود ان کی زندگی پہلے چین کی زندگی ہے میں نے وہی لکھا جو اپنی آنکھوں سے دیکھا" بک نے اپنے نقادوں کو جواب دیتے ہُوئے کہا۔

"ہندوستانی"

زیب النساء کی شاعری

زیب النساء کی شاعری پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور بڑے بڑے ادیب اہل قلم حضرات اس موضوع پر موشگافیاں فرما چکے ہیں۔ اور نہیں معلوم کب تک فرماتے رہیں گے۔ لیکن میں کہوں گا کہ اس چیز پر جس قدر قلم اُٹھایا جائیگا۔ اُتنے ہی اس کے پوشیدہ اور چھپے ہُوئے گوشے سامنے آتے جائینگے۔ اور اہلِ ذوق کو لذت و سرور کی کیفیت بخشتے رہیں گے۔

یوں تو ہر قوم اور ہر ملک میں جہاں بڑے بڑے مرد شعراء اور ادباء پیدا ہُوئے وہیں عورتوں کی بھی خاصی تعداد ہمیشہ ایسی رہی۔ کہ جس نے فصاحت و بلاغت اور شعر گوئی میں وہ ملکہ حاصل کیا۔ جس نے قومی و ملکی عروج و کمال کو اور چار چاند لگا دیئے۔ خود مسلمانوں میں بھی ایسی بڑی بڑی شاعرہ پیدا ہوئی ہیں کہ جن کے ایک ایک شعر کے بدلے ہزارہا انسانی جانیں قربان ہوگئیں۔ اور زر و جواہرات کا کیا ذکر کیا قوم کے ہونہاروں نے اپنے بے بہا خونوں کے دریا بہا دیئے ہیں۔ لیکن اس بزم میں زیب النساء نے جو جگہ پائی۔ سچ تو یہ ہے کہ بہت کم عورتوں کو یہ شرف نصیب ہوُا۔ اور اگر دنیا کے ملکوں کو اپنی اپنی بہترین خواتین شاعرہ پر فخر و ناز ہیگا تو ہندوستان کو بھی زیب النساء جیسی بےمثال شاعرہ پر فخر و ناز رہیگا اور ہندوستان کو بھی زیب النساء جیسی بےمثال شاعرہ اور بدیہہ گو کے کمالات ہمیشہ مغرور رکھیں گے۔

زیب النساء کی شاعری میں سب سے زیادہ جو چیز نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ اس کی حاضر جوابی اور نزاکت تخیل اور اس کی معصومیت بھری بلند فکری ہے۔ اور یہ ایسی چیز ہے جس کا جلوہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔

ایک دن شہنشاہ اورنگ زیب نے زیب النساء کی خواصوں میں سے ایک کو حکم دیا کہ نماز فجر سے پہلے مجھے آج جگا دینا۔ بادشاہ کا رعب و جلال شہرہ آفاق تھا۔ خواص اس ڈر سے کہ کہیں آنکھ نہ لگ جائے اور بادشاہ کی عدول حکمی ہو جائے تو جان کے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ رات بھر قطعاً نہ سوئی اور کروٹیں بدلا کی۔ مرغ کبھی رات کو بھی بول اُٹھا کرتے ہیں۔ آج بھی جب مرغ نے بانگ دی۔ تو اُس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اب بادشاہ کے جگانے کا وقت آگیا ہے۔ بادشاہ کو جا کر اُٹھا دیا۔

حالانکہ وہ ابھی ابھی تہجد کی نماز پڑھ کر بستر استراحت پر تشریف لے گئے تھے۔ اور پوری طرح سونے بھی نہ پائے تھے۔ کہ یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ بادشاہ کو یہ جگانا انتہائی ناگوار اور تکلیف دہ محسوس ہوا۔ اور اسی حالت میں آپ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکل گئے کہ "سر بریدن لازم است" یہ کلمہ سنتے ہی خواص نے اسے اپنے لئے پیغامِ موت محسوس کیا۔ اور جب زندگی سے مایوس ہو گئی تو آخری سلام کے لئے اپنی مالکہ زیب النساء کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس وقت وہ محوِ خواب تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ پاؤں دبا کر اُسے بیدار کیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر خاموش ہو رہی۔

زیب النساء نے اس کے اس طرح آنے اور رونے اور پھر خاموشی کا سبب دریافت کیا۔ مگر اُس نے نہ بتایا۔ آخر اُس کے بہت اصرار پر سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اور کہا کہ اب میں آپ کو آخری سلام عرض کرنے حاضر ہوئی ہوں۔ کوئی دم میں میرا سر میرے تن سے جدا اور میری روح میرے جسم خاکی سے الوداع ہوا چاہتی ہے۔ زیب النساء کو یہ خواص بے حد محبوب تھی۔ وہ اسے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس وقت اسے تسلی و تسکین دی۔ اور صبح حسب عادت بادشاہ کو سلام کرنے کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کے ساتھ وہ خواص بھی دست بستہ حاضر تھی۔ زیب النساء نے سلام کے بعد عرض کیا۔ "ابا جان! اس لونڈی کے لئے حضور کا کیا حکم ہے۔"

بادشاہ نے پھر وہی الفاظ دُہرائے۔ "سر بریدن لازم است" زیب النساء نے اس موقع پر اپنی ذہنی قابلیت اور بلندیٔ طبیعت کا جو ثبوت دیا ہے۔ وہ شاہی تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ سونے کے حروف سے لکھا جائے گا۔ فوراً عرض کیا ؎

سر بریدن لازم است آں مرغ بے ہنگام را
ایں پری پیکر چہ داند وقت صبح و شام را

بادشاہ یہ سن کر مسکرا دیئے اور اس خواص کا خون معاف کر دیا دیکھئے اس شعر میں سر بریدن کو جس طرح سے نباہا ہے اور اس کو جس خوبی سے ادا کیا ہے وہ خود اپنی نظیر اور خود اپنی مثال ہے۔

زیب النساء چونکہ زبردست شاعرہ تھی اور شعر ہی اُس کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب اور مرغوب چیز تھی۔ اس لئے جب اُس کے سامنے کوئی بہترین شعر آجاتا تو وہ کسی اور چیز کی پرواہ تک نہ کرتی۔ ایک بار اُس نے اپنی کسی لونڈی کو بیاض لانے کو کہا۔ راستہ میں اسے حوض ملا جس میں سُرخ مچھلیاں تیر تیر کر فطرتِ ازلی کے حسنِ نہادہ کا راز فاش کر رہی تھیں۔ وہ جذبات سے بیخود ہو کر اس کی طرف ہو کر رہ گئی۔ اور ابھی عالم میں بیاض حوض میں گر کر ضائع ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ زیب النساء کو بیاض کتنی پیاری ہو گی اور اس کو کیا کچھ نہ صدمہ ہوا ہو گا۔ لیکن وہ دوسروں کے بہترین اور فی البدیہہ کلام کی بھی حقیقی قدر دان تھی۔ جس وقت اس لونڈی نے فی البدیہہ یہ رباعی پڑھ کر اس واقعہ کو سنایا ؎

آں بیاض خاصہ شاہی کہ در وے ہر طرف
چوں نگہ کواکب نقطہائے انتخاب افتادہ است
ایں زماں از دست روشن خام خاکش در دہن
چوں بیاض در سینۂ ماہی در آب افتادہ است

تو اگرچہ اس کا سب سے زیادہ محبوب متاع عزیز ضائع ہو چکا تھا لیکن اس نے از راہ قدر دانی اس روشن نامی لونڈی کو کچھ نہ کہا اور اس کی تقصیر معاف کر دی۔

اسی طرح اسی لونڈی سے ایک بار اتفاقیہ ایک آئینہ ٹوٹ گیا جو کسی بادشاہ کا تحفہ تھا۔ اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے ہوئے زیب النساء کے پاس آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ آئینہ کس قدر اہم اور تاریخی یادگار کی حیثیت رکھتا تھا جس وقت وہ ٹوٹ گیا تو اس لونڈی نے اپنے الفاظ میں اس واقعہ کی اطلاع کی ؎

از قضا آئینۂ چینی شکست

زیب النساء نے اس عظیم الشان نقصان کی پرواہ نہ کرتے ہُوئے کیا خوب فی البدیہہ مصرعہ ارشاد فرمایا ؎

خوب شد اسبابِ خود بینی شکست

لفظ "خود بینی" میں کیا کیا لطافتیں اور باریکیاں ہیں اور دیکھئے کس پُر شوکت خندہ پیشانی سے اس نقصان کو برداشت کرتے ہُوئے اپنی قابلیت کا بے پردہ ثبوت دیا ہے۔

ایک دن رُخِ انور پر نقاب ڈالے اپنے کوٹھے پر چہل قدمی فرما رہی تھیں اُدھر سے ایک ایرانی شہزادے کا بھی گزر ہوا۔ دیکھتے ہی برجستہ کہا ؎

پردہ بردار نظر محتاج است
مرہمے داغ جگر محتاج است

زیب النساء نے کیا خوب جواب دیا ہے ؎

اگر من پردہ بردارم فتد بر آسمان غوغا!
کہ یا رب ایں چہ طوفان است مہ شد بر زمین پیدا

اللہ اللہ پردہ داری کی کیا وجہ بیان کی ہے اور غرورِ حسن کا کیا اچھوتا مرقع پیش کیا ہے؟

اسی طرح ایک بار کسی ایرانی شاہزادہ نے جو ایک عرصہ سے اس کے حسنِ جہاں آرا کا شیدائی اور اس کی شہرہ آفاق قابلیت کا فدائی تھا۔ اس کے پاس ایک شعر لکھ کر روانہ کر دیا ؎

ترا اے مہ جبیں بے پردہ دیدن آرزو دارم
تجلی ہائے حسنت را رسیدن آرزو دارم

زیب النساء نے یہ سن کر لکھ بھیجا ؎

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا
بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا
ہم چو بو پنہاں شدم در رنگِ گل مانندِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

عاشق مزاج شاہزادے نے جس وقت ان اشعار کو سنا۔ مورخین کا بیان ہے کہ وہ ایک میخوار و بادہ نوش کی طرح بدمست اور بیہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے ارادہ سے توبہ کی۔ اور اب وہ اس کی صورت پر نہیں بلکہ اس سیرت پر کہ جس پر ملائک بھی سو جان سے عاشق اور فریفتہ تھے۔ قربان تھا۔

سرو کے درخت کو شعرا اکثر بہت پسند کرتے ہیں۔ اور اس کی اکثر مثالیں تشبیہیں دیا کرتے ہیں۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ زیب النساء کسی باغ میں تفریح کر رہی تھیں۔ وہاں اور تمام اسباب تفریح و نشاط کے ساتھ ہی ساتھ لمبے لمبے سرو کے درخت بھی تھے۔ ان تمام مناظر سے بے خود ہو کر وہ سرو کے درخت سے لپٹ گئی۔ لیکن جب اس کے جسم نازک کو اس سے تکلیف پہنچی۔ تو اس کی زبان سے بے ساختہ یہ قطعہ نکل گیا ؎

وائے بر شاعرانِ نا دیدہ   غلطے را بخود پسندیدہ
سرو را قد یار میگویند   سر چوبے است نا تراشیدہ

کس لطیف پیرایہ میں شعرا کی غلطی کا احساس کرایا ہے۔ اور "قد یار" کی حقیقی تعریف و توصیف کا بلند و بالا نظریہ پیش کیا ہے؟

اورنگ زیب نے ایک بار زیب النساء کو شعر گوئی سے منع کر دیا تھا۔ یہ اس کی موزوں طبیعت کے لئے اس قدر زبردست سزا تھی۔ جسے وہ کسی حال میں نہ تو برداشت کر سکتی تھی اور نہ اس کی فطرت رواں کے بس کی بات تھی۔ لیکن بہرحال باپ کے حکم شاہی سے کچھ روز رکنا پڑا۔ ایک دن بادشاہ تشریف فرما تھے۔ باغ تھا۔ بہار کا موسم تھا۔ مسکراتے ہوئے غنچے اور کھلکھلاتے ہوئے پھول تھے۔ قمریوں کے ترانے اور بلبلوں کے نالے تھے۔ اگرچہ بادشاہ کا رعب مانع تھا۔ مگر دل میں جذبات کا جو سمندر موجزن تھا بھلا کس بادشاہ کے روکے رک سکتا تھا۔ شعر نکل ہی گیا ؎

اے عندلیب نالاں دم در گلو گرہ بند
نازک مزاج شاہاں تاب فغاں ندارد!

اُف ---- کس قدر نزاکت ہے اور دل کے پوشیدہ جذبات کی کیا روانی ہے۔ اور فطرت کے رازہائے سربستہ کی کیا پردہ برداری ہے بادشاہ باوجود خشک اور زاہد مزاج ہونے کے تڑپ اٹھا۔ اور باوجود ممانعت کے پھر شعر گوئی کی اجازت دے دی۔

ایک مرتبہ زیب النساء نے یہ مصرعہ ارشاد فرمایا ؎

از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم

دوسرے مصرعہ کے لئے اس نے اور شعرا کو دعوت دی۔ ہر ایک نے کوشش کی۔ مگر ناصر علی سرہندی نے جو مصرعہ لگایا۔ وہ نہایت ہی بے باکانہ تھا ؎

از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم   گویا رسید بر لب زیب النساء لبم

یہ سن کر اس نے انتہائی صبر سے کام لیا۔ اور اس کے جواب میں صرف یہ کہہ کر روانہ کر دیا ؎

ناصر علی بنام علی بردہ پناہ + ورنہ بہ ذوالفقار علی سر بریدہ است

اللہ اللہ کیا پر رعب اور جلال میں ڈوبے ہوئے الفاظ ہیں۔ اور فطری ہمت و بہادری کا کس حسین طریقہ پر پردہ فاش کر رہے ہیں۔
(بزم خیال ص۲۵)

عاقل خاں لاہور کا گورنر تھا۔ نہایت خوبرو اور ذہین و طباع تھا۔ اور نہایت عمدہ شاعر تھا۔ اس سے اور زیب النساء سے اکثر چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ زیب النساء نے یہ شعر لکھا ؎

گرچہ من لیلی اساسم دل چو مجنوں در نواست
سر بصحرا می زدم لیکن حیا زنجیر پاست

عاقل خاں نے جب اسے سنا تو جواب میں لکھ بھیجا ؎

عشق تا خادم ست باشد بستۂ ناموس و ننگ
پختہ مغزانِ جنوں را کے حیا زنجیر پاست!

یہ شعر اگرچہ کتنا عمدہ اور لطیف ہے۔ لیکن زیب النساء جو جواب دیتی ہے۔ اس کی عظمت اور پاکیزگی اور بلند خیالی کو کیا کہیئے ؎

پاکبازانِ محبت را حیا باشد مدام
چو تو مرغِ بے حیا را کے حیا زنجیرِ پاست

صرف ایک شعر میں محبت کا جو فلسفہ اور اُس کی واقعی قدر و منزلت زیب النساء نے جس انداز اور جس نزاکت اور خودداری کے ساتھ بیان کی ہے وہ خود اپنی نظیر ہے۔ اور دل چاہتا ہے کہ بار بار پڑھا جائے ——

یہ تھی سچی راندازی زیب النساء کا حسن جب شہرہ آفاق عالم ہؤا۔ تو ایران کے ایک عاشق مزاج شاہزادہ نے دیدار کے لئے ایران سے دلّی کا عزم کیا۔ دلّی پہنچ کر ہر طرح سے زیارت کی کوشش مگر ہر طرح سے ناکام و نامراد رہا۔ آخر ایک دن کسی طرح زیب النساء کے باغ میں جا گھُسا اور لباس بدل کر ایک گلدستہ اپنے ہاتھ سے زیب النسا کو پیش کیا۔ زیب النسا دیکھتے ہی سب واقعہ سمجھ گئی اور فوراً کہا ؎

بگو اے عاشقِ صادق چرا گلدستہ آوردی
دلِ بلبل شکستی بہرِ ما گلدستہ آوردی

لیکن شاہزادے نے بھی فوراً عرض کیا ؎

برائے زینتِ دستت نہ ایں گلدستہ آوردم
بخوبی لاف میزد گل بہ پشت بستہ آوردم

شاہزادی یہ پھڑکتا ہؤا شعر سُن کر بے قابو ہوگئی اور فوراً نقاب اُلٹ دی کہ دیکھنے والا محروم دیدار نہ رہے۔

عاقل خاں جب زیب النسا پر عاشق ہؤا اور دن رات کے لمحات اسی غور و فکر میں کٹنے لگے۔ تو ایک روز بے حد پریشان ہو کر اس کے زیر تعمیر باغ میں گارے کا گونڈا لے کر گھس گیا۔ سامنے والے مکان میں زیب النساء چوسر کھیل رہی تھی۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا اور پکار کر کہا ؎

من طلبت گرد جہاں میگردم

زیب النساء نے آواز پہچان لی اور فوراً فرمایا ؎

گر باد شوی تا سرِ زلفم نرسی

اسی طرح عاقل خاں ایک بار قلعہ کی فصیل کے نیچے اس کے فراق میں ٹہل رہا تھا۔ کہ سُرخ لباس زیب تن کئے زیب النسا کو کوٹھے پر دکھائی دی۔ آپ نے فوراً باآواز بلند پڑھا ؎

سُرخ پوشے بہ لبِ بام نظر می آید

زیب النساء کی شوخ طبیعت بھلا کب اس جگہ خاموش رہنے کی اجازت دیتی فوراً مصرعے پر مصرعہ لگایا ؎

نہ بزاری نہ بزور و نہ بزر می آید (تذکرہ شعراء)

جب دشمنوں نے اس پر عاقل خاں سے ایک نہایت ہی بے جا اتہام لگایا۔ اور بحکم عالمگیری قید ہوئی۔ تو اُس وقت اُس نے اپنی پاکدامنی میں ان معصوم الفاظ کو پیش کیا تھا ؎

قسم بہ کعبہ حاجات و احمد مرسل — کہ پاکبازی من باعث گناہ من است

شام کے وقت پُر فضا جگہ میں ایک بار زیب النساء تنہائی میں یہ اشعار کسی خاص کیفیت میں پڑھ رہی تھی ؎

چہار چیز غم از دل برد کدام چہار
شراب و سبزہ و آب رواں و رُوئے نگار

کہ اسی حالت میں بادشاہ تشریف لے آئے۔ اُنہیں اس قسم کے اشعار سے سخت نفرت تھی۔ مگر وہ اس قدر بے خود تھی۔ کہ اسے آنکھ اُٹھانے کا بھی موقع نہ مل سکا۔ مگر بادشاہ جب بالکل قریب آگئے۔ تو اُس نے اس شعر کو اس طرح بدل کر پڑھنا شروع کر دیا ؎

چہار چیز غم می برد کدام چہار
نماز و روزہ و تسبیح و توبہ استغفار

اورنگ زیب سب کچھ سمجھ چکے تھے۔ مگر صرف اپنی بیٹی کی حُسنِ لیاقت کو دیکھ کر خاموش رہا (باغ و بہار)

ایک بار زیب النسا بازیگروں کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ ایک عورت بانس پر چڑھ کر چکر کھا رہی تھی۔ شعراء اس پر اشعار موزوں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے کہا ہی تھا ؎

ایں لعبت بوالعجب کہ بر نے پیداست
یک تازہ گلے کہ بر سرِ شاخ رعناست

کہ زیب النساء نے کہا اور کیا خوب کہا ہے ؎

نے نے غلط است کافتاب محشر
برنیزہ برآمد و قیامت برپاست!

دیکھئے کیا تشبیہ دی ہے۔ عورت کو آفتاب اور بانس کو نیزہ پھر ان دونوں کا محشر کے ساتھ ذکر کر کے کلام میں کیا خوبی پیدا کر دی ہے؟

ایک دن وہ باغ میں تفریح کر رہی تھی۔ عاقل خاں بھی اُدھر سے آ نکلا اور دیکھتے ہی یہ پڑھا۔

نرگس زدہ بر سر واز شوق تو نرگس
خم کردہ رُخ خویش کہ رخسار تو بیند

زیب النسا نے اُس کے جواب میں فوراً یہ چُبھتا ہؤا شعر پڑھا ؎

ایں نہ نرگس کہ تو دیدی بہ سر افسر زن — بہ تماشائے تو بیرون شدہ چشم من

ایک مرتبہ اورنگ زیب نے یہ مصرعہ موزوں کیا۔ اور زیب النساء کو اس پر مصرعہ لگانے کو کہا سہ

دلیراں را دلیری بعد مردن بیشتر باشد

بادشاہ کی زبان سے فقرہ نکلا ہی تھا کہ اُس نے فوراً دوسرا مصرعہ یوں لگایا سہ

دلیراں را دلیری بعد مردن بیشتر باشد
کہ چرم گرگ تیغ شیر افگن را سپر باشد

بادشاہ اس حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی پر بے حد خوش ہوا۔ اور فرط مسرت سے گلے لگالیا۔ (مقالات شبلی مطبوعہ دار المصنفین)

یوں تو زیب النساء کو بدیہہ گوئی میں جو ملکہ اور کمال حاصل تھا۔ وہ خود اپنی نظیر ہے اور گزشتہ چند مثالوں سے اچھی طرح سے جان لیا گیا ہوگا کہ اس چیز میں اسے کہاں تک مہارت تامہ حاصل تھی۔ اور قدرت نے اس چیز کو اس کی سادہ اور معصوم فطرت میں کہاں تک ... یعت کر رکھا تھا لیکن اُوپر کا جو شعر گزرا ہے اس کے متعلق اہل علم اور صاحب فن حضرات کا بیان ہے کہ بدیہہ گوئی کی یہ ایسی زندہ مثال ہے اور ایسی بلند و پاکیزہ مثال ہے کہ جس کی نظیر مشکل سے پیش کی جاسکے گی۔

زیب النساء نہ صرف یہ کہ خود بہترین شاعرہ اور باکمال بدیہہ گو تھی۔ بلکہ اُس کی شوخیٔ طبیعت اور اُس کے فیض صحبت نے انہیں بھی شاعرہ کر دیا تھا جو اس کے اردگرد رہا کرتی تھیں اور اس چیز کو اُس نے عملاً مشاہدہ کرادیا تھا کہ آفتاب کا عکس جس چمکدار چیز پر پڑ جائیگا۔ وہ بھی آفتاب ہی کی طرح نظر آنے لگے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایک بار وہ اپنے آرامگاہ میں محوِ خواب تھی اُس کی ایک خواص آئی اور یہ دیکھ کر بکمال ادب ولحاظ جگا نہ سکی۔ البتہ اُس نے ذیل کے اشعار اُسی وقت موزوں کر کے اُس کے سرہانے رکھ کر چلی گئی سہ

تو بخواب ناز بودی	دمن از رقیب پنہاں
کف پات بوسہ دادم	زحنا شنیدہ باشی

بیدار ہونے کے بعد شاہزادی کو یہ اشعار سرہانے رکھے ہوئے ملے دیکھ کر بڑی شرمندہ ہوئی۔ اتفاق یہ کہ دوسرے روز جو یہ اُس کے آرامگاہ کی طرف گئی تو اُسے اپنے شوہر کے ساتھ سوتا پایا۔

اُس وقت اُس نے ذیل کے اشعار اُسی وقت کہہ کر اور رکھ کر چلی آئی سہ

مہ من بدور ستی	بہ برت قسم کے رفتے
نہ تو دیدہ ام آورے	کہ تو ہم نہ دیدہ باشی

وزیرزادی جب بیدار ہوئی اور اسے واقعہ کی خبر ہوئی۔ تو اس قدر شرمندہ اور پشیمان ہوئی کہ ایک مدت تک زیب النساء سے منہ چھپاتی رہی۔ تا آنکہ زیب النساء نے پھر اُس کے متعلق دوسرے اشعار کہے اور اس شرم کے ازالہ کی فکر کی۔

زیب النساء کے اگرچہ بے شمار واقعات اور اشعار ایسے اب بھی موجود ہیں جو اس کی قابلیت اور فطری صلاحیت و استعداد پر چمکتے ہوئے آفتاب کی طرح گواہی دے رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کے عہد پارینہ کی حسرت بھری نگاہوں سے یاد دلا رہے ہیں۔ مگر قلت گنجائش کی وجہ سے ہم نے ان سب کو نظر انداز کیا۔ اور ان میں سے خاص خاص کا ذکر کر دیا۔

اس مضمون کی تیاری میں اگرچہ اور ماخذوں سے بھی مدد لی گئی ہے لیکن زیادہ تر بزم خیال سے مستعار ہے۔ (عالمگیر)

غزل

یہ آخری ہچکیوں کے جھٹکے	اعجاز ہے بری زندگی کا
ہر چیز سے بے نیاز ہو کر	مفہوم نہ پا سکا خودی کا
کانٹا بھی چبھا تو رو دئے ہم	انجام یہی ہے آگہی کا
دُنیا سے لپٹ کے سونے والے	اک کھیل ہے یہ رواداری کا

ہر در پہ نہ اپنا سر جھکانا
رتبہ نہ گرانا بندگی کا

احمد ندیم قاسمی

تنویرات

ہیلیم گیس

اب سے تقریباً پچاس سال قبل امریکہ کے سائنسدانوں نے آفتابی شعاعوں کی تحقیقات کر کے ایک نئی شے دریافت کی جس کا نام انہوں نے اپنی زبان میں "ہیلیم" رکھا، اس وقت یہ بات کسی کے وہم گمان میں بھی نہ آسکتی تھی، کہ آفتاب کی شعاعوں میں دریافت کی جانے والی شے زمین پر کبھی دستیاب ہو سکے گی، مگر سائنسدانوں کے عزم و حوصلے کی داد دیجئے کہ وہ ہیلیم کی تلاش و جستجو میں برابر مشغول رہے اور ایک تجربہ کے بعد دوسرا تجربہ کرتے ہوئے بالآخر ہیلیم کی دستیابی میں کامیاب ہو گئے۔

اول اول یہ ہیلیم امریکہ کی ایک کان سے نکلے ہوئے پتھر سے ایک ٹکڑے میں دستیاب ہوئی۔

ہیلیم ہائیڈروجن گیس ہی کی طرح ہلکا ہوتا ہے، مگر اس میں خوبی یہ ہے کہ ہائیڈروجن کی طرح آگ یا سلائی کی لو قریب ہونے سے یہ دفعتاً جل نہیں اٹھتا۔

گذشتہ سال دنیا کا سب سے بڑا ہوائی جہاز "ہنڈنبرگ" یکا یک جل کر خاک ہو گیا اور اس میں سینکڑوں قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔ اگر اس جہاز میں ہائیڈروجن کے بجائے ہیلیم کا استعمال ہوتا تو غالباً یہ حادثہ اسقدر ہولناک صورت اختیار نہ کرتا۔

تمام دنیا میں امریکہ ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ہیلیم گیس دستیاب ہوتی ہے۔ ابھی گذشتہ سال تک وہاں کی حکومت کی جانب سے ہیلیم گیس کے باہر بھیجنے کی ممانعت تھی۔ مگر اب وہاں کی مجلس اعلیٰ نے ایک قانون کے ذریعہ ہیلیم کی تھوڑی مقدار باہر بھیجنے کی اجازت دے دی ہے۔

اکثر اسٹیشنوں پر آگ بجھانے کی غرض سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کے سرخ سرخ لوہے کے پیپے رکھے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی پیپوں میں ہیلیم گیس احتیاط سے بند کر کے امریکہ سے دوسرے ملکوں میں بھیجی جاتی ہے۔ جو ممالک ہیلیم منگاتے ہیں انہیں حکومت امریکہ کو یہ اطمینان دلانا پڑتا ہے کہ وہ اس گیس کو جنگ کے لئے استعمال نہ کریں گے۔ اطبائے مغرب کا بیان ہے کہ سانس کی اکثر بیماریوں میں ہیلیم بیحد مفید ثابت ہوتا ہے۔ دمہ جیسے ناقابل علاج مرض کے لئے تو یہ اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

بعض اوقات نامولود بچے کسی وجہ سے سانس نہیں لے سکتے ایسے وقت میں ہیلیم اور آکسیجن کے ذریعہ ان کے پھیپھڑوں میں مصنوعی سانس پیدا کر دی جاتی ہے۔ اور اس طرح بچوں کی زندگی خطرے سے نکل جاتی ہے۔

بعض لوگوں کو سینکڑوں فٹ گہرے پانی کے نیچے کام کرنا پڑتا ہے۔ ان کے لئے بھی ہیلیم قدرت کا ایک بیشقدر عطیہ ہے۔ اسقدر گہرے پانی میں غوطہ لگانے والوں پر پانی کا اتنا دباؤ پڑتا ہے، جسے وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے جب وہ غوطے لگانے لگتے ہیں تو ایک خاص قسم کا آہنی لبادہ پہن لیتے ہیں، جو ہر طرف سے بند ہوتا ہے، اس لبادے میں آلے کے ذریعے کافی ہوا بھری رہتی ہے۔ اس لبادے کو پہن کر غوطہ خور گہرے سمندر میں موتی اور سیپ تلاش کرتے ہیں۔ مگر اس طریقے میں بھی ایک نقص ہے۔ انسان کا جسم پانی کی طرح اسقدر ہوا کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مساوات کے ذریعہ ہوا کی نائٹروجن جسم میں داخل ہو جاتی ہے، جو بدن کے جوڑوں میں چبھن پیدا کر دیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمام بدن میں بیشمار کانٹے چبھو رہے ہیں۔

اب نائٹروجن کے بجائے ہیلیم کے استعمال نے غوطہ خوروں کو اس اذیت سے نجات دلا دی ہے، اہل سائنس کا خیال ہے کہ مشینوں اور انجنوں میں بھی ہیلیم کا استعمال بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوگا، وہ تجربے کر رہے ہیں اور امید ہے کہ وہ اپنی کوششوں میں جلد کامیاب ہو جائیں گے۔

ملزموں کی گرفتاری میں سائنس کی امداد

جرائم کی تحقیق و تفتیش اور مجرموں کی گرفتاری میں سائنس سے حیرت انگیز اور گرانقدر امداد مل رہی ہے۔ اکثر دلیر اور جری چور سونے

اور جواہرات کی دکانوں سے شوکیس کے شیشے توڑ کر ہزاروں اور لاکھوں روپے کا مال اڑا لے جاتے تھے۔ لیکن اب سائنس کی امداد سے ایسی صورت عمل میں آگئی ہے کہ چوروں کا ان دکانوں پر اس آسانی سے قابو پانا دشوار ہو گیا ہے۔

شوکیس کے چاروں طرف باریک تار کی جالی لگا دی جاتی ہے جس کو عام طور پر چھونے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ مگر جب چور شیشے کو توڑ کر مال چرانا چاہتا ہے تو شیشہ ٹوٹتے ہی جالی میں ایک برقی رو جاری ہو جاتی ہے جس کے مس کرتے ہی چور زمین پر گر پڑتا ہے۔

امریکہ کے بدمعاش بنکوں کے کلرکوں کو پستول دکھا کر آن کی آن میں ہزاروں روپے وصول کر لیا کرتے تھے۔ کلرکوں کو اپنی جان بچانے کیلئے بدمعاشوں کے مطالبہ کو خاموشی سے پورا کر دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ مگر اب سائنس کی امداد سے کلرکوں کی یہ مجبوری اور بے دست و پائی دور کر دی گئی ہے۔

اب تقریباً ہر مشہور بنک کے کلرک کی کھڑکی کے پاس پوشیدہ طور پر ایک پستول لگی رہتی ہے جس کا تعلق ایک باریک تار کے ذریعہ کلرک کی انگلی سے ہوتا ہے۔ یہ پستول کلرک کی انگلی کی ادنیٰ سی حرکت پر چور کے سینے کو اپنی گولی کا نشانہ بنا دیتی ہے۔

بعض بنکوں میں پستول کے بجائے ایک طرح کی گیس کام میں لائی جاتی ہے جس کو استعمال کر کے کلرک جب چاہے کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے آدمی کو کچھ دیر کے لئے اندھا بنا سکتا ہے۔ اس لئے اب بدمعاشوں کی گرفتاری چنداں مشکل نہیں رہی۔

اس سلسلے میں "الفرا ریڈ شعاعیں" بھی بہت مفید اور کار آمد ثابت ہو رہی ہیں۔ بڑے بڑے بنکوں کی تجوریوں میں فوٹو الیکٹرک سیل لگا دیتے ہیں جس پر کمرے کے ایک گوشے سے الفرا ریڈ کی ایک باریک شعاع پڑتی رہتی ہے۔

جب رات کی تاریکی میں چور خزانے کے اندر تجوریوں کو توڑنے کے لئے داخل ہوتا ہے تو فوٹو الیکٹرک سیل پر اس کا سایہ پڑتا ہے جس سے سیل کے اندر کی برقی رو بند ہو جاتی ہے۔ سیل کا ایک گھنٹی سے تعلق ہوتا ہے، جو سیل کی برقی رو بند ہوتے ہی دفعتہً بجنے لگتی ہے۔ اس طرح سنتری خبردار ہو جاتا ہے اور چور گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ اکثر پولیس کے دفتروں میں بھی یہ گھنٹی لگی رہتی ہے جس سے پولیس کو بھی واقعہ کی اطلاع ہو جاتی ہے۔

بہت سے جرائم پیشہ تیز سواریوں کے ذریعہ کاروائیاں کرتے ہیں اور آن کی آن میں فرار ہو جاتے ہیں۔ اگر انہیں بروقت گرفتار نہ کر لیا جائے۔ تو پھر ان کی تلاش اور گرفتاری مشکل ہو جاتی ہے۔ ایسے بدمعاشوں کی خبر گیری کیلئے پولیس کی موٹر سائیکلیں سڑکوں پر گشت کرتی رہتی ہیں، جن پر ریڈیو کے آلات نصب رہتے ہیں۔ جب کسی مقام پر کوئی واقعہ ہوتا ہے تو سائیکل سواروں کا افسر انہیں ہیڈ کوارٹر سے اطلاع دیتا ہے کہ فلاں چور رہا ہے سے ملزم کی موٹر ابھی گذری ہے، تم فلاں چوراہے پر پہنچکر اسے روک لو۔ اس طرح پولیس کے موٹر سائیکل سوار مجرموں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

چنگی کے کارکنوں کو بھی سائنس سے غیر معمولی امداد مل رہی ہے ایسے ایسے عجیب و غریب آلات ایجاد ہو گئے ہیں جن کے ذریعہ پیکٹ اور بقچہ کھولے بغیر ہی ان کے اندر کی چیزوں کا پتہ لگ جاتا ہے۔ لیکن مجرموں کی گرفتاری کے لئے حال ہی میں ایک اور آلہ ایجاد ہوا ہے جو تمام سابق آلات سے زیادہ موثر اور حیرت افزا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان کے دل میں غیر معمولی طور پر کوئی خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے تو اسے پسینہ آنے لگتا ہے۔ لیکن اگر یہ خوف زیادہ شدید نہ ہو تو اتنا پسینہ نہیں آتا۔ جو جلد پر ظاہر ہو، اب جو نیا آلہ ایجاد کیا گیا ہے وہ اس خفیف سے پسینے کو بھی بتا دیتا ہے جو جلد پر نمایاں نہیں ہوتا، اور جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جس شخص پر آلہ استعمال کیا گیا ہے وہ خائف اور ہراساں ہے۔ ابھی اس آلے میں بعض نقائص ہیں جو امید کی جاتی ہے کہ جلد ہی دور ہو جائیں گے۔ سائنسدانوں نے اس آلہ کا نام "گیلوانا میٹر" رکھا ہے۔

آجکل کے جرائم پیشہ بھی پرانے زمانے کے چوروں اور بدمعاشوں کی طرح گنوار اور جاہل نہیں ہوتے، اپنے حریفوں کی طرح وہ بھی علم و حکمت کے ساز و سامان سے کام لینے میں عجیب و غریب مہارت رکھتے ہیں۔

ایک جنٹلمین بدمعاش کیلئے یہ ناممکن نہیں کہ وہ رات کو کسی بنک کی تجوری توڑنے جائے تو الفرا ریڈ کا لیمپ ساتھ لیتا جائے اور خزانے میں داخل ہو کر اپنے لیمپ سے الفرا ریڈ شعاعیں تجوری کے سیل پر ڈالدے۔ اس طرح نہ سیل میں کوئی تغیر ہو سکتا ہے

نہ گھنٹی بج سکتی ہے۔ جو سنتری اور پولیس کو خبر ہو، علاوہ ازیں اب تو ریلوں کے توڑنے کے لئے ہتھوڑے کی بھی ضرورت نہیں، آکسی ہائیڈروجن فلم کا اسٹوپ جلا کر اس کی ایک پتلی سی لو تجوری پر ڈال دینا کافی ہوتا ہے۔ اس سے لوہے کی موٹی سی موٹی چادر اس طرح کٹ جاتی ہے جیسے قینچی سے کاغذ کی وفتی

روس میں سینما کا مفید استعمال

سوویٹ روس کی جمہوری حکومت نے پنج سالہ اسکیموں کے ذریعہ جو صنعتی، اقتصادی اور معاشرتی ترقیاں کی ہیں، وہ دوسرے اقوام و ممالک کے لئے موجب درس و بصیرت ہیں۔

جمہوریۂ روس جہاں عوام کی تعلیم و ترقی دیگر وسائل و ذرائع سے کام لے رہی ہے، وہاں صنعت فلم سازی کو بھی ملکی اور قومی ترقی کے ایک خاص ذریعہ کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔

روسی حکومت نے صنعت فلم سازی کو قومی حیثیت دے کر ایک ٹرسٹ کے ماتحت کر دیا ہے جس کا تعلق براہ راست سٹیٹ حکومت سے ہے۔ اس ٹرسٹ کا نام یونین ٹیکنیکل فلم ٹرسٹ ہے اور اس کا صدر دفتر شہر ماسکو کے پاس ایک قصبے میں قائم ہے اس ٹرسٹ نے بڑے پیمانے پر اپنے نگار خانے بنوا رکھے ہیں جن میں ہر طرح کی فلمیں بآسانی تیار کی جاتی ہیں۔

۱۹۲۷ء کی دوسری پنجسالہ اسکیم کے اجراء کے وقت اس ٹرسٹ کی عمارتیں تیار کی گئی تھیں۔ جو روس کے جدید فن تعمیر کا نمونہ ہیں۔ اس ٹرسٹ کے ساتھ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی سیر و تفریح کے لئے ایک باغ کے علاوہ ایک بستی پاور ہاؤس اور نگار خانوں کی مشینوں کی مرمت کے لئے ایک انجن گھر بھی موجود ہے۔

جمہوریۂ روس ملک کی تعلیم و ترقی میں صنعتِ فلم سازی سے خاص امداد لے رہی ہے، اور روس کے فلم ساز اپنے حلقۂ عمل میں ملک کی گرانبہا خدمت انجام دے رہے ہیں، روس کے طویل و عریض مملکت اور دور دراز دیہی آبادیوں میں جس قسم کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے فلم سازی کا یہ مرکز ویسی ہی فلمیں تیار کرتا ہے۔

مثلاً روس کو جاپان کی طرف سے ہوائی حملوں کا خطرہ رہتا ہے جس سے ملک کو آگاہ اور ہوشیار رکھنے کیلئے برابر ایسی فلمیں تیار ہوتی رہتی ہیں جنہیں دیکھ کر اہل روس کو یہ معلوم ہوتا رہتا ہے۔ اگر جاپان روس پر ہوائی جہازوں کے ذریعہ بمباری شروع کر دے تو اہل روس اپنے جان و مال کی حفاظت کس طرح کر سکتے ہیں؟

اسی طرح مختلف ممالک کی سیاسی جدو جہد اور ان کے روس پر پڑنے والے اثرات کے متعلق فلمیں تیار کر کے روس فلم نسانہ اخباروں کی نسبت اہل ملک کو کہیں زیادہ باخبر اور ہوشیار رکھتے ہیں

یہ ٹرسٹ اپنے فلموں میں تفریح کے ساتھ تعلیم کا بالخصوص لحاظ رکھتے ہیں۔ چنانچہ روس کا یہ فلم ٹرسٹ سیاسی فلموں کے علاوہ ایسی فلمیں بھی تیار کرتا رہتا ہے جن کے دیکھنے سے اہل ملک کی سائنٹفک اور جغرافیائی معلومات میں اضافہ ہو، بچوں کو معلومات بہم پہنچانے والی فلمیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ جن فلموں کے ذریعہ بچوں کو ملک کی سیاست یا اور کسی خاص موضوع کی تعلیم مقصود ہوتی ہے اس کی تیاری میں خاص غور و فکر سے کام لیا جاتا ہے۔ چونکہ بچوں کی دلچسپی ایک چیز کے ساتھ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ اس لئے ان کے لئے جو فلمیں تیار کی جاتی ہیں ان کا طول سو فیٹ سے زیادہ نہیں ہوتا۔

ماسکو کا مرکزی محکمۂ فلم سازی اپنے اداکاروں کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام رکھتا ہے، اور وہاں مختلف صنعت و حرفت کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اور ان کی فلمیں تیار کر کے ملک میں دکھائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایسی فلمیں خصوصیت کے ساتھ تیار کی جاتی ہیں۔ جن میں موٹر ڈرائیوری، ریلوے ڈرائیوری اور دوسری مشینوں کے استعمال کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ اس طرح فلموں کے ذریعہ اہل ملک کو کم سے کم وقت میں مشینوں کے استعمال کا طریقہ بہتر سے بہتر طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔

ہر سال ملک کے تمام فلمی اداکاروں اور ڈائرکٹروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوتی ہے جس میں تمام چھوٹے بڑے اداکاروں اور ڈائریکٹروں کے کاموں پر تنقید و تبصرہ کیا جاتا ہے اور صنعت فلم سازی کو مشترکہ اصولوں پر ترقی دینے کے طریقوں پر غور و خوض کیا جاتا ہے۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے وقت وہاں سینما خانوں کی تعداد سات ہزار ایک سو تھی مگر اس وقت روس میں پینتیس ۳۵ ہزار سینما خانے موجود ہیں۔ فلم سازی کی اس غیر معمولی ترقی کا باعث

یہ ہے کہ جمہوریہ روس نے فلم سازی کی ملکی ترقی کا ایک خاص ذریعہ قرار دے دیا ہے۔

روس میں مقامی سینما خانوں کے علاوہ گشتی سینما خانے بھی ہیں، جن کے ذریعہ دور دراز دیہاتوں میں بھی فلموں کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔ روسی سینما خانے علی العموم سیدھے سادے طرز کے ہوتے ہیں۔ روسی حکومت ملک کی دولت کو بے فائدہ نمود و نمائش پر ضائع نہیں کرتی۔

فلموں کی نمائش سے جو آمدنی ہوتی ہے، وہ ستر فیصدی سینما خانے والوں کے حصے میں آتی ہے۔ اور باقی میں سے ۲۰ فیصدی فلم ساز اور دس فیصدی فلم کے اشاعت کنندہ کمپنیوں کو ملتی ہے۔

دنیا کی عظیم ترین دوربین

کیلیفورنیا کے ایک پہاڑ پر جو سمندر کی سطح سے ۶۱۲۶ فٹ بلند ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی دوربین نصب کی جا رہی ہے۔ ماہرین نجوم بڑی بیتابی سے اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب انہیں اس دوربین کے ذریعہ ستاروں کا مطالعہ اور معائنہ کرنے کا موقعہ ملے گا۔ اس دوربین میں جو شیشہ نصب ہے۔ اس کا قطر ۱۲۰ انچ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آسمان میں ابھی پچاس کروڑ تارے ایسے ہیں جو اب تک بڑی سے بڑی اور بہتر سے بہتر دوربینوں کے ذریعہ بھی دیکھے نہیں جا سکے ہیں، مگر اب اس جدید دوربین کی امداد سے یہ تمام ستارے بخوبی نظر آنے لگیں گے۔

جو ستارے زمین سے قریب تر ہیں ان کے متعلق نئے نئے انکشافات کی توقع کی جا رہی ہے۔ مشتری ستارے کے متعلق ایک تحقیق طلب امر یہ ہے کہ اس ستارے میں جو تیس ہزار میل اور سات ہزار میل چوڑا سرخ نشان نظر آتا ہے، وہ کیا چیز ہے؟

دوسرا تحقیق طلب سوال یہ ہے کہ مریخ میں نہروں کی طرح جو چیز دکھائی دیتی ہے وہ نہریں ہی ہیں یا کچھ اور؟

تیسرا مسئلہ جو تاہنوز حل طلب ہے یہ ہے کہ کیا دمدار ستارے واقعی چاند پر مسلسل بمباری کرتے رہتے ہیں؟

اس سلسلے میں نمایاں ترین انکشافات چاند کے متعلق ہو سکیں گے، جو تمام ستاروں کی نسبت زمین سے قریب تر واقع ہے۔ اس وقت زمین اور چاند کے درمیان کے فاصلے کا تخمینہ ۲۴۰۰۰۰ میل بتایا جاتا ہے، مگر اس دوربین کی امداد سے یہ فاصلہ صرف ۲۵ میل رہ جائے گا۔ یعنی اس دوربین کے ذریعہ چاند اس قدر صاف نظر آئے گا، گویا وہ صرف ۲۵ میل کی دوری پر واقع ہے۔

نیند میں مطالعہ

سین فرانسسکو کے ایک سائنسدان نے جس کا نام ایلمر ایچ باؤن ہے۔ ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ انسان نیند کی حالت میں بھی پڑھ سکتا ہے۔ باؤن کا قول ہے کہ وقت کا کوئی حصہ ضائع نہ کرنا چاہیئے اور سونے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اسے بھی کام میں لانا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ کام کی حالت میں تو دماغ کو آرام کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے۔ لیکن نیند کی حالت میں دماغ کو آرام کی ضرورت نہیں۔

مسٹر باؤن نے ایک گراموفون بنایا ہے جو بجلی کے ذریعہ چلتا ہے اور ایک ٹوپی تیار کی ہے۔ جس میں فون لگا رہتا ہے۔ اس فون سے گراموفون تک ایک تار ہوتا ہے۔ پڑھی جانے والی چیز خواہ وہ کسی کالج کا لکچر ہو یا کوئی کتاب یا ریکارڈ ہو گراموفون پر لگا دیا جاتا ہے تو اس تار کے ذریعہ جو گراموفون سے سر کی ٹوپی کے فون تک لگا رہتا ہے ریکارڈ کی ساری باتیں سونے والے آدمی کے دماغ میں پہنچتی رہتی ہیں۔ یہ تمام باتیں اسی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہیں جس طرح لکھی ہوئی باتیں پڑھنے کے بعد دماغ میں محفوظ رہتی ہیں۔

ادارہ

بقیہ تبصرات

ذکر ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ تصویروں اور آئینوں کے چوکھٹے۔ پنکھیں۔ دستانے کیس۔ ریکیں۔ گلدان۔ قلمدان۔ الماریاں۔ اسٹیشنری کیس۔ معلق کیس۔ گھڑیوں کے خوبصورت بنگلے۔ مکان۔ جملہ قسم کے فینسی صندوقچے۔ گھنٹیاں۔ گھڑیوں کے کیس اور اسٹینڈ۔ گراموفون اور وائرلیس کے بکس۔ لیمپ کے شیڈ۔ ہوائی اور بحری جہاز اور کھلونے وغیرہ کس طرح لکڑی سے بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ رسالہ مفید اور کارآمد ہے۔ اور یقین ہے کہ ہندوستان کی صنعتی دنیا میں بہت زیادہ مقبول ہوگا۔

طالب فارسی

تبصرات

ماہنامہ "ہل" الہ آباد تقطیع $\frac{30\times 20}{8}$ حجم ۱۰۴ صفحات۔ ایڈیٹر شری ناتھ سنگھ پبلشرز انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد کی طرف سے جاری ہوا ہے۔ یہ ماہنامہ دیہات سدھار تحریک کے متعلق ہے۔ مضامین پُر از معلومات ہوتے ہیں۔ اور ہر مضمون کے متعلق تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ زیر نظر پرچہ میں "غریب کا دل" "جنگل ہمارے لئے کیوں ضروری ہیں"۔ "اسکول کے لڑکوں کے لئے دودھ" "اچھا کنواں بنوائیے"۔ اور ہز ایکسیلنسی وائسرائے کی تقریر نہایت اچھے مضمون ہیں۔ نظمیں صرف تین ہیں۔ مگر تینوں مفید اور کارآمد ہیں۔ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس رسالہ کا اگر موجودہ معیار برقرار رہا۔ تو اس کا مطالعہ کسانوں اور کاشتکاروں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

ماہنامہ "منزل" دہلی تقطیع $\frac{30\times 20}{8}$ حجم ۹۶ صفحات۔ ایڈیٹر سید محمود مؤرخ بی اے اور صاحبزادہ عالمگیر مرزا ارشد دہلوی۔ کاغذ عمدہ۔ قیمت سالانہ ؏۔ قیمت فی پرچہ ۳؍۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر ماہنامہ "منزل" بلیماراں دہلی۔

یہ نیا رسالہ دہلی سے جاری ہوا ہے۔ زیر نظر پرچہ میں تین نظمیں دو افسانے اور چھ مضمون ہیں۔ مضامین کی نسبت نظموں کا معیار پست ہے۔ افسانے اخلاق آموز اور نتیجہ خیز ہیں۔

مذہبیات میں بھی حصہ لیا جاتا ہے۔ تمام مضامین میں "خواجہ محمد شمس الدین حافظ شیرازی" بہت اچھا مضمون ہے۔

اگر کوشش کی گئی تو یہ رسالہ کامیاب ہو جائیگا۔

"تعلیمی گزٹ" نئی دہلی تقطیع $\frac{30\times 20}{8}$ حجم ۲۴ صفحات۔ کاغذ عمدہ۔ لکھائی چھپائی بہترین۔ قیمت سالانہ

یہ بچوں کا رسالہ ہے اور محکمہ تعلیم صوبہ دہلی میں منظور ہے۔

حضرت اخلاق دہلوی اور پروفیسر ایم اے قریشی دہلوی ایچ۔ یو۔ کے۔ پی اے۔ یو ایڈیٹر ہیں۔ اور جائنٹ ایڈیٹر محمد اکرم علی خاں درانی ہیں۔ زیر نظر پرچہ میں دو نظمیں اور گیارہ مضامین ہیں۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے۔ کہ ایڈیٹر صاحبان نے تاریخ ہند کے ابتدائی حصے نقل کر دیئے ہیں۔ بچوں کے مضامین ویسے ہی خشک ہوتے ہیں اور پھر تاریخ تو ایسا روکھا پھیکا مضمون ہے کہ جب تک اس کے ساتھ بچوں کی دلچسپی کے دوسرے سامان نہ ہوں۔ وہ خوش ہو کر پڑھ سکتے ہی نہیں۔ ہمیں تعجب ہے۔ کہ یہ رسالہ اگر ہمیشہ اسی قسم کے مضامین شائع کرتا ہے تو محکمہ تعلیم نے کیونکر منظور کر لیا۔

"ہماری زبان" تقطیع $\frac{27\times 17}{8}$ حجم ۱۶ صفحات۔ کاغذ عمدہ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ پندرہ روزہ اخبار۔ قیمت سالانہ ایک روپیہ۔ فی پرچہ ایک آنہ۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی کا یہ پندرہ روزہ اخبار ہے۔ اُردو زبان کی نشر و اشاعت کا علمبردار ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق بی اے سیکرٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب خدماتِ ادب اُردو میں اظہر من الشمس ہیں۔ اور آپ کی ذات سے ادب اُردو کو جو وسعت ملی ہے۔ ارباب علم اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اب آپ نے ادبیاتِ اُردو کی تقویت کے لئے "ہماری زبان" کا ایک نیا اور بہترین ذریعہ پیدا کیا ہے۔ اور یقین ہے یہ ذریعہ بہت کامیاب ثابت ہوگا۔

"ہماری زبان" کے مضامین ٹھوس اور پُر از معلومات ہوتے ہیں عریاں اور فضول مضامین کی اشاعت سے گریز کیا جاتا ہے۔ اس پرچہ کو بوڑھے۔ بچے۔ نوجوان اور عورتیں سب پڑھ سکتے ہیں۔

زیر نظر پرچہ میں "ہندوستانی کیا ہے"۔ "اُردو اور ناگری رسم الخط" بہت اچھے مضمون ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ "ہماری زبان" کے ذریعہ اُردو ادبیات میں بہت بڑا اضافہ ہوگا۔ حامیانِ ادب اُردو کو چاہیئے۔ کہ ضرور اس پرچہ کی بقاء حیات کے سامان پیدا کریں۔

"مدینہ" جوبلی نمبر تقطیع $\frac{26\times 20}{4}$ حجم ۱۴۶ صفحات قیمت ۸؍ مقام اشاعت بجنور۔ "مدینہ" کا جوبلی نمبر بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ ۲۳ تصاویر اور ۷۸ مضامین نظم و نثر کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ ۴۹ علمی، ادبی، تاریخی اور سیاسی مضمون ہیں دو افسانے اور ۲۷ نظمیں ہیں۔ ان میں سے "اُردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا نتیجہ ہے" "دوراہیں" "اسلامی تہذیب" "جہالت کی تاریکی" "اسلام کا معاشی نظام" "ہمارے حوصلے کہاں لے جانا چاہتے ہیں" "اُردو کی عشقیہ شاعری" "وسطی زمانے کا ہندوستان"

"گزشتہ صدی میں ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام" بہت اچھے مضمون ہیں۔ اور نظموں میں عرش تیموری اور ماہرالقادری کی اچھی نظمیں ہیں۔ مختصر یہ کہ اخبارات کے خاص نمبر اس معیار کے مضامین بہت کم شائع کرتے ہیں۔ ذخیرۂ ادب میں اس کی بدولت مفید اضافہ ہوا ہے۔

"بیسویں صدی" کا عورت نمبر

تقطیع ۲۰×۳۰/۸ کاغذ عمدہ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ سرورق رنگین۔ قیمت ۸/ مقام اشاعت لاہور

بیسویں صدی کا یہ نمبر اپنے پچھلے خاص نمبروں کی طرح ہوش رُبا مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ عورتوں کے لئے بہت اچھے مضامین مہیا کئے گئے ہیں اور نتیجہ خیز افسانے زینت رسالہ ہیں۔ حضرت خوشتر گرامی کی مساعی قابلِ تحسین ہیں۔

تصویرِ احساس

تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۹۶ صفحات۔ پبلشرز اُردو اکیڈمی پنجاب بیرون لوہاری دروازہ لاہور قیمت ۱۲/

یہ حضرت الطاف مشہدی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ الطاف مشہدی کے نام سے کون واقف نہیں۔ آپ موجودہ دور کے نوجوان شاعر ہیں۔ ان کو سلیم المزاجی کے ساتھ جوشیلی طبیعت ملی ہے۔ ان کا کلام اصلی جذبات کا آئینہ دار اور شبابیات کا خمخانہ ہوتا ہے۔ ان کے دل میں وطن کی محبت ہے۔ اس لئے وطنیت کے جذبات بدرجہ اُتم اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ وہ جب سرمایہ داری کے ظلم، بے روزگاری اور محنت کی بے قدری دیکھتے ہیں۔ تو ان کا دل خون ہوجاتا ہے۔ اور مزدور کی حمایت کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

حضرت الطاف کے کلام میں سوز، درد، جوش اور ولولہ ہے لیکن ان کے کلام کی وسعت میں محبت کی دنیا محدود نہیں۔ بلکہ یہ دائرہ ان کے جذبات کی وسعت کی بدولت از خود وسیع ہو گیا ہے۔ وہ ایک پھول سے محبت کرنا نہیں جانتے۔ بلکہ ان کو سارے چمن کے ساتھ مخلصانہ ہمدردی اور محبت ہے۔ ایک پھول کے مرجھانے پر اُن کو کبھی کسی نے افسوس کرتے ہُوئے نہ دیکھا ہوگا۔ بلکہ سارے چمن کی خزاں پر اشکبار رہتے ہیں۔

الطاف کی شاعری میں گل و بلبل کے قصے۔ عیش و نشاط کی طربناکیاں ہجر و وصال کی داستانیں بہت کم ہیں۔ البتہ مزدوروں اور کسانوں کی تکلیف کا احساس شدت کے ساتھ موجود ہے۔ اُن کے نغموں میں مظلوموں کی حمایت کا چشمہ اُبل رہا ہے

کتاب کی جلد بہت اچھی ہے۔ پبلشر نے بھی کتاب کی طباعت کے انتظام میں سلیقہ شعاری کا ثبوت دیا ہے۔

"اندھی دنیا"

تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۵۷ صفحات۔ کاغذ عمدہ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت ایک روپیہ طابع و ناشر مکتبہ جہاں نما۔ اُردو بازار جامع مسجد دہلی۔

حضرت اختر انصاری کے ۲۴ اخلاقی اور سبق آموز افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آج سے چند سال پیشتر ہم اختر صاحب کو صرف شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اور کامیاب شاعر سمجھے جاتے تھے لیکن ۱۹۳۳ء میں آپ نے افسانوی دنیا میں قدم رکھا۔ اور آپ کے افسانے مقبول ہُوئے۔

آج کل مختصر افسانہ نویسی اُردو میں بہت زیادہ ترقی کر رہی ہے۔ اور بہت زیادہ اچھے لکھنے والے پیدا ہوچکے ہیں۔ افسانے کے مجموعے بھی بکثرت شائع ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں یہ کہنا تو غلط ہوگا۔ کہ اختر انصاری کے افسانوں کا مجموعہ نوعیت کے لحاظ سے پہلا ہے۔ (البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اختر انصاری بھی مختصر افسانے اچھے لکھتے ہیں اور یہ مجموعہ دیکھنے کے قابل ہے۔

"وصلی کی دستکاریاں"

تقطیع ۱۸×۲۲/۸ حجم ۵۶ صفحات۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت ۸/

ملنے کا پتہ:۔ عصمت بک ڈپو دہلی۔

یہ مختصر مگر پُر از معلومات کتاب عصمت بک ڈپو دہلی کی طرف سے شائع ہوئی جس کے مؤلف سید رضا احمد صاحب جعفری اکبرآبادی ہیں۔

ہندوستان کی صنعتی پستی کے پیش نظر اسی قسم کی کتابوں کی اشاعت بہت زیادہ ضروری ہے۔ اس میں ان صنعتوں کی وضاحت کی گئی ہے جو وصلی سے تیار ہوتی ہیں۔ جن جن چیزوں کے بنانے کا طریقہ بتایا گیا ہے جا بجا ان کے نقشے بھی پیش کئے گئے ہیں۔

مؤلف نے نہایت تحقیق سے وصلی کی دستکاریوں کے لئے مواد فراہم کرکے ملک و قوم کے لئے پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ وصلی سے کس کس طرح فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں کتاب بہت مفید ہے اور اس پر عمل کرنے سے بیکار برسرکار ہو سکتے ہیں۔

"لکڑی کا باریک کام"

تقطیع ۱۸×۲۲/۸ حجم ۵۸ صفحات۔ کاغذ عمدہ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت ۸/

ملنے کا پتہ:۔ عصمت بک ڈپو۔ دہلی۔

اس رسالہ کے بھی مؤلف سید رضا احمد صاحب جعفری اکبرآبادی ہیں۔ لکڑی کی باریک اور مفید دستکاریوں کا تفصیل کے ساتھ اس میں

(بقیہ صفحہ ۲۱۷ پر دیکھیے)

نگران :-
پروفیسر تاجور
نجیب آبادی

شاہکار لاہور

ایڈیٹر :-
خواجہ محمود جاوید
ایم - اے

چندہ
سالانہ چھ روپے ششماہی تین روپے آٹھ۔ نادار خریداروں سے للعہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی نمونہ پانچ آنے

جلد (۹) | فہرست مضامین بابت ماہ جولائی ۱۹۳۹ء | نمبر (۴)

تصاویر :- (سہ رنگی) (۱) التجائے محبت۔ (یک رنگی) (۲) علامہ راشد الخیری۔ (۳) مسٹر صادق الخیری ایم - اے

[illegible] میں چھپوا کر دفتر شاہکار واقع مکان میاں علی محمد مہا علی محمد سٹریٹ (۵) ہسپی سیڈن خاص بل محمد روڈ لاہور

مختصرات

انٹرنس کا نتیجہ

اس سال میٹرک کے امتحان میں اٹھارہ ہزار طلبہ کامیاب ہوئے ہیں۔ صوبے کے بہت سے اسکولوں نے شاندار نتائج دکھاتے ہوئے اپنی روایات کو قابلِ تحسین حد تک قائم رکھا جن اسکولوں نے امتیاز حاصل کیا ہے۔ ہم اُن کے قابل ہیڈ ماسٹروں محنتی اور ایثار شیوہ استادوں کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ شاندار نتیجہ حاصل کرنے کی خاطر اچھے اسکولوں کے اساتذہ تمام سال اپنی زندگی کا آرام قربان کر کے دن رات طلبہ کو امتحان کی تیاری کراتے رہتے ہیں۔ صوبے میں ایسے مدارس کی تعداد درجنوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ جنہوں نے میٹرک کے امتحان میں امیدوار طلبہ کا ایک لشکر بھیجا اور سو فی صدی یا اس کے لگ بھگ نتیجہ دکھایا۔

یہ واقعہ ہے کہ ہندو اور سکھ قوم کے مدارس میں ایسے اسکولوں کی تعداد زیادہ ہے۔ جن کے شاندار نتیجے انہیں امتیازی حیثیت بخشتے ہیں۔ ایسے اسلامی مدارس جن کی عنانِ نظم و نسق ذمہ دار ہیڈ ماسٹروں کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے نتائج بھی بہت شاندار نکلے ہیں۔ لیکن افسوس اور رنج کے احساس سے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے اسلامی مدارس کی تعداد بہت محدود ہے۔ پرائیویٹ مسلم اسکولوں میں ایسے مدارس کی بالخصوص کمی ہے۔

لاہور کے سناتن دھرم ہائی اسکول، دیال سنگھ ہائی اسکول ڈی۔ اے۔ وی ہائی اسکول، دیال سنگھ ہائی اسکول کے نتیجے حسب دستور قابلِ فخر ہیں۔

مذکورہ بالا مدارس ہر سال طلبہ کا ایک جمِ غفیر امتحان میں بھیجتے ہیں اور پھر بھی شاندار نتائج دکھاتے ہیں۔ ہم ان اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں۔ خصوصاً مسلم ہائی اسکول لاہور کے فاضل ہیڈ ماسٹر مولانا محمد یعقوب خان صاحب اُن کے دستِ راست مولانا عزیز الدین صاحب سیکنڈ ماسٹر اور دیگر اساتذہ قوم کی جانب سے دلی سپاس کے مستحق ہیں کہ علم و تعلم سے مسلم طلبہ کی روایتی بے شوقی کے باوجود وہ قابلِ تعریف ضبط و شبانہ روز جاں فشانی و دماغ سوزی سے اس امتحان میں اپنے اسکول کے امتیاز کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ افسوس ہے کہ اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ کو مولانا محمد الدین مرحوم کے بعد کوئی دوسرا محمد الدین میسر نہ آسکا۔

مدرسین کی حالتِ زار

پنجاب کے بعض اضلاع سے حضرات مدرسین اپنی کس مپرسی اور بدحالی کے دلدوز حالات ہمیں بھیج رہے ہیں۔ چند ڈسٹرکٹ بورڈوں سے قطع نظر عام طور پر اپنے ماتحت مدارس کے استادوں سے بورڈوں کا سلوک حد درجہ غیر منصفانہ اور قابلِ ملامت ہے۔ اساتذہ کی بے کس جماعت اپنے آقاؤں سے قدر شناسی کی توقعات تو چوتھائی صدی سے منقطع کر چکی ہے۔ لیکن ستم یہ ہے کہ اب انہیں زندگی کی ابتدائی ضروریات فراہم کرنے کا مستحق بھی نہیں سمجھا جاتا۔ قومی تعمیر کے اصلی معمار ہمارے استاد ہیں۔ استادوں کے لئے طمانیت اور فارغ البالی کی ضرورت سب سے مقدم اور سب سے اہم ضرورت ہے۔ پامال اور بدحال اساتذہ ملک کے بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح معنی میں نہیں کر سکتے۔ ان کی شکستہ حالی سے خود اُن کو اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا بچوں کی آئندہ زندگی اس سے نقصان اُٹھاتی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ تعلیمات کے اربابِ نظم و نسق یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی استاد ہی کی ہستی کو کائنات کی سب سے غیر ضروری چیز تصور کئے ہوئے ہیں۔

لیکن استادوں کی یہ بے بسی در حقیقت انہیں کی خود فراموشی کا نتیجہ ہے۔ اُن میں عزت سے زندگی بسر کرنے کا احساس نہیں۔ وہ بے زبان چوپایوں کی طرح اپنے آقاؤں کی بے نیازی و بے اعتنائی کے جور برداشت کر رہے ہیں۔ اور ذرا نہیں شرماتے کہ ان کا یہ مویشیانہ خوف اُن کے آقاؤں میں فرعونیت اور غیر انسانی

بد دماغی اور غرور میں جانوروں کی سی بے بسی اور خود فراموشی میں اضافہ کر رہا ہے۔ اساتذہ اگر اپنے فرائض تعلیم و تربیت کو صحیح طور پر انجام دیتے ہوئے شیرانہ جرأت کے ساتھ اپنے ان نام نہاد خود ساختہ خداؤں کی خدائی سے انکار کر دیں۔ تو خدائے حقیقی اُن کی اس جرأت کو کبھی رائگاں نہ کرے گا۔ ضرورت ہے تنظیم اور سنگھٹن کی۔ باہمی تنظیم اجتماعی زندگی کے لئے رزق پانی ہوا اور روشنی سے زیادہ ضروری ہے۔ اور حسرت ہے کہ استادوں میں اسی کی کمی ہے کمی کیا ان کی زندگی کی یہ ابتدائی ضرورت سرے سے مفقود ہے۔ بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن اسی لئے قائم ہوئی تھی۔ اس انجمن کے چند روزہ قیام کے شاندار نتائج ہے جس استادوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ جہاں جہاں اس انجمن کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ وہاں کے استادوں میں احساس غیرت و خودداری پیدا ہو چکا ہے۔ انہوں نے اسی احساس کے زیر اثر اپنی جماعتی تنظیم کر لی اور متعلقہ افسران اور محکمے کی توجہ کو جھنجوڑ ڈالا ہے۔ ان کی تنظیم ہی کا صدقہ ہے کہ افسران تعلیم اور بورڈوں کے بے نیاز ممبر اُن کے حقوق کو نظر انداز کرتے ہوئے جھجکنے لگے ہیں۔ اور اگر اسی جرأت اور بے جگری سے وہ اپنی تنظیم میں لگے رہے تو اپنے تمام حقوق حاصل کر کے رہیں گے۔

لیکن اکثر اضلاع کے اساتذہ بیجا خوف کے سبب اپنی تنظیم کے تصور سے گھبراتے ہیں۔ حالانکہ بعض اضلاع میں حکومت پسند افسران اشارات اور انفرادی تنبیہات سے استادوں کو جماعتی تنظیم سے روک رہے ہیں۔ لیکن روکنے والوں سے زیادہ وہ ڈرپوک اور زیادہ ذلیل ہیں جو اس جائز حق سے دست بردار نظر آتے ہیں۔

ہوشیار پور کے رستم دوراں نے ڈرانے دھمکانے اور نقصان پہنچانے میں کون سی کسر باقی رکھی تھی۔ لیکن آفرین ہے وہاں کے اساتذہ کو کہ اُنہوں نے موسیٰ صفت اس کی فرعونیت کا چیلنج قبول کیا اور صد آفرین ہے مرکزی یونین کے بہادر رہنماؤں کو کہ انہوں نے اس کے علی الرغم مرکزی یونین کا اجلاس وہیں منعقد کیا اور ہوشیار پور میں یونین کی شاخ قائم کر دی۔ یہ انہیں کی ہمت اور بے جگری کا نتیجہ ہے کہ محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر اور تعلیمات کے آنریبل وزیر نے ان کے اس جائز حق کو تسلیم کیا اور اُس بد دماغ بلکہ بے دماغ فرعون کے نعرے یکسر ٹھنڈے کر دئے۔

یہ تھا جماعتی تنظیم کا کرامتی اثر۔ ہوشیار پور کی مثال ایک سبق ہے۔ اُن خوف زدہ اور جور پرست استادوں کے لئے جو اپنے فانی خداؤں کی تلخ نگاہی کو عتاب آلہی تصور کر کے اپنے اضلاع میں بورڈ ٹیچرز یونین قائم کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ جب تک وہ اس کفر میں (کیوں کہ بیجا خوف کفر سے بھی بدتر ہے) مبتلا رہیں گے۔ اُن کی پامالی اُن کا نوشتۂ تقدیر بنی رہے گی۔ کریم النفس افسران نے اپنے اضلاع میں نہ صرف ٹیچرز یونین قائم کرنے میں امکانی امداد سے بھی دریغ نہیں کیا۔ بلکہ اس مفید تحریک کو تعلیمات اور محکمے کے لئے مفید خیال کرتے ہوئے اس کی سرپرستی اور قدر افزائی کی ہے۔

پنجاب اور بنگال میں کانگریسی وزارتیں

کانگریسی مسلمان اس کے تمنائی ہی نہیں بلکہ ساعی بھی رہتے ہیں کہ پنجاب اور بنگال میں کانگریس وزارتیں قائم ہو جائیں۔ وہ اسٹیج پر ہنگامہ آرا تقریریں اور اخبارات میں طول طویل مقالات شائع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان دونوں صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کے قیام کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ہمارا خیال ہے۔ کہ کانگریسی مسلمانوں نے کبھی اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی زحمت نہیں کی۔

فیڈریشن کے متعلق لیگی مسلمانوں کا نقطۂ نظر تو واضح ہے لیکن کانگریسی مسلمان بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ فیڈرل حکومت مسلمانانِ ہند کیلئے نقصان رساں اور تباہ کن ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کے جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور جہاں مسلم وزارتیں قائم ہیں یا قائم ہو سکتی ہیں، فیڈرل حکومت کے اندر ان صوبوں کے مسلمانوں کی اکثریت بھی اقلیت میں تبدیل ہو جائے گی اور ان صوبوں کے مسلمانوں کی حاکمانہ فوقیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ بالکل یہی نتیجہ پنجاب اور بنگال میں کانگریسی وزارتوں کے قیام کا ہوگا۔

کانگریس ہندوستان کا ایک ملک گیر سیاسی ادارہ ہے۔ جس میں ہندوؤں کی بے پناہ اکثریت ہے اور جس کی زمام اقتدار تمامتر گاندھی جی کے ہاتھ میں ہے۔ جن کی فرقہ پروری طشت از بام ہو چکی ہے، یا ان متعصب اور فرقہ پرست لوگوں کے ہاتھوں میں جن کی مہاسبھائی ذہنیت اب راز درون پردہ نہیں رہی، اور جو گاندھی جی کے ہر جائز و ناجائز ایما کو اشارۂ غیب سے کسی طرح

کم نہیں سمجھتے، اس لئے پنجاب اور بنگال میں کانگریسی وزارتوں کے قیام کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان دونوں مسلم صوبوں میں کانگریس کی اور بالفاظ دیگر ہندو سبھائیوں کی حکومت قائم ہو جائے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کے جن صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہیں۔ ان کی عنان اقتدار و اختیار تمام تر کانگریس کے ہاتھ میں ہے اور کانگریس سے مراد جو کچھ ہے، وہ سبھاش چندر بوس اور گاندھی جی کی ذہنیت سے ظاہر ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں یہ نتیجہ نکالنا بعید از حقیقت نہ ہوگا۔ کہ اگر پنجاب اور بنگال میں کانگریسی وزارتیں قائم ہو جائیں تو ان صوبوں میں وہی لوگ حکومت کر سکیں گے۔ جن کو گاندھی، پٹیل اور راجندر بابو وغیرہ حکومت کیلئے منتخب کریں گے۔

آسام کی مثال ہمارے سامنے ہے، کانگریسی وزارت کے قیام سے پہلے آسام کا وزیر اعظم مسلمان تھا، لیکن جیسے ہی وہاں کانگریس وزارت کا قیام عمل میں آیا۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ اس مسلم صوبے کے تمام مسلمان وزارت عظمےٰ کے ناقابل قرار دیدئے گئے اور چیف منسٹری کی کرسی گاندھی جی کے ایک پرستار گوپی ناتھ بارڈولوئی کے حوالہ کر دی گئی۔

فرض کر لیجئے کہ کانگریس نے بڑی رواداری اور انصاف پسندی سے کام لیا اور پنجاب اور بنگال کی وزارت عظمےٰ کا قلمدان مسلمانوں کو تفویض کر دیا، تو اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ مسلمان وزراء بھی کانگریس کی محکومیت اور گاندھی جی کی پرستش پر مجبور نہ ہوں گے۔

بہر نوع پنجاب اور بنگال میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہو گئیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ فیڈرل حکومت کے قیام اور اس میں مسلمانوں کی شرکت سے۔ پہلے ہی ہندوستان کے تمام صوبوں میں مسلم اکثریتوں کا یکسر خاتمہ ہو جائے۔ اور پورے ملک پر بلا شرکت غیرے گاندھی جی کی حکومت کا علم لہرانے لگے۔

ہمیں امید ہے کہ کانگریسی مسلمان اس صورت حال پر غور کرینگے اور پنجاب و بنگال میں کانگریسی وزارت کے قیام کی کوشش کر کے قومی خودکشی کے مرتکب نہ ہوں گے۔

حیدرآباد آریہ ستیہ گرہ

ریاست حیدرآباد میں ہندوؤں کو جو مذہبی آزادی حاصل ہے، وہ کسی ہندو ریاست میں مسلمانوں کو میسر نہیں۔ برطانوی ہند کی طرح حیدرآباد کے ہندو بھی اپنے تمام مذہبی فرائض کی ادائیگی کیلئے آزاد ہیں۔ ان پر ریاست کی طرف سے کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہے۔ ہندوؤں کے اکثر بیشتر مندروں اور مٹھوں کو ریاست کی طرف سے بڑی بڑی جاگیریں ملی ہوئی ہیں۔

جس وقت حیدرآباد عدالت العالیہ کی تعمیر ہو رہی تھی اس کے حلقے میں ایک چھوٹا سا مندر آ گیا۔ خود ہندو اکابر کی رائے تھی کہ مندر کو احاطۂ عدالت سے دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے لیکن حضور نظام نے نہ صرف یہ کہ مندر کو وہاں سے ہٹانا گوارا نہیں فرمایا بلکہ اس کیلئے ایک شاندار عمارت تعمیر کرا کے عدل نوشیروانی کی حکایت کو عطا فرما دی۔

ایک بار مندر کی متعدد مورتیاں چوری چلی گئیں، حضور نظام کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ نے جہاں مورتوں کی تلاش و جستجو کا حکم صادر فرمایا۔ وہاں یہ بھی حکم دیا کہ سرکاری صرفے سے دوبارہ مورتیں تیار کرا دی جائیں۔

حضور نظام کے چشمۂ جود و سخا سے جہاں مسلم درسگاہیں سیراب ہو رہی ہیں۔ وہاں شانتی نکیتن، دیانند کالج ہندو یونیورسٹی، کنز و ہسپتال، ہری منی گرلز اسکول، وغیرہ کتنے ہندو ادارے بھی فیضیاب ہو رہے ہیں۔ "مہابھارت" ایک خالص ہندو مذہبی کتاب ہے لیکن حضور نظام نے اس کی اشاعت کے لئے بھی دس سال تک کے لئے ایک ہزار روپے سالانہ کی امداد منظور فرما کر ثابت کر دیا کہ ایک حکمران کی حیثیت سے وہ مذہبی امتیاز و تفرقہ سے بہت بلند ہیں۔

حضور نظام کے اس رواداری اور فیاضانہ طرز عمل کے باوجود ہندوستان کے ہندوؤں نے ریاست حیدرآباد کے خلاف تعصب اور تنگدلی کا جھوٹا پروپیگنڈا کر کے ملک بھر میں ایک طوفان برپا کر رکھا ہے، اور حیدرآباد کے خلاف ستیہ گرہ ایسی اشتعال انگیز اور امن شکن تحریک جاری کر رکھی ہے۔

آریہ کہتے ہیں کہ ریاست حیدرآباد میں ہندوؤں کو مذہبی آزادی حاصل نہیں۔ اس لئے وہ مذہبی حقوق حاصل کرنے کی غرض سے سول نافرمانی کی جنگ کر رہے ہیں، مگر یہ حیدرآباد پر ایک بے بنیاد اتہام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاست حیدرآباد ایک اسلامی

ریاست اور مسلم دور حکومت کی یادگار ہے اس لئے سبھائی ذہنیت کے ہندو اپنی اکثریت کے بل بوتے پر اُسے تباہ کر کے اُس کی جگہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ کانگریس بظاہر اگرچہ اس تحریک سے علیحدہ ہے، اور آریہ کانگریس کے نام سے حیدر آباد ستیہ گرہ کی تحریک چلائی جارہی ہے - پھر بھی اس تحریک میں آریہ سناتنی، کانگریسی، اور مہاسبھائی، ہر مسلک اور ہر عقیدہ کے ہندو شامل ہیں - اور ساری ہندو قوم اس تحریک کی اعانت میں مصروف ہے -

حیدر آباد کے واقعی حالات کیا ہیں اور آریہ ستیہ گرہ کے لیڈر کیسے کیسے غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈے کے ذریعے ہندوؤں کو پھانس پھانس کر حیدر آباد کی شرکت کیلئے آمادہ کر رہے ہیں - اس کے اندازہ کیلئے ہم دو قیدیوں کے بیانات کا ماحصل درج کر رہے ہیں -

ایک ستیہ گرہی جس کا نام پنڈت منگلا پرشاد ہے اور جو ۲۳ رضاکاروں کے جتھے کے ساتھ ستیہ گرہ کر کے ۶ مہینے ۲۲ سدن کیلئے سزایاب ہوا تھا اپنے بیان میں کہتا ہے - "میں نے اخبارات میں پڑھا تھا کہ ہندوؤں کو حیدر آباد میں مذہبی عبادت اور پرارتھنا کی اجازت نہیں ہے، اور نہ وہاں ہون کنڈ اور نہ مندر تعمیر ہوسکتے ہیں، بلکہ مندروں کو مسمار کیا جارہا ہے - حکومت ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنا لیتی ہے اور انہیں دن دہاڑے قتل کر دیا جاتا ہے، ان کی عورتوں کو عیاشی کا مشغلہ بنا رکھا گیا ہے - ہندوؤں کی دولت لوٹ لی گئی ہے - ان کے مکانوں اور جائداد کو سرکار نے ضبط کر لیا ہے -"

"لیکن جب میں جیل میں آیا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کہ خود سرکاری جیل میں ہون کنڈ بنے ہوئے ہیں - ہندو صبح شام پرارتھنا کرتے اور بھجن گاتے ہیں - جب جیل کے اندر آزادی کی یہ حالت ہے تو باہر کہاں تک آزادی نہ حاصل ہوگی - علاوہ ازیں جب میں نے ستیہ گرہیوں کو دیکھا، اور ان سے ملا تو مجھے بڑا افسوس ہوا کہ چند کے سوا باقی سب جاہل آوارہ بدمعاش اور کسائی کے ٹٹو ہیں -"

ایک اور ستیہ گرہی جس کا نام ہیرا نند شرما ہے اور جو جودھپور کے مدرسہ بصارت کاری کا مدرس ہے - اپنے بیان میں کہتا ہے - "مجھ کو آریوں اور دوسرے ہندوؤں نے آریہ ستیہ گرہ کی شرکت کیلئے کہا - میں نے پہلے تو انکار کر دیا لیکن اخبارات دیکھ کر اور لوگوں کی باتیں سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ حیدر آباد میں ظلم ہو رہا ہے، چنانچہ جودھپور کے آریہ سماجیوں نے میرے مصارف برداشت کئے، اور میں ستیہ گرہیوں کے ہمراہ ہوگیا، گلبرگہ آ کر میں نے دیکھا ہندو اور آریہ جیل کے اندر بھی پوجا پاٹ اور ہون کر رہے ہیں - مجھے سخت تعجب ہوا کہ جب جیل کے اندر اس قدر مذہبی رواداری برتی جارہی ہے، تو جیل کے باہر ہندوؤں کے مذہب پر کوئی پابندی کیونکر ہوسکتی ہے - آریہ لیڈروں کا یہ کھلا ہوا فریب دیکھ کر میں نے اپنے ڈکٹیٹر دھیندر شاستری سے کہا - یہ کیا معاملہ ہے؟ اور آپ لوگوں نے مجھے ایسا سخت دھوکہ کیوں دیا؟ انہوں نے کہا - تمہیں ہندوؤں کا ساتھ دینا چاہیئے - یہ بڑا پوتر کام ہے - میں نے کہا - کہ ان جھوٹی باتوں میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا، میں گھر جاؤں گا - انہوں نے بہت کوشش کی، مگر میں نے صاف کہہ دیا - کہ اب مجھے کافی تشفی ہوچکی ہے - اب میں یہاں ہرگز نہیں ٹھیر سکتا -"

ہم نے اخبارات میں اس طرح سے اور قیدیوں کے بیانات بھی پڑھے ہیں، ہمیں تعجب ہے کہ حیدر آباد ستیہ گرہ ایسی متہمانہ اور مفتریانہ بنیادوں پر چلائی جارہی ہے - پھر بھی نہ حکومت ہند اس تحریک کے خلاف کوئی کارروائی کرتی ہے اور نہ صوبائی حکومتیں، کانگریس بھی جو ملک کے امن و اتحاد کی دعویدار ہے خاموشی سے اس تحریک کو دیکھ رہی ہے - بلکہ انفرادی طور پر تو کانگریسی اس تحریک میں حصہ لے رہے ہیں - کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش نے ہندو مسلم تعلقات پہلے ہی سے خراب کر رکھے تھے - حیدر آباد ستیہ گرہ اس میں مزید اضافہ کا باعث ہو رہی ہے - اس لئے کانگریس اور صوبائی حکومتوں کا فرض ہے کہ حیدر آباد ستیہ گرہ جیسی اتحاد شکن اور افتراق انگیز تحریک کو روک کر ملک کی خراب فضا خراب تر ہونے سے بچائیں -

اردو کی بنیاد شدید خطرے میں

ہندوستان کی قومی زبان کے متعلق اہل ملک میں شدید اختلاف رونما ہے - اردو کے حامی اردو کو قومی زبان قرار دیتے ہیں، اور ہندی کے حامی ہندی زبان کو، کانگریس نے اردو ہندی

کے اس جھگڑے کو دور کرنے کیلئے ایک نیا نام "ہندوستانی" وضع کیا ہے اور ہندوستانی کی تعریف یہ کی ہے کہ ہندوستانی سے مراد وہ زبان ہے جسے شمالی ہند کے شہری اور پڑھے لکھے باشندے بولتے ہیں۔

حامیان اردو کا دعویٰ ہے کہ شمالی ہند میں جو زبان بولی جاتی ہے، وہ ہندی نہیں اردو ہے، لیکن ہندی کے حامی اردو کے حامیوں کے اس دعوی کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ شمالی ہند کے پڑھے لکھوں کی زبان کو اردو نہیں بلکہ ہندی قرار دیتے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھ رہے ہیں کہ زبان کے اختلاف کے ازالہ کے متعلق کانگریس کا فیصلہ بالکل ناکام ثابت ہو رہا ہے۔ اور جس پیرائے میں کانگریس نے فیصلہ کیا ہے، اس کا یہی انجام ہونا بھی چاہیئے تھا۔

شمالی ہند کے باشندوں میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے حامی موجود ہیں اور ان میں زبان کے متعلق شدید اختلاف ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ملک کا یہی خطہ اردو ہندی کے اختلاف کا مرکز ہے۔ اندریں صورت حامیان اردو کہہ سکتے ہیں کہ شمالی ہند کی زبان جس کا نام کانگریس نے ہندوستانی رکھا ہے۔ اردو ہے۔ اور ہندی کے حامی کہہ سکتے ہیں کہ کانگریس نے ہندوستانی کے نام سے جس زبان کو موسوم کیا ہے، وہ ہندی ہے۔

یہ میرا صرف خیال ہی نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ حامیان ہندی آئے دن اس دعوے کا اعلان کرتے رہتے ہیں کہ شمالی ہند کی زبان اردو نہیں بلکہ ہندی ہے۔ مثال کیلئے ہندی کے مشہور و ممتاز علمبردار "آج" اخبار بنارس کے چند مہینے قبل کا ایک افتتاحیہ جو اس نے دہلی ریڈیو اسٹیشن کی زبان کے خلاف ہنگامہ خیز پروپیگنڈے کے زمانے میں سپرد قلم کیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"آج" بنارس لکھتا ہے:

"جب کبھی زبان کا مسئلہ پیش ہوتا ہے، تو اردو کے دعویدار یہی کہتے ہیں کہ صوبہ یوپی کی بول چال کی زبان اردو ہے۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن کی عربی فارسی الفاظ سے لدی ہوئی زبان جو ہندی زبان جاننے والوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ عوام کی زبان بتائی جاتی ہے۔ ہمیں مجبور ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ ایسا کہنے والے حق و ناحق کی پروا نہیں کرتے، وہ ایک ایسی زبان کو جسکی پیدائش نوابوں کی ہے، مگر اب ہندوستانی تہذیب کی مخالف ہو گئی ہے۔ عوام کے سر لادنا چاہتے ہیں، جو ان کی سمجھ میں نہ آتی ہے نہ آ سکتی ہے۔ صوبہ یوپی کی زبان وہ نہیں ہے جو ریڈیو میں سنائی جاتی ہو یا جسے اردو کے پرستار چاہتے ہیں کہ وہ صوبے کی زبان ہو۔ اس صوبے کی بول چال کی زبان ہندی ہے۔"

"جس زبان میں مختلف اضلاع کے تعلیم یافتہ مرد و عورت آپس میں بات چیت کرتے ہیں وہ ہندی ہے نہ اردو، ہماری کتابی ہندی اور بول چال کی ہندی میں وہی فرق ہے جو کلکتہ کی بولی جانے والی بنگلہ اور بنکم بابو کی لکھی ہوئی بنگلہ میں، نہ کم نہ زیادہ، مگر یہ اردو تو کبھی نہیں ہو سکتی۔ ہاں اردو تعلیم یافتہ مسلمانوں کی زبان ہو سکتی ہے، اور ان ہندوؤں کی ہو سکتی ہے جنہیں ابتدا ہی سے الف، ب کی تعلیم دی گئی ہے۔ مگر وہ عام پڑھے لکھے لوگوں کی زبان نہ ہو سکتی ہے نہ ہے۔"

اردو کے حامی حضرات حامیانِ ہندی کی اس بحث و گفتگو کو پیش نظر رکھ کر غور فرمائیں کہ کانگریس کا فیصلۂ زبان اردو ہندی کی منازعت طے کرنے میں کہاں تک کامیاب ثابت ہو سکتا ہے۔ اور کانگریس کے فیصلہ کی بنا پر حامیان اردو یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ کانگریس نے جس زبان کو ہندوستانی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ وہ اردو ہے۔

"مدینہ" بجنور ایک کانگریسی اخبار ہونے کے باوجود اردو کی حمایت میں حامیان ہندی سے مسلسل جہاد کر رہا ہے۔ اس کی بحث و گفتگو کا دار و مدار ہمیشہ اس بات پر ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے عام پڑھے لکھے لوگوں کی زبان اردو ہے، اور کانگریس نے فیصلہ کر دیا ہے کہ شمالی ہند کے عام پڑھے لوگ جو زبان بولتے ہیں وہی ہندوستانی ہے لہذا اردو ہی کا دوسرا نام ہندوستانی ہے۔ اس کے متعلق اول تو ہمیں یہ کہنا ہے کہ جیسا کہ آپ "آج" کے اقتباسات میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، حامیانِ ہندی بحالت موجودہ بھی اس بات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں کہ شمالی ہند کے عام پڑھے لوگوں کی زبان اردو ہے۔ علاوہ ازیں تحریر و تقریر اور روزمرہ کی گفتگو کے ذریعہ حامیانِ ہندی اس سرعت اور تیزی کے ساتھ زبان میں تبدیلی پیدا کر رہے ہیں کہ بہت تھوڑے عرصہ میں واقعی شمالی ہند میں ایک

ہندو بھی اردو بولنے والا باقی نہ رہے گا، اور شمالی ہند کے تمام ہندوؤں کی زبان ہندی ہو جائے گی۔ اس انقلاب کا علم و اندازہ مدینہ اور دوسرے باخبر حامیان اردو کو بھی ہے۔

ان ہندوؤں کو جانے دیجئے جو علانیہ ہندی کے زیر علم اردو کے خلاف معرکہ آرا ہیں۔ آپ پنڈت جواہر لال نہرو، اور وجے لکشمی پنڈت کی چند سال قبل اور آج کی زبان کا مقابلہ کیجئے۔ تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ شمالی ہند سے اردو کس تیزی کے ساتھ بے دخل ہو رہی ہے۔ اور اس کی جگہ ہندی قبضہ کرتی جا رہی ہے۔ اسی طرح آپ شمالی ہند کے ہندی اخبارات و رسائل اور ان کے فسانہ نویسوں اور مضمون نگاروں کی زبان ملاحظہ فرمائیں گے، تو اس میں بھی زمین و آسمان کا فرق پائیں گے۔

علاوہ ازیں ہندی ساہتیہ سمیلن کی ایک خاص تجویز کی رو سے ان الفاظ کو بھی جو ہندی میں رائج ہو گئے ہیں مسخ کیا جا رہا ہے اور ہر طبقہ کے ہندی اہل قلم اور پڑھے لکھے ہندو یا تو ضرورت، انصاف، سفید، خاص وغیرہ لفظوں کی جگہ آوشیکتا، نیائے، شویت وشیش، وغیرہ استعمال کر رہے ہیں یا پھر جرورت، انساپھ، سپھید، کھاس وغیرہ لکھ بول رہے ہیں۔ ان تمام حالات کا نتیجہ ظاہر ہے۔

پنجاب کو چھوڑ کر ان تمام حصص ملک میں جو کانگریس کے فیصلے کے مطابق ہندوستانی کے حدود میں داخل ہیں۔ حامیان ہندی کی بے پناہ اکثریت ہے، اور بہ اردو کے مٹانے اور ہندی کے رائج کرنے کا قطعی فیصلہ کر چکے ہیں۔ اس لئے حامیان اردو جس بنیاد پر ہندوستانی کو اردو زبان سمجھ کر ہندوستانی کو ملکی زبان تسلیم کر رہے ہیں وہ بنیاد چند سال کے اندر یکلخت منہدم ہو جائے گی اور اس کی جگہ پر ہندی ایک شاندار عمارت کی شکل میں کھڑی نظر آئے گی۔ اس لئے حامیان اردو کو غور کرنا چاہیئے کہ اردو کی بنیاد کو تباہی سے بچانے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے اور اس پر پوری آمادگی کے ساتھ کاربند ہونا چاہیئے۔

مشاہیر عالم

مشاہیر عالم شاہکار کا مستقل عنوان ہے اور اس عنوان کے تحت میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ زیر نظر "شاہکار" میں اس عنوان پر دو مضمون شائع ہو رہے ہیں "کفورد" اور "علامہ راشد الخیری" "کفورد" مکمل مضمون ہے۔ لیکن "علامہ راشد الخیری" نامکمل۔ علامہ راشد الخیری کے صاحبزادے صادق الخیری ایم۔ اے نے اپنے والد کے مکمل سوانحات لکھنے کا ارادہ کیا ہے اور ادارہ شاہکار سے وعدہ کیا ہے کہ یہ مکمل مضمون بااقساط "شاہکار" میں شائع ہونے کیلئے دے دیں گے۔ چنانچہ "علامہ راشد الخیری" اسی مضمون کی پہلی قسط ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے دوست مسٹر صادق الخیری ایم۔ اے اپنے وعدے کو بناہنے میں کامیاب ثابت ہونگے۔

تصحیح

مئی کے شاہکار میں حضرت ماہر القادری کی ایک نظم "بادۂ شیراز" شائع ہوئی ہے اور اس نظم کا ایک شعر کاتب کی غلطی سے سے غلط شائع ہو گیا ہے جس کا ہمیں افسوس ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔ صحیح شعر یہ ہے ؎

بر ورق جہاں نوشت، مصر عجب حکایتے
حسن شکست جام دل، عشق درید پیرہن

معذرت

نئے ماہنامے۔ نئے ہفتہ وار اخبارات، رسائل کے خاص نمبر اور نئی کتابیں بکثرت دفتر شاہکار میں اظہار رائے کیلئے آ چکی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ جولائی کے شاہکار میں ان پر تبصرہ نہ ہو سکا۔ مگر اگست کی اشاعت میں ذیل کی کتب اور رسائل پر ضرور تبصرہ ہوگا۔

ماہنامہ مووی لینڈ۔ ماہنامہ پریم پجاری لاہور۔ ماہنامہ چاند بمبئی۔ ہفتہ وار شباب لاہور۔ سالنامہ عالمگیر۔ سالنامہ دیہاتی زندگی۔ ادب لطیف کا ڈرامہ نمبر۔ تمثیلی مشاعرہ۔ النساء سلمی۔ دیہاتی گیت۔ ماہر القادری کے سو شعر۔ ہندوستان کی صنعت اور تجارت۔ کنول روح غالب وغیرہ۔

ادارہ

پانی

تھا عشق کی خلقت سے پہلے یہ عالمِ بزمِ ہستی کا
ویرانے کے آغوش میں تھا ہر اک منظر اس بستی کا

تھے کوہ و بیاباں سب لیکن بےچینی تھی آرام نہ تھا
انساں تو تھے اس دنیا میں پہلو میں دلِ ناکام نہ تھا

دنیا میں بگولے اٹھتے تھے اور پانی کی تھی نایابی
ہر ذرہ تھا سیماب صفت ہر دشت میں تھی اک بیتابی

پھر قدرت کو منظور ہوئی اس بزمِ جہاں کی سیرابی
کچھ اجزائے ترکیبی سے کی دور جہاں کی بیتابی

اک حسنِ ازل کے پرتو سے تیار ہوا دل کا ڈھانچہ
پھر درد نے جان اس میں ڈالی اور نام پھر اسکا عشق ہوا

اس دل میں لاکھوں فتنے تھے ہر فتنہ جانِ الفت تھا
رگ رگ میں وفا کی آمیزش اور روحِ روانِ الفت تھا

الفت کی خلش پر نازاں تھا اور درد کی لذت پر قرباں
فردوس کی شیریں راتیں تھیں آئینِ وفا تھے وردِ زباں

بیتابی دی تھی قدرت نے کچھ ایسی اسکی فطرت میں
ہے جسکی جھلک اک تھوڑی سی اندازِ صبحِ قیامت میں

اس دل کی تڑپ ہر اک شئے پر اس طرح اثر انداز ہوئی
محشر کے نظارے جاگ اٹھے وارفتگیٔ غم ساز ہوئی

سکانِ سماوی ساکت تھے ہلچل تھی عالمِ بالا میں
یہ رنگ جو دیکھا قدرت نے دل پھینکدیا اس دنیا میں

انساں نے سمجھکر اک نعمت سینے میں رکھا اس دولت کو
کر ڈالا گویا مستحکم بنیادِ جذبۂ الفت کو

اب کیا تھا پیدا ہونے لگے افسانے عشق و محبت کے
اور خون کو پانی کرنے لگے دیوانے عشق و محبت کے

انساں کی آنکھوں سے طالب یوں پھوٹے چشمے پانی کے
جن میں کہ نہاں تھے افسانے دنیا کی صبحِ جوانی کے

طالب فارسی

مبارز

منشی خیرات علی دیوان خانہ میں بیٹھے پرانے کاغذات ترتیب دے رہے تھے۔ ایک تخت پر کرم خوردہ کتابوں کی قطاریں لگی تھیں۔ کاغذات اٹھاتے۔ پڑھتے۔ رکھ دیتے۔ پھر کوئی پرانی کتاب اٹھاتے، پڑھتے، مقابلہ کرتے، رکھ دیتے۔ کسی تصنیف کا سلسلہ تھا منشی جی کے تیور بتا رہے تھے کہ کسی گزرے ہوئے درخشاں دور سے معاملہ ہے۔ کسی خاموش شمع کو روشن کرنے کی فکر ہے۔ ماضی کی خبر سے کسی ویران بستی کے ہنگامے نکال رہے ہیں۔

پانوں کی ڈبیا خالی منہ کھولے پڑی تھی۔ چھت میں بجلی کا پنکھا لگا تھا مگر کھجور کا۔ پنکھا برابر ہیں دھرا تھا۔ پسینہ بہہ رہا تھا۔ لیکن اپنے خیال میں ایسے غرق تھے کہ پنکھے کا دھیان ہی نہ رہا۔ اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی منشی جی نے کہا "چلے آؤ" دروازہ کھلا ایک لڑکا داخل ہوا جس کے ایک ہاتھ میں خط تھا اور دوسرے ہاتھ سے پھٹے ہوئے گریباں کو سنبھالے سفید برہنہ سینے کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سر سے ننگا، بال بڑھے ہوئے۔ کشادہ پیشانی پر پریشان پڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ مدت سے حجام کا ہاتھ نہیں لگا۔ گریبان چاک۔ کندھوں پر سے آستینیں علیحدہ ہو رہی تھیں۔ پاجامہ کسی شفیق توجہ کا محتاج۔ ایک گھٹنے پر بے جوڑ سا پیوند۔ مگر دوسرا گھٹنا ہوا کھا رہا تھا۔ پاؤں میں جوتی نہ تھی۔ فرش پر پاؤں رکھتے جھجکتا تھا۔ بڑے بڑے ہاتھ میلے تھے اور پاؤں تو بہت ہی زیادہ میلے تھے۔

لڑکا فرش کے حاشئے سے بچکر کھڑا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ فرش اس کے لئے نہیں۔

ہاں۔ اس کا کرتہ پھٹا تھا۔ گورا رنگ ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ ستواں ناک۔ لمبی گردن، چوڑا سینہ۔ ہاتھ پاؤں سے تندرست۔ ڈیل ڈول عمر کے لحاظ سے زیادہ تھا۔ (ظاہری صورت بہت مسکین تھی) مگر نگاہ میں قرار اور مزاج میں استقلال تھا۔

لڑکا کمرے میں داخل ہوا، ہاتھ میں خط لئے تھا۔ منشی جی نے خط دیکھا۔ ہاتھ بڑھایا۔ لڑکے کو بغور دیکھا۔ خط لیا۔ لفافہ دیکھا لڑکے کو پھر دیکھا۔

منشی جی۔ میر باقر نے بھیجا ہے اس دھوپ میں؟ بیٹھ جاؤ۔

لڑکا۔ جناب۔ میر صاحب نے جواب مانگا ہے۔

منشی جی۔ دم لے لو۔ (خط پڑھ کر) ایسی کوئی جلدی نہیں۔ آرام کر لو۔ کیا دوڑے آئے ہو؟۔

لڑکا۔ جناب انہوں نے تاکید کی تھی کہ خط کے پہنچانے میں دیر نہ ہو۔ اور یہی جواب کیلئے ہے۔

منشی جی۔ میر صاحب کے ہاں نوکر ہو۔ کیا کام کرتے ہو۔ کب سے؟

لڑکا۔ تھوڑے دن ہوئے نانا ابا چھوڑ گئے تھے۔ یہی کام کاج۔ سودا سلف۔ دوڑ بھاگ۔ ننھے کو کھلانا۔ بہلانا وغیرہ۔

منشی جی۔ کیا نام ہے۔

لڑکا۔ مبارز۔

نام سنکر منشی جی مسکرا دیئے۔ خط پڑھا۔ لڑکا منتظر رہا۔ منشی جی کمرے میں ٹہلنے لگے۔ خود ہی باتیں کرنے لگے (گویا یہ بھی کسی پرانے مسودہ کا ورق ہے۔

منشی جی۔ مبارز! بچے کھلانا ہے۔ سودا سلف لانا ہے۔ مبارز! گھر کا کام کرنا ہے۔ کسی کے گھر کا کام کرتا ہے اپنے گھر کا کام نہیں۔ اپنا گھر ہی نہ ہوگا۔ کہتا تو ہے۔ نانا ابا چھوڑ گئے تھے۔ نانا ابا۔ باپ نہیں۔ پوچھوں؟ نہیں۔ افسوس مبارز۔ خدمتگاری کیسا پُر امن پیشہ ہے وطن کی خدمت نہیں۔ لوگوں کی خدمتگاری۔ میر باقر کے ہاں۔ غلامی۔ مبارز! خط لیکر آیا ہے۔ کس وقت خط لے کر آیا ہے کیسی چلچلاتی دھوپ ہے۔ کس بلا کی گرمی ہے۔ پسینہ بہہ رہا ہے اور آقا خس کی ٹٹیاں لگائے تہہ خانوں میں دوپہر بسر کر رہے ہیں۔ مگر مبارز خط لیکر چلا ہے۔ اور پھر نہ آتے دم لیا۔ نہ جاتے لے گا۔ اس بات کی تاکید ہے

آقا بھی تو میر باقر ہیں اپنا بچہ نہ بھیجا گیا۔ وہ تو اپنا بچہ ہے۔ کہیں بچے کو لُو لگ جائے۔ اس کیلئے تو بیگم صاحبہ نے بجلی کے پنکھے چھوڑ رکھے ہوں گے۔ اماں جان بیکل ہونگی۔ کہ چھوٹے میر صاحب کے خواب راحت میں خلل نہ آئے۔ یہ میر باقر نیاں پرائی اولاد کو اولاد تھوڑا ہی سمجھتی ہیں۔ لڑکے دم لے لو۔ مٹکیا میں پانی ہے۔ پی لو۔

لڑکا۔ نہیں جناب پیاس نہیں۔ جواب دیجئے گا؟

منشی جی۔ (اسی دھن میں) مبارز بھی کسی کا بچہ ہے۔ یہ بھی کسی کلسری کے دل کا قرار ہوگا۔ کسی ماں نے اسے دودھ پلایا ہوگا۔ اس کی ماں بھی اس کی بلائیں لیتی ہوگی۔ اس پر واری صدقے جاتی ہوگی۔ آج وہ نہیں۔ ورنہ کبھی گوارا نہ کرتی کہ کلیجے کی ٹھنڈک مبارز ایسی دھوپ میں باہر نکلے۔ مبارز!

لڑکا۔ جناب!

منشی جی۔ (اسی دھن میں) مبارز۔ ماں باپ نے کیا سمجھ کر نام رکھا تھا۔ باپ کا فخر، ناز، امیدیں، آرزوئیں، تمنائیں کیا کیا کچھ اس نام سے وابستہ نہ ہوگا۔ خاندان کا نام۔ وطن کی عزت۔ قوم کی آبرو۔ سب مبارز کے سپرد سمجھی ہوں گی۔ ماں باپ کی تمام زندگی کا سہارا مبارز ہی تھا۔ نام میں واقعی جہادی کارزار کی نسبت ہے۔ مقدر نے ہرا رکھا ہے۔ مگر ہمت نہیں ہاری۔ مقدر جہاں لئے جاتا ہے۔ چلا جا رہا ہے۔ اس کیلئے زندگی ایک ہنگامہ ہے۔ ایک سیلاب ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز۔ اتار چڑھاؤ کے تاثرات سے بے پروا ہے۔

مبارز ابھی بچہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے طوفانوں کا مقابلہ کر چکا ہے۔ ماں باپ کا سایہ اُٹھ چکا ہے۔

مبارز۔ (حیران ہو کر) جناب میر صاحب میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔

منشی جی۔ (اپنی دھن میں) جسم سے ظاہر ہے۔ کہ یہ گھر کتنی بلند روح سے آباد ہے۔ زندگی کے حوادث سے بالکل بے فکر ہے خدا پناہ دے۔ میر باقر کی ملازمت بھی ایک حادثہ ہے۔ ان کا نامہ بر ہے اور کس فدوی کے پاس پہنچا ہے۔ جواب طلب کرتا ہے۔ مگر مطالبہ میں وہ جان نہیں۔ جو کسریٰ و قیصر کے جسم پر لرزش طاری کر دیتی تھی۔ اللہ اکبر! کیا وقت تھا۔ کیا ہیبت تھی اور کیا سطوت۔ یہ فرق مقدر نے پیدا کر دیا۔ یہ وقت کی بات۔ مبارز کی طرح وہ بھی ایک نامہ بر ہی تھا کہ جس کی آمد اور انداز سے کسریٰ کے دربار میں سناٹا چھا گیا تھا۔ غور کرنے کی بات ہے۔ کسریٰ کا دربار اور نقیب خلیفۂ حجاز کے سفیر کی اطلاع دیتا ہے۔ ایک اعرابی داخل ہوتا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے ایک ہاتھ میں نیزہ، دوسرا تلوار کے دستہ پر۔ پاؤں میں رسی کی چپلیاں۔ جو گھس کر آدھی پونی رہ گئیں ہیں۔ قدم اٹھاتا۔ سفیروں کی صف سے آگے جا کھڑا ہوتا ہے اور مراسم دربار سے بے پروا ہو کر کسریٰ کو پیغام سُنا دیتا ہے۔ کیا پیغام؟ "ہمارا خلیفہ فرماتا ہے کہ اسلام پر ایمان لاؤ یا جزیہ دو۔ ورنہ جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ۔" کتنا بڑا مطالبہ اور کس قدر مختصر۔ کیسا تندروی شکل اعرابی اور کس بے جگری سے جملہ شرائط پیش کر دیتا ہے۔ یہ اس دور کا مبارز تھا جس کا کلام ایک زندہ قوم کا کلام تھا۔ خالد بھی مبارز تھا۔ طارق بھی مبارز تھا۔ ان کی آواز قوم کی آواز تھی۔ قوم کی آواز ان کی آواز تھی۔ ادھر ایک یہ غریب مبارز ہے۔ جو اس فدوی کے جھونپڑے میں آواز نہیں نکال سکتا۔ یہ میر باقر کا ملازم ہے۔ یہ مردہ قوم کا مبارز ہے۔

منشی خیرات علی ان خیالات کا ورد کر رہے تھے۔ کمرے کے چکر کاٹ رہے تھے۔ کبھی لڑکے کو دیکھتے۔ پھر اس کی طرف پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو جاتے۔ کبھی آسمان کو تکتے تو چھت کی کڑیاں حائل پاتے۔ "یہ دور اور وہ دور۔ وہ تھا۔ یہ ہے۔" ایسی ہی بڑبڑاہٹ جو ختم ہی ہونے میں نہ آتی تھی۔ لڑکا حیران تھا۔ کہ کس عذاب میں پھنس گیا۔ اور کہ صاحب خانہ کس خیال کے انسان ہیں۔ اس اثنا میں منشی جی پھر چنگھاڑنے لگے۔

منشی جی۔ افسوس کیسے کیسے ہونہار بچے خدمتگاریاں کرتے پھرتے ہیں۔ کبھی قوم کے ایسے ہی نونہال تھے جن کی زندگی کے مجاہدانہ کارنامے ہماری تاریخ کا عزیز ترین اثاثہ ہیں۔ ذرا دیکھنا تو مبارز کے دست و بازو۔ تلوار کیلئے کیسے موزوں ہیں۔ سینہ سپر کا کام دے گا۔ گلا کیسا خنجر آزما پایا ہے۔ ایسے ہی لڑکے سمندر میں گھوڑے دوڑا دیتے تھے۔ فتح و شکست کا تہیہ کر کے اپنے جہازوں کو جلا دیتے تھے۔ ساری دنیا ان کا وطن تھی۔ اور وطن کے مجاہد تھے۔ مبارز تھے۔ افسوس یہ سب مقدر کی باتیں ہیں۔

اس رد و کد کے بعد منشی جی بوریئے پر بیٹھ گئے۔ پیشانی کو ہاتھ کا سہارا دے کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی انداز میں

کبھی پیشانی پر شکنیں پڑ جاتیں کبھی تبسم سے لب کھل جاتے۔ یہ روحانی تڑپ اور تسکین کا دردناک منظر تھا منشی خیرات علی حال کے ادبار کی ظلمتوں اور ماضی کے اقبال کی طلعتوں کے ذہنی "سینما" میں مصروف تھے۔ گزشتہ درخشاں دنوں میں پہنچتے۔ مگر موجودہ گھٹاؤں سے پیچ و تاب کھا کر پھر لوٹ آتے۔

مبارز کھڑا تھا منشی جی کے غیر مخاطب مکالمے سے مبارز کے کچھ تیور بدل گئے۔ اس کی نگاہیں گہرائیوں سے بیدار ہو کر منشی جی کی بے بسی پر ہمدردی سے متبسم ہوئیں۔ لیکن کسی فوری خیال سے چہرہ تمتما سا گیا جسم میں لرزش ہوئی — آنکھوں میں بجلیاں کوند گئیں اور تیز تیز نظریں منشی جی پر پڑنے لگیں۔

مبارز۔ اگر اجازت ہو۔ تو ......

منشی جی۔ (ذرا بے توجہی سے) نہیں۔ ٹھہرو۔

مبارز۔ ٹھہرنے کیلئے نہیں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

منشی جی۔ (توجہ سے) کہو۔

مبارز۔ آپ نے "تقدیر"۔ "مقدر کی باتیں" اور "مقدر" کا بار بار ذکر کیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ بے بسی کے ان جملوں سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ کیا آپ یہ خیال فرماتے ہیں۔ کہ انسان جو کچھ ہے وہ بس ہے۔ جیسا کچھ ہے ابس ہے؟ جہاں کہیں ہے، بس ہے؟ اگر آپ کا یہ خیال ہے۔ تو مجھے آپ پر اور آپ کی ماضی نوازی پر حیرت ہے۔ میں نامہ بر ہی سہی بے یار و مددگار ہی سہی۔ میں میر باقر کا خدمتگار ہی سہی — آپ میرے مقدر کو میری بے نوائی۔ میرے پھٹے پرانے کپڑوں۔ میری شکستہ حالی سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ آپ کے حوصلہ شکن خیالات آپ کو مبارک ہوں۔ خدا کرے۔ کہ کوئی انسان ان سے متاثر نہ ہو۔ ظاہرا مالی فلاکت کے یہ معنی نہیں کہ انسان بلند جذبات اور اعلےٰ مقاصد سے بھی محروم ہے۔ آپ نے شاید میری اس حالت سے میرے "مقدر" کا اندازہ کر لیا۔ نوشتہ لوح تقدیر کی یہ تفسیر مجھے یاد نہیں آتی۔ جو گزر گیا اس کی پرستش چھوڑ دیجئے۔ حال کی تیز رفتار ریک گھٹائیں ماضی کے نقش مٹا رہی ہیں۔ ذرا باہر نکل کر دیکھئے۔ کس قیامت کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور پھر اس طوفان کیلئے تیار ہو جائیے۔ جو آرہا ہے۔ بلکہ آپہنچا ہے جس گرداب کی طرف دنیا کھنچی جا رہی ہے۔ اس سے آپ کا بیان کردہ "مقدر" نہیں بچا سکے گا۔ بلکہ عمل بچائے گا۔

میں عرض کروں میرا مقدر کیا ہے۔ میرا حوصلہ۔ میری ہمت، میرا عزم۔ میری عبرت۔ میری خودی، میری خودداری۔ میری امیدیں — امیدوں کو حاصل کرنے کے ارادے۔ اور ان ارادوں کی تکمیل کیلئے زندگی بھر کی بازی۔ یہ آلات ہیں میرے بلکہ میری اس روح کے۔ جو آزادی حاصل کرنے کیلئے میرے پیکر شکستہ میں تڑپ رہی ہے۔ اور انہی آلات سے کام لے کر میں اپنا "مقدر" تعمیر کروں گا۔ اپنی قوم کا مقدر تعمیر کروں گا۔ اپنے ملک ہندوستان کا مقدر تعمیر کروں گا۔ جو اس وقت چلتی پھرتی برائے نام زندہ لاشوں کا قبرستان ہے اور آپ دیکھیں گے۔ کہ میں ملک ملک کا مقدر تعمیر کر کے آئندہ دنیا کے مقدر کا معیار قائم کر دوں گا۔

معاف کیجئے گا۔ "مقدر" وہ نہیں۔ جو آپ کے خیال کے مطابق ہو چکا اور اٹل ہے۔ بلکہ "مقدر" وہ ہے۔ جو انسان کر سکتا ہے اور جو اس کے ادنےٰ سے اشارے پر ہو سکتا ہے۔

اس وقت مبارز کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی روشنی تھی۔ اس سے دو چار ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کے چہرے پر ایک نور تھا۔ اس کے لہجے میں ایک عزم اور اس کے انداز میں ایک استقلال تھا۔ وہ اس بلندی سے بولتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جہاں اُڑ کر پہنچنے کیلئے نگاہ کو پروں کی ضرورت ہو۔

منشی خیرات علی نے مبارز کی طرف دیکھا۔ ذرا غور سے مگر آنکھیں نیچی کر لیں اور مبارز کی تقریر سنتے رہے۔ البتہ "مقدر" کے متعلق لڑکے کا نظریہ سنکر جھنجھلا سے گئے۔ مبارز کی طرف نظر اٹھا کر بولے۔

منشی جی۔ لڑکے انگریزی کا تو اثر نہیں۔ ہمارا طرح دے جانا ہی قیامت ہو گیا۔ خوب کہی۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ اس طوفان خیز تقریر میں ہمارے میر باقر کا پیغام نہ بھول جانا۔ کیا کسی مدرسے مکتب میں بھی تعلیم پائی ہے؟

مبارز۔ صاحب اگر تعلیم سے آپ کا یہ مطلب ہے۔ کہ ایک آدمی غیر ملکی زبان میں ٹوٹی پھوٹی گفتگو کر سکے۔ اپنے ملک کے

شعار و شعور سے بیگانہ ہو جائے۔ اپنی ملکی زبان میں بات چیت کرنے سے شرمائے اور بی۔ اے، ایم۔ اے کی ڈگریوں کے پشتارے کمر پر لادے پھرے۔ تو شکر ہے کہ میں اس لعنت اور اس کے ذہنی جراثیم سے پاک ہوں۔ اور اگر تعلیم کے یہ معنی ہیں کہ دنیا دی چند روزہ عز و جاہ منصب و دولت کیلئے اکتساب تعارف کیا جائے یا ملازمت، و منزلت کی خاطر اس بدنصیب ملک کی بندو سلاسل کی کڑیوں میں ہر سال ہزاروں کا اضافہ کیا جائے۔ تو مقامِ شکر ہے۔ کہ اس تعلیم اور اس کی قربانگاہوں سے میں دُور رہا ہوں۔ حضرت عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ کہ جو وقت آنے والا ہے۔ اور جس بھنور میں ہماری ناؤ چکر کھانے والی ہے۔ وہاں آپ کے معلم و متعلم کام نہ آئیں گے۔ آپنے ابھی فرمایا تھا۔ کہ ایک تنہا اکھڑ اعرابی نے کسرا کے تخت پہ نیزہ جا گاڑا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ وہ غریب بدوی لکھنا پڑھنا تو درکنار۔ انگوٹھا لگانا بھی نہ جانتا ہوگا۔ البتہ اس کا دل و دماغ نور صداقت سے منور تھا ایسے ہی جاہل لوگ جب ملک و ملت کے نام پر ہمت اور بہادری کے جھنڈے گاڑ دیتے تھے۔ آپ کی تعلیم یافتہ پود "کشت بلورین" ہے جو کسی نرم گرم میدان میں اُترنے سے پہلے ہی مرجھا جائیگی اس گروہ میں "مبارز" پیدا ہو جانے کی توقع نہ کیجئے چمنستانوں میں نہیں ہیرا سنگ زاروں میں ملتا ہے۔ اسی گرد و غبار میں کوئی شہوار نمودار ہو جاتا ہے۔ اور میدان میں آتے ہی انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ "مبارز" آسمان سے نہیں برستے۔ یہ لعل گدڑیوں ہی میں ملتے ہیں۔ میں نے کوئی ایسی بڑی بات نہیں کہی میں آپ کو بڑی بڑی باتیں سننے کیلئے تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میر باقر کا پیغام محفوظ ہے۔ اطمینان رکھئے وہ دیکھئے وقت آ رہا ہے۔ جبکہ تمام میر باقروں کو انسانی نصب العین کے راستے کی دیوار حائل سمجھ کر راستہ سے ہٹا دیا جائے گا۔ اگر دنیا میں انسانوں کی ابتدا اور ان کا انجام ایک انداز سے ہے تو ان کے نظام حیات میں بھی یکسانیت ناگزیر ہے۔ حضرت یہ جبارت گرمی یا حرارت کا اثر نہیں۔ میں نہایت ٹھنڈے دل سے عرض گزار ہوں کہ جن دلوں میں آگ بھری ہو۔ ان پر موسم کا سرد گرم اثر نہیں رکھتا۔

میرے محترم [redacted] انسانیت میں جو طوفان اُٹھ رہا ہے اس کی آسمان رس موجیں موت کی طرح ہر انسان تک پہنچینگی اور پھر اس سیلاب میں وہی انسان ہمالیہ کے حریف بنیں گے جن کی مستقبل بین نگاہوں نے اسے دُور سے دیکھ کر اس کے تصادم کیلئے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے۔ خدا اس طوفان میں آپ کا مددگار ہو۔

منشی صاحب اس وقت میر باقر کے مذمتگار کی صورت میں ہاتف غیب آپسے ہمکلام ہے۔ بصیرت کی آنکھوں سے اسے دیکھئے اور عبرت کے کانوں سے اس کی صدائے حق کو سنئے ......

خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

عباداللہ

التجا

پیشہ ہے زمانے کا جفا جور سرشت
ہے خشک خیابانِ وفا پیار کی کشت
آ دوست کہ پھر مِل کے بنائیں باہم
اُجڑے ہوئے معمورہ کو صد رشک بہشت

دیس راج شرما
بی۔ سی۔ ڈی۔ (فرنچ)

سوزِ تمام

مجھے خوں رُلا رہا ہے، یہ غرورِ پاکبازی — تجھے کیا خبر، غلامی ہے تمام کفر سازی
مری عشرتوں کی جنت، تری آخرت کی کھیتی — یہی دہرِ بے حقیقت، یہی عالمِ مجازی
مرے دل کی دھڑکنوں سے وہ قریب ہو رہے ہیں — مرے شوق کو مبارک شبِ ہجر کی درازی
ترے دل کی سادگی سے مجھے ڈر لگا ہوا ہے — کہ سیاستِ زمانہ ہے فقط قمار بازی
ترا کام زہد و تقویٰ، مرا کام جذب و مستی — تو فقط رکوع و سجدہ، میں تمام ترنمازی
تری عقل محوِ قرآں، مرا شوق غرقِ قرآں — میں قتیلِ سوزِ بوذرؓ تو شہیدِ فکرِ رازیؒ
مرا شوق منتظر ہے، مری روح مضطرب ہے — اسی دھن میں چھیڑ مطرب! کوئی نغمۂ حجازی
اُٹھے اور اُٹھ کے پھر سے رخِ زندگی بدل دے — کوئی اک جواں مجاہد، کوئی ایک مردِ غازی
تو نیاز مندیوں پہ ابھی ناز کر رہا ہے — ابھی غزنوی نہیں ہے تری فطرتِ ایازی
تری زندگی خموشی، مری زندگی کشاکش — مجھے شوقِ دردِ بے حد، تجھے فکرِ چارہ سازی
یہ خمارِ بزدلی ہے، یہ قلندری نہیں ہے — یہ فضائے کنجِ عزلت، یہ طلب ہے بے نیازی

میں حقیقتوں کا ماہر، میں فدائے پیرِ رومی
مرا درس جذب و مستی، مرا کام نے نوازی

ماہر القادری

مدردیش

مدردیش مہابھارت

مدردیش کا نام سب سے پہلے مہابھارت کے پرب[1] اول میں آتا ہے۔ جہاں بھیشم (بھیکم) بدر کے ساتھ پانڈو اور دھرت راشٹ کے ناطہ بیاہ کا مشورہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جادوان کے خاندان میں ایک لڑکی ہے۔ جو ہمارے خاندان کے مناسب حال ہے اور راجہ سبل کی لڑکی گاندھاری کی بھی میں نے تعریف سنی ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ مدردیش کا راجہ بھی ایک دختر رکھتا ہے۔ یہ دونوں بھی ہمارے خاندان کے لائق ہیں۔

پھر اسی پرب[2] میں پانڈو کی شادی جب راجہ کنت بھوج کی لڑکی رانی کنتی کے ساتھ ہو جاتی ہے تو بھیشم اپنی اولاد در اولاد در اولاد کو بکثرت دیکھنے کے لئے اس کی دوسری شادی کی فکر کرتا ہے۔ اور بڑا بھاری لشکر اور جاہ و حشم لے کر مدردیش کو روانہ ہوتا ہے۔ راجہ ارجس کا نام اس وقت شل تھا۔ شاہانہ استقبال کر کے اس کو اپنے شہر میں لاتا ہے۔ اور تشریف آوری اور تکلیف فرمائی کا سبب دریافت کرتا ہے۔ بھیشم اس کے استفسار کے جواب میں اس کی بہن مدری کی تعریف کرتا ہے۔ پھر پانڈو کی لیاقت و شائستگی اس پر ظاہر کرتا ہے۔ اور کہتا ہے اگر ان دونوں کی قرابت صورت پذیر ہو جائے تو مناسب ہے۔ راجہ شل اس خویشی و قرابت پر اپنی مسرت کا اظہار کرتا ہے اور تھوڑے دنوں کے بعد راجہ شل رتھوں پر سامان جہیز لاد کر اور فیلان کوہ پیکر ہمراہ دے کر اپنی بہن رانی مدری کو بھیشم کے ہمراہ ہستناپور روانہ کر دیتا ہے۔ جہاں پانڈو کے ساتھ اس کی شادی ہو جاتی ہے۔

پھر مدردیش کا نام مہابھارت کے گیارھویں[3] پرب بنام استری پرب میں آتا ہے۔ جہاں پانڈو کے بیٹوں اور پوتوں کا ذکر ہے۔ پانڈو کے پانچ بیٹے تھے۔ تین رانی کنتی کے بطن سے جن کے نام یہ ہیں۔ جدھشٹر، بھیم، ارجن۔ دوسری رانی مدری راجہ شل کی بہن کے بطن سے سہدیو اور نکل تھے۔ جو دونوں توام پیدا ہوئے تھے۔

لیکن ان پانچوں بھائیوں میں ارجن کے سوا کسی اور بھائی کی اولاد حکمران نہیں ہو سکی۔ مدردیش کے شاہی خاندان میں صرف پانڈو ہی کی شادی نہیں ہوئی بلکہ اس کے فرزندوں میں سے جدھشٹر اور سہدیو کی شادیاں بھی مدردیش ہی میں ہوئی تھیں جس کا ثبوت مہابھارت کے گیارھویں پرب کے الفاظ ذیل سے ملتا ہے۔ جدھشٹر کی ایک رانی کا نام دیویکا تھا۔ جس سے پرت بند پیدا ہوا۔ دوسری رانی مدردیش کے شاہی خاندان سے تھی جو اپنے ملک کے نام پر مدری کہلاتی تھی۔ اس سے یودھا پیدا ہوا۔ سہدیو کی ایک بیوی تو درو پدی ہی تھی۔ دوسری راجہ مدردیش کی لڑکی سوہوترا نام تھی۔

ان تینوں مقامات پر مدردیش کے لئے مدردیش ہی کا لفظ درج ہے۔ لیکن بعض اور مقامات پر مہابھارت میں اسی لفظ کو کسی جگہ مدسوتر[4]۔ کسی جگہ مندسودر[5] اور کہیں منڈاور بھی لکھا گیا ہے۔

مدردیش اور راج ترنگنی

مہابھارت کے بعد جس کی تصنیف کو پانچ ہزار سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ مدردیش کا نام پنڈت کلہن کی راج ترنگنی میں اس موقع پر آتا ہے۔ جہاں راجہ بھکشاچر راجہ جے سنگھ[6] والیٔ کشمیر کے خوف سے کشمیر سے فرار ہو جاتا ہے۔ یہاں چند ملکوں

---

[1] ترجمہ مہابھارت مطبع آفتاب پنجاب لاہور مطبوعہ ۱۸۹۱ء صفحہ ۱۹۰

[2] 〃 〃 〃 〃 ۱۹۵

[3] ترجمہ مہابھارت فارسی سے اردو میں پرب دوم صفحہ ۲۸

[4] 〃 〃 〃 ادوم پرب صفحہ ۶ و ۱۳۰ و بھیکم پرب صفحہ ۳۵

[5] 〃 〃 〃 بھیکم پرب صفحہ ۲۷۔ [6] راجہ جے سنگھ کا عہد حکومت ۱۱۲۸ء سے ۱۱۵۴ء تک بیان کیا جاتا ہے کلہن نے اسی کے زمانہ میں راج ترنگنی راجگان کشمیر کے حالات میں لکھی تھی۔

کے ساتھ مدردیش کا نام اُس کی فیاضیوں[۵۱] کی شہرت کی وجہ سے بطور ضرب المثل لکھا گیا ہے۔

مدردیش اور زینہ ترنگنی[۵۲] } عہد راجہ جے سنگھ کے مؤرخ پنڈت کلہن کے بعد بڈشاہی زمانہ کا مؤرخ جونراج اپنی کتاب راجاولی عرف زینہ ترنگنی میں کم سے کم سات مقامات پر مدردیش کا ذکر کرتا ہے۔ ایک مرتبہ اس مقام پر لکھتا ہے جب علی شاہ والئے کشمیر حج کو جانا چاہتا ہے اور راجۂ مدردیش اُس کو اس ارادہ سے باز رکھتا ہے تو وہ لکھتا ہے:-

"مدردیش کے مغرور راجہ نے اس خیال اور طعن کے طرف سے تمہارا داماد یعنی علی شاہ سلطنت چھوڑ کر حج کو جا رہا ہے اور تمہاری بیٹی کو ہمیشہ کے لئے تم سے جُدا کر رہا ہے۔ بادشاہ کو سلطنت ترک کرنے اور حج سے مشرف ہونے کے ارادہ سے باز رکھا اور کچھ وقفہ کے بعد وہ علی شاہ کو اپنے ہمراہ کشمیر لایا[۵۳]۔"

پھر مدردیش کا ذکر اس موقع پر آتا ہے جب علی شاہ اور اس کے بھائی شاہی خان عرف زین العابدین میں کشمیر کے تخت و تاج کیلئے باقاعدہ جنگ شروع ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر مدردیش کا راجہ علی شاہ کی مدد کو آتا ہے۔ اور اُس کو پیغام بھیجتا ہے کہ جب تک ہم تمہاری مدد کو نہ آئیں تم پہاڑ پر ہی مقیم رہو۔

پھر مدردیش کا نام اُس جگہ آتا ہے جب جونراج سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ کی اولاد کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ اس کے چار فرزند تھے اور وہ چاروں راجہ مدر[۵۵] کی دو بیٹیوں کے بطن سے تھے۔

جونراج پھر ایک جگہ لکھتا ہے ایک مرتبہ گکھڑوں کے سردار نے مالدیو راجہ مدر[۵۶] کو شکست دینے کے بعد گرفتار کر لیا۔ جب بادشاہ کو خبر ہوئی تو اُس نے گکھڑوں کی قید سے راجہ کو رہا کرایا۔

مدردیش اور زینہ راج ترنگنی[۵۷] } اس تاریخ میں تین جگہ مختلف مقامات پر مدردیش کا ذکر آتا ہے۔ اس کا مصنف سلطان حیدر شاہ ابن سلطان بڈشاہ کے عہد حکومت کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے: "اس دوران میں راجہ مانک دیو والئے مدردیش[۵۸] کے زیر کمان اس کی ایک بہادر فوج ترکشوں کے ساتھ لڑائی کرتی ہوئی تباہ ہو گئی۔"

دوسری جگہ سلطان حسن شاہ کی حکومت کا ذکر کرتا ہوا شری ور پنڈت زینہ راج ترنگنی میں لکھتا ہے۔ جب تاتار خاں نے راجپوری (راجوری) اور والئے مدر[۵۹] راجہ جسے دیو (المشہور عجب دیو) کو بہت تنگ کیا۔ تو ان راجوں نے سلطان حسن شاہ والئے کشمیر سے اعانت طلب کی۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے تازی بٹ بہترین سامان جنگ سے مسلح فوج لے کر آیا۔ اور جب ان ممالک کے لوگوں نے شاہی جھنڈے کو دیکھا۔ تو انہوں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا اور تازی بٹ نے سیالکوٹ اور دوسرے مقامات کو جو تاتار خاں (حاکم لاہور) کے ماتحت تھے۔ تباہ کر کے ملک میں ہلچل مچا دی۔

تیسری جگہ سلطان محمد شاہ والئے کشمیر کے سلسلہ میں شری ور پنڈت راجہ مدر[۶۰] پرسرام کا اور اس کی مدری فوج کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ تاتار خاں کے خوف سے کشمیر میں چلے آئے تھے۔ اور سادات کشمیر سے جو اُس زمانہ میں بڑے عروج پر تھے۔

---

[۵۱] لیکن مہابھارت میں راجہ کرن۔ راجہ شل والئے مدر کو اس کے ملک کی سوشل خرابیوں کا طعن دیتا ہوا دیکھا گیا ہے۔

[۵۲] اس تاریخ میں ۱۱۴۹ء یعنی راجہ جے سنگھ کے بعد کے حکمرانوں سے لیکر ۱۴۵۹ء تک کے حالات جبکہ بڈشاہ ابھی زندہ تھا لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب بادشاہ کے حکم سے کلہن کی راج ترنگنی کا سلسلہ قائم کرنے کیلئے لکھی گئی تھی۔

[۵۳] دیکھو ترجمہ انگریزی زینہ راج ترنگنی بنام کنگس آف کشمیر مترجمہ جے سی دت ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۷

[۵۴] دیکھو ترجمہ انگریزی زینہ راج ترنگنی۔ ترجمہ جے سی دت ۱۸۹۸ء صفحہ ۵۸

[۵۵] " " " " صفحہ ۸۳

[۵۶] " " " " " ۸۶

[۵۷] اس کتاب کا مصنف شری ور پنڈت ہے جو پنڈت جونراج مصنف زینہ ترنگنی کا شاگرد ہے۔ یہ کتاب بعہد سلطان فتح شاہ والئے کشمیر ۱۴۸۶ء ۸۹۹ھ میں لکھی گئی۔ اس مصنف نے بڈشاہ سے لیکر فتح شاہ تک پانچ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔

[۵۸] دیکھو زینہ راج ترنگنی کا ترجمہ بنام کنگس آف کشمیر مصنفہ جگدیش چندر دت صفحہ ۱۹۴

[۵۹] ترجمہ مذکورہ بالا صفحہ ۲۲۹ [۶۰] ترجمہ مذکورہ بالا صفحہ ۲۶۹-۲۷۰

ان کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ جون زینہ نے ان تعلقات سے خوفزدہ ہو کر ملک میں یہ افواہ پھیلا دی کہ تاتار خاں نے سادات کے نام ایک خط لکھا ہے کہ مدر والوں کو اپنی دوستی کی آڑ میں فوراً گرفتار کر لو۔ یہ قصہ طویل ہے۔ مختصر یہ ہے کہ سادات اور راجہ برسرام کی فوج میں باقاعدہ جنگ ہوتی ہے۔ سید حسن۔ غازی امین اور سلیم اللہ اور کئی اور نامور سادات جن کی تعداد زینہ راج ترنگنی میں تیس نفر بتائی ہے مارے جاتے ہیں۔

مہابھارت کے زمانہ میں مدردیش کا محل وقوع

راجہ شل کا نام والئے مندرور (مدر) کی حیثیت سے مہابھارت کے پانچویں پرب بنام اودم پرب میں پانڈوں کی جلاوطنی اور بن باسی زندگی ختم کرنے کے بعد اس موقعہ پر آتا ہے جب دریودھن کے ساتھ ان کی لڑائی ہوتی ہے۔ راجہ شل جو راجہ پانڈو کا خسر پورہ اور اس کے دو فرزندوں کا حقیقی ماموں تھا۔ اپنے ملک سے بیشمار لشکر لے کر جس کا پھیلاؤ مہابھارت میں دو کوس تک بتایا گیا ہے۔ ان کی مدد کیلئے روانہ ہوتا ہے لیکن جونہی دریودھن کو راجہ شل کے آنے کی اطلاع ملتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ وعدے وعید کر کے اس کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دیتا ہے اور لکھتا ہے میرا ملک آپ کے سرراہ ہے بےمروت سے بعید ہے۔ کہ آپ بالا بالا ہی چلے جائیں۔ چند روز یہاں قیام فرمائیں۔ پھر آپ کا اختیار ہے جہاں جی چاہے چلے جائیں۔ شل۔ دریودھن کی دعوت قبول کر لیتا ہے اور دریودھن باتوں ہی باتوں میں اس کو ایسا شیشہ میں اتارتا ہے کہ وہ اپنے بہنوئی راجہ پانڈو اور اپنے بھانجوں سہدیو و نکل کی امداد کی بجائے ان کے دشمن دریودھن کی امداد پر آمادہ ہو جاتا ہے اور آخر اسی خونریز جنگ میں اپنے بھائی اور چند بیٹوں سمیت کام آجاتا ہے۔

اودم پرب کے اس مختصر سے اقتباس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ مدردیش کا راجہ اس زمانہ میں شل ہی تھا اور اس کے ملک کی حدود دریودھن کے ملک سے ملحق تھیں۔ یوں سمجھ لینا شاید زیادہ آسان ہوگا کہ راوی سے اور بقول جنرل کننگھم بیاس سے پار ہو کر دہلی اور دہلی سے پرے تک دریودھن چھایا ہوا تھا۔ اور راوی سے شمال کی طرف سیالکوٹ اور جہلم بلکہ اس سے آگے تک شل کی حکومت تھی۔

مہابھارت کے آٹھویں پرب بنام کرن پرب میں پھر راجہ شل کا ذکر آتا ہے۔ اور بڑی تفصیل سے آتا ہے۔ بلکہ اسی پرب میں لکھا ہے کہ شاکل یا شالکوٹ یا شل نگری ایکا ندی کے کنارہ پر واقع ہے اور مہابھارت کے ترجموں نے ایکا ندی ہی کو ایک کی ندی بنایا ہے جو سیالکوٹ کی مشہور ندی ہے اور جموں کے پہاڑوں سے نکل کر سیالکوٹ کے ضلع کو شاداب کرتی ہوئی اسی علاقہ میں گم ہو جاتی ہے۔

مہابھارت کے اس پرب میں راجہ شل کا ذکر والئے مدر کی حیثیت سے اس موقعہ پر آتا ہے جب دریودھن راجہ شل کو کرن کا رتھ بان بننے کا حکم دیتا ہے اور وہ پس و پیش کے بعد بہت سی شرائط کے ساتھ آخر اس کا رتھ بان بننا منظور کر لیتا ہے۔ اسی موقعہ پر کرن اور شل میں تلخ و تند گفتگو بھی ہو جاتی ہے اور کرن جوش میں آکر شل کو اس کے ملک کی بےغیرتی اور بےشرمی کا طعن دیتا ہوا کہتا ہے کہ تمہارے ملک کی عورتیں جو کھلے منہ پھرا کرتی ہیں۔ تمام عیوب کا مجموعہ ہیں[2]۔

مندرجہ بالا تمام اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ مہابھارت میں جس ملک کو مدر اور جس راجہ کو شل لکھا گیا ہے اس کا تعلق پنجاب سے باہر کسی اور ملک سے نہ تھا۔ بلکہ مدر وہی ملک ہے جو راوی سے جہلم اور چناب سے سیالکوٹ اور اس کی شمالی حدود تک پھیلا ہوا تھا۔ اور شل وہی راجہ تھا جو اس ملک کا حکمران تھا۔

پنجاب ٹیکسٹ بک کی ایک سرکاری کتاب میں مدردیش

---

[1] کلہن پنڈت کی راج ترنگنی کے ترجمہ کی جلد اول کے صفحہ ۵۹۲ پر نوٹ نمبر ۴۸ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے آپ کا ندی کا نام نیل مت پران کے شلوک نمبر ۱۱۳ میں درج ہے۔

[2] ترجمہ مہابھارت آٹھواں پرب بنام کرن پرب صفحہ ۵۔ راجہ کرن نے راجہ شل کے ملک کے جو عیوب بتائے ہیں ان کے متعلق یہ امر بھی شاید خالی از دلچسپی نہ ہو کہ مد کے معنے منشی اشیاء کے لئے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس ملک کے لوگ چونکہ بہت نشہ آور عرق پینے کے عادی تھے۔ اس لئے اسکو مد کہتے تھے۔ مد سے مدہ اور مدر وغیرہ کئی لفظ بنے اور بالآخر یہ ملک مد قوم یعنی مد پینے والے لوگوں کی وجہ سے مدردیش کہلایا۔

کے جائے وقوع کے متعلق جو یہ الفاظ درج ہیں کہ "مدر کھوٹان[۵۱] کے قدیم علاقہ کا نام ہے - جو غالباً کھوٹان کے جنوب میں واقع ہوگا" وہ قطعاً غلط ہیں -

مسلمان مؤرخ اور مدردیش

کشمیر کے قدیم سنسکرت مؤرخوں نے جن میں سب سے آخر شرلوبر مصنف زینہ راج ترنگنی گزرا ہے - اس علاقہ کو جو راوی یا بیاس سے جہلم اور سیالکوٹ بلکہ اس سے آگے تک پھیلا ہوا تھا - مدردیش میں لکھا ہے لیکن کسی مسلمان مؤرخ نے حالانکہ وہ محمود کے زمانہ میں تھے یا تیمور کے عہد میں یا ان کے بعد عہد مغلیہ میں - اپنی کسی تاریخ میں مدردیش کا لفظ تک بھی نہیں لکھا حالانکہ ان مؤرخوں میں بعض کشمیر کے قدیم مؤرخوں سے بھی پہلے گزرے ہیں - جیسے البیرونی وغیرہ اور بعض مسلمان مؤرخ کشمیر کے ان سنسکرت تاریخ نویسوں کے ہم عہد اور ہمعصر تھے جیسے مصنف ظفر نامہ تیموری مصنف تاریخ فیروز شاہی (ضیا برنی) وغیرہ اکبر کے زمانہ میں طبقات اکبری اور جہانگیر کے زمانہ میں تاریخ فرشتہ لکھی گئی ہیں - ان میں بھی مدردیش کا لفظ کہیں موجود نہیں ہے - بظاہر اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ گو کشمیر کے قدیم سنسکرت مؤرخ مدردیش کا لفظ ہی لکھا کرتے تھے - لیکن ہندوستانی مؤرخوں کے زمانہ میں یہ لفظ قطعاً متروک ہوچکا تھا - بلکہ کشمیر کے کسی ہندو مؤرخ نے بھی کسی جگہ مدردیش کا لفظ استعمال نہیں کیا -

مدردیش کا موجودہ محل وقوع

جنرل کننگھم کشمیر کے جغرافیہ قدیم میں ایک جگہ مدردیش کے متعلق لکھتے ہیں - یہ وسط پنجاب کا پرانا نام معلوم ہوتا ہے جو دریائے بیاس اور چناب اور جہلم کے درمیان واقعہ تھا - اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوہستان جموں کا وہ حصہ بھی جو چناب سے ملحق ہے مدردیش میں شامل تھا -

راجہ شل کا دارالحکومت چونکہ شاکل یا شالکوٹ ہی سب مؤرخوں نے بیان[۵۳] کیا ہے - اس لئے سیالکوٹ کی جسقدر تاریخیں لکھی گئی ہیں - ان سب میں سیالکوٹ کے علاقہ ہی کو مدردیش بتایا گیا ہے - حالانکہ مدردیش سیالکوٹ کے موجودہ علاقہ سے بہت زیادہ وسیع[۵۲] تھا - اور سیالکوٹ کے محدود علاقہ کا فرمانروا راجہ شل اسقدر عظیم الشان لشکر نہیں رکھ سکتا تھا - جو دو کوس تک کے وسیع میدان میں بمشکل سما سکتا -

مصنف گلاب نامہ نے مدردیش کا علاقہ سارا پنجاب بتایا ہے - چنانچہ لکھا ہے کہ راجہ چندر ہاس والئے مدردیش (پنجاب) سے جب راجہ باہو لوچن والئے جموں کی لڑائی ہوئی تو باہو لوچن کے قتل کے بعد اس کے بھائی جامبو لوچن نے جو شہر جموں کا بانی تھا راجہ چندر ہاس سے جنگ کی اور اس کو قتل کرکے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا - اور پنجاب اور اطراف واکناف کے کئی علاقے اپنے قبضہ میں لے آیا -

اس واقعہ سے کئی صدیوں کے بعد راجگان سیالکوٹ اور راجگان جموں میں لڑائیاں ہوتی رہیں - کبھی سیالکوٹ والے جموں کا کچھ علاقہ لے لیتے تھے اور کبھی جموں والے سیالکوٹ کے کسی حصہ پہ قابض ہو جاتے تھے - مدردیش کا علاقہ راجہ شل کے زمانہ میں یقیناً سارے پنجاب پر حاوی ہوگا - لیکن مہابھارت سے اس کی صحیح وسعت مملکت کا اندازہ نہیں ہوسکتا - زراج ترنگنی ہی سے مدردیش کا صحیح محل وقوع معلوم ہوسکتا ہے - البتہ پنڈت جونراج کی زینہ ترنگنی اور شرلوبر کی زینہ راج ترنگنی سے اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ اس کے عہد میں جس کو آج قریباً ساڑھے پانچ سو سال گزر چکے ہیں - کوہستان جموں کا نام مدردیش تھا - چنانچہ راجہ مالدیو اور راجہ مانک دیو اور راجہ عجب دیو یا ابھے دیو جن کا وہ والیان مدر کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے - جموں ہی کے راجہ تھے -

---

۵۱ زمانہ اردو کورس جماعت ہفتم مرتبہ سررشتہ تعلیم پنجاب صفحہ ۲۱ مصنفان پانڈو کوتو -

۵۲ دیوان کرپا رام مدار المہام مہاراجہ سر رنبیر سنگھ آنجہانی والئے جموں و کشمیر اپنی تصنیف گلاب نامہ (فارسی) سنہ تالیف سنہ ۱۹۲۹ء میں لکھتے ہیں "راجہ شل نے جموں سے ۶ فرسنگ کے فاصلہ پہ ایک سنگین قلعہ بنام شلکوٹ تیار کرکے اپنا دارالعدالت بنایا اور یورش ہائے متواتر سے جموں کو خراب کرتا رہا"

۵۳ گلاب نامہ میں لکھا ہے کہ راجہ شل کی ولایت پنجاب سے قندھار تک پھیلی ہوئی تھی -

راجہ مالدیو کے متعلق زینہ ترنگنی میں لکھا ہے کہ اس راجہ کے ساتھ بڈشاہ کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ایک مرتبہ گکھڑوں کے سردار نے مدر کے راجہ مالدیو کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ بڈشاہ کو خبر ہوئی تو اس نے گکھڑوں کے سردار سے اس کو رہا کرایا۔

راجہ مالدیو کا سال وفات ۱۴۵۶ء ب ہے۔ آج ۱۹۵۷ء ب ہے۔ اس حساب سے اس واقعہ کو آج ۵۰۱ سال گزر چکے ہیں۔ بڈشاہ ۸۲۶ھ میں تخت نشین ہوتا ہے اور ۸۷۹ھ میں وہ انتقال کر جاتا ہے۔ اس زمانہ کو بھی آج ۵۳۳ سال ہو چکے ہیں۔ گویا جس مالدیو کو زونراج نے راجۂ مدر لکھا ہے۔ اسی مالدیو کو مصنف تاریخ گلاب نامہ اور مصنف تاریخ راجپوتان پنجاب راجۂ جموں لکھتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ وہی راجہ مالدیو ہے جو بڈشاہ کے زمانہ میں جموں میں جموں کا حکمران تھا۔ جس کو سنسکرت مصنفوں نے راجۂ مدر اور فارسی و اردو کے مصنفوں نے راجۂ جموں لکھا ہے۔

پھر اس کے بعد سلطان حیدر شاہ کے زمانہ میں شری ور پنڈت مانک دیو کو اور برنامہ سلطان حسن شاہ راجہ اجے دیو یا عجب دیو کو مدردیش کا راجہ لکھتا ہے۔ راجہ عجب دیو کو مدردیش کا راجہ لکھتا ہے۔ راجہ عجب دیو راجہ ہمیر دیو عرف بھیم دیو کا فرزند تھا۔ اور بھیم دیو راجہ مالدیو کا بیٹا تھا۔ راجہ بھیم دیو کا ذکر طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ میں بھی ہے۔ یہ راجہ سید مبارک شاہ والئے دہلی (۸۲۳ھ لغایت ۸۳۷ھ) کے عہد میں زندہ تھا۔ اور یہ دوران جنگ جسرت گکھڑ کے ہاتھ سے قتل ہو گیا تھا۔

راجہ اجے دیو یا عجب دیو وہی راجہ ہے جس نے تاتار خاں حاکم لاہور کے خوف سے سلطان حسن شاہ والئے کشمیر سے مدد طلب کی تھی اور اس نے اپنے سپہ سالار تازی بٹ کو اس کی اعانت کے لئے روانہ کیا تھا۔

مندرجہ صدر تمام واقعات جن کا تعلق مہابھارت کے بعد کے زمانہ سے ہے۔ اس بات کی زندہ شہادت ہیں کہ سنسکرت زبان کے مؤرخین کشمیر نے جس مدردیش کا ذکر کیا ہے وہ کوہستان جموں ہی کا علاقہ ہے اور جس جموں کا ذکر اردو و فارسی کے مؤرخوں نے علی شاہ اور بڈشاہ کے زمانہ میں کیا ہے وہ مدر ہی کا علاقہ ہے[۳]

محمد الدین فوق

۱؎ چالیس سال کی حکومت کے بعد یہ راجہ ۱۴۵۶ء ب میں قتل ہو گیا۔ تیمور کے زمانہ میں بھی جموں کا یہی راجہ تھا۔ چنانچہ مصنف گلاب نامہ لکھتا ہے "جب ۸۰۱ھ میں امیر تیمور ملک سندھ کو تباہ کر کے مراجعت سمرقند کے ارادہ سے چوں متصل کوہستان جموں نزول رایت اقبال گشت راجہ مالدیو معہ جماعت راجپوتان پیکار طلب بہ عزم شبخون بہ قشون شتافتہ وگل زمین جموں را از لشکر گورگال کان گور ساختہ" بڈشاہ کی تخت نشینی اور تیمور کی وفات میں صرف ۱۶-۱۷ سال کا فرق ہے۔

۲؎ راجہ بھیم دیو کے دو اور بھائی بھی تھے۔ ایک چندن دیو۔ دوسرا ساگر دیو۔ ان میں چندن دیو کے دو فرزند تھے۔ شیرا اور سلطان۔ اس زمانہ میں دہلی پر سادات خاندان کی حکومت تھی اور راجہ مالدیو کی اولاد سے اکثر جموال راجپوت دربار دہلی میں ملازم تھے۔ علاقہ جموں کے شرخانیہ جموال راجپوت اسی شیرا کی اولاد سے ہیں۔ (از تاریخ راجگان جموال جلد دوم صفحہ ۴۳۷)

۳؎ پروفیسر گلشن رائے اپنے ایک مضمون "سیاسیات کشمیر میں آئینی اصلاحات" میں لکھتے ہیں۔ پرانے زمانے میں علاقہ جموں کا نام اُتر مدرا تھا اور لاہور کو دکھن مدرا کہتے تھے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ جموں مدردیش ہی کے ایک حصّہ کا نام تھا۔ (یہ مضمون ۱۴ اگست ۱۹۳۸ء کے اخبار ہمدرد سری نگر کشمیر میں درج ہے)

کوئی میرے دل سے پوچھے مرے ولولے قفس میں
یہ بہار کا زمانہ یہ مری بھری جوانی
(حسرت لکھنوی)

رُوحِ انتخاب

(۱)

شاعر کا خطاب نقّاد سے

او نقّاد، میری کائنات میں قدم رنجانہ فرما!
کہ میری دُنیا میں تقدیس کے چشمے رواں ہیں!

میری نگری میں وارد نہ ہو،
کہ تیری دُنیا میں جھوٹی مسکراہٹ اور کھسیانی ہنسی کی حکومت ہے۔ میں گلستانِ تخیل کے ہر پھول کو خلد کے پانی سے سینچوں گا۔
جو اس کے ارد گرد ایک طرفہ بہار پیدا کر رہے ہیں۔
میرے گلستاں میں آنے کی کوشش نہ کر!
کہ یہ پھول تیری ظالم نحوست سے مرجھا جائیں گے کیونکہ تیری آنکھوں سے موت جھانک رہی ہے، تیری ہر سانس کہر کا اثر لئے ہوئے ہے۔ آہ، تم اس بدنصیب دنیا میں رہتے ہو، جہاں تم طائر آزاد کے دل آویز نغموں سے محروم ہو،
سنو، گلستاں میں خوش نوا طائر گا رہا ہے،
میری کائنات میں نہ آ،
کہ وہ زمین پر گر پڑے گا اور ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جائیگا۔

رات دن،
شاعر کے تخیل میں۔
قرمزی پہاڑ کی جانب سے،
نرم سو آواز کے ساتھ،
ایک چشمہ رواں ہے،
نورانی چادر کی مانند ——
جو ایک ہموار، سایہ دار گلستاں کے قطعہ پر بہہ رہا ہے،
جس کو یہ قرمزی۔ پہاڑ خلد سے بہا کر لاتے ہیں اور جو ایک غیر فانی محبت کا گیت گاتا ہے۔

اگرچہ اس کی آواز بہت صاف اور نکھری ہوئی ہے۔
مگر، او نقّاد!
تم اس کو ہرگز نہیں سُن سکتے!
کہ تم گونگے ہو چکے ہو،
تم بہرے ہو چکے ہو۔
(انگریزی) —————— (ٹینی سن)

(۲)

عربوں کا جنگی ترانہ

ہم تقدیر سے بھی زیادہ تیز رفتار ہیں۔
ہم ہر وقت گھوڑوں پر سوار،
جنگ کیلئے تیار رہتے ہیں،
ہم مغربی حکمرانوں کی تہذیب و تمدن کو کچل دیتے ہیں۔
او مغرب کے سفید فام بادشاہو!
تیار ہو جاؤ!
ہشیار ہو جاؤ!!
عیش و عشرت ہم سے بہت دور بستے ہیں۔
ہم آرام طلبی کی موت نہیں مرتے،
اور نہ ہم عورتوں کی طرح آہ و فغاں کرتے ہیں،
اور نہ بچوں کی طرح بڑبڑاتے ہیں۔
بلکہ ہم خیموں کے رسّوں پر سوتے ہیں۔
ہم نئے جذبوں اور نئے ولولوں کے ساتھ بیدار ہوتے ہیں۔
اور میدانِ جنگ کی سمت۔
فتحمندانہ انداز سے روانہ ہوتے ہیں۔
سورج اور چاند ہماری رہنمائی کرتے ہیں، اور نسیم بہار ہمارے

بالوں کو چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے،
ہم شمال سے جنوب،
اور مشرق سے مغرب
فتح مندانہ انداز میں بڑھتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔
تلوار ہماری پیش قدمی کرتی ہے،
اور ہمارا قومی جھنڈا،
ہلالی نشان کے ساتھ،
ہر جگہ لہراتا ہوا دکھائی دیتا ہے،
ہم میدانِ جنگ میں
موت کے دانت کھٹے کر دیتے ہیں،
ہماری تلواریں اور نیزے،
دشمنوں کے دلوں میں،
ایک غیر فانی ہراس پیدا کر دیتے ہیں،
ہماری ڈھالیں،
ایک پُرسکوں چشمے کے پانی کے مانند چمکتی ہیں۔
دشمن کے بزدل اور جواں مرد سپاہی ہماری تلوار کی
محض جنبشوں سے ہی بے موت مرتے ہیں،
خدا کے فضل و کرم سے۔
ہم فتح مند و کامراں ہیں،

(جمیل فلکر) ــــــــ (انگریزی)

اثر چکوالی
بی۔ اے

مسائل لطیف

عتابِ خاص ملا، بے مزا سزا نہ ملی
مرے مزاج کو وحشت تھی داستانوں سے
پہنچ سکی نہ نظر تا بہ حدِ معنیٔ درد!
نہ آئی عذر طرازی بھی کم سوادوں کو
معاملات کی تہ میں عجیب الجھن تھی
مری حیات کی دو الجھنیں کبھی نہ کھلیں
دماغ شکوہ تھا ہم کو مگر وہ چشم رسا
مرے نشے کا تسلسل ہے تا ابد قائم
گماں کے گھر سے ملا کچھ صداقتوں کا سراغ

مزاجِ درد ملا، وحشت دوا نہ ملی
مگر وہ چشم حسیں طالب فسانہ نہ ملی
ہمیں یہ شکوہ رہا، درد کی دوا نہ ملی
فضا بنا نہ سکے کہہ دیا فضا نہ ملی
پتنے کی بات کبھی حسبِ مدعا نہ ملی
مزاجِ دل نہ ملا، آپ کی رضا نہ ملی
سراغ پا گئی ہنس ہنس کے دوستا نہ ملی
مجھے ازل سے سرشتِ شراب خانہ ملی
دیارِ وہم سے کچھ بوئے عارفانہ ملی

عدم کے وصف سے ہستی کا رنگ مل نہ سکا
ملا وجود کو سب کچھ مگر بقا نہ ملی

عدم

مشاہیرِ عالم

تھورو

تھورو ایک امریکن ادیب اور اہلِ قلم تھا، اگرچہ وہ ایک تعیش پسند ملک کا باشندہ تھا پھر بھی اس میں سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس کے مزاج میں تکلف کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس نے تمام عمر سگریٹ کو منہ سے نہیں لگایا، وہ لکھتا ہے ۔ میں نے کنول کا ڈنٹھل جلا کر پیا تھا۔ وہ بھی بچپنے میں، اس سے بدتر چیز میں نے کبھی نہیں پی۔

تھورو کبھی دعوت اور پارٹی میں شرکت نہیں کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ لوگ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے کھانے میں کتنی زیادہ خرچ ہوتا ہے اور میں اس بات پر ناز کرتا ہوں کہ میرے کھانے میں کتنا کم خرچ ہوتا ہے۔

تھورو کی بے تکلفی اور سادہ مزاجی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے ڈیسک پر سنگ سفید کے تین ٹکڑے رکھے رہتے تھے۔ ایک روز یہ کہہ کر ان کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا کہ ہمیں اپنے دماغ ہی کے جھاڑ پونچھ کر صاف رکھنے کا کام کونسا کم ہے جو یہ علت پالے رہیں؟

ایک دفعہ ایک عورت نے تھورو کو ایک چٹائی نذر کی، اس نے عورت کو چٹائی واپس کر دی اور کہا۔ محترمہ! میرے گھر میں اتنی جگہ نہیں ہے جو میں اس چٹائی کو رکھ سکوں۔ اور نہ میرے پاس اتنا وقت ہے جو میں اسے جھاڑ صاف کر سکوں۔

تھورو کی بے تکلف اور سادہ زندگی کی انتہا یہ تھی کہ شراب تو شراب وہ کافی اور چائے کو بھی بُرا سمجھتا تھا، وہ لکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عقلمند آدمیوں کیلئے پینے کی سب سے بہتر چیز صرف صاف پانی ہے، شراب اتنی اچھی چیز نہیں، جتنا پانی اور گرم کافی پی کر صبح کی یا گرم چائے پی کر شام کی امیدوں کو پاش پاش کرنے کے بارے میں تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے'

میں جب کبھی بھی کافی یا چائے کے لالچ میں پڑ گیا ہوں میرا اکثر زوال ہی ہوا ہے۔

ایک اور مقام پر اس نے مختصر اور سادہ زندگی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ پہلے مجھ کو اس بات کی فکر دامنگیر رہتی تھی کہ ایمانداری کے ساتھ روزی حاصل کرتے ہوئے میں اتنا وقت کیونکر بچا سکوں جو اپنے محبوب امور کے انجام دے سکوں۔ میں انہی دنوں ایک لمبا صندوق ریل کی سڑک کے نزدیک رکھا ہوا دیکھا کرتا تھا۔ جس میں مزدور رات کو اپنے اوزار رکھ کر تالا بند کر دیا کرتے تھے۔ اس صندوق کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ اگر کسی شخص کی مالی حالت خراب ہو تو اسے تین ڈالر میں اسی طرح کا ایک صندوق خرید لینا چاہیئے اور اس میں ہوا کی آمد و رفت کیلئے سوراخ کر لینے چاہئیں۔ بارش کی حالت میں وہ شخص اس کے اندر گھس کر اور اندر سے ڈھکن لگا کر آرام سے رات گزار سکتا ہے۔ اس طرح اس کی طبیعت آزاد رہے گی اور وہ آزادی کے ساتھ اپنے محبوب موضوع مطالعہ جاری رکھ سکے گا۔ اس میں نہ مکان کا جھگڑا ہے اور نہ مالک مکان کے تقاضے کا، کتنے آدمی دراصل اس سے بڑے صندوق ہی میں رہتے ہیں اور کرایہ دیتے دیتے مر جاتے ہیں۔

تھورو شراب کی طرح گوشت خوری کو بھی معیوب سمجھتا تھا۔ اس نے لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو شخص اپنے اعلیٰ خیالات یا شاعرانہ تخیلات کو بہترین حالت میں رکھنا چاہتا ہے اس کی طبیعت میں گوشت خوری سے اجتناب کی تحریک پیدا ہوتی ہے، بلکہ اسے اپنے ہر طرح کے کھانے میں کمی کرنی پڑتی ہے۔

تھورو تجرد کا بھی زبردست حامی تھا۔ وہ اپنے ایک مضمون

ہیں جس کا عنوان "ہایر لاز" (Higher Laws.) ہے لکھتا ہے۔ "ہم بدچلن ہوتے ہیں تو قوت تولید ہمیں گندہ بنا دیتی ہے، لیکن وہی قوت تولید جب ہم مجرد ہوتے ہیں تو ہمیں طاقت دیتی اور تیزی بخشتی ہے، تجرد کا مطلب ہے انسان کا پھول لانا، اور جیسے ہم جلال، شجاعت اور پرہیزگاری وغیرہ کہتے ہیں۔ وہ تجرد کے پھل کے مثل ہیں جو پھول کے بعد آتے ہیں جب پرہیزگاری کا چشمہ جاری رہتا ہے تو انسان جلد ہی خدا کی جانب مائل ہو جاتا ہے، پرہیزگاری ہم میں حرکت اور تیزی پیدا کرتی ہے اور بدچلنی ہمیں زوال پذیر بناتی ہے، وہی انسان مبارک ہے جسے مسلسل یہ محسوس ہوتا جائے کہ اس کی حیوانیت روز بروز فنا ہو رہی ہے اور روحانیت قائم ہوتی جا رہی ہے۔

لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے ملک کی ترقی کیلئے تجارت کی ضرورت ہے۔ تار کے ذریعہ گفتگو کرنی ضروری ہے اور کم سے کم ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرنا چاہیئے۔ لیکن اس مسئلہ پر کوئی غور نہیں کرتا کہ ہمیں انسان کی طرح رہنا چاہیئے یا جنگلی بندروں کی طرح، لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم سلیپر نہ بنائیں، ریل کی لائن نہ ڈالیں اور دن رات اس کیلئے محنت کرنے کی بجائے اپنی زندگی ہی کے بنانے میں وقت گذارتے رہیں تو پھر ریلوے لائن کون بنائے گا؟ اور ریلوے لائن نہ بنی تو ہم وقت کے اندر آسمان پر کیسے پہنچ سکیں گے؟ کون ان بھلے لوگوں سے پوچھے کہ اگر ہم گھر بیٹھ کر اپنا کام کریں تو پھر ریل کی ضرورت ہی کس کو ہو گی؟ ہم ریلوں پہ تھوڑے ہی چڑھتے ہیں۔ ریلیں ہی ہم پر چڑھتی ہیں۔ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ ریلوے لائن کے نیچے جو سلیپر (Sleepers یعنی دیگر سونے والے) بچھے ہوئے ہیں وہ کون ہیں؟ ان میں کوئی آئرش ہے کوئی امریکن، ان پر ریلیں بچھی ہوئی ہیں۔ اور ان کی لاشیں مٹی سے ڈھکی ہیں۔ جن پر مزے سے گاڑیاں چلتی ہیں، وہ بڑے ساؤنڈ سلیپر (یعنی دیگر گہری نیند سونے والے) ہیں۔ میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں، اور کتنے انسان ہر سال ان ریلوں سے کٹ جاتے ہیں، اس طرح کچھ خوش نصیب آدمیوں کو تو ریل پر چڑھنے کا موقع ملتا ہے اور کتنوں پر ریل گاڑی خود چڑھ جاتی ہے۔"

ایک اور مقام پر تھورو لکھتا ہے۔ کھانے کے بعد انسان آدھ گھنٹہ بھی نہ سوتا ہو گا کہ اٹھ کر پوچھتا ہے۔ ارے بھئی کیا خبر ہے؟ گویا تمام دنیا اس کا پہرہ دے رہی ہے اور اس فکر میں ہے کہ حضرت جیسے ہی سو کر اٹھیں انہیں خبر سنانی چاہیئے رات گذرنے کے بعد خبر اتنی ہی ضروری خیال کی جاتی ہے جتنا ضروری ناشتہ خیال کیا جاتا ہے۔ "ارے بھئی کوئی تازہ خبر سناؤ۔ دنیا کے کسی حصے میں کسی کو کچھ ہوا ہو تو اس کا حال بتاؤ" اور کافی یا چائے پیتے ہوئے پڑھتا ہے۔ فلاں دریا کے کنارے کسی آدمی کی آنکھیں فلاں دغا باز نے نکال لیں، ان بھلے آدمیوں کو کون بتائے کہ حضرت آپ تو اندھیرے میں رہتے ہیں، اور آپ کی دونوں آنکھیں تو کیا آنکھ کا ایک گوشہ بھی صحیح و سلامت نہیں ہے۔ رہی میری بات تو میرا کام تو ڈاک خانے کے بغیر بڑی آسانی سے چل سکتا ہے، میرا تو خیال ہے کہ ڈاک خانے کے ذریعہ جو خبریں آتی ہیں ان میں اہم خبریں بہت کم ہوتی ہیں۔ اگر میں نقادوں کے نقطۂ نظر سے کہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ زندگی بھر میں مجھ کو جتنے خطوط ملے ہیں۔ ان میں ایک یا دو ایسے تھے جن کی قیمت ٹکٹ کے برابر تھی۔ ایک پینی میں جو خطوط بھیجا جاتا ہے۔ اس میں لوگ بس ایک پینی کی قیمت کے خیالات بھیجتے ہیں۔ یہ سارا مذاق سنجیدگی سے کیا جاتا ہے، میں تو قطعی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کسی اخبار میں کوئی دلچسپ بات نہیں پڑھی۔

اگر کسی اخبار میں ایک دفعہ پڑھ لیں کہ فلاں شخص لوٹ لیا گیا، یا کسی حادثہ سے مر گیا۔ یا یوں کہیئے کہ کوئی مکان جل گیا، کوئی کشتی ٹوٹ گئی، جہاز پھٹ گیا، کوئی گائے ریل کی پٹڑی پر کٹ گئی۔ کوئی پاگل کتا مار ڈالا گیا، تو اس طرح کی خبروں کی ایک مثال کافی ہے، ان کے بار بار پڑھنے کی کیا ضرورت ہے، اگر کسی چیز کا اصل اصول آپ کو معلوم ہو جائے تو آپ اس کی لاکھوں نظیریں اور مثالیں لے کر کیا کریں گے؟

تھورو کا باپ پنسل بنانے کا کاریگر تھا۔ تھورو نے اپنے لئے معلمی کا کام منتخب کیا، لیکن اس کام سے اس کو دلچسپی نہیں ہوئی اور وہ بھی پنسل بنانے کا کام سیکھنے لگا۔ اس نے ایک پنسل بنائی جو لندن کی بہترین پنسلوں کا مقابلہ کرتی تھی، بوسٹن کی نمائش میں اس کی بڑی تعریف ہوئی تھورو کے دوستوں نے سمجھا اب اس کی قسمت کھل گئی۔ پنسل کی تجارت سے اس کے مالدار بننے میں

دیر نہ لگے گی۔ لیکن جب تھورو سے کہا گیا کہ اس کام کو ترقی دو تو اس نے جواب دیا۔ میں پھر پنسل کیوں بناؤں اور جس کام کو ایک دفعہ کر چکا اسے دوبارہ کیوں کروں؟

تھورو پنسل کا کام چھوڑ کر میدانوں اور باغوں کی سیر و تفریح کرنے لگا۔ اس کا محبوب ترین مشغلہ فطرت کا مطالعہ تھا۔

نیکی اور کار خیر کے بارے میں تھورو کہتا ہے، کار خیر ایک ایسا پیشہ ہے جس میں بہت سے لوگ گھس پڑے ہیں۔

تھورو کا قول ہے۔ اپنے مقررہ راستے پر چلے چلو، اگر اس میں کسی کا بھلا ہو جائے تو بہتر ہے۔ اگر مجھے پتہ چل جائے کہ کوئی بھلا آدمی قصداً میرے گھر پر میرے ساتھ بھلائی کرنے آ رہا ہے، تو اس سے اسی طرح بھاگوں گا جیسے افریقی جنگلوں کی گرم ہوا سے جو منہ، آنکھ، ناک، کان کو دھواں سے بھر دیتی ہے اور دم گھونٹ کر جان لے لیتی ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ دوسرے کے ساتھ بھلائی کرو۔ اگر مجھے نصیحت کرنی پڑے تو یہی کہونگا۔ کہ تم خود بھلے بنو، مان لیجئے کہ اگر سورج کے سر پر دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے کا خبط سوار ہو تو وہ اپنے مقررہ راستے کو چھوڑ کر ہر جھونپڑے پر گھومتا پھرے گا۔ ہر دیوانے کو قوت دے گا، گوشت کو پکائے گا، گوشے گوشے کی تاریکی کو دور کرے گا۔ مگر اس کی بجائے وہ کرتا کیا ہے؟ وہ اپنی روشنی کو بڑھاتا ہوا اپنے مقررہ راستے پر چلتا رہتا ہے، اور تمام روئے زمین کی بھلائی کرتا ہے؟ وہ اپنی روشنی کو بڑھاتا ہوا اپنے مقررہ راستے پر چلتا رہتا ہے اور تمام روئے زمین کی بھلائی کرتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ زمین اس کا چاروں طرف گردش کر کے اس سے اپنی بھلائی کرا لیتی ہے

تھورو کی بلند خیالی کا اندازہ ذیل کی سطروں سے ہو سکتا ہے، وہ لکھتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں برطانوی شہنشاہیت ایک عظیم الشان اور باعظمت چیز ہے اور ممالک متحدہ امریکہ کا بھی اوّل درجے کی طاقتوں میں شمار ہوتا ہے، مگر ہم لوگ اس بات پر یقین نہ کریں گے کہ ہر انسان کے دماغ کے سمندر میں خیالات کی ایسی لہر اٹھا اور گرا کرتی ہے کہ اگر وہ اسے عملی صورت میں لا سکے تو برطانوی شہنشاہیت اس کے خیالات کے سمندر میں لکڑی کے ٹکڑے کی طرح تیرتی پھرے۔

تھورو ہر طرح کی قید بند سے گھبراتا تھا اور بالکل آزاد اور بے پرواہ رہنا پسند کرتا تھا، وہ سیر و تفریح اور مطالعۂ فطرت کا بڑا دلدادہ تھا۔ لیکن وہ کن لوگوں کو اس کا مستحق سمجھتا تھا۔ اس کا اندازہ اس کے ذیل کے خیالات سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے

اگر تم ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے اور احباب سب کو چھوڑنے اور پھر انہیں کبھی نہ دیکھنے کیلئے تیار ہو، اگر تم نے اپنا قرض ادا کر دیا ہے۔ اور اپنی وصیت تحریر کر دی ہے، اپنے تمام جھگڑے طے کر دئے ہیں اور ہر طرح آزاد ہو چکے ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ تم سیر و تفریح کے اہل ہو۔

ایک بار کچھ لوگوں نے تھورو سے پوچھا۔ کیا آپ مہربانی کر کے ہمارے ساتھ ٹہلنے چلیں گے؟ تھورو نے جواب دیا میں کہہ نہیں سکتا۔ سیر و تفریح میرے لئے سب سے اہم ترین چیز ہے۔ اور سیر کا وقت میرے پاس اتنا فالتو نہیں ہے کہ میں لوگوں کو اپنے ساتھ لے سکوں۔

اپنے ایک دوست کے خط میں تھورو لکھتا ہے "میں نے آپ سے کبھی یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں آپ کو خط لکھوں گا۔ لہذا میں جو آپ کو خط لکھ رہا ہوں اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنے وعدے سے زیادہ ہی کر رہا ہوں۔"

وہ کہتا ہے کہ آجکل چھ روز تعطیل ہونی چاہیئے اور ایک روز کام۔

اہل قلم کے متعلق تھورو لکھتا ہے۔ علاوہ ازیں میں ہر اہل قلم سے یہ امید کرتا ہوں کہ وہ اپنی زندگی کے سیدھے سادے سچے واقعات لکھے نہ کہ محض وہ باتیں جو اس نے دوسروں کی زندگی کے سن رکھی ہیں جیسے وہ اپنے کسی رشتے دار کو کسی دور دراز مقام سے خط لکھ رہا ہو۔ اسی طرح حالات لکھنے چاہئیں، اگر کسی شخص نے سچائی کے ساتھ زندگی گذاری ہے۔ تو میرے لئے اس کی زندگی کا حال ایسا ہی دلچسپ ہوگا جیسے کسی دور دراز ملک کا حال۔"

تھورو کا قول تھا کہ کسی صاحب فن اور اس کے عمل کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ یہ بھی کہتا ہے۔ اگر تم کسی شخص کو یہ اطمینان دلانا چاہتے ہو کہ وہ غلط راستے پر ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ تم خود صحیح راستے پر چلو، لیکن اسے یقین دلانے کی کوشش نہ کرو، لوگ

جو چیز دیکھتے ہیں اُسی پر یقین کرتے ہیں، بس لوگوں کو دیکھنے دو۔"

ایک مقام پر لکھتا ہے "معلوم ہوتا ہے مردم شماری کرنے والوں نے بڑی غلطی کی ہے۔ اِس ملک میں دو آدمی ہیں کتنے؟ ہزار میل کے رقبے میں کتنے مرد ہوں گے؟ اِدھر اُدھر لڑھکنے والے بے اصول آدمیوں کو میں مردوں میں شمار نہیں کرتا۔"

ہندو مذہب کی تصانیف کے متعلق تھورو کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ علاوہ ازیں اسے چینی اور فارسی لٹریچر سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ ان سب کے مقابلے میں اس کا انجیل کا مطالعہ بہت محدود تھا۔ گاندھی تھورو سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ اور اس کی تصانیف کو بہت پسند کرتے ہیں۔

سرفراز بیگم

سیونی (ناگپور)

غزل

ان چھوٹی چھوٹی رنجشوں کو بھول جائیے
تجدیدِ رسم و راہ کے ساغر پلائیے

ویراں پڑی ہے میری محبت کی کائنات
آکر بسائیے اُسے آکر بسائیے

جی بھر کے مسکرائیے حالِ خراب پر!
دل کھول کر شرابِ تبسم پلائیے

محفل کی مے فروش فضا کیوں خاموش ہے؟
نغمہ سنائیے کوئی نغمہ سنائیے

دل کی طرف سے بھیجئے مجھکو پیامِ شوق!
آنکھوں کی راہ سے مجھے واپس بلائیے

جنگل ہے چاندنی ہے، فضائیں ہیں مست مست
دو چار بھولے بسرے فسانے سنائیے

تاروں کی کائنات میں لگ جائے آگ سی!!
کچھ اس طرح ربابِ محبت پہ گائیے

بنیادِ دردِ زیست ہے احساس ہوش کا!!
وحشی بنائیے مجھے وحشی بنائیے

کیا کہہ رہے ہیں آپ اثرؔ سے اے میرے دوست!
پروانے کو رموزِ فنا مت سکھائیے!

اثرؔ چکوالی

علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ

چار پانچ ماہ ہوئے اس مضمون کا بیشتر حصہ دلّی سے نشر ہوا، اس کے بعد اسے مکمل کرنے کی فرصت نہ ملی۔ اب کچھ ترمیم و اضافہ کرکے نذرِ شاہکار کرتا ہوں۔

(صادق الخیری)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

مصوّرِ غم حضرت علامہ راشد الخیری مغفور، جو ہند کے مایۂ ناز انشاءپرداز، خواتینِ ہند کے محسنِ اعظم، ایک عظیم المرتبت اسلامی مؤرخ اور مشرقی تہذیب و تمدن کے نوحہ خواں تھے، جنوری ۱۸۶۸ء میں بمقام دلّی اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے۔ وہ دلّی کے قدیم ترین اور علما کے اس خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کے علم و فضل کا دُور دُور شہرہ تھا۔ ان کے والد ماجد حافظ عبدالواحد مرحوم حیدرآباد دکن کے محکمۂ بندوبست میں افسرِ اعلیٰ تھے۔ جو انہیں نو سال کا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے اور ان کی پرورش دادا اور جان سے زیادہ عزیز سمجھنے والی ماں کے سپرد ہوئی۔ ان کے جدِ امجد مولینا خیر اللہؒ کے بزرگ عہدِ شاہجہانی میں حجاز سے واردِ ہندوستان ہوئے۔ انہی کی نسبت سے حضرت علامہ اور دیگر افرادِ خاندان نے "الخیری" کا اپنے نام کے ساتھ اضافہ کیا۔

لڑکپن میں اپنے ساتھیوں، شیخ (ڈاکٹر جبار خیری پی ایچ ڈی)، ابن (الحاج عبدالغفار الخیری پروفیسر جامعہ بیروت) مولوی عبدالمجید وغیرہ کی معیت میں خوب کھیلتے اور شرارتیں کرتے تھے۔ شرفا کے دستور کے مطابق کسرت بھی کرتے .... تھے۔ موسیقی کا شروع سے شوق تھا۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ الغوزہ اور ستار بہت اچھا بجاتے تھے۔ بنراکی، کرکٹ اور کبڈی میں بھی دلچسپی تھی کشتی کا ایک دھندلا سا نقش تو مجھے بھی یاد ہے۔

اب سے کئی سال پہلے ایڈورڈ پارک میں دلّی کے اکثر اہلِ علم سرِشام جمع ہوتے تھے۔ ایک رات چاندنی کھلی ہوئی تھی حضرت علامہ کے خاص خاص احباب کا مجمع تھا۔ سب گھیرا بنائے بیٹھے تھے۔ میں اس وقت آٹھ دس سال کا ہونگا، علامہ مرحوم کبھی کبھی مجھے بھی ہمراہ لے جاتے تھے۔ چنانچہ میں ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایکا ایکی جو نظر پڑی۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرتِ علامہ اور مولانا محمد علی مرحوم بیٹھے بیٹھے گتھے ہوئے ہیں۔ کبھی علامہ مرحوم اور کبھی مولانا مرحوم غالب آئے۔ میں یہ سمجھ کر کہ لڑائی ہو رہی ہے، رو پڑا۔ اس پر سب نے قہقہہ لگایا ــــــ اس کے آگے کی خبر نہیں۔ اس کے سنانے سے مطلب یہ ہے کہ بے تکلف دوستوں اور اپنی جیسی طبیعتوں کے آدمیوں کی صحبت میں انسان کو بڑی عمر میں بھی جوانی کی باتیں یاد آجاتی ہیں۔

ابتدا میں انہوں نے گھر پر ہی اردو، عربی اور فارسی سیکھی۔ بعدازاں عربک اسکول میں داخل ہوگئے۔ یہ وہی گہوارۂ علم ہے جہاں سے سرسیّد اور نذیر احمد جیسی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ ان دنوں یہاں مولانا حالی پڑھاتے تھے۔ ان کی نظرِ جوہرشناس حضرت علامہ پر پڑی اور ان کی ذہانت کے چرچے دوسرے استادوں سے سُنکر انہوں نے پیشین گوئی کی کہ یہ لڑکا بڑا ہوکر کوئی نمایاں کام کرے گا۔ یہ بات بھی لائقِ ذکر ہے کہ انہیں اسکول کے اُکتا دینے والے نصاب سے ازحد وحشت ہوتی تھی اور سوائے انگریزی کے کسی اور مضمون میں انہوں نے کبھی دلچسپی نہ لی۔ فرماتے تھے "دادا ابا اور بی اماں اسی فکر میں گھلے جاتے ہیں کہ ابّی (یہ ان کا پیار کا نام تھا) دن بھر محنت سے پڑھتا ہے۔ اُن کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی کہ ادھر حساب کا گھنٹہ بجا، اُدھر ہماری ٹولی نہر پر پہنچی یا گانا بجانا شروع کردیا۔" خیر، ادھر تو تھی مولینا حالی کی تعلیم، اُدھر ملی ڈپٹی نذیر احمد کی صحبت۔ ان کے علاوہ مولینا آزاد اور منشی ذکاء اللہ وغیرہ .... سے فیضیاب ہونے کے بھی اکثر مواقع میسر آئے۔ لیکن دراصل ان کے علم و فضل میں وسعت پیدا کرنے والا عنصر ذاتی مطالعہ (Self Study) تھا۔ انٹرنس کے بعد انہوں نے گھر پر ہی مشرقی علوم پر عبور حاصل کیا۔ عموماً چار بجے صبح اُٹھ بیٹھتے اور تین چار گھنٹے پڑھنے میں صرف

کرتے۔ بچپن سے ان میں مذہبیت بہت کافی تھی۔ لٹریچر کے ساتھ ساتھ انہوں نے خصوصیت سے اسلام اور دیگر مذاہب کا بھی مطالعہ کیا۔ یہ سب کچھ تعلیم کا حال تھا۔ اس پر سونے کا نوالہ کھلانے اور شیر کی نگاہ دیکھنے والی ماں کی تربیت، سونے پر سہاگہ تھی۔

الفراغِ تعلیم کے بعد ۱۸۹۰ء میں دہلی کے مشہور عالم مولوی عبدالرحیم صاحب کی صاحبزادی سے ان کی شادی ہوئی اور ۱۸۹۱ء میں علیگڑھ میں ملازم ہوگئے۔ لیکن ملازمت کی پابندیاں ان کی آزاد اور علم و ادب کی مشتاق طبیعت کے خلاف تھیں۔ کوئی ۱۸۹۲ء میں انہوں نے "احسن و بہونہ" تصنیف کی جو عشقِ نامراد اور حسن سوگوار ۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ کی داستان تھی۔ مگر اسے مولینا نذیر احمد اور مولانا حالی نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ لہذا مصنف نے بڑے ارمانوں سے لکھی ہوئی اپنی پہلی کتاب استادوں کی خوشنودی کیلئے ضائع کر دی، لیکن ہمت نہ ہارے۔ علامہ مرحوم نے مولینا نذیر احمد کی تصانیف کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ بلکہ انہی میں رس بس گئے۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں انہی کے رنگ میں "صالحات" لکھی۔ مولینا موصوف اسے پڑھ کر بے حد خوش ہوئے اور اس کی تعریف ان الفاظ میں کی "اپنی کتابوں کے علاوہ قصص میں یہ پہلی کتاب ہے جو میں نے شروع سے آخر تک پڑھی، اور اگر مجھے یقین نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ صالحات میری لکھی ہوئی ہے اور مسودہ چوری گیا۔" اسی طرح مولینا حالی نے اپنے عزیز ترین شاگرد کی لیاقت و ادبیت پر انتہائی مسرت و افتخار کا اظہار کیا۔ ۱۸۹۸ء میں "منازل السائرہ" شائع ہوئی۔ جس سے سارے ملک میں حضرت علامہ مرحوم کی دھوم مچ گئی۔ اور ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ اس عرصے میں ہوتے ہواتے علی گڑھ سے دہلی آ گئے۔ یہاں ان کے خاص خاص احباب کا ایک مختصر سا گروہ تھا۔ جس میں سر شیخ عبدالقادر، شیخ محمد اکرام بیرسٹر، آغا شاعر قزلباش، سر محمد اقبال مرحوم، پروفیسر محمد سعید مدیر نیرنگ وغیرہ شامل تھے۔ یہاں آ کر ۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ ان کی فطرت ادبی ذوق کی تکمیل چاہنے لگی۔ شروع شروع میں انہوں نے ڈپٹی نذیر احمد کے رنگ میں لکھا مگر بعد میں ان کا طرزِ انشا ایک نئے ڈھنگ میں ڈھلتا چلا گیا جو اول الذکر سے کہیں زیادہ شاعرانہ، ہمہ گیر اور پُر تاثیر تھا۔ ان کی تحریر نے ابتدا ہی سے قارئین کا دل موہ لیا اور لوگ ان کے مضامین کے مشتاق رہنے لگے۔ ۱۹۰۳ء میں سر شیخ عبدالقادر صاحب کے اصرار سے ان کے رسالے مخزن میں مضمون نگاری شروع کی جس کا تعارف صاحبِ مخزن نے اس طرح کرایا:۔

"یہ مضمون مدت کے تقاضوں کے بعد ہمیں اپنے دوست مولوی محمد عبدالراشد صاحب مترجم عدالت بندوبست سے ملا ہے۔ صاحب موصوف شمس العلما حافظ نذیر احمد صاحب کے عزیزوں میں ہیں اور زبان پر خوب قدرت رکھتے ہیں۔ خصوصاً مستورات کی زبان (جو فی الواقع دلی کی زبان ہے) بہت بے تکلف لکھتے ہیں۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد صاحب کی لاجواب کتابوں کے بعد مولوی عبدالراشد صاحب کی کتاب منازل السائرہ (جس کے ناشر بھی شیخ صاحب تھے) اپنی قسم کی ایک لاجواب کتاب ہے۔ ۔۔۔۔۔۔ یہ مضمون اس بے ساختہ پن سے لکھا گیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ۔۔۔۔۔"

علامہ مرحوم کی طبیعت غمناک اثر جلد مقبول کر لیتی تھی اور شاید اسی لئے وہ پردے میں رہنے والیوں کی حالت زار سے متاثر ہو کر ان کی ہمدردی اور حمایت میں کھڑے ہوئے۔ مضامین اور کتابوں کے علاوہ ۱۹۰۸ء میں "عصمت" جاری کیا جو ہندوستان کا سب سے پہلا زنانہ رسالہ تھا اور اب تک بفضلہٖ خواتین کا سب سے بڑا اور بہترین پرچہ مانا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کی ادبی خدمات نے اسے اردو کے صفِ اول کے رسالوں میں لا کھڑا کیا ہے۔

میں نے ابھی کہیں عرض کیا تھا کہ ملازمت سے ان کی طبیعت اچاٹ ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ چھٹیوں پہ چھٹیاں لینے لگے۔ کہ ایک پر لطف واقعہ پیش آیا۔ ان کے افسر صاحب خاصے فرعون بے سامان تھے انہیں بات بات میں ماتحتوں پر رعب جمانے کی عادت تھی۔ علامہ مرحوم کی طویل چھٹیوں سے تنگ آ کر ان پر بھی سختی کرنی چاہی مگر چونکہ ان کو ملازمت کی پرواہی نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے بارہا پینترے بدلے لیکن وہ کسی طرح قابو میں نہ آئے۔ آخر اس نے ڈاکٹری سارٹیفکیٹ طلب کرنے شروع کئے اور جب یہ شرط بھی پوری ہوئی تو سول سرجن کا سارٹیفکیٹ مانگا۔ اس کے ملجانے پر وہ اور بھی چراغ پا ہوا اور جب یہ رخصت بھی ختم ہوئی تو علامہ مرحوم نے ایک

دوسرے سول سرجن کا سرٹیفکیٹ بھیج دیا۔ ایک روز راستے میں دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ صاحب گھوڑے پر سے نیچے اُتر آئے اور دھیمی آواز میں بولے۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ اب تم مصنف ہو گئے ہو اور تمہیں نوکری کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن دیکھو اس طرح دوسرے لوگوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔" اس وقت اس کے چہرے سے اعترافِ شکست معلوم ہوتا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۱۰ء کی بات ہے جب وہ اٹھارہ انیس سال کی ملازمت سے مستعفی ہو کر ہمہ تن ادبی و اصلاحی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔

۱۹۱۱ء میں عورتوں کی حمایت کیلئے ایک مردانہ ادبی رسالہ "تمدن" نکالا جو اپنی قسم کا پہلا اور آخری رسالہ تھا۔ اس دَور میں ان کے حلقۂ احباب میں چند اور حضرات شریک ہوئے۔ جن میں سے رؤف علی مرحوم بیرسٹر، ابوالمعانی خلیقی مرحوم صاحب خیالستان، مولانا محمد علی مرحوم ایڈیٹر ہمدرد، میر جالب مرحوم ایڈیٹر ہمدم، حکیم اجمل خاں مرحوم، پرنسپل مشتاق احمد زاہدی کے ناموں سے کان زیادہ آشنا ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں ایک زنانہ اخبار "سہیلی" جاری کیا۔ ۱۹۲۲ء میں تربیت گاہ بنات (مسلمان بچیوں کا مدرسہ) کی بنا ڈالی ۱۹۲۶ء میں کم عمر بچیوں کیلئے "بنات" جاری کیا اور ۱۹۳۲ء میں زنانہ دستکاریوں کے ماہنامے "جوہر نسواں" کا اجرا فرمایا۔ اس زمانے میں ملنا ملانا کم کر دیا تھا۔ تمام تر توجہات یتیم بچیوں کی تعلیم و تربیت پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ اکثر احباب بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ جو بچ گئے تھے اُن سے برابر ملتے رہے۔ آخری دَور میں ملا واحدی ایڈیٹر نظام المشائخ، عارف ہسوی مرحوم ایڈیٹر انقلاب، مولوی فضل احمد شیدا، کپتان حبیب الرحمٰن سی۔ آئی۔ ای (علامہ مرحوم کے برادر نسبتی) اور شاہ محمد امان الرحمٰن (برادر نسبتی) سے میل جول زیادہ تھا۔

حضرت علامہ کی فطرت عافیت پسند تھی۔ جلسوں اور پارٹیوں کی شرکت سے اجتناب کرتے تھے۔ وہ تھے اور اکثر گوشۂ تنہائی۔ ان کا مونس قلم اور کاغذ اور ہمدم رسولِ اکرمؐ کا ذکرِ خیر تھا۔ ان کے بے تکلف دوست بھی زیادہ نہ تھے مگر جن سے بے تکلفی تھی ان میں خوب گھُل مِل کر رہتے تھے۔ ہر چند کہ قوم کی پستی اور عورت کی تباہ حالی نے ان کو الم نگار بنا دیا تھا مگر ان کی طبیعت میں جسقدر سنجیدگی تھی اتنی ہی ظرافت۔ اسی لئے جن لوگوں کو اُن سے واسطہ پڑتا تھا، وہ جانتے تھے کہ علامہ مرحوم آنسوؤں کے بادشاہ ہی نہیں قہقہوں کے سرتاج بھی ہیں۔ وہ حد درجہ لطیفہ گو، بذلہ سنج اور خوش مزاج تھے۔ اپنے تو اپنے غیروں کو بھی ان کی خدمت میں طمانیتِ قلب محسوس ہوتی تھی۔ ان کی ادبی افسردگی اور ذاتی شگفتگی میں بلاشبہ انتہائی تضاد تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس ماحول میں ان کی اوائل عمر بسر ہوئی اور جس میں ان کے کردار کو نشوونما کا موقع ملا وہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا تھا جب شاہجہاں آباد اور لال قلعے کی چہل پہل غدر کے ہاتھوں تباہ و تاراج ہو چکی تھی اور چپے چپے سے شہنشاہی کے زوال اور دلّی والوں کی بربادی کی صدائیں آ رہی تھیں اور زندہ دلی اور خوش طبعی کا سبب بے فکرے دوستوں کی صحبت اور فارغ البالی تھا جو اس وقت عام طور پر شرفا کو نصیب تھی۔ وہ دلّی کی پُرانی تہذیب و تمدن کا نمونہ تھے اور اس کی خوبیوں پر جان دیتے تھے۔ وضعداری، ہمدردی، خلوص، محبت، قناعت اور استقلال ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ دوسروں کی تکلیف سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے اور ضرورتمند کی بر امکانی مدد کرتے۔ خدا ترسی سے متعلق ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ بچپن میں یہ خاکسار بڑا شریر تھا۔ ایک دفعہ سب لڑکوں میں طے ہوا کہ وہ جو اندھا فقیر ہے اس کو ستایا جائے۔ چنانچہ مَیں نے اس اندھے کا ہاتھ پکڑا اور کھانے کا لالچ دیکر اس کے پیچھے پیچھے اس سمت میں بھگاتا لایا جہاں ایک لوہے کا کھمبا گڑا ہوا تھا۔ نزدیک آ کر مَیں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ بیچارہ چونکہ زور میں تھا اس لئے اُس سے ٹکرا لگی اور وہ ہائے کہہ کر گر پڑا۔ ہم سب کو بڑا مزا آیا۔ لیکن میں ابھی ہنس ہی رہا تھا کہ کمر پر بید پڑی۔ مڑ کر دیکھا تو والدِ مغفور خشمناک نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کو تادیب کیلئے ایک آدھ ہی بار مارا۔ وہ بھی ہاتھ سے لیکن اس وقت تو ان کی آنکھوں سے غصے کے شرارے نکل رہے تھے۔ چنانچہ وہ بید برسے، اس کے بعد اس فقیر کو انہوں نے اس طرح گڑگڑا کر اُٹھایا گویا فقیر کے نہیں خود ان کے جسم میں چوٹ لگی ہے۔ اس کو گھر لائے، کھانا کھلایا اور اس سے خدا جانے کیا کیا کہتے رہے۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ جا کر اس سے معافی مانگو۔ وہ اگرچہ دوسرے کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھ کر اس کی آگ

میں کود پڑتے۔ مگر خود اپنی بڑی سے بڑی تکلیف کا کبھی کسی پر اظہار نہ ہونے دیا۔ ان کی تمام عمر مشغولیت میں گذری، گویا آرام لینا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ جب وہ ظاہری طور پر محوِ استراحت معلوم ہوتے، اس وقت بھی ان کا دماغ کام کرتا ہوتا۔ ان کے نزدیک جینے کا مقصد یہ تھا:-

"زندگی کا وہی حصہ سچی زندگی کہے جانے کا
مستحق ہے جو قوم کی خدمت میں بسر ہو۔"

اور انہوں نے اس مقصد کو جس حد تک پورا کیا، ہر پڑھا لکھا شخص اس سے واقف ہے۔ بے شک ان کی ساری زندگی قوم کی خدمت میں بسر ہوئی۔ وہ اگرچہ خالص دہلوی تھے اور دلی کے پرستار، مگر ان میں صوبے وارانہ تعصب نام کو نہ تھا۔ ان کی راہ میں بہت سے مخالفین اور جلنے والوں نے روڑے اٹکائے مگر وہ بڑی سے بڑی مخالفت سے بھی مرعوب نہ ہوئے اور اپنا کام خاموشی سے کئے گئے۔ حاسدوں کے لچر اعتراضات کچھ تعجب انگیز نہیں کیونکہ کوئی بھی بڑا آدمی اپنے کم علم اور کم عمر ہمعصروں کی بدزبانی اور حسد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ان کی عظمت کی یہی کافی دلیل ہے کہ وہ اپنے مشن یعنی اصلاحِ نسواں میں کامیاب ہوئے۔ اور دنیائے ادب میں بلند مرتبہ پایا۔ وہ اس لحاظ سے بھی خوش نصیب تھے کہ جتنی مقبول تصانیف ان کی ہوئیں اردو کے شاید ہی کسی مصنف کی ہوئی ہوں۔ ساٹھ کے قریب کتابیں ان کی حیات میں بیس بیس ایڈیشن کی شائع ہوئیں اور تیس اکتیس اور ان کے انتقال کے بعد۔ اور ان کے ناشرین نے بقول مولانا تاجور "لاکھوں روپیہ پیدا کیا"۔ ان کی تصانیف کے سلسلے میں "آمنہ کا لال" ایک خاص وجہ سے قابلِ ذکر ہے۔ علامہ مرحوم دو دو سو صفحات کا ناول ایک ہفتے اور ضرورت ہو تو رات بھر میں ختم کر دیتے تھے۔ مگر یہ سو صفحے (آمنہ کا لال) انہوں نے ایک سال میں خاص اہتمام سے لکھے۔ علی الصباح نماز و قرآن سے فارغ ہو کر باوضو سفید براق چاندنی پر بیٹھ جاتے، اگر اور لوبان روشن ہوتا اور وہ نہایت ادب سے لکھنا شروع کرتے۔ خود فرماتے تھے "میں نے دوسری کتابیں قوم کے لئے لکھی ہیں مگر یہ کتاب اپنے لئے لکھ رہا ہوں۔" کیا خبر یہی تحفہ بارگاہِ رسالت میں مقبول ہو گیا ہو!

بالعموم بڑے آدمیوں کی گھریلو زندگی سکھ چین کی نہیں ہوتی مگر حضرتِ علامہ کی خانگی زندگی نہایت خوشگوار اور قابلِ رشک تھی۔ وہ جتنے اچھے بیٹے اور پوتے تھے، اتنے ہی اچھے بھائی اور باپ۔ اپنے بزرگوں کو انہوں نے ہمیشہ خوش رکھا۔ ساس نے ان کی گود میں دم توڑا اور دعا دی کہ خدا تمہیں بھی ایسے ہی اچھے داماد دے۔ دعا مقبول ہوئی اور انہیں سمدھیانے اچھے ملے۔ انہیں اپنی رفیقۂ حیات سے محبت نہیں عشق تھا۔ جوانی میں شاہجہاں آباد کے عناصرِ اربعہ مولوی اشرف حسین (دیباچہ نگار مثنوی سحر البیان)، قاری سرفراز حسین عزمی (صاحبِ شاہد رعنا) شہزادہ مرزا محمد اشرف گورگانی اور علامہ راشد الخیری (چاروں مرحوم) علمی و ادبی مباحثوں اور سرگرمیوں میں آدھی آدھی رات گزار دیتے۔ دوسرے احباب جہاں نشست ہوتی وہاں کھانا کھا لیتے۔ مگر علامہ موصوف نے کبھی رات کو کھانا باہر نہیں کھایا۔ رات کو واپسی پر بیوی کو کھانا گرم کرنے میں مدد دیتے اور ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ جوانی کا ایک قصہ بھی سن لیجئے۔ علامہ مرحوم اور ان کی بیگم صاحبہ میں کسی بات پر ذرا سی بد دلی ہو گئی۔ بے پناہ بارش ہو رہی تھی، علامہ مرحوم لحاف اٹھا، سیدھے چھت پر جا کر ایک ٹوٹی ہوئی کھری چارپائی پر لیٹ گئے۔ رات ڈھلی، پچھلا پہر ہوا، لحاف چوڑا ہو گیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر بیگم صاحبہ جو انگنائی میں یہ سوچتی ہوئی مضطرب ٹہل رہی تھی کہ "میں کیوں جاؤں؟ اپنے آپ ہی آ جائیں گے۔" صبر نہ کر سکیں تو اوپر گئیں اور اونچی آواز میں کہا "نہیں چلو گے"؟ علامہ مرحوم نے لحاف اوڑھے اوڑھے جواب دیا۔ "اب خبر لی ہے؟ پہلے تو مزے سے سوتی رہیں اور اب آئی ہیں۔" بیگم صاحبہ آہستہ سے بولیں "خدا بہتر جانتا ہے، میں بھی بھیگتی رہی ہوں۔" حضرت علامہ یہ سنتے ہی کھڑے ہو گئے اور گھبرا کر بولے "تم کیوں بھیگیں، اگر خدانخواستہ پڑ گئیں تو؟" بیگم صاحبہ نے جواب دیا "تم بھی تو آخر بھیگے ہو!" بس، ان میں کبھی اختلاف ہوتا تو اسی طرح لڑائی ہی لڑائی میں ملاپ ہو جاتا۔ یہ ہم نے بارہا دیکھا کہ کبھی انہوں نے ایک آدھ بات ایسی کہہ دی جو ان کی رائے میں ذرا سخت تھی تو بچوں کے سامنے ہی کھڑے معافی مانگ رہے ہیں۔ ایک موقع پر اپنی بیگم کے متعلق فرمایا۔ "یہ میرے تمام کاموں میں شریک رہی ہیں، ان کی

خدمات اسقدر شاندار ہیں کہ دنیا کی کوئی نعمت معاوضہ نہیں ہو سکتی۔" حقیقت یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ جس سلوک کی وہ لوگوں کو تلقین کرتے تھے، وہی ان کا اپنی بیگم کے ساتھ تھا۔ اُنہیں پھولوں سے بہت محبت تھی۔ چنانچہ پیرانہ سالی میں بھی اپنی بیگم صاحبہ کیلئے پھول منگواتے تھے۔ آبادی سے دور مقامات وہ بیحد پسند کرتے تھے اور شہر کی مصنوعی زندگی ناپسند چنانچہ اکثر کسی خاموش جگہ یا دریا کے کنارے سب کو ساتھ لے کر چلے جاتے۔ سب ہنسنے بولنے میں مشغول رہتے اور وہ نیم وا آنکھوں سے کہیں دور دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے میں مصروف ہوجاتے۔ چاندنی رات اور تاروں کی چھاؤں سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ برسات میں بجلی کوندتی ہو، بادل گرجتے ہوں مگر وہ صحن میں لیٹے رہتے کہ اس سے ان کی روح میں تازگی سی محسوس ہوتی، اسی طرح سردیوں میں پو پھٹنے سے پہلے عموماً ننگے سر چہل قدمی کرنے چلے جاتے، غرض قدرتی فضاؤں میں انہیں سکون حاصل ہوتا تھا۔

علامہ مرحوم نے اپنے آپ کو ہمیشہ بالکل معمولی انسان تصور کیا۔ وہ جتنے بڑے آدمی تھے اتنے ہی منکر المزاج اور شریف النفس۔ وہ اپنے مخاطب کو کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ علم وفضل اور رتبے میں اس سے ذرا بھی بڑے ہیں۔ ان کی پچاس سالہ عملی زندگی ہمارے لئے ایک کھلی ہوئی کتابِ ہدایت ہے۔ انہوں نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی ضبط وتحمل کمال کا تھا۔

المختصر وہ عالمِ باعمل تھے۔ دس بارہ پلے پلائے بچوں کے علاوہ ایک جوان بیٹے اور ایک چہیتی بہو کا داغ اٹھایا۔ پھر بھی خدمتِ خلق سے منہ نہ موڑا۔ ان کے پاس جو کچھ ہوتا مدرسے کی بچیوں اور محلّے کی بیواؤں اور یتیموں پر خرچ کر دیتے اور فخر سے یہ شعر پڑھتے ؎

اپنے کھیسے سے نہ ہم دام و درم دیتے ہیں
جب وہ خالق ہمیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں

وہ حد درجہ سادگی اور نفاست پسند تھے۔ ہم نے ان کا لباس ترکی ٹوپی، گھٹنوں سے نیچی اچکن، گھر میں سلیپر اور آنے جانا ہوا تو بوٹ دیکھا ہے۔ جوانی میں تن زیب کا، اپنی بیگم کے ہاتھ کا کڑھا ہوا کرتہ، رفل کا انگرکھا اور زری کی سلیم شاہی جوتی بھی پہنتے تھے۔ بدن کسرتی اور ڈیل ڈول بھاری بھر کم تھا۔ چہرے پر سفید نورانی ڈاڑھی اور آواز شبیر کی طرح گرجدار تھی جس کا کڑاکا آخر عمر تک رہا۔ صحت بہت اچھی تھی۔ صرف کبھی کبھار بیمار پڑتے مگر بیماری میں بھی سارے گھر کو بہلاتے رہتے تھے۔ عینک صرف لکھتے وقت استعمال کرتے اور اس وقت ان کا بشرہ اسقدر الہامی اور رعب دار ہوتا کہ ہماری ہمت ان کے آگے جانے کی نہ ہوتی۔ ان کے لکھنے کا طریقہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا۔ ضرورت ہو، تب تو ایک ہی نشست میں، ورنہ جم کر کبھی نہیں لکھتے تھے۔ چند سطریں لکھ کر باہر سڑک پر ٹہلنے لگتے، پھر آکر شروع کر دیتے اور تھوڑی دیر ہوئی نہیں کہ قلم رکھ کسی آئے گئے سے باتیں کرنے لگے۔ غرض اسی طرح انہوں نے یہ بے شمار کتابیں لکھیں۔ علامہ مرحوم صاحبِ قلم ہی نہیں، اعلیٰ درجے کے مقرر بھی تھے۔ اپنی عملی زندگی کی ابتدا انہوں نے واعظ کی حیثیت سے کی تھی۔ ان کی آواز میں غضب کا درد تھا۔ ہزارہا کا مجمع اُن کی تقریروں سے مسحور ہوجاتا۔ عموماً علی الصباح قرأت باآواز بلند فرماتے اور کچھ ایسے پُر تاثیر لب و لہجے میں، کہ سامع کا دل ودماغ الوہیت و نورانیت سے معمور ہوجاتا۔

دسمبر ۳۵ء میں بیمار پڑے مگر جب تک صاحبِ فراش نہ ہوگئے، اپنی علالت کا علم بیوی بچوں کو نہیں ہونے دیا۔ آخر زندگی کا چراغ گُل ہونے سے پہلے بھڑکا اور بہت زور سے بھڑکا۔ لاکھ جتن کر ڈالے مگر راہِ حیات کی اڑسٹھ منزلیں چلا ہوا مسافر تھک کر اب آرام کرنا چاہتا تھا۔ ان کی قریب قریب تمام ہی امیدیں پوری ہوئیں۔ صرف دو ارمان باقی رہ گئے تھے جن کا قلق تھا۔ ایک روضۂ اقدس کی حاضری اور دوسرے مسلمان لڑکیوں کیلئے تربیت گاہِ نبات کے ڈھنگ پر ہائی اسکول کا قیام۔ بسترِ مرگ کے چاروں طرف تمام اقربا جمع تھے اور سرہانے زندگی اور رنج وراحت کی شریک بیٹھی انہیں حسرت سے تک رہی تھیں کہ ایک غمگین مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے ہولے ہولے کہا۔ "اے بیگم، تمہاری خدمات بہت قیمتی ہیں۔ معاف کرنا ان کا معاوضہ ادا نہ کر سکا۔ فاطمہ اپنتالیس برس کا ساتھ چھوٹ رہا ہے۔" جب کشتی حیات دھیرے دھیرے کنارے آرہی تھی۔ انہیں

گھر سے باہر جانے کی ضد ہوئی۔ ہلنے جلنے کی طاقت نہ تھی۔ مگر کئی بار کہا "گاڑی منگواؤ، گاڑی منگواؤ، میں باہر جاؤں گا۔" کون جانتا تھا کہ حقیقتاً ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کیلئے مچل رہی ہے۔ موت سے ایک آدھ روز پہلے، انتہائے اضطراب و اصرار دیکھ کر مجبوراً گاڑی دروازے پر منگوائی۔ تو بس اتنا کہا "ہاں جاتا ہوں۔" اور آنکھیں بند کر لیں۔ کئی کئی روز سے زیادہ تر وقت کلام ربانی پڑھتے یا سنتے میں گذرتا تھا۔ اکثر سورہ یٰسین سننے کی فرمائش کرتے اور سن کر یکسوئی محسوس کرتے۔ دنیا سے تعلقات ختم ہو رہے تھے۔ مگر سرکار دو عالمؐ کا ذکر خیر کر کے بے چین ہو جاتے اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔ آخر میں ہر قسم کی دوا سے انکار کر دیا تھا۔ مبادا ڈاکٹر اندفاع نقاہت کیلئے برانڈی نہ دیدے۔ انجکشنوں سے ان کا جسم چھلنی ہو گیا تھا۔ مگر دم واپسیں تک ان کے تیوری پر بل نہ آیا۔ ۲ فروری ۱۹۳۶ء کی شب، زندگی کی آس ٹوٹ گئی۔ بس تھوڑی تھوڑی دیر بعد نہایت خفیف آواز میں اللہ اللہ زبان سے نکل جاتا تھا۔ آخر ۳ فروری کی صبح شاہجہاں آباد کے اس آخری بلبل رنگین نوا نے جس کی چہکار ایک عالم کو مسخر کر رہی تھی، قبلہ رو ہو کر ایک مرد مومن کی طرح خندہ پیشانی سے داعی اجل کو لبیک کہا سچ ہے وداع راشد سے رہی سہی دلی بھی اُجاڑ ہو گئی۔ اب نہ وہ دلی ہے نہ وہ دلی والے!

حضرت علامہ کی موت پر آنریبل سر شیخ عبدالقادر (ممبر انڈیا کونسل لندن) نے ایک خط اور مضمون میں اپنے رفیق دیرینہ کے کردار کی ایک جھلک یوں دکھائی ہے:۔

"موصوف کے انتقال سے میرا ایک پرانا دوست اور رفیق کار بچھڑ گیا جنہوں نے میرے ساتھ اردو ادب کی ترقی کیلئے بہت کوششیں کیں۔ اردو زبان اپنے ایک بہت بڑے ادیب سے محروم ہو گئی ہے۔ ہمارے لٹریچر میں موصوف نے جو اضافہ کیا وہ عرصہ دراز تک زندہ رہے گا اور لاتعداد لوگ جو ان کے بے مثل و بے نظیر طرز نگارش کے مداح تھے۔ ان کو ہمیشہ یاد رکھیں گے ..... بے شک ہندوستان اس علمی اور ادبی دولت سے محروم ہو گیا جو خدا نے ادب اردو کے محسن، تعلیم نسواں اور حقوق نسواں کے حامی، مولینا راشد الخیری کو عطا کی تھی اور وہ بے دریغ لٹا رہے تھے۔

اُن کی تصانیف میں غمناک کہانیاں اسقدر ہیں اور اکثر ایسی رقت آمیز طرز میں لکھی ہوئی ہیں کہ وہ ادبی دنیا میں "مصور غم" کے نام سے مشہور ہیں۔ مگر ان کے ملنے والے جانتے ہیں کہ گو وہ غم کی تصویر کھینچنے میں بہت مشاق تھے مگر خود غم کی تصویر نہ تھے۔ ان کا چہرہ بشاش تھا۔ کسی دوست کو دور سے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ہوتی تھی جو سو خوش آمدید کی ایک خوش آمدید تھی۔"

مجھے وہ وقت اب بھی یاد ہے جب آسمان ادب کے اس نیر تاباں اور مصلح نسواں کو سپرد خاک کیا جا رہا تھا تو اس شعر نے مجھ پر ناقابل بیان کیفیت طاری کر دی تھی!۔

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

بے شک ہم ہی نے، جن پر انہوں نے ہمیشہ اپنی جان چھڑکی، ان کو پیوند زمین کر دیا۔ آہ! اب یہ چاند کبھی طلوع نہ ہو گا۔ یہ شمع سوزاں جو خود گھُل گھُل کر اپنے نور سے دوسروں کو جگمگاتی رہی، اب کبھی روشن نہ ہو گی۔ دلی! اے دلی!! تیری خاک پاک سے جو ایسے ایسے باکمال پیدا ہوئے اور اپنے ہمیشہ دمکنے والے نقش پا چھوڑ کر پھر تیری آغوش میں جا سوئے، کیا ان کا دیدار اب کبھی نصیب ہو گا؟

صادق الخیری

سار ی دنیا مرے تخیل کی
تم ہنستے ہو تو مسکرائی ہے

تاثرات

(۱)

اتنی نیچی وادیاں اور اتنی اونچی چوٹیاں! اِس بلندی اور پستی سے ہے کیا مقصد ترا؟
مضحکہ انگیز ہے یہ امتیازِ خوب و زشت کیا یہ دھوکا ہے مری نظروں کا اے میرے خدا!

(۲)

آسماں چپ تھا ہوا ساکن زمیں خاموش تھی ایک ویراں راستے پر جا رہا تھا اک جواں
مَیں نے پوچھا اے مسافر کس طرف جائے گا تو؟ کانپتی آواز میں بولا "مری منزل کہاں!"

(۳)

یہ لبِ دریا یہ بھیگی گھاس اور یہ وقتِ شب سرسراتی ہے ہوا اور کانپتا ہے میرا دل
اب تو خلوت میں بھی جلوت کا مزا آنے لگا نازنیں پیکر سا اک رقصاں ہے دل کے متصل

(۴)

جاؤ اب مَیں نے بھی تم سے بے نیازی سیکھ لی جاؤ اب میری نظر کو بھی نہیں ہے شوقِ دید
لیکن اک لمحہ میرے دل پر تو رکھنا اپنا ہاتھ یہ کہاں سے اُٹھ رہا ہے نعرۂ ہل من مزید

(۵)

اے مرے مدت کے بچھڑے دوستو اس دہر میں جز غبارِ رہِ منزل اور کچھ حاصل نہیں
مَیں کچھ اس نفرت سے ہر محفل میں ٹھکرایا گیا اب مرے سینے میں اک مٹی کا بُت ہے دل نہیں

(۶)

وہ افق سے ایک بدلی نے اٹھایا اپنا سر نیم کی شاخوں میں لہرانے لگی ٹھنڈی ہوا
دیکھتا ہوں کچھ مگر محسوس کر سکتا نہیں میرے دل سے یہ نکل کر کون باہر آ گیا!

احمد ندیم قاسمی

پرچمِ حرّیت

کروٹ کوریا کا باشندہ تھا، اس کی عمر ۱۳ برس کی تھی، وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ایک کتاب کا جس کا نام "کوریا کی دردناک سرگذشت" تھا، بڑی دلچسپی سے مطالعہ کر رہا تھا۔

کروٹ کے ایک طرف ایک صندوق میں کچھ درسی اور کچھ تاریخی کتابیں پڑی تھیں، اور دوسری طرف بھورے رنگ کے ایک بستے میں کچھ کاپیاں تھیں، جن میں کوریا کے مشہور اور نامور لوگوں کی تصویریں بحفاظت رکھی ہوئی تھیں،

کمرے کا نصف دروازہ کھلا اور نصف بند تھا، کروٹ ذرا سی آہٹ ہونے پر بھی سہم کر اپنی کتابیں سمیٹنے لگتا تھا، اس لئے کہ اس کا باپ جاپانی حکومت کا ایک معتمد علیہ افسر تھا، اگر حکومت کو معلوم ہو جاتا۔ کہ کروٹ کوریا کی آزادی سے دلچسپی رکھتا ہے تو حکومت اس کے خاندان کو تباہ و برباد کر دیتی،

کوریا پر جو ہولناک مظالم ڈھائے گئے تھے، ان کے حالات پڑھنے میں کمسن کروٹ اس قدر محو ہو گیا تھا، کہ اسے اپنے باپ کی پوزیشن کا بھی خیال نہ رہا،

اسی حالت میں اس کا باپ نارو کمرے میں داخل ہوا، اور بیٹے کو اس طرح مطالعہ میں مصروف دیکھ کر بہت خوش ہوا، وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر مسرور ہو رہا تھا کہ میری طرح میرا یہ ہونہار بیٹا ایک روز حکومت کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوگا

اس نے کروٹ کے قریب جا کر محبت آمیز لہجہ میں کہا "بیٹا کروٹ! مطالعہ میں اتنی محنت نہ کیا کرو، کہ آنکھوں کو نقصان پہنچے،

باپ کی آواز سنکر کروٹ گھبرا گیا، اور اپنی کتابوں کو جلدی جلدی سمیٹ کر بولا "کون ہے؟ ابا جان!"

نارو۔ "یہ کونسی کتاب ہے؟"

کروٹ کچھ جواب نہ دے سکا، اور نارو کتاب کو دیکھ کر غصے سے بے اختیار ہو گیا، اس نے گردن پکڑ کر بیٹے کو دور دھکیل دیا، اور کتابیں اٹھا کر پھینکدیں، بستے سے تین تصویریں نکل کر بکھر گئیں، کروٹ کی کتابوں میں نارو کو ایسے کاغذ بھی ملے، جن سے معلوم ہوا، کہ کروٹ طلبہ کی انجمن کا سکرٹری منتخب کیا گیا ہے اور یکم مارچ کے باغیانہ جلسے میں شریک ہونے اور رضا کار بننے کی تجویز پیش کی ہے، کروٹ بت کی طرح کھڑا آنے والے مصائب کا انتظار کرنے لگا،

نارو نے دانت پیس کر کہا "بدمعاش! میرا بیٹا ہو کر اور یہ حرکتیں، تو اتنا بھی نہیں سمجھتا، کہ اگر ان میں سے ایک کاغذ بھی پولیس کے ہاتھ لگ جائے۔ تو سارا خاندان مصیبت و تباہی میں مبتلا ہو جائے گا" کروٹ اسی طرح خاموش کھڑا رہا،

نارو پھر بولا "میں جاپانی حکومت کا دیرینہ خدمت گزار ہوں حکومت نے میری خدمات کے صلے میں مجھے اعزاز و مناصب سے سرفراز فرمایا ہے۔ اور تو باغیانہ کارروائیوں میں حصہ لے۔ خبردار! جو میرے حکم کے بغیر گھر سے قدم باہر نکالا،

کروٹ نے ابھی ابھی حریت پسند قائدین کے حالات پڑھے تھے، جن کا اثر ہنوز اس کے دل پر موجود تھا، اس نے سوال کیا "یہ کیوں ابا جان؟"

نارو کا غصہ اور بھڑک اٹھا، اس نے تڑپ کر کہا "بدذات باتیں کرتا ہے، تالو سے زبان کھینچ لونگا،

کروٹ نے نرمی سے کہا، ابا جان حکومت سے پہلے تو ہم پر مادر وطن کے حقوق عائد ہوتے ہیں،

نارو نے کروٹ کو ایک طمانچہ لگا کر کہا "بڑا کہیں کا آیا ہے وطن پرست بن کے، جا نکل جا میرے گھر سے، ایسے کمینے بیٹے کی مجھے ضرورت نہیں،،

کروٹ نے پھر ادب سے جواب دیا، ابا جان مادر وطن کی خدمت کرنے کوئی کمینہ نہیں ہوتا، مشہور اور نامور لوگ مادر وطن کی خدمت ہی کرنے سے نامور اور مشہور ہوتے ہیں،،

نارو نے کروٹ کو ایک ٹھوکر مار کر کہا، پھر اپنی بکواس سے باز نہیں آتا ہے،،

کروٹ نے بڑے استقلال کے ساتھ جواب دیا، میں جلسے میں جائے بغیر نہ رہونگا، اس کے لئے چاہے مجھے کتنی ہی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے،

نارو نے کروٹ کو خوف دلانے کیلئے کہا، اے نالائق تجھے معلوم ہے، جب میں ایک مشہور جیل کا افسر اعلیٰ تھا، تو میں نے تیرے جیسے کتنے بد دماغ لونڈوں کو سیدھا کر دیا تھا، اور جو اپنی ضد پر اڑ جاتا تھا، اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا، میں نے اپنے انہیں ہاتھوں سے کوریا کا جھنڈا لہرانے کے جرم میں کتنے ہاتھ کاٹ ڈالے ہیں، جب مجھے غصہ آجاتا ہے، تو میں کسی بات کی پرواہ نہیں کرتا،،

کروٹ نے استقلال کے ساتھ جواب دیا، ابا جان آپ کی باتوں نے میری ہمت اور بھی بڑھا دی، آج آپ میری گردن پر بھی تلوار چلا دیجئے،

نارو غصے سے بے قابو ہوکر کروٹ کو چھڑی سے پیٹنے لگا اور کمسن کروٹ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے،

نارو نے کوریا کی سرگزشت نامی کتاب دکھاکر کہا، اس کتاب نے تیرا دماغ خراب کیا ہے نا؟ تو نے یہ کتاب کہاں سے پائی؟ یہ کہکر نارو نے کتاب کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینک دیا،

کروٹ دھیمی آواز سے بولا" یہ کتاب میرے دوست نے دی تھی"،

نارو نے حقارت سے کہا، مائیو؟ اس کا باپ تو میرے یہاں قید تھا،

اسی حالت میں سڑک سے ڈھنڈورے کی آواز سنائی دی، ڈھنڈورہ والا کہہ رہا تھا،

"یکم مارچ کو شہر سیول میں کوئی پبلک جلسہ نہ کیا جائے جو شخص اس حکم کے خلاف ورزی کرے گا، وہ سزائے موت کا مستوجب ہوگا،

نارو بولا" سن رہا ہے ڈھنڈورے کو؟"

کروٹ نے آہستہ سے کہا "جی ہ"

(۲)

کروٹ کی سرخ آنکھیں دیکھکر اس کی ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے، اور اس کے جسم پر پڑے ہوئے چھڑی کے داغ نے اس کے دل کو بے چین کر دیا، اس روز کروٹ کی ماں سے پکا ہوا کھانا بھی کھایا نہ جاسکا، کروٹ مائیو کے ہاں چلا گیا، وہ اس کا خاص رفیق اور دلی دوست تھا، دونوں ہم عمر اور ہم خیال تھے

مائیو کا باپ بڑا وطن پرست اور حریت پسند تھا، وہ وطنی جھنڈے بلند کرنے کے جرم میں جیل میں مرچکا تھا مائیو کا دل بھی وطن کی اسی محبت سے معمور تھا،

کروٹ نے اپنے جذبات کو تسکین دینے کے لئے کوریا کی تباہی اور اپنی سرگزشت سنائی، اس کے بعد دونوں میں پبلک جلسے کے متعلق گفتگو ہونے لگی،

کروٹ نے کہا، مائیو! تم نے حکومت کی منادی سنی! اب کیا ہوگا؟

مائیو نے بے تکلفی کے ساتھ جواب دیا، وہ ہوگا کہ یکم مارچ کا جلسہ رک نہیں سکتا، جلسہ ہوگا اور ضرور ہوگا اور اس میں کوریا کی آزادی کا علم بلند ہوکر رہے گا، مگر ان باتوں کو پوشیدہ رکھنا، تاکہ تمہارے باپ کو خبر نہ ہوجائے"

کروٹ نے کہا" ذرا پولیس والوں کو بیوقوف بنانا ہے دیکھو کیسا لطف آتا ہے لیکن جھنڈوں کا کیا انتظام ہوگا،

مائیو بولا" جھنڈے تو لاکھوں تیار ہوچکے ہیں، ہمارے لئے چار بڑے جھنڈے اور پچاس چھوٹی جھنڈیاں آنے والی ہیں"

کروٹ نے جوش کے ساتھ کہا، تو ان میں سے تین بڑے جھنڈے اور تیس چھوٹی جھنڈیاں میرے حصے کی رہیں،

مائیو، مسکرا کر" کروٹ! یہ لڈو نہیں ہیں، آزادی کے جھنڈے ہیں،

کروٹ" ہاں ہاں لڈو ہی ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ میٹھے اور لذیذ"

مائیو نے اپنے ہاتھ کا نشان دکھاتے ہوئے کہا، دیکھ یہ سب لڈو جو تیرے باپ نے کھلائے ہیں، اچھا تو دیکھ تجھے سب گیارہ جھنڈے ملیں گے،

کروٹ" اچھا بھئی گیارہ ہی سہی، لیکن تیرے پاس جو دو جھنڈے ہیں، ان میں سے تو ایک دے"

مائیو، ان جھنڈوں کو کون ہاتھ لگا سکتا ہے؟

کروٹ، میں !

"اچھا تو آؤ"

اس کے بعد دونوں میں مقابلہ شروع ہوگیا، جس کا باپ جھنڈے کے لئے سر دے چکا ہو، اس سے کون جھنڈا جیت سکتا ہے، کروٹ نے شکست کا اعتراف کرتے ہوئے پھر جھنڈا مانگا،

مائیو نے اسے بغور دیکھکر کہا، جھنڈا تجھے دونگا، مگر اس وقت جب تو میرے پاؤں چھوئے گا،

کروٹ:۔ اچھا جی میں تمہارے پاؤں بھی چھوؤنگا، اور کہو تو تمہیں سرکار بھی کہوں، لیکن سرکار کا لفظ تو میرے سینے میں برچھی کیطرح چبھتا ہے، چونکہ ہماری مادرِ وطن کو غلام بنا کر رکھنے والی طاقت کو سرکار کہتے ہیں، اس لئے مجھے اس ناپاک لفظ سے اپنی زبان کو بھی آلودہ کرنا گوارا نہیں، اور اسی لئے دوست تو کیا میں اپنے دشمن کو بھی سرکار کہنا پسند نہیں کرتا،

مائیو نے کروٹ کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا، شاباش دوست شاباش! لو ایک جھنڈا تمہاری نذر کرتا ہوں،

مائیو کی ماں پیٹھ ٹھونکنے کی آواز سنکر سہم اٹھی، اس نے سوچا شاید پولیس کے سپاہی گھر میں داخل ہوگئے ہیں، وہ اوپر آکر ادھر ادھر دیکھنے لگی، اسے یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی، کہ مائیو اپنے باپ کی شروع کی ہوئی مہم کو سرانجام دینے میں سرگرم ہے، اس نے ان دونوں لڑکوں کو پاس بلایا۔ اور آرام کرسی پر بیٹھکر انہیں مخاطب کرکے کہنے لگی،

"بیٹا مائیو! میں نے ابھی تک تجھے تیرے باپ کی موت کے حالات نہیں سنائے، ظالموں نے ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے،

یہ کہتے ہوئے اسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، دونوں لڑکے بھی رونے لگے، وہ پھر کہنے لگی، تیرے باپ اس ظالم حکومت کے دشمن تھے، انہوں نے ایک پوشیدہ مقام پر ایک خفیہ انجمن قائم کی تھی وہ اس حکومت کو تباہ وبرباد کرکے اس کے آہنی پنجے سے مادرِ وطن کو نجات دلانے کے لئے بہت بیقرار رہتے تھے، جو لوگ آج حریتِ وطن کی تحریک کے مشہور اور مقتدر لیڈر ہیں، وہ سب اس وقت اس خفیہ انجمن کے ممبر تھے، اس خفیہ انجمن کی طرف سے باغیانہ لٹریچر بھی شائع کئے جاتے تھے،

ایک دفعہ اسی انجمن کے ایک رکن اور تیرے باپ کے ایک خاص رفیق نے اپنے مکان پر قومی جھنڈا نصب کیا، کوریا کے باشندوں میں حریت کا جذبہ پیدا کرنے والا یہ جھنڈا استبداد پسند حکومت کو کیسے اچھا معلوم ہوتا، سپاہی تیرے باپ کو گرفتار کرکے لے گئے اور بڑی بیرحمی اور بیدردی سے قتل کر ڈالا، اور کروٹ کے باپ اس وقت اس جیل کے افسر تھے، جس نے تیرے باپ کیساتھ یہ سلوک کیا تھا"

کروٹ یہ سنکر نادم اور پشیمان ہوگیا!

قومی جھنڈے کے احترام کو برقرار رکھنے کے لئے خفیہ انجمن نے طے کیا تھا، کہ اس مجلس کے ہر رکن کو قومی جھنڈا اپنے سینے اور اپنے مکان پر لگانا چاہیئے، اس فیصلے پر سب سے پہلے عمل کرنے والے تیرے ہی باپ تھے، دوسرے ہی روز شہر میں جابجا قومی جھنڈے لہرانے لگے، استبداد پسند حکومت یہ دیکھکر دیوانی ہوگئی اور پاگل شیر کی طرح ہر طرف حملے کرنے لگی، اور جھنڈا رکھنے والے مرد وعورت بے رحمی کے ساتھ قتل وگرفتار ہونے لگے، عورتوں اور مردوں سے جیل خانے بھر گئے، اف! جیل خانے کے وہ مصائب کس قدر ہولناک تھے، مائیو کی ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے،

آخر میں تیرے باپ کی نوبت آئی، ان کے اوپر تو حکومت کی عرصہ سے نظر تھی، مائیو وہ تجھے میری گود میں دیکر جیل کی چاردیواری میں داخل ہوگئے، میں ایک روز جیل میں ان سے ملنے گئی تھی بڑی مشکل سے دو تین منٹ کی ملاقات کا موقعہ ملا تھا، تیرے باپ نے اس وقت جو الفاظ کہے تھے، وہ آجتک میرے دل پر نقش ہیں اس پیام کا ایک ایک حرف خون بنکر میری رگوں میں دوڑنے لگا اور اس سے بنا ہوا دودھ میں نے پلا پلاکر تجھے پالا، انہوں نے آخر وقت میں کہا تھا،

"میں تو مادرِ وطن کوریا کیلئے قربان ہو رہا ہوں، اگر تم میری سچی شریکِ حیات ہو، تو اپنے بیٹے مائیو کو بھی مادرِ وطن کیلئے وقف کر دینا جس خدا نے ہم دونوں کو یہاں ایک دوسرے کا شریک بنایا تھا، وہی دوسری دنیا میں بھی ہمیں آپس میں ملائے گا، اور ہم وہاں ایکدوسرے کے ساتھ زیادہ شاد اور بشاش رہینگے، بس اب جاؤ خدا تمہیں ہولناک مصیبتوں میں ثابت قدم رہنے کی توفیق بخشے "

مائیو اس وقت سے میری ایک ہی تمنا ہے، وہ یہ کہ تیری قربانی سے مادر وطن کوریا غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو جائے۔ تو نے جو پرچم حریت بلند کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اس سے مجھے یقین ہے کہ میری یہ تمنا پوری ہو جائیگی،

میری اس ملاقات کے تھوڑی ہی دیر بعد تیرے باپ کی لاش جسے ظالموں نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا، مجھے ملی، یہ کہکر وہ پھر رونے لگی، وفور ایثار و قربانی کے جوش سے مائیو اور کروٹ کے چہرے سرخ ہو گئے،

(۳)

پہلی مارچ آ گئی، شہر سیول کے ایک مکان میں تحریک حریت کے لیڈر جمع ہوئے، حکام کو بھی مدعو کیا گیا تھا، لوگوں کے جمع ہو جانے کے بعد ناشتہ نہ ہوا، اس کے بعد لیڈروں نے کھڑے ہو کر "مادر وطن کوریا زندہ باد"، کے نعرے لگائے، جس سے سارا مکان گونج اٹھا،

اس نعرے نے حکام میں ہلچل ڈال دی، ٹیلیفون پر ٹیلیفون آنے جانے لگے، اور تھوڑی ہی دیر میں حکومت کی موٹر لاریاں آ پہنچیں، تمام لیڈر ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑ کر جیل بھیجدیئے گئے، اس کے بعد لوگ ایک ہوٹل کے سامنے جمع ہو گئے، اور "کوریا زندہ باد"، کے نعروں سے شہر گونجنے لگا،

دوسرے روز شہر ویران سا نظر آنے لگا، بازار بند پڑے تھے، کوئی خرید و فروخت کرنے والا نہ تھا، شہر میں فوجیں گشت کر رہی تھیں، دکانداروں اور لین دین کرنے والوں سے خالی شہر گورستان سا معلوم ہو رہا تھا، دکانداروں کو سنگین کے زور سے دکان کھولنے پر مجبور کیا گیا۔ پھر بھی وہ کاروبار کرنے کی بجائے "مادر وطن کوریا زندہ باد"، کے نعرے ہی لگاتے رہے، کالجوں اور سکولوں کے پروفیسر اور ماسٹر بیکار بیٹھے تھے، پڑھانے کے لئے ایک طالب علم کا بھی پتہ نہ تھا،

صرف ایک اسکول میں دو سو طلبہ آئے، ماسٹروں کو بہت خوشی ہوئی، اور انہوں نے اپنی حکومت پرستی جتانے کیلئے حکام کو بلایا، طلبہ کو مٹھائی تقسیم کی گئی، اور جاپانی حکومت کی مدح و ستائش کے ترانے گائے گئے، حکام اپنی تعریف کے نغمے سن سن کر خوش ہو رہے تھے،

لیکن اسی دوران میں تیرہ سال کا ایک لڑکا کھڑا ہو گیا، اور اپنے جھولے میں سے قومی جھنڈے نکال کر سب کو تقسیم کرنے لگا، ہیڈ ماسٹر یہ حالت دیکھکر پاگل سا ہو گیا، تھوڑی دیر میں تمام طلبہ کے سینوں پر قومی جھنڈے آویزاں نظر آنے لگے، اس طرح آن کی آن میں اسکول باغیانہ جلسے کی صورت میں تبدیل ہو گیا، اور "مادر وطن کوریا زندہ باد" کے نعروں سے گونجنے لگا،

وہ جھنڈے تقسیم کرنے والا سیزدہ سالہ لڑکا مائیو تھا، مگر اس کے ساتھ اس کا رفیق کروٹ موجود نہ تھا،

(۴)

کروٹ ایک کمرے کے اندر رسیوں سے جکڑا پڑا تھا، اور اپنی بے بسی پر خون کے آنسو بہا رہا تھا، اس کا جسم تو کمرے میں تھا، مگر اس کا دل اسکول میں تھا، وہ اسکول جا رہا تھا لیکن اس کے باپ نے جانے نہیں دیا، دو طمانچے لگائے، اور رسی سے باندھکر کمرے میں بند کر دیا، کروٹ نے اپنے کو رسی کی بندشوں سے چھڑانے کی بہت کوشش کی، مگر رسی مضبوط تھی، ٹوٹ نہ سکی۔ اس کے بعد اس نے رسی کو دانتوں سے کاٹنا چاہا، مگر اس کے دانت لہولہان ہو گئے، پھر بھی رسی نہ کٹ سکی، تھوڑی دیر بعد اس کے مکان کے پاس سے پرچم حریت کا جلوس گذرا، اور اسے "مادر وطن کوریا زندہ باد" کے نعرے سنائی دیئے،

دانت کے خون سے رسی نرم ہو چکی تھی، اس لئے کروٹ اس کے کاٹنے میں کامیاب ہو گیا، اور وہ کھڑکی سے نیچے کود کر جلوس میں شامل ہو گیا، کروٹ اور مائیو دونوں گلے ملے،

تھوڑی دیر میں کوریا کی بہادر عورتوں کا بھی جلوس نکلا، اور وہ بھی آکر اس جلوس میں مل گیا، ٹیلیفون اور ٹیلیگرام سرعت کے ساتھ استعمال ہونے لگے، اور پولیس اور فوج کے سپاہی ہر طرف سے دوڑ پڑے،

پانسو سپاہیوں کا ایک فوجی دستہ سامنے سے آتا ہوا نظر آیا، اور توپ بندوق اور تلواروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں دیکھتے ہی دیکھتے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی، ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے خاک و خون میں تڑپنے لگے، اور ہزاروں آدمیوں کو موٹر لاریوں میں ٹھونس کر جیل خانے بھیجدیا گیا،

ایک لحیم و شحیم سپاہی نے اپنے آہنی پنجے سے کروٹ کی گردن پکڑ لی۔ اور کہا، جھنڈے کو پھینک دے،"

کروٹ :۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ میری ناک ہے۔"

"اچھا یہ تیری ناک ہے تو لے۔" یہ کہہ کر سپاہی نے کروٹ کی ناک کاٹ لی۔

کروٹ :۔ "یہ جھنڈا مجھے ہاتھ پاؤں سے زیادہ عزیز ہے۔"

"اچھا تو یہ بھی لے۔" یہ کہہ کر سپاہی نے کروٹ کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے اور وہ زمین پر گر پڑا۔ کروٹ نے جھنڈے کو منہ سے پکڑ لیا، اور کہا۔ "یہ جھنڈا مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے"

"تو اچھا لے۔" یہ کہہ کر سپاہی نے کروٹ کو قتل کر دیا۔

اتنے میں کروٹ کا باپ نارو آ پہنچا۔ اور بیٹے کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس سپاہی کو دھکے دیکر بولا:۔ "ظالم تو نہیں جانتا، کہ یہ کس کا بیٹا ہے؟ تو نے یہ کیا کیا؟"

سپاہی :۔ "خوب جانتا ہوں، تم جاپانی حکومت کے غدار افسر ہو۔"

نارو :۔ "او سنگدل، میں جو کچھ بھی ہوں لیکن تجھے اس بچے کو اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے اس کے بچپن پر رحم نہیں آیا۔"

سپاہی :۔ "چپ رہ تجھے نہیں معلوم کہ خود تو کتنے بے گناہوں کو قتل کر چکا ہے۔"

نارو چونک پڑا، اسے اپنی ظالمانہ کارروائیاں اور بے رحمانہ حرکتیں یاد آنے لگیں۔

سپاہی نے پھر کہا۔ "مجھے حکم ہے کہ جس کے ہاتھ میں بھی اس جھنڈے کو دیکھوں اسے مار ڈالوں۔"

نارو نے اپنے بیٹے کے خون سے تر جھنڈے کو اپنے ہاتھ میں بلند کر کے کہا۔ "تو لے مجھے بھی قتل کر دے۔"

سپاہی نے اس کی گردن پر بھی وار کر دیا۔ اور جاپانی حکومت کے وفادار جنیل کا سر تن سے جدا ہو کر زمین پر آ پڑا۔ اس پر سکوت فضا میں ایک صدا سنائی دی۔

"مادر کوریا زندہ باد!"

ابو محمد امام الدین رامنگری

غزل

رُخ سے پردہ اُٹھا رہا ہوں میں
دل پہ بجلی گرا رہا ہوں میں

جب تجھے بھی بھلا دیا میں نے
اب تجھے یاد آ رہا ہوں میں

وہ ادا ہائے کیا ادا ہو گی نا
جس سے نا آشنا رہا ہوں میں

کچھ نہ دیکھا تجھے حقیقت میں
یوں تجھے دیکھتا رہا ہوں میں

مجھ کو معلوم ہے مآل بقا
نقش ہستی مٹا رہا ہوں میں

پوچھئے مجھ سے عشق کی روداد
مدتوں مبتلا رہا ہوں میں

یاد جس کے سوا نہیں کچھ بھی تو
ہائے اس کو بھلا رہا ہوں میں

ہاتھ رکھ لیجئے کلیجے پر تو تو
قصۂ غم سنا رہا ہوں میں

یہ بھی اک شان ہے محبت کی
تجھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں

میکدہ ہل رہا ہے اے ساقی
اب کہاں لڑکھڑا رہا ہوں میں

ظفر تاباں

شیراز

(او۔ اے۔ میرٹ ہاکس (.O.A. Merrit Hawks) ایک فرانسیسی خاتون نے حال ہی میں ایک ضخیم کتاب "پرشیا، رومانس اینڈ ریالٹی" کے نام سے لکھی ہے۔ ذیل کا مضمون اُس کے ایک باب "شیراز" سے ماخوذ ہے) اثر

"مسافر اپنا گھر بھول جاتا ہے، اور اُس کا شیدائی بن جاتا ہے"
"سعدیؔ"

شیراز کے متعلق ہم جو کچھ نظم و نثر کی کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ حرف بحرف درست ہے، بالکل درست، یہ خوبصورت شہر ایک زرخیز میدان میں واقع ہے، جس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں، جو بتدریج کم ہوتے جاتے ہیں۔ شیراز کے اردگرد یہ پہاڑ ایک خاص منظر پیدا کر رہے ہیں، صبح کے وقت یہ بالکل نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن شام کے وقت بہت دُور۔

سورج غروب ہو رہا تھا کہ ہم شہر میں داخل ہوئے سورج کی آخری شعاعوں کا عکس بائیں ہاتھ کے کوہساروں پر ایک حسین منظر پیدا کر رہا تھا۔ سڑک کے کنارے سرو اور نارنگی کے درخت سامنے کی دیواروں پر طنزیہ انداز سے دیکھ رہے تھے۔ دائیں ہاتھ کے پہاڑ دھندلکوں میں لپٹے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے ایک حسین عورت سیاہ لبادے میں!

اس کے فوراً بعد ہی ہم بڑے بازار میں داخل ہوئے، جس کی چوڑائی ۱۵ فٹ تھی، اور جس کے دونوں طرف پانی کی شفاف نہریں رواں تھیں۔ بازار میں کوئی غبار اور گرد نہ تھی، کیونکہ مزدور اس کی صفائی میں صبح سے مصروف تھے۔ گو اس لحاظ سے کافی اخراجات کا امکان ہوسکتا ہے، لیکن ایران میں مزدوری بہت ارزاں ہے۔ اس وقت بازار میں صرف چند آدمی تھے، کیونکہ وہ جمعہ کی شام تھی، اس لئے "شیراز" ایک عظیم الشان اور خاموش شہر کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔ سبز سبز درخت ہر جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ بالآخر ہم بازار کے اختتام تک جا پہنچے جس کے ساتھ ہی گورنر کا محل واقع تھا جو کہ ۱۷۶۰ء میں بنایا گیا تھا، اور جس کے ساتھ ہی اس بازار کی ابتدا ہوئی۔

شہر کے چاروں گوشوں پر ایک ایک بُرج ہے جن پر نہایت اعلےٰ درجہ کی نقش کاری کی ہوئی ہے، ایران میں نقش کاری کا کام بہت رواج پذیر ہے، لیکن نقش کاری کے یہ نمونے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ بُرج کے بالکل درمیان "رستم" اور اس کے رخش کی تصویر ہے، جو دیواروں کی نسبت مقابلتہً گہرے انداز میں کی گئی ہے۔

فارسی زبان کے مشہور شعرا سعدیؔ اور حافظؔ کے مقبرے بھی شیراز میں واقع ہیں۔ ان مقبروں کی خوبصورتی نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن ان کا ذکر اس قابل ہے کہ اسے گوشِ دل سے سُنا جائے، کیونکہ ان دو شعرا نے گذشتہ سو سال سے ایرانیوں کے خیالات اور عقائد پر ایک گہرا اثر ڈالا ہے۔ گو یہ ضرور ہے کہ موجودہ دور میں خاص کر حافظ کی شاعری کو اہلِ فارس پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ کیونکہ اُن کا خیال ہے کہ عہدِ حاضر عمل کا زمانہ ہے۔ اور صوفیوں کی بابت محض خیال ہے اور ذوقِ عمل کے منافی۔

بازار کی مذکورہ سڑک سیدھی "کران دروازہ" کی جانب چلی جاتی ہے۔ "کران" سے ذرا باہر نکل کر ساتھ ہی "کوہ بنے" واقع ہے۔ جو میرے خیال میں شیراز کا خوبصورت ترین پہاڑ ہے۔ "کران گیٹ" کے قریب ہی ہم "ہنگی" کا پرانا محل، نئے باغات، اور چشمے (جو اب خشک ہو چکے ہیں) الاسکی اسٹیشن اور فوجیوں کے کوارٹرز دیکھتے ہیں!

اس میں کچھ شک نہیں کہ شیراز موجودہ حالت میں بھی دنیا کا ایک خوبصورت ترین شہر ہے، اور جس کی خوبصورتی "شاعرانہ" دلوں کو موہ لیتی ہے۔ لیکن مستقبل قریب میں شیراز موجودہ حالت سے بہت زیادہ خوبصورت ہو جائے گا۔ کیونکہ رضا شاہ پہلوی نے یہ حکم جاری کیا ہے۔ کہ شیراز کے ہر بازار کے دونوں طرف سرو کی قطاریں لگائی جائیں، اور ہر سرو کے ساتھ ہی گلاب کا

ایک ایک پودا بھی کاشت کیا جائے۔

شہر کے وسط میں ایک بڑا بازار ہے۔ جس کو کریم خاں نے بنوایا تھا۔ بازار کے دونوں طرف مختلف اقسام کی دوکانیں ہیں۔ جن میں ایرانی اور غیر ملکی ہر قسم کا مال دستیاب ہوسکتا ہے۔ ایران کی دستکاری ابھی تک زوروں پر ہے، اور موجودہ دور میں بھی نہایت اعلٰے کاریگر موجود ہیں۔ لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے "اچھے کاریگر تو زندہ ہیں، لیکن عقلمند خریدار موجود نہیں۔" ان حالات کے ماتحت ایرانی دستکاری بہت حد تک کم ہوتی جارہی ہے۔ اس بازار میں پرانی چیزوں کی خرید و فروخت کثرت سے ہوتی ہے۔ سوداگران پرانی چیزوں کو غیر ملکی باشندوں کیلئے بڑی بڑی قیمت پر خریدتے ہیں۔ جسقدر یہ بازار بڑا ہے۔ اسی قدر غلیظ بھی ہے۔ سڑکوں پر جگہ جگہ گندگی پھیلی ہوئی ہے۔

شیراز کی عورتیں عام طور پر غریب ہیں۔ اور ان میں سے اکثر صفائی پسند ہیں۔ گو وہ اپنے آپ کو مصفا رکھنے کی کوشش ضرور کرتی ہیں۔ شیراز ایسے خوبصورت شہر میں پانی کی سخت قلت ہے لیکن یہ قلت صرف شیراز تک ہی محدود نہیں بلکہ تقریباً ایران کے ہر شہر میں پانی کی کمی ہے۔ اس پانی کی قلت کو رفع کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے ایک موٹر بس مقرر ہے۔ جو عورتوں کو شہر سے دو میل کے فاصلے پر ایک چشمے کے کنارے لے جاتی ہے۔ جس کا پانی نہایت صاف اور میٹھا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ صرف شیراز تک ہی موجود ہے۔ عورتیں اس چشمے سے نہ صرف پانی بھر کر لاتی ہیں، بلکہ اکثر عورتیں کپڑوں کی دھلائی بھی وہیں کرتی ہیں بعض عورتوں کے پاس کپڑوں کا صرف ایک جوڑا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اس جوڑے کو اتار کر وہیں دھو لیتی ہیں۔ اور غسل کرنے کے بعد اسی کو خشک کر کے پہن لیتی ہیں۔ چشمے کے ارد گرد کسی مرد کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔

اس لئے عورتیں نہایت آزادی اور اطمینان سے کپڑے دھوتی اور نہاتی ہیں۔ یہ چشمہ یا دوسرے لفظوں میں "دھلائی گھر" سعدی رحمتہ علیہ کے مقبرے کے بالکل قریب ہے۔ (جو نہایت ابتر حالت میں ہے) مجھے یہ دیکھ کر نہایت افسوس ہوا۔ کہ مقبرے کے احاطہ میں عورتیں اپنے کپڑوں کو دھوپ لگوانے کیلئے بچھا دیتی ہیں اور ان کے بچے سعدی کی قبر پر شور و غل کرتے ہیں۔

ایران کا سب سے بڑا ہوٹل سعدی ہوٹل (شیراز) ہے۔ میرا قیام اسی ہوٹل میں تھا، یہ ہوٹل کم و بیش مغربی طرز پر بنایا گیا ہے، اور دیکھنے میں نہایت خوبصورت اور جاذب نظر ہے، ہوٹل کی عمارت کئی منزلوں میں منقسم ہے۔ ہر منزل کی سیڑھیوں کے اختتام پر ایک ایک کھانے کا کمرہ ہے۔ جس کے باہر دیواروں پر اخراجات خورد و نوش ایک فریم میں آویزاں ہیں۔ ہر منزل میں ایک ایک درجن کے قریب رہائشی کمرے ہیں۔ ہر کمرے کے باہر "چھ آدمیوں کیلئے کمرہ"۔ "دس آدمیوں کیلئے کمرہ" فارسی زبان میں لکھا ہوا ہے۔

سعدی ہوٹل کے دونوں طرف آگے اور پیچھے ایک ایک چھوٹا باغیچہ ہے، جن میں نارنگی اور سرو کے درخت جابجا لگے ہوئے ہیں۔ ہر باغیچے کے درمیان میں ایک ایک تالاب ہے جن میں لاتعداد سبز رنگ کی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔

سعدی ہوٹل میں صرف دو ملازم عورتیں ہیں۔ جن کے سپرد خاص خاص کام ہیں۔ ایرانی تہذیب کے لحاظ سے ہوٹلوں میں عورتوں کی ملازمت کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مجھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ یہ دو عورتیں جو دراصل کسی زمانے میں کسبی تھیں۔ اب جبکہ اُن کی جوانی نے ان کو جواب دے دیا ہے۔ ہوٹل کی ملازمت اختیار کر لی ہے۔

اثر چکوالی بی۔ اے

دیکھنے والے طلسمِ گردشِ افلاک کے
دل سے قائل ہیں تصور اور ادراک کے
طلسمِ وہم کیا افسونِ ساکنانِ دہر ہے
تیرگی کے گھومتے ہیں جس میں یہ ذرے خاک کے

عزیز تمکینی

کریکٹر اور بچپن

(گذشتہ سے پیوستہ)

کریکٹر کے بننے کا زمانہ وہ ہے جسے ہم بچپن کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وہ عمر ہے جب بچے کے دماغ پر عادات کے گہرے نقوش بنتے اور ایسی پائیداری اختیار کرتے ہیں کہ پھر باوجود کوشش کے بھی نہیں ہٹائے جا سکتے۔

تواریخ کے صفحات، لوگوں کے سوانح حیات اور موجودہ زمانے کی نت نئی مثالیں اس امر کا کھلا ثبوت ہیں کہ انسان کے بننے یا بگڑنے کا انحصار اس کے بچپن پر ہے۔ ننھے بچے کی مثال ایک ایسے پودے کی سی ہے جو ابھی اگا ہو۔ اور صاف ہوا اور کھلی دھوپ سے خوراک حاصل کرتا ہوا دن رات بڑھ رہا ہو۔ اب اس پودے کو ایک خوبصورت اور سرسبز درخت بنانا مالی کا کام ہے۔ اگر وہ عقلمند اور تجربہ کار ہے تو اس کی بیکار شاخوں کو تراش تراش کر اسے ایک خوشنما درخت بنا دے گا۔ لیکن اگر اس کے ہاتھ اس فن سے ناآشنا اور دماغ اس علم سے عاری ہے تو وہی پودا بڑا ہو کر یقیناً دلکشی سے دور اور دل فریبی سے بے بہرہ ہوگا۔

کریکٹر کی سب سے بڑی اور اعلےٰ تربیت گاہ گھر ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں انسان اپنی آئندہ زندگی کیلئے ایسے ایسے اصول وضع کرتا ہے جو تمام عمر اس کی روزانہ زندگی میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ یہیں اس کی دماغی نشوونما ہوتی ہے اور اسی بنیاد میں اخلاق کی پہلی اینٹ رکھی جاتی ہے۔ یہی وہ سانچہ ہے جس میں اچھا یا برا انسان کا کریکٹر ڈھلتا ہے اور اسی چار دیواری میں قوموں سلطنتوں اور ملکوں کی قسمت بنتی یا بگڑتی ہے۔

بچے کے اخلاق کو بنانے یا بگاڑنے کی پہلی اور سب سے بڑی ذمہ دار ماں ہے۔ یا یوں کہئے کہ ماں ایک نمونہ ہے جسے دیکھ دیکھ کر بچہ اپنے آپ کو اسی کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ بچے کی تعلیم اس وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب وہ زندگی کا پہلا سانس لیتا ہے اور بعض ماہرین فن کا خیال ہے کہ اس کی تعلیم ماں کے پیٹ ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی ماں کی عادات، خیالات و اطوار کا اس کے ذہن پر اثر پڑتا ہے اور وہ اسی قسم کا دماغ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ فرانس کے بادشاہ نپولین نے مادام کمپن سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: "تعلیم کا پرانا طریقہ بالکل فضول معلوم ہوتا ہے کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ لوگوں کو مناسب تعلیم دینے کیلئے کس بات کی ضرورت ہے۔" اُسنے جواب دیا "ماں" کی"۔ شہنشاہ پر اس جواب کا بہت اثر ہوا اور اس نے کہا کہ واقعی تعلیم کے لئے یہ ایک جامع جواب ہے بس اب یہ آپ کا کام ہے کہ ماؤں کو ایسی تربیت دیں کہ وہ اپنے بچوں کو صحیح تعلیم دے سکیں۔

ماں کیلئے سب سے بہتر تعلیم یہ ہے کہ وہ اپنے بچے کو اعلےٰ تربیت دینا سیکھ جائے۔ اس کی ذہنی و جسمانی نشوونما کے طریقوں سے واقف ہو جائے اور اُسے وہ اصول معلوم ہوں جن پر کاربند ہونے سے بچے کو اعلیٰ درجہ کا شہری اور بلند پایہ انسان بنایا جا سکتا ہے۔ دنیا کی اولوالعزم و مایۂ ناز ہستیوں کے سوانح حیات سے پتہ لگتا ہے کہ انہوں نے اچھی ماؤں کی آغوش میں پرورش پائی اور ان کی اعلیٰ زندگی و بہترین تربیت کا سہرا ان کی ماؤں کے سر ہے۔ سکاٹ کو شاعری ... کا شوق اس وقت ہوا جب وہ اپنی دادی اور والدہ سے منظوم کہانیاں سنا کرتا تھا اور یہ وہ وقت تھا جبکہ اسکی تعلیم بھی شروع .... نہ ہوئی تھی۔

ایک عورت نے ایک پادری سے پوچھا کہ میں اپنے بچے کی تعلیم کس وقت شروع کراؤں۔ ابھی اس کی عمر چار برس کی ہے۔ پادری نے جواب دیا۔ بیگم اگر ابھی تک آپ نے شروع نہیں کرائی تو چار سال ضائع کر دیئے ہیں۔

عربی زبان کی ایک مثل ہے کہ انجیر کا درخت انجیر کے درخت کو دیکھ کر پھل لاتا ہے۔ یہی حال بچے کا ہے۔ اس کی پہلی

تعلیم نقالی ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ ننھے ننھے بچے کبھی جانوروں کی طرح بولتے ہیں۔ کبھی خوانچہ والوں کی صدائیں لگاتے ہیں، کبھی ریل کی سی سیٹی بجاتے ہیں اور کبھی موٹر کا ہارن بن کر بھوں بھوں کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بچے جھوٹ موٹ کی دکانیں لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور خرید و فروخت کی نقل اتارتے ہیں۔ ننھی لڑکیاں گڑیاں کھیلتے کھیلتے زندگی کے تمام مدارج کی نقلیں اتارتی رہتی ہیں اور انہیں بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ جن باتوں کو وہ آج کھیل سمجھ کر کر رہی ہیں۔ کل انہیں کو عملی جامہ پہنانا پڑے گا۔

جن گھرانوں میں ماں اور باپ اچھا نمونہ بن کر بچے کے سامنے آتے ہیں۔ بچہ بھی اپنے آپ کو انہی کے سانچہ میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ جس گھر میں خاوند اپنی بیوی یا بچوں کے ساتھ بدزبانی سے پیش آتا ہے تو تھوڑے ہی عرصہ بعد بچے بھی نئی سے نئی بندشیں تراشنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن جہاں بچوں کو آپ اور جناب سے مخاطب کیا جاتا ہے تو اُن کے مُنہ سے بھی اسی قسم کے الفاظ سنے جاتے ہیں۔

بچے کے ابتدائی تاثرات کو خواہ کس قدر کم اہمیت کیوں نہ دی جائے لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کا اثر تمام عمر باقی رہتا ہے۔ بچپن کی کہانیاں ہی محمود غزنوی کو کھینچ کر ہندوستان لائیں اور سکندر اعظم کو دنیا کی فتح کیلئے آمادہ کر دیا۔ ملٹن کا یہ کہنا کہ جس طرح صبح دن کی حالت کا پتہ دیتی اسی طرح بچہ اپنی آئندہ زندگی کے متعلق پیشین گوئی کرتا ہے۔ لفظ بلفظ صحیح ہے۔ اس کی مثالیں نہ صرف گذشتہ تاریخ میں ملتی ہیں بلکہ موجودہ زمانہ بھی ان سے خالی نہیں۔

لارڈ براہم کا اندازہ ہے کہ باقی تمام زندگی کی نسبت اٹھارہ ماہ سے تیس ماہ تک بچہ مادی دنیا اور اپنی قوتوں کے متعلق زیادہ علم حاصل کرتا ہے۔ اپنے اور دوسروں کے دل و دماغ کو سمجھتا ہے دوسری چیزوں کی ماہیت معلوم کرتا ہے۔ اور اس کی اہمیت اسقدر زیادہ ہے کہ آکسفورڈ کے عالم بے بدل کی تعلیم اس کے مقابلے میں نہیں ٹھیر سکتی۔

پیدائش کے بعد بچہ ایک نئی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ پہلے پہل وہ چیزوں کو محض دیکھتا ہے۔ پھر غور کرتا ہے اس کے بعد مقابلہ اور سب سے آخر میں سیکھتا ہے اور ان کے تاثرات کو دماغ میں جگہ دیتا ہے۔ یہاں اسے ہر لحظہ رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اگر اس کے والدین عقلمند ہیں تو وہ ان کی نگرانی میں محیر العقول ترقی کرتا ہے۔ بچے کے دل و دماغ ہر نقش کو لینے کیلئے تیار ہوتے ہیں۔ خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا جو بھی سامنے آجاتا ہے اپنے دماغ میں بٹھا لیتے ہیں۔ بچپن ایک ایسا آئینہ ہے جس کا عکس آئندہ زندگی پر پڑتا ہے اور اس کی ہر پہلی چیز مثلاً خوشی، کامیابی، غم اور بہادری اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

یہ ہے وہ زمانہ جبکہ بچوں کا نہیں بلکہ قوموں کا کریکٹر بنتا ہے۔ ان کا مزاج، قوت ارادی اور عادات ترقی کرتی ہیں۔ وہ بچہ جو روزانہ بداخلاقی اور گندی فضا میں تربیت پاتا ہے بڑا ہو کر ایک اچھا انسان، اچھا شہری اور قوم کا اچھا فرد ثابت نہیں ہو سکتا لیکن جس گھر میں محبت اور فرض شناسی کی حکمرانی ہے جہاں دل اور دماغ عقلمندی سے حکومت کرتے ہیں جہاں روزانہ زندگی میں ایمانداری اور نیکی ہی نیکی نظر آتی ہے، جہاں حکومت سمجھدار، مہربان اور نرم دل ہے وہاں اور صرف وہاں سے ہم امید کر سکتے ہیں کہ بچہ مفید، صحت مند اور اعلیٰ خصائل لے کر نکلے گا۔

اس کے برعکس اگر وہاں جہالت، سخت گیری اور خود غرضی کا دَور دورہ ہوگا تو بچہ خود بخود وہی خصائل اختیار کر لے گا۔ اور بڑا ہو کر بھی ناشائستہ اور اکھڑ رہے گا۔ ایک قدیم یونانی کا قول ہے کہ اپنے بچے کو جاہل غلام کے ہاتھوں میں دے دو۔ کچھ عرصہ بعد تمہارے پاس بجائے ایک کے دو غلام ہو جائیں گے۔

بچہ جو کچھ دیکھتا ہے۔ لازمی طور پر اُس کی نقل اُتارتا ہے۔ اس کیلئے اطوار کردار اور عادات کی ہر بات نمونہ ہے۔ رشر لکھتا ہے کہ بچے کیلئے زمانہ نہایت ہی اہم وقت ہے۔ اس عرصے میں وہ دوسروں کے ساتھ مل جُل کر انکا رنگ اختیار کرتا ہے اور اپنے آپ کو انہیں کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ ہر نیا معلم اس پر پہلے معلم کی نسبت کم اثر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے کی فطرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کیلئے نمونہ کی ازحد ضرورت ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ عمدہ کریکٹر کے لوگ پیدا ہوں تو ہمیں بچوں کے سامنے عمدہ ترین نمونے پیش کرنے چاہئیں۔

جارج ہربرٹ کا قول ہے کہ ایک اچھی ماں سکول کے سو استادوں سے بہتر ہے۔ گھر میں وہ ایک ایسا مقناطیس ہے کہ جسکی طرف بچے خود بخود کھنچے رہتے ہیں اور ایک ایسا ستارہ ہے جسکی روشنی میں سب اپنا اپنا راستہ دیکھتے اور چلتے رہتے ہیں۔ سال بھر کے دوران میں تعلیم دیتی ہے اور بغیر الفاظ کے سبق پڑھاتی

وہ اکثر اپنی مثال سے وہ بات پیدا کر دیتی ہے جسے سکھانے سے زبان قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بُری مثال کے سامنے بہتر سے بہتر تعلیم بھی ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ مزید برآں یہ کہ مثال کی پیروی کیجاتی ہے۔ لیکن تعلیم کی نہیں اور اگر تعلیم کے ساتھ ساتھ عمل نہ ہو تو وہ قطعاً بے سود ہے۔ کیونکہ اس صورت میں تعلیم اسے حیلہ سازی اور دھوکا بازی سکھائے گی۔

بچے اپنے بزرگوں کی حرکات کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ ان کے اعمال کو غور سے دیکھتے ہیں۔ ان کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں اور پھر اسی طرح کرنے اور کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ بچے جب اپنے بزرگوں کو سگرٹ پیتے دیکھتے ہیں تو خود چھوٹے چھوٹے تنکے منہ میں لیکر ان کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محرم کی دسویں تاریخ کے بعد کئی دن تک اور اکثر اوقات دیر دیر تک ننھے ننھے بچے گلیوں میں ماتم کرتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ جلوسوں کے نکل جانے کے بعد بچوں کا نعرے لگانا ایک عام بات ہے۔ ایک دن جب میں حجامت بنانے کے بعد اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تو میرا چھوٹا بچہ جھٹ وہاں آکر بیٹھ گیا۔ میں جو منہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو دیکھا کہ سیفٹی ریزر کو اپنی گالوں پر پھیر رہا ہے۔ میں نے پوچھا بیٹا یہ کیا کر رہے ہو۔ کہنے لگا داڑھی مونچھ صاف کر رہا ہوں۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ بچے بڑے درجے کے نقال واقع ہوئے ہیں اور اگر والدین تھوڑی سی سمجھ رکھتے ہوں تو وہ ان کی اس عادت سے بہت کچھ کام لے سکتے ہیں۔ افعال کی نقل کرنے سے کریکٹر کی جڑیں آہستہ آہستہ اور ناواقفیت کے عالم میں نہایت مضبوط ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے بعض افعال دیکھنے میں بہت معمولی ہوں۔ لیکن روزانہ زندگی کے افعال کی بھی تو یہی صورت ہے۔ برف کے گالوں کی طرح وہ نہایت سکون سے صادر ہوتے رہتے ہیں۔ ہر گالا جو پہلے گالے پر پڑتا ہے کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ لیکن اس کے باوجود گالوں کا اجتماع برف کا انبار لگا دیتا ہے۔ یہی حال تواتر افعال کا ہے کہ ایک کے بعد دوسرا فعل صادر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ عادت کا مستحکم قلعہ تیار ہو جاتا ہے۔

ماں کی مثال بچے کیلئے اس لئے بھی زیادہ اہم ہے کہ اسے باپ کی نسبت بچے کے اخلاق و عادات پر اثر ڈالنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ گھر عورت کیلئے ایک چھوٹی سی سلطنت ہے۔ جہاں وہ اپنا پورا پورا تسلط جماتی ہے اور اپنے چھوٹے ماتحتوں پر ہر طرح سے حکمرانی کرتی ہے۔ ہر بات کے لئے ان کی نظر اس کی طرف ہوتی ہے اور وہ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسا مستقل نمونہ اور مثال بنی رہتی ہے۔ جسے وہ بغیر سوچے سمجھے دیکھتے اور نقل کرتے رہتے ہیں۔

بچپن کی مثال کا اثر اور ننھے دماغ پر خیالات کے گہرے نقوش کا ذکر کرتے ہوئے کاؤسے انہیں ان حروف سے تشبیہ دیتا ہے جو ایک چھوٹے درخت کی چھال پر کندہ کئے جائیں اور جو درخت کی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور پھیلتے جائیں اسی طرح وہ اثرات جو بچوں کے دماغ پر ڈالے جاتے ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے کیوں نہ ہوں کبھی نہیں مٹائے جا سکتے وہ خیالات جو اس وقت بچے کے دماغ میں پیدا کئے جاتے ہیں۔ ان بیجوں کی طرح ہیں جنہیں زمین میں ڈال دیا جاتا ہے اور وہ کچھ عرصہ وہاں پڑے رہنے کے بعد اُگ آتے ہیں اور پھر اعمال، خیالات اور عادات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ماں اپنے بچے کے وجود میں ایک بار پھر جنم لیتی ہے اور بچے اپنے آپ کو بغیر سوچے سمجھے اس کے اطوار، خیالات اور طرز زندگی کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ اس کی عادات ان کی عادات بن جاتی ہیں اور اس کا کریکٹر صاف طور پر ان میں جھلکتا ہے۔

یہ ہے وہ مہر مادری جس کا اثر مستقل اور پائیدار ہے اور جو زندگی کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور پھر اس گہرے اثر کے ماتحت جو ہر اچھی ماں اپنے بچوں پر ڈالتی ہے تمام زندگی میں ان کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ ایسے بچے جب زندگی کے عملی میدان میں اُترتے ہیں اور تفکرات، مصائب، اور بلاؤں سے دوچار ہوتے ہیں تو اس وقت بھی وہ ماں ہی کا سایۂ عاطفت ڈھونڈتے ہیں اور اسی کے الفاظ سے تسکین پاتے ہیں۔ نیک اور اچھے خیالات کا وہ بیج جو ماں بچپن میں بو دیتی ہے اس کے مرنے کے بعد بھی اچھے اعمال اور مستقل نیکیوں کی شکل میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ سر سید مرحوم کو وہ واقعہ جب انہیں بچپن میں اپنی والدہ کے حکم دینے پر نوکر سے معافی

مانگنی پڑی تھی عمر بھر نہ بھولا اور وہ زندگی بھر نہ صرف اپنے ماتحتوں سے بلکہ دوسرے لوگوں سے بھی نہایت اچھا سلوک کرتے رہے - یہاں تک کہ اپنے دشمنوں کو بھی شرمندۂ احسان کر لیا۔

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ گھر کی چھوٹی سی سلطنت میں خوشی یا غم، علمیت یا جہالت، تہذیب یا وحشت کا مدار عورت پر ہے - ایمرسن کا قول ہے کہ تہذیب کا بڑا حصّہ اچھی عورتوں کے اثرات کا نتیجہ ہے - اس میں شک نہیں کہ بچہ اپنی ماں کی گود میں اپنے نسلی خصائل کو لئے ہوئے ہوتا ہے - لیکن بچے کی آئندہ زندگی کا مدار کلی طور پر اس تربیت پر ہے جسے وہ اپنے پہلے اور نہایت با اثر معلّم یعنی ماں سے حاصل کرتا ہے -

بحیثیت معلّم کے عورت کا درجہ اس لئے بھی فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں رحم کا جذبہ بہت زیادہ ہے اور جس مہربانی اور شفقت سے وہ بچوں کو تعلیم دے سکتی ہے مرد نہیں دے سکتے - انسانیت کے وجود میں مرد اگر دماغ کا درجہ رکھتا ہے تو عورت دل کا اور اگر وہ قوت فیصلہ ہے تو یہ احساس اور اگر اس سے طاقت مراد ہے تو یہ اس سے خوبصورتی اور شان مختصر یہ کہ عورت کی عقل محبت اور التفات کے زیر اثر کام کرتی ہے ممکن ہے مرد اس کی ذہنی رہنمائی میں پیش پیش ہو لیکن احساس کا پیدا کرنا اسی کا کام اور کریکٹر احساس ہی سے بنتا ہے -

سینٹ آگسٹائن کی زندگی اس بات کا پورا پورا ثبوت ہے کہ ماں اور باپ کی مثال بچے کے دل و دماغ پر کیا اثر ڈالتی ہے اس وقت جبکہ آگسٹائن کا غریب والد اپنے بچے کی تعلیم کیلئے اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرتا تھا - اس کی ماں سچائی اور نیکی کی تعلیم سے اس کی روحانی دنیا کو منوّر کرتی تھی - آگسٹائن کی ابتدائی زندگی کچھ اچھی نہ تھی - لیکن ماں کی مثال اور اس کا اثر آخر کار اپنا رنگ لایا اور اس کا نتیجہ دنیا نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا - نپولین کی والدہ نے بڑی عمر تک اپنے بچے کو یہ معلوم ہونے دیا کہ ڈر کیا ہے - ہٹلر اور مسولینی کی ماؤں نے اپنے بچوں کے خیالات کو اسقدر بلند کیا کہ آخر کار انہوں نے دنیا کو دکھا دیا کہ نیک اور اعلےٰ خیالات کے وہ بیج جو اچھی مائیں اپنے بچوں کے دماغ میں بو دیتی ہیں ایک نہ ایک دن ضرور پھل لاتے ہیں -

اسی قسم کی بیشمار تاریخی مثالیں یہ ثابت کرنے کے لئے موجود ہیں کہ وہ اثرات جو ابتداً میں بچے کے دماغ پر ڈالے جاتے ہیں - بڑے ہو کر کسی نہ کسی صورت میں ضرور ظاہر ہوتے ہیں اب رہا یہ کہ ان کا پھل کڑوا نکلتا ہے یا میٹھا اثرات کی نوعیت پر موقوف ہے - کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ والدین باوجود کوشش کے بظاہر کامیاب نظر نہیں آتے - لیکن انہیں مایوس نہ ہونا چاہیئے کیونکہ یہ امر یقینی ہے کہ جلد یا بدیر ان کی اچھی تعلیم اور نیک مثال کا اثر بالآخر ضرور اپنا اثر دکھائے گا -

اسی قسم کا ایک واقعہ مغرب کے مشہور شاعر کوپر کے دوست جان نیوٹن سے تعلق رکھتا ہے - اس نے اپنی جوانی نہایت بُرے طریق سے گزاری - لیکن اچانک ہی وہ اپنے خواب سے ایسا چونکا کہ پھر بھول کر بھی اس راستے پر قدم نہ رکھا - بچپن کے زمانہ کی نصیحتیں ایک ایک کر کے یاد آتی گئیں اور وہ ان کی روشنی میں نیکی سچائی اور راستبازی کی راہ پر چلتا رہا - ایسی ہی ایک مثال ایک امریکن سیاست دان جان رنڈولف کے متعلق لکھی ہے - اس نے کہا کہ اگر میری والدہ بچپن میں مجھے اپنے گھٹنوں پر لٹا کر یہ نہ کہا کرتی کہ "اے وہ خدا جو آسمان پر ہے..." تو آج میں دہریہ ہوتا -

لیکن پہلی قسم کے واقعات شاذ ہوتے ہیں - یا اسی صورت میں ہوتے ہیں - جبکہ بچہ والدہ یا والد کی صحبت کی بجائے کسی اور کے ہاتھوں میں زیادہ دیر تک رہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ والدین کے بجائے بچے پر اُن لوگوں کا رنگ چڑھ جاتا ہے اور وہ انہی کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے - بعض اچھے گھرانوں کے بچے جو بدتمیز اور ان پڑھ نوکروں کے ہاتھوں میں پرورش پاتے ہیں - اسی قسم کے خصائل سے آراستہ ہو جاتے ہیں اور پھر والدین کی انتہائی کوشش کے باوجود بھی راہ راست پر نہیں آتے - اسی لئے کہا گیا ہے کہ ایسے نوکر جن کے ہاتھوں میں ننھے بچوں نے پروان چڑھنا ہے - نہایت سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر رکھے جائیں یا یہ کہ بچہ کو ان کی صحبت میں بہت کم رہنے دیا جائے - لیکن بعض مائیں یہ دیکھ کر کہ بچہ بہت روتا یا ضد کرتا ہے اسے نوکر کے حوالے کر دیتی ہیں اور پھر ایسی غافل ہو جاتی ہیں کہ گھنٹوں اس کا نام نہیں لیتیں - اس میں شک نہیں کہ اس طرح ان کی اپنی زندگی تو آرام سے گزر جاتی ہے - لیکن انسانی

سوسائٹی کے ایک فرد بلکہ ایک نسل کی زندگی خراب ہو جاتی ہے۔ انگریزی کے مشہور شاعر ساڈوتھے نے کہا ہے کہ تم جتنا عرصہ چاہو زندہ رہو۔ لیکن تمہاری زندگی کے پہلے بیس سال تمہاری نصف عمر سے کہیں زیادہ طویل ہیں۔ اور اپنے ساتھ واقعات و نتائج کا بے پناہ ذخیرہ لئے ہوئے ہیں۔

ایک ماہر موسیقی ۔۔۔ اچھی ماں کو سب سے بڑے معلم الاخلاق کا درجہ دیتا ہے اور وہ ایسا کہنے میں حق بجانب ہے۔ کیونکہ عورت ذہن رسا کی رہنمائی میں اپنے اچھے مزاج، رحمدلی اور مہربانی سے گھر کے تمام رہنے والوں کو گھیر لیتی ہے اور خوشی و اطمینان کا ایسا ماحول پیدا کرتی ہے جس میں پاکیزہ روحیں انسانیت کی بلندیوں کے رخ پرواز کرتی ہیں۔

وہ شکستہ جھونپڑی جہاں ایک نیک کفایت شعار، خوش مزاج اور صفائی پسند عورت کی حکومت ہے۔ نیکی، خوشی اور آرام کا گھر کہلا سکتی ہے۔ لیکن وہ شاندار محل جس میں بد سلیقہ، تند مزاج اور پھوہڑ عورت کا دور دورہ ہے، دنیا ہی میں دوزخ کا نمونہ ہے۔

اسی طرح سے ایک اچھا گھر نہ صرف بچپن میں بلکہ بڑی عمر میں بھی بہترین درسگاہ کا کام دیتا ہے اور بچے سے لے کر بوڑھے تک سب صبر، خوشی، ضبط نفس، جذبۂ خدمت اور احساس کے فرائض سے آشنا ہوتے ہیں اور روزانہ زندگی میں ان کا عملی سبق پڑھتے رہتے ہیں۔

(باقی دارد)

ایم۔ عنایت اللہ

حضرات اساتذہ سے گذارش

عنقریب مدارس اور کالجوں میں تعطیلات ہونے والی ہیں۔ لہٰذا حضرات اساتذہ دفتر شاہکار کو مطلع کریں کہ ان کے پرچے دفتر شاہکار ہی میں روک لئے جائیں یا بدستور جاری رہیں۔

جن اسکولوں اور کالجوں سے اطلاع نہ آئے گی اُن کے پرچے بدستور جاری رہیں گے۔ اور پرچوں کے ضائع ہونے یا نہ پہنچنے کا دفتر ذمہ وار نہ ہوگا اور جن اسکولوں اور کالجوں سے اطلاع آجائیگی اُن کی ہدایات پر عمل کیا جائے گا۔

اگر کسی اسکول یا کالج کی یہ خواہش ہو کہ ان کے پرچے دفتر شاہکار میں محفوظ رہیں تو وہ تعطیلات کے بعد تمام پرچے دفتر سے وصول کر سکتے ہیں۔

مینیجر

سینما

ہندوستانی سینما کی ترقی و اصلاح

ہندوستان میں فلم سازی کو شروع ہوئے ربع صدی سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا، لیکن اسی قلیل مدت میں اس صنعت نے معقول ترقی حاصل کر لی ہے، اور اسی طرح سینما سے دلچسپی رکھنے والی پبلک کا مذاق اور نقطۂ نظر بھی بتدریج بلند اور وسیع ہو کر کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔

شروع شروع میں تو سینمائی تصویروں کی نقل و حرکت ہی کو دیکھ کر تماشائی وقف حیرت و استعجاب ہو جاتے تھے۔ فلموں کے فنی اور معیاری پہلوؤں کی تلاش و جستجو کون کرتا تھا۔ مگر اب وہ حالت نہیں رہی۔ پبلک میں کافی مادۂ نقد و نظر پیدا ہو گیا ہے، اور اب وہ سینما کو تفریح کے ساتھ فنی نگاہ سے بھی دیکھنے کی خوگر ہو گئی ہے۔

ہندوستان کے اولین فلمساز دادا صاحب پھالکے تھے۔ جو ۱۹۱۳ء میں یورپ میں فلمسازی کا کام سیکھ کر ہندوستان آئے۔ انہوں نے ناسک کی ہندوستانی فلم کمپنی میں اپنی پہلی فلم ہرشچندر تیار کی، اس کے دوسرے ہی سال یورپ کی جنگ عظیم شروع ہو گئی جس سے ہندوستان میں یوروپین فلموں کی آمد بڑی حد تک بند ہو گئی۔ اس سے ہندوستانی صنعت فلم کو نشوونما کا بروقت موقع مل گیا۔ علاوہ ازیں یوروپین فلمیں۔ یوروپین تہذیب و معاشرت اور یوروپین مذاق و خیال کا آئینہ دار ہوتی تھیں اس لئے ان سے ہندوستانی ذوق کی کامل تسکین ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے برعکس [illegible] فلمیں تیار کی جاتی تھیں۔ ان کے فسانے تمام تر ہندوستانی مذہب ہندوستانی تاریخ اور ہندوستانی تہذیب سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے یہ فلمیں ہندوستانی مذاق کی زیادہ سے زیادہ کفالت کرتی تھیں

اور ہندوستانیوں کیلئے تفریح کے ساتھ تہذیب و اخلاق کی اصلاح کا بھی ذریعہ ثابت ہوتی تھیں۔ لہٰذا یہ چیز بھی ہندوستانی صنعت فلم کی ترقی و قبولیت کا باعث ہوئی۔

ناسک کی ہندوستانی فلم کمپنی کی کامیابی و ترقی کو دیکھ کر ہندوستانی سرمایہ دار فلمی کاروبار کی جانب متوجہ ہوگئے اور کوہ نور، مہاراشٹر، بنو تھیٹرس وغیرہ متعدد فلم کمپنیاں قائم ہو گئیں۔ تاہم ۱۹۲۱ء تک ہندوستانی صنعت فلم کی جو رفتار تھی، اسے کچھ زیادہ کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔ اس زمانے تک ہندوستان میں جن فلموں کی نمائش ہوتی تھی، وہ زیادہ تر غیر ملکی ہوتی تھیں۔ ۱۹۲۸ء تک ہندوستانی تصاویر کا تناسب ۱۵ فیصدی سے بھی کم ہی تھا۔ غیر ملکی فلموں کی درآمد کم کرنے کی غرض سے انڈین سینماٹوگراف کمیٹی نے ایک ایسا قانون بنانے کی بھی سفارش کی تھی جس کی رو سے غیر ملکی فلموں کا اوسط پچاس فیصدی سے بڑھنے نہ پائے۔ مگر یوروپین ارکان کی شدید مخالفت کے باعث کوئی ایسا قانون وضع نہ ہو سکا۔

ان حالات کے باوجود بیسویں صدی کے عشرۂ ثانیہ کے آغاز کو ہندوستانی فلم سازی کے دور ترقی کا آغاز قرار دینا بیجا نہ ہوگا، اس لئے کہ اسی زمانے میں امپیریل، کرشنا، شاردا، رنجیت، وغیرہ فلم کمپنیاں عالم وجود میں آئیں، اور پرتھوی راج، سلوچنا، زیب النساء، شانتا کماری، وغیرہ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے ذریعہ اچھی اچھی فلمیں تیار ہونے لگیں، اس دور کی فلموں میں مہاراشٹر اور پربھات فلم کمپنیوں کی "مرلی والا" اور "دو گرام" وغیرہ فلمیں فنی نقطۂ نظر سے امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس سے پہلے ہندوستانی نگارخانوں میں جو فلمیں تیار ہوتی

تھیں۔ ان کے فسانے زیادہ تر ہندوستان کے مذہبی قصوں سے متعلق ہوتے تھے، مگر اب اس میں ایک جدید عنصر کا اضافہ ہوا اور مذہبی قصوں کے ساتھ ساتھ ایسے فسانے بھی فلم بند ہونے لگے، جن میں شخصی جرأت و بہادری کے کارنامے وغیرہ دکھائے جاتے تھے۔

اس عشرے میں گریٹ ایسٹرن کارپوریشن لاہور نے ایک جرمن کمپنی کی امداد اور ہمانشو رائے، سیتا دیوی اور منورنجن پال کے اشتراک عمل سے "لائٹ آف ایشیا" اور "لوس آف مغل پرنس" وغیرہ چند ایسی فلمیں تیار کیں جو فنی اعتبار سے ہندوستانی فلموں میں تو امتیازی حیثیت رکھتی ہی تھیں۔ بدیشی فلموں سے بھی مقابلہ کر سکتی تھیں۔ ڈاکٹر ٹیگور اور بنکم چٹرجی کی تصانیف سے متعلق فلمیں بھی اسی زمانے میں تیار کی گئیں۔

گذشتہ چھ سات سال کے اندر ہندوستانی فلم سازی نے ہر اعتبار کافی ترقی کر لی ہے، اور اب ہندوستان میں جو فلمیں دکھائی جا رہی ہیں، ان میں ہندوستانی فلموں کا اوسط تقریباً پچاس فیصدی تک پہنچ گیا ہے، درانحالیکہ برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں ہنوز برطانوی فلموں کا اوسط ابھی ۳۰ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ ہندوستانی فلم سازی کو جہاں اور پہلوؤں سے ترقی ہوئی ہے۔ وہاں اس کی افادی حیثیت میں بھی نمایاں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب پبلک فلمی ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو پہلے کی طرح ذلت و حقارت کی نگاہوں سے دیکھنے کے بجائے قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھنے لگی ہے۔

آج کل ہندوستان میں ۷۰ فلم کمپنیاں فلم سازی کا کام کر رہی ہیں، اور ۱۲۰۰ سینما خانوں میں فلموں کی نمائش ہو رہی ہے، اس کاروبار پر ۱۵ کروڑ روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے اور اس صنعت سے کم و بیش ۳۵ ہزار نفوس اپنی معاش حاصل کر رہے ہیں۔

ہندوستانی صنعت فلم کی یہ ترقی و کامیابی ہر صورت حوصلہ افزا ہے اور اس کے مستقبل کو ہر طرح روشن قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن ضرورت ہے کہ اس صنعت سے تعلق رکھنے والے معائب و نقائص دور کئے جائیں اور اس کے معارف و محاسن میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہندوستانی فلم سازوں کو فلمی فسانے کی طرف خاص توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب ایکٹروں خصوصاً ایکٹرسوں کے نام پر ہندوستانی پبلک فلموں پر دیوانہ وار ٹوٹا کرتی تھی۔ اب اس کی نگاہ میں وسعت اور ذوق میں بلندی پیدا ہو گئی ہے اور وہ ایسی فلمیں طلب کرتی ہے، جن کے فسانے ہر پہلو سے فنی اور معیاری حیثیت رکھتے ہوں۔ "مدر انڈیا" نامی رنگین فلم کے دیکھنے کے بعد تو یہ نتیجہ نکالنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اگر فلم کا فسانہ اچھا ہو تو بعض دوسرے اعتبار سے پست ہونے پر بھی فلم مقبول ہو سکتی ہے۔ ہندوستان ہی میں نہیں دیگر ممالک میں بھی فلم سازی میں فسانوں کو خاص اہمیت دی جانے لگی ہے، مغربی فلم ساز برنارڈ شا اور ایچ۔ جی ویلس کو بڑی بڑی رقمیں پیش کر کے ان کے فسانے حاصل کرتے ہیں، اگر فسانے اہمیت کی چیز نہ ہوتے تو امریکن فلم ساز دیوانے نہیں تھے جو خواہ مخواہ ان اہل قلم کو بڑی بڑی رقمیں دے ڈالتے۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ ہندوستانی فلم ساز جس فلم پر لاکھ روپے خرچ کر دیتے ہیں اس کے فسانے پر دو دو سو روپے سے زیادہ خرچ کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اگر ہندوستانی فلم ساز اس صنعت کی کامل ترقی کے خواہشمند ہوں تو انہیں فلم سازی میں فسانے کو اہم حیثیت دینی پڑے گی۔

امریکہ، جاپان، روس اور اٹلی نے سینما سے کافی فائدہ اٹھایا ہے، ہندوستانی فلموں میں ابتک صرف عشق و محبت ہی کو نمایاں حیثیت اور امتیازی خصوصیت دی جا رہی ہے۔ اگر بہت زیادہ وسعت خیال سے کام لیا جاتا ہے تو عشقیہ فلموں میں کبھی کبھی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کا پہلو بھی شامل کر دیا جاتا ہے مگر اب یہ موضوع بالکل فرسودہ اور کہنہ ہو چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ زندگی اور ماحول کے نئے نئے پہلو بھی روشنی میں لائے جائیں۔ اور فلمی اسٹیجوں کو ان کا منظر گاہ بھی بنایا جائے۔ اقتصادی پہلو سے بھی فلموں میں گونا گونی پیدا کرنا ضروری ہے۔

علم الاقتصاد کا مسلمہ اصول ہے کہ کسی قطعۂ زمین پر جس پر کاشت ہو چکی ہو، اگر محنت اور سرمایہ کی مقدار پہلے کی نسبت زائد کر دی جائے تو اس زمین کی پیداوار میں بھی پہلے کی نسبت اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر بار بار یہی عمل کیا جائے تو ایک وقت آئیگا جب اس زمین کی پیداوار محنت اور صرفے کے مقابلے میں کم ہو

جائے گی اور اس وقت اس محنت اور سرمایہ سے کسی دوسری اراضی میں کاشت کرنا زیادہ سودمند اور منفعت بخش ہوگا۔ یہی حالت اس وقت ہندوستانی سینما کی ہو رہی ہے۔ اب تک جن حدود میں فلمیں تیار ہوتی رہی ہیں، ان میں مزید ترقی و کامیابی کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس لئے ہندوستانی فلم سازوں کو چاہیئے کہ وہ موجودہ حدود سے نکل کر نئے میدان میں آئیں، اس کے ساتھ ہی کچھ نئی قوتوں کو بروئے کار لایا جائے اور ایسی ممتاز ہستیوں کو اسٹیج پر لانے کی کوشش کیجائے، جن کی قابلیت و صلاحیت مشہور اور مسلمہ ہے۔

ہندوستانی فلموں کی ترقی کیلئے ترقی پسند اور وسیع مذاق و خیال رکھنے والے ڈائریکٹروں کی بھی خاص ضرورت ہے، بار بار کی ناکامیوں کے باعث فلم ساز طبقہ اتنا ڈر گیا ہے کہ اسے نئے آدمیوں سے کام لینے کی ہمت ہی نہیں ہوتی، اور اس لئے وہ پرانے ہی ڈائریکٹروں پر جو بار بار ناکام ہو چکے ہیں روپے برباد کرتا رہتا ہے

ہندوستانی فلم ساز فلموں میں جدت کی ضرورت سے ناواقف نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ نئی نئی ایکٹریسوں کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فلاں ایکٹریس کی خدمات حاصل ہو جانے پر ان کی کمپنی چمک جائے گی اور وہ مالا مال ہو جائیں گے، لیکن بدقسمتی سے ان کا یہ خواب رنگیں شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔

پارٹ کے متعلق عموماً صحیح ایکٹروں کے انتخاب میں غلطی کی جاتی ہے۔ جن ایکٹروں اور ایکٹریسوں کو کسی زمانے میں غیر معمولی شہرت و کامیابی حاصل ہو چکی ہے، اگر ان کے لائق پارٹ دیا جائے تو ان کے اشتراکِ عمل سے اب بھی کامیاب فلمیں تیار ہو سکتی ہیں

ان سب کاموں کیلئے صلاحیت عمل کے ساتھ قوت فہم کی بھی ضرورت ہے، لیکن ہمارے ڈائریکٹر ان خصوصیات سے محروم پائے جاتے ہیں۔ بہت سی فلموں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ڈائریکٹر فسانوں کے انتخاب میں اپنی اخلاقی اور سماجی ذمہ داریوں کو بہت کم محسوس کرتے ہیں، ڈائریکٹروں کا سب سے بڑا ذریعہ ہے

ایک کامیاب فلم تمام ملک میں دورہ کرتی ہے اور اس کا اثر دور دراز دیہاتوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر ایسی فلمیں اخلاقی اور سماجی اعتبار سے مضر ہوں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ ان کے نقصانات کتنے ہمہ گیر اور دور رس ہو سکتے ہیں۔ ایسی فلمیں بالخصوص ترک کر دینے کے قابل ہیں جن میں بدمعاشی اور جرائم کے واقعات دکھائے جاتے ہوں، اس قسم کی فلمیں نوجوانوں میں نہ صرف بدمعاشی کے جراثیم پیدا کرتی ہیں بلکہ انہیں ارتکاب جرائم کے نئے نئے طریقے بھی سکھاتی ہیں۔

فلموں کے عنوانات میں گوناگوں اور بوقلمانی پیدا کرنے کے لئے اور بہت سے قومی اخلاقی معاشرتی تہذیبی عنوانات موجود ہیں۔ اس لئے کوئی ضروری نہیں کہ فلموں میں دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے جرائم آموز فلمیں تیار کی جائیں۔

محمد حسین رشید ایم-اے

غزل

ترے حسن بیکراں کی یہ ادائے دلنوازی
نہیں اب کسی میں باقی سر و فکر پاکبازی

شب ہجر سے ڈروں کیا کہ یہ راز جانتا ہوں
تری زلف سے بنی ہے شب ہجر درازی

جو خیالِ عاشقی ہے تو وفا کا حوصلہ کر
وہ بنے گا غزنوی کیا جسے بار ہو ایازی

ہیں حریفِ یک جہاں ہوں یہ ہے امتیاز میرا
کہ مجھی سے ہے تغافل ہے مجھی سے بے نیازی

دیس راج شرما
(بی-سی-ڈی-(فرینچ))

مختار

ایک گاؤں کی فی کس سالانہ آمدنی

کسی ملک کی خوش حالی کا دارومدار زیادہ تر اس دولت پر ہے جو ملک کے مختلف ذرائع سے پیدا کی جاتی ہے۔ اور یہی ملک کی قومی آمدنی کہلاتی ہے۔ قومی آمدنی کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ مثلاً پروفیسر اے سی پیگو کہتا ہے "ان تمام اشیاء اور خدمات کو قومی آمدنی میں داخل کرنا چاہیئے جو کہ واقعی طور پر زر کے معاوضے میں فروخت کی جاتی ہوں، مگر اشیاء کو دو مرتبہ شامل کرنے سے گریز کرنا چاہیئے۔[1]" پروفیسر الفریڈ مارشل کا خیال ہے کہ "ملک کی محنت اور اصل سے ہر سال ایک خاص مقدار میں مادی اور غیر مادی اشیاء پیدا ہوتی ہیں، جن میں ہر قسم کی خدمات بھی شامل ہیں یہی کسی ملک کی صحیح قومی آمدنی ہیں۔[2]" اسٹیمپ تعریف کرتا ہے کہ "قومی آمدنی میں ان اشیاء اور خدمات کو شامل کرنا چاہیئے جن کا نہ صرف زر سے مبادلہ ہو سکے بلکہ جو حقیقی طور پر زر سے متبادل ہوتی ہوں۔[3]"

قومی آمدنی سے قوم کی معاشی خوش حالی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مختلف سالوں کے اعداد سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آیا قوم کی خوش حالی میں اضافہ ہو رہا ہے یا تخفیف، نیز اضافے یا تخفیف کا رجحان تیز رو ہے یا سست رو۔ صحیح اور قطعی اعداد معلوم ہونے کے بعد ان تدابیر پر بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح ملک کی گھٹتی ہوئی آمدنی میں مزید اضافے کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ دیکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ ملک کی معمولی آمدنی ملک کے مختلف معاشی طبقوں میں کس تناسب سے تقسیم ہو رہی ہے۔ کیونکہ پیدا شدہ دولت کی تقسیم غیر موزوں عدم مساوات بھی ملک کی عام خوش حالی کو متاثر کرتی ہے۔ جس طرح ہم اس ملک کو مرفہ الحال نہیں سمجھ سکتے جس کی قومی آمدنی کا فی کس سالانہ اوسط بہت کم ہوتا ہو۔ اسی طرح ہم کو اس ملک کی خوش حالی میں بھی شک ہوگا۔ جہاں پیدا شدہ دولت کا بڑا حصّہ آبادی کے تھوڑے سے حصّے کے قبضے میں چلا جاتا ہو۔ اور آبادی کے بڑے حصّے میں دولت کی مقدار کم آتی ہو۔

قومی آمدنی کا اندازہ کرنے کے مختلف طریقے ہیں، مثلاً معمولی آمدنی کے اعداد و شمار سے قومی آمدنی کا تخمینہ لگایا جاتا ہے۔ مگر ان ملکوں میں جہاں فی کس آمدنی کا اوسط کم ہوتا ہے اس طریقے کو اختیار نہیں کیا جا سکتا مثلاً ہندوستان میں صرف وہ لوگ جن کی آمدنی ۲ ہزار سالانہ سے زائد ہے محصول آمدنی ادا کرتے ہیں۔ اور ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ آبادی کے بڑے حصّے کو محصول ادا کرنے کی دشواریوں اور مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ پیشہ واری اعداد سے بھی قومی آمدنی کا تخمینہ کیا جاتا ہے مگر یہاں بھی ضمنی صنعتوں اور ذیلی کاروبار کی آمدنی کے اعداد دستیاب نہیں ہوتے، اس لئے یہ طریقہ بھی مفید نہیں ہو سکتا۔ قومی آمدنی کے حساب لگانے کا تیسرا طریقہ پیدائش دولت کے اعداد و شمار ہیں مگر یہ اعداد بھی مکمل نہیں ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں زرعی پیداوار اور معدنی پیداواروں کے اعداد مل جاتے ہیں مگر مرمت کے کاموں کی اجرت، ماہی گیری ضمنی صنعتوں، ریل کے علاوہ باربرداری کے دوسرے ذرائع کی آمدنی، چارہ فروشوں کے منافع، خانگی خدمات کے اعداد بہت کم ہیں۔ اس لئے بہت سا کام محض اندازوں پر کیا

[1] "ومی ان کمس آف ویلتھ" پروفیسر اے سی پیگو مطبوعہ ۱۹۳۲ء صفحہ ۳۲
[2] "اصول معاشیات" الفریڈ مارشل صفحہ ۵۲۴
[3] "برٹش انکمس اینڈ پراپرٹی" اسٹیمپ صفحہ ۴۱۶

جاتا ہے۔

اعداد و شمار کی قلت کی وجہ سے ہندوستان کی قومی آمدنی کا اندازہ لگانے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ مگر پھر بھی متعدد اصحاب نے مختلف طریقوں سے قومی آمدنی کے اندازے لگائے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام دادا بھائی نارو جی کا ہے۔ جنہوں نے سنہ ۱۸۶۷ء میں زرعی پیداواروں کی قیمت کا اندازہ دتخم کی قیمت گھٹانے کے بعد ۲۶ کروڑ پونڈ کیا تھا، نمک، کوئلہ، افیون، اور تجارت کا منافع ایک کروڑ ۷۰ لاکھ مصنوعات وغیرہ ڈیڑھ کروڑ، دودھ مچھلی، گوشت ڈیڑھ کروڑ، اور مد متفرقات کیلئے تین کروڑ کی رقم مخصوص کی تھی۔ اس طرح ملک کی مجموعی آمدنی ۳۴ کروڑ پونڈ ہوتی تھی۔ جس کو اس وقت کی برطانوی ہند کی سترہ کروڑ آبادی سے تقسیم کیا تھا اور اس طرح قومی آمدنی کا اوسط ۴۰ شلنگ یا ۲۰ روپے فی کس آتا تھا[۱] دادا بھائی نے خدمات کو اس لئے شامل نہیں کیا کہ ان کا معاوضہ پیدا شدہ اشیاء ہی میں سے دیا جاتا ہے اور جب اشیا کو شامل کر لیا تو خدمات کو شامل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

بعد میں جن لوگوں نے قومی آمدنی کے تخمینے لگائے ہیں۔ ان میں کے ٹی شاہ، کے جے کھمباٹا، پی اے واڈیا، جی این جوشی، اور جی فنڈلے شیراز کے نام قابل ذکر ہیں۔ شاہ اور کھمباٹا نے خدمات کی آمدنی کو بھی قومی آمدنی میں شامل کیا ہے۔ شیراز نے زرعی اور معدنی پیداواروں، صنعتی اشیا، ذرائع نقل و حمل، تجارت، نظم عامہ، فوج، آزاد پیشوں اور خانگی خدمات کے معاوضوں کو بھی قومی آمدنی کی فہرست میں داخل کیا ہے۔ نیز انہوں نے زرعی پیداوار کی قیمت میں سے تخم کی قیمت منہا نہیں کی ہے۔

بہر حال ہندوستان میں وقتاً فوقتاً قومی آمدنی کے بارے میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان کے نتائج حسب ذیل رہے ہیں[۲]

تحقیق کنندہ	سنہ تحقیق	قومی آمدنی فی کس روپوں میں
دادا بھائی نارو جی	سنہ ۱۸۷۰ء	۲۰ — ۰ —
بیرنگ باربور	سنہ ۱۸۸۲ء	۲۷ — ۰ —
ڈگبی	سنہ ۱۸۹۸-۹۹ء	۱۸ — ۹ —
لارڈ کرزن	سنہ ۱۹۰۰ء	۳۰ — ۰ —
ڈگبی	سنہ ۱۹۰۰ء	۱۷ — ۴ —
واڈیا اور جوشی	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	۴۴ — ۵ — ۶
شاہ اور کھمباٹا	سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء	۶۷ — ۰ — ۶
فنڈلے شیراز	سنہ ۱۹۲۴ء	۱۱۶ — ۰ — ۰

مگر ان مختلف اعداد سے کوئی صحیح نتیجہ اس لئے نہیں نکالا جا سکتا۔ کہ یہ مختلف سالوں کے ہیں اور ہر سال قیمتوں میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں، نیز روپے کی شرح مبادلہ بھی بدلتی رہی ہے۔ پھر طریق کار میں بھی اختلاف ہیں اور ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس سلسلے میں مسٹر شیراز کے مضامین کا ایک سلسلہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء کے ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوا ہے۔ جس میں حالیہ سالوں کے اعداد دئے گئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مقابلے کی آسانی کی خاطر متقابلہ اعداد بھی پیش کئے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں[۳]

سنہ	ملک کی مجموعی آمدنی (کروڑ روپوں میں)	فی کس آمدنی (روپوں میں)	سنہ ۱۹۱۱ء کی قیمتوں کے لحاظ سے فی کس قومی آمدنی
سنہ ۱۹۱۱ء	۱۹۴۲	۸۰	۸۰
سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	۲۹۰۰	۱۰۹	۸۹
سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	۲۲۵۰	۸۴	۸۱
سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	۱۷۰۰	۶۳	۷۲
سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	۱۶۰۰	۵۸	۶۷
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	۱۶۰۰	۵۸	۷۳
سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء	۱۶۰۰	۵۸	۷۴
سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء	۱۷۰۰	۶۳	۷۸

اگر ان اعداد کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۹ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک ہندوستان کی قومی آمدنی کا اوسط ۷۰ روپے کے قریب رہا ہے اور سنہ ۱۹۱۱ء کی قیمتوں کے لحاظ سے ۷۶ روپے کا اوسط آتا ہے۔

---

۱ "پاورٹی اینڈ ان برٹش رول ان انڈیا" دادا بھائی نارو جی صفحہ ۳۱

۲ "معاشیات ہند" جی بی جتھیار اور ایس بی بیری، جلد دوم سنہ ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۹

۳ "ٹائمس آف انڈیا" مورخہ ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء

ہندوستان کی قومی آمدنی کے سالانہ اوسط کی کمی کا اس وقت تک صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ دیگر ممالک کے متقابلہ اعداد پیش نظر نہ رکھے جائیں، چنانچہ مسٹر شیراز نے ۳۶-۱۹۳۵ء کے بعض دیگر ممالک کے اوسط آمدنی کے اعداد بتائے ہیں جو حسب ذیل ہیں[1]

نام ملک	فی کس قومی آمدنی کا اوسط روپیوں میں
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۱۱۸۴
برطانیہ عظمیٰ	۱۰۱۰
فرانس	۵۴۵
جرمنی	۵۱۹
اطالیہ	۳۱۹
جاپان	۱۸۶
بلگیریا	۱۲۰
ہندوستان	۶۳

ہندوستان کے مختلف مقامات پر بعض بعض دیہات میں .... دیہات کی مجموعی دیہی آمدنی معلوم کر کے فی کس آمدنی کا اوسط بھی لگایا گیا ہے، اور تعجب ہوتا ہے کہ اس طرح آمدنی کے اوسط میں اور تخفیف ہو جاتی ہے۔ مثلاً ۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر طیمن نے پمپلاسوداگر (بمبئی) میں آمدنی کا اوسط ۴۴ روپیہ سال بتایا ہے۔ میجر جیک نے ۱۴-۱۹۱۰ء کے درمیان ضلع فرید پور (بنگال) میں تحقیقات کی تو اوسط ۵۲ روپے فی کس آیا۔ مسٹر بختیار نے گجرات کے ایک گاؤں کی آمدنی کا اندازہ ۷۰ روپے فی کس بتایا ہے۔

اس سلسلے میں ہم نے بھی حیدرآباد کے ایک جاگیری موضع کی مجموعی اور فی کس آمدنی معلوم کرنے کی کوشش کی ہے[2]

موضع دو دوبال (جہاں یہ کام کیا گیا ہے) تعلقہ کوڑنگل، ضلع گلبرگہ میں شہر حیدرآباد سے بجانب جنوب و مغرب تقریباً ۶۷ میل کے فاصلے پر تانڈور کوسگی سڑک پر واقع ہے۔ ۱۳۴۷ف میں گاؤں کی آبادی ۲۶۵۲ تھی اور رقبہ ۱۲۶۱۶ ایکڑ تھا۔ جس میں مزروعہ رقبہ ۵۳۳۱ ایکڑ تھا۔ موضع میں ۵۷٫۶۵ فی صد ہندو، ۳۲٫۷۲ پست اقوام اور اقوام قدیمہ اور ۲٫۵ فی صد مسلمان آباد ہیں۔ موضع کا خاص پیشہ زراعت ہے۔ چنانچہ کام کرنے والی آبادی کا ۴۲٫۷ فی صد زراعت سے بالواسطہ یا بلا واسطہ آمدنی حاصل کرتا ہے۔ آبادی کا ۱۶٫۷ فی صد حصہ بافندگی یا تاگہ صاف کرنے اور رنگنے میں مشغول ہے اور بقیہ حصہ تجارت، ملازمت، چرواہی، گلہ بانی، ساہوکاری اور آزاد پیشوں سے آمدنی حاصل کرتا ہے۔

قومی آمدنی کا حساب لگانے کیلئے ۱۳۴۷ف (۳۸-۱۹۳۷ء) کا سال لیا گیا ہے۔ گو ہر چیز کے صحیح اعداد ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ تاہم گاؤں کی زرعی اور صنعتی پیداواروں اور دوسری چیزوں کے قریب ترین اندازے جو معلوم ہو سکے ان میں سے سال رواں کی قیمتوں پر حساب لگایا گیا ہے۔ نیز حساب مقامی قیمتوں سے لگایا گیا ہے اور زرعی پیداوار کی مجموعی قیمت میں سے تخم کی قیمت منہا کر دی گئی ہے۔ ذرائع آمدنی کو چار بڑی مدات میں زرعی پیداوار، دیگر ذرائع صنعتی پیداواروں و کاروبار اور متفرقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلی مد میں مختلف قسم کی زرعی اجناس مثلاً دھان معمولی و اعلیٰ مونگ پھلی، مرچ، کلتھی، جوار، راگی، ساوان، تل، کنگنی، ارہر، مونگ دوسری متفرق پیداواریں، ترکاریاں اور مختلف فصلوں کا گھاس یا جوار کی کڑوی کو شامل کیا گیا ہے۔

زرعی اجناس و چارہ۔

جملہ قیمت زرعی و اجناس وغیرہ	۴۹،۸۲۰
منہائی قیمت تخم	۱،۹۲۰
	۴۷،۹۰۰
مختلف قسم کا چارہ	۵،۴۶۵
زرعی شعبے کی جملہ آمدنی	۵۳،۳۶۵

جاگیر کے دیگر ذرائع آمدنی میں سیندھی و شراب کے علاوہ مختلف کارآمد درختوں، پھلوں اور گھاس کی قیمت شامل کی گئی ہے۔ جن کا ہر سال نیلام کیا جاتا ہے۔ آموں سے ہر سال تقریباً ۲ ہزار روپے اور مچھلی سے سالانہ ۲۰۰ روپے کے قریب کی آمدنی کو اس میں شامل نہ کیا جا سکا۔ یہاں شریفہ بھی بکثرت ہوتا ہے۔ مگر اس کو نیلام نہیں کیا جاتا۔ اس لئے اس کی قیمت کو بھی شامل نہیں کیا گیا۔ ۱۳۴۷ف میں جاگیر کے دوسرے مختلف ذرائع کی

[1] "ٹائمس آف انڈیا" مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء

[2] ممالک محروسہ سرکار عالی میں اب تک قومی آمدنی کے متعلق کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ راقم الحروف آجکل اس کام میں مصروف ہے۔ اور اگر حالات نے ساتھ دیا تو امید ہے کہ مارچ ۱۹۴۰ء تک کام ختم ہو جائے گا۔

آمدنی کا اندازہ ۵۵،۵۷ روپیہ کے قریب کیا گیا ہے۔

صنعتی اور ضمنی پیداواروں میں تیار شدہ پارچہ طلائی ونقروی زیورات، کمہاروں کے برتن، وہیڑوں اور دوسرے صناعوں کی مصنوعات کی قیمتیں، بڑھئی، لوہار، درزی، قصاب، رنگ ریز، کے معاوضے، کرایہ پر گاڑیاں چلانے والوں کی اُجرت، مرغیوں، انڈوں، اون، چمڑے، دودھ، گھی اور رسیوں کی قیمت۔ بیڑی سازی، آٹا پیسنے، دھان کوٹنے کی اجرت اور گاؤں کے سال رواں میں نئے پیدا شدہ مویشیوں کی قیمت کو شامل کیا گیا ہے جن کی مجموعی آمدنی ۵۱،۷۳۴ روپے ہوتی ہے۔

مد متفرقات میں بھگیلوں کی اجرت، ملازمین جاگیر کی تنخواہیں، ساہوکاروں کا سود، تاجروں کے منافع، زرعی اور غیر زرعی مزدوروں کی اجرتیں، خانگی ملازمتوں کے معاوضے، وظیفہ خواروں کے وظائف وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے، اور اس طرح اس مد سے ۴۸،۷۴۱ روپے آمدنی ہوتی ہے۔

اس طرح موضع کی مجموعی آمدنی حسب ذیل رہی۔

	مجموعی آمدنی	کل آمدنی کا فی صد
(۱) زرعی اجناس وچارہ	۶۵،۳۵۳ روپے	۳۷ فی صد
(۲) جاگیر کے دیگر ذرائع آمدنی	۵۵،۷ ۷ "	۵ "
(۳) صنعتی اور ضمنی کاروبار	۵۱،۷۳۴ "	۳۰ "
(۴) متفرقات	۴۸،۷۴۱ "	۲۸ "
جملہ	۹۲۶،۴۵ ۱ "	

اگر اس آمدنی کو ۲۶۵۲ افراد پر تقسیم کیا جائے تو فی کس آمدنی کا اوسط ۳ ۴ - ۰ - ۵۵ سالانہ آتا ہے۔ یا ایک شخص کو ۲،۲ پائی یومیہ ملتے ہیں۔ ہم نے گاؤں کے اخراجات کا اندازہ بھی لگایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کا سالانہ خرچ جن میں شادیوں اور رسومات کے اخراجات شامل ہیں ۵۲ روپے سال ہوتا ہے۔ نیز اس کے ساتھ ہی ایک زرعی خاندان کی آمدنی میں ضروریات کا اندازہ بھی لگایا گیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ایک شخص کو ایک سال میں کم از کم ۴-۶-۷۸ کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا اس کی موجودہ آمدنی سے ۶-۲۳ کے قریب کم ہے۔

حالات اور زیادہ مایوس کن نظر آتے ہیں۔ جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلیل آمدنی بھی غیر مساوی طور پر تقسیم ہو رہی ہے یعنی آبادی کا قلیل حصہ آمدنی کے بڑے حصے پر قابض ہے۔ اس طرح سالانہ اوسط اور گھٹ جاتا ہے۔ اس غیر مساوی تقسیم کا اندازہ ذیل کی جدول سے ہو سکتا ہے۔

طبقہ	آمدنی	متعلقہ افراد کی تعداد	آبادی فیصد	آمدنی کا فیصد
ساہوکار	۷۲۰۰	۱۷	۲ر	۵ر۰
سنجار	۸۲۸۰	۲۸	۱ر۲	۵ر۵
جاگیردار	۱۵۰۹۸	۴۲	۱ر۶	۱۰ر۰
سنار، لوہار، بڑھئی اور درزی	۶۴۰۰	۷۸	۲ر۹	۴ر۹

گویا ۶ فی صد آبادی ۲۵ فی صد آمدنی کا مالک ہے۔ اور ۹۴ فی صد کے پاس بقیہ ۷۵ فی صد آمدنی آبادی کا اوسط آمدنی ۴۳ روپے دس آنے کے قریب آتا ہے۔ مگر اس تعداد میں بھی زرعی وغیر زرعی مزدور خانگی اور جاگیری ملازم، وظیفہ خوار، اور نصف سے زائد بھگیلے جن سب کی مجموعی تعداد ۵۵۸ ہے اور جو کل آبادی کا ۲۱ فی صد حصہ ہیں، ایسے ہیں جن کی سالانہ آمدنی کا اوسط صرف ۸-۲۸ سالانہ یا ایک آنہ ۳ پائی روزانہ ہے۔

فی کس آمدنی کے اوسط کم ہونے کی وجہ سے گاؤں والوں کا معیار زندگی ادنیٰ ہوتا ہے، وہ سال کے بڑے حصے میں ایسی غذائیں کھاتے ہیں۔ جن میں غذائیت بہت کم ہوتی ہے۔ ان کی عام غذا کلتھی، راگی، ساوان، کھنگی، بیٹی یا جوار جیسے معمولی غلے ہیں۔ دالوں، ترکاریوں اور تیل کا استعمال بہت کم ہے، گھی دودھ، انڈے، مچھلی اور گوشت جن میں توانائی بخش اجزا زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کو بمشکل میسر آتی ہیں۔ وہ ادنیٰ اور معمولی غذائیں اس لئے نہیں کھاتے کہ وہ اچھی اور اعلیٰ قسم کی غذائیں کھانا نہیں جانتے، ان کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی مرغن غذائیں کھائیں۔ مگر وہ مجبور ہیں اور انکا افلاس انکو معمولی غذاؤں پر قناعت کرنے کیلئے مجبور کرتا ہے، حکومت ہند نے ہندوستان کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک شخص کیلئے جو اقل ترین غذا مقرر کی ہے۔ اس میں حسب ذیل چیزیں شامل ہیں:-

چاول - دس اونس، یومیہ } دالیں - دو اونس یومیہ
دوسرے غلے ۵ " "

بغیر پتوں والی ترکاریاں۔	۶ اونس یومیہ
پتوں والی ترکاریاں۔	۴ 〃
دودھ۔	۸ 〃
تیل۔	۲ 〃
پھل۔	۲ 〃

یہ اقل ترین غذا اس لحاظ سے مقرر کی گئی ہے کہ اس میں وہ تمام اجزا، حیاتین، جاہر اور چربی وغیرہ آجائے جو ایک معمولی انسان کی جان داری اور طاقت کو بحال رکھنے کیلئے کافی ہو۔ اس معینہ غذا کی قیمت اگر کم سے کم قیمتوں پر لگائی جائے تو ۶ — ۱۰ — ۵ ماہانہ ہوتی ہے۔ جس میں نمک مرچ، مصالحوں اور ایندھن کے ۶ — ۶ — ۱ جوڑنا ضروری ہیں۔ اس لحاظ سے ایک شخص کو صرف غذا کیلئے ۰ — ۱ — ۷ ماہانہ یا — ۱۲ — ۸۴ روپے سالانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں لباس، مکان کا کرایہ۔ بزرگوں اور تفریحات اور دوسری ضروریات کے اخراجات شامل نہیں ہیں۔

آمدنی کی کمی کی وجہ سے اس کی غذا معمولی اور ادنی ہوتی ہے اس کا لباس ایسا ہوتا ہے جو اس کو سردی و گرمی سے محفوظ نہیں رکھ سکتا، اس کے مکانات تاریک اور گندہ ہوتے ہیں، جن میں ایک جانب وہ مویشی باندھتا ہے اور دوسری جانب خود بھی مویشی بن کر زندگی گزارتا ہے۔ اس کا افلاس اس کو اجازت نہیں دیتا کہ اپنے بچوں کو تعلیم دلائے بیماریوں میں اپنا یا اپنے بیوی بچوں کا معقول علاج کرائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معمولی معمولی بیماریاں ہی وباؤں کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں، سینکڑوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ اور ہزاروں کو عمر بھر کیلئے اپاہج، معذور اور غیر کارکرد بنا دیتی ہیں۔ افلاس کا اثر اخلاق اور کردار پر بھی پڑتا ہے۔ بھوکے اور ننگے ملک میں اکثر جرائم محض افلاس کی بدولت وجود میں آتے ہیں۔ اگر جرائم کا تفصیلی طور پر تجزیہ کیا جائے تو بڑی تعداد ان افراد کی ملے گی۔ جنہوں نے فاقوں سے تنگ آکر یا بیروزگاری سے بیزار ہو کر جرموں کا ارتکاب کیا ہے۔ افلاس انسانی کردار کو اس قدر خراب کر دیتا ہے کہ وہ ان برائیوں کو بھی برداشت کرتا ہے جن کا بظاہر غربت سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً وہ غلاظت اور گندگی میں زندگی گذارتا ہے، لباس مکان اور کھانے پینے کی اشیاء میں صفائی و عدم صفائی کا بالکل خیال نہیں کرتا۔ اپنی غربت کی تکلیفوں کو مٹانے اور اپنے غم کو عارضی طور پر غلط کرنے کیلئے مختلف قسم کی منشیات مثلاً شراب، سیندھی، افیون، گانجہ اور بھنگ کا استعمال شروع کر دیتا ہے، جو اس کی تباہیوں میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں جب مستقبل تاریک ہوتا ہے تو لوگ مستقبل سے بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ اضافہ آبادی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جہاں ایک بچہ ایک لنگوٹی کے ساتھ پھر سکتا ہے، اور سوکھے ٹکڑے کھا کر زندہ رہ سکتا ہے وہاں چار بچے بھی اس حالت سے زندگی گذار سکتے ہیں۔ انفرادی نقطۂ نظر سے یہ خیال کہ افراد خاندان کی تعداد میں اضافہ سے خاندان کی مجموعی آمدنی میں اضافہ کرے گا۔ صحیح ہو سکتا ہے مگر ملک کی عام خوش حالی پر ایسی کمزور، منحنی اور غیر جاندار نسلوں کا برا اثر پڑتا ہے۔ ایسا ملک کیا ترقی کر سکتا ہے۔ جہاں ایسے افراد کی تعداد بہت زیادہ ہو جن کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوتا ہو۔ یا جو سال کے بڑے حصے میں یا مسلسل بے روزگاری میں زندگی بسر کرتے ہوں، جب حالات شدید ہو جاتے ہیں تو اصلاح معاشرت و معیشت میں ایسی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ ملک کے اچھے اچھے دماغ بھی ان کو آسانی سے سلجھا نہیں سکتے۔

(مجلہ عثمانیہ) محمد احمد سبزواری بی۔ اے (عثمانیہ)

صحن میں مٹی کی اک ڈھیری پہ باصد اضطراب — ایک چڑیا کر رہی ہے دانے دُنکے کی تلاش
زندگی تیری ہے اے چڑیا عمل کی زندگی — کھانا اور سونا ہے ہم ہندی جوانوں کی معاش

احمد ندیم قاسمی

افکارِ تازہ

کیفِ محبّت حاصل ہو تو مے نوشی کی حاجت کیا
جس کو تو نے دیکھ لیا وہ دُور رہے میخانے سے

اب کہاں چھپو گے تم اب تو چند دیوانے
ڈھونڈنے چلے تم کو موت کے بہانے سے
عشق بن کے آئے تھے تیرے آستانے پر
حُسن بن کے جاتے ہیں تیرے آستانے سے

ادبی دنیا

گر دیکھنا ہے عشق کا آئینِ اضطراب
سینے میں اور دردِ محبت بڑھا کے دیکھ

کرم کہوں اسے قدرت کا یا ستم سمجھوں
کہ دل دیا ہے مگر کوئی دلنواز نہیں
بس ایک لفظِ محبّت کے ماسوا کیا ہے
نہیں جو وہ تو مری داستاں دراز نہیں

مجلہ عثمانیہ

نظر جب انبساطِ عشق سے سرشار ہوتی ہے
تو بڑھ کر فرشِ گُل سے وادیٔ پرخار ہوتی ہے
نہ مجھ سے پوچھئے اس درد میں کیا کیف و لذت ہے
کہ اس کی چوٹ سے رگ رگ مری ہشیار ہوتی ہے

معارف

حُسن کی خوابیدہ محفل کو جگا دیتا ہوں میں
کس بلندی سے خدا جانے صدا دیتا ہوں میں
دردِ دل کا نام سُن کر مُسکرا دیتا ہوں میں
اپنی بربادی کا افسانہ سُنا دیتا ہوں میں
اللہ اللہ میرے دستِ شوق کی گستاخیاں
ان کی بزمِ ناز کے پردے اُٹھا دیتا ہوں میں

سب رس

صفحہ اطفال

پریشانی میں گھبراؤ مت

خدا نہ کرے، جب تم پر کوئی مصیبت کا وقت آ پڑے، یا تم کسی کام کے بگڑنے سے پریشانی میں مبتلا ہو جاؤ یا کوئی ایسی غلطی تم سے ہو جائے، جس سے تمہیں کوئی بڑا خطرہ دکھائی دینے لگے، یا امتحان دیتے ہوئے پرچے کے سوالات تمہیں مشکل نظر آئیں، ایسے وقت تمہیں گھبرانا نہ چاہیے، اگر تم گھبرا گئے، تو خطرہ زیادہ خوفناک ہو جائیگا، بگڑا ہوا کام اور زیادہ بگڑ جائے گا، مصیبت اٹل ہونے لگیگی، غلطی کی درستی ناممکن اور دشوار بن جائیگی پرچے کے سوالات تمہیں زیادہ خوف دلائیں گے، اور تم بری طرح ناکامیاب ہو جاؤ گے، لیکن اگر تم نے ہماری تدبیر اختیار کی، تو تمہاری ساری مشکلیں آسان ہو جائینگی بس وہ تدبیر یہی ہے، کہ ایسی پریشانی کے وقت بہادر بن جاؤ، اور دل کو یقین دلا دو، کہ ہم ابھی ان تمام مشکلوں کو حل کر لیں گے، گھبرانا بالکل بند کر دو، اپنے اوسان قائم رکھو، اور دماغ کو پریشان ہرگز نہ ہونے دو، ایسا کرو گے، تو خدا تمہاری مدد کرے گا، اور تمہارے دل و دماغ کو وہ طاقت دیگا، جس سے تم بگڑے کام بنا لو گے، مصیبت کو سر سے ٹال سکو گے، سوالات ایک ایک کر کے تمہاری سمجھ میں آنے لگیں گے، غلطی زیادہ بڑھنے کی جگہ دور ہو جائیگی، اور تمہارا دماغ عقل کی اتنی روشنی دیگا کہ جس سے تم سارا کام درست کر کے پریشانی سے نجات پاؤ گے، اور مشکلات کو آسان کر کے کامیابی حاصل کر سکو گے

تم نے اکبر کے نورتن راجہ بیربر کی کہانی تو سنی ہو گی، نہ سنی ہو، تو لو ہم تمہیں سناتے ہیں،

اکبر نے اپنے وزیروں سے پوچھا، کہ خطرے کے وقت کونسی چیز زیادہ کام آتی ہے، سب نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا، راجہ بیربر کی باری آئی تو اس نے جواب دیا، حضور اوسان کام آتے ہیں یعنی خطرے سے پریشان ہونا۔ اور گھبرانا خطرے کو زیادہ خوفناک بنا دیتا ہے، آدمی کو خطرے سے کوئی چیز بچا سکتی ہے، تو وہ اوسان ہیں، اسے چاہئے، کہ اپنے اوسان قائم رکھے

اکبر کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی، اور اس نے امتحان کے لئے راجہ بیربر پر اپنا مست ہاتھی چھوڑ دیا، بادشاہ کا مست ہاتھی جدھر رُخ کرتا، لوگ بھاگ کر اپنی جان بچاتے، کیونکہ مست ہاتھی جسے پکڑتا، پاؤں کے تلے

اسے کچل ڈالتا،

جب ہاتھی راجہ بیربر کی طرف لپکا، تو اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا، مگر وہ نہ تو پریشان ہوا، نہ گھبرایا اور اس نے جب دیکھا، کہ ہاتھی حملہ کرنے والا ہے، اپنے اوسان قائم رکھکر پاس ایک کتا بیٹھا تھا، اس کی ٹانگ پکڑ کر زور سے اُسے گھمایا، اور ہاتھی کے سر پر دے پٹکا، ہاتھی کتے کی ٹیاؤں ٹیاؤں سنکر سمجھا، کوئی بلا آگئی، ڈر اور فوراً بھاگ کھڑا ہوا، اس وقت اکبر کو یقین آیا کہ واقعی خطرے کے وقت انسان کو اپنے اوسان قائم رکھنے چاہئیں۔

بچو دیکھو کتنا بڑا جان جوکھوں کا خطرہ راجہ بیربر نے اپنے اوسان قائم رکھکر اپنے سر سے ٹال دیا، تمہیں بھی چاہئے، کہ مشکلات سے کبھی نہ گھبراؤ، (ناجور)

پیسے کا لکچر

پیارے بچو! تم نے ماسٹر صاحب کا لکچر سنا ہوگا پنڈت جی کا دیان کھیان سنا ہوگا، مولوی صاحب کا وعظ سنا ہوگا، اپنے پیارے اخبار پریم کے ذریعے سے مجھ پیسے کا بھی چھوٹا سا لکچر سن لو، میرا لکچر تمہیں پسند آئے یا نہ آئے، لیکن سنتے رہو گے۔ تو کبھی کام ضرور آئے گا

مجھے تانبے کا ایک مختصر اور حقیر ٹکڑا سمجھ کر لوگ میری قدر نہیں کرتے، یہ لوگوں کی نادانی ہے، مجھے نہ دیکھیں، بادشاہ کی اس تصویر کو دیکھیں، جو میری زینت ہے۔ مجھ پر جو حروف بنے ہوئے ہیں، ان کو پڑھیں، اور غور کریں۔ کہ میری کیا عزت ہے، میرا کیا مرتبہ ہے، میں شاہی سکہ ہوں، مجھے تانبے کا ٹکڑا سمجھنا بےسمجھی ہے، جو لوگ مجھے تانبے کا ایک ٹکڑا سمجھتے ہیں، وہ برابر کا تانبے کا ایک ٹکڑا لے کر بازار میں جائیں، اور اس سے ایک پیسہ خرید تو لیں ہندوستان بھر میں پھریں گے، کوئی پیسے کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیگا، ایسے آدمی کو کوئی پیسے کی صورت بھی نہ دکھائے گا، سب پاگل بنا کر بھگا دیں گے، تم نے خود بارہا دیکھا ہوگا اور تجربہ کیا ہوگا، کہ میرا ہی بھائی پیسہ جب پرانا ہو جاتا ہے، اس پر شاہی تصویر اور شاہی حروف نہیں ہوتے۔ تو کوئی اسے چھوتا نہیں، تم نے خود کئی بار ایسے پیسے کو واپس کیا ہوگا، اور تمہارے ہی ہاتھ سے کتنوں نے ایسے پیسے کو لینے سے انکار کیا ہوگا، ہمارے ہی وزن کے، ہمارے ہی قد کے اور کتنے تانبے کے ٹکڑے بھی تم نے دیکھے ہونگے جن پر کسی نہ کسی قسم کی تصویر بھی ہوگی، حروف بھی ہونگے، پھر بھی وہ بیکار ہونگے، کیونکہ ان پر وہ تصویر نہ ہوگی، جو مجھ پر یا میری برادری کے پیسوں پر ہوتی ہے، اسی سے تم میری حیثیت اور حقیقت کا اندازہ کر سکتے ہو۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں، جو میری اس حیثیت سے واقف ہیں، میری اس حقیقت سے آگاہ ہیں، پھر بھی وہ میری پوری قدر نہیں کرتے، مجھے بالکل معمولی اور کم قیمت چیز سمجھ کر الّلے تلّلے سے خرچ کر دیتے ہیں

محض فضول خرچ کر دیتے ہیں، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں اس طرح اڑا دینے کی چیز نہیں ہوں، میں پیسہ ہوں لیکن روپیہ اور اشرفی سے میرا رشتہ اور تعلق ہے۔ تم روز دیکھتے ہو، کہ روپے سے پیسے بنتے ہیں، اور پیسے سے روپیہ بنتا ہے، تم جب چاہتے ہو، سولہ آنے پیسے سے روپیہ بنا لیتے ہو، اور جب کچھ پیسوں کی چیزیں خرید کر روپے دیتے ہو، تو تمہیں پیسے ہی ملتے ہیں، اس سے تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو، کہ میرا روپے سے کتنا گہرا رشتہ ہے۔ اور یہی رشتہ روپے سے اشرفی کا ہے، روپے سے اشرفی ملتی ہے، اور اشرفی سے روپیہ، گویا پیسہ اور روپیہ ایک ہے، اور روپیہ اور اشرفی ایک ہے، تو پیسہ اور اشرفی بھی ایک ہی سمجھنا چاہئے، اور جب تم نے پیسے اور اشرفی کو ایک سمجھ لیا، تو پیسے کو تم نیلم، پکھراج، زمرد اور ہیرا سب کچھ سمجھ سکتے ہو، کیونکہ اشرفی سے کیا نہیں مل سکتا، اور کیا نہیں ہو سکتا۔

پیارے بھائیو اور دوستو! مجھے معاف کرنا اپنی تعریف آپ کرنا اپنے منہ میاں مٹھو بننا ہے، لیکن میں جب تک اپنی حقیقت اور حیثیت کھول کر بیان نہ کرتا کیسے تم سمجھتے، کہ میں کیا ہوں، اس لئے مجھے ایسی باتیں بیان کرنا پڑیں، اب میں اپنے بارے میں تم سے کچھ موٹی موٹی باتیں بیان کرتا ہوں،

تمہارے دل میں میری کچھ قدر نہیں ہوتی، تم کوئی چیز کھانے کی دیکھتے ہو، تمہیں بھوک ہو یا نہ ہو، تمہیں ضرورت ہو یا نہ ہو، تم اس چیز کو خرید لیتے ہو، اور مجھے اپنی جیب سے نکال کر باہر کر دیتے ہو، لیکن ذرا غور کرو۔ کہ جب در اصل تمہیں بھوک لگی ہو، تمہیں واقعی کسی چیز کی ضرورت ہو، اور اس وقت تمہارے پاس ایک پیسہ نہ ہو، تو اس وقت تمہاری کیا حالت ہو گی، تمہیں کتنی تکلیف ہو گی، اور کتنا حرج ہو گا، ممکن ہے، کہ تم اپنی تکلیف اور ضرورت سے مجبور ہو کر اس چیز کے لئے منت کرو۔ گڑگڑاؤ، بھیک مانگنے پر تیار ہو جاؤ، پھر بھی پیسے کے بغیر تمہیں وہ چیز نہ ملے،

میں تمہیں ایک واقعہ سناؤں، بغداد کا ایک بادشاہ تھا جس کا نام منصور تھا، یہ پہلے ایک معمولی آدمی تھا، بعد میں بادشاہ ہو گیا، اور اس کے بعد اس کے خاندان میں سینکڑوں برس تک برابر بادشاہ ہوتے رہے،

منصور حضرت محمد رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس کی اولاد میں سے تھا، اور بڑا عالم و فاضل تھا جس زمانے میں منصور بادشاہ نہیں تھا، ایک رات اسے کسی سرائے میں ٹھیرنے کی ضرورت ہوئی، اس نے سرائے کے مالک سے کہا، میں مسافر ہوں، آج کی رات تمہاری سرائے میں ٹھیرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ٹھیرنے کی اجازت دو، سرائے کے مالک نے کہا، سرائے تو ٹھیرنے ہی کیلئے ہے۔ کرایہ دو اور ٹھیرو،

منصور نے کہا، میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔

سرائے کے مالک نے کہا، تو میں تمہیں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دے سکتا،

منصور، میں عالم ہوں، فقہ اور حدیث جانتا ہوں میرا خیال کرو،

سرائے کا مالک، میں یہ کچھ نہیں جانتا، مجھے تو پیسے چاہئیے۔

منصور، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہوں، اور ان کے چچا کی اولاد ہوں،

سرائے کا مالک، تم جو بھی ہو، میں پیسے کے بغیر تمہیں نہیں ٹھہرا سکتا،

پریمیو! منصور سب کچھ تھا، لیکن اس کے پاس پیسہ نہ تھا، اس لئے وہ سرائے میں ٹھہر نہ سکا۔ اس سے سمجھ لو، کہ پیسہ کیا چیز ہے، آگے چل کر منصور بادشاہ ہو گیا، لیکن زندگی کے اس واقعہ کو وہ مرتے دم تک نہ بھولا، وہ پیسے پیسے کی حفاظت کرتا تھا، اور ایک دمڑی بھی فضول خرچ نہ کرتا تھا۔

خیرات بڑی اچھی چیز ہے، فقیروں، محتاجوں یتیموں اور بیواؤں کو خیرات دینے کا ہر مذہب میں ثواب لکھا ہے پنڈت جی اپنی کتھا میں بھی سناتے ہیں، مولانا صاحب اپنی وعظ میں بھی بیان کرتے ہیں، پادری صاحب اسی کا لکچر دیتے ہیں لیکن پریمی بھائیو، میں تو کہتا ہوں۔ کہ جب تک خوب سوچ نہ لو، کہ یہاں خیرات دینے کی پوری ضرورت ہے، خیرات میں بھی ایک پیسہ خرچ نہ کرو۔ اگر تم بغیر اچھی طرح سوچے سمجھے ہر مانگنے والے کو اپنا پیسہ اٹھا کر دے دو گے، تو کبھی ایسا وقت بھی آجائے گا جب ایک پیسے کے بغیر تمہارا کام رک جائیگا، اور تمہیں ایک پیسے کے لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پڑ جائیگی، یا کام کاج کا ہرج کرو، اور نقصان و تکلیف اٹھاؤ

مان لو، کہ تم کہیں جا رہے ہو، ریل سے جانا ہے، تم نے تانگے والے کو بے فکری سے کچھ زیادہ دے دیا یا اسٹیشن پر گئے، وہاں تم نے بے ضرورت کچھ خرید کر کھا لیا، یا کھانے پر ضرورت سے زیادہ خرچ کر دیا، کوئی چیز بکتے دیکھی، اور خرید لی، یا بھک منگوں اور فقیروں ہی کو بے سوچے سمجھے پیسے دے دیئے، اور گئے ٹکٹ خریدنے تم نے ٹکٹ کا دام کچھ سمجھا تھا، وہاں نکلا کچھ تم نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے، تو دیکھتے ہو، کہ بارہ آنے کی ضرورت ہے۔ اور پیسے پونے بارہ آنے ہیں، ایک پیسہ کم ہے، اب سمجھو مجھ نا چیز پیسے کی قدر کو، تم سر ٹپک کے مر جاؤ، ٹکٹ بابو پورے بارہ آنے لئے بغیر ہرگز ٹکٹ نہ دے گا، نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ایک پیسے کے لئے تمہارا جانا رک جائیگا، تمہارا وقت خراب ہوگا، تکلیف ہوگی، وقت سے نہ پہنچنے کی وجہ سے حرج اور نقصان ہوگا، اس وقت اگر تم چاہو گے

کہ جاکر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ، اور کہیں سے ایک پیسہ مانگ لاؤ، جب بھی گاڑی چھوٹ جائے گی، اور تم جا نہ سکو گے،

تم جانتے ہو بعض جگہ کشتی کے ذریعہ دریا اور ندی کو پار کرنا پڑتا ہے، اور کشتی کا کرایہ مقرر ہوتا ہے ایک پیسہ، دو پیسہ، ایک آنہ، دو آنہ، جتنا کم یا زیادہ راستہ ہو، اس کے مطابق مان لو تمہیں ایسی جگہ سے دریا پار کرنا ہے، جہاں صرف ایک پیسہ کرایہ ہے تم خوب شاندار کپڑے پہنے ہو، دیکھنے میں امیر معلوم ہو رہے ہو، امیر ہو بھی، تمہارے پیسے بھی تھے لیکن تم نے خیال نہیں کیا، پیسے کی حفاظت نہیں کی کسی طرح کل پیسے خرچ ہو گئے، دریا پار تھوڑی ہی دور پر تمہارا مکان بھی ہے، لیکن دریا پار کرنے کے لئے ایک پیسہ ضرور ہونا چاہئیے، اب سوچو اور بتاؤ کہ تم کیا کرو گے، جو لوگ غریب ہوتے ہیں محتاج ہوتے ہیں، وہ تو ملاحوں کے ہاتھ جوڑ کر ان کی جھڑکی سن کر کسی نہ کسی طرح بے پیسے بھی پار ہو جاتے ہیں لیکن اگر تم ملاح سے کہتے ہو، کہ بھائی میرے پاس پیسہ نہیں ہے، تو تمہاری عزت تو خاک میں مل جائیگی تمہیں ملاح کیا کہے گا، اور کشتی کے دوسرے مسافر کیا کہیں گے،

دنیا میں ہزاروں لاکھوں چیزیں ہیں، جن کی قیمت صرف ایک پیسہ ہوتی ہے، لیکن وہ بڑے کام کی چیزیں ہوتی ہیں، ان کے بغیر بڑے بڑے کاموں کا نقصان ہوتا ہے، میں نے تم سے کہا تھا، کہ میرا چھوٹا سا لکچر سن لو، اور ہو گیا اتنا بڑا، اگر میں اس پر لوٹتا رہوں، تو تمہارا بہت وقت صرف ہو جائے گا، اس لئے ایک بات سے اندازہ کر لو، تم سائیکل پر سوار کہیں جا رہے ہو، درمیان میں تمہاری سائیکل کا وال خراب ہو گیا، ہوا نکل گئی، ابھی دس میل کا راستہ باقی ہے - اور تمہارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے، اب اس نئی جگہ میں یا تو ایک پیسے کے لئے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرو، یا دکان دار سے عاجزی کرو، یا دس میل بائیسکل گھسیٹتے چلو،

پیارے بچو! اب میں اپنا لکچر ختم کرتا ہوں - اور امید کرتا ہوں، کہ میں نے پیسے کے بارے میں تمہیں اتنا بتا دیا ہے، کہ اگر تم اس کو یاد رکھو گے اور اس پر غور کرو گے، تو اپنی زندگی میں تم اس سے بہت کچھ فائدے حاصل کر سکو گے،

(منقول از پریم)

ابو محمد امام الدین
مدیر "ترجمان" بنارس

زندگی

درد و غم ہے زندگی رنج و الم ہے زندگی
کرب پیہم اضطراب و مبدم ہے زندگی

نوحۂ غم نغمۂ شادی سے ہم آہنگ ہے
صبح عشرت ہے کہاں شام الم ہے زندگی

پردۂ لطف و کرم میں ظلم پیہم ہے نہاں
شیوۂ فریاد انداز ستم ہے زندگی

سوز دل ہے آب و گل اسکے بلند و پست کی
ساز محرومی کا گویا زیر و بم ہے زندگی

اُس کی گردش آئنہ ہے گردشِ تقدیر کا
خون حسرت جسمیں ہے وہ جام جم ہے زندگی

باب عیش و شادمانی اس صحیفے میں کہاں
داستان درد بے پایاں ہر ضم ہے زندگی

سوچتا رہتا ہوں یارب ختم ہوگا کس طرح
ہے طویل افسانۂ غم اور کم ہے زندگی

ہم نے مانا دوزخ آفات ہے دنیا مگر
یاد رکھو یہ بھی حافظ مغتنم ہے زندگی

(پروفیسر) حافظ محمد کریم

تنویرات

کُتوں کے لئے عینکیں

حال ہی میں سوئیٹزرلینڈ کے ایک ڈاکٹر نے کتوں اور دوسرے چوپایوں کے لئے عینک سازی کا کاروبار شروع کیا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ایک عورت اس ڈاکٹر کے پاس اپنے کتے کو آنکھ کے علاج کی غرض سے لے آئی تھی۔ جس کی بینائی میں فتور پیدا ہو گیا تھا۔ جو چیز اس کے آنکھوں کے بالکل قریب ہوتی تھی اسے تو وہ دیکھ لیتا تھا مگر دور کی چیز اسے نظر نہ آتی تھی۔ اس ڈاکٹر نے بڑی کاوش اور دلچسپی سے کتے کی آنکھوں کا معائنہ کرکے اس کے لئے ایک عینک تیار کی۔

اس ڈاکٹر کو اپنے تجربے میں جو کامیابی ہوئی اس نے دوسرے چوپایوں کے علاج چشم کے لئے بھی اس کا حوصلہ بڑھا دیا۔ چنانچہ اب اُس نے اس سلسلے میں ترقی کرلی ہے کہ وہ چوپایوں کی آنکھوں کا سب سے بڑا ماہر اور معالج سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تجربہ گاہ میں روزانہ ہر قسم کے چوپایوں کا ہجوم رہتا ہے یہ ڈاکٹر جدید آلات کے ذریعہ چوپایوں کی آنکھوں کا معائنہ کرتا ہے اسکی تجربہ گاہ میں متعدد ڈاکٹر کام کرتے ہیں چنانچہ ایک ڈاکٹر کتے کی آنکھوں کا درمیانی فاصلہ ناپتا ہے دوسرا ڈاکٹر اسکی آنکھوں کے لینس کے جھکاؤ کی ناپ کرتا ہے اسکے بعد کتے کو ایک تاریک کمرے میں لیجایا جاتا ہے جہاں خوردبین کی مدد سے اُسکی آنکھوں کا تفصیلی معائنہ کیا جاتا ہے

کتے کی آنکھوں کے کامل امتحان کے بعد ڈاکٹر عینک کے شیشے کے پاور رنگ اور ناپ وغیرہ کا پرچہ مرتب کرتا ہے۔ لینس کے انتخاب میں ڈاکٹر کو بڑی احتیاط اور کاوش سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ کتے کی آنکھوں پر فریم رکھ کر یکے بعد دیگرے مختلف پاور کے شیشے رکھتا ہے جو شیشہ اس کی بینائی کے لئے زیادہ سے زیادہ صحیح ہوتا ہے اس کو فریم میں فٹ کردیتا ہے

آپ متعجب ہونگے کہ کتا نہ کسی زبان کے حروف پڑھ سکتا ہے اور نہ نقطے گن کر بتا سکتا ہے۔ پھر ڈاکٹر کتے کی بینائی کا امتحان کیونکر کرتا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کتے کی بینائی کا امتحان کرنا مقصود ہوتا ہے اسے کم وبیش ایک ہفتہ پیشتر سے روزانہ ایک ہڈی کے ٹکڑے پر پکایا ہوا گوشت رکھ کر کھانے کو دیا جاتا ہے۔ اس طرح کتا اس ہڈی کو بخوبی پہچان لیتا ہے یہاں تک کہ وہ ہڈی کو دیکھتے ہی سمجھ جاتا ہے کہ اب اسے گوشت ملے گا چنانچہ اس کے مُنہ سے رال ٹپکنے لگتی ہے۔ اس کے بعد کتے کی بینائی کا امتحان کرنے والا ڈاکٹر اس ہڈی کو کتے سے فاصلے پر رکھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کتنی دوری تک کتے کی نگاہ کام کرتی ہے۔ اس امتحان کے دوران میں جہاں کتے کی نظر ہڈی پر پڑی کہ اس کی زبان سے رال ٹپکی۔ اس سے ڈاکٹر سمجھ لیتا ہے کہ اس کے لئے کس پاور کا شیشہ کارآمد ہوگا۔

چشمے کی وضع وصورت کے بارے میں بھی ڈاکٹروں کو کچھ کم مغزپاشی نہیں کرنی پڑتی، معمولی وضع کے چشمے کتوں کی آنکھوں پر ٹھیر نہیں سکتے اس لئے ایسی وضع کے چشمے بنائے گئے جن کے فیتے کتوں کے کالر میں باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح دوڑ دھوپ کی حالت میں بھی کتوں کی آنکھوں پر سے چشمے گرتے نہیں۔

شہاب ثاقب

اہل سائنس کا خیال ہے کہ روزانہ کم وبیش دو لاکھ شہاب ثاقب ٹوٹا کرتے ہیں۔ شہاب ثاقب کیا ہیں۔ اس کے جواب میں اہل سائنس کہتے ہیں کہ دمدار ستاروں کی دم میں پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں وہ ستارے جب زمین سے قریب ہوتے ہیں تو زمین کی قوت کشش کے باعث پتھر کے ٹکڑے زمین کی طرف کھنچ آتے ہیں۔ جس وقت یہ پتھر زمین کی طرف چلتے ہیں۔ ان کی رفتار کم وبیش فی سیکنڈ ۴۴ میل ہوتی ہے۔ یہ پتھر جب اس تیز رفتاری کے ساتھ کرہ ارض کی طرف آتے ہیں تو ہوا کے ذرات سے ان کا زبردست تصادم ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پتھر گرم ہوکر جل اُٹھتے ہیں۔ اس لئے زمین کی طرف آتے ہوئے آتشیں پتھر ہمیں ایک خط شعلہ معلوم ہوتے ہیں جو شہاب ثاقب چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ تو زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی بجھ جاتے ہیں۔ مگر بڑے پتھر یک لخت جل کر خاک نہیں ہوجاتے۔ اس لئے کبھی کبھی وہ زمین تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر بھی ان کی مدت حیات دو چار سیکنڈ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ شہاب ثاقب گئے پتھروں کی صرف بیرونی وسعت سطح لال ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس کا اندرونی حصہ تپش اندوز نہیں ہوتا۔ اس لئے جو شہاب ثاقب زمین پر گرتے وقت

شعلہ زا نظر آتے ہیں۔ دو ہی چار منٹ کے اندر تودۂ برف سے بھی زیادہ سرد بن جاتے ہیں۔

جون ۱۹۰۸ء میں ایک بہت بڑا شہاب ثاقب سائبیریا کے بیابان میں گرا تھا جس سے زمین میں ایک بہت بڑا غار پڑ گیا تھا اور ایسی تیز و تند ہوا چلی تھی کہ میلوں تک کے درخت جڑ سے اُکھڑ گئے تھے اور اس کی گرج نے ہوا پر جو دباؤ ڈالا تھا اس سے انگلستان کے متعدد باد پیما آلات متاثر ہو گئے تھے اگر یہ لندن یا ٹیمس کے دہانے پر گرتا تو اس کے نیچے لاکھوں آدمی دب کر ہلاک ہو جاتے۔

اسلام نے شہاب ثاقب کی کچھ اور تاویل کی ہے۔ اس لئے یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ شہاب ثاقب کے متعلق اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اہل سائنس کا متفقہ فیصلہ نہیں ہے۔ شہاب ثاقب کے مولد و مسکن اور ان کی اصلیت و حقیقت کے متعلق ہنوز اہل سائنس بے حد مختلف الخیال ہیں اور اس بارے میں ابھی ان کی تحقیق بالکل ناقص ہے۔ ایسی صورت میں اسلام کی تاویل پر اہل سائنس کی رائے کا کوئی خاص اثر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ اہل سائنس کی موجودہ تمام رائیں بالکل غلط ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام نے جس چیز کو شہاب ثاقب قرار دیا ہے وہ اور شے ہو۔ اور اہل سائنس جس چیز سے بحث کر رہے ہیں وہ اور شے ہو۔

کسمک شعاعیں

کسمک شعاعیں ایکس رے سے بھی تیز رس ہوتی ہیں۔ لوہے کی آٹھ آٹھ فٹ ضخیم چادروں کو پار کر جانا ان کے لئے کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ ان شعاعوں کو عجیب و غریب ہمہ رسی و ہمہ گیری حاصل ہے چنانچہ آپ ان کو میلوں بلند فضائے آسمانی میں بھی پا سکتے ہیں۔ اور سینکڑوں فٹ پانی کے عمق میں بھی جہاں کبھی روشنی کا گذر نہیں ہوتا۔ یہ شعاعیں آپ کو مل سکتی ہیں۔

اہل سائنس اس پر تو متفق ہیں کہ ان شعاعوں کی آمد کرہ ارض سے باہر ہوتی ہے لیکن ابھی یہ امر طے شدہ ہے کہ ان کا اصل مرکز و مسکن کہاں ہے اور یہ کتنے فاصلے سے آتی ہیں۔ بعض حکماء کا خیال ہے کہ یہ شعاعیں ستاروں سے پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ملکن نے اپنے تجربات کے ذریعہ ثابت کر دیا ہے کہ ستاروں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ابھی کسمک شعاعوں کے مولد و مسکن کی طرح اس کی اصلیت و حقیقت بھی تحقیق طلب ہے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایکس رے ہی کی طرح یہ روشنی کی تیز کرنیں ہیں یا برقی ذرات کی زبردست بوچھار ——

یہ واقعہ ہے کہ دوران تجارب میں یہ شعاعیں برقی ذرات کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس سے یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی اولین پیدائش بھی برقی ذرات ہی کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ کسمک شعاعیں باہر سے نوری شعاعوں کی شکل میں کرہ ارض میں داخل ہوتی ہیں۔ بعدازاں ہوا کے ذرات سے ٹکرا کر ان کے برقی ذرات کو الگ کر دیتی ہوں جو اہل سائنس کے تجربوں کے نتیجے کے طور پر وجود میں آتے ہیں۔

ملکن اسی رائے کا حامی ہے۔

کسمک شعاعوں کے اندر عجیب و غریب طاقت موجود ہے۔ اگر اہل سائنس نے ان شعاعوں کو پورے طور پر اپنے قابو میں کر لیا۔ تو ایک شے کو دوسری شے میں تبدیل کر لینا بالکل آسان ہو جائیگا۔ لوہے اور تانبے کی چادروں پر کسمک شعاعوں کی تیز بوچھاڑ ڈال دی جائیگی۔ وہ دفعۃً سونے کی چادروں میں تبدیل ہو جائینگی۔ جب سے کائنات وجود میں آئی ہے۔ یہ شعاعیں بھی برابر پیدا ہو رہی ہیں۔

بین الاقوامی زبان کی ضرورت

ٹیلیگراف اور ٹیلیفون نے دنیا کے مختلف خطوں اور گوشوں میں بسنے والی قوموں کو ایک رشتے میں منسلک کر دیا ہے اور اس میں جو کسر رہ گئی تھی وہ ریڈیو کے ذریعہ تکمیل پذیر ہو گئی ہے۔ اب دنیا کے ایک کنارے بیٹھ کر دوسرے کنارے کے انسان سے مخاطبت و مکالمت چنداں دشوار نہیں رہی اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ تو سینکڑوں اور ہزاروں میل دور سے آپس میں باتیں کرنے والوں کا ایک دوسرے کو دیکھتے رہنا بھی ممکن ہو گیا ہے۔

لیکن سائنس کے اس عظیم الشان عطیہ سے پورا فائدہ اُٹھانے میں ہنوز ایک بڑی دشواری حائل ہے۔ آپ اپنے ریڈیو مشین کے ڈائل کو گردش دیجئے۔ آپ کو برلن یا ماسکو کے براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کے پروگرام کا ایک ایک لفظ سنائی دینے لگے گا۔ پھر بھی آپ وہاں کی زبانوں سے ناواقف ہونے کے باعث اس پروگرام کا مطلب سمجھنے سے بالکل قاصر رہیں گے۔ کہیں سے جرمن زبان میں پروگرام نشر ہو رہا ہے تو کہیں سے روسی زبان میں کہیں سے انگریزی اور فرنچ . . . . .

زبان میں اب آپ ہی فرمایئے کہ آپ کتنی زبانوں میں درک و مہارت حاصل کریں گے جو مختلف زبانوں کے پروگراموں سے مستفید ہوں گے۔

صرف یورپ میں ۱۲۰ زبانیں مروج ہیں۔ زبان و لسان کے اسی اختلاف کا نتیجہ ہے کہ باوجودیکہ گوناگوں اسباب و ذرائع نے دنیا کے اقوام و ملل کو باہم وابستہ اور مربوط کر دیا ہے پھر بھی کسی ایک بین الاقوامی زبان کے نہ ہونے سے قوموں اور ملکوں کے درمیان بیگانگی و ناآشنائی کی دیواریں حائل ہیں۔

دنیا کی ممتاز ترین شخصیتیں اس مسئلہ کے حل کرنے میں مصروف ہیں۔ اس کے قبل بھی اس سلسلے میں کوششیں کی جا چکی ہیں۔ چنانچہ مختلف زبانوں کو بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا جن میں "اسپرنٹیو" زبان سے زیادہ قابل استعمال اور کارآمد سمجھی جاتی ہے لیکن اس زبان میں سائنٹیفک نقطہ نظر سے مختلف نقائص پائے جاتے ہیں

بہرکیف ایک بین الاقوامی زبان کے مسئلے کے حل کرنے کے لئے لسانیات کے ماہرین خصوصی کی ایک مجلس مرتب کر دی گئی ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ یہ مجلس دو تین سال کی فکر و سعی کے بعد کسی ایسی زبان کے وضع کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ جو مختلف اقوام و ملل کے لئے قابل استعمال ہو گی۔

اس میں شک نہیں کہ زبان کی تشکیل و تدوین کے بعد بھی اس کا رواج پذیر ہونا خالی از مشکل نہ ہو گا۔ لیکن جو حضرات بین الاقوامی زبان کی تشکیل کی کفالت کر رہی ہیں، وہی اس کی ترویج کی بھی کفیل ہوں گی۔

تہذیب حاضرہ کے آثار کا تحفظ

حکمائے مغرب اس خطرہ کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر کوئی عالمگیر جنگ برپا ہوئی تو موجودہ تہذیب و تمدن کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچے بغیر نہ رہے گا۔ چنانچہ چند مہینے قبل امریکہ میں جو بین الاقوامی نمائش ہوئی تھی۔ اسی خطرے کے پیش نظر اس موقعہ پر موجودہ تہذیب و تمدن کے مخصوص امتیازی علائم و آثار کو ایک تہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تانبے اور دوسری دھاتوں کی آمیزش سے ایک نلکی تیار کی گئی ہے۔ جس کا طول ۷ فٹ تین انچ اور قطر ۶ انچ ہے۔ اس نلکی میں وہ تمام چیزیں بند کی گئی ہیں جو موجودہ تہذیب و تمدن کی خصوصیات و امتیازات کی مظہر ہیں۔ آج سے پانچ ہزار سال بعد جب موجودہ تہذیب مٹ چکی ہو گی۔ اور اس کی جگہ ایک نئی تہذیب کا دور دورہ ہو گا۔ اس وقت کے ماہرین آثار قدیمہ اس نلکی کو تہ خانے سے نکالیں گے اور اس میں محفوظ اشیاء کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ جائیں گے۔

اس نلکی کی اندرونی دیوار شیشے کی بنی ہوئی ہے اس نلکی میں یادگار اشیاء رکھنے کے بعد ہیلیئم گیس بھر دی گئی ہے۔ تاکہ وہ جلد خراب نہ ہو سکیں اتنی مختصر جگہ کے پیش نظر ایسی چیزوں کا انتخاب کرنا جو دور حاضرہ کی خصوصیات و امتیازات کو ظاہر کر سکیں۔ ایک نہایت اہم اور دشوار کام تھا۔ اس لئے ایسی اشیاء منتخب کی گئی ہیں جو سائز میں تو چھوٹی ہیں مگر موجودہ تہذیب کی خصوصیت و امتیاز کے اظہار میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

ان چیزوں کے تیار کرنے میں امریکہ کے سائنسدانوں اور انجینئروں کو غیر معمولی کد و کاوش سے کام لینا پڑا تھا۔ نلکی میں جو چیزیں رکھی گئی ہیں ان میں سے چند خاص کی تفصیل یہ ہے۔

سب سے اہمیت رکھنے والی چھوٹے سائز کی ایک کتاب ہے جس میں ایک کروڑ سے زیادہ الفاظ ہیں اس کتاب کا مکمل فوٹو فلم پر اتار لیا گیا ہے۔ فلم پر حرفوں جغرافیائی نقشوں اور تصویروں غرض کتاب کے ہر جز کے فوٹو آ گئے ہیں۔ حروف اتنے باریک ہیں جو معمولی طور پر پڑھے نہیں جا سکتے۔ اس لئے اس کتاب کے ساتھ ایک بہترین قسم کی خوردبین بھی رکھ دی گئی ہے۔ فلم پر چھپی ہوئی ایک ڈکشنری بھی رکھ دی گئی ہے۔ تاکہ آج سے ۵ ہزار سال بعد زبان کے ردو بدل کے باوجود اس کتاب کے پڑھنے میں دشواری نہ ہو۔ اس کتاب میں موجودہ دور کا مختصر تذکرہ ہے۔ علاوہ ازیں ایک اخباری فلم بھی تیار کی گئی ہے۔ اس فلم میں موجودہ طرز زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے واقعات کی تصویریں موجود ہیں۔ ساتھ ہی ٹاکی میں بھی بندوبست ہے۔ فلم کے آخر میں فٹ نوٹ کے ذریعہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ ٹاکی سینما کی مشین فٹ کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

اس طرح توقع کی جاتی ہے کہ ۶۹۳۹ء میں جب لوگ اس نلکی کو کھولیں گے۔ تو اس فلم کو مشین پر چڑھا کر اس وقت کی پبلک کو دکھا سکیں گے کہ آج سے پانچ ہزار سال قبل کے لوگوں کا طرز زندگی کیسا تھا۔

بائیبل کے ایک چھوٹے ایڈیشن کی فلم بھی تیار کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ہوائی جہاز، ٹیلیفون، ریڈیو سیٹ، بحری جہاز وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے کھلونے کی طرح ماڈل بھی نلکی میں محفوظ کئے گئے ہیں۔ آج کل کارخانوں اور مشینوں میں جس طرح کام کیا جاتا ہے۔ اس کی ٹاکی فلم بھی تیار کی گئی ہے۔ اسی طرح خانگی زندگی میں کام آنے والی اشیاء بھی اس نلکی میں فراہم ہیں۔ مثلاً فاؤنٹین پن، سگریٹ، سگار سے متعلق طرح طرح کی چیزیں لپ سٹک دانت

صاف کرنے کا برش پوڈر، نسوانی ہیٹ، فلم، چھوٹا کیمرہ، سیفٹی ریزر، نیز سکول کے نمونے وغیرہ وغیرہ اسبلس ٹاس، ربر ٹکٹ، کوئلہ وغیرہ کے نمونے بھی نلکی میں موجود ہیں۔

ان تمام چیزوں کو کامل احتیاط و حفاظت سے رکھنے کے بعد نلکی کا منہ چوڑی دار ڈھکن سے بند کر دیا گیا ہے۔ یہ نلکی نمائش کے میدان میں ویسٹنگ ہاؤس الیکٹرک کمپنی کی عمارت کے نیچے ۵۰ فٹ گہرے تہ خانے میں رکھی گئی ہے

جن سائنسدانوں کے دماغ میں اپنی تہذیب کی یادگار کے باقی رکھنے کا یہ عجیب و غریب خیال پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ مبادا اس عظیم الشان ذخیرے کے مقام کو بھول نہ جائیں۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا پمفلٹ تیار کیا ہے جس میں اس تہ خانے کا صحیح مقام اور پتہ درج ہے۔ انگریزی زبان کے سمجھنے کے لئے ایک "کی" (کلید) ساتھ موجود ہے تاکہ پچاس ہزار سال بعد لوگ انگریزی زبان کو بھول بھی جائیں تو کوشش کر کے تہ خانے میں بند فلم کتابوں کا پتہ لگا سکیں۔ اس پمفلٹ کی ایک ہزار جلدیں عمدہ کاغذ پر جو جلد خراب ہونے والا نہیں ہے دنیا کے ہر ممتاز کتب خانے اور میوزیم میں رکھوا دی گئی ہیں۔ تاکہ کسی ارضی یا سماوی حادثے کے باعث کوئی ملک تباہ بھی ہو جائے تو بھی ۶۹۳۹ء تک کہیں نہ کہیں اس پمفلٹ کا کوئی نسخہ ضرور موجود رہے۔ یہ نلکی ٹھیک ۶۹۳۹ء میں کھولی جائے گی۔ اس نلکی کے کھولنے کی تاریخ مذکورہ پمفلٹ میں انگریزی، ہندوستانی، عربی، پشتو وغیرہ مختلف زبانوں میں دی گئی ہے تاکہ تاریخ کے بارے میں کسی طرح کی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

امیر سلطان بیگم نجیب آباد

اعتراف

(موت کا ایک نعرۂ بیباکانہ)

آفتیں میری سنانیں، حادثے میرے تفنگ
روزِ اوّل سے ہوں میں ہستی سے برسرِ پیکار و جنگ

میری ماہیت پہ، میرے اجنبی اسرار پر
فلسفہ غرقِ تخیل، زیست حیراں، عقل دنگ

میرے دم سے دہر میں قائم مصائب کا وقار
میرے ہاتھوں میں غم و آلام کا ناموس و ننگ

ہر مصیبت میری طاقت کا ہے دھندلا سا نشاں
ہر الم کی پشت پر دقفِ عمل میری امنگ

میرے دل کی تشنگی اب تک ہے گرم و ناتمام
اس پہ شاہد ہے مرا بیتاب و خوں آلود چنگ

جاں شکن میرے مطالب، پختہ تر میرا نظام
میری سطوت سے جہاں پر عرصۂ انفاس تنگ

دسترس میں ہیں مری کون و مکاں کی وسعتیں
از زمیں تا آسماں ساری فضا ہے زیرِ چنگ

بارہا توڑا ہے میں نے زندگانی کا طلسم
بارہا بدلا ہے میں نے گردشِ دنیا کا ڈھنگ

پر یہ ان اوصافِ عشقِ شعلہ زا کو دیکھ کر
بیٹھ جاتا ہے مرا دل، ڈوب جاتی ہے امنگ

ناگہاں کچھ لو کھلا اٹھتے ہیں افکار و حواس
چھوٹ جاتے ہیں مرے ہاتھوں سے شمشیر و تفنگ

انتہائے جذبۂ غیرت سے کٹ جاتی ہوں میں
سامنے آتا ہے جب رستے سے ہٹ جاتی ہوں میں

باقی صدیقی

بزمِ انتخاب

ایک رات

غریبوں کی آنتیں جبکہ بھوک سے تلملا رہی تھیں۔
چیتھڑے لگے ہوئے جسم جاڑے میں ٹھٹھر
رہے تھے اور بیمار دوا کے بغیر تڑپ رہے تھے۔

بھگوان کی بے جان مورتی ریشمی کپڑوں میں لپٹی سجے ہوئے سنگھاسن پر براجمان تھی۔ چرنوں میں 'پرشاد' کی تھالیں رکھی تھیں۔ چوکے سے دھونیں کے ساتھ ساتھ خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ شمشان کے گدوں کی طرح موٹے موٹے پجاری، مایا، اور پاپ میں پھنسی ہوئی دنیا سے دُور! درد اور دُکھ سے بلکتی ہوئی زندگی سے دامن بچائے مندر کی محفوظ فضا میں قلعہ بند بیٹھے دھیان گیان میں مصروف تھے۔

مندر کے احاطے کے باہر میدان میں درختوں کے نیچے سردی میں پڑے ہوئے ننگے اور بھوکے بھکاریوں پر چاند کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔

دکھیارے سردی سے کنڈلی مارے اور دونوں ہاتھوں سے پیٹ کی خالی آنتوں کو دبائے پڑے تھے۔

چاند ان کی حالت پر آنسو بہا رہا تھا۔
جبکہ دُنیا سو رہی تھی۔
اور بھگوان اپنے بھگتوں کی پرارتھنا سے اترائے ہوئے تھے۔
وہ مسکرا رہے تھے!
زندگی کی اکثریت جبکہ کراہ رہی تھی۔

چاند زندگی کے اس رستے ہوئے "ناسور" کو اور نہ دیکھ سکا۔ اُس نے مندر کے سنہری کلس کے پیچھے منہ چھپا لیا۔

"اس پوجا اور نماز سے کیا فائدہ جب انسانیت ننگی اور بھوکی پڑی سسک رہی ہو؟" وہ صبح تک یہی سوچتا رہا اور پھر بھی اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔

ایک اندھی لڑکی لکڑی سے اپنی راہ ٹٹولتی اس میدان کی طرف آ رہی تھی، جہاں مندر کے کوڑے کرکٹ کے علاوہ برہمنوں کی جھوٹی پتریں اور بھگوان کے چرنوں کے باسی پھول پھینکے جاتے اور جو شہر کے اندھے لولے اور بیمار بھکاریوں کی رات کی جائے پناہ تھی۔

رگھوڑے پر مکھیاں بھنکتی ہی ہیں!

بھکارن کی لکڑی ایک پڑے ہوئے بھکاری کے سر پر پڑی۔ "کون اندھا ہے رے؟" اس نے غصہ سے کہا۔

"ہاں بابا اندھی ہی ہوں۔" لڑکی عاجزی سے بولی۔

لڑکی کی آواز پہچان کر وہ سیدھا بیٹھ گیا۔ "ارے ہنسی اتنی رات گئے تو کہاں سے آ رہی ہے، کسی کے پھندے میں تو نہ پھنس گئی تھی؟"

"کون کیشو! میں جانی کوئی ناک چڑھا پڑا اُدیاں آ گیا!" وہ وہیں بیٹھ جاتی ہے۔ "ارے آج لالچ میں نئی بستی چلی گئی تھی۔ سوچا تھا بڑے بڑے ساب لوگ رہتے ہیں، دو پیسے زیادہ ہاتھ لگ جائیں گے۔ پر وہاں تو بات کرنے کا ٹھکانا نہیں۔ اِدھر سے موٹر فرفر نکل گئی اُدھر سے موٹر فرفر نکل گئی۔ وہاں ہم لوگوں کی سنوائی نہیں۔ نوج ایسی لالچ ہو! واپسی میں راہ بھٹک گئی، بڑی مشکل سے پڑاؤ تک آئی ہوں۔"

"تھک بھی تو گئی ہو گی؟" کیشو نے ہمدردی سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں، پاؤں من من بھر کے ہو رہے ہیں۔" لڑکی اُٹھنے لگی۔ "جاؤں کسی پیڑ تلے کمر سیدھی کرنے کا ٹھکانا ڈھونڈوں۔"

"ارے کہاں اندھیرے میں ٹھوکریں کھائے گی یہیں پڑ جا۔ ذرا باتیں کریں گے۔ سردی سے نیند تو آتی نہیں۔"

"کیسی بالکوں کی سی باتیں کرتے ہو، میں اندھی سہی پر ہوں تو جوان اور تم بھی جوان ٹھہرے، دنیا کیا خیال کرے گی!؟"

"دُنیا جائے بھاڑ میں، بڑی دُنیا لئے پھرتی ہے!" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتا ہے۔ "سچ بتا نئی بستی سے کتنی بھیک لائی؟"

بھیک لائی خاک! ۲ پیسے کسی نے کٹورے میں ڈالے

تھے وہ بھی سپاہی جی کی بھینٹ ہو گئے، موا تھانے لئے جاتا تھا۔ دو پیسے دے کر چھٹکارا ہوا۔ صبح آدھے پیٹ ملی تھی اور اب فاقہ ہی ہوا۔"

"مجھے کیا پتہ تھا کہ تُو بھوکی آئے گی نہیں تو میں ہی کچھ ٹکڑے نوالے بچا رکھتا۔"

کچھ دیر کیلئے وہ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔

"کیا بھوک بہت لگ رہی ہے؟" کیشو نے پوچھا۔

"ارے یہ تو روز کی بپتا ہے۔"

"چل مندر کی جھوٹی پتریں ٹٹولیں، شاید کوئی پوری کا بچا بچایا ٹکڑا مل جائے۔"

دونوں مندر کی پشت کی طرف جاتے ہیں۔ جہاں جھوٹی پتریں اور ٹوٹے ہوئے پھولوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک طرف چند کتے کھڑے پتوں کو چاٹ رہے تھے۔ ان دونوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ غرانے لگتے ہیں۔

"برہمنوں کی جھوٹن کھا کر کتے بھی تو شیر ہو گئے ہیں!" کیشو بولا۔

دونوں بیٹھ کر بھوجن کی پتروں کو اُلٹ پلٹ کرنے لگتے ہیں۔ لیکن سوائے چٹے ہوئے پتوں کے انہیں کچھ نہ ملا۔

واپسی پر کیشو گیندے کی ٹوٹی ہوئی مالاؤں اور مرجھائی ہوئی پتیوں کے ڈھیر کو دیکھ کر کہنے لگے۔ "بھگوان کے چرنوں کے پھول پڑے ہیں۔"

"پڑے رہنے دو۔ ان سے ہمارا پیٹ نہیں بھر سکتا۔" وہ بولی۔ وہ دونوں چپ چاپ آ کر پیڑ کے نیچے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، دونوں سردی سے سکڑنے لگے۔

"بڑا جاڑا ہے!" کیشو نے کہا۔

"آنتیں بھی تو بھوک سے اینٹھ رہی ہیں۔"

ہوا اور تیز ہو گئی جو اس کھلے میدان میں تیر کی طرح کلیجے میں لگ رہی تھی۔

مندر کے پیپل کے چوڑے چوڑے پتے ان غریبوں کی حالت پر تالیاں بجا رہے تھے۔

"سردی بڑھتی جاتی تھی۔" دونوں نے کپکپاتے ہوئے کہا:-

"رات کیسے کٹے گی؟" لڑکی بولی۔ "بڑی سردی ہے، کلیجہ کانپ رہا ہے۔"

"میری ماں تو جب میں چھوٹا تھا تو مجھے چمٹا کر اوپر سے گدڑی ڈال لیتی تھی، اس طرح سردی ذرا کم لگتی تھی۔"

"کرتی تو میری ماں بھی ایسا ہی تھی۔" لڑکی بولی اور ساتھ ہی تھوڑی سرک بھی آئی۔

سردی کے مارے آخر نہ رکا گیا —— دونوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی کپکپی بندھی ہوئی تھی، ہوا ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی۔ مندر کے پجاری گرم گرم بھوجن کھا کر موٹے موٹے لحافوں میں پاؤں پھیلائے "سورگ" کے خواب دیکھ رہے تھے —— !

بھگوان کی مورتی سنگھاسن پہ اسی طرح بیٹھی مسکرا رہی تھی! جبکہ دنیا کی اکثریت جاڑے میں پڑی ٹھٹھر رہی تھی —— بھوک سے کراہ رہی تھی۔

شاکر علی (ساقی)

ادب کا ترقی پسند نظریہ اور اردو

ادب زمانے کے معاشرتی حالات، سیاسی عقائد اور اخلاقی رجحانات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر ایک طرف ادب کے ذریعے انسانیت کی باطنی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تو دوسری طرف خود انسانیت اس میں اپنے لئے راہِ عمل ڈھونڈھ لیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقوام کی تعمیرِ حیات میں ادب کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ تاریخ عالم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی فکر ہمیشہ غیر شعوری طور پر ادب سے متاثر رہی ہے اور قوموں نے اسی کی روشنی میں اپنی راہِ عمل متعین کی ہے۔ ادب کا مقصد اولین انسانیت کی اجتماعی فکر کو ایک ہی راستے پر ڈال دینا ہے۔

ادیب کا خیال جب ایک بار ظاہر ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس کا خیال باقی نہیں رہتا بلکہ ساری قوم کا خیال ہو جاتا ہے، اور چونکہ ادیب عام انسانوں کی طرح ایک خاص ہیئت اجتماعی اور نظامِ تمدن کا پروردہ ہوتا ہے، وہ ہماری معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح دنیا کے سارے

انسان ہوا کرتے ہیں۔ ایک ادیب یا شاعر جو کچھ لکھتا ہے وہ اگرچہ اس کی انفرادی قوت تخلیق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کی یہ تخلیقی قوت ہمیشہ غیر محسوس طور پر زمانے کے رجحان سے متاثر رہی ہے۔ اور اس کی زبان جسے ہم الہامی زبان سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل زمانے کی زبان رہا کی ہے۔

تاریخ ادب کے مطالعے کی سب سے بڑی غایت یہی ہوتی ہے کہ انسانی زندگی کے تمدنی ارتقا کا حال ادب کے ذریعے پڑھا جائے۔ ہیگل فلسفے کو تاریخ قرار دیتا ہے، جس طرح فلسفے میں زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ انسانی خیالات و افکار میں بھی انقلاب و تغیر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی اقوام عالم کے ملتے ہوئے تمدن اور انسانیت کے ذہنی رجحانات کے نقوش نظر آتے ہیں۔ جو ہر زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

یہ کہنا غلط ہے کہ ادب عالیہ (Classics.) خواہ وہ کسی دوَر کا ہو، ہر زمانے میں اور ہر قوم میں ادب عالیہ ہی رہے گا۔ ایمرسن نے سچ کہا ہے کہ ہر دوَر اپنا ادب عالیہ خود آپ تیار کر لیتا ہے۔ ہر ادبی کارنامے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس میں وہ سارے عصری میلانات اور خصوصیات موجود ہوں جن سے وہ   دوَر بنا ہے کوئی ادبی کارنامہ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب تک اس میں زمانے کی روح موجود نہ ہو۔ اب حسن محض کا نام ادب نہیں رہا ہے، اقوام عالم کا اجتماعی وجدان آج ادب میں حسن کو حقیقت اور نیکی کے جذبات کے ساتھ ہم آہنگ دیکھنا چاہتا ہے اور سب سے کامیاب ادیب وہی ہے جو بیک وقت ہمارے ذوق حسن، ذوق فکر اور ذوقِ عمل کو مطمئن کرے، اس میں کوئی شک نہیں کہ آرٹ کی کوئی راست اور قطعی غرض و غایت نہیں ہوتی۔ لیکن بالواسطہ آرٹ میلانی ہوتا ہے اور اس میں ایک چھپا ہوا (Background.) غایتی میلان ہوتا ہے۔ غالباً اسی خیال اور جذبے کے زیر اثر حضرت علامہ اقبال مرحوم نے تاج محل کے متعلق فرمایا تھا کہ اس عمارت میں حسن، نزاکت، لطافت اور دلکشی تو بدرجہ اتم موجود ہے۔ لیکن قوت، شوکت اور جلال کا اس کی تعمیر میں کوئی عنصر نظر نہیں آتا۔

قدامت پرستوں کا یہ خیال کہ ادبی پیداوار کے اعتبار سے موجودہ دوَر، دورِ تنزل ہے اور ادب کے وہ پارے جو قدیم شاہکاروں کے نمونوں سے مطابق نہ ہوں ادب کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ادیب یا شاعر زمان و مکان سے کبھی منحرف نہیں ہو سکتا، اب وہ زمانہ نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی فکر، رامائن، مہابھارت، الیڈ، ڈوائن کامیڈی اور شاہ نامہ جیسی کتابوں سے مطمئن ہو جائے، اگر آج الف لیلہ اور انوارِ سہیلی کے سے قصے تصنیف ہونے لگیں تو موجودہ نسل ان رجعت پسندانہ افادات کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھے گی۔ کیوں کہ اس میں روح عصر موجود نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ روح عصر کے بغیر ہر ادب قالب بے جان ہے۔

ہر قدیم ادب کا مطالعہ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اس کی حیثیت ہمارے موجودہ عصری میلانات کے تاریخی پس منظر کی سی ہے، ہومر، ڈانٹے، کالی داس، فردوسی اور سعدی سب اپنے اپنے زمانے کی پیداوار ہیں۔ ان میں سے کوئی وقت سے بعد پیدا نہیں ہوا۔ یورپ کی ادبیات میں رزمیہ دَور کے بعد رومانی دَور کی ابتدا ہوئی، ہندوستان میں دلی کی شاعری کے زوال کے بعد لکھنؤ کی شاعری کو فروغ ہوا۔ یہ سب تاریخ کی یا وقت کی تقدیریں ہیں۔ جو کسی طرح ٹل نہیں سکتی تھیں، تاریخی جبر کے اسی اٹل قانون کی بنا پر کوئی ادبی کارنامہ اپنے وقت کے بعد شاہکار تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اسے کوئی تاریخی اہمیت اور منزلت دی جا سکتی ہے۔ اب میں آپ کے سامنے اسی نظریے کی روشنی میں مختصر ادبیات عالم کا تاریخی تجزیہ کروں گا۔

میں نے ابھی ذکر کیا ہے کہ ادب ان ہی حالات اور اسباب سے بنتا ہے۔ جن میں مجموعی طور پر ہمارے نظام تمدن کی پرورش ہوتی ہے۔ ادب دراصل ہمارے جذبات اور احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور چونکہ جذبات ہمیشہ معاشرت اور ماحول سے متاثر رہتے ہیں۔ اس لئے ادب بھی زمانے اور ماحول کے ساتھ رہتا ہے۔ تاریخ تمدن کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے انسانوں کی منتخب اور محدود جماعت ہدایت اور رہبری کی آڑ میں عوام پر مسلط رہی ہے۔ تہذیب کے قدیم ترین دوَر میں انسان قدرت کے ہر اس مظہر کی پوجا کرتے تھے جس سے دل میں خوف اور استعجاب کے جذبات پیدا ہوتے تھے۔ ان بے شمار دیویوں اور دیوتاؤں کیلئے جو بھجن اور گیت تیار ہوتے تھے، وہ اسی جماعت کے افکار سے ہیں

یہ دراصل ایک قسم کی ادبی اعیانیت (Aristocracy in literature) کا دور تھا۔ زندگی کے دوسرے اہم شعبوں کی طرح مقتدر جماعت نے ادب کی پیدائش کو بھی اپنا موروثی حق قرار دے لیا تھا یہ رجحان ہم کو بہت زمانے بعد تک بھی نظر آتا ہے۔ ابتدا میں مصری کتابیں ایک خاص رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں۔ جن کو صرف کاہن ہی پڑھ سکتے تھے ویدوں کی زبان کا نام دیوبانی زبان تھا۔ یہ زبان اتنی پاک اور مقدس سمجھی جاتی تھی کہ عموماً غیر برہمن اور خصوصاً شودروں کیلئے حکم تھا کہ یہ اس مقدس زبان کا ایک لفظ بھی سننے نہ پائیں۔ اگر کوئی شودر بدنصیبی سے اس زبان کا کوئی لفظ سُن پاتا تھا تو اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا تھا۔ ادبیات میں اس دور کو ہم "پروہت کال" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

قریباً اسی دور کے ساتھ ساتھ یا اس کے کچھ ہی عرصہ بعد رزمیاتی تہذیب (Epic Civilization) کی بنیا پڑی۔ اس دور میں ستیزہ کاری کو انسانیت کا سب سے بڑا جوہر سمجھا جاتا تھا، غازیوں اور بڑے بڑے سورماؤں کی کامیابی اور کارنگاری کو خاص تائید الٰہی سے منسوب کیا جاتا تھا۔ ان بہادروں کے کارنامے منظوم کئے جاتے تھے اور قوم ان کو پڑھ کر فخر کرتی تھی، دنیا کی اکثر و بیشتر کتابیں مثلاً الیڈ اوڈیسی، رامائن، مہابھارت وغیرہ اسی تہذیب کی نمایندگی کرتی ہیں۔

اس کے بعد تاریخ کی ایک کروٹ نے سولہویں صدی عیسوی سے سرمایہ داری کے دور اور جاگیری نظام کو انسانیت پر مسلط کر دیا۔ اس وقت تمدن کی نمایندگی مذہبی پیشوا اور بڑے بڑے سامنتوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانہ کا معاشرہ ان جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں کی زندگی کو احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ مذہبی نظام اور سامنتی نظام دونوں نے ایک دوسرے کو سہارا دے رکھا تھا اور اس طرح عوام کے خیالات اور جذبات پر ان کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اس زمانے کا ادب دو حصوں میں منقسم ہے، ایک ادب تو صوفیوں اور درویشوں کے خیالات کی نمایندگی کرتا ہے جو ہم کو رہبانیت ترک اور تپسیا کی تلقین کرتے ہیں۔ اور دوسرا ادب وہ ہے جو دنیائے امارت کے زیر اثر پرورش پاتا رہا ہے اور جس میں عصری میلان بہ ظاہر ہوتا ہے کہ دولت مندی ایک مستقل نیکی ہے۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی، چاسر کے (Canterbury Tales) سعدی کی گلستاں، ملک محمد جائسی کی پدماوت سب اسی تہذیب کی یادگاریں ہیں۔ خیام، حافظ، کبیر اور میرا بائی وغیرہ کے ادبی کارنامے اسی دور کے خاص رجحان کی نمایندگی کرتے ہیں۔

جاگیری نظام کے ساتھ ساتھ ایک اور طبقے کو بھی آہستہ آہستہ فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ یہ مہاجنوں اور ساہوکاروں کا طبقہ تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ انسانی معاشرے میں اس طبقے کے تسلط اور اقتدار کی بنیاد کب پڑی۔ لیکن ایک حقیقت نفس الامر ہے کہ ایک زمانے میں تمدن اور معاشرت کی پوری باگ اس طبقے کے ہاتھ میں آگئی اور اس نے عصری میلان و رجحان کو بے حد متاثر کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں کلیسا کا اقتدار اپنی آخری سانس لے رہا تھا اور رزمیہ تہذیب تقریباً نیست و نابود ہو چکی تھی۔ لیکن انسانیت کارخانوں کے استبداد کے بوجھ سے دبی جارہی تھی۔ یہ دور تقریباً اٹھارھویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ اور اسی زمانے میں رومانی تحریک (Romantic revival) کی بنیاد پڑی۔ یہ تحریک دراصل مادیت اور ثروت پرستی کے خلاف ایک خاموش اور پُرامن احتجاج تھی جس نے عالمی ادبیات کا رُخ بالکل بدل ڈالا، گوئٹے ورڈزورتھ کیٹس شیلی، بائرن دراصل سب یک آواز ہو کر معاشرے کے اس تصنع اور بناوٹ کی پردہ دری کرتے ہیں جو سرمایہ داری کے نظام کے ساتھ معاشرے کی رگ و پے میں جاری ہو گیا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے زندگی کی ان تلخ حقیقتوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے ان سے پناہ ڈھونڈی اور اپنے لئے اور دوسرے کیلئے ایک ایسی خیالی دنیا تعمیر کی جہاں صرف جذبات اور احساسات کی رہنمائی کام کرتی ہے۔ اس زمانے کے ادبی کارنامے انسانی فکر کیلئے شراب کا کام کرتے ہیں، جہاں تک محبت کے جذبات اور حسن کے احساسات کا تعلق ہے۔ اس ادب کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس نے ہماری ایک بڑی روحانی ضرورت کو پورا کیا اور ہمارے وجدان کیلئے مسرت فراہم کی۔ اس قسم کے ادب سے انسانیت کبھی بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ یوں ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کی قدر و منزلت باقی رہے گی، لیکن زمانے کی رفتار کے ساتھ

ساتھ ہم ادب میں زندگی کے دکھ کو دور کرنے کا راستہ ڈھونڈتے ہیں اور یہ راستہ ہم کو مصیبت اور تکلیف سے بچ کر ایک ذہنی حصار تعمیر کر لینے میں نہیں مل سکتا بلکہ ہم ادب سے اپنے میں اس دکھ کا مقابلہ کرنے کی قوت اور تاب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہم کو یہ قوت اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک ادب میں واقعیت (Realism) نہ ہو اور ادب ان سارے افکار اور رجحانات کی نمائندگی نہ کرے جن سے اس وقت انسانیت دوچار ہو رہی ہے، ادب کا ترقی پسند نظریہ یہی ہے کہ جس طرح ہر ادب اپنے عصری میلانات کا آئینہ ہوتا ہے، ہمارا موجودہ ادب بھی ہماری ضرورت اور ہماری اجتماعی فکر کی مکمل نمائندگی کرے جدید ادب کا کوئی راستہ معین کرنے سے پہلے ہم کو موجودہ دور کے ان رجحانات کا اندازہ کر لینا چاہیئے جن سے ہماری زندگی کے تقریباً سارے کے سارے شعبے متاثر ہو رہے ہیں۔

انقلاب فرانس کے بعد سے انسانی ضمیر میں بھی ایک انقلاب پیدا ہو چکا تھا اور انسانیت کو محسوس ہونے لگا تھا کہ صنعتی تہذیب نے اس کے لئے بہت سی سوگواریاں پیدا کر دی ہیں اور اس کو بالکل بے دست و پا بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

انسانوں کو یہ بھی محسوس ہو چلا تھا کہ کلیں گو بظاہر ان کے اشاروں پر چلتی ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ خود کلوں کے تابع اور غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس احساس سے ساری دنیا میں بے چینی، انتشار اور ناآسودگی کی لہریں اٹھنے لگیں۔ لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم تک اس تہذیب کا پورے طور پر خاتمہ نہ ہو سکا۔ جنگِ عظیم نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم، اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں، ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کیلئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے، اقوام عالم اس وقت جس عہد اضطراب سے گزر رہی ہیں یہ دراصل ایک بہت بڑے سیاسی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے، ایسی صورت میں ادب کا ترقی پسند نظریہ یہی چاہتا ہے کہ ادب میں وہ سارے میلانات پیدا کئے جائیں۔ جن سے یہ دور بن رہا ہے۔ اب تک ہمارے ادب نے کلیساؤں کی سامنتیوں کی اور سرمایہ داروں کی زندگی سے بحث کی اور ان کے رسم و رواج ان کی تہذیب اور ان کی معاشرت کو مقبول بنانے کی خدمات انجام دیں، لیکن اب ہمارا جذبۂ انسانیت ہم کو دعوت دیتا ہے کہ ہم اس سطح سے اتر کر غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کا مطالعہ کریں۔ کیونکہ انسانی آسائش ان ہی کی جاں کاہیوں سے عبارت ہے، حقیقت یہ ہے کہ سماج کی عمارت کا سنگ بنیاد غریب طبقہ ہے، ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک اس نے جو قربانیاں کی ہیں۔ سختیاں جھیلی ہیں، اور سماج کے کھیت کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اب اسے ان جاں گسل صدیوں سے نجات دلائی جائے، جلد یا بدیر سارا عالم اس انقلاب سے متاثر ہوگا، زمانے کا یہ اٹل فیصلہ ہے اور اس فیصلے کے مقابلے میں دنیا کی کوئی مزاحم قوت یا تحریک نہیں ٹھہر سکتی۔ زندگی کے سارے شعبوں مثلاً سیاسیات، عمرانیات اور معاشیات میں اس عظیم الشان تحریک کیلئے فکر کی راہیں کھول دی گئی ہیں۔ اس لئے ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور یہی گویا ادب کا ترقی پسند نظریہ ہے جس کے علمبردار میکسیم گورکی۔ ڈسٹوئیسکی، ٹالسٹائی، ٹرجنیف اور چیخوف وغیرہ ہیں۔

اب میں اپنے مضمون کے دوسرے حصے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ یہ معلوم کرنے کیلئے کہ اردو ادب اس ترقی پسند رجحان سے کس حد تک متاثر ہے، ہم کو ان مختلف اصلاحی تحریکوں کا حال جاننا چاہیئے جن سے ہند جدید بن رہا ہے۔ ہندوستان میں سیاسی شعور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے شروع ہوتا ہے، اور اسی زمانے سے عوام میں بیداری کی روح پیدا ہونے لگی ہے۔ یہ بیداری دنیا کی رفتار ترقی کا کس قدر ساتھ دیتی رہی ہے۔ ایک مستقل بحث ہے بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زمانے کی تاریخ جس سرعت سے بدل رہی ہے اور اقوام عالم دیکھتے۔۔۔ دیکھتے جن عظیم الشان انقلابات سے دوچار ہو رہے ہیں، ان کا اثر ہندوستانی صورت حال پر بھی بتدریج پڑ رہا ہے، یہاں ان اسباب و علل سے بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ جن سے ہندوستان میں کوئی فوری انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا اور جن سے یہاں کی سوسائٹی کے قدیم اور رجعت پسند عناصر فوراً ہی مٹائے نہیں جا سکتے لیکن یہ ماننا ضروری ہے کہ بتدریج وقت رفتہ رفتہ ان سارے اسباب و علل پر غالب آتی جا رہی ہے اور یہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں

جدید رجحانات کی جھلکیاں نظر آنے لگی ہیں۔

اردو میں مولینا حالی پہلے آدمی سمجھے جاتے ہیں جنہوں نے ہمارے شعر و ادب کیلئے ایک نیا راستہ بنانے میں پہلا دلیرانہ اقدام کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی سے بہت پہلے نظیر اکبر آبادی نے بھی اردو شاعری کی روایتی رسم پرستی کو چھوڑ کر ایک نئی روش اختیار کی تھی لیکن حالی نے سب سے پہلے اس قسم کی کوشش کو ایک مستقل حیثیت دی، اور اپنے نظریہ شعر و ادب کو مقبول بنانے کیلئے انہوں نے اپنا سارا آرٹ بلکہ اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی نے خود جو کچھ لکھا ہے وہ غزل کیلئے نہیں ہے بلکہ ان کے پیش نظر سماج کی جدید اخلاقی برائیوں کی اصلاح تھی اور انہوں نے اپنا سارا آرٹ ان ہی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش میں صرف کیا، یہ بھی صحیح ہے کہ حالی کی نظر صرف مسلمان طبقے کی فلاح و بہبود پر تھی، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حالی نے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی فکر کیلئے نئی راہیں کھول دیں اور ان میں ادب کے ذریعے سے انسانیت کی سودمند خدمت انجام دینے کا احساس پیدا کر دیا۔

حالی نے ابتدا میں جو بیج بو دیا تھا اور جس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا تھا اس کی تکمیل اقبال کے ہاتھوں ہوئی۔ اقبال کی عظیم الشان شخصیت ان کی زندگی ہی میں بجائے خود ایک ادارہ بن گئی تھی اور اس کا اثر سارے ہندوستانی ادب پر پڑ رہا تھا، اقبال کے متعلق جس قدر مختلف اور متضاد رائیں ہیں وہ غالباً اردو ادب میں کہیں اور نہ ملیں گی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے پیام نے نہایت شدت کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے اور سارے کے سارے لوگ وہ خواہ اقبال کے حامی ہوں یا مخالف شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ بات شاعری کی اور ادب کی فطرت میں داخل ہے کہ جس قدر زیادہ کسی ادب کا اثر ہوگا۔ اور اجتماعی وجدان جسقدر زیادہ اس کے افکار اور نظریوں کو قبول کرے گا۔ اسی قدر زیادہ اس پر گفتگو ہوگی اور تنقیدیں کی جائیں گی۔ یہی حال اقبال کی شاعری کا ہے، ہر اس تنقید سے جو ان کی شاعری پر اور ان کے فلسفے پر کی جائے گی۔ ان کی عظمت اور ان کے پیام کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال نہ صرف ہندوستان کا بلکہ ساری دنیا کا سب سے بڑا ترقی پسند شاعر ہے، وہ نہ صرف ایک عظیم المرتبت شاعر ہے بلکہ ایک بلند پایہ حکیم مفکر اور فلسفی بھی ہے، اقبال کی یہی خصوصیت ان کو تاریخ ادبیات عالم میں ایک نہایت ممتاز اور رفیع مقام دیتی ہے۔ ان کی شاعری کے مرکزی تخیل (Theme) کا مطالعہ کرنے کیلئے ان کے فلسفے کو جاننا ضروری ہے۔ ان کے فلسفے کے مطالعے کے لئے ان کی ذہنی تربیت اور نشو و نما میں جو حالات معاون ہوئے ہیں۔ ان کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اقبال نے عام اردو شاعروں کی طرح پہلے غزلیں کہیں لیکن وہ بہت جلد ان سے سیر ہو گئے، بقول پروفیسر سروری زبان کی چاشنی سے ہٹ کر تکراری مضامین کے سوا ان غزلوں میں کیا تھا جو اس فلسفی شاعر کی توجہ کو الجھائے رکھتا۔

اب اقبال نے ان موضوعوں کو اپنی شاعری کیلئے منتخب کیا جن کا گہرا تعلق اسی زندگی اور ماحول سے تھا جس میں ان کی شاعری پرورش پا رہی تھی، اقبال اس زمانے میں ہند قدیم کی عظمت سے بے حد متاثر تھے۔ ان کے اسی تاثر نے ان سے ہمالہ، نیا شوالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت جیسی نظمیں لکھائی تھیں اور اسی احساس سے مجبور ہو کر انہوں نے خاک وطن کا مجھ کو ذرہ ذرہ دیوتا ہے۔ اور سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند کہا تھا۔ اسی زمانے میں اقبال یورپ گئے یہاں انہوں نے قدیم اور جدید فلسفے کا مطالعہ کیا ان کو اب اس باطنی اضطراب کا صحیح اندازہ ہوا جس سے اقوام عالم گزر رہی تھیں، یہاں انہوں نے سوگوار انسانیت کو دیکھا۔ جو مغربی تہذیب کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی۔ ان کے تصور حیات میں اب ایک تبدیلی پیدا ہوئی اور انہوں نے اپنی قوت فکر سے مغربی استعماریت کے خلاف احتجاج کیا اور عالمی جذبۂ اخوت کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ مغربی فریب کاریوں سے بچنے کیلئے اقبال انسانیت کیلئے کوئی مکمل نصاب اخلاق پیش کرنا چاہتا تھا اور چونکہ ان کے سامنے اسلام کا اخلاقی نظام موجود تھا اسی کو انہوں نے اپنی شاعری کا مرکزی تخیل قرار دیا۔ اور انسانیت کی رہبری کرنے لگے، اقبال نے وطن پرستی کے لعنے الا اپنے بند کر دیئے انسانیت کیلئے انہوں نے ایک نشاہ راہ عمل تیار کی اور اسی کو انہوں نے اپنی شاعری کا محور بنا لیا۔

اقبال کے اس نئے ذہنی رجحان پر ہر طرف سے لے دے ہوئی، وطن پرستوں نے ان پر ہر طرف سے لعن طعن کی بوچھار کی۔ اور ان پر فرقہ واریت کا الزام رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے

جہاں کہیں اسلام کا ذکر کیا ہے وہ دراصل ایک ایسے نظام کیلئے استعارہ ہے جو بنی نوع انسان کی فلاح کی راہیں تجویز کرے، وہ اگر کہیں بندہ مومن کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد کردار کی وہ بلندی ہوتی ہے جو دنیا میں نیکی کی حمایت اور بدی کے خلاف بغاوت کرنے پر ہر فرد کو آمادہ کر دے۔ ان کے نزدیک مومن کا تصور یہ ہے کہ کشمکش زندگی میں مومن کی قوی سیرت اس کی انفرادیت کو قائم رکھتی ہے۔ مومن زمان و مکان کا غلام نہیں ہوجاتا بلکہ زمانہ خود اس کا پابند ہوجاتا ہے - اور اس کے وجود میں جذب ہوجاتا ہے، مومن اپنے زمانے کا معمار اور کارسازِ حقیقی ہوتا ہے۔ لیکن کافر (اور کافر سے یہاں مراد وہ انسان جس کا کردار قوی نہیں ہے) اپنے آپ کو وقت کے رحم و کرم کے حوالے کر دیتا ہے اور اپنی انفرادی ہستی کو کھو دیتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

غرض یہ کہ یوروپ کے سفر کے بعد اقبال نے وطن پرستی کے محدود دائرے سے نکل کر ایک عالمی زاویۂ نگاہ اختیار کیا اور اپنے پیام کو اور زیادہ وسیع کر دیا، مغربی تمدن کے مستقبل کے متعلق ایک پیغمبرانہ انداز میں اظہار خیال فرماتے ہیں کہ:-

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اقبال کی اس دور کی شاعری میں ہم کو سرمایہ داری نظام اور مغربی تہذیب کے سراب کی حقیقتیں بے نقاب نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک مشہور نظم میں کہا ہے کہ:-

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اس کے بعد انہوں نے وہ شعر کہا ہے جس سے یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری میں اسلام کا تصور کسی فرقہ وارانہ جذبے کے تحت پیش نہیں کیا بلکہ اس کو ایک (Symbols) یا استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے جس سے ان کی مراد نیک عمل اور قوی کردار ہے۔ فرماتے ہیں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقبال کی شاعری کے قلبِ ماہیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اقبال اپنے وطن کی قسمت اور زبوں حالی سے غافل تھے، وہ آزادی کو تو ہر فرد اور ہر قوم کا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ غلامی ان کے نزدیک بدترین لعنت ہے جو انسان سے زندگی کی ساری راحتیں چھین لیتی ہے، حتیٰ کہ وہ اس کے جمالی احساس اور وجدانی عظمت کو بھی فنا کر دیتی ہے۔

غلامی کیا ہے ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

اسی زمانے سے اقبال نے ہندوستانیوں کے سامنے فرنگی سیاست اور حکمرانوں کی عیاری کا پردہ فاش کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مجلس اصلاح و آئینِ رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

یہاں تک ہم نے اقبال کی شاعری کا بانگ درا میں مطالعہ کیا - اس کے بعد اقبال کچھ دنوں تک فارسی میں کہتے رہے۔ فارسی میں ان کی شاعری کا کیا رجحان رہا اس کا تعلق ہمارے موضوع سے نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کا یہی رجحان پھر اردو میں بال جبریل اور ضرب کلیم کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اس مدت میں اقبال کے فلسفے نے ایک اور منزل طے کر لی تھی - ان کا ذوق آگہی صرف فریاد کرنے اور احتجاج کرنے سے مطمئن نہیں ہوجاتا، بلکہ وہ اس کے آگے بھی کچھ اور ڈھونڈھنا چاہتا ہے۔ اقبال کی اس تلاش اور جستجو کا نتیجہ ان کا وہ نظریہ ہے جسے انہوں نے فلسفۂ شاہین کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ فلسفہ انفرادیت، خودی کی تعمیر قوت عمل اور زندگی کی تلقین کرتا ہے، اقبال

کی مراد شاہین سے وہ خود دار اور باہمت فطرت ہے جو جہد زندگی میں کسی کی ممنون رہنا نہیں چاہتی بلکہ اپنا راستہ آپ بنا لیتی ہے۔ مجھے بعض ذمے دار حضرات کا یہ بیان پڑھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اقبال ظلم، استبداد اور جارحانہ قومیت کا حامی ہے۔ اقبال کی قوت کی تعلیم یا تلقین کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ وہ غریبوں اور کمزوروں کے مقابلے میں استعمال کی جائے، اقبال اس قوت کو مظلوم اور کمزور انسانیت کے ہاتھ میں اسے حربہ بنا کر دینا چاہتے تھے جو دنیا کے استبدادی دستور اور جابرانہ نظام کو ملیا میٹ کر سکے۔ اپنی نظم خدا کا فرمان فرشتوں کے نام میں انہوں نے صریحاً اس بات کا اعلان کیا ہے کہ وہ کبھی غریبوں کے مقابلے میں استبداد اور ظلم ناروا کو... روا نہیں رکھ سکتے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال نے مسولینی پر ایک نظم لکھی ہے، اس میں انہوں نے الیطالوی بیداری کی بڑی تعریف کی ہے اور الیطالیہ کو اس کی قسمت پر مبارک باد دی ہے کہ اس کو مسولینی جیسا قائد اعظم میسر ہے۔ ایک نقاد نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ "یہ[1] فیض مسولینی کا ہے جو الیطالیہ کیلئے ساری دنیا کو فنا کر سکتا ہے۔ جو الیطالیہ کے سرمایہ داروں کا سپہ سالار ہے، جو جنگ کو انسانیت کے لیے شیر مادر بتاتا ہے"۔ اقبال پر اس قسم کے اعتراضات وہی لوگ کرتے ہیں جنہوں نے ان کی شاعری کے اصل (ـــــ) یعنی مرکزی تخیل کو نہیں پایا، اقبال کبھی اس نظام تمدن کے حامی نہیں ہو سکتے۔ جس کی بنیادیں اس طرح انسانی تخریب پر قائم کی گئی ہوں وہ در اصل حرکت، زندگی قوت اور عمل کو انسانی کامگاری کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے ہیں اور ان کو جب کسی کردار میں یہ خصوصیات نظر آتی ہیں اس کو ایک نصب العینی نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں مسولینی کی تعریف وہ صرف اسی لئے کرتے ہیں کہ اس نے اپنی قوت عمل سے حیات ملی میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ ورنہ ان کا پیام ہمیشہ غریبوں اور مزدوروں کیلئے ہے اور ان کی شاعری ہمارے موجودہ عصر کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اقبال نے خود ایک غیور اور خوددار طبیعت پائی تھی اور وہ دنیا کے ہر انسان کو اسی صفت سے متصف دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک غربت بجائے خود کوئی بدی نہیں ہے وہ تو اس غربت میں بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی اگر غریب کے متعلق خدا سے کوئی دعا ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ:۔

جسے نان جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

اقبال اپنی فقیری و غربت کو اس امارت سے بدلنے کیلئے تیار نہیں ہیں جو ان سے ان کی ضمیر کی پاکی ان کی روحانی سربلندی اور ان کی فطرت کی خودداری چھین لے وہ ایک الہامی شان کے ساتھ اپنی فطرت غیور سے دریافت کرتے ہیں کہ ؎

اے میرے فقر غیور کیا ہے تیرا فیصلہ
خلعت انگریز یا پیرہن چاک چاک

مختصر یہ کہ اقبال کی شاعری نہ صرف اردو میں بلکہ ساری دنیا کی ادبیات میں ہمارے عصری رجحانات کی مکمل ترین نمایندگی کرتی ہے اقبال سے پہلے آج تک کسی شاعر نے اس قدر قوت اور تکمیل کے ساتھ اپنے پیام کے ذریعے انسانیت کی خدمت انجام نہیں دی۔ اب نہایت اختصار کے ساتھ اردو کے دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے رجحانات کا ذکر کیا جاتا ہے کسی دوسرے موقع پر تفصیل پیش کی جائے گی۔

اقبال کے بعد اردو ادب میں جوشؔ اور علی اختر ادب کے ترقی پسند نظریہ سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ جوشؔ کی انقلابی شاعری پر بنگال کے مشہور انقلابی شاعر قاضی نذر الاسلام کا بہت اثر ہے، نذر الاسلام کی شاعری کا اصل مرکزی خیال یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے کوئی فوری انقلاب رونما ہو جو انسانیت کی مجبوریوں اور حرماں نصیبوں کا خاتمہ کر دے۔ نذر الاسلام نے اس انقلاب کے پیدا کرنے کی بہت قوت کے ساتھ تلقین کی ہے۔ وہ انقلاب کا سب سے بڑا نقیب ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے نہ صرف اپنی شاعری سے عام احساس کو بیدار کر دیا بلکہ اس نے اپنے معتقدین کی ایک مستقل جماعت تیار کر لی۔ نذر الاسلام کے

---

[1] ادب اور زندگی اختر حسین رائے پوری

دلستان کے سب سے سرگرم اور نمایاں رکن جوش ملیح آبادی نظر آتے ہیں، جوش نذرالاسلام کی پیروی کے باوجود ایک انفرادیت کے مالک ہیں اور انہوں نے اردو ادب میں اپنے لئے ایک نمایاں جگہ پیدا کر لی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش کی شاعری کا نذرالاسلام یا اقبال کی طرح کوئی مستقل (Message) نہیں ہے۔ انہوں نے تقریباً ہر موضوع پر نظمیں کہی ہیں اور ہر قسم کا انداز بیان اختیار کیا ہے۔ لیکن ان کے پاس عصری میلان یا ماحول کا اثر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کا شاعرانہ (Sentiment) اگر کبھی بھٹکنا بھی چاہے تو جوش اس کو پھر اسی راستے پر لگا دیتے ہیں۔ جوش نے بھی اپنا یہی مقصد قرار دیا ہے کہ قوم میں ظلم کے خلاف تاب مقاومت پیدا کریں اور اس کے جذبۂ عمل کو حرکت دیں، وہ اپنی شاعری کو قوم کے بیدار کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

خواب کو جذبۂ بیدار دئے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دئے دیتا ہوں

علی اختر بھی قوم کی قوت فکر کی اصلاح کرنی چاہتے ہیں۔ علی اختر کی شاعری جوش کی نسبت زیادہ پُرسکون اور سنجیدہ معلوم ہوتی ہے۔ علی اختر جوش کی طرح بالکل انقلابی نہیں ہیں بلکہ وہ سوسائٹی کی بنیادی خرابیوں کو دور کرنے کیلئے قوم کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر بڑے شاعر کی طرح علی اختر بھی انسانیت کے اندرونی اضطراب سے متاثر ہیں۔

احسان بن دانش بھی انقلاب کے ایک بڑے نقیب ہیں۔ وہ خود زندگی کے ان تمام مراحل سے گذر چکے ہیں جن سے انسانیت کی ساری الم انگیزیاں عبارت ہیں یعنی احسان کو اپنی زندگی کی کش مکش میں غربت سے بہت زیادہ سابقہ رہا ہے۔ وہ کسی زمانے میں مزدور بھی رہ چکے ہیں۔ اس لئے ان کے خیالات اور جذبات میں جو صداقت پائی جاتی ہے۔ وہ دراصل ان کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی طبیعت پر جوش کا شاباباتی رنگ غالب ہے۔ لیکن ان کا آرٹ ان کے ترقی پسند رجحان میں زیادہ قوی اور موثر نظر آتا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے ہونہار شاعر مخدوم محی الدین نے بھی اپنی فکر کی جولانیوں کیلئے خاص طور پر یہی میدان منتخب کیا ہے۔ مخدوم کی شاعری میں بھی نذرالاسلام کا اثر بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قوم کے جذبات کو بیدار کرنے اور اس میں عمل کی قوت پیدا کرنے کیلئے جس طرز خیال اور انداز بیان کی بنیاد نذرالاسلام نے ڈالی وہ بجائے خود بیحد موزوں اور مکمل ہے۔

ماہر القادری نے ایک ہمہ گیر طبیعت پائی ہے۔ وہ جس طرز میں بھی فکر کرتے ہیں سو وہ بجائے خود مکمل نظر آتی ہے۔ ان کی انقلابی نظموں میں کمسن مزدور، اور والد مرحوم کی قبر پر، خاص طور پر قابل ہیں۔ کمسن مزدور میں ماہر نے وقت کے فیصلے کو صاف صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ:۔

اطلس و دیبا کہ پردے چاک ہو جانے کو ہیں
کرسیاں، گل دان صوفے خاک ہو جانے کو ہیں
اب کسی کے سامنے مزدور جھک سکتا نہیں
آنے والا انقلاب آئے گا رک سکتا نہیں

اب کے ترقی پسند رجحان سے تقریباً اردو کے سارے ممتاز ادیب اور شاعر متاثر ہو رہے ہیں۔ میں نے یہاں صرف ان شاعروں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اس رنگ کو مستقل حیثیت سے اختیار کر لیا، ماہر القادری، مجاز، میکش، وجد، صمد رضوی، ساغر، الطاف مشہدی۔ عدم وغیرہ سب غیر شعوری طور پر ادب کے اس نظریہ سے متاثر ہو رہے ہیں۔

اردو کے ادیبوں میں پریم چند ہماری زندگی کا سب سے سچا ترجمان ہے، پریم چند کی کہانیوں میں ہمارے ماحول کی اور ہماری زندگی کی مکمل تصویر نظر آتی ہے، ان کے افسانے جسقدر کامیاب مکمل اور غایتی ہوتے ہیں اسی قدر مقبول، دلچسپ اور ہر دل عزیز بھی ہوتے ہیں۔ پریم چند کا تقریباً ہر افسانہ کسی نہ کسی نیکی کے جذبے کو حرکت میں لاتا ہے "میدان عمل" میں پریم چند نے ہندوستانی نوجوان کے لئے ایک لائحہ عمل بنایا ہے جو ہر طرح نصب العینی معلوم ہوتا ہے ان کے آرٹ میں جسقدر واقعیت اور صداقت شعاری موجود ہے وہ اردو کے کسی ادیب میں نظر نہیں آتی۔

محمد عمر مہاجر متعلم سال چہارم (مجلہ عثمانیہ)

نگران
پروفیسر تاجور
نجیب آبادی

شاہکار لاہور

ایڈیٹر:-
فاروق علی خاں

فہرست مضامین بابت ماہ اگست ۱۹۳۹ء

جلد (۹) تصاویر:- احساس غم (سہ رنگ) ساقی (ایک رنگ) صحرائے عرب کا ایک نظارہ (ایک رنگ) نمبر (۵)

سالانہ چندہ:- چھ روپے۔ ششماہی تین روپے آٹھ آنے
نادار خریداروں سے:- للعہ (چار روپے) بذریعہ منی آرڈر پیشگی۔ نمونہ پانچ آنے

رفتارِ عالم

آجکل کا مصر

محترمہ کملا دیوی چٹوپادیہ مصر تشریف لے گئی تھیں۔ مصر کی موجودہ سیاسی و معاشرتی اور اقتصادی حالت کے متعلق آپ کا ایک طویل مضمون بمبئے کرانیکل میں شائع ہوا ہے۔

اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

جنگِ عظیم ختم ہوئی تو مصر نے ہزار دشواریوں سے گزرنے کے بعد آخر برطانیہ کو ۱۹۳۶ء کا معاہدہ استوار کرنے پر مجبور کیا۔ اس وقت اسی معاہدہ کی دفعات دیکھ کر بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ بتدریج مصر کو مکمل طور پر آزاد تسلیم کر لیا جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوتا ہے۔ کہ مصر آج تک بھی برطانوی ملوکیت کے پنجہ میں اسی سختی کے ساتھ گرفتار ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ مسولینی نے بھی جا بجا ایک وسیع سلطنت کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ مصر کو اپنی مجوزہ رومن سلطنت میں شامل کر کے رہے گا اور اپنے اسی مقصد کی تکمیل کیلئے وہ نہر سویز پر قابض ہونے کی پوری پوری کوشش میں مصروف ہے۔

اگر اٹلی اور برطانیہ میں آج جنگ چھڑ جائے۔ تو یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اٹلی کی فوجیں سب سے پہلے مصر پر حملہ آور ہوں۔ اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ مصر ایک بیرونی طاقت کے رحم پر پڑا ہے۔ اس کی حالت ایک ایسی نو آبادی کی سی ہے۔ جو دنیا کی نظروں میں تو آزاد ہے۔ لیکن جس کی ایک ایک حرکت برطانیہ کے اشاروں پر ہوتی ہے۔

معاہدہ کی رو سے برطانوی افواج کو دار الحکومت خالی کر دینا چاہیئے تھا۔ اور انہیں صرف نہر کے قرب و جوار میں مقیم ہونے کی اجازت تھی۔ اس وقت مقرر شدہ علاقہ میں حکومت مصر کے اخراجات پر فوجی بارکیں بننی منظور ہو گئیں۔ اور وفد کی حکومت نے اسی کام کے لیے پچاس لاکھ پونڈ بھی منظور کر لئے۔ مگر اس کے بعد جب حکومت برطانیہ کی کوششوں سے موجودہ حکومت برسر اقتدار آئی۔ تو اس کو برطانیہ کی خواہش کے مطابق اسی کام کے لئے ایک کروڑ تیس لاکھ پونڈ منظور کرنے پڑے۔ لیکن اس کے باوجود قاہرہ میں اب بھی برطانوی فوجیں موجود ہیں۔ مصری فوج کی تعداد کے مقابلے میں برطانوی فوج کہیں بہت زیادہ ہے۔ اور سکندریہ پر انگریز قابض ہیں۔

اسی معاہدہ کی رو سے اگلے سال تمام برطانوی فوجی حکام کو اپنی ملازمتوں سے سبکدوش ہو جانا چاہیئے۔ لیکن موجودہ بین الاقوامی سیاسی حالات کے پیش نظر انگریز اس تحریری وعدہ کو بھی پورا کرنے میں پس وپیش کر رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ موجودہ حکومت کی بدولت وہ تمام معاہدہ اب خاک میں مل چکا ہے۔ برطانیہ سے صرف وفد کی حکومت ٹکر کھا سکتی تھی۔ لیکن موجودہ حکومت کو یہ بات پسند نہیں۔

بیرونی مداخلت اور اثرات کے ماتحت مصر مجموعی طور پر اتنی ترقی بھی نہیں کر سکا۔ جتنی اسے اب تک کر لینی چاہیئے تھی۔ جس طرح انگریز ہندوستان کو تعلیمی لحاظ سے پیچھے رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح مصر میں بھی ایسی ہی مصلحتیں بروئے کار نظر آتی ہیں۔

ملک میں حکومتِ خود اختیاری کے ادارے قائم نہیں۔ یہانتک کہ آجکل بھی قاہرہ میں میونسپلٹی کا وجود نظر نہیں آتا۔ اس ملک کو دیکھ کر بار بار بدقسمت ہندوستان یاد آتا ہے۔ یہاں بھی شہریوں کے حقوق پامال نظر آتے ہیں اور ملک کی مختلف سیاسی جماعتیں اپنے اختلافات کی بنا پر ملک کو بالکل ہماری قومی مجالس کی طرح نقصان پہنچا رہی ہیں۔

عوام کی عام اقتصادی حالت ہندوستانیوں کی نسبت بہتر ہے۔ مثلاً یہاں کے ایک کسان یا مزدور کی آمدنی ہندوستان کے کسی اپنے ہم پیشہ کے مقابلہ میں دگنی ہوتی ہے۔

مصر ایک زراعتی ملک ہے اور اس کی پیداوار کا انحصار

نیل کے پانی پر ہے۔ بارش یہاں نام کو بھی نہیں ہوتی۔ اگر مصر کا انتظام کلیتہً مصریوں کے ہاتھ میں ہوتا۔ تو آبپاشی کے کئی مفید ذرائع سے ملک کی پیداوار میں بہت اضافہ ہو سکتا تھا۔ لیکن چونکہ سوڈان انگریزوں کے قبضے میں ہے۔ اس لئے بہم رسانی آب کا تمام اختیار بھی انہیں کو حاصل ہے۔ اس وقت تو حکومت کے پاس پانی کا ایک ذخیرہ جمع ہے۔ مگر معلوم نہیں جب یہ ختم ہو جائے گا تو کیا بنے گا۔

مصر کے شہر فن تعمیر، عام شکل وصورت اور ماحول کے لحاظ سے مشرق اور مغرب کا ایک عجیب ملاپ ہیں۔ ہندوستان کی نسبت یہاں کا اعلیٰ طبقہ مغربی رنگ میں زیادہ ڈوبا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ کسی مصری اور انگریز میں تمیز کرنا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ جہاں تک معاشرت کا تعلق ہے۔ اس طبقہ نے مغرب کی تقلید میں شاید ہی کوئی قدم پیچھے رکھا ہو۔ لیکن یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ مصریوں نے انگریزی یا کسی دوسری زبان کا قطعاً کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ آپ ہمیشہ دو مصریوں کو عربی میں بات چیت کرتے سنیں گے۔ بلکہ اگر کسی غیر ملکی کو بھی ان کے پاس بیٹھنے کا اتفاق ہو تو وہ بلا تکلف عربی بولتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی اور جب وہ لوگ مجھے یہ کہتے کہ ہندوستان میں بھی ایک ہی زبان کا ہونا لازمی ہے تو میں بہت ...... حیران ہوتی۔ کہ جن لوگوں نے اپنی عادات، لباس، رسم ورواج سبھی کچھ مغرب سے لیا ہے۔ انہیں اپنی زبان سے کتنی گہری محبت ہے۔ ملک بھر میں وفد ایک ایسی سیاسی جماعت ہے۔ جسے لوگوں کا پورا اعتقاد حاصل ہے۔ لیکن ہندوستانی کانگرس کے مقابلہ میں یہ جماعت اتنی منظم نہیں۔ عجیب بات ہے کہ اگرچہ سارے ملک میں وفد پارٹی کی بے شمار شاخیں ہیں۔ مگر ان کے ارکان کا کبھی باقاعدہ انتخاب نہیں ہوتا۔

جنرل کونسل کا نام وفد ہے۔ اس کونسل یا اس کی ماتحت مجالس میں اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جب تک کوئی رکن خود ہی علیحدہ نہ ہو جائے یا مر نہ جائے۔ نحاس پاشا اس پارٹی کے رہنما ہیں اور خود ہی وفد کے ارکان نامزد کرتے ہیں۔ اور پھر ہر ایک مجلس کے دائرہ رکنیت پر مہر تصدیق ثبت کرنا وفد کے اختیار میں ہوتا ہے۔

بیگم نحاس پاشا کی قیادت میں خواتین مصر بھی وفد میں شامل ہیں۔ مصری خواتین پر اگرچہ مغربیت کے اثر نے آزادی کا ملمع تو چڑھا دیا ہے۔ مگر معاشرتی نقطۂ نگاہ سے ہندوستانی عورتوں کے مقابلہ میں انہوں نے بہت کم ترقی کی ہے اور چونکہ الازہر کے ارباب بست وکشاد قدامت پسند ہیں۔ اس لئے بہت کم عورتیں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ بلکہ کچھ عرصہ ہوا۔ یونیورسٹی سے عورتوں کے کلی اخراج کی تجویز بھی پیش ہوئی۔ مگر خوش قسمتی سے یہ تجویز منظور نہ ہو سکی۔ لوگوں کو وفد پارٹی پر پورا پورا اعتماد ہے اور نحاس پاشا پر جان چھڑکتے ہیں۔ نحاس پاشا جب کبھی سیر کیلئے بھی باہر نکلیں تو لوگ انہیں صرف دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں۔ ان کے دلوں میں ملک کی خدمت کرنے کا ایک بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ مگر کمی صرف یہ ہے کہ وفد پارٹی ان کے لئے کوئی خاص دستور العمل تیار نہیں کر سکی۔

جنگ چین وجاپان

چین اور جاپان میں جنگ چھڑے دو سال گزر چکے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں جاپان نے جسے اپنی طاقت پر بے حد ناز تھا چین کو نیچا دکھانے کیلئے پوری کوشش کی ہے۔ مگر چیانگ کیشک کی بہادری اور بلند حوصلگی نے جاپان کو یہ ماننے پر مجبور کر دیا ہے کہ چین کو فتح کرنا آسان کام نہیں۔ بلکہ پچھلے دنوں چین نے جنگ کی دوسالہ یادگار منائی اس میں چیانگ کیشک نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ۱۹۴۱ء تک ہم جاپان کے خلاف اپنے تمام مقاصد میں کامیاب ہو کر رہیں گے۔ چیانگ کیشک کی یہ پیشگوئی اگر بالکل صحیح ثابت ہو جائے۔ تو یہ کوئی عجیب بات نہ ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع شروع میں جاپان نے شمالی چین میں لگاتار فتوحات حاصل کر لیں۔ مگر جب چیانگ کیشک اپنی چالوں سے جاپانی افواج کو جنوب کے گھنے جنگلوں میں لے آیا تو ان کی سب سرگرمیاں ختم ہو کر رہ گئیں۔ اور چین نے اپنے کئی مفتوحہ علاقوں پر قبضہ جما لیا۔ ان غیر متوقع حالات کے پیش نظر جاپان اب اس انتظار میں ہے کہ کسی طرح یہ جنگ بین الاقوامی صورت اختیار کر جائے تاکہ اسی بہانہ سے وہ اس بلا کو اپنے گلے سے علیحدہ کر سکے۔ جس سے باعزت بچ نکلنے کی اسے یوں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ شاید اسی مصلحت کی بنا پر ٹینٹسن میں جاپانی حکام انگریزوں کی خوب گت بنا رہے ہیں۔ چنانچہ پچھلے

دنوں جب انگریزوں نے جاپان سے ان زیادتیوں کی وجہ پوچھی اور ساتھ ہی اپنے مطالبات پیش کئے تو جاپان نے جان بوجھ کر بات کو ٹلوں دینے کیلئے انہیں نہایت حقارت سے ٹھکرا دیا۔ مگر برطانیہ کے سیاسین نے جنہیں اپنی سلطنت کا اقبال اب زوال پر نظر آرہا ہے چند ایک بھڑکیلی تقریریں کرنے کے سوا اور کوئی عملی اقدام نہیں کیا اور بیچارا جاپان اپنی اُسی مصیبت میں گرفتار ہے۔

اس جنگ میں جاپانیوں نے جن النسانیت سوز حرکات کا ثبوت دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اور جن کے تصور سے بھی رُوح کانپ اُٹھتی ہے چین کے بیسیوں شہر سینکڑوں قصبے اور ہزاروں دیہات صرف تماشہ دیکھنے کیلئے تباہ و برباد کر دئے گئے ہیں اور وہاں کے رہنے والوں کو بھوکوں مرتے دیکھ کر جاپانی سپاہی قہقہے لگاتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ ہزاروں بے قصور چینیوں کو کھڑا کر کے گولیوں سے اڑا دیا جاتا ہے۔ ہزاروں عورتوں کی عزت برباد ہو چکی ہے اور ہزاروں زندہ چینیوں کو گڑھوں میں پھینک کر اوپر سے آگ لگا دی جاتی ہے۔

۱۹۳۸ء تک اس جنگ پر جاپان کا چھ ارب روپیہ خرچ ہو چکا تھا۔ اب تک جاپان کے بھی ہزاروں سپاہی جنگ میں کام آ چکے ہیں۔ اور کہیں اس سے زیادہ بیماریوں کی نذر ہو چکے ہیں۔ لیکن ان "قربانیوں" کے باوجود جاپان چین کو فتح نہیں کر سکا۔

روس اور برطانیہ

یورپ کے موجودہ سیاسی حالات نے برطانیہ کو آجکل بجد پریشان کر رکھا ہے۔ آئندہ جنگ میں شامل ہونے کیلئے اگرچہ فرانس اور برطانیہ میں دوستانہ معاہدہ ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی یہ دونوں طاقتیں اٹلی اور جاپان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ فرانس اس وقت اپنی مخالف طاقتوں میں گھرا پڑا ہے اور اسے آغازِ جنگ ہی میں برطانیہ کو مدد کیلئے بلانا پڑے گا اور اگرچہ اپنے دوست روس سے اسے خود کسی خاص ذاتی فائدے کی توقع نہیں مگر صرف برطانیہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اور اس کے مفاد کی خاطر وہ اس کوشش میں مصروف ہے کہ کسی طرح روس اور برطانیہ میں بھی دوستانہ تعلقات قائم ہو جائیں۔

روس انقلاب کے بعد یورپ کی سیاسیات سے بالکل الگ تھلگ رہا ہے۔ موجودہ سیاسی الجھنوں سے پہلے روس برطانیہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور خود روس کو بھی یہ معلوم ہے کہ برطانیہ ہمیشہ اس کے دشمنوں کی پیٹھ ٹھونکتا رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ اس شرط پر مغربی جمہوریتوں کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہے کہ آئندہ اٹلی یا جرمنی اگر پھر کسی ملک پر حملہ آور ہوں تو نیک نیتی سے حملہ آوروں کے خلاف محاذ قائم کیا جائے۔ ایک تو برطانیہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر روس کی یہ شرط ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اور دوسرے چونکہ معاہدہ کی شرائط میں برطانیہ نے سراسر اپنے فائدے ہی کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس لئے روس بھی گفت و شنید میں کسی دلچسپی اور سرگرمی کا اظہار نہیں کر رہا۔ روس کی موجودہ طاقت یورپ کی جمہوری طاقتوں سے بھی زیادہ ہے اور وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر کسی کی مدد کا خواہاں نہیں۔ اس لئے جب تک برطانیہ اپنے خود غرضانہ طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا نہیں کرے گا۔ روس شاید اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہ ہو۔

اٹلی اور جرمنی

مسولینی اور ہٹلر دنیا کو ایک عرصہ سے جنگ کی دعوت دے رہے ہیں اور اب دنیا کو اس میں آج نہیں تو کل شامل ہونا ہی پڑے گا۔ اٹلی نے ساری دُنیا کی چیخ و پکار کے باوجود ابیسینیا پر قبضہ جما لیا اور اس کے بعد نہایت خاموشی سے البانیہ کی آزادی سلب کر لی۔ ادھر ہٹلر بھی اسی حکمتِ عملی پر عمل پیرا ہے اور دولِ عالم کیلئے اُس کی یہ جرأت ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے۔ جرمنی اور اٹلی جنگ کئے بغیر آخر متعدد ممالک پر کیوں قابض ہو چکے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں میں ایک عرصہ سے اپنا خاموش پراپیگنڈا کرنے میں مشغول تھے۔ اس دوران میں فرانس اور برطانیہ کے خلاف لوگوں کے جذبات مشتعل کرنے میں بھی انہیں خاصی کامیابی ہو گئی اور اب ان کے حوصلے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ساری دنیا کے احتجاج کے باوجود ہٹلر اور مسولینی اندھا دُھند اپنے مقاصد کی تکمیل کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ہٹلر آجکل ڈینزگ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ پولینڈ کے سیاسی رہنما برطانیہ اور فرانس کے بل بوتے پر یہ اعلان کر رہے ہیں کہ پولینڈ کی آزادی کو کسی صورت میں ختم نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اور ادھر ہٹلر ڈینزگ پر حملہ کرنے کی پوری طیاری کر رہا ہے۔ فرانس اور برطانیہ اگرچہ پولینڈ سے وعدہ کر چکے ہیں کہ وہ جنگ میں اس کی مدد کریں گے۔ لیکن انہیں ابھی تک روس کی امداد کی توقع نہیں۔

اس لئے پولینڈ بھی جیران ضرور ہو رہا ہے۔ اس صورت میں یا تو ہٹلر حسب سابق ڈینزگ کو بھی خاموشی سے فتح کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور اگر برطانیہ اور فرانس نے اس کی کھلم کھلا مدد کرنے کی جرأت کر لی تو یہ عالمگیر جنگ کا آغاز ہو گا۔

جنگِ عظیم میں شکست کھانے کے بعد جرمنی اگرچہ بیحد کمزور ہو گیا تھا۔ مگر گذشتہ عرصہ میں اس نے اپنی طاقت کو ہر لحاظ سے اتنا بڑھا لیا ہے کہ آج سارا یورپ اس کے کھلے چیلنج کو قبول کرنے میں لیس و پیش کر رہا ہے۔ مگر اب ہٹلر کی ہنگامہ آرائیاں حد سے زیادہ بڑھ چکی ہیں۔ روزویلٹ صدر جمہوریت امریکہ نے پچھلے دنوں یورپ کی نازک صورت حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے سینیٹ کے ارکان سے کہا کہ ہٹلر نے جو طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اس کے پیشِ نظر ہمیں ہر وقت ایک عالمگیر جنگ کے آغاز کی خبر سننے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

اس سے پہلے یہ معلوم ہوا تھا کہ جنرل فرانکو نے جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مگر حال ہی میں اٹلی کے امورِ خارجہ کی طرف سے جو بیان شائع کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاؤنٹ کیانو اور جنرل فرانکو کی ملاقات کے بعد اٹلی اور اسپین کے تعلقات اور مضبوط ہو گئے ہیں اور سیاسیات کے متعلق ان دونوں کے زاویہ ہائے نگاہ بالکل ایک ہیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آئندہ جنگ میں جرمنی اٹلی اور سپین ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے

ڈیلی اکسپریس کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ اٹلی لیبیا میں زبردست جنگی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس وقت لیبیا میں اٹلی کے تین سو پچیس جنگی جہاز اور ستر ہزار فوج موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اٹلی کے آئندہ دستور العمل کے مطابق سب سے پہلے ٹیونس پر نہیں بلکہ مصر پر حملہ کیا جائے گا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مصر کی موجودہ فوجی طاقت بہت کم ہے۔

دنیا کی ہر سلطنت اس وقت زبردست جنگی تیاریوں میں مشغول ہے۔ آئندہ جنگ کتنی ہیبتناک ہو گی۔ اس کا اندازہ کون نہیں لگا سکتا۔

فاروق علی خاں

گلدستۂ اشعار

سو سو امید بندھتی ہے اک اک نگاہ پر
مجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی
اقبال

اب جو بہارِ زندگی چُپ چاپ ہی ہے ہاں کبھی
اُٹھی صدائے درد جب کوئی کنارہ کر گیا
حامد

بے کاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
غالب

آنکھوں کو شغلِ گریہ ہمیشہ رہا عزیز
دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی
عزیز لکھنوی

دن رات اُن کو کام یہ رہتا ہے تاجور
مٹی پہ مرا نام لکھا اور مٹا دیا
تاجور

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے
اللہ مجھ کو کتنی محبّت ہے آپ سے
جلال الدین اکبر

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
تجھ سے جہاں میں لاکھ سہی تو مگر کہاں
حالی

عجز سے اور بڑھ گئی برہمیٔ مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست جسکی سمجھ میں آ سکے
حفیظ جالندھری

کیول کرشن

پنجاب کی تاریخی عمارتیں

پانچ دریاؤں کی اس سرزمین نے تاریخی حیثیت سے جو پلٹے کھائے ہیں۔ اُن کے باعث اس ملک کی بہت کم قدیم عمارتیں محفوظ رہ سکی ہیں۔ اگر کوئی شخص پنجاب کی تاریخی عمارتوں کی داستان سنانا چاہے تو وہ مغلوں کے زمانہ سے پیچھے نہیں جا سکتا۔ یہ ملک ہمیشہ سے ہندوستان اور باہر سے آنے والی قوموں کا میدانِ جنگ رہا ہے۔ بھلا جہاں سے حملہ آور فوجوں کے امنڈتے طوفان رہ رہ کر گزرتے ہوں، وہاں امن کی اُن یادگاروں، خوبصورت پرانی عمارتوں کی بہتات کیسے مل سکتی ہے۔ پھر یہاں پتھر کی وہ کثرت بھی نہیں جو دہلی اور آگرے کے قریب ملتی ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو خوبصورت اور پائدار عمارتیں بنانے کا صحیح شوق سب سے پہلے مغلوں کے ساتھ پنجاب میں آیا۔

ہندوؤں اور پٹھانوں نے یہاں کوئی قابلِ ذکر عمارت اپنی یادگار کے طور پر نہیں چھوڑی۔ لاہور کے قریب قدیم ہندو عہد کی یادگار بھیرو کا استھان ہے۔ لیکن جس حد تک استھان کے مندر کا تعلق ہے وہ کوئی تاریخی عمارت نہیں۔ اسی طرح پنجاب کے دوسرے حصوں میں راولپنڈی کے قریب ٹیکسلا، منٹگمری کے قریب ہڑپا لدھیانہ کے قریب سنیت وغیرہ بلاشبہ پرانی یادگاریں ہیں۔ لیکن یہ سب محض کھنڈر ہیں۔ یہاں کھدائی کا کام خواہ کسی پیمانہ پر کیا جائے امید نہیں کہ کوئی ایسی چیز برآمد ہو جسے تاریخی عمارت کا نام دیا جاسکے اس لئے میں آج شام کی گفتگو میں ان کا کوئی ذکر نہیں کروں گا۔

مغلوں کے علاوہ صرف سکھ قوم کی بنائی ہوئی دو عمارتیں ایسی ہیں جن کو تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے ان کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ان دونوں عمارتوں میں سے دربار صاحب امرتسر کو ایک خاص مذہبی حیثیت حاصل ہے۔ اس عمارت تک پہنچنے کیلئے زمین کی سطح سے نیچے اُترنا پڑتا ہے۔ یہاں ایک تالاب ہے جسے سکھ بہت متبرک مانتے ہیں۔ اس تالاب کے بیچ میں دربار صاحب کی عمارت ہے۔ جس کی آرائش سونے اور سنگ مرمر اور قسم قسم کی قیمتی چیزوں سے کی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے مثلاً انگریز ادیب آلڈس ہکسلے نے لکھا ہے کہ دربار صاحب کی عمارت فنِ تعمیر کا اچھا نمونہ نہیں ہے۔ اس قسم کے نکتہ چیں یہ بھول جاتے ہیں کہ دربار صاحب کے ساتھ تمام سکھ دنیا کا روحانی ضمیر بندھا ہوا ہے۔ یہ عمارت دنیا داروں کو خوش کرنے کیلئے نہیں بنائی گئی۔ یہاں واہگورو کے جیکارے بلند ہوتے ہیں اور گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہوتا ہے۔

سکھوں کی دوسری عمارت لاہور میں ہے اور رنجیت سنگھ کی سمادھ کے نام سے مشہور ہے۔ اس عمارت میں ہندو اور مسلمان طرز تعمیر کی ملاوٹ ہے۔ اگرچہ برجیوں اور کنگروں کی کثرت صاف طور پر ہندوؤں کے فنِ آرائش کی یاد دلاتی ہے۔ اس کا پچکا ہوا گنبد بھی مغلیہ گنبدوں سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ چھتوں میں اندر کی طرف چھوٹے چھوٹے آئینے لگے ہوئے ہیں۔ درمیانی گنبد میں کنول کا وہ پھول جو سنگ مرمر تراش کر بنایا گیا ہے۔ رنجیت سنگھ کی قبر کا نشان بنا رہا ہے۔

پنجاب کے لوگ اس عمارت کو عقیدت اور دلچسپی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے اندر پنجاب کے آخری دیسی حکمران کی راکھ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے اور یہی اس عمارت کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

فنِ تعمیر کی خوبیوں کیلئے ہمیں مغلوں کے عہد کی طرف دیکھنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کی تاریخی عمارتوں کا سب سے پہلا اور سب سے شاندار دور سولہویں صدی سے شروع ہوا اور اٹھارہویں صدی کے قریب ختم ہو گیا۔ اس دور کی سرگرمیوں کا مرکز شروع سے لے کر آخر تک لاہور کا شہر تھا۔ جن عمارتوں کے مٹتے ہوئے آثار پنجاب کے دوسرے حصوں مثلاً شیخوپورے یا کانگڑے میں ملتے ہیں، اُن کو لاہور کی عمارتوں سے کوئی نسبت نہیں۔

فنونِ لطیفہ میں فنِ تعمیر کی حیثیت بالکل انوکھی ہے۔ جب

بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔

تک سیاسی قوت قوم کے ہاتھ میں نہ ہو تعمیر کا فن ترقی نہیں کر سکتا۔ مثلاً شاعر کیلئے یہ ممکن ہے کہ بادشاہ کی سرپرستی کے بغیر "مسدس حالی" کے نام سے کوئی نظم لکھ دے۔ لیکن معمار یہ نہیں کر سکتا کہ تن تنہا اٹھے اور لاہور کے پہلو میں کوئی بادشاہی مسجد کھڑی کر دے — دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ عمارتوں کی تعمیر کیلئے سیاسی طاقت اور فنونِ لطیفہ کے پاکیزہ ذوق کا ملاپ ضروری ہے جب تک کسی ملک کے حکمرانوں کا ذوق ایک خاص لطافت کو نہ پہنچ جائے۔ اُس وقت تک اچھا فن تعمیر پیدا نہیں ہو سکتا۔

پنجاب کی تاریخ میں مغل بادشاہوں سے پہلے یا بعد کبھی کسی حکومت نے فنِ تعمیر پر اس قدر توجہ نہیں دی۔ کسی شام چل کر راوی کے پل پر کھڑے ہو جیئے۔ اور پچھم کی طرف نظر دوڑائیے۔ شفق کی سرخی پانی میں جھلک رہی ہے۔ لیکن اِس سے اوپر دریا کے شمالی کنارے پر ایک تنہا عمارت اپنی ویرانی کے باوجود زمین میں اپنے پیر مضبوطی سے جمائے آپ کو گھور رہی ہے۔ یہ لاہور کی سب سے پہلی مغلیہ عمارتوں میں سے ہے۔ جو دلکشا باغ اس کے ساتھ شامل تھا اس کو دریا کی موجیں بہا لے جا چکی ہیں۔ یہ ٹوٹی پھوٹی مضبوط، مٹتی ہوئی پُرغرور عمارت ہمایوں کے بھائی مرزا کامراں کی بارہ دری ہے۔

مرزا کامراں پہلا مغل حاکم تھا جس کے طفیل پنجاب کو خوبصورت باغ اور عمارتیں نصیب ہوئیں۔ لیکن اس کی بنائی ہوئی یہ بارہ دری مغلیہ طرز تعمیر کے بجائے پٹھانوں کے عہد کی عمارتوں کی یاد دلاتی ہے۔ دہلی جا کر اگر پٹھانوں کی بنائی ہوئی عمارتوں کو دیکھیئے تو اُن میں ایک ایسی کیفیت نظر آئے گی جو انہیں مغلوں کی عمارتوں سے صاف طور پر الگ کر دیتی ہے۔ پٹھانوں کی بنائی ہوئی عمارتوں میں ایک سختی اور رفعت اور ہیبت ایسی نظر آتی ہے جس کی جھلک اگرچہ مغلیہ عمارتوں میں بھی موجود ہے تاہم وہاں اس رعب و جلال کے ساتھ ساتھ حسن اور لطافت کے نقش بھی کچھ کم نمایاں نہیں ہیں۔ مرزا کامران کی بارہ دری میں آپ کو صرف افغانی تعمیر کی سختی اور سنگینی نظر آتی ہے۔ اس کی دیواریں بہت موٹی اور ٹھوس ہیں۔ یہی کیفیت چھتوں کی ہے۔ لکڑی پوری عمارت میں کہیں استعمال نہیں ہوئی۔ محرابوں میں ایک دبدبہ ہے اور ان کی گولائی میں نرمی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ اِس عمارت کو اپنے آپ پر اس قدر بھروسہ ہے کہ آپ یہ گستاخی کبھی نہیں کر سکتے کہ اس کی ویرانی پر رحم کھائیں یا ہمدردی کے آنسو بہائیں۔

لیکن ذرا تھوڑی دور شمال کو چلیئے۔ یہاں آپ کو ایک اور مغلیہ عمارت، ایک صدی بعد کی بنی ہوئی ملے گی۔ یہ نور جہاں بیگم کا مقبرہ ہے۔ اب مرزا کامران کے طرز تعمیر کی سختی اور درشتی کو ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یہاں ہر چیز سبک، ہر چیز نرم اور لطیف ہے۔ اس مقبرے کو سلطنتوں کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بہت سے صدمے دیکھنے پڑے ہیں۔ مقبرے کا ہشت پہلو گنبد اب غائب ہے۔ اندر سنگ مرمر کا فرش اور باہر سنگ ابری، سنگِ مرمر اور سنگِ زرد وغیرہ طرح طرح کے قیمتی پتھر جو لگے ہوئے تھے۔ اب کہیں نظر نہیں آتے۔ عمارت کی صرف ایک منزل ہے۔ لیکن اس سادگی میں بھی نفاست کی ایک شان پائی جاتی ہے۔ عمارت کے چاروں طرف بیچ میں ایک بڑی محراب ہے۔ جس کے دونوں طرف تین تین چھوٹی محرابیں ہیں۔ عمارت کے وسط میں ایک چبوترہ ہے جو نور جہاں اور اس کی بیٹی لاڈلی بیگم کی آخری خوابگاہ کا نشان دیتا ہے۔

اب نور جہاں بیگم اور آصف جاہ کے مقبروں کے درمیان ریل کی پٹڑی گزرتی ہے۔ مگر پچھلی صدی تک یہ مقبرے ملے ہوئے تھے۔ آصف جاہ کے مقبرے کا گنبد لاہور کے سب سے خوبصورت گنبدوں میں سے ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ آصف جاہ کی بیٹی کیلئے تاج محل کھڑا کرنے میں شاہجہاں نے اپنی بہترین محبت صرف کی۔ لیکن خود آصف جاہ کے لئے اس کے دل میں شکر گزاری کے جو جذبات تھے اُن کی تفسیر یہی یادگار یہ مقبرہ ہے۔ یہ آصف جاہ ہی کی ہمت اور تدبیر تھی کہ شاہجہاں کو ہندوستان کے تخت پر بیٹھنا نصیب ہوا۔ چنانچہ جب آصف جاہ مرا تو شاہجہاں نے حکم دیا کہ اُسے جہانگیر کے پہلو میں جگہ دی جائے اور اس کی تربت پر ایک ایسا گنبد تعمیر کیا جائے جو اس کے نام کی طرح بلند اور اس کے کارناموں کی طرح بے عیب ہو۔ یہ مقبرہ فرش سے لے کر گنبد تک سنگ مرمر کا تھا۔ بعد کے انقلابوں نے سنگ مرمر کا ایک ٹکڑا اس پر نہ چھوڑا۔ لیکن پھر بھی شاہ جہاں کی شکر گزاری نے جو حسن اس گنبد کو دیا تھا۔ وہ آج تک قائم ہے۔ ننگی اینٹوں کے اس گنبد کی چوٹی پر اب اکثر گدھ بسیرا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے لاجواب سڈول پن میں ایک

ایسی کیفیت ہے کہ بار بار دیکھئے تب بھی دل سیر نہیں ہوتا - آصف جاہ کے مقبرے کے گنبد سے بہتر گنبد پنجاب نے پھر کبھی نہیں دیکھا - مقبرے کی بیرونی دیواروں پر اب بھی منبت کاری کے رنگین ٹکڑے جو زمانہ کے ہاتھ سے بچ رہے ہیں- کہیں کہیں نظر آتے ہیں- ان کا رنگ و روغن اب بھی ایسا نکھرا ہوا معلوم ہوتا ہے جیسے آج ہی بنے ہیں-

آصف جاہ کے مقبرہ سے مشرق کی طرف بالکل ملا ہوا جہانگیر کا مقبرہ ہے - جہانگیر کو نور جہاں بیگم نے اس کی وصیت کے مطابق اپنے "باغ دلکشا" میں دفن کیا تھا - اور مقبرے کی تعمیر شاہجہاں نے کرائی تھی - پنجاب میں اس سے خوبصورت مقبرہ اور کہیں نظر نہیں آتا - مغلیہ طرز تعمیر کی تمام خصوصیتیں اپنی پوری پاکیزگی کے ساتھ یہاں جمع ہیں- عالیشان مینار سڈول برجیاں گنبد نما دروازہ نوک دار محراب، سنگ مرمر کی جالی، دیواروں پر مینا کاری کے نقش، باغ اور فوارہ کوئی چیز جو اس کی زینت بڑھا سکتی تھی چھوڑی نہیں گئی -

جب مقبرہ کی تعمیر ہو گئی تو شاہجہاں نے لاکھوں روپے کے سامان، جھاڑ فانوس فرش اور شامیانوں سے اسے سجایا لیکن جوں ہی مغلیہ حکومت کا اثر جاتا رہا نہ صرف یہ سب چیزیں رخصت ہو گئیں بلکہ سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی بیشمار سلیں بھی اکھاڑ لی گئیں مقبرے کی منڈیروں پر سنگ مرمر کی جو جالیاں تھیں ان پر بھی یہی بپتا پڑی - ان سب صدموں کے باوجود یہ عمارت اب بھی اپنی دلکشی اور خوبصورتی میں بعض لوگوں کے نزدیک صرف تاج محل سے دوسرے درجہ پر ہے -

مقبرہ سرخی مائل پتھر کے ایک بہت بڑے مربع چبوترے پر بنایا گیا ہے - چبوترے کے چاروں طرف وسط میں سنگ سرخ کے زینے ہیں- مقبرے کی دیواریں بھی سنگ سرخ کی ہیں- بادشاہ کی قبر کے چاروں طرف چالیس محراب دار حجروں کا حلقہ ہے - محرابوں کی ہر قطار میں وہی بانکپن نظر آتا ہے - جو مغلیہ محراب کی خاص نشانی ہے - اس عمارت کے بالکل وسط میں سنگین جالی کے کٹہروں کے پیچھے سنگ مرمر کا وہ تعویذ ہے - جس کے نیچے جہانگیر کا مرقد ہے - تمام مغل شہنشاہوں میں جہانگیر کو لاہور سب سے زیادہ پسند تھا - چنانچہ مرکر بھی اس نے لاہور کو اپنے فیض سے محروم نہیں کیا -

لیکن جہانگیر کا باپ اکبر بھی اپنے زمانے میں لاہور کی قدر بہت کچھ بڑھا چکا تھا - ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء تک اکبر نے لاہور ہی کو اپنا صدر مقام بنائے رکھا - لاہور کا قلعہ اس نے اسی زمانے میں بنوایا - شہر کے اندر جو عمارتیں اکبر کے عہد میں بنیں - ان کے نشان تک اب کہیں نہیں ملتے - ابوالفضل کا شاندار مکان فضل آباد راجہ ٹوڈر مل اور راجہ بھگوان داس کے محل وہ عظیم الشان محل جہاں عبدالرحیم خانخاناں پیدا ہوا - اور بہت سی دوسری عمارتیں اب محض خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں - البتہ شاہجہاں کے زمانے کے بنے ہوئے بعض مکانات اب بھی کسی حد تک موجود ہیں مثلاً حویلی میاں خاں جو نواب سعداللہ خاں کے مکان کا موجودہ نام ہے - یا پری محل ، جو نواب وزیر خاں کے مکان کا ایک حصہ ہے - مگر نواب وزیر خاں کی صحیح یادگار اس کی بنائی ہوئی عظیم الشان مسجد ہے - یہ مسجد شہر کی گنجان آبادی سے گھری ہوئی ہے - اس لئے اکثر لوگوں کو اس کی بہت سی خوبیاں نظر نہیں آتیں - دراصل اس کا شمار پنجاب کی چار یا پانچ بہترین تاریخی عمارتوں میں ہونا چاہیئے - اس کی پشت کی مغربی دیوار بہت مشہور ہے - چھوٹی اینٹ کی بنی ہوئی دیوار ہے - لیکن سطح اتنی سپاٹ - جیسے پتھر کی ایک ہی عظیم الشان سل کھڑی کر دی گئی ہو - اس سے کہیں زیادہ حیرت انگیز اس کی دیواروں کے اندر کے نقش و نگار ہیں - اس لحاظ سے پنجاب تو کیا ہندوستان بھر میں شاید ہی کوئی عمارت اس کی برابری کا دعویٰ کر سکے - ان رنگوں کی چمک اب تک اسی طرح قائم ہے - جیسے مصور ابھی کام سے فارغ ہو کر باہر نکلے ہیں - صرف سولھویں صدی کے اطالوی مصور دیواروں پر اس قسم کے رنگین نقش و نگار دکھا سکتے تھے -

شہر کے شمال میں لاہور کا قلعہ ہے - جو اکبر اور جہانگیر کی یاد تازہ کرتا ہے - اس قلعے کی دیوار اس قدر مضبوط اور اونچی اور چوڑی ہے کہ اس کی چوڑائی پر توپوں کا ادھر ادھر لے جانا بالکل آسان ہے - اس کے بڑے دروازوں میں سے کسی ایک کے سامنے کھڑے ہو جائیے - تو اس کی اونچائی اور بڑائی کو دیکھ کر دل پر ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی ہے - کہتے ہیں کہ مغلوں کے دل بہت بڑے تھے - اس لئے ان کی عمارتوں میں بھی وہی بڑائی اور فراخی جھلک دکھاتی ہے - یہ قلعہ اور اس کا عظیم الشان پھیلاؤ اس قول کی

بڑی اچھی مثال ہے۔ لیکن اس سے بھی اچھی مثال قلعے سے مغرب کی طرف اورنگ زیب کی جامع مسجد ہے۔ قلعہ پھر بھی قلعہ ہے لیکن بادشاہی مسجد کی فراخی اور وسعت کو دیکھ کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ عمارت نہیں۔ اینٹ پتھر میں ایک معجزہ دکھایا گیا ہے۔ رعب اور لطافت، ہیبت اور خوبصورتی کا میل شاید ہی کسی عمارت میں اس طرح نظر آیا ہو۔ دہلی کی جامع مسجد کا بانکپن ضرور دیکھنے والوں کے دلوں پر جادو کا کام کرتا ہے۔ لیکن بانکپن کے ساتھ خوف اور ہیبت اور دبدبہ صرف لاہور کی بادشاہی مسجد انسان کی حیرت زدہ نظروں کے سامنے لاتی ہے۔ اس کے میناروں اور گنبدوں کو کسی وقت چاندنی رات کی خاموشی میں دیکھئے۔ اس وقت وہ خواب کی دنیا کے خیالی نقش معلوم ہوتے ہیں۔ جن کا ہماری مادی دنیا میں کوئی حقیقی وجود نہیں۔ لیکن ہمارے ذہن کا ایک ہی جھٹکا انہیں پھر واقعات کی دنیا میں لے آتا ہے اس وقت وہ زندہ چیزیں بن جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہماری روح کیلئے آسمان سے کوئی پیغام لائیں گے۔ مسجد تعمیر کرنے والوں کا یہ بہت بڑا کمال ہے۔

لاہور کے جنوبی اور مشرقی علاقوں میں جو تاریخی عمارتیں ہیں۔ اُن میں سے اکثر کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ انارکلی کا مقبرہ ذرا اچھی حالت میں ہے۔ انارکلی کے مقبرہ سے ایک آدھ میل آگے بڑھ جائیے تو لاہور کی جنوبی حد پر وہاں پہنچنے میں جہاں کبھی زیب النساء بیگم کا بہت بڑا وسیع باغ پھیلتا چلا گیا تھا۔ یہاں اب باغ کا صرف ایک خوبصورت دروازہ نظر آتا ہے جس کو آجکل چوبرجی کہتے ہیں۔ اس دروازے کی دو منزلیں ہیں جن کی مینا کاری کے رنگ اب بھی قدرت کے رنگوں کو شرماتے ہیں۔ اس کے بعد مغلوں کی کسی عمارت نے یہ آب و تاب نہیں دکھائی۔

حمید احمد خاں

ساقی سے خطاب

سازِ چھیڑا ہے ننھی بوندوں نے
کالی کالی وہ بدلیاں چھائیں
جھولیاں بھر کے مستیاں لائیں
پھر نصیبوں سے ایسی برساتیں
کیف و رومان سے بھری راتیں
میرے خوابوں کی ہیں یہ تعبیریں
میرے جذبات کی ہیں تصویریں
پھر بہار آئی، چاک داماں ہوں
اپنی توبہ پہ پھر پشیماں ہوں
میری توبہ کا کچھ خیال نہ کر
میرے جذبات پائمال نہ کر
مجھ کو ساقی شراب پینے دے
اور دو چار روز جینے دے
سازِ چھیڑا ہے ننھی بوندوں نے

تاثیر قریشی

غزل

اب سمجھا ہے اب جانا ہے / بیگانہ پھر بیگانہ ہے

وہ کہتے ہیں دیوانہ ہے / جن کو اہلِ دل جانا ہے

یہ مجبوری پر مجبوری / خاموشی بھی افسانہ ہے

یہ پھولوں کی رُت یہ آنسو / فطرت ہی کچھ غم کھانا ہے

کتنی ہی آسیں ٹوٹی ہیں / ابتک اتنا ہی جانا ہے

تسکینِ دل کہئے جس کو / افسانہ ہی افسانہ ہے

اُن کا افسانہ ہے میں ہوں / میں ہوں اُنکا افسانہ ہے

کیسی صبحیں کیسی شامیں / رونا ہے یا رُلوانا ہے

تیرے کارن تیرے باعث / تیرے غم کو غم جانا ہے

دُنیا ہنسنے والی دُنیا

رونے والا دیوانہ ہے

سحر رامپوری

بھابی دُلہن

افرادِ تمثیل

شمن ———— میاں (بار ایٹ لا)
دلہن ———— بیوی (پرانے زمانہ کی ایک لڑکی)
بدر میاں ———— دیور (کالج سٹوڈنٹ)
پھپی اماں ———— ساس (شمن کی والدہ۔ ایک بڑی بوڑھی)
آیا ————

پھپی امّاں:- دلہن۔ بیٹی بارہ بجنے والے ہیں۔ بس اب سو جاؤ۔

دلہن:- جی ہاں۔ سو جاؤں گی۔

پھپی اماں:- مگر تم اب تک جاگ کیوں رہی ہو؟

دلہن:- میری تقدیر۔

پھپی اماں:- آخر کوئی وجہ؟

دلہن:- کچھ نہیں۔

پھپی اماں:- میں سمجھی نہیں تمہارا مطلب کیا ہے۔ بولو، کچھ تو کہو، چپ کیوں ہو؟ آخر اس خاموشی سے تمہارا مقصد؟ منہ میں گھنگنیاں بھر کے کیوں بیٹھ گئیں؟ . . . . لے جواب دو۔

دلہن:- کیا کہوں؟ پھپی اماں کچھ بات ہو تو کہوں بھی۔

پھپی اماں:- تو پھر تم اب تک سوئیں کیوں نہیں؟

دلہن:- اس لئے کہ نیند نہیں آئی۔

پھپی اماں:- یہ کوئی معقول عذر نہیں۔

دلہن:- پھپی امّاں آپ مفت میں کیوں پریشان ہوتی ہیں

پھپی امّاں:- اُوئی نوج۔ پریشان ہوں میرے اور تمہارے دشمن۔ میں تو نماز پڑھ کر وظیفہ ختم کرکے جو اُٹھی تو خیال آیا کہ بچوں کو ایک نظر دیکھتی جاؤں۔ رات کو سوتے میں کھل جاتے ہیں آج کل دن ویسے ہی خراب ہو رہے ہیں۔ اللہ بچائے بری گھڑی سے۔ یہاں آکر تمہیں دیکھا کہ جاگ رہی ہو۔ میرا دل یہ گوارا نہیں کرتا کہ گھر میں بہو تو رات آنکھوں میں کاٹے اور میں ساس ہو کر جھوٹے منہ بھی نہ پوچھوں؟ لہٰذا بیٹی اب آرام کرو تاکہ ہم بھی سکھ کی نیند سو سکیں۔

دلہن:- گستاخی معاف پھپی امّاں۔ جس دن سے آپ کے صاحبزادے کے پلّے بندھی ہوں میری تقدیر کا آرام تو اُسی دن سے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکا۔ جو لکھے پورے ہونے ہیں وہ تو ہو کر رہیں گے۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ مگر . . . . مگر خیر آپ تو آرام کیجئے۔ پھپی اماں جائیے آپ سو جائیے۔ میری خاطر بے آرام نہ ہوں آپ۔

پھپی امّاں:- میرے آرام اور بے آرامی کا تو خیال کرو نہیں لیکن تمہاری گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید شمن نے کچھ کہہ سن دیا ہے۔ آج تو غالباً صاحبزادے شکار کھیلنے تشریف لے گئے ہیں۔ کل تک آ جائینگے تو دیکھنا تمہارے سامنے بٹھا کر وہ خبر لوں کہ یاد ہی کریں۔ واہ صاحب واہ! . . . . سبحان اللہ پرائی بچی کو میں کس برتے پر بیاہ کر لائی تھی! بڑے آئے شکار کھیلنے والے!

دلہن:- شکار کھیلنے؟

پھپی اماں:- ہاں آج کل بہت شوق چرّا رہا ہے۔ میرے خیال میں تو شکار ہی کھیلنے گئے ہیں

دلہن:- پھپی اماں مجھ سے تو کہا تھا کہ میں ڈاکٹر پران ناتھ کے ہاں برج کھیلنے جاؤں گا۔

(ننھی کے رونے کی آواز اکثر آتی رہتی ہے۔ آیا بہلاتی بہلاتی اتنے میں یہاں پہنچ چکی ہے)

آیا:- بیگم صاحبہ! جب میں سودا لے کر آ رہی تھی تو بخّو نے کہا کہ آج تو نواب صاحب کے ہاں صاحب شطرنج کھیلنے جائیں گے۔ ان کا آدمی چٹھی لے کر آیا تھا۔

دلہن:- پھپی اماں ملاحظہ کیا آپ نے، دنیا سے نرالا وطیرہ اختیار کر رکھا ہے انہوں نے۔ آپ کہتی ہیں شکار کھیلنے گئے ہوں گے۔ مجھ سے انہوں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر پران ناتھ کے ہاں جانا ہے۔ کئی دن سے برج کھیلنے کو بلا رہے ہیں"۔ میں نے اعتراض کیا تو کہنے لگے۔ "تمہارے دماغ میں تو ایک وقت میں ایک خیال آتا ہے۔ ڈاکٹروں سے بگاڑ کر رکھنا کس خدا نے بتایا ہے"۔ ڈاکٹر پران ناتھ کے ہاں بھی چلے جاتے تو تھوڑی دیر کے لئے صبر آجاتا۔ لیکن اب آیا کی زبانی معلوم ہوا کہ شطرنج کی خاطر نواب صاحب کا پرچہ آیا تھا۔ اور میرے خیال میں تو صبح تک کچھ اور ہی گل کھلتا دکھائی دیتا ہے۔ نہ تو یہ شکار کھیلنے گئے ہیں نہ ڈاکٹر پران ناتھ کے ہاں اور نہ نواب صاحب کے ہاں۔ یہ کہیں اور ہی پہنچے ہیں۔

پھپی اماں:- خیر دلہن تم اس وقت ان باتوں کا اپنی طبیعت پر زیادہ اثر نہ لو۔ خواہ مخواہ رات کالی ہوگی۔ صبح ہونے دو میں خود سمجھ لوں گی۔ تم سو جاؤ۔

دلہن:- بچی گھر میں بیمار پڑی ہے۔ حکیم ڈاکٹر سبھی سے یارانہ دوستانہ ہے ایک ذرا ٹیلیفون کر دیتے تو کیا ہوجاتا۔ بدر میاں ہیں، انہیں اپنے کالج کی مصروفیت اور تفریحات سے فرصت نہیں۔ نوکر کے ساتھ بچی کو میں بھیجنا مناسب نہیں سمجھتی۔ کاش کہ آج کل کی عورتوں کی طرح بے پردہ ہوتی تو موٹر میں بٹھا کر ڈاکٹر کو خود دکھا کے بچی کی دوا لے آتی۔ ان کی محتاجی سے تو پنڈ چھوٹتا۔ ۔ ۔ ۔ ایک وہ ڈرامہ "ننھی کی اماں" لکھ کر میری سات پشت پر احسان کیا تھا ہم بڑے چاؤ سے سننے بیٹھے کہ ریڈیو والے ہمارے میاں کا ڈرامہ کر رہے ہیں۔ پھپی اماں خدا کی قسم اس میں بہت سی کیا تقریباً تمام باتیں، گفتگو، الفاظ، واقعات وہ تھے جو روزانہ میرے اُن کے درمیان ہوتے رہتے ہیں۔ دن چڑھے اُٹھنا، میری ہر بات پر اعتراض کرنا۔ اے بی سی ڈی پڑھانا، ننھی کا اُٹھ بیٹھنا، چائے کا دیر سے پینے کی وجہ سے ٹھنڈا ہونا، حسینہ خدیجہ کا آنا، آئے گئے کے سامنے میرا پھوہڑپن اُگلنا، سب باتیں یوں کی یوں ہی تھیں۔ خیر ڈرامے کو میں خون کے سے گھونٹ پی کر سنتی رہی مگر ادھر اُدھر دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرے سوا کوئی اور دنیا میں نہیں سن رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ لیکن دوسرے دن حسینہ خدیجہ آئیں اور کہا کہ "ہم نے آپ کے میاں کا لکھا ہوا ڈرامہ رات کو سنا۔ گھر کی زندگی پر بہت خوبصورتی سے نہایت عمدہ اور سلیس پیرایہ میں "روشنی" ڈالی ہے۔ ۔ اب میں اُن سے لاکھ انکار کر رہی ہوں کہ واہ میرے میاں نے تو آج تک کوئی ڈرامہ نہیں لکھا اور تم "روشنی" ڈالنے کو کہہ رہی ہو۔ مگر انہوں نے اول سے آخر تک تمام رام کہانی کہہ سنائی اور کہا کہ اب چھپانے سے کیا فائدہ۔ پھپی اماں میں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی کیا کرتی؛

پھپی اماں:- اے ہے دلہن! مجھے یاد ہے شمن نے ایک دفعہ کہا تھا کہ جو کچھ ریڈیو والے بولتے ہیں۔ اس کی آواز تمام دنیا میں جاتی ہے۔ اور جہان سنتا ہے۔ بھئی ہمیں تو یہ بات پسند نہیں کہ گھر کی بات باہر جائے اور وہ بھی اس طرح کہ دنیا سنے؛

دلہن:- پھپی اماں! میاں نے کہیں نہ سُن لیا ہو وہ تو میرے فضیحتے کر ڈالینگے

پھپی اماں۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ شمن نے اس قسم کی احمقانہ حرکت کی ہو۔ آخر کو ولایت سے پڑھ کر آیا ہے۔

دلہن:- اس ولایت نے تو رہا سہا بھی کھو دیا۔ ان کا بس چلے تو وہ مجھے "پالٹیوں" میں بے پردہ لئے پھریں۔ "پالٹیوں" میں۔

پھپی اماں۔ ہاں بیٹا اس زمانے کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔

دلہن۔ اور یہ تو نہایت ادنےٰ بات خیال کی جاتی ہے کہ میاں بیوی اللہ رکھے سیر تفریح کو جب باہر نکلے تو پر قینچ بیوی موٹر چلا رہی ہیں۔ میاں پاس بیٹھے ہیں۔ سگریٹ نکال کر ایک بیوی کے منہ میں دیا اور ایک اپنے مُنہ میں لیا اور سینما بائیسکوپ کی باتیں کرتے ہوئے 'پوم پوم' کرتے چلے جا رہے ہیں، لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اُٹھ رہی ہیں۔ جس سے میاں کا دم خشک ہو رہا ہے اور بیوی کا خون چلوؤں بڑھ رہا ہے۔

پھپی اماں:- اے بیٹا ہمیں اس سے کیا۔ دنیا جہنم کی طرف جا رہی ہے تو جانے دو ہم تو یہ کہتے ہیں کہ خود میں کوئی خامی نہ ہو بس۔

دلہن:- یہ خامی اور نقص نہیں تو اور کیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

پھپی اماں:- یعنی یہ کہ ۔ ۔ ۔ ۔

دلہن:- (جلدی سے) آپ کے صاحبزادے بلند اقبال کی یہ حرکت کس حد تک درست تھی کہ اپنی گھریلو زندگی کو "اُلم نشرح" کر کے اپنی شریک حیات کے لئے دنیا میں منہ دکھانے کو جگہ نہ چھوڑیں؛

پھپی اماں:- مگر یہ کیسے یقین کر لوں کہ شمن نے ۔

دلہن:- (جلدی اور تیزی سے) یہ نازیبا حرکت کی اور ضرور کی "ننھی کی اماں"

ڈرامہ لکھا اور ضرور لکھا۔ وہ ریڈیو والوں نے کیا اور ضرور کیا۔ دنیا نے سنا۔ گھر کی بات باہر پہنچی۔ میں کہیں کی نہ رہی اور قطعی نہ رہی۔

پھپھی اماں:۔ دلہن تم بھی حسینہ اور خدیجہ کے کہنے میں آگئیں، وہ کالج کی لونڈیاں تمہیں بیوقوف بنا گئیں۔

دلہن:۔ اچھا تو بدر میاں سے دریافت کروائے دیتی ہوں۔

پھپھی اماں:۔ ہاں یہ بات مانی

دلہن:۔ میں جاکر بات کرتی ہوں، آپ ذرا چھپ کر سنئے گا۔

پھپھی اماں:۔ لے بیٹی تم بھی مجھے سکھاتی ہو؟

دلہن:۔ برابر والے کمرے میں بدر میاں سو رہے ہیں انہیں جگاکر تمام باتوں کی تصدیق کرائے دیتی ہوں۔

پھپھی اماں:۔ مگر دلہن۔ اُس کی پڑھائی کے دن ہیں۔ پہلے ہی دبلا ہو رہا ہے سیپی سائنہ نکل آیا ہے نیکبخت کا۔ سوتے کو نہ جگاؤ صبح معلوم ہو جائیگا، ایسی جلدی کیا ہے؟

دُلہن:۔ نہیں پھپھی اماں! میں یہ چاہتی ہوں کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی اسی وقت ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ پھر بات کھٹائی میں پڑ جائے گی۔
(روانہ ہوتے ہوئے) آپ کواڑ کے پاس ......

پھپھی اماں:۔ (بات کاٹ کر) دلہن! سنو تو!! ...

دلہن:۔ (جاتے ہوئے) پردے کے پیچھے سے سب کچھ سن لیجئے گا (چلی جاتی ہے)

پھپھی اماں:۔ (اپنے آپ سے) آگ لگے میں بھی کس جھکنڈان میں پڑی۔ (دلہن سے) دلہن، بیوی تم جانو اور تمہارا کام۔ میرے بڑھاپے کی ہڈیوں میں اب اتنا دم نہیں کہ آدھی رات کو تمہارے قصے لے کر بیٹھوں اور تصفیہ کراتی پھروں (آپا کو آواز دیتی ہے) آپا ... ! آپا ... !

آپا:۔ جی بیگم

پھپھی اماں:۔ صراحی اور کٹورا سرہانے کی تپائی پر رکھ دو۔ میں سونے جارہی ہوں

(دوسرے کمرے میں)

دلہن:۔ (دور سے پکارتی ہوئی آتی ہیں) بدر میاں! ... بدر میاں!! ... اے بدر میاں!!! ... بدر ... م ... (سرہانے کی میز سے اندھیرے میں ٹھوکر کھاتی ہیں بہت لمبی "اُوئی" منہ سے نکلتی ہے میز پر رکھا ہوا شیشے کا گلاس گر کر چُور چُور ہو جاتا ہے) توبہ ہے بدر میاں۔ کہاں کی نیند سوار ہے! ــــ بدر میاں اُٹھ چکو!! چور ... چور! ابھی اُٹھو چور!! بدر میاں چور!!!

بدر:۔ (گھبرا کر) کہاں؟ ... کون؟ ... کیا؟ ... ہیں؟ (جلدی سے) بائیں ہاتھ کو بجلی کا (Switch) سوئچ ہے۔ ٹھہرئیے میں جلاتا ہوں (بجلی جلا کر اور ذرا سنبھل کر) بھابی دلہن آپ بھی کمال کرتی ہیں۔

دلہن:۔ سچ مچ، بدر میاں چور!

بدر:۔ خواہ مخواہ کا الزام، میں غافل پڑا سو رہا ہوں۔ لیکن آپ ایک سال کہے چلی جا رہی ہیں (بھابی دلہن کی نقل کرتا ہے) بدر میاں چور! بدر میاں چور!!

دلہن:۔ تو تم بھی ایسے گھوڑے بیچ کر سوتے ہو کہ اگر واقعی کوئی خدا نہ کرے گھر میں گھس آئے تو ... ؟

بدر:۔ میرا کیا لے جائیگا، کتابیں پڑی ہیں۔ میں نہ پڑھونگا وہ پڑھ لے گا۔

دلہن:۔ لیکن ہمارے دل سے تو پوچھو۔

بدر:۔ میں کسی کے دل کی بات نہیں پوچھا کرتا اور نہ اپنے دل کی کسی کو بتاتا ہوں۔

دلہن:۔ بکو مت۔ ذکر چور کا تھا۔

بدر:۔ معاف کیجئے گا، چور کا نہیں۔ بدر چور کا

دلہن:۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔

بدر:۔ ممکن ہے میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہو۔

دلہن:۔ کج بحثی کو چھوڑو۔ میں تم سے ایک بات پوچھنے آئی ہوں اور تمہیں بتانی پڑے گی۔ وہ یہ کہ

بدر:۔ (بات کاٹ کر بول اٹھتا ہے) بدر میاں چور ہیں یا نہیں؟

دلہن:۔ (ڈانٹ کر) بدر!

بدر:۔ جی والا قدر!

دلہن:۔ دنیا میں ادب بھی کوئی چیز ہے۔ (سنجیدگی سے)

بدر:۔ سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ (سنجیدگی سے)

دلہن:۔ یہ تو سب جانتے ہیں۔

بدر:۔ تو وہ بھی سب جانتے ہیں

دلہن:۔ لیکن تم نہیں جانتے۔ پڑھے لکھے جاہل ہو۔

بدر:۔ آپ خفا نہ ہوں ــــ جو کچھ دریافت کرنا ہے کر لیجئے تاکہ میں سو جاؤں صبح سے امتحان شروع ہے

دلہن:۔ امتحان گیا چولھے میں۔ یہ بتاؤ کہ "ننھی کی اماں" کس کی ایجاد ہے؟

بدر:۔ اللہ میاں کی۔

دلہن:۔ پھر وہی! ۔۔۔ میں یہ پوچھتی ہوں کہ "ننھی کی اماں" کو ۔ ۔ ۔ ۔

بدر:۔ کس نے پیدا کیا؟

دلہن:۔ پیدا کیا نہیں، کس نے لکھا۔

بدر:۔ کس نے لکھا؟ (آہستہ آہستہ) ننھی کی اماں ۔ ۔ ۔ کو ۔ ۔ ۔ کس ۔ ۔ نے لکھا (دلہن سے) آپ کا مقصد اس ڈرامے سے ہے۔ جس کا نام "ننھی کی اماں" تھا؟

دلہن:۔ ہاں ہاں! وہی!

بدر:۔ (جلدی کہتا ہے) وہ جو ریڈیو سٹیشن سے January last میں براڈ کاسٹ ہوا تھا؟

دلہن:۔ "جینولاش[1]" نہیں، ننھی کی اماں جو ہوا تھا اس کو کہہ رہی ہوں۔

بدر:۔ اور میں نے کیا کہا تھا؟ ۔۔۔ خیر تو ۔ ۔ ۔

دلہن:۔ وہ کس نے لکھا تھا؟

بدر:۔ وہ جو مارچ میں دوبارہ بھی ہوا تھا؟

دلہن:۔ (انتہائی حیرت سے) اے تمہیں خدا کی قسم! دوبارہ بھی کیا گیا؟ یہ تمہارے بھائی صاحب کی حرکت تھی۔

بدر:۔ بھائی صاحب پر تو آپ کا لہا ہمیشہ تیز ہی رہتا ہے۔ حالانکہ قصور ریڈیو والوں کا ہے کہ اچھے اچھے ڈرامے براڈ کاسٹ کیوں کرتے ہیں۔ کیوں بھابی دلہن۔ ٹھیک ہے نا؟

دلہن:۔ مگر یہ لکھا کس نے تھا؟

بدر:۔ کسی دل جلے کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

دلہن:۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ وہ دل جلا یا دل چلا کون ہے۔ مگر میں (جما کر) "تمہارے" منہ سے سننا چاہتی ہوں۔

بدر:۔ میرا کیا منہ کہ بڑی بھاوج کو کچھ سناؤں۔

دلہن:۔ کیوں کیوں؟ خیر تو ہے؟

بدر:۔ چھوٹا منہ اور بڑی بھاوج

دلہن:۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات تو ہم بھی جانتے ہیں۔ لیکن یہ میری بات کا تو جواب نہیں۔

بدر:۔ ارے ہاں! آپ کی بات تو رہ ہی گئی۔ کیا بات تھی؟

دلہن:۔ "ننھی کی اماں" کو کن صاحب نے لکھا تھا؟

بدر:۔ مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟

دلہن:۔ (جل کر) جی ہاں حضور آپ ہی سے عرض کر رہی ہوں۔

بدر:۔ (بڑے اطمینان سے) اچھا! میں یہ سمجھا کہ مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔

دلہن:۔ اور نہیں تو کیا در و دیوار سے باتیں کر رہی تھی؟

بدر:۔ خیر تو میرا خیال غلط ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(کچھ دیر سکوت طاری رہتا ہے)

دلہن:۔ (نرم لہجے میں) بتا دو بدر میاں! (پچکار کر) میرے بھیا، بتا دو۔

بدر:۔ بتا دوں؟

دلہن:۔ ہاں!

بدر:۔ (سوچتے ہوئے "تو" کو کھینچ کر کہا، تو ۔ ۔ ۔ بتا ہی دوں؟

دلہن:۔ ہاں ہاں!

بدر:۔ تو گویا بتا ہی دوں

دلہن:۔ اسے بھئی ہاں ہاں، ہاں، ہاں،

بدر:۔ تو کیا واقعی بتا دوں؟

دلہن:۔ بیہودہ مت بنو

بدر:۔ اچھا ٹھہریے، بتاتا ہوں۔

دلہن:۔ بتاؤ!

بدر:۔ آپ بتایئے کہ ۔ ۔ ۔ ۔

دلہن:۔ اے سبحان اللہ میں تو خود پوچھ رہی ہوں۔

بدر:۔ پوری بات تو سنئے۔ میں یہ کیا کہہ رہا تھا کہ اگر بتا دوں تو آپ کیا کھلوائیں گی۔

دلہن:۔ بتاؤں؟

بدر:۔ ہاں!

دلہن:۔ سچ مچ؟

بدر:۔ ہوں!

دلہن:۔ ایمان ایمان سے؟

بدر:۔ جی ہاں!

دلہن:۔ ج ۔ و ۔ ت ۔ یے (ہجے کر کے کہتی ہیں)

بدر:۔ جایئے ہم نہیں بولتے۔

دلہن:۔ (ہنس کر) اچھا تمہیں بتاؤ کیا کھاؤ گے؟

بدر:۔ شریف آدمی کیا کھایا کرتے ہیں؟

دلہن:۔ وہ تو میں بتا چکی۔

بدر:۔ ایمان دھرم سے مٹھائی کھلوانے کا وعدہ کرتی ہیں تو بتا سکتا ہوں ورنہ مجبوری کا نام صبر وغیرہ ہے۔ جا کر سکھ کی نیند سویئے۔

دلہن:۔ اچھا بات سنو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں مٹھائی کھلائیں گے۔

۱۔ January last

لیکن . . . . .

بدر :- لکھ کر دیجئے۔ یہ لیجئے فاؤنٹن پن اور یہ پیڈ۔

دلہن :- لاؤ کیا لکھ دوں ؟

بدر :- لکھئے۔ میں بسلامتی ہوش و حواس

دلہن :- (لکھتی جاتی ہیں اور آہستہ آہستہ کہتی جاتی ہیں) میں۔ بہ سلامتی ہوش و حواس . . . . .

بدر :- اور بلا جبر و تشدد کسی کے

دلہن :- اور۔ ب۔ لا۔ جب۔ رو۔ تش۔ دُد۔ کسی۔ کے

بدر :- وعدہ کرتی ہوں کہ بدر میاں کو صبح کالج جانے سے پہلے پہلے

دلہن :- (اسی طرح لکھتی اور بولتی جاتی ہیں) وعدہ۔ کرتی۔ ہوں۔ کہ۔ بدر۔ می۔ یاں کو۔ صبح۔ کا۔ لج۔ جانے۔ سے۔ پہلے۔ پہہ۔ لے۔

بدر :- چاہے چوری کروں یا میاں کی جیب کتروں۔ مگر بدر میاں کو مٹھائی ضرور کھلاؤں گی۔

دلہن :- چاہے۔ چو۔ ری۔ ک۔ روں۔ یا۔ می۔ یاں۔ کی۔ جے۔ ب۔ کترُوں م۔ گر۔ بدر۔ می۔ یاں۔ کو۔ می۔ ٹھائی۔ ضرور۔ کھ۔ لاؤں۔ گی۔

بدر :- اور سائین (Sign) ؟

دلہن :- سائن وائن میں نہیں کھلاؤں گی۔ میں تو ہندوستانی مٹھائی منگوا دونگی

بدر :- لیکن اس پہ Sign ہوں۔ بھول گیا۔ دستخط تو کر دیجئے۔

دلہن :- ہاں دستخط ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ لو۔ جب تحریر دی ہے تو دستخط کرنے سے کب انکار ہو سکتا ہے۔ لو اب بتاؤ کہ ننھی کی اماں کس نے لکھا تھا۔

بدر :- میں بتاتا تو ہوں۔ لیکن جو کچھ میں کہوں گا آپ مان بھی لیں گی ؟

دلہن :- کیوں نہیں ؟ لیکن سچ سچ بتانا۔

بدر :- آپ کو کیا کیا معلوم کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے یا جھوٹ۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا تو آپ پوچھتیں کیوں۔ اس لئے جو کچھ میں بتاؤں اسے بغیر چوں و چرا آپ کو ماننا پڑے گا۔ . . . لہٰذا آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ ننھی کی اماں کے مصنف کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔

دلہن :- جھوٹ۔ سفید جھوٹ۔ غلط۔ ایک دم غلط۔

بدر :- غلط

دلہن :- قطعی غلط، بالکل غلط، صریحاً غلط۔ سر سے لے کر پاؤں تک غلط زمین سے لیکر آسمان تک غلط۔

بدر :- دیکھا، آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ جھوٹ ہے۔ اور اگر یہ جھوٹ ہے تو اب سچ آپ بتا دیجئے۔

دلہن :- مجھے تو معلوم ہی ہے مگر میں تم سے سننا چاہتی ہوں۔

بدر :- میں اس قابل کہاں کہ آپ کو کچھ سناؤں۔

دلہن :- رہنے بھی دو بدر۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔

بدر :- تو کمال کیا آپ نے۔ رات کے بارہ بجے ایک شریف آدمی کو آ کر جگا دیا۔ وہ بھی ایسی بات پوچھنے کے لئے جو آپ کو معلوم ہے۔ . . . سبحان اللہ کیا کہنے!

دلہن :- بدر میاں! کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ "ننھی کی اماں" تمہارے بھائی صاحب نے نہیں لکھا؟

بدر :- بھائی صاحب نے؟ (حیرت زدہ ہو کر)

دلہن :- جی ہاں! اور اس میں میری دھجیاں اُڑائی ہیں۔ چیتھڑے بکھیر کر رکھ دیئے۔

بدر :- (آہستہ سے) چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ (زور سے) مگر آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟

دلہن :- جو کچھ کہ تم سن رہے ہو۔

بدر :- (ایک ایک لفظ کو الگ الگ کر کے کہتا ہے) میں۔ کیا۔ سن رہا۔ ہوں۔

دلہن :- میرا خون نہ کھولاؤ بدر!

بدر :- خون کھولانے سے مٹھائی نہیں بچ سکتی۔ وہ تو کھا کر رہوں گا۔ آپ تحریر دے چکی ہیں۔

دلہن :- ان ریڈیو والوں کو تو دیکھو۔ میرے میاں کے کہنے سننے میں آ کر ریڈیو پر ننھی کی ماں کا ڈھنڈورا پیٹ دیا پیسے کھا گئے ہوں گے کمبخت۔

بدر :- جی نہیں آپ کے میاں نے تو اُلٹے خود پیسے وصول کئے ہیں۔

دلہن :- تو پھر تمہارے بھائی کی غیرت نے یہ کیسے گوارا کیا کہ چار پیسوں کی خاطر اپنی بیوی کو بدنام کیا جائے۔ بیوی بھی ایسی کہ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں میں چراغ لے کر ڈھونڈو تو اللہ نے چاہا ایک نہ ملے۔

(کچھ دیر دونوں خاموش رہتے ہیں)

دلہن :- بدر میاں! یہ کب تک آئیں گے؟

بدر :- (جمائی لے کر) نیند آ رہی ہے۔

دلہن :- میں کیا کہہ رہی ہوں بدر میاں؟

بدر :- اس کے لئے دوسرا عہد نامہ لکھ کر دیجئے پھر بتاؤں گا۔

دلہن:- جی ہاں۔ اب کیا میں بات بات کی تحریر دیتی پھروں گی؟
بدر:- جو لوگ اپنا اعتبار کھو بیٹھتے ہیں ان کے ساتھ مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے۔
دلہن:- سب کچھ کہنا۔ مگر تمہیں بھی قسم ہے میری ہی بات کا جواب نہ دینا۔
بدر:- آپ کے میاں ۔ ۔ ۔
دلہن:- کہاں گئے ہیں؟ اور اب تک کیوں نہیں آئے؟
بدر:- میرا نام اگر آپ نہ لیں تو بتا دوں۔
دلہن:- اچھی بات ہے تمہارا نام نہیں کھلے گا۔
بدر:- اور نہ میرے سامنے پانی پت کی چوتھی لڑائی ہوگی؟ صبح کو جب میں کالج چلا جاؤں۔ اس کے بعد تم اپنے انہیں سُلٹتی رہنا۔
دلہن:- اچھا منظور۔
بدر:- بات یہ ہے بھائی صاحب نے مجھے منع کر دیا تھا کہ تمہاری بھابی کو خبر نہ ہونے پائے۔
دلہن:- لیکن اگر بھائی دریافت کریں تو ان سے جھوٹ بول کر مفت میں گنہگار بھی تو نہ ہونا چاہیئے۔
بدر:- اور بھابی دلہن آپ یہ تو اچھی طرح جانتی ہیں کہ جھوٹ بولنے کی تو میری عادت نہیں۔
دلہن:- ہیں؟
بدر:- میری عادت ۔ ۔ ۔ !
دلہن:- جھوٹ بولنے کی قطعی نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ تم کہے جاؤ۔
بدر:- بھابی دلہن اگر سچ پوچھتی ہیں تو بھائی صاحب کی یہ روش ہمیں تو اچھی لگتی نہیں کہ راتوں کو غائب ہیں یار ات گئے آ رہے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ In the long run نقصان دہ ثابت ہوگی۔
دلہن:- (جھلا کر) اچھا۔ تو یہ "ان لورن" کے پاس جایا کرتے ہیں۔ یہ بات ہے
بدر:- ان لورن کیا؟
دلہن:- تمہیں نے تو کہا کہ ۔ ۔ ۔
بدر:- (جلدی سے) In the long run کسی ۔ ۔ ۔
دلہن:- (فوراً بول اُٹھیں) ٹایپ کرنے والی کا نام ہوگا۔ ایک روز خوش وقتی میں وہ فرما بھی رہے تھے
بدر:- (جلدی جلدی کہتا ہے) بس بس بس۔ بس بھائی صاحب وہیں پہنچے ہیں۔ آج کل چاندنی راتیں ہیں نا؟ نہر پہ پارٹی کی تھی۔
دلہن:- ہوں و ہوں۔ (بھنا رہی ہیں)
بدر:- چاندنی راتیں، نہر کا کنارہ، بہتا پانی، ہلکی خنکی، ٹھنڈی ہوا، جوانی کے دن چینی کی گڑیا اور ۔ ۔ ۔
دلہن:- (آزردہ ہو کر) بس بس بدر! میں زیادہ نہیں سن سکتی ۔ ۔ ۔ ایک عورت کی مجبوریاں لاچاریاں۔ عورت اور وہ بھی ہندوستان کی عورت۔ غالباً دنیا بھر میں سب سے زیادہ بدقسمت۔
بدر:- بھابی دلہن جلنے دیجئے۔ یہ چار دن کی چاندنی ہے پھر اُن کو آپ ہی آپ نظر آ جائیگی۔
دلہن:- (آبدیدہ ہو کر) بدر! اس وقت میرے دل پر چھریاں چل رہی ہیں۔ (اٹک اٹک کر کہتی ہیں) لیکن لیکن ــــ لیکن تم سو جاؤ۔ (جانے لگتی ہیں)
(کوئی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے) کھٹ، کھٹ، ــــ کھٹ، کھٹ، کھٹ
(ہلکی آواز باہر سے آتی ہے) ایاز! ایاز!! نجو! ایاز!! ۔ ۔ بدر میاں! ۔ ۔ بدر میاں!!
دلہن:- (دبی آواز سے) خبردار جو بولے تو۔ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ ان کی یہی سزا ہے۔ باہر کھڑا رہنے دو۔
بدر:- آپ اطمینان رکھئے۔ میرا صبح امتحان ہے میں تو پڑ کے سوتا ہوں مگر ان کا دیر سے آنا ٹھیک نہیں۔ آگے آپ جانیں۔
(آواز۔ نجو! ۔ ۔ ایاز! ۔ ۔ ایاز!! ۔ ۔ آیا ۔ نجو! ۔ ۔ آیا)
آیا:- اے کون ہے! (جبکہ آیا کہنے والی تھی "اچھا ٹھہرو" دلہن لپک کر پہنچیں اور اس کا منہ بند کر لیا۔ آیا کہتی رہ گئی) اچھا ٹھے۔ اے ے ے (منہ بند ہو جاتا ہے)
دلہن:- خاموش، چڑیل کہیں کی۔
آواز:- آیا! آیا!! ۔ ۔ ایاز ۔ ۔ نجو! کنڈی کھولو! آیا ۔ ۔ نجو، ایاز، ایاز، آیا، نجو سب مر گئے؟
دلہن:- (آواز بدل کر) فقط تم زندہ ہو۔
میاں:- (آواز پہچان کر) ارے جاگ رہی ہو؟
دلہن:- (آواز بدل کر) تم سے کہا جاتا ہے کہ دن بھر کے تھکے ہاروں کو دو گھڑی آرام کرنے دو۔ سب غافل پڑے سو رہے ہیں۔
میاں:- (بیوی کی بدلی ہوئی آواز کی نقل کرتے ہوئے) سب غافل پڑے سو رہے ہیں تو یہ بول کون رہا ہے؟
دلہن:- (آدھ منٹ آہستہ آہستہ گنگناتی ہے اور پھر گانے لگتی ہے) رتیاں کدھر گنوائیں رے بالم ہرجائی رے (بھیرویں)
میاں:- ارے بھیرویں؟ اہاہاہا کیا موقع کی چیز شروع کی ہے! قسم ہے

In The Long run ــــ آخرکار ۔ ۵۲

یہاں تو کھڑے کھڑے سچ مچ سویرا ہو گیا۔ بیگم کنڈی کھول چکو۔

دلہن :۔ (پھر گاتے ہوئے) . . . .

. . . . تم سے شادی کئے پچھتائی رے۔

بالم ہرجائی رے . . . .

میاں :۔ بیگم!

دلہن۔ خطا معاف جو کی آپ سے وفا ہم نے۔ ہے سچ تو یہ کہ بہت ہی برا کیا ہم نے

لگایا دل کو تو سب رنج بھی سہا ہم نے۔ بس اب نہ بات کرو جاؤ کہدیا ہم نے

تم سے شادی کئے پچھتائی رے ــــ بالم ہرجائی رے

میاں۔ اجی اے گانے والی! کنڈی کھولو . . . بیگم . . . خانم . . . !

ننھی کی اماں . . . ! اے بی . . . سنتی ہو؟ ــــ اے بی .

دلہن۔ آیا! یہ اے بی، سی ڈی کا رونا رات کے بارہ بجے کون رو رہا ہے۔

اس سے کہہ دو کہ ہم لوگوں کی نیند حرام نہ کرے۔ اپنا راستہ لے ورنہ

اس کے حق میں برا ہوگا۔

میاں۔ (باہر سے آواز دیتا ہے) آیا!

آیا :۔ کون؟ . . . . صاحب؟ . . .

میاں۔ ہاں۔ کنڈی کھولو۔

آیا۔ (کنڈی کھول کر) س . . . س . . . سرکار!

میاں۔ (وجاہت آمیز لہجہ میں) جاکر سو جاؤ۔

آیا :۔ ب . . . ب . . . بہت اچھا۔

میاں۔ بیگم کہاں ہو۔

دلہن :۔ کہیں بھی ہوں تمہاری بلا سے۔

میاں۔ بات کیا ہے؟ برا کیوں مان گئیں؟

دلہن۔ میں کیوں برا ماننے لگی تھی۔ میں ایک ان پڑھ جاہل، بیوقوف، گھر کی

چاردیواری میں پڑی سڑنے والی، جس کی عقل محدود، جس کے کام

فضول، جس کے ذہن میں ایک وقت میں ایک خیال سے زیادہ

نہیں آسکتا۔ انگریزی دان شوہر سے بات بات پر الجھنے والی جس

. . . .

میاں۔ ننھی کی اماں؟

دلہن۔ ہاں ہاں ننھی کی اماں! جناب والا کو جس پر ناز ہے۔

میاں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اپنی ننھی کی اماں پر میں جتنا فخر کروں تھوڑا

ہے۔

دلہن۔ (جلدی جلدی) اس لئے کہ وہ آپ کا شاہکار ہے، آپ کی ان تھک

کوشش و عمل کا نتیجہ، جس کو ریڈیو والوں نے کیا، تمام بدن سنے سنا ہیں

کہیں کی نہ رہی اور تمہاری دلی مراد بر آئی۔

میاں۔ گول مول باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟

دلہن۔ اُف۔ فوہ۔ بس کیا کہوں۔ ایمان سے تم بھی بڑے وہ ہو۔

میاں۔ (سنجیدگی سے) جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔

دلہن۔ صاف صاف سننا چاہتے ہو تو لو سنو۔ ڈرامہ "ننھی کی اماں" کس

نے لکھا تھا؟

میاں۔ "ننھی کی اماں؟" (سوچتے ہوئے) مجھے کیا معلوم؟

دلہن۔ یہ تم حلفیہ کہہ رہے ہو؟

میاں۔ ذرا ذرا سی بات کے لئے میں حلف نہیں اٹھایا کرتا۔

دلہن۔ تو بس اس سے صاف ظاہر ہے کہ ننھی کی اماں تم نے لکھا تھا۔

میاں۔ اگر لکھ بھی دیا تو اس میں ہوا کیا؟

دلہن۔ لیکن میری ہنسی کیوں اڑائی؟ دنیا کیا کہے گی؟

میاں۔ دنیا تو کچھ نہیں کہتی مگر تم کو ضرور ناگوار گزرا ہوگا۔

دلہن۔ میرا تو خیر کچھ نہیں لیکن سننے والے تو میرے جنم پہ تھوک رہے ہونگے۔

میاں۔ انہیں کیا معلوم کہ یہ واقعات سچ ہیں۔

دلہن۔ جس جس نے سنا ہوگا یقیناً یہی خیال ہوگا جو میرا ہے۔

میاں۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

دلہن۔ تو یہ ناممکن بھی نہیں ہو سکتا۔

میاں۔ ممکن ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو وہ ناممکن ہو۔

دلہن۔ یہ ناممکن ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ ممکن نہ ہو۔

میاں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ ممکن ہو۔

دلہن۔ یہ ممکن ہے۔ ("ہے" پر زور دیا)

میاں۔ یہ قطعی ناممکن ہے۔

دلہن۔ آخر کس طرح؟

میاں۔ بیگم! ممکن کو ناممکن۔ ناممکن کو ممکن۔ ممکن کو ممکن اور ناممکن کو

ناممکن . . . . . .

دلہن۔ (جلدی سے بولیں) ہاں ہاں ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔ عورت

ذات کے سامنے جو جی چاہے ثابت کر سکتے ہو یہ مردوں کے بائیں

ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں تو اس ناممکنات کی دنیا میں خود کو کھو کر یہ معاملہ

خدا کو سونپتی ہوں۔

میاں۔ خدا کو سونپنے کے بعد خدا کے واسطے تم اپنے دل میں یہ بھی بٹھالو کہ یہ

ڈرامہ میں نے نہیں لکھا اور دنیا کو کہنے دو۔

دلہن۔ خیر، یہ تو تھا بدنصیب "ننھی کی اماں" کا قصہ۔ میری قسمت میں تو ان باتوں کے سوا اور کچھ لکھا ہی نہیں۔ تقدیر میں کلنک کا ٹیکہ تمہارے ہاتھوں لکھنا تھا سو لگ چکا (ایک مخصوص لہجے میں) لیکن میاں!

ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے + پسینہ پونچھ لو اپنی جبیں سے

میاں۔ پسینہ پونچھ لو اپنی جبیں سے؟

دلہن۔ (تصور میں ڈوب کر) ظفر نے کہا، چاندنی راتیں، نہر کا کنارا، بہتا پانی، ہلکی خنکی، ٹھنڈی ہوا، جوانی کے دن، چینی کی گڑیا۔

میاں۔ بیگم آج کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو؟

دلہن۔ میں تو پہلے ہی سمجھے ہوئے تھی کہ شہزادے صاحب نہ تو شکار کھیلنے گئے ہیں، نہ ڈاکٹر پران ناتھ کے ہاں تشریف لے گئے ہیں اور نہ نواب صاحب کو شطرنج کھیل کر ممنون کرنے گئے ہیں۔ بلکہ . . .

میاں۔ بلکہ . . . ؟

دلہن۔ بس رہنے دو۔ تمام قلعی کھول کے رکھ دوں گی۔

میاں۔ تہمت لگانے میں تو اب بھی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی (ٹھہر کر) آپ کچھ بتا سکتی ہیں کہ میں جھک مارنے کہاں جا سکتا تھا؟

دلہن۔ تجھے کیا معلوم کہ ان لورن کون ہے موئی جنم جلی

میاں۔ ان لورن؟

دلہن۔ کیا ننھے بنے کھڑے ہیں (نقل کرتی ہیں) ان لورن؟ جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔

میاں۔ آخر وہ ہے کون؟

دلہن۔ اپنے دل سے پوچھو وہی بتائیگا کہ ان لورن کون نورن چمارن ہے۔

میاں۔ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے بیگم؟

دلہن۔ (تیزی سے) نہ مجھے کچھ ہوا، نہ میں نے آدھی رات تک کسی کا انتظار کیا نہ تم دیر سے آئے، نہ بدر میاں نے مجھ سے کچھ کہا؟

میاں۔ بدر نے؟

دلہن۔ جی ہاں کچے چٹھے کھول کر رکھ دیئے۔

میاں۔ بلوا سکتی ہو؟

دلہن۔ کیوں نہیں؟ (آواز دیتی ہے) بدر میاں! یہاں آنا ذرا! — بدر میاں! او دیکھو تمہارے بھائی کیا چندا سا مُنہ لئے کھڑے ہیں

(جواب نہ ملنے پر) آیا! آیا!!

آیا:۔ جی بیگم! حاضر ہوئی۔

دلہن:۔ برابر والے کمرے سے بدر میاں کو بلا لاؤ۔

آیا۔ بہت اچھا۔ (جاتی ہے)

میاں۔ بدر نے کیا کہہ دیا تم سے؟

دلہن۔ ہاتھ کنگن کو کیا آرسی۔ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے

میاں۔ آخر کچھ تو کہو۔

دلہن۔ ٹھیر جاؤ بدر میاں کو آ لینے دو۔ گھبراتے کیوں ہو؟

میاں۔ لیکن تم نہیں بتاؤ گی —— کیوں؟

آیا:۔ (واپس آکر) بیگم صاحبہ۔ بدر میاں نے کہا ہے کہ میں تو گاپھل (غافل) پڑا سو رہا ہوں۔

دلہن:۔ جھوٹی لپاٹن کہیں کی۔

آیا:۔ آپ پوچھ سکتی ہیں۔ انہوں نے یوں کہا تھا کہ "آیا تم کہدو دیکھ رہی ہو میں تو گاپھل پڑا سو رہا ہوں۔" اور بیگم صاحبہ واکئی (واقعی) وہ تو کھراٹے (خراٹے) لے رہے تھے۔

دلہن۔ غافل نیند سے اُٹھ کر انہوں نے بات کی۔ پھر پٹ سے سو بھی گئے اور خراٹے بھی لینے لگے؟

آیا:۔ جی ہاں۔

دلہن۔ اللہ رے بھولپن۔ کس یقین کے ساتھ کہہ رہی ہیں "جی ہاں"

میاں۔ خیر بیگم! ہم وہیں چلے چلتے ہیں۔

دلہن۔ چلو۔ (دونوں دوسرے کمرے میں جاتے ہیں)

(دوسرا کمرہ ہے)

(ذرا دور سے آتی ہوئی آواز آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے) بدر میاں بدر میاں۔ اے بدر میاں۔ بدر میاں —— (کمرے میں اندھیرا تھا گھبراہٹ میں تیزی سے جو آئیں تو بدر کے پلنگ سے ٹھوکر کھا کر اُس پر گر پڑیں۔ اور ایک چیخ ماری)

بدر:۔ چور چور چور چور (چلّاتا ہے)

دلہن:۔ چور نہیں۔ میں ہوں۔ بجلی جلاؤ۔

بدر:۔ بجلی تو اے، یہ جل گئی مگر . . .

دلہن: (بات کاٹ کر) تمہارے بھائی آگئے۔

بدر:۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ آجائینگے۔

دلہن:۔ بدر میاں سنو تو —— یہ ننھی کی اماں کے مصنّف ہونے سے انکار کرتے ہیں۔

میاں۔ ننھی کی اماں کا شوہر ہونے سے تو انکار نہیں کیا نا؟

دلہن:۔ (میاں سے) چپ رہو جی —— (بدر سے) اور بدر میاں۔ انہیں

ذرا ان لورن کا اتہ پتہ بتا دینا۔ بچارے جانتے نہیں۔

بدر:۔ بھابی صاحبہ! ان لورن کے متعلق تو میرے پاس یہ جواب ہے کہ آپ نے خواب دیکھا ہوگا میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔

میاں۔ (طنزیہ سلام کرتے ہیں) بیگم صاحبہ۔ آداب عرض ہے۔

دلہن:۔ (غصے سے تلملا کر) بدر میاں؟

بدر:۔ (اطمینان سے) اور ننھی کی اماں کے مصنف کا نام معلوم کرنے کا جہاں تک تعلق ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ مٹھائی کھلانے کے وعدے کو تحریر تک میں لے آئیں۔ لیکن مجھے کچھ معلوم ہوتا تو بتاتا بھی۔

دلہن۔ اوئی! یہ مُنہ در مُنہ کا جھوٹ؟

بدر:۔ اور بھابی جان! وہ تحریر یہ دیکھئے۔

میاں۔ (پڑھتے ہیں) میں بسلامتی ہوش و حواس اور بلا جبر و تشدد کسی کے وعدہ کرتی ہوں کہ بدر میاں کو کل صبح کالج جانے سے پہلے پہلے۔ چاہے چوری کروں یا میاں کی جیب کتروں۔ لیکن مٹھائی ضرور کھلاؤں گی۔ فقط (رقیہ سلطان بیگم بقلم خود)

(بدر اور وکیل صاحب دونوں خوب ہنستے ہیں خوب۔ دلہن کھسیانی ہوکر چیختی ہیں۔ ایک شور سا مچتا ہے۔ ساس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ اُٹھیں اور گرجتی ہوئی آئیں)

پھپی اماں ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟ بدر میاں رات کو بھی نچلے نہیں بیٹھتے تمام گھر کو سر پر اُٹھا رکھا ہے پڑوسی کیا کہہ رہے ہونگے؟ (قریب آنے پر) شمن میاں۔ آپ تشریف لے آئے خیر سے؟ (طعن سے کہتی ہیں)

دلہن۔ پھپی اماں! دیکھئے تو۔ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ دونوں بھائیوں نے مل کر مجھے بیوقوف۔ دیوانی۔ پاگل بنا رکھا ہے۔

پھپی اماں (وقار آمیز لہجہ میں) شمن میاں۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ ادھر آؤ۔

میاں۔ اماں بی۔ میری ایک بات سن لیجئے۔

پھپی اماں بیٹا میں کہتی ہوں کہ میرے ساتھ چلے آؤ۔

دلہن:۔ پھپی اماں۔ آخر یہ دیر سے آنے کی وجہ کیوں نہیں بتاتے؟

میاں۔ اماں بی۔ اس سے پہلے کہ آپ کچھ کہیں۔ میں ان کے سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔

پھپی اماں اچھا

میاں۔ بیگم۔ تم نے اپنے بھائی کے مقدمہ کی وکالت کرنے کے لئے مجھ سے کب کہا تھا؟

دلہن۔ آج شام کو۔

میاں۔ کس وقت؟

دلہن۔ نو یا دس بجے ہونگے۔

میاں۔ رات کے دس بجے؟

دلہن۔ ہاں!

میاں۔ اور مقدمہ کی پیشی کب ہے؟

دلہن۔ کل صبح۔

میاں۔ تمہارے بھائی سعید میاں کی طبیعت کیسی ہے؟

دلہن۔ بیمار ہیں۔

میاں۔ وہ آج خود مجھ سے آکر مل سکتے تھے؟

دلہن۔ ان کی حالت اس قابل نہیں۔ صاحب فراش ہیں۔

میاں۔ ان کے بگڑے ہوئے مقدمہ کو اپنے ہاتھوں میں لینے سے پہلے اُن سے ملنا ضروری تھا یا نہیں؟

دلہن۔ بے شک ضروری تھا۔

میاں۔ اُن سے ملنے میں اُسی وقت کس کے کہنے سے گیا؟

دلہن۔ میرے کہنے سے۔

میاں۔ تو پھر طوفان کیوں مچا رکھا ہے؟ اس جگ ہنسائی سے کیا فائدہ؟

پھپی اماں دلہن! مجھے یاد آگیا۔ اُس وقت میں بھی موجود تھی۔ تم ہی نے تو سر ہوکر خود کپڑے پہنا کر اپنے سامنے روانہ کیا تھا شمن میاں کو۔

دلہن:۔ (نہایت ندامت اور بھولپن سے) اے ہے پھپی اماں۔ خدا کی قسم میں تو بالکل بھول ہی گئی۔

پھپی اماں ابھی سے سٹھیانے لگیں۔ اللہ رحم کرے۔ ہماری عمر کو پہنچو گی تو خدا معلوم کیا حال ہوگا؟

دلہن۔ لیکن پھپی اماں۔ آپ نے بھی . . . . .

بدر:۔ (جلدی سے بول اُٹھا) مینڈھے خوب لڑوائے۔ انہیں یاد کیوں نہ دلوایا۔ بھابی دلہن کو تو اب شرمندہ ہونا پڑا نا۔

دلہن:۔ بدر میاں بس تمہیں تو میں کیا کہوں؟

بدر:۔ میں تو اماں بی سے کہہ رہا ہوں۔

پھپی اماں۔ بوڑھے بیل سے اب کب تک ہل چلواؤ گے۔ ہمارے بھی اب پکے پان ہی سمجھو! اور کیا تو خدا معلوم کس دن سو برس پورے ہو جائیں

دلہن:۔ اللہ نہ کرے۔ پھپی اماں۔ آپ بھی کیسی باتیں کر رہی ہیں؟

پھپی اماں باقی رہا یہ معاملہ۔ تو بھی مانو نہ مانو تمہاری مرضی۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ گئی

گذری باتوں کا اب رونا کیا؟ اس لئے جاؤ۔ میرے خیال میں تو جا کر سو جاؤ۔ آرام کرو۔ نیند کے مارے میرا سر بھی نگوڑ مارا چکرا رہا ہے۔ میں بھی جا کر پڑتی ہوں۔ (یہ کہتی ہوئی جاتی ہیں)

دلہن:۔ (میاں سے) دیکھنا یہ تمام بیج ان حضرت بدرمیاں صاحب کے بوئے ہُوئے ہیں۔

میاں:۔ خیر۔ بھول جاؤ بیگم۔ آؤ چل کر سوئیں۔

بدر:۔ (طنزاً کھنکارتے ہیں) اہم اہم۔

دلہن:۔ (چلتے چلتے جھلا کر بولیں) بدرمیاں شادی ہو جائے۔ پھر دیکھنا۔

میاں:۔ کیوں؟ کیا دوسری شادی کرنے کا ارادہ ہے جناب کا؟

دلہن:۔ میری نہیں۔ بدرمیاں کی (دانت پیس کر) اس کی دلہن سے گن گن کر بدلے لونگی۔

بدر:۔ مگر فی الحال تو مٹھائی کا انتظام کر لیجئے گا۔

دلہن:۔ (نقل اتارتی ہے) پہل حال تو متھائی تا انتجام ترلیجئے دا۔

مرزا شمس الہٰی گورگانی بی اے (دہلوی)

غزل

کون دنیا میں سوگوار نہیں
دل نہیں ہے جو بے قرار نہیں

تیرے وعدوں کا اعتبار تو ہے
زندگانی کا اعتبار نہیں

اب وہ نیرنگیٔ خیال کہاں
اب وہ رنگینیٔ بہار نہیں

پھر تمہارا ہی نام لیتا ہوں
پھر مجھے دل پہ اختیار نہیں

نسیم حجازی

خوب ہے

اُن کی طرف سے عشق کی تشہیر خوب ہے
حالِ دلِ خراب کی تفسیر خوب ہے

رنج و خوشی کا غیر مناسب سا اختلاط
یارب! مری حیات کی تعمیر خوب ہے

دل کی کلی میں بوئے وفا بن گئی ہوتم
میرے سنہرے خواب کی تعبیر خوب ہے

تخریبِ عقل و ہوش کی تعمیر ہے جنوں
تخریبِ عقل و ہوش کی تعمیر خوب ہے

زندہ ہوں اک حسین تمنا کے ساتھ ساتھ
ظلمت میں دھیمی دھیمی سی تنویر خوب ہے

اثر چکوالی بی اے

شعر

ابر اُٹھا تھا کعبہ سے اور جھوم پڑا میخانہ پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشہ اور پیمانہ پر

میر

غزل

کیوں تو نے مجھ سے توڑ لیا رشتہ چاہ کا
او بے وفا کہاں ہے وہ وعدہ نباہ کا

رونے سے مجھ کو کام ہے ہو صبح یا ہو شام
اب امتیاز مٹ گیا شام و پگاہ کا

ہونٹوں پہ ہے فسانۂ اندوہِ بے بسی
دل کی زباں کو ورد ہے اب آہ آہ کا!

وہ دن گئے کہ تیرے خط آتے تھے روز روز
اب حال پوچھنا بھی گیا گاہ گاہ کا!

اشکوں کے موتیوں کے عوض میں خرید لوں
اشک گہر ہے ذرہ ہر اک تیری راہ کا!

جی تیرے التفاتِ نظر کو ترس گیا!
کب مجھ پہ کوئی پھول گرے گا نگاہ کا!

مہدی کے گھر میں شمع شبستاں ہے کیوں خموش
آج اُس کو انتظار ہے کس رشکِ ماہ کا

مہدی علی خاں

امّاں اور ابّا

میں نہیں بتا سکتی کہ ہماری سکونت کینیڈا کے وسیع مرغزاروں میں کب منتقل ہوئی۔ کیونکہ میں اس وقت چند ماہ کی تھی۔ میرے والدین روسی نژاد تھے۔ میرا باپ ہنری اپنے والدین کی شادی کے فوراً بعد پیدا ہوا تھا۔ میری ننہال والوں کی جنم بھومی بھی کینیڈا ہی ہے۔

میں ایک خوش مزاج لڑکی تھی۔ اور کھلے میدانوں میں بے فکری کی زندگی بسر کرنے کی عادی۔ ہر چند نئے آباد کاروں کو بہت سی تکالیف پیش آئیں۔ مگر میری ہر طرح سے غور و پرداخت کی گئی۔ اور میرا آرام ہر طرح ملحوظ رکھا گیا۔ ابّا کو اپنی نجابت پر ناز تھا لیکن وہ فطرتاً مطلب پرست تھے اور دوسروں سے خدمت لینے کے متمنی۔ میں نے بچپن ہی میں یہ معلوم کر لیا تھا کہ امی جان ابّا کی نسبت ابّا سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں اور ابّا اپنے کو گھر کا بادشاہ تصوّر کرتے ہیں۔ میں اوائل عمر ہی سے اس بات کے خلاف تھی۔ جب کبھی امّی میرے ابّا کو آتے دیکھتیں گھبرا کر پکار اٹھتیں "آمندہ جلدی ابّا کے سلیپر لاؤ۔ اور ہاں ذرا تکیے بھی درست کرتی آنا۔"

ایک رات مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہہ ہی دیا۔ "وہ اپنے سلیپر آپ کیوں نہیں لاتے؟ وہ تو تمہیں پوچھتے تک نہیں۔ اور تم ان کی اتنی خاطر مدارات کرتی ہو۔"

"ہشت۔ آمندہ۔ ایسا نہیں کہا کرتے۔ تمہارا باپ گھر کا سردار ہے۔"

"ہاں۔ اور وہ ہمیں یہ فراموش نہیں کرنے دیتے" مگر امّی وہ ڈیوڑھی کا پھاٹک کھولنے گئیں۔ تاکہ ابّا کو چھکڑے سے اترنا نہ پڑے اور چھکڑا سیدھا اندر آ جائے۔"

امّی پر حکومت چلانا آسان تھا۔ وہ حلیم الطبع تھیں اور ابّا فطرتاً حکمران۔ گویا ایک ماہر نفسیات کے نقطۂ نظر سے یہ جوڑی خوب تھی۔

کچھ سال گزرنے پر وہ چوبی مکان جس میں ہم پہلے آ کر آباد ہوئے تھے ایک کشادہ مکان کی حیثیت میں تبدیل ہو گیا۔ ہماری مزروعہ اراضی چھ سو چالیس ایکڑ تھی۔ جہاں ہر خزاں کے موسم میں غلے کی فصلیں لہراتی نظر آتیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں ابّا اس علاقہ کے متمول ترین زمینداروں بن گئے۔ انہیں اس بات پر بجا فخر تھا کہ قسمت ان کی راہ میں الطاف فراواں کا فرش بچھاتی ہے۔ ہوتے ہوتے وہ نہ صرف زراعت میں یگانہ تسلیم کئے گئے بلکہ اس علاقے کے امور شہریت میں بھی ان کی رائے وقیع سمجھی جانے لگی۔ مگر امّی اب بھی ان کی جوتیاں اٹھاتیں۔ ان کی کرسی کے گدیلے درست کرتیں اور کام سے واپسی پر ان کے لئے بیر وغیرہ تیار رکھتیں۔

بالغ ہونے کے بعد میرے بھائیوں نے اپنی علیحدہ زمین تیار کر کے وہاں بود و باش اختیار کر لی۔ اور گھر بار بسا لیا۔ مجھے مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ بعد تحصیل علم میرا ارادہ معلمہ بننے کا تھا۔ مگر سند حاصل کرتے ہی میرا تعارف ایورٹ سے ہو گیا۔ وہ ایک وجیہہ جوان تھا جسے نیو یارک کی کسی کمپنی نے قد آدم تصاویر کا آرڈر فراہم کرنے کیلئے وہاں بھیجا تھا۔ اس زمانے میں ہر ایک زمیندار اپنے خاندان کے افراد کی قدِ آدم تصویر بنوانا ضروری سمجھتا تھا۔ اور میرا خاندان اس کام میں پیش پیش تھا۔ میری اور میرے بھائیوں کی تصاویر بنانے اور انہیں قیمتی چوکھٹے میں جڑنے کا آرڈر ایورٹ کو دے دیا گیا۔ خوشحال علاقوں میں بڑے منافع کا کام تھا۔ اور اس سال ایورٹ نے خوب ہاتھ رنگے۔ ہمارے گاؤں میں ہی اس نے اپنا مستقر بنا لیا۔ اس کے اخلاق و اطوار میرے ہمجولی لڑکوں سے بالکل نرالے تھے۔ مجھے بھا گئے۔ ابّا کی نظروں میں بھی جچ گیا۔ ہم دونوں اکٹھے ادھر ادھر گھومتے رہتے۔ حتیٰ کہ اس کے نیو یارک واپس جانے سے پیشتر ہماری نسبت ٹھہر گئی۔

امّی کی جدائی مجھ پر شاق تھی۔ وہ بے چاری ایسی حلیم۔ ایسی ڈرپوک۔ ایسی فرمانبردار اور پھر اتنی جفاکش! کہ عہد جدید کے آلات کشت کاری اور ہر طرح کے سامان آسائش کے ہوتے ہوئے تمام کام کاج وہ خود کرتیں۔ حالانکہ تھی یہ بے انصافی۔

ہمارا رہائشی مکان گرد و نواح میں بہترین تھا۔ کیونکہ ابا نمائش کے دلدادہ تھے۔ مگر امی اب بھی کپڑے گھر دھوتیں۔ اور کنوئیں سے پانی لاتیں حالانکہ احاطوں میں نلکے لگے ہوئے تھے۔ بایں ہمہ کبھی اس خدا کی بندی کے لب پر کوئی حرفِ شکایت نہ آیا۔ بلکہ وہ اسی خیال میں مگن رہتی تھیں کہ ان کے خاوند کا رسوخ ضلع بھر میں روز افزوں ترقی پر ہے۔ ان کی فطرت میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور جب کبھی ابا ان پر محبت آمیز نگاہ ڈالتے، اُن کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک اٹھتیں۔ واقعی وہ شوہر کی پرستار تھیں۔ آہ۔ اُس روح فرسا حادثے کے بعد جس کا تعلق ان کی موت سے ہے۔ جب بھی ان کی یاد آتی ہے۔ ان کی وہ جفاکشی، وہ محبت وہ قرباں پذیری، وہ ایثار آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ ہر رات ہمارے بستر بچھانا۔ تکیے کے نیچے لباسِ شب خوابی رکھ دینا۔ وہ بے غرض خدمت اور پیار اب تک ان کی یاد دل میں تازہ رکھتا ہے۔

میری شادی کی پہلی رات انہوں نے میرے کان میں کہا "مجھے امید ہے البرٹ میری بچی سے اچھا سلوک کرے گا۔ اور سرمو تم گرما میں تم ہمارے ہاں آیا کرو گی۔" میں نے باہیں اُن کے گلے میں ڈال کر کہا "ہاں امید تو ایسی ہی ہے۔ مگر میں البرٹ کی جوتیاں نہ اٹھاؤں گی اور نہ اس کے بستر بچھاوں گی۔" یہ کہہ کر امی کے گال پر چٹکی لی۔

انہوں نے مسکرا کر کہا "نیک عورتیں اپنے خاوندوں کو آرام پہنچانے میں کوتاہی نہیں کیا کرتیں۔ مرد کیلئے دنیا کے اندر مصائب تھوڑے ہوتے ہیں۔ محنت کر کے چُور ہو جاتا ہے۔ اُسے حتی الامکان آرام پہنچانا بیوی کا فرض ہے۔"

"امی یہ باتیں اب پرانی ہو چکیں۔ جبر۔ بچے پیدا کرنا اور خانہ داری کچھ کم کڑا کام نہیں۔ اس لئے عورت مرد سے زیادہ محنت کرتی ہے" "بشت۔ وہ دیکھو آ رہے ہیں" اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ کیونکہ ابا اور البرٹ آ رہے تھے۔ وہ ہنس رہے تھے اور بشاش معلوم ہوتے تھے۔ ابا میری شادی دھوم دھام سے کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کیونکہ وہ نمائش کے شوقین تھے۔

"دنیا دیکھے گی کہ ہنری کی بچی کی شادی کس شان سے ہوتی ہے۔" وہ کئی دفعہ کہہ چکے تھے۔

ابا شہرت پسند اور البرٹ ایک مشہور و معروف فرم کا نمائندہ۔ اس سے بہتر روپیہ خرچ کرنے کا موقعہ پھر کب نصیب ہوتا۔ میری تینوں بھاوجیں بھی گھر کی زیبائش اور اوپر کا کام کرنے میں امی کا ہاتھ بٹانے آ پہنچیں۔ مکان تختۂ گل بنا ہوا تھا۔

..

رسم شادی کے بعد ہی جبکہ تقریباً تمام علاقے کے لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ ابا نے سب کے سامنے مجھے اور البرٹ کو بطور تحفۂ شادی ایک ہزار ڈالر کا چیک دیا۔ اگر صرف گھر کے لوگوں میں مجھے یہ رقم ملتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا اور پھر میں اسے ایک فیاضانہ تحفہ سمجھتی۔ مگر اس چیک کے نمائشی پہلو نے اسکی وقعت کم کر دی ہے۔ امی کو بھی یہ بات پسند نہ تھی مگر وہ بے چاری بے بس تھیں۔

اس رات سب لوگ ہمیں اسٹیشن پر الوداع کہنے کیلئے آئے۔ میں بچشم نم امی سے رخصت ہوئی۔ مجھے اس ہجوم میں صرف انہی کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اور انہی کی جدائی سوہانِ روح ہو رہی تھی۔

میں نیویارک جیسے بڑے شہر میں پہلی دفعہ آئی تھی۔ مگر اس تنگ و گنجان معمورے میں ہمارے دیہات کی سی وسعت اور کشادگی کہاں۔ وہاں بالٹیوں گائیں بھینسیں ہر وقت دروازے پر موجود اور یہاں بوتلوں میں دودھ خریدنا۔ وہاں انباروں کے انبار اور یہاں لفافوں میں آلو لانا۔ ایک عجیب تقابل تھا اور پھر البرٹ کی قلیل آمدنی میں گزارہ کرنے کیلئے ہر چند بخل سے کام لیا جاتا پھر بھی آمد و خرچ کی حدود آپس میں ٹکرا جاتیں۔ میں چند ہی روز میں گھر جانے کیلئے بیتاب ہو گئی۔ ماں کی جدائی مجھے بے چین کئے دیتی تھی اور موسم کے بہت بڑے فرق کی وجہ سے بھی یہاں میرا دم گھٹا جاتا تھا۔ اگر کوئی بات وجہ تسکین تھی تو یہ کہ البرٹ میری دلجوئی میں ہر وقت کوشاں رہتا۔

میری شادی کے ایک سال بعد امی نے ہمیں اطلاع دی کہ ان کے حلقے کے لوگ ابا کو پارلیمنٹ کا رکن بنانے پر مصر ہیں۔ ان کی تحریر کے حرف حرف سے خاص افتخار مترشح تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ابا منتخب ہو جائیں گے۔ کیونکہ سیاست میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اور ہوا بھی یہی۔ مدِ مقابل نے منہ کی کھائی۔

میں نے امی کو اپنے ہاں چند ایام گزارنے کی دعوت دی

مگر وہ کسی طرح رضامند نہ ہوئیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی غیر حاضری میں ابا کو تکلیف ہو گی۔ گھر کے کام میں ہرج ہو گا۔ یہ معذوریاں جو ان کی طرف سے پیش کی گئیں تو ناچار میں خود ان سے ملنے چلی گئی۔

ابا کے حالات میں اب نمایاں تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ کامیابی کے نشے سے وہ سرشار نظر آتے۔ جب پاس پڑوس کے لوگ ان کی ملاقات کو آتے تو وہ شاہانہ انداز سے ان سے ملتے۔ ان کے اعزاز میں متعدد ضیافتیں ہوئیں، کئی جلسے کئے گئے۔ مارے خوشی کے امی کا قدم زمین پر نہ پڑتا۔ وہ بیش از پیش ان کی پرستار ہو گئیں۔ مگر خدا جانے کیوں مجھے ابا کی یہ عزت افزائی جو پرستش کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ ایک آنکھ نہ بھائی۔

ایک دفعہ عین اسی دن جبکہ ابا کو نیو یارک جانا تھا امی بیمار ہو گئیں۔ انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ میں فوراً پہنچ گئی۔ ڈاکٹر نے جو وہاں پہلے ہی سے موجود تھا طبی معائنہ کے بعد متفکر چہرے کو بشاش بناتے ہوئے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کثرت کار کی وجہ سے کوفت سی ہو گئی ہے۔ کچھ عرصہ کے مکمل آرام سے طبیعت بحال ہو جائے گی۔" مگر باہر آ کر مایوسانہ انداز میں سر ہلا کر کہنے لگا "دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ کیا عمر ہو گی ان کی؟"

ابا نے جواب دیا "یہی پینتالیس ۴۵ کے لگ بھگ" اور یہ کہتے ہوئے ان کی پیشانی پر شکن نمودار ہو گئے۔ جن کا مفہوم اس وقت میں نہ سمجھ سکی۔ ڈاکٹر بولا "انہیں حرکت نہ کرنے دیں۔ اب امور خانہ داری کی نگہداشت کیلئے آپ کو کسی تندرست اور جفاکش خادمہ کی ضرورت ہو گی۔" اور پھر مجھے مخاطب کر کے کہا "آمنہ تم کب واپس جا رہی ہو۔"

"مجھے تو فوراً واپس جانا ہے۔ میں آئی بھی جلدی میں تھی۔ وہاں بھی کام زیادہ ہے۔" کہنے کو تو میں کہہ گئی مگر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اگر امی کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو میری دنیا زیر و زبر ہو جائیگی۔

"کچھ دیر تو تمہیں ٹھہرنا ہی پڑے گا۔" ابا نے فیصلہ کن انداز میں کہا "میں کام کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ میرا ونی پگ میں انتظار ہو رہا ہو گا۔"

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہمارا کچھ سمجھوتا ہو گیا۔ میں نے ایورٹ کو خط لکھ دیا کہ میں اس حالت میں والدہ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تقدیر مجھے واپس وطن کی طرف کھینچ رہی تھی۔ اسی دن ہمارے قصبے کا فوٹوگرافر میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"میں اپنی لڑکی کے ہاں جا رہا ہوں اور اپنی دکان اور سامان بہت سستے داموں فروخت کرنے کو تیار ہوں۔"

میں نے ایورٹ کو اس کے متعلق لکھا کیونکہ میں محسوس کر رہی تھی کہ والدہ کے پاس رہنے سے میں بھی خوش رہوں گی۔ اور ان کی بھی تیمارداری ہوتی رہے گی۔

خط ملتے ہی ایورٹ آ گیا اور معاملہ طے ہو گیا۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر ہم نے ایک عمدہ عکاس خانہ وسیع پیمانے پر کھول لیا۔ اور اخبارات میں اشتہار وغیرہ دینے سے کام میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔

ایک سال اور گذر گیا۔ امی ابھی بستر بیماری پر ہی تھیں۔ ہم سمجھ گئے کہ اب مرض ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ بظاہر ان کو اسی وقت تکلیف ہوتی جب دورہ ہوتا۔ لیکن حقیقتاً ہر وقت وہ بے چین رہتیں۔ کام کاج سے جو وقت بچتا میں باہر کھیتوں میں گزارتی۔ امی بے چاری کو ایک یہ بھی دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں ان کا خاوند یہ نہ خیال کرنے لگے کہ کام کاج بھی نہیں کرتیں اور ان کے مرض پر بھی زر کثیر صرف ہو رہا ہے۔ مگر ڈاکٹر کی رائے تھی کہ ابھی تک کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ دل بیحد کمزور ہو چکا ہے۔ اور یہ بیچاری کسی دن لیٹی لیٹی دم توڑ دے گی۔ یا ممکن ہے کچھ عرصہ اور اسی طرح گزار دے۔

میں بھانپ گئی کہ آخری جملہ سن کر ابا نے ہونٹ دانت تلے دبا لیا اور چیں بہ جبیں ہو گئے۔ چند دن کے بعد ابا مجھ کو ریلوے اسٹیشن پر ملے۔ ایسے وقت ملے کہ گاڑی چھوٹنے والی تھی۔ وہ نیا سوٹ پہنے ہاتھ میں ایک قیمتی چرمی بیگ لئے گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ جب میں نے حیرانی کا اظہار کیا تو جواب دیا۔

"آمنہ، مجھے ونی پگ جانا ہے۔ کام کی نوعیت سے پتہ لگتا ہے کہ مجھے وہاں غالباً ایک ماہ کے قریب رہنا ہو گا۔ کچھ جائداد وہاں خریدی ہے۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔ مجھے اس سے پہلے جانا چاہیئے تھا۔ مگر تمہاری والدہ کی علالت کی وجہ سے رک گیا۔"

میں نے تیکھی نگاہ ڈال کر کہا "میرے خیال میں آپ کا یہاں رہنا جائداد کے انتظام سے زیادہ ضروری ہے۔"

"مگر ان دنوں اسے افاقہ ہے اور کام اشد ضروری ہے۔ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر تو اسے روز دیکھ ہی جاتا ہے۔ تم بھی کبھی کبھی دیکھ لیا کرو۔"

دورانِ گفتگو میں انہوں مجھ سے آنکھ نہ ملائی۔ اور میں ان کی اس بے رخی پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی رہی۔

"جائداد؟ تو کیا جائداد کا انتظام اس عورت کی زندگی سے زیادہ ضروری ہے جو ان پر جان چھڑکا کرتی تھی۔ اور اب کوئی دم کی مہمان تھی۔"

وہ جلدی سے چرمی بیگ لئے گاڑی کی طرف چل دئے۔ کتنے توانا۔ خوشحال اور باوقار تھے۔ پچاس سال کی عمر میں تقدیر نے ان کی راہ میں اقبالمندی اور فارغ البالی کے پھول بچھا دئے تھے۔ میں اندر گئی تو امی کہنے لگیں۔ "آمنہ! تمہارے باپ نے ونی پگ میں بہت سی اراضی خرید لی ہے۔ وہ بڑا ہوشیار ہے۔ بچارے کو کام کی اتنی بھرمار رہتی ہے۔ اور میں ہوں کہ سوائے اخراجات بڑھانے کے اس کا بوجھ ہلکا نہیں کر سکتی۔" آہ۔ امی کو مرتے مرتے بھی یہی حسرت تھی۔ جس دن ابا ونی پگ گئے۔ اس دن شام تک میں امی کے پاس بیٹھی حیات و ممات۔ انصاف و محبت کے مسائل پر غور کرتی رہی۔ مگر جب میں نے امی پر غنودگی طاری ہوتے دیکھی۔ تو دبے پاؤں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ انصاف! آہ خدا کی چکی کتنا باریک پیستی ہے۔

ابا ونی پگ میں ایک کی بجائے دو ماہ رہے۔ ان کی واپسی کے دوسرے ہی دن امی کی حالت ابتر ہو گئی۔ ایک نرس کو بلوایا گیا۔ ہفتہ بھر امی کی حالت امید و یاس کے بین بین رہی۔ اور پھر سدھر گئی۔ میں ان کے پاس رہی۔ اور بغلی کمرے میں سوتی رہی۔ ایک صبح ابا کی واپسی کے کوئی دو ہفتے بعد میں باورچی خانہ کی طرف ناشتہ تیار کرنے کی غرض سے گئی۔ خادمہ دودھ دوہنے گئی ہوئی تھی۔ جونہی میں نے دروازہ کھولا۔ ابا کوئی چیز آگ میں پھینک رہے تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ جانے کس بات نے مجھے واپس اپنے کمرے کی طرف جانے پر آمادہ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آ گئے۔ میں فوراً اندر گھس گئی اور چولھے کی طرف لپکی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک لکڑی کے اوپر ایک چٹھی پڑی ہے جو ابھی تک جھلسی بھی نہ تھی۔ میں نے اسے اُٹھا لیا۔ میں آج تک حیران ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ میں فطرتاً شکی مزاج نہیں ہوں۔ بسا اوقات میں نے ایسے خطوط آگ میں جلتے ہوئے دیکھے ہوں گے۔ مگر میں نے کبھی پرواہ تک نہ کی۔ تقدیر سب کچھ کرا رہی تھی۔ آہ! کیا رنجدہ انکشاف تھا۔ خط پڑھ کر میرا خون جوش کھانے لگا۔ مضمون یہ تھا:۔

ونی پگ۔ اکتوبر ۱۸؍ ۱۹۳۱ء

جان سے پیارے ہنری۔

کتنا عرصہ اور انتظار کرنا ہوگا۔ تمہارے فراق میں دن کاٹنے مشکل ہو گئے ہیں۔ تم نے تو کہا تھا بہت جلد "خبر" سن لوگی۔ ایک ایک گھڑی قیامت کی گزر رہی ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر نے غلط کہا ہو کہ وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس بات کو ایک سال ہو گیا ہے۔ کیا حشر تک منتظر رہنا ہوگا۔ جلد آؤ۔ کیا اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ تمہاری یہاں جائداد ہے۔ اسی بہانے چلے آؤ۔ للہ! شادی کو زیادہ معرض التوا میں نہ ڈالو۔"

تمہاری اپنی
مِنّی

میں نے کاغذ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر غصّے میں مروڑ ڈالا۔ اتنے میں نرس کو آتے دیکھ کر میں نے کاغذ باورچی خانہ کی ایک اکھڑی ہوئی اینٹ کے نیچے رکھ دیا۔ اور خود قہوہ بنانے میں مصروف ہو گئی۔ گویا کوئی بات ہی نہ تھی۔ حالانکہ غصے اور نفرت کا سمندر میرے سینے میں موجزن تھا۔

"آپ کی والدہ نے رات آرام سے گزاری ہے اور آج اچھی معلوم ہوتی ہے۔" نرس نے آتے ہی کہا۔

مجھے یاد نہیں میں نے کیا جواب دیا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں امی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر ان کے لبوں پر ایک معصوم مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولیں۔ "آمنہ میں اب جلدی تندرست ہو جاؤں گی۔ گولیاں بہت مفید ثابت ہوئیں۔ تمہارے ابا عجب مصیبت میں پھنسے ہیں —— انہیں کتنی فکر ہے۔"

میں نے جھک کر امی کا بوسہ لیا اور ان کے بال چہرے سے ہٹائے۔ ان کے دل میں ابا کی یہ عزت و محبت اور ابا ان کی موت کی گھڑیاں گن رہے تھے اور وہ بھی ایک سنگدل بدکار عورت کی خاطر جو ابا سے نہیں بلکہ اُن کی دولت کو پیار کرتی تھی۔

کیسا ظلم! کتنی بے انصافی تھی! آہ دنیا۔ دنیا۔ میرا تمام دن درد و کرب

میں گزرا۔ جب ابا ناشتہ کیلئے آئے میں اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ میرا دل کھانا کھانے کو نہ چاہا۔

"اب کروں تو کیا کروں۔ کیا ابا کو بتا دوں کہ مجھے ان کے راز کا علم ہے؟ اس بے شرم فاحشہ کو لکھوں کہ میں تمہارا راز طشت از بام کر دوں گی؟ نہیں کچھ بھی ہو اندرونی جوش کو دبانا ہی مناسب ہے۔ امی ابا کی دلدادہ تھیں۔ انہیں اصلیت کا علم ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔

میں نے ایورٹ کو فون پر پیغام دیا کہ آ کر مجھے لیجائے اور وہ آتشیں راز سینے میں چھپا لئے۔ میں وہاں سے رخصت ہوئی۔ میں نے ایورٹ سے ذکر نہ کیا۔ شہر میں بہت سے ہمسایوں اور واقفکاروں نے امی سے متعلق استفسارات کیئے اور سب نے ابا سے اس مصیبت میں اظہار ہمدردی کیا۔ سب کو ان کے مصائب کا خیال تھا اور اس سراپا ایثار کی تصویر سے جو غلاموں کی طرح دن رات ابا کی خدمت کیا کرتی اور اس نازک حالت میں بھی جبکہ وہ قریب مرگ تھی۔ اسے اپنے شوہر کا آرام مدِ نظر تھا۔ کسی کو ہمدردی نہ تھی۔ جی تو چاہتا تھا کہ ببانگ دہل اعلان کر دوں کہ ہنری وہ انسان نہیں جو ان کے ذہن میں ہے بلکہ ایک متکبر، خود غرض، ہیچی خورہ ہے جس کی روح داغہائے معاصی سے بدنما ہو چکی ہے مگر۔۔۔۔۔"

اس کے بعد ایک ہفتہ تک میں امی کو دیکھنے نہ گئی۔ میں ابا سے دوچار ہونا نہ چاہتی تھی۔ میں اتنی زرد پڑ گئی اور ایسی عجیب و غریب حرکات مجھ سے سرزد ہونے لگیں کہ ایورٹ بے چارہ متفکر ہو گیا۔ اس نے یہی سمجھا کہ یہ سب امی کی علالت کی وجہ سے ہے اور میں نے بھی اسے اسی دھوکہ میں رکھنا مناسب سمجھا۔ دوسرے ہفتے امی کو کچھ افاقہ رہا اور نرس رخصت کر دی گئی۔ ابا نے ڈاکٹر سے کہہ دیا "میں خود اس کی تیمارداری کروں گا۔" ڈاکٹر بھی مطمئن ہو گیا کیونکہ مریضہ بہترین توجہ کی محتاج تھی۔ مجھے بلوا بھیجا گیا۔ مگر ابا خود امی کے کمرہ میں سونے کا انتظام کر چکے تھے۔ اور دوائیوں کا بکس بھی اسی کمرہ میں لے گئے تھے۔ میں نے جب یہ انتظامات دیکھے تو اس عورت کے الفاظ میرے دماغ میں چکر کھانے لگے "تم نے تو کہا تھا کہ بہت جلد" خبر سن لو گی اور یہاں ایک ایک گھڑی قیامت کی گزر رہی ہے۔"

ایک دفعہ پھر مجھے خیال آیا کہ سارا بھانڈا پھوڑ دوں مگر امی کی دلشکنی کے خیال نے مجھے اس ارادہ سے باز رکھا۔ میں ابا کو غیر سمجھنے لگی۔ یوں محسوس کرتی کہ میرا جسم اور روح فرشتہ سیرت والدہ کا جزو ہیں۔ جوں جوں دن گزرتے نزدیک تر ہوتی جا رہی تھیں۔ گو ان دونوں کیلئے ایک ایک دن پہاڑ تھا۔

یہ خوفناک راز میرے لئے سوہانِ روح تھا جس دن سے مجھے ابا کی اس حرکت کا علم ہوا۔ اس دن سے میں کئی دفعہ راتوں کو چونک پڑتی اور دل کو یہ طفل تسلی دینے کی کوشش کرتی کہ شاید یہ خواب ہو۔ ابا جن کو ان کے دوست اور ہمسائے عزت کی نگاہ سے دیکھتے جنہوں نے میدانوں کی آندھی اور برسات سے بھی سونا پیدا کر لیا۔ جنہوں نے لوگوں کیلئے قوانین وضع کیئے۔ ایسے شرمناک فعل کا مرتکب ہوئے۔ یہ تھی بات جو جگر پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھی۔ اور وہ بے کس و بے بس عورت جو سالہا سال تک خدا کے بعد دوسرے درجے پر ان کی قدر و منزلت کرتی تھی اُن کی کرتوتوں سے مطلقاً بے خبر تھی۔

دن گزرتے گئے۔ اور پھر وہ روح فرسا رات یعنی ۲۳ نومبر آئی۔ کاش کہ یہ تاریخ جنتری سے مٹ سکتی۔ کیونکہ یہ میرے دماغ میں ابھی تک آتشیں حروف میں مرقوم ہے۔ جب سے ابا امی کے کمرہ میں سونے لگے تھے میں ان کے ہاں نہیں گئی تھی۔ مگر ہر روز خبر منگاتی رہتی جس سے پتہ چلتا رہتا کہ مریضہ کو افاقہ ہے۔ کرسمس نزدیک آ رہا تھا اور موسم نہایت خوشگوار تھا۔ گویا فطرت کو ہر ذی نفس کو خوش رکھنا مقصود تھا۔ میں بعد دوپہر شہر میں گئی تو سب کو یہی کہتے سنا۔ "آفریں ہے تمہارے والد پر۔ بے چارے نے اس کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا ہے۔" سوائے ہاں میں ہاں ملانے کے اور چارہ ہی کیا تھا۔ لیکن میرے دل کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ میں یہ جھوٹی تعریف سنتے سنتے تنگ آ گئی تھی۔ لیکن انکشاف راز ناممکن تھا۔

شام کو میں واپس گھر لوٹ رہی تھی کہ مجھے ابا کا ایک ہمسایہ مل گیا۔ کسی غیبی احساس کے زیر اثر میں اس کے ساتھ امی کی بیمار پرسی کیلئے چل پڑی۔ آہ اگر میں نہ جاتی تو صورت حالات شاید یہ نہ ہوتی۔

ایورٹ خوش تھا کہ میں وہاں جا رہی تھی۔ اس نے کئی بار مجھ سے کہا تھا کہ چلو تمہاری امی کو دیکھ آئیں لیکن ہر بار میں نے کوئی

نہ کوئی عذر کر کے ٹال دیا۔ مجھے خوف تھا کہیں میرے والد کا راز طشت از بام نہ ہو جائے۔ اب جبکہ میں نے خود آمادگی ظاہر کی۔ وہ کہنے لگا "آمنہ واپس آنے میں جلدی نہ کرنا۔ جتنا ممکن ہو تمہیں اپنی امی کے پاس ٹھہرنا چاہیئے۔ نومبر کی رات تھی۔ وسیع میدان میں آندھی کی آواز سنائی دیتی۔ جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ گھنے بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ میرے ساتھی نے کہا۔ "آج طوفان کے آثار ہیں۔"

"ہاں۔ آثار تو کچھ ایسے ہی نظر آتے ہیں۔" میں یہ کہتے ہوئے کانپ اٹھی۔ رات تاریک تھی ہم سرگرم سفر رہے۔ حتیٰ کہ سامنے مکانوں کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ باورچی خانے میں اور امی کے کمرے میں لمپ روشن تھا۔ جونہی ابا نے گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ سنی۔ وہ باہر نکل آئے۔ ان کی آواز سے میں فوراً تاڑ گئی کہ وہ میرے آنے سے سراسیمہ ہو گئے ہیں۔ خفگی کے آثار صاف ان کے چہرے سے نمایاں تھے۔

"ایورٹ بھی آیا ہے کیا؟" انہوں نے ترشرو ہو کر پوچھا۔

"نہیں میں جاتی کے ساتھ آئی ہوں اور رات یہیں رہونگی"

میں نے نرس سے چاء کی پیالی لے لی اور جلدی سے ختم کر کے امی کے کمرے میں چلی گئی۔ سایہ دار لمپ کی روشنی میں ان کا چہرہ سفید نظر آ رہا تھا۔ لیکن میری آواز سنتے ہی انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرائیں اور جب میں انہیں بوسہ دینے کیلئے جھکی تو انہوں نے کہا "میری بچی تمہارا کیا حال ہے۔"

"اچھا حال ہے امی جان۔ میں رات بھر آپ کے پاس ٹھیروں گی۔"

اتنے میں ابا اندر آ گئے اور کپڑوں کو الٹنے پلٹنے لگے۔

میں نے کہا "آج رات میں امی کے کمرے میں سوؤں گی۔ آپ بغلی کمرے میں آرام کر لیں۔ آپ کئی راتوں سے جاگ رہے ہیں۔"

مگر ابا نے بچھونا بچھاتے ہوئے کہا "نہیں میں حسب معمول یہیں سوؤں گا۔ کیونکہ دوا وغیرہ پلانے کی ہدایات مجھے ہی یاد ہیں اور آج سردی بھی کچھ زیادہ ہے۔"

میں کچھ دیر امی کے پاس بیٹھی رہی لیکن وہ سوئی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اسلئے میں وہاں سے اٹھ کر اپنی خوابگاہ میں آئی اور کپڑے اتار دیئے۔ لیکن نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔ ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی اور طوفان زوروں پر تھا۔ نصف شب میں وہ آوازیں جو دن کو معمولی تصور کیجاتی ہیں عجیب کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں اپنے گھر میں مضطرب تھی۔

صبح کے چار بجے ہوں گے۔ کہ امی کے کمرہ میں کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی میں نے کان ادھر لگا دئے۔ کوئی حرکت کر رہا تھا۔ شاید امی کی حالت ابتر ہو گئی ہو۔ اور ابا کسی اور کو بیزار کرنا نہ چاہتے ہوں۔

میں گون اور سلیپر پہنکر کمرے سے نکلی۔ امی کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں ایک لمحہ بھر باہر ٹھیری رہی۔ کوئی آواز نہ آئی۔ آہستہ سے میں نے دروازہ کھول دیا۔ ابا امی کے سر کو سہارا دیکر گلاس ان کے منہ کو لگائے تھے۔ اور دھیمی آواز میں کہہ رہے تھے۔ "مار تھا۔ پی جاؤ۔ ایک قطرہ بھی نہ چھوڑنا۔"

اور وہ پی گئیں اف مرتے مرتے بھی وہ ان کی فرمانبردار تھیں۔ ابا کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں پوچھنے ہی کو تھی کہ کیا امی کی حالت زیادہ خراب ہو گئی ہے کہ میری نظر دوائیوں کی چھوٹی الماری پر پڑی اور ایک بوتل پر ٹھیر گئی۔ جس پر سے ڈھکنا اترا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر خون میری رگوں میں منجمد ہو گیا۔

جب امی نے دوا پی لی تو ابا نے پھر ان کو لٹا دیا۔ ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے مگر مجھے دیکھ کر وہ حیران سے رہ گئے۔ میں نے بھی بغیر کچھ کہے امی کا سرد ہاتھ پکڑ لیا۔ ان کی آنکھوں کی روشنی مفقود ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی اس شخص کے چہرہ کی طرف ان کی آنکھیں لگی تھیں جس کے سر پہ خون سوار تھا۔

"ہنری۔ تم نے میرے ساتھ آخری دم تک نباہی۔" اس کے بعد گو لب جنبش نہ کر سکے۔ مگر آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک تھی۔ ابا نے اپنے ہونٹ پونچھے اور گھٹنوں کے بل گر کر سر ہاتھوں میں لے کر بلک بلک کر رونے لگے۔ پچپن سالہ غرور اور تمکنت۔ ان کی ریاکاری نے خاک میں ملا دیا۔ ان کی مجرم اور خوفزدہ روح اب بے نقاب ہو چکی تھی۔

"آمنہ۔ آمنہ۔ میری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔ اس کے اچھا ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ اور وہ سخت تکلیف میں تھی اس لئے......"

پسینے کے قطرات ان کی پیشانی پر نمودار ہوئے اور سفید رخساروں پر آنسوؤں کے ساتھ گھل مل گئے - میں اپنے آبا نہیں بلکہ ایک قاتل کے سامنے کھڑی تھی - و نی پگ میں ایک عورت اس ڈرامہ کے آخری سین پر پردہ گر جانے کی منتظر تھی اور ایک بے غرض - فرمانبردار - ایثار مجسم - عصمت مآب عورت کی روح وہاں پہنچ چکی تھی جہاں مظلومیت کو انصاف کی توقع ہوتی ہے -

میں اُٹھ کھڑی ہوئی - لاش کا منہ ڈھانپ دیا اور قہر آلود نگاہوں اور خشمگیں دل کے باوجود روتے ہوئے بولی - "میں اسے ایک راز سربستہ رکھوں گی - وہ تم پر جان دیتی تھیں اور دنیا کو یہ بتانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ آپ قاتل ہیں -"

صبح ہوتے ہی نوکروں چاکروں کو بیدار کر کے اس غمناک اور ناگہانی موت سے مطلع کر دیا گیا - ڈاکٹر نے چونکہ پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ پتہ نہیں مریضہ کس وقت دم توڑ دے - لہذا شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی - اس سانحہ کے چند روز بعد تک میں عجیب ذہنی جانکنی کی حالت میں رہی - خویش و اقارب آتے جاتے رہے - مگر مجھے کوئی ہوش نہ تھا - لوگ والد سے ہمدردی کرتے اور کہتے "اچھا ہوا بیچاری دکھ سے نجات پا گئی -" اور میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اظہار حقیقت نہ کر سکتی تھی - تجہیز و تکفین کے دن آبا کی ماتمی صورت اور پادری کا ان کو ایک باوفا اور محبت کرنے والا خاوند کہہ کر پکارنا ایک مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی تھی - صداقت مجھے اس بات پر مجبور کر رہی تھی کہ میں صاف صاف کہہ دوں کہ آبا کو مرحومہ سے ذرا بھی محبت نہ تھی - وہ پرلے درجے کے بے وفا ہیں - انہوں نے زہر دیکر اماں کو مار ڈالا ہے مگر......

دن گزرتے گئے - ایسے دن جبکہ میں بیٹھی مجنونانہ ہر طرف تکتی رہتی - اور یہ یوں معلوم ہوتا کہ میں پاگل ہو جاؤں گی - ایورٹ بیچارہ متفکر رہتا - احباب و ہمسائے ہمدردی کرتے مگر آہ، انہیں کیا معلوم کہ کون سا غم مجھے اندر ہی اندر گھلا رہا ہے - کرسمس کے دن آبا ہمارے مکان پر آئے - تکفین کے بعد میں ان سے پھر نہیں ملی تھی - ان کے چہرے سے اب پیری اور کمزوری کے آثار ہویدا تھے - دیکھنے والے کہنے لگے - "آہ بے چارہ صدمہ برداشت نہیں کر سکا - اس بڑھاپے میں بیوی کا مر جانا گویا برسات میں گھر کے بیٹھ جانے کے برابر ہے -" کانپتے ہاتھوں سے بغیر نظر ملائے انہوں نے مجھے پچاس ہزار ڈالر کا چیک دیا - کاروبار فروخت کرنے کے بعد یہ رقم میرے حصے کی مجھے دیکر وہ و نی پگ جا رہے تھے جہاں کی روانگی پر دل ہی [illegible] اب وہ اس عورت کے پاس جا رہے تھے جو انکی منتظر تھی - جس نے اس دن کیلئے منتیں مانی ہونگی اور جسے بوہم و گمان بھی نہ تھا - کہ اس کا یہ راز بھی مجھ پر آشکار رہا ہے - ایورٹ نے یہ سوچ کر کہ شاید تبدیلی ماحول رفع غم کا موجب ہو مجھ سے پوچھا "کیا تم بھی و نی پگ جانا چاہتی ہو -" عام حالات میں یہ ایک معصومانہ سوال تھا مگر اندریں حالات میں نے چیخ کر کہا "نہیں نہیں - ہرگز نہیں -" اب چونکہ ہمارے پاس کافی روپیہ تھا - ہم نے نیویارک میں ایک عمدہ سا مکان خرید لیا اور وسیع پیمانے پر کام شروع کر دیا - میں بھی ایورٹ کی خاطر بظاہر بشاش رہنے لگی - مجھے آبا سے رسماً خط و کتابت جاری رکھنا پڑی ورنہ ممکن تھا ایورٹ کو شک گزرتا - رہ رہ کے مجھے یہ تعجب ہوتا کہ آبا کا ضمیر انہیں ملامت نہ کرتا ہوگا - مہینے گزر گئے - اس تاریک راز کے نقوش کچھ دھندلے ہونے لگے - میں بھی ایورٹ کے ساتھ کام میں دلچسپی لینے لگی - چونکہ اس علاقے کے لوگ خوشحال اور اعلےٰ طبقے کے تھے - کام خوب چل نکلا - دو سال اسی طرح گزر گئے اور میرے خیال میں وہ راز صرف میرے سینے تک ہی محدود تھا - آہ! انسان کیسی ناچیز ہستی ہے - تقدیر کس طرح اس کی تدابیر پر خندہ زن رہتی ہے - یہ کسے خیال ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ جنہوں نے آبا کی جائیداد خریدی تھی - باورچی خانے کا فرش ادھیڑ کر نیا فرش لگائیں گے اور آبا کا وہ راز فاش ہو جائے گا - اور اس طرح آبا کو عدالت کے روبرو ایک قاتل کی حیثیت میں پیش ہونا پڑے گا - اور انتقام کا ہاتھ انہیں زنداں کی طرف لے جائیگا -

ایک دن میں برتن صاف کر رہی تھی کہ ایورٹ وہاں آکر کہنے لگا "آمندہ کوئی آدمی باہر تمہاری ملاقات کیلئے کھڑا ہے" میں نے جلدی سے ہاتھ پونچھے اور بیٹھک میں گئی - وہاں ایک اجنبی کھڑا تھا جو مجھے دیکھ کر کہنے لگا "میں خفیہ پولیس کا افسر ہوں - کیا آپ میرے ساتھ آنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گی؟"

میں یہ سن کر ششدر رہ گئی - اور میری جگہ ایورٹ بولا "ذرا کھول کر فرمائیے آپ کا مطلب کیا ہے -"

"آپ کی اہلیہ محترمہ کا والد ہنری اپنی پہلی بیوی کے قتل کے الزام میں زیر حراست ہے اور آپ کی شہادت مطلوب ہے -"

یہ الفاظ سُن کر مجھے چکّر آ گیا۔ کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی اور میں کرسی پر گر پڑی۔ لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال لیا کیونکہ مجھے راز حتی الامکان پوشیدہ رکھنا تھا۔

"میرے ابا قتل کے جرم میں؟ ناممکن۔" یہ اُکھڑے اُکھڑے الفاظ گلو گیر آواز سے بصد مشکل میری زبان سے نکل سکے۔

پولیس افسر بولا" معلوم ہوتا ہے کہ نئے مالکان مکان کو فرش میں کچھ ادل بدل کرتے ہوئے ایک چھیٹی ملی ہے جس نے کچھ شبہات پیدا کر دیئے ہیں۔"

میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔

سراغرساں نے ایورٹ سے کہا۔"گاڑی سوا آٹھ بجے چھوٹتی ہے۔ اب سات بجے ہیں۔ مسز ایورٹ میری زیر نگرانی ہیں۔ جب تک وہ تیار ہوں مجھے یہیں رہنا ہوگا۔"

چھیٹی کا مجھے خیال تک نہ رہا تھا۔ ورنہ میں اسے کسی نہ کسی طرح تلف کر دیتی۔ مگر تقدیر کے آگے تدبیر ناکارہ ہے۔ طوعاً و کرہاً میں تیار ہو کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ مقدمے کے مبادیات مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہے۔ صرف اتنا یاد ہے کہ عدالت کا کمرہ تھا اور ہیں جمِ غفیر۔ احباب۔ ہمسائے اور میرا ملزم باپ۔

ایک لمحہ کیلئے کمرے میں سکوت کامل رہا۔ پھر سرکاری وکیل نے کچھ حلفیہ الفاظ کہے جو میں نے دہرائے۔ معاً میری نظر قیدی سے دوچار ہوئی اور رحم کا دریا میرے سینے میں جوش مارنے لگا۔ تمام غصّہ کافور ہو گیا۔ اس کی ملتمسانہ نگاہوں میں اس کی رُوح منعکس تھی۔ جب چھیٹی عدالت میں پڑھ کر سنائی گئی سامعین کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ معائنہ کی رپورٹ پڑھ کر سنائی گئی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ابا کو اس بات کی حیرانی تھی کہ وہ چھیٹی جلنے سے بچ کس طرح رہی۔ پھر سرکاری وکیل نے مجھ سے سوال کیا "مسز ایورٹ! جس دن آپ کی والدہ کا انتقال ہوا آپ وہاں موجود تھیں؟"

.. ..

(ترجمہ)

میں نے چہرہ ہاتھوں سے چھپا کر کہا "نہ پوچھئے لِلّٰہ مجھ سے یہ سوال نہ پوچھئے۔" اور پھر میں بے ہوش ہو گئی۔

تین ہفتے بعد مجھے ہوش آیا۔ میں ہسپتال میں پڑی تھی۔ اتنے دن میرا دماغ ماؤف رہا۔ اور میری جان کے لالے پڑے رہے۔ لیٹے لیٹے سب واقعات یکے بعد دیگرے میرے سامنے آنے لگے۔ عدالت کا خوفناک کمرہ۔ انجیل۔ حلف۔ ابا کا چہرہ۔ مگر ابا پر کیا بیتی مجھے اس کا ذرا بھی علم نہ تھا۔ نرس سے میں پوچھنا نہ چاہتی تھی۔ شام کو ایورٹ آیا۔ ابا کے متعلق استفسار پر اس نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔ مگر میرے اصرار پر اسے بتانا ہی پڑا۔ ابا نے اقبال جرم کر لیا تھا اور قید خانے میں سزا بھگت رہے تھے۔ مجھے یہ تسلی تھی کہ کم از کم میری شہادت ان کی سزا یابی کا باعث نہیں ہوئی۔ ورنہ تمام عمر مجھے اس کا رنج رہتا۔ نیویارک واپس جانے سے پہلے میں ابا کی ملاقات کیلئے گئی —— اُن ... کو اس ذلت میں دیکھ کر اگر میرے دل کے کسی کونے میں جذبہ نفرت کا شائبہ بھی تھا تو وہ معدوم ہو گیا۔

اس واقعہ کو بیس سال گزر گئے ہیں۔ اب ابا کی عمر چھہتر سال ہے اور روز بروز قبر سے نزدیک تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کا آفتابِ زندگی افقِ مغرب میں غروب ہونے کے قریب ہے۔ میں گاہ گاہ ان سے ملنے جاتی ہوں۔ غم و الم نے اپنے گہرے نقوش ان کے چہرے پر ثبت کر دیئے ہیں۔

"آئندہ۔ ہم تقدیر سے نہیں لڑ سکتے۔ ہمارے گناہ ظاہر ہو کر ہی رہتے ہیں۔ میں نے خدائی معاملات اپنے ہاتھ میں لئے اور اس کا خمیازہ بھگتا۔ آہ کمزور اور فانی انسان! اپنی ہستی کو نہیں پہچانتا۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو آخری ملاقات پر ابا کے منہ سے نکلے۔ کسی دن میں سُن لوں گی کہ ابا جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اس کے بعد ...... میری پیاری مرحومہ امی سفید لباس میں اپنے خاوند کی منتظر ہوں گی اور خدا کے حضور میں اس کی سفارش کر رہی ہوں گی۔ جیسے ایسا گناہ کبیرہ کا مرتکب ہونے کے باوجود وہ دل سے چاہتی تھیں

الفت بی۔ اے

وزیر آبادی

دو گھرانے

تعارف

رقیہ بیگم ——— داروغہ جیل کی بیوی
زبیدہ بیگم ——— رقیہ بیگم کی نند
فرخندہ اور ثریا ——— رقیہ بیگم کی لڑکیاں
رقیہ کی ساس ———

خدیجہ ——— ایک ڈپٹی کی بیوی
نسیمہ ——— خدیجہ کی بڑی لڑکی
امینہ ——— چھوٹی لڑکی
خدیجہ کی ساس ———

پہلا سین

رقیہ بیگم اور زبیدہ بیگم اپنے پلنگ پر بیٹھی دھوپ تاپ رہی ہیں۔ فرخندہ سٹول پر کھڑی ہو کر صحن کی دیوار پر سے پڑوسن کی لڑکی کے ساتھ باتیں کر رہی ہے۔ ثریا بھاگتی ہوئی آتی ہے۔

ثریا۔ (تیزی سے) اماں شاید ہمارے ہاں کوئی ملنے کیلئے آئی ہیں ابھی ابھی میں نے ڈیوڑھی پر تانگہ رکتے دیکھا ہے۔ چار برقعے ہیں۔ دو سفید، ایک نیلا، ایک جوگیا۔

رقیہ بیگم۔ ڈپٹی کے ہاں سے آئی ہونگی۔ وہی ہمیشہ بے وقت آ دھمکتی ہیں۔ وہ لا الگنی پر سے میری گرم چادر۔ کپڑے تو خیر ابھی ٹھیک ہیں۔ دوپٹہ ذرا میلا ہو گیا ہے۔ اتار دوں

زبیدہ بیگم۔ (کھڑی ہو کر) بھابی تم ان کو بٹھانا۔ میں جلدی سے یہ کپڑے بدل دوں۔ پچھلی دفعہ جب میں ان سے ملی تھی تب بھی یہی پہن رکھے تھے۔

[فرخندہ سٹول پر سے کود کر اب آئینہ کے سامنے کھڑی جلد جلد اپنے بال درست کر رہی ہے۔ چار برقعہ پوش خواتین اندر داخل ہوتی ہیں۔ جن میں ایک تو رقیہ بیگم کی ہم عمر ہے اور دو نوجوان لڑکیاں رقیہ بیگم کی لڑکیوں کی ہم عمر۔ ایک خاتون جس کی عمر ستائیس اٹھائیس برس کی ہوگی ——— (چاروں) السلام علیکم!]

رقیہ بیگم۔ بسم اللہ۔ آج کدھر سے عید کا چاند نکلا۔

خدیجہ۔ آپ کی بھانجیاں کہیں دم نہ لینے دیتی تھیں۔ ہر روز کہتی تھیں چلو خالہ جان کے ہاں۔ چلو خالہ جان کے ہاں۔

رقیہ بیگم۔ میری بھانجیاں مجھے یاد نہ کریں تو اور کون کرتا۔ فرخندہ اور ثریا بھی ہر وقت انہیں یاد کرتی رہتی ہیں۔ (ساتھ والی خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بہن ان کو میں نہیں پہچانتی؟

خدیجہ۔ یہ میری چھوٹی بھاوج ہیں۔ خدا جنت نصیب کرے ——— مقبول احمد کی بیوی۔ میرے بار بار کے تقاضہ پر پرسوں امرتسر سے ملنے کیلئے آئی تھیں۔

رقیہ۔ آج کا دن بڑا مبارک ہے۔ ان سے بھی ملنا ہو گیا (آواز بڑھا کر) فرخندہ! ثریا! ادھر آؤ۔ دیکھو تمہاری خالہ اور بہنیں آئی ہیں۔

[زبیدہ بیگم باہر نکل کر بڑے تپاک سے سب سے گلے ملتی ہیں۔ لڑکیاں بھی شرماتی ہوئی آکر اپنے بزرگوں کے پیچھے بیٹھ جاتی ہیں]

رقیہ۔ زبیدہ دیکھو! یہ بہن خدیجہ کی بھاوج ہیں۔ پانچ سال ہوئے چھ ماہ کی بیاہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ اکثر میکے میں رہتی ہیں۔ ابھی بے چاری کی عمر ہی کیا ہے۔ لڑکیوں کی صورت ہے۔ سچ ہے نیک بختوں ہی کو خدا آزمائش میں ڈالتا ہے۔

زبیدہ۔ بال بچہ بھی کوئی نہ ہوا۔ جس سے دل بہلا لیتی۔ اچھا بہن خدا صبر کی توفیق دے۔ شریفوں کیلئے شرافت ہی بڑی

چیز ہے۔

خدیجہ - بہن رقیہ ہم تو آپ کی نئی کوٹھی دیکھنے کیلئے آئے ہیں۔ اب وہاں اُٹھ جاؤ گی یا کرایہ پر رہنے کا ارادہ ہے؟

رقیہ - ابھی تو نہ کرایہ پر رہنے کا ارادہ ہے نہ خود جانے کا۔ کوٹھی بنوانے والے سلامت رہیں۔ (مسکرا کر) آ گئے ہم کب کوٹھی کے کرایہ پر بیٹھے ہیں۔

خدیجہ - ہاں اللہ رکھے خدا کا دیا بہت کچھ ہے۔ اسی طرح ہماری دونوں کوٹھیاں بھی خالی پڑی ہیں۔ کرایہ دار آتے ہیں واپس چلے جاتے ہیں۔ آپ کے بھائی کہتے ہیں دیکھا جائے گا۔

رقیہ دہ کوٹھیاں بھی تو موئیں اُجاڑ جنگل میں۔ کوئی لے گا بھی بڑے دل گردے والا۔

خدیجہ - بہن تم گئی تھیں کیل کے ہاں پسند آئی لڑکی؟

رقیہ - ابھی ہمیں لڑکیوں کے دیکھنے دکھانے کی جلدی کیا ہے۔ خدا خیریت رکھے لڑکا پڑھ چکے گا۔ تو لڑکیاں بہتیری مل جائیں گی۔ اُن کے تقاضہ سے چلی گئی تھی۔ وہ ہمارے رفیق پر ریجھ بیٹھے ہیں۔ روز ان کی نائن آتی تھی کسی نہ کسی بہانہ سے۔ میں نے کہا ذرا دو گھڑی کیلئے چلی ہی جاؤں۔ اور نہیں تو اُن کے گھر کا طور طریقہ ہی دیکھ آؤں۔

خدیجہ - لڑکی کی بڑی تعریف سُنی جاتی ہے۔

رقیہ - ہاں اچھی سی تھی لڑکی۔ مگر بہن! رفیق تو کہتا ہے۔ ایسے گھر شادی کروں گا۔ جہاں سے کم از کم ولایت کا خرچ مل جائے۔ ان کی رہیں تین لڑکیاں۔ آخر بہت دیا تو پھر بھی تین کو کتنا دیں گے۔ اپنی حیثیت ہی کا دیں گے۔ دوسرے مجھے وہم آ گیا۔ لڑکی تین بیٹوں کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ تین بھائیوں کے اوپر کی لڑکی اچھی نہیں ہوتی۔

زبیدہ - ہمارے رفیق کے لئے لڑکیوں کی کمی ہے۔ میں تو بھائی سے کہتی ہوں۔ ابھی ان بکھیڑوں کو رہنے دو۔ رفیق پڑھ لے تو پھر دیکھا جائے گا۔

رقیہ - ہاں ایک ہنسی کی بات سنو بہن! لڑکی بیچاری تو کہیں رہی۔ میں گئی تو لڑکی کی ماں بھی عاصی ~~وہاں بیٹی تھی~~۔ سرخ ہری چھال کا پاجامہ۔ کاسنی کریب کی قمیض۔ پیازی رنگ کا دوپٹہ۔ میرے لڑکے نے بھی سُنا تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ۔ کہ بھلا ان بیگم صاحب کے اپنے ہی شوق ابھی پورے نہیں ہوئے۔ اور چلی ہیں لڑکی کا رشتہ کرنے۔

خدیجہ - (ہنستے ہوئے) بہن کر لیتیں۔ رفیق کو ساس تو مل جاتی بیر بہوٹی سی۔

[رقیہ بیگم کی ساس باورچی خانہ سے کھانستی ہوئی نکلتی ہیں اور سب کو اسلام لے کر قریب ہی تخت پر بیٹھ جاتی ہیں]

رقیہ کی ساس - (کچھ دیر بعد رنگیں برقعوں کی طرف اشارہ کر کے) یہ کیسے کپڑے رکھے ہیں؟

زبیدہ - اماں جان لڑکیوں کے برقعے ہیں۔

ساس - کنواری لڑکیوں کے برقعے؟

رقیہ - اماں جان اب کنواری بیاہی کا فرق گیا۔ اب تو کنواری لڑکیاں بیاہی لڑکیوں سے اچھی رہتی ہیں۔

زبیدہ - اماں جان آپ ثریا اور فرخندہ کو روکتی ہیں۔ دیکھا سب لڑکیاں آجکل ایسے ہی برقعے پہنتی ہیں۔

ساس - میرے سامنے رنگین برقعے پہن کر تو مدرسے نہ گئیں جانتی نہیں رنگدار برقعے پر غیر مرد کی نگاہ اُڑ کر پڑتی ہے۔

زبیدہ - اماں جان اپنے اپنے زمانہ کے فیشن سبھی کر لیتے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ بیچاری لڑکیوں پر سختی کرتی ہیں۔ سفید برقعے پہننے والیاں بھی چپے چپے پر لیس، فیتہ، جھالر لگا لیتی ہیں کیا وہ فیشن نہیں۔ یہ تو پھر بھی سادہ سلے ہیں۔

ساس - اپنے دلیسی طور طریقہ سے کون روکتا ہے۔ مہندی لگائیں چوڑیاں پہنیں۔ مگر یہ میموں والے لعاتے پہن کر بازاروں میں نکلنا کونسی شرافت ہے۔ خدیجہ خاتون میری مانو تو کنواری لڑکیوں کو رنگدار برقعے پہننے سے روکو۔ لاڈ پیار کے اور بہتیرے طریقے ہیں۔

خدیجہ - شرافت دل کی چاہیئے، خاندانی لڑکیاں خواہ ہیرے پہن لیں پھر بھی خاندانی ہی کہلائیں گی اور یہ جو دوسری تیسری ہوتی ہیں ان کے جو وہ قصے مجھ سے سُن لیجئے۔ خواہ ظاہرہ منہ پر مکھیاں ہی بھنبھنا رہی ہوں۔

[لڑکیاں آہستہ آہستہ منہ میں باتیں کر رہی ہیں۔ رقیہ کی ساس کو ایک دم کھانستے کھانستے غوطہ آجاتا ہے۔ فرخندہ بے اختیار ہنستی ہے اور منہ دبا کر بھاگ جاتی ہے۔ اس کے پیچھے باقی لڑکیاں بھی بھاگ جاتی ہیں۔]

ساس ۔ (خدیجہ سے) خدیجہ ۔ کہو لڑکوں کیلئے کوئی رشتہ ملا ؟ پرسوں کریمہ کہہ رہی تھی اُن کو بڑی تلاش ہے ۔

خدیجہ ۔ (طنزاً مسکرا کر) اماں جان کیسی بھولی باتیں کرتی ہیں ۔ بھلا سعید اور رشید کے لئے بھی رشتوں کی کمی ہے بیسیوں رشتے اچھے سے اچھے گھرانوں کے اس وقت بھی مل سکتے ہیں ۔

ساس ۔ کہیں لڑکیوں کا بھی نام لیا یا نہیں ۔

خدیجہ ۔ تو بہ جی ان کے ابا تو ابھی تک ایسی بات زبان پر بھی نہیں لانے دیتے ۔ کہتے ہیں جب اچھی طرح پڑھ لینگی، تب شادی بیاہ کا نام لیں گے ۔

رقیہ ۔ پرسوں کمبخت نصیبن لولی ۔ انہیں لڑکیوں کیلئے بھی تلاش ہے ڈیوڑھی دو تین جگہ گھر دیکھنے کے لئے گئی ہیں ۔ میں نے کہا تیرا ستیا ناس ہوا بی ان لڑکیوں کی عمر ہی کیا ہے ۔ اور بہن خدیجہ کیوں کسی کے ہاں جانے لگی ۔ ابھی تو ان کی لڑکیاں ہماری لڑکیوں کی طرح پڑھ رہی ہیں ۔ جب پڑھ چکیں گی تو لوگ پاؤں پڑ کر رشتہ مانگیں گے ۔ کہیں لڑکی والے خود بھی جایا کرتے ہیں ۔

خدیجہ ۔ آتو ۔ یہ نصیبن بد ذات ۔ میں کہاں گئی تھی ۔ لڑکا دیکھنے ۔ ان کے ابا سُن لیں تو کبھی نامراد کو گھر میں پیر نہ رکھنے دیں ۔ بہن وہ تو فتح حسین جج کی بیوی اپنے اکلوتے لڑکے کیلئے آئی تھی ۔ ایک دن ۔ آپ جانتی ہی ہوں گی آپ کا تو آنا جانا بھی ہے ۔ میں نے صاف انکار کر دیا ۔ میاں صاحب اب جج بن گئے تو کیا ہوا ۔ دادا تو ابھی تک چوہڑ مفتی یا قریبی ہی مشہور ہیں ۔

رقیہ ۔ غریب کی جورو نام عمدہ خانم ۔ میں بھی کہوں یہ ساقط ذات مل کر بنا ہوا خاندان انہیں کیسے پسند آگیا ۔ بلکہ اس کی زبان سے آپ کا نام سنتے ہی میں نے اِدھر اُدھر سے پچھوا لیا ۔ آپ کی لڑکیاں ہماری بھی بیٹیاں ہیں ۔ شریف لڑکیوں کا رشتہ بھی کسی خاندان میں ہونا چاہیئے ۔

خدیجہ ۔ میری تو بہ میں نے تو نام سنتے ہی انکار کر دیا تھا ۔ حق مہر کا نام سنتے ہی بیوی کی جان آدھی رہ جاتی ہے ۔ پھر رشتے تلاش کرتیں ہیں خاندان میں ۔ اور ہمیں حق مہر پوچھنے کی ضرورت بھی کیا تھی ۔

[خدیجہ کی بھاوج اور زبیدہ آپس میں باتوں میں مشغول ہو جاتی ہیں]

اچھا بہن جانے دو ان باتوں کو چلو تمہیں نئی کوٹھی تو دکھالائیں ۔

خدیجہ ۔ ہاں بہن چلو پھر دیر ہو رہی ہے ۔ واپس جانے کی بھی جلدی ہے

رقیہ ۔ بس ہمارے ہاں آتے ہی تم کو جلدی پڑ جاتی ہے ۔ اوّل تو گھر سے نکلتیں ہی نہیں ۔ اگر بھولے سے نکل بھی آئیں تو پھر جانے کا سنا دیتی ہیں ۔ کبھی ایک رات تو ہمارے ہاں رہو ۔ آج میں نہیں جانے دوں گی ۔ مانا ہم غریب اس قابل نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

خدیجہ ۔ تو بہ تو بہ آپ غریب ہیں تو پھر زمانے میں امیر کون ہوگا ۔ بہن ابھی بہتیرے موقعے ہیں ۔ رات بھر رہنے کے ۔ رفیق کی شادی پر میں چار دن پہلے بن بلائے آجاؤں گی ۔

رقیہ ۔ تو رفیق کی شادی پر آئیں تو مجھ پر کیا احسان ہے اپنے بھانجے کیلئے آؤ گی ۔

خدیجہ ۔ مہربانی ۔

رقیہ ۔ زبیدہ بیگم تم زینب سے چائے تیار کراؤ ۔ ہم کوٹھی دیکھ کر ابھی آجائیں گے ۔

[زبیدہ کے سوا سب چلے جاتے ہیں ۔ تھوڑی دیر کے بعد کوٹھی دیکھ کر سب واپس آجاتی ہیں]

زبیدہ ۔ آیئے چائے تیار ہے ۔

خدیجہ ۔ بس اب اجازت دیجئے ۔ چائے اب گھر پر ہی پی لیں گے وہاں بھی اِن کی دادی انتظار کر رہی ہوں گی ۔

رقیہ ۔ میں تو اب نہ جانے دوں گی ۔ مانا ہماری چائے آپ کے لائق نہیں ۔ پھر بھی میری خوشی کیلئے ہی سہی ۔

خدیجہ ۔ وہاں بھی آپ کی چائے ہے ۔ بات یہ ہے کہ لڑکیوں کی دادی بغیر ان کے چائے پیتی ہی نہیں ۔

رقیہ ۔ تو کیا ہوا آجکل سردی ہے ۔ سردی میں خواہ چار دفعہ پی لیں ۔ اب یہاں بھی تو تیار ہے ۔

خدیجہ - خیر آپ کی خوشی۔ ورنہ تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم کوئی غیر تھوڑا ہی ہیں۔

[سب چائے پینے کیلئے فرش پر بیٹھ جاتی ہیں]

زبیدہ - چائے پیتے ہوئے خدیجہ سے) آپا جان نئی کوٹھی پسند آئی؟

خدیجہ - بہن بڑی خوبصورت کوٹھی ہے۔ خدا مبارک کرے۔ مجھے تو بہت پسند آئی ہے۔ جیسے کوٹھی والے۔ ویسی کوٹھی۔ خدا اب چین سے اس میں رہنا نصیب کرے۔

[لڑکیاں چائے پیتے ہوئے برابر آہستہ آہستہ ہنستی اور باتیں کرتی چلی جاتی ہیں]

رقیہ - لڑکیاں باتوں میں چائے پینا بھی بھول گئیں۔ فرخندہ! بہنوں کو چائے پلاؤ۔

فرخندہ - (ہنستے ہوئے نسیم کی پیالی اٹھا کر) نازک بانو! پیالی نہیں اٹھ سکتی۔ تو میں پلا دوں۔

[پیالی اٹھا کر اس کے منہ سے لگا دیتی ہے]

نسیمہ - (مسکراتے ہوئے پیالی ہٹا کر) مہربانی ابھی تو ہاتھ سلامت ہیں۔ لاؤ تو میں تمہیں پلا دوں۔

ساس - (خطائیوں کی رکابی آگے بڑھا کر) لڑکیو! کھاؤ۔ یہی تو کھانے پینے کے دن ہیں۔

رقیہ - کیسی لڑکیاں ہیں نہ کچھ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں۔

نسیمہ - خالہ جان سب تو ہم چٹ کر گئیں۔ اب خالی تشتریاں رہ گئی ہیں کہیں تو ان سے بھی دو دو ہاتھ کر لیں۔

رقیہ - واہ بڑی کھانے والی آئی ہیں۔ میں جانتی ہوں تمہارے کھانے کو۔

[باتوں باتوں میں چائے ختم ہو جاتی ہے۔ خدیجہ بیگم چلنے کیلئے کھڑی ہو جاتی ہیں]

رقیہ - بہن آج کا دن کتنی خوشی سے گذرا۔ اسی طرح کبھی کبھی آ جایا کیجئے نا۔

زبیدہ - خدیجہ کی بھاوج کی طرف اشارہ کر کے) بہن سعیدہ کی بھی بہت مہربانی ہے۔ ہمارا جی ان سے ملنے کو مدت سے چاہتا تھا۔

خدیجہ - اب آپ کی باری ہے۔ آپ سب تشریف لائیے۔ کہیں پہلے کی طرح فرخندہ اور ثریا کو گھر پر نہ چھوڑ آئیے۔

رقیہ - دیکھئے کسی دن ہم آپ کو خوب آ کر دق کریں گے۔ مگر لڑکیوں کو شاید ان کے آبا اجازت نہ دیں۔

خدیجہ - وہ دن ہمارے لئے عید کا چاند ہوگا۔ مگر لڑکیوں کو ضرور ساتھ لائیے۔ لڑکیوں ہی کی تو ساری رونق ہوتی ہے۔

رقیہ - (خدیجہ کی دونوں لڑکیوں کو پیار کر کے) بڑی پیاری بچیاں ہیں۔ خدا نیک نصیب کرے۔ (سعیدہ سے) بی بی تم ہو بہو میری چھوٹی بہن کلثوم ہو۔ مجھے تو بالکل وہی معلوم ہوتی ہو۔ خدا حافظ جانے سے پہلے ضرور ہم سے بھی ملنا۔

[سب گلے مل مل کر رخصت ہوتی ہیں۔ لڑکیاں کھڑکی میں سے دیکھتی ہیں۔ تانگہ چلا جاتا ہے]

رقیہ - (واپس کمرہ میں آ کر) میرا تو سر دکھنے لگا۔

ساس - شکر ہے گئیں۔

زبیدہ - بھابی آپ کی سہیلی تو بڑی ملنسار ہیں جب آتی ہیں بہت سی رونق ساتھ لاتی ہیں۔

رقیہ - میں جانتی ہوں۔ یہ کیوں اپنی لڑکیوں کو بنا سنگار کرا کے آئے دن آ جاتی ہے۔

زبیدہ - خیر آپ نے بھی خوب سنا دیا کہ رفیق ولایت کا خرچ مانگتا ہے اگر توفیق ہے تو کریں۔

رقیہ - معاف کریں رفیق کو بہتیری مل جائیں گی۔ ایک حد سے زیادہ موٹی، ایک حد سے زیادہ دبلی۔

زبیدہ - نہیں لڑکیاں تو دونوں ہی اچھی ہیں۔

ساس - اچھی ہیں تو گھر لے جاؤ۔ تمہارے بھی بال بچے ہیں۔ ہمارے لئے ہی نہ رہ گئی ہیں۔ ریشمی برقعوں والی میمیں۔

رقیہ - نہ بھئی فیشن تو خیر آجکل کی سبھی لڑکیاں کرتی ہیں۔ مگر یہ لڑکیاں حد سے زیادہ بڑھ گئیں ہیں۔ میری ثریا بھی تو عینک لگاتی ہے۔ مگر اسے تو ڈاکٹر نے نظر کی کمزوری کیلئے بتائی ہے۔ کوئی اس نسیمہ سے پوچھے اتنے بڑے بڑے تیر سے دیدے ہیں تجھے عینک کی کیا ضرورت پڑی ہے۔

زبیدہ - ثریا کی عینک کے شیشے بھی تو گول ہیں۔ معمولی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بیضوی شیشے تو اس کے چہرے پر بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ عینک بھی شاید سونے کی تھی۔

رقیہ - نئی نئی دولت ملی ہے۔ اب خواہ جوتیاں بھی سونے کی پہن لیں۔

تم نے دیکھا نہیں سرمہ کس فیشن سے لگایا تھا - برابر ایک سیدھی لکیر کہیں ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہوا تھا - ہماری لڑکیاں بھی سرمہ لگاتی ہیں اور ہمیں بھی یہ عمر ہونے کو آئی ابھی تک تمہارے بھائی سے سنا کرتے ہیں کہ تمہیں اوّل روز سے سرمہ لگانا آیا ہی نہیں - آدھا آنکھوں میں اور آدھا باہر - میں کہتی ہوں بس اب گذر گئی -

زبیدہ - آپ نے شاید اُن کے کلپ نہیں دیکھے کیسے خوبصورت تھے - ہماری تو یوں ہی گذر گئی - یہاں آماں فیشن کی مخالف تھیں - وہاں خالہ جان مخالف ہیں -

رقیہ - میری لڑکیاں بھی اب کلپ لگانے لگی ہیں - مگر ان کے بال جب دیکھو ادھر اُدھر بکھرے ہوئے نظر آئیں گے - ان لڑکیوں نے تو بالوں کو بھی اچھا بھلا چہرے کا سنگار بنا دیا تھا -

ساس - وہ لڑکیاں ؟ میرا منہ نہ کھلواؤ - وہ کوئی شریف زادیاں معلوم ہوتی تھیں - خبردار اگر آئندہ تم نے فرخندہ اور ثریا کو آڑی مانگ نکالنے دی -

رقیہ - فرخندہ اور ثریا کی مانگیں ان جیسی تھوڑی ہیں - ان کی آڑی مانگ اور سیدھی مانگ میں کوئی فرق ہی معلوم نہیں ہوتا - البتہ ان لڑکیوں نے مانگ کرسٹانیوں کی طرح بالکل بائیں آنکھ کے مقابلے پر نکال رکھی تھی اور بال ایسے بنائے تھے کہ کانوں کی لوئیں تک ان میں چھپی ہوئی تھیں -

ساس - کان ایسی شرم کی چیز ہیں تو یہ کان چھپانے والیاں اپنے کان کٹوا کیوں نہیں دیتیں -

رقیہ - کیا معلوم آگے چل کر یہ فیشن بھی نکل آئے -

ساس - وہ ان کے ساتھ والی بیوہ تھی ؟ -

رقیہ - بیوہ تھی مگر سات سہاگنوں کو پرے بٹھاتی تھی - کوئی پوچھے بیوی اب سہاگ تو اُجڑ گیا - اب یہ لال پیلے کپڑے کسے دکھاتی ہو - اپنا مسلمان طریق کا لٹھا ململ پہنو -

زبیدہ - شلوار تو میرے خیال میں مایا مچھندر کی تھی -

فرخندہ - شلوار کی مہری اتنی کھلی تھی کہ پہلے میں سمجھی غرارہ ہے -

رقیہ - مایا مچھندر کی شلوار تو نند کی تھی - بھاوج صاحبہ نے چینی جاپان کا پاجامہ پہن رکھا تھا اور دوپٹہ جالدار جارجٹ کا -

ساس - (ہنستے ہوئے) کہیں جالدار دوپٹے کے جال میں ہمیں تو پھنسانے نہیں آئی تھی -

زبیدہ - کیسے آماں ؟

ساس - خدا جنت نصیب کرے تمہاری چھوٹی بھابی کی جگہ -

زبیدہ - توبہ آماں وہ تو دوسری شادی کا نام تک نہیں لینے دیتی باپ بھائی اچھے ہیں - بیچاری کی گذر جائے گی -

ساس - ہوں ! معلوم ہے - اتنی آن والی تھیں تو پھر پرائے گھر میں سنگھار کرکے آنے سے کیا مطلب -

رقیہ - اب تو جوانی بھی ڈھل رہی ہے -

زبیدہ - صورت شکل تو بہت اچھی ہے - عمر بھی بہت زیادہ معلوم نہیں ہوتی - خیر اپنے گھر میں خوش رہیں ہمیں کیا مطلب -

فرخندہ - آماں اِن کی ذات کیا ہے ؟

رقیہ - آدھے سیّد آدھے میراثی -

زبیدہ - (ہنس کر) اور پونے قریشی -

رقیہ - نہیں خدا کی قسم پہلے میراثی ہوا کرتے تھے -

ساس - (پُر اشتیاق لہجے میں) تمہیں کیسے معلوم ہوا -

رقیہ - بس معلوم ہو گیا - اوّل تو اُن کا سانولا رنگ - لمبوترا قد گواہی دے رہا تھا - دوسرے مجھے مائی کریمہ نے پرسوں سارا قصہ سنایا تھا -

ساس - اچھا اچھا کریمہ نے ؟ وہ تو اُن کے بڑے گیت گاتی ہے

رقیہ - کب تک گیت گاتی - آخر اس کے ساتھ بھی پیٹ لگا ہے کھانے کو نہ ملا تو ساری قلعی کھول کر رکھ دی -

فرخندہ - میراثی کیسے ہوئے -

رقیہ - ڈپٹن کی دادی کے بھتیجے نے مائی کریمہ کے باپ کی شادی پر خود باجے بجائے تھے - اتنا میں اچھی طرح جانتی ہوں

زبیدہ - مائی کریمہ کا باپ کون راٹھ تھا -

رقیہ - کریمہ بے چاری نالائقوں کے پلّے بندھ کر اس حال کو پہنچی ورنہ اس کے دادا کے دروازے پر سینکڑوں غریب یتیم پرورش پا چکے ہیں - وہ اپنے منہ سے سب کچھ سناتی ہے ورنہ میں اسے کہاں دیکھنے گئی تھی -

فرخندہ - آماں سچ سچ جب خالہ خدیجہ ہنستی ہیں تو ان کے دانت بالکل رکھی ڈومنی کی طرح معلوم ہوتے ہیں -

ثریا ۔ اماں خالہ خدیجہ اتنی لمبی کیوں ہیں ۔

رقیہ ۔ میں کیا جانوں بیٹی ذہنی کیفیت کا اثر ہوگا اور کیا ۔

فرخندہ ۔ ان کی لڑکیاں تو اچھی ہیں ۔

رقیہ ۔ تمہاری سہیلیاں جو ہوئیں ورنہ نسیمہ تمہارے پاس بیٹھی ہوئی تم سے دس سال بڑی معلوم ہوتی تھی ۔ تو یہ مٹاپا بھی راہ راہ کا اچھا معلوم ہوتا ہے ۔

زبیدہ ۔ چھوڑو اب اُن کے ذکر کو اب تو بے چاری اپنے گھر بھی پہنچ گئی ہوں گی ۔

رقیہ ۔ زینب سے کہو چائے کے برتن اٹھا کر لے جائے ۔

ساس ۔ کر دو اب زینب کے حوالے ۔ برتن بھی سب خالی ہیں شاید گھر سے بھوکی چلیں تھیں ۔

زبیدہ ۔ نہیں خطائیوں کی ایک پوری پلیٹ بچی ہوئی تھی ۔ وہ میں نے اُٹھا کر الماری میں رکھ دی ہے ۔

دوسرا سین

[ڈپٹی کی بیوی خدیجہ اور اس کی لڑکیاں اپنے گھر پہنچ جاتی ہیں ۔ برقعے اُتار کر اور کپڑے تبدیل کر کے ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں]

خدیجہ کی ساس ۔ بہو! دیکھ آئیں سہیلی کی کوٹھی ؟

خدیجہ ۔ جی ہاں دیکھ لی ۔ خبر نہیں کس کس مظلوم کے گاڑھے پسینے کی کمائی اینٹ چونے کی شکل میں مکان پر لگی ہے ۔ خدا دشمن کو بھی جیل کا داروغہ نہ بنائے ۔ اچھا ہوا میرا سعید جیلری کے امتحان میں پاس نہ ہوا ۔ ہماری کوٹھیوں کے نقص نکالتی تھیں کہ اُجاڑ میں بنی ہوئی ہیں ۔ کوئی سمجھے خود بے چاری سات پشت سے میکلوڈ روڈ پر ہی رہتی چلی آئی ہیں ۔ میں تو حیران رہ گئی اُن کی کوٹھی دیکھ کر حرام کی کمائی سے کیسا محل کھڑا کر لیا ہے ۔

خدیجہ کی ساس ۔ حرام کی کمائی کبھی نہیں پھلتی ۔ دیکھ لینا اس رزق کا حساب بدن کے ایک ایک روئیں سے لیا جائے گا ۔ ہاں ان کے لڑکے کا پوچھا رشتہ ہو گیا ؟

خدیجہ ۔ رشتہ کوئی منہ کا نوالا تھوڑا ہی ہے ۔ ابھی کہیں بھی نہیں ہوا کر لیں گے کسی اپنے جیسے کے ساتھ خاندانی رشتے کی نہ انہیں چاہ ہے اور نہ کوئی شریف اُن سے ناطہ جوڑے گا ۔ سارے زمانے کا مال جمع کرنے کے بعد اب بیٹے کیلئے ولایت کا خرچ لڑکی والوں سے مانگتے ہیں دے دیگا کوئی حاجت مند ۔

خدیجہ کی ساس ۔ اس روز آئی چاروں طرف کیسا گھور گھور کر دیکھے میں نیت سمجھ گئی ۔

خدیجہ ۔ گڑھیا میں سے منہ دھو رکھیں، ذات نہ صفات ۔ داروغہ کے باپ کی سگی خالہ کے نواسے کے کندھے سے ابھی تک مشک نہیں اُتری، ساری کنڈی گروں کی گلی کا پانی بھرتا ہے ۔

امینہ ۔ اماں جان شاید آپ نے ایک بات کا خیال نہیں کیا ۔ میری اور نسیمہ کی تو ہنسی کو ضبط کرتے کرتے جان نکلی جاتی تھی ۔ سنئے اُن کی پھوپھی زبیدہ بے چاری نے شاید ہمارے آنے کی خبر سُن کر کپڑے بدلے تھے ۔ جب ہمارے پاس بڑی معتبر بن کر بیٹھی ہوئی تھیں تو اتفاقیہ میری نظر ان کی شلوار پر پڑ گئی ۔ دیکھا تو شلوار الٹی پہنے ہوئی تھیں ۔ میں نے نسیمہ کی چٹکی لی بس پھر تو ہماری ہنسی رو کے نہ رکتی تھیں ۔ شاید وہ سمجھ گئیں ۔ کیونکہ دوسری مرتبہ جب اندر سے آئیں تو شلوار سیدھی کر آئیں ۔

نسیمہ ۔ کہنے کو تو سوٹ کیلئے آنکھ کا نشہ خرید لیا گیا ۔ مگر پہننے پہننے کا سلیقہ بھی خدا کسی کسی کو دیتا ہے ۔ شلوار کی مہری بمشکل چار گرہ ہوگی پھنسی پھنسی ٹانگیں کیسی بُری معلوم ہوتی تھیں ۔

امینہ ۔ سوٹ تو آنکھ کے نشے کا تھا مگر دوپٹہ کیسا بے جوڑ معلوم ہو رہا تھا ۔ بیچاری میری ساکفن ۔

نسیمہ ۔ قمیض بھی بمشکل سترہ گرہ لمبی تھی جتنی چھوٹی قمیض تھی اتنی ہی لمبی چوڑی آستین پہنچوں کو ڈھانپ رہی تھی ۔

امینہ ۔ اور تو کوئی فیشن کرنا نہ آیا ۔ مگر چاندی کی چوڑیوں کا فیشن بڑی جلدی پورا کر لیا ۔

نسیمہ ۔ بھئی ہمارے برقعوں کی طرف دیکھ کر اس بڑھی کم بخت نے کتنی باتیں بنائیں ۔ مگر خود بھی طوفان بڑسکی کی شلوار پہن رکھی تھی ۔

خدیجہ - خیر قمیصیں تو سبھی پہنتے ہیں مگر ٹلوفان تو کسی کی شلوار آج انہیں کے ہاں دیکھی -

امینہ - ثریا تو بالکل پست قد رہ گئی ہے - جب جائیں اتنی کی اتنی -

نسیمہ - اور ماں بڑی سرو قد ہے ماں پر ہی جائے گی -

امینہ - میں نے تو صاف منہ پر کہہ دیا - کبھی ثریا کہیں اینچ دو اینچ قد کھینچ تان کر نکالو - ورنہ رابعہ کی طرح سکول میں گُڑوی کا خطاب مل جائے گا -

خدیجہ کی ساس - لڑکیو - سہیلیوں کی باتوں میں چائے یاد نہیں رہی - معلوم ہوتا ہے - آج وہاں خوب خاطر تواضع ہوئی -

خدیجہ - خاطر ہوئی تیل کی خطائیاں اور چائے -

نسیمہ - نہیں اماں جان کوکوجم کے بسکٹ بھی تو تھے -

ز - ب

ایک لمحے کے لیے، بس ایک لمحے کے لیے
میری آنکھیں اُن کی آنکھوں سے ملیں اور جھک گئیں
اس نہایت مختصر لمحہ میں بھی یہ بے لحاظ
اُن سے کچھ کہنے کو تھیں اور کہتے کہتے رک گئیں

مجید ملک

حامد کے دس شعر

آج کیوں تصویرِ خاموشی ہوں میں آتش نوا
شعلہ آسا اے زبانِ بے صدا جلتا ہوں میں

تاکہ تمنا دل کی نہ ہو شرمندۂ حرفِ سوال کہیں
ہم نے فریب سے قاتل کو آمادۂ قتلِ عام کیا

نہ پروا کر کہ ہوتے ہیں دو عالم سرگراں تجھ سے
یہ دیکھا کر کہ تو مجھ سے نہیں ہے شرمسارِ دل

جاؤ گے مرے دل سے تو کہنا کہ گئے ہم
پیمانِ وفا توڑ کے جاتے ہو تو کیا ہے

خاکِ حرم پہ سجدۂ بُت کا نشان ہے
مجھ کو بھی اک بہانہ ملا ہے نماز کا

ظلمت و نور مجھے حسن نما ہیں دونوں
کیا مصیبت ہے نہ کافر نہ مسلماں ہوں میں

کیوں ہر طرف ہے تیری نگہ مجھ کو رُو برُو
شبنم کو آفتاب مقابل ہے سُو بہ سُو

تیری اک اک ادا کا حق اُس نے ادا کیا
حیراں ہوں کس قدر ہے سخن گستر آئینہ

یہ جہان تیرہ کیا ہو میری وحشت کا حریف
اے خدا یہ خاک دامن میں اُڑا سکتا ہوں میں

جہاں محشر میں سرگرداں ہیں اور تیری رضا جوئی
کہ میرا اوّلین پیماں ہے تیری وفاداری

عثمان علی خان

گنہگار کون تھا؟

حالات نے کچھ ایسی شکل اختیار کر لی ہے - کہ میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا - اس کی ذمہ دار وہ ہے - میں نہیں - مجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا - میں یہ واقعات اس خاتون کے متعلق لکھ رہا ہوں جس سے میں محبت کرتا تھا - وہ میری ماں تھی - اب میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا - اب میں اس لئے مر رہا ہوں - کہ وہ میرے پاس موجود نہیں - میری عمر ابھی کوئی زیادہ نہیں لیکن میں بوڑھا معلوم ہوتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں - ایک وقت تھا کہ میرا چہرہ پھول کی طرح نرم اور روئی کے گالے کی طرح سفید تھا - اب میں کمزور ہو چکا ہوں - میری آنکھیں اپنی چمک کھو چکی ہیں - میرا چہرہ زرد پڑ گیا ہے - میں بہت جلد مر جاؤنگا - اس دنیا میں وہی آدمی زندہ رہتے ہیں جنہیں جینے کی آرزو ہو - میں اس آرزو کو دفن کر چکا ہوں - جب میں یہ خیال کرتا ہوں - کہ میرا زندہ رہنا بے سود ہے تو خودکشی کا ارادہ کر لیتا ہوں - آج میرا ارادہ اس ہُک کے ساتھ لٹک کر جان دے دینے کا ہے - جو چھت میں آویزاں ہے - لیکن نہیں میں خودکشی نہیں کر سکتا - جان دینے کیلئے ہمت کی ضرورت ہے اور مجھ میں یہ ہمت نہیں -

میرے بچپن کی کہانی سننے والوں کیلئے شاید کچھ دلچسپ نہ ہو - مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد ہے - میری ماں مجھے گھر چھوڑ کر کبھی تھیٹر دیکھنے چلی جاتی تو میں بہت رویا کرتا تھا - میں دل میں سوچتا - کہ میری ماں کو یہ حق حاصل نہیں کہ مجھے گھر میں چھوڑ کر خود تفریح کیلئے باہر چلی جایا کرے - وہ جب واپس آتی تو مجھے پیار سے گود میں اٹھا لیتی اور ہماری لڑائی ختم ہو جاتی - ہمارے لئے ایک دوسرے سے زیادہ دیر تک روٹھے رہنا ناممکن تھا - میرا اس کے سوا اور اس کا میرے سوا کوئی نہ تھا -

میں اپنے باپ سے بہت کم مانوس تھا - شاذ و نادر ہی اُس سے بات کرنے کا مجھے موقع ملتا - وہ بوڑھا تھا اور بیمار بھی - اُس کے ساتھ اُس کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں بھی بوڑھی ہو چکی تھیں - میری ماں بڑی سلیقہ شعار تھی - وہ مجھے کبھی کبھی پڑھایا کرتی لیکن جلد اُکتا جاتی اور کہتی :-

”جاؤ - باغ میں کھیلو - اب تم تھک گئے ہو گے -“

مجھے کسی اسکول میں نہیں بھٹایا گیا - گھر میں البتہ بڑے بڑے قابل استاد پڑھانے کیلئے مقرر تھے -

ہم ایک بہت بڑے شہر میں رہا کرتے تھے - ہمارے مکان کے سامنے ایک خوشنما باغ تھا جس میں رنگ رنگ کے پھول عجب بہار کا سماں دکھاتے تھے -

بیس برس کی عمر میں مجھے گانا سیکھنے کا شوق ہو گیا - میری ماں نے موسیقی کی طرف مائل دیکھ کر ایک روز مجھ سے کہا :-

”تم بمبئی چلے جاؤ - وہاں بہت جلد گانا سیکھ کر مشہور ہو جاؤ گے -“

میرا وہاں اکیلا جانا ناممکن تھا - ”میں وہاں کس سے بات کرونگا - کس کے ساتھ چہل قدمی کرنے کیلئے باغ میں جایا کرونگا - وہاں کون ہو گا - جو میری خبر گیری کرے ؟“

یہ خیالات تھے - جو رہ رہ کر میرے دماغ میں آتے - میں شام کو آگ کے پاس ماں کے قدموں میں بیٹھ جاتا - اور اس کو بتایا کرتا - کہ کس طرح وہ لڑکی مجھ سے محبت کرتی ہے - اور میں اُس سے کیا کیا باتیں کرتا رہتا ہوں - میں یہ بھی بتایا کرتا - کہ میں اُن لڑکیوں میں سب سے زیادہ کس کو پسند کرتا ہوں - میں جانتا تھا کہ تمام لڑکیاں مجھ سے محبت کرتی ہیں، لیکن میرا دل محبت سے بالکل ناآشنا تھا - یہ سچ ہے کہ چند لڑکیوں سے مجھے اُنس تھا - مگر محبت اور اُنس میں بھی تو فرق ہوتا ہے - میں اُن لوگوں میں سے تھا - جن کا ایمان حسن کو تمام رعنائیوں کے ساتھ دیکھ کر بھی متزلزل نہیں ہوتا -

(۲)

جب سے میں نے گانا بجانا شروع کیا تھا - مجھے کتابوں سے نفرت سی ہو گئی تھی - آخر ایک روز ہم بمبئی چلے گئے - وہاں ایک

اعلےٰ درجے کا مکان لے لیا۔ بمبئی میں خوب سیر و تفریح کرنے کا موقعہ حاصل تھا۔ میں تمام دن نہایت محنت سے گانا سیکھتا اور فرصت کا وقت ہم سب باغ کی سیر میں گزار دیتے۔ میں تمام دن اس انہماک سے مصروف رہتا۔ کہ ماں سے گفتگو کرنے کا وقت بھی نہ مل سکتا تھا۔ ایک روز میری ماں نے سوال کیا۔

"تم نے مجھے بھلا دیا ہے۔ گانا سیکھنے میں تم اسقدر محو رہتے ہو۔ کہ میری بالکل پرواہ نہیں کرتے۔ تمہیں سب سے زیادہ اپنی ماں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ورنہ تمہارا اور میرا اکٹھا رہنا ناممکن ہے۔"

کئی سال گزر گئے۔ میں نے تعلیم ختم کر لی اور متعدد جلسوں میں کمالِ فن دکھا کر خراجِ تحسین بھی حاصل کیا۔ لیکن میں پھر بھی خوش نہ ہو سکا۔ میرا باپ بیمار ہو گیا۔ اُس کی تیمارداری کیلئے میری ماں کو بمبئی سے جانا پڑا۔ یہ شاید دسمبر کا مہینہ تھا۔ جنوری کے اختتام پر میں بھی بیمار ہو گیا۔ میں نے تھیٹر کا کام چھوڑ دیا۔ حالانکہ اب مجھے وہاں سے معقول تنخواہ ملنے لگی تھی۔ میں بمبئی میں ماں کے بغیر بیماری کی حالت میں کیسے رہ سکتا تھا؟

(۳)

گھر آ کر میں اپنا تمام وقت سیر میں صرف کر دیتا۔ میرے کمرے میں باغ کے رُخ ایک بہت بڑی کھڑکی تھی۔ میں نے وہاں اپنا پیانو رکھوا لیا۔ فروری کے دوران میں میرا وقت پہلے کی طرح گانے اور سیر و تفریح ہی میں صرف ہوتا تھا۔ ایک روز سورج غروب ہو رہا تھا اُس کی شعاعوں میں گرمی کم ہو گئی۔ میرے دل میں باغ کی سیر کی سمائی۔ باغ میں پہنچکر میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ مجھے وہاں بیٹھے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ کہ کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی آہستہ آہستہ میرے پیچھے آرہا تھا۔ یہ ہلکی ہلکی آواز درختوں کے عقب میں سے آرہی تھی۔ آواز نزدیک ہوتی گئی۔ اور میرے دل کی دھڑکن تیز۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر یکایک ایک حسین لڑکی جو جوانی کے نشے میں مخمور تھی میرے سامنے تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا اور گویا سب کچھ دیکھ لیا۔ میں سمجھا قدرت کی تمام خوبصورتی ایک جگہ مرکوز ہو گئی ہے۔ ہم دیر تک آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ہم پر خاموشی طاری تھی۔ میرا خیال تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے چلی جائے گی۔ لیکن وہ بولی۔

"میں آپ کو روز یہاں دیکھتی ہوں۔ آپ ہمیشہ یہاں کیوں بیٹھتے ہیں؟"

"مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے۔ یہاں کا نظارہ جانفزا ہے۔" میں نے شرماتے ہوئے کہا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"لیکن میں نے آپ کو یہاں کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں ہمیشہ آپ کو دُور ہی سے دیکھتی ہوں۔ میں اس سامنے والے مکان ہی میں تو رہتی ہوں۔"

اس نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا جو درختوں کے جھنڈ میں سے نظر آرہا تھا۔ مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے اپنا بلوریں اور نازک ہاتھ اُٹھایا۔ میں پہلی مرتبہ اُس کے لباس کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس کے کپڑے عام لڑکیوں جیسے نہ تھے۔ بلکہ وہ زرق برق لباس اور مختلف قسم کے مرصع زیورات پہنے ہوئے تھی۔ اُس کی قمیص کی آستین بہت لمبی تھیں اور انگلیوں تک آئی ہوئی تھیں۔ مجھے اپنی طرف اس طرح نظر جمائے دیکھ کر بولی

"آپ کو میرا لباس پسند ہے؟"

"ہاں بہت خوبصورت ہے۔ کیا آپ کہیں باہر جارہی ہیں؟"

"نہیں میں کہیں جا تو نہیں رہی۔ میں کہیں نہیں جایا کرتی۔ میں لوگوں سے نفرت کرتی ہوں۔ لیکن آپ سے ...."

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میرا نام زرینہ ہے۔"

"یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم پڑوس میں رہنے کے باوجود ابھی تک ایک دوسرے سے ناآشنا ہیں۔"

"میں باہر نکلنا پسند نہیں کرتی۔ میں شاید آپ کو پہلے بتا چکی ہوں۔ پھر وہ خود ہی بولی۔

"دراصل میرا نام زبیدہ ہے۔ لیکن میں اپنے آپ کو زرینہ ہی کہتی ہوں۔ یہ نام مجھے زیادہ اچھا اور پیارا معلوم ہوتا ہے۔"

"تم جو بھی نام رکھو۔ تمہیں سجتا ہے زرینہ۔ تم سراپا حسن ہو۔" میں نے یہ فقرہ اس طرح ادا کیا۔ جیسے میں اپنے آپ سے گفتگو کر رہا ہوں۔

"میں بھی یہی خیال کرتی ہوں۔ کہ میں حسین ہوں۔ لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں۔ میں کوئی غیر معمولی طور پر خوبصورت نہیں۔ میری ادائے

ہیں وہ ذوقِ نظر نہیں رکھتے۔"

"اچھا۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میں نے پھر ایک دفعہ اس کے نازک قدموں کی آواز سُنی۔ جو آہستہ آہستہ گم ہو گئی۔

آج میں نے باغ سے جا کر پیانو بجانا چاہا۔ لیکن اُس کی آواز مجھے نہایت ناگوار معلوم ہوئی۔ میں ماں سے گفتگو بھی نہ کر سکا۔ اور نہ اُس سے آج کے واقعے ہی کا کوئی ذکر کیا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ کسی واقعہ کا ذکر میں نے اپنی ماں نہ کیا ہو۔

(۴)

دو روز تک میں باغ میں نہ جا سکا۔ نہ جانے مجھے کس بات کا خوف تھا۔ کہ میں باغ میں جانے سے گریز کر رہا تھا۔ شاید میں یہ خیال کرتا تھا کہ باغ میں پہلے کی سی خوبصورتی نہ ہو گی۔ میری ماں نے مجھ سے کئی بار کہا۔ کہ تم بہت کمزور نظر آتے ہو۔ اور تمہارے چہرے کی سرخی زردی میں تبدیل ہو رہی ہے۔

میرا باپ ابھی تک بیمار تھا۔ اور میری ماں کے وقت کا بیشتر حصہ اُس کی تیمارداری میں صرف ہوتا تھا۔

"آؤ آج شہر چلیں بیٹا! کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔" ماں نے کہا۔

"ماں میں باغ میں جانا چاہتا ہوں۔ تم آج اکیلی ہی ہو آؤ۔" میں نے جواب دیا۔

تیسرے روز میں نے باغ میں جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اور اُن کمزور ارادہ رکھنے والے آدمیوں کی طرح باغ میں چلا گیا۔ جنہیں اپنی قوتِ ارادی پر بھروسہ نہیں ہوتا۔

میں نے باغ میں پہلے سے زیادہ دلکشی پائی۔ روشیں سوکھ چکی تھیں۔ سیب کی کلیاں پہلے سے بڑی ہو چکی تھیں۔ درختوں پر چھوٹے چھوٹے سبز پتے نظر آ رہے تھے۔ ابھی باغ کے اس دلکش نظارے میں محو تھا۔ کہ اچانک سامنے سے زرینہ آ گئی۔

آج اس نے ایک اسی قسم کا دوسرا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

"تم دو دن سے کیوں نہیں آئے؟" پھر وہ ہنسنے لگی اور بولی۔

"میں جانتی ہوں، تم کیوں نہیں آئے۔" پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ بولی۔ "بتاؤ تم دو دن سے کیوں نہیں آئے؟"

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور وہ بہت حسین نظر آ رہی تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال سیاہ آنکھیں اور سرخ ہونٹ ایک نوجوان کیلئے دامِ اسیری بن سکتے تھے۔ "اگر تم خفا نہ ہو تو ایک بات کہوں؟" پھر وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی کہنے لگی۔

"تم پیانو پر کس قسم کے سُر نکالتے ہو۔ کم از کم وہ میری سمجھ میں تو نہیں آتے۔ میرا خیال ہے۔ تم ہلکے اور آسان سروں میں راگ الاپا کرو۔" میں تمہیں وہ گانا سناتی ہوں جو تم اکثر گایا کرتے ہو۔ پھر وہ آہستہ آہستہ گانے لگی۔ میں نے ایک دفعہ سنا، دو دفعہ سنا، تین دفعہ اور ہر بار مجھے ایک بار پھر سننے کی آرزو رہی۔ شام کا دھندلکا بڑھتے بڑھتے رات بن گیا۔ لیکن مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ کہ میں عالمِ بیداری میں ہوں یا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ کئی دفعہ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ حقیقتہً میں کوئی شیریں خواب ہی دیکھ رہا ہوں۔ لیکن اب وہ خواب نہ تھا۔ خواب ہوتا تو اس کے نتائج اتنے ہولناک نہ ہوتے۔ اُس شام زرینہ کی ملاقات کے بعد میں نے اپنے کمرے میں شمع روشن کر دی۔ سامنے باغ کی کھڑکی کھول کر زرینہ کی طرز پر گانا گانے لگا۔ اس گانے میں مٹھاس تھی۔ ایک قسم کی دل آفرینی۔ میں نے اُسے بار بار گایا۔ اور میری ہر کوشش پہلے سے زیادہ کامیاب رہی۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا اور غیر ارادی طور پر دروازہ کھولا۔ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُتر کر باغ میں پہنچا۔ باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ باغ کی اسی بنچ پر زرینہ بیٹھی دکھائی دی۔ اُس کا چہرہ اندھیرے میں صاف نظر آ رہا تھا۔ جب میں اُس کے قریب پہنچا تو دھیمی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

"آج میں نے تمہارا گانا سنا۔ تم نے بہت اچھا گایا۔ ہاں تم کل باغ میں نہ آنا۔ پرسوں غروبِ آفتاب کے وقت میں تمہاری منتظر رہوں گی۔ لیکن دیکھنا۔ سورج ڈوب نہ جائے۔

"ہاں میں ضرور آؤں گا۔" میں نے جواب دیا اور وہ چلی گئی۔

(۵)

میں صبح دیر سے اُٹھا۔ اور اس دن باغ میں نہ گیا۔ اُس حسین ساحرہ کا حکم تھا۔ اس کے حکم کی تعمیل کس طرح نہ کرتا۔ میں اب ماں سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا۔ میرا راز فاش نہ ہو جائے۔ یہ خیال رہ رہ کر میرے دل میں آتا کہ میری ماں میرے متعلق کیا کہتی ہو گی۔ کہ میرا بیٹا مجھ سے دھوکا کر رہا ہے۔ رات کھانے کے وقت میں بہت پریشان تھا۔ میرا رنگ زرد تھا۔

میرے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ میرا خیال درست تھا۔ میری ماں کی نیلی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جم رہی تھیں۔ اس کی نظروں میں حقارت و نفرت اور غم وغصہ کے ملے جلے تاثرات تھے۔ میرا خون میری رگوں میں جم گیا۔

"میں سب کچھ جانتی ہوں بیٹا" وہ بولی۔

"کیا"؟ میں نے یہ لفظ بڑی مشکل سے منہ سے نکالا۔

"میں سمجھتی ہوں۔ تم محبت کرنے لگے ہو۔ لیکن تم محبت نہیں کر سکتے۔ میں تمہیں محبت کرتے نہیں دیکھ سکتی۔ اب تم میری اجازت کے بغیر کہیں نہیں جا سکو گے۔"

میں کانپ گیا اور آہستہ سے بولا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے ماں۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔" وہ پھر بولی۔

"تم زرینہ سے محبت کرتے ہو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم اس سے کئی مرتبہ باغ میں بھی مل چکے ہو۔ کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ لیکن وہ لڑکی مجھے پسند نہیں۔"

میرا دماغ چکرانے لگا۔ میری زبان نے میرا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

"مجھے زرینہ سے محبت ہے ...... واقعی ... کیا ہم سب پاگل ہو گئے ہیں؟"

"میرے بیٹے تم سمجھ رہے ہو گے کہ تمہاری محبت کے متعلق کسی کو وہم و گمان نہیں۔ یہ سچ ہے۔ محبت کرنے والا اپنے سوا اور سب کو دیکھنا بھول جاتا ہے۔ وہ اگر دیکھنے کی کوشش بھی کرے تو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن ہمارا رشتہ ایسا نہیں۔ میں نے اپنی تمام زندگی تمہاری نذر کر دی ہے اور تمہیں بھی چاہیئے کہ اپنی زندگی۔ اپنی تمام زندگی میرے حوالے کر دو۔ میں نے اپنے آپ کو تمہاری ذات میں گم کر دیا۔ میرے لال تمہیں اپنے آپ کو میری ذات میں گم کر دینا چاہیئے۔ تم خواہ اپنی بیوی کے ساتھ رہو۔ اور وہ خواہ تم سے کتنی ہی محبت کرے۔ تم میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

میں آہستہ سے بولا "ماں میں تمہارا ہی ہوں۔ میں صرف دل بہلانے کیلئے پھولوں کو دیکھنے چلا جایا کرتا تھا۔ اپنا دل بہلانے اور وقت گزارنے کے لئے ہی گا بھی لیا کرتا تھا۔ تم مجھے معاف کر دو۔

میرے بچے مجھ سے وعدہ کرو کہ تم باغ میں میری اجازت کے بغیر کبھی نہیں جاؤ گے۔ اور زرینہ سے پھر کبھی نہیں ملو گے۔ یہ میں جانتی ہوں کہ تم اپنا وعدہ بہت جلد بھول جاؤ گے۔ لیکن کم از کم تم کل باغ میں نہ جاؤ۔ پرسوں تو ہم بمبئی چلے ہی جائیں گے۔

"لیکن ماں کل تو بہار کا پہلا دن ہے۔ کل کلیاں مسکرائیں گی۔ پتیاں لہرائیں گی اور پھول .....

"خاموش" میری ماں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

(۶)

دوسرے دن صبح ہی سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میرا باپ ابھی تک بیمار تھا۔ سفر کا تمام اسباب میری ماں نے ہی باندھا۔ میں نقش حیرت بن کر کھڑکی میں بیٹھ گیا۔ اور نیم باز آنکھوں سے سورج کو طلوع ہوتے دیکھنے لگا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی۔ سورج کے غروب ہونے سے پہلے زرینہ نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ میں یہ سوچ کر بیقرار ہو گیا۔ اور بھاگ کر ماں کے کمرے میں پہنچا۔ لیکن وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ میں نے خادمہ سے پوچھا۔ تو اس نے جواب دیا کہ وہ اپنی بہن سے ملنے کیلئے گئی ہیں۔ وہ کہہ گئی تھیں۔

"میں بہت دیر میں واپس آؤں گی۔ کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا۔"

میں یہ سنتے ہی باغ کی طرف بھاگا۔ میں بہت خوش تھا۔ اور اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھ رہا تھا۔ ماں کا خوف میرے دل سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔ زرینہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بینچ پر میری منتظر تھی۔ آج سارا باغ خوشبو سے مہک رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے زرینہ۔ سورج غروب ہو چکا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ اس میں ابھی کچھ دم باقی ہے۔ وہ دیکھو اس کی آخری کرنیں صنوبر کے درخت پر کانپ رہی ہیں۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ آج اس کا رنگ زرد تھا۔ اور اس کے رخساروں کی سرخی گم ہو چکی تھی۔

"آج تم اتنی اداس کیوں ہو زرینہ!"

"تم بھی تو آج بہت اداس نظر آ رہے ہو۔" میں تم سے محبت کرتی ہوں فیروز!"

"ہاں مجھے بھی تم سے محبت ہے۔"

چاند اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ مگر مجھے

ماں کا خیال آ گیا۔ زرینہ آہستہ آہستہ میری طرف سرکنے لگی۔ میں نے بڑھ کر اُسے ہاتھوں میں اُٹھا لیا۔ ہم دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر میں کسی ذاتی جذبے سے ڈر کر بولا۔

"مجھے اب اجازت دو زرینہ۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"اتنی جلدی کیا ہے فیروز؟"

"نہیں نہیں اب میں نہیں ٹھہر سکتا۔ زرینہ میری ماں میری منتظر ہو گی۔" میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے تھے۔ اس نے اپنی پلکیں کھلی ہی رکھیں۔ تاکہ آنسوؤں کے وہ دو ٹھٹکے ہوئے قطرے ڈھلک کر مجھ پر اس کا احساس الم عیاں نہ کر دیں۔

"خدا حافظ"

"خدا حافظ۔ مجھے بھول نہ جانا ——" زرینہ نے کہا۔

"تمہیں کون بھول سکتا ہے زرینہ۔ کیا تم بھولنے کیلئے ہو۔"

(۷)

اس کے بعد کیا ہوا۔ میں مختصر طور پر بتاؤں گا۔ میرے لئے ان واقعات کی یاد بڑی تکلیف دہ ہے۔ میں گھر میں پہنچا تو میری ماں موجود تھی۔ میں جانتا تھا۔ وہ مجھے اب معاف نہیں کرے گی۔ میں اس کی ہٹ سے اچھی طرح واقف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے غصے سے کہا۔ "فوراً گھر سے نکل جاؤ! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اور نہ زندگی بھر تمہاری صورت دیکھنے کی روادار ہونگی۔"

اس واقعے سے وہ اتنی متاثر ہوئی کہ پندرہ روز بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ شاید وہ اپنا وعدہ جھوٹا ثابت کرنا نہ چاہتی تھی۔ اُس کی وفات کے بعد اب میں اکیلا ہوں۔ آج تک اُس باغ میں نہیں گیا۔ نہ جانے مجھے پھولوں سے کیوں نفرت ہو گئی ہے؟ اس واقعے کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔ میں کبھی کبھی اس رات کو یاد کر لیا کرتا ہوں جس رات میں پھولوں کی کلیوں کو کھلتے ہوئے دیکھنے کیلئے باغ میں گیا تھا۔ میں اس لئے جی رہا ہوں۔ کہ مجھ میں مرنے کی طاقت نہیں۔ میں اپنی کہانی کے آغاز میں ذکر کر چکا ہوں۔ کہ میرے کمرے کی چھت میں ایک ہُک لگا ہوا ہے۔ جس میں لٹک کر میں آسانی سے جان دے سکتا ہوں۔ میرا بوڑھا ملازم سوچ چکا ہے۔ اب میں آسانی سے مر سکتا ہوں۔ زرینہ اسی مکان میں رہتی ہو اور اس نے ابھی تک شادی نہیں کی میں اس سے آج تک نہیں ملا۔ اگر آج خودکشی کی کوشش میں پھر ناکام رہا تو اسے ملنے کی کوشش کروں گا۔ مگر وعدہ نہیں کر سکتا۔ اس بات کا فیصلہ میری بپتا کے سننے والے ہی کریں گے۔ کہ میں گنہگار ہوں جس نے اپنی محبوبہ کی محبت کیلئے ماں کو مرنے پر مجبور کر دیا — یا میری ماں گنہگار ہے جس نے اپنی محبت پر اپنے بیٹے کی محبت کو نچھاور کر دیا۔

(ماخوذ)

انور کمال

مختصرات

کچھ شاہکار سے متعلق

محکمۂ تعلیمات اور اساتذہ کی خاطر میں نے شاہکار کے ادبی معیار کو کم کرتے کرتے تقریباً گم کر دیا ہے۔ مگر بقول شاعر

ہم کو جن سے وفا کی ہے امید
وہ نہیں جانتے وفا کیا ہے

اساتذہ شاہکار کی جانب سے اسی قدر بے اعتنائی برت رہے ہیں جتنے اپنی بدحالی سے بے پرواہیں۔ رہا محکمۂ تعلیم وہ صرف ڈسٹرکٹ بورڈوں کے مقامی پرچوں کی سرپرستی ضروری سمجھتا ہے۔ طلبہ میں بلند اور صالح ذہنیت پیدا کرنے والے لٹریچر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

اس ناسازگار فضا کے سبب اردو ادب کے معیاری ماہناموں کا حال بے حال اور مستقبل تاریک ہو رہا ہے۔

میں تعلیمی ادارات سے کفر کی حد تک مایوس ہو چکا ہوں اور اب شاہکار کو ایک تعلیمی پرچے کی بجائے ادبی ماہنامہ بنانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ آئندہ سے "تعلیمات" کا عنوان شاہکار میں نظر نہ آئے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تعلیم سے متعلق کوئی مضمون شاہکار میں شائع ہی نہ ہو سکے گا۔ نہیں۔ کسی ماہرِ تعلیم یا تعلیمات سے دلچسپی رکھنے والے کسی ادیب نے تعلیم پر کبھی اظہارِ خیال کیا تو اس کے لئے پرچے کے صفحات موجود ہیں لیکن "تعلیمات" کے عنوان کو قائم رکھنے کی خاطر معاوضہ دیکر ماہ بماہ مضمون حاصل کرنے کی دردسری اب مجھ سے نہ ہو سکے گی۔ مختصرات میں بھی آئندہ ثمانہ کی سی پابندی کے ساتھ اساتذہ یا تعلیمات پر نوٹ شائع نہ ہو سکیں گے۔

تعلیمی یبوست بلکہ نحوست کو کم کر کے پرچے میں افسانوی رنگینی بڑھائی جائے گی۔ اگرچہ صنف افسانہ میرے مذاق کو سازگار نہیں لیکن اپنے ذوقِ نگاہ پر اصرار کر کے میں نے شاہکار کو راہِ بےمنزل کا رہرو بنا دیا ہے۔ اب اس خود رائی سے دست بردار ہونا چاہتا ہوں۔

شاہکار کا کاغذ مجھے پسند نہ تھا۔ دفتری ناسازگاری کے طفیل اس ناگوار کو گوارا کیا جا رہا تھا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ بے مائگی و بےچارگی تو راہِ زندگی کی کسی منزل پر بھی میرا ساتھ نہ چھوڑیں گی۔ پھر رفقائے بے طلب کا احترام عقل دور اندیش کا حکم ہی مگر ایک جذبات پرست شاعر عقل اور اس کی بےمزہ سلطنتوں کا فرماں پذیر کبھی کبھی تو ہو سکتا ہے اس بےکیفی کو مستقل طور پر سرمایۂ زندگی نہیں بنا سکتا۔ خصوصاً میری زندگی تو ہمیشہ عقلی احکام سے سرتاب اور عافیت اندیشی کے دام سے گریزاں ہی رہی ہے۔ مجبوری کے طوق و سلاسل نے کبھی مجھے بےحس و بےاختیار بنا بھی دیا ہے۔ تو اس قید کو قیدِ بےمیعاد کبھی نہیں بننے دیا —

دوسرے اکثر ماہنامے معمولی قسم کا کاغذ استعمال کر رہے ہیں۔ اور ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ عام کاغذ اور اچھے کاغذ کے نرخوں میں دس اور بیس کا تفاوت ہے۔ شاہکار بھی کچھ مدت سے بحالت مجبوری اس عام کاغذ پر شائع ہو رہا ہے۔ لیکن اس نمبر سے اچھا کاغذ لگایا جا رہا ہے اور اس وقت تک یہی کاغذ استعمال میں لایا جائے گا۔ جب تک کہ وقت کا جبر بےاختیار قوتِ ارادی کا حریف غالب نہ بن جائے۔ قارئین دیکھیں گے کہ اس نمبر سے شاہکار کی ترتیب اور مضامین کی نوعیت میں بھی نمایاں ترقی نظر آئے گی۔ توقع ہے کہ آئندہ ہر نمبر پہلے نمبر سے بہتر اور دلچسپ تر صورت میں شائع ہوا کرے گا۔

حسنِ اتفاق سے شاہکار کے ادارے کو راجہ فاروق علیخاں صاحب کی خدمات حاصل ہو گئی ہیں۔ موصوف حضرت مولانا ظفر علیخاں صاحب مدیر روزنامہ زمیندار کے برادرزاد اور راجہ غلام حیدر خاں صاحب سابق مدیر روزنامہ ترجمان کلکتہ کے خلف الرشید ہیں۔ مذاق ادب و صحافت اس خاندان کا قدیمی امتیاز ہے۔ اور فاروق صاحب بھی اس امتیاز خاندانی کے بہت بڑے حصہ دار اور امین ہیں۔

میں نے انہیں تمام ادارتی اختیارات تفویض کر دئے ہیں۔ شاہکار کی ترتیب و تدوین سے متعلق اُن کی رائے کو میں اپنی تجویز پر

ترجیح دے رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا عہد نیا بت شاہکار کو معیاری رفعتوں پر سرفراز کرے گا۔

آنریبل وزیر تعلیم پنجاب کی تعلیمی سرگرمی

یہ ایک حقیقت ہے کہ آنریبل وزیر تعلیم پنجاب نے اپنے عہد وزارت میں صوبے کی تعلیمی رفتار کو پر پرواز لگا دئے ہیں۔

تمام ہندوستان میں لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم میں ایک تفاوت عظیم پایا چلا آتا ہے۔ لیکن پنجاب کے وزیر تعلیم کی مسلسل توجہ اور سرگرمی سے اس صوبے میں دیگر صوبجات کی بہ نسبت یہ تفاوت حیرت انگیز طریقہ پر کم ہو رہا ہے۔

اب انہوں نے پنجاب کے جسم معاشرۃ کی سب سے دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ یعنی صوبے کے زندانیوں کی اخلاقی پستی دور کرنے کیلئے جیلوں میں قیدیوں کی تعلیم و تربیت کا قابل تحسین پروگرام شروع کیا ہے۔ ہر جیل میں تعلیم یافتہ قیدیوں کو ان پڑھ قیدیوں کی تعلیم کے لئے ٹریننگ دی جا رہی ہے۔

اس کے علاوہ اس نہایت مفید تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے بہت سے تنخواہ دار ٹرینڈ مدرسین کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں۔ تعلیم کے اس جدید اور یادگار تاریخی پروگرام کے پیش نظر امید ہے کہ اگر ایک طرف صوبے کی عام جہالت دور ہو سکے گی وہیں بے شمار اخلاقی مجرم علم و تربیت کی روشنی حاصل کرکے اپنی نا قابل رشک زندگی کو اپنے اور دوسروں کیلئے مفید بنائیں گے اور اس طرح صوبے کی فضا اخلاقی جرائم سے پاک ہو جائے گی۔ یقیناً تمام اہل پنجاب آنریبل وزیر تعلیم کے اس قابل قدر کارنامے کو عزت و محبت کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ ہم اس مبارک اقدام پر اپنے صوبے کے آنریبل وزیر کو پنجاب کے تعلیمی کارکنوں اور صوبے کی تعلیم یافتہ پبلک کی جانب سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

سر سکندر کی فیڈریشن اسکیم

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ حکومت برطانیہ کی مجوزہ فیڈریشن ملک کے کسی طبقہ کی توقعات کو پورا نہیں کرتی۔ ہندو اس لئے خاموش نظر آتے ہیں کہ انہیں اس میں اپنے اختیارات کی وسعت نظر نہیں آتی۔ راجے اور مہاراجے بھی اس کے مخالف ہیں۔ انہیں اپنی جگہ یہ ڈر ہے کہ اس فیڈریشن کے لفاذ سے مرکزی حکومت ریاستوں کے معاملات میں دخل انداز ہو گی۔ اقلیتیں اسے اس لئے پسند نہیں کرتیں کہ ان کے جائز اختیارات اکثریت کے حوالے کر دئے گئے ہیں۔ ملک کے اس تاریک سیاسی مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے آنریبل سر سکندر حیات خاں نے ایک اور فیڈرل اسکیم پیش کی ہے۔ اس اسکیم کا ماحصل یہ ہے:-

"ہندوستان کو اکثریت کے لحاظ سے سات صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ صوبجات اپنی اپنی جگہ مکمل طور پر آزاد ہوں۔ مرکزی حکومت کے ہاتھ میں صرف ملک کی مجموعی ترقی و فلاح کی باگ ڈور ہو اور صوبوں کی حکومتوں سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ ملک کی اس جغرافیائی اور معاشرتی اسکیم میں زبان کا مسئلہ بھی پیش نظر رکھا جائے۔"

سر سکندر کی اس اسکیم پر اس وقت تک بحث نہیں کی جا سکتی جب تک اس کی جزئیات اور تفصیلات سے ہم پوری طرح آگاہ نہ ہوں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کی تقسیم خود فرقہ وارانہ تنازعات کو حل کر دینے کی حامل نہ ہو گی۔

اگر مجوزہ فیڈریشن کے مطابق مرکزی حکومت میں ایک خاص قوم کی اکثریت صوبائی حکومتوں پر حاوی رہی تو فرقہ وارانہ جھگڑوں کا لامتناہی سلسلہ ملک کو ایک ایسے مستقبل کی طرف کھینچتا چلا جائے گا جس میں اکثریت اور اقلیت کی ہولناک ٹکریں برابر ہوتی رہیں گی — اور ان چند صوبوں میں بھی جہاں اقلیتوں کی اکثریت ہے۔ اکثریت کا تسلط قائم ہو جائے گا۔

لیکن آنریبل سر سکندر کی اس اسکیم میں جو جمہوریت کی بنیادوں پر قائم نظر آتی ہے۔ فرقہ وارانہ حقوق کی تقسیم کا حل بھی موجود ہے۔ جب ہر صوبہ آزاد ہو کر اکثریت کی کسی دھمکی سے بے نیاز ہو گا۔ تو اقلیت اور اکثریت کے تمام جھگڑے مٹ جائیں گے اور ملک کی اقتصادی اور انتظامی حالت خود بخود سدھر جائے گی۔ مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر اس وقت تک فیڈریشن کے متعلق جتنی اسکیمیں پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سے سر سکندر کی اسکیم . . . . زیادہ بہتر ہے۔

حیدر آباد میں سماجی ستیہ گرہ

مہاتما گاندھی چند سال پہلے اپنے ایک بیان میں فرما چکے ہیں کہ

"آریہ سماج ایک جھگڑالو جماعت ہے۔"

گاندھی جی نے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کی مصنفہ کتاب ستیارتھ پرکاش کو مطالعہ کرنے کے بعد جو رائے قائم کی تھی وہ انہیں کے لفظوں میں زینتِ ذیل کی جاتی ہے:-

"ایک آریہ بھائی نے مجھے ستیارتھ پرکاش کی ایک کاپی جیل میں بھیجی ہے۔ میں نے ستیارتھ پرکاش کا بغور مطالعہ کیا۔ میں اسے پڑھ کر سخت مایوس ہوا ہوں، اتنے بڑے آدمی کی جو ایک جماعت کا روحانی پیشوا ہے ایسی تصنیف اُس کی شان کے شایاں نہیں کہلائی جاسکتی۔"

بات یہ ہے کہ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنے مت کی بنیاد ہی دوسرے مذاہب کی تخریب و دل آزاری پر رکھی تھی۔ ستیارتھ پرکاش کا تیرھواں باب پڑھ کر اس دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس کتاب میں سناتن دھرم کے اپنشدوں اور پرانوں، خالصہ دھرم کے شری گرنتھ صاحب، مسلمانوں کے قرآن مجید اور عیسائیوں کی انجیل مقدس پر زہر میں بجھے ہوئے نشتر سے جو نام نہاد تنقید کی گئی ہے۔ اُس کے پیشِ نظر ستیارتھ پرکاش کو پڑھ کر مہاتما گاندھی کی مایوسی کچھ بیجا نہیں۔ سوامی دیانند سرسوتی کی دوسرے مذاہب و اقوام کے خلاف غیر روادارانہ بلکہ معاندانہ روش کو ہر آریہ سماجی نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے۔ آریہ سماجی جماعت کی فساد آرائی اور فتنہ آفرینی اب کوئی نظری چیز نہیں رہی ہے۔ اس ملک میں ہندو مسلم خانہ جنگی کی تاریخ کا کوئی صفحہ ایسا نہ ملے گا جس میں فساد و بدامنی کی تشکیل و رہنمائی کے سلسلے میں آریہ سماجی جماعت کا ذکر نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ سوامی دیانند سرسوتی نے ایک بلند رتبہ ہندو ریفارمر کی حیثیت میں ہندو قوم و مذہب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ہندو دھرم کے دیرینہ توہمات۔ ہندو قوم کی قدیم بے معنی رسومات کی اصلاح کی۔ اور اگرچہ اس کا اعتراف نہیں کیا۔ لیکن ایک روشن خیال رہنما کی طرح "عقد بیوگان" کو "ودھوا وواہ" تبلیغ کو شدھی اور توحید کو ہندی نام دے کر اپنا لیا۔ اور اس طرح درحقیقت انہوں نے اُن بے شمار ہندوؤں کو اسلامی عقاید و اعمال سے مانوس کر دیا جو اسلامی اصطلاحات سے کانوں پر ہاتھ رکھنے کے خوگر تھے لیکن ستیارتھ پرکاش میں سوامی جی نے دیگر مذاہب کے خلاف جو زہر اگلا ہے یہ زہر توارث کے طور پر سماجی نسلوں میں پرورش پا رہا ہے اور اس کا اظہار آریہ سماجی جماعات و ادارات ایک مذہبی فرض سمجھ کر مختلف صورتوں میں کرتے رہتے ہیں۔

یوں تو آریہ سماجی تنظیم ملک کے تمام غیر آریائی فرقوں اور مذہبوں کے خلاف ابتدا سے ہنگامہ آرا رہتی چلی آئی ہے۔ لیکن مسلمان اور اسلام کے الفاظ تو خاص طور پر ان حضرات کے لئے جنوں آفریں بن رہے ہیں۔

آریہ سماج ابتدا میں ایک مذہبی جماعت کی حیثیت میں سطح وجود پر نمودار ہوئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اپنی مذہبی حیثیت کو صرف نمائشی مظاہروں تک محدود کر کے مدت مدید سے ایک خالص سیاسی جماعت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اب عملی طور پر اصل مذہب سے اُس کا تعلق برائے نام رہ گیا ہے۔ ملکی سیاست اُس کا میدانِ عمل بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سناتن دھرمیوں، بدھسٹوں، دیو سماجیوں اور اسی قسم کی دوسری تمام متضاد و متصادم عقاید رکھنے والی ہندو جماعتوں سے ان کا اتحاد ہو چکا ہے اور آریہ سماجی رہنمائی میں ہندوستان کی تمام غیر مسلم اقوام اسلام اور اسلامیانِ ہند کے خلاف ایک غیر متناہی محاذ قائم کر چکی ہیں۔ اگر آریہ سماجی تحریک اپنی ابتدائی مذہبی حیثیت پر قائم رہتی تو اچھوت ادھار، عقد بیوگان، توہمات مذہبی کی اصلاح اور بنیادی مسئلہ توحید میں اسلام سے قریب تر ہونے کے سبب آریہ سماج کا اتحاد مسلمانوں سے ہو سکتا تھا۔ سناتن دھرم اور آریہ سماج کے مذہبی عقاید میں زمین اور آسمان کی پوری مسافت حائل ہے۔ مگر سماجی جماعت اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن اور سناتن دھرمیوں کی رہنما بنی ہوئی ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آریہ سماج اب کوئی مذہبی جماعت نہیں بلکہ خالص ایک سیاسی گروہ ہے۔ اس گروہ کا تمام تر جوشِ عناد مسلمانوں کی تخریب و ترہیب کے لئے وقف ہو چکا ہے۔

حیدر آباد پر دھارمک ستیہ گرہ کے لباس میں آریائی یلغار

بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مملکت آصفیہ میں ہندو رعایا کو جو مراعات حاصل ہیں کسی ہندو ریاست میں بھی میسر نہیں۔

موجودہ مہاراجہ بڑودہ نے اپنے عہد ولیعہدی میں حیدرآباد کی سیاحت کے دوران میں اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ

"حیدرآباد میں ہندوؤں کو جو سہولتیں اور رعایتیں، حاصل ہیں، ہماری ریاست میں بھی حاصل نہیں۔"

ہندوؤں کے مشہور روحانی پیشوا گرو شنکر اچاریہ نے پچھلے دنوں خود حالات کی تحقیقات کے بعد آریہ سماجی پروپیگنڈے کی تردید کرتے ہوئے جو اعلان کیا اس کا ماحصل بھی یہی ہے کہ

"حیدرآباد میں ہندوؤں کے تمام فرقوں کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہے۔"

بہت سے ضمیر دار ہندوستیہ گرہیوں نے حیدرآباد میں حالات کا جائزہ لیتے ہوئے جب سماجی مخالفت کو کذب و افترا پر مبنی پایا تو اپنے بیانات میں اس نام نہاد دھارمک ستیہ گرہ کے چہرے کو بے نقاب کرتے ہوئے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے حقیقت افروز بیان نے تو آریہ سماجی باطل آرائی کو ہمیشہ کیلئے رسوا کر دیا ہے۔ مگر سماجی اخبارات و ادارات کی علانیہ معاندت اور خفیہ ریشہ دوانیوں کا چونکہ صرف ایک ہی مقصد ہے کہ مملکت آصفیہ کو ہندوستان کے ریاستی جغرافیے سے محو کر کے ملک کی اس سب سے بڑی اسلامی سلطنت کو "رام راجیہ" کا ایک حصّہ بنا دیا جائے اسلئے اس مقصد مسموم کے پیش نظر سماجی ستیہ گرہ کے رہنماؤں کو کوئی صداقت اس منظم فتنہ کاری سے روک نہیں سکتی۔ اور چونکہ کانگریس ہو یا کوئی دوسری غیر مسلم سیاسی جماعت ہر ایک پر سماجی ذہنیت طاری ہے۔ پریس کی تمام تر طاقت آریہ سماجی ہاتھوں میں ہے۔ ادھر انگریز کہ فطرةً طاقت کا پجاری واقع ہوا ہے۔ ملک کی کانگریسی اور سبھائی طاقتوں کے سامنے سرنگوں ہو رہا ہے۔ اس لئے "پیرا ماؤنٹ پاور" بھی سماجی یورش کے ساتھ ہو گئی ہے۔

دھارمک آزادی کا نام رکھ کر مملکت آصفیہ کے خلاف جو سماجی طوفان برپا ہے اس کے پس منظر میں گاندھی، ہنرو، پٹیل سی پی کی کانگریسی حکومت اور پیرا ماؤنٹ پاور کے خدائی فوجداروں کی ایک پوری مسلح فوج موجود ہے۔

دراز دستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں!

تاجور

تبصرات

ماہنامہ ہوی لینڈ:- تقطیع ۲۲×۱۸/۴ حجم ۴۲ صفحات

سرورق رنگین۔ کاغذ معمولی۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت سالانہ علاوہ محصول ڈاک عہ فی پرچہ ۳ر آنے۔

یہ نیا فلمی ماہنامہ سکندرآباد ریاست حیدرآباد سے جاری ہوا ہے۔ زیر نظر پرچہ میں ۲۵ مضامین نظم و نثر ہیں۔ پانچ نظمیں۔ چار فلمی مضامین اور سولہ مختلف مضامین ہیں۔ مضامین کے عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مضامین دلچسپ اور مفید ہوں گے لیکن مطالعہ کے بعد وہی مضامین غیر دلچسپ اور بے نتیجہ ثابت ہوتے ہیں۔

یہ رسالہ زیر نگرانی محمد حسام الدین صاحب غوری اور زیر ادارت ایل۔ سی کھلہ بی۔ اے جاری ہوا ہے۔ امید ہے مسٹر ایل سی کھلہ آئندہ اس کو دلچسپ اور مفید بنانے کی کوشش کریں گے۔

ماہنامہ پریم پجاری لاہور:- تقطیع ۳۰×۲۰/۸ حجم ۴۷ صفحات

سرورق باتصویر۔ کاغذ سفید عمدہ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت سالانہ سے رفی پرچہ ۵ر آنے

یہ نیا رسالہ لاہور سے جاری ہوا ہے۔ ایم۔ ایس البرسٹ ایڈیٹر ہیں اور جائنٹ ایڈیٹر جی ایچ ملک بی۔ اے ہیں۔ سچی خوشی کا مبلغ۔ پاکیزہ محبت اور وطن پرستی کا علمبردار ہے۔ حب الوطنی کے جذبات سے تمام مضامین لبریز نظر آتے ہیں۔

ماہنامہ چاند بمبئی:- تقطیع ۲۶×۲۰/۴ حجم ۷۰ صفحات

سرورق رنگین۔ کاغذ معمولی۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت سالانہ عہ۔ فی پرچہ ۲ر

یہ ماہنامہ بمبئی سے جاری ہوا ہے۔ زیر نظر پرچے میں تیس ۳۰ مضامین نظم و نثر ہیں۔ اور سب کے سب مفید اور دلچسپ ہیں

فلمی رسالہ ہے۔ فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصاویر زیب رسالہ ہیں۔ نظموں میں الطاف مشہدی اور حفیظ ہوشیارپوری کی نظمیں قابل ذکر ہیں۔ محترمہ حجاب امتیاز علی صاحبہ کا افسانہ "صنوبر کے سائے" اچھا ہے۔ اور روداد غم بھی اچھا افسانہ ہے۔

"ادب لطیف کا ڈرامہ نمبر": تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم ۲۲۲ صفحات۔

کاغذ عمدہ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت ڈرامہ نمبر ۱۲ ار۔

ادب لطیف کا ڈرامہ نمبر ۲۷ مضامین نظم و نثر کا اچھا مجموعہ ہے۔ ڈراموں کے متعلق پانچ تاریخی اصلاحی اور فنی مضامین، ۸ ڈرامے اور پانچ منظوم ڈرامے پیش کئے گئے ہیں۔ "ایک ایکٹ کا ڈرامہ" "ڈرامے کی مختصر تاریخ" "ڈرامہ اور تعلیم" "ڈرامہ فنی نقطۂ نظر سے" "ڈرامہ میں پلاٹ اور کردار نگاری" اچھے مضامین ہیں اور "آرام علاج" اچھا ڈرامہ ہے۔ نظموں میں الطاف مشہدی اور احمد ندیم قاسمی کی نظمیں اچھی ہیں۔

ماہر القادری کے سو شعر: تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ لکھائی چھپائی بہترین

قیمت ۸ ر ملنے کا پتہ۔ فرحت مکان نمبر ۶ ۸ ا حیدر آباد دکن۔

حضرت ماہر القادری کے نام سے کون واقف نہیں۔ آپ موجودہ نوجوان شعراء میں ممتاز حیثیت کے شاعر اور افسانہ نویس ہیں۔ حال ہی میں آپ کے سو اشعار کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس مجموعے سے آپ کی شاعرانہ قابلیت کا اندازہ مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کے مذاق کا علم ضرور ہو جاتا ہے۔ ماہر القادری کی بلند شاعرانہ حیثیت اور فلسفیانہ مذاق کی اگر جھلک دیکھنی ہے تو اس مجموعے کا ضرور مطالعہ کیا جائے۔

سالنامہ عالمگیر لاہور: تقطیع ۲۲×۱۸/۸ حجم ۲۱۶ صفحات۔ کاغذ عمدہ

لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت عہ۔

عالمگیر ایک مشہور اور پرانا رسالہ ہے اور خاص نمبر کثرت سے شائع ہوتے ہیں۔ زیر نظر سالانہ نمبر بھی اپنی جملہ خصوصیات سے مزین ہے۔ ۶۶ مضامین نظم و نثر ہیں۔ ۳۵ نظمیں۔ دس افسانے اور اکیس علمی اور تاریخی مضامین ہیں۔ مضامین کا معیار بلند ہے اور مدیر کی وسعت نظر کی داد دینا پڑتی ہے۔ ہوشربا مضامین۔ ڈرامہ آفریں نظمیں اور نتیجہ خیز افسانوں نے عالمگیر کے خاص نمبر کو واقعی خاص نمبر بنا دیا ہے۔

دیہاتی گیت: تقطیع ۲۲×۱۸/۸ حجم ۸۴ صفحات۔ کاغذ عمدہ۔ لکھائی صفائی دیدہ زیب

قیمت ۸ ر ملنے کا پتہ عصمت بک ڈپو دہلی۔

اس کتاب کے مؤلف ڈاکٹر اعظم کریوی ہیں۔ اور اردو ادب میں بہترین چیز ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ادب اردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں دیہاتی گیت اور ان کا ترجمہ کر کے اس نئے احساس کی ایک روشن اور کامیاب تصویر پیش کی ہے۔ جس کی طرف ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے حال ہی میں توجہ کی ہے۔ ہندوستانی کی سماجی اور طبقاتی آزادی کی وضاحت کی گئی ہے جس میں ملکی آزادی کا راز پوشیدہ ہے۔ کتاب قابل دید ہے۔

انشاء سلمیٰ: تقطیع ۲۲×۱۸/۸ حجم ۶۴ صفحات۔ کاغذ عمدہ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت

۶ ر ملنے کا پتہ عصمت بک ڈپو دہلی۔

یہ کتاب صاحبزادہ ولی احمد خاں صاحب ایم۔اے۔ایم۔ الف کی تصنیف ہے۔ اچھی اور مفید تصنیف ہے۔ اردو ادب میں خطوط نویسی کی بہت سی کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں۔ مگر یہ کتاب ان سب کی نسبت زیادہ اچھی ہے۔ انشاء سلمیٰ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کتاب لڑکیاں لڑکوں اور عورتوں کیلئے یکساں مفید ہے۔ مصنف کے اسلوب بیان میں دلچسپی کے ساتھ برجستگی بھی ہے۔ مقدمہ میں خط و کتابت کی تاریخ اور اس کی اہمیت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ جس نے کتاب کی افادیت میں بہت کچھ اضافہ کر دیا ہے۔ طلبا، طالبات اور خواتین کو انشاء سلمیٰ سے ضرور استفادہ کرنا چاہیئے۔

"شباب" لاہور: تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۸ صفحات سرورق رنگین کاغذ اچھا لکھائی

چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت فی پرچہ ار (ایک آنہ)

یہ ہفتہ وار اخبار لاہور سے فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی ادارت میں جاری ہوا ہے۔ غیر ممالک کی دلچسپ اور مفید معلومات کا ذخیرہ پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نتیجہ خیز اور مفید افسانے

اور نظمیں زیرِ نظر پرچے میں شامل ہیں۔ لیکن ابھی اس کے معیار کو بلند کرنے کی ضرورت ہے۔

تمثیلی مشاعرہ:- تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۱۴ صفحات - کاغذ عمدہ - لکھائی چھپائی دیدہ زیب خوبصورت جلد قیمت عہ ملنے کا پتہ - انجمن اربابِ ذوق لائلپور -

پہلی مرتبہ عزیزؔ لکھنوی مرحوم نے ماہنامہ "معیار" لکھنؤ کے ذریعہ عالمِ ارواح کے مشاعروں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ جو بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اس کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم دہلوی نے دہلی کی آخری "بزمِ ادب" کا منظر پیش کیا۔ اور ان دونوں حضرات نے اپنی جادو نگاریوں سے خیالی پیکروں میں جان ڈالدی تھی .... جن لوگوں نے ان مضامین کا مطالعہ کیا ہے وہ آج بھی مشتاق ہیں۔ لیکن پنڈت برجموہن دتاتریا کیفیؔ کی جدت طرازی نے اس قسم کے مشاعروں کی دلچسپیوں میں اور اضافہ کر دیا۔ چنانچہ آپ کے زیرِ اہتمام لائلپور گورنمنٹ کالج میں ایک تمثیلی مشاعرہ ہوا تھا اور اس کی قلمی تصویر ہمارے پیشِ نظر ہے۔

اس مشاعرے میں اردو کے بارہ شاعر ہیں۔ سوداؔ - میر دردؔ، میر تقیؔ، جرأتؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، آتشؔ، نسیمؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ - کالج کے طلبا اور پروفیسر صاحبان کو ان حضرات کے مخصوص لباس میں بٹھا کر ان کی غزلیں پڑھوائی گئیں۔ پنڈت جی کے حسنِ مذاق نے ایک اور بھی جدت کی ہے اور وہ یہ کہ اس مشاعرہ میں شعرا کا کلام سن کر اس کی داد دینے کا نہایت پُرلطف اور سبق آموز طریقہ تھا -

مختلف عمروں اور مختلف دوروں کے اساتذہ میں باہم حفظِ اور پاسِ ادب کا لحاظ اور داد کی نوعیت پر اس کا اثر - کی داد سے اس کے ذوق - رجحان اور رنگ شاعری کا اظہار - اساتذہ کی زبان سے ان کے کلام کے لفظی معنوی محاسن اور شاعرانہ نکات کی طرف اشارے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں کہ جن کی بدولت یہ مشاعرہ موجودہ شعرا کیلئے نصاب بن گیا ہے -

کتاب کے آخر میں ان تلمیحات کی بھی شرح کر دی گئی ہے جو داد کے سلسلہ میں استعمال ہوئی ہیں۔ یہ کتاب دیکھنے کے قابل ہے اور بہت زیادہ مفید ہے -

سالنامہ دیہاتی زندگی:- تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم ۸۰ صفحات - کاغذ عمدہ - لکھائی چھپائی دیدہ زیب - ملنے کا پتہ دیہاتی زندگی شیخوپورہ -

"دیہاتی زندگی" کامیاب تعلیمی رسالہ ہے اور محکمۂ تعلیم پنجاب میں منظور ہے - اس رسالے کے عام پرچے بھی مضامین کے لحاظ سے اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن سالنامہ ۱۹۳۹ء نسبتاً زیادہ اچھا ہے - زیرِ نظر سالنامہ پچیس مضامین نظم و نثر کا دلچسپ اور سبق آموز مجموعہ ہے -

"دیہات سدھار" تحریک کے متعلق بہت زیادہ مفید مضامین فراہم کئے گئے ہیں۔ مضامین چار ابواب میں منقسم ہیں۔ اصلاحی تاریخی، تعلیمی، حصۂ نظم اور ادبی و مزاحیہ مضامین - اصلاحی مضامین میں "وقت ونذر کی قدر" "بنجر کھیتوں کو لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کرنا" "باغ لگانے کیلئے چند ضروری باتیں" "گڑھوں کی کھدائی" "کپاس کی پیداوار" اچھے مضامین ہیں۔ تعلیمی مضامین میں "اصلاحِ دیہات اور طلبا" اچھا مضمون ہے - مزاحیہ مضامین میں لاہور شیخوپورہ تک اچھا افسانہ ہے - حصۂ نظم میں "چرواہی" اچھی نظم ہے -

"عورتوں کی دنیا" اور "بچوں کا صفحہ" "دیہاتی زندگی" کے مخصوص عنوانات ہیں اور ان ابواب میں نہایت اچھے مضامین پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ سالنامہ میں بھی ان موضوعات پر اچھے مضامین شائع کئے گئے ہیں -

اب تک "دیہاتی زندگی" ماہنامہ تھا لیکن ۱۹۳۶ سے ہفت روزہ ہو گیا ہے۔ سردار صاحب باوا نانک سنگھ صاحب ڈپٹی کمشنر ضلع شیخوپورہ کی ادب پروری اور علم نوازی کی بدولت "دیہاتی زندگی" کو یہ معراج نصیب ہوئی ہے -

طالب فارسی

خوش باش شہزادہ

آسکر وائیلڈ کا ایک شاہکار

شہر کے محلوں اور ایوانوں سے بھی بلند ایک فلک بوس مینار پر شہزادے کا مجسمہ نصب تھا طلائی چادر سے مجسمہ دمک رہا تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو بڑے بڑے نیلم جڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں تلوار تھی، جس کا مرصع دستہ سرخ جواہرات سے جگمگا رہا تھا۔

لوگ اس مجسمے کو بیحد پسند کرتے تھے۔ اس کے نہایت اور ستائش گر تھے۔ شہر کے ایک کونسلر نے جو ماہر فن ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا اور شہرت وامتیاز حاصل کرنا چاہتا تھا اس مجسمے کو دیکھ کر یوں اظہار رائے کیا تھا ——

"یہ ہوا کا رخ بدلنے والے آلہ کی طرح خوبصورت ہے۔ لمحہ لمحہ پر اس کے رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ بلا کا حسین ہے لیکن یہ جس قدر خوبصورت ہے اس قدر کارآمد نہیں ہے۔ مجسمے کی تعریف کرتے ہوئے کونسلر نے آخری الفاظ اس خیال سے شامل کر دیئے تھے کہ لوگ اسے لغو نہ سمجھ لیں۔

چاند کے کھلونے کے لئے روتے ہوئے ایک کمسن بچے سے اس کی دانشمند ماں نے کہا ——

"میرے لال تو بھی خوش باش شہزادے کی طرح کیوں نہیں بنتا۔ دیکھ تو خوش باش شہزادہ کبھی کسی چیز کے لئے رونے کا خواب بھی نہیں دیکھتا"

"مجھے خوشی ہے کہ دنیا میں ایک ہستی تو ایسی ہے جو ہر طرح مطمئن ہے"۔ —— ایک مایوس آدمی اس عجیب مجسمے کی طرف دیکھ کر خود بخود بول اٹھا۔

"سفید کپڑوں پر سرخ رنگ کی چمکدار جاکٹ پہنے گرجا گھر سے نکل کر باہر جاتے ہوئے چند یتیم بچوں نے خوش باش شہزادے کے عظیم الشان مجسمے کو دیکھ کر کہا —— "یہ بالکل فرشتے کی طرح معلوم ہوتا ہے"۔

"فرشتہ! جسے تم لوگوں نے کبھی دیکھا نہیں اس کے متعلق تم کیسے جان سکتے ہو"۔ حساب کے ایک ماسٹر نے قدرے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"لیکن ہم لوگوں نے اسے خواب میں دیکھا ہے" —— یتیم بچوں نے حساب کے ماسٹر سے کہا۔ بچوں کے خواب کی بات پر ماسٹر صاحب بہت جھنجھلائے اور برافروختہ ہو اٹھے، وہ بچوں کے خواب کو سچا نہیں سمجھتے تھے۔

ایک شب میں اس شہر کے اوپر سے اڑتا ہوا ایک کنجن جا رہا تھا اس کے سارے ساتھی چھ ہفتے پہلے مصر جا چکے تھے۔ وہ پیچھے رہ گیا تھا راستہ میں ایک حسین کھنجنی سے جو دریا کے اوپر اڑ رہی تھی اس کی ملاقات ہو گئی۔ اور وہ اس کے حسن پر فریفتہ ہو گیا۔ کھنجنی کے دلفریب حسن نے اسے اس طرح اپنی جانب مائل کر لیا کہ وہ اپنے رفیقوں کو چھوڑ کر اس سے کچھ پیار بھری باتیں کرنے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس نے کھنجنی کے سامنے اپنے شوق و تمنا کا اظہار کرتے ہوئے کہا —— "کیا میں تم سے محبت کر سکتا ہوں"۔

کھنجنی نے اس کی محبت کی پیشکش کو قبول کرتے ہوئے اپنی فطرت ادا کے ساتھ گردن جھکا دی۔ کھنجنی کی مسرت و شادمانی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اظہار محبت کے طور پر کھنجنی کو گھیر کر اڑنے لگا اور اپنی پرواز کے کمال دکھانے لگا۔ تالاب کے پانی کو اپنے تیز بازوؤں سے مس کر کے اس پر نقرئی لہریں پیدا کرنے لگا۔

وہ صحبت عشق و محبت موسم گرما تک گرم رہی۔

"یہ بیہودہ عشق بازی" —— دوسرے کھنجنوں نے کہا —— "اس کے پاس کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ پھر بھی اس کے چاہنے والوں کی کمی نہیں ہے"

دریا کے کنارے کھنجنیوں کی بھرمار تھی۔ موسم سرما کے آتے ہی وہ اڑ کر چلی گئیں، محبوبہ کے چلے جانے کے بعد محبت کا مارا کھنجن محزون وملول رہنے لگا۔ اس کی دلدوز یاد نے اسے دیوانہ بنا دیا۔ تنہائی اسے بری طرح اذیت دے رہی تھی وہ کہیں چلا جانا چاہتا تھا۔

کھنجن نے دل گرفتہ ہو کر کہا —— "جاتے وقت اس سے بات چیت بھی نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے وہ ایک باوفا معشوقہ ہے۔ وہ ہمیشہ ہوا میں اڑا کرتی ہے۔ وہ بڑی شوخ ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پالتو ہو میں تو مسافر ہوں۔ اس لئے میری محبوبہ کو بھی پردیس ہی پسند ہونا چاہیئے

بالآخر وہ بھی مصر کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کے رفقا گئے تھے۔

وہ دن بھر اڑتا رہا۔ شام کو خوش باش شہزادہ کے مینار پر پہنچا، اس کے بازو شل ہو گئے تھے۔ وہ شب گذاری کے لئے جگہ تلاش کرنے لگا۔ اسی دوران

میں اُس کی نظر اس فلک بوس مینار پر پڑی۔ کھنجن نے کہا — میں وہیں ٹھہرونگا وہ نہایت پر فضا مقام ہے وہاں تازہ ہوا خوب ملے گی۔ یہ سوچ کر وہ خوش باش شہزادے کے پیروں کے پاس جا بیٹھا۔ چاروں طرف دیکھ کر اُس نے کہا — "مجھے سنہری خواب گاہ مل گئی۔"

وہ سونے کی تیاری کرنے لگا، جیسے ہی اپنے سر کو اپنے بازوؤں کے درمیان ڈال کر سونا چاہتا تھا۔ ناگہاں اس پر پانی کی ایک بوند پڑی۔

طائر نے متعجب ہو کر کہا "کیسی عجیب بات ہے۔ آسمان پر کہیں بادل کا ایک چھوٹا سا بھی ٹکڑا نہیں۔ نیلگوں آسمان میں ہیرے کے ٹکڑے کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ پھر بھی پانی برس رہا ہے۔ یوروپ کی نسبت شمالی آب و ہوا تو واقعی بڑی خوفناک ہے۔"

کھنجن کو بارش زیادہ پسند نہ تھی۔ جو محض اس کی خودغرضی پر مبنی تھی پھر دوسری بوند گری۔ کھنجن نے پھر کہا — "ایسے مجسمے سے کیا فائدہ جو بارش سے بھی نہ بچا سکے مجھے کسی چمنی کی تلاش کرنی چاہیئے جو دھواں نکلنے کے لئے بنائی گئی ہو۔ یہ جگہ تو اچھی نہیں ہے۔"

یہ سوچ کر کھنجن اُڑنا چاہتا تھا کہ بازو پھیلانے سے پہلے ہی اس پر پانی کا ایک اور قطرہ آ گرا۔ اُس نے ناگہاں اوپر کی طرف دیکھا — اُف اُسے کیسا منظر دکھائی دیا۔

خوش باش شہزادے کی آنکھیں اشک آلود تھیں۔ اور اس کے سنہرے رخساروں پر آنسو لڑھک لڑھک کر ٹپک رہے تھے۔ چاند کی چاندنی میں اس کا چہرہ اتنا حسین اور دلفریب معلوم ہو رہا تھا — کہ کھنجن کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا — "تم کون ہو؟" — کھنجن نے ازراہِ ہمدردی پوچھا۔

"میں خوش باش شہزادہ ہوں۔"

"تم رو کیوں رہے ہو؟" — کھنجن نے پوچھا — "تم نے تو مجھے اپنے آنسوؤں سے تر کر دیا۔"

کھنجن کے سوال کا جواب دیتے ہوئے خوش باش شہزادے کا بت بولا — جب میں زندہ تھا تو مجھے مطلق نہ معلوم ہوا کہ آنسو کیا ہیں۔ اس لئے کہ میں اس وقت ایسے ایوانِ شاہی میں رہتا تھا جہاں تکالیف و مصیبت کی کسی آواز کی رسائی نہ تھی۔ میں دن میں اپنے دوستوں کے ساتھ باغ میں کھیلتا تھا اور شام کے وقت عالیشان حال میں ناچ دیکھتا تھا۔ رنگ رلیوں میں مست رہتا تھا۔ باغ کے چاروں طرف بلند چہار دیواریاں تھیں۔ میں نے کبھی یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کہ چہار دیواری کے پار کیا ہے؟ میں جس طرح اپنے باغ اور محل کو آراستہ دیکھتا تھا۔ سمجھتا تھا ہر طرف یہی حال ہے میرے مصاحب اور ہم صحبت مجھے خوش باش شہزادہ کے نام سے پکارتے تھے اور دراصل میں تھا بھی خوش باش۔ اگر عیش و عشرت کو خوشی و شادمانی کہا جائے۔ تو میں عیش و عشرت ہی میں جیا اور عیش و عشرت ہی میں مر گیا۔ اور اب جب کہ میں مر گیا ہوں۔ لوگوں نے مجھ کو اتنے اونچے مقام پر بٹھا دیا ہے کہ میں اپنے شہر کی تکلیف و مصیبت افلاس و ناداری اور بیکسی و ناچاری کو بآسانی دیکھ سکتا ہوں اگرچہ میرا دل شیشے کا بنایا گیا ہے پھر بھی رونے کے سوا مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

"ارے یہ کیا ٹھوس سونا نہیں ہے؟" — کھنجن نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ تنقید کہنے اور اسے زوردار لہجہ میں پیش کرنے میں خاص سلیقہ اور تمیز رکھتا ہے۔" —

خوش باش شہزادہ کے مجسمہ نے آہستہ اور شیریں آواز میں کہنا شروع کیا — "دور فاصلے پر ایک تنگ اور گندی گلی میں ایک غریب کا مکان ہے اس مکان میں ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ اس کھڑکی سے میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک عورت میز پر بیٹھی ہوئی ہے وہ دبلی پتلی بھوکی اور اداس ہے وہ درزن ہے اور سوئی کے زخموں سے اس کے ہاتھ سرخ ہو گئے ہیں۔ آئندہ شاہی دربار کے موقع پر ملکہ کی سہیلی کے پہننے کے لئے ایک خوبصورت گون پر وہ طرح طرح کے بیل بوٹے کاڑھ رہی ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک بستر پر اس کا ننھا بچہ بیمار پڑا کراہ رہا ہے۔ اسے بخار ہے، وہ اپنی ماں سے نارنگی مانگ رہا ہے مگر اس کی ماں کے پاس پانی کے سوا اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ جو اپنے بچے کو دے سکے اس لئے لڑکا چیخ رہا ہے — کھنجن او میرے چھوٹے کھنجن! — تلوار کے دستے میں جو لعل جڑا ہوا ہے۔ اسے لے کر اس غریب عورت کے پاس میں نہیں جا سکتا۔ میرے پاؤں اس طرح بندھے ہوئے ہیں۔ کہ میں حرکت کرنے سے مجبور ہوں۔"

"میں مصر جانے کے لئے ٹھہرا ہوا ہوں" — کھنجن نے کہا — "میرے دوسرے ساتھی دریائے نیل کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے اُڑ رہے ہونگے۔ اور نیلوفر کے بڑے بڑے شگفتہ پھولوں سے خاموش سرگوشی کر رہے ہونگے۔ وہ جلد ہی مصر کے بادشاہ کے مقبرے پر جا کر بسیرا لینگے۔ بادشاہ مصور اور بیش قیمت کفن میں لپٹا سو رہا ہے۔ اس کی نعش ملائم کپڑوں سے ملبوس اور کیمیاوی سیال میں تر

ہے۔ اس کے گلے میں قیمتی جواہرات کا ہار پڑا ہوا ہے۔ اور اس کے ہاتھ سوکھے پتّوں کی طرح ہیں"۔۔۔۔

خوش باش شہزادے نے پھر کہا۔۔۔ "کھنجن! کھنجن!! او میرے ننھے کھنجن! میرے ساتھ صرف ایک رات رہ کر کیا تم میرے سفیر نہ ہوگے، بچہ پیاس کے مارے تڑپ رہا ہے۔ اور اس کی ماں اپنے لخت جگر کو پیاسے تڑپتے دیکھ کر بےچین اور مضطرب ہے"۔

"میں لڑکے کو پسند نہیں کرتا۔۔۔ گذشتہ موسم گرما میں جب کہ میں ساحل دریا پہ مقیم تھا۔ وہاں دو شرارتی لڑکے تھے جو ہمیشہ مجھ پر سنگ باری کیا کرتے تھے۔ اگرچہ مجھے ان کا ایک پتھر بھی نہیں لگا۔ کیونکہ کھنجن اُڑنے میں بہت تیز اور طرار ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں میرا خاندان تیز پروازی میں خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے۔ تاہم وہ ہماری توہین و تذلیل تو ہوئی تھی"۔۔۔ کھنجن نے کہا۔

لیکن خوش باش شہزادہ اتنا زیادہ اندوہ گیں اور غمزدہ ہو رہا تھا کہ کھنجن اسے دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس نے شہزادے کے متعلق اپنی دلی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"اگرچہ یہاں شدت کی سردی پڑ رہی ہے۔ تاہم میں تمہارے ساتھ ایک رات رہ کر کار سفارت انجام دینے کو تیار ہوں"۔

"ننھے کھنجن! شکریہ!"۔۔۔ شہزادے نے کہا۔

کھنجن نے شہزادے کی تلوار کے دستے میں سے بڑے لعل کو نکال لیا اور اسے اپنی منقار میں لے کر شہر کے اوپر اُڑنے لگا۔ وہ گرجا گھر کے کنگورے سے اُڑتا ہوا جہاں سنگ سفید کے دیوتاؤں کی مورتیں بنی ہوئی تھیں ایوان شاہی کے اوپر سے گذرا جہاں اسے رقص و سرود کی آواز سنائی دی۔ ایک مکان کی چھت پر ایک حسینہ اپنے محبوب کے ساتھ کھڑی عشق و محبت کی باتیں کر رہی تھی۔ کھنجن نے محبوبہ کو کہتے سنا۔ "آسمان میں جگمگاتے ہوئے تارے کیسے عجیب معلوم ہو رہے ہیں۔ اور محبت میں کتنی حیرت انگیز کشش ہے"۔

محبوبہ نے پھر کہا۔۔۔ "مجھے امید ہے کہ شاہی دربار کے وقت تک میری پوشاک تیار ہو جائیگی۔ میں نے اس پر حسین بیل بوٹے کاڑھنے کے لئے کہا ہے۔ لیکن درزن بہت کاہل اور سست ہے"۔ کھنجن دریا کے اُوپر سے گذرا۔ اور جہازوں کے مستولوں پر لٹکتی ہوئی روشنیوں کو دیکھا۔ اس نے شہر میں ایک خاص مقام پر بوڑھے یہودیوں کو آپس میں لین دین کرتے روپوں کو تولتے دیکھا۔ اور آخر میں اُڑتے ہوئے غریب درزن کے گھر پہنچا اور جھانک کر دیکھا۔ لڑکے کو شدید بخار تھا اور وہ بستر پر پڑا تڑپ رہا تھا بےچینی کے ساتھ ہاتھ پاؤں ٹپک رہا تھا۔ اُس کی تھکی ہاری ماں سو گئی تھی۔ کھنجن آہستہ سے کمرے میں گھسا اور لعل کو درزن کے انگشتانے کی بغل میں میز پر رکھ دیا۔ پھر اس بخار میں جلتے ہوئے بچے کے بستر کے چاروں طرف اُڑ کر اپنے بازوؤں سے ہوا دی۔۔۔ "واہ مجھے کتنی ٹھنڈک معلوم دے رہی ہے"۔۔۔ بخار میں جلتے ہوئے بچے نے کہا۔۔۔ "میں تندرست ہوا جا رہا ہوں"۔ اور وہ تھوڑی دیر میں میٹھی نیند کے مزے لینے لگا۔

کھنجن خوش باش شہزادہ کے پاس واپس لوٹ آیا۔ اور جو کچھ کیا تھا اُسے شہزادے کو سُنا دیا۔ کھنجن نے پھر کہا۔ "یہ بڑے تعجب کی بات ہے اس شدت کی سردی میں مجھے گرمی معلوم ہو رہی ہے"۔

"اس لئے کہ تم نے ایک نیک کام انجام دیا ہے"۔۔۔ شہزادے نے کہا۔

کھنجن کچھ دیر تک طرح طرح کی باتیں سوچتا اور اُدھیڑ بُن کرتا رہا۔ اسی حالت میں اُسے نیند آ گئی، وہ ہمیشہ اسی طرح غور و فکر کرتے ہوئے سونے کا عادی تھا۔ وہ صبح اُٹھ کر دریا میں نہانے گیا۔

"یہ عجیب بات ہے یہاں جاڑے کے دنوں میں بھی کھنجن دکھائی دے رہا ہے"۔۔۔ پل پر سے گزرتے ہوئے علم الطیور کے ایک پروفیسر نے کہا۔۔۔ اسی سلسلے میں اس نے ایک مقامی اخبار کو ایک طویل مراسلہ بھی لکھا۔ اشاعت کے بعد اس مراسلہ کو ہر شخص نے پڑھا اس میں ایسے پیچیدہ الفاظ تھے کہ وہ مراسلہ اکثر قارئین کی سمجھ ہی میں نہ آیا۔

"میں آج رات کو مصر جاؤں گا"۔۔۔ کھنجن نے کہا۔ اپنے خوش آئند حالات کے متعلق اس کے خیالات نہایت زبردست تھے۔ وہ شہر کی تمام یادگار عمارتوں پر گیا، اور گرجا گھر کے بُرج کے کلس پر جا بیٹھا۔ وہ جہاں بھی گیا۔ اُسے دیکھ کر گوریوں نے آپس میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "یہ نووارد کتنا شاندار ہے"۔

اس طرح کھنجن نے خوب سیر و تفریح کی چاند کے طلوع ہونے پر وہ خوش باش شہزادہ کے پاس گیا۔ اور بولا

"کیا مصر میں آپ کو کوئی کام ہے؟ میں فوراً روانہ ہو رہا ہوں"۔

"کھنجن! کھنجن! میرے ننھے کھنجن! کیا ایک رات میرے ساتھ اور نہ رہو گے؟"

(باقی آئندہ) محمود جاوید ایم۔ اے

نگران
پروفیسر تاجور نجیب آبادی

شاہکار لاہور

ایڈیٹر
فاروق علی خاں

فہرست مضامین بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۹ء

جلد (۹) نمبر (۶)

تصاویر:- (۱) احساسِ شباب (۲) مزدور عورت (۳) حسنِ دامنگیر۔

چندہ سالانہ چھ روپے ششماہی تین روپے آٹھ آنے۔ نمونہ پانچ آنے۔

ایم ہادی حسن اختر ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار واقعہ برمکان میاں علی محمد، میاں علی محمد سٹریٹ (۴۵) سی بیڈن (خواجہ دل محمد روڈ) لاہور

مختصرات

اعلیٰ حضرت خسرو دکن کی رعایا پروری

ہندوستان کے آریہ سماجیوں نے سیاسی مقاصد کے پیش نظر حیدر آباد کے خلاف جو ستیہ گرہ شروع کر رکھا تھا وہ اعلان اصلاحات کے بعد بند کر دیا ہے۔

خسرو دکن نے اپنی سلطنت میں جو اصلاحات نافذ کی ہیں۔ وہ اپنی اہم خصوصیات کی بنا پر ہندوستان کے آئین جدید سے بھی کہیں بدرجہا بہتر ہیں اور اس لحاظ سے دوسری ریاستوں کی نام نہاد اصلاحات سے تو اُن کے موازنہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نئی اصلاحات کے ماتحت حیدر آباد کی مجوزہ مجلس مقننہ ہندوستان کی آئین سازی مجالس کی بہ نسبت زیادہ نمایندہ حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اقتصادی اور حرفتی مفادات کو اس کی اساس قرار دیا گیا ہے۔ کانگریس ایک عرصہ دراز سے اس کوشش میں رہی ہے کہ ہندوستان میں مخلوط نیابت کا اصول نافذ ہو جائے۔ ہندوستان میں تو نہیں حیدر آباد میں اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی ہے اور اس لحاظ سے بھی اس آئین کو ہندوستان کے آئین پر ایک نمایاں فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔

مجلس مقننہ میں منتخبہ ارکان کو اکثریت حاصل ہوگی اور اس کے ساتھ اشتراک عمل کیلئے مختلف کمیٹیوں کا قیام ہر درجہ مفید ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ اصلاح دیہات کے لئے بھی حکومت کی طرف سے ایک نئے عظیم الشان پنچایتی نظام کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

دولت آصفیہ کی طرف سے مذہبی امور کے متعلق آئینی اصلاحات کا جو توضیحی اعلان ہوا۔ اس میں مندرجہ ذیل امور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱- قوانین سلطنت کے اندر رہ کر ہر مذہب کے پیروؤں کو اپنی تنظیم کا پورا حق ہے۔

۲- ان مذہبی تقریبات پر جو عمارات کے احاطوں کے اندر منائی جائیں گی کوئی پابندی نہ ہوگی۔

۳- ایسے مجلسی جلسے حکومت سے اجازت حاصل کئے بغیر منعقد کئے جا سکتے ہیں۔

۴- مذہبی جلوسوں کیلئے حکومت کی طرف سے راستے مقرر کر دئے جائیں گے اور ان کے لئے صرف ایک بار درخواست دینے کی ضرورت ہوگی۔

۵- عبادت گاہوں کی تعمیر کے متعلق حکومت قوانین مرتب کر دیگی یہ قوانین جہاں امن عامہ کے تحفظ کا باعث ہوں گے۔ وہاں مختلف مذاہب کیلئے سہولت کا موجب بھی ہوں گے۔

حضور نظام جب سے تخت پر جلوہ افروز ہوئے ہیں ریاست شاہراہ ترقی پر سرعت سے گامزن ہے۔ ۱۹۲۷ء میں حضور نظام کی خواہش کے مطابق ایک انتظامی کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا اور ۱۹۳۷ء میں ایک اور کمیٹی نے آئینی اصلاحات کی ایک جامع اور مبسوط سکیم تیار کی۔ جسے اعلیٰ حضرت نے منظور فرما لیا۔ جب نظم و نسق اور رعایا کی آزادی کے لحاظ سے حیدر آباد کا درجہ ہندوستان کی ساری ریاستوں کی بہ نسبت بہت بلند ہے تو پھر آرام سے بیٹھے بیٹھے آریہ سماجیوں کے تن بدن میں کیوں آگ لگ گئی۔ ان کی اس شر انگیز تحریک کی وجہ صرف یہی تھی کہ متعصب ہندوؤں کو حیدر آباد میں مسلم اثر و اقتدار ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اور اس حقیقت کا اعلان وہ بارہا اپنے منہ سے بھی کر چکے ہیں۔

مہا سبھائیوں کی اس فتنہ انگیز روش کے باوجود اگر اعلیٰ حضرت حضور نظام نے ریاست میں جدید اصلاحات کے ساتھ مذہبی اور سیاسی اصلاحات کا دائرہ اور وسیع کر دیا ہے۔ تو اُن کی اس رعایا پروری، فراخدلی اور انتہائی فیاضی کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔

تحریک کے دوران میں ستیہ گرہی نہایت دریدہ دہنی سے ریاست اور حضور کے خلاف بہتان طرازی کرتے رہے۔ اور اگرچہ وہ پوری سزا کے مستحق تھے مگر اعلیٰ حضرت نے اپنی روایتی فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی جوبلی سالگرہ کے موقعہ پر تمام قیدیوں کو رہا کر دینے کا

حکم صادر فرما دیا۔ قیام امن و سکون پر اظہار خیالات فرماتے ہوئے اعلیٰحضرت نے اپنے فرمان میں حسب ذیل تصریح فرمائی ہے۔

"میں اُن حالات کی وجہ پر بحث نہیں کرنا چاہتا جن سے ریاست کی پُرامن فضا مکدّر ہو گئی ہے۔ میری رعایا کے دوستانہ تعلقات صدیوں سے خوشگوار چلے آتے تھے۔ وہ ضرب المثل بن چکے تھے۔ لیکن اب ان میں فرق آگیا ہے۔ مجھے بطور ایک حکمران کے اس صورت حالات پر سخت افسوس ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ کام اب بھی بہت زیادہ خراب نہیں ہوا۔ اور اب بھی مختلف جماعتیں ٹھنڈے دل سے ماضی اور حال کے واقعات پر غور کر سکتی ہیں۔ اور مستقبل کے متعلق خوشگوار حل تلاش کر سکتی ہیں کیونکہ ریاست کی بہبودی اور ترقی کا کام اسی طرح چل سکتا ہے۔ کوئی حکومت اُس وقت تک مناسب طریقہ سے کام نہیں کر سکتی جب تک فضا بالکل صاف نہ ہو۔"

اعلیٰحضرت نے اپنی سالگرہ کی تقریب سعید کے موقعہ پر آریہ سماجیوں سے انتہائی فیاضی کا سلوک کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آریہ سماجی اپنی معاندانہ اور فتنہ پرور سرگرمیوں کو اب ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں گے اور ان اصلاحات کو جو انہیں عطا کی گئی ہیں بروئے عمل لانے کے لئے حکومت سے پورا اشتراک اور تعاون کریں گے۔

اعلیٰحضرت نے جس شاہانہ وقار اور حسن خوبی سے اس تحریک کا خاتمہ کیا ہے ہم اس پر اُنہیں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ہندوستانیوں پر حضور کا سایہ ہمیشہ قائم رہے۔

سرسکندر کی فیڈریشن اسکیم

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ہندوستان کیلئے جس وفاقی نظام کی تجویز کو پیش کیا گیا ہے۔ اس پر ہندوستان کی جملہ سیاسی جماعتیں متفق نہیں ہو سکیں ہر چند گول میز کانفرنس کے موقعہ پر وفاق کی تجویز کو ہندوستان کے مندوبین نے نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا لیکن جب اس کی تفاصیل کو شائع کیا گیا تو اس کے متعلق والیان ریاست اور مسلم اقلیت بالفاظ صریح اپنی بیزاری کا اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کیونکہ اس میں اقلیتوں اور ریاستی حکمرانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کوئی تسلی بخش صورت نہیں رکھی گئی۔ اور مرکزی تشکیل کچھ اس نوعیت کی ہے کہ اس میں اکثریت کا اقتدار اور غلبہ ہمیشہ کے لئے مستحکم ہو جاتا ہے لیکن کوئی وفاقی نظام اس وقت تک کامیاب نہیں کہلا سکتا جب تک مرکزی حکومت کا دائرہ اختیار محدود نہ ہو۔ اگر مرکز اس قدر وسیع الاختیار ہو کہ وہ وفاق میں شامل ہونے والی وحدتوں کے داخلی امور میں براہ راست دخل انداز ہو سکے یا اس کی تشکیل اس طرح کی ہو کہ اس سے دست اندازی کا امکان باقی رہ جائے اور ملک کی اقلیتیں ہمیشہ اکثریت کے رحم و کرم پر رہیں تو ایسا وفاق ناقص و نامکمل ہے۔

ان حالات کی موجودگی میں والیان ریاست اور مسلمانوں نے حکومت برطانیہ کے مجوزہ وفاقی نظام کو ٹھکرا دیا۔ چونکہ اس تجویز سے مسلمانوں کے ساتھ بے انصافی ہوتی تھی اس لئے اُنہوں نے اس اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اپنے طور پر غور و خوض شروع کیا۔ اور اس تجویز کے بدل کے طور پر متعدد تجاویز شائع کیں۔ پاکستان سکیم مسٹر اسداللہ کی سکیم۔ سید عبداللطیف اور نواب صاحب ...... ممدوٹ کی اسکیمیں۔ سب اس سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں جن میں ایک ہی مسئلے کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ ان تمام تجاویز پر ملک کے جرائد و صحائف میں بہت سی جرح قدح ہو چکی ہے۔

چونکہ سرسکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کے دل میں بھی برطانوی وفاقی تجویز کے بدل کے لئے ایک تڑپ مدت سے تھی اس لئے اُنہوں نے کامل غور و خوض کے بعد اپنی سکیم کو حال ہی میں شائع کیا ہے جس پر ملک کے اکثر سیاسی حلقوں کی طرف سے بڑی شد و مد کے ساتھ اظہار رائے اور تنقید ہو چکی ہے۔

سرسکندر کی یہ سکیم ان اسباب و علل پر نہایت بالغ نظری سے غور کرنے کے بعد تیار کی گئی ہے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی فیڈرل سکیم میں بنیادی اور اصولی ترمیمات کے متقاضی ہیں اپنی سکیم میں وزیر اعظم پنجاب نے ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں کے اس مطمع نظر کو بھی پیش نظر رکھا ہے جس کے حصول میں برطانوی فیڈرل سکیم مانع نظر آتی ہے۔ انہوں نے اس امر پر بھی خاص توجہ دی ہے کہ فیڈریشن میں شامل ہونے والی مختلف وحدتوں میں سے کسی کے حقوق و مفادات کی اُس پامالی کا امکان باقی نہ رہے جس پر عرصے سے ہندوستان کی اقلیتیں اور ریاستیں شدید تفکر و تردد کا اظہار کر رہی ہیں۔ اس سکیم میں نہ صرف مرکزی حکومت کے اقتدار کو محدود اور اقلیتوں کے مفادات تحفظ ہی کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا ہے بلکہ ریاستوں اور صوبوں کو جداگانہ عناصر کی حیثیت سے ایک وفاق میں شامل کرنے کی بجائے خود ہندوستان کی تقسیم

ایک جدید جغرافیائی اور لسانی رعایت سے کی گئی ہے جس کی رو سے ہندوستان کو ذیل کے سات طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے

طبقہ اول:۔ آسام بنگال اور ریاست بنگال و سکم

طبقہ دوم:۔ بہار اُڑیسہ

طبقہ سوم:۔ صوبجات متحدہ آگرہ اور اُن کی ریاستیں

طبقہ چہارم:۔ مدراس ٹراونکور کورگ اور ریاست ہائے مدراس۔

طبقہ پنجم:۔ صوبہ بمبئی۔ حیدر آباد۔ میسور۔ مغربی ہند صوبہ متوسط اور بمبئی کی ریاستیں۔

طبقہ ششم:۔ صوبہ متوسط برار گوالیار راجپوتانہ اور وسطی ہند۔ بہار اور اُڑیسہ کی ریاستیں۔

طبقہ ہفتم:۔ صوبجات پنجاب۔ سرحد۔ سندھ۔ بلوچستان اور ریاست ہائے کشمیر پنجاب بیکانیر اور جیسلمیر۔

سر سکندر نے اس طبقاتی تقسیم کو حتمی قرار نہیں دیا بلکہ انہوں نے اس امر کی صاف طور پر وضاحت کر دی ہے کہ ان طبقات کی تشکیل میں متعلقہ جماعتوں کے مشورے اور مفاہمت سے حسب ضرورت رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ ان سات طبقات میں سے ہر ایک کے لئے ایک مجلس قانون ساز ہو گی جس میں متعلقہ برطانوی ہند کے علاقوں اور ریاستوں کے نمائندے اسی حق نیابت سے شامل ہونگے جس کو برطانوی فیڈرل سکیم میں تسلیم کیا گیا ہے۔ ان طبقاتی مجالس قانون ساز کے ۳۷۵ نمائندوں سے مرکزی فیڈرل اسمبلی کی تشکیل عمل میں آئیگی جس میں برطانوی ہند کے ۲۵۰ اور ریاستوں کے ۱۲۵ ارکان شامل ہونگے۔ اور اس کی مجموعی رکنیت کا ⅓ حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہوگا۔

اس سکیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اقلیتوں کے تحفظ کے لئے خاطر خواہ انتظام کیا گیا ہے۔ ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے بھی خاص اقدامات کئے گئے ہیں اور جس طرح مرکزی حکومت کے وسیع اختیارات کو محدود کر کے صوبائی خود مختاری کو زیادہ مؤثر بنانے کی سعی کی گئی ہے اس سے یہ سکیم ہندوؤں کے نزدیک بھی نہایت پسندیدہ ہو سکتی ہے۔

آئینی حیثیت سے اس سکیم کی خوبی یہ ہے کہ اس کو نافذ کرنے کے لئے برطانوی پارلیمنٹ کو انڈیا ایکٹ میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں کرنی پڑتی۔ ایک دو دفعات کی ترمیم اور ایک دو دفعات کے اضافے کے بعد برطانوی فیڈرل سکیم کو سر سکندر سکیم کے مطابق بآسانی تمام ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس سکیم سے مسلمانوں کی وہ آئینی حیثیت جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں تسلیم کی گئی ہے قائم رہتی ہے لیکن والیانِ ریاست کی وہ پوزیشن جس کی وجہ سے وہ برطانوی فیڈرل سکیم کو تشویش و اضطراب کی نظر سے دیکھ رہے تھے بڑی حد تک محفوظ ہو جاتی ہے اور ان کی انفرادی حیثیت کے زائل ہونے کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ اقلیتوں کے مذہبی سیاسی تمدنی اور اقتصادی مفادات کی خاطر خواہ حفاظت کی گئی ہے وفاق میں شامل ہونے والی وحدتوں کو مرکز کے ناجائز مداخلت سے محفوظ بنا دیا گیا ہے اور فیڈرل اسمبلی کے اختیارات اس قدر کم کر دیئے گئے ہیں کہ اس سے اب صوبجاتی خود مختاری کے بے حقیقت ہو جانے کے امکانات اُٹھ گئے ہیں۔

گو سر سکندر کی سکیم اس لحاظ سے بہت بعد از وقت ہے کہ وہ ایک ایسے موقع پر شائع ہوئی ہے جبکہ والیانِ ریاست بمجبوری تمام برطانوی فیڈرل سکیم ہی کو قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کر چکے تھے اور کانگرس بھی دبی زبان سے اس کی حمایت پر کمر بستہ ہو چکی تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ جہاں تک وفاقی نظام کے صحیح مقتضیات کا تعلق ہے یہ تجویز نہایت مستحسن ہے اور اس کی جزئیات یقیناً اتنی خوش آئند ہیں کہ اسے حکومت برطانیہ حکومت ہند ہندوستانی ریاستیں کانگرس اور مسلم لیگ سب بشرح صدر قبول کر سکتے ہیں لیکن یہ بات علیحدہ ہے کہ ملک کی سیاسی جماعتوں کے بے بنیاد اوہام۔ باطل شکوک۔ سیاسی چالیں اور سبک جذبات اس کی قبولیت کے لئے سنگ راہ ثابت ہوں+

پنجاب میں ناخواندگی کے خلاف جہاد

ہندوستان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ ساری دنیا کے اَن پڑھ لوگوں کا ایک تہائی حصّہ یہاں آباد ہے۔ یعنی پینتیس کروڑ کی آبادی میں سے صرف دو کروڑ اور پچاس لاکھ نفوس لکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۱ء کے اعداد و شمار سے یہ ظاہر ہوا تھا کہ ان دس سالوں میں ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں میں صرف ایک فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم اپنی حالت پہ جتنا بھی ماتم کریں کم ہے۔ تعلیم کے لحاظ سے دنیا کے جس ملک کا درجہ اتنا پست ہو اس کی معاشری، اقتصادی اور سیاسی حالت بھلا کہاں تک سدھر سکتی ہے۔

لیکن ملک کی اِس تاریک فضا میں اب کہیں کہیں روشنی کی کرنیں بھی دکھائی دیتی ہیں اور مختلف صوبوں میں نئی حکومتوں نے مسئلہ تعلیم کی طرف خاص توجہ دی ہے۔

آنریبل میاں عبدالحی وزیر تعلیم پنجاب نے بالغوں کو تعلیم دینے کے لئے ایک نہایت مفید پروگرام تیار کیا ہے اور اس کو بروئے عمل لانے کیلئے صوبہ بھر میں زبردست جدوجہد کی جارہی ہے۔

وزیر تعلیم اپنا پیغام لے کر خود دیہات میں جاتے ہیں اور پچھلے ایک سال کے عرصہ سے پنجاب کے دیہات میں تعلیم بالغان کا کام نہایت خوبی سے جاری ہے۔ متعدد دیہات میں نئے مدارس کھولے گئے ہیں اور جو پہلے قائم تھے ان کا معیار بلند کر دیا گیا ہے۔

آنریبل وزیر تعلیم کی کوششوں سے فوجیوں کی تعلیم کا کام بھی وسیع پیمانے پر جاری ہے اور یہ تہیہ کر لیا گیا ہے کہ پنجاب کے کسی فوجی کو ان پڑھ نہیں رہنے دیا جائے گا۔ پولیس کے محکمہ میں بھی انہیں ہدایات کے ماتحت سپاہیوں کو تعلیم دی جارہی ہے۔ جیل خانوں میں اب ان پڑھ قیدی باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

وزیر تعلیم نے صوبہ کی مختلف مجالس، سبھاؤں اور اساتذہ سے اپیل کی تھی کہ اس تحریک میں وہ بھی حکومت سے تعاون کریں۔ اس اپیل کا استقبال بڑی گرمجوشی سے کیا گیا ہے اور اس وقت کئی ادارے رضاکارانہ طور پر ملک کی خدمت میں مصروف ہیں۔

آنریبل وزیر تعلیم نے مدارس کے ارباب حل وعقد کو متنبہ کر دیا ہے کہ جو اسکول باقاعدگی سے تعلیم بالغان کا کام نہیں کریں گے ان کی سرکاری گرانٹ بند کر دی جائے گی۔

لاہور میں اساتذہ اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے ایک اجتماع میں آنریبل وزیر تعلیم نے فرمایا:-

"اس وقت تک میں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے جائز ذرائع کا استعمال کیا ہے۔ لیکن میں اس معاملہ میں ناجائز ذرائع استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ناخواندہ اور تعلیم سے بے بہرہ بدقسمت لوگوں کو تعلیم دینے سے بہتر اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔ اس وقت تک تو میں اس اہم کام کی طرف سب کو توجہ دلاتا رہا ہوں۔ لیکن اگر ضرورت پڑی تو مجھے سختی کے طریقے بھی اختیار کرنے پڑیں گے۔ محکمہ تعلیم کے قواعد کی رُو سے کسی تعلیمی ادارے کو گرانٹ دینا یا نہ دینا میرے اختیار میں ہے۔ کسی تعلیمی ادارے کو گرانٹ دیتے وقت آئندہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ آیا وہ تعلیم بالغاں کے سلسلہ میں کام کر رہا ہے؟ اور اگر کر رہا ہے تو کسی حد تک اگر اس تعلیمی درسگاہ کا کام تسلی بخش نہ ہوا تو مدد کے لئے اسے ایک کوڑی تک نہیں دی جائے گی۔

میں آپ سے ایک ایسے پنجابی کی حیثیت میں مدد کے لئے درخواست کرتا ہوں جس کے دل میں صوبہ کا درد ہے۔ اس کار نیک میں اگر آپ نے میری حوصلہ افزائی کی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے مقصد میں صحیح طور پر کامیاب نہ ہوں۔ آپ میں سے اگر ہر ایک کم از کم ایک ناخواندہ آدمی کو ہی تعلیم دینا اپنا فرض سمجھ لے تو اس طریقہ سے بآسانی صوبہ کے پڑھے لکھے لوگوں میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ میں اپنے صوبہ کو تعلیمی لحاظ سے اس قابل بنا دینا چاہتا ہوں کہ اس کا کوئی باشندہ تعلیم سے بے بہرہ نظر نہ آئے۔"

وزیر تعلیم کے مندرجہ بالا الفاظ سے آپ پر یہ ظاہر ہو گیا کہ صوبہ میں ناخواندگی کے خلاف انہوں نے کس زور شور سے جہاد شروع کر رکھا ہے۔ پنجاب کے مختلف حصوں سے بالغوں کی نئی تعلیمی درسگاہوں کے متعلق ہمیں بے شمار اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ اور اس تحریک کی کامیابی وہردلعزیزی کا یہی بہت بڑا ثبوت ہے۔

آنریبل میاں عبدالحی کا یہ نیک مقصد کسی تعریف سے بالاتر ہے ہمیں یقین ہے کہ ان کی سرگرمیاں صوبہ کو تعلیمی لحاظ سے ایک بلند معیار تک پہنچا دیں گی۔

"شاہکار"

کی نئی ترتیب وتدوین کے متعلق ہمیں ملک کے ادبی حلقوں سے جو حوصلہ افزا پیغامات موصول ہو رہے ہیں۔ ان کے لئے ہم احباب کرام کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری محنت اور معاونین کرام کی نوازشیں "شاہکار" کا معیار ابھی اور بلند کر دیں گی۔ بالخصوص ہم حضرات اثر صہبائی، حامد علیخاں۔ صلاح الدین احمد۔ صادق الخیری، اور احمد ندیم قاسمی کے کریمانہ حسن ظن کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے:

فاروق علی خاں

رفتارِ عالم

سیاسیاتِ عالم میں اسلام کی حیثیت!

عنوان بالا کے ماتحت "السٹریٹیڈ ویکلی" میں "ابن مسلم" کا ایک جامع اور مبسوط مضمون شائع ہوا ہے۔ سیاسیات عالم اور ممالک اسلامیہ کی موجودہ روش کے متعلق اس سے بہتر مضمون شاید ہی کسی نے لکھا ہو۔ ذیل میں ہم اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

اس وقت تمام دنیا کے مسلمانوں کی اضطراب آمیز نگاہیں مغربی کشمکش کے اس بڑھتے ہوئے طوفان کی طرف لگی ہوئی ہیں جس کا اثر ان کے آزاد اسلامی ممالک پر پڑتا ہے۔ اٹلی اور جرمنی کے جنگجویانہ عزائم کا مقصود انجام کار ہندوستان ہو سکتا ہے لیکن یہ دونوں طاقتیں سردست اپنے استعماری جال میں جن قوموں کو پھانسنا چاہتی ہیں وہ مشرقِ قریب اور مشرقِ بعید کی اسلامی حکومتیں ہیں۔

اسلامی حکومتوں کو موجودہ صورتِ حالات کا پہلے ہی سے علم ہو گیا تھا اور انہوں نے کیل کانٹے سے تیار رہنے کی کوشش شروع کر دی۔ جب اٹلی اور حبشہ کی جنگ جاری تھی تو اسلامی حکومت کے ایک تاجدار سے مجھے دیر تک گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔ میں اس تاجدار کا نام بغیر اس کی اجازت کے ظاہر نہیں کر سکتا لیکن دنیائے اسلام میں وہ ایک ممتاز ترین ہستی ہے۔ منجملہ دیگر امور کے مجلس اقوام کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ میری حکومت نے تو صرف اس لئے مجلس مذکور کی رکنیت قبول کر لی کہ برطانیہ فرانس اور روس نے جو ہمارے دوست ہیں۔ ہمیں مجلس اقوام میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔ ہمیں اس مجلس سے بڑی اُمیدیں تھیں۔ اس کے بعد اس نے صاف الفاظ میں بغیر کسی تلخی کے اس سلوک پر ناراضی اور بے اطمینانی کا اظہار کیا جو حبشہ کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔ اگرچہ کل دنیا کو اس بدقسمت ملک کے ساتھ ہمدردی تھی لیکن حبشہ کے معاملے میں مسلمانوں کے جذبات خصوصیت کے ساتھ مجروح ہوئے۔ مسلمانوں کے اس احساس کی بنا وہ روحانی تعلق ہے جو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مبارک عہد میں اس وقت کے نجاشی نے صحابہ کے ساتھ قائم کیا تھا۔ بعد کی اسلامی حکومتوں نے دنیا کی اس قدیم ترین عیسائی حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ مگر جب حبشہ کا ستارہ اٹلی کے غاصبانہ حملے کی وجہ سے گردش میں آگیا تو اسلامی حکومتیں بے دست و پا تھیں۔

مجلس اقوام میں جو اسلامی حکومتیں شامل ہیں ان کے متعلق تاجدار مذکور نے کہا کہ مجلس اقوام نے جو سلوک حبشہ سے کیا ہے وہ اس سے بہتر سلوک کی توقع نہیں رکھ سکتیں۔ اس کے بعد اس نے ترکی ایران افغانستان اور عراق کے معاہدہ سعد آباد کا ذکر کرتے ہوئے کہا "ہم مجلس اقوام کے حتمی سے حتمی مواعید پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس سامان حرب نہیں ہے لیکن ہم اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے عملی تجاویز اختیار کر رہے ہیں۔" اس نے یہ تو نہیں بتایا کہ خطرے کے مہیب بادل کس سمت سے نمودار ہوں گے لیکن اس کا مطلب سمجھنے کے لئے مجھے دماغ پر بار ڈالنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کیونکہ یہ معنے روزِ روشن کی طرح صاف اور واضح نظر آتے ہیں۔ اسلامی حکومتوں کے نقطۂ خیال سے موجودہ صورتِ حالات کے ضروری و اہم ترین پہلو یہ ہیں کہ اسلامی ممالک دنیا کے بین الاقوامی معاملات میں ایسی حیثیت رکھتے ہیں جس کی بنا پر ان کی حالت خطرناک نظر آتی ہے۔ حالت یہ ہے کہ اس وقت ڈکٹیٹر، جمہوریت پسند، سرپرست اور دوست سبھی امداد کے محتاج ہیں۔ یہ امداد بھی دو قسم کی ہے۔ ایک میں تو وعدوں اور عام باتوں کا عنصر غالب نظر آتا ہے اور دوسری میں قوتِ عمل کا۔

جن جن آزاد اسلامی ممالک نے واقعات کی اس رفتار کو چشمِ بصیرت سے دیکھا انہوں نے اپنے طرزِ عمل کو صاف اور واضح الفاظ میں ظاہر کر دیا ہے وہ باوجود ظاہری اختلافات کے برطانیہ کا جو ان کا سب سے بڑا مددگار ہے ساتھ دینے اور اپنی قسمت کو اس سے وابستہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ دنیا کے موجودہ سیاسی ہنگاموں کے متعلق اسلام کی پوزیشن کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی گزشتہ تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے۔

اسلام کا جمہوری نظام

ساڑھے تیرہ سو سال سے کچھ زیادہ عرصہ گذرا کہ اسلام کا آفتاب مکہ سے طلوع ہوا اور قریباً نصف صدی کے عرصہ میں اس کی شعاعوں سے دنیا کے دور دراز حصے منور ہو گئے۔ اسلام کی فتوحات اور اس کے ثقافتی اثرات کی لہریں قدیم دنیا کے تینوں براعظموں کے ہر کونے میں پہنچ گئیں۔ خلیفہ دوم (فاروق اعظم) کے زمانہ میں اسلام کے جاہ وجلال کا علم پوری شان کے ساتھ مشرق قریب اور شمالی افریقہ میں لہرا رہا تھا۔ اس زمانہ میں اگر کوئی طاقت مسلمانوں کی حریف تھی تو وہ رومی سلطنت (مشرقی) تھی جس نے اسلام کی شوکت وعظمت کے سامنے ابھی سر تسلیم خم نہیں کیا تھا

مسلمانوں کی ابتدائی خلافت جمہوریت کا ایک بین الملی نظام تھا۔ اس کے بعد اسلام کی جو حکومتیں قائم ہوئیں سلطنت عثمانیہ جنگ عظیم سے پہلے ان کی آخری یادگار تھی۔ ٹرکی کے عثمانی تاجداروں نے اس امر کو کبھی نظرانداز نہیں کیا کہ اسلام کی حکومت ایک بین الاسلامی یا بین الملی حیثیت رکھتی ہے اسلامی نظام حکومت کے یہ اہم ترین پہلو موجودہ صورت حالات پر براہ راست اثرانداز ہوتے ہیں۔ اگرچہ مشرق وسطی کی اسلامی حکومتیں بہت کچھ زوال پذیر ہو گئی ہیں لیکن پرانی دنیا میں ان کی طاقت ابھی قائم ہے۔ دنیا کے اس حصے میں مسلمان نمایاں طور پر آبادی کا جزو غالب ہیں۔ یہیں ان کی چھ بڑی حکومتیں اور دوسری چھوٹی ریاستیں واقع ہیں۔ ان چھوٹی ریاستوں کو یورپین طاقتوں نے اپنی سرپرستی اور نگرانی میں لے رکھا ہے شمالی افریقہ، مشرق قریب اور مشرق وسطی میں اسلامی حکومتوں کا ایک ایسا نظام موجود ہے جہاں صرف ایک مذہب اور ایک مشترکہ ثقافت کا علم لہراتا دکھائی دیتا ہے۔

دنیا کے اس حصے کا سیاسی نصب العین اگرچہ مغرب کی جمہوریت اور آمرانہ نظام سے مختلف ہے مگر مسلمان فرمانروا مغرب کی "جوع الارض" کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انہیں قدرتی طور پر ایک دوسرے سے ہمدردی ہے۔ اور وہ دنیا میں باقاعدہ نظام اور قیام امن کے نصب العین کے حامی ہیں۔ اگرچہ سیاسی پہلو سے مشرق وسطی کی اسلامی حکومتیں دنیائے اسلام میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن ان حکومتوں میں مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعتیں شامل نہیں ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں ۹ کروڑ اور چین میں ۵ کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ چینی مسلمان اپنے معاملات میں بالکل خودمختار ہیں۔ اسی طرح ایشیا اور افریقہ کے بعض حصوں میں بھی مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی ہے۔ مگر مسلمانوں کی ان تمام جماعتوں کی ہمدردی آزاد اسلامی حکومتوں سے ہے اور چونکہ وہ تین براعظموں کے مقامات اتصال اور بری بحری اور ہوائی تجارت کی بڑی بڑی شاہراہوں پر واقع ہیں اس لئے ان کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

جب سے اسلامی حکومتوں پر زوال آیا ہے۔ مشرق وسطی مغربی طاقتوں کی باہمی رقابتوں اور کشمکشوں کا محور رہا ہے۔ مغربی حکمت عملی میں جو چیزیں نمایاں اور مستقل طور پر نظر آتی ہے وہ انگلستان اور اسلامی حکومتوں کے باہمی تعلقات ہیں جن سے اگر بجنسہ ہم آہنگی نہیں تو باہمی سمجھوتے اور اشتراک عمل کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے واقعات کی یاد تازہ رہے گی۔ جن کی بناء پر ترکی اور انگلستان ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن غور کرنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔ کہ غیر معمولی نوعیت کے یہ واقعات خاص حالات سے پیدا ہوئے تھے۔

مسولینی اور سابق قیصر جرمنی

ان حالات میں یہ امر باعث تعجب نہیں کہ مغرب کے بہت سے مدبرین نے اپنے مفاد کے پیش نظر اسلام پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ اسلامی حکومتوں نے اسلام کے ان دوستوں کی ہواخواہی اور ہمدردی کا خیر مقدم کیا ہے۔ لیکن اسلامی حکومتوں پر ان مدبرین کا جادو نہیں چلا۔ مسولینی جرمنی کے سابق قیصر کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر قیصر جرمنی کی حکمت عملی ذرائع اور شان و شوکت کے اعتبار سے قیصر روم کے جانشین کے طریق کار سے بالکل مختلف تھی۔ اگرچہ غازی انور پاشا (مرحوم) نے سابق قیصر جرمنی کے ساتھ تعلقات قائم کر رکھے تھے لیکن اس پر بھی انور پاشا اس شرط پر اتحادیوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھے کہ برطانیہ طرابلس کو اطالیوں کی گرفت سے آزاد کرنے کے لئے ترکوں کی مدد کرے۔ اٹلی نے جو اس وقت جرمنی اور آسٹریا کا ساتھ دے رہا تھا بغیر کسی اشتعال انگیز وجہ کے ترکوں سے جنگ چھیڑ دی۔ اور ۱۹۱۲ء میں طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ انور نے جس کی شخصیت سپاہیانہ اوصاف اور اولوالعزمانہ تخیل کا مجموعہ تھی۔ اپنی پوری مدد جرمنی کے لئے وقف کر دی۔ طرابلس اس کا نصب العین تھا۔

اسلام کے ساتھ جرمنی کے تعلقات نہایت اچھے ہیں۔ اٹلی کے ساتھ مسلمانوں کی لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ مگر جرمنی کے ساتھ اسلام کی کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ نہ پہلے نہ حال میں۔ اسلامی حکومتوں کے ساتھ جرمنی کے تعلقات خصوصیت کے ساتھ مفید ثابت ہوئے ہیں۔ یہ انہیں تعلقات کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے اس خیال سے کہ اٹلی جرمنی کے ساتھ ہے اٹلی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں سختی سے کام نہیں لیا۔ اگر واقعات کی رو نے غازی عصمت انونو کو جرمنی اور انگلستان میں سے کسی کو اپنا دوست بنانے کی ضرورت پر مجبور نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ غازی موصوف کو اس سے اطمینان حاصل ہو گا لیکن ایسی ضرورت پیش آنے پر ترکی نے انگلستان کا ساتھ

دینے کا ارادہ ظاہر کر دیا ہے۔

دولِ عالم اور اسلام

اس وقت تک جاپان زیادہ تر وسط ایشیا اور چین کی اسلامی آبادی کے معاملات میں دلچسپی لیتا رہا ہے۔ جاپان نے چینی مسلمانوں کو آزادی کے سبز باغ دکھلائے اور انہیں خوب بھڑکایا۔ اس کے علاوہ جاپان نے "پان ایشیاٹک لیگ" کے ذریعہ بھی مسلمانوں پر ڈورے ڈالنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ چونکہ ان دلاسوں اور چکنی چپڑی باتوں کی حقیقت دراصل کچھ نہ تھی اس لئے مسلمانوں پر جاپان کا اُلٹا بُرا اثر پڑا۔ چنانچہ چین و جاپان کی موجودہ جنگ میں مسلمانانِ چین ایک زبردست جذبۂ حب الوطنی کے ساتھ اپنے ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ گزشتہ سال حج کے موقعہ پر صوبہ کانسو کے لیڈر نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ چین کے ایک کروڑ مسلمان اپنے ملک پر قربان ہونے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ جاپان نے جب یہ دیکھا تو اپنے پرچار کا جال اور زیادہ پھیلا دیا۔ مئی ۱۹۳۸ء میں ٹوکیو میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی گئی۔ چنانچہ عربوں میں جاپان کی اس مسلم نوازی کا بہت چرچا رہا۔ مسجد کی افتتاحی رسم کے موقعہ پر شہزادہ یمن اور سعودی وزیر کو بھی مدعو کیا گیا اور مسجد کے مختلف زاویوں سے ہزاروں تصویریں لے کر ممالک اسلامیہ میں بھیجی گئیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ دولِ ثلاثہ میں سے ہر ایک اسی کوشش میں ہے کہ باشندگان حلقہ بحیرۂ قلزم کی ہمدردی ہر طرح سے حاصل کی جائے۔ کیونکہ برطانیہ اور مشرق کے درمیان آمد و رفت کا ایک یہی بڑا بھلا راستہ ہے

دولِ عالم سے سلاطین اسلامیہ کے سلسلۂ تعلقات میں سب سے عجیب بات روس سے انکا اتحاد ہے۔ اگرچہ پچھلی روایات ہمیشہ اس کے خلاف رہی ہیں مگر آج کل ترکی اور روس میں دامن چولی کا ساتھ ہے۔ صدیوں تک ایک دوسرے کے دشمن رہنے کے باوجود اب تو ان میں اتنی گہری چھنتی ہے کہ پچھلے دنوں جب روس اور جمہوریتوں کے درمیان قیام صلح و امن کے لئے گفتگو ہو رہی تھی تو ترکی سے جمہوریتوں کو یہاں تک توقع تھی کہ وہ اپنے تعلقات اور اثر و اقتدار کو استعمال میں لاتے ہوئے روس کو اُن کا قائل کر دیگا۔ اس طرح ایران اور روس میں مدت سے ایک کشمکش چلی آتی تھی مگر اب ان کے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ روس اور افغانستان کے تجارتی تعلقات اتنے اہم ہیں کہ افغانستان میں روسی مال کو ہندوستانی مال پر قطعًا ترجیح دی جاتی ہے۔

روس اور ممالک اسلامیہ کے تعلقات میں یہ نمایاں تبدیلی آخر کیوں ہوئی؟ زار کی حکومت کے بعد اشتراکی حکومت کا قیام بھی اس کی کوئی وجہ قرار نہیں دی جا سکتی۔ اور پھر اس صورت میں جب ہم یہ جانتے ہیں کہ زار کی حکومت کے بیرونی تعلقات اُس حیثیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھے جو سوویٹ کو ورثہ میں ملی ہے۔ اس وقت صلح و امن کے محاذ پر اگرچہ روس سب سے زیادہ دلیر مانا گیا ہے مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس کی حکمت عملی ہمیشہ صلح پسندانہ رہی ہے۔ یوں کہئے کہ اب روس کو ممالک اسلامیہ کی طرف دوستی کا ہاتھ اس لئے بڑھانا پڑا ہے کہ وہ بھی اُن کے استحکام اور نظم و نسق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اسلام اپنے وقار کا کم سے کم حصہ ضائع کرنے کے بغیر کمیونزم کی گرفت اور اُس کی روح کا مقابلہ کر سکتا ہے

روس کی اس دوستی کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ مسلمانوں کے متعلق برطانیہ کی حکمت عملی نے پیدا کی۔ ایک عرصہ تک ——— میں خاص طور پر ایک مشہور امریکن سیاست دان کی رائے کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ انگریز ممالک اسلامیہ کی اس بات پر کھولتے اور پیچ و تاب کھاتے رہے کہ ان میں یگانگت اور تنظیم کا شوق پیدا ہو کر کیوں عملی صورت اختیار کر رہا ہے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کو الگ الگ رکھنے کی بہتیری کوششیں کیں۔ کئی تیر چلائے مگر انہیں نہ صرف اپنے مقصد میں ناکامیابی ہوئی بلکہ اُلٹا یہ نقصان پہنچا کہ شرقِ قریب اُن کے دشمنوں کی گود میں ہنستا کھیلتا نظر آنے لگا۔ جرمنی اور اٹلی نے انگریزوں کی اس عاقبت نااندیشانہ روش سے خوب فائدہ اُٹھایا اور اپنے مفاد کے لئے اتنے ہاتھ پاؤں مارے کہ عارضی طور پر وسطی حکومتوں کو مسلمانوں کا اعتماد حاصل بھی ہو گیا۔

"مسلمان ہمارے سگے ہیں" کچھ عرصہ کے بعد انگریزوں کی آنکھیں بھی کھلیں کہ یہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے ——— چنانچہ ۱۹۳۸ء سے جہاں جمہوری اور دوسری حکومتوں نے مسلمانوں کے حق میں ایک پُر زور پراپیگنڈا شروع کر رکھا ہے وہاں برطانیہ سب سے آگے آگے نظر آتا ہے ——— پچھلے سال ریڈیو میں بھی عربی کا پروگرام خاص طور پر شامل کر لیا گیا۔ غرض اب مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہر طاقت گوشۂ چشم التفات کی اُمیدوار ہے۔

مسلمان رہنما اٹلی اور جرمنی کے خود غرضانہ مقاصد سے تو واقف ہیں۔ اٹلی کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ اپنی مسلمان رعایا کو یوں تو بہت اچھی طرح خوش نہیں رکھتی۔ مگر انگریزوں کی مخالفت اور ممالک غیر پر قبضہ کرنے کی خاطر مسلمان اُس کے دوست بھی کہے جاتے ہیں اور پیارے بھی۔

برطانوی مصنفین مسلمانوں کے متعلق اٹلی کی اسی حکمت عملی کو منظر عام پر لا رہے ہیں۔ چنانچہ مسلمان سیاسیین اور بعض چھوٹی سلطنتوں کے مسلمان حکمرانوں کو اب یہ احساس ہو گیا ہے کہ اگر برطانیہ سے ہمارے بہتر تعلقات پیدا ہو جائیں تو یہ ایک زیادہ فائدہ مند اور قدرتی بات ہوگی چار سال ہوئے ایک مسلمان ڈپلومیٹک نمائندہ نے مجھے بتایا کہ میں یورپ کے ہر دارالحکومت میں گیا ہوں۔ برطانیہ کے سوا مغرب میں ہر حکومت آمادۂ جنگ ہے۔ مجھے ہر حکومت کے وزراء سے تبادلہ خیالات کرنے کا موقع ملا اور میں بلا پس و پیش یہ کہنے کو تیار ہوں کہ وہ صرف لندن سے نقارۂ جنگ بجنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اب اسے برطانیہ کا حیرت انگیز صبر کہہ لیجئے کہ اُس نے جنگ کی طرف ابھی تک قدم نہیں اُٹھایا مگر اس دوران میں اٹلی اور جرمنی کے رویہ نے برطانیہ کو مسلمانوں کے متعلق اپنی پچھلی روش میں کامل تبدیلی پیدا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ افریقہ میں اطالوی کامیابیوں اور ترقیوں کی بنا پر مصر نے آزادی حاصل کر لی۔ زیک کا جھگڑا پیدا ہونے پر برطانیہ کی طرف سے ممالک اسلامیہ کو تجدید اسلحہ اور تنظیم کے لئے فوراً روپیہ دے دیا گیا۔ حالانکہ اس سے پیشتر مسلمان حکمران برطانیہ سے یہ مدد حاصل کرنے کے لئے اپنی کوششوں میں ہمیشہ ناکامیاب رہا کرتے تھے مگر اب ترکی ایران اور عراق نے اسلحہ خریدنے کے لئے اور اسلحہ ساز کارخانوں اور سڑکوں کی تعمیر کے لئے کروڑہا روپے قرض لئے ہیں۔

فرانس نے برطانیہ کی خواہش کے مطابق بلکہ اُس کے اُکسانے پر ترکی سے اپنا ایک پرانا جھگڑا ختم کر دیا ہے۔ سنجک اور اسکندرونہ پر پہلے ترک حکمران ہوا کرتے تھے مگر اب ان دونوں ممالک پر فرانس قابض تھا فرانس نے اب یہ ممالک ترکی کو واپس دے دیئے ہیں اور دونوں کے درمیان ایک نیا معاہدہ اتحاد استوار ہو گیا ہے۔

مسلمانوں کا اتحاد ممالک اسلامیہ کی موجودہ تاریخ پر اگر ایک چھپلتی ہوئی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ گزشتہ چند سالوں میں اسلامی ممالک کا اتحاد اور باہمی اخوت کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کی سلطنتوں میں تعلیمی اور صنعتی لحاظ سے ایک نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ برطانیہ سے جو قرضے لئے گئے ہیں اُن سے نہ صرف نئے آلات حرب خریدے گئے ہیں۔ بلکہ صنعت و حرفت کی ترقی اور سڑکوں کی تعمیر کا لائحہ عمل میں بھی خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ آج اسلامی حکومتوں میں مسئلہ دفاع کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ مصر۔ ترکی۔ یمن اور سعودعربیہ عین وسطی حکومتوں کے دباؤ تلے ہیں۔ ان ممالک میں ترکی کو ہر لحاظ سے بلند مرتبہ حاصل ہے چنانچہ ترک ماہرین یمن۔ سعودعربیہ اور عراق کے فوجی مشیر مقرر ہوئے ہیں۔ اسکندرونہ میں ایک عظیم الشان اسلامی بحری مرکز قائم کرنے کی تجویز منظور کی گئی ہے۔ جہاں تک بحری طاقت کا تعلق ہے۔ مشرقی بحیرۂ روم میں انگریزوں اور مسلمانوں کے زاویہ ہائے نگاہ ایک ہونگے۔

مصر کے وزیر خارجہ جب انقرہ تشریف لے گئے۔ تو اُنہوں نے کہا تھا کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو ترکی اور مصر کی فوجیں دوش بدوش لڑیں گی۔ مصر کی ایک ہوائی جہاز ران کمپنی قاہرہ اور مشرق کے اسلامی دارالسلطنتوں کے درمیان نئے ہوائی راستے قائم کرنے میں مصروف ہے۔ مصریوں کو اس وقت اسلامی دنیا میں ایک خاص اثر و رسوخ حاصل ہے۔ اہل عرب کی آنکھیں بالخصوص مصر کی رہنمائی کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مصر کا مفاد اور بحیثیت مجموعی مسلمان ممالک کا مفاد برطانیہ کے مفاد سے مشترک ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی ممالک برطانیہ سے رشتہ اتحاد استوار کر رہے ہیں تاکہ مشرق ادنے میں ایک آہنی دیوار کھڑی کر دیں۔ اس دیوار کا سب سے کمزور پشتہ فلسطین ہے جہاں برطانیہ کی حکمت عملی اسلامی دنیا کی مصلحتوں سے متصادم ہوتی ہے ۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں جرمنی اور اطالیہ کی متحدہ قوتیں اسلام اور برطانیہ کے درمیان خلیج حائل کرنے کے لئے پوری سرگرمی کا اظہار کر رہی ہیں اب جبکہ مسولینی کے ادعائے حفاظت اسلام کا بھانڈا البانیہ کے چوراہے میں پھوٹ چکا ہے۔ فلسطین میں برطانیہ کے خلاف زہر اگلنے کی تنہا ذمہ داری جرمنی کے کندھوں پر آپڑی ہے۔

مشرق ادنے سے جو تازہ ترین اطلاعات موصول ہوئی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمنی نے حضرت مفتی اعظم یروشلم کو فلسطین اور شام کی متحدہ حکومت کا رئیس بنانے کے سلسلہ میں ایک پیشکش کی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مصری پارلیمنٹ نے ایک بار پھر اپنی اس امید کا اظہار کیا ہے کہ برطانیہ کے ساتھ سمجھوتے کی گفتگو نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔

اس وقت اسلامی ممالک بیدار، ہشیار اور متحد ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ان ملکوں کی عنان حکومت ہے۔ اُن کی نظر واقعات و حقائق پر جمی ہوئی ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی تقدیر کے حل کے لئے بہترین راہ عمل تجویز کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

فاروق علی خاں

دو مائیں

ایک اسٹیشن پہ ہنگامِ غروبِ آفتاب
جا رہا ہے اِک جواں انگلینڈ کو باآب و تاب

دوسرے درجے کے آگے ہے وہ انبوہِ عوام
ایک مرکز پر نہیں رہتا نگاہوں کا قیام

گلفشاں عہدِ جوانی اور ولایت کا سفر
دلنشیں طرزِ خرامِ ناز بل کھاتی کمر

مانگ ترچھی اور دن سیدھے غرور و ناز کے
جنبشِ مژگاں میں لشکر سامری اعجاز کے

دیدۂ میگوں پہ عینک رُخ پہ نسوانی نکھار
پتلے پتلے سُرخ ہونٹوں پر تبسم موج بار

دے رہے ہیں ارمغاں شیخی کے مارے اقربا
پیکرِ راحت نظر آتے ہیں سارے اقربا

کہہ رہی ہے ماں کہ اے لختِ جگر نورِ نظر
خرچ چاہے جسقدر ہو جائے اندیشہ نہ کر

تُو سند بیرسٹری کی لے کے جس دن آئیگا
سارا کنبہ اپنی منہ مانگی مرادیں پائے گا

فرش پا انداز ہو گا آسماں تیرے لئے
کر رہا ہے جمع سرمایہ جہاں تیرے لئے

تیری ٹھوکر سے زر و گوہر اُگل دیگی زمیں
اِک اشارے سے ترے محور بدل دیگی زمیں

حاسدوں کے تیری پابوسی کو سر جھک جائینگے
دشمنوں کی دشمنی کے راستے رُک جائینگے

فیصلوں سے تیرے جیلوں میں بھرے جائینگے لوگ
نام بھی تیرا جو سُن پائیں گے تھرائینگے لوگ

راحتیں بھیجے گا مجبوراً خدا تیرے لئے
تختِ شاہی تک ہی سیدھا راستہ تیرے لئے

اُس سے تھوڑی دُور اِک بیوہ کا اکلوتا پسر
تیسرے درجے کے آگے ہے کھڑا باندھے کمر

جا رہا ہے جنگ کے میداں میں سینہ تان کر
نوجوانی کو متاعِ بے حقیقت جان کر

کہہ رہی ہے ماں کہ اے میری تمنّا کے چراغ
کچھ نہ پوچھ اس وقت ہے کتنا مرا دل باغ باغ

صبر کے دریا میں کشتی ہجر کی کھیتی ہوں میں
تو امانت قوم کی ہے قوم کو دیتی ہوں میں

ہو تجھے واضح کہ تیرے صف شکن اجداد کے
برچھیوں کی بارشوں میں گونجتے تھے قہقہے

ہے تری رگ رگ میں ان کا خون اے نورِ بصر
رکھ کے جو سوتے تھے شب کو لاشۂ دشمن پہ سر

ان کے ہاتھوں میں رہی ہے تیری طفلی کی زمام
جن کی تلواروں نے جھانکے بھی نہیں برسوں نیام

تیری شریانوں میں اُن ضیغم شکاروں کا ہے خوں
جن کو خونیں ندّیوں میں تھا نہانے کا جنوں

تیری پیشانی اُنہیں کا آئینہ ہے ہُو بہُو
نُور کے تڑکے چٹاتے تھے جو برچھوں کو لہُو

آگ توپوں کے دہانے بے طرح برسائینگے
سنسناتے تیر پیشانی کو چھونے آئیں گے

بجلیاں تیغوں کی کوندیں گی نگاہوں میں تری
خون کے سیلاب لہرائیں گے راہوں میں تری

برچھیاں لپکیں گی پہلو گُدگُدانے کیلئے
آئیں گے ریلے تجھے پیچھے ہٹانے کیلئے

لیکن اے لختِ جگر نورِ نظر جانِ حیات
یاد رکھنا اپنی بیوہ ماں کی صرف اتنی سی بات

پشت جو میداں میں دکھلاتا ہے مردِ خام ہے
گولیاں سینہ پہ کھانا سورما کا کام ہے

شعلہ ہائے جنگ میں جوہر دکھانے کیلئے
جم کے لڑنا قوم کی عزت بچانے کیلئے

پشت پر کھایا جو تو نے زخم اے نورِ نگاہ
دُودھ بخشوں گی نہ ہرگز ذاتِ باری ہے گواہ

خون میں لتھڑا ہوا جب فتح پا کر آئے گا
اپنی بیوہ ماں کی آنکھوں میں تبسّم پائے گا

احسان دانش

شاد عظیم آبادی

ماحول

تاریخ ادبیات اردو کے مطالعہ کے دوران میں ایک بات مجھے ہمیشہ کھٹکتی رہی ہے کہ مغلوں کے زوال و ادبار اور مسلمانوں کی تمدنی اور معاشرتی تباہی کے باعث جوں جوں اردو کی قدر دانی کے مرکز بدلتے رہے ہیں۔ توں توں ان مرکزوں کے متوسلین کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے گویا عناد کی ایک حس خفی سی پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مقامی حالات و تعصبات جغرافیائی کیفیات اور ہنگامی واقعات کے ماتحت ایک مرکز کی تخلیقات ادبی دوسرے مرکز کی تخلیقات ادبی سے یک گونہ مختلف ہوتی ہیں۔ لیکن اس اختلاف کو ادبیات کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بنا لینا نہ صرف کم نگاہی کی دلیل ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے سخت نقصان دہ بھی ہے کہ اردو ادبیات کی مجموعیت کی تشکیل میں ان مختلف مرکزوں نے جو حصہ لیا ہے۔ اس پر تو بر نو پردے ڈال دئے جاتے ہیں۔ ان کم سواد نقادوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اردو ادبیات کی مجموعیت (Complete. WHOLE) کا جائزہ لینے کیلئے مختلف مرکزوں کو ضروری اجزا سمجھنا پڑے گا۔ لیکن ان اجزا کو اپنے کل سے کیا نسبت ہے۔ اس کا یقین اس وقت تک نہ ہو سکے گا جب تک ان عناصر کو اس صناعانہ زاویہ نظر سے نہ دیکھا جائے گا جس سے مصور اپنی تصویر کے اجزا کو دیکھتا ہے تاکہ مجموعہ کے تناسب میں اور اجزا کی باہمی نسبت میں کوئی خلل نہ پیدا ہو۔ اس معاملے میں دہلی اور لکھنو کے ہوا خواہ بالعموم کج بین و کج نظر رہتے ہیں۔ ہر چند لکھنو نے خود ایک مستقل مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اور دہلی والوں کے اس دعوے کا جواب کہ

نسیم دہلوی ہم موجد باب فصاحت ہیں
کوئی اردو کو کیا سمجھیگا جیسا ہم سمجھتے ہیں

ان دندان شکن الفاظ میں دیا جاتا ہے کہ

دعوئ زباں کا لکھنو والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

لیکن زبان کے معاملے میں برابری کے اعتراف سے قطع نظر اسی قسم کی تحریکات آئے دن پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جن کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دہلی کی ادبی پیداوار کے مقابلے میں لکھنو کی ادبی پیداوار کو فرومایہ اور ہیچ ثابت کریں۔ چنانچہ عبدالسلام نے شعرالہند میں اردو کے دو اسکول بنا کر تمام کتاب کا زاویہ نظریہ رکھا ہے کہ لکھنو کی شاعری بازاری، سوقیانہ، عامیانہ، مبتذل اور فحش ہے اور اس کے مقابلے میں بقول اس کے دہلی کی شاعری میں برجستگی سوز و گداز خلوص اور تصوف کی چاشنی ہے۔ مولوی محمد حسین ادیب ہمایوں میں مسلسل اس ہرزہ سرائی کا جواب دے چکے ہیں۔ لیکن اب بھی اتنی گنجائش باقی ہے کہ اس گتھی کو اچھی طرح سلجھا دیا جائے کہ دہلی اور لکھنو اسکول سے کیا مراد ہے۔ اور ان کی خصوصیات میں کیا کوئی اساسی تخالف موجود ہے اور جہاں کوئی اصلی اختلاف معلوم ہوتا ہے وہ دہلی اور لکھنو کا فرق ہے یا شاعری اور تک بندی کا۔ یعنی جن شاعروں کو مولوی عبدالسلام لکھنو کے اسکول کا نمائندہ خیال کرتے ہیں وہ شاعر بھی ہیں یا نہیں۔ اور اس سے قطع نظر لکھنو نے اچھے شاعر بھی پیدا کئے ہیں یا نہیں۔

مولوی عبدالحلیم شرر نے بھی گذشتہ لکھنو میں لکھنو کی تخلیقات ادبی پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس وقت تک غالباً شعرالہند شائع نہ ہوئی تھی۔ ورنہ شرر سے بہتر ہوا خواہ لکھنو کو میسر نہ آ سکتا تھا۔ دہلی اور لکھنو کی اس باہمی نزاع سے قطع نظر اب دہلی اور لکھنو کا پنجاب اور دکن سے اختلاف شروع ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اور دکن والوں نے جو دکن میں اردو اور پنجاب والوں نے جو پنجاب میں اردو کا نعرہ بلند کیا ہے۔ اس سے اردو ادبیات کی مجموعیت کا جائزہ لینے میں اور کتنی مشکلات کا اضافہ ہوتا ہے۔

ان مرکزوں کے علاوہ جن کا ابھی ذکر آچکا ہے۔ اردو ادبیات

کا ایک مرکز عظیم آباد بھی رہا ہے۔ لیکن اس کی تخلیقات ادبی سے اعتنا نہ کرنے کی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس نے پنجاب یا دکن کی طرح خودسر ہوکر خود مرکز ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ یہاں کے ادیبوں اور نقادوں نے زبان اور ادبیات کے معاملے میں لکھنو اور دہلی کے تفوق اور مرکزیت کو تسلیم کرکے خود ہی حد تک اپنی کم نظری کا ثبوت دیا ہے۔ ورنہ یہ مرکز اپنی تخلیقات کی گونہ گونی اور اپنے ارباب علم و فضل کی شہرت کے باعث ہر طرح سزاوار تحسین ہے۔ گیا کے رسالہ ندیم کے بہار نمبر میں سید عزیز الدین احمد بلخی راز عظیم آبادی اپنے مضمون ضمیمہ تاریخ شعرا بہار میں لکھتے ہیں۔

"نازک خیالی، بلند پروازی، مضمون آفرینی، جدت طرازی اور سخن سنجی میں عظیم آباد کے شعرا دہلی اور لکھنؤ کے شعرا سے کبھی پیچھے نہیں رہے مگر با ایں ہمہ یہاں کے لوگ اہل زبان نہیں تسلیم کیے گئے اور یہاں کی زبان دہلی اور لکھنو والوں کے نزدیک مستند نہیں سمجھی گئی۔ عام طور پر یہاں کی زبان دلی اور لکھنو کی زبان سے لگا نہیں کھاتی۔ مگر عظیم آباد کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ اس مرکز پر دہلی اور لکھنو کی زبان و شاعری کا باہم اجتماع اور اختلاط ہونے کے باعث یہاں شاعری کا ایک تیسرا اسکول قائم ہو گیا اور یہاں کی زبان اوسط درجے کی اردو شمار کی جاتی ہے۔"

اس اقتباس کو پڑھ کر علامہ مرحوم کا یہ شعر یاد آیا کہ ؎

پستی ہمت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
ظالم اپنے شعلہ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

مقام مسرت ہے کہ عظیم آباد کے ہوا خواہوں میں ایک خود گرد خود شکن و خود نگر نقاد بھی موجود ہے۔ یعنی صفیر بلگرامی صاحب کا پوتا سید وصی احمد بلگرامی۔ اس باہمت شخص نے دہلی اور لکھنو کے استناد اور زبان دانی کے دعووں کے متعلق کیا خوب لکھا ہے:

"ایران میں ایک سیالکوٹی مٹی کا چراغ دیکھا۔ پوچھا تو کون؟ چراغ نے کہا۔ داغی۔ پوچھا داغی کیا؟۔ چراغ نے کہا۔ داغ کا چراغ۔ پوچھا۔ یہاں کیوں آیا؟۔ چراغ نے کہا۔ جلنے کیلئے!۔ پوچھا۔ داغ کے گھر کیوں نہ جلا؟ چراغ نے کہا۔ دل کو دل جلانا آتا ہے۔ چراغ جلانا نہیں آتا۔ پوچھا پھر لکھنو میں کیوں نہ جلا۔ چراغ نے کہا۔ وہاں ہوا بہت تیز تھی۔ پوچھا۔ تیرا نام۔ چراغ نے کہا۔ اقبال۔"

مطلب صاف ظاہر ہے۔ دلی اور لکھنو کی مرکزیت کا جلا ہوا۔ عظیم آباد کا ہوا خواہ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ ندیم کا "بہار نمبر" اس لئے شائع کیا گیا تھا کہ صوبہ بہار نے اردو کی جو خدمات کی ہیں ان کی توضیح کی جاسکے۔ لیکن اس کے مضمون نگاروں میں عظیم آبادی نقادوں کا لہجہ بالعموم البنا رہا ہے۔ گویا دہلی اور لکھنو کے آفتاب درخشاں کی طرف آنکھیں اٹھانے کی ہمت نہیں کرسکتے۔ اپنے عظیم آباد سے بے سلوک کریں تو دوسروں سے کیا شکایت۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ مسٹر رام بابو سیکسنہ نے تاریخ ادبیات اردو میں پانچ چھ شعروں کے ایک بارے میں عظیم آباد کی اہمیت کا اعتراف کیا۔

ڈاکٹر گراہم بیلی نے اور ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے راسخؔ* عظیم آباد کے رئیس بڑے قدردانِ سخن تھے۔ صاحب شعر الہند نے بھی بیس سطروں میں مربیانِ سخن کے ضمن میں دہلی کے دو تین شاعروں کے نام گنوا دئے۔ جو رؤسا عظیم آباد کی فیضیابیوں سے بہرہ ور ہوئے۔

*عظیم آبادی اور [illegible]

چلئے چھٹی ہوئی۔ جھگڑا کٹا۔ فساد مٹا۔ فیصلہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس سرزمین سے بیدل اور راسخ، شاہ الفت حسین، فریاد علی ابراہیم خاں، جمال اور شاد عظیم آبادی پیدا ہوئے اس کے ساتھ یہ بے اعتنائی مجرمانہ غفلت ہے۔ راقم السطور نے ریزہ ریزہ چن کے عظیم آباد کے ساتھ دہلی اور لکھنو کے ادبی روابط کی مختصر سی داستان مرتب کی ہے۔ جس کے ضمن میں وہاں کے ادیبوں اور عالموں کا ذکر بھی ضمناً آئے گا۔ راقم السطور کے خیال میں شاد کے اسلوب شعری اور خصائص ذہنی کی تشکیل جن عناصر سے ہوئی ہے۔ ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ان اجزا کا ذکر بھی کیا جائے۔ جن سے عظیم آباد کا ادبی ماحول پیدا ہوا تھا۔ یہ ماحول گویا شاد کی شاعری کا پس منظر ہے۔ اور اس کے ہاں جو نوے فیصدی شعر تصوف کے موجود ہیں۔ ان کی کثرت کی توجیہ بھی اس ماحول کے سمجھنے کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔

عظیم آباد سے دہلی اور دہلی والوں کے ادبی روابط غالبؔ

متقدمین میں سے اشرف علی فغاں کے ساتھ شروع ہوتے ہیں ۔ آزاد کا بیان ہے کہ اشرف علی نواب شجاع الدولہ حاکم اودھ کی بدسلوکی سے خفا ہو کر عظیم آباد چلے گئے ۔ اور راجہ شتاب رائے کی سرکار میں اختیار اور اعتبار حاصل کیا - آزاد کا بیان ہے ۔ کہ شتاب رائے سے بھی اس بات پر بگڑی کہ احمد شاہ درانی نے جو ہندوستان پر حملے کئے تھے ۔ ان کے سلسلے میں ایک دن راجہ صاحب نے پوچھا کہ نواب صاحب ملکہ زمانی کو احمد شاہ درانی کیونکر لے گیا ۔ یہ بولے ۔ مہاراج جس طرح سیتا جی کو راون لے گیا تھا ۔ اس طرح وہ بھی لے گئے ۔ بظاہر آزاد نے جو فغاں کا حال لکھا ہے ۔ وہ مرزا علی لطف کے تذکرہ گلشن ہند سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے ۔ اور اگرچہ اس واقعہ کی تائید مرزا علی لطف نہیں کرتے کہ وہ لکھتے ہیں "بعد کئی برس کے عظیم آباد آئے اور بطور بود و باش کے وہاں ٹھہرائے ۔ رفاقت میں مہاراج شتاب رائے کے چند مدت اوقات کاٹے ۔ اور لطیفہ اور بذلہ سنجی میں ہی دن رات کاٹے ۔ تاہم ہمیں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے ۔ کہ خود مرزا لطف کا تذکرہ علی ابراہیم خاں کے تذکرہ فارسی گلزار ابراہیم پر مبنی ہے جو ۱۱۹۶ھ میں لکھا گیا تھا - اس تذکرہ کے مصنف علی ابراہیم خاں خود عظیم آبادی تھے ۔ اسی لئے ان کا بیان فغاں اور شتاب رائے کے تعلقات کے متعلق مستند ہونا چاہیئے ۔ یہ تذکرہ میری نظر سے نہیں گزرا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا جو کچھ آزاد نے لکھا ہے وہ اس تذکرے کی کسی عبارت سے ماخوذ ہے ۔ بہر نوع اشرف علی فغاں جیسے خوش ذوق اور خوش فکر شاعر کی موجودگی میں عظیم آباد کی ادبی فضا میں شعر و شاعری کا کافی چرچا ہو گیا ہو گا ۔ گلشن ہند میں رکن الدین عشق، شاہ قدرت اللہ قدرت، فقیر درد مند اور میر باقر علی حزیں کا ذکر بھی موجود ہے اور یہ لوگ تمام دہلی کے تھے ۔ قیاس چاہتا ہے کہ عظیم آباد کی ادبی فضا پر دہلی کے اسلوب شعری بالخصوص متانت اور شستگی کا کافی اثر پڑا ہو ۔ اس قیاس کی تصدیق عظیم آباد کے شعراء کے کلام کے مطالعہ سے ہو گی ۔ بہر نوع ان متقدمین میں سے اشرف علی فغاں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی شوخی پائی جاتی ہے ۔ جس میں معاملہ بندی کا سا رنگ جھلکتا ہے مثلاً ۔

تھا پیچ و تاب مجھ کو ڈسیں اب وہ کالیاں
ظالم اسی لئے تو نے زلفیں تھیں پالیاں
دیکھا کہ یہ تو چھوڑتا ممکن نہیں مجھے
چلنے لگا وہ شوخ میرا تب یہ چالیاں
ہر بات بیچ روٹھنا ہر دم میں ناخوشی
ہر آن دو کھنا مجھے ہر آن گالیاں
ایذا ہر ایک طرح میں دینا غرض مجھے
کچھ بس نہ چل سکا تو یہ طرحیں نکالیاں

اس کے ساتھ ہی فغاں کے ہاں سوز و گداز کی بھی کمی نہیں ہے ۔

یہ تھا خیال خواب میں ہیگا یہ روز وصل
آنکھیں جو کھل گئیں وہی راتیں ہیں کالیاں
مجھ سے جو پوچھتے ہو تو یہ حال شکر ہے
یوں بھی گزر گئی میری ووں بھی گزر گئی

یہ بات فراموش نہیں ہونا چاہیئے کہ دہلوی شعراء کی آمد سے پہلے عظیم آباد کا ایک فارسی شاعر یعنی مرزا عبدالقادر بیدل ہندوستان میں مشہور و مقبول ہو چکا تھا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیدل کے تصوف اور فلسفہ اخلاق نے عظیم آباد کی نثری اور شعری پیداوار پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے ۔ بلکہ راقم السطور کا تو یہ عقیدہ ہے کہ راسخ عظیم آبادی اور شاد عظیم آبادی کا تصوف صرف ان کے قریبی ماحول ہی سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اس عظیم آبادی صوفی یعنی بیدل کی مقبولیت بھی اس بات کا موجب ہوئی ہے کہ راسخ اور شاد اردو میں وہی راستہ اختیار کریں جو بیدل نے فارسی میں کیا تھا ۔ میری مراد صرف متصوفانہ مضامین کی مشابہت سے ہے ۔ ورنہ بیدل کے عمومی انداز کلام اور اسلوب فکر کو شاد عظیم آبادی کی صفائی اور سلاست سے کوئی نسبت نہیں ۔

راسخ عظیم آبادی کے متعلق جو شاد کے استاد شاہ الفت حسین فریاد کے ہم عصر تھے ۔ اردو میں بہت کم مواد موجود ہے ۔ خود شاد نے اپنی کتاب "حیات فریاد" میں صرف ان کا نام لینے پر اکتفا کی ہے ۔ سکینہ اور موہن سنگھ دیوانہ نے ان کو قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا ۔ ڈاکٹر گراہم بیلی نے صرف یہ لکھا ہے :-

"راسخ جو ۱۷۴۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۲۲ء میں

فوت ہوئے۔ سیلانی آدمی تھے۔ غازی پور، کلکتہ، دہلی اور لکھنو پھرتے رہے۔ ۱۸۰۱ء میں عظیم آباد واپس آئے۔ ان کا اندازِ کلام اگرچہ صفائی اور پاکیزگی کیلئے بہت مشہور ہے۔ لیکن پڑھنے والا ان سے بہت جلد اکتا جاتا ہے۔ اُن کے کلام کا اکثر حصہ تصوف کے مضامین سے متعلق ہے۔"

آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ ڈاکٹر گراہم بیلی نے اس بات پر بالکل غور نہیں کیا کہ راسخ کے ذریعے لکھنو اور دہلی کی ادبی روایات عظیم آباد میں پہنچی ہیں۔ راسخ ایک حسن پرست سیلانی شاعر تھا۔ اور ولی کی طرح جلوہ ہائے نو بنو کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہا۔ اس کی مضطرب طبیعت نے ایک جگہ کبھی قرار نہ پایا۔ وہ خود کہتا ہے۔

چاوڑی قاف ہے یا خلد بریں ہے راسخ
جمگھٹے حوروں کے پریوں کے پرے ملتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ راسخ نے دہلی اور لکھنو میں رہ کر جہاں تک اندازِ کلام کا تعلق ہے۔ دونوں مرکزوں کے شاعروں اور ادیبوں سے استفادہ کیا۔ اس کے دیوان میں ایک طرف لکھنو کی کھلی ڈھلی معاملہ بندی پائی جاتی ہے۔ تو دوسری طرف داغ کی زبان کی صفائی اور تیکھا پن بھی موجود ہے۔ تصوف کی چاشنی بھی ہے۔ اگرچہ اس کی وہ کیفیت بھی نہیں جو پروفیسر گراہم بیلی نے بیان کی ہے۔ زبان کی پاکیزگی کے معاملے میں سخت گیر سے سخت گیر نقاد وہ بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا۔ کہ اس کا کلام استناد کا رتبہ رکھتا ہے۔ اور عظیم آباد کے ہوا خواہ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ راسخ جیسے شاعر کے پیدا ہونے کے بعد عظیم آباد کو بھی زبان کے مقابلے میں دہلی اور لکھنو کی طرح مرکزیت حاصل ہونی چاہیئے۔ آپ لوگ مشتاق ہوں گے کہ راسخ کے اس دیوان زنگار رنگ سے کچھ ایسے شعر پڑھ کر سنائے جائیں جو اس کے انداز اور اسلوب کی گوناگونی پر شاہد ہوں۔ واضح رہے کہ شاد پر راسخ کا بہت گہرا اثر ہے۔ اور اس کے ہاں بھی ایک غزل میں جو مختلف رنگ کے شعر نکل آتے ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ عظیم آباد کا کوئی منتقل سکول نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ راسخ کا کلام شاد کو گویا زبان کی پاکیزگی کا معیار معلوم ہوتا ہے۔

اب راسخ کے شعر سنئے:۔

شبِ فراق ہے کچھ انتظام کر لینا
ہمارے نالوں کی تم روک تھام کر لینا
ستمگروں میں بس قتل نام کر لینا
ہمارے کھیولوں میں تم دھوم دھام کر لینا
سنا سنا کے ہمیں خاک میں ملا دینا
مٹا مٹا کے ہمیں خوب نام کر لینا

نظر پھیر کر کج کلاہوں نے مارا
قضا بن کے ترچھی نگاہوں نے مارا
نکل کر کہاں حشر سے جا سکو گے
بہ میدان اب دادخواہوں نے مارا
لگے تیر ملتے ہی نظروں سے نظریں
مجھے ملکے میرے گواہوں نے مارا
تیری زُلف پر خم میں غارت ہوا دل
مسافر کو پیچیدہ راہوں نے مارا
نکل جائے منہ سے گر اے ضعفِ ہجراں
تو سمجھوں بڑا تیر آہوں نے مارا

دوسری غزل کے اشعار میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ یہ محاورے استعمال کئے گئے ہیں۔ میدان مارنا۔ کسی سے ملکر مارنا۔ تیر مارنا۔ اور اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس غزل کی ردیف ایسی تھی۔ کہ محاوروں کے کھپت بے ساختہ ہوسکتی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ محاوروں کے اس استعمال میں راسخ اور اس کے تتبع میں شاد کا ایک رجحان نفسی پوشیدہ ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ عظیم آباد کی زبان کو جو دہلی اور لکھنو والے ٹکسال باہر گنتے تھے۔ تو راسخ اور شاد کی طبیعت کا میلان خواہ مخواہ ہی ہوگیا تھا کہ محاوروں پر اپنا عبور ظاہر کریں۔ اگرچہ شاد کے کلام پر تنقید کرنے کا ابھی موقع نہیں آیا۔ لیکن بے محل نہ ہوگا۔ اگر اس جگہ شاد کی ایک غزل پیش کی جائے کہ اندازہ ہو جائے کہ اس کے ہاں زبان کی شستگی اور محاورے کے استعمال کی کیا کیفیت ہے۔

مسافروں نے بندھے جگ کو اپنے توڑ دیا
قریب گھر کے پہنچتے ہی ساتھ چھوڑ دیا

ہجومِ اشک سے دیدار میں خلل نہ پڑے
جو اب کے روئیں تو آنکھوں کو میں نے پھوڑ دیا
یہ دوستی تمہیں البسوں کی شان ہے واعظ
کہ جب کسی کو جگانے لگے جھنجھوڑ دیا
ہزار شکر تری اس عطا پہ اے ساقی
جو جام ایک دیا لاکھ کیا کہ وڑ دیا
دلِ شکستہ سے کیا معذرت کروں اے شاؔد
مجھے تو ہجر نے اس سال اور توڑ دیا

اس میں کوئی شک کہ شاؔد کی غزل ناسخؔ کی غزل کی نسبت زیادہ جاندار ہے۔ اور اس مصرع میں کہ

جب کسی کو جگانے لگے جھنجھوڑ دیا

واعظوں کی دریدہ دہنی اور بے باکی پس منظر کے طور پر ایسی نمایاں ہوئی ہے کہ شاؔد کی صنعت گری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ لیکن آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ اس غزل میں کم از کم دو محاورے یعنی آنکھوں کو میں نے پھوڑ دیا اور ہجر نے اس سال اور توڑ دیا۔ اسی رجحانِ ذہنی کے ماتحت غزل میں لائے گئے ہیں۔

بہرنوع راسخؔ عظیم آبادی کا کلام پختگی کے اعتبار سے نہایت استادانہ ہے۔ معاملہ بندی کی جھلک بھی ہے لیکن زیادہ تر وزیر و صبا کے رنگ میں رنگی ہوئی۔ جرأت اور داغ والی بات نہیں ہے۔ مثلاً

حیا نے وصل کی شب مار ڈالا
سرو ہی تھا خم گردن کسی کا
عدو ماتم میں میرے ہنس رہے ہیں
کسی کے پھول ہیں گلشن کسی کا

اس شعر میں گلشن اور پھول کا تلازمہ ملاحظہ ہو۔ اگرچہ سچ یہ ہے کہ راسخؔ بلند رتبہ شاعر نہیں ہے لیکن ناسخؔ کی طرح انہیں حق پہنچتا ہے کہ عظیم آباد کو مرکزیت کا فخر بخشوائیں۔ مشکل ردیف اور قافیے پر، محاورے پر، زبان پر، اور خزانۂ الفاظ پر انہیں ناسخؔ ہی کی طرح عبور حاصل ہے۔ اور شاؔد نے راسخؔ سے جو کچھ لیا ہے وہ یہی ہے کہ اپنے مطلب کو نہایت فصیح اور نہایت صاف زبان میں ادا کرنا سیکھا ہے۔ لکھنؤ کے اکثر شاعروں کی طرح راسخؔ بھی سنگلاخ زمینوں میں غزل کہہ کر اپنی استادی کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن ناسخؔ کی طرح شعر نہایت بے مزہ نکالتے ہیں۔ اگرچہ ان کی زبان پہ حرف نہیں رکھا جا سکتا۔ مثلاً

چل سرک، لمبی ہو میرے گھر سے ٹل فرقت کی رات
ہٹ پرے، جا دور، کالا منہ نکل فرقت کی رات
ہے شبِ مہتاب فرقت بھی کوئی کالا پہاڑ
چاند چلتا ہے فلک پہ سر کے بل فرقت کی رات

اس کے مقابلے میں شاؔد بھی اگرچہ بعض اوقات نہایت مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ انہوں نے راسخؔ سے صرف انداز کی سلاست اور محاورے کا صحیح اور سچا استعمال سیکھا ہے۔ اگرچہ سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاؔد باوجود اپنے خلوص کے پھیکے اور بے مزہ شعر بھی نکال جاتے ہیں۔ شاؔد کی یہ غزل ملاحظہ ہو ؎

نہ ابرو نے نہ مژگانِ حجاب آلود نے مارا
ہمیں ساقی تیری چشمانِ خواب آلود نے مارا
رخِ روشن پہ بل کھاتی ہوئی زلفوں کا جھک پڑنا
جو سچ پوچھو تو اس ماہِ سحاب آلود نے مارا
نشیلی آنکھ کا ڈورا تھا ساقی یا سروہی تھی
نرے رندوں کو اس مستِ شراب آلود نے مارا
امنڈ آنا اچانک چشمِ حیرت زا میں اشکوں کا
بھری محفل میں اس سیلِ شتاب آلود نے مارا
وہ نکہت گیسوؤں کی اور عرق میں تر وہ رخسارے
سنگھا کر اپنی بوئے عطرِ گلاب آلود نے مارا

جو کوئی آبلہ سینے کا اپنے ٹوٹ جاتا ہے
تو اے سوزِ محبت! کیا کہوں جی چھوٹ جاتا ہے
سکوتِ بے محل سے توڑ کر دینا جواب اچھا
یہ سب سچ ہے مگر عاشق کا دل تو ٹوٹ جاتا ہے

بلایا کوہ پر شیریں کو اے فرہاد! کیا کہنا!
بڑے پتھر کو پانی کر دیا استاد! کیا کہنا!

آپ دیکھ چکے ہیں کہ عظیم آباد کی ادبی فضا کے احیائے تہذیبی

یہ ہیں -

متقدمین دہلی کی سادگی، بیدل کا تصوف اور راسخ کی زبان کی پاکیزگی اور محاورے کے استعمال پر قدرت۔

لیکن یہ اجزار ترکیبی شاد کے پیدا ہونے سے پہلے عالمِ وجود میں آچکے تھے -

شاد کی پیدائش یعنی ۱۸۴۶ء کے بعد عظیم آباد کی ادبی فضا میں سب سے زیادہ تحریکات ادبی پیدا کرنے والا واقعہ یہ ہے - کہ ۱۸۵۹ء میں انیس، دبیر، مونس اور ظہیر دہلوی سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم کی خاص فرمائش پر اور عظیم آباد کے دوسرے رؤسا کے اصرار پر جن میں شاد کے چچا اور والد بھی شامل تھے عظیم آباد پہنچے - تفصیل اس اجمال کی یہ ہے - کہ سلطنت اودھ کے مٹ جانے کے بعد غدر کا چرکا لکھنو والوں کو ایسا لگا - کہ تفصیل اس کی بیان میں نہیں آتی - ظہیر دہلوی کے نواسے ثابت لکھنوی اپنی تصنیف حیاتِ دبیر میں لکھتے ہیں - کہ غدر کے مصائب سے مرزا صاحب ایسے متاثر ہوئے کہ لکھنو چھوڑ کر سیتاپور پہنچے اور اس زمانے میں یہ رباعی کہی ؎

شطرنج دو رنگی سے ہیں ششدر بندے
آوارہ ہیں شہر شہر در در بندے
اے بندہ نواز ہے تعجب کا محل
تو مالکِ ملک اور بے گھر بندے

لکھنو میں امن ہو گیا اور مرزا صاحب واپس تشریف لائے - لیکن اب لکھنو میں کیا تھا - خاک اڑتی تھی - نہ وہ صحبتیں نہ وہ قدردان امیر فقیر ہو گئے تھے - آخر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے - سیدہ امام باندی بیگم رئیسہ عظیم آباد نے مرزا صاحب کو لکھنو طلب کیا - اہلِ عظیم آباد کی خوش ذوقی کی داد دینی چاہیئے کہ اس موقعہ پر وہ انیس کو نہیں بھولے اور جس سال مرزا دبیر عظیم آباد گئے ہیں یعنی ۱۸۵۸-۵۹ء میں عظیم آباد کے دوسرے رئیسوں نے میر انیس، میر مونس اور میر ظہیر کو بھی مجلس پڑھنے کیلئے عظیم آباد بلایا - میر ظہیر دہلوی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری داستانِ غدر یا طرازِ ظہیری میں عظیم آباد جانے کا ذکر نہیں کیا - لیکن اس روایت کے ناقل ثابت لکھنوی ہیں جو ظہیر کے نواسے ہیں - اور جن پر اس معاملے میں بھروسہ کیا جا سکتا ہے - اس مرحلے پر شاید عرض کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو - کہ غدر دہلی کے سلسلے میں راشد الخیری — حسن نظامی اور ناصر نظیر، فراق نے جو کتابیں لکھی . . . ہیں - ان کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور ظہیر کی داستانِ غدر کو دوسرے پلڑے میں تو اس کتاب کا وزن زیادہ نکلے گا -

بہر نوع یہ سال عظیم آباد کی تاریخ میں یادگار رہے گا - کہ انیس، دبیر، مونس اور ظہیر نے اپنے مرثیے پڑھ کر سنائے - اور گویا ایک چھوٹے سے پیمانے پر عظیم آباد میں کچھ دنوں کیلئے لکھنو کی شاعری کی بساط بچھ گئی - دبیر نے یکم محرم کو گلزار باغ میں اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھا - اور ابتدا میں دو رباعیاں پڑھیں

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے
اس دور میں جورِ آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنو جنت تھا
آدم ٹھہرے جو ہم جناں سے نکلے

پہونچا جو کمال کو وطن سے نکلا
قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیل کمال کی غریبی ہے دلیل
پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

ثابت لکھنوی اپنی تصنیف حیاتِ دبیر میں لکھتے ہیں - کہ عظیم آباد کے رؤسا کے اخلاق نے دبیر کو ایسا متاثر کیا کہ اہلِ عظیم آباد کی تعریف میں بھی ایک فارسی رباعی انہوں نے کہی ؎

ایں شہر بہ خاطر ملولاں شاد است
معمورۂ خلق و حلم و عدل و داد است
ہر فرد بشر دفتر خلق است دبیر
ایں شہر ز اخلاق عظیم آباد است

یاد رہے کہ یہ وہی دبیر ہیں کہ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے دربار میں مرثیہ پڑھنے گئے - تو باتوں میں انہوں نے لفظ خداوند سے واجد علی شاہ کو مخاطب نہیں کیا - حالانکہ لکھنو میں یہی طریقہ رائج تھا - کسی شر انگیز حاسد نے واجد علی شاہ کے کان بھرے کہ شاید مرزا صاحب کو خداوند کہنے میں کچھ تامل ہے - دبیر کو بھی یہ خبر جا پہنچی - دوسرے دن منبر پر گئے تو پہلے یہ دو رباعیاں پڑھیں -

ناداں کہوں، یا دل کو خرد مند کہوں
یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیر
ہوتا نہیں بندوں کو خداوند کہوں

حیدر کو غنی، سب کو غرض مند کہوں
بے حد ہیں شرف ان کے میں تا چند کہوں
ہے شیرِ خدا میں بخدا شانِ خدا
اس بندے کو سو بار خداوند کہوں

انیس اور مونس کے متعلق دریافت نہ ہوسکا کہ وہ اس یادگار مجلس کے بعد عظیم آباد گئے یا نہیں۔ لیکن دبیر سے رؤسائے عظیم آباد کے بالخصوص میر حسن صاحب شاد کے والد اور میر عباس صاحب شاد کے چچا کے تعلقات ایسے شگفتہ قائم ہوئے کہ ہر سال تا وفات دبیر وہاں جاتے رہے۔ سید وصی احمد بلگرامی اپنے مضمون س ش ص ، ہیں لکھتے ہیں کہ

"جب شاد صفیر بلگرامی کے شاگرد ہو چکے۔ تو مرثیہ بھی کہنا شروع کیا۔ چنانچہ ایک سال جب مرزا دبیر عظیم آباد موجود تھے۔ وہ اپنا ایک مرثیہ مرزا دبیر کے پاس بغرض اصلاح لے گئے اور مرزا دبیر نے صفیر بلگرامی کے کہنے پر اس مرثیے پر اصلاح بھی کی۔"

اس سوال کے متعلق کہ شاد کس کے شاگرد تھے۔ مرزا دبیر والے مرثیے کا قصہ بھی زیرِ بحث آچکا ہے اور شاد کی کچھ تحریریں ایسی بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دبیر کی شاگردی سے انکار ہے۔

خود مجھے یہ خیال تھا کہ وصی احمد کے بیانات کی تحقیق ابھی تک نہیں ہوئی۔ لیکن حیاتِ دبیر کے مؤلف ثابت نے یہ گتھی بالکل سلجھا دی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں شاد کا ایک خط نقل کیا ہے۔ جس میں شاد لکھتے ہیں "میں نے مرزا دبیر سے ۱۲۷۶ھ میں اصلاح لی ہے۔ اور میں ان کو اپنا اور اس فن کا استاد جانتا ہوں۔ پینتیس ۳۵ برس ہوئے کہ جناب مرزا صاحب کے بعض نادان دوستوں نے مجھے کچھ ایسا پریشان کر دیا کہ جوشِ جوانی میں از خود رفتہ ہوگیا۔ نوائے وطن میں بعض ریمارک میرے قلم سے ایسے نکل گئے۔ کہ میں اب تک شرمندہ ہوں اور ان کی روح پر فتوح سے معافی کا خواستگار۔"

یہ خط بہت طویل ہے اور ضرورت نہیں کہ سارا نقل کیا جائے۔ لیکن اس میں ایک فقرہ ایسا ہے جو نہایت معنی خیز ہے۔ وہ یہ کہ "میں میر انیس صاحب کا طرز فطرتاً پسند کرتا ہوں۔" اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاد نے مرثیے پر جو دبیر سے اصلاح لی ہے وہ گویا تبرک کے طور پر ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ دبیر سے شاد کے بزرگوں کے تعلقات، انیس کی نسبت بہت اچھے تھے۔ اس لئے ابتدائے مشق کے زمانے میں شاد نے ماحول کے اثرات کے ماتحت مرثیہ لکھ کر دبیر کو دکھایا ہوگا۔ لیکن ان کی طبیعت کا رنگ، ان کی زبان کا اسلوب اور ان کی مرثیہ نگاری کا انداز بالکل انیسی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاد انیس سے بھی زیادہ مونس کی زبان کے مداح تھے۔ انیس کی موجودگی میں مونس کا رنگ نہیں جما۔ اور اس آفتاب درخشاں کے نور میں یہ نجم روشن یا پھیکا سا نظر آتا رہا۔ لیکن مجھ سے پوچھئے تو میں کہوں گا کہ مونس کے کلام کا بہترین حصہ انیس کے بہترین اشعار سے کم رتبہ نہیں ہے۔

سلام تو بالخصوص مونس بہت اچھا کہتے ہیں۔ آپ حضرات واقف ہوں گے کہ سلام میں واقعات کربلا کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی، کاوش ہائے انسانی کی بے ثمری۔ اور اس کے متعلقہ اخلاق اور متصوفانہ مسائل بھی اشعار کا موضوع ہوتے ہیں۔

عظیم آباد میں جو صحبتیں شاد نے دیکھی ہیں۔ ان کا اثر یہ ہوا ہے کہ ان کی اکثر غزلوں میں بالکل مونس کے سلام کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ اس بحث میں اس وقت الجھنے کی ضرورت نہیں کہ اخلاق کو شعر سے کیا نسبت ہے لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ شاد نے صرف یہی نہیں کیا کہ فلسفۂ اخلاق کے بعض مسائل کو نظم کر دیا ہو۔ بلکہ انہوں نے ایسے اشعار کو بھی ذاتی واردات اور تجربات کا سرمایہ دار بنانا چاہا ہے اور اپنے خلوص کی وجہ سے بہت حد تک شعریت کے معیار تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ شاد کے کلام پر تنقید کا موقع نہیں آیا۔ لیکن جی نہیں چاہتا کہ اس مرحلے پر میر مونس کے سلام کے بعض اشعار

اور شاد کے اشعار پیش کر کے ایک تقابلی مطالعہ کا موقع بہم پہنچانے کے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ خود شاد کہتے ہیں۔

مجھی پہ کیا ہے عدد تک ہے معترف بخدا
زبانِ حضرتِ مونس کا شاد کیا کہنا

اب میر مونس کے سلام کے بعض اشعار سنئے۔

سلامی، غمِ ہمرہاں رہ گیا
میں تنہا پس کارواں رہ گیا
ذرا دیکھو انجام کارِ بشر
کہاں سے یہ آیا کہاں رہ گیا
مرقع ہے دنیا کا حیرت کی جا
رہا بس وہیں جو جہاں رہ گیا

شاد کا یہ شعر یاد کیجئے:۔

کہاں میں اور کہاں اے شاد دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

اور سنئے:۔

غنی ہے دل سوئے دولت نظر نہیں رکھتے
یونہی گزر گئی ہم سیم و زر نہیں رکھتے
ریاضِ دہر میں ہم مثل سرو ہیں آزاد
سوائے بے ثمری کچھ ثمر نہیں رکھتے
ہنر کو عیب سمجھتے ہیں اس زمانے میں
ہزار شکر کہ ہم کچھ ہنر نہیں رکھتے
مسافرانِ عدم کس طرف گئے یا رب!
کہ وہ ہماری ہم ان کی خبر نہیں رکھتے

مزا نہیں ہے خموشی کا خوش بیاں کیلئے
زباں سخن کیلئے ہے، سخن زباں کیلئے
سراب اُٹھانے دے اے آسماں جلوں کبتک
بری ہے اتنی بھی نرمی کڑی کماں کیلئے

اب شاد کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دل اپنی طلب میں صادق تھا، گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا، دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا
بے راحلہ و بے زادِ سفر، رحمت پہ بھروسہ کر کے فقط
دنیا کی سرا سے جو اُٹھ کر اسی طرح گیا وہ خوب گیا
طاقت جو نہیں اب حیرت سے تصویر کا عالم رہتا ہے
وہ آخر شب کی آہ گئی وہ نعرۂ یا محبوب گیا

دیکھنا غافل ذرا دنیا کو بیگانے ہوئے
کل جو قصے پیش پا تھے آج افسانے ہوئے
کچھ نو راحت دے نہیں اسے گوشۂ تاریک و تنگ
آئے ہیں سارے بیابانِ جنوں چھانے ہوئے

وہ شاید تو نہیں وہ ہم نہیں جو ہم نے سمجھا ہے
سمجھ لینے کو یہ بھی کم نہیں جو ہم نے سمجھا ہے
وہی پیری میں ہیں اسے شاد تھے جیسے جوانی میں
مگر افسوس اب وہ ہم نہیں جو ہم نے سمجھا ہے

ان کی بھلی کہی صبا کیوں نہ ہوں اب کنارہ کش
عین بھنور میں لا کے جب ناؤ میری ڈبو چکے
ہے لبِ بامِ آفتابِ عمر کا دن اخیر ہے
کام بہت ہے رُوح کو جسم کا بوجھ ڈبو چکے

دنیا کو جھینکتے ہیں عبث اہلِ فن پڑے
اس بیسوا کو ترک نہ کر دیں جو بن پڑے
اے شاد یہ حیات بھی ہے اک طرح کی موت
گو پاس یک رہے ہیں ہم اربابِ فن پڑے

مرثیہ سے شاد کی دلچسپی کی بنا صرف یہی نہیں تھی کہ انہیں انیس اور دبیر کی یادگار مجلس سننے کے موقعے ملے تھے۔ بلکہ ان کی شیعیت کو بھی اس دلچسپی سے خاصہ تعلق تھا۔ شاد کا گھرانا جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں، نہایت متعصب شیعوں کا گھرانا تھا۔ لیکن شاد کی خوش ذوقی اور سلیم الطبعی نے انہیں اجازت نہ دی کہ مرثیہ کو اپنا خاص فن بنالیں۔ وہ گویا غزل ہی کیلئے پیدا ہوئے تھے اور جو کچھ انہوں نے انیس و دبیر اور مونس وغیرہ سے

لیا۔ اسے بھی انہوں نے غزل کے سانچے میں ڈھال لیا۔ اپنے اشعار میں وہ بہت کم شیعیت کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ مجھے ان کے مطبوعہ دیوان میں صرف ایک شعر ایسا نظر آیا جس میں انہوں نے صاف صاف اپنے مسلک کا اظہار کیا ہے۔ اس غزل میں جس کا مطلع ہے۔

لکھا برگِ گُل پر بخطِ جلی ہے
خوشا وقت اس کا جو ابتک کلی ہے

مقطع میں کہتے ہیں۔

محمدؐ ہیں سرتاج عالم میں سب کے
محمدؐ کا اے شادؔ نائب علی ہے

اس سے یہ خیال نہ ہونا چاہیئے کہ شیعیت کے اس ماحول کا جس میں شادؔ نے پرورش پائی۔ ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ابتدائی مشق کے بعد جب وہ خود فکر کرنے لگے اور تقلید کی راہوں سے نکل گئے تو انہیں اپنی طبیعت کا میلان تصوف کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوا۔ لیکن شیعیت کو تصوف سے کچھ بیر سا رہا ہے۔ اس کی مفصل داستان آگے آئے گی۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شادؔ نے شیعی عقائد سے متاثر ہو کر تصوف کے پیچیدہ مسئلوں کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ صرف وحدت وجود اور اس کے متعلقہ مسائل سے جو مضامین پیدا ہوتے ہیں انہیں تک اپنے اشعار کو محدود رکھا۔

اس زمانے میں یعنی جب شادؔ بیس برس کے تھے تو ان کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے کچھ عرصے کیلئے ان کے تمام ماحول کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔

اس واقعہ نے شادؔ کی شاعری کو فوراً ایک نئے راستے پر ڈال دیا۔ اور اگرچہ کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنی قدیم روش پر آگئے لیکن اس واقعہ سے جو مشاہدات اور واردات متعلق ہیں۔ انہوں نے شادؔ کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شادؔ کے ہم عصروں میں ان کے ایک دوست تھے۔ جن کا نام غالباً سید تجمل حسین خاں تھا اور جو سلطانؔ تخلص کرتے تھے۔ انہیں نواب سلطان مرزا بھی کہا جاتا تھا اور اسی نام سے یہ اپنے دوستوں میں مشہور تھے۔

غالباً ۱۲۸۱ھ میں یا اس کے قریب لکھنو کے اربابِ نشاط میں سے ایک فتنۂ روزگار عظیم آباد پہنچی۔ ایک نوجوانی پھر اس پر لکھنو کی شائستگی اور شستگی گویا سونے پر سہاگہ۔ تھوڑے دنوں میں اس قتالۂ عالم نے ایسا رنگ جمایا کہ سلطان مرزا بھی وہاں پہنچے۔ اور وہیں کے ہو رہے۔

غم ہائے روزگار کو آنے دیا نہ پاس
ہم کوئے عاشقی میں گئے جا کے رہ گئے

شادؔ ان دنوں سلطان مرزا کے ہم مشرب و ہم راز تھے۔ انہوں نے بچشم خود ناز و نیاز کے تمام مراحل دیکھے اور عشق کی بیتابی سے لے کر حسن رعنا کی تسخیر تک جتنی منزلیں پیش آتی ہیں سب سلطان مرزا کے ساتھ طے کیں۔ ابتدائے شباب کا زمانہ ہر طرح کی بے فکری ہر روز روزِ عید و ہر شب شب برات۔ طرّہ یہ کہ اس فتنۂ روزگار کو بھی سلطان مرزا سے محبت ہو گئی۔ اب تو یہ تینوں کھُل کھیلے۔

عظیم آباد کی فضائیں ان کی محبت کے ترانوں سے گونجنے لگیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس آفت روزگار کا رنگ سانولا تھا۔ لیکن آنکھوں کی مستی ایسی ہوش ربا تھی کہ دیکھی نہ سنی۔ اس بہار آفریں زمانے کے تاثرات نے شادؔ کی شاعری کو جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے خالص تغزل کے راستے پر ڈال دیا۔

اس زمانے میں شادؔ نے جو غزلیں کہی ہیں ان کا انداز ان کی عام غزلوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ ان کی عام غزل کی روش یہ ہے کہ دو تین شعر تصوف کے ایک آدھ شعر کسی اخلاقی مسئلے سے متعلق دو تین شعر خالص واردات کے کہیں کہیں ایک آدھ شعر نہایت تیز معاملہ بندی کا بھی نکال جاتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں جو غزلیں کہی گئی ہیں۔ ان میں ایک ہی کیفیت کا تسلسل نظر آتا ہے۔ یہ غزلیں بہت کم لیکن جتنی کہی ہیں اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ۔

ایک ستم اور لاکھ ادائیں
اُف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں، تنگ قبائیں
اُف ری جوانی ہائے زمانے
ہجر میں اپنا اور ہی عالم
ابر بہاراں دیدۂ پُرنم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں
اُف ری جوانی ہائے زمانے

کالی گھٹائیں باغ میں جھولے
دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں
اُف ری جوانی ہائے زمانے
اپنی ادا سے آپ کھٹکنا
اپنی ہوا سے آپ جھجکنا
چال میں لغزش منہ پہ ہوائیں
اُف ری جوانی ہائے زمانے
پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے نمازیں
ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے
جو نہیں جائز اس کی دعائیں
اُف ری جوانی ہائے زمانے

سر پہ کلاہ کج دھرے، زلف دراز خم بہ خم
آہوئے چشم ہے غضب، ترکِ نگاہ ہے ستم
عشوۂ دلگداز وہ ذبح کرے جو بے چھری
ناز وہ دشمنِ وفا، رحم کی جس کو ہے قسم
وہ خمِ گیسوئے دراز، دامِ خیالِ عاشقاں
ہو گئے کر کے طرح شکار اب نہ رہے کہیں کے ہم

شاد کا مشہور مستزاد آپ نے سُنا ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے کچھ اشعار رسمی استعارات اور تشبیہات سے گرانبار ہیں۔ مثلاً

فتنۂ خو آفتِ جاں بت سنگ دل آشوبِ جہاں، دشمنِ امن و اماں
سرورِ کج کلہاں خسروِ اقلیمِ جفا، بانئے مکر و دغا

لیکن اس کے تین چار اشعار ایسے ہیں جو پکار پکار کر اس واقعہ کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا تفصیلی ذکر اوپر آچکا ہے۔ مثلاً

رس بھری ہائے وہ آنکھیں تیری کالی کالی ..... بے پیئے متوالی
سانولا رنگ نمک ریزِ جراحاتِ جفا ..... اُف کہاں دھیان گیا
آنکھیں سوئی ہوئی، آواز ہے بھرائی ہوئی، باتیں گھبرائی ہوئیں
اس سے تو اور کسی بھید کا ملتا ہے پتا ..... شاد قسمیں تو نہ کھا

میں عرض کر چکا ہوں کہ شاد کے دیوان میں اس قسم کی غزلیں گنتی کی ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس رنگین دور میں شاد نے جو کچھ دیکھا اور برتا ہے۔ اس نے شاد کے کلام پر عموماً کوئی اثر نہیں کیا۔ شاد کی ان غزلوں میں اور بعد کی پختہ غزلوں میں یہ فرق ہے کہ ان غزلوں کی سی تصویریت اور رنگینی و شادابی بعد کی غزلوں میں موجود نہیں۔ لیکن اس کے برخلاف بعد کی غزلوں میں ایک دبی ہوئی آگ سی ملتی ہے جو میرے خیال میں ان غزلوں کی بیباک شعلہ طرازی سے کہیں زیادہ دل گداز ہے۔ مخزن کے ابتدائی دور میں شاد کی جو غزلیں چھپتی رہی ہیں۔ میں ان کو شاد کا معیاری کلام سمجھتا ہوں۔ اس دور کی غزلوں میں "جان لیا، پہچان لیا، اور ابرو تیرا اور گیسو تیرا" بہت مشہور ہیں۔ ان غزلوں کے بعض اشعار پیش کرتا ہوں۔ جن سے اندازہ ہوگا کہ جب جوانی کی آندھی فرو ہوئی تو شاد نے اپنے مشاہدات کو کیسی صناعانہ چابک دستی سے تغزل کے قالب میں ڈھال کر استعمال کیا۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ان غزلوں میں شاد نے بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ شعر کہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کے بیان کو خاص حدود کے اندر رکھنا چاہتے ہیں۔ انداز کچھ کھنچا ہوا کچھ رکا ہوا ہے۔ لیکن یہ رکاوٹ ایک فنی کارنامہ ہے۔ کیونکہ اس رکھ رکھاؤ کے باعث اگر پہلے شاد کے شعر خنجر تھے تو اب نشتر ہو گئے ہیں جن کی میٹھی میٹھی چبھن کو دیر تک پڑھنے والا اپنے دل میں لئے رہتا ہے — ملاحظہ ہو۔

موجِ پیمانۂ تقدیر ہے گیسو تیرا
طاقِ میخانۂ توحید ہے ابرو تیرا
کچھ اشاروں سے ہی کہہ دے تری چتون کے نثار
کس پہ تولے ہوئے تلوار ہے ابرو تیرا
شاد کیا کیجیئے دیکھا نہیں جاتا مجھ سے
چہرا اُترا ہوا، بہتا ہوا آنسو تیرا

کچھ تعجب نہیں آنکھوں نے اگر مان لیا
دل نے دیکھا نہیں اس پر تجھے پہچان لیا
زہر کیا چیز ہے اک تلخ دوا ہے ناصح
ہم نے جس بات کو اب ٹھان لیا ٹھان لیا

بس فدا لغزشِ رفتار پہ اپنی اے شاد
دُور سے اس نے مجھے دیکھ کے پہچان لیا

اپنے عہد کے معاصروں میں جن لوگوں سے شاد زیادہ متاثر ہوئے ہیں ان کے نام شاد نے خود حیاتِ فریاد میں اپنے استاد کے شاگرد گنوانے کے سلسلے میں لکھے ہیں۔ جن میں سے مولوی محمد بخش وکیل خان بہادر خدا بخش کے والد۔ نواب میر غلام حسین شجر، مرزا غلام حسین قمر، نواب جعفر خاں۔ مولینا محمد عبدالرؤف وحید مرحوم نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ شاد کے معاصروں میں ایک شخص کا نام شاد نے کبھی نہیں گنوایا۔ معلوم نہیں اسے فروگذاشت کہنا چاہیئے یا کچھ اور۔

میری مراد شمس العلما نواب محمد امداد اثر عظیم آبادی سے ہے۔ جن کے بیٹے علی امام اور حسن امام ہندوستان کے نہایت مشہور قانون دان تھے۔ صاحب شعرالہند نے نواب صاحب کے اشعار کی بہت تعریف کی ہے۔ لیکن میری نظر سے ان کی جو غزلیں گزری ہیں۔ انہیں پڑھ کر نواب صاحب کی شاعری کا کوئی اچھا اثر دل پر نہیں پڑتا۔ البتہ ایک نقاد کی حیثیت سے ان کا رتبہ یقیناً بہت بلند ہے۔ ان کی کتاب کاشف الحقائق میری نظر سے گزر چکی ہے۔ اور اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو شاد نے اپنی تصنیف فکرِ بلیغ میں اس سے استفادہ بھی کیا۔

میں نے قصداً صفیر بلگرامی اور شاہ الفت حسین فریاد کا تذکرہ نہیں کیا کیونکہ ان کے ساتھ شاد کے جو تعلقات تھے۔ وہ ایک جداگانہ بحث کے محتاج ہیں۔ سید وصی احمد نے صفیر بلگرامی کے متعلق یہ دعوی کیا ہے کہ وہ شاد کے استاد تھے۔ برخلاف اس کے شاد نے حیاتِ فریاد میں ان کا ذکر کبھی نہیں کیا اور صرف شاہ الفت حسین فریاد کے شاگرد ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اس واقعہ کی تحقیق کیلئے ایک مستقل مضمون لکھا جانا چاہیئے اور اس مضمون کی دوسری قسط انشاءاللہ اسی واقعے سے متعلق ہوگی۔

سید عابد علی عابد
ایم۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

"میری منسوبہ"

مری پیاری — ثریّا جبیں ہے
کلی سے ہے نازک تو گل سی حسیں ہے
ہر اس کی ادا برق سے شوخ تر ہے
ہر انداز اُس کا بہار آفریں ہے
دہن غنچۂ باغِ جنت ہے اُس کا
تو رخسار نورِ سحر سے حسیں ہے
کنول کے ہیں دو پھول یا ہاتھ اس کے
جبیں مرمریں ہے تو لب مخملیں ہے
نگاہوں سے اس کی عیاں سحرِ بابل
نظامِ جہاں اُس کے زیرِ نگیں ہے
جبیں اُس کی روشن ستارہ سحر کا
گھٹا اس کی زلفوں کی کفر آفریں ہے
مقدّس ہے پھولوں سے اُس کی محبت
مرے غنچۂ دل میں جو جاگزیں ہے
وہ آنکھوں سے ہے دُور لیکن قسم ہے
تصوّر میں میرے وہ بالکل قریں ہے
ہے میرے تصوّر کو کیوں پیار اس سے
کہ جس حور کو میں نے دیکھا نہیں ہے

مہدی علی خاں

اضطرابِ شوق

حضرت اثر صہبائی ہندوستان کے بلند پایہ شاعر ہیں آپ کی نظموں کا مجموعہ "ذکر و فکر" کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔
"اضطرابِ شوق" بھی اسی کی ایک نظم ہے، جسے ہم شکریہ کے ساتھ یہاں درج کر رہے ہیں۔ شاہکار

ازل سے مجھکو ہی تیری ہی آرزو اے دوست!
اُڑائے پھرتی ہے تیری ہی جستجو اے دوست!

ترے فراق میں طوفانِ بے قراری ہوں
رہینِ آہ و فغاں وقفِ اشکباری ہوں

میں تجھ کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں کوہساروں میں
تری تلاش میں رہتا ہوں لالہ زاروں میں

سحر کے رنگِ تبسّم میں ڈھونڈتا ہوں تجھے
بہارِ محفلِ انجم میں ڈھونڈتا ہوں تجھے

صبا سے پوچھتا پھرتا ہوں جلوہ گاہ تری
نکالتا ہوں کبھی کہکشاں میں راہ تری

تری تلاش میں دریا کے ساتھ بہتا ہوں
ہر ایک موج سے دردِ فراق کہتا ہوں

میں نالہ کش ہوں شب و روز تیری فرقت میں
اک اضطرابِ مجسّم ہوں تیری الفت میں

مری نوائے پریشاں سے دم بخود ہے جہاں
مرے جنونِ فراواں سے دم بخود ہے جہاں

زمیں خموش، فضا چُپ ہے، آسماں خاموش
مرے خروش پہ ہے محفلِ جہاں خاموش

سمجھ سکا نہ کوئی آہ! گفتگو میری
مگر جگا گئی دنیا کو ہاؤ ہو میری

الٰہی کوئی نہیں جو سُنے مری فریاد
غضب ہے میرا جنوں اور ستم تری بیداد

عجیب شے ہے مگر تیری آرزو اے دوست!
ازل سے مجھ کو ہے تیری ہی جستجو اے دوست!

اثر صہبائی

قانونی مشورہ

آج اتوار کا دن ہے یہ خوفناک واقعہ پچھلی جمعرات کے روز پیش آیا تھا۔ گویا چار روز ہوئے میری زندگی میں وہ منحوس سانحہ گزرا جس کا اثر شاید عمر بھر میرے قوا پر مسلط رہے۔ اب بھی جب مجھے اس کا خیال آتا ہے تو میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ یہ واقعہ بیداری میں پیش آیا تھا یا خواب میں!

جمعرات کا ذکر ہے۔ شام کے پانچ بجے کا وقت تھا۔ میں اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا صبح کے مقدمے کے لئے مسل کے ضروری کاغذات کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ قتل کا مقدمہ تھا۔ ابتدائی عدالت سے میرے پانچوں موکلوں کو موت کی سزا ہو چکی تھی۔ ان کے خلاف استغاثہ کی طرف سے ایسی کڑی شہادتیں پیش کی گئی تھیں کہ ان کا انجام بڑی حد تک طے شدہ تھا۔ لیکن جب میں نے مقدمہ لیا تو مجھے اپنی قسمت کی یاوری پر اعتماد تھا اور میں سمجھتا تھا کہ اوپر کی عدالت سے انہیں بری کرا لینا میرے لئے مشکل نہ ہوگا۔ مگر اتنے دن گزر جانے پر بھی میں نے مقدمہ کی تیاری کی کوشش نہ کی تھی۔ دراصل یہ دن میری زندگی میں بالکل نئی شان رکھتے تھے۔ مسرت تھی کہ امنڈی چلی آ رہی تھی۔ کسی کام پر دل نہ لگتا تھا۔ جی جی میں آتی کہ گھر سے نکل جاؤں اور عیش و نشاط کے پر لگا کر دنیا میں اڑتا پھروں لیکن اس کیفیت کے تذکرہ سے پیشتر میں آپ کو اس کی اصل وجہ بھی بیان کر دوں؟

لیجئے یہ تفصیل بھی سن لیجئے۔

میں نے ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی تھی اور میکلوڈ روڈ پر اپنا دفتر کھول دیا تھا مگر پریکٹس کے ابتدائی مدارج میں مجھے بڑی مشکلات کا سامنا ہوا۔ بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے وکالت سے بددل ہو کر اسے ہمیشہ کیلئے ترک کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ انہیں دنوں اسلامیہ کالج میں انگریزی کے استاد کی آسامی خالی ہوئی تھی اور اخباروں میں اس کا اشتہار نکل رہا تھا۔ میں نے اس ملازمت کے لئے درخواست دے دی۔ اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو وکالت سے علیحدہ ہو کر تعلیم و تعلّم کے پیشہ کو اختیار کر لوں گا لیکن وہ آسامی بھی پُر ہو گئی اور مجھے بمجبوری تمام وکالت ہی پر قناعت کرنا پڑی۔

مجھے کالج کے زمانے سے شام کے وقت سیر کیلئے جانے کی عادت تھی۔ میرا معمول تھا کہ سورج کے ڈھلتے ہی میں چھڑی لے کر ہوسٹل سے نکل کھڑا ہوتا اور دیر تک باغوں میں گھومتے رہنے کے بعد واپس لوٹتا۔ وکالت شروع کی تو بھی میرا معمول یہی رہا۔ اور دن بھر کی تھکا دینے والے فکر و اضمحلال کے بعد میں شام کے وقت سیر کی خاطر لاہور کی گنجان اور پُر شور سڑکوں سے باہر نکل جاتا۔

اپریل ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے کہ میں حسب معمول ایک شام سیر کیلئے نکلا۔ لاہور کے باغات بہت بارونق نظر آتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کیاریوں میں ننھے ننھے رنگ برنگی چراغ جل رہے ہیں میں اپنے خیالات میں غرق لارنس باغ سے نکل کر ریس کورس روڈ کی طرف ہو لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں گالف روڈ سے ہوتا ہوا نہر پر چلا جاؤں گا۔ موسم بہار میں دلفریب نظارا روح پرور ہوتا ہے اور اس کے خاموش اور پُر فضا منظر میں پژمردہ دلوں کو راحت اور اطمینان کا بہت سا سامان مل جاتا ہے۔ میں اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں باغ کی آخری حد کو عبور کر کے سڑک پر پہنچ گیا۔ سڑک کے اس پار ایک بڑے سے پیڑ کے نیچے ایک زرد رنگ کی چھوٹی سی موٹر کھڑی تھی۔ میں نے یونہی رفع استعجاب کی خاطر اس طرف ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ نیلے رنگ کے لباس میں ایک لڑکی موٹر کی مشین پر جھکی ہوئی اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ اور شاید کسی پُرزے کو ٹھیک کرنے میں منہمک تھی۔ میں اتنے عرصے میں آگے بڑھ چکا تھا۔ نہر سے لوٹ کر وہیں واپس آنے تک مجھے بیس منٹ ضرور لگ گئے ہوں گے۔ لیکن جب میں سڑک کی نکڑ پر پہنچا تو وہ زرد رنگ کی موٹر وہیں کھڑی تھی اور لڑکی اس پر بدستور جھکی ہوئی تھی۔ نہ جانے کس پُر اسرار شوق و اشتیاق نے مجھے اس طرف متوجہ ہونے کی ترغیب دی کہ میں باغ میں داخل ہونے کی بجائے موٹر کی طرف بڑھ گیا۔

لڑکی نے میرے قدموں کی چاپ ضرور سنی ہوگی۔ لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اگر یہ واقعہ کسی ناول یا افسانے میں پیش آتا تو شاید میرا انداز تصنع اور بناوٹ سے پُر ہوتا۔ لیکن چونکہ یہ واقعہ اصل زندگی میں پیش آیا تھا۔ اس لئے میں نے قریب پہنچ کر صرف اتنا کہا۔

"کیا آپ کی موٹر میں کچھ نقص واقع ہو گیا ہے؟"

مجھے اب تک حیرت ہے کہ میں نے یہ سوال کیونکر اس بے باکانہ جرأت سے کیا تھا۔ ہماری تہذیب میں چونکہ دونوں جنسوں کے اختلاط کے مواقع پیش نہیں آتے۔ اس لئے کسی اجنبی مرد کیلئے ایک ناواقف لڑکی سے گفتگو کرنے کی جرأت کرنا بالکل غیر معمولی واقعہ ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر یہ سوال کر دیا۔ لڑکی نے اپنے سر کو جنبش دی اور مڑ کر میری جانب دیکھا۔ گو شام ہو گئی تھی اور درختوں کے سائے تاریک ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن ابھی اسقدر روشنی باقی تھی کہ اس کا چہرا مجھے صاف نظر آ جاتا۔ میں نے اس کو محض ایک نظر دیکھا۔ لیکن اس ایک نظر میں مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں نے جلوۂ ذات کے نور سے اپنی آنکھیں منور کر لی ہیں۔ اسے لڑکی کہنا شاید قدرت کی توہین کے مترادف ہوگا۔ ہاں اسے ایک ایسی دیوی کہا جا سکتا تھا جس کے حسن شاداب کے تصور سے شاعر کے تخیل میں جودت اور تپسوی کے خوابوں میں رنگینی آ جایا کرتی ہے۔ جب اس رومان انگیز شام کی سرسراتی ہوئی عطر بیز ہوا میں اس کا آنچل اڑتا تو اس پر کسی سمندری پری کا گمان ہوتا جو اس خاکدانِ تیرہ کو اپنے جلوۂ حسن سے منور کرنے کے لئے اپنی آبی مملکت سے ادھر بھول پڑی تھی۔

اس نے رومال سے اپنے ہاتھوں کو پونچھتے ہوئے لاپروائی کے عالم میں کہا۔ "ہاں سیلف سٹارٹر کی تار اصل مشین سے غالباً منقطع ہو گئی ہے۔ لیکن اگر تم ہینڈل گھما سکو تو میرے خیال میں موٹر چل پڑے گی۔"

حسن میں غالب آ جانے کی کسقدر قوت ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا میری قوتِ ارادی سلب ہو چکی ہے اور میں بغیر کچھ کہے سنے موٹر کا ہینڈل گھمانے میں مصروف ہو گیا۔ شاید عام حالت میں میرے لئے اس ہینڈل کو گھمانا مشکل ہو جاتا۔ لیکن اس دن مجھ میں ایک بے پناہ طاقت نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی کہ میں نے ابھی دو جھٹکے ہی دیئے تھے کہ موٹر چالو ہو گئی۔ میں ایک طرف کو ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے موٹر کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر میری جانب ان نظروں سے دیکھا جن میں تشکر کی ایک دنیا بسی ہوئی تھی پھر جس طرح وہ اچانک میری دنیا میں نمودار ہوئی تھی اسی طرح ہمیشہ کیلئے غائب ہو گئی۔

میں کچھ دیر اسی جگہ پر ساکت و صامت کھڑا رہا۔ ریس کورس روڈ کی کوٹھیوں کا خاموش و ساکن منظر جو آغاز بہار کے تبسم سے دلفریب ہو رہا تھا لارنس باغ کے سبزہ زار اور بلند قامت پیڑوں کے جاں افروز نظارے سے مل کر جاذب نظر ہو رہا تھا۔ لیکن قدرت کی اس رنگینی کے مقابلے میں میرا دل یاس کے اتھاہ سمندر میں بیٹھا جا رہا تھا۔ مسرت کی وہ جھلملاتی ہوئی روشنیاں جن کی جھلک سے ہماری زندگی کبھی کبھی پُرکیف بن جاتی ہے ہمیشہ کیلئے معدوم ہو گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں ایک بے حقیقت شے ہوں۔ دراصل انسان کو اپنے مرتبے اور شخصیت کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا بھی اس وقت احساس ہوتا ہے جب اسے حضور حسن میں حاضر ہونے کا موقع ملتا ہے۔

میں نے اپنی ناکام زندگی پر محاکمہ کیا تو اپنی خامیوں کی داستان میری نظروں میں پھر گئی۔ یقیناً اگر میں اس کی نظروں میں بالکل بے مایہ شخص نہ ہوتا تو اس کا انداز خطابت ایسا سرد نہ ہوتا وہ "تم" کی بجائے مجھے کم از کم "آپ" کے لفظ سے ضرور خطاب کرتی۔ مگر پھر میرے دل میں خیال گزرا کہ آخر اس میں اس کا قصور ہی کیا تھا۔ میری زبوں حالی پر کسے میرے بھکاری ہونے کا گمان نہ ہوتا۔ اُلجھے ہوئے بال، پژمردہ چہرا۔ غلیظ کپڑے، خاک سے اٹا ہوا جوتا ان کو دیکھ کر مجھے کون شہر کا رئیس تصور کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی حالتِ خستہ پر رونا آ گیا۔ یقین کیجئے میں چوبیس پچیس سال کا نوجوان اس شام سڑک پر کھڑا کھڑا رو پڑا۔ اور میں نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنے دل میں قسم کھائی کہ یا تو میں اس ذلیل زندگی کو ختم کر دوں گا یا پھر میں اپنی خستہ حالت کو رہنے نہیں دوں گا۔

اس عزم کامل کے بعد میں ایک بدلا ہوا شخص تھا!

دن گزرتے گئے۔ ہفتے گزر گئے۔ مہینے گزر گئے۔ سال گزر گئے۔ حتیٰ کہ خود میری زندگی کا وہ دردناک زمانہ گزر گیا اور خوفناک خواب کی طرح ماضی کے دھندلکے میں گم ہو کر ہمیشہ کیلئے معدوم ہو گیا۔

دن رات کی مسلسل محنت اور غیر مختتم کاوش کے نتیجے میں اب میں وہ خستہ حال اور بے مایہ پلیڈر نہ تھا جو شام کے وقت لاہور کی سڑکوں پر افسردہ دلی سے چہل قدمی کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ بلکہ ایک ایسا صاحب حیثیت وکیل کہ نہ صرف جس کی کوٹھی پر ٹیلیفون لگا ہوا تھا اور دروازے پر موٹر کھڑی رہتی تھی۔ بلکہ جسے امارت کے علاوہ شہرت اور عزت بھی حاصل تھی۔ اب میری شام پیدل ہوا خوری کی بجائے کلب میں ٹینس کھیلنے میں بسر ہوتی۔

پچھلے مہینے یعنی جون ۱۹۳۹ء کی بات ہے کہ میں ایک شام کلب میں داخل ہوا تو کچھ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ سامنے کی کرسیوں پر جہاں چند عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے اپنی گفتگو میں منہمک تھے۔ مجھے وہی چہرا نظر آیا جو آج سے تین سال قبل ایک دلفریب شام کے سہانے منظر میں ریس کورس روڈ کی نکڑ پر نظر آیا تھا۔ گو اُس دن میں نے محض چند ساعتوں کیلئے دیکھا تھا لیکن میرے لئے اس چہرے کی دلکشی کو بھول جانا ناممکن تھا۔ یوں بھی کسی حسین چہرے کو دیکھ کر بھول جانا میرے بس کی بات نہیں۔ کئی ایسے حسین چہرے کا نقشہ جنہیں میں نے اپنی زندگی میں محض چند مختصر ساعتوں کے لئے دیکھا ہے۔ اب تک میری زندگی کا سرمایہ ہے۔

میں اپنے قصے کو طوالت نہیں دے سکتا۔ اس لئے مختصراً یہ عرض کر دوں کہ اس شام کھیل سے فارغ ہونے پر ہم ایک دوسرے کے دوست ہو چکے تھے۔ ہفتہ بھر کی ملاقات کے بعد اس کے دل میں میرے متعلق وہ دلچسپی پیدا ہو رہی تھی جو آغاز الفت سے تعبیر کی جاتی ہے اور میرا سینہ جو اس وقت تک عشق کی تڑپ سے خالی تھا اس آگ سے بھڑک رہا تھا جس کی لو میں ساری دنیا حسن کا ایک جلوہ نظر آنے لگتی ہے۔ مگر میں نے اس کا نام ابھی تک آپ کو نہیں بتایا۔ کیونکہ آخر نام میں ہی کیا ہے؟ لیکن اگر آپ اس کے لئے اصرار کریں تو چلئے سہولت کی خاطر اسے یاسمین کے فرضی نام سے موسوم کر لیتے ہیں۔

اب پچھلی جمعرات یعنی ۲۷ جولائی ۱۹۳۹ء کا قصہ سنیئے۔

اس شام میرے اور یاسمین کے درمیان طے ہوا تھا کہ ہم دونوں ریگل سینما میں پہلا شو دیکھنے جائیں گے اور میں ساڑھے چھ بجے کے بعد اسے لینے کیلئے اس کے ہاں آؤں گا۔ یہ وہی شام تھی جب میں بیٹھا ہوا قتل کے مقدمے کے کاغذات دیکھ رہا تھا اور جس کا تذکرہ اس واقعہ کے ابتدا میں میں نے درج کیا ہے۔ میں نے گھڑی دیکھی تو چھ بج چکے تھے۔ میرے گھر سے رخصت ہونے میں گویا نصف گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے گھبرا کر مقدمے کے کاغذات پٹک دئے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ غسل سے فارغ ہو کر میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے شروع کئے۔ آج مجھے وہ سرور اور نشہ محسوس ہو رہا تھا۔ جو انسان کو زندگی میں سب سے بڑی کامیابی حاصل ہونے پر ہوا کرتا ہے۔ رگ رگ میں مسرت و ابتہاج کا خون دوڑ رہا تھا اور یوں دکھائی دیتا تھا گویا دنیا کی تمام مسرتیں سمٹ کر میرے نہاں خانۂ دل میں داخل ہو گئی ہیں۔

میں شاعر نہیں ہوں۔ لیکن مجھے اس دن واقعی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں سیاروں ستاروں، آفتاب ماہتاب، کہکشاں اور ثریا سب سے گزر کر جنت کے اس گوشے میں پہنچ گیا ہوں۔ جہاں افسردگی اور پژمردہ دلی کا گزر نہیں۔ دنیا پر بادۂ کیف و مستی کا نشہ چھایا ہوا نظر آتا تھا جس سے مدہوش ہو کر تمام کائنات عالم حسن و لطافت بن رہی تھی اور اس کا گوشہ گوشہ کیف و سرمستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے اور شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنی ہیئت کا جائزہ لینے لگا۔ نہ جانے میں یاسمین کے خیالوں میں کھویا ہوا وہاں کتنا عرصہ کھڑا رہا۔ کہ اچانک نصف گھنٹے کے گجر نے مجھے چونکا دیا۔ گویا یاسمین کے ہاں پہنچنے کیلئے میرے پاس صرف دس منٹ باقی تھے۔ میں جلدی سے پیچھے مڑا اور ٹوپی اٹھانے کے لئے لپکا۔ اتنے میں باہر کا دروازہ کھلا اور خادم نے اندر آ کر کہا۔

"ایک شخص آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔"

مجھے یہ غیر متوقع اور غیر ضروری آمد سخت ناگوار گزری اور میں نے ملازم سے درشت لہجہ میں کہا "تم جانتے نہیں مجھے اس وقت باہر جانا ہے۔"

"میں نے اسے رخصت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں مانا۔"

مجھے کچھ طیش سا آگیا اور اسے خود رخصت کرنے کیلئے باہر کی طرف چل دیا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جاتے ہی اس نالائق سے کہدونگا کہ بھلے مانسوں کا یہ وطیرہ نہیں کہ شام کے وقت وہ بن بلائے لوگوں کے مکانوں کا طواف کرتے پھریں۔ میں نے نشست کے کمرے کا دروازہ کھولا تو مجھے شام کی پھیلتی ہوئی تاریکی میں ایک آدمی کا ہلکا سا

سایہ کمرے کے باہر کے دروازے پر نظر پڑا جو مجرموں کی طرح چپ چاپ آہستہ آہستہ برآمدے کی دیوار کے ساتھ ایک متوحش انداز میں آگے آرہا تھا۔ مجھے وہ شخص اندھیرے کی وجہ سے نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن اس کا سایہ ایک ایسے ہیبتناک ہیولے کی صورت اختیار کئے ہوئے تھا کہ اس سے بے اختیار ڈر لگتا تھا۔ یکلخت نووارد دہلیز میں کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک لمبا تڑنگا فلاکت زدہ اور پریشان حال انسان تھا جس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوف اور دہشت کے آثار نظر آرہے تھے۔

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جو اس کے جسم کے مقابلے میں بالکل غیر فطری معلوم ہوتی تھی مجھ سے پوچھا "کیا آپ ہی وکیل صاحب ہیں؟"

اس کا لہجہ کچھ پڑھے لکھے انسانوں کا سا تھا۔ چنانچہ میں آیا تو اُسے دھتکار دینے کی نیت سے تھا۔ مگر اب میرے منہ سے صرف یہ نکلا "ہاں۔ کیا تمہیں کوئی کام ہے؟"

کچھ دیر فضا میں خاموشی طاری رہی، پھر وہ اسی دھیمی آواز میں بولا۔ "میں آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔"

بظاہر یہ ایک بہت معمولی سا سوال تھا۔ لیکن یقین کیجئے اس وقت مجھے یہ سوال حد درجہ غیر معمولی نظر آیا۔ بالآخر میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا "بہت اچھا میں تمہیں پانچ منٹ دے سکتا ہوں۔ اندر چلے آؤ۔ اور خدا کیلئے اپنا مطلب جلدی بیان کرو۔"

ہم دونوں نشست کے کمرے سے گزر کر دفتر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ ایک ناقابل بیان دہشت میرے دماغ پر مستولی ہو رہی تھی اور میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر میز کی طرف آگے کو جھک گیا۔ میں انتظار میں تھا کہ وہ اپنا مطلب بیان کرے لیکن غالباً وہ بھی اسی انتظار میں تھا کہ گفتگو کا آغاز میری طرف سے ہو۔ اس کی خاموشی سے میرا دھیان پھر یاسمین کی طرف گیا اور میں سوچنے لگا کہ اگر یہ شخص پانچ منٹ کے عرصے میں یہاں سے دفع نہ ہو گیا تو میں اُس کے ہاں وقت پر نہیں پہنچ سکوں گا۔ آخر میں نے جھنجھلا کر کہا "جلدی کرو مجھے اور ضروری کام بھی ہیں!"

اس پر وہ بولا "آپ وہی وکیل صاحب ہیں نا جو پچھلے دنوں ضلع فیروزپور کے ایک ڈاکے اور قتل کے مقدمے میں پیش ہوئے تھے۔"

میں الفاظ میں وقت ضائع نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے محض سر کے اشارہ سے اثبات میں جواب دیا۔ وہ پھر خاموش ہو گیا اور خلا میں دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ وہ کچھ حواس باختہ سا نظر آتا تھا اور اس کے چہرے سے یوں ظاہر ہوتا تھا گویا دیوانہ یا سودائی ہے جسے اپنا مافی الضمیر واضح کرنے میں بہت دقت کا سامنا ہے۔ بالآخر اس نے فرش کی طرف ہاتھ بڑھا کر کسی چیز کو اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ میں نے دیکھا تو یہ کھجور کے پتوں کا ایک بڑا سا تھیلا تھا۔ غالباً یہ تاریکی کی وجہ سے مجھے پہلے نظر نہیں آیا تھا۔ وہ بولا "بات یہ ہے کہ مجھے آپ سے قانونی مشورہ درکار ہے۔ میں نے قتل کر دیا ہے......"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور اس کی بیچارگی اور بیکسی پر لاپروا ہو کر میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ ظالمانہ اور بیرحم قہقہہ جس کے دوران میں اس نے یاس آگیں نظروں سے میری جانب دیکھا۔ پھر گھبرا کر بولا "اب جبکہ میں قاتل ہوں کیا آپ بتلائیں گے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

اتنا کہہ کر اس نے وہ کھجور کا تھیلا میز پر رکھ دیا اور متوحش نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی رام کہانی سنانے لگا۔ وہ کسی زمانے میں بہت بڑا تاجر تھا۔ شنگھائی میں اس کا کاروبار لاکھوں روپیہ میں پھیلا ہوا تھا۔ لیکن جنگ چھڑی تو جاپانیوں کی چیرہ دستیوں نے اسے خاک میں ملا دیا اور اب وہ مہینوں کے جانگداز مصائب کے بعد بحالت تباہ آج ہی گھر واپس لوٹا تھا اور جب گھر پہنچا تو......

مجھے اس کی طویل کلامی پر جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو پونے سات ہو چکے تھے۔ گویا میں نے نووارد کی بکواس سننے میں اپنا وقت کھو دیا تھا۔ مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے اس کے فقرے کو مکمل ہونے سے پیشتر اُٹھتے ہوئے کہا "تم مجھ سے مشورہ لینے آئے ہو اور میرا مشورہ یہ ہے کہ تم فی الفور تھانے چلے جاؤ اور اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔ لو اب جاؤ اور ایسا ہی کرو۔"

میرا خیال تھا وہ میرے جواب سے مایوس ہو جائے گا لیکن

اُس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور وہ کھڑا ہو کر بولا "بہت اچھا۔" اس کے بعد اس نے مجھے سلام کیا اور پھر کمروں میں سے گزرتا ہوا رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

میں نے پھر گھڑی دیکھی۔ وقت کے ضائع ہو جانے کا غم مجھے کھائے جا رہا تھا جب مجھے یہ خیال آتا کہ یاسمین کس طرح دروازے پر میری منتظر ہو گی تو میرا دل بیٹھ جاتا اور میں اس اجنبی کو کوسنے پر مجبور ہو جاتا۔ میں نے ٹوپی اٹھائی اور موٹر کی طرف لپکا۔ مگر باہر برآمدے میں پہنچ کر معاً مجھے خیال آیا کہ چابیوں کا گچھا جس میں موٹر کی چابی بھی شامل ہے دفتر کی میز پر بھول آیا ہوں۔ اپنے حافظے کو کوستا ہوا میں پھر پلٹا۔ میز پر بتی جل رہی تھی اور اس کی تیز روشنی میں چابیوں کا گچھا چمک رہا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میرے جسم کو کسی چیز نے چھوا۔

یہ وہی کھجور کے پتوں کا بھدا اور کرخت تھیلا تھا جسے غالباً اجنبی میز پر بھول گیا تھا۔

میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن یہ ایسا وزنی اور چکنا ہو رہا تھا کہ میرے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر پڑا اور اس کے ساتھ ہی اس میں سے کوئی سیاہ گول سی چیز لڑھک کر قالین پر جا رہی۔ میں نے رفع استعجاب کی خاطر میز پر سے بتی کو اُٹھا کر اُسے روشنی میں دیکھنا چاہا۔ لیکن اس پر نظر پڑتے ہی میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہے اور میں غش کی حالت میں زمین پر گرنے والا ہوں۔ مگر میں نے پھر غور سے دیکھنے کی کوشش کی تو واقعی میرے سامنے یاسمین کا چہرا تھا۔ اس کے عنبریں بال فرش پر بکھرے ہوئے تھے اور خون کے سیاہ قطرے قالین پر بہہ رہے تھے ——!

محمود نظامی ایم۔اے

گلدستۂ اشعار

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کدھر جاؤں

ناسخ

انگڑائی لینے پائے نہ تھے وہ اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مُسکرا کے ہاتھ

نظام رامپوری

شک نہ کر میری خشک آنکھوں پہ
یوں بھی آنسو بہائے جاتے ہیں

ساغر نظامی

مئے رنگیں تھا سادہ پانی بھی
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

جوش ملیح آبادی

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

مومن

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا

انشاء

خبر نگاہ کو، نگاہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

غالب

خبر کیا تھی جدائی اس طرح محروم کر دیگی
محبت عمر بھر کی ورنہ میں اک پل میں کر لیتا

حامد

زبان دہن میں تو غنچہ کے بھی ہے کیا لازم
کہ جس کے منہ میں زباں ہو سخنوری جانے

سودا

بیرندر ناتھ منٹو ایم۔اے

شعر

اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ
ہم کو غصہ پہ پیار آتا ہے

امیر مینائی

ہوس

رہتے ہو کس لئے مری آہوں سے دُور دُور
میرے الم سے، میری نگاہوں سے دُور دُور

تمہیدِ رسم و راہ میں اتنا حجاب کیوں
مجھ پائمالِ شوق پر آخر عتاب کیوں

کیوں مجھ ستم زدہ پہ جفائے مدام ہے
کیا تم کو میرے صدق میں کوئی کلام ہے

کیا تم کو واقعی مرے دل کی خبر نہیں
اتنی بھی غم شناس تمہاری نظر نہیں

اُلجھی ہوئی ہے رُوح امیدوں کے خار سے
دل ہیں سُلگ رہے ہیں الم کے شرار سے

جاں شعلہ آفریں ہے، نظر بیقرار ہے
میرے غمِ نہفتہ کی آئینہ دار ہے

آتش بھڑک اُٹھی ہے جنوں کے چراغ سے
شعلے نکل رہے ہیں جگر سے، دماغ سے

مارا ہے مجھ کو حادثۂ انتخاب نے
کچھ تم نے اور کچھ دلِ خانہ خراب نے

اُلفت نہ ہو سکے تو ذرا بات ہی سہی
پیرایۂ کرم میں کوئی گھات ہی سہی

باقیؔ صدیقی

نوجوان لیڈر

ہندوستان میں لیڈروں کی فصل عام ہو رہی ہے - خصوصاً نوجوانوں میں یہ غلط فہمی بہت پھیل رہی ہے کہ قوم کی نجات کے ضامن ہمیں ہو سکتے ہیں - یہ مضمون اسی قسم کے ہر خود غلط نوجوان رہنماؤں کے متعلق ہے - لیکن اس سے کسی خاص فرد یا جماعت پر حملہ مقصود نہیں - اس لئے کوئی صاحب خواہ مخواہ اس ٹوپی کو اپنے سر پر موزوں کرنے کی کوشش نہ فرمائیں -

حاسد میرے خلاف لاکھ پروپیگنڈا کرتے پھریں لیکن مجھے پختہ یقین ہے کہ میں پیدائشی لیڈر ہوں - حسد کی آگ میں جلنے والے مخالفوں کی زبان کو کون پکڑ سکتا ہے؟ جو ان کے منہ میں آتا ہے وہ کہے جائیں - لیکن ان سے تو انہیں بھی انکار نہ ہوگا کہ مجھے فطرت کی طرف سے بعض ایسے جوہر ودیعت کیئے گئے ہیں - جو محض بڑے بڑے رہنماؤں کا حصّہ ہوتے ہیں - میں سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ایک آل انڈیا انجمن کا سیکرٹری تھا - کیا یہ حقیقت اس امر کا ثبوت نہیں کہ قدرت نے مجھے ہندوستان کے تباہ حال اور بدقسمت عوام کی قیادت کیلئے انتخاب کر رکھا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس انجمن کے صرف دو ارکان تھے لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟ دنیا کے تمام عظیم الشان کارناموں کی ابتدا نہایت حقیر تھی - کیا روم کی تعمیر ایک ہی دن میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تھی؟ اصل چیز عزم اور ارادہ ہے - ارادوں کی بلندی سے کسی انسان کی عظمت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے - اور اگر مجھے اس معیار پر پرکھا جائے تو میرے بدترین مخالف بھی میری عظمت کے اعتراف پر مجبور ہوں گے -

میرا اعتقاد ہے کہ میری کوششیں ایک دن ضرور کامیاب ہوں گی - میری مخلصانہ جدوجہد کبھی رائیگاں نہیں جا سکتی - خدا بے غرض عمل کی جزا ضرور دیتا ہے - میری مساعی ضرور مشکور ہونگی - اور ہندوستان ایک دن آزاد ہو کر رہے گا اور میں اپنے وطنِ عزیز کی آزاد جمہوریت کا پہلا صدر ہوں گا - میرے علاوہ اس اعزاز کا مستحق کون ہے؟ آزاد قوم کی قیادت اسی کو زیب دیتی ہے - جس نے اسے آزادی کی نعمت عطا کی ہو - جس شخص نے انقلاب کے پُر خروش ایام میں ملک کی کامیاب رہنمائی کی ہو امن کے دنوں میں صدارت کا سہرا بھی اسی کے سر پھبتا ہے - جب میں اپنے ان عزائم کا ذکر کرتا ہوں تو حاسد ہنستے ہیں - میرا مذاق اڑاتے ہیں - مجھ پر پھبتیاں کستے ہیں - لیکن کیا میں ان کے طعن و تشنیع سے ڈر کر حوصلہ ہار دوں گا؟ جنہیں کام کرنا ہوتا ہے وہ عوام کے استہزا کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے - میرے سامنے ایک مقدس اور جلیل القدر مقصد ہے اور میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس کے حصول کیلئے ہر قسم کے مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کروں گا - لوگوں کی ہنسی میرے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں کر سکتی - کم ہمت لوگ ہمیشہ بڑے آدمیوں کا مذاق اڑاتے رہے ہیں - کیا لوگوں نے نپولین کو طعن و تشنیع کے تیروں کا ہدف نہیں بنایا؟ کیا بسمارک کی ہنسی نہیں اڑائی گئی؟ کیا گیری بالڈی کو دیوانہ نہیں کہا گیا؟ اور آج دنیا انہی لوگوں کی عظمت کی قائل ہے - تاریخ کے صفحات ان کے کارناموں سے پُر ہیں اور ان کا مذاق اڑانے والوں کو کوئی جانتا تک نہیں - اُن کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے - بقائے دوام کا تاج صرف اولوالعزم لوگوں کے لئے ہے - وہ بزدل اور کم ہمت جو صرف دوسروں پر ہنسنا جانتے ہیں - گمنامی کے پردے میں چھپ جاتے ہیں - لیکن ان لوگوں کا نام ابدالآباد تک زندہ رہتا ہے جو دنیا کی تعریض و تعریف سے بے نیاز ہمیشہ اپنے مقصد کے حصول کیلئے سرگرمِ کار رہتے ہیں - آج جو لوگ مجھ پر ہنستے ہیں - مجھے دیوانہ کہتے ہیں - مجھے طرح طرح کے ناموں سے پکارتے ہیں - کل مجھے ملک و ملت کے نجات دہندہ کے لقب سے یاد کریں گے - تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے - دنیا کے تمام بڑے بڑے آدمیوں سے ہمیشہ یہی ہوتا چلا آیا ہے - پھر میں لوگوں کی ہنسی کی کیوں پروا کروں؟

میرے دشمن کہتے ہیں کہ میں مذہب کے نام کا ناجائز استعمال کرتا ہوں۔ لیکن وہ یہ فتویٰ دینے والے کون ہوتے ہیں؟ میں نے مانا کہ مجھے مذہب سے کوئی انس نہیں۔ میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہے جہاں مذہب کا چرچا بالکل نہ تھا۔ میں مذہب کے ابتدائی اصولوں سے بھی ناواقف ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں سٹیج پر مذہب کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ اگر جنگ اور عشق میں سب کچھ جائز ہے۔ تو سیاست میں کس چیز کو ناجائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ سیاست میں تو وہ چیزیں بھی جائز ہیں جو بشاید عشق اور جنگ تک میں ناجائز سمجھی جاتی ہوں۔ میں اسٹیج پر یہ نعرہ لگاتا ہوں کہ "مذہب خطرے میں ہے۔" کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس طرح بھولے بھالے عوام کو جس راہ پر لگانا چاہوں لگا سکتا ہوں۔ مجھے بزرگانِ دین سے کوئی عقیدت نہیں۔ میں تو ان میں سے اکثر کے نام سے بھی نا آشنا ہوں۔ لیکن کیا میں ان کا واسطہ دیکر لوگوں کے جذبات کو اپیل نہیں کر سکتا؟ کیا یہ بزرگ اور مقدس ہستیاں اور ان کا فیض صرف ان لوگوں کا اجارہ ہے۔ جنہوں نے ان کے سوانح حیات کا نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے اور جو ان کی زندگیوں کو اپنے لئے لائحہ عمل بنائے ہوئے ہیں؟ وہ لوگ جو اس قدر تنگ نظرانہ زاویہ نگاہ رکھتے ہوں، کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ اور پھر میری مجبوریوں کو بھی تو دیکھئے۔ مجھے اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ میں ان بزرگوں کی زندگیاں کا مطالعہ کرتا پھروں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ آج سے چودہ پندرہ سو سال پہلے کے اصول بیسویں صدی میں کام نہیں دے سکتے۔ سیاسیات میں اندھی عقیدت کو رہنما بنانا درست نہیں۔ مجھے ان بزرگوں کی عظمت کا اعتراف ہے لیکن میں ان کے اصولوں پر چل کر اپنی قوم کی کشتی کو ساحلِ مراد تک نہیں پہنچا سکتا۔ مگر مجھے ان سے کوئی بغض بھی نہیں ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں ان کے نام سے فائدہ اٹھانا عار نہیں سمجھتا۔ حاسد میری اس نیک نیتی کو کسی اور ہی رنگ میں پیش کریں تو میں انہیں کیسے روک سکتا ہوں؟

میرے بدخواہ کہتے ہیں کہ میں مستقل مزاج نہیں۔ میں نے انجمنیں بنائیں اور توڑ ڈالیں۔ میں کہتا ہوں یہی بات تو میرے استقلال کا ثبوت ہے۔ مجھے جماعتوں یا انجمنوں سے نہیں بلکہ اصول اور مقصد سے محبت ہے۔ انجمنیں مقصد کیلئے ہیں۔ مقصد انجمنوں کیلئے نہیں۔ میں ایک انجمن کی تشکیل کرتا ہوں یا اس میں شریک ہوتا ہوں تو اس لئے نہیں کہ مقصد کو اس پر قربان کر دیا جائے بلکہ اس لئے کہ اسے حصولِ مقصد کا ذریعہ بنایا جائے۔ لیکن ابھی میری قوم میں خود غرض لوگوں کی اکثریت ہے۔ میں نے کئی انجمنوں کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے لیکن جب وہ ترقی کر جاتی ہیں تو خود غرض لوگ ان پر قابض ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے جو میری غیر مشروط اطاعت سے انکار کرتے ہیں جب میری زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمتِ ملت کیلئے وقف ہے جب میرا ہر فعل قوم کی فلاح کیلئے ہے اور جب میرا ہر قدم ملک کی ترقی کیلئے اٹھتا ہے تو پھر میرے اعمال و افعال کو تنقید کی کسوٹی پر کیوں پرکھا جاتا ہے؟ میں ایسے قدر ناشناس رفقائے کار کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں ان سے علیحدہ ہو کر ایک نئی جماعت بنا لیتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے بیس پچیس سال کی عمر میں کئی جماعتیں بنائی اور تباہ کی ہیں۔ یہ درست ہے۔ لیکن کیا اس تعمیر و تخریب میں میری کوئی ذاتی غرض شامل تھی؟ اگر میں نام و نمود کا بھوکا ہوتا تو ہمیشہ ان انجمنوں سے وابستہ رہتا جن کی ترقی و عروج کیلئے میں نے سالہا سال شب و روز محنت کی ہے۔ لیکن میں نے قومی خدمت کو ہمیشہ ذاتی اغراض پر مقدم رکھا اور جب دیکھا کہ یہ انجمنیں اب نااہل لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی ہیں تو ان کی تخریب کیلئے ان کی تعمیر سے کہیں زیادہ سرگرمی دکھائی۔ کیا اس وقت میرا دل خون نہیں ہوتا تھا جب میں اپنے ہی لگائے ہوئے پودے کی جڑ پر کلہاڑا چلا رہا ہوتا تھا؟ میں انسان ہوں۔ مجھ میں بھی محبت اور انس کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر انسانی کمزوری مجھ پر غالب آ جاتی تھی اور اکثر مجھے صدمہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ لیکن میں نے ملت کے مقاصدِ جلیلہ کی خاطر ہمیشہ اپنے جذبات کو کچلا۔ اگر اسی کا نام عدمِ استقلال ہے تو میں اس پر۔۔۔ قطعاً کسی قسم کی ندامت محسوس نہیں کرتا۔

میرے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ میں محسن کش ہوں۔ میں نے ان لوگوں کے گلے پر چھری پھیری ہے۔ جنہوں نے مجھے مصیبت کے وقت پناہ دی۔ لیکن میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جہاں قومی مقاصد درپیش ہوں وہاں میں ذاتی تعلقات کی قطعاً

کوئی پروا نہیں کرتا - ہماری تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جہاں ملت کی عزت کا سوال پیش نظر تھا - وہاں باپ نے بیٹے کا اور بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا - اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ وہ مجھ پر کوئی احسان کر کے مجھے خدمتِ قوم کی راہ سے برگشتہ کر سکتا ہے تو وہ غلطی پر ہے - میں ایک عزم لے کر اُٹھا ہوں - اور جب تک وہ پورا نہیں ہو جاتا میں فروعی مسائل کی طرف کوئی توجہ نہیں دے سکتا - میری عزیز میری دوست اور میری محسن میری قوم ہے اور جہاں میری قوم اور میرے ذاتی عزیزوں - دوستوں یا محسنوں کے مفاد ٹکراتے ہوں وہاں میں قوم کا ساتھ دوں گا - یہی اصول ہمیشہ میری زندگی کا لائحہ عمل رہا ہے اور میں مرتے دم تک اسی پر کاربند ہوں گا - میں جانتا ہوں کہ مجھے بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا - لیکن میں نے یہ سب کچھ سمجھتے اور جانتے ہوئے خدمتِ وطن کی وادی میں قدم رکھا تھا اور اب کوئی رشتہ یا تعلق مجھے یہ قدم پیچھے ہٹانے پر مجبور نہیں کر سکتا - ع

یا جاں رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

حاسد میری قابلیت پر بھی حملہ کرتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ میں کم سواد اور جاہل ہوں - میرا مطالعہ محدود ہے - میں نے مذہب فلسفہ یا سیاست پر کوئی کتاب نہیں پڑھی - لیکن وہ یہ نہیں سوچتے - کہ قابلیت اور مطالعہ لازم و ملزوم نہیں - کیا اَن پڑھ لوگوں نے کاروبارِ حکومت کو کامیابی سے چلا کر یہ ثابت نہیں کیا کہ صاحب جوہر کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز رہتے ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے سیاست یا اقتصادیات پر کوئی کتاب نہیں پڑھی - لیکن اس کے باوجود میں نے سیاسی اور اقتصادی مسائل پر گھنٹوں لکچر دیئے ہیں - میں اشتراکیت کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں جانتا - لیکن باینہمہ میں نے کئی بار اس پر تنقید کی ہے - اس کے برعکس ہزاروں لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر مطالعہ کتب میں ضائع کر دی ہے لیکن وہ میرے سامنے پانی بھرتے ہیں - وجہ یہ ہے کہ ایک من علم کیلئے دس من عقل کی ضرورت ہے اور یہ لوگ اس سے بالکل بے بہرہ واقع ہوئے ہیں - میں علم کی کمی بھی عقلِ خداداد سے پوری کر لیتا ہوں لیکن اس کے باوجود حاسد کہتے ہیں کہ میں بالکل جغد ہوں - اب آپ ہی بتایئے کہ حسد کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟

حمید نظامی

نوآموز افسانہ نویسوں کیلئے

افسانہ نویسوں کی تعداد ہر روز بڑھ رہی ہے لیکن اکثر افسانہ نویس اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں - ذیل میں ہم نئے افسانہ نویسوں کیلئے چند ہدایات درج کرتے ہیں -

۱ - کہانیاں لکھنے سے پہلے کہانیاں بار بار پڑھو -

۲ - اپنی پہلی کہانی کو چھ مہینے کے لئے کہیں رکھ دو - اور اس کے بعد پھر پڑھو - تم یقیناً ردی سمجھ کر اسے پھینک دو گے -

۳ - جو مقام تم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اس کا ذکر اپنی کہانی میں کبھی نہ کرو -

۴ - جس زمانہ کے رسم و رواج کا تمہیں علم نہیں اس کا ذکر بھی اپنے افسانہ میں نہ کرو -

۵ - اپنی کہانی خود پڑھو اور پھر اپنے آپ سے پوچھو کہ میں اس میں کونسی بات دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں -

۶ - کیا پڑھنے والا تمہاری کہانی پڑھ کر گناہ کا قائل تو نہ ہو جائیگا اگر جواب مثبت میں ہے تو سوسائٹی کے لئے تمہاری کہانی ناپاک ہے

۷ - تمہاری کہانی ایک کشتی ہے - کیا مقابلہ کی کئی کشتیوں میں تمہاری کاغذ کی کشتی تو نہیں؟ اگر ہے تو اسے خود ہی غرق کر دو - ورنہ یہ کام دوسروں کو کرنا پڑے گا -

۸ - کیا تمہاری کہانی قدرت کے مطابق ہے - اگر نہیں تو قدرت اس کے مطابق نہ ہو گی -

۹ - تمہاری کہانی تمہاری اولاد ہے - اس کی خوبصورتی کو تم نہیں دوسرے دیکھ سکتے ہیں -

۱۰ - تمہاری کہانی سیدھی سادی - مختصر اور واضح ہونی چاہیئے - لمبی اور پیچیدہ کہانیوں کا زمانہ گزر گیا - اور اب وہ کبھی واپس نہ آئیگا -

۱۱ - تمہاری کہانی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہیئے - کہ وہ کہانی معلوم نہ ہو -

(آرٹ اینڈ لٹریچر - لندن)

آتشِ شوق

(گلبانگِ حیات زیرِ تدوین کا ایک ورق)

۱

آتشِ شوق فرشتوں کی تمنّاۓ عزیز — آتشِ شوق نے ہی خاک کو بخشی ہے تمیز
آتشِ شوق سے ہے جوہرِ ہستی کی نمود — زندگی نام ہے جس کا ہے یہی چیز وہ چیز

۲

آتشِ شوق ہی دراصل ہے گلزارِ خلیلؑ — آتشِ شوق کو دیتا ہے ہوا جبرائیلؑ
آتشِ شوق کے قائل کی جزا جلوۂ طور — آتشِ شوق کے منکر کی سزا موجۂ نیل

۳

آتشِ شوق سے ہے شمعِ شبستانِ حیات — آتشِ شوق سے ہے تازہ دمِ ایمانِ حیات
فیض سے جس کے ہوا کرتا ہے "آدمِ مومن" — آتشِ شوق ہے وہ آیۂ قرآنِ حیات

۴

آتشِ شوق ہے بیتابیٔ جوہر کی دلیل — آتشِ شوق ہے تکمیلِ تمنّا کی کفیل
آتشِ شوق سے خالی ہے امینؔ جو دل بھی — یا تو کمزور وہ بیچارہ ہے یا خوار و ذلیل

امین حزیں (سیالکوٹی)

خوش رہو!

کشتی کنارے جا لگی۔ میں ملاحوں کو جی ہی جی میں ہزار ہزار صلواتیں سناتا خشکی پر آ رہا۔ اور تھیلا ہاتھ میں لٹکا کر پگڈنڈی پر ہو لیا۔

گرمیوں کی رخصتیں تھیں۔ اور میں ایک عزیز دوست کے ہاں جا رہا تھا، جو دریا کے کنارے سے آٹھ میل دور ایک قصبے میں رہتا تھا۔ میں نے اُسے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دے رکھی تھی۔ ورنہ اونٹ یا گھوڑے کا انتظام ہو جاتا۔ دراصل میں اُسے اپنی آمد سے متعجب کرنا چاہتا تھا۔ گاڑی تو اسٹیشن پر دو بجے ہی پہنچ گئی تھی۔ اور میں ڈھائی بجے کشتی پر بھی سوار ہو گیا۔ لیکن دریا چڑھاؤ پر تھا اور ملاحوں کے لمبے لمبے چپو جھاگ اُگلتی ہوئی موجوں کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ کشتی کبھی اِدھر پھر جاتی تھی۔ کبھی اُدھر مڑ جاتی تھی۔ چپو پانی میں یوں غوطوں پر غوطے لگا رہے تھے۔ جیسے کوئی جاندار چیزیں ہوں۔ اور لپک لپک کر موجوں کو کاٹ کھانا چاہتی ہوں۔ ہم مسافر بھیگ گئے تھے۔ اور چار بجے ہمیں یہ سن کر بہت رنج ہوا کہ ہم جائے روانگی سے چند میل آگے جانے کے بجائے ایک میل مخالف سمت کی طرف ہٹ آئے ہیں۔ آخر کنارے سے دو ملاح مدد کے لئے بلائے گئے۔ کشتی میں چند نوجوان مسافروں نے بھی زور لگایا اور بصد مشکل سب کی متفقہ کوششوں سے کشتی کنارے لگی!

اب میں دن چھپنے سے پہلے قصبے میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن اس پست قد گنجان جھاڑیوں سے پٹے ہوئے جنگل میں کوئی ایسی آبادی بھی تو نہ تھی۔ کہ میں وہاں رات بسر کر سکتا۔ خدا کا نام لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پگڈنڈی پر اڑنے لگا۔

اچانک مجھے پیچھے سے کسی نے آواز دی "ٹھہر جاؤ!"

میں گھبرا کر رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو گھاٹ پر پولیس کے چار سپاہی کھڑے مجھے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ میری سنہری عینک اور گورا رنگ دیکھ کر سہم گئے۔ اُن میں سے ایک بولا۔ "آپ جا سکتے ہیں!"

لاحول ولا قوۃ! یہ کیا مذاق ہے! لیکن مجھے چراغ جلے قصبے میں پہنچنا تھا اور پولیس والوں کی اس غیر قانونی مداخلت پر دانت پیسنے کا میرے پاس وقت نہ تھا۔ میں پلٹ کر اپنی راہ پر تقریباً بھاگنے لگا!

آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے اور دُور اُفق پر گاہے گاہے بجلی چمک اٹھتی تھی۔ ہوا نمی سے بوجھل ہو رہی تھی اور تمام منظر جیسے بارش کا منتظر کھڑا تھا۔ میرے قدم اس خیال سے اور تیز ہو گئے، کہ اگر اس ویرانے میں بارش شروع ہو گئی۔ تو عجب نہیں کہ سردی سے ٹھٹھر کر اکڑ جاؤں۔ یا کسی برساتی نالے کی زد میں آ کر کسی چٹان سے ٹکرا کر مر جاؤں۔

میں چار میل طے کر آیا ہوں گا کہ بوندا باندی شروع ہو گئی اور آس پاس ہری فصلوں پر بوندیں ٹپا ٹپ ایک مسلسل راگ الاپنے لگیں۔ کھیتوں کے کناروں پر شاید آگ کے خشک پتے زور زور سے کھڑکھڑانے لگے۔ میں خوفزدہ سا ہو گیا۔ مجھے بھوتوں اور دیگر ارواح غیر مرئی پر کوئی یقین نہیں۔ لیکن اب میں محسوس کرنے لگا۔ جیسے ساری کائنات ارواح خبیثہ کے قبضے میں ہے، اور جیسے وہ کھیتوں کے کنارے پودوں کی آڑ میں مجھ پر تالیاں بجا رہے ہیں۔ قہقہے لگا رہے ہیں۔ اور مجھے پھانس لینے کے متعلق سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ خوف نے میرے عقب میں کسی کے پاؤں کی چاپ بھی پیدا کر دی۔ بہت دیر تک میں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ لیکن جب خوف کی آخری حد پر پہنچ کر محسوس کیا۔ کہ میرا اگلا اینٹھ رہا ہے۔ تو آپ سے آپ میری گردن مڑ گئی۔ اچانک بجلی پوری شدت سے چمکی اور دُور ایک کبڑا ٹھنٹھ پگڈنڈی کے عین درمیان ظاہر ہوا کہ اندھیرے میں جذب ہو گیا۔ اس کے بعد بادل اس زور سے گرجا جیسے پہاڑ کروٹ بدل رہے ہیں!

میں اقبال کے اشعار گنگنانے لگا۔ لیکن میری سراسیمگی سے ہٹ، گنگناہٹ میرے لئے مصیبت بن گئی۔ مجھے خود اپنی آواز پر کسی بھوت کی

آواز کا گمان ہونے لگا - میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چار طرف دیکھنا شروع کیا۔ لیکن گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مجھے خود اپنا وجود ہی نظر نہیں آتا تھا -

اچانک مجھے راہ کی بائیں جانب ایک دیا سا ٹمٹماتا دکھائی دیا - یہ شاید ایک جھونپڑی تھی - جس کے دروازے پر ایک بے حس و حرکت سایہ سا کھڑا تھا - میں نے وہیں کھڑے ہو کر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے آواز دی "کیا مسافر کو رات گزارنے کے لئے کوئی کونا کھدرا مل سکے گا؟"

سایے میں حرکت ہوئی - ایک اور سایہ فرش پر سے اُبھرا اور دوسرے کے قریب ہو کر پھر جدا ہو گیا -

"آجاؤ" ــــ آواز میں بڑھاپا تھا -

اب گنجان اور موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں - میں جھونپڑی کی طرف بھاگا اور دروازے کے پاس رک کر ہانپنے لگا -

"اندر آجاؤ -"

میں اندر چلا گیا -

یہ ایک بہت بوڑھی عورت تھی - اس کے بال کھچڑی ہو چکے تھے - اور چہرے کی جھریوں کا انجام اور آغاز معلوم نہیں ہوتا تھا - اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی - اُس کے سارے جسم میں رعشہ تھا اور سر تو بار بار رعشے کی شدت سے اِدھر اُدھر جھک جھک جاتا تھا - "تم کہاں سے آرہے ہو مسافر بیٹا"، اُس نے کانپتی آواز میں محبت سے پوچھا -

"گھاٹ سے"، میں نے تھیلا فرش پر رکھتے ہوئے کہا -

"گھاٹ سے؟ کشتی آگئی ہے کیا؟ اے شیدو کشتی گھاٹ پر آگئی - یہ مسافر وہیں سے اُتر کر آرہا ہے -"

ایک لڑکی دیوار سے لگ کر کھڑی تھی - میں نے اس کی طرف دیکھا تو بس چہرے پر شفق پھول کر رہ گئی - اس نے لجا کر نیچے جو دیکھا تو میں سمجھا آسمان اپنے ستاروں سمیت زمین پر آرہا ہے! یونہی نیچی نظریں کئے وہ بولی "مگر اماں - بھیا نہ آیا۔"

"آرہا ہوگا - یہ مسافر تو بہت تیز آرہا ہے، ہانپ رہا ہے بے چارا - گھبرا گیا ہے بارش سے - اِسے کھاٹ پر چادر ڈال دو اے میاں مسافر آرام کرو تم - ہم تو آج رات جاگتی رہیں گی - آج میرا بیٹا آرہا ہے!"

اوہ! یہ بات! میں مسکرانے لگا - کتنی معصومیت اور کتنی محبت ہے - ان دو روحوں کے انتظار میں کتنا خلوص ہے - ان دو پاکیزہ سینوں میں! میرا بیٹا آرہا ہے - میرا بھیا آرہا ہے! زندگی بھی عجیب چیز ہے - یہ آرزوئیں - یہ امیدیں - یہ انتظار - اُف! زندگی بھی عجیب چیز ہے! کبھی وہ یہاں سے پردیس سدھارا ہوگا - ان کی آنکھیں بھیگ گئی ہوں گی - پھر راتوں کو انہوں نے ٹوٹی کھاٹوں پر سر بسجدہ ہو کر دعائیں مانگی ہوں گی - نذریں دی ہوں گی - پیر جی کے پاؤں چومے ہوں گے - سنیاسیوں سے پترے پھنکوائے ہوں گے - بزرگوں کے مزاروں پر رنگدار کھدر کے غلاف چڑھائے ہوں گے - "میرا بیٹا جیتا رہے - میرا بھیا دولہا بنے!" اور آج اس کی واپسی کا دن ہے - وقت اپنی تیز رفتاری کو کیسے کیسے بوقلموں پردوں میں چھپائے بیتا جا رہا ہے!

"کھانا کھاؤ گے میاں مسافر؟" بڑھیا نے کمال مہربانی سے پوچھا -

لیکن میرے پاس کھانے کا کافی سامان موجود تھا - میں نے شکریہ ادا کیا - تھیلا کھولا - ڈبل روٹی اور آم کے مربے سے خوب سیر ہوا - کوٹ ایک طرف برتنوں پر ڈال دیا - ٹوپی لکڑیوں کے ایک ڈھیر پر دھر دی - اور کھاٹ پر ہو بیٹھا - شیدو نے چادر بچھا دی تھی - اِس دوران میں اُس نے اپنے سارے جسم کے ارد گرد کچھ ایسے طریقے سے چادر لپیٹ لی تھی - کہ مجھے اُس کی آنکھوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا - اور اس کی آنکھیں ــــ تاروں کی طرح چمک رہی تھیں - ایک بار دروازے کی طرف مڑتے ہوئے اُن میں دیے کا جو عکس پڑا تو میں سمجھا باہر بجلی چمک اٹھی ہے -

میں نے پوچھا "ماں - کہاں گیا ہے تیرا بچہ -"

بڑھیا اُسی طرح باہر دیکھتی ہوئی بولی "مزدوری کرنے بیٹا - وہ کوئٹے میں مزدوری کرنے گیا تھا - چار سال ہوئے کوئٹے میں بڑی آفت آئی تھی - تم نے سنا ہوگا - سارا شہر زمین پر بچھ کر رہ گیا - ہم سے آدھ میل دور ایک گاؤں ہے - وہاں کے نمبردار نے ہمیں بتایا - کہ کوئٹے میں مزدوروں کی ضرورت ہے، بیٹا گبرو تھا - رضامند ہو گیا - مجھے بھی اُس کے بیاہ کیلئے کچھ رقم کی ضرورت تھی - اللہ کا نام لے کر چل دیا - وہاں دو سال کاٹ کر آرہا ہے - ہر مہینے دس روپے بھیجتا رہا ہے - میں نے پچھلے سال گاؤں

میں ایک لڑکی بھی ڈھونڈھ نکالی - خوبصورت اور سگھڑ - کپڑے پر پھول کاڑھتی ہے - جیسے کسی نے سچ مچ پھول توڑ کر دھر دیا - اُس کے ماں باپ نے جو سُنا کہ نوازؔ آنے والا ہے - تو کہنے لگے کہ بیاہ کی تاریخ مقرر کرو - میں نے کہا وہ آئے گا - کچھ روز آرام کرے گا - پھر تسلی سے سب کچھ ہو جائے گا - کہنے لگے نہیں - جو بات کل ضرور ہونی ہے وہ آج ہی کیوں نہ ہو جائے - انہوں نے تو کل کی تاریخ مقرر کر دی - میں نے چیخ پکار کر پرسوں کا دن مقرر کیا ہے، ہفتہ سے ہمارے ہاں گاؤں کی لڑکیاں آ رہی ہیں - رات بھر گلے گائے جاتے ہیں - ناچ ہوتے ہیں - ڈھولک پر جو تھاپ پڑتی ہے، تو پو پھٹے تک کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ چاند ڈوب گیا اور تارے ماند پڑ گئے - پھر جو یہ تھک کر سوتی ہیں - تو بیٹا میں انہیں دیکھ دیکھ کر بہت ہنستی ہوں - ایک کا سر دوسری کی ٹانگوں پر ہے تو دوسری کی ٹانگیں تیسری کے سر پر - بس ٹانگیں، باہیں اور بالوں کا جال بچھ جاتا ہے! پرسوں آدھی رات کو دیئے کا تیل ختم ہو گیا - بتی اوپر چڑھاتی گئیں، چڑھاتی گئیں، ساری بتی راکھ ہو گئی - اندھیرا چھا گیا پر ڈھولک اُسی طرح بجتی رہی - اندھیرے میں ناچ بھی ہوا - آج رات بارش کی وجہ سے نہیں آسکیں - ہم نے کپڑے تیار رکھے ہیں - گندم خریدلی ہے - کچھ زیور بھی بنوا لئے ہیں - اری شیدو وہ چاندی کے کڑے تو میاں مسافر کو دکھا دے - ہائے ہائے تو تو سمٹی جا رہی ہے - اپنا بھائی ہے تیرا - شیدو تم سے شرما رہی ہے مسافر بیٹا - پرسوں تم بھی نوازؔ کی شادی دیکھ کر چلے جانا - ہمارے علاقے کا میراثی ایسی شہنائی بجاتا ہے - کہ لاہور والے بھی سُن پائیں تو منہ میں انگلی ڈال لیں - ٹھہر سکو گے کل کا دن؟"

میں بڑھیا کی ایسی ہلکی پھلکی تقریر بغیر اکتائے سنتا رہا اور حیران ہوتا رہا - کہ یہ بڑھیا جس نے تقریباً ستر سال اس جھونپڑی میں گزارے - شدت کی گرمیوں میں کھیتوں کی نگہبانی کی - سردیوں میں ٹھٹھرتی رہی - رنج بھوگے - مصیبتیں سہیں - آج یوں باتیں کر رہی ہے، جیسے اُس کے من پر ایک ذرا سی خراش تک بھی نہیں! امید کتنی بڑی ساحرہ ہے!

میں نے کہا "ماں جی - مجھے قریب ہی ایک گاؤں میں جانا ہے - پرسوں شادی کے وقت میں یہاں ضرور پہنچ جاؤں گا۔"

وہ دروازے سے ہٹ آئی - اور انتہائی مسرت سے مجبور ہو کر اس زور سے ہنسی جیسے کوئی ٹین کے ڈبے میں پتھر ڈال کر کھڑکھڑا رہا ہے! بولی "ہے میرے بچے، تو کتنا اچھا ہے - ضرور آئیو - اور میرے نوازؔ کی گلابی رنگ کی واسکٹ پر سیپ کے ان گنت بٹنوں کی بہار دیکھیو جو شیدو نے خاص اس کے لئے تیار کی ہے!"

شیدو نے بھی کڑے نکالتے ہوئے میری طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا! میں نے سمجھا مجھ پر کسی نے چنبیلی کے پھولوں کی بارش برسادی ہے!

میں نے کڑے انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا "اوہ - یہ کڑے ہیں! بہت خوبصورت ہیں - بہت اچھے ہیں - سُنار نے غضب ڈھایا ہے! یہ نقش دیکھو - یہ پھول دیکھو - اور صفائی کیسی ہے ان میں - کیسے چمک رہے ہیں! کتنے بھاری ہیں! بڑی چاندی خرچ آئی ہو گی ان پر؟"

بڑھیا ہاتھ ملتے ہوئے بولی - "آدھ سیر - پوری آدھ سیر!" بڑھیا کی سانس پھول رہی تھی "دو پاؤ"۔

"اللہ کرے تیری بہو سو سال تک سہاگن رہے!" میں نے کڑے واپس دیتے ہوئے کہا - شیدو نے اب اپنی چادر ڈھیلی کر دی تھی - اب مجھے اُس کا چہرہ نظر آرہا تھا - صاف ستھرا جیسے مصفا جھیل پر پورے جاند کا عکس!

میں نے بھاری آواز میں کہا "میں سو رہا ہوں - تم کب سوؤ گی؟"

"آج رات تو ہم نہیں سو سکیں گی - آج رات تو نوازؔ آرہا ہے۔"

میں مسکرایا - وہ دونوں دروازے پر کھڑی تھیں - میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا - مگر نیند کہاں - اتنے ہلکے پھلکے ماحول میں میری رُوح نے نیا چولا بدل لیا تھا - میں اپنے آپ کو ان دونوں کی مسرتوں سے بیگانہ نہ رکھ سکا -

اور ابھی تک نوازؔ کیوں نہیں آیا!

میں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا - ڈیڑھ بج رہا تھا!

میں بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا - اور شاید اس دوران میں میری آنکھ بھی لگ گئی - میں نے محسوس کیا کہ نوازؔ کھیتوں کی مینڈھوں پر سے پھلانگتا جھاڑیوں پر سے کودتا جھونپڑی کی

کی طرف ہنستا ہوا بڑھا آ رہا ہے! میں چارپائی پر اُٹھ بیٹھا۔ دونوں اسی طرح دروازے پر کھڑی تھیں!

میں نے پوچھا۔ "نواز نہیں آیا؟"

"ابھی تک نہیں آیا۔"

"بارش بند ہو گئی ہے؟"

"کب کی"

"کیا وجہ ہوئی نواز نہیں آسکا۔"

"خدا معلوم" بڑھیا اب دہلیز پر بیٹھ گئی۔ "شاید بارش کی وجہ سے رُک گیا ہو۔"

شیدو بولی۔ "ہاں بارش بھی تو خوب زور سے برسی ہے۔ اور گھاٹ کی طرف تو بادل گرج رہا تھا!"

یہ دل کو تسکین دینے کے طریقے! اے اللہ! زندگی بھی کتنا عجیب معمہ ہے!

مگر اُسے اب تک آجانا چاہیئے تھا! میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ آخر میں نے تہیہ کر لیا کہ اس کی تلاش میں کم از کم ایک میل تک تو جاؤں۔ ان دونوں نے مجھے بہت روکا لیکن میں کھیتوں کو عبور کر کے پگڈنڈی پر آ گیا۔ جو اب ننھی سی ندی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ بلصفت چاند دُور افق پر ہولے ہولے پیلا پڑ رہا تھا! اور کہیں کسی درخت پر دکھیاری کوئل اپنا غمگین نغمہ الاپ رہی تھی۔ میری ہلکی پھلکی روح پر ایک بوجھ سا آ پڑا!

میں نے پاگلوں کی طرح آوازیں دینی شروع کر دیں "نواز۔ او محمد نواز"

ایک خرگوش ایک جھاڑی سے نکلا اور کھیتوں میں چھرر چھرر کی آواز پیدا کرتا ہوا کسی اور جھاڑی میں گھس گیا۔

پگڈنڈی پر دُور وہی کیکر کا درخت کھڑا جیسے مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا! میں خوفزدہ ہو کر واپس جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ میں نے سمجھا درخت کے اس طرف بہت دُور کوئی بہت مبہم سا یہ حرکت میں ہے۔ میرے جیسے پر لگ گئے!

دونوں سایے اسی طرح دروازے میں بے حس و حرکت کھڑے تھے!

مجھے خاموش دیکھ کر شاید ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ کیونکہ دل کی ہر ضرب پر ان کا وجود دھیرے سے کانپ جاتا تھا!

میں نے کہا "اب تو پو پھٹنے کو آئی۔ شاید وہ گھاٹ سے اب روانہ ہو، میں نے تو اسے بہت آوازیں دیں۔"

دونوں چپ کھڑی رہیں۔ آخر بڑھیا نے شیدو کو کہا۔

"تو جا کر حلوا تو دیکھ۔ ٹھنڈا نہ ہو گیا ہو۔ اور بیروں سے چیونٹیاں تو نہیں چمٹ گئیں! کھیر پر کوئی برتن رکھا تھا تو نے؟ کوئی ٹڈی نہ گر پڑے! نواز تیرا مذاق نہ اُڑائے، چھوکریاں بھی تو نہ آئیں۔ ورنہ رونق رہتی۔ جی بہلا رہتا۔"

میں کھاٹ پر بیٹھا تو ایسے محسوس کیا جیسے چالیس میل پیدل چل کر آیا ہوں۔ تھکا ہارا۔ سینے میں جیسے دل نہیں، من بھر چٹان رکھی ہے۔

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ دیا ٹمٹماتا رہا۔ مشرق کی طرف پو پھوٹ رہی تھی۔ دونوں معصوم روحیں دروازے پر بے جان بتوں کی طرح کھڑی تھیں۔ کہ اچانک ان میں حرکت ہوئی۔

"وہ کوئی آ رہا ہے۔"

"وہ کھیتوں کے پار۔ پگڈنڈی پر"

میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ "کہاں کہاں"

اب شیدو کا حجاب جانے کدھر غائب ہو گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر دور اشارہ کرتے ہوئے بولی، 'وہ وہ — میرا ہاتھ جو اس نے پکڑا.... تو میں سمجھا بجلی کا ایک تیر میرے سر اور پاؤں سے سنسناتا ہوا نکل گیا ہے!

میں باہر آ گیا۔ "محمد نواز"

کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ مگر مجھے جواب نہ ملا۔

"بھیا نواز" شیدو اپنی باریک آواز کو کوئل کی طرح پوری قوت سے بلند کرتے ہوئے پکاری۔ مگر پھر بھی جواب نہ ملا!

"وہ ہمیں حیران کرنا چاہتا ہے۔" بڑھیا مسکراتی ہوئی بولی۔

اب وہ ہم سے پانچ قدم کے فاصلے پر تھا۔ بڑھیا ہانپ رہی تھی۔ شیدو کانپ رہی تھی!

"نواز" دونوں یک زبان ہو کر اُسے گلے لگانے کے لئے دو قدم آگے بڑھتی ہوئی پکاریں۔

"میں نواز نہیں ہوں۔"

"ہائیں!"

"ادی شیدو نے اُسے چھو لیا تھا!"

"تو پھر تم کون ہو؟" بڑھیا جیسے اُسے ابھی دبوچ لیگی۔

"میں پولیس کا سپاہی ہوں۔"

ہم تینوں کے دل دھک سے رُک گئے اور پھر یوں دھڑکے جیسے ابھی پھٹ کر بکھر جائیں گے!

"نواز کہاں ہے؟"

میں تھانے میں سپاہی ہوں، نواز میرا بچپن کا دوست ہے وہ کشتی سے اُترا اور اِدھر آنے لگا کہ تھانیدار نے تین چار سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُسے پکڑ لائیں، کیونکہ افسر مال صاحب کا اسباب بنگلہ پر پہنچانا تھا۔ اور اِس وقت بیگار پہ اور کوئی آدمی نہ پکڑا جا سکا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میرے گھر اطلاع دے دینا۔"

"لیکن وہ کب آئے گا؟" بڑھیا جیسے گر جائے گی!

"ایک ہفتے کے بعد۔ بنگلہ پہ اس نے افسر مال صاحب کے دفتر کا پنکھا بھی کھینچنا ہے!"

بڑھیا دیوار سے لگ گئی اور پھر ہولے ہولے نیچے کھسکتی زمین پہ بیٹھ گئی۔ شیدو کا چہرہ! ـــــ جیسے چھوئی موئی کسی کے مس سے مرجھا کر بے رونق ہو جاتی ہے!

سپاہی یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔

میں نے اب وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ اندر سے تھیلا اٹھایا۔ باہر آیا۔ شیدو کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک کر اُس کے رخساروں پر افق کے قریب ڈوبتے ہوئے تاروں کی طرح چمک رہے تھے! اور بڑھیا اپنا نچلا ہونٹ اپنے پوپلے منہ میں ڈالے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

"جاتے ہو بیٹا؟"

"ہاں ماں!"

"اچھا۔ خوش رہو!"

احمد ندیم قاسمی

طائرانِ صحرا

صبح

حُسن کی دیوی
دودھ کی جھیل سے نہا کر
خراماں خراماں ادھر آ نکلی ہے۔

شام

یہ کس حسین
دیوی کی زُلفیں
تمام عالم پہ
چھا رہی ہیں؟

رات

اے حسین رات
تو ماتھے پر چاند کا ٹیکا لگائے
کہکشاں کا لبادہ اوڑھے
جنگل میں
اتنی اداس کیوں بیٹھی ہے؟

ایک منظر

چاند کی کشتی
جھیل میں تیر رہی ہے
پہاڑ جھیل کے کنارے
چپ چاپ بیٹھا ہے
نَے کا پودا
ہوا میں کانپ رہا ہے
بید رو رہا ہے
اور روحیں آہستہ آہستہ جھیل کا طواف کر رہی ہیں۔

راجہ مہدی علی خاں

خطرۂ جنگ

رگِ زمانہ میں مضطر ہے بیقرار ہے خوں
سوار ہے سرِ اقوام پر بلا کا جنوں

امان و امن سے اس کا مزاج برہم ہے
یہ اقتدار عدوئے سکونِ عالم ہے

فساد و فتنہ کا سب ساز و برگ ہے تیار
سلاح خانوں میں سامانِ مرگ ہے تیار

بڑھائے جاتے ہیں لشکر شمار سے باہر
بتائے جاتے ہیں کمتر دیار سے باہر

قضا کے دیو فضاؤں میں اُڑتے پھرتے ہیں
اجل رسیدوں پہ کب دیکھئے یہ گرتے ہیں

ہوا میں رستے بنے ہیں سپاہیوں کیلئے
فلک پہ اڑتے ہیں ظالم تباہیوں کیلئے

حکیم محوِ عمل ہیں کہ رُونما ہو جائے
وہ نسخہ جس سے جہاں دفعتاً فنا ہو جائے

بہانہ چاہیئے میدان میں اُترنے کا
اشارہ ہونے کو ہے مارنے کا مرنے کا

قیامت آہ! نئی بحر و بر پہ آئے گی
فضاؤں میں بھی اماں زندگی نہ پائے گی

نہیں ہے رحمتِ ربِّ کریم کا خواہاں
جہاں ہے پھر کسی جنگِ عظیم کا خواہاں

محرومؔ

بھائی

لال بولے —— بتّو نے روپیہ مانگا ہے اب میں کہاں سے دوں۔

"کس لئے؟"

"لاہور میں مکان بنانا چاہتے ہیں، یہ دیکھو لکھا ہے ——

"یہاں آدھی تنخواہ کرایہ کے عوض چلی جاتی ہے۔ ہم نے زمین تو کسی نہ کسی طرح خرید لی ہے۔ لیکن مکان بنانے کو روپیہ نہیں۔ ہمارا ارادہ ڈیڑھ ماہ کی تنخواہ پیشگی لے لینے کا ہے۔ گورنمنٹ بعد میں کاٹتی رہیگی کچھ بلڈنگ فنڈ سے آجائے گا لیکن اتنے سے کام نہ چلے گا۔ آپ ایک ہزار روپیہ کا بندوبست کر دیجئے۔ گورنمنٹ کی کاٹ کے بعد آپ کا روپیہ اتارنے کی فکر کروں گی۔" پڑھ کر بولے اب بتاؤ کیا کروں۔

"پھر دے دیجئے۔ گورنمنٹ کا قرض ادا کر کے آپ کا روپیہ دے دیگی۔"

"روپیہ دیگی یا نہیں، یہ تو بعد کی بات ہے۔ سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ روپیہ لاؤں کہاں سے؟ رائے ابھی بیکار ہے اور سریندر کو ابھی لا کالج میں داخل ہونا ہے۔

"لیکن وہ بھی تو آپ کی لڑکی ہے۔"

"لڑکی ہے تو بیاہ کر دی۔ اپنا فرض پورا کر دیا۔" آخر تمہاری دوسری بہنیں بھی تو ہیں ان کے بھی تو ہاتھ پیلے کرنے ہیں۔ اور پھر رائے سریندر ......

"پھر بھی آپ کو کچھ امداد تو کرنی چاہیئے۔"

"تمہاری بھی تو آخر سگی بہن ہے۔ تم کیوں کچھ مدد نہیں کرتے؟"

"میری حالت آپ سے پوشیدہ نہیں۔ پھر بھی جو کہیں کر دونگا۔"

"میں تو اس وقت پانچ سو سے زیادہ نہیں دے سکتا۔

"بہتر۔"

باپ نے پانسو دیا۔ بھائی نے بھی پانسو۔ باپ ریٹائرڈ تحصیلدار تھا اور بھائی کلرک۔ اس غرض کیلئے اس نے اپنی بیوی کا ایک زیور بیچ دیا۔

* * * * * *

مکان بنے ہوئے دو ماہ گزر گئے۔ ایک دن بتّو کے خاوند ایک لفافہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے آئے۔ اور پڑھنے لگے۔ لکھا تھا:

عزیز ساوتری

تمہیں معلوم ہے اس ماہ سریندر کو لا کالج میں داخل ہونا ہے۔ میرے پاس اسوقت روپیہ نہیں۔ تم اسے ایک سو روپیہ داخلہ کیلئے دے دینا اور پھر اگر ممکن ہو تو بیس روپیہ ماہوار دیتے رہنا۔ ورنہ اس عرصہ میں انتظام کر لوں گا۔ میں تمہیں تکلیف نہ دیتا لیکن مجبور ہوں۔

تمہارا پیارا پتا

بتّو نے جل کر کہا ان سے ایک سال بھی صبر نہ ہو سکا۔ سرکار کی کاٹ کے بعد یہاں تو سو ٹکے بھی نہیں بچتے۔ پھر سو روپیہ کہاں سے لاؤں۔ خاوند نے جیب سے دوسرا لفافہ نکالا اور پڑھنے لگا۔ لکھا تھا:

عزیز بتّو!

میں نے پتاجی کی میز پر ایک خط دیکھا تھا۔ جو وہ تمہیں لکھ رہے تھے۔ اس میں انہوں نے تم سے سو روپیہ مانگا ہے۔ مجھے معلوم ہے تم ادا نہ کر سکو گی۔ لیکن اگر تم روپیہ نہ دو گی تو پتاجی کی نظروں میں تمہاری اور بھائی صاحب کی وقعت کم ہو جائے گی۔ میں سو روپیہ بھیجتا ہوں۔ جب سریندر آئے چپ چاپ اسے دے دینا کسی نہ کسی طرح تمہیں بیس روپیہ ماہوار بھی پہنچانے کی کوشش کروں گا۔

تمہارا بھائی

اُس کے خاوند اُس کی گود میں سو روپیہ کا رجسٹرڈ لفافہ اور خط پھینک کر دوسرے کمرہ میں کپڑے بدلنے چلے گئے۔ بتّو کی آنکھوں میں غصّہ کی بجائے آنسو آ گئے اور وہ رونے لگی۔

اوپندر ناتھ اشک

بچّوں کی تعلیم و تربیت

آج سے کچھ سال پہلے تک ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ بچّوں کی تعلیم کی ذمہ داری تمام نہیں تو بہت کچھ ماں پر عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس وقت ماں گھر پر ہی رہتی تھی اور باپ کا کام گھر سے باہر رہ کر روزی کمانے کا تھا۔ مگر اب حالات بدل گئے ہیں اور اکثر ماؤں کو روزی کمانے یا سوسائٹی میں مصروفیات کی وجہ سے گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ بلکہ باپ بھی بے روزگاری کی وجہ سے گھر پر رہنے لگا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ بچّوں کی ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری محض ماں پر ہے یا باپ پر۔ اصل میں یہ ذمہ داری پہلے بھی ماں باپ دونوں پر تھی اور اب بھی دونوں ہی پر ہے۔ بہت کم والدین ایسے ہیں جو صحیح معنوں میں اسے پورا کرتے ہیں۔

گو عورتوں کو اب گھر کے بہت سے جھنجھٹوں سے چھٹکارا ملتا جاتا ہے۔ پھر بھی بچّوں کی تعلیم زیادہ تر انہیں کے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے۔ وہ اس سے بری نہیں ہو سکتیں۔ بچّوں کو گھر پر جو سکھایا جاتا ہے عموماً کسی ارادے یا مقصد سے نہیں سکھایا جاتا۔ بلکہ محض اتفاقیہ طور پر۔ اس میں نہ کوئی طریقہ یا تجویز ہوتی ہے نہ کوئی باقاعدگی اس لئے بچّے اکثر ایسی باتیں سیکھ لیتے ہیں جو انہیں نہ سیکھنی چاہئیں اور اکثر ایسی باتوں کو سیکھنے سے رہ جاتے ہیں جن کا سیکھنا ضروری ہے۔ بچّوں کی تعلیم تین چیزوں پر منحصر ہے۔ گھر، سکول اور سوسائٹی۔ ابھی تک اسکول پر بہت زور دیا گیا ہے۔ مگر گھر اور سوسائٹی کی ذمہ داریاں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ والدین اکثر خیال کرتے ہیں کہ بچّے کو اسکول میں داخل ہونے سے پہلے کچھ سکھانے پڑھانے کی ضرورت نہیں مگر یہ غلط ہے بچّے کی تعلیم کا سلسلہ اسکول جانے سے بہت پہلے ہی شروع ہو جانا چاہیئے۔

بچّوں کو ہر بات سیکھنے اور جاننے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ یہ شوق وہ اس نقل کے مادہ سے پورا کرتے ہیں۔ جیسے قدرت نے اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ مگر قدرت نے انہیں دو اور بڑی قوتیں بھی عطا کی ہیں۔ بچّے ہر بات کو بڑی غور سے سنتے اور دیکھتے ہیں اور بڑے نکتہ چین ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ یہ اہلیت رکھتے ہیں تو اُن کے بڑوں کو بھی اپنی بات چیت اور حرکات و سکنات میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

بچّوں کو اسکول جانے سے پہلے بہت سی باتیں سکھائی جا سکتی ہیں۔ ایک تین چار سال کے بچّے کو ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ بغیر کسی مدد کے خود کھانا کھا سکے۔ خود نہا دھو سکے۔ خود کپڑے اُتار پہن سکے اور گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں دلچسپی لے سکے۔ مثلاً میز کرسی جھاڑنا۔ نازک چیزوں کا احتیاط سے رکھنا اٹھانا اور لے جانا وغیرہ وغیرہ۔

جو ماں اپنے بچّوں کو اس طرح اپنے آپ پر بھروسہ کرنا سکھاتی ہے وہ گویا اُس کی آئندہ بھلائی اور سُکھ کا بیج بو رہی ہے۔ بہت سے لوگ جو زندگی سے مایوس نظر آتے ہیں یا بات بات میں دوسروں کا منہ تکتے ہیں۔ اس لئے ایسے ہوتے ہیں کہ بچپن میں اُنہیں دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ اپنے آپ پر بھروسہ رکھنے کی یہ عادت بچّوں میں جلدی نہیں پیدا ہوتی۔ لیکن جب پیدا ہو جاتی ہے۔ تو انہیں وہی مسرت حاصل ہوتی ہے جو بڑوں کو کسی کا محتاج نہ رہ کر اپنی آزادی سے حاصل ہوتی ہے۔ بچّوں کے کاموں میں زیادہ دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ صرف دیکھ بھال کی ضرورت ہے نہ انہیں ہر بات کے بُرے بھلے نتیجوں پر تقریریں دینے سے کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ یہ کافی ہے کہ اُن پر یہ ظاہر کر دیا جائے۔ کہ ہم تم سے فلاں بات کے کرنے اور فلاں بات کے نہ کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔

بچّے کا دماغ طوالت پسند نہیں کرتا۔ بدقسمتی سے اس کے ارد گرد کی دنیا ہمیشہ طوالتوں سے بھری رہتی ہے اور اسی دنیا میں ہم اسے رہنے پر مجبور کرتے رہتے ہیں۔ چاہیئے یہ کہ ہم اس کے لئے دنیا کے اندر ایک اور چھوٹی سی دنیا پیدا کریں۔ جس میں ہر بات نہایت سادگی سے واقع ہوتی ہو۔ اور آسانی سے سمجھ میں آ

بشکریہ آل انڈیا ریڈیو

جائے۔ گویا بچے کو بچے کی دنیا میں ہی رکھنا چاہیئے۔ اس چھوٹی سی دنیا میں اس کے استعمال اور دلچسپی کے سامان چھوٹے ہی پیمانے پر ہونے چاہئیں۔ اس کی کرسی، میز، پلنگ، چار کی پیالی کھانے پینے اور منہ ہاتھ دھونے کا سامان سب چھوٹا چھوٹا ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ اس کا صحیح استعمال کرنا اور سنبھالنا سیکھ جائے۔ اور بڑا ہو کر بھی اسی طرح کی بڑی بڑی چیزوں کو پاکر پریشان نہ ہو۔

اس چھوٹی سی دنیا میں بچہ ہر بات آہستہ آہستہ مگر بہت اچھی طرح سیکھتا ہے۔ ماں کو چاہیئے کہ اس کو سکھانے میں صبر سے کام لے۔ اس میں وقت زیادہ لگتا ہے۔ مگر اس کو زیادہ وقت دینے سے اور بہت سی باتوں میں ماں کا وقت بچ جاتا ہے یہ کہنا کہ بچہ کو سکھا کر ماں بالکل بےفکر ہو جائے ٹھیک نہیں۔ بچے کا مزاج بہت چنچل ہوتا ہے جس بات میں اسے آج دلچسپی ہے۔ کل اُسی سے اس کی طبیعت اکتانے لگتی ہے۔ اکثر والدین اس کی طبیعت کی تبدیلیوں کا خیال نہیں رکھتے اور اس سے وہی باتیں اُسی طرح بار بار کروانے چاہتے ہیں رمیں ان سے یہ کہونگی کہ شوق سے وہی باتیں کروائیے۔ مگر نئی نئی صورتوں میں بچہ جو کچھ سیکھتا ہے ضروری نہیں کہ اسے کرتے وقت ہر بار ذمہ داری بھی محسوس کرے۔ ایک محقق کی طرح اس کی دلچسپی آج کے تجربوں پر بہت دیر تک نہیں رہتی۔ بلکہ نئے تجربوں کی طرف رہتی ہے۔ اسے اپنے تجربوں کی بُرائی بھلائی سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ تجربے کو تجربے کی حیثیت سے پسند یا ناپسند کرتا ہے اور ہمیشہ نئے احساسات ڈھونڈتا رہتا ہے۔ جب ہم بڑوں کو بھی اپنے دن کے بندھے ہوئے کام پھیکے معلوم ہوتے ہیں تو بچہ تو پھر بچہ ہی ہے۔ وہ ابھی معلومات کی دنیا کی دہلیز پہ کھڑا ہے۔ جن باتوں میں اسے دلچسپی نہیں انہیں کرنا بے کار سمجھتا ہے۔

اس لئے میں یہ ضروری سمجھتی ہوں کہ بچوں کو سکھانے کے طریقے دلچسپی سے خالی نہیں ہونے چاہئیں۔ آجکل کے طریقۂ تعلیم میں کھیل کے ذریعہ تعلیم دینے کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے بچوں کے لئے جو گڑیوں کا کھیل مقرر کیا تھا اس میں ایک بڑی مصلحت تھی۔ چاہیئے یہ تھا کہ لڑکوں کیلئے بھی یہ کھیل مقرر کیا جاتا۔ زندگی کے فرائض ادا کرنے کی تعلیم دینے کے لئے اس سے بہتر طریقہ ممکن نہیں۔ یہ کھیل کم و بیش تمام دنیا میں رائج تھا۔ اب اس کی اتنی قدر نہیں رہی۔ کہیں کہیں گڑیاں نظر بھی آتی ہیں۔ تو ان سے کھیلنا بس یہیں تک محدود ہے کہ لڑکیاں انہیں اِدھر اُدھر اُٹھائے پھریں۔ وہ پہلی سی بات نہیں کہ آج گڑیا کی سالگرہ ہے۔ لڑکی اس کے نئے کپڑے سی رہی ہے — سہیلیاں آرہی ہیں اور اُن کی مہمان نوازی کے فرض بڑے سلیقے سے ادا کئے جا رہے ہیں۔ آج گڑیا کی شادی ہے۔ آج تیج تہوار ہے۔ آج گڑیا بیمار ہے۔ آج مکتب میں بیٹھی ہے وغیرہ وغیرہ۔ خانہ داری اور دنیا داری کی کون سی بات تھی جو اس کھیل کے ذریعہ لڑکیوں کو نہیں آجاتی تھی۔

آجکل بچوں کیلئے نئے نئے کھیل اور نئے نئے کھلونے بنائے گئے ہیں۔ جن کے ذریعہ انہیں طرح طرح کی باتوں کا علم ہو جاتا ہے جہاں تک ہوسکے ان کے لئے یہ کھیل کھلونے مہیا ہونے چاہئیں آپ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالئے گا کہ بچوں کی تعلیم کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے یعنی کھیل اور کھلونے سنجیدہ طریقوں میں بھی انہیں بہت کچھ سکھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً بات چیت کرتے۔ کتابوں سے پڑھ کر اور کہانیاں کہہ کر یا اپنی اور دوسروں کی زندگی کے واقعات سنا کر۔

والدین کی ذمہ داریاں اس وقت بھی جاری رہتی ہیں جب بچہ اسکول جانے لگتا ہے۔ اسکول کا راستہ ایک دوہرا راستہ ہے ایک راستہ سے بچہ علاوہ کتابوں کے اپنے ساتھ کچھ اور بھی لے جاتا ہے۔ دوسرے راستہ سے وہ اپنے کتابی علم کے علاوہ کچھ اور بھی لاتا ہے۔ اس لئے اسکول اور گھر والوں میں سمجھوتا اور اتفاق ضروری ہے۔ یعنی اسکول کی تعلیم سے گھر کی تربیت اور گھر کی تربیت سے اسکول کی تعلیم کا اثر زائل نہ ہو۔

اسکول میں بھی بچوں کی تعلیم کے بنیادی اصول وہی ہونے چاہئیں جو گھر کی تربیت کے ہوتے ہیں۔ یہاں بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ اُس کی شخصیت کو ٹھیس نہ پہنچے اور اپنے من میں اس نے خوبصورتی یا بدصورتی کی جو دنیائیں بنائی ہوئی ہیں وہ ایک جھٹکے کے ساتھ بننے یا بگڑنے نہ پائیں بلکہ آہستہ آہستہ وسیع یا تنگ ہوتی جائیں۔ استانیوں کو چاہیئے کہ اپنے معلومات کو بچوں کے سامنے خوب سلجھا کر پیش کریں۔ کیونکہ بچے ایسے ایسے سوالات کرتے ہیں کہ بعض وقت اُن کے جواب دینے

نہیں بنتی - ان سوالات کو ٹالنا نہ چاہیئے - کیونکہ بچے ان کے جوابات اور لوگوں سے مانگیں گے اور اکثر گمراہ ہو جائیں گے -

تعلیم کے نئے حامی اور ریفارمر یہ نہیں چاہتے کہ بچہ بڑا ہو کر صرف دنیاوی ترقی کے میدان میں اور بچوں سے آگے نکل جائے بلکہ یہ کہ آئندہ وہ جہاں بھی کھڑا ہو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ اپنے تمام تعلقات کو اچھی طرح سمجھ کر اپنی اور اُن کی زندگی کو بہتر بنانے کی قابلیت پیدا کرے -

بچہ چونکہ بڑوں کی طرح جسمانی - دماغی، جذباتی اور روحانی قوتوں کا مجموعہ ہے - اس لئے اسکول میں اس کی تعلیم اس قسم کی ہونی چاہیئے کہ نہ صرف اُس کی دماغی بلکہ تمام قوتیں بڑھ سکیں اور وہ ان کو استعمال کرنے کی ہمت اور جرأت رکھ سکے -

ہندوستان کے نوے فی صدی اسکولوں میں اس کی تعلیم میں اس خیال کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا کہیں کہیں رکھا جاتا ہے تو بہت جلد اُس کا اثر زائل ہو جاتا ہے - جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی جماعتوں میں تو نئے طریقہ کی تعلیم دی جاتی ہے - مگر بڑی جماعتوں میں آکر وہ اُسی پرانے پردے میں دھکیل دیئے جاتے ہیں جس سے انہیں بچانے کی کوشش چھوٹی جماعتوں میں کی جاتی ہے میں پرانے طریقہ کی تعلیم کی برائی نہیں کرنا چاہتی - لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ اس کے مطابق بچے کو ایک نہایت ادنیٰ ہستی مانا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہمدردی کا سلوک نہیں ہوتا - سوائے کتابیں پڑھانے اور امتحان پاس کرنے کے اور کسی بات پر زور نہیں دیا جاتا - نئے طریقہ کے اسکولوں میں بچے کو ایک قابل احترام ہستی مانا گیا ہے اور اس کے ساتھ نہایت محبت اور ادب کا سلوک کیا جاتا ہے - تاکہ وہ اپنی شخصیت کی قدر و قیمت پہچانے اور بڑا ہو کر دوسروں سے محبت اور ادب کا سلوک کرنا سیکھے -

چونکہ گھر پر بچوں کی تربیت آجکل خاطر خواہ نہیں ہوتی - اس لئے بہت چھوٹی عمر میں ہی بچے کو اسکول میں ڈال دینا چاہیئے - نئے طریقہ کے اسکولوں میں بچوں کو تین چار برس کی عمر میں ہی داخل کر لیا جاتا ہے - پہلا سال بھر تک تو انہیں کتابوں سے کچھ واسطہ ہی نہیں پڑتا - کھلونوں اور ریت کے بنے ہوئے حرفوں کے طریقے - ا - ب - اے - بی - سی اور گنتی سکھائی جاتی ہے - باقی وقتوں میں انہیں ڈرائنگ اور رنگ بھرنے کے ذریعے اپنی انگلیوں کو آئندہ لکھنے کیلئے تیار کرنا سکھایا جاتا ہے -

کتابوں سے کچھ حاصل کرنا بچے کیلئے مشکل ہوتا ہے - کیونکہ ابھی اُس کے خیال کی قوت کی نسبت حس کی قوت زیادہ تیز ہوتی ہے - وہ رکھ کر - چھو کر، ٹٹول کر، سونگھ کر اور چکھ کر زیادہ جلدی سیکھتا ہے - اس لئے کتابوں کے بجائے اس کے لئے ہر مضمون کے واسطے ایک خاص طرح کا سامان ہونا چاہیئے - جسے میٹریل یا اپریٹس کہتے ہیں - یہ ہر مضمون کیلئے جدا جدا ہر قسم کا ہوتا ہے - اس میٹریل کو استانی ایک ایسے کمرہ میں لے کر بیٹھتی ہے جس میں تمام فرنیچر وغیرہ چھوٹا چھوٹا ہوتا ہے اور اس میں پندرہ بیس بچوں سے زیادہ بچے نہیں ہونے چاہئیں - یہاں پڑھانے کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہوتا - میٹریل سے بچہ جب چاہے کھیلتا ہے - استانی اُس کے کام میں بہت کم دخل دیتی ہے اور صرف یہ دیکھتی رہتی ہے کہ بچہ کب اُس کی مدد طلب کرتا ہے - اگر وہ ٹھیک کام کر رہا ہے تو وہ خاموش بیٹھی رہتی ہے - اگر غلطی کرتا ہے تو وہ خود اُٹھ کر اُسی کام کو صحیح طریقہ میں کرنے لگ جاتی ہے - بچہ محسوس نہیں کرتا کہ اُسے کوئی دوسرا شخص کچھ بتا رہا ہے - بلکہ یہ کہ اس کا صحیح راستہ پر آجانا اپنے ہی خیال کے ذریعہ ہوا ہے - ساتھ ہی استانی اپنی حرکات و سکنات اور بول چال میں بدصورتی اور بھدا پن نہیں آنے دیتی تاکہ بچے اُس کی نقل کر کے اپنی حرکات و سکنات اور بول چال کو خوبصورت بنائیں - وہ اپنی معلومات کو بچوں کے دماغ پر زبردستی ٹھونسنا نہیں چاہتی - اور ان کی مانگ کے مطابق ان کی مدد کرتی جاتی ہے - وہ بچے کو کبھی یہ نہیں کہتی کہ یہ مت کرو - وہ مت کرو - نہ وہ سزا دینے کی قائل ہے -

اسکول میں بچوں کا کام بھاری زیادہ اور کڑا نہ ہونا چاہیئے اور کچھ دیر لگاتار کام کرانے کے بعد انہیں آرام دینا چاہیئے - نئے طریقہ کے اسکولوں میں یہ اس طرح کرایا جاتا ہے کہ بچوں کو چند منٹ کیلئے بالکل خاموش بٹھایا جاتا ہے یا بے حس و حرکت لٹا دیا جاتا ہے - اس سے انہیں اپنے جسم پر ضبط رکھنے کی عادت بھی ہو جاتی ہے -

بچوں سے اسکول میں جو کام کرایا جاتا ہے کافی ہے - گھر پر کرنے کو کام دینے کی ضرورت نہیں - نہ کھیل اور کام میں ان کے واسطے امتحان اور مقابلہ کی ضرورت ہے - کیونکہ ان سے بچوں

ہیں ایک دوسرے سے بڑھ جانے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے جو بڑھ کر سینکڑوں سوشل خرابیوں کا باعث بنتی ہے۔ اسکول میں بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینی چاہیئے۔ ایسا کرنے سے بچوں کو وہ مضمون بھی پڑھائے جا سکتے ہیں جو پرانی طرز کے اسکول میں دیر سے شروع کئے جاتے ہیں۔

یہ نیا طریقۂ تعلیم ذرا مہنگا پڑتا ہے مگر سب اسکولوں میں رائج ہو جائے تو اس پر زیادہ خرچ نہ آئے۔

یہاں میں بچوں کو چھوڑ کر استانیوں کی نسبت بھی کہنا چاہتی ہوں۔ بچوں کیلئے استانیاں خاص طور پر ٹرینڈ ہونی چاہیں اور اُن کی قابلیت بہت اونچے درجے کی ہونی چاہیئے۔ آخر استانیوں کی تعداد اب بڑھتی جاتی ہے۔ مگر ابھی اور بڑھنی چاہیئے کیونکہ بچوں کی پڑھائی کا عورتوں کے ہاتھ ہی میں رہنا مناسب ہے۔

گھر اور اسکولوں کے علاوہ بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری سوسائٹی پر بھی ہے۔ گھر اور اسکول دونوں جگہ بچہ اس کی امانت ہے۔ جب وہ اپنی امانت کو واپس لے تو اُس کی حالت ایسی ہونی چاہیئے کہ وہ اس کے کام آ سکے۔ اس لئے سوسائٹی کو چاہیئے کہ نجی اور سرکاری طریقوں سے بچوں کی تعلیم کیلئے ایسے حالات پیدا کرے کہ جن میں ان کی تعلیم کا مقصد پورا ہو۔ اور وہ اچھے شہری بننے کے قابل بن سکیں۔

کملا بقایا

شعر

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیّاد کی ہے

شیخ محمد جان پیر دبیر

"ساقی"

کنارِ آب ہے، ابرِ بہار ہے ساقی
شراب لا کہ فضاء بے قرار ہے ساقی

ہوائیں میکدہ بر دوش، پھول جام بہ کف
بہار، آج مکمّل بہار ہے ساقی

ردائے شکر میں آسودہ منظروں کی قسم
غلط کہ تیرے کرم کا شمار ہے ساقی

یہ کون ہنستا ہے پھولوں کی اوٹ سے پیہم
کہ تا حدودِ نظر برق زار ہے ساقی

پلائے جا کہ توقف گناہ ہے یعنی
ترا شباب ہے، عہدِ بہار ہے ساقی

پلا دے آج ہی کل کیلئے جو رکھی ہے
کہ زندگی کا کسے اعتبار ہے ساقی

فضا بھی مست ہے، گلشن بھی مست ہے لیکن
نیازمند، ابھی ہوشیار ہے ساقی

رہوں میں ہوش میں جبتک، پلائے جا مجھکو
پھر اُس کے بعد تجھے اختیار ہے ساقی

نثار لالہ و گل کی جوانیاں تجھ پر
ترے سحر کو ترا انتظار ہے ساقی

سحر رامپوری

نابینا گوّیا

رات بہت آگے نکل چکی ہے -
نیلے آسمان پر نہ جانے کس نے کالی کالی چادریں بچھا دی ہیں
دھرتی خاموش ہوگئی ہے -
بے چین ہوا مندر کے دروازے پر سجدہ کر کے بھیگی ہوئی گھاس پر لیٹتی پھرتی ہے -
سنسان راستوں سے جو جنگلوں سے ہو کر آتے ہیں --
گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آرہی ہیں - درختوں کے پتے جنگل میں ڈوب گئے ہیں -
ندی آہستہ آہستہ کناروں کو ٹٹول ٹٹول کر آگے جا رہی ہے -
اور کناروں پر اُگے ہوئے پھول سر جھکائے، آنکھیں بند کئے، بہار کے سپنے دیکھ رہے ہیں
رات بہت آگے نکل چکی ہے
دھرتی خاموش ہوگئی ہے

۲

دیوتا کے مندر میں آرتی ختم ہو چکی ہے -
مندر کے دروازے بند کر دئے گئے ہیں -
کھلے ہوئے دریچوں سے اُن پھولوں کی خوشبو چھن چھن کر آ رہی ہے - جو شام کی آرتی پر دیوتا پر چڑھائے گئے تھے -
اور گھی کے چراغ کی لَو جھوم جھوم کر اپنی روئی ہوئی آنکھوں سے دیوتا کا گیت گا رہی ہے - سارے مندر میں سناٹا ہے -
پوجاری چادر اوڑھے مندر کے برآمدے میں سویا پڑا ہے -
آس پاس کوئی بھی نہیں - کتنے ہی لوگ شام کو آئے تھے -
لیکن سب چلے گئے ہیں -
گوبر سے لپے ہوئے برآمدے پر کتنے ہی پیروں کے نشان ہیں -
کچھ بڑے - کچھ چھوٹے اور کچھ حسین حسین -
دیوتا کے مندر میں آرتی ختم ہو چکی ہے
مندر کے دروازے بند کر دئے گئے ہیں

۳

نابینا گوّیا آہستہ آہستہ پتھروں کو ٹٹول ٹٹول کر سیڑھیاں چڑھا -
سیڑھیوں پر جلتا ہوا چراغ نہ جانے کس نے آج سر شام ہی بجھا دیا تھا -
اُس کے ایک ہاتھ میں عصا ہے - دوسرے ہاتھ میں ستار -
آج وہ مدّت کے بعد دیوتا کو ایک گیت سنانے آرہا ہے
جو اُس نے کئی راتوں جاگ جاگ کر اپنے دل کی ساری عقیدت کو اکٹھا کر کے لکھا ہے - اُس کی آنکھوں نے دیوتا کو نہیں دیکھا -
لیکن اُس کے دل میں دیوتا کی محبت کا نور ہے!
رات اندھیری ہے - لیکن اُس کے پیار کی دنیا جگمگ کر رہی ہے -

۴

رات اور تاریک ہوگئی -
دھرتی کے کونے کونے میں خوف سا چھا گیا -
آسمان پر بادلوں نے دانت دکھا دکھا کر گرجنا شروع کر دیا -
بجلیاں کوندنے لگیں - اشجار تھر تھرانے لگے -
سنسان اور گھمبیر راستوں پر رات کا کاجل بچھ گیا -
طوفان کا شور سن کر پوجاری نے کروٹ بدلی - نیم وا آنکھوں سے مندر کے دروازے کی طرف دیکھا - اور پھر سو گیا -
نابینا گوّیا کو باہر کے طوفان کا احساس ہی نہ تھا -
وہ گا رہا تھا اپنا گیت -
اور رو رہا تھا ستار کے تاروں کے ساتھ آواز ملا کر -

یہ اُس کا پہلا گیت تھا۔
پہلا اور شاید آخری!
گاتے گاتے وہ کبھی بار اُٹھا۔ ایک عجیب دیوانگی کے ساتھ وہ ناچنے لگا۔ ایک عجیب جنون کے ساتھ وہ جھوم جھوم کر گانے گانے لگا۔
مندر کے آنگن میں فطرت کی رقاصہ دیوانی ہو کر ناچ رہی تھی۔
اور مندر کی سیڑھیوں پہ دیوتا کا رقاص دیوانہ ہو رہا تھا۔

۵

صبح پوجاری نے دیکھا۔
بارش سے بھیگی ہوئی ایک لاش سیڑھیوں پر پڑی ہے۔ ایک ہاتھ میں ستار لئے۔ دوسرے میں عصا۔
اور آدھے کھلے ہوئے منہ میں دیوتا کی محبت کا پہلا اور آخری گیت۔

پریم ناتھ سادھو رونق کاشمیری

علامہ راشد الخیری کے خطوط

مسٹر صادق الخیری (دفتر "عصمت" دہلی) قارئین "شاہکار" سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کے یا ان کے کسی دوست یا عزیز کے پاس علامہ راشد الخیری مرحوم کا کوئی نجی یا مخزن کے سلسلے میں صحافتی خط ہو تو از راہِ کرم اُن کے پاس فوراً بھیج دیں۔ اگر مکتوب الیہ کو اصرار ہو تو موصوف اس کی نقل رکھ لیں۔ اصل بحفاظت دلی بصد تشکر واپس کر دیا جائے گا۔ نیز جن صاحب کے پاس علامہ مرحوم کا اٹو گراف ہو وہ بھی اسے ارسال فرمائیں — باعثِ ممنونیت ہوگا۔

مینجر شاہکار۔ لاہور

غزل

سنبھل سنبھل کہ یہاں ہوشیار گرتے ہیں
جو شاہسوار ہیں وہ بار بار گرتے ہیں

رہِ فراق کی دشواریاں معاذ اللہ
قدم قدم پہ یہاں کوہسار گرتے ہیں

ہر اک قدم پہ سنبھلنے کی آرزو لیکن
ہر اک قدم پہ ترے جاں نثار گرتے ہیں

کسی غریب کو یاد آئیں تو بُرا کیا ہے
کہ اُن کے نام پہ اشکوں کے ہار گرتے ہیں

درِ حبیب کو ناصح خدا کا گھر نہ سمجھ
یہاں جو گرتے ہیں بے اختیار گرتے ہیں

نسیم آج ستارہ بلند ہے اپنا
کہ اُن کے پاؤں پہ ہم بار بار گرتے ہیں

نسیم حجازی

ڈاکو

یہ لوگ ۔ قانون کی تلوار ہاتھ میں لے کر
امن عامہ کے نام پر
مجرم اور غیر مجرم
سب پر برابر کا وار کرتے ہیں
یہ قانون کے مالک
حکمران!
یہ ہمیں چور۔ ڈاکو۔ راہزن۔ قزاق گردانتے ہیں۔
لیکن کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں؟
کیا سلطنت منظم ڈکیتی نہیں
یہ اخلاق کے علم بردار
امن عامہ کے محافظ
ہاں ہاں یہ قانون کے ٹھیکیدار
جن کی زبانیں چوری کی برائیاں کرتے کرتے خشک ہو گئی ہیں
ان سے کہو۔
اس وسیع و عریض دنیا میں ایسا بھی کوئی ہے۔
جو ڈکیتی کو گناہ سمجھتا ہو۔
اور اس سے اجتناب کرتا ہو۔
قانون کے نام پر
غربا کی جیبوں پر ڈاکہ۔
قیام امن کے نام پر ٹیکس
اور بھاری تنخواہیں۔
حاصل کرنا
کیا یہ ڈکیتی نہیں۔
کہ رعایا بھوکوں مرے
اور حکمران!
رنگ رلیاں منائے

جن میں ہر وہ فرد شریف خلیق اور معزز ہے
جو غربا کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کو شیر مادر سمجھ کر ہضم کر جائے
اور ڈکار تک نہ لے
شاہی محلات کے کمرے منور کرنے کیلئے غریب رعایا کی ہڈیوں
سے۔
فاسفورس تیار کیا جاتا ہے
یہ سرمایہ دار!
بڑی بڑی توندوں والے
جن کے چہروں پر سرخیاں دوڑ رہی ہیں
اور جن کی آنکھیں خمار آلود
اور گردنیں اکڑی ہوئی ہیں
یہ سب غریب کی محنت پر ڈاکہ مارتے ہیں
ان کے کارخانے
دفاتر
فیکٹریاں
سب غریب مزدوروں کے دم خم سے چلتی ہیں۔
سرمایہ مزدور کماتا ہے
لیکن عیش
سرمایہ دار مناتے ہیں
مہاجن کی توند!
اسی صورت میں
بڑھ سکتی ہے۔
کہ غریب فاقے کریں
جاگیردار!
کے محلات میں رونق اسی صورت میں ہو سکتی ہے
کہ کسان کی جھونپڑی کا چراغ گل ہو

موجودہ سماج اور سوسائٹی کی نظریں کتنی بلند ہیں

دنیا!

ایک خوبصورت اور کشش آفریں طوائف ہے۔
دولت!
نہ اُترنے والا نشہ
اور سرمایہ دار!
ایک تماشائی
روٹی۔ تندرستی اور لباس۔
غریب ان سب سے محروم ہے،
بنی نوع انسانوں کا قافلہ
بڑی سُرعت سے
تباہی اور ہلاکت کے عمیق غار کی طرف گامزن ہے!
دنیا!
ایک تاریک زنداں ہے
اور سرمایہ دار!
اس کے محافظ ہیں
جو امن وقانون اور شرافت کے نام پہ
غریب زندانیوں کا خون روا سمجھتے ہیں
شکم پُری کے لئے
چوری کرنا!
عیب
لیکن امن اور قانون کے نام پر ڈکیتی
جائز
دلوں کا خون کرنا۔
روا اور عین قانون
یہ اپنے آپ کو انسان گردانتے ہیں
اور تمہیں وحشی کہتے ہیں۔
لیکن قسم ہے —— مذاق کل کی
قدرت کی نظروں میں تم انسان ہو
لیکن یہ بڑے بڑے تو ندوں
اور!
سرخ چہروں والے۔
وحشی بدترین وحشی ہیں۔
(قاضی نذر الاسلام)

محمد اشرف خال

غزل

وہ عدو کی گود میں سوتے رہے
سسکیاں لے لے کے ہم روتے رہے

تیرِ مژگاں کی سُنی آمد تو ہم
رات بھر زخموں کا منہ دھوتے رہے

زندگی تھی عیش و عشرت کیلئے
ہم بتوں کی یاد میں کھوتے رہے

یاد کر کے اُن کی باتیں رات بھر
حضرتِ الطاف خوں روتے رہے

الطاف مشہدی

ڈانٹے

تیرہویں صدی کے وسط میں جب مغربی دُنیا ظلمت کی جانب سے روشنی کی طرف بڑھ رہی تھی، اُس وقت فلورنس کے خوبصورت اور ہجوم پرور شہر میں علم جدید کا ایک آفتاب طلوع ہوا۔ جس کو کائنات نے ڈانٹے الگیری کے نام سے تعبیر کیا۔ ڈانٹے نے اپنی زندگی کے اوّلین لمحات سیاسیات کی تگ و دو میں گزارے۔ اور اسی وجہ سے اسے ایک نہایت افسوسناک ذلت اور لامحدود عرصے کی جلاوطنی سے دوچار ہونا پڑا۔ اسے ادب کی خوش قسمتی کہیے، یا حسنِ اتفاق، کہ جلاوطنی کے اس عرصے میں اُس نے دنیائے ادب کے بہترین منظومات میں سے ایک نظم تخلیق کی جس نے دنیا کے خیالات کو ایک نئی رَو میں بہنے کیلئے مجبور کر دیا، میرا مطلب ڈانٹے کی مشہور تصنیف ڈیوائن کامیڈی سے ہے۔

ڈانٹے جسے عہدِ حاضر میں جدید آسمانِ ادب کا ستارۂ سحری کہتے ہیں، اپنے ہم عصروں کی نگاہوں میں محض ایک عزلت پسند اور دنیا کے راہ و رسم سے بے نیاز فلسفی تھا۔ بکیچیو اس کے متعلق لکھتا ہے۔ "ڈانٹے کا قد درمیانہ تھا۔ آخری ایامِ حیات میں قدرے جھک کر چلتا تھا، اس کا چہرہ اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ نچلا ہونٹ موٹا تھا، چہرے کا رنگ سیاہی مائل تھا، اس کے بال گھنے، سیاہ اور گھنگھریالے تھے اور اس کا چہرہ ہمیشہ افسردگی کے تاثرات لئے ہوئے ہوتا تھا۔

ڈانٹے ۱۲۶۵ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک مشیر قانون تھا، ایامِ مدرسہ میں وہ اپنے ہم جماعتوں سے کسی حالت میں بھی کم نہیں تھا، فلورنس ان دنوں "نغماتِ حسن و عشق" کا ایک گہوارہ تھا۔ ڈانٹے بھی اس گہوارے میں جھولنے سے باز نہ رہ سکا۔ وہ ادبی انقلاب جو بعد ازاں تمام یورپ میں آندھی کی طرح پھیلا، اور جس نے مغربی تمدن اور ادب میں ایک نئی جان ڈال دی۔ بہت حد تک ڈانٹے کی انقلابی طبیعت کا رہینِ منت ہے۔

وہ "رومان" جو بعد میں لاتعداد نظموں کی تخلیق کا باعث ہوا۔ "بیٹرس پورٹینری" اور ڈانٹے کی اتفاقیہ ملاقات پر مشتمل ہے۔ بیٹرس عمر میں ڈانٹے سے چند ماہ چھوٹی تھی، "تجدید حیات" میں ڈانٹے نے اپنے بہترین جذبات کو بیٹرس کے نام ہی سے انتساب کیا ہے۔ اور بیٹرس کی ہر ادائے زندگی کے متعلق نغمہ سرائی کی ہے۔ ڈانٹے نے بیٹرس کو ایک یا دو دفعہ سے زیادہ نہیں دیکھا تھا۔ پورے نو برس کے بعد جب اس کو بیٹرس ملی، تو اس وقت وہ لکھتا ہے۔ "وہ غیر فانی ہستی میرے سامنے آئی ایک مرمریں لباس میں، دو خوبصورت سہیلیوں کو پہلوؤں میں لئے ہوئے اُس نے گلی میں سے گزرتے ہوئے اپنی حسین اور کشش نواز آنکھوں کو اس طرف موڑا جہاں میں بےحس و حرکت کھڑا تھا، اس نے کچھ اس انداز سے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے سلام کیا، جس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہرگز نہیں بھول سکتا۔

یہ بات پورے یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی، کہ آیا بیٹرس کو بھی ڈانٹے کے جذباتِ محبت کا احترام تھا، یا نہیں، لیکن ڈانٹے کی جنون انگیز محبت شاہد ہے کہ بیٹرس ایک حد تک "بے رخ" ضرور واقع ہوئی تھی۔ اور یہی بات ڈانٹے کی مرگ آفریں علالت کا باعث ہوئی۔ ڈانٹے کو امید تھی، کہ بیٹرس یقیناً اس کی ہو کر رہے گی۔ مگر امیدوں کے ان حسین خوابوں میں ہی بیٹرس کو دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔ ڈانٹے نے اپنے اس غیر فانی غم کو بھلانے کیلئے ایک اور "ہستی" کا انتخاب کیا۔ لیکن حقیقی محبت نے بہت جلد اس کے "تفریحی جذبات" پر قابو پا لیا۔ اور اس نے پھر بیٹرس کی حسین یاد میں اپنے آپ کو فنا کر دیا۔

بیٹرس ڈانٹے پر کچھ ایسی چھا چکی تھی کہ اس نے اپنی تمام تصانیف میں بیٹرس کو خراجِ عشق دیا ہے۔ حتےٰ کہ اس کی مشہور بلند پایہ تصنیف "ڈیوائن کامیڈی" بھی بیٹرس کے ذکرِ حسین سے خالی نہیں ہے۔

"ڈیوائن کامیڈی" میں ڈانٹے "ورجل" کی معیت میں اپنے سفر کو اعراف سے گزرتے ہوئے دوزخ میں ختم کرتا ہے۔ اعراف کوہسار کی چوٹی پر وہ "بہشت ارضی" کو دیکھتا ہے۔ جہاں اس

کو "بیٹرس" ملتی ہے وہ بیٹرس کے ساتھ بہشتِ ارضی کی مختلف راہوں سے گزرتا ہے۔اور بیٹرس کو اس رنگ اور ایسے الفاظ میں خطاب کرتا ہے، جو آجتک کسی قوم کے ادب نے پیش نہیں کئے۔

ڈانٹے کی پیدائش اتفاقاً ایک ایسے عہد میں ہوئی جس کو بلاتردید انقلابی اور شورش پسند کہا جاسکتا ہے۔ سائمن ڈی بارڈی سے بیٹرس کی شادی اور بعدازاں سنہ ۱۲۹۰ء میں اس کی موت نے ڈانٹے کو اجازت نہ دی، کہ وہ بہت عرصہ تک لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتا۔ رنج وغم نے بہت جلد اس پر غلبہ پالیا۔

"بعوت" اس نے بیٹرس کی موت سے ہی متاثر ہوکر لکھی اس کتاب میں اپنے الم انگیز خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس نے بیان کیا ہے۔ کہ بیٹرس کی موت کے بعد میں کیوں جلیما ڈونی سے شادی کرنے پر مجبور ہوا۔

سیاسیات سے متعلق اس کے نظریات کی ابتدا میدانِ جنگ سے شروع ہوتی ہے۔ چونکہ اُس کا تعلق کلیسائی جماعت سے تھا۔ اس لئے اس جماعت کی شکست اُس کیلئے لاتعداد تکالیف کا باعث ہوئی، چنانچہ اسی سلسلے میں ڈانٹے ایک غیر معین عرصے کے لئے جلاوطن کردیا گیا۔ سنہ ۱۳۰۲ء سے لے کر سنہ ۱۳۲۱ء تک اس نے اپنے ایام حیات جلاوطن ہمراہیوں کے ساتھ اس کوشش میں گزارے کہ کسی طرح آزاد ہوکر وہ اپنے وطن مالوف کو واپس جاسکے۔ سنہ ۱۳۱۶ء میں اس کو بعض عجیب شرائط کے ماتحت گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن اُس کی غیرت نے ان حالات میں فلورنس جانا گوارا نہ کیا۔ وہ چاہتا تھا، کہ اسے غیر مشروط طور پر واپس بلا لیا جائے۔ تاکہ وہ بلاخوف وخطر قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوسکے۔ مگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور وہ اسی بے بسی کی حالت میں لمبارڈی ٹسکنی اور روماگنا کی ریاستوں میں گھومتا رہا، اس کے سفر کی تفصیلات نہایت محدود ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کہاں کہاں تک پہنچا، لیکن اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ پیرس میں بھی گیا، بایں کہ ڈانٹے کو روینا میں رہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ سفیر کی حیثیت میں اُسے وینس بھیج دیا گیا، لیکن یہاں وہ کامیاب نہ ہوسکا اور مجبوراً روینا واپس لوٹ آیا۔ جہاں سنہ ۱۳۲۱ء میں اُس نے دنیا کو خیرباد کہی، اور اُس کو سینٹ فرانسس کے گورستان میں دفن کر دیا گیا، لیکن افسوس مرنے کے بعد بھی ڈانٹے کو آرام نصیب نہ ہوا۔ کیونکہ جلد ہی اس کی تصنیف "ڈی مناچیا" نے مذہب کے پجاریوں میں اُس کے خلاف نفرت اور حقارت کی آگ لگادی۔ اس کتاب میں ڈانٹے نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، کہ بادشاہِ وقت خدا کا نمائندہ ہے، اور انسانی نسل کے قومی اور اخلاقی پہلوؤں کی نمو کیلئے اس کا وجود ناگزیر ہے اُسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ پوپ کے دوش بدوش کھڑے ہوکر قومی تعمیر کا کام سرانجام دے .... ڈانٹے کے یہ نظریات پوپ کے حق میں ایک کاری ضرب ضرور ثابت ہوئے۔ کیونکہ پوپ کا یہ دعوےٰ تھا، کہ روحانی اور اخلاقی طور پر صرف اسی کو یہ حق حاصل ہے، کہ وہ قومی تعمیر کا کام سرانجام دے سکے، چنانچہ ڈانٹے کی اس کتاب کے تمام نسخے نذرِ آتش کر دیئے گئے یہی نہیں بلکہ اُس کی ہڈیوں کو بھی آگ کے شعلوں کے حوالے کر دیا جاتا۔ مگر لوگوں کی عرض و برداشت پر اس خیال کو ترک کر دیا گیا، لیکن یہ ضرور ہوا کہ اُن ہڈیوں کو قبر میں دوبارہ دبا دینے کی بجائے ان کو قبرستان کے ایک گمنام گوشے میں پھینک دیا گیا۔

ڈانٹے کی شہرت کی بنیاد اس کی مشہور عالم تصنیف "ڈیوائن کامیڈی" پر ہے۔ ڈانٹے نے اس کتاب کا نام پہلے صرف "کامیڈی" رکھا تھا۔ ڈیوائن کا لفظ بعد میں ایزاد کیا گیا ہے۔ "کامیڈی" کا مفہوم ان دنوں یہ نہیں تھا، جو آجکل سمجھا جاتا ہے، بلکہ ان دنوں "کامیڈی" سے مطلب "وہ تاثرات تھے، جو ایک خوش انجام کی طرف لئے جائیں۔" ڈیوائن کامیڈی میں ڈانٹے نے زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ جن کیلئے آخرت میں عزت وراحت ملے گی اور جن کے لئے سزا و اذیت دی جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈانٹے کے اپنے سفر کی طویل داستان جو اس نے "ورجل" کے ساتھ دوزخ، اعراف اور بہشت کی سیر سے اخذ کی، اپنے عہد کے تمدن کا ایک نہایت ہی کامیاب عکس ہے۔ اور اس نے شاعری کے لباس میں تاریخ، فلسفہ، ادب، علم جسمانی، زبان، اخلاقیات اور مذہب کو نہایت تحیر خیز اور دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بائرن نے کیا خوب کہا ہے: "ڈانٹے سے پہلے اٹلی کی کوئی زبان، کوئی شاعری، کوئی ادب اور کوئی تمدن نہ تھا۔"

(ترجمہ بہ تصرف)

اثر چکوالی بی اے

پیام شوق

(ایک عزیز دوست کے نام)

اے دوست! مبارک تجھے شملے کے نظارے ہر سمت کو بہتے ہوئے سیماب کے دھارے
افلاک کی رفعت پہ یہ تابندہ ستارے تابندہ ستاروں کے وہ خاموش اشارے
وہ صبح کا پُرکیف سماں تجھ کو مبارک
یہ شانِ جہانِ گزراں تجھ کو مبارک

اس عالمِ فانی کے نظارے ہیں مسافر جتنے بھی نظر آتے ہیں سارے ہیں مسافر
خورشید مسافر ہے ستارے ہیں مسافر پھر کیا ہے جو انسان بچارے ہیں مسافر
اس پُل سے گزرنا ہے ہر اک کو روشِ آب
یارانِ سرِ پُل ہیں اقارب ہوں کہ احباب

ہیں میری نگاہوں میں وہ ایامِ طربناک دیکھے تھے نہ جب رُوح نے تقدیر کے پیچاک
ہم دونوں کو جب رنجِ جدائی سے نہ تھا باک اب یاد سے اُن کی ہیں مرے قلب و جگر چاک
بھولا ہوا اک خواب ہے وہ عہدِ سعید آج
تبدیل محرّم میں ہوئی آہ وہ عید آج

ہوں تجھ کو مبارک وہ طرب خیز گھٹائیں وہ گنبدِ افلاک وہ پُرکیف فضائیں
وہ کوہ وہ سبزہ وہ فسوں کار ہوائیں وہ دامنِ کہسار میں پھولوں کی ردائیں
پھولوں کی رداؤں کا دلاویز نظارہ
ہو تجھ کو مبارک یہ جنوں خیز نظارہ

سنتا ہوں کہ شملے میں بہت ہے طلبِ جام ہر راہ میں ہیں حسن کے ہم رنگِ زمیں دام
اس شہر میں ہے سلسلۂ قلب و نظر عام لیکن ہوں تری اس سے مبرّا سحر و شام
تجھ پہ اثر انداز نہ ہو حُسنِ فسوں کار
آنکھیں بھی ہوں بیدار تری دل بھی ہو بیدار

ہے شملے کی ہر راہگذر حُسن سے معمور وہ محفلِ آباد ہے اک انجمنِ نور
وہ انجمنِ نور ہے عزت دہِ صد طور یہ جلوہ گہِ حُسن نہ کر لے تجھے مسحور
رفعت سے نہ اس خاک پہ تیری نظر آئے
منزل تجھے افلاک پہ تیری نظر آئے

اے دوست! خبردار کہ دُنیا ہے ستم کیش — دُنیا ہے ستم کیش، زمانہ ہے بداندیش
ہیں دہر بداندیش کے ہاتھوں ہوں جگر ریش — ہیں نیش پس و پیش وہ بیگانے ہوں یا خویش
تو نے ابھی رکھا ہے قدم عالمِ نو میں
حایل نہ ہوں ابنائے زماں اس تگ و دو میں

پیرانِ کلیسا ہیں کہ مندر کے برہمن — فطرت میں ہیں اے دوست! یہ دراصل مہاجن
ملبوسِ شریفانہ میں پوشیدہ ہیں رہزن — ہو ان کی رسائی سے پرے تیرا نشیمن
ہو صورتِ آئینہ ترا جوہرِ ادراک
دنیا کی کثافت سے تری رُوح رہے پاک

فطرت تری بالا ہوسِ لعل و گہر سے — تو دُور ہو تہذیبِ فرنگی کے اثر سے
روشن ہو تری راہِ سفر نورِ بصر سے — تاباں ہو تری رات ترے داغِ جگر سے
اونچی تری پرواز ہو اس عام فضا سے
چیتے کا جگر، میری نظر، مانگ خدا سے

دُنیا کہ ہے آزاد کی آنکھوں کے لئے راز — تیرے لئے اے دوست! ہو میدانِ تگ و تاز
ہو شمع تری ذات ہر اک بزم کی ہمراز — یہ شمع مگر رکھتی ہو پروانوں کے انداز
ہو نکہتِ ہر باغ زمانے میں تری ذات
تو بار کسی پر بھی نہ ہو زیرِ سماوات

گو غم ہے کہ قسمت نے کیا مجھ سے تجھے دُور — سچ پوچھے تو دل تیری ترقی پہ ہے مسرور
یہ عالمِ ایجاد ہے تقدیر سے مجبور — تو دل میں ہے آنکھوں سے مری گرچہ ہے مستور
ہر وقت تری یاد مرے دل میں رہے گی
یہ موجِ حسیں دامنِ ساحل میں رہے گی

بالا ہیں مری عقل سے اسرارِ خدائی — ہے اس کے ہر اک کام میں انساں کی بھلائی
تقدیر کے ہیں کھیل ملاقات و جدائی — یہ بات کبھی میری سمجھ میں تو نہ آئی
اقبال بھی تقدیر کی منطق کو نہ سمجھا
آزاد کو پھر عالمِ معنی کی خبر کیا

جگن ناتھ آزاد بی۔ اے

اگر کسی صاحب کے پاس "کہکشاں" (جو کبھی لاہور سے نکلتا تھا) کا مکمل فائیل یا اس کے کچھ پرچے ہوں تو از راہِ مہربانی، یا قیمتاً اس پتے پر جلد سے جلد بھیج دیں:-

ج۔ معرفت رسالہ "شاہکار" لاہور

بزمِ انتخاب

مسز روزویلٹ کی حیرت انگیز قوتِ عمل

صدر جمہوریہ امریکہ کی بیگم مسز روزویلٹ کی اَن تھک ہمت اہل امریکہ کیلئے روز بروز باعث حیرت بن رہی ہے۔

وہ سال بھر میں اوسطاً چالیس ہزار میل کا سفر کر لیتی ہیں۔ یہ اوسط اکثر بڑے بڑے سوداگروں کے سفر کے اوسط سے بھی زیادہ ہے۔ اکثر تاجر متفق ہیں کہ اتنا سفر بھی بجائے خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مسز روزویلٹ عموماً موٹر میں سفر کرتی ہیں۔

اپنے اس طوفانی گشت میں ہر تیسرے دن بیگم روزویلٹ ایک لیکچر دیتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ سامعین کے ہر گروہ کیلئے وہ کسی نئے موضوع کا انتخاب کرتی ہیں۔ سالانہ سو سے زائد لیکچروں کے لئے نئے نئے موضوعوں کا انتخاب مسز روزویلٹ کی ہمہ گیر قابلیت اور حیرت انگیز عملی قابلیت کا گواہ ہے۔ کیونکہ اتنے مختلف النوع لیکچروں کی تیاری کیلئے بہت محنت درکار ہے۔

وہ ایک سنڈیکیٹ کے لئے ہر ہفتے اخبارات میں چھ مضامین لکھتی ہیں۔ اس کام کا آغاز ۱۹۳۶ء کے نو روز سے ہوا۔ پیشہ ور اخبار نویسوں نے شروع میں ان کے اعلان کو شک کی نظروں سے دیکھا تھا۔ کیونکہ اُن کے خیال میں یہ بات ناممکن تھی کہ مسز روزویلٹ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود پابندی کے ساتھ تقریباً ایک ہزار لفظ روزانہ لکھنے کا وقت نکال سکینگی۔ لیکن حقیقت ہے کہ اس اعلان کے بعد اُن کے مضامین نہایت باقاعدگی سے چھپتے رہے ہیں۔ ان مضامین کی حیثیت بالعموم ڈائری کی سی ہوتی ہے۔ لیکن مسز روزویلٹ اس میں سیاسیات پہ جرح و نقد کی بھی مناسب آمیزش کر دیتی ہیں۔ یہ تنقید ہمیشہ لازماً اُن کے شوہر کی سیاسیات کی تائید و حمایت ہی میں نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ مخالفانہ تنقید بھی ہوتی ہے۔ یہ مضامین وہ میل ملاقات کے وقت کے انتظار کے وقفوں میں ہوٹلوں میں بیٹھ کر بلکہ ٹیکسیوں میں بھی ہمیشہ اپنے ہاتھ سے لکھتی ہیں۔ اور پھر یہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو جاتے ہیں۔

حامد علی خاں "ہمایوں"

انڈیا آفس کے چند تاریخی دستاویزات

انڈیا آفس (لندن) کے کتب خانے میں قلمی اور مطبوعہ کتابوں، مرقعوں وغیرہ کے ساتھ قدیم اسنادی کاغذات بھی محفوظ ہیں۔ میں نے اپنے قیام یورپ کے زمانے میں بہ لحاظ دلچسپی ان کا بھی معائنہ کیا تھا۔ ان کی مختصر کیفیت یہاں درج کی جاتی ہے۔

اس قسم کے فارسی کاغذات ایک "چکٹ بک" میں چسپاں ہیں، اور ان پر ایک ایک انگریزی نوٹ بھی لگا ہوا ہے۔ اس چکٹ بک میں جو کاغذات ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) کاغذات فتح علی شاہ قاچار۔
(۲) خطوط والاجاہ رئیس ارکاٹ۔
(۳) فرمان شہنشاہ بابر۔
(۴) اسنادات عالمگیر۔
(۵) پاسپورٹ سلطنت ترکی۔
(۶) سند سلطنت آصفیہ۔

فتح علی شاہ قاچار کے کاغذات وہ فرامین ہیں جو کمپنی انگریز اور ان کے سفیر مقیم ہندوستان کو تجارت وغیرہ کے متعلق دئے گئے ہیں۔ ان فرامین کی طرز بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ سلطنتِ مغلیہ اور سلطنتِ آصفیہ کے قدیم اسنادات وغیرہ ہوتے ہیں۔ ناصیہ پر مہر۔ خاتمے پر دستخط اور پشت پر تاریخ وغیرہ۔

یہ مراسلت شاہ انگلستان کے نام نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ کمپنی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ کاغذات ۱۲۲۵ھ اور اس کے مابعد کے ہیں۔

والاجاہ کے خطوط شاہ انگلستان جارج سوم، اور سرکار کمپنی دونوں کے موسومہ ہیں۔ یہ مراسلت نہایت عمدہ زر افشانی سنہرے حاشیے کے کاغذ پر ہوئی ہے۔ ایک خط میں والاجاہ نے اپنے خاندانی جھگڑوں کے متعلق بھی خاص اپنے قلم سے صراحت کی ہے۔ یہ مراسلت ہم رتبہ بادشاہوں کی مراسلت کا انداز رکھتی ہے، برتری اور بزرگی کا پتہ نہیں چلتا۔

باقیہ کا ایک فرمان ہے جو قاضی جلال کی معاش کے متعلق ہے۔ عالمگیری کاغذات میں مختلف فرمان اور اسناد وغیرہ شامل ہیں، جو صوبہ جات الہ آباد۔ پنجاب وغیرہ کے معاشوں کے متعلق ہیں اور بعض کاغذات اسد خاں۔ محمد اسلم۔ قاضی شریعت خاں وغیرہ کے مہری بھی ہیں۔ ان کے تفصیلی معائنے کیلئے بڑے وقت کی ضرورت تھی۔

سلطنت ترکی کا صرف ایک پاسپورٹ اس میں شامل تھا۔ سلطنت آصفیہ کی ایک سند موجود تھی۔ یہ سند قطب الدولہ کی موسومہ ہے۔ اس کے ساتھ ان کا ایک وصیت نامہ بھی ہے۔ قطب الدولہ آصف جاہ ثانی کے ابتدائی عہد میں راج بندری۔ ویلور وغیرہ کے جاگیردار تھے۔ ان کا وصیت نامہ حسب ذیل ہے:۔

وصیت نامہ قطب الدولہ تحریر غرہ ذیقعدہ ۱۱۸۷ھ

"وصیت نامہ چوں ایں جانب را بیماری دراز شدید لاحق شدہ اگرچہ بعونہ تعالیٰ صحت یافتم امازندگی راچہ اعتبار است، لہذا برخوردار مرزا زین العابدین عرف سبحان بخش را کہ اکبر اولاد است ولیعہد وقائم مقام خود کردم۔ بعد از من خانہ و اثاثہ سرانجام ہمہ املاک وجاگیرات و دیہات وغیرہ ہر رطب و یابس کہ در ملکیت دارم ہمہ از برخوردار مذکور راست، بجان ودل بخشیدم و دیگرے را دراں دخل و اختیار نیست، باید کہ برادران کہ از وکوچک تر اند ہمیشہ در اطاعت و اختیار او بودہ دعویٰ و طلب چیزے نداشتہ باشند۔ برخوردار پرورش اہلیہا وہمشیرہا وجملہ قبائل و وابستگان خواہد کرد۔ اگر از اولاد من کسی بدستور عوام از مرزا زین العابدین درخواست نزکہ وحصہ بکند مناسب نیست چرا کہ نام وآبرو کہ پیدا کردہ ام نخواہد ماند۔

ایں جانب از رفاقت بندگان عالی بر آمدہ رفیق کمپنی انگریز شدہ ام از دوستی و خیر خواہی جائے پرورش در کمپنی پیدا کردہ ام از انجا بجائے دیگر نباید رفت۔

حرف نمکحرامی حضور کہ از سبب رفاقت کمپنی برایں جانب آمدہ است اگر خدا توفیق بدہد بوساطت نواب رکن الدولہ یا ظفر الدولہ مراسلات از حضور کردہ ایں حرف را از من باید برآورد۔

برائے حج وزیارت از طرف من کدام شخص صالح را مقرر کردہ باید فرستاد و قرضداری مردم کہ بطرف منست از آمدنی جاگیرات وغیرہ ادا باید کرد چوں برخوردار مرزا زین العابدین خوردسال است تاحین رشد بحد بلوغیت نواب صاحب مشفق مہربان نواب جرأت جنگ بہادر را وصی وامین واتالیق مقرر کردم۔ احتیاط و خبرداری درہمہ امورات خانگی وجاگیرات وغیرہ کردہ بعونہ تعالیٰ بعد رسیدن بحد بلوغ جملہ املاک وسامان وسرانجام نزد زین العابدین بسپارند۔ تحریر فی تاریخ صدر"

اس وصیت نامے کے ساتھ انہوں نے اپنے جاگیرات کی سند کی نقل بھی شامل کی ہے، یہ سند حضرت آصف جاہ ثانی کی معطیہ ہے۔ نقل سند کو قاضی سید علی امجد کی مہر موثق کرتی ہے۔ اس سند کی رو سے پرگنہ (تعلقہ)۔ ایٹ کوٹہ وغیرہ سرکار راج بندری۔ صوبہ حیدرآباد بر مجمع کامل (الہ سماصمیہ) بمن قطب الدولہ حسن علی خاں انتظام جنگ کی جاگیر میں عطا ہوئے ہیں۔

یہ سند ان کی وصیت نامے کے پہلے عطا ہوئی ہے۔ سند کے ساتھ دفتری کیفیت کی نقل بھی موجود ہے۔ (جیسا کہ اس زمانے میں قاعدہ تھا) اس کیفیت پر حضرت آصف جاہ ثانی کی شرح تحریر کی نقل کی گئی ہے۔ جو حسب ذیل ہے:۔

"خاطر جمعدارند انشاء اللہ تعالیٰ ایں چار تعلقہ برشما تا اولاد و احفاد برقرار خواہد بود۔"

اس سند سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث معاش قطب الدولہ کی صرف وہ معاش تھی جو ان کے حسب خواہش ان

کی اولاد و احفاد کے نام عطا ہوئی تھی۔ اس جاگیر کے علاوہ شمالی سرکار کے کئی تعلقے مثلاً مصطفے نگر، ایلور، راج بندری وغیرہ بھی قطب الدولہ کی جاگیر میں تھے۔

اب مؤرخ دکن کیلئے یہ سوال عجیب اور تحقیق طلب ہوگا۔ کہ سرکار کمپنی کی رفاقت نے اپنی رفاقت کا کیا صلہ دیا، اور قطب الدولہ کے بعد ان کی جاگیرات کا جو لاکھوں کی تھی کیا حشر ہوا؟

(نصیر الدین ہاشمی) "مجلہ طیلسانیئین"

دیوتاؤں کا فیصلہ

اگلے زمانہ میں لوگ انسان کو انصاف کرنے سے معذور سمجھ کر وقتاً فوقتاً طرح طرح کے دوسرے طریقے اختیار کرچکے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ آپ ان کے انصاف کو مشتبہ نظروں سے دیکھیں اور رخنوں سے بھرا ہوا خیال کریں۔ لیکن ہماری عدالتیں ان سے بری ہیں۔ اور اس زمانہ کا انصاف تو مفت ہوتا تھا مفت لاکھوں کروڑوں روپے انصاف کے بہانے محکمے قائم کرنے کیلئے رعایا سے نہیں لوٹے جاتے تھے۔ اور یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ پچھلے دنوں جرائم آجکل سے ہزار گنا کم تھے اور کیا اچھے انصاف کی سچی جانچ جرائم کی کمی نہیں ہے؟

خیر یہ باتیں تو ایک طرف۔ اب ہم آپ کو پچھلے زمانے کی ایک عجیب وغریب عدالت میں دائر کیا ہوا ایک دلچسپ مقدمہ کا حال سناتے ہیں۔

دوسری صدی عیسوی میں وسط ایشیا کے ایک بادشاہ نے دنیوی عدالتوں اور قوانین کو ٹھکرا کر انصاف کا ایک نرالا ڈھنگ ایجاد کیا تھا۔ یہ عدالت انسانی اثرات سے بالکل بری تھی۔ یہاں انصاف دیوتاؤں کا ہوتا تھا۔

شہر کے ایک وسیع میدان میں یہ دیوتا اپنا فیصلہ سنایا کرتے تھے۔ اس عدالت کے وسط میں ایک حصہ لوہے کی سلاخوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس حصے کے ایک طرف دو تہہ خانے تھے۔ جہاں آمد و رفت بھی پوشیدہ سرنگوں کے ذریعے ہوا کرتی تھی۔ ان تہہ خانوں کا ایک ایک دروازہ سطح زمین پر سلاخوں سے گھرے ہوئے حصے میں کھلتا تھا۔ ان دروازوں کے بالکل مقابل عدالت کے دوسرے کنارے سلاخوں سے باہر دو طلائی تخت تھے جن پر شاہ اور اس کی بیٹی جلوہ افروز ہوتے تھے۔

یہ تو ہوا عدالت کا نقشہ۔ اب اس میں انصاف کس طرح ہوتا تھا؟ جب کوئی شخص کسی جرم کے الزام میں گرفتار ہوکر آتا تھا تو تمام شہر میں اعلان کر دیا جاتا تھا کہ فلاں دن دیوتاؤں کی عدالت میں اس شخص کا انصاف ہوگا۔ چنانچہ اس دن سب لوگ عدالت میں جمع ہو جاتے تھے۔ شاہ اور شہزادی اپنے اپنے تخت پر رونق افروز ہونے کے بعد ملزم کو عدالت میں پیش کیا جاتا تھا۔ ملزم پہلے شاہی تخت کے سامنے جاکر شاہی آداب بجا لاتا اور پھر واپس ہو جاتا۔ اور سلاخوں کے اندر داخل ہوکر تہہ خانوں کے ان دو دروازوں میں سے کسی ایک کو اپنے ہی ہاتھوں سے کھول دیتا۔ اب ان دو تہہ خانوں میں کیا رہتا تھا؟

ایک میں تو ملک الموت یعنی خونخوار شیر ہوتا تھا جو خاص طور سے اس انصاف کیلئے کئی روز سے بھوکا رکھا جاتا تھا۔ اگر ملزم اس دروازے کو کھولتا تو شیر فوراً اس کا خاتمہ کر دیتا تھا۔ دیکھنے والے رنج و غم کرتے تھے۔ سوگ کی گھنٹیاں بجائی جاتی تھیں اور سینکڑوں غلام جو سوگ کیلئے خاص طور سے مہیا کیا جاتے تھے۔ زور زور سے رونا چلانا شروع کر دیتے تھے۔ لوگوں کو یقین ہو جاتا تھا کہ ملزم نے یقیناً جرم کیا تھا۔

اگر ملزم دوسرا دروازہ کھولتا تو اس میں سے ایک حور وش پری جمال نازنین برآمد ہوتی تھی جو اس شخص کے قریب آکر اپنے گلے کا ہار اس کو پہنا دیتی تھی۔ فوراً مذہبی گروطلب کئے جاتے تھے جو وہیں پر تیار رہتے تھے۔ اور اسی وقت اس حسینہ کی اس شخص کے ساتھ شادی ہو جاتی تھی۔ سب لوگ خوشیاں مناتے تھے۔ اور دولہا دلہن کی خوشی کیلئے دیوتاؤں سے دعائیں مانگتے تھے۔ اور ان پر پھولوں کی بارش کرتے تھے۔

اب اگر اس شخص کو لوگوں نے اپنی ہی آنکھوں سے جرم کرتے دیکھا ہو تو کیا تھا۔ مانا کہ اس نے واقعی جرم کیا تھا۔ لیکن جب دیوتا اس سے راضی ہیں اور جب دیوتاؤں کو اس کا جرم پسند ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی مجرمانہ حرکت انسانیت کیلئے نجات اور بھلائی کا باعث تھی۔ اس نے خود ہی اپنے ہاتھوں سے دروازہ کھولا تھا۔ دیوتاؤں نے اس کے دل میں وہی دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تھا۔ اور دیوتاؤں کے انصاف پر بھلا کون سر ہلا سکتا تھا۔

ہماری نظروں میں یہ انصاف سچا ہوتا تھا یا جھوٹا، لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس انصاف کا اثر قوم کے ضمیر پر تو خوب پڑتا تھا۔ سب لوگ سمجھتے تھے کہ انصاف دیوتا کرتے ہیں۔ اور دیوتا تو دل کا سب حال جانتے ہیں۔ ان کیلئے ظاہر و پوشیدہ سب برابر ہے گناہ کریں گے تو ضرور سزا پائیں گے اور سزا بھی کیسی۔ موت!! ناہبیا نا اس سے تو دور ہی اچھے۔

خیر۔ انصاف تو یکا ہوتا تھا۔ اس کے خلاف کسی کو احتجاج کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ لیکن ....

ایک نوجوان فوجی عہدہ دار نے جرم کیا۔ نت نیا۔ بالکل نرالا۔ جس کی نظیر عدالت کی زندگی میں ایک نہ تھی۔.... اس نے پریم کیا...... شہزادی سے!! اور پریم کیلئے تو کوئی بندھن نہیں ہے۔ شہزادی بھی اس نوجوان سپاہی سے محبت کرتی تھی.... کیا پریم کرنا پاپ تھا؟ نہ ہو۔ لیکن ایک اجنبی عورت سے بار بار ملنا...... راتوں کو...... تنہا..... اور پھر گھنٹوں سرگوشیاں کرنا یہ ضرور پاپ تھا۔ اور یہ باتیں کیا کہیں چھپا کرتی ہیں۔ شاہ کو معلوم ہو گیا اور شاہ بھی بیچارہ انصاف میں جکڑا ہوا تھا، مجبور تھا۔ وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ بجز اس کے کہ اس جرم کا فیصلہ عدالت کے سپرد کر دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نوجوان سپاہی کو عدالت میں حاضر ہو کر دیوتاؤں کا فیصلہ حاصل کرنے کی اطلاع دی گئی۔

چونکہ یہ جرم ایک خاص جرم تھا اور اس میں شہزادی اور شاہ کو خاص دلچسپی تھی۔ اس لئے اس مقدمے کیلئے خاص خاص اور بڑی بڑی تیاریاں کی گئیں۔ شاہی پنجروں کا سب سے زیادہ خونخوار شیر اور ملک کی سب سے زیادہ حسین لڑکی اس نوجوان پریمی کیلئے منتخب کئے گئے۔ اور ملک کے کونے کونے میں اعلان کر دیا گیا کہ فلاں دن اس فوجی نوجوان کا اس جرم کے الزام میں عدالت سے فیصلہ حاصل کیا جائے گا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا سب لوگ عدالت کے میدان کے گرد جمع ہو گئے۔ کچھ دیر بعد نقارے پر چوب پڑی۔ ساتھ ہی شاہ اور شہزادی اپنے اپنے تخت پر رونق افروز ہوئے۔ اور نوجوان ملزم کو حاضر عدالت کیا گیا۔

لوگوں کی تعداد ہمیشہ سے بہت زیادہ تھی اور ان سب کا دل ملزم کیلئے ہمدردی سے لبریز تھا۔ یہ بانکا سپاہی نہایت خوش اخلاق اور ہر دل عزیز تھا۔ عدالت میں اس کو جاں بلب دیکھ کر لوگوں نے آہیں بھرنی شروع کیں اور صدق دل سے دعاؤں کے لئے ہاتھ اٹھا دئے۔ ہر شخص ہمدردانہ جذبات سے بے قابو ہو رہا تھا۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ اور بے چینی کی ایک آگ لگی ہوئی تھی۔ لیکن نوجوان سپاہی اطمینان و سکون کا مجسمہ بنا ہوا فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔

شہزادی نے بھی اپنے حصے کا پورا کام کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مقدمے میں اس کو بے انتہا دلچسپی تھی۔ اپنی جان خطرہ میں ڈال کر اس نے تمام کٹھن منزلیں طے کر لیں اور وہ وہ باتیں معلوم کر لیں جو دیوتاؤں کے قانون کے مطابق خود شاہ کو بھی معلوم نہ ہو سکتی تھیں۔ اور کیوں نہیں؟ ایک شہزادی، نوجوان حسین، کیا کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ان دیویوں کے پیچھے میں تو دیوتا بھی کئی مرتبہ جکڑے جا چکے ہیں۔ غرض وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ کونسی لڑکی نوجوان کیلئے منتخب کی گئی تھی۔ اور یہ بھی کہ کس تہ خانے میں اس کو رکھا گیا تھا۔

نقارے پر دوبارہ چوب پڑی۔ اور مقدمے کی کارروائی شروع ہو گئی۔ نوجوان آگے بڑھا۔ شاہ اور شہزادی کے سامنے جھک کر آداب بجا لایا۔ اور سر اٹھاتے اٹھاتے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے شہزادی سے دریافت کرنا چاہا کہ کونسے دروازے کو کھولا جائے۔ نوجوان سمجھ چکا تھا کہ شہزادی نے سب کچھ معلوم کر لیا ہو گا۔ اور شہزادی یہ خوب جانتی تھی۔ کہ اس کا دلبر اس سے ضرور دریافت کرے گا اور اس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کیا جواب دیگی۔

جب نوجوان نے استفسارانہ نگاہیں شہزادی کی طرف اٹھائیں تو شہزادی نے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ اپنے سیدھے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ نوجوان نے بھی اطمینان کے ساتھ لوٹ کر قدم بڑھایا۔ اور سلاخوں کے اندر داخل ہو کر سیدھی جانب کا دروازہ کھول دیا۔

کیا اس دروازے میں سے لڑکی نکلی؟ ہم کو یہاں پر ایک لمحہ غور کرنا چاہیئے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ ایک نیم وحشی قوم کی شہزادی تھی۔ جن میں حسد کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ شہزادی اس

منتخب حسینہ سے واقف تھی، پہچانتی تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے لاجواب حسن کے سبب اس سے کچھ جلتی بھی تھی۔ اپنے فرشتے کی گود میں اپنی جگہ اس حسینہ کا تصور اس کو مارے ڈالتا تھا۔ نوجوان میرا ہے۔ صرف میرا۔ اگر دیوتا اس کو میرا نہیں ہونے دیتے تو پھر وہ کسی اور کا بھی نہیں ہو سکے گا۔

وحشیانہ جوش کے ساتھ یہ خیال اس کے دماغ میں سمائے ہوئے تھا۔ نوجوان کی اس حسینہ کے ساتھ شادی دیکھنے کے بدلے مرجانا وہ زیادہ پسند کرتی تھی۔

تو کیا اس دروازے میں سے شیر نکلا؟ کیا شہزادی نے اپنے پریمی کو ببر شیر کے حوالے کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ چاہے کچھ ہی ہو پھر بھی وہ نوجوان سے بے حد پریم کرتی تھی۔ اس پر دل وجان سے فدا تھی۔ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اور اپنے ہی اشارے سے اپنے عاشق صادق کو، اپنے دل و جگر کو، شیر کے خونی پنجوں کے حوالے کر دیتی، اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے سے جدا کر دیتی، بالکل ہی کھو دیتی، فرقت میں اپنی ساری عمر برباد کرتی اور اس کی یاد میں مر مر کے زندہ رہتی۔

آخر شہزادی نے کیا تصفیہ کیا؟ اپنے دلبر کو موت کے حوالے یا دوسرے کے حوالے۔ کیونکہ اس کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا۔ اس سوال کا جواب میں اس داستان کے پڑھنے والے دوستوں سے چاہوں گا کہ ہر پہلو پر مکمل غور کرنے کے بعد اس کا فیصلہ وہ خود کریں کہ دروازے میں سے کیا نکلا۔

ملک الموت یا پیام مسرت

(ایم۔ اے شاکر) "سب رس"

نئی کتابیں

رُوحِ غالب

مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایم اے - پی - ایچ - ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ - کتابت و طباعت اچھی - جلد سادہ مگر خوبصورت سائز ۲۰×۲۶/۸ حجم ۲۷۵ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے - ناشران :- ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن -

اُردو ادب میں غالب کو جو بلند حیثیت حاصل ہے اُس میں اب شاید کسی چون و چرا کی ضرورت نہیں - غالب کی موت کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اس عظیم الشان ادبی ہستی کا مرتبہ اور بلند ہو رہا ہے -

گزشتہ چند سالوں سے غالب پر بڑی محنت اور کاوش سے مبسوط اور محققانہ مضامین لکھے جا رہے ہیں - ہندوستان کے بڑے بڑے انشاپرداز اور علمی و ادبی حلقے غالب کو صحیح رنگ میں پیش کرنے کے لئے کئی بلند پایہ کتابیں منظرِ عام پر لا چکے ہیں لیکن جہاں تک غالب کو سمجھنے کا تعلق ہے ہم انگریز شاعر میتھیو آرنلڈ کے اُن الفاظ کو جو اس نے شیکسپیئر کے متعلق لکھے ہیں یہاں بھی استعمال کئے بغیر نہیں رہ سکتے ——— "ہم رہ رہ کر سوال کرتے ہیں - غالب مسکراتا ہے اور خاموش ہے" ——— کسی ایک نقاد سے یہ توقع رکھنا شاید عبث ہے کہ وہ غالب کی شخصیت کی تھاہ کو پہنچ سکے گا تاہم اس میں شبہ نہیں کہ چند سال سے تنقیدِ غالب کے سلسلہ میں جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں - اُنھوں نے غالب کے مسئلہ کے مختلف اور متعدد پہلوؤں پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے - ڈاکٹر زور صاحب کی کتاب "روحِ غالب" بھی اسی سلسلہ میں ایک حسین پیشکش ہے -

روحِ غالب میں غالب کے اردو مکاتیب شامل ہیں غالب کی نثر یوں بھی اُردو کی جان ہے - پھر اس نثر میں سے بھی ڈاکٹر زور صاحب نے ایسے ایسے ادب پارے منتخب کئے ہیں کہ غالب اپنی زبان کی لطافت - ادبی گلکاریوں ندرتِ خیال اور دلکش اسلوب بیان کے لحاظ سے اپنی معیاری رفعتوں پر فائز نظر آتا ہے -

روحِ غالب کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مرتب نے خطوط غالب کے صرف ایسے حصے پیش کئے ہیں جن میں غالب اپنی عمیق ترین فنی اور علمی گہرائیوں میں جانے کی بجائے خاص ادبی رنگ میں سامنے آتا ہے - ایک عام پڑھنے والے کو غالب کے کسی ایسے دقیق فنی مسئلہ سے دوچار نہیں ہونا پڑتا جس کا حل اُس کے لئے ایک مشکل بن کر رہ جائے بلکہ شروع سے لے کر آخر تک وہ صرف ایک آسان اور اعلےٰ نثر کا سلوب خاص سے لطف اندوز ہوتا ہے - ان خطوط میں غالب کی زندگی کے صرف وہی واقعات ہیں جن کے مطالعہ سے طبیعت پر فرحت اور شگفتگی سی چھا جاتی ہے - مرزا غالب کی خودداری آزادروی ظرافت - مروت اور فراخ حوصلگی ہر جگہ اپنی جھلکیاں دکھلائے جاتی ہے - شہنشاہِ سخن کی شخصیت کا صحیح نقشہ اُن کے اپنے خطوط ہی نے خوب کھینچا ہے - خطوط پڑھتے جائیے آپ کو یوں محسوس ہو گا جیسے آپ خود غالب سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں - کتاب کے پہلے حصے میں غالب کی زندگی کے حالات درج ہیں - اُن کی تصنیفات و تالیفات سے متعلق معلومات اور پھر اُن کے رشتہ داروں - دوستوں اور شاگردوں کے تذکرۂ تعلقات نے ان خطوط کے مطالعہ میں ایک مزید دلچسپی اور لطف کا سامان مہیا کر دیا ہے - ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ملک کے ایک بلند پایہ ادیب ہیں اور ادب غالب کا یہ فنکارانہ انتخاب اُن کی قابلیت کا ایک بہترین نمونہ ہے - ہمیں یقین ہے کہ ملک "روحِ غالب" کا استقبال بڑی گرمجوشی سے کریگا -

نذرِ دکن

مرتبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ مدیرہ سب رس - کتابت و طباعت عمدہ - جلد خوشنما - تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ ضخامت ۱۰۱ صفحے قیمت ایک روپیہ چار آنے - ناشران :- ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن

دکن کے اُردو نواز اداروں میں ادارہ ادبیات اُردو کو ایک نمایاں شہرت حاصل ہے - اس ادارہ کے زیرِ اہتمام نہ صرف اُردو علم ادب کی بہتر سے بہتر کتابیں نشر ہو رہی ہیں بلکہ اس کے زیرِ سرپرستی مشہور خواتین دکن کی ایک علمی انجمن بھی قائم ہے - چنانچہ اس انجمن کی بدولت آج وہاں کی خواتین بھی ایک حیرت انگیز قابلیت کے ساتھ خدمت علم و ادب میں پیش پیش نظر آتی ہیں -

حال میں بزمِ خواتین کی سرگرم کارکن محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے "سب رس"

کا خواتین نمبر "نذرِ دکن" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ جس میں دکن کے متعلق خواتین دکن کے مضامین اور نظمیں درج ہیں۔ اس مجموعہ میں شروع سے لے کر آخر تک جتنے مضامین اور نظمیں ہیں سب کا معیار بلند ہے اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہماری خواتین میں بھی اب علم و ادب کا صحیح اور سلجھا ہوا ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ کتاب کے شروع میں محترمہ مسز صغرا ہمایوں مرزا کا مضمون "دکن میں سلاطین اسلام کی آمد" درج ہے۔ محترمہ کا نام محتاج تعارف نہیں یہ مضمون بھی ان کی پختہ کاری کا ایک نمونہ ہے۔ ممتاز جہاں بیگم صاحبہ کا محققانہ مضمون دکن کے چند تاجدار شعراء بہت محنت سے لکھا گیا ہے۔ موصوفہ نے اس مضمون میں دکن کے مختلف شاعر بادشاہوں کے مختصر سوانح حیات کے ساتھ ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ قمر النساء بیگم صاحبہ کا تاریخی مضمون مکہ مسجد کا "سنگ بنیاد" بہت دلچسپ ہے۔ تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ نے "وطنیت" کے موضوع پر اس خوبی سے لکھا ہے کہ انہیں داد دینی پڑتی ہے

صفیہ صدیق فریدہ صاحبہ کا مضمون "دورِ آصفی کے مثنوی گو شعراء" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ محترمہ نے اپنے اس مضمون میں دکن کے مثنوی گو شعرا کا تذکرہ کیا ہے۔ شعرا کے مختصر سوانح حیات کے ساتھ ساتھ اُن کا کلام بھی درج ہے۔ مضمون کے اندازِ بیان اور طرزِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ نفس مضمون سے متعلق موصوفہ کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔

ان مضامین کے علاوہ باقی سب مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتاب کے حصہ نظم کا معیار بھی اچھا خاصہ ہے۔ محترمہ لطیف النساء صاحبہ نے اپنی غزل میں قوم اور ملک کی خستہ حالی اور زمانہ کی موجودہ تباہ کن روش پر نہایت خوش اسلوبی سے قابل قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا محترمہ ولی کے تخیل پر ایک نہایت گراں پایہ مضمون لکھ کر ہندوستان بھر کے ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اس غزل پر بھی اُنہیں بزم ادب کی طرف سے پہلا انعامی کپ دیا گیا۔

محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے سب رس کے اس نمبر کی ترتیب و تدوین میں جس محنت ہمت اور قابلیت کا ثبوت دیا ہے ہم اس کی داد دیئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ خواتین دکن کا یہ گلدستۂ رنگ و بو تعلیم یافتہ گھرانوں کی زینت بننے کے لائق ہے۔

فرہنگ عامرہ

مؤلفہ محمد عبداللہ خاں صاحب خویشگی۔ کتابت معمولی۔ جلد خوشرنگ اور مضبوط۔ سائز ۳۰×۲۰/۱۶ حجم ۵۸۲ صفحات قیمت دو روپیہ

ملنے کا پتہ۔ محمد عبداللہ خاں خویشگی۔ فیروز منزل متصل جامع مسجد۔ خورجہ یو۔پی۔

یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اکثر ہندوستانی تعلیمات و ادبیات سے اب خاص دلچسپی لے رہے ہیں اور ان کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہو رہی ہیں کہ رفتار زمانہ کے ساتھ تعلیم و تعلم میں جو بہتر تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اُن کے مطابق پرانے مشرقی انداز کو بھی نیا رنگ دیا جائے۔

اسی سلسلہ میں مولوی محمد عبداللہ صاحب خویشگی نے اردو فارسی اور ترکی کے چالیس ہزار الفاظ کا ایک ایسا مجموعہ لغت مرتب کیا ہے۔ جسے ہر لحاظ سے جامع کہا جا سکتا ہے۔ کتاب انگریزی ترتیب کے مطابق ہے اور اس کی تکمیل اس خوبی سے کی گئی ہے۔ کہ اس میں موجودہ زمانہ کی ہر علمی ضرورت پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔

کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر لفظ کے سامنے اس کا صحیح تلفظ درج ہے اور الفاظ کے معنی جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ ہر مصدر کے ساتھ اس کا مضارع بھی موجود ہے اور ہر حرف کی تقطیع کے شروع میں ان حروف کا مثالوں کے ساتھ دیا گیا ہے جن سے اس کا بدل ہے۔

دیباچے نے کتاب کی خوبیوں میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ نئے نئے الفاظ کیلئے اس میں جہاں انسلاک الصدور (PREFIXES.) اور لواحقاتِ ترکیبی (SUFFIXES.) کی فہرست دی گئی ہے۔ وہاں عام فارسی اسماء کی جمع بنانے کا قاعدہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔ معنوں میں روزمرہ کی شستگی، مجلسی رواداری، تہذیب اور سنجیدگی کا لحاظ رکھا گیا ہے اور بے معارج چیزوں کی جگہ ہزاروں نئے اقتصادی، تمدنی اور سیاسی الفاظ داخل کر دئیے گئے ہیں۔

مولوی محمد عبداللہ خاں صاحب نے یہ قابل قدر فرہنگ مرتب کر کے زبان پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کی بہت قدر ہوگی۔

"ف"

نگراں
پروفیسر تاجور نجیب آبادی

شاہکار لاہور

ایڈیٹر
فاروق علی خاں

جلد (۱۰) نمبر (۱)

فہرست مضامین بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء

سالانہ چندہ: چھ روپے۔ ششماہی تین روپے آٹھ آنے۔ نمونہ پانچ آنے

ایم ہادی حسن اختر ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار بر مکان میاں علی محمد۔ میاں علی محمد سٹریٹ (۱۵ ہسپتال روڈ) خواجہ دل محمد روڈ لاہور سے

رفتارِ عالم

ایک جدید عالمگیر جنگ

بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات اور سیاسی اقتدار کی خواہش عرصے سے جرمنی کو اپنی حدود پھیلانے پر مجبور کر رہی تھی۔ سوڈیٹن لینڈ، آسٹریا، چیکوسلاوکیہ اور میمل کا الحاق انہیں خواہشات کا آئینہ دار تھا۔ لیکن اپنی حدود میں اسقدر توسیع کر لینے کے باوجود جرمنی کی نظریں پولینڈ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس کا مطالبہ تھا کہ ڈانزیگ۔ کوریڈور۔ صوبہ پوزین اور بالائی سائیلیزیا اس کے حوالے کر دئے جائیں۔ کیونکہ جنگِ عظیم سے قبل یہ اس کے مقبوضات تھے۔

میونچ کے میثاق تک ہٹلر کے مطالبات جرمنی کی مشرقی سرحد پر بہت معمولی تھے۔ نازیوں نے برسرِ اقتدار آتے ہی اپنے پرانے دشمن روس کے خلاف پولینڈ کے ساتھ صلح رکھنے کا ایک معاہدہ مرتب کر لیا تھا۔ مگر دراصل ہٹلر کی چال یہ تھی کہ آسٹریا اور چیکوسلاویکیہ کے مسائل کو اپنی خواہش کے مطابق طے کر لینے تک پولینڈ کے ساتھ اتحاد اور دوستی کا رابطہ قائم رہنا چاہیئے تاکہ روس جو جرمنی کے خلاف فرانس سے ساز باز کر رہا تھا اگر اپنے حلیف چیکوسلاویکیہ کی امداد و معاونت کے لئے جرمنی کے خلاف کسی جارحانہ اقدام کیلئے آمادہ ہو تو پولینڈ اس کے راستے میں حائل ہو سکے۔ چنانچہ چیکوسلاویکیہ پر قبضہ کر لینے تک پولینڈ کے متعلق ہٹلر کے تمام منصوبے وہی رہے یہانتک کہ خود ڈانزیگ کے نازیوں نے حکومتِ پولینڈ کے مفروضہ مظالم کی جو طویل شکایات رائش کے حکومت کے پاس ارسال کرنا شروع کر رکھی تھیں خود انہیں بھی قابلِ درگذر تصور کیا گیا۔ لیکن چیکوسلاویکیہ پر خاموشی سے قابض ہو جانے کے بعد ہٹلر نے اپنا رخ پولینڈ کی جانب کیا اور ابتدا میں ڈانزیگ اور کوریڈور کی جرمن اقلیت کے خلاف پولش اکثریت کے مفروضہ غیر ہمدردانہ رویے کو اپنی مطالبات کا بہانہ بنا کر پولینڈ کے خلاف اپنے منصوبوں کو واضح کر دیا۔

پولینڈ

یورپ کے تمام ممالک میں پولینڈ کی تاریخ ایک مسلسل کشمکش اور پیہم اضطراب کی تاریخ ہے۔ اسے طاقتور ہمسایہ سلطنتوں کی مذموم ریشہ دوانیوں اور جارحانہ چالوں کا مقابلہ کرتے۔ پچھلے نوسو سال سے غیر مختتم حوادث اور مشکلات کا شکار ہونا پڑا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت پولینڈ کا اصل رقبہ ۱۶۱۸ء کی نسبت نصف ہے۔ اُس وقت مشرقی پروشیا اور لیتھوانیا اور ایستھونیا کے بعض حصّے پولینڈ کے قبضے میں تھے۔ لیکن بعد میں مشرقی پرشیا اس سے علیحدہ ہو گیا اور ایستھونیا کا حصّہ سویڈن کے ماتحت چلا گیا۔ اٹھارہویں صدی میں پولینڈ کی اندرونی طاقت، نظامِ حکومت کی تباہی کی وجہ سے ایسی بگڑی کہ اس کا دو تہائی حصّہ روس، جرمنی اور آسٹریا میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پولینڈ یورپ کے نقشے سے بالکل معدوم ہو کر روس کے زیرنگیں ہو گیا۔ جنگِ عظیم چھڑی تو سب سے اوّل جرمنی نے پولینڈ کے اس حصّے کو جو اس کے قبضے میں تھا آزاد کر دیا۔ اِدھر ۱۹۱۷ء میں روس میں بغاوت ہوئی اور زار کو قتل کر دینے کے بعد نئی حکومت برسرِ اقتدار آئی تو اس نے لیتھوانیا۔ ایستھونیا وغیرہ کے ساتھ ساتھ پولینڈ کو اپنی مملکت سے علیحدہ کر کے اس کی آزادی کو بھی تسلیم کر لیا۔ بلکہ یوکرین کا ایک حصّہ بھی پولینڈ کے حوالے کر دیا گیا۔

جدید پولینڈ کے لیڈر مارشل جوزف پلوڈسکی نے اپنے

ملک کی تین کروڑ آبادی کہ جس میں بیس لاکھ جرمن بھی شامل تھے۔ ازسرِنو منظم کیا۔ ملک کی اندرونی طاقت اور بیرونی وقار کو قائم کرنے کیلئے وہ تمام ذرائع اختیار کیے جو اس کے لئے ضروری تھے اور رفتہ رفتہ ملک کو ایک طاقتور سلطنت میں تبدیل کر لیا۔ اس وقت پولینڈ کی آبادی ساڑھے تین کروڑ ہے جس میں دس لاکھ جرمن۔ ۳۵ لاکھ یہودی اور تیس لاکھ پولش مسلمان شامل ہیں۔ اپنی قوت کے لحاظ سے پولینڈ یورپ کے اوسط درجے کے ممالک میں سب سے اوّل ہے۔ پولینڈ میں ہر تندرست آدمی پر فوجی خدمت واجب ہے۔ یہاں تین لاکھ فوج کے لئے دس مستقر ہیں اور اس کی فضائی طاقت کے متعلق قابل اعتماد اندازہ یہ ہے۔ کہ اس کے جنگی طیاروں کی تعداد دو ہزار سے اوپر ہے۔

کوریڈور

جنگِ عظیم کے بعد جرمنی کی ازسرِنو تشکیل کی گئی تھی۔ اور امن کیلئے خطرناک نہ رکھنے کی نیت سے اس کے ان مقبوضات کو اس سے جدا کر کے دوسرے ممالک کو دے دیا گیا تھا جن کے بل بوتے پر وہ آئندہ دنیا کے امن کے لئے باعثِ خطر ہو سکتا تھا۔ چونکہ پولینڈ بھی اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں شامل رہا تھا۔ اس لئے مشرقی پروشیا کے ایک علاقے کو جسے کوریڈور کہا جاتا ہے جرمنی سے جدا کر کے پولینڈ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ دراصل پولینڈ چاروں طرف سے خشکی میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد طاقتور سلطنتیں قائم ہیں اور اس کے پاس تجارتی مقاصد اور مدافعانہ ضروریات کے لئے کوئی بندرگاہ موجود نہیں تھی۔ چنانچہ اس کی آزادی کو محفوظ کرنے کی نیت سے کوریڈور کا علاقہ دے کر سمندر تک اس کا راستہ معین کر دیا گیا اس اقدام کا مقصد اگر ایک طرف جرمنی کے علاقوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے جرمنی کے دیوانہ پن کو آئندہ کیلئے روکنا تھا تو دوسری طرف پولینڈ کو سمندر کا کھلا راستہ دے کر اپنے فتنہ پرور ہمسایوں کے مقابلے میں طاقتور بنانا بھی تھا۔ کوریڈور بلجیم کے رقبہ سے نصف ہے۔ تاریخی لحاظ سے کوریڈور کا علاقہ جرمنی اور پولینڈ دونوں کیلئے بہت اہمیت رکھتا ہے سنہ ۱۴۶۶ء تک یہ علاقہ جرمنی کا تھا۔ لیکن سنہ ۱۷۷۲ء میں یہ پولینڈ کے قبضے میں رہا۔ اس کے بعد پھر جرمنی کے ہاتھ میں چلا گیا۔

سنہ ۱۹۱۸ء تک جرمنی کے قبضے میں رہنے کے بعد اس کا الحاق ایک مرتبہ پھر پولینڈ کے ساتھ ہو گیا۔ پولینڈ نے اس میں اقتصادی توسیع کی اور اس کو صنعتی ترقی دی۔ ادھر مشرقی پروشیا کا نوجوان اور صنعت پسند طبقہ اس علاقے کو جرمنی اور مشرقی پروشیا کے مجلسی اور اقتصادی اختلاط میں سدِ سکندری دیکھ کر جرمنی کو ہجرت کر گیا۔ جس سے مشرقی پروشیا جرمنی کا عضوِ معطل بننے کے علاوہ ایک "بے جان" ملک کی صورت اختیار کرنے لگا۔

ڈانزیگ

جرمنی کے دوسرے مقبوضات میں ڈانزیگ اور اس کا ملحقہ علاقہ بھی ایسے تھے جنہیں جرمنی سے علیحدہ کرنا ضروری سمجھا گیا۔ ڈانزیگ جو شمالی یورپ کی ایک قدیم بندرگاہ ہے دریائے وسچولا کے دہانے پر واقع ہے۔ دریائے وسچولا پولینڈ کے بیچوں بیچ بہتا ہے اور پولینڈ کی تجارتی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

قرونِ اولیٰ میں یہ بندرگاہ پولینڈ کے قبضے میں تھی لیکن چودھویں صدی میں جب پولینڈ کے حصے بخرے ہوئے تو جرمنی نے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ چنانچہ اس بندرگاہ میں جرمنوں کی آبادی بڑھنے لگی۔ جو اس وقت اسی فیصدی کی حیثیت رکھتی ہے جب پولینڈ جرمنی کے قبضے سے نکلا تو اس نے ڈانزیگ کے حصول کی کوشش نہ کی۔ تاہم جنگِ عظیم کے بعد ڈانزیگ کی علیحدگی کا مسئلہ پیش ہوا اور اس کی جرمن اکثریت کے پیشِ نظر اسے ایک علیحدہ آزاد بندرگاہ قرار دے کر خودمختار کر دیا گیا۔ یہاں جمعیت اقوام کے ایک ہائی کمشنر کے علاوہ نازیوں کی اکثریت کی طرف سے ایک حاکم اور پولینڈ کے اقتصادی اور معاشی حقوق کی نگہداشت کے لئے ایک پولش افسر برسرِ اقتدار تھے۔ ان تینوں کے اشتراک سے ڈانزیگ کی آزاد بندرگاہ کا کام چل رہا تھا۔ پولینڈ کی تجارت کا اکثر حصہ ڈانزیگ کے راستے باہر کے ممالک کو جاتا ہے۔ لیکن پولش مدبر اس امر سے بے خبر نہ تھے کہ اگر کسی طرح ڈانزیگ ان کے قابو سے باہر ہو گیا تو ان کی تجارت کے تمام راستے مسدود ہو جائیں گے۔ اس لئے انہوں نے ڈانزیگ کے کوریڈور کے ساحل پر سنہ ۱۹۲۱ء میں اپنی نئی بندرگاہ تعمیر کی۔ جس کا نام "گڈینیا" ہے۔ گڈینیا کی تعمیر نے تجارتی نقطۂ نگاہ سے ڈانزیگ کی

آبادی حیثیت بہت کم کر دی ہے۔ اور اب پولینڈ کو محض اقتصادی ضروریات کیلئے ڈانزیگ پر انحصار کی چنداں ضرورت نہیں رہی۔

جنگ کی وجوہات

یہ تو تھی پولینڈ اور ہٹلر کے مطلوبہ علاقوں کی اجمالی کیفیت اب دیکھنا یہ ہے کہ جب اٹلی کا الحاق حبشہ و البانیہ یا جرمنی کا الحاق آسٹریا و چیکوسلاویکیہ یا چین پر جاپان کا ظالمانہ حملہ اور خود ٹین سین میں برطانوی باشندوں پر خطرناک جاپانی ناکہ بندی کسی فوج کشی کا موجب نہ ہو سکی تھی تو پولینڈ اور جرمنی کا موجودہ نزاع ایک عالمگیر جنگ کی صورت کیوں اختیار کر گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ عسکری نقطہ نگاہ سے پولینڈ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ روس اور جرمنی کی دو مخالف طاقتوں کو جن کی دشمنی بالفعل عارضی طور پر اتحاد اور دوستی میں بدل گئی ہے ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ جرمنی عرصے سے پولینڈ کو ہضم کرنے کی فکر میں تھا۔ کیونکہ اس کو صاف کر لینے کے بعد بحر بالٹک کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی آزادی کو ختم کر دینا اس کے لئے چنداں مشکل نہیں رہتا تھا۔ لیکن روس اپنے مفاد کیلئے پولینڈ کی آزادی میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اگر پولینڈ پر جرمنی کا قبضہ ہو جائے تو روس کو ہر وقت جرمن حملہ کیلئے تیار رہنا پڑے گا۔ ادھر پولینڈ نے جرمنی کے مقاصد سے باخبر ہونے کی وجہ سے نہ صرف روس کے ساتھ بلکہ برطانیہ اور فرانس کے ساتھ بھی ایسا معاہدہ کر رکھا تھا جس کی رو سے وہ پولینڈ کی آزادی کی ضمانت کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے ہٹلر کے لئے پولینڈ پر چڑھائی کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے پہلے آسٹریا اور چیکوسلاویکیہ کے مسائل کو حسب خواہش طے کیا۔ پھر میمل پر جو لیتھونیا کا علاقہ تھا قبضہ کیا۔ جب استھینا اور موراویا بھی جرمن اقتدار میں چلے گئے تو پولینڈ اور جرمنی کا ڈانڈے سے ڈانڈا مل گیا اور ہٹلر کے لئے اپنے پاؤں پھیلانے کے متعدد بہانے نکل آئے۔ جب تک اسے برطانیہ، فرانس اور روس کا خطرہ تھا۔ وہ در پردہ پولینڈ کے خلاف ڈانزیگ کے نازیوں کو ریشہ دوانیوں کی شہ دیتا رہا جس کے نتیجہ میں شہر کا امن۔ اس کے باشندوں کے حقوق۔ تجارتی اور اقتصادی حالت سب تباہ کر دی گئی اور جمعیت اقوام سے اس کا تعلق منقطع کیا گیا۔ لیکن جیسے ہی روس کے ساتھ اس کا سمجھوتہ ہو گیا اس نے صاف اعلان کر دیا کہ ڈانزیگ اور کوریڈور اس کو واپس کر دیئے جائیں۔ اور ساتھ ہی ڈانزیگ سے پولینڈ کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش جاری کر دی گئی۔ حکومت کے ہر محکمہ پر نازی جماعتیں برسر اقتدار ہو گئیں۔ شہر کی جرمن آبادی عسکری نظام کے ماتحت منظم کر دی گئی۔ پولیس کا محکمہ نازیوں کے قبضے میں چلا گیا اور بندرگاہ میں جرمنی سے اسلحہ منگا کر جمع کر لیا گیا۔ گویا ڈانزیگ جرمن الحاق کیلئے ہر طرح تیار ہو گیا۔

چونکہ ڈانزیگ کئی صدیوں سے پولش بندرگاہ تھا۔ اس لئے اس کے چھن جانے سے پولینڈ کے دریا کا دہانہ چھن جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر جرمنی اس پر قبضہ کر لینے کے بعد اس کی قلعہ بندی کر لے تو گڈینیا کی بندرگاہ اور بحیرہ بالٹک کا ساحلی علاقہ آسانی سے پولینڈ کیلئے بیکار بنایا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف کوریڈور کا علاقہ پولینڈ کے لئے اس قدر اہمیت رکھتا ہے جتنا جرمنی کے لئے یہاں کے کوئلے کی کانیں اور ریلوے پولینڈ کیلئے بہت ضروری ہیں۔ کوریڈور کے چھن جانے سے نہ صرف پولینڈ بہت کمزور ہو جاتا ہے بلکہ وہ چاروں طرف سے خشکی میں محصور ہو کر جرمنی کی جوع الارض کا شکار ہو سکتا ہے۔ لہذا پولینڈ کے لئے جرمنی کے مطالبات ٹھکرا دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ مگر جرمنی روس کی مداخلت سے بے خوف ہو چکا تھا۔ اس نے پولش حکومت کیلئے چند ذلت آمیز تجاویز تیار کیں۔ جن کی اطلاع پولینڈ کو دینے کی بجائے اس سے اس امر کا مطالبہ کیا گیا۔ کہ پولینڈ کا سفیر جرمنی آئے تاکہ جس طرح چیکوسلاویکیہ کے متعلق ہٹلر کے مطالبات زبردستی منوا لئے گئے تھے۔ اسی طرح دھمکیوں کے ذریعہ ان مطالبات پر بھی دستخط کروا لئے جائیں۔

اس موقع پر برطانیہ اور فرانس نے ہٹلر کے مطالبات کو گفت و شنید اور مفاہمت کے ذریعے طے کرا دینے کی ضمانت دی اور موجودہ خوفناک جنگ کو روکنے کی از حد کوشش کی۔ لیکن ہٹلر عرصہ سے تشدد کا قائل ہو رہا تھا۔ اس نے مصالحانہ کوشش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ سمجھوتہ کا وقت نکل چکا ہے۔

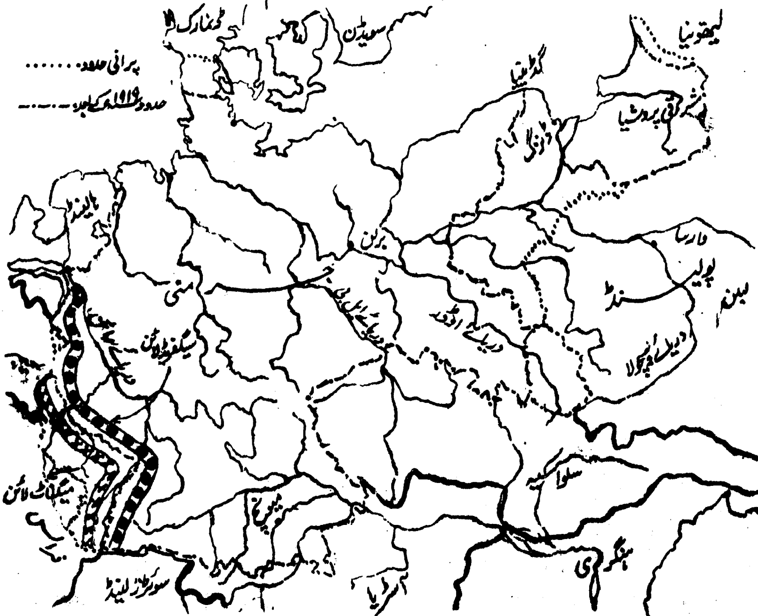
ہٹلر اور مسولینی نے اب جنگ کیلئے ایک نیا اصول

وضع کیا ہے اور وہ یہ کہ کسی جنگ کو شروع کرنے کیلئے اعلان جنگ کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ کمزور ملک کے خلاف جب جی میں آئے چڑھائی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق ہٹلر نے پہلے تو ڈانزیگ کو باقاعدہ جرمن قلمرو میں شامل کر لینے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد اچانک پولینڈ پر حملہ کر دیا۔

اس موقعہ پر پولینڈ کو درمیان میں چھوڑ دینا تمام دنیا کے امن اور چین کو خطرے میں ڈال دیتا۔ چنانچہ برطانیہ اور فرانس نے ہٹلر کو اطلاع دی کہ اگر اس نے اپنے جارحانہ اقدامات کو یہیں پر نہ روکا تو وہ مجبور ہو جائیں گے کہ انسانیت، شرافت اور امن کے نام پر اپنے ان مواعید کو پورا کریں جو پولینڈ کی آزادی کو ہر حالت میں برقرار رکھنے کیلئے انہوں نے اس مظلوم ملک سے کر رکھے ہیں۔ لیکن برطانیہ کی آخری تنبیہ بھی کارگر ثابت نہ ہو سکی اور ہٹلر نے دنیا کو ایک مرتبہ پھر ایک ایسی عالمگیر جنگ کے ہولناک گڑھے میں دھکیل دیا ہے جس کے نتائج شاید پہلی جنگ سے بھی زیادہ خوفناک ہوں گے۔ موجودہ صورتِ حالات نے دنیا کو ایک عجیب کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے جرمنی اور روس نے پولینڈ پر قبضہ جما لیا ہے۔ روس کی مداخلت سے پہلے برطانیہ اور فرانس نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر جرمنی نے پولینڈ کو فتح کر بھی لیا تو یہ جنگ ختم نہ ہوگی بلکہ اس وقت تک جاری رہیگی جب تک ہٹلر اپنی معاندانہ سرگرمیوں کو ختم کر کے متنازعہ امور کے تصفیہ کیلئے دوستانہ اور امن پسندانہ گفت و شنید سے کام نہ لے۔ اب روس کی مداخلت کے بعد جنگ کا کیا نقشہ ہوگا۔ اس کے متعلق کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا لیکن ظاہر ہے کہ اگر برطانیہ اور فرانس پولینڈ کی حمایت پر ڈٹے رہے تو جس طرح روس اچانک جنگ میں کود پڑا ہے۔ اسی طرح باری باری ان سلطنتوں کو بھی میدانِ جنگ میں آنا پڑے گا۔ جو اب تک اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر چکی ہیں۔

محمود نظامی

جرمنی جنگ عظیم سے پہلے اور جنگ عظیم کے بعد



انصاف

عدالتیں تماشا بنی ہوئی تھیں - بڑے بڑے کامیاب وکیل دن بھر بیٹھے مکھیاں مارا کرتے تھے - اور ایسے ایسے آدمی جو عدالتوں میں آتے ہوئے کانپتے تھے - عدالتوں کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے تھے - قانون ذلیل ہو چکا تھا - انصاف بکتا تھا - روپیہ آخری حکم تھا۔ رشوت کی یہ گرم بازاری اس نئی روشنی کے زمانے میں عجیب و غریب صورت اختیار کئے ہوئے تھی - چودھری صفدر حسین جو ایک کامیاب وکیل ہیں - اس زمانہ کی بابت کہا کرتے تھے کہ ہمارے شہر کا وہ زمانہ روپے کا زمانہ تھا - لوگوں کا نہ صرف مال بلکہ جان اور آبرو خطرے میں تھی - شہر کے ساہوکار اس زمانہ کو سنہری زمانہ کہہ کر اب تک یاد کیا کرتے ہیں - اور اس کے ہاتھ سے نکل جانے پر اسی طرح افسوس کرتے ہیں جیسے کوئی حساس تیموری شہزادہ مغلوں کی بادشاہت مٹ جانے پر آنسو بہاتا ہے -

۲

دن سدا ایک سے نہیں رہتے - ڈپٹی ہیبت رائے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا آنا تھا کہ عدالتوں میں سناٹا چھا گیا - قانون کو قانون اور انصاف کو انصاف سمجھا جانے لگا - رشوت کی لعنت عدالتوں سے دور ہوئی - اہلکار منشی متصدی، ایجنٹ تھے اور تمام دن ڈپٹی ہیبت رائے کے حق میں بد دعائیں کرتے - اب وہ چہل پہل نہ وہ ٹھٹھا کھن نہ وہ مستغیثوں اور ملزموں کا مونچھوں پر تاؤ دینا اور اکڑنا - عدالتوں کا نقشہ ہی پلٹ گیا - معلوم ہوتا تھا کہ لکشمی احاطہ عدالت سے ناراض ہو کر چلی گئی ہے -

ڈپٹی ہیبت رائے سے کوئی جھوٹوں جا کر کہہ دے سہی کہ فلاں شخص نے رشوت کا نام لیا بس پھر یا وہ نہیں یا ڈپٹی صاحب نہیں - مرنے مارنے پر تیار، جب تک اس کو نکال نہ دیں کھانا پینا حرام سمجھیں - اب تک مقدمے شہر میں مشہور ہیں کہ ملزموں نے فیصلہ سے پہلے اگر سفارش یا رشوت کا نام بھی لیا تو سزا نہ بھی دینی ہوتی جب بھی دیتے - کیا مجال کہ کسی منصف، سب جج یا ماتحت مجسٹریٹ کی عدالت میں کوئی شخص رشوت کا نام بھی لے -

ابھی ڈپٹی ہیبت رائے کو آئے ایک سال ہی گزرا تھا۔ کہ ایک مقدمہ میں جس کا فیصلہ ڈپٹی صاحب لکھ چکے تھے - ملزم فیصلہ سنانے کی تاریخ سے ایک روز پہلے ڈپٹی صاحب کے مکان پر پہنچا - ڈپٹی صاحب نہایت خلوص سے پیش آئے۔ پاس بٹھایا - ملزم نے اپنی بیگناہی اور مظلومی کی داستان شروع کی - کئی دلیلیں پیش کیں - ڈپٹی صاحب غور سے سنتے رہے - انہوں نے میز پر سے فیصلہ اٹھا کر دیکھا اور قدرے مسکرائے - گویا زبان حال سے کہا کہ ہم تم سے پہلے سب کچھ کر چکے ہیں - اور فیصلہ ٹھیک لکھا ہے - ملزم نے اس مسکراہٹ کو اپنی جرأت کی تمہید سمجھا اور کمر سے ہمیانی کھول کر چلتے چلتے میز پر رکھ گیا - ڈپٹی صاحب نے ہمیانی کا منہ کھولا اور روپے نکال کر گنے پورے پانچ سو تھے -

فیصلے کی تاریخ آئی - فیصلہ پہلے ہی ملزم کے حق میں تھا - اسے اس الزام سے بری کر دیا گیا - لیکن ساتھ ہی اس پر رشوت دینے کا مقدمہ چلایا اور ملزم کو قید کر کے روپیہ سرکاری خزانے میں داخل کر دیا - یہ بات سن کر لوگوں نے کانوں پر ہاتھ دھرے - رشوت لینا یا دینا تو درکنار - رشوت کا نام لینا گناہ سمجھا جانے لگا -

۳

قانون اور انصاف کے نام کا ڈنکا بجا کر تین سال کے بعد ڈپٹی ہیبت رائے تبدیل ہو گئے - اہلکاروں کی چھاتی پر سے گویا بوجھ اترا - رشوت خوروں کے جسم نے گویا فالج سے نجات پائی - نئے مجسٹریٹ کے آتے ہی رشوت پھر کچھ کچھ چلنے لگی - نیک اور شریف لوگوں میں ڈپٹی ہیبت رائے کے جانے پر افسوس کیا جاتا تھا - متوسط اخلاق کے لوگ بھی متاسف تھے - البتہ عادی مجرموں اور جرائم پیشہ لوگوں کی بن آئی تھی - ایک دن صبح ہی اخباروں میں

لوگ یہ خبر پڑھ کر حیران رہ گئے کہ ڈپٹی ہیبت رائے کے خلاف حکومت کی طرف سے رشوت ستانی کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ پولیس نے پچیس شہادتیں فراہم کر لی تھیں۔ جن میں ٹھیکیدار، تاجر اور مختلف طبقوں کے معززین شامل تھے۔ ہر شخص حیران تھا۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ ایسے دیکھتے تھے گویا ایک دوسرے پر خاموش طنز کر رہے تھے۔

مقدمہ چلا، سرکاری وکیل نے ابتدائی تقریر میں وہ وہ دلائل ڈپٹی صاحب کے خلاف پیش کیں کہ وکلائے صفائی دانتوں میں انگلیاں دبانے لگے۔ شہادتیں اس قدر واضح مکمل اور ڈپٹی صاحب کے خلاف تھیں کہ تو یہ قتل عمد کے ایک مقدمہ میں تین ہزار۔ دفعہ ۲۱۲ کی ایک اپیل کے سلسلے میں پانسو دفعہ ۴۹۸ کے دو مقدموں میں چار چار سو روپیہ اور دفعہ ۱۸۱ کے تین مقدمات میں مختلف رقمیں لینا یہ سب کچھ روز روشن کی طرح ثابت ہوا۔

۴

شہادت استغاثہ ختم ہوئی اور ڈپٹی صاحب پر فرد جرم عائد کی گئی۔ مقدمہ کی سماعت ایک ٹربیونل کر رہا تھا جس میں تین جج تھے، ایک سرکاری اور دو غیر سرکاری۔ فیصلے کی تاریخ سے پہلے جہاں کہیں سنو یہی تذکرہ تھا۔ ڈپٹی ہیبت رائے کے بڑے بڑے معتقد بھی کہتے تھے کہ ڈپٹی صاحب کا بچنا محال ہے — جاہل مزدوروں سے لے کر اونچے طبقے تک کے لوگوں کا خیال تھا کہ ڈپٹی صاحب ضرور بالضرور قید ہوں گے۔

فیصلے کی تاریخ آ پہنچی۔ اس بات کا یقین اب بھی بعض لوگوں کو نہ تھا کہ ڈپٹی صاحب نے رشوت لی ہے۔ لیکن یہ خیال یقین کے درجے تک پہنچ چکا تھا کہ ڈپٹی صاحب کے بچنے کی اب کوئی صورت نہیں ہے۔ رشوت لی ہو یا نہ لی ہو ڈپٹی صاحب بڑا گھر ضرور دیکھیں گے۔ ڈپٹی ہیبت رائے جیسے رشوت دشمن کے خلاف مقدمہ کی خبر لوگوں نے جس طرح بھی سنی تھی۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جبکہ فیصلہ کی تاریخ پر ججوں نے ڈپٹی صاحب کو بیگناہ قرار دے کر بری کر دیا۔ اتنے مکمل ثبوت کے باوجود ڈپٹی صاحب کا بری ہو جانا کچھ کم تعجب انگیز نہ تھا۔ اس فیصلہ کے لوگوں کے دلوں میں ایک دفعہ پھر ڈپٹی ہیبت رائے کی انصاف پسندی اور حق پرستی کی یاد تازہ ہو گئی۔

۵

ڈپٹی صاحب کو بری ہوئے تین دن گذر چکے تھے۔ خویش و اقارب، یار دوست جوق در جوق مبارک باد کہنے کیلئے آ رہے تھے۔ چوتھے دن لوگوں کا تانتا ٹوٹا اور آمد و رفت کم ہوئی شام کا وقت تھا۔ ڈپٹی صاحب کے خاص خاص بے تکلف دوست انہیں گھیرے بیٹھے تھے۔ ایک صاحب نے کہا۔ ڈپٹی صاحب! ہمیں اس بات کا یقین ضرور ہو گیا تھا کہ آپ قید ہو جائیں گے۔ اس کے باوجود آپ کا باعزت طور پر بری ہو جانا کسی طرح معجزہ سے کم نہیں، آخر بتلایئے تو کیا گنجائش تھی؟ آپ کس طرح بچے؟ ڈپٹی صاحب نے مسکرا کر آہستہ سے اس دوست کے کان میں کہا۔ "ٹربیونل کے ججوں کو رشوت دیکر"

وقار انبالوی

"آنکھیں"

دو آنکھیں ہیں اس بت کی دو صبر شکن ساغر
پھر اس پہ اشارے بھی بس تو یہی تو بہ ہے
آرزو لکھنوی

آنکھ اس ادا سے اس نے دکھائی کہ میں نے شوق
چپکے سے اپنا مے کا بھرا جام رکھ دیا
شوق

یاد آتی ہے کسی شوخ کی مستی بھری آنکھ
ملتی جلتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانے سے
آغا حشر

دیدار سے محروم ہیں آنکھیں تو گلہ کیا
اس راہ سے تم دل میں اتر آئے ہوئے ہو
حامد

تیری آنکھیں ہیں مجھے مست بنانے والی
بادۂ ناب کے دو گھونٹ پلانے والی
ظفر علیخاں

ہبر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
میر

نمائش و نمائش گاہ

اے مبصر، ذرا وسیع نگاہ ساری دُنیا ہے اِک نمائش گاہ
اہلِ دنیا ہیں صرفِ نام و نمود فطرتِ شخصیت ہے شہرت گاہ
صرف اغراض کی نمائش ہے یہ جو ہنگامہ سا ہے شام و پگاہ
بیم و امید کے دوراہے میں نہیں ملتی سکون کی کوئی راہ
دعوئے آگہی ہے حسنِ فریب ورنہ باطل کہاں ہے حق آگاہ
نفس کو اپنے مطمئن کر لے یہیں ملتی ہے شورشوں کو پناہ
ہے یہ بے سود فکرِ نام و نمود غور سے سُن پیامِ برگ و گیاہ
سب کا انجام خاک ہونا ہے طرۂ گُل ہو، یا ہو طرفِ کلاہ
فرصت علم و عقل و عرفاں ہے اے خرابِ غرور و نخوت و جاہ

ہے خودی و نمود سے بیزار
محرمِ لا الٰہ اِلا اللہ

سیماب اکبرآبادی

علی مردان خاں

علی مردان خاں کا نام شاہجہانی عہد کی تاریخ کے درخشاں اوراق پر جگہ جگہ سنہرے حروف میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ شاہجہان خوبصورت عمارتوں کی تعمیر کے شوق کیلئے مشہور ہے۔ دنیا کا خوبصورت ترین مقبرہ تاج محل اسی کی شہرۂ آفاق یادگار ہے۔

عربی میں ایک مثل مشہور ہے کہ رعایا بھی راعی ہی کا مسلک اختیار کر لیتی ہے۔ شاہجہاں کے عہد کے بڑے بڑے امراء جن میں سعد اللہ خاں، وزیر خاں، آصف خاں، شہزادہ داراشکوہ اور علی مردان خاں وغیرہ شامل ہیں۔ تعمیرات کے کام میں بے انتہا دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے شاہی عمارات کے علاوہ ذاتی شوق سے بھی بے شمار وسیع، خوبصورت اور بیش قیمت عمارتیں تعمیر کرائیں۔ لاہور کے موچی دروازے کے اندر رنگ محل کے موجودہ علاقے میں نواب سعد اللہ خاں کا عظیم الشان محل واقع تھا۔ اس محل کی ڈیوڑھی کا ٹوٹا پھوٹا دروازہ "جسے محکمۂ آثار قدیمہ" نے محفوظ کر رکھا ہے۔ اب تک موجود ہے۔ اِس دروازے کے اندر اب کوچہ در کوچہ ایک محلہ آباد ہے۔ جسے "حویلی میاں خاں" کہتے ہیں۔ سعد اللہ خاں کا محل اس کے بیٹے میاں خاں کے زمانے میں اسی نام سے موسوم تھا۔

نواب وزیر خاں کے "پری محل" کا ذکر بھی اب بیکار ہے۔ شاہ عالمی دروازے کے اندر اس کی ڈیوڑھی کا دروازہ تو اب تک قائم ہے لیکن اس کے اندر دکانوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ہاں لاہور کی "ٹالنٹن مارکٹ" کے پاس وزیر خاں کے باغ کی خوبصورت بارہ دری جس میں آجکل "پنجاب پبلک لائبریری" قائم ہے، اب بھی اس کی یاد دلاتی ہے۔ مگر اس کی سب سے بڑی یادگار جس نے اس کے نام کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اس کا بسایا ہوا شہر وزیر آباد اور اس کے پیوند خاک ہوتے ہوئے عالی شان دروازے نہیں، بلکہ لاہور کی وہ خوبصورت، پائدار اور پُرشکوہ مسجد ہے۔ جو "وزیر خاں کی مسجد" کے نام سے مشہور ہے اور جو اپنی وضع کی مغلیہ عمارتوں میں عدیم النظیر سمجھی جاتی ہے۔

آصف خاں کو بھی تعمیرات کے کام سے بڑی دلبستگی تھی۔ اس نے نہ صرف شاہ جہان کے حکم سے قلعہ لاہور میں بہت سی شاہی عمارتیں تعمیر کرائیں بلکہ اپنے لئے بھی بیس لاکھ روپے کے صرف سے ایک عظیم الشان قصر بنوایا جو موجودہ "وطن بلڈنگ" سے لے کر "شہید گنج"، "سرائے میاں سلطان" اور "ریلوے ٹیکنیکل سکول" تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ یہ بجائے خود ایک قلعہ تھا جس کے اندر زنانہ اور مردانہ محلات، دفاتر، مسجدیں، تالاب، حمام، حوض، فوارے اور باغ وغیرہ موجود تھے۔ اس عظیم الشان عمارت کا اب کوئی نشان باقی نہیں۔

شہزادہ داراشکوہ کو بھی باپ اور نانا کے ذوقِ تعمیر سے حصّہ وافی ملا تھا لیکن اس کی تعمیر کردہ عمارتیں بھی اب دوسری عمارتوں کی طرح بے نام و نشان ہو چکی ہیں۔ البتہ لاہور میں ایک چوک اب تک اس کے نام سے منسوب ہے۔ اس نے موجودہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک بہت بڑی مسجد بھی بنوائی تھی جس کی ایک بچی کھچی دیوار "ریلوے ٹیکنیکل سکول" کی تعمیر کے زمانے تک باقی تھی مگر سکول کی تعمیر کے وقت مسمار ہو گئی۔

باقی رہا علی مردان خاں، اُسے شاہ جہان کے عہد کا میر تعمیرات کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ شاہ جہان کی بیشتر عالی شان عمارتیں اسی خوش ذوق اور ماہرِ فن امیر کے زیرِ ہدایت تعمیر ہوئیں۔ علی مردان خاں کو بھی تعمیرات کا شوق آبائی ورثہ میں پہنچا تھا۔ قندھار میں ایک عظیم الشان باغ اب تک اس کے باپ کی یادگار کے طور پر موجود ہے۔ علی مردان خاں نے شاہی احکام کی تعمیل میں اور اس کے علاوہ ذاتی شوق سے بھی

اتنی عمارتیں بنوائیں کہ اب بآسانی ان کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں ہو سکتا ۔ تاریخی کتابوں میں کہیں ان عمارتوں کی تفصیلات اور کہیں محض نام دیکھنے میں آتے ہیں ۔ کہتے ہیں گوجرانوالہ کے ضلع میں علی مردان خاں نے ایک خوبصورت قصبہ بھی بسایا تھا اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام کی رعایت سے ابراہیم آباد رکھا تھا ۔ اب یہ قصبہ بالکل نیست و نابود ہو چکا ہے البتہ اس مقام پر اب تک ایک بلند ٹیلا باقی ہے ۔ جس پر سوودھرہ کی نئی آبادی کے مکانات نظر آتے ہیں ۔

چنیوٹ میں شاہ برہان کا مقبرہ اور دکھنی سرائے ضلع جالندھر میں نورمحل کی خوبصورت رنگین عمارت بھی علی مردان خاں کی یادگار ہے ۔

کابل میں علی مردان خاں نے ایک نہایت شاندار مسقّف بازار تعمیر کرایا تھا جو اب تک ماہرینِ فن سے خراجِ تحسین حاصل کر رہا ہے ۔ کابل کے ایک محلے کا نام بھی "باغ علی مردان خاں" ہے ۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہاں علی مردان خاں نے کوئی بہت بڑا باغ لگایا ہوگا ۔ اب باغ تو باقی نہیں ، نام باقی ہے ۔

دہلی کا قلعہ اور شاہی عمارات اگرچہ مکرمت خاں کی نگرانی میں تعمیر ہوئیں ۔ لیکن ان کی تعمیر میں بھی علی مردان خاں کے فنی مشورے شامل تھے ۔ بلکہ بعض نوشتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کا قلعہ ، جامع مسجد ، نہر اور شہر پناہ بھی علی مردان خاں نے تعمیر کرائی ۔

کشمیر میں بھی اس نے کئی عمارتیں بنوائیں اور باغ لگائے ۔ علی مردان خاں کا ایک کارِ نمایاں یہ ہے کہ اس نے کشمیر کے بعض دشوار گذار راستوں کو صاف کر کے اس قابل بنا دیا کہ وہ بے خطر سیر و سفر کرنے کے کام آسکیں ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "شالا مار باغ" لاہور کی عمارت بھی علی مردان خاں ہی کے اہتمام میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی ۔ باغ کی تاریخ "نمونۂ خلد بریں" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۰۴۷ھ میں تعمیر ہوا ۔ علی مردان خاں ۱۰۴۷ھ میں ہندوستان آیا تھا ۔ باغ کی عمارت جس پر چھ لاکھ روپے صرف ہوئے کم و بیش ایک سال میں مکمل ہو گئی تھی ۔ اس لئے اگرچہ علی مردان خاں اور شاہ جہان کے مراسم اس کے ہندوستان میں وارد ہونے سے پہلے بھی قائم تھے ۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا ۔ کہ شالا مار باغ کی عمارت کی تعمیر یا اس کے نقشے کی تیاری میں علی مردان خاں بھی کسی طرح شامل تھا یا نہیں ۔ البتہ اتنا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس باغ کو قائم اور سرسبز و شاداب رکھنے کا ذریعہ جو نہر ہی وہ علی مردان خاں ہی نے نکالی تھی ، اور اس باغ کا نفیس نظامِ آبپاشی اسی کے کمالِ فن کی یادگار ہے ۔

مغل بادشاہوں کو بابر کا مذاق ورثے میں ملا تھا ۔ اُن کو سبزے کے ساتھ آبِ رواں سے بھی عشق تھا ۔ اُن کے ہر باغ ، ہر مقبرے اور ہر محل میں فواروں ، آبشاروں چمنوں اور نہروں کی بغایت دلاویز نمائش کی جاتی تھی ۔ پانی کے اس فنی اور آرائشی استعمال ہی نے شالا مار کو شالا مار بنایا اور اس کیلئے ہم علی مردان خاں کے شکر گذار ہیں ۔ شالا مار کی نہر کے ذکر پر خیال خود بخود علی مردان خاں کی نکالی ہوئی نہروں اور اُس کے تعمیر کردہ پلوں کی طرف جاتا ہے ۔ شالا مار باغ کی نہر دو لاکھ روپے کے صرف سے تعمیر ہوئی تھی ۔ اس نہر سے گرد و پیش کے اضلاع کا بہت سا بے آباد و زراعتی علاقہ آباد ہو گیا ۔ نہر جمنا ، نہر دو آبۂ رچنا اور نہر رہتک بھی علی مردان خاں ہی کی نگرانی میں نکالی گئیں ۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ یہ نہریں ملک کے حق میں باعثِ رحمت ثابت ہوئیں ۔

علی مردان خاں کے اہتمام میں متعدد پل بھی تعمیر ہوئے ۔ کابل اور جلال آباد کے راستے میں اس کا بنایا ہوا "سرخ پل" اب تک موجود ہے جس کی تاریخ کسی شاعر نے اس مصرع سے نکالی تھی ۔ ع

بانیٔ این پل علی مردان شد از لطفِ مجید

علی مردان خاں کون تھا اور کہاں سے آیا ؟ اس کا باپ گنج علی خاں امرائے ایران میں سے تھا ۔ یہ شخص ایران کے شاہی دربار میں نہایت بلند منصب پر فائز تھا اور شاہِ ایران اُسے "ارجمند بابا" کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا ۔ شاہ جہان کے عہد میں شاہِ ایران نے جب شہنشاہِ ہندوستان سے رابطۂ اتحاد استوار کرنا چاہا تو شاہجہان کو قندھار کا علاقہ بطور نذر گذرانا ۔ یہ نذر اس خیال سے بھی پیش کی گئی کہ خود شاہجہان کو قندھار پر تصرف حاصل کرنے کی تمنا تھی ۔ ایران اور ہندوستان کے اس ربط ضبط کے بعد اکثر ایرانی نواب اور امیرزادے

ہندوستان آنے جانے لگے۔ اسی سلسلے میں علی مردان خاں بھی ہندوستان آیا۔ میں اس سے پہلے بتا چکا ہوں کہ علی مردان خاں اور شاہجہان کے مراسم اُس کے واردِ ہندوستان ہونے سے پہلے قائم ہو چکے تھے۔ دونوں کو باغ لگانے اور عمارتیں تعمیر کرنے کا فطری ذوق ودیعت ہوا تھا۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ علی مردان خاں کی گوناگوں قابلیتوں اور خاندانی وجاہت کے باعث شاہجہان کے دربار میں اس کی غیر معمولی قدر و منزلت ہوئی۔ ہندوستان میں وارد ہونے سے پہلے ہی شاہجہان نے اُسے یار وفادار کا خطاب دے رکھا تھا۔

علی مردان خاں کو صرف عمارتوں، باغوں، نہروں اور پلوں کی تعمیر ہی کا مذاق نہ تھا بلکہ وہ علمی و ادبی ذوق سے بھی بہرہ ور تھا۔ اس کی تحریرات میں عموماً اعلیٰ درجے کے اشعار کے حوالے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب وہ پہلی دفعہ شاہجہان کے دربار میں باریاب ہوا تو اس نے بادشاہ کو پیش کرنے کے لئے جو چیز منتخب کی، وہ بھی ایک ادبی یادگار تھی۔ یعنی "شاہ نامہ فردوسی" کا ایک قدیم نسخہ جو ایرانی خطاطی اور مصوری کا ایک بہترین نمونہ تھا۔ سنا ہے کہ یہ نسخہ پٹنہ کی "خدا بخش لائبریری" میں اب تک محفوظ ہے۔

۱۰۴۹ھ میں علی مردان خاں پہلے پہل لاہور میں وارد ہوا۔ بادشاہ اُس وقت لاہور سے باہر تھا۔ کچھ عرصے کے بعد لاہور پہنچ کر شاہجہان نے قلعۂ شاہی میں علی مردان خاں کو باریابی کا شرف بخشا۔ بادشاہ کے ایماء سے چند عمائد دربار نے دیوان عام کے دروازے تک جا کر اُس کا استقبال کیا۔ جہاں پناہ نے علی مردان خاں کی نذر قبول کی اور خلعت، خطاب اور انعامات سے سرفراز کرنے کے علاوہ اسے لاہور تک پہنچنے کے سفر خرچ کے طور پر دس لاکھ روپے عطا کئے۔ اس کے بعد علی مردان خاں کشمیر اور پنجاب کے صوبہ دار کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ اور ہفت ہزاری منصب کی بخشش سے اُس کی مزید عزت افزائی ہوئی۔

کشمیر کی صوبہ داری کے ایام میں علی مردان خاں نے سڑکوں کی تعمیر اور قحط زدہ لوگوں کی امداد کا حیرت انگیز انتظام کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ماہر فنِ تعمیر ہونے کے علاوہ وہ اعلیٰ درجے کا منتظم بھی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے اسے "امیر الامراء" کا خطاب دیا اور کابل کی زیادہ اہم صوبہ داری اس کے سپرد کی۔

علی مردان خاں کی انتظامی قابلیت کے ساتھ اُس کی جنگی قابلیت کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ شاہجہان کے عمائد دربار میں کوئی شخص کابل اور قندھار کے چپے چپے سے اتنا واقف نہ تھا جتنا علی مردان خاں۔ چنانچہ اس طرف جب کبھی کسی سرکش یا باغی نے سر اٹھایا شاہجہان نے علی مردان خاں کی جنگی قابلیت پر پورا اعتماد رکھا اور علی مردان خاں نے ہر فتنہ کو نہایت قابلیت سے دبا دیا۔ اورنگ زیب بھی جو اُن دنوں شہزادہ تھا علی مردان خاں کی قابلیتوں کا معترف تھا چنانچہ شہزادہ اور علی مردان خاں میں خط و کتابت کے تعلقات بھی قائم تھے۔

لاہور میں علی مردان خاں کا عالیشان قصر اور باغ "شالامار باغ" کی سڑک پر واقع تھا۔ اسی باغ میں علی مردان خاں نے اپنی والدہ کا نہایت خوبصورت اور رفیع الشان مقبرہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ لیکن تقدیر کو یہ منظور تھا کہ یہی مقبرہ خود اُس کی آخری آرام گاہ بھی بنے۔ ۱۰۶۶ھ میں جب علی مردان خاں کشمیر جا رہا تھا وہ پیچش کے مرض میں مبتلا ہو کر راہیِ عدم ہوا۔ اُس کی لاش لاہور پہنچائی گئی اور اسی مقبرہ میں ماں کی قبر کے ساتھ علی مردان خاں کی قبر بھی بنی۔ یہ مقبرہ شالامار باغ کی سڑک پر گلابی باغ کے روبرو واقع ہے۔ اب اس کے اردگرد ریلوے ورکشاپ کی عمارت کا احاطہ ہے، لیکن مقبرے تک پہنچنے کیلئے ایک تنگ راستہ چھوڑ دیا گیا ہے۔

اُس زمانے کے کسی شاعر نے ان اشعار میں علی مردان خاں کی تاریخ وفات کہی تھی۔

امیرِ صاحبِ دولت ہشیر صاحبِ حشمت
ثنا گوئے علیؑ مردِ حق آگاہ مرداں خاں
سفر چوں کرد ازیں دنیائے دوں سوئے جناں اے دل
ندا آمد بتاریخش کہ حق آگاہ مرداں خاں

جیسا پہلے شعر کے دوسرے مصرع سے بھی کسی قدر ظاہر ہو جاتا ہے علی مردان خاں شیعہ تھا۔ اُس نے کشمیر میں اپنے ایک عظیم الشان باغ کی تمام آمدنی مشہدِ مقدس کیلئے وقف کر دی تھی۔

اب میں علی مردان خاں، اُس کے مکان اور اُس کے مقبرے کے متعلق "تاریخ لاہور" سے کچھ اقتباسات پیش کرتا ہوں جن سے اُس کی شخصیت اور ان عمارتوں کی حیثیت پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے:-

"علی مردان خاں عمارات کے کام میں ایسا استاد تھا کہ کروڑوں روپے اُس کے ہاتھ سے تعمیرات پر صرف ہوئے - علی مردان خاں کا باغ معروف بہ نولکھا باغ لاہور میں اُس کی یادگار تھا جس کی اب صرف ڈیوڑھی باقی ہے - باقی عمارت سب برباد ہو چکی ہے - دہلی کی نہر جو عین شہر میں بہتی ہے اِسی شخص نے نکالی تھی - مادھوپور سے اسی نے ایک نہر کھدوائی تھی اور اس کے ذریعہ شالامار کو سیراب کیا تھا - بڑی نہر جو دہلی سے ہانسی حصار کو جاتی ہے - اِس نے دوبارہ درست کرائی - اسی طرح اس نے ہزاروں عمارتیں بنوائیں جن کا حد و حساب نہیں۔"

علی مردان خاں کے مکان کے متعلق "تاریخ لاہور" کا یہ اقتباس قابلِ توجہ ہے:-

"اسلامی حکومت کے زمانے میں اِس کے ساتھ کی خشتی عمارت مسجدِ وزیر خاں کے سوا دوسری نہ تھی مگر شہر کی بربادی کے وقت یہ عالی شان مکان خاک میں مل گیا: . . . . . مکان مقبرے سے شمال کی سمت میں ہے - اِس کی عمارت نہایت عمدہ مقطع کاشی کاری کی بنی ہوئی ہے - سب عمارت خشتی ہے - محرابی چھتیں ہیں - اُوپر کی منزل پر جانے کے دو زینے ہیں . . . ."

اس کے بعد مقبرے کا ذکر کرتے ہوئے مؤلفِ "تاریخ لاہور" نے یہ عبارت درج کی ہے:-

"نواب علی مردان خاں کا مقبرہ تین منزلہ ہے - ایک منزل زمین کے اندر بطور تہ خانے کے ہے - یہ تہ خانہ نہایت وسیع ہے - اِس میں تین قبریں ہیں - اِس کی چھت قالبوتی گنبد نما ہے - اس تہ خانے سے اوپر کی منزل میں ایک پختہ عالی شان مثمن چبوترے پر گنبد کی عمارت ہے - اس کی شکل ہشت پہلو ہے اور اس کے آٹھوں طرف آٹھ عالیشان محرابیں ہیں - مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں اس عالیشان مقبرے میں میگزین تھا جو گلاب سنگھ کی ماتحت فوج سے متعلق تھا - اس مقبرے کی پہلی منزل میں سنگ سرخ اور سنگِ ابری کی بڑی بڑی سلیں نصب تھیں . . . . . . پہلی منزل کے زینہ سے آدمی اوپر جائے تو گنبد کے چاروں سمت پھر سکتا ہے - ہر ایک پہلو میں دریچہ دار عالیشان شاہ نشینیں بنی ہوئی ہیں اور بیچ میں عالیشان گنبد ہیں - یہاں جب آدمی آخری چھت پر جاتا ہے تو ہر ایک گوشے پر چھوٹے چھوٹے ہشت درے خوشنما گنبد نظر آتے ہیں، اور درمیان میں ایک بڑا عالی شان گنبد ہے - اس مقبرے کی عظمت و شان کا کچھ حساب نہیں - اتنا بلند مقبرہ لاہور میں اور کوئی نہیں ہے۔"

حکومت کے انقلاب اور دستبردِ روزگار سے یہ عالی شان عمارتیں مٹ مٹا گئی ہیں - حکومت ہند کے "محکمہ آثارِ قدیمہ" کے تحفظ کے باوجود اب ان کے بچے کھچے کھنڈروں سے ان کی گزشتہ عظمت و شان کا دھندلا سا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا - بقولِ میر ؎

جہاں پر اب مزاریں ہو گئی ہیں
وہاں پہلے بہاریں ہو گئی ہیں

شالامار کی سڑک پر شاہجہاں کے زرّیں عہد کے اس بلند ذوق ماہرِ تعمیرات کے قصر و باغ اور مقبرے کا عبرتناک حشر دیکھ کر انسان دم بخود رہ جاتا ہے۔

آخر میں علی مردان خاں کی جامع کمالات شخصیت کے گوناگوں اوصاف ایک فقرے میں یوں دہرائے جا سکتے ہیں کہ وہ ایک عالی خاندان ادب دوست امیر، ایک خوش مذاق اور ماہرِ فنِ متنوع ایک باکمال انجنیر، ایک منتظم صوبہ دار اور ایک کارآزمودہ سپہ سالار تھا۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

حامد علی خاں
(جائنٹ ایڈیٹر "ہمایوں")

قطعات

غمِ بیکراں

غم زدوں کا کوئی خدا بھی ہے — کوئی یہ ظلم دیکھتا بھی ہے
اب یہ غم ہے کہ مٹ گیا غمِ دل ! — آخر اس غم کی انتہا بھی ہے

غم نصیب کی صبح

یہ نسیم سحر ہے اے اختر ! — یا فضا بھر رہی ہے سرد آہیں !
اور اُفق پر یہ آفتاب ہے یا — زخم ہے آسمان کے سینے میں

غمناک موسیقی

کروٹیں لے رہی ہے دل میں مرے — ایک بھولی ہوئی سی یادِ حزیں
مطربہ ! یہ نوائے غم افروز — میرے ماضی کی داستاں تو نہیں

عالمِ یاس

مل گئیں خاک میں سب اُمیدیں — ہو گئیں دل کی حسرتیں برباد
طبع محزوں ہے یاس سے لبریز — میرؔ کے شعر آرہے ہیں یاد !

جوانی

نیند آتی ہے اس طرح شب کو — جیسے پینے میں نشہ چڑھتا ہے
صبح اس طرح سو کے اُٹھتے ہیں — جیسے سیلاب آگے بڑھتا ہے

رقاصہ

کر دیا حافظے میں حشر بپا — اور ماضی میں زندگی بھر دی
اُنگلیوں کو فضا میں لہرا کر — تُو نے اِک داستاں رقم کر دی

اخترؔ انصاری

ایک شوہر کی نفسیات

"بڑی رقم تو کسی گانٹھ کے پورے سے لونگی، آپ بس نذر پانچ روپے دے دیجئے۔" مسز طبلیکر نے نہایت ہموار لہجے میں چندہ مانگا۔

"جی، بڑی عنایت! ایکہزار، بلکہ ایک لاکھ فرماتیں تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔" میں نے نہایت نرم آواز میں جواب دیا اور ایک روپیہ جیب سے نکال کر پیش کر دیا جسے اُس نے بڑی حقارت سے دیکھا۔ اور حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"ایک روپیہ!"

"اسے چندہ نہ سمجھئے۔ کاروبار کی حالت آج کل بہت خراب ہے میں بالکل انکار نہ کر سکتا تھا، اور بڑی سے بڑی رقم شخصی خدمت"

"مگر ایک روپیہ!" اُس نے میری بات پوری نہ ہونے دی۔

"میں کہہ رہا تھا کہ شخصی خدمت کے مقابلے میں بڑی سے بڑی رقم ہیچ ہے —— اور آج کل چندے ——"

"مگر ایک روپیہ! کل سینما میں ہی آپ نے دس بیس خرچ کر دیئے ہونگے!"

"درست فرمایا مگر جب ایک دوست سے کسی کو قرض لینا ہو تو ایسا طرف اسراف نہیں بلکہ "سرمایہ" سمجھا جاتا ہے۔ جلسے میں صدارت کس کی ہوگی؟" میں نے بات ٹالنے کے لئے دریافت کیا۔

"شریمتی تارا بائی ٹاپتے کی۔ میں اب تک اُن سے نہ ملی تھی۔ سُنی سنائی باتوں نے ملنے سے باز رکھا تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ اب میری زبان سے ان کے خلاف ایک لفظ نہ نکلے گا۔"

"ہاں اُمید تو رکھنا ہی چاہیئے اُمید پر تو کوئی ٹیکس نہیں!" یہ کہہ کر میں نے ایک مصنوعی قہقہہ مارا۔

"میری درخواست پر اُنہوں نے فوراً صدارت منظور کر لی اور اپنی تکلیف کا کچھ خیال نہ کیا۔ بڑی خوبیوں کی دیوی ہیں!"

"اونہوں! رائے قائم کرنے میں جلدی خطرناک ہوتی ہے!"

"جی، وہ اپنے ساتھ سیٹھ دمودر لال کو بھی لائیں گی ——"

"جی ہاں، وہ جہاں جاتی ہیں سیٹھ جی اکثر ساتھ ہوتے ہیں۔ خیر، گو میں خود چندہ نہیں دے سکتا مگر شخصی خدمت کر سکتا ہوں ——"

"وہ کیسے؟"

"جی ویسے تو سیٹھ جی بہت دینگے تو ہزار، لیکن اگر میں پہلے سے ایک ہزار کا اعلان کر دوں تو دس ہزار سے کم دے ہی نہیں سکتے!"

"تب تو آپ بہت کارآمد ہونگے —— ضرور شرکت فرمائیے گا ہمارے اسکول کو مالی مدد کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمارا اسکول بہت ہر دلعزیز ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ ہمارے یہاں سب سے زیادہ زور اس پر دیا جاتا ہے کہ لڑکیوں میں خود اعتمادی پیدا ہو۔

"ہوں ں!"

"میری اگر دوسری ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو میں پوری زندگی اس کام کے لئے تج دیتی!"

"آپ کی جگہ میں ہوتا تو بہت پس و پیش کرتا۔ ایک تو اس لئے کہ آپ کی ایسی خوبصورت زندگی یوں "تج" دینے کی چیز نہیں، اور دوسرے اس لئے کہ ان میں خود اعتمادی پیدا کر کے آپ ان کو خود سر بیویاں بنا دینگی ——"

"پرانی قسم کی فرمانبرداری سچی فرمانبرداری نہیں بلکہ بیوی اپنا کوئی مصرف ہی نہیں دیکھتی لیکن برابری کے احساس کے بعد بیوی اگر فرمانبرداری کرے تو اس کی بناء گہری محبت پر ہوگی، اور ——"

"معاف فرمائیے مسز طبلیکر، بیوی کی خود اعتمادی کے معنی شوہر کی بے اعتمادی کے ہونگے —— میں تو بھگت رہا ہوں!"

"تو آپ کیا عورت کو جاہل ہی رکھنا چاہتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں! مگر خیر چھوڑئیے اس بحث کو۔"

"بدقسمتی سے میرے شوہر نہ آسکیں گے، اس لئے بھی آپ کا آنا ہمارے لئے بہتر ہوگا، بھول نہ جائیے گا۔ وعدہ کیجئے!"

"میں ضرور آؤں گا مگر مسٹر طبلیکر کیوں نہ آسکیں گے؟"

"جی، ان کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی کام رہتا ہے۔ آپ بائی جی کو بھی ساتھ لائیے گا!"

"مجھے افسوس ہے، مگر وہ کسی ایسے کام سے دلچسپی نہیں لے سکتیں جس سے مجھے دلچسپی ہو۔"

"یہی حال تو میرے پتی کا بھی ہے —— لیکن وہ تو نہایت سگھڑ اور سوشیل دیوی ہیں، میں نے ایک شادی میں انہیں دیکھا تھا!"

"بدقسمتی سے میرا خیال اس کے برخلاف ہے۔"

"چھی چھی، ایسی بات اپنے مُنہ سے نہ نکالئے ——"

"یہ میں آپ سے کہہ رہا ہوں —— شکایت نہیں کر رہا۔"

"مگر آپ ان کو سدھار سکتے ہیں ——"

"ساتھ رہنے کا موقعہ ملے تو آدمی کوشش بھی کرے!"

"چھی چھی، ایسا نہ کہئیے"

"میں شکایت نہیں کر رہا۔ مگر میرے گھر میں پہنچتے ہی ان کا مزاج بگڑ جاتا ہے۔ اس لئے میں رات گئے گھر میں جاتا ہوں اور صبح بغیر صورت دکھائے نکل آتا ہوں۔"

"معاف فرمائیے، شاید میں نے اپنی حماقت سے ایک ناگوار ذکر چھیڑ دیا ——"

"جی، آپ کو بالکل نادم نہ ہونا چاہیئے۔ یہ تو ایک فطری سی بات ہے میں گبھرو جوان بھی نہیں اور پیسے والا بوڑھا بھی نہیں —— مگر میں شکایت نہیں کر رہا!"

"دونوں باتیں غلط!"

مسز طبلیکر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور مجھے گھورنے لگی۔ میں نہ سمجھ سکا اس گھورنے کا کیا مطلب تھا اور وہ کیا سوچ رہی تھی

"جی، غلط نہیں۔ ان کو گھر سے باہر دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ گھر کے اندر کیا ہو جاتی ہیں۔ بس اگر اُن کے مکان میں نہ گھسوں تو بہت خوش رہیں گی!"

"اُن کے مکان میں کیا معنے؟"

"جی، وہ یہی سمجھتی ہیں! مگر میں شکایت نہیں کر رہا!"

"لیکن مکان تو میاں بیوی، دونوں کا ہوتا ہے!"

"مگر وہ ایسا نہیں سمجھتیں —— میں شکایت نہیں کر رہا!"

"آپ نے وجہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہوگی!"

"جی، اس کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی —— کم از کم معقول وجہ نہیں ہو سکتی!"

"تو آپ تالیف قلب سے کام نہ نکالتے ہوں گے!"

"یقین کیجئے، میں شکایت نہیں کر رہا۔ مگر وہ مجھے اتنا پسند نہیں کرتیں جتنا مجھے پسند . . . . ."

"ہوں!" (ایک ٹھنڈی سانس بھر کر) "میں جانتی ہوں کہ پسند کے مطابق پسند نہ کیا جانا کتنا بڑا عذاب ہے۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے —— اب مجھے جانا چاہیئے، ضرور آئیے گا!"

"میں نے وعدہ کیا ہے۔ ضرور آؤں گا۔"

شام کو میں جلسے میں گیا۔ نہایت خوش آئند تقریب تھی۔ سو ڈیڑھ سو لڑکیاں جوگیا ساریوں میں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ پہلی قطار میں پہلی لڑکی تو بلا کی حسین تھی۔ شاید پسینے کے قطروں نے اس کے چہرے کو اتنا دمکا دیا تھا۔ انعامی کتابیں اور چیزیں بھی خوبصورت اور کارآمد تھیں انعام تقسیم ہؤا۔ مختصر تقریریں ہوئیں میرا نام بھی پکارا گیا۔ میں کھڑا ہو گیا اور تقریر کی۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جلسے میں شرکت کا موقعہ ملا۔ یہاں میں نے جو کچھ دیکھا توقع سے زیادہ دیکھا۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ یہاں کی تربیت یافتہ لڑکیاں اس خصوصیت کی حامل ہونگی۔ کہ قومی زندگی کو خوش و خرم بنا سکیں اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ تلطف و مدارا اور عفو و الفت کا برتاؤ کر سکیں گی۔ کیونکہ اس کے بغیر گھر کی زندگی خوشی سے نہیں گذر سکتی۔ میں ایک ہزار روپیہ کا حقیر ہدیہ پیش کرتا ہوں۔"

میں نے تقریر ختم کی تو جب تک کرسی پر نہ آ بیٹھا تالیاں بجتی رہیں پھر شریمتی ٹاپتے اور سیٹھ دمودر لال میں کانا پھوسی ہوئی اور بالآخر میرا قیاس صحیح نکلا۔ سیٹھ صاحب نے دس ہزار کا اعلان کیا۔ اس کے بعد چلئے کا ناشتہ ہؤا۔ میری بھی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ تو مسز طبلیکر نے مجھ سے کہا کہ۔

"ابھی جائیے گا نہیں!"

اب مسز ٹاپتے اور سیٹھ دمودر لال نے بھی مجھے پوچھا کہ میں اُن کے ساتھ جاؤں۔ غرض جب بڑے مہمان رخصت ہوئے تو مسز طبلیکر میری طرف متوجہ ہوئیں اور ایک جگہ بیٹھ کر کہنے لگیں:۔

"ہم سب آپ کے بہت ممنون ہیں۔"

"میں نے اپنا سماجی فرض ادا کیا ہے اس سے زیادہ کیا؟"

"میں خود آپ کو مکان پہنچا دونگی ——"

"مکان! مکان میں تو رات گئے پہنچوں گا!"

"مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے اور مجھے آپ کی تنہائی کا بڑا خیال ہے۔"

"شکریہ! میں بھی آپ کی تنہائی سے بہت متاثر ہوں!"

"خوشامدی مرد"

"آپ مجھے مخلص نہیں سمجھتیں !"

"اگر آپ مجھے ملازم بنا رہے ہیں !"

"تو کہیں چل کر میرے ساتھ کھانا کھائیے۔"

"آج تو میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔"

"تو آئندہ ہفتے میں کسی دن ؟"

"آئندہ ہفتہ بڑی مصروفیت کا ہوگا! اچھا آج ہی سہی!"

"شکریہ! اپالو میں ٹھیک آٹھ پر!"

"ٹھیک آٹھ پر"

اپنے دروازے تک آکر مجھے رخصت کرتے ہوئے مسز ٹلبلیکر نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ! آج کی شام بڑی دلچسپ تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ صحبت میں نہ تو میاں کی بیوی شریک تھی اور نہ بیوی کا میاں ——— تفریحی اوقات میں کسی میاں یا بیوی کا موجود ہونا صحبت کو بے لطف کر دیتا ہے —— ہولناک بات ہے!"

"مجھے اگر وہ شخص مل جائے جس نے سب سے پہلے "میاں" اور "بیوی" کی اصطلاحیں وضع کیں تو گلا دبا کر مار ڈالوں! اُس بدبخت نے نسلِ انسانی کی خوشیوں کو "شادی" کے نام سے تباہ کر دیا!"

"میرا خیال ہے کہ آپ کی بیوی ذرا التفات سے کام لیتیں تو آپ اچھے شوہر بن سکتے تھے!"

"جی معلوم نہیں، مگر انسان ضرور بن جاتا!"

"ہاں، یہ آج کی پُرلطف صحبت تو یقیناً میسر نہ آتی" کہہ کر مسز ٹلبلیکر ہنس دیں۔

"آپ نہیں جانتیں کہ آج آپ نے میری جان بچالی، ورنہ میں ضرور خودکشی کر لیتا!"

"اب تو ارادہ نہیں ہے؟"

"نہیں!"

"میں بہت خوش ہوں!"

"کل آئیے گا؟"

"آپ تو مصروف ہوں گی۔"

"نہیں کوئی خاص کام نہیں تھا، میں ہفتہ بھر آرام کرنا چاہتی تھی۔ آپ آسکتے ہیں۔"

"شکریہ! کل تو نہ آسکوں گا۔"

"پرسوں ؟"

"پرسوں ——— ہُوں، پرسوں، معاف فرمائیے پرسوں بھی نہ آسکوں گا۔"

"اترسوں"

"اترسوں کیا دن ہوگا؟"

"اتوار!"

"اوہو، ایک قرار داد اتوار کو بھی ہے!"

"میں سمجھ گئی آپ کی بیوی کیوں خفا رہتی ہیں ——— کیا آپ نے مجھے غیر دلچسپ پایا؟"

"توبہ توبہ!"

"واقعی آپ مجھے غیر دلچسپ نہیں سمجھتے؟" مسکرا کر پوچھا۔

"آپ کے برابر دلچسپ تو ———"

"حماقت!" ہنس کر کہا۔

"پیر کے روز تو آئیے گا؟"

"ہاں، پیر کے دن حاضر ہو سکوں گا!"

میں پیر کے روز جانا بھول گیا اور پھر بھولا ہی رہا۔

ل احمد

ہو کہیں پیدا ملی طوفاں وہ بھی گماں کرنا
ضرور اس میں شامل میری چشم تر بھی ہو گی

ظفر علی خاں

بصیرت بے نگاہی

پیدائشی اندھا

اے رفیقِ مضطرب اے ہمدم آتش بجاں　　کس نے تیری رُوح کو سونپا ہے سوزِ بیکراں
کیا مطالب ہیں کہ جن کی شوخئ حیرت طراز　　بن گئی ہے تیری بیتابی کا اک دلچسپ راز
کیا جنوں، کیسی تڑپ، کس طرز کا ہیجان ہے　　تیری ہر اک سانس میں مبہم سا اک طوفان ہے
میں سمجھ سکتا نہیں مطلب تری گفتار کا　　بہکے بہکے بے سروپا اجنبی افکار کا
رنگ و پرتو کا طلسماتی جہاں کیا چیز ہے　　چاندنی راتوں کا نورانی سماں کیا چیز ہے
یہ انوکھی اصطلاحیں یہ نرالے اعتبار　　کر نہیں سکتے کوئی مفہوم مجھ پر آشکار
رنگ کس ڈھب کا جنوں ہے جس سے تو بیحال ہے　　نور کس دنیا کا غم ہے جس سے تو پامال ہے

غیر پیدائشی اندھا

اے رفیقِ بے خبر اے ہمدم نا آشنا　　میرا اندھاپن ہے تیری بے نگاہی سے جُدا

میرا اندھاپن حقیقت میں ہے اک زخمِ جگر تیری آنکھوں کے سفینے نے نہیں دیکھا بھنور

تجھ کو کیا معلوم دُنیا حُسن کا طُوفان ہے بزمِ ہستی جاگتے رنگوں کا اک رومان ہے

تیری نظروں نے جبینِ رنگ کو چوما نہیں تو تماشا گاہِ رنگ و نُور میں گھوما نہیں

تیری آنکھوں میں ازل سے یہ جہاں تاریک ہے بزمِ گیتی بے ضیا، دَورِ زماں تاریک ہے

میرے اندھے پن میں غلطاں ہیں بصارت کے نقوش ظلمتوں میں جھلملاتے ہیں صباحت کے نقوش

ذہن میں کتنے گذشتہ واقعے آباد ہیں کتنے رنگیں تجربے چشمِ حزیں کو یاد ہیں

تھرتھرا کر چشمِ تیرہ بخت کے آغوش میں آ ہی جاتی ہے مری رفتہ بصارت ہوش میں

میری تیرہ زندگی خمیازۂ انوار ہے
آنکھ خوابیدہ ہے ، اور اک نظر بیدار ہے

عدم

لچھمن

لچھمن نے کنوئیں میں سے پانی کی سترہویں گاگر نکالی، اس دفعہ پانی سے بھری ہوئی گاگر . . . تو اٹھاتے ہوئے اُس کے دانتوں سے بے نیاز جبڑے آپس میں جم گئے۔ جسم پر پسینہ چھوٹ گیا۔ اس نے داہنے ہاتھ سے نندو کی بہو ——— گوری کی گاگر کو تھاما اور چرخی پر اڑی ہوئی رسی کو دوسرے ہاتھ سے اتارا۔ ایک دفعہ چوکسی اور بیم ورجا سے تیس فٹ گہرے کنوئیں میں جھانکا۔ اپنے شانوں کو جھٹکا دیا۔ جبڑوں کو دبایا تو گال کچھ پھول سے گئے۔ لچھمن نے پھر غور سے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھا۔ ہتھیلی میں سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ انگلیوں کے نیچے آج کچھ نئے نئے، سرخ سے نشان بن رہے تھے ۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نشان آج دوپہر تک اُبھرتے ہوئے ایذا رساں آبلے بن جائیں گے۔ اور شرادھ کی کھیر کھانے کیلئے اس کی انگلیاں یکجا نہ ہو سکیں گی — تاہم نصرت کی ایک ہلکی سی سُرخی اُس کے چہرہ پر پھیل گئی۔ اس نے راٹھ گودام کی ان بہو بیٹیوں کی طرف دیکھا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"رام کالی . . . . آج کس کا شرادھ ہے؟"

نندو کی بہو آگے بڑھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے گھونگٹ کو چوٹی کی طرف کھسکایا۔ کولہے پر سے دھوتی کا پلّہ سرک گیا۔ اُس نے احتیاط سے ایک پلّہ سینہ پر ڈالا اور لجاتی ہوئی بولی "میرے باوا کا۔"

——— اور پھر سب عورتیں لچھمن کی تعریف کرنے لگیں ۔

بہت بہادر آدمی ہے لچھمن۔ راٹھور ہے نا، دوسری بولی۔ لچھمن کا بیاہ ہوگا۔ میں اُس کی گھوڑی گاؤں گی۔ گھوڑی کی باگ تھاموں گی۔ جوٹنا گاؤں میں اس کی ماں کے میکے ہیں، میری ماں کے میکے بھی جوٹنا گاؤں میں تھے۔ میں لچھمن کی بہن ہوئی نا۔ اور ایک کہنے لگی: "مجھے تو بھاوج کا رشتہ ہی پسند ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں سلائی ڈالوں گی۔ میری گاگر بھری تو کیا احسان کیا؟ دیور بھابیوں کے سینکڑوں کام کرتے ہیں۔ گوری بہو! اچڑھے پوہ کوئی سا ہاتھ نکلے۔ گلابی سی سردی ہو۔ بڑا مزہ رہے گا۔ اس سال نہ بھی ہو تو جلدی کا ہے کی ہے۔ لچھمن بھائی کوئی بوڑھا تھوڑے ہی ہو گیا ہے. . . . . ."

. . . . اور لچھمن کی عمر پچپن برس کی تھی۔ سترھویں گاگر نکال چکنے کے بعد اُس نے اپنے پھولتے ہوئے بازوؤں کی طرف دیکھا اور پھر کنکھیوں سے نندو کی بہو۔ گوری کی طرف . . . . راٹھ گودام کے سب آدمیوں نے گوری کے حُسن کی تعریف تو سُنی تھی۔ مگر لچھمن کے سوائے اسے جی بھر کر کسی نے نہ دیکھا تھا — اسے دیکھ کر لچھمن کو یاد نہ رہا۔ کہ اس کے ہاتھوں پر اتنی بڑی بڑی مست، نیم وا آنکھوں نے کوئلے سے دھر دئے ہیں اور وہ عورت جس کے جوڑا گاؤں ننہال تھے۔ اُس کی ماں کو جب لچھمن کے باپ نے سالی کہا تھا۔ تو اچھا خاصا "کورو کھشیتر" چھڑ گیا تھا اور اسی کنوئیں پر جب اس نے ایک دفعہ بھابی کا آنچل تھاما۔ تو بھائی نے اُس کی ناک توڑ دی تھی . . . . . دفعتاً لچھمن نے اپنے آپ کو ایک بڑی سی آنکھ بنتے دیکھا جس میں گورے گورے بازو، جھنکارتے ہوئے پازیب، سرکتے ہوئے پلّے اور نہ جانے کیا کچھ سما گیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے یکے بعد دیگرے تیس برس کے غلاف آہستہ آہستہ اس کے جسم پر سے اُتر گئے ہوں۔ وہ اپنے آپ کو پچیس برس کا نوجوان سمجھنے لگا۔

لچھمن نے سوچا۔ اوّل تو عورتیں بہادری کو پسند کرتی ہیں۔ کیونکہ ان میں اس مادہ کا فقدان ہوتا ہے اور دوسرے وہ اس مرد کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ جو عورت کے سامنے مرد کی فطری کمزوری کو ظاہر نہ ہونے دے۔ دوسرے لفظوں میں محبت میں لبِ کر بھی اظہارِ تعشق نہ ہو، کیونکہ دوسری طرح بات کچھ عام سی ہو جاتی ہے۔ آج

کنوئیں پر چھوٹی بڑی اس کی بہادری کا سکہ مان گئیں۔ آج تو وہ بالکل شیہ سروپ' ہو گیا تھا۔ تبھی تو سب 'راوہائیں' اس کی طرف کھچی چلی آتی تھیں۔ مگر اُس نے کمزور، کم ظرف آدمی کی طرح اُن کی ضرورت سے زیادہ متوجہ ہو کر اپنے مردانہ وقار کو کم نہیں کیا اور... ...ستره گاگریں ہسر سنگھ کی جان نکل جائے۔ گوری تو ضرور اٹھتی بیٹھتی یہی سوچتی ہوگی کہ میرا شوہر لچھمن کے مقابلہ میں کس قدر نالائق اور کمزور ہے...... کاش میں لچھمن کی بیوی ہوتی! اگرچہ آج ان عورتوں میں سے ایک خود بخود بہن اور دوسری لکھیا وج بن گئی ہے اس وقت لچھمن پل بھر کیلئے بھی یہ نہ سوچ سکا کہ "کو رکھشیتہ" کس طرح بیاہا ہوا تھا اور اس کی ناک کیوں توڑی گئی تھی۔ لچھمن نے نہ جانا کہ وہ کھلو کھلے سے الفاظ صرف گاگریں نکالنے کی قیمت میں اگر گھونگٹ کو ذرا سا چوٹیا کی طرف سرکا دینے سے شرادھ کیلئے سارا پانی مل جاتا ہے تو کسی کا بگڑتا ہی کیا ہے۔ عورتیں اپنی آنکھوں کی ہیرا پھیری سے سینکڑوں کام سدھ کر لیتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سترہ گاگریں تو اکیلی گوری کے حسن کی جھلک کی قیمت ہے۔ اور محض ادنیٰ سی قیمت...... اور وہ مست آنکھیں!..... ورنہ کون بھابی ہے اور کون ویدہ؟ گوری بھی ایک مایا ہے اور مایا ہی رہے گی!

× × × × ×

راٹھ گودام کے سبھی لوگ جانتے تھے کہ لچھمن کو بابا کے نام سے پکارنا کتنا خطرناک کام ہے۔ لچھمن بُری سے بُری گالی برداشت کرنے کی قوت رکھتا تھا۔ مگر بابا کا لفظ اُس کے دماغی توازن کو مختل کر دیتا۔ بابا کے جواب میں تو بابا، تیری ماں بابا۔ تیرا باپ بابا اور اس قسم کی ہذیان بکتا اور بڑے بڑے پتھر پھینکتا۔ وہ ابھی اپنے آپ کو چھوکرا کیوں سمجھتا تھا؟ اسے کھٹکا سا لگا ہوا تھا کہ اگر وہ بوڑھا ہو گیا۔ تو کون اُسے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے چلے گا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے بابا لچھمن.... بابا لچھمن کہہ کر تماشا دیکھتے۔ مگر وہ اپنے تجربہ کی خوفناک نوعیت سے واقف تھے۔ زور سے بابا کہہ چکنے کے بعد وہ راٹھ گودام منڈی کی بوریوں کے پیچھے یا اس کی تنگ گلیوں میں غائب ہو جاتے۔

جب کوئی کہتا کہ مالک رام کے بیاہ کی تاریخ ۱۵ پھاگن مقرر ہوئی ہے۔ تو لچھمن ایک اضطراب کے عالم میں سن باٹنی چھوڑ دیتا۔ اپنی لاٹھی کو اُٹھا کر زور سے زمین پر ٹپکتا۔ اور کہتا۔

"ہاں بھائی!..... ۱۵ پھاگن۔"

دوسرا کہتا۔ "ہاں بھائی..... ہم نہ بیاہے تو کیسے سانے؟"

لیکن لوگ اُسے خوش کرنا بھی جانتے تھے۔ کوئی کہتا لچھمن، آج تو تیرے چہرے پر سولہ برس کے جوان کا روپ ہے۔ ارے بھائی! وِدھیا کی لڑکی جوان ہو رہی ہے۔ اتنی ہی جوان ہے جتنے تم جوان ہو۔ خوب میل ہے۔ خوب جوڑ ہے۔ اگر تم اُسے حاصل کر سکو۔ تو کتنا مزا رہے۔

لچھمن جوانی میں حبس بے جا اور اغوا کی سزائیں کاٹ چکا تھا۔ اس لئے وہ خاموشی سے دو تین بار وِدھیا کی بیٹی کا نام لینا، اور ذہن میں سینکڑوں بار...... اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، —— وِدھیا کی بیٹی...... وِدھیا کی بیٹی...... دہرائے جاتا۔ حتےٰ کہ اس کی ڈاڑھی میں کھجلی ہونے لگتی۔

راٹھ گودام ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ آٹھ نو سو کے لگ بھگ گھر ہوں گے۔ تحصیل سے ایک کچا سا راستہ کیکر اور شیشم کے تناور درختوں کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا چند میل جا کر ایک بڑے سے بڑ کے نیچے یکدم رُک جاتا۔ عام طور پر مسافر وہاں پہنچ کر ششدر رہ جاتے۔ انہیں یونہیں دکھائی دیتا۔ گویا راستہ اس سے آگے کہیں نہ جائے گا۔ یعنی باوجود زمین کے گول ہونے کے راٹھ گودام دنیا کا 'ٹرمینس' ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ بڑ کی بڑی بڑی ڈاڑھیوں میں سے ہو کر تین چھوٹی چھوٹی گلیاں گاؤں میں داخل ہو جاتی تھیں۔ چند خستہ حالت کچے مکانوں، ایک آدھ چھوٹی اینٹ کی عمارت جس میں بورڈ کا ایک پرائمری اسکول تھا، شاہ رحیم کی قبر اور کالا بھیرو کے مندر کے گرد گھوم کر تینوں گلیاں پھر گاؤں کے مشرق کی طرف ایک کشادہ سی سڑک سے مل جاتی تھیں۔ کالا بھیرو کے مندر کے قریب کالے کالے کتے گھومتے رہتے تھے اور اُن کی آنکھوں سے غصہ اور دانتوں سے زہریلا لعاب ٹپکتا تھا۔ کالا بھیرو شوجی مہاراج کے اوتار گنے جاتے ہیں۔ اُن کی رفاقت میں ہمیشہ ایک سیاہ فام کتا رہا کرتا تھا۔ اس لئے کالا بھیرو مندر کے پجاری چپڑی ہوئی روٹیوں اور پوریوں وغیرہ

سے سیاہ فام کتوں کی خوب تواضع کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے کتے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور سرکاری آدمیوں کو انہیں گولی ڈالنے کی مجال نہ تھی۔ کتے مفت کی کھاتے تھے۔ اور موٹے ہوتے جا رہے تھے۔ رانڈ گودام میں داخل ہونے والے راستہ کے پاس بڑ کے ایک بڑے تنے کے نیچے لچھمن بیٹھا کرتا تھا۔ وہ تین کام کرتا تھا۔ اوّل تو ہر ناواقف مسافر کو کالا بھیرو والے راستہ سے نہ گزرنے کی ہدایت کر کے کتوں سے بچانا۔ دوسرے اُسے اپنے کنوئیں کا شیریں اور مصفا پانی پلانا اور تیسرے زندگی کا گزارا کرنے کے لئے سن کی رسیاں بانٹتا رہتا۔

کبھی کبھی کوئی انجان مسافر بڑ کے نیچے لچھمن کو چہرے سے درویش صورت پاکر نہایت تپاک سے پوچھتا "پانی پلاؤ گے بابا؟" تو لچھمن فوراً لاٹھی اٹھا لیتا اور کہتا "بیٹی کا رشتہ تو نہیں مانگتا جو مجھے بابا سمجھتے ہو۔ ابھی تمہارے پوتوں کو پچھاڑ سکتا ہوں۔ اسی کنوئیں سے اس دن ستر گاگریں پانی کی کھینچی تھیں۔ تمہارے گاؤں کی سب عورتوں کو اپنے دام میں گرفتار کر سکتا ہوں۔ سمجھتے کیا ہو۔ اس بات کو وشنو عطار جانتا ہے ...... سارا محلہ جانتا ہے۔ گاؤں جانتا ہے ......" ادھر پھر کالا بھیرو کے تمام کتے مسافر پر چھوڑ دیتا اور مسافر بیچارے کی خوب ہی آؤ بھگت ہوتی۔ جتنے کہ وشنو عطار یا بازار کا کوئی اور دوکاندار مسافر کو اس کی غلطی سے آگاہ کر دیتا اور اگر وہ اپنے گاؤں سے اس کے لئے کسی میگھو، جنک دلاری یا دودھیا کا رشتہ لا دینے کا خیال ظاہر کرتا تو اس کی میٹھی چارپائی ہوتی۔ بستر بچھا بچھایا استراحت کیلئے مل جاتا اور لچھمن پوچھتا۔

"گانجا لاؤں چاچا...... کالا بھیرو کا گانجا تو دور دور مشہور ہے سبھی لوگ جانتے ہیں۔"

کبھی کبھی وشنو اور رانڈ گودام کی چھوٹی سی منڈی کے لوگ دور سے کسی مسافر کو آتا دیکھتے۔ تو وہ کہتے۔ لچھمن بھائی دیکھو وہ کوئی تمہیں دیکھنے کیلئے آرہا ہے۔ شاید سیتا موہری کا باپ ہے۔ سیتا موہری جوڑا گاؤں کے نمبردار کی لڑکی ہے بہت خوبصورت! ذرا سنور جاؤ۔ ہاں! ہاں! لچھمن پہلے تو گانجا کا کش لگاتے ہوئے کہتا ——— ہو بھائی ...... لچھمن تو بھی ہے۔ جتی ہونا کتنی اونچی اوستھا ہے"...... مگر پھر فوراً ہی لچھمن اپنی دھوتی اور پٹکے کے بل درست کرنے لگ جاتا۔ اور وہ عطار کی دوکان پر دھو کر ٹنگی ہوئی قمیص پہن کر جلدی جلدی اس کے بٹن بند کر لیتا اور پھر باوجود نہایت ہوشیاری سے کام لینے کے اس کی ڈاڑھی میں کھجلی ہونے لگتی۔

* * * * * *

وشنو عطار کی وساطت سے لچھمن کو کالا تیل مل گیا تھا۔ کم از کم لچھمن کو اس دوائی کا نام کالا تیل ہی بتایا گیا تھا۔ اس میں خوبی یہ تھی کہ برف کی طرح سپید ڈاڑھی چند ہی لمحوں میں اُترتے آنے والی گھٹا کی طرح کالی ہو جاتی تھی۔ لچھمن تو عطار کی حکمت کا سکہ مان گیا تھا۔ یہ وشنو میں ہی طاقت ہے کہ وہ پلک جھپکنے میں پچپن برس کے بڈھے کو بیس برس کا جوان بنا دے۔ لچھمن نے اس کے عوض کتنی ہی سن کی رسیاں بانٹ کر وشنو کو سامان وغیرہ باندھنے کیلئے دی تھیں۔

وشنو کی دوکان پر کبھی گلقند کے لئے کھانڈ کا قوام پکایا جاتا اور کبھی عرق گاؤزبان نکالا جاتا۔ ہر روز بھٹی جلتی تھی۔ کبھی کبھی بہت سے اپلوں کی آنچ میں کشتے مارے جاتے تھے۔ اور کالے تیل کا غلام بنا ہوا لچھمن وشنو کے سینکڑوں کاموں کے علاوہ بھٹی میں آگ بھی جھونکا کرتا تھا۔

لچھمن تھوڑا بہت پڑھنا جانتا تھا۔ وہ کبھی کبھی حیرت سے وشنو کی دوکان میں رکھے ہوئے ڈبوں پر جلی قلم سے لکھے ہوئے لفظوں کو پڑھتا۔ عقرقرحا۔ معجون سورنجان، خمیرہ ابریشم عناب والا، جوارش آملہ عنبری، ...... اس کے علاوہ اور بھی کئی بوتلیں تھیں۔ کسی میں عرق برنجاسف تھا اور کسی میں بادیان۔ ایک طرف چھوٹی چھوٹی شیشیاں پڑی تھیں۔ جن میں کشتہ سنگ یشب، شنگرف وغیرہ رکھے تھے۔ ان چھوٹی شیشیوں پر لچھمن کی نظریں جمی رہتی تھیں۔

پچھلے شرادھ کے دن لچھمن کو نندو کے ہاں پھر بلایا گیا۔ لچھمن نے کالا تیل ملا اور نندو کے ہاں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں گوری کی تصویر بجلی کی طرح کوند کوند جاتی تھی۔ اگرچہ اس کے ہاتھوں پر ابھی تک اپلے دھکتے ہوئے کوئلوں کی طرح پڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تاہم گوری کی بھی

مورت اس کے کلیجہ میں ٹھنڈک پیدا کر رہی تھی۔

لچھمن نے ریشمی پٹکا باندھا۔ یہ اسے کالا بھیرو کے ایک پروہت نے دیا تھا۔ پروہت جی کے جسم پر آبلے پھوٹ جانے پر لچھمن نے ان کی بڑی سیوا کی تھی۔ جیٹھ، ہاڑ اور ساون تین مہینے سردائی، ٹھنڈائی وغیرہ رگڑ رگڑ کر پلائی تھی۔ پروہت کو وہ پٹکا ان کی کسی معتقد عورت نے دیا تھا۔ پروہت کے ارد گرد عورتوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اور عورتیں انہیں تھالیوں میں سیدھا اور نہ جانے کیا کیا کچھ بھینٹ کرتیں۔ عقیدت ہی تو ہے۔

لچھمن نے پٹکا باندھا اور غرور سے وشنو کی دوکان کے شیشے میں اپنی پگڑی کو دیکھا۔ الماری میں لگے ہوئے شیشوں میں اسے اپنی شکل اور چند ایک گدھے دکھائی دیئے۔ گدھے اس کی پیٹھ کی جانب کمہار کے برتنوں سے لدے جا رہے تھے۔ رائے گودام کے تمام برتن پک کر تحصیل میں بکتے تھے اور وہ گدھے تحصیل ہی کو جا رہے تھے۔ عطار کی الماری کے شیشے میں لچھمن کو اپنا عکس بہت ہی دھندلا سا نظر آتا تھا۔ مگر اس کے باوجود لچھمن جانتا تھا کہ یہ اس کا اپنا عکس ہے، اور وہ قریب تر کھڑے ہوئے گدھے کا۔ وشنو نے لچھمن کی امتیاز کر لینے کی قوت کی جی کھول کر داد دی۔

لچھمن نے گوری کے گھر جانے کیلئے قدم اُٹھایا تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سارے جسم پر کوئلے ہی کوئلے دھر دیئے گئے ہوں۔ کچھ دیر کے لئے ہاتھ کی جلن تو ختم ہو گئی۔ کیونکہ اس کا سارا جسم ہی ایک بڑا سا ہاتھ بن گیا تھا۔ لچھمن اٹھا۔ لڑکھڑایا، لیٹ گیا۔ چند لمحات کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے کنوئیں کی منڈیر پر ستره گاگریں ایک قطار میں رکھی ہوں۔ اُس نے آنکھوں کو ملا۔ دوکان کے اندر لگے ہوئے جالوں، بھڑ کے دو تین چھتوں اور ایک آرام سے لٹکتی ہوئی چمگادڑ کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے ہوا کو ایک چھوٹی سی گالی دی۔ کیونکہ وہ اس کے ٹیکے سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی

گدھوں پر مزید بوجھ لادا جا رہا تھا۔ کمہار نے چھ ماہ کے عرصہ میں چار پانچ سو برتن، حقے کی چلمیں، رہٹوں کی ٹنڈیں بنا رکھی تھیں۔ پہیہ اور پاؤں دن رات چلتے رہتے تھے۔ اور کمہار کے جھونپڑے سے گنگنانے، کھنکارنے، تھوکنے، حقے کی گڑ گڑاہٹ اور کھٹ پٹ کی آوازیں پیہم سنائی دیتی تھیں۔ گدھے تو بوجھ محسوس ہی نہیں کرتے تھے۔ گویا سارے کا سارا رائے گودام اٹھالیں گے۔ لچھمن نے دل میں کہا۔ یقیناً یہ گدھے مجھ سے زیادہ بوجھ اُٹھا سکتے ہیں..... اگرچہ ستره گاگریں.....

اس وقت کمہار نے آواز دی۔ "او گدھے کے بچے!"

لچھمن نے کہا۔ آخر وہ گدھے ہیں اور میں آدمی ہوں۔ اگر یہ بات او نچے کہی جاتی تو شاید وشنو ایک دفعہ پھر اُس کی امتیاز کرنے والی غیر معمولی قوت کی داد دیتا۔ بازار میں ایک لڑکا جسے کالی کھانسی کی شکایت تھی۔ بڑے مزے سے کھڑا پکوڑے کھا رہا تھا۔ اور کھانستے جاتا تھا۔ اُس کے پاس ہی ایک نسبتاً چھوٹا لڑکا قمیص کا کف منہ میں ڈال کر چوس رہا تھا۔ کئی چھوکرے تحصیل سے منگوائی ہوئی برف کے گولوں پر لال لال شربت ڈلوا کر انہیں چاٹ رہے تھے۔ گلی میں چند عورتیں باتیں کر رہی تھیں۔ ایک کہتی تھی جب میرا چندو پیدا ہوا تو اُسی دن ہماری گائے نے بچھڑا دیا۔ اور وشنو پکوڑے والے سے پوچھ رہا تھا۔ کیوں بھائی! اس دفعہ ادھ کبھی پر نہ جاؤ گے؟" چھوکروں نے لچھمن کو دیکھا تو اس کا حلیہ عجیب ہی بنا ہوا تھا۔ ان کا لڑکپن کاک کی طرح تیر کر سطح پر آگیا۔ لڑکے چلائے۔ "بابا لچھمن... بابا لچھمن!"

لچھمن بوکھلا کر اٹھا چھت پر چمگادڑ چکر لگانے لگی۔ دو تین بھڑیں بھنبھنانے لگیں۔ چارپائی کے پائے سے لچھمن کا گھٹنا ٹکرایا۔ لچھمن کو ایک بڑا اچھکر آیا۔ اس نے ہوا کو ایک گالی دی، چھینکا اور رونے لگا۔

× × × × × ×

گوری عرصہ تک نئے لچھمن کو دیکھ کر ہنستی رہی۔ لسے ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ لچھمن کے عجیب سے روپ کو دیکھ کر شرادھ تو کیا اپنے پتروں کو بھی بھول گئی ہے۔ بھیرو استھان کے پروہت بھی آئے ہوئے تھے۔ جب گوری اُن کی تواضع کرتی تو لچھمن کے دل میں خلش سی محسوس ہوتی پھر وہ اپنی کم ظرفی پر اپنے آپ ہی کو کوستا جب پروہت چلا گیا تو گوری نے گھونگھٹ کو پیا کی طرح سرکا دیا۔ عورتیں پچھل بچھڑوں اور بڈھوں سے پردہ اُٹھا دیتی ہیں اور اس نے بھی لچھمن سے پردہ اُٹھا دیا تھا۔ لچھمن نے [illegible] دیکھا دل میں فیصلہ کیا کہ محبت بھی تو کسی کو بے پردہ بنا دیتی ہے۔ گوری [illegible] آئی تو لچھمن نے [illegible] محسوس

کیا۔ جیسے اس کے وجود کا اسے قطعی علم نہیں اور جوں جوں وہ بے اعتنائی ظاہر کرتا تا گوری کھچی چلی آتی تھی لیکن پھر سوچا کہ یہ سب کچھ کھجاؤ کالے تیل کی وجہ سے تھا۔

روٹی سے فارغ ہونے پر محلہ بھر کی عورتیں لچھمن کے گرد جمع ہوگئیں۔ گوری اُن سب کی ترجمانی کرتی تھی۔ بولی "سترہ گاگریں! بہن میں تو مان گئی لچھمن کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے مرد تو بالکل کسی کام کے نہیں۔ دو گاگریں اتنے گہرے کنوئیں سے نہ نکال سکیں۔ لچھمن راٹھوڑ ہے، آدمی تھوڑے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے بڑوں نے ہماری تمہاری لاج رکھی تھی۔ اب کل کی ہی تو بات ہے۔ کتنے آن والے آدمی تھے راٹھوڑ!"

لچھمن کا منہ کان تک سُرخ ہوگیا۔ اس نے اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش کی۔ مگر ناکامیاب رہا۔ وہ عورت جس کے جوڑا گاؤں ننہال تھے اور جس سے گاگر کی بہن کا رشتہ تھا۔ بولی۔ "میں تو بھابی کے آنے پر خوب رنگ رلیاں مچاؤنگی۔ اس کے ساتھ مکھیاں ہولوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ بس گری رین موہے سنگ جاگا۔ بھور بھئی تو بچھڑن لاگا ۔ ۔ ۔ ۔ اور بھابی کتنی خوشی ہوگی"

رگا گر کی بھابی، بولی "میں نے تو اپنے لئے دیورانی ڈھونڈ بھی لی ہے" لچھمن کے کان کھڑے ہوگئے۔ جب بھابی نے کہا۔ مجھے تو اس کا نام بھی معلوم ہے۔ تو لچھمن بہت ہی خوش ہوا۔ ضبط نہ کرسکا۔ بولا۔

"کیا نام ہے بھلا اس کا؟"

"نام ثریا سندر ہے۔"

"کہوگی بھی؟"

"ذرا مزاج کی سخت ہے۔"

"میں جو نرم ہوں۔"

"گوری بھی جانتی ہے۔"

"گوری کہے گی بھی؟"

"کاؤدیوی!" گوری نے کہا

"کاؤدیوی؟" لچھمن نے پوچھا۔ دو دفعہ نام کو دہرایا اور ذہن میں سینکڑوں بار اس کا جاپ کیا حتٰی کہ اس کی ڈاڑھی میں کھجلی ہونے لگی۔

گوری بولی "تم مقابلہ نہیں کرسکتے۔ تم میں کالا بھیرو کی سوگند لیتی ہوں۔ کاؤدیوی سے بیاہ کروانے کا میرا ذمہ۔ سارا خرچ میں اپنی گرہ سے دوں گی۔

اب لچھمن کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ شب و روز نندو کے گھر کا طواف کرنے لگا۔ اس کے ذرا سے اشارے پر تحصیل چلا جاتا۔ کمہاروں کے گدھوں سے زیادہ بوجھ اٹھا لیتا۔ کالا بھیرو کے کتوں سے زیادہ شور مچاتا اور راٹھ گودام کے ٹٹوؤں سے زیادہ کھاتا۔

اس دفعہ برسات میں گوری کے گھر کا پرنالہ اوپر کی منزل پر بند ہوگیا تھا۔ گوری نے لچھمن کو کہا کہ وہ چھجے پر چڑھ کر پرنالہ تو صاف کر دے۔ لچھمن نے کوٹھے پر چڑھ کر دیکھا تو پرنالے میں ایک کتے کا پلّہ مرا پڑا تھا اور پلّے کا سر پرنالے میں بے طرح پھنس گیا تھا۔ اب پلّہ کالے رنگ کا تھا۔ اس کی عزت ملحوظ خاطر تھی۔ مار کاٹ کر نکالنا کالا بھیرو کی بےعزتی کرنا تھا۔ مگر پلّہ نہ اوپر آتا تھا۔ نہ نیچے جاتا تھا۔

لیکن لچھمن اپنے آپ میں ایک نئی جوانی پا رہا تھا۔ اور عنقریب ہی شادی کی خوشی میں اُس ہونے جوان بننے کے لئے وشنو عطار کی کئی دوائیاں کھائیں۔ آج دوائی زیادہ کھا لینے کی وجہ سے اس کا سر پھٹ رہا تھا۔ اور اسے تمام جسم میں سے شعلے نکلتے دکھائی دیتے تھے۔ جوش میں وہ سب کام کئے جاتا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے تک وہ تخ دھوپ میں چھجے پر بیٹھا پرنالے کو صاف کرتا رہا۔ نیچے سے چند بچوں اور عورتوں نے آوازیں دیں۔

"بابا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بابا ۔ ۔ ۔ ۔ کاؤدیوی آئی۔"

لچھمن نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ بچوں کو گالیاں دیں۔ کتے کے پلّے کو دُم سے پکڑ کر زور سے کھینچا۔ تو وہ جھٹکے سے باہر نکل آیا۔ مگر ساتھ ہی لچھمن کو بھی اس زور سے جھٹکا لگا کہ وہ اوپر کی منزل سے زمین پر آ رہا۔

سارے کا سارا راٹھ گودام نندو کے گھر اُمڈ پڑا۔ لوگوں کو لچھمن کے یوں مجروح ہونے کا بہت افسوس تھا۔ خصوصاً جبکہ کاؤدیوی سے اس کی شادی کا چرچا چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا۔ نرم دل لوگوں نے بیچارے کی مصیبت پر آنسو بھی بہائے۔

شام کے قریب خبر ملی کہ چوٹ وٹ کی اب کوئی بات نہیں رہی۔ لچھمن شادی کیلئے بالکل تیار ہے۔ آج شام کو اُس کی شادی ہوگی، گاگر کی بھابی، تو کہتی تھی۔ "اتنی بھی جلدی کا ہے کی ہے...... لچھمن کوئی بوڑھا کھوڑے ہو گیا ہے؟"

شام کو باجہ بجنے لگا۔ راٹھ گودام کے بہت سے آدمی براتی بن کر شادی میں شامل ہوئے۔ لچھمن کو بہت اچھے پہناوے پہنائے گئے۔ سہرے باندھے گئے۔ وہ اور بھی جوان ہو گیا تھا۔ لوگوں نے شمشان میں ایک بڑے پرانے پیپل کے پیڑ تلے نوجوان لچھمن کو رکھ دیا۔ ایک طرف سے آواز آئی۔ "ہٹ جاؤ...... دلہن آ رہی ہے۔"...... ایک آدمی چھکڑا گھسیٹتا ہوا لایا۔ چھکڑے میں سے لکڑیاں اُتار کر زمین پر چتا کی صورت میں چُن دی گئیں۔ اوپر لچھمن کو رکھا اور آگ لگا دی...... یہ عجب شادی تھی۔ جس میں سب براتی رو رہے تھے اور جب نندو کی بہو گوری نے کاؤ کی ان تمام لکڑیوں کا خرچ اپنی گرہ سے دیا۔ تو اُس کی چیخ ہی نکل گئی!

راجندر سنگھ بیدی

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اقبال

"نگاہیں"

پھر نہیں مست نگاہوں سے نہ دیکھ آہ نہ دیکھ
تیرے قربان ہیں آنے دے ذرا ہوش مجھے

آغا حشر

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے

شاد عظیم آبادی

وہ نگاہیں مجھے دیوانہ بنا دیتی ہیں
دین و دُنیا کو اک افسانہ بنا دیتی ہیں

حامد

دامنِ نگاہ میں جلوہ ہائے حُسنِ دوست
بجلیاں بھری ہوئیں دامنِ نگاہ میں

تاجور

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

غالب

محبت آ ہی جاتی ہے نگاہیں چار ہونے پر
نظر سے جب نظر ملتی ہے دل بھی دل سے ملتا ہے

نواب ہجر شاہجہانپوری

کس کی نگاہ لڑ گئی کس کی نگاہ سے
طوفان [illegible] کا اٹھا جلوہ گاہ سے

[illegible]

موجِ سخن

یارب مذاقِ سیرِ چمن جاوداں رہے
پھولوں کی انجمن میں مری داستاں رہے

شایانِ جادہ ہے جو رواں و دواں رہے
ہم کیا رہے کہ گردِ رہ امتحاں رہے

اِک اُس کے غم پہ سینکڑوں خوشیاں نثار ہیں
وہ دل جو مبتلائے غمِ جاوداں رہے

میَں تا بہ زیست اُن کی طلب میں پھرا کیا
وہ تا بہ عمر شاملِ رگہائے جاں رہے

اے نامرادِ عشق جگانا ہے دہر کو
ملتی ہوئی اذاں سے صدائے فغاں رہے

منزل سے بھی ہے راہ چھُڑانے کا احتمال
رہزن سے ہوشیار ذرا کارواں رہے

وہ شاد ہے جو غم کو خوشی میں گزار دے
مژدہ اُسے جو رنج میں بھی نغمہ خواں رہے

محرومیٔ نصیب پہ ہوں خاک تازشیں
سر میرا زیرِ پا نہ رہے آستاں رہے

اے حُسن عشق بن کے مری دیکھ بھال کر
ابکے نئی ادا سے مرا امتحاں رہے

مر کر بھی خاکساروں کو کیونکر ملے پناہ
کیا ہو اگر زمیں نہ رہے آسماں رہے

بیدار ہو شباب میں غفلت روا نہیں
وہ رات کیا جو مرکزِ خوابِ گراں رہے

اے بُت بغیرِ واسطہ رکھ مجھ سے اتحاد
ملنے کا لطف کیا جو خدا درمیاں رہے

وہ ہے شگفت آگ لگا دے جو باغ میں
وہ پھول ہے جو آتشِ صد گلستاں رہے

دیوانگی کو دیتے ہیں وسعت بقدرِ ظرف
دیوانے پھیل جائیں تو دنیا کہاں رہے

اعجاز بیخودی میں جوانی گزر گئی
صرف اتنا ہوش ہے کہ بہت سرگراں رہے

اعجاز صدیقی
(اکبر آبادی)

لیان ٹراٹسکی

کے اے۔ حمید صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ ملک کے مشہور ادیب ہیں۔ آپ کی کتابیں "اتاترک مصطفیٰ کمال" اور "مشاہیر عالم" علمی و ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ آج کل آپ مسلمانانِ عالم کی تاریخ مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ عظیم الشان کتاب دس جلدوں میں ختم ہوگی۔ مندرجہ ذیل مضمون آپ ہی کے رشحاتِ قلم سے ہے جسے ہم شکریہ کے ساتھ درج کر رہے ہیں۔

ایک جرمن فلاسفر کا قول ہے کہ "انقلابات ملک کے نوجوانوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔" یہ قول بعینہٖ ٹراٹسکی پر صادق آتا ہے۔ جس استقلال عزم اور شجاعت سے اُس نے مادرِ وطن کی خدمت کی۔ اُس کی تعریف کئے بغیر کون رہ سکتا ہے مگر اسی مادرِ وطن کے سپوتوں نے اپنے اس نامور بھائی کو ملک سے ہمیشہ کے لئے باہر نکال دیا۔

جس شخص کی ذات سے انگلستان، فرانس، جرمنی، سوئٹزرلینڈ اور ٹرکی ہراساں و پریشاں ہوں اور اُسے اپنے ہاں مقیم نہ ہونے دیں جس شخص کا اپنا ملک ہی اُس کا نام سن کر کانپ اُٹھے اور یہ فیصلہ صادر کرے کہ وہ کسی حالت میں بھی اپنی زندگی کے ایام ملک کے اندر رہ کر نہیں گذار سکتا وہ بلامبالغہ ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک ہوگا۔

ٹراٹسکی نے جس ملک کی دل و جان سے خدمت کی جسے اُس نے زار کے مظالم سے نجات دلا کر ترقی کا راستہ دکھایا آج وہی روس اُسے اپنے ہاں پناہ دینے سے بھی منکر ہے۔ وہ ٹراٹسکی جس نے اپنی دماغی قوت اور رعب سے روسیوں پر اپنی زبردست شخصیت کا سکہ جما رکھا تھا۔ جس کی معرکتہ الآرا تجاویز نے دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی اور جس کی ولولہ انگیز تقریروں نے دنیا کے سیاسی حلقوں میں کھلبلی ڈال دی تھی آج میکسیکو میں نہایت بیکسی اور بے چارگی کے عالم میں اپنے دن کاٹ رہا ہے۔ کسی زمانہ میں اُس کے ہمعصر اور نائب اُس کے ادنےٰ اشارہ پر رقص کرنا اپنی تقدیر کی خوبی سمجھتے تھے لیکن آج وہی لوگ ملک کے ارباب بست و کشاد ہیں اور ٹراٹسکی کا نام زبان تک لانا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔

روس کو زار اور اُس کی ملوکیت کے پنجہ سے آزاد کرنے کے لئے اُس نے ایک عظیم الشان مہم کا آغاز کیا۔ ملک کی فلاح کے لئے اُس کی پیہم کوششیں کامیاب ثابت ہوئیں۔ اور آخر کار روس کو زار اور اُس کے خاندان سے ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی۔

ٹراٹسکی نے جو کچھ چاہا کر دکھایا۔ وہ ہر اُس فعل کو جسے وہ مناسب سمجھتا فوراً پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا۔ لیکن جب ملک میں امن کے خواب کی تعبیر پوری ہوگئی۔ شخصی جھگڑے مٹ گئے اور خفیہ پولیس صحیح معنوں میں لوگوں کی خادم ہوگئی تو بھی اُس کے قلب بے چین کو تسکین نہ ہوئی۔ اُس نے غربا کو اُمراء اور سرمایہ داروں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا اور ملک میں ایک نئی تحریک پھیل گئی۔

ٹراٹسکی سوشلسٹ ہے۔ موت نے اُسے کبھی مرعوب نہ کیا۔ اُس کی فطرت میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک سلطنت کو تہ و بالا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ تدبر، دور اندیشی اور فصاحت کے اعتبار سے اس کا پایہ بہت بلند تھا۔ اُس کی قوت ارادی اتنی زبردست تھی کہ بڑے سے بڑے خطرہ سے متاثر ہو کر بھی کبھی اُس نے اپنے ارادے کو بدلنا گوارا نہ کیا۔

ٹراٹسکی کی زندگی کے حالات بے حد دلچسپ ہیں۔ وہ بچپن ہی سے انقلابی تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ قدرت نے اُس کی فطرت میں یہ وصف خاص طور پر ودیعت کر رکھا تھا۔ قید اور جلاوطنی کے مصائب سے تو وہ اوائل عمر میں ہی شناسا ہو گیا تھا۔ لڑکپن ہی میں اس کے ہر قول اور فعل سے غیر معمولی ذہانت مترشح ہوتی تھی۔ چوبیس سال کی عمر میں اُس نے مختلف ملکوں کی خفیہ پولیس میں ہلچل ڈال دی۔ اور اسی عمر میں وہ ایک انقلابی جماعت کا صدر منتخب کیا گیا۔ بعد میں اسی عہدۂ صدارت کے باعث اُسے ایک عرصہ تک قید رہنا پڑا۔ گزشتہ جنگ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے ہی اُسے رہا کر دیا گیا تھا۔ مگر چند دنوں کے بعد ہی اُسے پھر جلاوطن کر دیا گیا۔ متواتر تین سال تک وہ آسٹریا۔ سوئٹزرلینڈ۔ فرانس۔ سپین اور امریکہ میں سرگرداں ہا

کینیڈا میں تقریباً ایک ماہ تک زیر حراست رہنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں وہ پھر روس میں داخل ہوا۔ اُس وقت اُس کی عمر اڑتیس سال تھی۔

آئندہ دس سال کے عرصہ میں اُس کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر چمکنے لگا۔ وہ بالشویک پارٹی کا ایک بہت بڑا رکن سمجھا جاتا تھا۔ لینن اُن دنوں بالشویک پارٹی کا قائد اعظم تھا۔ ٹراٹسکی بھی اس کی عظمت کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور بعد میں تو وہ لینن کی متابعت اپنے لئے قابل فخر سمجھتا تھا لینن جو خدمت اس کے سپرد کرتا وہ اُسے قابلیت کے ساتھ سرانجام دیتا ان دونوں نے مل کر ۱۹۱۷ء میں انقلاب عظیم کی داغ بیل ڈالی اور اس کام کو اس خوبی سے نباہا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔

۱۹۲۱ء میں لینن کی اقتصادی تجاویز نے مغرب کے بڑے بڑے مدبروں کو چکرا دیا۔ مگر جس استقلال اور اولوالعزمی سے ٹراٹسکی نے اُنہیں سمجھ کر عملی جامہ پہنایا وہ اسی کا حصہ تھا۔ غیر معمولی ذہانت کے اس ثبوت نے اُس کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے اور عظمت کے لحاظ سے اُسے لینن کے بعد دوسرے درجے کا مدبر قرار دیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں اس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ لوگ لینن کو بغاوت کا بادشاہ اور ٹراٹسکی کو اُس کا وزیر اعظم سمجھنے لگے۔

جب تک لینن زندہ رہا ٹراٹسکی کے متعلق کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی۔ لینن کے بعد اس نے سٹالن کی طرف دستِ تعاون بڑھانا چاہا۔ عزم و استقلال کے لحاظ سے سٹالن کا شمار بھی ملک کے مشہور رہنماؤں میں ہوتا تھا مگر ٹراٹسکی اور سٹالن زیادہ دیر تک ایک دوسرے سے متفق نہ رہ سکے۔ پہلے پہل ان میں اصولی اختلاف رونما ہوا مگر چند ہی دنوں میں اس اختلاف نے مخاصمت کی صورت اختیار کر لی —— اس خیال سے کہ یہ دشمنی جماعت کے لئے مضر ثابت ہوگی۔ دونوں کچھ عرصہ تک خاموش رہے۔ مگر پھر اختلاف کی آگ پورے زور سے بھڑک اُٹھی۔ دونوں انقلاب پسندوں نے آمریت کے لئے زبردست تگ و دو کی۔ دونوں ایک دوسرے کو ایسی شکست دینا چاہتے تھے کہ ان میں سے ایک اپنے دوسرے حریف کو یا تو ملک سے باہر نکال دے اور یا پھر خود چلا جائے۔ سٹالن نے سوشلزم کے صحیح مقصد اور اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسا حربہ استعمال کیا کہ اکثریت نے اُس کا ساتھ دیا۔ مگر ٹراٹسکی چونکہ صحیح معنوں میں بالشویک تھا۔ اس لئے اُس نے اپنے اصولوں کو چھوڑنے کی بجائے جلاوطن ہونا پسند کر لیا۔

ٹراٹسکی کی مشہور کتاب "تاریخ انقلاب روس" دنیا کی ایک معرکتہ الآرا کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ تاریخی یادداشت کی حیثیت سے یہ کتاب ابدالآباد تک مستند رہے گی۔ اس کے اصولوں سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو۔ مگر اس کا مطالعہ پڑھنے والے کے دل میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کتاب میں ٹراٹسکی نے واقعات کی جو تشریح کی ہے وہ نہ صرف حرف بحرف صحیح ہے۔ بلکہ ادبی لحاظ سے بھی بہت بلند ہے۔

ٹراٹسکی کی بیوی اپنے شوہر کی اعانت کرنا اور اُس کی آواز پر لبیک کہنا اپنی زندگی کی انتہائی مسرت سمجھتی تھی۔ وہ شاہراہ زندگی پر اپنا ہر قدم شوہر کے ساتھ ساتھ اٹھاتی رہی۔ حتیٰ کہ جب اُسے سائبیریا میں نظر بند کر دیا گیا تو یہ جاں نثار عورت سایہ کی طرح اُس کے ساتھ رہی اور اسی وجہ سے ٹراٹسکی نے جلاوطنی سے قبل از میعاد نجات پائی۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آزاد ہو کر ٹراٹسکی نے اپنی اس قابل قدر بیوی سے کیوں اچھا سلوک نہ کیا اور اُس سے کیوں علیحدگی اختیار کر کے ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لی جو عمر میں بھی اُس سے بہت چھوٹی تھی۔

ٹراٹسکی کی دوسری بیوی بھی فطرتاً انقلاب پسند تھی۔ سرکاری اسکول سے اُسے صرف اس لئے نکال دیا گیا تھا کہ اس نے نہ صرف خود عبادت کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ دوسرے طلبہ کو بھی یہ ترغیب دی تھی کہ وہ انجیل کی بجائے کمیونسٹ لٹریچر کا مطالعہ کریں۔ اس لڑکی کے بطن سے ٹراٹسکی کے ہاں کئی بچے پیدا ہوئے۔ لیکن چونکہ اُس نے اپنی پہلی بیوی کو باقاعدہ طور پر طلاق نہ دی تھی۔ اس لئے مخالفین نے ٹراٹسکی کے خلاف خوب زہر اُگلا۔

۱۹۲۰ء میں ٹراٹسکی کے والد بیاسی سال کی عمر میں تپ محرقہ سے انتقال کر گئے۔ اُس سیدھے سادھے باپ کو اپنے بیٹے کی ثروت و جاہ و حشمت و اقبال پر کوئی فخر نہ تھا کیونکہ ٹراٹسکی حد سے زیادہ خود پسند ہے اور غالباً اسی وجہ سے دوسرے اکابر کو اس سے اختلاف ہو جاتا تھا اس وقت ٹراٹسکی یہ سمجھتا تھا کہ وہ دنیا میں اس لئے پیدا ہوا ہے کہ ایوان حکومت کو بالکل منہدم کر کے اس کی بنیادوں پر ایک نئی حکومت کی عمارت تیار کرے اُسے ہمیشہ یقین رہا کہ لوگوں کی عقل اُس کے خیالات سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس لئے اُنہیں چاہیئے کہ بلا چون و چرا اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے چلے جائیں۔ وہ جمہوریت کو اپنی مطلق العنانی کے سامنے بالکل جھکا ہوا دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے خیال میں کسانوں، مزدوروں، سپاہیوں سب کو اُسی کی پیروی سے دین و دنیا کی تسکین حاصل ہو سکتی تھی۔

ٹراٹسکی کے ان خیالات کی وجہ ہی سے لوگ اُس کے مخالف ہو گئے۔ اور اُس کی ہر بات کو شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ٹراٹسکی نے اس بات کی بھی کوئی پرواہ نہ کی اور شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اس عظیم انسان انسان اور روس کے قائدِ اعظم کو وہ دن دیکھنا پڑا جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔

ٹراٹسکی ایک اعلیٰ پایہ کا مقرر ہے۔ روس میں اُسے لسان العصر کہتے ہیں۔ ٹراٹسکی اپنے قلم سے شمشیر کا کام لیتا ہے۔ دوسروں سے کام لینا اُسے خوب آتا ہے لیکن وہ کسی کے ساتھ مل کر کام نہیں کر سکتا۔ زندگی میں اگر اُس نے کسی کے ساتھ مل کر کام کیا تو وہ لینن تھا۔ وہ مدت تک لینن کا رفیق کار رہا مگر اُس نے لینن کی بلند پایہ شخصیت سے یہ سبق نہ سیکھا کہ عالی شان انسانوں کا کام صرف دوسروں کی رہنمائی کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ اُن کی خدمت بھی اُن کا اہم ترین فرض ہے۔

ٹراٹسکی چونکہ خود نہایت فہیم ہے۔ اس لئے غبی لوگوں سے اُسے بہت کد ہوتی ہے۔ لینن کی زندگی میں وہ اسی بات پر قانع رہا کہ لینن کے بعد اُسے دوسرا درجہ حاصل ہے مگر اس کی موت کے بعد وہ علی الاعلان یہ کہتا رہا۔ کہ میں ملک میں سب سے زیادہ عالم اور مدبر ہوں۔ اور اپنے اسی عقیدہ سے متاثر ہو کر اُس نے وہ کچھ کہا جسے اُس کے زوال کی ایک وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس کے حریفوں نے اُس کے مقابلہ میں ایسے حربے استعمال کئے جو انسان کی شان کے شایاں نہیں۔

ٹراٹسکی کی حالت قابل رحم ہے۔ اگر اُسے ملک بدر نہ کیا جاتا تو اُس کی خداداد ذہانت مادر وطن کے لئے نہایت کار آمد ثابت ہوتی۔ اور ٹراٹسکی اگر خود بھی ذرا صلح جوئی سے کام لیتا تو سٹالن کا رسوخ اُس کے مقابلہ میں ہیچ تھا۔ اگر لینن کی زندگی میں وہ اس حقیقت پر غور کر لیتا کہ اُس کی شان و شوکت کی بنیاد اُن پہاڑوں پر رکھی جا رہی ہے جو آتش فشاں ہیں اور ایک دن اس خوفناک طریقہ سے پھٹنے والے ہیں کہ خود اُسے بے حد نقصان پہنچے گا تو ممکن ہے لینن اپنے دوست کے لئے کوئی ایسا لائحہ عمل تجویز کرتا کہ اُس کی زندگی ان المناک عواقب سے محفوظ ہو جاتی۔ مگر ٹراٹسکی آتش فشاں پہاڑوں کی طرح خود بھی آتش تھا۔

ٹراٹسکی ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کرتا رہا کہ دنیا کو صرف سرمایہ داروں نے مصائب میں مبتلا کر رکھا ہے اور دنیا کی تمام مشکلات کا حل سوشلزم ہے۔

ٹراٹسکی اور سٹالن میں سب سے پہلا جھگڑا "مسئلہ چین" پہ پیدا ہوا۔ سٹالن کا خیال تھا کہ چینیوں کے ساتھ عارضی طور پر صلح کر کے مشرق میں کمیونزم کا پراپیگنڈا وہیں سے شروع کرنا چاہیئے۔ ٹراٹسکی اس کے خلاف تھا اُس کی دور بین نگاہوں نے یہ فوراً بھانپ لیا تھا کہ اس اقدام سے روس کو ہزیمت اٹھانا پڑے گی۔ اور بعد میں ہوا بھی وہی جو ٹراٹسکی کہتا تھا۔ اس کے بعد کسانوں کے بارے میں نزاع پیدا ہوا۔ اس مرتبہ بھی ٹراٹسکی کی رائے صائب نکلی۔ اس کی پنج سالہ سکیم زیادہ اہم اور مفید تھی۔ مگر سٹالن اور اُس کی پارٹی نے اسے محض مخالفت کی بنا پر مسترد کر دیا۔

ٹراٹسکی کے اس قول کی حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ سٹالن اور اُس کے ہمنواؤں نے سوشلزم کے صحیح مقاصد کو پس پشت ڈال کر اپنی شان و شوکت اور جلبِ منفعت کا زیادہ خیال رکھا۔ جب تمام دنیا کے انقلاب پسندوں کی تاریخ مرتب کی جائیگی۔ تو یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اُس میں ٹراٹسکی کا نام درخشاں نظر آئے گا۔

ٹراٹسکی آج کل میکسیکو میں ہے۔ وہ ایک مدت تک مذاہب عالم کے مطالعہ میں مصروف رہا اور اُس کا خیال ہے کہ اسلام دنیا کا بہترین مذہب ہے۔

کے۔ اے۔ حمید

ایک اک حرفِ غمِ دل کا سنانا ہے اُنہیں
کل اگر بھول نہ جاؤں جو مجھے یاد ہے آج
جگرؔ

ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے
سیمابؔ اکبر آبادی

غزل

پھر ہے مجھے اُس نورِ مجسّم کی تمنّا
خوابوں میں بھی رہتی ہے نظر محوِ تماشا

عِصیاں کی حقیقت کو سمجھتی ہے مشیّت
قدموں میں مرے لوٹتی ہے جنّت ماویٰ!

عارض پہ ڈھلکتے ہیں اِدھر اشکِ مسرّت
پھُولوں پہ چمکتے ہیں اُدھر لولوئے لالا!

اے گردشِ ایّام اِدھر دیکھ! اِدھر دیکھ!
مطرب بھی ہے ساقی بھی ہے، لا بربط و مینا!

مَیں شمس و عطارد سے کیا کرتا ہوں باتیں
بستا ہے تصوّر میں مرے عالمِ بالا!

کب جذبۂ تخلیق سے بن جائیگی صورت
محفوظ ہے سینے میں مرے کس کا ہیولیٰ!

یہ کس کے تجسّس نے سکھائی مجھے پرواز
رفعت کو مری دیکھتے ہیں سدرہ و طوبیٰ!

ہر بات ہے عاشق کی زمانے سے نرالی
مُرجھا کے ہرا ہوگا مرا نخلِ تمنّا!

جانے بھی لگے! توبہ بھی کی! جام بھی توڑے!
ساقی نے جو دیکھا تو دھرا رہ گیا تقویٰ!

احمد ندیم قاسمی

اقبال کی تعلیمات

کہتے ہیں شعر سحر ہے، قوموں کی زندگی و بقا کیلئے جو کام شعر سے لیا جاتا ہے، وہ کسی اور طرح سے ناممکن ہے، کارلائل کے نزدیک شاعر ایک "ہیرو" ہے۔ چنانچہ وہ شکسپیر کے متعلق لکھتا ہے۔

"برطانیہ کے باشندے جو دنیا کے ہر حصے پر پھیلے ہوئے ہیں اور ہر ملک کے قریے قریے اور گوشے گوشے میں پائے جاتے ہیں، ان کو نہ تو حکومتِ وقت کی طاقت رشتۂ اتحاد و اتفاق میں منسلک رکھ سکتی ہے۔ اور نہ قانونِ وقت ہی ان کو مہذب اور متمدن بنا سکتا ہے، ان بکھرے ہوئے موتیوں کو برادری کی ایک لڑی میں پروئے اور ان کروڑوں صاحبِ تاج و سریر بنانے والا ہمارا بے تاج بادشاہ شیکسپیر ہے۔"

اقبال کی شاعری نے بالعموم ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلم قوم کے مردہ دلوں میں زندگی کی ایک غیر فانی لہر دوڑا دی ہے، وہ ذہنی پستی جو مدت سے مسلمانوں میں سرایت کر چکی تھی اقبال کی شاعری نے اس ذہنی پستی کو بالکل نابود کر دیا ہے۔ آج زندگی کے جو آثار ہمیں مسلمانوں میں نظر آ رہے ہیں۔ وہ اقبال کے حیات بخش نغموں کا ہی نتیجہ ہیں۔ اقبال یقیناً اس عہد کا مسیح ہے جس کی آتش نفسی نے مردہ دلوں کو زندہ کر دیا ہے۔ شاعر خود کہتا ہے ؎

جو کو کنار کے خوگر تھے اُن غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند

جب ہی تو اقبال کے اس حیات بخش پیام سے متاثر ہو کر ایک مغربی نقاد مسٹر ہربرٹ ریڈ" اپنے عہد کی ادبی پستی کا شکوہ ان الفاظ میں روتا ہے۔

"وِٹمن کا نصب العین اس حیثیت سے بہت اہمیت رکھتا ہے، کہ وہ نظری نہیں عملی ہے۔ صرف ایک شاعر ایسا ہے جس کے ہاں یہ چیز نظر آتی ہے، اور وہ بھی ہماری نسل اور قوم سے نہیں، میری مراد "محمد اقبال" سے ہے۔ جس کی نظم "اسرار خودی" کا ترجمہ ڈاکٹر "رینالڈ نکلسن" نے کیا ہے۔ اور جو میکملن کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے، ادھر ہمارے ملک کے شاعر تو کیٹس کے زمانہ کی قدیم روش پر چل رہے ہیں اور بلبلوں پرندوں یا دوسرے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر نظمیں لکھ رہے ہیں اور ادھر لاہور میں ایک ایسی نظم شائع ہو رہی ہے۔ جس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں پر کامل طور سے تسلط جما لیا ہے۔ ایک مسلمان نوجوان لکھتا ہے۔ اقبال اس عہد کا مسیح ہے جس کی آتش نفسی نے مردوں کو زندہ کر دیا ہے، تم پوچھو گے کہ اس میں آخر کون سی ایسی ظاہری کشش ہے، جس نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ اس قسم کی کسی ظاہری کشش کا رہین منت نہیں، جو مبلغوں اور دنیا کو نجات کا پیغام دینے والوں کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ یہ اعجاز ایک نظم نے دکھایا ہے، جس کے حسن و جمال کے آئینہ میں فلسفۂ جدید کے اکثر پہلو منعکس نظر آتے ہیں۔ اس میں خیالات کی فراوانی ہے۔ لیکن اس میں یگانگی اثر پائی جاتی ہے، اور اس کا فلسفہ ساری کائنات کیلئے آوازِ غیب کا حکم رکھتا ہے۔"

اقبال سراسر اسلامی تعلیمات کا مفسر ہے۔ اس کی تعلیمات کا ماخذ قرآن حکیم ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال نہایت مضحکہ خیز ہے۔ کہ اقبال کی تعلیمات مادہ پرستی کا پرچار ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب اقبال نے "اسرار خودی" شائع کرائی۔ تو بعض بر خود غلط ملا اور عجمی تصوف کے شیدائی اقبال کی مخالفت پر کھڑے ہو گئے، اور اقبال کو "منصوری فتنے" سے تعبیر کرتے ہوئے با آواز بلند پکار اُٹھے "اس کو دار پر کھینچ دو، یہ مسلمانوں کو مغربی مادیت کی تعلیم دے رہا ہے" شکر ہے کہ ان لوگوں کو بہت جلد اپنی

غلطی کا احساس ہو گیا! اور ماننا پڑا کہ اقبال کی تعلیمات مادیت کا پرچار نہیں، بلکہ عین اسلامی تعلیمات ہیں۔ اور اس کا کوئی نظریہ یا خیال شاعرانہ دماغ کی اختراع نہیں ہے!

خودی

اقبال کی تعلیمات میں خودی کی تعلیم کا بڑا حصہ ہے۔ صوفیا کے خیال کے مطابق کہ "ہم کچھ بھی نہیں" خودی کی تعلیم کے بالکل منافی ہے، یا یوں کہئیے، کہ صوفیا کا یہ نظریہ اسلامی تعلیم کے بالکل متضاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عجمی تصوف نے اسلامی تعلیمات کو اس درجہ مسخ کر دیا ہے۔ کہ وہ شخص جو اسلام کی حقیقی روح سے واقف نہیں۔ اسلام کو محض "دعاؤں" اور حجروں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتا، حالانکہ اسلام عمل کا دوسرا نام ہے۔ صوفیا کا خیال ہے کہ ہم کچھ بھی نہیں۔ لیکن اقبال کے نزدیک "ہم سب کچھ ہیں" اور یہ جہاں کچھ بھی نہیں ؎

نہ تو زمیں کیلئے ہے نہ آسماں کیلئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کیلئے

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اقبال کی رائے میں دنیا کی ہر شے کا دارومدار خودی پر ہے۔

(۱) پیکر ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ مے بینی ز اسرارِ خودی است
(۲) صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او
غیر او پیداست از اثبات او

انسان کیا ہے؟ خودی کی ایک مجسم تصویر۔ خودی کیا ہے! اپنی ہستی کا صحیح احساس! جس قدر انسان اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے! اسی قدر وہ اسرار و رموز سے آگاہ ہوتا جاتا ہے اور زندگی کے حجابات اس کے سامنے سے اٹھتے جاتے ہیں ؎

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے، لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

جو فرد خودی کا علمبردار نہیں، وہ "انسان کامل" نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے، کہ کسی انسان کو "انسان کامل" بننے کیلئے خدا سے دوری ضروری ہے! بلکہ کوئی فرد اس وقت تک "انسانِ کامل" نہیں بن سکتا، جب تک وہ خدا سے قریب نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہئیے کہ خدا کی قربت سے یہ ہرگز مقصود نہیں ہے کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے۔ بلکہ انسانِ کامل وہ شخص ہو سکتا ہے، جو خدا کو اپنے اندر جذب کرلے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

خودی کی زندگی قوموں کی زندگی ہے، اگر خودی زندہ ہے، تو فقر بھی شہنشاہی سے کم نہیں، دریا ایک قطرے کی مانند ہے، اور کوہسار پرنیاں و حریر سے کم ہیں ؎

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر
نہنگِ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگِ مردہ ہے موجِ سراب میں زنجیر

خودی کی بقا کیلئے ضروری ہے، کہ ہمارے دل آرزوؤں اور جستجوؤں سے لبریز ہوں، تاکہ ان آرزوؤں کو پورا کرنے کیلئے انسان ہر وقت سرگرم عمل رہے، اور "ٹینی سن" Tennyson کے یولے سز (Ulysses) کی طرح ہر وقت اس کے قدم ایک نئی دنیا تلاش میں ...... بڑھیں۔ زندگی آرزوؤں کا دوسرا نام ہے، وہ تجدید زیست ہیں۔ ان کی محدودیت گویا موت کی آواز دیتا ہے! اقبال کہتا ہے ؎

زندگانی را بقا از مدعا است ٭ کاروانش را درا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است ٭ اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار ٭ تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

آرزو جانِ جہان رنگ و بو است ؛ فطرتِ ہر شے امینِ آرزو است
آرزو ہنگامہ آرائے خودی ؛ موجِ بے تابے ز دریائے خودی
آرزو صید مقاصد را کمند ؛ دفترِ افعال را شیرازہ بند
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

جس طرح خودی کی بقا کیلئے آرزوؤں کا پیدا ہونا ضروری ہے، اسی طرح خودی کی پختگی کیلئے عشق لابدی ہے۔ خودی نیابتِ خود ایک نور ہے۔ عشق اس نور کو اور بھی تابندہ و درخشندہ کر دیتا ہے۔ عشق ایک عرفان ہے، جو ہماری زندگی کو غیر فانی بنا دیتا ہے۔ عشق ہمارے دلوں میں ایک جاوداں تڑپ، زندہ امید اور غیر فانی سوز و گداز پیدا کر دیتا ہے۔ عشق ایک معرکہ حیات ہے۔ وہ لامحالہ تمام مقاصد کا سرچشمہ ہے اور ان کے حصول کا واحد ذریعہ ہے ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است ؛ زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر ؛ زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
از محبت اشتعالِ جوہرش ؛ ارتقائے ممکناتِ مضمرش
فطرتِ او آتش اندوزد ز عشق ؛ عالم افروزی بیاموزد ز عشق
دل ز عشق او توانا می شود ؛ خاک ہمدوشِ ثریا می شود

زندگی

اقبال کی رائے میں زندگی شوپنہار کے خیال کے مطابق مصائب و آلام کا گہوارہ نہیں ہے بلکہ شاعر کے نزدیک مصائب و آلام خودی کی تربیت و اصلاح کے ممد و معاون ہیں۔ اس کی رائے میں حیات نام ہے مسلسل ناکامیوں کا! ع

زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

مبارزا بزم بر ساحل کہ آنجا ؛ نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز ؛ حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اقبال زندگی کے مصائب پر چھا جانا چاہتا ہے۔ وہ مصائب و آلام کو محض اعتبارات خیال کرتا ہے، بلکہ شاعر کے نزدیک یہی چیزیں آخر کار انسان کیلئے حیاتِ دوام کا باعث ثابت ہوتی رہی۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان ان عارضی مصائب و آلام کے زیر اثر آ کر اپنی زندگی کو تلخیوں اور ناکامیوں کا گہوارہ بنانے سے احتراز کرے، یہی نہیں بلکہ ان مصائب کا مقابلہ سینہ سپر ہو کر کرے۔ گوئٹے اپنی مشہور تصنیف "فاؤسٹ" میں لکھتا ہے

" حوادثِ زمانہ سے اثر پذیر نہیں ہونا چاہیئے
بلکہ زندگی کے آرٹ کی تکمیل اسی میں ہے۔"

اقبال کہتا ہے ؎

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست
گفتا مئے کہ تلخ تر او نکو تر است

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختن ناتمام!

اقبال زندگی سے ناامید ہونا کفر سمجھتا ہے، وہ نہ تو خود مایوس ہوتا ہے، اور نہ ہی دوسروں کو مایوس ہونے دیتا ہے، وہ متشائم نظریۂ حیات کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اس کو ملت کی بقا کیلئے سخت خطرناک گردانتا ہے۔ کیونکہ اس متشائم پسندی نے کئی قوموں کو بلندی سے دے پٹکا ہے۔ وہ ہم کو زندگی کے درخشندہ و تابناک پہلو سے روشناس کراتا ہے اور زندگی سے مایوس ہونے کی بجائے اس کے ساتھ محتشم امیدیں وابستہ رکھنے کی تعلیم دیتا ہے ؎

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزوست
زندگانی محکم از لا تقنطوا است
ناامید از آرزوئے پیہم است
ناامیدی زندگانی را سم است
زندگی را پاس خواب آور بود
ایں دلیلِ سستی عنصر بود!

وہ لوگ جو زندگی کے حوادث سے گھبرا جاتے ہیں۔ ایک ایسے گناہ کے مرتکب ہیں۔ جو اسلام کی نگاہوں میں ایک بہت بڑا گناہ اور ذلیل ترین حرکت ہے، کیونکہ قرآنِ پاک ہم کو ہمیشہ "نصر من اللہ و فتح قریب" کی تعلیم دیتا ہے۔ اقبال کہتا ہے

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

ناتوانی زندگی را رہزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است

جہاں اقبال زندگی کے مصائب و حوادث سے دب جانے کی بجائے ان پر چھا جانے کی تلقین کرتا ہے، وہاں وہ زندگی میں ہمیشہ ایک تغیر و انقلاب دیکھنے کا متمنی ہے۔ کیونکہ زندگی نام ہے، تغیر و انقلاب کا، وہ زندگی جو کیف و جمود کی ترجمان ہے۔ زندگی نہیں، موت ہے، کیونکہ ہماری زندگی کا خمیر ہی تغیر و انقلاب سے اٹھایا گیا ہے۔" شاعر کہتا ہے ؎

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظرات
زندگی در پئے تعمیرِ جہان دگر است

زندگی از طوفِ دیگر رستن است
خویش را بیت الحرم دانستن است

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

آزادی

اقبال حریت کا زبردست حامی ہے، اس کا پیغام مکمل آزادی کا آئینہ دار ہے، اقبال کے خیال میں غلام کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اگرچہ بظاہر وہ خدا کی پرستش کرتا ہے، لیکن اس کے دل پر فرمانروائے وقت کی حکومت ہوتی ہے، غلامی ربطِ ملت کے افتراق کا سب سے بڑا باعث ہے، غلامی میں عشق اور مذہب گاڑی کی دو پٹڑیوں کی مانند ہو جاتے ہیں۔ محکومی ایک موت ہے۔ جو ہر وقت غلام کو خوف و ہراس کا مرکز بنائے رکھتی ہے فرماتے ہیں۔

از غلامی دل بمیرد در بدن ؛ از غلامی روح گردد بار تن
از غلامی بزمِ ملت فرد فرد ؛ ایں و آں با آں و ایں اندر نبرد
از غلامی مردِ حق زنار بند ؛ از غلامی گوہرش ناارجمند

در غلامی عشق و مذہب را فراق ؛ انگبین زندگانی بدمذاق

در غلامی عشق جز گفتار نیست ؛ کارِ ما گفتار ما را یار نیست

دین و دانش را غلام ارزاں دہد ؛ تا بدن را زندہ دارد جاں دہد
گرچہ بر لب ہائے او نامِ خداست ؛ قبلۂ او طاقتِ فرمانرواست
ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ ؛ زندگیِ او را حرام از بیمِ مرگ

یہی نہیں، بلکہ غلام کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے، اس کی آنکھوں سے بصارت جاتی رہتی ہے۔ وہ تقلید کو زندگی خیال کرتا ہے۔ دین و دانش کو چند سکوں کی خاطر فروخت کر دیتا ہے، اور تحقیق کی بازی کو بالکل ہار دیتا ہے "نگاہ شوق" اس کی ترجمان نہیں رہتی۔ اس کا دل "جرأت اندیشہ" سے خالی ہو جاتا ہے، سوزِ عمل اس کے بدن سے رخصت ہو جاتا ہے اور بالآخر "لذتِ ایماں" سے اس کا وجود محروم ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرور غلاموں کے روز و شب پہ حرام

دیں و دانش را غلام ارزاں دہد
تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

از غلامی لذتِ ایماں مجو ؛ گرچہ باشد حافظِ قرآں مجو

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد

یعنی از کوئے غلامی زسگاں خوار تراست
من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

عمل

اقبال کی ہر تصنیف عمل کے پیغام کو لئے ہوئے ہے۔ اقبال کے خیال میں عمل ہی میں حقیقی روحانی تعلیم و اخلاقی قوت، جوشِ فکر اور گرمی پوشیدہ ہے، وہ قوم جو محض گفتار کی غازی ہے دنیا میں ہرگز کامیاب اور سرخرو نہیں ہو سکتی۔ مسلمان اگر اس وقت پستی کی جانب جا رہا ہے، تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے، کہ اس نے عمل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ اور عجمی تصوف اور بدھ مت کے اصولوں کو اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنا لیا ہے اور بجائے جہاد فی سبیل اللہ" وہ محض "دعاؤں" اور "قلمی جہاد" سے کام لینے لگا ہے۔

بعض لوگوں کا یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ اقبال روحانی قوت کا قائل نہیں ہے اور ہر عجمی تصوف کا مخالف ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، اقبال صرف اس عجمی تصوف کا مخالف ہے جس کی آئینہ دار خیام کی شاعری ہے! جو منجمد اور سست خیالات کی حامل ہے۔ اور اسلامی تعلیم کے برخلاف رہبانیت کی تعلیم دیتی ہے، لیکن وہ مولانا روم، غزالی یا رازی کا اس لئے پرستار ہے، کہ ان کی شاعری یا فلسفہ اسلامی تعلیمات کا زیور ہے، جو مسلمانوں کو عمل اور جدوجہد کی تعلیم دیتا ہے۔ علامہ اقبال اپنے مضمون "فلسفہ نفس کوشی" میں اس نظریئے کی مزید تشریح یوں فرماتے ہیں۔

"مسٹر ڈکنسن کے نزدیک میں نے اپنی نظموں میں جسمانی قوت کو منتہائے کمال قرار دیا ہے۔ انہوں نے مجھے ایک خط لکھا ہے جس میں یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے انہیں اس بارے میں غلطی ہوئی ہے میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں، لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا، جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوتِ پیکار دی جا رہی ہو، تو میرے نزدیک اس پر لبیک کہنا اس کا فرض اولین ہے لیکن میں اُن تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں۔ جس کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔"

موجودہ عہد میں جب کہ عجمی تصوف کے نظریات نے ہمارے دست و بازو شل کر دئے ہیں۔ اقبال کا درس عمل اس قابل ہے کہ اس کو مسلمان اپنے دلوں میں جگہ دیں۔ تاکہ شاعر کا پیغام "بانگِ درا" سے کم ثابت نہ ہو، اقبال "کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر" پیدا کرنے کا متمنی ہے اور مسلمان کو اسلام کا صحیح تعلیم و عمل سے روشناس کرانا چاہتا ہے کیونکہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اور

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات
لذتِ تخلیق قانونِ حیات

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

وطنیت

اقبال وطنیت کے اس محدود خیال کا سخت دشمن ہے! جو عام لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ اس کے خیال میں وطنیت کا یہ محدود نظریہ اسلام کی عالمگیر اخوت کے سخت منافی ہے۔

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

جیسا رینان کہتا ہے، اسلام وطنیت جنسیت، النسل اور رنگ کی قیود سے آزاد ہے، اقبال کی وطن پرستی قید مکانی سے آزاد ہے۔ اس کی رائے میں وطن یا ملک ایک جغرافیائی حد بندی کا نام ہے، جس پر ہمیشہ تاریخی واقعات اثر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور تغیر و انقلاب کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ اقبال کی وطنیت ایک عالمگیر اخوت کی مالک ہے، وہ تمام دنیا کو اپنا وطن تصور کرتا ہے ع

ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ما است

اقبال اس نظریئے کو اپنے مضمون "فلسفہ سخت کوشی" میں اس طرح بیان کرتا ہے۔ "اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے۔ نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ در اصل اسلام بلکہ

کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافی حدود پر ہے دنیائے اسلام میں استیلاء حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں، جو قومیت کو ملک و وطن کے حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوعِ انسان کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و نما ہے۔ نسل اور حدود ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے، اور اگر اسے یہی حیثیت دی جائے، تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا، لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوت کا مظہرِ اتم سمجھ لیا جائے۔"

شاعر کی دعا ہے ؎

نوعِ انساں قوم ہو میری وطن میرا جہاں
بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں

اقبال کی اس تعلیم سے وہ لوگ جو وطنیت کے مفہوم کو بہت تنگ معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اقبال کے اس نظریے کو مغربی خیالات کا اشتہار گردانتے ہیں۔ حالانکہ وطنیت کے متعلق اقبال کی تعلیم اس بات کو ہرگز بھی ظاہر نہیں کرتی۔ کہ اقبال کا دل حبِ وطن سے خالی ہے۔ اس کی عالمگیر اخوت میں ہی حب الوطنی پوشیدہ ہے۔

بقول شیخ سعدیؒ ع

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

اقبال بھی اسی خیال کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

جو کرے گا امتیازِ رنگ و بو مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

ہنوز از بندِ آب و گل نہ رستی
تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدمِ بے رنگ و بویم
از آں پس ہندی و تورانیم من

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ربطِ ملت

کسی قوم کا استحکام ربط و جذب سے ہوتا ہے، فرد واحد کی حیثیت اگر اس کا تعلق کسی جماعت سے نہیں، تو ایک قطرہ کی مانند ہے۔ لیکن اگر وہی فرد کسی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے، تو اس جماعت کو ایک ازلی طاقت نصیب ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ ایک قطرے سے ایک سمندر بن جاتا ہے! شاعر کہتا ہے ؎

محفل کوکب ز جذبِ باہم است ۔ ہستی کوکب ز کوکب محکم است

فرد کی اہمیت کو اقبال یوں بیان کرتا ہے ؎

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود!
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش
رونقِ ہنگامۂ احرار باش

اثر چکوالی بی۔ اے

خطّہ ہائے عرب کی حالت

طوفانِ نوحؑ کے بعد

مسلّط ہُو کا عالم تھا عرب کے ریگ زاروں پر
اُداسی اپنا سایہ ڈالتی تھی کوہساروں پر

تفحصّ پر نقوشِ "غیرذی زرع" نمایاں تھے
سُراب آبادِ وحشت میں نہ انساں تھے نہ حیواں تھے

نشیبوں میں چھپی تھی سبزۂ خودرو کی سرسبزی
بہاریں لُوٹنے والا مگر ملتا نہ تھا کوئی

ببولوں کی ہری شاخوں میں پتّے تلملاتے تھے
مسافر چھاؤں لیتے تھے ۔ نہ گلّہ منہ لگاتے تھے

نہ اونٹوں کو تعلق تھا عرب کے ساربانوں سے
رہِ منزل کا رشتہ گم ہوا تھا کاروانوں سے

ہوا مسموم میدانوں میں ہر سو جانستاں کانٹے
فضا پر حکمراں شعلے زمیں پر حکمراں کانٹے

بگولے بن کے چکّر کاٹتی تھی فتنہ سامانی
کبڈّی کھیلتے تھے ہر طرف غولِ بیابانی

قناتیں کھنچی تھی ہولناکی خشک ٹیلوں پر ۔۔۔ تعیّن وسعتِ ناپیدا کا ناممکن تھا ٹیلوں پر

دبے پاؤں ۔ نظر پھیرے گزر جاتی تھیں برساتیں ۔۔۔ رمائے تھیں بھبوت اپنے بدن پر چاندنی راتیں

حکومت کر رہی تھی دشتِ ونخلستاں میں ویرانی ۔۔۔ پیاسوں[1] کے لئے بیتاب تھا ہر جھیل کا پانی

کھجوروں کی فراوانی کو انسانوں کی خواہش تھی ۔۔۔ دلِ صحرائے بے پایاں کو مہمانوں کی خواہش تھی

زمانے کی زباں پر جب عرب کا نام آتا تھا ۔۔۔ فصیلِ شہر بابل میں تمدّن منہ چھپاتا تھا

نہ تھیں حاوی قیاس آرائیاں اسکی مشیت پر ۔۔۔ پڑے تھے سینکڑوں پردے رُخِ رازِ حقیقت پر

کسے معلوم تھا اِس دشتِ جانفرسا کا یہ رُتبہ ۔۔۔ بنے گا "وحشت آبادِ عرب" قبلہ کا ہم پلّہ

یقیں کب تھا پڑینگی پھر یہاں کعبہ کی بنیادیں
خبر کیا تھی اِدھر کھنچ آئینگی جنت کی طنابیں

شاد عارفی

---

[1] پیاسوں ؟ مدیر

قدرت کا خونیں انتقام

ہرنام سنگھ کا باپ کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ آس پاس کے گاؤں میں اُس کی بات بنی ہوئی تھی، اور کچہری دربار کے لوگ بھی اُس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہرنام سنگھ کے باپ میں بہت سی خوبیوں کے ساتھ سب سے بڑی بُرائی یہ تھی کہ وہ کسانوں پر بہت زیادہ سخت گیر تھا۔ غریب کسان اُس کی پرچھائیں سے کانپتے تھے، لگان کے ادا کرنے میں اگر کسی قسمت کے مارے کسان سے ایک دن کی بھی دیر ہو جاتی، تو پھر دوسرے دن وہ غریب کسان اپنے ڈھور ڈنگر، اور گھر کے برتن، بھانڈے کے ساتھ، زمیندار کی چوپال میں بیٹھا ہوا نظر آتا۔ ہرنام سنگھ کا باپ کہا کرتا تھا کہ سختی کے بغیر زمینداری ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی سخت گیر پالیسی نے اُس کو بیدرد اور بے حس بنا دیا تھا۔ اُس کی زندگی اور کاروبار کی لغت میں "عفو و درگذر" کی اصطلاح کہیں نظر نہ آتی تھی۔

ہرنام سنگھ نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی کہ اُس کی چوپال میں غریب کسانوں کی گوشمالی کی جا رہی ہے اور وہ بلک بلک کر فریاد کر رہے ہیں۔ فاقہ کش مزدوروں سے بیگار لی جا رہی ہے کسانوں کے گھروں اور کھلیانوں سے اناج قرق ہو کر آ رہا ہے اُس کے باپ کے سامنے بہت سے پریشان حال کاشتکار سر جھکائے کھڑے ہیں۔ اور اُس کا باپ غریبوں کو بے نقط گالیاں سُنا رہا ہے۔ گاؤں کے بسنے والے ظلم و زیادتی کی فریاد تحصیلدار یا تھانیدار سے کر سکتے ہیں، ہرنام سنگھ کے باپ نے تھانہ اور تحصیل کے آدمیوں کو پہلے ہی سے ملا لیا تھا، وہ پیٹ کے کتے اپنے فرائض کو پسِ پشت ڈال کر زمیندار کی زیادتیوں سے چشم پوشی کر رہے تھے۔ ہرنام سنگھ نے دیکھا کہ تھانیدار، اُس کے باپ کے یہاں ہفتہ میں ایک دو مرتبہ دعوت کھاتے ہیں، اور اس کا باپ، گاؤں والوں کو مرعوب بنانے کیلئے تھانیدار کے آنے اور دعوت کھانے کی خبر کو گاؤں میں خوب مشہور کرتا ہے۔ جس بچے نے اس جابرانہ ماحول میں پرورش پائی ہو، اس سے کسی بھلائی کی کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

ہرنام سنگھ کو گاؤں کے مدرسے میں داخل کرا دیا گیا، ہرنام سنگھ پڑھنا پڑھانا تو کچھ نہ تھا، لیکن اُس کے باپ کے رعب و داب کے اثر سے گاؤں کے مدرسہ کا ہیڈ ماسٹر اُسے ہر سال ترقی دیدیا کرتا تھا۔ اور وہ مدرسہ جہاں اُس کے ذہن و فکر کی تربیت ہونی چاہیئے تھی، اُس کے گھمنڈ، کمینہ پن اور آوارگی کیلئے تجربہ گاہ بن رہا تھا۔ گاؤں کے با اثر افراد کی اگر یہ لوگ ہاں میں ہاں نہ ملائیں، تو نوکری کے لالے پڑ جائیں۔ اس کے سوا، ان لوگوں کی تنخواہ بہت ہی کم ہوتی ہے۔ لڑکوں کے والدین "انعام" کے طور پر کچھ دیتے دلاتے رہتے ہیں۔ اس سے اُن کی گذر اوقات ہو جاتی ہے ہرنام سنگھ کا باپ بھی مدرسہ والوں کو تیج تیوہار پر سمجھتا رہتا تھا۔ ہرنام سنگھ کئی سال تک گاؤں کے مدرسے میں پڑھتا رہا۔ ہرنام سنگھ کے چچا تھانیدار تھے، وہ اسے چند دن کے بعد اپنے ساتھ لے گئے، اور اپنے مستقر پر پہونچکر اُسے انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا۔

چچا کے یہاں بھی ہرنام سنگھ کو نہایت ہی جابرانہ ماحول سے سابقہ پڑا۔ بیگناہوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، غریبوں کے ساتھ زیادتی، گاؤں کے اَن پڑھ اور بھولے بھالے لوگوں کو فریب کے جال میں پھانسنا، رشوت، بد دیانتی، روپیہ کا ناجائز مصرف، یہ تمام مناظر روزانہ، ہرنام سنگھ کی نگاہوں کے سامنے سے گذرتے۔ اُس کے باپ کی چوپال اور تھانہ کے در و دیوار میں صرف مٹی اور اینٹ پتھر کا فرق تھا، ورنہ دونوں عمارتوں کی بنیاد ایک ہی چٹان تھی۔ وہ چٹان جو بیکسوں کی آہوں، مظلوموں کی چیخوں اور مصیبت زدوں کے آنسوؤں کو جذب کر کے، اور زیادہ مضبوط اور ٹھوس ہو جاتی ہے

انگریزی اسکول میں پہنچ کر، ہرنام سنگھ کی نخوت کا نشہ اور زیادہ تیز ہو گیا۔ انگریزی گفتگو، سوٹ بوٹ، میز کرسیاں، بجلی کے پنکھے، تفریحی پروگرام، یہ تمام چیزیں مل جل کر اچھے خاصے انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہیں، اور ہرنام سنگھ میں تو پہلے ہی سے نخوت و غرور کی خو بُو سمائی ہوئی تھی، اس فضا میں پہنچ کر اُس کی فطرت کے جراثیم کی خوب پرورش ہونے لگی۔ وہ اسکول، جہاں کی دنیا صرف نصاب کی کتابوں تک محدود ہو۔ جہاں لڑکوں کو کلرک اور عہدیدار بنانے کیلئے تعلیم دی جاتی ہو، جہاں کی کوششوں کا ماحصل امتحان کے پرچوں میں اتفاقیہ کامیابی ہو، اور اسکول کا وقت ختم ہو جانے کے بعد، استاد اور طالب علم ایک ہی صوفے پر بیٹھ کر سینما کے ہوس انگیز فلم دیکھ سکتے ہوں۔ وہاں طلبہ کے دل و دماغ کی تربیت، اور اُن کے کردار کی بہتری اور بلندی کی کیا امید کی جا سکتی تھی۔ ہرنام سنگھ تو اسکول کے آوارہ لڑکوں کا لیڈر بن گیا۔ شہر میں کوئی تھیٹریکل کمپنی آتی، تو اُس کے پنڈال میں داخلہ کیلئے مدرسہ کے طلباء کے واسطے رعایتی ٹکٹ حاصل کرنا، کمپنی کے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو اسکول کی طرف سے دعوت دلا کر، ان کے کمالات کا مظاہرہ کرانا، طلبا کیلئے تفریحی پروگرام مرتب کرنا، یہ سب اہم فرائض ہرنام سنگھ سے متعلق تھے، اور ان کاموں میں ہرنام بیحد دلچسپی لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسکول میں بہت زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز تھا اور اسکول کے ماسٹر پیش گوئی کیا کرتے تھے کہ ہرنام بہت زیادہ ذہین اور تیز ہوگا اور اس کا مستقبل بہت زیادہ شاندار ہے۔

ہرنام کے کردار پر کوئی نگرانی کرنے والا نہ تھا۔ اُس کے چچا پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی تھی، مگر اُس کو اوّل تو اپنے کاموں سے ہی فرصت نہ تھی۔ دوسرے اُس کی نگاہ میں انسان کے کردار کا صرف یہی معیار تھا، کہ ایک آدمی کسی نہ کسی طریقہ سے زیادہ سے زیادہ روپیہ کما کر، بہتر سے بہتر طور پر زندگی بسر کر سکے۔ ہرنام تنومند جوان تھا، خوب بن ٹھن کر رہتا تھا۔ انگریزی بول چال اور بیٹھنے اُٹھنے کے آداب سے واقف تھا، آجکل کی سوسائٹی کو ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ اور اس ظاہر پرست دنیا میں ایسے ہی آدمی کو "مہذب" اور "کلچرڈ" کہا جاتا ہے۔ ہرنام کا چچا بھی خوش تھا کہ اس کا بھتیجا، آہستہ آہستہ "سوشل" بن رہا ہے، اور شہر کے معزز لوگوں میں اس کو ہر دلعزیزی حاصل ہو رہی ہے۔ اُس کے کان تک ہرنام کی بداخلاقی کی بعض اطلاعیں پہنچی تھیں، مگر وہ خود ان ہی لعنتوں میں گرفتار تھا، ایسی اطلاعیں اُس کے نزدیک اہم لائق توجہ اور غیر متوقع نہ تھیں، اس نے کئی بار لوگوں سے کہا کہ:

"جوان آدمی کو ذرا رنگین بھی ہونا ہی چاہئے۔"

اسکول کے چپراسی کی نوجوان بہو، اچھی خاصی تندرست تھی، برسات کی رات کو وہ مردہ پائی گئی، یہ موت بہت ہی پُراسرار تھی، اسکول میں مشہور ہو گیا کہ اس میں ہرنام کی پارٹی کا ہاتھ ہے۔ واقعات خواہ کچھ ہی ہوں، مگر اسکول کے ذمہ دار عہدیداروں نے اسکول کی بدنامی کے خوف سے اس معاملہ کو دبا دیا۔ اور اس حسرتناک موت پر اسرار کا پردہ پڑا رہا۔

ہرنام کے پاس روپیہ کی کمی نہ تھی، اُس کا باپ کافی روپیہ بھیجتا تھا۔ اور پھر اُس کا تھانیدار چچا جس کے یہاں سچ مچ دھن برستا تھا، بھتیجے کی ہر ضرورت پوری کرنے کے لئے تیار تھا۔ اسکول کے ماسٹروں اور لڑکوں کو رام کرنے کیلئے ہرنام ہفتہ میں ایک آدھ پارٹی ضرور دیا کرتا تھا اور اس طرح پورا اسکول اُس کی مٹھی میں تھا۔ کون نہیں جانتا کہ "حق نمک خواری" کا "پاس" کس کس طرح زبانوں کو گنگ بنا دیتا ہے اور لوگ کیسی کیسی چشم پوشیاں کر جاتے ہیں۔ اس پاپ بھری دنیا اور مکار سنسار میں وسیع دستر خوان والوں کے گناہوں کی وسعت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ بڑے لوگ مال و زر لٹاتے ہی اس لئے ہیں کہ اُن کے گناہوں پر پردہ پڑا رہے اور بڑے بڑے نیک لوگ، اس خیال سے کہ اپنے محسن کی بُرائی کر کے "محسن کشی" کے مجرم نہ ہو جائیں۔ زبان سے ایک لفظ نہیں نکالتے اور اس طرح سیاہ کاریوں پر پردے پڑتے جاتے ہیں، اور مالداروں اور امیروں کی اچھائیاں منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں۔ ہرنام کی بدعنوانیوں پر بھی اسکول میں کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ اور وہ من مانی کارروائیاں کرتا رہا۔

امتحان کے بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ اپنے گاؤں گیا اور وہاں پہنچ کر اُس نے ایک رنگین ماحول پیدا کر [illegible]

کوشش کی۔ مگر یہ شہر نہیں، گاؤں تھا۔ جہاں کے رہنے والے ننگ و ناموس پر اپنا سب کچھ لٹا سکتے ہیں۔ اُس کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں، اور ہر دشواری پر اُس کا کمینہ عزم زیادہ زیادہ مضبوط ہوتا گیا۔ وہ باپ کے رعب، دولت اور اپنی جوانی اور مغرب زدہ زندگی کے سہارے، گاؤں کی معدوم فضا کو شہر کا "کلب گھر" بنانا چاہتا تھا۔ مگر گاؤں والے اس کیلئے تیار نہ تھے۔ مصیبتوں اور پریشانیوں کی آندھیوں میں بھی گاؤں والوں کی شرافت اور عزت کا فانوس روشن تھا۔ ہرنام کی ہوسناکیوں کی پھونکیں، اُس کو کیا بجھا سکتی تھیں!

ایک دن ہرنام ایکھ کے کھیت کے قریب، جو جنگل سے ملا ہوا تھا، ٹہل رہا تھا، وہاں سے ایک نوجوان لڑکی جو اپنے باپ کو روٹی دینے کیلئے جا رہی تھی گزری۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ سال کی ہوگی معمولی ناک نقشہ، سانولا رنگ، میانہ قد، مگر صحت اور شباب کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک قدم پر زمین کی چھاتی دہل جاتی تھی۔ وہ ایک غریب کسان کی لڑکی تھی، جس کا باپ چند بیگھے زمین کو الٹ پلٹ کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ لڑکی کے کپڑے بوسیدہ تھے۔ پیروں میں گلٹ کے موٹے موٹے کڑے پڑے ہوتے تھے، جو چلتے میں کبھی کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے، ماتھے پر سیندور کا ٹیکا، اور کانوں میں بالیوں کی بجائے نیم کی سنکیں! دُنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف، بھولی بھالی معصوم! گناہ کے تصوّر سے ناآشنا، تمام دنیا کو پاک سمجھنے والی! ہرنام نے اس موقعہ کو اپنے خیال میں یہ سمجھا کہ غیب سے اس کو یہ فرصت عطا کی گئی ہے۔ اُس نے لڑکی کو چھیڑنا شروع کیا۔ لڑکی جھجک کر رُک گئی، وہ بے بسی کے عالم میں رونے لگی، اُس کے آنسو، جن کی قیمت چاند، سورج بھی شاید نہیں ہو سکتے، اُس کے رخساروں سے ڈھلک کر چھُٹتے ہوئے کھیت کی مٹی پر گرنے لگے۔ ہرنام بہت خوش تھا، لڑکی نے ایکبار آسمان کی طرف دیکھ کر ——

"ہے! پرماتما"

کہا۔ کہ اتنے میں، اُس کے سامنے سے ہرن دوڑتے ہوئے نکلے شکاری ان ہرنوں کا تعاقب کر رہے تھے، شکاریوں نے دوڑتے ہوئے ہرنوں پر گولی چلا دی۔ اور ایک شکاری کی گولی ہرنام کے ٹھیک دل پر پڑی، ہرنام آہ کر کے زمین پر گرا۔ اور آن کی آن میں ٹھنڈا ہو گیا۔ شکاریوں نے آکر اُسے اٹھایا، مگر وہ ختم ہو چکا تھا۔ لڑکی اُس کی لاش پر ایک نظر ڈالتی ہوئی، اپنے بھوکے باپ کو روٹی دینے کے لئے چلی گئی۔

ماہر القادری

غزل

تقدیر ہر آغاز کا انجام ہے شاید
مجبوریٔ تدبیر کا اک نام ہے شاید

درماندگیٔ راہ سے نیند آنے لگی ہے
اے میری غریب الوطنی شام ہے شاید

اے طائرِ آزاد یہ بے بال و پری کیا
ہاں کنجِ قفس میں تجھے آرام ہے شاید

دُنیا تہ و بالا ہوئی جاتی ہے تو یونہی
دُزدیدہ نگاہی تری بدنام ہے شاید

اب تک جو یہ محروم ہے ساقی کے کرم سے
یہ رند تہی جام خم آشام ہے شاید

اک کیفِ دل آویز ہے کہتے ہیں جسے شعر
ہو درد سے لبریز تو الہام ہے شاید

ساقی نگہہ فیض کا اک دور ادھر بھی
میخانہ میں ناظر بھی تہی جام ہے شاید

ناظر الدین ناظر

ناطقِ فلم

ناطق فلم دورِ جدید کی ایک ایسی ایجاد ہے جس سے ہر کہ و مہ محظوظ ہوتا ہے - اس ایجاد کو سمجھنا، یعنی ان تمام برقی آلوں اور مشینوں کے عمل سے واقفیت حاصل کرنا جن کی بدولت اسٹوڈیو میں فلم لیجاتی ہے اور پھر سینما گھر میں پیش کی جاتی ہے اگرچہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں، تاہم جن اصولوں پر یہ دونوں عمل مبنی ہیں، وہ عام طور پر شاید بالکل نا قابلِ فہم اور غیر دلچسپ ثابت نہ ہوں گے - پردۂ سیمیں پر آرٹ کے ایک جیتے جاگتے شاہکار کے مشاہدے سے دل اور دماغ دونوں مسحور ہوتے ہیں دل زیادہ اور دماغ کم ــــ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ آلوں اور مشینوں کے اجزا اور پرزوں کی حرکت اور عمل کے مطالعہ سے جن کی بدولت یہ شاہکار چلنے پھرنے اور بولنے کی قابلیت حاصل کرتا ہے، کم از کم دماغ ہی لطف اندوز نہ ہو سکے

ناطق فلم کے ایک ٹکڑے کو لیا جائے تو اس پر تصاویر کا ایک تواتر اور کنارے پر لکیروں کی ایک لیک نظر آتی ہے، جیسا کہ شکل (۱) سے ظاہر ہے - یہ لیک آواز سے تعلق رکھتی ہے - اور تصاویر مناظر اور اداکاری سے - اب اوّل ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مناظر اور اداکاروں کی حرکات و سکنات کس طرح فلم بند کی جاتی ہیں - اس مقصد کیلئے خاص قسم کے عکاسی کے کیمرے استعمال کئے جاتے ہیں - جو مختلف پرزوں پر مشتمل ہوتے ہیں - ان کیمروں کی ساخت خصوصاً ناطق فلموں کے سلسلے میں بہت پیچیدہ ہوتی ہے، لیکن ان کے میکانی جزئیات سے ہمیں یہاں کوئی بحث نہیں - عام حیثیت سے ہر کیمرہ پر ایک زبردست عدسہ[1] موجود ہوتا ہے جس کے پیچھے عکاسی کی کم عرض، اور طویل منفی[2] فلم ایک مشین کی مدد سے مستقل رفتار سے گزاری جاتی ہے فلم اور عدسہ کے درمیان ایک جھلملی[3] عمل کرتی ہے جو فلم پر عدسہ کی روشنی کو کھولتی اور بند کرتی ہے -



صوتی لیک

جو متغیر کثافت کی لکیروں پر مشتمل ہے -

شکل (۱)
ناطق فلم کا ایک ٹکڑا

یہ عمل مشین کی بدولت مستقل طور پر ایک خاص رفتار سے انجام دیا جاتا ہے - بظاہر تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلم کیمرے کے اندر مسلسل طور پر چل رہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جھٹکوں سے حرکت کرتی جاتی ہے - جونہی جھلملی کھلتی ہے، فلم ایک چھوٹے سے وقفہ (ثانیہ کے ایک چھوٹے سے جزو) کیلئے ساکن ہو جاتی ہے، اور اس دوران میں فلم پر منظر کی تصویر اتر جاتی ہے - اس کے فوراً ہی بعد فلم اور عدسہ کے درمیان جھلملی حائل ہو جاتی ہے اور اس کے دوبارہ کھلنے تک فلم تصویر لئے بغیر ہی گذر جاتی ہے - اس طرح فلم پر فی دقیقہ (منٹ) کوئی نوّد (۹۰) تصاویر یکے بعد دیگرے اتاری جاتی ہیں، اور بعد میں اس منفی فلم سے جتنی مثبت فلمیں درکار ہوں، خاص طریقوں سے طبع کر

---

[3] SHUTTER

[1] LENS [2] NEGATIVE FILM.

لی جاتی ہیں۔ سینما گھر میں جب مثبت فلم تظلیلی لالٹین[1] میں جھٹکوں سے گزاری جاتی ہے۔ اور لالٹین کے فلم اور عدسہ کے درمیان جھلملی سے اسی طرح عمل کیا جاتا ہے، جس طرح کہ اسٹوڈیو کے عکاسی کے کیمرے میں کیا گیا تھا تو پردے پر تصاویر یکے بعد دیگرے اس تیزی سے آتی جاتی ہیں کہ ہماری آنکھیں ان ساکن تصاویر کے تواتر کو محسوس نہیں کر سکتیں، اور ناظر کی ہمیں ایک ایسی تصویر نظر آتی ہے جس میں مسلسل حرکت پائی جاتی ہے۔

فلم بندی کا جو طریقہ اوپر بیان کیا گیا ہے، وہ خاموش فلموں کے سلسلے میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ جو فی زمانہ مفقود ہیں۔ ناطق فلم جو دراصل تصویر اور آواز کی ایک ہم آہنگ ترکیب ہے، اپنے تصویری حصہ کی فلم بندی کیلئے اسی طریقہ کی محتاج ہے۔ اس فلم میں صدا بندی مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے، اور تمام طریقوں میں ایک مشترکہ امر یہ ہے کہ اخیر میں تصویری اور صوتی حصہ کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ سینما گھر میں فلم کے پیش کئے جانے پر آواز اور آواز کے متعلق اداکار کی حرکت . . .

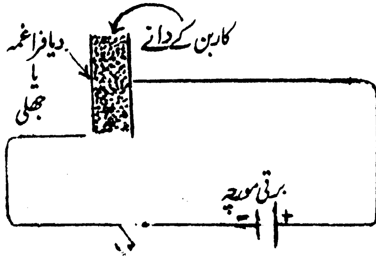
. . . .

. . . .

ایک دوسرے سے آگے یا پیچھے نہ ہونے پائے۔ اس نہج پر ناطق فلم کی تیاری کی پہلی کوشش سنہ ۱۸۷۸ء میں ایک سائنسدان "تھورپ[2]" نے کی۔ اس نے فی ثانیہ چار کے تواتر سے عکسی تصاویر میں اور صدا بندی کے لئے فونوگراف کا استعمال کیا۔ عکسی تصاویر کو کاغذ کے ایک طویل پٹے پر چسپاں کر کے پٹے کو چلایا جاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی فونوگراف بجایا جاتا تھا۔

اس کے بعد ہی "فرٹس[3]" نے صدا بندی کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا۔ جس کی بدولت عکاسی کی ایک پٹی[4] پر آواز نقش کر لی جاتی تھی۔ آگے چل کر "اڈیسن[5]" نے تظلیلی لالٹین اور فونوگراف کی مدد سے جو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے چلائے جاتے تھے، تھوڑی بہت کامیابی کے ساتھ ایک ناطق فلم پیش کی۔ لیکن ان سب سے اہم تر طریقہ سنہ ۱۹۰۴ء میں "لاسٹ[6]" نے دریافت کر لیا تھا۔ جس کی بنا پر صدا بندی کے ایک جدید طریقہ کی داغ بیل پڑی جو متغیر رقبہ[7] کا طریق کہلاتا ہے۔

متغیر رقبہ کے طریق کا اصول یہ ہے کہ اسٹوڈیو میں اداکاروں کی آواز کے زیر و بم کو اوّل ایک مائیکروفون کی مدد سے برقی تہیجات[8] میں تبدیل کر لیا جاتا ہے۔ شکل (۲) میں مائیکروفون کا ایک دور[9] دکھایا گیا ہے جس کے ہارن[10] کے اندر ابرق یا کسی موزوں دھات کا دیافراغمہ[11] یا جھلی نظر آتی ہے، اور جھلی کے پیچھے کاربن کے دانے پیک کئے گئے ہیں۔ برقی مورچوں[12] کی بدولت معمولی حالتوں میں ایک مستقل رَو[13] اس دور میں موجود رہتی ہے۔ لیکن جب اداکاروں کی آواز کے زیر و بم سے مائیکروفون کی جھلی دبتی اور چھوٹتی ہے تو جھلی کے دبنے سے کاربن کے دانے ایک دوسرے پر دبتے ہیں جس کی وجہ سے دور کا تعرض[14] گھٹ جاتا ہے۔ لہذا رَو بڑھ جاتی ہے، اور جھلی کے چھٹنے پر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس طرح آواز کے اتار چڑھاؤ کے مطابق دور میں رَو بڑھتی اور گھٹتی ہے ــــــ آواز کا چڑھاؤ جتنا زیادہ ہو، اسی قدر



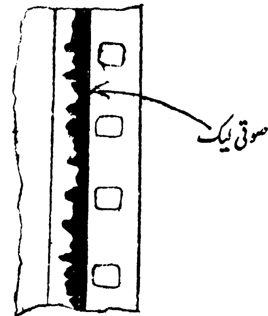
شکل (۲)

رَو بڑھ جاتی ہے۔ اور اتار جس قدر زیادہ ہو، اسی طرح کم ہو جاتی ہے رَو کے یہ تہیجات جو آواز کے زیر و بم کا استفسار کرتے ہیں، مائیکروفون

---

[1] PROJECTING LANTERN [2] THORPE.
[3] FRITTS. [4] PHOTOGRAPHIC BAND
[5] EDISON.
[6] LAUSTE [7] VARIABLE AREA METHOD.
[8] ELECTRICAL IMPULSES [9] CIRCUIT.
[10] HORN [11] DIAPHRAGM
[12] ELECTRIC BATTERIES.
[13] CONSTANT CURRENT. [14] RESISTANCE.

کے دور سے مکبّروں[1] کو منتقل کئے جاتے ہیں - جہاں ان کی تکبیر کی جاتی ہے - ان تکبیر یافتہ تہیجات کی مدد سے ایک چھوٹے سے آئینہ کو مرتعش کیا جاتا ہے جو دو مقناطیسی قطبوں کے درمیان سلیکان برانز[2] کی ایک تار سے لگا ہوتا ہے - اس ارتعاش کن آئینہ سے روشنی کی شعاعیں ایک تنگ شگاف کے ذریعہ سے فلم کی صوتی لیک[3] پر منعکس کی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لیک پر متغیر رقبوں کے ارتسامات نقش ہو جاتے ہیں جو شکل (۳) میں دکھائے گئے ہیں - چونکہ ان نقوش کا رقبہ آئینہ کے ارتعاشات کے مطابق

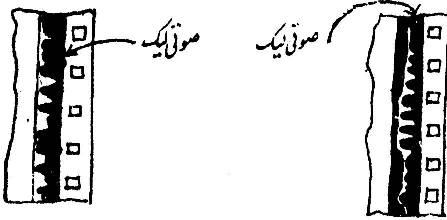


شکل (۳)

صوتی لیک جس پر متغیر رقبہ کے نقوش دکھائے گئے ہیں

بڑھتا گھٹتا ہے اور آئینہ کے ارتعاشات مائیکروفون کے دور کی رَو کے اتار چڑھاؤ پر منحصر ہوتے ہیں اور رَو کا یہ تغیر آواز کے زیر و بم پر مبنی ہوتا ہے، لہذا یہ نقوش آواز کا استحضار کرتے ہیں اور فلم پر بمنزلہ آواز کی تصویر کے ہیں - "آر - سی - اے[4] - فوٹوفون" کا صدا نگار آلہ اسی اصول پر صدا بندی کی تکمیل کرتا ہے - اس طریقہ سے جو صوتی لیک حاصل ہوتی ہے، اس میں پس منظر[5] کی غیر ضروری آوازیں بھی مضمر ہوتی ہیں - جن سے رہائی حاصل کرنے کیلئے لیک

کے صاف حصوں کو ایک خاص طریقہ سے یا تو اُڑا دیا جاتا ہے یا سیاہ کر دیا جاتا ہے -



شکل (۴)

صوتی لیک سے پس منظر کی آوازوں کو معدوم کرنے کا طریقہ دکھایا گیا ہے

صدا بندی کا ایک اور مشہور طریقہ متغیر کثافت[1] کا طریق کہلاتا ہے - جس میں فلم کی صوتی لیک پر آواز کے زیر و بم پر مبنی متغیر کثافت کی باریک لکیریں پیدا کی جاتی ہیں - اس ضمن میں مائیکروفون کے برقی تہیجات کو مکبّروں کی مدد سے تکبیر دینے کے بعد روشنی کی ایک جھلملی[2] پر منطبق کیا جاتا ہے - جو تہیجات کی قوت کے مطابق کھلتی بند ہوتی ہے - چنانچہ روشنی کے شگاف سے شعاعوں کا ایک متغیر مجموعہ نکلتا ہے جس کے تغیرات برقی تہیجات کے موافق ہوتے ہیں - روشنی کے اس مجموعہ کو فلم کی صوتی لیک پر ڈالا جاتا ہے، اور جب فلم دُھل کر تیار ہوتی ہے تو لیک پر متغیر کثافت کی باریک لکیریں ظاہر ہوتی ہیں - جن کی کثافت آواز کے اتار چڑھاؤ پر مبنی ہوتی ہے - "ویسٹرن الیکٹرک[3]" کا صدا نگار آلہ اسی طریقہ پر متغیر کثافت کی لکیریں پیدا کرتا ہے - جو شکل (۱) میں دکھائی گئی ہیں - اس قسم کی صوتی لیک تاباں لیمپ[4] کے استعمال سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے - جو "فاکس فلم کارپوریشن[5]" کا طریقہ ہے - اس سلسلے میں مائیکروفون کے تہیجات کو تکبیر دینے کے بعد ایک تاباں لیمپ پر منطبق کیا جاتا ہے جس کی روشنی برقی

---

۱ AMPLIFIERS ۲ SILICON BRONZE.
۳ SOUND TRACK. ۴ R.C.A. PHOTOPHONE
۵ BACKGROUND NOISE.

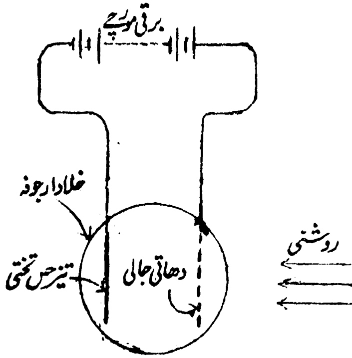
۱ VARIABLE DENSITY METHOD.
۲ LIGHT GATE ۳ WESTERN ELECTRIC.
۴ GLOW LAMP
۵ FOX FILMS CORPORATION.

تہیجات کے ساتھ بڑھتی گھٹتی ہے۔ اس متغیر روشنی کو مندرجہ بالا طریقہ سے صوتی لیک پر ڈالا جاتا ہے۔

ناطق فلموں میں صدا بندی کیلئے گراموفون کے ریکارڈ بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ریکارڈ موم سے بنائے جاتے ہیں۔ اور ان کا قطر عموماً ۱۷ انچ اور موٹائی ایک انچ ہوتی ہے۔ ریکارڈوں پر آواز کی لکیریں برقی میکانی[1] طریقہ سے (جو گراموفون ریکارڈنگ میں استعمال ہوتا ہے) مرکز سے باہر کی جانب کاٹی جاتی ہیں اور ریکارڈ کی رفتار فی دقیقہ ۳۳ ۱/۳ چکر ہوتی ہے۔

صدا بندی کے تمام طریقوں میں اس امر کی احتیاط کی جاتی ہے کہ تصویر اور آواز میں کامل ہم آہنگی رہے۔ اس لئے فلم اور صوتی لیک کو چلانے والی برقی موٹروں کو خاص طریقوں سے بالکل ہم قدم اور ہم آہنگ رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے اُن کی رفتار ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ مناظر کی عکاسی اور صدا بندی شروع کرنے سے قبل فلم اور لیک دونوں پر نشان لگا دئے جاتے ہیں، تاکہ بعد میں دونوں کو جوڑنے میں آسانی ہو اور دونوں میں کامل مطابقت پائی جائے۔

یہاں تک فلم کی عکاسی اور صدا نگاری کے بعض اہم طریقوں کے متعلق بحث ہوئی۔ جب تصویر اور آواز کی منفی فلمیں تیار ہو جاتی ہیں اور دونوں کو جوڑ کر ایک دوسرے کے مطابق کر دیا جاتا ہے تو اس سے جتنی مثبت فلمیں ضروری ہیں طبع کر لی جاتی ہیں اور انہیں سینما گھروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ سینما گھر میں کس طرح اس فلم سے متحرک اور ناطق تصاویر پیش کی جاتی ہیں۔ یہاں یہ فلم جیسا کہ آگے بھی ذکر ہو چکا ہے تظلیلی لالٹین کے عدسہ اور چراغ کے درمیان جھٹکوں سے گذاری جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی عدسہ اور فلم کے درمیان جھلملی عمل کرتی ہے۔ جو عدسہ پر فلم کی روشنی کو بند کرتی کھولتی ہے۔ لالٹین میں یہ تمام عمل اسی طرح انجام دئے جاتے ہیں، جس طرح کہ عکاسی کے کیمرے میں فلم لینے وقت ان کی تکمیل کی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سینما گھر کے پردے پر یکے بعد دیگرے تصاویر اس تیزی سے آتی جاتی ہیں کہ ہمیں تسلسل کا دھوکا ہوتا ہے اور مناظر اور اداکار حرکت کرتے اور بولتے نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ صوتی لیک پر شعاعوں کا ایک مجموعہ ڈالا جاتا ہے اور لیک کی متغیر کثافت کی لکیروں یا متغیر رقبوں کے نقوش کی وجہ سے لیک سے متغیر روشنی نکلتی ہے۔ جو ایک برقی[1] ضیائی خانہ پر مرتکز کی جاتی ہے۔ یہ خانہ ایک خلادار جوفہ[2]، ایک تیز حس[3] تختی اور ایک دھاتی[4] جالی پر مشتمل ہے۔ تیز حس تختی چاندی



شکل (۵)
ضیائی برقی خانہ

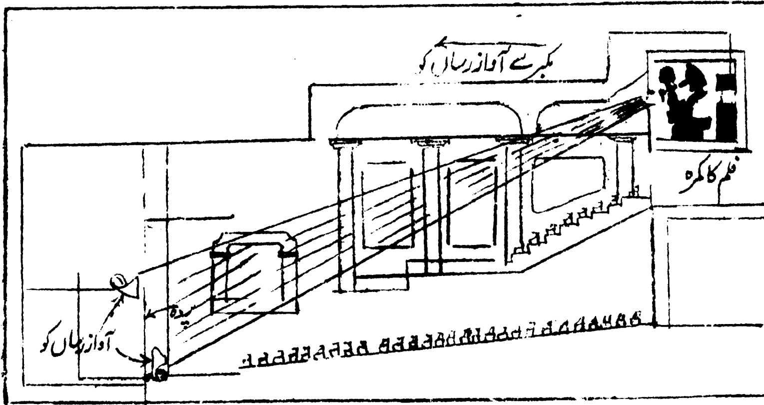
سے بنائی جاتی ہے جس کے ایک رُخ پر جہاں روشنی ڈالی جاتی ہے پوٹاشیم[5] کی ایک تہ چڑھا دی جاتی ہے۔ اس تختی کو برقی مورچہ کے منفی سے اور دھاتی جالی کو مثبت سے لگا یا دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے تختی پر برقیوں[6] کی توفیر ہو جاتی ہے اور وہ منفی طور[7] پر بار ہو جاتی ہیں۔ اور جالی پر برقیوں کی کمی ہو جاتی ہے اور وہ مثبت طور[8] پر بار ہو جاتی ہے۔ روشنی کی غیر موجودگی میں تختی اور جالی کے دور میں رَو معدوم ہوتی ہے، کیونکہ دونوں کے درمیان خلا بطور ایک حاجز[9] کے عمل کرتی ہے۔ لیکن جب تختی کے تیز حس رُخ پر روشنی کی شعاعوں کا مجموعہ ڈالا جاتا ہے تو تختی کے برقیوں میں ایک ہیجان رونما ہوتا ہے اور برقیوں کا اندفاع[10] شروع ہوتا ہے، اور اسی وقت جالی پر جہاں

ا؎ PHOTO-ELECTRIC CELL ۲؎ VACUUM BULB.
۳؎ SENSITIVE PLATE ۴؎ METALLIC GRID.
۵؎ POTASSIUM ۶؎ ELECTRONS
۷؎ NEGATIVELY CHARGED.
۸؎ POSITIVELY CHARGED ۹؎ INSULATOR
۱۰؎ REPULSION.

ا؎ ELECTRO-MECHANICAL.

برقیوں کا خسارہ رہتا ہے، تختی کے برقیوں کا انجذاب۱ شروع ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تختی سے جالی کی برقیوں کی ایک بوچھاڑ شروع ہوتی ہے، یا بالفاظ دیگر ضیائی برقی خانہ کے دور میں تختی سے جالی کی طرف، دونوں کے درمیان خلا کے ذریعہ ایک برقی رو بہتی ہے۔ اس رو کی قوت روشنی کی تیزی پر منحصر بلکہ تقریباً متناسب ہوتی ہے، روشنی جس طرح تیز ہوتی جاتی ہے، اسی طرح برقیوں کی بوچھاڑ اور لہٰذا رو بھی قوی ہوتی جاتی ہے اور جس طرح کم ہوتی ہے، معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ غرض صوتی لیک جس کے مقناطیسی میدان۵ میں لوہے کا ایک مقنا رو ک۴ رو کے تغیرات کے مطابق حرکت کرتا ہے۔ یہ حرکت ایک مخروط کے ذریعہ ہوا کو پہنچائی جاتی ہے جس کی وجہ سے آواز پیدا ہوتی ہے

اس سے قبل ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ صوتی لیک کے متغیر کثافت کی لکیریں یا متغیر رقبے کے نقوش کس طرح آواز کے زیر و بم کا استحفار کرتے ہیں۔ اب ان نقوش یا لکیروں کو آواز میں تبدیل کرنے کے طریقے پر دوبارہ ایک نظر ڈالی جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان نقوش پر روشنی کی شعاعوں کے انعکاس سے متغیر



شکل (۱۶)
سینما گھر کا خاکہ

متغیر روشنی کی جو شعاعیں ضیائی برقی خانہ پر ڈالی جاتی ہیں، ان کی بدولت خانہ کے دور میں متغیر رو کا ظہور ہوتا ہے۔ جس کا تغیر روشنی کے تغیر کے مطابق ہوتا ہے۔ رو کے ان تغیرات کو مکبر کی مدد سے تکبیر دیجاتی ہے اور پھر تاروں کے ذریعہ سینما کے پردے کے پیچھے آواز رساں۲ کو روانہ کیا جاتا ہے۔ جو انہیں دوبارہ آواز میں تبدیل کرتا ہے۔ آواز رساں کے عمل کا اصول یہ ہے کہ رو کے تکبیر یافتہ تغیرات سے ایک برقی مقناطیس۳ پر عمل کیا جاتا ہے

۱ ATTRACTION ۲ LOUD SPEAKER
۳ ELECTRO MAGNET.

روشنی حاصل کیجاتی ہے جس کا تغیر لکیروں کی کثافت یا نقوش کے رقبوں کے مطابق ہوتا ہے۔ پھر اس روشنی سے ضیائی برقی خانہ میں متغیر رو پیدا کی جاتی ہے جس کا تغیر روشنی کے مطابق ہوتا ہے اور یہاں سے اس متغیر رو کی بدولت آواز رساں کے مقنا رو ک کو حرکت دیجاتی ہے۔ جو رو کے تغیر کے مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ اس حرکت سے جو آواز پیدا ہوتی ہے، وہ اصلی آواز کا ٹھیک استحفار کرتی ہے، اور چونکہ آواز رساں سینما کے پردے کے پیچھے لگایا جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متحرک تصاویر بالکل زندہ انسانوں کی طرح بولتی اور گاتی ہیں۔

سید بشیر الدین احمد

۴ ARMATURE ۵ MAGNETIC FIELD

ابّا کہاں گئے؟

اماں! بتاؤ میرے ابّا کہاں چلے گئے اور وہ کب واپس آئیں گے۔ بڑے بھائی نے ان کا نام پتھر پر کیوں لکھوایا ہے۔ پھر اگر وہ مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں تو مجھے یہاں کیوں چھوڑ گئے؟ وہ تو ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ لیجاتے ہیں۔

تم کہتی ہو کہ وہ بیمار ہیں، علاج کیلئے حکیم کے ہاں گئے ہیں۔ جب اچھے ہو جائیں گے تو آئیں گے نا! ...... لیکن بیماری میں تو تم ان کو دوا پلایا کرتی تھیں اور ان کا سر دباتی تھیں اور مجھ سے کہتی تھیں کہ دعا کرو "اللہ میاں تمہارے ابّا کو اچھا کردیں۔" اب وہ حکیم کے ہاں ہیں تو وہاں کیوں نہیں چلتیں، مجھے بھی اپنے ساتھ لیچلو۔ تم انہیں دوا دینا۔ میں دعا کروں گا۔

تم ابّا کی تصویر دیکھ کر کیوں رویا کرتی ہو؟ میں نے دیکھا کل تم تو سو رہی تھیں اور تمہاری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ابّا کی تصویر تمہارے سینہ پر پڑی تھی، میری تصویر دیکھ کر تو تم خوب ہنستی ہو .... تم کیوں روتی ہو اور کیوں ہنستی ہو ...... لاؤ ابّا کی تصویر دو۔ دیکھوں مجھے بھی رونا آتا ہے یا نہیں؟

ابّا جب دفتر چلے جاتے تھے تو چھوٹی آپا وہ تصویروں والا قاعدہ مجھے پڑھاتی تھیں۔ اب آپا نے پڑھانا بھی چھوڑ دیا ہے اور میری تختی بھی نہیں دھوتیں۔ ابّا میرے لکھنے اور پڑھنے سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ آپا سے کئی بار کہا ہے کہ مجھے محبوب کے ساتھ دفتر بھیجدیں تو میں ابّا کو اپنا سبق سنا آؤں۔ لیکن وہ نہیں بھیجتیں۔ پوچھو تو کہتی ہیں۔ وہ وہاں نہیں ملیں گے۔ "ان کا کام ختم ہوگیا" اگر کام ختم ہوگیا ہے تو وہ کیوں نہیں آتے؟

کتنے دن ہوگئے میں کھیلنے بھی نہیں گیا، ابّا گیند بلا خوب کھلاتے تھے۔ اب باغ میں بھی کوئی نہیں لے جاتا، میں چاہتا ہوں کہ اپنی کیاری میں بونے کیلئے پھول توڑ کر لاؤں لیکن مالی مجھے دیکھیگا تو مارے گا۔ ابّا نے تو مالی کے خفا ہونے پر اس کو پیسے دے دئے تھے، کل محبوب سے کہا کہ دو پیسے میں مٹھائی اور پھل پھول کر لا دے تو نہ ہی گیا، ابّا تو ایسا نہ کرتے۔

اماں! اب تم میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کیوں نہیں کھاتیں۔ آپا سے کہہ دیتی ہو کہ یوسف کو کھلادو، وہ نہ تو خود کھاتی ہیں اور نہ مجھے اچھی طرح کھلاتی ہیں، کل ان سے کہا کہ ذرا میری ریشمی اچکن اور نیا جوتا نکال دو تو کہنے لگیں عید کے دن پہننا، مجھے بتاؤ کیا ابّا عید تک آجائیں گے اور میں اچکن اسی روز پہنوں، میں ضرور ان کے ساتھ جاؤں گا اور عیدی لے کر کھلونے بھی لاؤں گا۔ ہے نا اماں!

اماں! یہ تم کیا دعا مانگ رہی ہو؟ "الٰہی ان کو جنت میں بھیجدے۔" "کیا ابّا جنت میں جا کر اچھے ہو جائیں گے؟" "ہاں بیٹا! جنت بڑی اچھی جگہ ہے وہ وہاں بہت خوش ہوں گے، نہیں اماں! تم روؤ نہیں۔ میں نے رات خواب دیکھا ہے، ابّا جنت ہی میں گئے ہیں۔ آؤ چلو ہم بھی ان کے پاس چلیں! اٹھو! اٹھو بھی!!

سیّد یوسف بخاری دہلوی

اثر نے آہ میں ہر چند، نے تاثیر نالے میں
پر اتنا ہے کہ ان دونوں سے میرا دل بہلتا ہے

سودا

زندگی کا بیمہ

چند دن ہوئے ایک صاحب میری زندگی کا بیمہ کرنے کے ارادے سے میرے پاس تشریف لائے مجھے ان بیمہ ایجنٹوں سے سخت نفرت ہے کیونکہ وہ ہمیشہ میری موت کے جلد واقع ہو جانے کے متعلق ہی بحث کرتے ہیں حالانکہ میرا خیال ہے کہ میں اتنی جلدی نہیں مرونگا۔ کئی بار میری زندگی کا بیمہ کیا گیا مگر میری یا کمپنی کی بدقسمتی ہیں نے ایک مہینہ سے زیادہ کبھی فیس ادا نہیں کی اور پالسی ہمیشہ کالعدم ہو جاتی رہی۔

اب کے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بیمہ زندگی کا بیمہ کرانے سے انکار نہیں کرونگا بلکہ ایسے جوابات دونگا کہ ایجنٹ خود ہی کہدے کہ کمپنی تم ایسے شخص کا بیمہ نہیں کر سکتی۔ جب اس نے سلسلہ گفتگو شروع کیا تو میں اسے طرح دیتا رہا اور اس قدر حوصلہ دلایا کہ اسے یہ غلط فہمی ہو گئی کہ میں زندگی کا بیمہ کرانے کو آمادہ بیٹھا ہوں۔ وہ ایک درخواست کا فارم جس پر چند سوال تھے اور جن کا مجھے جواب دینا تھا میرے پاس چھوڑ گیا۔

سچ پوچھئے تو یہی میرا اصل مدعا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جوابات میں اس کی ایسی گت بناؤں کہ پھر میرے پاس آنے کا نام تک نہ لے۔ میں نے سوالات والا کاغذ اپنے سامنے رکھ لیا۔ اور ایسے جوابات تیار کئے جو ہمیشہ کیلئے یہ فیصلہ کر دیں کہ میرا بیمہ زندگی ناممکن ہے۔

سوال۔ عمر کیا ہے؟

جواب۔ یاد نہیں

سوال۔ چھاتی کتنی ہے؟

جواب انیس انچ

سوال۔ چھاتی کا پھیلاؤ کتنا ہے؟

جواب۔ آدھا انچ

سوال۔ قد کتنا ہے؟

جواب چھ فٹ پانچ انچ دفتر ٹھیک بالکل سیدھا کھڑا ہوں مگر چلتے وقت کچھ سکڑ جاتا ہے

سوال۔ کیا تمہارا دادا مر چکا ہے؟

جواب۔ تقریباً

سوال۔ اگر مر چکا ہے تو موت کی وجہ؟

جواب۔ اگر مر گیا ہے تو کثرت شراب نوشی

سوال۔ کیا باپ مر چکا ہے؟

جواب۔ دنیا کے لئے تو مر ہی چکا ہے

سوال۔ وجہ موت؟

جواب:۔ پانی کے استعمال سے نفرت

سوال۔ باپ کی جائے رہائش؟

جواب:۔ عدم آباد۔

سوال تمہیں کون کونسی بیماریاں لاحق ہیں؟

جواب بچپن میں تپدق اور گنٹھیا۔ جوانی میں سیاہ کھانسی۔ پیٹ درد۔ اور دماغ پر پانی کا دباؤ۔

سوال۔ کیا تمہارا کوئی اور بھائی بھی ہے؟

جواب۔ ۱۴ بھائی ہیں اور سب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔

سوال۔ کیا تمہیں کوئی ایسی عادت ہے جو عمر کو کم کر سکتی ہے؟

جواب۔ شراب اور تمباکو کا استعمال کرتا ہوں۔ افیون اور کوکین کھاتا ہوں ورزش سے نفرت ہے۔

ان جوابات کے بعد میں نے یقین کر لیا تھا کہ کمپنی والے میری زندگی کا بیمہ نہیں کرینگے اس لئے میں نے اپنی درخواست اور ایک چک دو تین ماہ کے پریمیم کے لئے کافی تھا، کمپنی کے دفتر میں بھیج دیا۔ مجھے یقین تھا کہ چک واپس آ جائیگا۔ مگر آج مجھے کمپنی کے دفتر سے یہ خط ملا تو میں حیران رہ گیا

جناب عالی

آپ کی درخواست اور تین روپیہ کا چک موصول ہوا۔ کافی غور کے بعد کمپنی نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ بطور ایک اول درجہ کے کیس کے آپ کا بیمہ کر لیا جاوے"

(پی کاک) محمد دین بی۔ اے

عربوں کا ذہنی ارتقاء

اسلام اور عیسائیت کی بڑی بڑی جنگوں سے پہلے عربی بولنے والی دنیا اُن علاقوں میں زیادہ سرعت کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ جہاں کسی زمانے میں اہل یونان کا بول بالا تھا۔اسی زمانہ میں عربوں کا دماغ شاعری اور مذہبی مباحث کی طرف بھی مائل ہوگیا تھا۔ قومی اور نسلی کامیابیوں کی تحریک نے ان کی ذہنی قوتوں کو ایک ایسے چراغ کی شکل میں منتقل کردیا۔جس سے ہرجگہ روشنی پھیل گئی۔یونان کے بعد یہ امتیاز عربوں کو حاصل ہوا کہ ان کی سرگرمیوں کی بدولت بنی نوع انسان میں علوم وفنون کی ترویج واشاعت کا پھر چرچا شروع ہوگیا۔اگر یونانی علوم وفنون کے باپ تھے۔ تو عربوں کی حیثیت بلاشبہ ایک پالنے والے باپ کی تھی۔نئی دنیا میں علم کی روشنی اور طاقت کے پھیلانے کا سہرا عربوں ہی کے سر ہے۔

لیکن جب ہم عربوں کی ذہنی ترقی کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔کہ اسلام کی عربی ثقافت کا عرب کی اصلی ثقافت سے وہی تعلق تھا جیسا کہ سکندر کے بعد یونانی ثقافت کا یونان کی یورپی ثقافت سے۔اسلام کی عربی ثقافت نسلی پہلو سے ناقص نہ تھی۔اس میں ایران اور مصر کی ثقافتوں کا عنصر بھی شامل ہوگیا اگرچہ مصر اور ایران کے لوگوں نے بڑی سرگرمی اور شوق سے عربی زبان سیکھنا شروع کردی۔لیکن عربی زبان سے مصری اور ایرانی ثقافت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔

عربوں کی ابتدائی فتوحات سے عربی ثقافت کا یونان کی ادبی روایات سے ایک گہرا تعلق پیدا ہوگیا۔اور یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ تعلق یونانی زبان کے ذریعہ سے نہیں بلکہ یونانی تصنیفات کے شامی ترجموں کی وساطت سے ہُوا۔ذہنی پہلو سے نسطوری عیسائیوں کا پایہ بازنطینی سلطنت کے درباری علما کے مقابلے میں زیادہ ارفع تھا۔اور مغرب کی لاطینی بولنے والی قوموں سے وہ زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ساسانی بادشاہوں کے آخری دور میں اُن سے رواداری کا برتاؤ کیا گیا۔اور گیارہویں صدی میں ترکوں کے عروج تک اسلام نے بھی اُن سے رواداری کا برتاؤ کیا۔ایرانی دنیا میں وہ ذہنی ترقی کے علم بردار تھے۔انہوں نے نہ صرف یونانیوں کے علم طب کی روایات کو برقرار رکھا بلکہ اس میں اپنی معلومات کا اضافہ بھی کیا۔خلفائے امیہ کی سلطنت میں طبیب زیادہ تر نسطوری عیسائی تھے۔اور اس میں شک نہیں کہ بہت سے نسطوری عیسائیوں نے اسلام قبول کرلیا۔مگر مذہب کی تبدیلی سے ان کے کام اور خیالات میں کوئی فرق نہ آیا۔انہوں نے یونانی زبان اور شامی ترجموں کے ذریعہ سے ارسطو کے فلسفہ کو برقرار رکھا۔ان کے پاس علم ریاضی کی بہت سی کتابیں تھیں۔سینٹ بینی ڈکٹ یا کاسی ڈورس کے علمی ذرائع بھی نسطوری عیسائیوں کی علمی معلومات اور ساز وسامان کے مقابلے میں حقیر اور بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔

جب عرب کے بادیہ نشین شاگردوں نے نسطوری استادوں کے سامنے زانوے ادب تہ کیا تو ان کے تازہ دماغ نے جو ہر شے کو حیرت و استعجاب سے دیکھنے اور اس کی ماہیت دریافت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ علوم وفنون کو ترقی دی۔ایران کئی صدیوں سے مذہبی سرگرمیوں میں منہمک تھا۔ان سرگرمیوں میں عربی جملے اور محاورے شامل ہو گئے۔ ایران کی مذہبی روایات میں عربی زبان کی اس شمولیت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسلام کے مذہبی حلقوں میں تفرقے شروع ہوگئے اور بے دینی پھیل گئی۔

لیکن صرف ایرانی ہی جو یونانی علوم وفنون کے ماہر تھے۔عربوں کے استاد نہیں تھے۔مشرق کے تمام متمول شہروں میں یہودی عالم اپنی تمام امتیازی ادبی روایات کے ساتھ پھیلے ہوئے تھے۔اس طور پر عربی دماغ اور یہودی دماغ میں اشتراک پیدا ہوگیا۔اور ان کی مشترکہ سرگرمیاں عوام کے لئے مفید ثابت ہوئیں۔یہودی عالموں نے اپنی معلومات سے عربی دماغ کو زیادہ جلا دی۔ زبان کے معاملے میں یہودیوں نے کبھی تعصب سے کام نہیں لیا۔اسلام سے ہزار سال قبل یہودی یونانی زبان بولتے تھے۔ مگر اسلام کی نئی دنیا میں وہ عربی بولتے اور لکھتے تھے۔مثلاً یہودیوں نے خلیفہ ماموں کے دور میں عربی زبان میں مذہبی مسائل پر بڑی بڑی کتابیں لکھیں۔حقیقت یہ ہے کہ عربی ثقافت میں یہودی ادب اور روایات

کی آمیزش اس قدر ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس ثقافت میں یہودی ثقافت کا خاتمہ اور عربی ثقافت کا آغاز کب شروع ہؤا۔

اس کے علاوہ خاص کر علم ریاضی میں علمی تحریک کا ایک تیسرا ماخذ بھی تھا۔ جس کی خوبیوں پر روشنی ڈالنا اس وقت مشکل ہے یہ ماخذ ہندوستان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عربوں کے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے دور میں عربوں کے ذہنی قوا کا سنسکرت کے ادب اور ہندوستان اور ایران کے علم طبیات سے ایک گہرا تعلق تھا۔

خلفائے امیّہ کے دور میں عربوں کی امتیازی سرگرمیوں کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔ اگرچہ سلاطین عباسیہ کے دور میں ان سرگرمیوں کا مظاہرہ اپنی پوری شان لئے ہوئے ہے تاریخ ہی سے تمام صحیح فلسفہ اور اعلیٰ پایہ کے ادب کی ابتدا ہوتی ہے اور یہی ان کی بنیاد ہے چوٹی کے پہلے عرب مصنفین مؤرخ زندگی کے سوانح نگار اور شاعر تھے۔ جب عوام میں تعلیم کا ذوق پیدا ہوگیا۔ تو عرب مصنفین نے لوگوں کی تفریح طبع کے لئے چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور افسانے لکھنے شروع کر دیئے جن میں رومانی عنصر شامل تھا۔ اسی سے عربوں میں ایک تعلیمی نظام اور تعلیمی لٹریچر کی ترقی کا دور شروع ہؤا نویں اور دسویں صدی تک اسلام میں ایسے لوگ موجود تھے۔ جنہوں نے عربی قواعد پر بڑی بڑی کتابیں لکھیں۔

مغرب سے تقریباً ایک صدی پہلے دنیائے اسلام کے اندر بصرہ کوفہ۔ بغداد۔ قاہرہ اور قرطبہ میں بے شمار مذہبی مدارس کی بنیادیں رکھی گئیں۔ اور کئی عظیم الشان یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ ان یونیورسٹیوں کی روشنی سے غیر مسلم دنیا بھی روشن تھی۔ اور ان میں مشرق سے لے کر مغرب تک کے طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان عظیم الشان درسگاہوں میں قرطبہ کی یونیورسٹی کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی جہاں بے شمار عیسائی طلبہ تعلیمی استفادہ حاصل کرتے رہے پیرس آکسفورڈ۔ شمالی اٹلی اور مغربی دنیا آج تک بھی قرطبہ کے بلند پایہ فلاسفر ابن رشد (۱۱۹۸ - ۱۱۲۶) کی غیر معمولی قابلیت کو مانتی چلی آرہی ہے۔ اس نے ارسطو کی تعلیم کو اس طریقہ سے پیش کیا کہ مذہب اور صحیح سائنس وہ بالکل الگ الگ چیزیں بن گئیں۔ اور اس طرح سائنس کی ترقی کے لئے وہ راہیں کھل گئیں جنہیں اسلام اور عیسائیت دونوں نے قانون الٰہی سمجھ کر بند کر رکھا تھا۔

ابن رشد کے علاوہ ہمیں اس تاریخ میں حکیم ابو سینا (۱۰۳۷-۹۸۰) کا نام بھی درخشاں نظر آتا ہے ابو سینا عربی دنیا کے دوسرے سربرآوردہ پیدا ہوئے۔

سکندریہ۔ بغداد۔ اور قاہرہ میں کتابیں نقل کرنے کا کام بڑی محنت اور کاوش سے ہونے لگا۔ اور ۹۷۰ء کے قریب قرطبہ میں ستائیس ایسے مدارس کھولے گئے۔ جن میں غریبوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔

"پیچھا اور شول کا قول ہے کہ عربوں نے علم حساب کی بنیاد یونانی حساب دانوں کے وضع کردہ اصولوں پر رکھی۔ مگر حساب کے عربی اعداد اور رقموں کے ماخذ پر آج تک کوئی روشنی نہیں ڈال سکا۔ تھیوڈلا اعظم کے زمانہ میں بوتھیس نے بعض ایسی علامات استعمال کیں جو ایک لحاظ سے ہمارے نو ہندسوں ہی کی طرح تھیں۔

گربرٹ کے ایک شاگرد نے بھی حساب کی انہیں علامات کا استعمال کیا جو اور زیادہ ہماری علامات سے ملتی جلتی تھیں۔ لیکن انیسویں صدی تک حساب میں صفر کا استعمال کہیں نہ ہوتا تھا۔ اور اسے ایجاد کرنے کا فخر ایک مسلمان ماہر ریاضی محمد ابن موسےٰ ہی کو ہؤا محمد ابن موسےٰ نے حساب میں سب سے پہلے عشاریہ اور اہمیت کے لحاظ سے ہندسوں کے لئے جگہیں مقرر کیں۔

جیومیٹری کے علم میں عربوں کی کوئی خاص ایزاد قابل ذکر نہیں۔ لیکن الجبرا تو قطعی طور پر اُن کی ایجاد ہے اس کے علاوہ علم مثلث کُروی (Spherical Trigonometry) عربوں نے ہی واضح طور پر پیش کیا اور اس میں جیب (Sine) مماس Tangent اور مماس اتمام Co-Tangent اُنہیں کی ایجاد کردہ چیزیں ہیں۔

فزکس (Physics) میں رقاص Pendulum عربوں نے ہی ایجاد کیا۔ اور مناظر (Optics) کے متعلق بھی فزکس اُنہیں کی مرہون احسان ہے۔

علم ہیئت (Astronomy) کی سائنس میں عربوں نے بہت ترقی کی۔ انہوں نے کئی رصدگاہیں Observatories ..... تعمیر کیں اور کئی ایسے آلاتِ فلکیہ بنائے جو آج کل بھی استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔ راہ آفتاب (Ecliptic) کے زاویوں اور حرکت وسطیہ اعتدالین Precession of Equinoxes کے حسابات کو صحیح طور پر پیش کیا۔

؎ جنرل ہسٹری آف یورپ۔

غرض عرب ایک غیر معمولی قابلیت کے ہیئت دان تھے۔

طب میں عربوں نے یونانی علم کو بہت وسعت دی۔ انہوں نے ...... (Physiology) اور (Hygiene) حفظان صحت کا بغور مطالعہ کیا۔ اور عملی طور پر ان کے اور ہمارے طریق علاج میں کوئی فرق نہ تھا۔ آجکل عربوں کے طریق علاج ہی کے اکثر اصولوں پر عمل ہو رہا ہے۔ عرب ڈاکٹروں نے بعض خطرناک اور مشکل آپریشن اس کامیابی کے ساتھ کئے کہ آج کل کے مشہور ماہر ڈاکٹروں سے بھی اس کامیابی کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اُس وقت جب یورپ میں دوائیوں کا استعمال مذہباً ممنوع تھا۔ اور مریضوں کا علاج صرف روحانی اور مذہبی پیشوا کرتے تھے۔ عربوں میں علم طب روز افزوں ترقی کر رہا تھا۔

عربوں نے کیمسٹری (Chemistry) کے لئے بھی بہت کچھ کیا۔ کیمسٹری کے کئی جوہر (Substances) مثلاً پوٹاش (Potash) شورہ کا تیزاب (Nitric acid) گندھک کا تیزاب (Sulphuric acid) دریافت کئے الکحل کا لفظ بھی عربی زبان ہی کا ہے۔

جہاں تک صناعت کا تعلق ہے عربوں کا درجہ اس فن میں بھی بہت بلند رہا اور اس سلسلہ میں اُنہوں نے دنیا کے سامنے اپنے کام کے ایسے مختلف اور مکمل نمونے پیش کئے۔ جو خوبصورتی کے لحاظ سے خود اپنی مثال تھے۔ سونے۔ چاندی۔ تانبے۔ کانسی اور لوہے کے کام میں عرب خصوصاً بہت ماہر رہے۔ اعلےٰ قسم کے کپڑے بننے میں عربوں کی برابری کوئی نہ کر سکا اُن کا شیشے اور برتنوں کا کام دنیا بھر میں مشہور تھا۔ وہ کاغذ بنانے اور رنگنے کے مختلف طریقوں سے خوب واقف تھے۔ یورپ میں ان کے چمڑہ کے کام کی بہت قدر قیمت تھی۔

وہ سائنس کے اصولوں پر زراعت کرتے تھے۔ اور عجیب بات ہے کہ اُس زمانہ میں بھی اُنہوں نے آبپاشی کے بہت سے بہتر طریقوں کو قابل عمل بنایا۔ زمین کی خوبیوں اور نقائص کو بہت جلد معلوم کر کے وہ زمین کی حالت کے مطابق ایسی فصل بوتے تھے جو خوب پھلتی پھولتی تھی۔ نئے نئے پھلوں اور پھولوں اور بیجوں کو دریافت کرنے کے لئے اُنہوں نے بہت محنت کی اور اُن کی زرعی تحقیقاتیں ہر لحاظ سے کامیاب ثابت ہوئیں۔ سائنس کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے عربوں نے زراعت پر نہایت مفید اور کارآمد کتابیں لکھیں۔ اور مغربی ممالک کو انہوں نے کئی نئے درختوں اور پودوں سے شناسا کیا۔

کاغذ بنا کر عربوں نے انسان پر جو احسان کیا وہ خاص طور پر قابل تعریف ہے۔ عربوں نے یہ کام چینیوں سے اس طرح سیکھا۔ کہ ۷۵۱ء میں چینیوں نے سمرقند کے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ لیکن فتح عربوں ہی کو ہوئی اُنہوں نے چینیوں کے کئی سپاہی قید کر لئے۔ اور اُن میں سے بعض سپاہی بڑا اچھا کاغذ بنانا جانتے تھے۔ بس اُنہیں سے یہ فن عربوں کے ہاتھ آیا۔ اور پھر بعد میں اہل یورپ نے جو کاغذ کے نام سے ناواقف تھے۔ عربوں ہی سے اس کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اُس وقت تک کتابیں کمائے ہوئے چمڑے پر لکھی جاتی تھیں۔ اور تعلیم و تعلم کے سلسلہ میں دنیا کچھ نہ کر سکتی تھی۔ لیکن بعد میں عربوں کی بدولت کئی جگہوں پر کاغذ بننے لگا۔ مراقش میں کاغذ کے عربی کارخانے بہت مشہور تھے۔

اوپر کا تمام مضمون پڑھ کر آخر میں آپ کو یہ معلوم کر کے ضرور حیرت ہوگی۔ کہ عربوں نے یہ تمام ترقیات اُس زمانہ میں کیں جب مسلمانوں کی سلطنتیں بن رہی تھیں۔ اور اُن کی اپنی دنیا میں امن و امان نہ تھا۔

کیول کرشن سوار ا۔ بی۔ اے

وہ لب میگوں جو یاد آئے مجھے مخمور رات
میں لبِ ساغر سے لب اپنا ملا کر رہ گیا

——— مخمور لکھنوی (مرحوم)

بھول کر بھی نہ کبھی عشق کا لوں گا پھر نام
آج اگر جان سے چھوڑے ہی تری یاد مجھے

——— امیر (رامپوری) مرحوم

خدا کسی کو کسی ساتھ آشنا نہ کرے
اگر کرے تو قیامت تلک جدا نہ کرے

——— لچھمی نرائن (اورنگ آبادی) مرحوم

بزمِ انتخاب

غالب کا ایک غیر معروف خط

اردو نثر کے ارتقا میں غالب کے خطوط کو ایک غیر فانی امتیاز حاصل ہے۔ لیکن غالب نے اپنے ابتدائی خطوط مذاقِ زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے مقفیٰ عبارت میں لکھے تھے اور بعد کے خطوط صاف اور رواں عبارت ہیں۔ اگرچہ وہی سیدھے سادے خطوط اردو نثر کے ارتقا میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ پھر بھی موازنے کیلئے مقفیٰ عبارت والے خطوط بھی زنجیر کی ایک ضروری کڑی ہیں۔ کیونکہ انہی سے ہم جان سکتے ہیں کہ غالب کا زمانہ ۔۔۔۔ اردو کے بدلتے ہوئے رجحانات کے آغاز کا زمانہ تھا۔ اس خط کیلئے ہم مالک رام صاحب کے ممنون ہیں۔ (ادبی دنیا)

(مرزا کی مندرجہ ذیل تحریر ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ یہ پہلی دفعہ دہلی سوسائٹی کے رسالہ مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی تھی اور دوسری دفعہ اب "ادبی دنیا" کے ذریعے مداحین غالب تک پہنچائی جا رہی ہے) مالک رام

حکام معدلت فرجام اور صاحبان والا مقام کی جناب میں اور حاضران انجمن اور دانندگان ہر علم و فن کی خدمت میں بلکہ جو شخص خدا پرست و حق شناس ہے۔ اُس سے یہ التماس ہے کہ یاد کرو ۱۸۵۷ء میں دلی کے رہنے والوں نے حاکموں پر شہر کا دروازہ بند کر دیا اور ایسے فرماں دہانِ دادگر سے لڑائی کا قصد کیا۔ میگزین کا دروازہ کھلوایا اور انہیں کی گولی بارود سے ان پر آگ کا مینہ برسایا۔ چار مہینے چار دن ظلم کی آنچ کی تیزی رہی۔ قلعہ اور شہر اور باہر خونریزی رہی۔ ناگاہ قہر الٰہی اس شدت سے نازل ہوا کہ ہر جاندار کو جلینا مشکل ہوا۔ قوم انگریز کو خدا نے فتح عنایت کی۔ انہوں نے سیاست کے بعد رعیت کی رعائت کی۔ ہر چند حکام کو عفو جرائم منظور رہا مگر قہر حاکم حقیقی بدستور رہا۔ نہ مکیں کا پتہ نہ مکاں کے آثار، نہ گلی کوچے نہ وہ بازار، مانا کہ شہر کی صورت اب اس سے بہتر ہے مگر وہ عمارت جس پر خدا کے قہر کی آندھی چلی تھی وہ کدھر ہے ؎

سپس ہر آئنہ شہرے جدید خواہد بود
نہ آنکہ شاہجہاں ساخت در زمان قدیم

رفع فتنہ و فساد، ظہور امن و داد مسلم، لیکن قہر الٰہی سے کچھ پیش نہیں جاتی۔ خلافِ تقدیر تدبیر بن نہیں آتی، تین برس برابر کال رہا۔ ہر شخص خستہ و بدحال رہا۔ آب و ہوا کی ناسازگاری طرح طرح کی مصیبت رنگ رنگ کی بیماری، کلیجوں کا تپ کی حرارت سے سُلگنا، گھروں میں جا بجا آگ کا لگنا، ہوا شرارہ ریز، خاک شعلہ انگیز دریا کو کنوئیں کا پانی زہراب مینہ کے پانی کی بوند گوہرِ نایاب، اساڑھ اور ساون برسات کے دو مہینے تمام ہوئے، ساون کے آخر اور بھادوں کے اول دو چار مینہ ہوئے جن میں پانی اسقدر برسا کہ زمینداروں نے حاصلِ فصلِ ربیع سے ہاتھ دھو لئے، بایان کار کا حال خدا جانے خلق اس کے اسرار کو کیا جانے، گرانی اور ارزانی ایک امر عام ہے مجھے خاص اپنے عرض مدعا سے کام ہے، بوڑھا ہوں، ناتواں ہوں، سچ اگر پوچھئے تو نیم جاں ہوں ؎

ضعف نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میں کہاں اور بزم نشینی کہاں، نظم و نثر میں وہ رنگینی کہاں۔ سرکار کی خدمت گزاری کا شائق ہوں، مگر اب صرف دو کام کے

لائق ہوں، اگرکسی امر میں بذریعہ خط مجھ سے کچھ پوچھا جائے تو وہ لکھ سکتا ہوں۔ جو میری رائے میں آئے، یا اگر تحریر نظم و نثر فارسی و اردو کا حکم ہو تو لکھ کر بھیج سکتا ہوں۔ آئندہ حکام کے پسند نہ ہو یا مقبول ہو جائے ۱۸۰۶ء سے جس کو آج ساٹھ برس ہوئے سرکار انگریزی کا نمکخوار ہوں۔ اور ۱۸۵۵ء یعنی دس برس شہنشاہ بحر و بر حضرت فلک رفعت ملکۂ معظمہ کا مدحت نگار ہوں، دو قصیدے[1] میرے ولایت پہنچ گئے ان میں سے ایک کی رسید کی اطلاع مجھ کو آگئی تیسرا قصیدہ میرے مسودات میں موجود ہے مطلع اس کا یہ ہے ؎ نامہ زد کشور بہ چو نامور آمد ؛ از افقِ نامہ آفتاب بر آمد

یہ قصیدہ اس کے سزاوار ہے کہ ایران بھیجا جائے اور وہاں کے شعرا سے داد مانگی جائے۔ اب میں جناب صاحب کمشنر بہادر اور مجموع صاحبان عالی شان کو سلام کرتا ہوں اور نگارش کو تمام کرتا ہوں۔

راقم:-
اسداللہ خاں شاعر - برادر زادہ نصراللہ بیگ خاں
رئیس سلونک وسلونسہ
مرقومہ:- ۱۱ ماہ اگست ۱۸۶۵ء

---

[1] پہلے قصیدے کا مطلع ہے ؎ نظم نخست زمزمۂ خونچکاں دہد ؛ کہ خوں طراز سر درق داستاں دہد
اور دوسرے قصیدے کا مطلع ہے ؎ در روزگارہا نتواند شمار یافت ؛ خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
یہ تینوں قصیدے کلیات میں شامل ہیں۔ پہلا ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا تھا اور دوسرا ۱۸۵۸ء میں۔ یہ دستنبو کے ساتھ بھی شامل ہے۔ ان دونوں قصیدوں کے متعلق مرزا کی اردو فارسی تحریروں میں اکثر جگہ اشارے ہیں۔ م۔ر

بارش کے بعد

بھونرے مستانہ وار پھولوں پہ گرے　　　ہو ہو کے بے قرار، پھولوں پہ گرے
چھیڑا جو صبا نے تھپکیاں دے دے کے　　　اُٹھ اُٹھ کے، بار بار، پھولوں پہ گرے

گلشن کی فضا میں تتلیاں تھرّائیں　　　یا باغ میں اُڑتی ہوئی پریاں آئیں
یا دست بہار نے تماشے کے لئے　　　پھولوں کی ہوا میں پتّیاں بکھرائیں

بکھرے ہوئے پھول ہیں خیابانوں میں　　　یا بادۂ مشک بو ہے پیمانوں میں
ہیرے برسا کے ابر بدمست گیا　　　اب پھول برس رہے ہیں بُستانوں میں

عباس بیگ محشر

(ادبی دنیا)

مزاج کا مطالعہ

اشخاص کے مزاج کی تین قسمیں ہوتی ہیں، ایک وہ جو اپنی طبیعت کی اندرونی کیفیات (Introvert -) کے مطالعہ کے عادی ہیں، دوسرے وہ جو صرف اپنی ظاہری کیفیات (Extravert) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تیسرے وہ جو اپنی دونوں کیفیتوں (Ambivert -) پر نظر رکھتے ہیں۔

اگر کوئی شخص دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی بجائے گھر میں بیٹھ کر دلچسپ کتابیں پڑھتا ہوا، اجنبیوں سے ملنے میں گھبراتا ہو، اپنے اوپر بیجا اعتراض سے کبیدہ خاطر ہوتا ہو، اپنے کپڑے اور ظاہری شکل کا زیادہ خیال رکھتا ہو، کسی اہم بات کا فیصلہ کرنے میں دوسروں کی رائے پسند نہ کرتا ہو، خاموشی سے سوچتے سوچتے مضمحل ہو جاتا ہو، کئی دوستوں کے بجائے صرف ایک مخلص دوست سے انس اور محبت رکھتا ہو، کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو اچھی طرح سوچتا ہو، کسی بات کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس کی اہمیت سے زیادہ اپنے اصول کو پیشِ نظر رکھتا ہو، تو اس کا مزاج اوّل الذکر قسم کا ہے، وہ فطری طور پر خاموش جفاکش، حساس اور عزلت پسند ہوتا ہے، وہ زیادہ تر خواب و خیال کی دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اس مزاج کے لوگ تصنیف و تالیف، تلاش و تحقیق، آرٹ اور ایجاد کے زیادہ دلدادہ ہوتے ہیں، لیکن اس قسم کا مزاج متوازن نہیں ہوتا ہے۔ اس میں توازن پیدا کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ایسے مزاج والے اشخاص کو جسمانی ورزش خوب کرنا چاہیئے۔ جسمانی ورزش کی تفریح میں ان کے دماغ کے رجحانات تخیل کی اونچی دنیا سے اتر کر ایک مناسب سطح پر آجاتے ہیں، ایسے مزاج کے لوگوں میں دماغی یکسوئی رہتی ہے۔ وہ اپنے ماحول سے دلچسپی پیدا کر کے اس ناخوشگوار پہلو کو دور کر سکتے ہیں۔ ان کے لئے دوستوں سے ملنا مصیبت میں ہمسایوں سے ہمدردی کرنا، مجلس مباحثہ و مناظرہ میں حصہ لینا مفید ہے۔ اس قسم کی باتوں سے اپنی ذات کے ضرورت سے زیادہ احساس کو کم کرنے کا موقع ملتا ہے جس سے اندرونی کیفیات کے مطالعہ کی شدت میں کمی ہوتی ہے۔

دوسری قسم کے مزاج کے وہ لوگ ہیں جن کو اپنے دوستوں سے اپنی زندگی کے واقعات اور تجربات بیان کرنے میں لطف آتا ہے۔ ان کو لوگوں کے سامنے اپنی رائے ظاہر کرنے میں جھجک نہیں ہوتی، نئے نئے لوگوں سے ملنے جلنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ اجنبیوں سے بھرے ہوئے کمرہ میں داخل ہونے میں حجاب نہیں کرتے، اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں متشدد ہوتے ہیں۔ کسی بات کا نفی میں جواب دینے میں نہیں گھبراتے، مواقع سے ہر قسم کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مباحثوں میں جلد مشتعل اور برافروختہ ہو جاتے ہیں، ان کے دوستوں کا حلقہ جتنا زیادہ وسیع ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ ان کو زندگی کا لطف ملتا ہے۔

ایسے لوگ فطرۃً ہمیشہ خوش رہتے ہیں، ان کو کوئی غم اور فکر نہیں ہوتا، عام طور سے وہ کھلاڑی، اداکار، تماشوں کے منتظم، اور میزبان بہترین ہوتے ہیں، لیکن ان کیلئے بھی چند نفسیاتی ہدایتیں ہیں، جن کے ذریعہ وہ اپنے مزاج کی اصلاح کر سکتے ہیں، عام طور سے ان کو اپنے مشاغل سے سطحی دلچسپی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اپنی تمام قوتوں کو معاشرتی زندہ دلی میں برباد کر دیتے ہیں جو صحیح نہیں ہے، انہیں اپنی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو مجتمع کرنا چاہئے تاکہ ان میں آزادی اور ذمہ داری کا احساس ہو اور جب وہ کسی کام کو شروع کریں تو اس کو آخر تک پہنچائیں، اور جس کام میں کامیابی کی امید نہ ہو اس کو ہاتھ نہ لگائیں۔ ان کے لئے کھانے پینے، بولنے چالنے اور معاشرت کی دوسری دلچسپیوں میں حصہ لیتے وقت ضبط اور احتیاط بھی ضروری ہے، تاکہ ان کی گفتگو سے کسی شخص کی ذات پر حرف گیری نہ ہو، اور ان کے کام سے ناخوشگوار صورتیں نہ پیدا ہو جائیں۔

تیسری قسم کے لوگوں کا مزاج بہت متوازن ہوتا ہے، یہ لوگ طبعاً نہ جنگجو ہوتے ہیں، اور نہ عزلت پسند، وہ زندگی کے تمام مسائل کی پیچیدگیوں کو آسانی سے سلجھا لیتے ہیں، ہر قسم کے لوگوں سے تعلقات قائم کر سکتے ہیں، ان کے کام میں دقت اور رکاوٹ کم پیدا ہوتی ہے، ایسے لوگ، استاذ، باپ، کپتان، اور تیماردار

کے فرائض نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیتے ہیں، مگر بعض اوقات ان کے مزاج کا رجحان مذکورہ بالا دو قسموں میں سے کسی ایک کی طرف ہو جاتا ہے، اس میلان کو روکنے کی آسان صورت یہ ہے کہ جب وہ اس قسم کا خطرہ محسوس کریں، تو ان کو فوراً کسی دلچسپ مشغلہ میں مصروف ہو جانا چاہیئے۔

"ص - ع" (معارف)

کانگریس کی "ہندوستانی زبان"

کانگریس کے صوبجات میں برسر اقتدار ہوتے ہی ان صوبجات میں کوشش ہو رہی ہے کہ تمام ہندوستان کی ایک مشترکہ ہندوستانی زبان" رائج کی جائے۔ اس "ہندوستانی زبان" پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے اس ہفتہ سری نگر میں ایک تقریر کی جس میں آپ نے فرمایا۔

"میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اور اگر مسلمان یہ دعویٰ کریں کہ اردو ان کی زبان ہے۔ تو میں اُن کا یہ دعوےٰ تسلیم نہیں کروں گا۔ کیونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں فرقوں نے ہی اردو زبان کی ترویج میں حصہ لیا ہے۔ "ہندوستانی زبان" کے الفاظ نے اس معاملے کے حل میں اور بھی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ درحقیقت ہندوستانی کوئی زبان نہیں ہے۔ تامل اور تلیگو کو بھی ہندوستانی زبان کہہ سکتے ہیں۔ اگر ہندوستانی کا مطلب اس زبان سے ہے جو دہلی میں پچاس سال پہلے تک بولی جاتی تھی۔ اور جو لکھنؤ میں اب بھی بولی جاتی ہے تو میں اُسے تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔ اردو زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو عربی، فارسی اور سنسکرت سے لئے گئے ہیں۔ لیکن اب ایسی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جس کی بنا پر اردو زبان کو فارسی، عربی اور سنسکرت کے ان الفاظ سے جو اس کا جزو اعظم بن گئے ہیں۔ محض اس وجہ سے محروم کر دیا جائے کہ ان الفاظ کا مادہ فارسی، عربی یا سنسکرت زبانوں کا ہے۔ اردو زبان میں فارسی، عربی اور سنسکرت کے مزید الفاظ شامل کرنا بھی غیر ضروری ہے۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اردو زبان ایک ایسا ترکہ ہے جو ہندوستانیوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ملا ہے۔ اگر مسلمان یہ دعویٰ کریں کہ اردو صرف مسلمانوں کی ہی زبان ہے۔ تو ہندوؤں کو ان کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ میں ایک ہندو ہوتے ہوئے بھی بلا پس و پیش یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہماری مادری زبان اردو ہے۔"

— زبان کو کسی ایک فرقہ یا مذہب سے وابستہ کرنا اس زبان کے ساتھ انتہائی ظلم ہے اور مسلمانوں اور ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ ہندی ہو یا اردو اس کے ساتھ نادان دوستی یا دشمنی کا ثبوت نہ دیں۔ ہمارے ملک میں دونوں زبانوں کو بولنے والے دونوں اقوام میں موجود ہیں۔ اور کسی فرقہ کا ایک زبان کو نقصان پہنچانا ملک کے لٹریچر کو نقصان پہنچانا ہے

کانگریس کی نئی "ہندوستانی زبان" کے متعلق تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ نئی شتر مرغی زبان اردو اور ہندی دونوں کو تباہ کرنے کا باعث ہوگی۔ اور جس صورت میں کہ ہندوستان کے اندر پنجابی۔ بنگالی۔ اڑیا۔ تلیگو اور دوسری سینکڑوں زبانیں موجود ہیں۔ ہندی اور اردو کو علیحدہ علیحدہ پوزیشن کیوں نہیں دی جاتی اور ان دونوں زبانوں کو تباہ کر کے ان کی قبروں پر اس نئی "ہندوستانی زبان" کی عمارت کو کیوں کھڑا کیا جا رہا ہے۔

(ریاست)

نئی کتابیں

محبت کا فسانہ:۔

از جناب لطیف الدین احمد اکبرآبادی۔ لکھائی چھپائی نفیس۔ جلد اور گرد پوش خوشنما۔ تقطیع متوسط۔ صفحات ۳۴۳۔ قیمت دو روپے۔ ناشر عظیم اطہر صاحب محلہ منٹولہ آگرہ۔

ہمیں یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوتی ہے کہ گذشتہ چند سال سے اردو ادب نے اپنے لئے ایک خاص رُخ چن لیا ہے۔ اسی دلچسپی اور کوشش کا نتیجہ ہے کہ ہمیں آجکل ایسے ہندوستانی افسانہ نویس اور مضمون نگار نظر آرہے ہیں۔ جن کے ادبی فن کا معیار مغرب کے بلند اصولوں پر بھی پورا اُترنے لگا ہے۔ اردو اب ہمیں نئے نئے خیالات اور محسوسات سے مالامال معلوم ہوتی ہے اور اس کے جدید رجحانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا کاروان ادب منزلِ مقصود کی طرف حوصلہ افزا پیش قدمی کر رہا ہے۔

اس کاروان ادب کے علمبرداروں میں مشہور افسانہ نگار جناب لطیف الدین احمد صاحب کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے اور آپ کے ادبی و علمی کارنامے صوری و معنوی خصوصیات کے لحاظ سے ہمارے ادب کیلئے باعثِ فخر سمجھے جاتے ہیں۔ اب آپ کی جدید تصنیف "محبت کا فسانہ" نے نفسیاتی افسانہ نگاری میں ایک اور قابلِ قدر اضافہ کر دیا ہے۔

"محبت کا فسانہ" کے ہیرو اور ہیروئن ایک انجینیر اور ان کی بیوی ہیں جن کا بیاہ ان رومان انگیز ملاقاتوں کے بعد ہوا ہے جنہیں بورژوا طبقہ ایک کامیاب شادی کے لئے ضروری نہیں بلکہ قطعاً لازمی قرار دیتا ہے۔ انجینیر صاحب اُن محنتی اور صحت مند لوگوں میں سے ہیں جو محض اپنی کوششوں کی وجہ سے دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اُن کی اعلےٰ تعلیم یافتہ بیوی جنہیں شادی کے بعد بیگم جمالی کہا جاتا ہے۔ خوبصورت ہیں، تندرست ہیں۔ شائستگی اور سلیقے ہوتے مذاق کے ساتھ انہیں ہر موضوع پر برمحل باتیں کرنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے۔

شادی کے بعد ہنی مون کشمیر کی روح افزا وادی میں منایا جاتا ہے۔ شروع شروع میں تو مسٹر جمالی اور بیگم جمالی کے تعلقات میں قدرتی طور پر پہلی سی ہم آہنگی قائم رہتی ہے۔ مگر بعد میں صرف ذہنی آزادی اور خود مختاری کی وجہ سے، ایک دوسرے کے متعلق اُن کے خیالات و تاثرات کچھ اس طرح بدلتے جاتے ہیں اور پھر یکدم ایسا پلٹا کھاتے ہیں کہ چاہ کا رشتہ ٹوٹنے تک نوبت آ پہنچتی ہے۔ اُدھر بیوی تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتی ہیں اور اُدھر شوہر بھی تعلیم میں اپنی جگہ کم نہیں۔ پھر حصول کامیابی کی ابتدائی تگ و دو نے شوہر کی طبیعت سے ملائمت بھی کم کر رکھی ہے۔ اس لئے بات کچھ اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔ کجا وہ پہلی باتیں اور کجا وہ وقت کہ مسٹر جمالی نہایت متانت سے کتاب لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور مسز جمالی الگ تنہائی میں وقت کو کوستی ہیں کہ کیوں نہیں کٹتا۔ بس لے دے کر گھر میں ایک کتا ہے۔ جس سے وہ کبھی کبھی باتیں کر لیتی ہیں۔

تعلقات بدگمانی اور بے التفاتی کے درمیان تمام منازل طے کر کے سرد مہری کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اگرچہ شوہر اور بیگم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ مگر ظاہر یوں ہوتا ہے کہ جان پہچان تو الگ رہی دونوں نے ایک دوسرے کو کہیں دیکھا تک نہیں۔

شوہر اور بیگم کی فطرت چونکہ دراصل بُری نہیں اور دونوں ایک دوسرے کے خیرخواہ ہیں۔ اس لئے حالات پھر کروٹ لے کر اپنی اصلی جگہ پر آجاتے ہیں۔ شوہر اور بیگم میں ہم آہنگی اور ذہنی مطابقت پیدا ہو کر رہتی ہے۔ اور دونوں اس ملاپ کے بعد ہمیشہ..... بہت خوش خوش رہتے ہیں۔ یہ ہے بہت مختصر سا خاکہ اس داستان کا جسے "محبت کا فسانہ" تین سو تینتالیس صفحوں میں نہایت دلآویزی سے سناتا ہے۔

محبت کے افسانہ کا ہر باب بجائے خود ایک افسانہ ہے۔ جس میں جگہ جگہ اخلاقی اور معاشرتی مسائل پر ایسی فاضلانہ مگر دلکش [illegible]

کی گئی ہے۔ کہ افسانویت میں کہیں بھی فرق نہیں آنے پاتا اور پھر ہر باب کے شروع اور آخر پر کوئی شعر یا قول سارے باب کا مفہوم اس خوبی سے ادا کر جاتا ہے کہ مصنف کے اس حسنِ انتخاب کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر کردار واحد متکلم میں بات کرتا ہے۔

ل۔ احمد ندرت خیال، ندرت بیان اور مرصع طرز نگارش کے لئے مشہور ہیں۔ "محبت کا افسانہ" بھی انہیں خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے۔ محبت کے افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اپنی اس رائے کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں کہ یہ "طویل افسانہ" ایک ایسا شاہکار ہے۔ جس کے فنی کمالات پر ہمارے افسانوں کی دنیا بجا طور پر نازاں رہے گی۔ ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز اور معاشری اخلاقی مسائل کے موضوع پر اردو میں اس سے بہتر کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری۔

چراغاں

از احسان دانش کتابت طباعت عمدہ قیمت ۸؍
ملنے کا پتہ مکتبہ دانش مزنگ لاہور

احسان دانش صحیح معنوں میں ایک مزدور شاعر ہے نام نہاد انقلابی شاعری آجکل فیشن میں داخل ہے خصوصاً نوجوان شعراء کے نزدیک کمال سخن یہی ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو اپنی نظموں میں کوسنے دئے جائیں۔ ترقی پسندی کا نقاب اوڑھا جائے آزاد روی کی ڈینگیں ماری جائیں۔ سرمایہ داری کی مذمت کی جائے اور اشتراکیت کا دم بھرا جائے لیکن ہمارے ان ترقی پسند شعراء کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خلوص کا عنصر یکسر مفقود ہوتا ہے موجِ حوادث کے تھپیڑے کھانا اور چیز ہے۔ اور منہ میں پائپ لئے ہوئے لب ساحل ٹہلنا اور چیز ہمارے نوجوان شاعروں کی اکثریت بلند طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور یہ لوگ نہ مزدور کے جذبات کی نمائندگی کی صحیح اہلیت رکھتے ہیں۔ نہ انہیں اس کا کوئی حق پہنچتا ہے،

احسان غالباً ہندوستان کا واحد شاعر ہے۔ جس نے وہ تمام مصائب برداشت کئے ہیں جو فلک نے مزدور خصوصاً ہندوستان کے مزدور کیلئے مخصوص کر رکھے ہیں۔ اس پر تمام وہ مظالم ڈھائے گئے ہیں جو اس ملک کے سرمایہ دارانہ سماجی نظام میں ایک غریب اور مفلوک الحال انسان پر توڑے جا سکتے ہیں۔ احسان کسی بادشاہ یا نواب کا درباری شاعر نہیں۔ بلکہ جو لوگ اسے جانتے ہیں۔ انہیں علم ہے۔ کہ وہ واقعی ہندوستان کے فاقہ کش اور بے نوا مزدوروں کا ترجمان ہے اس کی دردانگیز نظمیں اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہیں۔ اس کے کلام کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز اس کا خلوص ہے۔ احسان کی شاعری ریاکاری سے قطعاً ملوث نہیں ہونے پائی اور اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ پاکیزگی جذبات کے کمیاب جوہر کو محفوظ رکھا ہے۔

"چراغاں" احسان کے کلام کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے اس میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں۔ احسان کو سامراجی نظام حکومت اور سرمایہ دارانہ سماجی نظام کے ستم زدوں کے جذبات کی نقاشی میں محیر العقول کمال حاصل ہے۔ لیکن اس کی شاعری محض فریاد بن کر نہیں رہ جاتی۔ بلکہ ایک ایسی آگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو سامراج اور سماج۔ دونوں کو اپنے بے پناہ شعلوں کی لپیٹ میں لے آنا چاہتی ہے۔ اس کا کلام نالۂ محزوں نہیں بلکہ ایک نعرہ جنگ ہے جو زیر دستوں کو زبردستوں مظلوموں کو ظالموں اور ستم کشوں کو ستم کیشوں کے مقابلہ پر ڈٹ کر کھڑے ہو جانے کے لئے ابھارتا ہے،

احسان کا قلم جراح کے نشتر کی طرح بے رحم ہے۔ ہندوستان کے جسم قومیت کا سب سے گھناونا داغ ہمارے لیڈر ہیں۔ احسان کی نظم سیاہ پوش لیڈر، ان گندم نما جو فروش، رہنماؤں کے خلاف بغاوت کا اعلان ہے۔ یہ نظم اس قابل ہے کہ ہندوستان کے اکثر لیڈروں کو ان کی سالگرہ کے دن تحفے کے طور پر بھیجی جائے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

شہر کے مزدور طبقے میں جہاں ہر دل ہے صاف۔
ایک لیڈر ہے بعنوانِ بغاوت گرمِ لاف۔
ان غلاموں کے نگر میں جاہلوں کے دیس میں
فتنۂ محشر ہے۔ گویا آدمی کے بھیس میں
کارگاہ زہد سے بوئے ریا آتی ہوئی۔
رہنمائی ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہوئی
دیکھ لے ہندوستان مجھ فتنۂ جاں کی بات سن ؟
شاعرِ مزدور پامالِ جہاں کی بات سن،
یہ ہیں تیرے خضرِ ملت یہ ہیں تیرے سرپرست،
یہ ہیں تو جن کی زباں کی آڑ سے بھرتا ہے جست،
یہ ہیں تیری سرزمیں نازاں ہے جن کی ذات پر،

یہ ہیں جن کی مہر لگتی ہے - تیری آفات پر
یہ غریبوں کی تباہی کو سمجھتے ہیں بہار
شورشوں کی آگ بھڑکاتے ہیں یہ عصیاں شعار
ان کے سینوں میں دغا چھپ چھپ کے ہوتی ہے جواں
کور باطن ہی انہیں سمجھے گا اپنا پاسباں
دشمنِ انصاف ہیں یہ والۂ جام سبو
ان کے افسانے کی سُرخی ہے غریبوں کا لہو

آخری شعر کس قدر جگر خراش حقیقت کا حامل ہے!

احسان نے پردہ پر جو نظم لکھی ہے وہ اس کے زورِ بیان کا بہترین نمونہ ہے۔

شان و شوکت کو بڑھانے کیلئے پردہ نہیں
رنگ و روغن کو چھپانے کیلئے پردہ نہیں
اس کا پردہ ہے کہ ہم گرداب ناداری میں ہیں
زندگی سے تنگ ہیں مٹنے کی تیاری میں ہیں
اس کا پردہ ہے کہ جینا موت سے دشوار ہے
سانس کا ڈورا نہیں چلتی ہوئی تلوار ہے
اس کا پردہ ہے کہ سینے درد سے معمور ہیں
اشک بار آنکھیں ہماری قلب کے ناسور ہیں
اس کا پردہ ہے کہ ہم اپنی نظر پہ بار ہیں
پپڑیاں ہونٹوں پہ مرجھائے ہوئے رخسار ہیں
اس کا پردہ ہے کہ چہرے ہیں الم کے اشتہار
رُوح پر اندوہ دل بریاں کلیجے داغدار
اس کا پردہ ہے کہ دل کا حال پیشانی پہ ہے
نکتہ چیں غیرت ہماری خستہ سامانی پہ ہے
اس کا پردہ ہے کہ سر پہ چادریں ہیں تار تار
پیرہن میں جابجا پیوند ہیں اور بے شمار
اس کا پردہ ہے سراسر غم کی تصویریں ہیں ہم
ہند کے خوابِ چمن بندی کی تعبیریں ہیں ہم

احسان نے حضرت علامہ اقبالؒ کا جو مرثیہ لکھا تھا اس کے آخری اشعار ملاحظہ ہوں۔

ترے آتش فشاں پرسوز نغموں سے جہاں جاگا
زمیں نے کروٹوں پہ کروٹیں لیں آسماں جاگا
مگر پنجاب اب تک بےخود و مدہوش سوتا ہے
زمانہ جاگ اٹھا اور یہ غفلت کوش سوتا ہے
یہ بحرِ بےخودی میں سربسر غرقاب ہے اب تک
یہ میٹھی نیند کا ماتا اسیرِ خواب ہے اب تک
قیامت ہے سمندر میں بھی شورِ تشنہ کامی ہو
جہاں اقبالؒ پیدا ہو وہاں مذہب غلامی ہو

قیامت تو یہ ہے کہ پنجاب دوہری غلامی میں مبتلا ہے!

"چراغاں" کی غزلوں میں بھی احسان اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز نظر آتا ہے۔ اس کے کلام کی نمایاں خصوصیات سادگیٔ جذبات اور خلوص ہیں۔ اس کی غزلیں عریانی کے عیب سے یکسر پاک ہیں۔ اس کے ہاں فلسفیانہ پروازِ تخیل مفقود ہے لیکن سیدھے سادے اور پاکیزہ جذبات کی کمی نہیں۔ وہ غیر ضروری اور نمائشی ترکیبوں کے پردے میں افلاس تخیل کو ڈھانپنے کا قائل نہیں۔ اس لئے اس کی غزلوں کی زبان میں جوش ملیح آبادی اور اس اسکول کے دوسرے شعراء کی طرح پرشوکت لیکن بےمعنی الفاظ نظر نہیں آتے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فکرِ دوائے دردِ دل　　درد سے کم نہ تھی مگر
تو نے بڑا کرم کیا　　درد جو لا دوا دیا
فطرت کشمکش پسند　　عشق کی سمت جب جھکی
ضبط الگ عطا کیا　　ذوقِ جنوں جدا دیا

تمہاری یاد ہے میری کتابِ غم کا دیباچہ
خدا رکھے یہی ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ہے
ستم کو کیا ستم سمجھوں جفا کو کیا جفا جانوں؟
وہی جور آشنا جب زندگانی کا سہارا ہے
وفا کی آرزو لغزش ہے اک خوش اعتقادی کی
مجھے احسان اکثر دوستوں نے مل کے مارا ہے

توبہ کی نازشوں پہ ستم ڈھا کے پی گیا
"پی!" اس نے جب کہا تو میں گھبرا کے پی گیا
نیت نہیں خراب، نہ عادی ہوں اے ندیم!
"آلامِ روزگار سے تنگ آ کے پی گیا"

ساقی کے حسنِ دیدۂ میگوں کے سامنے
میں جلوۂ بہشت کو ٹھکرا کے پی گیا

"چراغاں" ہر صاحبِ ذوق کے کتب خانہ کی زینت ہونی چاہیئے

مفتاح العربیہ (دو حصے)

از قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی - کتابت، طباعت عمدہ قیمت فی حصہ دس آنے -

ملنے کا پتہ :- مکتبہ علمیہ میرٹھ -

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کا نام ہندوستان کی ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں - آپ اردو کے مشہور ادیب ہیں - آپ کے عربی افسانوں اور مضامین کے تراجم اکثر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں "مفتاح یا کلام العربی" کی تصنیف کے ذریعہ انہوں نے اردو زبان پر بہت بڑا احسان کیا ہے - قرانِ کریم کے معانی و مطالب اور جدید عربی جرائد و رسائل کے سمجھنے کیلئے عربی ادب سے واقفیت ضروری ہے - "مفتاح العربیہ" ایک ایسی کتاب ہے - جس کی مدد سے اردو پڑھے لکھے حضرات کم سے کم عرصہ میں عربی زبان سیکھ سکتے ہیں - اسی موضوع پر پہلے بھی دو چار کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر یہ کتاب ان میں بہترین ہے - مؤلف کا اندازِ تحریر نہایت سلجھا ہوا ہے اور وہ عربی صرف و نحو کے دقیق اور پیچیدہ اصول اس سادگی کے ساتھ بیان کر گئے ہیں کہ بڑی آسانی کے ساتھ مبتدیوں کی سمجھ میں بھی آجاتے ہیں - ان کا مشقوں کا انتخاب اور نمونے کے اقتباسات خاص طور پر داد کے مستحق ہیں - آپ نے جدید عربی کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور اپنی کتاب میں ممتاز عربی اخبارات الفتح (قاہرہ) البلاغ (قاہرہ) المبداء (بغداد) وغیرہ سے بڑی تعداد میں ایسی خبریں بطورِ نمونہ درج کی ہیں - جن میں جدید الفاظ و تراکیب بکثرت استعمال ہوئی ہیں - غرضیکہ یہ کتاب ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے - اور جو لوگ عربی زبان کے مطالعہ سے دلچسپی رکھتے ہیں یا اسے سیکھنا چاہتے ہیں ہم ان سے اس کتاب کے مطالعہ کی پر زور سفارش کرتے ہیں -

"ف"

عنوانِ نو

کعبہ و بُت خانہ سے نکلا نہ کام
ایک سجدہ وہ بھی محدودِ مقام

کون ہے رودادِ دل کا رازدار
قصۂ ہستی ہے ابتک ناتمام

میرے اشکوں نے کیا ہے اکتساب
لرزشِ انجم سے اندازِ خرام

میرا سجدہ، خامئ ذوقِ سجود
تیرا در تسکینِ آئینِ عوام

پھر شکستِ دل کو دے عنوانِ نو
پھر نیازِ عشق ہے بے ننگ و نام

پھر نگاہِ شوق ہے آوارہ سر
پھر نمودِ حسن ہے بے اہتمام!

یہ تحیّر! سر بسر عجزِ خموش
وہ تبسّم! ہُو بہُو لطفِ کلام

ساقئ مے خانہ رہتا ہے خموش
جوش میں آتا ہے جب تک دورِ جام

گلستانِ ہند میں انور ہوں میں
عندلیبِ خوش نوا ہے زیرِ دام

لطیف انور

ل - احمد صاحب کی کتابیں

انشائے لطیف

اردو ادب سے ذوق رکھنے والوں کیلئے صاحب لالہ رخ کا نام تعارف کا محتاج نہیں - ل - احمد صاحب نے اردو میں افسانہ نویسی کا جو معیار پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے - ان کی قلم سے نکلا ہوا ہر افسانہ نفسیات و واردات قلب، اور حکمت وجذبات کی بولتی تصویر اور اردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے - پندرہ افسانوں کا یہ مجموعہ حسن وعشق کی کشاکش اور فلسفۂ شباب کا مرقع ہے - آپ اگر اردو زبان کی گیرائی اور سادہ و نثر کی شعر آفرینی کے قدردان ہیں تو اس مجموعے کو دیکھئے - پونے تین سو صفحات، مجلد قیمت دو روپے -

نغمات :-

اس مجموعے میں ل - احمد صاحب کے ساٹھ مختصر ترین ادب پارے شامل ہیں جنہیں نثری شاعری کا ایک وجد آفریں نامہ کہا جا سکتا ہے : زبان کی نفاست اور بیان کی لطافت کا اندازہ کرنے کے لئے اس مجموعے کا دیکھنا از بس ضروری ہے -

۱۳۶ صفحات، مجلد قیمت ایک روپیہ -

محبت کا افسانہ

یہ ایک طویل افسانہ ہے جس کے اندر ل - احمد صاحب نے موسیقیانہ زبان اور فلسفیانہ استدلال میں مسرت انزدواج ....

سے بحث کی ہے لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل افسانہ ہے اور ہر باب میں کسی نہ کسی معاشرتی و اخلاقی مسئلے پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے -

ساڑھے تین سو صفحات، مجلد قیمت دو روپے :

زندگی کے کھیل :-

اس مجموعے میں ل - احمد صاحب کی بارہ سماجی کہانیاں شامل ہیں جن کے اندر معاشرتی خرابیوں اور فلاکت زدہ سماج کی جیتی جاگتی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں - یہ کہانیاں پرانے ٹیکنیک پر نئے ادب کی تعمیر کی مثال پیش کرتی ہیں -

ایک سو ساٹھ صفحات، مجلد قیمت ایک روپیہ :

میموں کے افسانے :-

یہ تین بہترین افسانوں کا ترجمہ ہے اور انگریز مصنف رائڈ ہیگرڈ اور فرانسوی فسانہ نگار گاتی ایر کی بہترین کہانیاں منتخب کی گئی ہیں - اس پر ل - احمد کا جادو نگار قلم - کتاب چھپ رہی ہے -

ضخامت تقریباً دو سو صفحات، مجلد قیمت ایک یا سوا روپیہ ہو گی :

ملنے کا پتہ :-

عظیم اطہر - محلہ منٹولہ، آگرہ

اپنا مکان

ہماری زیر نگرانی میں بنوائیں

دیکھنے میں شاندار اور لاگت میں عام مکانوں کے برابر اور بالکل جدید ترین طرز کا ہو گا - ہم آپ کے شہر میں سینکڑوں مکانوں کی نگرانی کر کے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں -

دفاتر :- ۱۳ برانڈرتھ روڈ کوچہ شیخ عظیم اللہ نزد اسلامیہ کالج لاہور -

بیرون شیرانوالہ گیٹ منور سٹریٹ - منور منزل لاہور :

منیجر :- عبدالعزیز ایم اے ٹی آئی (لندن) التعمیرات - دی ماڈرن بلڈنگ کارپوریشن لاہور -

نگراں:- پروفیسر تاجور نجیب آبادی

شاہکار لاہور

ایڈیٹر:- فاروق علی خاں

جلد (۱۰) فہرست مضامین بابت ماہ نومبر ۱۹۳۹ء نمبر (۲)

چندہ سالانہ: چھ روپے۔ ششماہی

ایم ہادی حسن احقر ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شا

رفتارِ عالم

دنیا آج جس اضطراب انگیز خلفشار میں مبتلا ہے - اس کی سطح صرف دو تین ملکوں کی خونیں آویزش سے آشنا ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ موجودہ تہذیب اور اس کے تمام لوازم کی ایک آخری کشمکشِ موت و حیات ہے - یورپ کی تہذیب آخری ہچکیاں لے رہی ہے اور جس کو ہم جرمنی، انگلستان اور فرانس یا غیر جانبدار ممالک کہتے ہیں - وہ یا تو علاماتِ مرض ہیں یا تیماردار اور معالج - دنیا اب صرف یہ دیکھنے کی منتظر ہے کہ تیماردار اور معالج بیمار کو کس طرح ٹھکانے لگاتے ہیں - یورپ کی موجودہ تہذیب کیا ہے؟ اس کا اندازہ لگانے کے لئے ہمیں نہ یورپ کی سیر و سیاحت کیلئے کمر سے ستو باندھ کر نکلنے کی ضرورت ہے اور نہ کتب و رسائل کے کسی ضخیم انبار کو دیمک کی طرح چاٹنے کی حاجت؟ اس تہذیب کے اتنے مبیح اور قبیح حسین اور بدنما اشتیاق انگیز اور گھن لانے والے مخلوط اور مختلف مناظر خود ہمارے ہندوستان میں بمبئی کلکتہ اور کراچی کی راہ سے وارد ہو چکے ہیں اور اتنی تعداد میں کہ اگر ان سے آنکھیں بند کر کے گریز بھی کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے - اکبر مرحوم نے گھبرا کر کہا تھا

ے ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لائسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبر ہم نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

ممکن ہے آج سے چند سال پیشتر صرف پارک میں ٹہلنا چھوڑ دینے سے "آنکھوں کی نگرانی" اور تہذیب جدید کی لائسنس طلبی سے نجات مل جاتی ہو لیکن جنگِ عظیم کے بعد تو اس کی ناخواندہ اولاد کچھ اس طرح پھیلی ہے کہ کوچہ و بازار اس سے بھ گئے ہیں - اب گھر کے اندر بھی خلوت گزین ہو جائیے تو جھٹکا

اسی تہذیب کی کارفرمائی ہے - خدا نے انسان پیدا کئے اور شیطان نے یورپ کے مدبر یہ ایک بہت پرانا مقولہ ہے - لیکن ان کی صداقت اتنی نمایاں کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی نمایاں آج ہے -

تہذیب مغرب کی کارفرمائی

دیکھنے میں مسٹر چیمبرلین اور ان کے یاران سرپل ہر ہٹلر اور اس کے خواجہ تاش، اسٹالین اور اس کے کامریڈ عصمت انونو اور اس کے غازی گاندھی جی اور ان کے بکرے - روزویلٹ اور ان کے "خلشی مشکل" گفت و شنید - اکھاڑ پچھاڑ، دار و گیر حرب و ضرب اور مار دھاڑ میں مصروف ہیں لیکن حقیقت میں یورپ کی تہذیب کی موت و حیات کا فیصلہ ہو رہا ہے - ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس میں حصہ لے رہا ہے - کسی کو بولنے کا حق ہے کسی کو لکھنے کا، کسی کو مار بیٹھنے کی طاقت ہے اور کسی کو بم کے ذریعے اُڑا دینے کی - اپنی طرف سے کوئی شخص کمی نہیں کر رہا ہے - کمی ہے تو صرف انسان مختار کی مجبوری کی ے

اس جبر پہ تو ذوقِ بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

ہٹلر نے پولینڈ کو اپنا تر نوالہ بنایا کہ روس سے ساز باز نہ کر لینے کے بعد برطانیہ و فرانس کسی طرف سے حملہ آور ہو کر پولینڈ کو بچا نہیں سکتے تھے، فرانس و برطانیہ نے پولینڈ کی حمایت کا بیڑا اٹھا لیا کہ مظلوموں کی حفاظت، کمزوروں کی اعانت اور معقولیت کے استحکام کیلئے ہٹلر سے جنگ کرنے کا یہ آخری موقعہ تھا - اس کے بعد جو لڑائی ہوتی وہ یا تو اغراض کی ہوتی یا جوع الارض کی، ہٹلر نے روس سے ساز باز کر لیا کہ اس کے بغیر جرمنی کو فاقہ کشی سے بچانے اور اپنی مشرقی اور جنوبی سرحد کو محفوظ رکھنے کی اور کوئی صورت نہ تھی - اور جناب روس نے بھی اپنے حریف دیرینہ سے مصافحہ کر لیا کہ جنگِ عظیم کی بے انصافیوں کی اصلاح کا یہ بہترین موقعہ تھا - جب ہٹلر برطانیہ و فرانس کے ساتھ الجھا ہوا ہو اور برطانیہ

و فرانس ہٹلر سے گلچھت میں مصروف ہوں تو موسیو اسٹالین سے زیادہ احمق اور کون ہوتا اگر وہ لتھوانیا اسٹھونیا لٹویا اور فن لینڈ پر ہاتھ نہ صاف کرتے۔ جن کو جنگِ عظیم میں جرمنی سے شکست کھا جانے کے بعد بزورِ شمشیر مگر بذریعہ معاہدہ اپنے سے علیحدہ کیا تھا۔ تہذیب جدید کی پہلی مشق یہ ہے کہ جو شخص موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتا وہ احمق ہے اور یورپ کا کوئی شخص موجودہ زمانے میں احمق نہیں ہے۔

ہندوستان کا کشکول

پھر جب حالت یہ ہو کہ برطانیہ و فرانس نے بیٹھے بٹھائے ہٹلر سے جنگ کرنے کا دردِ سر اس لئے مول لیا ہو کہ معقولیت و شرافت، جمہوریت اور انصاف مساوات اور آزادی کی لاش ڈانزگ اور وارسا کی گلیوں میں بے گور و کفن پھر رہی تھی۔ اور یہ دونوں سلطنتیں جو دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان سلطنتیں ہیں، اپنی عافیت حیات کو اس لئے مصیبت میں مبتلا کر رہی ہوں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دنیا میں آزادی و دستور، اور معقولیت و شرافت کی گنگا بہا دینے کا تہیہ کر چکی ہیں تو کانگرس، گاندھی جی اور ان کے چیلے لنگوٹیاں کس کر اس گنگا میں کیوں غڑاپ سے چھلانگ لگا کر دو چار ڈبکیاں لگا لینے کی اجازت طلب نہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے کھٹ سے برطانیہ سے مطالبہ کر دیا کہ ؎

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

پولینڈ کی تین کروڑ آبادی کی آزادی کی حفاظت کیلئے جان کی بازی لگا دینے والو ہندوستان کے ۳۵ کروڑ محکوم بھی آزادی اور خود مختاری کے طلبگار ہیں اور جمہوریت کے علم کی خاطر دنیا سے لڑ جانے والو ہندوستان بھی جمہوریت کی بھیک مانگتا ہے بات دیکھنے میں بہت معقول معلوم ہوتی تھی۔ انگلستان سے لے کر ہندوستان تک انگریزی حلقوں میں دردمندی اور دلسوزی کی لہر دوڑ گئی۔ وائسرائے اور وزیر ہند میں لاسلکی کا غیر مرئی رشتہ قائم ہو گیا۔ باتیں ہونے لگیں اور آخر میں طے پایا کہ مطالبہ درست ہے۔ اس کو فی الفور قبول کر لینا چاہیئے۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ برطانیہ دوسروں کیلئے تو جان بھی دینے کیلئے تیار ہے اور اپنوں سے بات بھی کرنا پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ "بات کرنے" کا سلسلہ شملے میں قائم ہوا۔ اور وہاں تک جاری رہا۔ گرمیوں کے آخری دن ختم ہو گئے۔ جاڑے آ گئے، بجلی کے پنکھے ملاقاتوں کے منظر دیکھتے دیکھتے تھک کر بند ہو گئے۔ پسینے اکتا کر خشک ہو گئے، لیکن ملاقاتیں ختم نہ ہوئیں اور جب ختم ہوئیں تو معلوم ہوا کہ ہندوستان کی پوری باون زبانوں کو وائسرائے نے ہم کلامی کا شرف عطا فرمایا ہے، کانگریس کے کئی لیڈر، مسلم لیگ کے کئی رہنما، ہندو سبھا کے کئی نیتا، لبرل فیڈریشن والے اچھوت سکھ، پارسی، زمیندار، تاجر، اخبار نویس الغرض ہر وہ شخص باریاب ہوا جس کو کسی جماعت کی ترجمانی کا دعویٰ تھا اور جب واقعی صورتِ حال ایسی ہو گئی کہ پرانے لیڈروں ہی کو بار بار بلانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تو ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ سچ ہے ؎

کسے نماند کہ اکنوں بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را دبا ز کشی

اس کے بعد وائسرائے کی طرف سے اعلان ہوا۔ اور اس کی صدائے بازگشت لارڈ زٹلینڈ کی زبان سے دارالامرا میں بلند ہوئی۔ اور ہندوستان کے گوشِ منتظر نے سنا کہ ہندوستان کو جمہوری دستور حکومت دیدینا کیا مشکل ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس ملک میں اتنی قومیں آباد ہیں اور اتنے مفاد کلبلا رہے ہیں کہ دستور کی کل کوئی سیدھی نہیں بیٹھتی۔ آزادی اور نو آبادیاتی درجۂ حکومت تو ایک دن میں دیدیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ کانگریس، مسلم لیگ، اچھوت، سکھ، پارسی والیانِ ریاست بلکہ یورپین تک کی مصلحتیں زیرِ غور ہیں اور جب تک کوئی ایسا نیا دستوری آلہ دریافت نہ ہو جائے جس کو آزادی کے ساغرِ لبریز میں لگا دیا جائے تاکہ جب پھر اس میں جمہوریت کا بادہ سرجوش بھرا جائے اور پیالے کو ٹیڑھا کر دیا جائے تو مئے حریت کا ایک قطرہ بھی باہر نہ گرے۔ اس وقت تک کیا کیا جا سکتا ہے ہاں اگر اس قسم کی کوئی "کج دار و مریز" شے دستیاب ہو جائے تو سبحان اللہ ہندوستان سے کس کو بخل ہے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

انقرہ اور ماسکو

اِدھر ہندوستان اور برطانیہ کے مابین تہذیب جدید کے اصولوں کے مطابق سیاسی بات چیت ہو رہی تھی اور اُدھر ماسکو اور انقرہ کے مابین اور انقرہ اور لندن و پیرس کے مابین سیاسی داؤں پیچ کھیلے جا رہے تھے۔ روس اور ترکی میں کوئی بیس برس کا گہرا دوستانہ ہے۔ جس زمانے میں باب عالی پر اتحادی طاقتوں کے ڈریڈ ناٹ اپنی اژدہوں کے ہیبتناک منہ کھولے ہوئے آبنائے باسفورس اور شاخ طلائی میں کھڑے تھے۔ سلطان وحید الدین انگلستان فرانس اٹلی اور یونان کے سفراء کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ شیخ الاسلام قسطنطنیہ میں بیٹھ کر علاوہ صوم و صلواۃ اور ذکر و تسبیح کے انگورہ کے مٹھی بھر غازیوں پر فتوے الکفر کے گولے پھینک رہے تھے۔ مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھی ترک بیمار کی مردہ رگوں میں اپنا گرم گرم خون داخل کرنے میں بے تحاشا مصروف تھے اور یونان کی فوجیں سمرنا میں ترکوں کی عزت آبرو اور جان و مال پر ہاتھ صاف کر رہی تھیں۔ اس وقت دنیوی طاقتوں میں سے اگر کوئی طاقت ترکان احرار کے کام آئی تھی تو وہ صرف روس کی نئی حکومت تھی جو مزدوروں اور کسانوں کے وحشی انقلاب پر قائم ہوئی تھی اور جس کو مٹا دینے کیلئے یوکرین کے سفید روسی اور ان کی امداد کرنے والی یورپی طاقتیں مصروف کار تھیں۔ روس نے نہ صرف اخلاقی امداد دے کر ترکی کی بہت سی گتھیوں کو سلجھا دیا بلکہ سامان جنگ بارود اور روپیہ دیکر غازیان انگورہ کو اس قابل بھی کر دیا کہ یونان کے تازہ ترین سامان جنگ کو جو اتحادی ذخائر حرب سے موصول ہو رہا تھا، تباہ و برباد کر کے اپنے وطن کو غلامی سے نجات دلادیں مصیبت کے وقت کی اس دستگیری کو کون بھول سکتا ہے۔ ترکوں نے بھی ہمیشہ اس کو یاد رکھا اور روس نے بھی یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ترکی کی دوستی عالم اسلام کی دوستی ہے۔ اس تعلق کو قائم رکھا اور اس میں روز افزوں استحکام پیدا کیا۔

ترکوں کا تدبر

جب یورپ کے بارود خانے میں جنگ کی چنگاری گری اور پولینڈ بھک سے اُڑ کر صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور آگ کے شعلے جرمنی کی مغربی سرحد پر پھیل گئے تو ترکی پر فرانس برطانیہ جرمنی اور روس نے از سر نو ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ ترکوں کو فرانس اور برطانیہ سے کسی زمانہ میں کافی تکلیف پہنچ چکی تھی۔ لیکن انہوں نے نہ صرف عثمانی سلطنت کی پرانی آلائشوں کو جسم سے اتار کر پھینک دیا بلکہ جنگِ عظیم کی عداوتوں کو بھی فراموش کر دیا۔ انہوں نے شام فلسطین عراق اور عرب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور صرف ترکی کے علاقے پر قناعت کر کے اسی کو مضبوط و مستحکم کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس غرض کیلئے انہوں نے فرانس اور برطانیہ سے بھی تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم کئے۔ یہاں تک کہ برطانیہ نے گرانقدر رقم قرضے کے طور پر دینی قبول کی۔ اور ایک طاقتور ترکی کے وجود کو اپنے مشرقی مقبوضات کیلئے مفید سمجھنے لگا، ترکوں نے بھی اس بات کو غنیمت خیال کیا۔ ترکی کی جغرافی پوزیشن اور جنگی نوعیت اس قسم کی ہے کہ اس کے لئے فرانس اور برطانیہ دونوں کی دوستی مفید ہے اور دشمنی مضر، دوستی اس لئے مفید ہے کہ اٹلی کا ارض روم یعنی ایشیائی ترکی پر مدت سے دانت ہے۔ اگر اس دانت کو مصطفیٰ کمال کی خاراشگاف تلوار کھٹا نہ کر دیتی تو آج طرابلس الغرب کی طرح ترکی کے ایشیائی حصے پر بھی اٹلی کا قبضہ ہوتا اور بحیرہ روم میں اس کا کوس لمن الملک بجتا۔ ترکی کو سب سے زیادہ وہ اندیشہ اب تک اٹلی سے ہے اور چونکہ برطانیہ و فرانس کو بھی اٹلی سے خطرہ ہے۔ اس لئے ترکی کی دوستی ان کے لئے بھی نہایت قیمتی چیز ہے۔ دوستی کی اس دوگونہ ضرورت نے تینوں کو مجبور کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ حسن تعلقات قائم رکھیں ورنہ کہاں مغربی تہذیب اور کہاں حسن تعلقات!

یورپ کی جنگ کے آغاز کے ساتھ اس ضرورت میں اور زیادہ اہمیت پیدا ہو گئی برلن، ماسکو، پیرس اور لندن میں رسہ کشی ہونے لگی۔ ترکی اور روس کے مابین حالات جدیدہ کے ماتحت کوئی نیا معاہدہ تو نہ ہو سکا مگر ترکی کے مدبرین کے اس اقدام کو ان کی عدیم المثال کامیابی پر محمول کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف فرانس و برطانیہ کو اپنا حلیف مددگار اور جنگی رفیق بنا لیا بلکہ ان سے یہ بھی تسلیم کرا لیا کہ وہ اس کو روس سے لڑنے پر مجبور نہیں کر سکیں گے۔

نصر اللہ خاں عزیز بی اے

دو مشہور سہرے

مرزا غالب اور استاد ذوق کے سہروں کو بہت سے لوگوں نے پڑھا و پڑھایا ہے لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو سہروں کے متعلق بعض ضروری امور سے واقف ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد غالباً پہلے شخص ہیں جنہوں نے قدرے وضاحت کے ساتھ مرزا کے حالات کو آب حیات میں لکھا ہے۔ اور دونوں سہروں کے متعلق اس میں یہ درج کیا ہے۔

"نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت ان کے بیٹے تھے۔ اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے مگر بادشاہ انہی کی ولی عہدی کے لئے کوشش کر رہے تھے جب اُن کی شادی کا موقع آیا تو بڑی دھوم کے سامان ہوئے۔ مرزا نے یہ سہرا کہہ کر حضور میں گزرانا:۔۔۔۔۔

مقطع کو سنکر حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں۔ ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو استاد اور ملک الشعرا بنایا ہے یہ سخن فہمی سے بعید ہے۔ بلکہ طرفداری ہے چنانچہ اسی دن استاد مرحوم حسب معمول حضور میں گئے تو بادشاہ نے وہ سہرا دیا کہ استاد اسے دیکھئے۔ انہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیرو مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا کہ استاد تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو اور ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا۔ استاد مرحوم وہیں بیٹھ گئے اور عرض کیا:۔۔۔۔۔۔۔

ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اسی وقت انہیں ملا۔ شام تک شہر کی گلی گلی، کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ دوسرے دن ہی اخباروں میں مشتہر ہو گیا مرزا بھی بڑے اداشناس اور سخن فہم تھے۔ سمجھے کہ تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور یہ قطعہ[۱] حضور میں گزرانا۔ ۔ ۔ ۔"

یہی عبارت قدرے ترمیم کے بعد مختلف درسی و غیر درسی کتب میں پائی جاتی ہے۔ ہاں دیوان ذوق مؤلفہ آزاد[۲] میں اس ضمن میں یہ الفاظ اور زیادہ ہیں:۔

"بیگم کے ایما سے غالب مرحوم نے یہ سہرا کہہ کر زر نگار کاغذ پر لکھ کر ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گزرانا۔"

یادگار غالب میں سہروں کے متعلق کسی قسم کا چرچا بھی نہیں۔ اس کے علاوہ پچھلے دنوں کی شائع شدہ چند دیگر کتب جن سے مرزا کے حالات پر مزید روشنی پڑتی ہے یہ ہیں۔

(۱) غالب از مولانا مہر ۱۹۳۶ء
(۲) غالب نامہ از مسٹر اکرام ۱۹۳۶ء
(۳) مکاتیب غالب از مولانا عرشی ۱۹۳۷ء
(۴) ذکر غالب از مسٹر مالک رام ۱۹۳۸ء

ان مطبوعات سے سہروں کے متعلق بہت ہی کم یا یوں کہنا چاہیئے کہ بہت ہی ناتشفی بخش حال معلوم ہوتا ہے۔ ہاں اس باب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب حیدرآبادی کی عنایت سے مجھے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے اُس کی کیفیت یوں ہے کہ ۱۵ جنوری ۱۸۴۷ء کو ولی عہد مرزا دارا بخت نے عالم جاودانی کی راہ لی اور ولی عہدی کا مسئلہ نئے سرے سے درپیش ہوا۔ نواب زینت محل بیگم صاحبہ کو بادشاہ کے مزاج میں

---

[۱] مراد "معذرت نامہ" ــــ منظور ہے گزارش الخ
[۲] مطبوعہ اسلامیہ پریس لاہور صفحہ ۲۹۰

بہت دخل تھا وہ چاہتی تھیں کہ اُن کے لختِ جگر مرزا جواں بخت ولی عہد تسلیم کئے جائیں لیکن بعض درباری اس بات کے حق میں نہ تھے۔ نواب زینت محل بیگم صاحبہ کو معلوم ہوا کہ استاد ذوق اس جماعت کے رکن ہیں جو مرزا جواں بخت کی ولیعہدی کے مخالف ہے چنانچہ ۱۸۵۲ء میں جب شہزادہ مرزا جواں بخت کی شادی کا وقت آیا تو جناب بیگم صاحبہ نے سہرا لکھنے کے لئے مرزا غالب سے کہا اسی وجہ سے مرزا کے معذرت نامہ میں شعر ہے

سہرا لکھا گیا ہے زرہ امتثال امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مرزا جواں بخت کے نکاح کی رسم یکم اپریل ۱۸۵۲ء کو ادا ہوئی تھی لیکن تیاریاں بہت پہلے سے ہو رہی تھیں۔ بادشاہ سلامت کے ایما یا حکم سے استاد نے ۲۷ مارچ کو سہرا لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ مرزا نے اپنا سہرا اس سے کچھ پہلے ہی کہا تھا۔

اب اسی ضمن میں یہ جان لینا چاہیئے کہ مرزا کا سہرا جو اس وقت کے دہلی اُردو اخبار مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء میں چھپا تھا اس میں ایک مصرع یوں تھا۔

سات دریا کے فراہم کئے ہونگے گوہر

جناب لالہ سری رام ایم اے مرحوم صاحب خمخانہ جاوید کی عطا کردہ گراں بہا کتب کا ذخیرہ ہندو یونیورسٹی لائبریری بنارس میں سری رام سیکشن کے نام سے موسوم ہے اسی قابل قدر ذخیرے میں ایک قلمی بیاض ہے جس میں بہت سے شعرا کی نظمیں مندرج ہیں چنانچہ اُس میں سہرے کا مذکورہ بالا مصرع اسی طرح ہے۔

ہاں اس امر کا جتلانا بھی غیر مناسب نہیں کہ سہرے کی ذات کے ساتھ ہی معذرت نامہ کی ہستی وابستہ ہے چنانچہ معذرت نامہ میں ایک مصرع یوں ہے۔

کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

دہلی اردو اخبار (۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء) میں یہ مصرع یوں درج ہے۔

علم و کمال و فضل سے نسبت نہیں مجھے

میرے خیال میں بعض اصحاب اس امر کو جان کر ضرور قدرے متعجب ہونگے۔ کہ مرزا کا دیوان جو ۱۸۵۲ء کے بعد ان کی حیات میں ہی نظامی پریس کانپور سے ۱۸۶۲ء میں چھپا تھا اور جس کی طباعت میں مرزا نے کافی احتیاط سے کام لیا تھا اس میں سہرا درج نہیں ہاں معذرت نامہ ضرور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے اس کو اپنی شاعری کی اہم چیز تصور نہ کی تھی یا یہ کہ استاد کے سہرا کے مقابلے میں اپنے سہرے کو کمتر تصور کیا ہوگا اس لئے اس کی اشاعت سے گریز کیا ہوگا۔ ہاں یہ کہنا بھی غیر مناسب نہیں کہ دیوان کے بعض قلمی نسخوں میں بھی سہرا مندرج نہیں۔

مہیش پرشاد مولوی فاضل
ہندو یونیورسٹی بنارس

غزل

ترے در پہ سجدہ ادا کر رہے ہیں
تجھے آج سے ہم خدا کر رہے ہیں

دُعا دے رہے ہیں مجھے زندگی کی
کوئی ان کو روکے یہ کیا کر رہے ہیں

یہ کن مست آنکھوں کے مخمور ڈورے
شرابی مجھے برملا کر رہے ہیں

بُرا ہو نصیبوں کا الطاف اُن سے
جوانی میں مجھ کو جدا کر رہے ہیں

الطاف مشہدی

رباعیات

خالق نے بسا کے دہر کی بستی کو
مفہوم دیئے بلندی و پستی کو
ہر ذرّہ کے نقطے میں نہاں ہے نقطہ
مہمل نہ سمجھ نگارشِ ہستی کو

خورشید و کواکبِ درخشندہ و ماہ
ہم ان کے پرستار نہیں ہیں واللہ!
یہ لائقِ احترام لیکن ہیں ضرور
ہیں قدرتِ صانعِ حقیقی پہ گواہ

قاری ہوں نہ بید خواں ہوں یارب
نے واقفِ اسرارِ نہاں ہوں یارب
عاصی ہوں نظر ہے دامنِ رحمت پر
جویائے گوشۂ اماں ہوں یارب

ہے نازشِ کائنات یہ پیکرِ خاک
دھوم اس نے مچا رکھی ہے زیرِ افلاک
یہ دارِ فنا یہ اس کی بزم آرائی
غافل انجام سے ہے یا ہے بیباک

محروم

سچ کا مقصود

مجھے ایک فاضل کا مندرجہ ذیل خط موصول ہوا:۔

اے صاحب نظرات!

سچ کی خوبی اور سچوں کے اجر و ثواب اور جھوٹ کی برائی اور جھوٹوں کی سزا و عتاب کے متعلق میں نے بہت کچھ سنا اور عہد آدم علیہ السلام سے آج تک، مختلف اقوام و ملل کے علماء و حکماء نے اس موضوع پر کہ سچ تمام اخلاق حسنہ و صفات عالیہ کی جڑ اور کامیابی و کامرانی کی بنیاد ہے، بہت کچھ پڑھا۔ یہ سب سننے اور پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میری زندگی کی ناکامیاں اور میری عیش کی تلخیاں سب جھوٹ کی نحوست کا نتیجہ ہیں۔ میرا یہ خیال کہ بعض موقعوں پر جھوٹ سچ سے زیادہ مفید اور زیادہ نفع بخش ہوتا ہے، محض وہم باطل اور شیطان کا دھوکا ہے اور میں نے سچے دل سے خدا اور اپنے نفس سے عہد کر لیا کہ زندگی بھر کبھی جھوٹ کا نام نہ لوں گا۔ اور اس عہد کو نباہنے کیلئے، عزیمت نفس اور قوت ارادی کی مدد حاصل کی اور اس رب العزت سے نصرت و اعانت کی دعا مانگی۔

اس عہد کے بعد اس کے ایفاء کے سلسلہ میں جو واقعات پیش آئے اور میری زندگی پر اس کے جو آثار و نتائج مرتب ہوئے وہ میں مختصراً آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

میں ایک تاجر تھا، جو خریدار میری دکان پر آتا میں اسے چیز کی اصل قیمت اور اس پر کم از کم نفع جو میں لے سکتا تھا صحیح صحیح بتا دیتا۔ مگر اسے اصرار ہوتا کہ قیمت میں اور کچھ کمی کی جائے۔ میرے لئے یہ ناممکن ہوتا اور مجبوراً انکار کر دیتا۔ خریدار قیمت کی گرانی کا عذر کر کے واپس چلا جاتا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ قیمت قطعاً وہی ہوتی جس پر میں اب تک اس چیز کو فروخت کرتا رہا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ پہلے میں جھوٹ بول کر قیمت زیادہ بتا دیا کرتا تھا اور پھر اس میں تدریجاً کمی کر کے صحیح قیمت پر آتا تھا۔ خریدار اس طریقے سے خوش ہو جاتا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ چیز اسے سستی مل رہی ہے۔ اب جو میں نے اسے ابتداء ہی میں صحیح قیمت بتا دی اور اس میں کمی کرنے سے انکار کر دیا تو وہ سمجھا کہ میں سخت معاملہ اور گراں فروش ہوں اور میری دکان چھوڑ کر دوسرے کی دکان پر چلا گیا۔

سارے دن یہی کیفیت رہی۔ رات کو جب میں اپنے گھر واپس آیا تو اتنے پیسے بھی پاس نہ تھے جن سے پیٹ بھرنے کا سامان کیا جا سکتا۔ چند روز کے بعد میں سارے بازار میں گراں فروش مشہور ہو گیا۔ اور گاہک میرے سایہ سے بھاگنے لگے۔

مجھے ایک مجلس وعظ و ارشاد میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ مجلس کے صدر نشیں ایک شیخ تھے۔ جو ضعیف عقلوں کی تجارت میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے چاروں طرف متوسلین و معتقدین اپنی گردنیں جھکائے بیٹھے تھے جو شیخ کی ہزلیات پر موقعہ بموقعہ رقص کرنے لگتی تھیں۔

شیخ صاحب نے "توکل" کے متعلق تقریر فرمانا شروع کی۔ آپ نے فرمایا توکل کا مطلب یہ ہے کہ بندہ ہر قسم کے ظاہری اسباب و وسائل سے قطع تعلق کرے اور رزاق کریم کے جود و کرم پر بھروسہ کرے۔ پھر دیکھئے وہ کس طرح چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اپنے اس دعوی کی دلیل میں آپ نے کچھ آیتیں تلاوت کیں جن کو توڑ مروڑ کر اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اور کچھ حدیثیں بھی سنائیں۔ جن کی صحت کی واحد سند یہ تھی کہ انہیں شیخ نے خود اپنے کانوں سے، اپنے شیخ سے سنا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ حدیث بار بار آپ کی زبان پر آتی تھی:۔

"اگر تم اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرو جیسا کہ کرنا چاہیئے تو وہ تمہیں اس طرح روزی دے جس طرح پرندوں کو دیتا ہے کہ صبح کو خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو شکم سیر واپس آتے ہیں۔"

میں شیخ کے لغو دلائل سن کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا

رہا تھا لیکن جب میں نے اس حدیث کے مفہوم کا مسئلہ ہوتے دیکھا تو نہ رہا گیا اور بے اختیار بول اٹھا۔ حضرات! آپ اس حدیث کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں، حالانکہ یہ اس کی تردید کرتی ہے۔ آپ ایک ایسی حدیث کو جس سے شارحین نے وجوب سعی وضرورت عمل پر سند لی ہے ناکارگی و بے عملی کی حجت ٹھہراتے ہیں۔ ذرا غور فرمائیے۔ جب خداوند تعالے نے پرندوں کے شام کے وقت شکم سیر لوٹنے کیلئے صبح کو خالی پیٹ نکل جانا ضروری قرار دیا ہے۔ حالانکہ ان بیچاروں کو پانی کا ایک قطرہ سیراب اور کھانے کا ایک دانہ شکم سیر کرنے کیلئے کافی ہے تو پھر وہ انسان کو کو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے کا کیونکر حکم دے سکتا ہے۔ حالانکہ اس کے پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کے لئے دنیا بھر کی نعمتوں کا ایندھن ناکافی ہے۔

حضرات! بات یہ ہے کہ آپ لوگ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے مفت کی اڑانے کے عادی ہو گئے ہیں اور اپنی اس عادت بد کو چھپانے کیلئے قرآن وحدیث کی آڑ لیتے ہیں، حالانکہ جسے آپ توکل کہتے ہیں وہ سراسر عجز ہے اور جسے آپ قناعت بتاتے ہیں وہ سراسر کاہلی ہے۔

یہ الفاظ میری زبان سے نکلنے نہ پائے تھے کہ شیخ کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے، اور ان کے منہ سے تھوک اڑنے لگا۔ اور انہوں نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ اس زندیق کو ہماری مجلس سے کان پکڑ کر باہر نکال دو۔

شیخ کے مرید اشارہ پاتے ہی مجھ پر اس طرح ٹوٹ پڑے جس طرح وہ فاتحہ کی بریانی پر گرتے ہیں، اور ان کے پیچھے تلے ہاتھ میری کمر پر اس طرح پڑنے لگے۔ جس طرح نیاز کے حلوے پر پڑتے ہیں، اور انہوں نے مجھے مار پیٹ کر "دست بدست دگرے دپا بدست دگرے" باہر نکال دیا۔

اس واقعہ کی سارے شہر میں شہرت ہو گئی، میں جس طرف نکلتا میری طرف انگلیاں اٹھتیں اور جس کی طرف متوجہ ہوتا وہ مجھ سے منہ پھیرتا۔

جناب والا۔ میں آپ سے کیا چھپاؤں۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے کبھی محبت نہیں ہوئی۔ میرا دل ہمیشہ اس کی نفرت سے لبریز رہتا تھا لیکن مصلحتاً زبان سے اس کی تعریف ہی نکلتی رہتی تھی۔ کچھ تو اس لئے کہ خانگی زندگی کے اطمینان میں خلل نہ پڑے اور کچھ اس لئے کہ عورت کے مالدار ہونے کی وجہ سے مجھے اس سے جو فائدہ پہنچ رہا تھا، وہ ہاتھ سے نہ جائے۔ لیکن اس اقرار کے بعد میں نے جھوٹ کا وہ پردہ جو میرے دل اور اس کے دماغ کے درمیان حائل تھا قطع کر دیا۔ اب اس کے کان محبت کے دلکش نغموں سے محروم ہو گئے اور اس کی آنکھیں میرے نظر افروز تبسم سے مایوس ہو گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اولاً میری خانگی زندگی کی خوشی ختم ہوئی اور پھر رشتہ ازدواج کی شکست کے ساتھ میری خانگی زندگی ہی برباد ہو گئی۔

میں ایک مجمع میں پہنچا جہاں کچھ جاہل بے فکرے ملکی سیاسیات پر بحث مباحثہ کر رہے تھے۔ وہ زعمائے قوم کے اعمال وافعال پر نکتہ چینیاں اور ان کی نیت کا کیمیاوی تجزیہ کرنے لگے۔ ملک کے ایک جلیل القدر رہنما کے متعلق جس نے قوم کی خدمت کے لئے اپنی زندگی تج دی تھی اور جس نے ملت کی فلاح وبہبود کی خاطر اپنا گھر بار لٹا دیا تھا "خائن وغدار" کے لفظ استعمال کئے۔ واللہ آسمان کا زمین پر منطبق ہو جانا میرے نزدیک اس سے ہلکا ہے کہ کسی بری کو متہم کیا جائے اور کسی مخلص کو بددیانت بتایا جائے۔ اس موقعہ پر میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور میں نے چیخ کر کہا:۔

"اے بدبختو! غفلت وجہالت کے اندھیرے میں کب تک بھٹکتے رہو گے؟ تمہیں سیاسیات کے میدان میں اترے ہوئے برسوں گزر گئے۔ مگر تم اب تک راہنما اور راہزن میں فرق نہیں کر سکے۔ کیا غضب ہے کہ تم بندۂ غرض کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتے ہو اور اپنے مخلص قومی خدمت گزاروں پر لعن وطعن کرنے لگتے ہو کیا اس غلط طرز عمل کا نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ تمہارے طعن وتشنیع کے تیروں سے ان کی ہمتیں مجروح ہو جائیں اور ملک ان کی قابل قدر خدمات سے محروم رہ جائے گا"۔

میرے ان ناصحانہ کلمات کا جواب انہوں نے سب وشتم کے ساتھ دیا۔ اور ایک صاحب نے آگے بڑھ کر دھکوں اور مکوں سے میری تواضع شروع کر دی اور میں بمشکل ان کے ہاتھوں سے رہائی پا کر چکنا چور اپنے گھر واپس آیا۔

میں ایک ضروری تقریب میں شرکت کیلئے تیز قدمی کے ساتھ چلا جا رہا تھا کہ راستہ میں ایک صاحب سے مڈ بھیڑ ہو گئی جنہیں شاعری کا خبط تھا۔ انہوں نے مجھے روک لیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کا ایک تازہ قصیدہ سُن لوں جو انہوں نے کسی نواب کی بچی کے کن چھیدن کی تقریب میں قلمبند کیا ہے۔ میں ان کے تازہ اور باسی کلام کے مزہ سے اچھی طرح واقف تھا، لہٰذا ان سے ادب کے ساتھ معافی چاہی۔ مگر انہوں نے معافی قبول نہ کی۔ مجبوراً میں ان کے حکم کی تعمیل کیلئے رہگزر سے ہٹ کر ایک گوشہ میں کھڑا ہو گیا اور ان کا قصیدہ سننے لگا۔ انہوں نے ترنم کے ساتھ اپنا قصیدہ پڑھنا شروع کیا جس کا ایک ایک شعر میرے لئے زہر کے ایک ایک گھونٹ کی طرح تھا۔ کاش وہ کسی طرح یہ جام زہر مجھے ایک دم پلا دیتے تاکہ میں اس مصیبت سے جلد رستگاری حاصل کر سکتا۔ مگر ان کی یہ حالت تھی کہ وہ ہر شعر سنانے کے بعد، داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھتے اور دیر تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہتے تاکہ میرے چہرہ کی شگفتگی سے اپنے شعر کی دلکشی پر استدلال کر سکیں۔ لیکن جب وہ میرے چہرہ پر تلخی کے آثار پاتے تو سمجھتے کہ یہ وہی تلخی ہے جو بادۂ کہن کے تلخ جام لنڈھانے والوں کے چہرہ پر نمودار ہونا ضروری ہے۔

غرض اسی طرح انہوں نے تقریباً پچاس شعر سنا ڈالے۔ اس کے بعد وہ رُک گئے اور کہنے لگے میرے قصیدہ کا پہلا بند تو ختم ہوا۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا اور کل کتنے بند ہیں؟ مُسکرا کر بولے صرف دس۔ جن میں سے کوئی پہلے سے چھوٹا نہیں ہے۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے کہا جناب والا مجھے معاف کیجئے آپ کے شعر سراسر بیہودہ ہیں اور ان دونوں سے زیادہ بیہودہ آپ کی بھونڈی آواز ہے اور ان سب سے زیادہ بیہودہ میرے متعلق آپ کی یہ بدگمانی ہے کہ میں اس درجہ بدذوق ہوں کہ آپ کے ان لغو شعروں کو سننے کی خاطر اپنے اس اہم کام کو قربان کر سکتا ہوں جس کے لئے میں گھر سے نکلا ہوں۔

میری یہ تنقید شاعر صاحب کو نہایت ناگوار گذری۔ انہوں نے تان کر ایک گھونسہ میرے سینہ پر مارا۔ میں نے بھی گھونسہ کا جواب گھونسہ سے دیا اور ہم دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ میرے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ موقعہ پا کر میں نے اسے تاک کر ان کی کھوپڑی پر رسید کیا۔ واللہ میرا مقصد بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ میں اس بدمذاقی کے مرکز کو تباہ کر دوں۔ لاٹھی پڑتے ہی شاعر صاحب چکرا کر زمین پر گرے اور ان کے ہاتھ سے اشعار کا بلندہ بھی چھوٹ کر الگ جا پڑا اور میں نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر فوراً اس کا تیا پانچہ کر دیا۔ تاکہ میں اور دوسرے سلیم الطبع اشخاص، ہزلیات کی اس پوٹ سے نجات پائیں۔

قریب ہی ایک سپاہی اپنی ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ مارپیٹ سے فراغت کے بعد وہ ہم دونوں کو پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔ مجھ پر ضرب شدید اور شارع عام پر بیجا اجتماع کرنے کے الزام میں مقدمہ چلا اور جیلخانہ بھیج دیا گیا۔ اب جیل خانہ ہی سے میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔

اے صاحب نظرات! از راہ کرم میری رہنمائی کیجئے اور سچ کے متعلق اس بدگمانی کو جو میرے دل میں پیدا ہو گئی ہے دور کیجئے پانچ موقعوں پر میں نے سچ کا تجربہ کیا، نتیجہ بجز مفلسی، خانہ بربادی، تہمتِ غداری اور الزام فسق کے کچھ نہ نکلا اور یہ نت نئی مصیبتیں اور رنگ برنگے عذاب جو میں آج اس تنگ و تاریک قیدخانہ کی کوٹھری میں بھگت رہا ہوں ان پر مستزاد ہیں۔

اے مظلوم قیدی! خداوند تعالیٰ تمہاری مصیبتیں دور کرے اور تمہیں راہ ہدایت دکھائے۔ تمہارا خط ملا جس میں تم نے سچ کی خاطر جو مصیبتیں سہیں اور پھر ان کی وجہ سے جو بدگمانی تمہارے دل میں پیدا ہوئی، اسے بیان کیا ہے۔

عزیز من، مصائب و نوائب کے جھگڑوں میں اپنی عقل کو اڑا دینے اور رنج و الم کے طوفان میں اپنی بصیرت کو ڈبو دینے سے تمہیں احتراز لازم تھا۔ دنیا میں تم پہلے راست گو نہیں ہو جسے وادیٔ صدق کی بادیہ پیمائی میں اس آبلہ پائی سے واسطہ پڑا ہو۔ اگر تم "حسن اخلاق" کا مفہوم صحیح طور پر سمجھتے اور اس کی تلخی پر صبر کرتے تو تم اس میں وہ شیرینی پاتے جو کہیں میسر نہیں ہو سکتی۔ حسن اخلاق، معاش کے وسائل میں سے کوئی وسیلہ یا آرام کے ذرائع میں سے کوئی ذریعہ نہیں۔ وہ نفس انسانی کے مدارج میں سے ایک درجہ ہے جس کو طے کرنے کے بعد، انسان انسانیت کے بلندترین منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ جو شخص حسن اخلاق کا یہ مطلب سمجھتا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنی دولت کو ترقی دے، یا اپنے آرام میں اضافہ کرے، وہ اس کی توہین کرتا ہے۔ اور اسے تاجر کے سامان اور سوداگر کے اوزار کے ہم رتبہ قرار دیتا ہے۔

یہ غلط نظریہ ہے کہ انسان اپنی خوشحالی کو اخلاق کی میزان قرار دے، اگر اس کی زندگی خوشگوار ہے تو وہ اپنے اخلاق کو قابل اطمینان سمجھے اور اگر زندگی تلخ ہے تو اپنے اخلاق کو ناقص باور کرے۔ ہم نے بہت سے فضلاء کو ٹھوکریں کھاتے اور بہت سے جہلاء کو گلچھرے اڑاتے دیکھا ہے۔ کوئی "بلند اخلاق" اپنی من مانی راحت حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ عوام کے دل میں محبت اور عزت کی جگہ حاصل نہ کر لے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ ایسی قوم میں زندگی بسر کرتا ہو جو حسن اخلاق کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو، اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ وہ محاسن اخلاق سے متصف ہوں حالانکہ دنیا میں اکثر جاہل بستے ہیں جو اخلاق کا نام بھی نہیں جانتے۔ وہ ہر بلند اخلاق کے دشمن ہیں کیونکہ وہ ان کی خواہشات پر لبیک نہیں کہتا، اور ہر پست اخلاق کے دوست ہیں کیونکہ وہ ان کی ہر صدائے بے ہنگام کی ہمنوائی کرتا ہے۔

ضروری ہے کہ راست گو کا سینہ اس قدر وسیع ہو کہ زندگی کے ہر قسم کے آلام و افکار کی اس میں سمائی ہو سکے۔ اور اس کا دل اسقدر مضبوط ہو کہ دنیا جہاں کی دشمنی کا تحمل کر سکے، بلکہ اصلاح نفوس اور تہذیب اخلاق کے مقدس مقصد کی خاطر اپنی جان تک بھینٹ چڑھا دے جس طرح ایک سپاہی دشمن پر فتح پانے کیلئے اپنی گردن کی بازی لگا دیتا ہے۔

سچائی ایک پُر فضا باغ ہے جس کے چاروں طرف مصائب کے کانٹوں کی باڑ بندھی ہوئی ہے، اگر کسی کو اس گلشن میں داخل ہونا ہے تو اسے ان کانٹوں سے الجھنے کیلئے تیار ہونا چاہیئے۔ جس طرح انبیاء و اولیاء، اور انسانی سوسائٹی کے مصلحین الجھے ہیں۔

جس طرح بخشش کا نتیجہ فقر ہے۔ بہادری کا نتیجہ موت ہے، اسی طرح فضیلت کی راہ میں بھی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں، اور اس تک صرف وہی لوگ پہنچتے ہیں، جو ثابت قدم اور بلند ہمت ہوں۔ چنانچہ سچائی کی راہ میں بھی ایک سنگ گراں موجود ہے، اور وہ سنگ گراں ہے۔ جھوٹوں سے مقابلہ و مخالفت، جن کی دنیا میں اکثریت ہے

اے شخص کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں راست گو کا اعلیٰ ترین لقب حاصل ہو جائے، اور تم شرف و عزت کی بلندیوں پر جلوہ افروز ہو جاؤ۔ لیکن تمہیں اس کی کچھ قیمت نہ ادا کرنی پڑے۔ اگر تمہاری یہ خواہش ہے تو تم نے سچائی کی بڑی بیقدری کی اور اس کا مرتبہ بالکل نہ پہچانا۔ کیا تمہیں تجارت کی تباہی، گھر کی بربادی، الحاد کے اتہام اور غداری کے الزام کا رنج ہے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ راستی کی عزت حاصل کرنے کیلئے تم نے یہ قیمت زیادہ ادا کی ہے، حالانکہ تم سے پہلے فضلاء اس عزت کے حاصل کرنے کیلئے اس سے زیادہ قیمت ادا کر چکے ہیں اور انہوں نے اس سودے کو مہنگا نہیں سمجھا۔

اے محترم قیدی!

قید کی جو تکلیفیں تم برداشت کر رہے ہو اور دشمن کی جو اذیتیں تم سہہ رہے ہو، تمہیں مبارک ہوں کہ تم میری نگاہ میں بہت سے ان لوگوں سے ارفع ہو جو خود کو خوش نصیب و باعزت گردانتے ہیں۔ "کاسمی" پر ظلم نہ کرو اور اس سے بدگمانی نہ برتو بلکہ اس کے بیج کو اپنے دل کے بہترین گوشہ میں جگہ دو اور کچھ عرصہ انتظار کرو۔ راستی کا یہ پودا پھلے پھولے گا اور بار آور ہوگا۔ اور پھر اس کے ثمر شیریں سے تمہیں وہ حظ حاصل ہوگا جو ہفت اقلیم کے بادشاہ اپنی سلطنت لٹا کر بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

(مصطفیٰ لطفی المنفلوطی مصری)

زین العابدین سجاد میرٹھی

ہاتھ کو ہوں ہاتھ کہتے یوں کہے ہے وہ آ
یہ ہاتھ کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
میر

غزل

جنونِ عشق لے آیا ارے ظالم کہاں مجھ کو
نظر آتی ہے اپنی زندگی اِک داستاں مجھ کو

بلائیں لاکھ صبح و شام کی رعنائیاں مجھ کو
کہا جائے جسے دل، اب میسّر ہے کہاں مجھ کو

اِسے تدبیر سے نسبت؟ اِسے تقدیر ہی کہیے
دکھائے زندگی کی ہر روش ناکامیاں مجھ کو

قسم اِن بستیوں سے تو کہیں بہتر تھے ویرانے
مِلا ہے کچھ نہ کچھ اکثر سکونِ دل جہاں مجھ کو

عبث، بدلے ہوئے موسم کی دلکش چاندنی راتیں
جو بہلائیں نہ تیری یاد کی رنگینیاں مجھ کو

یہ ناکامی کے بعد احساسِ ناکامی کے ہنگامے
عطا کر دی ہے گویا دولتِ کون و مکاں مجھکو

یہ دُنیا کس طرح سمجھوں کہ دل والوں کی دُنیا ہے
ہنسی ہے بارہا جو دیکھ کر ناکامراں مجھ کو

یہ صورت، آنسوؤں کو زیست سی تعبیر کرتا ہوں
یہ حالت ہونگی کچھ ایسی ہی تو مجبوریاں مجھ کو

سحرؔ، جذبات کا مندر ہے اور حالات کی پوجا
نہ "ربطِ باغباں" مجھ کو نہ "خبطِ آشیاں" مجھ کو

سحرؔ رامپوری

غزل

قریب اپنے بُلایا بھی کچھ کہا بھی نہیں
مجھے عزیز بھی رکھتا ہے۔ جانتا بھی نہیں

تعلقات کی احباب کو ہوا بھی نہیں
وہ میرے پاس نہیں ہے مگر جُدا بھی نہیں

مدارِ کیفِ محبّت ہے بدگمانی پر
وفا وفا بھی نہیں ہے جفا جفا بھی نہیں

جو ہے تو ہر نگہِ التفات بے معنیٰ
نہیں۔ تو حُسنِ نوازش کی انتہا بھی نہیں

کبھی یہ طرزِ تکلّم کہ "ہم تمہارے ہیں"
کبھی وہ شانِ تبسّم کہ واسطا بھی نہیں

زمانہ "اپنی" نظر بازیوں کو کیا جانے
وہ سامنے نظر آتا ہے۔ سامنا بھی نہیں

یہ احتیاطِ محبّت کہ جاننے والے
سمجھ رہے ہیں کہ وہ مجھ کو جانتا بھی نہیں

وہ حال جس میں تڑپنے سے چین ملتا ہے
یقیں ہے آپ نے دیکھا تو کیا سُنا بھی نہیں

گزر رہی ہے جو گزری ہے دل پہ کیوں مانو
ثبوت اب بھی نہیں ہے ثبوت تھا بھی نہیں

عبث کرم کی امیدیں بندھا رہا ہے جہاں
مجھے تو اب ستمِ دوست کا گلا بھی نہیں

اسے جنون سمجھ لو کہ بیخودی کہہ لو
صدائے دید لگاتا ہوں آسرا بھی نہیں

مری نگاہ کے پلکے پہ بس نہیں میرا
یہ چاہیے تھا کہ میں ان کو دیکھتا بھی نہیں

نئی بیاضِ طلب کی گئی ہے مجھ سے شادؔ
یہ طرزِ پرسشِ حالات کچھ بُرا بھی نہیں

شادؔ عارفی

جلوہ

نوشہ یا کسی دوسرے کے محسوسات سے مجھے بحث نہیں۔ تمام دن میں انتظام کا "خوشگوار فریضہ" ادا کرتا رہا تھا۔ اور خود کو سموسوں کی طرح خستہ، اور کباب کے گوشت کی طرح کچلا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ کیا بتاؤں کہ کسی تقریب میں اس قسم کی ذمہ داری کس دردسری اور بےلطفی کا مزہ چکھاتی ہے؟ میں نے بڑی دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے، صرف کھانے کی سربراہی اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ لیکن مجھے کئی چیزوں کا خیال رکھنا پڑا۔ برتن ٹوٹنے نہ پائیں۔ میٹھے کی طشتریاں دسترخواں تک پہنچنے سے پہلے خالی نہ ہو جائیں، بچی ہوئی بریانی اور میٹھا اس صفائی سے جمایا جائے کہ کھانے والوں کو پتہ نہ لگے اور آپ جانئے پانچسو آدمیوں کا انتظام ہو تو سات آٹھ سو سے زیادہ حضرات "قدم رنجہ" اور تناول ماحضر سے خود ممنون و مشکور ہوتے ہیں۔ اور "المکلّف" کو چھوڑ کر منتظم دسترخوان کی جان کھاتے ہیں۔ اور کوئی کس کس کی زبان روکتا پھرے۔ چھوٹے سے لیکر بڑے تک ہر ایک کچھ نہ کچھ خرابی نکال سکتا ہے "بریانی کو داغ لگ گیا۔" "میٹھے کو زیادہ تاؤ آگیا۔" "سموسے تو آئے ہی نہیں۔" "ذرا گوشت، اور گرم گرم" غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ سنئے اور سر دھنئے۔ سچ کہتا ہوں، اگر دوستی کا سوال بیچ میں نہ ہوتا تو دیگوں کو چولھے میں جھونک کبھی کا بھاگ کھڑا ہوتا۔ تعجب ہے میری بھی عقل کہاں چرنے گئی تھی کہ اپنے دولھا دوست کی بات نہ مانی۔ وہ بیچارا لاکھ سمجھاتا رہا کہ "بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ دوستوں میں لطف آئے گا۔ کہاں کا دردِ سر مول لے رہے ہو۔" لیکن اپنے خلوص اور کام کا ثبوت دینا بھی ضروری تھا۔ اسی جوش نے کسی کے مشورے کو خاطر میں نہ لانے دیا اور آپ سے کیا چھپائیں۔ اس خبر کی تصدیق بھی منظور تھی کہ "جس کسی کا انتظام کھانے پر ہو۔ اس کی قسمت کے کیا کہنے!" یہاں یہ مغالطہ نہ پیدا ہو کہ خدانخواستہ اس دن میں نے اپنے لئے کچھ مراعات برتی ہوں گی۔ میرا تو وہ حال ہوا کہ دریا میں تنہا اور پیاسا۔ لوگوں کو ہاتھ اور منہ چلاتے اور بڑی بڑی ذخائر دیگوں کو خالی ہوتے دیکھ رہا تھا۔ ایک قسم کی گھٹن سی ہونے لگی اور سوائے دو چار سموسوں کے کوئی دوسری چیز حلق سے نہ اتری۔

دو چار دسترخوانوں کا انتظام تو واقعی بڑی مستعدی سے کیا۔ ہر شخص ڈکار کے ساتھ، مبارکباد، اور ماشاءاللہ کہتا اور حسن انتظام کی داد دیتا۔ لیکن ادھر ادھر کی دھوڑ دھوپ، اٹھک بیٹھک، اور لانے لیجانے سے جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگا۔ میں نے لاپروائی برتنی شروع کی کسی دسترخوان پر بریانی پہنچی میٹھا نہ پہنچا۔ اور بعض جگہ تو نہ بریانی نہ میٹھا۔ صرف سالن کے کٹورے دھرے رہ گئے۔ میں کیا کرتا۔ قصداً یا شرارتاً تو انتظام سے بددل نہ ہوا تھا۔ دو چار آدمی اور آ گئے، انہوں نے میرا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ اور دعوتی ہر طرح مطمئن تھے۔ لیکن میں بالکل برداشتہ خاطر تھا۔ گانیوالی کو ایک نظر دیکھ چکا تھا۔ اب اس کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ سوچا کہ اس وقت تو مجھے محفلِ رقص و سرود کا انتظام کرنا چاہیئے۔ یہاں کیوں مکھیاں مارتا بیٹھوں۔" دوسروں کو ہدایت دیتا ہوا "ابھی آیا" کہہ کر میں اس کمرہ کی طرف چلا جہاں چمچوں اور رکابیوں کی جھنکار کے بجائے، پائل، نغموں اور قہقہوں کی گونج تھی۔ دروازہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دوست احباب اندر بلا رہے تھے۔ کہ..... دولھے کے والد پاس سے گزرے۔ "کون تم ہو۔" انہوں نے رک کر پوچھا۔ "جی ہاں۔" میں نے بےلبسی کے انداز میں کہا۔ "ارے بابا۔ ذرا ڈٹے رہو انتظام پر۔ یہی تو وقت ہے۔ چلو۔ اب تم اندر گئے تو باہر نہ نکل سکو گے۔" میں غم و غصہ میں بھرا ہوا بغیر کچھ جواب دئے پھر سے اپنی انتظامی قابلیتوں کا مظاہرہ کرنے لگا۔ خدا خدا کرکے مردانہ کا انتظام ختم ہوا۔ زنانہ سے "دسترخوان بھیجو" کی "آہ و بکا" بلند ہونے لگی۔ میں نے سوچا "عورتیں پکانے کھلانے میں مشاق ہوتی ہیں۔ چٹ پٹ سربراہی ہو جائے گی۔ لیکن توبہ کیجئے اس نے تو وہ طول کھینچا کہ میں بوکھلا گیا۔ دسترخوان پہ دسترخوان بچھ رہا ہے اور پوچھئے تو یہی کہا جائے گا کہ "ابھی تو بچھے ہی نہیں

اٹھے۔" شاید دو دو چار چار دفعہ کیلئے کھانا محفوظ کر لیا جاتا ہوگا۔ بہر حال میں نے سارا انتظام اپنے شرکاء کے سپرد کیا اور ایک کونہ میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھ گیا۔ اتنے میں خود دولھے میاں تشریف لائے۔ میں نے انہیں نزدیک بلا کر کہا۔ "میں اگر مرجاؤں تو مجھے اس چولھے کے نیچے دفن کرنا۔" "ارے! کیا بہت تھک گئے ہو۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے موٹر منگوائی اور مجھے دولھے والوں کے مکان میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے جاتے ہی بستر کا رُخ کیا اور لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔

اتنے میں ایسا سنائی دیا۔ جیسے بہت غل شور ہو رہا ہو۔ باجے بج رہے ہوں۔ کسی نے میرا پیر بھی کچل دیا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر خیال آیا شاید خواب دیکھ رہا ہوں اور آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ تھوڑی دیر بعد کروٹ بدلنی چاہتا ہوں تو ساتھ ہی ایک صاحب لیٹے ہوئے ہیں۔ بہت چکرایا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو کئی بستر لگے ہوئے ہیں۔ سمجھ گیا کہ برات آچکی ہے اور براتی سونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ سونے کی تکلیف ہر تقریب میں ہوتی ہے۔ تاوقتیکہ کافی اہتمام کے ساتھ نہ جائیں کسی کروٹ چین نہیں آسکتا۔ میں نے پاس لیٹنے والے صاحب سے کہا۔ "مہربان۔ ذرا کھسک جائیے۔" کہنے لگے "دو گھنٹے کا تو معاملہ ہے، یوں آنکھ جھپکتے صبح ہو جائے گی۔ سو رہیئے۔" میری یہ عجیب عادت ہے کہ بستر پہ کوئی دوسرا ہو تو نیند آتی ہی نہیں میں پیچ و تاب کھاتا۔ اسی طرح لیٹا رہا۔ پاس لیٹنے والے صاحب کے خراٹے نوبت کی طرح سمع خراشی کرنے لگے۔

میں جس جگہ لیٹا ہوا تھا وہ عین زنانی دروازہ کے سامنے تھی۔ مجھے ایسا سنائی دیا۔ جیسے دو تین عورتیں آہستہ آہستہ باتیں کر رہی ہوں۔ میں نے اپنے کان اس آواز پر لگا دئے۔ ایک عورت نے کہا۔ "اب سو بھی رہو۔"

پہلی عورت کی آواز تھی۔ "نہیں۔ تو جا۔ مردانہ سے روشن کرا لے۔"

دوسری آواز — "میں اکیلی۔ اتنی رات گئے نا بابا۔"

پہلی آواز — "جا تجھے میری قسم ہے۔ بغیر اس کے کام نہ چلے گا۔"

پیٹرومکس گُل ہو چکا ہے شاید۔ میں نے اندازہ لگایا۔ اتنے میں زنانی دروازہ پر چوڑیاں بجیں۔ میں نے اپنے اطراف سونے والوں کو دیکھا۔ سب سو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ "کوئی ہوشیار ہے؟" ہمارے براتیوں کے خراٹے اس سوال کا جواب دے رہے تھے۔ میں چپ سادھے لیٹا رہا۔ پھر پکارا گیا "اے۔ اے۔" اب تو میرے بھی کان کھڑے ہوئے۔ میں نے جمائی لی۔ "کون ہے؟" کہہ کر دروازہ کے قریب گیا۔ "کیا چاہیئے؟" میں نے درشت لہجہ میں پوچھا۔ "ذرا دروازہ کھولئے۔" — "کیوں؟" میں نے لہجہ کی درشتی بدستور قائم رکھی۔ "پہلے کھولئے تو۔" ایک خاص انداز سے کہا گیا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ موتیا کی خوشبو اور ہوا کی خنکی، مجھے کہیں سے کہیں لے اڑی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سینے میں کوئی شعلہ بھڑک اٹھا ہو۔ چوڑیاں بجیں، پھر دانتوں کی چمک دکھائی دی "یہ . . . ذرا روشن کر دیجے۔" میں دم بخود اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں . . . میرے دل کو برما رہی تھیں۔ "وہ کہاں؟ — کدھر؟" کہتا ہوا میں قصداً اس کی طرف بڑھا۔ "ادھر۔ اُدھر۔ سیدھے ہاتھ کی طرف" اس نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ میں نے پوچھا۔ "اندھیرے سے گھبراتی ہیں آپ" "نہیں"۔ "مجھ سے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ کہنے لگی۔ "آپ سے بھی نہیں۔" میں نے پٹرومکس پکڑنے کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ چوڑیوں کی جھنکار ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، ایک نے کروٹ بدلی باقی سب سو رہے تھے۔ "اسے روشن تو کر دیجے۔" میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میرے دل میں گھی کے چراغ سلگ رہے تھے۔ میں لرز رہا تھا۔ پٹرومکس کا ایک اوزار ابھرانا چاہتا تو دوسرا ہاتھ کو آتا۔ اسپرٹ ڈالتا رہا تو بس ڈالتا ہی رہا۔ بڑی مشکل سے پٹرومکس روشن ہوا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے اوپر اٹھایا۔ بجلی سی مجھ پر گری۔ چند رضائیوں میں سے دبے ہوئے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ میرے ہاتھ سے پٹرومکس چھوٹنے کو تھا۔ کہ چوڑیوں کی جھنکار ہوئی۔ دانتوں کی چمک دکھائی دی۔ اور میرے ہاتھ سے پٹرومکس لے لیا گیا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے پٹرومکس پھٹ گیا ہو اور سارے کمرے میں دھواں

ہی وہیں ڈھیر ہو گیا ہے بہت دیر کے بعد کچھ سوچنے کے قابل ہوا۔ سب سے پہلا خیال اس ماما کا تھا جو دروازہ میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ گال پچکے ہوئے۔ مدقوق۔ عمر رسیدہ۔ اس عرصہ میں میرے ساتھ بیٹھنے والے صاحب پورے بستر پر قابض ہو چکے تھے۔ میں وہیں زمین پر لیٹ گیا۔ شاید بیہوش ہو چکا تھا۔

رشید احمد قریشی

(حیدرآباد)

اصلاح

"پولینڈ کی زیادتی کی جارہی آبادی"

پنجاب کے اردو اخبارات میں حال استمراری کا یہ غلط استعمال عام ہو رہا ہے۔ اس سے عبارت بدنما ہو جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر کوئی فارسی ترکیب اس معنی کو بہت خوبی سے ادا کر سکتی ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا فقرے کی بجائے یوں کہا جا سکتا ہے۔

پولینڈ کی پامال آبادی۔ پولینڈ کی مظلوم آبادی۔ پولینڈ کی ستم رسیدہ آبادی۔

تاجور

شام

دن ختم ہو چکا ہے اور شام ہو گئی ہے
شورش خموشیوں کے دامن میں سو گئی ہے

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کیا گنگنا رہے ہیں
گزری مسرتوں کے دن یاد آ رہے ہیں

دن بھر کی کلفتوں پر ہے راج خامشی کا
دنیا کو مل رہا ہے پیغام آشتی کا

صحنِ چمن پہ طاری اک وجد ہو گیا ہے
فطرت کا ذرّہ ذرّہ نشے میں کھو گیا ہے

پھولوں پہ اک فسوں ہے، کلیاں چٹک رہی ہیں
کلیاں چٹک رہی ہیں، چڑیاں چہک رہی ہیں

اک ایک شے جہاں کی مستی میں کھو گئی ہے
نغماتِ شام سُن کر مدہوش ہو گئی ہے

اثر چکوالی بی۔اے

غزل

غم کا گماں یقینِ طرب سے بدل گیا احساسِ عشق حُسن کے سانچے میں ڈھل گیا

ساتھ ان کے لے رہا ہوں میں گلگشت کے مزے یہ خواب ہی سہی مرا جی تو بہل گیا

مجبورِ عشقِ چشمِ فسوں ساز سے ہوں میں جادُو مجھی پہ دوست کا چلنا تھا، چل گیا

میں انتظارِ عید میں تھا عید آ گئی ارمانِ دید دامنِ عشرت میں پل گیا

ہے برقِ جلوہ یاد مگر یہ نہیں ہے یاد خرمن مرے غُرور کا کس وقت جل گیا

پیمانِ عشق و حُسن کی تجدید کے سوا جو بھی خیال ذہن میں آیا نکل گیا

بڑھتے چلے ہیں آئے دن اسبابِ اضطراب یادش بخیر آج کا وعدہ بھی ٹل گیا

منظور کس زباں سے بُتوں کو بُرا کہیں
ایماں ہمارا کفر کے دامن میں پل گیا

علی منظور (حیدرآبادی)

تیتروں کی پالی

ایک شخص:۔ (پنواڑی سے) چھوٹے خاں اچھے تو ہو؟

پنواڑی:۔ وعلیکم السلام گلاب بھائی۔ کہئے۔ پان چاہیئے یا سگریٹ؟

گلاب:۔ سرگیٹ؟ سرگیٹ تو بھائی بڑے آدمی "پیا کرتے ہیں"۔ ہمیں تو دھیلے کا پان اور دھیلے کی بیڑیاں دیدو۔ مگر جرا (ذرا) جلدی سے۔

پنواڑی:۔ اجی ابھی لو۔ مگر اتنی جلدی کاہیکی ہے۔ خیر تو ہے؟

گلاب:۔ (ایک دوسرے شخص کو جاتا دیکھ کر) ارے گابوخاں؟ ... چچا ٹھہرنا۔ میں بھی چل رہا ہوں (پنواڑی سے) چھوٹے خاں دینا ... بیڑیاں بھی جلدی سے دیدو۔

پنواڑی:۔ (گابوخاں کو آتا دیکھ کر) آئیے آئیے گابوخاں۔ اب تو آپ کے درشنوں کے بھی ٹوٹے پڑ گئے۔

گابوخاں:۔ کون ہے بھئی؟ .... (منہ اونچا اٹھا کر غور سے) چھوٹے خاں ہیں کیا؟ اب تو آنکھوں سے بھی کم دکھائی دینے لگا۔

پنواڑی:۔ کہو چچا۔ "مجاز" تو اچھے ہیں؟

گابوخاں:۔ ہاں بیٹا۔ سکر ہے کھُدا (خدا) کا جس حال میں رکھے۔ بے روجگاری نے مار رکھا ہے۔

پنواڑی:۔ (آہستہ سے) گلاب بھائی۔ بے روزگاری۔ بڑھاپا۔ پیروں سے چلا نہیں جاتا۔ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔

گلاب:۔ (پنواڑی کے کان کے قریب منہ لا کر) مگر تیتر بازی ہے کہ کسی طرح نہیں چھوٹتی۔

پنواڑی:۔ گویا گندے نالے کے بھوت کی طرح چمٹی ہوئی ہے۔

گلاب:۔ (بلند آواز سے) ہاں صاحب۔ یہ بات تو اگلے وَخت (وقت) کے آدمیوں میں ہی دیکھی۔ ہڈیاں کیا ہیں جرمنی فولاد ہیں۔

پنواڑی:۔ ارے میاں یہ مکھڑے بھی اب قصے اور کہانیاں بنکہ رہ جائیں گے۔ (گابوں خاں سے) چچا .... پان کھاؤ گے؟

گابوخاں:۔ پان؟ ہوہنہ! بارہ اور بارہ چوبیس برس ہو گئے جب سے دانت ٹوٹے ہیں تو پان اور پان کے مزے دونوں سے مرحوم (محروم) ہیں۔

گلاب:۔ خیر۔ تو یہ لو بیڑی پیئو۔

گابوخاں:۔ ارے بیٹا۔ یہ بیڑی سرگیٹ تو جب سے پھرنگی (فرنگی) آئے ہیں۔ جب سے پیدا ہو گئے ہیں۔ ورنہ گدر (غدر) ہوا تھا نا گدر۔ اس کے بھی بیسیوں سال بعد تک کوئی مد کوڑی کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔ ہمارے باپ نے سدا حُکہ (حقہ) پیا اور سرگیٹ بیڑی کو کدی (کبھی) منہ نہ لگایا۔

گلاب:۔ اب "حُکہ" تو وہیں۔ پالی میں چل کر پئیں گے۔

پنواڑی:۔ پالی؟ پالی کیسی؟

گلاب:۔ آج نباب صاب کے ہاں تیتر لڑیں گے نا۔ ان کے ہاں پالی میں "حکّے" کی تو بس بہار ہوتی ہے۔ ہیں تو آکھر (آخر) کو وہ بھی پرانے کھاندان (خاندان) سے۔ اور وہ بھی نباب!

پنواڑی:۔ کون؟ نواب ظفر جنگ؟ ان کے ہاں پان میری ہی دوکان سے تو جاتے ہیں۔ مگر صاحب۔ تیتر بازی بھی انہیں کے دم سے دکھائی دے رہی ہے۔ جس دن ان کی آنکھ بند ہوئی۔ اُس دن تیتر بازی کے بھی سو برس پورے ہوئے سمجھو۔

گابوخاں:۔ گلاب۔ میں نے سنا ہے تمہارا تیتر نباب صاب کے تیتر سے لڑ رہا ہے؟

گلاب:۔ ہاں چچا۔ جوڑ تو پچھلے جمع (جمعہ) کو بندھ گئی تھی۔ اب کرے سو مولا ......!

گابوخاں:۔ چھوٹے خاں دیکھا۔ اسے کہتے ہیں آنکھ دیکھے مکھی کھانا۔ (گلاب سے) بندۂ کھُدا۔ (بندۂ خدا) ..... وہ رئیس لوگ

ٹھیرے اپنے تیتر کو سونے کا نوالا کھلانیوالے اور ویسے بھی اُن کا تیتر چار پانچ بازیاں بڑھا ہوا ہے اور تمہارا ہے ابھی کورا بیٹھا۔

بنواڑی:۔ گابو خاں۔ اُس تیتر کی تو شہر بھر میں جوڑ نہیں مل رہی تھی میاں گلاب نے بھی زبردستی ٹانگ اڑا دی۔

گلاب ۔ ارے میاں۔ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔

بنواڑی ۔ میاں کس دھوئیں میں ہو۔ دو لاتوں میں انجر پنجر ڈھیلے کر دے گا۔ اُن کے تیتر کا نام بھی ناگ ہے ناگ ۔

گلاب ۔ جی ہاں مر گئے انجر پنجر ڈھیلے کرنے والے!! کچھ ان کے دوسرے تیتر "پستول" نے تیر مارا ہو گا کچھ یہ بہادری دکھائیں گے۔ پتہ بھی ہے۔ بجیر گھاں (نظیر خاں) نے میرے پٹھے کی پھڑک دیکھ کر اس کا نام کیا رکھا ہے؟ نیولا! نیولا! تو جناب وہ بھی اپنے نام کا نیولا ہے۔ دن میں تارے نہ دکھا دے تو بات ہی کیا۔

بنواڑی:۔ نیولے کے وار سے پہلے ہی اگر ناگ نے ڈس لیا پھر تو چودہ طبق روشن ہو جائیں گے نا؟

گلاب:۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ ابھی معلوم ہو جائے گا۔

گابو خاں:۔ ارے میاں وہ کہتے ہیں نا کہ "نائی رے نائی بال کتنے" "ججمان جی آگے آئے جاتے ہیں۔" وہی مثل ہے

گلاب:۔ چچا اب تو چل کر سیر دیکھو۔ پھر کہنا۔

بنواڑی:۔ گلاب بھائی (پلٹ کر) چچا۔ ایک دو منٹ! دوکان بڑھالوں پھر میں بھی چلتا ہوں۔ (مختلف اشیاء و ڈبے وغیرہ اٹھا کر جلدی میں دھڑا دھڑ دھڑا دھڑ اوپر تلے رکھنے لگتا ہے۔)

گابو خاں:۔ نورا بہشتی والے نے پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ کلو فراش سے "پچیس کا پیارا" لڑا لو۔ مگر بس کر گئے بچپنا۔ (بنواڑی سے) چھوٹے خاں۔ دوکان بند کر لی کیا؟

بنواڑی:۔ (دوکان کا دروازہ زور سے بند کر کے) بس چچا چلو۔ چچا چلو چلو چلو بند کر چکا دوکان۔ (روانہ ہو جاتے ہیں)

(نواب صاحب کے ہاں)

نواب صاحب:۔ (آواز دیتے ہیں) ارے ننھے۔ او ننھے مُنن مُنن۔ او مُنن کہاں مر گئے کمبخت؟ بنو۔ بنو۔ ننھے۔ مُنن۔ بنو۔ ننھے۔ مُنن۔ بنو۔ سب مر گئے۔ میاں وزیر علی ذرا جانا۔ برآمدہ کی تپش میں تیتر ٹنگا ہوا ہلکان ہو رہا ہو گا۔ اسے اُتار لاؤ۔ ان نمک حراموں کو تو خیال بھی نہیں ہوتا۔

وزیر علی:۔ بہت بہتر (جاتا ہے)

نواب صاحب:۔ نظیر خاں۔

نظیر خاں:۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے۔ ارشاد؟

نواب صاحب:۔ کہئے۔ آج کی جوڑ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

نظیر خاں:۔ خیال؟ خیال کیسا سرکار یقین ہے کہ ناگ جیتے گا۔

نواب صاحب:۔ اچھا۔

نظیر خاں:۔ جی ہاں۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے۔

نواب صاحب:۔ نہیں بھئی۔ یقین کے ساتھ تو کون کہہ سکتا ہے برابر کی جوڑ ہے۔

نظیر خاں:۔ اللہ اللہ کیجئے سرکار۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے۔ کہاں حضور کا تیتر "ناگ" اور کہاں اُس چنڈو باز گلاب کا "ولبہ"[1] تیتر۔ زمین آسمان کا فرق ہے۔ جی؟ جی ہاں۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے۔

نواب صاحب:۔ نہیں۔ نظیر خاں تم مغالطے سے کام لے رہے ہو۔ (ٹھہر کر) ہمارا تیتر ہار گیا تو بڑی ہیٹی ہو گی۔

نظیر خاں:۔ دشمنوں کے منہ میں خاک سرکار۔ بھلا وہ "نیولا" ہمارے ناگ کا کیا مقابلہ کرے گا۔ ناگ کا! جس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے۔

(وزیر علی تیتر لے کر داخل ہوتا ہے)

وزیر علی:۔ سرکار۔ تیتر حاضر ہے۔

نظیر خاں:۔ میاں ذرا انہیں باہر تو نکالو۔ (پھر نواب صاحب کو دیکھ کر) اللہ حضور کو سلامت رکھے۔

(وزیر علی تیتر باہر نکالتا ہے)

ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔ چشم بد دور۔ کیا پیاری آنکھ پائی ہے اور آنکھ پر ہی کیا منحصر ہے۔ اللہ حضور کو سلامت

---

[1] ولبہ۔ وہ تیتر یا بٹیر جو لڑائی میں پہلے کسی سے ہار گیا ہو۔ یہاں طنزاً کہا ہے۔

سکھے بستوان دُم۔ باریک نوکدار چونچ۔ تیز پنجے۔ خار کیا ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں پاؤں میں تلواریں باندھ دی ہیں۔ اور یہ خوبصورت پر۔ گٹھیلا بدن۔ متناسب اعضا۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ چونچ سے دم تک تصویر ہے تصویر۔

(وزیر علی سیٹی بجاتا ہے۔ تیتر بولتا ہے۔ نظیر خاں تعریف کرتے ہیں)

اہاہا کیا سریلی اور کڑاکے دار آواز پائی ہے۔

مُنّن۔ (جو اس اثنا میں آچکا تھا) ـــ قربان جاؤں۔ اجازت ہو تو ایک عرض کروں؟

نواب صاحب:۔ (ہنس کر) ہیں ہیں ہیں۔ کہو کہو تم بھی کہو۔

مُنّن قربان جاؤں ان پر سے نظر اُتروا کر پالی میں لڑنے کیلئے بھیجئے گا۔

نظیر خاں:۔ بے شک۔ بے شک۔ ہاں سرکار۔ اتنا کرم تو ضرور کیجیے گا۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے۔

مُنّن:۔ ہیں ہیں ہیں قربان جاؤں۔ ہیں ہیں ہیں۔

نبّو:۔ حضور پالی میں تو لوگ جمع ہو چکے ہیں۔ محض سرکار کا انتظار ہے۔

نواب صاحب:۔ اچھا۔ نبّو دیکھو "ناگ" کی نظر اُتروا کر مولوی صاحب سے دم کروا کے پالی میں لے آؤ۔ ہم بھی آتے ہیں۔

(نواب صاحب مسند پر سے اٹھے سب نے بسم اللہ بسم اللہ کہنا شروع کیا اور ساتھ ہو لئے)

(پالی میں ....)

گلاب:۔ (مُنّن کو آتا دیکھ کر) میاں لاؤ نا تیتر کھا مکھا (خواہ مخواہ) دن چڑھ رہا ہے پھر میں نہیں لڑاؤں گا۔ ہاں۔ پہلے سے کہے دیتا ہوں۔ ہاں۔

مُنّن:۔ ابے تو ہے کیا؟ گلا رہا کیوں ہے؟

گلاب:۔ زنراخ کرتا تو میاں ـــــ

مُنّن:۔ ہش چپ۔ سرکار۔ حضور۔ غریب پرور تشریف لا رہے ہیں!

نواب صاحب:۔ کیوں مُنّن؟ کیا ہے؟

مُنّن:۔ قربان جاؤں (گلاب کی طرف اشارہ کر کے) ابھی سے دم گلا جا رہا ہے۔

نواب صاحب:۔ کیوں گلاب؟ کیا بات ہے؟

گلاب:۔ اجی بات یہ ہے جی۔ گریب پرور۔

نظیر خاں۔ خاموش۔ مردود۔ گریب پرور ہو گا تیرا.....

باقی سب:۔ تیرا باپ۔

گلاب:۔ حجور گریب پرور.....

مُنّن:۔ بکواس بند کر نہیں تو.......

نواب صاحب:۔ اُلّو کا پٹھا نہیں تو.....

گلاب:۔ حجور مائی باپ ہیں۔ جی چاہے جو کہیں۔

نبّو:۔ (آ کر) غریب پرور تیتر حاضر ہے۔

نواب صاحب:۔ (گلاب کی طرف اشارہ کر کے) اس سے کہو کہ اپنے "دلبے" کو کھولے۔ نبّو تم مقابل بیٹھو۔

نبّو:۔ جو حکم۔ (نبّو اور گلاب تیتر باہر نکال کر لڑاتے ہیں)

گلاب:۔ (ایک خاص لہجے و خاص الفاظ میں اپنے تیتر کو خود ڈرتے ڈرتے۔ ہمت دلاتا ہے) "آئی ہا، بیٹا" آئی ہاہاہا"

نبّو:۔ (اپنے تیتر کو مخصوص آوازوں میں للکار کر لڑاتا ہے) ات ات ات ات۔ (اس کے تیتر نے دوسرے تیتر کے ایک لات اڑ کر ماری تو کہا) یہ بات ہے۔ ات ات ات

گلاب:۔ شاباش ہے میرا بھائی۔ آئی ہا۔ آئی ہاہاہا۔ آئی آئی۔ آئی ہاہا۔ کیا بات ہے۔ (اپنے تیتر کو جیتتا دیکھ کر ہونٹ چبانے ہوتے) یہ ..... شاباش.... یہ ..... آئی۔

نبّو:۔ (سیٹی بجاتا ہے۔ پھر تیتر کو مارتا ہوا دیکھ کر ہمت دلاتا ہے) اُٹھ جا میرے شیر.... ہوں.... ات ات ات۔

(نواب صاحب کا تیتر دس بارہ منٹ تک خوب مار کھاتا ہے۔) سب خوشامدی حاضرین کے منہ اُتر جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں۔ نواب صاحب کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ ان کا تیتر متواتر منہ کی کھاتا ہے اور گلاب خوشی میں نڈر ہو کر منہ کی آتا ہے۔ ارے شاباش ہے میرے بیوے چبا جا ناگ کو۔ آئی ہاہاہا۔

(نواب صاحب کا تیتر نیم بے ہوشی کی حالت میں ادھ موا ہو کے)

لاتیں کھا رہا ہے۔ نظیر خاں مُنّن کے کان میں کچھ کہتا ہے
ذرا سی دیر بعد منّن لوگوں کی آنکھ بچا کر پالی کے نزدیک چھیچھڑے
پھینک آتا ہے۔ چیلیں اکٹھی ہونی شروع ہوتی ہیں۔ نواب
صاحب کا تیتر نیم بیہوشی کی حالت میں کچھ غور نہیں کرتا۔
اس لئے پالی میں پڑا رہتا ہے۔ لیکن گلاب کا تیتر چیلوں
سے بھڑک کے اُڑ جاتا ہے۔

عام لوگ:۔ یہ تو ڈرا ہے یہ تو ڈر گیا۔ ہارا نہیں قطعی نہیں ہارا۔
بازی پھر ہو گی۔ (لیکن خوشامدیوں نے شور مچا دیا۔ اور ان کی
ایک نہ چلنے دی نظیر خاں بولے)

نظیر خاں:۔ واہ وا واہ۔ کیا خوبصورت کشتی جیتا ہے۔

ایک خوشامدی:۔ بھئی کیا کہنے۔

دوسرا:۔ سبحان اللہ۔

تیسرا:۔ ماشاء اللہ

چوتھا:۔ یہ ناگ ہی کا حصہ ہے کہ مارنے کو بھگا دے۔

پانچواں:۔ ہاں صاحب۔ ایمان کی تو یہی ہے۔

نظیر خاں:۔ ارے میاں تو آخر ہے بھی تو کس کا تیتر؟ نواب صاحب
کی طرف دیکھ کر) اللہ حضور کو سلامت رکھے۔

(نواب صاحب کی باچھیں کھِل گئیں۔ خوشی خوشی اٹھے اور
واپس لوٹ گئے۔ خوشامدی پیچھے پیچھے .....)

نظیر خاں:۔ (کمرے میں پہنچ کر) دیکھا حضور میں نے تو پہلے ہی
عرض کر دیا تھا۔ (منّن کی طرف آنکھ مار کے) اللہ حضور
کو سلامت رکھے۔

نواب صاحب:۔ (مسکرا کر) ہاں صاحب۔ تم نے تو گویا حکماً
جتوایا۔

نظیر خاں:۔ (جلدی سے بولے) اللہ حضور کو سلامت رکھے۔

نواب صاحب:۔ نظیر خاں۔ آج سے تمہاری نگاہ کو ہم مان گئے
کسوٹی ہے کسوٹی۔

نظیر خاں:۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے۔ حضور ہی کی قدردانی
کی دم قدم خیر مناتے گُن گاتے ہیں۔

منّن:۔ مگر قربان جاؤں حضور (قریب آ کر چپکے سے) آجکل نظیر خاں
کچھ پریشان ہیں۔

نواب صاحب:۔ ہاں تو مجھ سے کہا ہوتا؟ لاحول ولا قوۃ ۔
نظیر خاں یہ لیجئے۔ (سَو سَو کے دو نوٹ آگے کھسکا کر) آج
کتنی بڑی خوشی کا دن ہے۔

نظیر خاں:۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے۔ خدا کرے آپ رکھ
رکھ بھولیں اور ہم لے لے بھولیں۔ (رقم لے لیتا ہے۔ منّن
نظیر خاں کو آنکھ مارتا ہے)
اور حضور۔ اس منّن بیچارے کی عمر بھی آپ ہی قدموں میں
گذری۔ آپ ہی کے ٹکڑوں پہ پلا۔ پرسوں اس کے بھائی
کے بیٹے کی ساس کی بہو کے بھتیجے کی بہن کی نند کی شادی
ہے۔ اب یا اللہ کا آسرا ہے۔ یا بس یہ کہ ...... اللہ حضور
کو سلامت رکھے۔

نواب صاحب:۔ منّن بڑا بیوقوف ہے۔ مجھ سے ذکر بھی نہیں کیا۔

مُنّن:۔ قربان جاؤں۔ خود کہتے ہوئے شرم آتی تھی۔ ہیں ہیں ہیں
قربان جاؤں۔

نواب صاحب:۔ اچھا لے۔ (دو تین سو کے کچھ نوٹ کچھ روپیہ
دونوں ہاتھوں سے سمیٹتا ہے)

نظیر خاں:۔ ہاں تو کہو نا۔ آگے بڑھو۔

نواب صاحب:۔ کون ہے نظیر خاں؟

نظیر خاں:۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے۔ یہ ننّو جس نے "ناگ"
کو اپنی جان سے زیادہ عزیز کر کے پالا ہے یہ یہ ....
اللہ حضور کو سلامت رکھے یہ ....

نواب صاحب:۔ ارے ہاں۔ لے لے۔ ننو تو کہاں چھپا بیٹھا
ہے۔ (آگے بڑھ کر وہ بھی مٹھی گرم کرتا ہے)

مُنّن:۔ قربان جاؤں۔ یہ مولوی صاحب سلام کیلئے حاضر ہوئے
ہیں انہوں نے لڑائی سے پہلے تیتر پہ دم کیا تھا۔

نواب صاحب:۔ ہاں ہاں لیجئے مولوی صاحب آگے آئیے۔ (وہ
بھی کچھ نوٹ کچھ روپے اینٹھتے ہیں) اس کے بعد آہستہ
آہستہ سب رخصت ہو جاتے ہیں۔ پھر اسی دن دوپہر کو
کو نظیر خاں کے گھر پر تینوں یعنی منّن۔ ننو۔ اور مولوی صاحب پہنچتے ہیں

ننو:۔ اب آئندہ کا سوچو کہ اگلے جمعہ کو پروگرام کیا ہوگا؟

منّن:۔ ابے ہوگا تب ہو گا۔ آج کی ریزگاری نکال کر پہلے حساب تو کر لو۔
پھر ... کی پھر دیکھی جائے گی۔

شمس الہدیٰ گورگانی بی۔ اے دہلوی

دعوت

دونوں چھوٹے بھائیوں کے بیچ میں اب ہرگز زندگی نہیں گزر سکتی تھی، کیونکہ ان کا بڑا پن برقرار نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے ایک درجن بچوں اور چوتھی جانشین بیوی سمیت صفدر بھائی جان علیحدہ مکان لیکر رہنے لگے تھے۔ والد صاحب سے صرف تین سو روپے نقد لیکر اپنے حق حقوق سے دست بردار ہونا کوئی معمولی ایثار نہیں تھا۔

جس دن ان کا سامان اُٹھنے لگا برادری کے پانچ بزرگ بٹھلائے گئے اور ان کے دونوں چھوٹے بھائی ارشد اور شوکت بھی بمعہ والد بزرگوار موجود تھے۔ بھائی جان نے اپنے پہننے کے کپڑے، تانبے اور پیتل کے چند کٹورے اور رکابیاں، جن پر ان کے دادا کا اسم گرامی بمعہ ولدیت کندہ تھا، ایلومونیم کی چند پرانی اور سیاہ فام دیگچیاں اور وضو کرنے کیلئے کلکتے کی ساخت کا ٹونٹی دار پیتل کا بدھنا، پہلی بیوی کے جہیز میں آیا ہوا بڑی تقطیع کا تفسیر حسینی والا کلام مجید بمعہ ایسی پرانی اطلس کے جزدان کے جو پورے پچیس برس کا ہو گیا تھا اور گرد آلود تھا، اور اس کی رحل حاضرین کو دکھا دکھا کر دوسرے مکان میں منتقل کرایا۔

صرف ان کے لوہے کی دبیز چادر کے ڈیڑھ فٹ اونچے اور ساڑھے چار فٹ لمبے صندوق سے متعلق جس میں علیگڑھ کا چار لیور کا قفل لگا تھا کچھ بدمزگی پیدا ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس میں کچھ نہیں صرف کتابیں بھری تھیں۔ تاہم نامعقول شوکت اور ارشد نے باتفاق رائے احتجاج کیا کہ جب بھائی جان ایک ایک چیز بتا رہے ہیں تو یہ صندوق بھی کھول کر دکھائیں کہ اس میں کیا ہے اور بھائی جان قریب تھا کہ قفل توڑنے کیلئے بیباکھو لوہار کو بلاتے، کیونکہ انکی تمام کنجیاں جو ایک ہی گچھے میں تھیں گم ہو گئیں تھیں لیکن والد صاحب نے ڈانٹ کر کہا ہم کہتے ہیں مت کھولو، رہنے دو، کتابیں ہونگی اور اس بچارے کے پاس کیا دھرا ہے" اس لئے بھائی جان وہ صندوق کھولتے کھولتے رہ گئے۔

اتنے محتاط رہنے کے باوجود، بزبانِ خلق یہی مشہور تھا کہ صفدر بھائی جان نے خاصی رقم دبالی ہے۔ بھائیوں کا حق ہضم کر لیا ہے، اور دیکھ لینا وہ غصب شدہ رقم دھیرے دھیرے نکالیں گے۔

صفدر بھائی جان آبائی دکان میں اپنے والد کا ہاتھ اس زمانے سے بٹاتے تھے جبکہ ارشد اور شوکت "الف الف زبر آ، نون الف زبر نا" آنا" بے الف زبر با نون الف زبر نا بانا" پڑھا کرتے تھے۔ لیکن اب چونکہ وہ دونوں بزعم خویش اس طرح پر فارغ التحصیل ہو چکے تھے کہ باوجود استطاعت، اور وقت ہونے کے صرف انگریزی کا مڈل پاس کر لیا تھا، اور اب چونکہ اس قابل ہو گئے تھے کہ صبح سے شام تک اپنے والد کی دکان پر بیٹھے رہیں۔ اس لئے صفدر بھائی جان نے کمال ایثار سے کام لیا اور الگ ہو گئے۔

۲

کنبے برادری میں یا اہلِ شہر کے ہاں جب دعوت ہوتی تو وہ ضرور جاتے۔ منیر احجام ایک پیسہ لیکر ان کا پورا سر مونڈ دیتا تھا۔ لہذا وہ اپنے گھٹے سر میں روغن ناریل لگا کر اور چگی داڑھی کے ہر ایک بال کو پروان چڑھا کر اور عطر حنا کا ایک پھاہا اپنے کان میں کھونس کر جاتے تھے۔ پھر تنہا ہرگز نہ جاتے، بلکہ شفقتِ پدری سے کام لیکر اپنے جملہ فرزندوں کو، ایک دوسرے کی انگلی پکڑ کر لیجاتے تھے۔ البتہ ہر ایک ننھا برخوردار اس وقت تک دعوت میں شریک ہونے کا مستحق نہ سمجھا جاتا جبتک اس کی نوالہ چبانے والی ڈاڑھیں نہ اُگ آئی ہوتیں۔ یہ ننھی فوج ان کی زیر کمان نہایت خاموش فوجی قدم سے چلتی تھی، کیونکہ طمانچے مار مار کر، بھائی جان نے انہیں سدھایا تھا۔

دعوت میں ہر چند وہ کھاتے لیکن کم کھاتے تھے۔ البتہ اپنی نوخیز امت کو باصرار تمام کھلایا کرتے تھے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے سیدھے ہاتھ کی انگشت شہادت سے "نہیں نہیں"، کہنے کے باوجود منت سماجت سے کسی کو فیرنی کا پیالہ چٹا رہے ہیں۔ کبھی زردے میں کشمش اور بادام چن چن کر کسی کو نگلا رہے ہیں، کسی کے لئے سربراہ کاروں کو بآوازِ بلند مخاطب کر کے گرما گرم پلاؤ یا عمدہ یخنی لانے کی فرمائش کر رہے ہیں، یا اپنے ولیعہد سے کہہ رہے ہیں کہ "تھوڑا سا قورمہ اور لے!"

اس موقع پر منجملہ اور لوگوں کے ان کے دونوں بھائی تبسم آمیز،

قہر آلود، آڑی ترچھی اور کھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگتے اور
پھر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے گھورتے تھے۔ شاید
وہ انہیں چشم نمائی کرتے ہوں، لیکن صفدر بھائی ایک دو دفعہ تو نظریں
چرا لیتے تھے۔ پھر اپنے برادران خورد کی غیر سعادت مندانہ نظروں
کی تاب نہ لاسکتے اور اضطراب کے عالم میں یا تو اُٹھ کھڑے ہوتے۔
یا متواضعین سے زوردار لہجے میں پانی طلب فرماتے، ورنہ اپنی خفگی
ان طشتریوں، قابوں، پیالیوں پر نکالتے جن کی جھنکار بیچارے میزبانوں
کا دل چھوٹا کردینے کا باعث ہوتی اور وہ سہم کر کبھی اپنے برتنوں کو کبھی
ان کو دیکھنے لگتے تھے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ جب یہی نوبت آئی تو صفدر بھائی جان
نے اپنے پانچوں برخوردار کو سرِ محفل چانٹے رسید کئے اور فرمایا۔ کمبخت!
مردود! اور دعوت میں آنے کی ضد کریگا۔ نہیں دیکھتا کہ یہ تیرے چچا نہیں
دشمن ہیں۔ تم لوگ ان کی نظروں میں زہر سے بدتر ہو!" تمام محفل "
"ہائیں"! "ہائیں" کی صدا سے گونج رہی تھی، بھائی جان غیض میں بھرے
ہوئے تھے اور ارشد اور شوکت کی یہ حالت تھی کہ گویا پتھر کے
بن گئے ہوں۔ بُت ہوں، بے رُوح ہوں۔

اس دن وہ راستے میں بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ ساتھ
نہ چلے اور جب ان کا گھر پہلے ملا تو اندر داخل ہوتے ہی اپنی چوتھی ہمدم
و ہمراز بیوی سے باآوازِ بلند فرمانے لگے تاکہ عقب میں آنے والے
بھائی سڑک پر کھڑے ہو کر ان کا لفظ لفظ سُن لیں اور یاد رکھیں۔
"مردودوں نے مجھے گھور گھور کر ادھ موا کر ڈالا۔ جیسے یہ اپنے گھر سے
کھانا لیجا کر کھلا رہے ہوں! کیا مجھے حق نہیں کہ اپنے بچّوں کا فکر کروں؟
ہمیشہ پیچھے ہی پڑے رہتے ہیں۔ اتنی اولاد ہوتی تو معلوم ہوتا۔ کھلانے
والے کچھ کہتے نہیں ہیں انہیں بخار چڑھا آتا ہے"!

اس کے بعد بھائی جان نے والد صاحب سے بیان کرکے
ارشد و شوکت کو صلواتیں سنوالیں جب دم لیا۔

۳

کچھ اپنے ہاتھوں تو مکان بنایا نہیں تھا۔ پرانا بنا بنایا مکان لیا تھا۔
صرف چھپر بدلا تھا۔ لہٰذا اس مکان میں اول ہی سے نہ ڈیوڑھی تھی۔
نہ نشست گاہ، نہ مہمان خانہ، پس وہ آنے جانے والوں کو کہاں
بٹھا کر پان کھلاتے کہاں چائے پلاتے، کہاں کھانا کھلاتے، کہاں
سلاتے۔ مزید براں علیحدہ ہوتے وقت میز کرسی، الماریاں، فرش
فروش، سب کچھ چھوڑ گئے تھے، ایک تنکا نہ لیا تھا۔ لہٰذا ابھی متذکرہ
آبائی میراث پر ان کا حق تصرف باقی تھا۔ اور اسی واسطے ان کے ٹاٹ
کے پردے والے دروازے پر جب کوئی ملاقاتی یا مہمان آ پہنچتا
تو وہ خوشی خوشی اس کا خیر مقدم کرتے اور فوراً اسے بیس قدم
آگے تک باتیں کرتے کرتے لیجا کر اپنے بھائیوں کا کمرہ کھول
دیتے، وہاں آرام کرسی دراز کر کے مہمان کو بٹھاتے، پھر چونکہ ان کا
مکان بیس قدم دُور پڑتا، اس لئے بھائیوں ہی کے اندرون خانہ پہنچ کر
چائے بنانے اور ناشتہ تیار کرنے کا حکم دیتے تھے، یا اگر پان
پیش کرنا ہوتا تو پان بنواتے۔ اگر بیویں باورچی خانے میں کام کر رہی
ہوتیں یا ایک ساتھ دونوں کی کنپٹیوں میں شدید درد اُٹھ بیٹھتا تو
بھائی جان خود پاندان کو جھٹکے کے ساتھ اپنے ساتھ کھینچ کر جلدی
جلدی گلوریاں بنا کر گیلی صافی میں لپیٹ خاصدان میں رکھ کر اپنے
ہاتھوں کے کتھے اور چونے کے داغ دیواروں سے صاف کرتے
ہوئے، تاکہ سمجھنے والے یہ نہ سمجھ لیں کہ پان خود بھائی جان نے ہی
لگائے ہیں۔ مہمان خانے میں ورود فرماتے تھے۔ وہ مہمان کی مدارات
اس حُسن اسلوبی سے انجام دیتے تھے کہ کوئی یہ فرق و امتیاز نہ کرنے
پاتا تھا کہ یہ گھر ان کا نہیں ہے۔ اور ارشد و شوکت دوسرے ہیں اور
یہ دوسرے۔

بھائیوں کا مطلق خیال نہ ہوتا ہوگا کہ بھائی جان کا خاندان بھکاری
ہے، نہ بیویں ایسا تصور کر سکتی تھیں۔ تاہم تکیہ پر بیٹھنے والے چند
بے فکرے فضول آوازے کستے رہتے تھے کہ ہاں وہ دیکھو بھائی جان
کے ہاں کا کٹورا اپنے چھوٹے بھائیوں کے گھر چلا کہ "آج سالن نہیں ہے
دیدو!" "آج روٹی نہیں پکی چند روٹیاں اور دال دیدو!" "آج ذرا سا
مربہ، یا چٹنی، یا اچار، نہیں تو ہلدی، مرچ، پیاز، اور نہ تھوڑا سا نمک دیدو!"
اتنی سی چیزیں دینے کے بعد نہ بھائی جان امیر ہو جاتے اور نہ
ارشد و شوکت اور ان کی دلہنیں غریب بن جاتیں، تاہم لوگ ان کے
بچّوں کو چڑانے سے باز نہیں رہتے تھے۔

بھائی جان تو یہاں تک غیرت نہ برت سکتے تھے کہ جب وہ کسی
مہمان کو اپنے بھائیوں کے ملاقاتی کمرے میں بٹھاتے اور اپنے
بھائیوں ہی کے ہاں سے ناشتہ، کھانا، پان، اور چائے تیار کرا کر
خود لاتے اور وہ مہمان انہیں "آئیے!" کہہ کر شریک کرنا چاہتا تو وہ
بلا عذر کھانے پینے بیٹھ جاتے تھے۔ نہ محض بلکہ اکثر اپنے کسی پاس

کھڑے ہوئے فرزندارجمند کو بھی "الاگہ تواضع کی اختیار" کی سعادت میں شریک بنا لیتے تھے، اور مہمانوں کو اکیلا چھوڑنا اپنی وا اپنے بچوں کی کج خلقی اور بدتمیزی پر محمول کرتے تھے۔

ان کی دکان ایک تو یونہی چھوٹی تھی۔ دوسرے اس میں سامان ہر ہفتے آتا تھا، کچھ روزنہ روز تو آتا نہیں تھا۔ اس بنا پر ان کی یہ روایت کہ بھئی کیا کہیں بہت پریشان ہوں۔ بکری بالکل کم ہوتی ہے۔ عین حقیقت تھی۔ مگر لوگ اسے تسلیم کرنے سے منکر ہوتے تھے۔ جو شاید بغض پر مبنی ہوگا۔

ایک دن جب انہوں نے اپنے والد صاحب سے روایت بیان کی کہ آج گھر میں کچھ کھانے کو نہیں ہے، صبح سے اب تک گھر بھر کا فاقہ ہے اور پھر چونکہ وہ آنسو پی گئے تھے لہٰذا ان کے لمبے چوغانے کے رومال میں آنکھیں پونچھتے وقت کسی طرح کوئی آنسو جذب ہوسکتا تھا؟ تاہم والد صاحب نے دھیرے سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کہیں کوئی دیکھتا نہ ہو، پانچ پانچ کے دو نوٹ ان کی مٹھی میں دیکر خود ہی مٹھی دبا دی۔ لعدازاں یہ روایت سینہ بسینہ ارشد اور شوکت سے دونو بہوؤں تک پہنچی۔ تو وہ افسوس ظاہر کرنے کی بجائے خندہ زن ہوگئیں۔ چنانچہ جب بھائی جان نے دیوار کے پاس کان لگا کر تمام گفتگو سنی تو دوڑے ہوئے والد صاحب کے پاس گئے اور رو رو کر بیان کیا، اور جب والد صاحب سے ارشد اور شوکت کو نافرض شناس، غیر ہمدرد، سفید خون والے اور دونوں بہوؤں کو غیریت برتنے والیں، اپنے کنبے کا گھر بھرنے اور ہمارے لڑکے سے جلنے والیں، چڑیلیں، مرداریں، پرفن عورتیں ہونے کا فتویٰ باآواز بلند صادر کرا لیا تب دم لیا۔

اس واقعے کے آٹھ دن بعد بھائی جان نے جے نرائن سورج دین سے چھ سو روپے کا سامان خرید کر سو سو روپے کے پرانے چھ نوٹ ادا کئے اور ارشد کو معلوم ہوگیا تو والد صاحب سے بیان کرنے کے بعد یہ رائے زنی بھی کی کہ اب بتائیے ان کے ہاں کس طرح فاقے ہوتے ہیں اور اس دن کیا یہ نوٹ نہ تھے؟ آپ ہم لوگوں سے فضول بدظن رہتے ہیں"۔ والد صاحب مصلحتاً خاموش ہوگئے۔ اگر وہ مصلحت نہ سمجھتے تو ارشد کے دانت کھٹے کر دیتے یہ کہہ کر "کیا اس دن خزانہ بند نہیں تھا؟ کیا بازار صرافہ میں نوٹ بھنانے کا آٹھ آنے سیکڑہ بٹہ نہیں مانگا جا رہا تھا، جو صفدر بھائی جان کی حیثیت سے زیادہ تھا! پھر وہ کیا کرتے؟ نوٹوں کے ٹکڑے کر کے اپنی بیوی اور بچوں کو نگلوا دیتے؟ تھوڑا سا آٹا اگر بازار سے ادھار لاتے تو دنیا کیا کہتی؟

۴

چار نکاحوں کی آٹھ عدد شیروانیاں رکھی تھیں جو پچیس برس کے طولانی عرصے میں ہمیشہ ان کے جسم پر موزوں رہیں اور جنہیں اسی برس کی عمر تک وہ بخوبی استعمال کر سکتے تھے۔ اسی لئے نبی بخش ٹیلر ماسٹر ہر بقرعید اور شب برات کے موقع پر یہ موہوم امید اپنے قلب میں پیدا کر لیتا تھا کہ بھائی جان اب کی بار ضرور اس کی دکان پر آ کر دقیانوسی اسٹول پر بیٹھیں گے، اور وہ گاہک کی دزدیدہ کترن کا ساختہ گز لے کر ان کا غیر کشادہ سینہ، لمبی اور صراحی دار گردن، اٹھے ہوئے بازو، پتلی کمر کی پیمائش کر کے ایک شیروانی قطع و برید کریگا۔

نبی بخش کی یہ عادت بری تھی کہ وہ اکثر جاتے جاتے "سلام علیکم" کہہ کر پھر "سنئے تو بھائی جان!" کا جملہ خطابیہ ادا کر کے انہیں روک لیتا۔ اور بلیزر۔ پام بیچ۔ ٹویڈ۔ پاپلین اور سلک کے مختلف نمونے ان سے پسند کراتا پھر خود بخود بتا دیتا کہ ارشد بھیا یا شوکت میاں، یا ان کے بچوں یا بیویوں کے کپڑے سلیں گے۔ صفدر بھائی جان آہ سرد بھر کر "اچھا ہے!" کہہ دیتے اور پھر قدرے توقف کے بعد فرمانے لگتے۔ نبی بخش! ان لوگوں کی اپنی کمائی نہیں ہے۔ جو چاہے سلائیں، خوب پہنیں اور پہنائیں۔ پھوہڑوں سے سابقہ پڑا ہے۔ ورنہ سگھڑ عورت تو وہی ہے جو اپنے بچوں کے اور خاوند کے جملہ ملبوسات خود تیار کرے، خود دھوئے، اور اگر استری بہم نہ پہنچے تو پیتل کے گول لوٹے میں انگارے بھر کر اسی سے کپڑوں پر استری پھیر دیا کرے! بھائی جان کو فخر تھا کہ ان کے ہاں ایسا ہوتا ہے۔

ان کے لڑکے آخر لڑکے تھے۔ انہیں کہاں کسی دفتر میں جانا پڑتا یا حاکم سے ملاقات کرنی ہوتی، جو وہ نئے نئے کوٹ اور شیروانیاں پہنتے۔ سلائی دار موٹے کپڑے کا لمبا جاجیانہ کرتہ اس پر صدری اور مثلث قطع کا ٹخنوں سے اونچا کورے لٹھے کا پاجامہ ان کے لئے کافی تھا۔ البتہ ایک ایک شیروانی بھی تھی جو دادا جان نے ایک عید کے موقع پر اپنے سب پوتوں کو سلا دی تھیں۔ انہیں صفدر بھائی جان اپنے ہاتھ سے نیم کی خشک پتیاں نیچے اوپر رکھ کر چمڑے کے صندوق میں مقفل کر دیتے تھے اور خاص موقعوں پر نکال کر بدون استری کئے

پہنا دیتے تھے۔ پھر بتعجیل ممکنہ سنبھال کر اسی طرح رکھ دیتے تھے۔

اگر وہ احتیاط نہ برتتے تو ارشد و شوکت کی اولادوں کی طرح ان کے بیٹوں کی شیروانیاں بھی چند سال میں تار تار ہو جاتیں۔

۵

ان کی بھینس چار سیر دودھ دیتی تھی۔ لیکن یہ دودھ چونکہ گھر کی چیز تھی، لہٰذا بھائی جان دل لگا کر نہیں پیتے تھے۔ نہ کسی گھر والے کو دل لگا کر کھانے پینے دیتے تھے، شاید بمشکل آدھ پاؤ چائے میں پڑتا ہوگا اور اتنا ہی ننھے کی دودھ پینے والی بوتل میں بھرا جاتا تھا۔

باقی دودھ اس طرح فروخت ہو جاتا تھا کہ جب چند ساعتوں کے بعد اس دودھ پہ کوئی چکنی چکنی سطح نمودار ہوتی تو اسے چابکدستی سے الگ کر کے جامن ڈال کر، دہی، پھر مکھن، پھر گھی بنا کر اس زنبیل میں ڈال دیا جاتا جسے عرف عام میں ٹین کا کنستر کہتے ہیں۔ اور خالی دودھ تمام اہل محلہ کے ہاں قسم کھا کھا کر کہ اس میں ایک بوند پانی ملایا ہو تو حرام ہے، لڑکے بالے تقسیم کر آتے تھے کہ پاؤ بھر دودھ اِس ہاتھ لیجئے اور تین پیسے صرف، اُس ہاتھ دیدیجئے۔ ارشد اور شوکت ان کے ہاں سے دودھ نہیں منگاتے تھے۔ حالانکہ گوالن سے دو سیر دودھ یومیہ خریدتے تھے۔

آخر وہ کیوں مول نہیں لیتے تھے، اس کا علم نہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ سگے بھائی تھے۔ اس لئے شاید صفدر بھائی جان ان سے دام نہ لیتے اور دام نہ لینا گویا ان کی بندھی ہوئی آمدنی میں خسارے کا موجب ہوتا۔

کوئی مول لے چاہے نہ لے، ہفتے دو ہفتے میں آدھ پاؤ سے کہیں زیادہ دودھ چائے کے انیسویں صدی کے نقشیں اور شکستہ پیالے میں بھر کر بنفس نفیس بھائی جان عین اس وقت لاتے تھے جبکہ والد محترم بمع اپنے ہر دو پسران دستر خوان پر بیٹھ گئے ہوتے۔ پھر "سلام علیکم" داغ کر فاتحانہ انداز سے وہ پیالہ صرف والد صاحب کے سامنے رکھ کر بھائی جان اس وقت تک خاموش اور مؤدب کھڑے رہتے کہ والد بھائی جان کو نظر اٹھا کر نہ دیکھ لیتے اور "آؤ صفدر کھاؤ" کہہ کر دودھ کا خیر مقدم نہ کرتے۔ بھائی جان الامر فوق الادب کے مصداق چپ چاپ دستر خوان پہ بیٹھ جاتے تھے۔

اکثر دودھ چکھ کر والد صاحب ارشد و شوکت کی جانب بڑھاتے، لیکن وہ نفی میں جواب دیتے تو خود پیالہ سامنے کھینچ کر "تو تم نہیں پیتے تو میں ہی پی لیتا ہوں" کہتے کہتے اس دودھ میں شکر ملا کر، پھر روٹی چور کر کھانا شروع کر دیتے تھے۔

لیکن عین اس موقع پر بہوؤں کا نیم وا گھونگٹ میں سے مسکرانا صفدر بھائی جان کو بے حد شاق گزرتا تھا اور وہ دانت پیس کر، گاہے ہونٹھ چبا کر، زہر آلود نظروں سے کبھی شوکت و ارشد کو کبھی بہوؤں کو دیکھ کر اپنے دل سے خطاب کرتے تھے کہ "اے دل یہ چڑیلیں تجھ سے جلتی ہیں۔ دیکھ زنہار انہیں ایک بوند دودھ کی بھی مفت نہ کھلانا!" ـــــ چنانچہ زہرہ اور سلیمہ جب سسرال سے میکے آئیں تو ایک خوشگوار شام کو بھائی جان انکی دعوت کر دیتے مگر ارشد اور شوکت کی گھر والیوں کو زنہار نہ مدعو فرماتے تھے۔

۶

ان کا تیرہواں بچہ پیدا ہوا۔ مانا کہ وہ چاند نہیں تھا، سورج نہیں تھا۔ مریخ اور عطارد نہیں تھا، لیکن پھر بھی ایسا کوئی بدصورت نہ تھا۔ میراثنوں نے خبر پاتے ہی "سر پہ گھونگر والے بال ہمارے للّا کے" بدھائی گائی لیکن ادھار گا بجا کر چلی گئیں۔

وہ خود عقل کے پتلے تھے۔ کوئی کیا اصلاح دے سکتا تھا۔ یہ بات انہی کے دل سے اٹھی تھی کہ اب کی مرتبہ بچے کا عقیقہ بڑی دھوم دھام سے کیا جائے۔

مرزا کالو بیگ بھٹیارے کو بلایا گیا۔ پیلی بھیت کے چاول آئے۔ گھی گھر کی بھینس کی مہربانی سے کافی تھا۔ دو تولہ زعفران وہ بھی سورج مارکہ خرید لی۔ امر سنگھ حلوائی کے ہاں ایک دن میں چھ چھ مرتبہ جا کر امرتیوں سے متعلق ہدایات خود بھائی جان دے کر آئے۔ برادری میں دعوت پھرائی گئی۔ رؤسائے شہر اور اہل محلہ بھی مدعو کئے گئے۔

یہی طے پایا کہ بھائی جان کے گھر کے سامنے شامیانہ تانا جائے۔ چنانچہ تانا گیا۔ ان کے جملہ بچوں نے صندوق میں سے نکال کر چمکدار پوشاکیں پہن لیں۔ ارشد اور شوکت کی دلہنیں بھی گئیں اور کرتہ ٹوپی نبی بخش درزی کے ہاں سے سلا کر لے گئیں۔

میرا حجام نے صبح بچے کا سر مونڈا۔ اس کی کٹوری میں دھیلے سے لے کر اکنی تک ڈالی گئیں۔ بکرے ذبح ہوئے۔ شام کو نہایت اعلیٰ قسم کی بریانی سے مہمانوں کی ضیافت کی گئی۔ ارشد اور شوکت نے ایک حرکت تو یہ کی کہ خود اہل محفل کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ اور سربراہ کاری کا بوجھ بھائی جان، ان کے بچوں اور چند غیر لوگوں کے سر پہ چھوڑ دیا۔ چنانچہ بھائی جان کیا، والد صاحب کو بھی ناگوار گزرا۔

دوسرے جب امرتیاں تقسیم ہونے لگیں تو ایک چھوڑ دو دو حصے دو لوگوں نے لئے، بانٹنے والوں سے مانگ مانگ کر لئے، اور بھائی جان کی ایک نہ سنی کہ "بھئی پہلے باہر والوں کو تقسیم کر لینے دو۔ تم تو گھر کے ہو۔ اگر کم پڑ گئیں تو کتنی سبکی نہ ہوگی؟" شوکت نے دبی زبان سے کہا۔ "پرواہ نہیں" اور امرتیاں کھاتا رہا۔

بھائی جان اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے جب وہ اپنی نوخیز جماعت کے ساتھ ان کی طرف دیکھ دیکھ کر قہقہے لگاتا تھا۔

بہر حال پان پھول تقسیم ہونے کے بعد جب لوگ رخصت ہونے لگے۔ تو اہل برادری نے ان کے بڑے بیٹے کے ہاتھ میں عقیقے کی نسبت سے ایک ایک روپیہ رکھنا شروع کیا۔ حالانکہ بھائی دور بیٹھے تھے۔ مگر ہر روپے کی "کھٹ کھٹ" پر کان لگائے تھے اور اپنے جی میں شمار کرتے جاتے تھے۔

جب محفل برخاست ہو گئی تو بھائی جان روپے لیکر گئے۔ ان کا تخمینہ درست نکلا۔ پچپن روالے میں اوتیلیس زنانے میں جمع ہوئے تھے۔

اسی وقت اتفاق سے ایک روپیہ ان کے ہاتھ سے جو پتھر پر گرا تو اس سے "کھٹ" کی صدا نکلی۔ بھائی جان کو شبہ ہوا۔ پھر بجایا تو وہی "کھٹ" گویس کی سدشنی ہیں گئے۔ بغور پرکھنے لگے۔ پھر بجایا۔ "کھن" کی بجائے "کھٹ" کی صدا نکلی۔ بہت افسردہ ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے سب روپے دیکھ ڈالے اور بجا ڈالے۔ تمام روپے کھوٹے تھے۔

بھائی جان کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ بڑبڑاتے ہوئے تمام روپے فرش پر بکھیر دئے۔

والد صاحب ایک طرف بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ چونک کر فرمایا "کیا بات ہے صفدر؟"

بھائی جان نے کہا "بات کیا ہوگی۔ سب کیا کرایا خاک میں مل گیا!"

انہوں نے پوچھا "کیوں؟"

بھائی جان جوش و اضطراب کے ساتھ بولے "حرامزادوں نے بریانی کھالی۔ امرتیاں لےلیں اور کھوٹے روپے دے گئے!"

انہوں نے پوچھا "کیا سب؟"

بھائی جان نے روتی آواز میں کہا "جی سب!"

انہوں نے کہا "کس نے آخر یہ شرارت کی ہوگی؟"

بھائی جان بولے "کیا معلوم"

والد صاحب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور وہ انا للہ وانا الیہ راجعون کی تلاوت کرتے سنائی دئے۔

بھائی جان یہ کہتے ہوئے اندر چلے گئے "یہ بیوقوفی تو تھی جو ہم کو بیٹھے کچھ نہ کرتے تو اچھا ہوتا!"

ارشاد شوکت کا وہاں پتہ نہیں تھا۔ بہت پہلے وہ خبر نہیں کدھر کھسک گئے تھے۔

حسن عزیز جاوید

غزل

مرا جامِ شکستہ جامِ ہوش افزا نہ ہو جائے
کہیں برہم نہ سب کیفیتِ میخانہ ہو جائے

دکھا اے شعبدہ گر عشق وہ جلنے کی کیفیت
زبانِ شمع فریادِ غم پروانہ ہو جائے

وہ مجھ کو دیکھتے ہیں اب نگاہِ لطف آگیں سے
ذرا سی بات ہے لیکن اگر افسانہ ہو جائے

ہوس سے بھر نہ لے عقلِ فرومایہ مرے دل کو
یہ میرا دین ہے ظالم کہیں دنیا نہ ہو جائے

شہید اپنی یہ چشمِ خشک اگر ہو مائلِ طوفان
تو دنیا دیکھ لے دریا بکف پیمانہ ہو جائے

قربان حسین شہید

غزل

چراغِ کشتۂ دل کا دھواں ہوں
میں مرغِ پر شکستہ کی فغاں ہوں

فسانہ دردکا غم کا بیاں ہوں
کسی تصویرِ حسرت کی زباں ہوں

لحد پر میری آنسو مت بہاؤ
بہت اچھا ہوں جیسا ہوں جہاں ہوں

خبر اتنی تو رکھتا ہوں کہ ہوں میں
نہیں یہ جانتا لیکن کہاں ہوں

یہ کہتی ہے مری قبرِ شکستہ
کسی ٹوٹے ہوئے دل کا نشاں ہوں

مجھے وصل اس کا ہو جاتا میسّر
بڑی مشکل یہ ہے میں درمیاں ہوں

قفس سے مجھ کو اب کیا چھوڑتا ہے
کہ مدّت ہو چکی بے آشیاں ہوں

جفائے دہر کا ہوں صید پامال
شہابؔ خستہ جان و ناتواں ہوں

(قاضی) شہاب الدین شہابؔ
(حیدرآباد دکن)

پُرانے خیال کی عورت

ہم اور تم الگ الگ ہیں۔ کیونکہ تم تم ہو اور ہم ہم۔ ہم قدامت پسند ہیں تم جدت پسند۔ ہم مشرق ہیں تم مغرب۔ ہم آغاز ہیں تم انجام۔ ہم ساکن تم متحرک۔ ہم بکواسی گنے جاتے ہیں اور اس معاملہ میں تم بری، ہماری عقل موٹی ہے۔ اس قدر کہ اس کی موٹائی کا پتہ نہیں لگتا۔ تمہاری سمجھ باریک ہے اتنی کہ ہے یا نہیں یہ جاننا مشکل ہے۔ اسے کسر نفسی نہ سمجھئے یہ حقیقت ہے یہ نہ ہوتا۔ تو نئی اور پرانی تہذیب کا فرق ہی نہ رہتا۔ خیر یہ تو ہوئیں زمانہ سازی کی باتیں۔ اب موجودہ زمانہ کو جو شکائتیں ہماری ملزمہ سے ہیں وہ بھی سُن لیجئے۔

کہا ایک بیگم سے مس نے یہ اِک دن\
پرانی ہیں جتنی ہیں باتیں تمہاری\
سمجھتی ہو زیور کو زینت کا ساماں\
لگاتی ہو کپڑوں کو گوٹہ کناری !\
رہا کرتی ہو قید گھر میں ہمیشہ\
نہ سیر و سیاحت نہ شوقِ سواری\
یہ سب کام باہر ہیں تہذیب سے اب\
نشانِ جہالت ہیں باتیں یہ ساری\
تمہیں اس سے کیا تم اسیرِ قفس ہو\
چلے باغ میں لاکھ بادِ بہاری

یہ کوئی آج کا قصہ نہیں، غدر کے بعد سے نئے اور پرانے رسم درواج میں تُو تُو مَیں مَیں چلی آرہی ہے۔ پرانے خیال والی کہتی ہیں کہ تکلف میں تکلیف ہے ہماری ایک سادگی پر تمہاری ہزار بناؤٹیں فدا ہیں۔ دنیا چار دن کی چاندنی ہے پھر وہی اندھیرا۔ گھر میں مختصر ضرورت کا سامان کافی ہے۔ خدا دولت دے تو شادی بیاہ میں دل کھول کر خرچ کرو۔ زیور بنا لو۔ چلو چھٹی ہوئی۔ کسی سے کھوٹ ہو تو اس سے زبانی لڑ جھگڑ کر دل صاف کر لو۔ پورے خاندان کے لئے دو ایک دالان۔ ایک آدھ سائبان بہت ہے۔ چھوٹے بڑے سب ایک جگہ رہیں۔ کھائیں پئیں۔ سوئیں جاگیں۔ کچھ حرج نہیں۔ لڑکے لڑکیوں کے لئے الگ کمروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ ماؤں کے لئے اُن کے بچے ہی ہرے بھرے باغ ہیں۔ لڑکیوں کے لئے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو کھلانا ہی بڑی سیر ہے۔ میز کرسی بے کار ہے۔ چاندنی سے بڑھ کر کوئی زینت نہیں، عورت کے لئے بیڈ منٹن کی قسم کی ورزش کی کیا ضرورت ؟ گھر کی جھاڑو بہارو اور پکانا۔ پیندھنا۔ سینا۔ پرونا۔ پیسنا۔ کوٹنا ایسے کام ہیں جن سے ورزش خود ہی ہوتی رہتی ہے اور اسی کا نام صحت ہے۔ خانہ داری کے کام بخوبی انجام نہ دے سکنا ہی روگ کہلاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مغربی تقلید کے زیر اثر ہم بلا سوچے سمجھے نئی معاشرت اختیار کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا ہے کہ ہماری تہذیب ایک ایسی معجون بن گئی ہے جس میں پرانی اور نئی تہذیب کی خوبیاں بہت کم اور برائیاں بہت زیادہ ہیں۔ اس کے جواب میں جدت پسند خاتون کے جو اعتراضات ہیں۔ ان کی تنقید سے مجھے بحث نہیں مگر میں یہ ضرور کہوں گی کہ اگر قدامت پسند فریق کی صفائی میں اس کی معاشرتی خوبیوں کا ذکر نہ کیا جائے تو یقیناً زیادتی ہوگی ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد + یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

وہ دیکھئے صاف ستھرا ہندوستانی وضع کا مکان ہے۔ دالان اور کمروں میں برف سا بچھونا ہو رہا ہے۔ صحنچی میں کورے کورے مٹکے صراحیاں چمکتے ہوئے گلاس، کٹورے دھرے ہوئے ہیں۔ سامنے برآمدے کے اندر تختوں کا فرش ہے۔ جس پر قالین اور گاؤ تکیہ لگا ہے۔ لمپ، دیوارگیری جابجا قرینے سے لٹک رہی ہے۔ پٹاری صاف، اگالدان دھوئے رکھے ہیں۔ قریب ہی تپائی پر عطردان میں موسم کے لحاظ سے عطر اور خاصدان میں الائچی چکنی ڈلی پڑی ہے۔ گھر والی چمپئی دوپٹہ اوڑھے۔ پلنگ پر بیٹھی شیروانی پر بٹن ٹانک رہی ہیں۔ ساتھ ہی بچی کو سبق بھی بتاتی جا رہی ہیں۔

آج سمجھا جاتا ہے کہ پرانی وضع کی عورت کو کسی قسم کی تفریح میسر ہی نہ تھی۔ غریب کی ساری عمر بند کوٹھڑی میں ختم ہو جاتی۔ لیکن یہ خیال کسی قدر غلط ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ کسی دن کسی کو قطب صاحب

کی سُوجھی۔ آج کل کا خاندان تو تھا نہیں کہ دو تین آدمی موٹر میں بیٹھ 'پکنک' کے لئے چل دیئے۔ پورے محلہ کی عورتیں ساتھ ہوتیں۔ چندہ کر کے غریب پڑوسنوں کو بھی زبردستی ساتھ لیتیں۔ ذرا علامہ راشد الخیری مرحوم کی زبانی سنئے۔ کیا اچھا وقت تھا۔ مینہ دھائیں دھائیں پڑ رہا ہے اور عورتیں ہیں کہ کوئی آم باندھ رہی ہے۔ کوئی بینی روٹی پکا رہی ہے۔ ایک گاڑی اور دس پندرہ سواریاں' اتنے ہی بچے۔ کچھ برسات کے گیت گاتی بھیگتی ہوئی پیدل چلیں۔ گاڑی والیاں اُن کا ساتھ دے رہی ہیں۔ جھولا باغ میں پہلے ہی ماموں نے ڈلوا دیا تھا۔ پانچ چار اسے لپٹیں۔ باقیوں نے کڑھائی چڑھائی۔ پاک قلمی بڑے۔ گلگلے۔ پھلکیاں گرم گرم اتر رہی ہیں۔ جھولوں میں لال سبز پیڑھیاں پڑی ہیں اور جھولنے والیاں رنگ رنگ کے کپڑے پہنے لہک لہک کر ملہار گا رہی ہیں۔ ع

سکھی آئے بدروا جھوم کے

سچ مانئے تو ہندوستانی تہذیب اسی نیک بخت کے دم سے تھی۔ اب تو غیروں کی نقالی سے وہ نقشہ ہی بدل گیا ہے ؎

مسز اور مس بن گئیں عورتیں سب + نہ زیب النساء ہے نہ چنچل کماری

خانہ داری اور سلیقہ شعاری ان میں بڑی حد تک پائی جاتی تھی آج کل جدید خیالات کی رَو میں خانہ داری کی باتیں خواب و خیال ہوتی جا رہی ہیں۔ اکثر لڑکیاں نرسنگ کھانا پکانا اور سلائی کی تعلیم کے بعد بھی بچوں کی پرورش میں آیاکی، باورچی خانہ میں خانساماں اور سلائی میں درزی کی سدا محتاج نظر آتی ہیں۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ جدید سماجی زندگی کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ انسان اپنا زیادہ وقت ان کاموں میں نہ خرچ کرے جن کو اس سے کم قابلیت والے آسانی سے کر سکتے ہیں۔ وہ اس قیمتی وقت کو زیادہ مفید باتوں کی نذر کرے۔ مگر مشاہدہ بتلا رہا ہے کہ عام طور پر اس سنہرے اصول کے صرف پہلے ہی حصے پر عمل کیا جاتا ہے۔

کفایت شعاری اور ہُنر مندی میں پرانی وضع کی عورت اپنی نظیر آپ ہی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے رہنے سہنے کے طریقے میں بھی چند ایسی خصوصیات تھیں جن میں کچھ نہ کچھ مصلحت ضرور تھی

ہر قسم کا کھانا پکانا ان کے لئے ایک معمولی بات تھی۔ اکیلی عورت چالیس پچاس کی دعوت نپٹا لیا کرتی۔ دستکاری سے انہیں قدرتی لگاؤ تھا۔ بازار کی جھوٹی لیسوں کے مقابلہ میں گوٹا کناری اور شوخ رنگین لباس اُنہیں زیادہ پسند تھا۔ تن زیب کی قمیض گلبدن کی شلوار اور آبِ رواں کا دوپٹہ اُن کی محبوب پوشاک تھی۔ یوں گاڑھا اور نین سکھ بھی اکثر پہن لیتیں شادی شدہ کا سفید کپڑے پہننا معیوب سمجھتیں زیورات کا بہت شوق تھا۔ غریب سے غریب کے بدن پر بھی چند زیور ضرور نظر آتے اور یہی اس کے آڑے وقت میں کام آتے عام طور پر آٹھویں دن کانچ کی چوڑیاں اور مہندی کا معمول تھا۔ ان کے سنگھار کا سامان سستا اور دیرپا ہوا کرتا۔ سُرمہ مسی کاجل۔ افشاں۔ شہاب اور ایسے عطر جن کی مہک صندوق سے برسوں نہ جاتی۔ رسوم کی البتہ بہت دلدادہ تھیں۔ اور ان تقریبوں کے بہانہ کنبہ کی عورتیں مل بیٹھتیں۔ اور پھر اس موقعہ پر دینے لینے سے بلانے والی کا بہت سا بار کم ہو جاتا۔ پرانے خیال کی عورت کی تعلیم البتہ چند مذہبی کتابوں تک ہی محدود رہتی۔ بہت کیا کسی نے تو روزنامہ۔ چند پند۔ بہشتی جھومر پڑھ ڈالا۔ مگر وہ ان مسائل پر عمل ضرور کرتیں۔ خط لکھنا اول تو جانتی ہی نہ تھیں جو لکھا بھی تو لمبے چوڑے القاب اور درجہ بدرجہ گھر والوں کے سلام سے اُسے ختم کر دیا۔ عام طور پر ان کی شاعری کا دعوٰے تو نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تعلیم ہی کہاں تھی۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ان میں شعر و شاعری کی صلاحیت ضرور تھی۔ ان کی پہیلیوں اور لوریوں میں یہ چیز آتی ہے ؎

آجا ری نیندیا تو آ کیوں نہ جا۔ مورے بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

چوہے جی تم بڑے امراؤ + ہم بات کریں تم باہر آؤ

کھود کھاد کیا بلندر + تم بات کرو ہم سنیں گے اندر

وہ بچوں کو، ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا۔ بادشاہ سے شروع کر کے بادشاہوں۔ جنوں۔ پریوں کی دل چسپ کہانیاں سناتیں سمندر پار کی شہزادی اور اُڑن کھٹولے کا ذکر ضرور آتا۔ مسافروں کے مارے دن کو کہانی نہ کہنے میں بھی کام کے وقت کو ضائع نہ کرنے کا فلسفہ تھا۔ ہماری قدیم معاشرت نے موسیقی سے بڑی بے پروائی برتی ہے مگر جب ساز تک گھر میں رکھنا گناہ سمجھے تو اس کی لطف بہتر کیسے نہ بے بہرہ رہتی۔ بہت کسی کا جی چاہا تو اس قسم کا ایک آدھ شعر گنگنا لیا ؎

کوئی ایسی سکھی چاتر نہ ملی + موہے پی کے دوارہ بٹھا دیتی

میں نے راہِ مدینہ بھی دیکھی نہیں + موری بہیاں پکڑ کے بتا دیتی

غریب طبقہ میں چکی کے گیت تھکن مٹانے کو گھنٹوں مل کر گائے جاتے یا پھر دیہات میں ساون اور جھولے کے گیت :-

برکھا گئی جاڑے گئے بیت گئی کھر سائے + آون آون کہہ گئے آئے نہ بارہ ماس

جن رسموں پر آج ہم ہنستے ہیں۔ جو رواج بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے پردے میں مصیبت کے ماروں کی کتنی ڈھارس بندھتی۔

رسموں کے بہانے سے غیور غریبوں کے جذبات کو ٹھیس لگائے بغیر اُن کی مدد ہوسکتی تھی۔ پرانے خیال کی ماں کنبے محلے کی غریب لڑکیوں کو دُودھ لہائیگنگ کے بہانہ کچھ دے سکتی ہے۔ اس طرح ساون میں بیٹے کو بھیج کر پردیسن بیٹی کو گھر بلانا۔ دیکھئے کس خوبی سے رسم نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے۔

نیم کی نبولی پکی ساون بھی کبھی آئے گا
جئے میاں کا جایا ڈولی بھیج بلائے گا

اکثر بیماریوں کے مفید اور سستے علاج اور ٹوٹکے انہیں زبانی یاد ہوتے۔ بات بات پہ ڈاکٹر کو آدمی نہ دوڑتا۔ عورت کے لئے کھیل کود البتہ اُنہیں نہ بھاتی۔ لڑکیوں میں گڑیوں کا کھیل بہت مقبول تھا ان کی تمام رسمیں پوری کی جاتیں۔ اگرچہ نام کو یہ کھیل تھے مگر ماں بیٹی کو ہنڈ کلیا سے کھانا پکانے کی اور گڑیا کے کھیل سے خانداری، سینے پرونے کی تعلیم دیا کرتی۔ آج یوروپ اور امریکہ میں زیادہ زور اس بات پر دیا جا رہا ہے کہ بچوں کو جو کچھ پڑھایا جائے۔ اُس کو عملاً ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ مگر ہندوستان میں بہت پہلے اس قسم کی عملی تعلیم کا مکمل نظام تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ اب ہم اسے نظر انداز کر چکے ہیں۔

ان کا روزمرہ دستور یہ تھا کہ وہ صبح کو اُٹھ کر خدا کو یاد کرتیں۔ ناشتہ تیار کر کے بچوں کا منہ ہاتھ دُھلا اُن کو اور گھر کے مردوں کو ناشتہ کراتیں۔ کوئی بڑی بوڑھی ہوئی تو اُس کی دوا کوٹ دی پھر کھانا پکانے میں مصروف ہو جاتیں۔ گھر کی تمام سلائی وہ خود ہی کرتیں۔ بوڑھی عورتیں محلہ کے بچوں کو پڑھایا کرتیں۔

علمی معلومات کی کمی سے وہ زود اعتقاد ضرور تھیں۔ مگر ان کے اکثر وہم تجربہ سے خالی نہ تھے۔ مثلاً یہ حکم کہ گھر سے کوئی باہر سدھارے تو جھاڑو مت دو۔ اس میں یہ احتیاط تھی کہ اُس کی گری پڑی چیز جلدی سے اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ یا یہ اصول کہ دونوں وقت ملے کوئی کام نہ کیا جائے ظاہر ہے کہ اس سے بینائی پر اثر پڑے گا۔

اس غریب کو جاہل۔ قدامت پسند اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے مگر اُس کی سلیقہ مندی سے انکار نہیں ہوسکتا۔ وہ گھر کی چیزوں کو بے کار ضائع نہ ہونے دیتی۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر میز پوش۔ پرانے کپڑوں کے غلاف۔ رومال۔ بڑے آدمیوں کے کپڑوں سے بچوں کے بنا لینا۔ پیوند لگانا۔ رفو کرنا۔ چکی چلانا۔ چرخہ کاتنا۔ سویاں بنانا۔ روئی کے ٹکڑے جمع کر کے [illegible] ٹکڑے پکا لینا۔ گھر کے بیکار کاغذ گلا کر ٹوکریاں ڈبے بنا ڈالنا ان کے روزانہ مشاغل تھے۔ غریب اور خاص کر بیوہ گوٹا نواڑ بُن کر سلائی اور پسائی سے اپنی روزی کما لیتی۔ جب ہم سنتے ہیں کہ ایک سپاہی کی بیوی نے جس کی آمدنی آٹھ روپے ماہوار تھی۔ بیٹی کو ہزار روپے کا جہیز دیا۔ تو تعجب ہوتا ہے۔ مگر پرانی وضع کی عورت کے لئے یہ ناممکن نہ تھا۔ ایک تو وہ سلیقہ سے روزمرہ کی ضروریات میں کفایت کرتی۔ دوسرے اس کے اخراجات زیادہ نہ تھے۔ زیورات اکثر پشت در پشت چلتے، لباس اور خوراک سادہ ---- سب خاندان ایک جگہ رہتا۔ کوٹھی اور خانساماں کا قصہ نہ تھا۔

محض وضعداری ہی نہیں اس کی سیرت میں محبت۔ ملنساری خلوص۔ مہمان نوازی۔ شرافت کوٹ کوٹ کر پائی جاتی تھی۔ حالی مرحوم نے اسی کردار کی تفسیر میں کہا ہے۔

نیکی کی تم تصویر ہو۔ عفت کی تم تدبیر ہو۔
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے

ان انمول جذبات کے علاوہ اس کی دنیا صرف اس کا گھر تھا۔ وہ خاوند اور بچوں کی بے غرض خدمت ہی اپنا بہترین شغل سمجھتی۔ اور اسی دل جمعی سے گھر کی فضا کو جنت بنائے رکھتی۔ آج کل کی نئے خیال کی عورت نے اس بات کا تہیہ کر لیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں مرد کے برابر ثابت رہے۔ وہ مرد کو اپنا رقیب سمجھتی ہے۔ اور اُسے شکست دینے کے لئے اُس نے اپنا سب کچھ تج دیا ہے۔ عورت اب وہی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ جو مرد کرتا ہے۔ اور انہی کاموں کی تلاش میں رہتی ہے۔ گھر گرہستی اور مادریت کو حقارت سے دیکھتی ہے۔ مغرب میں لڑکیاں کلب اور ہوٹل کی زندگی کو گھر پر ترجیح دے رہی ہیں اور یہی طرزِ عمل ہندوستان میں بھی عام ہو رہا ہے۔ مغربی ملک اس انقلاب سے بہت پریشان ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گھرانے کی نگہداشت بھی ملازمہ کو سونپ کر ماں نوکری پر چلی جاتی ہے۔ مشہور فلسفی مل کا خیال ہے کہ ماں کی طرح اس کے بچہ کی نگرانی کوئی نہیں کر سکتا اور واقعی جو بچے بچپن میں ماں کے روحانی فیض سے محروم ہیں۔ ان سے آئندہ زندگی میں بلند اخلاق کی توقع بیکار ہے۔ یہی قوم کی بربادی ہے۔ گھر کی مالکہ کے لئے گھر کی دیکھ بھال بجائے آمدنی بڑھانے کے زیادہ ضروری ہے کیونکہ اس سے یہی ہوگا کہ ایک کی آمدنی دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ یعنی مرد بے روزگار ہو جائیں گے اور عورت برسرکار،

یہ سچ ہے کہ اس تحریک نے ابھی مشرق میں پوری طرح زور نہیں پکڑا مگر ابھی سے اس کی روک تھام کے سلسلہ میں چاہیئے کہ قدامت پسند خاتون کی رائے اور تجربہ کو موجودہ لڑکی کے نصاب تعلیم میں وقعت سے جگہ دے دی جائے۔

جسے ہم قدیم کہتے ہیں کیا وہ اسی لئے قابلِ نفرت ہے کہ وہ قدیم ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ قدیم ہی نئے دَور کی منزلِ مقصود ہے۔ وہی آپس کی محبت۔ وہی پرانی سادگی اور سچائی آج اس نئی کشتی کا کنارہ ہے۔ پرانے خیال کا موٹا گاڑھا پہننے والی اپنی سادگی اور خلوص میں نئی معاشرت کی نمائش اور تکلف سے کہیں بہتر ہے —— سماج کا طوفان کتنے ہی زور سے اُٹھے۔ یہ سایہ دار درخت اپنی جگہ سے سرکنے والے نہیں۔ یہ ہری بھری ڈالیاں کیسی ہی بودی نظر آئیں لیکن ان کچھوں میں ایسے نشیمن آباد ہیں۔ کہ جس سمے آسمان تمدن پر انقلاب کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوگی۔ تب دیکھنا ان ہی کوئلوں کی کوک یہ مدت کی سوئی آشا جگا دے گی۔

"ہوائے کوچۂ مشرق کی موجیں یاد ہیں مجھ کو
وہی تھی منزلِ راحت وہی رفتار اچھی تھی"

رُوح افزا عزیز الدین
(بی اے آنرز)

ٹیلیفون

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور اس وقت تک بجتی رہی جب تک میں نے اپنی کہانی کی آخری سطریں لکھ نہ لیں۔ میں نے آہستہ سے رسیور اٹھایا۔

"جی ۔۔۔۔ امی"

"جی ہاں" "شکر ہے رسیور تو اٹھا لیا" جیسے چھوٹی چھوٹی سریلی گھنٹیاں بج رہی ہوں ایک شوخ سی آواز آئی۔ "گھنٹہ بھر سے گھنٹی بج رہی ہے لارڈ صاحب سنتے ہی نہیں۔ معاف کیجئے گا، میں باز آئی اس ٹیلیفون سے جو آپ نے اکیلے گھر میں اس لئے لگا رکھا ہے کہ میاں کو دفتر سے آنا یاد دلاتی رہا کروں۔ میں کہتی ہوں آخر کتنا کام کرتے ہیں آپ؟ وہ یہ آپ پانچ بجے گھر پہنچ رہے ہیں؟ ہے نا! وہاں میری تصویر ہی آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہوگی۔ جبھی دیر ہو گئی! سمجھی! مگر آپ کی بلا سے کوئی انتظار کرتا ہے جلتا رہے آپ کو کیا۔ بس اب بولیں گے تو نہیں۔ ارے! ہاں دیکھئے تو آپ نے جو ساڑھی بھیجی ہے وہ ہمیں بالکل پسند نہیں۔ کھلے کھلے پھول ہیں سارا گلدستہ سینے پر آجاتا ہے۔ سچ کہتی ہوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کئی بار دیکھا ہے۔ آنکھوں میں کھبتی نہیں۔ کبھی میں بھیج رہی ہوں وہی لے آئیے پہلی، اچھے جو ہوئے، پانچ منٹ لگیں گے کار پہ۔ کولڈ کریم پاؤڈر اور لپ سٹک بھول گئے تھے۔ سن لیا نا جناب نے۔ ہاں ایک اور چیز بھی تھی۔ ارے بھول ہی گئی؟ اچھا جانے دیجئے۔ اچھا ہاں یہ تو بتائیے ٹیلیفون پر میری آواز کیسی آتی ہے؟ نہ، نہ آپ نہ ہلائیے اپنی پھول کی پتیوں کے سے ہونٹ میں جو بول رہی ہوں۔۔"

ان لگاتار الفاظ کے جواب میں جن کے پیچھے ہزاروں مسرتیں جھانک رہی تھیں میں رکتے رکتے صرف یہی کہہ سکا آ۔۔۔پ کیسے؟ میں یہ کہنا۔۔۔۔ آپ غلط نم۔۔۔ب

دوسری طرف سے ایک ہلکی سی چیخ کی آواز آئی۔ ٹیلیفون پر رسیور زور سے گرا۔ میں اپنے سر کو ہاتھوں کا سہارا دئے بعد میں کیا سوچتا رہا یہ اب مجھے یاد نہیں۔

فاروق علیخاں

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ؟
دفع مرض کے واسطے پِل پیش کیجئے!

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے!

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجئے"

اقبال

نکاتِ زندگی

دل کلیمِ زندگی، آنکھیں کلامِ زندگی
کیوں نہ بزمِ حسن تک پہنچے پیامِ زندگی

یہ نہ ہو تو کون ہو پھر شاد کامِ زندگی
رُوپ بھر کر صبح کا آتی ہے شامِ زندگی

التفاتِ خاص پہ ان کے قیامِ زندگی
ان کا نظریں پھیر لینا اختتامِ زندگی

لے اک انگڑائی اور اپنی رُوح کو آزاد کر
تا بکے قیدِ تعیّن، اے غلامِ زندگی

تشنۂ جلوہ کا ہے ذوقِ نظر تشنہ ابھی
ہو درخشاں اور کچھ ماہِ تمامِ زندگی

ہر قدم پر جشنِ رنگ و نشرِ بُو ہر گام پر
خالقِ صد گلستاں ہے ہر خرامِ زندگی

غیر کے قدموں سے منزل پر پہنچنے کی امید!
بن سکے تو خود بنا نقشِ دوامِ زندگی

اے حیاتِ دہر، اے نقشِ جمیلِ کائنات
لے نگاہِ واپسیں سے اب سلامِ زندگی

خوگرِ رنجِ اسیری ہے یہ اس کا ظرف ہے
کیوں کہے اعجاز کو کوئی غلامِ زندگی

اعجاز صدیقی (اکبرآبادی)

جنگ کے شعلے

چینی منصف کے محل کے باہر بید مجنوں کا ننھا درخت ژالہ باری سے لرز رہا تھا۔ چاروں طرف برف گر رہی تھی اور برف کے گالے، بلور کے ٹکڑوں کی طرح ہوا میں تیر رہے تھے۔ آفتاب کے رخسار پر جو ربا کے اُس پار اپنی آخری شعاعیں سطحِ آب پر ڈال رہا تھا، کہر کی ایک ہلکی سی نقاب پڑی ہوئی تھی۔ بتکدوں کی نقرئی، طاؤسی اور چمپئی چھتیں، کنفشٹ چین کی قرمزی برجیاں اور خاص کر خدائے جنگ، لاڈیہ کی سر بفلک پرستشگاہ ادلوں اور گالوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ نہ صرف ملکی منچوریوں، بلکہ پردیسی چینیوں، تاتاریوں، تبتیوں، منگولیوں اور کہیں کہیں روسیوں اور جاپانیوں کے بڑے بڑے سمور والے کوٹوں پر برف کے ننھے ننھے ذرات چھوٹے چھوٹے ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ ہر شخص کسی نہ کسی کام پر جا رہا تھا۔ ان کے پاؤں میں گھٹنے تک کے جوتے، اور سروں پر اونی ٹوپیاں یا بھیڑ کی کھالوں کے کنٹوپ تھے۔ جس سے ان کے شانے تک چھپے ہوئے تھے۔ ان کی ناکیں، شمالی منچوریا کے میدانوں اور منجمد پہاڑیوں سے آنے والی سرد ترین ہواؤں سے ٹھٹھر کر بینئی خرگوش کی طرح سکڑ گئی تھیں۔

باہر سخت سردی تھی اور خنک ہواؤں کے جھونکے جسم کے پار ہوئے جاتے تھے، لیکن محل گرم تھا اور کمرے دہکتے ہوئے آتش دانوں کی بدولت نہایت آرام دہ۔ مشرق اور مغرب کی لعنتوں، افیم اور شراب کی خوشبو سے فضا لبریز تھی۔ مغرب کا نمونہ پتلا دُبلا، طاقتور، نیلی آنکھوں اور خوبصورت بالوں والا، دراز قد امریکی تھا۔ اور مشرق کا نمونہ، حلیم الطبع خلیق اور بھاری جسم والا یہ چینی منصف تھا۔ جس کی ٹانگیں سنگِ مرمر کی رنگین و منقش کرسی پر پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ دونوں ——— سی بری کلارک اور ضونیہ ——— بڑے دیرینہ دوست تھے۔ ان دونوں کا رشتۂ اتحاد بڑا مضبوط تھا جس پر بدبختی اور شرمناکی کا سایہ تھا، کیونکہ اس کی بنیاد ایک افسوسناک عیب پر قائم تھی جسے وہ دونوں ایک دوسرے کیلئے قابلِ معافی سمجھ کر چشم پوشی کرتے تھے۔ یہ عیب امریکی میں شراب نوشی اور چینی میں افیم خوری تھا۔ وہ دونوں اکٹھے اپنی اس شرمناک عادت کو پورا کیا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ آپس میں ان کا بھائی چارہ، ہمدردی اور محبت بڑھتی گئی۔

ان دونوں کی تقدیریں بھی ایک دوسرے سے مماثل تھیں یعنی ملازمت کی نہایت عمدہ ابتدا اور ترقیوں کے بے شمار مواقع کا یقین، لیکن انجام کار، ناکامیاں اور مایوسیاں! ——— یہاں منچوریا کے اس چھوٹے سے قصبے لیانگ کیاؤ میں، وسیع میدان کے پیچھے ۔۔۔۔۔۔

———

کچھ سال ہوئے سی بری کلارک اپنے وطن سان فرانسسکو میں ایک نوعمر ذہین قانون دان اور ہوشیار سیاس تھا اور اس کا مقصدِ حیات ایوانِ حکومت کا ممتاز رکن بننا تھا۔ اس نے حصولِ مقصد کیلئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے اور وہ تمام فضول حرکتیں کیں جو اس زمانے میں آگے بڑھنے کیلئے ہر نوجوان کو کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن بیچارہ ناکام رہا۔ مجمعوں میں تقریریں کرنے، لوگوں سے ملنے ملانے، بڑے آدمیوں کی خوشامد کرنے اور کھلانے پلانے کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا البتہ اُسے اس سلسلے میں شراب نوشی کی لت پڑ گئی اور حد سے زیادہ پینے کی وجہ سے اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔

اس کا ایک سرپرست تھا جسے اس سے بیحد ہمدردی تھی۔ ایک روز اس نے اپنے دوست سے مشورہ کیا "ہمیں سی بری کی کچھ مدد کرنی چاہیئے۔"

"کہو تو اس کے نام دو تین ہزار کا چک دیدوں؟"

"نہیں۔ اسے تو وہ شراب کی نذر کر دیگا۔ ہمیں اُسے کوئی معقول ملازمت دلوانی چاہیئے۔"

"ملازمت؟ ملازمت کہاں رکھی ہے؟"

"تمہارا ایسٹرن کمپنی پر بہت اثر ہے، ہے نا؟"

"اچھا ـــــــ ؟"

"سی بری کو چین، جاپان یا کہیں اور بھجوا دو۔"

"ــــ لیانگ کیاؤ میں ایک جگہ ہے ــــ لیکن سی بری ایماندار تو ہے نا؟"

"بالکل!"

"اچھا ـــــ لیکن لیانگ کیاؤ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور وہاں کوئی انگریز شاذو نادر ہی نظر آتا ہے۔ وہ گھبرا تو نہ جائے گا؟"

"ارے نہیں۔ لیانگ کیاؤ اس کیلئے بہت مناسب جگہ ہے شاید وہ وہاں کچھ سنبھل بھی جائے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ کبھی نہایت جفاکش تھا، اور اپنے مستقبل کو نہایت شاندار بنانا چاہتا تھا مگر..."

"خیر۔ مایوسیوں اور ناکامیوں سے تو ہر شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔"

"بےچارہ بڑا عافیت پسند ہے۔ باوجود نہایت جوشیلے ہونے کے وہ دنیا میں صلح و آشتی کا قائل ہے۔ جنگ اور خون بہانے سے اسے دلی نفرت ہے۔"

"تو یوں کہو کہ وہ رقیق القلب ہے؟"

"ہاں، لیکن صلح و امن کیلئے وہ لڑنے اور مارنے مرنے سے بھی دریغ کرنے والا نہیں۔"

"بس تو منچوریا اس کیلئے بہترین مقام ہے، کیونکہ تم میری بات یاد رکھو، دیر یا سویر، جاپانیوں اور چینیوں میں لڑائی ضرور ہوگی تم اس سے کہہ دو کہ وہ ملازم ہو گیا ہے۔"

بس اس طرح سی بری کلارک نے بابِ طلائی، بازارِ اشک، اور جزیرۂ حیوان کو الوداع کہا اور کئی ہفتوں کے سفر کے بعد لیانگ کیاؤ پر پہلے پہل نظر ڈالی ـــــ آس پاس کے مناظر غیر معمولی طور پر دلکش تھے۔ تمام منچوریا پر بارشِ حسن ہو رہی تھی اور وسیع و عمیق دریا لوئی نہایت شان سے اٹھلاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ آسمان کی نیلی چھتری تاحدِ نظر سایۂ شہپر کی طرح پھیلی ہوئی تھی ـ دور، شنگرفی، گیرواں اور سبزی مائل پہاڑیاں، قوسِ قزح کے رنگوں کے ساتھ مل کر ایک نغمۂ شفق پیدا کر رہی تھیں، لیکن قصبہ بذاتِ خود نہایت کثیف اور گنجان تھا جہاں ایک درجن کے قریب مختلف لڑاکو اور کینہ پرور قومیں آباد تھیں۔ دیواروں پر جگہ جگہ مردار خور جانور قطار بنائے بیٹھے تھے اور بیسیوں قسم کی بدبوئیں فضا میں تیر رہی تھیں۔ اور خاک اموجوں کی طرح اڑتی ہوئی، کہ تنفس میں بھی دقت ہو اور انسان شدت کی پیاس محسوس کرے..... ایک بات یہاں بڑی اچھی تھی۔ یعنی پیاس بجھانے کیلئے بےشمار جگہیں اور طرح طرح کی شرابیں! ـــــ اسکوچ وسکی، جاپانی، روسی اور خود یہاں کی بنی ہوئی چاول کی برانڈی اور خاصی سستی! چنانچہ اپنی آمد کے اگلے ہی روز، شام کو کلارک، ایک میخانے سے دوسرے میخانے میں پیتا پھرا۔ یہاں تک کے نشے میں چور ہو کر اول فول بکنے لگا اور اسی بدمستی میں ایک تاتاری سے لڑائی بھی ہو گئی۔ تاتاری نے اسے مارنے کیلئے اپنا چمکدار خنجر نکالا ـــــ لیکن اسی دم ایک شخص اسے بچانے آ گیا۔ یہ ایک چینی تھا جو باوجود نہایت بھاری بدن ہونے کے میزیں اور کرسیاں ہٹاتا ہوا اس کی طرف تیز رفتاری سے آیا اور تاتاری کو دھکا دیکر غضبناک لہجے میں اس سے بولا "نگو یوتی یات چن نگان لوطان!"

الفاظ کا گورکھ دھندا! کون انہیں سمجھے؟

معاً تاتاری کھڑا ہو گیا اور تین بار نہایت لجاجت سے اس کے سامنے دوزانو ہوا۔ پھر اس چینی نے صاف انگریزی میں متحیر امریکی سے گفتگو کی "مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سے اپنا تعارف کرا دوں۔ میں ضوپو ہوں ـــــ یہاں کا جبن یعنی منصف۔"

سی بری نے اس کا شکریہ ادا کیا اور معذرت کے طور پر کہا "قصور میرا ہی ہے۔ میں نے حد سے زیادہ پی لی تھی۔"

"نہیں۔ عیوب بھی محاسن کی طرح فطری ہیں۔ کنفیوشس کا قول ہے۔ "راہِ عظیم، افضل ترین ہے، لیکن لوگ اسے چھوڑ کر، پگڈنڈیوں پر چلتے ہیں۔" کیونکہ اصل راہ سے ہٹ کر چلنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ آہ!" اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا "میں بھی ایک پگڈنڈی پر چلتا ہوں۔ مجھ میں بھی ایک عیب ہے۔"

اس طرح ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔ رات کا کھانا انہوں نے ساتھ کھایا اور دونوں ایک دوسرے کے رازوں اور کمزوریوں سے واقف ہو کر پکے دوست بن گئے۔ پھر رات گئے تک وہ اپنی تقدیروں کی کجروی کا مذاق اڑاتے رہے۔

ضوپو بھی کلارک کی طرح اپنے حصولِ مقصد میں ناکامیاب رہا۔ وہ ایک ممتاز چینی خاندان کا فرد تھا، اس لئے اسے تعلیم

کیلئے پیکنگ بھیج دیا گیا۔ چنانچہ اس نے وہاں —— "شہر ممنوع"
کے ایوان رفیع الشان اور گہوارۂ علم میں —— پڑھا اور وہ ڈگری
حاصل کی جسے حسن پسند چینیوں کی زبان میں "گُلِ لیاقت کی سند"
کہا جاتا ہے۔ پھر دو سال بعد ہزارہا طلبا میں اوّل رہ کر اس نے
"چِن شیح" (مقتنِ فاضل) کی ڈگری لی اور وطن کینٹن واپس ہوا۔
اپنے معزز والدین کے گھر میں داخل ہوتے وقت وہ اکادمی کا
زرق برق لباس پہنے ہوئے تھا۔ یعنی ریشم کی چوکور جوتیاں،
گول ٹوپی پر گُل بوٹے کی سنہری لیس، اور سینے و پشت پر بگلے اور
پیازی ساٹن کے فیتوں سے لکھے ہوئے چوکی اور طاچنگ
ٹولی کے مقولے۔ کچھ عرصے بعد وہ امریکہ چلا گیا جہاں اس
نے عالمگیر جنگ کے زمانے میں کئی چینی سفیروں کے ساتھ
جان توڑ کام کیا۔ چونکہ وہ صبح سے لے کر آدھی آدھی رات
تک کام کرتا تھا، اس لئے سُستی اور نیند کے غلبے سے محفوظ
رہنے کیلئے اس نے افیم پینی شروع کر دی۔ اور آخر کار اپنی آبائی
عادت کا جو اُسے ورثتاً ملی تھی شکار ہو گیا —— بہرحال سی ری
کلارک کی طرح اس نے چین کی بے حد خدمت کی تھی اور وہ
اُن لوگوں میں سے تھا جنہوں نے مادرِ وطن کو دوبارہ زندگی بخشی
لیکن انجام کار، اس سے زیادہ با اختیار لوگوں نے اس کے ساتھ
وہی سلوک کیا جو سی ری کے ساتھ ہوا تھا۔

کسی نے کہا تھا "ضوپو نے ہمارے ملک کی خاطر اپنی جان
تک کی پروانہ کی تھی، اس کے معاوضے میں اسے کسی بڑے
عہدے پر فائز کرنا چاہیئے۔"

جواب ملا "نہیں جی، مستعمل لکڑی کس کام کی؟"

"پھر بھی! اس لکڑی کو کہیں ٹھکانے لگا دو۔"

"میں بتاؤں؟" ایک نوجوان چینی افسر نے تمسخر سے کہا۔
"اسے لیانگ کیاؤ بھیج دو —— جہاں صرف گندگی اور
بدبوئیں ہیں! —— کوئی اور معقول افسر وہاں جانا پسند نہ
کرے گا۔"

بس اس طرح ضوپو کو لیانگ کیاؤ بھیج دیا گیا، وہی گندہ
چھوٹا سا قصبہ، جہاں وسیع میدان کے پیچھے سی ری کلارک
آیا، اور جو کچھ عرصے بعد نہایت اہم مقام اور شاید بین الاقوامی جنگ
کا مرکز بننے والا تھا۔ ۔ ۔ ۔

۲

سرِ شام ضوپو کے مکان پر دو نو دوست جمع ہوتے اور اس
دلفریب کمرے میں رات بھر گزار دیتے جہاں ساگوان کا فرنیچر،
واڈ گوں کونوں میں دھندلا پڑ جاتا تھا اور جس کی دیواروں پر نندو ساٹن
منڈھی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں چاروں طرف عمودی رسم الخط میں
حکیمانہ مقولے کڑھے ہوئے تھے اور فرش پر اژدہوں کی نارنجی
گلابی اور بادامی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔

یہ سرما کی ایک خنک رات تھی اور وہ دونوں اپنے اپنے
شغل میں مصروف تھے۔ امریکی جام پر جام چڑھا رہا تھا اور چینی بار بار
اپنا ہاتھ قریب کی الماری کی طرف بڑھاتا تھا جہاں شقیقہ اور سینگ
کے بکسوں میں ستی اور رہن ہوک (مختلف قسم کی افیمیں) اور
ایک چھوٹا سا چراغ جس میں سے زمرد جیسا شعلہ نکلتا تھا اور
جس پر سبز تتلیاں منڈلاتی تھیں، رکھا ہوا تھا۔ وہ پھرتیلی انگلیوں
سے کیکنار کی گولی بنا کر اپنے پائپ کی ننھی سی پیالی میں ڈالتا اور
پھر اسے چراغ کی لو پر گرم کر کے دیکھتا رہتا کہ افیم کی انٹی
کہربائی اور طلائی رنگ بدل رہی ہے۔ افیم گرم ہو کر گل جاتی اور
اس میں سے بخارات اُٹھنے لگتے۔ بار بار کش لینے سے افیم
کے خوشبودار دھوئیں کے بادل سارے کمرے میں پھیل جاتے
اور ضوپو چمڑے کے چوکور تکیوں کا سہارا لئے پائپ پر پائپ
پئے جاتا —— بیرونی دنیا اسے اپنے سے دور، بہت دور
ہٹی ہوئی معلوم ہوتی۔

بند دریچوں میں سے آنے والی آوازیں اسے بہت مدھم
سنائی دے رہی تھیں۔ برف کے گرنے کی دھب دھب اور
تند و سرد ہواؤں کا شور، بس خواب سا معلوم ہوتا تھا۔ باہر لوگ اپنے
اپنے کاموں پر جاتے ہوئے محبت و نفرت یا زندگی اور موت
جیسے غیر ضروری موضوعات پر باتیں کر رہے تھے اور جو راہ گیر
جاپانی جاسوس، یا غدارانِ وطن ہوتے تو وہ بظاہر منچوری ریلوں
کا تذکرہ کرتے مگر ان کی مراد بڑی بڑی سلطنتوں کے زوال اور
کسی ہولناک جنگ سے ہوتی —— لیکن ان لوگوں اور
ان کی باتوں پر بھی ضوپو کے لئے ایک خوابناک حقیقت چھائی
ہوئی تھی۔ جنگ! ریلیں! غدار! جاپان!

ضوپو کو کوئی بات یاد آنے لگی —— اس کے کانوں میں

جھنک سی پڑ چکی تھی۔ اسے یاد آیا کہ نانکنگ سے حکومت نے کچھ ضروری کاغذات بھیجے ہیں۔ چند گھنٹے ہوئے ایک خفیہ قاصد ان اشد ضروری کاغذات کو لایا تھا، لیکن کلارک کے کہنے سے اس نے انہیں بغیر اچھی طرح پڑھے احتیاط سے رکھ دیا۔ مگر قاصد بھی تو اس وقت آیا جب امریکی کی جام اور ضنوپو تین بار پائپ پی کر نشے میں چور ہو چکے تھے۔ اسی لئے انہوں نے ان کی کوئی پروا نہیں کی، سوچا کہ صبح پڑھ لیں گے۔ پھر بھی اسے ایک خط میں کوئی ضروری بات یاد آنے لگی ——— ایک جاپانی دستے کے متعلق، جو مکدان سے طوفان کی طرح برق رفتاری سے جانبِ شمال دریائے لیالو کی طرف بڑھا آ رہا تھا ——— اور یہ کہ مغربی سرحد کے اُس پار منگولیا کا حکمراں "جیپ سند جمپا ہوتختو" (یعنی مقدس راہب) جاپان کا ہمدرد ہے، اس لئے وہ اپنی فوجیں منچوریا بھیج رہا ہے ——— اور دونوں لشکر متحدہ حملہ کرنے کی غرض سے ایک دوسرے سے مل جانا چاہتے ہیں ——— اور ان دونوں کو آپس میں ملنے سے روکنے کیلئے چینی وطن پرستوں کی ایک فوج مارشل چانگ سُوہ لیانگ کی کمان میں، ہی لونگ کیانگ میں سے گزری ہے ——— اور ——— ہاں، کچھ مقامی چینی حکام کے متعلق بھی تو لکھا ہے جنہیں رشوت دی گئی ہے اور ——— کچھ اور بھی!

وہ کیا؟ . . . . .

کوئی بہت ہی اہم معاملہ!

کاغذات میں یہی لکھا ہے "بہت ہی اہم اور اشد ضروری!" ——— اور اس کا تعلق ——— ذرا سوچنے دو ——— ریل کے پُل سے ہے، ریل کا پُل! . . .

لیکن معاملہ کیا ہے؟

اس نے سوچا اور یاد نہ آنے پر جھنجھلا اُٹھا۔

آخر اس نے یاد کرنے کی کوشش بالکل چھوڑ دی۔ یاد نہیں آتا تو نہ آئے ——— کوئی پروا نہیں! کسی چیز کی پروا نہیں سوائے افیم کی انٹی کے ——— اور اس نے پھر پینا شروع کر دیا۔

اس کے مطمئن زرد چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے افیم کے دھوئیں کو، جس کے گھیرے دار بادل سامنے ناچ رہے تھے۔ غور سے دیکھا۔ وہ رنگ برنگی معلوم ہوتے تھے، بادامی، طاؤسی، نارنجی، ارغوانی اور حیرت زا سبز ——— اس کے گذشتہ خوابوں کے رنگوں کی طرح ——— وہ خواب جن میں اس نے اپنے تئیں اعزازات و تکلفات سے سجا ہوا دیکھا ——— پھر یہ بادل دیکھتے ہی دیکھتے رنگ بدلنے لگے ——— اس کے مستقبل کے خوابوں کی طرح ——— خوش کن، نازک، حسین . . . . . .

اس نے سہی بری کلارک کی طرف گردن پھیری ——— وہ بھی خواب دیکھ رہا تھا۔ نشیلے، دلچسپ خواب! ضنوپو نے اندازہ کر لیا کہ امریکی بھی مسرور ہے۔ شکر ہے گوتم بدھ کا! وہ دونوں خوش تھے۔

اور کیوں نہ ہوں؟ کیا کنفیوشس نے نہیں کہا کہ فرزانوں کا واحد مقصدِ حیات مسرت ہوتا ہے . . . .؟ مسرت! ہاں اس کے لئے مسرت افیم میں . . . . . .

وہ ستائیس بار دم لگا چکا تھا۔ اب اس نے الماری میں سے ایک اور پائپ نکالا جو چند سال ہوئے اس کے ایک دوست نے اُسے جشنِ ماہتاب کے روز، خدائے آتش کی سرخروئی کی خوشی میں تحفتہً دیا تھا۔ یہ گلابی بلّور کا بنا ہوا تھا اور اس پر سات سیاہ رنگ کے لمبے لمبے پھندنے بندھے ہوئے تھے۔ منہال پر نیلم و پکھراج کی پچیکاری تھی اور دستے پر آسمانی دیوتاؤں کے اوصاف کندہ تھے ——— لاؤزی سے لیکر روحِ عظیم تک موتی شاہ سے لیکر مولدِ قدیم تک، مادرِ مغرب سے لے کر تائی شان (کوہِ مشرق) کے دیوتا تک جو چین کی سرحدوں کو غیر ملکی وحشیوں کے حملے سے محفوظ رکھتا ہے . . . . غیر ملکی وحشی! یہ الفاظ ضنوپو کے ذہن و دماغ میں گونج اُٹھے فوراً اُسے کوئی بات یاد آئی کسی خطرے کا خیال آیا . . . . . .

ٹھیک تو ہے ——— غیر ملکی وحشی ——— دشمن! وہ لوگ جنوب اور مغرب، مکدان اور منگولیا سے بھاگے آ رہے ہیں اور دریا ر تو نی کے پاس اتصال کی کوشش کر رہے ہیں ——— اور مارشل چانگ سُوہ لیانگ کے سپاہی اس اتحاد کو روکنے کیلئے روانہ ہو چکے ہیں اور وہ پل؟ کوئی اشد ضروری بات اس سے متعلق تھی . . . . لیکن کیا؟ اس نے یاد کرنے کی جدوجہد کی مگر بیکار . . . . آخر اس نے سوچا کہ اپنے دوست سے معلوم کرے۔

"سی بری!" اس نے جھنجوڑا "سی بری!"

"اس وقت مجھ سے نہ بول، او چینی کافر!" اس نے نشے میں کہا "کتنا اچھا خواب ہے! ایوانِ خاص! لوگ خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں، پریذیڈنٹ کلارک! ...... پریذیڈنٹ سی بری کلارک! ......" اور مدہوش ہوگیا۔ ضوپو مسکرانے لگا۔

آخر کار اس نے فیصلہ کرلیا۔ پل ایسی کی تیسی میں پڑے اور چین چولھے میں جائے، دونوں اپنی حفاظت خود کرلیں گے۔ اس وقت کسی چیز کا فکر نہیں ہونا چاہیئے ــــــ سوائے لطف و سرور کے۔ چنانچہ اس نے افیم پینی شروع کی اور جلدی جلدی تین پائپ خالی کردیئے۔

سارے کمرے میں معطر کہر پھیل گئی اور ادھر ادھر آراستہ کی ہوئی چیزیں دھندلی پڑنے لگیں۔ اژدھوں کی کھالیں اور دیواروں کے زرد ریشمی پردے نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی ہڈیوں، پسلیوں اور پٹھوں میں تقلیبِ ہیئت ہو رہی ہے۔ غیر مرئی اشیاء صاف نظر آنے لگیں۔ اس کی روح بیرونی سطح پر نمودار ہوئی اور ما فی الضمیر گذشتہ آرزوؤں اور تجربوں کی طرف رجوع کرنے لگا۔ ناکامیاں اور مایوسیاں ...... وہ نہیں، نہیں، ان کا اب کوئی وجود نہیں بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں۔ بس ایک دو کش اور لگانے کے بعد، ضوپو میں بھی الوہیت آجائے گی۔ اس کے لبوں پر تبسم کھیلنے لگا اور افیم کا سرور ایک دلکش نغمے کی مانند اس کی کائناتِ حیات پر چھا گیا۔ اب اس کے کان کسی قسم کی آوازوں سے آشنا نہیں تھے۔ باہر کا طوفان اور سڑکوں کا شور و غل بجھی ہوئی قندیلوں کی طرح گل ہوگیا تھا۔ اس نے پھر کش لگائے اور خوابوں میں محو ہوگیا۔ اس وقت کا سماں اس کے سامنے آیا جب وہ پیکنگ میں "تعلیم کے رفیع الشان محل" میں "چین شیح" یعنی قانون کا ڈاکٹر بنایا گیا تھا۔ اس نے دیکھا ــــــ جیسا کہ وہ ہر رات خواب دیکھتا تھا ــــــ کہ وہ حجلۂ سماعت کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ پھر وہ سات بار سرنگوں ہوا اور اس نے سامنے کی دیوار پر قرمزی ریشم کی چار شعاعی جھنڈیاں دیکھیں۔ جن میں سے تین پر کونگ یون جانگ کے مقولے سلمے ستارے سے کڑھے ہوئے تھے۔ پہلا مقولہ تھا "مسرت نیکی ہے۔" دوسرے کے الفاظ تھے "میں نیک رہ کر مسرت حاصل کرنی چاہتا ہوں۔" تیسرے کا مطلب تھا "لو دیکھو ــــــ میں نے مسرت حاصل کرلی ہے۔"

چوتھی جھنڈی خالی تھی۔ لیکن ضوپو جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن مالکِ مکان اس پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور لکھے گا۔ جب مالکِ مکان داخل ہوا تو وہ سوچنے لگا، دیکھئے اس پر کیا لکھا جاتا ہے۔ وہ ایک طویل قامت شخص تھا۔ لیکن اس کی صورت افیم کے بادلوں کی وجہ سے ضوپو نے صاف طور پر کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس کے ہاتھ سینے پر جڑے رہے اور وہ بھی نہایت نرمی سے اس کے سامنے کئی بار سرنگوں ہوا، اور جیسا کہ وہ ہر شب کہا کرتا تھا اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا "از راہ کرم پہلے آپ اندر تشریف لے چلئے۔"

چینیوں کی روایتی شائستگی کے مطابق، وہ اس سے زیادہ جھکا اور بولا "میں کیسے پہلے داخل ہونے کی جرأت کرسکتا ہوں، اے عاقل و مکرم بھائی!" اور جب بار بار وہ اپنی انکساری کا اظہار کرچکے تو دونوں اندر گئے اور ضوپو کو اس کے مہمان نے تعظیماً اپنے پاس بائیں جانب بٹھایا۔ پھر ایک نرم رو ملازم نے آکر ان کو گرم شراب سے لبریز دو زریں و شفاف جام پیش کئے۔ جو صرف بڑے بڑے امرا اور علما و فضلا استعمال کرتے ہیں ــــــ اور ضوپو نے فخر سے تصور کیا کہ وہ بھی عالم و فاضل ہے۔ اور کیا واقعی اس نے تمام امتحانات اعزاز سے پاس نہیں کئے تھے؟ اور کیا اس کی ماں کو ایسا لائق فرزند پیدا کرنے پر لوگوں نے بھرے مجمع میں مبارکباد نہیں دی تھی؟

وہ بیٹھا شراب کی چسکیاں لیتا رہا اور چوتھی جھنڈی کو دیکھتے ہوئے اس نے، ہر رات کی طرح، پوچھا "آپ چوتھی جھنڈی پر کب لکھیں گے۔ اے دانا و معظم بھائی؟"

بالعموم جواب ہوتا "شاید کبھی نہیں۔" لیکن آج مالکِ مکان اس سوال پر کھڑا ہوگیا اور کہا "ابھی!"

وہ دیواروں کے پاس پہنچا اور قرمزی ریشم پر یہ الفاظ لکھے "تین چیزیں مسرت سے کہیں زیادہ باعثِ نیکی ہیں ــــــ وفاداری

ایثار اور جرأت ۔ ۔"

سکوت!

یکلخت مالکِ مکان ضوپو کی طرف مڑا اور ——— جونہی یکایک افیم کہر ہٹ گئی تو اس نے اپنے میزبان کا چہرہ صاف طور پر دیکھا . . . . پُر رعب خمدار ناک، چوڑی پیشانی، سفید براق لمبی داڑھی! اس نے پہچان لیا اور فوراً دوزانو ہو گیا "کنفیوشس . . . . !"

کنفیوشس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دہرایا ۔

"وفاداری، قربانی، بہادری . . . . . ."

یہ الفاظ اس کے منہ سے بجلی کی کڑک کی طرح نکلے ایسی کڑک کی طرح جس نے اس کے دماغ کے ریشے ریشے کو بکھیر دیا اور اُسے اس کے خوابوں سے چونکا دیا۔ خواب ختم ہو گیا لیکن کڑک اس کے کانوں میں گونجتی رہی، بلکہ دم بدم تیز ہوتی گئی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دیو ڈھول پیٹ رہا ہے اور جونہی ضوپو نے بھاگ کر جلدی سے دریچہ کھولا، کہیں دور ایک بہت تیز روشنی بلندی پر نمودار ہوئی اور اس کے بجھنے سے پہلے بیشمار زرد شعلوں کی لپیٹ آسمان میں پھیل گئی۔

ضوپو سمجھ گیا کہ یہ کیا ہے۔ جنگِ عظیم کے زمانے میں اُسے یورپ میں اس سے واسطہ پڑا تھا ——— یہ دور، بیسیوں میل دور، توپ کی گرج و چمک تھی . . . . .

وہ سی بری کو ہوشیار کرنے کیلئے مڑا۔ مگر وہ پہلے ہی بیدار ہو گیا تھا، سرخ آنکھیں، سنجیدہ صورت! ——— وہ بھی جان گیا تھا۔

"توپ . . . . . . ؟"

"مغربی سمت میں ہے۔" ضوپو نے اشارے سے بتایا۔

"شاید منگولی ہیں . . . ."

"ہاں، جاپانیوں سے ملنے کیلئے دوڑے چلے آرہے ہیں ——— وہ خط یاد ہے؟"

"ہاں۔"

"جنگ!"

"جنگ!" سی بری نے استعجاب میں دہرایا اور اُن لوگوں کو کوسنے لگا جو دنیا کے امن کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ وہ جنگ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتا تھا۔ اس نے سوچا کہ جیسے عالمگیر جنگ کا سبب صرف آسٹریا اور سربیا کی مقامی لڑائی تھا اسی طرح ایک ہو گا۔ چین اور جاپان کا تنازع آپس کی بات ہے اور شاید کچھ عرصے کے بعد دونوں میں صلح ہو جائے۔ لیکن اگر منگولیوں نے اس میں حصہ لیا تو روس بھی آدھمکے گا کہ چین کے حصے بخرے میں زرخیز علاقے خود ہتیا لے اور جب روس میدان میں آیا تو فرانس، انگلستان، اٹلی اور جرمنی کیوں خاموش بیٹھنے لگے؟ ممالک چین کی تقسیم میں اپنا اپنا حصہ برابر کا ٹھہرانے کیلئے وہ بھی کسی نہ کسی طرف سے ضرور شرکت کریں گے۔ ان کے بعد بلجیم اور پرتگال اور پھر پولینڈ بھی جنگ میں کود پڑیں گے ——— کہ بڑے کتوں کو لڑتا دیکھ کر چھوٹے کتے صرف بھونکنے ہی میں اپنی بہادری سمجھتے اور ذرا خوش ہو لیتے ہیں۔

"ہم کو ایک ہڈی چاہیئے! ہم کو ایک ہڈی چاہیئے!"

"آؤ چلو لڑیں!"

"خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے!"

"ایلونس ۔ انفانٹس، ڈے لا پاتری!"

"ہُرے! ہُرے! ہُرے!"

ہر شخص آمادہ بر جنگ ہو گا۔ ہر متنفس لڑنے کیلئے بیچین ہو گا، اور آخر کار امریکہ بھی مداخلت کرے گا۔ غرض ہر چہار طرف جنگ کے شعلے بھڑکیں گے۔ مشرق، شمال، جنوب، مغرب یعنی ہر سمت آگ اور خون سے ہولی کھیلی جائے گی۔ گورے، کالے، زرد، لال اور بھورے انسانوں میں خونریزی ہو گی۔ بحری علاقوں اور بری خطوں میں لہو کے پرنالے بہہ نکلیں گے۔ فضا آتشناک ہو گی فلانڈرز کے لہلہاتے کھیتوں سے لیکر وسط افریقہ کے گھنے دار جنگلوں تک لڑائیوں کی چنگاریاں بکھر جائیں گی۔ گویا ایک عالمگیر جنگ ہو گی ——— محض اس لئے کہ چند سو منگولی سوار جاپانیوں سے ملنے کیلئے چلے آرہے ہیں۔

سی بری کلارک نے تمنا کی "کاش مارشل چیانگ سُو لیانگ جلدی سے پہنچ جائے اور جاپانیوں کے آنے سے پہلے منگولیوں کو کاٹ کر سرحد سے پرے بھگا دے۔ کاش! یہ مقامی کشمکش صرف چین اور جاپان میں رہے، کہ اس طرح دنیا خون کی ندیوں سے محفوظ

رہیگی لیکن یہ کیسے ممکن ہے ......؟"

توپ کی گرج اور چمک قریب تر ہوتی جا رہی تھی، اور بم پے در پے پھٹ رہے تھے۔ آسمان کے مشرقی گوشے میں جہاں نور فجر ظاہر ہونے والا تھا۔ دھوئیں کا ایک تاریک بادل منڈلانے لگا۔

صبح ہوئی۔ لوگ باگ بستروں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گھبرا کر گھروں سے باہر نکلے اور پُر جوش سوال و جواب ہونے لگے۔ جاپانی اور بالشویکی ایجنٹوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اول الذکر اپنی وسیع سلطنت کا پروپیگنڈا کرتے ہوئے کہنے لگے۔ کہ جاپانی حکومت منچوریا میں امن و امان کی بارش کر دیگی اور ثانی الذکر یقین دلانے لگے کہ انقلاب احمر غریب و امیر میں مساوات قائم کر دیگا۔

توپوں کی گرج قریب تر ہو رہی تھی اور سی ہری دل میں کہہ رہا تھا "کیا کیا جائے؟ اسے خدا کیا کیا جائے ......؟"

اس نے ضوپو اور ضوپو نے اُسے دیکھا اور معاً دونوں کے دلوں میں ایک ہی خیال آیا۔ "وہ کاغذات ـــــ" امریکی نے لڑکھڑا کر کہا۔ "نانکنگ سے جو آئے ہیں ......"

"اور وہ پل ......؟"

"ہاں ـــــ ہاں۔"

وہ دونوں دوڑے دوڑے الماری کے پاس گئے اور چاول کے کاغذوں کا بنڈل کھول کر ایک خط بڑے غور سے پڑھنے لگے جو محکمۂ افواج کے افسر اعلیٰ میجر چو یو نے بھیجا تھا۔ میجر نے انجینئری کی تعلیم امریکہ میں پائی تھی اور جنگ کی چالاکیوں سے خوب واقف تھے۔ اس خط میں ندی کے پُل کا تذکرہ تھا جو لیانگ کیاؤ سے تھوڑے فاصلے پر تھا، اور منگولیوں کو جاپانیوں سے ملنے کیلئے اس پُل پر سے گذرنا تھا۔ چینی فوجیں دوسری سمت میں تھیں لیکن پچاس میل کے فاصلے پر۔ اس لئے منگولیوں سے ان کی مڈبھیڑ ہونی قریباً ناممکن تھی۔ اس خطرے کو میجر چو یو نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا اور اسی سے محفوظ رہنے کیلئے انہوں نے تدبیر کی تھی۔ خط میں آگے چل کر مذکور تھا کہ پُل سے متصل ایک سنگین اسلحہ خانہ ہے جس میں وہ سامانِ حرب جمع ہے جو جنگِ عظیم کے بعد بہت سستا مل گیا تھا۔ یہاں مختلف آلاتِ حرب کے علاوہ ایک اور خاص چیز ہے جو میجر چو یو کی ایجاد ہے۔ یہ ایک ننھا سا بکس ہے جسے وقت ضرورت ایک اکیلا آدمی استعمال کر سکتا ہے، لیکن وہ شخص بہادر اور جری ہونا چاہیئے، کیونکہ ایک ذراسی جنبش سے بکس پھٹ پڑے گا اور تمام اسلحہ خانے، پُل، اور خود اس شخص کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ـــــ یہ کام کوئی محبِ وطن ہی انجام دے سکتا تھا۔

"یہ کام ـــــ" ضوپو نے ہولے ہولے کہا۔ "اپنے انجام دینے والے کو اس کی زندگی کے تمام عیوب و نقائص سے پاک کر دے گا۔ اور بعدِ موت اس میں الوہیت سما جائے گی۔ تاکہ وہ دیوتاؤں کے جلو میں سیاحی کر سکے۔"

"ہاں۔ یہ کام صرف کوئی شریف النفس اور محبِ وطن ہی کر سکتا ہے۔" امریکی نے آہستہ سے جواب دیا۔

ضوپو مسکرایا اور دروازے کی طرف مڑا "مجھے جلدی کرنی چاہیئے۔"

"اور مجھے بھی۔"

"تمہیں؟"

"ہاں۔ میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

"تمہیں کیا ضرورت پڑی؟ تم تو امریکی ہو ......"

"میں تمہارا دوست بھی تو ہوں۔"

"پھر بھی ......!"

"رہنے دو۔" سی ہری نے بے چینی سے کہا۔ "پُل یہاں سے دس میل ہے، اور منگولی بہت قریب آ گئے ہیں۔ ہمیں بگٹٹ بھاگنا چاہیئے۔"

وہ دونوں موٹر میں سرپٹ دوڑے چلے گئے اور بازاروں، گلیوں، کوچوں سے نکل کر کھلے میدان میں آ گئے کہ جسقدر ممکن ہو دریا لونی کے پل تک پہنچ جائیں۔ وہاں پہنچتے پہنچتے انہوں نے گرد و غبار اڑتا دیکھا اور ان کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ ان کے کان مختلف النوع شور و غل سے گونج اٹھے۔

"منگولی آن پہنچے، جلدی کرو۔" امریکی نے اسلحہ خانے کے قریب رکتے ہوئے کہا "جس طرح ہو جلد اندر گھس جاؤ۔ میرے پاس ریوالور ہے، میں ان سے نپٹتا ہوں۔"

"میں جاتا ہوں ـــــ لیکن تم اکیلے ان سے کیسے لڑو گے؟"

"خدا کے واسطے اندر جاؤ، جس طرح بھی ہوگا میں ان سے

مقابلہ کروں گا اور تمہیں کام کرنے کیلئے وقت مل جائے گا۔"

وہ خاموش کھڑا سیکنڈ گنتا رہا۔ وہ اندازہ کر رہا تھا کہ ضوپو اب اندر پہنچ گیا ہوگا، اب بکس ڈھونڈ لیا ہوگا، اب کل پر ہاتھ رکھا ہوگا ——— اور اسی دم بندوقوں اور نیزوں سے مسلح سوار سامنے نظر آئے اور ان کی تلواریں چمکنے لگیں۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی ضوپو کو دو منٹ اور ملنے چاہئیں تاکہ منگولیوں کے پار کرنے سے پہلے پل ٹوٹ جائے اور وہ جاپانیوں سے متحد نہ ہو سکیں ——— اور اس طرح دنیا حرص و ہوس کے سمندر میں ڈوبنے سے بچ سکے ..... بالآخر اس نے فائر کیا اور منگولی کپتان گولی کھا کر گھوڑے پر سے گر پڑا۔ اس نے پھر فائر کیا اور منگولیوں نے چیخوں کے طوفان میں اس کی طرف نیزے پھینکے۔

اس نے اسلحہ خانے کی طرف آخری نگاہ ڈال کر قہقہہ لگایا۔ اور عین اسی لمحے جب وہاں سے ایک غضبناک دھماکے کے ساتھ تباہی و بربادی کا کوہ آتش فشاں پھٹا، سی بری کے قلب میں ایک منگولی نیزہ ہمیشہ کیلئے پیوست ہو گیا۔

صادق الخیری

پھرتے ہو اب آوارہ و افسردہ و تنہا
کہتے تھے سب کم ہی ملا کیجے اُس سے

حامد

گلدستۂ اشعار

طرفہ تر ہے یہ کہ اپنا بھی نہ جانا اور یونہی
اپنا اپنا کہہ کہ مجھ کو سب سے بیگانہ کیا

میر حسن

اُن نے قصداً کبھی میرے نالے کو
نہ سُنا ہوگا گر سُنا ہوگا

درد

ہنستا ہی مَیں پھروں جو مرا کچھ ہو اختیار
پر کیا کروں مَیں دیدۂ بے اختیار کو

میر

فرقت میں تری تارِ نفس سینے میں میرے
کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا

ذوق

تم خفا ہو تو بتا دے مجھے دنیا میں کوئی
اپنی روٹھی ہوئی قسمت کو مناؤں کیسے

وحید الدین سلیم

کہنے سے میر اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اِس دلِ خانہ خراب کو

کیول کرشن سوار، بی۔ اے

محسوسات

ہر نفس پیغامِ بربادی ہے انساں کیلئے
نبض کی ہر موج ہے نشترِ رگِ جاں کیلئے

زندگی دی ہی گئی تھی کشمکش کے واسطے
دل بنایا ہی گیا تھا سوزِ پنہاں کیلئے

اپنے اندازِ کرم کی مجھ سے تاویلیں نہ کر
یہ بھی اک تقریب تھی جورِ فراواں کیلئے

کچھ نہ پا کر بھی سمجھتا ہے کہ سب کچھ پا لیا
زندگی سب سے بڑا دھوکا ہے انساں کیلئے

اے مرے حسنِ عقیدت اے مرے نورِ یقیں!
کفر کی بھی اک جھلک تکمیلِ ایماں کیلئے

پھول، ذرّے، کہکشاں، تارے، شفق، قوسِ قزح
نذر لائے ہیں ترے حسنِ فراواں کیلئے

رہ گئی ہے دولتِ ایمان و دیں ماہرؔ کے پاس
یہ بھی حاضر ہے نگاہِ کفر ساماں کیلئے

ماہر القادری

افسانۂ فردا

ذیل کا افسانہ میں نے انگریزی سے اخذ کیا ہے، سائنس سے متعلق انگریزی میں اس قسم کے افسانوں کا رواج حال ہی میں ہوا ہے اردو زبان میں اس نوع کے افسانے میری نظر سے نہیں گزرے۔ امید ہے کہ قارئین اس موضوع کو غیر دلچسپ نہ پائیں گے۔

(سید شبیر الدین بی اے)

ہم اکیسویں صدی کے انسان بھی کس قدر خوش قسمت ہیں کہ انیسویں بیسویں صدی میں جن خیالات سے سائنس دانوں کا دماغ الجھتا تھا، وہ عملی شکل میں ہمارے سامنے ظاہر ہو رہے ہیں۔ کہاں ریل اور ہوائی جہاز کی آہستہ خرامی اور کہاں ٹیوب[1] ریل کی ڈیڑھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار! ریل گاڑی اور ہوائی جہاز کو انیسویں بیسویں صدی والے بہت بڑی کامیابی سمجھتے تھے اور ناز کرتے تھے! لیکن ٹیوب ریل جیسی تیز رفتار سواری بھی ہمیں حیرت میں نہیں ڈال سکتی۔ خدا جانے، انسان کے دماغ سے اور کیسی کیسی چیزوں کا ظہور ہوگا اور آئندہ چل کر کتنے ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار ممکن ہوگی! کسی زمانہ میں انسان ریڈیو اور غیب بینی[2] کو محض ایک خیال خام سمجھتا تھا، لیکن جب ان ایجادوں کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ان کے قصیدے پڑھنے لگا اور پھر بھی ان ایجادوں کا مضحکہ اڑاتا رہا۔ جو مستقبل میں نمودار ہونے والی تھیں۔ لوگ ٹیوب ریل کے متعلق کل کیا کہتے تھے اور آج کیا کہہ رہے ہیں! تاریخ سائنس اس قسم کے واقعات کو مسلسل طور پر دہراتی ہے، اور اس سے ہمیں ایک بڑا سبق حاصل ہوتا ہے۔

"الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السموٰت وما فی الارض
واسبغ علیکم نعمہٗ ظاھرۃ وّ باطنۃ"

کیا تم لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ جو کچھ آسمان میں ہے
اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کو اللہ نے تمہارا مطیع فرمان
کر رکھا ہے، اور تم پر اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں پوری کی
ہیں۔ (۳۱ : ۱۹ قرآن حکیم)"

سائنس کی ایجادوں سے ہم روزمرہ کے ہزاروں کام نکال لیتے ہیں لیکن شاذ ہی ہمارے دل میں ان کے موجدوں کا خیال گذرتا ہے۔ ریل، ہوائی جہاز، ٹیلیفون، ریڈیو، وغیرہ کو کون نہیں جانتا، مگر ان کے موجدوں سے کتنے لوگ واقف ہیں! تاہم تاریخ جو قوموں کا حافظہ ہے، ان مشاہیر کے حالات کو اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے لیکن ٹیوب ریل جیسی عظیم الشان ایجاد کو منصۂ شہود پر آئے پچیس سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ اور تاریخ موجد کے بارے میں اب تک خاموش ہے،

حقیقت یہ ہے کہ ٹیوب ریل کا موجد ایک خلوت پسند انسان تھا۔ اور کوئی شخص نہ جانتا تھا کہ اس کے روز و شب کیسے گذرتے ہیں ایک حیثیت سے تھوڑے بہت معلومات مجھے حاصل تھے، کیونکہ اس کی موت کے دس سال قبل سے تادم مرگ ایک عزیز شاگرد بلکہ ایک رازدار دوست کی طرح میں نے اس کے ساتھ کام کیا تھا لیکن یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اب تک میں نے بھی دانستہ خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کی موت کے دن سے اس کے حالات زندگی وغیرہ کے حصول کے لئے مختلف سائنسی سوسائٹیوں سے میرے پاس لگاتار فرمائشیں آنے لگیں، اور اخباروں کے نامہ نگار میرے گھر کے چکر کاٹنے لگے۔ جب میں نے یک قلم انکار کر دیا تو معاوضوں سے مجھے زیر کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بولی دینے لگا یہاں تک کہ ایک مشہور روزانہ اخبار نے پانچ ہزار روپیہ پر معاملہ طے کرانا چاہا اور دوسرے ہی دن ایک سائنسی سوسائٹی نے چھ ہزار سے سودا کرنے کی خواہش کی لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہا لوگ میری اس ہچکچاہٹ کا مضحکہ اڑاتے تھے اور جن لوگوں کی مجھ سے بنتی نہ تھی، انہیں میرے خلاف کہنے اور لکھنے کا اچھا خاصا موقعہ ہاتھ آگیا۔

میرے قدیم شناساؤں میں ایک صاحب تھے جن کا دستور تھا۔ کہ جب کوئی شخص میرے خلاف کچھ کہتا تو اس کی پیٹھ ٹھونکتے اور سنا ہے کہ بڑے فاضلانہ انداز سے فرماتے: "اجی میاں! وہ جانتا ہی کیا ہے!" اور جب کوئی میری ستائش کرتا تو جز بز ہو کر فرماتے: "اجی چھوڑئیے بھی وہ ہمارا ہی تربیت یافتہ ہے" ان حضرت نے میرے خلاف ایک لمبا چوڑا مضمون شائع کرایا۔ جس میں بزعم خود اس راز کا انکشاف کر ڈالا کہ طبیعیات میں میری ڈاکٹری کی ڈگری پروفیسروں کو چائے کھانے کی دعوت اور پھر رقم دینے دلانے کا نتیجہ تھی مثل مشہور ہے: "دروغ گو را حافظہ نباشد"۔ چنانچہ اسی مضمون کے

[1] Tube Railway [2] Television

آخر میں انہوں نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ڈاکٹری کے متعلق میری معلومات تمام کی تمام ٹیوب ریل کے موجد کی تحقیق کا نتیجہ تھی پچھلے اس نوع کے تھے الزامات جو اس وقت مجھ پر لگائے جاتے تھے۔

غرض دشمنوں کے حاسدانہ حملوں اور دوستوں کے گلے شکووں کے باوجود میں نے کامل پچیس سال تک مہر سکوت نہ توڑی۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے یعنی موجد کی وصیت۔ موت سے کوئی دو ہفتے قبل موجد نے مجھ سے قسم لی تھی کہ خدانخواستہ ٹیوب ریل کے پہلے تجربہ میں اگر وہ کامیاب اور زندہ وسلامت نہ نکلا تو پچیس سال تک اس کی ایجاد کی تفصیلات اور اس کے حالات کے متعلق ایک لفظ اخباروں میں شائع نہ کرایا جائے شاید اس کا خیال تھا کہ اگر پہلے تجربہ میں وہ زندہ نہ بچ سکا اور اس کی حسرتناک زندگی اور انجام کی زمانہ میں تشہیر کی گئی تو آئندہ ایک زمانہ تک کسی کو جرأت نہ ہوگی کہ اس کام کو ہاتھ لگائے اور اُسے ترقی دے یہ دلیل اگرچہ کمزور معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے سوا دوسری کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ پہلے تجربہ میں اس کی ایجاد تو کامیاب نکلی لیکن وہ زندہ نہ بچ سکا مجھے معلوم نہیں کہ موجد کی وصیت پر عمل کرنے میں میں حق بہ جانب ہوں یا نہیں۔ اگر میں حق بہ جانب ہوں تو مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے محترم استاد کی وصیت کی تکمیل کر دی، اور اگر نہیں تو میری تسلی کے لئے یہی کافی ہے کہ موجد کے بعد اس ایجاد کو ترقی دینے میں بہت بڑی حد تک میری ہی کوششوں کو دخل ہے

―――― (۱) ――――

وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں تجربہ خانے میں مددگار کی حیثیت سے ڈاکٹر نعمان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا وہ تیس سال کا ایک دبلا پتلا انسان تھا۔ جس کے چہرے پر قبل از وقت ضعیفی کے آثار نمودار ہو چکے تھے اس کا شمار ہندوستان کے مشہور انجنیروں میں ہوتا تھا پلوں اور نالیوں کے موضوع پر بعض انکشافات کے سلسلے میں اس کا نام شاید ہمیشہ زندہ رہیگا کچھ دنوں سے وہ انجنیری کی اس شاخ کو چھوڑ کر اپنا سارا وقت تجربہ خانے میں صرف کرنے لگا تھا چونکہ ہر روز نت نئے تجربوں کے سلسلہ میں اُسے بہت کچھ صرف کرنا پڑتا تھا اور اندوختہ قلیل رہ گیا تھا، اس لئے وہ بڑی تنگی سے گزارا کر رہا تھا وہ ملازموں کے اخراجات تک کا کفیل نہ ہو سکتا تھا اور اکثر اوقات اپنا کھانا خود پکانے پر مجبور ہو جاتا تھا

اس نے خندہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کیا اور کرسی پیش کرتے ہوئے کہا: "مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ میرے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ یہ اقدام آپ کے لئے کہاں تک مناسب ہے! میری معاشی حالت اس وقت کچھ اچھی نہیں اور شاید میری تکلیفوں میں آپ کو بھی حصہ لینا پڑے"

میں نے جواب دیا "میں تو اس کیلئے خوشی سے تیار ہوں"

واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں مجھے طبعیات میں ڈاکٹری کی ڈگری کے لئے تیاری کرنی تھی میری آمدنی بہت قلیل تھی اور خرچ بہت زیادہ، اس لئے فرصت کے اوقات میں جو کچھ بھی کما سکتا تھا، وہ ازبس ضروری تھا اس کے علاوہ ٹیوب ریل کی حقیقت جاننے کا مجھے از حد اشتیاق تھا اس ایجاد کے متعلق جس کی تکمیل میں ڈاکٹر روز و شب منہمک رہتا تھا، اکثر سائنسدانوں کی رائے کچھ ہمت افزا نہیں تھی۔ عوام کی تو پوچھئے ہی نہیں بعض لوگ تو علانیہ ڈاکٹر کو خبطی کہتے تھے۔ لیکن ہمارے کالج کے بعض پروفیسروں کے دل میں اس کی بہت وقعت تھی اور ان کی رائے تھی کہ ڈاکٹر نعمان اتنا کم ہمت انسان نہیں کہ اس ایجاد کو ادھوری چھوڑ جائے۔

غرض ڈاکٹر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ایک ایسی ایجاد کی تکمیل میں مصروف ہوں جو نقل و حمل کی دنیا میں انقلاب انگیز ثابت ہوگی۔ اور مجھے امید ہے کہ میں بہت جلد کامیاب ہونگا"

میں نے کہا: "سنا ہے کہ اس ایجاد کی تہ میں بان انجن کا اصول ہے بان انجن کوئی نئی چیز نہیں؛ یہ تو گذشتہ صدی کے خوابوں کی تعبیر ہے اس وقت لوگ خیال کرتے تھے کہ ایک نہ ایک دن وہ بان انجنوں کی مدد سے بحر اٹلانٹک کو بیس منٹ کے اندر عبور کر سکینگے، قمر کی سرزمین پر پہنچ جائیں گے اور سیاروں کی سیر کرینگے جو چیز ہمارے تخیل کو گرماتی ہے وہ ان ہونی سے ہونی بنجاتی ہے۔ آج نہیں تو کل۔ اور یہی ہوتا آیا ہے"

"بالکل درست" ڈاکٹر نے جواب دیا: "اس کی تہ میں وہی اصول ہے۔ جس پر بان انجن کام کرتے ہیں اب تو یہ مشکل بات نہیں رہی کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کی موزوں آمیزش کے احتراق کی بدولت بان انجن کو مسافر اور دیگر ضروری ساز و سامان کے ساتھ کرۂ ہوائی میں پہنچا دیا جائے، اور فی منٹ سو سے زیادہ میل کے حساب سے فضا کی لامتناہیوں کو طے کیا جائے لیکن دوبارہ زمین پر اترتے وقت نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سو فیصدی ناکامی، حادثہ اور موت! گذشتہ صدی کے اخیر میں اور اس صدی کے اوائل میں جو خوفناک حادثے رونما ہوئے ہیں ان کی روداد سنکر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ابھی تک ہم نے بان انجن کی کامیاب پرواز نہیں دیکھی اور خدا جانے کتنے سالوں یا صدیوں میں انسان کو یہ سعادت نصیب ہوگی موجودہ حالت میں اوپر جانا تو آسان ہے۔ لیکن اگر کوئی صحیح

Rocket Engine

Combustion

سلامت نیچے پہنچ جائے تو یہ ایک کرامت ہوگی، ایک معجزہ !"

میں نے عرض کیا "لیکن نظری لحاظ سے نیچے اترنے کا اصول بھی ایسا ہی سادہ ہے جیسے اوپر جانے کا۔ اوپر جانے کیلئے ہم انجن کے احتراقی کمرے میں ہائیڈروجن اور آکسیجن داخل کرتے ہیں ان دونوں کے احتراق سے یکے بعد دیگرے بان کے پیچھے کی طرف دھماکے ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے رفتار میں زبردست اسراع[1] پیدا ہوتا ہے اور وہ آگے کی طرف زناٹے کے ساتھ فضا کو چیرتی چلی جاتی ہے اب نیچے اترنے کے لئے انجن کو معکوس سمت میں چلانا چاہیئے، یعنی اس طرح کہ دھماکے پیچھے واقع ہونے کی بجائے آگے کی طرف واقع ہوں اس طرح چند دھماکوں میں انجن کی رفتار میں کافی ابطا[2] واقع ہوجائیگا جب رفتار دھیمی ہوجائے تو بان پر سے ملفوف پرکھول لیئے جائیں اور طیارے کی طرح نیچے ......"

"ٹھیک ہے" قطع کلام کرتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا "لیکن ہزار ڈیڑھ ہزار میل کی رفتار میں بان پر قابو رکھنا عملی طور پر ناممکن ہے انجن کو معکوس کرنے پر یا تو بان یک دم زمین پر آجاتی ہے یا منزل مقصود سے میلوں فاصلہ پر کسی شے سے جا ٹکراتی ہے اسی وجہ سے بان کو اتارنے کے تمام موجودہ طریقے ناکام ثابت ہوئے ہیں میں نے ایک طریقہ دریافت کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب یہ عملی جامہ پہنیگا تو تمام مشکلات حل ہوجائیں گی اور تمام خطرے دور ہو جائیں گے۔"

اس جملہ کو ختم کرکے وہ کچھ دیر تک میرے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا جیسے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے دعوے پر مجھے کہاں تک اعتماد ہے۔ اسکی آنکھوں میں میں نے ایک عجیب و غریب کشش محسوس کی اور خود بخود مجھے یقین ہوتا گیا کہ وہ اس دعوے کا مجاز ہے پھر اس نے ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا

"بان کی تیزی سے چلنے والی گاڑیوں کی رفتار پر قابو رکھنے کا ایک ہی اصول ہے، اور وہ یہ کہ گاڑی کو ایک ٹیوب کے اندر سے گذارا جائے جس طرح بندوق کی نالی سے گولی کو چھوڑتے ہیں پھر ہم اس سمت اور رفتار دونوں پر قابو رکھ سکتے ہیں اور جب اور جہاں چاہیں روک سکتے ہیں"

"فرکشن[3] یعنی رگڑ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے سوال کیا، "ٹیوب کے اندر اسقدر زبردست رفتار میں ہوا اور بان کے درمیان رگڑ کی وجہ سے کیا اتنی گرمی پیدا نہ ہوجائیگی کہ بان جل کر بھسم ہوجائے، ؟"

"ٹیوب کے اندر سرے سے ہوا ہی نہ ہوگی، لیکن صرف خلا" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"یہ بھی مانا، پھر ٹیوب کے بازوؤں سے بان کی رگڑ ہوجائے تو؟" میں نے سوال کیا۔

ڈاکٹر نے جواب دیا "ٹیوب اتنی کشادہ ہوگی کہ بان اس کے بازوؤں کو مس کئے بغیر گذر سکیگی۔ ٹیوب کے اندر خودکار ریڈیو کنٹرول[4] موجود ہوگا جو بان کو اپنی راہ سے ذرہ بھر بھٹکنے نہ دیگا، اور جس طرح کہ ریل خود بخود پٹری پر اپنی راہ قائم رکھتی ہے، اسی طرح ٹیوب کے اندر بان معلق ہوکر اپنی راہ چلے گی ریل کو البتہ ڈرائیور کی ضرورت ہوتی ہے لیکن بان گاڑی ڈرائیور کے بغیر بھی صرف ریڈیو کنٹرول کی مدد سے چلائی اور ٹھہرائی جاسکتی ہے۔ فی الوقت اسی طریقہ پر میری توجہ مرکوز ہے لیکن ایک اور طریقہ بھی ہے جس کا خاکہ میرے دماغ میں موجود ہے، انشاء اللہ پہلے طریقہ کی کامیابی کے بعد اس پر غور کرونگا۔ کوبالٹ[5] فولاد کی مقناطیس پذیری کی خاصیت سے تو آپ واقف ہونگے۔ یہ فولاد اس بلند درجہ تک مقناطیس پذیر ہے کہ متخالف قطب[6] والے دو ٹکڑے محض ایک دوسرے کے اندفاع[7] کی بدولت ہوا میں معلق ٹھیر سکتے ہیں کیا اس اصول پر ایک مقناطیسی ہوئی نلی کے اندر سے بازوؤں کو مس کئے بغیر بان معلق ہوکر گذر نہ سکیگی ؟"

"خیر پہلے طریقہ کو لیجیئے" میں نے عرض کیا "میلوں لمبی ٹیوب بنانا اور پھر پمپوں کی مدد سے ہوا کو خارج کرکے اس کے اندر خلا قائم رکھنا اور خود کار ریڈیو کنٹرول لگانا، کیا یہ سب آسان ہے، ؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا "آسان نہیں تو مشکل بھی نہیں ریل کی ایجاد کیوقت لوگوں نے بھی خیال کیا ہوگا کہ ہزاروں میل تک پٹریاں بچھانا، اسٹیشن بنانا انجنوں کیلئے پانی کا انتظام کرنا...... ناممکن ہے اسی طرح برقی ریل کے ظہور کے وقت انہوں نے سوچا ہوگا کہ ہزاروں میل تک تار لگانا اور اسمیں برقی رو کی رسد قائم رکھنا کچھ کھیل نہیں ٹیوب ریل کے متعلق ضروری سازو سامان، اسمیں شک نہیں کہ کروڑوں روپیوں کا محتاج ہوگا اور ٹیوب بچھانے اور ٹیوب سے ہوا کو خارج کرنے وغیرہ کے سلسلے میں ہزاروں مشکلات حائل ہونگی۔ لیکن اس بنا پر کیا یہ کہنا درست ہے کہ یہ ایجاد کامیاب نہ ہوگی"

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر ایک میز کی طرف بڑھا جس پر ایک طویل نلی جو تقریباً پچاس قدم لمبی تھی اور کئی جگہ سے خمیدہ تھی، بچھائی گئی تھی۔ میز کے قریب ہی ایک سوئچ بورڈ[8] موجود تھا جس پر چند بٹن دبانے کے بعد اس نے کہا کہ نلی میں اب ریڈیو کنٹرول قائم ہوگئے ہیں اس کے بعد وہ لوہے کا ایک سگار سا گول نلی کے داخلہ کے پاس لے گیا جو نلی میں معلق ٹھیر گیا اور میری طرف دیکھ کر

[1] Acceleration [2] Retardation [3] Friction [4] Automatic radio control
[5] Cobalt Steel [6] Opposite Poles [7] Repulsion [8] Switch board

کہا: "اب ذرا نلی کی دوسری طرف نظر جمائے رکھیے" جونہی اس نے ایک اور سوئچ دبائی لوہے کا ٹکڑا نلی کی دوسری طرف سے اچھل کر نکلا اور کمرے کی دیوار سے اس زور سے ٹکرایا جیسے بندوق کی گولی۔ اس خمیدہ نلی میں سے ایک ثانیہ کے اندر ٹکڑے کا نکل جانا ایک ایسا حیرت انگیز امر تھا کہ میں کچھ دیر تک سناٹے میں رہ گیا۔

اب ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا: "دیکھ لیا آپ نے، چھوٹے پیمانے پر یہ اصول عملی ہے اور اسی طرح بڑے پیمانہ پر بھی یہ کام کریگا۔"

اس کی آنکھوں میں فتح و کامرانی کی چمک تھی اور لہجے سے یقین و خود اعتمادی ہویدا تھی۔ اب ٹیوب ریل کے اصول کی عملیت کا مجھے پورا یقین ہوگیا، اور اس سلسلہ میں بعض میکانی جزئیات اور برقی آلوں وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر سے بحث مباحثہ کے بعد میرے رہے سہے شکوک بھی رفع ہو گئے،

(۲)

یہ تھی روئداد ڈاکٹر نعمان سے میری پہلی ملاقات کی۔ چند ہفتوں میں ٹیوب ریل سے مجھے اتنی ہی دلچسپی ہو گئی جتنی خود ڈاکٹر کو تھی، ہم دونوں اس ایجاد کے متعلق متعدد میکانی جزئیات کی تجویز کرتے، ان کی عملیت کے متعلق بحث کرتے اور ان کی تعمیر کے سلسلہ میں سر جوڑ کر مشکلات کا حل کرتے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، ڈاکٹر موصوف کسی تجویز کو صرف اس لئے پس پشت نہ ڈالتا تھا کہ وہ اس کی اپنی نہیں بلکہ اس کا رویہ ہمیشہ یہی رہا کہ وہ میری غلطیوں کی اصلاح کرتا اور جب کبھی میری رائے وزنی ہوتی، اس کو اپنی رائے پر فوقیت دیتا۔ میں نے گھنٹوں ریڈیو کنٹرول کے متعلق اس سے بحث اور اختلاف بھی کیا ہے۔ اور اس ضمن میں میرے بعض مشورے اس نے قبول کئے اور اکثر کی اصلاح بھی کی ہے،

ٹیوب ریل کی نلی سے ہوا کے اخراج کیلئے پمپوں کی تجویز میں جس طرح ہم دونوں نے محنت کی ہے وہ ہمیشہ مجھے یاد رہیگی نلی سے ہوا کو بالکل خارج کرنے اور پھر اندر قطعی خلا قائم رکھنے کیلئے اتنے زبردست اور موثر کشش کے پمپوں کی ضرورت تھی کہ ان کے اصول اور پھر ان کے جزئیات نے ہمیں مہینوں مصروف رکھا۔ یہاں ہر ہر قدم پر ریاضی کے پیچ در پیچ مسئلوں سے سابقہ پڑتا، میرے تمام مشورے غلط ثابت ہوتے اور مجھے اعتراف ہے کہ اکثر اوقات میرا دماغ کام نہ کرتا تھا یہ ڈاکٹر نعمان ہی کی ہمت تھی کہ کوئی دس ماہ تک مسلسل طور پر احتصائے کے پُرپیچ مساوات میں سر کھپانے کے بعد وہ کشش پمپ کے ایک نئے اصول پر پہنچا جو حیرت انگیز نہیں تو عظیم الشان ضرور تھا۔ یہ اصول گویا پا لیا تھا کہ اس پر عمل کرنے والے پمپ کیلئے میکانی جزئیات تجویز کرنے میں بڑی مشکلوں کا سامنا ہوتا اور ایک ایک پر عبور حاصل کرنے کیلئے ہفتے گذر جاتے تھے۔

معاشی اعتبار سے ڈاکٹر نعمان کے لئے یہ زمانہ بڑا صبر آزما تھا تھوڑی بہت رقم جو اس کے پاس موجود تھی، وہ تجربوں کے سلسلہ میں ختم ہو چکی تھی، چند ماہ سے وہ میری تنخواہ بھی ادا نہ کر سکا تھا، لیکن اب ہمارے تعلقات ایسے تھے کہ تمام مصائب دونوں مل کر جھیل لیتے خوش قسمتی سے مجھے ان دنوں طبیعیات میں ڈاکٹری کی ڈگری مل گئی اور ساتھ ہی غزالی کالج میں طبیعیات کے لیکچرار کی جگہ پر میرا تقرر ہوگیا۔ کالج میں میری تنخواہ دو سو روپیہ تھی جو میرے مصارف کیلئے کافی سے زیادہ تھی میں نے کئی دفعہ ڈاکٹر نعمان کو اس رقم میں حصہ دار بنانے کی کوشش کی، لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ البتہ مجھے اجازت تھی کہ تجربوں کے سلسلہ میں جب کوئی اشد ضرورت لاحق ہو تو اپنی رقم کا استعمال کروں اس کا باقاعدہ حساب وہ اپنے پاس نہایت احتیاط کے ساتھ رکھتا تھا اور زندگی کے اخیر دنوں میں جب اس کے پاس کافی روپیہ جمع ہوا تو یکمشت بے باق کر دیا تنگی کے زمانہ میں بعض رئیسوں کی جانب سے اُسے چھوٹی بڑی رقمیں پیش کی گئیں، لیکن اُن کے ہمراہ جو خطوط موصول ہوتے ان کا لہجہ کچھ ایسا تحکمانہ اور مربیانہ ہوتا کہ اس کی خودداری پر گراں گذرتا اور انہیں شکریہ کیساتھ واپس کئے بغیر نہ بنتی ایک مشہور رئیس نے پندرہ ہزار روپیہ کا وعدہ اس شرط پر کیا تھا کہ جب ایجاد کامیاب ہو جائے تو اُسی کے نام سے منسوب کر دی جائے اس پیشکش کا بھی وہی حشر ہوا جو ہونا تھا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ معاش کا کوئی ذریعہ نکالے بغیر زندہ رہنا مشکل ہوگیا چنانچہ ڈاکٹر نے کبھی برقی آتشدانوں کی ایجنسی خریدی کبھی ریڈیو سیٹوں کی مرمت کا کام کیا، ور کبھی خانگی برقی اور میکانی آلات کو فروخت کیا، لیکن کچھ بنتا نظر نہ آیا وہ اپنی ایجاد کی دھن میں لگا رہتا تھا اور دوسرے معاملوں پر کافی توجہ مبذول کرنے کیلئے وقت نہ پاتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر ایک قلیل ماہانہ پر اس نے ریلوے میں ایک چھوٹی سی ملازمت قبول کر لی۔ رات بھر ملازمت کرتا اور دن بھر تجربہ خانہ میں مصروف رہتا۔ محنت و مشقت کی زیادتی کے باعث اس کی صحت بتدریج گرتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک دن ڈاکٹروں سے معلوم ہوا کہ اس کا دل کمزور ہو گیا ہے،

افسوس ہے کہ ڈاکٹر نعمان کے اس صبر آزما زمانے کے اکثر واقعات میری ڈائری میں درج ہونے سے رہ گئے مجھے اتنا یاد ہے کہ اس زمانہ میں ہم نے ٹیوب ریل اور اس کے متعلق تمام جزئیات

Design — Suction pumps — Calculus

وتفصیلات کی تجویز مکمل کر لی اور اُن کے ماڈلوں کا امتحان پورا کر لیا۔ اور پھر بڑے پیمانے پر کام شروع کرنے کیلئے بڑے بڑے رئیسوں اور سرمایہ داروں سے خط و کتابت کی اور اُنہیں ایک کمپنی کھولنے پر آمادہ کرنا چاہا لیکن کہیں سے کوئی امید افزا جواب نہ ملا۔ ایجاد کی عملیت پر کسی کو یقین نہ آتا تھا اور انہیں سمجھانا بھی مشکل تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر کو ان لوگوں کے کوچوں کی خاک بھی چھاننی پڑی اور ان کے عالیشان دفتروں کا طواف بھی کرنا پڑا ان تمام کوششوں کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ دفتروں کے پندرہ بیس ماہانہ کمانے والے کلرک تک اس کا مضحکہ اڑانے لگے ان سب تلخیوں کو وہ ٹھنڈے دل سے گوارا کر لینے کا عادی تھا، لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے آخر اس نے تنگ آکر دفتروں کے چکر کاٹنے بند کر دیئے اور صرف خط و کتابت پر اکتفا کرنے لگا۔ دن بھر وہ اپنی لکھنے کی میز پر مصروف رہتا، اپنی ایجاد اور ایجاد کے مختلف حصوں کے نقشے اتارتا اور خطوط کے ہمراہ کمپنیوں کے ڈائرکٹروں کو روانہ کرتا۔ اس دفعہ اس نے اپنی تمام تر توجہ انجنیری کمپنیوں کی طرف مبذول کر لی تھی۔

ایک شب کا واقعہ ہے کہ میں اپنے کمرے میں یونیورسٹی کے امتحان کیلئے بی۔ اے کی طبیعیات کا پرچہ تیار کر رہا تھا کمرے میں میرے سوا کوئی موجود نہیں تھا اور ہر سو کامل خاموشی تھی کہ دس بجے اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر نعمان اس تیزی سے کمرے میں داخل ہوا جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو۔

"خیر تو ہے؟" میں نے یکلخت چونک کر کہا۔

"خدا کا فضل ہے ایک خوشخبری لایا ہوں" ڈاکٹر نے جواب دیا

اس کے لبوں پر ایک عجیب و غریب قسم کا تبسم نظر آ رہا تھا، چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور سانس تیز تیز چل رہی تھی میں نے پرچے لپیٹ کر رکھ دئیے اور ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ میری کرسی کے بازو پر بیٹھ گیا اور میرے شانے کو جھنجوڑتے ہوئے بولا: "دوست! خدا کارساز ہے، اس نے ہماری سن لی"

"آخر کیا بات ہے، کچھ پتہ بھی چلے کہ ہوا کیا؟" میں نے پوچھا۔ اس نے جواب دیا: "ہاں تم جانتے ہو اسٹیل اینڈ فولاد کمپنی کے چیف ڈائرکٹر نے ابھی ابھی یہ خط مجھے ایک آدمی کے ہاتھ روانہ کیا ہے کہ کل وہ خود اور کمپنی کے بعض انجنیر ہمارے تجربہ خانے میں ٹیوب ریل کے ماڈلوں کا امتحان کرینگے اور اگر اس کی عملیت کے بارے میں تشفی ہو جائے تو کمپنی کی جانب سے چالیس پچاس میل لمبی ٹیوب تعمیر کر دی جائیگی اور بان انجن اور دیگر جزئیات کی تعمیر میں جو کچھ سہولتیں مطلوب ہوں، وہ مہیا کر دی جائینگی بشرطیکہ کامیابی کے بعد مناسب شرائط پر ریلوے معہ انجن وغیرہ کمپنی کے حوالے کر دی جائے۔ میں نے ڈائرکٹر کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور لکھ بھیجا کہ تجربہ خانے میں کل ضرور کمپنی کے اسٹاف کا منتظر ہونگا۔"

اخیر کے دو تین جملے اس نے بڑی تیزی سے ادا کئے۔ جیسے وہ جلد از جلد گفتگو ختم کر دینا چاہتا ہے اور کرسی پر دراز ہو گیا۔

"ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب! ایسا بھی جوش کس کام کا! اس کا اثر دل پر کچھ اچھا نہ ہوگا ذرا ضبط سے کام لیجئے" میں نے کہا اور اٹھ کر کمرے میں برقی پنکھے کی رفتار تیز کر دی۔

رات بھر ہم ٹیوب کی تعمیر اور انجن کے کل پرزوں کے متعلق بحث کرتے رہے۔ دوسرے دن کمپنی کے انجنیروں اور ڈائرکٹروں نے ایجاد کے ماڈلوں کا اچھی طرح جائزہ لیا اور دنگ ہو کر رہ گئے کمپنی کے ڈائرکٹر نے ڈاکٹر نعمان کو مبارکباد دی، اور انجنیروں سے کہا کہ دو ماہ تک ٹیوب اور انجنوں وغیرہ کی تعمیر کے اخراجات کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کریں۔

(۳)

دو ماہ کے بعد کمپنی کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں ڈائرکٹروں نے انجنیروں کی سفارش پر ٹیوب ریل کیلئے ایک بہت بڑی رقم منظور کر لی اس کے تین ماہ کے اندر تمام قانونی مراحل طے کر لینے کے بعد ٹیوب کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ تجویز یہ ہوئی تھی کہ فولاد نگر سے جہاں کمپنی کا کارخانہ واقع ہوا تھا آہن آباد کی لوہے کی کان تک جو یہاں سے پچاس میل کے فاصلہ پر واقع تھی، بیس قدم قطر کی فولادی ٹیوب کنکریٹ کی مضبوط اساس پر بچھائی جائے۔ راستہ میں بعض مقامات پر پہاڑ، جنگل اور دریا حائل ہوتے تھے، اور اس لئے ٹیوب کو خم دیکر لیجانا پڑتا تھا۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہی کہ جس طرح ریل گاڑی خمیدہ لائن پر سے بہ آسانی گذر جاتی ہے، اسی طرح ٹیوب ریل خمیدہ نلی میں سے بلاوقت بازوؤں کو مس کئے بغیر گذر جاتی ہے، اسی طرح ٹیوب ریل خمیدہ نلی میں سے بلاوقت بازوؤں کو مس کئے بغیر گذر جاتی ہے۔

جب آدھ میل پر ٹیوب بچھا دی گئی تو دور دور تک اس کی شہرت پھیلنے لگی تمام اخباروں اور رسالوں میں اس کے چرچے تھے اور تصاویر شائع کی جاتی تھیں۔ فولاد نگر کے میدان جہاں ٹیوب تعمیر کی جاتی تھی۔ دور اور قریب کے لوگوں کی زیارت گاہ بن گئے تھے، ٹیوب کے ارد گرد دن بھر اور خصوصاً شام میں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ہر قسم کے لوگ یہاں نظر آتے اور ہر طرح کے واقعات یہاں رونما ہوتے۔ ہر شخص ٹیوب ریل کے متعلق اپنی اپنی عقل کے مطابق قیاس آرائیاں کرتا۔ کہیں گرما گرم بحثیں ہوتیں کہیں دل لگی، اور مذاق۔ ایک خشک

مولوی صاحب جو بیسویں صدی کے کٹھ ملاؤں کا نمونہ معلوم ہوتے تھے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوئے:" اجی میاں! یہ تمام باتیں کیا ہیں۔ خدا سے مقابلہ کرنا ہے، خدا سے! نعوذ باللہ سخت کفر ہے۔ اور حرام نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہے، کہ کُلّ من علیہا فان! ایک اور صاحب جو بیسویں صدی کے نام نہاد روشن خیال ملاؤں کے انداز کے تھے اپنے قدیم وجدید اور دنیا بھر کے علوم و فنون کے حامل ہونے کا دعوے کرتے کرتے تھک جاتے اور پھر اپنے "سبقے اطفال نوتعلم"[1] پر اس طرح رعب جماتے "کچھ سمجھا تم نے! مادہ ہی دنیا پر حکمران ہے۔ جدید سائنس کہاں سے کہاں ترقی کر گئی ہے،، یعنی قدیم سائنس سے بہت زیادہ۔ اب اس نلی کے اندر ہوا کے زور سے گاڑی جائیگی۔ لیکن یہ تعجب کی بات نہیں۔ میں نے خود ایک ایجاد سوچی ہے، مطلب یہ ہے۔ کہ ایک ہوائی جہاز جو ہوا کے زور سے چاند تاروں تک پہنچ جائے نہ پٹرول کی ضرورت نہ کسی قسم کے ایندھن کی! اب اس کے متعلق جرمنی کے بڑے بڑے ڈاکٹر مجھ سے خط وکتابت کر رہے ہیں۔ بہت جلد یہ ایجاد نکل جائے گی بیچارے کچھ اور بیان فرمانا چاہتے کہ پیچھے سے دو چار آدمی اس ہفت رنگی بکواس پر اس زور کا قہقہہ لگاتے کہ وہ جز بز ہو کر اپنے شاگردوں کی ٹولی کے ساتھ سرکس کے مسخرے کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتے نکل جاتے،

آخر تین سال کے بعد وہ دن آ پہنچا جب نلی کی تعمیر ختم ہو گئی اور بان انجن وغیرہ تیار ہو گئے۔ ۵، اگست ۲۰۱۲ء کا دن پہلی پرواز کیلئے منتخب کیا گیا۔ اس دن فولاد نگر انجینیروں، سائنسدانوں، تماشبینوں اور اخبارات کے نامہ نگاروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اور ٹیوب کے اطراف میلوں تک انسانوں کا ایک جنگل سا نظر آتا تھا۔ کوئی رجائی یقینی لہجہ میں کہتا: ابھی ایک ماہ کے اندر ہم اس گاڑی سے ضرور سفر کریں گے"۔ کوئی وہمی بڑے چکیہانہ انداز میں کہتا:" آج کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور ہو گا"۔ ڈاکٹر نعمان کے جوش و مسرت کا یہ عالم تھا کہ اسے اپنی طبیعت پر قابو رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کی صحت پہلے سے گری ہوئی تھی۔ اور اب رہ رہ کر اختلاج کے دورے پڑتے تھے میں دست بدعا تھا کہ یہ دن خیر و خوبی سے گذر جائے۔

صبح دس بجے پرواز کے تجربے شروع کئے گئے۔ اول بان گاڑی میں لوہے وغیرہ کی چند معمولی چیزوں کو بند کر کے فولاد نگر سے روانہ کیا گیا۔ چار منٹ کے اندر ہی ٹیوب کے واخلے میں ایک مدھم سی گونج سنائی دی۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ گاڑی بخیر و خوبی آہن آباد پہنچ گئی ہے۔ پھر

آہن آباد سے گاڑی واپس روانہ کی گئی۔ جس کا علم ایک اور دھماکے سے ہُوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی داخلے میں آ کر رُکی۔ دوسرے تجربے میں۔ ایک کتے کو، تیسرے میں ایک بلی کو گاڑی میں بند کر کے روانہ کیا گیا۔ سفر کے اختتام پر دونوں جانور صحیح وسالم پائے گئے تین منٹ گاڑی کے اسراع اور ابطا کو دیئے جاتے تھے، اور بقیہ ایک منٹ میں وہ اپنی پوری رفتار یعنی ڈیڑھ ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے چلتی تھی۔ ان تجربوں سے ثابت ہوا۔ کہ کتے اور بلی جیسے جانوروں کا عصبی نظام ڈیڑھ ہزار میل رفتار کی برداشت کیلئے ڈیڑھ منٹ کے اندر خود بخود تیار ہو جاتا ہے۔

اب ڈاکٹر نعمان کی باری تھی۔ انجینروں اور سائنس دانوں کے ہجوم کو چیر کر میں اور ڈاکٹر گاڑی کی طرف بڑھے۔ اندر داخل ہوتے وقت ایک طویل اور پر جوش مصافحہ کے دوران میں وہ مجھ سے ان الفاظ میں مخاطب ہُوا "عزیزم:۔ ممکن ہے یہ میری آخری ملاقات ہو، مجھ پر تمہارے احسانات بہت زیادہ ہیں۔ اور میں تمہارا انتہائی شکر گذار ہوں"، اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں بڑا سخت دل واقع ہوا ہوں لیکن اس موقع پر مجھ سے ضبط کی تاب رخصت ہو چکی ہے، بڑی دقت سے میں نے یہ الفاظ ادا کئے "محترم ڈاکٹر! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، الٹے میں آپ کا ممنون ہوں! میری آنکھیں نم ہو گئیں اور میں نے دوسری طرف اپنا منہ پھیر لیا"۔ "۱۱-۵۵"[1]، کمپنی کے چیف انجینر کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ دوسرے ہی لمحہ میں ڈاکٹر کی خدا حافظ، میں نے سُنی اور میرے پلٹنے تک گاڑی کے دروازے بند ہو چکے تھے، مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ کہ اب ڈاکٹر ہمیشہ کیلئے ہم سے جدا ہو چکا ہے،

ٹھیک بارہ بجے ایک ہلکا سا دھماکا ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی زناٹے سے بان ٹیوب کے اندر غائب ہُوئی۔ ایک ثانیہ تک انجینروں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور پھر وقت نگار پر نظریں جما دیں۔ ایک منٹ دو تین۔ تین منٹ ۴۷ ثانیوں پر وقت نگار کا کانٹا پہنچا۔ اور ٹیوب کے داخلے میں ایک مدھم گونج سنائی دی۔ گاڑی صحیح سلامت آہن آباد پہنچ چکی تھی۔ ہجوم سے یکدم شور و غل کی آواز بلند ہُوئی۔ اور فتح و کامرانی کے نعرے بلند کئے گئے۔ گاڑی کے متعلق مزید حالات معلوم کرنے کے لئے انجینر ریڈیو کنٹرول کیبن میں داخل ہُوئے۔ خلاف توقع بارہ بجکر دس منٹ تک آہن آباد سے کوئی خبر نہیں ملی۔ لیکن اس کے بعد آواز رساں[2] نے بولنا شروع کیا۔

لہ خاقانی کا شعر ہے۔ سبقے اطفال نوتعلم را
لوح ادبار در بغل منہیند

لہ chronograph لہ Loud Speaker

"ٹھیک ۱۲-۶-۳۴ کو گاڑی صحیح وسلامت آہن آباد پہنچی دو منٹ تک ڈاکٹر نعمان کا پتہ نہیں تھا۔ اس لئے مجبوراً دروازہ کھولا گیا۔ ڈاکٹر موصوف اپنی نشست پر تھے، لیکن اس طرح کہ نشست پر کمر سے لٹک رہے تھے، سر آگے جھکا ہوا تھا۔ اور دونوں ہاتھ دل پر تھے، انہیں باہر نکالا گیا۔ اور فوراً طبی امداد بہم پہنچائی گئی۔ ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ وہ چل بسے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

اس کے بعد کیا ہو؟ اس کے کہنے سننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ البتہ چند دنوں کے اندر یہ بات دنیا میں پھیل گئی۔ کہ انسان کا اعصابی نظام بان گاڑی کی رفتار کے اسراع کو برداشت نہیں کرسکتا۔ لیکن بہت کم لوگ اصل حقیقت سے واقف ہیں۔ ڈاکٹر نعمان نے بان گاڑی کے اندر پرواززان[له] کی نشست کے سامنے ایک حرکت نگار[ٹ] آلہ لگایا تھا۔ تاکہ بعد میں پرواززان کی ہر حرکت کا فلم پر مطالعہ کیا جا سکے۔ پہلی پرواز کے کوئی پندرہ دن بعد یہ فلم فولاد کمپنی میں انجینروں کے ایک مجمع کے سامنے پیش کی گئی۔ اس موقع پر میں بھی موجود تھا۔ تمام انجینر اور سائنسدان انتہائی بے چینی سے فلم کو دیکھ رہے تھے۔ پردے پر ہمیں کیا نظر آیا؟ ڈاکٹر نعمان نے نشست پر بیٹھ کر تسمہ کمر سے باندھنا شروع کیا اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے ابھی وہ نشست پر اچھی طرح دم لینے بھی نہ پایا تھا۔ کہ اس سے ایک ایسی حرکت سرزد ہوئی۔ جیسے وہ خود کو سنبھالنا چاہتا ہے، اس کے بعد دونوں ہاتھوں سے اس نے دل کو تھام لیا۔ اور دو ایک جھٹکوں میں روح قفس عنصری سے پرواز ہو گئی۔ عین اس وقت نشست کے سامنے لگائے ہوئے وقت نگار نے ۱۱-۵۸ دکھائے۔

"یعنی وہ پرواز سے دو منٹ قبل فوت ہوا!" دو تین اشخاص کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور پھر بحث مباحثے ہونے لگے۔ اب اس امر میں کسی کو شبہ نہ رہا کہ بان کی رفتار سے ڈاکٹر کی موت واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ پرواز کے دو منٹ قبل ہی اس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی تھی۔

آخر اس بیماری دل نے دل کا کام تمام کیا!

اگر ڈاکٹر نے نشست کے سامنے حرکت نگار نہ لگایا ہوتا۔ تو کسی کو یقین نہ آتا۔ کہ انسان بان کی رفتار کی تاب مقاومت نہیں لا سکتا۔ اور کون ایسا شخص ہوتا جو دیدہ و دانستہ دوسرے تجربے کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا!

یہ ہیں اصلی حالات ٹیوب ریل کے موجد کے، جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ یہ واقعات ایک امانت کی طرح میرے پاس محفوظ تھے اور موجد کی وصیت کے مطابق اب پچیس سال بعد ان واقعات کو دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ کہ میں نے ایک بڑے فرض سے سبک دوشی حاصل کر لی ہے۔ (ماخوذ)

بشیر الدین بی۔ اے

له Pilot ٹ Cinematograph

بزمِ انتخاب

کھاڑیوں کا ناچ اور گانا

اوڑیسہ اور چھوٹا ناگپور کے پہاڑی ڈھالوں پر مختلف نیم وحشی قبائل آباد ہیں - یہ ہندوستان کے پرانے باشندوں کی نسل سے ہیں۔ جن تک تہذیب اور تمدن کی روشنی ابھی نہیں پہنچی ہے - ان کا قد چھوٹا، جسم سڈول، اور رنگ آبنوس کی طرح کالا اور دلکش ہوتا ہے - ان کے اعضاء کی ساخت اور تناسب میں وہ ہم آہنگی ہوتی ہے جسے حسن کہتے ہیں۔ انہیں قبائل میں ایک دلچسپ قبیلہ ہے جس کا نام کھاڑیا ہے

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق اوڑیسہ اور چھوٹا ناگپور میں ان کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ اور صوبۂ متوسط میں تیرہ ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ بنگال اور آسام میں جو لوگ ہجرت کر گئے ہیں ان کی تعداد کے متعلق کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا - کھاڑیا قبیلہ اپنے عادات و اطوار میں تقریباً دوسرے قبیلوں جیسا ہے۔ اس کے ناچ اور گانے کا قیاس کیا جا سکتا ہے - ذیل کا مضمون سرت چندر رائے کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

کھاڑیا لوگوں میں جو دیہاتی کہانیاں، روائتی قصے، اور ہوائی اور خیالی افسانے رائج ہیں - ان سے ان لوگوں کے ذہنی ارتقا اور تصورات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے - ان قصے کہانیوں میں ایک طرف تو ان کی مذہبی رسوم کی جھلک موجود ہے - دوسری طرف یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ موسم اور موسمی تغیرات وغیرہ کے بارے میں ان کے کیا تصورات ہیں اور نیز یہ کہ ان کے فنونِ لطیفہ، اور ان کے جمالیاتی احساس کی بنیادیں کن باتوں پر ہیں - خصوصاً ان کے مقبول گیتوں میں ان کی اصلی روح ان کے حوصلے اور آرزوئیں اور ان کا احساسِ حسن، صاف طور پر جھلکتے نظر آتے ہیں۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ ان کے سارے آرٹ کی جڑیں ان کی مذہبی رسوم اور ان کے جادو اور ٹونے میں ملتی ہیں جو ان میں سالہا سال سے رائج ہیں - خود ان کی مصوری کے زنگار رنگ نمونے ان کے مذہبی تہواروں کے موقعہ پر استعمال ہوتے ہیں۔ لکڑی میں تراش خراش کر کے جو تصویریں بنائی جاتی ہیں یا جو گلکاریاں کی جاتی ہیں ان میں کہتے ہیں کہ ان کے معبود یا خدا کی روح آ جاتی ہے، اور اسی قسم کے اور بہت سے توہمات ان میں عام ہیں - مگر قطعی طور پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ صرف مذہب اور جادو ٹونے ہی ان کی ساری فنی کوششوں کی بنیاد ہیں - جس طرح اور قبائل کے فنون پر مذہبی اثرات کے علاوہ اور بہت سی باتیں اثر انداز ہوتی ہیں اسی طرح کھاڑیہ لوگوں کے فنون کے ارتقاء میں بہت سی چیزیں شامل ہیں جن کو خالصاً مذہبی حیثیت دینا غلطی ہوگی۔

یہ لوگ اپنی بانسریوں، لکڑیوں کے کنگھوں، اپنے دروازے کے کواڑوں پر جو نقاشی کرتے ہیں، اور ان کی عورتیں لباس اور کپڑوں وغیرہ پر جو پھول پتیاں کاڑھتی ہیں - ان سے ان لوگوں کے خالص جمالیاتی ذوق کا پتہ چلتا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ اپنے ماحول اور متعلقہ اشیا کو حسین اور خوبصورت بنانے کیلئے کرتے ہیں - بالکل اسی طرح جیسے ان کی عورتیں اپنے جسم پر گودنے وغیرہ کا کام صرف اس لئے کرا لیتی ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ اس طرح ان کی جسمانی دلکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

جمالیاتی احساس اور اسی کے ساتھ ساتھ فن کاری کا پہلو کسی نہ کسی صورت میں انسان میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔ ارتقاء کے ابتدائی منزل میں بھی اس کی جھلک موجود ہے۔

خود زبان جو جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے آرٹ اور فن کاری کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ کھاڑیا لوگوں کی دیہاتی کہانیوں کی زبان اور ان کے روایتی افسانوں کا لب و لہجہ ان کی فنی کوششوں کا آئینہ ہے۔ اگرچہ ان کی زبان اور لب لہجہ میں بہت زیادہ سادگی اور ایک حد تک کھردرا پن بھی ملتا ہے۔ تاہم ان کے دلکش اور خوش آئند ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

کھاڑیا قبیلہ کا ایک مخصوص طبقہ جو دودھ کھاڑیا کہلاتا ہے۔ اپنی گذر اوقات کھیتی باڑی پر کرتا ہے جب ان کو فصل وغیرہ کاٹ کر کچھ عرصہ کیلئے فراغت مل جاتی ہے تو وہ ان کے ناچ رنگ کا زمانہ ہوتا ہے۔ فرصت اور فراغت کے ان زمانوں میں خاص قسم کے گیت تصنیف کر لیتے ہیں۔ یہ گیت اگرچہ ایک حد تک غیر مرتب بحروں اور نامکمل زبان میں ہوتے ہیں مگر ان سے ان کے اندرونی احساسات کا پتہ چلتا ہے۔ اپنی خامیوں کے باوجود اسلوب اور نفس مضمون کے اعتبار سے ان کے یہ گیت ان کے دوسرے طبقہ کے گیتوں سے زیادہ بہتر اور جامع ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ ان کے الفاظ کا ذخیرہ بہت محدود ہوتا ہے اور ان کے یہ گیت محض گیت کی حیثیت سے اس قدر جامع نہیں ہو سکتے ہیں کہ ان کے جذبات اور احساسات کی پوری پوری ترجمانی کر سکیں۔ وہ اس کمی کو اپنے رقص سے پورا کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے گیت اور ان کے مخصوص رقص کی حرکات و سکنات کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یہ لوگ گیت گاتے جاتے ہیں اور ناچتے جاتے ہیں۔ جذبات اور تاثرات کے اظہار میں جہاں ان کے الفاظ معذور ہوتے ہیں وہاں ان کے قدموں کی جنبش اور ان کے اشارے خانہ پری کر دیتے ہیں۔ ان کے گیت ان کی دھنیں اور ان کا ناچنے کا انداز ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

کھاڑیا لوگوں کی اندرونی ابیج اور ان کے جذبات کی آسودگی کا پہلو سب سے زیادہ واضح طور پر ان کے ناچ اور گیتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے مذہبی رسم و رواج اور تہواروں میں یہ پہلو بہت دھندلا ہو جاتا ہے۔ دراصل ان کے ناچ اور ان کے گیتوں ہی میں ان کا غم ان کی مسرت، ان کے احساسات کی شدت اور کمی، ان کے سماجی تاثرات، ان کے آئیڈیل کی جھلک ملتی ہے۔ ان کے علاوہ خود ان کے جمالیاتی ذوق کا اظہار ہوتا ہے یہ اظہار کتنا ہی نامکمل کیوں نہ ہو۔ مگر یہ معلوم ہوتا ہے وہ کس حد تک فطرت اور خود انسان میں حسن کی تلاش کر لیتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا ناچ گانا عموماً بہت بڑے مجمع میں ہوتا ہے، گانے ناچ کا ڈھنگ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ناچنے گانے والے اور تماشائی دونوں لطف میں شریک ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کے گیت ہمارے ہاں کی نظموں اور غزلوں کی طرح پڑھے نہیں جا سکتے صرف ناچ کے اوقات میں گائے جا سکتے ہیں۔ اس لئے ان گیتوں کے ترتیب دینے والے بحروں وغیرہ کی پابندی کا کچھ زیادہ خیال نہیں کرتے۔ کہیں کہیں ایک ایک لفظ کو بار بار دھرا کر اور ایک ہی فقرے کو موقع و محل کی مناسبت کے لحاظ سے کھینچ تان کر گیت کا جزو بنا لیتے ہیں، اور اپنی آوازوں کے اتار چڑھاؤ اور تانوں کی کمی بیشی سے ان ہی میں ایک ربط اور آہنگ پیدا کر لیتے ہیں۔ ان گیتوں میں کہیں کہیں ان کے ہندو پڑوسیوں کی زبان کا بھی ایک آدھ لفظ آ جاتا ہے۔

ان کے ناچ میں یہ خصوصیت ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں ایک ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ ناچ کی بعض قسمیں ایسی بھی ہیں جن میں مرد اور عورتیں مختلف صفوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ بعض ناچ میں بوڑھے مرد اور عورتیں شریک ہوتی ہیں اگرچہ اس میں کبھی کبھی نوجوان مرد بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر ناچ کی یہ صورت ہوتی ہے کہ چند نوجوان ڈھولک اٹھائے ہوئے ناچنے والوں سے کسی قدر فاصلہ پر کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ڈھول پر گیت شروع کرتے ہیں جوں ہی وہ گیت کا ایک حصہ ختم کرتے ہیں ناچنے والے اٹھا لیتے ہیں اور ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس دوران میں گیت برابر مناسبت سے گائے جاتے ہیں۔ دودھ کھاڑیا کے گیت اور ناچ مختلف موسموں کے لحاظ سے ہوتے ہیں جس طرح مختلف موسموں میں ان کے مشاغل مختلف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کے ناچ اور گیت

بھی موسموں کی مناسبت کے لحاظ سے بدل جاتے ہیں۔ ان کے ناچ کی پانچ مخصوص قسمیں ہیں۔ "ہاریاؤ" "کنبھار" "ہالکا" "کدھنک" اور "چھورا"۔

ہاریاؤ ناچ ماگھ مہینہ (جنوری-فروری) کی خاص چیز ہے ہاریاؤ ناچ میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دونوں ایک ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ ہر ماگھ میں کسی نہ کسی گاؤں کی باری ہوتی جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مل کر ناچتے ہیں۔ آس پاس کے گاؤں کے مرد اور عورتیں آ کر اس ناچ میں شرکت کرتی ہیں۔ ناچ کرتے وقت مرد اور عورتیں اکثر مختلف صفوں سے کبھی کبھی ایک ہی صف میں اس طور پہ آجاتے ہیں کہ ہر فرد کے ہاتھ داہنے اور بائیں دونوں طرف مرد یا عورت کی گردن میں ہوتے ہیں۔ ناچ میں قدم اٹھانے کا انداز کسی قدر فوجی قسم کا ہوتا ہے۔ ہاریاؤ ناچ بہت تیزی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اکثر قدم اسقدر تیزی سے اٹھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ بھاگ رہے ہیں۔ کبھی کبھی ناچنے والے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اور پھر ناچ کے دوران میں اس طرح حرکت کرتے ہیں کہ دائرے بن جاتے ہیں۔ اس ناچ میں جھکنے کی ضرورت نہیں پڑتی سینے تنے ہوئے ہوتے ہیں اور ڈھول برابر بجتے رہتے ہیں۔

پھاگن اور بیساکھ کا درمیانی عرصہ کندھار ناچ کا موسم ہوتا ہے۔ یہ آنگن ناچ بھی کہلاتا ہے۔ اس میں جوان مرد اور عورتیں اور بعض ادھیڑ عمر کے لوگ بھی شریک ہوتے ہیں۔ ناچنے والے ناچ کے دوران میں گائے جاتے ہیں اور ایک دائرہ بناتے جاتے ہیں۔ جوں ہی گیت کا ایک حصہ ختم ہوتا ہے آگے بڑھنا شروع کرتے ہیں اور سب لوگ مل کر کورس میں ایک نعرہ "ہورے ہارے!" خاص لب و لہجہ اور آواز کے مخصوص اتار چڑھاؤ کے ساتھ بلند کرتے ہیں جس وقت ناچنے والے آگے بڑھنا شروع کرتے ہیں ڈھول بجانے والے جن کے چہرے ان کے مقابل ہوتے ہیں پیچھے ہٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر اس طرح ناچنے والے پیچھے ہٹتے ہیں اور ڈھول بجانے والے ان کے قدموں کی مناسبت سے آگے بڑھنا شروع کرتے ہیں۔ ناچنے والے جب اپنی پرانی جگہ پہ پہنچ جاتے ہیں تو پھر دائرہ بنا کر ناچتے ہیں۔ اس ناچ میں جھکنا پڑتا ہے۔ ناچنے والے اور ڈھول بجانے والے دونوں جھکتے ہیں۔ قدم آہستہ اٹھتے ہیں۔ ایک قدم زمین پر جما رہتا ہے اور دوسرا گانا سب کے لحاظ سے یا آگے کی طرف اٹھتا ہے یا پیچھے کی طرف۔ اس ناچ کی ایک قسم ایسی ہے جس میں دو صفیں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہوتی ہیں۔ ناچ کے دوران میں دونوں صفیں ایک دوسرے کی طرف بڑھتی ہیں اور جب چند ہاتھ کے فیصلہ پہ آجاتی ہیں تو ناچنے والے بڑی زور سے پیر زمین پر ٹیکتے ہیں اور منہ سامنے کئے ہوئے پیچھے لوٹنا شروع کرتے ہیں۔ لوٹتے وقت ایک مخصوص انداز سے جھکتے بھی ہیں۔

ہالکا ناچ میں مرد اور عورتیں ایک خاص ترتیب کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ یہ دو پارٹیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ہر پارٹی باری باری گاتی ہے۔ دونوں پارٹیاں متوازی صفوں میں ایک دوسرے کی طرف بڑھتی ہیں اور پیچھے پلٹتی ہیں۔

ہر فرد اپنے داہنے ہاتھ سے اپنے دائیں طرف والے کے بائیں بازو کی گرفت کرتا ہے اور بائیں ہاتھ سے اپنے بائیں طرف والے کے داہنے بازو کی گرفت کرتا ہے۔ دونوں اسطرح پر گتھ لینے کے بعد ناچنے والے نہیں آگے کی طرف ذرا اُٹھا لیتے ہیں اور گیت کے کسی ٹکڑے کو دہرا کر ناچ شروع کر دیتے ہیں۔ ہالکا ناچ کے دوران میں گانا بجانا نہیں ہوتا ہے۔ ہر پارٹی پہلے ایک جھکاؤ کے ساتھ دائرہ بناتی ہے۔ گیت یا گیت کا ٹکڑا جب ختم ہو جاتا ہے تو ایک طرف ذرا مُڑ کر ایک صف میں آجاتے ہیں اور چلتے چلتے دفعتاً رُک جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک لمبی جست پھر دو نسبتاً مختصر جستوں کے بعد اوپر اچھلتے ہیں اور زمین پر زور سے پیر ٹیکتے ہیں اور انتہائی بلند آواز سے "ہُر.......ر......" یا "ہر.....ر....." کا کورس کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر صف میں آجاتے ہیں۔ اور ہر پارٹی باری باری سے گیت شروع کرتی ہے۔ اس ناچ میں بوڑھے مرد اور عورتیں دونوں نوعمروں کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ جن گیتوں سے ناچ شروع ہوتا ہے انہیں پارد کہتے ہیں۔ پارو ناچ کے علاوہ بھی گاتے ہیں۔ اکثر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جب ان کے مویشی چرتے ہوتے ہیں۔ پہاڑیوں پہ بیٹھے یا میدانوں میں درختوں کے سائے میں مگن پارو الاپتے رہتے ہیں۔ بیساکھ اور جیٹھ کے درمیان جو

گیت گائے جاتے ہیں وہ جلیھواری پارو کہلاتے ہیں - اسوں سے پوس کے درمیان والے کواری پارو کہلاتے ہیں ماگھ اور چیت کے درمیان جو گائے جاتے ہیں انہیں بھاگ اری پارو کہتے ہیں - پارو کی مختلف قسمیں مختلف دھنوں میں گائی جاتی ہیں -

کدھنگ ناچ کی کئی قسمیں ہیں - بیساکھ اور جلیٹھ میں جلیٹھواری ناچ ہوتا ہے - گہن سے لیکر چیت تک کھاری ناچ کا زمانہ ہے - اس ناچ میں بھی لڑکے اور لڑکیاں دونوں شریک ہوتی ہیں - ایک کا ہاتھ دوسرے کے گلے میں ہوتا ہے اور اسی حالت میں کبھی بہ آگے بڑھتے ہیں کبھی پیچھے ہٹتے ہیں - عموماً کئی صفیں ایک دوسرے کے پیچھے ہوتی ہیں - کبھی ایک نصف دائرہ یا مکمل دائرہ بنا کر بھی ناچ ہوتا ہے - ناچنے والے اپنی ٹانگوں کو باری باری آگے اور پیچھے جھلاتے ہیں اور اس کے بعد اپنی داہنی ٹانگ ایک فٹ کے قریب بلند کرتے ہیں - یہ ناچ ڈھول اور جھانجھ پر ہوتا ہے -

جلیٹھ اور بیساکھ زمانہ کا سا کدھنگ ناچ کا زمانہ ہے - کدھنگ ناچ کی جو قسم جادورا کہلاتی ہے - اس میں بھی مرد اور عورتیں دونوں شریک ہوتے ہیں - ناچنے والے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر ایک ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور پیچھے ہٹتے ہیں اسمیں آگے کی طرف جھکنا ہوتا ہے اور ان کے قدم باقاعدگی کے ساتھ زمین سے اٹھتے اور گرتے ہیں -

کدھنگ ناچوں میں دویلر ناچ بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے اس ناچ میں ناچنے والے لمبی لمبی صفیں بنا لیتے ہیں - ہر فرد اپنے داہنے طرف والے کا بایاں ہاتھ اپنی داہنی بغل میں دبائے رکھتا ہے اور بائیں ہاتھ میں بائیں طرف والے کا داہنا ہاتھ ہوتا ہے -

یہ لمبی لمبی صفیں ناچتے وقت چھوٹے چھوٹے تیز قدم اٹھاتے ہوئے دائروں کی شکل میں آ جاتی ہیں -

کدھنگ ناچ کی ایک اور قسم اندو کدھنگ یا اندرائل کہلاتی ہے - اساڑھ اور ساون کے مہینوں میں عام طور پر کیچڑ وغیرہ بہت ہوتی ہے - اس لئے ہر رات کو ناچ نہیں ہو سکتا - اس زمانہ میں جلیٹھ والے ناچ ہوتے ہیں - کوار یا آسون میں اندرائل ناچ شروع ہو جاتے ہیں اور یہ کاتک تک جاری رہتے ہیں -

اندرائل ناچ کی بھی تین قسمیں ہوتی ہیں - تھارہا، لہسوا اور راتا - ان ناچوں میں بھی نوعمر لڑکے لڑکیاں اور نوجوان مرد اور عورتیں برابر شریک ہوتی ہیں -

تھارہا ناچ میں ناچنے والے ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اور بغیر جھکے ہوئے ناچتے ہیں - لہسوا میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر اور آگے کو جھک کر گیتوں کی لے پر بڑھتے ہیں - جھکتے جھکتے ناچنے والے تقریباً بیٹھ جاتے ہیں اور جوں ہی گیت کا کوئی ٹکڑا ختم ہوا تو کود کر کے پھر سیدھے تن کر کھڑے ہو جاتے ہیں -

راتا ناچ میں ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں - ہر فرد اپنے دونوں ہاتھوں سے آگے والے کے بازو پکڑتا ہے - پھر جلد جلد قدم اٹھا کر دائرے کی شکل میں آ جاتے ہیں -

جادورا ناچ اکثر گاؤں کے اکھاڑوں میں ہوتا ہے - اس ناچ میں صرف عورتیں یا کچھ مرد بھی شامل ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے جھکاؤ کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور پھر پیچھے لوٹتے ہیں قدم بڑی احتیاط اور باقاعدگی سے پڑتے ہیں - عموماً ناچنے والے دو صفوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہوتی ہیں - ڈھول بجانے والے ان کے وسط میں کھڑے ہوتے ہیں - جب ایک صف ڈھول والوں کی طرف بڑھتی ہے تو فوراً مقابل والی صف بھی ان کی تقلید کرتی ہے اور جب ایک صف پیچھے ہٹتی ہے تو دوسری بھی اسی طرح پیچھے کی طرف لوٹتی ہے - جب صرف ایک صف ہوتی ہے تو پھر یوں ہوتا ہے کہ صف بڑھتی ہے تو ڈھول والے پیچھے ہٹتے ہیں - اور جب ڈھول بجانے والے آگے بڑھتے ہیں تو ناچنے والے پیچھے ہٹتے ہیں -

کھاڑ یا قبیلہ کے متذکرہ بالا ناچ ان کے اندرونی احساسات اور امنگوں کا آئینہ ہوتے ہیں - ان کے مختلف موسمی ناچ اور ان ناچوں کی مخصوص حرکات و سکنات، ان لوگوں کے نزدیک ابر و باراں اور اس قسم کی ان تمام قوتوں کو خوش کر دیتی ہیں جن کا تعلق ان کی کاشت وغیرہ اور ان کے اقتصادی مفاد سے ہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف موسمی ناچوں کی نوعیت ایسی ہے اور ان ناچوں کے دوران میں ایسے نعرے لگائے

جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان ناچوں کی ایجاد ان کے پُراسرار عقائد کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ مگر فی زمانہ ناچتے وقت یہ باتیں کھلاڑیوں کے ذہن میں نہیں ہوتیں۔

(نیا ادب)

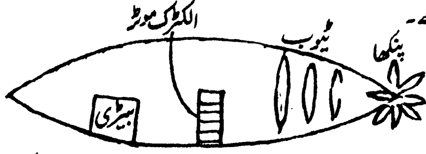
انصار ہارونی

ٹینک، تارپیڈو اور سُرنگ

موجودہ جنگ میں سب سے زیادہ جو چیز عوام کو حیرت میں ڈالتی ہے وہ تارپیڈو اور سُرنگ کے ہولناک نتائج ہیں۔ ننانوے فیصدی آدمی تارپیڈو اور سُرنگ کی نسبت کچھ نہیں جانتے اور اُن کے دماغوں میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سمندر کے اندر ہی اندر یہ کس طرح بعض اوقات چند لمحات میں بڑے بڑے جہازوں کو غرق کر دیتے ہیں اور آبدوز کے "تارپیڈو مارنے" سے آخر مطلب کیا ہے۔

پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ تارپیڈو اور سرنگ اصلیت میں ایک ہیں۔ وہی چیز جب متحرک ہو کر کام کرتی ہے تو اُسے تارپیڈو کہتے ہیں اور وہی جب ایک جگہ جمی ہوئی رہ کر پھٹتی ہے تو اُسے سُرنگ بولتے ہیں۔ اصلیت کے لحاظ سے ایک ہونے کے باوجود متحرک وغیر متحرک ہونے کی وجہ سے اُن کی بناوٹ اور مشینری میں فرق ہوتا ہے۔

متحرک تارپیڈو کا صحیح تخیل دماغ میں قائم کرنے کے لئے یہ سمجھ لیجئے کہ دراصل تارپیڈو مچھلی کی ایک قسم ہے جس کے جسم میں بجلی پیدا ہونے کی ایک قدرتی بیٹری ہوتی ہے۔ یہ مچھلی اس بیٹری کی وجہ سے بڑا زبردست دھکا مارتی ہے جس سے تمام جسم میں زلزلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس مچھلی کی شکل کے مطابق ہی تارپیڈو بنائے گئے تھے۔ اور اس مچھلی کی طرح ہی وہ پانی کے اندر اس وقت چلتے ہیں۔ تارپیڈو کوئی گولہ نہیں ہوتا جسے مارا جائے بلکہ تارپیڈو مچھلی کی شکل کی ایک چھوٹی کشتی ہوتی ہے۔ اس کشتی میں ایک بیٹری، ایک الکٹرک موٹر اور چند ٹیوب ہوتے ہیں۔ جن میں پھٹنے والا مادہ ہوتا ہے۔ آبدوز کے اندر سے دشمن کے جہاز کا زاویہ معلوم کر کے اسی طرف اس تارپیڈو کشتی کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ الکٹرک موٹر اور بیٹری اپنا کام کرتے ہیں۔ جب یہ جہاز سے جا کر ٹکراتی ہے تو مادہ پھٹتا ہے اور جہاز میں شگاف پڑ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا متحرک تارپیڈو دشمن کے جہاز کے پیندے پر مارا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ جہاز کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے۔



ایک اور قسم کا تارپیڈو وہ ہوتا ہے جو الکٹرک موٹر کی مدد سے چھوڑا نہیں جاتا بلکہ اسے ایک تار سے باندھ دیتے ہیں اور اس تار کا دوسرا سرا آبدوز کے پچھلے حصہ میں باندھتے ہیں۔ پھر آبدوز کو اس طرح چلاتے ہیں کہ خود آبدوز تو الگ رہے مگر یہ تارپیڈو دشمن کے جہاز سے ٹکرا جائے۔ ٹکر کے زور سے اس کے اندر کا مادہ پھٹتا ہے اور جہاز کے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی محض ٹکر پر اعتماد نہیں کیا جاتا بلکہ تار کا ایک سرا آبدوز پر الکٹرک بیٹری سے جوڑ دیا جاتا ہے جیسے ہی تارپیڈو دشمن کے جہاز سے ٹکراتا ہے۔ برقی رو (کرنٹ) پیدا ہوتا ہے اور پھٹنے والا مادہ برقی رو کی گرمی سے پھٹتا ہے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ آبدوزوں میں تارپیڈو کشتیوں کا اسٹاک رکھنا پڑتا ہے۔ اور یہ تارپیڈو اتنے چھوٹے نہیں ہوتے کہ بہت بڑی تعداد میں جہاز کے اندر جمع کئے جا سکیں۔ اس لئے ان کا محدود اسٹاک جلد ختم ہو جاتا ہے اور انہیں نیا اسٹاک لینے کیلئے کسی نہ کسی ایسے بندرگاہ کی ضرورت ہے جس کے حکام ان سے ساز باز رکھتے ہوں۔ آجکل جرمن آبدوز سمندروں میں کام کر رہے ہیں جو جرمنی سے الگ ہیں اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اُن کے لئے کوئی نہ کوئی ایسی جائے پناہ ہے، جہاں سے وہ اپنا اسٹاک لے سکیں اور دیگر ضروریات زندگی مثلاً ہوا اور خوراک حاصل کریں۔

بعض جہازوں کو جرمن آبدوزوں نے انگلستان کے مغرب میں تارپیڈو مار کر غرق کیا۔ سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ اُن کی جائے پناہ کہاں ہے۔ مگر کوئی نہ کوئی مخفیہ مقام، جزیرہ یا "غیر جانبدار" طاقت کا

بندرگاہ انہیں ضرور مدد پہنچاتا ہے۔

ان تار پیڈو کی نسبت یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ بالکل نئی چیز نہیں ہیں بلکہ انگلستان اور جمہوریہ متحدہ امریکہ کی جنگ میں سب سے پہلے استعمال ہوئے تھے۔ روس، فرانس جرمنی سب انہیں اپنی سابقہ جنگوں میں استعمال کر چکے ہیں۔ پروشیا اور فرانس کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی اس میں فرانس پر ان تار پیڈوؤں کا اتنا خوف غالب تھا کہ فرانس نے پروشیا کے خلاف اپنے جہاز بھیجنے بند کر دئے تھے۔ لیکن گذشتہ جنگوں میں تار پیڈو بالکل یقینی طور پر کارگر نہیں ہوا تھا۔ کبھی اس کا وار کامیاب ہوتا تھا اور کبھی نہیں۔ بہرکیف گذشتہ جنگ عظیم میں سب سے پہلے یہ سائنٹفک تکمیل کے ساتھ استعمال ہوئے اور انہوں نے ایسا غضب ڈھایا تھا کہ تجارتی جہازوں کا ان سے اتنا نقصان ہوا کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کروڑہا روپیہ کا نقصان ہوا

اسی لئے جنگ عظیم کے بعد ان کے استعمال پر بڑی ہی پابندیاں لگا دی گئی تھیں۔

ٹینک

ٹینک کی ساخت کے چار سادہ اصول ہیں۔

(۱) دشمن پر دور سے حملہ کرنا۔

(۲) دشمن پر وار کرنا۔

(۳) دشمن کو قریب سے مارنا۔

(۴) ان تینوں حالتوں میں خود کو مارنے سے بچانا۔

ان چار مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے ایسی موٹریں ہزاروں کی تعداد میں بنائی گئیں جو ہر طرف سے سخت سے سخت دھات کی چادر سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ جنہیں اندر بیٹھے ہوئے آدمی چلاتے ہیں۔ یہ تخیل تو بہت سادہ ہے اور زمانہ ماضی کے اُس مسلح جنگ آزما سے لیا گیا ہے جو سر سے پاؤں تک فولادی خود، زرہ بکتر وغیرہ سے ڈھکا ہوتا تھا جس کے جسم پر کوئی حربہ کارگر نہیں ہوتا تھا۔

اس آہن پوش سورما اور ٹینک کے طریق جنگ کا اصول ایک ہی ہے۔ یہ ٹینک سب سے پہلے جنگ عظیم میں استعمال ہوئے اور برطانیہ کے سر اُن کی ایجاد کا سہرا ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ء تک یہ ایجاد زیادہ مقبول نہیں ہوئی۔ کیونکہ ٹینکوں کے استعمال کے صحیح طریقے استعمال نہیں کئے گئے تھے اور برطانیہ و فرانس کے رہنمایانِ جنگ نے ان کی قدر و قیمت کا زیادہ احساس نہیں کیا تھا۔ جو ٹینک پہلے بنے تھے ان میں کچھ نقص بھی رہ گئے تھے مگر سب سے بڑی وجہ ناکامی کی یہ تھی کہ ان کا استعمال میدانِ جنگ میں صحیح طور سے نہیں کیا گیا۔ اپیریز کے میدانِ جنگ میں یہ جرمنوں کے مقابلہ میں بیکار ہو گئے۔ ان میں سے اکثر دشمنوں کی صفوں تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئے۔ لیکن سنہ ۱۹۱۸ء میں صلح سے کچھ عرصہ قبل ان ٹینکوں کے جوہر آخر کھل گئے اور ان کی وجہ سے جرمن فوج میں بڑی بھگدڑ پڑی۔

پہلے ٹینک صرف بیس میل فی گھنٹہ سڑک پر چل سکتے تھے سنہ ۱۹۳۱ء میں برطانیہ نے "واکارس لائٹ ٹینک" بنائے جن کی رفتار تیس میل فی گھنٹہ سڑک پر تھی۔ یہ ٹینک چار فٹ چوڑی خندق کو بھی پار کر جاتے تھے۔ لیکن تازہ ترین ٹینک میں چالیس ہارس پاور کے انجن لگا دئے گئے ہیں، اور ان کی رفتار ۴۵ میل فی گھنٹہ تک ہے۔ رفتار اور زیادہ تیز کی جا سکتی ہے۔ اگر انجن بڑا اور باڈی ہلکا ہو۔

پٹرول کا ذخیرہ

جرمن کے ٹینک جو پولینڈ میں کام کر رہے ہیں زیادہ تر ہلکی قسم کے ہیں۔ ایسے ٹینک میں ایک دفعہ پٹرول کا مقررہ ذخیرہ لے لیا جائے تو تقریباً ڈیڑھ سو میل کے سفر تک کافی ہوگا۔ برطانیہ کے میڈیم ٹینک میں جو مقابلتاً بھاری ہوتے ہیں بہت سا پٹرول آجاتا ہے اور یہ ایک دفعہ کے بھرے ہوئے پٹرول سے سو میل تک دھاوا کر سکتے ہیں۔ یہ ٹینک وزن میں تیس ٹن ہوتے ہیں۔ ان میں چار مشین گنیں اور ایک دور کی مار نے والی توپ ہوتی ہے۔

"مدینہ"

نئی کتابیں

معارفِ جمیل

ازجناب حکیم آزاد انصاری۔ لکھائی چھپائی نفیس تقطیع متوسط۔ ضخامت ۲۵۵ صفحے قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے غیر مجلد دو روپے، ملنے کا پتہ شمس الاسلام پریس حیدر آباد دکن۔

معارفِ جمیل حضرتِ آزاد انصاری کے کلام کا مجموعہ ہے۔ حضرتِ آزاد ہماری زبان کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ آپ کا کلام اردو کے جلیل القدر جرائد میں نہایت وقعت کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ منظومات اور رباعیات کے علاوہ آپ کی غزلیات پر مشتمل ہے اور ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اردو سے نری تغزل کی شاعری کے دور ختم کے ہوجانے کے باوجود آپ کے مجموعہ کو دیکھ کر یہی معلوم کہ آپ کی مشقِ سخن بڑی حد تک غزل تک محدود ہے۔

دراصل غزل حسن وعشق کے داخلی جذبات کے اظہار اور قلبی واردات کے بیان کا بہترین وسیلہ ہے۔ ولی سے لے کر اس وقت تک شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جو اس کی دلکشیوں کی طرف متوجہ نہ ہوا ہو۔ گو متوسطین اور متاخرین کے ہاتھ میں غزل کی حیثیت محض ایک کھلونے کی سی تھی مبالغہ اور غلو اُن کے کلام کی آرائش، ہوس رانی ان کا حسن اور رکیک خیالات اُن کا معراجِ شعری تھا۔ لیکن اب ادبی اصلاح کی تحریکات نے غزل کے ظاہر و باطن کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ اب محض جذباتی پہلو سے تعلق رکھنے کی بجائے غزل میں شخصی اور ذاتی محسوسات کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں حیاتِ انسانی کے سنگین مسائل کی نقشہ کشی کی جاتی ہے اور اس کے مضامین میں حقائقِ حیات اور اخلاق کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

موجودہ تحریکاتِ شعری کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم آزاد کی غزل پر نظر ڈالیں تو ہمیں ان کے ہاں وہ منفرد مشاہدات اور نکات نظر نہیں آتے جن کی موجودگی سے ان کی غزل اس رفعتِ خیال اور عمیق فلسفیانہ غور وفکر کی حامل نظر آتی جو غالب اور اقبال کے تاثر کی وجہ سے آج اردو غزل کے اجزا لاینفک متصور ہوتے ہیں۔ تاہم آزاد کی غزل میں ایک پُر زور معنوی تاثیر ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام قاری کے قلب کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ حالی سے اصلاح لینے کی وجہ سے ان کے کلام میں سادگی اور سلاست اور بیدل کے مشوروں کی بنا پر لطافت اور پاکیزگی آگئی ہے۔ آزاد کے موضوعات گو عام غزل گو شعرا کے موضوعات ہیں لیکن اس سادگی، سلاست اور نزاکت کی وجہ سے ان مضامین کو انہوں نے شگفتہ بنا دیا ہے۔

ان کی غزلیات جنسی تعلقات کے بیان سے منزہ اور جسمانی لذات کے اظہار سے معرا ہیں۔ رکیک اور بازاری خیالات کا جو متوسطین اور متاخرین کیا، خود اس زمانہ کے اکثر غزل گو شعراء کا محبوب مضمون ہیں، خفیف سا پرتو بھی ان کے ہاں نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے شعری مذاق کو مبتذل جذبات سے ملوث نہیں کرتے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو ان کے کلام کو دوسروں کے کلام سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی سبب انہیں اردو کے متعدد مشاق غزل گو شعرا پر فوقیت و رفعت حاصل ہے۔ ذیل کی غزل میں آزاد کے شعری آرٹ کی سادگی ملاحظہ فرمایئے۔

تو ہے اور فکرِ جفا ہے اور بس
میں ہوں اور شکرِ خدا ہے اور بس

بندہ پرور اس طرف بھی اک نظر
اک نظر کی التجا ہے اور بس

یا تو دل تھا اور لاکھوں مدعا
یا دلِ بے مدعا ہے اور بس

عادتِ چون وچرا کے دن گئے
اب سرِ صبر و رضا ہے اور بس

کل تک اصرارِ خطا تھا لیکن آج
میں ہوں اقبالِ خطا ہے اور بس

ہو چکے دنیا کے شکوے ہو چکے
اب فقط تجھ سے گلا ہے اور بس

دوستو! ناصح مرا دشمن نہیں
اک ذرا سر پھر گیا ہے اور بس

اس غزل میں یاس اور قنوطیت کے جو اجزا اور حزن خاموش کا جو لطیف عنصر نظر آتا ہے۔ آزاد کی غزلیات میں ان کا وجود جگہ جگہ ملتا ہے۔ آزاد قنوطی شاعر نہیں، لیکن ان کی نظر میں اپنے محبوب کا جو بلند تصور ہے اور جس طرح وہ اس کے قرب کیلئے بے چین نظر آتے اس سے غیر شعوری طور پر ان کی غزل میں قنوطی خیالات کی جھلک نظر آنے لگتی ہے اور ان کی غزل میں ایک الیاسوزِ پیہم پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں درد کی فراوانی ہے۔ ایک دوسری غزل کے اشعار میں سوز و گداز ملاحظہ کیجئے۔

نہ وہ ہم ہیں، نہ وہ دل ہے، نہ حسرت ہے نہ ارماں ہے
وفورِ نامرادی ہے، ہجومِ یاس و حرماں ہے

امنگیں ہیں سو افسردہ، طبیعت ہے سو پژمردہ
نہ دلچسپی کی صورت ہے، نہ خوش وقتی کا ساماں ہے

کبھی جو دل نویدِ وصل سے مسرور رہتا تھا
وہ اب تقدیر سے پامالِ کلفت ہائے ہجراں ہے

کبھی جو دل زمانے کے ستم بے خوف سہتا تھا
وہ اب انجامِ الفت کے تصور سے ہراساں ہے

کبھی جس دل کو دنیا بھر کا اطمینان حاصل تھا
وہ اب تیری عنایت ہائے بیجا سے پریشاں ہے

کبھی جو دل تری چشمِ کرم کا تجھ سے سائل تھا
وہ اب تیری توجہ ہائے پیہم سے پشیماں ہے

سرِ تسلیم خم ہے جو مناسب ہو وہ جائز رکھ
ستم بھی تجھ کو بھاتا ہے اکرم بھی تیرے شایاں ہے

آزاد کی غزلیات مجموعی طور پر صاف ستھری ہیں۔ ان میں نہ فارسی ترکیبوں کی زیادتی ہے نہ تعقید و اغلاق کی بھرمار ہے نہ بعید از کار تشبیہات و استعارات سے کام لیا گیا ہے نہ تخیل کی جولانیاں دکھائی گئی ہیں۔ جہاں چھوٹی چھوٹی بحریں ہیں وہاں سادہ سادہ الفاظ کو استعمال کیا ہے اور سیدھے سیدھے جذبات کی نقشہ کشی کی ہے۔ جہاں ردیف و قافیہ دشوار ہے وہاں اقتضائے حال سے مضمون بھی بلند ہے۔ منظومات میں "نوحۂ ممتاز" کے عنوان سے شریکِ زندگی کی رحلت پر انہوں نے جو مرثیہ لکھا ہے وہ ان کے شعری آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔ اس مرثیہ میں سوز اور درد کی تمام کیفیتیں موجود ہیں۔ جذبات اس قدر پُر خلوص اور فطری ہیں کہ قاری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"چاند سے جھڑپ" کے عنوان پر جو نظم ہے اس کی سب سے نمایاں خصوصیت "موسیقیت" ہے اور یہ موسیقی الفاظ اور معانی دونوں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ آزاد کی اکثر نظموں میں اصوات و معانی کا خوش آہنگ امتزاج نظر آتا ہے "حسن دلنواز" کے عنوان سے جو نظم ہے اس کا مطالعہ کیجئے۔ اس میں شاعر کے پیش نظر حسن بسیط کا ایک وسیع تخیل ہے اور وہ اشیائے عالم میں ایسے حسن کا مشاہدہ کر رہا ہے جس کی پرستش اس کے لئے مضمر ہے۔ اس نظم میں آزاد کا شعری کمال بہت نمایاں ہے۔ چند اشعار پڑھئے۔

حُسن سے اپنا عہد نباہ
حُسن سفید و حُسنِ سیاہ

ایک ہیں پیشِ اہل نگاہ
چاہ ہر اہلِ حُسن کو چاہ

حُسن حیاتِ عالم ہے
جوہرِ ذاتِ عالم ہے

وجہِ ثباتِ عالم ہے
چاہ ہر اہلِ حُسن کو چاہ

حُسن غذائے الفت ہے
عقدہ کشائے الفت ہے

یعنی برائے الفت ہے
چاہ ہر اہلِ حُسن کو چاہ

حُسن بتاں سے ربط بڑھا
جسم کا جاں سے ربط بڑھا

رُوح جہاں سے ربط بڑھا ؛ چاہ ہر اہلِ حُسن کو چاہ

معارف جمیل کی ابتدا میں حضرت آزاد نے خود اپنے قلم سے اپنی اور اپنی شاعری کی ایک بسیط سرگزشت بھی لکھی ہے۔ یہ پڑھنے کی چیز ہے۔ اس میں آپ نے اپنی شاعرانہ خصوصیات کے متعلق ایک تفصیلی بحث کی ہے جو حد درجہ دلچسپ ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ہر شاعر اور بالخصوص حقیقی شاعر کے کلام میں کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جس سے اس کا کلام دوسرے شعرا کے کلام سے ممتاز نظر آتا ہے۔ ہم بھی اپنی پنجاہ سالہ کوشش و مشق سے اپنی شاعری میں چند بڑی بھلی خصوصیات پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ انہیں ہماری اختیار کردہ خصوصیات نے ہماری سعی و کوشش سے مل کر ہم کو اپنا رنگِ خصوصی پیدا کرنے میں مدد دی ہے۔"

وہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کلام کی اصلی ترتیب۔ (۲) سلاست و صفائی زبان۔ (۳) ندرت بیان (۴) تکرار الفاظِ حسین (۵) صنعتِ ترصیع و تقابل (۶) صنعتِ ترصیع جدیدہ کی ایجاد (۷) شعر میں اصطلاحاتِ علمیہ کا استعمال۔ ان خصوصیات کے اظہار کے بعد حضرت آزاد نے اِن کی مثالیں بھی اپنے کلام سے اجمالاً بیان کی ہیں۔ جن کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں "معارف جمیل" کا استقبال بڑی گرمجوشی سے ہوگا۔

بیوہ:۔

مصنفہ منشی پریم چند آنجہانی۔ تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۹۲ صفحات قیمت عہ، ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

منشی پریم چند کے افسانوں اور ناولوں سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے پیشِ نظر ہمیشہ "سماج" کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس ناول میں بھی ہندو سماج کے ایک خاسد عضو کی اصلاح مقصود ہے۔ ہندو سوسائٹی میں، بیوہ کی حالت بہت افسوسناک اور المناک ہے خصوصاً نوجوان بیوہ کی۔ اس کی اصلاح کیلئے منشی جی نے "بیوگان کی شادی" اور "بیوہ گھر" کے قیام کی ضرورت اور اس کی اہمیت کو پیش کیا ہے۔ اور بیوگان کی شادی نہ ہونے کی صورت میں، جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں انہیں نہایت جرأت سے بے نقاب کیا ہے۔ زندگی کی سادگی اور شیرینی، پلاٹ کی خوبی، کرداروں کی سیرت نگاری اور حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں کی مصوری جس خوبی سے کی گئی ہے، اس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ منشی جی کا نام بالکل کافی ہے۔ ان کی تمام خصوصیات اس ناول میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

سبدِ چین:۔

از مرزا غالب۔ صفحات ۸۰۔ قیمت ۶ر ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

مرزا غالب کی فارسی منظومات کا مجموعہ ان کی زندگی میں نولکشور پریس سے شائع ہوگیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے فارسی زبان میں جو کچھ کہا وہ "سبدِ چین" کے نام سے ایک مختصر سے مجموعہ کی شکل میں شائع کیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ مجموعہ نایاب ہوگیا۔ اور کسی وجہ سے کلیات میں بھی شامل نہ ہو سکا۔ اب مکتبہ جامعہ نے اسے حاصل کر کے دوبارہ شائع کیا ہے۔

مرزا کے اردو کلام کو ہندوستان میں جو مقبولیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن ان کے فارسی کلام کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ ورنہ "سبدِ چین" اب تک کس مپرسی کے عالم میں نہ پڑی رہتی۔ بہرحال مکتبہ جامعہ اور مسٹر مالک رام ایم۔ اے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس نایاب مجموعہ کو حاصل کر کے محفوظ کر دیا۔ امید ہے کہ اہلِ ذوق اس سے استفادہ کریں گے۔

"سبدِ چین" کے اس اڈیشن میں اس کے مرتب مسٹر مالک رام ایم۔ اے نے مرزا کا وہ کلام بھی جمع کر دیا ہے جو کلیات نظم و نثر کے علاوہ ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ ضروری حواشی کا بھی اضافہ کیا ہے اور مرزا کی ایک نایاب تصویر بھی اس میں شامل ہے۔

مرزا کی فارسی کی اکثر چیزیں مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی تصانیف بہت مبسوط ہیں۔ اس لئے صرف ان کے اقتباسات داخل نصاب کئے گئے۔ "سبدِ چین" نہایت مختصر بھی ہے اور ان کے آخری زمانے کا کلام ہونے کی وجہ سے اس میں پختگی اور حسن معنوی

بھی زیادہ - اس لئے اس کتاب کو داخل نصاب کرنے میں بھی سہولیت ہوگی -

بنی اسرائیل کا چاند :-

سر رائیڈر ہیگرڈ انگریزی زبان کا مشہور مصنف ہے - چونکہ وہ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں مدتوں افریقہ میں مقیم رہا - اس لئے اس نے وہاں کی مقامی روایتوں پر مبنی ایسے ناول لکھے جن میں افریقی زندگی و تاریخ اور وہاں کے باشندوں کے عقائد و تمدن سے بحث کی گئی ہے - دنیا کی بعض دیگر اقوام کی طرح افریقی بھی آواگون یا روح کے بار بار پیدا ہونے کے عقیدہ کے قائل تھے - سر رائیڈر ہیگرڈ کے بیشتر ناولوں کا موضوع بھی یہی عقیدہ ہے - ایک زمانہ ہوا مولانا ظفر علیخاں نے ہیگرڈ کے ایک ناول کا ترجمہ سیر ظلمات کے نام سے کیا تھا - ناول زیر تنقید اس کے ایک دوسرے ناول کا ترجمہ ہے - اس میں مصنف نے اس زمانہ کا حال لکھا ہے - جب بنی اسرائیل فرعون کے ہاتھوں ظلم و ستم کا شکار ہو رہے تھے اور آخر ایک طویل جدوجہد اور کشمکش کے بعد حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہ السلام کے ذریعہ انہیں نجات ہوئی - اس کا حال تورات کی کتاب خروج کے پہلے چودہ ابواب میں دیا ہے - "بنی اسرائیل کے چاند" کی روایت اور خروج کے بیانات میں کچھ اختلاف ہے - مثلاً تورات میں دس "وباؤں" کا ذکر ہے اور ہیگرڈ کے ہاں کم کا ——— اس اختلاف کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مقامی روائتوں میں مصنف نے ایسا ہی سنا ہوگا اور اسی طرح لکھ دیا - کیونکہ خود عیسائی ہونے کی حیثیت سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ انہیں اس باب میں تورات کے بیانات کا علم نہ ہو -

اب رہا ترجمے کا سوال تو عبدالمجید حیرت بحیثیت مجموعی اصل کی خوبیوں کو ترجمہ میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں - زبان بامحاورہ اور سلیس ہے -

ہمیں امید ہے کہ اردو علم و ادب کے قدردان مترجم کی حوصلہ افزائی کریں گے - تاکہ وہ آئندہ اپنی زبان کی مزید خدمات بجالا سکیں -

"ف"

تصحیح

پچھلی اشاعت میں حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کی نظم "نمائش و نمائش گاہ" کے دوسرے شعر کا مصرع ثانی غلط چھپ گیا تھا - قارئین تصحیح فرمالیں -

(غلط) "فطرت شخصیت ہے شہرت گاہ"

(صحیح) "فطرت شخصیت ہے شہرت خواہ"

مدیر

ل۔ احمد صاحب کی کتابیں

انشائے لطیف

اردو ادب سے ذوق رکھنے والوں کیلئے صاحب لالہ رخ کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ ل۔ احمد صاحب نے اردو میں افسانہ نویسی کا جو معیار پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ ان کی قلم سے نکلا ہوا ہر افسانہ نفسیات و واردات قلب، اور حکمت و جذبات کی بولتی تصویر اور اردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے۔ پندرہ افسانوں کا یہ مجموعہ حسن و عشق کی کشاکش اور فلسفۂ شباب کا مرقع ہے۔ آپ اگر اردو زبان کی گہرائی اور اردو نثر کی شعر آفرینی کے قدرداں ہیں تو اس مجموعے کو دیکھئے۔ پونے تین سو صفحات مجلد قیمت دو روپے۔

نغمات

اس مجموعے میں ل۔ احمد صاحب کے ساٹھ مختصر ترین ادب پارے شامل ہیں۔ جنہیں نثر کی شاعری کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ زبان کی نفاست اور بیان کی لطافت کا اندازہ کرنے کیلئے اس مجموعے کا دیکھنا ازبس ضروری ہے۔ ۱۳۶ صفحات۔ مجلد قیمت ایک روپیہ

محبت کا فسانہ

یہ ایک طویل افسانہ ہے جس کے اندر ل۔ احمد صاحب نے موسیقانہ زبان اور فلسفیانہ استدلال میں مسرت ازدواج ...... سے بحث کی ہے۔ لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل فسانہ ہے اور ہر باب میں کسی نہ کسی معاشری و اخلاقی مسئلے پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

ساڑھے تین سو صفحات۔ مجلد قیمت ایک روپیہ

زندگی کے کھیل

اس مجموعے میں ل۔ احمد صاحب کی بارہ سماجی کہانیاں شامل ہیں جن کے اندر معاشری خرابیوں اور فلاکت زدہ سماج کی جیتی جاگتی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ کہانیاں پرانے ٹیکنیک پر نئے ادب کی تعبیر کی مثال پیش کرتی ہیں۔

ایک سو ساٹھ صفحات، مجلد قیمت ایک روپیہ۔

ممیوں کے افسانے

یہ تین بہترین افسانوں کا ترجمہ ہے اور انگریزی مصنف رائڈر ہیگرڈ اور فرانسوی فسانہ نگار گاتی ابر کی بہترین کہانیاں منتخب کی گئی ہیں۔ اس پر ل۔ احمد کا جادو نگار قلم۔ کتاب چھپ رہی ہے۔

ضخامت تقریباً دو سو صفحات، مجلد قیمت ایک یا سوا روپیہ ہوگی۔

ملنے کا پتہ :-

عظیم اطہر۔ محلہ منٹولہ، آگرہ

نگراں
پروفیسر تاجور نجیب آبادی

شاہکار لاہور

ایڈیٹرز
خواجہ محمود جاوید ایم۔اے
فاروق علیخاں

فہرست مضامین دسمبر ۱۹۳۹ء

چندہ:-

سالانہ چندہ۔ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے۔ نمونہ کی کاپی ۸/

ایم ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار لاہور چھپوا کر واقعہ بر مکان محمد الدین، محمد الدین سٹریٹ فلیمنگ روڈ لاہور دفتر شاہکار سے شائع کیا

رفتارِ عالم

جنگِ چین و جاپان

معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ دو سال میں جاپان نے چین کو نیچا دکھانے کیلئے جتنی قربانیاں کی ہیں وہ سب ضائع جائیں گی۔ جنگ کے پچھلے اور موجودہ حالات و واقعات خود بخود یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ چین میں جاپان کی ایک پُر امن اور مستقل حکومت کا قائم ہو جانا صرف مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ کوریا، فارموسا اور مانچوکو کے سب مدبرین پر اب یہ حقیقت آشکارا ہو چکی ہے کہ جاپان چین سے کچھ نہ لے سکیگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جہاں تک اس میں ہمت ہے چین سے لڑتا چلا جائے اور جب پاس کچھ نہ رہے تو آرام سے گھر آ بیٹھے۔

مان لیا کہ جاپان کی فوجوں نے قومی جوش میں آکر چین کے کئی علاقے فتح کر لئے مگر مشکل تو یہ ہے کہ چینی ان فتوحات کو مانتے نہیں اور وہ اس طرح کہ جب جاپان کی فوجیں کوئی شہر فتح کر کے ایک طرف ہوتی ہیں تو دوسری طرف سے چینی آ دھمکتے ہیں کہ فتح کیا ہوگا مان لیا مگر راج تو ہمارا ہی رہے گا۔ یہ ہے چین اور جاپان کی موجودہ جنگ کا مختصر سا نقشہ۔

اگر آج کوئی جاپان کو یہ مشورہ دے کہ میاں چین میں حکومت یا پیش قدمی کا خیال دل سے نکال دو تو ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں۔ کہ جاپان اس تجویز کا پُر جوش استقبال کرے اور وہ تو خود یہ دل سے چاہتا ہے کہ آج نہیں تو کل اسے چند ایسے چینی مل جائیں۔ جو فی الحال اس کے اشاروں پر کام کرنے کے سوال ہی کو قابلِ غور سمجھیں مگر اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ آزاد چین "جاپانی چین" کو کبھی آرام سے نہ بیٹھنے دیگا اور چینی جاپان سے بدلہ لینے کیلئے جنگ کی آگ کو ہمیشہ سلگائے رکھیں گے۔

جاپان چین پر صرف اس صورت میں غلبہ پا سکتا ہے کہ وہ اپنے مفتوحہ اور برباد کئے علاقوں کے حالات کو ہر لحاظ سے بہتر بنانے میں صحیح طور پر کامیاب ہو جائے اور اگر یہ علاقے جاپان کی غیر معمولی جدوجہد سے بہت جلد پھر اپنی اپنی صورت اختیار کر لیں، جو جنگ سے پہلے زمانۂ امن میں تھی تو البتہ پھر جاپان کو دُور آگے بڑھ کر ہاتھ مارنے کی بھی سوجھ سکتی ہے۔ اگر چین نے جاپان کو اس کے فتح کئے ہوئے علاقوں کا انتظام بھی نہ کرنے دیا اور ساتھ ہی جنگ کو جاری رکھنے کی موجودہ حکمتِ عملی بھی جاری رکھی تو سمجھ لیجئے کہ اقتصادی لحاظ سے جاپان کی لُٹیا ڈوبی۔ خود جاپانی مدبرین بھی اب یہی کہہ رہے۔

جہاں تک فوج کی طاقت اور بہادری کا تعلق ہے جاپان چین کے مقابلے میں جنگ فتح کر چکا ہے۔ جاپانی افواج اس وقت چین کے بڑے بڑے شہروں اور سارے ساحلی علاقوں پر قابض ہونے کی دعویدار ہیں۔ لیکن پھر بھی جاپان کے اختیارات اور جاپان کے اشاروں پر ناچنے والی جاپانی حکومتوں کے اختیارات وقتی طور پر صرف میدانِ جنگ کے اندر محدود رہتے ہیں جس میں جاپانی مشینیں آگ اُگلتی ہیں۔ جاپانی افواج جس سُرعت سے چین کے اندرونی حصّوں کی طرف بڑھتی ہیں۔ چینی سپاہی اس سے کہیں زیادہ چالاکی کے ساتھ بظاہر اپنے ہاتھ سے نکلے ہوئے علاقہ کے ذرائع آمد و رفت منقطع کر دیتے ہیں۔ جاپانی افواج کے لئے خوراک اور اسلحہ حاصل کرنا ایک ناممکن سی بات بن جاتی ہے اور علاقہ پر پھر چینی چھا جاتے ہیں۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر جاپان ان علاقوں میں چینیوں سے چھٹکارا حاصل کر کے زراعت و تجارت کو ازسرِ نو شروع کرنا چاہے تو اسے مزید پانچ لاکھ آدمیوں کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر جاپان کی موجودہ حالت کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زراعت کا کام سلجھانے والے تجربہ کار جاپانی کسان کچھ تو جنگ میں مر چکے

ہیں اور باقی لڑ رہے ہیں۔ کھیتوں اور کانوں میں عورتیں مردوں کا کام کر رہی ہیں۔ جاپانی معاشرت میں عورتوں کی ان مصروفیات سے خلل پیدا ہو گیا ہے۔ وہ گھریلو زندگی کے لطف سے محروم ہو چکے ہیں۔ سب اور وہ لڑکے جن کا فرض صرف مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنا تھا۔ اب اسلحہ سازی کے کارخانوں میں دن رات کام کرتے ہیں اور اپنے کالے ہاتھوں کی طرف دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتے ہیں۔

جاپان کی "عذابِ جان" نوآبادیات

جاپان کی نوآبادیات زبانِ حال سے یہ پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ نوآبادیات کا انتظام کر لینا صرف فرانس اور برطانیہ ہی کے بس کی بات ہے۔ فارموسا پر جاپان کا قبضہ تقریباً چالیس سال سے ہے۔ مگر فارموسا کے رہنے والے اپنے حاکموں کی جان کو دن رات رو رہے ہیں۔ کوریا پر جاپان تین سال سے قابض ہے۔ بیچارے نے لاکھ کوششوں سے یہاں پلیگ اور دوسری وباؤں کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا۔ سیلاب زدہ علاقہ کا بندوبست کیا۔ آبپاشی کے ذریعہ ہمیشہ خشک رہنے والی زمین کو سیراب کر کے ملک کو قحط سے بچایا۔ لیکن اہلِ کوریا جاپانیوں سے انتہائی نفرت کرتے ہیں۔ مانچوکو میں بھی ایسی ہی حالت ہے۔ چانگ ہسلیانگ کی کی حکومت کے بے وجہ دباؤ سے تنگ آ کر منچوریا کے بہت سے چینی خود ہی جاپان کی حکومت کو ترجیح دینے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ جاپان نے وہاں ایک مستقل حکومت قائم کر کے ملک بھر کے ناقابلِ برداشت ٹیکسوں سے شہریوں کو نجات دلائی۔ بڑی بڑی سڑکیں بنوائیں۔ ریلوں میں توسیع کی گئی۔ تجارت کو فروغ دیا اور اپنی دلچسپی کے مطابق کسانوں کے حالات بھی درست کئے مگر ان باتوں کے باوجود جاپانی منچوریا کے رہنے والوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتے اور ان کی اس نفرت وحقارت میں ہر سال اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ منچوریا میں جاپان کی پانچ لاکھ فوج متعین ہے۔ لیکن امن کبھی قائم نہیں ہو سکا۔ رات کے وقت ریلوں پر باقاعدہ دھاوے بولے جاتے رہے۔ پُلوں کو ڈائنامیٹ سے اُڑا دیا جاتا ہے اور چینیوں کے اچانک حملوں سے جاپان کے ہزاروں سپاہی ہلاک و مجروح ہوتے رہے۔ انقلاب پسند چینیوں کی سرگرمیوں کا یہ عالم ہے کہ مکدن کے ہوائی مستقر میں بارود رکھ کر آگ لگا دی گئی اور دھماکہ اس زور سے ہوا کہ جاپان کے بہت سے ہوائی جہاز بالکل تباہ ہو گئے۔

کوریا کی آبادی صرف دو کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ لیکن جاپان کا کام وہاں اتنی فوج رکھ کر بھی نہیں چلتا جتنی برطانیہ نے پینتیس کروڑ ہندوستانیوں کے انتظام کے لئے مقرر کر رکھی ہے۔ حکومت کوریا کے باشندوں سے قانونی طور پر ہتھیار چھین چکی ہے۔ لیکن مشرقِ بعید میں چینیوں کی انقلاب پسند جماعتیں نہایت اطمینان سے جاپانی افسروں کو قتل کرنے کا کام کئے جاتی ہیں۔

پھر اب کیا ہو گا

جب جاپان کی پہلی نوآبادیات میں بدانتظامی کا یہ عالم ہے تو اب یہ توقع رکھنا کہ وہ کبھی اپنے نئے فتح کئے ہوئے چینی علاقوں پر بھی تسلط جمانے میں کامیاب ہو جائے گا، ذرا مضحکہ خیز سی بات معلوم ہوتی ہے۔ جاپان کے ان فتح کئے ہوئے علاقوں میں چینیوں کی تعداد تیئیس کروڑ کے لگ بھگ ہے اور یہ سارے کے سارے جاپانیوں کے جانی دشمن ہیں۔ اب بجائے اس کے کہ جاپان کی طرف سے ان کی ہمدردی حاصل کرنے کیلئے انتہائی کوششیں ہوتیں۔ جاپانی افواج ظلم اور رعب سے اپنا کام نکالنا چاہتی ہیں۔

آزاد چین میں جنرل چیانگ کیشک کے ماتحت اس وقت بھی بیس کروڑ سپاہی اپنے ملک پر قربان ہونے کیلئے تیار بیٹھے ہیں اور ان کے علاوہ لاکھوں چینی پراپیگنڈا، تنظیم اور گوریلا جنگ کے لئے غلام چین میں پہنچتے رہتے ہیں۔

ملایا، جاوا، امریکہ اور فلپائنز میں آباد چینیوں کی تعداد ایک کروڑ پچاس لاکھ ہے۔ جب سے جنگ چھڑی ہے یہ چینی اپنے ملک کو کروڑوں روپے بھیج رہے ہیں تاکہ جاپان سے ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔

چینیوں اور جاپانیوں کی اس گہری عداوت کی ایک وجہ تو قدرتی طور پر ظاہر ہے کہ چین، جاپان کا غلام نہیں بننا چاہتا، مگر اس کے علاوہ جاپانیوں نے چینیوں کے ساتھ یوں بھی کبھی انسانوں کا سا سلوک نہیں کیا۔ وہ اپنے مقابلہ میں چینیوں کو بہت حقیر سمجھتے ہیں حالانکہ جاپان اگر اپنے آپ کو مہذب سمجھتا ہے تو یہ تہذیب اور اس کے ساتھ آرٹ اور لٹریچر اس نے چینیوں ہی سے حاصل کیا۔ جاپانیوں کو چینیوں سے یہ گلہ ہے کہ وہ ان سے متحد نہیں ہوتے۔

اقبال کا نظریۂ ادب

اقبال کا نظریۂ ادب کیا ہے؟

اس کے نزدیک ادب اور زندگی کا کیا تعلق ہے؟ ادیب اور شاعر کو زندگی کی جدوجہد اور کشمکش میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس پر بحیثیت ایک ادیب کے کیا فرائض عاید ہوتے ہیں؟ اگر اس سوال کا جواب ادب کی مشکل اصطلاحوں میں دیا جائے تو وہ بہت لمبا اور گنجلک ہو جائے گا۔ اس لئے سیدھے سادھے الفاظ میں سن لیجئے۔

بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے اور یہ رہا ہے کہ جب انسان زندگی کی کٹھن آزمائشوں اور تکلیفوں سے عاجز آ جاتا ہے یا ہمت اور حوصلے کی کمی کی وجہ سے اُن کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتا تو وہ اپنے اصلی اور واقعی ماحول سے بھاگ کر ادب اور شاعری کے دامن میں پناہ لیتا ہے اور وہاں اپنے لئے جذبات اور خیالات کی ایک چھوٹی سی ستھری اور خوبصورت دنیا بسا لیتا ہے اور اس تمثیل کو حقیقت پر ترجیح دیتا ہے۔ اگر آپ دنیا کے ادب کا مطالعہ کریں تو ماننا پڑے گا کہ اکثر ادیبوں پر یہ تعریف پوری اترتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے جہاں تک ممکن ہوتا ہے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ ان کے ملک میں آگ لگی ہو لیکن وہ روم کے شہنشاہ نیرو کی طرح بیٹھے بانسری بجاتے ہیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن کی شان میں اقبال نے خود کہا ہے ؎

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار

ان میں سے بعض ایسے بھی ہوئے ہیں۔ جن کا دل زیادہ حساس تھا اور وہ گرد و پیش کے حالات اور واقعات سے اثر لئے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن انہوں نے اس اثر کا اظہار محض آنسوؤں اور آہوں اور دنیا کی نااہلیت پر گریہ وزاری کی شکل میں کیا۔ البتہ انہوں نے ان جذبات کو شعر اور ادب کے قالب میں ڈھال کر دلکش اور اثر آفریں ضرور بنا دیا۔ لیکن یہ لوگ بھی دراصل زندگی سے گریز کر کے ادب کی سرزمین میں پناہ لینا چاہتے تھے۔ وہ اس آہ وزاری کے ذریعہ اپنے جذبات کی شدت کو ظاہر کر کے سکون حاصل کر لیتے تھے۔ اور کچھ کرنے کی ذمہ داری سے آزاد ہو جاتے تھے۔ وہ لوگ بھی جو اس ادب کے قدردان تھے جذبات کے اظہار کو عمل کا بدل قرار دیتے تھے کیونکہ یہ ادب اور شاعری عمل کی قوت کو کم کرتی ہے بڑھاتی نہیں۔ اس کی تہ میں یہ عقیدہ پنہاں ہے کہ فن کار ہمیشہ اپنے ماحول سے شکست کھاتا ہے اور زندگی کی عملی کشمکش میں شریک ہونے سے اس کی قوتِ تخیئل اور نظر کی رسائی کم ہو جاتی ہے۔

جو ادب اس نظریہ پر مبنی ہے وہ محض ادیب اور شاعر کے ذاتی جذبات اور احساسات کا نقشہ کھینچتا ہے اور اجتماعی زندگی سے بیگانہ ہوتا ہے۔ آپ بیتی بیان کرتا ہے، جگ بیتی سے سروکار نہیں رکھتا۔ ممکن ہے اس کے چاروں طرف نہایت زبردست سیاسی سماجی اور تمدنی تحریکیں دنیا کے نظام کو درہم و برہم کر رہی ہوں۔ لیکن وہ شعوری طور پر ان سے متاثر نہیں ہوتا اس کے اپنے چھوٹے سے دل کی خلش عالم انسانیت کے دکھ درد پر غالب آ جاتی ہے اور اس دل کے ٹوٹنے کی صدائیں (جس کو ممکن ہے کسی نہایت نااہل خیالی محبوب نے توڑا ہو!) تمام انسانی ہنگاموں کا شور غائب ہو جاتا ہے وہ اس نفیس اور آرام دہ اصول پر کاربند رہتا ہے کہ "ادب کو ادب کی خاطر" ہونا چاہیئے۔ اس کو زندگی کی آگ میں کودنے سے کیا کام؟ اقبال ایسے ہنروروں سے بھی بیزار ہے ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

اقبال کا نظریۂ ادب

اقبال کا نظریۂ ادب کیا ہے؟ اس کے نزدیک ادب اور زندگی کا کیا تعلق ہے؟ ادیب اور شاعر کو زندگی کی جدوجہد اور کشمکش میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس پر بحیثیت ایک ادیب کے کیا فرائض عاید ہوتے ہیں؟ اگر اس سوال کا جواب ادب کی مشکل اصطلاحوں میں دیا جائے تو وہ بہت لمبا اور گنجلک ہو جائے گا۔ اس لئے سیدھے سادھے الفاظ میں سُن لیجئے۔

بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے اور یہ رہا ہے کہ جب انسان زندگی کی کٹھن آزمائشوں اور تکلیفوں سے عاجز آجاتا ہے یا ہمت اور حوصلے کی کمی کی وجہ سے اُن کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتا تو وہ اپنے اصلی اور واقعی ماحول سے بھاگ کر ادب اور شاعری کے دامن میں پناہ لیتا ہے اور وہاں اپنے لئے جذبات اور خیالات کی ایک چھوٹی سی ستھری اور خوبصورت دنیا بسا لیتا ہے اور اس تمثیل کو حقیقت پر ترجیح دیتا ہے۔ اگر آپ دنیا کے ادب کا مطالعہ کریں تو ماننا پڑے گا کہ اکثر ادیبوں پر یہ تعریف پوری اترتی ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کی دنیا سے جہاں تک ممکن ہوتا ہے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ ان کے ملک میں آگ لگی ہو لیکن وہ روم کے شہنشاہ نیرو کی طرح بیٹھے بانسری بجاتے ہیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن کی شان میں اقبال نے خود کہا ہے ؎

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

ان میں سے بعض ایسے بھی ہوئے ہیں۔ جن کا دل زیادہ حسّاس تھا اور وہ گردوپیش کے حالات اور واقعات سے اثر لئے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن انہوں نے اس اثر کا اظہار محض آنسوؤں اور آہوں اور دنیا کی نااہلیت پر گریہ وزاری کی شکل میں کیا۔ البتہ انہوں نے ان جذبات کو شعر اور ادب کے قالب میں ڈھال کر دلکش اور اثر آفریں ضرور بنا دیا۔ لیکن یہ لوگ بھی دراصل زندگی سے گریز کر کے ادب کی سرزمین میں پناہ لینا چاہتے تھے۔ وہ اس آہ وزاری کے ذریعہ اپنے جذبات کی شدّت کو ظاہر کر کے سکون حاصل کر لیتے تھے اور کچھ کرنے کی ذمہ داری سے آزاد ہو جاتے تھے۔ وہ لوگ بھی جو اس ادب کے قدردان تھے جذبات کے اظہار کو عمل کا بدل قرار دیتے تھے کیونکہ یہ ادب اور شاعری عمل کی قوت کو کم کرتی ہے بڑھاتی نہیں۔ اس کی تہ میں یہ عقیدہ پنہاں ہے کہ فن کار ہمیشہ اپنے ماحول سے شکست کھاتا ہے اور زندگی کی عملی کشمکش میں شریک ہونے سے اس کی قوتِ تخیئل اور نظر کی رسائی کم ہو جاتی ہے۔

جو ادب اس نظریہ پر مبنی ہے وہ محض ادیب اور شاعر کے ذاتی جذبات اور احساسات کا نقشہ کھینچتا ہے اور اجتماعی زندگی سے بیگانہ ہوتا ہے۔ آپ بیتی بیان کرتا ہے، جگ بیتی سے سروکار نہیں رکھتا۔ ممکن ہے اس کے چاروں طرف نہایت زبردست سیاسی سماجی اور تمدّنی تحریکیں دنیا کے نظام کو درہم و برہم کر رہی ہوں۔ لیکن وہ شعوری طور پر ان سے متاثر نہیں ہوتا اس کے اپنے چھوٹے سے دل کی خلش عالم انسانیت کے دکھ درد پر غالب آجاتی ہے اور اس دل کے ٹوٹنے کی صدا میں (جس کو ممکن ہے کسی نہایت نااہل خیالی محبوب نے توڑا ہوا) تمام انسانی ہنگاموں کا شور غائب ہو جاتا ہے وہ اس نفیس اور آرام دہ اصول پر کاربند رہتا ہے کہ "ادب کو ادب کی خاطر" ہونا چاہیئے۔ اس کو زندگی کی آگ میں کودنے سے کیا کام؟ اقبال ایسے ہنروروں سے بھی بیزار ہے ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزا

بشکریۂ آل انڈیا ریڈیو

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

جہانتک موجودہ دور کا تعلق ہے حالی پہلا شاعر تھا جس نے جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر اردو شاعری کے دھارے کا رخ بالکل پلٹ دیا اور جو شاعری دور زوال میں شاعروں کے چھوٹے اور اوچھے جذبات کا کھیل بن کر رہ گئی تھی اس کو قومی زندگی کے عروج و زوال کا ترجمان بنا دیا۔ اقبال شاعری کے اسی نظریہ کا معترف ہے۔ وہ گریز کا مخالف ہے اور چاہتا ہے کہ شاعر اور ادیب بھی دوسرے زندہ انسانوں کی طرح زندگی کے پر آشوب سمندر میں تیرنا سیکھیں۔ یہ زندگی کبھی کڑوی ہے کبھی میٹھی۔ کبھی کامیابی اور فتح مندی سے ہم آغوش ہے اور کبھی ناکامی اور حسرت کا منہ دکھاتی ہے۔ لیکن انسان کی سیرت اسی کشمکش میں ڈھلتی ہے اور شاعر اور ادیب اسی آگ میں تپ کر کندن بن سکتے ہیں۔

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت
شریک سوز و ساز بحر و بر زی
تو ایں جنگ از کنار عرصہ بینی
بمیر اندر نبرد و زندہ تر زی

بہرحال اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ جو ادیب اس جنگ سے بھاگے گا وہ شاید ادب کو الفاظ کا کھیل بنا کے اپنا اور اپنے جیسے بے ہمت اپاہجوں کا دل بہلا لے۔ لیکن اس کی تحریر میں وہ قوت اور جوش اور خلوص نہیں پیدا ہو سکتا جو افراد اور اقوام کی تقدیر بدل دیتا ہے وہ ساحل کی سلامتی سے رزم خیر و شر کو دیکھتا ہے اور ساحل کے سنگریزوں سے کھیلتا ہے لیکن نہ طوفان کے تھپیڑے کھاتا ہے نہ اس کو موتی ہاتھ آتے ہیں۔ ادب اس وقت حیات آفریں بنتا ہے جب اس کے ہاتھ میں زندگی کی نبض ہو اور وہ انسان کے دل میں زندگی کے امکانات اور اس کے حسن و شوکت کا زیادہ گہرا احساس پیدا کرے۔ اقبال ہی کی زبان سے اس حقیقت کی تعبیر سنیئے:۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

لہذا وہ ادب میں بھی ضرب کلیمی کی شان پیدا کرنا چاہتا ہے جو انسانوں میں اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا ولولہ پیدا کر دے اور ان کی کھوئی ہوئی یا سوئی ہوئی خودی کو بیدار کر دے۔ اس کے نزدیک ادب اور تمام فنون لطیفہ کا اعلیٰ ترین مقصد خودی کا استحکام ہے جو ادب انسان کو اس کی خودی سے بیگانہ کرتا ہے اور تسخیر عالم کیلئے اس کو آمادہ نہیں کرتا وہ انفرادی اور قومی زندگی کیلئے ہلاکت کا پیغام ہے۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

مشرق کے شاعر کے اس بلند اور اہم فرض کا احساس کرتے ہوئے وہ اس کو ان الفاظ میں دعوت عمل دیتا ہے:۔

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس نے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے یا نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے

الیسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے
ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے!

اور پھر اقبال کا ادیب اور شاعر صرف اپنے ذاتی جذبات کی نمائش نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے کلام میں عالم انسانیت کا دل دھڑکتا ہے۔ وہ تمام قوتیں اور تحریکیں جو انسانوں کو بحیثیت انسان کے متاثر کرتی ہیں اور ان کی تقدیر کو بناتی یا بگاڑتی ہیں۔ اس کے دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں اور جب یہ "نغمہ" ادب خوردہ "عقل" بن کر نکلتا ہے تو انسانوں کیلئے شمع ہدایت بن جاتا ہے۔ اقبال کا اپنا کلام اس اصول کی ایک بہترین مثال ہے — کون سے اجتماعی مسائل تھے جن پر اقبال نے اپنی شاعری میں بحث نہیں کی؟ فلسفہ۔ سیاست۔ معاشرت۔ مذہب۔ تعلیم۔ سبھی اس کا میدان تھے۔ لیکن یہ اس کی شاعری کا اعجاز ہے کہ اس نے ان اہم اور دقیق مسائل کو شعر کے حسین قالب میں اس عمدگی سے ڈھالا کہ ان کی شعریت میں فرق نہ آیا...... تمام ادیبوں اور شاعروں کیلئے اس کا پیغام یہی ہے کہ وہ انسانیت کے بلند ترین مقاصد کی ترجمانی کریں اور ان کے حصول کیلئے جو جدوجہد جاری ہے اس میں علم برداری کے فرائض انجام دیں اور اپنی گوشہ نشینی اور آسائش پسندی کو چھوڑ کر اس عظیم الشان انسانی جہاد میں شریک ہوں۔

اے میان کیسہ ات نقد سخن
بر عیار زندگی خود را بزن
مدتے غلطیدۂ اندر حریر
خو بہ کرپاس درشتے ہم بگیر
مثل بلبل ذوق شیون تا کجا
در چمن زاران نشیمن تا کجا
اے ہما از یمن دامت ارجمند
آشیانے ساز بر کوہ بلند

"نئے ادب" اور "ترقی پسند" ادب کی جو مفید تحریک ہندوستان میں بڑھ رہی ہے۔ اس پر اقبال کا یہ احسان ہے کہ اس نے اپنے بعد آنے والے ادیبوں کی توجہ کو قومی اور اجتماعی مسائل کی طرف پھیرا تھا اور انہیں محض ذاتی جذبات اور مکروہات کے بند ھنوں سے نجات دلائی تھی۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض تنگ نظر یا ناسمجھ لوگ محض اس کے طرز بیان سے یا اس کی مذہبیت سے بدظن ہو کر اس بات کا اعتراف نہ کریں یا وہ اس بے لاگ تنقید اور محاکمہ سے جو قدیم اور جدید دونوں کو پرکھتا ہے چراغ پا ہوں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر حالی اور اقبال نے اردو شاعری اور ادب کو یہ نیا راستہ نہ دکھایا ہوتا تو جدید ادب کے یہ علم بردار نہ معلوم کن بھول بھلیوں میں گم ہوتے۔ محض دوسرے ملکوں کی تقلید سے راستہ پانا اور کوئی پائیدار کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ جب تک ہم اپنی خودی کے سوتوں کو تلاش نہ کریں اور ان کی قوت سے کام نہ لیں۔

میرے شرر میں بجلی کے جوہر
لیکن نیستان تیرا ہے نمناک!
تیرا زمانہ، تاثیر تیری
غافل نہیں یہ تاثیر افلاک!
کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منت تاک!
رکھتا ہے ابتک مے خانۂ شرق
وہ مے کہ جس سے روشن ہو ادراک
اہل نظر ہیں یورپ سے نومید
ان امتوں کے باطن نہیں پاک!

خواجہ غلام السیدین

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
اقبال

نغمۂ ندیم

سرشاریوں میں ہم سے سرزد ہوئیں خطائیں — تو دے اگر سہارا کیوں مست لڑکھڑائیں
یہ دلربا نظارے، یہ دلکشا فضائیں — دھندلے اُفق سے دی ہیں کس نے مجھے صدائیں
بے تاب ہیں اُمنگیں محجوب ہیں ادائیں — کب تک یہ پردہ داری، آؤ نقاب اُٹھائیں
لہرا رہی ہیں زُلفیں، چھٹنے لگیں گھٹائیں — آنسو ڈھلک رہے ہیں، تارے نہ ڈوب جائیں
اے کاش اسی نشے میں کٹ جائے زندگانی — ہم منتظر کھڑے ہیں، وہ آئیں یا نہ آئیں
کل رات دل میں جیسے اِک شوخ گنگنایا — دل سے اُٹھیں صدائیں۔ دل نے سنیں صدائیں
سر جھک رہا ہے میرا۔ دل رُک رہا ہے میرا — آئیں تو اب وہ آئیں ورنہ کبھی نہ آئیں
یہ بے سبب تڑپنا۔ بے بات بیٹھ جانا! — ہیں دل کی دھڑکنوں میں پنہاں تری ادائیں
اُف یہ طویل راتیں، یہ انتظار تیرا — مغرب کے پربتوں پر تارے نہ مسکرائیں
توبہ مری مسلّم۔ برحق مری عبادت — یہ سب سہی وہ مجھ کو اب بھی پلا نہ جائیں
ہو شش جہات میں تم، ہو کائنات میں تم — جب تم ہی تم ہو ہر سُو پھر ہم کہاں سمائیں

مانا کہ دینے والا ہے منتظر ہمارا
لیکن ندیم ہم نے مانگی نہیں دُعائیں

احمد ندیم قاسمی

غزالہ

"ہاں۔ مگر انسان اور جانور میں یہ فرق ہے کہ انسان خود اپنے بنائے ہوئے اصولوں کا پابند رہتا ہے۔ اور جانور اپنی جبلی تحریکات کے اشاروں پر چلتا ہے۔ وہ جانوریت سے اسی قدر نزدیک ہے جسقدر اپنی خواہشوں کا تابع ہوتا ہے۔"

میں نے معنی خیز نگاہوں سے سلیم اور غزآلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور یہ دیکھ کر مجھے ایک ناقابلِ بیان شیطانی مسرت حاصل ہو رہی تھی کہ میرے تیر نشانہ پر بیٹھ گئے۔ سلیم اور غزآلہ کی نگاہیں آنِ واحد کیلئے ملیں اور جھک گئیں۔ چہروں کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ یقیناً سمجھ گئے تھے کہ میرا روئے سخن انہیں کی طرف تھا۔

سلیم میرا عزیز ترین دوست تھا۔ مجھ کو اس سے اتنی ہی محبت تھی جتنی کسی کو اپنے حقیقی بھائی سے ہوتی ہے۔ لیکن جب سے وہ کلکتہ سے واپس آیا اور اپنے ساتھ اس فتنۂ روزگار غزآلہ کو لایا مجھے اس کو جلانے میں ایک خاص لذت محسوس ہوتی تھی۔ میں ہر ممکن موقع پر ان دونوں کو شرمندہ کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ میرے لئے ان کی ندامت آلود نگاہوں کا جھکنا اور رنگِ رخ کا اُڑنا دلچسپ ترین منظر تھا۔

غزآلہ کا اصلی نام جمیلہ تھا۔ لیکن غزالی آنکھوں اور پیکرِ رعنا کی رعایت سے سلیم اس کو غزالہ کہا کرتا تھا۔ وہ اس نام سے بہت خوش ہوتی تھی۔ اس خوشی سے محروم کرنے کیلئے میں ہمیشہ اس کو اس کے اصلی نام سے مخاطب کرتا تھا۔ اس کا قد لمبا اور نزاکت کے دلفریب رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آنکھیں آہوئے ختن کو شرمندہ کرتی تھیں۔ رفتار میں بلا کی محشر خیزی تھی۔ جب وہ اپنی لمبی سیاہ زُلفیں بکھرا کر چلتی تو دیکھنے والوں پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ لیکن مجھے اس کی رفتار سے بھی نفرت تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے حُسن کی بے پناہ جاذبیت پر مغرور ہے اور جان بوجھ کر اس طرح چلتی ہے تاکہ سلیم اس کے طلسم سے کبھی باہر نہ نکل سکے۔ وہ سلیم کی بے قراری اور والہانہ محبت دیکھ کر خوش ہوتی تھی اور میری طرف فاتحانہ انداز سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی۔ میں اس کی مسکراہٹ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ہم اس وقت سلیم کے خوشنما بنگلے میں سبزہ پر بیٹھے ہوئے چاء پی رہے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غزآلہ اس وقت باغ کے تمام پھولوں سے زیادہ دلفریب اور رنگین پھول معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے خاموشی کے ساتھ دل میں اس کا اقرار کیا لیکن ایک ناقابلِ بیان پر اسرار خلش دل میں خار بن کر چبھنے لگی۔ مجھے یہ سوچ سوچ کر غصہ آ رہا تھا کہ کسی نہ کسی طریقہ سے اُسے میرے اس اعتراف کا علم ہو گیا ہے۔ ورنہ جب اس نے چاء کی پیالی میری طرف بڑھائی، تو اس کی آنکھوں میں شرارت کے جلوے کیوں رقصاں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں ہنس رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر میں غصہ سے آگ بگولہ ہو گیا اور سلیم کے ایک سوال کا جواب مندرجہ بالا الفاظ میں دیکر بیک وقت دونوں سے انتقام لیا —— "اور عقلمند اور بے وقوف میں یہ فرق ہے"

سلیم نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد جواب دیا "کہ عقلمند دنیا میں خوشی اور مسرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ بے وقوف اپنی حماقت کے طلسم میں گرفتار رہتا ہے اور پھر اسے اصول کی پابندی کہتا ہے۔" "اور جن انگوروں تک نہیں پہنچ سکتا ان کو کھٹا کہتا ہے۔" غزآلہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

دونوں قہقہہ لگا کر ہنسے —— غزآلہ کی ہنسی! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدہا نقرئی گھنٹیوں کی آواز فضا پر چھا گئی ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی پسلیاں دبائے ہوئے تھی۔ آنکھوں سے ہنسی کے اشک جاری تھے۔ نازک جسم بل کھا رہا تھا۔

مجھے آج تک حیرت ہے کہ میں نے کیونکر ضبط کیا۔ کون سی ایسی قوت تھی جس نے مجھے اس کا گلا گھونٹ دینے سے باز رکھا۔ میں جوشِ غضب میں اس کو قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اور وہ میرا غصہ دیکھ کر اور زیادہ ہنس رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی پسلیاں دکھنے لگیں۔ آواز میں ضعف پیدا ہو گیا۔

"ہیں! ارشد صاحب آپ چاء پینا بھول گئے۔"

دفعۃً غزالہ نے ہنسی روک کر کہا۔ "اچھا ٹھہریئے دوسری پیالی بنائے دیتی ہوں۔"

"جی نہیں تکلیف نہ کیجئے۔" میں نے کہا "مجھے ٹھنڈی چاء پسند ہے۔"

"اچھا! یہ بھی شاید کوئی اصول ہو۔" اس نے کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

لیکن ساتھ ہی اس نے ناز کے ساتھ پیالی میرے ہاتھ سے چھین لی اور چاء بنانے لگی۔

"لیجئے۔ آج میری خاطر سے اپنا اصول توڑ دیجئے۔" اس نے مجھے چاء دیتے ہوئے کہا۔

غزالہ ہنس ہنس کر۔ مسکرا مسکرا کر شریر نظروں سے میری طرف دیکھ دیکھ کر۔ مجھ سے میری گستاخی کا انتقام لے رہی تھی۔ وہ باتیں کرنے میں اپنے باریک مرجانی ہونٹوں کو اور آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کو عجیب وغریب طریقہ پر حرکت دے رہی تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے کبھی کبھی میرے دست و بازو کو چھو بھی لیتی تھی اور جب میں اس حرکت پر ناراض ہو کر اس کی طرف دیکھتا تو قہقہہ لگا کر ہنس دیتی تھی۔

سلیم سبزہ پر نیم دراز یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں غزالہ کی ایک ایک ناشائستہ حرکت کی سزا دے سکتا تھا۔ وہ سلیم کے ساتھ بھاگ کر آئی تھی۔ اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کلکتہ میں اس کا ضعیف مگر دولتمند شوہر فالج میں مبتلا ہے۔ ایسی حالت میں طنز آمیز گفتگو سے اس کے دل کو زخمی کر دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن جوشِ غضب ہی نے میرے ہونٹوں پر مہر لگا دی تھی۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ بس میں یہی چاہتا تھا کہ اسے پکڑ کر دبا دوں۔ اس قدر سختی کے ساتھ کہ اس کا دم نکل جائے۔

میں ایک سنجیدہ۔ شریف اور خوش اخلاق انسان ہوں۔ کینہ پروری یا خواہ مخواہ کی دل آزاری میرا شیوہ نہیں۔ لیکن غزالہ نے میری دنیا ہی بدل دی۔ میرے اخلاق و عادات بدل دیئے۔ متذکرہ واقعات کے بعد مجھے غزالہ سے انتقام لینے کی ایک دھن سی ہو گئی تھی۔ سوتے جاگتے کسی وقت میرا ذہن اس کے خیال سے خالی نہ رہتا تھا۔ اس کی ایک ایک شرارت یاد آتی تھی اور میں تلملا تلملا کر رہ جاتا تھا۔ تنہائی میں اس سے انتقام لینے کیلئے اور اپنے دل کا غبار دھونے کیلئے میں نے کئی دفعہ "حسن اخلاق" پر مضامین لکھے اور خوب دل کھول کر ان لوگوں کو برا بھلا کہا جو گناہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

دوست احباب کے مجمع میں بھی میری بحث اور تقریر کا یہی موضوع ہوا کرتا تھا۔ ان کی ذرا ذرا سی لغزش کو بڑھا چڑھا کر مہیب ناک نتائج کی پیشگوئی کرنا میرا دستور ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اپنی پاکبازی اور خوش اخلاقی پر روشنی ڈالنے سے بھی نہ چوکتا تھا۔ غزالہ کے آنے سے پیشتر میرے دوست مجھ کو ایک رنگین خیال آزاد مزاج انسان سمجھتے تھے۔ لیکن اب میری اس ماہیت قلب کو دیکھ کر سب مجھے "مولانا" کہنے لگے۔ ان میں سے بعض تو واقعی میری عزت کرتے تھے اور میرے سامنے حسن و عشق کی داستانیں بیان کرنے سے پرہیز کرتے اور بعض میری پاکبازی کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن میں ان کے مذاق کا جواب صرف تحقیر آمیز تبسم سے دیا کرتا تھا۔

سلیم سے مجھ کو نفرت ہو گئی تھی۔ وہ ایک کمزور انسان تھا، ناپاک جذبات کی رو میں بہنے والا۔ جس کے ضمیر کی شمع گل ہو چکی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی میری تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔ اور نگاہوں سے نفرت برسنے لگتی تھی۔ میں بے چینی کے ساتھ اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب غزالہ اس کی دولت کو اڑانے کے بعد کسی دوسرے شکار کے ساتھ بھاگ جائیگی۔ یہ سوچ کر میں ایک فاتحانہ غرور اور تمکنت کے ساتھ اپنے کمرہ میں ٹہلنے لگتا تھا۔ میرا سر بلند اور سینہ چوڑا ہو جاتا تھا چنانچہ کئی دفعہ ایسے موقعوں پر میں نے وہ تقریر سوچی جس کے زہر آلود جملوں سے میں اس کے زخموں پر نمک پاشی کروں اور ثابت کروں کہ میں نے زندگی کا جو راستہ اختیار کر رکھا ہے وہی

صحیح ہے۔

انسان اپنے ضمیر کی سرزنش سے بچنے کیلئے اپنے عیوب سے چشم پوشی کرتا ہے اور ان کو ہنر ثابت کرنے کیلئے نت نئے دلائل سوچتا ہے۔ ضمیر کی آواز کمزور پڑ جانے کے بعد یہی دلائل اس کے عقائد بن جاتے ہیں۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ کبھی یہ سوچ کر کہ میں بلا وجہ سلیم کی بدخواہی کر رہا ہوں اور بلا وجہ سلیم اور غزالہ کی پر مسرت زندگی میں اپنی زہر آلود طنز سے تلخی پیدا کر دیتا ہوں۔ میں شرمندہ بھی ہوا کرتا۔ لیکن ایسے موقع پر ہمیشہ میں نے یہ سوچ کر اپنے ضمیر کو دھوکہ دے لیا کہ میری بدخواہی اور تلخ کلامی میری پاکیزہ روح کی پیدا کردہ ہے۔

سلیم کو غزالہ کے حسن و شباب کی فسوں سازیوں نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ نتائج سے بے خبر ہو کر دونوں ہاتھوں سے دولت لٹا رہا تھا۔ جائداد کا کچھ حصہ بیچا جا چکا تھا اور اخراجات بجائے گھٹنے کے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔

ایک روز غزالہ نے ٹیلیفون کر کے مجھے بلایا۔ ایک نئی کار خریدی گئی تھی۔ میں جس وقت پہنچا سلیم اور غزالہ بنگلے کے باہر اسی نئی کار کے قریب کھڑے تھے۔

"خوب آ گئے بھائی ارشد" سلیم نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "غزالہ کی چشم کرم آج تمہاری طرف مڑ گئی ہے۔ آج نئی کار میں تمہارے ہی ساتھ ہوا خوری کو جائے گی۔"

"میرے ساتھ!" میں نے لاپروائی کے ساتھ کہا "لیکن مجھے تو ایک بڑا ضروری کام ہے۔"

"کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔" غزالہ نے میرے قریب آ کر کہا "آپ کو میرے ساتھ ضرور چلنا ہوگا۔ ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھنے سے تو مجھ کو کوفت ہو جاتی ہے۔ مارے ڈر کے موٹر چلاتے ہی نہیں۔ بس نہیں کہ کسی ٹھیلہ کے پیچھے لگا لیں۔ آپ نڈر ہو کر چلاتے ہیں۔"

میرا دل سینے میں اچھلنے لگا...... نہ معلوم مجھے اتنی خوشی کیوں محسوس ہو رہی تھی جتنی نپولین کو اپنی فتوحات کے بعد بھی نہ ہوئی ہوگی۔ میں نے فاتحانہ انداز سے مسکرا کر سلیم کی طرف دیکھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی قلعہ کے بلند مینار پر سے کسی چھوٹے بچے کو دیکھ رہا ہوں...... وہ میری نگاہوں میں کس قدر چھوٹا معلوم ہو رہا تھا!۔

غزالہ امید و بیم کی حالت میں میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ وہ اس وقت ایک خوبصورت بچے کی طرح پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ انتہائی دلفریب اور بھولی! اُسے اس وقت ناامید کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہ تھی۔

"اگر سنا ہی نہ جائیگا تو عذر کرنا فضول ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تو چلئے گا نا؟" غزالہ نے پُرجوش لہجہ میں پوچھا۔

"چارہ ہی کیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک!" غزالہ نے بچوں کی طرح چیخکر کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کار کی طرف کھینچ لے گئی۔

"دیکھا۔ میں نے کہا تھا کہ ارشد صاحب میرا کہنا نہ ٹالیں گے" اس نے موٹر میں میرے قریب بیٹھکر سلیم سے کہا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ غزالہ کے اس جملہ نے مجھ پر کیا اثر کیا۔ دل خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ مگر ذہن میں غصہ کی تلخی پھیل رہی تھی۔ اسے کیوں یقین تھا کہ میں اس کی بات نہ ٹالوں گا؟ کیوں؟ میں سلیم کی طرح کمزور طبیعت کا انسان نہیں کہ ایک بے اصول عورت کے حسن سحر ساز کا غلام بن جاؤں۔ میرے لئے اس کی خوبصورتی بالکل بے حقیقت تھی۔ مجھے اس بات پر اور زیادہ غصہ آیا کہ باوجود میرے طعن و طنز کے آجتک غزالہ کو یہ یقین نہ آیا کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ بخلاف اس کے وہ مجھے بھی سلیم کی طرح اپنا بندہ بے دام سمجھتی تھی...... میں نے تہیہ کر لیا کہ آج غزالہ کی اس غلط فہمی کو دور کر کے رہوں گا۔ تاکہ اس کے غرور کا سر میری شخصیت کے آگے نیچا ہو جائے۔ میں اس کو شکست دینا چاہتا تھا۔

لیکن باوجود اس کے میں نے بلا ارادہ نتائج سے بے خبر، حادثات سے لاپروا اور قانون سے بے نیاز ہو کر موٹر کو پوری رفتار سے چلانا شروع کیا۔ ہر مرد پر خوبصورت عورت کی تعریف بجلی کا اثر کرتی ہے۔ وہ بڑے سے بڑے خطرہ کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن مجھ پر یہ اثر بہت زیادہ ہوا۔ ایک ناقابل بیان سی دیوانگی میرے اوپر طاری ہو گئی تھی۔ جیسے کسی پر شیطان سوار ہو۔ سڑک کی کنکریاں

اُڑ اُڑ کر ہمارے اوپر آ رہی تھیں۔ سڑک کے آئندو روند چیخ چیخ اٹھتے تھے اور بعض کی تو گالیاں بھی میرے کان تک پہنچیں۔ لیکن میں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ میں جان جان کر۔ دیدہ و دانستہ موٹر کو لئے ہوئے موت کے منہ میں چلا جاتا تھا اور بچکر نکل آتا تھا۔ کئی گاڑیوں سے موٹر لڑتے لڑتے بچ گئی۔ ہر دفعہ میں غزالہ کی طرف کنکھیوں سے دیکھ لیتا تھا اور دیکھنے کے بعد رفتار اور تیز کر دیتا تھا۔ شہر سے باہر نکل جانے کے بعد میں نے غزالہ کو اپنی مہارت دکھانے کیلئے موٹر کو صرف ایک ہاتھ سے چلانا شروع کیا۔ وہ سیٹ کے تکیہ سے لگی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور نیم وا ہونٹوں پر تبسم کی ہلکی ہلکی موجیں رقصاں تھیں۔ تیز ہوا کے پُر زور جھونکوں نے سیاہ گھنگرالی زلفوں کو بکھیر دیا تھا۔ آوارہ لٹیں سیاہ ناگنوں کی طرح لہراتی ہوئیں اُڑتی ہوئیں اس کے رخساروں سے لپٹی جا رہی تھیں۔ دو لٹوں کے درمیان رخسار کا ایک حصہ دمک رہا تھا۔ جس کی رنگت ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے سُرخ ہو گئی تھی۔

مجھے معلوم نہیں کہ کب میرا بایاں ہاتھ اُٹھا اور غزالہ کی کمر کے گرد لپٹ گیا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ میرے جسم میں بجلی کی ایک رو دوڑ گئی تھی۔ جس کی ناقابلِ برداشت تحریک سے مجبور ہو کر میں نے موٹر کی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹہ سے بڑھا کر ستّر میل کر دی۔

مجھے یقین تھا کہ غزالہ کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا ہو گا لیکن جب میں نے دیکھا تو اس نے آنکھیں کھول دی تھیں اور نہایت اطمینان کے ساتھ میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اُف اُن کا شرارت آمیز تبسم!! وہ میری خود فراموشی کا مضحکہ اڑا رہی تھیں۔ اور اس طرح ہنس رہی تھیں جس طرح کوئی ظالم اپنے شکست خوردہ مقابل کو اپنے قدموں پر لوٹتا ہوا دیکھ کر ہنستا ہے۔ میں نے غصّہ کے ساتھ اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ غزالہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"روک دیجئے اب ہم بہت دُور نکل آئے ہیں"، غزالہ نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

میں نے موٹر روک لیا۔

"اب آپ ادھر آ جائیے میں خود چلاؤں گی" اس نے کہا۔ جگہیں بدلنے کے بعد میں نے غزالہ کی طرف پیٹھ کر لی اور کھڑکی سے سر نکال کر جھانکنے لگا۔

"بس غرور کی یہی سزا ہے" میں نے دل میں سوچا اور خوش ہوا کہ میری اس بداخلاقی سے اس کو ضرور تکلیف ہو گی۔ لیکن میری خوشی کافور ہو گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ میرے وجود سے قطعی بے خبر ہو کر موٹر چلانے میں مصروف ہے۔ چند ہی منٹ کے اندر میرا غرور اور احساسِ برتری سب خاک میں مل گیا۔ غزالہ کی نازک کلائی کے ہلکے ہلکے جھٹکوں سے معلوم ہوتا تھا کہ موٹر میں جان بھر دی ہے۔ وہ اس کے اشاروں پر چل رہی تھی۔ خطروں سے خود بخود بچتی۔ ہوا میں اڑتی چلی جا رہی تھی۔

میرے غصّہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ . . . . . یہ سب محض بہانہ تھا۔ پہلے میری تعریف کر کے مجھے ساتھ آنے پر آمادہ کیا اور پھر خود مقابلہ کر کے مجھے زک دی۔ یہ سب اس نے سوچ کر کیا تھا۔ محض مجھ کو شرمندہ کرنے کیلئے اور وہ بے وقوف سلیم بھی اس میں شریک تھا! دغاباز ——— میرا خون کھول رہا تھا۔ چہرہ کی رگیں جوشِ غضب سے پھول پھول کر اُبھر آئی تھیں اور وہ بے رحم مجھ کو کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ انتہا یہیں پر نہ ہوئی بلکہ جب ہم بنگلہ کے قریب پہنچے تو سلیم اپنے باغیچہ میں ٹہل رہا تھا۔ غزالہ نے یک بیک موٹر روک دیا اور اُتر کر آہوئے رم خوردہ کی طرح چھلانگیں بھرتی ہوئی اس کی طرف دوڑ گئی۔ اطاعت شعار شوفر کی طرح مجھ کو موٹر کار پھاٹک تک لے جانا پڑی شاید اس توہین کے بعد میں کبھی بھول کر بھی ان کے مکان کی طرف رُخ نہ کرتا۔ لیکن غزالہ یہ بھی نہ چاہتی تھی۔ اس لئے مجھ کو بصد اصرار چاء کیلئے روک لیا۔

چار روز تک میں سلیم کے پاس نہ گیا۔ اس نے کئی مرتبہ ٹیلیفون پر اور آدمی بھیج بھیج کر مجھ کو بلایا۔ لیکن میں کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دیتا۔ میں اپنی رائے میں غزالہ سے انتقام لے رہا تھا اور اس کو یہ یقین کرانا چاہتا تھا کہ مجھ پر اس کے سحر ساز حُسن کا کوئی اثر نہیں ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس یقین سے اس کے غرور کو ٹھیس لگے گی۔ لیکن پانچویں روز میرے خیالات میں تذبذب پیدا ہو گیا۔ دل بار بار چاہتا تھا کہ جاؤں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ میری ہنگامی خود فراموشی کا (جب میں نے غزالہ کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا تھا) اس پر کیا اثر ہوا۔ چنانچہ کئی دفعہ جانے اور نہ جانے

کا فیصلہ کرنے کے بعد بالآخر سہ پہر کے وقت میں وہاں چلا گیا۔

حسبِ معمول سلیم اور غزالہ باغیچہ کے سبزہ پر بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔

"بھئی واہ مان گیا" سلیم نے مجھے دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہوئے غزالہ سے کہا۔ "شاید تمہیں علمِ غیب میں بھی دخل ہے۔ تمہاری ہی بات سچی ہوئی۔"

"کیا ہوا؟" میں نے صاحب سلامت کے بعد سلیم کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی چند منٹ ہوئے غزالہ نے کہا تھا کہ آج تم ضرور آؤ گے۔"

میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ غزالہ کو پورے وثوق کے ساتھ یقین تھا کہ میں بغیر اس کو دیکھے ہوئے زندہ نہیں رہ سکتا۔ کم از کم اس کے فاتحانہ تبسم سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

"تو... تو پھر انہیں علمِ غیب ضرور آتا ہے۔" میں نے غصّہ کو ضبط کر کے کہا "اس لئے کہ آج بھی آنے کا میرا ارادہ نہیں تھا۔ کمشنر صاحب سے مل کر جا رہا تھا۔ ادھر سے جو گزرا تو کہا لاؤ یہاں سے بھی ہوتا چلوں۔"

"سلیم کی طرح آپ کا ارادہ بھی کمزور رہا کرتا ہے" غزالہ نے کہا اور قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں اس نے ایک پھول توڑ کر میرے کوٹ میں لگا دیا۔

"لیجئے یہ ارادہ بدلنے کا انعام ہے۔" اس نے کہا اور ہنسنے لگی۔

چائے پینے کے بعد سلیم اپنے وکیل سے ملنے چلا گیا۔ میں غزالہ کے ساتھ تنہا رہ گیا۔

"اندر چل کر بیٹھئے گا یا اور کچھ دیر یہاں رہئے گا؟" غزالہ نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے تو اب اجازت دیجئے ذرا کام ہے۔" میں نے کہا۔ میری آواز میں خود بخود نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ دل کی کدورتیں دھلی جا رہی تھیں اور ایک عجیب ناقابلِ بیان سی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے کسی نشہ آور چیز نے جسم کی ساری طاقت سلب کر لی ہو۔ غزالہ مجھ سے کم از کم چار پانچ فٹ کے فاصلہ پر لیٹی ہوئی تھی۔ کہنی زمین پر ٹیکے اور سر کو ہاتھ پر بلند کئے ہوئے۔ اس کے لیٹنے کا انداز کچھ عجیب دلفریب تھا۔

"دیکھئے ارشد صاحب" اس نے بھویں سکیڑ کر کہا "اب آپ بہت زیادہ بننے لگے ہیں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ آپ کو کوئی کام نہیں ہے۔"

غزالہ کے غرور کو ٹھیس لگانے کی خواہش داستانِ پارینہ بن چکی تھی؛

"نہیں سچ۔ جانے دیجئے۔ مجھے بہت ضروری کام ہے۔"

"جی نہیں۔ آپ نہیں جا سکتے، لائیے ایک سگریٹ پلائیے"

میں نے اس کو سگریٹ دیکر دیا سلائی جلائی۔ وہ اٹھ بیٹھی اور میرے قریب آ گئی۔ اسقدر قریب کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ سگریٹ جلاتے وقت میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"آپ کبھی کلکتہ نہیں گئے؟" غزالہ نے دفعتہً مہرِ سکوت کو توڑ کر پوچھا۔

"ہاں۔ کئی دفعہ" میں نے جواب دیا "لیکن سلیم کی طرح مجھ پر بنگال کے جادو کا اثر نہیں ہوا۔"

اگر ممکن ہوتا تو میں پیٹھ ٹھونک کر خود ہی اپنے آپ کو شاباش دیتا۔ آخر اشاروں اشاروں میں میں نے وہ کہہ دیا جو کہنا چاہتا تھا۔ لیکن بظاہر میرے جواب سے غزالہ کے غرور کو ٹھیس نہ لگی۔ اس لئے کہ وہ ہنس رہی تھی۔

"جادو کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔" اس نے کہا "کوئی فوراً اثر کرتا ہے۔ کوئی رفتہ رفتہ۔"

"لیکن مجھ پر اثر ہو ہی نہیں سکتا۔ یقین کیجئے۔"

غزالہ نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ کچھ دل ہی دل میں سوچ کر مسکراتی رہی۔

اس کی مسکراہٹ میرے لئے ایک کھلا ہوا چیلنج تھی۔ اور میرے دعوے کو باطل ثابت کر رہی تھی۔ شائد اس وقت اسکی نظروں میں وہ منظر پھر رہا تھا جب موٹر پر بیخود اور مدہوش ہو کر میں نے اس کی کمر کے گرد اپنا ہاتھ حمائل کر دیا تھا — یہ خیال آتے ہی میرا دل بیٹھ گیا۔

"ارشد صاحب کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ آپ کو مجھ سے کیوں اتنی ضد ہے۔" اس نے پوچھا۔

دفعتہً غزالہ کی حالت میں نمایاں تغیر پیدا ہو گیا تھا ۔ شوخی ۔ شرارت اور بے فکری کے تمام علامات دور ہو گئے تھے ۔ نگاہوں میں شکایت کی ایک دنیا پنہاں تھی ۔ اور اگر میں نے دھوکہ نہیں کھایا تو اس کی آنکھیں پرنم تھیں ۔ اس سے پہلے میں نے اس غمگین حالت میں اسے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ مجھ کو یہ اندازہ تھا کہ یہ حالت اس میں کسقدر بے پناہ جذب پیدا کر دیتی ہے ۔

"مگر غور کرنے پر بھی یاد نہیں آتا کہ میں نے کبھی آپ کو ناراض ہونے کا موقع دیا ہو ۔" وہ آہستہ آہستہ ایسے لہجہ میں کہہ رہی تھی جیسے کوئی خود اپنے دل سے باتیں کر رہا ہو۔" میں جانتی ہوں کہ میں ایک کمزور اور گناہگار عورت ہوں۔ جس نے اپنے ازدواجی فرائض کو بھلا دیا ـــــ لیکن کسی کو کیا معلوم کہ یہ ازدواجی زندگی کیسی تھی . . . . . . میرے ماں باپ نے دولت کے لالچ میں ایک دائمی مریض بڈھے کے ساتھ میری زندگی وابستہ کر دی تھی ۔ جس کا ایک ایک پیسہ پر دم نکلتا تھا ۔ لاکھوں روپیہ کی آمدنی ہونے کے باوجود گھر میں صرف ایک ماما نوکر تھی ۔ باقی کام سب مجھ کو خود کرنا پڑتا تھا ۔ اس پر طرہ یہ کہ اس جانفروشی کے انعام میں صرف جھڑکیاں ملتی تھیں ۔ چار بجے صبح سے آدھی آدھی رات تک مجھے کمر سیدھی کرنے کی مہلت نہ ملتی تھی ۔ لیکن کبھی بھول کر بھی انہوں نے پسندیدگی کا اظہار نہ کیا ۔ ہر وقت غصہ ـــ گھرکیاں ۔ طعنے اور تلخ کلامی ، پھر بھی خوشی خوشی ان تمام تکلیفوں کو برداشت کر لیتی اگر کبھی کبھی میری روح کی تشنگی بھی بجھتی رہتی ۔ کبھی محبت اور نرمی کا سلوک بھی کرتے . . . . . ."

اب غزالہ کی آنکھوں سے سیل اشک جاری ہو گیا تھا ـ وہ سسکیاں لے لے کر بدقت بول رہی تھی ۔

"یہی نہیں بلکہ وہ ہر وقت مجھ پر شبہ کی نگاہیں ڈالا کرتے تھے ـــ میں جدھر جاتی تھی ۔ اُن کی نگاہیں جاسوسوں کی طرح میرے پیچھے لگی رہتی تھیں ۔ جب ذرا میں آنکھوں سے دور ہوئی بس . . . . فوراً چلا چلا کر پکارنا شروع کر دیا اور میرے آنے پر صاف صاف الفاظ میں ایسی ایسی شرمناک باتیں کہیں کہ شاید کوئی اپنی زرخرید کنیز کو بھی نہ کہتا ہو ۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ یہ زندگی کوئی کیونکر برداشت کر سکتا تھا اور کب تک ؟ میں ان سے ڈرنے لگی تھی ۔ میں انہیں دیکھ کر کانپ جاتی تھی ۔

اتنا کہہ کر غزالہ اپنی اشک آلود آنکھیں اٹھا کر میری طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھنے لگی ۔ وہ میرے جواب کی منتظر تھی ۔

جذبات کے جوشِ فراواں نے مجھ کو کچھ کہنے کی اجازت نہ دی ۔ ایک بیخودی سی چھائی جا رہی تھی ۔ دل دھڑک رہا تھا ۔ غزالہ نے اب آنکھیں بند کر کے گردن جھکالی تھی ۔ آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے ۔ میں گذشتہ تمام باتیں بھول چکا تھا ۔ صرف یہ احساس باقی تھا کہ ایک بے بس اور لاچار عورت ۔ زمانہ کے ہاتھوں ستائی ہوئی ۔ گردشِ روزگار کے طرح طرح کے مظالم سے تنگ ۔ میری پناہ ڈھونڈھ رہی تھی ۔ مجھ سے مدد مانگ رہی تھی ۔ میں نے بے خودی میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چاہا کہ محبت اور ہمدردی کی باتوں سے اس کو خوش کروں ۔ اس کے آنسوؤں کے طوفان کو روکوں ۔ لیکن زبان کانپ کر رہ گئی ۔

"غزالہ!" میں نے بمشکل کہا اور اس کا ہاتھ زور سے دبا دیا ۔

اس نے جواب میں میری طرف اپنی بڑی بڑی اشک آلود آنکھوں سے دیکھا ۔ صرف ایک نظر ـ لیکن اف خدا کی پناہ !! وہ نظر کیا تھی ایک بجلی تھی جو کوندی اور کوند کر میرے دل میں اُتر گئی ۔ اس ایک نظر نے غزالہ کی حزنیہ داستانِ زندگی دہرا دی اور میری گذشتہ بے التفاتی اور مخالفت کی شکایت کی ۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ مجھ کو معلوم نہیں ۔ صرف اتنا یاد ہے کہ میں جذبات سے گرانبار آواز میں اس کو تسکین دے رہا تھا اور کبھی نہ فنا ہونے والی ـ والہانہ محبت اور پرستاری کی داستاں سنا رہا تھا ـــ بے خود اور بے ہوش ۔ ماحول سے بے خبر ۔ دنیا اور مافیہا سے بے نیاز ۔ ماضی و مستقبل سے لاپروا ـــ غزالہ کا سر میرے شانہ پر تھا اور میرا بازو اس کے گرد ۔ وہ اب بھی رو رہی تھی ۔ لیکن خوشی اور اطمینان کے ساتھ ۔ ایک معصوم بچہ کی طرح ۔ کئی منٹ اسی حالت میں گزر گئے ۔

"ہٹیئے! بڑے وہ ہیں آپ" غزالہ نے دفعتہً الگ ہو کر کہا اور مسکرانے لگی ۔ "خواہ مخواہ مجھے رُلا دیا ۔ یہ اسنے زخم

ہرے کر دئے۔"

آخری جملے نے پھر اس کے حسین چہرہ پر اداسی اور غمگینی کی کیفیت پیدا کر دی۔ لیکن اچانک نہ معلوم کیا سوچ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

آہ! ان فسوں ساز آنکھوں کی طنز آمیز ہنسی۔ ان کی شرارت! دل چاہتا تھا کہ زمین شق ہو اور میں اس میں سما جاؤں۔ وہ میری شکست پہ ہنس رہی تھی۔ میرے غرور و نخوت کا سر جھکا کر خوش ہو رہی تھی ——— لیکن حیرت ہے کہ حسبِ معمول مجھے غصہ نہ آیا۔ بخلاف اس کے مجھے دیوانگیٔ شوق نے بے خود کر دیا۔ اسی ہنگامہ خیز لمحہ کے اندر پہلے پہل مجھے یہ علم ہوا کہ میں بغیر اس کے زندہ نہیں رہ سکتا۔

غزالہ ہنستی ہوئی کھڑی ہو گئی اور میں بھی اس کے ساتھ اس طرح کھڑا ہو گیا گویا اس کے ساتھ کسی غیر مرئی زنجیر سے وابستہ تھا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ شام کے تاریک سائے باغ کے اشجار اور بلند دیواروں سے اتر کر سبزہ پر پھیل رہے تھے اور خوفناک اژدھوں کی طرح پھولوں کی کیاریوں پر لوٹ رہے تھے۔ ہوا بالکل ساکت تھی۔ تاروں کی چھاؤں نے تاریکی میں ایک عجیب پُر کیف اور دلفریب نور سمو دیا تھا۔ فضا میں بسی ہوئی خاموشی اپنی صدہا نہ دکھائی دینے والی زبانوں سے عجیب و غریب رومانی۔ پراسرار اور نشاط انگیز پیغامات سنا رہی تھی اور دل کے نہاں خانہ میں چھپے ہوئے فتنوں کو گدگدا کر جگا رہی تھی۔ اس رومان پرور ماحول میں غزالہ اپنی بے پناہ رعنائیوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ لمبا۔ چھریرہ اور دلفریب نزاکت میں ڈوبا ہوا جسم، زرد رنگ کی ریشمی ساڑی اور سیاہ مخملی جمپر میں ملبوس۔ کانوں میں چمکدار سفید بندے۔ کلائیوں میں دو دو باریک سیاہ چوڑیاں بس یہ اس کی آرائش تھی۔ لیکن پناہ بخدا کس قدر جاذبیت میں ڈوبی ہوئی۔ اس نے میری بیخود۔ بے حجاب اور مشتاق نگاہوں کی بے قراری دیکھی اور دیکھ کر مسکرا دی۔ میں بے چین ہو گیا۔ تلملا اٹھا۔

"غزالہ!" میں نے گرانبار آواز میں کہا۔" ہماری موجودہ حالت اب زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی۔ تمہیں کوئی قطعی فیصلہ کرنا ہوگا۔"

"مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ اچھا خدا حافظ۔"

رخصت ہوتے وقت غزالہ کی سحر ساز آنکھوں نے نظروں ہی نظروں میں کچھ ایسی بات کہہ دی کہ میرے دل میں مسرت کا ایک طوفان موجیں مارنے لگا۔ اگر وہ آگے نہ بڑھ گئی ہوتی تو معلوم نہیں اظہار امتنان میں میں کیا کرتا۔ اس کے قدموں پر گر پڑتا یا اس کے سامنے سجدۂ شکر ادا کرتا۔ مجھے بھول کر بھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ مسرت سلیم کے ساتھ بے وفائی کا اعلان ہے یا میری شکست اور میری پاکبازیوں کا نوحہ!

اب مجھے کچھ زیادہ بیان کرنا باقی نہیں ہے۔ سلیم کے سر سے پانی اونچا ہو چکا تھا۔ آبائی جائیداد کوڑیوں کے دام بک چکی تھی۔ قرض خواہوں نے دعوے کرنا شروع کر دئے تھے۔ آخر وہ ایک روز لاپتہ ہو گیا۔

غزالہ نے ٹیلیفون پر مجھ کو بلایا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" میں نے امید و بیم کی حالت میں پوچھا۔

"ابھی تو صرف یہ طے کیا ہے کہ کلکتہ واپس جاؤں گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا یہ نہیں معلوم۔" اس نے سنجیدہ لہجہ میں جواب دیا۔

"غزالہ!" میرے منہ سے نکلا اور زبان کانپ کر رہ گئی۔

"مجھے معلوم ہے آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" اس نے کہا۔" اور بہت خوش ہوں، لیکن سلیم کی طرح آپ کو بھی برباد ہوتے دیکھوں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مجھ کو جانے دیجئے۔"

"نہیں غزالہ۔ میری جائداد اتنی ہے کہ ہم تم دونوں مل کر بھی اس کو ختم نہ کر سکیں گے۔ یہاں سے دور کشمیر کے کسی پُرفضا مقام پر ہم اور تم ایک خوشنما بنگلہ لے کر رہیں گے۔ سواری کے لئے گھوڑے اور کشتیاں ہونگی۔ فکر اور دنیاوی آلائشوں سے پاک روحوں کی طرح ہم تم۔ محبت کے گیت گاتے۔ دلکشا باغات اور بہشت نظیر مرغزاروں میں گھومتے پھریں گے اور جب دل گھبرائے گا تو کچھ دنوں کیلئے کسی بڑے شہر میں چلے جائینگے۔

"افسوس ہم ایسا نہیں کر سکتے۔" غزالہ نے کہا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ ہم ایسا کرنے سے اپنے بنائے ہوئے اصولوں کو توڑ کر جانوریت سے نزدیک ہو جائیں گے۔" غزالہ نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"ارشد" اس نے دفعتاً میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔ "میں پہلے ہی جانتی تھی کہ تمہاری نفرت دراصل محبت ہی کی ایک انوکھی نمود ہے۔ تمہارا غصہ رشک کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی جان کر میں مطمئن تھی۔"

"تو کیا تم نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ سلیم کی بربادی کے بعد میرا نمبر ہوگا۔"

"پہلے ہی نہیں، بلکہ اسی دن جب میں نے تم کو پہلے پہل دیکھا تھا۔"

بے وفائی اور خود غرضی کی کیسی بدترین مثال! لیکن اس آخری جملہ کو سن کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ یہ سلیم کے خلاف میری شاندار کامیابی تھی۔ جوشِ مسرت سے بے خود ہو کر میں نے غزالہ کو اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا اور کانپتے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست کر دئے۔

"غزالہ!" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پکارا۔

"ارشد!" غزالہ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور ہم دونوں محبت کے طوفانی موجوں پر بہنے لگے۔

شبیر حسین رضوی بی۔اے
(لکھنؤ)

آرزو

اک روز یہ ویرانۂ دل آ کے بسائیں
یا اُن سے یہ کہہ دو کہ ہمیں یاد نہ آئیں
ہے دل کی تمنّا کہ یہاں وہ کبھی آئیں
افسانۂ غم ہم انہیں رو رو کے سنائیں
افسوس! نہ روشن ہوئی امید کی دنیا
کیا کیا نہ شبِ ہجر میں مانگی ہیں دعائیں
شاید کسی بے کس کا ہوا خونِ تمنّا
آئی ہیں کچھ اس سمت سے ناساز صدائیں
ہیں باعثِ آبادیٔ دل تیرے ستم بھی
زندہ کئے دیتی ہیں مجھے تیری جفائیں
بنیادِ شکستہ پہ ہو مینا نے کی تعمیر
پھر ٹوٹا ہوا شیشۂ دل ڈھونڈ کے لائیں
اب کیوں انہیں منظور رہا پردے میں رہنا
یہ کس نے کہا تھا کہ وہ نظروں میں سمائیں
ہم محوِ تصوّر ہوئے بیٹھے ہیں نسیم آج
گر وہ بھی یہاں آئیں تو کہہ دو کہ نہ آئیں

نسیم ایم۔اے

بعثتِ خیر الوریٰ

(یعنی ظہورِ قدسی پر وہ دلچسپ نظم جو ۱۳ مئی ۱۹۳۸ء دہلی ریڈیو سٹیشن سے براڈ کاسٹ کی گئی)

اے تیری تشریف آوری لطفِ الٰہی کا سبب
وے تیری نصفت پروری عالم پناہی کا سبب

اے تیرے فیضِ عام کی کل انس و جاں پر بارشیں
وے تیرے لطفِ تام کی سارے جہاں پر بارشیں

انصاف و عدل و داد کو ارزاں سے ارزاں کر دیا
دہرِ فساد آباد کو امن و اماں سے بھر دیا

اسلام کے انوار سے دُنیا کو روشن کر دیا
اکرام کی تکرار سے صحرا کو گلشن کر دیا

وحدت کے دیپک راگ سے دل تا جگر گرما دیا
عشقِ خدا کی آگ سے سر تا بسر گرما دیا

باطل پرست آفاق کو حق کا شناسا کر دیا
انسان کے اخلاق کو بالا سے بالا کر دیا

کثرت پسند اقوام کو وحدت پہ فائز کر دیا
تقدیرِ خاص و عام کو رفعت پہ فائز کر دیا

پیغامِ ربِّ انس و جاں تا انس و جاں پہنچا دیا
اعلامِ نفعِ ایں و آں تا ایں و آں پہنچا دیا

ساز "ہو الحق" چھیڑ کر ساز "انا" رُکوا دیا
ہر بندۂ سرکش کا سر پیشِ خدا جھکوا دیا

ہر سمت سطحِ ارض پر حق کی بنائیں ڈال دیں
کل اُس کے طول و عرض پر حق کی بنائیں ڈال دیں

دنیا کے حق میں دین کو آساں سے آساں کر دیا
مذہب کے سخت آئین کو آساں سے آساں کر دیا

ہر بندۂ اللہ کو اللہ تک پہنچا دیا
ہر راہرو، ہر راہ کو اللہ تک پہنچا دیا

ہر جادۂ بیداد کو مسدود کر کے دم لیا
ہر صورت الحاد کو نابود کر کے دم لیا

مغرور سرکش ہستیاں بے جان کر ڈالی گئیں
فرعونیت کی بستیاں ویران کر ڈالی گئیں

سب بیہودہ، بے جا حرکتیں انساں سے چھڑوا دی گئیں
باطل پرستی کی لتیں دوراں سے چھڑوا دی گئیں

کل بے خبر افراد کو حق کی خبر دے دی گئی
ہر کورِ مادر زاد کو چشم و نظر دے دی گئی

ہر دل میں شمعِ طور کی اک ضو سی دوڑا دی گئی
ہر سمت حسن و نور کی اک رَو سی دوڑا دی گئی

تفریقِ اقوامِ جہاں یکسر مٹا ڈالی گئی
تمیزِ نسلِ این و آں گھر گھر مٹا ڈالی گئی

ہر شخص کو ہر حال میں آزادیاں دے دی گئیں
اقوال میں، اعمال میں آزادیاں دے دی گئیں

علم و حلم کی جستجو فرضِ بشر کر دی گئی
دانائیوں کی آرزو محبوب تر کر دی گئی

خورشیدِ وحدت کی ضیا ہر سمت پھیلا دی گئی
تہذیب حکمت انتما ہر سمت پھیلا دی گئی

دنیا میں تعلیمِ ہُدا تا دُور پہنچا دی گئی
عالم میں آوازِ خدا تا دور پہنچا دی گئی

لطف و کرم کی کُو بہ کُو لہریں رواں کر دی گئیں
فیضِ اتم کی چار سو نہریں رواں کر دی گئیں

دریا کے دریا کاٹ کر خشکی میں لا ڈالے گئے
قلزم کے قلزم پاٹ کر خشکی بنا ڈالے گئے

کون و مکاں کی نعمتیں مقسوم فرما دی گئیں
دونوں جہاں کی وسعتیں محکوم فرما دی گئیں

کل قوم کو بیتاب سے بیتاب جانیں بخش دیں
کیخسرو دارا سے وہ چند شانیں بخش دیں

جامِ مئے وحدت اثر پینے کے قابل کر دیا
مرنے کی لذت بخش کر جینے کے قابل کر دیا

سعیٔ رفاہِ عام کو اتمام تک پہنچا دیا
انسانیت کے کام کو انجام تک پہنچا دیا

اے سرورِ کون و مکاں! کون و مکاں تجھ پر فدا
اے رہبرِ ہر دو جہاں! دونوں جہاں تجھ پر فدا

اے سیدِ جن و بشر! خوش آمدی، خوش آمدی
اے احمدِ والا گہر! خوش آمدی، خوش آمدی

اے مہبطِ روح الامیں! اہلاً و سہلاً، مرحبا
اے رحمۃٌ للعالمیں! اہلاً و سہلاً، مرحبا

اے مرسلِ آخر زماں! لاکھوں تحیات و سلام
اے افضلِ پیغمبراں! لاکھوں تحیات و سلام

اے داعیٔ ربّ العلا! صلّے علٰے، صلّے علٰے
اے داعیٔ خلقِ خدا! صلّے علٰے، صلّے علٰے

حکیم آزاد انصاری
(حیدرآباد دکن)

نواب صاحب

نواب رحمت اللہ خاں ہمارے صوبہ کے مشہور رئیس ہیں - خدا کا دیا سب کچھ ہے - خیر آباد کے ضلع میں سینکڑوں گاؤں ان کی ملکیت ہیں - نواب کا ذاتی خطاب ملا ہوا ہے - راج دربار میں عزت کے مالک ہیں - پچھلے سال خان بہادر بنائے گئے تھے - اب "سر" کی "امیدواری" ہے - ہمارے علاقہ میں ان کی ٹکر کا کوئی زمیندار نہیں - نواب صاحب جس ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہے ہیں - وہ بعض عام والیانِ ریاست کیلئے بھی باعثِ رشک ہو سکتا ہے -

لیکن نواب صاحب محض نواب صاحب ہی ہیں - آج کل کے نوابوں کا خیال ہے کہ دولت اور علم ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے - بالکل یہی عقیدہ ہمارے نواب رحمت اللہ خاں صاحب کا ہے - یہ جتنے بڑے امیر ہیں اس سے زیادہ علم سے کورے واقع ہوئے ہیں - یوں تو ماشاء اللہ اسمبلی کے رکن بھی ہیں - لیکن قابلیت کا یہ عالم ہے کہ انگریزی یا اردو میں تقریر کرنا تو کجا ان کیلئے انگریزی یا اردو تقریر کا سمجھنا بھی محال ہے - اس لئے اپنا حقہ ہمیشہ اسمبلی کے اجلاس میں ساتھ لے جاتے ہیں - ادھر اسمبلی کے قابل ارکان دھواں دھار تقاریر میں مشغول ہوتے ہیں - اُدھر نواب صاحب "لگا رہے دھوئیں کی اٹاری چلا جا" کی عملی شرح فرما رہے ہوتے ہیں - آپ علاقہ کی خوش قسمتی یا بد قسمتی سے پرانی کونسل کے رکن بھی تھے - لیکن ان کی شرافت اور معصومیت کا یہ عالم تھا کہ سال بھر میں ایک مرتبہ بھی زبان نہ کھولتے تھے اور شریف آدمی کا اصول بھی یہی ہونا چاہیئے - جب اتنے پڑھے لکھے - قانون دان اور ماہرینِ آئین و سیاست بال کی کھال نکالنے کو موجود ہیں - تو نواب صاحب کو کیا پڑی ہے کہ حقہ کی نے کو منہ سے نکالیں اور مفت میں اسمبلی کے ایوان میں موتی بکھیرتے پھریں؟ ملک و ملت پر ان کا یہی احسان کیا کچھ کم ہے کہ وہ اجلاس میں تشریف لے آتے ہیں - اور صوفے پر بیٹھے بیٹھے حقہ پینے کے علاوہ کبھی کبھی مقررین کی طرف بھی دیکھ لیتے ہیں کہ وہ اتنا گلا کیوں پھاڑ رہے ہیں؟ کبھی کبھی کا لفظ ہم نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ نواب صاحب عام طور صوفے پر "پڑے پڑے" اونگھا ہی کرتے ہیں اور ایسی مبارک گھڑیاں شاذو نادر ہی آتی ہیں - جب وہ کسی خوش قسمت مقرر کی طرف متوجہ ہوئے ہوں - لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ نواب صاحب اسمبلی کے ایوان میں جا کر صرف حقہ ہی پیتے رہتے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتے - جب رائے شماری کا وقت آتا تھا تو کونسل کے دنوں میں نواب صاحب اس زریں اصول پر عمل پیرا ہوا کرتے تھے - "جدھر صاحب کا ہاتھ ادھر میرا ہاتھ" - نئے آئین نے ایوان کو صاحب بہادر کے وجودِ مسعود سے محروم کر دیا ہے - اس لئے اب ہمارے نواب صاحب وزیر اعظم کی طرف تکتے رہتے ہیں اور جدھر ان کا اشارہ ہو ادھر ہی ہاتھ اُٹھا دیتے ہیں - اب آپ ہی انصاف فرمائیے یہ نواب صاحب کا کتنا بڑا کارنامہ ہے - ان کی ملک و ملت سے محبت اور ہمدردی واقعی قابلِ داد ہے - کیونکہ اگر ان میں خدمتِ خلق اور حبِ وطن کا جذبہ نہ ہوتا تو وہ خیر آباد سے صرف "ہاتھ اٹھانے" کیلئے لاہور کے صعوبت زا سفر کی زحمت کیوں برداشت کرتے؟

سچی بات تو یہ ہے کہ شریف آدمی کو قانونی موشگافیوں سے کوئی تعلق بھی نہیں ہونا چاہیئے - اسمبلی کے رکن کو بال کی کھال نکالنے سے کیا واسطہ؟ ہمارے نواب صاحب کے نزدیک اچھی حکومت کا مفہوم یہی ہے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب خوش رہیں - کمشنر کو سلام کرنے جائیں تو وہ کرسی پیش کریں اور کبھی کبھی گورنر بہادر کے درِ دولت تک رسائی نصیب ہو جائے! یہ مراعات نصیب ہو جائیں تو سمجھئے زندگی کی سب حسرتیں پوری ہو گئیں اور ظاہر ہے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب کی خوشنودی - کمشنر کی

کرسی اور گورنر بہادر کے آستاں سے ان کے اردلیوں کا تو کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ اسمبلی کے ارکان کی دھواں دھار تقریروں کا کوئی تعلق نہیں - اسی لئے ہمارے نواب صاحب بزرگوں کی اس زرّیں نصیحت پر کیوں عمل نہ کریں سے

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد!

نواب صاحب کی دولت و ثروت کے باعث ان کے کئی حاسد بھی پیدا ہوگئے ہیں اور وہ ان کے متعلق طرح طرح کی غلط افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ انہیں حاسدوں نے ان کے متعلق اس قسم کی روایات مشہور کر رکھی ہیں۔ کہ نواب صاحب نے فلاں بیوہ کا اتنا روپیہ ہڑپ کر لیا اور فلاں یتیموں کی اتنی زمین غصب کر لی ہے اور فلاں شخص نے نواب صاحب کے پاس اتنا روپیہ بطور امانت رکھا تھا وہ اب واپس نہیں کرتے۔ اوّل تو اس قسم کی باتیں قرینِ قیاس نہیں ہیں۔ لیکن اگر یہ درست بھی ہوں تو اس میں نواب صاحب کا کیا قصور ہے ؟ انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ جن کے پاس بہت زیادہ ہے انہیں اور دیا جائیگا اور جنکے پاس بہت تھوڑا ہو ان سے وہ بھی چھین لیا جائیگا۔ انجیل مقدس کے الہامی کتاب ہونے سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا - اب اگر نواب صاحب کتابِ مقدس کے اس ارشاد کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں تو کیا گناہ کرتے ہیں ؟ یہ اصول انہوں نے خود تھوڑے سے ہی بنایا ہے - دو ہزار سال سے اس پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔ محض حسد کی وجہ سے نواب صاحب ایسے نیک نفس اور خدا ترس بزرگ کو مطعون کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں -

اردو کے کسی دقیانوسی شاعر نے کہا ہے کہ اگر نام منظور ہو تو "فیض کے اسباب" بنانے چاہئیں اور اس بھلے مانس کے نزدیک "فیض کے اسباب" کیا تھے ؟ ع

چاہ بنا - پُل بنا - تالاب بنا !

ہم حیران ہیں کہ ان چیزوں کا فیض سے کیا تعلق ہے ؟ ہمارے نواب صاحب اس نکتہ کو خوب سمجھتے ہیں - علاقہ والے چیخ چیخ کر مر جائیں مگر وہ اس قسم کے کاموں کیلئے پھوٹی کوڑی بھی بطور چندہ دینے کے روادار نہیں - ان کی نظر ہر وقت اس ارشادِ ربانی پر رہتی ہے کہ "تحقیق مسرف شیطان کے بھائی ہیں"۔ اسی لئے وہ حتی الوسع اس قسم کے اسراف سے بچنے کی کوشش ہی کرتے ہیں - حاسد ان کے اس اصول سے بھی غلط نتیجہ اخذ کرتے ہیں - ان کے متعلق یہ مشہور کیا جاتا ہے کہ وہ ممسک ہیں - کنجوس ہیں - بخیل ہیں - حالانکہ ان الزامات کو حقیقت سے دُور کا تعلق بھی نہیں - نواب صاحب کی سیر چشمی سخاوت اور دریادلی کا یہ ثبوت کیا کم ہے کہ کمشنر صاحب نے ایک بدررو کو پختہ کرانے کیلئے چندہ مانگا تھا - نواب صاحب نے پانچ سو روپیہ چندہ دیا - کوئٹہ میں زلزلہ آیا - نواب صاحب کو اہل کوئٹہ سے قطعاً کوئی ہمدردی نہ تھی - ان کا خیال تھا کہ کوئٹہ کا زلزلہ قہر خداوندی ہے اور کوئٹہ والوں کو ان کے گناہوں کی قرار واقعی سزا ملی ہے - اپنے اس خیال کا وہ کئی بار کھلم کھلا اظہار بھی کر چکے تھے - بلکہ وہ تو یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں کوئٹہ کے زلزلہ سے عبرت حاصل کرنی چاہئیے - لیکن بایں ہمہ جب ڈپٹی کمشنر نے انہیں بلا کر کہا کہ حضور وائسرائے بہادر نے اہلِ کوئٹہ کی اعانت کیلئے ایک فنڈ جاری کیا ہے - تو انہوں نے اپنے اصول کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ضمیر کا خون کرتے ہوئے محض اس لئے دو سو روپیہ چندہ دے دیا کہ ان کی دریادلی اور سخاوت پر حرف نہ آنے پائے !

جہاں تک علم و فن کی سرپرستی کا تعلق ہے - ہمارے نواب صاحب پرانے زمانے کے نوابوں سے کسی طرح کم نہیں - یہ درست ہے کہ انہیں پڑھنے لکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا - لیکن ذوقِ سلیم کوئی اکتسابی چیز تو ہے نہیں یہ تو ایک نعمتِ خداداد ہے جسے مل گئی مل گئی - قدیم وضع کے نواب ...... شعر و سخن کی قدردانی کے لئے مشہور تھے۔ ہمارے نواب صاحب رقص و سرود کی سرپرستی کیلئے یگانۂ روزگار ہیں دور دور سے رنڈیاں، قوال، بھانڈ اور گویے آتے ہیں اور نواب صاحب کے سامنے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے ہیں - نواب صاحب رقص و سرود کے بہت بڑے مبصّر ہیں - رقاصہ کے پاؤں کی ہر حرکت اور مغنّی کے گلے کے ہر اُتار چڑھاؤ کو نہایت ناقدانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور سب کو مناسب انعام دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ بعض "اہل فن" کو تو انہوں نے مستقلاً اپنی سرپرستی میں لے رکھا ہے ! ہمیں نواب صاحب

کے ذوق کی داد دینی چاہیئے۔ ان کی عمر اب ساٹھ سے متجاوز ہو چکی ہے۔ اس عمر میں دل مردہ ہو جاتا ہے۔ آرزوئیں مٹ جاتی ہیں۔ ولولے سرد پڑ جاتے ہیں۔ اس عمر کو اگر شامِ زندگی کہا جائے تو موزوں ہو گا۔ لیکن ہمارے نواب صاحب ہیں کہ اس عمر میں بھی قدیم وضع کو نبھائے چلے جا رہے ہیں۔ جب دیکھو شغلِ نادنوش جاری ہے اور رقص وسرود کی محفل گرم ہے۔ غنیمت ہیں یہ چند شمعیں جو ابھی تک پرانی تہذیب کے افسردہ ایوان میں ٹمٹما رہی ہیں۔ جب زمانے کے بے رحم ہاتھ نے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا تو لوگ کیسے ڈھونڈیں گے؟

حمید نظامی

زمانے کو بھلا سودا کوئی کس طرح پہچانے
کہ اس ظالم کی کچھ سے کچھ ہے ہر آن میں صورت

سودا

اب عشق تماشا مجھے دکھلائے ہے کچھ اور
کہتا ہوں ہیں کچھ منہ سے نکل جائے ہے کچھ اور

جرأت

اشک سے سوزِ غمِ عشق مٹایا نہ گیا
شعلہ اس آگ کا پانی سے بجھایا نہ گیا

بیدار

یک بیک سازِ دو عالم بے نوا ہو جائے گا
کہتے کہتے رُک گئے جس دم ترا افسانہ ہم

سیماب

شباب

(سانیٹ)

موجزن ہے بحرِ ہستی میں ترا رنگیں شباب
اور پنہاں ہیں تبسّم میں ہزاروں بجلیاں
لب کی ہر مستانہ جنبش پر ہے جنّت کا گماں!
اور قلبِ ملتہب میرا مجسّم اضطراب!

شام کی رعنائیوں میں تیرا حسن بے نقاب!
میری جلوت گاہِ دل میں عشق کی سرگرمیاں
قلب کے پردوں پہ کچھ الفت کے بوسوں کے نشاں
وہ تلطف کی نظر اور میری شانِ اضطراب!

تیری نظروں کے کرم سے ہو رہا ہے بے قرار
کیفِ مستی کی تجلّی میں نہاں رومانِ عشق!
قلب کی گہرائیوں میں مضطرب طوفانِ عشق
ساحلِ ہوش و خرد کو ڈھا رہا ہے بار بار!
میری رگ رگ میں بسا ہے تیرا حسن بے مثال
تیرے خال و خد سے ظاہر فکرِ یزداں کا کمال

مشتاق اسلام آبادی

سفرِ عراق

تاریخ انقلاب کے عبرت انگیز مناظر

کائنات میں شاید "زمانہ" سے زیادہ تیز رفتار اور سریع السیر کوئی دوسری چیز نہیں ہے، ذرا پلک جھپکی اور ایک جُگ بیت گیا، بچپن، جوانی اور بڑھاپا، کہنے کو تین "زمانے" ہیں، مگر وقت کی تیز رفتاری کے سامنے یہ فرصت بہت ہی قلیل ہے، وقت کی عجلت پسندی نے "گہوارے" اور "قبر" میں کوئی فرق باقی نہیں رکھا، تاریخ جس کو ہم افسانہ کی طرح ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتے ہیں، حقیقت میں "وقت" کی "خاموش آواز" ہے اسی "آواز" میں ان گنت نسلوں اور قوموں کی تہذیب وتمدن کے نغمے آسودہ ہیں۔

ہاں! تو میں "زمانہ" کی تیز رفتاری کا ذکر کر رہا تھا، میں نے عراق کا سفر ۱۹۳۳ء میں کیا تھا، اور اب ۱۹۳۹ء ہے، پورے چھ سال باتوں باتوں میں گزر گئے، حساب کیا تو حیرت ہوئی کہ ایک دو مہینے اور برس دو برس نہیں، پورے چھ سال کی مدت، یعنی دو ہزار سے کچھ اوپر دن بیت گئے، مگر تصور کی نگاہ سے دیکھا، تو میں نے اپنے کو بغداد شریف کی گلیوں میں گھومتے پایا، دجلہ کا رومانی ساحل، بغداد کے خوشنما باغیچے، عراق کے لہلہاتے مرغزار، کھجوروں کے باغ اور بابل کے عبرت انگیز کھنڈر، ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے آنے لگے۔

حافظہ کی بدولت استنے دنوں کا واقعہ، "آج کی بات" محسوس ہونے لگا۔ اُن ہی تاثرات کے ایک نقش کو یہاں پیش کر رہا ہوں، دل چاہتا ہے، کہ جو کچھ ان آنکھوں نے دیکھا ہے اُسے "شاہکار" کے محترم ناظرین کو، کاغذ پر دکھا دوں، اسی لئے تو "مکتوب" کو "نصف ملاقات" اور "مطالعہ" کو "نصف مشاہدہ" کہا گیا ہے۔

نفوسِ قدسی

تاریخ بین حضرات سے یہ حقائق پوشیدہ نہیں ہیں، کہ فتح عراق کے بعد، بہت سے کبار صحابہ، مدینہ منورہ سے عراق میں آکر بس گئے، ان نفوس قدسیہ کے فیض صحبت نے عجم کی خاک سے ایسے عظیم المرتبت انسانوں کو پیدا کیا، جو نہ صرف تاریخ اسلام، بلکہ علم وعرانیت کی تاریخ کے "ہیرو" سمجھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کے شہروں میں بزرگانِ دین کے بہت سے مزارات ہیں۔ کوفہ، کربلا، نجف، بغداد اور بصرہ، یہ وہ مقامات ہیں۔ جہاں کی سرزمین میں، علم "ومعرفت کے گنجینے" محوِ خواب ہیں۔ افسوس ہے کہ مادہ پرست دنیا عہدِ قدیم کے لوٹے ہوئے پیالوں، بوسیدہ مورتوں اور ٹوٹی ہوئی ٹھیکریوں کی تو تحقیق واکتشاف (Re-Search) کرتی ہے، لیکن ان زندہ جاوید ہستیوں کے کارناموں کو اُجاگر کرنے اور منظرِ عام پر لانے کی کوشش نہیں کرتی! —— بعض لوگ غالباً ہنسیں گے، کہ یہ مضمون نگار علم وتہذیب کے روشن زمانہ میں، پرانے وقتوں کی باتیں کر رہا ہے، لیکن میں منافق نہیں ہوں، لوگوں کے طعن وطنز سے ڈر کر، حق بات نہیں چھپا سکتا اور میں یہ جو کچھ اپنے کمرے میں بیٹھ کر کہہ رہا ہوں۔ پھانسی کے تختہ پر کہنے کی بھی بفضلہ ہمت رکھتا ہوں۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

سلمان پاک میں

نجف اشرف، کربلائے معلی، کاظمین شریفین، کوفہ اور مسیب وغیرہ مقدس مقامات کی زیارت کے بعد، ایک دن صبح کو ہم بغداد شریف سے موٹر کار میں روانہ ہوگئے اور

بغداد کی کشادہ اور مصفیٰ سڑکوں سے ہوتے ہوئے، جنگل میں پہنچ گئے۔ کھجوروں کے جھنڈوں میں عراقی لڑکے "نشید" پڑھ رہے تھے، اور گاؤں کی عورتیں سیاہ برقعوں اور چادروں میں لپٹی ہوئی، ادھر اُدھر آجا رہی تھیں۔ چند میل چل کر ہماری موٹر کار بگڑ گئی، اب ہم چٹیل میدان میں کھڑے ہوئے تھے، کہیں آبادی نظر نہ آتی تھی، البتہ کہیں کہیں اونٹ اور بکریاں چرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں — تقریباً ایک گھنٹہ تک ہم کو ٹھہرنا پڑا، اور مشین درست ہونے کے بعد عراقی ڈرائیور نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے "الحمد اللہ" کہا اور موٹر ٹیکسی (السیارۃ الایجارہ) حرکت میں آگئی۔ اس مقام سے چلنے کے بعد تقریباً چالیس منٹ میں ہم "سلمان پاک" پہنچ گئے۔

یہاں پر حضرت سلمانؓ فارسی صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار ہے، اس لئے اس آبادی کا نام ہی "سلمان پاک" مشہور ہو گیا ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا شمار اکابر صحابہ میں ہوتا ہے، غزوۂ خندق میں حضرت سلمان ہی کے مشورے سے رسول اللہ نے خندق کھودنے کا حکم دیا تھا۔ ان ہی حضرت سلمان کے متعلق حضرت رسولِ خدا نے فرمایا تھا:-

"سلمان میرے اہل بیت سے ہیں۔"

حضرت سلمانؓ کے مزار کے قریب گنبد میں حضرت حذیفۃ الیمانی رضی اللہ عنہ کا مزار ہے، حضرت حذیفہ "صاحب السر" کے مبارک لقب سے یاد کئے جاتے ہیں، ان کو رسول اللہ نے بعض اسرار خاص بتلائے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ سے تنہائی میں جاکر بعض باتیں دریافت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت حذیفہ کے مزار کے پاس حضرت عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار ہے۔ یہ تینوں مزار ایک بڑی چہار دیواری کے اندر واقع ہیں، صحن بہت وسیع ہے، صدر دروازہ بہت اونچا ہے، اس عمارت میں چھوٹے بچوں کیلئے درسگاہ بنی ہوئی ہے، دروازہ پر کھجور وغیرہ اشیاء ملتی ہیں۔

سلمان پاک، ایک چھوٹے گاؤں کی حیثیت رکھتا ہے، کچے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ لیکن گاؤں کی گلیاں صاف اور کشادہ ہیں، اس چھوٹے سے گاؤں میں قہوہ خانے ہیں — جہاں قہوے کے علاوہ، کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی ملتی ہیں۔

قصر کسرےٰ

سلمان پاک سے دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر "طاق کسریٰ" واقع ہے، یہ وہی عالیشان قصر ہے جس کے کھنڈروں کو دیکھ کر، ملک الشعراء خاقانی بے اختیار پکار اٹھا:-

اے دیدۂ عبرت بیں! از دیدہ نظر کن ہاں!
آثارِ مداین را آئینۂ عبرت داں

"طاقِ کسریٰ" اپنے زمانہ کے بہترین قصروں میں شمار ہوتا تھا، قصر کی آرائش اور زیب و زینت نے تو بابل و نینوا کے تمدن کو مات کر دیا تھا۔ لیکن انقلابات نے اس بے مثال قصر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اس وقت ڈاٹ کا ایک حصہ باقی رہ گیا ہے، اور تین دیواریں موجود ہیں — غالباً قصر کسرےٰ کا یہ سب سے بڑا ہال تھا۔ اس ہال کی چوڑائی ۸۴ قدم ہے، دیواروں کا آثار سات گز کا ہے، اس ہال سے ملحق، وہ دروازہ ہے، جس کے کنگرے حضرت پیغمبر اسلام کی ولادت باسعادت کے وقت سجدے میں آگئے تھے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ دروازہ "حرم سرا" سے متعلق ہوگا۔ اس دروازہ کی دیوار شق ہو گئی ہے، ہمارا گائیڈ، طاق کسریٰ پر چڑھ گیا۔ اس قصر کے آس پاس دور تک مٹی کے ڈھیر نظر آتے ہیں، اور یہ سب مداین کی عظمت کے مقبرے ہیں۔ یہ وہی میدان ہے جہاں بڑے بڑے بادشاہ اور سفراء سرِ نیاز خم کرتے تھے، اور آج عراقی چرواہے، ان کھنڈروں کو بے تکلف روندتے پھرتے ہیں۔

کم کن ز کبر و ناز کہ دیداست روزگار
چین قبائے قیصر و طرف کلاہ کے

قصر کسریٰ کے ہال کی چھت ٹوٹ گئی ہے، صرف ایک طرف کی ڈاٹ باقی رہ گئی ہے، گائیڈ کے کہنے پر میں نے "اللہ" کا نعرہ لگایا تو گونج پیدا ہو گئی، قصر کی دیواریں لانبی لانبی اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں، اس ہال کے فرش پر جو ریت ہے اس میں پرانے

زمانے کے سکے بکثرت ملتے ہیں۔ میں نے بھی دو تین سکے ڈھونڈ کر حاصل کئے، جن کے نقوش بالکل مٹ گئے تھے۔

تاریخ پر ایک سرسری نگاہ

مداین کی حکومت اپنے عہد کی باعظمت اور پرشکوہ حکومت تھی۔ حضرت عمر فاروق خلیفہ ثانی کے زمانہ میں مداین فتح ہوا۔ سطوتِ پرویز کے پرخچے اڑ گئے۔ عرب کے جانباز سپاہی جب قصرِ کسریٰ میں داخل ہوئے، تو وہاں کے ساز و سامان کو دیکھ کر متحیر ہوئے۔ قصر کی آرائش، دیواروں کی گلکاری حریر و دیبا کے پردے، ایران کے نرم و خوشنما قالین، غرض ایک ایک چیز اپنی جگہ جاذبِ نظر تھی۔ اسی قصر میں "بہار" نامی ایک قالین تھا، جس پر نازک ترین صنعت کے ساتھ بہار کا منظر پیدا کیا گیا تھا، اور خزاں کے زمانہ میں، اس قالین پر بیٹھ کر شراب پی جاتی تھی، تاکہ خزاں میں بہار ہی کا سماں نظر آئے لیکن آخر اس "بہار" پر بھی خزاں آ گئی، اور اس قالین کے ٹکڑے اُن مجاہدین کو تقسیم کر دئے گئے، جن کی تلواروں نے مداین کو فتح کیا تھا۔

مداین کی فتح کے بعد جب دربارِ خلافت میں بہت سی بیش بہا چیزوں کے ساتھ کسریٰ کی بیش قیمت مرصع تلوار اور زریں کمر بند آیا، تو حضرت عمر فاروقؓ نے ان کو دیکھ کر فرمایا:-

"جس قوم نے ان چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا، وہ ایک مُتدین قوم ہے۔"

قصرِ کسریٰ سے جب ہم واپس ہوئے ـــ تو قلب و نگاہ پر عبرت چھائی ہوئی تھی، اور تھوڑی دیر کیلئے دنیا کی طرف سے دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔ اللہ بس، باقی ہوس۔

ماہر القادری

غزل

خبطِ ناشکیبائی ضبط سے بدلتا ہے
تلخئ حوادث کا آفتاب ڈھلتا ہے

عشق کی تباہی پر حُسن ہات ملتا ہے
انقلاب ایسی بھی صورتیں بدلتا ہے

جانگدازلمحوں میں دل خراش لمحوں میں
دوست کا تصوّر بھی بے وفا نکلتا ہے

ہوش اُڑنے والے ہیں اشک بہنے والے ہیں
پھر کوئی نیا ارماں یاس سے بدلتا ہے

اعتبار یا حُسنِ اعتبار، کیا کہئے
وہ اُدھر بھلاتے ہیں دل اِدھر بہلتا ہے

انتہا کی ناچاری، انتہا کی مجبوری
ہر شکست پر منہ سے مرحبا نکلتا ہے

جگمگا چلے تارے، گنگنا اٹھے دھارے
مضطرب مگر اب تک کروٹیں بدلتا ہے

انتشار کی دنیا؟ انتظار کا عالم؟
پھول جب مہکتے ہیں، چاند جب نکلتا ہے

اے سحرؔ میں پاؤں گا اُن سے دادِ خودداری
دیکھنا ہے الفت کا وہ بھی دور چلتا ہے

سحر رامپوری

نکات

"گلبانگِ حیات زیرِ تدوین کا ایک ورق"

ٹالے ٹالے یہ وقت ٹالے سختی ہی کے دن سہی نکالے
لے ضبط سے کام دل سے کہدو ہے غصہ حرام تھوک ڈالے

۲

سینے سے نِکل چلے ہیں نالے ہاں غیرتِ دل گلا دبالے
آنسو ہی تو جانِ آبرو ہیں پی کر انہیں آبرو بچالے

۳

بُلبل نے کئے ہزار نالے کیا روئے چمن کے ہنسنے والے
ہو جاتے ہیں کیا سے کیا۔ کہوں کیا! نالوں کو اگر کوئی دبالے

۴

ہیں سوزِ دروں سے دل کے لالے اس آگ کو رکھ امیںؔ سنبھالے
پک جائے گا منہ گر آہ نکلی لالے لالے ہیں چھالے چھالے

امین حزیںؔ سیالکوٹی

خوف

انسان کی طبیعت میں خوف فطری طور پر ودیعت ہوا ہے اور ہم اس سے بالکل اسی طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح لوہا مقناطیس سے، اس خوف کو دُور کرنے یا اس سے محفوظ رہنے کیلئے ہم خواہ کتنی ہی ہمت اور بہادری سے کام لیں، لیکن اس کا وجود ہم پر ہمیشہ غالب اور آخر وقت تک ہر حالت میں ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ ان میں سے بعض خوف ایسے ہوتے ہیں جو پوری طرح اپنے اصلی انجام تک نہیں پہنچتے، اپنی آمد کا اظہار کئے یا بغیر کئے گزر جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم کو ایک گھنٹہ بھی صحیح آرام اور سچی مسرت کا نہ ملتا۔ یہ خوف ہم پر مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً مستقبل کا خوف، سیلاب کا خوف، بجلی کا خوف، بھوت پریت کا خوف۔ اور موت، کا غور سے دیکھا جائے تو موت کا خوف تمام خوف و ہراس کا سرچشمہ ہے۔ کیونکہ تمام واقعات و حادثات کے خوف کا لازمی نتیجہ صرف موت ہے۔ لیکن ہمیں اس وقت صرف مافوق الفطرت روحوں کے خوف کے متعلق کچھ کہنا ہے —

بھوت پریت اور جنات کا خیال نیا نہیں ہر ملک ہر قوم اور ہر فرقہ میں اس کو کچھ نہ کچھ اہمیت حاصل ہے۔ بہت سے مکانات، کھنڈر، مساجد، منادر، پرانے تناور درخت، قبرستان، شمشان اور مقابر تمام شہروں قصبوں اور دیہات میں جنات اور بھوت پریت کا مسکن ہونے کیلئے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ یہ شہرت یہاں تک ہے کہ اچھے خاصے سمجھدار لوگ ایسے مقامات پر دن دہاڑے جانے سے جی چراتے اور خوف کھاتے ہیں۔ اس قسم کے تمام مقامات کے متعلق کچھ نہ کچھ قصے اور کہانیاں مشہور ہوتی ہیں۔ جن میں راویوں کے ذاتی مشاہدے کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ یہ کہانیاں ہر چھوٹے بڑے کے سامنے بیان کیجاتی ہیں۔ جن کے سننے سے چھوٹے بچوں کے دل و دماغ اس قسم کی وہمی کہانیوں سے ماؤف ہو جاتے ہیں اور جن کا اثر ان کی ذہنی اور روحانی حتیٰ کہ جسمانی نشوونما پر بھی نہایت بُرا پڑتا ہے۔

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بھوت اور دیو وغیرہ کوئی وجودی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ یہ سراسر اپنے وہم و خیال کا قصور ہے البتہ جادو کو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ مذہبی کتابوں میں اس کا کثرت کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن ہمیں اس وقت ان ارواح کے وجودی یا غیر وجودی ہونے سے بحث نہیں، بلکہ اس قسم کے واقعات دیکھنے یا سننے سے انسان کے دل و دماغ پر جو خوف و ہراس طاری ہوتا ہے۔ صرف اسی اثر کو پیش کرنا ہے، بھوت پریت کے خوف کا اندازہ اس کہانی سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

ایک دن شام کے وقت، ایک برات کا جلوس گشت کرتا ہوا اپنی منزلِ مقصود کی طرف جا رہا تھا۔ اتفاق سے جلوس کی راہ میں ایک پرانا قبرستان بھی پڑتا تھا۔ براتیوں میں سے ایک صاحب نے جو پرانی وضع قطع کے آدمی تھے احتیاط کے خیال سے یہ کہا کہ قبرستان کے قریب سے گزرنا ٹھیک نہیں، دو تین آدمیوں نے ان کی تائید کی بعض مخالفت پر اتر آئے، موافق حضرات میں سے ایک صاحب فرمانے لگے کہ اسی طرح، یہ ہمارا چشم دید واقعہ ہے، ایک برات، ایسا ہی جھٹپٹا تھا ایک قبرستان کے پاس سے گزری۔ قبرستان کے پاس سے گزرنا تھا آندھی کا ایک طوفان اٹھا، خیر طوفان تو اٹھا اور ختم ہو گیا۔ لیکن دلہن پر ایک سرسامی کیفیت طاری ہو گئی، یہ تکلیف بھی چند دن بعد جاتی رہی — لیکن دوسرے سال اس کے ہاں جو بچہ ہوا اس کا سر کٹا ہوا تھا۔ چند سال جب تک وہ زندہ رہی اسی طرح سر کٹے بچے جنتی رہی بالآخر اسی صدمہ میں مر گئی۔ یہ حکایت سن کر دوسرے صاحب بولے کہ یہ سب بے سروپا باتیں ہیں۔ ایسی کہانیاں ہم نے بھی بہت سی سنی اور پڑھی ہیں لیکن جناب معاف کیجئے گا۔ ہمارے

یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر کیا گیا تھا۔

تجربہ اور مشاہدہ میں آج تک کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا۔ ایک قبرستان ہی پہ کیا موقوف ہے ڈرپوک دل اور وہمی مزاج لوگ تو مسجدوں اُن کے کنوؤں، باولیوں اور گھر کی موریوں تک کے متعلق یہ کہا کرتے ہیں کہ ان میں بھوت رہتا ہے، ہمارے محلہ میں پرانے وقت کی ایک باولی تھی بہت گہری اور ڈراؤنی اُس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ رات گئے کوئی شخص وہاں نہیں جا سکتا اور جو جاتا ہے وہ اس کی بھینٹ ہو جاتا ہے، فلاں رات فلاں آدمی گیا تھا مر گیا۔ فلاں دن صبح کو فلاں آدمی کی لاش پانی پر تیرتے ہوئے دکھائی دی۔ الغرض اس قسم کی بُری افواہیں اس محلہ بلکہ دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں، کوئی صریح ثبوت اور عینی شہادت نہیں ملتی تھی۔ میری اور میرے ایک عزیز دوست کی ہمیشہ اہلِ محلہ سے اس معاملہ میں بحث اور تکرار رہا کرتی تھی۔ آخر ایک روز میرے دوست نے یہ ٹھان لی کہ اس بھینٹ کے خیال کو جھوٹا ثابت کیا جائے چنانچہ اُسی رات اُس نے چند اہلِ محلہ کو جو باولی کی اس خوفناک بھینٹ کے قائل تھے جمع کیا اور کہا کہ میں تمہارے سامنے وہاں جاتا ہوں، اور اس ثبوت میں کہ میں وہاں تک گیا باولی کی اس پہلی سیڑھی پر جو پانی میں ڈوبی ہوئی ہے ایک کیل گاڑ آؤں گا۔ سب نے اسے منظور کر لیا اور وہ جری دل انسان آدھی رات کے وقت اس باولی پر گیا اور سیڑھی پر پہنچ کر وہ کیل ٹھونک دی کیل ٹھونک کر وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ اس نے ایک خوفناک چیخ ماری اور گر کر اُسی وقت دم دیدیا۔ لوگوں نے بھی اس چیخ کو سُنا۔ اور وحشت زدہ ہو کر وہاں سے اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے۔ صبح سویرے وہ سب باولی پر آئے، دیکھا تو وہ مردہ پڑا تھا، جونہی انہوں نے لاش کو اٹھانا چاہا، دیکھا کہ کیل میں اس کا دامن بندھا پڑا ہے، دراصل وہ بھینٹ نہیں چڑھا بلکہ کیل ٹھونکتے وقت اس کا دامن کیل میں بندھ گیا اور جب وہ کیل ٹھونک کر اٹھا تو اس نے سمجھا کہ فی الواقعی اس کو کسی نے پکڑا ہے فوراً اس پر ایک خوف طاری ہوا۔ منہ سے ایک چیخ نکلی۔ یکبارگی دل کی حرکت بند ہوئی اور مر گیا۔

جس وقت وہ یہ قصہ بیان کر رہے تھے۔ اتفاق سے دلہن کی پالکی قریب تھی اور وہ اس میں بیٹھی ہوئی یہ قصہ حرف بحرف سُن رہی تھی، قصہ بیان کرنے اور سننے اور آپس میں بحث کرنے والوں نے یہ خیال بھی نہیں کیا کہ اس قصہ کو اُن کے علاوہ دلہن نے بھی سُن لیا ہے اور نہ معلوم اس کے دل میں اس وقت کیسے خوفناک خیالات گشت لگا رہے ہیں۔ باوجود اس قصے اور قضیے کے ان کی کچھ نہ چل سکی۔ کیونکہ دوسرا راستہ بہت چکر دار اور طول طویل تھا جو نہی برات قبرستان کے مقابل آئی ان کا وہم و اندیشہ حرف بحرف سب کے سامنے آیا۔ وہی آندھی کا ایک طوفان اٹھا، تمام فضا آن کی آن میں گرد و باد سے آلودہ ہوگئی اور آندھی کے درمیان پالکی میں سے خوفناک چیخیں سنائی دیں جب مطلع صاف ہوا تو وہ لوگ ان پر خوب ہنسے جو برات کو اس سڑک پر لانے کیلئے بضد تھے۔ دو تین قریبی رشتہ دار دلہن کو دیکھنے دوڑے، پالکی کا پردہ اٹھایا تو دیکھا دلہن بیہوش پڑی ہے۔ دلہن کا ہوش میں لانا بہت ضروری تھا۔ لیکن سب نے باتفاق یہ طے کیا کہ یہاں ٹھہرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ گھر پہنچ کر باقاعدہ کوئی تدبیر ہوگی۔ چنانچہ جلدی جلدی برات گھر پہنچی، دلہن کو اتارا گیا، کسی نے پنکھا جھلا کسی نے پانی کے چھینٹے دیئے کسی نے عطر سونگھایا، کسی نے کچھ پڑھ کر دم کیا، غرض ہوش میں لانے کی تمام تدبیریں کی گئیں اور بڑی دیر کے بعد دلہن کو افاقہ ہوا۔ اب تقریباً ہر عورت و مرد کا اس سے یہی سوال تھا۔ دلہن تم بیہوش کیوں ہوگئی تھیں! بیٹی! تم نے کیا دیکھا تھا؟ اچھی ہو، اب تم کس طرح ہو، دلہن پر ایک عجیب حالت طاری تھی وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ کبھی اُس کو غش آنے لگتا اور کبھی وہ ہائے ہائے کرنے لگتی۔ آخر بمشکل تمام اس نے اتنا کہا کہ آندھی کے وقت ایک بھوت گھس آیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ لیجانا چاہتا تھا، جب میں نے انکار کیا تو وہ میرا گلا گھونٹنے لگا اور کہا کہ اچھا رات کو میں تجھے تیرے گھر سے اُٹھا لاؤں گا۔ یہ سُن کر سب نے حیرت اور افسوس کا اظہار کیا اور اس واقعہ کو بالکل خیالی اور بے سر و پا بتا کر اس کا خوف دُور کرنے کی کوشش کی۔ دودھ پلایا، پھر کمرے میں لے گئیں اور سونے کیلئے کہا۔

شام ہو ہی چکی تھی رات کی تاریکی آہستہ آہستہ غالب ہو رہی تھی۔ سب نے اس واقعہ کے ذکر اذکار میں تھوڑا بہت کھانا کھایا، سونے کی ٹھیرائی۔ بچوں کو تھپک تھپک کر سُلایا۔

عورتوں نے مل کر گانا شروع کر دیا، مردوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ وہ تین آدمی مل کر باری باری جاگیں اور رات بھر گھر کی دیکھ بھال رکھیں، تمام انتظامات مکمل ہو گئے، اپنی اپنی جگہ ہر ایک مطمئن تھا۔ جب آدھی رات ہوئی تو عورتوں نے تھک کر گانا بند کیا اور سو گئیں۔ گھر کی رونق اور ہنگامہ ایک مستقل خاموشی اور سکون میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن ایک بھیانک خاموشی اور ہیبتناک سکون جس کے پردے میں ہزاروں بھوت اور آسیب اپنے شکار کی تلاش کیلئے نقل و حرکت میں مصروف ہیں ؎

محافظوں نے بڑی سختی سے نیند کا مقابلہ کیا اور خوب نگہبانی کی۔ وہ ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار تھے۔ لیکن جو ہونی شدنی ہوتی ہے وہ ہر طرح ہو کر رہتی ہے۔ گرجا کے گھنٹے نے ایک بجایا۔ فضا میں ایک جمود تھا۔ ہوا ساکن تھی، تمام کائنات پر موت کی سی ایک خاموشی طاری تھی۔ اس سکون اور تاریکی میں گھنٹے کی آواز بھیانک طور پر گونجی اور فضا میں ڈوبتی ہوئی چلی گئی۔ ان لوگوں نے بھی گھنٹے کی آواز کو سُنا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی جیسے کوئی آسمان دیکھ کر وقت کا اندازہ کرتا ہو کہ اب کتنی رات باقی ہے اور صبح کتنی دیر میں ہو گی۔ لیکن آسمان پر آندھی کا گرد و غبار چھایا ہوا تھا اور بادل بری طرح گرج رہے تھے گویا وہ جنوں اور بھوتوں کی آمد کا اعلان کر رہے ہیں۔ آندھی کا یہ طوفان لحہ بہ لحہ بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ یہ مکان بھی اس کی زد میں آ گیا۔ روشنی گل ہو گئی، کمروں کے کواڑ جھڑ جھڑ کرنے لگے، پلنگ کی چادریں اڑنے لگیں۔ بادل کی گرج، بجلی کی چمک اور کڑک نے سوتے ہوئے بچوں اور عورتوں کو جگا دیا۔ بچے ابھی رو ہی رہے تھے کہ دولہا کی آواز سنائی دی، وہ چیخ رہا تھا، "ادھر آؤ! ادھر آؤ!" دو تین مرد، تین چار عورتیں اوپر پہنچیں جہاں دولہا دلہن آرام کر رہے تھے۔ دولہا نے کہا۔ "میں سو رہا تھا، یکایک میں نے ایک چیخ سنی جو بہت ڈراؤنی تھی۔ ہڑبڑا کر آنکھ کھولی تو دیکھا کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور آندھی کے جھکڑ کھڑکی کے کواڑوں کو توڑے ڈالتے ہیں۔ دلہن کا ایک پاؤں پلنگ کی پٹی پہ تھا اور دوسرا فرش پہ، ایک ہاتھ سینہ پر اور دوسرا کھڑکی کی طرف۔ اور بھوت! بھوت!! کہہ کر بے اختیار چیخ رہی تھی۔ میں قریب پہنچا ہی تھا کہ وہ پلنگ پہ گری اور بیہوش ہو گئی۔" یہ سن کر سب پریشان ہو گئے اور دلہن کو ہوش میں لانے لگے، محلہ میں ایک حکیم صاحب بھی تھے کوئی جا کر انہیں بلا لایا۔ حکیم صاحب نے آکر نبض دیکھی، حرکت پائی سب کو اطمینان دلایا کہ زندہ ہے اپنے سامنے ہوش میں لائے دوا کی دو گولیاں کھلائیں اور کہا کہ دماغ کو غیر معمولی صدمہ پہنچا ہے۔ تم سب اس کے پلنگ سے دُور دُور بیٹھے رہو، اسے آرام سے لیٹا رہنے دو۔ خبردار! کوئی اس سے بات نہ کرے اور کمرے میں برابر موجود رہنا تاکہ تمہاری موجودگی میں ڈر محسوس نہ ہو، طوفان ختم ہو چکا تھا، دلہن کی حالت ذرا پُرسکون تھی اپنے دل ہی دل میں سب دعائیں کر رہے تھے کہ الٰہی! اب دلہن کو کوئی صدمہ نہ پہنچے کہ دلہن نے پھر ایک بے اختیار چیخ ماری اور بکنا شروع کر دیا:۔

"دیکھو! دیکھو!! بھوت! وہ بھوت!!" کھڑکی بدستور تازہ ہوا کی آمد و رفت کیلئے کھلی ہوئی تھی کبھی کبھی ہوا کا کوئی تیز جھونکا اس کے کواڑوں کو پریشان کر دیتا تھا۔ ایک عورت اٹھ کر کھڑکی کی طرف جانے لگی تاکہ اس منحوس کھڑکی ہی کو بند کر دے جہاں سے دلہن کو بھوت آتا دکھائی دیتا ہے کہ دلہن پھر چیخی۔ "بھوت! ہائے بھوت!! وہ مجھے گھور رہا ہے وہ میری طرف آ رہا ہے، وہ مجھے لے جائے گا، وہ مجھے کھا جائے گا۔" دولہا اور اس کے تمام عزیز جو کمرے میں موجود تھے۔ سب حیران و پریشان تھے کہ آخر وہ بھوت کہاں ہے جسے وہ تو دیکھ رہی ہے اور ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔ دولہا نے قریب جا کر دیکھا اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا، پیشانی پسینے سے تر تھی، ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے اور منہ سے چیخ پکار جاری تھی۔ "دیکھو! وہ آ گیا۔ میرے بال پکڑ لئے، مروڑ رہا ہے۔ مجھے گھسیٹ لیا۔ میری گردن ٹوٹی، میں مری۔۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔"

اس کے بعد اس کی زبان یک لخت بند ہو گئی گویا اس کا سانس ٹوٹ گیا ہو۔ عزیزوں نے یہ حالت دیکھی تو ان سے نہ رہا گیا بیقرار ہو کر اٹھے اور دلہن پر جھک گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ دلہن کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے

پڑے ہیں۔ تمام جسم بالکل سرد اور چہرہ کا رنگ چنبیلی کی طرح سفید ہے۔ ہونٹ کھُل کر اندر کی طرف مڑ گئے ہیں۔ دانتوں کی بتیسی بند ہے۔ ہاتھوں کی انگلیاں سکڑی ہوئی ہیں اور آنکھیں پھٹی ہو کی چھت کی طرف لگی ہیں۔ گھبرا کر نبض دیکھی، کان لگا کر دل کی حرکت کو سنا دونوں کو بند پایا، اسی وقت تمام گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سچ مچ بھوت ہی نے دلہن کی عزیز جان لی یا بھوت کا خوف اس کا ——— ایک انسانی زندگی کا ——— جان لیوا تھا۔

یوسف بخاری

خانہ بربادی کے ہاتھ آئی نہ میری بزم عیش
بجلیوں کو میرے خرمن کا پتہ ملتا نہیں

ناجور

حقیقت ہے تو اتنی ہے طلسم راز ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

سیماب

فقط اک قطرۂ خوں رہ گیا ہے جسم کے پہلو میں
اسی کو دل سمجھ لو تم اسی کو آرزو دل کی

رسا مرحوم رامپوری

نہ دیر کر ارے صیاد رُوح مضطر ہے
چھری چلا کہ پہنچ جاؤں آشیانے میں

شفا اکبر آبادی مرحوم

غزل

ملتا ہے محبت کی فطرت کو جواب آخر
خود حُسن کے چہرے سے اٹھتا ہے نقاب آخر

ہر عیش کی محفل کا انجام بس اتنا ہے
اک کیف شراب اوّل اک موج سراب آخر

اس دہر میں ناممکن ہے زیست مسرت کی
خود لوٹ کے گرتا ہے ہر جامِ حباب آخر

بس جاتی ہے آنکھوں میں جب باغ کی شادابی
کانٹا نظر آتا ہے شاداب گلاب آخر

جب حُسن کی رعنائی پھیکی نظر آتی ہے
آتا ہے محبت کی فطرت پہ شباب آخر

جب زلف تصوّر میں فطرت کو ستاتی ہے
کرتا ہے گھٹاؤں سے انسان خطاب آخر

تم عشق کی گرمی سے واقف ہی نہیں شاید
دریا سے بھی اٹھتا ہے طوفانِ سراب آخر

بس عشق و محبت کا اتنا ہی فسانہ ہے
اک موجِ کرم اوّل اک شانِ عتاب آخر

بڑھ جاتی ہے دنیا میں جب راحت و سرمستی
زاہد نظر آتا ہے پابندِ شراب آخر

زاہد حیدر آبادی

موسیقی

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

پیدا ہے ہوا میں اک تموّج
خاموش فضا میں اک تموج
ہے ارض و سما میں اک تموّج
ساز اپنا بجا رہی ہے فطرت
سُر تجھ سے ملا رہی ہے فطرت

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

بکھرا ہے فضا میں راز تیرا
تو ساز کی اور ساز تیرا
ہر تار ہلاکِ ناز تیرا
تاروں میں مچل رہی ہے فطرت
راز اپنے اُگل رہی ہے فطرت

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

آدم کے نفس کا بولتا ساز
قدرت کے گلے کی پہلی آواز
وہ موجِ حیاتِ سینۂ راز
پیکر میں جو وجہ زندگی ہے
خود ایک لطیف موسیقی ہے

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

احساس کی اِک صدا ہے نغمہ
جذبات کی انتہا ہے نغمہ
فطرت کو اُچھالتا ہے نغمہ
سینوں میں جو ہیں خودی کی لہریں
نغمہ کیا ہے اسی کی لہریں

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

موسیقی ہے خوش اداؤں میں
رفتار کی دلربائیوں میں
انگڑائیوں میں جمائیوں میں
فطرت کے دل کی دھڑکنوں میں
اور تیری حسین چوڑیوں میں

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

فریاد نہیں ہے بانسری کی
نالاں ہے رُوح آدمی کی
سنتا ہوں میں گونج موسیقی کی
ہر ضرب میں ہر فتادگی میں
ہر وصل میں ہر شکستگی میں

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

نغموں کے سوا نہیں خلا میں
طوفاں میں ابر میں ہوا میں
نغمے ہیں منتشر فضا میں
ہے جزوِ لطیفِ روحِ انساں
منزل کی تلاش میں پریشاں

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

تو پیت کے گیت گا رہی ہے
احساس کو گدگدا رہی ہے
بھولی ہوئی یاد آ رہی ہے
وقت اپنی روش سے ہٹ رہا ہے
پیچھے کی طرف پلٹ رہا ہے

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

نغمہ ترا کیفیت فزا ہے
سکتے میں شام کی ہوا ہے
بہتا پانی ٹھہر گیا ہے
سنتا ہے مگر ترا ترانہ
رستے میں کھڑا ہے چپ زمانہ

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

گو نغمہ ہے دلنوازتیرا
کیا جانے کوئی گداز تیرا
ہمدرد مگر ہے ساز تیرا
افسردہ ہے ناز دلبری کا
ہر تان ہے مرثیہ خودی کا

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

گائے ہوئے راگ جو ترے ہیں
وہ قلب سما میں ولولے ہیں
بے چین ہیں تجھ کو ڈھونڈتے ہیں
اک عالم انتشار میں ہیں
اب تک ترے انتظار میں ہیں

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

ہر ذرہ ہے رازدار تیرا
فطرت پہ ہے اختیار تیرا
بجتا ہے جب ستار تیرا
دنیا تیزی سے گھومتی ہے
گردش کے ساتھ جھومتی ہے

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

دیتی ہیں دعا تجھے ہوائیں
دامن پھیلائے ہیں فضائیں
تیرا نغمہ تری ادائیں
شاعر سے شعور چھینتی ہیں
دولت سے غرور چھینتی ہیں

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

نغموں سے جمود میں ہے حرکت
حرکت پہ جمود کی ہے حالت
ہر تان ہے اِک نئی حقیقت

بالائے فضا برس رہی ہے
نغموں کی گھٹا برس رہی ہے

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

اے پریت کے گیت گانے والی
نالوں کو نوا بنانے والی
چنگ و بربط بجانے والی

اس دل کا ستار بھی بجا دے
سوئی ہوئی راگنی جگا دے

گائے جا گائے جا حسینہ
ساز اپنا بجائے جا حسینہ

جمیلؔ مظہری ایم۔ اے

شاعر

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اقبالؔ

نازی

یہ وہ قصّہ نہیں کچھ جھوٹی سچی جس میں باتیں ہیں
بیان میں درد ہے گزری ہوئی سچی کہانی ہے

نازی کا نام تو نازآفرین تھا لیکن پیار سے ماں باپ ۔ دوست آشنا اپنے پرائے سبھی نازی نازی ہی پکارتے تھے

نازی میری بچپن کی سہیلی تھی ۔ صرف یہی نہیں کہ اس سے میری غیر معمولی دوستی تھی بلکہ میری امی اور اس کی بی بی میں بھی بہناپا تھا اور اسی طرح میرے بابا اور نازی کے آغا کی بھی بڑی گاڑھی چھنتی تھی ۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں اور نازی سات سات آٹھ، آٹھ سال کی لڑکیاں ہونگی ۔ ہمارے شاہ میر خاں صاحب —— نازی کے والد —— کے مکان میں صرف ایک دیوار کی آڑ تھی ۔ اور ہمارے باورچی خانہ کے دالان کا دروازہ اُن کے صحن میں کھلتا تھا ۔ کوئی ایسا منحوس ہی دن ہوتا ہوگا جو میں نازی کے گھر اور نازی میرے گھر نہ آتی ہوگی مجھے گڑیوں کا بہت شوق تھا وہ میرے گھر آتی تو میں اُسے گڑیوں کے بیچ میں بٹھا دیتی ۔ کپڑوں کی بچی بچائی دھجیاں جوڑ جوڑ کر ہم گڑیوں کے کپڑے سیتے انہیں رنگ برنگی رنگتے اور لچکا، بانکڑی ٹانک ٹانک کر پہناتے ۔ پوت کے زیور پروئے جاتے ۔ اکثر گڑیوں کا بیاہ بھی رچتا ۔ اور ہمارے سوا اور لڑکیاں بھی اس نیک کاج میں شریک ہو کر ہمارا ہاتھ بٹاتیں —— ہائے کیا مزے کے دن تھے یاد آجاتی ہے تو کلیجہ پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے ——

میں نازی کے گھر جاتی تو وہ مجھے لئے لئے سارا خانہ باغ چھان مارتی ۔ اسے پرندوں سے بڑی محبت تھی اور اس لئے اس نے کئی قسم کے پرندے پال رکھے تھے ۔ پرندوں کے انڈے اور نومولود بچے دکھانے اور ان پر تنقید کروانے کے بعد، وہ مجھے اپنی چھوٹی سی پھلواری میں لے جاتی، جس میں نازی کے اپنے ہاتھ سے گلاب، موتیا، بیلا، چنبیلی اور جائی جوئی کے پودے بڑے قرینے اور سلیقہ سے لگا رکھے تھے۔ وہ اس خوشنما پھلواری میں ایک حسین تیتری کی طرح گھومتی نظر آتی ۔

نازی خوبصورت بھی تھی اور ہنس مکھ بھی ۔ ہنسنا ہنسانا اس کی فطرت میں داخل تھا ۔ نچلا بیٹھنا تو وہ جانتی ہی نہ تھی ۔ دن بھر جلے پاؤں کی بلی کی طرح باغ میں مارے مارے پھرنا پودوں کو گا گا کر سینچنا اور پرندوں کی خدمت کرنا اُس کا محبوب مشغلہ تھا ۔ صورت کے ساتھ ساتھ قدرت نے اُسے غیر معمولی صحت بھی عطا کی تھی ۔ دوسروں کو بیمار دیکھ کر وہ مجھ سے پوچھا کرتی ۔ "سچ کہو نکہت بیماری کس کو کہتے ہیں —— لوگ سچ مچ بیمار ہوتے یا چپ چپ باتیں ہی بناتے ہیں؟"

اس کی ہر ادا سے زندگی اور زندہ دلی ٹپکی پڑتی تھی وہ حسن اور رحمت کی دیوی معلوم ہوتی تھی !

دن گزرتے گئے اور ہم بھی چھوٹے سے بڑے ہوتے گئے ۔ یہاں تک کہ مجھے سترھواں اور نازی کو سولھواں سال لگ گیا ۔ شباب کی سرحد میں داخل ہوتے ہی نازی قیامت بن گئی تھی ! شاعر نے شاید اسی ہی کیلئے کہا تھا ؎

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تیری کافر جوانی جوش پہ آئی ہوئی

صحت اور شباب کا امتزاج کہاں میسّر ہوتا لیکن یہاں تو حُسن، شباب اور صحت ۔ قدرت کے تین انمول خزانے اس کے قدموں پر نچھاور ہو رہے تھے ۔ وہ جب اپنے گھنگھریالے سیاہ بالوں کو شانوں پر بکھیر کر اپنے آسمانی دوپٹہ کے آنچلوں سے کھیلتی ہوئی آتی تو دیکھنے والوں کو جنت کی حُور کا شبہ ہوتا ۔ وہ مسرت کا مجسمہ اور شادمانی کی تصویر تھی ۔ اس کے نازک ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلا کرتی اور

اس کی سیاہ حسین آنکھوں میں سُرور رقصاں نظر آتا۔

کہتے ہیں کہ جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر آیا ہی کرتے ہیں ہمارے ہوش سنبھالتے ہی اِدھر اُدھر سے پیام آنے لگے۔ مردانے سے الگ بات چیت ہوتی اور زنانہ میں الگ امیری (مشاطہ) امّی جان اور خالہ بی ——— نازی کی والدہ ——— سے گھنٹوں آہستہ آہستہ باتیں کیا کرتیں۔ غرض ہوتے ہوتے میری نسبت میرے رشتہ کے ماموں شمشاد علی صاحب کے صاحبزادے امداد علی صاحب.. ....

اور نازی کی نسبت اس کے پھوپھی زاد بھائی شاہ رخ خاں سے ہوگئی اور اس کے دو چار ماہ بعد ہی ہماری شادیاں بھی ہوگئیں یوں تو ہمارے لئے گھر کی ہر چیز سے جدا ہونا تکلیف دہ تھا لیکن ماں باپ اور ساتھ کے کھیلے دوستوں کی جدائی بے انتہا شاق گزر رہی تھی۔ خصوصاً وہ بھی عجیب دردناک وقت تھا۔ جب میں اور نازی ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنے کیلئے ملیں میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں لیکن جو چیز میرے لئے۔ میرے رنج سے بھی زیادہ رنج دہ تھی وہ نازی کے آنسو تھے جو میں نے اپنی عمر میں پہلی بار بہتے دیکھے...... ہے! کاش وہ نرگسی آنکھیں رونا نہ سیکھتیں!!!

شادی کے بعد مجھے اپنے شوہر کے ہمراہ ضلع رائچور ——— ان کی جائے ملازمت ——— جانا تھا۔ چلتے وقت میں نازی سے ملنے گئی۔ لیکن ہماری ملاقات بہت سرسری تھی۔ ہم صرف ایک دوسری سے خط برابر لکھنے کے وعدے لیتی رہیں۔ میں نے پوچھا "نازی! کہو تمہیں شاہی تو پسند نہیں نا" "شاہی" اسکی سیاہ آنکھیں چمک اٹھیں "کیسا پیارا خطاب ہے نکہت۔ واللہ میں اب انہیں شاہی ہی پکارا کروں گی"

"بس رہنے بھی دو اپنی شوخیوں کو پہلے یہ تو بتاؤ کہ وہ ہیں کیسے؟" میں نے پھر پوچھا "کیسے بیان کروں کہ وہ کتنے اچھے ہیں۔ اگر میں مسلمان نہ ہوتی تو دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرتی۔ بس۔ یہ کہہ کر اس نے زور سے میرے چٹکی لی اور تبسم کی نازآمیز موجیں اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگیں۔" خدا کرے تمہارا دیوتا ہمیشہ قابل پرستش رہے۔ نازی اور تم ہمیشہ ہنستی رہو۔" میں نازی کو گلے لگا کر رخصت ہوئی اور اپنا پتہ دیکر اس کا پتہ لیتی گئی۔

ہر آٹھویں پندرھویں میں اس کو خط لکھا کرتی اور وہ بھی سو کام چھوڑ چھاڑ کر پہلے میرے خط کا جواب دیتی وہ میرے حالات دریافت کرتی اور میں اس کے وہ اپنے خطوط میں اپنے "دیوتا" کی تعریفوں کے پُل باندھا کرتی اور اس کو "باعث فخر شوہر"۔ "قابل تقلید انسان"۔ "انسان نما فرشتہ" وغیرہ صفات سے یاد کرتی اور اکثر یہ جملے بھی ہوا کرتے۔ "نکہت! یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ایسا نیک نفس۔ پاک طینت فرشتہ خصائل اور پاک نظر پارسا شوہر ملا۔ بخدا میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔ اب تم چاہے بُرا کہو یا بھلا میں تو سچ خدا کے بعد انہیں کو خدا سمجھتی ہوں!

سترہ مہینوں کے بعد ہم رائچور سے حیدرآباد آئے۔ نازی عثمانیہ شفاخانہ میں تھی۔ اور اس کا پہلوٹھی کا لڑکا صرف سات دن کا تھا۔ میں دوسرے دن نازی کو دیکھنے شفاخانے گئی۔ سبحان اللہ اس عظیم الشان شفاخانے کی نفاست اور تنظیم کا کیا کہنا۔ ہزاروں مریض صاف ستھرے لباس۔ قیمتی پلنگوں پر برقی پنکھوں کے نیچے آرام و سکون کے مزے لیتے۔ شاہ دکن کی عمر و اقبال کو دعائیں دے رہے تھے۔ ہر مرض کے ماہر ڈاکٹر اپنے بیماروں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ کئی نرسیں مخصوص لباس میں چپ چاپ اپنے فرائض کی ادائیگی میں منہمک تھیں ——— لفٹس کے آنے اور جانے کی مسلسل آواز کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

ہم پہلی منزل کے کشادہ راستوں سے گزر کر پتھر کی سیڑھیوں کے ذریعہ دوسری منزل پر پہنچے اور دو تین موڑ مڑ کر زچہ خانہ میں داخل ہوئے۔ عام حصّوں کے بعد خاص خاص حصّے شروع ہوئے۔ یہاں اتفاق سے پہلا وارڈ بی نازی کا تھا۔ صاحب کو باہر چھوڑ کر میں اندر گئی۔ کمرہ مکلّف ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ برقی پنکھے کے نیچے نازی صندلی لباس پہنے مسہری پر بیٹھی تھی۔ مسہری کا مچھر دان اور بچھونا چاندی کی طرح سفید تھے۔ مجھے دیکھتے ہی نازی! مجھ سے لپٹ گئی۔ خوشی کے آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ بچّہ کا چھوٹا سا جھولا مسہری سے ملا ہوا تھا۔ میں نے جھولے کا پردہ الٹا۔ میں نے دیکھا کہ اُجلے

بچھونے پر گلاب کا ایک پھول کھلا ہوا ہے۔ میں نے ایسا خوبصورت بچہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ میں نے نازی سے کہا "تمہارا بچہ تو بڑا ہی پیارا ہے نازی خدا چشم بد سے بچائے!" — "اپنے باپ جیسا ہے نکہت" نازی نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے سرور برسا کر کہا۔

"پھر تو یہ کہو کہ ہمارا بہنوئی صورت اور سیرت دونوں میں یکتا ہے۔"

"حقیقت ہے نکہت بخدا حقیقت ہے!" نازی نے فخریہ انداز سے کہا نازی کی والدہ گل آفریں اپنے داماد کی تعریف سنکر کھلی جاتی تھیں۔ اتنے میں حیاتی — نازی کی انا — نے آکر کہا کہ "بی بی دولہا نواب آگئے ہیں" میں ہٹنے لگی تو نازی نے لجاجت سے کہا "کہاں چلیں نکہت ٹھیرو بھی نا آخر وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں۔" "مگر تم بھی تو اپنے بھائی سے پردہ کرتی ہو نازی" میں نے نرم لہجہ میں جواب دیا۔ تھوڑی سی بحث و تکرار کے بعد یہ قرار پایا کہ میں نازی کے دولہا سے اور نازی میرے شوہر سے پردہ اٹھا دے۔ چنانچہ شاہ رخ خاں، امداد علی صاحب کو لئے ہوئے وارڈ میں داخل ہوئے۔ یہاں ہم دونوں پہلے سے ان کے استقبال کیلئے تیار تھیں۔

اس طرح اور اس عجیب طریقہ سے میرا پردہ شاہ رُخ سے اُٹھ گیا۔ اور میں نے ان کو اس روز آنکھ بھر کر دیکھا۔ وہ حقیقت میں خوبصورت اور خوش رو جوان تھے۔ اُن کے اخلاق نہایت وسیع اور ان کے انداز نہایت شائستہ اور دلفریب تھے۔ ان کی بات چیت میں ایک خاص کشش اور اُن کی آواز میں غیر معمولی نرمی اور لوچ تھا۔ انہوں نے مجھ سے بہت ہی شائستگی اور احترام سے بات چیت کی۔ نازی سے ان کا سلوک والہانہ تھا۔ جس انداز سے انہوں نے اس کی خیریت پوچھی اور جن الفاظ میں اس سے گفتگو کی وہ ان کی بے پناہ محبت اور خلوص کے شاہد تھے۔

نازی کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ تھا۔ وہ اپنے دیوتا کی شائستگی اور تہذیب دیکھ دیکھ کر پھولے نہ سماتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد نازی کی خالہ زاد بہن کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ دونوں باہر جانے لگے۔ شاہ رخ نے چلتے ہوئے کہا:-

"گلنار بھی تمہیں دیکھنے آئی ہے نازی! نیچے سے بلوا لو" نازی نے حیاتی — نازی کی انا — بھیج کر گلنار کو بلوایا۔ اسے چادر میں لپٹی لپٹائی حیاتی کے پیچھے آتے دیکھ کر میں نے پوچھا۔

"یہ کون ہے نازی؟"

"کیا پوچھتی ہو نکہت بڑی ستم زدہ لڑکی ہے۔ نازی نے افسوس کے لہجہ میں کہا۔ بیچاری کی ماں بیوہ تین روپیہ پر میرے چچا کے ہاں ملازم ہے۔ ایک سال ہوا اس کی شادی غریب ماں نے بڑے چاؤ سے کی تھی۔ لیکن مقدر کی برائی وہاں بھی ساتھ رہی۔ چھ مہینے ہوئے ہیں کہ اس کے شوہر نے اس غریب کو بے خطا طلاق دے دی۔ اب اس بے وارث کو میں نے رکھ لیا ہے۔ کیا بتاؤں کیسی نیک سخاوت کش اور محبت والی لڑکی ہے۔ مجھے اس لڑکی کی بدولت بے انتہا آرام ملتا ہے۔"

گلنار نے کمرے میں آکر چادر اُتار دی۔ میں نے دیکھا کوئی اٹھارہ، انیس سال کی جوان لڑکی ہے۔ دُبلی پتلی نازک بدن۔ موزوں ڈیل ڈول متناسب اعضا۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ ملیح چہرہ۔ صاف ستھرا لباس پہنے کھڑی ہے ہاتھوں میں چاندی کے کڑے اور سرخ بلور کانوں میں سونے کے بندے۔ گلے میں موتیوں کا چھڑا اور چاندی کی زنجیر۔ پاؤں میں بادامی چپل پہنے سرمہ لگائے سر گوندھے۔ کپڑوں سے پھولوں کی بھینی بھینی مہک بکھرتی ہوئی وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ پہلے جھک کر نازی کو مجرا کیا پھر مجھے، گل آفریں اور نازی کی خالہ زاد بہن کو ادب سے سلام کیا۔ اس کے بعد "ہمارے چھوٹے سرکار کیا کر رہے ہیں۔" کہتی ہوئی جھولے کے پاس آئی۔ بچے کو گود میں لے کر اس کے رخسار کے بوسے لیتی جاتی اور کہتی جاتی "کہو ننھے میاں گھر کب آؤ گے۔ تمہارے خیال میں ہم کو تو رات بھر نیند نہیں آتی اور تم ہو کہ مٹھیاں بند کئے آٹھوں پہر سوتے ہو۔ آنکھیں کھولو، باتیں کرو۔ امّی سے کہو کہ گھر جلد چلیئے، گلنار ہمیں یاد کرتی ہے!" پھر نازی سے مخاطب ہو کر نہایت ادب و

احترام سے باتیں کرنے لگی۔ گھر کا حساب۔ کتاب سنایا۔ باغ کے پھولوں کا ہار گوندھ لائی تھی۔ اپنے ہاتھ سے نازی کے سر میں لگایا۔ پھر ایک چھوٹا سا مرتبان حیاتی کو دیتے ہوئے کہا " انا جی سیب کا مربہ ہے میں نے بیگم کیلئے آج ہی تازہ تیار کیا ہے روز لیتی آؤں گی۔ رات کے کھانے پر یاد سے دیا کرنا۔"

استنے میں شفا خانے کی گھنٹی بجنے لگی ـــــ جس کے یہ معنی تھے کہ مریضوں کے عزیز و اقربا جو عیادت کیلئے آتے ہیں وہ سب شفا خانہ سے رخصت ہو جائیں ـــــ ہر طرف سے خدا حافظ فی امان اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں بھی اپنا برقعہ سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ گلنار نے چادر اوڑھ لی۔ میں نے نازی کی پیشانی کو پیار کیا۔ بچے کی آنکھوں کو چوما اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکلنے لگی تو دروازہ میں شاہ رخ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ نازی کی خالہ زاد بہن باہر جا چکی تھی وہ اندر آ گئے۔ بچہ کو ہاتھوں پر اٹھا اٹھا کر پیار کیا اور نازی سے چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ خدا حافظ کہہ کر چلنے لگے تو گلنار نے بھی نازی کو مجرا کیا اور بسور کر کہنے لگی۔ "گھر کب آؤ گی بیگم آپ کے بغیر گھر کاٹے کھاتا ہے ـــ نوکر میری بات سنتے نہیں کام وقت پر نہیں ہوتا، سرکار کو تکلیف ہوتی ہے۔"

"انشاءاللہ آج کے چوتھے روز آجاؤں گی گلنار جس طرح تیسے چار روز اور گھر سنبھال لے شاباش میری بچی اچھی ہوتی ہے!" اس طرح نازی نے اس کو محبت بھرے لہجہ میں سمجھایا۔

شفا خانے کی دوسری گھنٹی بجی اور ہم نازی سے رخصت ہو کر جلد جلد نیچے اُتر گئے۔ شفا خانے کی سیڑھیوں کے پاس امداد علی صاحب اور شاہ رخ خاں نے ایک دوسرے کو بڑے تپاک سے خدا حافظ کہا۔ گلنار نے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا۔ ہم اپنی اپنی موٹروں میں سوار ہو گئے۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ گھر پہنچی تو میرے دماغ میں یہ خیالات چکر لگا رہے تھے کہ "کیسی خوش نصیب ہے نازی! ماں باپ کی ایک بیٹی۔ دو بھائیوں کی اکیلی بہن۔ خدا نے شوہر بھی لاکھوں میں ایک دیا، پارسا۔ متقی، خوبصورت، پاکیزہ، سیرت، کونسی نعمت ہے جو نازی کو نہیں ملی؟ نازبردار ماں باپ تابعدار بھائی۔ عاشق زار شوہر حسین اولاد خدا اس جیسے نصیب ہر لڑکی کے کرے۔ نوکر بھی ملے تو شائستہ با ادب اور وفادار۔ گلنار جیسی نیک طینت خوش سلیقہ ملازمہ۔ حیاتی جیسی خیرخواہ جان نثار انا کسی کو ملتی ہے؟ یہ بھی خوش قسمتی ہے کہ اس کا سارا کنبہ کھاتا پیتا ہے۔ اپنے ہاں بھی اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ خسر ابھی تک بر سر روزگار ہیں۔ ساس بہو پر پروانہ وار نثار رہتی ہیں۔ سنتے تھے کہ پھوپھی ساس بن کر اور باندی سوت بن کر بہت جلاتی ہے۔ لیکن نازی کے طالع کی یاوری دیکھو کہ پھوپھی نے ساس بن کر اس مثل ہی کو سرے سے جھوٹا کر دکھایا۔

غرض شاہ رخ خاں کی شائستگی اور گلنار کی اطاعت نے میرے دل پر کچھ ایسے گہرے نقوش چھوڑے تھے کہ میں ہفتوں ان سے متاثر رہی۔ چونکہ میری طبیعت ان دنوں کچھ خراب سی رہتی تھی اور نازی زچہ خانے میں تھی۔ اس لئے اس زمانے میں نہ میں دوبارہ اس کے گھر گئی نہ وہ میرے ہاں آئی۔ ہاں خیریت پرسی کیلئے نازی نے دو دفعہ حیاتی کو بھجوا کر اور میں نے دو دفعہ شرفن بی کو بھیج کر اس کی خیریت منگوائی۔

اس ملاقات کے دو مہینہ بعد میرا پہلونٹی کا لڑکا "جواد علی" دنیا میں آیا۔ جواد کی پیدائش میری بیماری کا پیش خیمہ تھی۔ تین مہینے تک بخار نے پیچھا نہ چھوڑا۔ اس اثنا میں نازی دو تین بار مجھے دیکھنے آئی۔ میں ہر دفعہ پوچھتی رہی۔ "شاہ نور کو کیوں نہیں لائیں؟ نازی!" مگر وہ حسب عادت مسکرا کر جواب دے دیتی۔ "شاہی نے نہیں بھیجا نکہت وہ نوری کو گھڑی بھر کیلئے بھی نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتے۔"

میری طبیعت ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ صاحب کا تبادلہ اورنگ آباد میں ہو گیا۔ میں چلتے وقت نازی سے ملنے گئی۔ وہ باغ میں تھی مجھے بھی وہیں بلا لیا۔ اس کا خانہ باغ تھا تو چھوٹا سا مگر ہر چیز سے صاحب خانہ کے پاکیزہ مذاق اور سلیقہ کا پتہ چلتا تھا۔ اکثر درختوں میں اس کے محبوب پرندوں کے پنجرے ٹنگے ہوئے تھے۔ میں اور نازی ایک گھنے آم کے پیڑ کے

نیچے سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھ گئے۔ نازی بولی "جواد کو کیوں نہیں لائیں نکہت؟"

میں نے بلا سوچے سمجھے جواب دے دیا "اس کے باپ نے نہیں بھیجا نازی" لیکن میرا ضمیر میرے اس سفید جھوٹ پر مجھے ملامت کرنے لگا۔ کیونکہ نہ میرے شوہر کو جواد سے اتنا زیادہ اُنس تھا نہ وہ اُس کی کسی بات میں دخل دیتے تھے۔

کچھ دیر تک ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے نازی سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ آٹھوں پہر گلنار سے چمٹا رہتا ہے۔ شاہی اور گلنار کو بچے کیلئے اپنے دن کے چین اور رات کی نیند کی بھی پروا نہیں رہتی۔ دونوں اس ننھی سی جان پر جان چھڑکتے ہیں۔ بچہ رات کو بھی شاہی کے پاس سوتا ہے۔ اور گلنار بھی قریب ہی رہتی ہے اور اس طرح نازی کو بچے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا وہ اپنی بھوک کھاتی اور اپنی نیند سوتی ہے اور اس کو خبر تک نہیں ہوتی کہ اُس کا لختِ جگر کس طرح پل رہا ہے۔

ان حالات کو سُن کر میں نے اپنی ساری عمر میں پہلی مرتبہ نازی سے ایک حسد سا محسوس کیا۔ میں نے سوچا کہ ہم دونوں ساتھ کی کھیلی ہوئی بچپن کی سہیلیاں ہیں۔ کیا یہ قدرت کی بے انصافی نہیں کہ ساری اچھی چیزیں ایک ہی کو دے دیں۔

اگر مجھے شاہی جیسا محبت کرنے والا شوہر۔ زیب آفرین سی نازی کی پھوپھی ــــــ جیسی ناز بردار ساس اور حیاتی جیسی جاں نثار آنا نہ دی ہوتی تو کم از کم گلنار جیسی ایک وفادار خادمہ ہی دے دی ہوتی۔ میں نے اپنی مطیع اور بے چین زندگی کا مقابلہ نازی کی پُرسکون اور ناز آفرین زندگی سے کیا تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں اپنے قلب کی خاموش اور ساکن گہرائیوں میں ایک انتشار اور کرب سا محسوس کرنے لگی ......!

میں نازی سے رخصت ہو کر گھر آئی اور اس کے دوسرے ہی روز اورنگ آباد چلی گئی۔ لیکن وہاں بھی جب کبھی نازی کی قابلِ رشک زندگی کا خیال آتا تو میں تھوڑی دیر کیلئے خدا کی ناشکر گزار بندی بن جاتی۔

دو چار مہینے تک میری اور نازی کی خط و کتابت مسلسل اور باقاعدہ رہی۔ پھر میری جانب سے تساہل ہونے لگا۔ کیونکہ ایک تو خود میں خطوط کے جواب دینے میں بڑی کاہل ہوں۔ دوسرے جواد کے دانتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لڑکے سمجھدار نہ تھے۔ اس لئے اس کی تیمارداری بھی مجھی کو کرنی پڑتی تھی۔

آخر نازی کے خط بھی کم اور مختصر آنے لگے کچھ عرصہ بعد اس کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ اس کے چھوٹے بھائی شاہ زمان کو ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔ دوسرے میں بیچارے کی موت کی خبر تھی۔ دو مہینے کے بعد تیسرا خط خود نازی کی علالت کی خبر لئے ہوئے آیا۔ چوتھے خط میں نازی کے والد کی بیماری اور پانچویں میں ان کے انتقال کی اطلاع تھی۔ اس کے بعد مجھے نازی کا کوئی خط نہ ملا۔ میں نے پرسے کے خط کے علاوہ کئی خطوط لکھے۔ اپنی کاہلی کی معافی چاہی اور طرح طرح سے خط لکھنے کی التجا کی لیکن بے سود آخر میں میں بھی ہار کر چپ ہو رہی۔

دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ وقت گزرتا گیا یہاں تک کہ دو سال بعد صاحب دو مہینے کی رخصت پر حیدرآباد آئے میں نے دوسرے ہی روز پتہ دے کر آدمی کو بھیجا تاکہ نازی کو میرے آنے کی اطلاع اور مجھے اس کی خیریت کی خبر مل جائے مگر معلوم ہوا کہ اس کی رہائش کا قدیم مکان فروخت ہو چکا ہے اور اب اس میں کوئی اور صاحب رہتے ہیں پھر تو مجھے دن رات یہی فکر رہنے لگی کہ کسی طرح نازی کی جائے قیام کا پتہ چل جائے۔ اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔

ایک روز سویرے سویرے مجھے نازی کی یاد بے طرح ستانے لگی۔ صاحب دفتر جا چکے تھے۔ جواد اپنی سائیکل سے کھیل رہا تھا۔ اور میں تخت پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھی اور دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ نجانے نازی کیسی ہے؟ خدا کرے سب بھلے چنگے ہوں۔

میں اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ یکایک حیاتی

نمودار ہوئی ــــ حیاتی کو دیکھ کر میں اچھل پڑی۔ "تم کدھر آئیں حیاتی!" میں نے بے ساختہ پوچھا "نازی تو اچھی ہے؟" یہ سن کر بوڑھی انا رونے لگی۔ "تم رو رہی ہو حیاتی؟" میں نے گھبرا کر پوچھا "خیریت تو ہے نا؟" "خیریت کہاں کی بیگم!" حیاتی نے بلک کر کہا "خیریت ہوتی تو پھر کیا تھا؟" "ہائے یہ تم کیا کہہ رہی ہو انا؟" "نازی تو زندہ ہے نا" "ہاں زندہ ہے بیگم مگر مردوں سے بدتر" بوڑھی انا سسکیاں لے کر کہنے لگی۔ "کل ہی تمہارے آنے کی خبر ملی۔ رات دن تمہارا ہی کلمہ پڑھتی تھی۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔ چلو بیٹی تم خود چل کر اپنی ساتھ کی کھیلی کو دیکھ آؤ۔"

مجھ میں اب تاب کہاں تھی۔ میں نے جھٹ پٹ ایک چھٹی صاحب کے نام لکھ کر ڈاک کے اوپر رکھ دی۔ سید کو دن بھر کا کام سپرد کیا۔ جواد کو بہلا کر اماں بی کے گود میں دیا۔ اور خود انا کے ساتھ نازی کے گھر روانہ ہوئی۔

حیاتی راستہ بھر مجھے نازی کی داستانِ مصیبت رو رو کر سناتی رہی۔

اُف!! .... انتظار اور تشویش بھی کیا بُری چیز ہے .... معلوم ہوتا تھا کہ لاکھوں کوس کی مسافت ہے .... راستہ کاٹے نہ کٹتا تھا ...

میں اپنی اس دن کی حالت بیان نہیں کر سکتی وہ دن .....! میری زندگی کے منحوس ترین دنوں میں سے ایک تھا۔ ہر چیز بھیانک نظر آ رہی تھی۔ ہر شے سے نحوست ٹپکتی تھی۔ خدا خدا کر کے راستہ ختم ہوا اور ہماری گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ "شاہ منزل" کی پھاٹک میں مڑی۔ میرا دل .....! زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اتنے زور سے کہ اس کی دھک دھک کی آواز میں اپنے کانوں سے سن رہی تھی۔

باغ کے کشادہ راستوں سے گزرتے ہوئے دو تین موڑ مڑ کر ہم زنانہ دروازہ پر پہنچے۔ حیاتی نے خود جلدی سے اتر کر مجھے اتارا۔ اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے مکان میں داخل ہو گئی۔ میں ایک نیم بیہوشی کے عالم میں حیاتی کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔ آخر چلتے چلتے وہ ایک وسیع کمرے کے دروازے پر رکی۔ بھڑے ہوئے پٹ دھکا دینے پر کھل گئے۔ کمرہ قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ بیچ میں چوکیوں کے فرش پر سفید چاندنی اور کشمیری قالین بچھے رہے تھے۔ ایک طرف مخملی تکیوں سے ٹیک لگائے نازی سر جھکائے بیٹھی تھی ــ میں ... آہستہ آہستہ اس کے قریب جا پہنچی۔ لیکن اسے خبر تک نہ ہوئی۔ میں نے نزدیک پہنچ کر اسے .... غور سے دیکھا ...... آہ! کیا بتاؤں میں نے کیا دیکھا؟ وہ مستِ شباب حسینہ جو حسن اور زندگی کی جان تھی .... ہائے وہ محبت اور سرور کی دیوی جسے دیکھ کر مردہ دل بھی جی اٹھتے تھے .... اب مردوں سے بھی بدتر تھی۔ وہ قیامت زا حسن اور فتنہ ساز شباب خاک میں مل چکا تھا ..... وہ گلاب کی پتی کو شرمانے والا رنگ اور چاند کو شرمندہ کرنے والا روپ مٹ چکا تھا .... اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی ...... ان سیاہ جادو بھری آنکھوں کی شوخی اور چمک دمک رخصت ہو چکی تھی ..... اب ان کے نیچے سیاہ گہرے گہرے حلقے تھے ــ رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ گال پچک گئے تھے .... بس نازی اب یاس اور ناامیدی کی ایک تصویر تھی۔ جو ساکت و صامت میرے سامنے دھری تھی۔ ہاں! اگر لٹے ہوئے حسن اور اجڑے ہوئے شباب کی کوئی نشانی باقی تھی تو وہ اس کے سیاہ لانبے لانبے ریشم جیسے بال تھے۔ جو اس وقت بھی اس کے شانوں پہ بکھر کر اسے ایک ملکوتی شان میں پیش کر رہے تھے ..... میں کوئی دو منٹ تک اسے سکتے کے عالم میں دیکھا کی۔ پھر یکا یک خیال آیا "اف! کیا یہ وہی میرے ساتھ کی کھیلی ہوئی نازی ہے؟ جس کا ہنس مکھ چہرہ میری زندگی کا سرمایہ تھا ...... آہ! کیا یہ وہی میری پیاری سہیلی ہے جس کی خوبصورتی کے چرچے گھر گھر ہوتے تھے۔"

یہ سوچتے ہی میرا دل پھٹنے لگا اور میں بے اختیار نازی کو پکار کر اس کے پہلو میں جا گری۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک طوفان امنڈا چلا آ رہا تھا۔ "کون" نازی نے ناتواں آواز میں پوچھا "تم ہو نکہت!" ...... تم آگئیں؟...

اچھا کیا ...... میں نے تمہیں اپنا دردِ دل سنانے کیلئے بلایا ہے ......!!

"نازی ... میری نازی!! میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ..... ہائے! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں .... میری آنکھیں مجھے دھوکہ دے رہی ہیں؟ میری بچپن کی غمگسار بتا تجھے کیا ہو گیا .... تجھے میری نظر تو نہیں لگ گئی ...... ہائے ہائے ......!! نازی میں تیری گنہگار ہوں - میں تجھے ٹوکا کرتی تھی -"

"نکہت چپ رہو"! نازی نے آہستہ سے کہا" میں ڈرتی ہوں کہ کہیں میرا دم نہ نکل جائے، میرے دل کی حسرت دبی نہ رہ جائے۔ پہلے میری کہانی سُن لو - پھر رو لینا جلنا جی چاہے -"

اُس کے بعد وہ تکیوں کے سہارے بیٹھ گئی اور رنجی ہوئی آواز میں بولی -

"سنو نکہت تم کہتی ہو تم مجھے ٹوکا کرتی تھیں - تم نہیں مجھ سے سارا زمانہ جلتا تھا - آج سے ایک سال پہلے میں اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت عورتوں میں شمار کرتی تھی ...... میرا جوان بھائی مر گیا - میرا شفیق باپ مجھے ہمیشہ کیلئے چھوڑ گیا - مگر میری صحت اور مسرت میں فرق نہ آیا - اس لئے کہ میرا شوہر میرا تھا یا کم از کم میں اُسے اپنا سمجھتی تھی ... لیکن آغا کے مرتے ہی مجھ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا - شاہی گویا ماموں کے لحاظ سے چپ تھے ان کے ختم ہوتے ہی میرے راج کا زمانہ بھی ختم ہو گیا - شاہی کے انداز صاف بدلے بدلے نظر آنے لگے - لیکن ان کے متعلق میرے حسنِ ظن نے مجھے کچھ اور خیال نہ کرنے دیا - مگر کچھ عرصہ بعد ہی سارا راز کھل گیا کیونکہ شاہی کو اب اپنی بات چھپانے کی ضرورت نہ تھی ..."

یہ کہہ کر نازی نے ایک دلدوز آہ کھینچی! اور اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں - تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھول کر وہ پھر مری ہوئی آواز میں بولی -

"وہ دن میری زندگی کا منحوس ترین دن تھا نکہت جس دن مجھے اپنی بدنصیبی کی خبر ملی اور معلوم ہوا کہ شاہی نے گلنار سے نکاح کر لیا ہے - انتہائی خوش نصیب سمجھ کر ...... بدنصیب آہ!! انتہائی بدنصیب ...... سمجھنا کتنا مشکل ہے ...... یہ کوئی میرے دل سے پوچھے - نکہت میں بتا نہیں سکتی کہ میری قسمت نے دفعتاً کروٹ بدل کر مجھ میں کیا انقلاب پیدا کر دیا ......

ہاں تو مجھے ایک دن معلوم ہو گیا کہ اب میرا دیوتا! ... میرا نہیں رہا ......! میری حالت مجنوں کی سی ہو ہو گئی - مجھے سر پیر کا ہوش نہ رہا - میں بے تحاشا دوڑتی ہوئی وہاں ..... پہنچی جہاں وہ صوفے پر پیر لٹکائے بیٹھے تھے ——— میں نے اُن کے پیر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لئے اور پوچھا -

" سچ کہو شاہی کیا تم سچ مچ میرے نہیں رہے؟" وہ خاموش تھے - " .... " نہیں کہو .... نہیں کہو .....!" میں نے مجنونانہ انداز سے چلا کر کہا - "نہیں کہدو شاہی ورنہ میں مر جاؤں گی -" وہ اب بھی چپ تھے - " نہیں یہ نہیں ہو سکتا ..... تم کسی اور کے نہیں ہو سکتے - لوگ جھوٹ کہتے ہیں جھوٹ .... !! کیوں یہ سب جھوٹ ہے نا شاہی؟" میں نے عاجزی سے ان کے پیر دباتے ہوئے پوچھا لیکن وہ اب بھی چپ تھے - میرا دل! اب زور زور سے دھڑکنے لگا اس قدر زور سے کہ ... میں نے محسوس کیا وہ تڑپ تڑپ کر کہیں نکل جانا چاہتا ہے -

میں نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنا سر ان کے قدموں پر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی - انہوں نے مجھے اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور دبی آواز سے کہنے لگے -

"معاف کر دو نازی! مجھ سے غلطی ہوئی -"

میں نے محسوس کیا کہ میرا دل چلتے چلتے رک رہا ہے - میرا جسم پسینہ سے شرابور اور برف کی طرح سرد ہو گیا - اس کے بعد مجھے خبر نہیں کیا ہوا سنتی ہوں کہ میں بے ہوش ہو گئی - اگلے دن سہ پہر کو مجھے ہوش آیا - وہ میرے سرہانے بیٹھے کوئی ٹھنڈا ٹھنڈا سا عرق میرے سر میں ڈال رہے تھے - گلنار میری پائینتی کی طرف بیٹھی میرے تلوے سہلا رہی تھی - میں پلنگ پر اٹھ بیٹھی - مجھے سب باتیں یاد آ گئیں - مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا - جیسے میرے کلیجہ میں سینکڑوں سوئیاں چبھ رہی ہیں - میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی -

"کیا یہ سچ ہے گلنار" میں نے گلنار سے پوچھا "تو نے شاہی سے نکاح کر لیا ہے۔ کیا میری محبت، شفقت اور نیکی کا یہی بدلہ تھا گلنار جو تو نے مجھے دیا؟ اگر تو مجھے زہر دے دیتی تو بہتر تھا، اچھا تھا اگر تو مجھے قتل کر دیتی۔ مگر میرے دیوتا!! ...... کو مجھ سے نہ چھینا ہوتا!!!" وہ خاموش تھی۔

"آہ! یہ کس خطا کی سزا تھی شاہی" میں نے شاہی سے پوچھا "آخر میں نے کیا کیا تھا۔ تم مجھ سے کیوں روٹھ گئے؟" شاہی خاموش رو رہے تھے۔ اتنا کہہ کر نازی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تکیہ پر سر رکھ دیا .... وہ بیہوش تھی! ...... میں بڑی مشکل سے اُسے ہوش میں لا سکی۔ حیاتی نے ایک نیم گرم دودھ کا پیالہ دیا اور میں نے منتوں سے اُسے پلایا۔ بڑی دیر کے بعد اس کے حواس بجا ہوئے۔

"تم رو رہی ہو نکہت؟" اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "آہ! تم رو رہی ہو" "مجھے بھی رونا چاہیئے تھا۔ مگر میرے آنسو خشک ہو چکے ہیں۔ اب میری آنکھیں ایک آنسو بھی نہیں بہا سکتیں!" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"مگر میں اتنا روتی ہوں نکہت" اس نے پھر کہنا شروع کیا کہ اتنا شاید حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کیلئے بھی نہ روئے ہوں گے۔

حضرت یعقوبؑ کے اور بھی تو گیارہ بیٹے تھے۔ مگر میرا دیوتا ایک ہی تھا۔ واحد اور اکیلا میرے دل کی دنیا اسی کی محبت سے آباد تھی ....!!"

"تم ہی بتاؤ میں کیوں نہ روتی۔ میرا دیوتا مجھ سے روٹھ چکا ہے۔ مگر اب بتاؤ میں کیا کروں؟ بتاؤ .... جلدی بتاؤ!" اس نے اسقدر چلا چلا کر کہنا شروع کیا کہ میں ڈر گئی۔ "بتاؤ نکہت میں کیا کروں۔ میں اپنے دیوتا کو کیسے راضی کروں؟ میری امیدوں کی بستی اُجڑ گئی۔ میری محبت کی جگمگاتی دنیا تیرہ و تار ہو گئی ...... میری توقعات غلط ثابت ہوئیں ..... میرے عقیدے باطل .... میرے خیالات جھوٹ۔ اور میرا اندازہ بے بنیاد نکلا۔ میں نے دشمن کو دوست سمجھا اور ایک بے وفا کو دیوتا ..... آہ! میری سادگی دیکھو کہ میں انہیں کو اپنا سب سے زیادہ ہی خواہ اور دوست سمجھتی رہی جو در حقیقت میری تباہی کے باعث ہوئے آہ دنیا۔ مکار دنیا۔ دغا باز دنیا۔

یہ کہہ کر وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ غرض نازی کا دن بھر یہی حال رہا۔ ہوش میں آتی تو وہی داستان غم سناتی۔ یہاں تک کہ سناتے سناتے پھر بے ہوش ہو جاتی۔ آہ! بھولی بھالی لڑکی کو کتنی بُری طرح فریب دیا گیا تھا۔

جب اس نے مجھے شاہی اور گلنار کی فریب کاریوں اور دغا بازیوں کا حال سنایا کہ کس طرح وہ اسے دھوکے دیکر اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کیا کرتے اور کس طرح وہ ان کے فریب کو محبت سمجھ سمجھ کر ان پر پروانہ وار نثار ہوتی رہی تو میں حیران رہ گئی .... ! اُف! مکر بھی کسقدر خوفناک ہوتا ہے!!!

دن بھر نازی کہتی رہی اور میں سن سن کر روتی رہی۔ لیکن خود اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ اس نے مجھ سے بہ منت کہا کہ "تم میرے بعد میری داستانِ غم ضرور حوالۂ قلم کر دینا.. تاکہ مجھ جیسی کئی بھولی بھالی معصوم لڑکیاں مردوں کی جھوٹی محبت پر یقین کر کے تڑپ تڑپ کر اپنی جانیں نہ گنوائیں"

"ایک بات اور ہے نکہت!" اس نے عاجزی سے کہا "تم میری ساتھ کی کھیلی میری غمگسار سہیلی ہو۔ اگر تم کبھی کبھی میرے نوری کو دیکھ جایا کرو تو میری روح پر تمہارا احسان ہو گا۔ اب میرا ننھا ماں کی مامتا سے ہمیشہ کیلئے محروم ہونے والا ہے۔ افسوس!

یہ کہہ کر چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ پھر حیاتی سے پوچھا "پانچ بجنے میں کتنی دیر ہے حیاتی؟" "پندرہ منٹ کم ہیں نازی!" میں نے جواب دیا۔

حیاتی سے معلوم ہوا کہ شاہی روزانہ پانچ بجے نوری کو ساتھ لاتے ہیں اور شام تک یہیں رکھتے ہیں۔ لیکن بچہ اکثر گلنار کے ہاں ہی رہتا ہے۔

"تعجب ہے شاہی نے ایسا کس طرح کیا نازی؟" میں نے اپنے جذبات سے مجبور ہو کر دریافت کیا۔ "آخر وہ اُن کی شدید محبت کیا ہو گئی؟"

نازی تھوڑی دیر تک قالین کو دیکھتی رہی "بس

وہ یہی کہتے ہیں نکہت "غلطی ہو گئی بخش دو" نازی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔"

اتنے میں حیاتی نے شاہی کے آنے کی اطلاع دی ۔ میں تخت پر سنبھل کر بیٹھ گئی ۔ ان کی گود میں نوری تھا ۔ شاہی نوری کو نازی کے قریب بٹھا کر خود بھی پاس بیٹھ گئے۔ میرا سلام نیچی نیچی نظروں سے لیا اور کچھ کھوئے کھوئے سے نظر آنے لگے ۔ نازی نے کوئی بات نہ کی ۔ ہاں مایوس اور اداس نظروں سے نوری کو دیکھنے لگی ۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد شاہی بولا ۔

"نکہت بہن ذرا آپ ہی اپنی بہن کو سمجھایئے ۔ جو ہونا تھا ہو گیا ۔ اب اس طرح سوگ لے کر بیٹھنے سے کیا حاصل ؟ خود پر نہیں تو مجھ پر ۔ مجھ پر نہیں تو اپنے نوری پر رحم کریں اور اپنے آپ کو سنبھالیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ اٹھ کر دوا کی بوتل دیکھتے ہوئے حیاتی سے کہنے لگے ۔ "تم نے دوا کی ایک خوراک بھی نہیں پلائی ۔ غضب کیا ۔

"میں تو ہزار بار پلاؤں میاں مگر وہ پئیں بھی ۔ دوا کیسی بی بی نے تو کھانا پانی تک چھوڑ دیا ہے ۔" بوڑھی آنا نے آنسو بہا کر جواب دیا۔

"خدا کے لئے دوا پی لیا کرو نازی" شاہی نے منت سے کہا ۔ "کیا تمہیں دوا سے فائدہ معلوم نہیں ہوتا ؟"

نازی نے اپنی اداس آنکھوں سے شوہر کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر آہستہ آہستہ کہنے لگی ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
یاں کے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

یہ کہتے کہتے نازی کی طبیعت یکایک بگڑ گئی ۔ دن بھر کی کوفت کی وجہ یا خدا جانے دکھ کی تاب نہ لا کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ نڈھال ہو کر قالین پر گر پڑی ۔ شاہی گھبرا گئے ۔ "آپ انہیں سنبھالئے" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا ۔ "میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں" نازی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔ وہ نازی کے پہلو میں بیٹھ گئے اور حیاتی سے گھبرا کر کہا ۔

"عبدالکریم سے کہو جلد موٹر لے جا کر ڈاکٹر رام گوپال کو لائے ۔"

"آخر میری کیا خطا تھی ؟ میں نے تم سے محبت کی اور ایسی سچی محبت جیسی .... تنفس کی تکلیف سے نازی ہانپنے لگی ۔ شاہی سر جھکا کر رو رہے تھے ۔ میری اور حیاتی کی ہچکی بندھی ہوئی تھی ۔ معصوم نوری گھبرا گھبرا کر ماں کو دیکھ رہا تھا ۔

اس کی پریشانی دیکھ کر نازی نے نوری کو اپنے سینہ پر لٹا لیا اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی ۔ نوری رونے لگا ۔ "اس کو لے لو ۔" نازی نے شاہی سے کہا ۔ "میں جانتی ہوں گلنار مکار ہے ۔ اور تم اس کی محبت میں دیوانہ ہو مگر نوری کا سوائے تمہارے کوئی نہیں ۔ میں اپنے لال کو کس کے حوالے کروں ۔"

نازی کی خشک آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ۔ معلوم ہوتا تھا کہ خونِ جگر کے آخری قطرے آنکھوں میں کھچ آئے ہیں ۔

نازی (شاہی سے بھرائی ہوئی آواز سے کہا) "تمہارا لال میرے جگر کا ٹکڑا ہے ۔" اگر میرے بچے سے تم نے بے وفائی کی تو قیامت کے روز میں تمہاری دامنگیر ہونگی ۔" ہائے میرا بچہ بہت کم سن ہے ۔ یہ کہتے کہتے نازی پر کرب اور سکرات کی حالت طاری ہونے لگی ۔ میں نے اس کے سرد ہاتھوں کو گرم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں نازی ۔" حیاتی نے کہا ۔ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں ۔ نازی نے اشارہ سے منع کیا اور رک رک کر کہا "یہ .... وقت ... یٰسین .... پڑھنے ..... کا ہے ..... شاہی ..... خدا جانے معصوم بچے کے جی میں کیا آئی ۔ کہ اس نے جھک کر اپنا منہ نازی کے منہ پر رکھ دیا اور دم توڑتی ہوئی ماں نے بات کرنے کی آخری جدوجہد کرتے ہوئے کہا "میرے لال خدا حافظ !!"

نازی کے ہاتھ پیر کانپنے لگے ۔ آنکھیں پتھرا گئیں ۔ میں نے سورۂ یٰسین شروع کی ۔ اب اس پر ایک سکوت سا طاری تھا ۔ بچہ ماں کے رخساروں کے بوسے لے رہا تھا ۔

ادھر میں نے سورۂ یٰسین ختم کیا۔ اُدھر میری ساتھ کی کھیلی پیاری سہیلی۔ نازی نے آخری ہچکی لی اور اس حالت میں کہ اس کا ایک ہاتھ بچے پر تھا اور دوسرا شاہی کے ہاتھ میں اس کی پاک روح قفس عنصری سے عالم ملکوتی کی طرف پرواز کر گئی۔

حیاتی نازی کے پاؤں پر گر کر چیخنے لگی۔ "بی بی! میری بی بی" میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگی... شاہی نے رومال سے اپنا منہ چھپا لیا..... بچہ مردہ ماں کے چہرے پہ اپنا منہ رکھے امی امی کہہ کر پکارنے لگا......

پروین (حیدرآبادی)

یاد

اے گمنام ہستی۔
میں نے اکثر دیکھا ہے۔ تجھے۔
چاندنی راتوں میں۔
دور ان پہاڑیوں پر بیٹھے ہوئے۔
شاید کسی کی انتظار میں۔
کبھی کبھی تیری نرم اور نازک انگلیاں ایک ستار کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔
اور وہاں سے ایک پُر درد نغمہ نکل کر تمام فضا میں پھیل جاتا ہے۔
جب یہ پُر اسرار گیت مجھ تک پہنچتا ہے۔
تو میرے دل کی گہرائیوں سے ایک سرد آہ نکلتی ہے۔
مجھے گزرے ہوئے دن یاد آجاتے ہیں اور میں دیوانی سی ہو جاتی ہوں۔
پھر میں نکل کھڑی ہوتی ہوں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں جہاں تیرا نغمہ مجھ تک نہ پہنچ سکے۔
اے پردیسی!
میں تجھ سے درخواست کرتی ہوں۔ کہ
اپنے گیتوں سے میری مدت کی سوئی ہوئی آرزوؤں کو بیدار نہ کر
آہ۔ میں ڈرتی ہوں کہ کہیں وہ مجھے پاگل نہ بنا دیں۔

پاگل پریمی

خواب کی باتیں

سارا دن کام سے بغل گیر رہا، اور شام تک تکان مجھ میں خوب خوب بس گئی۔ سروش خوابستان کی سرحد سے، نندیا پور کے مینار پر بیٹھا ہوا تاک رہا تھا۔ میری حالت بھی اُس کے نظر پڑی۔ میرے ننھے سروش ہی کی باتوں کا رنگ لئے ہوئے تھے، اور وہ مجھ پر مہربان تھا۔ اس نے مجھ میں تکان کو لیا ہوا دیکھا، اور خواب آور کو بھیج کر ایک گلبدن کو منگا بھیجا، نیند کی دیوی کو۔

دیوی خمارستان کے بنے ہوئے، دھندلے سے رتھ پر سوار، مینار کے پاس پہنچی، اور سروش کے احکام کو اپنے کانوں کی زینت بنا کر، فضائیں، ہواؤں کے ساتھ اچھلتی کودتی، رقص کرتی، اور بادلوں میں سے ہوتی ہوئی، میرے دروازے پر آئی اور کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے لبوں کو موڑ کر سیٹی سی بجانے لگی، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ڈھیلے ڈھالے سفید، بکھرے ہوئے، نرم، ریشمی پیراہن کو سنوارتی جانے لگی۔

میں اُٹھا اور دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی آمد پر حیرانی ظاہر کرنے لگا، گویا مجھے اس کے آنے کی توقع نہ تھی۔ لیکن میرا دماغ فریب کے ساتھ کھیل رہا تھا، (کیوں کہ مجھے ہر شام دیوی کی آمد کی توقع تھی۔ لیکن میرا دماغ فریب کے ساتھ کھیل رہا تھا، اور وہ شام بھی ایسی ہی شاموں سے ایک تھی) لیکن ان دیویوں کے ساتھ جب تک انسان یونہی اجنبیت کا سلوک نہ کرے، بازی گاہِ حیات میں نیپ نہیں سکتا۔

میں نے حیرانی ظاہر کی اور جب وہ مسکرانے لگی تو میں بھی مسکرا دیا اور اس کی رضامندی پاتے ہوئے، میں نے اس کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اُسے پہلو میں لے لیا۔ اور دونوں اکھٹے آہستہ آہستہ بستر کی طرف چلنے لگے، اور وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ لیکن ابھی تک ہاتھ ایک دوسرے کی بغلوں ہی میں تھے۔

اس کی مخمور آنکھوں کی نظریں مجھے مدہوش سا کرنے لگیں اور آہستہ آہستہ میرا منہ اس کے لبوں تک پہنچنے لگا ـــــ اور پھر لب مل گئے۔ نہ جانے کیوں، لیکن اب مجھے ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آنے لگی، اور میری ہستی کا سماں بدل گیا، زمان و مکان نے ایک نیا لباس پہن لیا۔

نیند کی دیوی فرش پر بیٹھی بربط بجا رہی تھی۔ اور میں اپنے کانوں کے سیپیوں میں سروں کے موتیوں کا خزانہ جمع کر رہا تھا ـــــ تاروں میں سے راگ نکل رہا تھا۔

"اس سنسار میں سکھ کے دھیان گھیر ڈالے رہتے ہیں،
سپنوں میں بھی سکھ کے دھیان سندر ناچ دکھاتے ہیں،
کاش! یہی سب سکھ کے دھیان جیون کی پھلواری ہیں
پیراہن سچائی کے، تن پر پہنیں آ جائیں!"

یہ راگ میری حالت کو ظاہر کرتا تھا، جاگتی دنیا میں خواب لیکن زندگی کے صحیفے کا واقعہ نہ تھا، نہ ہونا تھا۔ میں ہزاروں بار اس کے، اس خواب کے حقیقت ہو جانے کی تمنا سے لپٹا رہتا تھا، لیکن یہ ہم آغوشی بے کیف ہی رہتی تھی، آرزو بر نہ آتی تھی اور میرے خیال بے تعبیر خوابوں تک پہنچ کر ہی رُک جاتے تھے۔

میں فرش پر بیٹھا تھا، اور نیند کی دیوی مگن ہو کر ساز بجائے جا رہی تھی۔ میری تمنا میرے عین مقابل بیٹھی میرا حال دیکھ رہی تھی اور میں اپنے کو آنند ساگر کی ٹھہری ہوئی، مچلتی ہوئی لہروں میں درد سے ملی ہوئی خوشی کے ساتھ بہتا چلا جاتا محسوس کر رہا تھا، نیند کی دیوی کے راگ ایک ایک پل کے بعد اپنے پہلے پیراہن اتار دیتے تھے اور نئے لباس زیبِ تن کر لیتے تھے۔ راگوں کے عریاں بدن دیکھ کر، میری تمنا کے جذبات میں ہیجان پیدا ہونے لگا تھا، اس لئے وہ اُٹھ کر کمرے سے

باہر چلی گئی - اور راگوں نے اس کے جانے کے بعد پریم اور درد کے سیئے ہوئے پہناوے اتار ڈالے اور نئے خبط فریب کے تیار کئے ہوئے کپڑے پہن لئے، اور میں جو پریم گیانی تھا - نرا نادان بنتا جانے لگا - ساز کے راگوں کی بھولی بھولی باتیں سُروں کی لہروں کے ساتھ مایا کے پیراہنوں کی خوشبوؤں سے مست کر کے، میری سمجھ کو ہم آغوش بنا کر لے گئیں، اور نہ جانے کس بندی خانے میں جا پھینکا -

اتنے میں دروازہ کھلا، اور میری تمنا دو اجنبیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی - اُن کے جسم دُھندلے دُھندلے تھے - اور اندر آ جانے پر (جبکہ نیند کی دیوی نے نغمہ سازی بند کر دی تھی) میری تمنا بولی - "حاضرین! بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ دو روحیں آج کی شب بسر کرنے کیلئے یہاں آئی ہیں، اور یہاں رہنے کے عوض میں ہمیں اپنی باتوں سے محظوظ کرنے کا وعدہ کرتی ہیں -"

میں نے یہ شرط قبول کر لی، اور نیند کی دیوی نے بھی اور پھر ہم سب دائرہ سا بنا کر فرش پر بیٹھ گئے اور میں نے نیند کی دیوی سے فرمائش کی "من موہنی! اس سمے میں، جبکہ دو آتمائیں، شاید مہا آتمائیں ہمارے ہاں رات بسر کرنے آئی ہوئی ہیں، کوئی اچھا سا راگ سنا -"

نیند کی دیوی باقی حاضرین کی رضامندی پا کر اُٹھی، اور ساز لیکر بیٹھ گئی - انگلیاں ہلیں، تار لرزے اور نغمہ پیدا ہوا -

نغمہ

میرے من کے سنگھاسن کی رانی! ــــ آ، اور میرے غموں کو اپنی ہلکی ہلکی اور میٹھی رسیلی مسکراہٹوں میں بانٹ لے - تیرے پیچھے اب کوئی نہیں جو من کی سُنے اور من کی سنائے، جگ دیکھ لیا، اور سکھ کے سپنوں سے مایوس ہو کر بیٹھ رہا - کیا کہوں؟ تیرا کہا نہ کر سکا، اور پرمیشر کی دیا سے بے آس ہو گیا - آہ! اس سنسار چکر میں میرا کوئی نہیں، جگ بیری ہے اور من تیرے پاس - اتنا وقت بیت گیا جو بیتنی تھی سو بیت چکی، اب بچنے کی سوچ کیسے کروں؟ سب تدبیریں اُلٹی ہو گئیں اور میں وقت کی ندی میں بہتا بہتا پاپ کے کالے ساگر میں گر چکا - پریم کی ساری مایا، تھوڑی تھوڑی کر کے آنکھوں سے نکل رہی ہے، تیرے صاف اور دلکش سپنے کیلئے آنکھوں کے موتیوں سے ہار بناتا رہتا ہوں - سیدھی راہ نہیں ملتی، سوجھ ہی نہیں رہی کہ منزل پر پہنچ سکوں - دکھائی کیسے دے! آنکھوں کا نور تیرے ہار کے موتیوں میں جا چکا - رس بن بن کر - میں اندھا ہو گیا - مجھے ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا محسوس ہو رہا ہے - ماتا بھی بھولی مجھے پژمردہ نظروں سے دیکھ رہی ہے - کیوں نہ دُکھی ہو؟ اس کا ایک بیٹا میں، آنکھوں کا نور کھو بیٹھا - سمجھ مجھے کہتی ہے - میں بھی سوچتا ہوں، کیوں نہ میں بھی بے وفا ہو جاؤں؟ کیوں نہ محبت کی زنجیریں کاٹ ڈالوں؟ ہاں ــــ محبت کی زنجیریں! ــــ پریتم پیاری! تُو سپنوں میں آئی، اور میرے من کے سنگھاسن پر بیٹھ گئی - رُوپ کی کرنیں بھی بکھیریں، اور باتیں بھی کیں - وہ باتیں تیرے ہونٹوں کی پنکھڑیوں سے لگ کر پھول بنتی گئیں - اور پریم کی دیوی نے ان پھولوں کو گوندھ کر زنجیریں بنا دیں، اور اُن محبت کی زنجیروں میں مجھے باندھ لیا اور مجھے تیرا اسیر بنا دیا - ایسی غلامی پہ ہزاروں آزادیاں نثار! ــــ ہاں، ایک کامنا ہے، وہ یہ کہ پرمیشر کرے تو بھی کسی ایسی ہستی سے دوچار ہو، جس کے نینوں کی بجلی میری ہی طرح تیرے من کے خرمن کو بھی جلا کر خاک کر ڈالے اور پھر تو وہ راکھ اپنی آنکھوں میں لگا کر انہیں زیادہ رسیلا بنا لے، اور تجھے کچھ دکھائی دے سکے، تو میری حالت کو دیکھ سکے اور سمجھ کر میرے دکھ کو پہچان سکے - پرمیشر کرے تجھے بھی کسی سے پریم ہو اور تو بھی وہ دکھ سہے جو میری قسمت کا حصہ ہیں -"

نیند کی سندر دیوی یہ راگ سُنا کر چُپ ہو گئی، ذرا دیر سب چپکے بیٹھے رہے، اور پھر ایک روح بولی "ہم نشینو! یہ راگ مجھے کچھ یاد دلا گیا، اجازت ہو تو سب سے کہوں؟"

دوسری رُوح میری طرف اشارہ کر کے بولی "محفل کے صدر سے پوچھ لو، سب کی وہی رائے ہو گی -"

میں یہ سُن کر بول اُٹھا "ہاں ہاں، میرا خیال ہے، کسی کو اعتراض نہ ہو گا -"

میری تمنا مُسکرائی "اعتراض؟ ــــ اعتراض کا خیال کیسا؟"

نیند کی دیوی بولی "اور ہو بھی کیوں؟"

اور روح نے آپ بیتی کہنی شروع کی :-

"یہ تب کی بات ہے، جب میں ایک جسم میں تھی، اور میرے اس جسم سے آرزو کی خوشبوئیں آیا کرتی تھیں، اور میں خواہشات کے پیراہن اور تمناؤں کے زیورات سے اپنے جسم کو سجایا کرتی تھی۔

"ابھی جبکہ قدرت کی دیوی نے میرے عریاں جسم کو جوانی کی ہلکی پھلکی، باریک اور رنگیں، ریشمی چادر سے نہ ڈھکا تھا تو میں بچپن کے دلکش صحرا میں کھڑی تھی ——— بڑا عرصہ جو ایک لمحہ بھی ہے، میں یونہی کھڑی رہی، آرزو کی پریاں آئیں اور مجھے .... چوم کر کہتیں 'ابھی تو ہم تمہارے جذبات میں ہیجان نہیں لا سکتیں، لیکن جب تمہارا یہی سینہ اپنی حالت تبدیل کر لے گا، تو ہماری کامنا نقاب اُلٹ کر مراد مندی کی پھلواری میں زمانہ کو طرزِ رفتار سکھائے گی۔

اور ایک روز سچ مچ اُن کی کامنا مراد کی پھلواری میں زمانہ کی ہم جلیسی کرتی ہوئی، جنت نگاہ بناتی محوِ خرام نظر آئی، اور

"قدرت کی دیوی نے جلدی سے میرے عریاں جسم کو شباب کی ہلکی پھلکی، باریک، ریشمی اور رنگین چادر سے ڈھانپ دیا، اب میں جوان ہو چکی تھی - یہ میں خود بھی جانتی تھی اور دیکھنے والوں کی نظریں بھی مجھے میری جوانی کا احساس دلاتی تھیں -

"اور جب میرے نین پورے مدھ بھرے ہو گئے اور میرے لب بھی، تو زندگی نے مجھے اپنے ایک محبوب واقعہ سے ملایا، اور میں ایک نوجوان سے ملی - جس نے مجھے اپنی شکستہ دلی کی داستان، اس طرح سنائی، ایک گیت میں، ایک پرانے ساز کے ساتھ ؛

"جو کچھ مجھ پر کل بیتی وہ مجھے خوب یاد ہے،

"اور جو کچھ آج گذرے گی، وہ بھی میں سنا سکتا ہوں -

"کیونکہ جو کچھ آج گذرے گی وہی کل بیتی تھی، اور جو کچھ آج بیتے گی، وہی کل گزرے گی -

"کل صبح جب سورج نکل کر ذرا اونچا جا چکا تو میں اُس کے محل کے دروازے پر جا کھڑا ہوا،

"جا تو رات کو بھی سکتا تھا، لیکن نہ گیا - اس لئے نہیں کہ سو نا رہا، بلکہ وہ محوِ خواب تھی، اور اسے جگا کر بے آرام کرنا، یہ میرا ایمان نہیں -

"خیر، محل کے دروازے پر جا کھڑا ہوا، اور وہیں چپکا کھڑا رہا - ذرا دیر بعد اُس کی سواری نکلی - جب میرے قریب آئی تو میں نے حسرت اور شوق سے بھرپور نگاہیں اس پر ڈالیں - اُس نے بھی میری طرف دیکھا، اور یہ سمجھ کر کہ بھکاری ہے، اپنے ریشمی بٹوے میں سے کچھ نقدی نکالی اور میری طرف پھینک دی، میں تذبذب میں پڑ گیا - کیونکہ میری تمنا کا مرکز وہ نقدی نہ تھی - اور اسے یونہی گرا بھی نہ رہنے دے سکتا تھا، کیونکہ اُن ہاتھوں کی تقدیس کو ٹھیس پہنچنے کا خدشہ تھا - جوں توں کر کے میں نے زمین سے نقدی بھی اٹھالی اور اس سے یہ شعر کہہ کر اپنی تمنا بھی ظاہر کر دی :-

حسن کی رانی! اتنا زمانہ گذر گیا، اور تم عشق کی تخلیق کرتی رہیں -
لیکن کیا یہ بھی نہ جانا کہ شکستہ دل مایوسوں کی تمنا کیا ہے؟ ——
بھکاری تو پریم کی بھیک چاہتا ہے -

"اس نے یہ سنا اور مسکرا کر یوں بولی اور چل دی :-

پریم کے بھکاری! اتنا زمانہ گذر گیا اور تم حسن سے رس پاتے رہے، لیکن کیا یہ بھی نہ جانا کہ حسن کی گہرائی کو پہنچ سکو؟ —
حسن تو تکمیل نہیں جستجو ہی کا نام ہے،

اس کی سواری چلی گئی، اور میں سوچتا ہوا لوٹ آیا، ناکام لیکن مطمئن -

"یہی ہے جو مجھ پر کل بیتی تھی، اور آج بھی یہی گزرے گی،

"جو مجھ پر کل بیتی وہ مجھے خوب یاد ہے،

"اور جو کچھ آج گزرے گی وہ بھی میں سنا سکتا ہوں "

یہ گیت اس نوجوان نے مجھے سنایا اور پھر وہ "ناکام" اور میں "انجان"، اکٹھے رہنے لگے، اور جب زندگی ہم سے جدا ہو گئی اور ہمارے جسموں کو بھی ساتھ لیتی گئی، تو ہم فضا میں، دو آوارہ روحیں بن گئے، اور ہم نے خانہ بدوشی اختیار کر لی! ———

اس داستان کا آخری ٹکڑا سنانا باقی رہ گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ میرا وہ نوجوان ہم عصر یہی دوسری روح ہے، جسے آپ دیکھ رہے ہیں!"

ہم سب ذرا سے حیران ہوئے، اور پھر کچھ دیر، سوچ بچار کی دیوی کو، اپنے خیالوں کی پری بناتے رہے، پھر دوسری روح، وہ "ناکام صنم آشنا" بولا:-

"میرے ذمے بھی کچھ سنانا ہے، لیکن سنانے کا زمانہ اب گیا گزرا ہو چکا۔ ہاں تب کچھ لطف تھا کہ میں حالِ دل سنایا کرتا تھا، اور "وہ" سنا کرتی تھیں۔ لیکن کچھ نہ سنانا یا بتانا، فرض ٹھہر چکا ہے، اس لئے چند موتی بتاتا ہوں۔" جو آپ دیکھیں، یعنی سنیں۔"

یہ کہہ کر اس نے ساز اٹھایا، سُر درست کئے، اور یہ گیت گایا، جو قدم قدم پر مختلف ہے، لیکن جس کا مطلب ایک ہی ہے۔

وقت گذرتا گیا۔

مزدور وقت، ماضی کی کان کی گہرائیوں میں جاتا رہا۔

وقت کی دیوی، سانس کے ذریعے، لمحوں کو اپنی بین میں بھرتی رہی، اور مستقبل کے نغمے، ماضی کے گیت بنتے رہے۔

وقت کا شکاری، مستقبل کے لمحوں کے تیر، سالوں کی کمان میں رکھ رکھ کر، ماضی کی فضا میں چھوڑتا رہا۔

وقت کا سورج، مستقبل کے پورب سے نکل کر، ماضی کے پچھم میں چھپ جاتا رہا۔

لمحوں کے ذرے، وقت کی زمین سے اڑتے رہے، اور برسوں کی ہوا انہیں ماضی کے آسمان تک لیجاتی رہی۔

مستقبل کی ندی، زور و شور کے ساتھ، ماضی کے ساگر میں گرتی رہی۔

وقت کا پانی مستقبل کے چشمے سے، پھوٹ پھوٹ کر، ماضی کی چٹان پر دھارے بناتا رہا۔

وقت کا ماہی گیر مستقبل کے ساگر سے، لمحوں کی مچھلیاں لا لا کر، ماضی کی منڈی میں بیچتا رہا۔

وقت کا کسان، ماضی کی زمین میں، لمحوں کے بیج بوتا رہا!

مستقبل کے ساحل سے آئے ہوئے، وقت کے جہاز، ماضی کے جزیرے کے .... گرد جمع ہوتے رہے۔

وقت کی مالن، ماضی کی دلہن کیلئے، مستقبل کے باغ سے، لمحوں کے پھول لے لے کر، برسوں کے ہار تیار کرتی رہی۔

مستقبل کی رات میں، لمحوں کے چمکتے ہوئے ستارے، ماضی کے دن میں غائب ہو گئے۔

مستقبل کے سمندر سے آئے ہوئے، برسوں کے بادل، ماضی کی سرزمین میں برستے رہے۔

مستقبل کے کنوئیں سے، وقت کا پانی، ماضی کی کھیتی سیراب کرتا رہا۔

وقت کا ساز، مستقبل کی بیلوں میں لگے ہوئے، لمحوں کے انگوروں کو نچوڑ نچوڑ کر ماضی کے میخانے میں لیجاتا رہا۔

وقت کی دوشیزہ، مستقبل کے باسی، نوجوان برسوں کے لمحوں کے دلوں کو، ماضی کی نظروں کے تیروں کا نشانہ بناتی رہی

وقت کی ٹکسال میں، مستقبل کی کانوں سے لائی ہوئی، برسوں کی چاندی کے، لمحوں کے سکے، ماضی کے ملک میں چلتے رہے

فرقت زدہ وقت کے ہم نشیں، سال، اس کے مستقبل کے نینوں سے، لمحوں کے بہتے ہوئے آنسو ماضی کی دیوی کی ساری سے پونچھتے رہے۔

وقت کی شمع میں، مستقبل کے لمحوں کے جلے ہوئے پروانوں کی راکھ، ماضی کے ڈیوٹ پر جمع ہوتی رہی۔

وقت کا لکڑہارا، مستقبل کے جنگل سے، لمحوں کے پیڑ کی کاٹ کر لائی ہوئی لکڑیاں "پراچین کال" کے باشندوں کے ہاتھ بیچتا رہا۔

وقت کا نوجوان بیٹا مستقبل، ماضی کی دوشیزہ کے رخساروں پر لمحوں کے بوسے ثبت کرتا رہا۔

. . . .

اس "ناکام صنم آشنا" روح نے یہ رنگ برنگے یکرنگ موتیوں کے ہار کا گیت ہمیں سنا کر ختم کر دیا، اور پھر، دونوں روحیں، یکدم آگاہ کئے بغیر اور رخصت لئے بغیر چل دیں۔ کیونکہ روحیں آزاد ہوتی ہیں، اور ہم، فانی حیوانوں کے رسمی تکلفات سے متنفر!

اور پھر نہ جانے کیا ہوا، کہ میری تمنا بھی غائب ہو گئی، اور کچھ دیر، میں کائنات کی ہر شے سے بے خبر پڑا رہا۔

اور پھر مجھے نیند کی دیوی کی آواز بھی، کہیں، دور سے، نامعلوم گہرائیوں سے آتی ہوئی معلوم ہونے لگی، اور

سورج نکل آیا، اور
میں جاگ پڑا!! ـــــ اور پھر کام میں مشغول ہو گیا۔
کہ تکان مجھ میں خوب خوب بس جائے، اور گردش مجھ پہ مہربان ہو کر، نیند کی دیوی کو میرے تصور کی محفل میں لے آئے،
ـــــ تاکہ میں کسی اور روح کا فسانہ سن سکوں!!!

میراجی

غزل

میری ہستی میں ہیں انوارِ ازل آئینہ کار
اپنی منزل کو وہیں پایا جہاں سمجھا تھا میں
بحرِ ہستی میں حباب آسا نہ تھا جس کو قیام
اس کو نادانی سے عمرِ جاوداں سمجھا تھا میں
ڈوبتے ہی موج میں ساحل نظر آیا مجھے
عشق کے دریا کو بحرِ بیکراں سمجھا تھا میں
آ رہی ہے دور سے کوئی صدائے درد ریز
وائے نادانی اسے اپنی فغاں سمجھا تھا میں
وہ مرے پُرسوز دل کی آتشیں تنویر تھی
جس کو گردوں پر شبِ غم کہکشاں سمجھا تھا میں
برقِ خرمن سوز کا اک آتشیں گہوارہ تھا
شومیٔ قسمت سے جس کو آشیاں سمجھا تھا میں
اب کھلا مجھ پر کہ ہوں میں بھی ترے جلووں کا عکس
خود کو تیرے اور اپنے درمیاں سمجھا تھا میں
گریہ تھی شبنم، جنوں تھی مسکراہٹ پھول کی
کیوں فضائے رنگ و بو کو گلستاں سمجھا تھا میں
اک نشاطِ عارضی نے کر دیا زار و نزار
چار دن کے ولولوں کو جاوداں سمجھا تھا میں
دل کی دنیا تیری غفلت سے ہوئی زیر و زبر
ہائے اس دنیا کا تجھ کو پاسباں سمجھا تھا میں
غور سے دیکھا تو اک مجذوب سے بڑھ کر نہ تھا
کیوں جنابِ دوست کو اک نکتہ داں سمجھا تھا میں

دوست جالندھری

ضبطِ غم

خدا معلوم میرے عشق کا انجام کیا ہوگا
تڑپتے ہی تڑپتے چاندنی راتیں گزرتی ہیں
قیامت کی طرح ساون کی برساتیں گزرتی ہیں
جو ہو میری طرح مضطر اسے آرام کیا ہوگا

مجھے رسوا کیا تیری محبت نے زمانے میں
مجھے مرنے کی حسرت ہے مگر میں مر نہیں سکتا
شکایت تیرے اس جور و ستم کی کر نہیں سکتا
کہ تو مسرور ہوتا ہے مرے پیہم ستانے میں

دلِ مجبور کو میں ضبط کی تلقین کرتا ہوں
کہ تیرے حسنِ عالم سوز کا چرچا نہ ہو جائے
تو اے! پردہ نشیں پردے ہی میں رسوا نہ ہو جائے
بڑی مشکل سے خود کو مائلِ تسکین کرتا ہوں
کہ ہونا مائلِ تسکیں نہیں آساں محبت میں
عیاں ہو کر ہی رہتا ہے غمِ پنہاں محبت میں

مرزا اسمٰعیل برلاس

اندھے کی دُعا

یا الٰہی! اسیر روز و شب سے کیا مقصود ہے
کس قرینے کا طلسمِ بزمِ ہست و بوُد ہے

روز و شب سنتا ہوں جن کو کیا ہے ان باتوں کا راز؟
صبح کے جلووں کا مقصد، چاندنی راتوں کا راز

کون گردوں پر جلاتا ہے ستاروں کے چراغ
کون بھرتا ہے مئے شبنم سے پھولوں کے ایاغ

آسماں کہتے ہیں کس کو، کہکشاں کیا چیز ہے
یا الٰہی! چاند اور سورج میں کیا تمیز ہے

کس طرح دریا کے سینے سے اُبھرتے ہیں سحاب
کس طرح دوشِ ہوا پر رقص کرتے ہیں سحاب

کیا سمندر واقعی پانی کا اک انبار ہے؟
آسماں کا شامیانہ بے در و دیوار ہے

حسُن کیا شے ہے کہ جس کی ایک ہلکی سی جھلک
قلبِ انساں میں اُٹھا دیتی ہے اُلفت کی کسک

جب کوئی تعریف کرتا ہے کسی دلدار کی
تھرتھرا اٹھتی ہے رگ رگ میرے جسمِ زار کی

مضطرب ہو کر مری بے نُور پُتلی بار بار
جھانکنے لگتی ہے چشمِ کور سے دیوانہ وار

یا الٰہی میرے اندھے پن کا کیا مفہوم ہے
نُور کی دولت سے میری آنکھ کیوں محروم ہے

میری آنکھوں کے چراغوں کو بجھا رکھا ہے کیوں
مجھ سے حیرت گاہ عالم کو چھُپا رکھا ہے کیوں

یا الٰہی دے جہاں کی طرح بینائی مجھے
کر نہ دے اک دن جنونِ شوق سودائی مجھے

جز نظر جانِ حزیں اک مستقل آزار ہے
زندگی بے لطف ہے، بے کیف ہے، بیکار ہے

باقی صدیقی

مُجرم

افرادِ تمثیل :-

پادری
مجرم
پرسم
میری
سپاہی وغیرہ۔

زمانہ :- گذشتہ صدی کا آغاز
جگہ :- پیرس سے تیس میل جنوب کی طرف ایک گاؤں۔

منظر :- پادری کے گھر کا ایک خوبصورت کمرہ۔
پرسم اور میری موجود ہیں۔

وقت :- دس بجے رات۔

پرسم :- میری شوربا ابھی گرم نہیں ہوا کیا ؟"

میری :- جی نہیں۔

پرسم :- چولھے میں لکڑیاں تو چھنٹ رہی ہیں۔ سینک ناکافی ہے۔

میری :- جی.....

پرسم :- تو دو ایک لکڑیاں اور لگا دے نا۔ کھڑی منہ کیا تک رہی ہے۔ . .

میری :- لیجئے۔

پرسم :- گیارہ بجنے کو آئے ہیں۔ مگر بھائی جی کا کچھ پتہ نہیں.... میری؟

میری :- جی۔

پرسم :- "وہ کچھ کہہ کر نہیں گئے، ہوں ؟"

میری :- اونھوں۔

پرسم :- آخر تمہیں بتایا تو ہوگا کہ کہاں جا رہے ہیں۔

میری :- "جی...."

پرسم :- (غصہ سے) کیا انٹ سنٹ بکے جا رہی ہو۔ بتاتی کیوں نہیں پتہ ہے تو ؟

میری :- یہ بھی ایک ہی کہی، پوچھتیں تو بتاتی۔

پرسم :- کہیں تیرا سر تو نہیں پھر گیا۔

میری :- اور آج ہی صبح تو آپ نے کہا تھا کہ میری باتوں میں خواہ مخواہ دخل نہ دیا کرو۔

پرسم :- (جل کر) اوہ رے۔ کیا کہنے تیری عقل کے۔ کچھ سوچا تو کر سمجھا تو کر...... میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ.....

میری :- (بات کاٹ کر) مگر.....

پرسم :- شاباش! شاباش۔ اب یہ "مگر" کہنے کی بڑی ضرورت تھی۔ تو یہ میری۔ کس کے پلے پڑی ہوں۔ اری میں تو صرف اتنا پوچھ بیٹھی تھی کہ بھائی جی کہاں گئے ہیں.......

میری :- ہمارے ہاں ہی تو گئے ہیں۔

پرسم :- (چونک کر) تمہارے ہاں ؟

میری :- میری ماں کی طبیعت کچھ دنوں سے خراب ہے نا۔

پرسم :- ہوں۔ ان سے تو اس سردی میں بھی اندر نہیں بیٹھا جاتا۔ معلوم نہیں جسم کس پتیسہ کا ہے۔

میری :- (جان بوجھ کر) جی۔ (پھر جلدی سے) بائی جی شوربے کو جوش آرہا ہے۔

پرسم :- تو اتار لے ہنڈیا۔ اچھا ادھر لا... تو بھاگ کے باورچی خانے سے نمکدان لے آ... وہ چاندی کا..."

میری :- چاندی کا؟

پرسم :- ہاں بابا ہاں... جا میرا دماغ نہ کھا۔

میری :- وہ... وہ تو اب کسی اور کے گھر پڑا ہوگا۔ بیچ دیا تھا۔

۱؎ اس ڈرامے کا پلاٹ وکٹر ہیوگو کے شہرۂ آفاق ناول "لامزریبلز" سے اخذ کیا گیا ہے۔ (نازمن مکین)

مقدس باپ نے۔

پرسم:- (حیرانی سے) کیا کیا؟ حواس تو ٹھکانے ہیں تمہارے؟"

میری:- مقدس باپ نے کہا اور میں نے موسیو گریسیس کے ہاتھ بیچ دیا۔

پرسم:- بھئی واہ یہ بھی خوب رہی۔ تو گویا میری رضامندی کے بغیر ہی ایک چیز اڑنچھو ہو گئی۔

میری:- میرا تو اس میں کوئی قصور نہیں۔ میں تو حکم کی بندی ہوں۔ آپ کا کام کہنا ہے اور میرا کرنا۔

پرسم:- (غصہ سے) کیا ضرورت آ پڑی تھی آنجناب کو کہ نمکدان کے بھی پیسے کھرے کر لئے۔

میری:- (متانت سے) ایک غریب بڑھیا کے مکان کا کرایہ ادا کرنا تھا۔ مالک مکان نے غریب کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔

پرسم:- (ترشی سے) ہاں اس کا کرایہ دینے کو بھی تو بھائی جی ہی رہ گئے تھے۔ لوگ دیکھتے ہیں سیدھا سادا، بھولا بھالا آدمی ہے۔ مزے سے اُلو سیدھا کر لیتے ہیں اپنا۔

میری:- مگر میں تو آئندہ ایسی باتوں میں محتاط رہوں گی۔

پرسم:- اچھا... خیر... ان کیلئے کھانا دانا چن دو۔ آتے ہی ہوں گے۔

میری:- ابھی لیجئے۔

(پادری داخل ہوتا ہے)

پادری:- (زندہ دلی سے) او ہو بھئی۔ یہ جگہ تو گرم ہے۔ باہر تو ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکے بدن کو چھلنی کئے دیتے ہیں۔

پرسم:- خیر سے آ گئے آپ۔ کب کی بیٹھی انتظار کر رہی ہوں۔

پادری:- (مسکرا کر) اچھی بہن بھی تو تم ہی ہو نا پھر! بھئی میری کی ماں کچھ بیمار سی ہے نا۔ اس کی خیریت پوچھنے گیا تھا۔ یہ زندگی کا الٹ پھیر بھی کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ ابھی کل کی بات ہے انہیں کے دن بڑے چین سے گزرتے تھے۔ مگر میری کے والد کی وفات پر قسمت کی دیوی تو گویا ان کیلئے اندھی ہو گئی اور اب بیچاروں کے ہاں سوکھے ٹکڑوں کی نوبت آ پہنچی ہے....

پرسم:- (لمبی سانس کے بعد) اللہ کی باتیں اللہ ہی جانے۔

پادری:- (چونک کر) اوہو! کتنی بڑی غلطی ہوئی۔ بھول ہی گیا میری جاؤ بیٹیا تمہاری ماں تمہیں بلا رہی تھی۔ دیکھو اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ بیمار کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا بھی علاج کا ایک حصہ ہے۔

میری:- بہت خوب۔ مقدس باپ۔ کام کاج تو ختم ہو ہی چکا ہے۔ میں جاتی ہوں۔

(میری جاتی ہے)

پادری:- یہ آج کیا بات ہے پرسم! بڑے گہرے سوچوں میں ڈوبی ہوئی ہو۔ تمہارا چہرہ.......

پرسم:- (بات کاٹ کر متانت سے) میں سوچ رہی ہوں کہ یہ لوگ بھی اچھے پنجے جھاڑ کے آپ کے پیچھے پڑے ہیں۔ کیا مجال ہے جو کہیں رات کو بھی کمر سیدھی کرنے دیں آپ کو۔

پادری:- (لجاجت سے) پرسم ہمارا کام خلقِ خدا کی خدمت کرنا ہی تو ہے (پھر ذرا ٹھہر کر) آہ۔ میرے مادرِ وطن فرانس کی ڈوبتی ہوئی نیا گہرے سمندر کی منجدھار سے نکلنے کی بیکار کوشش کر رہی ہے۔ بہت ممکن ہے توازن قائم نہ رہے اور کشتی جس کے نکلنے کی فی الحال مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ڈوب ہی جائے.... ہمیں عوام کی حالت کو سنوارنا ہے پرسم!

پرسم:- یہ "عوام" ہی تو ہماری لٹیا ڈبو کر رہیں گے۔ کیا کہنے اس "حالت سنوارنے کے۔"

پادری:- عزیز بہن میں تمہارا مطلب سمجھ نہیں سکا۔

پرسم:- (ذرا تیزی سے) وہ کل آپ نے کسی کا کرایہ ادا کرنے کیلئے میرا چاندی کا نمکدان ہی فروخت کر دیا۔

پادری:- مجھے سخت افسوس ہے پرسم۔ مگر انسان کو کسی غریب کی مشکل حل کرنے کیلئے اپنے نیک اور پاک ارادے ......"

پرسم:- جانے یہ "نیک اور پاک ارادے" ابھی ہمیں کیا کیا دکھلانے والے ہیں۔

پادری:- (ہنس کر) میری تو جان بھی انہیں کاموں کیلئے ہے۔

پرسم :۔ خیر آپ کھانا کھائیں ۔ مجھے نیند آرہی ہے ۔

پادری :۔ تم جاؤ ۔ مجھے بھوک نہیں ۔

(پرسم کے جانے کے بعد پادری میز کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ کر کتاب کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہے ۔ ایک مجرم خنجر ہاتھ میں لئے دبے پاؤں پچھلے دروازے سے داخل ہوتا ہے)

مجرم :۔ (خنجر پادری کی گردن پر رکھتے ہوئے) خبردار اگر تمہارے منہ سے ابھی آواز نکلی تو ابھی دم توڑتے ہوئے نظر آؤ گے ۔

پادری :۔ میں بھلا ایسا کیوں کروں گا ۔ بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں ۔

مجرم :۔ میں تین روز سے بھوکا ہوں کھانا کھلواؤ گے ؟

پادری :۔ یقیناً ۔ مگر کھانے کی الماری کی چابیاں میرے پاس نہیں ۔ ساتھ کے کمرے میں میری بہن سو رہی ہے اس سے مانگ لوں ؟

مجرم :۔ چپ چاپ بیٹھے رہو ۔ میاں یہ چکمے کسی اور کو دینا یہ خاکسار کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا ۔

پادری :۔ مگر اس گھر میں صرف ہم دو ہی تو ہیں ۔ اور کوئی نہیں تم گھبراتے کس سے ہو ۔

مجرم :۔ ہوں ۔ تو چلو ۔ یہ سُن لو اگر تم نے مجھے پکڑنے کی ذرا بھی کوشش کی تو تمہاری خیر نہیں ۔ حسرتیں تمہاری بے گور و کفن اور خاک و خون میں لتھڑی ہوئی لاش پر آٹھ آٹھ آنسو روئیں گی ۔ ... سمجھے ۔

پادری :۔ خاطر جمع رکھو ۔ (دونوں دروازے کے قریب آتے ہیں) پرسم ۔ پرسم ۔

پرسم :۔ (اندر سے) "کیا ہے بھیا"

پادری :۔ ایک غریب مسافر کھانا مانگ رہا ہے ۔ الماری کی چابیاں چاہئیں ۔

پرسم :۔ یہ آدھی رات گئے یہ کیا بلا گلے آ بندھی ۔

پادری :۔ پرسم ۔ جلدی ۔

پرسم :۔ اچھا اچھا آئی ۔

(دروازہ کھولتی ہے ۔ مجرم کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ جاتی ہے)

پادری :۔ چابیاں مجھے دے دو اور تم جاؤ سو رہو ۔

(پرسم چابیاں دے دیتی ہے ۔ پادری الماری کھول کر کچھ کھانے پینے کی چیزیں نکالتا ہے اور انہیں میز پر رکھ دیتا ہے ۔

مجرم :۔ اس دروازے کی کنڈی لگا دو تاکہ "بوڑھی بھینس" پھر باہر نہ آ سکے ۔

(کھانا شروع کر دیتا ہے)

پادری :۔ مطمئن رہو ۔ ہاں ۔ یہ "کانٹا" نہیں لو گے ؟

مجرم :۔ اونہوں ۔ قیدی جیل خانوں میں اسے استعمال نہیں کرتے ۔

پادری :۔ جیل خانوں میں ؟ ۔

مجرم :۔ مجھ ایسے غریب جنہیں پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا نہ ملے ۔ مجھ ایسے لوگ ۔ انکا گھر فی الحقیقت جیل کی اندھیری کوٹھڑی ہی تو ہے ۔

پادری :۔ میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں ؟ ۔

مجرم :۔ مطلب ؟ آنکھیں ہوتے ہوئے بھی اندھے بنے رہو تو کوئی کیا کرے ۔ سنو چند ایک سال ہوئے میں نے اپنے بلبلاتے بچوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے ایک سیٹھ کے ہاں چوری کی ۔

پادری :۔ چوری ؟

مجرم :۔ ہاں ۔ چوری ۔ تم اسے گناہ سمجھتے ہو مگر ایسے وقت میں جبکہ میرے پاس اپنے عزیز بچوں کو دینے کیلئے روٹی کا ایک ٹکڑا تک موجود نہ تھا اور پیسہ ملنے کی کہیں سے امید نہ تھی ۔ میں نے اسے گناہ نہیں بلکہ ثواب سمجھا ۔

پادری :۔ پھر ؟

مجرم :۔ پھر کیا ۔ گرفتار کیا گیا ۔ میں نے لاکھ سر پیٹا ۔ ہزار کوشش کی ، مگر آہ وزاریاں بے سود تھیں ۔ آج رہا ہونے کے بعد میں ایک "سند یافتہ" بدمعاش بن چکا ہوں ۔ بھوک سے تنگ آ کر اگر میں چوری کروں تو میں مجرم نہیں ہو سکتا ۔

پادری :۔ اوہو! تم نے بہت دُکھ اٹھایا ہے۔ آؤ اب خدا سے معافی مانگ لو۔ ہم دونوں اکٹھے رہیں گے اور کام کاج کر کے اپنا پیٹ پالیں گے۔

مجرم :۔ معافی مانگ لوں۔ خدا سے جس نے مجھے کہیں نہ رکھا۔ میں اس کے آگے رویا گڑگڑایا۔ دعا کے لیئے ہاتھ اٹھائے مگر میری التجا ٹھکرا دی گئی۔ مجھے کچھ نہ ملا۔ پھوٹی کوڑی تک نہ ملی۔ اب اسی خدا سے معافی مانگوں جس نے مجھے چوری کرنے پر مجبور کر دیا جس نے مجھے جیل بھجوایا۔ رسوا و بدنام کیا۔ ہرگز نہیں۔ میرا ضمیر ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ تمہارا خدا۔ ظالم خدا۔ سنگدل بے رحم خدا......

پادری :۔ ہیں ہیں کیا کہہ رہے ہو۔

مجرم :۔ کہتا کیا ہوں۔ جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا ہوں۔ تمہارے خدا کے ظلم و ستم کا بھانڈا پھوڑتا ہوں اور کیا۔

پادری :۔ تمہیں بہت زیادہ رنج ہے۔ آج رات یہیں ٹھہرو۔ میں تمہیں اوڑھنے کو کمبل وغیرہ لائے دیتا ہوں۔

مجرم۔ کیوں پولیس کو اطلاع دینے کا ارادہ ہے؟

پادری :۔ ہرگز نہیں۔ خدا کے نیک بندے ایسا نہیں کیا کرتے۔ میں لاتا ہوں۔

(پادری چلا جاتا ہے۔ مجرم کمرے کی چند ایک خوبصورت چیزیں جیب میں ڈال کر بغلی دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ پادری واپس آکر کمرہ خالی پاتا ہے)

پادری :۔ (بلند آواز سے) ارے بھائی۔ کدھر ہو تم۔

(کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ پادری پرسم کے دروازے پر دستک دیتا ہے، پرسم! پرسم!)

پرسم :۔ (اندر سے) کیا ہے۔ وہ نگوڑا مسافر ابھی گیا نہیں۔ ذرا بھی تو آنکھ نہیں لگی۔ توبہ میری۔"

پادری :۔ وہ تو چلا گیا۔ اور... اور... تمہاری دو ایک چیزوں پر ہاتھ صاف کر گیا۔

پرسم :۔ (دروازہ کھول کر داخل ہوتی ہے) ارے کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ (کمرے کی تمام چیزوں کو بغور دیکھ کر) آپ پولیس میں اطلاع کر دیجئے وہ بھوکا، نمک حرام ابھی یہیں کہیں ہوگا۔

پادری :۔ (نرمی سے) نہیں، پرسم مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔

پرسم :۔ آپ کی نیکی ایک نہ ایک دن ضرور کچھ گل کھلائے گی دیکھا آپ نے۔ اور سدھاریئے عوام کی حالت۔

پادری :۔ خیر۔ خدا مجھے اس کا اجر دے گا۔

پرسم :۔ "مگر......"

(باہر دروازے پر دستک)

پادری :۔ کون ہے۔ آجاؤ اندر۔

(دو پولیس کے سپاہی مجرم کو پکڑے داخل ہوتے ہیں۔ مجرم کانپ رہا ہے)

پرسم :۔ آخر پکڑا ہی گیا نا۔

سپاہی :۔ جی۔ یہ بے تحاشا بھاگا جا رہا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے اسے پکڑ سکے۔ یہ چیزیں آپ کی ہیں۔ اس کے پاس تھیں۔ کل آپ کی میز پہ یہ چیز دیکھی تھی جبھی پہلے یہاں لائے ہیں اسے۔ (ملزم ملتجیانہ پادری کی طرف دیکھ رہا ہے)

پادری :۔ (سپاہی سے) میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ یہ تو میرے دوست ہیں۔

سپاہی :۔ (حیرانی سے) آپ کے دوست ہیں مقدس باپ؟

پادری :۔ ابھی ابھی یہاں سے کھانا کھا کر تو گئے تھے۔

سپاہی :۔ اور یہ چیزیں.....

پادری :۔ میں نے خود ہی تو انہیں دی ہیں۔

سپاہی :۔ خود دی ہیں؟

پادری :۔ ہاں۔ ہاں۔ اچھا اب انہیں چھوڑ دو!

سپاہی :۔ مگر یہ تو اپنا پتہ ہی نہیں بتاتے۔

پادری :۔ میں نے کہہ تو دیا میرے ایک دوست ہیں۔ یہ کیا کم ہے۔

سپاہی :۔ جی ہاں مقدس باپ۔ ہم اس غلطی کی معافی چاہتے ہیں۔

(سپاہی سلام کر کے رخصت ہوتے ہیں)

مجرم :۔ آپ نے۔ آپ نے۔ میری عزت بچائی۔ مجھے

نئی زندگی دی ہے۔

پرسیم:۔ کم عقل کمینے ...... کُتے۔

پادری:۔ (نرمی سے) ہوا کیا پرسیم۔ انسان غلطی کر ہی بیٹھتا ہے۔

مجرم:۔ واقعی مجھ سے بہت سخت غلطی ہوئی۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو مقدس باپ۔

(بے اختیار رو پڑتا ہے)

پادری:۔ بیٹا مجھ گنہگار کو اور گنہگار نہ کرو۔ خدا سے معافی مانگو۔ توبہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ خدائے قدوس اپنے نادان بندوں کو معاف کر دیتا ہے۔

(پادری مجرم اور پرسیم تینوں ہاتھ اوپر اٹھا دیتے ہیں۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

احمد شجاع پاشا

اسقدر ہم نے کیا ہے ستم کو یاد
ایک عالم کو ہے ہماری یاد ہے ستم
نصیر (ام ۹۹م)

نئی کتابیں

چوپال

مصنفہ جناب احمد ندیم قاسمی - حجم ۲۴۰ صفحات - سائز متوسط۔ قیمت مجلد عہ پبلشرز دار الاشاعت پنجاب لاہور

ہمارے ادب میں اب افسانہ کی صنف ترقی کر رہی ہے اور اس وقت جو افسانے لکھے جا رہے ہیں ان کا انداز ایک خوش آیند مستقبل کی امید دلاتا ہے - آج سے چند برس قبل اردو افسانوں کی حقیقت محض قصّوں کی تھی - ان کا انداز اس قدر بھونڈا اور ان کا اسلوب اس قدر مضحکہ خیز تھا کہ پڑھنے والے کی طبیعت مکدر ہو جاتی تھی - لیکن اب لوگوں کی طبیعت میں جدّت پیدا ہو رہی ہے اور وہ مہمل افسانوں سے گھبرانے لگے ہیں - ترجمہ کیلئے اکثر دوسری زبانوں کے اُن شاہکاروں کو منتخب کیا جاتا ہے - جن کی اشاعت سے ہمارے ادب کو کسی قسم کے استفادے کی امید ہو - طبعزاد افسانوں میں ہماری معاشرہ کے مخصوص رجحانات اور افراد کی نفسیاتی کیفیتوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور یہ مغربی ادب کے طویل مطالعہ کا نتیجہ ہے -

احمد ندیم قاسمی ایک خوش فکر اور خوش ذوق نوجوان ہیں - زیرِ نظر کتاب ان کے چودہ طبعزاد افسانوں کا مجموعہ ہے - جسے حال ہی میں دار الاشاعت پنجاب نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے - کتاب کے ساتھ مولینا عبد المجید سالک مدیر "انقلاب" کا تعارف اور سیّد امتیاز علی تاج کا دیباچہ بھی شامل ہیں - ان کے علاوہ مصنف نے "عرضِ حال" کے عنوان سے خود بھی ایک مختصر سا دیباچہ لکھا ہے - جس میں انہوں نے اپنے افسانوں کی اس عقبی زمین اور مخصوص دیہاتی ماحول کی وضاحت کی ہے - جو زیرِ نظر مجموعہ کی اصل روح ہے - وہ لکھتے ہیں :-

> " دیہات کے کچّے گھروں - تنگ گلیوں - غلیظ جوہڑوں، کھلے میدانوں، بل کھائی ہوئی مہین پگڈنڈیوں منہ اندھیرے بیلوں کی گھنٹیوں، شام پڑے ننھے چرواہوں کے دلربا گیتوں، رات کو چھتوں پر نوخیز دوشیزاؤں کی ترنّم ریزیوں اور سرد راتوں میں الاؤ کے ارد گرد گاؤں کے خوبصورت نوجوانوں کی گپ شپ میں ہزاروں جاں گداز افسانے پوشیدہ ہیں -"

احمد ندیم نے اپنے تمام افسانوں میں اس پاکیزہ فضا کو جو پنجاب کے دیہات سے مخصوص ہے - ہمیں دکھانے کی کوشش کی ہے اور اپنے افسانوں کے کردار انہیں نوجوانوں اور دوشیزاؤں سے چنے ہیں - جن کی معصوم زندگیوں نے ہمارے دیہات کو جنت بدوش بنا رکھا ہے - ان کی اس کوشش سے متاثر ہو کر سیّد امتیاز علی صاحب تاج اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

> " منشی پریم چند اپنے اکثر افسانوں میں ایک شہری کے نقطۂ نظر سے دیہات کی زندگی کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں - لیکن ندیم قاسمی خود دیہات سے تعلق رکھتا ہے - وہ کسی خارجہ نقطۂ نظر سے دیہات کو نہیں دیکھتا بلکہ نہایت بے تکلفی سے دیہات کو دیہات کے نقطۂ نظر سے منکشف کرتا ہے -"

یہی وجہ ہے کہ جہاں ہمیں منشی پریم چند کے افسانوں میں دیہاتی اور شہری زندگی کو دوش بدوش دیکھ کر ان کے تقابلی مطالعہ کا موقع ملتا ہے وہاں احمد ندیم قاسمی کے افسانے ہمیں اس فضا میں لے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں جس میں اس کے کردار چلتے پھرتے اور سانس لیتے ہیں - منشی پریم چند کے افسانوں میں شہری اور دیہاتی زندگی دونوں کی کمزوریاں اور خوبیاں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں - مگر احمد ندیم محض دیہاتی زندگی کو اس کے شوخ ترین رنگوں کے ساتھ ہمارے

سامنے رکھ دیتا ہے اور ہمیں موقع دیتا ہے کہ اس زندگی کے متعلق خود اپنی انفرادی رائے قائم کریں۔ لیکن منشی پریم چند کے افسانوں میں جہاں ہمیں دیہات کی فضا کے صاف صاف اور سادہ سادہ نقوش نظر آجاتے ہیں وہاں احمد ندیم کے شاعرانہ انداز اور فلسفیانہ رنگ کی وجہ سے کہیں کہیں ان میں تصنع کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منشی پریم چند جہاں محض نثر نگار تھے وہاں احمد ندیم ایک خوش ذوق شاعر بھی ہے۔ اور اس کا شاعرانہ مرتبہ نوجوان شعرا میں بہت اونچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانوں کی زبان بعض اوقات غیر شعوری طور پر شاعرانہ ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے افسانوں کے دیہاتی کرداروں کی آرا و افکار اور بول چال کو دیہاتیوں کی سیدھی سادھی زبان میں پیش کرنے کی بجائے کہیں کہیں خاص ادبی زبان کی دلکشیوں کو دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے طبیعت پہ ناگوار سا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس زبان سے جہاں انہوں نے کسی خاص منظر کو دکھانے میں مدد لی ہے یا کسی خاص شے کی نقشہ کشی کی کوشش کی ہے وہاں وہ پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ ایک جگہ "حق بجانب" میں انہوں نے اپنے تصور کو یوں پیش کیا ہے۔

"کیا کبھی کسی عجائب خانہ میں کسی حور آسمانی کا سرم یا مرمر میں ڈھلا ہوا مجسمہ آپ کی نظروں سے گزرا ہے جس کے سیاہی مائل سنہرے بال اس کے بھرے بھرے گداز شانوں پر بکھرے ہوئے ہوں۔ اور جن کے بارے اس کے تمام جسم کے نمایاں خطوط میں ایک مبہم سا خم پڑ گیا ہو! جس کے لبوں کے گہرے باریک گوشوں میں مسرت و غم کا ایک قیامت آفریں امتزاج کروٹیں لے رہا ہو اور بغور دیکھنے سے یوں معلوم ہو۔ جیسے صناع نے انہیں ابدی ارتعاش کی سزا دے رکھی ہے! جس کی غزال سی آنکھوں کی سیاہی کا آدھا حصہ اوپر کی پلکوں نے ڈھانپ لیا ہو۔ جیسے وہ فرطِ غم سے بے ہوش ہو رہی ہے! اور پلکوں کے ساتھ دو آبدار موتی آنسوؤں کی شکل میں یوں لرز رہے ہوں جیسے دل کسی رگ کے ذریعہ اپنی اس کھوئی ہوئی دولت کو پھر اپنے اندر جذب کرنے کی خواہش میں انہیں کھینچ رہا ہے! جس کا سادہ لباس اطلس و سنجاب کے انباروں سے سج رہا ہو اور جس کے مدوّر ہاتھ یوں اٹھے ہوئے ہوں۔ جیسے کوئی شخص دردِ سر کی شدت سے مجبور ہو کر اپنے دونوں ہاتھ پیشانی کی طرف لے جانے کو اٹھاتا ہے!

کیا آپ نے کبھی ایسا مجسمہ دیکھا ہے؟

دیکھا تو میں نے کبھی نہیں، لیکن میں اگر سنگ تراش ہوتا تو اس قسم کا مجسمہ بنانے میں مجھے نہایت آسانی ہوتی کیونکہ ایک رات میں نے اس تراش خراش کی ایک لڑکی کو اپنے کمرہ میں پناہ دی تھی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد ندیم کے تمام افسانوں میں ہمیں کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ نظر نہیں آتا۔ لیکن اس کے باوجود ان میں زندگی کی حرارت ضرور دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ ہمیں ایک ایسی جاندار مخلوق نظر آتے ہیں۔ جن میں حیات کی تمام علامتیں موجود ہیں۔ احمد ندیم کو خود احساس ہے۔ کہ شاید انتہا میں حضرات ان کے بعض افسانوں کی ہلکی سی عریانی پر برافروختہ ہو جائیں۔ لیکن اگر ان کے نقاد یہ دیکھیں کہ یہ صاف گوئی اور بیباکی محض حقیقت نگاری کی وجہ سے ہے تو انہیں اس عریانی کو انسانی زندگی کی ایک سچی تصویر سمجھنا پڑے گا۔ جس کے بغیر کوئی ادبی کارنامہ مکمل متصور نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے دیہات کی معاشرہ کو جس طرح دیکھا ہے بے جھجک اسی طرح پیش کر دیا ہے۔ پنجاب کے غریب کسان کی درد بھری زندگی کے تاریک اور غم انگیز پہلو دکھا کر قاری کے جذباتِ خفتہ کو بیدار کرنے کی ایک غیر شعوری کوشش ندیم کے ہر افسانہ میں نظر آتی ہے۔ مولانا سالک اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"ندیم کے افسانوں میں پنجاب کے غریب کسان کی زندگی کے مختلف پہلو صاف جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کا عشق، اس کی جوانی، اس کی غریبی، اس کی جفاکشی، اس کی

سادگی اور سب سے بڑھ کر اس کی شدتِ احساس! اور یہی وہ شدتِ احساس ہے جس میں ندیم کو ثروت و افلاس۔ سرمایہ و محنت حکم اور محکومی کی ٹکر کے امکانات نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے آرٹ کے خیابانوں سے نکل کر انقلاب کے ریگستانوں میں جوشِ جنوں کے مظاہرے کرتا ہے۔"

ندیم کے افسانوں کی زبان بہت شستہ اور دلآویز ہے اور ان کا افادی پہلو بھی کچھ کم جاذبِ نظر نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مجموعہ جو ہمارے ادب میں پنجاب کے دیہات کی زندگی کو پہلی مرتبہ روشناس کراتا ہے مقبول ہوگا۔ اور اس کے مصنف کے دل میں اس مقبولیت سے متاثر ہو کر آئندہ اور اچھی اچھی چیزیں لکھنے کی تحریک پیدا ہوگی۔ کتاب بہت عمدہ چھپی ہے اور اُن تمام صوری محاسن کی حامل ہے جو دارالاشاعت کی مطبوعات سے مخصوص ہیں۔

وداعِ راشد

مصنفہ جناب رازق الخیری۔ کاغذ، کتابت طباعت عمدہ حجم ۸۰ صفحات قیمت ..... ملنے کا پتہ عصمت بک ڈپو دہلی

رازق الخیری علامہ راشد الخیری مرحوم کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ "وداعِ راشد" میں انہوں نے اپنے جلیل القدر باپ [illegible]یماری اور موت کے واقعات کو اس دلدوز اور موثر انداز میں بیان کیا ہے کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ یہ مختصر سی کتاب خود مصنف کے الفاظ میں حیات راشد کا آخری باب ہے۔ رازق صاحب نے دلی کی صاف ستھری اور آسان زبان میں سچے اور پاک جذبات کی ایک دردناک تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ علامہ صاحب کے انتقال سے چند روز پہلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دس گیارہ بجے ہوں گے ٹائم پیس کی طرف دیکھ کر فرمایا ایک گھنٹہ بعد آج کا دن ختم ہو جائے گا۔"

"مگر آبا جان پھر دوسری تاریخ شروع ہو جائے گی۔"

فرمایا "ہاں اسی طرح انسانی زندگی کے مختلف دور آتے ہیں ہر انجام کے بعد ایک آغاز ہے۔"

تھوڑی دیر خاموش رہے پھر فرمایا "رازق میاں جس دنیا نے رسول اللہ سے وفا نہ کی وہ کسی سے وفا نہیں کر سکتی۔"

پندرہ بیس منٹ تک کوئی بات نہ کی پھر مجھ سے فرمایا "آج سے چالیس سال پہلے دنیا کا کیا حال تھا۔"

"میں نے عرض کیا۔ وضعداری کے چشمے پھوٹ اور محبت کے پھول کھل رہے تھے۔"

"ہاں مگر میں کچھ اور کہہ رہا ہوں اس وقت مسلمان عورت کی کیا حالت تھی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔

"آپ ہی کی کتابوں سے اندازہ کیا ہے کہ اس وقت عورت کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ جہالت، رسوم کی پابندی۔ مرد کے مظالم، پردہ کی سختی۔ آپ نے عورتوں کو جھنجھوڑا اور ان میں بیداری کی روح پیدا کی۔ ان کے حقوق کیلئے سارے ہندوستان سے لڑے۔

"جی یہ چاہتا تھا کہ عورت کو خلع کا حق مل جاتا اور پنجاب میں مسلمان لڑکی کا ترکہ ملنے لگتا۔

"آپ گھبرائیے نہیں آبا جان۔ خدا آپ کو جلد تندرست کر دے گا۔ مسلمان عورت کیلئے آپ کو بہت کچھ کرنا ہے۔ آپ بہت دیندار ہیں، خدا کی رحمت سے مایوس کیوں ہوئے جاتے ہیں۔ انشاء اللہ جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

"آنکھیں کھلیں بند کر لیں اور چند لمحے بعد نیم وا آنکھوں سے حسرت سے دیکھا اور فرمایا۔

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

آپا جان نے کہا "آبا ایسی باتیں نہ کیجئے" فرمایا "رازق میاں حالی کی اس غزل کے کچھ اور شعر یاد ہوں گے سناؤ" دو شعر مجھے یاد تھے سنا دئے تو فرمایا تمہیں مطلع یاد نہیں" یاد تھا مگر کس دل سے سناتا۔ فرمایا لو سنو مجھے یاد آگیا۔

"ان کے جاتے ہی کچھ اور ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت"

کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے پڑھنے سے مصورِ غم کی زندگی کے تمام پہلو آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم محض ایک عظیم الشان مصنف ہی نہیں بلکہ ایک بڑے انسان بھی تھے۔ یہ کتاب ہر مسلمان کو پڑھنی چاہیئے۔

عصمت کی کہانی

کاغذ و طباعت عمدہ حجم ۹۰ صفحات تقطیع ۲۲×۱۸/۸ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ عصمت بک ڈپو دہلی۔

یہ کتاب بھی رازق الخیری صاحب کی تصنیف ہے۔ اس میں انہوں نے رسالہ "عصمت" کی ۲۸ سالہ سرگزشت بیان کی ہے۔ یہ داستان بڑی دلچسپ ہے اور اس کے مطالعہ سے اردو صحافت کی آج سے ربع صدی پہلے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

کپڑے کی چھپائی

مصنفہ جناب اقبال احمد صاحب۔ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔ حجم ۷۲ صفحات تقطیع ۲۲×۱۸/۸ قیمت ۱۰ر ملنے کا پتہ عصمت بک ڈپو دہلی۔

یہ کتاب ان عورتوں اور لڑکیوں کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگی جنہیں گھریلو دستکاریوں سے شغف ہے اس میں چھپائی کے مختلف طریقے بتائے گئے ہیں۔ کتاب کے شروع میں "ہنرا چھاپنے کے فن پر ایک تاریخی نظر" کے عنوان سے ایک پُراز معلومات مضمون بھی درج ہے۔

گلستان خیاطی

مرتبہ غدیر فاطمہ صاحبہ۔ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔ ۱۱۹ صفحات تقطیع ۲۲×۲۰/۸ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ رسالہ "جوہر نسواں" دہلی۔

"گلستان خیاطی" رسالہ "جوہر نسواں" کا خاص نمبر ہے۔ جو کپڑوں کی کٹائی اور سلائی کے متعلق ایک کارآمد اور مستقل کتاب کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ نمبر بے حد محنت اور قابلیت سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور پانچ مختلف ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مردانہ اور زنانہ کپڑوں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے کپڑوں اور متفرق اشیاء کے سینے کے متعلق نہایت مفید معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کتاب میں ہر قسم کے نقشے دیئے گئے ہیں۔ تاکہ لڑکیوں کو ہدایات سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ ہر لڑکی کو اس مفید کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

"ف"

مکتبہ جہاں نما دہلی

کی

چند خاص مطبوعات

اندھی دنیا اور دوسرے افسانے

از اختر انصاری دہلوی - یہ فسانے ہمارے اکثر ادبی شاہکاروں کی طرح افیون کی گولیاں نہیں ہیں - یہ افسانے استبداد اور بے انصافی ریاست اور سیاست، رجعت اور قدامت، سماج اور تہذیب کے خلاف علم جہاد بلند کرتے ہیں - قیمت مجلد ۱۲ر

نغمۂ روح

اختر انصاری کا پُرسوز اور روح پرور کلام جس میں ان جذبات واحساسات کی مصوری کی گئی ہے - جو واقعات کی زندگی میں پرورش پاتے ہیں - طبع ثانی قیمت ۱۲ر

موتی

از سید یوسف بخاری، مشرق و مغرب کے علماء، ادباء اور فلاسفر کے حکیمانہ اور شاعرانہ اقوال کا مجموعہ جو اپنے حکمت اور فلسفہ سے انسان کی ہر حصۂ حیات میں رہنمائی کرتے رہے ہیں - مع مقدمۂ مؤلف جو اقوال کے فلسفہ و تاریخ پر مشتمل ہے - محکمہ تعلیمات سرکار عالی حیدر آباد میں منظور شدہ قیمت ۱۲ر

پتہ:- مہتمم مکتبہ جہاں نما اردو بازار جامع مسجد دہلی

گراموفون کے ریکارڈ

اگر آپ کے پاس ہوں تو انہیں مت پھینکئے، سائنسدانوں نے ایک مصالحہ حال میں دریافت کیا ہے جس کو **زیڈ ZED** کہتے ہیں - اس کے لگانے سے ریکارڈوں میں گھسی ہوئی لکیریں گہری ہو جاتی ہیں اور آواز بہت تیز ہو جاتی ہے - وہی دلکش نغمے جو بہت بھلے لگتے ہیں از سر نو عود کر آتے ہیں - گڑگڑاہٹ بالکل مٹ جاتی ہے - نئے ریکارڈوں پر زیڈ لگانے سے عمر بڑھ جاتی ہے اور وہ عرصہ تک نہیں گھستے - خوب بک رہا ہے - آپ بھی خرید لیجئے قیمت ایک شیشی دو روپے عہ

گرین فیلڈز (انڈیا) کمپنی، پنڈری سی پی